نشان ٹپہ آصفیہ (۱۵۳)
نشان ٹپہ برطانیہ (M 3950)

ادارۂ ادبیات اردو حیدرآباد دکن

کا

ماہ نامہ

سب رس

بابت مارچ ۱۹۳۸ء یعنی جلد (۱) شمارہ (۳)

زیر نگرانی

ڈاکٹر سید محی الدین قادری زورؔ

مجلس ادارت

صاحبزادہ میر محمد علی خاں میکشؔ
خواجہ حمید الدین شاہدؔ
سکینہ بیگم
معین الدین احمد انصاری

مکتبہ ابراہیمیہ پریس میں طبع ہوکر دفتر "ادارہ" رفعت منزل خیریت آباد سے شائع ہوا
سالانہ چندہ (للعہ) علاوہ محصول ڈاک۔ فی پرچہ چھ آنے

تحفۂ لاجواب

یہہ تحفہ ہے لاجواب ازبس لے لو — مرغوب دل ہر کس و ناکس لے لو

سب کا لینا تو امر ناممکن ہے — سب میں بہتر یہہ ہے کہ "سب رس" لے لو

امجد

سب رس کے مقاصد و قواعد

۱ - یہہ "سلسلہ ادبیات اردو" کا ماہوار علمی و ادبی رسالہ ہے جس میں اردو زبان اور ادب کے مختلف شعبوں اور پہلوؤں پر بحث ہوگی۔

۲ - مضامین متعلقہ سیاسیات حاضرہ اور مذہبی مباحث کسی صورت میں قابل اشاعت متصور نہ ہوں گے۔

۳ - اردو مطبوعات پر بے لاگ تنقید کرکے اردو تصنیف و تالیف کا ذوق صحیح پیدا کرنے کی کوشش کی جائے گی۔

۴ - غیر زبانوں کے شاہکار مضامین کو اردو میں منتقل کرکے اردو کے علمی و ادبی سرمایہ میں اضافہ کیا جائے گا۔

۵ - یہہ رسالہ کم از کم ۶۴ صفحات اور زیادہ سے زیادہ ۹۶ صفحے پر ہر ماہ عیسوی کے پہلے ہفتہ میں شائع ہوا کرے گا۔

۶ - رسالہ نہ پہنچنے کی اطلاع پندرہ تاریخ تک دفتر میں پہنچ جانی چاہئے۔

۷ - جواب طلب امور کے لئے جوابی پوسٹ کارڈ یا لفافہ آنا ضروری ہے۔

۸ - خط و کتابت کرتے وقت نمبر خریداری کا حوالہ ضرور دیا جائے۔

۹ - اشتہارات کی اجرت پیشگی لی جائے گی۔ وی پی کے ذریعہ سے وصولی منظور نہیں کی جائے گی۔

سب رس کی قیمت

	سالانہ	ششماہی	فی پرچہ
حیدرآباد کے لئے	چار روپے	دو روپے آٹھ آنے	چھ آنے
حیدرآباد سے باہر	چار روپے آٹھ آنے	تین روپے	سات آنے

نرخنامہ اجرت اشتہارات

	ایک سال	چھ ماہ	تین ماہ	ایک ماہ
ایک صفحہ	۵۰ روپے	۳۰ روپے	۱۵ روپے	۶ روپے
آدھا صفحہ	۳۰ "	۱۵ "	۱۰ "	۴ "
چوتھائی صفحہ	۱۵ "	۱۰ "	۴ "	۲ "

محرم نمبر ۱۲ار — اقبال نمبر عہ ۱۲ار — مرقع دکن نمبر عا ار — خواتین نذر دکن نمبر عہ ار

جلد (۱) شمارہ (۳) | **سب رس** | مارچ ۱۹۳۹ع

فہرست تصاویر

۱۔ سانولی شہزادی۔ نقش اجنٹا۔ کتاب نو دکن کی ایک تصویر — مقابل صفحہ ۶

۲۔ نواب رفعت یار جنگ اول — ۳۔ نواب رفعت یار جنگ ثانی " " " ۵۰

فہرست مضامین۔

صفحہ

۱۔ اداریہ — ادارہ — ۵

۲۔ غزلیں — جعفر علی خاں اثر لکھنوی — ۶
امین حسن تجلی

۳۔ مزدور کا بیاہ (نظم) — احسان بن دانش (لاہور) — ۷

۴۔ خواب گراں (ڈرامہ) — شوکت علی خاں — ۹

۵۔ غزل — علی اختر — ۱۳

۶۔ بچوں کی پرورش — ملیح الزماں — ۱۴

۷۔ سوانح نگاری کا ایک شاخسانہ — جہاں آرا بیگم — ۱۶

۸۔ کس طرح لکھیں — ڈاکٹر سید محی الدین قادری زور ایم اے۔ پی ایچ ڈی — ۲۰

۹۔ اے دوست (نظم) — صمد رضوی ساز بی اے ال ال بی — ۲۴

۱۰۔ سلام بجناب امام علیہ السلام — لطیف النساء بیگم بی اے — ۲۵

۱۱۔ حیدرآباد کی علم دوست خواتین کا پہلا اجتماع — سکینہ بیگم معتمد شعبۂ نسواں — ۲۶

۱۲۔ خطبۂ صدارت شعبۂ نسواں — محترمہ لیڈی حیدری صاحبہ — ۲۷

۱۳۔ احسان فراموش دنیا (نظم) — بشیر النساء بیگم بشیر — ۲۸

۱۴۔ خیر مقدمی تقریر۔ — رابعہ بیگم (محبوبیہ گرلز اسکول) — ۲۹

۱۵۔ علم دوست خواتین کو دعوت عمل — لطیف النساء بیگم بی اے — ۳۱

۱۶۔ غزل — انیسہ ہارون بیگم شروانیہ — ۳۳

۱۷۔ اظہار ممنونیت — سکینہ بیگم — ۳۴

۱۸۔ عرض حال (نظم) — بشیر النساء بیگم بشیر — ۳۵

۱۹۔ تاثرات سفر یورپ — ہارون خاں شروانی ایم اے — ۳۶
اکسن پر سٹراٹ ۷

۲۰۔ تنہائی — طاہرہ سلطانہ — ۳۸

۲۱۔ سانحۂ کربلا — [illegible] بیگم — ۳۹

۲۲۔ عبداللہ قطب شاہ اور محرم — سید محمد ایم اے — ۴۱

۲۳۔ سلام — نوشابہ خاتون بی اے — ۴۶

۲۴۔ علی عادل شاہ شاہی کے مرثیے — نصیر الدین ہاشمی — ۴۷

۲۵۔ مرثیۂ عقیدتمندانہ (نظم) — میر امیر علی خاں — ۴۷

۲۶۔ رباعیات — میر کاظم علی برق موسوی — ۴۷

۲۷۔ دکن کے مرثیہ نگار شعراء — افضل النساء بیگم — ۴۸

۲۸۔ نواب رفعت یار جنگ مرحوم دکن کے ایک علم دوست اور صاحب ذوق امیر — خواجہ حمید الدین شاہد — ۵۷

۲۹۔ قطعہ تاریخ وفات — قاضی میر لطف علی عارف — ۶۶

۳۰۔ نلگنڈہ اور اس کے قرب وجوار — مؤید الدین حسن — ۶۷

۳۱۔ غزل — حمید لکھنوی — ۶۹

۳۲۔ اردو رسالوں کے خاص نمبر — مرزا سیف علی خاں — ۷۰

۳۳۔ بچوں سے — معین الدین احمد انصاری — ۷۳

۳۴۔ پہیلیوں کے حل — پانچ اصحاب — ۷۴

۳۵۔ انعامی سوالات۔ — میر محمود علی اکبر منشیر — ۷۴

۳۶۔ لطیفے — سید غوث الدین احمد — ۷۴

۳۷۔ اطلاعیں — مہتمم سب رس — ۷۵

۳۸۔ معلومات — محمد غوث محی الدین (روضہ شیخ گلبرگہ) — ۷۵

۳۹۔ امام حسین علیہ السلام — محمد رفیع الدین فاروقی آرزو — ۷۶

۴۰۔ غزال کی آنکھ — سیدہ حامد النساء بیگم (بشیر آباد) — ۷۷

۴۱۔ علم کے طالب کو کیا کیا چاہئے (نظم) — حسین شریف درد (سٹی کالج) — ۷۸

۴۲۔ وقت کی قیمت — غلام مجتبیٰ قمر (بیدر شریف) — ۷۸

۴۳۔ لالچ کی سزا — اشرف النساء بیگم (محبوبیہ گرلز اسکول) — ۷۹

۴۴۔ دلچسپ معلومات — حسین شریف درد — ۷۹

۴۵۔ لطیفے — مرزا محمد ارشد مختار بیگ دہلوی — ۷۹

۴۶۔ بچوں کی تعلیم و تربیت — مرزا سیف علی خاں — ۸۰

۴۷۔ باغبان (قصہ) — میر محمود علی (متعلم خیریت آباد) — ۸۲

۴۸۔ ہوائی جہاز کی ایجاد — مسعود بن سعید (مدرسۂ عالیہ) — ۸۳

۴۹۔ ہم بچے ہیں (نظم) — سید موسیٰ کلیم ید اللہی — ۸۵

۵۰۔ بدر کامل اور ننھا سلیم (نظم) — میر کاظم علی داخل — ۸۵

۵۱۔ لوہے کی کان — سید اقبال حسین اقبال (سٹی کالج) — ۸۵

۵۲۔ رجز حیات (نظم) — محمد عبدالسلام ذکی بی اے۔ ٹی ڈی — ۸۶

ادارہ کے شعبۂ نسواں کے اجلاس عام کی روداد اور تقریریں صفحات ۲۶ تا ۳۶ میں ملاحظہ ہوں۔

ضروری اطلاعیں

سب رس کے گذشتہ سال کے پرچے دکن نمبر کے اعلان کے بموجب ہمیں نومبر اور ڈسمبر ۱۹۳۸ء کے چند پرچے وصول ہوئے ہیں لیکن مزید چند پرچوں کی ضرورت ہے، جو صاحب علحدہ کرنے چاہتے ہوں براہ کرم دفتر کو مطلع فرمائیں۔ اصل قیمت پر پرچے خریدے جائیں گے۔

سب رس کے پہلے سال کی جلد۔ بعض علم دوست اصحاب نے سب رس کے گذشتہ سال کے مکمل بارہ پرچوں کی جلدیں طلب فرمائی ہیں، ایسے اصحاب کے لئے نہایت خوبصورت جلدیں (خاص طور پر بنواکر اور شیرازہ پر سب رس کی ڈائی معہ صراحت سنہ اور ان کا نام منقش کراکے) روانہ کی جارہی ہیں۔ اس قسم کی جلدیں بطور تحفہ بھی علم دوست احباب ایک دوسرے کی خدمت میں پیش کر سکتے ہیں کیونکہ یہ خوشنما جلد اردو کے کئی سو بہترین فسانوں، پاکیزہ نظموں، اور دلچسپ و مفید مضمونوں کا ایک خوبصورت مجموعہ ہونے کے علاوہ پچاس سے زیادہ دلفریب اور رنگین تصویروں کا ایک مرقع بھی ثابت ہو سکتی ہے۔ اور کسی تقریب کے وقت علم دوست اصحاب کے لئے اس سے بہتر تحفہ دستیاب نہیں ہو سکتا۔ اگر چاہیں تو جلد پر تحفہ دینے والے اور لینے والے دونوں کے نام بھی صراحت کے ساتھ منقش کردئے جاسکتے ہیں۔ سال بھر کے رسالوں کی جلدیں صرف پانچ روپئے میں روانہ کی جارہی ہیں۔

سب رس کے متفرق پرچے جن اصحاب کے یہاں سب رس کا گذشتہ سال کا فائل مکمل نہیں ہے اور وہ اس کو مکمل کرنا چاہتے ہیں تو دفتر سے مراسلت کریں۔ اگر ممکن ہو تو دفتر رعایتی قیمت سے پرچے فراہم کرکے ان کے فائل کی تکمیل میں مدد دے گا۔

کتاب گھر۔ ادارہ سب رس کی خواہش ہے کہ علم و ادب کا ذوق رکھنے والوں کے لئے ہر طرح کی علمی و ادبی سہولت فراہم کرے چنانچہ سب رس کتاب گھر میں جو کتابیں موجود نہیں رہتیں ان کو بھی کسی نہ کسی طرح سے فراہم کرنے کی کوشش کی جاتی ہے۔ علم دوست اصحاب اپنی ضرورت کی کتابیں بلاتکلیف سب رس کتاب گھر کے توسط سے حاصل کر سکتے ہیں۔

رقمی داد وستد۔ ادارہ کے بڑھتے ہوئے کاروبار کی وجہہ سے مختلف اصحاب اس کے کاموں میں ہاتھ بٹا رہے ہیں، اور سب رس کا چندہ اور ادارہ ادبیات اردو کی کتابوں وغیرہ کی قیمت بھی وصول کر رہے ہیں۔ اس سلسلہ میں علم دوست اصحاب کو مشورہ دیا جاتا ہے کہ وہ ادارہ سے متعلق کوئی رقم ادا کرتے وقت ادارہ کی مطبوعہ نمبری رسید ضرور حاصل کریں تاکہ ادارہ کے حسابات میں دقتیں نہ پیدا ہوں۔ دفتر صرف اسی رقم کی ذمہ داری لے سکتا ہے جس کے لئے مطبوعہ رسید جاری کی گئی ہے۔

ایجنٹوں کی ضرورت سب رس اور بچوں کے سب رس" اور ادارہ ادبیات اردو" کی کتابوں کے لئے مختلف شہروں اور تعلقوں میں ایجنٹوں کی ضرورت ہے جن کو کافی کمیشن دیا جائے گا اور ہر قسم کی سہولتیں فراہم کی جائیں گی۔ ایجنسی کے تفصیلی شرائط دفتر سے معلوم ہو سکتے ہیں۔

"ادارہ"

اس مہینے ادارہ ادبیات اردو کے شعبہ نسوان کے اجلاس عام نے حیدرآباد کی خواتین میں ایک علمی و ادبی چہل پہل پیدا کردی۔ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ ملک کی علم دوست خواتین اپنے لئے ایک علمی و ادبی مرکز کی ضرورت محسوس کر رہی تھیں۔ اس اجلاس عام نے نسوانی کتب خانہ کے قیام کے متعلق ادارہ کی تجویز کا گرم جوشی سے خیر مقدم کیا۔ ادارہ اس سلسلہ میں جو کام انجام دے رہا ہے اس کی بناء پر توقع ہے کہ ادارہ جلد ایک ایسے کتب خانہ کا افتتاح کرسکے گا جہاں خواتین پردہ ہی میں رہ کر علم و ادب کے خزانوں سے مستفید ہوسکیں گی۔ اس سلسلہ میں جملہ علم دوست اور صاحب ذوق خواتین سے امداد و اعانت اور مشورے کی درخواست کی جاتی ہے۔ اور وہ محترمہ سلیمہ بیگم صاحبہ معتمد شعبہ نسوان سے ادارے کے پتہ پر مراسلت کرسکتی ہیں۔ اجلاس عام کی مکمل روداد اور تقریروں کے خلاصے اس شمارہ میں شائع کئے جارہے ہیں۔

محترمہ جہاں آرا بیگم صاحبہ کا ایک مضمون بھی اس نمبر میں شامل ہے جس میں انھوں نے بعض ایسے مسائل پر خیال آرائی کی ہے جو غلط فہمیاں پیدا کرنے کے باعث ہوں گے۔ اس کا جواب شعبہ تنقید کی طرف سے آئندہ مہینے شائع کیا جائے گا۔ اس شعبہ نے اس اثنا میں سب رس کے لئے اردو کی جدید مطبوعات پر بڑی اچھی تنقیدیں لکھ دی ہیں لیکن یہ اور دوسرے شعبوں کی رودادیں، نیز بعض اہم اور دلچسپ مضمون اور افسانے اور پاکیزہ نظمیں اس نمبر میں جگہ کی قلت کی وجہ سے شائع نہ ہوسکے۔

گذشتہ ماہ ادارہ نے دو کتابیں "نذر دکن" اور "محرم نامہ" شائع کیں۔ اس مہینے ایک اور کتاب شائع ہورہی ہے۔ یہ ایک معاشرتی ناول "عاصمہ" ہے جس میں ادب کے ترقی پسند نظریوں کے مطابق ڈیوڑھی کی ایک کنیز کے واقعاتِ زندگی بیان کئے گئے ہیں جس کو سماج کی ستم ظریفیوں نے ہر طرح سے لوٹ کر اور ناکارہ محض بنا کر چھوڑ دیا لیکن جس کی فطری صلاحیتیں آزادی اور زندگی کا گہوارہ تھیں۔

اس مہینے (۱۱ر فروری ۱۹۳۹ء کو) ادارہ ادبیات اردو کے ایک فیاض سرپرست نواب رفعت یار جنگ بہادر نے انتقال فرمایا۔

آپ علمی و ادبی دنیا میں بھی ایک خاص اہمیت رکھتے تھے۔ حیدرآباد ایجوکیشنل کانفرنس کے قدیمی سرپرستوں اور معاونوں میں آپ کا نام سرِ فہرست رہے گا۔ ہندوستان اور دکن کے اکثر رسائل اور جرائد کی آپ نصف صدی سے زیادہ عرصہ تک اعانت کرتے رہے ہیں۔ آپ نے اپنے زمانۂ تعلقداری میں بیدر اور نظام آباد میں صنعت و حرفت کے مدارس قائم کئے جن کی وجہ سے حیدرآباد کی قدیم صنعتیں پھر سے زندہ ہوگئیں۔ اور ملک کے نوجوان اپنے اسلاف کے کھوئے ہوئے فن کاغذ سازی اور بیدری ظروف بنانے کے کمال سے بہرہ مند ہوگئے۔ بیدر میں آپ کی سرپرستی میں ایک اردو رسالہ بھی جاری ہوا تھا۔ ملک کے اکثر مصنفین و مولفین کی آپ ہر طرح سے امداد و قدر افزائی کرتے رہے۔

علم و ادب کا اعلیٰ ذوق رکھنے کے علاوہ آپ ایک بڑے ہی روشن ضمیر اور صاحب دل بزرگ تھے۔ آپ کے اعلیٰ کردار، ایثار نفس، اور وضع داری کا ان لوگوں پر خاص اثر تھا جن کو آپ سے کبھی ملنے کا شرف حاصل ہوا ہے۔ وضع داری کے ساتھ کسرِ نفسی کا جس خوبی سے آپ کی ذات میں میل ہوا تھا اس کی نظیر نہیں مل سکتی۔ امارت کی آن بان کے علاوہ علم و فضل اور زہد و تقویٰ کو جس شائستگی کے ساتھ آپ نے نبھایا وہ دوسرے صاحبان ثروت کے لئے ہمیشہ ایک نمونہ ہے۔

"ادارہ"

غزلیات

نگہ شوق کو یوں آئینہ سامانی دے
عشق کو حسن بنا حسن کو حیرانی دے

کچھ تری چشم سخن ساز کا افسانہ کھلا
لب مے نوش کو تکلیف گل افشانی دے

آئینہ سنگ در دوست ہوا بھی تو کیا
سر جو سجدے میں جھکے تو تری پیشانی دے

شمع درکار ہے تربانگہ الفت کے لئے
دل کو اک شعلہ بنا شعلہ کو عریانی دے

کسی منزل میں ہو بے تاب ہی شبنم کی طرح
پرتو مہر جیسے ذوق پر افشانی دے

عشرت ذبح تقاضا ترا سر آنکھوں پر
جب تڑپنے کی اجازت بھی گراں جانی دے

دلنوازی میں بھی ایذا ہے محبت کی قسم
تجھ کو فرصت جو کبھی شغل ستم رانی دے

ہر جراحت کو ہے اک تازہ جراحت کی ہوس
اور کچھ غمزۂ خونریز کو جولانی دے

چمن آرائی الفت کا جو سودا ہے اثر
اشک گلرنگ سے ہر شام و سحر پانی دے

جعفر علی خاں اثر (لکھنوی)

بے خودی میری بے اثر نہ ہوئی
تلخیٔ عمر کی خبر نہ ہوئی

درد درماں بنا رہا اپنا
ہم کو تو فکر چارہ گر نہ ہوئی

وعدہ موقوف ہے قیامت پر
لیکن اے مہرباں اگر نہ ہوئی

جب سے پیدا ہوئی ہے ہجر کی شب
کبھی منت کش سحر نہ ہوئی

وصل سے اور بھی جنون بڑھا
یہ بھی تدبیر کارگر نہ ہوئی

اس کے دامن نے پردہ داری کی
خاک میری جو در بدر نہ ہوئی

حشر میں لطف کچھ نہیں بسمل
چشم جاناں جو فتنہ گر نہ ہوئی

امین الحسن بسمل

سانولی شہزادی — اجنتا کے پہاڑی غار میں

مزدور کا مہمان

بہاروں پر تھی سردی کی جوانی
ابھی بادل چھٹا تھا پڑ کے پانی

لبالب خنکیوں سے تھیں فضائیں
چلی آتی تھیں برفانی ہوائیں

فلک پر بکھرتے پھرتے تھے بادل
نمی کے مارے تھے ان کے بوجھل

خموشی میں تھا شورش کا بسیرا
تھا غالب نور پر دھندلا اندھیرا

جھکی تھیں ذرے ذرے کی نگاہیں
نگاہوں کے لئے تھیں بند راہیں

خمیدہ نرم شاخوں کی کمر تھی
سواری رات کی نزدیک تر تھی

لبِ فطرت پہ ساکن تھے ترانے
دھندلکے تھے کہ بھوتوں کے فسانے

ملمع دن کا کالا ہو رہا تھا
فلک اشکوں میں کاجل رو رہا تھا

اسی سردی میں اک بے چارہ مزدور
مشقت کا دھنی قسمت سے مجبور

بہت گذری نہ تھی شادی کو مدت
مگر اللہ رے پیسے کی قلت

سنہری آگ چولھے میں جلائے
تھا بیٹھا ہاتھ بغلوں میں دبائے

پرانے ٹاٹ کے ٹکڑے پہ بیوی
سمٹ سمٹا کے چپ بیٹھی ہوئی تھی

ستے چہرے پہ ضبطِ غم کے آثار
پھٹی چادر میں پیوندوں کی بھرمار

بدن میں کپکپی سردی کے مارے
جگر میں آتشِ غم کے شرارے

نحیف اعضاء میں کمیابی غذا کی
مگر بشرے پہ معصومی وفا کی

امنگیں فرطِ ناداری سے مایوس
جوانی خستہ پیراہن میں ملبوس

حیا و شرم کے آنکھوں میں در باز
نگاہیں پائے شوہر پر بصد ناز

یہ تھا مزدور بے چارے کا عالم
کہ امیدوں کا تھا ٹوٹا ہوا دم

نظر اٹھتی تھی جو بیوی کے رخ پر
ڈھلک آتی تھی کچھ گھرنی سے کھا کر

امیدیں، ولولے، افکار و جذبات
ہوئے جاتے تھے ناموزوں خیالات

جوانی کا فسوں کم ہو رہا تھا
تبسم بھیگ کر غم ہو رہا تھا

گری جاتی تھی غیرت سے جوانی
شرافت ہو رہی تھی پانی پانی

جبینِ سرد پر ساعت بہ ساعت جھلک اٹھتا تھا عنوانِ ندامت
بدلتی تھی نظر شعلوں پہ کروٹ
کہ اتنے میں بجی باہر کی چوکھٹ

سنا مزدور نے جب شورِ زنجیر بنا چہرہ پریشانی کی تصویر
ہوا اندیشہ دل زوروں سے دھڑکا ہو جیسے بحر کی موجوں میں تڑکا
گیا ڈیوڑھی پہ ڈرتا کپکپاتا
تو اک مہماں کو پایا مسکراتا

یہ حالت اور پھر مہماں کا آنا ! بدل کر رہ گیا کروٹ زمانہ
خوشی مہمان کے آنے سے طاری مگر انجام سے دل بھاری بھاری
تبسم لب پہ شرمایا ہوا سا تکلم کا بھنیں کھایا ہوا سا
یہ ڈر اب انکشافِ حال ہوگا
غرورِ مفلسی پامال ہوگا

اسی ہستی پریشانی میں آخر ز بعضہ جان کر مہماں کی خاطر
کرا کے خوب ڈیوڑھی کی صفائی بچھا دی لا کے گھر سے چارپائی
خیال آیا کہ ہمسایوں میں جا کر
جو مل جائے تو اک لے آوے بستر
مگر احساسِ ناکامی نے ٹوکا
شرافت نے دہائی دے کے روکا

نہ خودداری نے جب گردن جھکائی اوڑھا دی لا کے اپنی ہی رضائی
وہی اک ٹاٹ کا ٹکڑا جھٹک کر بچھا رکھا تھا جس کو گھر کے اندر
لحاف اس کو سمجھ کر جسم ڈھانپا کبھی اونگھا کبھی سردی سے کانپا
یونہی شب جاگتے سوتے گذاری بمشکل صبح کی آئی سواری !
کہاں ہو مخملوں پر سونے والو !
سرابِ عیش پر خوش ہونے والو !!
ذرا یہ شانِ مہمانی تو دیکھو !
تمدن کی ستم رانی تو دیکھو !

احسان دانش

خواب گر

سلسلہ گذشتہ

ریحانہ:۔ شمیم۔ تم کو ایسی بداخلاقی نہیں کرنی چاہیے۔

مدن:۔ شمیم کے ساتھ تم اب گفتگو کرنا چاہتی ہو ریحانہ کیا کھانا تیار ہے؟

ریحانہ:۔ اوہ مجھے جلد جانا چاہیے ورنہ تمام دوکانیں بند ہو جائیں گی مگر میری واپسی تک آپ ٹھہرے رہیے۔

مدن:۔ (ریحانہ کو جانے کا اشارہ کرتے ہوئے) میں کوشش کروں گا ... میں کوشش کروں گا۔

(ریحانہ باہر جاتی ہے۔ خاموشی جس کے دوران میں مدن مسکراتے ہوئے شمیم کی طرف دیکھتا ہے)

مدن:۔ اچھا دوست کہو کاروبار کیسے چل رہے ہیں؟

شمیم:۔ اچھے! اگر یہی مذاق کو آپ کاروبار سمجھتے ہیں تو بہت اچھے چل رہے ہیں۔ خیر کچھ بھی ہو۔ میں نے تو آج ایک اچھا کام کیا ہے۔ ایک ایڈیٹر سے تصفیہ کر آیا ہوں کہ وہ میرا مضمون اپنے اخبار میں چھاپ دے گا۔ فائدہ تو ضرور ہوگا۔ (گانے لگتا ہے)۔

"جواب بھی نہ تکلیف فرمائیے گا   تو پھر ہاتھ ملتے ہی رہ جائیے گا"

یہ شعر بھی ناکام رہا تو مجھ کو بھی ہاتھ ملنا پڑے گا۔ یہ نظم بھی مکمل نہیں ہوئی۔

مدن:۔ شمیم۔ اگر تم کو قارون کا خزانہ بھی ملتا تو تم مطمئن نہ ہوتے۔

شمیم:۔ کیا میں مطمئن نہیں رہوں گا؟ اچھا مجھے دنیا کی دولت دے کر دیکھیو میں کیا کرتا ہوں گا۔ سب سے پہلے مدارس بناؤں گا تاکہ لوگ اعلیٰ تعلیم حاصل کر سکیں۔

مدن:۔ دنیا کی جو بہترین چیزیں ہیں تم ان کو فراموش کر کے خیالی پلاؤ پکاتے ہو۔ اور ثروت و شہرت کے خواب دیکھتے ہو۔ تم کو اطمینان نصیب نہیں ہوتا کیوں؟ اسی لئے کہ تم خوش رہنے کے طریقے نہیں جانتے۔

شمیم:۔ ندیا ہے سنسار، بہتی ندیا ہے سنسار

ندیا ہے سنسار بابا ندیا ہے سنسار

سانس ہوا اور ناؤ ہے زبان کرے جلد شکار

بابا ندیا ہے سنسار بہتی ندیا ہے سنسار

مدن:۔ تم ایک ایسی نظم کیوں نہیں لکھتے جو کبھی ختم ہی نہ ہو سکے۔

شمیم:۔ یہ کیسے ممکن ہو سکتا ہے۔ ختم تو کرنا ہی پڑے گا۔

مدن:۔ یہ اپنی طبیعت پر موقوف ہے۔ یہ ایسا ہی شاعر کر سکتا ہے جو ہمیشہ خوش رہتا ہو۔

شمیم:۔ اس کے لئے کچھ دن میرا پیشہ اختیار کرنا پڑے گا۔

مدن:۔ کچھ معاملے کی باتیں بھی کرو گے!

شمیم:۔ شوق سے! فرمائیے آپ کو کونسی نشستیں پسند ہیں؟ پانچ چار، تین اور دو روپے

مگر آپ تو سامنے کی نشستوں پر بیٹھیں گے کہیے کتنی نشستیں چاہئیں!

مدن:۔ تم نہیں جانتے میں کون ہوں۔

شمیم:۔ مجھے معلوم نہیں۔ ہم سب کو خوش آمدید کہتے ہیں۔

مدن:۔ شمیم میں ایک خواب گر ہوں۔

شمیم:۔ کیا کہا!؟

مدن:۔ لوگ جو خواب دیکھتے ہیں وہ سب میرے ہی بنائے ہوئے ہوتے ہیں۔

شمیم:۔ دیکھیے۔ آپ تھوڑی دیر کے لئے آرام کیجئے۔ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ آپ کا دماغ تھک گیا ہے۔

مدن:۔ تم میری بات نہیں سمجھ سکتے لیکن اسے عام لوگ، بچے بڑے سب سمجھ جاتے ہیں۔ میں خواب بناتا ہوں۔ ننھے ننھے خواب جو لوگوں کے دلوں میں پہنچ کر انھیں مسرور کر دیتے ہیں۔ کیا تم نے کبھی یہ بھی سوچا ہے کہ خزاں میں کونپل کہاں چلی جاتی ہے۔ وہ میرے کارخانے میں پہنچتی اور اطلاع دیتی ہے کہ خوابوں کی کن

لوگوں کو فصل ورنت ... اور بہار میں وہ جو خواب اپنے ساتھ لے گئی تھی ان کا کیا ہوا۔

شمیم :۔ کیا آپ سمجھتے ہیں کہ میں آپ کی ان باتوں کو باور کروں گا۔

مدن :۔ تم نے کبھی سوچا ہے کہ جب پھول مرجھا جاتے ہیں تو ان کی رنگینیاں کہاں جاتی ہیں۔ یا یہ کہ سرما میں تیتریوں کو کیا ہو جاتا ہے۔ میرا کارخانہ خزاں کی زد سے باہر ہے۔

شمیم :۔ اس سے قبل ایسا خیال تو میرے دماغ میں آیا ہی نہ تھا۔

مدن :۔ میرا کارخانہ ایک اسٹور ہے جس میں وہ تمام حسین چیزیں رکھی جاتی ہیں جن کی طرف دنیا نے کوئی توجہ نہ کی ہو۔ اور وہاں میں اپنا شاہکار یعنی خواب بناتا ہوں۔ وہ خواب جس کی تعبیر محبت ہے۔

شمیم :۔ واللہ !

مدن :۔ تم محبت کے قابل نہیں ؟

شمیم :۔ قابل تو ہوں ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ مگر محبت ایک ڈھلتی چھاؤں ہے۔ اس کو قرار نہیں۔ جہاں روپ ہوتا ہے وہاں روح نہیں ہوتی اور جہاں روح ہوتی ہے روپ نہیں ملتا۔ میں ایک عرصہ تک دل کو ہاتھ پر رکھے پھرتا رہا۔ لیکن میرا تجربہ یہ ہے کہ پہلے ہی دھوپ میں ساری رعنائیاں اڑ جاتی ہیں۔

مدن :۔ تمھیں نقلی جنس ملی ہے۔ انتظار کرو یہاں تک کہ اصلی دولت مل جائے۔

شمیم :۔ مگر کوئی اسے پہچانے کیسے ؟

مدن :۔ اس کی کئی علامتیں ہیں۔ جب کسی سے سچی محبت ہو جاتی ہے تو دل میں ایک لطیف کسک پیدا ہوتی ہے۔ تخیل عرش پیمائی کرنے لگتا ہے۔ پھر عاشق اڑتے تاروں کے ساتھ مصروفِ خرام ہوتا اور آسمان پر پہنچ کر چاند کو محبت کے گیت سنانا چاہتا ہے۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ میرے خوابوں میں چاند کا بڑا حصہ ہے۔ میں اسے توڑ کر استعمال کرتا ہوں یہاں تک کہ وہ آسمان سے بالکل غائب ہو جاتا ہے اور پھر اسے بڑھنے کا موقع دیتا ہوں۔ تم نے دیکھا ہوگا وہ بہت جلد بڑھتا ہے ۔۔ اور دو ہفتوں میں پھر استعمال کے قابل ہو جاتا ہے۔

شمیم :۔ خوب۔ اور کیا یہ سارے خواب کوپل لے کر آتی ہے؟

مدن :۔ نہیں۔ میرے پیامبر اور بھی ہیں۔ اور رات جب گھڑی بارہ بجاتی ہے۔ کیلنڈر سے ایک ورق جدا ہو جاتا ہے اور یقیناً میں میرے کارخانے میں چلا جاتا ہے۔ میں اسے سرخ اور سنہری رنگ دے کر چمکا دیتا ہوں اور کہتا ہوں "جا رے گزرے ہوئے دن۔ اور زمانے میں ایک یادگار بن جا رہ" میں بچے خریدتا ہوں اور اور ان میں خواب دم کر کے پھونکتا ہوں اور پھر انھیں تکمیل کے لئے دنیا میں بھیجتا ہوں۔

شمیم :۔ میں ساری عمر خواب دیکھتا رہا ہوں۔ لیکن وہ میرے ہی بنائے ہوئے خواب تھے۔ میں سمجھتا ہوں کہ میرے خوابوں کی آمیزش ٹھیک نہیں رہتی۔

مدن :۔ اصل چیز تو تم بھول ہی جاتے ہو۔ تمھارے خواب ضرورت سے زیادہ میٹھے ہوتے ہیں۔ تمھیں چاہیے کہ ان میں لطافت اور رعنائی پیدا کرنے کے لئے تھوڑا سا درد بھی شریک کرو۔ مجھے اس کا پتہ فوراً چل گیا۔ اس لئے میں نے اول صبح کی شبنم کے موتی لئے اور اپنے خوابوں کے گلدستوں کو اشک افشانی کی نعمت سے تر و تازہ کر دیا۔

شمیم :۔ (خوش ہو کر) اشک افشانی! کس قدر لطیف خیال ہے میں تو ایک سچے آنسو کا تجربہ کرنا چاہتا ہوں۔ خود میرا بنایا ہوا نہیں

مدن :۔ ان کی بڑی کثرت ہے بےخودی سے تلاش شرط ہے۔

شمیم :۔ بالکل ٹھیک۔ لیکن منتشر خوابوں کی جستجو کون کرے گا۔

مدن :۔ ایک دفعہ میں نے ایک خواب بنایا تھا جو تمہارے سننے کے قابل ہو سکتا تھا۔ میں نے اسے ایک پچی کے قالب میں رکھ دیا۔ گویا بیس برس کی بات ہے اور اب وہ بھی ایک تازہ پھول کی طرح شگفتہ عورت ہو گئی ہے۔ بڑی بڑی نیلی آنکھیں اور صبیح رنگ۔

شمیم :۔ اور فرمائیے۔

مدن :۔ ہاں اور سنو۔ جب میں نے اسے دنیا میں بھیجا تو اس کا پتہ اپنے پاس رکھا۔ یہ لو اپنے پاس رکھ لو۔

شمیم :۔ شکریہ۔ مگر اس کا مصرف ؟

مدن :۔ مصرف۔ تم اس دولت کے مالک بن جاؤ گے۔ سچ کہتا ہوں تم بڑے خوش قسمت ہو۔

شمیم :۔ کیا اس کے رخسار گلابی ہیں ؟

مدن :۔ نہیں۔

شمیم :۔ آہ ! پھر تو یہ لڑکی کوئی اور ہے۔ مجھے وہ کہاں ملے گی ؟

مدن :۔ ڈھونڈنا تمہارا کام ہے

شمیم :۔ میں ابھی جاؤں گا۔ (جانا چاہتا ہے)

مدن :۔ میں تو اس کا مشورہ نہیں دوں گا۔ آج نہیں۔

شمیم :۔ میں چاہتا ہوں کہ جلد از جلد اس کا پتہ لگا لوں ورنہ کوئی دوسرا اس کو ڈھونڈھ لیجائے گا۔

مدن :۔ دیکھو شمیم ایک دفعہ ایک شخص کو سانپ کی چھتری کی تلاش تھی۔

شمیم :۔ (چیں بچیں ہو کر) سانپ کی چھتری !

مدن :۔ یہ سمجھ کر کہ کہیں لوگ اس سے پہلے آ کر اپنے قبضہ میں نہ کر لیں وہ رات ہی کو تلاش میں روانہ ہوا۔ صبح ہو گئی لیکن اسے کچھ نہ مل سکا اور وہ ناکام خراب و خستہ گھر لوٹا۔ جب اپنے باغ میں سے گذر رہا تھا تو اس نے دیکھا کہ خود اس کی چولھٹ کے قریب رات میں سانپ کی ایک بڑی سی چھتری نکل آئی تھی۔ جاننے والوں کی بات سنو اور ذرا صبر سے کام لو۔

شمیم :۔ اگر آپ کی یہ رائے ہے تو ۔ ۔ ۔ ۔ مگر صرف اتنا کہہ دیجئے کیا وہ مجھے مل جائے گی ؟

مدن :۔ میں یقین کے ساتھ نہیں کہہ سکتا۔ کیا اس معاملہ میں تمہارا دماغ کچھ بھی کام نہیں کرتا۔

شمیم :۔ جی ہاں۔ میں ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ کچھ۔

مدن :۔ ہاں ہاں۔

شمیم :۔ مجھے خوف ہے کہ میں ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔

مدن :۔ تمہارے لئے سب سے بڑا خطرہ یہ ہے کہ جس وقت تم ستاروں پر نظر جمائے بڑے بڑے قدم اٹھا رہے ہو ممکن ہے تم کسی کلمبنور کو روند ڈالو۔

(مدن کی شخصیت اور انداز گفتگو شمیم کو بھی متاثر کر دیتی ہے جس طرح اس نے ریحانہ کو متاثر کیا تھا۔ ان دونوں کی نظریں ایک دوسرے پر جمی ہوئی ہیں۔ اتنے میں کھڑکی میں سے ایک سرخی گذرتی ہوئی نظر آتی ہے اور ریحانہ داخل ہوتی ہے)

ریحانہ :۔ مجھے بڑی خوشی ہوئی آپ ابھی تک تشریف رکھتے ہیں۔

مدن :۔ مگر اب مجھے جانا چاہیئے۔ میں بڑا بھٹکنے والا ہوں۔

ریحانہ :۔ (راستہ روکے ہوئے وہ دروازے میں کھڑی ہو جاتی ہے) نہ جائیے۔

مدن :۔ جب ناخوش گوار واقعات پیش آتے ہیں تو میں کھڑکی کود کر فرار ہو جاتا ہوں۔ دیکھو کہیں اب کے بھی مجھے ویسا ہی نہ کرنا پڑے۔

شمیم :۔ (رہنمائی کے انداز میں) ہمارے مہمان کو غور سے دیکھو۔ تمہیں اندازہ نہیں کہ یہ کون ہیں۔ یہ بزرگ خواب بناتے ہیں۔ رنگین خواب جو راتوں میں چمگادڑوں کی طرح اڑتے پھرتے ہیں۔

۱ـ کلاہ باراں

...نوں نے مجھے ایک پری جمال کا پتہ دیا ہے۔ اب صرف تین نعل
اور ایک گھوڑا ملنا باقی ہے۔ (معمولی انداز میں) کاش مجھے پتہ مل جاتا۔

مدن:۔ ہاں مل جائے گا۔ خدا حافظ

(وہ جھک کر سلام کرتا اور تیزی کے ساتھ دروازے سے نکل کر چل
دیتا ہے۔ ریحانہ دروازے تک تیزی سے جاتی ہے اور باہر دیکھ کر)

ریحانہ:۔ کتنی تیزی سے چل دیئے۔ اب تو نظروں سے بھی غائب
ہو گئے۔

شمیم:۔ بالآخر میری تمنائیں پوری ہونے کو ہیں۔ شادی بڑی
دھوم دھڑاکے کی ہوگی۔ میں سرخ سن برج کی شیروانی پہنوں گا۔
(گاتا ہے) شاید اسی کا نام محبت ہے شیفتہ
اک آگ سی ہے سینے کے اندر لگی ہوئی

ریحانہ:۔ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ میں اب پریم کی رس بھری دنیا
میں قدم رکھنے والی ہوں۔ وہ دنیا جو مرد کو آدم سے ورثے میں
ملی ہے۔

ریحانہ:۔ خدا انھیں ہر طرح خوش رکھے۔
ہمیں چاہئے کہ اب خوب روپیہ کمائیں تاکہ تمھاری نئی دلہن کی
ساری فرمائشات کی تکمیل ہو سکے۔ میں ناچوں گی۔ خوب ناچوں گی۔
اس قدر ناچوں گی کہ لوگ چلا اٹھیں ... ارے اس نے ناچ ناچ کر
اپنا کام ہی تمام کر ڈالا۔

شمیم:۔ سچ کہتی ہو۔ ہم کو کسی صورت یہ کھیل مل کر چلانا ہی پڑے گا۔
اچھا میں اخبار کے لئے وہ اشتہار مکمل کر دیتا ہوں۔

(وہ دوات قلم اٹھا میز کے قریب بیٹھ کر لکھنا شروع کرتا ہے)

حال میں اس شہر میں ایک سیلانی تھیٹر آیا ہوا ہے۔ جنت نگاہ اور
فردوس گوش کے سارے زرق برق لوازم موجود ہیں۔ ریحانہ کا
ناچ سحر کا اثر پیدا کرتا ہے۔ ریحانہ سرتاپا حافظ کی غزل کی طرح
حسین ہے۔ ناچتی ہے تو ایسا معلوم ہوتا ہے کہ اس کا ہر عضو رقص
میں پریم کے گیت لکھ رہا ہے۔ ریحانہ ایک ۲۰ سالہ گیہوں ...
رنگ ... کون رنگ ہے؟

ریحانہ:۔ صبیح ... صبیح

شمیم:۔ واللہ کتنی عجیب بات ہے۔ بعض چیزیں جو ہمیشہ ہمارے
سامنے رہتی ہیں ان کا رنگ بھی معلوم نہیں ہوتا۔ صبیح رنگ اور ...

ریحانہ:۔ نیلی شمیم۔

شمیم:۔ صبیح رنگ اور نیلی آنکھیں۔ صبیح! نیلی! واللہ کیسی عجیب ...

ریحانہ:۔ کیا بات عجیب ہے۔

شمیم:۔ میں یوں ہی کچھ سوچ رہا تھا۔ اکثر لڑکیاں صبیح اور نیلی آنکھوں
والی ہوتی ہیں

ریحانہ:۔ ہاں شمیم۔ جب سورۂ رحمٰن کی حوریں تو ہیں ہی نہیں۔

شمیم:۔ تمھاری آواز کس قدر دلکش معلوم ہوتی ہے! معلوم نہیں
کیوں معلوم نہیں مجھے کیا ہو گیا ہے۔

(جیب سے پرچہ نکال کر پڑھنے لگتا ہے)

ریحانہ:۔ بات کیا ہے شمیم بولتے کیوں نہیں؟

شمیم:۔ ذرا روشنی میں آجاؤ۔

ریحانہ:۔ تمھیں ہو کیا گیا ہے؟

شمیم:۔ مجھے سب کچھ ہو گیا ہے ...... (ریحانہ کو دیکھتے ہوئے
پڑھنے لگتا ہے) "آنکھیں جو کہہ رہی ہوں۔ میں تم سے پریم
کرتی ہوں: بانہیں جو لپٹ جانے کے لئے بے چین ہوں ہونٹ
جو کہہ رہے ہوں" بولتے کیوں نہیں"۔ ریحانہ کیا یہ ممکن ہے؟ تم
آج کتنی سندر معلوم ہو رہی ہو۔ میں نے آج تک اتنی دلکشی محسوس
نہیں کی تھی۔ تم بالکل بدل گئی ہو۔ میرے خیال میں تم نے
اپنا اصل روپ اتار کر پھینک دیا ہے۔ اور سبزے کی شگفتگی

اور پھولوں کی رعنائیاں چھین لی ہیں۔

ریحانہ:۔ او! شمیم، آخر بات کیا ہے؟

شمیم:۔ محبت ۔۔۔۔۔۔ آخر میں نے اسے پا ہی لیا۔ میں تم ۔
خیال تو کرو، میں تم کو روز دیکھتا تھا۔ لیکن کبھی میں نے خواب
نہیں دیکھا ۔۔۔۔۔۔ محبت کا خواب۔ ہاں ۔۔ ہاں ۔۔۔۔ یہ
اس کا ایک حسین خواب ہے۔ یہی وجہ ہے کہ میرا دل نسیم صبا
کی موجوں میں جھول رہا ہے۔

ریحانہ:۔۔ آہ! شمیم۔

شمیم:۔ آہ! میرے بازوؤں میں کیسی عجیب تحریک پیدا ہو رہی ہے
میں اوپر کو اڑنا چاہتا ہوں۔ آسمانوں میں پرواز کرنے کے لئے
میرے بازو تڑپ رہے ہیں۔ چلو آسمان کی چھت پر پہنچ کر تاروں کے
حلقے میں پریم کے گیت الاپیں۔

ریحانہ:۔ میں کب سے چاند پر بیٹھی اپنے محبوب کی راہ تک رہی
ہوں۔ شمیم میں تمھارے تبسم کو اپنے من میں بسانا چاہتی ہوں۔

شمیم:۔ تم مجھے ایک بوسے کے ذریعہ دے دو۔

(دونوں ایک دوسرے کی طرف جھکتے ہیں۔)

ریحانہ:۔ بوسے کے بعد مسرت کا سانس لیتے ہوئے اپنے لب
ہٹا کر۔۔۔ میں کتنی خوش ہوں! ایسا معلوم ہوتا ہے کہ مجھے ساری
دنیا کی نعمت اور لذت مل گئی۔

شمیم:۔ ریحانہ آؤ، کہکشاں کے کنارے کو گھر بنالیں۔ اب
ہمارے دن ہمیشہ مسرتوں میں گزریں گے۔

(وہ شمع تک پہنچ چکے ہیں۔ شمیم گاتا ہے)

شمع بجھنے کو ہے اور جس وقت پروانہ سرگوشیاں کرتا ہوا گرتا ہے
شمع کی لو سرخ نظر آتی ہے۔

(ماخوذ)

شوکت علی خاں

غزل

جو راز ابتک حجاب میں ہیں وہ خود بخود آئیں گے زباں پر
ادا تو کر سجدہ عقیدت نگارِ فطرت کے آستاں پر

قفس میں ہوں ہم صفیر! آزادیوں کا صدقہ خبر تو لینا
کہ بجلیاں رقص کر رہی تھیں ابھی ابھی میرے آشیاں پر

وہ رہرو نامراد ہوں میں جو راہ میں تھک کے رہ گیا ہو
شکستہ پائی کا غم ہے دل میں نگاہ ہے گردِ کارواں پر

ترا یہ دعویٰ! رموزِ فطرت سے آشنا ہیں تری نگاہیں
پڑے ہوں تاریکیوں کے پردے جب اس قدر محفلِ جہاں پر

زمانہ سر دھن رہا ہے جس پر نمود ہے سطح کی وہ اختر
نہ جانے کیا ہو جو روحِ شاعر کے بھید آجائیں تک زباں پر

علی اختر

انھوں نے مجھے ایک پری جمال کا پتہ دیا ہے۔ اب صرف تین نعل اور ایک گھوڑا ملنا باقی ہے۔ (معمولی انداز میں) کاش مجھے پتہ مل جاتا۔

مدن:۔ ہاں مل جائے گا۔ خدا حافظ

(وہ جھک کر سلام کرتا اور تیزی کے ساتھ دروازے سے نکل کر چل دیتا ہے۔ ریحانہ دروازے تک تیزی سے جاتی ہے اور باہر دیکھ کر)

ریحانہ:۔ کتنی تیزی سے چل دیئے۔ اب تو نظروں سے بھی غائب ہو گئے۔

شمیم:۔ بالآخر میری تمنائیں پوری ہونے کو ہیں۔ شادی بڑی دھوم دھام سے کی ہوگی۔ میں سچ سچ برج کی شیر وانی پہنوں گا۔ (گنگناتا ہے) شاید اسی کا نام محبت ہے شیفتہ

اک آگ سی ہے سینے کے اندر لگی ہوئی

ریحانہ:۔ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ میں اب پریم کی رس بھری دنیا میں قدم رکھنے والا ہوں۔ وہ دنیا جو مرد کو آدم سے ورثے میں ملی ہے۔

ریحانہ:۔ خدا تمہیں اسی طرح خوش رکھے۔

ہمیں چاہیئے کہ اب خوب روپیہ کمائیں تاکہ تمھاری نئی دلہن کی ساری فرمائشات کی تکمیل ہو سکے۔ میں ناچوں گی۔ خوب ناچوں گی۔ اس قدر ناچوں گی کہ لوگ چلا اٹھیں۔ ۔ ۔ ہائے اس نے ناچ ناچ کر اپنا کام ہی تمام کر ڈالا۔

شمیم:۔ سچ کہتی ہو۔ ہم کو کسی صورت یہ کھیل مل کر چلانا ہی پڑیگا۔ اچھا میں اخبار کے لیے وہ اشتہار مکمل کر دیتا ہوں۔

(وہ دوات قلم اٹھا میز کے قریب بیٹھ کر لکھنا شروع کرتا ہے)

حال میں اس شہر میں ایک سیلانی تھیٹر آیا ہوا ہے۔ جنت نگاہ اور فردوس گوش کے سارے زرق برق لوازم موجود ہیں۔ ریحانہ کا ناچ سحر کا اثر پیدا کرتا ہے۔ ریحانہ سرتا پا حافظ کی غزل کی طرح حسین ہے۔ ناچتی ہے تو ایسا معلوم ہوتا ہے کہ اس کا ہر عضو نغمہ میں پریم کے گیت لکھ رہا ہے۔ ریحانہ ایک ۲۰ سالہ ایکٹرس ہے رنگ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ کون سا رنگ ہے؟

ریحانہ:۔ صبیح ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ صبیح

شمیم:۔ واللہ کتنی عجیب بات ہے۔ بعض چیزیں جو ہمیشہ ہمارے سامنے رہتی ہیں ان کا رنگ بھی معلوم نہیں ہوتا۔ صبیح رنگ اور آنکھیں

ریحانہ:۔ نیلی شمیم۔

شمیم:۔ صبیح رنگ اور نیلی آنکھیں۔ صبیح! نیلی! واللہ کیسی عجیب بات

ریحانہ:۔ کیا بات عجیب ہے۔

شمیم:۔ میں یونہی کچھ سوچ رہا تھا۔ اکثر لڑکیاں صبیح اور نیلی آنکھوں والی ہوتی ہیں

ریحانہ:۔ ہاں شمیم۔ ہم سب سورۂ رحمٰن کی حوریں تو ہیں ہی نہیں

شمیم:۔ تمھاری آواز کس قدر دلکش معلوم ہوتی ہے! معلوم نہیں کیوں معلوم نہیں مجھے کیا ہو گیا ہے۔

(جیب سے پتہ نکال کر پڑھنے لگتا ہے)

ریحانہ:۔ بات کیا ہے شمیم بولتے کیوں نہیں؟

شمیم:۔ ذرا روشنی میں آجاؤ۔

ریحانہ:۔ تمھیں ہو کیا گیا ہے؟

شمیم:۔ مجھے سب کچھ ہو گیا ہے۔ ۔ ۔ ۔ ۔ (ریحانہ کو دیکھتے ہوئے پڑھنے لگتا ہے) "آنکھیں جو کہہ رہی ہوں۔ میں تم سے پریم کرتی ہوں! ہیں جو چپٹ جانے کے لئے بے چین ہوں ہونٹ جو کہہ رہے ہوں بولتے کیوں نہیں"۔ ریحانہ کیا یہ ممکن ہے؟ تم آج کتنی سندر معلوم ہو رہی ہو۔ میں نے آج تک اتنی دلکشی محسوس نہیں کی تھی۔ تم بالکل بدل گئی ہو۔ میرے خیال میں تم نے اپنا اصل روپ اتار کر پھینک دیا ہے۔ اور سبزے کی شگفتگی

اور پھولوں کی رعنائیاں چھین لی ہیں۔

ریحانہ:۔ او شمیم۔ آخر بات کیا ہے؟

شمیم:۔ محبت ...... آخر میں نے اسے پا ہی لیا۔ تمھیں تم خیال کی تو کرہ میں تم کو روز دیکھتا تھا۔ لیکن کبھی میں نے خواب نہیں دیکھا...... محبت کا خواب۔ ہاں ... ہاں ... اس کا ایک حسین خواب ہے۔ یہی وجہ ہے کہ میرا دل نسیم بہار کی موجوں میں جھول رہا ہے۔

ریحانہ:۔ آہ! شمیم۔

شمیم:۔ ہاں! میرے بازوؤں میں کبھی عجیب تحریک پیدا ہو رہی ہے میں اوپر کو اڑنا چاہتا ہوں۔ آسمانوں میں پرواز کرنے کے لئے میرے بازو تڑپ رہے ہیں۔ چلو آسمان کی چھت پر پہنچ کر تاروں کے حلقے میں پریم کے گیت الاپیں۔

ریحانہ:۔ میں کب سے چاند پر بیٹھی اپنے محبوب کی راہ تک رہی ہوں۔ شمیم میں تمھارے تو تم کو اپنے من میں لینا چاہتی ہوں۔ اپنا تبسم مجھے ایک بوسے کے ذریعہ دے دو۔

(دونوں آہستہ آہستہ دوسرے کی طرف جھکتے ہیں۔)

ریحانہ:۔ بوسہ کے بعد مسرت کا سانس لیتے ہوئے اپنے لب ہٹا کر۔۔ میں کتنی خوش ہوں! ایسا معلوم ہوتا ہے کہ مجھے ساری دنیا کی نعمت اور لذت مل گئی۔

شمیم:۔ ریحانہ آؤ۔ انگیٹھی کے کنارے خود کو گرمالیں۔ اب ہمارے دن ہمیشہ مسرتوں میں گذریں گے۔

(وہ معونہ تک پہنچ چکے ہیں۔ شمیم گاتا ہے۔

شمع بجھنے کو ہے اور جس وقت پردہ سرگوشیاں کرتا ہوا گرتا ہے شمع کی لو سرخ نظر آتی ہے۔)

(ماخوذ)

شوکت علی خاں

غزل

جو راز اب تک حجاب میں ہیں وہ خود بخود آئیں گے زباں پر
ادا تو کر سجدۂ عقیدت نگارِ فطرت کے آستاں پر

قفس میں ہوں ہم صفیر! آزادیوں کا قصہ نہ تو لیتا
کہ بجلیاں رقص کر رہی تھیں ابھی میرے آشیاں پر

وہ رہرو نامراد ہوں میں جو راہ میں تھک کے رہ گیا ہو
شکستہ پائی کا غم ہے دل میں نگاہ ہے گردِ کارواں پر

ترا یہ دعوی! رموزِ فطرت سے آشنا ہیں تری نگاہیں
پڑے ہوں تاریکیوں کے پردے جب اس قدر محفلِ جہاں پر

زمانہ سر دھن رہا ہے جس پر نمود ہی سطح کی وہ اختر
نہ جانے کیا ہو جو روحِ شاعر کے بھید آجائیں زباں پر

علی اختر

بچوں کی پرورش

ایک ماہر خصوصی کے مشورے

ماؤں کے لیے یہ امر عام طور پر پریشانی کا باعث ہوتا ہے کہ بچوں کو بھوک تو نہیں ہوتی۔ گر پینے کے لیے برابر کچھ نہ کچھ مانگتے ہیں لیکن جب تک بچہ کو بظاہر کوئی بیماری نہ ہو اس بات پر پریشانی کی کوئی ضرورت نہیں ہے۔ ہم گو گرما میں غذا کی ایسی ضرورت نہیں ہوتی جتنی کہ سرما میں محسوس ہوتی ہے۔ ماؤں کی معلومات کے لئے بچوں کی دیکھ بھال کے متعلق جو مشورے ماؤں کے دریافت کرنے پر انھیں دئے گئے ہیں ان میں سے چند ذیل میں درج کئے جاتے ہیں۔

(۱) **سوال**۔ میری چھوٹی بچی ہمیشہ کچھ نہ کچھ پینے کے لئے طلب کرتی ہے اور پھر بھی اس کو ہچکیاں آتی ہیں۔ کیا اس کو میں ضرورت سے زیادہ تو نہیں پلاتی ہوں۔

مشورہ۔ اس بچی کو جوش دیا ہوا ٹھنڈا پانی غذا کے درمیان پلایا جائے اور دودھ صرف کھانے کے بعد دیا جائے۔ بہتر ہوگا کہ دودھ میں تھوڑا پانی شریک کر دیا جائے۔

(۲) **سوال**۔ میرا ایک بچہ ہے جو اگلے مہینہ میں ڈھائی سال کا ہوگا، چونکہ وہ پیدائشی طور پر کمزور ہے اس لئے اس کی پرورش ایسی غذا پر ہوئی ہے جو پہلے سے مخصوص ذرائع سے کام لے کر قابل ہضم بنائی جاتی تھی۔ بڑی دقت سے اس کو کھانے کے لئے راضی کرنا پڑتا ہے اور خصوصاً حال میں جب سے اسے زکام کی شکایت ہوئی ہے اس وقت سے یہ دشواری بہت بڑھ گئی ہے۔

مشورہ۔ زکام سے اس کیفیت میں زیادتی نہیں ہوتی ہے۔ اصل بات یہ ہے کہ ابتدائی دنوں میں جو غذا اس کو ملتی رہی چونکہ وہ پہلے ہی سے قابل ہضم حالت میں ہوتی تھی اس لئے اس کے ہاضمہ کی قوت جیسے چاہیے ترقی نہ کر سکی۔ اب اس کی ضرورت ہے کہ بتدریج اس کے ہاضمہ کو اعتدال پر لانے کی کوشش کی جائے۔ اس کو زیادہ چکنی اور نشاستہ دار غذائیں مثلاً بالائی، آلو، پراٹھا اور دودھ کی زیادہ بنی ہوئی چیزیں نہ دی جائیں۔ کیونکہ یہ سب دیر ہضم ہیں۔ ترکاری اور میوہ (شروع میں صرف عرق نکال کر) جوش کیا ہوا ٹھنڈا پانی یا ہلکا جو کا پانی (آش جو) زیادہ تر دیا جائے، پراٹھے کی بجائے چپاتی (جس میں بھوسہ شامل ہو) کھلائیں۔ چند روز تک رات کو سوتے وقت ایک چمچہ "ملک آف میگنیشیا" پلانے سے بچہ کی بشاشت اور چالاکی آجائے گی۔ مغرب کے وقت بلکہ اس کے قبل ہی اسے کھانا کھلایا جائے۔ جس قدر ہو سکے بچہ کو کھلی ہوا میں کھیلنے کے لئے چھوڑ دیں، اس کو دوڑنے پر مجبور نہ کریں۔ تازہ کھلی ہوا، نیند اور آرام بھی غذا کی طرح از بس ضروری ہیں۔

(۳) **سوال**۔ میں اپنی ڈھائی سالہ بچی کے لئے کیا کروں؟ وہ پیدائش ہی سے دبلی ہے اور نشوونما کافی نہیں ہو رہی ہے۔ صحت تو بظاہر اچھی ہے اور دبلی بھی نہیں ہے۔ کھانا بغیر بہلائے اور پھسلائے کبھی نہیں کھاتی اور اگرچہ وہ ہوشیار اور اپنے ہاتھ سے خود کھانے کے قابل ہے لیکن ہر وقت سمجھا بجھا کر کھلانا پڑتا ہے۔ ایک بار ۱۴ گھنٹے تک بغیر کچھ کھائے ہوئے رہی۔ پھر بھی کھانے کی خواہش اس میں پیدا نہیں ہوئی۔

مشورہ۔ آپ کی بچی کو غذا سے نفرت کی وجہ یہ ہے کہ ابتدا سے اس کو بہلا پھسلا کر کھلانے کی عادت پڑ گئی ہے۔ بچے سمجھنے لگتے ہیں کہ اس طرح غذا سے نفرت کر کے وہ اپنے نگران اشخاص کی شفقت اور دلچسپی حاصل کریں گے۔ میری تجویز یہ ہے کہ اس کو ایک ہل کی ایک خوراک دی جائے اور کامل (۲۴) گھنٹے کا فاقہ دیا جائے۔ اس دوران میں سوائے پانی کے کسی قسم کی غذا نہ دیں۔ اس کے سامنے تھوڑا سا کھانا رکھ دیں اور اس کو اپنے ہاتھ سے خود کھانے کے لئے چھوڑ دیا جائے۔ اگر وہ مناسب وقت کے اندر نہ کھالے یا چھوڑ دے تو کھانا اٹھا لیا جائے مگر اس کے نہ کھانے یا ادھورا چھوڑنے پر کسی طرح کے تعلق خاطر کا اظہار نہ کیا جائے۔ ممکن ہے کہ یہ طریقہ آپ کے لئے آسان نہ ہو، مگر بچی کو اس بری عادت سے باز رکھنے اور اس کو صحت مند اور سمجھ دار بنانے کے لئے اس سے بہتر کوئی طریقہ نہیں۔ میں یقین دلاتا ہوں کہ اگر بچی اس طرح چھوڑ دی جائے گی تو طبعاً وہ ایسا کرنے پر مجبور ہوگی۔ جب وہ خود بخود کھانا شروع کردے تو رفتہ رفتہ اس کے ماں باپ بچی کو سنا کر، انجان بن کر، باتیں کی جائیں کہ "اب تو بچی بڑی ہوشیار ہوگئی ہے، اپنے ہاتھ سے خود کھا لیا کرتی ہے" اس کا نتیجہ آپ بہت جلد محسوس کریں گے۔ اور بچی اپنی بھوک اور غذا کی خواہش ظاہر کر کے آپ کی دلچسپی اسی طرح حاصل کرے گی جس طرح پہلے اپنی بے رغبتی سے حاصل کرتی تھی۔

(۴) **سوال**۔ میرا بچہ دو برس کا ہے اور اپنی عمر کے لحاظ سے کافی بڑا ہے، یوں تو عام طور پر ہر چیز کھا لیا کرتا ہے۔ مگر انڈا یا انڈے سے بنی ہوئی ہر چیز سے اس کو نفرت ہے۔ کیا یہ اس کی ہٹ تو نہیں ہے؟

مشورہ۔ شاید کبھی یہ ہوا ہوگا کہ اس سے بڑی عمر کے کسی شخص نے کبھی بے خیالی میں اس بچہ کے سامنے انڈے سے نفرت ظاہر کی ہوگی یا حقیقتاً اس کو انڈے سے طبعی نفرت ہوگی۔ بچوں کو اس قسم کی طبعی خصوصیات کے خلاف مجبور کرنے سے ان کا ہاضمہ خراب ہو جاتا ہے۔ بلکہ ایسی غذاؤں سے ان کی صحت خراب ہو جاتی ہے اور یہ عادت بہت وقت سے دیر میں چھوٹتی ہے۔ مگر خاص خاص غذاؤں سے بچہ کو جو نفرت ہوتی ہے وہ گویا اس کی صحت کی فطری ضمانت ہوتی ہے۔

(۵) **سوال**۔ کیا آپ از راہ کرم مجھے مشورہ دیں گے کہ میں اپنی گیارہ مہینے کی بچی کو کیا غذا دوں۔ نویں مہینہ تک تو اس کو اپنا دودھ پلاتی رہی۔ اس کے بعد سے دودھ کا خشک سفوف (جو بند ڈبہ میں بکتا ہے) پلا رہی ہوں۔ مگر یہ نہیں معلوم کہ اب اس کو کیا غذا دی جائے۔ اب تک اس کے دانت بھی نہیں نکلے ہیں۔ دانت دیر سے نکلنے کی وجہ آپ کی رائے میں کیا ہے۔

مشورہ۔ گیارہویں مہینے میں اس بچی کو آپ ناشتہ میں دلیا، گلنتھی یا دودھ کے ساتھ توس دیں۔ دوپہر کو شوربا یا یخنی کے ساتھ چپاتی کے چھوٹے چھوٹے ٹکڑے یا نیم برشت انڈے کے ساتھ ڈبل روٹی اور کچھ میٹھا قلیل مقدار میں یا دودھ کی پڈنگ یا کھیر یا میوہ کا مغز۔ شام کو دودھ و ڈبل روٹی یا کوکو اور دودھ کے ساتھ بسکٹ یا توس کھلا سکتے ہیں اس کو پوری غذا اچھا اور پیالی سے کھلایا دانت نکلنے میں جو دیر ہو رہی ہے اس کے لئے اپنے طبیب سے مشورہ کیجئے۔ ممکن ہے کہ بچی کو ایسی ادویہ کی ضرورت ہو جو ہڈیوں کی ساخت اور نشو و نما کے لئے ضروری ہیں۔ (ترجمہ)

مطبع الرسول (دفتر جامعہ عثمانیہ)

سوانح نگاری کا ایک شاخسانہ

سوانح نگاری ایک اچھا فن ہے۔ ادب کی ایک اہم صنف ہے۔ مختلف قوموں کی مشہور ہستیوں اور نمایاں خدمات کرنے والوں کی زندگی کے حالات لکھنا تاکہ وہ دوسروں کے لئے اور آئندہ آنے والی نسلوں کے لئے نمونے کا کام دے سکیں، ہر ملک و قوم میں رائج رہا ہے اور اس فن کی جس قدر اہمیت جتائی جائے کم ہے۔ کون پسند کرے گا کہ مشاہیر اور محسنان بنی آدم نے کشمکش حیات کی راہ پر اپنی اولوالعزمیوں اور بلند ہمتوں کے جو نقش قدم چھوڑے ہیں، وہ ہماری ہدایت کے لئے محفوظ نہ کرلئے جائیں۔

مگر معاف کیجئے مجھے یہاں صحیح سوانح نگاری کے محاسن پر کچھ لکھنا مقصود نہیں ہے بلکہ اس عالم کون و فساد میں چونکہ اکثر اچھی چیزوں سے بھی، عالم اختلاط میں، فساد پیدا ہونے لگتا ہے، یہاں سوانح نگاری کی ایک نئی شکل کی طرف توجہ دلانی مقصود ہے جو اگر مفسدہ پرداز نہیں تو فاسد ضرور ہے۔

لیکن اس سے پہلے کہ اس "نئی شکل" پر کچھ لکھا جائے آج کل کی اس فضا کا جائزہ لینا شاید بیجا نہ ہوگا۔ جس نے اس ترقی کے دور میں کچھ تخلیق ادب کی چاروں طرف ایسی لہریں دوڑا دی ہیں کہ اس سے جو ہلچل مچ گئی ہے اس نے ایک عدم توازن پیدا کر دیا ہے۔ جہاں اچھی اور مفید علمی و ادبی کتابیں پیدا ہو رہی ہیں اور جہاں نئی پود حتیٰ کہ زیر تعلیم کالج کے لڑکوں اور لڑکیوں کی بعض کوششیں بھی اس میدان میں آئندہ ترقی کی خاطر، قابل ہمت افزائی ہیں۔ وہاں کچھ خرافات بھی چھپ رہی ہیں۔ اور گندم نما جو فروشی کا بھی خاصا میدان کھل گیا ہے جس سے توازن کے بگڑ جانے، معیار کے گر جانے، اور صحیح مذاق کے نہ پیدا ہو سکنے کا اندیشہ قوی ہوتا جا رہا ہے۔ تعلیم کی روشنی جیسی جیسی پھیلتی جائے گی، علم و ادب تصنیف و تالیف کا چرچا بڑھتا جائے گا۔ اور یہ ایک فطری چیز ہے۔ مگر ایک ایسا ہنگامہ تو برپا نہ ہونا چاہیئے کہ معیار اور چیزوں کی قدر و قیمت تہہ و بالا ہو جائے۔ کالج کے طلباء و طالبات کو تو چھوڑیئے کہ ان میں کچھ صلاحیتیں پیدا ہو چکی ہیں اور ان میں سے بعض صحیح تربیت سے تصنیف کے راستہ پر ڈالے جا سکتے ہیں۔ گو یہ بھی اکثر اپنے متعلق غلط فہمیوں سے پاک نہیں ہوتے۔

کیا فرماتے ہیں اس مسئلہ میں علمائے شرع ادبیات و جبہ پوشان فن تنقید کہ:-

(۱) اسکولوں کے بچے بھی اپنے کو مصنف سمجھنے لگیں اور لڑکوں اور لڑکیوں کو ان کے صحیح حدود میں رکھنے کی بجائے ان کو ان کے عزیز یا دوست مضامین لکھ کر دیا کریں تاکہ ان کا نام مضمون نگاروں کی فہرست میں رسالوں میں چھپنے لگے، جس سے ان کے ذہنوں میں عدم توازن پیدا ہو۔ اور یہاں تک کہ کسی اسکول کی چھٹی جماعت کے لڑکے کے فلسفۂ اقبال پر مضامین چھپنے لگیں اور پڑھنے والوں کو مضمون تو خاصا معلوم ہو مگر اس جماعت کے لڑکے اور اس کی عمر، ذہن اور فلسفۂ اقبال میں کوئی مناسبت معلوم نہ ہوتی ہو۔ اور پھر پڑھنے والوں کو پیسے دے کر ایسے مضامین پڑھنے پڑیں!

(۲) اور کس نفسیاتی کیفیت و ذہنی بنیاد پر مبنی ہے یہ واقعہ کہ تصنیف و تالیف کا میدان اپنے اوپر بلا وجہ تنگ کر کے ایسے

اشخاص بھی جو دو چار کتابوں کے مصنف کی حیثیت سے روشناس ہونے لگیں۔ کسی تعلیمی ترقی کے بیان کے سلسلہ میں ایسے افراد کی سوانح حیات لکھنے جنھوں نے کچھ تعلیم پالی ہو یا جن کے کچھ مضامین شائع ہو گئے ہوں یا جن کے نام سے ایک آدھ مضمون چھپ گیا ہو۔

خصوصاً جب اس شق نمبر (۲) کے تحت ایک صاحب نے اپنے رجحان کے موافق ایک مخصوص صنف ہی کی خدمت کا ارادہ کر کے یہ بیڑا اٹھایا ہو کہ ہر تعلیم یافتہ خاتون یا ادب سے دلچسپی رکھنے والی عورت خصوصاً اگر اس کا یا اس کے نام سے کوئی مضمون کہیں چھپ گیا ہو تو اس کی سوانح حیات پیروی کے ذریعہ حاصل کر کے اپنی کسی کتاب کی کوئی جلد مرتب کرنے میں صبح و شام دوا دوش فرمانے لگیں اور چونکہ اس فہرست میں کالج کی اکثر طالبات آجاتی ہیں، ان کے ساتھ جو غائبانہ ہمدردی ہے، اس کو معین اور مربوط شکل دینے کے لئے ان سے نامہ و پیام شروع کر دیا جائے؛ اب یہ ایک دوسری چیز ہے کہ اکثر گھرانے ابھی اس قدر "قدیم وضع" کے ہیں کہ ایک اجنبی مرد کی اس قسم کی پیام رسانی کو بن بیاہی لڑکیوں کے نام غیر موجہ اور بے ضرورت سمجھتے ہیں اور بعض تو شاید قابلِ برافروختگی بھی! یہ اُن لوگوں کا آپس کا معاملہ ہے۔ ہمیں یہاں اس مسئلہ کے سوشیل پہلو سے بحث نہیں۔

ہم تو صرف سوانح نگاری کے ایک شاخسانہ سے بحث کر رہے ہیں اور پوچھتے ہیں کہ سوانح نگاری کے فن کو اس درجہ گرا دینا کہ اس میں کالج کی لڑکیوں کی سوانح بھی چھپنے لگیں۔ جب کہ ابھی اس طبقہ کی قابلِ لحاظ سوانح شروع بھی نہ ہوئی ہوں، آیا ادبیات کی کوئی خدمت ہے؟ یا فنِ سوانح نگاری کو ذلیل کرنا مقصود ہے؟ اور ایسی لڑکیوں کی سوانح جمع کرنے کی کوشش جنھوں نے ابھی زندگی کا مفہوم بھی پوری طرح نہ سمجھا ہو، آیا خود ان لڑکیوں کو اپنی زندگی کی اہمیت کے متعلق غلط فہمی میں مبتلا کرنا نہیں ہے اور آیا خود فنِ سوانح نگاری اور تصنیف کی اس سے ان کی نظروں میں کوئی تحقیر نہیں ہو رہی ہے؟

آج کل کچھ "ہمت افزائی" اور اس کے طریقوں کا بھی غلط استعمال ہونے لگا ہے۔ شاید کہا جائے کہ نوعمروں اور ہونہاروں کی ہمت افزائی کرنی مقصود ہے! اگرچہ اس خیال کو سوانح نگاری کی حد تک صرف لڑکیوں سے متعلق وسیع کیا گیا ہے اور نہیں معلوم کیوں ایسا کیا گیا ہے، مگر ہم پوچھتے ہیں کہ کسی ترقی یافتہ قوم کے ادب میں اس قسم کی سوانح نگاری کی کہیں کوئی مثال پائی گئی ہے؟ یا محض کسی شخص کی کسی نفسیاتی بنیاد پر مبنی یہ اس کی ایک "ایجادِ بندہ" ہے اگر ایسا ہے تو اندیشہ ہے کہ وہ "گندہ" ہے۔ ہم نے نفسیاتی بنیاد کی طرف اشارہ اس مجبوری سے کیا ہے کہ ادب کی یا سوانح نگاری کے فن کی روایات اور عقل و روایت کی کوئی بنیاد اس تصنیع کی تائید نہیں کرتی۔ شاید ان کیفیات میں سے ایک ہو جس کو ماہرینِ نفسیات کسی قسم کا (complex) کہتے ہیں۔

مگر نہیں، معاف کیجئے، ایک اور معمولی سی وجہ مجھ جیسی غیر نفسیات داں ہستی کی بھی سمجھ میں آجاتی ہے گو شاید اس کی بنیاد نفسیات ہی پر ہے۔ وہ یہ ہے کہ ہر فردِ انسانی اپنی خود اظہاری کے جذبہ کا شکار ہوتا ہے، اور اخباروں، کتابوں، اور رسالوں میں کسی عنوان سے نام کا چھپ جانا بھی اس جذبہ کی تشفی کا باعث ہوتا ہے۔ تو اگر بھولی بھالی لڑکیاں یا عورتیں اس خصوص میں سوانح لکھ کر کتاب کی شکل میں چھپنے کے لئے بھیجنے کی استدعا کا شکار ہو جائیں تو کوئی تعجب نہیں۔ اس سے تو شاید ان کو ادبی نہیں تو اور قسم کا فائدہ ضرور پہنچے گا۔ کہ فلاں خاندان میں پیدا ہوئے ہیں۔ فلاں اسکول میں اس جماعت تک اور فلاں اسکول میں

اس جماعت تک تعلیم پائی پھر یا تو سینئر کیمبرج کی راہ سے یا اسکول فینل یا عثمانیہ میٹرک کے راستہ سے کالج پہنچ گئیں. کچھ اس نے
خاندان اور والدین کی وجاہت کا ذکر بھی آگیا. اور ماشاء اللہ سے دو چار مضامین " شہاب میں، سب رس میں یا بہت دور کی د...
شمالی ہند کے کسی رسالے میں لکھ کر یا لکھوا کر بھجوائے ہیں. چلئے چھٹی ہوی. اس سے بڑھ کر شان دار زندگی اور کیا ہوگی ! اور
شاید ایسے حالات زندگی ہیں. کہ اس زمانہ کے مصنف ان کو کتابوں میں شایع کریں !! ور غالبًا یہ بھی مقصود ہے کہ جب انشاء اللہ
ملک میں تعلیم بہت زیادہ عام ہوجائے گی اور حقیقی تعلیم یافتگی مردوں اور عورتوں دونوں میں پیدا ہوگی تو آئندہ آنے والے اس حا...
ہنسیں کہ ماشاء اللہ کیا مفید معلومات اور اہم مواد ہمارے لیئے اسلاف نے برائے ہدایت و تشویق چھوڑا ہے ؟ اور غالبًا ایک صدی
اس کتاب پر ریسرچ ہوگا کہ یہ مواد جو جمع کیا گیا تھا آیا اس سے کسی قسم کی ڈائرکٹری مرتب کرنی مقصود تھی یا ان کی سوانح لکھنی مقصود تھ...
(کیونکہ دونوں صورتوں میں ادھوری اور غیر مکمل ہوگی!) مصنف کی نفسیات کیا تھی اس کا محرک کیا تھا؟ کیونکہ ہم سمجھتے ہیں کہ سو سال
بعد نفسیات کا علم بہت ترقی کر جائے گا اور ہر چیز کے نفسیاتی پہلو پر آج سے بہت زیادہ زور دیا جائے گا۔

ہاں البتہ نفسیاتی کمزوری کے اس پہلو سے کھیل کر مصنف ایک ذاتی قسم کا فائدہ اٹھا سکتا ہے. مثلاً ایک مقامی اخبار نے
ایک ڈائرکٹری شایع کی جس میں ملک کے متعلق کچھ مفید معلومات تھیں مگر آپ جانتے ہیں کہ محض مفید معلومات لکھ دینے سے آج کل کتابیں
نہیں بکتیں، تو اس ڈائرکٹری میں کیا یہ گیا کہ چار پانچ ہزار مڈل کامیاب لڑکوں کی فہرستیں شایع کردیں. چلئے ہر لڑکے نے ایک ڈائرکٹری
اپنے چھپے ہوئے نام کی خاطر خرید لی تو چھٹی ہوئی. کوئی دوسرا اس کو خریدے یا نہ خریدے نفع خاصا ہوگیا. تو یہ پہلو ذاتی منفعت کا ہمارے
زیر بحث "سوانح" کا بھی ہوسکتا ہے کہ جن خواتین کا اس میں نام آگیا وہ خود تو یقینًا خریدیں گی اور کچھ خرید کر عزیز اقارب اور سہیلیوں کو
دیں گی کہ ان کی اس "نام چھپائی" کا چرچا ہو اور پھر جناب بعد کو تو ان خواتین کی نسلیں بھی غالبًا خریدتی رہیں گی کہ آخر وہ ایک
"خاندانی کارنامہ" رہے گا. ہم مانتے ہیں کہ یہ مالی پہلو اہم ہے اور تجارتی ڈائرکٹریوں کے لیئے زیادہ موزوں ہے. لیکن جو لوگ ملک کے
مصنفین کہلاتے ہیں اور علمی و ادبی خدمات کے دعویدار ہیں آیا اُن کے لیئے بھی یہ چیزیں زیب دے سکتی ہیں !

غرض کہ اس ایک موضوع پر نمونتًا کسی قدر طویل بحث سے میرا یہ مقصد ہے کہ میں ملک کے صحیح مذاق کے لوگوں کی اور اہل تنقید کی نظر
اس پوری صورت حال اور اسی قسم کی مختلف بے راہ رویوں کی طرف پھیروں اور خصوصًا ارباب ادارۂ ادبیات اردو کی توجہ اس طرف
منعطف کراؤں کہ زیر بحث اور دیگر بدعنوانیوں کے سد باب کی طرف عملی قدم بڑھائیں کیونکہ جس قدر زیادہ علم کی اشاعت ہوگی. مصنفین
نکتہ چین، مؤلفین اور ان کے ساتھ ساتھ گندم نما جو فروشوں کی بھی کمی نہ رہے گی. اور تیسرے درجے کے مصنفین و مؤلفین کی جو چھاپے
خانے کی سیاہی کو برباد کرتے رہتے ہیں اور اچھی کتابوں کے انتخاب کو مشکل اور گراں بناتے رہتے ہیں اب بھی کمی نہیں. لہذا کوئی قوت یا
ارادہ ایسا ہونا چاہیئے جو اردو و ادب کی ہمدردی میں لغویات کو روکنے سیدھا راستہ بتانے اور اچھی چیزوں کی ہمت افزائی کا
باقاعدہ کام اپنے ذمہ لے۔

مثلاً ایک مسئلہ جو نقادوں کے لیئے قابل غور ہوسکتا ہے یہ ہے کہ اردو میں عام طور پر مضمون نگار اپنے ماخذہ مواد کے اظہار کے

مسئلہ میں بہت کم ایمان داری سے کام لیتے ہیں اور عموماً یوروپی زبانوں سے مواد و خیال لے کر اپنی تصنیف کی صورت میں پیش کرنے کا مرض عام ہوگیا ہے۔ کیا حیدرآباد نے نہیں دیکھا کہ بعض انگریزی ڈرامہ نویسوں کے ڈرامے ترجمہ اور محرف کرکے "مصنفہ" فلاں کے نام سے پیش کیے گئے۔ اور شاید کہیں اصل مصنف سے منت پذیری کے اظہار کی ضرورت نہ سمجھی گئی۔ بہرحال ہماری روز افزوں ادب کا یہ درآمد کردہ جزو زیادہ ادبی ایمان داری کا طالب معلوم ہوتا ہے۔

یہ سب چیزیں آج کل کے ادب اور اس کے رجحانات و رفتار کے متعلق میرے دماغ میں کچھ عرصہ سے آ رہی تھیں۔ میں اپنے کو اس قابل نہیں سمجھتی کہ ان اہم اور دیدرس مسائل تنقید و ادب وغیرہ کا حل پیش کرسکوں۔ مگر اتنا ضرور محسوس کیا کہ ہماری رفتار و کردار ادبی میں "سب کچھ ٹھیک نہیں ہے" کہیں پانی مرا ہے۔ کہیں سے کچھ بو آتی ہے۔ کچھ مقامات کی طرف اشارہ کر دیا گیا ہے۔ اب یہ ماہرین فن تنقید اور اطبائے ادبیات کا کام ہے کہ ان امراض کی تشخیص کریں اگر ان میں جیسا کہ مجھے شبہ ہے بعض متعدی اور وبائی کیفیت رکھتے ہیں تو ان کا سدباب کیا جائے۔ پھیلنے سے روکا جائے اور اگر چند اشخاص وبا سے متاثر پائے جائیں تو ان کو مانع مرض ٹیکہ دیا جائے۔ ضرورت ہو تو ادبی آبادی سے باہر قیام کرنے پر مجبور کیا جائے۔ یہ عمل اگرچہ ان چند اشخاص کے لیے تکلیف رساں اور رنج دہ ہوگا مگر ساری ادبی آبادی وبا سے محفوظ و مصئون رہ سکے گی۔ آخر یہی عمل پلیگ وغیرہ سے متعلق حفظان صحت والے کرتے ہی ہیں! اور ذہنی وبائیں پلیگ سے زیادہ مخدوش ہوتی ہیں۔ یا پھر جو مداوا و معالجہ ماہران خصوصی تجویز کریں! یہ بہرحال ان کا مسئلہ ہے۔

یہ پوری تحریر محض ادبیات کی فضا کو پاک کرنے اور رکھنے کی طرف متوجہ کرنے کی خواہش سے لکھی گئی ہے۔ اشخاص اور ذاتیات سے بحث نہیں۔ اور یہ بھی ضروری نہیں کہ جو خیالات یہاں ظاہر کیے گئے ہیں ان سے سب متفق ہوں۔ لیکن اگر اس تحریر نے صحیح خیال اور صحیح درک و نظر رکھنے والے حضرات کو اصلاح حال کی طرف متوجہ کر دیا تو چلیے سمجھوں گی کہ یہ کاغذ سیاہی اور لکھنے میں جو وقت اور خیال صرف ہوا وہ ضایع نہ ہوا۔

جہاں آرا

نذرِ دکن

مرقع دکن کے ساتھ اس کا ایک **ضمیمہ خواتین** علحدہ کتابی صورت میں شایع ہوا ہے جس میں دکن کی چھپن سے زیادہ انشا پرداز خاتونوں کے نہایت دلچسپ اور مفید مضمون اور نظمیں، شامل ہیں، یہ اصل میں اسی دکن نمبر کا حصہ ہے جو صنف لطیف کے رشحات قلم پر مشتمل ہے۔ اور ادارۂ ادبیات اردو کے شعبۂ نسوان کی طرف سے اس کے سرگرم معتمد محترمہ سکینہ بیگم صاحبہ کے پُرخلوص مساعی کی وجہ سے نہایت خوبی، نفاست اور لطافت کے ساتھ مرتب اور شایع ہوا ہے۔ اس کی عام قیمت عمہ رکھی گئی ہے لیکن صرف سب رس کے خریداروں کو نصف قیمت پر محض اس وجہ سے دیا جائے گا کہ یہ سب رس ہی کا ایک حصہ ہے۔ اس خواتین دکن نمبر کے بعض مضمون نگاروں کے نام یہ ہیں۔

رابعہ بیگم صاحبہ (زنانہ کالج)	فاطمہ بیگم صاحبہ آدا	تصدق فاطمہ بیگم صاحبہ	قمر النساء بیگم صاحبہ	کبریٰ اقبال عبدالرؤف
زبیدہ ضیاء الدین انصاری	بشیر النساء بیگم صاحبہ بشیر	رابعہ بیگم صاحبہ (معلمہ محبوبیہ اسکول)	انسر النساء بیگم صاحبہ	ممتاز جہاں بیگم صاحبہ صوفی
صفیہ صدیق فریدہ بیگم صاحبہ	جہاں بانو بیگم صاحبہ بی اے	لطیف النساء بیگم صاحبہ بی اے	ذاکرہ بنت فضل اللہ احمد صاحب	تسنیم ربانی بی اے
منیر صوفی ام اے	تصدق فاطمہ غلام پنجتن صاحبہ	نور جہاں قریشی صاحبہ	انیسہ ہارون بیگم صاحبہ شروانیہ	شہر بانو بیگم صاحبہ

کس طرح لکھیں؟

اردو پر قابو پانے کے لیے اس کے بڑے بڑے مصنفوں کے کلام کا مطالعہ اور پھر مستقل مشق۔ ان دو باتوں کی سخت ضرورت ہے۔

"جتنا زیادہ تم ان لوگوں کے کارناموں کا مطالعہ کرو گے جو پر عظمت تھے اتنا ہی تمہاری قوت ایجاد میں اضافہ ہوگا" انگلستان کے مشہور نقاش اور نقادِ فن سر جوشیا رینالڈ کا قول ہے جو نہ صرف نقاشی بلکہ انشا پردازی پر بھی صحیح طور پر منطبق ہوتا ہے۔

آپ کو ان اچھے الفاظ کی ایک عمارت بنانی چاہیے جن سے آپ واقف ہیں۔ انہیں اعتماد کے ساتھ استعمال کرنا سیکھیے اور اس بات کی کوشش کیجیے کہ نئی نئی ترکیبیں بن سکیں اور اس طرح سے ایک شخصی اسلوب کا ارتقا ہو جائے۔

بعض اصحاب یہ مشورہ دے سکتے ہیں کہ ایک وسیع لفظی خزانہ جمع کر لینے کا آسان ترین ذریعہ کسی اردو لغت کو زبانی یاد کر لینا ہے۔ لیکن یہ خیال نہایت فریب دہ ہے کیونکہ تنہا الفاظ کو یاد رکھ لینا کافی نہیں ہے انشا پرداز کو چاہیے کہ انہیں دوسرے لفظوں کے صحیح تعلق کے ساتھ معلوم کرے۔

ایسے مصنفوں کی تقلید کرنے کی ہرگز کوشش نہ کرنی چاہیے جن کا اسلوب خاص اور غیر معمولی خصوصیتوں کا مالک ہو گیا ہو۔ محمد حسین آزاد، ملا رموزی، آغا حیدر حسن یا خواجہ حسن نظامی کے اسلوب کی نقل آتارنا نہ صرف مشکل بلکہ بے سود ہے۔ اس کے لیے ایک آزاد ایک رموزی ایک آغا حیدر حسن ایک خواجہ حسن نظامی ہی کے دل و دماغ کی ضرورت ہے۔ نوجوان انشا پردازوں کو ان مصنفوں کی طرف بڑھنا چاہیے جن کی زبان میں وضاحت، سادگی، جوش اور فطریت تناسب کے ساتھ ظاہر ہوتی رہتی ہو اور جن کی تقلید میں واقعی کامگاری نصیب ہو سکتی ہو۔

اس بارے میں سر سید شبلی، حالی اور وحید الدین سلیم زیادہ قابل توجہ ہیں۔ ان کے اسلوب بھی دلچسپ اور پر تنوع ہیں اور وہ بھی اپنے موضوعوں کو ایک خاص دلچسپ پیرائے میں بیان کرتے ہیں ان کی تحریروں کی خصوصیات انشا پردازی کے طالب علموں کو یہ دو سبق سکھاتی ہیں کہ۔

۱۔ کامیاب انشا پردازی، پڑھنے والے میں دلچسپی پیدا کرنے اور پھر اس کو قائم رکھنے پر منحصر ہوتی ہے۔

۲۔ مطالعہ اس لیے تکلیف دہ نہیں ہوتا کہ ہر صفحہ ایک خاص دلچسپی رکھتا ہے، اور شبلی حالی اور سلیم کی ایک اور خصوصیت تو یہ ہے کہ وہ پڑھنے والوں کے دلوں میں ادب اور تاریخ کا سچا ذوق موجزن کر دیتے ہیں۔

اس امر کا افسوس ہے کہ اردو میں ایسے روزناموں اور ہفتہ وار اخباروں کی کمی ہے جن کے مضامین انشا پردازی کے اچھے نمونوں کا کام دے سکتے ہوں اور جن کے مطالعہ سے وہ لوگ سبق حاصل کر سکیں۔ جو ایک سادہ اور فطری اسلوب کی مشق

کرنی چاہتے ہوں، یورپ کی زبانوں میں ایسے کئی پرچے نکلتے ہیں اور وہاں کے بعض انشا پردازوں نے تو انہی کے مطالعہ سے اپنے ادبی ذوق اور تحریری مشق میں ترقی کی ہے۔

انگریزی زبان میں ٹائمز اور منچسٹر گارڈین اس لحاظ سے بہت مفید ہیں۔ ان کے علاوہ اوسط درجہ کے مقبول پرچوں میں ڈیلی ایکسپریس، ڈیلی میل، اور ایوننگ اسٹانڈرڈ بھی اکثر اوقات نہایت اچھے نمونے پیش کرتے ہیں۔ ہفتہ وار پرچوں کی تو اچھی خاصی تعداد ہے لیکن اسپکٹیٹر میں انشا پردازی کے عمدہ نمونے اکثر نکلتے ہیں۔ اردو میں ابوالکلام آزاد کے الہلال، مولانا محمد علی کے ہمدرد، عبدالماجد کے سچ، اور صدق، خواجہ حسن نظامی کے منادی، قاضی عبدالغفار کے پیام، اور خلافت کے پرچوں میں اس قسم کی خصوصیات جھلکتی رہی ہیں۔ جہاں کوئی اس قسم کا اچھا مقالہ نظر آئے آپ کو چاہیئے کہ نہ صرف ایک سے زیادہ مرتبہ اس کو پڑھ جائیں بلکہ اس امر پر غور کریں کہ اس مقالہ کا پورا اثر کس نقطہ پر منحصر ہے اور یہ کہ جملوں کی ترکیبوں اور لفظوں کے استعمال میں کن امور کو پیش نظر رکھا گیا ہے۔ ابوالکلام، محمد علی، عبدالماجد اور خواجہ حسن نظامی کی اس قسم کی تحریروں کا ایک دوسرے سے مقابلہ کرنے سے بھی انشا پردازی کے بہت سے راز بے نقاب ہو سکتے ہیں۔

اگرچہ اعلیٰ درجہ کی ادبی تحریروں کا گہرا اور بار بار مطالعہ کچھ کم فائدہ مند نہیں لیکن اس سے بڑھ کر کامیاب نتیجے مطلب نویسی کی مشق سے حاصل ہو سکتے ہیں۔ لفظی خزانے کو وسیع کرنے کا بھی سب سے بہترین ذریعہ یہی ہے۔ دوسرے کی عبارت کو اپنی زبان میں ادا کرنا مطلب نویسی ہے۔ اور ایسا کرتے وقت فن انشا پردازی کے کسی طالب علم کو محض تبدیلی کی خاطر ایسے الفاظ نہیں استعمال کرنے چاہئیں جن سے اصلی عبارت کا مطلب فوت ہو جائے۔ اس طریقۂ کار سے اس میں کوئی شک نہیں کہ اصلی عبارت کے اسلوب کی برابری تو نہیں کی جا سکتی لیکن لفظوں کا صحیح استعمال کرنا آجاتا ہے جو اچھی تحریر کی طرف بڑھنے کا پہلا قدم ہے

آپ نے اپنی عبارت میں جن الفاظ کا استعمال کیا ہے ان کا اصل عبارت کے الفاظ سے مقابلہ کیجیئے اور لغت کی مدد سے دیکھیئے کہ دونوں میں کن جزوی امور کا فرق ہے اور کونسا لفظ مطلب کو ٹھیک اور مختصر طور پر ادا کر سکتا ہے۔ اس طرح کی محنت سے آپ کے لفظی خزانے میں قسم قسم کے لفظوں کا اضافہ ہوتا جائے گا۔

ایک اور طریقۂ کار خلاصہ نویسی ہے جس کی وجہ سے نومشق انشا پرداز بہت جلد ترقی کر سکتے ہیں۔ خلاصہ نویسی سے مراد ہے۔ کسی عبارت کے مطلب کو اپنے الفاظ میں مختصر سے مختصر کر کے لکھنا۔ اس سے ضروری اور غیر ضروری الفاظ میں امتیاز کرنے کا مادہ پیدا ہو جائے گا جو ایک اچھے انشا پرداز کے لئے نہایت ضروری ہے۔

عبارت آرائی کی مشق کے ساتھ ساتھ انشا پرداز کو جن امور کی طرف سب سے زیادہ متوجہ ہونا پڑتا ہے ان میں مضمون کا خاکہ، اس کے آغازی جملے، اس کی مسلسل دلکشی، اور سب سے بڑھ کر مضمون کے مناسب ترین اور دلکش عنوان کا انتخاب نہایت اہم ہیں۔

تقریباً ہر کامیاب انشا پرداز اس راز سے واقف ہوتا ہے کہ مضمون لکھنے کے لئے موضوع کا انتخاب کر لینے کے بعد

سب سے پہلے اس کو اپنے کام کا ایک خاکہ بنا لینا چاہیے۔ جس میں وہ دیکھتا ہے کہ زیر بحث موضوع پر کیا کیا لکھا جا سکتا ہے؟ اس خصوص میں آپ اس بات کا ضرور خیال رکھئے کہ خاکہ پر غور کرتے وقت جو جو خیالات دماغ میں جولانیاں دکھاتے ہیں وہ فوراً قلم بند کر لئے جائیں تاکہ بعد میں ان پر نظر ثانی کر کے اس امر کا تصفیہ کیا جا سکے کہ آیا کسی مضمون میں شامل ہونے کی ان میں سکت ہے یا نہیں۔ نمونے کے طور پر یہاں حسب ذیل چند جملے پیش کئے جاتے ہیں جو ایک اچھے مضمون کے خاکہ کا کام دیں گے

وہ کونسی صفات ہیں جو کامیاب آدمی کو ممتاز کرتی ہیں؟

تحریک، جوش

استقلال، جرأت، اور کچھ اور

اس میں آگے بڑھنے کی اہلیت ہوتی ہے اور وہ ایک خاص مقصد کی طرف چلتا ہے۔

وہ تعمیری طریقے پر سوچتا ہے، خیالات حاصل کرنے کے لئے ہمیشہ تیار رہتا ہے، اور کام کرنے کے بہترین طریقے ڈھونڈھتا ہے۔ زیادہ جانتا ہے اور زیادہ دیکھتا ہے کیونکہ اس کے خیالات بجائے سو راستوں کے ایک ہی جانب متوجہ رہتے ہیں۔ اپنے کام کی تہ تک پہنچتا ہے اور دور تک کی سوچ لیتا ہے۔

خاکہ ڈال لینے کے بعد دوسری چیز جس پر انشا پردازوں کی کامیابی کا انحصار ہے۔ مضمون کے آغازی جملے ہیں۔ پڑھنے والے کو اپنی طرف متوجہ کر لینے کے لئے مضمون کی اچھی ابتدا ہر حال میں لازمی ہے۔ انشا پرداز کو چاہئے کہ مضمون کی باگ فوراً اپنے ہاتھ میں لے لے۔ بہترین تمہید وہی ہے جو موضوع سے دلچسپی پیدا کر دیتی ہے اور منکشف کرتی ہے کہ مضمون نگار کی نظر میں ایک معین مقصد موجود ہے۔ حسب ذیل دو نمونے ظاہر کر سکتے ہیں کہ متذکرۂ بالا موضوع (یعنی کامیاب انسان کو ممتاز کرنے والی صفات) پر کسی مضمون کے ابتدائی جملے کس طرز کے لکھے جا سکتے ہیں۔

(۱) کیا کامیابی کا کوئی راز ہے؟ کیا اس امر کی کوئی سادہ توضیح کی جا سکتی ہے کہ کیوں ایک آدمی آگے بڑھ نکلتا ہے اور دوسرا ایک ہی جگہ پڑا رہتا ہے۔

(۲) قمر الدین دفتر میں ملازم ہونے کے چند ہفتوں بعد ہی ترقی پانے والوں کے زمرہ میں شمار کیا جانے لگا وہ ایک زندہ آدمی اور سوچنے اور کام کرنے والا انسان ہے اور ان لوگوں میں سے ہے جن کا آگے بڑھنا یقینی ہے:

جب میں نے پرسوں "مضامین سرسید" میں یہ خیال پڑھا کہ کامیابی کا تعلق محنت اور صرف مسلسل محنت سے ہے تو مجھے متذکرۂ بالا جملہ یاد آ گیا جو میرے ایک دوست عہدہ دار نے اپنے دفتر کے ایک اہلکار کی نسبت مجھے خط میں لکھا تھا۔

مضمون کا ایک جاندار آغاز توجہ پیدا کرنے کا بہترین ذمہ دار ہوتا ہے۔ لیکن دوسرا مسئلہ پڑھنے والے کی دلچسپی کو مسلسل رکھنے سے متعلق ہے۔ یہ ضروری ہے کہ آپ رفتہ رفتہ اپنے طریقۂ تحریر کی گہرائی دکھانے لگیں۔ اگر آپ متذکرۂ بالا موضوع پر

لکھتے وقت محنت اور اپنی خود آپ کرو سے متعلق پس پا افتادہ اور معمولی خیالات اور زبان زدعوام اقوال پیش کر دیں تو آپ کے ناظرین بہت جلد اکتا جائیں گے۔ وہ جس چیز کے خواہشمند ہوتے ہیں وہ یہ ہے کہ موضوع پر بالکل نئے اور عملی طریقے پر روشنی ڈالی جائے اس بارے میں مضمون نگار کو اس بات کا بھی خیال رکھنا پڑتا ہے کہ اگر ساتھ ساتھ اپنے ذاتی تجربات بھی تناسب کے ساتھ پیش کر دئے جائیں تو بیان زیادہ دلچسپ ہو جائے گا۔

خیالات کو ہمیشہ ایک دلکش لباس یا پیرایہ میں پیش کرنے کی بھی ضرورت ہے۔ یاد رکھئے کہ مستعمل اور پامال واقعات بھی دلچسپ بنائے جا سکتے ہیں۔ بشرطیکہ انہیں اچھی نقروں سے ملبوس کیا جائے۔ اس بات کو بھی شروع سے آخر تک پیش نظر رکھنا ضروری ہے کہ پڑھنے والوں کے دل و دماغ پر اپنے خیالات اور واقعات کی واضح ترتیب کے علاوہ سادہ اور بولتے ہوئے لفظوں کے استعمال ہی سے اپنا گہرا اثر بٹھایا جا سکتا ہے۔

اس سلسلہ میں اور دو باتیں قابل ذکر ہیں۔ مضمون کی ظاہری شکل و صورت کا دلکش بنانا بھی ضروری ہے۔ طول طویل اور مسلسل عبارتوں کے لکھنے سے پرہیز کرنا چاہئے۔ چھوٹے چھوٹے علیحدہ ٹکڑے زیادہ جاذب نظر ہوتے ہیں۔ اگر درمیان میں مختصر ذیلی سرخیاں آتی رہیں تو پڑھنے والے کو جلد بیزار ہونے سے روکنے کا کام دے سکتی ہیں۔

اس امر کی اہمیت سے بھی غالباً ہر صاحب ذوق واقف ہے کہ مضمون کا عنوان انتہائی جدت اور ہوشیاری کا نتیجہ ہونا چاہئے۔ اختصار، وضاحت، اور مناسبت اچھے عنوان کی سب سے اہم خصوصیتیں ہیں۔

اچھا عنوان مصنف کے کارنامے کے لئے بہترین اشتہار کا کام دے سکتا ہے۔ تجربہ کار انشا پرداز اس راز سے بخوبی واقف رہتے ہیں اور ایک ایسا عنوان حاصل کرنے کے لئے جو لوگوں کو ان کا مضمون پڑھنے پر مجبور کر دے ہر طرح کی زحمت اٹھاتے ہیں۔

ایک کامیاب عنوان وہی ہوتا ہے جو دلکش اور مختصر ہونے کے علاوہ اس موضوع کو اچھی طرح واضح کر دے جس پر مضمون لکھا گیا ہو۔ بعض وقت اچھے اچھے مضمون بھی عنوان کے بھدے پن کی وجہ سے ناکام پڑے رہتے ہیں اور کوئی ان کی طرف توجہ نہیں کرتا۔

اکثر ایسا بھی ہوتا ہے کہ اگر مضمون ناقص ہو تو مصنف کو موزوں اور موثر عنوان ملتا نظر نہیں آتا۔ اگر کوئی کارنامہ معین مقصد کی پیداوار نہیں ہوتا تو ظاہر ہے کہ اس کا عنوان ذرا مشکل ہی سے دستیاب ہو سکتا ہے۔ فسانوں یا مختصر قصوں کے لکھنے والوں کی کمزوریاں بھی اکثر اسی وقت ظاہر ہوتی ہیں جب مصنف ان کے لئے دلچسپ اور موزوں عنوان حاصل کرنے کی فکر میں ہو۔

یہاں چند مثالیں پیش کی جاتی ہیں جن پر غور کرنے سے معلوم ہوگا کہ کس طرح بھونڈے عنوانوں کو صرف لفظوں اور ترکیبوں کی تبدیلی کے ساتھ پر زور، موثر، اور دلکش بنایا جا سکتا ہے۔

بھدے عنوان	موثر عنوان
حد سے زیادہ کھانا کھانے کے نقصانات	زیادہ کھانا

اچھی غذا پکانے کے طریقے		آپ کی پسندیدہ غذا
پردے کی خرابیاں		پس پردہ
حالی کی نظم و نثر میں اُن کے کردار کے اثرات		حالی کی شخصیت ان کے کارناموں میں

(ماخوذ از فن انشا پردازی)		سید محی الدین قادری زور

اے دوست

وہ دن بھی یادگارِ زندگی ہے اے مرے ہمدم!!		نگاہیں ملتے ہی جب مل گئے تھے دل سے دل باہم
دلوں میں ایک طوفاں تھا مگر خاموش تھے دونوں		سراپا گفتگو لب تھے مجسم گوش تھے دونوں
نظر نیچی کیے دامن سمیٹے کھوئے کھوئے سے		خمارِ خواب میں ڈوبے ہوئے کچھ سوئے سوئے سے
لبوں کی لرزشوں میں ایک ہیجانِ تکلم تھا		حسیں جذبات کا خاموش طوفانِ تلاطم تھا
کہا کچھ تم نے زیرِ لب بڑھی الجھن مرے دل کی		ہوئے خاموش تم اور بڑھ گئی دھڑکن مرے دل کی
ملا کر ملتجی نظریں مرے دل میں در آئے تم		شباب و شعر کی رنگینیوں کو ساتھ لائے تم

وہ غم!! جو حاصلِ سوز و فا ہو — دے دیا تم نے!!
سما کر مجھ میں آخر مجھ سے مجھ کو لے لیا تم نے!!

عزیز از زندگی!! مجھ کو بھی اب جینے کا ارماں ہے		مری دنیا کا ذرہ ذرہ اب گلشن بداماں ہے
یہی راتیں یہی دن، یہ زمین و آسماں ہوں گے		نہ جانے دوست!! اس دنیا میں ہم دونوں کہاں ہوں گے

جو بھولے سے کبھی ہم راز تو مجھ کو نہ یاد آئے!!
تو بہتر ہے مجھے اُس دن سے پہلے موت آجائے!!

بدل جائے گی شاید زندگی کی رسمِ دیرینہ		بکھر جائیں گے عہدِ رفتہ کے اوراقِ پارینہ
ہزاروں انقلابوں سے گذرتی جائے گی دنیا		خیال و فکرِ انساں سے سنورتی جائے گی دنیا
یہ ہو سکتا ہے دل اور عقل ہم آہنگ ہو جائیں		شباب و حسن غور و فکر کی دنیا میں کھو جائیں
یہ ممکن ہے چھپا لے آسماں تاروں کی بستی کو		یہ ممکن ہے نگل جائے زمیں اجزائے ہستی کو

مگر اے دوست!! تیری یاد اب دل سے نہ جائے گی!!
یہ میری زندگی ہے۔ میرا مستقبل بنائے گی!!

صمد رضوی ساز

سلام بہ جناب امام علیہ السلام

السلام اے نورِ عینِ رحمۃ اللعالمین
السلام اے راحتِ جانِ امیر المومنین

السلام اے نو بہارِ بوستانِ مرتضیٰ
السلام اے افتخارِ دودمانِ مصطفےٰ

السلام اے فاطمہ کے نور دیدہ السلام
السلام اے ظلم و جور و غم رسیدہ السلام

السلام اے منبعِ عزم و ہمم فیض و عطا
السلام اے معدنِ خلق اتم صدق و صفا

السلام اے مصدرِ ایمان و تسلیم و رضا
السلام اے مظہرِ مہر و کرم جود و سخا

السلام اے سیدِ عالی نسب والا حسب
نازشِ دینِ مبیں سبطِ شہِ امّی لقب

اے شہنشاہِ سریر انّما تجھ پر سلام
ورثہ دارِ بادشاہِ ہل اتیٰ تجھ پر سلام

اے حسینؑ ابن علیؑ ایمان کی تو جان ہے
تیرے جد کی شان میں لولاک کا فرمان ہے

باپ وہ جس کی فرشتوں نے ثنا کی بار بار
کہ "فتیٰ الّا علی لا سیف الّا ذوالفقار"

ماں وہ کی تعظیم جس کی خود نبیؐ نے بارہا
بضعۃ منّی کہا جس کو پیمبر نے سدا

پلنے والے گودیوں میں احمدِ مختار کی
چوسنے والے زباں کے مخبرِ اسرار کی

واہ کیا کہنا ترا اے راکبِ دوشِ نبی
تو نے دی تاثیر دکھلا فاطمہؑ کے شیر کی

حشر تک باقی رہا اسلام پر احساں ترا
کارنامے نے ترے تاریخ کو چمکا دیا

ٹوٹتا ہے کفر کیونکر تو نے بتلایا ہمیں
کس طرح مرتے ہیں حق پر تو نے دکھلایا ہمیں

جس سے ہے دور تو وہ پیکرِ تنویر ہے
جس پہ قدرت نے قلم توڑے تو وہ تصویر ہے

تو نے عالم کو دکھا دی شانِ ضبط و اختیار
گود میں اصغر کی میت لب پہ شکرِ کردگار

محوِ حیرت ہے زمانہ تیری ہمت دیکھ کر
شکر کے سجدے کئے کڑیل جواں کی لاش پر

لذتِ ایذا رسانی سے عدو بھی جھک گئے
تو مصائب سے نہیں تجھ سے مصائب تھک گئے

اے رضا جوئے خدا، تیری رضا حق کی رضا
اے سراپا سِرّ نفسِ مطمئنہ مرحبا

قربِ حق منزل تری ہے مرحلہ تیرا عظیم
تیرا پیرو جادہ پیمائے صراطِ مستقیم

ہمت عالی نے تیری لے لیا کونین کو
کفر سمجھا راہِ حق میں ترک نصب العین کو

لطیف النساء بیگم

حیدرآباد کی علم دوست خواتین کا پہلا اجتماع

(روئداد اجلاس عام شعبۂ نسوان)

شعبۂ نسوان کا پہلا اجلاس عام بتاریخ ۲۶ ذیحجہ ۱۳۵۵ھ صبح ساڑھے دس بجے بمقام حیدرآباد لیڈیز اسوسی ایشن کلب محترمہ لیڈی حیدر نواز جنگ بہادر و محترمہ مہدی یار جنگ بہادر کی مشترکہ صدارت میں منعقد ہوا جس میں اُردو علم و ادب سے دلچسپی رکھنے والی صاحب ذوق ہندو و مسلم خواتین نے حصہ لیا۔

اجلاس کی ابتدا کلام پاک سے کی گئی جس کو شاہجہاں بیگم صوفی نے نہایت خوش الحانی سے سنایا اس کے بعد معتمد شعبہ کی تحریک اور محترمہ سارہ بیگم صاحبہ کی تائید کے بعد صدر صاحبہ کو عزیزہ جہاں بانو بیگم صاحبہ نے پھول پہنائے۔ لیڈی حیدری صاحبہ نے کرسی صدارت قبول کرتے ہوئے ایک مختصر سی تقریر فرمائی جس میں آپ نے شعبہ کے قیام و مقاصد پر خوشنودی کا اظہار کیا، اور خواتین سے درخواست کی کہ اس کی توسیع و ترقی میں ہاتھ بٹائیں اور اس کے کامیاب بنانے میں حتی الامکان سعی کریں۔

رالعہ بیگم صاحبہ سے ارشاد ہوا کہ خطبۂ صدارت پڑھ کر سنائیں، اور انھوں نے نہایت عمدگی سے اس فرض کو انجام دیا۔ اس کے بعد چونکہ موصوفہ دوسرے جلسہ میں جانے والی تھیں آپ نے جلسہ میں آخر تک شریک نہ رہ سکنے کی معذرت کی اور اجلاس کی رہنمائی کے لئے بیگم مہدی یار جنگ بہادر کا انتخاب کرتے ہوئے کرسی صدارت قبول کرنے کی درخواست کی۔

محترمہ رالعہ بیگم صاحبہ نے پھر ایک فاضلانہ تقریر کی جس میں آپ نے صدر و خواتین کا خیر مقدم کیا۔ شعبہ کے قیام اور اغراض و مقاصد پر روشنی ڈالی اور خواتین حیدرآباد کو علمی دلچسپی کی طرف توجہ دلائی، اس پُر مغز تقریر کے ختم پر ہماری مایۂ ناز شاعرہ محترمہ بشیر النساء بیگم صاحبہ بشیر نے اپنی ایک نفیس نظم "عرض حال" واہ، واہ اور تالیوں کی گونج میں سنائی، آپ کی نظم نے خواتین پر ایک خاص اثر کیا۔

اس کے بعد لطیف النساء بیگم صاحبہ نے "ادارہ ادبیات اُردو" اس کے شعبہ اور زنانہ کتب خانہ کے قیام سے متعلق ایک نہایت دلچسپ تقریر کی جس میں حیدرآبادی خواتین کو علمی و ادبی دنیا میں عملی حصہ لینے کی طرف راغب کیا، آپ کی تقریر کے اختتام پر محترمہ صغرا بیگم ہمایوں مرزا نے ایک مختصر سی تقریر کی اور کتب خانہ کی امداد کے لئے آمادگی ظاہر کی۔ ان کے بعد بیگم صاحبہ سید امیر حسن صاحب مرحوم نے حاضرین کو مخاطب کرکے اپنی شگفتہ تقریر سے انھیں محظوظ کیا، زنانہ کتب خانہ کے قیام پر اظہار مسرت کرتے ہوئے آپ نے پندرہ روپے کا عطیہ بھی اسی وقت کتب خانہ کے لئے عنایت کیا اور کتابیں بھی دینے کا وعدہ فرمایا۔

بشیر النساء بیگم صاحبہ نے ایک اور نظم بعنوان "احسان فراموش دنیا" سنائی جو جلسہ میں بڑی مقبول ہوئی۔

آخر میں معتمد شعبہ نے صدر و حاضرین کی خدمت میں مخلصانہ شکریہ پیش کیا اور طالبات مدرسہ محبوبیہ نے قومی ترانہ سنایا جو حاضرین نے ادب و احترام کے ساتھ ایستادہ ہو کر سنا۔

اختتام جلسہ پر اُردو مطبوعات کی نمائش ترتیب دی گئی تھی جس کا خواتین نے نہایت شوق سے ملاحظہ کیا اور اکثر و بیشتر نے کتابیں بھی مول لیں۔

سکینہ بیگم

(شعبۂ نسواں)

خطبۂ صدارت محترمہ لیڈی حیدری صاحبہ

معزز خواتین!

علم و ادب کی ترقی کے واسطے ایسی بزموں اور انجمنوں کی ضرورت ہے جو ملک کے ادبی ذوق کو بڑھانے۔ اس کو اعلیٰ معیار پر پہنچانے میں صحیح رہنمائی کریں اور مصنفین و مولفین کی دماغی قابلیتوں کو عرصہ ظہور پر لانے کے ساتھ ساتھ ان کی نشر و اشاعت اور طباعت و فروخت کی موانعات و مشکلات سے انھیں نجات دیں۔

ادارۂ ادبیات اردو حیدرآباد دکن کے قیام کا بنیادی مقصد یہی ہے۔ میں خوش ہوں کہ ادارہ مذکورہ اپنے فریضے کو نہایت عمدگی سے انجام دے رہا ہے۔ اور اب تک کئی مفید ادبی کتابیں ملک کے سامنے پیش کر چکا ہے۔ امید ہے کہ اس میں اور ترقی ہوگی۔

مجھے یہ معلوم کر کے بڑی مسرت ہوئی کہ اب اس ادارہ نے چند خواتین پر مشتمل۔ ایک انجمن بنام شعبۂ نسواں قائم کی ہے۔ جس کا اہم مقصد حلقۂ اناث میں ذوقِ علم، شوقِ عمل اور ادبیاتِ اردو کا لطیف و سنجیدہ مذاق پیدا کرنا ہے۔ توقع کہ یہ شعبہ اپنے مقاصد میں کامیاب اور ہماری خواتین کے لئے مفید و کارآمد ثابت ہوگا۔

شعبۂ نسواں حیدرآباد میں اپنی نوعیت کی پہلی انجمن ہے یہ حیدرآباد کی ایک خوش قسمتی کی علامت ہے کہ ادارہ کی توجہ اس طرف منعطف ہوئی ہے۔

آپ جانتی ہیں کہ اردو ہندوستان کی پیداوار اور یہاں کی مروجہ و مشترکہ زبان ہے۔ اگرچہ یہ زبان برابر ترقی کرتی چلی جارہی ہے اور ایک صدی کی بہ نسبت دوسری صدی میں زیادہ وسعت اور ہمہ گیری حاصل کر رہی ہے لیکن اب بھی ضرورت ہے۔ کہ اس کو وسیع سے وسیع تر بنایا جائے۔ تاکہ موجودہ زمانہ کی علمی و ادبی ضرورت کو پورا کرنے کی اس میں قابلیت و استعداد پیدا ہو سکے اور ہمارے سرمایہ علم و ادب میں روز افزوں اضافہ ہوتا جائے۔

اگرچہ ہماری گورنمنٹ یہ کام انجام دے رہی ہے۔ مگر علاوہ گورنمنٹ کی توجہ کے قوم کے افراد نہ صرف مردوں بلکہ عورتوں کا بھی فرض ہے کہ اس میں حصہ لیں۔ بڑی خوشی کی بات ہے کہ ایک ایسے اہم شعبہ میں حیدرآباد کی اکثر بیویاں کام کرنے کو تیار ہیں مجھے امید ہے کہ یہ کام جاری رہے گا۔ ترقی کرے گا۔ اور ملک کی خواتین زیادہ تعداد میں اس میں شریک ہوں گی۔ اور گرمجوشی سے حصہ لیں گی۔

صاحب عزم اور قابل کار اصحاب نے اصلاح و ترقی کے واسطے اب تک جتنی بھی کوششیں کی ہیں اُن سے ہماری بہنیں اسی وقت استفادہ کر سکتی ہیں جب کہ وہ اشتراک عمل کریں۔

چند باہمت خواتین نے اس ادارہ کے ذریعہ تہیہ کیا ہے کہ ترقی پرور اعلیٰ خیالات گھر گھر پہنچائیں۔ اور آپ گھر بیٹھے ان سے فائدہ حاصل کر سکیں۔ اب یہ آپ کا کام اور آپ کے فیصلہ پر منحصر ہے۔ کہ اس چھوٹے سے ادارہ کو کس طرح ترقی دیں اور کیونکر بام عروج پر پہنچائیں۔ آپ چاہیں۔ تو اس کو بڑا سا بڑا ادارہ بنا سکتی ہیں۔ اور دنیا پر ثابت کر دے سکتی ہیں کہ علمی میدان میں خواتین بھی پیچھے نہیں رہ سکتیں۔

میں چاہتی ہوں کہ اس موقع پر کارکنان ادارہ سے بھی یہ کہوں کہ انجمنیں بنتی ہیں۔ ادارے قائم ہوتے ہیں۔ مگر جلد سے جلد ان کی نرم رفتاری میں فرق پڑ جاتا ہے۔ اگرچہ ہر ایک کی ابتدا تو شاندار ضرور ہوتی ہے۔ لیکن سستی دل کی کمی اور زمانہ کی سرد مہری و بدمذاقی انہیں پست ہمت اور سست کار بنا دیتی ہے۔

لیکن جو لوگ مستقل مزاج اور ثابت قدم ہوتے ہیں۔ کوئی وقت کوئی تکلیف ان کے پائے استقامت کو اپنی جگہ سے نہیں ہٹا سکتی۔

پس آپ کو بھی کسی وقت دامن استقلال کو ہاتھ سے نہ چھوڑنا چاہیئے۔ اپنے ارادوں اور مقاصد میں عزم بالجزم محنت مشقت اتحاد و اتفاق، خلوص و صداقت اور ثابت قدمی کے ساتھ قائم رہنا چاہیئے۔ میری دعا ہے کہ ادارہ کا شعبۂ نسوان اپنے ارادوں میں کامیاب ہو اور روز افزوں ترقی حاصل کرے۔

احسان فراموش دنیا

صنفِ نازک جسے کہتے ہیں یہ اربابِ نظر　　ہے اسی ذات پہ قوموں کی ترقی کا مدار
کیا غضب ہے کہ کریں مرد ترقی حاصل　　اور عورت رہے، یوں جہل و ضلالت پہ کنار
لازمی ہے کہ بنے قابلِ خدمت یہ بھی　　کام کیونکر وہ کرے جس کا ہو بازو بیکار
آہ مضبوط اگر بندشِ بنیاد نہیں!　　کام کیا آئے گی پھر قوتِ فنِ معمار
اپنی تاریخ پہ جس وقت نظر پڑتی ہے　　ہم پہ ہوتے ہیں عیاں اپنے نمایاں کردار
کس قدر زود فراموش ہے بے حس دنیا　　آج کہتی ہے ہمیں ناقص و عضوِ بیکار
کارآمد رہے ہم کارگہِ ہستی میں　　ہر زمانہ میں مسلّم رہا اپنا ایثار
تھا قدم عالمِ اسلام میں پہلا کس کا؟　　کس کی جرأت پہ تھے انگشت بدنداں کفار
تھے وہ آغشتہ بخوں کس نے جگر کے ٹکڑے؟　　جن کے ایثار کا اب بھی ہے مقر ہر دیندار
چاند بن کر کیا دنیا کو منور کس نے؟　　کس نے اکبر کے مقابل میں اٹھائی تلوار
کس کے افسانے سے توقیر ہے جھانسی کی سوا؟　　سطوتِ نور جہاں سے ہے کسی کو انکار
کس کے تسخیرِ عمل کا ہے گواہ "تاج محل"　　اور یہ گوشۂ محل کس کی ہے حیات کا مزار
یاد رکھو! کہ ہے یہ عالمِ ہستی ہم سے　　ہم جو مٹ جائیں تو مٹ جائیں گے لیل و نہار

نشاط النساء بیگم

محترمہ رابعہ بیگم صاحبہ کی خیر مقدمی تقریر

عالی جناب صدر نشین صاحبہ اور محترم خواتین

میں اس خیال سے نہایت مسرور ہوں کہ آج آپ کا خیر مقدم ادا کرنے کی سعادت مجھے حاصل ہوئی ہے۔ معزز بہنو۔ محترمہ لیڈی حیدری صاحبہ نے باوجود عدیم الفرصتی ہماری ہمت افزائی اور احساس علم پروری کے تحت جو ہمیشہ آپ کا مطمع نظر رہا ہے۔ اجلاس ہذا کی افتتاحی صدارت کو قبول فرما کر ہماری جو عزت افزائی فرمائی ہے اس کے ہم سب تہ دل سے شکر گذار ہیں اور اپنے دلوں میں ایک سرور آمیز تقویت محسوس کر رہے ہیں۔ اور بیگم صاحبہ نواب مہدی یار جنگ بہادر کے قدم رنجہ فرما کر اس جلسہ کو رونق بخشنے کا ہم بجان و دل شکریہ ادا کرتے ہیں۔

نیز آپ سب صاحبین کی تشریف آمدی جو تعاون اور شرکت عمل کے جذبہ کا ثبوت دے رہی ہے۔ ہماری قلبی مسرت اور دلی سپاس گذاری کا باعث ہے۔

ادارۂ ادبیات اردو کے شعبۂ نسواں کا یہ پہلا اجلاس عام ہے جس میں آپ سب کے اجتماع کا شرف نصیب ہوا ہے۔ اب ہمیں یہ زرین موقع میسر آیا ہے کہ شعبۂ نسواں اور اس کے اغراض و مقاصد کا آپ سے تعارف کروایا جائے۔

شعبۂ نسواں ادارۂ ادبیات اردو کی ایک شاخ ہے۔ اس ادارہ کا بنیادی مقصد یہ ہے کہ اردو زبان اور اردو ادب کا صحیح ذوق پیدا کیا جائے۔ انشاپردازوں اور شعراء کے حلقہ میں تصنیف و تالیف کا شوق بڑھایا جائے۔ ملک کی علمی اور عملی جدوجہد میں اجتماعی تائید حاصل کی جائے۔

شعبۂ نسواں کا قیام ہر نومبر ۳۲ء میں عمل میں آیا جس کے اجلاس کم و بیش ہر مہینہ میں ایک بار حسب سہولت منعقد ہوتے رہے ہیں مجلس عاملہ ۵ اراکین پر مشتمل ہے۔

اس قلیل مدت میں عملی طور پر شعبہ نسواں نے جو کام انجام دیا ہے وہ "نذر دکن" کے پیکر میں آج آپ کا طالب نظر ہے اور "ہماری طرز معاشر" مصنفہ لطیف النساء بیگم صاحبہ اور "رسائل طیبہ" تصنیف طیبہ بیگم صاحبہ مرحومہ زیر طباعت عنقریب آپ سے ملتمس توجہ ہونے والی ہیں۔

ہماری انجمن کے اغراض یہ ہیں

(۱) باہم تقسیم عمل سے کاروبار میں سہولت پیدا کریں۔

(۲) مختلف خیال اور متضاد نظرئے رکھنے والی خواتین کا تعاون و مشورہ حاصل کریں۔

(۳) ادارہ کے ہمدردوں اور رفیقان کار کے دائرہ کو وسیع بنائیں۔

(۴) صاحب الرائے خواتین کی ایک ایسی جماعت کو۔ جو ہر معاملے میں شعبہ کی مشیر کار ہو سکے مہیا کریں۔

آپ یقیناً میرے اس خیال سے اتفاق فرمائیں گی کہ ایک زندہ زبان ایک قوم کو زندہ رکھنے کی ضامن ہے۔ زبان کی زندگی اس کی ہمہ گیری اور ہر جہتی ادائے مطالب کی قوت کا پیدا کرنا۔ شستہ بیانی سلیم المذاقی و قادر الکلامی کا حامل ہونا اور معتدبہ ذخیرہ علم و ادب کا فراہم رکھنا ہے۔

اس حقیقت سے انکار نہیں ہو سکتا کہ زبان کا سرچشمہ خواتین ہیں۔ ملک کے نونہال اس چشمہ کی روانی سے سرسبز ہوتے یا اس کے رکاوٹ سے مرجھا جاتے ہیں۔ ارباب نظر مادری زبان کی جو اہمیت تسلیم کرتے ہیں وہ محتاج تصریح نہیں۔ ایک خوش گو فصیح البیان ماں گہوارہ ہی میں بچے کو اپنی زبان و کلام سے گوش آشنا کر دیتی ہے۔ جس کے اثرات از "مہد تا لحد" زائل نہیں ہوتے۔ دنیا میں بڑے بڑے ادیبوں کی پیداوار کا پنہاں راز ماں ہے۔

لہذا ضرورت ہے کہ ہماری خواتین ادب اردو کی اہمیت پر غور فرمائیں۔ اور اپنی مشترکہ مساعی اور اتحاد عمل کے ساتھ۔ مقاصد بالا کو فائز المرام بنانے کی طرف توجہات مبذول فرمائیں اور اپنے لطیف سرمایۂ نظم و نثر سے شعبہ نسواں کو ادب اردو کا ایک گراں بہا مخزن بنائیں۔ ہماری مستورات کو اپنی علمی، ادبی، سماجی اور اصلاحی قوتوں کو منصۂ ظہور پر لانے کے لئے۔ اس سے بہتر موقع میرے خیال میں نہیں ملے گا۔

یہ امر ہمارے لئے اس لئے حوصلہ افزا ہے کہ دور موجودہ کی متعدد خواتین تصنیف و تالیف شاعری و انشا پردازی۔ غرض مختلف نظم و نثر کا ملکہ اور علم و عمل کا میلان رکھتی ہیں۔ ہماری امید کی نظریں آپ پر جمی ہوئی ہیں۔ آپ چاہیں تو شعبہ نسواں کے نومولود طفل شیر خوار کو صف شکن سورما اور پیلتن پہلوان بنا کر اکھاڑے میں لا کھڑا کر سکتی ہیں۔

لہذا جمیع خواتین سے جنھوں نے تشریف فرمائی سے اس جلسہ کو ممنون فرمایا ہے درخواست ہے کہ حتی الامکان اپنی اور اپنے اعزا اور دوست احباب کی شرکت سے شعبہ مذکور کو کامیاب فرمائیں۔ اور اپنی دماغی قابلیتوں اور نتائج فکر کے جواہر پاروں سے عالم نسواں کو منور کر دیں۔

مشترکہ بے لاگ اجتہاد عمل پر خلوص ایثار اور جذبۂ خدمت۔ متحدہ گرم جوش درد وطن۔ صمیم کوہ سان عزم و استقلال ہی اوج مقاصد پر پہونچا سکتا ہے۔

یقیں محکم۔ عمل پیہم۔ محبت۔ فاتح عالم
جہاد زندگانی میں ہیں یہ مردوں کی شمشیریں

یہ امر کس قدر مسرت انگیز ہے کہ ہم ایسی حکومت کی پیداوار ہیں جو ہمارے چمنستان حیات کی آبیاری کو ہر طرح تیار ہے۔ ہماری علمی ضرورتوں تعلیمی سہولتوں کے مدنظر جامعہ کا قیام عمل میں آیا۔ دارالترجمہ قائم کیا گیا۔ دور حاضرہ کے مختلف علوم و فنون ریاضی۔ سائنس۔ فزکس۔ کیمیا۔ نباتیات حیوانیات۔ ڈاکٹری۔ انجنیری کے اردو ترجمے فراہم کئے گئے جس سے ادبیات اردو میں ایک کثیر سرمایہ معلومات کا اضافہ ہوا ہے اور ہماری انشا کی حدود وسیع ہو گئیں۔ ہم پر حکومت کا یہ احسان ہے۔ تو ہمارا بھی کام ہے کہ اس کا ہاتھ بٹائیں اور اپنا حق ہم بھی ادا کریں۔

زبان اردو ہمارے اسلاف کی امانت ہے اس کی نگہداشت پرورش و بالیدگی ہماری گراں بہا ذمہ داری ہے۔

شعبہ نسواں کا افتتاح۔ میں توقع کرتی ہوں کہ دنیائے نسواں کا ایک امید پرور جالب توجہ مرکز رہے گا۔ اور آپ حضرات اس کو ایک مستقل کارکن انجمن بنانے میں۔ بدل و جان اپنی مساعی جمیلہ سے اس کی امداد فرمائیں گی اور ہمیشہ اپنے تعاون کا اسے مستحق گردانیں گی۔

میں ڈاکٹر زور صاحب کی توصیف و شکر گذاری کو فریضۂ انسانیت سمجھتی ہوں۔ کیونکہ آپ ہی کا حامیانہ التفات اور آپ ہی کی حوصلہ افزا توجہات شعبۂ نسواں کی تخلیق کا باعث ہیں۔ آپ نے خواتین میں ذوق عمل کی سرگرمی کی ایک لہر دوڑا دی ہے اور آپ ہی کے فکر و عمل نے ہمارے دماغوں میں علمی جد و جہد کی ایک روح پھونک دی ہے جس کے ہم اراکین شعبہ منت پذیر رہیں گے۔

(شعبۂ نسواں)

علم دوست خواتین کو دعوتِ عمل

محترمہ صدر صاحبہ اور میری عزیز بہنو!

میں نے آپ کی بیسیوں مرتبہ سمع خراشی کی ہے لیکن آج صرف عرضِ حال کرنا ہے۔ بقول لیڈی حیدری صاحبہ کے "ہم عورتوں کا خاصہ کہ کہتے بہت ہیں اور کرتے کم" لیکن ہم نے عہد کیا ہے کہ آئندہ سے ہم کریں گے بہت اور کہیں گے کم۔ آپ نے دیکھا ہوگا کہ جب کسی ادارہ یا انجمن کا قیام ہوتا ہے تقریریں تو بہت دھواں دھار اور بہت طویل طویل ہوتی ہیں لیکن انجام میں کام برائے نام نظر آتا ہے اسی لئے ہم نے پہلے کام کیا اور بعد میں شعبہ کا افتتاحِ عام۔ چنانچہ شعبہ نسواں کی پہلی تالیف "نذرِ دکن" آپ کی نظر سے گذر چکی ہوگی اور اس وقت بھی آپ کی خدمت میں پیش کرنے کے لئے موجود ہے۔

ادارۂ ادبیاتِ اردو گذشتہ آٹھ سال سے ڈاکٹر زور صاحب کے زیرِ نگرانی سرگرمِ عمل ہے۔ اور اپنی زندگی کی اس قلیل مدت میں بہت کچھ کر چکا ہے۔ چنانچہ اس نے حسبِ ذیل کتابیں شایع کی ہیں۔ یہ واضح ہو کہ ادارہ نے گذشتہ سات آٹھ سال کے قلیل عرصہ میں جو ۲۰ کتابیں شائع کی ہیں ان میں اکثر ایسی ہیں جن کے متعلق ہندوستان کے مستند اصحابِ علم و فضل اور جرائد و رسائل نے بہترین رائیں لکھی ہیں۔

۱۔ مرقعِ سخن جلد اول۔ ۲۔ مرقعِ سخن جلد دوم۔ ۳۔ ورڈسورتھ اور اس کی شاعری۔ ۴۔ ٹیگور اور ان کی شاعری۔ ۵۔ یوسف ہندی قیدِ فرنگ میں۔ ۶۔ نذرِ ولی۔ ۷۔ سراج سخن۔ ۸۔ فیضِ سخن۔ ۹۔ ایمانِ سخن۔ ۱۰۔ بادۂ سخن۔ ۱۱۔ کیفِ سخن۔ ۱۲۔ متاعِ سخن۔ ۱۳۔ مشاہیرِ قندھار دکن۔ ۱۴۔ ہوش کے ناخن۔ ۱۵۔ گریہ و تبسم۔ ۱۶۔ نقدِ سخن۔ ۱۷۔ امن کی دنیا۔ ۱۸۔ مدراس میں اردو۔ ۱۹۔ محرم نامہ۔ ۲۰۔ نذرِ دکن۔

ان کے علاوہ ۱۹۳۰ء سے ہر ماہ رسالہ سب رس اور اس کا ضمیمہ بچوں کا سب رس پابندی سے نکل رہے ہیں۔ اور اب تک جو نمبر شایع ہوئے وہ اپنی دیدہ زیبی اور عام دلچسپی کے لحاظ سے تمام ہندوستان میں مقبول ہوئے۔

ان مطبوعہ کتابوں کے علاوہ حسبِ ذیل کتب زیرِ طبع ہیں:۔

۱۔ روحِ غالب۔ مرزا غالب کی نثر پر تبصرہ اور انتخاب مرتبہ ڈاکٹر زور (۲) نذرِ اقبال علامہ اقبال کی حیات اور کارناموں پر تفصیلی نظر
۳۔ عاصمہ (ناول) ڈیوڑھیوں اور حرم سراؤں کی معاشرت کا مرقع مؤلفہ ابوظفر مویدالدین حسن صاحب۔
۴۔ تاریخ گولکنڈہ از مولوی عبدالمجید صاحب صدیقی ام اے ال ال بی۔ ۵۔ گنجِ سخن انتخاب کلام میر احمد علی عصر مرتبہ مولوی سید محمد صاحب ام اے
۶۔ کلیاتِ فہیم۔ کلام قاضی صدیق احمد صاحب فہیم مرتبہ زین العابدین صاحب ایچ سی ایس اول تعلقدار نظام آباد

ان زیرِ طبع کتابوں کے علاوہ حسبِ ذیل کتب کے مسودے مکمل ہو چکے ہیں:۔

۱۔ تاریخ ادبِ انگریزی از مولوی میر حسن صاحب ام اے۔ ۲۔ تاریخ ادبِ اردو از ڈاکٹر سید محی الدین قادری صاحب زور
۳۔ تاریخ ادبِ عربی از مولوی سید ابوالفضل صاحب ام اے۔ ۴۔ مرقعِ سخن جلد سوم مرتبہ ادارہ۔
۵۔ رمزِ سخن انتخاب کلام سدانند جوگی بہاری لال رمز (۶) فردوسِ سخن انتخاب کلام محمد بہبود علی صاحب صفی اورنگ آبادی
۷۔ اردو مرثیہ نگاری از میر سعادت علی صاحب رضوی ام اے۔ ۸۔ بالا حصار گولکنڈہ کی نظمیں از صاحبزادہ میر محمد علی خاں صاحب میکش۔
۹۔ کلامِ مزاج انتخاب کلام حکیم مظفر الدین خاں مزاج۔ ۱۰۔ مشاہیرِ گولکنڈہ از ڈاکٹر سید محی الدین قادری صاحب زور

وہ کتابیں جن کے سودے ابھی مکمل طور پر تیار نہیں ہوئے اور جو ادارے کی طرف سے لکھی جارہی ہیں حسب ذیل ہیں۔

(۱) منکرین اسلام از مولوی عبدالقادر صاحب صدیقی ام اے پروفیسر دینیات)
(۲) شمس الامرا کی اردو خدمات از نواب محمد ظہیر الدین خاں صاحب بی اے۔
(۳) تاریخ ادب ہندی از مولوی عبدالقادر صاحب سروری ام اے ال ال بی۔
(۴) ہمنیوں کا تمدن از مولوی عبدالمجید صاحب صدیقی ام اے ال ال بی۔
(۵) رسائل طیبہ منتخب مضامین طیبہ بیگم صاحبہ
(۶) حیدرآباد، بچوں کے لئے ایک دلچسپ معلومات کی کتاب از خواجہ حمید الدین صاحب شاہد
(۷) بچوں کی نظمیں از محترمہ لطیف النسا بیگم صاحبہ بی اے (۸) ہماری معاشرت از محترمہ لطیف النسا بیگم صاحبہ بی اے
(۹) دکن کی اردو نثر زیر ترتیب مولوی سید محمد صاحب ام اے۔
(۱۰) ترجمہ از مولوی فیض محمد صاحب بی اے ڈپ ایڈ
(۱۱) ترجمہ از مولوی عبدالقیوم صاحب باقی ام اے۔
(۱۲) ترجمہ THEORIES AND FORMS OF POLITICAL ORGANIZATION. از مولوی ظہیر الدین احمد صاحب ام اے ایچ سی ایس

یہ ہماری احسان فراموشی ہوگی اگر ہم ڈاکٹر زور صاحب کا شکریہ ادا نہ کریں جن کا ذوق علم و ادب شعبۂ نسواں کے وجود کا باعث ہوا ہے۔ اس شعبہ کے مقاصد سے آپ آگاہ ہو چکی ہیں۔ البتہ یہ بتلانا ہے کہ اس کا قیام صرف تمامتر علمی و ادبی اغراض کے تحت ہوا ہے ہمارے شعبہ کی داعی سکینہ بیگم صاحبہ ہیں اور ہم نے انھیں اپنا رہبر اس لئے بنایا ہے کہ ان کے سینہ میں دل ہے اور دل میں قوم کا درد اور ملک کی محبت وہ خاموش اور بے غرض کام کرنے والی ہیں انھیں نام و نمود اور ظاہر داری سے دور کا لگاؤ بھی نہیں وہ جو کچھ کرتی ہیں اپنے خلوص قومی اور درد نسوانی سے بے چین ہوکر۔ انھوں نے متمول طبقہ سے زیادہ غریب طبقہ کی خدمت کی ہے اور کر رہی ہیں جس پر ہمیں بجا طور پر فخر کرنا چاہیئے۔

دوسری محترم ہستی رابعہ بیگم صاحبہ کی ہے جن کی رہبری سے ہم ایک طرح کی قوت اور طمانیت محسوس کرتے ہیں بیگم موصوفہ بھی ایک پرخلوص دل رکھتی ہیں اور یہ شعبہ کی خوش قسمتی ہے کہ اسے ایسے مخلص اور صادق القول و عمل کارکن نصیب ہوئے۔

ہم محترمہ مسز ہمایوں مرزا صاحب کے بھی شکر گذار ہیں جنھوں نے ہماری درخواست پر اس اجلاس میں قدم رنجہ فرمایا ہے حالانکہ وہ ابھی تک سوگ میں ہیں اور آج ہی ہمایوں مرزا صاحب مرحوم کی وفات کے بعد گھر سے باہر قدم نکالا ہے۔

شعبہ کے زیر غور امور میں ایک امر زنانہ کتب خانہ یا دارالمطالعہ کا قیام ہے۔ افسوس ہے کہ ہمارے وسیع ملک میں باوجود علمی و ادبی ذوق و شوق ایک بھی زنانہ کتب خانہ نہیں اور اس کمی کا احساس ان خواتین ہی کو ہو سکتا ہے جنھیں علمی اور تنقیدی کام کرنے پڑے ہوں۔ چنانچہ یہ اتفاق ہے کہ ہمیں ام اے کے لئے مقالے لکھنے پڑے تو اگرچہ ذرا سا کام ہے لیکن پھر بھی ہمیں سخت مشکلات سے دوچار ہونا پڑا۔ سرکاری کتب خانوں نے ہمیں دور سے ہی دھتکار دیا کہ یہاں زنانہ کا انتظام نہیں۔ ذاتی مقدرت اتنی نہیں کہ صدہا کتابیں وقت واحد میں خرید لی جائیں چنانچہ گھر گھر پھرنا پڑا اور در بدر کی ٹھوکریں کھانی پڑیں کس کس کے آگے ہاتھ جوڑے اور کس کس طرح کتابیں بہم پہنچائیں وہ خدا ہی جانتا ہے۔

کتب خانہ کے قیام کے سلسلہ میں پہلی مبارک خاتون جنھوں نے دامے درمے قدمے سخنے مدد دینے کا وعدہ فرمایا ہے وہ بیگم ہمایوں مرزا صاحب کی ذات ستودہ صفات ہے آپ بھی قوم کی ایک مخلص اور قابل قدر ہستی ہیں۔ حقیقت یہ ہے کہ ایسی ہی ہستیاں ہیں جن کی قسم کی صداؤں اور قدم کی ٹھوکروں سے مرتی ہوئی قومیں جی جاتی ہیں۔

اب آخر میں ہماری آپ سے عرض بلکہ التجا ہے کہ آپ بھی ہمارے ساتھ تعاون کار کریں۔ ہمیں معلوم ہے کہ آپ میں ہم سے بہت زیادہ کام کرنے والی بیبیاں موجود ہیں جن میں صدہا جوہر قابل پوشیدہ ہیں لیکن انھیں اپنی قابلیت کو ظاہر کرنے کا موقع نہیں ملا یا زمانے نے ساتھ نہیں دیا لیکن اب وقت آگیا کہ ہم اپنے جواہر پاروں سے کام لیں اپنی قوتوں کو برسر کار لائیں اور دنیا کو دکھادیں کہ جنس لطیف بھی علمی اور ادبی ذوق میں جنس قوی سے کسی طرح کم نہیں۔ آئیے ہم اپنی پُرخلوص خدمت قومی سے شعبہ کو کارآمد بنائیں۔ یہ ہمارا ہم عورتوں کا شعبہ ہے اس میں ہم اور تم کی تخصیص نہیں۔ اس کے لئے ڈگری اور سند لازمی نہیں۔ ہر وہ بی بی جو اپنے ملک و قوم یا اپنی زبان و ادب کی کچھ نہ کچھ خدمت کرنا چاہتی ہیں آئیں۔ اور ہمارا ہاتھ بٹائیں۔ یہ مثل سچ ہے کہ:۔ ”گئے ہاتھ سب کا نوالہ جائے پھیں“

لیکن ایک دو سے کام نہیں ہو سکتا سب مل کر تعاون کار کریں تو ہم دکھادیں گے کہ حیدرآباد کی خواتین کیا کر سکتی ہیں جنھیں فرصت ہو وہ تصنیف و تالیف کے کام انجام دیں۔ عدیم الفرصت ہوں تو صرف مضامین عطا کریں۔ اگر یہ بھی نہ ہو سکے تو کم از کم اس شعبہ کی تالیفات و تصانیف کی مستقل خریدار ہی بن جائیں۔

آپ اچھی طرح سمجھ لیں کہ شعبہ نسواں کی ترقی اس بات کی بین دلیل ہوگی کہ خواتین حیدرآباد کو اپنے فرائض کا احساس ہے۔ اور اس کا تنزل ہماری بے حسی کا ناقابل انکار ثبوت اس لئے اپنے شعبہ کی حیات و موت اور عروج و زوال کی آپ خود ذمہ دار ہیں۔

لطیف النساء بیگم

غزل

پھینک دینے کی کوئی چیز نہیں علم و کمال
ورنہ حاسد تری خاطر سے میں یہ بھی کروں

(مولانا شبلی رحمتہ اللہ علیہ)

ثبت ہوں جادۂ ہستی پہ مرے نقش قدم
دل میں ارماں ہے کوئی بات میں ایسی کروں

سخت ناداں ہوں اگر چھوڑ کے لطف باقی
دل کو میں شیفتۂ لذت فانی کروں

رہے ناسازیٔ عالم کی نہ اصلا پروا
کیا مزا ہو جو فقط ”ایک“ کو راضی کروں

”اس کی“ کہلا کے اگر دوں غیر سے عرض مطلب
غیرت آتی ہے بہت ورنہ میں یہ بھی کروں

بے غمی کیوں نہ ہو اصلاح مفاسد سے جب
نسخۂ تجربۂ شافی و کافی کروں

رنج ناکامیٔ پیہم کو مٹا کر دل سے
قصۂ حال کو افسانۂ ماضی کروں

ملک الموت مجھے تھوڑی سی مہلت دیدے
اپنے معبود کو اس وقت تو راضی کروں

مرتے دم لب پہ ہو توحید و رسالت کا سبق
عمر رفتہ کی اسی طرح تلافی کروں

حب احمد کا مجھے آج عنایت ہو صلہ
دل مایوس کی میں جس سے تسلی کروں

جوہر طبع کا جلوہ نہیں وہ شے ہرگز
لاکھ پردوں میں چھپا کر جسے مخفی کروں

انیسہ ہارون بیگم شیروانیہ

ٰ یعنی کلمہ طیبہ:۔ لا الٰہ الا اللہ محمد الرسول اللہ۔

(رشیدہ نسواں)

اظہار ممنونیت

آج کے جلسہ کا سب سے لطیف اور خوش گوار فریضہ یعنی اظہار ممنونیت کا شرف مجھے بخشا گیا ہے۔

شکریہ کے دو بول بول لینا کوئی اہم کام نہیں لیکن محض رسماً و لفظاً شکریہ ادا کر دینا میں سمع خراشی و تضیع اوقات بھی ہوں اس اصل ممنونیت تو وہ ہے جس کو دل محسوس کرے اور دل کا احساس قید اظہار سے بری ہے۔ لیکن اظہار ممنونیت بھی ایک فرض انسانی ہے اس لیے لازم ہے کہ شکریہ ادا کیا جائے۔

وہ جذبات تشکر جو اس وقت اراکین شعبہ کے دلوں میں موج زن ہیں کسی انشا پرداز کے قلم کی روانی اور کسی مقرر کی زبان کی فصاحت کے محتاج تھے۔ وہی صحیح طور پر ان کی ترجمانی کر سکتے۔ نہ کہ میں جسے نہ تو لکھنے سے کام نہ بولنے سے واسطہ۔ یہ کام کوئی رابعہ بیگم یا لطیف النسا بیگم جیسی معجز بیان خواتین کے حوالے ہوتا تو "پھر دیکھتے انداز گل افشانی گفتار"! لیکن چونکہ قرعۂ فال بنام من دیوانہ زدند مجبوراً جس طرح بھی ہو سکے اپنے ٹوٹے پھوٹے الفاظ میں مگر بخلوص دل ان جذبات شکر گذاری کو آپ کی خدمت میں پیش کرنے کی جرأت کرتی ہوں جن سے ہمارا دل آج لبریز ہیں اور جن کا ایک عشر عشیر بھی اگر آپ تک پہنچا سکوں تو اپنے آپ کو قابل مبارک باد تصور کروں گی۔

سب سے پہلے ہم آج اپنے آقائے ولی نعمت سلطان العلوم حضرت اقدس و اعلیٰ خلد اللہ ملکہ کی بے شمار عنایتوں ان کی علم دوستی و علم نوازی اور ہماری صنف پر ان کے ان گنت احسانات کا اعتراف کرتے ہوئے نہایت ادب و احترام کے ساتھ سپاس گزار ہیں کہ آج ان کی بدولت حیدرآباد کی خواتین بھی علم و ادب کے میدان میں مردوں کے دوش بدوش نظر آ رہی ہیں۔

اس کے بعد ہم صدر جلسہ لیڈی حیدری صاحبہ کی خدمت میں ہدیۂ شکرانہ پیش کرتے ہیں کہ انھوں نے باوجود اپنی مختلف النوع مصروفیتوں کے ہمارے اجلاس کی صدارت قبول کر کے ہم کو ممنونیت کا موقع دیا۔ موصوفہ کو علمی مشاغل سے جتنی دلچسپی و وابستگی ہے وہ محتاج بیان نہیں۔ ان کے ہاتھوں اس جلسہ کا افتتاح ہمارے حق میں شگون نیک ہے۔ ان کی رہبری میں ہم کو یقینی ان اعلیٰ مقاصد کے حصول میں مدد ملے گی جس کی تمنا ہر ترقی یافتہ قوم میں ہونا چاہیے۔

ساتھ ہی بیگم صاحبہ نواب مہدی یار جنگ بہادر کے ہم بہ دل مشکور ہیں کہ انھوں نے اپنی شرکت سے جلسہ کو رونق اور کرسی صدارت کو زینت بخشی۔ نواب صاحب کو بحیثیت ادارہ کے صدر ہونے کے جو دلچسپی ہے وہ ظاہر ہے۔ ہمیں امید ہے کہ بیگم صاحبہ موصوفہ خود بھی آج سے اس شعبہ میں دلچسپی اور عملی حصہ لے کر ہر منزل پر ہماری رہنمائی فرماتی رہیں گی۔

بیگم صاحبہ نواب ولی الدولہ بہادر گو اس وقت موجود نہیں لیکن ان کے نیک خیالات ضرور اس وقت ہمارے شریک حال ہیں۔ ہمارے معاملات میں ان کی دلچسپی خود اس بات کی ضامن ہے۔ افسوس کہ باوجود ان کی عین خواہش کے کچھ ایسے وجوہات مانع ہوئے کہ ہمارے اجلاس میں وہ حصہ نہ لے سکیں۔ ہم ان کی خدمت میں ان کی عدم موجودگی پر اظہار تاسف کرتے ہوئے ان کی موجودہ مہربانی و دلچسپی کا شکریہ اور آئندہ عملی حصہ لینے کی درخواست کرتے ہیں۔

ان تمام خواتین کا جنھوں نے اپنے اشتراک عمل اور تعاون سے جلسہ کو کامیاب بنانے میں مدد دی ہے۔ ہم خلوص دل سے شکریہ ادا کرتے ہیں۔ اس زمرہ میں خصوصیت سے ہم مس پوپ صاحبہ کے مشکور ہیں کہ انھوں نے انتظامات میں ہماری ہر طرح امداد فرمائی۔

حاضرین کی خدمت میں جن کی موجودگی خود ان کے جذبۂ تعاون کی بین دلیل ہے ہم اپنی مخلصانہ ممنونیت کا اظہار بصدق دل پیش کرتے ہیں. ان کی موجودگی سے آج بزم کی رونق دوبالا ہوگئی۔ آپ سب سے اب ہماری یہ درخواست ہے کہ جس عمارت کا سنگ بنیاد آج اس جذبۂ خلوص سے رکھا گیا ہے۔ اس کی تعمیر میں ہر وقت ہاتھ بٹاتی اور امداد کرتی رہیں۔ کوئی وقت اس کی ترقی کے سد راہ نہ ہونے دیں۔

لیڈی حیدری صاحبہ نے خطبہ صدارت میں ٹھیک فرمایا کہ " ابتدا تو شاندار ضرور ہوتی ہے لیکن سعی و عمل کی کمی اور زمانہ کی سرد مہری انہیں پست ہمت و سست کار بنا دیتی ہے۔"

آیئے ہم اپنی انتہا کو بھی شاندار بنانے کی کوشش کریں۔ زمانے کو دکھا دیں کہ ہم کبھی ہمت نہ ہاریں گے اور جس کام کا بیڑا اٹھایا ہے اُسے کرکے دکھا دیں گے ہمت کا حامی خدا ہے۔ بقول شاعر

بہ ہر کاری کہ ہمت بستہ گردد
اگر خاری بود گلدستہ گردد

سکینہ بیگم

عرض حال

خوشا قسمت نوید جاں فزا باد صبا لائی
گلستان ادب میں اور اک تازہ بہار آئی

تعالی اللہ کیا اعجاز دور شاہ عثماں ہے
کہ اس عہد مبارک میں ہر اک گھر اک دبستاں ہے

مبارک اے دکن! اہل دکن برکات عثمانی
مبارک ہو خواتین دکن معراج نسوانی

خدا کا شکر ہے قائم ہوا ہے شعبۂ نسواں
وہ جس کا مدتوں سے منتظر تھا طبقۂ نسواں

فریضہ اپنا اب یہ ہے کہ دیں ایسا فروغ اس کو
حیات جاوداں پا جائے دنیا مان لے جس کو

بہر صورت سدا جاری رکھیں کوشش ترقی کی
اب اپنے ہاتھ میں ہے لاج اس کی اور اپنی بھی

یہ بزم نو ہو ثابت کار آمد کامراں ہو کر
پھلے پھولے یہ شاخ گل جہاں میں گلستاں ہو کر

مرادیں بانی شعبہ کی یا رب ساری آئیں
خواتین دکن بام ترقی پر نظر آئیں

اگرچہ عام ہیں تعلیم کے چرچے زمانے میں
تاسف ہے مجھے لیکن حقیقت کے سنانے میں

بہت پیچھے ہیں اب تک ہم گزشتہ کارناموں سے
ہے لغزش ہر قدم پر اور شکایت آسمانوں سے

مہیا ہیں اگرچہ ملک میں سامان ترقی کے
ترقی ہوگی جب حاصل کہ ہوں خواہاں ترقی کے

ہماری فطرتوں میں ہیں ابھی کمزوریاں باقی
کہ اب تک ہم میں دانستہ بھی ہیں نادانیاں باقی

نحیف و زار فطرت ہے طبیعت لا اُبالی ہے
ہماری اپنی دنیا بس خیالی ہی خیالی ہے

اگر یہ کیف رکھتی ہیں فضائیں گلستانوں کی
تو ہے ذوق نظر کی یا شکایت باغبانوں کی

کبھی تقدیر کے شکوے کبھی قسمت پہ روتے ہیں
ہم اپنے وقت کی دولت کو بس اس طرح کھوتے ہیں

مبارک ہے وجود ان کا جو خطروں سے گزرتے ہیں
تذبذب میں جو رہتے ہیں سدا ناکام رہتے ہیں

حقیقت میں وہی انساں ہیں جو کچھ کام کرتے ہیں
سراپا دیکھے اپنی سرزمیں کا نام کرتے ہیں

یوں ہی گر بے عمل بیٹھے رہیں ہم آشیانوں میں
ہماری داستاں تک بھی نہ ہوگی داستانوں میں

بشیر النساء بیگم بشیر

تاثراتِ سفرِ یورپ (تیسری قسط)

برنڈزی سے استنبول تک

(۱۹ر جون ۱۹۳۸ء تا ۲۲ر جون ۱۹۳۸ء)

ہمارا جہاز اچھا بڑا تھا، اطالوی کمپنی کا تھا اور "پالستینا" (فلسطینیہ) نام تھا۔ حال کے زمانے میں جب سے اٹلی نے بحیرۂ روم کو اطالوی جھیل بنانے کا منصوبہ گانٹھا ہے، اس نے چاروں طرف اپنے جہازوں کا جال بچھا دیا ہے، چنانچہ اب اٹلی سے ایتھنز، استنبول، شام، فلسطین، مصر، تونس، فرانس، مراکو اور امریکہ تک اطالوی جہاز جاتے ہیں۔ اطالوی ساحل چھوڑنے سے پہلے وہ فارم جو کہ لے لیا گیا تھا، ہمارے روپے کے متعلق بھرا تھا وہ ہم سے واپس لے لیا گیا۔ برنڈزی سے استنبول تک کا راستہ نہایت دلچسپ ہے، اور جن مقامات کا ذکر پڑھتے عمر گزر گئی وہ سامنے آجاتے ہیں۔ تقریباً تین گھنٹے تک تو جہاز اطالوی ساحل کے اتنے قریب ہو کر چلا کہ مشکل سے میل ڈیڑھ میل کا فصل ہوگا۔ اطالوی ساحل چھوڑتے ہی البانیہ کا ساحل نظر آنے لگا اور تقریباً چار بجے سے رات کے آٹھ بجے تک اس واحد خالص یوروپی اسلامی سلطنت کا کنارہ نظر آتا رہا جس پر اس وقت اٹلی کی نگاہ حرص و آز بڑھ رہی ہے۔ ہم البانی بندرگاہ والونا کے بالکل قریب ہو کر گذرے لیکن چونکہ شہر جزیرہ نمائے لنگوئیتا کے پیچھے چھپا ہوا ہے اس لئے یہ نظر نہیں آیا۔ رات کے نو بجے ہم یونانی جزیرہ کورکیرا (کورفو) کے قریب ہو کر گذرے جہاں کسی زمانے میں ولیم دوم قیصر جرمنی اپنی بہن ملکۂ یونان کے پاس اپنی چھٹیاں بسر کیا کرتا تھا۔

جہاز میں اکثر یونانی اور نیم یونانی بھرے ہوئے ہیں جن کے چہرے بشرے سے بربریت اور وحشت نمایاں ہے۔ ۲۰ر کو ہم اس تنگ خلیج میں داخل ہوئے جو جزیرہ نمائے پیلو پونیز (موریہ) اور تھسلی کو ایک دوسرے سے جدا کرتی ہے۔ ہمارے بائیں طرف مشہور آفاق شہر لپانتو اور مسولونگی تھے، جو ترکوں اور عیسائیوں کی خوں فشاں تاریخ میں نہایت اہم ہیں۔ لپانتو تو وہ مقام ہے جہاں ۷ر اکتوبر ۱۵۷۱ء کو ڈون جان شاہزادہ آسٹریا نے ترکی امیر البحر عروج موذن زادہ کو شکست دی تھی اور یہ پہلی شکست تھی جو ترکوں کو عیسائیوں کے ہاتھوں ہوئی تھی، مسولونگی وہ مقام ہے جہاں بیٹھ کر بائرن نے جنگ آزادی یونان میں یونانیوں کو مسلمانوں کے خلاف بھڑکایا تھا اور جہاں اس کا ۱۹ر اپریل ۱۸۲۴ء کو انتقال ہو گیا۔ ساڑھے نو بجے کے قریب شمال کی طرف برف پوش کوہ پارناسوس نظر آیا جسے قدیم بت پرست یونانی اپولو دیوتا اور میوز دیبیوں کی آماجگاہ سمجھتے تھے۔ ان مقامات سے قدیم و جدید یونان کی تاریخ کی یاد تازہ ہو جاتی ہے اور اندازہ ہوتا ہے کہ کلمہ گویان اسلام نے کہاں کہاں جا کر اپنا جھنڈا گاڑھا تھا اور یونانی قوم کی بربریت کی داستان پہاڑوں کی ان ناہموار چوٹیوں سے ظاہر ہوتی ہے جو صبح سے برابر ہمارے جہاز کو گھیرے ہوئے تھیں۔

دوپہر کے وقت کورنتھ نظر آیا اور ایک بجے جہاز نہر کورنتھ کے مقابل کھڑا ہو گیا جو بحیرۂ ترعینیہ اور بحیرۂ ایجئن کو جدا کرنے والی خاکنائے کورنتھ کو کاٹ کر نکالی گئی ہے تاکہ جہاز جزیرہ نمائے موریہ کا دور کرنے سے بچ جائیں۔ یہ نہر نہایت ہی تنگ ہے اور بس اتنی ہی چوڑی ہے کہ صرف ایک ہی جہاز اس میں ہو کر نکل سکتا ہے، بلکہ ایک جہاز میں بھی دونوں طرف لکڑی کے موٹے موٹے پٹڑے باندھ دیے جاتے ہیں تاکہ اگر جہاز کی کنارے سے ٹکر ہو تو یہ پٹڑے جپ کا کام دیں۔ ہمارا جہاز نہر کے دہانے پر اس لئے تقریباً ایک گھنٹہ کھڑا رہا کہ ادھر سے ایک

دوسرا جہاز آ رہا تھا۔ نہر زیادہ سے زیادہ دو تین میل طویل ہے۔ لیکن جہاز اس قدر آہستہ آہستہ جاتا ہے کہ گذرنے میں ڈیڑھ پونے دو گھنٹے لگ جاتے ہیں۔ پانچ بجے کے قریب ہم تاریخی اعتبار سے دو نہایت ممتاز جزیروں یعنی ای گینا (AEGINA) اور سالامس (SALAMUS) کے درمیان ہوکر گذرے۔ یہ وہی سالامس ہے جہاں ۴۸۰ قبل مسیح میں ایرانیوں کو پہلی مرتبہ یونانیوں کے ہاتھوں شکست ہوئی تھی اور ای گینا وہ جزیرہ ہے جو کسی زمانے میں خود ایتھنز کے ہم پلہ سمجھا جاتا تھا۔ سالامس ایتھنز سے اس قدر قریب ہے کہ اسے لئے بغیر کوئی مملکت ایتھنز پر قبضہ قائم نہیں رکھ سکتی اور ۴۸۰ ق م میں گو شہنشاہ ایران خاص ایتھنز پر قابض ہوچکا تھا لیکن سالامس کی شکست کے بعد اسے واپس لوٹ جانا اور اگلے سال یونان کو خیرباد کہنا پڑا۔

شام کے سات بجے ہمارا جہاز "مدینۃ الحکماء" ایتھنز کے بندرگاہ پرائیوس پر لنگر انداز ہوا۔ جہاز میں پہلے سے یہ اطلاع آویزاں کی گئی تھی کہ جہاز والوں کی طرف سے ایک اکسکرشن ایتھنز جائے گا۔ لیکن جہاز دو گھنٹہ دیر کرکے پہونچا اور مجبوراً اکسکرشن کا خیال چھوڑ دیا گیا چونکہ نہ معلوم کبھی پھر اس تاریخی شہر کو آنا ہو یا نہ ہو اس لئے میں تنہا پاسپورٹ لے کر کنارے گیا۔ وہاں گائڈ موجود تھے ان میں سے ایک کو ساتھ لے کر (۳۵۰) درہم (ایک انگریزی پونڈ ۵۵۰ یونانی درہم کے برابر ہوتا ہے) کو گاڑی (مع اجرت رہنما) ایتھنز کے لئے کی ایتھنز بندرگاہ سے پندرہ میل کے قریب ہے، اور راستے بھر میں نفیس مکانات، چوڑی سڑکیں ملیں۔ خود شہر رات کو بہت بارونق اور بھلا معلوم ہوتا ہے۔ افسوس ہے کہ دیر ہوجانے کی وجہ سے میں یہاں کی عمارتیں اچھی طرح نہ دیکھ سکا بلکہ محض سرسری طور پر جوپیٹر کا مندر، قدیم تھیٹر، شہنشاہ ہیڈرین کا دروازہ دیکھا۔ اس کے علاوہ پارلیمنٹ کا ایوان، شاہی محل، جامعہ یہ سب بھی باہر سے دیکھے۔ رہنما سے دریافت پر معلوم ہوا کہ ایتھنز میں اب نہ کوئی مسلمان ہے نہ مسجد بلکہ تمام یونان سے (جس میں سو برس پہلے لاکھوں مسلمان تھے) اب مسلمان ناپید ہیں۔ (PANTHEON)

ایتھنز میں خاص طور پر بہت سی عمارتوں پر چراغاں ہو رہا تھا۔ معلوم ہوا کہ استنبول کے ترکی گورنر سرکاری طور پر یہاں آئے ہوئے ہیں ان کے اعزاز میں یہ چراغاں ہے۔ خدا کی قدرت ہے کہ چند سال پہلے والا یورپ کا "مرد بیمار" اس قابل ہوگیا کہ اس کا ایک نسبتہ معمولی عہدہ دار ایتھنز آئے اور اس کے اعزاز میں چراغاں کئے جائیں۔

رات کے ٹھیک بارہ بجے جہاز نے لنگر اٹھایا اور استنبول کی طرف روانہ ہوگیا۔ صبح ہی ہم جزیرہ اندروس اور جزیرہ لوبیہ (نیگروپونت) کے درمیان میں ہوکر گذرا۔ لوبیہ وہ جزیرہ ہے جسے زرکسیز شہنشاہ ایران نے یونان پر چڑھائی کرتے وقت مستقر بنایا تھا آبنائے میں سے نکلتے ہی کھلا بحیرۂ ایجین آجاتا ہے، چنانچہ شام کے ساڑھے تین بجے تک کسی طرف خشکی کا پتہ نہیں ملا۔ ساڑھے تین بجے ایشیائی ساحل نظر آنا شروع ہوا اور آدھ گھنٹے میں ہم ترکی جزیرہ تینے دوس اور ایشیائے کوچک کے درمیان ہوکر گذرے اور ۶ بجے درۂ دانیال میں داخل ہوئے۔ اب ہمارے جہاز پر پیچھے کی طرف اطالوی اور سامنے کی طرف ہلال و تارہ کا ترکی علم اڑ رہا تھا، اور گویا اس طرح ترکی حکومت کو سلامی دے رہا تھا۔ درۂ دانیال میں داخل ہونے کے وقت میرے سامنے وہ تمام نظارے آگئے جو پچھلی جنگ عظیم میں اس خطے پر رونما ہوئے تھے۔ یہ وہ جگہ ہے جہاں اتحادی افواج نے لاکھ سر مارے لیکن وہ اس ذراسی جگہ میں ہوکر نہ گذر سکے اور مریض اپنے جان ترکوں نے اس آبنائے میں فرانسیسی اور انگریزی جہاز ڈبو دیے۔ سب سے پہلے جو چیز نظر آتی ہے وہ یورپی ساحل پر انگریزوں اور فرانسیسیوں کے

قبرستان ہیں جن میں وہ ہزاروں یوروپی دبے پڑے ہیں جنھوں نے ادھر کی طرف سے آستانہ کو فتح کرنے کا ارادہ کیا تھا۔ رات کے ۲ بجے جہاز اور سدالبحر کے قلعے نظر آئے۔ اس کے بعد آبادی ہی آبادی تھی اور جہاز کے دونوں طرف یعنی ایشیا اور یوروپ کے کناروں پر اندھیری رات میں بے شمار برقی قمقمے جگمگاتے ہوئے عجیب بہار دے رہے تھے۔ دفعتہً جہاز کی رفتار دھیمی ہوگئی اور چار افسر نہایت عمدہ چست وردی زیب تن کئے ہوئے ایک ہلال تارے والی کشتی میں سے اتر کر جہاز پر سوار ہوگئے بظاہر معلوم ہوتا تھا کہ یہ کوئی بڑے ترکی فوجی افسر ہوں گے لیکن دریافت سے پتہ چلا کہ یہ محض پولیس کے عہدہ دار ہیں اور مسافروں کے پاسپورٹوں کی تنقیح کرنے آئے ہیں۔

دوسرے دن ۲۲ رجون کو صبح کے وقت چاروں طرف بحیرہ مارمورا تھا، زمین کہیں نظر نہ آتی تھی کہ بس چشم زدن میں باسفورس اور استنبول کا عجیب و غریب اور لاثانی منظر آموجود ہوا۔

ہارون خاں شروانی

تنہائی

تم پوچھتی ہو........ تنہائی سے تمھیں اس قدر کیوں اُنس ہے؟ .... کیا تم نے کبھی سوچا بھی ہے یا یوں ہی پوچھ بیٹھیں؟ اپنی تنہائی کی دنیا کا نقشہ کھینچتی ہوں کیا پھر بھی میری تنہائی پر تمھیں اعتراض ہوگا۔

تمھارے ہنگامہ پرور شہر سے پانچ چھ میل دور ایک جھونپڑی ہے جس کے اطراف نہایت ہی خوبصورت ایک خودرو باغ ہے رنگ برنگ کے بے ترتیب پھول قدرت کی عریانی کا ایسا دلکش نظارہ پیش کر رہے ہیں کہ جی چاہتا ہے انہیں کو دیکھتے زندہ رہوں انہیں کو دیکھتے مر جاؤں....

.... روح پرور سویرا........ پرکیف شام.... جب سورج غروب ہوتا ہے شعاعیں آسمان پر پھیل جاتی ہیں تو ایسا معلوم ہوتا ہے کہ افق مغرب میں آگ لگ گئی ہے۔ شام کی یہ دلفریبی کس قدر رومان انگیز ہے۔ تم ہی بتاؤ؟ کون اس میں گم ہو جانا نہ چاہے گا..........

کاش! تمھاری دنیا میں بھی ایسی ہی رنگینیاں میسر آتیں اور کیف و سرور کی ایسی ہی چند گھڑیاں مل جاتیں........ تو کون اس سے بھاگا پھرتا؟

میں ایسی دنیا میں ہوں جہاں میری روح شعریت کے عمیق سمندر میں غرق رہتی ہے۔ میری دنیا زمانے کی تلخیوں، سرد مہریوں اور آزمائشوں سے پاک ہے جہاں نہ تمھاری دنیا کا سا ہنگامہ ہے اور نہ دن رات کی گردش یہاں ہر لمحہ ایک نیا لطف و سرور ہے........ مجھے تم ایسی دنیا میں بلانے کی کیوں خواہش کر رہی ہو جہاں کے دوست دشمن سے زیادہ قاتل........ جہاں کا امن جنگ سے زیادہ خونیں اور جہاں کے بسنے والے ماضی کی یاد اور مستقبل کے تصور سے حال کو مکدر بنا دیتے ہیں........ میری دنیا کا ہر منظر جنت نظیر، قدرت کے اعلیٰ ترین مظاہر یہاں بے نقاب ہیں اور دل درد کے احساس سے معمور ہو جاتا ہے۔ میری دنیا عقل کی نہیں جذبات کی دنیا ہے جہاں کی فنادگی میں بھی ایک خاص لذت

طاہرہ سلطانہ

(زنانہ ہائی اسکول نام پلی)

سانحاتِ کربلا

آہ کیا حسرت فزا ہیں سانحاتِ کربلا — کس قدر صبر آزما ہیں واقعاتِ کربلا

اے شہیدِ کربلا، اے جانِ بنتِ مصطفےٰ — اے امامِ تشنہ لب، اے نورِ چشمِ مرتضیٰ

مدتیں گذریں مگر تازہ، ترا افسانہ ہے — جو کبھی خالی نہیں ہوتا یہ وہ پیمانہ ہے

دل تری امت کا تیرے درد سے خالی نہیں — جب تلک دنیا ہے تجھ کو بھولنے والی نہیں

آج تازہ تیرے سوزِ غم سے داغِ سینہ ہے — پھر چھلکتی ساغرِ نو میں مئے دیرینہ ہے

آہ مظلومی پہ تیری اشکِ خوں روتے ہیں ہم
تو سراپا صبر تھا اور صبر کو کھوتے ہیں، ہم

جس کے جھولے کو جھلاتے تھے کبھی روح الامیں — اپنے سینے پر سلاتے تھے جسے سردارِ دیں ؐ

مسکرا دیتا اگر آغوشِ زہراؑ میں کبھی — حوریں آتی تھیں بلائیں لینے کو فردوس کی

جو ہوا تھا فاطمہ کے شیر سے پل کر جواں — دست و بازو سے تھی جسکے حیدری سطوت عیاں

جس کی نسبت یہہ سنا ہے فخرِ موجوداتؐ سے — روشنی ہے فاطمہ کے گھر میں اسکی ذات سے

جس کا دروازہ کھلا رہتا غریبوں کے لئے — وقف جس کا مال و زر رہتا یتیموں کے لئے

کیا خبر تھی جان پر اس کے یہہ آفت آئیگی
ظلم پر آمادہ اپنی قوم ہی ہو جائے گی

آہ تجھ کو ظالموں نے بے سبب دھوکا دیا — نامے لکھ لکھ کر بلایا اور غلط وعدہ کیا

کون ہے ہمسر ترا اے مصدرِ صبر و رضا — گھر لٹا، کنبہ لٹا تو نے نہ کچھ شکوہ کیا

حلق پر لختِ جگر کے تیر چلتا دیکھ کر — کلمۂ حق تھا زباں پر آسماں پر تھی نظر

قلب گو مضطر ہے سبطِ احمدِ مختار کا — اذن ہوتا ہے مگر فرزند کو پیکار کا

ریت کا وہ گرم میداں، اور وہ نازک قدم — جن کے چلنے کے لئے مخصوص تھا صحنِ حرم

دوپہر کی دھوپ اور پھر وہ تمازت الاماں — اور اس پر پیاس کی شدت کہ سوکھی تھی زباں

بچہ بچہ کافروں کا شاد تھا سیراب تھا — فاطمہ کا لال پانی کے لئے بے تاب تھا

تھا صف آرا چار سو لشکر ادھر کفار کا
اور ادھر تنہا پسر تھا حیدرِ کرار کا

شاہ نے تلوار کھینچی تو قیامت آ گئی — تیغ کھنچتے ہی جلو میں فتح و نصرت آ گئی
ہو رہے تھے تیغ حضرت سے ہزاروں سر قلم — سامنے آنے کو تھراتے تھے اعدا کے قدم
برق آسا جب چمکتی تھی وہ سیفِ آبدار — سیکڑوں زخمی ہزاروں ختم ہوتے نابکار
پڑ گئی لشکر میں بھاگڑ چھپتے پھرتے تھے لعیں — مسکرا دیتے تھے ان کے بھاگنے پر شاہِ دیں
درمیانِ جنگ دیکھا جب کہ ہے وقتِ نماز — پھینک کر شمشیر قبلہ رو ہوا ماہِ حجاز
محوِ طاعت دیکھ کر کفار چلانے لگے — پا کے موقع ہر طرف سے تیر برسانے لگے
خوں آلودہ زمیں پر جھک گیا سجدے میں سر — شمر نے تلوار رکھ دی گردنِ شبیر پر

اک اندھیرا چھا گیا تھرا گیا عرشِ بریں
جب ہوا فرشِ زمیں پر غرقِ خوں وہ نازنیں

الوداع اے تاجدارِ دین و ملت الوداع — اے گلِ صد رنگِ گلزارِ رسالت الوداع
دے کے سر تو نے بچا لی آبرو ایمان کی — ملتِ بیضا پہ اپنی جان تک قربان کی
موت ہو یا زندگی ہو سب یدِ قدرت میں ہے — ناشکیبائی مگر انسان کی فطرت میں ہے
چشمِ تر جس کی نہ ہو اسلام سے بیگانہ ہے — جو ترے غم سے ہو خالی دل نہیں ویرانہ ہے

اے بشیر عبرت فزا ہے داستانِ کربلا
شق ہوا جاتا ہے دل سن کر بیانِ کربلا

یہ نہیں وہ غم کہ اک ہنگامۂ بے جوش ہو — لب پہ تیرا نام ہو اور زندگی خاموش ہو
چاہنے والے ترے بے صبر یوں ہوتے نہیں — جان سے جاتے ہیں لیکن پھوٹ کر روتے نہیں
عہدِ ماضی پر نظر کر اے مسلماں غور سے — جان دی ہے حامیانِ دیں نے کس کس طور سے
درس جانبازی کا ہے یہ مسلمِ خوابیدہ کو — کارناموں کو سلف کے دیکھ اور بیدار ہو

"تازہ خواہی داشتن گر داغہائے سینہ را
گاہے گاہے باز خواں ایں دفترِ پارینہ را"

بشیر النساء بیگم بشیر

عبداللہ قطب شاہ اور محرم

یوں تو کم و بیش تمام قطب شاہی فرماں رواؤں میں مذہبی پابندی ان کی سیرت کی ایک نمایاں خصوصیت کے طور پر نظر آتی ہے۔ لیکن عبداللہ قطب شاہ جو شہر حیدر آباد کے اولوالعزم آباد کار سلطان محمد قلی قطب شاہ کا نواسا اور مکہ مسجد کے نیک نہاد بانی کا چہیتا بیٹا تھا، بہت زیادہ پابند مذہب اور شعار اسلامی کا شیدائی تھا اس خاندان کا پہلا فرماں روا جو اپنے ایک ناخلف بیٹے کے ہاتھ شہید ہوا۔ مسجد میں عین حالت نماز میں فوت ہوا تھا۔ گولکنڈہ اور حیدر آباد میں قدیم اور عالی شان مسجدوں کی کثرت بھی ان بادشاہوں کی مذہبیت کا ایک پائندہ ثبوت ہے جو باوجود زمانے کی دست برد اور مصلیوں کی بے پروائی کے آج بھی اپنے بنانے والوں کی خدا ترسی کی یاد دلاتی ہے۔

سلطان عبداللہ قطب شاہ کی ابتدائی تربیت بھی اس کے نامور باپ سلطان محمد قطب شاہ کی خاص توجہ سے میر قطب الدین نعمت اللہ، مرزا اشرف شہرستانی اور منشی الممالک خواجہ مظفر علی جیسے لوگوں کے ہاتھوں میں ہوئی جو نہ صرف فضیلت علمی اور اعزاز خاندانی کے مفتخر تھے بلکہ اپنی پاکیزہ سیرت اور شرافت نفس کے لحاظ سے بھی منتخب روزگار تھے۔ علاوہ ازیں وہ اپنی شہزادگی اور بادشاہی کے زمانے میں ایک عرصہ دراز تک اپنی نیک دل والدہ حیات بخشی بیگم کے زیر اثر رہا۔ یہ خاتون صوم و صلوٰۃ کی پابند تھی اور سادہ مذہبی زندگی کو بہت پسند کرتی تھی۔ وہ ہمیشہ علما، فقرا و مشائخین کی خدمت کیا کرتی تھی۔

سلطان عبداللہ قطب شاہ نے تخت نشین ہونے کے بعد بہت سے مذہبی مراسم اور اسلامی تقاریب جو قدیم سے چلی آتی تھیں ان کو نہ صرف برقرار رکھا۔ بلکہ اس کی توجہ سے یہ پہلے سے زیادہ اہتمام کے ساتھ کی جانے لگیں۔ میلاد النبی صلعم کا جشن جو سلطان محمد قطب شاہ کے زمانے میں موقوف ہو گیا تھا۔ سلطان عبداللہ کے حسن توجہ سے پہلے سے زیادہ اہتمام اور انتظام سے منعقد ہونے لگا۔

حیدر آباد کا محرم اپنی بہت سی خصوصیات کے لحاظ سے آج بھی ممتاز ہے۔ اور موجودہ مراسم عزاداری وغیرہ اکثر قطب شاہی زمانے کی یادگار ہیں۔ سلطان محمد قلی قطب شاہ کے عہد سے یہ دستور چلا آتا تھا کہ جیسے ہی محرم کا چاند آسمان پر نمودار ہوا حیدر آباد میں شہدائے کربلا علیہم السلام کے مراسم عزاداری شروع ہو گئے۔ عیش و عشرت کی محفلیں موقوف اور ماتم حسینؑ کی مجالس شروع ہو جاتی تھیں۔ شاہی نقار خانہ میں بلکہ تمام امرا و وزرا کی ڈیوڑھیوں پر جو نوبت نقارے بجا کرتے تھے۔ موقوف کر دیئے جاتے تھے۔ گانا بجانا یک لخت بند ہو جاتا تھا۔ سارے شہر میں سیندھی، شراب اور بھنگ وغیرہ تمام نشہ آور چیزوں کی خرید و فروخت یک قلم موقوف ہو جاتی تھی۔ شاہی باورچی خانے میں گوشت کا استعمال چھوڑ دیا جاتا تھا۔ عام طور پر رعایا بھی ان دنوں گوشت نہیں کھاتی تھی۔ تنبولی اپنی دکانیں برخاست کر دیتے تھے۔ خاص و عام سب پان کھانا چھوڑ دیتے تھے کیونکہ بعض لوگ اس کے سخت عادی ہوتے تھے اس لیے ان کی خاطر ایک خشک مرکب نکالا گیا جو "نان ریزہ" یا "سکھ مکھ" کہلاتا تھا۔ اکثر مجالس عزا میں اس کو تقسیم کرتے تھے آج بھی حیدر آباد میں اس کا رواج ہے حماموں میں حجام بال تراشنا چھوڑ دیتے تھے۔ شاہی جامہ دار خانے سے مقربین و ملازمین شاہی کو کالے و نیلے رنگ کے کپڑے اور سیاہ اور سبز رنگ کے عصا تقسیم کئے جاتے تھے۔ امرا و وزرا کو بھی ان کے حسب مراتب بیش قیمت ماتمی لباس سرکار کی طرف سے دیا جاتا تھا۔ محل شاہی (دولت خانہ عالی)

اور دارالسلطنت میں دو بہت بڑے عاشور خانے تھے۔ محرم میں بہت ہی اہتمام کے ساتھ ان کی آرائش ہوتی تھی۔ ان کے دیو
اور صحنوں میں بیش قیمت فرش بچھایا جاتا تھا چھت پر نیلے رنگ کے مخمل یا اطلس کی چاندنی لگائی جاتی تھی ان دونوں عاشور خا
چودہ معصومین علیہم السلام کے نام سے سونے چاندی کے چودہ چودہ خوبصورت علم ایستادہ کئے جاتے تھے۔ ان پر فولادی سرطوق ہوتے تھ
ان علموں کو زربفت کے پارچے جن پر آیات قرآنی اور ادعیہ ماثورہ منقش ہوتی تھیں، باندھے جاتے تھے۔ دولت خانہ عالی
عاشور خانے میں ایک دیوار پر طاقچوں کی دس قطاریں ایک دوسرے کے متوازی بنی ہوئی تھیں۔ پہلی تاریخ سے روزآنہ ایک اید
کے طاقچوں میں چراغ روشن کئے جاتے تھے۔

دسویں کی شب کو پورے دس قطار طاقچے روشن ہوجاتے تھے۔ ان کے علاوہ بڑے بڑے چراغ دان بھی تھے جو درختوں کی
کے بنے ہوئے تھے۔ جن میں سے ہر ایک میں اکیس بیس چراغ روشن ہوتے تھے۔ دالانوں میں آدمی کے قد سے بھی بڑی شمعیں جلائی جا
حوضوں کے اطراف بھی روشنی کی جاتی تھی۔ صبح اور شام مجالس عزا منعقد ہوتی تھیں۔ خوش آواز ذاکر دل سوز انداز میں واقعا
شہادت بیان کرتے تھے۔ سوزخوان مرثیے اور نوحے سناتے تھے۔

عصر کے وقت بادشاہ عبداللہ قطب شاہ ماتمی لباس پہنے گھوڑے پر سوار ہوکر آہستہ آہستہ اور کبھی سیاہ مخمل کے سنگھا
بیٹھ کر جو خاص اس غرض کے لئے بنایا گیا تھا۔ قصر داد محل سے برآمد ہوتے تھے۔ تمام امرا، وزرا، مقربین و ملازمین ہمراہ ر
رہتے تھے۔ ان کے لباس بھی سیاہ ہوتے تھے۔ بادشاہ کی سواری ایوان الادہ یعنی عاشور خانہ شاہی میں داخل ہوتی تھی۔ راستہ بھر
دونوں طرف سواری کے ساتھ ساتھ خوش الحان سوزخوان مرثیے سناتے جاتے تھے۔ جب سواری عاشور خانے کے دروازہ پر پہنچ
تو بادشاہ سواری سے اتر پڑتے عاشور خانے کے اندر داخل ہوتے تھے اور اپنے ہاتھ سے علموں کو سہرے باندھتے اور پھول چڑھاتے تھے
پھر مغرب تک وہیں ٹھہر کر اپنے ہاتھ سے طاقچوں کے چراغ روشن کرتے اور ذاکروں کے بیان اور مرثیے سنتے جس کے بعد خطیب شا
بادشاہ کے روبرو کھڑے ہوکر نہایت فصاحت و بلاغت سے شہدائے کربلا کے ارواح طیبہ پر فاتحہ پڑھتا اور بادشاہ کی درازی عمر
کے لئے دعا کرتا۔ بادشاہ اس توفیق ایزدی پر سجدۂ شکر بجالاکر محل کو واپس ہوتے اور امرا اور وزرا وغیرہ عاشور خانے میں ٹھ
جہاں مجلس عزا شروع ہوتی۔ مجلس کے ختم ہونے کے بعد دسترخوان بچھایا جاتا اور نہایت پرتکلف کھانے (بے گوشت کے) کھلائے
جاتے۔ مصری اور گلاب کا شربت پلایا جاتا اور نان ریزہ کے طبق تقسیم کئے جاتے۔ کھانے کے بعد پھر عزاداری شروع ہوتی جس کا
آدھی رات تک جاری رہتا تھا۔ دولت خانہ عالی کے باہر بھی جو بڑا عاشور خانہ تھا اور جو کوتوال شہر کی نگرانی میں تھا۔ وہاں بھی
اسی طرح کی روشنی ہوتی، مجالس عزا میں عزاداروں کی ضیافت کی جاتی تھی۔ ان دو عاشور خانوں کے علاوہ بادشاہ کے اعزہ اور امرا
متعدد عاشور خانے تھے خصوصاً حیات آباد، کلثوم پورہ، بالا پور، خیرت آباد اور لنگر فیض اثر کے عاشور خانے اپنے علموں اور مجا
عزا کے لئے بہت مشہور تھے۔ ان کے علاوہ مختلف کارخانہ جات جیسے فیل خانہ، طویلہ شاہی وغیرہ کے ملازمین بھی محرم میں قسم قسم
کے تازیے اور تابوت بناتے تھے۔

چھٹی محرم کی رات سے روزانہ عاشور خانے کے علم اور بیتا تا زیے داد محل کے وسیع میدان میں لائے جاتے تھے جہاں ہر طرح کی روشنی ہوتی تھی علموں کے سامنے محبانِ اہل بیت اور عقیدت مند افراد چھوٹی چھوٹی مشعلیں ہاتھ میں لئے ہوئے دو رویہ چلتے تھے جن کے درمیان مرثیہ خوانوں اور ذاکروں کی جماعتیں ہوتی تھیں جب یہ لوگ اس طرح داد محل کی دیواروں کے بالکل نیچے پہنچ جاتے تو علموں کے گرد تمام ماتمی جمع ہو کر بہت زور و شور سے نوحہ و بکا کرتے۔ بادشاہ سلامت بھی محل سے برآمد ہوتے اور گریہ و بکا کو دیکھکر اور ذاکروں کی زبان سے مصائب کربلا سن کر خود بھی آبدیدہ ہوتے پھر تمام عزاداروں کے لئے محل شاہی سے "نان ریزہ کے طبق" ارسال کرتے۔ کوتوالِ شہر بادشاہ کی سلامتی کی دعا کرتا اور علم واپس ہوتے۔ عاشورے تک روزانہ اسی طرح علم لائے جاتے تھے اور ماتم ہوتا تھا۔ ساتویں کی رات کو ان علموں کے علاوہ قصبہ حیات آباد کے علم اور سرطوق بھی لائے جاتے تھے جن کے ساتھ بڑا مجمع ہوتا تھا۔

ساتویں کی صبح کو بادشاہ ندی محل میں تشریف لاتے اور شہ نشین میں کھڑے ہو جاتے تھے۔ ایران و ہندوستان کے سفیر مقامی وزراء اور امراء اور جملہ طبقات کے ملازمین سب سیاہ لباس پہنے ہوئے اپنے مقام پر کھڑے ہو جاتے تھے۔ دولت خانہ عالی، لنگر نیفی اشرف حیات آباد اور دوسرے مقامات کے علم اس خاص دروازے سے جو دروازہ بارہ امام کے نام سے موسوم تھا محل کے اندر داخل ہوتے۔ جس کے ساتھ ہندو مسلمان عوام کا انبوہ کثیر ہوتا تھا۔ تمام علم یکے بعد دیگرے بادشاہ کے سامنے لائے جاتے۔ زائرین مصائب اہل بیت بیان کرتے اور عزادار نالہ و شیون بلند کرتے۔ ہر علم کو ریشمی پارچہ باندھا جاتا اور نجاوروں کو اشرفیوں کے توڑے دئے جاتے۔ ساتویں کی شام کو بادشاہ چراغوں کو روشن کرنے اور پھول چڑھانے کے بعد خود بھی مجلس عزا میں شریک ہوتے تھے۔ اسی طرح نویں کی مجلس میں بھی شرکت کرتے اور اپنے ہاتھ سے امراء سفراء کو کافوری شمعیں تقسیم کرتے اور خود بھی شمع لئے ہوئے عاشور خانے کے باہر آتے۔ علم عاشور خانے سے نکل کر میدان کی طرف روانہ ہوتے بادشاہ خود بھی کوئی پانسو قدم علموں کے ساتھ پیدل چلتے اور پھر محل کے ایک بلند حصے میں کھڑے ہو جاتے یہاں اس روز دو بجے تک عزاداری اور شور و شیون کا سلسلہ جاری رہتا تھا۔

یوم عاشورہ کی صبح کو سب لوگ سیاہ پوش و برہنہ پا دولت خانہ عالی کے عاشور خانے میں جمع ہوتے۔ بادشاہ سلامت بھی اسی طرح برہنہ پا چلتے ہوئے اُس مسجد میں آتے جو عاشور خانے کے متصل تھی۔ مسجد میں مجلس عزا منعقد ہوتی اور مصائب اہل بیت بیان کئے جاتے فاتحہ خوانی کے بعد جب مجلس برخاست ہوتی تو بادشاہ مجلس سے نکل کر دولت خانہ عالی میں داخل ہوتے اور نماز و زیارت حضرت سید الشہداء علیہ السلام میں مشغول ہو جاتے اس کے بعد خاص و عام کو کھانا کھلایا جاتا تھا اور سادات کے دو سو یتیم و یسیر لڑکے بادشاہ کے حضور میں پیش کئے جاتے تھے جن کو جامہ ولا سے نفیس لباس اور روپیوں کی تھیلیاں دی جاتی تھیں۔

دارالسلطنت کے علاوہ ریاست کے تمام شہروں، قلعوں اور بندرگاہوں میں بھی علم استادہ کئے جاتے تھے اور مجالس عزا منعقد کی جاتی تھیں۔ ان کے تمام مصارف سرکار سے ادا کئے جاتے تھے۔ مراسم عزاداری میں نہ صرف مسلمان بلکہ ہندو بھی برابر کے شریک تھے۔ ہندو، مرد، عورتیں اور بچے کیا امیر و کیا غریب ایام عاشورہ میں غسل کر کے اچھے کپڑے پہنتے مکانات کی صفائی و آہک پاشی کرتے اور پھر نہایت خلوص و عقیدت کے ساتھ شربت کی ٹھلیاں اپنے سروں پر لے کر عاشور خانہ جاتے اور نیاز ادا کرتے۔

(شعبۂ نسواں)

اظہار ممنونیت

آج کے جلسہ کا سب سے لطیف اور خوش گوار فریضہ یعنی اظہار ممنونیت کا شرف مجھے بخشا گیا ہے۔

شکریہ کے دو بول بول لینا کوئی اہم کام نہیں لیکن محض رسماً و لفظاً شکریہ ادا کر دینا میں سمع خراشی و تضیع اوقات سمجھتی ہوں اس لئے اصل ممنونیت تو وہ ہے جس کو دل محسوس کرے اور دل کا احساس قید اظہار سے بری ہے۔ لیکن اظہار ممنونیت بھی ایک فرض انسانی ہے اس لئے لازم ہے کہ شکریہ ادا کیا جائے۔

وہ جذبات تشکر جو اس وقت اراکین شعبہ کے دلوں میں موج زن ہیں کسی انشا پرداز کے قلم کی روانی اور کسی مقرر کی زبان کی فصاحت کے محتاج تھے۔ وہی صحیح طور پر ان کی ترجمانی کر سکتے۔ نہ کہ میں جسے نہ تو لکھنے سے کام نہ بولنے سے واسطہ۔ یہ کام تو کوئی رابعہ بیگم یا لطیف النساء بیگم جیسی معجز بیان خواتین کے حوالے ہوتا تو "پھر دیکھئے انداز گل افشانی گفتار"! لیکن چونکہ قرعۂ فال بنام من دیوانہ زدند مجبوراً جس طرح بھی ہو سکے اپنے ٹوٹے پھوٹے الفاظ میں مگر بخلوص دل ان جذبات شکر گذاری کو آپ کی خدمت میں پیش کرنے کی جرأت کرتی ہوں جن سے ہمارے دل آج لبریز ہیں اور جن کا ایک عشر عشیر بھی اگر آپ تک پہنچا سکوں تو اپنے آپ کو قابل مبارکباد تصور کروں گی۔

سب سے پہلے ہم آج اپنے آقائے ولی نعمت سلطان العلوم حضرت اقدس و اعلیٰ خلد اللہ ملکہ کی بے شمار عنایتوں ان کی علم دوستی و علم نوازی اور ہماری صنف پر ان کے لاتعداد احسانات کا اعتراف کرتے ہوئے نہایت ادب و احترام کے ساتھ سپاس گزار ہیں کہ آج ان کی بدولت حیدرآباد کی خواتین بھی علم و ادب کے میدان میں مردوں کے دوش بدوش نظر آ رہی ہیں۔

اس کے بعد ہم صدر جلسہ لیڈی حیدری صاحبہ کی خدمت میں ہدیۂ شکرانہ پیش کرتے ہیں کہ انھوں نے باوجود اپنی مختلف النوع مصروفیتوں کے ہمارے اجلاس کی صدارت قبول کر کے ہم کو ممنونیت کا موقع دیا۔ موصوفہ کو علمی مشاغل سے جتنی دلچسپی و وابستگی ہے وہ محتاج بیان نہیں۔ ان کے ہاتھوں اس جلسہ کا افتتاح ہمارے حق میں شگون نیک ہے۔ ان کی رہبری میں ہم کو یقینی ان اعلیٰ مقاصد کے حصول میں مدد ملے گی جس کی تمنا ہر ترقی یافتہ قوم میں ہونا چاہیئے۔

ساتھ ہی بیگم صاحبہ نواب مہدی یار جنگ بہادر کے ہم بہ دل مشکور ہیں کہ انھوں نے اپنی شرکت سے جلسہ کو رونق اور کرسی صدارت کو زینت بخشی۔ نواب صاحب کو بحیثیت ادارہ کے صدر ہونے کے جو دلچسپی ہے وہ ظاہر ہے۔ ہمیں امید ہے کہ بیگم صاحبہ موصوفہ خود بھی آج سے اس شعبہ میں دلچسپی اور عملی حصہ لے کر ہر منزل پر ہماری رہنمائی فرماتی رہیں گی۔

بیگم صاحبہ نواب ولی الدولہ بہادر گو اس وقت موجود نہیں لیکن ان کے نیک خیالات ضرور اس وقت ہمارے شریک حال ہیں۔ ہمارے معاملات میں ان کی دلچسپی خود اس بات کی ضامن ہے۔ افسوس کہ باوجود ان کی عین خواہش کے کچھ ایسے وجوہات مانع ہوئے کہ ہمارے اجلاس میں وہ حصہ نہ لے سکیں۔ ہم ان کی خدمت میں ان کی عدم موجودگی پر اظہار تاسف کرتے ہوئے ان کی موجودہ مہربانی و دلچسپی کا شکریہ اور آئندہ عملی حصہ لینے کی درخواست کرتے ہیں۔

ان تمام خواتین کا جنھوں نے اپنے اشتراک عمل اور تعاون سے جلسہ کو کامیاب بنانے میں مدد دی ہے۔ ہم خلوص دل سے شکریہ ادا کرتے ہیں۔ اس زمرہ میں خصوصیت سے ہم مس پوپ صاحبہ کے مشکور ہیں کہ انھوں نے انتظامات میں ہماری ہر طرح امداد فرمائی۔

حاضرین کی خدمت میں جن کی موجودگی خود ان کے جذبۂ تعاون کی بین دلیل ہے ہم اپنی مخلصانہ ممنونیت کا اظہار بصد دل پیش کرتے ہیں۔ ان کی موجودگی سے آج بزم کی رونق دوبالا ہوگئی۔ آپ سب سے اب ہماری یہ درخواست ہے کہ جس عمارت کا سنگ بنیاد آج اس جذبۂ خلوص سے رکھا گیا ہے۔ اس کی تعمیر میں ہر وقت ہاتھ بٹاتی اور امداد کرتی رہیں۔ کوئی وقت اس کی ترقی کے سد راہ نہ ہونے دیں۔

لیڈی حیدری صاحبہ نے خطبۂ صدارت میں ٹھیک فرمایا کہ "ابتدا تو شان دار ضرور ہوتی ہے لیکن سعی و عمل کی کمی اور زمانہ کی سرد مہری انہیں پست ہمت و سست کار بنا دیتی ہے۔"

آئیے ہم اپنی انتہا کو بھی شان دار بنانے کی کوشش کریں۔ زمانے کو دکھا دیں کہ ہم کبھی ہمت نہ ہاریں گے اور جس کام کا بیڑا اٹھایا ہے اُسے کر کے دکھا دیں گے ہمت کا حامی خدا ہے۔ بقول شاعر

بہ ہر کاری کہ ہمت بستہ گردد
اگر خاری بود گلدستہ گردد

سکینہ بیگم

عرضِ حال

خوشا قسمت نوید جانِ فزا باد صبا لائی
گلستانِ ادب میں اور اک تازہ بہار آئی

تعالی اللہ کیا اعجاز دورِ شاہِ عثمان ہے
کہ اس عہدِ مبارک میں ہر اک گھر اک دبستاں ہے

مبارک اے دکن! اہلِ دکن برکاتِ عثمانی
مبارک ہو خواتینِ دکن معراجِ نسوانی

خدا کا شکر ہے قائم ہوا ہے شعبۂ نسواں
وہ جس کا مدتوں سے منتظر تھا طبقۂ نسواں

فریضہ اپنا اب یہ ہے کہ دیں ایسا فروغ اس کو
حیاتِ جاوداں پا جائے دنیا مان لے جس کو

ہر صورت سدا جاری رکھیں کوشش ترقی کی
اب اپنے ہاتھ میں ہے لاج اس کی اور اپنی بھی

یہ بزمِ نو ہو ثابت کارآمد کامراں ہو کر
پھلے پھولے یہ شاخِ گل جہاں میں گلستاں ہو کر

مرادیں بانیٔ شعبہ کی یارب ساری بر آئیں
خواتینِ دکن بامِ ترقی پر نظر آئیں

اگرچہ عام ہیں تعلیم کے چرچے زمانے میں
تاسف ہے مجھے لیکن حقیقت کے سنانے میں

بہت پیچھے ہیں اب تک ہم گزشتہ کاروانوں سے
ہے لغزش ہر قدم پر اور شکایت آسمانوں سے

مہیا ہیں اگرچہ ملک میں ساماں ترقی کے
ترقی ہوگی جب حاصل کہ ہوں خواہاں ترقی کے

ہماری فطرتوں میں ہیں ابھی کمزوریاں باقی
کہ اب تک ہم میں دانستہ بھی ہیں نادانیاں باقی

نحیف و زار فطرت ہے طبیعت لا اُبالی ہے
ہماری اپنی دنیا بس خیالی ہی خیالی ہے

اگر بے کیف رکھتی ہیں فضائیں گلستانوں کی
تو ہو ذوقِ نظر کی یا شکایت باغبانوں کی

کبھی تقدیر کے شکوے کبھی قسمت پہ روتے ہیں
ہم اپنے وقت کی دولت کو بس اس طرح کھوتے ہیں

مبارک ہو وجود ان کا جو خطروں سے گزرتے ہیں
تذبذب میں جو رہتے ہیں سدا ناکام رہتے ہیں

حقیقت میں وہی انساں ہیں جو کچھ کام کرتے ہیں
سر انجام کیے اپنی سرزمیں کا نام کرتے ہیں

یوں ہی گر بے عمل بیٹھے رہیں ہم آشیانوں میں
ہماری داستاں تک بھی نہ ہوگی داستانوں میں

بشیر النساء بیگم بشیر

تاثراتِ سفرِ یورپ (تیسری قسط)

برنڈزی سے استنبول تک

(۱۹ر جون ۱۹۳۸ء تا ۲۲ر جون ۱۹۳۸ء)

ہمارا جہاز اچھا بڑا تھا، اطالوی کمپنی کا تھا اور "پالستینا" (فلسطینیہ) نام تھا۔ حال کے زمانے میں جب سے اٹلی نے بحیرۂ روم کو اطالوی جھیل بنانے کا منصوبہ گانٹھا ہے، اس نے چاروں طرف اپنے جہازوں کا جال بچھا دیا ہے، چنانچہ اب اٹلی سے ایتھنز، استنبول، شام، فلسطین، مصر، تونس، ڈالنس، مراکو اور امریکہ تک اطالوی جہاز جاتے ہیں۔ اطالوی ساحل چھوڑنے سے پہلے وہ فارم جو کولتے بیانا لگاما نو پر اپنے روپے کے متعلق بھرا تھا وہ ہم سے واپس لے لیا گیا۔ برنڈزی سے استنبول تک کا راستہ نہایت دلچسپ ہے، اور جن مقامات کا ذکر پڑھتے عمر گزر گئی وہ سامنے آجاتے ہیں۔ تقریباً تین گھنٹہ تک تو جہاز اطالوی ساحل کے اتنے قریب ہو کر چلا کہ مشکل سے میل ڈیڑھ میل کا فصل ہوگا۔ اطالوی ساحل چھوڑتے ہی البانیہ کا ساحل نظر آنے لگا اور تقریباً چار بجے سے رات کے آٹھ بجے تک اس واحد خالص یوروپی اسلامی سلطنت کا کنارہ نظر آتا رہا جس پر اس وقت اٹلی کی نگاہِ حرص و آز بڑھ رہی ہے۔ ہم البانی بندرگاہ والونا کے بالکل قریب ہو کر گذرے لیکن چونکہ شہر جزیرہ نمائے لنگوئیتا کے پیچھے چھپا ہوا ہے اس لئے ہمیں نظر نہیں آیا۔ رات کے نو بجے ہم یونانی جزیرہ کورکیرا (کورفو) کے قریب ہو کر گذرے جہاں کسی زمانے میں ولیم دوم قیصرِ جرمنی اپنی بہن ملکۂ یونان کے پاس اپنی چھٹیاں بسر کیا کرتا تھا۔

جہاز میں اکثر یونانی اور نیم یونانی بھرے ہوئے ہیں جن کے چہرے بشرے سے بربریت اور وحشت نمایاں ہے، ۲۰ر کو ہم اس تنگ خلیج میں داخل ہوئے جو جزیرہ نمائے پیلوپونیز (موریہ) اور تھسلی کو ایک دوسرے سے جدا کرتی ہے۔ ہمارے بائیں طرف مشہور آفاق شہر لپانتو اور مسولونگی تھے، جو ترکوں اور عیسائیوں کی خوں فشاں تاریخ میں نہایت اہم ہیں۔ لپانتو وہ مقام ہے جہاں ۷ر اکتوبر ۱۵۷۱ء کو ڈون جان شاہزادہ آسٹریا نے ترکی امیر البحر عروج موذن زادہ کو شکست دی تھی اور یہ پہلی شکست تھی جو ترکوں کو عیسائیوں کے ہاتھوں ہوئی تھی، مسولونگی وہ مقام ہے جہاں بیٹھ کر بائرن نے جنگ آزادی یونان میں یونانیوں کو مسلمانوں کے خلاف بھڑکایا تھا اور جہاں اس کا ۱۹ر اپریل ۱۸۲۴ء کو انتقال ہوگیا۔ ساڑھے نو بجے کے قریب شمال کی طرف برف پوش کوہ پارناسوس نظر آیا جسے قدیم بت پرست یونانی اپولو دیوتا اور میوز دیبیوں کی آماجگاہ سمجھتے تھے۔ ان مقامات سے قدیم و جدید یونان کی تاریخ کی یاد تازہ ہو جاتی ہے اور اندازہ ہوتا ہے کہ کلمہ گویان اسلام نے کہاں کہاں جا کر اپنا جھنڈا گاڑھا تھا اور یونانی قوم کی بربریت کی داستان پہاڑوں کی ان ناہموار چوٹیوں سے ظاہر ہوتی ہے جو صبح سے برابر ہمارے جہاز کو گھیرے ہوئے تھیں۔

دوپہر کے وقت کورنتھ نظر آیا اور ایک بجے جہاز نہر کورنتھ کے مقابل کھڑا ہو گیا جو بحیرۂ ترعینیہ او بحیرۂ ایجین کو جدا کرنے والی خاکنائے کورنتھ کو کاٹ کر نکالی گئی ہے تاکہ جہاز جزیرہ نمائے موریہ کا دور کرنے سے بچ جائیں۔ یہ نہر نہایت ہی تنگ ہے اور بس اتنی ہی چوڑی ہے کہ صرف ایک ہی جہاز اس میں ہو کر نکل سکتا ہے، بلکہ ایک جہاز میں بھی دونوں طرف لکڑی کے موٹے موٹے بیڑے باندھ دیے جاتے ہیں تاکہ اگر پہاڑی کنارے سے ٹکر ہو تو یہ بیڑے جب کا کام دیں۔ ہمارا جہاز نہر کے دہانے پر اس لئے تقریباً ایک گھنٹہ کھڑا رہا کہ ادھر سے ایک

دوسرا جہاز آرہا تھا۔ نہر زیادہ سے زیادہ دو تین میل طویل ہے لیکن جہاز اس قدر آہستہ آہستہ جاتا ہے کہ گذرنے میں ڈیڑھ پونے دو گھنٹے لگ جاتے ہیں۔ پانچ بجے کے قریب ہم تاریخی اعتبار سے دو نہایت ممتاز جزیروں یعنی الی گینا (AEGINA) اور سالامس (SALAMUS) کے درمیان ہوکر گذرے۔ یہہ وہی سالامس ہے جہاں ۴۸۰ء قبل مسیح میں ایرانیوں کو پہلی مرتبہ یونانیوں کے ہاتھوں شکست ہوی تھی اور الی گینا وہ جزیرہ ہے جو کسی زمانے میں خود ایتھنز کے ہم پلہ سمجھا جاتا تھا۔ سالامس ایتھنز سے اس قدر قریب ہے کہ اسے لئے بغیر کوئی مملکت ایتھنز پر قبضہ قائم نہیں رکھ سکتی اور ۴۸۰ء ق م میں گو شہنشاہ ایران خاص ایتھنز پر قابض ہوچکا تھا لیکن سالامس کی شکست کے بعد اسے واپس لوٹ جانا اور اگلے سال یونان کو خیرباد کہنا پڑا۔

شام کے سات بجے ہمارا جہاز "مدینۃ الحکما" ایتھنز کے بندرگاہ پرائیوس پر لنگر انداز ہوا۔ جہاز میں پہلے سے یہہ اطلاع آویزاں کی گئی تھی کہ جہاز والوں کی طرف سے ایک اکسکرشن ایتھنز جائے گا لیکن جہاز دو گھنٹہ دیر کرکے پہونچا اور مجموعی اکسکرشن کا خیال چھوڑ دیا گیا چونکہ نہ معلوم کبھی پھر اس تاریخی شہر کو آنا ہو یا نہ ہو اس لئے میں تنہا پاسپورٹ لے کر کنارے گیا۔ وہاں گائیڈ موجود تھے ان میں سے ایک کو ساتھ لے کر (۳۵۰) درہم (ایک انگریزی پونڈ ۵۵۰ یونانی درہم کے برابر ہوتا ہے) کو گاڑی (مع اجرت رہنما) ایتھنز کے لئے کی ایتھنز بندرگاہ سے پندرہ میل کے قریب ہے، اور راستے بھر میں نفیس مکانات، چوڑی سڑکیں ملیں خود شہر رات کو بہت بارونق اور بھلا معلوم ہوتا ہے افسوس ہے کہ دیر ہوجانے کی وجہہ سے میں یہاں کی عمارتیں اچھی طرح نہ دیکھ سکا بلکہ محض سرسری طور پر پی (PANTHEON) جوپیٹر کا مندر قدیم تھیٹر شہنشاہ ہیڈرین کا دروازہ دیکھا۔ اس کے علاوہ پارلیمنٹ کا ایوان شاہی محل جامعہ یہہ سب بھی باہر سے دیکھے۔ رہنما سے دریافت پر معلوم ہوا کہ ایتھنز میں اب نہ کوئی مسلمان ہے نہ مسجد بلکہ تمام یونان سے (جس میں سو برس پہلے لاکھوں مسلمان تھے) اب مسلمان ناپید ہیں۔

ایتھنز میں خاص طور پر بہت سی عمارتوں پر چراغاں ہو رہا تھا معلوم ہوا کہ استنبول کے ترکی گورنر سرکاری طور پر یہاں آئے ہوئے ہیں ان کے اعزاز میں یہہ چراغاں ہے۔ خدا کی قدرت ہے کہ چند سال پہلے والا یورپ کا "مرد بیمار" اس قابل ہوگیا کہ اس کا ایک نسبتہ معمولی عہدہ دار ایتھنز آئے اور اس کے اعزاز میں چراغاں کئے جائیں۔

رات کے ٹھیک بارہ بجے جہاز نے لنگر اٹھایا اور استنبول کی طرف روانہ ہوگیا۔ صبح ہی ہم جزیرہ اندروس اور جزیرہ یوبیہ (نیگروپونت) کے درمیان میں ہوکر گذرا۔ یوبیہ وہ جزیرہ ہے جسے زرکسیز شہنشاہ ایران نے یونان پر چڑھائی کرتے وقت مستقر بنایا تھا آبنائے میں سے نکلتے ہی کھلا بحیرۂ ایجئن آجاتا ہے، چنانچہ شام کے ساڑھے تین بجے تک کسی طرف خشکی کا پتہ نہیں ملا۔ ساڑھے تین بجے ایشیائی ساحل نظر آنا شروع ہوا اور آدھ گھنٹے میں ہم ترکی جزیرہ تینے دوس اور ایشیائے کوچک کے درمیان ہوکر گذرے اور ۶ بجے درۂ دانیال میں داخل ہوئے۔ ہمارے جہاز پر پیچھے کی طرف اطالوی اور سامنے کی طرف ہلال وتارہ کا ترکی علم اڑ رہا تھا، اور گویا اس طرح ترکی حکومت کو سلامی دے رہا تھا۔ درۂ دانیال میں داخل ہونے کے وقت میرے سامنے وہ تمام نظارے آگئے جو پچھلی جنگ عظیم میں اس خطے پر رونما ہوئے تھے۔ یہہ وہ جگہ ہے جہاں اتحادی افواج نے لاکھ سر مارے لیکن وہ اس ذرا سی جگہ میں ہوکر نہ گذر سکے اور مریض بے جان ترکوں نے اس آبنائے میں فرانسیسی اور انگریزی جہاز ڈبو دئے۔ سب سے پہلے جو چیز نظر آتی ہے وہ یورپی ساحل پر انگریزوں اور فرانسیسیوں کے

قبرستان ہیں جن میں وہ ہزاروں یوروپی دبے پڑے ہیں جنھوں نے ادھر کی طرف سے آستانہ کو فتح کرنے کا ارادہ کیا تھا۔ رات کے ۲ بجے چناق اور سدالبحر کے قلعے نظر آئے۔ اس کے بعد آبادی ہی آبادی تھی اور جہاز کے دونوں طرف یعنی ایشیا اور یورپ کے کناروں پر اندھیری رات میں بے شمار برقی قمقمے جگمگاتے ہوئے عجیب بہار دے رہے تھے۔ دفعتہً جہاز کی رفتار دھیمی ہوگئی اور چار افسر نہایت عمدہ چست وردی زیب تن کئے ہوئے ایک ہلال تارے والی کشتی میں سے اتر کر جہاز پر سوار ہوگئے بظاہر معلوم ہوتا تھا کہ یہ کوئی بڑے ترکی فوجی افسر ہیں لیکن دریافت سے پتہ چلا کہ یہ شخص پولیس کے عہدہ دار ہیں اور مسافروں کے پاسپورٹوں کی تنقیح کرتے آئے ہیں۔

دوسرے دن ۲۴ جون کو صبح کے وقت چاروں طرف بحیرہ مارمورا تھا، زمین کہیں نظر نہ آتی تھی کہ بس چشم زدن میں باسفورس اور استنبول کا عجیب و غریب اور لاثانی منظر آموجود ہوا۔

ہارون خاں شروانی

تنہائی

تم پوچھتی ہو...... تنہائی سے تمھیں اس قدر کیوں اُنس ہے؟ ...... کیا تم نے کبھی سوچا بھی ہے یا یونہی پوچھ بیٹھیں؟ اپنی تنہائی کی دنیا کا نقشہ کھینچتی ہوں کیا پھر بھی میری تنہائی پر تمہیں اعتراض ہوگا۔

تمھارے ہنگامہ پرور شہر سے پانچ چھ میل دور ایک جھونپڑی ہے جس کے اطراف نہایت ہی خوبصورت ایک خودرو باغ ہے رنگ برنگ کے بے ترتیب پھول قدرت کی عریانی کا ایسا دلکش نظارہ پیش کر رہے ہیں کہ جی چاہتا ہے انہیں کو دیکھتے زندہ رہوں انہیں کو دیکھتے مرجاؤں....

.... روح پرور سویرا...... پرکیف شام...... جب سورج غروب ہوتا ہے شعاعیں آسمان پر پھیل جاتی ہیں تو ایسا معلوم ہوتا ہے کہ افق مغرب میں آگ لگ گئی ہے۔ شام کی یہ دلفریبی کس قدر رومان انگیز ہے۔ تم ہی بتاؤ؟ کون اس میں گم ہو جانا نہ چاہے گا.......

کاش! تمھاری دنیا میں بھی ایسی ہی رنگینیاں میسر آتیں کیف و سرور کی ایسی ہی چند گھڑیاں مل جاتیں...... تو کون اس سے پیچھا چھڑاتا؟

میں ایسی دنیا میں ہوں جہاں میری روح شعریت کے عمیق سمندر میں غرق رہتی ہے۔ میری دنیا زمانے کی تلخیوں سرد مہریوں اور آزمائشوں سے پاک ہے جہاں نہ تمھاری دنیا کا سا ہنگامہ ہے اور نہ دن رات کی گردش یہاں ہر لمحہ بعد ایک نیا لطف و سرور ہے...... مجھے تم ایسی دنیا میں بلانے کی کیوں خواہش کر رہی ہو جہاں کے دوست دشمن سے زیادہ قاتل...... جہاں کا امن جنگ سے زیادہ خونیں اور جہاں کے بسنے والے ماضی کی یاد اور مستقبل کے تصور سے حال کو مکدر بنا دیتے ہیں...... میری دنیا کا ہر منظر جنت نظیر قدرت کے اعلیٰ ترین مظاہر یہاں بے نقاب ہیں اور دل درد کے احساس سے معمور رہتا ہے۔ میری دنیا عقل کی نہیں جذبات کی دنیا ہے جہاں کی نقادگی میں بھی ایک خاص لذت

طاہرہ سلطانہ

(زنانہ ہائی اسکول نام پلی)

سانحاتِ کربلا

آہ کیا حسرت فزا ہیں سانحاتِ کربلا
کس قدر صبر آزما ہیں واقعاتِ کربلا

اے شہیدِ کربلا، اے جانِ بنتِ مصطفٰے
اے امامِ تشنہ لب، اے نورِ چشمِ مرتضٰی

مدتیں گذریں مگر تازہ ترا افسانہ ہے
جو کبھی خالی نہیں ہوتا یہ وہ پیمانہ ہے

دل تری امت کا تیرے درد سے خالی نہیں
جب تلک دنیا ہے تجھ کو بھولنے والی نہیں

آج تازہ تیرے سوزِ غم سے داغِ سینہ ہے
پھر چھلکتی ساغرِ نو میں مئے دیرینہ ہے

آہ مظلومی پہ تیری اشکِ خوں روتے ہیں ہم
تو سراپا صبر تھا اور صبر کو کھوتے ہیں ہم

جس کے جھولے کو جھلاتے تھے کبھی روح الامیں
اپنے سینے پر سلاتے تھے جسے سردارِ دیں

مسکرا دیتا اگر آغوشِ زہرا میں کبھی
حوریں آتی تھیں بلائیں لینے کو فردوس کی

جو ہوا تھا فاطمہ کے شیر سے پل کر جواں
دست و بازو سے تھی جس کے حیدری سطوت عیاں

جس کی نسبت یہ سنا ہے فخرِ موجودات سے
روشنی ہے فاطمہ کے گھر میں انکی ذات سے

جس کا دروازہ کھلا رہتا غریبوں کے لئے
وقف جس کا مال و زر رہتا یتیموں کے لئے

کیا خبر تھی جان پر اس کے یہ آفت آئیگی
ظلم پر آمادہ اپنی قوم ہی ہو جائے گی

آہ تجھ کو ظالموں نے بے سبب دھوکا دیا
نامے لکھ لکھ کر بلایا اور غلط وعدہ کیا

کون ہے ہمسر ترا اے مصدرِ صبر و رضا
گھر لٹا، کنبہ لٹا تو نے نہ کچھ شکوہ کیا

حلق پر لختِ جگر کے تیر چلتا دیکھ کر
کلمۂ حق تھا زباں پر آسماں پر تھی نظر

قلب گو مضطر ہے سبطِ احمدِ مختار کا
اذن ہوتا ہے مگر فرزند کو پیکار کا

ریت کا وہ گرم میداں اور وہ نازک قدم
جن کے چلنے کے لئے مخصوص تھا صحنِ حرم

دوپہر کی دھوپ اور پھر وہ تمازت الاماں
اور اس پر پیاس کی شدت کہ سوکھی تھی زباں

بچہ بچہ کافروں کا شاد تھا سیراب تھا　　فاطمہ کا لال پانی کے لئے بے تاب تھا
تھا صف آرا چار سو لشکر ادھر کفار کا
اور ادھر تنہا سپہ تھا حیدرِ کرار کا

شاہ نے تلوار کھینچی تو قیامت آ گئی　　تیغ کھنچتے ہی جلو میں فتح و نصرت آ گئی
ہو رہے تھے تیغ حضرت سے ہزاروں سر قلم　　سامنے آنے کو تھراتے تھے اعدا کے قدم
برق آسا جب چمکتی تھی وہ سیفِ آبدار　　سیکڑوں زخمی ہزاروں ختم ہوتے نابکار
پڑ گئی لشکر میں بھاگڑ چھپتے پھرتے تھے لعیں　　مسکرا دیتے تھے ان کے بھاگنے پر شاہِ دیں
درمیانِ جنگ دیکھا جب کہ ہے وقتِ نماز　　پھینک کر شمشیر قبلہ رو ہوا ماہِ حجاز
محوِ طاعت دیکھ کر کفار چلانے لگے　　پا کے موقع ہر طرف سے تیر برسانے لگے
خوں آلودہ زمیں پر جھک گیا سجدے میں سر　　شمر نے تلوار رکھ دی گردنِ شبیر پر
اک اندھیرا چھا گیا، تھرا گیا عرشِ بریں
جب ہوا فرشِ زمیں پر غرقِ خوں وہ نازنیں

الوداع اے تاجدارِ دین و ملت الوداع　　اے گلِ صد رنگِ گلزارِ رسالت الوداع
دے کے سر تو نے بچا لی آبرو ایمان کی　　ملت بیضا پہ اپنی جان تک قربان کی
موت ہو یا زندگی ہو سب یدِ قدرت میں ہے　　ناشکیبائی مگر انسان کی فطرت میں ہے
چشمِ تر جس کی نہ ہو اسلام سے بیگانہ ہے　　جو ترے غم سے ہو خالی دل نہیں ویرانہ ہے
اے بشیرؔ عبرت فزا ہے داستانِ کربلا
شق ہوا جاتا ہے دل سن کر بیانِ کربلا

یہ نہیں وہ غم کہ اک ہنگامۂ بے جوش ہو　　لب پہ تیرا نام ہو اور زندگی خاموش ہو
چاہنے والے ترے بے صبر یوں ہوتے نہیں　　جان سے جاتے ہیں لیکن پھوٹ کر روتے نہیں
عہدِ ماضی پر نظر کر اے مسلماں غور سے　　جان دی ہے حامیانِ دیں نے کس کس طور سے
درس جانبازی کا ہے یہ مسلمِ خوابیدہ کو　　کارناموں کو سلف کے دیکھ، اور بیدار ہو

"تازہ خواہی داشتن گر داغہائے سینہ را
گاہے گاہے باز خواں ایں دفترِ پارینہ را"

بشیر النساء بیگم بشیرؔ

عبداللہ قطب شاہ اور محرم

یوں تو کم و بیش تمام قطب شاہی فرماں رواؤں میں مذہبی پابندی ان کی سیرت کی ایک نمایاں خصوصیت کے طور پر نظر آتی ہے۔ لیکن عبداللہ قطب شاہ جو شہر حیدر آباد کے اولوالعزم آباد کار سلطان محمد قلی قطب شاہ کا نواسا اور کرمسجد کے نیک نہاد بانی کا چہیتا بیٹا تھا، بہت زیادہ پابند مذہب اور شعار اسلامی کا شیدائی تھا اس خاندان کا پہلا فرماں روا جو اپنے ایک ناخلف بیٹے کے ہاتھ شہید ہوا۔ مسجد میں عین حالت نماز میں فوت ہوا تھا۔ گولکنڈہ اور حیدر آباد میں قدیم اور عالی شان مسجدوں کی کثرت بھی ان بادشاہوں کی مذہبیت کا ایک پایندہ ثبوت ہے جو باوجود زمانے کی دست برد اور مصلیوں کی بے پروائی کے آج بھی اپنے بنانے والوں کی خدا ترسی کی یاد دلاتی ہے۔

سلطان عبداللہ قطب شاہ کی ابتدائی تربیت بھی اس کے نامور باپ سلطان محمد قطب شاہ کی خاص توجہ سے میر قطب الدین نعمت اللہ، مرزا اشرف شہرستانی اور منشی الممالک خواجہ مظفر علی جیسے لوگوں کے ہاتھوں میں ہوئی جو نہ صرف فضیلت علمی اور اعزاز خاندانی کے مفتخر تھے بلکہ اپنی پاکیزہ سیرت اور شرافت نفس کے لحاظ سے بھی منتخب روزگار تھے۔ علاوہ ازیں وہ اپنی شہزادگی اور بادشاہی کے زمانے میں ایک عرصہ دراز تک۔ اپنی نیک دل والدہ حیات بخشی بیگم کے زیر اثر رہا۔ یہ خاتون صوم و صلوٰۃ کی پابند تھی اور سادہ مذہبی زندگی کو بہت پسند کرتی تھی۔ وہ ہمیشہ علماء فقراء و مشائخین کی خدمت کیا کرتی تھی۔

سلطان عبداللہ قطب شاہ نے تخت نشین ہونے کے بعد بہت سے مذہبی مراسم اور اسلامی تقاریب جو قدیم سے چلی آتی تھیں ان کو نہ صرف برقرار رکھا۔ بلکہ اس کی توجہ سے یہ پہلے سے زیادہ اہتمام کے ساتھ کی جانے لگیں۔ میلاد النبی صلعم کا جشن جو سلطان محمد قطب شاہ کے زمانے میں موقوف ہو گیا تھا۔ سلطان عبداللہ کے حسن توجہ سے پہلے سے زیادہ اہتمام اور انتظام سے منعقد ہونے لگا۔

حیدر آباد کا محرم اپنی بہت سی خصوصیات کے لحاظ سے آج بھی ممتاز ہے۔ اور موجودہ مراسم عزاداری وغیرہ اکثر قطب شاہی زمانے کی یادگار ہیں۔ سلطان محمد قلی قطب شاہ کے عہد سے یہ دستور چلا آتا تھا کہ جیسے ہی محرم کا چاند آسمان پر نمودار ہوا حیدر آباد میں شہدائے کربلا علیہم السلام کے مراسم عزاداری شروع ہو گئے۔ عیش و عشرت کی محفلیں موقوف اور ماتم حسینؑ کی مجالس شروع ہو جاتی تھیں۔ شاہی نقارخانوں میں بلکہ تمام امراء و وزراء کی ڈیوڑھیوں پر جو نوبت نقارے بجا کرتے تھے۔ موقوف کر دیئے جاتے تھے۔ گانا بجانا یک لخت بند ہو جاتا تھا۔ سارے شہر میں سیندھی، شراب اور بھنگ وغیرہ تمام نشہ آور چیزوں کی خرید و فروخت یک قلم موقوف ہو جاتی تھی۔ شاہی باورچی خانے میں گوشت کا استعمال چھوڑ دیا جاتا تھا۔ عام طور پر رعایا بھی ان دنوں گوشت نہیں کھاتی تھی۔ قصاب اپنی دوکانیں برخاست کر دیتے تھے۔ خاص و عام سب پان کھانا چھوڑ دیتے تھے کیونکہ بعض لوگ اس کے سخت عادی ہوتے تھے اس لئے ان کی خاطر ایک خشک مرکب نکالا گیا جو نان ریزہ یا سکھ کہلاتا تھا۔ اکثر مجالس عزا میں اس کو تقسیم کرتے تھے آج بھی حیدر آباد میں اس کا رواج ہے۔ حماموں میں حجام بال تراشنا چھوڑ دیتے تھے۔ شاہی جامہ دار خانے سے مقربین و ملازمین شاہی کو کالے و نیلے رنگ کے کپڑے اور سیاہ اور سبز رنگ کے عصا تقسیم کئے جاتے تھے۔ امراء و وزراء کو بھی ان کے حسب مراتب بیش قیمت ماتمی لباس سرکار کی طرف سے دیا جاتا تھا۔ محل شاہی (دولت خانہ عالی)

اور دارالسلطنت میں دو بہت بڑے عاشور خانے تھے۔ محرم میں بہت ہی اہتمام کے ساتھ ان کی آرائش ہوتی تھی۔ ان کے دالانوں اور صحنوں میں بیش قیمت فرش بچھایا جاتا تھا چھت پر نیلے رنگ کے مخمل یا اطلس کی چاندنی لگائی جاتی تھی ان دونوں عاشور خانوں میں چودہ معصومین علیہم السلام کے نام سے سونے چاندی کے چودہ چودہ خوبصورت علم استادہ کئے جاتے تھے۔ ان پر فولادی مرطرق ہوتے تھے ان علموں کو زربفت کے پارچے جن پر آیات قرآنی اور ادعیہ ماثورہ منقش ہوتی تھیں، باندھے جاتے تھے۔ دولت خانہ عالی کے عاشور خانے میں ایک دیوار پر طاقچوں کی دس قطاریں ایک دوسرے کے متوازی بنی ہوئی تھیں۔ پہلی تاریخ سے روزانہ ایک ایک قطار کے طاقچوں میں چراغ روشن کئے جاتے تھے۔

دسویں کی شب کو پورے دس قطار طاقچے روشن ہوجاتے تھے۔ ان کے علاوہ بڑے بڑے چراغ دان بھی تھے جو درختوں کی شکل کے بنے ہوئے تھے۔ جن میں سے ہر ایک میں اکیسو بیس چراغ روشن ہوتے تھے۔ دالانوں میں آدمی کے قد سے بھی بڑی شمعیں جلائی جاتیں حوضوں کے اطراف بھی روشنی کی جاتی تھی۔ صبح اور شام مجالس عزا منعقد ہوتی تھیں۔ خوش آواز ذاکر دل سوز انداز میں واقعات شہادت بیان کرتے تھے۔ سوزخوان مرثیے اور نوحے سناتے تھے۔

عصر کے وقت بادشاہ عبداللہ قطب شاہ ماتمی لباس پہنے گھوڑے پر سوار ہوکر آہستہ آہستہ اور کبھی سیاہ مخمل کے سنگھاسن پر بیٹھ کر جو خاص اسی غرض کے لئے بنایا گیا تھا، قصر داد محل سے برآمد ہوتے تھے۔ تمام امرا، وزرا، مقربین و ملازمین ہمراہ رہتے تھے۔ ان کے لباس بھی سیاہ ہوتے تھے۔ بادشاہ کی سواری ایوان الادہ یعنی عاشور خانہ شاہی میں داخل ہوتی تھی۔ راستہ میں دونوں طرف سواری کے ساتھ ساتھ خوش الحان سوزخوان مرثیے سناتے جاتے تھے۔ جب سواری عاشور خانے کے دروازہ پر پہنچتی تو بادشاہ سواری سے اتر پڑتے عاشور خانے کے اندر داخل ہوتے تھے اور اپنے ہاتھ سے علموں کو سہرے باندھتے اور پھول چڑھاتے تھے پھر مغرب تک وہیں ٹھہر کر اپنے ہاتھ سے طاقچوں کے چراغ روشن کرتے اور ذاکروں کے بیان اور مرثیے سنتے جس کے بعد خطیب شاہی بادشاہ کے روبرو کھڑے ہوکر نہایت فصاحت و بلاغت سے شہدائے کربلا کے ارواح طیبہ پر فاتحہ پڑھتا اور بادشاہ کی درازی عمر کے لئے دعا کرتا۔ بادشاہ اس توفیق ایزدی پر سجدۂ شکر بجالا کر محل کو واپس ہوتے اور امرا اور وزرا وغیرہ عاشور خانے میں ٹھہرتے جہاں مجلس عزا شروع ہوتی۔ مجلس کے ختم ہونے کے بعد دسترخوان بچھایا جاتا اور نہایت پر تکلف کھانے (بے گوشت کے) کھلائے جاتے۔ مصری اور گلاب کا شربت پلایا جاتا اور نان ریزہ کے طبق تقسیم کئے جاتے۔ کھانے کے بعد پھر عزاداری شروع ہوتی جس کا سلسلہ آدھی رات تک جاری رہتا تھا۔ دولت خانہ عالی کے باہر بھی جو بڑا عاشور خانہ تھا اور جو کوتوال شہر کی نگرانی میں تھا۔ وہاں بھی اسی طرح کی روشنی ہوتی، مجالس عزا ہوتیں، عزاداروں کی ضیافت کی جاتی تھی۔ ان دو عاشور خانوں کے علاوہ بادشاہ کے اعزہ اور امرا کے متعدد عاشور خانے تھے خصوصاً حیات آباد، کلثوم پورہ، بالاپور، خیرت آباد اور لنگر فیض اثر کے عاشور خانے اپنے علموں اور مجالس عزا کے لئے بہت مشہور تھے۔ ان کے علاوہ مختلف کارخانہ جات جیسے فیل خانہ، طویلہ شاہی وغیرہ کے ملازمین بھی محرم میں قسم قسم کے تازیے اور تابوت بناتے تھے۔

چھٹی محرم کی رات سے روزآنہ عاشورخانے کے علم اور تعازیے دادمحل کے وسیع میدان میں لائے جاتے تھے جہاں ہر طرح
کی روشنی ہوتی تھی۔ علموں کے سامنے محبانِ اہل بیت اور عقیدت مند افراد چھوٹی چھوٹی مشعلیں ہاتھوں میں لئے ہوئے دو رویہ چلتے تھے
جن کے درمیان مرثیہ خوانوں اور ذاکروں کی جماعتیں ہوتی تھیں جب یہ لوگ اس طرح دادمحل کی دیواروں کے بالکل نیچے پہنچ جاتے تو
علموں کے گرد تمام ماتمی جمع ہوکر بہت زور و شور سے نوحہ و بکا کرتے۔ بادشاہ سلامت بھی محل سے برآمد ہوتے اور گریہ و بکا کو دیکھ کر
اور ذاکروں کی زبان سے مصائب کربلا سن کر خود بھی آبدیدہ ہوتے۔ پھر تمام عزاداروں کے لئے محل شاہی سے "نان ریزہ کے طبق"
ارسال کرتے۔ کوتوالِ شہر بادشاہ کی سلامتی کی دعا کرتا اور علم واپس ہوتے۔ عاشورے تک روزآنہ اسی طرح علم لائے جاتے تھے اور
ماتم ہوتا تھا۔ ساتویں کی رات کو ان علموں کے علاوہ قصبہ حیات آباد کے علم اور سرطوق بھی لائے جاتے تھے جن کے ساتھ بڑا مجمع ہوتا تھا
ساتویں کی صبح کو بادشاہ ندی محل میں تشریف لاتے اور شہ نشین میں کھڑے ہوجاتے تھے۔ ایران و ہندوستان کے سفیر، مقامی
وزراء اور امراء اور جملہ طبقات کے ملازمین سب سیاہ لباس پہنے ہوئے اپنے مقام پر کھڑے ہوجاتے تھے۔ دولت خانۂ عالی، لنگر فیض اثر
حیات آباد اور دوسرے مقامات کے علم اس خاص دروازے سے جو دروازہ بارہ امام کے نام سے موسوم تھا محل کے اندر داخل
ہوتے۔ جس کے ساتھ ہندو مسلمان عوام کا انبوہ کثیر ہوتا تھا۔ تمام علم یکے بعد دیگرے بادشاہ کے سامنے لائے جاتے۔ زائرین مصائب
اہل بیت بیان کرتے اور عزادار نالہ و شیون بلند کرتے۔ ہر علم کو ریشمی پارچہ باندھا جاتا اور مجاوروں کو اشرفیوں کے توڑے دئے
جاتے۔ ساتویں کی شام کو بادشاہ چراغوں کو روشن کرنے اور پھول چڑھانے کے بعد خود بھی مجلس عزا میں شریک ہوتے تھے۔ اسی طرح
نویں کی مجلس میں بھی شرکت کرتے اور اپنے ہاتھ سے امراء سفراء کو کافوری شمعیں تقسیم کرتے اور خود بھی مشعل لئے ہوئے عاشورخانے
کے باہر آتے۔ علم عاشورخانے سے نکل کر میدان کی طرف روانہ ہوتے بادشاہ خود بھی کوئی پانسو قدم علموں کے ساتھ پیدل چلتے اور
پھر محل کے ایک بلند حصے میں کھڑے ہوجاتے یہاں اس روز دو بجے تک عزاداری اور شور و شیون کا سلسلہ جاری رہتا تھا۔

یوم عاشورہ کی صبح کو سب لوگ سیاہ پوش و برہنہ پا دولت خانۂ عالی کے عاشورخانے میں جمع ہوتے۔ بادشاہ سلامت بھی اسی طرح
برہنہ پا چلتے ہوئے اُس مسجد میں آتے جو عاشورخانے کے متصل تھی۔ مسجد میں مجلس عزا منعقد ہوتی اور مصائب اہل بیت بیان کئے جاتے
فاتحہ خوانی کے بعد جب مجلس برخاست ہوتی تو بادشاہ مجلس سے نکل کر دولت خانۂ عالی میں داخل ہوتے اور نماز و زیارت حضرت سید الشہداء
علیہ السلام میں مشغول ہوجاتے۔ اس کے بعد خاص و عام کو کھانا کھلایا جاتا تھا اور سادات کے دو سو یتیم و بیسر لڑکے بادشاہ کے حضور میں
پیش کئے جاتے تھے جن کو جام دلائے نفیس لباس اور روپیوں کی تھیلیاں دی جاتی تھیں۔

دارالسلطنت کے علاوہ ریاست کے تمام شہروں، قلعوں اور بندرگاہوں میں بھی علم استادہ کئے جاتے تھے اور مجالس عزا
منعقد کی جاتی تھیں۔ ان کے تمام مصارف سرکار سے ادا کئے جاتے تھے۔ مراسم عزاداری میں نہ صرف مسلمان بلکہ ہندو بھی برابر کے
شریک تھے۔ ہندو، مرد، عورتیں اور بچے کیا امیر و کیا غریب ایام عاشورہ میں غسل کرکے اچھے کپڑے پہنتے مکانات کی صفائی
و آب پاشی کرتے اور پھر نہایت خلوص و عقیدت کے ساتھ شربت کی ٹھلیاں اپنے سروں پر لے کر عاشورخانہ جاتے اور نیاز ادا کرتے۔

علموں کو پھول چڑھاتے، نذرانے دیتے اور حصولِ مراد کے لئے منتیں مانگتے جو بچے ایامِ عاشورہ میں پیدا ہوتے تھے عام اُن کے نام حضرت سید الشہداء کے نام پر "حسین" رکھتے تھے۔

یہ قطب شاہی عہد کے مراسمِ عزاداری کا ایک سرسری خاکہ ہے آج بھی بہت سی اس میں اُسی طریقے پر حیدرآباد میں ادا ہوتی ہیں جس طرح تین ساڑھے تین سو برس پہلے ہوتی تھیں۔

سید محمد

سلام بر شہدائے عالی مقام علیہم السلام

اے سلامی رن کو جب اکبرؑ چلے — ڈالتے سایہ ملک سر پر چلے
لشکرِ اعدا میں بھاگڑ پڑ گئی — کھینچ کر شمشیر جب صفدرؑ چلے
محوِ حیرت یاں ہوئے جن و بشر — واں ملائک بھی تو غش غش کر چلے
جسمِ اطہر چور زخموں سے ہوا — بزدلوں کے تیر چھپ چھپ کر چلے
تین دن کی پیاس یوں لہو سے بجھے — حلق پر مظلوم کے خنجر چلے
دشمنوں نے خون میں نہلا دیا — پیشِ حق، کیا سرخرو ہو کر چلے
صبرِ اہلِ بیتؓ کے جوہر کھلے — اُف نہ کی آرے بھی جو سر پر چلے
حشر میں ہوں گے قسیمِ آب جو — تشنہ ابنِ ساقیؑ کوثر چلے
خون برسائے نہ کیونکر آسماں — ہائے پیاسے سبطِ پیغمبر چلے
ظلم کی شمشیر پر تھی انتہا — اس ستم کے تیر کب کس پر چلے
راہِ حق میں کر دئے، قرباں پسر — رسمِ ابراہیم زندہ کر چلے
لب پہ شکوہ ہی نہ تھا، شبیرؑ کے — یوں چلے اصغرؑ ادھر اکبرؑ چلے
ظلم کی چادر جو اوڑھے تھے شقی — سر برہنہ آلِ پیغمبرؑ چلے

خوں رلاتا ہے غمِ آلِ نبیؐ
دل پہ نوشابہ نہ کیوں نشتر چلے

نوشابہ خاتون

علی عادل شاہ شاہی کے مرثیے

بیجاپور کے آٹھویں تاجدار سلطان علی عادل شاہ ثانی کی شاعری سے ہم واقف ہیں، سلطان کا تخلص شاہی تھا اس کے "ہندوستانی کلیات" پر ہمارے دو تفصیلی مضمون[1] شایع ہو چکے ہیں۔

سلطان کے کلیات میں کوئی مرثیہ نہیں ہے، یہاں ہم سلطان کے دو مرثیے پیش کرتے ہیں۔

گزشتہ محرم میں رسالہ "سب رس" میں قدیم اور جدید شعرا کے جو مرثیے[2] پیش ہوئے تھے ان میں قدیم مرثیے زیادہ تر دکنی اردو سے لئے گئے تھے، لیکن سلطان علی عادل شاہ کا مرثیہ ان میں نہیں تھا اس لئے ان کا تعارف مناسب معلوم ہوتا ہے۔

سلطان علی عادل شاہ کی ولادت ۱۰۴۷ھ میں ہوئی، ۱۰۶۷ھ میں تخت و تاج کا مالک بنا اور ۱۰۸۳ھ میں انتقال ہوا، بیجاپور میں مدفون ہے۔

شاہی کا مذہب امامیہ تھا، اس کو اہل بیت رسالت سے انتہائی خلوص تھا، اس نے منت مانی تھی کہ اگر جنگ میں کامیابی ہوگی تو علم بٹھا کر مرثیہ خوانی کا آغاز کرے گا۔ جنگ کی کامیابی کے بعد "حسینی محل" کی تعمیر خاص اسی غرض کے لئے ہوئی تھی، یہاں محرم میں علم استادہ ہوتے تھے، اس کے عہد کے ملک الشعرا نصرتی نے اپنے ایک قصیدہ میں جو "عاشورہ کے بیان میں" کے عنوان سے لکھا گیا ہے، تفصیل کے ساتھ بیجاپور کے محرم کا تذکرہ کیا ہے۔

نصرتی نے بیان کیا ہے کہ علی عادل شاہ ثانی نے اہل بیت کی توفیق حاصل کر کے ہر سال عرس کرتا ہے، اس نے حسینی محل کی تعمیر اس کی تزئین اور آرائش کی تفصیل کے ساتھ علموں کی سواری، راستوں کی آرایش، آتشبازی، لوگوں کا سوگ بدلنا، پہلوانوں کے کرتب دکھانا وغیرہ امور کی پوری صراحت کی ہے۔

سلطان کے زمانہ میں بیجاپور میں گھر گھر شاعری کا چرچا تھا، عام شاعروں کے علاوہ بعض ایسے شعرا بھی تھے جو صرف "مرثیہ گوئی" کرتے تھے، ان میں مرزا کا نام سب سے زیادہ درخشان نظر آتا ہے، مرزا وہ شخص ہے۔ جس نے اپنی تمام عمر مرثیہ گوئی میں صرف کردی اور سوا مرثیہ کے اور کسی صنف میں شعر گوئی نہیں کی، حتیٰ کہ جب بادشاہ نے اپنے قصیدہ کے لئے اصرار کیا تو ایک مرثیہ میں اپنے تخلص کے بجائے بادشاہ کا نام لکھ دیا، چنانچہ موئف "بساتین السلاطین" کہتا ہے "روزے علی عادل شاہ مرزاں را بحضور طلبیدہ مدارت و عنایات بد و نمود و تکلف نمود، کہ زبان را بمدح بادشاہ آشنا سازد، مرزاں گفت زبانے را کہ در حمد، و نعت و منقبت وقف گردیدہ در حکم من نماندہ بادشاہ مکرر تکلف نمود، ناچار یک دو مرثیہ برزبان سلطان گفتہ بجائے اسم خویش تخلص علی عادل شاہ کہ شاہی بود بہ قسمے داخل نمودہ کہ دو معنی واقع شد

---

[1] رسالہ معارف بابتہ مئی ۱۹۳۳ء اور رسالہ شہاب بابتہ بہمن واسفند ۱۳۴۳ ف۔ مقالات ہاشمی میں اول الذکر مضمون شامل ہے۔

[2] دکنی مرثیوں پر ہمارے متعدد مضامین رسائل، "کتبہ"، "ادبی دنیا"، اور "شہاب" میں شایع ہوئے ہیں، ان میں قدیم دکنی شعرا کے کئی مرثیے پیش کئے گئے ہیں۔ اس کے بعد "دکن میں اردو" کے تیسرے اڈیشن میں چند مرثیے شامل کر دئے گئے تھے۔ اب مقالات ہاشمی حصہ اول میں ہمارے مطبوعہ اکثر مضامین شامل ہیں۔

مرزا کی شہادت بھی ایک مرثیہ لکھتے وقت ہوتی ہے، مطبوعہ (بساتین السلاطین صفحہ ۲۳۳) مرزا کے مرثیوں کے نمونے "مقالات ہاشمی" میں شامل ہیں۔

سلطان علی عادل شاہ کے دو مرثیے ہمارے بزرگ مرحوم مولوی صفی الدین کے کتب خانہ کی بیاض میں موجود ہیں۔ ایک مرثیہ تیرہ شعر کا ہے، اور دوسرا پانچ شعر کا ہے، ایک میں شاہی تخلص ہے اور دوسرے میں علی عادل تخلص آیا ہے، نہیں معلوم یہ مرثیے خود سلطان کی فکر کے نتائج ہیں یا مرزا کے کہے ہوئے چونکہ ہمارے پاس اس کی تحقیق کے لئے کوئی ذریعہ نہیں ہے اس لئے ہم ان کے متعلق کچھ صراحت نہیں کر سکتے۔

ذیل میں دونوں مرثیے درج کئے جاتے ہیں، امید ہے کہ دلچسپی سے دیکھے جائیں گے۔

شہ کے غم سوں دل ہے نالاں ہائے ہائے　　جگ برستے خون ابھالاں ہائے ہائے
جگ کے سرور دل کے لہو سوں بھر چلے　　پھور کر پلکھاں کے بالاں ہائے ہائے
یک شگفتہ گل نہ اس غم سوں رہیا　　ہر خزاں میں بونہالاں ہائے ہائے
دم تری (؟) دل میں دکھ سوں لہو جمیا　　تو پنچتے کہن میں لعلاں ہائے ہائے
اس شہداں کون کھول انکھیاں دیکھ تو　　ہے بروسہ کے اودھاں ہائے ہائے
کربلا کی سب زمین رنگیں ہوئی　　لہو بھری دلدل کے نالاں ہائے ہائے
نین شفق جگ پونچھ کر سنتے ملک　　لہو بھری سوا ور و مالاں ہائے ہائے
گر خوشی ہور خرمی کے کر پرے　　آہ کے چھتے ہیں نالاں ہائے ہائے
اس دکھ سوں یہ کے امتی سب تن منی　　نت جلیں انکھیاں ملالاں ہائے ہائے
اس دکھ سوں حوراں پیتاں ہات کون　　توڑ کر زلفاں کے بالاں ہائے ہائے

نت کریں عادل علی یکس دل ستے
شہ کا ماتم ماہ و سالاں ہائے ہائے

دیگر

جب تے دھریا امام حسن کربلا منے　　تب تے ہوا ہے غم کوں رہن کربلا منے
افسوس صد ہزار کہ سرور حسینؑ کا　　ہو کر رہیا ہے سرخ بدن کربلا منے
جس روز سے او سور چلیا جگ کوں کر وداع　　اس روز تھے ہے سوز رین کربلا منے
ہو لالہ زار سرپو سارے شہید کے　　دستے ہیں لہو سوں لال چمن کربلا منے

نبہ کا دیپک لگا کو جو شاہی نے دھوند کر
پایا ہے پی بہا یو رتن کربلا منے

نصیر الدین ہاشمی

ٖ۱ چونکہ کسی اور جگہ سے اس کی صحت ناممکن تھی اس لئے کاتب نقل کیا گیا ہے۔

بضاعتِ رسالت میں عقیدت مندانہ عرض

تنگ ہے افکارِ دنیا سے مری جانِ حزیں
رحم کرنا حال پر یا بنتِ ختم المرسلیں

التجا جس وقت تک میری نہ ہوگی یہ قبول
آپ کے در پر رگڑتا ہی رہوں گا میں جبیں

جانتا ہوں مانتا ہوں میری قسمت ہے بری
آپ گر چاہیں تو کیا قسمت بدل سکتی نہیں

سارا عالم جانتا ہے ہوں غلامِ پنجتن
ہے حیا کی بات جو میں ہاتھ پھیلاؤں کہیں

مرتبے فضلِ خدا سے دونوں بھی اچھے ملے
زوجۂ شیرِ خدا اور بنتِ ختم المرسلیں

یہ وہ مخدومہ ہے جس کے در کے ہیں شبیہ سا
فخر کرتے ہیں ملائک اور جبریلِ امیں

کربلا میں ہم رہیں جنت کی کیا پروا امیرؔ
مسکن و مدفن کو میسر ہے ہو میسر وہ زمیں

میر امیر علیخاں امیرؔ

رباعیات

(۱)

غمِ شبیر میں جو اشک بہا دیتا ہے
درِ جنت اسے اللہ بہا دیتا ہے
مدحِ شبیر میں اک بیت اگر کوئی کہے
باغِ فردوس میں اک بیت خدا دیتا ہے

(۲)

راضی برضائے حق حسینِ جانباز
تھا طالب و مطلوب میں اک رازو نیاز
سر سجدۂ حق میں اور گلو پر خنجر
تھی آخری وہ حسینِ بیکس کی نماز

(۳)

ترس آلِ محمدؐ پہ نہ آیا صد حیف
تاراج کیا گلشنِ زہرا صد حیف
بے اذن نہ آتے تھے ملک جس گھر میں
اعدا نے اسی گھر کو جلایا صد حیف

میر کاظم علی برقؔ موسوی صاحب

دکن کے مرثیہ نگار شعراء

یہ بات پایۂ ثبوت کو پہنچ چکی ہے کہ اردو میں مرثیہ نگاری کی ابتدا دکن سے ہوئی۔ اگرچہ کہ اس امر کا صحیح پتہ نہ لگ سکا کہ دکھنی مرثیے پہلے کہاں لکھے گئے کیونکہ بیجاپور اور گولکنڈہ دونوں سلطنتوں کے بانی شیعہ مذہب کے پیرو تھے اور ان حکومتوں کے شروع ہی سے مجالس عزا کا دستور پڑ گیا تھا جہاں مرثیہ خوانی بھی ہوتی تھی۔ بیجاپور میں علی عادل شاہ ثانی اور گولکنڈہ میں سلطان عبداللہ قطب شاہ کے زمانے میں خاص طور سے اس طرف توجہ کی گئی اور دکن میں مرثیہ گوئی کا عام رواج ہو گیا۔ بعض شعرا نے مرثیے کے سوا اور کسی صنف میں طبع آزمائی نہیں کی۔ اور اکثر شعرا نے کوئی نہ کوئی مرثیہ ضرور لکھا ہے۔ یہ بات قابل ذکر ہے کہ دکن میں شیعہ سلطنتوں کے زوال کے ساتھ مرثیہ نگاری کو بھی زوال نہیں آیا بلکہ اس کا سلسلہ باقی تھا۔ لیکن بعد میں اسی صنف کو جو ترقی ایک فن کی حیثیت سے لکھنؤ میں حاصل ہوئی وہ دکن میں نہ ہو سکی تھی۔

دکھنی مرثیوں کی سب سے پہلی خصوصیت ان کا مرثیہ پن ہے۔ ان کا اصل مقصد حضرت امام حسینؑ علیہ السلام کا غم تازہ کرنا تھا۔ اس لیے صرف اس بات کا خیال رکھا جاتا تھا کہ رنج و غم کے مضامین اس طرح بیان کیے جائیں کہ واقعات آنکھوں کے سامنے ہو جائیں اور سننے والے کی آنکھوں سے آنسو نکل پڑیں۔ اس بارہ میں دکن کے مرثیے شمالی ہند کے مرثیوں سے مختلف ہیں۔ انیس و دبیر نے مرثیوں میں کردار نگاری، مکالمے اور مناظر قدرت وغیرہ کو شامل کر کے اس فن کو نہایت وسعت دی۔ تاہم بھی دکھنی مرثیے ان سے خالی نہیں ہیں۔ اور ان میں واقعہ نگاری کا بھی ثبوت ملتا ہے۔ اگرچہ مضامین میں شمالی ہند کی گوناگونی نہیں پھر بھی علی اصغر کی شہادت اور امام قاسم اور بی بی سکینہ کی شادی اور جدائی کو تقریباً ہر مرثیہ نگار نے نئے طرز پر باندھا ہے۔ دکن کے مرثیے تاریخی حیثیت سے دہلی اور لکھنؤ کے مرثیوں کے مقابلہ میں زیادہ اہم ہیں کیونکہ ان سے مرثیہ نگاروں کے نام اور اس زمانے کے حالات کا پتہ چلتا ہے۔ اگر یہ بات نہ ہوتی تو اکثر شعرا کے متعلق ہم کو کچھ بھی معلومات نہ حاصل ہوتیں۔

دکھنی مرثیے بالعموم مربع بندوں کی شکل میں لکھے گئے ہیں۔ ہر مرثیے کے پہلے بند کے چار مصرعے ہم قافیہ و ہم ردیف ہوتے ہیں لیکن ہر بند کا چوتھا مصرعہ اسی ردیف و قافیے میں لکھا جاتا ہے جو ابتدائی بند کا ہوتا ہے۔ چند مرثیے مخمس کی شکل میں بھی ہیں۔ سلام، درود و فاتحہ کے لیے عموماً غزل کی طرز اختیار کی گئی ہے۔ بعض مرثیہ نگاروں نے مرثیے بھی غزل کی طرز میں لکھے ہیں۔

اب ہم ہر عہد کے مشہور مرثیہ گویوں کے مختصر حالات اور ان کے کلام کا نمونہ پیش کریں گے جس سے ان شعرا کے کمال کے ساتھ زبان کی تدریجی ترقی کا بھی بخوبی اندازہ ہو سکتا ہے۔

قطب شاہی مرثیہ نگار

وجہی۔ اگرچہ اس بات کا پتہ نہ لگ سکا کہ بیجاپور اور گولکنڈہ کی سلطنتوں میں سے پہلے کس جگہ مرثیہ نگاری کی ابتدا ہوئی۔ لیکن اس وقت جو قدیم ترین مرثیہ دستیاب ہوا ہے وہ گولکنڈہ کے شاعر وجہی کا ہے۔ وجہی کئی حیثیتوں سے اس عہد کا سب سے بڑا شاعر کہلانے کا مستحق ہے۔ اور یہی وہ شخص ہے جس کی نثر و نظم دونوں کے نمونے موجود ہیں۔ وجہی کی شاعری کا زمانہ ابراہیم قطب شاہ کے عہد سے شروع

اور عبداللہ قطب شاہ کے عہد میں بھی وہ زندہ تھا۔ وجہی اپنی مثنوی قطب مشتری اور نثر سب رس کی وجہ سے بہت مشہور ہے۔ اس کی کئی غزلیں اور رباعیاں بھی ملتی ہیں لیکن مرثیہ صرف ایک ہی دستیاب ہوا ہے۔ یہ مرثیہ حسب ذیل ہے ؎

حسین کا غم کرو عزیزاں | انجو نین سوں بھرو عزیزاں
بناجو اوّل ہوا ہے غم کا | عرش گگن ہور وعرت ہلایا
قضا میں جوں جوں لکھیا الٰہی | گریا حسینؑ پر او ہیں سمایا
یو کیا بلا تھا یو کیا جفا تھا | مگر قضا تھا سو یو دکھایا

محمد قلی قطب شاہ

یہہ گولکنڈہ کا اہم بالشان بادشاہ اور بہت بڑا شاعر تھا۔ اس نے ۹۸۸ھ سے ۱۰۲۰ھ تک حکومت کی۔ اس کا اسلوب بیان نہایت سادہ ہے اور اس کے کلام میں فارسی کے ساتھ ساتھ ہندی الفاظ کی آمیزش ہے۔ اس نے فارسی کے برخلاف ہندی اسلوب اختیار کیا ہے۔ اس نے مختلف اصناف سخن میں شاعری کی ہے۔ اس کے کلام میں مثنویاں۔ قصیدے۔ مرثیے۔ غزل۔ ترجیع بند اور رباعیات شامل ہیں۔ اس کے عہد میں مرثیہ نگاری کی طرف کافی توجہ کی گئی۔ کلام کا نمونہ درج ذیل ہے۔

آج شہ چیں چلیا شرق نگر تھے شتاب | ڈھال فلک کی اچا وہ شہ عالی جناب
باندھ خنجر کرن کی زرین فرنگ ہاتھ لے | صبح کے وقت آ بیا پکے دو پیالی شراب

نوحہ۔ دو جگ اماں دکھ تھے سب جیو کرتے زاری وائے وائے | تن روں کی لکڑیاں جال کر کر تے خواری وائے وائے
پنکھی سٹے ہیں سب پران دو دو بھرائے سمدراں | چھوڑے ہیں سب اپنے گھراں دیکھو توزاری نئے وائے

عبداللہ قطب شاہ۔ ۱۰۳۵ھ تا ۱۰۸۳ھ

سلطان محمد قطب شاہ کا فرزند اور جانشین عبداللہ قطب شاہ بھی شاعر تھا۔ اس کا تخلص عبداللہ تھا۔ اس نے سیاسی مشکلات کے باوجود ادبی ذوق کو ترک نہ کیا۔ اس کے عہد میں اردو کو بہت ترقی ہوئی اور ریختی ایک مستند زبان بن گئی۔ مرثیہ نگاری میں بھی کافی ترقی ہوئی سلطان کے کلام میں لفظی شان و شوکت اور سلاست خاص طور پر قابل ذکر ہیں۔ مرثیہ کے چند اشعار ذیل میں درج ہیں ؎

علی ہور فاطمہ کرتے ہیں دونوں آج زاری بھی | حسن کا ہور حسین کا دکھ لے آیا جگ پو خواری بھی
حسین جب چلے لڑنے سراں بھیں پر لگے پڑنے | شہیداں ہر طرف جرنے لگیا یو دکھ بیاری بھی
شہر بانو کہے اگر کر اے سنسار کے سرور | منجے غربت منے بھاکر نجاؤ چھوڑ باری بھی

غواصی۔ یہہ ابراہیم قطب شاہ کے عہد میں پیدا ہوا اور محمد قلی کے عہد میں مشہور ہوا۔ سلطان عبداللہ کے عہد میں اس کو شاہی تقرب حاصل ہوا۔ وجہی کی طرح یہ بھی ایک اعلیٰ شاعر تھا۔ اس کی دو مثنویاں زیادہ مشہور ہیں۔ ایک سیف الملوک و بدیع الجمال اور دوسری طوطی نامہ اس کے انتقال کی تاریخ یقینی طور پر معلوم نہیں۔ لیکن خیال کیا جاتا ہے کہ عبداللہ قطب شاہ کے زمانے ہی میں اس کا انتقال ہوا۔ اس کے

کلام میں ہندی الفاظ زیادہ پائے جاتے ہیں۔ کلام سادہ اور تصنع سے پاک ہے۔ اس کا طرز بیان دلکش ہے اور اس کی قادر الکلامی
ظاہر کرتا ہے۔ اس کے چند غزلیات اور مرثیے بھی دستیاب ہوئے ہیں ؎

دستا نہیں کروں کیا وہ بھان کربلا کا	پھرتا ہوں زار ہوں میں حیران کربلا کا
اسمان تے خدایا جبرئیل اوذکو آیا	روزا اوپر تے لایا فرمان کربلا کا
دکھ سہر ملک لئے ہیں ماتم زدے ہوئے ہیں	رو رو دریا کئے ہیں اسمان کربلا کا

لطیفت۔ غلام علی خان لطیفت عبداللہ قطب شاہ کے عہد کا شاعر ہے۔ امامیہ مذہب کا پیرو تھا۔ وہ محض تفنن طبع کی خاطر شاعری کرتا
پر گو شاعر تھا۔ ایک سال کی مدت میں پانچ ہزار پانچسو اشعار کی ثنوی لکھ دی۔ اسے اپنی شاعری کے علاوہ اپنی شرافت امد امارت پر
فخر تھا۔ وہ اپنی ثنوی ظفرنامہ کی وجہ سے مشہور ہے۔ مرثیے بھی کہا کرتا تھا۔

اے اہل دل اشک سوں انکھیاں کوں تر کرو	نکلیا ہے پھر یو ماہِ محرم نظر کرو
یو آہ و فغاں سن کر عباس علی	چلے مسکرا تنے نیر نین مبلے
کہے تب حسینا کہ اے میرے بھائی	کہ بکی نیں کرتے ہم تے جدائی

افضل۔ افضل کے متعلق بہت سے اختلافات ہیں۔ کیونکہ اس نام کا ایک شاعر شمالی ہند میں بھی گذرا ہے۔ دکن کے افضل کے
صرف اتنا معلوم ہے کہ وہ اس دور کے آخری زمانے سے تعلق رکھتا ہے اور گولکنڈہ کے ختم ہو کر سلطنت مغلیہ میں شامل ہو جانے کے
یہ حیدر آباد میں موجود تھا۔ میراں شاہ معروف کا مرید اور ان سے خلافت حاصل تھی۔ اس کی تصانیف میں ایک ثنوی محی الدین
کا پتہ چلتا ہے۔ مرثیے بھی دستیاب ہوئے ہیں۔ اس کے کلام میں فارسیت غالب ہے ؎

حسین کا دلبر و دلدادہ قاسم	حسین کا مونس و غم خوار قاسم
کشیدہ رنج و غم بسیار قاسم	جہاں سوں دیدۂ خونبار قاسم

گیا از بد عنت کفار قاسم

شاہی۔ شاہ قلی خاں نام۔ شاہی تخلص گولکنڈہ کا نامور مرثیہ گو تھا۔ وہ امامیہ مذہب کا پیرو تھا۔ اور سختی کے ساتھ مذہب
پابند تھا۔ پہلے وہ گولکنڈہ کی فوج میں شامل تھا۔ لیکن بعد میں اسے دربار میں جگہ ملی۔ تانا شاہ نے اس سے مرثیہ لکھنے کی فرمایش کی
مرثیوں نے تھوڑے ہی عرصہ میں کافی شہرت حاصل کر لی۔ چنانچہ اورنگ زیب کے سپاہیوں نے ان کو زبانی یاد کر لیا اور اس طرح وہ شمال
میں پہنچ گئے۔ اس کا ایک مرثیہ لاجواب ہے جس میں اس نے اس واقعہ کا ذکر کیا ہے جب کہ حضرت امام حسین کی شہادت کے بعد آ
خاندان قید ہو کر دمشق کو جاتا ہے۔ اس واقعہ کا طرز بیان انیس کے مماثل ہے۔ زبان بھی اعلیٰ اور شاعرانہ ہے۔ نمونۂ کلام ذیل
درج ہے۔

ہائے غریب یتیم نمانی عابد تیری زاری ہے	باپ کا مرنا دکھ بھرنا تس پر یو بیماری ہے
کہا بہشت سے پیام لیا یا عابد تیری دادی کا	کٹھن گھڑی ہو پوتے میرے تجھ پہ نگساری ہے

کاظم ۔ کاظم کے متعلق صرف اس قدر معلوم ہے کہ وہ گولکنڈہ کا شاعر تھا۔ وہ صرف مرثیہ نگار ہی تھا۔ اس کے مرثیوں کی خصوصیت یہ ہے کہ ان میں مرثیہ پن اور ادبیت دونوں پائے جاتے ہیں۔ مرثیہ کا نمونہ حسب ذیل ہے ؎

رکھنا امام دیں کے تیں جنگل منے بی آب و نان　　طفلاں کوں ان کے بے گنا غم میں رلانا کہاں روا

جن کو بٹھاتے تھے نبی دوش مبارک پر مدام　　نیزہ پر ان کے سر کئیں رکھ کر پھرانا کہاں روا

مرزا ۔ ابو القاسم مرزا تانا شاہ کے دربار کا مشہور مرثیہ گو تھا جب تانا شاہ کو قید کر لیا گیا تو اس کو اس قدر رنج ہوا کہ اس نے فقیری اختیار کر لی اور بقیہ زندگی گوشہ نشینی میں گذار دی۔ اس کے کئی مرثیے دستیاب ہوئے ہیں جن سے پتہ چلتا ہے کہ مرزا مشکل زمینوں میں مرثیے لکھا کرتا تھا۔ اس کا کلام سوز و گداز کے باعث اعلیٰ درجہ کا قرار دیا جا سکتا ہے۔ اگرچہ زبان کے لحاظ سے صاف نہیں لیکن پر اثر ضرور ہے۔ علی اصغر (ر) شہادت کے متعلق کہتا ہے ؎

کہوں دکھ درد اصغر کا وہ نور چشم سرور کا　　شہ غازی کے جوہر کا کرو زاری مسلماناں

عزیزاں دل ہوا پرخوں یوسن اصغر کے ماتم کوں　　کئے معصوم شہادت سوں کرو زاری مسلماناں

عادل شاہی مرثیہ نگار

نوری ۔ اس شاعر کے بارے میں بہت سے اختلافات ہیں کیونکہ اس تخلص کے دو شاعر گذرے ہیں۔ ایک بیجاپور میں اور ایک گولکنڈہ میں۔ بہر حال خیال کیا جاتا ہے کہ مرثیہ نگار نوری بیجاپوری سے تعلق رکھتا تھا۔ اس کے کلام کا نمونہ حسب ذیل ہے۔

کوئی نظم اس میں تو کرتا نہ تھا　　ولے سب تعصب دیا ہم ہٹا

نہ کچھ خوف کھایا نہ جھجکا ذرا　　وہم مرثیے سے بہل کر دیا

ہاشمی ۔ سید میراں نام اور ہاشمی تخلص۔ علی عادل شاہ کا درباری شاعر تھا۔ یہ مادر زاد اندھا تھا۔ اس نے ایک مثنوی یوسف زلیخا سے موسوم ہے ۱۰۹۹ھ میں مرتب کی۔ غزلوں کا دیوان بھی مرتب کیا۔ اس کا کلام زبان کی صفائی کے لحاظ سے قابل تعریف ہے ؎

دلبند مصطفےٰ کا تابوت لے چلے ہیں　　فرزند مرتضیٰ کا تابوت لے چلے ہیں

سلطانِ دو جہاں کا تابوت لے چلے ہیں　　مظلوم کربلا کا تابوت لے چلے ہیں

مرزا ۔ علی عادل شاہ کے عہد کا سب سے بڑا مرثیہ گو تھا۔ اس نے مرثیے کے علاوہ اور کسی صنف میں طبع آزمائی نہیں کی۔ مرثیہ گوئی کا ایسا شوق تھا کہ انتقال کے وقت بھی ایک مرثیے کا عنوان لکھ رہا تھا۔ اس کو بادشاہ کا تقرب حاصل تھا پھر بھی اس نے کبھی بادشاہ کی مدح نہ کی۔ ایک وقت بادشاہ نے خود خواہش کی تو ایک مرثیے میں اپنے نام کی بجائے بادشاہ کا نام لکھ دیا۔

مرزا مرثیہ گوئی کو مذہبی فرض خیال کرتا تھا اس لئے کہا جاتا ہے کہ اس کو خواب میں بھی اس کی تلقین ہوتی تھی۔ چنانچہ بیان کیا جاتا ہے کہ ایک روز مرزا مرثیہ لکھ رہا تھا۔ ایک مصرعہ موزوں ہوا تھا کہ ؎

دلاں پھاکاں اناراں کر کھو سینہ طبق میانے

دوسرے مصرعہ کے لئے مضمون نہیں مل رہا تھا۔ اسی سوچ میں تھا کہ اس پر مدہوشی طاری ہوئی۔ دیکھا کہ آنحضرت صلعم

لائے ہیں اور فرماتے ہیں ؎

نبی روبرے محشر کوں یو تحفہ لے کے جاتا ہے

مرزا نے یہی کہہ کر مرثیہ پورا کیا۔ اس کی شہادت یوم عاشورہ ہوئی۔ کہا جاتا ہے کہ ایک مرثیہ لکھ رہا تھا کہ کسی نے خنجر

ہلاک کر دیا۔ اس کے انتقال کا سنہ ٹھیک طور پر معلوم نہیں۔ خیال کیا جاتا ہے کہ ۱۱۰۰ھ سے پیشتر اس کا انتقال ہوا۔

کلام کا نمونہ حسب ذیل ہے۔

شریعت اساسے پہ اپنا ستم — حقیقت ثنا سے پہ اپنا ستم

نبی کے نواسے پہ اپنا ستم — سب امت کے آسے پہ اپنا ستم

قطب شاہیوں اور عادل شاہیوں کے بعد ۱۰۹۸ھ میں پورا دکن مغلیہ سلطنت میں شامل ہوگیا۔ دکن پر مغلوں کی

۱۱۳۵ھ تک رہی۔ اس ۳۷ سال کے عرصہ میں اردو کے کئی شعرا مشہور ہوئے۔ جن کا کلام آج تک موجود ہے۔ اب گولکنڈہ

بیجاپور کی بجائے اورنگ آباد پایۂ تخت قرار پایا اور تمام شعرا اور باکمال اشخاص کا مرکز بن گیا۔ اس دور میں بھی کئی مرثیہ گو

جن میں سے مشہور حسب ذیل ہیں۔

دور مغلیہ کے مرثیہ نگار

ولی اورنگ آبادی:۔ ان کا نام ولی محمد تھا۔ اورنگ آباد کے رہنے والے تھے اور تحصیل علم کے لئے گجرات گئے اور ایک عرصہ تک

اقامت اختیار کرلی۔ مولانا عبدالحق صاحب کی تحقیقات کے بموجب سنہ ۱۱۱۹ھ میں انتقال کیا۔ ولی کے دیوانوں میں ان کا کوئی مرثیہ

نہیں ہے لیکن ایڈبرا کی بیاض میں شامل ہیں۔ ولی کے مرثیے غزل کی طرز میں لکھے گئے ہیں ؎

غوغا ہوا ہے جہاں میں شہ کے وصال کا — سینے منے پڑا ہے چھالا اس ملال کا

محتاج ہیں جہاں کے محباں تمام مل — دیدار چاہتے ہیں مبارک جمال کا

یوجی ولی فدا کر اس شاہِ کربلا پر — اس لایق ثنا پر بو سلام یاراں

ذوقی:۔ ان کا نام سید شاہ حسین ذوقی تھا۔ اور ان کے مرشد شاہ خاں محمد نے ان کو بحر العرفان کا خطاب عطا کیا تھا۔ ا

اور اپنی شاعری پر فخر بھی کرتے تھے۔ ان کی مثنوی وصال العاشقین بہت شہرت رکھتی ہے۔ ان کی غزلیں اور مرثیے بھی مشہور

نمونہ کلام حسب ذیل ہے ؎

تب ہزار دل درد و غم سوں شہربانو نے کہا — مجھ کوں کس کس کوں سونپ کر جاتے ہو اے سرو تن

تم بنا اے جانِ جاناں کیوں کرکروں میں زندگی — تم بناں کس کوں کہوں میں یہ اپس کا دکھ کٹھن

اشرف:۔ سید اشرف اس دور کے اچھے شعرا میں سے تھے۔ شیعہ مذہب کے پیرو تھے۔ عمر غربت میں بسر ہو

جنگ نامہ حیدر یادگار چھوڑی جس کا سنہ تصنیف ۱۱۲۵ھ ہے۔ ان کے مرثیوں میں ادبیت پائی جاتی ہے۔ یہ بھی معلوم ہوتا ہے کہ انھیں فطرت نگاری کا خوب ملکہ تھا۔ مرثیہ کا نمونہ حسب ذیل ہے۔

بانو کہیں اصغر نہیں اب میں جھلاؤں کس کے تئیں　　سونا ہوا ہے پالنا اب میں سلاؤں کس کے تئیں
نہلا کے میں کپڑے پنا اس کو بناتی گل نمن　　وہ پھول سوکھ نیرن اب میں بناؤں کس کے تئیں

ولی ویلوری۔ سید محمد فیاض نام اور ولی تخلص تھا۔ ویلور جو مدراس کے علاقہ میں ہے۔ اس کا وطن تھا۔ دکن میں سات گدھ کے نواب سعادت خاں کا درباری تھا۔ اس کے بعد سوہوٹ کے قلعہ میں ایک عہدہ پر مامور کیا گیا۔ ارکاٹ میں انتقال ہوا۔ بہت مذہبی آدمی تھا۔ اس کی دو مثنویوں کا پتہ چلا ہے۔ مثنوی رتن پدم اور دعائے فاطمہ۔ روضتہ الشہدا بھی مثنوی کی طرز میں ہے لیکن اس کو مرثیہ کہہ سکتے ہیں۔ نمونہ کلام یہ ہے۔

سو حملہ کر تنگ چودھر سوں کفار　　لگے کرنے بدن پر شاہ کے وار
لگے تب شہ کوں زخماں تن پو سارے　　ادچھلنے کوں لگے لہو کے فوارے
دیکھے نیں ہاتھ میں ہلنے کون قوت　　نہ کچھ پیرن میں رہی چلنے کون قوت

یتیم احمد۔ یتیم احمد نام اور یہی تخلص بھی تھا۔ اور برہان پور کا باشندہ تھا۔ شاید مرثیوں کے سوا کسی اور صنف میں شاعری نہیں کی۔ سات مرثیے دستیاب ہوئے ہیں جن میں سے دو حضرت امام حسین کی شان میں قصیدے ہیں۔ ان مرثیوں کی زبان ہمعصروں کے مقابلے میں صاف اور سلیس نہیں ہے۔ مرثیوں کا نمونہ ذیل میں درج ہے۔

حیف گھائل حسین تن تیرا　　جسم پر خوں ہے پیرہن تیرا
تو کہاں ہور کدھر ہے تن تیرا　　کیوں بسیرا ہوا ہے رن تیرا
نہیں ملتا بوند کسی کنے پانی
سخت طفلاں کے سر پو حیرانی

ندیم۔ سید شاہ ندیم اللہ حسینی نام ندیم تخلص بیجاپور کے باشندے تھے۔ عالمگیر کی فتح کے بعد مشہور ہوئے۔ مرثیوں کے سوا اور کوئی کلام دستیاب نہیں ہوا۔ نمونہ حسب ذیل ہے۔

ہے ہے اصغر ابن حسین سونا تیرا پالنا　　رو رو بانو کرتے ہیں بین سونا تیرا پالنا
تجھ بن بانو ہے بیحال اہو میں بکھرے سر کے بال　　کہتے ہے ہے میرا لال سونا تیرا پالنا

مغلیہ دور کے مرثیے ادبیت اور سوز و گداز کے لحاظ سے قابل ذکر ہیں۔ اور زبان کی تدریجی ترقی کے لحاظ سے اس دور کا کلام کافی صاف ہے۔ اس عہد میں چونکہ ولی ویلوری کی روضتہ الشہدا مثنوی کی شکل میں لکھی گئی تھی اس کے بعد کے اکثر مرثیہ نگاروں نے اس وقت کی مروجہ شکل کو اظہار واقعات کے لئے محدود دیکھکر مثنوی ہی کی شکل میں لکھنا پسند کیا۔ چنانچہ

اس کے بعد وہ مجالس وغیرہ اسی قسم کی مثنویاں لکھی گئیں۔

سنہ ۱۱۲۰ھ تک مغلیہ سلطنت کو زوال آچکا تھا۔ چنانچہ اس سنہ میں آصفجاہ اول نے سلطنت آصفیہ کی بنیاد ڈالی۔ اس دور میں اردو کو بڑی ترقی نصیب ہوئی اور نظم و نثر کی کئی کتابیں لکھی گئیں اور شعراء کے تذکرے مرتب کیے گئے۔ اس دور میں بھی کئی مرثیہ گو شعراء گذرے ہیں۔ ان میں سے چند حسب ذیل ہیں۔

دور آصفیہ کے مرثیہ نگار

رضی :۔ حافظ رضی الدین اس دور کا بڑا مرثیہ نگار ہے۔ اس کے مرثیوں کی دکن میں بڑی شہرت تھی اور ان کی تضمین کی جاتی تھی۔ اس کے مرثیوں میں ادبیت نہیں پائی جاتی۔ بلکہ وہ اپنے سوز و گداز اور مرثیہ پن کی وجہ سے مقبول عام تھے۔ کلام کا نمونہ پیش ہے ؎

آل نبی کے غم سوں لہو روتے ہوں یوں پکارا — دل میرود ز دستم صاحب دلاں خدارا
دل میں چھپا رکھا تھا حضرت حسین کا غم — دردا کہ راز پنہاں خواہد شد آشکارا
ظلم دشت کربلا میں دیکھ بے حد و شمار — امتی محشر تلک روتے میں دکھ سوں زار زار

قادر :۔ ان کا سنہ پیدائش اور وفات دونوں معلوم نہیں ہیں۔ خیال کیا جاتا ہے کہ ۱۱۴۹ھ میں وہ زندہ تھا اور اس سے قبل فوت ہو چکا تھا۔ میر عبدالقادر نام تھا اور ایک مشہور مرثیہ گو تھے۔ ان کے مرثیوں سے ان کی علمی قابلیت کا ثبوت ملتا ہے۔ معلوم ہوتا ہے کہ علم نجوم اور ہندسہ میں بھی مہارت رکھتے تھے۔ ان کے مرثیے تسلسل، سادگی اور جذبات انسان کے ترجمانی کے لحاظ سے قابل تعریف ہیں ؎

ہوا شہرت محرم میں جو غم ہے شاہ عالی کا — کہ ہے فرزند پیارا وہ دونوں عالم کے والی کا
قیامت کا نپنا تھا اور تنزلزل جب کرے ظاہر — مجھے تقویٰ تب آخر ہے حسین سرور سے والی کا

روحی :۔ روحی کے متعلق صرف اس قدر معلوم ہے کہ حیدرآباد کے میرزادے تھے۔ ہاشم علی برہان پوری کے ایک شعر سے معلوم ہوتا ہے کہ ان کی زندگی میں یہ انتقال کر چکے تھے۔ ان کے مرثیے غزل کی طرز پر لکھے گئے ہیں اور ادبی حیثیت سے قابل ذکر ہیں۔

آج غمناک شہ ہیں چمن کے گل — بلکہ دل چاک شہ ہیں سمن کے گل
یوں نہ لالے شفق کے دستے ہیں — لہو میں ڈوبے ہیں سب گگن کے گل

امامی :۔ اس کے متعلق کچھ بھی علم نہیں۔ اس کے تخلص سے اس کے شیعہ ہونے کا پتہ چلتا ہے۔ اور ہر مرثیہ کے ختم پر وہ اپنا یہ عقیدہ پیش کرتا ہے کہ حضرت امام حسین کا مداح ہونے کی وجہ سے اس کے گناہ معاف ہو جائیں گے۔ وہ معمولی مرثیہ گو نہیں تھا۔ اس کا اسلوب بیان دلکش ہے اور اس کے مرثیے ڈرامائی اثر رکھتے ہیں۔ بحریں نہایت دلچسپ استعمال کی ہیں۔ مرثیوں کا نمونہ حسب ذیل۔

محشر میں جب محمد شاہ زمن اٹھیں گے — سب انبیائے مرسل پر غم حزن اٹھیں گے
حیدر علی لوہو سوں آلودہ تن اٹھیں گے — لیتے لوہو کے ہلکاں ہے ہے حسن اٹھیں گے

ہاشم علی۔ ہاشم علی اس دور کا مشہور مرثیہ نگار ہے۔ ۱۱۶۹ھ تک اس کے بقید حیات رہنے کا پتہ ہے۔ شیعہ مذہب کا پیرو تھا اور مرزا بیجاپوری کی طرح سوائے مرثیے کے اور کسی صنف میں طبع آزمائی نہیں کی۔ اور اس کے عقیدہ کے مطابق اس کے مرثیے سننے کے لیے آنحضرت خواب میں تشریف لایا کرتے تھے۔ اس کے مرثیوں کا مجموعہ دیوان حسینی کے نام سے موسوم ہے جس میں ردیف وار مرثیے ہیں۔ ہاشم علی کے مرثیے مکالمے کی طرز کے ہیں جس کی وجہ سے دلچسپ بھی ہیں۔ کلام کی پختگی سے اندازہ ہوتا ہے کہ زبان کس قدر ترقی کر چکی تھی۔ نمونہ کلام حسب ذیل ہے۔

آج پر خوں کفن ترا اصغر — آج سوکھا دہن ترا اصغر
لال ہے گلبدن ترا اصغر — حیف یو بالین ترا اصغر
جلوہ سیں اٹھ کے رن کو چلا تب کہی : لہن — دامن پکڑ کے لاج سوں انجھوال بھرنے نین
مت چھوڑ کر سدھارو تم اس حال میں ہمن — تم بن رہے گا ہائے یہ سونا ہوں میرا

نظر۔ سید محمد علی نام اور نظر تخلص۔ اورنگ آباد کے مشہور شاعر تھے۔ درویش منش آدمی تھے۔ ہر آٹھویں روز مشاعرہ کرتے۔ دوپہر تک طالب علموں کو درس دیا کرتے پھر شعر و سخن کا چرچا رہتا۔ ان کا کلام حسب ذیل ہے۔

اصغر کوں شہ نے گود میں لے کر ننگے ہو نیر — ملعون نے جواب میں مارا ستم کا تیر
بیداد کیا کیا تری تقصیر یو صغیر — یا نا نہیں زبان نہیں دست و پا نہیں

درگاہ۔ درگاہ قلی خاں المتخلص بہ درگاہ۔ موتمن الدولہ سالار جنگ بہادر خطاب تھا۔ خاندان قلی خاں کے فرزند تھے۔ خاندان نواب سالار جنگ کے آپ ہی مورث اعلیٰ ہیں۔ آصفجاہ اول نے آپ کی سرپرستی فرمائی جس وقت آپ کی عمر چار سال کی تھی جاگیر اور منصب عطا فرمایا۔ بیس سال کی عمر سے آپ آصفجاہ اول کے ہمرکاب رہنے لگے۔ نواب ناصر جنگ اور نواب صلابت جنگ مرحوم کے زمانے میں آپ کے مدارج میں اور ترقی ہوئی اور خطاب سے سرفراز کئے گئے۔ ایک زمانے تک صوبہ خجستہ بنیاد کے صوبہ دار رہے۔ ۱۱۹۵ھ میں خدمت سے علحدہ ہو کر اپنی جاگیر میں گوشہ نشین ہو گئے۔ ۱۱۹۸ھ میں آپ کا انتقال ہوا اور اورنگ آباد میں باپ کے مقبرہ میں دفن کئے گئے۔ فارسی کے اچھے شاعر تھے۔ اردو میں بھی طبع آزمائی کی ہے۔ زیادہ تر مرثیے کہا کرتے تھے ؎

ہوئی صبح شہادت اب بجاؤ طبل رحلت کا — اٹھائے اس جنازے کوں پڑھو کلمہ شہادت کا
مدینہ میں لیجا جلدی کرو اب دفن میت کا — محمدؐ سے کہو آیا جگر خاتون جنت کا

مائل۔ ڈاکٹر احمد حسین المتخلص بہ مائل حیدرآباد کا مشہور شاعر تھا۔ شمالی ہند کے مشہور شعرا میر، انیس، سودا وغیرہ کے جواب میں ان کی غزلیں قابل ملاحظہ ہیں۔ وصفی کے شاگرد تھے۔ نظم میں کئی کتابیں شائع کی ہیں۔ مائل کے کلام سے ان کے استاد فن ہونے کی پوری تصدیق ہوتی ہے۔ بلند خیالی، صفائی زبان، رنگینی مضمون اور تاثیر وغیرہ کے لحاظ سے قابل تحسین ہے۔ ۱۳۳۳ھ میں انتقال ہوا حیدرآباد میں مدفون ہیں کلام کا نمونہ حسب ذیل ہے ؎

زبان جرأت پسر ابن مرتضیٰ — زخمی کیا تھا جس نے اسی پر جھپٹ پڑا
تلوار کی زبان سے سر کر دیا جدا — حیدر نے دی صدا کہ مرے شیر مرحبا

آنے لگا جو غش تو پکارا حسین کو
بابا سنبھالو آکے اب اس نورِ عین کو

مسرور۔ میر محمد علی نام مسرور تخلص ۔حیدر آباد کے رہنے والے اور یہاں کے ایک قدیم خاندان سے تعلق رکھتے ہیں ۔ ناجیؔ کے شاگرد ہیں مرثیہ گوئی میں کمال حاصل کیا ہے ۔ اپنے رنگ میں فی الوقت اپنا مقابل نہیں رکھتے ۔

تیغ زن آکے جو نزدیک ستم ڈھاتے ہیں — پیچ دستار کے رنگین نظر آتے ہیں
رُخ سے سہرے کی کئی لڑیوں کو سرکاتے ہیں — دل سے کہتے ہیں ہم ارمان بھرے جاتے ہیں

بیاہ کا ہونا بھی پیغام اجل کا ٹھیرا
رنگ مہندی کا ہمیں خون تمنا ٹھیرا

تلوار۔
خم کا وہ حسن کہ وہ جانتا ہے کٹ کٹ کے ہلال — جوہر ایسے ہیں کہ جن سے چمن خلد نہال
گھاٹ وہ گھٹ گئی جس سے سپہ زشت خصال — باڑھ وہ جس سے بڑھی آرزوئے اہل کمال

دیدۂ اہل نظر میں یہ جگہ پاتی ہے
حلقۂ موئے میاں کہتے ہیں بن جاتی ہے

آصفیہ دور کے مرثیوں کے دیکھنے سے معلوم ہوتا ہے کہ اس فن میں کافی ترقی ہوئی۔ اور مرثیوں کو زیادہ پراثر بنانے کے لئے کربلا کے واقعات ہندوستانی رنگ میں پیش کیا گیا۔ اور حضرت علی اور امام قاسم کے واقعات کو نئے نئے طریقوں سے باندھا گیا۔ کلام کو سادہ اور عام فہم بنانے کی بھی کوشش کی گئی اور بہت سے پرانے الفاظ متروک کر دئے گئے۔

۱۲۲۰ھ کے بعد سے ایک اہم تغیر یہ ہوا کہ دکھنی زبان کی بجائے دہلی اور لکھنؤ کی زبان نظم و نثر میں استعمال ہونے لگی۔ استادانِ دہلی و لکھنؤ کے یہاں جمع ہو جانے کے باعث عام طور سے اسلوب بیان میں فرق ہو گیا۔ زبان میں صفائی کے ساتھ ساتھ تکلف زیادہ ہو گیا تشبیہوں اور استعاروں سے کام لیا جانے لگا۔ اس دور میں لوگ نثر کی طرف زیادہ متوجہ ہو گئے۔ دکن میں اردو ادب کے پہلے زینے کا آغاز مثنویوں سے ہوا پھر غزل گوئی کا دور شروع ہوا۔ اس کے بعد دکھنی شعراء غزل سے پھر مثنوی و نظم کی طرف متوجہ ہو گئے۔ غزل گوئی بھی متروک نہیں ہوئی لیکن یہ امر ضرور واقع ہوا کہ زبان اور اسلوب میں نمایاں اور بیّن فرق ہو گیا۔ اسی زمانے میں نیچرل شاعری اور قومی نظموں کی بنیاد پڑی۔

آصفی دور کے ابتدائی حصہ میں زیادہ مرثیہ نگاروں کا ذکر ملتا ہے۔ اس کے بعد بھی اگرچہ اردو کو ترقی ہوتی رہی اور بہت سے نامور شاعر پیدا ہوئے لیکن ایسے شعرا جنھوں نے صرف مرثیہ ہی کی صنف میں طبع آزمائی کی بہت کم ہیں۔ اس کی وجہ شاید یہ تھی کہ دلی اور لکھنؤ کے اثر سے شعراء کی تمام تر توجہ غزل کی طرف مبذول ہو گئی تھی۔ اس کے ساتھ ہی قصیدہ گوئی کا رواج بھی زیادہ ہو گیا تھا۔ دکھنی مرثیہ گوئی کی تاریخ کے مطالعہ سے یہ ظاہر ہوتا کہ یہ فن دکن میں کافی ترقی کر چکا تھا جس وقت شمالی ہند میں اس کی طرف توجہ کی گئی۔ اور اکثر لوگوں کا یہ خیال کہ مرثیہ گوئی کا سلسلہ دکن میں بالکل ٹوٹ گیا تھا اور میر ضمیر وغیرہ کو نئے سرے سے اس کو ایجاد کرنا پڑا بالکل غلط ہے۔ یہ کہنا البتہ صحیح ہے کہ انیس و دبیر نے مرثیہ گوئی کو معراج کمال کو پہنچا دیا اور آج تک کوئی دوسرا مرثیہ نگار ان کے مقابل کا پیدا نہ ہوا۔

افسر النساء بیگم
بی اے (آخری)

نواب رفعت یار جنگ اولی
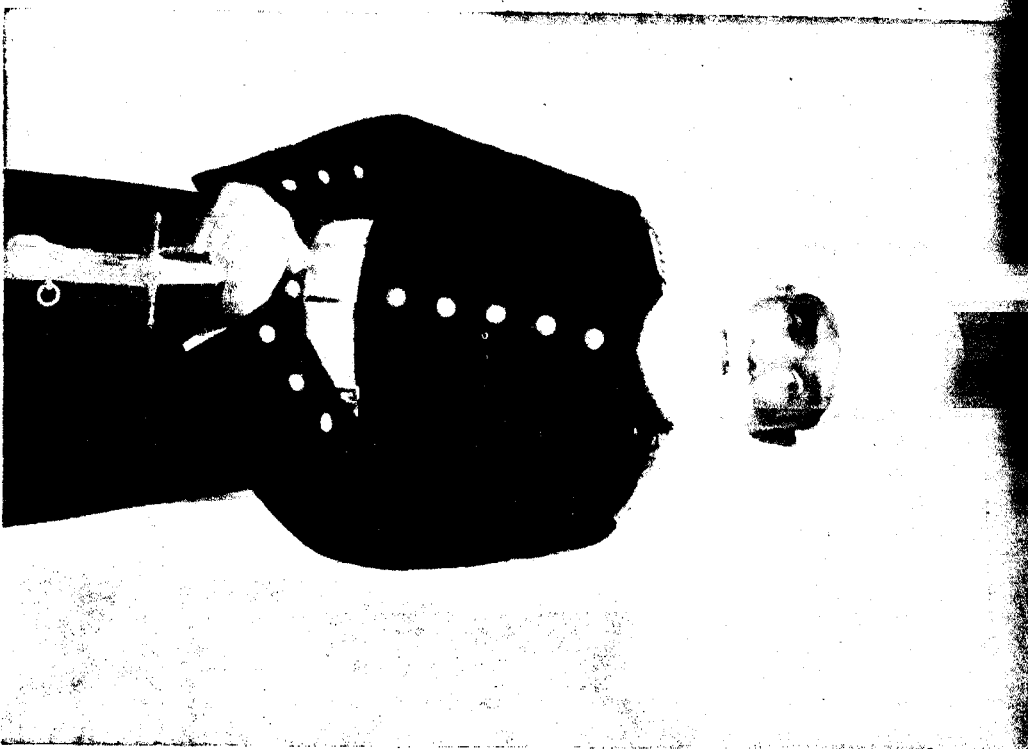
نواب رفعت یار جنگ ثانی

نواب رفعت یار جنگ مرحوم

دکن کی ایک علم دوست اور صاحبِ ذوق ہستی

ملک و مالک کے حقیقی بہی خواہوں اور روشن خیال اربابِ فکر سے حیدرآباد کبھی محروم نہیں رہا۔ سرزمین دکن کی تاریخ وطن کے قابلِ فخر فرزندوں کے
رناموں سے معمور ہے۔ کوئی دور ایسا نہیں گزرا جب کہ اس ملک میں مخلص کام کرنے والے پیدا نہ ہوئے ہوں ایسی مایہ ناز فرزندان ملک کی فہرست میں نواب
عت یار جنگ بہادر کے خاندان کو ہمیشہ خاص اہمیت اور نیک نامی حاصل رہے گی یہ خاندان ایک ایسے وقت میں ملک و مالک کی خدمت گزاری کے لئے کمربستہ
اجب کہ اہل حیدرآباد پر عام طور پر جمود طاری تھا اور نواب مختار الملک اس ریاست کی فلاح و بہبود کی خاطر باکمالوں کی تلاش میں سرگرم تھے ایسا معلوم ہوتا
ا کہ حیدرآباد میں عالم و فاضل دیانت دار اور واقف کار اصحاب کا فقدان ہوگیا ہے۔ اس مایوس کن ماحول میں نواب مختار الملک کو دو گوہر نایاب دستیاب ہوئے
کی مردم شناس نظروں نے تاڑ لیا کہ ان دو بھائیوں یعنی نواب رفعت یار جنگ اول اور نواب عماد جنگ اول میں وہ تمام صلاحیتیں اور اعلیٰ خصوصیات موجود
جن کی تلاش میں انھیں ریاست سے باہر افراد کے لئے چھان بین کرنی پڑ رہی تھی عجیب اتفاق کی بات ہے کہ وہ اپنے اس انتخاب میں خاص طور پر کامیاب رہے۔
ئے کہ جیسے جیسے زمانہ گزرتا گیا نواب مختار الملک نے پیچیدہ سے پیچیدہ اور اہم سے اہم کام ان کے سپرد کرکے آزما لیا کہ حیدرآباد کے یہ دونوں سپوت
حاظ سے ان قابل افراد پر سبقت لیجاتے ہیں جو بیرونِ ریاست سے بلائے گئے تھے۔

اندان

نواب رفعت یار جنگ کا خاندان دکن میں اپنے ذوقِ علم و فضل دیانت داری اور ملک و مالک کی بہی خواہی میں شروع ہی سے ممتاز تھا ان کے آباو اجداد
سلطنت بیجاپور میں اور اس کے زوال کے بعد اورنگ آباد، میسور، اور حیدرآباد میں رشد و ہدایت اور اعلیٰ معیارِ اخلاق کی وجہ سے ہمیشہ عزت
گاہوں سے دیکھے گئے ہیں ان کے اجداد میں قاضی حمید الدین ناگوری بہت مشہور و معروف تھے۔ اسی طرح ان کا ننھیال کا سلسلہ بھی ایک اور بلند پایہ
ل شہاب الدین سہروردی تک پہنچتا ہے اس سلسلہ کے متعدد اصحاب نے مختلف طریقوں سے سلطنت کی خدمت کی بعض دیوان اور صدر صوبہ بھی رہے۔
یں نامور علما اولیا اور مشائخین عظام بھی پیدا ہوئے جنھوں نے دکن کے باشندوں میں نہایت خوبی سے دینداری کا جذبہ پیدا کیا مسلم اور غیر مسلم سب ہی
ے ارادت رکھتے تھے شہنشاہ اورنگ زیب سے بھی اس خاندان کو توسل اور وابستگی رہی ہے۔ حاجی عبد اللطیف خان اور عبد الکریم خان جاگیرداروں کو
سب حاصل تھا مگر زمانہ مابعد میں حالات متغیر اور طریقہ معاشرت مختلف رہے بعضوں نے فوجی یا دوسری نوکریاں اختیار کرلیں اور بعض نے درس و
یس اور وعظ و تبلیغ کا طریقہ جاری رکھا۔ اس خاندان کے ایک فرد حضرت شاہ عالم قادری کے صاحبزادے مولوی غلام محمد کو میسور کے فرمانروا حیدر علی خان
و سلطان بڑی وقعت کی نگاہوں سے دیکھتے تھے۔ اور نواب نظام علی خان بہادر نے بھی ان کو حیدرآباد طلب فرماکر خدمت بخشی گری خطاب، جاگیر و
واز ماتِ امیرانہ سے سرفراز فرمایا۔ وہ بالآخر گلبرگہ میں جمعیت رسالہ کے ساتھ مقیم رہے اور وہیں ۱۲۲۶ھ میں انتقال کیا۔

اس خاندان کے ایک بزرگ حافظ محمد عبد العزیز مولوی ایسی عالم اکمل اور فاضل اجل تھے جن کی ذات بابرکات اور فیضانِ صحبت سے بکثرت طالبانِ علوم مستفید
تے رہے۔ محمد مدنی جاگیردار خلف محمد عبد اللطیف خان نے کمالِ عقیدت مندی سے اپنی دختر کو آپ کے عقدِ ازدواج میں دیا۔ ان کے سلسلہ میں عبد الحکیم صاحب اور ان کے فرزند
ی شیخ محمد عبد الرحمٰن حافظ، قاری اور جید عالم تھے۔ تین مرتبہ حج اور آخر دفعہ اکثر مقاماتِ مقدسہ کی زیارت سے مشرف ہوئے تھے تمام عمر تعلیم و تدریس
و پند و نصیحت میں بسر کی شاگردوں کا دائرہ بہت وسیع تھا اسی کو آپ بہترین شغلِ زندگی سمجھتے تھے۔ نواب مختار الملک بہادر نے کئی مرتبہ باصرار طلب کرکے

بہ نظر قدردانی کوئی عہدہ قبول کرنے فرمایا آپ نے ہر وقت توکل اور استغنیٰ کی زندگی اور آزادانہ درس و تدریس کو ملازمت کی مکڑ بندیوں پر ترجیح دی آپ
آزادروی اور بیباکی سے نواب صاحب بہت متاثر ہوئے انگریز عہدہ داران فوج بھی اکثر آپ کی پابندی وضع و خودداری کی تعریف کیا کرتے
ماہ ذیقعدہ ۱۳۱۱ھ میں آپ کا انتقال ہوا ۔

آپ کے دو فرزند شیخ احمد حسین رفعت یار جنگ اول اور شیخ محمد صدیق عماد جنگ اول اور ایک صاحبزادی زوجہ حافظ محمد عبداللہ کی
تھیں جن کے دو فرزند حضور نواز جنگ حاکم الدولہ اور سعد جنگ تھے ۔ نواب رفعت یار جنگ ثانی کے تذکرے سے قبل ضروری ہے کہ ان کے والد
شیخ احمد حسین رفعت یار جنگ اول کے مختصر سے حالات بھی پیش کر دئے جائیں تاکہ یہ معلوم ہو سکے کہ آپ کی تربیت کس ماحول میں ہوئی تھی ۔

مولوی شیخ احمد حسین خان بہادر نواب رفعت یار جنگ اول

۱۲۷۲ھ میں تولد ہوئے اپنے والد ماجد مولوی حافظ حاجی
اور عم بزرگوار مولوی محمد حسین صاحب نقشبندی متخلص ساماں کے پاس ابتدائی تعلیم ہوئی بعد ازاں دار العلوم بلدہ میں شریک ہوئے اور امتیاز
لیتے ہوئے چند سال میں فارغ التحصیل ہو گئے مشہور علماء وقت مثلاً مولوی محمد زمان خان شہید وغیرہ کی صحبت سے بھی مستفید ہوئے نہایت ذہین اور
تھے ۔ دستار فضیلت باندھے زیادہ زمانہ نہیں ہوا تھا کہ مولانا محمد عبد الحلیم فرنگی محلی سے ایک مسئلہ پر آپ سے اختلاف ہوا نوجوان مولوی کی یہ
مولانا کو شاق گزری ۔ معاملہ وزیر اعظم تک پہنچا تو اس مدبر نے چیفی خانہ میں علماء وقت کی ایک مجلس مقرر کی وہاں سب کے روبرو مولانا عبد الحلیم
شیخ احمد حسین کا مباحثہ ہوا ۔ علماء حاضر نے بالاتفاق مولوی آخر الذکر کے سر فتحیابی کا سہرا باندھا جس سے نواب مختار الملک نہایت خوش ہوئے
خداداد طبیعت و ذہانت کی وجہ سے طالب علمی کے زمانے سے ہی نواب صاحب کی نظر شفقت و عنایت رہی ۔ اس معرکہ پر بذریعۂ عنایت نامہ
کیا اور حوصلہ افزائی فرمائی ۔ فرمایا کرتے تھے کہ یہ نوجوان مولوی بڑے دماغ کا شخص ہے بہت بڑا آدمی ہونے والا ہے مجھ سے جہاں تک ہو سکے
مدد کروں گا ۔ اسی زمانے میں درس و تدریس میں مشغول ہوئے آپ کی عمدہ طرز تعلیم حسن اخلاق روشن دماغی کے چو طرف چرچے تھے ۔ حتیٰ کہ ملازمین
کے عہدہ دار نواب مختار الملک کے ذریعہ سے آپ سے استفادہ کی تمنا کرتے مگر بوجہ عدیم الفرصتی بعض وقت آپ معذرت کرتے ۔ سب کو
تلمذ کا شوق تھا ۔ دلچسپ پیرایہ میں درس دیتے تھے طالب علم کو بار ہوتا نہ اس کو مدت دراز کتابوں میں صرف کرنی پڑتی مکرم الدولہ آپ کے
مشہور ہے کہ بے شمار لوگ نہ صرف آپ کی تعلیم سے فیض یاب ہوئے بلکہ اکثر سرکاری ملازمت میں بھی لگا دئے گئے اور ملک کا کوئی حصہ ایسا نہ
چند اشخاص اس دستگیری کی یادگار نہ پائے جاتے اور شکر گزار نہ ہوتے ۔ عربی فارسی کی تحریر و تقریر و لہجہ میں آپ اہل زبان کے ہم پلہ تھے اور
سے بھی واقف تھے ۔ آپ صرف عالم ہی نہ تھے بلکہ سواری، شکار، نشانہ اندازی اور پیراکی میں مشاق، کسرت، کشتی، بنوٹ وغیرہ
ہتھیار اور ان کے استعمال میں ماہر تھے آپ کی ان قابلیتوں کے علاوہ نئی روشنی کے لگاؤ سے آپ کو اپنے ہم عصروں میں امتیاز و تفوق حاصل
عم بزرگوار حضرت ساماں کی صحبت کی وجہ سے اوائل میں آپ کو شاعری کا بھی شوق رہا ۔ کوکب تخلص کرتے تھے اور چنانچہ ایک مختصر دیوان
ہو چکا تھا مگر عام تعلیمی دلچسپی اور اصلاح تمدن و سیاست کے خیالات نے اس مذاق پر تفوق حاصل کیا ۔ پچھلے دور میں حیدرآباد کی تعلیمی ترقی میں
دلچسپی سے کوشش کی اور حصہ لیا شاید ہی یہ عزت اس زمانے میں کسی اور کو نصیب ہوئی ہو ۔ بقول سید حسین بلگرامی (نواب عماد الملک مرحوم)
میں آپ پہلے شخص تھے جن کو یہاں کی تعلیم کی ناقص حالت کا احساس اور اہل ملک کی بے خبری و بیکسی کا درد پیدا ہوا اور اس خرابی کے دور

ششِ شروع کی"

ابتداً دفترِ پیشی میں مدار المہام کے تمام قلمی تجاویز کے (جو مختلف محکموں کے گذارشات پر صادر ہوتیں) دیکھنے سمجھنے اور بہت جلد کام سے واقف ہونے کا موقع ملا۔ ماہ صفر ۱۲۸۱ھ میں سرکاری ملازمت میں شریک ہوئے ۱۲۸۱ھ میں محکمہ مال میں کام کیا جو اس زمانے میں ریاست کا اعلیٰ اور اہم ترین محکمہ تسلیم کیا جاتا تھا اور سب اس کے ماتحت تھے۔ خاص اور اہم کاغذات سربمہر لفافہ جات جو نواب مکرم الدولہ بہادر کی دستخط کے لئے پیش کرنے ہوتے سب آپ کی تحویل وحفاظت میں رہتے مزید براں نواب صاحب کے پاس رہ کر متفرق کام بھی پیش کیا جاتا نواب مکرم الدولہ مجلس مال اور مدار المہام کے درمیان بحیثیت نائب مقرر ہوئے تو تقریباً چار سال تک (یعنی ۱۲۸۲ھ تا ۱۲۸۶ھ) تمام کاغذات آپ ہی کے توسط سے پیش ہوتے تھے اور ان کے ساتھ رہ کر مجلس سے آئے ہوئے کاغذات آپ ان کو سمجھا کر تجویز کراتے۔ جب نواب مکرم الدولہ صدر المہام مال ہوئے اس وقت بھی آپ مددگاری کا کام انجام دیتے رہے اس طرح آپ کو مختلف صیغوں کے کام کی قابل لحاظ واقفیت حاصل اور کافی تجربہ ہوگیا تھا ۱۲۹۲ھ میں اطراف بلدہ کے حالات کی اصلاح کی غرض سے تعلقداری کی خدمت دو سال نہایت محنت و مستعدی سے انجام دی۔ اس کارگزاری پر خوشنودی ظاہر فرماتے ہوئے مدار المہام بہادر نے دوسرے عہدہ داروں کو تقلید کی ہدایت فرمائی۔

۱۸۷۵ء کے مشہور قحط میں ضلع رائچور پر (جہاں شدید ترین قحط کا انتظام درپیش تھا) متبدل ہوکر فوراً جائزہ لینا پڑا اس نازک موقع پر آپ نے ایسی عمدگی سے انتظام کیا کہ مصیبت زدوں کے ساتھ پوری ہمدردی کی گئی۔ عمارتیں اور پل اور سڑک وغیرہ تیار کرائے گئے۔ آپ کا انتظام عموماً بنظر تحسین دیکھا گیا اور برٹش گورنمنٹ نے بھی تعریف کی۔ کچھ عرصہ بعد نواب مختار الملک نے آپ کو بلدے میں بلالیا اور یہاں بطور اسپیشل افسر بعض اہم اور پیچیدہ کام آپ کے تفویض ہوئے۔ زمانۂ سابق میں سرکار کے مقابل بڑے بڑے ساہوکاروں کے دعوے اور مطالبے تھے۔ بڑے جاگیرداروں اور عربوں کے تنقیے پیش ہوتے تھے۔ ایسے مقدمات کی تحقیقات اور ان کے تصفیہ وانتظام کے متعلق مشورہ دینے کا کام آپ کے سپرد کیا جاتا تھا اور آپ کی صائب رائے کی مدار المہام بہت قدر فرماتے تھے۔ اُن کو آپ پر پورا اعتماد تھا اور دیگر عہدہ داروں وغیرہ کی نظروں میں آپ کی بڑی وقعت تھی عرصہ دراز تک آپ معتمد و رکن "مجلس قرضہ بابد واد بایدگرفت سرکار عالی" بھی رہے ۱۸۸۱ء میں جب کہ نواب مکرم الدولہ لندن جارہے تھے تو مختار الملک نے یہ ارشاد فرماتے ہوئے کہ "اس وقت میرا جانا تو محال ہے کسی اور پر مجھے بھروسہ نہیں۔ آپ کا ساتھ جانا گویا میرا ساتھ جانا ہے" سینہ سے لگا کر بہ اظہار اعتماد و قدردانی آپ کو ان کے ساتھ ولایت روانہ کیا۔ ہمراہی میں آپ نے ہر جگہ ہر انتظام احتیاط و عمدگی سے کیا۔ اس سلسلہ میں لندن، فرانس اٹلی وغیرہ مختلف ممالک کی سیاحت کا موقع ملا۔ آپ کی کارگزاری سے نہ صرف نواب مکرم الدولہ مطمئن ہوئے بلکہ نواب مختار الملک بھی خوش ہوئے اس سفر میں آپ نے ہر مقام کی گورنمنٹ اور وہاں کے حالات وانتظامات کا بغور معائنہ ومطالعہ کیا۔ اور تعلیم کے متعلق مفید معلومات حاصل کئے اگرچہ سوائے انگریزی کے یورپ کی کسی زبان سے واقف نہ تھے لیکن لندن میں آپ نے فرنچ زبان میں بول چال کی حد تک تھوڑی استعداد حاصل کرلی ہر جگہ کے معززین پر اپنے اخلاق، وضعداری اور جامع قابلیت سے عمدہ اثر قایم کیا۔

لندن سے واپس آنے کے بعد کچھ عرصہ کے لئے رکن "مجلس دریافت انعامات" رہے اور مستعدی سے ملتویات کا تصفیہ کیا۔ پھر صدر مجلس ہوئے علاوہ انفصالی کام کے اصلاح کی جانب بھی توجہ کی اس کے بعد "تحقیقاتِ عطیاتِ اراضی ونقدی سرکار آصفیہ" کے لئے کامل

اور وسیع اختیارات کے ساتھ کمشنری انعامات کے اعلیٰ عہدہ پر مقرر ہوئے۔ یہاں غیر معمولی توجہ اور محنت سے سررشتہ کی تنظیم ترمیم کا اصلاح ہو با قاعدگی پیدا کیا اور کثرت فیصلہ جات سے بہترین ریکارڈ قائم کیا۔ بہ قول شمس العلما عزیز جنگ مرحوم جنھوں نے قوانین مال و عملیات پر مفید کتب تالیف کی ہیں "اس عہدہ کی نازک ذمہ داریوں کو جس نیک نامی و استقلال کے ساتھ انجام دیا حیدرآباد کی تاریخ میں آپ کی جوہر طبیعت کی ایک اعلیٰ یادگار ہے" چندے آپ کمشنر کروڑگیری بھی رہے۔ بعد ازاں صوبہ داری اورنگ آباد کے لئے آپ کا انتخاب ہوا مگر وہاں جانے کی نوبت نہیں آئی۔ اسی اثناء میں صوبہ داری سمت شمال پر ممتاز ہوئے اصلاحات کی جانب توجہ بدستور مائل رہی۔ آپ کا زمانہ خاص شان وقار کا گزرا نواب سروقار الامراء نے آپ ہی کی عہد صوبہ داری میں اس صوبہ کا دورہ فرمایا۔ تمام حالات و انتظامات سے خوش ہوئے اور ہر موقعہ پر آپ کے ساتھ تعظیم و توقیر کا برتاؤ کیا بالآخر و تمکسمت شرقی پر آپ کا تبادلہ ہوا یہاں سرکار اور رعایا ہر دو کی بہبودی کے کام کئے۔ رعایا کی تکلیف رفع کرنے ان کو زیادہ نفع بخش کاموں میں مصروف کرنے کی ہر طریقہ سے کوشش کرتے رہے زمینات کی بہترین نگہداشت اور مختلف مفید اجناس اور نیشکر کی کاشت، ریشم اور لاک وغیرہ پیدا کرکے فائدہ اٹھانے کی ترغیب دلائی گئی۔ بوقت دورہ فضول تکلفات کو ناپسند کرکے ان کے عوض سال بھر کی زراعتی و مصنوعاتی ترقیات کی نمائش منعقد کرنے کی ہدایت کرتے تھے شمس العلماء عزیز جنگ لکھتے ہیں کہ "رعایائے مالگزاری آپ کی پرستش کرتے تھے آپ کا ہر ایک کام اصول کے سانچے میں ڈھلا ہوا ہوتا آپ کی دلسوزی اور حقیقی ہمدردی کا اندازہ دل ہی کر سکتا ہے" آپ کے رفاہ عام کے کاموں میں حسب ذیل اداروں کا قیام ہمیشہ آپ کے نام کو زندہ رکھے گا۔ (۱) مدرسہ اسلامیہ (نظامیہ) (۲) مدرسہ اعزہ (۳) سول سروس کلاس۔ آپ نے یورپ کی تعلیم کے لئے طلبا کو تیار کرنے اور وظیفہ دیکر روانہ کرنے کی بھی تحریک کی نیز اُردو زبان کو ذریعہ تعلیم قرار دینے پر زور دیا اور اس بارے میں ایک زبردست تحریک کی تھی جو آج جامعہ عثمانیہ کی شکل میں تکمیل کو پہنچی۔ آپ نے اُردو مڈل کو جاری کرایا اور اضلاع میں صدہا مدارس رعایا کی تعلیم و تربیت کے لئے قائم کرائے۔ آپنے روز جمعہ بعد ظہر ۵ صفر ۱۳۱۵ھ کو انتقال کیا شمس العلماء عزیز جنگ ولا نے قطعہ تاریخ وفات لکھا تھا۔

جب چلے ملکِ بقا کو دولت ایماں کے ساتھ قصر جنت میں ہوئے ممتاز رفعت یار جنگ
عرض کی فکر ولا نے سال رحلت فی البدیہ چلدئے دنیا سے باعزاز رفعت یار جنگ

نواب رفعت یار جنگ اول کے فرزند اکبر صاحب تذکرہ مولوی شیخ ضیاء الحق فصیح الدین احمد نواب رفعت یار جنگ ثانی تھے۔ آپ کے حالات ایک جداگانہ کتاب کا موضوع بن سکتے ہیں لیکن اس موقع پر اختصار کے ساتھ درج کئے جاتے ہیں۔ جو زیادہ تر مرحوم کے خود نوشتہ سوانح کا اقتباس ہیں۔

ابتدائی زندگی

بتاریخ ۲۵ ذی الحجہ ۱۲۸۵ھ م ۸ اپریل ۱۸۶۹ء م ۲۸ فروردی بہشت ۱۲۷۸ف ضلع تولد ہوئے اسی زمانہ سے ریاست کے منصبداروں میں شمار ہوا تسمیہ خوانی تک منشی حیدر شریف اور منشی رحیم الدین اتالیق رہے اور حسب ہدایت والد ماجد زبانی تعلیم و تربیت ہوتی رہی۔ چار سال کی عمر سے تعلیم آغاز ہوئی۔ ابتدائی تعلیم اُردو فارسی عربی دینیات مکان پر مولوی محمد واصل و مولوی محمد کامل وغیرہ سے اور کچھ انگریزی ریورنڈ فرینڈس سے پڑھنے کے بعد مدرسہ اعزہ کے قیام پر سالار جنگ کی بارہ دری میں مسٹر راس وغیرہ کے زیر تعلیم رہے فارسی تقریر و تحریر میں کافی مہارت ہوئی۔ بعد ازاں سینٹ جارج گرامر اسکول میں مسٹر ہوم کی نگرانی میں انگریزی اور لیٹن زبان کی تعلیم جاری رہی۔ یہاں سے ۱۸۸۱ء میں مدرسۃ العلوم علی گڈھ میں بانی مدرسہ آنریبل سر سید احمد خان کی خاص توجہ اور مولوی مشتاق حسین کی ذاتی نگرانی

...زمانۂ صدارت مسٹر سیڈنز و مسٹر نسبیٹ بابو بختاور لعل اور ابو الحسن اور مسٹر اشوتوس بھٹا چارجی اساتذہ سے انگریزی ریاضی تاریخ جغرافیہ مولوی محمد عباس حسین سے دینیات اور مولوی محمد عبد الجبار خان صاحب سے عربی ادب کی تعلیم پائی۔ علی گڑھ سے حیدرآباد واپس آنے کے بعد دوبارہ مدرسہ اعزہ میں مسٹر جارج شیٹ بی اے اور مولوی حافظ محمد ابراہیم کے زیر نگرانی انگریزی و عربی کی تعلیم ہوتی رہی۔

شیخ عبد اللہ عرب مکی صاحب عربی بول چال سکھانے مقرر تھے بعدہٗ مولوی عبد الجبار خان صاحب صدر مدرس علوم مشرقیہ سے عربی علم ادب وغیرہ کا سلسلہ جاری رکھا۔ اصلاح خیالات و ترقی کے لئے "مجلس اتفاق" قایم کی ایک کتب خانہ اور کرکٹ کلب کی بھی بنا ڈالی اور بحیثیت معتمد کامیابی کے ساتھ چلایا۔ ینگ مینز امپروومنٹ سوسائٹی رزیڈنسی کے ممبر رہے اعلیٰحضرت میر محبوب علی خان کے با اختیار حکومت کی زیر سایہ ہونے کی جانب سے تہنیت پیش کرنے جو وفد حاضر ہوا تھا اس میں شریک تھے۔

۱۸۸۲ء میں امتحان میٹرک کی تکمیل کے بعد وزیر اعظم سالار جنگ کے حکم سے مدرسہ عالیہ نظام کالج کی اُس خاص جماعت میں شریک رہے جو انگلستان جانے کے لئے زیر نگرانی مسٹر ہاڈسن ام اے اور مسٹر سٹین تعلیم پا رہی تھی یہاں مولوی حیدر علی صاحب سے قرآن مجید تفسیر وغیرہ میں تلمذ رہا۔

اگرچہ اس کے قبل معلائی طریقہ کی سواری اور اس کے متعلقہ جنگی کرتب کی مشق کی تھی اور کسرت، کشتی، جنبیہ، بنوٹ وغیرہ بھی سیکھا تھا لیکن اس زمانہ میں نظام ہونہار و النظیر کا رسالہ قایم ہونے پر اس میں شریک رہ کر باقاعدہ فوجی تعلیم پائی تلوار، بندوق، وغیرہ کی بطور خاص مشق کی سواری سے زیادہ شوق اور کرکٹ وہاکی کی عادت رہی۔

یورپ کا سفر

۱۸۸۵ء کے آخر میں یورپ جاکر سرکار عالی کے ایجنٹ مسٹر جوزف راک کے مشورہ سے لندن کے یونیورسٹی کالج میں کچھ دنوں شریک رہے ڈاکٹر مارلی سے انگریزی اور ڈاکٹر ہل سے ریاضی پروفیسر لالامان سے فرنچ زبان اور حبیب سلیمانی سے عربی میں استعداد حاصل کی مسٹر گریفن خاص توجہ سے تاریخ پڑھاتے اور بہت مہربانی سے پیش آتے تھے۔

والد ماجد کی ہدایت پر کیمبرج یونیورسٹی کے خصوصیات کی وجہ پہلے سینٹ پیٹرز کالج میں شریک ہوئے۔ وہاں اساتذہ کی عنایت رہی کالج بوٹ میں بھی شریک کئے گئے۔ اس زمانہ میں طلباء ہند کی انجمن قایم ہوئی اور وقتاً فوقتاً مجالس ہوتے رہے۔

بعد ازاں ٹرینٹی ہال کالج میں منتقل ہو کر سلسلہ تعلیم جاری رکھا۔ یہاں مشہور و معروف مقنن سر ہنری مین ماسٹر تھے۔ ریورنڈ ہیکر ٹیوٹر۔ دونوں مہربان تھے خصوصاً اول الذکر اخلاص سے پیش آتے۔ ہر تقریب میں شریک رہا کرتے۔ اس زمانہ میں انگریزی میں پروفیسر بک، عربی ادب تاریخ وغیرہ میں تلمذ لارڈ کیتھ فاکنر سے رہا یہ حضرات اپنی عنایت سے استعداد وغیرہ کی تعریف کرتے اور شفقت و وقعت کا برتاؤ رکھتے تھے یونیورسٹی کی تعلیم کا سلسلہ ختم کرکے مکرر لندن پہنچکر قانون کی طرف توجہ کی۔ بیرسٹری کا تعلق مڈل ٹمپل سے رہا مشہور معلم قانون مسٹر شیر وڈ کے زیر تعلیم امتحانات متعلقہ سے فارغ ہو کر مسٹر آمنڈ ہاشنڈ سکالر بیرسٹر کے چیمبرز میں معلومات قانونی میں اضافہ کرکے تصدیق حاصل کی۔

حین قیام لندن پڈنگٹن میں پارلیمنٹ کے نمونہ پر ایک پارلیمنٹ قایم ہوئی تھی جس کی غایت یہ تھی کہ لوگوں کو پارلیمنٹری طریقہ سے واقف کرکے آیندہ کے لئے ان کو اس خدمت کا اہل بنایا جائے۔ صاحب تذکرہ کو بھی ایک کونسٹی کے ممبر کی حیثیت سے شرکت اور کچھ عرصہ تک اس نقلی پارلیمنٹ سے تعلق رہا لندن میں آنحضرت صلعم کے میلاد مبارک کی تقریب سال بہ سال خوش سلیقگی سے منانے اور مختلف اقوام کے لوگوں کو مدعو کرنے کا طریقہ جاری کیا۔

سب پرس

کوئن وکٹوریہ کے تقاریب جوبلی میں شرکت پرنس آف ویلز (بعد ازاں ایڈورڈ ہفتم) سے بعض مواقع پر ملاقات اور نیز بطور ممبر سوسائٹی ... کے دربار میں شرکت کی عزت حاصل رہی۔

۱۸۹۱ء میں انٹرنیشنل کانگریس آف اورینٹلسٹس کی شرکت بطور معتمد شعبہ عربی و اسلام کی گئی اور منجانب مجلس انتظامی بطور کارگزاری صداقت نامہ خوشنودی عطا ہوئی اس موقع پر اس کانگرس میں یہ قرارداد منظور ہوئی کہ آئندہ زبان عربی کی تعلیم کی طرف خاص توجہ ہونی چاہیے کیونکہ یہ نہ صرف ایک مکمل اور زندہ زبان ہے بلکہ اس سے عبرانی وغیرہ کے سمجھنے اور انجیل وغیرہ کتب مقدس کے صحیح مفہوم کو پہنچنے میں بڑی مدد ملتی ہے۔ ان ایام میں مختلف ملکوں کے مشہور معروف علماء فضلاء وغیرہ سے ملاقات ہوئی اور مختلف اقوام کے افراد کی طبیعتوں سے واقف ہونے اور ان کی خصوصیات کے امتیاز کا موقع ملا۔ زمانہ مابعد میں اس کانگریس کی طرف سے بطور ڈیلیگیٹ بحیثیت مہمان شاہ پرتگال دار السلطنت لزبن جانے کا تہیہ ہوا تھا مگر دفعتاً وہاں ہیضہ پھوٹ پڑنے سے جانا نہ ہو سکا اور دیرینہ آرزو سفر ہسپانیہ و پرتگال وغیرہ کی پوری نہ ہو سکی۔ البتہ مالٹہ اور جبرالٹر دیکھ لیا گیا۔ بعض اوقات ہندوستانیوں اور بعض مشہور انگریزوں میں صلح کرانے کی خدمت انجام دینی پڑی۔ ڈاکٹر لائٹنر بانی یونیورسٹی پنجاب جو اس زمانہ میں ووکنگ اور لندن میں رہتے تھے۔ عزت کا برتاؤ کرتے تھے اور ان کے عمدہ خیالات ان کی ایک تحریر سے جو مسٹر پلوڈن رزیڈنٹ حیدر آباد کو لکھی گئی تھی ظاہر ہوتے ہیں۔ انڈیا آفس کے عہدہ دار و نیز اکثر اعلیٰ کے اشخاص سے تعارف رہا جس میں سے بعض ہندوستان کے گورنر اور ویسرائے ہوئے۔ نارتھ بروک کلب اور انٹرنیشنل کلب سے ممبری کا تعلق رہا

لندن کے صرف بالائی نمائشی مہذب حالات سے نہیں بلکہ اندرونی مفصل حالات سے بھی واقفیت اور صحیح رائے قائم کرنے کا موقع ملا نتیجہ اخذ کیا گیا کہ ہر چمکنے والی شے سونا نہیں ہے۔ مصنوعی تہذیب اور نمائشی شائستگی سے اصلی راحت، الفت، تسکین قلب و روح حاصل نہیں ہوتی۔ تمام ظاہری اسباب تہذیب حالت مطمئنہ پیدا کرنے سے قاصر و ناکام بلکہ مانع رہے ہیں۔ یہ رائے دن بدن مضبوط ہوتی گئی کہ جب تک اسلام کی سچی تعلیم نہ پھیلے باوصف اس قدر ترقی کے اصلی اصلاح نہ ہوگی۔ آئندہ اینگلو سیکسن قوم اسلام قبول کر کے اپنے آزادی کا سلسلہ دنیا میں قائم رکھ سکے گی۔ اور وہی لوگ جو صدیوں سے اسلام کے مخالف رہے ہیں اس کو بدنام اور اس کے پیروؤں کو برباد کرنے میں کوئی دقیقہ اٹھا نہ رکھا۔ آئندہ اس کے حلقہ بگوش ہو کر اس کی ترقی اور زیادہ شہرت کے باعث ہو رہیں گے۔ گو یہ بات ابھی ان کے خیال میں نہیں آتی لیکن وہ وقت جلد اور ضرور آنے والا ہے۔

مسٹر عبد اللہ کوئلیم کے مساعی بیکار نہ جائیں گے ان کے تقاریر اور تحریرات سے نہ صرف انگریز بلکہ انگریزی داں لوگوں میں جستجو کی تحریک پیدا ہو چکی ہے۔ اور جوں جوں اصلی حالات سے وقوف ہوگا دائرہ اسلام بھی وسیع ہوتا جائے گا۔ نیک نیت مسلمان جس گھر میں رہیں جس سوسائٹی میں شریک ہوں اپنے پاک اخلاق عمدہ خیالات اور صحیح مذہبی معلومات سے وہاں کے لوگوں پر گہرا اثر ڈالے بغیر نہیں رہ سکتے۔ عام وعظ کے علاوہ خانگی محفلوں میں اصلاح خیالات کی سعی ہونی چاہیے جو ضرور نتیجہ بخش ثابت ہوگی۔ مسجد ووکنگ تیار ہوئی اور ہنوز کچھ کام باقی ہی تھا کہ عیدین کے موقع ہندوستانی طلباء کو آمادہ کر کے وہاں جا کر خطبہ پڑھنے نماز ادا کرنے کا طریقہ ڈالا گیا۔ اس روز وہاں اسلامی طریقہ سے بکرے ذبح کئے جاتے اور پخت و پز کا اہتمام مسلمانوں کے ہاتھوں میں رہتا اور بعد سب ایک جگہ بیٹھ کر کھاتے دوسرے دوست احباب بھی اس تقریب میں شریک کئے جاتے اس طرح خوشی سے دن بسر کر کے شام کو لندن واپس ہو جاتے۔ چنانچہ ۱۸۹۱ء کے ایک عید کے موقع کی تصویر پیش نظر ہے۔ ہمیشہ ہر ایک سے اخلاق و تہذیب اور نرمی سے پیش آنے کی عادت رہی۔ اپنے اعتقادات کا دوسرے پر دباؤ ڈالنے سے احتراز اور اس نازک مسئلہ میں حلم

کہ جب کوئی بطور خود پوچھتا تو حتی الامکان اس کی تشفی کیجاتی۔ اس اصول پر کاربند رہنے سے لوگ زیادہ مائل و معتقد ہوتے رہے۔

مختلف مذاہب کی چھان بین اور تاریخی حالات کی مطابقت سے اصل اور نقل کا فرق معلوم ہوچکا تھا اور کثرت مطالعہ سے معلومات میں وسعت اسلام کی سیدھی سادی تعلیم کی زیادہ وقعت اور دوسرے اعتقاد رکھنے والوں سے ایک نوع کی ہمدردی پیدا ہوگئی تھی۔

مسٹر عبداللہ کوئیلیم اور ان کے خاندان سے خلوص و محبت کے روابط رہے۔ حتی الامکان ان کی کوششوں میں شرکت اور ان کو صلاح و مشورہ سے مدد دیجاتی رہی۔ ان کی تبلیغ کا اثر زیادہ دور تک پھیلانے کی غرض سے ذاتی مصارف سے ایسے طریقے اختیار کئے گئے کہ بہت جلد نہ صرف انگلستان بلکہ باہر دور دراز مقامات کے لوگ مسٹر کوئیلیم کے کام کی طرف متوجہ ہونے لگے لندن میں جب کسی انگریز کو اسلام کے متعلق واقفیت حاصل کرنا ہوتی تو مسٹر کوئیلیم اس کام کو نواب صاحب کے حوالہ کر دیتے۔ اس شخص سے مل کر اس کے سوالات کا خاطر خواہ جواب اور اس کے شکوک کو رفع کیا جاتا۔

آنحضرت رسول عربی صلعم کے سچے حالات اور حقیقی تعلیم سے واقف کرا دیا جاتا جس کا اثر اچھا ہوتا۔ ان اشخاص میں زیادہ قابل ذکر مسٹر کنلف ہیں جن کا مکان لندن سے کچھ فاصلہ پر براک لی میں تھا وہ مشاق اسول میکنکل انجینیر تھے۔ غور و فکر کے عادی تھے۔ کچھ عرصہ سے عیسائی مذہب سے بوجہ چرچ کی تعلیم اور پادریوں کے عمل سے متنفر ہو رہے تھے دیگر مذاہب کا مطالعہ کر کے مذہب اسلام کی طرف متوجہ ہوئے۔ اس معاملہ میں مسٹر کوئیلیم سے استمداد کی مگر دوری اور عدیم الفرصت ہونے کی وجہ سے انھوں نے صاحب موصوف کو ہدایت کی کہ لندن میں نواب صاحب سے ملیں اور اس کی اطلاع ان کو بھی دی گئی جس پر انھوں نے مسٹر کنلف کی بستی میں جا کر ان سے ملاقات کی۔

اس طرح ایک دوسرے کے پاس آمد و رفت ہوتی رہی گفتگو اور مطالعہ کا سلسلہ جاری رہا جب وہ ہر طرح مطمئن ہوگئے تو اسلام قبول کیا۔ ان کا نام ان کی طبعی مذاق اور مذہبی جوش اور ہمدردی کے لحاظ کرتے عبید اللہ رکھا گیا۔ جو بعد مسجد لیورپول کے رجسٹر میں درج ہوا۔ اس کے بعد ان کے قلمی مضامین اور نظمیں انگریزی اور دیگر اخبارات میں شایع ہوتے رہے۔ ایک طویل قصہ جس میں انھوں نے تبدیل مذہب کا سبب اور مذاہب عیسوی و اسلامی کی تعلیم و اختلاف اور آخر الذکر کے وجوہ ترجیح بیان کئے تھے مدراس کے اخبار محمڈن میں چھپا اور موصوف کے مذہبی جوش و حمیت کی شہرت رہی۔

مسٹر کنلف نہایت ذہین اور دماغ والے شخص تھے جنھوں نے متعدد اور مختلف کلیں ایجاد کی تھیں اور میکزم گن کا نقشہ ابتداءً ان ہی کے ہاتھ کا بنایا ہوا تھا۔

نواب صاحب مرحوم سے ان کو خاص اعتقاد و محبت رہی اور اس کے اظہار میں بطور شکریہ انھوں نے ایک کوئک فائرنگ گن جو آسانی سے ایک منٹ میں متعدد بار چلائی جاسکتی تھی کا نقشہ پیش کیا جس کو شکریہ کے ساتھ واپس کر کے صلاح دی گئی کہ ہر ایک کل پرزہ اور اس کو صحیح مقام پر جانے کی صراحت کے ساتھ مکمل نقشہ مع پوری کیفیت کے تیار کردیں تو سلطان المعظم غازی عبدالحمید خان ثانی کی بارگاہ میں پہنچایا جائیگا صاحب موصوف نے اس کی تکمیل کی جانب توجہ کی تھی۔ مگر افسوس ہے کہ دفعتاً شکوہ قلب سے وہ علیل ہوگئے اور نواب صاحب کو یاد کیا۔ آپ کی اطلاع ذریعہ تار لندن میں دی گئی۔ وہ اتوار کا دن تھا۔ ریل کم چلتی ہے۔ کسی قدر دیر میں ریل ملی بمقام براک لی پہنچنے پر حالت نازک پائی گئی

جب ان سے پکار کر کہا گیا کہ مسٹر احمد آئے ہیں فوراً ان کی آنکھیں کھلیں اور دیکھ کر احمد کہا چہرہ پر مسرت ظاہر ہوئی اطمینان کی کیفیت طاری ہوئی اور ان کے نام کے ساتھ روح پرواز کرگئی۔

ان کے اقربا عیسائی تھے۔ ان کے بھائی جو دوسرے شہر میں تھے فوراً چلے آئے ان کا رجحان عیسوی طریقہ پر ان کے آخر کام کرنے کا تھا مگر خدا کے فضل و کرم سے نواب صاحب کا اثر غالب رہا۔ بیوہ اور جوان بیٹے نے مرحوم کی تجہیز و تکفین اسلامی طریقہ پر کرنے میں مزاحمت نہیں کی بعض ہندستانیوں کو جو لندن میں اس وقت موجود تھے فراہم کیا گیا اور ترکی سفارت کے امام کو طلب کر کے نماز جنازہ ادا کر کے کافن ریل سے لیورپول بھیجا گیا۔ جہاں مسٹر عبداللہ کوئیلم اور دیگر مسلمانوں نے اس کو لیجا کر اس حصہ قبرستان میں جو مسلمانوں کے لئے رکھا گیا تھا۔ دفن کر دیا اور عبداللہ کوئیلم نے موقعہ کے لحاظ سے کیونکہ وہاں عیسائی لوگ بھی جمع ہوئے تھے مسلمانوں کے اعتقاد اور اس رسم کے متعلق موزوں و موثر تقریر سنائی۔ مسٹر کنلف کی وفات پر مختلف ملکوں سے لوگوں نے رنج و ہمدردی کا اظہار کیا۔

جب نواب صاحب وطن واپس ہو رہے تھے مسلمانان لیورپول نے وداعی جلسہ کیا جس میں ترکی کونسل جنرل ہز آنر اسد بے اور شیخ الاسلام عبداللہ کوئیلم۔ مولوی برکت اللہ وغیرہ نے اسلام کی راہ میں ان کی ہمدردانہ کوششوں کا ذکر خیر کر کے بہ اظہار خلوص و محبت خدا حافظ کہا۔ نواب صاحب کو کیمبرج لندن لیورپول جہاں کہیں قیام ہوا وہاں ہر دلعزیزی نصیب ہوئی بالآخر جہاں زیادہ رہنے کا اتفاق ہوا اور اخلاق و عادات وغیرہ کے متعلق ایک خاندان کے لوگوں کا جو خیال رہا اس کا اندازہ اس کی صدر خاتون مسماۃ مسز نارتھ کرافٹ معمرہ ۶۱ سالہ کی تقریر سے (جو سابق میں ایک سوانیہ کالج کی پرنسپل تھیں) جن میں سے ایک سالگرہ کے موقعہ پر دوسرے بوقت روانگی از لندن پیش کی گئی تھیں تحریری ہوتا ہے۔

ملازمت

نواب صاحب مرحوم ~~۱۸۹۲ء~~ میں ریاست کی سروس میں شامل ہوئے۔ چھ سات ڈویژنوں پر دوم تعلقدار اور پانچ اضلاع پر اول تعلقدار مجسٹریٹ ضلع رہ کر مستقل اصلاحات و انتظامات کر کے ناپسندیدہ عناصر کا جو رعایا اور حکومت کی تکلیف اور بے وقعتی کا باعث تھے قلع قمع کر کے سرکاری اقتدار اور رعب قایم کیا۔ حکمت عملی سے سرکار کی ہر دل عزیزی میں اضافہ اور رعایا کی تسکین و تشفی کا باعث ہوئے جس سے دونوں آپ کی کارگزاری سے خوش اور مداح رہے۔ جہاں گئے ایک محسن و مصلح کی حیثیت سے خیر مقدم ہوا۔ آپکے ہمدردانہ اور منصفانہ برتاؤ سے رعایا، اس قدر متاثر و ممنون ہوئی کہ آپ کو "دھرم اوتار" اور "نجات دہندہ" پکارتی۔ لارڈ کرزن نے (جن سے لندن کی شناسائی تھی) جو ضلع ورنگل میں شکار کی غرض سے تشریف لائے تھے آپ سے نہایت خندہ پیشانی کے ساتھ ملاقات فرمائی۔ تعلقداری ضلع بیدر کے زمانہ میں اعلیٰ حضرت بندگان عالی (بزمانہ ولیعہدی) نے سیر و سیاحت اور ازدیاد معلومات ملکی کی غرض سے اس تاریخی مقام پر رونق افروز ہو کر ہر ایک کام اور انتظام کو ملاحظہ فرما کر اظہار مسرت فرمایا تھا۔

~~۱۹۱۵ء~~ میں صوبہ داری ورنگل پر کچھ روز بڑی محنت و جانفشانی سے کام کیا۔ پھر بحیثیت صوبہ دار اورنگ آباد میں ~~۱۹۱۸ء~~ سے کچھ عرصہ تک رعایا کی فلاح و بہبود کے کاموں میں مصروف رہے اسی اثنا میں لارڈ چمسفورڈ وائسرائے ہند اور لارڈ لائیڈ گورنر بمبئی کی تشریف آوری کے موقع پر ملاقات کا موقع ملا۔ دونوں آپکے انتظام اور خوش سلیقگی کا اثر لیتے گئے۔ آخر زمانہ میں سررشتہ علیات کی اصلاح کی غرض سے دارالسلطنت میں بلائے گئے۔ تجربہ اور غور کے بعد ایک نہایت اہم اور مفید دستور العمل مرتب کیا۔ آپ کا پر خلوص اور ہمدردانہ نظم و نسق سب کے لئے باعث تشفی تھا۔ آپ تعلیم اور بالخصوص مقامی صنعتوں کی حفاظت اور ترقی کے پرجوش حامی رہے۔ بیدر میں مدرسہ صنعت و حرفت جاری کر کے مشہور بیدری صنعت کو مٹنے سے بچا لیا۔ افزائش

...اں ومویشی کی طرف خاص توجہ کی۔ نظام آباد میں کاغذسازی کا کام جاری کیا اعلیٰ قسم کے کاغذ تیار ہونے لگے جن کی تعریف حیدرآباد و میسور کی
...نمائشوں میں ہوئی۔ زمانہ اول تعلقداری میں حسب فرمان خسروی امیر پائیگاہ نواب معین الدولہ بہادر کار ہائے مال و عدالت کا عملی تجربہ حاصل کرنے
...کے لئے کچھ عرصہ تک وہاں تشریف فرما رہے۔ مالیگاؤں کی جاترا کو از سرنو جاری کیا اور ایک کلب اور کئی کتب خانے اور مطالعہ گھر قایم کئے۔
...دستکاریوں کی نمائش کا انتظام کیا۔ غرض اہل ملک کی ترقی کے کاموں میں آپ کو بے حد شوق و انہماک رہا۔ اعلیٰ حضرت غفران مکان ہمیشہ آپ کو
...قابل اعتماد اور وفادار سمجھتے رہے۔ ۱۳۲۲ھ میں اپنی جوبلی کے عظیم الشان دربار میں خطاب آبائی سے سرفراز فرمایا۔ سر ٹریور پلاوڈن اور ان کے
...بعد کے حیدر ریزیڈنٹ صاحبان آپ کے متعلق عمدہ رائے رکھتے تھے۔ سر الگزنڈر پنیہ اور اس زمانہ کے یوروپین عہدہ دار آپ کو حیدرآباد کے
...بہترین اشخاص میں شمار کرتے تھے۔ اعلیٰ حضرت بندگان عالی خلد اللہ ملکہ کے الطاف شاہانہ ہمیشہ یکساں طور پر آپ پر مبذول رہے۔ مرحوم
...ریاست کے ان چند باوقعت حکام میں سے تھے جن کے وجود کو ہر شخص مغتنم سمجھتا ہے جس مقام پر رہے فتنہ و فساد کا دروازہ بند کر دیا اور اگر
...کہیں اس کی کوشش ہوئی تو فوراً حکمت عملی سے اس کا سدباب کر دیا۔ ہمیشہ گرد و پیش کے حالات سے باخبر رہے اور شر و فساد کی بیخ کنی
...و بعد کے تدارک سے بہتر تدبیر سمجھتے تھے۔ میلاد شریف کے جلسے نہایت اہتمام او تکلف سے ہوا کرتے تھے منتخب واعظین کے ذریعہ سے
...مسلمانوں کو آنحضرت صلعم کی زندگی کے سچے واقعات بتائے جاتے اور نیک کام کرنے کی ترغیب دی جاتی۔ عیدین میں جو ہر شخص کی عطر اور
...پان سے تواضع کرتے اس خلوص اور مساوات اسلامی کا لوگوں کے دلوں پر گہرا اثر پڑتا اہل ہنود سے بھی ان کے تہواروں پر جب وہ ملنے
...آتے تو اسی خلوص اور کشادہ پیشانی سے ملاقات کرتے اور ان کی بھی عطر پان سے تواضع کرتے۔ آپ کبھی کسی پارٹی میں شریک نہیں ہوئے سازش
...کے انسداد کے ہمیشہ درپے رہتے تھے۔ نادار طلبہ، بیواؤں اور یتیموں کی اس طرح امداد کرتے کہ کسی کو خبر نہ ہوتی۔ مطالعہ کا بے حد ذوق
...تھا، اردو، انگریزی زبانوں کے کئی رسالے اور اخبار آپ کے مطالعہ سے گذرتے۔ خادمین و مصلحان قوم کو بڑی قدر کی نگاہوں سے دیکھتے
...دینداری، خوش اخلاقی، فیاضی اور علم کی قدردانی آپ کے خاص اوصاف تھے پہلی دفعہ جس شخص سے جس طرح ملتے ہمیشہ اس طریقہ کو قایم رکھتے
...بھی آپ سے ایک دفعہ ملاقات کرتا وہ آپ کے اخلاق سے متاثر ہوئے بغیر نہ رہ سکتا۔ ظاہری اوصاف کے علاوہ تقدس اور پاک باطنی
...آپ کے چہرہ سے نمایاں ہوتی تھی۔

نواب صاحب مرحوم فطرتاً مصلح قوم اور پاکباز و پارسا پیدا ہوئے تھے۔ ان کی ساری زندگی زہد و اتقا اور اصلاح و ہدایت میں بسر ہوئی۔ ملازمت
...زمانہ میں بھی ان کے یہی اوصاف نمایاں رہے۔ اکثر اضلاع اور بالخصوص بیدر میں نواب صاحب مرحوم نے ایک ایسے قبیح فعل کی اصلاح کی طرف
...توجہ مبذول فرمائی کہ ان سے پہلے کسی عہدہ دار کو اس کی ہمت نہ ہوئی تھی۔ پیشہ ور عورتیں لڑکیوں کو اس غرض سے ناچ کی تعلیم دیتی تھیں کہ
...آئندہ ان سے ناجائز فائدہ حاصل کریں۔ نواب صاحب مرحوم نے پہلے اس بات کی تحقیق فرمائی کہ آیا یہ لڑکیاں ان پیشہ ور عورتوں سے
...کوئی قرابت رکھتی ہیں یا زمانہ قحط میں یا اور کسی ذریعہ سے حاصل کی گئی ہیں۔ کافی معلومات اور تحقیقات کے بعد ان عورتوں کو قانوناً مجبور
...کیا گیا کہ ان لڑکیوں کی پرورش شریفانہ طریقہ سے کریں اور جب وہ بالغ ہو جائیں تو ان کی شادی کسی شریف قوم سے کر دی جائے۔ جب ان لڑکیوں
...کی شادی ہو گئی تو نواب صاحب مرحوم نے ان کو چند کارآمد اشیاء، لباس اور کچھ رقم بھی عطا کی تاکہ وہ اپنی زندگی کا آغاز شریفانہ طریقہ پر کریں۔
...باطنی اور پارسائی کے علاوہ آپ کے دل میں ملک و قوم کا بھی خاص درد تھا۔ ہندو مسلم اتحاد کے بڑے زبردست حامی تھے۔ زمانہ ملازمت میں

ہندو مسلم رعایا کو ایک نظر سے دیکھتے تھے چنانچہ آخر وقت تک جب کبھی اضلاع کے وہ ہندو یا مسلمان لوگ رجن کو آپ سے تعلق رہا تھا) حیدرآباد آتے تو آپ کی خدمت میں حاضر ہونا اپنا اولین فرض سمجھتے۔ اضلاع میں جہاں کہیں قدیم ہندو یا مسلمان آثار نظر سے گذرتے آپ ان کی حفاظت اور احترام کی طرف وہاں کے رہنے والوں کو خاص طور پر متوجہ کرتے۔ اس کے علاوہ آپ نے ریاست کے آثار قدیمہ کی حفاظت اور نگرانی کے لئے گورنمنٹ کو فوراً توجہ دلائی اور یہ مشورہ دیا کہ برٹش انڈیا کے کسی ماہر فن کی خدمات اس کام کے لئے مستعار لی جائیں۔ چنانچہ ابتداءً میں بنکنڈہ کی مزار ستونوں کی دیوال کی صفائی کے لئے مسٹر واکر صدرالمہام فینانس سے ایک معتدبہ رقم منظور کروائی۔ اور ریاست میں آثار قدیمہ کے تحفظ کا کام آپ ہی کی سفارش اور توجہ سے شروع ہوا اور ان آثار کو مٹنے سے بچا لیا۔

مرحوم کی شادی ۱۳۰۹ھ میں بڑے سلیقہ سے ہوئی۔ اعلیحضرت غفران مکان نے اپنے دست مبارک سے سہرہ باندھ کر عزت افزائی فرمائی۔ آپ کی اہلیہ مولانا ظہور حسن فرنگی محلی جاگیردار سرکار عالی کی دختر اور نواب نصیر جنگ آصف جاہی کی ہمشیر ہیں۔ آپ کی کثیر اولاد سے اس وقت تین فرزند (غازی الدین احمد مددگار مہتمم، برقی ناصرالدین احمد تحصیلدار اور سراج الدین احمد زیر تعلیم) اور چار دختر بقید حیات ہیں۔ آپ کے بڑے داماد نواب میر باسط علی خاں سشن جج صوبہ ورنگل ہیں۔ دوسرے داماد مولوی ظہور حسن صاحب انصاری (فرزند نواب نصیر جنگ آصف جاہی) تھے جو ملک کے ایک قابل فخر نوجوان تھے۔ اور اعلیٰ تعلیم کے لئے یورپ تشریف لیجا رہے تھے کہ جہاز پر یکایک انتقال فرمایا۔ سب رس کے حصۂ اطفال کے ایڈیٹر معین الدین احمد انصاری انہی کے فرزند ارجمند ہیں۔ تیسرے داماد ڈاکٹر سید محی الدین قادری صاحب زور ہیں جن کے نام اور کام سے علمی دنیا بخوبی واقف ہے۔ چوتھے داماد مولوی افضل الدین حسن صاحب ہیں جو نواب صاحب مرحوم کے حقیقی ہمشیر زادہ ہیں۔

خواجہ حمید الدین شاہد

قطعۂ تاریخ

جس سے سنتا ہوں وہ کہتا ہے بصد رنج و الم
ہو گئے ہم سے جدا نواب رفعت یار جنگ

اُن کے اوصافِ حمیدہ سے ہے واقف کُل جہاں
تھے بڑے ہی باخدا نواب رفعت یار جنگ

جنتی تھے جنتی، جنت میں داخل ہو گئے
کہدو عارفؔ پارسا نواب رفعت یار جنگ
۱۳۵۷ھ

میر لطف علی عارف ابوالعلائی قاضی پرگنہ ہتنورا

نلگنڈہ اور اُس کے قرب و جوار میں

(ایک روزنامچہ سے)

ادارہ سب رس ایسے مضامین شکریہ کے ساتھ شائع کرے گا جن میں ممالک محروسہ سرکار عالی کے اضلاع اور دیہات کے متعلق دلچسپ معلومات درج ہوں، اور جن میں قدیم عمارتوں، مندروں، مسجدوں کے حالات اور درگاہوں اور قبروں کے کتبوں کی نقلیں بھی شامل ہوں۔

نلگنڈہ کی آبادی

سلطنت آصفیہ کے اضلاع تلنگانہ میں ایک ضلع نلگنڈہ ہے جو دارالسلطنت کے مشرق میں واقع ہے۔ اس ضلع کا مستقر اسی نام کے ایک چھوٹے سے شہر میں ہے جو سطح سمندر سے تقریباً ایک ہزار فیٹ بلندی پر ہے۔ اس شہر کی پرانی آبادی کے دو طرف پہاڑ ہیں جس کی وجہہ گرمی شدت کی ہوتی ہے ان دو پہاڑوں میں سے ایک پر امام ضامن کا چلہ اور دوسرے پر حضرت لطیف صاحب کا مزار ہے پرانی آبادی کے سلسلہ میں مگران پہاڑوں سے ذرا ہٹ کر جدید وضع کے بنگلے اور باغ ہیں۔ یہیں اکثر دفاتر سرکاری ہیں پولیس کے کوارٹرس ہیں، احاطہ پولیس میں ایک خوبصورت مسجد ہے۔

نلگنڈہ کا قطب مینار

نلگنڈہ کی قدیم آبادی کے ایک گوشہ میں پتھر کا ایک ستون کھڑا ہے۔ نئے اصحاب جو نلگنڈہ جاتے ہیں وہ اس ستون کو بھی دیکھتے ہیں گویا وہ یہاں کا قطب مینار ہے یہہ ستون جس کی بلندی اکتالیس فیٹ ہے، ایک ہی پتھر میں تراشا گیا ہے، زمین میں جو حصہ گڑا ہے وہ اس کے سوا ہے بہت ممکن ہے کہ کسی دیول کے سامنے یہہ چراغ کا کھم (دیپک) ہو مگر اب تو نہ یہاں کوئی دیول ہے نہ دیول کے کوئی آثار۔

لنگ کی کرامت

نلگنڈہ سے قریب ہی موضع پانگل کی آبادی ہے یہاں پیتل کے ظروف بہت اچھے بنتے ہیں اس آبادی سے متصل ہی ایک دیول ہے جو گو شکستہ ہوگئی ہے لیکن سنگ تراشی کے اچھے اچھے نمونے اب بھی موجود ہیں یہاں سے کچھ ہٹ کر ایک اور قدیم دیول ہے جس کی نسبت اہل ہنود کا اعتقاد ہے کہ اس دیول کے لنگ پر کسی کا سایہ نہیں پڑتا اور یہ ایک کرامت ہے۔ جناب بہاؤالدین خاں صاحب تحصیل دار اور عزیزی احمد حسین صاحب خزانہ دار ضلع کی معیت میں اس دیول کا معائنہ میں نے کوئی نو بجے دن کے کیا جب کہ دھوپ خوب چمک رہی تھی اور ایک ستون نما سایہ لنگ پر دیکھا اسی کی وجہہ میری یا میرے ہمراہیوں کی چھاؤں لنگ پر نہ پڑ سکتی تھی، یہہ ستون نما سایہ اُن چار کھمبوں میں سے ایک کا تھا جو دیول کے حجرہ کے باہر دالان میں لگے ہیں یہہ آفتاب کے رخ اس حساب سے کھڑے کئے گئے ہیں کہ ایک نہ ایک کھم کا سایہ ہر گھڑی لنگ پر رہتا ہے اس لئے جب کوئی دوسرا یہاں آتا ہے تو ستون کے آڑ میں ہونے سے اس کی چھاؤں پیدا ہی نہیں ہوتی۔ غرض یہہ ایک صنعت تعمیر ہے جس کو ضعیف الاعتقاد کرامت سمجھنے لگے۔ ایسی مختلف قسم کی صنعتیں میں نے متعدد جگہ دیکھی ہیں۔ بلگندل (ضلع کریم نگر) کے قلعہ کی مسجد کے مینار ہلانے سے لرزتے ہیں دگلور (ضلع ناندیڑ) میں شاہ ضیاءالدین صاحب کے گنبد کے چبوترے پر چند قبور ہیں اور مشہور ہے کہ ان کی تعویذوں کو جو سنگ سیاہ کے ہیں ٹھوکو تو ہر ایک تعویذ سے موسیقی کا ایک بول سا، رے، گا، ما، نکلتا ہے ان تعویذوں کو مار کر میں نے بھی دیکھا آواز بھی آئی ممکن ہے کہ فن موسیقی کا واقف اصول سے ٹھوکے تو صحیح بول بھی نکلیں۔ اسی طرح بیجاپور کے گول گنبد (محمد عادل شاہ کے مقبرہ) میں یہہ

صنعت ہے کہ اس کی دیوار سے منہ لگا کر بات کرو تو آواز دوسری طرف اس طرح پہونچتی ہے جیسے ٹیلیفون غرض یہ سب جس طرح میں تعمیر ہے پانگل کے دیول میں بھی ایک صنعت رکھی ہے ۔ اس زمانہ میں ان چیزوں کا مذاق تھا تو ایسے کاریگر بھی تھے اب نہ اس کا نہ رہا نہ قدرداں رہے، نہ کوئی ایسے فن داں ہیں ۔

دیورکنڈہ

نلگنڈہ سے دیورکنڈہ گیا یہاں کی آبادی بھی ایک پہاڑ کے دامن میں ہے جس پر ایک ویران قلعہ ہے، قلعہ کے شمال اور جنوب مغربی گوشوں میں دور دور تک سیکڑوں قبور ہیں بہت سی تو ٹوٹ پھوٹ گئیں کچھ جو درست ہیں بالعموم سنگ سیاہ کے تعویذ ایک ہی وضع قطع کے ہیں ۔ کہتے ہیں کہ سیکڑوں شہداء یہاں مدفون ہیں کچھ مجذوب اور اولیاء اللہ ان میں سے بعضوں کے قصے زبان زد عام ہیں ۔

ازرفتگاں بہ زیر زمیں استخواں نماند — جز قصہ و فساد و نام و نشاں نماند

شہر خموشاں

ایک درگاہ حضرت حاجی درویش محمد صاحب قدس سرہ کی دیورکنڈہ کی آبادی سے مشرق کی طرف نلگنڈہ جانے والی سڑک کے کنارے ایک بلند ٹیلہ پر ہے درگاہ سے دور تک بڑا اچھا منظر ہے مزار سے متصل جانب مغرب ایک بڑا سا پتھر دوسرے پتھروں پر اس طرح آپڑا ہے کہ ایک مسقف حجرہ بن گیا مشہور ہے کہ حضرت حاجی صاحب مرحوم اسی میں رہتے تھے ایک مرتبہ یہ پتھر گرنے لگا تو حضرت نے اپنے دونوں ہاتھوں سے اسے تھاما، چنانچہ حضرت کے دست مبارک کے نشان پتھر پر پڑ گئے جو اب تک نمایاں ہیں، اسی حجرہ میں لکڑی کے چند شکستہ تختے پڑے ہیں کہتے ہیں کہ یہ اس تخت کی لکڑی ہے جس پر حضرت بیٹھا کرتے تھے، ان بزرگ کی تاریخ وفات ۷ ارجمادی الثانی ۹۹۹ھ کندہ ہے ۔

ایک دوسری درگاہ حضرت سلیمان شاہ رحمتہ اللہ علیہ کی اسی سڑک پر تحصیل کچہری کے مقابل پختہ دیوار سے محصور ہے جس کے چاروں گوشوں پر چار چھوٹی چھوٹی سرائیں، وسط میں ایک مسجد بائیں مزار ایک مستطیل حوض اور اطراف چبوترے ہیں درگاہ سے متصل جانب غرب ایک اجڑے ہوئے باغ کے آثار بھی پائے گئے ۔ درگاہ کے دروازہ پر کتبہ لگا ہے ۔

چو از ملک ناسوت فرمود رحلت — سلیمان شہ ملک مجد و کرامت

بہ گفت ارشد از بہر تاریخ سالش — سلیمان عالی نسب شد بہ جنت

۱۱۷۳

امیر بیگ خاں عالی کرم شجاعت جنگ — بناء نمود چو ایوان مکرمت مینا

بگفت ارشد ممتاز بہر تاریخش — مکان تعزیہ شاہ ملک کون و مکاں

ایک اور مزار مسافر بنگلہ دیورکنڈہ کے مقابل ہے ۔ بالین قبر سنگ سیاہ پر یہ عبارت لکھی ہے :-

"یا اللہ وفات مرحومی نادر العصری شرف الدین حسن بن درویش بیگ غرہ ماہ ذیقعدہ ۹۸۷ھ وقوع یافت"

اس سے کچھ ہٹ کر قلعہ کے نیچے ایک چبوترہ پر جو مٹی کی دیوار سے محصور ہے تین قبور ہیں ان میں سے ایک کی تعویذ پر تین طرف عبارت کندہ ہے یہ کچھ تو پڑھی گئی اور کچھ میری اور میرے دوست جناب ایجاد علی صاحب مددگار جنگلات کی متفقہ کوشش کے باوجود

پڑھی جا سکی جو پڑھا وہ یہہ ہے :-

(مغرب رخ) الاھو والملائکۃ واولوا العلم قایماً بالقسط ....

(مشرق رخ) الاھو العزیز الحکیم ان الدین عند اللہ الاسلام وما توالا باللہ ....

شمال کے رخ طغریٰ ہے جو بالکل نہ پڑھا گیا ۔ سر مزار سیاہ پتھر کی تختی ہے جس پر حسب ذیل عبارت کندہ ہے :-

"وفات مرحومی مسمی محمدؐ شیخ برہان قریشی فردوس مکان"۔

عبارت بالا میں لفظ محمدؐ کے بعد حرف "ے" اور "ہ" بھی ہے اگر شیخ برہان محمدی پڑھا جائے تو پھر بھی "ہ" رہ جاتا ہے اس عبارت کے نیچے ۔ "تاریخ وفاتش روز پنجشنبہ دوم ماہ ذی قعدہ ۹۹۵ھ" لکھا ہے ۔

دلاور کنڈہ کی صنعت

یہاں ریشم اور سوتی پارچہ بنتا ہے، ماضی قریب میں یہاں کے رومال بہت مشہور تھے یہہ بنتے تو اب بھی ہیں مگر پہلے عام تھے اب فرمائش کرو تو بنا دیتے ہیں ۔ یہہ میری دیکھی ہوئی بات ہے کہ عورتیں تیلیا رومال شوق سے اوڑھتی تھیں، مرد اس سے شملہ باندھتے تھے اور بڑے دفاتر کے جمعدار، چپراسیاں پیش قبض یا جمیہ لگا کر اسی سے کمر کستے تھے مگر آج مصنوعی ریشم جب اصل ریشم سے زیادہ چمک دمک کا اور سستا ملتا ہو تو ان دیسی سوتی کپڑوں کو کون پوچھتا ہے ۔ جولاہوں کی حالت خستہ و خراب ہے

معین الدین حسن

غزل

نالۂ دل اثر انداز نہیں ہے تو نہ ہو
لب ہلا لیتا ہوں آواز نہیں ہے تو نہ ہو

شکر کرتا ہوں ابھی حسرت پرواز تو ہے
اب اگر طاقت پرواز نہیں ہے تو نہ ہو

حسن کی ذات سے نسبت ہے یہی کیا کم ہے
عشق خود باعث اعزاز نہیں ہے تو نہ ہو

رہنمائی دل پُر شوق کرے گا میری
کوئی غربت میں جو دمساز نہیں ہے تو نہ ہو

ہم تو حال غم دل اپنا کہے جائیں گے
وہ اگر گوش بر آواز نہیں ہے تو نہ ہو

حسن اور عشق میں جذبات وہی ہیں موجود
کوہ کن سا کوئی جاں باز نہیں ہے تو نہ ہو

نظر اپنی ہے فقط تیرے کرم پر ساقی
در توبہ بھی اگر باز نہیں ہے تو نہ ہو

آنکھوں آنکھوں میں تو ہے سلسلۂ ناز و نیاز
گفتگو ہوتی ہے آواز نہیں ہے تو نہ ہو

دل تو اپنا نگہہ ناز کی جانب ہے حمید
دل کے جانب نگہ ناز نہیں ہے تو نہ ہو

حمید (لکھنوی)

اُردو رسالوں کے خاص نمبر

"سب رس"

شعبہ تنقید کی طرف سے نواب مرزا سیف علی خاں صاحب نے گذشتہ مہینے میں اُردو کے جو خاص نمبر شائع ہوئے ہیں ان پر حسب ذیل تعارفی تبصرہ روانہ فرمایا ہے :۔

سالنامہ ادبی دنیا (لاہور) بابت ۱۹۳۹ء حجم ۲۷۶ صفحات قیمت عہ پتہ منیجر صاحب رسالہ ادبی دنیا لاہور اور مکتبہ ابراہیمیہ حیدر...

لاہور کے مشہور ماہنامہ "ادبی دنیا" نے اس سال بھی اپنی قدیم وضعداری کے ساتھ شاندار سالنامہ نکالا ہے جو علم و ادب کے جواہر پاروں سے آراستہ ہے۔ لکھائی، چھپائی دیدہ زیب ہے۔ آرٹ پیپر کی کوئی تین درجن تصویریں جن میں کئی رنگین بھی ہیں اور اپنے اندر کافی کشش رکھتی ہیں۔ اس سالنامہ کے مضامین نثر میں مسٹر کرشن چندر، جناب نیاز... سردار راجندر سنگھ بیدی صاحب، جناب عاشق حسین صاحب بٹالوی، جناب وقار انبالوی، جناب شبیر حسن صاحب لکھنوی اور جناب... انصاری کے طبع زاد افسانے اور مسٹر چندر بھوشن سنگھ آزاد، جناب میر محمد علی خاں صاحب شہاب، جناب سراج الدین احمد صاحب، جناب طا... کے دوسری زبانوں کی کہانیوں کے ترجمے، اندر لال داس صاحب قمر، پروفیسر بسنت صاحب، راجہ فاروق علی خاں صاحب، صلاح الدین... کے ڈرامے، منشی پیارے لال صاحب شاکر، پروفیسر فیض احمد صاحب، پنڈت برج موہن دتاتریہ، سید بادشاہ حسن صاحب حیدرآ... سید شہنشاہ حسین صاحب رضوی، سید نور الحسن صاحب بی اے ایس، مظفر احمد صاحب، جناب میراجی اور جناب بسنت سہائے صاحب کے تا... علمی و ادبی مضامین قابل ذکر ہیں۔

حصہ نظم میں جناب اختر صہبائی، جناب ضیا فتح آبادی، جناب سید علی منظور، جناب آزاد انصاری، پنڈت اندرجیت شرما، جناب جو... اختر شیرانی، جناب سیماب اکبرآبادی، جناب محشر، جناب فراق، جناب فانی بدایونی، جناب وجد حیدرآبادی، جناب امجد حیدرآبادی، جناب... یگانہ لکھنوی، جناب ساغر نظامی، جناب نظیر لدھیانوی، جناب احسان بن دانش، جناب ماہر القادری اور جناب ظفر کی نظمیں اور غز... بہت دلچسپ اور رنگین ہیں۔

سالنامہ ادب لطیف (لاہور) بابت ۱۹۳۹ء حجم ۲۸۰ صفحات قیمت عہ۔ پتہ منیجر صاحب رسالہ ادب لطیف لاہور اور مکتبہ ابرا...

لاہور کے ماہنامہ "ادب لطیف" کا یہ سالنامہ اس دفعہ نہایت خوبصورت شائع ہوا ہے۔ لکھ... چھپائی بھی اچھی ہے۔ اس میں ہندوستان کے مشہور مضمون نگار، افسانہ نویس، ڈراماٹسٹ اور شعرا کے اچھوتے مضامین، دلچسپ افسانے، ڈرامے اور پرکیف نظمیں درج ہوئی ہیں۔ ان میں سے چند کا تذکرہ ذیل میں کیا جاتا ہے۔

پنڈت برج موہن کیفی دتاتریہ نے اپنے مضمون "خواجہ حالی مرحوم" میں مولانا حالی کی خصوصیات اور ان کی شاعری پر رو... ڈالی ہے۔ مولوی امتیاز علی صاحب تاج نے طالب بنارسی کے مشہور ڈرامے "لیل و نہار" پر دلچسپ تبصرہ کیا ہے، مولانا ماہر القادر... قدیم تمدن، بت پرستی اور بت تراشی کے متعلق چند مفید معلومات لکھی ہیں، جناب سید بادشاہ حسین صاحب حیدرآبادی نے ہندو... حرفتی ناقابلیت کے اسباب، قومی خصوصیات، جغرافیائی ماحول، امراض و افلاس، جہالت و ناتجربہ کاری، سیاسی غلامی اور تجارتی...

...ح طور پر بیان کئے ہیں۔ جناب فضل حق صاحب قریشی دہلوی نے آغا حشر کے متعلق اپنے ذاتی تاثرات قلمبند کئے ہیں۔

افسانوں میں مسٹر کرشن چندر، محترمہ حجاب امتیاز علی، پروفیسر سید فیاض محمود، جناب پریم پجاری، جناب اعظم کریوی، محترمہ ...ہ عبدالقادر، منشی پریم چند، آنجہانی، جناب صادق الخیری، جناب ایم اسلم، جناب سعادت حسن منٹو، جناب اختر انصاری کے دلکش ...لے قابل ذکر ہیں۔

مزاح نگاروں میں پروفیسر کنہیا لال، جناب شوکت تھانوی، علامہ ظریف اور جناب ناکارہ حیدر آبادی نے طنز کے خوب پہلو نکالے ہیں ...خاطر خواہ داد ظرافت دی ہے۔

جناب بہزاد لکھنوی، حکیم احمد شجاع صاحب، جناب احمد ندیم قاسمی، جناب نریندر ناتھ صاحب نے چند دلچسپ ڈرامے لکھے ہیں۔

حصہ نظم میں اردو کے مشہور شعراء حضرت جوش ملیح آبادی، علامہ سیماب، جناب امین حزیں، حضرت احسان، جناب اثر صہبائی ...ب الطاف مشہدی، جناب فراق اور جناب آزاد انصاری کی نظمیں اور غزلیں بہت دلچسپ اور کیف آور ہیں۔

...ہمایوں (لاہور) سالگرہ نمبر بابت ۱۹۳۹ء حجم ۱۰۴ صفحات قیمت ۱۲؍ پتہ۔ ۲۳۔ لارنس روڈ لاہور

...ہور کے قدیم اور مشہور ادبی ماہنامہ ہمایوں نے حسب معمول اپنا سالگرہ نمبر شائع کیا ہے۔ اس میں کئی بلند پایہ علمی، ادبی مضامین، افسانے ...ے اور نظمیں ہیں۔ اس نمبر کے شروع صفحات پر جناب بشیر احمد صاحب ایڈیٹر ہمایوں کا وہ مقالہ جو "یوم اردو" کے موقع پر انجمن اردو ...ب کے جلسہ میں پڑھا گیا تھا درج ہوا ہے۔ آخری صفحات پر اسی طرح کا ایک اور مقالہ جس کو جناب حامد علی خاں صاحب۔ جائنٹ ایڈیٹر ...یوں نے انجمن مذکور کے جلسہ میں پڑھا تھا لکھا گیا ہے۔ یہہ دونوں مقالے اردو، ہندی کے جھگڑے پر ایک سیر حاصل تبصرہ ہیں۔ جناب فلک پیما ...ڈراما "نقل اور اصل" اور جناب پروفیسر سید فیاض محمود صاحب کا ڈراما "قسمت کا فیصلہ" بہت دلچسپ اور نتیجہ خیز ہیں۔ مسٹر کرشن چندر ...ب سید علی عباس صاحب، جناب عبدالحمید صاحب کے افسانے، بے رنگ و بو، منجی کی پریت اور پہاڑ کا انتقام کافی دلکش اور سبق آموز ہے۔ نظموں میں مزدور کا عزم، فن لطیف، غم، روح انسان، برساتی ندی، عود بتی، منظر کے نام تقاضائے فطرت بہت دلچسپ، فطری اور دلا دینے میں ہیں۔ تصویروں میں مزدور کا عزم (رنگین)، نیا سال، زندگی، پانی کے قطرے، انعکاس نور، ایک دیہاتی منظر بہت خوبصورت اور نظر افروز ہیں۔

...ماہنامہ صبح امید (بمبئی) بابت ۱۹۳۹ء حجم ۱۰۰ صفحات قیمت ۸؍ پتہ۔ منیجر صاحب رسالہ صبح امید بمبئی ۸۔

اس نمبر کے بعض مضامین اور نظمیں اعلیٰ درجے کے ادیب اور شعراء کے قلم کی منت کش ہیں۔ حضرت ...ر شیرانی، مولانا آزاد، مولانا عبدالماجد صاحب، مولانا ظفر علی خاں صاحب، علامہ سید سلیمان ندوی، علامہ سیماب اکبرآبادی، ...مولانا ماہر القادری جیسے بلند پایہ ادیبوں اور شاعروں کے رشحات قلم سے اس نمبر کو زینت دی گئی ہے۔ ابتداء میں ڈاکٹر ...محی الدین صاحب قادری زور اور ڈاکٹر بذل الرحمن صاحب کے پیامات بھی بصیرت افروز ہیں۔

مولانا ابوالکلام آزاد نے اپنے مخصوص رنگ میں خاص اس نمبر کے لئے ایک مقالہ "الاصلاح" تحریر فرمایا ہے یہ فلسفیانہ مضمون ...اندر بہت ساری اصلاحی اور تعمیری خصوصیتیں رکھتا ہے۔ مولانا عبدالماجد صاحب دریابادی کا مختصر مضمون "ملکۂ حسن" یورپ کے ...ملکۂ حسن پر ایک بصیرت افروز تبصرہ ہے۔ حضرت سید سلیمان صاحب ندوی نے "حج بیت اللہ" پر ایک پُر مغز مقالہ سپرد قلم فرمایا ہے ...مولانا ماہر القادری نے "جنت بغداد" میں بغداد کے انقلابات کی مختصر تاریخ دلچسپ پیرایہ میں بیان کی ہے پروفیسر سید نجیب اشرف صاحب ندوی نے

"اردو کے مختلف نام" کے عنوان سے اُردو کی مختصر تاریخ لکھی ہے۔ مولانا احمد شبلی صاحب نے اپنے مزاحیہ مضمون "جھوٹ بھی ضرورت زندگی سے ہے" میں ثابت کیا ہے کہ جھوٹوں کے آگے سچا رو مرتا ہے۔

اس نمبر میں بعض قابل خواتین کے مضامین نظم و نثر بھی شامل ہیں۔ ان میں محترمہ زاہدہ خاتون صاحبہ لکھنوی اور زاہدہ بسوانی کی غزلیں، محترمہ ا۔ر کے بانو مضمر رضویہ کی نظم "اشک آدم" اور محترمہ ن ب صاحبہ دہلوی کا مختصر مضمون "میں کیا مضمون لکھا" قابل ذکر ہیں۔

اس نمبر کے حصہ نظم میں مولانا سیماب اکبرآبادی کی نظم "اتحاد قومیت" جناب صاحبزادہ میکش کی نظم "شاعر مشرق" جس کو انہوں نے اسماعیل کالج بمبئی کے جلسہ "یوم اقبال" میں پڑھی تھی، حضرت نیرنگ کی نظم "آہنگ عمل" مولانا ظفر علی خاں کی نظم "ہلال عید دیکھ کر" حضرت اختر شیرانی کی نظم "صبح عید" اور جناب آغا حشر کی نظم "گریہ یعقوب" جناب سنجر عظیم آبادی اور جناب فطرس ... کی غزلیں دل افروز اور روح پرور ہیں۔

تصویروں میں دو بجلیاں، رقاصہ، حسن، نیکی و بدی، دولت کی سیڑھی دلکش اور جاذب نظر ہیں۔ اس سالنامہ کی کتابت اچھی نہیں ہے، بمبئی میں نہ اچھے کاتب ملتے ہیں، نہ لیتھو کی چھپائی پاکیزہ ہوتی ہے۔ اس لئے یہ نقص نظر انداز کرنے کے قابل ہے۔

سالنامہ ساقی (دہلی)

بابت ۱۹۳۹ء مرتبہ جناب شاہد احمد صاحب ۲۸۰ صفحات قیمت عہ پتہ۔ منیجر صاحب رسالہ ساقی کھاری دہلی، مکتبہ ابراہیمیہ عابد روڈ سے بھی یہ قیمت عہ سکہ عثمانیہ دستیاب ہوسکتا ہے۔

ادارہ ساقی دہلی نے اس سال بھی اپنا سالنامہ نہایت شاندار پیمانہ پر نکالا ہے پہلے پچاس صفحات پر شکسپیر کے مشہور ڈرامے "کنگ لیئر" کو مولانا عنایت اللہ صاحب دہلوی سابق ناظم دارالترجمہ حیدرآباد نے اردو کے نہایت خوبصورت لباس میں پیش کیا ہے۔ ڈاکٹر ... شادانی نے "ایران کی عشقیہ شاعری" پر ایک تنقیدی و تاریخی مقالہ سپرد قلم فرمایا ہے جناب صادق الخیری صاحب کا "حسن و شباب" جناب ایم اسلم صاحب کی "سادھو کی پتری" جناب ل۔ احمد صاحب کا چینی افسانہ "داؤ" جناب سید وزیر حسن صاحب کی "رشیدہ" محترمہ حجاب امتیاز علی کی "مہمان داری" جناب فیضی صاحب رامپوری کی "رضیہ" جناب عظیم بیگ صاحب چغتائی کی "لال بیگ" جناب سعادت حسن صاحب منٹو کا "پھاہا" جناب آوارہ کی "دو رہیں" جناب اختر انصاری صاحب کا "میں نے ایسا کیوں کیا" محترمہ صالحہ عابد حسین کا "خاں بہادر" جناب ناکارہ حیدرآبادی کا "شاگرد" جناب اشرف صبوحی کی "اندھیری راتیں" یہ سب کے سب مختصر افسانے اور دلچسپ کہانیاں اپنے اندر روانی، عبرت، نصیحت، مزاح اور طنز کے مختلف پہلو رکھتی ہیں۔

جناب "بیابانی" کا "پاگل" جناب "ناصح" کا "ڈاک گھر" اور جناب انصار ناصری صاحب کا "بخت آور" یہ تینوں ڈرامے نہایت ... اور دلچسپ ہیں۔

پروفیسر براس نے "جاپانی پہلوان" میں جاپان کے فن پہلوانی اور وہاں کے دنگلوں اور کشتیوں پر تفصیل سے روشنی ڈالی ہے اس مضمون کے ساتھ جاپانی پہلوانوں کی چند تصویریں بھی ہیں۔ جناب سید بادشاہ حسین صاحب حیدرآبادی نے "ڈرامہ میں مکالمہ کی اہمیت" کے عنوان سے مکالمہ نگاری اور کردار کی خصوصیات پر اچھا تبصرہ کیا ہے۔ جناب محمد مسلم صاحب نے "چینی تعلیم" اور چینی معلومات کی ضرورت پر دل نشیں پیرایہ میں نہایت دلچسپ اور نصیحت خیز مکالمہ لکھا ہے۔ جناب آغا محمد اشرف صاحب نے اپنے مخصوص انداز میں ایران

برس کی تاریخ ایک مختصر مضمون میں بڑی خوش اسلوبی کے ساتھ بیان کی ہے جناب سید علی صاحب شاکر نے کسی خود غرض
ار" تعلیم یافتہ" "شریف" "شاہد بازاری کے" "چند عاشقانہ خطوط" درج کرائے ہیں۔
حصہ نظم میں جناب امین حزیں، جناب کوکب، جناب احسان بن دانش، جناب علی منظور، جناب نہال، جناب شاد اور جناب
صاحب کی نظمیں، دل گداز، پرکیف اور بلند پایہ ہیں۔

خاص نمبر بابت سنہ ۱۹۳۹ء باتصویر مرتبہ حافظ محمد عالم صاحب ۲۱۲ صفحات قیمت عہ پتہ: مینجر صاحب رسالہ عالمگیر
...لاہور مکتبۂ ابراہیمیہ عابد روڈ حیدرآباد سے بھی مل سکتا ہے۔ قیمت عہ سکہ عثمانیہ۔

رسالہ عالمگیر کا یہ خاص نمبر ۵ ے مضامین نظم و نثر پر مشتمل ہے۔ چند خاص مضامین کا قارئین کرام سے ذیل میں تعارف کرایا جاتا ہے
جناب پروفیسر حامد حسن صاحب نے ایک تحقیقی مضمون "علامہ اقبال اہل ایران کی نظر میں" تحریر فرمایا ہے "شکار با شکاری"
...ن کار" "نادمی" "بڑھاپے کی شادی" "جھوٹ" "ڈاکٹر راشد" "اقرار محبت" "کامیاب وکیل" "شادی اور
...ں" "خطرناک جادوگر" "بھوت" "جوانی کی یاد" عبرت انگیز، نفسیاتی، جذباتی، معاشرتی، سماجی، فلسفیانہ اور مزاحیہ افسانے ہیں
مولانا محمد عبداللہ صاحب قریشی نے بعض مشہور شعراء کے آخری کلمات قلمبند کئے ہیں۔ "درۂ خیبر" کے عنوان سے پشاوریوں کے متعلق
خالدہ ادیب خانم کے تاثرات درج ہوئے ہیں جناب خواجہ احمد صاحب فاروقی نے موجودہ سیاست پر ایک دلچسپ تبصرہ کرکے یورپی
جنگ کے امکانات پر روشنی ڈالی ہے۔ جناب خیر بہوروی نے حضرت ریاض پر ایک ادبی مقالہ لکھا ہے۔ جناب پروفیسر بشیر صاحب
... نے اپنے مضمون "تقدیر بدست" میں ہاتھ کی لکیروں کو تفصیل کے ساتھ بتایا ہے۔ جناب کوثر چاند پوری نے دنیا کے سب سے
...وان" رستم" کی سوانح حیات لکھی ہے۔ جناب لطیف صاحب ندوی لکھنوی نے کابل کی مختصر تاریخ لکھی ہے۔ جناب محمد اصدیقی
...ی نے فارسی کے ایک ظریف شاعر "حلاج شیرازی" کے مختصر حالات اور کچھ اشعار لکھے ہیں۔ جناب سید احمد اللہ صاحب قادری
...رسالہ تاریخ نے مدراس کے مشہور شاعر شمس العلماء محمد عبدالرحمن شاطر کی شاعری پر ایک طائرانہ نظر ڈالی ہے۔ جناب سید ارشاد حسین صاحب
... "والیٹر" کی مختصر سوانح عمری لکھی ہے۔
حصہ نظم میں حضرت جلیل، جناب اختر مینائی، جناب اظہار نسری، جناب منظر نیر آبادی، جناب ... حضرت امجد حیدرآبادی
...دل شاہجہان پوری، جناب کیفی چڑیاکوٹی، جناب تبسم، جناب محوی لکھنوی، جناب مخمور جالندھری، جناب اثر صہبائی، جناب ماہر
...بادی کی غزلیں اور نظمیں خاص طور پر قابل ذکر ہیں۔
اس نمبر میں بعض سادہ اور رنگین تصویریں جاذب نظر اور دلکش ہیں۔

مرزا سیف علی خاں

بچوں سے

فروری کے پرچے میں "بقرعید" یا "المنکرات" پر مضمون لکھنے کے لئے کہا گیا تھا مگر کم بچوں نے حصہ لیا۔ اب ہم تاریخ بڑھائے دیتے ہیں۔ مضامین ضرور لکھ بھیجیں۔ مضمونوں پر نمبر دیے جائیں گے اور نتیجہ اپریل کے پرچہ میں شایع کیا جائے گا۔

ایک اور بات آپ سے یہ کہنا ہے کہ آپ اپنے پرچے کے متعلق رائے لکھ بھیجیں کہ آپ کو اپنے سب رس میں کس قسم کی کمی نظر آتی ہے اور سب رس کو کس طرح اس سے بہتر بنایا جائے۔ غرض کہ جو کچھ رائے لکھیں صاف واضح طریقے سے اور بالکل آزادی سے لکھیں اور ۱۵ مارچ تک ہمارے پاس بھیج دیں جن کی رائیں بہترین سمجھی جائیں گی وہ اپریل کے پرچے میں شائع کردی جائیں گی۔ فروری کی پہیلیوں کے کسی نے بھی صحیح بھیجے۔ مندرجہ ذیل پانچ اصحاب میں سے پہلے چار نے ایک غلطی کی ہے اور آخری صاحب نے دو۔

۱۔ مسیح الدین خاں متین۔ ۲۔ میر محمود علی اکبر مشیر۔ ۳۔ خوند پیر پاشاہ۔ ۴۔ خواجہ معین الدین۔ ۵۔ حبیب شمس۔

پہیلیوں کے صحیح حل یہ ہیں:-

(۱) انسان یا آدمی (۲) گھڑی یا گھڑیال (۳) صندوق (۴) انار (۵) حقہ۔

اس وقت یہ انعامی سوالات دیے جا رہے ہیں:- (۱) انھیں بھی ۱۵ مارچ تک حل کرکے دفتر میں بھیج دیں۔ (۲) جوابات وہی بھائی اور بہنیں روانہ کریں جو اس رسالہ کے خریدار ہیں۔ (۳) اگر ایک سے زیادہ اصحاب انعام کے مستحق ہوں تو قرعہ انعام کا تصفیہ کیا جائے گا۔ (۴) انعام میں ایک کتاب "اسکول کی زندگی" دی جائے گی جو میر محمود علی صاحب کی عطیہ ہے۔

انعامی سوالات

معین الدین احمد

(۱) وہ کونسی چیز ہے جو جاکر نہیں آتی (۲) وہ کونسی چیز ہے جو آکر نہیں جاتی (۳) وہ کونسی شئے ہے جس کے چار حرف ہیں۔ اسے بڑے لوگ استعمال کرتے ہیں۔ اگر اسے الٹ کر پڑھیں تو بارش کا موسم یاد آجاتا ہے۔ (۴) وہ کونسی شئے ہے جو خود تو بے جان لیکن جانداروں کو گرفتار کرتی ہے۔ (۵) وہ کونسی شئے ہے جو خود تو اندھی ہے لیکن اندھے کو راستہ ڈھونڈنے میں

لطیفے

میر محمود علی اکبر مشیر

۱۔ ایک ملازم نے کوئی غلطی کی مالک نے غصہ میں آکر کہا تم گدھے کے بچے ہو نوکر نے ہاتھ جوڑ کر عرض کیا سرکار ماں باپ ہیں۔

۲۔ ایک مرتبہ ایک صاحب آم کھا رہے تھے اس اثنا میں ایک صاحب ان کی ملاقات کے لئے آئے آپ نے آم پیش کیا انھوں نے انکار کیا اتفاقاً ادھر سے ایک گدھا گذرا انھوں نے چھلکا پھینکا وہ سونگ کر چلا گیا۔ ملاقاتی نے کہا کہ دیکھئے جناب گدھے آم نہیں کھاتے جس پر آپ نے کہا جی ہاں گدھے آم نہیں کھاتے۔

(۳) ایک صاحب کے گھر مہمان آئے تھے اتفاق سے ان کے کمپونڈ میں گدھے چر رہے تھے۔ مہمان نے دریافت کیا کیا آپ کے گھر میں گدھے رہتے ہیں۔ میزبان نے کہا نہیں جناب رہتے نہیں ہیں بلکہ آج آئے ہیں۔ سید غوث الدین احمد

اطلاعیں

[...]ن تحفہ۔ سب رس بچے اور طلبہ اپنے بھائیوں، بہنوں، اور دوستوں کو گزشتہ سال کے سب رس کے بارہ پرچوں کی خوبصورت [...]
تحفے کے طور پر دے سکتے ہیں۔ ایسی جلدوں پر سب رس کے نام اور سنہ کے علاوہ تحفہ دینے والے کا نام اور جس کو تحفہ دیا جارہا [...]
کا نام بھی منقش کردیا جاسکتا ہے۔ بارہ پرچوں کی ایسی نفیس مکمل جلد کی قیمت صرف ۱۲عہ ہوگی۔ اگر سب رس بچے منی آرڈر کے ساتھ
[...]زیز یا دوست کا پتہ لکھ بھیجیں تو یہ جلد دو چار روز کے اندر ان کی طرف سے تحفہ بن کر ان کے دوست کے یہاں پہنچ جائے گی۔
[...]چند ہی جلدوں کی گنجائش ہے۔ علم دوست طلبہ اپنی فرمائشیں جلد روانہ کریں ورنہ موقع نہ رہے گا۔

[...] رس کے متفرق پرچے۔ جن بچوں کے یہاں سب رس کے گذشتہ سال کے پورے پرچے محفوظ نہ ہوں اور وہ اپنا
[...]ل کرنا چاہتے ہوں تو دفتر سے مراسلت کریں۔ اگر ممکن ہو تو دفتر سب رس رعایتی قیمت سے پرچے فراہم کرکے ان کے فائل کی
[...]ں دے گا۔

[...]بچوں کی تحریک ہے کہ بچوں کے سب رس کے صفحوں میں اضافہ کرکے اس کی قیمت میں اضافہ کیا جائے۔ اس بارے میں
[...]نے کافی غور کے بعد یہ تصفیہ کیا ہے کہ:-

جن بچوں کو ۱۶ صفحوں سے زیادہ مضمون اور نظمیں وغیرہ پڑھنے کا شوق ہے وہ بڑے سب رس کے خریدار بن جائیں۔ جس کا چندہ
[...]چار روپے سالانہ علاوہ محصول ڈاک ہے۔ بڑے سب رس کے سب مضمون بھی مفید، دلچسپ اور معلومات آفریں ہوتے ہیں۔ اور طلبہ
[...]مطالعہ سے پوری طرح فائدہ اٹھا سکتے ہیں۔ اس بڑے پرچہ میں بچوں کا پرچہ بھی شامل رہتا ہے۔ اور تصویریں بھی چھپتی ہیں۔ جو بچے
[...]ت چھوٹے پرچے کے خریدار ہیں وہ آئندہ سے بڑا پرچہ لینا چاہیں تو دفتر سے مراسلت کریں۔ ان کا چندہ بڑے پرچہ میں منسوب کرکے
[...]یت کے ساتھ بڑا سب رس جاری کیا جائے گا۔

مہتمم سب رس

[...]لومات

[...]ن کے عجائب گھر میں اوسطاً ہر روز سو کتابوں کا اضافہ ہوتا رہتا ہے۔
[...]فریقہ کی بعض قومیں شیر کے گوشت کو غذا کے طور پر استعمال کرتی ہیں۔
[...]یفٹی دیا سلائیاں ابتداءً ۱۸۵۵ء میں سوئیڈن میں ایجاد ہوئی تھیں۔
[...]ساہ برطانیہ کا تاج ۴۰ آونس وزنی ہے۔ (۵) جاپان میں ہر سال تقریباً ۵۰۰ مرتبہ زلزلے آتے ہیں۔
[...]سورج کی روشنی ۸ منٹ ۸ سکنڈ میں زمین تک پہونچتی ہے۔ (۷) ہندوستان کا رقبہ جزائر برطانیہ سے ۱۴ گنا
[...]ہے۔

محمد غوث محی الدین (روشیخ گلبرگہ)

امام حسین علیہ السلام

حسین نام تھا۔ آپ کے والد ماجد علی مرتضیٰ اور والدہ ماجدہ سیدہ فاطمہ زہرہ رسول اللہ کی لخت جگر تھیں۔ آپ ہجرت کے [illegible]
[illegible] شعبان المعظم پنجشنبہ کے روز مدینہ منورہ میں تولد ہوئے۔ ولادت کی خبر سن کر رسول مقبول تشریف لائے آپ نے صاحبزادے کے [illegible]
حضرت امام حسین کی ہستی متعدد صفات کی حامل تھی علم عمل، زہد تقویٰ، جود، سخا، شجاعت، اخلاق، صبر اور شکر آپ میں [illegible]
کہ نہایت اعلیٰ عنوان تھے۔

آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کو آپ سے غیر معمولی انس تھا چنانچہ آپ فرماتے ہیں (۱) اہل بیت میں مجھ کو حسنؑ و حسینؑ سب سے زیادہ [illegible]
(۲) خدایا میں ان کو محبوب رکھتا ہوں تو بھی ان کو محبوب رکھ (۳) حسنؑ و حسینؑ جنت کے دو پھول ہیں (۴) حسنؑ و حسینؑ نوجوانان [illegible]
سردار ہیں۔

ایک مرتبہ آنحضرتؐ نے امام حسنؑ اور حسینؑ کو اپنے دوش مبارک پر بٹھایا حضرت یعلیٰ بن مرہ نے کہا صاحبزادے تمہاری [illegible]
اچھی ہے۔ آپ نے فرمایا سوار بھی کتنے اچھے ہیں۔

صحابہ کرام بھی آپ کی تعظیم کیا کرتے تھے۔ چنانچہ ایک دفعہ حضرت عمرؓ مال غنیمت تقسیم کر رہے تھے۔ آپ نے امام حسنؑ اور حسینؑ کو [illegible]
ہزار درہم دیئے اور جب اپنے بیٹے عبداللہ کی باری آئی تو ان کو پانسو درہم دیئے۔ انھوں نے کہا یا امیرالمومنین میں طاقتور ہوں۔ میں نے
میں رسول مقبول کا ساتھ دیا ہے اس وقت تو یہ دونوں بالکل بچے تھے۔ اب ان کو ایک ایک ہزار درہم دیئے گئے ہیں اور مجھے صرف پا[illegible]
کے چہرے کا رنگ سرخ ہو گیا آپ نے فرمایا "جا تو بھی ان کے باپ جیسا باپ، ان کی ماں جیسی ماں، ان کے نانا جیسے نانا، ان کی نانی جیسی
ان کے ماموں جیسے ماموں، ان کی خالہ جیسی خالہ اور ان کے چچا جیسے چچا لا۔ کیا تجھے نہیں معلوم کہ ان کے باپ علی مرتضیٰ، ماں فاطمہ زہرا، [illegible]
نانی خدیجۃ الکبریٰ، ماموں ابراہیم، خالہ ام کلثوم اور رقیہ اور چچا جعفر طیار تھے عبداللہ ابن عمر یہ سن کر خاموش رہ گئے۔

آپ نہایت متقی اور پرہیزگار واقع ہوئے تھے۔ نماز، روزہ اور حج آپ کے پر معنی مشغلے تھے۔ آپ نے ایک ہزار نوافل اور [illegible]
ادا فرمائے ہیں۔ آپ کی جود و سخا کا یہ عالم تھا کہ کوئی سائل آپ کے گھر سے خالی نہیں جاتا تھا۔ ایک دفعہ آپ نے ایک فقیر کو دیکھا جو دس
درہم کے لئے خدا سے دعا مانگ رہا تھا۔ آپ مکان تشریف لا کر دس ہزار درہم غلام کے ہاتھ روانہ فرما دیئے۔

آپ بہت سادہ طبیعت واقع ہوئے تھے۔ ایک مرتبہ چند فقراء کھانا کھا رہے تھے انھوں نے آپ کو مدعو کیا آپ نے ان کی [illegible]
رد نہیں کی بلکہ ان کے ساتھ شریک ہو گئے اور فرمایا کہ متکبر لوگوں کو خدا دوست نہیں رکھتا۔

آپ کی کتاب زندگی کے اوراق کا مطالعہ کرنے سے یہ بات مشاہدہ میں آتی ہے کہ آپ کی ہستی تمام صفات حسنہ کا [illegible]
اور ایسی صفات اور خوبیوں کے مجسمہ کا نام حسینؑ تھا۔ آپ نے حق کے لئے جان دی اور قیامت تک آپ کی شہادت کی یاد منائی جائے گی۔

محمد رفیع الدین فار[illegible]

حضرت امام حسین علیہ السلام کے حالات اور ان کی شہادت کے سانحہ کے متعلق مزید معلومات حاصل کرنی ہوں تو دفتر سب رس سے محرم نامہ منگا[illegible]
صفحات۔ ۹ تصاویر۔ مجلد قیمت (۸عہ) ہر مسلمان گھر میں سب رس کے محرم نامہ کی ایک جلد ضرور ہونی چاہیئے۔

عقل کی آنکھ

ایک بادشاہ اپنی تھوڑی سی فوج اور وزیر کو ساتھ لے کر شکار کو نکلا۔ حبشی کا غلام بھی ہمراہ تھا۔ چلتے چلتے شہر سے دور جنگل میں نکل گئے۔ انھیں وہاں ایک ہرن دکھائی دیا۔ بادشاہ کے دل میں خیال پیدا ہوا کہ ہرن کو زندہ گرفتار کرنا چاہیے۔ چنانچہ ہرن کے پیچھے گھوڑا دوڑایا جب ساتھیوں سے دور نکل گیا تو وہ ایک چوراہے پر پہنچا۔ وہاں ایک نابینا شاہ صاحب بیٹھے ہوئے تھے۔ اس نے شاہ صاحب سے پوچھا کہ شاہ صاحب کیا ادھر سے کوئی جانور گیا ہے۔ شاہ صاحب نے کہا کہ ہاں بادشاہ سلامت ابھی ابھی ادھر سے ایک ہرن پورب کی طرف گیا ہے یہ سنتے ہی بادشاہ اسی جانب کو چل دیا۔ تھوڑی دور جانے کے بعد بادشاہ نے ہرن کو گرفتار کرلیا۔ کچھ عرصہ کے بعد وزیر اور غلام بھی بادشاہ سے آملے۔ جب تمام ایک جگہ جمع ہوئے تو بادشاہ نے وزیر سے پوچھا کہ چوراہے پر جو نابینا شاہ صاحب بیٹھے ہیں انھیں یہ کیونکر معلوم ہوا کہ میں بادشاہ ہوں اور انھوں نے جانور کا نام بھی بتادیا۔ وزیر نے کہا حضور میں خود حیران ہوں۔ میرے ساتھ بھی یہی واقعہ پیش آیا۔ انھوں نے مجھے وزیر کہہ کر مخاطب کیا تھا۔ غلام نے بھی دست بستہ ان باتوں کی تصدیق کی۔ اب تو بادشاہ کی حیرت کی کوئی حد نہ رہی۔ وزیر اور غلام کو ساتھ لے کر چوراہے پر پہنچا۔

بادشاہ :۔ شاہ صاحب آپ کی بعض باتوں نے مجھے حیران کر رکھا ہے۔ براہ کرم میرے سوالوں کا صحیح صحیح جواب دیجئے۔

شاہ صاحب :۔ حضور شوق سے فرمائیں۔ میں آپ کے سوال کے جواب دینے کی کوشش کروں گا۔

بادشاہ :۔ آپ تو نابینا ہیں آپ کو کوئی چیز دکھائی نہیں دیتی پھر یہ کیسے معلوم ہوا کہ ادھر سے جانے والا جانور ہرن ہی تھا؟

شاہ صاحب :۔ حضور عالی یہ ظاہر ہے کہ مجھے کچھ دکھائی نہیں دیتا مگر عقل سے انسان بہت کچھ معلوم کرسکتا ہے۔ ادھر سے جانے والا جانور چوکڑی بھر رہا تھا اور میں جانتا ہوں کہ ہرن دوڑتے وقت چوکڑی بھرتا ہے۔

بادشاہ :۔ شکریہ! مہربانی فرماکر اب یہ بھی بتا دیجئے کہ آپ نے کس طرح جانا کہ میں بادشاہ ہوں۔

شاہ صاحب :۔ یہ بھی میں نے صرف عقل کی رہنمائی سے معلوم کیا ہے۔ کیونکہ آپ نے مجھے شاہ صاحب پکارا تھا۔ میں نے خیال کیا کہ مجھ غریب فقیر کو شاہ صاحب کہنے والا ضرور کوئی اعلیٰ ظرف انسان ہے ہو نہ ہو یہ کوئی بادشاہ ہے اس لئے میں نے آپ سے اسی طرح گفتگو کی جیسے بادشاہ سے کی جاتی ہے اور بعد میں آنے والے صاحب کو میں نے اس طرح وزیر جانا کہ انھوں نے مجھ سے جن الفاظ اور انداز میں گفتگو کی وہ پہلے والے سے ذرا کم معلوم ہوتی تھی اور بادشاہ کے بعد وزیر ہی اسی درجے کے کسی شخص کو آنا چاہئے تھا اس لئے میں نے انھیں وزیر صاحب کہہ کر مخاطب کیا اور تیسرا شخص جو ادھر سے گذرا اس کا انداز پہلے دونوں سواروں سے بالکل جدا اور سخت تھا۔ اس نے دور ہی سے چیخ کر پوچھا کہ ارے اندھے کیا دو گھوڑے سوار گذرے ہیں؟ میں نے اسے بتا تو دیا۔ مگر یہ بھی معلوم کرلیا کہ ایسی سختی سے بات چیت کرنے والا اور اتنا کم ظرف سوائے غلام کے کوئی نہیں ہوسکتا۔ شاہ صاحب کی گفتگو کا بادشاہ اور اس کے ساتھیوں پر بہت اثر ہوا۔ اور غلام نہایت شرمندہ ہوا اور سب خوش خوش شہر کو لوٹے۔

جمیلہ حامد النساء بیگم

علم کے طالب کو کیا کیا چاہیئے

علم کے طالب کو کیا کیا چاہیئے
اور کیا اس کو ہونا چاہیئے

ان مضامیں پر ہے کچھ میرا کلام
ایک اک مصرعہ کو دیکھا چاہیئے

شرطِ اوّل ہے یہ انساں کے لئے
آدمی کا ذہن اچھا چاہیئے

یہ تو قدرت کی عنایت ہے مگر
پھر بھی ہم کو غور کرنا چاہیئے

آدمی ہر حال میں ہے آدمی
ذمہ داری اپنی دیکھا چاہیئے

علمیت ہی کا نشر ہے تربیت
اولاً اخلاق اعلیٰ چاہیئے

معرفت پر ہے بنا اخلاق کی
ذاتِ خالق کا عقیدہ چاہیئے

پڑھنے لکھنے کا نہیں تعلیم نام
اس سے بے شک استفادہ چاہیئے

یہ خطابت اور کتابت ہی فقط
آپ کو انسان ہونا چاہیئے

علم کے طالب کا ہے یہ فرضِ عین
عقل کی باتوں پہ چلنا چاہیئے

کیجیئے گا قدر اپنے وقت کی
اقتدارِ وقت اچھا چاہیئے

اپنے اپنے وقت پر ہر کام ہو
انتظامِ وقت اچھا چاہیئے

قوتِ بازو پہ کیجیئے اعتماد
اپنی ہمت پر بھروسہ چاہیئے

آڑے وقتوں میں بنیں سینہ سپر
طالب علمو ایسا شیوا چاہیئے

بادشاہِ وقت و ملت والدین
ان کا اپنے دل میں رتبہ چاہیئے

اپنے چھوٹوں سے محبت کیجیئے
اور بڑوں سے جھک کے ملنا چاہیئے

آپ کی رگ رگ میں ہو حبِ وطن
ملک کا آنکھوں میں نقشہ چاہیئے

دھجیاں ہو جائے گر علم لباس
سوزنِ محنت سے سینا چاہیئے

ہے مثالِ علم پانی کی طرح
پر حصول اس کا زیادہ چاہیئے

اپنا رستہ خود بنا لیتا ہے یہ
کس طرف سے اس کو بہنا چاہیئے

زندگی میں ہے سہارا علم کا
بحرِ ہستی میں سفینہ چاہیئے

کیجیئے حاصل مسلسل علم کو
ایک اک موتی پرونا چاہیئے

حسین شریف در

وقت کی قیمت

وقت ایک قیمتی شئے ہے۔ جب تک کوئی شخص بیمار نہ ہو تندرستی کی قدر نہیں جانتا اسی طرح جب کوئی شخص وقت کو بے وجہ فضول ضایع کرکے دیگر مصائب میں گرفتار ہو جاتا ہے تب وہ وقت کی قدر کو جانتا ہے کہ یہ کیسی قیمتی شئے ہے۔ بقول شخصے۔

"انسان کچھ کھو کر سیکھتا ہے" مقولہ ہذا کے مطابق جب انسان وقت کو کھو کر کوئی ناقابل برداشت تکلیف محسوس کرتا ہے۔ تب کہیں وہ خواب غفلت سے بیدار ہو کر وقت کی قیمت کو محسوس کرتا ہے۔ اور افسوس کرتا ہے کہ :۔ "کاش میں اس قیمتی وقت کو ضائع کرتا"

یہ مقولہ ہر کس و ناکس کی زبان زد ہے کہ :۔ "کمیاب شئے گراں قیمت ہوتی ہے" لیکن وقت اس کے برعکس ہے یعنی خداوند عالم وقت کو بغیر کسی قیمت کے ہر امیر و غریب کو عطا کیا۔ لیکن بہت کم لوگ ایسے ہیں جو وقت کی قدر کرتے ہیں۔ اس لئے کہ کسی شخص کو وقت کی کمی محسوس نہیں ہوتی کیونکہ وقت کی بہتات ہے

اگر تم وقت کی قدر کو جاننا چاہتے ہو تو کسی بے تاج بادشاہ سے پوچھو یا کسی سراغ رسان سے پوچھو۔ وہ یہی کہے گا کہ :۔

"وقت چار دانگ عالم میں مثل ہوا کے ہرجائی ہے لیکن بہت کم اشخاص ایسے ہیں جو وقت کو قدر کی نگاہ سے دیکھتے ہیں"

ایک بادشاہ ہے جو وسیع سلطنت پر حکمران ہے۔ کچھ عرصہ بعد ایک دوسرا طاقتور شہنشاہ اس بادشاہ کی ریاست پر قبضہ کرلیتا ہے۔ اور وہ بادشاہ جان کے خوف سے چھپتا چھپاتا اپنی حدود سلطنت سے نکل جاتا ہے۔

اس وقت اس بدنصیب دل جلے اور بے تاج بادشاہ کے مغموم دل سے یہ پُردرد صدا نکلتی ہے "کاش! میں اس وقت کی قدر و منزلت کرتا جب کہ میں کئی لاکھ رعایا کا آقا تھا جب کہ میں ایک وسیع خزانہ کا مالک تھا۔ لیکن افسوس صد افسوس کہ میں نے اس عزیز ترین وقت کو عیش و عشرت اور غرور و نخوت سے بسر کیا۔ میرا وہ نازک بدن جو محلوں کے نرم و نازک بچھونوں پر رہا کرتا تھا آج فرش زمین پر ہے۔ وہ سر جو غرور و نخوت سے بھرپور تھا آج سرنگوں ہے۔ میرا وہ پُررعب چہرہ اور وہ پُرغضب نگاہیں جب کسی ادنیٰ شخص پر پڑ جاتی تھیں تو وہ لرز جاتا تھا۔ اور آج میں وہ ہوں کہ اگر دشمن کا ایک ادنیٰ سپاہی آتشیں نگاہوں سے گھورے تو میں کانپ جاؤں۔ افسوس صد افسوس کسی نے سچ کہا ہے :۔ "گیا وقت پھر ہاتھ آتا نہیں" وہ وقت جب کہ میرے دم قدم سے محفلیں آباد رہتی تھیں اور میری رعایا مجھ کو سر آنکھوں پر بٹھاتی تھی۔ ہر امیر و غریب کے دل میری عزت سے بھرپور تھے اگر میں اب بھی کروڑہا روپئے پانی کی طرح بہادوں تو "اے وقت تو اب واپس نہیں آسکتا۔" اے وقت تو بہت قیمتی ہے۔ کسی شہنشاہ کا خزانہ تیری قیمت ادا نہیں کرسکتا۔ سچ ہے! تو قیمتی ہے ہیروں سے زیادہ، شہنشاہوں کے خزانوں سے زیادہ، حتیٰ کہ اے وقت تیرے سامنے دنیا کی دولت ہیچ ہے۔ تیری اتنی بہتات کے باوجود کوئی شخص تجھے خرید نہیں سکتا اور نہ کوئی خرید سکے گا۔

کاش! اگر کوئی شخص وقت کی قیمت کو محسوس کرکے نہایت ہی عقلمندی سے صرف کرے تو وہ بہت کچھ عروج حاصل کرسکتا ہے۔

بادشاہ کے اس کلام سے ظاہر ہے کہ دنیا کی کوئی شئے وقت سے زیادہ قیمتی نہیں۔ حتیٰ کہ دنیا کے کسی شہنشاہ کا خزانہ وقت کی قیمت ادا نہیں کرسکتا۔

غلام مجتبیٰ قمر (بیدر شریف)

لالچ کی سزا

نسیم ایک نیک لڑکا تھا۔ ایک دفعہ وہ ٹہلنے جا رہا تھا۔ راستے میں اسے ایک قیمتی بٹوا پڑا ملا۔ بٹوہ نہایت ہی عمدہ تھا اور ایک ریشمی ڈورا پڑا ہوا تھا۔ نسیم نے جب بٹوہ کھولا تو معلوم ہوا کہ اس میں ایک سونے کی انگوٹھی ہے۔ وہ خوش نہ ہوا بلکہ یہ خیال کر کے رنجیدہ ہوا کہ کسی راستہ چلنے والے کا قیمتی بٹوہ گر گیا ہے۔ نسیم بٹوہ لے کر سیدھا قاضی جی کے پاس گیا اور اس کے ہاتھ میں دے کر کہنے لگا کہ یہ بٹوہ جس شخص کا ہو اسے دیدیجئے۔ اتنے میں بٹوہ کا مالک جمال اپنے بٹوہ کی تلاش کے لئے اتفاق سے ادھر کو آنکلا۔ اس نے بہت کچھ تلاش کی۔ لیکن ناکام رہا۔ سوچا کہ قاضی صاحب سے جا کر اپنے نقصان کی اطلاع کرنی چاہیئے۔ جمال دوڑا ہوا قاضی صاحب کے پاس گیا۔ اس وقت قاضی اور نسیم میں یہ گفتگو ہو رہی تھی۔

قاضی:۔ تم نے یہ بٹوہ کس جگہ پایا؟

نسیم:۔ میں ٹہلنے جا رہا تھا تو مجھے راستہ میں یہ بٹوہ پڑا ملا۔ میں اسے آپ کے پاس لے آیا تاکہ جس کا ہو اسے مل جائے۔

جمال نے قاضی کو اپنی طرف متوجہ کیا اور کہا کہ یہ بٹوہ میرا ہے۔ میں اس کی تلاش میں عرصہ سے پریشان ہوں۔ قاضی نے نسیم کی طرف اشارہ کیا اور جمال سے کہا کہ یہ شخص میرے پاس ایک بٹوہ لایا ہے۔ بتاؤ تمہارا بٹوہ کیسا ہے۔

جمال:۔ میرا بٹوہ بالکل نیا اور قیمتی تھا اور اس میں ایک ریشمی ڈورا پڑا تھا۔

قاضی:۔ اس کے اندر کیا تھا؟

جمال نے اپنے دل میں سوچا کہ اگر میں کہدوں کہ میرے بٹوہ میں دو انگوٹھیاں تھیں۔ تو نسیم کو ایک انگوٹھی اپنے پاس سے دینی پڑے گی۔ یہ سوچ کر بولا جی جناب اس میں سونے کی دو انگوٹھیاں تھیں۔

قاضی۔ جناب آپ نے سب کچھ صحیح بتلایا لیکن آپ کے کہنے کے خلاف اس میں تو صرف ایک انگوٹھی ہے۔

جمال:۔ تو جناب نسیم ہی نے ایک انگوٹھی غائب کر لی ہوگی۔

قاضی نے کہا کہ نہیں ایسا ہرگز نہیں ہوسکتا۔ بھلا خیال تو کرو کہ اگر اس لڑکے کو چرانا ہی ہوتا تو وہ بٹوہ میرے پاس لاتا ہی کیوں۔ تمہارے بٹوہ میں دو انگوٹھیاں تھیں۔ اور اس میں صرف ایک انگوٹھی ہے اس لئے تم اس کے مالک ہرگز نہیں ہو سکتے۔

یہ کہہ کر قاضی نے بٹوہ نسیم کو دے دیا اور جمال کو چار و ناچار گھر واپس ہونا پڑا۔ دیکھو بھائیو اور بہنو لالچ بہت بری بلا ہے۔ جمال نے اپنے ہاتھ سے اپنا بٹوہ کھو دیا۔

اشرف ہادی علی (محبوبیہ گرلز اسکول)

دلچسپ معلومات

(۱) دنیا میں زیادہ بارش۔ آسام میں چراپونجی کے مقام پر سالانہ ۵۰۰ انچ ہوتی ہے۔ (۲) سب سے زیادہ آبادی جاپان کے پایہ تخت شہر ٹوکیو میں ہے۔ (۳) اہل روس نے ایک ریل بنائی ہے جس کا نام ٹرانس سائبیرین ریلوے ہے۔ حسین شریف

لطیفے:۔ جج (مجرم سے) آج تم بارہویں مرتبہ عدالت میں آئے ہو اس مرتبہ ہرگز ہرگز تمہارا قصور معاف نہ ہوگا۔

مرزا محمد ارشد مختار بیگ

بچوں کی تعلیم و تربیت

(آخری قسط)

نفسیات کے ماہروں کا قول ہے کہ بچہ اپنی عمر کے پہلے پانچ سال میں جتنا علم حاصل کرتا ہے اپنی آئندہ زندگی کے کسی سال میں بھی اتنا حاصل نہیں کرسکتا
ئش سے سنِ شعور تک بچہ کی دماغی حالت میں بہت سی تبدیلیاں ہوجاتی ہیں اوائل زندگی کے تاثرات ہی کسی بچے کے مزاج اور مذاق کے بنانے میں
موثر ثابت ہوتے ہیں، عموماً عہد طفلی ہی میں بچہ کا مذاق، مزاج، عادات و اطوار بنتے اور نشوونما پاتے ہیں اس لئے ابتدائی زمانہ میں اگر ہم بچوں کو
ے مذاق کے موافق صحیح اصول پر تعلیم دیں تو حقیقی معنوں میں انہیں انسان بنا سکتے ہیں۔

ابتدائی تعلیم و تربیت ہی ایسی چیز ہے جو بچہ کے افعال، عادات و اطوار اور چال چلن کو سانچے میں ڈھال دیتی ہے۔ پیدائش کے وقت بچہ بالکل
ہوتا ہے، البتہ تھوڑی ذہانت ضرور رکھتا ہے، اس کی دماغی قوتیں حواس خمسہ کے ذریعہ بتدریج علم حاصل کرتی ہیں اس طرح اس کی تعلیم شروع
تی ہے عمر کے ساتھ ساتھ اس کی قوتوں کی نشوونما ہوتی ہے اور اس کے علم میں اضافہ ہونا شروع ہوتا ہے۔

ہر قوم کی ترقی اور بہبودی کا دار و مدار اس کے بچوں کی صحیح تعلیم و تربیت اور اصلاح پر منحصر ہے، آج کے بچے کل کے شہری ہوتے ہیں، زمانہ کی رفتار
سرعت سے ترقی کر رہی ہے کہ دنیا دیکھتے دیکھتے کیا سے کیا ہو جا رہی ہے، وہ زمانہ گیا جب کبوتر اڑائے جاتے تھے، پتنگ بازی کے جلسے بڑی دھوم
م سے منائے جاتے تھے، بلبل اور کرگٹ لڑائے جاتے تھے، آج کل کے کھلونوں نے بھی مہذب شکل اختیار کرلی ہے، ہر کھلونہ کا ایک میکانی یا صنعتی
ہوتا ہے، پتنگوں سے زیادہ بچوں کی دلچسپی کا سامان طیاروں کی پرواز میں منتقل ہوگیا ہے، اپنے بچوں کو ہم اب ایسے کھیل سکھائیں اور
کے لئے ایسی تفریح کے سامان مہیا کریں جن میں تعلیم کا پہلو نمایاں ہو، چھوٹے بچوں کی تعلیم اب اسی طرح ہو رہی ہے، بچے کھیلنے کودنے پڑھنے لکھنے
جاتے ہیں، تعلیم کا یہ طرز کمسن بچوں کے نازک دماغوں پر نہایت خوش گوار ہوتا ہے، ابتدائی تعلیم کے یہ ڈھنگ ہر ملک میں نہایت کامیاب ثابت
ہے ہیں۔

بچوں سے اکثر غلطیاں ہوا کرتی ہیں، ان کی ان غلطیوں اور فروگزاشتوں کا مواخذہ نہایت احتیاط سے کرنا چاہئے، ایسے موقعوں پر غم و غصہ
والدین کے چہروں سے ہوا کرے تو بہتر ہے، بچہ سے اس کی غلطیوں کا ذکر بار بار نہ کرنا چاہئے ورنہ وہ بے حس اور ڈھیٹ ہوجائے گا۔
الدین کے حرکات و سکنات کا مطالعہ کرتا رہتا ہے، جب وہ اپنی کسی غلطی پر والدین کا چہرہ بدلا ہوا دیکھتا ہے تو اس پر ضرور اثر ہوتا ہے اور
خود نصیحت حاصل کرتا ہے۔

بچوں کو ان کی شرارتوں اور غلطیوں پر کچھ اور سزائیں بھی دی جاسکتی ہیں، مثلاً انھیں سینما نہ دکھانا، مٹھائی چاکلٹ وغیرہ نہ دینا، ان کے
ق کی چیزیں انھیں نہ دلانا، ان کے کھلونوں میں سے کسی ایک کھلونے کو ضبط کرلینا غرض کہ سزا ہر غلطی کی حیثیت کے موافق ہونی چاہئے
سی بچہ پر والدین کی ناراضی اور اس قسم کی سزاؤں کا کوئی اثر نہ ہو تو سمجھ لینا چاہئے کہ وہ والدین کی صحبت میں تربیت نہیں حاصل کرسکتا ایسے
کو کسی اچھے بورڈنگ ہاؤس میں بھیج دینا چاہئے تاکہ اجنبی ماحول میں والدین کی محبت یاد آئے اور وہ اپنی غلطیوں پر پشیمان ہوکر ان سے
انے کا عزم کرلے۔

نوخیز لڑکوں اور لڑکیوں کی تربیت اس طرح ہونی چاہئے کہ وہ گھر میں عزیز و اقارب کے ساتھ ان کے احترام اور اپنے اعلیٰ کردار کو

اور یہ اُسی محبت کا اثر تھا کہ وہ ان پھولوں کی خوشبو میں ایک خاص فرحت اور لذت پاتا۔ وہ اکثر محبت بھری نظروں سے ندی کو تکا کرتا۔ اس وجہ یہ تھی کہ ندی اس کے باغ کے پاس سے بہتی تھی اور اُس کے درختوں کو پانی دیتی تھی۔ اور اس طرح اُس کی زندگی مسرت، کیف اور لطف سے بسر ہو رہی تھی۔ یہ سب محبت کا اثر تھا۔ اور محبت جو ہر دل میں کم و بیش موجود رہتی ہے اس کے دل میں بھی تھی اور اُسے دنیا و مافیہا سے بے پرواہ بنا چکی تھی۔

اُس کا مالک جب باغ میں آتا اور باغ کی تر و تازگی کو دیکھتا تو ٹھنڈی سانس بھر کر کہتا "یہ سب مالی کی محبت کا اثر ہے۔ پھول سے مالی کی محبت کی خوشبو آرہی ہے۔" شاید وہ اپنی محبت کو یاد کرنے لگتا جو اس کے نوجوانی کے زمانے کی بہترین یادگار تھی۔

دن گذرتے گئے۔ مالی بڈھا ہوتا گیا اور درخت تناور ہوتے گئے۔ اس کے مالک نے باغیچہ دوسرے کے ہاتھ بیچ ڈالا۔ باغبان اب بہت بڈھا ہو گیا تھا۔ درختوں کو اب بڈھے کی خدمات کی ضرورت نہ تھی۔ بڈھے کے ہاتھ بھی اب درختوں کی خدمت کر بھی نہ سکتے تھے حالانکہ اس کی دلی محبت بڑھتی جا رہی تھی۔ اُس کی حالت اُن پرندوں کی سی تھی جو درختوں کی ٹہنیوں پر بیٹھ کر اور پھولوں سے مخاطب ہو کر نغمہ سرائی کرتے۔ بڈھا مالی بہت فرطِ مسرت سے کوئی دیہاتی راگ گانے لگتا۔ ایک دن نئے آقا نے بڈھے مالی کو بلا کر کہا "یہ لو تنخواہ۔ اب تم بڈھے ہو گئے۔ باغ تم سنبھال نہیں سکتے۔ جاؤ اور گھر بیٹھ کر اللہ اللہ کرو۔ اب تم کام نہیں کر سکتے۔ اور یہ خدا کو یاد کرنے کا زمانہ ہے۔ اور یہ لو انعام۔"

بڈھے مالی نے ہاتھ جوڑ کر کہا "حضور میری ایک تمنا پوری کر دیں گے؟" کیا؟ مرنے کے بعد میری قبر پر اس باغ کا ایک پھول ڈال دیجئے گا۔" یہ کہہ کر کہنہ سال باغبان نے ایک سرد آہ بھری، اور لاٹھی ٹیکتا ہوا باہر نکل گیا۔

(ماخوذ)

محمود علی

ہوائی جہاز کی ایجاد

ایک زمانے میں ہوا میں اڑنا انسان کے نزدیک خواب و خیال تھا اور باوجود مختلف کوششوں کے ناکامیابی رہی۔ لیکن ۱۷۸۳ء میں کچھ کامیابی کی صورت نظر آئی۔

مانٹ گالفیر کے دو بھائیوں نے جو ملک فرانس کے رہنے والے تھے، غبارہ ایجاد کیا۔ پہلے ان دونوں نے ابر کو اڑتا ہوا دیکھا۔ کیا تو اس نتیجہ پر پہونچ کر اگر ایک ربر کی تھیلی میں ابر کی طرح بھاپ بھر دی جائے تو وہ بھاپ اس ربر کی تھیلی کو ہوا میں اڑا لے۔ انھوں نے لکڑی جمع کر کے آگ سلگائی اور اس آگ کے اوپر ایک ربر کے تھیلے جس کا قطر ایک سو پانچ فٹ تھا اس میں لکڑیوں کے دھوئیں جمع کیا اور اس کو جب ہوا میں چھوڑ دیا تو وہ تقریباً ڈیڑھ میل تک ہوا میں بلند ہو گیا اور دس منٹ کے بعد نیچے آگیا۔ ان دونوں نے یہ خیال کیا کہ یہ غبارہ ہوا میں اس لئے اڑا کہ اس کے اندر جو دھواں تھا وہ بہت ہلکا تھا۔ اور تھوڑے دنوں کے بعد یہ مسئلہ حل ہو گیا کہ گرم ہوا ہوا سے ہلکی ہوتی ہے۔ وہ تھیلا ہوا میں اس وقت تک بلند ہوتا رہا جب تک کہ اس کے اندر کا دھواں گرم رہا اور جونہی اس میں خنکی ہونے لگی۔ غبارہ وزنی ہو کر نیچے آگیا۔ اس پہلے تجربے میں یہ غلطی ہوئی تھی کہ اس میں کوئی ایسا انتظام نہیں کیا گیا کہ اندر کے دھوئیں

گرم رکھا جا سکے۔ یہ ہوا پر قابو پانے کا پہلا تجربہ تھا۔

دوسری کوشش سنہ ۱۷۸۳ء میں دوسرے دو بھائیوں نے کی جن کا نام رابرٹ تھا اور فرانس کے ہی رہنے والے تھے۔ انھوں نے ایک غبارے میں ہیڈروجن گیاس بھر دی۔ وہ غبارہ تین ہزار فٹ بلندی پر اڑا اور تقریباً پینتالیس منٹ تک ہوا میں رہا اور ایک کھیت میں جو پندرہ میل کے فاصلہ پر تھا گر گیا جہاں کے لوگ اس غبارہ کو دیکھ کر پریشان ہو گئے اور اس کو ٹکڑے ٹکڑے کر دیا۔

اسی سال مانٹو گالفیر ہی کے دو اور بھائیوں نے ایک اور غبارہ بنایا۔ انھوں نے ایک پنجرا اس غبارہ میں نیچے کی طرف لٹکا دیا۔ اور اس میں ایک بکرا۔ ایک مرغ اور ایک بطخ کو بند کیا جو سب سے پہلے دنیا کے ہوائی مسافر تھے۔ ان تینوں جانوروں کو کوئی صدمہ یا نقصان نہیں پہونچا صرف مرغ کا پکھوٹا کچھ زخمی ہو گیا تھا جس کی وجہ یہ ہوئی کہ اس غبارے کے اڑنے سے پہلے بکرے نے اس کو ایک لات مار دی تھی۔

پہلا انسان جس نے ہوا میں پرواز کی وہ روزیر تھا جو فرانس کا ہی رہنے والا تھا سنہ ۱۷۸۳ء میں یہ تین مرتبہ ہوا میں اڑا۔ اس نے یہ ثابت کر دیا کہ غبارہ میں رہ کر اندر کی ہوا کو ایک انسان آگ روشن کر کے گرم رکھ سکتا ہے۔ فرانس کی اس ہوائی جد و جہد کی خبریں تمام یورپ میں پھیل گئیں۔ جس کے بعد ہی مختلف مقامات پر غبارے ہوا میں اڑائے جانے لگے اور رفتہ رفتہ وہ بڑے بڑے بنائے جانے لگے اور انسان میں بھی یہ جرأت پیدا ہو گئی کہ وہ ہوا میں اڑیں۔ سنہ ۱۸۳۶ء میں لندن کے چند مشہور معزز لوگ غبارے کے ذریعے ہوا میں اڑے اور یہ غبارہ اٹھارہ گھنٹے ہوا میں رہنے کے بعد زمین پر اترا اور اس دوران میں اس نے ۵۰۰ میل کا راستہ طے کر لیا تھا۔ ان غباروں میں صرف یہی خرابی تھی کہ وہ ہوا کے رخ پر ہی اڑتے تھے۔ اور اس خرابی کو رفتہ رفتہ دور کیا گیا یہ اس طرح کہ ایک وزنی چیز غبارہ کے نیچے لگا دی گئی۔ سنہ ۱۹۰۱ء میں دو جرمن سائنس داں سات میل اونچے ہوا میں اڑے۔ سنہ ۱۹۰۲ء میں کونٹ زیپلین ایک جرمن موجد نے اس طرف توجہ کی اور اس نے ہوائی جہاز بنائے جس کے ڈھانچے بہت ہلکی دھات کے تھے اور اس کے اندر مختلف خانے بنائے گئے جس میں ہوا بھری گئی۔ یہ ہوائی جہاز بہت بڑے تھے اور ان کو زیپلین کا نام دیا گیا کیونکہ زیپلین ہی ان کا موجد تھا۔

جنگ عظیم میں جرمنی نے زیپلین کو اکثر استعمال کیا ہے۔ زیپلین ہوائی جہاز ہی نے نارتھ سی کو عبور کر کے انگلستان کے مختلف مقامات پر بم برسائے۔ اور اس کے ذریعہ سے فرانس اور پیرس پر بم برسائے گئے۔ امریکہ کے دو نوجوانوں نے وزنی مشین ہوا میں اڑانے میں کامیابی حاصل کی۔ انھوں نے پتنگوں اور چڑیوں کو دیکھا کہ وہ کس طرح ہوا میں اڑتے ہیں۔ انھوں نے یہ خیال کیا کہ پرندوں کی طرح ہوا میں اڑنا ممکن ہے۔ چنانچہ انھوں نے پرندوں ہی کے وضع کے ہوائی جہاز تیار کیے۔ رابٹ نے سنہ ۱۹۰۳ء میں پہلی مرتبہ ہوا میں نئے قسم کا ہوائی جہاز ایجاد کیا۔ سنہ ۱۹۰۹ء میں بلیرٹ نامی ایک فرانسیسی نے بحیرہ انگلستان کو عبور کیا اور اس کامیابی پر ایک ہزار پونڈ کا انعام حاصل کیا۔ دس ہزار پونڈ کا انعام ایسے شخص کو دیے جانے کا اعلان کیا گیا جو لندن سے منچسٹر تک پرواز کرے۔ اس انعام کو پالہم نامی ایک صنّاع نے حاصل کیا۔ اسی زمانے کے ہوائی جہاز کو رفتہ رفتہ ترقی حاصل ہوتی گئی۔ جنگ عظیم میں ان ہوائی جہازوں سے بڑی مدد لی گئی تھی۔ اور اب بھی ہوائی جہازوں کی اہمیت بڑھتی جا رہی ہے۔ وسائل حمل و نقل میں اس سے بڑی مدد لی رہی ہے ہوائی جہاز کی وجہ سے دنیا کی طنابیں بہت قریب آ گئی ہیں۔ موجودہ خرابی جو اب باقی رہ گئی ہے وہ یہ ہے کہ اس کو اڑنے کے لیے کافی گنجائش کی ضرورت ہے۔ فرانس کے ایک شخص نے اس خرابی کو دور کر کے تجربتاً بتا دیا۔ آج کل جرمنی، روس، فرانس، اور امریکہ میں ہوائی جہاز بنانے کے کارخانے نہایت سرعت سے ترقی کر رہے ہیں۔

مسعود بن سعید

ہم بچے ہیں

ہم ننھی ننھی کلیاں ہیں — ہم چھوٹے چھوٹے انساں ہیں
ہر حال میں شاداں فرحاں ہیں — تعمیرِ وطن کے ساماں ہیں
ہم باغِ وطن کے غنچے ہیں

ہم بچے ہیں ہم بچے ہیں
ہم ننھے ننھے تارے ہیں — ہم سب کے دل کے پیارے ہیں
ہم قلبِ وطن کے پارے ہیں — ہاں بچے ہم بے چارے ہیں
ہم باغِ وطن کے غنچے ہیں

ہم بچے ہیں ہم بچے ہیں
ہم کو نہ کبھی پست جانو — مستقبل کو ہم میں دیکھو
قوم کی عزت گر تم چاہو — سب سے پہلے ہم کو سنبھالو
ہم باغِ وطن کے غنچے ہیں

ہم بچے ہیں ہم بچے ہیں
ٹھہری ہم معقول بنیں گے — دنیا میں مقبول بنیں گے
غنچوں سے ہم پھول بنیں گے — پھول بنیں گے پھول بنیں گے
ہم باغِ وطن کے غنچے ہیں
ہم بچے ہیں ہم بچے ہیں

سید موسیٰ کلیم ید اللّٰہی

"بدرِ کامل" اور "ننھا سلیم"

ایک شب سلیم ننھا — صحنِ مکاں میں نکلا
تھی شب وہ چاندنی کی — رخشاں تھا ماہِ تاباں
وہ چاند دیکھتا تھا — میں دیکھتا تھا اس کو
اس چاند پر جوانی — اس چاند پر تھا بچپن
گویا بدر پر آنکھ — اٹھی ہلال کی تھی
اور رفتہ رفتہ پایا — منزل کو آج اپنی
ہے ابتدا سفر کی — منزل ہے دور اس کی
وہ دور کر رہا ہے — تاریکیٔ جہاں کو
اس سے مرا ہے روشن — تاریک گوشۂ دل
بھٹکے ہوئے مسافر — پاتے ہیں راہ اس سے
مایوس دل میں میرے — ارماں جگائے اس نے
اس پر چکور عاشق — ماں باپ اس پہ مفتوں
وہ کل جہاں کا پیارا — اس پر پیار سب کا
یا رب دعا ہے میری — جیسا ہے فیض اس کا
میرا "سلیم" بڑھ کر — پہنچائے فیض سب کو
محروم گر رہوں میں — پروا نہیں ہو اس کی
میرا وطن کم از کم — ہو فیض یاب اس سے

میر کاظم علی واصل

لوہے کی کان

لوہے کی قدر و قیمت سونے اور ہیرے سے بھی زیادہ کرنی چاہیے۔ اگر قدرت میں بجائے لوہے کے سونے اور چاندی جیسی نرم اور ملائم دھاتوں کی بہتات ہوتی تو ہمارے کاروباری دنیا میں بہت مشکل ہوتی۔ سونے اور بگڑ کام سونے جیسی اعلیٰ اور نازک دھات بجا نہ لاسکتے۔ دنیا کے سارے اہم کام لوہے کی مشین انجام دے رہی ہے۔

انگلستان جو سارے دنیا میں متمول خیال کیا جاتا ہے اس کی وجہ یہ ہے کہ وہاں لوہے اور کوئلہ کی کانیں بکثرت پائی جاتی ہیں۔ ہیرے یا سونے کے خزانے وہاں بہت کم ہیں۔ وہاں کے لوگوں نے لوہے کی صنعت میں وہ کمال حاصل کئے کہ لوہے کو سونے اور موتی کے عوض فروخت کرتے ہیں۔ سونے کو زمین سے نکالنے کے لئے کافی محنت اور صرفہ برداشت کرنا پڑتا ہے مگر لوہا بہت ہی کم صرفہ اور محنت سے حاصل ہو سکتا ہے۔ اگر ہمارے ملک میں بھی قدرت نے لوہا اور کوئلہ کثرت سے پیدا کر دیا۔ تو اس کی قدر سونے سے بھی زیادہ کرنی چاہیے۔ اب ہم تمھیں ایک دلچسپ کہانی سناتے ہیں جو لوہے کی کان سے متعلق ہے۔

کسی زمانے میں ایک مقام پر چار آدمی رہا کرتے تھے۔ وہ تمام خوش حال تھے۔ ان چاروں میں حد درجہ کا اتحاد و اتفاق تھا۔ لیکن ایک دن وہ اپنی تمام دولت کھو بیٹھے اور غربت کا شکار ہو گئے۔ آخرکار وہ سب ایک دانشمند آدمی کے ہاں گئے اور اپنی بدقسمتی کا افسانہ سنانے لگے۔ دانشمند آدمی کو ان پر رحم آیا۔ اس نے ان چاروں میں سے ہر ایک کو ایک عجیب و غریب سیب دیا اور ان نوجوانوں سے کہا کہ تم سب ایک ایک سیب کو اپنے سر پر رکھو اور کسی جانب نکل جاؤ۔ جہاں کہیں سیب گر جائے وہاں رک جاؤ اور زمین کھودو تمھارے پھاوڑے کے ساتھ جو کچھ نکل آئے اس پر قناعت کرو۔

ان لوگوں نے دانشمند کے کہنے کے مطابق اپنا راستہ لیا۔ ایک میل بھی جانے نہ پائے تھے کہ ان میں سے ایک کے سر سے سیب گر پڑا۔ اس شخص نے اسی جگہ کھودا اور تانبہ پایا۔ اپنے ساتھیوں سے کہنے لگا "کل کی مرغی سے آج کا انڈا بھلا" اگر تم چاہتے ہو تو یہیں ٹھیرو اور میرے شریک حال ہو جاؤ۔ لیکن انھوں نے اس خیال سے انکار کیا کہ شاید ان کے قسمت میں کوئی اس سے زیادہ بہتر شئے ہے۔ اور اپنی راہ لی۔

تھوڑی دیر نہ گذری تھی کہ دوسرے کے سر سے سیب زمین پر آرہا۔ اسی جگہ اس نے اپنے پھاوڑے سے کھودا اور چاندی کا خزانہ پایا۔ اپنے ساتھیوں سے کہا بہتر ہے کہ تم لوگ یہاں ٹھیر جاؤ اور میری ملکیت میں حصہ دار بن جاؤ۔ مگر دوسرے دونوں نے نفی میں جواب دیا۔ اور کہا کہ وہ بھی قسمت آزمائی کرتے ہیں۔ لہٰذا دونوں نے اپنا راستہ اختیار کیا کچھ فاصلہ طے کرنے کے بعد تیسرے شخص کے سر سے سیب گرا اس نے وہاں اپنے پھاوڑے سے کھودنا شروع کیا اور ایک سونے کی کان پائی۔ اس کو دیکھ کر بہت خوش ہوا اور چلا کر کہا "میری قسمت سب سے اعلیٰ ہے"۔ ساتھی کو اپنی دولت پر مدعو کیا۔ چوتھے شخص نے ساتھی کی دعوت کا شکریہ بجا لاتے ہوئے کہا کہ وہ بھی قسمت آزمائی کرے گا۔ ممکن ہے کہ اس کو ہیرے اور جواہرات ملیں۔ یہ کہتے ہوئے چوتھا شخص وہاں سے نکل پڑا۔ تھوڑے عرصہ بعد اس کا سیب بھی سر سے گرا اس نے بھی اسی مقام پر کھودنا شروع کیا۔ آخرکار لوہا برآمد ہوا وہ اسے پاکر بہت رنجیدہ ہوا مگر آگے چل کر لوہے کی کان کی بدولت وہ دوسروں سے زیادہ مالدار بن گیا۔

سید اقبال حسین اقبال

رجز حیات

رگوں میں خوں ہے جوش زن ابھی جوان ہے زندگی — بلند و پست دہر میں اک امتحاں ہے زندگی
مثالِ بحرِ مضطرب رواں دواں ہے زندگی — صدآرزوئے حریت کا کارواں ہے زندگی

تلاشِ دمبدم ہی سے تو زندگی میں جان ہے
یہ زندگی کا اوج ہے یہ زندگی کی شان ہے

ارادے سب رکھو اٹل کہ تم ابھی جوان ہو — رہو قدم زنِ عمل کہ تم ابھی جوان ہو
ہو دست آہنی میں بل کہ تم ابھی جوان ہو — بنے نہ سدِ رہ جبل کہ تم ابھی جوان ہو

تلاشِ دمبدم ہی سے تو زندگی میں جان ہے
یہ زندگی کا اوج ہے یہ زندگی کی شان ہے

ہو سرفروش و صف شکن وطن پہ تیغ زن — وفا شعار و ذی ہمم فدائی شہ دکن
دلِ قوی میں رات دن ہو یہ لگی ہوئی لگن — ضرور اک نہ ایک دن کریں گے خدمتِ وطن

تلاشِ دمبدم ہی سے تو زندگی میں جان ہے
یہ زندگی کا اوج ہے یہ زندگی کی شان ہے

زمانہ کس ادا سے پھر سناتا ہے کھری کھری — کہ زندگی ہے جاوداں نہ سمجھو اس کو سرسری
رگوں میں برق زندگی ہے کوٹ کوٹ کر بھری — ابھارے کیوں نہ کام پر تمھیں خیالِ برتری

تلاشِ دمبدم ہی سے تو زندگی میں جان ہے
یہ زندگی کا اوج ہے یہ زندگی کی شان ہے

اٹھو اشارے کرتے ہیں فلک سے تارے بار بار — اٹھو تمھارے واسطے ہے موجِ آب بے قرار
حیاتِ نو کا لایا ہے پیامِ ابرِ نو بہار — دلوں کو گدگداتی ہے ادائے حسنِ سبزہ زار

تلاشِ دمبدم ہی سے تو زندگی میں جان ہے
یہ زندگی کا اوج ہے یہ زندگی کی شان ہے

محمد عبد السلام ذکی

ادارہ کی مطبوعات دوسرے اداروں کی نظر میں

ماہنامہ "سب رس" نے اپنی قلیل زندگی میں کافی سے زیادہ شہرت حاصل کر لی ہے۔ یہ ماہنامہ اس کی زندگی کا دوسرا سال ہے۔ اتنی کم [illegible]
[illegible] اور ضخیم نمبر شایع کر چکا ہے۔ یہ خاص نمبر جو "دکن نمبر" ہے گذشتہ خاص نمبروں سے ہر طرح فائق ہے۔ گویا دکن کی ایک مکمل تاریخ ہے جس کی موجودگی میں
تاریخ کی ضرورت نہیں رہتی۔ اگر اس خاص نمبر کے ہر پہلو پر روشنی ڈالی جائے تو بہت زیادہ وقت و گنجایش کی ضرورت ہے مختصراً یہ کہ ۔ مضامین نظم و نثر کے علاوہ
[illegible] سلاطین آصفی وزرائے آصفی اور امرائے آصفی کی ۔ تصاویر اور آثار دیگر تصاویر اس خاص نمبر میں شایع کی گئی ہیں جو یقیناً بڑی دقت سے حاصل کی گئی ہوں گی
[illegible] پرانے زمانے کی ہیں، دکن کے بادشاہ، ادبا، مشاہیر، تاریخی عمارتیں، تاریخی شہر، غرض کوئی پہلو ایسا باقی نہیں رہا ہے جس پر مضامین نہ ہوں
[illegible] ادبیات اردو کو اس خاص نمبر کی اشاعت پر مبارکباد پیش کرتا ہوں۔

"شاعر" آگرہ جنوری ۱۹۳۹ء

[illegible] نمبر: بلند پایہ مضمون نگاروں کی دماغی کاوش اور بہترین شعرائے کرام کے کلام نظم و نثر کے علاوہ تاریخی واقعات کا مخزن۔ ضخامت ہند کے ۸۰ صفحات
[illegible] وغیرہ۔ فرماں روایان مملکت آصفیہ و دیگر اسلامی مرحوم فرماں رواؤں کے علاوہ ان اہل ہنود کی تصاویر جن کو مملکت آصفیہ کے حکمرانوں نے اپنی صحیح خدمت
[illegible] میں جاگیریں وغیرہ عطا کی تھیں، اور نسلاً بعد نسلٍ ان کے پاس موجود ہیں۔ ان کی تصاویر غرض کہ یہ سالگرہ نمبر اپنی مثال آپ ہے۔ ادارہ اور ادارہ کے نگران
[illegible] محی الدین صاحب قادری زور قابل صد ہزار ستایش ہیں۔ ادبیات سے دلچسپی رکھنے والے حضرات کے لئے یہ نادر تحفہ ہے جس نے ملاحظہ نہ فرمایا ہو وہ ضرور طلب کریں۔

"منادی اسلام" بمبئی جنوری ۱۹۳۹ء

[illegible]یہ و تبسم نوجوان حیدرآباد خدمت ادب و زبان میں آج سے نہیں اتنے عرصہ سے لگا ہوا ہے کہ بہت سے نوجوان جوانی کی آخری سرحدوں کو بھی عبور کر گئے ہیں
[illegible] اور ہمت بدستور جوان ہی ہے۔ ادبی خدمت گذاروں کی اسی شستہ و منتخب جماعت کے ایک ممتاز رکن بکش صاحب بھی ہیں جو مدت سے اپنے میخانہ سے شعر و ادب کے جام
تقسیم کر رہے ہیں۔ گریہ و تبسم انھیں کے کلام کا مجموعہ ہے۔ اور رنگ و بو کا ایک خوش منظر گلدستہ ادارۂ ادبیات اردو اس کے قبل بھی بہت سی کتابیں شاعروں اور
[illegible] محفل میں بار پانے کے قابل شایع کر چکا ہے، اور یہ کتاب بھی اسی سلسلہ کی ایک تازہ قسط ہے۔ کتاب کی تقسیم کئی حصوں میں ہے مثلاً حرکت و حیات، سکون و اضطراب
[illegible] عمل و قال، عقیدت و یقین، شباب و شعر وغیرہا اور ہر عنوان کے ماتحت اسی کی مناسبت سے نظمیں درج ہیں بعض بعض نظموں پر بے اختیار کلام اقبال کا دھوکا ہو جاتا ہے۔

[illegible] ولی۔ اردو شاعری کے "باوا آدم" کے نام سے کون ناواقف ہے! نذر ولی، انھیں کے کلام کے مختلف پہلوؤں پر جامعہ عثمانیہ کی چار گریجویٹ خاتونوں کا مجموعہ
مقالات ہیں۔ پہلا ولی کا تخیل ہے، دوسرا کلام ولی اور تصوف، تیسرا ولی کی معلومات اور خصوصیات شاعری، اور چوتھا ولی کا فن شاعری، اور ہر عنوان پر
[illegible] بانوے محترم نے قلم اٹھا کر تبصرہ نویسی کا حق ادا کر دیا ہے اور ایک تازہ شہادت اس امر کی بہم پہنچا رہی ہے کہ نور جہاں بیگم، جہاں آرا بیگم اور زیب النساء بیگم
[illegible] شعر و ادب کی بابت جو روایات و حکایات مشہور ہیں وہ محض افسانہ نہیں۔ ولی کے تغزل کی تشریح میں قلم بہت آسانی سے پھسل سکتا تھا لیکن صحیح تربیت کا
[illegible] جہاں بھی قلم نسوانی حجاب و حیا کی پابندیوں کے ساتھ خوب بچ بچ کر چلا ہے۔ بعض بعض فقرے، ادبی حیثیت سے بھی خوب بیساختہ زبان قلم پر آگئے ہیں۔

"صدق" لکھنؤ جنوری ۱۹۳۹ عیسوی

ڈاکٹر سید محی الدین صاحب قادری زور پروفیسر ادبیات اردو جامعہ عثمانیہ کی معرکۃ الآرا کتابیں

اردو کے اسالیب بیان

اردو نثر نگاری کی تاریخ انشا پردازوں کی
نثر کے اسالیب اور ان کی خصوصیات پر تبصرہ جدید
اردو نثر کے رجحانات اور مستقبل کے متعلق مشورے
طبع سوم ۱۸۰ صفحات قیمت

اردو شہ پارے

آغاز اردو سے ولی اورنگ آبادی تک کے
اردو ادب (نظم و نثر) کا منتخبات تذکرہ
معہ نمونہ کلام ۔ قدیم شعراء اور قدردانوں
اردو کی نایاب تصاویر بڑی تقطیع
۴۰۰ صفحات مجلد قیمت

روح تنقید

فن تنقید پر اردو ادب کی واحد مستند
کتاب جو مختلف جامعات کے نصاب
تعلیمی میں شامل ہے ۔ طبع سوم
صفحات ۲۹۰ قیمت

تنقیدی مقالات

روح تنقید کا دوسرا حصہ اردو کے
بہترین ادبی کارناموں پر بلند پایہ
تنقیدیں ۔ طبع دوم
۲۹۶ صفحات مجلد قیمت

عہد عثمانی میں اردو کی ترقی

گزشتہ ربع صدی میں اردو ادب میں جو ترقیاں
ہوئی ہیں ان کا مفید اور مکمل تذکرہ جامعہ عثمانیہ
مستند تاریخ حیدرآباد کے جملہ خدمت گزاران اردو
خدمات پر تبصرہ ۔ ۲۸۶ صفحات مجلد قیمت

محمود غزنوی کی بزم ادب

غزنین کی فارسی شاعری اور وہاں کی
ادبی و علمی چہل پہل کا مبسوط تذکرہ
صفحات ۱۱۰
قیمت

ہندستانی لسانیات

اردو زبان کا لسانی تجزیہ و تشریح
اپنے فن میں اردو کی پہلی کتاب
اردو ہندی جھگڑے کی تاریخ
قیمت

ہندستانی صوتیات

(بزبان انگریزی)
اردو زبان کا صوتی تجزیہ و تشریح جدید ترین
علمی صوتیاتی آلوں اور گرودنوں کے نتائج
کے چھ بہتر فوٹو ۔ قیمت

فن انشا پردازی

مضمون نگاری اور انشا پردازی کے راز اور فن
میں کامیابی کے عملی طریقے ۔ انشا پردازی
میں کامیابی حاصل کرنے کے وسائل صفحات ۱۱۶
قیمت

طلسم تقدیر

زوال گولکنڈہ کے وقت کا
نیم تاریخی افسانہ
طبع سوم صفحات ۶۶
قیمت

سیر گولکنڈہ

۱۶ افسانے ۔ ۱۲ تصاویر ۔
گولکنڈہ کی زندگی کے مختلف پہلو
افسانوں کی شکل میں قلمبند ہوں
کی مختصر تاریخ صفحات ۱۶۰ قیمت ۱۵

گولکنڈے کے ہیرے

۱۷ افسانے ۸ تصاویر
سیر گولکنڈہ کا دوسرا حصہ گولکنڈہ کے
آخری دور کے متعلق نیم تاریخی افسانے
صفحات ۱۳۶ قیمت مجلد ۱۲

دفتر سب رس ۔ رفعت منزل خیریت آباد حیدرآباد دکن یا ہر کتب فروش سے مل سکتی ہیں ۔

عطرِ تریاق
کے استعمال سے پلیگ، ہیضہ، دق، سِل، ملیریا کے متعدی اثرات وبائی وغلیظ ہوائیں موثر بدن نہیں ہوتیں اور کپڑا کیڑے
سے محفوظ رہتا ہے قیمت فی شیشی ۱۰/
سکندر ہیر آئیل
زمانہ حاضرہ کی مفید ترین ایجاد ہے
صرف دس قطرے اپنے پسند کے کسی تیل میں شریک کرکے استعمال کریں، یہہ دوا بھی ہے اور خوشبودار تیل بھی جو جملہ امراض
دماغی کا مصلح اور مقوی دماغ ہے قیمت فی شیشی ۸/
ملنے کے مقامات
شاہ سید عبدالرزاق، دارالمجربات یونانی طبی بورڈ (روبرو ہائی کورٹ) میر حسن عابد روڈ۔ شفا خانہ ڈاکٹر مختار چھتہ بازار
آفتاب کی تمازت
سے اپنی عزیز جان کو بچانے کے لئے سن ہیٹ کا استعمال کیجئے جو آپ کو اس خطرۂ عظیم سے محفوظ رکھے گی
حیدرآباد میں سن ہیٹ کا شاندار مرکز
جہاں آپ کو جدید وضع کا ارزاں و اطمینان بخش مال دستیاب ہوتا ہے۔
سید احمد معین الدین ہیٹ اینڈ ہوزیری مرچنٹ
متصل
ساگر ٹاکیز ترپ بازار حیدرآباد دکن
TURAB
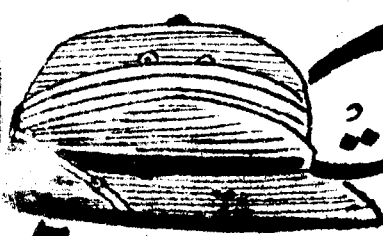
"ادارۂ ادبیاتِ اردو" حیدرآباد دکن

کا

ماہ نامہ

۹ نظمیں
۶ غزلیں
۷ افسانے اور قصے
۲ ڈرامے
۷ عام دلچسپی کے مضمون
۷ علمی اور تاریخی مضمون

سب رس

زیرِ نگرانی
ڈاکٹر سید محی الدین قادری زورؔ

زیرِ ادارت
صاحبزادہ میر محمد علی خان میکش

بہ اہتمام
خواجہ حمید الدین شاہد

مکتبہ ابراہیمیہ مشین پریس میں طبع ہو کر دفتر ادارۂ رفعت منزل خیریت آباد سے شایع ہوا

یہہ تحفہ ہے لاجواب از بس لے لو مرغوبِ دلِ ہر کس و ناکس، لے لو
سب کا لینا تو امرِ ناممکن ہے سب میں بہتر یہہ ہے کہ "سب رس" لے لو

امجد

سب رس کے مقاصد و قواعد

(۱) یہہ "ادارۂ ادبیات اردو" کا ماہوار علمی و ادبی رسالہ ہے جس میں اردو زبان اور ادب کے مختلف شعبوں اور پہلوؤں پر بحث ہوگی۔

(۲) مضامین متعلقہ سیاسیات حاضرہ اور مذہبی مباحث کسی صورت میں قابل اشاعت متصور نہیں ہوں گے۔

(۳) اردو مطبوعات پر بے لاگ تنقید کرکے اردو تصنیف و تالیف کا ذوق صحیح پیدا کرنے کی کوشش کی جائے گی۔

(۴) غیر زبانوں کے شاہکار مضامین کو اردو میں منتقل کرکے اردو کے علمی ادبی سرمایہ میں اضافہ کیا جائے گا۔

(۵) یہہ رسالہ کم از کم (۶۴) صفحات اور زیادہ سے زیادہ (۹۶) صفحات پر ہر ماہ عیسوی کے پہلے ہفتہ میں شائع ہوا کرے گا۔

(۶) رسالہ نہ پہنچنے کی اطلاع پندرہ تاریخ تک دفتر میں پہنچ جانی چاہئے

(۷) جواب طلب امور کے لئے جوابی پوسٹ کارڈ یا لفافہ آنا ضروری ہے

(۸) خط و کتابت کرتے وقت نمبر خریداری کا حوالہ ضرور دیا جائے۔

(۹) اشتہارات کی اجرت پیشگی لی جائے گی۔ وی پی کے ذریعے سے وصولی منظور نہیں کی جائے گی۔

سب رس کی قیمت

	سالانہ	شش ماہی	فی پرچہ
حیدرآباد کے لئے	چار روپئے	دو روپے آٹھ آنے	چھ آنے
حیدرآباد سے باہر	چار روپے آٹھ آنے	تین روپے	سات آنے

نرخنامہ اجرت اشتہارات

	ایکسال	۶ ماہ	۳ ماہ	ایک ماہ
ایک صفحہ	۵۰ روپے	۳۰ روپے	۱۵ روپے	۶ روپے
آدھا صفحہ	۳۰ "	۱۵ "	۱۰ "	۴ "
چوتھائی صفحہ	۱۵ "	۱۰ "	۴ "	۲ "

جلد (۱) شمارہ (۵) | سب رس | مئی سنہ ۱۹۳۸ء

فہرست تصاویر

۱- ڈاکٹر رضی الدین صدیقی ۳
۲- گولکنڈہ کا غدار وزیر میر جملہ ۲۸
۳- گولکنڈہ کا وفادار وزیر نیکنام خاں ۷

نمبر	عنوان	مصنف	صفحہ
۱	اداریہ		۶
۲	غزل	صفی اورنگ آبادی	۷
۳	نظم بلند (غزل)	نواب عزیز یار جنگ بہادر عزیز	۷
۴	ہنسی اور ظرافت	مرزا عصمت اللہ بیگ	۹
۵	دور حاضرہ کے خطرات اور ان سے بچنے کے تدابیر	محمد عبدالرحمن خاں بی اے آر سی ایس بی ایس سی (لندن)	
۶	چال دیئے (غزل)	تقی عابدی	۱۴
۷	طیارچی (ایک ہیبت ناک افسانہ)	اکبر صدیقی	۱۵
۸	طرز یگانہ (غزل)	مرزا یگانہ چنگیزی	۲۱
۹	میرے لئے (غزل)	مرزا فرحت اللہ بیگ بی اے	۲۱
۱۰	بیوہ (افسانہ)	رشید قریشی	۲۲
۱۱	کسان (نظم)	میکش	۲۴
۱۲	جنگ (نظم)	مخدوم محی الدین ام اے	۲۵
۱۳	دیوتا (افسانہ)	بیکاری	۲۶
۱۴	مغنیہ سے (نظم)	انسب کیانوی	۲۷
۱۵	نیک نام خان	عبدالمجید صدیقی ام اے ال ال بی	۲۸
۱۶	عید تو یہ ہے (افسانہ)	منتصبہ جمیل الرحمن	۳۳
۱۷	اندھیری رات (نظم)	باقی ام اے ریسرچ اسکالر	۳۸
۱۸	انتقام (ڈرامہ)	قاضی عبدالغفار	۳۹
۱۹	مشرقی اور مغربی شاعری کا فرق	لطیف النساء بیگم بی اے	۴۷
۲۰	جواب الجواب	نواب عزیز یار جنگ بہادر عزیز	۵۱
۲۱	جواب تنقید	محمد عبداللطیف (لکچرار ورنگل)	۵۴
۲۲	اورنگ آباد (نظم)	میر سکندر علی وجد بی اے سی ایس	۵۷
۲۳	بچوں سے		۵۸
۲۴	اپریل کی پہیلیوں کے صحیح حل	(۴۲) اصحاب	۵۸
۲۵	شعبدے	میر حیدر علی	۵۸
۲۶	نئی پہیلیاں	حبیب الرحمن، خواجہ معین الدین فاروقی	۵۸
۲۷	مجھے سب سے زیادہ ہنسی کب آئی	افسر بیگم صدیقی، عبدالرزاق، سعید جلیل الدین	۵۹
۲۸	اقوال زریں	معین الدین احمد انصاری	۵۹
۲۹	بدگمان بیگم (ڈرامہ)	محمد کمال خاں، مرزا عالیہ	
۳۰	چھٹی کا دن (نظم)	لطیف النساء بیگم بی اے	۶۱
۳۱	جادو کا محل (افسانہ)	اشرف ہادی علی	۶۲
۳۲	بچپن کی ایک خطرناک تفریح	رضیہ زین العابدین	۶۵
۳۳	مفید باتیں	محمد عبدالحکیم قریشی (متعلم)	۶۶
۳۴	زمین کی شکل	جی سورج بھان	۶۷
۳۵	الحمرا	محمود علی (فیض آباد)	۶۸
۳۶	ایک سمجھ دار لڑکا (قصہ)	ابوالمحاسن متین	۶۸
۳۷	ریل کا موجد	شیخ رحیم الدین ظہیرآبادی	۶۹
۳۸	بچوں کی مٹھائی (نظم)	سید ابوالقاسم سرور	۷۰
۳۹	سینما	محمد شفیع الدین صدیقی	۷۱
۴۰	احسان فراموشی (قصہ)	کیقباد و سہراب جی مدرسہ	۷۲
۴۱	دیکھنے والے (غزل)	صدق جائسی	۷۳
۴۲	دیکھنے دے (غزل)	میر آفتاب علی خاں مہر	۷۳
۴۳	اقبال مرحوم	میکش	۷۴
۴۴	عید میلاد النبی (نظم)	سلطان محمد قلی قطب شاہ	۷۴
۴۵	تبصرے	سید ابوالفضل العباس ام اے ریسرچ اسکالر، میکش وغیرہ	

اداریہ

ہم ان تمام معاصرین کے شکرگزار ہیں جنھوں نے سب رس کے بعض مضامین کو اپنے صفحات پر جگہ دی اور اس طرح اپنے ناظرین کو بھی ان سے استفادہ کا موقع دیا۔ لیکن ہمیں اُن معاصرین سے شکایت ہے جنھوں نے "سب رس" کے مضامین نقل تو کئے لیکن حوالہ نہیں دیا۔ یہ طریقہ اصول صحافت کے بالکل منافی ہے اور اس سے ان پر اخلاقی ذمہ داری بھی عائد ہوتی ہے۔

ہمارے ایک لاہوری معاصر نے "سب رس" کے پہلے شمارہ سے "علامہ اقبال" کی تصویر کا عکس لے کر شایع کیا ہے۔ اور یہ نہیں لکھا کہ یہ "سب رس" سے لیا گیا ہے۔ ہمیں حیرت ہے کہ اقبال کی وہ تصویر جو سردار امراؤ سنگھ شیرگل مجیٹھیا نے اتاری تھی اور خود انھوں نے ڈاکٹر زور کو پیرس میں دی تھی اور جس کو ہم نے ڈاکٹر زور سے حاصل کر کے شایع کیا تھا، ہمارے معاصر کو کہاں سے مل گئی!

ہمارے بعض مضمون نگار ایسے مضامین بھیج دیتے ہیں جو پہلے شایع ہو چکے ہیں۔ چنانچہ "امتحان" کے بارے میں ہمارے پاس کئی شکایتیں وصول ہوئی ہیں۔ ہم اپنے قلمی معاونین سے توقع رکھتے ہیں کہ وہ ایسے ہی مضامین عنایت کریں گے جو غیر مطبوعہ ہوں تاکہ ہم ادارتی ذمہ داری کی پوری پابندی کر سکیں۔ خاص کر دوسری زبانوں کے مضامین کا ترجمہ کرتے وقت اطمینان کر لینا چاہیئے کہ پہلے کسی اور نے ان کا ترجمہ شایع تو نہیں کیا۔

"عثمانین" کی علمی فتوحات روز بہ روز ترقی پذیر ہیں۔ مرزا سرفراز علی صاحب بی، اے (عثمانیہ) نے ٹرینٹی کالج لندن میں تقریری انعام حاصل کیا۔ میر عباس علی خان صاحب بی، اے (عثمانیہ) نے الہ آباد کے کئی تقریری انعامی مقابلوں میں امتیازی کامیابیاں حاصل کیں۔ اس سلسلہ میں سب سے زیادہ مسرت خیز خبر یہ ہے کہ "ڈاکٹر رضی الدین نے گزشتہ پچھلی سال کی بہترین سائنسی تحقیق" کے سلسلہ میں ہندوستان کے عظیم الشان ادارہ سے طلائی تمغہ حاصل کیا۔ ڈاکٹر صاحب حیدرآباد کے اس قدیم قابلِ احترام طبقہ کے چشم و چراغ ہیں جس کے افراد دکن میں علم و فضل اور قضاءت و خطابت وافتا کی خدمات صدیوں سے انجام دیتے آئے ہیں۔ اسی طبقہ سے قدیم اولیا و علمائے کرام کے علاوہ مولانا شاہ رفیع الدین قندھاری، مولانا انوار اللہ فضیلت جنگ، نواب معزز یار الدولہ اور نواب نیر وزیر یار جنگ جیسے بزرگ افراد پیدا ہوئے ہیں۔ بڑی خوشی کی بات ہے کہ حیدرآباد کے ان قدیم خاندانوں میں پھر سے صاحبان علم و فضل و کمال پیدا ہو رہے ہیں۔ جو یقین ہے کہ اپنے اسلاف کی طرح ملک کی بیش بہا خدمتیں انجام دیں گے۔

"مجلۂ عثمانیہ" ایک معیاری رسالہ ہے لیکن ہر سال مدیروں کی تبدیلی کے ساتھ اس کا معیار اور پالیسی بھی بدل جاتی ہے چنانچہ "مجلۂ عثمانیہ" کا تازہ ترین شمارہ اپنی نوعیت کے لحاظ سے افسوس ناک بھی ہے اور تعجب خیز بھی۔ معلوم ہوتا ہے کہ نئے مدیر صاحب نے جامعۂ عثمانیہ کی قابل احترام روایات کو بالکل نظر انداز کر دیا ہے۔ "سب رس" کے متعلق جن زہریلے خیالات کا اظہار کیا گیا ہے ان کی ہمیں مطلق پرواہ نہیں۔ لیکن افسوس صرف اس امر کا ہے کہ انھوں نے "جامعۂ عثمانیہ" کے علمی وقار کو گرانے کی ایک شرمناک کوشش کی ہے۔ ہم سمجھتے ہیں کہ یہ شمارہ "یونس سلیم صاحب" کے نام سے کسی ایسے شخص نے مرتب کیا جس کے دل میں جامعۂ عثمانیہ کا کوئی درد نہیں ہے۔ اگر معاملہ اس کے برعکس ہے اور یونس سلیم صاحب ہی نے اس کو مرتب کرنے کی زحمت گوارا کی ہے تو ہمیں افسوس ہے کہ مادر جامعہ سے یونس صاحب جیسے طیلسانی بھی پیدا ہو رہے ہیں۔

ی سلیقے کی نہ آزادی قرینے کی
ضرورت کچھ نہیں معلوم ہوتی اپنے جینے کی

ے دل کا مختار او مالک ہوں مگر پھر بھی
سمجھتا ہوں کہ ان کے ہاتھ ہی ہر اک بدی نیکی

یں یہی دل ہے تو پھر اللہ مالک ہے
نہیں معلوم کیا ترکیب ہے دنیا میں جینے کی

ت اور پھر معلوم ہو جائے قیامت ہے
ترے سینے میں کس نے ڈال دی ہے میرے سینے کی

خالق نے دی ہے آنکھ بزمِ دہر کو دیکھے
یہاں کی رتی رتی ہے سلیقے کی قرینے کی

ما دل کہ بیٹھے عاشق و معشوق کہلائے
انگوٹھی میں بٹھا کر دیکھ لو جوڑی نگینے کی

وں جب سے مفلس اپنے آنسو پی کے رہتا ہوں
کروں کیا اے صفی عادت بری ہوتی ہے پینے کی

ی (اورنگ آبادی)

غزل

جس کی نگہ بلند ہے جس کی نظر بلند
وہ میں ہوں تیرے دیکھنے والوں میں سر بلند

ڈوبے کہیں تو کشتیٔ دل بحرِ عشق میں
موجِ سرشک اور ہوائے چشمِ تر بلند

کس طرح مجھ غریب کی بر آئے آرزو
دستِ سوال پست، مقامِ اثر بلند

نسبت نہیں ترے قدِ موزوں سے سرو کو
کیا فائدہ؟ جو ہو شجرِ بے ثمر بلند

ہو لاکھ سدِ راہ نشیب و فرازِ دہر
رکھے مدام اپنا ارادہ بشر بلند

نقشِ قدم پہ اس کے ہی میری جبیں کا نقش
سجدوں نے کر دیا شرفِ رہ گزر بلند

فرقت کی رات نوحۂ عشرت میں کٹ گئی
آوازۂ نشاط رہا تا سحر بلند

کب تک رہے گا سینۂ سوزاں میں سرنگوں؟
کب تک نہ ہوگا شعلۂ داغِ جگر بلند؟

واں امتحانِ ناز یہاں نازِ امتحاں
رتبہ میں طور سے ہے ترا سنگِ در بلند

رکھتا نہیں ہے گریۂ آتش عناں عزیز
ایک ایک اس کی بوند ہے مثلِ شرر بلند

نواب [illegible] یار جنگ بہادر عزیز

ہنسی اور ظرافت

ہنسی ایک متعدی کیفیت ہے۔ جہاں دو چار آدمی مل کر بیٹھے اُن میں سے کسی ظریف نے کوئی فقرہ چھیڑا اور اس کے اثرا
شروع ہوگئے۔ اب اس متاثرہ حلقہ میں جس نے قدم رکھا وہ اس کیفیت میں گرفتار ہوا جس طرح چوہوں سے پلیگ، مچھر و
اور مکھیوں سے ہیضہ کے اثرات نمایاں ہوتے ہیں، اُسی طرح سے خوش طبعی اور ظرافت کے جراثیم کانوں کی راہ سے مختلف غدو
ہوتے خاص خاص رگ پٹھوں کو چھیڑتے ہوئے جسم میں سرایت کر جاتے ہیں۔ حملہ کی ابتدا دماغ سے ہو کر اس کا اثر ہونٹوں،
رخساروں پر پھیل جاتا ہے۔ گر اختتام اس طرح ہوتا ہے کہ انسان بیتاب ہو جاتا ہے آنکھیں بند ہو جاتی ہیں بتیسی باہر نمودار ہو
پھٹا رہ جاتا ہے اور وہ دونوں ہاتھوں سے اپنا پیٹ دبا کر ایسی ایسی بے سُری آوازیں نکالنا شروع کر دیتا ہے کہ خدا کی
ان بے سُری آوازوں کو اصطلاح میں قہقہا کہتے ہیں۔ اور یہی وہ مقام ہے جہاں ہنسنے اور رونے کا سنگم ہے ا
آخری نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ رگ پٹھے کھنچ جاتے ہیں سانس پھول جاتا ہے اور آنکھوں سے آنسو جاری ہونے شروع ہو جاتے
چاہیئے کہ ہنسنے اور رونے میں صرف ایک قہقہے کا فاصلہ ہے۔ کسی نے سچ کہا ہے۔

ہنسی کے ساتھ یاں رونا ہے مثل قلقل مینا
کسی نے قہقہا اے بے خبر مارا تو کیا مارا

اب دیکھنا یہ ہے کہ ظرافت کیا بلا ہے اور ہنسی کس چڑیا کا نام ہے۔ اپنی مارواڑی بھاشا میں تو بس ظرافت اسی کو کہتے ہیں
ہنسی آجائے اور ہنسی اس کیفیت کا نام ہے جو ظرافت کے اثر سے پیدا ہو۔

اس مختصر سی تعریف کو سن کر بعض خوش طبع ناک بھوں چڑھائیں گے اور بعض ترش رو اصحاب کھل کھلا کر ہنس پڑیں گ
یا روئے واقعہ یہ ہے کہ ہنسی کوئی ایسی چیز نہیں، جس پر عمل جراحی کر کے بتا دیا جائے اور تیز نشتر کی نوک سے ذہنی کیفیت کو چیر
باہر نکال کر دکھا دیا جائے جن کے چھیڑنے سے چہرے پر تبسم کی برق کوند جاتی ہے یا قہقہے کے بادل گرجنے لگتے ہیں۔ تاہم یہ
ذرا کسی بچے کے تلوے کو انگلی سے ٹھوکے دیجیئے تو اول تو وہ مسکرائے گا پھر کھل کھلا کر ہنس پڑے گا۔ یا کسی بڑے شخص کی بغل
غدودوں کو اچھی طرح سے گدگدا دیجئے اور پھر تماشا دیکھئے کہ وہ کس کس نمونے کے قہقہے اڑانا شروع کر دیتا ہے۔ مگر میں جس
اس میں گدگدانے کی مطلق ضرورت نہیں بلکہ موٹی سے موٹی کھال والا شخص جس کے ہنسی کے غدود بالکل بے حس ہو
کھل کھلا کر ہنس دیتا ہے۔

اب رہی خوش طبعی یا ظرافت تو جس طرح شاعری اور مصوری کی صحیح اور مکمل تعریف کرنا ایک مشکل امر ہے۔ اُسی
حدود قائم کرنا گویا دریا کو کوزے میں بند کرنا ہے۔ اور چونکہ ظرافت میں خوش طبعی، خوش مذاقی، تمسخر، ہنسی دلگی،
مضحکہ، مزاح، لطیفہ گوئی، پھبتی، پھکڑ، نوک جھوک، فقرہ بازی اور تمام پُر مذاق چیزیں شریک ہیں۔ اس
مکمل اور جامع تعریف کرنا قطعی غیر ممکن ہے۔ دنیا میں ہر ایک علم و فن کے ادارے کھلے ہوئے ہیں۔ مگر ظرافت یا خوش طبعی ک

...ر نہیں ہے جن کی طبیعتوں کو ناچ گانے سے لگاؤ ہے۔ وہ ناچ گانے کی تعلیم گاہوں میں شریک ہوجاتے ہیں۔ جن کو آرٹ سے دلچسپی ہے وہ آرٹ اسکول میں داخل ہوجاتے ہیں مگر جن اصحاب کی طبیعتیں ظرافت کی طرف مائل ہیں وہ بیچارے ادھر ادھر ٹامک ٹوئیے ہی مارتے پھرتے ہیں۔ اگر کوئی ظرافت کا ادارہ ہوتا تو پھر آپ دیکھتے کہ ایک گمشعل سے گمشعل طبیعت کا لڑکا بھی دو دو بجے رات تک پُر مذاق لطیفے رٹتا ہوا دکھائی دیتا اور ...ر بدل صورت بچے کے ماں باپ یہی خواہش کرتے کہ ان کا بچہ ظرافت کے مڈل اسکول تک ضرور پہنچ جائے۔

ظرافت کی تعلیم دینے سے میرا یہ مقصد نہیں کہ زبردستی ہر ایک کا مذاق اڑایا جائے بلکہ مطلب یہ ہے کہ وہ ہر شئے کو ...رنگ میں دیکھ سکے اور اس کے ہر پہلو کو ایک دلچسپ اور لطیف انداز میں ظاہر کرسکے۔ جس میں دانائی اور برجستگی کے ساتھ ساتھ شگفتگی اور ...دلی کے اجزا بھی موجود ہوں۔ جن کی بدولت ایک ظریف مداری کی طرح جھولی میں گدھے کے کان ڈال کر خرگوش نکالتا ہے اور بھوسے کے بیج بو کر زعفران کے پودے اگاتا رہتا ہے۔

اس تماشے میں سب سے اول حاضر جوابی، ذکاوت اور تخیل کی زبردست اداکاری ہے۔ اور اُس کے بعد صرف لفظوں کا الٹ پھیر ہے یعنی اس میں چند بے سروپا اور غیر مربوط خیالات کو اس طرح مخلوط کر دیا جاتا ہے کہ اس میں تعجب اور تحیر کی کیفیت پیدا ہوجاتی ہے اور سامعین کے سامنے ایک نظر فریب جلوہ، دلوں میں فرحت اور روح میں ایک مسرت کی لہر دوڑ جاتی ہے۔ میں نے تعجب اور تحیر کا لفظ اسی لئے استعمال کیا کہ جب تک کسی نہ کسی طریقہ سے لوگوں کے دلوں میں استعجاب اور تحیر کی کیفیت پیدا نہ کی جائے، کسی طرح مسرت اور خوشی حاصل نہیں ہوسکتی ظرافت کے متعلق ...سلہ کا خیال ہے کہ جس قدر تناقص اور متضاد کیفیتیں پیدا کی جائیں اتنا ہی ظرافت میں اضافہ ہوتا جائے گا۔

> مثلاً کوئی صاحب بڑے مقطع چقطع، موٹے تازے، بھاری بھرکم توند لئے نہایت پرتکلف کپڑے پہنے آہستہ آہستہ اور نہایت متانت سے چلے جا رہے ہوں۔ یکایک ان کا پاؤں پھسلے اور وہ قلابازی کھا کر دھم سے نیچے آرہیں۔۔۔ کیچڑ میں اُن کے تمام کپڑے لت پت ہوجائیں۔ ٹوپی ایک طرف جا پڑے ہاتھ پاؤں مار رہے ہوں توند مشکیزہ کی طرح الگ ہلتی ہوئی نظر آئے۔ اٹھنے کی کوشش کریں۔ پھر پھسلیں اور اڑدھم کر کے نیچے آرہیں۔ اپنے گرد تماشائیوں کا ہجوم اور ہنستے ہوئے مجمع کو دیکھ کر غصہ سے ہونٹ چبانے شروع کردیں اور سر بازار گالیوں کی بوچھار باندھ دیں تو ان کی ہیئت کذائی پر خواہ مخواہ لوگوں کو ہنسی آجائے گی۔

پرتکلف کپڑوں کا کیچڑ میں لت پت ہونا، قدم پھونک پھونک کے دھرنے کے باوجود ٹانگ پھسل کر گرنا۔ باوجود متانت کے سر بازار گالیاں دینا۔ ...ب متضاد کیفیتیں ہیں اب ان میں جس قدر تناقص اور بے ربطی بڑھتی جائے گی اُسی قدر استعجاب بڑھے گا اور لوگوں کو ہنسنے کا موقع ملے گا۔ ...طرح اگر کوئی پہلوان سر بازار دھپے کھائے یا کوئی شریف صورت گدھے کی طرح رینگے۔ بندر کی طرح منہ بنائے، لنگور کی طرح اچھلنے لگے۔ یا کوئی شخص ہنستے ہنستے رو دے یا روتے روتے ہنس پڑے یا جیسے ہم عالم خیال کر رہے ہوں وہ مہمل بے تکی اور گدھے پن کی باتیں کرنے لگے یہ سب صورتیں اپنی اصلی صورتوں سے متضاد ہیں اور یہی وہ کیفیتیں ہیں جن سے تعجب کی تحریک ہوتی ہے جو ہنسی کا مادۂ تولید ہے۔ ڈاکٹر الیگزنڈر کہتا ہے کہ ظرافت انسان کی وہ معصوم مسرت ہے جو دوسروں کو مضرت یا تکلیف پہنچانے سے حاصل ہوتی ہے۔

قدیم زمانے میں ظلم و تعدی اور بے رحمی کے اجزا مسرت حاصل کرنے کے لئے جزو اعظم خیال کئے گئے تھے۔ اس زمانہ میں اگر ہم کسی شخص کو ڈوبتا ہوا دیکھیں تو ایک روحانی تکلیف ہوتی ہے۔ مگر اگلے زمانے میں رومن کسی کو مرتا ہوا یا ڈوبتا ہوا دیکھتے تھے تو انھیں بے حد

سب رس

خوشی ہوتی تھی اور سرکس میں گاڑیاں دوڑاتے وقت اگر کسی کی گاڑی ٹکرا کر پاش پاش ہوجاتی یا مقابلے کے وقت جنگلی درندے
بوٹی کرتے تو یہ جانکاہ منظر دیکھ کر یار لوگ پھولوں نہیں سماتے تھے۔ اب بھی لندن میں کتوں کے ذریعے لومڑی کا شکار اور ریچھ
کے مقابلے ایک پُرلطف اور روحانی مسرت کا سماں پیش کرتے رہتے ہیں بعض رفیق القلب ا ۔ بزدل اصحاب کو اس نظ
روحانی تکلیف پہنچتی ہے مگر اسپین کے چھوٹے سے چھوٹے بچے کے سامنے ذرا سانڈوں کے مقابلے کا نام آیا اور اس کی کانوں تک
ان کا عقیدہ ہے کہ اس قسم کی جنگ سے ہم تو ہم خود سانڈ کو ایک روحانی مسرت حاصل ہوتی ہے۔ چنانچہ آئے دن اسپین کے
اللہ میاں سے یہی لڑائی رہتی ہے کہ تو نے ہمیں سینگ کیوں نہیں دیئے۔ ہم بھی اس کھلے میدان میں سانڈوں کی طرح ڈ
مسرت ابدی حاصل کرتے۔

ہندوستان میں بھی اس وحشیانہ مسرت کا ایک دور گزر چکا ہے۔ جو شیروں کے مقابلے، ہاتھیوں کی لڑائی اور مینڈھو
گزرتا ہوا بصرف مرغ بازی اور بٹیر بازی پر آٹکا ہے۔

مولانا عبدالحلیم شرر نے ایک واقعہ لکھا ہے۔ اس کو پڑھنے کے بعد اسپینی جنگجو اور ہندوستانی صلح پسند اصحاب کے
ہو سکتا ہے وہ لکھنے ہیں۔

"اتفاقاً ایک مرغ باز کا مرغ ہار گیا۔ وہ دل شکستہ ہو کر عراق چلے گئے۔ اور نجف اشرف میں مہینوں مصروف عبادت
رہے۔ شب و روز دعا کرتے تھے کہ خداوندا ائمہ معصومین کا صدقہ مجھے ایسا مرغ دلوا دے جو لڑائی میں کبھی
نہ ہارے۔ ایک رات خواب میں بشارت ہوئی کہ "جنگل میں جاؤ" آنکھ کھولتے ہی انھوں نے بیابان کا رستہ
لیا۔ یک بیک ایک دڑکوہ سے "ککڑوں کوں" کی آواز آئی۔ یہ ایک مرغی بھی ساتھ لے گئے تھے آواز سن کر
انھوں نے فوراً مرغی چھوڑ دی۔ وہ مرغ اسے دیکھ کر فوراً باہر نکل آیا اور ان صاحب نے اسے پکڑ لیا۔ اس کی
نسل پھر ایسی ہوئی کہ انھیں پھر کبھی شرمندہ نہیں ہونا پڑا۔"

مگر آج کل قانون "انسداد بے رحمی بر جانوران" نے کم سے کم ہندوستان میں تو اس جوش و خروش کو ٹھنڈا کر دیا ہے۔ لیکن اسپین
یہ چہل پہل ہے۔ وہی سانڈوں کے زور اور وہی مقابلوں کے زور ہیں۔ اب رہے وہ مشترک اجزا جو کلام میں ظرافت کا رنگ پ
اصول جو اصلی واقعات میں تناقص اور متضاد کیفیتوں کا نقشہ کھینچ دیتے ہیں۔ ان میں بعض تو ایسے ہیں جو ہندوستان میں کث
ہیں اور دوسرے ملکوں میں کم۔ مگر بعض مشترک ہیں جو ہر ملک میں ظرافت پیدا کرنے کے ذریعے بنے ہوئے ہیں۔ چنانچہ تجنیس،
تشبیہ و تضاد کو تقریباً ہر قوم نے اپنا آلہ ظرافت بنا رکھا ہے۔ اس پر بھی بڑے لطف کی بات یہ ہے کہ ہر زبان، ہر ملک اور ہر
بالکل جدا جدا ہے۔

اس وقت ریڈیو، ٹیلیفون، سینما، اور اسی قسم کی دوسری ایجادوں نے ایک قوم کو دوسری قوم سے اور ایک
ملک سے روشناس کرا دیا۔ خیالات اور رفتار و گفتار میں ایک کو دوسرے کا ہم خیال اور ہم زبان بنا دیا۔ مگر ظرافت کی
اہل زبان کے دوسری زبان والا قابو نہیں پا سکا۔ واقعہ یہ ہے کہ دنیا کی ہر زبان کے علوم و فنون کا ترجمہ اسی خوبی، اسی
ساتھ کیا جا سکتا ہے جو اس کی اصل عبارت میں موجود ہے (باقی)

مرزا عصمت

دورِ حاضر کے خطرات اور اُن سے بچنے کے تدابیر

اللہ تعالیٰ کی تمام مخلوق میں انسان سب سے زیادہ ذی اقتدار اور با اثر ہے۔ یہہ امتیاز قدرت نے اس کو اُس کے اعلیٰ دماغی ارتقا سے عطا کیا ہے جس کی وجہہ سے وہ نہ صرف تمام حیوانات و نباتات پر بالآخر غالب آچکا ہے بلکہ نظام عالم کی بڑی بڑی قوتوں کا میابی کے ساتھ مقابلہ کرتا ہے۔ تاریخ کا ہر طالب علم جانتا ہے کہ انسان کو اس بلند مرتبہ پر پہنچنے کے لئے ہزارہا سال کی جدوجہد درکار لاحق ہوی۔ حیاتیات کے متعلم نظریۂ ارتقا کے موجب جملہ جاندار اشیاء کو ماحول کی تبدیلی کے ساتھ ناموافق حالات کی سختیاں برداشت کرتے ہوے ترقی کی راہ میں گام زن مان کر انسان کو اس سے ایک درجہ کمتر مخلوق سے بتدریج انسان میں تبدیل ہونے کے لئے کئی لاکھ سال کا اندازہ لگاتے ہیں۔ اور اگر اُس حالت سے آغاز کیا جائے جب کہ زمین آفتاب کے بطن سے آتشی جنم لے کر فضا میں رونما ہوی تو اس پر انسان کو جو زمین ہی کا ایک جزو ہے موجودہ شکل و صورت سے آراستہ ہونے کے لئے دو ہزار ملین سال سے کم مدت نہیں گزری۔

کائنات کے محققین کی ان رایوں کو قلمبند کر کے ہم یہہ بتا دینا مناسب سمجھتے ہیں کہ ایک شخص جب اپنا خاندانی شجرہ تیار کرتا ہی تو اُس پیڑی منتی تک جس کو وہ اپنا جدّ اعلیٰ تصور کرتا ہے سلسلہ ملانے کے لئے اس کو کس قدر محنت اٹھانی پڑتی ہے اور اپنے پیشرؤں سے منسوب کتنی قوی اور ضعیف روایتوں کے حوالے دینے پڑتے ہیں۔ اس لئے انسانی ارتقاء کا مسئلہ اگر مشکل نہ ہوگا تو کیا ہوگا، اور متشکّی مزاج اور شیدائیان فن کی دانست میں " ضعیف " عقیدے کے لوگ اگر اس مسئلہ کی تفصیلات کو شبہ کی نظر سے دیکھیں تو انھیں بُرا نہ ماننا چاہئے۔ بہر حال کسی کو اعتراض نہ ہوگا اگر یہہ کہا جائے کہ انسان جب سے ایک علحدہ جنس کی حیثیت سے زمین پر مسلّط ہوا تو اُس وقت سے اب تک ہزارہا سال کی مسلسل دماغی و جسمانی کوششوں کے بعد اس کو عامۂ مخلوقات پر فوقیت نصیب ہوی اس کی اس عالم گیر فتح و نصرت کا سب سے بڑا ذریعہ اس کی منظّم زندگی ہے جس میں مذہب کو اعلےٰ و ارفع مقام حاصل ہے۔

مذہب انسان کو نہ صرف اس کی چند سالہ زندگی کا زمانہ امن و آسائش کے ساتھ بسر کرنے کے طریقے سکھاتا ہے بلکہ مرنے کے بعد کی لامتناہی مدت کو اس کی روح کے لئے پُر لطف و پُر سکون بنانے کی غرض سے اس کی اور اس کے نوع کی آئندہ نسلوں کے حفظ و امان کا سامان بھی مہیّا کراتا ہے۔ ہر دور میں چند ایسے انسان بھی پیدا ہوتے ہیں جنھوں نے علم حاضر پر عبور حاصل کر کے (بلکہ اکثر محض اپنے خیالی تصور میں اس علم پر حاوی ہو کر) انانیت کی بدمستی میں الاہیت کو ایک مفروضہ خیال کیا ہے یا فطرت کو الاہیت کی جگہ ساری کائنات کا حاکم قرار دیا ہے۔ لیکن اس کے باوجود بھی انھوں نے مذاہب کے ان تمام اصول کا جو عمل صالح اور امن عالم کے لئے ساسی سمجھے گئے ہیں نہ صرف احترام کیا ہے بلکہ اپنی زندگی کا بڑا حصہ اُن اصولوں کی متابعت میں صرف کیا ہے۔

نپولین بوناپارٹ کی لاپلاس سے پہلی ملاقات ۱۷۸۵ء میں ہوی جب کہ وہ فرانس کے فوجی مدرسے کے ۱۶ سال والے نوخیز طالب علم کی حیثیت سے لاپلاس کے سامنے امتحان کی غرض سے حاضر ہوا۔ نپولین جب ترقی کرتا ہوا فرانس کا مطلق العنان

حاکم بن مہیتا توسیرانے تعلقات کی بنا پر لاپلاس کو کئی اعزاز عطا کئے اور بالآخر ایک وزارت سے بھی سرفراز کیا ۔ لاپلاس جیسے ریاضی کے شیدائی کو علمی تحقیقات سے کون سا مشغلہ روک سکتا تھا ۔ اس نے بالآخر اپنی شہرۂ آفاق کتاب فلکی میکانیات کو شائع کرکے نپولین کے مطالعے کے لئے پیش کیا۔ نپولین نے اس گراں بہا تحفہ کی تمہید پڑھی اور شاید اس کے چند ابتدائی اوراق بھی اُلٹے ، لیکن اس میں کہیں اللہ تعالیٰ کی تعریف یا اس کی قدرت کا اعتراف نہ پایا' اس لئے یہہ خیال کرکے کہ اپنی خوش اعتقادی اور حمایت مذہب کا اچھا اعلان ہوگا لاپلاس سے شکایت کی کہ نظام عالم کی ایسی جامع اور ایسے بڑے فاضل کی لکھی ہوی کتاب میں کہیں بھی کائنات کے خالق کا ذکر نہ ہونا قابل افسوس ہے' لاپلاس نے جواب دیا " صاحب مجھے اپنے مضمون کی تیاری میں اس مفروضہ کی کہیں ضرورت نہیں پیش آئی "

نپولین نے جب اس گستاخانہ جواب کا ذکر لاپلاس کے ہم پلہ اور ہم عصر ریاضی کے ماہر لاگرانج سے کیا تو اس نے کہا " ممکن ہے کہ یہہ ایک مفروضہ ہی ہو۔ لیکن نہایت ہی پُر لطف اور شاندار مفروضہ ہے' اس سے بے شمار امور کی توجیہہ ہوجاتی ہے " ان دونوں شہرۂ آفاق محققین کے سوانح عمری کے مطالعے سے معلوم ہوگا کہ انھوں نے عمل صالح سے کبھی گریز نہیں کیا اور جس مقدس اعتقاد کو مفروضہ تصور کیا آخر دم تک دنیائی کاروبار میں اس کی متابعت کی ۔ یہہ بات بھی دلچسپی سے خالی نہیں کہ لاپلاس کو نظام شمسی کی اپنی جس تحقیق پر ناز تھا اور لاگرانج نے اپنی جس تصنیف کے متعلق فخریہ بیان کیا تھا کہ اس کے اندر ایک بھی ہندسی شکل نہیں ہے سارا موضوع تفرقی مساواتوں ہی کے ذریعے ادا ہوا ہے' اُن میں زمانۂ حال کی تنقید نے متعدد اسقام نکالے جس سے ظاہر ہے کہ کائنات سے متعلق انسان کی بڑی سے بڑی تحقیقات تکمیل کی محتاج ہے اور علم میں جس قدر اضافہ ہوتا ہے اسی قدر مزید اضافہ کی ضرورت محسوس ہوتی ہے ۔

دور حاضر کے بعض نوجوان خواہ وہ کسی مذہب کے ہوں چند ایک دہریت زدہ مصنفین کے خام خیالات یا ناقص روایات کو بغیر سوچے سمجھے اپنے لئے چراغ ہدایت فرض کرکے مذہب کے اصول اور اس کے عملی قواعد وضوابط کو غیر ضروری بلکہ مانع راہ ترقی سمجھتے ہیں۔ ان کی دانست میں مذہب ایک ڈھکوسلا ہے اور خدا کا تصور آزاد خیالی کے حق میں زمانۂ جاہلیت کا جاری کردہ ظلم وستم ہے ان لوگوں کو زمانہ کے تغیر وتبدل سے جب حکومت ملتی ہے تو وہ جزا وسزا کے قیود سے اپنے آپ کو آزاد سمجھ کر غیر ذمہ دارانہ اور لاابالی زندگی بسر کرتے ہیں جس کی وجہ سے انسانیت کا خون ہونے لگتا ہے اور آدمی دیدہ نہیں دانستہ بہیمیت کی طرف رجوع ہوجاتا ہے ۔ انفرادی آزادی کا بڑے سے بڑا حامی بھی کبھی منظم زندگی کے قواعد وضوابط کو جبر وتعدی کا مرادف نہیں تصور کرسکتا ۔ زندگی تو بڑی چیز ہے کوئی کھیل بھی قواعد وضوابط سے خالی نہیں ہوسکتا ۔ اکثر کھیلوں جیسے کرکٹ فٹ بال وغیرہ کے قواعد وضوابط کو اگر غور سے دیکھیں تو معلوم ہوگا کہ محض خود اختیاری ہیں ، لیکن اُن میں لغویت نہ ہونے کی وجہ سے کوئی ان پر اعتراض نہیں کرتا بلکہ سالہا سال کے رواج نے اُن کے گرد روایات کا ایک ہالا تیار کر رکھا ہے جو ان کے روز افزوں احترام کا باعث ثابت ہوا ہے ۔ مذہب کا صحیح مفہوم نہ جان کر اگر انسان یہہ سمجھنے لگیں کہ مذہب ضعیف الاعتقاد ذہنیتوں کو ایک ثبوت طلب ہستی کا بے جا خوف دلاتا ہے یا

محتاج ولائل آئین کے قیود میں صحیح و تندرست اجسام کو جکڑ کر خیالی گناہ کی حقیقی لذتوں سے محروم رکھتا ہے، اور اس دھوکے میں پڑ کر مطلق العنان زندگی بسر کرنا چاہیں تو تھوڑی سی مدت میں وہ نہ صرف زمرۂ انسانی سے خارج ہو جائیں گے بلکہ ہمیشہ کے لئے روئے زمین سے انسان کی نسل ہی مٹ جائے گی۔

ارضیات کے متعلم جانتے ہیں کہ طبقات الارض کے اندر آغاز عالم حیات سے لے کر اب تک کے حیوانات و نباتات کی نعشوں کے ساتھ اُن کی تاریخ بھی دفن ہے۔ سالہا سال کی محنت و مطالعہ کے بعد پتہ چلا ہے کہ کس دور میں کن نباتات کو فروغ تھا اور کون حیوانات روئے زمین پر مسلط تھے۔ ان کی شکل و شباہت کیا تھی جسمانی و دماغی کیفیت کیسی تھی۔ چٹانوں کے ایک طبقہ سے نکل کر عین اس کے بالائی طبقہ پر پہنچتے ہیں تو دیکھا جاتا ہے کہ بعض حیوانات کے رکاز یک لخت غائب ہو گئے گویا اُن کی نسل ہی دنیا سے اٹھ گئی اور دوسری نوع یا جنس کے جانداروں کا دَور دورہ شروع ہو گیا۔ اس واقعہ کی اہل الرائے اس طرح توجیہ کرتے ہیں کہ بعض موسمی تغیرات کے اچانک حملے نے براہِ راست یا متعدی بیماریوں کے توسط سے ان بدنصیب حیوانات کے بیشتر حصہ کو نیست و نابود کر ڈالا۔ ان میں سے صرف وہی بچ سکے جو خاص ارتقائی ذرائع سے ان مشکلات کا مقابلہ کر سکے اور اس طرح اپنے آپ کو جدید حالات کے موزوں بنا کر بتدریج بدلے ہوئے جسم میں رونما ہوئے، حُو راسی یا کھریالی عہد کے بعض قدیم دیوہیکل توام کی نسبت تصور کیا جاتا ہے کہ خود ان میں سے بعضوں نے ناخن و دنداں کی صلابت اور طبیعت کی خباثت میں وہ کمال حاصل کیا کہ ان کے باقی ماندہ صلح پسند بنی عم اُن کے شکار بن کر تمام کے تمام دنیا سے ناپید ہو گئے۔

دور حاضر کا مغربی طفل مکتب بھی بلا مبالغہ ان امور سے اچھی طرح واقف ہے۔ لیکن سیاسی دنیا پر ایسی تاریکی چھائی ہوئی ہے کہ جو قومیں اپنے آپ کو سب سے زیادہ تہذیب یافتہ سمجھتی ہیں سائنس جیسے متبرک اور خدا رساں علم کی مدد سے آئے دن نئے نئے اور زبردست سے زبردست آلات کشت و خون ایجاد کر کے اپنے ہی جیسے لیکن کمتر مایہ انسانوں کو اجتماعی حیثیت سے قتل کرتی چلی جاتی ہیں۔ اس درندہ خصائی کی اصل وجہ خدا فراموشی ہے، جب خدا کو بھول گئے تو نہ اپنا مذہب قابل عمل رہا اور نہ دوسروں کی جانیں قابل وقار ہیں۔ پھر عہد و پیمان کا کون احترام کرے، عدل و انصاف کی کیوں تکلیف گوارا کی جائے۔ رحم و کرم کے لئے تو ایسی دنیا میں جگہ ہی کہاں نکل سکتی۔ اعلیٰ تہذیب زبردست بہیمیت کا مرادف بن جاتی ہے۔ ایسی قومیں جب تک دولت و ثروت کے نشہ میں سرشار رہتی ہیں اور اُن سے کہا جاتا ہے کہ ان کا یہ وحشیانہ طرز عمل تہذیب کا قاتل ہے تو ان کے سرگروہ فرماتے ہیں "ہم کو اپنے جذبات فطری کے خلاف عمل کرنے کی کوئی ضرورت نہیں۔ عالم حیات میں بھی تو یہی دیکھنے میں آتا ہے، بڑی قوت چھوٹی قوت پر غالب آتی ہے۔ انسان کی طبیعت بھی ایسی ہی متضاد و مخالف قوتوں کا مجموعہ ہے۔ نیکی بدی دراصل کوئی جداگانہ خواص نہیں ہیں بلکہ اضافی حیثیت رکھتی ہیں، جو چیز مفید ہے اچھی ہے جو غیر مفید ہے بُری ہے اور واضح ہے کہ حالات کے لحاظ سے وہی چیز کبھی مفید ہے اور کبھی غیر مفید" ذرا سا غور کرنے سے معلوم ہوگا کہ یہ استدلال کسی طرح شیطان کے اُس استدلال سے کم نہیں جس کے بموجب ایک مشہور انگریزی ضرب المثل کے بُرے کام کی رغبت دلانے کے لئے صحائف آسمانی کے حوالے پیش کرتا ہے۔

یہی قومیں جب کمزور ہو جاتی ہیں اور اُن کی مطلق العنانی دوسری قوموں میں منتقل ہو جاتی ہیں تب کہیں اُن کی آنکھیں کھلتی ہیں اور وہ اضطراب کے ساتھ انسانی مساوات اور صلح و امن کی خوبیوں کا وظیفہ پڑھنے لگتی ہیں۔

دنیا سے جب اس طرح عدل و انصاف اٹھتا جاتا ہے اور خود غرضی کسی قاعدہ قانون، عہد و پیمان کو شمار ہی میں نہیں لاتی تو اس کا لازمی نتیجہ یہہ ہوگا کہ انسان جانور سے بھی بدتر ہو جائے گا اور قتل و خون و غارت گری بالآخر اگر نسل انسانی کو میٹ نہ دیگی تو کم از کم تہذیب دنیا سے اٹھ جائے گی اور آدمی دس لاکھ برس پہلے کے وحشی درندہ میں تبدیل ہو جائے گا۔ مذہب کے مخالفوں کے پاس مذہب کے خلاف سب سے بڑا یہہ اعتراض ہے کہ دنیا میں مذہب کے نام سے جتنی مہلک لڑائیاں ہوئی ہیں اتنی کسی اور غرض سے نہیں ہوئیں۔ غور کرنے سے معلوم ہوگا کہ اکثر مذہبی لڑائیاں صرف برائے نام مذہبی تھیں لڑنے والوں کے اغراض اور نصب العین عموماً بالکل دوسرے تھے مثلاً ذاتی یا خاندانی عروج، حکومت کی طمع یا جوش انتقام وغیرہ۔ اگر بالفرض یہہ مان بھی لیا جائے کہ جملہ نام نہاد مذہبی لڑائیاں فی الحقیقت مذہب ہی کی خاطر ہوئیں تو دنیا کی تاریخ بآواز بلند نالاں ہے کہ ان مذہبی لڑائیوں سے کئی ہزار مرتبہ زیادہ کثیر التعداد اور قبیح الاثر حصول ملک و دولت اور تخت و تاج کی لڑائیاں ہیں، اگر اس کا حساب لگایا جائے تو معلوم ہوگا کہ جتنے انسان ان کے شکار ہوئے ہیں اتنے نہ وبائی امراض میں مرے ہیں نہ حوادث سماوی جیسے قحط سال طوفان طغیانی زلزلہ وغیرہ سے، وحشی سے وحشی درندوں نے بھی باہمی جنگ و جدل میں اپنی جنس کے اتنے جاندار قتل نہیں کئے جتنے کہ بنی آدم نے قتل کئے، اور یہہ قتل و خون قاتلوں نے اپنی ضروریات زندگی کے لئے مجبور ہو کر نہیں کئے بلکہ اکثر صورتوں میں محض اپنی شان و شوکت آرام و آسائش کی خاطر حرص و طمع کے زیر اثر کئے، خدا کو مانتے ہوئے یا کسی عالم گیر ماورائی زبردست قوت سے ڈرتے ہوئے انسان سے جب اس کی جنس کے ساتھ ایسی وحشیانہ حرکتیں سرزد ہوئی ہیں تو اس شیطانی دور کا کیا اندازہ لگایا جا سکتا ہے جب کہ دنیا سے خوف خدا اٹھ جائے گا اور کروڑوں کی تعداد میں مہلک سے مہلک آلات حرب و ذرائع کشت و خون لے کر اقوام عالم قاعدہ قانون، عدل و انصاف غرض انسانیت کے تمام خواص کو ترک کر دے کر کامل بہیمیت کے ساتھ ایک دوسرے کو مسخر کرنے کی دُھن میں مصروف ہو جائیں گی!

آنے والی دنیا کی یہہ ہیبت ناک تصویر مدبران عالم کی آنکھوں سے پوشیدہ نہیں ہے مغربی ناول نویسوں اور افسانہ نگاروں (مثلاً ایچ۔ جی۔ ویلز وغیرہ) نے اس مضمون کی کئی کتابیں لکھی ہیں اور سینما کے فلم تیار کئے ہیں لیکن ان کوششوں سے صرف عوام الناس کی تفریح اور مصنفین وغیرہ کے مالی مفاد کے سوا کوئی اور نتیجہ برآمد نہیں ہوا، سچی بات یہہ ہے کہ انسان بالطبع کاہل اور قدامت پسند واقع ہوا ہے، جب تک اُس کو ناقابل برداشت تکلیف نہ ہو وہ پرانے راستوں سے ہٹ کر نئے راستے پر چلنا نہیں چاہتا۔ اکثر لوگ کسب معیشت کے دھندوں میں لگے رہتے ہیں، جو خوش نصیب فرحت اور مرفہ الحالی کی گودوں میں پرورش پاتے ہیں انھیں آئے دن اس بات کی فکر لگی رہتی ہے کہ اپنی دولت سے کیا نئے مزے حاصل کریں اور بیکاری کا وقت کیسے کٹے۔ جو ان کے بین بین واقع ہیں وہ دنیا کی رفتار کو دیکھ کر سمجھتے ہیں کہ آخر اس کا نتیجہ کیا ہوگا لیکن پست ہمتی یا قسمت پرستی کی وجہ سے یہہ کہکر کہ دنیا میں ہمیشہ سے ایسا ہی ہوتا آیا ہے یا "چنیاں نماند و چنیں نیز ہم نخواہد ماند"

اپنے دل کو تسکین دے لیتے ہیں، مغربی ممالک میں جہاں دو ایک صدی سے ہر چیز بڑے پیمانے پر صورت پذیر ہو رہی ہے اور اس کے اثرات بہت جلد محسوس ہوتے ہیں، چند سال سے یہہ رائے قائم ہوتی آ رہی ہے کہ دنیا کی حکومت کی مشینوں پر جس طبقے نے آغاز تاریخ سے قبضہ کر رکھا ہے اس کی تربیت ناقص ہے، حکومت کی چوٹی پر عموماً وہی لوگ پہنچتے ہیں جو بڑے سرمایہ دار ہوتے ہیں، حصول دولت کے ذرائع کی نسبت بہت وسیع معلومات رکھتے ہیں، اچھے مقرر ہیں حکمت عملی خوب جانتے ہیں، عوام الناس کی کمزوریوں سے پوری طرح واقف ہیں، دنیا کی تاریخ کا زیادہ تر وہ جزو پڑھے ہوتے ہیں جو خود غرض مدبّروں اور مطلق العنان سپہ سالاروں کی داستانوں سے زیادہ وقعت نہیں رکھتا۔ حالانکہ بدیہی بات ہے کہ اپنے ابناء جنس کی قسمتوں کا فیصلہ کرنے والوں کے لئے فراست و تدبّر سے بڑھکر ایمانداری، نیک نیتی اور ایثار نفس کی ضرورت ہے۔

یہہ خوبیاں بھی تربیت سے حاصل ہو سکتی ہیں۔ ایچ۔ جی۔ ویلز نے برٹش ایسوسی ایشن فار ایڈوانسمنٹ آف سائنس کے سال گزشتہ کے اجلاس میں شعبۂ تعلیم کے خطبۂ صدارت کے ساتھ دور حاضر کے متعلمین کی تعلیم و تربیت کے نقائص دور کرنے کی ایک اسکیم پیش کی ہے جس کو ہر شخص بآسانی حاصل کر سکتا اور سمجھ سکتا ہے۔ اس میں بنی نوع انسان کی تاریخ کو حیاتیات کی ایک شاخ تسلیم کر کے روئے زمین کی اقوام میں یگانگت پیدا کرنے کی کوشش کی گئی، یہہ تجویز جو بڑی محنت اور وسیع مطالعہ کے بعد پیش کی گئی ہے حقیقت میں عملی جامہ پہنانے کے قابل ہے، راقم الحروف کی رائے میں تمام عملی برائیوں کی جڑ خواہ وہ ایک آدمی کے لائحہ عمل سے متعلق ہوں یا قوم کے، عدم احساس تناسب ہے۔ کسی چیز کی حقیقی اہمیت سمجھنے میں اگر طبیعت کا جمود رکاوٹیں پیدا کرتا ہے تو غیر ضروری ذاتی دلچسپی بھی اکثر اوقات شدید موانعات کا باعث ہوتی ہے۔ اس کی وجہہ سے انسان غیر جانبداری اور توازن رائے کی نعمتوں سے محروم رہ جاتا ہے، مثلاً ہر مذہب میں ذوی القربیٰ اور دوست احباب کی اعانت پر اصرار کیا جاتا ہے لیکن اس طرح نہیں کہ مستحقین کے حقوق تلف کر کے قوم اور ملک کا روپیہ اور اہم خدمات قرابت داروں اور دوستوں پر لٹا دئے جائیں، ایسے دوسرے بے شمار عمل ہیں جن کا خود غرضانہ دلچسپی کی وجہہ سے حد سے متجاوز ہو جانا ملک و قوم کے لئے باعث مضرت ہے۔ ان غلطیوں سے بچنے کے لئے ہر چیز کو اس کے صحیح منظر میں دیکھنے کی کوشش کی جانی چاہئیے تاکہ حتی الامکان اس کی حقیقی اہمیت کا لحاظ ہو سکے دنیا کے مدبروں اور ذمہ دار حکام کے لئے اس سے بہتر مشورہ نہیں دیا جا سکتا۔

دور حاضر کی جدتوں میں ایک بڑی با اثر جدت یورپ کے بعض بڑے ملکوں میں ڈکٹیٹروں کا تقرر ہے۔ صدیوں قبل روما کی جمہوری حکومت نے بعض نازک موقعوں پر اس خدمت کو عارضی طور پر بارہا قائم کیا ہے مگر جوں ہی بلا ملک سے ٹل گئی یہہ عہدہ بھی برخاست کر دیا گیا۔ دور حاضر میں ایسا نہیں ہو رہا ہے، سالہا سال سے ڈکٹیٹر چلے آ رہے ہیں، اس میں شک نہیں کہ ضرورت کے وقت حکومت کے تمام اختیارات ایک ایماندار اور قابل اعتماد ہستی کے سپرد کرنے میں بڑا ہی فائدہ ہوتا ہے، ہر ایک کام فی الفور انجام پاتا ہے، مختلف مدبروں کے اختلاف رائے سے جن رکاوٹوں کا اندیشہ ہے وہ ڈکٹیٹر شپ کے عہد میں پیدا ہی نہیں ہو سکتیں، جب تک کوئی ان غیر معمولی خوبیوں سے آراستہ اور ملک کا سچا فدائی نہ مل جائے اس عہدۂ جلیلہ کے قیام سے بجائے فائدے کے نقصان ہی نقصان ہوتا ہے، ڈکٹیٹر شپ اگر کسی ملک کے لئے مفید ثابت ہوتی ہے تو دوسرے کے لئے باعث تباہی نہ ہونی چاہئیے۔ اگر کسی ملک میں یہہ عہدہ اس نیت سے تراشا جاتا ہے کہ عامۂ خلائق کی پُرامن زندگی میں رخنہ ڈالا جائے تو اس سے بدتر کوئی عمل نہیں ہو سکتا

بعض حضرات کو فکر رہتی ہے کہ اگر ہر شخص اچھے ہی کام کرے گا تو دنیا سے برائی بالکل اٹھ جائے گی تو پھر نیکی کو کیا قدر و منزلت حاصل ہوگی، تندرستی کی اسی وقت قدر ہوتی ہے جب کہ کبھی مرض کی تکلیف بھی برداشت کرنی پڑی ہو۔ ان مہمل خیالات کے دور کرنے کے لئے اتنا کہہ دینا کافی ہوگا کہ انسان دنیا میں اچھے کام کرنے کے لئے پیدا ہوا ہے، بالفرض برائی دنیا سے اٹھ بھی جائے تو اچھے کام کرنے کا ہر وقت موقع باقی رہتا ہے، تندرستی کا لطف اٹھانے کے لئے بیماری کی چاشنی ضروری نہیں، تندرستی کے ساتھ اس کے مستحسن مشاغل ہیں جب آدمی مصروف ہو جاتا ہے تو یہہ مشاغل

اس کی مسرت کا باعث ہوتے ہیں ورنہ بے کاری بہت جلد اس کی تندرستی کو برباد کر دے گی۔

ایک دوسری غلط رائے سائنس اور اس کی ایجادات سے متعلق ہے، دوران جنگ میں بمب کے گولوں اور زہریلی گیسوں وغیرہ کے استعمال سے بے گناہ شہریوں، بیکس عورتوں اور بچوں کی جو شرمناک خون ریزیاں سنی جاتی ہیں ان کی ذمہ داری سائنس اور ماہران سائنس کے سر تھوپنا قرین انصاف نہیں سائنس نے بہیۃ اشیا، کلیات فطرت کی تلاش اور ماہیت مادہ کی تحقیق میں دریافت کئے، ان سے ہر اچھے اور برے کام لئے جاسکتے ہیں، بعض ممالک کے سررشتہ جات جنگ کے چند سنگدل اشخاص نے ان سے خلق کشی کا کام لیا تو اس کی ذمہ داری ان سنگدلوں پر ہے نہ کہ سائنس یا اس کے شیدائیوں پر۔ اگر مہذب دول اپنے علم و دولت کے سرمایوں کو بجائے ایک دوسرے کے کشت و خون پر صرف کرنے کے بنی نوع انسان کی فطرتاً مخالف قوتوں جیسے امراض متعدی یا حوادث سماوی مثلاً قحط، طغیانی، زلزلہ وغیرہ کے مسلسل مقابلے کے لئے محفوظ کر دیا تو حکومتوں کے جملہ مسائل خود بخود حل ہوجائیں گے اور بنی نوع انسان حقیقت میں خدا کی بہترین مخلوق ثابت ہوسکیں گے روحانیات اور اسرار حق کے افشا، کی کوشش اور قوائے حیات پر اقتدار حاصل کرنے کے مساعی انسان ہی کے بس کے کام ہیں ان کے لئے بڑی فرصت کثیر سرمایہ اور وسیع اشتراک عمل کی ضرورت ہے، مہذب دنیا کے باشندے اگر چاہیں تو اپنی وحشت پرستی کو چھوڑ کر جلد سے جلد ان انسانی مشاغل کی طرف متوجہ ہوسکتے ہیں، اللہ تعالے سے دعا ہے کہ ہر فرد بشر کو ان اصول پر کاربند ہونے کی ہدایت دے تاکہ انسان کی نسل بہ حیثیت انسان کے برقرار رہے۔

محمد عبدالرحمن خان

اے آر سی اس - بی اس سی (لندن)

چل دیے

ہونٹوں پہ ایک برق سی لہرا کے چل دیے
کچھ اور سوز عشق کو بھڑکا کے چل دیے

پیمانہ چشم مست کا چھلکا کے چل دیے
مست شراب حسن کو بہکا کے چل دیے

موج صبا سی پھولوں میں اب تک بسی ہوئی
آغوش انتظار میں وہ آ کے چل دیے

دنیا مری نگاہ میں تاریک ہوگئی!
گیسو وہ اپنے دوش پہ پھیلا کے چل دیے

حیران کر گئے مجھے حیران کر گئے!
آئینۂ جمال وہ دکھلا کے چل دیے

اک تفرقہ تصور پیہم میں ڈال کر!!
شیرازۂ خیال کو بکھرا کے چل دیے

کچھ اور اضافہ کر کے مرے اضطراب میں
تعلیم صبر و ضبط کی فرما کے چل دیے

آنکھوں کو دے کے دعوت نظارۂ جمال
اللہ کس ادا سے وہ شرما کے چل دیے

بگڑے ہوئے کھچے ہوئے روٹھے ہوئے تقی
تعمیر حسن و عشق کو وہ ڈھا کے چل دیے

تقی عابدی

طیّارچی

(ایک ہیبت ناک افسانہ)

اکبر صدیقی ان نوجوانوں میں سے ہیں جنہوں نے علم و ادب کی خدمت کے لئے اپنے آپ کو وقف کر دیا ہے، ان کی کتاب "مشاہیر قندھار" ادبی حلقوں میں بہت مقبول ہوئی اب انھوں نے کام کرنے کی ایک نئی راہ نکالی ہے مشہور مغربی افسانوں کو اردو جامہ پہنانے میں خاصی کامیابی حاصل کر لی ہے "سب رس" فبروری میں ان کا ایک ترجمہ سحر زدہ شائع ہوا تھا جو بہت پسند کیا گیا اور مدیر دکن نے بھی شکریہ کے ساتھ اس کو سب رس سے نقل کیا تھا صاحب موصوف نے سب رس کو ہر مہینہ ایک ہیبت ناک افسانہ دینے کا وعدہ کیا ہے "سب رس"

۱۹۳۶ء کی خزاں میں امریکہ کی معاشی حالت ناگفتہ بہ تھی میں باوجود ہنرمند ہونے کے اپنی غربت کا احساس کر رہا تھا یہ احساس مجھ پر آہستہ آہستہ طاری ہوتا گیا۔

پیر کی صبح تھی میں میز سے لگا ہوا اپنی معاشی حالت کو بہتر بنانے کی تدبیریں کر رہا تھا اور حسب معمول ناکامی ہو رہی تھی، میں نے اپنی بیوی سے مشورہ کیا "بیگم! اب ہمارے پاس صرف اسّی ڈالر بنک میں باقی رہ گئے ہیں اور آیندہ مہینے تک اتنی رقم میں گھر چلنا چاہئے اس کے بعد وہ رقم آجائے گی جو مسٹر شارٹ نے دینے کا وعدہ کیا ہے"

ہم دونوں مہینہ کا میزانیہ بنانے میں مصروف تھے اور آخر اس نتیجے پر پہنچے، کہ مجھے غیر معمولی محنت کرنی پڑے گی، ورنہ ہم ایک مہینے تک تنگی ترشی کے باوجود بھی گذران نہ کر سکیں گے، تلاش معیشت کا سوال میرے لئے ناقابل حل بنتا گیا۔

میری بیوی نے کہا میں نے کل کے ٹائمز سے ایک اعلان کاٹ لیا ہے کسی کمپنی کو ایک طیارچی کی ضرورت ہے طیارہ یہاں سے بیامنڈ اسپورٹ (نیویارک) تک پرواز کرے گا اچھا ٹھیرئیے میں ابھی ڈھونڈ لاتی ہوں

وہ چلی گئی اور تھوڑی دیر بعد کاغذ کا ایک پرزہ ہاتھ میں لئے ہوئے واپس آئی، اشتہار کی تحریر یہ تھی "ضرورت ہے!!

مستعد طیارچی کی ایک ایسے غیر اجازت یافتہ طیارہ کے لئے جو اس انجلس سے بیامنڈ اسپورٹ (نیویارک) تک پرواز کرے گا تنخواہ اور سفر خرچ معقول۔"

میں نے بیوی سے کہا مجھے ایسی ملازمت کی ضرورت نہیں، مالک نہایت ایماندار آدمی ہے اور اعتراف کرتا ہے کہ طیارہ غیر اجازت یافتہ ہے اس کا مطلب یہ ہے کہ یا تو یہ آثار قدیمہ کی یادگار ہے یا طویل پرواز کے ناقابل۔ میں خواہ کتنا ہی تجربہ کار طیارچی سہی، لیکن ابھی مرنے کے لئے تیار نہیں"

"کیا ایک غیر اجازت یافتہ طیارہ اڑ ہی نہیں سکتا، اور اگر ایسے طیارہ پر ملازم رکھا جائے تو کیا ہوائی قوانین عدالت ہمارے لئے کھلے نہیں ہیں؟ ہم نالش نہیں کر سکتے؟" میری بیوی نے ہر لفظ پر زور دیتے ہوئے کہا۔

میں نے اس کو سمجھایا کہ عدالتی دروازے ہر طرح کھلے ہیں۔ لیکن ایک طیارچی کے لئے ضروری ہے کہ اس کے پاس ہوائی چھتری ہو اور دنیا کے جغرافیہ پر عبور تامّہ رکھتا ہو۔ لیکن اس کمپنی میں ملازم ہونے کے یہ معنے ہیں کہ مجھے یہاں سے نیویارک جانے کے لئے برفانی پہاڑ اور ریگستانوں سے گذرنا پڑے گا سیکڑوں بڑے اور چھوٹے مقامات خوفناک جنگل اور جھاڑیاں طے کرنی پڑیں گیں۔ مجھے یہ سفر مضحکہ خیز معلوم ہوتا ہے لیکن مفلسی سب کچھ کراتی ہے اس لئے میں نے امیدواری کے لئے درخواست دینا مناسب سمجھا، اس لئے ٹیلیفون کا وصولہ اٹھایا اور کمپنی کے دفتر سے ملا لیا، میرا مخاطب مشہور فلم کمپنی کا مالک ٹرن بل تھا، مالک کمپنی نے طیارہ کی ساخت کے متعلق چند باتیں بتائیں جو میری دلچسپی کا باعث ہوئیں میں اسی جگہ اپنے تقرر کا خواہاں ہو گیا

دوسرے دن کمپنی کے دفتر پہنچا ٹرن بل سے ملاقات کی بہت دیر تک باتیں ہوتی رہیں اس جگہ کے اور بھی امیدوار تھے طیارہ ہر امیدوار کو بتلایا جا رہا تھا۔ چنانچہ میں نے بھی طیارہ دیکھا اور کوئی نقص نہ پایا، ایک ہفتے بعد میرے تقرر کا اعلان ہو گیا اس اثناء میں میں نے راستے کے جغرافیائی حالات کا گہرا مطالعہ کیا تاکہ میرا سفر کامیاب ہے میں اس نئے تقرر پر خوش تھا اور راضی تا ملازمت پر

مسرت کے ساتھ دستخط کر دئے۔

طیارہ ایک سال سے زیر استعمال تھا یہ عصر جدید کا طیارہ تھا مشین اچھی حالت میں تھی لیکن ایک گمان ضرور تھا کہ زیادہ بوجھ لادنے زیادہ تیز رفتار لے جانے اور بلند فضا میں اطمینانی پرواز کرنے سے قاصر رہے گا یہ ایک شرق صنعت تھی ایک سال پہلے ٹرن بل نے اس کو کیلیفورنیا میں خریدا تھا سو گھنٹے پرواز کر چکا تھا اسی کے ساتھ کے اور دو چار طیارے تھے جو زیادہ سامان لادے جانے اور زیادہ تیز رفتار لے جانے کی وجہ سے خراب ہو چکے تھے، مہلک حادثات نے ان کی شکلیں مسخ کر دی تھیں لیکن وہ طیارہ جو اب میرے قبضے میں تھا ہر قسم کے عیب سے پاک تھا اور اس کا دستہ عربی گھوڑے کی لگام معلوم ہو رہا تھا کہ میں جو بھی اشارہ کروں اس کو نہایت وفاداری کے ساتھ انجام دے گا اس کے ساتھ ہی طیارے زیادہ وزن لے جانے اور غیر معمولی رفتار میں پرواز کرنے کے بعد حادثات کا شکار ہو چکے تھے اس لئے ناظر ہوائی نے اس خیال سے کہ یہ بھی پانچواں سہارا نہ بن جائے اس کا اجازت نامہ چھین لیا تھا ٹرن بل اس فکر میں تھا کہ اس نقصان کی تلافی کے لئے جو محض بدنامی کی وجہ سے پیدا ہو گئی ہے عدالت سے چارہ جوئی کرے لیکن عدالت جانے سے پہلے اس شرط پر سمجھوتہ ہو گیا کہ اگر طیارہ کسی فلم کے سلسلہ میں ہیامنڈ اسپورٹنگ تک پرواز کرے تو ٹرن بل ہزاروں ڈالر کے مالک بن جائیں گے۔
اسی سلسلے میں مجھے ملازم رکھا گیا اور اتنی اجرت دی گئی تھی جس نے مہینوں کے لئے فکر معاش سے بے نیاز بنا دیا، دس ہزار ڈالر میں میری زندگی کا بیمہ کرایا گیا۔

میں طیارہ کو آزمانے کے لئے مسلسل چھ گھنٹے تک پرواز کرتا رہا اس اثنا میں متعدد بار زمین پر آیا اور پھر فضا میں اڑ گیا، آڑے ٹیڑھے الٹے سیدھے اور ترچھے ہو کر ہر طرح میں نے طیارہ کو آزما لیا اور جب اس میں کوئی نقص نظر نہ آیا تو پندرہ ہزار فٹ کی بلندی تک پرواز کر گیا، اس بلندی پر بھی اس کی رفتار میں کسی قسم کا فرق نہ ہوا تو میں یکلخت نیچے اترا اور پھر اسی سرعت کے ساتھ فضا میں بلند ہو گیا۔
اب مجھے معلوم ہو گیا کہ ناظر ہوائی نے بلاوجہ اجازت نامے سے محروم کر دیا ہے

اس آزمائش سے یقین ہو گیا کہ میرا سفر کامیاب رہے گا میں نے اپنے سفر کی تیاریاں شروع کر دیں مجھے سنسان جنگل، ریگ زار و ویران آبادیاں برفانی پہاڑ، کہر آلود فضا، جنوبی کیلیفورنیا کی بلند ڈھلوان چٹانیں اور ایسی سینکڑوں وحشتوں کا سامنا کرنا تھا!!
۱۳ اکتوبر روانگی کی تاریخ تھی اور ۱۴ اکتوبر میری سالگرہ کا دن۔ لاس اینجلس سے ۱۳ کی صبح نکل کر شام کے وقت کان کاس میں جہاں میرے والدین بہ تقریب مہمانی تھی اس کا انتظام اگلے ہفتے ہی مکمل ہو چکا تھا، ۱۳ اکتوبر کی صبح کو ہم طیران گاہ جا رہے تھے، مجھے ہر چیز سے مستعدی اور استقلال نظر آ رہا تھا لیکن جب آسمان کی طرف نظر اٹھی فضا نہایت مغموم نظر آنے لگی، کئی دن سے مطلع صاف تھا اسی لئے آج کا کہر ناگوار خاطر تھا، اس کے باوجود میرا یقین تھا کہ شام تک میں کان کاس جا پہنچوں گا۔

طیارہ فضا میں دس ہزار فٹ کی بلندی پر پرواز کر رہا تھا۔ ایک منٹ میں چار میل طے ہو رہے تھے۔ کچھ دیر بعد ہی میں سان جبرئیل کی وادی میں تھا دور بہت دور لاس اینجلس کے بلند مینار نظر آ رہے تھے لامحدود فضا میں ان گنت آبادیاں دکھائی دے رہی تھیں دریاؤں کا پیچ و خم، درختوں کے جھنڈ، سڑکیں، ریلیں، باغوں کی روشیں غرض فضا میں ہو کر دور سے نیچے کے مناظر دیکھنا جام جم کے مشاہدہ سے کم نہیں علم جغرافیہ کی اہمیت کا اندازہ یہیں پہنچ کر کیا جا سکتا ہے۔
سیرا میڈری اور سان انٹونیو کی برفانی چوٹیاں بھی نظر سے اوجھل ہو گئیں مشرقی افق پر سان برنارڈینو، سان گرگانیا اور سان جیکنٹو کی چوٹیاں نظر آ رہی تھیں کچھ لمحے گذرنے کے بعد میں نے انھیں بھی عبور کر لیا اب ہر طرف ریت کے ٹیلے نظر آ رہے تھے کہیں نخلستان اور دو چار خیمے اور پانی کے چشمے بھی نظر آ جاتے۔ کیلیفورنیا تک پہنچنے میں مجھے صرف ایک گھنٹہ باقی تھا اس لئے میں جنوبی نیوادا کی طرف نکل گیا اور راستے میں دریا کا چکر لگاتا ہوا بولڈر کا بند دیکھنے کے لئے زمین سے صرف دو ہزار فٹ کی بلندی پر آ گیا، بولڈر کا بند انسانی صنعت کا عظیم الشان کارنامہ ہے جو دریائے کلوریڈو کے پانی کو روک کر بنایا گیا ہے، اس سے کروڑوں ایکڑ زمین

...سیراب ہوتی ہے اور یہی آبشار نیاگرا سے بن گئی برقی قوت بہم پہنچاتا ہے۔
...دیکھنے کے بعد آٹھ ہزار فٹ بلند ہوگیا، طیارہ میڈلیک کی طرف اری زونا
...جنوبی حصے میں پرواز کر رہا تھا میں اس کی ارضی ماہیت دیکھ رہا تھا زمین
...حائل ہو رہی تھی قدیم لاووں کے آثار نظر آرہے تھے، پہاڑوں کی بلند
...چوٹیاں گہری گھاٹیاں اور وادیاں غرض ہر چیز عظمت و جبروت کی حامل تھی
...میں تین سو میل تک یہی مناظر دیکھتا گیا، وحشت، یاس اور تنہائی میرے تخیل
...کوسوں دور تھے طیارہ دس ہزار فٹ کی بلندی پر دو سو میل فی گھنٹہ کی
رفتار سے پرواز کر رہا تھا اور میری نظریں دریائے کولوریڈو پر تھیں جو نہایت
...شان سے ایک بڑے اژدہا کی طرح چکر کاٹتا ہوا میڈلیک کی طرف بہہ رہا تھا۔
مطلع ابر آلود ہونے لگا اور وحشت و تنہائی بھی محسوس ہونے لگی، طیارہ کبھی
پانچ سو فٹ بلند ہو جاتا اور کبھی اتنی تیزی سے اترتا جیسے پتھر گر رہا ہے۔
میں اس کو قابو میں رکھنے کی انتہائی کوشش صرف کر رہا تھا، یہ ناخوشگواری
میرے طیارہ کے غیر اجازت یافتہ ہونے کو بار بار یاد دلا رہی تھی جو اس امر کے لئے
کافی تھی کہ طیارہ کی مشنری میں کوئی کمزوری پیدا ہوگئی ہے۔
ان جھکولوں کے صدمے سے اگر طیارہ کا کوئی بازو بیکار ہو جاتا تو میرا کیا حشر ہوتا!
اس میں کوئی شک نہیں کہ میں طیارہ سے چھتری میں منتقل ہو جاتا لیکن میری منزل
کہاں ہوتی؟ گرانڈ کینیان یان کے گہرے غاروں میں، پانی سے چالیس میل اور
غذا سے سو میل دور اور انسانی آبادی سے نہ معلوم کتنے فاصلے پر اگر اس حالت
میں میں گر جاؤں تو جس بے بسی کی موت مروں اس کا اندازہ لگانا مشکل ہے
گرانڈ کینیان یان میں طیارہ کو اتارنا اس کے پرخچے اڑا دینے کے مرادف ہے اور
چھتری کے ذریعے اترنا جلتے توے سے آگ میں کودنے سے کم نہیں۔
میں نے اب انجن کو اس کے حال پر چھوڑ دیا، مشین برابر کام کرتا رہا، طیارہ
گرانڈ کینیان یان سے چودہ ہزار فٹ کی بلندی پر تھا، اری زونا کا ریگستان
...دو سو بیس میل فی گھنٹہ کی رفتار سے میرے نیچے بھاگ رہے تھے، مطلع کا
وہی عالم تھا لیکن مشین برابر وفاداری کے ساتھ کام کر رہی تھی، بادل
گرج رہے تھے، میں مشرق کی طرف ہوا کے سمندر میں بہا چلا جا رہا تھا سفید
بادلوں کی وجہ سے مطلع کی وحشت دور ہونے لگی، میں نے گوشت کے بھنے ہوئے
ٹکڑے اور روٹی وغیرہ کھائی، گرم گرم کافی پی اور پھر اپنے مستقبل کے لئے
تیار ہوگیا، طیارہ سطح سمندر سے سترہ ہزار فٹ کی بلندی پر بادلوں سے
کھیل رہا تھا کبھی ان سے اوپر جاتا اور کبھی نیچے۔ بارش ہو رہی تھی، بجلیاں چمک
رہی تھیں اور گرج کی آوازیں کان پھاڑے دے رہی تھیں، میں ایک ہزار فٹ
اور بلند ہوگیا، دنیا میری نظروں سے اوجھل تھی نیچے ہر طرف طوفان ہی طوفان
نظر آتا تھا، ایک گھنٹہ گذر گیا۔ فرحتی سوئی میں ہزار فٹ بتلا رہی تھی اور میں
کچھ سردی اور آکسیجن کی کمی محسوس کرنے لگا، موخر الذکر نے مجھے زیادہ ہراساں کر دیا
اس لئے اترنے لگا لیکن بادلوں کے طوفان کی تیزی نے مجھے کہیں کا نہ رکھا
جدھر نظر اٹھتی بادل نظر آتے مجھے سوائے اس کے کوئی چارہ نظر نہ آیا کہ انتہائی
رفتار کے ساتھ انتہائی قابل برداشت بلندی پر پرواز کروں لیکن مصیبت
تنہا نہیں آتی، برف سے طیارے کے دونوں بازو وزنی ہو رہے تھے اور میں
باوجود کوشش کے زمین کا چپہ بھی نہ دیکھ سکا حالانکہ ریگستان کے بعد ابھی تک
میں نے دو سو میل کا فاصلہ طے کر لیا تھا، اب جنوبی ہوا کا ایک تھپیڑا مجھے
شمال مغربی میکسیکو جدید میں اور شمالی ہوا کا تھپیڑا جنوب مغربی کولوریڈو پر
یا جنوب مشرقی یوٹہ پر گرا دیتا، مقابل کی رو شمال مشرقی اری زونا میں
بہا لے جاتی، یہ کل رقبہ انگلستان کے خطے کے مساوی ہے جو اری زونا سے
میکسیکو جدید اور یوٹہ تک پھیلا ہوا ہے۔
اس طرح پرواز کرتے رہنا بھی خودکشی سے کم نہ تھا اس لئے میں نے اتر کر بارش
ہی میں برف جھاڑ دینے کا خیال کیا تیرہ ہزار فٹ سے اوپر بارش بہت کم تھی
لیکن نیچے پہاڑوں پر دھواں دھار بارش ہو رہی تھی، جس نے میری پرواز کو
سفر بے منزل بنا دیا تھا اب صرف ایک آخری صورت باقی رہ گئی تھی کہ میں
چھ ہزار فٹ نیچے اتروں اور بارش ہی سے برف دھل جانے کی دعا کروں،
اور ہوا کے ایسے تھپیڑے کے لئے ملتجی ہوں جو مجھے فلاگ اسٹاف یا ہال بروگ
اری زونا کے کسی طیران گاہ پر پہنچا دے، ابھی میرے پاس اتنا پٹرول تھا
کہ میں دو گھنٹے مسلسل پرواز کر سکتا تھا لیکن اس کو استعمال کرنے کی قابلیت
مجھ میں باقی نہ تھی کیونکہ آئندہ سفر میں اور دو تین سو پونڈ برف بازوں پر
جم جاتی۔

میں نے طیارہ کو ایک زوردار جھکولا دے کر ایک دائرہ پر گھمایا تاکہ برف گرا کر
بار ہلکا کر سکوں، جھکولے کے ساتھ ہی دھڑام کی ایک آواز ہوی اور طیارہ
دایاں ہزار فٹ نیچے آرہا، دوسرے لمحے میں مجھے ایسا معلوم ہوا گویا طیارہ زمین پر
گر گیا ہے، اس کے بعد بندوق پھٹنے کی آواز ہوئی اور دونوں بازو طیارچی
کی نشست پر آکر جم گئے جیسے کوئی پرند پر جوڑے اتر رہا ہے، میں نے پیٹرول
رساں نالی کاٹ دی اور انجن بند ہوتے ہی مجھے محسوس ہوگیا کہ طیارہ
سر کے بل انتہائی سرعت کے ساتھ زمین کی طرف جا رہا ہے، رفتار نما تین سو
میل پہ تھا، چند لمحے میرے لئے گھنٹوں سے زیادہ تھے، طیارہ کے بازو
ہوا کے زور سے اڑ کر بار بار میرے سر پر پڑ رہے تھے، لیکن میری ٹوپی نے
میرا سر بچا دیا، اور اب میں اپنی نشست سے ہٹ کر چھتری تک پہنچنے کی
فکر میں تھا، اگر چھتری پیچھے لٹکتی ہوی نہ ہوتی تو چھتری کو سہارنے
والے تار سے میں ٹکڑے ہوگیا ہوتا لیکن اس کے باوجود بھی میں زخمی ہوا مجھ
پر نیم بے ہوشی کی حالت طاری ہوی، دھواں دھار بارش کی
سنسناتی ہوئی آوازیں بادلوں کی گرج اور بجلیوں کی چمک میری اس
غفلت کو دور کرنے کے لئے کافی تھے، میں نے اپنے ہاتھ بڑھا کر اس زنجیر
کو کھینچنے کی کوشش کی جس سے چھتری ملحق تھی نتیجہ یہہ ہوا کہ اس کے
ساتھ کی متعلقہ اشیا نکل آئیں اور فضا میں گم ہوگئیں ان تمام آوازوں
کو دباتے ہوئے چھتری کھلنے کی آواز سنائی دی، میں نے دیکھا چھتری
طیارہ سے چھوٹ کر لٹک رہی ہے، میں نے طیارہ کو خدا حافظ کہا اور زنجیر
ہاتھ میں لئے ہوے نیچے اتر گیا، اس منتقلی میں میرے ایک دو زخم آئے اور
بے ہوش ہوگیا، ہوش جب آیا تو ایک زور کی آواز سنائی دی، میں سمجھ گیا
کہ ٹرن بل کا طیارہ بھی میرا ہم سفر ہے۔ میں نیچے گھورتا رہا کہ زمین دیکھ
سکوں لیکن بارش کی کثرت سے کچھ سجھائی نہ دیا، کچھ دیر بعد مٹی کی
بو آنے لگی، ساکن پانی اور سڑے گلے پودوں کی بدبو محسوس ہو رہی تھی،
مویشیوں کی بھی آوازیں آئیں، دوسرے لمحے میں میرا ایک پیر کیچڑ میں
لت پت ہوگیا اور ساتھ ہی پورا جسم اور پھر کچھ فاصلے پر چھتری
بھی اتر آئی، میں نے خود کو چھتری کی قید سے آزاد کیا اس کے بعد
ایک دھماکے کی آواز آئی، میں سمجھ گیا کہ طیارہ بھی زمین پر پہنچ [illegible]
چھتری بند کی اور پھر اپنی منزل سوچتا رہا، دفعتاً خوفناک آوازیں
آنی شروع ہوئیں جن سے معلوم ہوا کہ میں ایک ریگستان کو طے کر کے دلدل
میں آپھنسا ہوں، آوازیں ثوری مینڈکوں کی تھیں میں دیوانہ وار ہنستے
ہوئے آپ سے آپ سوال کرنے لگا کہ آیا میں اری زونا کے جنگلوں میں ہوں یا
میکسیکو جدید، یوطہ، یا کلوریڈو کی وادیوں میں؟ میری منزل خدا ہی
جانے، میرے آئندہ احباب کا علم بھی اسی کو ہے، میرے اطمینان قلب
کے لئے یہی کافی تھا کہ میں زندہ زمین پر آگیا ہوں اگرچہ دلدل میں ہوں
لیکن یہہ جنت سے کم نہیں۔

بارش تھم گئی تھی، سورج نکل آیا تھا، تھوڑی دور سبز گھاس لہرا
رہی تھی، پرندوں کے چہچہوں سے دلدل معمور تھی، جب اپنے مستقبل
پر غور کیا تو معلوم ہوا کہ قدرت مجھے زندہ رکھنے کی تدبیریں کر رہی ہے۔ اگر
خدا کو میری موت منظور ہوتی تو میں اسی وقت مر چکا ہوتا جب کہ طیارہ کے
بازو سر پر پڑ رہے تھے یا چھتری کسی ایسے مقام پر اترتی کہ میں کسی چٹان
سے ٹکرا کر دم توڑ دیتا یا سمندر میں ڈوب جاتا، لیکن اب صورت ہی اور تھی
میں ایسی جگہ تھا جہاں پانی اور غذا میسر ہونے کا امکان تھا۔
مغربی سمت میں نصف میل کے فاصلہ پر مجھے ایک چٹان نظر آئی وہاں پہنچ کر
اطراف میں نظر دوڑائی، ہر طرف دلدل ہی دلدل تھی، کوئی تین سو ایکڑ کا رقبہ
ہوگا، انسان کا کہیں پتہ نہ تھا وادی ڈاش کلش (اری زونا) میں یہی
مناظر میرے پیش نظر تھے لیکن مجھے معلوم تھا کہ میکسیکو جدید، کولوریڈو اور یوطہ
انھیں دلدلوں سے بھرے پڑے ہیں میں اپنی جغرافیائی معلومات کی بنا پر
سمجھتا تھا کہ یہ وہ مقام تھا جس کو یہاں کے باشندے "فور کارنرس"
کہتے ہیں اور جہاں اری زونا، میکسیکو جدید، یوطہ اور کولوریڈو کے حدود
آملتے ہیں۔
میں چٹان سے اترا اور اب انسانی آثار کی کھوج میں لگ گیا، زمین غور سے
دیکھی تو معلوم ہوا کہ بکریوں کے گلے یہاں کی گھاس چر گئے ہیں، ان کے پیر کے
نشانات بھی نظر آئے، یہہ میری معلومات میں اضافہ کرنے والی چیزیں تھیں

…ہنچ کے بڑھا اور وہ وہیں آثار میرے مستقبل کو درخشاں بنانے والے نظر آئے
…س کریہ میرا بدقسمت شکستہ طیارہ چھ فٹ زمین میں دھنسا ہوا دکھائی دیا
…وڑی کوشش کے بعد میں نے اپنا لوہے کا صندوق اس میں سے کھینچ لیا
…جس میں دوربین ڈوربی، گلاس، ادویہ، ابتدائی جراحی کا سامان تھرماس
…شکاری چاقو، دیاسلائی کی ڈبیاں، جیبی قطب نما، ایک بندوق اور
…ا نکٹ تھے میں ان سب کو لے کر جھنڈی لینے کے لئے چلا گیا، راستہ میں خرگوش
…شکار کیا، جھنڈی لی اور ایک مقام پر پہنچ کر چھوٹا سا خیمہ کھڑا کیا، گوشت
…بھوننے کے لئے مجھے کچھ نہ ملا تو طیارہ کے بازو کا تھوڑا سا حصہ توڑ کر برتن
…کی شکل بنالی، ناشتہ کیا، شام ہوگئی ستاروں سے آسمان جگمگا گیا، میں نے
مختلف ستارے پہچان لئے، طائری ملبوس اتار کر پائجامہ پہنا اور بلانکٹ
اوڑھ کر سوگیا، سو کر اٹھا یوں تو دن چڑھ آیا تھا زخموں سے چور ہونے کی
وجہ سے طبیعت مضمحل تھی، لیکن اٹھ کر زخم دھوئے آئیوڈین پھیری اور
…کس کر باندھ دیا، اس حرارت سے مجھ پر بے ہوشی طاری ہوگئی، خدا جانے
میں کب تک بے ہوش رہا لیکن کتوں اور انسانوں کی آوازیں مجھے ہوش میں
لائیں آنکھیں کھولا تو دیکھتا کیا ہوں کہ میں ایک نے وے جو ہندی کے
زانو پر سر رکھا ہوں، اور اس کے قریب ہی دو تین ادھیڑ عمر کے آدمی اپنی
زبان میں گفتگو کر رہے ہیں جس سے میں قطعاً ناواقف تھا ان کے قریب ہی
پیار خوبصورت گھوڑے کھڑے ہنہنا رہے تھے مجھ میں کھڑے ہونے کی سکت نہ تھی
ان لوگوں نے بدقت تمام مجھے گھوڑے پر بٹھایا اور گھر کی راہ لی ہم راستہ طے کر رہے تھے
…میرا مربی مجھ پر سوالات کی بوچھار کر رہا تھا لیکن افسوس کہ میں ایک کا بھی جواب
نہ دے سکا میں نے اس کے استفہامی لہجہ کو دیکھ کر انگریزی زبان میں ایک
جملہ کہا لیکن وہ نہ سمجھ سکا میں نے ہسپانوی زبان میں اس سے گفتگو کی اس کا
جواب ملا کہ اس کی ایک بہن "ای ٹے ڈی کل شی" آل جے ٹوبیں رہتی ہے
جو ہسپانوی زبان سے خوب واقف ہے لیکن خود اس کی زبان اتنی شکستہ تھی کہ
میں اس کو بمشکل سمجھ سکا۔ اس کے بعد بھی وہ اپنی زبان میں اشاروں کے ساتھ
ساتھ گفتگو کرتا گیا، اس کی طویل گفتگو کے بعد مجھے معلوم ہوا کہ ان نے ے
جو ہندیوں نے میرے طیارہ کے گرنے کی آواز سنی اور اس کی تلاش میں پڑ گئے

پہلے دن ناکام رہے اور دوسرے دن انھوں نے مجھے پالیا دلدل سے تین
میل پر بیس پچیس جھونپڑیوں کی ایک آبادی تھی مجھے ایک جھونپڑی میں لٹایا گیا
ایک ہندی نے گھاس کا ایک گٹھا لایا اور اس کو بستر کی شکل میں پھیلا دیا
ہمہ گیر اور بلانکٹ سے اس کو آراستہ کیا گیا اور ہر طرح کا آرام پہنچانے کی کوشش
کوشش کی گئی کچھ دیر بعد ایک شخص ہاتھ میں دیگچی لئے ہوئے آیا اور جوشاندہ پلایا
دوسرے آدمی نے تھوڑی دیر بعد گرم گرم پتھر لا کر مجھے اوڑھنیاں اوڑھا دیں گنتیں
میں پسینہ میں شرابور ہوگیا اور خود کو گرم حمام میں محسوس کرنے لگا۔

سر مغرب ایک عورت میری کٹیا میں آئی اور پیشانی پر ہاتھ رکھ کر مسکرانے لگی شاید
یہ سمجھ کر کہ میں ان کے علاج سے رو بصحت ہوں میں نے اس کو اشارہ سے کہا کہ
میں بھوکا ہوں، تب اس نے ایک کٹورا لایا جس میں گوشت کے بھنے ہوئے ٹکڑے
اور جو کے ابلے ہوئے دانے تھے میں نے یہ غذا بڑی خوشی سے کھائی، وہ لوگ روزانہ
میرے لئے مختلف قسم کی جڑی بوٹیاں لاتے اور دل دہی سے میرا علاج کرتے
اس اثنا میں میں نے وے جو زبان کے چند الفاظ بھی معلوم کر لئے اور ٹوٹے پھوٹے
الفاظ میں اپنا کام نکالنے کے قابل ہوگیا۔

ایک دن میں بستر پر پڑا ہوا تھا کہ کٹیا کا دروازہ کھلا اور سولہ سالہ خوش رو
ہنس مکھ لڑکی داخل ہوئی وہ میرے قریب آئی میں اس کے خیر مقدم کے لئے اٹھا
اس نے نہایت سلیس اور صاف ہسپانوی زبان میں کہا "میں اے ٹی ڈی کل شی
ہوں، میرے بھائی انکلازی نے مجھے آپ کے ساتھ گفتگو کرنے کے لئے طلب کیا ہے
اس نے مجھ سے کہا تھا کہ آپ بیمار ہیں اور آسمان سے گر گئے تھے اور پھر یہاں لائے گئے
یہ الفاظ میرے لئے زندگی بخش ثابت ہوئے اور میں اپنے آپ کو ایک تندرست
نوجوان محسوس کرنے لگا۔

۱۴ر اکتوبر کی صبح کو لاس اینجلس سے چلا تھا اس دن سے ابھی تک مجھے
شیو shave کرنے کا موقع نہ ملا اب جو آئینہ میں اپنی تصویر دیکھی تو زلفیں
رخساروں پر اور ڈاڑھی سینے پر لہرا رہی تھی میں اپنی شکل سے ڈر گیا میں نے
پہلی دفعہ خود کو اس حال میں دیکھا، لاس اینجلس سے چلنے کے بعد اب تک کے
واقعات کا اعادہ کیا اور جب اے ٹی ڈی کل شی کا خیال آیا تو فوراً ایک
ندامت محسوس ہوئی اب مجھے اس کی موجودگی کا احساس ہوا ایسے

قدرتی مناظر سے گھری ہوئی کٹیا میں اس کا وجود جنت میں حور سے کم نہ تھا
میرے دل میں سیکڑوں سوالات تھے جو اس سے کرنے تھے، ہم تین گھنٹے لگاتار باتیں
کرتے رہے اس کے بعد نروے جو ہندی آگئے اور ہماری گفتگو میں مخل ہونے لگے
اس سے ایک نئی بات یہہ معلوم ہوئی کہ میں جنوب مشرقی یوطہ کے علاقہ پیانگو جو سے
(۱۶۰) برفانی میل کے فاصلے پر تھا جہاں نئی تہذیب کے لوگ بستے ہیں اور تار اور
ٹیلیفون کے ذرایع مراسلت مہیا ہو سکتے ہیں۔

سرما کا موسم شروع ہو چکا تھا اور میری سالگرہ اور کرسمس کے ایام وہیں گذر رہے تھے
جنوری کا مہینہ تھا طیارہ ناقابل استعمال تھا اور صحت بھی سفر کی مانع تھی
فروری کی ایک صبح انکلازی کٹیا میں آیا "میں آل جے ٹو جا رہا ہوں جہاں
میرے ایک بھائی کے ہاں پیغام بر کبوتر ہیں جو شمن لی (اری زونا) جاتے ہیں
اگر آپ چاہیں تو کوئی خط دیجئے جو کسی فرانسسکو ایگزمن تک پہنچا دیا جائے گا۔
میں خوشی سے اچھل گیا اور کاغذ پنسل لے کر اس کے حکم کی اس طرح تعمیل کی

"مدیران جرائد لاس اینجلس

طیارے کے پرخچے اڑ گئے، میں چھتری
کے ذریعے زمین پر آ گیا، اب برف سے گھرا ہوا آل جے ٹو (یوطہ) سے ۲۶ میل دور
"شن شین بے ٹو" میں ہوں، جوزف ٹرن مل تک اطلاع دے دو کہ ایک آبی
طیارہ روانہ کر دیں"

اگر یہ اطلاع شن لی میں کسی پادری کے ہاتھ لگ جائے تو اس کی اطلاع ہاتھوں ہاتھ
میری بیوی کو ہو جائے گی اور وہ میری خیریت سن کر مطمئن ہو گی، میں نے دعائیں
دیتے ہوئے کاغذ کا پرزہ انکلازی کے حوالے کیا اور وہ برفانی جنگل میں نظر سے
غائب ہو گیا، وہ نویں دن واپس آیا اور اطلاع دی کہ میری چٹھی کبوتر کے ذریعہ
روانہ کر دی گئی ہے، اس کے دوسرے دن مجھے ایک طیارہ کی آواز سنائی دی
میں کٹیا سے باہر ہوا تو ایک روپہری آبی طیارہ برفانی زمین پر اترنے کے تمام
سامان سے آراستہ ہماری جھونپڑیوں پر منڈلاتا نظر آیا اور دوسرے لمحہ
میں وہ میری کٹیا سے سو گز کے فاصلے پر آ کر رک گیا۔ طیارے سے چھ آدمی
اترے اور میری طرف رخ کئے، ٹرن مل خود پیش پیش تھے، اور ان کے بعد دو طیارچی اور
دو اخباری نمائندے اور چھٹا جیرلڈ ٹاؤن سنڈ لاس اینجلس کے اخبار کا ایڈیٹر تھا

ہم سب صحیح سلامت لاس اینجلس واپس آ گئے، ایک دن ٹرن مل نے
دفتر میں میری طلبی ہوئی، اس نے مجھ سے کہا "۱۳ اکتوبر سے اب تک میں
انگلیوں پر دن گنتا رہا، تمھاری گم شدگی کے بعد مختلف مقامات پر تار
دئے گئے اور لاحاصل تلاش کی گئی، تمھارے لئے الاسکا کو بھی تار دیا گیا۔
آخر جب میری تمام کوششیں ناکام ہو گئیں تو یہہ سمجھا کہ تم بے آب و دانہ اور بے
گور و کفن موت کی آغوش میں سو چکے ہیں، تمھارا قاتل خود کو قرار دے لیا
لیکن تمھاری بیوی میرے اس خیال کی تردید کرتی رہی میں تمھیں دواخانہ
بھیج کر طبی معائنہ کرواتا ہوں کیونکہ میں تمھاری موجودہ صحت کا حال معلوم
کرنے کا متمنی ہوں"۔ میں نے مالک کے حکم کی تعمیل کی اور دواخانہ آیا ڈاکٹر
نے لاشعاع کے ذریعے مجھے ناخن سے تالو تک دیکھ لیا اور کوئی نقص نہ پایا
ٹرن مل خوش ہو گیا اور میز کے خانے سے ایک کاغذ نکال کر میری طرف بڑھایا۔ یہہ
ایک چک تھا جو مجھے میری کامیاب پرواز لینے نیویارک تک پہنچ جانے کے بعد
دیا جانے والا تھا، میں نے چک دیکھا اور اس سے متعجب ہو کر سوال کیا جناب
کیا یہہ آپ کی غلطی نہیں؟

"میں نے اپنی تمام عمر میں صرف ایک غلطی یہہ کی کہ تمھیں ایک غیر اجازت یافتہ
طیارہ دے کر برفانی راستوں پر اڑایا اور اسی غلطی کا جرمانہ بخوشی ادا کر رہا ہوں"
ٹرن مل نے کہا میں نے اس کا شکریہ ادا کیا اور باہر آیا۔

میں اپنا قصہ ختم کرنے سے پہلے ان نروے جو ہندیوں کا شکریہ ادا کرتا ہوں
جنھوں نے مجھے حیات نو بخشی آئندہ سال پھر "شن شین بے ٹو" جاؤں گا
لیکن غیر اجازت یافتہ طیارہ میں نہیں، میں نے ایسے طیاروں میں پرواز
کرنے اور اچانک زمین پر اترنے کا خیال ذہن میں لانے کی قسم کھائی ہے

ترجمہ اکبر صدیقی

طرزِ یگانہ

جنھیں ذوقِ حضوری خواب و بیداری میں حاصل تھا
خداوندا وہ آنکھیں کون سی تھیں کون سا دل تھا؟

خدایا! آگیا واللہ وہ جلوہ بھی دیکھا ہے!
خدا جانے وہی حق تھا کہ حق کا عکس باطل تھا

تماشا گاہِ حیرت میں کہاں کا تو کہاں کا میں!
بس اتنا تھا کہ آئینے سے آئینہ مقابل تھا

اندھیری کوٹھری میں آئینہ دیکھا تو کیا دیکھا؟
یہی دیکھا کہ میں خود دیدۂ بینا میں باطل تھا

ہے حسنِ گنہ گاری زہے فیضِ پشیمانی!!
ـے ٹھنڈا پسینا آگیا جنت میں داخل تھا

نگاہِ شوق کی دنیا خدا جانے کہاں تک ہے
جہاں دیکھا وہی حسنِ یگانہ شمعِ محفل تھا!

میرزا یگانہ چنگیزی

میرے لئے

برہمی ہوتی ہے اس کی بے سبب میرے لئے
سجدۂ در بھی ہوا ترکِ ادب میرے لئے!

ہے تگ و دو اس جہاں میں انبساطِ زندگی
پائے بندیٔ قفس ہے کیا غضب میرے لئے

ہاں نہ پوچھ اس کلبۂ احزاں کی کیفیت نہ پوچھ
ہو گئے ہیں ایک ہی سے روز و شب میرے لئے

کیا ہو امیدِ وفا اس چرخِ کج رفتار سے
ایک بھی گردش کرے ظالم نہ جب میرے لئے

ہے امیدوں سے زیادہ ناامیدی کا ہجوم
کیا رہا ہے زندگی کا لطف اب میرے لئے

مے سے توبہ کر تو لوں، لیکن یہ دیکھوں کس طرح
تڑپے یوں ہر جام میں بنت العنب میرے لئے

کچھ نہ کچھ اس میں بھی چشمِ فتنہ زا کا زور ہے
یوں سکونِ دل ہوا تھا پہلے کب میرے لئے

غیر تو دشمن ہی تھے اپنے بھی اب دشمن ہوئے
ہو گئی دنیا ہی فرحت، کچھ عجب میرے لئے

مرزا فرحت اللہ بیگ (بی، اے)

بیوہ

موت پر کس کا زور چل سکتا ہے، بنواری لال تھوڑی سی علالت کے بعد تیس سال کی عمر ہی میں مر گیا..... ایک بیوی کو دنیا سے اس ناانصافی کی شکایت کرنے کے لئے زندہ چھوڑتے ہوئے..... ایک نوجوان بیوی کو جس کی امیدوں اور آرزوؤں کے چراغ اپنی پوری رنگینی سے اس کے دل کو منور کر رہے تھے..... شیلا اب بیوہ تھی..... عورت ہونے کا حق اس سے چھین لیا گیا تھا..... وہ اپنے خاوند کی قاتلہ سمجھی جانے لگی..... ڈائن سمجھی جانے لگی..... ایک بیوہ سب کچھ سمجھی جاتی ہے..... سولہ سترہ سال کی الھڑ، ہر دم خیالی دنیا بسانے والی نادان لڑکی کو اک دم سے یہ باور کرایا جائے کہ "تو بیوہ ہے" کس قدر ہیبت ناک اور دل ہلا دینے والا ہوتا ہے، مرنے والے سے زیادہ اسی کا غم شیلا کے لئے سوہان روح تھا، وہ چاہتی کوئی اسے تسلی دے اس کی اشک شوئی کرے، اور اسے طعن و تشنیع کرنے والی زبان چبھتی ہوئی قہر آلود نظریں..... چاروں طرف سے گھیری رہیں۔

سسرال میں اب اس کا کوئی گزارا نہ تھا، خاوند کو کھا جانے والی کا کہاں گزارا ہو سکتا ہے؟ زندگی تک اس کے چرنوں میں اور مرنے کے بعد وہ جہاں ہو وہیں..... دنیا میں؟ کس کے ساتھ؟ کیوں؟..... شیلا روتی تھی..... اپنے سر کے بال نوچ ڈالے تھے، کھانا چھوڑ دیا تھا، پھر بھی..... یہ سب ڈھونگ تماشے سمجھے گئے کہا گیا کہ "بڑی مکار ہے، منحوس ہے"..... وہ اور بھی زیادہ رونے لگی.....

سسرال سے نکال دی گئی، شیلا سسرال سے نکال دی گئی..... ایک منحوس ہمیشہ نڈھال رہنے والی لڑکی کو کون اپنے گھر میں رکھ سکتا ہے جب کہ اس گھر میں شادی، پوجا، سالگرہ ہوتی ہوں، چھوٹے چھوٹے بچے ہوں..... ساس نے صاف کہہ دیا "جاؤ اپنی ماں کے پاس میرے گھر میں تو اب رہنے کی ضرورت نہیں میرے بیٹے کو کھا گئی..... اب اور کسے کھائے گی" بیچاری کی آواز بھر آگئی..... سننے والوں کو بھی ترس آ گیا..... شیلا کے سر پر سبھوں نے اس کے پاپ کی گٹھڑی کی طرح میلے کچیلے کپڑے باندھ دیے..... دروازے بند ہوتے گئے.....

شیلا کی ماں بہت دن ہوئے مر چکی تھی..... اس کے باپ نے دوسری شادی کی اور اس شادی کے کچھ دن بعد ہی دنیا سے منہ موڑ لیا..... اپنی پہلی بیوی کے پاس چلا گیا، شیلا کی سوتیلی ماں ایک چھوٹے سے مکان میں رہا کرتی اور اسے شیلا یا شیلا کے معاملات سے بہت کم تعلق ہوتا۔

وہ مکان جس میں شیلا اب جا رہی تھی، اس کے باپ کی وصیت سے ان دونوں ماں بیٹیوں کا تھا اور وہ کسی غیر کے گھر نہیں جا رہی تھی، شیلا کی ماں طبیعت کی کچھ بری نہ تھی..... لیکن..... ایک بیوہ لڑکی کے لئے ماں کا دل بھی سخت ہو جاتا ہے اور وہ بھی سوتیلی ماں کا، ابتدائی دو چار دن کے علاوہ باقی کے دن شیلا کے لئے کچھ زیادہ امید افزا نہ تھے۔ سسرال سے زیادہ یہاں اسے تکلیف ہوتی تھی..... جو بات غیروں کی زبان سے سنی جائے وہی اگر اپنے بھی دہرائیں تو سننے والے کا دل چھد کے رہ جاتا ہے مگر ان تمام طعن و تشنیع اور بدسلوکی کا اثر کچھ دنوں کے لئے شیلا کے دل پر بہت گہرا داغ بٹھا نا رہا لیکن اب..... اسے ان باتوں کو سنتے ہوئے بہت دن ہو چکے تھے..... ان باتوں نے اس کے کان پکا دئیے تھے..... وہ سب کچھ سنتی..... سمجھتی کہ وہ اسی کی مستحق ہے اور زندگی کے دن بغیر روئے دھوئے گزار رہی تھی..... اس کی ماں نے ایک دن کہا کہ وہ اپنے کھانے پینے کا علیحدہ انتظام کر لے۔ وہ کہتی "ایک بیوہ تیرا بار اٹھانے کی طاقت نہیں رکھتی....." پھر بھی مکان میں شیلا کا حصہ تھا۔ وہ مصلحتاً خاموش ہو جاتی..... بچا ہوا دینے اور کھانے میں دونوں کو بہت دن تک کوئی اعتراض نہ ہوا.....

شیلا کی ماں کے ہاں ایک لڑکا کھانا کھایا کرتا اور ماہوار چار پانچ روپے جو کچھ بھی ہو سکتا دے دیتا..... وہ روزانہ دو وقت شیلا کے گھر آتا، اور اب تین چار وقت آنے لگا تھا، راجہ شنکر مدرسہ میں میٹرک کی تعلیم پاتا تھا، بڑا ہی منچلا، طبیعت میں شوخی اور شرارت، گانے بجانے کا شوقین، غرض

موجودہ زمانے کا نوجوان تھا... شیلا سے اس نے کبھی کھل کر بات نہیں کی لیکن نظر میں... شیلا کے لئے اُن کے راز کی گہرائی تک پہونچنا مشکل نہ تھا
شیلا کی ماں نے ایک دن راجہ شنکر سے کہا "تھوڑی دیر اگر شیلا کو بھی پڑھا دو تو وہ کہیں دس بیس کی نوکری کرے گی" شیلا نے بھی اس کو غنیمت جانا
اور دوسرے دن سے تعلیم شروع ہوگئی..... راجہ شنکر کو اب پڑھنے کی فرصت نہ تھی، وقت بے وقت جب دیکھو وہ شیلا کو پڑھاتا رہتا... شیلا ذہین تھی
اس کی تمام توجہ تعلیم کی طرف ہوگئی، اس نے بہت جلد سیکھ لیا لکھنا، پڑھنا... اور ساتھ ہی پڑھاتا بھی، راجہ شنکر اس کے کہنے پر اپنی کتاب کے دلچسپ حصے
اسے سناتا کر زیادہ کبھی کسی بات پر اڑ جاتی یا سننے کے لئے تیار نہ ہوتی... "ایک عورت نے مرد کے لئے جان دے دی" وہ تعجب سے پوچھا کرتی، راجہ شنکر کچھ نہ کہتا...

شیلا کی ماں چند دنوں تک تو بڑی سختی سے دونوں کی نگرانی کرتی رہی لیکن بعد میں وہ لاپرواہ ہوگئی.... دونوں کو پڑھنے پڑھانے کی کامل آزادی
حاصل تھی... محلہ والوں نے ناک بھوں چڑھائی... مگر پرواہ کرنے والا کون تھا... کسی تہوار کے موقع پر ایک ناٹک کھیلا جانے والا تھا، راجہ شنکر نے شیلا
کی مدد سے اپنا پورا پارٹ یاد کر لیا تھا، اور اسی کا کام سب سے زیادہ اچھا رہا... دوسرے دن شیلا نے ہیروئن کا پارٹ خود یاد کر لیا اور کل کے
کام کو دوبارہ دہرایا گیا..... راجہ شنکر ہیرو، شیلا ہیروئن..... شیلا نے اپنا پارٹ ختم کیا..... اس کی ہمت بڑھ گئی تھی اس نے سوچتے ہوئے کہا "اگر
ہم ایسے ہی ایک دوسرے کے ساتھ عمر بھر کے لئے رہیں تو" "کھیل سکتے ہیں اگر..." "میں چاہوں تو نا" شیلا نے ہنستے ہوئے کہا "ہاں"، راجہ شنکر
کی زبان سے نکلا... اس نے زمین پر اپنی انگلی سے کریدتے ہوئے کہا "میں تم کو چاہتا ہوں شیلا" شیلا خاموش ہوگئی.... اور چلی گئی..... راجہ شنکر بھی کچھ
تذبذب کچھ امید کی حالت میں گھر چلا آیا......

شیلا اب بننے سنورنے لگی.... اس کے شباب کے دریا میں پھر کسی کا چہرہ عکس افگن تھا، کوئی دیکھنے والا ہو تو آرائش کیوں نہ کی جائے
شیلا اور راجہ شنکر کے درمیان خطوط کا سلسلہ بندھ گیا..... محبت کے خطوط کا، شیلا کی ماں نے ان کی اس چوری کو پکڑ لیا وہ ایک بپھری ہوی شیرنی
کی طرح شیلا پر جھپٹی، شیلا کو ہر برے لفظ سے یاد کیا اور آخر میں گھر سے نکل جانے کی دھمکی دی، شیلا کے لئے راجہ شنکر کے ساتھ بھاگ جانے کا خیال فضول تھا
اس نے صاف طور پر کہہ دیا تھا "ہمارا اس طرح بھاگ جانا..... ہم دونوں کے لئے بہت خطرناک ہوگا" وہ اتنے بڑے مرحلے میں اپنی عزت اور آبرو کی
بازی لگانا نہیں چاہتا تھا۔ شیلا نے منہ پھوڑ کر اپنی نسوانی حیا اور خودداری کو بالائے طاق رکھ کر کہا "چلو بھاگ چلیں" مگر راجہ شنکر کا جواب مایوس کن تھا
اسے اب ناامیدی ہوگئی، راجہ شنکر آیا، شیلا اُسے دیکھتے ہی پھوٹ پھوٹ کر رونے لگی، روتے ہوئے سارے واقعات بیان کر دئے۔ راجہ شنکر نے
بہت دم دلاسا دیا "اس کو کوئی حق نہیں..... گھر تمھارا بھی ہے اور اس کا بھی.... اب کی دفعہ جو کچھ کہے تو تم اپنا حصہ مانگو..." راجہ شنکر کی بتائی ہوی
ترکیب کارگر تو ہوی لیکن سختی بڑھ گئی دونوں میں ایک دیوار حائل کر دی گئی..... نہ یہ اس سے ملے اور نہ وہ اس سے..... پھر بھی جس کو ملنے کی
دھن سمائی ہو وہ کب کس رکاوٹ کو خاطر میں لاتا ہے۔ وہ بچے جو شیلا کے پاس پڑھنے آتے تھے، راجہ شنکر نے ان میں سے ایک کو ہموار کر لیا اور اس
طرح خطوط کا سلسلہ برابر جاری رہا... بعض اوقات وہ مل بھی لیا کرتے..... دونوں بہت بری طرح ایک دوسرے کو چاہتے تھے..... انجام دل خوش کن
نہیں ہو سکتا تھا، راجہ شنکر نے امتحان دینے کے بعد اپنے گھر کی راہ لی..... اور وہاں اس کی شادی ہوگئی..... شیلا نے بھی اسے مشورہ دیا تھا کہ "تم
شادی کر لو" مگر جس وقت یہ خبر شیلا کے کانوں میں پہنچی، وہ سنبھل نہ سکی، آنسوؤں کا دریا اس کی آنکھوں سے بہہ نکلا، یہ دوسری بیوگی تھی
راجہ شنکر کو اس کے سامنے آتے ہوئے جھجک ہوتی تھی..... مگر اس نے اپنی بیوی کو اس کے مدرسہ میں داخل کیا..... سرسوتی شیلا سے زیادہ حسین
تھی..... مگر وہ بیوہ نہ تھی..... وہ گھنٹوں اس کی صورت دیکھتی اور آہیں کھینچا کرتی..... سرسوتی نے راجہ شنکر سے پوچھا "استانی جی ملول
غمگین کیوں رہتی ہیں"، "میں کیا جانوں"، راجہ نے اس انداز میں کہا کہ سرسوتی سمجھ گئی "یہ سب تو جانتے ہیں"، سرسوتی کھنچی کھنچی رہنے لگی

راجہ شنکر نے سمجھا کہ شیلا ہی نے کچھ کہا ہوگا وہ ایک دن اس کے پاس گیا، وہ اپنے بال سکھا رہی تھی..... وہ مسکرائی لیکن طنز اس کے لبوں پر کھیل رہا تھا..... "شیلا یہ تم نے کیا کیا" "میں نے کیا کیا راجہ" "کچھ بھی نہیں؟" "کچھ بھی نہیں" اس نے نہایت ہی سنجیدہ لہجہ میں کہا اور اٹھ کر جانے لگی، راجہ نے بڑھ کر اس کا دامن تھام لیا ..."سرسوتی کو میری طرف سے صاف کردو..." شیلا چونکی اس کے کانوں میں "سرسوتی کو میری طرف سے صاف کردو" گونج رہا تھا... "میں نے تو کچھ بھی نہیں کہا" اپنے اضطراری حالت میں جواب دیا لیکن وہ سوچتی رہی "میں کون ہوں ایک بیوہ.....اور سرسوتی سہاگن اس کے خاوند کو کیوں چھین لوں... مگر... راجہ نے مجھ سے محبت ہی کیوں کی، میں بدلہ لوں گی... ضرور لوں گی "وہ مکتب پر گر پڑی اس کی آنکھوں سے آنسو بہہ بہہ کر تکیہ میں جذب ہو رہے تھے

دوسرے دن سرسوتی آئی..... باتوں ہی باتوں میں راجہ شنکر کا ذکر آیا "وہ کس قدر آزاد ہوگیا ہے..... راتوں کو سوتا ہی نہیں ہمیشہ کچھ سوچا کرتا ہے" شبہہ کے لئے یہ جاننا مشکل نہ تھا..... وہ اکیلے خیال میں گم رہتا ہے..... "سرسوتی" اس نے اس کی طرف مترحم نظروں سے دیکھتے ہوئے کہا "ایک بات کہوں برا تو نہ مانوگی" نہیں شیلا نہیں ایسا خیال نہ کرنا میں تمھیں اپنی بہن سمجھتی ہوں... شیلا کو سرسوتی بہن سمجھتی ہے... راجہ راتوں کو سویا نہیں کرتا، سوچا کرتا ہے... اس کے دماغ میں چکر لگانے لگا، شیلا نے کچھ بھی نہ کہا... دو بڑے بڑے آنسو ڈھلک کر اس کے رخسار پر بہنے لگے... سرسوتی گھبرا گئی اس نے اس کے آنسو صاف کئے شیلا نے سسکیاں بھرتے ہوئے کہا "کچھ سن سرسوتی کچھ سن... تم اپنی ہستی کو سنبھال کر رکھو... میں نے اپنی ہستی کو کھو کر خود کو کھو دیا ہے ..." اپنے آپ کو سرسوتی کے گود میں ڈال دیا۔

چند دنوں کے بعد شیلا... یکایک غائب ہوگئی... سرسوتی نے اپنی خادمہ کی طرف دیکھا، اس خبر کو سن کر اس کی آنکھیں اشک آلود ہوگئی تھیں، اسی رات کو نواری لال کی ماں نے خواب میں دیکھا کہ نواری لال دولھا بنا بیٹھا ہے۔ اس کی شادی ہو رہی ہے۔

رشید قریشی (عثمانیہ)

کسان

برہنہ جسم، پسینے میں غرق، ننگے پاؤں
مگر سکون ہے یوں دل میں جیسے ٹھنڈی چھاؤں
گیہوں کے کھیت سے کٹیا میں اپنی آیا ہے
تصورات کی دنیا بھی ساتھ لایا ہے!
ہے اک پھٹی ہوی کمبل غریب کاندھوں پر
سیاہ ابر پہ رہ رہ کے اٹھ رہی ہے نظر
پڑا ہے کھیت کا سامان ایک کونے میں!
ہیں اس کی زیست کے اسرار پاکے کھونے میں
نفس ہے پھولی ہوی جیسے پھونک بھٹّے کی
رکھی ہے کان پہ بیڑی بنا کے پتّے کی
لہو کی لہر سی ہے موج زن پسینے میں!
بقائے دہر کا ہے راز اس کے جینے میں

ہر ایک سانس ہے اس کا بہار آزادی
کہ اس غلام کا دل ہے دیار آزادی

میکش

جنگ

نکلے دہانِ توپ سے بربادیوں کے راگ
باغِ جہاں میں پھیل گئی دوزخوں کی آگ

کیوں ٹمٹما رہی ہے یہ پھر شمعِ زندگی
پھر کیوں نگارِ حق پہ ہیں آثارِ بیوگی !

عفریتِ سیم و زر کے کلیجے میں کیوں ہے پھانس
کیوں رک رہی ہے سینے میں تہذیبِ نو کی سانس

امن و اماں کی نبض چھٹی جا رہی ہے کیوں
بالینِ زیست آج اجل گا رہی ہے کیوں

اب دلہنوں سے چھین لیا جائے گا سہاگ
اب اپنے آنسوؤں سے بجھائیں وہ دل کی آگ

بربط نوازِ بزمِ الوہی ادھر تو آ !!
دعوت دہِ پیامِ "عبودی" ادھر تو آ

انسانیت کے خون کی ارزانیاں تو دیکھ
اس آسمان والے کی بیدادیاں تو دیکھ

معصومۂ حیات کی بے چادری تو دیکھ
دستِ ہوس سے حسن کی غارت گری تو دیکھ

خود اپنی زندگی پہ پشیماں ہے زندگی
قربان گاہِ موت پہ رقصاں ہے زندگی

انساں رہ سکے کوئی ایسا جہاں بھی ہے؟
اس فتنہ زار زمیں کا کوئی پاسباں بھی ہے؟

او آفتابِ رحمتِ دوراں طلوع ہو !
او انجمِ حمیّتِ یزداں طلوع ہو !!

مخدوم محی الدین (ام، اے)

تم جھوٹ کہتے ہو!

مقدس دیوتا کی نورانی آنکھوں سے غصہ کی چنگاریاں نکل رہی ہیں، چہرہ دہکتے اور گرم آفتاب کی مانند آگ کے شعلے برسا رہا ہے۔

دیوتا نے اپنے ایک پجاری کو دنیا کی سیر کرنے کی اجازت دی تھی اور کہا تھا کہ تم وہاں اپنے قول و فعل سے میری نمائندگی کرو گے تم کو وہاں فرشتوں سے زیادہ نازک بدن اور حسین ہستیاں دکھائی دیں گی، ان کے دل لبھانے والے نازو انداز اور گداز جسموں میں گناہ کے سیلاب بہا کرتے ہیں، ان کاغذی پھولوں کو تم اپنی راحت کا ذریعہ نہ بنانا، اور وہاں اس کا بھی خیال رہے کہ اسی مقام کے ایک پُر سکون جنگل کو چند لڑکوں نے حصولِ علم کے لئے بسایا ہے، ان تمام نونہالوں سے ہنس بول کر ملنا، میری دعا اور محبت کا گلدستہ وہاں کے اس "رشکِ گلستاں" کو دے دینا جو میٹھی میٹھی باتیں اور رس بھری ادائیں فرشتوں کو بھی آمادۂ پرستش کرتی ہیں، وہ مجسم تقدس ہے اور اس کے تقدس میں ایک احساسِ درد، وہ اپنے ساتھیوں کے درد سے تڑپ اٹھتا ہے اپنی ہمدردی سے ان کو خوش کرتا ہے اور اس طرح خود خوش ہوتا ہے، اس کے معصوم دل کو دکھ پہنچاؤ گے تو میرا غضب تم پر نازل ہوگا

دیوتا نے پجاری سے یہ بھی کہا تھا کہ تم جس وقت میرا درشن کرتے ہو تو میری مدہوش کن نگاہ کا اثر تم میں ایک وجدانی کیفیت پیدا کر دیتا ہے، یہ کیفیت تم کو ہر قسم کی فکروں سے آزاد کر دیتی ہے لیکن دنیا والوں کے پیمانے شراب سے چھلکتے ہیں، وہ آگ کو پانی کر کے پی جاتے ہیں، پھر اس کے بعد ان میں وہ تقدس باقی نہیں رہتا جو انسانیت کا آئینہ دار ہو، تم نے اس خانہ خراب کو منہ لگایا تو دیکھنا اچھا نہ ہوگا۔

پجاری دنیا کی سیر کرتا ہوا انجام کار اس فردوسی بستی میں داخل ہوا، جس کی جانب دیوتا نے اشارہ کیا تھا، یہاں لہلہاتا ہوا سبزہ زار تھا، بلند اور سفید عمارتیں تھیں، معصوم لڑکے آبی رنگ کا لباس پہنے نغمہ سرائی کر رہے تھے، ان کے نقروی تبسم اور رنگین قہقہوں سے ماحول درخشاں تھا، ایسا معلوم ہوتا کہ جنت نگاہ اور فردوس گوش کے باعث یہ مقام الوہیت نواز دیوتا کا تفرج گاہ ہے۔

یہاں اس نے ایک لڑکے کے شیریں نغمے سنے، جس کے سوز و گداز نے اس کو تھوڑی دیر تک اپنے آپ سے بے خبر کر دیا، وہ گا رہا تھا۔

بستی بستا کھیل نہیں   بستے بستے بستی ہے

اس معصوم ہستی کے اندر پجاری کو اپنے دیوتا کی جھلک نظر آئی، اس نے نیاز مندانہ نگاہ سے اس معصومیت نواز لڑکے کی پرستش کی اور اس کے مضطرب دل نے دم بھر کے لئے ایک سکون حاصل کیا۔

پجاری کی ایک ایسے لڑکے سے بھی ملاقات ہوئی جو بہت اچھا شاعر تھا اس کا تخلص اتنا مغالطہ انگیز تھا کہ پجاری کو اپنے دیوتا کی نصیحت یاد آگئی پجاری کو وہ مجسم شراب معلوم ہو رہا تھا، اس کی آنکھوں میں شراب کا نشہ تھا، اس کے رخساروں پر شراب جیسا رنگ کھیل رہا تھا، اس کے ہونٹوں میں شراب کی لذت تھی، لیکن وہ مادی شراب سے بالکل ناآشنا تھا، پجاری یہاں بغیر پیئے مدہوش ہو گیا، دنیا میں اس نے کئی لطیف چیزیں دیکھیں مگر کبھی اس کو اتنا لطف نہ آیا اس پر ایک سرور اور نشہ کی کیفیت طاری تھی۔

پجاری نے آخر دیوتا کے منظورِ نظر رشکِ گلستاں کو پا لیا، حسنِ فطرت کا ذوق رکھنے والے اس جنگل کو رشکِ ارم اور اس لڑکے کو شہزادہ کہتے تھے، اس کے آس پاس دوسرے کئی لڑکے مصروفِ گلگشت تھے، ایک ہی پودے کے خوشنما پھولوں کی طرح ان میں یکسانیت نظر آتی تھی، پجاری نے لڑکے کے قدم چومے اور لڑکے نے پجاری کی عزت کی، کیونکہ وہ دیوتا کا خاص نمائندہ تھا، اس نے گلدستہ کا پلکوں سے بوسہ لیا، اس کی آنکھوں میں

خوشی کے تنو رقصاں تھے، لبوں پر پھولوں کو شرمانے والی مسکراہٹ تھی، مخمور اداؤں سے خرمنِ دل پر بجلیاں گر رہی تھیں، وہ دیوتا کے احسان سے پھولوں نہیں سما رہا تھا، اظہارِ تشکر کے لئے وہ بے چین تھا، اُس نے پجاری سے کہا "دیوتا یہاں نہیں آسکتے؟ وہ نہیں آسکتے تو مجھے اپنے پاس بلائیں میں ان کو میٹھے راگ سناؤں گا، میرے اچھے دیوتا کیسے نیک ہیں، وہ مجھے کتنا عزیز رکھتے ہیں، جب یہاں کے برے لوگ مجھے ستاتے ہیں، تو دیوتا ان سے روٹھ جاتے ہیں، میرے ستانے والوں کو دیوتا کی ناراضگی کا خیال سہما دیتا ہے، وہ مجھ سے طالبِ عفو ہوتے ہیں، میں بھی ان کو معاف کر دیتا ہوں، کہیں دیوتا کا غضب ان پر نازل نہ ہو جائے، میں کسی کو مبتلائے مصیبت نہیں دیکھ سکتا"۔

یہاں چند دن قیام کرکے پجاری دیوتا کے پاس واپس جا رہا تھا، وہ بہت تھکا ہوا تھا، ہلکی ہلکی پھوار پڑ رہی تھی، بادل کا رنگ تو بہ شکن تھا، پجاری نے دیکھا، شرابِ ارغوانی نے دنیا والوں میں ایک لطف انگیز بات پیدا کر دی ہے، سفید گلاس میں آتشیں پانی ——— اس کے خیالات متزلزل تھے، اس نے دیوتا کے حکم کی نافرمانی کی، رکتے رکتے پیمانہ منہ سے لگا ہی لیا، اس کے بعد اس پر ایک کیف چھا گیا، اسی کیف میں وہ دیوتا کی طرف لوٹا دیوتا نے اسے آتا دیکھ کر خوشی کا اظہار کیا، لیکن جب اسے معلوم ہوا کہ پجاری نے اس کے حکم کی نافرمانی کی ہے، تو اس کی ساری مسرت غصہ سے بدل گئی، اب پجاری کا ماتھا ٹھنکا وہ بہت پشیمان تھا کہ کیوں اس نے ایسی حرکت کی جس نے اس کے مقدس دیوتا کو ناراض کر دیا، دوسرے دن پجاری نے دیوتا کو اس لڑکے کا پیغام سنایا اور اس کا واسطہ دے کر معافی چاہی، دیوتا نے کہا "اچھا خوش ہو جا میں تجھے معاف کرتا ہوں"———

پجاری نے اس کے بعد مقدس دیوتا کو کبھی ناراض نہ کیا۔

ستیہ پجاری (عثمانیہ)

مغنیہ سے

نغمۂ دل نواز بن پردۂ ساز میں کبھی آ
جلوۂ حسن دلبری رنگ مجاز میں کبھی آ
بزم سرودِ عشق کو کب سے ہے تیرا انتظار
خلوتِ راز سے گزر محفلِ ناز میں کبھی آ

آ اے حسیں مغنیہ کب سے ہے تیرا انتظار

میری نگاہ کو بھی دے دعوتِ جلوۂ تمام
پردۂ بےخودی میں لے شرم و حیا سے انتقام
پھر مجھے شوق سے سنا، پریم کی دھن میں کوئی گیت
پھر مرے قلب و روح کو دے کوئی سرمدی پیام

آ اے حسیں مغنیہ کب سے ہے تیرا انتظار

میری متاعِ عشرت و صبر و سکوں لٹائے جا
شوخ نظر کا واسطہ برقِ نظر گرائے جا
سوزِ جگر کا ساز ہو رہنِ تبسمِ جمال
زخمِ جگر کو خندۂ ناز سے تو ہنسائے جا

آ اے حسیں مغنیہ کب سے ہے تیرا انتظار

سجدۂ عشق کے لئے سجدہ گرِ نیاز بن
آنکھ کا میری نور بن، دل کا مرے گداز بن
دیکھ حدیثِ دردِ دل، منظرِ عام پر نہ آئے
عالمِ حسن و عشق میں جوشِ جنوں کا راز بن

آ اے حسیں مغنیہ کب سے ہے تیرا انتظار

انسب کلیانوی

نیک نام خاں

اگرچہ گولکنڈہ کی صرف دو سو سال کی تاریخ ہے لیکن یہہ عجیب بات ہے کہ اس میں بہت سے مشاہیر ملتے ہیں جن کی زندگی میں تاریخ کی بہت سی حقیقتیں پوشیدہ ہیں، یہہ سچ ہے کہ اس سلطنت کو ایسے بیوفاؤں سے بھی سابقہ پڑا جنھوں نے اس کو ناقابل تلافی نقصان پہنچایا اور بالآخر اس کا خاتمہ کر دیا، لیکن ایسی شخصیتیں بھی ہیں جن کی غیر متزلزل وفاداری اس سلطنت کی ہمیشہ دستگیری کرتی رہی اور اس سلطنت کو مقدور بھر زندہ رکھا، اگرچہ بیوفاؤں کی بیدردی کی وجہہ سے بالآخر گولکنڈہ کی سلطنت ختم ہوگئی لیکن اس کے وفاداروں کے سبق آموز کارنامے اب تک زندہ ہیں۔ اس سلطنت کے وفادار ارباب سیاست کی ایک بڑی فہرست ہے۔ اس میں جہاں مصطفےٰ خاں اردستانی حضرت میر مومن استرآبادی حضرت حسین شاہ ولی اور عبدالرزاق لاری پائے جاتے ہیں وہاں نیک نام خاں کا نام نیک بھی ہے جو گولکنڈہ کے مشاہیر میں سے تھا یہہ بھی ایک بڑی شخصیت تھی جس کی وفاداری اور حمیت اب بھی بہت سوں کو یاد ہے۔

نیک نام خاں سے متعلق اب تک بہت کم معلومات تھے، دنیائے تاریخ اس کو صرف ایک سپہ سالار کی حیثیت سے جانتی تھی، یہہ مختصر معلومات بھی کچھ مغل تاریخوں سے اور کچھ انگریزی وثائق سے حاصل ہوتے تھے، کوئی مقامی تاریخ ایسی نہیں ہے جو نیک نام خاں کے تفصیلی حالات پر روشنی ڈالتی، مغل مورخوں کو اس سے کوئی خاص واسطہ نہ تھا، مغل مورخ اس سے کچھ اس طرح واقف ہوئے تھے کہ یہہ بیجاپور کی تائید میں جے سنگھ کے مقابلہ کے لئے گیا تھا، ان کو تفصیلی حالات لکھنے کی ضرورت نہ تھی نہ ان کے ہاں کوئی مواد تھا۔ انگریز کمپنی کے عہدہ داروں نے اس وجہہ سے اس کا ذکر کیا ہے کہ اس نے کئی سال کرناٹک کی سپہ سالاری اور گورنری کی تھی، اسی کے طفیل میں انگریزوں کو مدراس ملا، لیکن یہہ سب تحریریں اس قدر پراگندہ اور مختصر ہیں کہ ان سے نیک نام خاں کے حالات پر کافی روشنی نہیں پڑتی اور بعض مرتبہ تو غلط فہمی پیدا ہو جاتی ہے، بعض جگہ اس کو ابوالحسن قطب شاہ کا سپہ سالار بتایا گیا ہے حالانکہ یہہ عبداللہ قطب شاہ کا سپہ سالار و وزیر تھا اور ابوالحسن کی تخت نشینی سے پہلے اس کا انتقال ہو گیا تھا، لیکن ایک مقامی تاریخ سے جس کا نام حدائق السلاطین ہے اور جس سے اب تک استفادہ نہیں کیا گیا نیک نام خاں کے بہت سے حالات معلوم ہوتے ہیں، اس تاریخ کا مولف علی طیفور بسطامی ہے جس کے متعلق معلوم ہوتا ہے کہ یہہ مولف کئی مرتبہ گولکنڈہ آیا اور گیا اور چونکہ یہہ فاضل آدمی تھا اس لئے ابوالحسن قطب شاہ کے علم نواز دربار نے اس کی بہت آؤ بھگت کی تھی اور دربار کی مہمان نوازی سے فائدہ اٹھا کر اس نے گولکنڈہ میں اپنی تاریخ لکھی تھی جو ۱۰۹۲ھ میں گولکنڈہ کی فتح سے چھ سال پہلے ختم ہوی ہے، اور اتفاق یہہ ہے کہ علی بن طیفور اور اس کا بھائی ابراہیم جو خادم تخلص کرتا تھا نیک نام سے براہ راست وابستہ تھے، ابراہیم تو نیک نام خاں کا ملازم تھا اور ظاہر ہے کہ اس کی قربت کی وجہہ سے یہ نیک نام خاں سے اچھی طرح واقف تھے۔

تمام تاریخوں سے معلوم ہوتا ہے کہ نیک نام خاں کا اصل نام رضا قلی تھا، علی بن طیفور کے علاوہ جس کی تاریخ اس حقیقت کی صحیح رہنمائی کرتی ہے مغل مورخوں سے بھی اس کی تصدیق ہوتی ہے، محمد کاظم جو عالم گیر نامہ کا مولف ہے نیز خافی خاں اس کو رضا قلی لکھتے ہیں[1]۔ ایک مثنوی سے جو

---

[1] عالم گیر نامہ محمد کاظم ۱۰۰۶

گولکنڈہ کا غدار وزیر میر جملہ

گولکنڈہ کا وفادار وزیر نیک نام خاں
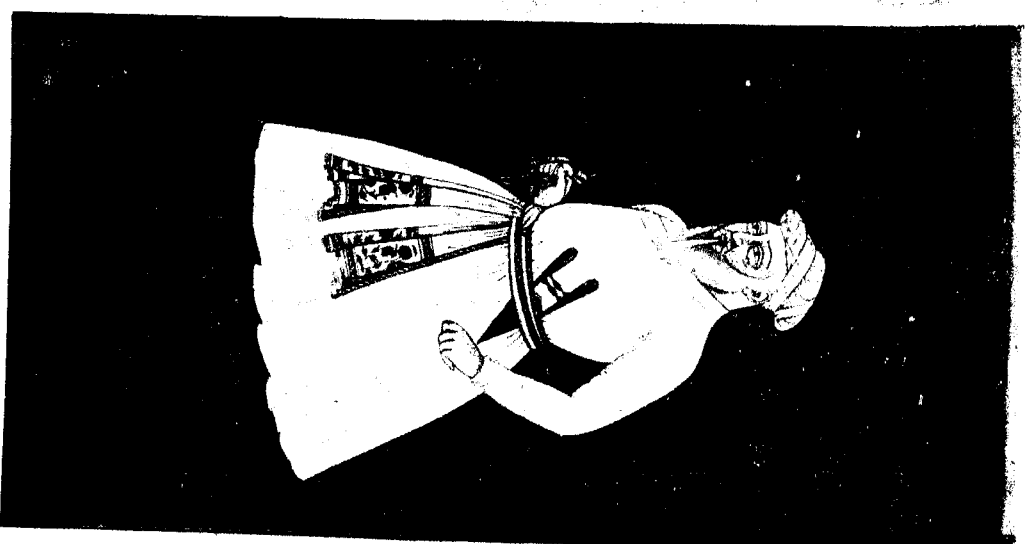
سب ہیں
ں کی تعریف میں لکھی گئی تھی اس کا نام رضا خاں ظاہر ہوتا ہے ؎ رضا خاں جم قدر خورشید رائے   ز سرتا بہ پا محض لطف خدائے
لیکن قیاس یہہ ہے کہ یہہ اس کا نام نہیں بلکہ خطاب تھا جو گولکنڈہ آنے کے بعد دربار قطب شاہی سے عطا ہوا تھا اس کے ابتدائی حالات صرف
ت معلوم ہوتے ہیں کہ یہہ ایرانی تھا اور صفوی دربار کا ملازم تھا' خافی خاں تو اس کو ایرانی امیر لکھتا ہے کہ "دراصل از امرائے ایران بودہ"[1]
ر ولیم اروِن سے بھی اس کی تصدیق ہوتی ہے' اس میں شبہہ کرنے کی کوئی وجہہ نہیں ہے لیکن یہہ صحیح ہے کہ یہہ شاہ ایران شاہ عباس
نی صفوی کا ملازم خاص تھا چونکہ یہہ خواجہ سرا تھا اس لئے شاہی محل کا خاص انتظام اس کے سپرد تھا' خافی خاں نے اس کے متعلق ایک
عجیب وغریب روایت نقل کی ہے جس سے معلوم ہوتا ہے کہ وہ پیدائشی خواجہ سرا نہیں تھا بلکہ خود ساختہ تھا[2] لیکن جو تصویریں اس کی دستیاب
ئی ہیں ان سے غالباً اس روایت کی توثیق نہیں ہوسکتی۔ سب مورخ اس کو نیک نام خاں خواجہ سرا اور رضا قلی خواجہ سرا لکھتے ہیں۔
فی خاں کی اسی روایت سے نیک نام خاں کے ترک وطن کی توجیہہ بھی کی جاتی ہے کہ وہ شاہ ایران کی خفگی کی وجہہ سے گولکنڈہ
اگ آیا تھا' چنانچہ خافی خاں کے الفاظ یہہ ہیں "از غضب شاہ ایران .... آخر کار رو بہ دکن آورد"[3] ممکن ہے کہ اس
ایت کا یہ حصہ صحیح ہو لیکن حقیقت یہہ معلوم ہوتی ہے کہ نیک نام خاں سلطنت گولکنڈہ کی عظمت سے متاثر ہو کر آیا تھا' یہہ سب
تے ہیں کہ قطب شاہی دربار کی مہماں نوازی لوگوں کو دور دور سے کھینچ لاتی تھی' نیز ایران اور گولکنڈہ کے پرانے تعلقات تھے جو عبداللہ قطب شاہ
عہد حکومت میں زیادہ گہرے ہوگئے تھے یہہ بات کچھ خلاف قیاس بھی نہ تھی اہل ایران گولکنڈہ کی قدر شناسی سے ناواقف نہ تھے۔ ایسا معلوم ہوتا ہے
شش کچھ یہاں بھی کام کر رہی تھی' سچ پوچھو تو گولکنڈہ کی سلطنت نیک نام خاں کے حقیقی خدمات کی صحیح ترجمان ہوسکتی تھی' یہی میدان تھا جہاں
پنی وفادارانہ فوجی وسیاسی قابلیت ظاہر کر سکتا تھا' یہاں اس کو نہ صرف اپنی صحیح خدمات ظاہر کرنے کا موقع ملا جس کی وجہہ سے اس کو
ت دوام ملی بلکہ خود سلطنت گولکنڈہ کو بھی اس سے سیاسی اور فوجی فائدے پہنچے جس کو تاریخ کبھی فراموش نہیں کر سکتی۔

نام خاں ٹک میں

یہہ بتانا مشکل ہے کہ نیک نام خاں ایران سے گولکنڈہ کب آیا تھا اور پھر یہہ سوال بھی حل طلب رہ جاتا ہے کہ وہ کرناٹک میں
کب متعین کیا گیا تھا' حدائق السلاطین سے معلوم ہوتا ہے کہ یہہ کرناٹک میں میر جملہ کے ساتھ بلکہ اس کے ماتحت مامور ہوا تھا[4]
ز یہہ ہیں کہ وہ غالباً میر جملہ کے ساتھ گولکنڈہ آیا اور ایک ہی زمانے میں کرناٹک میں متعین کیا گیا تھا اور غالباً ان دونوں میں دیرینہ روابط تھے' اگر یہہ
یں ہے تو اس قدر قطعی ہے کہ وہ کرناٹک میں میر جملہ کے ماتحت تھا اور اسی ماتحتی میں فوجوں کی رہنمائی کرتا تھا' ممکن ہے کہ کرناٹک کی عظیم الشان
تحات جن میں سدھوٹ اور گنڈی کوٹ شامل ہیں اور جو میر جملہ کی طرف منسوب کی جاتی ہیں نیک نام خاں کی کوششوں کا پھل ہوں لیکن ۱۰۶۵ھ میں
کی غداری سے نہ صرف کرناٹک بلکہ خود سلطنت گولکنڈہ کی سیاسی فضا بدل گئی جس کا سلطنت کو کوئی اندازہ نہ تھا' بات یہہ تھی کہ میر جملہ نے
میں وسیع فتوحات حاصل کر لی تھیں اور اس سے مغرور ہو کر وہ ایک خود مختار راج دھانی کی فکر کر رہا تھا اور جب گولکنڈہ نے مزاحمت کی تو وہ
بچاؤ کے لئے مغل سلطنت سے مل گیا اور اس کا نتیجہ یہہ ہوا کہ مغل سلطنت سے ایک لڑائی ٹھن گئی اور گولکنڈہ کو دب کر صلح کرنی پڑی' یہہ ایسا
ک واقعہ تھا کہ اس سے سلطنت کی تمام بساط الٹ گئی اور اس قدر نقصان پہنچا کہ اس کی پھر تلافی نہ ہوسکی۔ فرانسیسی سیاح برنیر کہتا ہے کہ
ے سلطنت کا تمام وقار غائب ہو گیا تھا اور یہ کوئی اچنبے کی بات نہیں ہے کہ اس کا نفسیاتی اثر دوسرے امراء و عمائد سلطنت کے جذبۂ وفاداری کو

---

[1] منتخب اللباب خافی خاں جلد دوم ۱۹۴ [2] منتخب اللباب خافی خاں جلد دوم ۱۹۵ [3] منتخب اللباب خافی خاں جلد دوم ۱۹۵ [4] حدائق السلاطین

منزلزل کرنے لگا کہا جاتا ہے کہ خود عبداللہ قطب شاہ نے شرم کے مارے شہر حیدرآباد چھوڑ کر گولکنڈہ میں گوشہ نشینی اختیار کرلی اور اگر برنیر کا بیان صحیح سمجھا جائے تو عبداللہ قطب شاہ نے دربار کی نشست بھی چھوڑ دی تھی[1]

نیک نام خاں کی وفاداری

اس تاریک فضا میں نیک نام خاں کی ہمت ایک بڑی نظر افروز حقیقت تھی، علی بن طیفور کہتا ہے کہ میر جملہ نے جاتے ہوئے نیک نام خاں کو بھی دعوت بغاوت دی اور ساتھ چلنے کے لئے کہا لیکن اس نے نہ صرف اس قبیح حرکت سے صاف انکار کر دیا بلکہ دل خراش واقعہ سے اس کے جذبۂ وفاداری پر ایسی ضرب لگی کہ اس نے گوشہ نشینی اختیار کرلی[2] جو اس کی وفاداری کا سچا ثبوت تھا۔ اس ہمت شکن ماحول میں نیک نام خاں کی غیر متزلزل وفاداری ایک بڑی سبق آموز حقیقت تھی۔ جہاں مغل سلطنت کی سحر انگیزیاں میر جملہ کو جادۂ وفاداری سے منحرف کر سکتی تھیں نیک نام خاں کو بھی منتشر کر سکتی تھیں لیکن اس نے اپنی وفاشعاری کو ہاتھ سے جانے نہ دیا۔

اگرچہ نیک نام خاں برسوں سے کرناٹک میں کام کر رہا تھا لیکن ایسا معلوم ہوتا ہے کہ گولکنڈہ کی حکومت اس کی شخصیت اور اس کے بلند کردار سے بہت دنوں تک واقف نہیں ہوئی، اس کی غالباً ایک وجہ یہہ تھی کہ میر جملہ کے ہوتے ہوئے اس کو ترقی کے مواقع نہیں تھے، یہہ جوہر اس قدر چھپا ہوا تھا کہ اس گھٹاٹوپ میں نیک نام کے اوصاف ظاہر نہیں ہو سکتے تھے حکومت اس کے صحیح اوصاف سے اس وقت واقف ہوئی جب کہ میر جملہ کی بے وفائی کا غلغلہ بلند ہوا اور نیک نام خاں نے میر جملہ کے ساتھ جانے سے انکار کر دیا عجب نہیں کہ سلطنت اس ہمت شکن ماحول میں اس کو ایک قابل قدر شخصیت سمجھنے لگی کیونکہ اس میں ایسے جوہر تھے جو سلطنت کی اندرونی اور بیرونی گتھیاں سلجھانے میں مدد دے سکتے تھے خود مفتوحہ کرناٹک کی سربراہی ایک مشکل مسئلہ بنا ہوا تھا، یہہ ابھی ابھی فتح ہوا تھا اور اس لئے اس نئے ملک کو قابو میں رکھنا آسان کام نہ تھا اس کے علاوہ فتوحات کا سلسلہ ابھی جاری تھا، اگرچہ کرناٹک کی تسخیر ابراہیم قطب شاہ کے عہد سے جب کہ جنگ تالی کوٹ ہوئی تھی جاری تھی عبداللہ قطب شاہ کے عہد میں اکثر فتوحات ہو چکی تھیں کیونکہ بیجاپور کی طرف سے اندولہ خاں اور شاہ جی یہہ کام کر رہے تھے تو گولکنڈہ کی طرف سے میر جملہ اور نیک نام خاں یہہ کام انجام دیتے رہے اور مشرقی کرناٹک کا ایک بڑا حصہ جس کو حیدرآبادی کرناٹک کہنے لگے تھے حاصل کر لیا۔ لیکن یہہ کام ابھی باقی تھا، خاندان وجیانگر کے پرانے اجزا رائل، نائک اور ودیار کی شکل میں موجود تھے اور موقع دیکھتے تھے اور جب موقع ملتا گولکنڈے کے دشمنوں سے کام لیتے تھے، چنانچہ تنجور کے راجہ سری رنگ رائل نے گولکنڈہ کے خلاف شاہجہاں سے امداد کی درخواست کی تھی اس کے علاوہ گولکنڈہ کو انگریزوں اور ولندیزیوں سے علحدہ مقابلہ کرنا تھا کیونکہ یہہ فرنگی تاجر ۱۶۱۱ء سے ساحل کارومنڈل پر قدم جما رہے تھے۔ اور مدراس کے انگریزی وثائق سے معلوم ہوتا ہے کہ میر جملہ کے انحراف کی وجہہ سے جب کہ وہ کرناٹک چھوڑ کر مغلوں کے پاس چلا گیا قدیم راجہ وجیانگر نے کرناٹک پر حملے شروع کر دئے تھے۔ چنانچہ گرین ہل جو انگریزی کمپنی کا صدر تھا کہتا ہے کہ میر جملہ کے جانے کے بعد راجہ وجیانگر کی فوجیں پلی کٹ اور پنا بلی پر آگئیں[3] ممکن ہے کہ اس میں خود میر جملہ کا ہاتھ ہو کیونکہ وہ یہاں اپنی ایک خود مختار راج دھانی بنانا چاہتا تھا، جب اس کو ناکامی ہوئی تو یہاں سے جاتے ہوئے کرناٹک کی رعایا میں گولکنڈہ کی طرف سے زہر پھیلا دیا، ان فوجوں کی فوری مزاحمت بھی ضروری تھی، ظاہر ہے کہ اس عظیم الشان کام کی سربراہی کے لئے ایسے آدمی کی ضرورت تھی جو نہ صرف کرناٹک سے واقف ہو اور یہاں کی ہندو طاقت سے آشنا ہو نیز فرنگی اقوام کا پورا جواب دے سکے ایسے موقع کے لئے نیک نام خاں سے بہتر آدمی نہیں ہو سکتا تھا، اس نے یہاں برسوں کام کیا تھا یہاں کے جغرافیہ اور سیاسی طاقتوں سے اچھی طرح واقف تھا۔

---

[1] سفرنامہ برنیر ۱۹۵ [2] حدائق السلاطین ورق ۲۰۲ [3] مدراس قدیم کے اوراق پارینہ جلد اول ۱۶۶

اس بات کی وضاحت مشکل ہے کہ نیک نام خاں کو کرناٹک کا کب گورنر بنایا گیا، مدراس کے قدیم وثایق سے معلوم ہوتا ہے کہ یہہ ۱۶۶۳ء میں کرناٹک کا گورنر ہوا تھا، لیکن یہہ بیان بحث طلب معلوم ہوتا ہے کیونکہ میرجملہ نے ۱۶۵۶ء سے کچھ پہلے گولکنڈہ سے انحراف کیا اور کرناٹک چھوڑا تھا اور ظاہر ہے کہ اس کے جاتے ہی حیدرآبادی کرناٹک کی سرلشکری اور گورنری کا مسئلہ درپیش تھا اور یہہ مسئلہ اس وجہہ سے بھی زیادہ پیچیدہ تھا کہ کرناٹک کی پرانی ہندو طاقتیں سر اٹھانے لگیں اور مغلوں سے مدد مانگنے لگی تھیں اور اس کا باعث خود میرجملہ معلوم ہوتا ہے نیز سدسوٹ اور گندی کوٹ کو میرجملہ اپنی جاگیر سمجھتا تھا حالانکہ یہہ حکومت گولکنڈہ کی طرف سے فتح ہوی تھی اور جب تک حکومت ان مفتوحہ علاقوں کو عطا نہیں کرتی یہہ جاگیر نہیں ہوسکتی تھی لیکن میرجملہ کے اس جھوٹے دعوے کی وجہہ سے مغل حکومت ان علاقوں پر اپنی نظر رکھتی تھی تاکہ گولکنڈہ کا اقتدار زیادہ پھیلنے نہ پائے، ان حالات کے مدنظر عبداللہ قطب شاہ کو ان علاقوں پر فوری قبضہ کرنا چاہئے تھا، چنانچہ حدائق السلاطین سے معلوم ہوتا ہے کہ عبداللہ نے میرجملہ کے جاتے ہی حیدرآبادی کرناٹک کو اپنے قبضہ میں لے لیا گو بعض روایات سے یہہ معلوم ہوتا ہے کہ دو سال کے بعد یہہ قبضہ اس وقت ہوا تھا جب کہ اورنگ زیب جنگ برادرانہ میں مصروف ہوگیا۔ قرائن یہ ہیں کہ ۱۶۵۶ء ہی میں نیک نام خاں کو یہاں کا گورنر بنایا گیا ہوگا تاکہ ان علاقوں کی فوری ضبط و تنظیم ہوسکے اور یہہ کام صرف نیک نام خاں ہی کرسکتا تھا کیونکہ یہہ نہ صرف ان علاقوں سے واقف تھا بلکہ اپنے خلوص و وفاداری کا سچا ثبوت دے چکا تھا، ایسا معلوم ہوتا ہے کہ میرجملہ کے جاتے ہی عبداللہ قطب شاہ نے اس کو فوراً کرناٹک سے گولکنڈہ طلب کیا تھا اور حدائق السلاطین کے الفاظ نقل کئے جائیں، "تو بہ نوازشات شاہانہ و عنایات بادشاہانہ مفتخر و منتظم گردانید، پایہ قدر و منزلت اور ا بدرجہ اعلا و ذروہ اعتلا برافراشتہ و از سائر وزرائے عظام اختیار تمام بخشید" اسی موقع پر اس کو رضا خاں کا خطاب دیا گیا، نیز پورے اعتماد کے ساتھ کرناٹک کی سرلشکری اور گورنری اس کے سپرد کردی یعنے حدائق السلاطین کے الفاظ ہیں "سپہ سالاری کل آں مملکت[1] مفوض داشتند" لیکن اس کے ساتھ یہہ بات غور طلب ہے کہ ان علاقوں میں نیک نام خاں کو مطلق اختیار دیے گئے جو کسی سپہ سالار یا صوبہ دار کو نہیں دئے جاتے "زمام اختیار مہمات عزل و نصب ارباب مناصب و کفالت بہ کف اقتدار او گذاشتہ و بہ خطاب خاں مقرر ساختہ بہ احترام و اکرام خزانہ و سپاہ و احتشام روانہ آں صوب ساختند" ان الفاظ سے معلوم ہوتا ہے کہ حکومت نیک نام خاں پر پورا اعتماد رکھتی تھی اور واقعات بتاتے ہیں کہ اس نے پوری وفاداری کے ساتھ یہہ اعتماد پورا بھی کیا حکومت کے علاوہ عام لوگ بھی نیک نام خاں کی ترقی کو مسرت کی نگاہ سے دیکھتے تھے، ابراہیم نے جو خادم تخلص کرتا تھا اس مسرت خیز واقعہ کی تاریخ ذیل کے مصرع سے نکالی تھی[2] :-

ہمہ جا فتح میسر بادا

کرناٹک میں مامور ہونے کے بعد نیک نام خاں کو بہت کام کرنا تھا ایک طرف ہندو طاقتوں کا مقابلہ کرنا تھا جو میرجملہ کی بغاوت کی وجہہ سے سر اٹھا رہی تھیں دوسری طرف فرنگی قوموں کی جو کارومنڈل پر قابض ہوگئی تھیں گتھیاں سلجھانا تھا جس زمانے سے یہہ کرناٹک پر مامور ہوا ہے ہندو طاقتوں کا مقابلہ شروع کردیا۔ شری دیلور کو جو مدراس کے جنوب میں واقع ہے اپنا مستقر بنالیا تھا اور وہاں سے ان مقامات پر حملے شروع کردئے جہاں کرناٹک کے پچھلے راجگان اپنی فوجوں کی نقل و حرکت کررہے تھے، چنانچہ مدراس کی تحریروں سے معلوم ہوتا ہے کہ ۱۶۵۹ء میں قطب شاہی فوجیں مدراس کے قریب پہنچ گئیں دوسری مشکل یہہ تھی کہ اس زمانے میں ولندیزی پرتگالیوں کے پرانے مقبوضات پر حملہ آور ہورہے تھے، چنانچہ سنٹ طامس پر جو مدراس سے

---

[1] حدائق السلاطین ورق ۲۰۲ [2] حدائق السلاطین ورق ۲۰۳ [3] مدراس قدیم کے اوراق پارینہ ۱۹۷ - ۱۹۹

ےمیل کے فاصلے پر واقع ہے ولندیزی پیش قدمی کررہے تھے، جو سلطنت گولکنڈہ کے مفاد کے منافی تھا اور سلطنت یہاں اپنا قبضہ کرنا چاہتی تھی اس لئے ۱۶۶۲ء میں نیک نام خاں نے سنٹ طامس کا محاصرہ کرلیا تاکہ یہہ جگہ کسی اور قوم کے ہاتھ میں نہ جائے، چند ہی روز میں اس پر قبضہ ہوگیا[۱] اور یہاں کی آبادی سب مدراس میں منتقل ہوگئی، اس وار سے غالباً یہہ فائدہ ہوا کہ ولندیزی آگے نہیں بڑھ سکے اور پرتگالیوں کے پرانے مقبوضات پر گولکنڈہ کا قبضہ ہوگیا نیز ہندو طاقتوں کی سرکوبی ہوگئی، اس طریقہ سے میر جملہ کی غداری کی وجہہ سے جو سیاسی نظام بگڑ گیا تھا اس کا سدباب ہوگیا، کیونکہ نیک نام نے کوئی چالیس ہزار فوج کے ساتھ پیش قدمی کی تھی، ایڈورڈ ونٹر جو اس زمانے میں انگریز کمپنی کا صدر تھا وہ ایک خط مورخہ ۱۰ دسمبر ۱۶۶۳ء میں لکھتا ہے کہ نیک نام خاں چالیس ہزار فوج کے ساتھ مدراس کے قریب پڑا ہوا ہے، لیکن ان ضروری چیزوں کے ساتھ اس نے مزید فتوحات بھی حاصل کرلیں لیکن اگر حدائق السلاطین کے الفاظ پر اعتماد کیا جائے تو "تمام آں مملکت تسخیر نمودہ" یعنے کرناٹک کے زیر اقطاع جو ابھی فتح نہیں ہوے تھے مسخر کئے گئے، گوٹی گرم کنڈہ اور کڑپہ اس نے فتح کئے تھے اور یہہ سدھوٹ اور گنڈی کوٹ کے ساتھ شامل ہوکر جو میر جملہ کے زمانے میں فتح ہوے تھے ایک مستقل علاقہ ہوگئی تھی اس کو نیک نام خاں کا بڑا کارنامہ سمجھنا چاہئیے۔ اس نے نہ صرف اپنی فوج کشیوں سے کرناٹک کے نظام کو درست کیا بلکہ بڑی فتوحات حاصل کرلیں۔

نیک نام خاں کی اس پیش قدمی سے انگریز کمپنی بھی متاثر ہوے بغیر نہیں رہ سکتی تھی۔ ایک تو اس وجہہ سے کہ یہہ چالیس ہزار کی فوج کے ساتھ سنٹ طامس پر قابض ہوگیا تھا جو مدراس کے قلعہ سنٹ جارج سے بہت قریب تھا اور دوسرے واقعات سے معلوم ہوتا ہے کہ نیک نام خاں انگریز کمپنی کا موافق نہیں تھا۔ یہہ ۱۶۴۷ء کے سمجھوتہ کا جس کو قول کہتے ہیں اور جو میر جملہ نے انگریز کمپنی عطا کیا تھا مخالف تھا، یہہ چاہتا تھا کہ اس قول کو منسوخ کرکے جدید قول کی تکمیل کرے اور انگریزوں سے زیادہ رقم وصول کرے، کیونکہ ۱۶۴۷ء کے قول کے مطابق یہہ طے ہوا تھا کہ انگریز کمپنی کروڑ گری کی آدھی رقم حکومت گولکنڈہ کو دیا کرے، اگر قول کے مطابق اس کی پابجائی ہوتی تو کوئی مضائقہ نہ تھا لیکن گرین ہل نے ۱۶۵۸ء میں یہہ شکل اختیار کی تھی کہ بجائے آدھی کروڑ گری ادا کرنے کے صرف ۳۸۰ ہون سالانہ ادا کرتا تھا اور اس کو "شہر کا کرایہ" کہا جاتا تھا یعنے مدراس کی سکونت کے معاوضہ میں کمپنی کی طرف سے یہہ رقم ادا کی جاتی تھی۔ لیکن انگریز کمپنی کے بیان کے مطابق جب نیک نام خاں ۱۶۶۳ء میں کرناٹک کا گورنر ہوکر آیا تو اس نے یہہ رقم لینے سے انکار کردیا، اس نے نہ صرف کروڑ گری کی تمام رقم طلب کی بلکہ یہہ کہا کہ میں مدراس میں ایک حوالدار رکھونگا جو سختی کے ساتھ تمام رسائد کی تعمیل کیا کرے گا انگریز کمپنی اس سے بہت خائف ہوگئی کیونکہ خود ایڈورڈ ونٹر کے خط سے معلوم ہوتا ہے کہ نیک نام خاں کوئی چالیس ہزار فوج کے ساتھ سنٹ طامس پر قابض تھا ونٹر نے گفت و شنید کی لیکن نیک نام خاں نے اس کو نہیں مانا، ممکن تھا کہ لڑائی کی صورت پیدا ہوتی لیکن بدقسمتی سے کرناٹک کے نائکوں نے پھر شورش کردی اور اس کا نتیجہ یہہ ہوا کہ سنٹ طامس کی تمام فوجیں اس شورش کے سدباب کے لئے متوجہ ہوگئیں اور کمپنی کو چند روز کے لئے دم لینے کا موقع مل گیا، اور ایسا معلوم ہوتا ہے کہ ۱۶۷۰ء تک نیک نام خاں کو پھر اس طرف توجہہ کرنے کا موقع نہیں ملا تھا۔ ۱۶۷۰ء میں ونٹر کی جگہ فاکس کرافٹ کمپنی کا صدر ہوا تھا، نیک نام خاں نے اس شخص سے اپنے مطالبات مانگے، جب مطالبات پورے نہیں ہوئے تو نیک نام خاں نے جارحانہ کاروائی اختیار کی مدراس کے راستے بند کردئے اور ٹریلی کین پر قبضہ کرلیا، اس سے اہل مدراس اور کمپنی کو بہت تکلیف ہوی اس سے مجبور ہوکر کمپنی نے ۱۶۷۱ء میں نیک نام خاں کے مطالبات منظور کرلئے تھے کمپنی اس بات کے لئے تیار ہوگئی کہ سالانہ ایک ہزار دو سو ہون کرایہ ادا کرے گی اور پچھلے بقایا میں گیارہ ہزار ہون ادا کئے، نیک نام خاں کا دیا ہوا یہہ قول انگریز کمپنی کے اسناد میں موجود ہے۔

---

[۱] مدراس قدیم کے اوراق پارینہ ۱۹۷۔ ۱۹۹

(باقی آئندہ)

عبدالمجید صدیقی

عید تو یہ ہے

قاسم جب گھر پہنچا تو بارش کا زور ٹوٹ چکا تھا۔ مگر ہلکی ہلکی پھوار جب بھی پڑ رہی تھی۔ اس نے برآمدے میں اپنے جوتوں کی مٹی جھاڑی اور ٹاٹ کا پردہ اٹھا کر اندر داخل ہوا۔ اپنی پرانی سائیکل کو بھی اپنے ساتھ کھینچا۔ "بہت پرانی ہوگئی ہے ایک نئی خریدوں گا" اس نے دل ہی دل میں کہا۔ اس نے اپنے ڈاک کے تھیلے میں جھانک کر دیکھا ایک بھی خط باقی نہ تھا۔ "آج کا دن اچھا گزر گیا" اس نے برساتی جھاڑتے ہوئے سوچا۔ دالان میں علی بیٹھا ہوا تھا۔ آج وہ پہلے سے بھی زیادہ سنجیدہ معلوم ہو رہا تھا۔ وہ اپنی فکروں میں ایسا غرق تھا کہ اسے اپنے باپ کے آنے کی خبر بھی نہیں ہوئی۔ قاسم کو علی کی صورت دیکھتے ہی خیال آیا کہ "سردی تو شروع ہوگئی ہے مگر بے چارے کے پاس کوئی گرم کپڑا نہیں ہے۔ اور باورچی خانے کی چھت بھی ٹپکتی ہے۔ اسی کی مرمت کروانی ہے۔"

"آج کتنی سردی ہے۔ بارش تو آج سارے دن ہوتی رہی مگر شکر ہے کہ میں نے سارے خط بانٹ دئے" قاسم نے ہنس کر کہا مگر علی نے کچھ جواب نہ دیا۔ قاسم نے کپڑے بدلنے شروع کئے۔ اپنی وردی اتار کر کھونٹی سے لٹکائی۔ اور ایک پرانا کوٹ جو کہ ایک بیگم صاحبہ نے اسے دیا تھا پہن کر باورچی خانے کا رخ کیا۔

علی کی خاموشی اس کو بری لگ رہی تھی۔ وہ سارے دن کے حالات کسی کو سنانا چاہتا تھا۔ اور یہاں سوائے علی کے اور کوئی نہ تھا "حامد کی بیوی بہت بیمار ہے" اس نے ہمت کر کے پھر کہنا شروع کیا "اس کے چھوٹے چھوٹے بچوں کا برا حال ہے۔ بچاروں کی کوئی دیکھ بھال کرنے والا نہیں۔ ڈاکٹر صاحب کہتے ہیں کہ اس بیماری میں وہ بہت کمزور ہوگئی ہے لیکن اس کی بیماری کا میں نے تم کو تھوڑا سا حال تو رات کو بھی سنایا تھا۔"

علی نے انگڑائی لے کر اپنے باپ کی طرف غور سے دیکھا۔

"آج صبح جب میں اس کو ڈاک دینے گیا۔ ...."

"صبح" علی نے آہستہ سے کہا۔

"صبح" قاسم نے تیوری پر بل ڈال کر اپنی غلطی کو ٹھیک کیا۔ "تو حامد نے کہا وہ تو اچھی ہیں مگر بچوں کو دیکھ بھال کرنے کے قابل نہیں" میں نے پوچھا کہ میں بھی کچھ مدد کر سکتا ہوں تو کہنے لگا، کہیں سے ایک کمبل مل جائے تو بہتر ہے سردی سے تو بچ جائیں گی۔ میں نے وعدہ کیا ہے کہ کوٹھی والی بیگم صاحبہ جنہوں نے مجھ کو کوٹ دیا تھا ان سے کمبل بھی مانگ لاؤں گا۔"

قاسم نے چولہا سلگایا۔ علی تو پڑھا لکھا عقلمند آدمی تھا۔ وہ اس قسم کے ذلیل کام کیسے کر سکتا تھا۔ "شاما کی چھوٹی بچی شانتا بہت اچھی ہے وہ روز میرا انتظار کرتی رہتی ہے۔ آج شاما نے اس کو نئی گڑیا لا کر دی تھی۔ اس نے مجھے بھی بتائی۔ بہت خوش تھی میں نے بھی تعریف کر دی۔ بڑی اچھی ...."

"یا اللہ" کہہ کر علی نے اپنی کتاب فرش پر پھینکی۔

"آج تم بہت گھبرائے ہوئے ہو!" قاسم حیرت سے اپنے بیٹے کا منہ تکنے لگا۔

"ہاں" علی نے سرد آہ بھر کر کہا۔ "اصل یہ ہے کہ حامد کی بیمار بیوی، شاما کی خوبصورت بچی، راستے کی خرابی اور بارش کی زیادتی کی

کہانیاں سنتے سنتے میں بیزار ہو گیا ہوں ۔"

"دل کی گھبراہٹ کی دوا حکیم قریشی کے پاس بہت اچھی ملتی ہے ۔ بہتر ہے کہ تم ان کو نبض دکھاؤ ۔ غفلت کرنا اچھا نہیں ۔"

"وہ حکیم قریشی کون " علی نے منہ بنا کر کہا ۔

" یہی جو ہمارے گھر کے پیچھے رہتے ہیں ۔" قاسم نے دالان کی دیوار کی طرف اشارہ کر کے کہا ۔

"وہ حکیم تو بالکل گدھے ہوتے ہیں ۔ کوئی عقلمند پڑھا لکھا آدمی ان سے علاج نہیں کرواتا ۔"

قاسم کو علی کا یہ ترش جواب ذرا برا لگا ۔ وہ علی کی ماں کے متعلق سوچنے لگا ۔ کہ اس کو حکیم قریشی پر بڑا اعتقاد تھا ۔ اگر وہ حکیموں اور خصوصاً حکیم قریشی کے متعلق اپنے بیٹے کی یہ رائے سنتی تو بچاری کا کیا حال ہوتا ؟ انھوں نے اس کو اپنی بیٹی بنا لیا تھا ۔ اور قاسم بھی ان کے سوا کسی اور سے علاج نہیں کرواتا تھا ۔ اچھا ہوا کہ وہ علی کے بچپن ہی میں مر گئی ۔ ورنہ اس کا تعلیم یافتہ بیٹا اپنی باتوں سے اسے دکھ ہی پہنچاتا ۔

قاسم تھوڑی دیر میں سب کچھ بھول گیا ۔ اور پھر کہنا شروع کیا "تمھاری نوکری کے متعلق میں نے اپنے دوستوں سے ذکر کیا تھا ۔ وہ کہتے ہیں کہ تمھیں ڈاکیے کی نوکری آسانی سے مل سکتی ہے ۔ ایک جگہ خالی ہے اگر میں کہوں تو افسر ضرور مان لے گا ۔" یہ کہہ کر قاسم سوچ میں پڑ گیا کہ "علی کو نوکری تو مل جائے گی مگر سائیکل خریدنے کے لئے روپیہ کہاں سے لاؤں گا ۔ بچہ پیدل تو نہیں پھر سکتا آخر تعلیم یافتہ ہے اس کا بھی خیال رکھنا چاہیے ۔"

علی دالان میں ٹہلنے لگا "تو آپ چاہتے ہیں کہ میں بھی ڈاکیہ بن جاؤں ؟"

علی کے اس سوال سے قاسم کے دل پر چوٹ لگی ۔ ڈاکیے کے پیشے کو، جس پر اس کو اتنا فخر تھا، علی کا حقارت کی نظر سے دیکھنا اس کو اچھا نہ لگا ۔

"ایسا ذلیل کام میں ہرگز نہ کروں گا ۔ لوگوں کو خط دیتے پھرنا، ان کی الٹی سیدھی باتیں سننا مجھ کو ذرا اچھا نہیں لگتا ۔" علی نے زمین پر پاؤں مار کر کہا ۔

میں جن لوگوں کو خط لیجا کر دیتا ہوں وہ سب شریف اور ہمدرد ہوتے ہیں ۔ ذرا ان بیگم صاحبہ کو دیکھو کتنی خدا ترس ہیں ۔ ڈاکیوں میں اکثر تم سے بھی زیادہ پڑھے لکھے ہیں ۔

"تو اس سے پیشے کی ذلت کم تھوڑی ہو جاتی ہے ۔" علی نے منہ بنا کر کہا ۔

مگر پھر بھی ...... "مگر وہ اپنے مغرور بیٹے کو کس طرح سمجھاتا کہ لوگ اس کی کتنی عزت کرتے ہیں ۔ اس کا "خط لے جاؤ" کہنے سے لوگ کس طرح بھاگے بھاگے اس کے پاس آتے ہیں ۔ وہ اس کو اپنے غم اور خوشی کا پیام بر سمجھتے ہیں ۔ وہ خط جو اوپر سے اتنے معمولی معلوم ہوتے ہیں ۔ ان کو ان کے مالک کس طرح کانپتی ہوئی انگلیوں سے کھولتے ہیں ۔ ان کو پڑھنے سے کس طرح ان کے چہرے خوشی سے سرخ یا غم سے پیلے پڑ جاتے ہیں ۔

"میں کوئی اچھی نوکری کروں گا ۔ آپ کو صرف اٹھارہ روپیے ملتے ہیں جن سے ہمارے اخراجات بھی پورے نہیں ہوتے ۔ اور اس پر سارے دن شہر کے کوچوں میں مارا مارا پھرنا پڑتا ہے ۔ مگر اتنا جانتے ہوئے بھی آپ کہتے ہیں کہ میں بھی ڈاکیہ بن جاؤں"

لاحول ولا قوۃ !!"

بیٹے کے اس جواب سے قاسم کا منہ کھلا کا کھلا ہی رہ گیا۔ اس پریشانی میں اسے سالن جلنے کی بو آئی۔ وہ کچھ جواب دئے بغیر چولھے کی طرف لپکا۔ اس کو کھانا پکا کر کھانا تھا۔ بھوک اور تھکان کے مارے اس کی بری حالت تھی۔ بھوکا رہے تو نوکری کون کرے۔ علی کی طرح اسے کوئی دوسرا سہارا نہ تھا۔ وہ جانتا تھا کہ باتیں بنانا اور ہے اور پیٹ پالنا اور۔

"یہ بھی کوئی کام ہے" علی نے پھر کہنا شروع کیا۔ "دربدر ردی نوٹ بیچیں اور اشتہار بانٹتے پھرو۔ بھلا یہ بھی کسی شریف آدمی کے کرنے کا کام ہے!!"

"علی!" اس نے حیرت سے بیٹے کو دیکھتے ہوئے کہا۔ "میں لوگوں کو ضروری خط اور اخبار رسالے جاکر دیتا ہوں جن سے ان کو دنیا کی خبریں معلوم ہوتی ہیں۔ اگر میں نہ ہوں تو لوگوں کو یہ سب کس طرح معلوم ہوں۔"

"یہ تو کوئی معمولی آدمی بھی کرسکتا ہے۔" علی نے بھرائی ہوئی آواز میں کہا۔ "آپ نے نہ روپیہ جمع کیا۔ نہ جائداد بنائی نہ زندگی کا لطف اٹھایا۔ نہ آپ کو یہ معلوم کہ دنیا میں کیا ہو رہا ہے۔ سوائے ڈاکیوں کے آپ نے اور کسی سے دوستی بھی نہیں کی۔ سوائے پیٹ بھرنے کے آپ کو کسی بات کی فکر نہ رہی۔ میرے مقاصد اور خیالات آپ سے زیادہ بلند ہیں۔ میں یہ نہیں چاہتا کہ میرے بچے میرا ذکر کرتے ہوئے شرمائیں۔ اور میرے متعلق جھوٹ بولتے پھریں!"

قبل اس کے کہ قاسم کچھ کہے وہ پردہ اٹھا کر جا چکا تھا۔ پردے کے پھٹے ہوئے حصے میں سے اس کا کالا کوٹ دور سڑک پر نظر آرہا تھا۔ قاسم سوچنے لگا "علی کہتا تو ٹھیک ہے کہ سوائے ڈاکیوں کے کسی اور سے میرا میل جول نہیں مگر ڈاکیوں کی تو برادری ہی الگ ہے لیکن ان کو تو اس بات پر فخر ہے کہ وہ دوسرے آدمیوں جیسے نہیں۔ میں نے زندگی کا کافی لطف اٹھایا ہے۔ میں دوستوں کی دعوتیں کرتا ہوں۔ اور دوسرے بھی مجھے دعوتیں دیتے ہیں۔ اور لوگ میری عزت بھی کرتے ہیں۔ اس کے علاوہ میں نے کبھی کسی فقیر کو اپنے گھر سے خالی ہاتھ نہ جانے دیا۔ علی کی ماں کو بھی خوش رکھا۔ جو کچھ کہ ایک شریف آدمی کو کرنا چاہئے میں نے سب کچھ کیا۔ پھر معلوم نہیں علی کو میرے نام سے کیوں شرم آتی ہے؟" اس نے دیگچی میں تھوڑا سا پانی ڈالا اور سوچنے لگا کہ اگلے مہینے اس کو نئی سائیکل خریدنی ہے اور باورچی خانے کی چھت کی مرمت کروانی ہے۔ علی کی ماں نے اس کو کتنا آرام پہنچایا تھا۔ جب سے وہ مری ہے وہ کھانے کا مزا ہی بھول گیا۔ علی کی ماں اسے خاص اہتمام سے دفتر جانے سے پہلے توشہ باندھ کر دیا کرتی تھی۔ وہ اپنی بیوی سے بہت خوش تھا۔ مگر اب اس بات سے خوش تھا کہ جلد مرگئی ورنہ اسے بھی علی کی باتیں سہنی پڑتیں۔ اسی کے دوستوں نے علی کی ماں کے مرنے پر قاسم سے کتنی ہمدردی کی تھی۔ اس نے سوچا کہ جب حامد سے اس نے کہا کہ "اب میری زندگی بالکل بیکار ہے۔" تو حامد نے کہا "نہیں تم کو اپنے بیٹے کے لئے زندہ رہنا چاہیے۔"

اگلے مہینے نئی سیکل خریدوں گا اور باورچی خانے کی چھت کی مرمت کراؤں گا۔" اس نے اپنے تکلیف دہ خیالات کو دور کرنے کے لئے چلا کر کہا قاسم نے گھڑی کی طرف دیکھا آٹھ بج چکے تھے۔ علی کا انتظار کرنا بیکار تھا۔ اسے ایسا معلوم ہو رہا تھا کہ وہ بالکل اکیلا رہ گیا ہے۔ اس نے دسترخوان بچھایا۔ کٹورے میں سالن نکال کر صبح کی بچی ہوئی روٹی سے کھانے لگا۔ وہ چاہتا تو باورچی خانے میں ہی بیٹھ کر کھا لیتا مگر علی کی ماں کا یہی قاعدہ تھا وہ اس کے بنائے ہوئے طریقوں کو توڑنا نہیں چاہتا تھا۔ کھانا کھانے کے بعد اس نے اپنی رضائی اوڑھی اور دالان کے ایک کونے میں بیٹھ کر حقہ پینے لگا۔

علی دس بجے کے قریب گھر آیا۔ اس کے غصے کی آگ ٹھنڈی پڑ چکی تھی "مجھے اس وقت بہت غصہ آرہا تھا۔ ابا؟

کھیلتے ہوئے کہا۔ معلوم نہیں میں نے کیا کیا کہہ ڈالا لیکن میں بھول گیا کہ آپ کو مجھے پڑھاتے میں کتنا روپیہ صرف کرنا پڑا ہوگا۔ اور کتنی تکلیفیں اٹھانی پڑی ہوں گی مگر میں سوچتا ہوں کہ جب بی۔ اے پاس کرلیا ہے تو کوئی اچھا کام کیوں نہ ڈھونڈوں۔"

قاسم سوچنے لگا کہ یہ لڑکا بھی کیسی باتیں کرتا ہے۔ اسے علی کی وجہ سے کوئی تکلیف نہیں اٹھانی پڑی اس کو تعلیم دلانا بھی وہ اپنی زندگی کا ایک فرض سمجھتا تھا۔ اس کو خیال تک نہ آتا تھا کہ علی پر بیکار روپیہ صرف ہو رہا ہے۔ آج قاسم بہت غمگین تھا اس کو علی کی باتیں کچھ پسند نہ آئیں۔ وہ چپ چاپ جاکر بستر پر لیٹ گیا۔

صبح جب وہ اٹھا تو اسے ذرا تھکان محسوس ہوئی۔ رات کو وہ اچھی طرح نہ سو سکا۔ ساری رات الٹے سیدھے خیالات اس کو ستاتے رہے۔ اس نے گھڑی کی طرف دیکھا چھ بج چکے تھے۔ وہ جلدی سے اٹھا اور دفتر جانے کی تیاری کرنے لگا۔ اور نو بجے تک کھانا پکا کر سائیکل پر باندھ کر ڈاک خانے کی طرف چل کھڑا ہوا۔ جب وہ وہاں پہنچا تو بہت کم لوگ آئے ہوئے تھے۔ مگر وہ ہمیشہ وقت پر کام کرنے کا عادی تھا۔

اس کے دوست ہاشم نے کہا کہ اسے دو مہینے کے بعد پنشن ہو جانے والی ہے۔ اس لئے وہ چاہتا ہے کہ اپنی سائیکل بیچ دے۔ چھ مہینے ہوئے کہ میں نے خریدی تھی۔ ابھی تو بالکل نئی ہے۔" ہاشم نے کہا "لیکن میرا کوئی دوست خریدے گا تو آدھی قیمت پر بیچ دوں گا۔"

"اچھا تو میں لے لوں گا۔" قاسم نے ہاشم سے کہا۔

پھر سب لوگ دن بھر کے گشت کے لئے اپنے تھیلے خطوں اور رسالوں سے بھرنے لگے۔ عید میں صرف ایک دن باقی تھا۔ عید کارڈوں کی بھرمار تھی۔ "آج تو خوب لمبا چکر ہے" اس نے ہاشم سے اپنا تھیلا بھرتے ہوئے کہا۔ اس کے بعد سارے ڈاک خانے میں خاموشی چھا گئی۔ سب لوگ اپنے اپنے کام میں مشغول ہو گئے۔ "آدھی قیمت پر سائیکل مل جائے گی کتنی اچھی بات ہے۔" قاسم سوچنے لگا۔ پہلے حامد کے گھر آیا۔ قاسم نے خیریت پوچھی۔

"آج" ان کی طبیعت زیادہ خراب ہے۔ اگر۔ . . . اگر آپ کو تکلیف نہ ہو تو ذرا ڈاکٹر کو بلا لائیے۔"

ڈاکٹر کو بلانے کے لئے کم از کم دو میل کا سفر کرنا پڑتا تھا۔ مگر اس نے اپنے دوست کی خاطر یہ سفر خوشی سے اختیار کرلیا۔ ڈاکٹر آیا اور اس نے کہہ دیا "کوئی فکر کی بات نہیں۔ کل سے آج حالت اچھی ہے۔ تھوڑے دنوں میں اچھی ہو جائیں گی۔"

"خدا کا شکر ہے کہ ان کے اچھے ہونے کی امید تو ہوئی" حامد نے ڈاکٹر کے جانے کے بعد کہا۔

"ہاں بھائی مجھے تو بہت فکر ہو گئی تھی۔" قاسم نے اپنی برساتی پہنتے ہوئے کہا۔

"قاسم بھائی اب کے ہماری عید بھی عجیب موقعے پر آئی۔" حامد نے اپنی چھوٹی لڑکی خالدہ کے کندھے پر ہاتھ رکھ کر کہا۔ "اس کی ضد ہے کہ عید میں نئے کپڑے لوں گی۔ ان کی بیماری میں اتنا خرچ ہو گیا ہے کہ اس چھوٹی سی بچّی کے لئے کپڑے بھی نہیں بنا سکتا۔"

"ہاں بھائی بیماری بہت بری بلا ہے" قاسم نے سرد آہ بھر کر کہا۔

"بعض لوگوں پر بھی کس طرح مصیبت آتی ہے۔ بیچارا حامد اپنی بیوی کی بیماری میں بالکل مفلس ہو گیا۔ خالدہ کے لئے کپڑے بھی نہیں بنا سکتا۔" قاسم سوچنے لگا۔ اس نے چند خط مختلف گھروں پر دئے۔ "بیچاری خالدہ" وہ سوچنے لگا "اس کی عید کتنی سونی رہے گی۔"

اس نے اپنی سائیکل ایک سڑک کی طرف پھیری۔ اس سڑک پر دوسری سڑکوں سے زیادہ کیچڑ تھا۔ وہ ایک گھر کے دروازے پر ٹھیرا۔ "خط لے جاؤ" کا نعرہ لگایا۔ بہت سے چھوٹے چھوٹے بچے اس کے گرد آکر جمع ہو گئے۔ "مجھے دو مجھے دو" سب چیخ رہے تھے۔ قاسم سب سے بڑے کو خط دے کر مسکراتا ہوا آگے چل کھڑا ہوا۔

اس وقت بارش تو نہیں ہو رہی تھی مگر رات کی بارش کا کیچڑ اب تک سڑکوں پر باقی تھا۔ سمنٹ کی سڑک پر سے گزر کر شاما کے گھر کی

... اپنی ساڑی پھیری۔ "اللہ رحم کرے! یہ شہر میں تو میری بوڑھی سائیکل کی ہڈی پسلی ایک کر دیں گی۔" قاسم نے آہستہ سے کہا۔ دوسرے شاما کا گھر ... شاما بیٹھی ایک کتاب میں تصویریں دیکھ رہی تھی۔ "دیکھو شاما میں تمہارے لئے ایک اور کتاب لایا ہوں" قاسم نے دوسرے ایک تصویر والی دکھائی۔ وہ دوڑتی ہوئی دروازے پر آئی۔ "لائیے چلیں دیکھئے" قاسم سے وہ تصویروں کی فہرست چھین کر وہ اندر بھاگ گئی۔ اور مختلف اخباروں ... بہت سی تصویریں اس کو لا کر دکھائیں۔ ان سب کو دیکھنے کے بعد وہ پھر اپنے کام پر چل کھڑا ہوا۔ آگے بڑھا تو دیکھا بڑھیا ماما زینت بی ... کے کنارے کھڑی تھی۔ قاسم کو دیکھ کر وہ آگے بڑھی۔ "بیٹا میں تمہاری ہی راہ دیکھ رہی تھی۔ یہ پانچ روپے میری بیٹی کو بھیج دینے ہیں۔ نے بڑی مشکل سے ... جمع کئے ہیں۔ آج ہی بھیج دے۔" "اچھا اماں" قاسم نے کہا اور روپے جیب میں رکھتے ہوئے سوچنے لگا۔ "اس بچاری کو یہ بھی معلوم ... روپے بھیجنے میں بھی پیسے لگتے ہیں۔ خیر ایک غریب کا بھلا ہو گا۔"

... کرتے ہوتے وہ بیگم صاحبہ کے بنگلے پر پہنچا۔ اتفاق سے وہ برآمدے میں کھڑی تھیں۔ ایسے موقعے پر وہ ضرور قاسم کی خیریت پوچھ لیتی ... انھوں نے باتوں باتوں میں پوچھا کہ علی کو نوکری ملی یا نہیں؟ قاسم نے غمگین صورت بنا کر کہا "ابھی نہیں ملی۔ وہ میری طرح جاہل نہیں ہے، ... بی۔ اے پاس کر چکا ہے۔ کوئی بڑا کام چاہتا ہے۔"

"شاید دفتر کا کام چاہتا ہے!"

"جی ہاں" قاسم نے آہستہ سے کہا۔

"اچھا میں صاحب سے ذکر کروں گی۔ شاید کوئی جگہ خالی ہو۔ صرف تمہاری خاطر میں ضرور کوشش کروں گی۔"

قاسم نے بیگم صاحبہ کو بتایا کہ اس کو کس طرح علی کے کپڑوں اور دوسری ضرورتوں پر روپیہ خرچ کرنا پڑتا ہے اور اس کے گھر کے خرچ بھی پورے نہیں ہو ...

عید کے دن شام کو جب وہ گھر پہنچا تو علی دالان میں بیٹھا ہوا تھا۔ آج وہ بہت خوش معلوم ہو رہا تھا۔ اس نے اپنے باپ کو عجیب نظروں سے دیکھا۔ ... اس کے پاس بیٹھا۔ علی نے کہا "بیگم صاحب نے مجھے بلایا تھا۔ صاحب سے مجھے ملایا۔ انھوں نے آپ کی بڑی تعریف کی اور کہا کہ ایسے نیک ... کا بیٹا بھی نیک ہونا چاہیے۔ صاحب نے کہا کہ بس یہ سفارش کافی ہے کل سے دفتر میں آ کر کام کرو۔ انھوں نے مجھے نوکری دلا دی ... کہ وہ آپ کا بہت خیال رکھتے ہیں۔"

قاسم خوشی سے پاگل ہو گیا۔ "دیکھا ہماری بیگم صاحب کو اللہ انھیں خوش رکھے اگر وہ یہاں سے چلی جائیں تو بہت سے غریب بھوکے مر جائیں۔ دیکھو آخر انھوں نے ... بھی خیال رکھا۔" قاسم نے آدھی قیمت پر ہاشم سے نئی سائیکل خریدنے کی خوش خبری علی کو سنائی۔ "اب تم نوکر ہو گئے ہو تو ہم اس مہینے باورچی خانے کی مرمت بھی کرا لیں گے۔" قاسم نے کھانا پکانے کی تیاری کرتے ہوئے کہا۔

کھانا کھانے کے بعد قاسم نے شیروانی پہنی اور وہ کوٹھری میں سے سائیکل نکالی۔ "اب کدھر چلے ابا" علی نے سر کھجاتے ہوئے کہا۔

"علی تم کو یہ تو معلوم ہی ہے میں بڈھا ذلیل آدمی ہوں۔ تمہاری طرح عقلمند پڑھا لکھا تو ہوں نہیں۔ کام بھی ذلیل لوگوں کے سے کرتا ہوں" قاسم نے اپنے ڈاک کے تھیلوں میں سے چار پانچ ڈبے نکال کر ... "خالدہ کے لئے کچھ کپڑے اور حامد کے دوسرے بچوں کے لئے کھلونے اور مٹھائی لے جا رہا ہوں۔ عید کے دن بچوں والے گھر میں خالی ہاتھ جانا اچھا نہیں معلوم ہوتا۔"

قبل اس کے کہ علی کچھ کہے۔ قاسم جا چکا تھا۔ جب قاسم حامد کے پاس پہنچا تو سب بچے کھیل رہے تھے اس کو دیکھتے ہی وہ اس کے گرد آ کر جمع ہو گئے۔ قاسم نے ان سب کو چیزیں دیں۔ خالدہ کپڑوں کو دیکھ کر خوشی سے پاگل ہو گئی۔ اپنی ماں کو دکھانے کے لئے اندر بھاگی۔ بچوں کے شور و غل میں آ کھڑے ہو گئے۔ خالدہ اپنی ماں سے ضد کر رہی تھی کہ جلدی سے اس کو کپڑے ... اس کے چلانے کی آواز باہر صاف آ رہی تھی۔ ——— گھر واپس آتے ہوئے قاسم سوچنے لگا "عید تو یہ ہے۔"

مصنفہ بنت جمیل الرحمٰن

اندھیری رات

اندھیرا چھا گیا تھا خاک کی رنگیں فضاؤں پر
نقابِ شب پڑی تھی دہر کی شیریں اداؤں پر

گل و غنچہ، بیابان و چمن، کہسار اور وادی
حریمِ ناز، گورستان، ویرانہ اور آبادی

شبِ تاریک کی آغوش میں بے ہوش ہوتے تھے
ترانے زندگی کے ہر طرف خاموش ہوتے تھے

سیاہی کے بلند ایوان میں سنسان خاموشی
اندھیرے کے کھلے میدان میں انجان خاموشی

سیاہی کی چمک بالیں پہ شمعِ نور کے بدلے
ہوائے وادیٔ ایمن، چراغِ طور کے بدلے

کھلی جب آنکھ، دیکھا اک اندھیرا بزمِ ہستی پر
امنڈ آئی تھی اک کالی گھٹا آنکھوں کی بستی پر

نظر نور آشنا تھی، اڑ چلی افلاک کی جانب
ستاروں کی طرف، ایوانِ آتشناک کی جانب

نظر کے ساتھ میری رُوح بھی پرواز میں آئی
چلی اڑتی ہوئی، انجم کی بزمِ ناز میں آئی

جہاں آنکھوں کے آگے برق پارے جھلملاتے تھے
جہاں اک رفعتِ عالی میں تارے جھلملاتے تھے

شبستانِ فلک میں نور کے لاکھوں جہاں پیدا
چمکتی بجلیوں میں سُرخ اور نیلے مکاں پیدا

سہانی چاندنی، زرین وادی، نور کے دریا
بہے جاتے تھے گویا سامنے کافور کے دریا

اندھیری رات میں میری نگہ نے یہ سماں دیکھا
سیاہیٔ زمیں پر جلوہ زارِ آسماں دیکھا

کہا بیتاب ہو کر میری روحِ جاودانی سے
کہ حاصل روشنی کر اس فضائے آسمانی سے

شعاعِ چرخِ رنگیں سے بڑھا تابندگی اپنی
جہاں کے نور و ظلمت میں نہ الجھا زندگی اپنی

محمد عبد القیوم خان باقی ایم اے (ریسرچ)

تقام

چوتھا منظر

عطیہ اپنے کمرہ میں ایک میز پر کہنیاں ٹیکے ہوئے اور اپنا سر ہاتھوں میں تھامے ہوئے بیٹھی ہے۔ وہ خود ہی آہستہ آہستہ اپنے دل سے باتیں کر رہی ہے۔ کبھی باتیں کرتے کرتے میز کے پاس سے اٹھ کر ٹہلنے لگتی ہے۔ کبھی پھر کسی کونے میں کرسی پر جا بیٹھتی ہے۔

"یہ تو معلوم تھا" مگر میری محبت نے زندگی کے ٹھوس حقائق سے
ا کیا۔ شاید محبت ہمیشہ ایسا ہی کرتی ہے۔ میں تو جانتی تھی کہ ناصر کی طلب
ش خواہش ہے۔ وہ میری محبت کا جواب نہیں ہے پھر کیوں میں نے
ں سے اقرار الفت کر لیا۔ کیوں میں نے اپنے دل کی کتاب اس کے
منے کھول کر رکھ دی! کیا میں جانتی نہ تھی کہ اس کی جنس فریب ہے
ا باز ہے! یہ بھی نہ جانا میں نے تو کیا جانا! ہرن کو خدا نے مضبوط اور
رفتار ٹانگیں اسی لئے تو دی ہیں کہ وہ شیر سے اپنی جان بچا سکے، پھر
ہرن کم بخت اگر خود ہی اپنی ٹانگ توڑ کر شیر کے ساتھ بیٹھ جائے تو قصور
س کا! تین مہینے تک۔ تین مہینے تک اس بہانہ باز نے زندگی کی کس قدر
ریب تصویریں میرے سامنے رکھیں، مگر وہ نقش کچے تھے اور وہ رنگ
نے لگا۔ میں بیوقوفوں کے باغ عدن میں بے خبر پڑی رہی۔ میری
ی ہوگی! اب وہ مجھے سمجھا رہا ہے کہ اماں اور چچا کے حکم سے سرتابی
کے وہ مجھے اپنی بیوی نہیں بنا سکتا، اور کہتا ہے کہ میرے ساتھ نکل چل
عزت میرے لئے نہیں ہے۔ عیش مجھے دینا چاہتا ہے! بغیر آبرو
عیش! مرد کا بہیمانہ تصور! وہ بیچارا اپنی اماں سے ڈرتا ہے چچا جان
ڈرتا ہے۔ وہ ابھی ننھا بچہ ہے! لیکن مجھے اپنے آغوش میں لیتے
لئے پورا مرد ہے! میری آبرو کو اپنے خاندان کی اشتہاری عزت
مقابلے میں تولتا ہے، سمجھتا ہے کہ وہ اپنی خاندانی عزت کے پلہ میں
فریب کا وزن رکھ کر اس کو میرے پلہ سے بھاری بنا دے گا۔

بے ایمان! بے ایمان!

غصہ کی حالت میں اپنے ہاتھوں کے دونوں مٹھیاں باندھ لیتی ہے!

مجھے لکھتا ہے: "میں مجبور ہوں۔ چچا صاحب زہر کھا لینے کی دھمکی دے رہے ہیں: ۶۵ برس اس دنیا میں دنیا کی تمام گندگیوں کے ساتھ زندگی گذار لینے کے بعد ہی چچا صاحب کی موت کا امکان اس قدر ہولناک ہے! مگر ۲۰ برس کی ناکردہ گناہ لڑکی کا خنجر چھپا بھی ہو مگر اس عالی خاندان مرد کے ضمیر میں ایک چٹکی نہیں لے سکتا! پھر کہتا ہے مجھے معاف کرو میرے قصور سے درگذر و! فریبی کہیں کا!

تیز تیز ٹہلنے لگتی ہے، پھر دونوں ہاتھوں سے اپنی آنکھیں بند کر کے ایک کرسی پر بیٹھ جاتی ہے، تھوڑی دیر تک بے حس و حرکت بیٹھی رہتی ہے، پھر دفعتاً اپنی ساڑی کے دامن سے آنسو پونچھتی ہوئی اٹھتی ہے۔ ساڑی کے پلو کو غور سے دیکھتی ہے:

آنسو! ایک کوّے کے لئے جو صبح میرے گھر کی دیوار پر فائیں فائیں کر رہا تھا! اور اب کسی گھوڑے پر بیٹھا غلاظت کھا رہا ہوگا! آنسو! ایک کتے کے لئے جو شام میرے سامنے دُم ہلا رہا تھا اور اب کسی کوچہ میں پڑا ہوا مکھیاں مار رہا ہوگا! آنسو! معصوم کے آنسو! موتیوں سے گراں تر۔ ایسے کے لئے جو اُن کی قیمت نہ جانتا ہو! سوروں کے سامنے میرے موتی ہرگز نہ بکھیرے جائیں گے!!

تن کر سیدھی ہو جاتی ہے، ساڑی کو سنبھال لیتی ہے، اور بہت تمکنت کے ساتھ میز کے سامنے جا بیٹھتی ہے:

"جس کا کیسہ زر خالص سے پُر ہو وہ کھوٹے پیسے کے ضایع ہونے کا غم کیوں کرے: میں عورت ہوں اور عورت کا سرمایہ میری گرہ میں ہے! ایسے کتنے ہی کھوٹے سکے میرے سامنے خاک پر گریں گے اور میں ان کو اٹھا کر پانی میں پھینک دوں گی! محبت میں نے کی اور محبت ایک ہی دفعہ کی جا سکتی ہے! دھوکہ میں نے کھایا اور دھوکہ ایک ہی دفعہ کھایا جا سکتا ہے۔ وہ منزل طے ہو گئی، وہ دروازہ بند ہو گیا! زخم اگر مندمل نہ بھی ہو تو بلا سے، رستا رہے! مگر میرے

غرورِ نفس کی بھاری چادر اس کو ڈھانکے رہے گی۔ وہ کھل نہیں سکتا! غیروں کی نظر کے سامنے عریاں نہیں کیا جا سکتا۔ یہ عورت کا وقار ہے!!

—— یہی لکھدوں اس کو؟ یا کچھ نہ لکھوں! ——

سوچتی ہے اور پھر کھڑی ہو جاتی ہے۔

"میر صاحب اماں سے ڈاکٹر رضا کا ذکر کر رہے تھے، شاید پیام ہی آئے تھے۔ —— کیوں نہ میں اس کو قبول کر لوں۔ گویا میرے کان میں کوئی کہہ رہا ہے —— عطیہ! تیرے لئے محبت کے دروازے بند ہو گئے، مگر زندگی کے باقی سب دروازے کھلے ہوئے ہیں! —— اور انتقام کا دروازہ بھی! —— دوشیزگی کی پابندیوں سے آزاد ہو جا، اور پھر جب تک تیرا حسن اور اس کی کشش باقی ہے اپنا انتقام لے! جلا جلا کر اور رلا رلا کر ان موذیوں کو!

یکایک لطیفہ آواز دیتی ہے اور عطیہ چونک پڑتی ہے۔

لطیفہ: عطیہ کیا کر رہی ہو تنہا، میر صاحب جو تشریف لائے ہیں۔

عطیہ: تشریف لائیے اماں! تشریف لائیے دادا۔

لطیفہ اور میر صاحب داخل ہوتے ہیں۔

میر صاحب: میں دیکھتا ہوں عطیہ! کہ آج کل تم اکثر اپنے کمرے میں بند رہتی ہو اور ٹینس و شطرنج بھی کئی دن سے بند ہے۔

عطیہ: جی ہاں دادا! میں آج کل شطرنج کی چالوں پر عالمانہ غور و فکر کر رہی ہوں کچھ نئی چالیں، کچھ نئے نقشے ڈھونڈھ رہی ہوں!

میر صاحب: اللہ رے ذوق! آج کل کی لڑکیاں بھی ایک طرفہ معمہ ہیں! شطرنج بھی عالمانہ غور و فکر کی زد میں آگئی! جس شخص نے محض تفریح کے لئے یہ کھیل ایجاد کیا ہوگا اُسے کیا خبر ہوگی کہ کسی زمانہ میں اس کھیل پر بھی متمدن دنیا کی چھوکریاں غور و فکر کے حملے کیا کریں گی۔ شطرنج نہ ہوئی علم الافلاک ہو گیا!!

—— خیر بیٹھو ہم بھی آج کل کسی فکر میں مبتلا ہیں۔ تم سے کچھ مشورہ کرنا چاہتے ہیں (لطیفہ کی طرف دیکھ کر) بات یہ ہے کہ —— یعنی بات یہ ہے کہ —— کہ دراصل معاملہ یہ ہے کہ —— تمھاری شادی کا سوال درپیش ہے۔ عطیہ! ڈاکٹر رضا کو تو تم جانتی ہو! یہ بھی جانتی ہو کہ وہ ہمارے شہر کے ایک نیک نام اور کامیاب ڈاکٹر ہیں وہ تم سے شادی کرنا چاہتے ہیں، لیکن ہم لوگوں کو (لطیفہ کی طرف ...) تردد یہ ہے کہ ان کی عمر ذرا زیادہ ہے، پہلی بیوی کا انتقال ہو چکا ہے ... نوجوان لڑکی بھی موجود ہے (ذرا رک کر) اب تمھاری والدہ تو کہتی ہیں کہ ... تفاوت قابل اعتراض ہے اور میں —— میں کہتا ہوں کہ اول تو ... ایسا کیا زیادہ ہے —— ڈاکٹر صاحب کی عمر ۳۹ سال ہے —— ... تمھارے لئے اس قدر خوشحال اور نیک سیرت شوہر ہر طرح مناسب ... پھر بڑی بات یہ کہ ہم لوگوں کی طرح وہ بھی نہایت آزاد خیال ہیں۔ بتاؤ تمھاری کیا رائے ہے۔

عطیہ: دادا! میں نے آپ کو ہمیشہ باپ کی برابر سمجھا۔ اب جو آپ ...

میر صاحب: مگر تمھارے دل کا رجحان!

عطیہ: دل کے رجحان کا کیا ذکر، وہ تو نہ ادھر ہے نہ اُدھر ——

لطیفہ: مگر بیٹی! بغیر طبیعت کے رجحان کے ازدواجی زندگی ایک ساز بغیر نغمہ کے —— ایک تار ہو گا ٹوٹا ہوا! تمھارے والد مرحوم سے میری ... صرف ذاتی رجحانات کا نتیجہ تھی، ان کو بہت سی قربانیاں کرنی پڑیں ... ہم اس رشتہ کے نتائج کو بھگت رہے ہیں۔ خاندان نے اور سماج نے تمھارے والد کو اور مجھے اس طرح ستایا جس طرح فرعون اپنے غلاموں کی ننگی پیٹھ پر ... لگواتا تھا! مگر باوجود اس ابتلا کے ہم اور وہ دنیا سے بے تعلق رہ کر ... محبت کے دامن میں آسودہ رہے! ——

عطیہ: جی ہاں! میں سمجھی! جب مجھے اس رشتہ میں کوئی عذر نہیں تو ... تردد کیوں! اب خدا کا نام لیکر پیام منظور کیجیے۔

میر صاحب: مبارک، مبارک! خدا راست لائے! عطیہ بیٹی! تیرا فیصلہ دانشمندانہ ہے۔ اپنے حال کو تو ہی بہتر سمجھ سکتی ہے۔ جھوٹے اور کاذب ہیں وہ مرد جو دعوے کرتے ہیں کہ وہ عورت کی بھلائی کو اس سے بہتر سمجھتے ہیں ... جھوٹے ہیں وہ سب ——

عطیہ: وہ جو چاہیں سمجھیں، اور جس طرح چاہیں اپنے کو آسمان پر بٹھائیں ... جب تک اس جنس میں آپ جیسے لوگ موجود ہیں، دادا، دنیا تباہ نہ ...

میر صاحب: اچھا تو میں جاتا ہوں اور تاریخ مقرر کرنے کے لئے ...

لطیفہ: آداب! دادا۔

(ایک سال کے بعد علیہ کی شادی ڈاکٹر رضا سے ہو چکی ہے
زندگی میں علیہ خوش ہے، ڈاکٹر رضا کی لڑکی ریحانہ بہت ہی نیک اور
سعادتمند لڑکی ہے، علیہ سے اس کے تعلقات بے تکلف بہنوں کے
سے ہیں، ناصر بھی اکثر شام کو یہاں آکر ٹینس کھیلا کرتا، ڈاکٹر رضا علیہ اور
بیٹھے ہوئے چاء پی رہے ہیں، نازو علیہ کی کرسی کے پیچھے کھڑی ہے)

ریحانہ: تو باواجان کسی دن پھر پردہ کے مسئلہ کو ذرا تفصیل کے ساتھ
سمجھائیے آخر مولویوں کے بیان کی حقیقت کیا ہے۔

(کسی شخص کے آنے کی آہٹ ہوتی، نازو دوڑ کر گئی اور واپس آئی)

نازو: ناصر میاں آئے ہیں سرکار!

ڈاکٹر: بلائیے ان کو، یہیں بلائیے۔

(ناصر آتا ہے، ادب سے سلام کرتا ہے)

ڈاکٹر: آؤ بھئی ناصر! اب تم لوگوں کے ٹینس کھیلنے کا وقت ہو گیا،
ایک پیالی چاء پی لو تو جاؤ۔ میں اپنے مریضوں کو دیکھوں۔

(ڈاکٹر باہر جاتے ہیں)

علیہ: تم چلو، میں آتی ہوں، ذرا باورچی خانہ میں جھانکتی آؤں۔

(علیہ جاتی ہے، ناصر اور ریحانہ کھڑکی کا پردہ اٹھا کر باہر
دیکھتے ہیں)

ناصر: یہ لو یہ تو بارش شروع ہو گئی، گیا ہمارا ٹینس، لاحول ولا...

(دونوں بیٹھ جاتے ہیں)

ناصر: آپ کچھ خاموش سی ہیں۔ گئی ہو

ریحانہ: جی نہیں ناصر بھائی، آج کالج میں ذرا کام زیادہ تھا، تھک گئی

ناصر: یہ آپ مجھے ناصر بھائی کیوں کہتی ہیں، میرا آپ کا کوئی رشتہ تو ہو نہیں

ریحانہ: دلہن آپا آپ کو بھائی کہتی ہیں، میں نے بھی کہنا شروع کر دیا

ناصر: نہ کہا کیجئے۔

ریحانہ: کیوں؟

ناصر: نہ کہا کیجئے۔

ریحانہ: آخر کیوں؟

ناصر: بس نہ کہا کیجئے۔ اس لفظ میں اور اس کے مفہوم میں وہ ... بات نہیں
میری روح ڈھونڈتی ہے!

ریحانہ: جس لفظ میں ترنم ہو وہی بتا دیجئے۔

ناصر: وہ لفظ؟ ــــ کیا آپ کو ایسا کوئی لفظ معلوم نہیں۔

ریحانہ: (کچھ شرما کر خاموش رہ جاتی ہے)

ناصر: خاموش کیوں ہو گئیں آپ۔

ریحانہ: یہ سوچ رہی تھی کہ ترنم لفظوں میں کہاں ہوتا ہے، الفاظ کے
اندر تو ترنم نہیں ہوتا، البتہ ترنم کے اندر سے الفاظ ضرور پیدا ہوا کرتے ہیں!
جب روح کے اندر ترنم ہوتا ہے تو زبان بہ سکے ڈھالتی ہے!

ناصر: کیا خوب کہا آپ نے! میری زبان اگر کوئی ایسا سکہ ڈھالے تو
آپ کو ناگوار تو نہ ہو گا؟

ریحانہ: ناگوار کیوں ہوتا، ترنم آپ کا، سکہ آپ کا، میں کون کہ مجھے ناگوار ہو!

ناصر: آپ کون! ترنم تو آپ ہی کا پیدا کیا ہوا ہے۔

ریحانہ: (چونک کر) میرا پیدا کیا ہوا! میرا ــــ

ناصر: جی ہاں! آپ کا۔

ریحانہ: کیوں کر؟

ناصر: اس طرح جس طرح ہوا صنوبر کے پتوں میں ترنم پیدا کرتی، اس طرح جس طرح
آبشار سے نغمگی پیدا ہوتی ہے، اس طرح ــــ

ریحانہ: آپ کچھ شاعر بھی ہیں ناصر بھیا... ناصر صاحب!

ناصر: شعر میں کہتا نہیں، مگر شعریت حاصل کرتا ہوں ــــ ایسی رنگین
نظریوں سے جیسی کہ اس وقت میرے ضبط کا امتحان لے رہی ہے!

ریحانہ: (بہت سنجیدہ صورت بنا کر) نہیں ناصر صاحب! میں آپ کے
ان اشاروں کی حریف نہیں ہو سکتی!

ناصر: محبت کے اشارے کیا ایسے مشکل ہیں یا اس قدر نامرغوب؟

ریحانہ: مشکل بھی اور نامرغوب بھی! ــــ کچھ اور باتیں کیجئے!

ناصر: اور وہ دو حرف جو میں کہنا چاہتا ہوں، کتنی دفعہ میں نے کہنا چاہا اور کہہ نہ سکا۔

(ڈاکٹر رضا اور عطیہ داخل ہوتے ہیں)

ڈاکٹر رضا: آج تو بھئی بارش نے ٹینس کھیلنے کی بالکل ہی ممانعت کر دی، کیا مصیبت ہے اگر دن بھر مطب کی محنت کے بعد شام کو کھلی ہوا میں بھی نہ نکل سکیں۔

(ناصر کچھ حرکت کرتا ہے، گویا جانے کا ارادہ ہے)

عطیہ: بیٹھو ناصر، اب کھانا کھا کر جائیو، کہو اب تمہارے امتحان کا نتیجہ کب تک آئے گا؟

ناصر: ابھی تو دو مہینے انتظار کرنا ہوگا، ہماری یونیورسٹی کے نتیجے بہت دیر سے نکلتے ہیں۔

عطیہ: دیر آید درست آید۔ جو نتیجہ قطعی و مختتم ہوتا ہے وہ ہمیشہ دیر ہی میں نکلا کرتا ہے۔ نتیجہ تو وہی فیصلہ کن ہوتا ہے جو انتظار کرائے۔ زندگی جس قدر آہستہ چلتی ہے اسی قدر زیادہ باریک بینی سے ہے!

ناصر: بہن عطیہ کے فلسفیانہ اشارے بھی بہت پرلطف ہوتے ہیں۔

عطیہ: پرلطف! ـــــ ایک حد تک! اس حد کے بعد میرا فلسفہ خوفناک طریقہ پر سنجیدہ ہو جاتا ہے!

ڈاکٹر رضا: اچھا تو اب چھوڑیے اس فلسفہ کو! ورنہ میں بھی اپنے مریضوں کا حال سنانے لگوں گا!

(ریحانہ اٹھ کر چلی جاتی ہے اور عطیہ بھی اٹھتی ہے)

عطیہ: جانے دیجئے! میری تو یہ ہے، کہیں اس دل لگی میں زندگی کا اصلی فلسفہ نہ بھول جاؤں! ذرا جا کر باورچی خانہ کی تو خبر لوں! (مسکرا کر) شدید ترین اور سنجیدہ ترین فلسفہ اگر ہے تو وہ باورچی خانہ کا فلسفہ ہے!!

(عطیہ جاتی ہے)

ڈاکٹر: کہو بیٹے ناصر! آج کل تمہارے کالج کی انجمن محافظ حقوق نسواں کا کیا حال ہے؟

ناصر: جی اب تو امتحان کے بعد یونیورسٹی کے سب ہی شعبے بند ہو گئے!

ڈاکٹر: ارے میاں! میری سمجھ میں نہیں آتا کہ آخر اس انجمن بازی اور انجمن سازی کا نتیجہ کیا ہے! ہم لوگوں نے اپنی زندگی کو نقالی اور تصنعات سے اس قدر بھر لیا ہے کہ ہمارا تصور چند مصطلحات کا غلام بن کر رہ گیا ہے۔ انجمن محافظ حقوق! سبحان اللہ! گویا حقوق کی حفاظت بھی کسی سرحد کا معاملہ ہے! کہ جب تک ایک دستہ فوج کا یا ایک توپ خانہ سرحد پر متعین نہ کرو دشمن کے حملہ کی کوئی روک ہی نہیں! اور عورتوں کے حقوق کے ایسے ہی محافظ ہو تو پہلے اپنے گھر میں کچھ کر کے دکھاؤ! اس سے کیا فائدہ کہ انجمن کے ہر ممبر کا گھر تو بدستور عورتوں کے لئے جیل خانہ بنا رہے اور گھر کے باہر ممبر صاحب حقوق نسواں کے نقارے بجاتے پھریں۔

ناصر: تو جناب بغیر اجتماعی کوششوں کے اصلاح ـــــ

ڈاکٹر: اجتماعی کوششیں اور اصلاح! انفرادی کوششوں کا پتہ نہیں اور اجتماعی کوشش کا ارادہ ہے! ارے میاں! تم تعلیم یافتہ ہو نوجوان ہو، ولایت جا کر اور زیادہ تعلیم یافتہ اور مہذب ہو جاؤ گے۔ یہ تو بتاؤ کہ آج تک تم نے اپنے گھر میں، اپنے خاندان میں اپنے رشتہ داروں میں بھی اصلاح کی کوئی صورت نکالی؟

تو دروں در چہ کردی کہ بیروں خانہ آئی؟

ناصر: مگر ہمارے خاندان کے لوگ تو اس قدر قدامت پسند ـــــ

ڈاکٹر: اجی وہ کتنے ہی قدامت پسند ہوں مگر یہ تو بتائیے کہ آپ نے ان کی قدامت پرستی کے خلاف کیا جہاد فرمایا؟ ـــــ سوائے انجمن محافظ حقوق نسواں کے جلسوں میں کھڑے ہو کر تقریر کرنے اور تالیاں بجا کر رزولیوشن پاس کر دینے کے!

ناصر: جی یہ تو بجا ہے، مگر ـــــ

ڈاکٹر: جب یہ بجا ہے تو پھر آپ کے نقارہ میں سوائے آواز کے رکھا کیا ہے؟ اگر مگر کیسی؟

(عطیہ داخل ہوتی ہے)

عطیہ: کوئی بڑے زور کی بحث ہو رہی ہے یہاں!

ڈاکٹر: بحث وحث کچھ بھی نہیں، ذرا میاں ناصر کی مزاج پرسی کر رہا ہوں! یہ بڑے محافظ حقوق نسواں بنے پھرتے ہیں! کہتے ہیں کہ اپنے گھر میں تو قدامت پرستوں کی وجہ سے کچھ نہ کر سکا مگر باہر تمام جہان کی عورتوں کو آزاد کرا دینے کا ارادہ ہے!

عطیہ: شیر نے بکری سے کہا تھا آ! میں تجھے غرانا سکھا دوں! بکری نے کہا بخشئے چچا! مجھے ممیانا ہی زیادہ پسند ہے! ذرا دور ہی رہیے!!

ڈاکٹر: اجی ہاں! یہی تو میں بھی کہہ رہا ہوں کہ یہ سب دھوکہ بازی ہے!

عطیہ: اور میں کہتی ہوں پہلے تو یہ حضرت اپنا حال درست کریں، اپنے دامن کے دھبے دھوئیں! اس کے بعد ہم غریبوں پر کرم فرمانے کا ارادہ کریں! اگر یہی سب ہمارے حقوق کے محافظ ہیں تو ہم باز آئے ایسے حقوق سے! بخشو بی بلی! چوہا لنڈورا ہی جئے گا!

سب راس

ناصر: تو اب تو آپ دونوں مل کر میرا خاتمہ ہی کر دیں گے!

ڈاکٹر: بھاگ نکلیے! بھاگ نکلیے میاں ناصر! انجمن محافظ حقوق نسواں زندہ باد!!

(نازو داخل ہوتی ہے)

نازو: سرکار! خاصہ حاضر ہے اور ریحانہ بی فرماتی ہیں کہ ان کے سر میں درد ہے اس وقت خاصہ تناول نہ فرمائیں گی۔

عطیہ: سر میں درد ہے! ذرا میں اس کو دیکھ تو لوں۔

(عطیہ جاتی ہے، ڈاکٹر اور ناصر اٹھ کر ٹہلنے لگتے ہیں۔ گویا عطیہ کی واپسی کا انتظار کر رہے ہیں)

ناصر: مجھے ایک ضروری بات . . . . . بلکہ بہت اہم بات —— یعنی اپنی زندگی کے متعلق ایک امر —— میں یہ عرض کرتا ہوں کہ بہت —— میرا مطلب یہ ہے کہ ——

ڈاکٹر: میاں ناصر، عطیہ کی باتوں سے معلوم ہوتا ہے کہ تمہیں بوکھلا دیا۔

ناصر: جی نہیں! مگر —— لیکن —— یعنی وہ ایک اور بات کہنی ہے!

ڈاکٹر: تو کہو نا! بات کیا ہے آخر! تم تو اگر اور لیکن اور یعنی میں پھنس کر رہ گئے۔

ناصر: جی مجھے یہ عرض کرنا ہے —— یعنی یہ کہ —— کیا یہ ممکن ہے کہ ریحانہ —— اجازت ہو تو عرض کروں؟

ڈاکٹر: ہاں! ہاں! بھائی کہو نا، ضرور کہو، کہو بھی کہیں! کیا تم ریحانہ کے متعلق مجھے اپنے جذبات سے مطلع کر رہے ہو؟

ناصر: (جلدی سے گھبرا کر) جی ہاں! جی ہاں! یہی تو عرض کرنا چاہتا تھا۔

ڈاکٹر: تو میاں ناصر سنو! فیصلہ قطعاً ریحانہ کے ہاتھ میں ہے معاملہ اس کا ہے وہی جانے! ہم تو اس کو اپنے تجربہ اور عقل کے مطابق مشورہ دے سکتے ہیں —— بس! باقی وہ بالکل مختار ہے۔ البتہ تم پہلے اس کی ماں سے دو باتیں کر لو! —— اور بھی مجھے تو ——

(عطیہ داخل ہوتی ہے)

عطیہ: ریحانہ کا مزاج کچھ سست ہے۔ میں نے اس کے لئے قہوہ بھجوا دیا ہے آئیے خاصہ ٹھنڈا ہو رہا ہے!

(سب جاتے ہیں)

(عطیہ ایک آراستہ کمرہ میں صوفے پر بیٹھی ہوئی ہے، ناصر سامنے کرسی پر بیٹھا ہوا ہے)

عطیہ: مجھ سے کیا کہتے ہو؟ اگر یہ خیال ہے تو خدا مبارک کرے! اتنا تو میں کہتی ہوں کہ بس نوجوان کو ریحانہ جیسی بیوی نصیب ہوگی اس سے زیادہ خوش نصیب کون ہو سکتا ہے —— مگر اپنا معاملہ تم خود ہی اس کے سامنے پیش کرو، میں بھی کسی موقعہ سے دو حرف کہہ دوں گی۔ تم تو ہمارے انجمن محافظ نسواں کے ممبر ہو تم ہی ریحانہ کے حقوق کی عزت کر سکتے ہو! یہ حق اسی کا ہے کہ وہ ہاں کہے یا نہیں! رہے ہم ماں باپ تو زیادہ سے زیادہ اتنا ہے کہ ہم مناسب مشورہ دیں!

ناصر: مگر آپ کی سفارش؟

عطیہ: سفارش! عقل گئی ہے تمہاری! یہ معاملات سفارشوں سے طے ہوا کرتے ہیں یا طے ہونے چاہئیں! اظہار مدعا سے تمہاری زبان قاصر تو نہیں! اگر میں تو جانتی ہوں بہت میٹھی اور دلکش ہے، اپنے وکیل خود بنو! گھبراتے کیوں ہو! زبان طرار! دماغ ہوشیار، انداز دلپسند سب کچھ خدا نے تم کو دیا ہے!

ناصر: میں نے تو ذکر چھیڑا تھا۔

عطیہ: پھر کیا کہا اس نے؟ —— لو وہ تو خود ہی آ رہی ہے —— میں تمہارے لئے میدان خالی کرتی ہوں۔

(عطیہ مسکراتی ہوئی جاتی ہے —— ریحانہ داخل ہوتی ہے)

ریحانہ: اوہو ناصر صاحب، سنتی ہوں کہ کل تو آپ سے اور ابا جان سے بڑی مزیدار بحث ہوئی۔

ناصر: جی ہاں، بحث وحث کیا، ڈاکٹر صاحب نے میری تھوڑی سی گوشمالی فرمائی۔

ریحانہ: کان تو کچھ آپ کے سرخ معلوم نہیں ہوتے!

ناصر: (ہنس کر) دولھن آپا کا انداز گفتگو کچھ آپ بھی اختیار کرتی جاتی ہیں!

ریحانہ: جیسی ماں ویسی بیٹی —— ہونا بھی یہی چاہئے —— اگر آپ چاہتے ہیں کہ میں سنجیدہ بن جاؤں تو لیجئے میں نہایت سنجیدہ بن گئی اب فرمائیے!

(مذاقاً منہ بنا کر کرسی پر بیٹھ جاتی ہے)

ریحانہ: لیجئے، اب ذرا دیکھئے میری سنجیدگی —— دہکتے انگارے کی طرح باوقار اور برف کی طرح ٹھنڈی! اب آپ کیا حقوق نسواں کے

مسئلہ پہ کچھ فرمائیں گے ؟

ناصر: (دفعتاً اٹھ کھڑا ہوتا ہے) ریحانہ! خدا کے لئے! مرتے ہوئے کو طنز اور استہزا سے نہ مارو! میں اپنی زندگی کا فیصلہ کرنے آیا ہوں! بتادو کیا فیصلہ ہے؟

ریحانہ: (دوسری طرف نظر پھیر کر) ناصر صاحب! اگر راستہ ناہموار ہو تو گھوڑے کو دوڑائیے نہیں! کہیں ٹھوکر نہ کھائیے!

ناصر: تو کیا راستہ ناہموار ہے!

ریحانہ: بہت! آپ کے خیال و گمان سے بھی زیادہ!

ناصر: (گھٹنوں کے بل کرسی کے پاس بیٹھ جاتا ہے) میں مرجاؤں گا ریحانہ! بس فنا ہوجاؤں گا!

ریحانہ: یہ آپ نے گھٹنوں کے بل بیٹھ کر عرض حال کرنے کا خاص فرنگی طریقہ کیوں اختیار فرمایا — وہ بھی میرے ساتھ، کہ میں ایک کالی عورت ہوں! غلام قوم کی عورت! نامہذب عورت! — اس ذکر کو فی الحال ملتوی کیجئے۔ مجھے چند روز سوچنے دیجئے!

ناصر: مگر — امید کی کوئی جھلک میرے لئے؟

ریحانہ: ابھی نہیں!

ناصر: عنایت کا کوئی لفظ میرے لئے؟

ریحانہ: ابھی نہیں!

ناصر: کرم کی ایک نظر میرے لئے؟

ریحانہ: ابھی نہیں!

(عطیہ داخل ہوتی ہے، دروازہ ہی سے آواز دیتی ہے)

ریحانہ: ڈاکٹر صاحب بلا رہے ہیں (ناصر کو دیکھ کر) اوہو! میاں ناصر بھی موجود ہیں۔ (ریحانہ "بہت خوب" کہتی ہوئی جاتی ہے)

ناصر: (عطیہ سے مخاطب ہوکر) جی ہاں میں موجود ہوں۔ کس مشکل میں پھنس گیا میں!

عطیہ: سبحان اللہ! گویا آپ ننھے بچے ہیں کہ میں نے آپ کو اٹھا کر کانٹوں بھری جھاڑی میں پھینک دیا!

ناصر: تو پھر میرا حشر کیا ہوتا ہے؟ ریحانہ نے تو اپنا جواب ملتوی رکھا ہے

عطیہ: التوا کی گود میں امیدیں پلتی ہیں۔

ناصر: مگر —

عطیہ: مگر وگر کچھ نہیں، اگر وہ کہتی ہے کہ انتظار کرو تو کرو انتظار!

ناصر: مگر انتظار میرے لئے روح فرسا ہے!

عطیہ: (مسکرا کر) روح کو تحلیل ہونے دو، جس قدر تحلیل ہوگی اسی قدر کثافت سے پاک ہوگی!

ناصر: یہ مذاق ہے یا طنز؟

عطیہ: نہ مذاق ہے اور نہ طنز، صرف مشورہ ہے، دوستانہ اور بزرگانہ!

ناصر: آپ اگر مشیر اور ناصح ہیں تو کچھ معین اور دستگیر بھی بنیے!

عطیہ: سنو میاں ناصر! مرد اپنی محبت کی کاغذی کشتیاں بہتے پانی پر ڈالتا ہے، بہت سی بہہ جاتی ہیں — بہی چلی جاتی ہیں، اور کتنی ہی بہتے بہتے غائب ہوجاتی ہیں، ایک دو کنارے کی گھانس اور کیچڑ میں پھنس کر رہ جاتی ہیں کوئی ایسی بھی ہوتی ہے جو کنارے سے دو ہاتھ آگے ڈوب کر رہ جاتی ہے — جو کشتی چار دن بھی نہ تیر سکے اس کا کیا اعتبار!

ناصر: (مسکرا کر) آپ کے معمے اور بھی جان کا عذاب ہیں!

عطیہ: میرے معموں کی پل صراط سے گذرے بغیر اپنے تصور کی جنت میں کیوں کر داخل ہوسکوگے! — خیر اب تم گھر جاؤ، میں دو ایک دن میں ریحانہ کا منشا معلوم کرکے تم کو اطلاع دوں گی۔ بادلوں کی طرح بھاگنے سے کوئی نتیجہ نہیں!

(ناصر "خدا حافظ" کہہ کر جاتا ہے، عطیہ کھڑی ہوئی مسکرا رہی ہے) "میرے انتقام کی منزل قریب آرہی ہے — ہر چیز سے زیادہ پرکیف انتقام! — چراغ اپنا ہی خون پیتا ہے اور تاریکی کو کھاتا جاتا ہے، مگر پھر کالا بن کر وہ خون اور ظلمت اس کے حلق سے نکلتی ہے!! — عمل کے بطن میں اس کے نتائج زندہ رہتے ہیں!!

(ریحانہ اور ناصر کی شادی قرار پاگئی، نکاح بہت سادگی کے ساتھ ہونے والا ہے، دولہا اپنے خاندان کے بزرگوں کے ساتھ آگیا ہے یہ منظر وہی ہے جو پہلے منظر — میں دیکھے گئے تھے۔ دولہا والوں کی طرف سے

...ن کے جلد پڑھائے جانے کا تقاضہ ہو رہا ہے، دولھا مسند پر سہرا باندھے
...ٹھا ہے، اس کمرے کے ایک پہلو میں پردے پڑے ہوئے ہیں، یہ زنانہ حصّہ ہے
...کٹر ناصر داخل ہوتے ہیں -)

...ے بڑے میاں: کیوں جناب ڈاکٹر صاحب: کیا دیر ہے اب؟

...اکٹر: جی کچھ دیر نہیں، لڑکی کی منشا معلوم کی جا رہی ہے!

...ے میاں: اب اس کی بھلا کیا ضرورت ہے! منشا تو بہر حال پہلے ہی
...علوم تھی، اور مسلمان لڑکی کی منشا ہی کیا!

...اکٹر: جی بجا ہے میر صاحب! اس کی کیا منشا! منشا تو صرف میری اور
...پ کی ہونی چاہیے!

...ے میاں: جی ہاں! شرفا کا تو یہی دستور ہے!

...اکٹر: اور در اصل جناب میر صاحب! شرفا کے لئے تو خود نکاح بھی ایک دستور
...ر رواج ہی تو ہے! اس کی بھی چنداں حاجت تو نہ تھی!

...وسرے بڑے میاں: کیا فرمایا آپ نے ڈاکٹر صاحب؟ توبہ! کچھ مذاق کر رہے ہیں!

...اکٹر: (ہنس کر) جی ہاں، آج تو دن ہی مذاق کا ہے — ہم سب مذاق
...ے کے لئے تو جمع ہوئے ہیں!!

...ے میاں: بجا بجا ہے، اچھا تو اب کیا دیر ہے نکاح میں؟

...اکٹر: جی، وہ دیکھئے دولھا کی والدہ تشریف لا رہی ہیں، معاف کیجئے
...ے پردہ آ رہی ہیں، آپ کو تو معلوم ہی ہے کہ ہم لوگ پردہ کے پابند نہیں

...ے میاں: (گھبرا کر) کیا فرمایا آپ نے؟ دولھا کی وا — دولھن
...ا — یہ تو جناب مناسب نہیں شریعت کے بالکل خلاف، واللہ!
...ں ہو کر) بالکل خلاف: نامحرم کے سامنے کوئی شریف عورت آئے!
...صاحب، نہیں، منع کیجئے اُن کو منع کیجئے!

(عطیہ نہایت سادہ لباس میں ایک چادر لپیٹے ہوئے مگر منہ او
...ھولے ہوئے داخل ہوتی ہے)

...یہ: ضرورت نہیں کہ آپ حضرات کو — جو آج ہی ہمارے خاندان میں
...ب ہو جانے والے تھے — میں نے عرض کیا ہو جانے والے تھے۔
...ے" پر زور دے کر)

(سب حیران ہو کر ایک دوسرے کا منہ تکتے ہیں۔ ناصر اپنا سہرا
ہٹا دیتا ہے)

بڑے میاں: یہ آپ کیا فرما......

عطیہ: ٹھہرئیے، ٹھہرئیے! بڑے میاں! ذرا میری بات سنیئے! میں
دولھن کا ایک پیام لائی ہوں!

(سب ایک دوسرے کی طرف گھبرا گھبرا کر دیکھتے ہیں)

ایک بڑے میاں: کیا معنی اس کے، یعنی ہماری توہین —

عطیہ: جی نہیں! توہین کا کوئی موقعہ نہیں! توہین صرف معززین کی
ہوا کرتی ہے! جس کی گرہ میں کچھ نہ ہو اس سے کوئی کیا چھینے! گفتگو صرف
ایک ذرا سے معاملہ کی ہے —

بڑے میاں: اب کیسی گفتگو! — یعنی

عطیہ: یعنی وائی رہنے دیجئے! ایک عورت کو اپنی مقدس اور محترم ذات
شریف سے دو باتیں کر لینے دیجئے! آپ اگر اسی طرح میری بات کاٹتے رہے
تو بس صبح تک بھی دولھن کا پیام نہ پہنچا سکوں گی!

بڑے میاں: مگر ہم —

عطیہ: غصّہ کی حالت میں محفل پر اپنے منہ کا تھوک نہ اڑائیے!

بڑے میاں: مگر ہم —

عطیہ: "ہم" ایک بے معنی لفظ ہے — ایک دھول سے بھری ہوئی
گٹھڑی ہے! — یہ "ہم"! — اس دھول کو اڑا دینے والی ہوا
چلنے والی ہے — میں اب سب کے لئے دولھن کا یہ پیام لائی ہوں
کہ اس کو دولھا اور دولھن والوں کے نسب پر بہت شبہ ہے!

بڑے میاں: یعنی، یہ کیا گفتگو ہے آپ کی؟ — ہم

عطیہ: پھر وہی ہم! — کہہ تو دیا کہ دولھن مجہول النسب دولھا سے
نکاح کرنا نہیں چاہتی۔

بڑے میاں: یعنی؟

عطیہ: یعنی یہ کہ دولھن کو معلوم ہو چکا ہے کہ ناصر میاں کی تیسری پشت
میں — یعنی دولھا میاں کے نانا کے دادا نو مسلم تھے، اس لئے —

سب پرس

بڑے میاں : (بگڑکر، بآواز بلند) ہم نہیں سن سکتے یہ توہین آمیز اشارات! حسب ونسب کے متعلق! اسلام نے حکم دیا ہے کہ نسب اسی کا اچھا جس کے اعمال اچھے ہوں!

عطیہ : اعمال! ذرا وہ بھی سن لیجئے! آپ میں سے ایک صاحب تو وہ ہیں — حضرت مولانا — جنھوں نے بلاوجہ دو بیویوں کو طلاق دی، ایک صاحب وہ ہیں — جناب میر صاحب قبلہ — جن کی بیوی کے مہر اور نان نفقہ کا مقدمہ چل رہا ہے — اور وہ جو خواجہ خضر اس طرف بیٹھے ہیں (اشارہ کرکے) وہ اس مقدمہ میں حلف دروغی کرکے آئے ہیں! اور وہ دولہا کے چچا صاحب — (چاروں طرف دیکھتی ہے) کہاں ہیں وہ جنھوں نے عمر بھر ایک بازاری عورت کو بلا نکاح اپنے گھر میں رکھا — ایک صاحب نے اپنی لڑکی کو محروم الارث قرار دیا! ایک صاحب نے — وہ جو ادھر بیٹھے ہیں! — اپنی ۱۴ سال کی لڑکی کو زبردستی اور صرف دولت کی خاطر ۶۰ سال کے ایک بوڑھے بوالہوس کے حوالہ کیا — اور سنئیے گا اپنے اعمال حسنہ! — یہ نسب آپ کا اور یہ اعمال آپ کے!!

(سب لوگ اٹھ کھڑے ہوتے ہیں۔ کوئی اپنا عصا سنبھال لیتا ہے، کوئی عمامہ درست کرتا ہے، کوئی قبا کے دامن جھاڑتا ہے — ناصر ابھی تک بیٹھا ہوا ہے)

عطیہ : ٹھہرئیے! میں کہتی ہوں کہ آپ جا نہیں سکتے! میری لڑکی نے جس کو آپ بیاہنے آئے تھے یہ کہا ہے کہ آپ سب بازاری لفنگے ہیں جو بے گناہ عورتوں کی زندگی سے کھیلا کرتے ہیں — جانور ہیں —

(سب بوڑھے بڑبڑا رہے ہیں!)

ایک بڑے میاں : لاحول ولاقوۃ —

عطیہ : خاموش! تم سب نے عورت کو اپنی ہوس کا کھلونا بنا لیا ہے، اور جیسے اس کے بزرگ ویسا ہی ناصر بھی ہے! —

بڑے میاں : (بگڑکر) بس معاف کیجے، ہم سننا نہیں چاہتے۔

عطیہ : سننا چاہو یا نہ چاہو، سننا تو پڑے گا! شرافت اور نسب کے دعویدارو! میں نے اور میرے شوہر نے تم سب کو صرف اسی لئے آج یہاں آنے کی ترغیب دی تھی کہ تم کو ذلیل کرکے اسی ذلیل عورت کے دروازے سے اٹھایا جائے، جس کو تم نے سالہا سال اس کے جائز حقوق سے محروم... جس کی زندگی کو تم نے تلخ کردیا — اب اسی تلخی کا ایک گھونٹ پیتے جاؤ!

ایک بڑے میاں : استغفراللہ!

دوسرے : لاحول ولا —

تیسرے : انا للہ —

عطیہ : استغفراللہ، دل سے کہو، شاید خدا تمھارے گناہ معاف کر... لاحول تم اپنے اعمال سیاہ پر پڑھو، اپنے بھائی شیطان کے نام پر! انا للہ اپنی مردہ روحوں کے لئے کہو، جو خدا کرے جلد دنیا کی آل... سمیٹ کر وہاں جائیں جہاں ان سے حساب مانگا جاتا ہے!!

بڑے میاں : ہم اب نہیں ٹھہر سکتے یہ تمام بیہودہ باتیں سننے کے...

عطیہ : (مسکراکر) غلہ جب پھٹکا جاتا ہے تو خالی اور خراب... ہوا اڑا کرلے جاتی ہے — جائیے، تشریف لے جائیے — نسب کی جھنڈیاں ہلانے والے! اموزی — مکار!!

(ناصر کی طرف اشارہ کرکے)

اٹھو دولہا میاں! گھر کو سدھارو، ممکن تھا کہ یہی جواب تم کو دیدیا جاتا مگر ہم ان بڑے صاحبوں کی ذلت اور رسوائی کی لذ... سے محروم رہ جاتے! — جاؤ اپنے مکروفریب کی پونجی کسی اور... میں لے جاؤ! — ہمارے گھر اس کا نرخ بہت گرا ہوا ہے!

سب بوڑھے براتی : (ناصر کا ہاتھ پکڑکر کھینچتے ہوئے)

ایک : اچھا دیکھا جائے گا!

دوسرا : اچھا دیکھا جائے گا!

تیسرا : دیکھا جائے گا!

(پردہ گرتا ہے)

قاضی عبدالغفار

مشرقی اور مغربی شاعری کا فرق

شاعری خدا کی دین ہے۔ ہر وہ شخص جسے بات کرنی آتی ہو شاعری نہیں کرسکتا۔ وہی شاعر بن سکتا ہے جس میں شاعری کا فطری طور پر ودیعت کیا گیا ہو۔ اگرچہ شعر سے محظوظ ہونے کی صلاحیت ہر فرزند آدم میں موجود ہے اور ہر بچہ کم و بیش ذوق شعر فطرت سے لے کر پیدا ہوتا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ شاعری قوموں کی مادری زبان کہلاتی ہے۔ ہم نے اکثر خورد سال بچوں کو جن کے توتلی بولی بھی درست نہیں ہوتے تک سے تک ملاتے اور بے معنی الفاظ کو وزن میں ڈھالتے سنا ہے اور اکثر ایسا بھی ہوتا ہے عالم اور فاضل اصحاب شعر موزوں نہیں پڑھ سکتے لیکن ان کا مذاق شعر نہایت پاکیزہ ہوتا ہے۔

غرض جس طرح یہ بات مسلم ہے کہ شاعری اکتسابی یا درسی علم نہیں بلکہ ذوقی اور وہبی مادہ ہے۔ اسی طرح اس سے بھی انکار نہیں کیا جا سکتا کہ شعر یا کلام موزوں ہر ذہن کو متاثر کرنے کی صلاحیت رکھتا ہے۔ شعر میں ایک ایسا عالمگیر اثر ہے جو جاہل عالم، بڑے اور چھوٹے سب کے دلوں کو لبھاتا ہے۔ اعشیٰ، ابوالحسن، رودکی، لارڈ بائرن، ورسولن وغیرہ کی اعجاز نما شاعری کی مثالوں کو چھوڑ کر بھی دیکھا جائے تو جو کیف اور اثر قلب انسانی میں ایک شعر پیدا کرتا ہے وہ نثر کے ایک صفحہ سے ممکن نہیں۔ شاعری انسانی روح کی غذا ہے۔ جس طرح اچھی غذا کے بغیر جسم انسانی جیسا کہ چاہیے بالیدہ نہیں ہوتا اسی طرح فنون لطیفہ سے بے نیاز رہ کر روح انسانی کی لطافتیں خوابیدہ رہتی ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ انسان نے نثر سے پہلے نظم کہنی سیکھی یا فطرت نے سب سے پہلے کلام موزوں عطا کیا ہے کیونکہ اس کے بغیر اس عالم کون و فساد کی ہنگامہ آرائی بھی بے کیف نظر آتی۔

جس طرح شعر کی اثر آفرینی اور شاعری کا ذوقی ہونا دو مسلمہ نظریے ہیں۔ اسی طرح ہمیں یہ بھی ماننا پڑے گا کہ ایک خطۂ ملک کے محسوسات و تاثرات شاعری دوسرے خطۂ زمین سے جدا گانہ ہوتے ہیں۔ سر والٹر اسکاٹ نے درحقیقت بہت ہی سچ کہا ہے کہ دنیا کی تمام ملکوں کی شاعریاں بھی یکساں نہیں ہیں بلکہ ان میں کچھ نہ کچھ فرق ایسا ضرور ہے جس سے وہ ایک نہیں کہی جا سکتیں۔ ظاہر ہے کہ جب عالم کی افراد میں یکسانیت نہیں پائی جاتی تو دو مختلف خطۂ زمین کی شاعری جو دنیا کے دو مختلف سمتوں میں واقع ہیں کیونکر یکساں ہو سکتی ہے۔ چنانچہ مشرقی اور مغربی شاعری میں جو بعد المشرقین نظر آتا ہے اس کا سبب بھی یہی محرکات و تاثرات کا افتراق ہے۔

ایشیائی شاعری اور خصوصاً اردو شاعری برسوں سے مطعون ہے۔ چنانچہ مولانا حالی نے بھی اپنے مقدمۂ شعر و شاعری میں اس پر بہت کچھ لے دے کی ہے اور وہ اس کو اس سے بھی بہت زیادہ قابل ملامت سمجھتے ہیں چنانچہ آپ نے آخر میں فرمایا ہے۔

"اگرچہ اردو شاعری کی حقیقت ظاہر کرنے کے لئے اس بات کی نہایت ضرورت تھی کہ مشہور اور مسلم الثبوت شاعروں کے کلام پر صراحتہً نکتہ چینی کی جائے۔ کیونکہ عمارت کا بودا پن جیسا بنیاد کی کمزوری سے ثابت ہوتا ہے ایسا اور کسی چیز سے ثابت نہیں ہوتا مگر صرف اس خیال سے کہ ہمارے ہم وطن ابھی اعتراض سننے کے عادی نہیں ہیں۔ بلکہ تنقید کو تنقیص سمجھتے ہیں۔ یہاں تک

ہوسکتا ہے اس مضمون میں کسی خاص شاعر کے کلام پر کوئی گرفت یا اعتراض اس طرح نہیں کیا گیا جو خاص اس کے کلام سے خصوصیت رکھتا ہو بلکہ شاعری کے عام طریقہ پر اعتراض کر کے مثال کے طور پر جس کسی کا کلام یاد آیا ہے نقل کر دیا ہے۔"

مولانا حالی کی عظیم المرتبت شخصیت سے کس کو انکار ہوسکتا ہے۔ یہ دنیائے ادب اردو کا وہ پیشوا ہے جس نے اردو شاعری کی کایا پلٹ دی۔ اور وہ ہادی عیسیٰ دم ہے جس کی قُم نے اسلام کے مردہ قالب میں تازہ روح پھونک دی یہی بات جو خدمت اسلام کی حالی کے "مد وجزر اسلام" نے کی دوسرے مسلمان شعرا کے پورے پورے ضخیم دیوان بھی نہ کر سکے چنانچہ سر سید نے فرمایا تھا کہ جب مجھ سے بارگاہ خداوندی میں پوچھا ہوگی کہ کیا لائے آیا ہے تو جواب دوں گا کہ حالی سے مسدس لکھوا لایا ہوں لیکن ان تمام احسانات اور خوبیوں کے اقرار کے ساتھ اس سے بھی انکار نہیں کیا جا سکتا کہ مولانا نے مقدمہ شعر و شاعری میں جو اعتراضات اردو شاعری اور خصوصاً اردو تغزل پر کئے ہیں وہ سب کے سب قابل قبول نہیں ہیں۔ مولانا حالی نے اکثر انھیں خیالات کا اظہار کیا ہے جو ورڈس ورتھ نے (WORDSWORTH) لریکل بیالڈز (LERICAL BALLADS) کے مقدمے میں پیش کئے ہیں چاہے مقدمۂ شعر و شاعری لریکل بیالڈز کے مقدمے کو دیکھ کر یا سن کر لکھا گیا ہو یا نہیں لیکن شاعری کے جس معیار کی اس میں سفارش کی گئی ہے وہ یقیناً کم و بیش وہی ہے جو مغربی شاعری کا ہوتا ہے۔ اور وہ ایک ایسا راستہ ہے جس پر مشرقی شاعر کا پاؤں قدم قدم پر لڑکھڑا تا ہے غرض اردو شاعری پر اور خصوصاً تغزل پر مغربی ادب پرستوں کا ایک عام اعتراض یہ ہے کہ اس کی شاعرانہ رنگینیاں مصنوعی ہوتی ہیں اور اس کی سحر کاریاں جھوٹی اس کو حقیقت سے کوئی لگاؤ ہوتا ہے نہ واقعہ نگاری سے کوئی سروکار چنانچہ ان کی کوشش اور تمنا ہے کہ مشرقی شاعری کا معیار گھٹ کر یا بڑھ کر بن کر یا بگڑ کر جس طرح بنے مغربی معیار شاعری سے بھڑ جائے تو وہ گنگا نہائیں کیونکہ ان کے خیال میں یہی معراج شاعری ہے اس لئے آج کل عام طور پر یہی دیکھا جاتا ہے کہ مقالہ نگار یا مضمون نگار نے جہاں شاعری کے کسی پہلو پر قلم اٹھایا مغربی شعرا کے دو چار مقولے موٹے موٹے الفاظ میں نقل کر دئے جیسے ملٹن کا خیال ہے کہ "اچھا شعر وہی ہے جس میں زور، سادگی اور اصلیت ہو" یا گولڈ اسمتھ کہتا ہے کہ "میری مبنی بر اصلیت نظمیں ہی میرے لئے باعث فخر و ناز ہیں" چنانچہ وہ اپنی نظم سے یوں مخاطب ہوتا ہے "اے میری پیاری نظم تو محفل میں لوگ تجھ پر لے دے کرتے ہیں لیکن جب میرے پاس کوئی نہیں ہوتا تو تجھ پر گھمنڈ کرتا ہوں" وغیرہ وغیرہ اس میں کوئی شک ہی نہیں کہ اقصائے عالم کے مفکرین و مدبرین کے اقوال نقل کرنے سے ضرور قارئین و ناظرین کو استفادہ پہونچتا ہے اور یہی وہ طریقہ ہے جس سے معمولی دماغ غیر معمولی دماغوں کے نتائج فکر سے روشناس ہوتے ہیں لیکن مشرق میں رہ کر مغرب کی گانا یا زمین کے سکے آسمان میں چلانا محال نہیں تو مشکل ضرور ہے۔

مغربی شعرا کے خیالات مغرب ہی کے لئے موزوں ہیں جہاں زیادہ تر مادہ، اصلیت، اور عمل سے بحث رہتی ہے۔ ان کے نتائج افکار ان ذہنیتوں پر کس طرح منطبق ہو سکتے ہیں جنھوں نے روحانی فضا میں نشو و نما پائی ہو تخیل کے پروں پر اڑتے ہوں اور باطنی عالم میں کھوئے ہوئے ہوں چنانچہ ان دونوں سرزمینوں کا فرق یورپ کا ایک عالم نفسیات ولیم شاہ اپنی کتاب "اپنے نفس کی شناخت" (KNOW YOUR OWN MIND.) میں (جس کا ترجمہ مولوی علی اکبر صاحب

غالب نام تعلیمات نے کیا ہے ، اس طرح بیان کرتا ہے ۔
"سیاحوں کا بیان ہے کہ برما کے جوگی دھوپ میں آسن جما کر مذہبی رموز کا مراقبہ کیا کرتے ہیں اور دنیا کی ان کو مطلق پروا نہیں ہوتی لیکن مغربی ممالک میں بلحاظ آب و ہوا یہ دشوار ہے کیونکہ اس معاملہ میں اس سرزمین پر خدا کی مار ہے ۔ علاوہ ازیں کسب معاش میں یہاں بہت دشواریاں پیش آتی ہیں نتیجہ یہ ہے کہ سفید اقوام عملی پہلو پر زیادہ زور دیتی ہیں اور عمل دنیا سے الگ ہو کر اعلیٰ ذاتی صفات کے حاصل کرنے اور گہرے غور و فکر کی زندگی بسر کرنے کا رواج ہمارے ہاں سے اٹھ گیا ہے بلکہ اس کو ہم کم و بیش حقارت کی نظر سے دیکھنے لگے ہیں"
ولیم مکالا ور مغرب کے سطحی پن اور عملی ذہنیت کی وجہ کسب معاش کی دشواریوں کو قرار دیتے ہیں آہ انھیں کیا خبر کہ غریب مشرقی کس طرح مر مر کر جیتے ہیں ۔ بہر حال چاہے یہ خدا کی مار ہو یا خدا کا فضل مغرب اور مشرق کی ذہنیتوں میں بہت بڑا فرق ہے اور اس افتراق کا ذمہ دار ارث اور ماحول ہے نہ اقتصادی پستی ۔ اور ایک وسیع النظر نقاد سخن کو ان ہی اختلافات کی روشنی میں ان کے کمال کو جانچنا چاہیے ۔
اس میں کوئی شک نہیں کہ انگریزی نظم کی وہ صنف جس کو لرک (LERIC) کہتے ہیں اپنے اندر ایسے گوناگوں تنوعات رکھتی ہے جو اردو تغزل میں موجود نہیں مشرقی اور مغربی شاعری کے رجحانات ان کے افکار و تخیل کی خصوصیات اور ان کے ارتقا کے اسباب پر غور کرنے کے بعد اس اعتراض کی اہمیت جو مغربی ادب پرستوں کو مشرقی شاعری پر ہے بہت کچھ گھٹ جاتی ہے ۔
مشرقی شاعری کی خصوصیت موضوعی (SUBJECTIVE) اور باطنی کیفیات پر مبنی ہے ۔ اس کی دنیا زیادہ تر موضوعی ہوتی ہے ۔ وہ اپنے باطن کے عالم رنگ و بو کی رنگینیوں میں کچھ ایسا غرق ہوتا ہے کہ دنیائے واقعیت (REALISM) سے دور جا پڑتا ہے اور حقیقت میں اس کے خیال کو پرواز اور اس کی موضوعیت (SUBJECTIVITY) کی نزاکت ہی اس کا کمال شاعری ہے ۔ مشرقی شاعر فطرتاً تصوریت پسند (IDEALIST) ہوتا ہے ۔ اس لئے عام طور پر مشرقی شاعری میں موضوعیت کا عنصر غالب رہتا ہے ۔
(OBJECTIVE)
برخلاف اس کے مغربی فن کاری کی خصوصیت یہ ہے کہ شاعر ایک معروضی عالم میں رہتا ہے ۔ اس کو خارجی عالم سے ایک خاص ربط رہتا ہے وہ مشرقی شاعر کی طرح اپنے باطنی عالم سے متاثر نہیں ہوتا بلکہ اس کو بیرونی دنیا سے گہری دلچسپی رہتی ہے جو مغربی اہل فن کا طرۂ امتیاز ہے ۔ مغربی شاعر واقعیت پسند (REALIST) ہوتا ہے وہ خارجی عالم سے راست اثرات قبول کرتا ہے اور ان بیرونی تاثرات ہی کو خوبی سے ظاہر کرنا مغربی شاعری کا کمال ہے اور یہی وجہ ہے کہ مغربی شاعری میں معروضیت (OBJECTIVITY) کا عنصر نمایاں رہتا ہے ۔
اپنے اس خیال کی تائید میں اگر مشرقی اور مغربی مصوری کی مثال لی جائے اور ان کا تقابل کر کے دکھلایا جائے تو بے موقع نہ ہوگا ۔ مغربی مصوری کے دو بڑے اصناف منظر نگاری (LANDSCAPE -) اور تصویر کشی

(PORTRAIT DRAWING) ہیں۔ ان ہر دو اصناف میں ایک مغربی مصور جس بات کا خاص التزام رکھتا ہے وہ واقعہ نگاری یا واقعیت (REALISM -) ہے منظر نگاری میں خطوط اور رنگوں کے توازن کے ساتھ سب سے بڑا التزام اس بات کا رکھا جاتا ہے کہ واقعیت ہاتھ سے نہ جانے پائے اس خصوص میں جو چیز نمایاں ہوتی ہے وہ پیش کردہ منظر کے نظری (PERSPECTIVE) کی صحت ہے۔ اور یہی چیز واقعیت کی جان ہے اسی طرح تصویر کشی میں بھی مغربی مصور کے پیش نظر انفرادی خصوصیات، جذبات اور سیرت کی صحیح صحیح ترجمانی ہوتی ہے برخلاف اس کے مشرقی مصور منظری زاویوں کے قید و بند سے آزاد نظر آتا ہے۔ بظاہر اس کی مصوری اس قدر ناقص نظر آتی ہے کہ وہ مناظر کو صحیح زاویوں میں بھی نہیں بتا سکتا اور ایسا معلوم ہوتا ہے کہ وہ مناظر و سراپا کے معمولی قواعد سے بھی ناآشنا ہے۔ اسی طرح مشرقی تصویر کشی (PORTRAIT) میں بھی انفرادی خصوصیات، جذبات اور سیرت نگاری مفقود نظر آتی ہے۔

پس ظاہر بین نظریں کہہ سکتی ہیں کہ مشرقی مصوری ناقص ہے اگرچہ حقیقت شناس جانتا ہے کہ ایک مشرقی فن کار کے لئے پابندئ رسم و آئین ایسی ہی ضروری ہے جیسے مذہبی رسوم کی۔ کوئی ماہر فن فن کار کے اپنے معیار سے جانچے تو ان بے رنگ تصویروں میں اک عالم رنگ و بو نظر آئے گا اور معلوم ہوگا کہ اس کے نزاکت خیال، معنی آفرینی اور موضوعی کیفیات میں کتنی گہرائیاں ہیں اور اس باکمال مصور نے خارجی دنیا سے الگ رہ کر حسن اور معنی کے کیسے کیسے دریا بہائے ہیں۔ یہی ظاہر بینی ہے کہ اجنٹہ کی مصوری، ایلورہ اور پالم پیٹھ وغیرہ کی نازک اور حسین بت تراشی کے معنوی پہلو اور خیال آفرینی کو ایک عامیانہ نظر سے جانچنے والا محسوس اور معلوم نہیں کر سکتا۔

پس جب ہر دو صاحبانِ فن کے موضوع ہی الگ ہیں۔ رجحانات اور محرکات ہی الگ ہیں یہاں تک کہ دونوں کا مطمح نظر بھی جدا جدا ہے تو چاہیئے کہ دونوں کے کمال کو پرکھنے کی کسوٹیاں بھی جدا جدا ہوں ورنہ اگر ایک فن کاری کی کسوٹی پہ دوسرے فن کو جانچا جائے تو ہر صاحب شعور سمجھ سکتا ہے کہ اس کے حسن و قبح کا کس قدر اندازہ لگ سکے گا اور اگر تھوڑا بہت بھی جانے تو وہ کس حد تک درست ہوگا۔

اس لئے عقل کا تقاضا ہے کہ مغربی اور مشرقی شاعری کو ان کے اپنے معیار پر جانچا جائے ورنہ ایک کے معیار پہ دوسرے کو جانچ کر اس کے حسن و کمال کو پامال کرتے ہوئے اور اس کی خصوصیات اور نزاکتوں کو نظر انداز کر کے اس کے حسن و قبح کا غلط اندازہ لگانا کسی صاحب فہم کے پاس قرین انصاف نہیں ہو سکتا۔

لطیف النساء بیگم (بی اے)

جواب الجواب

شعر۔ یوں اس طرح تڑپ کر میں بیقرار رویا — دشمن بھی چیخ اٹھا بے اختیار رویا

اعتراض۔ من بیقرار کا ترجمہ "میں بیقرار" صحیح نہیں اس لئے کہ فارسی ترکیب میں لفظ "من" مضاف واقع ہوا ہے۔

جواب۔ من بیقرار میں "من" مضاف نہیں ہے موصوف ہے ترکیب اضافی نہیں توصیفی ہے ع

میں الزام ان کو دیتا تھا قصور اپنا نکل آیا

جواب الجواب۔ مجیب نے یہ بیان نہیں کیا "میں بیقرار رویا" میں لفظ "بیقرار" کو اس کے ماسبق اور مابعد سے کیا تعلق ہے؟ "میں" اس جملہ میں مبتدا ہے اور "رویا" اس کی خبر؟ لفظ "بیقرار" معلق رہ جاتا ہے۔

"من بیقرار" میں اضافت توصیفی سہی؟ لیکن اردو میں صفت مقدم ہوتی ہے اور موصوف موخر؟ مصرع۔ یوں ہوتا:۔

کچھ اس طرح تڑپ کر بیقرار زار رویا

تو ترکیب درست اور مصرع بامحاورہ ہوجاتا۔

شعر۔ آیا ہے بعد مدت بچھڑے ہوئے ملے ہیں — دل سے لپٹ لپٹ کر غم بار بار رویا

اعتراض۔ دونوں مصرعوں میں زمانہ کا تطابق الفاظ سے صحیح نہیں ہے۔ ردیف رویا کی بجائے روتا ہے چاہیے۔

جواب۔ ماضی مطلق کبھی حال کے معنی دیتی ہے مثلاً ناسخ فرماتے ہیں ؎

خانۂ عاریتی میں جو درم بھرتے ہیں — عقل سے مجھ کو نظر آئے وہ انساں خالی

یعنی ایسے لوگ مجھ کو عقل سے خالی نظر آتے ہیں۔

جواب الجواب۔ مجیب نے جس قاعدہ کا ذکر کیا ہے اور مصباح القواعد سے ناسخ کا جو شعر نقل کیا ہے اس میں "بھرتے ہیں" (حال مطلق) کے مقابلہ "آئے" (ماضی مطلق) حال کے معنی پر استعمال ہوا ہے۔ لیکن فانی کے شعر میں "آیا ہے ملے ہیں" (ماضی قریب) کے مقابلہ میں "رویا" ماضی مطلق، حال کے معنی پر استعمال ہوا ہے۔ اس لئے ناسخ کا شعر نہ مفید ادعا ہے نہ محل استشہاد؟؟

شعر۔ کیا اس کو بیقراری یاد آگئی ہماری — مل مل کے بجلیوں سے ابر بہار رویا

اعتراض۔ دونوں مصرعوں میں ربط نہیں پر کیونکہ پہلے مصرع میں کیا حرف استفہام ہے اس لئے دوسرے مصرع میں مل مل کی جگہ کیوں مل چاہیے۔

جواب۔ کیا یہ قاعدہ ہے کہ جب پہلے مصرع میں استفہام ہو تو دوسرے مصرع میں کیوں ہونا ضروری ہے تاکہ ربط ہوجائے دیکھئے غالب کا شعر ہے ؎

کب وہ نمرود کی خدائی تھی — بندگی میں مرا بھلا نہ ہوا

مطلب سنئے تو ربط بھی معلوم ہوجائے گا شاعر اپنے نزاکت تخیل کی بنا پر بجلی کے کوندنے اور موسم بہار میں پانی برسنے پر حسن تعلیل صرف کرگئے ہیں کہ یہ موسم بہار کا بادل جو بجلیوں سے گویا مل مل کر زار زار رو رہا ہے تو کیا اسے ہماری بیقراری یاد آگئی جو اس کی یہ حالت ہے۔

جواب الجواب۔ غالب کے شعر میں حرف "کیا" بتعلق مصرع ثانی استعجابیہ ہے فانی کے شعر میں "کیا" بتعلق مصرع ثانی استفہامیہ ہے اس لئے غالب کے شعر سے استدلال غلط ہے۔

شعر۔ آیا کہ دل گیا کوئی پوچھے تو کیا کہوں — یہ جانتا ہوں دل ادھر آیا ادھر گیا

اعتراض۔ اس شعر میں دل آنا کس معنی میں استعمال ہوا ہے اگر لغوی معنی میں استعمال ہوا ہے (مثال چھوڑ کر) یعنی ادھر آیا ادھر گیا اگر دل کا آنا مجازاً عاشق ہونا کے معنی میں استعمال ہوا ہے تو جب بھی ادھر آیا ادھر گیا سے کیا مراد ہے۔

جواب۔ شعر کی توضیح ملاحظہ فرمائیے پھر آنا جانا معلوم ہوجائے گا۔

دل آیا۔ کسی کی محبت ہوئی کسی پر طبیعت آئی۔ دل گیا۔ دل پہلو سے چلا گیا یعنی ادھر کسی پر طبیعت آئی ادھر دل پہلو سے نکل کر پرایا ہوگیا مطلب یہ ہے کہ اگر کوئی مجھ سے پوچھے کہ بتاؤ دل آیا یا گیا تو میں اس کا کیا جواب دوں میں جانتا ہوں یہی کہدوں گا کہ ادھر کسی پر میری طبیعت آئی ادھر میرے پہلو سے میرا دل چلا۔

جواب الجواب۔ "ادھر آیا ادھر گیا" یہ اردو کا محاورہ ہے جس کے معنی ہیں،

"جانے میں کچھ دیر نہیں لگتی" جیسے :-

نہ تھی یہ خبر ہم کو اب کے بہار ادھر آئے گی اور اُدھر جائے گی

اور مطلق "ادھر" کے معنی اس طرف اور "اُدھر" کے معنی اُس طرف ہیں۔

اب (مثال مندرجۂ اعتراض کے ساتھ) شعر زیر بحث کے معنی اور مجیب کی تاویلات قابل غور ہیں۔

شعر ۵ - شاید کہ شام ہجر کے مارے بھی جی اٹھے صبح بہار حشر کا چہرا اتر گیا!

اعتراض ۵ - جی اٹھے یہ الفاظ صاف بتلا رہے ہیں کہ شام ہجر کے مارے "کشتگان شام ہجر" کے معنی میں استعمال ہوا ہے لیکن اردو میں اس کے معنی ہیں "وہ لوگ جن کو شام ہجر نے ستایا ہے" جیسے مصیبت کا مارا جو مصیبت زدہ کا ترجمہ ہے۔ کشتۂ مصیبت کا نہیں۔

جواب - مارا کے معنی فرہنگ آصفیہ میں ہیں مقتول قتل شدہ، کشتہ، جان دادہ۔ مذبوح، ذبح شدہ۔ پھر ہجر کے مارے کا ترجمہ ہجر کا ستایا ہوا۔ آپ مصیبت کے مارے پر قیاس کرتے ہیں اور اس سے مصیبت زدہ معنی لیتے ہیں اور کشتۂ مصیبت نہیں کہتے صحیح ہے مگر ہر جگہ ایسا نہیں ہے مارا کے معنی کشتہ اور مقتول کے بھی لغت میں ہیں تو پھر ہجر کے مارے کا ترجمہ کشتۂ ہجر کہنے میں کیا قباحت ہے۔ مارا کے معنی ڈسا ہوا۔ گزیدہ اور کشتہ کے ہو سکتے ہیں جیسے سالک کا شعر ہے ؎

وہ سر دھرماں تری نظروں میں ہے گویا پانی بھی مانگتا نہیں مارا نگاہ کا

اب نگاہ کے مارا کا ترجمہ کشتۂ نگاہ صحیح ہے یا ستایا ہوا نگاہ کا درست ہے میرے خیال میں جو نگاہ کا مارا پانی تک نہ مانگے اس کے کشتہ اور مقتول ہونے میں کیا شبہ ہو سکتا ہے ایسے ہی ہجر کا مارا یعنی کشتۂ ہجر مراد لیں تو کیوں غلط؟ سمجھ میں نہیں آتا!

جواب الجواب - حیرت ہے کہ مجیب نے بحوالۂ فرہنگ آصفیہ "مارا" کی سند تو پیش کی لیکن "مارے" کا لفظ جو معرض بحث میں ہے اس کے متعلق کیوں سکوت اختیار کیا؟ "مارے" کے متعلق اسی فرہنگ میں یہ عبارت مرقوم ہے :-

"شامت کے مارے نے پھر قصور کیا یعنی شامت زدہ نے" لہذا سالک کے

شعر سے اعتراض رفع نہیں ہو سکتا۔

شعر ۱ - فانی کی ذات سے غم ہستی کی تھی نمود شیرازہ آج دفتر غم کا بکھر گیا

اعتراض ۱ - پہلے مصرع میں غم ہستی کا ذکر ہے دوسرے میں غم کی تخصیص نہیں اور یہ واضح نہیں ہوتا کہ دفتر غم آیا ہستی کا ہے یا عشق و ہوس کا۔

جواب - شعر کا مطلب لکھنے سے واضح ہو جائے گا کہ کونسا غم ہے کہتے ہیں فانی کی زندگی تک دنیا کا غم بھی نمایاں رہا آج دیکھو اس کے بعد دفتر غم شیرازہ بکھرا ہوا نظر آتا ہے یعنی غم عالم اس کے ساتھ ساتھ تھا اور غم کا ساتھی اب نہ وہ موجود ہے نہ غم کا پتہ۔

جواب الجواب - مجیب کی ترجمانی اور شاعر کے پیرایۂ بیاں میں کوئی مطابقت ربط نہیں ہے۔ مابہ البحث شعر کے مصرع اولیٰ سے ثابت ہے کہ غم ہستی ذات فانی سے وابستہ ہے اور مصرع ثانی میں مطلق "دفتر غم" کا بکھر جانا بیان کیا گیا ہے۔ لہذا "غم ہستی" کو "دفتر غم" سے کیا تعلق باوجود اس سرگرم ترجمانی کے واضح نہیں ہوتا۔

شعر ۶ - ہزار ڈھونڈیے اس کا نشاں نہیں ملتا جبیں ملے تو ملے آستاں نہیں ملتا

اعتراض ۶ - "جبیں ملے تو ملے" اس سے کیا مراد ہے۔ جبیں تو آستانۂ ہر متلاشی کے ساتھ ہے۔

جواب - جبیں ملے تو ملے یعنی پیشانی تو موجود ہے جیسے کہتے ہیں خدا ملے تو ملے مگر روزگار نہیں ملتا یعنی خدا تو موجود ہے اس کا ملنا مگر ملازمت غیر موجود اور اس کا ملنا عنقا ہے۔ مطلب یہ ہے کہ جبیں تلاش کرو خدائے بے نشان کا پتہ ملتا ہی نہیں پیشانی تو نشان ہے مگر اس کے آستانے کو لاکھ ڈھونڈو کہیں پتہ نہیں۔ شعر میں ہے سمجھ میں نہیں آتا کہ اعتراض سے کیا مقصود ہے اور یہ متلاشی آپ نے کہاں سے تراشا محققین کی رائے ہے کہ متلاشی بمعنی تلاش کرنے والا محض غلط ہے کیونکہ عربی قاعدہ یہاں جاری نہیں ہو سکتا۔

جواب الجواب - مجیب کی خود ساختہ توجیہات سے قطع نظر "جبیں" کے متعلق جو میسر ہے "ملے تو ملے" کہنا قطعاً بے معنی اور مہمل ہے۔ مصرع اس طرح درست ہو سکتا ہے :- "جبیں ملی ہے مگر آستاں نہیں ملتا"

اس اصلاح سے اعتراض کی اہمیت واضح ہوجاتی ہے۔ مجیب کا اعتراض لفظ "ستلاشی" پر بھی ہے؛ واضح رہے کہ بعض فارسی الاصل الفاظ کو عربی قاعدہ کے تحت اساتذہ نے استعمال کیا ہے جیسے "مششدر" ظہیر فاریابی:۔ بر بساط امرا و نقش مششدر یافتند۔

"ستلاشی" زند ہے۔ ستلاشی تیرے، افلاک کے ستارے ہیں۔

شعر۔ چشم ساقی اثر مے سے نہیں ہیں گلرنگ دل مرے خون سے لبریز ہے پیمانے کا

اعتراض۔ پیمانے کو دل کا مضاف الیہ قرار دینے کے بجائے اگر یوں کہا جاتا کہ پیمانہ میرے دل کے خون سے لبریز ہے تو شعر بامعنی اور تشبیہ کامل ہوتی۔

جواب۔ شعر بامعنی ہے اور تشبیہ اب بھی کامل ہے۔ دل کا پیمانہ اضافت مجازی ہے چشم ساقی کو پیمانے سے تشبیہ دی ہے اور مے کو خون سے گلرنگ۔ وجہ شبہ ہے۔

مطلب یہ ہے کہ کہیں یہ نہ سمجھ لینا کہ ساقی کی آنکھیں شراب پینے سے گلرنگ (لال) ہوگئی ہیں بلکہ یہ پیمانے ہیں جو میرے خون سے چھلک رہے ہیں۔

جواب الجواب۔ شاعر تو کہتا ہے "پیمانے کا دل" اور مجیب کہتا ہے "دل کا پیمانہ" یہ عجیب اخلاص مندانہ تعبیر ہے؟

شعر۔ لوح دل کو غم الفت کو قلم کہتے ہیں کُن ہے انداز رقم حسن کے افسانے کا

اعتراض۔ غم کو قلم سے تعبیر کرنا عجیب وغریب ہے، اور "کو" کی تکرار بھی مخل فصاحت ہے! کُن ایک کلمۂ لفظی ہے اسی لحاظ سے انداز رقم کی جگہ انداز بیان زیادہ موزوں تھا۔

جواب۔ غم کو قلم سے اس لئے تعبیر کیا ہے کہ قلم کی روسیاہی مشہور ہے اور اسود الصحائف (جس کے نامۂ اعمال زیادہ سیاہ ہوں) دو "کو" مصرع میں آگئے تو آپ مخل فصاحت خیال کرتے ہیں حالانکہ ایک استاد نے پانچ "کو" ایک مصرع میں جمع کردیے ہیں۔

گوشۂ کنج تنہائی میں ہم مونس سمجھتے ہیں! الم کو یاس کو حسرت کو بیتابی کو حرماں کو

انداز رقم "انداز بیان سے اس لئے بہتر ہے کہ وہ لوح قلم کی مناسبت سے لایا گیا ہے۔ افصح اور فصیح سے بحث نہیں مطلب یہ ہی کہ کلام غلطی سے پاک ہے۔

جواب الجواب۔ بقول مجیب "قلم" تو روسیاہ ٹھیرا اگر "غم" بھی روسیاہ اور ہم رنگ عصار موسیٰ ہوتا تو تشبیہ تمام ہوجاتی۔ "کو" کی تکرار کا تعلق ذوق سلیم سے ہے، شمار سے نہیں۔

شعر۔ زندگی بھی تو پشیماں ہے یہاں لا کے مجھے! ڈھونڈھتی ہے کوئی حیلہ مرے مرجانے کا

اعتراض۔ پہلے مصرع میں بھی کے بعد تو کا لفظ زائد اور مخل فصاحت ہے بھی تو کے بجائے لفظ آپ چاہئے۔ علاوہ بریں مصرع ثانی کی ترکیب بھی مہمل ہے کیونکہ کسی کے مرجانے کا حیلہ کوئی نہیں ڈھونڈتا البتہ مارڈالنے کے لئے حیلہ درکار ہے۔

جواب۔ پہلے مصرع میں بھی کے بعد تو زائد اور بیکار نہیں ہے حسن کلام اور تاکید کے لئے تو آتا ہے مثلاً داغ کا شعر ملاحظہ ہو ؎

معجزہ حضرت عیسیٰ کا غلط بھی تو نہیں ورد اٹھتا ہے وہ کہتے ہیں اگر قم مجھ کو

دوسرے اعتراض کا جواب کہ مرجانے کا حیلہ کوئی نہیں ڈھونڈتا جب کوئی مارڈالنے کی طاقت نہیں رکھتا تو چاہتا ہے کہ کسی طرح خود ہی مرجائے اور مارڈالنے کا حیلہ اس وقت درکار ہوگا جب خود میں مارڈالنے کی طاقت ہو۔

آپ کی اصلاح سے دو "پ" ایک جگہ جمع ہوکر کانوں پر گرانی پیدا کرتے ہیں۔

جواب الجواب۔ داغ کے شعر میں حرف "تو" تاکید کے معنی پر استعمال ہوا ہے یعنی عیسیٰ کا معجزہ ہرگز ہرگز غلط نہیں، مجھ کو جب وہ قم کہتے ہیں تو درد اٹھتا ہے۔ فانی کے شعر میں "تو" بیکار ہے اور بھی کا لفظ مخل معنی؟

اسی سے یہ مفہوم ہوتا کہ "زندگی" کے علاوہ کوئی اور بھی "پشیمان" ہے۔ اصلاح پر اعتراض صحیح نہیں، بقول مجیب مومن کی وہ غزل جس کا یہ مطلع ہے:۔

دکھاتے آئینہ ہو اور مجھ میں جان نہیں
کہو گے پھر بھی کہ میں تجھ سا بدگمان نہیں

قافیہ اور ردیف میں دو "نون" ایک جگہ جمع ہوجانے کی وجہ سے مہمل ہوجائے گی؟

نیز "حیلہ ڈھونڈتا" کے متعلق جو عجیب وغریب تاویلات کی گئی ہیں وہ لاجواب ہیں۔

نواب عزیز یار جنگ بہادر

تنقیدِ باقیاتِ فانی کا جواب (بہ سلسلۂ گذشتہ)

شعر [۱۱]

اب اسے دار پہ لیجا کے سلادے ساقی یوں بہکنا نہیں اچھا ترے دیوانے کا

اعتراض [۱۱]۔ یہ نہیں معلوم ہوتا کہ دار پر سلانے کی زحمت ساقی کو کیوں دی جا رہی ہے؟ اور دار پر سلانا کس معنی میں استعمال ہوا اگر سولی دینا کے معنی میں استعمال ہوا تو یہ غلط ہے اس مفہوم کو ادا کرنے کے لئے اردو میں دار پر چڑھانا مستعمل ہے۔

جواب۔ ساقی کو دار پر سلانے کی زحمت اس واسطے دی جا رہی ہے کہ اس کا شراب پلایا ہوا متانا ہے۔ ساقی کو آپ کلال سمجھے ہوئے ہیں۔ شعر کی مٹی پلید کر دی۔ شاعر تو مشہور مثل کی بنا پر کہتا ہے کہ سولی پر بھی نیند آتی ہے وزیر کا شعر ہے ؎

یادِ مژگاں میں مری آنکھ لگی جاتی ہے لوگ سچ کہتے ہیں کہ سولی پہ بھی نیند آتی ہے

مطلب شعر کا یہ ہے کہ چونکہ مشہور ہے کہ سولی پر نیند آتی ہے اس لئے شاعر کہتا ہے کہ اے ساقی (معشوق) تیرا شراب پلایا ہوا متانا (عاشق) نہ جانے کہاں بہکتا پھر رہا ہے یہ اچھا نہیں۔ سولی پر لے جا کر اسے ہمیشہ کی نیند سلا دے وہاں اس کو نیند آ جائے گی

شعر [۱۲]

دل سے پہنچی تو ہیں آنکھوں میں لہو کی بوندیں سلسلہ شیشہ سے ملتا تو ہے پیمانے کا

اعتراض [۱۲]۔ بہتر تو یہ تھا کہ پیمانے کی مناسبت سے صرف آنکھ کا ذکر ہوتا یا آنکھوں کی مناسبت سے پیمانے کی جمع لائی جاتی؟

جواب۔ یہاں دل سے شیشہ کو تشبیہ دی ہے اور آنکھوں سے پیمانہ کو۔ اور تشبیہ میں نقص نہیں ہے۔

مطلب شعر کا یہ ہے کہ چونکہ آنسو۔ خون کا قطرہ۔ اور لہو کا جوہر اور دل خون کا مخزن ہے شاعر کہتا ہے کہ دل سے خون کی بوندیں اس طرح امنڈ کر آنکھوں تک پہونچی ہیں جیسے شراب شیشے سے پیمانہ تک پے در پے پہونچتی ہی رہے۔

شعر [۱۳]

ہڈیاں ہیں کئی لپٹی ہوئی زنجیروں میں لئے جاتے ہیں جنازہ ترے دیوانے کا

اعتراض [۱۳]۔ یہ شعر جو کہ یہ منظر پیش کر رہا ہے وہ محتاج بیان نہیں۔

جواب۔ یہ شعر العشق نار یحرق ما سوی اللہ کی تصویر پیش کر رہا ہے۔

شعر [۱۴]

کہتے ہیں کیا ہی مزہ کا ہے فسانہ فانی آپ کی جان سے دور آپ کے مرجانے کا

اعتراض [۱۴]۔ مرجانا کس معنی میں استعمال ہوا ہے اگر حقیقی معنی میں استعمال ہوا ہے تو مرجانے کے بعد یعنی فوت ہوجانے کے بعد آپ کی جان سے ... یہ تو اس وقت کہتے ہیں جب کوئی حادثہ وغیرہ ابھی وقوع پذیر ... عاشق ہونا کے معنی میں استعمال ہوا ہے تو جب بھی آپ کی جان سے ... ہے۔ اگرچہ مطلق مرجانا عاشق ہونا کے معنی میں استعمال نہیں ہوتا۔

جواب۔ مرجانا اپنے حقیقی معنی میں استعمال ہوا ہے یعنی فوت ہوجانے کے ... اور پھر آپ کی جان سے دور کہنا خرابات نہیں شعر کا مطلب ملاحظہ فرمایئے شاعر کہتا ہے کہ وہ محبوب یہ کہتا ہے کہ اے فانی تمہاری جان سے ... مرجانے کا کیا پر لطف قصہ ہے۔

جان سے دور محاورہ ہے مخلص دوست کہا کرتے ہیں جو مرجانے کا ... لانا برا سمجھتے ہیں۔ جان سے دور اور مرجانے میں لطف آنا۔ یہ دونوں باتیں لا کر محبوب کے اطوار اور کچھ اپنے سے محبت ثابت کرنا مقصود ... اس لئے یہ محاورہ برمحل اور نہایت لطف ریز ہو گیا۔ مطلق مرجانا عاشق ہونے کے معنی میں آتا ہے دیکھئے فرہنگ آصفیہ۔ اگر اس شعر میں مرجانے سے ... ہونے کے معنی مراد لیں تب بھی معنی میں کوئی خرابی نہیں آتی۔

شعر [۱۵]

یاں ہوش سے بیزار ہوا بھی نہیں جاتا اس بزم میں ہشیار ہوا بھی نہیں جاتا

اعتراض [۱۵]۔ بیزار ہونا یعنی ناراض ہونا۔ ملول ہونا۔ ناخوش ہونا۔ یہاں کیا ... مراد ہیں اور اس کو ہوش سے کیا تعلق ہے قطع نظر اس کے جب مصرع اولیٰ ... ہوش سے بیزار ہونے کی نفی کر دی گئی ہے تو شاعر ہشیار قرار پاتا ہے ... مصرع ثانی میں یہ کہنا کہ ہشیار رہوا بھی نہیں جاتا بے معنی ہے۔

جواب۔ یاں اور اس کا مشار الیہ معشوق ہے شاعر اپنی کشمکش کی حالت کو بیان کرتا ہے کہ یار دو عشق ... سے بیزار ہو کر نیچی ہے اور نہ بزم معشوق میں ہوشیار ہی رہ کر کام چلتا ہے یعنی یہی نہیں کہ غفلت ... کوئی کام نکلے اور نہ عقل و ہوش سے کام لینے سے کوئی کامیابی نصیب ہو سکتی ہے یہاں عجیب کشمکش ہے مطلب عرض کرنے کے بعد شاید شعر بامعنی ہو گیا ہے۔

شعر [۱۶]

کہتے ہو کہ ہم وعدۂ پرسش نہیں کرتے یہ سن کے تو بیمار ہوا بھی نہیں جاتا

اعتراض [۱۶] (حصۂ ظرافت کو چھوڑ کر) قطع نظر اس کے قافیہ میں لفظ بیمار نہیں ہوا جاتا کس معنی میں استعمال ہوا ہے اگر حقیقی معنی میں استعمال ہوا ہے تو یہ درست نہیں اس لئے کہ بیمار ہونا انسان کا اختیاری ... اور اگر لفظ بیمار سے مجازاً عاشق ہونا مراد ہے تو مصرع ثانی کے یہ معنی ہوئے کہ ہم سے عاشق ہوا بھی نہیں جاتا

اپنی طرف سے الفاظ کے معنی میں گنجائش پیدا کر کے اعتراض کا موقع
خود اعتراض کرنا اور خوش ہو جانا انصاف کے بالکل خلاف ہے جملے
شعر کا مطلب نہیں سمجھتے۔ منٹے۔ وعدۂ پرسش۔ عاشق کی بیماری پرسی کا
مراد ہے مطلب یہ ہے کہ دوست ! تم یہ کہتے ہو کہ ہم یہ اقرار نہیں کر سکتے
بیمار پرسی کو آئیں گے۔ اچھا نہ کر ہم سے بھی بیمار نہیں ہوا جاتا۔
ہم بیمار بن رہے تھے کہ تم ہماری عیادت کو آ گئے یعنی ہم تو تمہارے
اقرار پر بیمار ہوتے تم اقرار نہیں کرتے ہم بیمار نہیں بنتے تم آنے سے
ہم بیمار بننے سے بچے۔

معرفت بخشا دلِ آگاہ نے ورنہ پہلے سوزِ غم اک شعلۂ بیہوش تھا
مصرعِ ثانی میں سوزِ غم کو شعلہ اور پھر شعلہ کو بیہوش کہنا۔
چیل بسولا لے گئی کیسے پھنکوں راب کے مصداق ہے۔
ایک بہترین اوصاف شعر کا مضحکہ اڑانا انصاف سے بعید ہے۔
ہوش۔ بے حس شعلہ خاموش شعلہ۔ مطلب یہ ہے کہ بھائیو! میرے
دل نے مجھے معرفتِ الٰہی کی تجلی سے پر نور کر دیا نہیں تو اس سے
پہلے غمِ دل کی سوزش بجھی ہوئی آگ کے مثل تھی یعنی میرا دل اول
ایک تھا اب معرفت کی بدولت چمک اٹھا۔

عمر کہیے اس کو یار و دادِ عشق دل کے لب جنبش میں تھے اور میں سراپا گوش تھا
سراپا گوش کی جگہ ہمہ تن گوش ہوتا تو بہتر تھا۔ دل کے لب جنبش میں
ہے حقیقی معنی میں لبوں کی حرکت ثابت ہوتی ہے مجازی معنی
کے لئے کوئی قرینہ چاہیے (مثال چھوڑ کر) اگر بات کرنے کو لب تکلم کی
سے تعبیر کیا جاتا تو شعر با معنی ہوتا۔
سراپا گوش ہمہ تن گوش کے معنی میں آتا ہے۔ چنانچہ قول فیصل میں
سراپا کی تحقیق میں لکھتے ہیں۔
لغت سراپا افادہ معنی استیعاب می کند اے از سر تا پا چوں سراسر
یعنی ازین سر تا آن سر۔ ازین لب تا آن لب گاہے بمعنی ہمہ تن
ہم مطبوعہ نولکشور۔ دل کے لب۔ دل کو ایک شخص قرار دیا
کے لئے لازم تھے۔ اس کا ذکر کیا۔ اس مصرع میں استعارہ بالکنایہ

اور استعارہ تخییلیہ ہے علمائے فن بلاغت نے اس کی یہ تعریف لکھی ہے کہ
کسی ایک شے کو کسی شئے کے ساتھ خیال میں تشبیہ دیں اور مشبہ بہ کا ذکر
نہ کریں بلکہ صرف مشبہ بہ سے خصوصیت رکھنے والی چیزوں کو مشبہ کے لئے
ثابت کریں مثلاً ذوق کا مصرع "قفس میں کیوں کہ نہ پھڑکے دلِ آشیاں کے لئے"
اس میں ظاہر ہے کہ پھڑکنا طائر کے لئے مخصوص ہے۔ لیکن شاعر نے دل کو
اپنے خیال میں طائر سے تشبیہ دی ہے اور ظاہر میں طائرِ دل یا مرغِ دل نہیں
کہا بلکہ صرف پھڑکنا ایک ایسا لفظ کہدیا جس سے شاعر کا مقصود حاصل ہو گیا
بس اس قاعدہ کے مطابق دل کو شخص سے خیال میں تشبیہ دے کر مشبہ بہ کی
خصوصیت یعنی لب کہدیا جیسا کہ غالب کہتے ہیں۔ ۔ ۔

خامہ انگشت بدنداں کہ اسے کیا کہیے ناطقہ سر بہ گریباں کہ اسے کیا کہیے
ظاہر ہے کہ جس طرح دل لب نہیں رکھتا غالب کے شعر میں خامہ دانت اور
ناطقہ سر و گریباں نہیں رکھتا بس معلوم ہوا کہ خامہ اور ناطقہ کو انسان متردد سے
تشبیہ دی ہے اور اس کی خصوصیت یعنی انگشت بدنداں اور سر بہ گریباں
ہونے کا ذکر کر دیا ہے مطلب شعر جناب فانی یہ ہے کہ یارو! ایک وقت تھا کہ
میرے دل کے لب میری عمر کی سرگذشت یا عشق کی داستان کہوں بیان کیا
کرتے تھے اور میں مارے شوق کے ہمہ تن گوش بنا ہوا سنتا ہوتا تھا۔ ناظرین کرام
انصاف فرمائیں کہ اس حالت میں جناب فانی کا شعر با معنی ہے یا بے معنی۔

پی اور وہ پی ازل میں کہ اتری نہ حشر تک یادش بخیر دل بھی عجب بادہ نوش تھا
اعتراض۔ "یادش بخیر" دعا کے طور پر غائب کے حق میں بولا جاتا ہے متوفی کے لئے
نہیں چونکہ مصرع ثانی میں "بادہ نوش تھا" کہنے سے بادہ نوش کا متوفی ہونا
ظاہر ہوتا ہے۔

جواب۔ معترض صاحب اپنی طرف سے اپنے حسب منشا تشریح کر لیتے ہیں اور
اعتراض چسپاں کر دیتے ہیں۔ حالانکہ یادش بخیر دعا ہی کے طور پر دل کے لئے
شاعر نے استعمال کیا ہے اور با موقع استعمال کیا ہے شاعر کب کہتا ہے کہ دل
مر گیا ہے وہ تو دل کی حالت بیان کرتا ہے اور دعا دیتا ہے کہ یارو! خدا زندہ
رکھے کبھی ہمارا دل بھی عجب شراب کا رسیا تھا اس نے روزِ ازل میں پی اور
اتنی پی کہ حشر تک بھی اس کا نشہ نہ اترے یعنی بڑا شرابی تھا۔ اب کہیے

یا دشنِ بخیر با موقع استعمال ہوا ہے یا بے موقع۔

نظم: دل کی ہر بوٹ میں اک دنیا ہی اک مٹ گئی آہ اُن دو خون کی بوندوں میں کتنا جوش تھا

اعتراض۔ بنی کی مناسبت سے مٹی چاہیے۔ مٹ گئی کہنا صحیح نہیں۔ مصرع ثانی میں دو اسم عدد ہے معدود یعنی بوندوں سے بہت فصل جا پڑا ہے جس سے خون کا تعدد لازم آتا ہے چاہیے تو یہ تھا کہ دو خون کی بوندوں کے عوض خون کی دو بوندوں میں کہتا۔

جواب یہ بنی خود بن گئی کے معنی میں ہے تو مٹی کی کیا ضرورت ہے۔ اب رہا دوسرا اعتراض البتہ نثر میں ایسا قاعدہ ہے کہ عدد اور معدود میں فاصلہ نہیں ہوتا مگر نظم میں صرف فاصلہ ہی نہیں بلکہ تقدیم تاخیر بھی ہو جاتی ہے۔ دیکھئے شعر

کہے ایک جب سن لے انسان دو کہ حق نے زباں ایک دی کان دو

یہاں بھی انسان دو میں انسان کا تعدد لازم آتا ہے۔ جس طرح دو خون کا تعدد لازم آتا تھا نظم میں اس طرح ہوا ہی کرتا ہے۔

شعر: کیا یہ فانی کر رہا تھا عالمِ ہستی کی سیر آگے آگے بے خودی تھی پیچھے پیچھے ہوش تھا

اعتراض۔ بے خودی سے بے خود موہانی، ہوش سے ہوش (غالباً بلگرامی) مراد لئے جائیں تو شعر با معنی اور پر لطف ہو سکتا ہے ورنہ مہمل۔

جواب۔ ایسے اچھے شعر کو مہمل ہی نہیں بلکہ بے خود موہانی اور مخدومی جناب ہوش بلگرامی کے اسما کے ساتھ مضحکہ اڑایا گیا ہے۔ مطلب یہ ہے کہ ایسی حالت میں انسان دنیا کی کیا سیر اور تماشا کر سکتا ہے کہ بے خودی جس کو سامنے کھینچ رہی ہے کہ ادھر چلا آ۔ اور ہوش پیچھے پڑ کے روکتا تھا کہ ادھر نہ جا۔

شعر: اب جنوں سے بھی توقع نہیں آزادی کی چاک دامن بھی باندازۂ داماں نکلا

اعتراض۔ مصرع اول میں لفظ بھی زاید ہے کیونکہ اس سے یہ مفہوم ہوتا ہے جنون کے علاوہ کسی اور چیز سے بھی اس کو آزادی کی توقع تھی۔

جواب۔ نہیں! کسی اور چیز سے آزادی کی توقع نہیں تھی بلکہ جنون ہی سے تھی۔ شاعر کہتا ہے کہ جنون سے توقع آزادی کی تھی اب اس سے بھی نہیں۔ بھی یہاں کلمۂ تاکید ہے۔ شمول کے لئے نہیں ہے۔

شعر: بجلیاں شاخِ نشیمن پہ بچھی جاتی تھیں کیا نشیمن سے کوئی سوختہ ساماں نکلا

اعتراض۔ شاعر نے دوسرے مصرع کو پہلے کی کیوں علت قرار دیا ہے واضح نہیں قطع نظر اس کے بجلیوں کے ساتھ بچھنے کا لفظ استعمال کرنا غیر ہے۔

جواب۔ فرہنگ آصفیہ میں ہے۔ بچھا جانا۔ عجز و انکسار کے مارے جھکا جانا اس لئے بجلیاں بچھ جانا۔ بجلیوں کا زمین سے لگ جانا چھو جانا دوسرے مصرع کو اس لئے علت قرار دیا ہے کہ سوختہ سامان جس کا سب تباہ ہو چکا ہو اور صرف ایک نشیمن رہ گیا ہو تو بجلیاں اس کے جلانے کے واسطے بھی گھونسلا کی شاخ پر ٹوٹی پڑتی ہیں اب علت واضح ہو گئی ہوگی۔

شعر: چارہ گر ناصح مشفق دل بے صبر و قرار جو ملا عشق میں غم خوار وہ نادان نکلا

اعتراض۔ لفظ قرار پر بھی بائے قافیہ لانے کی ضرورت ہے دل بے صبر و قرار کہنے سے یہ احتمال پیدا ہوتا ہے کہ قرار دل بے صبر سے جدا ہے۔

جواب۔ لفظ قرار دل بے صبر سے کس طرح جدا ہو سکتا ہے اور نہ احتمال کی قرار دل بے صبر سے علیحدہ اس لئے کہ واؤ عاطفہ موجود ہے وہ اس کو کہاں علیحدہ ہونے دے گا حالی کا شعر ہے ملاحظہ فرمائیے۔

چکور اور شہباز سب اوج پر ہیں مگر ایک ہم ہیں کہ بے بال و پر ہیں

آپ کے قاعدہ کے رو سے تو یہاں بھی بے بال و بے پر چاہیے حالانکہ

شعر: تمام قوتِ غم صرفِ دل ہوئی ورنہ زمیں زمیں ہی نہ ہوتی نہ آسماں

اعتراض۔ موجودہ صورت میں پہلا مصرع دوسرے مصرع کی علت قرار نہیں پاتا اگر غم کی جگہ پر دل کا لفظ ہوتا تو یہ معنی ہوتے کہ دل غم کی وجہ سے ناتواں ہو گیا ورنہ نالہ و فغاں سے نہ زمین ہوتی نہ آسمان ہوتا۔

جواب۔ اتنی کوشش کے بعد سطحی مطلب اور بالکل پامال مضمون پیدا کیا بغیر اصلاح کے شعر اپنی جگہ بالکل ٹھیک ہے۔ کہتے ہیں یار و ابڑی خیر گزری میرے غم کی پوری قوت میرے ہی دل پر صرف ہو گئی اگر ایسا نہ ہوتا تو یقین مانو کہ میرے کثرتِ غم کے بار سے ادہر تو زمین دھنس جاتی ادہر آسمان میری آہ کے غم سے یوں تھم نہ سکتا پارہ پارہ ہو کر نہ جانے کہاں اڑ جاتا کیونکہ یہ وہی غم ہے جس کے متعلق بلبل شیراز نے کہا

آسماں بارِ امانت نتوانست کشید قرعۂ فال بنامِ منِ دیوانہ زدند

محمد عبد اللطیف (لکچرار ورنگل کالج)

اورنگ آباد (دکن)

تری ہر صبح پیغامِ حیاتِ تازہ لاتی ہے
تری ویرانیوں میں زندگانی مسکراتی ہے

نسیمِ جاں فزا چلتی ہے تیرے سبزہ زاروں میں
شرابِ حسن بل کھاتی ہے تیرے آبشاروں میں

دلوں کو مست کرتی ہیں تری بدمست برساتیں
فضاؤں میں لٹاتی ہیں جوانی چاندنی راتیں

دکن کی سرزمیں پر موجزن ہے جوئے خوں تیری
اگلتی ہے ہزاروں لعل خاکِ تیرہ گوں تیری

ترے جگنو گرا دیتے ہیں قیمت ماہتابوں کی!
تری مٹی کے ذروں میں چمک ہے آفتابوں کی

تری پائندگی یوں ہنس رہی ہے انقلابوں پر
سمندر جیسے ہنستا ہے حقارت سے حبابوں پر

زمانے میں ترے آثار کی توقیر ہوتی ہے
تری گودی میں اہلِ ہند کی تہذیب سوتی ہے

رہی چشمِ مذاہب تیرے در پر خوں چکاں برسوں
رہیں[1] گے دامنِ کہسار میں جن کے نشاں برسوں

ہے تیری وادیوں میں عزمِ خلجی بے قرار اب تک
فضا میں ہمتِ تغلق کا اڑتا ہے غبار اب تک

زمانہ جانتا ہے، کوہساروں میں ترے اکثر
ہوا ہے امتحانِ تیزیِ تیغِ ملکِ عنبر

ترے دامن میں عالمگیر میٹھی نیند سوتا ہے
جلالِ قطب شاہی اپنی بربادی پہ روتا ہے

حصاروں میں تری نکلا نتیجہ سعیِ پیہم کا
ترے مشرق سے پہلا[2] آفتابِ آصفی چمکا

ترے ہی ساز پر میں نے سنے نغمے جوانی کے
ترے ماحول میں سیکھے ہیں گر جادو بیانی کے

تخیل پر مرے منقوش ہے تیری بہار اب تک
مرے آنسو تری الفت کے ہیں آئینہ دار اب تک

ہواؤں سے پرانی داستانِ راز سنتا ہوں
میں تنہائی میں تیری رس بھری آواز سنتا ہوں

ترے در پر متاعِ زندگانی چھوڑ آیا ہوں
وفورِ شوق کی پہلی کہانی چھوڑ آیا ہوں

سکندر علی وجد
بی اے، ایچ سی ایس

[1] ورا اور اجنٹا کے غار
[2] صف جاہ اول نے اورنگ آباد ہی میں خودمختاری کا اعلان کیا تھا۔

بچوں سے

اس دفعہ ہمارے عنوان پر زیادہ مضمون وصول نہیں ہوئے۔ دیکھیں آئندہ مہینے تم میں سے کتنے بچے اور بچیاں مضمون بھیجتی ہیں مضمون بہو[illegible]
اور اچھا ہو۔

عنوان حیدرآباد کی کوئی تاریخی عمارت

پہیلیوں کے حل کرنے میں یوں تو بہت سے بچوں اور بچیوں نے دلچسپی لی لیکن ہم صرف ان کے نام لکھ رہے ہیں جن کے پانچ سے زیادہ حل صحیح ہیں
جن کے نام خط کشیدہ ہیں ان کا لفظوں کا زینہ بھی صحیح ہے۔ معلوم ہوتا ہے کہ سب ننھے بھائیوں اور بہنوں میں غور کرنے کا شوق پیدا ہو چلا ہے۔ اس
نمبر میں بھی ہم نے کئی پہیلیاں چھاپی ہیں امید ہے کہ ان کو بھی شوق کے ساتھ حل کیا جائے گا۔

اپریل کی پہیلیوں کے صحیح حل

ا۔ ا۔ ۱۔فارس ۲۔جاپان ۳۔ٹرکی ۴۔روس ۵۔چین ۶۔جرمنی ۷۔فرانس ب ۱۔جامن [illegible]
۲۔سوئی تاگا ج ۱۔پنسل یا قلم ۲۔مخلوق یا آدمی ۳۔فکر ۴۔دھواں ۵۔انڈا ۶۔کیچوا د۔ پہلے بکری کو لے جائے گا پھر کتے کو لے جا کر بکری کو واپس لائے گا
بکری کو وہاں چھوڑ کر پان کا گٹھا لے جائے گا۔ پھر واپس آکر بکری کو لے جائے گا۔ لفظوں کے زینہ کا حل کئی طرح سے حل کیا گیا ہے بعض بچوں نے بے [illegible]
لفظ بھی لکھے ہیں جس کی وجہ سے ان کا زینہ غلط قرار پایا۔

معین الدین احمد انصاری ۱۶ ا۔بشیر محمد عبدالرحمن خان ۱۶۔ زہرہ ہاشم علی ۱۵۔سید عالم علی فورتھ فارم عالیہ ۱۴۔سید عبدالکریم جادم ۱۴۔
محمد عبدالباسط پنجم سٹی کالج ۱۴۔سید [illegible]حسین پنجم سٹی کالج ۱۳۔عبدالحکیم متعلم کمم پیٹھ ۱۳۔صالحہ سید علی جعفری محبوبیہ ۱۳۔تقی حسین خان سعید ہفتم سٹی کالج ۱۳۔سعدیہ
سید یاور حسین ۱۳۔محمد احمد اللہ خان محمود ہفتم دارالعلوم ۱۳۔حبیب شمس پنجم سٹی کالج ۱۳۔ ودرراج چہارم سٹی کالج ۱۲۔سیدہ خلیل الدین ۱۲۔محمود عبدالماجد
پربھنی ۱۲۔کنیز فاطمہ ذکیہ سلطانہ بشیرآبادی ۱۲۔فیروز صدیقی ۱۱۔محمد ممتاز الدین خان پنجم سٹی کالج ۱۱۔طیبہ محمد علی فاضل ۱۱۔رام چندرا ریڈی ششم مدرسہ [illegible]
رشید احمد علی خان ۱۰۔محمد عمر علی شیبانی ششم شاہ گنج ۹۔حبیبہ حبیب الرحمن ۹۔میر بیدار علی ۔ شبلی کرمانی ششم شاہ گنج ۶۔مسیح الدین خان اقبال بشیرآباد
خواجہ معین الدین فاروقی سٹی کالج ۶۔ رقیہ سید صفدر حسین ۱۴۔جلال صدیقی ۱۳۔

اب ان پہیلیوں کے حل بھیجیں۔ (ا) (۱) ادھر چلیں ادھر چلیں بیچ کلیجہ دھڑکے ۔ ہاتھ خاں یوں کہیں دو دو انگل سرکے
(۲) ایک ہی صورت ایک ہی ذات ۔ دونوں کے پاؤں منہ نہ ہات + ایک کا سر ہے آنکھ نہیں۔ ایک کی آنکھ ہے سر نہیں۔ (حبیبہ حبیب الرحمن)
ب (۱) گھوڑا اڑا کیوں ۔ پان سڑے کیوں روٹی جلے کیوں (۲) ایک بھائی چڑھتا ایک بھائی اترتا (خواجہ معین الدین فاروقی جماعت پنجم سٹی کالج)
ج (۱) جالا تھا سو جل گیا چلو نہ اس کے تاگو۔ گھر سے لوگ باہر آئے تو کھڑکی سے بھاگو (۲) کالا ہے پر کوا نہیں۔ کر پتلی ہے پر چیتا نہیں۔
جبڑا ہے مگر شیر نہیں۔ (افسر بیگم صدیقی متعلم مچھلی کمان ہائی اسکول) د (۱) آکر ہمارے ہاتھ میں ایسی بلی رہی۔ کئی بار وہ کھلی یا کلی کی کلی رہی
(۲) ظاہر میں ہے سفید تو باطن میں ہے کالی ۔ لذت میں گر عجب ہے تو خوشبو میں نرالی (محمد عبدالرزاق طالب علم جماعت ہشتم الف مدرسہ فوقانیہ نظام آباد)

شعبدے

باکمال تاگا۔ تھوڑے سے تاگے کو نمک کے پانی میں بھگو کر سکھا لیجئے۔ بعد ازاں اس میں ایک چھلا ڈال کر دوہرا کر لیجئے پھر کسی چیز سے باندھ کر دیا سلائی
روشن کر کے تاگے کو جلا دیجئے۔ تاگا جل جائے گا مگر چھلا نہیں گرے گا۔

پیاسا گلاس ایک مٹی کی نئی سہنک لے کر اس میں پانی ڈال دیجئے۔ ایک گلاس میں تھوڑا کاغذ روشن کر کے اس سہنک پر الٹ دیجئے پانی کو گلاس کھینچ لے گا
اس طرح پانی سہنک سے غائب ہو جائے گا۔

میر بیدار علی

مجھے سب سے زیادہ کب ہنسی آئی؟

سب ہی بھائی اور بہنوں کو یہ سن کر حیرت ہوگی کہ مجھے یہ سوال دیکھ کر ہی زیادہ ہنسی آئی۔ وجہ یہ ہے کہ جن باتوں پر ہنسی ہوں وہ سب کی سب یکے بعد دیگرے یاد کر کے ہنس رہی ہیں مثلاً کھیلتے ہوئے کسی کے پیر کا پھسل جانا اور دھڑام سے گر پڑنا یا بارش میں کسی کا باہر سے بھیگتے ہوئے گھر میں آنا اور قمیص نکال کر ہاتھوں میں لئے سکھانے کے لئے ناچتے ہوئے پھرنا الٹے کپڑے پہنے ہوئے دولہا بھائی یا بھائی جان سے مٹھائی طلب کرنا غرض ایسے بیسیوں واقعات ہیں جن پر ہنستے ہنستے پیٹ میں درد ہوتا ہے لیکن ایک وقت لوٹ لوٹ کر ہنسنا پڑا تھا۔ آپ بھی ہنسیں مگر صرف مسکرا کر خاموش ہو جائیے آپ ہنسنے لگیں تو آپ کے پیٹ میں درد ہوگا میں اس کی ذمہ دار نہیں۔

آپا جان کی شادی میں چوتھی کی تیاری تھی رسم دراصل ہم ہی کو انجام دینی تھی ہم سب بہنیں مختلف ترکیبیں کر رہی تھیں کہ کسی صورت دولہا بھائی کا مذاق اُڑایا جائے ہماری ترکیب کا قصہ یہ تھا کہ ایک پلنگ تاگے کچے سے بُنا جائے اور اس پر ایک سرخ رنگ کی سوزنی بچھا دی جائے چنانچہ اس پر عمل کیا گیا سیتا پھل کا زمانہ تھا مہمانوں نے سیتا پھل کھا کر اور کچھ ضائع کر کے صحن میں ڈھیر لگا دیئے تھے کمرے کی بڑی دری پر ایک طرف اپنا بنا ہوا پلنگ بچھا دیا اور پلنگ کے اوپر ایک چاندنی کے دو ٹکڑے کر کے ان کو ڈوری سے باندھ کر ڈوری اس طرح پلنگ کے نیچے لائی گئی کہ اگر پلنگ پر کچھ وزن ڈالا جائے تو ڈوری کے دبنے سے چاندنی کے ٹکڑے علیحدہ ہو جائیں اس انتظام کے بعد ہم نے سیتا پھل اور ان چھلکوں وغیرہ کو چاندنی پر نہایت سلیقہ سے جما دیا اور پلنگ پر سوزنی بچھا دی۔

دولہا بھائی آئے اور ان کا پلنگ پر بیٹھنا ہی تھا کہ پلنگ کا آسمان پھٹ گیا اور سیتا پھل کے چھلکوں کی بارش ہو گئی ادھر بارش ہوئی اور بڑی مشکلوں سے پلنگ کی چو دیواری سے دولہا میاں نکلے شیروانی اور سیتا پھل کے چھلکوں میں لپٹے ہوئے تھے اور ہم فرش پر لوٹتے ہوئے آنتوں کو بل دے رہے تھے۔

سعیدہ خلیل الدین

اقوال زرّین

(۱) سب سے بڑا بہادر وہ ہے جو غصہ کے وقت اپنے نفس پر قابو رکھے .... (آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم)

(۲) جو شخص مجھے میرے عیب بتاتا ہے وہ میرا عزیز ہے .... (حضرت عمر رضی اللہ عنہ)

(۳) تصرف سے علم بڑھتا اور مال گھٹتا ہے .... (حضرت علی کرم اللہ وجہہ)

(۴) اپنا کام اپنے ہاتھ سے کرنا عقلمندی اور کامیابی کی دلیل ہے .... (نپولین اعظم)

(۵) دوسروں کو خوش رکھ کر جو خوشی حاصل ہوتی ہے اس سے بڑھ کر دنیا میں کوئی خوشی نہیں .... (ملٹن)

(۶) ہر شخص سے محبت کرو مگر ہر ایک پر اعتبار نہ کرو اور کسی کے ساتھ برائی نہ کرو .... (شکسپیر)

مرسلہ معین الدین احمد انصاری

بدگمان بیگم

منظور	رحم دل شوہر	ننھا	بیگم کا ...
بیگم	منظور کی بدگمان بیوی	فہمیدہ	بیگم کی ملا...

منظور۔ مطالعہ کے کمرے میں بیٹھا کتاب دیکھ رہا ہے۔ بیگم بڑے غصہ کی حالت میں داخل ہوتی ہے۔

بیگم۔ نگوڑی کو جاکر دو تین گھنٹے ہو گئے مگر اب تک آنے کا نام نہیں لیتی خدا معلوم کم بخت کے سانپ سونگھ گیا، زمین نگل گئی یا آسمان [illegible] کر گیا کہ اب تک نہیں لوٹی۔

منظور۔ آخر تم نے اسے کہاں بھیجا ہے جو اتنی بک بک لگا رکھی ہے۔

بیگم۔ میں نے اسے بازار بھیجا تھا تاکہ صابون لے آئے اور میں منّے کو حمام کرا سکوں۔

منظور۔ ذرا صبر و تحمل سے کام لو وہ کچھ بھاگی تو نہیں جاتی جو تم ناحق پریشان ہو رہی ہو۔

بیگم۔ بس خاموش رہو جب دیکھو۔۔۔ ایک ادنیٰ ملازمہ کی پشتیبانی کرتے رہتے ہو؟

منظور۔ لو تم تو خفا ہو گئیں، میں نے ذراسی بات کہی کہ آپ کے غصہ کا پارہ حد سے بڑھ گیا۔

بیگم۔ خیر جانے بھی دو میں ہی قصوروار ہوں، فہمیدہ بالکل بے قصور ہے نا۔

منظور۔ نہیں نہیں قصور اس کا بھی ہے مگر بھئی آدمی بشر ہے، انسان سے تو غلطیاں ہو ہی جاتی ہیں۔ آجانے پر جو جی چاہے سو کہہ لینا۔

بیگم۔ میں کیوں برا بھلا کہتی، میں اس گھر کی کون ہوں؟ تم نے تو میرا رتبہ نوکروں سے بھی گھٹا دیا۔

منظور۔ آخر تمہیں ہو کیا ہے جو مجھ سے ہر بات پر الجھا کرتی ہو، جب وہ آئے تو اسے خوب گالیاں کہہ سنانا میرے پیچھے ہاتھ دھو کر کیوں پڑی ہو۔!!!

بیگم۔ میں کون ہوں تمہارے پیچھے پڑنے والی، اور اگر پیچھے پڑ... تمہارے آگے بھلا میری کیا دال گل سکتی ہے۔

منظور۔ جو بھی بہتان لگاتی ہو لگا لو مگر میں تو بالکل بے قصور ہوں۔

بیگم۔ ہر ایک الزام تم مجھ ہی پر دھرتے ہو میں نے پہلے سیکڑوں دفعہ ... کہ نوکروں کے معاملات میں دخل نہ دو، مگر تم نے میری ایک نہ ...

منظور۔ اچھی بات ہے اب کی مرتبہ نوکر اپنی مرضی سے رکھنا، اپنی خوشی ...

بیگم۔ مگر جب تک فہمیدہ کا نگوڑا منہ کالا نہ ہوگا مجھ پر اس گھر کا کھانا حرام ...

منظور۔ مگر کسی کو ذراسی بات پر نوکری سے علیحدہ کر دینا کہاں کا انصاف ...

بیگم۔ انصاف ہو یا ناانصافی مگر میں تو اپنی بات سے نہ ٹلوں گی۔ ایک ... خاموش دو دفعہ خاموش ہو گئی تو اس نے نوکری کو ایک مذاق سمجھ رکھا ... ہمارے پاس اس کی گذر ہو رہی ہے اگر دوسری جگہ ہو تو ایک دن بھی کوئی گھڑی بھر کے لئے پانی بھی نہ پینے دے۔

منظور۔ خیر اب کی بار اسے معاف کر دو پھر کبھی قصور کرے گی تو اسے نکال دینا ...

بیگم۔ نہیں ایسا ہرگز ہرگز نہیں ہو سکتا تمہیں نے تو نوکروں کو اپنے سر پر چڑھا لیا ہے۔ ورنہ ایک دو ٹکوں کی ملازمہ کی مجال اتنی ہو سکتی ہے۔؟

منظور۔ آجانے پر اسے نوکری سے علیحدہ کئے دیتا ہوں۔

بیگم۔ یاد رکھو اسے تنخواہ کا بقایا نہ دینا ورنہ میں اسے کھرا کھرا جواب سناتی ہوں ...

منظور۔ اتنا بھی غضب نہ کرو ایک تو یہ کہ اس کو تھوڑے سے قصور پر برطرف کر رہی ہو دوسرے یہ کہ بغیر تنخواہ کے۔

بیگم۔ یہ سزائیں بھی اس کے لئے کم ہیں۔

منظور۔ تو کیا اس نے اتنے دن محنت نہیں کی جو تم اسے تنخواہ بھی نہیں دینا چاہتیں

جادو کا محل

بہت زمانے کا ذکر ہے کہ کسی شہر کے بادشاہ کو سیر و سیاحت کا بہت شوق تھا۔ اکثر وہ اپنے دوستوں کے ساتھ دور دور تک [illegible]
.... ایک دفعہ وہ اپنے دوستوں کے ساتھ بہت دور کے سفر پر گیا۔ راستے میں
ایک بڑا گھنا جنگل نظر آیا۔ ساتھیوں میں سے ایک نے اس جنگل میں شکار کرنے کا ارادہ ظاہر کیا۔ سب لوگ راضی ہو گئے۔ یہ جنگل بہت گھنا اور
خوفناک تھا۔ سارا دن چلنے پر بھی ختم نہ ہوا جب سورج غروب ہو رہا تھا تو انھیں اس جنگل میں ایک عالی شان محل نظر آیا جسے دیکھ کر وہ سب
حیران رہ گئے کہ ایسے ویران جنگل میں اتنا عالی شان محل کس کا ہوگا۔ اس میں کوئی آدمی نہ تھا۔ محل کے دروازہ نہ تھا بلکہ محل کی دیوار توڑ کر
اندر جانے کا راستہ بنایا گیا تھا۔ بادشاہ اور اس کے ساتھی اندر گھس گئے۔ محل سجا سجایا اور ہر طرح کے سامان سے آراستہ تھا۔ کھانے پینے کی سب
چیزیں موجود تھیں مگر کسی آدمی کا پتہ نہ تھا۔ چونکہ بادشاہ اور اس کے ساتھی بہت تھکے ہوئے تھے سب کھانے کے گرد بیٹھ گئے اور چاہتے تھے کہ
کھانا شروع کریں۔ اتنے میں کسی ساتھی کی نظر راستے پر پڑی وہ چیخ اٹھا کہ دوڑو دیواریں آپس میں مل رہی ہیں۔ سب ساتھیوں کی نظریں اس طرف
اٹھیں تو دیکھا کہ جس راستے سے وہ آئے تھے وہ آہستہ آہستہ بند ہوا جا رہا ہے۔ سب دوڑنے لگے مگر باہر نکلنے سے پہلے راستہ بند ہو چکا تھا دونوں دیواریں
آپس میں مل گئی تھیں ان کو ایسا معلوم ہونے لگا کہ دیواریں چن دی گئی ہیں اب وہ سب گھبرا گئے اور راستہ تلاش کرنے لگے۔ راستہ تلاش کر ہی رہے تھے کہ
ایک شخص نمودار ہوا جو لباس سے غلام معلوم ہوتا تھا۔ اس کو دیکھ کر سب کی جان میں جان آئی۔ اور سب نے مل کر اس سے دریافت کیا کہ تم کون ہو اور
اس ویرانے میں یہ کس کا محل ہے۔ یہ راستہ کیونکر بند ہو گیا مگر اس شخص نے کسی سے کچھ نہ کہا اور پیچھے آنے کا اشارہ کر کے آگے چلنے لگا اب سب کے
سب اس کے پیچھے ہو لئے۔ وہ انھیں لئے ہوئے اندھیرے تہ خانہ میں اترا اور اسی اندھیرے میں بہت دور چلنے کے بعد ایک جگہ روشنی نظر آئی
یہ سب لوگ اسی طرف چل پڑے۔ یہاں پر دروازہ کھلا سامنے ایک نہایت سرسبز و شاداب باغ دکھائی دیا جس میں ہر طرف نہریں جاری تھیں اور
حوض میں قسم قسم کی مچھلیاں اور فوارے تھے۔ بیچ میں ایک خوشنما تخت سونے اور جواہرات سے سجا ہوا تھا اس پر ایک خوبصورت ملکہ بیٹھی ہوئی تھی وہ
شخص جو بادشاہ کو مع ساتھیوں کے گرفتار کر کے لایا تھا ملکہ کے سامنے جھک کر آداب بجا لایا اور کہا حضور قیدی حاضر ہیں۔ بادشاہ اور اس کے
ساتھیوں کی طرف دیکھ کر ملکہ نے مسکرایا۔ بادشاہ کو قیدی کا لفظ سن کر بڑا غصہ آیا۔ اس نے کڑک کر غلام سے کہا اے شخص منہ سنبھال کر بات کر
[illegible] تم ہم کو قیدی بناتا ہے۔ ملکہ نے بات کاٹ کر کہا اے بادشاہ جب تم میرے علاقے کے محل میں گرفتار ہو کر آئے ہو تو قیدی نہیں تو پھر کیا ہو۔ بادشاہ نے
کہا تو نے ہمیں بلا وجہ کس لئے گرفتار کیا۔ ملکہ نے جواب دیا تمھیں قتل کرنے کے لئے [illegible] لیا ہے۔ [illegible] بادشاہ نے کہا او بے رحم ملکہ آخر کس جرم میں تو ہمیں
[illegible] ہے۔ اس نے کہا کہ میرے باپ کے خون کا بدلہ تجھ سے اور تیری رعیت سے لینے کی خاطر۔ یہ [illegible] میرا اسے نوکری سے [illegible] تیرے باپ [illegible]
میرے باپ کی سلطنت میں تیرے باپ نے بغاوت کی اور تمام رعیت تیرے باپ کی طرف دار ہو گئی آخر کار میرے باپ کو شکست ہوئی۔ اور وہ
[illegible] ہاتھوں بڑی بے رحمی سے قتل ہوا میری ماں اس صدمہ کی تاب نہ لا کر چھ ماہ بعد مر گئی۔ اور مجھے وصیت کر گئی کہ اگر میں زندہ رہوں تو
[illegible] کا بدلہ تیرے باپ اور اس کی رعیت سے لوں۔ ایک سال کے اندر ہی اندر تیرا باپ بھی مر گیا اور مجھے اس سے بدلہ لینے کا موقع
[illegible] تو بادشاہ بنا تو میں نے دل میں ٹھان لی کہ اپنے باپ کے خون کا بدلہ تجھ سے اور تیری رعایا سے لوں گی بہت مدت سے تیرا انتظار
[illegible] اب تو میرے پنجہ میں گرفتار ہو گیا ہے میری ماں کی وصیت کے مطابق تو قتل کر دیا جائے گا جیسا کہ میرا باپ تیرے باپ کے ہاتھ سے

...ہوا۔ بادشاہ نے کہا یہ تو کہہ کہ ہمارے داخل ہوتے ہی محل کی دیواریں گل گئیں اس میں کیا راز تھا۔ ملکہ نے ہنس کر کہا۔ جب میرا باپ قتل ہوگیا اور
...ابنی ہوگئی تو میرے پاس نہ فوج تھی نہ طاقت کہ اپنے باپ کے خون کا بدلہ تجھ سے لے سکوں۔ اس لئے میں نے اپنی ماں کے بوڑھے استاد سے
...کامل جانتا ہے مدد مانگی اور خواہش ظاہر کی کہ جادو کے زور سے کوئی ایسا جال پھیلایا جائے جس سے دشمن میرے قبضہ میں آسکے اور میں اس
...باپ کے خون کا بدلہ لے سکوں۔ یہ ظاہر ہے کہ اگر میں لڑنے آتی تو تیری فوج مجھے مار ڈالتی یا قید کر لیتی۔ اب تو میرے قبضہ میں ہے
...قتل کیا جائے گا یہ سن کر بادشاہ کے پیر تلے سے زمین نکل گئی۔ اس نے ہمت کر کے کہا دھوکہ دے کر قتل کرنا بزدلی ہے۔ اگر ہمت ہے تو مقابلہ کرو۔
...نے کہا دھوکے ہی سے سہی مگر مجھے اپنے باپ کے خون کا بدلہ لینا ہے۔ اب بادشاہ منت سماجت کرنے لگا کہ ملکہ رحم کر کسی کی جان لینے سے
...فائدہ ہوگا۔ میرا خون بہانے سے تیرا باپ زندہ تو نہیں ہوسکتا۔ میں اس کے معاوضہ میں تجھ کو اس ملک کی ملکہ بنا دوں گا۔ میری رعایا تیری رعایا
...ہوگی۔ ملکہ نے کہا مجھے تخت و تاج کی خواہش نہیں مجھے اپنے باپ کے خون کا بدلہ لینا ہے۔ یہ سچ ہے کہ تیری جان لینے سے میرا باپ زندہ تو نہ ہوگا مگر
...اس سے میرے انتقام کی آگ تو بجھے گی اور میں اپنی ماں کی وصیت پوری کر سکوں گی۔ جب بادشاہ نے دیکھا کہ یہ ضدی عورت کسی طرح ماننے والی
...نہیں اور جان لے کر ٹلے گی تو اس نے کہا اچھا اگر ایسا ہی ہے تو کیا میرے قتل ہونے کے بعد یہ طلسم ٹوٹ جائے گا۔ ملکہ نے کہا نہیں بلکہ یہ اپنے بنانے والے کے قتل
...ہونے پر ٹوٹ جائے گا۔ بادشاہ چونکا اور کہا وہ شخص کون ہے اور کہاں ہے ملکہ اس سوال سے چونک گئی اور کہا کہ اس کا بنانے والا میری ماں کا
...استاد ہے جس کا پتہ تمھیں نہیں بتلایا جائے گا۔ بادشاہ نے کہا خیر یہ تو بتاؤ کہ یہاں سے نکل جانے کا کوئی راستہ اور بھی ہے یا نہیں۔ ملکہ نے جواب
...دیا بھاگ کر نکلنے کی کوشش نہ کر یہاں سے نکلنا آسان نہیں۔ خیر جب تو میری جان ہی لینے پر تلی ہوئی ہے تو اتنا تو بتا کہ کیا میرے قتل کر دینے کے بعد
...طلسم توڑ دیا جائے گا۔ ملکہ نے کہا نہیں جب تک تیری رعیت کا ایک شخص بھی زندہ رہے گا اس وقت تک طلسم نہ توڑا جائے گا اور ہر شخص کو اس طلسم میں
...موت کے گھاٹ اتارا جائے گا۔ بادشاہ نے دل میں کہا۔ اُف ایک انسان کی جان کے بدلے لاکھوں بندگان خدا کا خون کیا جائے گا۔ یہ سوچ کر
...فکر میں پڑ گیا۔ تھوڑی دیر کے بعد سر اٹھا کر کہا اے ملکہ اگر ایسا ہی ہے تو مجھے چند دن کی مہلت دی جائے تاکہ عاقبت کا کچھ توشہ ساتھ لے لوں
...ملکہ نے کہا ناممکن آج کی مہلت غنیمت سمجھ کل صبح تو قتل کر دیا جائے گا۔ اب بادشاہ بالکل مایوس ہوگیا اور وہیں باغ میں ایک درخت کے نیچے
...اسی سوچ میں بیٹھ گیا۔ اسی حالت میں رات ہوگئی۔ ملکہ محل میں چلی گئی۔ مگر بادشاہ وہاں سے ذرا بھی ٹس سے مس نہ ہوا۔ ملکہ نے کھانا بھجوایا اس نے
...کھانے سے انکار کر دیا۔ اس کے ساتھی چونکہ بہت تھکے ماندے اور بھوکے تھے اس لئے انھوں نے کھانا کھایا۔ اور مزے سے سو گئے۔ مگر
...بادشاہ کو نیند نہ آئی وہ بے قرار ہو کر ٹہلنے لگا۔ بہت رات گئے تک وہ یوں ہی ٹہلتا رہا۔ قریب آدھی رات کے چاند کی ہلکی روشنی میں ایک
...سایہ اس کی طرف آتا دکھائی دیا تو بادشاہ ایک پاس کے درخت کی آڑ میں چھپ گیا۔ تھوڑی دیر بعد سایہ اس کی طرف سے ہو کر نکل گیا وہ ایک
...عورت کا سایہ تھا اس نے سوچا اس آدھی رات میں یہ کون عورت یہاں چلی آئی ہوگی چل کر دیکھنا چاہیئے کہ یہ کون ہے اور کہاں جاتی ہے
...یہ سوچ کر تلوار کمر سے کھولی اور اس کے پیچھے پیچھے تھوڑے فاصلے سے ساتھ ہولیا۔ یہ سایہ بہت دور کا چکر کاٹ کر ایک گھاٹی پر پہونچا اور
...نیچے اتر کر ایک پہاڑی کے نیچے داخل ہوگیا۔ بادشاہ بھی اس کے ساتھ اندر داخل ہوا اور چٹانوں کی آڑ میں چھپ گیا۔ یہ ملکہ تھی
...تھوڑی دیر کے بعد ایک بوڑھا شخص عصا ہاتھ میں لئے سامنے آیا اور کہا۔ اے ملکہ اتنی رات گئے تم نے یہاں آنے کی تکلیف کیوں اٹھائی۔ ملکہ نے
...کہا اے قابل احترام بزرگ جس شخص کا مجھے انتظار تھا وہ گرفتار ہوگیا ہے۔ میں چاہتی ہوں کہ وہ کل قتل کر دیا جائے۔ میں نے اتنی رات
...گئے آپ کی اس لئے تکلیف اٹھائی کہ وہ شخص طلسم توڑنے کی کوشش میں ہے۔ ایسا نہ ہو کہ وہ آپ کا پتہ لگا لے اور نصیب دشمناں کچھ نقصان

تو یہ جاتا ہے۔ جادوگر نے کہا۔ تو کیا اس کو طلسم توڑنے کا ذریعہ معلوم ہوگیا ملکہ نے کہا ہاں اس نے کچھ اس طرح سے پوچھا کہ بے
بات زبان سے نکل گیا۔ جادوگر نے کہا کہ یہ تم نے برا کیا خیر اس کو میری قیام گاہ کا بھی پتہ معلوم ہوگیا۔ ملکہ نے کہا یہ میں نے نہیں بتلایا۔ جادوگر نے
کہا کہ یہ تم نے اچھا کیا کہ پتہ نہیں بتلایا اگر وہ میرا پتہ لگا بھی لے اور مجھے قتل بھی کردے تو اس طلسم کو نہیں توڑ سکتا جب تک وہ طلسمی انگشتری حاصل
نہ کرلے وہ میرے قتل کے بعد دوسرے طلسم میں جائے گا اور جلد موت کے گھاٹ اتر جائے گا۔ ملکہ نے کہا طلسمی انگشتری کیسی ہے اور کہاں
ہے۔ وہ کس طرح دستیاب ہوسکتی ہے یہ راز تم نے مجھے کبھی نہیں بتایا جادوگر نے ہنس کر کہا کہ میں تمہیں بتانا ضروری نہ سمجھا میرے قتل کے بعد اور
گھاٹیاں سب غائب ہوجائیں گی۔ اور میرا خون بہنے سے یہاں ایک وسیع سمندر لہریں مارنے لگے گا۔ اور میرا قاتل اس میں غوطے کھانے لگے گا
اس سمندر میں بڑی بڑی مچھلیاں اور مگرمچھ ہوں گی اگر وہ باہمت شخص ہوگا تو ان سب کا مقابلہ کرتا ہوا اس کے کنارے پہنچ جائے گا ورنہ
اجل ہوجائے گا۔ جب وہ سب آفات سے بچ کر سمندر پار کرے گا تو اس کو ایک بہت بڑی چٹان ملے گی وہ اس کا چکر کاٹ کر اس کے
اس کے ڈھلوان میں گھاٹی نظر آئے گی اس گھاٹی میں ایک ہموار جگہ ایک گنبد ہوگا۔ اس گنبد کے کلس پر ایک چڑیا ہوگی جس کے سینے میں وہ جادو کی
محفوظ ہے۔ جب وہ گنبد میں داخل ہوگا تو اس کو وہاں تین تیر اور ایک کمان ملیں گی۔ اگر وہ ان کو لے کر اس چڑیا کو مار دے گا اور اس کا سینہ چاک
انگشتری حاصل کرلے گا تو طلسم اس کے ہاتھ میں آجائے گا تم اطمینان رکھو اگر وہ میرا پتہ لگا کر مجھے قتل بھی کردے تو وہ سمندر کی مصیبتوں کا مقابلہ
نہ کرسکے گا۔ اگر اس سے بھی بچ کر سمندر کے کنارے پہنچ گیا تو بھی ناواقفیت کی وجہ سے وہ چٹانوں میں ٹھوکریں کھاتا ہوا بھوکا پیاسا مرجائے گا۔ مگر طلسم
یہ باتیں کر کے ملکہ گھر جانے کو اٹھ کھڑی ہوئی۔ جادوگر اس کو چھوڑنے پہاڑ کے نیچے سے باہر نکل آیا۔ بادشاہ نے یہ تمام قصہ سن لیا۔ اور دل میں ٹھان لیا
کہ آج ضرور اس جادوگر کو قتل کر کے جادو کی انگوٹھی حاصل کرلوں گا۔ اور ہزاروں بندگان خدا کی جانیں بچاؤں گا۔ یہ سوچ کر تلوار سنبھالے بیٹھ گیا
تھوڑی دیر میں جادوگر واپس آیا۔ اور اپنے مقام پر سو گیا جب اس کے خراٹوں کی آواز آئی تو بادشاہ تلوار لے کر آگے بڑھا اور ایک ہی وار میں
کام تمام کردیا۔ اس کے قتل کے ساتھ ہی زمین لرزنے لگی اور پہاڑ وغیرہ سب غائب ہوگئے اور اس جگہ ایک وسیع سمندر لہریں مارنے لگا جادوگر کی
لاش اس میں بہہ گئی اور بادشاہ اس میں غوطے کھانے لگا مگر ہمت کر کے آگے بڑھا بڑی بڑی مچھلیاں اور مگرمچھ منہ کھولے اس کو نگلنے آگے بڑھے
مگر وہ تلوار سے ان کا خاتمہ کردیا مردانہ وار آگے بڑھتا گیا اور آخر کار سمندر پار کرلیا اور جیسا کہ جادوگر نے کہا تھا اسی طرح چٹان کاٹ کر اس
پہنچ گیا اور گھاٹی میں اترنے پر گنبد نظر آیا جس کے کلس پر چڑیا بیٹھی تھی۔ وہ گنبد کے اندر گھسا وہاں اس کو تین تیر اور ایک کمان ملی۔ ان کو لے کر باہر
اور تیر کمان میں لے کر نشانہ تاک کر مارا پہلا وار خالی گیا اسی طرح دوسرا وار بھی خالی گیا تیسرا نشانہ ٹھیک بیٹھا اور چڑیا پھڑک کر زمین پر آگری چڑیا کے گرتے ہی
گنبد وغیرہ سب غائب ہوگئے سارا طلسم ہلنے لگا اور غضب کا اندھیرا سارے طلسم پر چھا گیا۔ ملکہ کو معلوم ہوگیا کہ بادشاہ نے چڑیا کا سینہ چاک کر کے
نکال لی۔ اس سمندر کا چلو بھر پانی لے کر اس میں انگوٹھی ڈبو کر وہ پانی سمندر پر چھڑکا سمندر غائب ہوکر راستہ صاف ہوگیا ملکہ شیرنی کی طرح گرجتی ہوئی آئی اور
حملہ کیا۔ بادشاہ نے ملکہ کو قتل کردیا۔ چونکہ راستہ طلسم کی وجہ سے بہت دور ہوگیا تھا اس لئے جلد جلد قدم بڑھاتا ہوا محل کو آیا اور انگوٹھی پانی میں گھول کر محل پر
چھڑکنے لگا جس سے جادو کا محل غائب ہوگیا اور راستہ بالکل صاف ہوگیا بادشاہ اپنے ساتھیوں کے ساتھ ہنسی خوشی اپنے ملک کو واپس آگیا

اشرف ہادی علی (محبوب نگر)

انسانی زندگی میں بعض ایسے لمحے گزرتے ہیں جن کی یاد کبھی دل سے بھلائی نہیں جا سکتی ایسا ہی ایک لمحہ وہ تھا جب میں اپنے بھائیوں اور ایک بہن کے ساتھ ایک ایسے ٹرالی کے ڈبہ میں سوار تھی جو اپنی پوری تیزی کے ساتھ ہمارے قابو اور اختیار سے باہر ڈھلوان پٹڑیوں پر گذر رہا تھا جو ایک پہاڑ سے اس کے دامن کی نشیبی سطح تک تعمیر کا سامان لانے لے جانے کے لئے بنائی تھیں ہم نے اس سفر کو اپنے طفلانہ زعم میں تفریح کے تصور میں اختیار کیا تھا لیکن اس کے اندر جو خطرات پوشیدہ تھے اس کا احساس اس وقت ہوا جب ان ٹرالی کے ڈبوں نے اپنی تیز رفتاری اور ہماری بے اقتداری ہم پر ظاہر کر دی۔

واقعہ یہ ہے کہ نظام ساگر کی تعمیر جب قریب الختم تھی ہم ایک ایسے سفال پوش مکان میں رہتے تھے جو بزمانہ تعمیر عہدہ داران کی سکونت گاہ ہونے کی یادگار میں اب مسافر بنگلہ نوکلفنڈ کے نام سے مشہور ہے ساگر منظر کی پہاڑی اور کٹے کے دامن میں یہ مکان ہماری تفریح کے لئے وسیع میدان رکھتا تھا اس وقت ہمارا کام پڑھنا لکھنا اور صبح شام نظام ساگر کی تفریح کرنا تھا نہ گوشے پردہ کی بندشیں تھیں نہ سواری کی محتاجی جو کوئی نظام ساگر دیکھنے آتا چاہے مرد ہو یا عورت اس کے ساتھ نظام ساگر دیکھتے صبح شام ہر مہمان کے ہمراہ دور تک جا کر دیکھتے مگر کبھی جی بھرتا تھا اور نہ کبھی اکتاتے ہماری یہ عادت سی ہو گئی تھی کہ روزانہ شام ساگر منظر جاتے جو زیر تعمیر تھا اور ہمارے مکان سے بہت قریب۔ اس وقت سامانِ تعمیر فراہم کرنے کے لئے ٹرالی بھی چلا کرتی تھی جو ہمارے مکان اور ساگر منظر کے درمیان گزرتی تھی شام میں جب کام بند ہو جاتا تمام ڈبے مکان کے پیچھے ہی ٹھیرا کرتے۔ ان ڈبوں کو دیکھ کر ہر وقت میرے بھائی رشید اصرار کرتے تھے کہ ہم کسی دوران میں بیٹھ کر پٹڑیوں پر پھسلیں چونکہ ہماری تفریح ہمارے ایک بزرگ استاد کے ساتھ ہوتی اس لئے ان کی موجودگی میں ایسی خواہش کا اظہار کبھی نہیں ہو سکتا تھا۔

ہم نے سوچا کہ استاد صاحب کی رکاوٹ کو دور کرنے کا یہی ایک طریقہ ہو سکتا ہے کہ واپسی میں ذرا تیز چل کر اُن سے علیحدہ ہو جائیں یہ عمل کامیاب بھی ہو گیا مغرب کا وقت تھا ہم ساگر منظر سے اتر کر استاد صاحب کی نظروں سے اوجھل ہو گئے چونکہ ہمیں سیدھے راستے سے چلنے کی عادت نہ تھی پتھروں اور جھاڑیوں میں سے چلنے میں زیادہ لطف آتا تھا اس لئے ہمیں جھاڑیوں میں چھپ کر استاد صاحب کو دھوکا دینے کا بہت ہی اچھا موقعہ ہاتھ آیا تھوڑی دیر کے بعد ہم کمین گاہ سے نکل کر اُن باربرداری کے ڈبوں کے پاس پہنچے۔ ایک ڈبہ میں بہن عالیہ کو سوار کر کے میں نے ڈھکیلنا شروع کیا دوسرے ڈبہ میں رشید نے قیوم کو بٹھلایا اور اس کو حرکت دینے لگے تھوڑی دیر ڈھکیلنے کے بعد ہم نے ایسا محسوس کیا کہ ڈبے ہماری مدد کے بغیر چل رہے ہیں اب ہم اپنے اپنے ڈبوں میں چڑھ گئے جوں ہی ہم نے ڈبوں میں قدم رکھا ان کی رفتار تیز ہونے لگی ڈبے زور سے چلنے لگے ہم ان کے کنارے پکڑے ہوئے تھے پٹڑیاں کچھ ایسی بنی ہوئی تھیں کہ خدا کی پناہ دونوں جانب بڑے بڑے غار اور تار پر موٹر دونوں غاروں کے بیچ سے گزر رہے تھے ایسا معلوم ہوتا تھا پل صراط پر سے گزر رہے ہیں خوف کے مارے منہ سے بات تک نہیں نکلتی تھی اور رات کی تاریکی میں دم بدم اضافہ ہی ہوتا جا رہا تھا کہ اندھیری رات اور

استاد صاحب کی آوازوں سے دل ہلے جاتے تھے افسوس تو یہ تھا کہ جواب بھی نہ دے سکتے اور اُن پر ظاہر بھی نہیں کر سکتے تھے کہ سب بس میں مبتلا ہیں بدحواس بے دست و پا ڈبوں پر کھڑے چلے جا رہے تھے منہ سے آواز تک نہیں نکلتی تھی گو استاد صاحب کی آواز سے کان مگر جواب نہیں دے سکتے تھے خوف الگ دامنگیر تھا کہ اب اُن کے سامنے کیسے جائیں اور کیونکر منہ دکھلائیں۔

استاد صاحب قبلہ گھبرائے ہوئے مکان تشریف لے گئے۔ چپراسیوں کو قندیلوں کے ساتھ روانہ کیا گیا کہ ہم کو ڈھونڈ وہ لوگ ساگر منظر کی طرف چلے گئے اس وقت اندھیرا کافی ہو چکا تھا جب ہماری ڈھونڈھ شروع ہوئی ہم ٹرالی میں ایسے سہمے ہوئے جا رہے تھے گویا سانپ چھو گیا ہے ایک دوسرے سے بات کرنے کی تک ہمت نہ تھی کوئی دو تین فرلانگ جانے کے بعد پٹڑیوں اور کراس تھا اس کی وجہ سے پٹڑیاں کچھ سڑک میں دبی ہوئی تھیں وہاں آکر ہمارا ڈبہ کچھ آہستہ ہوا ساتھ ہی میں کود گئی اور ڈبے کو تھام لیا کھینچ لیا۔ سڑک کے بازو چھوٹے چھوٹے پتھر چبوتروں کی شکل میں جمے ہوئے تھے اس پر کودنے سے تھوڑی سی چوٹ بھی آئی احساس کس کو تھا۔ رشید کا ڈبہ ذرا پیچھے تھا انھوں نے آواز دی کہ پٹڑیوں پر پتھر رکھ دوں کہ رکاوٹ ہو جائے مگر میں یہ تمیز نہ کر سکی کیا کہنا چاہتے ہیں گو آواز آ رہی تھی۔ تاہم جب وہ ڈبہ قریب آگیا تو میں نے اور عالیہ نے پوری طاقت سے پکڑ کر اسے روک دونوں بھی اتر گئے اور ان ڈبوں کو چھوڑ دیا وہ پھر حرکت کرنے لگے نہ جانے ان کا کیا حشر ہوا۔

ہم نے سیدھا گھر کا رخ کیا دل میں ایک گھبراہٹ تھی کہ نہ جانے کس کس کے عتاب کا سامنا ہو۔ ابا کے خوف سے دم نکلا جاتا تھا استاد صاحب قبلہ کا غصہ سے تمتمایا ہوا چہرہ الگ آنکھوں میں پھر رہا تھا راستہ میں بہت سے گڑھوں کانٹوں اور حصار کے تاروں کا سامنا کرنا پڑا بالآخر باورچی خانے کے دروازے سے مکان میں داخل ہوئے غصہ سے بچنے کی ترکیب یہ سوجھی کہ کتابیں لے کر سبق یاد کرنے لگے سبق یاد کر کے کچھ کھا لیا۔ کھایا کس سے جاتا تھا مگر مصلحت وقت یہی تھی کہ بھوکے نہ سوئیں کیونکہ جانتے تھے کہ دوسری صورت میں یا کھانے کے لئے اٹھوائیں گے اور اس وقت استاد صاحب قبلہ اور ابا کا سامنا کرنا ہوگا اور اس خیال سے رونگٹے کھڑے ہو جاتے تھے

ہمارے استاد صاحب کا یہ اصول تھا کہ شاگرد کا کیسا ہی قصور ہو مگر سبق اچھا یاد ہو تو وہ برداشت کر لیتے اور اگر سبق میں ذرا بھی غلطی ہو تو پھر بہت خفا ہوتے ہم نے صبح چھ بجے ناشتہ سے قبل ہی جا کر سبق سنا دیا مگر رشید کو شاید دہشت اور پریشانی سے بخار آگیا تھا استاد صاحب قبلہ نے صرف اس قدر فرمایا کہ "آئندہ کبھی ایسا نہ کرنا یہ پہلی غلطی ہے اگر سبق میں ذرا بھی غلطی ہوتی اور رشید کو بخار نہ ہوتا تو تم لوگوں کی خیر نہ تھی!"

اس کے بعد ہم کو کبھی ان ڈبوں میں بیٹھنے کی ہمت نہ ہوئی اور اب جب کبھی اُن پٹڑیوں کا پل صراط یاد آتا ہے تو وہی منظر آنکھوں میں پھر جاتا ہے وہی خوف دل پر طاری ہو جاتا ہے۔

رضیہ زین العابدین

مفید باتیں

انسان کو مصیبت میں صبر کرنا چاہیئے نہ کہ غم صبر سے قدرتی مسرت اور غم سے دلی تکلیف حاصل ہوتی ہے

دنیا میں انسان کو اپنا اعتبار نہ کھونا چاہیئے اگر کھو دے تو ماں باپ کے کھونے کے برابر ہے۔

محمد عبدالحکیم قریشی متعلم (مد

زمین کی شکل

زمین جس پر ہم رہتے ہیں اور جو ہم کو چپٹی نظر آتی ہے اصل میں نارنگی کے مانند گول ہے یہ سُن کر شاید تم کو تعجب ہوگا کہ زمین جس پر
شان عمارتیں بنی ہوئی ہیں جس پر امیروں کے بڑے بڑے محل اور حویلیاں اور غریبوں کے چھوٹے چھوٹے مکانات اور جھونپڑیاں کھڑی ہیں اور
پر اونچے اونچے پہاڑ گہرے سمندر اور بڑی بڑی ندیاں ہیں کیونکر گول ہو سکتی ہے۔ ممکن ہے کہ تمھیں یہ خیال پیدا ہو کہ ایسی زمین جس پر بڑے
شہر ہیں جن میں کھیل کے بڑے بڑے میدان ہیں جہاں سیکڑوں بچے روزانہ کرکٹ فٹ بال کھیلتے ہیں جس کی سڑکوں پر ہزاروں قسم کی
ریاں چلتی ہیں اور شہروں کے ایک کونے سے دوسرے کونے کو پہنچ جاتی ہیں۔ ایسی زمین ہرگز گول نہیں ہو سکتی۔ ایسا ہی خیال پُرانے
نے میں لوگوں کا تھا۔ وہ یہی سمجھتے تھے کہ زمین چپٹی ہے۔ ان میں سے کچھ لوگوں نے یہ خیال کیا کہ اس چپٹی زمین کا کہیں نہ کہیں سرا ضرور ہونا
یے جہاں زمین ختم ہو جاتی ہے۔ اس فکر میں چند بہادر ملاح اپنی چھوٹی چھوٹی کشتیوں پر بیٹھ کر اس کے سرے کی تلاش میں ایک ہی رُخ میں ناک کی سیدھ
روانہ ہوئے۔ تم کو یہ یاد رکھنا چاہیے کہ ان کی کشتیاں آج کل کے جہازوں کے مانند آگ اور پانی کے ذریعے نہیں چلتی تھیں وہ کشتیاں بہت چھوٹی
ں جو بادبان یعنی پردوں کے ذریعے ہوا کے زور پر چلتی تھیں۔ اسی وجہ سے وہ بہت آہستہ آہستہ چلتی تھیں اور جو فاصلہ کہ آج کل کے جہاز پندرہ دن میں
کرتے ہیں وہ کشتیاں چھ مہینے میں بھی نہیں طے کر سکتی تھیں۔ ایسی ہی کشتیوں میں بیٹھ کر وہ ملاح اپنی کشتیوں کا رُخ ایک ہی سمت میں رکھ کر زمین کے
ے کی تلاش میں روانہ ہوئے۔ کیا تم اندازہ لگا سکتے ہو کہ اُن کی جانیں کس قدر خطرے میں تھیں؟ بہر حال وہ روانہ ہوئے۔ ایک مہینہ گذرا دو مہینے
گئے لیکن زمین کے سرے کا کوئی پتہ نہیں ملا۔ وہ اور آگے بڑھے چھ مہینے گذر گئے سال بھر ہو گیا پر ان کو زمین کا سرا نظر نہیں آیا۔ ایک طرف
ان کا یہ زور کہ سمندر کی موجیں ایک ایک میل اوپر اٹھتی اور بیٹھتی تھیں ان کے ساتھ ان کشتیوں کا بھی یہی حال ہوتا تھا اور دوسری طرف ہوا کہتی تھی کہ
ہوں۔ ان ملاحوں کو ہر منٹ یہ خطرہ رہتا تھا کہ کہیں ان کی کشتیاں اُلٹ نہ جائیں لیکن ان دھن کے پکے ملاحوں نے کبھی ہمت نہ ہاری اور اسی
میں کہ زمین کا سرا اب بہت نزدیک ہے آگے بڑھتے گئے۔ یہ یاد رکھنا چاہیے کہ اس سفر میں اُن کی کشتیوں کا رُخ ہمیشہ ایک ہی سمت میں رہا۔ کچھ
کے بعد انھیں یہ دیکھ کر بڑی حیرت ہوئی کہ وہ جہاں سے چلے تھے آخر میں پھر وہیں پہنچ گئے۔ ان لوگوں نے خیال کیا کہ اگر زمین چپٹی ہے تو کہیں نہ کہیں
کا سرا ملنا چاہیے تھا لیکن ایسا نہیں ہوا۔ برخلاف اس کے ایک ہی سمت میں سفر کرنے پر بھی وہ اسی مقام پر پہنچے جہاں سے کہ روانہ ہوئے تھے
یہ اسی وقت ممکن ہے جب کہ زمین گول ہو۔

ایک اور مثال سے بھی زمین کا گول ہونا ثابت کیا جا سکتا ہے۔ تم روزانہ دیکھتے ہو کہ سورج صبح میں نکلتا ہے اور دن بھر سفر کرنے کے بعد شام کو غروب
تا ہے جس وقت سورج نکلتا ہے اس کی روشنی پہلے بنگلوں اور مکانوں کے بلند حصّوں پر پڑتی ہے اور جوں جوں سورج بلند ہوتا ہے اس کی روشنی
حصے میں پھیلتی جاتی ہے۔ یہاں تک کہ تھوڑی دیر کے بعد ہر طرف روشنی پھیل جاتی ہے۔ اگر زمین چپٹی ہوتی تو سورج کی روشنی ایک ہی وقت میں
ایک ہی ساتھ مکانات کے نیچے اور اوپر تمام حصوں میں پھیل جاتی لیکن تم کو معلوم ہے کہ ایسا نہیں ہوتا۔ کیا تم بتا سکتے ہو کہ وہ کونسی چیز ہے جو
ج کی روشنی کو ایک ہی وقت میں زمین کے تمام حصوں پر پھیلنے سے روکتی ہے؟ وہ زمین کی گولائی ہے۔ ان مثالوں کے ذریعے تمھیں معلوم

ہو چکا ہے کہ زمین اصل میں گول ہے۔
اب تم یہ سوال کر سکتے ہو کہ جب زمین گول ہے تو پھر چپٹی کیوں نظر آتی ہے۔ تم کو معلوم ہے کہ تمہاری نظر اپنے مقام سے صرف تھوڑے فاصلے تک جا سکتی ہے جس کے آگے تم کو ہر چیز مدہم نظر آتی ہے۔ اس سے اور آگے تم کو کچھ بھی نظر نہیں آتا اسی طرح چیونٹی کی نظر بہت چھوٹی ہے صرف تھوڑے فاصلے تک جا سکتی ہے۔ ایسی چیونٹی کو جو کسی گیند پر رینگ رہی ہو اس گیند کا صرف تھوڑا سا حصہ نظر آئے گا اور چپٹا معلوم ہوگا جو حال گیند پر چیونٹی کا ہے وہی حال ہمارا زمین پر ہے۔ زمین بہت بڑی ہے ہماری نظر اس چیونٹی کے مانند صرف تھوڑی دور جا سکتی ہے۔ اس لئے ہم کو ایک ہی وقت میں زمین کا صرف تھوڑا سا حصہ دکھائی دیتا ہے جو لازمی طور پر چپٹا معلوم ہوتا ہے۔

جی سورج بھا...

الحمرا

جنوبی ہسپانیہ کے مشہور شہر غرناطہ کے پاس ایک اونچی پہاڑی ہے جس پر الحمرا کی پرانی عمارت کھڑی ہے آس پاس بڑے بڑے پہاڑ ہیں جن پر ہمیشہ برف جمی رہتی ہے پاس ہی ایک بہت بڑا جنگل ہے جس میں زیتون کے درخت پھیلے ہوئے ہیں۔ الحمرا میں بہت سے چھوٹے چھوٹے محل ہیں جن کو مراکش کے عربوں نے بنایا تھا۔ دیواروں پر جا بجا خوبصورت بیل بوٹے بنے ہوئے ہیں۔ اُن میں طرح طرح کی عبارتیں کھدی ہیں۔ ایک بڑا محل ہے جس کے دو بڑے بڑے مکانات ہیں ان میں مسلمان بادشاہوں کے دربار لگتے تھے ایک تو وہ ہال ہے جہاں دوسرے ملکوں کے ایلچی بادشاہ کی خدمت میں حاضر ہوتے تھے کورٹ آف لائنز یعنی شیروں کے دربار کے نام سے مشہور ہے اس دربار میں عرب کاریگروں نے سنگ مرمر سے تراش کر ایسے خوبصورت شیر بنائے ہیں جنہیں دیکھ کر دھوکا ہوتا ہے کہ کہیں ہم شیروں کی کچھار میں تو نہیں آگئے۔ اس دربار کے اطراف عالی شان ایوان اور محرابیں پھیلی ہوئی ہیں صحن میں حوض ہے جس میں فواروں کی جگہ سنگ مرمر کے شیر کھڑے ہیں۔ ان شیروں کے منہ سے پانی نکلتا ہے دربار میں سنگ مرمر کی ۱۲۴ محرابیں ہیں کئی بڑے بڑے کمرے ہیں۔ الحمرا کی خوبصورتی کا چرچا ساری دنیا میں ہے ملکوں ملکوں کے لوگ اسے دیکھنے آتے ہیں۔ الحمرا کو دیکھ کر اگلے زمانے کے لوگوں کی کاریگری اور ہنرمندی کی یاد تازہ ہو جاتی ہے (ماخوذ)

محمود علی متع...

ایک سمجھ دار لڑکا

نذیر کی عمر بھی مشکل سے گیارہ سال کی ہوگی اس کے باپ کے اولاد بہت زیادہ تھی لیکن آج سے گیارہ سال پہلے ان کی جو آمدنی تھی اس میں کچھ بھی اضافہ نہ ہوا تھا گھر کا خرچ بہت بڑھ گیا تھا جس سے وہ بہت پریشان تھا
عید کے دن نذیر کا باپ اس کو ساتھ لئے ہوئے اپنے ایک دوست سے ملنے کے لئے گیا۔ دوست :۔ "آج تم نے نماز کہاں پڑھی؟"
نذیر کا باپ "محلہ ہی کی مسجد میں پڑھی"۔ پھر نذیر کے باپ نے بیٹے سے کہا کہ چچا کو سلام کرو۔ نذیر سلام کر کے چپکے سے ایک کرسی پر بیٹھ گیا۔ باپ نے اپنے دوست سے کچھ باتیں کرنے کے بعد بچے سے کہا، "تم اپنی چچی سے عید مل آؤ"

اندر سے بیٹھ گیا چچی بہت محبت والی تھیں کمسن بچوں سے محبت سے پیش آتیں پہلے نذیر کا مزاج پوچھا پھر اس کو عیدی کے طور پر ایک اٹھنی دینی چاہی۔
نذیر مجھے اٹھنی نہیں چاہیئے" چچی (اصرار سے) "لو میاں میوہ مٹھائی ...
نذیر:۔ چچی میں نہیں لیتا ابا کو معلوم ہوگا تو وہ بہت خفا ہوں گے
نذیر باہر چلا آیا اور اپنے باپ کے ساتھ ہولیا۔ راستہ میں اس نے ابا ... ابا! چچی مجھے اٹھنی دینا چاہتی تھیں میں نے نہیں لی۔
باپ :۔ "تم نے اٹھنی کیوں نہیں لی؟"
نذیر :۔ "آج کل آپ روپیہ نہ ہونے سے بہت پریشان ہیں اگر میں عیدی لیتا تو آپ کو بھی ان کے بچوں کو عیدی دینی پڑتی"
نذیر کے باپ نے جب یہ بات سنی تو خوش ہو کر اس کو ...

ریل کا موجد

یہ مضمون انگریزی [illegible] کتابوں سے اخذ کیا گیا ہے۔

عزیز بچو! تم میں سے ہر ایک جانتا ہے کہ دنیا میں آج کل وہ کام ہو رہے ہیں جو پہلے زمانے میں نہ سنے جاتے تھے۔ پہلے زمانے میں ایک مقام سے دوسرے مقام کو جانا ہوتا تو چھکڑوں یا سواری کے جانوروں کے ذریعے جاتے تھے۔ اس طرح کئی مہینوں کا سفر ہوتا تھا لیکن جب سے ریل [illegible] مہینوں کا سفر دنوں میں، اور دنوں کا گھنٹوں میں طے ہونے لگا۔ کسی زمانے میں ہوا میں اُڑنا ایک ناممکن بات سمجھی جاتی تھی لیکن آج کل ہم ہوائی جہاز کو پرندوں کی طرح ہوا میں قلابازیاں لگاتے دیکھتے ہیں اسی طرح سیکڑوں چیزیں عالم وجود میں آئیں۔ ان تمام چیزوں کی ایجاد کا گھر "سائنس" ہے۔

لیکن یہ سمجھنا کہ صرف سائنس پڑھنے سے یہ کام آسان ہو جاتا ہے نہیں۔ اس کے لئے عمل ہمت اور عالی دماغی کی ضرورت ہے یوں تو ہم ہندوستانی بھی سائنس کی بڑی بڑی ڈگریاں حاصل کرتے ہیں لیکن ہاتھ پر ہاتھ دھرے خاموش بیٹھے رہتے ہیں۔ ایسی ڈگریوں سے کیا فائدہ جس سے کسی قسم کا استفادہ نہ کیا جاسکے۔ ان تمام چیزوں کی ایجاد کرنے والے مغربی ممالک کے رہنے والے تم ہی جیسے انسان مگر اولوالعزم اور سچا ارادہ رکھنے والے ہیں۔ یہ خیال نہ کرنا کہ وہ تم جیسے غریب نہیں۔ وہ تم سے بھی غریب تھے۔ باوجود غربت کے اپنے آپ کو ہر کام کا اہل سمجھتے ہیں۔ آج ہم تم کو ان ہی میں سے ایک شخص کا حال سناتے ہیں جس نے سب سے پہلی مرتبہ ریل کا انجن تیار کیا۔ اس عالی ہمت شخص کا نام جارج اسٹفنسن تھا۔

جارج ملک انگلستان کے کسی قریہ میں ۱۷۸۱ء میں پیدا ہوا اس کے والد کا نام رابرٹ اسٹفنسن تھا۔ یہ کوئلے کی کان میں مزدوری کیا کرتا تھا۔ اس سے اندازہ لگایا جاسکتا ہے کہ کوئلے کی کان میں کام کرنے والے کی کیا آمدنی ہوگی اور وہ اپنے بچوں کی تعلیم و تربیت کا کس طرح انتظام کرتا ہوگا

جارج اور لڑکوں کی طرح بارہ سال کی عمر تک آوارہ رہا اور اپنا سارا وقت کھیل کود میں گنوایا اس کے باپ نے اپنی آمدنی میں اضافے کے خیال سے اپنے لڑکے کو بھی کان میں ملازم رکھا دیا۔

ان دنوں کوئلے کی کانوں میں بھاپ سے چلنے والا انجن استعمال کیا جاتا تھا بھلا ایسا لڑکا جو علم سے بالکل بے بہرہ ہو کس طرح اس انجن سے متعلق معلومات بہم پہنچاتا لیکن اس کو روز بروز انجن سے دلچسپی ہوتی گئی۔ بڑی کوشش کے بعد انجن سے اچھی طرح واقف ہوگیا۔ اسی زمانے میں ٹریوتھک نامی ایک شخص نے اپنے ایک دوست کی مدد سے ایسا انجن ایجاد کیا تھا جو بغیر کسی جانور کی مدد کے سڑکوں پر دوڑتا تھا جارج کو بھی ایسے انجن تیار کرنے کی فکر ہوئی لیکن اس کو اپنی مشکلات کا اچھی طرح احساس ہوگیا تھا اور یہ خوب جان گیا تھا کہ جب تک تعلیم نہ پائی جائے کامیابی قطعی ناممکن ہے۔ چنانچہ اب جارج راتوں کو مدرسے میں پڑھتا تھا۔ دیکھو ترقی کرنے والے سپوت ایسے ہوتے ہیں۔

جارج کی شادی بھی ہوگئی جس کے سبب اس کے اخراجات بڑھ گئے لیکن جارج ایک ہوشیار آدمی تھا۔ دوسری مزدوری کے ذریعے اس کی تلافی کرتا تھا اس کے گھر ایک بچہ پیدا ہوا لیکن اس کے بعد ہی بیوی شوہر کو جدائی کا داغ دے گئی بیوی کے مرنے کا اس کو اتنا صدمہ ہوا کہ انگلستان کو خیرباد کہہ کر اسکاٹ لینڈ کا رستہ لیا۔ اسکاٹ لینڈ میں کچھ دنوں تک رہ کر ایک معقول رقم کے ساتھ انگلستان واپس آیا۔ اب اس کو اپنے ماں باپ کی بھی کفالت کرنی پڑی چونکہ اس کا باپ اندھا ہوگیا تھا۔ جارج ایک کان میں ملازم ہوگیا اس کان میں ایک انجن تھا جو پانی خارج کرنے کے لئے استعمال ہوتا تھا لیکن یہ انجن خراب ہونے کی وجہ سے برابر کام نہیں کرتا تھا مالک نے اس کی درستی کے لئے ہر ایک ماہر سے رائے لی لیکن کچھ نہ ہوا

جب جارج نے اس کی مرمت کی اجازت چاہی تو پہلے اس کا مذاق اڑایا لیکن چند روز یہ سمجھ کر کہ چلو اس کو بھی موقع دو، اجازت دے دی۔ اس نے انجن کو ذرا سی تبدیلی کے بعد اس قابل بنا دیا کہ وہ تھوڑی دیر میں پانی خارج کرنے لگا۔ مالک یہ دیکھ کر حیران رہ گیا۔ اور

اس کو انجن کا افسر اعلیٰ مقرر کیا۔

جارج نے ایک ایسے انجن تیار کرنے کا بیڑا اٹھایا جس کی مدد سے کوئلہ اٹھایا جا سکے۔ آخر کار اس نے ایک دن ایسا انجن بنا کر لیا جو بھاپ کے بل بوتے پر کوئلہ ایک جگہ سے دوسری جگہ پہونچاتا تھا اور یہ پٹڑیوں پر چلتا تھا۔

ایک اور شخص جس کا نام ایڈرڈ تھا یہ ارادہ کیا کہ ایک ریل ایسی تیار کی جائے جو گھوڑوں کی مدد سے پٹڑیوں پر چلے یہ سن کر خود اس کے پاس گیا اور اس سے کہا کہ تم بغیر گھوڑوں کے بھی اس کام کو بہت آسانی سے انجام دے سکتے ہو چنانچہ اس نے ایک انجن تیار کرنے کا وعدہ کیا۔

جارج نے ایک چھوٹا سا انجن تیار کیا اور اس کے ساتھ چھوٹی چھوٹی گاڑیاں لگا دیں۔ اور خود چلانا شروع کیا۔ منظاہرے کے دن بہت لوگ جمع ہو گئے پہلے انجن بہت ہی آہستہ رفتار سے چلتا رہا اور پھر اس نے اس کی رفتار ایک دم تیز کر دی لوگ یہ دیکھ کر دنگ رہ گئے اور واہ! واہ! کے نعرے بلند ہوئے

جارج اپنے لڑکے کے ساتھ انجنوں کی تیاری میں مصروف رہتا اور ایک دوسرے سے اچھا تیار کیا کرتا جو سب سے اچھا انجن تیار کرے اس کو پانچ سو پونڈ کا انعام دیا جانا مقرر ہوا۔ اس انعام کا جارج ہی مستحق قرار پایا۔ اور اس کے لڑکے نے انجنوں میں اور بہت اصلاحیں کیں۔ آخر میں پارلیمنٹ سے اس کو انگلستان میں پٹڑیاں بچھانے کی اجازت مل گئی اور تھوڑے دنوں ہی میں ملک انگلستان کے ایک گوشے سے دوسرے گوشے تک پٹڑیوں کا جال بچھ گیا۔

تم نے دیکھا کہ ایک معمولی انسان جس کے ہاں نہ کھانے کو برابر غذا تھی اور نہ رہنے کو گھر تھا کتنا بڑا آدمی بن گیا۔ اس کا ارادہ پکا اور مضبوط تھا۔ تم بھی اپنے ارادوں میں مستقل ہو جاؤ۔ انشاءاللہ ضرور کامیابی حاصل ہو گی دنیا میں کوئی چیز ناممکن نہیں۔ دوسری قوموں کو یہ ثابت کر دکھاؤ کہ ہمارے دماغوں میں بھی ہر کام کے انجام دینے کی صلاحیت موجود ہے۔

شیخ رحیم الدین (ظہیر آبادی)

بچوں کی مٹھائی

نامیاں نانا نہیں دیتے ہیں کسی کو گالی
اچھے بچے نہیں کرتے ہیں زباں اپنی خراب
ایسے بچوں کو کوئی پیار نہیں کرتا ہے
دیکھو نبتن کو وہ کس طرح سے چپ رہتا ہے
کل سے اسکول کو جایا کرو پڑھنے کے لئے
جس طرح بھائی پڑھا کرتا ہے ویسے ہی پڑھو
سائکل چھوٹی سی اسکول کے جانے کے لئے
اچھے بچے جو ہیں سنتے ہیں بڑوں کا کہنا

ہاں بری بات برے ہوتے ہیں بچے ایسے
یہ گنواروں میں ہوا کرتے ہیں ایسے تیسے
نہ کوئی دیتا ہے پاس اپنے بلا کے پیسے
تم بھی ایسے ہی رہو رہتا ہے نبتن جیسے
وال سے پھر آکے سبق ہم کو سناؤ لے سے
کوٹ پتلون بنا دیں گے تمھیں بھی ویسے
کل منگا دیں گے مگر بیٹھو گے اس پر کیسے
جو برے ہیں وہ نہیں سنتے بڑوں کی شے سے

سید ابوالقاسم سرور

سینما

سینما کی ابتدائی حالت یہ تھی کہ تصاویر علیحدہ علیحدہ لی جاتی تھیں اور روشنی کی مدد سے انھیں پردے پر دکھلایا جاتا تھا اور شاید اس وقت کسی کو بولتے فلم کا خیال بھی نہ آیا ہوگا لیکن جس طرح ہر چیز ترقی کی طرف مائل ہوتی ہے اسی طرح سے سینما بھی ترقی کی طرف مائل تھا سینما کی ترقی میں عقلمند مصوروں ڈرامہ نویسوں اور اداکاروں نے حصہ لیا اور ان الگ الگ تصویروں کو فلم کی صورت میں لایا گیا یا دوسرے الفاظ میں یوں کہئیے کہ مسلسل تصاویر کو فلم کہنے لگے اسی طرح اس کی ترقی کا دروازہ کھلا اور اب تک بہت کچھ ترقی کر چکا ہے سینما کے لئے بڑے بڑے مصنفین نے اچھے اچھے ڈرامے لکھے فلموں کے ساتھ ریکارڈ بھی دیئے جانے لگے اور تصاویر کے ساتھ ریکارڈ بھی لگائے گئے جب یہ لوگ ہونٹ ہلاتے ہیں تو ایسا معلوم ہوتا ہے کہ گویا زندہ آدمیوں کی طرح باتیں کر رہے ہیں سینما جیسی اچھی چیز ہے بشرطیکہ اس سے فوائد حاصل کئے جائیں مثلاً اگر کسی کو یہ سمجھایا جائے کہ ہوائی جہاز اس طرح سے پرواز کرتا ہے تو وہ نہ اس کو اچھی طرح سے سمجھے گا اور نہ اس کی تشفی ہوگی اور اگر اس کے بجائے ہم اس کو کسی فلم کے ذریعے سے بتلائیں کہ ہوائی جہاز اس طرح سے پرواز کرتا ہے تو وہ فلم دیکھنے کے بعد اچھی طرح سمجھ جائے گا اس کے سوائے بھی ہزارہا مثالیں ہیں جن کے باعث سینما سائنس دانوں کا شاندار کارنامہ کہلاتا ہے۔ مثلاً اگر ہم کسی کو کہہ دیں کہ ہر قوم کی ترقی کا دارومدار ان کے ہوشیار قومی لیڈروں پر ہے تو بعض لوگ یہ خیال کریں گے کہ کیا کہیں غریب قومی لیڈر بھی کسی قوم کو ترقی دے سکتے ہیں اور یہ خیال کریں گے کہ کیا بیچارے لیڈروں پر ہی قومی ترقی کا دارومدار ہے لیکن اس کے بجائے اگر ہم انھیں فلم دکھلادیں کہ لیڈروں نے کیسے مجمع کے سامنے تقریریں کیں اور مجمع کو اپنا بنالیا۔ تو لوگ سمجھ جائیں گے کہ چند ہوشیار لیڈر مل کر کسی قوم کو کیسے ترقی دے سکتے ہیں اگر ہم کسی کو یہ سمجھائیں کہ ترکی کچھ دنوں پہلے بہت مصیبت میں پھنس گیا تھا لیکن اس کو چند فدایان ملک نے اس پستی سے نکالا تو اتنا کہنے اور سمجھانے سے لوگوں کو تشفی نہیں ہوگی لیکن ان تمام واقعات کو فلم کے ذریعے سے بتلادیں تو لوگ اچھی طرح سے سمجھ جائیں گے کہ ان جاں نثاران قوم نے ترکی کو کس طرح پستی سے نکال کر بلندی پر پہنچا دیا۔ اس لئے سینما کی سی سہولتیں کسی اور چیز میں نہیں آسکتیں کیونکہ مشاہدہ ہی سے معمولی عقل والا انسان ہر چیز کو سمجھ سکتا ہے سینما ہمیں نصیحت آموز سبق سکھلاتا ہے اور مناظر قدرت سے ہم کو بہرہ اندوز کرتا ہے سینما ہی تعلیمی تفریح کا بہترین ذریعہ ہے تاج محل جو دنیا کے (۷) خوبصورت عجائبات میں سے ہے اور جس کو اکثروں نے ابھی تک دیکھا نہیں اگر اس عمارت کو یہاں دیکھنا چاہیں تو صرف فوٹو کے ذریعہ سے دیکھ سکتے ہیں لیکن فوٹو میں ہمیں اس کی خوبیاں اچھی طرح سے ظاہر نہ ہوں گی۔ اس کے بجائے اگر تاج محل فلم میں بتلایا جائے تو ہم اپنے وطن میں بیٹھ کر اس عمارت کا حسن مرمری دیکھ سکتے ہیں اور اپنے دل کو خوش کر سکتے ہیں کیونکہ یہ ہماری گزشتہ زمانے کی بہت بڑی تاریخی یادگار اور اسلامی تعمیر کا مکمل ترین نمونہ ہے جو لوگ تمام دن کام کرنے کے بعد تھک جاتے ہیں انھیں تفریح کے لئے سینما سے بہتر کوئی چیز نہیں ہوسکتی کیونکہ سینما میں ہر وہ چیز رہتی ہے جو تفریح اور دل کی شگفتگی کے لئے موزوں ہو۔ مثلاً سینما میں وہ بہترین مناظر اور تاریخی ڈرامے بتلائے جاتے ہیں جن سے دلچسپی پیدا ہوجاتی ہے۔ یہ تفریح کی حد تک ہے لیکن سینما کا اصلی مقصد تعلیم دینا ہے سینما صرف تعلیم اور ریاست کی حد تک ہی مفید نہیں بلکہ زندگی کے ہر شعبہ کے لئے ضروری ہے سینما ہمیں اچھی تعلیم دیتا اور ہماری ہمت بڑھاتا ہے مثلاً ہم میں اتنی صلاحیت نہیں کہ اپنی بود و باش کے نقائص اور ترقی یافتہ ممالک کی خوبیاں دیکھیں لیکن اس کا مشاہدہ ہمیں سینما ہی کے ذریعہ ہوسکتا ہے سررشتۂ تعلیمات حکومت سرکار عالی بھی سینما کے ذریعہ تعلیم پھیلانے کی تجاویز پر غور کر رہا ہے بہرکیف سینما ہر طرح سے مفید ثابت ہوسکتا ہے

محمد شفیع الدین صدیقی (طالب علم مدرسہ وسطانیہ شاہ علی بنڈہ)

احسانِ فراموشی (ایک سبق آموز قصّہ)

کہتے ہیں کہ کسی ملک میں بادشاہ بیمار ہوگیا۔ وہاں کے حکما نے بہت علاج کیا مگر کچھ افاقہ نہ ہوا۔ بادشاہ ناامید ہو چکا تھا کہ وہاں ایک حکیم آیا۔
میں ماہر تھا۔ اور بہت سی زبانیں بھی جانتا تھا۔ جب اس نے سنا کہ بادشاہ کو کوئی اچھا نہ کرسکا تو اس نے اپنے آنے کی اطلاع دی۔ اور حکم پاکر حضور
داخل ہوا اور درخواست کی کہ اگر ارشاد ہو تو بغیر کسی داخلی علاج کے حضور کو اچھا کر دونگا۔ بادشاہ نے جواب دیا کہ اگر تم مجھے اس طرح تندرست کر
میں تمہیں خوش کردونگا۔ دوسرے دن حکیم ایک گیند اور ایک بلّا لے کر حاضر ہوا۔ دونوں اندر سے کھوکھلے تھے۔ ان میں دوائیں بھری ہوئی تھیں
حضور اس سے خوب کھیلیں۔ جب بدن سے پسینہ نکلنے لگے تو اس وقت آپ فوراً حمام کریں اور خوب سوئیں۔ کل آپ بالکل تندرست ہوجائیں گے۔
ایسا ہی کیا اور جب جاگا تو بالکل تندرست تھا۔ بادشاہ حیران رہ گیا۔ پھر اس نے دربار کیا ارکانِ دولت حاضر ہوئے۔ حکیم صاحب بھی موجود تھے
ان کی بڑی تعریف کی اور انعام واکرام دیا۔ وزیرِ اعظم کو حکیم کی عزت افزائی ناگوار گذری۔ اس نے ارادہ کیا کہ حکیم کو بادشاہ کی نظروں سے گرا
بادشاہ کچھ کم عقل بھی تھا۔ وہ وزیر کے بہکانے میں آگیا۔ وزیر نے بادشاہ کو کہا کہ یہ حکیم جاسوس ہے۔ اور آپ کے کسی دشمن نے اسے بھیجا ہے اگر
آپ کو اچھا کردیا ہے مگر آخر کار دواؤں کی تاثیر رنگ لائے گی۔ اور آپ کی جان پر بن آئے گی۔ بہتر ہے کہ آپ اسے بلاکر فوراً قتل کا حکم دے
بادشاہ نے کہا۔ بہتر میں اپنی جان بچانے کے لیئے ابھی اس کے قتل کا فیصلہ کیئے دیتا ہوں۔ پھر بادشاہ نے حکیم کو بلا بھیجا۔ اور جب وہ خوش خوش آیا
پوچھا تو جانتا ہے کہ میں نے تجھے کس لیئے بلایا ہے۔ حکیم نے جواب دیا۔ نہیں۔ حسبِ ارشاد میں حاضر ہوگیا۔ بادشاہ نے کہا کہ میں تجھے قتل کرنا چا
حکیم سخت حیران ہوا۔ اور کہا کہ خداوند میرے قتل کی وجہ تو آپ بتادیجئے۔ بادشاہ نے کہا کہ تو جاسوس ہے اور میرے مارنے کا ارادہ رکھتا
حکیم سمجھ گیا کہ حاسدوں کا داؤ چل گیا ہے۔ وہ دیر تک اپنی بے قصوری کا اظہار کرتا رہا۔ اور جب دیکھا کہ گنجائش مشکل ہے تو بادشاہ سے درخواست
تھوڑی دیر کے لیئے اجازت ملے کہ میں اپنے مکان جاکر اپنا سامان عزیزوں میں تقسیم کردوں۔ اس سامان میں ایک کتاب بھی ہے جو کتب خانۂ شاہی
قابل ہے۔ بادشاہ نے پوچھا کہ وہ کیسی کتاب ہے؟ حکیم نے کہا کہ اس میں بہت سی راز کی باتیں ہیں۔ ازآں جملہ ایک یہ ہے کہ جب میرا سر کاٹا جائے
اس کتاب کو کھول کر چھٹے ورق کے بائیں صفحہ کی تیسری سطر پڑھ کر جو سوال کریں میرا سر فوراً جواب دے گا۔ بادشاہ خوش ہوا۔ اور بولا کہ یہ تما
دیکھنے کے قابل ہے اور اس نے قتل کا حکم دوسرے دن پر ملتوی کردیا۔ حکیم اپنے گھر جاکر ایک ہی دن میں سب کاموں سے فراغت حاصل کر
ایک بڑی کتاب لے کر حاضر ہوا۔ اور جزدان سمیت اسے بادشاہ کی خدمت میں داخل کر کے کہا کہ جب میرا سر کاٹا جائے تو اسے ایک طشت میں جزدان
رکھ دیجئے فوراً خون بند ہوجائے گا۔ پھر کتاب پڑھ کر سوال کیجئے۔ میرا سر جواب دے گا۔ حکیم نے پھر التجا کی کہ جہاں پناہ! میں بے گناہ ہوں میرے قتل
درگذر کیجئے۔ مگر بادشاہ نے ایک نہ سنی اور کہا کہ تیرے مارے جانے کے بعد تیرے سر سے گفتگو سنوں گا۔ یہ کہہ کر بادشاہ نے کتاب اٹھالی اور جلاد
حکیم کا کام تمام کردیا۔ جب حکیم کا سر جزدان پر رکھ کر طشت میں رکھا گیا تو خون فوراً بند ہوگیا۔ بادشاہ نے کتاب کھول کر چاہا کہ ورق الٹے۔ مگر وہ آپس میں
چپاں تھے کہ انگلی میں لعابِ دہن لگائے بغیر اسے الٹا نہ سکا۔ جب نوبت چھٹے ورق پر پہنچی۔ بادشاہ نے ہر چند چاہا کہ ورق الٹے۔ اور انگلی کو لعاب
ورق الٹاتا تھا۔ یہاں تک زہر ہلاہل نے جو کتاب کے اوراق میں لگا ہوا تھا جسم میں سرایت کی اور بادشاہ کا حال لحظہ بلحظہ متغیر ہونے لگا۔ اس کی بصارت جاتی
آخر بے قرار ہوکر تخت کے نیچے جا پڑا۔ اسی وقت سر نے پکارا "اے ظالم" دیکھ بے گناہوں کا خون ضائع نہیں جاتا۔ اس کلام کو سنتے ہی بادشاہ چل بسا اور اپنی سزا کو پہنچا

دیکھنے والے

ھ لے دیکھ کر خود نبضِ بسمل دیکھنے والے
دکھائیں کیا تجھے بیتابیٔ دل دیکھنے والے

ری گردن میں ہاتھ اپنے حمائل دیکھنے والے
ہی ہے جذبۂ دل جذبۂ دل دیکھنے والے

واتے خاک اگر بن جا غبارِ پردۂ لیلیٰ
بگولے کی طرح اٹھ اٹھ کے محمل دیکھنے والے

ہنسی سمجھے تھے قلبِ مضطرب پر ہاتھ کا رکھنا
تڑپ کر رو دیئے بیتابیٔ دل دیکھنے والے

کمانِ غمزہ میں تیرِ نگہ زہ کر چکا کوئی
نویدِ اے جنبشِ مژگانِ قاتل دیکھنے والے

نہ چھوٹ جائے کہیں رنگِ حنا دستِ حنائی سے
کفِ افسوس مل کر خوں بھرا دل دیکھنے والے

سوالِ وصل کا بس بس جواب اتنا ہی کافی ہے
ادا سے مسکرا دے روئے سائل دیکھنے والے

خدا شاہد یہ تیری بیکسی ہے قابلِ عبرت
فلک کو یاس سے منزل بہ منزل دیکھنے والے

بُتانِ شوخ کو دل دیکھنے کا صدقؔ دعویٰ ہے
مرے اشعار تو دیکھیں مرا دل دیکھنے والے

صدقؔ جائسی

دیکھ لینے دے

کل آنا آج جانا یہ تماشا دیکھ لینے دے
ٹھہر عمرِ رواں دو دن کی دنیا دیکھ لینے دے

ہنسیں رونے پہ اور روئیں ہنسی پر دیکھنے والے
یہ دنیا رو کے ہنسنا ہنس کے رونا دیکھ لینے دے

قیامت ہے یہ کہنا منہ چھپا کر جانے والے سے
ٹھہر جا دیکھ لینے دے ٹھہر جا دیکھ لینے دے

دکھا دے یوں جھلک دل جل اٹھے بیہوش ہو جاؤں
مجھے موسیٰ صفت ہی اپنا جلوہ دیکھ لینے دے

جنوں وحشی کو لیجا بعد تو زنداں سے محشر میں
اسے پہلے ذرا ہر پھر کے صحرا دیکھ لینے دے

نہ کر محدود بُت خانے میں مسجد میں کلیسا میں
ترا ہر جائی جلوہ مجھ کو ہر جا دیکھ لینے دے

خدایا پہلے حسرت تھی مگر اب عبث آئے گی
انھیں آنکھوں سے دنیا کا تماشا دیکھ لینے دے

میر آفتاب علی خاں مہر

عیدِ میلاد النبیؐ

فرشتے ہور گگن ساتوں کوں نثاراں سوں سنوارے ہیں

شہِ دنیا و دیں کے تئیں عرش کرسی سنگارے ہیں

مگر مولود ہے شہ کا عرش اوپر طبل کا باجے

مراداں پاونے سارے جگت ہاتاں پسارے ہیں

خوشیاں تھے جگ سماتے نیں سو اپنے پیرہن میانے

نیرہ جگ آپنا تن من شہنشہ پر نثارے ہیں

محمد قطب شہ غازی کرے مولود بہو خند سوں

تو اس کی عمر و دولت تئیں دعا صف صف ہو ٹھارے ہیں

ملک ہور جن سب کرتے دعا شہ کا صدق سیتے

دنیا ہور دین میں ایسا سو شہ نیں کر بچارے ہیں

صدق ..... کاری آپ آچا یا نا نو دو جگ میں

طبق نوراں کے لے حوراں سو شہ پر تھے نثارے ہیں

نبیؐ صدقے کیا پایا ہے ترکماں آج میزوانی

علیؑ صدقے سے دو جگ میں بلند اس کے ستارے ہیں

سلطان محمد قلی قطب شاہ

صرے

حیدرآباد ڈومینینس مولفہ جی پی بھان صاحب مددگار سٹی کالج ، ملنے کا پتہ اور قیمت باوجود تحقیق کے مل نہ سکے ۔
پہلی ہی نظر میں معلوم کیا جاسکتا ہے کہ یہ کتاب طالب علمانہ نقطۂ نظر سے نہیں بلکہ عوام کے افادہ اور خصوصاً دیگر ممالک کے سیاحوں اور معلومات
حاصل کرنیوالوں کے لئے لکھی گئی ہے ۔ فہرست مضامین، تقسیم ابواب، خاص ترتیب غرض کوئی ایسی سہولت اس میں نہیں جس سے مطالعہ کرنیوالا بغیر کافی
[illegible] جس چیز کا خواہشمند ہے معلوم کرسکے تاہم شگفتہ انداز بیان، سلیس پیرایہ اور خصوصاً افسانوی تسلسل جس سے یہ کتاب مملو ہے وہی اس
[illegible] ہے کہ پڑھنے والے کو اس کے ختم کرنے تک روک سکے ۔ عوام کے افادہ کی خاطر لکھی ہوئی اس کتاب میں حیدرآباد کی جدید ہمہ جہتی ترقیات
[illegible] تفصیلی بیانات سے خاص طور پر پرہیز کیا گیا ہے ۔ کتاب کے آخر آخر میں صوبوں اور اضلاع کے متعلق مجمل معلومات درج کئے گئے ہیں ۔ بہرحال بحیثیتِ
[illegible] کی یہ مختصر کتاب معلومات آفریں کہی جاسکتی ہے اور جس مقصد کے لئے لکھی گئی ہے اس کو بڑی حد تک پورا کرسکتی ہے ۔

[illegible] کہانیاں مولفہ محمد عبدالسلام صاحب ذکی بی ، اے ۔ عثمانیہ ، ناشر سید عبدالقادر اینڈ سنس قیمت سرکار سے ۸/ عوام سے ۸/
ذکی صاحب ملک کے بچوں کی ترقی و اصلاح میں اس قدر زیادہ حصہ لینے لگے کہ بالآخر خود ایک "بچہ" بنکر رہ گئے ۔ بچوں کی
[illegible] ، ان کی دماغی حالت اور ان کے شوق و دلچسپی کو ایک "بچہ" سے بڑھ کر کون جان سکتا ہے یہی وجہ ہے کہ پیش نظر کتاب ذکی صاحب کے
[illegible] نظر کی پوری آئینہ دار ہے اس میں کل کہانیاں یا کہانی نما تاریخی حالات ہیں جو سلطنت آصفیہ کے چھ سلاطین اور پانچ اسی خاندان کے پیشروؤں
اور دیگر متعلقین کے ہیں ۔ انداز بیان سادہ اور سلیس ہے ۔ آج کل اردو ادب میں افسانہ کی جو قدر ہے وہ سب ہی کو معلوم ہے ، آصفی سلاطین
کے صدہا تاریخی واقعات ایسے ہیں جنھیں بالکل کہانی کے پیرایہ میں ادا کیا جاسکتا ہے ۔ زیر نظر کتاب میں کہانی کم اور تاریخ زیادہ ہے ۔ اگر ذکی صاحب
سلاطین آصفی کے ان بیشمار واقعات میں سے جو زبان زد خاص و عام ہیں چند دلچسپ، نتیجہ خیز اور اثر انگیز واقعات لے کر بچوں کی دلچسپی کے لئے
[illegible] کی زبان میں کہانیوں کی شکل میں یا ڈرامائی انداز میں پیش کرتے تو انھیں بلاشک اپنے مقصد میں اس سے کہیں زیادہ کامیابی ہوتی مگر
[illegible] عبدالمجید صاحب صدیقی استاد تاریخ کہ جنھوں نے اس کتاب کے پیش لفظ میں لکھا ہے) ". . . . . . ابتدا میں کوئی چیز مکمل نہیں ہے
[illegible] قدر اعتراف کرنا پڑے گا کہ اس میدان میں ذکی صاحب نے پہلا قدم رکھا ہے " ۔ ابتدا میں عبدالمجید صاحب صدیقی کا پیش لفظ
اور سروری صاحب کا مقدمہ ہے اس کتاب کو شہزادہ مکرم جاہ کے نام نامی سے معنون کیا گیا ہے ۔ مجموعی طور پر ذکی صاحب کی یہ پہلی کوشش
ناقابل تحسین نہیں کہی جاسکتی اور قوی توقع ہے کہ ان کا " دوسرا نقش " اس سے بہرصورت بڑھ چڑھ کر ہوگا ۔

المنظور کربلا نمبر بدایون سے نکلنے والا ماہوار رسالہ ہے ، دنیائے اسلام کی اس عظیم ترین قربانی کی دردناک و خون چکاں یاد کو
تازہ کرنے کے لئے جس طرح اور رسائل نے اپنے اپنے خاص نمبرات پیش کئے ہیں اسی طرح المنظور کے ایڈیٹر جناب
جناب محمد عبدالواحد عثمانی صاحب نے بھی اس کا کربلا نمبر پیش کیا ہے ۔ اس مختصر سے پرچہ میں باب التفسیر کے علاوہ سارے مضامین داستان کربلا ہی سے
متعلق ہیں جس کے لئے یہ نمبر پیش کیا گیا ہے " داستان عشق " اور " شہید مظلوم " اچھے مضامین میں شمار کئے جاسکتے ہیں ۔ شذرات میں اپنے
متعلق " خود ستائی نہیں حقیقت ہے " کہہ کر جو روشنی ڈالی گئی ہے وہ موجودہ پرچہ کی کسی " خوبی " پر منطبق نہیں کی جاسکتی حالانکہ یہ خاص نمبر ہے ۔

سالانہ چندہ ۲ روپیہ منیجر المنظور بدایون سے مل سکتا ہے۔ ۲

مرقع اصلاح حال مصنف منصور حیدرآبادی۔ یوم ترک مسکرات کے سلسلہ میں لکھی ہوئی تین نظموں کو یکجا جمع کرکے شایع کیا گیا ہے۔ پہلی نالۂ منصور یعنی ترک مسکرات" دوسری "مثنوی ترک جوا" اور تیسری "اتحاد ہندو مسلم" تینوں میں کوئی خاص نہیں متعدد اشعار وزن و تقطیع کے قیود سے بے نیاز ہیں معلوم نہ ہوسکا کہ آخری نظم لکھنے کا کیا محل تھا۔ یہاں نفاق کب ہوگیا تھا جس کو دور کی دعوت دونوں مذاہب کے لوگوں کو دی جارہی ہے۔ اس قسم کی نظموں سے اکثر لوگ خصوصاً بیرون ریاست کے لوگ غلط فہمیوں کا شکار ہوجاتے ہیں۔ احتراز ضروری ہے۔ ملنے کا پتہ غائب۔ ۲

پہلا شراب کار مترجمہ محمد یونس سلیم صاحب بی۔اے۔ ملنے کا پتہ دارالادب پنجاب بارود خانہ اسٹریٹ لاہور قیمت درج نہیں ٹالسٹائے کے اس مختصر سے ڈرامے کے متعدد تراجم اردو اور ہندی میں ہوچکے ہیں۔ ترجمہ در ترجمہ ہونے کی وجہ زبان کی کوئی لطافت اور خوبی باقی نہیں رہی اور نہ اصولاً رہ سکتی ہے جہاں تک میرا خیال ہے اس ڈرامہ کے تمام تراجم میں ممنون لوہاری نے سب سے اچھا ترجمہ کیا ہے جسے آج دس گیارہ سال پہلے شاید ڈسمبر ۱۹۲۶ء کے نگار میں انہوں نے "ابوالخمر" کے نام سے شایع کیا تھا اس چھوٹے سے ڈرامہ کو (پانچ ایکٹ میں منقسم کیا گیا ہے) جناب راجہ حسن اختر صاحب اکسٹرا اسسٹنٹ کمشنر پنجاب کے نام سے معنون کیا ہے۔ اس میں شک نہیں کہ دیہات سدھار کی تحریک کے لئے ایسی اشاعتیں مفید ہیں لیکن بار بار ایک ہی راگ الاپو تو سننے والے کو اس سے نفرت ہوجاتی ہے۔ ان فرسودہ تخیلات کے بھونڈے تراجم پر آج کل جو محنت صرف کی جارہی ہے اگر وہی محنت اپنے ملک اپنی زبان اپنی تہذیب و معاشرت اور غریب طبقہ کی روی حالت کی اصلاح و ترقی کے لئے اپنے ہی ذاتی و اپجی خیالات پیش کئے جائیں تو ماحول بہت کچھ بدل سکتا ہے۔ سوائے سرورق کے موجودہ حالت میں اس ترجمہ میں کوئی بات قابل لحاظ نہیں۔ ۲

خیابانِ نسواں نصیر الدین صاحب ہاشمی حیدرآباد کے ان انشاپردازوں میں سے ہیں جنہوں نے اردو زبان کے تاریخی تحقیقی ادب میں قابل قدر اضافہ کیا ہے ان کی بعض کتابوں نے اردو دانوں میں بڑی مقبولیت حاصل کی ہے۔ ہاشمی صاحب نے مستقل تصنیفات کے علاوہ کئی دلچسپ مضامین لکھے جو وقتاً فوقتاً مختلف اخبارات و رسائل میں شائع ہوتے رہے ان کے مضامین کا پہلا مجموعہ شائع ہوکر زیادہ عرصہ نہیں ہوا کہ ماہنامہ "عصمت" کے بکڈپو کی جانب سے ان کے ان مضامین کا دوسرا مجموعہ مرتب کرکے چھاپا گیا ہے جو ہندوستان کی نسوانی زندگی سے متعلق ہیں۔ بعض مضامین بلاشبہ اس قابل ہیں کہ ان کو ضرور پڑھا جائے۔

یہ کتاب (۱۲) میں عصمت بک ڈپو سے مل سکتی ہے۔

انتظام کتب خانہ نوشتہ شیخ محبوب صاحب قریشی، ناشر محبوبیہ کارخانہ جلدسازی نظام شاہی روڈ حیدرآباد دکن قیمت ۴ر

شیخ محبوب صاحب قریشی ایک باہمت اور پرجوش حیدرآبادی ہیں۔ ان کے دل میں علمی خدمت کا ایک قابل قدر جذبہ ہے اسی جذبہ کے تحت انھوں نے فن صحافی کو ماہرانہ طور پر حاصل کرکے جدید ترین وسائل کے ذریعہ "محبوبیہ کارخانہ جلدسازی" قائم کیا۔ جس کے کام کی نفاست اور پائیداری اور نرخوں کی واجبیت تمام ہندوستان میں مشہور ہے اس کارخانہ کے قیام کے علاوہ انھوں نے تحفظ کتب کے لئے بعض قابل قدر ایجادیں کیں۔ جلد کو پانی اور کیڑوں کے اثر سے بچانے کے لئے "محبوبیہ بک پالش" اور اوراق کی حفاظت کے لئے ایک ...

...رکھا - یہ ایجادیں عرصہ دراز کی کاوش اور تجربات کا نتیجہ ہیں۔ آج کل وہ کتابوں کو دیمک سے بچانے کے لئے تجربے کر رہے ہیں - اگر یہ ...ہوگئے تو علم کی ناقابل فراموش خدمت ہوگی - حیرت ہے کہ ان علمی کاموں کے باوجود شیخ محبوب صاحب قریشی نے تحریری کام ...کے لئے بھی وقت نکالا - ان کی پیش نظر کتاب "انتظام کتب خانہ" ہے اگرچہ مدارس کے کتاب خانوں کے انتظام اور اُن کی ضرورتوں کا خاص طور پر ...نظر رکھا گیا ہے لیکن اس کا مطالعہ ہر اس شخص کے لئے مفید ہوگا جو اپنی کتابوں کو کم سے کم خرچ سے سنوارنا اور ان کو ہر وقت پاکیزہ صورت اور ...اچھی حالت میں رکھنا چاہتے ہوں - شیخ محبوب صاحب نے "سب رس" کے لئے ایک خاص "فائیل کور" بھی تیار کیا ہے جس میں "سب رس" ...کے بارہ شمارے حفاظت سے رکھے جا سکتے ہیں اور آسانی سے نکالے اور لگائے جا سکتے ہیں - اس پر سنہرے حروف میں "سب رس" بھی لکھا ہوا ہے ۔ م

مسلمان اور تجارت

از ابوالمکارم محمد مشائخ صاحب عارف چنیا پوری قیمت ۲ ر

ابوالمکارم عارف چنیاپوری نے "مسلمان اور تجارت" کے عنوان سے ایک مضمون لکھا تھا جس کو کتابی صورت میں شائع کیا گیا ہے۔ زبان عام فہم ہے اور ایسا معلوم ہوتا ہے کہ یہ مضمون عوام کے لئے لکھا گیا ہے اس زمانہ میں جب کہ تمام ترجمانات سرکاری ملازمت کی جانب مرکوز ہیں، اس قسم کے رسالے بہت کارآمد ثابت ہو سکتے ہیں - اس مختصر کتاب میں عارف صاحب نے مسلمانوں کی تاریخ ماضی پر ایک نگاہ بازگشت ڈالی ہے اور مذہبی نقطۂ نظر سے ثابت کیا ہے کہ مسلمانوں کی معاشی ترقی کے لئے "تجارت" کا پیشہ اختیار کرنا ضروری ہے - جن مسلمانوں کے دل میں اپنی قوم کا درد ہے وہ اس رسالہ کو ضرور پڑھیں - مصنف کے پتہ پر مل سکتی ہے - م

انکشاف

از صاحبزادی قطب النسا بیگم صاحبہ - صاحبزادی قطب النسا بیگم صاحبہ خاندان شاہی کی ایک روشن خیال خاتون ہیں انھوں نے اپنے خاندانی حالات کو "انکشاف" کے نام سے ایک کتابی صورت میں ترتیب دیا ہے، اگرچہ یہ کتاب، ایک خاص خاندان سے متعلق ہے لیکن اس کی افادیت سے اس لئے انکار نہیں کیا جا سکتا کہ اس کے ذریعے خانوادۂ آصفیہ کی ایک قابل احترام شاخ کے حالات پر روشنی پڑتی ہے - اس کے علاوہ ایک عظیم المرتبت خانوادہ کی ایک لائق خاتون کی علمی خدمت کے لحاظ سے بھی وہ قابل مطالعہ ہے - ہم صاحبزادی صاحبہ کو ان کے علمی مشاغل پر مبارکباد دیتے ہیں اور ان سے توقع رکھتے ہیں کہ وہ اپنے خانوادہ کی خواتین میں علم کا سچا شوق پیدا کریں گی ۔ م

روزنامہ مشیر ہند بمبئی

ابوسعید خان صاحب رفاعی جو حیدرآباد کے ایک معزز جاگیردار ہیں بمبئی سے روزنامہ "مشیر ہند" نکال رہے ہیں - اس روزنامہ کا مقصد حیدرآباد کے طبقہ جاگیرداران اور طبقہ صاحبزادگان کی صحیح نمائندگی اور مسلمانوں کی قومی خدمت کرنا ہے - اس میں دنیا بھر کی خبریں، مضامین اور نظمیں شائع ہوتی ہیں لیکن افسوس ہے کہ زبان کا بعض وقت لحاظ نہیں رکھا جاتا - اس لئے اکثر غلطیاں نظر آتی ہیں - کتابت و طباعت بھی زیادہ اچھی نہیں ہے - ہمیں امید ہے کہ رفاعی صاحب ان امور پر قابو پالیں گے - اس طرح ان کا یہ اخبار اہل ملک کو زیادہ استفادہ کا موقع دے گا - م

اردو ہفتہ وار بمبئی

خوشی کی بات ہے کہ اہل حیدرآباد میں صحافتی خدمت کا شوق روز بروز ترقی کرتا جا رہا ہے، طوفان اور مشیر ہند کے علاوہ ہفتہ وار "اردو" بھی ایک حیدرآبادی اہل ذوق جناب غالب صاحب حیدرآبادی کی ادارت میں نکلنے لگا ہے - اس کے تمام شمارے سلیقہ سے مرتب کئے گئے ہیں اور توقع کی جاتی ہے کہ وہ بہت جلد ترقی کے منازل طے کرے گا - اس کے شماروں پر ایک عمومی نظر ڈالنے کے بعد ہم اس نتیجہ پر پہنچتے ہیں کہ یہ اردو اہل حیدرآباد کی خدمت کے لئے جاری کیا گیا - اس میں ان ناجائز پروپگنڈوں کا جواب دیا گیا ہے جو بیرون ملک حیدرآباد کے خلاف کئے جا رہے ہیں - ہم اپنے اس معاصر کا خوشی سے خیر مقدم کرتے ہیں - م

تاریخ عدالت آصفی مصنفہ میر باسط علی خاں صاحب ام اے (کنٹب) بار ات لاقیمت اور ملنے کا پتہ درج نہیں۔

دولت آصفیہ کے قیام سے اب تک معدلت گستری والصاف رسانی کے لئے متعدد عدالتوں اداروں اور دفاتر اوران کی تدریجی ترقی کے متعلق آج تک کسی نے ایسی مسلسل مربوط اور جامع تصنیف ملک کے سامنے پیش نہیں کی جیسی کہ مولوی باسط علی پیش کی ہے۔ دو سو سال سے زیادہ کا عرصہ گذر گیا کہ بانی سلطنت آصفیہ اوران کے بیدار مغز و عادل جانشینوں نے ملکی ضروریات اپنی رعایا کی سہولتوں اور اس کے اطمینان کی خاطر ہر مذہب اور ہر فرقہ کے عقائد و معاشرتی اصول کا پورا پورا لحاظ کرکے اپنی قائم کردہ متعدد ذریعہ عدل گستری اور حق پسندی کا پورا حق ادا کر دیا۔

پیش نظر تاریخ عدالت تین سو چودہ ۳۱۴ صفحات پر مشتمل ہے جس کو سات ابواب میں تقسیم کیا گیا ہے۔ پہلے باب میں ریاست حیدرآباد کی اجمالی تاریخ ہے دوسرے باب میں ریاست حیدرآباد میں اسلامی قوانین کا تذکرہ ہے۔ تیسرا باب عہد آصفی میں عدالتوں کے قیام اوران کی مشتمل ہے۔ اس باب کے مختلف حصے ہیں جن میں متعدد قدیم دفاتر عدالت ہائے فوجداری دیوانی اسمات ضلع و تعلقات مشترک عدالتیں مجالس مرافعہ صدر وغیرہ کی تفصیل ہے غرض نہایت تفصیل سے ہر قابل مصنف نے سلاطین آصفیہ کے طریقہ عدل پر روشنی ڈالی ہے۔

چوتھا باب دور عثمانی میں عدالتوں کا نظم و نسق اوران کی اصلاح و ترقی کے مفصل بیانات سے مملو ہے۔ پانچویں باب میں بلندی معیار امتحانات عدالتی و انجمن وکلا، عدالت عالیہ کا حال درج ہے۔

چھٹا باب ان شہزادگان والا تبار، مشاہیر سلطنت، صدر اعظمان، مدار المہامان، معین المہامان، صدر المہامان، معتمدین عدالت نیز واراکین عدالت العالیہ وغیرہ کے دلچسپ اجمالی حالات جمع کئے گئے ہیں جنھوں نے اصلاحات و انتظام عدالت میں اپنی دلچسپی سے عملی حصہ لیا۔

باب ہفتم میں صرف خاص مبارک اور علاقہ غیر خالصہ یعنی پائیگاہوں، سمستانوں اور جاگیرات وغیرہ کی عدالتوں کے بیانات ہیں۔

کتاب کو اعلیٰ حضرت بندگان عالی، شہزادگان و شہزادیان والا تبار کے علاوہ قدیم مشاہیر حیدرآباد، اراکین کونسل قدیم و جدید عدالت اور عمارات عدالت العالیہ و عدالت ہائے اضلاع کی دلکش تصاویر سے مزین کیا گیا ہے جو تعداد میں پچاسی ہیں۔ شروع میں رفتار عدالت کا نقشہ دیا گیا ہے۔

کتاب "عادل حقیقی" کی بارگاہ میں نذر کی گئی ہے۔ ابتدا میں نواب سر امین جنگ بہادر کا قابل قدر پیش لفظ ہے۔ طباعت عمدہ اعلیٰ قسم کا استعمال کیا گیا ہے۔ ٹائیٹل پیج ملک کے ایک نامور مصور قیوم کا تیار کردہ ہے۔ میر باسط علی خاں صاحب کی یہ کوشش لائق صد تحسین ہے کہ اس روشن ترین پہلو کو اس قدر دلنشین اور عمدہ پیرایہ میں ملک کے آگے پیش کیا۔ پوری کتاب پڑھنے کے بعد ہر آدمی بے اختیار مصنف کے ساتھ دہرانے پر مجبور ہو جاتا ہے۔

ہر چند عدل جنس گراں بود در جہاں ارزاں بما رسید بہ بازار آصفی

مقالہ از مولوی عبد اللطیف صاحب منشی فاضل مولوی عالم لکچرار اخلاقیات ورنگل کالج۔ یہ چھوٹی سی کتاب ورنگل کالج کے صدر مولوی بی۔ اے کی علمی اور ادبی دلچسپی کی وجہ سے شائع کی گئی ہے مضمون نویسی کے متعلق مفید معلومات پر مشتمل ہے۔ اس میں چار باب ہیں چار اصول (۱) مضمون نگاری کی اہمیت (۲) مبادیات مضمون نویسی (۳) عناصر (۴) تعلیم مضمون نویسی ان میں مفید اور دلچسپ ہدایتیں درج کی گئی ہیں شروع میں ان کتابوں کے نام دیئے گئے ہیں جن سے بالواسطہ یا بلاواسطہ استفادہ کیا گیا ہے ان میں ایک ڈاکٹر زور کی کتاب اسالیب بیان ہے لیکن تعجب ہے کہ اس موضوع کی متعلق کتاب فن انشا پردازی کا مطالعہ نہیں کیا گیا حالانکہ یہ اس موضوع پر اسالیب بیان سے زیادہ اہم اور مفید ہے بہرحال مولوی عبد اللطیف صاحب وسطانیہ اور فوقانیہ کے طلبہ کے لئے یہ چھوٹا سا رسالہ مرتب کرکے کمی کو پورا کیا ہے۔ ضرورت ہے کہ طلبہ کی سہولت کے لئے ایسی ہی کتابیں لکھی جائیں۔

سب رس کے قلمی معاونین اور خریدار اصحاب سے

۱۔ بعض خریدار اصحاب کے پتے غلط معلوم ہوتے ہیں یا واضح نہیں ہیں جس کی وجہ سے تقسیم کنندوں کو دقت ہو رہی ہے۔ اور یا تو بعض پرچے واپس آ رہے ہیں یا دیر میں پہنچ رہے ہیں۔ جن اصحاب کو ایک ہفتہ کے اندر پرچے نہ مل رہے ہوں وہ اپنے ٹھیک پتے اور نمبر مکان وغیرہ سے مطلع فرمائیں۔

۲۔ بعض اصحاب نے دفاتر یا مدارس کے پتے دئے ہیں۔ اگر انگریزی مہینے کی ابتدائی تاریخوں میں چھٹیاں ہوں تو سب رس ان کو وقت پر نہیں پہنچ سکتا۔ اصحاب اگر مکان کے پتے روانہ کرسکیں تو دفتر کو سہولت ہوگی۔

۳۔ بلدہ کے بعض اصحاب بار بار پتہ تبدیل کرنے کی اطلاع دیتے ہیں یا اضلاع کے اصحاب عارضی طور پر بلدہ آکر اپنے پرچے طلب کرتے ہیں۔ ایسی صورتوں میں پرچے وقت پر نہیں پہنچ سکتے۔ اگر وہ مہینے سے زیادہ قیام کرنا نہ ہو تو قدیم پتہ ہی سے منگوالیں۔ اور ڈاک خانہ کو اپنے پتہ کی تبدیلی سے مطلع کردیں تو رسالہ مل جائے گا۔

۴۔ خریدار اور مضمون نگار اصحاب کے اتنے استفساری خطوط آتے ہیں کہ ادارہ ان کا فوری جواب بعض دفعہ نہیں دے سکتا۔ یہ امر واضح رہے کہ جن خطوط میں جواب کے لئے اسٹامپس روانہ نہیں کئے جاتے ان کے جواب کی توقع نہ رکھنی چاہیئے۔ ہر مراسلت میں نمبر خریداری کا حوالہ بھی ضروری ہے۔

۵۔ بعض اصحاب اپنے مضمون یا نظمیں روانہ کرتے وقت اس امر کا خیال نہیں کرتے کہ ہر مضمون یا نظم کے نیچے نام اور پتہ کا اندراج ضروری ہے اکثر دیکھا جاتا ہے کہ صرف خط کے نیچے دستخط کر دئے جاتے ہیں جو بعض اوقات واضح نہیں ہوتے اور خط کے ساتھ دوسرے کاغذات پر جو مضامین ہوتے ہیں ان کے ختم پر نام لکھنا بھول جاتے ہیں۔ بچوں کے بعض مضامین اور خط بغیر نام کے بھی وصول ہوئے ہیں۔

سب رس کی جلد

سب رس کے سال بھر کے بارہ پرچوں کے لئے ایک جدید قسم کا "فائیل کور" بطور جلد کے تیار کیا گیا ہے جس کے پشتہ پر سنہری حروف میں "سب رس" ہے۔ اور جس میں نہایت سہولت کے ساتھ ہر ماہ پرچہ لگایا یا نکالا جاسکتا ہے۔ یہ ایک بالکل جدید چیز ہے اور یورپی طرز پر تیار کی گئی ہے۔ اس لیے پرچے خراب نہیں ہوتے اور نہ سب رس کے رنگین سرورقوں کو نقصان پہنچتا ہے۔ جو اصحاب سال بھر کے سب رس کے بارہ پرچوں کو ایک جگہ کرنا چاہتے ہوں وہ ابھی سے یہ فائیل کور خریدلیں تو ان کے رسالے محفوظ رہیں گے اور اس نفیس و خوشنما فائل کور کی جلد سے ان کی میزوں اور الماریوں کی آرائش و زیبائش میں بھی اضافہ ہوگا۔ اس کی قیمت باوجود اتنی خوبیوں کے صرف (۱۲) ہے۔ سب رس کے ایجنٹوں سے یا راست حاصل کی جاسکتی ہے۔

خواجہ حمید الدین شاہد مہتمم سب رس

نذرِ ولی

ادارۂ ادبیات اردو کا نیا کارنامہ

ادارۂ ادبیات اردو اصل میں جامعہ عثمانیہ کے فیض یافتہ نوجوانوں کی تصنیفات و تالیفات کی اشاعت کے لئے
قائم کیا گیا تھا اور خدا کے فضل سے اس اثنا میں اس نے اتنی کامیابی حاصل کی کہ اس کے اغراض و مقاصد میں توسیع عمل میں آئی
حیدرآباد کا واحد علمی و ادبی ادارہ بن گیا ہے جو اپنے مطبوعات کے ذریعہ سے اردو زبان اور ادب کی اہم خدمت انجام دے رہا ہے
نوجوانوں کے دلوں میں اردو کی خدمت کا ولولہ پیدا کرنا اور اہل ملک کو اردو ادب کے مطالعہ کی طرف راغب کرنے میں اس نے
اس وقت تک ادارہ نے جامعہ عثمانیہ کے پچاسوں طلبہ کے مضامین کے مجموعے اور دیگر کتب شائع کی ہیں۔ اب
جامعہ کی ام۔ اے۔ کی طالبات کے مضامین کا یہ نفیس مجموعہ پیش کیا ہے جو اردو زبان میں اپنی قسم کی پہلی کوشش ہے
اس میں دکن کی مایہ ناز خواتین انشا پرداز محترمہ جہاں بانو بیگم صاحبہ بی۔ اے۔ محترمہ لطیف النساء بیگم صاحبہ بی۔
محترمہ نعیم النساء بیگم صاحبہ بی۔ اے۔ اور محترمہ نجم النساء بیگم صاحبہ بی۔ اے کے دلچسپ مضامین شامل ہیں جو بابائے ریختہ
اورنگ آبادی کے حالات زندگی اور خصوصیات کلام پر نہایت دلچسپ اسلوب میں اور جدید ترین نقطۂ نگاہ سے لکھے گئے ہیں
کے متعلق ڈاکٹر زور کی یہ رائے ہے کہ

ولی کی شاعری کا ایسا تفصیلی تجزیہ اب تک نہیں کیا گیا تھا اس کتاب کے مطالعہ سے واضح ہو جائے گا
کہ ولی واقعی استاد الاساتذہ اور آدم اردو تھے۔ ان مضامین میں ولی کی معلومات، ان کے تخیل
ان کے فن شعر، اور ذوق عرفان کے علاوہ ان کے اسلوب زبان، اور انتخاب الفاظ کے
متعلق بھی نہایت مفید اور دلچسپ بحثیں کی گئی ہیں۔ اردو ادب اور شاعری کا ذوق رکھنے والے
اصحاب ان کے مطالعہ سے ضرور بہرہ مند ہوں گے۔

اس کتاب کی کتابت و طباعت اور جلد بندی ایسی ہی نفیس ہے جیسی کہ صنف نازک کی ایک نفیس ترین کتاب کے لئے ہونی
نذرِ ولی، اقبال اور جوش کے کلام کے مجموعوں کی سائز پر نہایت دیدہ زیب جلد کے ساتھ شائع کی گئی ہے جس پر دو جلد
خلا کوفی میں نام کے سنہری ٹھپے ہیں۔ تعداد صفحات ۲۵۰۔ قیمت مجلد عا/ ۸

خواجہ حمید الدین مہتمم ادا

دفتر سب رس یا ہر کتب فروش سے مل سکتی ہے۔

محض خریداران سب رس کے لئے

صرف تین ماہ تک اُردو کی مشہور و معروف کتابیں رعایتی قیمتوں پر

صرف سب رس کے خریداروں کو حسب ذیل بیش مشہور و معروف اردو کتابیں ۳۰ جون سنہ ۱۹۳۸ء تک ادارہ کی طرف سے رعایتی قیمت سے دی جائیں گی۔

قیمتوں میں قابل لحاظ تخفیف کرانے کا واحد مقصد یہی ہے کہ ادارۂ سب رس چاہتا ہے کہ

(۱) سب رس پڑھنے والوں کے لئے وسعت مطالعہ کا زرین موقع حاصل ہو۔

(۲) بہترین اُردو کتابوں تک شائقین کی سہولت سے رسائی ہو سکے۔

(۳) کم صرفہ سے وہ اپنے گھر میں ایک چھوٹا سا دلچسپ کتب خانہ جمع کر سکیں۔

رعایتی قیمتوں اور بازار کی رائج قیمتوں کا مقابلہ کر لینے سے سب رس کی اس مفید تجویز اور ایثار کی اہمیت واضح ہو جائے گی۔

ہر فرمایش کے ساتھ سب رس کے خریداری نمبر کا حوالہ دینا ضروری ہے۔ ورنہ تعمیل نہیں کی جائے گی۔

اگر دس روپیہ سے زیادہ کی کتابیں منگوائی جائیں تو محصول ڈاک دفتر سب رس ہی ادا کرے گا۔

نوٹ۔ اگر اس رعایت سے فائدہ اٹھایا گیا تو ادارہ کوشش کرے گا کہ اُردو کی دیگر مفید اور اہم کتابیں بھی اسی طرح رعایتی قیمتوں پر اپنے خریداروں کے لئے فراہم کر سکے۔

کتاب	مصنف	کیفیت	بازاری قیمت	رعایتی قیمت
۱۔ اردو شہ پارے	ڈاکٹر سید محی الدین صاحب قادری زور	وہ معرکۃ الآرا کتاب جو یورپ میں دو سال کی تحقیق و تفتیش کے بعد لکھی گئی۔ سب رس کی سائز کے چار سو صفحات بارہ تصاویر مجلد	لعہ ۴ر	للعہ ۲ر
۲۔ اردو ادب بیسویں صدی میں	مولوی علی حسنین صاحب زیبا ایم اے ریسرچ اسکالر	عہد حاضر کے اردو ادب کا پر لطف تبصرہ جس پر مصنف کو ایم اے کی ڈگری حاصل ہوئی	۱۲ر	۸ر
۳۔ جدید اُردو شاعری	پروفیسر عبد القادر صاحب سروری	حالی سے لیکر موجودہ عہد تک اردو شاعری کے مختلف دبستانوں کی مستند اور مقبول تصویری تاریخ	عا۸ر	عال
۴۔ یورپ میں دکنی مخطوطات	مولوی نصیر الدین ہاشمی صاحب منشی فاضل	یورپ کے کتب خانوں کی دکھنی قلمی کتابوں کا تفصیلی تذکرہ۔ سات سو سے زیادہ صفحات	للعہ	ے
۵۔ اُردو کے اسالیب بیان	ڈاکٹر سید محی الدین صاحب قادری زور	اردو نثر نگاری کی تاریخ۔ انشا پردازوں کی نثر کے اسلوب اور خصوصیات پر تبصرہ۔ جدید نثر نگاروں اور مستقبل کے متعلق مشورے	۳ہر	۱۲ر
۶۔ یادگار ولی	مولوی سید محمد صاحب ایم اے	اردو شاعری کے ابوالآبا حضرت ولی اورنگ آبادی کے دو صد سالہ جشن یادگار کا باتصویر دلچسپ مرقع	عال	عہ۸ر
۷۔ ارمغان عزیز	نواب عزیز یار جنگ بہادر	حیدرآباد دکن کے مشہور استاد اور باکمال شاعر کے بلند پایہ کلام کا مجلد باتصویر اور دیدہ زیب مجموعہ	عال	مہ۸ر
۸۔ مرقع سخن جلد دوم	مرتبہ ڈاکٹر زور	حیدرآباد کے پچاس شعرائے دور آصفیہ کا باتصویر تذکرہ۔ چار سو صفحات اور پچاس تصاویر مجلد	صمہ	للعہ
۹۔ سراج سخن	پروفیسر عبد القادر صاحب سروری	شاہ سراج اورنگ آبادی کے کلام کا نہایت مستند انتخاب جس کے ساتھ حضرت سراج کی تحریر کا عکس بھی ہے	۱۲ر	۸ر
۱۰۔ خواتین عہد عثمانی	مولوی نصیر الدین صاحب ہاشمی	خواتین دکن کی پچیس سالہ ہمہ جہتی ترقی کا مرقع۔ بقول مدیر معارف اپنے موضوع کے لحاظ سے اردو زبان میں پہلی کتاب	عہ۸ر	عمہ
۱۱۔ مشاہیر قندھار دکن	محمد اکبر الدین صاحب صدیقی	دکن کے مشہور مردم خیز خطہ قندھار شریف کے اولیا علما و مشائخین اور شعرا و مصنفین کا باتصویر تذکرہ	عمہ	۸ر

نمبر	نام کتاب	مصنف	کیفیت	قیمت
۱۲	عہد ابراہیم عادل شاہ کی مکتوبات (لیانت)	مولوی علی محسن صاحب ایم اے	بیجاپور کی تاریخ کے ایک اہم دور کے متعلق نہایت دلچسپ اور مفید تحقیقی مقالہ جس پر مصنف نے ...	[illegible]
۱۳	فن انشا پردازی	ڈاکٹر سید محی الدین صاحب قادری زور	مضمون نگاری و انشا پردازی کے راز اور فن تحریر میں کامیابی کے عملی طریقے اور ترقی کے وسائل	[illegible]
۱۴	بادۂ سخن	ڈاکٹر سید محی الدین صاحب قادری زور	دکن کے مشہور شاعر ڈاکٹر احمد حسین مائل کے حالات زندگی اور انتخاب کلام مع تصویر	[illegible]
۱۵	مثنویات میر	مولوی سید محمد صاحب ایم اے	اردو شاعروں کے سرتاج میر تقی میر کی مثنویاں جن کی قلمی نسخوں کے مقابلہ کے بعد تصحیح و مقدمہ کے ساتھ شائع	[illegible]
۱۶	تنقیدی مقالات	ڈاکٹر سید محی الدین صاحب قادری زور	اردو اور فارسی کے بہترین مصنفوں اور شاعروں کے کارناموں پر اعلیٰ پایہ کی تنقید ...	[illegible]
۱۷	کیف سخن	ڈاکٹر سید محی الدین صاحب قادری زور	دکن کے مشہور شاعر سید رضی الدین حسن کیفی مرحوم کے حالات زندگی اور انتخاب کلام مع تصویر شاعر	۱۲ر
۱۸	حضرت امجد کی شاعری	مولوی نصیر الدین صاحب ہاشمی	عہد حاضر کے سب سے بڑے اہل دل شاعر حضرت امجد کے کلام پر تبصرہ اور نمونہ	۱۲ر
۱۹	متاع سخن	ڈاکٹر سید محی الدین صاحب قادری زور	نواب عزیز یار جنگ بہادر عزیز کے جلد دیوانوں کا دلچسپ انتخاب مع حالات و تصویر شاعر	۱۲ر
۲۰	فیض سخن	ڈاکٹر سید محی الدین صاحب قادری زور	استاد الاساتذہ حضرت میر شمس الدین محمد فیض کے حالات زندگی اور نمونۂ کلام مع تصویر	۱۲ر

جملہ ۱۲ر ۳۸ - ۱ر

نوٹ بازار کی قیمتوں اور سب رس کی رعایتی قیمتوں کے مقابلہ سے معلوم ہوگا کہ سب رس کے خریداروں کے لئے کتنی زیادہ سہولت بہم پہونچائی ... یعنے بیس کتابوں کی خریدی پر سب رس کے خریدار کا بیک وقت گیارہ روپئے آٹھ آنے کا فائدہ ہوتا ہے۔ یقین ہے کہ اہل ذوق اصحاب ... زرین موقع کو ہاتھ سے جانے نہ دیں گے کیونکہ دفتر سب رس نے محض علم و ادب کی خدمت کی خاطر ان کتابوں کے مصنفین و مولفین سے ... کی یہ رعایت صرف تین ماہ کے لئے حاصل کی ہے۔

خواجہ حمید الدین شاہد مہتمم سب رس

گولکنڈے کے افسانے

دکن کی عظیم الشان قطب شاہی سلطنت کی شہرۂ آفاق ثروت تہذیب، معاشرت، اور اصلی زندگی معلوم کرنا ہو تو ڈاکٹر زور کے یہ سب ... افسانے ضرور پڑھئے۔ ان ہی بقول مولانا عبدالحق بی اے معتمد انجمن سکرٹری اردو "تاریخ اور افسانے اور واقعات اور تخیل کو اس خوبی سے ملایا ... کہ قطب شاہی دور کی تصویر نظروں کے سامنے پھر جاتی ہے"

تاریخی معلومات کے علاوہ جو اصحاب جدید اردو نثر اور افسانوں کے پاکیزہ اسلوب سے لطف اندوز ہونا چاہتے ہیں۔ ان کے لئے ...

"سیر گولکنڈہ" اور **"گولکنڈے کے ہیرے"** ایک نعمت غیر مترقبہ ہیں۔

گولکنڈہ کی کوئی سیر و تفریح ان کتابوں کے مطالعہ کے بغیر ممکن نہیں ہو سکتی۔ جو گولکنڈہ دیکھ چکے ہیں وہ جب یہ افسانے پڑھتے ہیں تو محسوس کرتے ... کہ ہم نے کچھ نہیں دیکھا، اور جنہوں نے کبھی گولکنڈے کی سیر نہیں کی ان کے دلوں میں ان کو پڑھنے کے بعد گولکنڈہ کی سیر کی امنگیں موجزن ہو جاتی ہیں۔

دونوں کتابیں باتصویر ہیں۔ سیر گولکنڈہ صفحات ۱۹۰ تصاویر ۱۲ اور قیمت صرف ۱۵ر

گولکنڈے کے ہیرے مجلد " ۱۳۶ " ۸ " " ۱۲ر

ہر کتب فروش اور علمی کرو دفتر **سب رس** یا **مکتبۂ ابراہیمیہ** سے طلب کیجئے۔

ادارۂ ادبیات اردو کی مطبوعات

۱۔ **مرقع سخن** (جلد اول) حیدرآباد کے پچیس شعرائے دورِ آصفیہ کا باتصویر تذکرہ۔ چار سو سے زیادہ صفحات، پچاس سے زیادہ تصاویر۔ مجلد قیمت (صمہ) اس بیش قیمت کتاب کے اب صرف چند نسخے باقی رہ گئے ہیں۔

۲۔ **مرقع سخن** (جلد دوم) حیدرآباد کے دیگر پچاس شعرائے دورِ آصفیہ کا باتصویر تذکرہ چار سو سے زیادہ صفحات پچاس سے زیادہ تصاویر قیمت مجلد (صمہ) اس جلد میں سلاطین و خانوادۂ آصفی و امرائے بارگاہ کے بھی تذکرے ہیں جن کی شاعری یا علم دوستی قابل ذکر ہے۔

۳۔ **سراج سخن** حضرت شاہ سراج الدین سراج اورنگ آبادی کے حالاتِ زندگی، کلام پر تبصرہ، اور جملہ اصنافِ سخن کا بہترین انتخاب از پروفیسر عبدالقادر سروری ایم۔اے، ال ال بی صفحے (۱۵۲) قیمت (۱۲/) مع تصویر خط سراج

۴۔ **ایمان سخن** استاد الشعراء شیر محمد خان ایمان حیدرآبادی کے حالاتِ زندگی، کلام پر تبصرہ، اور جملہ اصنافِ سخن کا بہترین انتخاب از مولوی سید محمد صاحب لکچرار اردو صفحے (۱۲۰) قیمت (۱۲/) ایمان عہد آصفجاہ ثانی کے ملک الشعرائے دکن تھے۔

۵۔ **فیض سخن** استاد کامل حضرت میر شمس الدین محمد فیض علیہ الرحمۃ کے حالاتِ زندگی، کلام پر تبصرہ اور جملہ اصنافِ سخن کا بہترین انتخاب، از ڈاکٹر سید محی الدین صاحب قادری زور ایم۔اے۔ پی ایچ ڈی صفحے (۱۴۴) قیمت (۱۲/) مع تصویر درگاہ فیض

۶۔ **بادۂ سخن** ڈاکٹر احمد حسین مائل کے حالاتِ زندگی، کلام پر تبصرہ، اور جملہ اصنافِ سخن کا بہترین انتخاب از ڈاکٹر سید محی الدین صاحب قادری زور ایم۔اے پی ایچ ڈی صفحے (۱۲۸) قیمت (۱۲/) مع تصویر شاعر۔

۷۔ **کیفِ سخن** سید رضی الدین حسن کیفی کے حالاتِ زندگی کلام پر تبصرہ، اور جملہ اصنافِ سخن کا انتخاب از ڈاکٹر سید محی الدین صاحب قادری زور ایم اے۔ پی ایچ ڈی۔ صفحے ۱۲۲ قیمت ۱۲/

۸۔ **متاعِ سخن** نواب عزیز یار جنگ بہادر عزیز کے حالاتِ زندگی، کلام پر تبصرہ اور جملہ اصنافِ سخن کا بہترین انتخاب، از ڈاکٹر سید محی الدین صاحب قادری زور ایم اے۔ پی ایچ ڈی صفحے (۱۲۵) قیمت (۱۲/) مع تصویر شاعر۔

۹۔ **ورڈزورتھ اور اس کی شاعری** انگلستان کے مشہور شاعر کے حالاتِ زندگی اور نمونہ کلام جس نے اردو کی فطری شاعری کو خاص طور پر متاثر کیا۔ از مولوی میر حسن صاحب ایم اے۔ صفحے (۱۸۴) قیمت (عہ/) مع تصویر شاعر۔

۱۰۔ **ٹیگور اور اس کی شاعری** ہندوستان کے مشہور شاعر اعظم کے حالاتِ زندگی و تصنیفات پر تبصرہ از مولوی مخدوم محی الدین صاحب ایم اے صفحات (۱۲۸) قیمت (۱۲/)

۱۱۔ **ہوش کے ناخن** حیدرآباد کی سماجی زندگی کا ایک مرقع جو ڈرامہ کی شکل میں پیش کیا گیا ہے از مولوی میر حسن و مخدوم محی الدین ایم اے۔ صفحات (۹۲) قیمت (۱۲/)

۱۲۔ **یوسفِ ہندی قیدِ فرنگ میں** مرزا غالب مرحوم کے واقعۂ قید کا مستند تذکرہ از مولوی محسن بن شبیر صاحب بی اے ال ال بی صفحے ۸۰ قیمت (۸/)

۱۳۔ **نذرِ ولی** بابائے ریختہ حضرت ولی اورنگ آبادی کی خدمت میں طالبات جامعہ عثمانیہ کی نذرِ عقیدت صفحات (۵۰) قیمت مجلد (عاں ۸/)

المشتہر خواجہ حمید الدین مہتمم ادارۂ ادبیات اردو

سب رس کتاب گھر

[حید]ر آباد، اضلاع [...] اور برطانوی ہند سے دفتر سب رس کو ادارۂ ادبیات اردو کی مطبوعات کے علاوہ عام اردو ادب اور خاص کر دکن کی مطبوعات فراہم کرنے [کے لئے] فرمائشیں وصول ہوتی ہیں لیکن ابھی دفتر نہیں چاہتا کہ ایک مکمل اردو بک ڈپو کے انتظامات کی ذمہ داری لے۔ تاہم اہل ذوق اصحاب کے اصرار پر حیدرآباد [کے] خاص خاص اور مشہور و معروف مصنفین و شعراء کی کتابیں دفتر سب رس میں فروخت کے لئے حاصل کی گئیں اور خواہشمند اصحاب کے یہاں روانہ کی جاتی [ہیں۔] دوسرے اہل ذوق اصحاب کی اطلاع کے لئے بھی ذیل میں ان کتابوں کی فہرست درج کی جاتی ہے جو سب رس کتاب گھر سے عام بازار کی [قیم]ت پر حاصل کی جا سکتی ہیں۔

[تصن]یفات حضرت حکیم الشعراء سید احمد حسین امجد

کتاب	قیمت
[رباع]یات امجد حصہ اول	۸؍
[رباع]یات امجد حصہ دوم	۸؍
[...]ر امجد حصہ اول	عہ
[...] امجد حصہ دوم	عہ
[...] امجدی پیوند	عہ
[...] امجد	۶؍
[...] امجد	عاں
[...] بیوی کی کہانی	۴؍
[...]یات امجد	عہ
[...] امجد	سے
[...] امجد	سے

[تصن]یفات و تالیفات مولوی سید محمد صاحب ایم اے

کتاب	قیمت
[...]ب نثر اردو	عاں
[...] گفتار	۱۲؍
[...]یات میر	عاں
[...]ائی فارسی	۱۲؍
[...]کار ولی	عاں

کلام استاد سخن نواب عزیز یار جنگ بہادر عزیز

کتاب	قیمت
ارمغان عزیز	عاں
متاع سخن	۱۲

تصنیفات ڈاکٹر سید محی الدین صاحب قادری زور

کتاب	قیمت
اردو کے اسالیب بیان	۸؍
اردو شہ پارے	۸؍
روح تنقید	۱۲؍
تنقیدی مقالات	۸؍
عہد عثمانی میں اردو کی ترقی	۸؍
محمود غزنوی کی بزم ادب	عہ
ہندوستانی لسانیات	عاں
ہندوستانی صوتیات (انگریزی)	۸؍
فن انشاپردازی	۸؍
طلسم تقدیر	۸؍
سیر گولکنڈہ	۱۵؍
گولکنڈے کے ہیرے	۱۲؍

تصنیفات و تالیفات پروفیسر عبدالقادر صاحب سروری

کتاب	قیمت
دنیائے افسانہ	۸؍
کردار اور افسانہ	۸؍
جدید اردو شاعری	عاں
حیدرآباد کی تعلیمی ترقی	عہ
چینی اور جاپانی افسانے	۶؍
انگریزی افسانے	۸؍

کلام سید محمد حسین صاحب آزاد

کتاب	قیمت
خیالات آزاد جلد اول	۸؍
خیالات آزاد جلد دوم	عہ

تصنیفات و تالیفات مولوی نصیر الدین صاحب ہاشمی

کتاب	قیمت
یورپ میں دکنی مخطوطات	للعہ
دکن میں اردو	۸؍
خواتین عہد عثمانی	۸؍
حضرت امجد کی شاعری	۱۲؍
مکتوبات امجد	۱۲؍
رہبر سفر یورپ	۱۲؍
ذکر نبی	۱۲؍

ان کے علاوہ ادارۂ ادبیات اردو کی جملہ کتابیں بھی سب رس کتاب گھر سے مل سکتی ہیں۔

مہتمم

رجسٹرڈ نمبر M3950

نشان ٹپۂ آصفیہ (۱۵۳)

۸ - نظمیں
۳ - غزلیں
۸ - افسانے اور قصے
۲ - ڈرامے
۱۲ - عام دلچسپی کے مضمون
۷ - علمی اور تاریخی مضمون

"ادارۂ ادبیاتِ اردو" حیدرآباد دکن

کا

ماہ نامہ

سب رس

زیر نگرانی
ڈاکٹر سید محی الدین قادری زورؔ

زیر ادارت
صاحبزادہ میر محمد علی خاں میکشؔ

بہ اہتمام
خواجہ حمید الدین شاہدؔ

مکتبہ ابراہیمیہ مشین پریس میں طبع ہوکر دفتر "ادارہ" رفعت منزل خیریت آباد سے شائع ہوا

سب رس کے مقاصد و قواعد

(۱) یہ "سلسلہ ادبیات اُردو" کا ماہوار علمی و ادبی رسالہ ہے جس میں اُردو زبان اور ادب کے مختلف شعبوں اور پہلوؤں پر بحث ہو گی

(۲) مضامین متعلقہ سیاسیات حاضرہ اور مذہبی مباحث کسی صورت میں قابل اشاعت متصور نہ ہوں گے ۔

(۳) اردو مطبوعات پر بے لاگ تنقید کر کے اردو تصنیف و تالیف کا ذوق صحیح پیدا کرنے کی کوشش کی جائے گی ۔

(۴) غیر زبانوں کے شاہکار مضامین کو اردو میں منتقل کر کے اردو کے علمی و ادبی سرمایہ میں اضافہ کیا جائے گا ۔

(۵) یہ رسالہ کم از کم (۶۴) صفحات اور زیادہ سے زیادہ (۹۶) صفحات پر ہر ماہ عیسوی کے پہلے ہفتہ میں شائع ہوا کرے گا ۔

(۶) رسالہ نہ پہنچنے کی اطلاع پندرہ تاریخ تک دفتر میں پہنچ جانی چاہیئے

(۷) جواب طلب امور کے لئے جوابی پوسٹ کارڈ یا لفافہ آنا ضروری ہے

(۸) خط و کتابت کرتے وقت نمبر خریداری کا حوالہ ضرور دیا جائے ۔

(۹) اشتہارات کی اجرت پیشگی لی جائے گی ۔ وی پی کے ذریعے سے وصولی منظور نہیں کی جائے گی ۔

سب رس کی قیمت

	سالانہ	ششماہی	فی پرچہ
بلدہ حیدرآباد کے لئے ۔	چار روپے ۔	دو روپے آٹھ آنے ۔	چھ آنے
شہر میں یا شہر سے باہر بذریعہ ٹپہ	چار روپے آٹھ آنے ۔	دو روپے بارہ آنے	سات آنے

محرم نمبر ۔ ۱۲ ؍ اقبال نمبر عہ ۱۲ ؍

اخراجات ٹپہ ذمہ خریدار

بچوں کے سب رس کی قیمت

	سالانہ	ششماہی	فی پرچہ
بلدہ حیدرآباد کے لئے ۔	ایک روپیہ	دس آنے	ڈیڑھ آنہ
شہر میں یا شہر سے باہر بذریعہ ٹپہ	ایک روپیہ آٹھ آنے ۔	بارہ آنے ۔	دو آنے

سب رس کی خریداری، اس میں اشتہارات کی طباعت، اور ادارۂ ادبیات اُردو کی رکنیت یا اس کے مطبوعات کی خریداری کے سلسلے میں جو اصحاب صدر دفتر (رفعت منزل خریت آباد) سے گفتگو یا مراسلت نہیں کر سکتے وہ حسب ذیل اصحاب سے گفتگو یا مراسلت کر سکتے ہیں ۔

بلدہ ۔ (۱) مسٹر ایس اے کریم نمائندۂ خصوصی چیلہ پورہ قریب مکان حکیم محمود صمدانی مرحوم (۲) مسٹر ایس بی اننتا مکتبۂ ابراہیمیہ عابد روڈ ۳ رحمان کا ٹیج گھانسی بازار ۔

اضلاع ۔ مسٹر محمد فخرالدین ارماں روضۂ شیخ گلبرگہ شریف (۲) مسٹر احمد الدین بی اے جونا بازار اورنگ آباد

سب رس

جلد ۱ شمارہ ۱۰

۱۹۳۸ء

اکتوبر

فہرست تصاویر

۱۔ مولوی عزیز مرزا مرحوم مقابل صفحہ ۶
۲۔ آبشار جرسپہ مقابل صفحہ ۲۴

فہرست مضامین

نمبر	مضمون	مصنف	صفحہ
۱	اداریہ	میکش	۵
۲	غزل	نواب عزیز یار جنگ بہادر عزیز	۶
۳	مولوی عزیز مرزا مرحوم	عبدالحق (بی، اے۔ ڈی لٹ۔ الہ آباد)	۷
۴	مروجہ محبت	سید نورالحسن بی اے بی ٹی۔ ڈیپ ایڈ سی ٹی (گلاسگو)	۹
۵	عروس نو کی جدائی پر (نظم)	علی احمد	۱۲
۶	ایلورا	حبیب احمد فاروقی (بی، اے۔ ڈپ ایڈ)	۱۳
۷	چاند (نظم)	محمد نعیم الدین صدیقی (عثمانیہ)	۱۵
۸	موت (ڈرامہ)	محمد یحییٰ (ام، اے۔ اچ سی ایس)	۱۶
۹	تعلیمی سفر یورپ ڈائری کے دو ورق	مسز صوفی ام اے	۲۲
۱۰	جوگ فال یا آبشار جرسپہ کی سیر	مرزا عصمت اللہ بیگ	۲۵
۱۱	کمال سلطانی (نظم)	ابو المنیہ مشتاق قریشی (بنگلوری)	۳۰
۱۲	اسلام اور اقتصادیات	رابعہ بیگم (محبوبیہ گرلس اسکول)	۳۱
۱۳	ہندوستانی موسیقی	افضل عابدی وفا	۳۴
۱۴	غزل	ڈاکٹر امیر علی خاں ہاشم (بی۔ اچ ڈی)	۳۸
۱۵	اتحادی دیہی بنک	مترجمہ میر حسن (ام، اے)	۳۹
۱۶	شام و سحر (نظم)	سید مجتبیٰ حسین نقوی (ام، اے۔ ایم ایڈ)	۴۸
۱۷	بچوں کی تعلیم و تربیت	مرزا سیف علی خاں	۴۹

نمبر	مضمون	مضمون نگار	صفحہ
۱۸	مزدور (نظم)	عزیز فاطمہ ضیاء الدین	۵۱
۱۹	بھوتوں کی مسجد (افسانہ)	اکبر صدیقی (بی، اے)	۵۲
۲۰	غزل	صفی (اورنگ آبادی)	۵۳
۲۱	جھٹکے والا	رشید قریشی	۵۴
۲۲	جدائی	احمد علی اکبر راز قاسمی	۵۶
۲۳	بیوقوف (افسانہ)	سیتا دیوی / مترجمہ بیس بی امتنا	۵۷
۲۴	خطبۂ صدارت یوم اقبال اسمٰعیل کالج بمبئی	ڈاکٹر سید محی الدین قادری زور (ام، اے - پی، اچ ڈی)	۶۵
۲۵	پنہارن (نظم)	کاوش	۷۰
۲۶	فیشن	پروفیسر سعید الدین ام اے بی اس سی / مترجمہ محمد معین الدین ام اس سی	۷۱
۲۷	تبصرے	ادارہ	۷۳
۲۸	بچوں سے	(۳۸) اصحاب	۷۴
۲۹	معموں اور پہیلیوں کے حل		"
۳۰	نئی پہیلیاں	سید لائق علی خاں، بشیر النساء بیگم	"
۳۱	اتاترک مصطفٰی کمال کا بچپن	غلام حقانی انصاری	۷۵
۳۲	بری عادت	محمد کمال خاں (مدرسہ عالیہ)	۷۸
۳۳	رنگ چوں چوں چوں	سکینہ بیگم	۷۹
۳۴	کھیل کی تلوار (نظم)	لطیف النساء بیگم (بی اے)	۸۰
۳۵	خاموش شہزادی	امامی سلطان یار جنگ	۸۱
۳۶	مچھر نے قلعہ فتح کرادیا	مرزا عبدالرحمن بیگ	۸۲
۳۷	دوراندیشی	محمد اسد اللہ خاں (سٹی کالج)	۸۲
۳۸	بچوں سے باتیں (نظم)	محمد کریم الدین خاں علم	۸۳
۳۹	شکسپیئر کے جواہر ریزے	مسز عبدالرؤف	۸۳
۴۰	کام کی باتیں	سیدہ عظیم النساء بیگم	۸۳
۴۱	ہمدرد طالب علم (ڈرامہ)	شیخ رحیم الدین (ظہیرآبادی)	۸۴
۴۲	ہماری پڑوسن	عظمت افضل خاں	۸۶
۴۳	صراحی کی کہانی خود اس کی زبانی	سید اقبال حسین اقبال	۸۸

سب رس کا جنوری ۱۹۳۹ء کا شمارہ چونکہ سالگرہ نمبر ہوگا اس لئے اس کی ابھی سے تیاریاں شروع کردی گئی ہیں۔ اس میں چالیس پچاس تصویریں ہوں گی اور صفحات بھی رسالہ کے عام حجم سے تین گونہ زیادہ ہوں گے مضامین نظم و نثر کا خاص انتظام کیا جارہا ہے اس میں اشتہارات کے لئے صفحات کی تعداد معین کردی گئی ہے۔ مشتہرین قبل از قبل مہتمم سے مراسلت کرلیں

شاہد

مہتمم سب رس

یہ سب رس کا دسواں شمارہ ہے۔ پہلا سال ختم ہونے میں ابھی اور دو مہینے باقی ہیں لیکن اس اثناء میں ہمیں جو کامیابی حاصل ہوئی ہے رسائل اور بالخصوص حیدرآباد کے حالات کے پیش نظر بہت ہمت افزا ہے۔ ہمیں نہ صرف توقع کے مطابق قدردان اور خریدار بہم پہنچے سے اچھے ادبی معاونین بھی ملے۔

اس کے سوا بعض ایسے مفید تجربے بھی حاصل ہوئے جن کی مدد سے ہمارا آئندہ سال موجودہ سے زیادہ کامیاب ہوگا۔ کاروباری معاملات سے تعلق رکھنے والے اصحاب ناواقف نہیں کہ ابتداء میں انتظامات کی درستی میں عرصہ لگ جاتا ہے۔ باضابطگی آسانی سے پیدا نہیں ہو سکتی۔ اب تک ادارۂ سب رس کا زیادہ تر وقت انتظامات کے نذر ہو گیا لیکن امید ہے کہ اب سب رس میں وہ تمام ظاہری اور معنوی ترقیاں ہوں گی جو ابتداء ہی سے ارباب ادارہ کا مطمح نظر ہیں۔ خدا کا فضل ہے کہ اس عرصے میں متعدد ایسے ہمدرد اصحاب مل گئے ہیں جو سب رس کے کاموں میں دلچسپی کے ساتھ ہاتھ بٹا رہے ہیں چنانچہ ستمبر کا رسالہ ایسے ہی ہمدرد کار مولوی سراج الدین احمد صاحب کی عملی امداد کی وجہ سے ہماری عدم موجودگی کے باوجود وقت پر شائع ہوا ہے۔ کیونکہ اس زمانہ میں ہم جشن یوم اقبال میں شریک ہونے کیلئے بمبئی گئے ہوئے تھے۔ اس ہنگامہ پرور مقام پر یاد رفتگاں کی اتنی بھی فرصت اس امر کا ثبوت ہے کہ گجرات کو اردو سے جو قدیم ترین تعلق ہے وہ اب تک باقی ہے جس کو دیکھ کر کہنا پڑتا ہے کہ وہ "ولی" کو اپنا بنانے کی کوشش میں غیر جانب نہیں ہیں اگرچہ دکن والے سے کبھی نہیں چھوڑنا چاہتے۔

جشن یوم اقبال اسمٰعیل کالج جوگیشوری کی جانب سے زیر صدارت ڈاکٹر زورؔ منایا گیا۔ اگرچہ تین دن مسلسل بارش ہو رہی تھی لیکن ہال بہت جلد بھر گیا شعریہ کے ترانۂ ہندی کے بعد جسٹس سوجی جج ہائیکورٹ بمبئی نے تقریب کا افتتاح کیا۔ ڈاکٹر زورؔ کا خطبۂ صدارت بہت دلچسپی اور غور سے سنا گیا جس میں انھوں نے گجرات اور دکن کے لسانی تعلقات پر سرسری نظر ڈالتے ہوئے اقبالؔ کی حیات اور کلام کے مسلسل اور ہم رنگ ارتقاء پر اپنے خیالات کا اظہار کیا۔ ڈاکٹر نذیر احمد دیوان بہادر جسٹس جھاوبری اور مولانا عرفان کی تقریریں بھی دلچسپ تھیں۔ مدیر "سب رس" نے "کلام اقبال میں شکوہ کا پہلو" کے عنوان سے ایک مقالہ سنایا۔ دوسرے روز ڈاکٹر زورؔ نے انجمن ترقی اردو کی درخواست پر انجمن اسلامیہ ہائی اسکول کے ہال میں اردو زبان کے ارتقاء پر بڑی معلومات آفریں اور دلچسپ تقریر کی۔ ڈاکٹر بدل الرحمٰن صاحب ام اے۔ پی ایچ۔ ڈی کرسیٔ صدارت پر تھے۔ تقریروں اور جلسوں کے علاوہ کئی عصرانوں اور عشائیوں نے ہماری [illegible] زندگی میں خوش گوار لمحوں کا اضافہ کیا۔

طلبہ و طالبات اسمٰعیل کالج سے مل کر ہمیں بڑی خوشی ہوئی۔ ان میں زندگی اور بیداری کی لہر ہے۔ وہ ہنگامہ پرور فضا میں آنکھ کھولتے ہیں، آزاد ماحول میں زندگی بسر کرتے ہیں اور جب کالج سے نکلتے ہیں تو زمانہ کا مقابلہ کرنے کے لئے تیار نکلتے ہیں۔ ان کا پرخلوص عشائیہ جس میں طالب علمانہ سادگی لیکن عالمانہ شان تھی، ناقابل فراموش ہے۔

پروفیسر نجیب اشرف صاحب ندوی (جن کے ہم آٹھ دن تک عملاً مہمان تھے) کا شکریہ ادا کرنا ایسا ہی ہے جیسے اپنا آپ شکریہ ادا کر لینا۔ ان کی [illegible] انہوں نے دل سے بیگانگی کو نکال دیا تھا۔ ان کی پرلطف گفتگو ان کا عالمانہ وقار اور ان کا انکسار۔ بہت کم لوگ ایسے ہوں گے جن کی عظمت [illegible] شکست غرور میں پوشیدہ ہے۔

سب میں

اس شمارہ میں دو تصویریں شائع کی جارہی ہیں۔ ایک تو آبشار جرسپہ کی ہے جس کے دلچسپ مناظر کا لفظی مرقع مولوی مرزا ...
نے اسی رسالہ میں نہایت خوبی سے پیش کیا ہے۔ دوسری تصویر مولوی عزیز مرزا مرحوم کی ہے جو ملک و قوم کے بے نظیر محسن ہونے کے ...
ادب کے بھی قابل قدر خدمت گذار تھے۔ ان کی خدمات اس قابل تھیں کہ ان پر ایک مبسوط کتاب مرتب کرکے شائع کی جاتی۔ اگر ادارہ ...
وہ اُردو زبان و ادب کے ایسے محسنوں پر چھوٹی چھوٹی کتابیں لکھوا کر شائع کرے گا۔ مرحوم کے فرزند ارجمند مولوی سجاد مرزا صاحب ...
جس طرح سے انھوں نے مرحوم کی یہہ تصویر عنایت کی اور ادارے کے دیگر کاموں میں شروع ہی سے ہاتھ بٹا رہے ہیں اپنے والد ...
خدمت کی تکمیل کے سلسلہ میں بھی ادارے کی خاطر خواہ مدد کریں گے۔ فی الحال مرحوم کے متعلق مولوی عبدالحق صاحب کے اس مضمون ...
ایک اقتباس شائع کیا جاتا ہے جو ان کی وفات کے وقت لکھا گیا تھا۔

میکش

غزل

مداح ہوں میں بھی اسی ممدوح خدا کا
صدقے میں کھنچا جس کے یہہ کونین کا خاکا

ہے دھیان دمِ خواب مدینے کی فضا کا
یہہ نیند کا جھوکا ہے کہ جنت کی ہوا کا

شیرازۂ کونین یہہ وابستہ ہے جس سے ؟
اک حلقہ ہے وہ آپ کے گیسوے رسا کا

مشہور ہوے جس سے زمانے میں مسیحا
تھا ایک کرشمہ لبِ اعجاز نما کا

نازک ہے مزاج آپ کے بیمار کا بیحد
اٹھے گا نہ اس سے کبھی احسان قضا کا

لے جائے گا طیبہ کو مرا جذبِ محبت ؟
محتاج نہیں ہوں، خضرِ راہنما کا

جو آپ پہ مرتے ہیں، وہ مرتے نہیں ہرگز!
ملتا ہے مزا اُن کو فنا میں بھی بقا کا

مل جائے کہیں خارِ بیابانِ مدینہ
مشتاق ہے، ہر آبلہ میرے کفِ پا کا

کافور ہوی گرمیٔ خورشید قیامت ؟
رخ دیکھتے ہی آپ کے مشتاق لقا کا

سر پر ہو مرے گردِ رہِ وادیٔ طیبہ ؟
سمجھوں گا میں سایہ اسے کعبے کی ردا کا

میخوارِ محبت ہیں بہت دیر سے پیاسے ؟
ساغر کوئی! صدقہ نگہِ ہوش ربا کا

کیا پرسشِ محشر کا عزیز اب مجھے کھٹکا
جب ہات میں دامن ہے شہِ عقدہ کشا کا

نواب عزیز یار جنگ بہادر عزیز

مولوی محمد عزیز مرزا مرحوم
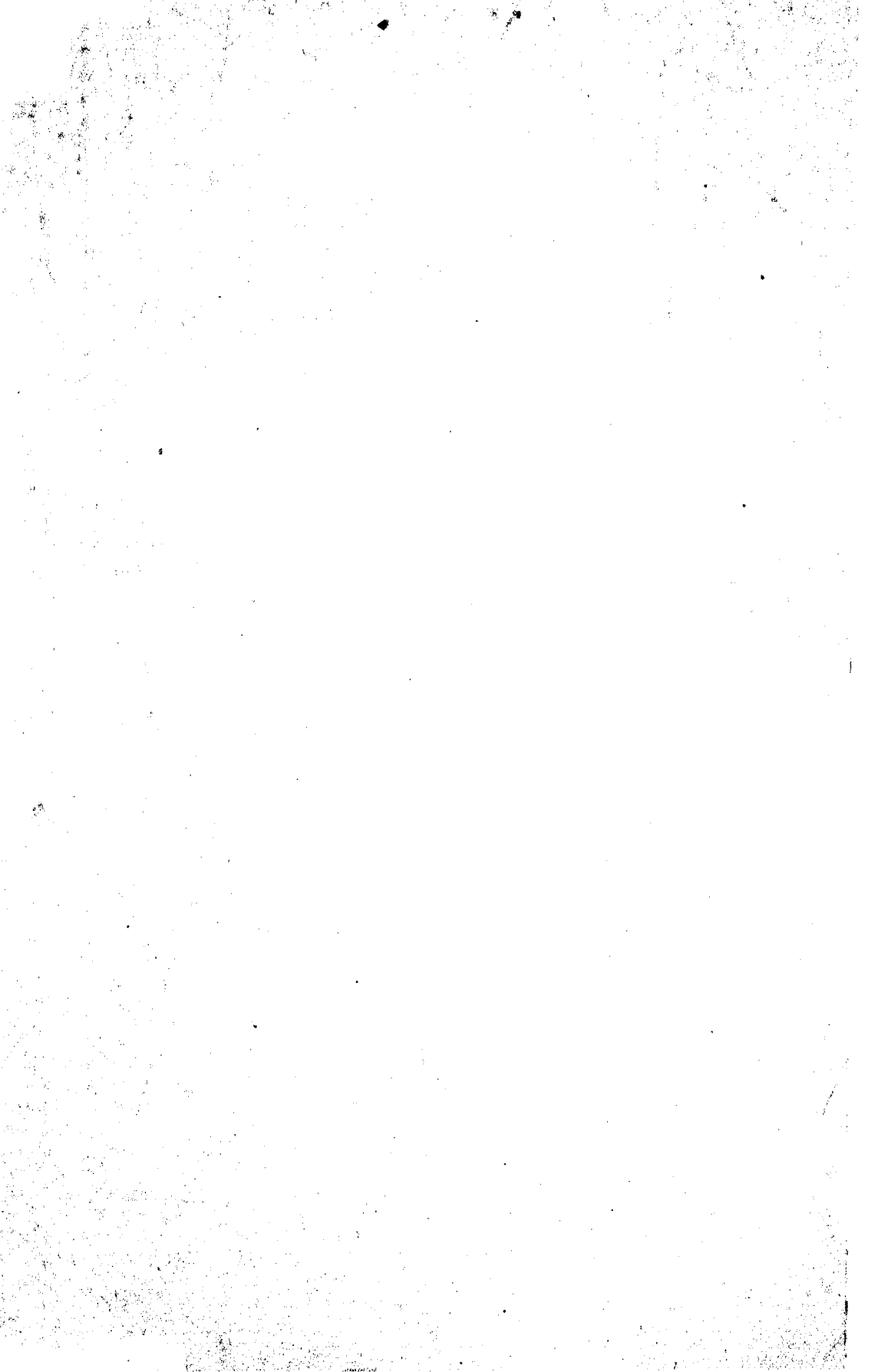
مولوی محمد عزیز مرزا مرحوم

مرحوم لڑکپن سے ذہین و ذکی مشہور تھے۔ طالب علمی کے زمانے میں بھی وہ اپنے ہمسروں میں ممتاز رہے اور آنرز کے ساتھ بی اے
پاس کیا اور علی گڈھ کالج کے نہایت قابل اور سعید سپوتوں میں سے تھے۔
طالب علمی سے فارغ ہونے کے بعد وہ حیدرآباد آئے اگرچہ ابتدا میں وہ معمولی خدمت پر مقرر ہوئے لیکن خداداد ذہانت اور
جدّ و جہد سے انھوں نے یہاں غیر معمولی کامیابی حاصل کی اور مددگاری ہوم سکریٹری سے سکریٹری کی معزز اور اہم خدمت پر فائز ہوئے
دانی اور کارگزاری ریاست حیدرآباد دکن میں ضرب المثل ہے وہ کام کرنے میں بجلی اور محنت کرنے میں آندھی اور طوفان تھے معاملات
اس قدر جلد پہنچتے تھے کہ جن لوگوں نے انھیں معاملات کو ہفتوں اور مہینوں مطالعہ کیا تھا وہ بھی دیکھتے رہ جاتے تھے۔ سرکاری خدمت
اور دشوار منزلوں کو انھوں نے ہمیشہ اس آسانی سے طے کیا کہ کبھی اُن کی طبیعت پر گراں نہ گزرا جو کام دوسرے لوگ آٹھ آٹھ
گھنٹوں میں طے نہیں کر سکتے تھے وہ مرحوم نے دو تین گھنٹوں میں بھگتا دیا اور پھر اس دقیق نظری کے ساتھ کہ کیا مجال کوئی بات
۔ اپنے فرائض نہایت دیانت داری اور دلچسپی کے ساتھ ادا کئے۔ اور نہ کبھی کام کرنے سے اکتائے اور نہ آج کا کام کل پر چھوڑا
وجوہ سے وہ خدمت ہوم سکرٹری سے اول تعلقداری پر بھیجے گئے تو حالانکہ انھوں نے کبھی مال کا کام نہیں کیا تھا لیکن اپنے فرض منصبی
اور استقلال کے ساتھ ادا کیا کہ لوگوں کو حیرت ہوئی اور سرکاری رپورٹوں میں متواتر ان کی کارگزاری پر اظہار خوشنودی کیا گیا۔
رعایا اس قدر خوش تھی کہ ہندو مسلمان ان کے تبادلے پر آنسو بہاتے تھے۔ اس کے بعد وہ مجلس عالیہ عدالت کے رکن (جج ہائیکورٹ)
باوجودیکہ انھوں نے کوئی قانونی امتحان پاس نہیں کیا تھا لیکن یہاں بھی وہ اپنے کام میں ممتاز رہے تعلیم یافتہ شخص کے یہی معنی ہیں
کام پر ہاتھ ڈالے اسے حسن و خوبی کے ساتھ ادا کرے۔ تھوڑے ہی عرصہ کے بعد وہ پھر اسی جانگزا اور طمانیت سوز خدمت ہوم سکرٹری
کئے گئے۔ اس زمانے میں مرحوم نے ریاست حیدرآباد کی تعلیم پر خاصی توجہ کی اور ایک ایسا قابل تعریف نوٹ ریاست کی تعلیمی حالت
جو ہمیشہ یادگار رہے گا نیز اس میں ایسی ایسی مفید تجاویز پیش کی ہیں کہ اگر ان پر کافی طور سے عمل کیا گیا تو ملک کی خوش قسمتی سمجھی جائے گی
ریاست کی تعلیمی حالت میں اصلاح کا خیال پیدا ہوگا تو اسی داغ بیل پر چلنا پڑے گا۔ مرحوم کی ذہانت قابلیت وسعت معلومات پر
گواہ ہے۔ باوجود کثرت کار کے علمی شوق ان کے دم کے ساتھ رہا۔ ہندوستان کے مشہور اردو رسالوں میں شاید ہی کوئی ایسا ہو جس میں
ان کے مضامین طبع نہ ہوئے ہوں۔ اور پبلک انھیں ہمیشہ وقعت کی نگاہ سے دیکھتی تھی۔ مرحوم مقرر بھی تھے اور بلاتکلف تقریر کرتے تھے
سے زیادہ ان کی تحریر پرزور اور شاندار ہوتی تھی چنانچہ ان کے بعض مضامین اردو انشا پردازی کے بہت عمدہ نمونہ ہیں۔ مرحوم کو علم
خاص دلچسپی تھی محمود گاواں کی سیرت پر جو رسالہ لکھا ہے اس سے ان کے تاریخی تجسس و تلاش کا پتہ لگتا ہے۔ اردو ادب میں بھی
ایسا ہی ذوق تھا جو وکرم اروسی (کالیداس کے ڈرامے کا ترجمہ) سے صاف ظاہر ہے۔ ریاست حیدرآباد میں کوئی علمی اور سوشل مجلس
نہ تھی جس کے وہ پریزیڈنٹ یا وائس پریزیڈنٹ نہ ہوں مثلاً دائرۃ المعارف، نظام کلب۔ کتب خانہ آصفیہ، علی گڈھ اولڈ بوائز
انجمن، انجمن اردو وغیرہ وغیرہ سب ان سے فیضیاب تھیں۔ انجمن قائم کرنے والے یا کسی عارضی جلسہ کے منعقد کرنے والے اول ہی سے

یہہ سمجھ لیتے تھے کہ مولوی عزیز مرزا اس کے صدر ہوں گے۔ یہہ کہنا ہرگز مبالغہ نہیں کہ مرحوم حیدرآباد کی تمام قومی ملکی اور تمدنی تحریکوں کے

اس سے بڑھ کر دوسری بات جس نے مرحوم کو عام و خاص، امیر و غریب، ادنیٰ و اعلیٰ سب میں ہر دلعزیز بنا دیا تھا ان کی [illegible] تھی۔ وہ چھوٹے بڑے سب سے یکساں خوش اخلاقی اور بشاشت سے پیش آتے تھے ہر ایک کی سنتے اور نہایت بے تکلفی سے باتیں کرتے [illegible] نخوت و رعونت چھو نہیں گئی تھی، چھوٹے سے چھوٹے آدمی کے ساتھ بھی وہ مساوات کا برتاؤ کرتے تھے، ان کا گھر پبلک کا گھر تھا اور صبح [illegible] رات کے ۱۱ بجے تک لوگوں کا تانتا بندھا رہتا تھا اور باوجودیکہ ان کے کاموں میں ہرج ہوتا اور بعض اوقات تکلیف ہوتی تھی لیکن وہ [illegible] سے ضروری کام چھوڑ کر بھی مل لیتے تھے۔ لوگوں کی مقصد برآری اور سفارش کرنے میں بڑے دلیر تھے اور کبھی کوئی شخص ان کے در سے [illegible] نہ گیا۔ ان کی مجلس میں علمی چرچے رہتے تھے اور ہر شخص آزادانہ گفتگو کر سکتا تھا۔ افسوس کہ ان کے جاتے ہی یہہ چرچے حیدرآباد سے اٹھ گئے [illegible] کوئی جگہ ایسی نہ رہی جہاں ایسی صحبت کا لطف حاصل ہو سکے ظریف اور خوش طبع بھی تھے، ان کے مزیدار لطیفوں اور چٹکلوں کا ان کے [illegible] اب تک مزہ لیتے ہیں، انکی مجلس سے شاذ و نادر ہی کوئی شخص ناخوش اور مایوس ہو کر آتا۔ مذہب کے بہت پابند تھے کہیں ہوں اور کسی حال [illegible] نماز قضا نہیں ہوتی تھی ان کی زندگی نہایت سادہ اور بے ریا تھی۔ باوجود اس جاہ و منصب اور قیام حیدرآباد کے کبھی بھولے سے بھی [illegible] عیش کی طرف مائل نہ ہوئے وہ بہت متقی اور پرہیزگار تھے اور ہمیشہ طالب علمانہ زندگی بسر کرتے تھے۔ ان کی طرز معاشرت پرانے اور [illegible] طبقہ کے لوگوں کے لئے قابل تقلید نمونہ تھی۔ مرحوم بہت صاف گو تھے، جو دل میں آتا فوراً زبان سے کہہ دیتے تھے اور اس صاف گوئی سے [illegible] اوقات نقصان بھی پہونچا۔ اگرچہ کبھی کبھی رنجیدہ ہو جاتے تھے لیکن پھر جلد صاف بھی ہو جاتے تھے کبھی دل میں کینہ یا بغض نہیں رکھتے۔ ان کا [illegible] عام تھا دوست دشمن بلا امتیاز اس سے متمتع ہوتے تھے انتقام کا کبھی خیال نہ کیا بلکہ جن لوگوں نے ان سے برائی کی انھوں نے اس کا [illegible] بھلائی سے کیا اور بیسیوں مثالیں ہمارے سامنے ایسی موجود ہیں کہ دوستوں سے بڑھ کر انھوں نے دشمنوں کو نوازا۔ مرحوم بہت نرم [illegible] کسی کی درد بھری داستان سن کر خود ان کا دل بھر آتا تھا۔ ان کی تنخواہ کا ایک حصہ دوسروں کی دستگیری میں صرف ہوتا تھا اور یہی وجہ [illegible] پاس کبھی روپیہ جمع نہ ہوا اور خالی ہاتھ اس دنیا سے کوچ کیا۔

حیدرآباد سے جانے کے بعد انھوں نے اپنی زندگی قومی کاموں کے لئے وقف کر دی تھی اور آل انڈیا مسلم لیگ ان کے حوالہ کر دی گئی [illegible] ان کے سکریٹری ہونے سے قبل لیگ برائے نام تھی، مرحوم نے اسے زندہ کیا۔ ہندوستان کے مختلف صوبوں میں دورہ کر کے اس کے دائرہ کو وسیع کیا اور اہل کمال اس کے کاموں کی قدر کرنے لگے۔ اگر وہ زندہ رہتے تو یہہ مسلمانوں کی حمایت میں سب سے پرزور الثر ثابت ہوتی۔

مرحوم کی عمر پورے پچاس برس کی بھی نہ تھی کہ پیام اجل پہنچا۔ اب تک وہ طالب علمی اور ملازمت کے دھندے میں گرفتار رہے [illegible] حال میں مکروہات دنیا سے فارغ ہو کر قومی کارزار میں بڑی مستعدی سے قدم رکھا تھا اور یقین تھا کہ وہ سب سے زیادہ کارآمد اور [illegible] ثابت ہوں گے۔ کیونکہ جب ایام ملازمت میں انھوں نے اس قدر نمایاں کام کئے تو بعد فراغت وہ کیا کچھ نہ کرتے لیکن افسوس کہ عین [illegible] اور نہایت بے وقت انھیں اس دنیا سے کوچ کرنا پڑا اور ملک و قوم کی بہت سی توقعات اور آرزوئیں ان کے ساتھ خاک میں مل گئیں۔

عبدالحق

ماخوذ از چند ہم عصر

مروّجہ محبت

محبت کی تعریف کسی خبطی نے یوں کی ہے کہ محبت نام ہے ایک خاص ہستی سے ایسی دلچسپی کا کہ دوسری تمام ہستیاں اس کے مقابلے میں نظر انداز ہو جائیں۔ لیکن انسانی خود غرضی کا یہ بہت اچھا اور آسان بہانہ ہے۔ اور سماجی زیادتیوں کی اسی سے بنیاد پڑتی ہے اگر اس مقولہ کو صحیح مان لیں تو خاندان، اعزا، اور اقربا سے الفت بے معنی ہو جاتی ہے۔ محبت یقیناً ایک اعلیٰ درجہ کا جذبہ ہے جو ماں کو بیٹے سے بھائی کو بہن سے اور دوست کو دوست سے ایک سنہرے اور دل خوش کن رشتہ میں منسلک کر دیتا ہے۔ لیکن زندگی کا تقاضا ہے کہ اس رشتہ کو وسیع سے وسیع تر کیا جائے۔ یہاں تک وسیع کہ مقام۔ وقت۔ شخصیت۔ قومیت اور رنگ و روپ کا فرق باقی نہ رہے۔

محبت منجملہ دیگر داخلی جبلتوں کے ایک جبلت ہے بعض جبلتیں حیوانی ہوتی ہیں اور بعض روحانی۔ محبت پاکیزہ روحانی جبلت کا نام ہے اور اس واسطے دائرۂ خیر میں داخل کی جا سکتی ہے۔ ظاہر ہے کہ دائرۂ خیر کو جس قدر وسعت ہو سکے بنی نوع انسان کی بہتری فلاح اور بہبودی کا باعث ہوگا۔ لیکن اس کی وسعت میں ایک اور خود غرضی سے مملو مقولہ حائل ہے۔ کہا جاتا ہے کہ پہلے گھر میں چراغ جلاؤ تو پھر مسجد میں، لوگ خود غرضی کی بنا پر صرف گھر میں چراغ جلانے پر اکتفا نہیں کرتے۔ بلکہ گھروں کو برقی روشنی سے جگمگا دیتے ہیں۔ اور جگمگاتے رہتے ہیں اور محلہ میں ہزاروں گھروں میں اندھیرا رہتا ہے۔ ایسی تاریکی کہ خدا کی پناہ۔ کاش یہ خوش قسمت ہستیاں اپنے گھروں میں چراغ جلا کر دوسرے گھروں کے اندھیرے کی بھی فکر کرتیں۔ مگر جیسا کہ عرض کیا جا چکا ہے کہ تعیشات کے بندے ہر چیز اپنے لئے چاہتے ہیں اور ہر ہستی پر اپنی ملکیت اور قبضہ کو اخلاق کا سچا معیار تصور کرتے ہیں۔ خود اُن کا اور اُن کے اہل و عیال کا دوزخ شکم لذیذ کھانوں سے بھر جائے۔ اُن کی اور اُن کے وابستگان کی کھال ریشم کے نفیس لباسوں سے ملبوس ہو جائے۔ یہی اُن کا مطمح نظر اور نصب العین زندگی ہے۔ ان کی بلا سے کہ مخلوق پر کیا گذر رہی ہے اور یہ لوازمات بہم پہنچانے کے لئے انھوں نے شعوری اور لاشعوری طور پر بنی نوع انسان پر کیا کیا ظلم و ستم کے پہاڑ توڑے ہیں۔ حرص و ہوا کے بندوں کو خبر تک نہیں ہوتی کہ جب ان کے جگر کے ٹکڑے صحت کو ستیاناس کرنے والی اغذیہ نوش جان فرما رہے ہیں تو ہزاروں بے زبان معصوم بچے دودھ کی چند بوندوں کے لئے ترس ترس کر جان دے رہے ہیں۔ صرف ذرا سی قربانی سے وہ ان مصائب کو مسرتوں میں بدل سکتے ہیں۔ کاش اُن کے دل میں محبت کا روحانی جذبہ ہوتا جو گو قدرت نے ان کو عطا فرمایا تھا لیکن انتہائی خود غرضی کی وجہ سے انھوں نے اس کو ناکارہ اور مردہ بنا دیا۔

اس میں شبہ نہیں کہ دنیا میں ہزاروں مثالیں ملیں گی کہ ایک کی خاطر یعنی صرف اُس ایک کی خاطر جس سے محبت ہو لوگوں نے جانیں دے دیں۔ ایسے محبت کرنے والوں کے کارنامے اب بھی محبت کی تاریخ یا ادب سے پڑھے جاتے ہیں اور مثال کی طور پر پیش کئے جاتے ہیں۔ لیکن واضح رہے کہ ان جانبازوں کا حشر احمقانہ خود غرضی کا نتیجہ تھا۔ وہی ملکیت کی تمنا جو خبط کی حد کو پہونچ چکی تھی محبت جیسے ناپیدا کنار طوفانی دریا کو کوزہ میں نہیں بھرا جا سکتا وہ اگر ایک ہستی، ایک خاندان، ایک ملت۔ ایک قوم۔ اور ایک ملک سے کی جائے تو محدود ہو جاتی ہے۔ اور نیکی کا محدود کرنا گناہ ہے۔ محدود محبت مثل ایک بیمار آدمی کے ہے۔ گو وہ زندہ ہے لیکن ضرور کچھ جراثیم زہریلے اور بس بھرے اس کے جسم کو آہستہ آہستہ کھا رہے ہیں۔ ہماری روز مرہ کی زندگی میں ہمیں نظر ہی کیا

آتا ہے بس یہی نا کہ فلاں شخص اپنی بیوی بچوں کو بہت زیادہ چاہتا ہے۔ اُن کے لئے دوسروں کا گلہ کاٹتا ہے۔ فلاں اپنے خاندان دوسرے خاندانوں کو تباہ و برباد کر کے سیوا کرتا ہے۔ فلاں اپنی ملت پر جان دیتا ہے۔ لیکن دوسری ملتوں کے خون کا پیاسا ہے فلاں وطن پرست ہے لیکن دوسرے ممالک کے باشندوں کی خانماں بربادی کا دلنواز خواب دیکھا کرتا ہے۔ وطن کی محبت میں پور ہزاروں بلکہ لاکھوں ہم جنسوں کو تیغ و تفنگ کا نشانہ بناتا ہے اور جب وہ خاک و خون میں تڑپ تڑپ کر جان دیتے ہیں جب ان بیوہ بیکس و بے بس بیویاں، بیٹیاں رو تی پیٹتی ہیں اور معصوم یتیم دانے دانے کو ترستے ہیں تو وہ قہقہہ لگا لگا کر گردنوں پھولوں کے ہار پہنے ہوئے باجے بجاتے ہوئے۔ عقل کے اندھوں کے کاندھوں پر سوار سورما بن کر نکلتے ہیں۔ سماج ان کی آؤبھگت کرتی ہے۔ شعرا ان کی تعریفوں کے گیت گاتے ہیں۔ آپ ہی انصاف کریں کہ یہ جذبہ شیطانی ہے یا روحانی۔ برخلاف ان کے اگر ان کے دل میں درد ہو۔ اگر اُن میں شرافت اور انسانیت ہو تو وہ اپنے اہل ملک کی فلاح و بہبود کے کچھ اور طریقے سوچتے۔ ذرا غور تو کیجئے کہ محبت دلوں کو ملانے والی۔ ساتھی کو پھیلانے والی۔ مختلف ہستیوں کو ایک جان۔ مختلف النوع قالب بنانے والی چیز ہے باعث بربادی سبب ناگفتہ بہ تباہی کا ہوتی ہے۔ کیوں؟ اس لئے کہ محبت جس کی آڑ میں شکار کھیلا گیا۔ خون آشام شکاری اس کا وجود میرے ایسی ہستی یا ہستیوں میں تھا ہی نہیں۔ یہ تو غرض کے بندے اور نفس کے غلام تھے۔ دنیا کو دھوکا دینے کے لئے بھولے فرشتہ صفت انسانوں کی آنکھوں میں خاک جھونکنے کی خاطر یہ بہروپ بھرا گیا تھا۔ اصل میں اِن کی خودغرضی ہی تمام مصائب کی جڑ ہے۔ خاندانی جھگڑے، قومی حسد، رنگ و روپ کی رکاوٹیں، نسلی فرق اور قومی تشدد یہ سب خودغرضی اور نفس پرستی کے نتائج ہیں۔

مذہب کی بنیاد محبت پر ہے۔ محبت ایمان حقیقی ہے اور یہاں تک کہا جاتا ہے کہ محبت خدا ہے اور خدا محبت بزرگان قوم کی سوانح عمریاں اس نقطہ کو واضح کرتی ہیں کہ میں اور تو میں وہاں کوئی فرق نہیں تھا۔ بلکہ پیٹ پر پتھر باندھ کر خود فاقوں کی مصیبتیں اٹھا کر دوسروں کی مدد کی۔ خود اور ان کے اہل و عیال مصائب اور آلام میں پڑے۔ لیکن کے لئے گھر بار سب لٹا دیا۔ یہ ہے شان محبت کی جو انھیں اپنے خدا اور اس کی پیدا کی ہوی مخلوق سے تھی۔ اس حقیقت ظاہر نہیں کیا جاتا۔ اس کی تبلیغ کوئی نہیں کرتا کہ بنی نوع انسان کا ذرا سا دکھ ان محترم ہستیوں کو بے قرار کر دیتا تھا۔ اُن کے لئے خواب و خور حرام ہوتا تھا اور جب تک اپنی حد تک انھیں اطمینان نہ ہو جائے کہ غریب اور بیکس خواہ اپنے ہوں یا غیر آسودہ ہو چکے انھیں چین نہیں آتا تھا۔

ان اوصاف پر جو جان ہیں انسانیت کی پردہ ڈالا گیا اور ڈالا جاتا ہے۔ مذہب کے نام سے ایک دوسرے کا گلا کو کاٹا جاتا ہے اور خوش ہوتے ہیں کہ ہم نے ان تمام وحشیانہ حرکات سے اللہ کی خوشنودی حاصل کی اور جنت کے مستحق ہو گئے۔ پہلے صلیبی جنگ لڑی جاتی تھی۔ عیسائی اور مسلمان ایک دوسرے کا بے دریغ خون بہاتے تھے اور بدنام کرتے مذہب کو۔ گو وہاں بھی وہی خودغرضی کارفرما تھی جو آج فرقہ وارانہ جنگ میں مضمر ہے۔ مزا یہ ہے کہ فرقہ وارانہ جنگ زمانہ جہالت میں نہیں بلکہ متمدن روشن خیالی کے زمانہ میں ہو رہی ہے۔ اگر اس کو تمدن اور روشن خیالی کہتے ہیں تو کتنے ہم وحشی ہونا کہیں بہتر سمجھتے ہیں بشرطیکہ زندہ رہو اور زندہ رہنے دو کا فلسفۂ حیات کارفرما ہو۔ سیدھی اور سچی باتوں کو حضرت انسان۔ شریف انسان ہیں مکار انسان کس کس طرح توڑ موڑ کر میٹھا میٹھا حلوہ بنا لیتا ہے۔

مقررین کو دیکھئے کہ جب تقریر کرنے کو آتے ہیں تو زمین و آسمان کے قلابے ملا دیتے ہیں۔ واعظین اور مبلغین شرافت، انسانیت کے مجسمے نظر آتے ہیں لیکن جنگ چھڑنے دیجئے یہی لوگ آسمانی کتابیں لے کر لوگوں کو برافروختہ کرتے ہیں اور ایک بھائی کو دوسرے بھائی کے خون کا پیاسا بنا دیتے ہیں۔ جنت کی دلکش تصویریں اور حوروں کے دل آویز جلوے کھنچے جاتے ہیں اور ہزاروں وارفتگی کے عالم میں خون کے دریا میں نہاتے ہیں تاکہ شہید یا غازی کے لقب سے یاد کئے جائیں۔

گر ہمیں مکتب است و ایں ملا۔ کار طفلاں تمام خواہد شد

یہ تو ہمارے رہبر ہیں۔ ان کا کام تو یہ تھا کہ محبت جو اپنے کمال پر ایمان کامل بن جاتی ہے۔ ایک دوسرے میں کوٹ کوٹ کر بھر دیتے۔ دیکھا آپ نے! یہ ہے مخلوق خدا سے محبت جو لازمی گردانی گئی ہے۔

قوم پرستی اور مذہب پرستی کا بہروپ آپ دیکھ چکے؟ اصل تو یہ ہے کہ نفس پرستی اور خود غرضی نے ہمیں اندھا کر دیا ہے نیک و بد کی تمیز ہم سے اُٹھ گئی۔ اپنا الّو سیدھا کرنے کے لئے ہم سب کچھ کرنے کو تیار ہیں۔ ہر سچ کو جھوٹ کر دکھانا بائیں ہاتھ کا کھیل ہے۔ زمانہ اور سماج اُس ہی کو سچ سمجھتا ہے جو ایسے خود غرضوں نے اُن کو سمجھا دیا۔ اگر انسان عقل سے کام لے تو تمام راز افشا ہو جائیں۔

گو گھنگھور گھٹا دنیا کو تیرہ و تار بنا دیتی ہے اور چار طرف اندھیرا چھا جاتا ہے پھر بھی برق کبھی کبھی چمک کر اپنے نور سے اس تاریک فضا میں بھی سیدھے راستہ کا پتہ بتا کر گمراہی سے بچاتی ہے۔ خود غرض، عیش پرست، ہوا و ہوس کے غلاموں نے محبت کے نام کو بدنام کیا اور کر رہے ہیں۔ ہزاروں بھولی بھالی ہستیوں نے اس نام پر قربانی اور مصیبت چڑھائی۔ اور چڑھا رہی ہیں ظلم و ستم، مکاری و دغا بازی کا بازار گرم ہے اور دھوکے کے سیاہ بادل چاروں طرف چھائے ہوئے ہیں۔ لیکن باایں ہمہ یہ سمجھ لینا جہالت اور حماقت ہے کہ محبت جس کے معنی قربانی اور ایثار ہے مفقود ہے۔ کمیاب ضرور ہے لیکن عنقا نہیں۔ اگر سمجھ اور عقل کو رہنما بنایا جائے۔ اور ذاتی مفاد کا جنون ہر وقت سر پر سوار نہ رہے۔ ابتلا اور امتحان کے موقع پر آسا کا دامن ہاتھ سے نہ چھوٹے اور کٹھن سے کٹھن موقع پر ہراساں نہ ہو تو انسان اس جوہر بے بہا کو پا سکتا ہے جس کے ملنے کے بعد وہ دنیا کی ہر نعمت سے بے نیاز ہو جاتا ہے۔ اشرف المخلوقات کہلانے کا صرف اسی شخص کو حق ہے جو اپنی جان دوسروں کی خاطر مصیبت میں ڈالے اور غیروں کے لئے اپنی مسرتوں کی قربانی افضل سمجھے۔ جب تک حیوانی جبلتوں سے جنگ نہ کی جائے۔ ان کو شکست دے کر قابو میں نہ لایا جائے اور جگت میں پریم ہی پریم بھرا ہے کے خیال کو شاعرانہ واہ واہ کے لئے نہیں بلکہ عمل کرنے کے لئے اختیار نہ کیا جائے آتما کو شانتی نصیب نہیں ہو سکتی۔

محبت دیگر اوصاف حمیدہ سے علیحدہ نہیں کی جا سکتی۔ کیونکہ یہ جزء اعظم ہے اور ہر نیکی میں اس کا موجود رہنا ضروری ہے۔ بھروسہ، دوستی، احسان مندی، عزت، پرستش، عبادت۔ غرض کہ ہر جگہ اس کا راج پاٹ ہے ورنہ یہ الفاظ ہی الفاظ ہیں۔ جو شرمندۂ معنی نہیں۔

پریم پجاری کے من مندر میں، ذات پات، رنگ روپ، کا امتیاز نہیں۔ وہاں ہر کس و ناکس کی پوجا ہوتی ہے۔ وہ کسی کا دشمن ہو ہی نہیں سکتا۔ کیونکہ عفو اور خطا پوشی اُس کا شعار ہے۔ وہ انسان کی کمزوریوں کو سمجھنے کی کوشش کرتا ہے اُن پر خفا نہیں ہوتا بلکہ دور کرنے کی کوشش کرتا ہے۔ سعی پیہم، باوجود ناکامیوں اور سخت مخالفتوں کے اس کا نصب العین

زندگی ہے وہ خود اپنا خضر راہ ہے اور اپنی راہ خود چل رہا ہے۔ تعصب، کوتاہ بینی، اور حسد و بغض اس کے راستہ میں حائل
لیکن وہ آہستہ آہستہ اُن پر فتح یاب ہوتا ہے۔

اگر ہم اس فلسفۂ خیال کو سمجھیں اور اس پر عمل پیرا ہوں تو محبت بنی نوع انسان کے لئے ایک نعمت غیر مترقبہ
اہل دل کے لئے پریم نیا جیون کا سکھ نہیں۔

سید نور الحسن

عروسِ نو کی جدائی پر

ابھی چھیڑا تھا تم نے بربطِ بیتابِ ہستی کو
ابھی تم نے دیا تھا درسِ رفعت میری پستی کو
ابھی تاریک دنیا ہو چلی تھی میری نورانی
ابھی ہر ذرہ ذرہ ہو چلا تھا دل کا روحانی
ابھی تکمیل کو پہونچا نہ تھا افسانۂ ہستی
ابھی لینے نہ پائی تھی مری امید کی بستی
ابھی کل ہی تو تم نے ساغرِ الفت پلایا تھا
ابھی کل ہی تو تم نے مجھ کو دیوانہ بنایا تھا

نہ رخصت ہو شریکِ زندگی مجھ سے نہ رخصت ہو

ابھی آراستہ کی تھی محبت کی جبیں میں نے
سنواری تھی ابھی قسمت کی زلفِ عنبریں میں نے
تبسم آرہا تھا پہلے پہلے میرے ہونٹوں کو
ترنم چھیڑتا تھا پہلے پہلے میرے ہونٹوں کو
ابھی فصلِ بہاری میرے کاشانے میں آئی تھی
ابھی موجِ مسرت میرے غم خانے میں آئی تھی
ابھی بادِ صبا نے گدگدایا تھا گلستاں کو
ابھی نکلی تھی نکہت چھوڑ کر پھولوں کے داماں کو

نہ رخصت ہو شریکِ زندگی مجھ سے نہ رخصت ہو

مری امید کی دنیا! تجھے کیونکر بھلا دوں میں
بہاروں کو خزاں کی گود میں کیونکر سُلا دوں میں
ملا دوں خاک میں کیونکر جوانی کی بہاروں کو
مسل کر پھینک دوں کیونکر تمناؤں کے ہاروں کو
ابھی میں اپنی بربادی کا ماتم کر نہیں سکتا
ابھی شیرازۂ ہستی کو برہم کر نہیں سکتا
ربابِ غم کے تاروں کو ابھی بجنے نہ دوں گا میں
خزاں کی بزمِ ماتم کو ابھی سجنے نہ دوں گا میں

نہ رخصت ہو شریکِ زندگی مجھ سے نہ رخصت ہو

افق سے جھانکتا ہے پھر ابھی صبحِ مسرت کا
پیا ہے ایک ہی جرعہ ابھی صہبائے الفت کا
ابھی دنیائے عقل و ہوش پر مستی نہیں چھائی
ابھی لی ہی نہیں تم نے مرے پہلو میں انگڑائی
ابھی تو کھیلنا ہے حسن کی گستاخ نظروں میں
ابھی تو جذب ہونا ہے ترے بیتاب جلووں میں
ابھی دامانِ مشتاقِ محبت باز رہنے دے
نیازوں کے لئے وا بارگاہِ ناز رہنے دے

نہ رخصت ہو شریکِ زندگی مجھ سے نہ رخصت ہو

علی احمد

ایلورا

خلدآباد میں زیارتوں سے فارغ ہوکر ہم ایلورا کو ۱۲ بجے پہنچے۔ یہاں کوئی ۳۰ غار ہیں جو پتھر کو تراش کر بنائے گئے ہیں۔ پہلے دس غار بدھ مت کے پیروؤں نے تراشے ان کی ابتداء چوتھی صدی عیسوی میں ہوئی۔ اس کے بعد کے درمیانی غار برہمن مت کے پیروؤں نے بنائے ہیں، ان کا زمانہ ساتویں صدی معین کیا گیا ہے۔ اس کے بعد چند غار جین مت کے پیروؤں نے بنائے۔ یہ دسویں صدی میں تعمیر ہوئے۔ یہ پچھلے غاروں کی نقلیں ہیں جو اس قدر فن کارانہ نہیں۔ سارے غار یا تو مندر ہیں یا خانقاہیں ان کی دیواروں پر اپنے اپنے عقائد اور مذہبی روایات کو ظاہر کیا گیا ہے۔ ظاہر ہے کہ اتنا عظیم الشان کام سوائے مذہبی جوش کے اور کوئی جذبہ تکمیل کو نہیں پہونچا سکتا تھا۔ ہمیں خیال ہوا کہ شاید ان کے پاس پتھر تراشنے کے کوئی خاص آلے ہوں گے مگر دریافت کرنے سے معلوم ہوا کہ وہاں جو آلے پائے گئے وہ بالکل معمولی ہتوڑیاں اور چھینیاں ہیں۔ حیرت ہوتی ہے کہ کس طرح سخت پتھر اس طرح کاٹے جا سکے۔ دیواروں اور ستونوں پر جو شکلیں تراشی گئی ہیں۔ ان کا مکمل تناسب حیرت افزا ہے۔ تعجب میں اضافہ ہوجاتا ہے۔ جب ہم ان شکلوں میں دیکھتے ہیں کہ چہروں سے جذبات پورے طور پر واضح کیے گئے ہیں۔ اس طرح بنانے والوں کی سنگ تراشی ہی نہیں بلکہ جذبات نگاری بھی قابلِ تعریف ہے۔

یہاں کی سب سے بڑی اور بہترین غار کیلاس کہلاتی ہے۔ چنانچہ وہاں پہنچتے ہی ہم نے پہلے کیلاس کا تفصیلی معائنہ کیا۔ محکمۂ آثارِ قدیمہ کی جانب سے عبدالحی صاحب نے پہلے ہم کو اس غار کی خصوصیات بتلائیں اور پھر ہر شکل کی پوری تفصیل کرتے ہوئے ہماری رہبری کرتے رہے۔ ضروری تفصیل نہ بیان کرتے تو ہم یہاں کی سنگ تراشی کی خوبیوں کو اس خوبی سے نہ سمجھ سکتے۔

راشٹرکوٹ خاندان کے راجہ کرشنا اول کا نام تاریخ کبھی فراموش نہ کرسکے گی۔ کیونکہ ہندوستان کا سب سے زیادہ حیرت خیز تعمیری عجوبہ یعنی کیلاس کا مندر ایلورا کے چٹانوں میں اسی راجہ کے عہد میں تراشا گیا۔ برہمن مت کے پیروؤں نے اپنے عقائد اور مذہبی روایات کے ظاہر کرنے میں بدھ مت والوں کی نقل کی۔ مگر فن کارانہ نقطۂ نظر سے ان کا کارنامہ بھی اصل سے کسی طرح کم نہیں۔

یہاں کی سنگ تراشی کو بخوبی سمجھنے کے لیے ان برہمنوں کے عقائد سے ذرا سی واقفیت ضروری ہے جنھوں نے اپنے خیالات کو اس طرح عملی جامہ پہنایا ہے۔ کہتے ہیں کہ ویدا میں تو وحدانیت ہی کی تعلیم دی گئی ہے۔ مگر انسان کی یہ کمزوری ہے کہ وہ اوہام میں مبتلا ہوکر بت پرستی کی طرف مائل ہوجاتا ہے۔ چنانچہ بدھ نے بت پرستی کی تعلیم کہیں نہیں دی مگر اس کے پیرو ان انسانی کمزوریوں کا شکار ہوئے۔ برہمنوں نے بھی خدا کی مختلف صفات کو مفروضہ پیرائے میں دیوتاؤں کے نام سے موسوم کرلیا۔ انسانی نقطۂ نظر سے خدا کی تین صفات بہت اہم ہیں۔ انھیں سے تین دیوتاؤں کا خیال پیدا ہوا۔ برہما (جو خالق تصور کیا جاتا ہے) وشنو (جو رب تصور کیا جاتا ہے) اور شیو (جو موت کا دیوتا تصور کیا جاتا ہے) برہمو کی پوجا نہیں ہوتی۔ البتہ وشنو اور شیو کی عبادت کی جاتی ہے۔ ان دونوں کے کئی اوتار ہوئے ہیں اور ان سب

سب رسس

اوتاروں کی پرستش ہوتی ہے۔ فرق یہ ہے کہ وشنو کے اوتاروں کی شکلیں معین ہیں مگر شیو کی شکل نہیں ہوتی بلکہ ایک گول
ستون بنایا جاتا ہے جو لنگم کہلاتا ہے۔

کیلاس کی سب سے اہم سنگ تراشی وہ ہے جس میں دیواروں پر رامائن کا تقریباً پورا قصہ اور مہابھارت کے
مناظر پیش کئے گئے ہیں۔

رام چندر جی رخصت ہوتے سے پہلے والد سے قدم بوس ہو رہے ہیں' ان کے ساتھ غمگین رعایا آنسو بہاتے ہوئے
شہر کے باہر تک گئی ہے۔ رام چندر جی کشتی پر سوار ہو کر دریا کے پار اتر رہے ہیں۔ پھر جنگل کا منظر ہے اور ان کی رہائش گاہ
مقابلہ بنایا گیا ہے۔ سورپ نکھا رام چندر جی پر فریفتہ ہو کر اپنے دام میں پھانسنا چاہتی ہے مگر آخر میں ناکام ہو کر ستا
کوشش کرتی اور سزا پاتی ہے۔ راون اپنی بہن کی بے عزتی کا بدلہ لینے کے لئے سیتا سے تنہائی میں بھیک مانگتا ہے۔ دراصل
رقص کرتا ہے' جو آج بھی ہندوستانی کلاسکل رقص کا بہترین مظہر سمجھا جاتا ہے۔ سیتا لنکا کے ایک باغ میں قید کی جاتی ہے۔ ہنو
فوج کو لے کر سمندر پر پل تعمیر کرتا ہے۔ لڑائی ہوتی ہے جس میں راون مارا گیا اور رامچندر جی نے سیتا کو قید سے چھڑا دیا۔
دریا' جنگل' باغ اور سمندر کو بخوبی واضح کیا گیا ہے۔ بڑی خوبی یہ ہے کہ چہروں سے سارے جذبات نمایاں کئے گئے
خصوصاً ہنومان کا سمندر کو دیکھ کر متفکر ہونا کہ یہ کس طرح عبور کیا جا سکے گا جذبات نگاری کی بہترین مثال ہے۔ اور یہ پورا
ایک دیوار پر منقش ہے۔

کیلاس کا درمیانی حصہ بالکل ایک رتھ کی شکل کا عظیم الشان مندر ہے۔ اس کے اطراف بھی مسقف حصہ ہے جس کی
مختلف اوتاروں کی شکلیں ہیں اور ہر شکل کسی مذہبی روایت کو ظاہر کرتی ہے۔ برہمن مت پر جب اوہام کا غلبہ ہوا تو
برے بھلے سب طرح کے عقائد شامل ہو گئے۔ اس لئے یہاں کے نقش و نگار میں بے معنی اوہام سے لے کر نہایت دقیق فلسفیا
خیالات تک کی روایات اور عقائد کا ایک سلسلہ ہے۔ عقائد کی بھلائی یا برائی کو نظر انداز کر کے یہاں ہم کو صرف یہ دیکھنا
سنگ تراش نے اپنے خیالات کو نقش کی صورت میں کس خوبی سے ظاہر کیا ہے۔

شیو اور پاربتی چوسر کھیل رہے ہیں' شیو تین مرتبہ ہار چکے اور چاہتے ہیں کہ اور ایک بازی کھیلی جائے مگر پاربتی کو
انکار ہے۔ شیو جی کا بازی ہار جانے کے بعد کچھ آزردہ ہو کر پھر کھیلنے کی درخواست کرنا اور پاربتی کا فاتحانہ مسکراہٹ اور ایک
ہاتھ اٹھائے ہوئے منہ پھیر کر انکار کرنا اس خوبی سے ظاہر کیا گیا ہے کہ اس سے بہتر فن کاری کا کوئی نمونہ مشکل ہی سے مل سکے گا۔

یہاں ایک گروپ فوٹو لیا گیا اور کھانے کے بعد ہم دسویں غار کو گئے جو سُتار کی جھونپڑی کہلاتا ہے۔ یہ غار ایک بہت بڑی
میں تراشا گیا ہے اور ایک بہت بڑے ہال پر مشتمل ہے۔ ایک جانب بدھ کا ایک بڑا بت اور اس پر "اسٹوپا" ہے۔ اسٹوپا میں ایک
کنول کا پھول بنایا گیا ہے۔ اس سے مطلب یہ ہے کہ زندگی پانی کا ایک بلبلہ ہے اور جو شخص اس زندگی میں بدھی حاصل کرلیتا ہے
کرے پر کے کنول کی طرح ایک دائمی اور ابدی راحت کی زندگی حاصل کرلیتا ہے۔

اس کی چھت گردی ہے اور سطح پر ۲' ۳ فٹ کے فاصلے اسی قدر چوڑی تختیاں کمانوں کی شکل میں تراشی گئی ہیں۔
آواز کے ضعفی انعکاس کے اصول پر کی گئی ہے۔ بلند اور چوڑی سیڑھیوں کے سامنے کچھ فاصلے پر تالی بجائی جائے تو گئی تا

سنائی دے گی کیونکہ تالی کی آواز مختلف سیڑھیوں سے ٹکرا کر منعکس ہوتی ہے۔ بجلی کی کڑک دراصل ایک ہی آواز ہوتی جو مسلسل گونج سنتے ہیں وہ دراصل قریب کے بادلوں سے اس آواز کے مسلسل انعکاس کا نتیجہ ہے۔ یہ سب مثالیں صعی انعکاس کے اصول کی توضیحات ہیں۔ ستار کی جھونپڑی کی بھی خصوصیت یہ ہے کہ یہاں آواز چھت پر کے زینہ نما سے مسلسل گونجتی ہے۔ یہاں مولوی جلال الدین صاحب نے گانے کا انتظام کیا تھا۔ ہمارے ایک ساتھی نے بھی توفیق ایک غزل گائی۔ اس غار میں یہ گانے بہت لطف دے رہے تھے۔

یہاں سے ہم مختلف غاروں کا معائنہ کرنے کے لئے روانہ ہوئے۔ دوتھال اور تین تھال غاریں ایک حیرت انگیز کارنامہ ہیں۔ پتھر پہاڑوں میں دومنزلہ اور سہ منزلہ عمارات تراش دینا اور وہ بھی معمولی ہتوڑی اور چھینی سے ایک محیرالعقل کام ہے۔ ایک غار میں فٹ لمبا اور ۴۰ فٹ چوڑا ہال ہے اور اس پر کئی لاکھ من کا بوجھ۔ سمجھ میں نہیں آتا کہ اتنا وزن کیسے قائم رہ سکتا ہے جدید فن بھی اس کو سمجھنے سے عاجز ہے۔ آخری غاریں جین مت کے پیروؤں نے بنائی ہیں۔ ان کی چھت پر رنگ کاری بھی کی گئی ہے جو اجنٹہ کے غاروں کی ایک نقل ہے۔ یہاں ایک تصویر میں عورت اور مرد بالکل انگریزی طرز کا رقص کر رہے ہیں۔ اس کو دیکھ کر حیرت ہوتی ہے کیونکہ یہ دسویں صدی کا کارنامہ ہے اور ہندوستان میں اس طرز کا رقص نہیں ہوتا۔ کیلاس کے مندر کے بعض ستونوں پر قابل اعتراض تصویریں کندہ نظر آئیں۔ سمجھ میں نہیں آتا کہ ایک عبادت گاہ میں مذہبی کاریگروں نے اس کو کیوں روا رکھا۔ اس کے بہت سے وجوہ بیان کئے گئے مگر عقل سلیم کے لئے اس کی کوئی تاویل بھی قابل قبول نہیں ہوسکتی۔

چاند

حبیب احمد فاروقی

آسماں کی نیلگوں دنیا میں سرگرداں ہے تو
جستجو میں کس کی اے شوریدہ سر! حیراں ہے تو

محو ہے ذوقِ طلب میں بے سروساماں ہے تو
راہِ ذوقِ جہد میں عبرت دہِ انساں ہے تو

کس نے سکھلائی یہ مجنونانہ سرگرمی تجھے؟
محفلِ شب کی خموشی میں یہ بے چینی تجھے؟

گوکہ تیری مضطرب کوشش سکون آمیز ہے
تیرے سینے میں نہاں اک شورِ رستاخیز ہے

جنبشِ ابرِ پریشاں ہی تری مہمیز ہے
آہ! تو درماندگی میں بھی تبسم ریز ہے

مثل تیرے محوِ حرکت محفلِ انجم نہیں
آشنائے لذتِ سوز و گدازِ غم نہیں

آہ! اس درماندہ رہرو کی کوئی منزل بھی ہے؟
اس مشقت آزمائی کا کوئی حاصل بھی ہے؟

اس غبارِ راہ میں پیدا کوئی محمل بھی ہے؟
بحرِ ذوقِ جستجو! تیرا کوئی ساحل بھی ہے؟

جانتا ہوں میں، مری دنیا سے گو تو دور ہے
راز جو پیہم تجسس میں ترے مستور ہے

محمد نعیم الدین صدیقی عثمانیہ

موت

تیسرا منظر

(وہی کمرہ ہے جو پہلے منظر میں دکھایا گیا ہے۔ صبح کا وقت۔ حمیدہ کی حالت نازک ہے)

نصرت۔ روشنی اچھی خاصی ہو رہی ہے۔ اور صبح بھی تو ہو چکی ہے۔

حمیدہ۔ تم کب واپس آئے۔

نصرت۔ میں گیا کہاں تھا۔ معلوم ہوتا ہے تم کوئی خواب دیکھ رہی تھیں۔ جبھی نیند میں قندیل۔ قندیل کہہ رہی تھیں۔

حمیدہ۔ میں نے ایک بہت ہی وحشت ناک خواب دیکھا ہے۔

نصرت۔ پھر بھی میں سمجھتا ہوں کہ تم کافی عرصہ تک گہری نیند سوتی رہیں۔ اب طبیعت کیسی ہے۔

حمیدہ۔ اگر میں نے خواب نہ دیکھا ہوتا تو میں ضرور آرام محسوس کرتی۔ مگر اب..... اُف میرا دم گھٹا جا رہا ہے۔

(حمیدہ کے چہرے پر انتہائی تکلیف کے آثار نمایاں ہوتے ہیں)

نصرت۔ (پریشان ہو کر)۔ نرس۔ نرس.... کلثوم.... کلثوم

(دونوں بھاگتی ہوئی آتی ہیں)۔ نرس دیکھو ان کی حالت کیا ہو رہی ہے

حمیدہ۔ میں اچھی..... اچھی ہوں.... نرس.... نرس کو
... اس کو یہاں ٹھہرنے دو...... تم کچھ آرام... آرام کرو۔
..... نرس..... نرس...... میرے قریب... بیٹھ قریب
.... نہ آؤ.... اُف...... اللہ..... اللہ..... کتنی
.... کتنی.... گرمی..... میرا بدن..... میرا بدن.. پھنک رہا ہے۔

نصرت۔ اچھا میں جاتا ہوں۔ مگر تم بھی باتیں کر کے خود کو نہ تھکاؤ (چلا جاتا ہے) نرس اونگھنا شروع کرتی ہے۔

حمیدہ۔ نرس۔

نرس۔ (چونک کر) جی بیگم صاحب۔

حمیدہ۔ وہاں..... میرے بچوں کی..... تصو
.... وہ..... یہاں ہے..... لے آؤ...
دیکھ..... دیکھ لوں۔

نرس (تصویر دیتے ہوئے) بڑے خوبصورت بچے ہی
آپ کی صحت کی دعائیں مانگ رہے ہیں۔

(نرس پھر اونگھنے لگتی ہے۔ حمیدہ تصویر کو دیکھ کر رونا...

حمیدہ۔ ذرا یہاں آؤ۔

نصرت۔ (کمرہ سے نکلتے ہوئے) کیا مجھے بلایا۔

حمیدہ۔ ہاں..... تم یہیں..... ٹھہرو..... نرس
..... جانے دو۔

نصرت۔ اچھی بات ہے (نرس سے) تم جاؤ۔ مگر دیکھو
تم نے منگوائے تھے۔

نرس۔ جی نہیں رات زیادہ ہو گئی تھی اس لئے نہ منگوا سکی
منگوائے لیتی ہوں۔

نصرت۔ ہاں کسی کو بھیج کر فوراً منگوالو۔ ابھی۔ ابھی دنا

نرس۔ بہت اچھا۔ (جاتے ہوئے پلٹ کر) کیا میں دوا

حمیدہ۔ نہیں۔

نصرت۔ دوا کا وقت ہو گیا ہے پی لو۔

حمیدہ۔ اچھا...... لاؤ۔ (نرس دوا دیتی ہے)

نرس۔ ٹمپریچر بھی لے لوں۔

نصرت۔ ضرورت نہیں میں خود دیکھ لوں گا۔ (نرس چلی
خود اٹھ کر تھرمامیٹر لگاتا ہے) کیا تم کو بہت گرمی معلوم ہو رہی

حمیدہ۔ (سر کے اشارے سے ہاں کہتی ہے)

(بازو کے کمرے سے نرس اور کلثوم بی کی باتوں کی آواز آتی
نرس کی آواز۔ ذرا کسی سے کہو کہ تھوڑے سیب لے آئے
کلثوم بی کی آواز۔ میرے کو کیا غرض ہے۔ تم بولو نا
بیگم صاحب کیسے ہیں۔

[illegible] آواز۔ کوئی توقع نہیں۔

[illegible]۔ (تھرما میٹر دیکھتے ہوئے) ننانوے اعشاریہ آٹھ۔ میں تم کو تو [illegible] نہیں ہے۔ سانس بھی ٹھیک چل رہی ہے۔ پسینہ بھی [illegible] ہے۔ ۔ ۔ ۔ صبح کا منظر کتنا دل فریب ہے۔ تم نے ایک [illegible] تھی "سہانی صبح" یاد ہے۔

[illegible]۔ (جس کی حالت اب بہتر معلوم ہو رہی ہے) ہاں۔ [illegible] صبح" ۔ ۔ ۔ ۔ میں تم سے ایک بات پوچھنا چاہتی ہوں۔

[illegible] ایک بات۔

[illegible]۔ کیا ہے۔

[illegible]۔ یہ تو تم جانتے ہو کہ میں نے ہمیشہ تم پر اعتماد کیا۔ یہ اچھا تھا [illegible]۔ تمہارے اعتماد کی وجہ سے میں اپنی کمزوریوں سے مقابلہ [illegible] پر مجبور ہوا۔ اور بالآخر مجھے کامیابی ہوئی۔ یہ تمہارے اعتماد ہی کا نتیجہ ہے کہ ہماری زندگی اتنی پرکیف رہی۔

حمیدہ۔ اب مجھے اطمینان ہو گیا۔ اور میری موت بہت ہی پرسکون ہو گی۔

نصرت۔ تمہاری رفعت میری نظروں میں بہت زیادہ ہو گئی ہے۔ [illegible] اگر ایسے وقت میں نے تم کو کھو دیا تو یہ صدمہ ناقابل برداشت ہو گا۔ تم کو اچھا ہو جانا چاہئے۔ سمجھیں ۔ ۔ ۔ ۔ میرے خون میں برائی کے چند قطرات موجود ہیں۔ شادی کے بعد بہت سی عورتوں نے مجھے ورغلانے کی کوشش کی۔ اور بعض وقت مجھے یہ محسوس ہونے لگتا تھا کہ میں ان میں سے کسی کا ہو رہوں گا۔ لیکن میں نے مقابلہ کیا اور کامیاب ہوا۔ ہر کامیابی کے بعد میری محبت زیادہ استوار ہوتی گئی۔ مجھ میں جرأت پیدا ہوتی گئی۔ مجھ کو اپنی اس زندگی کا [illegible] افسوس نہیں ہے۔ ہماری زندگی ضایع نہیں ہوئی۔ ہم نے [illegible] و اتحاد کی اہمیت کو معلوم کر لیا۔

[illegible]۔ اب مجھے کوئی فکر نہیں ہے۔ اگر میں مر بھی گئی تو تمہارے دل میں تو یقیناً زندہ رہوں گی۔

نصرت۔ تمہاری یاد ہمیشہ میرے دل میں باقی رہے گی ۔ ۔ ۔ ۔

یاد کیوں۔ تم خود میرے ساتھ رہو گی۔

حمیدہ۔ زندگی اور موت انسان کے اختیار میں نہیں ہے ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ میرے پیر ٹھنڈے ہو گئے ہیں۔ ان پر گرم پانی کی بوتلیں رکھ دو۔

(وہ اپنی آنکھیں بند کر لیتی ہے۔ تنفس تیز ہو جاتا ہے۔)

نصرت۔ کلثوم۔ کلثوم ۔ ۔ ۔ ۔ (کلثوم بی داخل ہوتی ہے) گرم پانی لے آؤ۔ مگر ٹھیرو۔ جا کر شوفر سے کہو کہ موٹر لے جا کر فوراً ڈاکٹر صاحب کو لے آئے۔ پانی میں خود لے آؤں گا۔

کلثوم بی۔ مہ کار پانی گرم کرتا ہے۔

نصرت (حمیدہ کے پیر چھو کر) برف سے زیادہ سرد۔ ابھی وہ گرمی کی شکایت کر رہی تھی اور اب یہ عالم ہے۔ (کلثوم بی سے) دیکھو اگر کیتلی میں کچھ پانی ہو تو لے آؤ۔

کلثوم بی (جا کر کیتلی لاتی ہے) سرکار اس میں ذرا سا گرم پانی ہے۔

نصرت۔ (کیتلی لے کر دیکھتا ہے) اتنے سے پانی سے کیا ہو گا۔ جا نرس کو بھیج دے۔ (بوتل میں پانی بھرتا ہے۔ پھر اسے تولیہ میں لپیٹ کر پیر سینکتا ہے)

حمیدہ۔ ہٹو، ہٹو ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ دور ہٹو ۔ ۔ ۔ ۔ ہر چیز کو یہاں ۔ ۔ ۔ ۔ یہاں سے ہٹا دو۔

(نرس اور کلثوم بی داخل ہوتے ہیں۔)

نصرت۔ ان کی یہ حالت اور تمہارا پتہ نہیں (نرس حمیدہ کے قریب جاتی ہے) کلثوم گرم پانی کہاں ہے۔

کلثوم بی۔ ابھی لاتی ہوں سرکار (چلی جاتی ہے)

حمیدہ۔ ہر چیز ۔ ۔ ۔ ہر چیز ۔ ۔ ۔ ۔ کمرہ بالکل ۔ ۔ ۔ ۔ بالکل صاف ۔ ۔ ۔ ۔ کر دو۔ سب ۔ ۔ ۔ ۔ سب چیزیں ۔ ۔ ۔ ۔ ہٹا دو۔ (نصرت سامان ہٹانا شروع کرتا ہے۔ حمیدہ آنکھیں کھول کر دیکھتی ہے۔ اور اس کی نظر بچوں کی تصویر پر پڑتی ہے) وہ ادھر ۔ ۔ ۔ ۔ ادھر دیکھو ۔ ۔ ۔ ۔ اور تم ۔ ۔ ۔ ۔ صرف تم ۔ ۔ ۔ ۔ یہاں ٹھیرو ۔ ۔ ۔ اف ۔ ۔ ۔ ۔ اللہ ۔ ۔ ۔ ۔ کتنی سردی ۔ ۔ ۔ ۔ اللہ۔

نصرت - ابھی گرم پانی کی بوتلیں آ ہی جاتی ہیں۔ خاموش رہو تم کو آرام کی ضرورت ہے۔

حمیدہ - اور تم۔

نصرت - میں تمھارے پاس ٹھہرا رہوں گا۔ مطمئن رہو۔ (ڈاکٹر داخل ہوتا ہے۔ حمیدہ کو دیکھتا ہے اس کے بعد بہت ہی مدہم آواز میں نصرت سے)۔

ڈاکٹر۔ کیا آپ نے سب کو اطلاع دے دی تھی۔

نصرت۔ ہاں۔ وہ لوگ اب آتے ہی ہوں گے۔

ڈاکٹر۔ ایک گھنٹہ بھی اگر یہ زندہ رہیں تو غنیمت ہو جائے۔

نصرت - کاش وہ اتنی دیر زندہ رہیں کہ ان لوگوں کو دیکھ سکیں۔ ڈاکٹر صاحب آپ کوئی انجکشن نہیں دے سکتے؟

ڈاکٹر۔ کوشش کروں گا۔ مگر امید کم ہے نبض اکھڑ چکی ہے۔ (انجکشن دیتا ہے)

حمیدہ - بس .... صرف تم .... تم ہی ..... اکیلے ..... یہاں ٹھہرو۔

ڈاکٹر۔ میں باہر کے کمرہ میں ٹھہرتا ہوں۔

نصرت - مناسب ہے (ڈاکٹر چلا جاتا ہے نصرت حمیدہ کو دیکھنے لگتا ہے اس کی آنکھوں میں آنسو آجاتے ہیں)

...... اسٹیج پر تاریکی چھا جاتی ہے ...... پردہ گرتا ہے ....

چوتھا منظر

(اس منظر میں حمیدہ کا خواب دکھایا گیا ہے کمرہ وہی ہے جو دوسرے منظر میں تھا۔)

حمیدہ - میں اپنا کام ختم کر چکی۔ اب تم لوگ آجاؤ (بچے بھاگتے ہوئے آتے ہیں ہر ایک کو گود میں لے کر پیار کرتی ہے) تم سب بڑے اچھے بچے ہو۔

بڑا لڑکا - امی - ابا بھی نہیں آئے۔

حمیدہ - اب آتے ہی ہوں گے۔ جب تک تم کلثوم کے ساتھ کھیلو۔ مگر اندر ہی - باہر بہت سردی ہے (آواز دیتی ہے کلثوم (کلثوم بی داخل ہوتی ہے) دیکھو اگر باہر سردی نہ ہو باغ میں لے جاؤ۔

کلثوم بی - اچھا بیگم صاب (بچوں کو لی جاتی ہے۔ طالب علم داخل ہوتا ہے)

طالب علم ۲ - میں وہاں گیا تھا۔ وہ لوگ آپ کے بہت شکر

حمیدہ - اچھا ..... زاہد کا مزاج اب کیسا ہے۔

طالب علم ۲ - وہی حال ہے - نہ بیماری میں کمی ہوتی ہے وہ آرام کرتے ہیں۔ اس حالت میں بھی وہ دو دو بجے مطالعہ میں مصروف رہتے ہیں۔ کمزوری بڑھتی جا رہی کلاس میں لکچر دیتے دیتے بے ہوش ہو جاتے ہیں

حمیدہ - بیچارے کریں تو کیا کریں۔ بوڑھی ماں۔ بیوہ بہن ماں کے بچے سب کی پرورش انہی کے سر تو ہے۔ اگر وہ نوکری چھوڑ دیں تو ان کو کون سنبھالے۔

طالب علم ۲ - دنیا میں بہت سی چیزیں نا انصافی پر مبنی نظر حالانکہ ایسا نہیں ہے۔ خدا کو ان کا بہتر علم ہے۔ اس لحاظ ہمارے پروفیسر صاحب بڑے خوش قسمت ہیں۔

حمیدہ - تمھارا خیال بالکل صحیح ہے اور اس کے لیے ہم مشکور ہیں۔

طالب علم ۲ - پانچ سال قبل میں نے پروفیسر صاحب کو نہایت اب بھی جب کبھی مجھے اس کا خیال آجاتا ہے تو شرم سے پانی ہو جاتا ہوں۔ مگر ان کی شرافت دیکھیے کہ انھوں نے مجھے گھر میں پناہ دی۔ ان کو اس وقت اس کا بہت صدمہ ہوا تھا

حمیدہ - انھوں نے تو کوئی اثر نہیں لیا۔ البتہ مجھے تکلیف جس کی وجہ سے وہ بھی پریشان ہو گئے۔

طالب علم ۲ - مجھے الفاظ نہیں ملتے کہ میں اپنی ندامت کا اظ

حمیدہ - جو ہو گیا اس کا ذکر ہی کیا ہے۔ وہ ہم سب کے لئے

علم ۱۔ میں ان کی جرأت اور مستقل مزاجی کو کبھی فراموش نہ
ں گا۔

۔ اس سے تمھارا کیا مطلب ہے۔

علم ۱۔ جب ہم نے دوسرے طلبا کے پاس جاکر پروفیسر صاحب
تاری کی اطلاع دی تو ان کے شخصی آزادی والے نظریہ کو بعض
معنوں پر محمول کیا گیا۔ اس لیے ہم نے یہ تصفیہ کرکے کہ یہ چیز کالج
کے لیے مضرت رساں ہے ان کی توہین کی۔ پھر وہ اپنی جائداد سے
ستعفی ہوگئے۔ طلبہ کا اعتماد جاتا رہا۔ انھوں نے خیال کیا کہ پروفیسر صاحب
اپنی صفائی پیش کرنے سے قاصر ہیں۔ وہ صرف نظریے بیان کرنا جانتے
ہیں ان پر عمل کرنا نہیں جانتے۔ یہ ہماری سمجھ میں اب تک نہیں
آیا کہ انھوں نے اپنی صفائی کیوں پیش نہیں کی حالانکہ شہادت کی
کمزوری کی وجہ سے انہیں بے گناہ قرار دیا جا چکا تھا۔۔۔۔۔

کیا آپ کو سردی معلوم ہو رہی ہے۔

حمیدہ۔ ہاں۔ معلوم تو ہو رہی ہے۔ باہر نہ جانے بچے کس حال میں ہیں۔

طالب علم ۲۔ بچوں کو کبھی ہوا نقصان نہیں پہنچاتی۔۔۔۔ پھر
میرا ضمیر مجھے ملامت کرنے لگا اور میں ان سے ملنے حاضر ہوا۔

(نصرت اور بچے داخل ہوتے ہیں)

طالب علم ۱، ۲ } آپ آگئے۔

نصرت۔ باہر بلا کی سردی ہے۔ اور یہ میدان میں کھیل رہے ہیں۔

حمیدہ۔ کلثوم بی کہاں مر گئی۔

نصرت۔ وہ سردی سے اکڑی ہوئی کمرہ میں بیٹھی ہے۔

۔ میں نے اس سے کہا تھا کہ ان کے ساتھ رہے۔

نصرت۔ جاؤ تم سب کلثوم کے پاس جاؤ (بچے چلے جاتے ہیں)

علم ۲۔ (حمیدہ سے) جو کچھ میں آپ سے کہہ رہا تھا اس کے متعلق
پوچھ لیجیے۔

۔ کس چیز کے متعلق۔

طالب علم ۱۔ وہی آپ کا اقرار۔

نصرت۔ مندمل شدہ زخموں کو چھیڑنے سے کیا فائدہ۔

طالب علم ۲۔ پروفیسر صاحب

نصرت۔ مجھے اس طرح مخاطب نہ کرو۔ اب میں ایک معمولی تاجر ہوں۔

طالب علم ۱۔ کیا میں ان کو بتادوں کہ میں آپ کے پاس کیسے آیا۔ یہ
ابھی تک اس سے ناواقف ہیں۔

نصرت۔ عورت ہمیشہ کسی نہ کسی بات کی کھوج میں رہتی ہے۔ تم ان سے
باتیں کرکے ان کا دل بہلاؤ میں کچھ دیر پڑھنا چاہتا ہوں۔ (اپنی آرام
کرسی کی طرف جاتا ہے۔ حمیدہ اور طالب علم باتیں کرتے رہتے ہیں۔)

طالب علم ۱۔ میں فطرتاً صاف گو واقع ہوا ہوں۔ میں نے پروفیسر صاحب سے
دریافت کیا کہ انھوں نے اپنی صفائی کیوں پیش نہیں کی۔ اور جب انھوں نے
کہا کہ اس لئے کہ وہ صفائی پیش نہیں کرسکتے تھے تو میری حیرت کی کوئی
انتہا نہ رہی۔ مجھے بڑی مایوسی ہوئی میری امیدوں پر پانی پھر گیا۔ انھوں نے
میرے سامنے اقرار کیا کہ۔۔۔۔ میں آپ سے کن الفاظ میں بیان کروں۔
لیکن۔۔۔۔ خیر تو آپ سے شادی کرنے کے بعد انھوں نے دوسری
عورتوں سے محبت کی۔ ان میں سے ایک سے انہیں گہری محبت تھی۔
جس کا علم آپ کو بھی ہے۔۔۔۔۔ آخر کار ایک روز شوق انھیں
اس کے دروازے تک کھینچ لے گیا۔

حمیدہ۔ لیکن وہ اپنے نفس پر غالب آگئے۔

طالب علم ۲۔ جی ہاں۔

حمیدہ۔ ایسی صورت میں وہ اپنی صفائی بہتر طریقہ پر پیش کرسکتے تھے۔

طالب علم ۲۔ لیکن وہ سچے مسلمان ہیں خود کو گنہگار سمجھتے تھے۔

نصرت۔ یہ وجہ نہ تھی۔ تمھارے آنے سے پہلے کئی مرتبہ میں نے اپنے
نفس امارہ پر فتح پائی۔ لیکن برائی میرے دل سے کلیتاً زائل نہیں
ہوئی تھی۔ اس لئے مستقبل کے بارے میں مجھے خود پر اعتماد نہ تھا۔ میں
نہیں کہہ سکتا تھا کہ کس وقت مجھ سے لغزش ہوجائے گی۔ اس لئے مجھے
مجبوراً خاموش رہنا پڑا۔ میں نے اس لڑکے کو جو مدرسہ سے نکال دیا گیا تھا

اس لئے اپنے پاس بلا لیا کہ مجھے اس شخص سے ہمدردی تھی جو فطرتاً میری طرح کمزور تھا۔ میں نے خیال کیا کہ اس طرح اس کی مدد کر سکوں گا۔ مگر اس کی حالت بد سے بدتر ہوتی گئی۔

طالب علم ۱۔ بہرحال آپ کے طرز عمل نے میرے دل میں آپ کا وقار بڑھادیا۔ ممکن ہے اسے آپ خوشامد پر محمول کریں مگر حق یہ ہے کہ آپ قابل عزت انسان ہیں۔ شرافت و انسانیت کا قابل تقلید نمونہ۔ شرافت کا اس سے زیادہ اور کونسا ثبوت ہو سکتا ہے کہ آپ نے اپنے دشمنوں کو معاف کر دیا۔

نصرت۔ تم خواہ مخواہ خود کو میرا دشمن سمجھتے ہو۔ میں تو تم کو اپنا دوست سمجھتا ہوں اور جوں جوں وقت گزرتا جائے گا۔ ہماری دوستی استوار ہوتی جائے گی۔ (حمیدہ سے) اب تو تم سمجھ گئی ہوگی کہ میں نے کیوں صفائی پیش نہیں کی۔ طلبا کی بہتری کے لئے میں کالج سے مستعفی ہو گیا۔ کیوں کہ میں نے محسوس کیا کہ میرا وجود ان کے لئے خطرناک ہے۔

طالب علم ۱۔ آپ ایسی باتیں نہ کیجئے مجھے تکلیف ہوتی ہے۔۔۔۔ میرے لائق اگر کوئی کام ہو تو۔۔۔۔۔۔

نصرت۔ نہیں۔ شکریہ (طالب علم جانے لگتا ہے) دیکھو جاتے جاتے خطوط کا ذرا دیکھ لینا (طالب علم چلا جاتا ہے تھوڑی دیر بعد ایک خط لاکر نصرت کو دیتا ہے۔ نصرت اس خط کو دیکھ کر حمیدہ سے) تمہارے والد کا ہے (خط پڑھتے ہوئے) نہ جانے کتنی مرتبہ میں نے اپنے گھر کی فضا کو مکدر کر دیا۔ تم نے میری وجہ سے بہت تکلیف اٹھائی۔

حمیدہ۔ میں نے کوئی تکلیف نہیں اٹھائی۔

نصرت۔ تمام عورتوں کی طرح تمہارے دل میں بھی اعلیٰ زندگی کی خواہش ہوگی۔ مگر میں اس خواہش کو پورا نہ کر سکا۔ عورت چاہے کتنی ہی محبت کرنے والی کیوں نہ ہو کبھی کبھی مرد کے خلاف اس کے دل میں نفرت کا جذبہ پیدا ہوتا ہے۔ تم اس کلیہ سے مستثنیٰ نہیں ہو سکتیں۔ مگر تم نے اس پر غالب آنے کی انتہائی کوشش کی۔ (خط کا مضمون سناتا ہے) وہ کہتے ہیں آج کل یہاں بہت سردی ہے

پھول ٹھٹھر ٹھٹھر کر جھڑ چکے ہیں اور ہم بھی بڑھاپے کے میدان [illegible] تیز چلے جا رہے ہیں۔ (خط دیتے ہوئے) کیا تم نے انہیں [illegible] بھجوا دیا تھا۔

حمیدہ۔ (خط لے کر دیکھتے ہوئے) ہاں (وقفہ جس میں [illegible] پڑھتی ہے) تم نے یہ نوٹ دیکھا۔

نصرت۔ نہیں پڑھو کیا لکھا ہے۔

حمیدہ۔ لکھتے ہیں اب چونکہ میں بڑھا ہو گیا ہوں اس [illegible] لکھ کر تمہاری ماں کے پاس رکھا دیا ہے جب میں مر جاؤں [illegible] دونوں اسے دیکھنا۔

نصرت۔ کیا یہ خود انھوں نے لکھا ہے۔

حمیدہ۔ (کچھ سوچتے ہوئے) میں نے بھی اپنا وصیت [illegible]

نصرت۔ کیا دیوانی ہو گئی ہو۔

حمیدہ۔ کون جانتا ہے کہ کسے کب موت آ جائے گی۔

نصرت۔ خدا کے واسطے ایسی باتیں نہ کرو۔

حمیدہ۔ میں تم کو اپنی وصیت سناتی ہوں (جا کر [illegible] لے آتی ہے اور اسے کھول کر پڑھنا شروع کرتی ہے [illegible] خط لکھنا چاہتی ہوں۔ لیکن اگر میں اس وقت خط [illegible] ایسے خیالات و جذبات کا اظہار ہوگا جو تم کو صدمہ [illegible] اور میں نہیں چاہتی کہ میری وجہ سے تم کو کوئی صدمہ [illegible] اسے اپنی حد تک رہنے دوں تو اپنے دل پر ایک بار [illegible] ہوں۔ میں نے بہت غور کیا۔ لیکن کسی صحیح نتیجہ پر [illegible] اپنے خیالات کا اظہار اپنی ڈائری میں کر رہی ہوں [illegible] مرنے کے بعد تم اسے پڑھ لو۔۔۔۔۔ میری موت [illegible] اس قوت کو جسے تم رو رو کر بہانے والے ہو ان [illegible] کے لئے محفوظ رکھنا جنھیں میں اپنے پیچھے چھوڑ [illegible] موت میری طرف بڑھی چلی آ رہی ہے۔ شاید تم یقین [illegible] میں اس کے قدموں کی چاپ سن رہی ہوں۔ میں [illegible]

نرس

...ت ہر ایک کو آتی ہے۔ اس لئے مجھے اپنے مرنے کا کوئی غم نہیں
ہے۔ ہاں اگر مجھے افسوس ہے تو اس کا کہ میں نے زندگی میں کوئی
اچھا کام نہیں کیا۔ اگر رنج ہے تو اس کا کہ تمھیں ترقی کرتے نہ دیکھ
سکی۔ میرے مرنے کے بعد تم میرے بچوں کی نگہداشت کرنا۔ ان کی
طرف سے لاپروائی برت کر ان کو کمزور اور دائم المریض نہ بنا دینا۔
ان کو میری موت کا احساس نہ ہونے دینا۔ ان کے ننھے اور
معصوم دلوں کو دکھ نہ پہنچانا۔ میں تمھاری مشکور ہوں کہ تم نے
مجھے تعلیم دی۔ سیدھا راستہ بتایا اور مجھ سے محبت کی حالانکہ
میں اس کی اہل نہ تھی۔ میں خوش نصیب ہوں کہ مجھے تم جیسا شوہر
ملا۔ مجھے صرف تمھارا اور بچوں کا خیال ہے اور یہی خیال مجھے
رلاتا ہے (رونے لگتی ہے) اب میرا دل صاف ہو گیا۔ میں اس
قابل ہو گئی کہ جنت کا نظارہ کر سکوں۔

نصرت۔ تم کو کیا ہو گیا ہے کیا تم نے یہ سب کچھ اپنے ہوش و حواس
میں لکھا ہے۔

حمیدہ۔ ہماری جدائی کا وقت آگیا ہے۔ ہماری مسرتوں کا
دور ختم ہونے کو ہے۔

نصرت۔ میں تباہ ہو جاؤں گا۔ آہ میں کیا کروں۔

حمیدہ۔ نہ صرف ہماری مسرتیں بلکہ ہمارا خوش حال گھر، ہمارے
بچے۔ ہمارے دوست سب جا چکے ہیں۔ مجھے ان میں سے کوئی بھی
نظر نہیں آ رہا ہے۔ میں تنہائی محسوس کر رہی ہوں ناقابل بیان
تنہائی (دوڑ کر نصرت سے لپٹ جاتی ہے) میں تمھارے مضبوط
اور قوی بازوؤں میں سو جانا چاہتی ہوں ...... میں بچوں کو
دیکھنا چاہتی ہوں (بچے داخل ہوتے ہیں) کس بلا کی سردی لگ رہی ہے۔
آؤ۔ میرے پاس آؤ (بچوں کو گود میں لے لیتی ہے) ابھی میری زندگی
کی شمع جل رہی ہے۔ آؤ تمھارے کپڑے بدل دوں۔ تمھارے
بال برابر کر دوں ...... زندگی کا شعلہ آہستہ آہستہ مدھم ہوتا
جا رہا ہے۔ تاریکی بڑھتی جا رہی ہے۔ تم بچوں کو لے کر یہاں سے
چلے جاؤ۔

نصرت۔ تم بھی میرے ساتھ آؤ۔ میں تمھارے بغیر نہیں جا سکتا۔

حمیدہ۔ کاش میں آ سکتی (روتی ہے) جاؤ۔ چلے جاؤ۔ (جاتے ہیں)
سب لوگ چلے گئے (روتی رہتی ہے) آواز۔ زندگی کی شمع اب
بجھنے والی ہے تھوڑی دیر اور صبر کر۔

(اسٹیج پر تاریکی چھا جاتی ہے) "پردہ گرتا ہے"۔

پانچواں منظر

(وہی کمرہ جو پہلے منظر میں دکھایا گیا ہے۔ صبح کا وقت ہے نصرت
حمیدہ کے سرہانے بیٹھا جھکا ہوا اسے دیکھ رہا ہے۔ پائنتی کی
طرف ڈاکٹر اور نرس کھڑے باتیں کر رہے ہیں۔)

نصرت۔ ڈاکٹر صاحب۔ ڈاکٹر صاحب۔ ذرا ان کو دیکھیے۔
پتلیاں حرکت نہیں کر رہی ہیں (حمیدہ کا ہاتھ داہنے ہاتھ میں لیتے
ہوئے) نبض کا بھی پتہ نہیں چل رہا ہے۔

(ڈاکٹر نبض دیکھتا ہے۔ قلب کی حرکت محسوس کرنے کی کوشش کرتا ہے وہ
منہ سے کچھ نہیں کہتا مگر اس کا چہرہ صاف بتا رہا ہے کہ مریضہ کا خاتمہ
ہو گیا۔ کلثوم بی رونے لگتی ہے۔ نصرت انتہائی ضبط سے کام لیتا ہے پھر
بھی اس کی آنکھیں آب گوں ہو جاتی ہیں۔ پھر یکایک دیکھیے ڈاکٹر صاحب
وہ حرکت کر رہی ہیں۔ شاید ابھی وہ زندہ ہیں۔ پروردگار تو انھیں بچائے۔

ڈاکٹر۔ مجھے آپ کے ساتھ بہت ہمدردی ہے۔ مجھے یہ کہتے ہوئے دلی
صدمہ ہوتا ہے کہ وہ ابدی نیند سو رہی ہیں۔ اور اب کبھی حرکت نہ
کریں گی (گھڑی دیکھ کر) سات بجے ہیں۔

نرس۔ (گھڑی دیکھ کر) جی ہاں

ڈاکٹر۔ ممکن ہے آپ کو نرس کی ضرورت ہو اس لئے فی الحال یہ یہاں ٹھہریں گی۔
مگر مجھے اجازت دیجیے۔

نصرت۔ ڈاکٹر صاحب میں آپ کا مشکور ہوں آپ نے جان توڑ کوشش کی مگر
قضا و قدر کے سامنے آپ کی کچھ نہ چل سکی۔

ڈاکٹر۔ (جاتے ہوئے) میرے لائق اگر کوئی خدمت ہو تو ...؟

نصرت۔ جی نہیں، شکریہ۔ (ڈاکٹر چلا جاتا ہے نصرت حمیدہ کی طرف جس کو کلثوم بی چادر اڑھا رہی ہے۔ متوجہ ہوتا ہے۔ اس کے چہرہ کی طرف حسرت بھری نگاہ سے
دیکھتے دیکھتے [illegible] میں گر کر تھام لیتا ہے۔ (پردہ گرتا ہے)

محمد یحییٰ صدیقی

تعلیمی سفرِ یورپ

(ڈائری کے دو ورق)

یوم جمعہ ۱۸ جون سنہ ۱۹۳۷ء آج صبح ساڑھے آٹھ بجے جہاز مارسیلز پہنچا۔ نو بجے ناشتہ (بریک فسٹ) کے بعد ہم سب ساتھ جہاز پر سے اتر گئے۔ ہم نے چلتے ہوئے ملازمین "رانپور" کو انعام دیا۔ اسٹیشن پر قدم رکھتے ہی ہم نے اپنا پہلا فریضہ فرینچ روپیہ لیا اور خط ڈاک میں ڈالے۔ میں نے بھی ایک خط بذریعہ ہوائی ڈاک والدقبلہ مدظلہ کے نام بھیجا۔ اسٹیشن مارسیلز بہت وسیع مقام ہے۔ سیکڑوں ریلیں اور اسی طرح سمندر میں بیسیوں جہاز کھڑے رہتے ہیں۔ ہمارے لینے کے لئے دو گائیڈز آئی تھیں۔ انھوں نے از راہ عنایت ہم سے پوچھا بھی کیا آپ کے واسطے موٹریں منگوائی جائیں؟ ہم نے اس کی ضرورت نہیں سمجھی اور چہل قدمی کرتے ہوئے ریل تک چلے جائیں گے۔ لیکن جب آدھ گھنٹے تک چلنے کی نوبت آئی اور پیر شل ہو گئے تو خدا یاد آنے لگا۔ ہمارے ڈبوں کا علیحدہ انتظام ہو چکا تھا۔ ہمارا اسباب بھی ہمارے پاس ہی رکھا گیا۔ جنگل کا سماں مناظرِ قدرت سے مالا مال نہایت پر لطف نظر افروز ہو رہا تھا۔ اونچی اونچی پہاڑیاں تمام سبز پوش ہو رہی تھیں۔ جدھر دیکھو سرسبز و شاداب کھیتیاں۔ کہیں تر و تازہ پھل دار درخت نظر آتے تھے تو کہیں گھاس کٹا ہوا۔ اسٹرابری کے پودوں پر اور ہی عالم تھا۔ اکثر پہاڑیوں پر بھی زراعت کی گئی ہے دو رویہ سایہ دار بلند بالا سڈول و تناور درخت لگے ہوئے ہیں۔ دیہات کے مکانات نفیس چھوٹے چھوٹے بعض دو منزلہ اور تمام تر سفال پوش ہوتے ہیں۔ ہر ایک گھر میں پائین باغ ہوتا ہے یا کھیتی ہو رہی ہے۔ اس وقت ان کا موسم گرما ہے لیکن ایک پتہ بھی خشک دکھلائی نہیں دیتا۔

راستہ میں گائیڈ سے گفتگو ہوئی۔ بہت اچھی ملنسار خوش وضع لڑکی ہے۔ ہمارے خیر مقدم کے لئے جب پیرس سے روانہ ہوئی تو بیچاری نے رات کو سفر کیا تھا۔ کچھ تھکی ہوئی سی تھی لیکن نہایت خندہ روئی اور کشادہ پیشانی سے ہماری خدمت میں مصروف عمل تھی۔ میں نے اس کو حیدرآبادی دو چوڑیاں دیں اس کو بیحد پسند آئیں بہت خوش ہوئی اور کہا کہ پیرس چل کر میں آپ کو فرانس کی چوڑیاں اپنی یادگار دوں گی۔ میں نے اظہار تشکر کے ساتھ کہا اس کی ضرورت نہیں آپ کی مہربانیاں اور الطاف ہی کافی ہیں مجھ کو ہمیشہ یاد رہیں گی۔ ریل میں ہم نے دوپہر اور رات کا کھانا کھایا۔ انڈے، مرغی، ترکاری، مکھن روٹی پوڈنگ اور بھی گوشت تھا جو میرے کھانے کا نہیں تھا۔

چار بجے ہم کو مسز وتانے فرینچ مٹھائیاں اور عمدہ کیک دئے۔ یورپ کی ریلوں میں ایک لمبا سا برآمدہ ہوتا ہے جس کے ذریعہ تمام ریل کے مختلف ڈبوں میں جا سکتے ہیں۔

ساڑھے گیارہ بجے رات کو ہم پیرس پہنچے۔ صرف پاسپورٹ دکھلائے گئے۔ ہمارے سامان کا معائنہ نہیں کیا گیا۔ اور دو تین گائیڈ آگئی تھیں۔ انھوں نے ہم سب کو بسوں میں سوار کیا اور دار الاقامہ طالبات بین الاقوامی کی جانب روانہ کیا۔ نہایت عالی شان سات منزلہ مکان ہے۔ بالاترین منزل کی چھت پر سے عروس البلاد (پیرس) کا نظارہ نو واردوں کی

[illegible] کے سامنے ایک ایسا خوش نما و دلآویز سماں باندھ دیتا ہے جس سے عقل انسانی استعجاب، حیرت کے گرداب میں غوطہ زن [illegible] پرلطف احساسات کی جاذب ہو جاتی ہے۔ بالخصوص رات کا منظر قابل دید ہوتا ہے جب کہ رنگین روشنیوں سے تمام شہر بقعۂ نور [illegible] ہے۔ مجھ کو اکیلا کمرہ ملا اور خوب سجا سجایا۔ الماری ششدرہ۔ سنگار کی میز۔ لکھنے کی میز لیمپ و بستر وغیرہ ہر طرح سے آراستہ [illegible] سے متصل ایک چھوٹا سا حمام ہے۔ جس میں منہ دھونے کی بیسن۔ ٹب و صاف تولیہ ہر وقت رہتا ہے۔ کھانا ہم سب نیچے جاکر [illegible] ہال میں کھاتے ہیں۔ عجیب طریقہ ہے۔ اشیاء خوردنی تیار کرکے تمام میزوں پر چُن دیتے ہیں اور نوکرانیاں ہر ایک [illegible] پاس کھڑی رہتی ہیں۔ صفوں کی صفیں لوگوں کی ایک ہی دروازے سے داخل ہوتی ہیں اور یکے بعد دیگرے برابر قدم [illegible] اٹھا [illegible] ایک ہی قطار میں آگے بڑھے جاتے ہیں۔ ہر شخص پہلے ایک چھوٹی سی کشتی اٹھا لیتا ہے پھر رکابی کانٹا چمچہ چھری گلاس اس میں [illegible] رکھ لیتا ہے اور ایک سرے سے جو جو چیزیں پسند ہوتی ہیں لیتا چلا جاتا ہے اس کے بعد کسی ایک میز پر جاکر بیٹھ جاتا ہے۔ تمام ہال میں چھوٹی [illegible] میزیں لگی ہوتی ہیں ان پر پانی کے جگ اور نمک دان رکھے ہوتے ہیں۔ اور نوکرانیاں نگرانی کرتی رہتی ہیں۔ کسی چیز کی [illegible] تو لاکر دیتی ہیں۔ جہاز کے کھانوں سے یہاں کے کھانے یا یوں کہئے کہ تمام یورپ کے پکوانوں سے زیادہ لذیذ ہوتے ہیں۔

شنبہ ۱۱ر جون۔ آج دن بھر پیرس کے مشہور مقامات کی سیر کرتے رہے۔ سڑکیں کشادہ ہیں۔ جابجا مجسمے کھڑے ہوئے [illegible] تاریخی واقعات اور لازوال رفیع الشان ہستیوں کی یاد کو تازہ کروا رہے ہیں۔ ایک مقام پر جنگ عظیم کی یادگار میں ایک خوبصورت دروازہ اور کمان بنائی گئی ہے۔ لوگ پھولوں کے گلدستے لاتے ہیں اور وسطی چوکھٹے پر مقتولین کی یاد میں رکھ دیتے ہیں۔ سڑکوں کے دونوں جانب شان دار بلند عمارتیں ہیں۔ پھولوں اور ترکاریوں کی دکانیں دیکھ کر طبیعت خوش ہو جاتی ہے۔ گلدستے مختلف خوش نما شکلوں میں تیار کئے جاتے ہیں۔ ترکاریاں بھی نہایت صاف ستھری قرینے سے رکھی ہوتی ہیں۔ ہم نے پھولوں سے آراستہ ایک موٹر دیکھی جس پر رنگ برنگ کے پھولوں کے ہار اور حلقے۔ دروازوں، چھت اور پہیوں پر نصب کئے گئے تھے۔ بہت سی کلیسائیں دیکھیں۔ ان میں مجسمے رکھے ہیں اور تصویریں بھی ہیں۔ پان تھیون ایک نہایت خوبصورت عدیم النظیر مقام ہے۔ اس کے اونچے اونچے ستون ہیں اور گنبد بہت ہی بلند۔ اس کی دیواروں کو نازک اور لطیف گل کاری سے مزین کیا گیا ہے اور چھت پر [illegible] کاری کی گئی ہے۔ اس میں اکثر مشہور افراد و دلاوران قوم کی تصویریں اور مجسمے ہیں۔ جان آف آرک کی مختلف تصاویر کے توسط سے اس کے محیر العقول کارناموں کا مظاہرہ کیا گیا ہے۔ کسی زمانہ میں یہاں گرجا ہوا کرتی تھی۔ اب تو صرف متقدین کی یادگار بھی جاتی ہے۔ یہاں سے نکل کر ایک اور گرجا میں گئے جہاں ایک صندوق نما پیتل کا ڈبہ رکھا ہے جو سینٹ جینیون کا جنازہ سمجھا جاتا ہے۔ یہ ایک مشہور خاتون گذری ہیں جو لوگوں کے لئے دعائیں مانگتی تھیں جس کے اثر سے ان کے رنج و محن و بلیات و مصائب دفع ہو جاتے تھے اور نیز مریضوں کو شفا حاصل ہوتی تھی۔ اس جنازہ کے اطراف موم بتیاں سلگاتے ہیں اور زائرین میں سے [illegible] مرادیں مانگنی ہوتی ہیں اس کے قریب جاکر گھٹنوں کے بل بیٹھتا ہے سینہ پر صلیب کا اشارہ کرتا ہے۔ اور جنازہ کو [illegible] لگاکر دعائیں مانگتا ہے۔ تعجب ہوا کہ اب تک ان لوگوں کے دلوں میں مردہ پرستی باقی ہے اور جزو ایمان بنی ہوئی ہے۔ [illegible] بڑے موم بتیاں روشن کر رہے تھے اور مرادیں مانگ رہے تھے۔ ہم نے کارڈ اور تصویریں خریدیں اور اپنے قیام گاہ [illegible] واپس ہوئے۔ دوپہر کے کھانے کے بعد ڈرائنگ روم میں ایک لکچر کا انتظام کیا گیا۔ پروفیسر بوربون نے انگریزی میں

تقریر کی فرانس کے تعلیمی حالات سنائے اور کہا کہ یہاں تعلیم کے تین مدارج ہوتے ہیں یعنے ابتدائی۔ ثانوی و اعلیٰ یا عا

(۱) ابتدائی تعلیم مفت و جبری ہوتی ہے اور اس تعلیم کا سلسلہ چودہ سال کی عمر تک جاری رہتا ہے جس سے طالب علم

لکھنے پڑھنے میں کافی مہارت حاصل ہو جاتی ہے۔ عام تعلیم کے اس درجہ کو طے کرنے کا نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ ہر ایک طالب علم خوا

لڑکا ہو یا لڑکی ایک اچھے شہری کی حیثیت پیدا ہو جاتی ہے اور وہ عملی دنیا میں قدم رکھنے کے قابل ہو جاتے ہیں۔

(۲) اس کے بعد ثانوی تعلیم کا دور شروع ہوتا ہے جس کی تکمیل چھ یا سات سال کے عرصہ میں کی جاتی ہے اور صرف

طلبا کو میسر ہوتی ہے جو مرفہ الحال ہوں یا گورنمنٹ سے وظیفہ پاتے ہوں۔ ان کی تدریس میں یہ خیال رکھا جاتا ہے کہ عا

و تہذیب و شائستگی میں اضافہ ہو دنیا کے حالات سے باخبر رہیں۔ بین الاقوامی سیاسی معاملات کو بخوبی سمجھنے لگیں۔ ادب

ان میں ذوق پیدا کر دیا جاتا ہے۔ زبان ہائے لاطینی و یونانی کو ترجیح و اہمیت دی جاتی ہے۔ جغرافیہ سے زیادہ دلچسپی

(۳) اعلیٰ تعلیم کی تحصیل کے لئے پانچ یا چھ سال کی مدت قرار دی گئی ہے۔ اس عرصہ میں طالب علم کسی ایک مضمون کو

طور پر وضاحت کے ساتھ پڑھتا ہے اور نظر غائر کے ساتھ مطالعہ کرتا ہے اور ریسرچ کرتا ہے۔ مضامین ذیل عموماً لئے جا

قانون۔ طب۔ فلسفہ۔ سائنس۔ تاریخ۔ صنعت و حرفت وغیرہ۔ طالب علمی کے دور دوم و سوم میں طلبا کو اساتذہ کی صحبت

رکھا جاتا ہے تاکہ ان کی قربت سے طالب علموں کی سیرت کی تعمیر میں مدد ملے۔ اس موقع کو غنیمت سمجھ کر حتی الامکان اس

مستفید و مستفیض ہونے کی سعی کی جاتی ہے اور مدرسین کی حیات بالکل شاگردوں کی زندگی سے وابستہ رہتی ہے۔ پرو

بوربون نے کہا کہ انگریزی طریقۂ تعلیم میں اس قدر فراخ دلی سے کام نہیں لیا جاتا۔ ملک فرانس میں ۱۷ جامعات ہیں

تمام بڑے بڑے شہروں میں قائم کی گئی ہیں اور ۲۵ ہزار طلبا زیر تعلیم ہیں۔ ۱ فی صدی باہر کے ملکوں سے آئے ہو

ہیں۔ قانون کی طرف زیادہ مائل ہوتے ہیں اور سائنس سے دلبستگی بہت کم ہوتی ہے۔ لڑکیوں کا نصاب تعلیم علیحدہ رکھا

جاتا ہے۔ ان میں عام طور سے غیر زبانوں اور ادبیات کے سیکھنے کا شوق پایا جاتا ہے۔ تمام مدارس میں طالب علموں کی جسمانی

صحت کا زیادہ خیال رکھا جاتا ہے اور ان کا وقتاً فوقتاً طبی معائنہ کروایا جاتا ہے۔ پروفیسر بوربون کی تقریر کے اختتام پر

مسٹر دتا نے پروفیسر موصوف کا پرجوش الفاظ میں ہم سب کی جانب سے شکریہ ادا کیا۔ ہم کو مباحثے اور سوالات کے لئے

دیا گیا۔ میں نے جبری تعلیم کے متعلق دریافت کیا کہ غریب ملک میں کس طرح مروج ہو سکتی ہے۔ پروفیسر نے کہا یہ مسئلہ نہایت اہم اور

ہے اور مشکلات بیان کیں کہ لوگ رات کو اپنا وقت دینا پسند نہیں کریں گے۔ لہٰذا دن کا نصف حصہ ان کی تعلیم کے لئے مخصوص

کر دیا جائے اور نصف حصول معاش کے لئے۔ میں نے دل میں کہا ہندوستانیوں کی غفلت پسندیوں اور راحت طلبیوں سے تو

بھی کم امید کی جاتی ہے۔

شام کو ہم سب (آرٹ گیلری) تصویر خانہ دیکھنے کے ارادے سے باہر نکلے۔ راستہ میں ہم نے کتب خانہ دیکھا مطالعہ کے لئے نہایت

روشن اور ہوادار ہال بنا ہے۔ ہر شخص کو داخل ہوتے ہی ایک پرچہ دیا جاتا ہے۔ جس کتاب کی ضرورت ہو اس پر لکھ کر دیتے ہی کتاب مل

جاتی ہے اور وہ وہیں کسی میز پر بیٹھ کر لکھ پڑھ سکتا ہے اور جاتے وقت پرچہ مع کتاب کے واپس کر دیتا ہے۔ ہم سب جس وقت ان

میں داخل ہوئے ہیں تمام لوگ مطالعہ میں نگاہیں جمائے بیٹھے تھے۔ یک بیک سب کی نظریں ہماری طرف اٹھنے لگیں اور ایک آن میں ہم

آماجگاہ نظارہ بن گئے۔ کتابیں کھلی کی کھلی سامنے رکھی رہیں۔ ہم نے بھی احساس کیا کہ ان کا وقت ضائع ہو رہا ہے اور چپکے سے لوٹ گئے۔

جوگ فال یا آبشار جرسپا
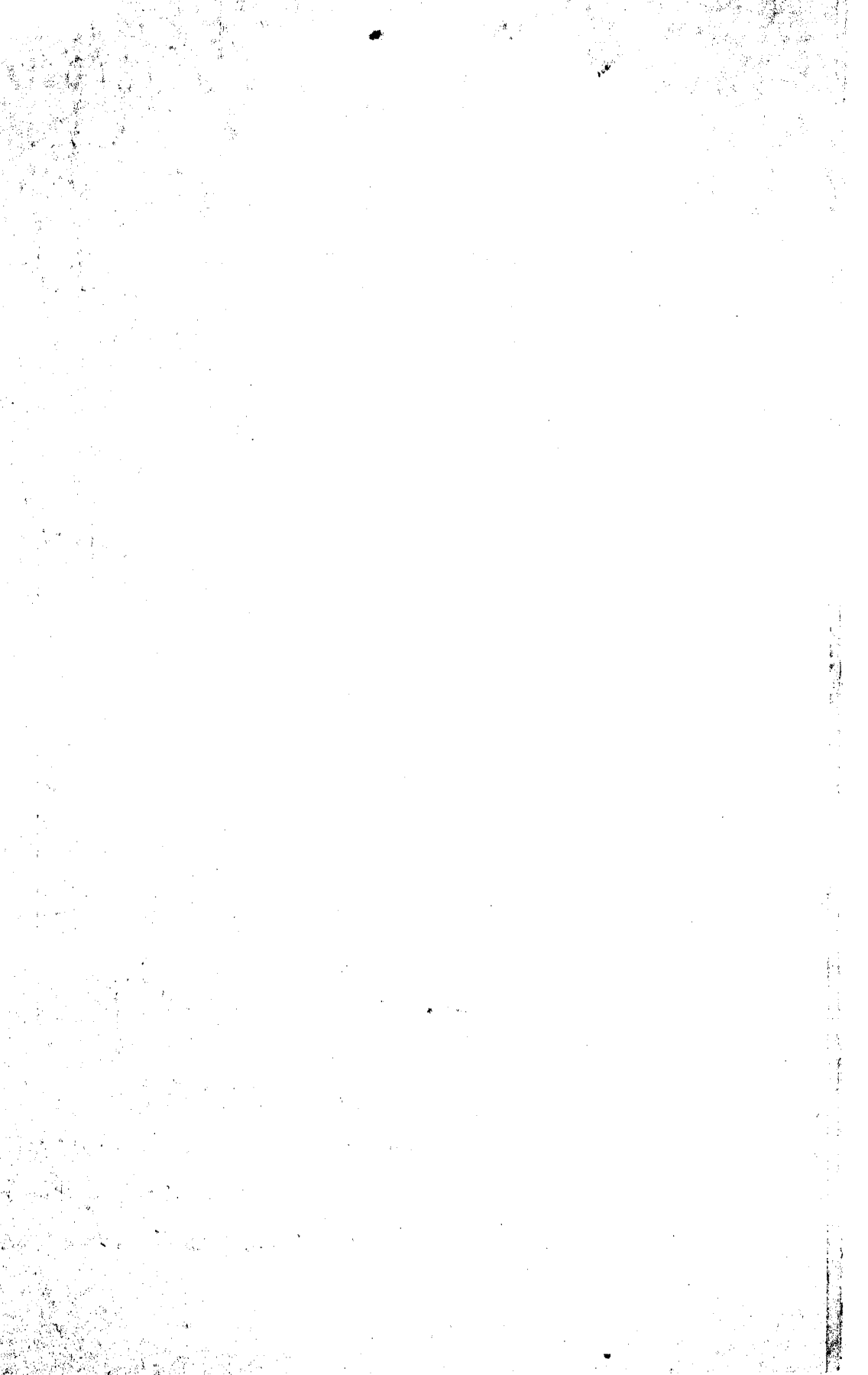
جوگ فال یا آبشار جرسپہ کی سیر

ہمارا ہمیشہ کا مقررہ پروگرام یہہ ہے کہ ہر دسمبر کی ۲۰ تاریخ کو آنے والے سال کی استقبالی تقریب میں حیدرآباد سے تقریباً چار میل فاصلہ تک سیر و سیاحت کو نکل جاتے ہیں اور مہینہ سوا مہینہ ادھر اُدھر ٹامک ٹوئیے مار کر پھر واپس چلے آتے ہیں۔
جانے سے قبل ریلوے گائڈ اور اسی قسم کے لٹریچر کا بڑے زور و شور سے مطالعہ کیا جاتا ہے اور ہر ممکنہ سہولت بہم پہنچا کر قابل دید مقامات کی سیر نہایت تفصیل سے کی جاتی ہے۔
مگر ۱۹۳۳ء کا آغاز کچھ عجیب و غریب انداز سے ہوا ہم حسب دستور قدیم اپنا بوریا بدھنا سنبھال اپنے دوست کے گھر پہنچے۔ وہاں ایک اور صاحب بھی تشریف فرما ہیں۔ ایک طرف کتابوں کا ڈھیر ہے دوسری طرف نقشوں کا انبار ہے اور وہ دونوں کے دونوں سر سے سر جوڑے مطالعہ میں غرق ہیں، اس قدر غرق کہ ہم کھٹ پٹ، کھٹ پٹ کرتے ہوئے اُن کے سروں پر پہنچ گئے، مگر کوئی یار دوست چونکا۔ تھوڑی دیر تک تو ہم کھڑے ہوئے ان کا تماشا دیکھتے رہے۔ مگر جب دیکھا کہ وہ تو کتاب کے کیڑوں کی طرح ورق پر ورق چاٹے ہی چلے جاتے ہیں تو ہم سے نہ رہا گیا۔ ہم نے جوش میں آکر کہا کہ "قبلہ آج ۲۰ تاریخ ہے اور آپ ہیں کہ اپنا ہی کھاتہ پھیلائے بیٹھے ہیں"۔
ہماری آواز سنتے ہی دونوں نے سر اٹھایا اور کہا کہ بھئی خوب آئے کہو اس سال کدھر کا پروگرام ہے؟ ہم نے کہا "آگرہ، دہلی اور کشمیر کا۔ کہنے لگے میاں آگرہ اور دہلی کو تو مارو گولی۔ اس سال تو جنوبی ہند کا سفر ہوگا۔ اور وہ بھی اس شان سے کہ اب تک کسی کے حاشیہ خیال میں بھی نہ آیا ہوگا۔
بات یہہ ہے کہ ریل کے ذریعے سفر کرنے سے ہم کو اہم اور قابل دید مقامات چھوڑنے پڑتے ہیں۔ اس لئے رائے یہہ قرار پائی ہے کہ اول موٹر سے سفر کریں۔ حیدرآباد سے روانہ ہوں، اول ہمنا آباد مقام رہے، اس کے بعد مرہٹہ ریاستیں، سانگلی، کولہاپور، مرج سے گور گوا میں فادر کرسمس کے ساتھ، کرسمس کی عید منا کر ملیبار چل دیں اور سمندر کے کنارے کنارے سفر کرتے ہوئے راس کماری میں اور وہاں بحر ہند میں اشنان کر کے علاقہ مدراس کے مشہور و معروف مندروں کا درشن کرتے ہوئے حیدرآباد آدھمکیں۔ ایک روز گھر میں آرام لیں اور دوسرے روز اپنے اپنے کاروبار سے جُٹ جائیں۔
ملیبار کا نام سن کر ہمارے کان کھڑے ہوئے اور اس سفر کی کیفیت پر غور کرتے کرتے ہماری آنکھیں بند ہو گئیں گویا ایک مراقبہ کی کیفیت سی ہم پر طاری ہو گئی۔ حافظہ کے محافظِ دفتر نے چھ چھ اور سات سات سو برس پیشتر کے سیاحوں کے لکھے ہوئے سفرناموں اور تاریخوں کا مواد ہمارے سامنے پیش کرنا شروع کر دیا، خیالات کا دریا موجزن ہوا اور ملیبار کے مناظر ہماری نظروں کے سامنے پھرنے لگے۔ کبھی سمندر موجیں مارتا ہوا دکھائی دیتا، کبھی مغربی گھاٹ کی سر بہ فلک چوٹیاں آسمان سے باتیں کرتی ہوئی دکھائی دیتیں، کبھی ایک سرسبز و شاداب جنگل نظر آنے لگتا جس میں انواع و اقسام کے نباتات، الائچی، جوز، جاوتری، دارچینی، سنکونا اور صندل وغیرہ کی خوشبو سے دماغ معطر ہو جاتا اور کبھی خود رَو پان کے منڈوے، سیاہ مرچ اور ناریل کے درختوں کی قطاریں نظر آنے لگتیں۔

اس وقت ہم نے اس بات پر غور کیا کہ جب سلیمان تاجر، مارکو پولو اور ابن بطوطہ جیسی ہستیاں جن کے پاس کوئی
کا انتظام نہیں تھا اور وہ کالے کوسوں سے سفر کرتے ہوئے خاص ملیبار دیکھنے کی غرض سے آئیں اور ہزار افسوس ہم
ہے کہ ہم ایک عدد موٹر کے مالک ہوتے پر بھی وہاں کا سفر نہیں کر رہے ہیں۔ ہم نے فوراً مراقبہ کی نیت توڑ کر سر اٹھایا اور
رائے بالکل ٹھیک ہے یہہ سفر نہایت لاجواب رہے گا۔ سچ تو یہہ ہے کہ آگرہ جاکر چاندنی رات میں تاج محل کے آگے جوتوں کی
پھاڑ پھاڑ کر دیکھنے سے کوئی فائدہ نہیں ہے یا جامع مسجد کے مناروں اور قطب مینار پر کھڑے ہو کر بادشاہی مقبروں کے معا
کوئی نتیجہ نہیں ہے۔ بہتر تو یہی ہے کہ قدرتی مناظر کا نظارہ کریں اور آج سے دو ہزار سال پیشتر کا تمدن دیکھ کر اپنی آنکھیں
پھر کیا تھا سفر کی تیاری شروع ہو گئی۔ حساب کرنے کے بعد معلوم ہوا کہ کل تین ہزار میل کا سفر ہے۔ موٹر کی تو کوئی
اس لئے کہ وہ بالکل نئی اور انشیورڈ تھی۔ رہے ہم تو خدا کے فضل سے ہمارا بھی بیمہ ہو چکا تھا۔ موٹر میں معہ ڈرائیور کل چھ آدمی
ان سب مسافروں کا ضروری سامان سفر مثلاً سفری پلنگ، کپڑوں کے ٹرنک، باورچی خانہ کا صندوق، ٹن پروویژن
دو تین تھرماسپ، پٹرول کے ڈبے، ٹائر ٹیوب، نقشہ جات، ضروری پارٹس، مطالعہ کی کتابیں، دوا درمن اور مرہم پٹی
اسی قبیل کا بہت کچھ سازوسامان تھا۔ اس تمام سامان کو بڑی محنت اور جانفشانی سے جما کر رسیوں سے کس دیا اور پھر
نظر ثانی کرنے موٹر کو سامنے سے دیکھا تو معلوم ہوا کہ وہ موٹر تو نہیں بلکہ قدیم زمانہ کا کوئی اللہ دیا جانور ہے۔ ہم دعوے سے کہتے
کوئی شخص اس عجیب و غریب شئے کو دیکھ کر کہہ دیتا کہ یہہ موٹر ہے، تو وہ موٹر ہم اسے انعام دے کر اپنا پورا پروگرام کینسل
بہر حال گجر دم تمام سازوسامان کے ساتھ جب یہ عجیب و غریب چیز پھنکار مار کر اپنی جگہ سے آگے بڑھی تو معلوم ہوا کہ گویا
کا محل ہوا میں اڑنے کے لئے زمین پر گھسٹتا چلا جا رہا ہے۔ اس شان و شوکت سے ہم روانہ ہوئے اور ہزاروں دلچسپیوں کا
ہوئے جب ملیبار کے حدود میں داخل ہوئے تو عجیب و غریب کیفیت طاری ہوی، جاڑے کا زمانہ ہے، دہلی اور لکھنو میں اس
سے دانت بج رہے ہیں، مگر ہماری یہہ کیفیت ہے کہ پسینے میں شرابور ہیں کوٹ اتار کر ایک طرف پھینک دیا ہے نیم آستینیں
ڈنگرا چڑھائے موٹر کے ہچکولوں میں کچالو کی طرح ملتے چلے جا رہے ہیں۔ جوں جوں خط سرطان کی قربت بڑھتی جاتی ہے، دھا
دھوپ میں حدت، گرمی میں شدت، پسینے میں اضافہ اور دماغ پر گرمی چڑھتی چلی جاتی ہے، یہاں کے مناظر، مقامی کیفیت
نائروں اور ٹوڈوں کے دلچسپ واقعات ہم انشاء اللہ پھر کسی موقعہ پر تفصیل سے عرض کریں گے۔ مگر اس وقت ہماری نظر
پُر فضا، پُر کیف اور پُر آب منظر کا نقشہ پھر رہا ہے جس کے خیال سے آنکھوں میں طراوت اور دل میں فرحت پیدا ہو جاتی ہے۔
سنئے اور لطف اٹھائیے ...... تو اس ہیئت کذائی سے ہم چلے جا رہے ہیں گھٹنے چڑھائے ہوئے۔ دیوانوں کی طرح گریبان
ہاتھ سے پنکھا جھلتے ہوئے اور دوسرے ہاتھ سے پسینا پونچھتے ہوئے کہ میسور کی سرحد سے گزر کر مغربی گھاٹ پر چڑھنے لگے۔
سی بدن میں پیدا ہوی اترے ہوئے کپڑے زیب تن ہونے لگے۔ تھوڑی دیر میں ہاتھ پاؤں اولے کی طرح ٹھنڈے اور
سُن ہو گئے۔ کبھی معلوم ہوتا تھا کہ چہرہ پر سے ناک غائب ہو گئی ہے، ناک ٹٹولنے کے لئے اندر سے ہاتھ نکالتے تو معلوم ہوتا کہ

تو ڈھائی ہزار فٹ سطح سمندر سے بلند اور کبھی ڈھائی ہزار فٹ نیچے دامن ہیں۔ راستہ کی کیفیت یہ کہ سمپولے کی
کے اطراف بل کھاتا ہوا چلا جا رہا ہے۔ موٹر کی یہہ کیفیت کہ ہوائی جہاز کی طرح ہوا سے باتیں کرتی چلی جا رہی ہے
ی سے نیچے دیکھو تو تمام میدان کفِ دست کی طرح دکھائی دے رہا ہے۔ ہم ہیں کہ پرندہ کی نگاہ سے پور منظر دیکھ رہے ہیں۔
ہمارے ساتھی کو باغبانی کا خبط تھا' درختوں کو دیکھ کر ان کا دل باغ باغ ہوا چلا جا رہا تھا کھڑکی سے منڈ با باہر نکالے برابر ٹٹولتے ہوئے
جاتے تھے تھوڑی دور چلے کہ انگلی باہر نکال شور مچانا شروع کر دیتے "ارے ٹھیرو" وہ دیکھو فرن کا سنگل ہے ایک دو نہیں ہزاروں
اور موٹر روک لی جاتی اور وہ اپنا سبّل پھاوڑا سنبھال کھدائی شروع کر دیتے۔ دس پانچ ٹوکرے فرن سے بھر پھر آگے چلتے تھوڑی
دور چلنے کے بعد پھر وہی آواز "ارے موٹر روکو' وہ دیکھو درختوں پر کیا خوبصورت آرکیڈ لٹک رہے ہیں" بقول شخصے "ایں ہم اندر
عاشقی بالائے غم ہائے دگر" پھر موٹر روک لی جاتی ہے اور یار لوگ بندروں کی طرح درختوں پر چڑھ ان کی تکّہ بوٹی شروع کر دیتے۔ وہاں
بھی دس بارہ ٹوکرے بھر پھر آگے روانہ ہو جاتے اور دوسرے روز وہ مالِ غنیمت کسی نزدیک کے اسٹیشن سے حیدرآباد روانہ کر دیا جاتا۔
غرض اس طرح رکتے رکاتے جھاڑ بندر کھیلتے سبّل پھاوڑے چلاتے برابر چلے جا رہے تھے۔ کبھی سپاری کا جنگل آتا تو آنکھوں یا
طراوت پیدا ہو جاتی۔ تاڑ جیسے لانبے لانبے درخت' سپید سپید تنے۔ بس معلوم ہوتا تھا کہ ہزاروں سپید پوش سبز عمامے باندھے کھڑے
ہیں کبھی صندل کا جنگل آ جاتا تو خوش بو سے دماغ معطر ہو جاتا اور کبھی ہرا بھرا خوش بو دار پھولوں سے لدا ہوا جنگل آ جاتا تو قلب میں
خنکی دوڑ جاتی تھی جنگل میں جو سڑک جا رہی تھی' اس کی عجیب کیفیت تھی بیند رہ بیس فٹ چوڑی' لال ایسی کہ بیر بہوٹی' صاف اس قدر
کہ گویا ابھی تیار ہوئی ہے۔ اس کے دونوں جانب درخت تھے' کوئی دو دو سو فٹ بلند' موٹے موٹے تنے' تنوں پر پھول دار بیلیں
دھی ہوئیں معلوم ہوتا تھا کہ گویا جنگل کی گل پوشی ہو رہی ہے۔ میلوں نکل گئے اور دھوپ کا بیج تک نہ ملا۔ خیال ہوتا تھا کہ جنت کے کسی
گوشے سے گزرتے ہوئے چلے جا رہے ہیں۔ بلندی پر سے دیکھو تو معلوم ہوتا تھا کہ سڑک نہیں صحرا کی مانگ ہے جس میں سیندور بھر دیا گیا ہے۔
نالی پہاڑوں کی کھوہوں میں پارے کی طرح بے قرار تھا۔ کہیں پہاڑوں کی چوٹی پر فوارہ کی شکل میں اچھل رہا ہے۔ کہیں نشیب میں ابل رہا ہے
چٹانوں کی شگافوں میں سے موتی کی طرح ڈھلک رہا ہے۔ جھرنے کی جھر جھر چشموں کی سائیں سائیں' پھولوں کی بھینی بھینی مہک اور
... کی چہک نے دیدہ و دل موہ لئے تھے۔

اتفاق سے ہمارے خیال میں اس وقت یہہ بات آئی کہ حیاتیات کے دو شعبے ہیں ایک نباتیات اور دوسرا حیوانیات۔ نباتیات
... علم کے لئے یہاں بہت کچھ ذخیرہ ہے مگر جن لوگوں کو حیوانیات سے دلچسپی ہے ان کے لئے یہاں کوئی مواد نہیں ہے۔ ابھی ہم یہ سوچ
رہے تھے کہ ہماری کار مڑی اور ہم نے دیکھا کہ کچھ دور فاصلہ پر حیوانیات کے شعبہ کا صدر یعنی ایک زبردست شیر کھڑا ہوا ہے۔ اس کی
دم ہماری طرف تھی اور منہ دوسرے جانب تھا اس لئے اس نے ہم کو باضابطہ آنکھوں سے تو نہیں دیکھا۔ مگر ہم شیر کو اس طرح دیکھ رہے
تھے کہ گویا وہ ہم کو ہی گھور رہا ہے۔ ہمیں اس کا علم نہیں کہ شیر نے ہمیں پھر مڑ کر دیکھا یا نہیں۔ اس لئے کہ ہم نے موٹر کی رفتار بہت تیز کر دی تھی
دوبارہ مڑ کر دیکھنا آدابِ جنگل کے خلاف سمجھا۔ یہہ ہم نہیں بتا سکتے کہ ہم سب یک بیک دم بخود کیوں ہو گئے تھے۔ یا تو ہماری سانس

خود بخود رک گئی تھی یا ہم نے جان بوجھ کر روک لی تھی۔ مگر جب ہم میں سے کوئی زور سے سانس لیتا تھا تو ہمیں یہہ خیال ہوتا تھا کہ
ٹپک رہے ہیں۔ بہت دور جانے کے بعد ہم نے مڑ کر دیکھا، مگر یا تو وہ حضرت راستہ بھٹک گئے یا ہم کو رذیل المخلوقات سمجھ کر چھوڑ دیا۔
خرگوش، ہرن، چیتل اور قسم قسم کے دوسرے اور جانور نظر آئے جو خود ہماری صورت دیکھ دیکھ کر بھاگ رہے تھے اب یہاں سے آگے
وہ اتار اس غضب کا تھا کہ ہم کوسوں آگے بڑھ گئے مگر پٹرول کے ٹینک سے ایک قطرہ بھی خرچ نہیں ہوا۔ حال یہہ ہے کہ موٹر خود بخود
چلی جارہی ہے نشیب بھی وہ نشیب کہ خدا جھوٹ نہ بلائے تو مسلسل چالیس میل تک ڈھال چلا گیا تھا۔ راستہ بھر "سر دے آن"
کے نقشوں پر تنقید ہوتی رہی۔ نقشہ کہتا تھا کہ جر سپا ۲۰۴۰ فٹ سطح سمندر سے اونچا ہے۔ ہم کہتے تھے کہ نقشہ جھوٹ کہتا ہے ہم تھوڑی
اگر یہی زمین کا ڈھال رہا تو دو سو فٹ سطح سمندر کے نیچے پہنچ جائیں گے۔ اسی ردو قدح میں شام ہوگئی۔ اتنے میں ایک موڑ آیا ہوا
تھا کہ دھائیں دھائیں کی آوازیں کانوں میں آنے لگیں پانی کے چشمے، ندیاں اور نالے جو ہمارے ساتھ ساتھ میل سے برابر بہتے ہوئے
آرہے تھے، وہ سب کے سب یہاں پہنچ کر شیوراتری ندی سے مل گئے۔ اس مقام پر شیوراتری بڑے آب و تاب سے بہہ رہی تھی
بھی چوڑا ہو گیا تھا روانی میں بھی تیزی آگئی تھی۔ جس طرف منہ اٹھاؤ لوگوں کا ایک ہجوم نظر آتا تھا۔ ان کے ہاتھوں میں قندیلیں
کی طرح چمک رہی تھیں، بون فائر کا عکس پانی میں عجیب لطف دے رہا تھا۔ غرض یہہ کہ ہم لوگ دور سے اس آتش بازی کا لطف
اٹھاتے ہوے ایک بلند مقام پر جا پہنچے۔ یہاں ایک نہایت خوبصورت مسافر بنگلہ ہے جو بمبئی پریسیڈنسی کے علاقہ میں ہے۔

شیوراتری ندی صوبہ بمبئی کے عظیم الشان وادیوں میں سے کودتی پھلانگتی میسور کے سرسبز اور گھنے جنگلوں کو سیراب کرتی
اس مقام پر پہنچ کر تقریباً دو سو پچاس فٹ چوڑی ہو جاتی ہے اور ۹۶۰ فٹ بلند پہاڑ کی چوٹی سے نیچے گرتی ہے۔

یوں تو ہندوستان میں کئی آبشار ہیں مگر سچ تو یہہ ہے کہ "دروغ برگردن راوی" ہندوستان تو رہا ایک طرف دنیا کے
معروف آبشار بھی اس کے مقابلہ میں آکر دبک جاتے ہیں۔ مثلاً کہتے ہیں کہ سیروسولی آبشار (Serosoli Fall) ۲۴۰۰ فٹ بلند
ایون سن آبشار (Evenson Fall) آلپ میں ۱۲۰۰ فٹ بلندی سے گر رہا ہے اور آروے آبشار (Arve Fall) ۱۰۰۰
جر سپہ بلندی میں ان سے کم ہے مگر مقدار آب جو اس میں بہہ رہا ہے وہ ان سب سے بہت زیادہ ہے۔

رہی نائیگرا آبشار (Neagera Fall) تو دنیا میں سب سے بڑی ہونے کے باوجود صرف ۱۶۴ فٹ بلند ہے مگر جر سپہ
بلندی میں اس سے چھ گنی زیادہ اونچی ہے۔ امریکہ، چین، جاپان اور دیگر ممالک کے سیاح دور دور سے اسے دیکھنے کے لئے آتے
اور رات کے دو دو بجے تک بیٹھے ہوے آتش بازی، بون فائر اور آبشار کے لطف اٹھاتے رہتے ہیں پانی کی مار سے یہاں
کٹ کر نعل کی طرح ہو گیا ہے۔ اگر مقابل میں کھڑے ہو کر دیکھو تو اس پر سے چار چادریں گرتی ہوئی دکھائی دیتی ہیں۔

سب سے بڑی چادر بالکل سامنے گرتی ہے، راجہ فال کے نام سے مشہور ہے۔ اس سے ذرا ہٹ کر ایک چادر پتھروں سے
ٹکراتی ہوئی نہایت جوش و خروش سے چٹانوں پر بہتی ہوئی راجہ فال سے مل جاتی ہے، اس کو روور (Roaver) کہتے ہیں۔ اس
نزدیک ہی تیسری آبشار ہے، اسے دیکھو تو معلوم ہوتا ہے کہ سپید رنگ کا انار چھوٹ رہا ہے۔ اس کا نام راکٹ (Rocket) ہے

دوسری آبشار سب سے علحدہ ایک غمگین عورت کی طرح، آبی چادر اوڑھے ہوئے زار و قطار روتی ہوئی دکھائی دیتی ہے اسی کو... ڈیم بلانش (DameBlauch) کہتے ہیں۔ ان چاروں کی کیفیت دور سے دیکھنے کے قابل ہے، پانی تو نظروں سے غائب ہو جاتا ہے صرف جھاگ اڑتے ہوئے دکھائی دیتے ہیں۔

یعنی بنگلہ سے وقت واحد میں صرف تین آبشار نظر آتے ہیں مگر پانی کے مقام کی بلندی، سرسبز وادی کی کیفیت اور ندی کی روانی تفصیل کے ساتھ نظارہ کی جا سکتی ہے۔ یہاں سے چار یا پانچ فرلانگ پر ایک اور مسافر خانہ ہے جو میسور بنگلہ کے نام سے مشہور ہے۔ ایمان کی بات تو یہ ہے کہ آبشار دیکھنے کا لطف بس یہیں سے آتا ہے۔ ایک طرف تو راجہ صاحب غوطہ مارتے ہوئے صاف دکھائی دیتے ہیں اور دوسری طرف ان کے شاگرد پیشہ قلابازیاں کھاتے اور شور و غل مچاتے ہوئے پوری طور پر نظر آتے ہیں۔ علی الصباح اٹھ کر آبشار کی کیفیت دیکھو تو عجیب و غریب ہوتی ہے، کانوں میں پانی کے گرنے کی دھائیں دھائیں آوازیں تو آتی رہتی ہیں مگر آبشاریں نظروں سے غائب ہو جاتی ہیں غور سے دیکھو تو دھوئیں کا ایک زبردست بادل نیچے سے اوپر تک چھایا ہوا ہوتا ہے۔ بس ایسا معلوم ہوتا ہے کہ ایک سپید دیو کھڑا ہوا ہے جس کے پاؤں وادی میں اور سر آسمان پر ہے۔ آفتاب کی تمازت سے جب نمی میں کمی ہونا شروع ہو جاتی ہے اور کہر چھٹ جاتی ہے تو بتدریج یہہ آبشاریں صاف نظر آنے لگتی ہیں۔ پھر دوپہر کے بعد سے تو ایک دوسرا لطف شروع ہو جاتا ہے۔ سورج کی شعاعیں آبشاروں پر پڑتی ہیں اور اس نعل دار وادی میں، ایک زبردست خوش رنگ قوس قزح (اندردھنش) نمودار ہو جاتی ہے۔

اس نعل دار وادی کے اندر جانے کے لئے، پہاڑ کو کاٹ کر ایک نہایت دل کش اور دل گداز راستہ بنایا ہے جو سانپ کی طرح بل کھاتا ہوا دامن کوہ تک چلا جاتا ہے۔ یہہ راستہ تقریباً تین میل لانبا ہے۔ ہمارے خیال میں معمولی چال سے ایک گھنٹے میں نیچے پہنچ سکتے ہیں۔ سب سے آخر میں ایک پلیٹ فارم سا بنا ہوا ہے یہہ ڈینجر سگنل ہے۔ اگر اس سے ذرا نیچے اترے تو گویا موت کے منہ میں گئے۔ چنانچہ یہی غلطی ہم سے اور ہمارے ایک ساتھی سے ہوئی اس پلیٹ فارم سے تقریباً ۶۰۰ فٹ فاصلہ پر آبشاریں گر رہی تھیں ہمیں بھی نزدیک سے جا کر دیکھنے کا شوق چرایا۔ پلیٹ فارم سے نیچے اترے تو دیکھا کہ مہین مہین پھوار چاروں جانب اڑ رہی ہے۔ تھوڑی دور جانے کے بعد دیکھا کہ ہم بھیگ کر چھوہا ہو گئے۔ معلوم ہوتا تھا کہ چاروں طرف مینہ برس رہا ہے۔ زمین اور پتھروں پر اس قدر کائی جمی ہوئی تھی کہ بعض اوقات ہم اپنی مرضی کے خلاف دو دو گز تک پھسلتے ہوئے چلے جاتے تھے۔ ذرا قدم اٹھایا اور پھسلے، ذرا قدم جمانے کی کوشش کی اور دھڑ سے نیچے آ رہے۔ اندر پانی کی آواز اس قدر تھی کہ کانوں کے پردے پھٹے جا رہے تھے اور پھوار اس شدت کی تھی کہ آنکھوں کے پردے تر بہ تر ہو گئے تھے ہم دونوں نزدیک تھے مگر افسوس کہ نہ تو ایک دوسرے کو دیکھ سکتا تھا اور نہ ایک دوسرے کی بات سن سکتا تھا۔ بہ دقت تمام ہم نے اس گرداب بلا سے نجات پائی اور توبہ کی کہ آئندہ سے آبشار تو دیکھیں گے مگر دور سے دیکھیں گے اور کبھی اس کے اندر نہیں جانے کی کوشش نہ کریں گے۔ باہر آنے کے بعد لوگوں نے ہم سے اندر کی کیفیت دریافت کی تو ہم نے کہا کہ ہم اندھوں کی طرح اندر گئے اور اندھوں کی طرح باہر نکلے اس لئے اندر کی نہ تو کوئی صحیح کیفیت دے سکتے اور نہ کوئی چشم دید واقعات بتا سکتے ہیں مگر یہہ ضرور کہہ سکتے ہیں کہ اگر ذرا آگے اور پھسل جاتے تو غالب کا یہہ مصرع ہم پر صادق آ جاتا کہ " نہ کہیں جنازہ اٹھتا نہ کہیں مزار ہوتا"

چوتھے روز با دلِ ناخواستہ ہم نے وہاں سے کوچ کیا۔ تھوڑی دور جانے کے بعد ہم نے پھر پلٹ کر آبشار پر نظر ڈالی تو دیکھا کہ دریا کی غیر فانی موجیں پہاڑ کی چوٹی پر سے مچل مچل کر نیچے گر رہی ہیں اور ہماری بے ثباتی پر قہقہے لگا لگا کر اونچے سروں میں یہ راگ سنا رہی ہیں کہ 'Men may come and men may go' But I go on for ever. بہر حال یہہ ایک اپنے منظر کا مختصر سا بیان ہے۔ ہمارے ملک کے علاوہ دنیا کے کسی اور حصہ میں ہوتا تو نہ صرف اس کو ہر درسی کتاب میں جگہ ملتی بلکہ اس کے اشتہارات سے در و دیوار چھپ جاتے اور ہر ایک گھر میں اس کی تصویریں لٹکی ہوئی دکھائی دیتیں۔

مرزا عصمت اللہ بیگ

کمالِ سلطانی

(تاریخ ٹیپو سلطان شہید کا ایک گمشدہ ورق)

فخرِ شاہانِ دکن، یعنی وہ ٹیپو سلطان
جس کے اقبال کا "میسور" میں چمکا کوکب

مرجعِ خلقِ خدا، مبدءِ الطاف و عطا
نعمتِ رب کی غرض، رحمتِ خالق کا سبب

جب ہوا تختِ "خداداد" پہ جلوہ آرا
"در دولت" ہوا پرنور جو از "سایۂ رب"

آستاں بوس کسی دن ہوا ایک افرنگی
اور طے کرتے ہوئے جملہ رسومات ادب

عرض کی میں نے سند لی ہے کئی شاہوں سے
ہر جگہ اپنی سواری کے دکھا کر کرتب

باریابی کا شرف آج مقدر سے ملا
دل سے نکلے گی نہ کیوں حسرتِ تحسینِ ادب

شہ ذی جاہ نے فرمایا یہہ سن کر ہاں ہاں
قدر جوہر کی تو شاہوں کا ہے فرضِ منصب

پھر دیا حکم کہ کل صبح ملو نزدِ حصار
جو ہے خاص اپنی سواری کا وہ لے کر مرکب

حسبِ ایما ادھر آیا وہ، ادھر سلطان نے
ہمعنانی کا شرف دے کے بڑھایا اشہب

جا کے ایک سمت کو لوٹ آئے تو شہ نے یہہ کہا
تم ابھی فن سواری میں ہو طفلِ مکتب

دیکھ لو کس کے سُمِ اسپ نے چھوڑا ہی نشان
کس کی آمد کا حریفوں کو ملے گا مطلب

پسِ تحقیق خجل ہو کے دیا اس نے جواب
ذات والا کو سزاوار ہیں یہ جنگ کے ڈھب

مہر کے سامنے ذرے کی حقیقت کیا ہے
شہسواری کا میں دعویٰ کروں شایاں یہ ہی کب؟

کہیں پایا نہ یہہ فن میں نے بہت چھانا ہے
پیرس و لندن و روم و حبش و مصر و حلب

علم تو علم ہنر کے بھی دھنی تھے ہم لوگ
آج کیا ہے کہ تہی دست ہیں اے وائے غضب

الراقم مشتاق قریشی

اسلام اور اقتصادیات

عرصے سے دنیا عام طور پر ایک معاشی بے چینی اور اضطراب میں مبتلا ہے اور ہر ملک ہر قوم کے ریفارمر ضرورتِ وقت کے تحت فلاح و بہبود کی نئی نئی راہیں نکالتے اور سمجھاتے ہیں اور ایک حد تک یہ مصلحانہ جد و جہد کامیاب بھی نظر آتی ہے لیکن بمصداق ؎

کبابِ سیخ ہیں ہم کروٹیں ہر سو بدلتے ہیں　　　جو جل اٹھتا ہے یہ پہلو تو وہ پہلو بدلتے ہیں

ہر دوسرا پہلو جلے بغیر نہیں رہ سکتا اس کی وجہ یہ ہے کہ ایک مرض کا علاج دوسرے اس سے زیادہ سخت مرض میں مبتلا کر کے کیا جاتا ہے مثلاً سرمایہ داری کا انسداد بالشویزم۔ گداگری کا تدارک امساک اس کشاکش زندگی اس جنگ زرگری میں اہل اسلام کی حالت بہت زیادہ سقیم ہو رہی ہے جس کا ایک بڑا سبب یہ ہے کہ وہ اپنے زرین اصول یعنی اسلامی تعلیمات سے بے نیاز ہو کر اک طائر گم کردہ آشیاں کی طرح ادھر ادھر بھٹک رہے ہیں اور اس حقیقت کو بھول گئے ہیں کہ ان کی ہر مشکل کا حل کلام پاک میں موجود ہے۔

اسلام نے پہلی مرتبہ دنیا کو "الدنیا مزرعتہ الاخرہ" کا پیام سنایا اور وہ ذرائع بتائے جس سے اس کھیتی کی آبیاری کی جا سکتی تھی —— تزکیۂ نفس اور اصلاح اخلاق کے ساتھ "کلوا من طیبات ما رزقکم و عملو" (پاک چیزیں جو تمہاری روزی بنائی گئی ہیں کھاؤ اور کام کرو) سے کسب معاش کی تعلیم دی۔ رہبانوں درویشوں کو "العبادہ سبعون جزاً وافضلہا طلب حلال (عبادت کے ستر جزو ہیں اور ان میں سے افضل ترین کسبِ حلال ہے) سے حکم دیا گیا کہ اکل حلال کی تلاش کرو اور اپنا بوجھ دوسروں پر مت ڈالو "یا عبدی حرک یدک" (اے میرے بندے اپنے ہاتھ کو حرکت دے) سے کاروبار میں مشغول ہونے اور السعی منی سے جد و جہد کرنے کی ہدایت فرمائی حسب ذیل ارشادات سے واضح ہو گا کہ اسلام نے حصولِ دولت کے کون کون سے طریقے بتائے ہیں:—

۱۔ جس کی ملک میں زمین ہو چاہئے کہ وہ اس میں زراعت کرے۔ ۲۔ اللہ تعالیٰ نے جب معیشت کے اسباب پیدا کئے تو کھیت اور بھیڑ بکریوں میں برکت دی۔ ۳۔ خدائے تعالیٰ اپنے بندہ کو کسب کی حالت میں دیکھنا پسند کرتا ہے۔ ۴۔ اللہ تعالیٰ مومن متحرک کو دوست رکھتا ہے ۵۔ آدمی کا اپنے ہاتھ سے کام کرنا افضل کسب ہے۔ ۶۔ تم زمین میں تجارت کے لئے پھیل جاؤ۔ ۷۔ دریا کو اس لئے تمہارے تابع کر دیا کہ تم اس کا فضل دریافت کرو۔ ۸۔ میری امت کے لئے دس حصوں میں سے نو حصے رزق تجارت میں ہے تاکہ مسلمان اپنے اپنے طبعی میلان کے مطابق جو فن چاہیں انتخاب اور جو پیشہ چاہیں اختیار کریں۔

چونکہ کسب سے معاش حاصل کرنا انسان میں صفات حسنہ اور جذبات عالیہ پیدا کرتا ہے مثلاً عزم و ہمت، خود داری و خود اعتمادی، ہمدردی و ایثار وغیرہ اس کے برعکس مفت خوری ان اوصاف کو زایل اور ان جذبات کو فنا کر دیتی ہے اس لئے جس طرح جائز طریقوں سے کسب معاش کی ترغیب دی ہے اسی طرح نہایت شد و مد کے ساتھ ناجائز ذرائع سے حصول زر کی ممانعت فرمائی ہے۔ جیسے، چوری، قزاقی، خیانت، غصب، حق تلفی، رشوت ستانی اور سود۔

مشہور گویّے تان سین نے سائنس کا بغور مطالعہ کرکے صرف ایک مت پر اکتفا کیا۔ اور وہ ہنومان مت ہے جو آج تک شمالی ہند میں پسند کیا جاتا ہے۔ تان سین نے نان کو ۹۲ سے گھٹاکر ۱۲ کردیا۔ درباری راگ سب سے پہلے عہد اکبری میں رائج ہوا اور اس وقت سے یہہ ذراما اور مندر کے راگ کے پہلو بہ پہلو ترقی کر رہا ہے۔ تان سین جیسے موسیقی داں کا رتبہ رکھنے والے بہت کم ہیں تاہم بعض ہندو نے ضرور کمال حاصل کیا جن میں داں اودے پور کی شہزادی، شاعر میرا بائی، ہندی رامائن کے مصنف تلسی داس اور بندرا کا مشہور ہیں۔ جنوبی ہند میں تیاگ راج مشہور گویّا اور شاعر تھا۔ تیاگ راج نے انیسویں صدی کے شروع میں بہت سے شاگرد بنائے جو اس وقت تک موجود ہیں۔ ہندی راگ یا راگنی کے قواعد بنانے والے جانتے تھے کہ بعض آوازیں بعض موسموں سے ہم آہنگ ہوجاتی ہیں اس لئے خاص راگ خاص موسموں میں گائے جانے لگے۔ اگر راگ ودیا کا ماہر کسی راگ یا راگنی کو مناسب وقت یا موسم میں الاپے تو سرور اور سکونِ قلب حاصل ہوتا ہے۔ راگ سے مریض تک اچھے ہوجاتے ہیں۔ اس لئے راگوں کے لحاظ سے دن کو سات حصوں میں تقسیم کیا گیا۔

۱ - ۶ بجے صبح سے ۹ بجے صبح تک .... ترانہ نرم خواب آور اور صاف۔

۲ - ۹ بجے صبح سے ۱۲ بجے دوپہر تک .... سب صفا۔

۳ - ۱۲ بجے دوپہر سے ۳ بجے تک .... سب تیز ہوجاتے ہیں۔

۴ - ۳ بجے سے ۶ بجے تک .... گا۔ ما۔ نی تیز اور ری۔ دھا۔ ہموار۔

۵ - ۶ بجے سے ۹ بجے رات تک .... زیر و بم پھر تیز ہوجاتے ہیں۔

۶ - آدھی رات سے ۳ بجے صبح تک .... ری اور پا تیز باقی ہموار۔

۷ - ۳ بجے سے ۶ بجے صبح تک .... ہموار تیز ہوجاتے ہیں۔

یہہ تو راگ راگنیوں کے لحاظ سے مخصوص وقت کی تقسیم تھی، تان سین کے رائج کردہ ہنومان مت کے مطابق چھ راگنیاں یہہ ہیں۔ بھیروں، ہنڈول، دیپک، سری، میگھ اور مالکونس۔ لیکن تان سین کی شہرت کا راز دھرپد میں تھا جو ایک نہایت ہی مشکل راگنی ہے جس کے سمجھنے اور گانے والے اب بھی رام پور میں موجود ہیں۔

خیال سلطان حسین جونپوری کی ایجاد ہے جس کی تکمیل سدا رنگ نے کی بریم کی راگنی عموماً خیال ہی میں گائی جاتی ہے۔ قوالی امیر خسرو کی ایجادیں ہیں جو مشہور سیاست داں، مغنی اور سلطان غیاث الدین بلبن کے درباری رکن تھے۔ امیر خسرو کے مخترع راگنیوں میں **جھیر**۔ جو غارا اور ایک فارسی راگ سے مرکب ہے۔ **سازگری**۔ پوربی۔ گورا، کنگلی اور ایک فارسی راگ سے مرکب ہے۔ **ایمن**۔ ہنڈول اور نیریز ہے۔ **عشاق**۔ سارنگ، بسنت اور نوا ہے۔ **موافق**۔ توڑی، مالڑی، دوگاہ و حسینی ہے۔ **غنم**۔ پوربی میں ذرا تغیر کردیا گیا ہے۔ **زیلف**۔ کھٹ راگ میں شہ ناز کو ملایا ہے **فرغنہ**۔ کنگلی اور گورا میں فرغانہ ملایا ہے۔ **سرپردہ**۔ سارنگ، بلاول، اور راست کو ترکیب دیا ہے۔ **باخرز**۔ دلیکارین، ایک ناری راگ ملایا ہے۔ فردوست یا پردوست۔ کانہڑ، گوری، پوربی، روا ایک ناری راگ سے مرکب ہے **قتم**۔ کلیان میں ایک فارسی راگ شامل ہے۔

چنانچہ قران السعدین میں بھی امیر خسرو کی اختراعات کا ذکر اس طرح کیا گیا ہے۔

زمزمۂ سازگری در عراق کردہ بہ گلبانگ، عراق اتفاق

راگ درپن میں لکھا ہے کہ ان راگوں میں سے سازگری، باخرز، عشاق اور موافق کی اختراع میں امیر خسرو نے انتہائی کمال دکھلائے ہیں۔ باقی راگوں میں یوں ہی ردوبدل کر کے دوسرے نام رکھ دئے ہیں۔

قوالی، ترانہ، نقش، نگار، بسیط، تلانہ، سوہلا یہہ خاص امیر خسرو کی ایجادیں ہیں۔ ان میں سے بعض راگوں کے نام ایسے ہیں جو ہندی میں موجود تھے لیکن امیر نے کچھ تصرف کر کے ان کا نام بدل دیا۔ اب راگ کی تقسیم کو لیجئے۔ راگ بھی اکثر دیوتاؤں کے نام سے منسوب ہیں۔ مثلاً شنکر، بھیرویں، سری، کدارا، بھیم، گوری، جے جینتی، کلیان، بلت، یوگ ایشوری درگاہ وغیرہ۔ اس کے علاوہ متعدد راگوں کے نام مقامی ہیں جن میں :-

پہاڑی، پوربی، ملتانی، بھوپالی، بندربی، سارنگ، گوڑ سارنگ، ٹوڈی، ملہار، تلنگ، بنگال، نیپال، دھناسری، سندھ، براری مارو، ایوا، مالوی، دیوگڑھی، ہمیر، جونپوری، کھمباوتی، سورٹھ، اور کانڑا وغیرہ وغیرہ ہیں۔

واضح ہو کے مالابار ساحل پر بارش کی کثرت ہے جس سے لفظ ملہار بنا ہے۔ تلنگانہ ایک ضلع ہے جس سے تلنگ بنا ہے۔ دھناسرم بھی ایک ضلع ہے جس سے دھناسری بنی ہے اور کھمبایت بھی ایک ضلع ہے جس سے کھمباوتی بنی اور دیوگڑھی کا نام اس وقت دولت آباد ہے۔ اس کے علاوہ بعض راگ اور راگنیاں ان لوگوں کے نام سے مشہور ہیں جنھوں نے ان میں نئی نئی شکلیں پیدا کیں اور ان اختراع کرنے والوں میں سب سے مشہور میاں تان سین گذرا ہے۔ فاکس ٹرینگوے صاحب (FoxTrangway) لکھتے ہیں کہ ہر چند میاں تان سین کی تعریف آئین اکبری میں بہت کی گئی ہے لیکن بقول ان کے ہندوؤں کی شکایت ہے کہ اس نے خالص ہندو راگ بہت خراب کر دئے۔

ہندوستانی موسیقی ایک دریائے بے پایاں ہے اس کا اس مختصر سے مضمون میں شرح و بسط کے ساتھ بیان کرنا صرف ناممکن ہی نہیں بلکہ دریا کو کوزے میں بند کرنا ہے۔ اس لئے فنی اور راگ راگنیوں کے سلسلے کو جو بیحد طویل اور دراز ہے نظر انداز کر کے موسیقی کے اثرات سے متعلق کچھ عرض کرنا چاہتا ہوں۔ اب تک تو ہمیں موسیقی کی ابتدا، اس کے پھیلاؤ اور اس کی بے انتہا راگ راگنیوں میں سے چند ہی راگنیوں کے نام جو کسی قدر مشہور ہیں معلوم ہوے۔ اب اس بات پر غور کرنا چاہئے کہ کس راگ یا راگنی سے کس وقت کس قسم کا اثر ہوتا ہے۔ یہہ تو معلوم ہے کہ مستقل راگ چھ ہیں۔ لیکن اب ان میں سے بھی ایک یعنی آخر الذکر (دیپک) متروک ہو گیا ہے اور باقیوں کی کیفیتیں یہہ ہیں :-

بھیرویں۔ یہہ مہادیو جی کی ہیبت ناک صورت میں دکھلایا گیا ہے۔ اور اس کا مدعا ہے کہ پو پھٹنے والی ہے، صبح کی آمد ہے، چڑیاں بولنے لگی ہیں، ہوا میں خوشبو آنے لگتی ہے اور صبح کا سہانا سماں پیش نظر ہے۔ یہہ مہادیو کے منہ سے نکلا ہے جس کا رخ جنوب کی طرف ہے۔

ہنڈول۔ کی شکل یہہ ہے کہ گویا کرشن ہنڈولے میں لیٹ رہا ہے اور شیو جی مہاراج عاشقانہ حالت میں دکھلائے گئے ہیں۔ ان کا رخ شمال کی طرف ہے۔

سری راگ۔ مہادیوجی کے سر سے نکلا ہے جس کا رخ مشرق کی جانب ہے۔ اور وہ شاہانہ لباس پہنے ہوئے ہاتھ میں کنول لئے ہوئے سنسار کو برکتوں اور بخششوں سے مالامال کر رہے ہیں۔

مالکونس۔ مالکونس کے متعلق یہہ کہا جاتا ہے کہ وہ پاربتی جی کی ایجاد ہے اور اس سے مراد جذبات کو حرکت دینا ہے۔ اس میں ایک ایسی طاقت ہے جو پتھر کو موم کر سکتی ہے۔

میگھ۔ اس میں شیوجی کا سر آسمان کی جانب ہے اور شکل ان کی سیاہ فام اور جسیم ہے۔ اس کے یہہ معنی ہیں کہ بادل کی سی مشابہت پیدا ہو گئی ہے۔ یہی راگ راگنیاں اپنے عادات، خصائل اور افعال کی رو سے انسانی قلوب پر چند اثرات چھوڑتی ہیں اور ان سب راگ راگنیوں کی تقسیم ہم اس طرح کر سکتے ہیں۔ وہ راگ جو دماغی و قلبی امراض میں موثر ثابت ہوئے ہوں۔ وہ راگ راگنیاں جن کے سننے سے روح لطیف تر ہو جاتی ہے اور آخر اپنی منزل مقصود پر پہونچ جاتی ہے۔ وہ راگ جس کے سننے سے دلوں میں جوش اور ولولہ پیدا ہوتا ہو۔ وہ راگ راگنیاں جن کے سننے سے دلوں میں ویراگ پیدا ہو اور بے ثباتی دنیا کا خیال کر کے خدا کی یاد میں محو ہو جائیں۔ وہ راگ جس کے سننے سے غم و اندوہ پیدا ہو۔

یہہ ہیں ہندوستانی موسیقی کی سحرکاریاں جن سے اہل خرد بھی بے اعتنائی کرتے ہیں۔ اور گانے کو حرام بتاتے ہیں لیکن ان کی طبیعت بھی جب مزے پر آتی ہے تو خلوت ہی میں بیٹھے بیٹھے ترنم کرنے لگتے ہیں۔ باوجود اس ذوق و شوق اور عام رجحان کے یہ دیکھ کر بڑی حیرت ہوتی ہے کہ ایسے ضروری اور اہم فن سے لوگ اس قدر بے اعتنا کیوں ہیں۔ حالانکہ "موسیقی فرشتوں کی زبان" "ٹوٹے ہوئے دل کی دوا" "ہوا کی شاعری" اور آسمان کی وہ چیز ہے جو زمین پر ہے اور (Confucious) کا لفسی کے قول کے مطابق وہ ملک مہذب کہلانے کا مستحق نہیں جس میں راگ کا چرچا وسیع نہ ہو۔

افضل عابدی وفا

غزل

لگائی علم و فراست کی دوربیں میں نے
مگر نہ پائی کہیں منزل یقیں میں نے

تمھیں تو یار نے ایک بار "ہاں" کہا ہی کلیم
ہزار بار سنی ہے وہی "نہیں" میں نے

مکین خانہ دل اب پتہ چلا تیرا
مرے ہی واسطے روندی تھی یہ زمیں میں نے

گل وفا کے عوض خار باد ہی پنپے
کس اشتیاق سے سینچی تھی یہہ زمیں میں نے

تجھے خبر ہو تو للّٰہ باغباں کہہ دے
کہ بو وفا کی تھی سونگھی یہیں کہیں میں نے

نہ زخم دل کو تو ان آنسوؤں سے دھو ہاشم
دفور اشک میں کھوئے کئی نگیں میں نے

ہاشم

اتحادی دیہی بنک

یہہ مضمون رزرو بنک آف انڈیا۔ اگریکلچرل کریڈٹ ڈپارٹمنٹ کے حالیہ بلیٹن کا ترجمہ ہے جسے مسٹر ابیگا ڈگرنے بنک کے ڈپٹی گورنر مسٹر ناناوتی کی شرکت سے مرتب کرکے مسٹر جے، بی، ٹیلر گورنر کے مقدمہ کے ساتھ شایع کیا ہے۔ "سب رس"

شعبہ قرضہ جات زرعی کے جانب سے شائع شدہ پہلے بلیٹن میں ایک تمثیلی اتحادی بنکنگ کا طریقۂ کار بیان کیا گیا تھا اتحادی اداروں کو کسانوں کی حالت سدھارنے کے مقصد میں کس طرح زیادہ سے زیادہ امکانی حد تک کامیابی ہوسکتی ہے گروہ اس کے طریقوں کے مطابق کسانوں کی زندگی کے ہر ممکنہ پہلو کو اپنے دائرۂ عمل میں داخل کرلیں، اور نہ صرف قرضوں کی فراہمی کی حد تک بلکہ ان تمام امور میں جن کی وجہہ سے کاشتکاری اس وقت غیر معاشی ہوگئی ہے اس کی مدد کی کوشش کریں۔ ہمارا دعویٰ یہہ نہیں ہے کہ یہہ ایک ایسی انوکھی تجویز ہے جو پہلے کسی کے ذہن میں نہیں آئی۔ دیہی تنظیم جدید کی ساری اسکیموں میں یہی اساسی خیال مسلمہ طور پر کارفرما ہے۔ یہاں تک کہ تحریک اتحادی میں بھی بلاشبہ یہی وہ نصب العین تھا جس کو اس تحریک کے علم برداروں نے اپنے سامنے رکھا۔ یہہ بہرحال نہیں کہا جاسکتا کہ تحریک اتحادی نے اس نصب العین کو مستقل طور پر اپنے پیش نظر رکھا یا یہہ کہ اس کو عملی جامہ پہنانے میں پیہم سعی کی۔ گذشتہ چند سال میں، خاص طور پر اس وقت جب کہ زراعت کو ایک بڑے نازک دور سے گذرنا پڑا، تحریک اتحادی کا رجحان اپنے پیدا کردہ فوری مسائل، قرضوں کی فراہمی اور ان سے نجات دلانے کی روزافزوں دھن میں لگے رہنے اور دیہی تنظیم جدید سے زیادہ سے زیادہ بے تعلق رکھنے کی طرف رہا ہے۔ یہاں تک کہ اب یہہ ایک ایسا کام سمجھا جارہا ہے جسے ایک جداگانہ جماعت کو انجام دینا چاہئے۔ اصل نصب العین پیچھے جاپڑا ہے۔ اس کے حاصل کرنے کے طریقوں کو یہہ کہہ کر مسترد کردیا جارہا ہے کہ وہ اس قدر تاخیر طلب ہیں کہ مزارعین کو کوئی فوری امداد نہیں دے سکتے۔ ادائی قرض اور ارزاں نرخ قرضوں کی فراہمی کا بڑا زور و شور ہے۔ فوری نتائج حاصل کرنے کی غرض سے کسی منتر کی تلاش نہایت جوش و خروش سے کی جارہی ہے۔ ایسی اسکیموں کا مطالبہ کیا جارہا ہے جو آن کی آن میں ساری صورت حال کو بدل دیں گی۔ جو لوگ اس کشمکش کے جنجال میں بری طرح پھنسے ہوئے ہیں ان کی بے چینی کو سمجھنا آسان ہے قرضوں کی شرح کی تخفیف، آسان اقساط کی منظوری، شرح سود کو گھٹانے کے لئے مہاجنوں کے کاروبار کو منضبط کرکے ان کی لوٹ کے انسداد کے لئے ایسے امدادی چارہائے کار، جو عملی سیاسیات کے دائرہ میں ہیں یقیناً اختیار کئے جانے چاہئیں۔ یہہ حقیقت کہ ان سے حالات صرف برائے نام سدھر سکتے ہیں نظروں کے سامنے سے ہٹ جانے کے خطرے میں ضرور ہے۔ بار بار یہی دہرانا پڑتا ہے کہ اس دیہی مسئلہ کے حل تک پہونچنے کا کوئی قریب تر راستہ نہیں یہہ ایک مشقت طلب اور کٹھن کام ہے۔ بایں ہمہ مایوس ہونے کی کوئی وجہہ نہیں اور اپنے مقصد کو پوری طرح سمجھ کر اس کے حصول کے لئے پیہم کوشش کی جائے تو بالآخر یہہ لازمی طور پر ممکن ہوجائے گا۔

اس قسم کی کوششوں کی اس سے زیادہ ضرورت کسی وقت بھی پیش نہیں آئی تھی۔ اس لئے یہہ محسوس کیا جارہا ہے کہ ان خیالات کی جنھیں پہلے بلیٹن میں قدرے اختصار کے ساتھ پیش کیا گیا تھا، مزید وضاحت مفید ہوگی۔ اس بلیٹن کا مقصد دیہی زندگی کے حالات کا زیادہ مکمل تجزیہ کرنا اور ایسے اصول پیش کرنا ہے جن پر دیہی آبادی اس طرح منظم کی جاسکے گی کہ وہ اپنے آپ کو اپنی موجودہ خستہ حالی سے نجات دلانے کے قابل ہوجائے، اور ہر طرح ترقی کے ذریعہ اس کی اساس کو کامیاب اور مستحکم بنایا جاسکے۔

اس مسئلہ کے دو پہلو

ہندوستان میں دیہی زندگی میں رکاوٹوں کے اسباب متعدد اور مختلف ہیں۔ ان کا ایک خاص پہلو غور کرنے والے کے میلان طبع اور مسئلہ کے اس پہلو کے ساتھ اس کے انہماک کے مطابق اہمیت حاصل کرتا ہے لیکن ہندوستانی کاشتکار کے لئے زراعت صرف ایک کاروبار نہیں بلکہ یہہ اس کی ساری کائنات ہے۔ اس کی زندگی کا ہر پہلو دوسرے پہلوؤں کو متاثر کرتا اور ان سے متاثر ہوتا ہے۔ اور ہر نقطہ پر ترقی ہی اس کی اصلی خوش حالی کے لئے ممد ہوسکتی ہے۔ اس کی معاشی خوش حالی، سماجی اور مذہبی رسم و رواج کے شکنجہ میں بری طرح جکڑی ہوی ہے۔ اس لئے ایک ایسے ادارہ کو جس کی اصل غایت کسان کی ساکھ میں اضافہ کرنا ہو، اس کی زندگی پر جو عناصر کارفرما ہیں، ان سب کی طرف توجہہ کرنی چاہئے اور ان کے ایک ... تصور پر مبنی ہونا چاہئے جنھیں دو اہم عنوانات میں تقسیم کیا جاسکتا ہے۔ (الف) معاشی (ب) عمرانی یا مذہبی۔

(الف) معاشی

معاشی حد تک کاشتکار کی مجبوریاں یہہ ہیں، جن کا علم عام ہے۔ اس کی اراضی کی جزوی، منتشر اور غیر معاشی نوعیت، قدیم طریقہ کاشت اور مجموعی زرعی ماحصل کی کمی، سود کی وہ تباہ کن شرحیں جن کے مطابق اسے قرضوں کی ادائی کرنی پڑتی ہے۔ ناجائز قبضہ اور دغا جس کا قدم قدم پر ارتکاب کیا جاتا ہے، جس کی وجہہ سے کسان اپنی محنت کے اس جزوی معاوضہ سے بھی محروم ہوجاتا ہے جو ممکن ہے بہ صورت دیگر اسے ملتا، ناخواندگی، جہالت اور تنظیم کی کمی جو اسے بہ آسانی ہر قسم کے استحصال کا شکار بنادیتی ہے مویشیوں کی اموات کی شرح کے بڑھے ہوے ہونے کی وجہہ سے لبا اوقات مویشیوں کے بدلنے پر مجبور ہوجانے سے وسائل آمدنی پر حد سے زیادہ بار حفظان صحت اور طبی امداد کی عدم موجودگی، اور خود کسان کی ناقص غذا جو انسانی ... کے اتلاف کا باعث ہوتی ہے۔

جس امر کو ہمیشہ مساوی طور پر تسلیم نہیں کیا جاتا وہ دیہی حالات میں ایسی اساسی تبدیلیاں ہیں جو زمانہ حال میں واقع ہوئی ہیں ملک میں امن و امان کے قیام، اور اس کے نتیجہ کے طور پر اراضی میں حقیقت کے تحفظ کے بعد مزارع نے اپنی ساکھ میں یکایک اضافہ محسوس کیا۔ جس کا نتیجہ یہہ ہوا کہ فضول اخراجات کے مواقع بڑھ گئے، اور وہ بری طرح قرض میں ڈوب گیا عدالتوں کے قیام نے بھی متضاد طور پر غیر محتاط اور بے درد مہاجنوں اور دوسرے بے ایمان افراد کے لئے جو کسانوں سے کاروبار کرتے ہیں، ان کی جہالت اور قانون کے ایسے قیاسات سے فائدہ اٹھانے کے لئے وسیع تر گنجائش پیدا کردی جو ان کی سمجھ سے باہر ہیں۔ علاوہ برایں دیہات کا سارا معاشی نظام بدل چکا ہے۔ پہلے گاؤں میں اس کی ساری ضروریات مہیا رہتی تھیں لیکن اب یہہ بات باقی نہیں رہی۔ روپیہ سارے لین دین کی اساس بن گیا ہے، اور کسان اپنی ساری ضروریات اگانے کی جگہ بیرونی بازاروں میں فروخت کی غرض سے نفع بخش اجناس

کاشت کی طرف مائل ہے، تاکہ اپنی دوسری ضروریات کی تکمیل کے لئے اسے نقد روپیہ مل سکے ۔ روپے کا استعمال ایسی مہارت اور احتیاط چاہتا ہے جو کسان میں نہیں پائی جاتی ۔ ایک دو اجناس پر بھروسہ کرنے کی وجہہ سے ان کے ناکام ہو جانے کی صورت میں کسان بے بس ہو جاتا ہے ایک ایک کرکے کسان نے اپنے دوسرے ذرایع آمدنی کھو دئے ہیں ۔ جہاں اس سے قبل غیر موسمی اوقات میں وہ اپنے بیلوں کو بنڈیوں میں جوتتا تھا، اب اس کی جگہ موٹر بس استعمال کرتا ہے ۔ کارکردگی اور رفتار میں اضافہ مفید تو ہے لیکن اس طرح کسان کے ہاتھ سے ایک کام چلا گیا جس کی جگہ اسے کوئی دوسرا کام نہیں مل سکا ۔ برخلاف اس کے اسے اس مقصد کے لئے اپنی زرعی آمدنی کا ایک حصہ صرف کرنا پڑتا ہے ۔ پہلے اس کی بیوی غلہ گھر میں پیس لیتی تھی ۔ اب آٹے کی گرنی کی وجہ سے اسے اس مشقت سے تو نجات مل گئی لیکن یہ بھی کوئی خالص رحمت نہیں اس لئے کہ کسان آٹا پسوانے کے لئے اب رقم صرف کرتا ہے ۔ درآں حالے کہ اس کی بیوی کو اس کی جگہ کوئی اور کام نہیں مل سکا ۔ یہہ صرف دو ایسی خصوصی مثالیں ہیں جو یوں ہی چن لی گئی ہیں، لیکن اجناس کی ہر قسم کی تیاری جو پہلے کسان اور اس کا خاندان گھر پر کرتا تھا، یا گاؤں کے دوسرے پیشہ ور فرقے انجام دیتے تھے، اب ایسے مراکز میں جو دیہات سے الگ ہیں کارخانے یا کرنیاں نسبتاً بہت بڑے پیمانہ پر انجام دے رہی ہیں ۔ اس طرح کہ کسان تمام دوسرے کاموں سے محروم ہو گیا ۔ اب اس کا کام صرف فصلیں پیدا کرنا اور انھیں کم سے کم نفع بخش اور ابتدائی شکل میں فروخت کرنا رہ گیا ہے ۔ مغربی ممالک میں صنعتی دور کے آغاز میں جو حالات پیش آئے تھے وہی اس وقت ہندوستان میں پیش آ رہے ہیں ۔ اس کے مطابق خود ملک کو بھی صنعتی نہیں بنایا گیا جس کی وجہ سے یہ تلافی کرنے والا فائدہ بھی مفقود ہے ۔ بجائے اس کے کہ صنعت زرعی آبادی کے اضافہ کو جذب کرنے، کل کی بنی ہوئی ارزاں اشیا کی وجہہ سے چھوٹی چھوٹی صنعتیں اور حرفے مفقود ہو گئے اور چھوٹے چھوٹے کاریگر کسب معاش کے لئے اراضی کی جانب ڈھکیل دئے گئے جس کا بار اراضی پر پڑا ۔ گذشتہ چالیس سال میں ہندوستان میں زراعت پیشہ آبادی میں ایک کروڑ اسی لاکھ کا اضافہ ہو گیا ۔ ۱۹۰۱ء میں زرعی آبادی ۹۰۹۵۵۴۹ تھی جو ۱۹۳۱ء میں ۱۰۹۷۳۰۷۸۸ ہو گئی ۔ معلوم ہوتا ہے کہ اس آبادی میں اور بھی اضافہ ہوتا لیکن انفلوئنزا کی وبا کی وجہہ سے جس سے معلوم ہوتا ہے کہ زرعی آبادی سب سے زیادہ بری طرح متاثر ہوی ۱۹۲۱ء میں ۱۹۱۱ء کے اعداد میں بہ مشکل کوئی اضافہ ہوا ۔ بہ حیثیت مجموعی دیہی آبادی میں ۱۹۲۱ء سے ۱۹۳۱ء تک دس سال میں تین کروڑ کا اضافہ ہوا یعنے ۲۸۳٫۰ ملین سے بڑھ کر ۳۱۵ ملین ہو گئی ۔ زیر کاشت رقبہ میں بھی حسب صراحت ذیل اضافہ ہوا :-

ہندوستانی ریاستیں ...... ۱۹۱۵ تا ۱۶ (۳۱۰۸۹) ...... ۱۹۳۳ تا ۳۴ (۷۵۱۳۶) برطانوی ہند ۲۵۴۴۱۲ - ۲۶۷۱۶۰ کل ہند ۲۵۸۴۹۸ - ۳۴۲۲۹۶

معلوم ہوگا کہ یہہ اضافہ ہندوستانی ریاستوں میں بہت نمایاں رہا ۔ برخلاف اس کے اس کی رفتار برطانوی ہند میں زرعی آبادی میں اضافہ کے مطابق نہیں رہی ۔ نہروں کی تعمیر کے قطع نظر جس کی وجہہ سے بعض ناقابل کاشت علاقے زیر کاشت آگئے ۔ برطانوی ہند میں اضافہ کا نتیجہ صرف کم سے کم فائدہ بخش اراضی کو زیر کاشت لانے کا باعث ہوتا اس لئے کہ زرخیز علاقوں کی آبادی پہلے ہی سے گنجان ہے ۔ اس وجہہ سے یہہ ضروری نہیں کہ رقبہ میں اضافہ زرعی پیداوار کی تعداد میں مساوی اضافہ ظاہر کرے ۔ زیر کاشت رقبہ میں اضافہ کی مناسبت سے آبادی اور زمین کی پیدا آوری میں اضافہ کا سارا موضوع دلچسپ ہے، جو تحقیقات کا طالب ہے ۔

زراعت کے بارے میں حکومت ہند نے جو اعداد شایع کئے ہیں ان میں ۔ بعض کی بنا پر جو اوپر درج کئے گئے ہیں یہہ نتیجہ نکالا
نہ ہوگا کہ زمین پر آبادی کا دباؤ بڑھ رہا ہے اور یہہ کہ آئندہ مشکلات کا شدید خطرہ ہے جب تک کہ جو لوگ زراعت میں لگے ہوئے ہیں
ان کی تعداد محدود نہ کردی جائے اور زمین کی پیداآوری میں اضافہ نہ کردیا جائے ۔

اس لئے معاشی نقطۂ نظر سے جو مسئلہ درپیش ہے وہ یہ ہے کہ پھر توازن قائم کیا جائے تاکہ کسان کے موازنہ کا گڑا ہوا توازن
ٹھیک ہوجائے ۔ اس کے یہہ معنے نہیں کہ گھڑی کے کانٹے پیچھے کی طرف گھما دئے جائیں ۔ بلکہ یہہ معنی ہیں کہ جدید حالات کی وجہہ سے جو
کمی پیدا ہوگئی ہے اس کو کسی دوسرے طریقہ پر پورا کردیا جائے ۔

(ب) سماجی اور مذہبی اوپر جن معاشی رکاوٹوں کا ذکر کیا گیا ہے ان کے علاوہ کسان کی زندگی کے سماجی اور مذہبی پہلو
اس کی معاشی خوش حالی پر اثر انداز ہوتے ہیں ۔ سماجی امور میں ذات پات کا فرق سب سے
بڑی رکاوٹ ہے ۔ اولاً تو یہہ نظام معاشی کارکردگی کو مختلف مدارج میں تقسیم کردیتا ہے ۔ اس کی وجہ سے اعلیٰ فرقوں میں ایک تم
برتری اور ادنےٰ فرقوں میں ایک ہم کمتری پیدا ہوجاتی ہے ۔ اور یہ دونوں چیزیں کامیاب کاشت کاری کے لئے مضر ہیں ۔ کسی برہمن
کاشت کار کی زمین عام طور پر ایک کنبی یا روایتی کسان کی زمین کی طرح پیداآور نہیں ہوتی ۔ اس لئے کہ برہمن عام طور پر نہ تو خود
ہل چلائے گا اور نہ خود محنت کرے گا ۔ اس کی عورتیں بھی کھیتوں میں کام نہیں کریں گی ۔ اس طرح اس کو اپنے خاندان سے وہ مدد
نہیں ملے گی جو ایک کنبی کو اپنے خاندان سے ملتی ہے ۔ دوسری طرف ادنےٰ فرقے اور قدیم دیسی ہیں جن کے راستہ میں کاشتکاری کے
مناسب طریقوں سے لاعلمی ، کاہلی ، غفلت اور مسکرات اور منشیات کے استعمال کی وجہہ سے رکاوٹیں پیدا ہوجاتی ہیں ۔ فرقہ واری
یا نسلی ذیلی تقسیمیں اس طرح کارکردگی میں اضافہ کے راستہ میں مستقل رکاوٹیں پیدا کرنے کی طرف مائل ہوتی ہیں اور معاشی اختلافات
ہمیشہ کے لئے قایم کردیتی ہیں ۔ ہر ایک فرقہ ایک کارندہ کی حیثیت سے کاشت کاری کی ایک جداگانہ صفت کی نمائندگی کرتا ہے ۔ یہہ
فرق گذشتہ زمانے میں اس قدر واضح طور پر تسلیم کیا جاتا تھا کہ گجرات میں تشخیص لگان کے قدیم "کوموارنی" نظام کے تحت ایک پٹہ دار
ایک ہی قسم کی زمین کے لئے جو ایک ہی موضع میں واقع ہو ایک "دھرالد" سے زیادہ لگان ادا کرتا تھا ۔ اس طرح سماجی نقطۂ نظر سے
ایک مسئلہ یہہ ہے کہ عدم مساوات دور کردی جائے اور ادنےٰ ترین درجہ سے تعلق رکھنے والے کاشت کار کی اس طرح مدد کی جائے
کہ وہ اعلیٰ درجہ کو پہونچ جائے ۔ دوسرے یہہ کہ فرقہ واری رسم ورواج میں تعدد ازدواج اور گونت بیاہ اور تقریبی اخراجات کے بارے میں
ناقابل تغیر اصولوں کی طرح جن کی نشو ونما اس زمانہ میں ہوئی جب کہ حالات بالکل جداگانہ تھے اور زندگی گاؤں تک محدود ، زیادہ آسان
اور سادہ تھی ، بدلے ہوئے حالات کے مطابق تبدیلی نہیں ہوئی ۔ سماجی اصلاحات دیہات تک نہیں پہونچے ، اور خاص کر سماج کا ادنےٰ
طبقہ وہی پرانی لکیر کا فقیر ہے ۔ تا وقتیکہ فرقوں کے لیڈروں کی تعلیم کے ذریعے یا کم از کم قانون سازی کے ذریعے رائے عامہ پیدا کرکے
ان رسوم ورواج کی ترمیم نہ کی جاسکے اور مفلس تر طبقوں کو اس بارے سے نجات نہ دلائی جائے کسی مستقل معاشی ترقی کی کوئی امید
نہیں کی جاسکتی ۔

۵ - مذہب ایک اعلیٰ ترہستی پر اعتقاد کے مفہوم میں دیہات میں رائج ہے لیکن اس کی روشنی دھیمی پڑگئی ہے جو مشکل سے دہقان کی زندگی کو بلند کرنے اور سنوارنے کے مقصد میں معاون ہو سکتی ہے۔ جو مذہب دیہاتوں تک پہونچا ہے وہ مُلّاؤں کے ذریعے پہونچا ہے اور رسم و رواج کے ساتھ مل کر مذہب کی ایک بھدی نقل کی صورت اختیار کر لیتا ہے۔ بہت بڑی حد تک یہہ توہمات کا ایک مجموعہ ہو جاتا ہے جو بہت خطرناک معاشی رکاوٹیں ثابت ہو رہے ہیں۔ مثال کے طور پر مذہبی تقاریب اور بچوں کی پیدائش، شادی بیاہ اور تجہیز و تکفین کے موقع پر فضول خرچی کو پیش کیا جا سکتا ہے، جو ایسی صورتوں میں بھی کی جاتی ہے جب کہ رقم صرف سود کی تباہ کرنے والی شرحوں پر حاصل کی جا سکتی ہو، جس کے نتیجہ کے طور پر بسا اوقات قرض لینے والے اور اس کے جانشینوں کا پورا مستقبل تاریک ہو جاتا ہے اور جس سے املاک کے نقصان اور مفلوک الحالی کے لئے راستہ صاف ہو جاتا ہے۔ کوئی فرد اگر اس فعل کی نامعقولیت کو محسوس بھی کرے تو اس کے لئے رائے عامہ کا مقابلہ مشکل ہو جاتا ہے۔ ایک باغبان کا حسب ذیل قصہ جو ایک افسر کے یہاں ملازم تھا، ایسی ہی نوعیت رکھتا ہے۔ اس باغبان کی بیوی بری طرح علیل ہو گئی تو ڈاکٹر نے اسپتال میں اس کے علاج کا انتظام کیا۔ جب وہ وہاں بتدریج صحت یاب ہو رہی تھی، باغبان نے اپنے مالک سے کچھ روپے قرض لئے اور چند روز تک غائب رہا واپسی پر جب اس سے غیر حاضری کی وجہ دریافت کی گئی تو اس نے کہا کہ اس کی ذات والے سر ہو گئے تھے کہ دیوتاؤں کو منانا اور اپنی ذات والوں کی ضیافت کرنا ہی اس کی بیوی کے صحت یاب ہونے کا واحد ذریعہ ہے۔ اپنی بیوی کی جان بچانے کی طرف سے وہ جو بے توجہی برت رہا تھا اس کے متعلق ان کی طعن و تشنیع سے مجروح ہو کر اپنے مالک سے لی ہوئی رقم کے علاوہ اس نے اپنی دو بھینسیں فروخت کر دیں اور ان کی قیمت سے چند بکریاں خریدیں جو مقامی دیوی کی بھینٹ چڑھائی گئیں، اور ذات والوں کی تواضع گوشت اور شراب سے کی گئی۔ یہہ شخص عادتاً کفایت شعار اور محتاط تھا لیکن سماجی بے رحمی کا شکار ہو کر اسے ایک قیمتی وسیلۂ آمدنی سے ہاتھ دھونا پڑا اور وہ مقروض ہو گیا۔ دیہی زندگی سدھر نہیں سکتی جب تک کہ یہہ توہمات اور مضرت رساں رسوم جو اکثر معاشی تباہی کا باعث ہوتی ہیں ختم نہ کر دیا جائے اور جب تک گاؤں والوں کے خیالات نہ بدل دئے جائیں اور ان میں روشنی نہ پھیلائی جائے۔

تمام پہلوؤں پر ایک نظر

۶ - یہہ کسی طرح دیہی حالات کا کوئی بسیط تبصرہ نہیں ہے۔ ذرائع رسل و رسائل، آب رسانی رہائش، حفظان صحت، چراگاہوں تک رسائی، ایندھن وغیرہ کے خصوص میں بیشتر دیہات کی صورت حال ہرگز تشفی بخش نہیں، اور اس کو بہتر بنایا جا سکتا ہے۔ ان رکاوٹوں کے علاوہ ہر گاؤں اپنے مقامی مسائل رکھتا ہے جن کا انکشاف صبر کے ساتھ مقامی تحقیقات کرنے سے ہو سکتا ہے۔ دیہی مسائل کے تمام پہلوؤں پر اس قدر سرسری نظر ڈالنے کے بعد اصل احساس ممکن ہو جاتا ہے کہ اس کا کوئی آسان اور فوری حل دریافت کرنے کی کوشش کس قدر فضول ہے۔ یہہ بھی صاف ظاہر ہے کہ یہہ توقع کرنا کس قدر فضول ہے کہ اگر حالات کو ان کے دھارے پر چھوڑ دیا جائے تو زمانے کی رفتار اور نئے نئے خیالات کے رواج سے وہ خود بخود سدھر جائیں گے۔ ساتھ ہی ساتھ اس مسئلہ کی وسعت سے گھبرانے یا کسی شکست خوردہ اور مجہول رویہ کے اختیار کرنے کی ضرورت نہیں۔

اس مسئلہ کی کامل وسعت کا احساس ہونا چاہئے اور اس امر کا احساس بھی ہونا چاہئے کہ اس کے لئے کوئی فوری بنا بنایا علاج نہیں بلکہ اس کے برخلاف ایک ہمہ گیر نظام عمل مرتب کیا جانا چاہئے ۔ اور چاہے طریقۂ کار کیسا ہی سست کیوں نہ ہو، جو نتیجے حاصل کرنے ہیں ان کے پیش نظر اس اصول پر عمل کرنا چاہئے ۔

دو اہم لحاظات

۷ ۔ اس مسئلہ کا یہ تجزیہ واضح طور پر دو اہم امور کی طرف اشارہ کرتا ہے جنھیں اس کا حل دریافت کرنے کی کوشش کے دوران میں ذہن میں رکھنا پڑے گا ۔ اولاً یہ مسئلہ اس قدر وسیع ہے کہ اس کے سارے پہلوؤں کو بہ یک وقت حل نہیں کیا جاسکتا ۔ برخلاف اس کے اگر ہر گاؤں میں ایک علحدہ عمل کے لئے اس مسئلہ کے صرف چند پہلو لئے جائیں تو اس سے تشفی بخش نتائج کے حاصل ہونے کا قرینہ نہیں ۔ اس مسئلہ کا ایک پائدار حل دریافت کرنے کی غرض سے اس کے ہر پہلو پر بہ یک وقت حملہ کرنا چاہئے ۔ لہٰذا یہ نتیجہ نکلتا ہے کہ اگرچہ متعدد دیہات امداد کے مساوی حاجتمند ہوں، اس مہم کا واحد امکانی طریقہ یہ ہوگا کہ پورے اور کارگر عمل کے لئے چند مقامات چن لئے جائیں ۔ دوسرے یہ کہ اس مہم میں دیہات کے لیڈروں کا تعاون حاصل کرکے غنیم کے علاقے میں جنگ کرنی چاہئے ۔ یا یوں کہئے کہ موجودہ حالات کو بدلنے کے لئے خود دیہاتیوں کا ایک ادارہ ہونا چاہئے ۔ جس چیز کی ضرورت فی الحقیقت ہے وہ لوگوں کی ساری نفسیات، ان کے طریق تخیل اور طریق زندگی میں تبدیلی ہے اور یہ مقصد محض بیرونی دباؤ سے حاصل نہیں ہوسکتا ۔ صرف اسی وقت جب کہ خود لوگوں کو کسی تبدیلی کے فائدوں کا یقین ہوجائے کوئی مستقل نتائج حاصل کئے جاسکتے ہیں ۔ اور اس غرض سے پروگرام کو بروئے عمل لانے کے لئے ایک مقامی ادارہ ناگزیر ہے اس قسم کے کسی ادارہ کی نوعیت پر غور و خوض شروع کرنے سے قبل اُن سمتوں کی وضاحت ضروری ہے جن میں باہر سے مدد اور رہبری کی جانی چاہئے تاکہ مقامی ادارہ تشفی بخش طریقہ پر کام کرنے کے قابل ہوجائے ۔

ایک مرکزی ایجنسی

۸ ۔ بیشتر صوبوں میں دیہات کے حالات کی تحقیقات کرنے اور ایسے چارہائے کار کے رواج کے لئے مرکزی ایجنسی کی کمی ہے جس کا مقصد ترقی ہو ۔ انفرادی طلبا، معاشی اور عمرانی مسائل پر جو تحقیقات کرتے ہیں وہ ضائع ہوجاتی ہیں، اس لئے کہ ان نتائج اور علاجوں کو جو وہ پیش کرتے ہیں استعمال کرنے کے لئے کوئی کل نہیں ہے جہاں کوئی عالی خیال علی آدمی کسی گاؤں میں سکونت اختیار کرلیتا ہے اور صبر آزما ذاتی کوشش سے ضروری اصلاحات کرنا چاہتا ہے اسے زیادہ کامیابی حاصل ہوتی ہے ۔ لیکن اسے بھی امداد اور رہبری چاہئے ۔ مختلف "قومی تعمیری" محکموں کی مصروفیات کو مربوط کرنے کی کوشش بھی کوئی نمایاں نتائج نہیں پیدا کرسکی کیونکہ دراصل جس ارتباط کی ضرورت ہے وہ برسر موقع افراد کا تعاون ہے جو ہر ایک کے اپنے معمولی کاروبار میں منہمک ہونے کی وجہ سے مفقود ہے ۔ اس کا امکان ہے کہ ہر محکمہ اپنے نقطۂ نظر کو مقدم قرار دے اور مسائل کی طرف پوری توجہ نہیں کی جاتی ۔ ایسا معلوم ہوگا کہ غیر سرکاری اور سرکاری افسروں کی تحقیقات دونوں کا مقابلہ کرنے کے لئے مقامی اداروں کے ذریعے عملی چارہائے کار کو بروئے عمل لانے کے کام کو اپنے ذمہ لینے کے لئے اور نتائج پر نظر رکھنے اور ان کو جانچنے کے لئے دیہی تنظیم جدید کے ایک جداگانہ محکمہ کی ضرورت ہے ۔ اس امر کی ضرورت ہے کہ یہ محکمہ پنجاب کے کمشنر ترقیات کی طرح

...رس

...ا عہدہ دار کے سپرد کیا جائے ۔ تاکہ وہ روزانہ کے معمولی کاروبار کی جکڑ بند سے آزاد رہ کر اس مسئلہ پر پوری پوری توجہ ...س کی مدد ایک معاشی کونسل یا دیہی تنظیم جدید بورڈ کے ذریعے کی جا سکتی ہے جو متعلقہ محکموں کے اعلیٰ افسروں اور ساتھ ...ا عہدہ داروں پر مشتمل ہو ۔ لیکن کسی محکمہ کے صدر کو معتمد بنا کر صرف اس قسم کی کوئی کونسل یا بورڈ قائم کرنا فضول ہے ...ہ محکمہ تنظیم جدید کے افسر کو دیہی تنظیم سے مسلسل واقفیت رکھنا چاہئے اور جدید خیالات کے لئے محرکات فراہم کرنے چاہئیں ۔ ...ی کی کی وجہ سے کام کرنے پر آمادگی گھٹ جاتی ہے اور ساری ترقیاں رک جاتی ہیں ۔

...ہمہ گیر پروگرام کے لئے ...قامی ادارے ۔

۹ ۔ مقامی انتظام کے بارے میں یہہ صاف ظاہر ہے کہ یہہ اس قسم کا ہونا چاہئے کہ موجودہ حالات کے خلاف ایک ہمہ جہتی مہم شروع کی جا سکے ۔ تاکہ ہر دائرہ میں ترقی ہو ۔ وہ تین ادارے جو ملک کے مختلف حصوں میں پہلے ہی سے قائم ہیں یعنے (۱) دیہی انجمن اتحادی یا دیہی بنک (۲) دیہی مدرسہ (۳) دیہی پنچایت یا دیہی کونسل اس مقصد کے لئے سب سے زیادہ موزوں ہیں اگر انھیں صحیح اسپرٹ کے ساتھ اور مناسب مقاصد کے ...چلایا جائے ۔ اس مسئلہ پر کامل طور پر غور کرنے کی غرض سے ضروری ہے کہ اس مقصد سے جب گاؤں کا انتخاب کیا جائے اسی میں ...تینوں اداروں کو پہلو بہ پہلو اور ایک دوسرے کے ساتھ تعاون سے کام کرنا چاہئے ۔ دیہی بنک کو معاشی تیزی کے لئے، دیہی مدرسہ ...سماجی اور تمدنی بہتری کے لئے اور دیہی پنچایت کو انتظام، طبی امداد وغیرہ کے لئے کام کرنا چاہئے ۔ دیہات کے حالات کی اساسی ...ی کے عمدہ ہونے کے لئے ہر ادارہ کو جس طریقہ پر کام کرنا چاہئے اس کا ہر نقطۂ نظر سے مکمل بیان اس بلیٹن کو بہت طویل بنا دے گا ...ر یہہ درحقیقت ہمارے مبحث سے باہر ہے ۔ اس لئے ہم یہاں صرف دیہی مدرسہ اور دیہی پنچایت کا کام ۔ اجمالاً بیان کریں گے ...ر دیہی بنک کی تنظیم کے بارے میں اپنی تجاویز کو زیادہ تفصیلات کے ساتھ واضح کریں گے ۔

...ی مدرسہ اور اُس کی ...جدید تنظیم کی ضرورت

۱۰ ۔ دیہی مدرسہ کا اولین فرض نئی نسل کی تمدنی ترقی کے ذرائع فراہم کرنا اور ساتھ ہی ساتھ بقیہ آبادی کے لئے بصیرت افروز خیالات کے ایک مرکز کا کام دینا ہونا چاہئے یہہ اسی وقت ہو سکتا ہے جب کہ نظام تعلیم میں اساسی تبدیلیاں کی جائیں اور اس کے اساسی مقصد کی دوبارہ وضاحت ...جائے کسانوں کے راستہ میں جو رکاوٹیں ہیں ان میں سے اکثروں کے سب سے زیادہ قطعی علاج کے طور پر تعلیم کی ضرورت کے بارے ...گفتگو کرنا فیشن ہو گیا ہے لیکن ایک ہمہ جہتی ترقی کے حصول کے لئے جس قسم کی تعلیم کی ضرورت ہے اس پر بہت کم غور کیا جاتا ہے ۔ ...طور پر موجودہ تعلیم کی خالص ادبی نوعیت کو برا کہا جاتا ہے ۔ اور پیشوں کی طرف میلان کی ضرورت پر زور دیا جاتا ہے ۔ جس چیز پر ...نہیں ڈالی جاتی وہ یہہ ہے کہ اگر تعلیم کو فی الحقیقت تعلیم کہلانا ہو تو اس کو چاہئے کہ طالب علم کو نہ صرف لکھنا پڑھنا اور حساب کرنا ...جائے، یا کوئی خاص دھندا سکھائے بلکہ اس کو جسمانی، اخلاقی، تمدنی اور معاشی ہر طریقہ سے بہتر بنانا چاہئے تاکہ وہ ترقی کر کے ...نقطۂ نظر سے ایک بہتر آدمی بنے ۔ ہندوستان میں یہہ تو تسلیم کیا جاتا ہے کہ مدرسوں میں اخلاق کی تربیت دی جانی چاہئے ۔ لیکن ...مقصد کے حصول کا یقین حاصل کرنے کے لئے چارہائے کار کی طرف توجہہ نہیں کی جاتی ۔ جب تک کہ موجودہ طریقہ تعلیم سے

یہہ کمی دور نہ کردی جائے طالب علم کی نفسیات کو بدلنے اور دیہی علاقوں کو عام طور پر ترقی دینے کے مقصد میں کامیابی کا امکان نہیں چاہیے موجودہ نظام کے تحت مدرسوں کی تعداد میں کتنا ہی اضافہ کیوں نہ کردیا جائے۔ مندرجہ بالا نصب العین کے ساتھ ساتھ مدارس کو جدید حکمیاتی اور صنعتی ترقیوں کی معلومات کے پھیلانے اور نوجوانوں کو کلوں کے سمجھنے میں مدد دینی چاہئے۔ دوسرے ممالک مشینوں سے اپنی عظمت کی تعمیر کررہے ہیں، اور طلبائے مدارس بھی سادہ مشینوں کی بناوٹ اور عمل کو سمجھتے ہیں لیکن اس ملک کے لوگ اس سے ابھی گھبراتے ہیں۔ کاشتکاروں کو قیمتی ٹریکٹروں اور پمپوں کے استعمال کی ترغیب دینے میں نقصان یہہ ہے کہ گاؤں میں کوئی ایسا شخص نہیں جو انھیں چالو حالت میں رکھنا جانتا ہو۔ اور جب کوئی خرابی پیدا ہو جاتی ہے تو آس پاس کے قصبوں میں بھی ایسے افراد کی فراہمی مشکل ہے جو اسے درست کرنا جانتے ہوں۔ کلوں کے بارے میں لوگوں کی اس کمزوری کی ذمہ داری کچھ کم نہیں، جس کے تحت ان کے بنانے اور درست کرنے کا تعلق صرف لوہار سے ہے۔ جب تک کہ یہہ نقص اوائل عمر میں لوگوں کو مشین کی ساخت اور استعمال کی تعلیم دے کر دور نہ کیا جائے، ملک کی ترقی کے لئے مشینوں کے عام طور پر استعمال میں آنے کا کوئی قرینہ نہیں۔ اس نظام تعلیم کی اس طرح جدید تنظیم کہ جس میں یہہ تمام اہم عناصر شامل ہوں، جن کی طرف سے اس وقت تک غفلت برتی گئی ایک سخت ضرورت ہے۔ مختصر یہہ کہ دیہی مدرسہ کو دیہی آبادی کی ساری نفسیات کے بدلنے اور ایک زیادہ راست کار خوش معاملہ، عزت نفس رکھنے والی، ترقی پسند اور متحد دیہی آبادی پیدا کرنے میں سب سے زیادہ توانا قوت بن جانا چاہئے۔

دیہی پنچایت۔ موجودہ رکاوٹیں

۱۱۔ دوسرے ادارے یعنے دیہی کونسل یا دیہی پنچایت کو اس کے دستور کے مطابق گاؤں کی ان ضروریات کی طرف توجہہ کرنے کا اختیار دینا چاہئے جو مشترک عمل چاہتی ہوں۔ یہہ دہقانوں کے نمائندوں پر مشتمل ہونی چاہئے، جو گاؤں کی ضروریات کا بہترین طور پر اندازہ کرسکیں اور ان کو پورا کرنے کی قابلیت رکھتے ہوں۔ مل کر کام کرنے کی عادت دیہات میں عام طور پر مفقود ہو چکی ہے۔ علاوہ بریں دیہی ہنگامے اور جھگڑے لوگوں کو غیر متحد کرنے اور تعمیری کام کو مشکل بنانے کی طرف مائل رہتے ہیں۔ لوگ ذمہ داری کا بوجھ اپنے کندھوں پر لینے کے لئے آگے نہیں بڑھتے۔ ہر شخص کا کام کسی شخص کا بھی کام نہیں رہا۔ گاؤں میں تعلیم یافتہ، روشن خیال، خدمت خلق کا جذبہ رکھنے والوں کی تعداد کم ہے جنھیں ایسے مفاد کے کاموں کے بارے میں کوئی اندازہ ہو، جو شروع کئے جاسکتے ہیں۔ سوائے مدراس، صوبجات متوسط اور میسور، بڑودہ اور ٹراونکور کی ریاستوں کے کسی اور جگہ عام طور پر پنچایتوں کی امداد کا کوئی ذریعہ نہیں سب سے زیادہ رکاوٹ رقم کی کمی تھی اس لئے کہ عام طور پر مقامی محصول بندی کے لئے زیادہ گنجائش نہیں رہی اور اضلاعی اور مقامی بورڈ پنچایتوں کی امداد کی غرض سے اپنے پاس سے رقم دینے پر آمادہ نہیں۔ اگر یہہ مقصد ہو کہ پنچایتیں اپنے صحیح مقاصد میں کامیاب رہیں تو ان رکاوٹوں کو دور کردینا

پنچایتوں کے لئے نظام العمل

۱۲۔ جو کام پنچایتیں اپنے ذمہ لے سکتی ہیں ان کی چار قسمیں کی جاسکتی ہیں:۔
(۱) دیہی آبادی کی عام ضروریات کی فراہمی (۲) پبلک اداروں کی نگرانی (۳) دیہی زندگی کی آسائشوں میں اضافہ کرنا، اور (۴) حفظان صحت کا انتظام۔ پہلی قسم میں آبادی اور مویشیوں کے لئے آب رسانی سڑکوں اور نالیوں

کھیتوں کی کاشت اور اسی قسم کی دوسری ضروریات کی فراہمی کو شامل کیا جا سکتا ہے۔ دوسرے قسم کا کام گاؤں کی چاوڑی، دھرم شالہ
... دن جیسی سرکاری اور پبلک عمارتوں کی نگرانی اور اچھی حالت میں داشت مدارس اور دیہی سروس کی نگرانی، دیہی چراگاہوں کی
... جہاں جبری تعلیم اور بچپن کی شادی جیسے سماجی قوانین ہوں انھیں لوگوں کو سمجھانا اور نافذ کرنا وغیرہ پر حاوی ہے۔ تیسری قسم میں جن آسائشوں
... ذکر کیا گیا ہے، ان میں دیہی کتب خانوں پبلک باغوں، دیہی دواخانوں اور ورزش جسمانی کی جماعتوں کا قیام شامل ہوگا۔ دیہی ریڈیو
انتظام کھیل کے میدانوں کی فراہمی، سایہ اور میووں کے لئے درخت لگانا یا دیہی بن تیار کرنا۔ مکانات کی گنجانی کو دور کرنا اور گاؤں کے
... علاقہ میں توسیع کرنا، راستوں پر روشنی کا انتظام وغیرہ چوتھی قسم کا کام یعنے حفظان صحت سب سے زیادہ اہم ہے۔ امراض کو پھیلنے سے
... کنے اور صفائی کو قائم رکھنے کے لئے متعدد چارہائے کار ہیں مثلاً بدبودار گنڈوں کو پاٹنا، پینے کے پانی کو صاف کرنا۔ سڑکوں کی خرابی کو
... کرنا، بیت الخلائے اور موریاں بنانا۔ گاؤں کے راستوں وغیرہ کی صفائی۔ مختصر یہ کہ پنچایت پبلک مفاد، دیہی انتظام اور حفظان صحت
... کام اپنے ذمہ لے سکتی ہے، اور جدید زندگی کی آسائشوں کو دیہات تک پہونچا سکتی ہے۔ اگر دیہاتیوں کو عام مفاد کے لئے ایک
... سے تعاون کی تعلیم دی جاسکے تو بیشتر کام بغیر چندہ کے کیا جا سکتا ہے۔ اور اس امر کی ترغیب دی جا سکتی ہے کہ اس قسم کا
... کے لئے وہ رقم کی جگہ محنت ادا کریں۔ قدیم زمانے میں جب کہ دیہات باہر کے کسی علاقے کے محتاج نہیں تھے اور اپنے امور
... سرانجام کرتے تھے، محنت کی اس قسم کی ادائی بہت عام تھی جس کو صرف دوبارہ رائج کرنے کی ضرورت ہے۔

پنچایتوں کے ذریعے عدالتی کام

۱۳- دیہی پنچایتوں کے عام فرائض یہ ہیں۔ ہندوستان کے بعض حصوں میں ایک قسم کا ابتدائی عدالتی کام بھی ان کے سپرد کیا گیا ہے۔ مقدمہ بازی ہندوستانی
... ہات کے لئے سم قاتل ہے اور بہت سا وقت، روپیہ اور قوت معمولی جھگڑوں میں صرف ہو جاتی ہے، جو باضابطہ فوجداری یا دیوانی
... عدالتوں میں پیش کئے جاتے ہیں۔ باضابطہ عدالتوں کے قیام سے قبل اس قسم کے امور کا تصفیہ گاؤں کے بزرگ کرتے تھے۔ اور انھیں
... کے حوالے کرنا صرف ایک قدیم ادارہ کو دوبارہ زندہ کرنا ہوگا۔ بار بار عدالتوں سے رجوع کرنے کی وجہہ سے فرضی شہادت
... اور فرضی مقدمات گھڑنے کی چالوں سے دیہاتی واقف ہو رہے ہیں اور ان کے اخلاق بگڑتے جا رہے ہیں۔ پنچایت چھوٹے
... دیوانی اور فوجداری کا تصفیہ، عدل، مساوات اور دیانت کے ساتھ وکیلوں اور پیشہ ور قانونی مشیروں کی مداخلت کے بغیر
... میں کرے تو نہ صرف دیہاتی کا وقت اور روپیہ بچے گا بلکہ اس سے مقدمہ بازی کا وہ جذبہ بھی دب جائے گا، جو بڑھتا اور
... تباہی کی طرف ڈھکیلتا رہا ہے۔

پنچایتوں کے لئے کام کی گنجائش

۱۴- اس طرح معلوم ہوگا کہ پنچایتوں کے ذریعے دیہات کو سدھارنے کی بہت بڑی گنجائش ہے، اگر انھیں مجوزہ طریقہ پر دوبارہ تقویت دی جائے۔ اور یہ ایک وسیع پروگرام اپنے ذمہ لیں۔ ممکن ہے ہر موضع میں مناسب مواد دستیاب نہ ہو سکے اور ان کی
بڑی تعداد بعض زیادہ ابتدائی فرائض کی انجام دہی پر اکتفا کرے لیکن اس کے لئے بھی کسی معذرت کی ضرورت نہیں

اس لئے کہ کسی پنچایت کا کام چاہے وہ کتنا ہی غیر مکمل کیوں نہ ہو، بجائے خود حکومت خود اختیاری اور مشترک کام کی تعلیم کی حیثیت
لیکن کام کے لئے جو مواضعات منتخب کئے جائیں ان میں پنچایتوں کو چاہئے کہ سارا پروگرام اختیار کریں۔ اس لئے کہ اس کے بغیر
ترقی ناممکن ہے۔

مترجمہ میر حسن

شام و سحر

صبح ہستی آشنائے شام ہستی ہو چلی — مہر تاباں کی درخشانی میں پستی ہو چلی
شام انجم چھپ گیا تاروں کی بستی ہو چلی — اور تسلط چار سو یک گونہ مستی ہو چلی
شام کے آغوش میں مہر تاباں روپوش ہے — شب کی تاریکی میں دنیائے عمل بیہوش ہے

صبح کا نکلا ہوا اب کارواں منزل میں ہے — لیلیٰ شب محو خواب جانفزا محمل میں ہے
یک خفقہ بلبل نوا سنج فغاں محفل میں ہے — اور اک ہیجان برپا اس دل بسمل میں ہے
ربط ہم دونوں میں دیرینہ ہے نالے ایک ہیں — کشتگان غم ہیں اپنے دل پہ آلے ایک ہیں

ہیں رہ غم کے مسافر اپنی منزل دور ہے — مرحلے طے کرتے ہیں راہ عمل بے نور ہے
لن ترانی کی صدا باقی ہے کوہ طور ہے! — یاں تنازع للبقا کا جادہ داں دستور ہے
اے کہ سن گر آرزوئے منزل مقصود ہے — حرکت لا منتہا ہی راز ہست و بود ہے

غنچہ ساں ہے کیوں گرفتہ کیوں ہے پابند محن — نکہت گل بن کے ہو آوارہ بر دوش چمن
پھر انا الحق کے لئے تیار ہے دار و رسن! — پھر متاع ہوش لوٹے ہے فریب پیر زن
آبیاری نہر شیریں کی کسی قصہ میں ہے — آج کل فرہاد با ہمت کے سب حصے میں ہے

سونے والے چونک غفلت سے سحر ہونے کو ہے — پھر ہم آغوش تجلی برگ و بر ہونے کو ہے
قافلہ کا کوچ پھر اے بے خبر ہونے کو ہے — تو پڑا سوتا ہی کیوں ہے کیا دربدر ہونے کو ہے
اس تن آسانی میں مضمر زحمت صد دام ہے — گامزن ہیں اور تو گم گشتۂ ایام ہے

پا بہ گل رہنا ہے قسمت سرو بستاں کے لئے — مرکز و محور بنے ماہ درخشاں کے لئے
عرصۂ دنیا ہے کم تجھ رخش جولاں کے لئے — تیری پیدائش ہوئی عزم سلیماں کے لئے

تا بہ کے واماندگی تا کے تخیل باغلتن ؟
دیگراں ساغر بلب تو تشنۂ در انجمن !

سید مجتبیٰ حسین نقوی

بچوں کی تعلیم و تربیت

دوسری قسط

ہماری سماج میں بچوں کی تعلیم و تربیت کا بار بار تذکرہ تو کیا جاتا ہے اور اس مسئلہ پر کثرت سے اظہار خیال بھی ہوتا رہتا ہے
گر کوئی عملی اقدام نہ ہونے کی وجہ سے وہ ہمارے لئے ایک افسانہ رنگین سے زیادہ حقیقت نہیں رکھتا، ہر باپ اور ہر ماں کا یہی دعویٰ
ہے کہ وہ اپنے بچوں کی بہترین تعلیم و تربیت کرتے ہیں مگر ان والدین کی تعلیم و تربیت کے نتائج پر اگر غور کیا جائے تو صفر ہی صفر نظر آتے ہیں
ایک زمانہ ایسا بھی گذرا ہے جب کہ ساری قوم کا نظام تربیت رہنمایان دین اور پیشوایان مذہب کے ہاتھوں میں تھا، وہ بچوں
کو صرف مذہبی عقاید اور قدیم اخلاق کے موافق تعلیم و تربیت دیتے تھے، اس قسم کی تعلیم میں سب سے زیادہ اہم یہہ بات تھی اور زیادہ تر
زور اس مسئلہ پر دیا جاتا تھا کہ ہادیانِ دین کے غیر محدود اختیارات کو بغیر کسی غور اور سوچ بچار کے قبول کر لیا جائے۔ اس دور میں
اندھی تقلید، تعصب اور مذہب کے بیجا جوش و خروش کا جو سمندر موجیں مارتا تھا وہ اسی تعلیم کا نتیجہ تھا۔ یہی حالت یورپ کی بھی تھی،
لیکن وہاں پندرھویں اور سولھویں صدی میں ایک عام انقلاب رونما ہوا، یہہ زمانہ یورپ کی نشاۃ ثانیہ کا ہے، اس دور میں جن علوم
و فنون نے ترقی کی اور جو اصلاحیں عمل میں آئیں ان میں بچوں کی تعلیم و تربیت بھی داخل ہے۔ اس فن کی ابتدا پہلے اخلاقی اور علمی حیثیت
سے ہوئی مگر آخر میں وہ سیاست کا ایک اہم جزو بن گیا اور یہہ اصول قرار پایا کہ جن لوگوں میں بچوں پر حکومت کرنے کی صلاحیت نہیں ہوتی
وہ کسی قوم پر بھی اپنا اقتدار قائم نہیں رکھ سکتے، مگر اس دور کے آغاز میں چونکہ قومیت اور جمہوریت نے بہت کم ترقی کی تھی اس لئے اس
فن کے متعلق جو کتابیں لکھی گئیں ان کا تعلق صرف طبقۂ اعلیٰ کی تعلیم و تربیت کی حد تک تھا، عوام کی اصلاح کے طرف کسی نے بھی توجہ نہیں کی
کچھ عرصہ کے بعد عوام کی تعلیم و تربیت کا احساس پیدا ہوا اور چند قابل افراد نے اس طرف توجہ کی چنانچہ انیسویں صدی میں اسی
فن پر متعدد کتابیں لکھی گئیں، ان کتابوں میں زیادہ تر عوام اور غریب بچوں کی تعلیم و تربیت سے بحث کی گئی، اس طرح یہہ مسئلہ عوام کی دلچسپی
کا مرکز بن گیا۔ اس زمانے میں بچوں کی تعلیم و تربیت کے جو اصول قائم ہوئے ان کا خلاصہ یہہ ہے کہ ابتدا میں بچہ کا دماغ ایک جذب
کرنے والا آئینہ ہوتا ہے اس لئے اس کے سامنے جو شکل آتی ہے اس کا عکس اس کے دماغ پر مرتسم ہو جاتا ہے، یہہ صورت اس کے
دماغ پر کچھ عرصہ تک قائم رہی تو وہی اس کی فطرت بن جاتی ہے۔
اصل تربیت کے لحاظ سے بچہ کے متعلق ابتدا میں کوئی رائے نہیں قائم کرنی چاہئیے، بلکہ نہایت احتیاط اور سادگی کے ساتھ اس کی
پرورش کرنی چاہئیے، جب وہ دو ڈھائی برس کا ہوگا تو تربیت کے اثرات قبول کرنے کا عادی ہو جائے گا، اس میں ہر چیز کے دیکھنے،
سمجھنے اور سننے کا شوق پیدا ہوگا، اس میں زندگی کی حرکت شروع ہو جائے گی اور ایک دن وہ "انسان" کی صورت میں دنیا کے سامنے آئیگا
بچوں کی نشو و نما میں فطرت اور تربیت دونوں کا حصہ شریک ہے، فطرت بچوں کو مختلف قوتیں عطا کرتی ہے اور تربیت ان قوتوں
کو ابھارتی اور سیدھے راستوں پر لے جاتی ہے، اس لئے سب سے پہلے یہہ معلوم کرنا چاہئیے کہ بچوں کے فطری رجحانات یا ان کے فطری قویٰ کی

نمایاں خصوصیتیں کیا ہیں تاکہ ان کے فطری میلان کے موافق ان کی تعلیم و تربیت ہو۔

بچوں میں استقلال مطلق نہیں ہوتا' ان کی کوئی مستقل رائے نہیں ہوتی' ان کے دل میں ہر وقت نئے نئے جذبات اور خیالات پیدا ہوتے رہتے ہیں اور وہ ہر وقت نئی نئی چیزوں کے لئے مچلتے رہتے ہیں کبھی روتے ہیں' کبھی ہنستے ہیں' کبھی خوش ہوتے ہیں' کبھی رنجیدہ ہو جاتے ہیں' کبھی کسی چیز کو پسند کرتے ہیں اور کبھی کسی چیز سے بلا وجہ نفرت کرنے لگتے ہیں۔ ان نیرنگیوں سے پتہ چلتا ہے کہ ان میں تلون بہت ہوتا ہے اس لئے ان کی ان کمزوریوں پر تربیت دینے والوں کو قابو حاصل کرنا چاہئے اور ناخوشگوار الجھن پیدا کئے بغیر ان کی اصلاح کرنی چاہئے تاکہ ان میں مستقل مزاجی پیدا ہو اور وہ تعلیم و تربیت کے اثرات قبول کر سکیں۔

بچپن کا یہہ انقلابی دور بچہ کی عمر کے پہلے سال سے شروع ہو کر چھ سات برس کی عمر تک رہتا ہے' عام طور پر اس زمانے کو کوئی اہمیت نہیں دی جاتی' حالانکہ یہی زمانہ سب سے زیادہ اہم اور توجہ کا مستحق ہے' اس سن میں بچہ غور و فکر کی عادت سیکھتا ہے' اسی زمانے میں اگر اس کی تربیت عمدہ اور صحیح اصول پر ہو تو اس کا مستقبل نہایت شاندار ہو سکتا ہے' جو عادتیں اس سن میں پیدا ہوں گی وہ تادم آخر قائم رہیں گی' ان کا ترک کرنا دشوار ہی نہیں بلکہ ناممکن ہو جائے گا۔ ایک فلسفی کہتا ہے۔

> "انسان کی تربیت اسی دن سے شروع ہوتی ہے جب کہ وہ دنیا میں جنم لیتا ہے' جو عادتیں عہد طفلی میں پڑ جاتی ہیں وہ کبھی نہیں جاتیں' اکثر عیوب کے زہریلے جراثیم بچپن ہی میں ہمارے جسم سے لپٹ جاتے ہیں' یہہ وہ زمانہ ہوتا ہے جب کہ ہم پر "ماں" کی حکومت رہتی ہے"

بچوں کی تعلیم و تربیت کی سب سے بڑی ذمہ داری والدین پر عاید ہوتی ہے اور انھیں اس اصول کا لحاظ رکھنا نہایت ضروری ہے۔ سب سے پہلے والدین کا باہمی اتفاق و اتحاد ہے' جب تک یہہ دونوں ایک دوسرے کے ہم خیال نہ ہوں بچوں کی تعلیم و تربیت صحیح اصول پر ہرگز نہیں ہو سکتی۔

والدین سے سب سے بڑی غلطی جو سرزد ہوتی ہے وہ یہہ ہے کہ وہ بچہ کو اپنی ذات سے جدا نہیں سمجھتے بلکہ اپنا ایک عکس یا پرتو خیال کرتے ہیں اور اسی اصول پر اس کی تعلیم و تربیت کرتے ہیں۔ مثلاً ایک تاجر اپنے بچہ کو تجارت کی تعلیم دیتا ہے' زمیندار کاشتکاری سکھاتا ہے' ڈاکٹر طب کی طرف راغب کراتا ہے' وکیل بیرسٹر بنانا چاہتا ہے اور معلم پروفیسر بنانے کی کوشش کرتا ہے' ایسا خیال بالکل بے اصول اور نہایت مضرت رساں ہوتا ہے' بچہ والدین کے وجود کا عکس یا سایہ نہیں ہوتا' اس کی ایک مستقل ہستی ہوتی ہے' اس کے احساسات اور جذبات والدین سے بالکل علحدہ ہو سکتے ہیں' اس کا مذاق جدا ہوتا ہے اس لئے یہہ قطعاً ضروری نہیں کہ اس کے والدین نے جس قسم کی تعلیم حاصل کی ہو وہی اس کے لئے بھی موزوں ہو۔ بچوں کی تعلیم کا یہہ اصول ہونا چاہئے کہ ان کی ذات کو ایک مستقل وجود تسلیم کیا جائے اور ان کے خیالات' جذبات اور مذاق کے موافق ان کو تعلیم دی جائے۔

بچے کی عمدہ تعلیم و تربیت کے لئے سب سے زیادہ اہم گھر کی فضا ہوتی ہے' جب تک والدین ہم خیال اور اصول انسانیت کے پابند نہ ہوں بچے کی تربیت ہرگز خاطر خواہ نہیں ہو سکتی۔ سخت افسوس ہے کہ ہمارے اکثر گھروں کا ماحول بچوں کے لئے بہت برا ہوتا ہے

کی ماں اپنے طرز عمل سے بچے کو یہ باور کراتی ہے کہ اس کا باپ کتنا ناانصاف، خود غرض اور خود پسند ہے اور کبھی باپ اس کو غیر شعوری طور پر یہ جتلاتا ہے کہ اس کی ماں کس قدر جاہل، بدمزاج اور توہم پرست ہے۔ یہ بھی بڑی بدبختی کی دلیل ہے کہ والدین اکثر آپس میں اس وقت لڑتے جھگڑتے اور تلخ و ترش لفظوں کا تبادلہ کرتے ہیں جب کہ ان کے بچے ان کے چشم دیدگواہ ہوتے ہیں، اس قسم کی ان بن اور لڑائی بچوں کو بد کیف کر دیتے ہیں اور ماں باپ کی نسبت ان کا حسن ظن کم ہوتا جاتا ہے اور رفتہ رفتہ ان کی نظروں میں والدین کی کوئی عزت یا وقعت باقی نہیں رہتی، اگر والدین اپنا وقار بچوں کی نظروں میں قائم رکھنا چاہتے ہیں تو ان کے سامنے کبھی لڑنا جھگڑنا اور مشتعل ہو کر ایک دوسرے کو صلواتیں نہ سنانا چاہئیے۔ شاید ہی کوئی گھر ایسا ہوگا جہاں میاں بیوی میں شکر رنجی نہ ہوئی ہو، مگر ایسی لڑائی جس کا بداخلاقی اثر فوراً نقش قبول کرنے والی ذہنیتوں پر برا ہوتا ہو نہ ہونی چاہئیے۔

بچہ کی پرورش جس ماحول میں ہوتی ہے اس کی خو بو اس کے دل و دماغ میں کچھ اس طرح بس جاتی ہے کہ ایک دن وہ اسی کا مجسمہ بن جاتا ہے اگر اس ماحول میں خود غرضی، خود پسندی اور انانیت کا عنصر غالب ہے تو بچے میں بھی یہی عیوب آہستہ آہستہ گھر کر جاتے ہیں اور اگر محبت، یگانگت، اتفاق اور خود اعتمادی کا رنگ گھر کی فضا پر چھایا ہوا ہے تو بچہ بھی خود کو اسی رنگ میں رنگتا جاتا ہے

مرزا سیف علی خاں

مزدور

گرد چہرہ پر پسینے میں جبیں ڈوبی ہوئی!
پیٹھ پر ناقابل برداشت ایک بار گراں
ہڈیوں میں تیز چلنے سے چٹخنے کی صدا
جا رہا ہے جانور کی طرح گھبراتا ہوا
مضمحل اور ماندگی سے اور فاقوں سے نڈھال
اپنے ہم جنسوں کی بے مہری سے مایوس و ملول
اپنی خلقت کو گناہوں کی سزا سمجھے ہوے
راستے میں راہ گیروں کی نظر سے بے نیاز
اس کے دل تک زندگی کی روشنی جاتی نہیں
ایک لمحہ بھی نہیں فکر معیشت سے نجات
دیکھ اے قارونِ اعظم دیکھ اے سرمایہ دار

آنسوؤں میں کہنیوں تک آستیں ڈوبی ہوی
ضعف سے لرزی ہوی سارے بدن کی جھریاں
درد میں ڈوبی ہوی مجروح ٹخنے کی صدا
ہانپتا، گرتا، لرزتا، ٹھوکریں کھاتا ہوا
چار پیسے کی توقع سارے کنبہ کا خیال
صفحۂ ہستی پہ اک سطر جو کہ ہے مد فضول
آدمی ہونے کو لعنت اور بلا سمجھے ہوئے
سوزش ماتم سے نغموں کے اثر سے بے نیاز
بھول کر بھی اس کے ہونٹوں پر ہنسی آتی نہیں
صبح ہو یا شام تاریک اس کی کائنات
نامرادی کا مرقع بیکسی کا شاہ کار

گو ہے تیری ہی طرح انساں مگر مقہور ہے
دیکھ اے دولت کے اندھے سانپ یہ مزدور ہے

عزیز فاطمہ ضیاء الدین

بھوتوں کی مسجد

"کڑی دوپہر ہے، ادھر کدھر جا رہے ہو؟ وہاں نہ جاؤ" ایک راہرو نے مجھ سے کہا میں نے کہا "کیوں؟ مسجد ہے، ٹھنڈی جگہ ہے باولی ہے، میں وہاں جا کر نہاؤں گا اور کچھ دیر پڑا رہوں گا تاکہ تکان دور ہو جائے۔

"میاں! خدا کے واسطے!! تمہاری جوانی پر رحم آتا ہے، ادھر نہ جاؤ اس میں شک نہیں کہ وہ مسجد ہے لیکن اب وہاں بھوت رہتے ہیں، ادھر کا گیا پھر نہ لوٹا" راہرو نے مجھ سے منت سے کہا "اس سے ٹھنڈا مقام مجھے اس گاؤں میں نہیں مل سکتا اور مجھے تھکے ماندے کو تو جانے ہی دو تمہارا شکریہ" کہہ کر میں مسجد کی طرف چلا گیا۔

حیدرآباد دکن کے جغرافیہ سے واقف لوگ جانتے ہیں کہ ناندیڑ ضلع کا ایک تعلقہ بلولی ہے یہاں نصف میل تک شرقاً غرباً ایک راستہ ہے اس راستہ کے دونوں بازوؤں پر مکانات اس طرح بنے ہیں گویا ایک مردہ سانپ سے کوڑے بھڑ گئے ہوں۔ بس یہی ہے تعلقہ بلولی ضلع ناندیڑ۔ سانپوں کی یہاں کثرت ہے۔ مغرب کے بعد ہر دس قدم پر ایک سانپ دوڑتا نظر آتا ہے دوسرے امراض کے مقابلے میں سانپ سے ڈسے اموات ہی سالانہ زیادہ ہوتے ہیں۔ اس کے باوجود بلولی ایک دلکش گاؤں ہے۔ ہاں۔ میرے لئے دلکش، دلفریب اور مسحور کن لیکن جاذبیت کے اسباب آبادی سے باہر ہیں مغرب میں ایک تالاب ہے جس کی سطح آب کا زیادہ حصہ شاید شعاع مہر کی تاب نہ لاتا ہو۔ اس لئے وہاں رنگ کی ملگجی سی چادر اوڑھے رہتا ہے۔ اس سطح آب پر بچھی ہوی چادر پر کنول کے پھول سرخ اور سفید گلدستے معلوم ہوتے ہیں اور سطح آب سے کلیوں کا ابھار دیکھ کر یہ دھوکا ہوتا ہے کہ دور۔ بہت دور۔ پانی میں کوئی سارس گردن پروں میں چھپائے ایک پاؤں پر کھڑا ہے۔

مرغابی، لگلے، سارس، ہرن، خرگوش غرض دنیا بھر کا شکار موجود ہے لیکن نو آموز شکاریوں نے انھیں اتنا ہوشیار کر دیا ہے کہ یہ دور کے جانور سے بھی ڈرتے ہیں اور کسی کی زد میں نہیں آتے۔ میں ہرن کے شکار کی غرض سے صبح کا نکلا ہوا، دس بارہ سانپوں کو ہمیشہ کی نیند سلاتا ہوا اس مسجد کی طرف آرہا تھا جو تالاب کے مشرقی کنارے قدیم شاہی .... یادگار، اپنی طرز میں یکتا آبادی سے دور اذاں کی صداؤں سے بے نیاز مسلمانوں کی زبوں حالی کا مرثیہ پڑھتی ہوی کھڑی ہے۔ مسجد کیا ہے خوبصورت تراشیدہ پتھر پر پتھر رکھ دئے گئے لیکن اس خوبی سے کہ دو پتھروں کے درمیان سوئی بھی نہیں جا سکتی۔ اس کے فلک بوس میناروں کے کلس بھی پتھر کے ہیں۔ ہر مینار میں آٹھ کنگورے ہیں اور ہر کنگورے میں پتھر کی ایک زنجیر، زنجیر در سے مشابہ ہے اور اس کے نچلے سرے سے گھنگرو لٹکایا گیا ہے۔ طوفانی ہوائیں زنجیروں کو کھڑکاتی اور گھنگروؤں کو بجاتی رہتی ہیں۔

یہی وہ مسجد تھی جہاں مجھے جانے سے روکا جا رہا تھا۔ میں وہاں پہنچا، ستمبر کا موسم گرمی کی شدت اور گرد آوری ان چیزوں نے مجھے کہیں کا نہ رکھا میں سیدھے باولی پر گیا غسل کیا اور مسجد میں ظہر کی نماز پڑھ کر وہیں لیٹ گیا اور پھر خبر نہیں کہ دن کب ختم ہوا۔

...ہی نگینوں کے ساتھ آئی اور گئی کہ اللہ اکبر کی ہلکی ہلکی صداؤں نے مجھے بیدار کردیا لیکن تاریکی اور وحشت کے مارے میں کچھ نہ ... منبر پر بھی کا ایک دیا جلتا نظر آیا۔ رات کی وجہہ سے وقت بھی نہ معلوم ہوسکا تئیس ۲۳ ماہ ہلالی تھی چوبیسویں کا چاند اپنی ہلکی اور ... روشنی سے ٹمٹماتا ہوا نکلا میں وقت کا اندازہ کرکے لرز گیا لیکن فوراً ہمت کرکے اٹھ بیٹھا اذان کے مینار سے ایک سایہ اترتا ہوا ... لانبی سی سفید براق ڈاڑھی اور نیچی سی عبا سے علامتہ الدہر اور صوفی معلوم ہوتا تھا۔ اس شخص نے منبر کے پاس پہنچ کر نماز پڑھی ... سمجھا کہ کوئی مسافر ہوگا اس لئے ستون کو سہارا لگائے نیند میں مخمور بیٹھا رہا۔ کبھی کبھی اس کو بھی دیکھ لیتا۔ اس نے نماز ختم کی اور ... بڑی تسبیح لے کر مسجد کے صحن میں ٹہلنے لگا۔ وہ صحن کی شمالی دیوار سے جنوبی دیوار تک کئی بار آیا اور گیا لیکن تین بجے کے قریب میں نے ... وہ شمالی دیوار سے جب جنوبی دیوار کی طرف جاتا ہے تو اس کے قد میں ایک فٹ کا اضافہ ہوجاتا ہے، میرے بدن میں سنسنی ... اب مسجد کے مینار کے برابر ہوچکا تھا میں ہوش باختہ تھا لیکن ذرا جرات کی اور جب وہ مجھ سے دور یعنے جنوب کی طرف چلا گیا ... ہمت سے پوچھا "کون ہے؟" وہ پھر شمالی دیوار تک حسب معمول مسجد گردانی کرتا ہوا آیا اور پھر جنوب کی طرف جانے لگا میں نے ... ایک دبی آواز زبان سے نکالی "کون ہے؟" لیکن جب میں تیسری مرتبہ دریافت کیا ... تو وہ شمالی دیوار تک آیا میں نے دیکھا ... سر اس کا ارجن اور بھیم کے گرز یا گاما پہلوان کی رانوں جیسی موٹی موٹی انگلیاں امام مسجد پر رکی ہوی تھیں۔ وہ آیا اور اپنی ... انگلی سے میرے بدن کو ہلا کر کہا "کیا لگایا ہے؟ کون ہے؟ کون ہے؟ کون ہے؟" اور اس کے بعد غائب ہوگیا۔

میں دم بخود اور سکتے کے عالم میں تھا شاید یہی بھوت ہو جو اس مسجد کی رونق کا باعث ہو۔ مسلمانوں میں مسلمانی نہ رہی ... انے اپنے گھروں کو بسانے کی خاطر ایسے شب زندہ دار عابدوں کو لا بسایا ہو۔

اکبر صدیقی

غزل

کیا کہوں ان سے جو پوچھیں کبھی حالت میری
کیا مرے دوست اٹھالیں گے مصیبت میری

رشک احباب کو ہے دیکھ کے حالت میری
کاش سن لے کوئی مجھ سے بھی حقیقت میری

توبہ توبہ ہے بس انجان نہ بن آنکھ ملا
آئینہ ہوگئی اپنے پہ حقیقت میری

اس لئے روز پریشان پھرا کرتا ہوں
ایک دن یاد کریں گے وہ محبت میری

میں تو بدنام ہوں بدنام کیا کرتا ہوں
ہنس دیا آپ نے کیوں دیکھ کے صورت میری

کچھ سمجھ میں نہیں آتا ہے بہت کچھ سوچا
آپ کا راز تو شاید نہیں حسرت میری

واہ وا اس غمِ فرقت سے تو کچھ بھی نہ ہوا
اس نے پہچان لیا دیکھ کے صورت میری

وہ اگر وہ ہیں تو پھر ہائے یہہ اُن کے برتاؤ
میں اگر میں ہوں تو پھر واہ یہہ حالت میری

میرے منہ پر مری تعریف جو کرتے تھے صفیؔ
[illegible] شکایت میری

صفی

جھٹکہ والا

جھٹکہ والے کو ذرا " استاد " کہہ دیجئے یا کرایہ میں زیادہ تکرار نہ کیجئے تو نہایت شرافت اور انسانیت کا برتاؤ کرتا ہے۔ یہی معلوم ہوگا کہ جھٹکہ ہمارا ذاتی ہے اور جھٹکہ والا بھی ہمارا نوکر ہے۔ آپ کے ہاتھ میں سامان ہوگا تو یہہ جھپٹ کر اسے لے لے گا۔ قرینے جھٹکہ میں جما دے گا اور پھر جب آپ سوار ہونے کو ہوں گے تو بڑھ کر دروازہ کھول دے گا اور آپ سوار ہولیں تو اسے بند کرتا ہوا آپ پوچھ لے گا " کدھر سے چلوں میاں " اس کا یہہ پوچھنا اس کی عین خوشنودی کی دلیل ہے۔ آپ چاہیں ڈیڑھ دو میل کا چکر بھی لے جائیں۔ یہہ برا نہ مانے گا۔ گھوڑے کو " چل بیٹا چل " کہتے ہوئے یہہ آپ کی طرف متوجہ ہوتا ہے۔ " تو میاں آپ کچہری میں ہیں نا " آپ کسی کچہری میں نہ بھی ہوں تو اس کی دل شکنی کے خیال سے آپ کہہ دیں گے " ہاں۔ ہوں " کیونکہ وہ اس قدر اور ارمان سے یہہ سوال کرتا ہے کہ سننے والے کو محسوس ہونے لگتا ہے کہ اگر جواب نفی میں دیا گیا۔ تو وہ گنگ ہو جائے گا پھر کبھی بات نہ کرے گا۔ " کونسی کچہری؟ " وہ پوچھتا ہے لیکن ساتھ ہی یقین بھی ہوتا ہے کہ آپ کا تعلق ضرور " صفائی " سے ہے۔ اور جواب کا انتظار کئے بغیر " اے ہٹ جاؤ موڑ سے " کا نعرہ لگا کر " کیا اندھیر ہے میاں۔ کل تمام دن کچہری کے دروازہ پہ سڑتے پڑے رہے اس منشی کے ہاتھ جوڑے۔ اس کے پاؤں پڑے بغیر ۔۔۔ کے مانیں گے ہی نہیں بولتے ہیں۔ کیا مصیبت ہے عجب عجب باریکیاں نکال رہے ہیں۔ گھوڑا موٹا تازہ ہوتا۔ تو دیتے کیوں نہیں؟ دانے کے پیسے گھاس مفت دلاؤ۔ گھوڑا بھی موٹا ہوتا ہے۔ ہم بھی خوش رہتے ہیں گھوڑے کو مارو مت بغیر مار کے یہہ ٹٹو چلتے ہیں۔ ہمارے دادا کے پاس ایک عربی گھوڑی تھی۔ جھٹکہ تو بس اس کی پیٹھ پر اڑتے رہتا تھا۔ اب دیکھئے یہہ گھوڑے کو۔ آپ کا وزن ہے ہی کتنا۔ مگر کیسا ہانپ رہا ہے ایک بات ہے۔ نئے نئے قانون نکل رہے ہیں۔ جھٹکہ کو لنگور ہے۔ نمبر لیو رہے۔ یہہ کرو رہے وہ کرو رہے۔ پھر یہہ پولیس والوں کے ہاتھ بڑے بڑے ہیں ہاتھ اٹھا دیا تو کھڑے رہو پٹتے ہوئے۔ میاں بارہ سال سے جھٹکہ چلاتا ہوں ایسا کبھی دیکھنے میں نہیں آیا۔ اور یہہ پولیس والے کو ڈیڑھ دمڑی کا ڈریس کیا مل جاتا ہے۔ کوتوالی مل جاتی ہے۔ کسی کی عزت کا تو خیال ہی نہیں۔ سواری اندر بیٹھی ہوتی ہے مگر دے رہا ہے گالیاں۔ موقع دیکھ رہا ہوں۔ ہے کسی نہ کسی کی کم بختی آئی ہے۔ " اے ہٹ جاؤ موڑ سے " آپ اس معلومات آفریں لکچر کے دوران میں گردن ہلاتے رہتے ہیں یا " ہوں۔ ہاں " کرتے رہتے ہیں اپنی قابلیت کا مزید ثبوت دینے کے لئے وہ ایک دوسرا موضوع چھیڑ دیتا ہے۔ " یہہ ہندو مسلم فساد کا کیا ہوا کچھ معلوم ہے میاں " آپ سمجھ جاتے ہیں کہ اس کے پاس اس کا کافی مواد ہے اور اس کو کہنے کا موقع دینے کے لئے آپ تعجب سے پوچھتے ہیں " ہاں۔ کیا ہوا " وہ سنبھل کر بیٹھ جاتا ہے۔ پہلے آپ کی اس لاعلمی پر تعجب و ہمدردی ظاہر کرتا ہوا پوچھتا ہے " آپ کو نہیں معلوم " اور پھر شروع ہوتی ہے مکمل روداد فساد۔ " کیا بتاؤں میاں گھٹنے گھٹنے برابر خون بہہ رہا تھا۔ ہمارے محلہ کا شیر جو ہے وہ تو خون میں نہا لیا تھا

...ں کی ایک کلال کی لڑائی ہوئی۔ میں بولوں گا قصور چھوٹو شیر کا ہی ہے۔ مفت پلاؤ بولے تو باپ بھی نہیں پلاتا۔ بس اسی بات پر
...ائی ہوگئی۔ وہ اپنے آدمی لے آیا۔ یہہ اپنے حامیوں کو لے گئے۔ لاٹھیاں چلیں۔ پولیس آئی۔ چو طرف لڑائی شروع ہوگئی۔ مگر
...یاں ایک فائدہ تو ہوا۔" آپ پوچھتے ہیں۔ وہ کیا؟ وہ ہنستے ہوئے کہنے لگتا ہے "میری ایک سنار سے لڑائی تھی دیکھ لیا نا
...تے کل ہیں۔ داد نہ فریاد۔ اور سیٹھ ہری لال سے رہن کی سب چیزیں چھڑا لیا" اور پھر تاسف کے لہجہ میں کہے گا "مگر ایک بات
...بری ہوئی "عثمان پاشا کا نام بدنام ہوا سنا۔ افوں بیچارے کیا کرے۔ لڑے ہم۔ مرے ہم۔ بدنام ہوئے افوں۔ ایسا
...یں ہونا تھا۔ اللہ عثمان پاشاہ کو عمر دے۔ کیا پاشاہ ہے میاں۔ اچھا اب کدھر موڑوں؟" آپ اسے سیدھی یا بائیں طرف
...نے کو کہیں گے۔ آپ کا مکان ابھی بہت دور رہتا ہے اس لئے وہ یہہ کہتا رہتا ہے "میں بھی آپ کے جیسا شریف تھا۔۔۔
...ے دوستوں میں پڑکر خراب ہوگیا۔ باوا کا مرنا کیا ہوا مصیبت آگئی۔ میں بھی پڑھتا تھا چہارم میں تھا۔ ان کے مرنے کے
...ے پڑھنا چھوڑا۔ گھر چھوڑا۔ پینا کھانا سیکھا۔ اب اس حالت میں ہوں۔ اب بھی نام تو لکھ لیتا ہوں۔ پرسوں کچہری میں
...انگوٹھے کا نشان کر دبولے۔ میں بولا۔ لاؤ دوات قلم۔ منشی صاحب مجھے نیچے اوپر دیکھنے لگے۔" آپ کی طرف داد طلب
...وں سے دیکھتا ہے۔ آپ بھی بناوٹی تعجب سے کہتے ہیں "اچھا" "خدا آپ کو نیکی دے فارسی وارسی بھی پڑھا ہوں
...ہنستے ہوئے "پرسوں ایک میم صاحبہ میرے جھٹکے میں بیٹھ گئے تھے۔ مجھ سے پوچھے "تم کو انگریزی آتی ہے" میں بولا۔
...ہیں" بہت تعجب کرے۔ کہنے لگے۔ اور ذرا پڑھتے تو بڑی نوکری مل جاتی۔ میاں دھیڑوں کی اولاد پڑھ پڑھ کے کرسیوں
...پر رہتا ہے۔ ہم تو شریف الخاندان۔ ہم کو نوکری نہیں مل سکتی تھی۔ یہہ میم لوگاں بھی عجیب ہوتے ہیں۔ آدمی ان کے
...سنے چھپ نہیں سکتا۔" آپ کا گھر آجاتا ہے۔ آپ اتر کر کرایہ دیتے ہیں۔ وہ جاتے جاتے پوچھ لیتا ہے۔ "پرسوں فتح میدان
...ارہے ہیں نا میاں۔ سالگراں ہے۔ صبح چھ بجے آجاؤں گا"۔

اب آپ کسی وقت سواری کی تلاش میں ہوں اور کسی تانگہ سے کرایہ ٹھیرا کر اس میں سوار بھی ہو جائیں اور کہیں
...جھٹکہ والا آپ کو دیکھ پاوے تو جھٹکہ دوڑاتے ہوئے آگیا آپ کو اس تانگہ سے اتار کر اپنے جھٹکہ میں بٹھائے گا۔
یہہ تو میاں کے گھر کی سواری ہے" کہہ کر تانگہ والے کو چپ کرے گا۔ اور چل بیٹا ٹخ ٹخ ٹخ۔ بعض دفعہ آپ جھٹکے والے کو
...نخی سے کچھ کہہ دیتے ہیں کرایہ میں زیادہ تکرار کرتے ہیں۔ اور آپ کے اس طرز عمل سے جس جھٹکہ والے کی تخلیق ہوتی ہے
...سے پناہ مانگنے کی تاکید آئی ہے آپ کچھ پوچھیں گے تو جواب ہی نہ دے گا یا دے گا بھی تو ناخوشی کے ہم معنی۔ "مجھے
معلوم" آپ پوچھیں گے فلاں مکان معلوم ہے؟ وہ صاف اڑا دے گا "مجھے نہیں معلوم" اب آپ کہتے ہیں وہ مسجد ہے۔
...ڈاڑھی ہے۔ وہ کہاں ہے۔ وہ گردن ہلاتا رہے گا۔ "نہیں مجھے معلوم نہیں"۔ کوئی نل بیچ میں آگیا تو یہہ جھٹکہ روک دے گا۔
...پانی پیئے گا گھوڑے کو پلائے گا۔ اور اس کے بعد نہایت آہستہ چلائے گا۔ آپ تیز چلانے کو کہیں تو جواب دے گا۔ "کیا جانور کو
...ما۔ بچارہ چل کے دیکھیرے کہو کو آرہا ہے" اور بھیگے ہوئے دانہ کی بکیٹ سامنے سے اٹھا کر آپ کے پیروں میں رکھ دے گا۔

آپ کو مجبوراً دستی ناک سے لگانی پڑتی ہے۔ آپ کسی گلی میں داخل ہونے کو کہیں گے۔ وہ اڑ جائے گا۔" اس کے اندر جھٹکا نہیں آپ مجبور ہو کر گھر سے بہت دور اتر جاتے ہیں کرایہ دینے گئے تو لینے سے پہلے دیکھ لے گا کہ کیا دے رہے ہیں۔ اور منہ بنا کر "کیا دے رہے ہیں؟ کس کو دے رہے ہیں؟ آٹھ آنے سے ایک پیسہ کم نہ لوں گا" آپ کچھ سختی سے کہیں گے کہ کرایہ یہ ٹھہرایا گیا تھا تو وہ دلیل پیش کرے گا "کسے معلوم تھا کہ اتنا دور ہے ورنہ آتا ہی کیوں" آپ کو آٹھ آنے ہی دینے پڑتے ہیں ورنہ دو دو ہاتھ اور گالی گفتار کے لئے تیار رہنا پڑتا ہے۔ کرایہ لیتے ہوئے وہ آپ کو قائل کرائے گا کہ اس کا یہ روپیہ بالکل حق بجانب تھا کیونکہ "بساں جب سے نکلے ہیں۔ کوڑی کی آمدنی نہیں آپ جیسے شوقین بیٹھے تو بیٹھے۔ یا ہر پھر کر زنانی سواری پڑھنا ہے۔ آٹھ آنے کیا بہت ہیں۔ رستہ میں ٹھیرتے ہوئے بھی تو آئے۔" آپ نہ تو جواب دیتے ہیں اور نہ وہ اس کے سننے کے لئے ٹھیرتا ہے آپ پھر کبھی اس کے جھٹکے میں نہیں بیٹھتے۔

رشید قریشی

جدائی

میری آنکھیں نم تھیں۔ ہاں مجھے آنسوؤں پر قابو تھا۔ مگر تم دو ابلتے ہوئے چشموں کے روکنے پر قادر نہ تھیں۔ تم سے نظر نہ ملانا چاہتا تھا مجھے خوف تھا کہ تمہاری نظریں میرے سینے سے دل کو باہر کھینچ لیں گی۔ مگر میں محسوس کرتا کہ تمہاری نظریں میری نظروں کو ڈھونڈتی تھیں وہ چاہتی تھیں کہ میری کائنات پر اسی طرح ضوفشانی کرتی جس طرح کسی گلستان پر بہار کا سورج۔ تم نگاہوں سے ہاں زبان سے بھی ۔۔ مجھے تسلی و تسکین دینے کی کوشش کر رہی تھیں ہر مصیبت و غم کو برداشت کرنے تمہارے تسلی آمیز الفاظ نرم نازک لہجے میں ایک بے قرار دل پر اسی طرح اثر کر رہے تھے جس طرح مرجھائے ہوئے پھول پر صبح کی شبنم۔

تمہارے لرزتے ہوئے ہونٹ میرے ہونٹوں سے ملے تمہاری پُرنم آنکھیں میرے دل و دماغ کے لئے شراب سے لبریز پیالے تھیں، جدائی کی ساری تکالیف کو میں بھول چکا تھا۔

(ماخوذ از انگریزی) احمد علی اکبر راز قاسمی

افغانی قندہار نہیں۔ دکن کا قندہار جسے قندہار شریف کہا جاتا ہے۔ کیونکہ محمد تغلق کے ساتھ دکن میں آئے ہوئے اولیاء اللہ کی چودہ سو میں کا ایک کثیر حصہ قندہار شریف ہی کے حصہ میں آیا۔ یہ دکن کا بلگرام ہے۔ یہاں سے اولیاء، صوفیا، علما، شعرا، مورخین مشاہیر پیدا ہوئے جن کے حالات اور کارنامے "مشاہیر قندہار دکن" میں پڑھئے جس کو اکبر صدیقی صاحب بی اے نے مرتب و باتصویر شائع کیا اور اب ادارۂ ادبیات اردو کو اس کا حق تصنیف دے دیا ہے۔ (سہیم)

رامیند جی کمورشال، خدا کے فضل سے دولتمند آدمی تھا، لیکن وہ خوش قسمت نہیں تھا۔ موت اس کے دروازہ پر بھی استادہ تھی، اور ہر سال رامیند جی کے بیٹوں میں سے کسی نہ کسی ایک کو اپنی آغوش میں کھینچ لیا کرتی تھی۔ رامیند جی نے اس عالم آب و گل میں جب اپنی پہلی سانس لی، اس کی ماں کا سایہ سر سے اٹھ گیا تھا۔ اس کا باپ، ایک بیوہ بہن کی دیکھ بھال و نگہداشت کی اعانت سے، بے ماں بچے کی بہرحال پرورش کر رہا تھا، لیکن وہ بھی پانچ سال کے معصوم بچے کو چھوڑ کر مر گیا۔ اس وقت سے اس کی پھوپی کے سوا اس کا کوئی یار و مددگار نہیں تھا۔ لیکن پھوپی جان کو اپنے فرائض نگہداشت کی انجام دہی کے لئے ایک غیر متوقع ذریعے سے مدد مل گئی۔ اور وہ ذریعہ اس کا سوتیلا بیٹا جوگیش تھا۔ جوگیش اپنی سوتیلی ماں سے دور دور رہا کرتا تھا۔ وہ مفلس تھی اس لئے کسی قسم کی مالی امداد کی خواہش بجا طور پر کر سکتی تھی۔ اس لئے وہ ہوشیاری سے انجان و خاموش رہا کرتا تھا۔ لیکن جوں ہی اس نے یہ سنا کہ سوتیلی ماں ایک معصوم یتیم کی مختار نگراں کار بن گئی ہے، پھر تو ایک لمحہ بھی نہیں رہ سکا اور اس کی دستگیری کے حیلے سے چل پڑا لیکن بہت ہی کم عرصہ میں اس کی آرزو خاک میں مل گئی، اور مقاصد میں ناکامی کی صورت نظر آنے لگی۔ رامیند جی کو بمشکل کوئی چالاک یا ذہین لڑکا کہہ سکتا تھا، مگر اپنی پھوپی پر اس کو بیحد اعتماد تھا۔ وہ اس کے اشارہ پر اپنی جان تک قربان کرنے کے لئے مستعد تھا۔ جوگیش کی سوتیلی ماں کو بھی اپنے سوتیلے بیٹے سے کوئی امیدیں وابستہ نہیں تھیں، چونکہ اس نے پچھلے واقعات بھلائے نہیں تھے تاہم جوگیش اس قدر جلد مایوس ہو جانا نہیں چاہتا تھا۔ اس کی سوتیلی ماں ہمیشہ زندہ رہنے سے رہی، اور دنیا میں رامیند جی کا کوئی اور رشتہ دار بھی موجود نہیں تھا۔ لہٰذا جوگیش کے صبر و تحمل کا صلہ کبھی نہ کبھی مل ہی جائے گا۔ جوگیش کی شادی کم عمری میں ہو چکی تھی، لیکن اس کی بیوی اپنے والدین کے مکان میں ہی رہتی سہتی تھی۔ ماں کے لاڈ و پیار نے اس کی زندگی کو ناکارہ کر رکھا تھا اور وہ اپنے میکے سے دور زیادہ عرصہ تک نہیں رہ سکتی تھی۔ جوگیش جس زمانہ میں اپنے مکان میں مقیم تھا وہ ایک دو مرتبہ اپنی بیوی کو گھر لانے میں کامیاب ہوا، لیکن جس وقت سے وہ یہاں ٹھیرا اس کی آمد و رفت قطعی بند ہو گئی۔ اس کی خوشدامن اپنی لڑکی کو ایسے مقام پر بھیجنا ناپسند کرتی تھی جہاں اس کی آؤ بھگت نہ ہو سکے۔ چونکہ جوگیش کو اپنی سوتیلی ماں کے طرز عمل کے متعلق کوئی یقین نہیں تھا اس لئے وہ اپنے حق پر زور بھی نہیں دیا کرتا تھا۔ وہ اس کی بیوی کی آمد و رفت کو شاید اچھی نظر سے نہ دیکھے، یا اس کی بیوی کو یہاں کا ماحول بار خاطر گذرے۔ یہی ایک منتی تھی جس کے خوف سے جوگیش لرزہ براندام رہا کرتا تھا۔ اگرچہ اس کی بیوی رادھا رانی اپنے طور سے کبھی نہیں آئی، ہاں گاہے ماہے جوگیش کو بلوا لیا کرتی اور وہ اکثر ٹال کر کبھی چلے گر جایا کرتا۔ آج کل وہ تنگدست تھا اور ایک پیسہ بھی بچا نہ سکتا تھا۔ علاوہ ازیں وہ رادھا رانی سے ایک طویل عرصہ کے لئے دور رہنے سے ڈرتا تھا، مبادا ہو کہ اس کی سوتیلی ماں حرف گیر ہو۔ جوگیش اپنی ثابت قدمی سے لڑکے پر اچھا خاصہ اثر بٹھا چکا تھا۔ اب وہ لڑکا چپکے چپکے سے کچھ روپے پیسے اس کو لا کر دیا کرتا اور جوگیش لڑکے کی تعلیم کے بہانہ سے دن میں تین چار گھنٹے اپنے پاس رکھا کرتا۔ اب وہ اس بیوقوف کو ایک ہارمونیم خریدنے کی ترغیب دے رہا تھا۔ اس میں راز یہ تھا کہ ایک ناقص باجا فروخت کرا دیا جائے کیونکہ تاجر نے پچاس فیصدی کمیشن دینے کا وعدہ کیا تھا۔

رامیند جی اور اس کی پھوپی جس مکان میں رہتے سہتے تھے وہ کلکتہ کے مضافات میں واقع تھا۔ یہاں کے باشندے بہت ہی غریب اور جھونپڑیوں میں گذر بسر کرتے تھے۔ یہاں اینٹوں کے صرف تین چار مکان تھے، وہ بھی بہت پرانی طرز کے۔ اطراف و اکناف لانبے چوڑے کھیت، گھنے جنگل اور متعدد تالاب، کٹنٹے پھیلے ہوئے تھے۔ وحشت کا یہ عالم تھا کہ روز روشن میں گیدڑوں کی خوفناک آوازیں سنائی دیتی تھیں۔

ان کے اپنے گاؤں میں کھیتی باڑی کی خاصی جائداد تھی اور ایک ذاتی مکان بھی تھا لیکن اس مقام پر ان کی صحت ٹھیک نہیں رہا کرتی تھی یا اس وجہہ گاؤں میں پھوپی رہنا چاہتی اور نہ بھتیجا، انھوں نے تمام زراعتی زمین پٹہ پر اوروں کو دے دی تھی۔ اور پھوپی جان سال میں ایک دو بار رقم وصول کرنے کے لئے گاؤں کو جایا کرتی تھی۔ جوگیش وصولی رقم میں اس کی مدد کرنا چاہتا تھا لیکن اس کی سوتیلی ماں اس پیش کش کو ٹال جاتی تھی۔ دن گذرتے جاتے تھے، اور رامیندھی عالم شباب کے طرف سرعت کے ساتھ گامزن تھا "میں بوڑھی ہوگئی ہوں شاید کسی دن میری آنکھیں بند ہو جائیں" اس کی پھوپی جان نے ایک دن اثنائے گفتگو میں کہا "اگر میں اس کی شادی کسی موزوں لڑکی سے کرادے سکوں تو میں اطمینان کے ساتھ اپنی آخیر سانس لوں گی"۔ رامیندھی اور جوگیش اس وقت دوپہر کا کھانا کھا رہے تھے۔ رامیندھی یہہ سن کر خوش ہوگیا، لیکن اس کو محسوس ہوا اور اپنا سر نیچے جھکا لیا۔ "تم اس کی شادی کی فکر ابھی سے کیوں کر رہی ہو؟" جوگیش نے کہا "وہ تو بمشکل سولہ سترہ سال کا لڑکا ہی تو ہے اور اب تک اس کی کوئی خاص تعلیم بھی نہیں ہوئی ہے۔" "یہہ کوئی اہم بات نہیں ہے،" اس کی سوتیلی ماں نے کہا "اس کے معاملہ میں زیادہ گہرائی میں جانے کی ہمیں کوئی ضرورت نہیں ہے۔ ہاں یہہ صحیح ہے کہ وہ نوعمر ہے۔ تو کیا ہوا، ہم اس کے لئے ایک کم سن دلہن تلاش کرلیں گے۔ اس کا ذکر اس کے لئے کوئی چنداں ضرورت نہیں ہے۔ اور اس سے حاصل ہی کیا ہے؟ لوگ روپیہ کمانے تعلیم حاصل کرتے ہیں۔ اس کے پاس تو کافی دولت ہے اپنے گذارے کے لئے اس کو کمانے کی نوبت ہی نہیں آئے گی۔ بلکہ یہاں صورت حال یہہ ہے کہ وہ ہمیشہ بہت سارے کاہلوں کی پرورش کرے گا۔"

جوگیش ان برجستہ جوابات کو سن کر پیچ و تاب کھا کر دم بخود رہ گیا۔ اور سخت پریشانی میں مبتلا ہوگیا اگر بڑھیا رامیندھی کی اب شادی کردینے کا مستقل ارادہ کرلے تو جوگیش کو اس پر نگاہ رکھنی پڑے گی۔ اس کی سوتیلی ماں اس بیوقوف کی دولت پر چیل کی نظروں سے تکتی رہتی تھی اس پر طرفہ یہہ کہ ایک دلہن عالم وارد ہوں گی تو خدا جانے دیکھ بھال کی نوعیت کیا ہو۔ ان دونوں کے درمیان تو جوگیش کی جان آفت میں رہے گی۔ ان مشکلات کے حل کی صرف ایک شکل نظر آرہی تھی یہہ کہ کسی پھوہڑ لڑکی کا انتخاب کرکے، رامیندھی کے ساتھ اس کی شادی رچائے۔ کچھ عرصہ بعد جوگیش خط لئے ہوئے سوتیلی ماں کے پاس پہونچا۔ بڑھیا مبرخانہ میں کام کر رہی تھی۔ جوگیش نے کہا "میں آپ سے کچھ کہنا چاہتا تھا" اس کی سوتیلی ماں نے کہا "مجھ کو یہہ سب کام ختم کرنا ہے جو کچھ کہنا ہو کیا وہیں سے بیان نہیں کرسکتے؟" "لڑکے کی شادی کے متعلق حال میں آپ کچھ بات چیت کر رہی تھیں"۔ جوگیش نے کہا "میں ایک اچھے خاندان سے واقف ہوں۔ اگر آپ مجھ کو اجازت دیں تو میں گفت و شنید کا سلسلہ چھیڑ دوں"۔ اس کی سوتیلی ماں نے کوئی دلچسپی نہیں لی "لڑکی کون ہے کس کی ہے؟" "ان کا مکان کہاں واقع ہے؟" "یہاں سے کچھ دور نہیں" جوگیش نے کہا "میری بیوی سے اس کی رشتہ داری ہے اور واقعہ یہہ ہے کہ یہہ لڑکی تو اس کی ممیری بہن ہی ہے، خوبصورت بھی ہے، عمر تو بس اپنے رامیندھی کے لئے بالکل موزوں ہے۔ اچھی خاصی سمجھدار بھی ہے اور وقت پر اپنا پورا کاروبار سلیقہ کے ساتھ چلالے گی"۔ ان ساری باتوں سے رامیندھی کی پھوپی غیر متاثر سی رہی۔ "دلہن کا باپ کیا کام کرتا ہے؟ اس کی حیثیت کیا ہے؟ کیا وہ گھر کے کھاتے پیتے لوگ ہیں؟" جوگیش کی گفتگو پر جس خشک انداز میں توجہہ کی گئی اس سے وہ کچھ حواس باختہ ہوا "اس کا باپ مرچکا ہے" اس نے کہا "وہ یتیم ہے اور میری خوشدامن نے اس کو پالا پوسا ہے۔ مجھ کو حیرت ہے کہ آپ دولت کی کیوں فکر کر رہی ہیں؟ آپ کے رامیندھی کے ہاں تو اللہ کا دیا ہوا اس قدر ہے کہ اس کو کسی خسر کی دولت کی احتیاج ہی کیا ہے"۔ "تاہم میں یہہ ہرگز نہیں چاہتی کہ دلہن کے لوگ مفلس و قلاش ہوں" "نیز میں اپنے لڑکے کی شادی کسی یتیم لڑکی سے نہیں کرانا چاہتی۔ اس کے والدین خود اس دار فانی سے کوچ کرگئے ہیں۔ اب تو اس کو ساس سسرے کی سخت ضرورت ہے، تاکہ وہ اس کی نگہداشت کرسکیں۔ وہ تنہا تو اس دنیا میں سیاہ سفید کا مقابلہ نہیں کرسکتا ہے۔ یہہ تو تم بھی جانتے ہو کہ اس کی اور اس کی جائداد کی نگرانی ہمیشہ کرنی

جوگیش کچھ صورت بنا کر یہاں سے کھسک گیا۔ اگر وہ رامسید ھی کی شادی اس لڑکی کے ساتھ کرا دے سکے تو اس کے معاملات بہت کچھ سلجھ جائیں گے
اپنے سسرال میں عزت بہت کچھ بڑھ جاتی' اور یہہ تو ظاہر ہے کہ لڑکی بھی نہایت مشکور رہتی۔ لڑکی کمسن تھی اور دنیا کے اونچ نیچ سے
واقف بھی' اس لئے لڑکی کو اپنے ہموار کر لینا جوگیش کے لئے بالکل آسان کام تھا۔ لیکن اس کی سوتیلی ماں کے چہرہ کا رنگ ڈھنگ اس کے معا
کچھ بہت افزا نظر نہیں آرہا تھا۔ لیکن یہہ اس طرز کا آدمی نہیں تھا جو بہت جلد ہمت ہار بیٹھتے ہیں۔ وہ روزانہ نت نئے پیامات لاتا' اور اپنی سوتیلی
ماں کا کافی عرصہ تک سمع خراشی کیا کرتا حتی کہ رامسید ھی سے راست گفتگو کر کے معاملہ طے کرنے کی کوشش کی۔ لیکن یہہ لڑکا کچھ ایسا بیوقوف تھا کہ اپنی بھلائی
میں بھی تمیز نہیں کر سکتا تھا کچھ عیاری سے اس کے ذریعہ کوئی کام نکالنا تو ناممکن تھا۔ ایک دن صبح یہہ بڑھیا جھاڑ جھنکے کی غرض سے اپنے بھتیجے کے
کمرہ میں گئی جس وقت بستر لپیٹ رہی تھی تو اس کے تکیہ کے نیچے سے تین چار تصویریں برآمد ہوئیں یہہ سب کی سب جوان اور خوبصورت لڑکیوں کی تصویریں تھیں
اس وقت جوگیش صبح کی چہل قدمی کے لئے باہر گیا ہوا تھا۔ بڑھیا نے رامسید ھی کو بلوا بھیجا' اور بہت سختی سے پوچھا "یہہ کیا ہیں" "میں کیا جانوں؟"
لڑکے نے مرعوب خوردہ لہجہ میں جواب دیا۔ "تم نہیں جانتے؟" اس کی پھوپی نے اور درشتی کے ساتھ پوچھا "پھر جانتا کون ہے' بابا؟ یہہ یہاں پہونچیں کیسے؟"
"دادا جوگیش نے یہہ لادئے ہیں۔ اور وہ یہہ جاننا چاہتے تھے کہ ان سب میں زیادہ خوبصورت کونسا ہے"۔ اس کی پھوپی نے بمشکل تبسم کو روکا' اور
تصویروں کو الٹ پلٹ کرنے لگی۔ تب اس نے پھر پوچھا "سب سے خوبصورت کون ہے' تم مجھے بتا سکتے ہو؟" رامسید ھی زور سے سر ہلایا اور بھاگ نکلا۔ اس کی
پھوپی یہہ تصویریں لے خود کے کمرہ میں چلی گئی۔ جوگیش' لڑکیوں کے جتنے پیامات لاتا' اگرچہ کہ اس بڑھیا کو ناپسند ہوا کرتے۔ لیکن یہہ اکیلی بیوہ کوئی بہتر پیام کا
انتظام بھی نہیں کر سکتی تھی۔ اس کو کوئی صلاح مشورہ دینے والا بھی نصیب نہیں تھا۔ اب اس نے یہہ تصفیہ کیا کہ ان چار لڑکیوں میں سے کسی موزوں لڑکی کا
انتخاب کر لینا چاہئے۔ اس کو اس بات کا تو یقین تھا کہ کوئی لڑکی اس کی مرضی کے مطابق پوری پوری نہیں اترے گی لڑکیوں کے نام۔ پتے تصاویر کی
پشت پر درج تھے۔ اس نے اپنی ایک سہیلی کے توسط سے ان کے متعلق معلومات حاصل کرنے کا ارادہ کر لیا۔ اسی دھن میں اس نے دوپہر کا کھانا جلد کھالیا
اور تصاویر لے کر اپنی سہیلی کے گھر کی طرف چل پڑی' اس کی سہیلی چندرا لکھمی نے جو خود بھی ایک بیوہ ہی تھی اپنی سہیلی کا خندہ پیشانی سے استقبال کیا؟ اور
تصویروں کو غور سے دیکھا۔ بعد اس نے کہا "اگر تم اپنے بھتیجے کے لئے حقیقت میں کسی دلہن کی تلاش کر رہی ہو۔ تو اجنبی گھروں میں گھس پڑنے کے بجائے اپنی
پرانی سہیلی کو کیوں نا ممنون کرتیں؟" رامسید ھی کی پھوپی کچھ حیرت زدہ سی رہ گئی' اور یوں گویا ہوئی "میں تو یہہ جانتی تھی کہ تمہارے صرف دو بیٹے تھے
تمہاری کوئی بیٹی بھی ہے؟" چندرا لکھمی نے مذاق سے اس کو دھکا دیا اور کہا "میری بیٹی اگر نہیں ہے تو نا سہی' تو کیا میرے خاندان میں کوئی لڑکی ہوگی؟
میری بھانجی سوشیلا کو بھول گئیں؟" "ہاں ہاں یقیناً! میں اچھی طرح جانتی ہوں' بچپن میں وہ کس قدر سندر تھی۔ تو کیا واقعی میرے بھتیجہ کے ساتھ شادی
پر تم راضی ہو جاؤ گی؟ تم تو جانتی ہو' اس نے کوئی تعلیم حاصل نہیں کی ہے"۔ "اوہ' کچھ مضائقہ نہیں' اس کی سہیلی نے کہا "وہ تعلیم یافتہ نہ سہی' لیکن
اتنا دولتمند ہے کہ ایک خاندان کی پرورش کر سکتا ہے۔ ہم کو دنیا کی ساری نعمتیں وقت واحد میں نصیب نہیں ہو سکتیں' خود ہماری مشکلات ہمارے سامنے ہیں
غریب بہن کا شوہر تو چل بسا ہے' وہ کسی قسم کا جہیز دینے سے معذور ہے"۔ رامسید ھی کی پھوپی تھوڑی دیر خاموش رہی۔ تب اس نے کہا' "معلوم ہوتا ہے
ہمارے میرے لڑکے کے نصیب میں کوئی نگہبان ہے ہی نہیں اب تک اس کے لئے جتنے بھی پیام آئے وہ سب باپ مرے ہوے لڑکیوں کے تھے۔ تاہم یہہ
سب سے بہتر ہے چونکہ یہہ تو تمہاری بھانجی ہے۔ تم دونوں بیچارے لڑکے کی یقیناً دیکھ بھال کرو گے۔ مگر لڑکی ہے کہاں؟ جس وقت وہ چھوٹی سی جان تھی
اس وقت اس کو دیکھی تھی۔ اب میں اس کو دیکھنا چاہتی ہوں" "وہ کلکتہ میں ہے' لیکن جب تمہارا جی چاہے اس کو دیکھ سکتی ہو" اس کی سہیلی نے کہا۔
"رامسید ھی کے ہمراہ' اتوار کو دوپہر میں' ہمارے ساتھ کھانے میں شریک ہو جاؤ تو ہمارے لئے بڑی خوشی کی بات ہوگی میں اپنی بہن کو بھی مدعو کروں گی'

اس موقع پر تم اس کو خوب دیکھ لینا" "تم نے تو خوب ترکیب سوچی" رامیندھی کی پھوپی نے کہا "میں مقررہ وقت سے کچھ پہلے ہی آجانے کی کوشش کروں گی"
یہہ کہتے ہوئے اس نے رخصت لی ۔ رامیندھی کو اس وقت خوش نصیب کہنا چاہئے کیونکہ آج اس کے سامنے صرف کوئی تصویر نہیں ہے بلکہ ایک مجسم
ہے جس کو آنکھ بھر کے دیکھ رہا ہے ۔ یہہ تسلیم کرنا چاہئے کہ جوگیش اپنی سوتیلی ماں سے کم عقل نکلا ۔ پہلی ہی نظر میں رامیندھی لڑکی پر فدا ہو گیا ۔ بنگالی معیار
لڑکی واقعی حسین تھی ۔ رنگ نہایت صاف تھا، جسم سڈول، اعضا متناسب، آنکھیں بڑی بڑی جن میں اعتماد کا رنگ جھلکتا تھا ۔ رامیندھی کی پھوپی
نے بھی لڑکی کو بہت پسند کیا ۔ تاہم وہ کچھ کہے بغیر نہ رہ سکی "لڑکی تو میرے لڑکے سے خاصی بڑی نظر آتی ہے ۔ اگر دلہن کم عمر ہوتی تو میں رضامند ہو جاتی"
"ہاں ہاں آپ بالکل سچ فرماتی ہیں" چندر الکھی نے کہا "پر ایسی معمولی وجہہ سے لڑکی کو رد نہ کیجئے ۔ یہہ بہت ہی اچھی لڑکی ہے اور جب یہہ لڑکی تمہارے
گھرانے میں داخل ہو جائے گی تو خود تم کو سب کچھ معلوم ہو جائے گا ۔ بہت ہی کم سن لڑکی تمہارے لئے تکلیف دہ ثابت ہوگی ۔ وہ رات دن رو رو کر تم
سخت پریشان کر دے گی ۔ میری سوشیلا تو ہر کام میں تمہاری مدد کرے گی وہ اس قدر سلیقہ مند اور گھر کے کام کاج سے اتنی واقف ہے کہ وہ پورے
کاروبار کا نہایت عمدگی کے ساتھ انتظام کر دے گی" بالآخر دونوں سہیلیوں میں اس پیام کا تصفیہ ہو گیا ۔ رامیندھی تو اس رشتہ سے باغ باغ
جوگیش کے کانوں تک جب یہہ خبر پہونچی تو وہ آگ بگولہ ہو گیا ۔ وہ اپنی سوتیلی ماں کے پاس دوڑتا گیا اور کچھ سخت لہجہ میں بکنا شروع کیا "بڑی دوڑ دھوپ کے
بعد آپ آخر ایک یتیم لڑکی ہی لا رہی ہیں نا ۔ تو پھر آپ نے میرے پیام کو کیوں انکار کر دیا تھا ۔ شاید اس لئے کہ وہ پیام میرے ذریعہ سے آیا، جس کا
بار خاطر گذر رہا تھا" بڑھیا اس ساری گرما گرمی کی وجہہ سے تو خوب واقف تھی ۔ چند کھری کھری باتیں سنانے کا اس نے ارادہ کر لیا تھا، لیکن مجبور
خاموش رہ گئی ۔ اپنی طبیعت پر کچھ قابو پانے کے بعد کہا "یہہ جوڑا مجھے بیحد پسند ہے، اسی لئے میں نے اس کو بخوشی قبول کر لیا ہے اگر چہ وہ یتیم ہے لیکن میں اس کو
بچپن سے خوب جانتی ہوں، سب سے بڑھ کر یہہ کہ وہ نہایت اچھی لڑکی ہے" جوگیش جواب میں بہت کچھ کہنا چاہتا تھا، لیکن وہ یہہ بھی سمجھ گیا کہ ساری الفاظ
بے سود ثابت ہوگی ۔ شادی کا مسئلہ تو امر فیصل شدہ ہو گیا ۔ اس کی عیارانہ چالیں شادی کو روک سکتیں، اور نہ کسی قسم کی رکاوٹیں پیدا کی جا سکتی تھیں
ہندو شادیوں میں جہیز کا مسئلہ ہی بہت ساری مصیبتوں کا باعث ہو سکتا ہے مگر یہاں تو اس کے دینے نہ دینے کا سوال ہی ختم کیا جا چکا ۔ دلہن کو
تحفہ تحائف دینا نہ دینا، اس کے لوگوں کی اختیاری بات ہے ۔ چونکہ جوگیش کی سوتیلی ماں دلھن کے رشتہ داروں سے خوب واقف تھی، ان کے سلسلہ میں کسی
قسم کی دروغ گوئی سے یہہ معاملہ ٹوٹ نہیں سکتا ۔ اس کے دماغ میں کئی ایک ترکیبیں سوجھیں لیکن سب فضول ثابت ہوئیں ۔ اور شادی کی مقررہ تاریخ
قریب ہوتی گئی ۔ بڑھیا نے شادی کے موقع پر اس کی بیوی رادھارانی کو بھی مدعو کیا، لیکن طبیعت کی ناسازی کا عذر کر کے وہ نہیں آئی ۔ جوگیش کی سوتیلی
نے پھر کہلا بھی نہیں بھیجا ۔ جوگیش کے حرکات سکنات سے گویا وہ عادی ہو گئی تھی لیکن رادھارانی کی اس کے ساتھ تو ایک دن بھی نہیں بنے گی ۔ رامیندھی کی شادی
کے رسوم بغیر کسی ناگوار واقعہ کے ادا ہو گئے ۔ شادی میں کوئی دھوم دھام اور نمائش نہ تھی، لیکن دونوں طرف کے تمام رشتہ دار اس موقع پر خوشی خوشی جمع تھے
اور مبارکبادیاں پیش کیں ۔ جس وقت دلھن اپنے میکے سے رخصت ہو رہی تھی تو دلھن کی ماں نے جوگیش سے استدعا کی کہ وہ لڑکی پر نظر رکھے ۔ جوگیش کے
ہونٹوں پر شاطرانہ مسکراہٹ تھی ۔ اس کی گنجان مونچھوں کی وجہہ سے اس پر کسی کی نگاہ نہیں پڑی، سوشیلا اپنے نئے مکان میں داخل ہوئی ۔ شادی کے
سلسلہ میں مکان کی درستی، صفائی اور آراستگی کی وجہہ سے مکان گویا نیا معلوم ہوتا تھا ۔ ادائی رسم کے لئے مکان میں لوگوں کا ہجوم تھا، اور سچ تو یہہ ہے
موقع کے لحاظ سے سجایا بھی خوب گیا تھا ۔ دلھن کا اس کے نئے مکان میں رسمی استقبال کیا گیا، اور شنکھ کی تیز صداؤں نے یہہ خبر گھر گھر پہونچا دی ۔ سب سے
پہلے رامیندھی کی پھوپی نے دلھن کا چہرہ دیکھا ۔ جواہرات کا ایک بڑا صندوق اس کے ہاتھ میں تھا ۔ جوگیش خشمناک نظروں سے اس کی طرف گھور رہا تھا
بڑھیا نے صندوق میں سے سونے چاندی کے جگمگاتے زیورات کا ایک انبار نکالا اور یکے بعد دیگر سب دلھن کو پہنا دے ۔ جو لوگ چاروں طرف جمع ہو گئے

سب دس
ان کی طرف دیکھتے ہوئے استدعا کی "براہ کرم دلہن کو برکت دیجئے اور دعا کیجئے کہ یہہ اس کا سنگار اس پر سے کبھی نہ اترے" سب مہمانوں کے زبان پر تعریف و توصیف کے کلمات تھے۔ زیورات کی بھی کوئی حد ہے! ان سب کی تقریباً دس ہزار لاگت ہوگی۔ حقیقت میں لڑکی نہایت خوش قسمت ہے۔ وہ اپنے میکے سے شادی کا ارزاں ترین لباس پہنے بغیر کسی زیور کے یہاں آئی۔ ہاں پتلی چوڑیوں کا ایک جوڑ ضرور تھا۔ اور جوں ہی اپنے شوہر کے مکان میں قدم رکھا شہزادیوں کے سے زیورات نصیب ہو گئے۔ جوگیش غصہ سے دانت پیستے ہوئے اپنے کمرے میں جا بیٹھا۔ جواہرات وغیرہ کے لئے روپیہ جہاں سے ملا اس کا اسے خوب پتہ تھا۔ رامیندھی کا باپ اپنے کسی ہمسایہ کا مکان چند ہزار میں رہن رکھ لیا تھا۔ اب تک اس پر سود خوب بڑھتا چلا جا رہا تھا۔ اور واقعہ یہہ ہے ایک دو سال بعد تو پورا مکان رامیندھی کے قبضہ میں آ جا سکتا تھا۔ لیکن بڑھیا کی یہہ کس قدر بیوقوفی ہے کہ کل سود معاف کر دیا' اور صرف اصل رقم لے کر جس کا مکان تھا اس کے حوالے کر دیا' یہہ احمقانہ معاملہ جوگیش پر نہایت شاق گذر رہا تھا۔ لیکن بڑھیا نے اس کے علم و اطلاع کے بغیر یہہ تصفیہ کر لیا تھا۔ ورنہ اس کو اتنی رقم کہاں سے مل جاتی؟ جوگیش کچھ ایسا متاثر تھا گویا کسی نے اسی کا پیدائشی حق غصب کر لیا۔ دلہن کو تحفتہً دینے کے لئے اس نے نہایت سستے داموں کے رولڈ گولڈ کی بالیاں فراہم کی تھیں۔ لیکن وہ ان سب واقعات کو دیکھ کر اس قدر غضبناک ہوا کہ ان کو دوبارہ مقفل کر دیا۔ جب رسم و رسوم سب کچھ ادا ہو گئے اور مہمانوں نے اپنی اپنی راہ لی تو موقع پاکر یہہ اپنی سوتیلی ماں کے پاس پہونچا۔ "اتنی کثیر رقم خواہ مخواہ چھوڑ دینا کیا آپ مناسب سمجھتی ہیں؟ آخر ایسی ضرورت ہی کیا پڑی تھی؟" "ایک حقیر رقم کی خاطر' غریب بوڑھے برہمن کا مکان اگر میں حاصل کر لیتی تو کیا کوئی نیک نامی ہوتی۔ حقیقت زیورات کے لئے تو مجھ کو رقم کی شدید ضرورت تھی۔ آخر میرے بھتیجے کی بیوی زیورات سے محروم کیوں رہے؟ اسی وجہہ سے جس روز وہ میرے ہاں آئی میں نے اس کو وہ سب پیش کیا جن کی ایک دلہن مستحق ہوتی ہے" "آپ کچھ انتظار کرتیں" جوگیش نے چلا کر کہا "ایسی کیا آفت آگئی تھی؟ رامیندھی تو بس ایک بیوقوف ہی ہے۔ لیکن تمھیں تو اس کی بہتری کا ہر وقت خیال ہونا چاہئے"۔ اس کی سوتیلی ماں نے سختی سے جواب دیتے ہوئے کہا۔ "آپ یقین کیجئے' مجھ کو تو شب و روز بس یہی دھن رہتی ہے۔ میں نے کوئی دھوپ میں بال سفید نہیں کئے ہیں۔ برائی بھلائی میں اچھی طرح تمیز کر سکتی ہوں" جوگیش کی کوئی اور بات سنے بغیر وہ یہاں سے چلدی' معاملہ کی اہمیت کا اب جوگیش کو کامل طور سے اندازہ ہو گیا۔ اگر وہ دور بینی سے کام نہ لے تو اپنا بوریا بستر باندھ کر کسی اور جگہ سدھارنا پڑے گا۔ وہ یہاں اس مقصد سے پڑا ہوا نہیں تھا کہ تین مرتبہ مفت کھانا اور رہنے کے لئے پختہ مکان مل جائے۔ یہہ تو اس کو اپنے دیہاتی مکان میں بھی نصیب ہو سکتا ہے اس کا اصل منشا یہہ تھا کہ یہاں پر کچھ ایسی چیز ہاتھ آ جائے کہ آئندہ آرام و آسائش سے گذرے اپنی آرزو کی تکمیل کے لئے وطن کو خیرباد کہا" بیوی سے ایک طرح کی کنارہ کشی کی' اور اب اپنی سوتیلی ماں کے ہاں انتہائی ذلتیں برداشت کرتا چلا آ رہا ہے۔ اگر اس کی مراد برانے کی توقع نہ رہی تو یہاں مزید قیام کرنا احمقانہ فعل ثابت ہوگا۔ فی الحقیقت مستقبل اب تاریک نظر آ رہا تھا۔ پہلے تو صرف سوتیلی ماں سے سابقہ رہا کرتا تھا اب تو رامیندھی کی بیوی اور اس کے رشتہ داروں کا بھی سامنا ہے۔ بڑھیا تو اس چھوکری پر روپیہ تو پانی کی طرح بہا رہی تھی' اس کے پاس نہ صرف دس ہزار کے جواہرات و زیورات تھے' بلکہ روزانہ نئے کپڑے' فرنیچر کا سامان وغیرہ کا سلسلہ بندھ گیا تھا۔ یہہ سب روپے کی بربادی تھی۔ جوگیش نے رامیندھی کی دولت میں حصہ دار بن بیٹھنے کی ترکیبیں سوچی تھیں' لیکن دلہن کے جواہرات اور قیمتی ریشمی ملبوسات میں اپنا حصہ قرار دینے کے لئے کوئی تدبیر نہیں سوجھ رہی تھی۔ بڑھیا نے رامیندھی کی شادی ٹھیک وقت پر کرا دی تھی' کیونکہ اس کے بعد سے تو اس کی صحت سرعت کے ساتھ بگڑتی چلی جا رہی تھی۔ اس حالت میں جوگیش کو کچھ زیادہ توقع ہو گئی' لیکن پھر بھی اس کو بڑھیا کے سامنے اپنی شکست کا احتمال لگا ہوا تھا۔ جب اس نے یہہ دیکھا کہ اس کی سوتیلی ماں' گاؤں کی ساری جائداد فروخت کر کے' اس رقم سے کلکتہ میں ایک بڑے مکان کے تعمیر کرنے کا ارادہ کر رہی ہے' تو اس کی کمر ہی بیٹھ گئی یہہ نئی عمارت آئندہ رامیندھی کی بیوی کی جائداد ہوگی۔ درگا پوجا کا تہوار قریب آ رہا تھا۔ رامیندھی کی پھوپھی

تہوار منانے کا اچانک طور سے تہیہ کیا۔ لیجئے پوجا خود اپنے مکان میں، جوگیش نے ترشروئی سے اختلاف کرتے ہوئے کہا "ہم نے اپنے مکان میں کبھی پوجا
نہیں کی۔ اب اس میں کیا فائدہ نظر آرہا ہے۔ اس کا مطلب صرف یہی ہے کہ خرچ و اخراجات کا سلسلہ ختم ہی نہ ہو۔ اب تو رامیندھی کی شادی
ہوچکی ہے، آپ کو زیادہ سے زیادہ محتاط رہنا چاہئے۔" "اوہ، اس میں خرچ ہی کیا ہوگا" ضدی بڑھیا نے کہا "میرا لڑکا اس سے بھکاری تو نہیں
بن جائے گا۔ اب اس کی شادی ہوچکی ہے، تو دیوتاؤں کو خوش کرنا اس کا پہلا فرض ہے مجھ کو ہمیشہ اس کی تمنا رہی ہے اور اس مرتبہ تو میں
ضرور سرانجام دوں گی" رادھارانی کو دوبارہ دعوت دی گئی۔ اب کے تو اسے انکار کرتے نہیں بنی کیونکہ اسے اندیشہ تھا کہ شوہر پاس جانے کے
بار بار کا انکار ممکن ہے لوگوں میں کچھ چہ میگوئیاں پیدا کرے۔ وہ پوجا کردے۔ وہ پوجا سے کچھ ہی پہلے آئی۔ چونکہ وہ نئی دلھن کے شاندار زیورات قیمتی
کا حال سن چکی تھی۔ اس لئے بظاہر رامیندھی کی بیوی کا ساتھ دینے کے لئے اپنے عزیز و اقارب سے چند جواہرات و نفیس جوڑے اس نے مستعار لئے
جوگیش اس وقت تک تنہا رہا کرتا تھا۔ لہٰذا جو کمرہ اس کے سپرد تھا وہ چھوٹا ہی تھا لیکن اب تک اس کو اس نقص کا احساس بھی نہیں تھا
بیوی کو کہنا پڑا "ایسی غلامانہ زندگی بسر کرتے ہوئے یہاں پڑے رہنے میں آخر تمھیں مل کیا رہا ہے" جوگیش کی بیوی نے ابروؤں میں شکن ڈالے
ہوئے پوچھا "رہائش کے لئے تمھیں ایک اچھا کمرہ بھی تو نصیب نہیں۔" "ایسی بے صبری سے کوئی فائدہ نہیں" اس کے شوہر نے کہا "تمھیں وقت
کا ساتھ دینا چاہئے علاوہ اس کے یہاں بڑے کمرے خالی نہیں ہیں۔ اس مکان میں تو بڑے کمرے صرف دو ہی ہیں ایک تو بڑھیا نے خود
دوسرے میں نئی دلھن صاحبہ رہتی ہیں ان دونوں میں سے کسی کو میں یہ نہیں کہہ سکتا کہ میرے لئے اپنا کمرہ خالی کردیں۔" "یہ لڑکی واقعی
بڑی خوش قسمت ہے" رادھارانی نے کہا "یہ گویا کنگال کی جھونپڑی سے نکل کر شاہی تخت پر پہونچ گئی اور مجھ کو دیکھو! اماں باپ کے گھر میں ہمیشہ کے لئے
غربت و تنگدستی کے دن گذار رہی ہوں۔" "کچھ انتظار کرکے تو دیکھو" جوگیش نے کہا۔ "انتظار، بالکل صحیح" رادھارانی نے تیزی سے کہا "ہاں مجھ کو
تو موت تک انتظار ہی انتظار کرنا ہے یہ میں جانتی ہوں؟ کیا تم نے سنا پوجا کے سلسلہ میں سوشیلا کو چند ہیرے تحفتہً دے جا رہے ہیں؟ مجھے اپنے پر
کہ محض بیوقوف بننے کے لئے یہاں کیوں آئی۔" جوگیش نے ساری رات بیداری میں گذار دی، لیکن اپنی بیوی سے بات چیت کرنے کی جرأت نہیں
پوجا کے مراسم شان و شوکت سے ادا کئے گئے۔ سوشیلا کے لئے اور پرانے جواہرات کا گھر میں اور باہر ہر زبان پر چرچہ تھا۔ رادھارانی کی طنز آمیز زبان سے
آخر بیوقوف رامیندھی بھی نہ بچ سکا "بھائی جان میں یہ کہتی ہوں" اس نے کہنا شروع کیا "کیا سب جواہرات صرف تمہاری حسین و جوان بیوی کے
ہیں؟ کیا تمہاری ایک عمر رسیدہ اور بدشکل بھابی ان میں سے ایک روکی بھی حقدار نہیں؟" رامیندھی یہ سن کر اپنے میں گھبراہٹ اور پریشانی محسوس کیا
"میں نے تو اس کو کچھ بھی نہیں دیا ہے" اس نے کہا "یہ سب کچھ پھوپی جان کا دیا ہوا ہے" "تو اس کا مطلب یہ ہوا" رادھارانی نے کہا "کہ ساری
دولت تو تمہاری ہے، نہ کہ تمہاری پھوپی جان کی۔" رامیندھی یہ جملہ سننے کے بعد احمقانہ انداز میں اس کو گھورتا رہا۔ بعد یہ کہتے ہوئے جھپٹ ہوا "بالکل
ٹھیک ہے، میں آپ کے لئے کچھ کوشش ضرور کروں گا۔" وجئے کے دن جو پوجا کا اخیر دن ہے، رامیندھی سونے کی ایک زنجیر لئے رادھارانی کے پاس
پہونچ کر اس کی نذر کردی اور اس کے قدموں پر جھک گیا۔ رادھارانی نے کچھ اس طرح مکاری کی کہ یہ واقعہ گویا اس کے لئے نہایت تعجب خیز ہے اور کچھ مدھم
آواز سے کہا "اوہ میرے پیارے بھائی، یہ تم نے کیا حرکت کی؟ کیا تم نے یہ نتیجہ نکالا تھا کہ میری گفتگو سنجیدگی پر مبنی تھی؟ میں تو صرف مذاق کر رہی تھی"
"میں یہ کیسے جان سکتا تھا" رامیندھی نے جواب دیا "میں نے سوچا کہ واقعی آپ کا مطلب یہی ہے، لہٰذا میں نے پھوپی جان سے عرض کردی اور انھوں نے
یہ مجھ کو دے دیا۔" جوگیش نے بیوی کو اپنے کمرہ میں بلوایا، اپنے غصہ کو دبلاتے ہوئے کہا "ان حرکات و سکنات سے مجھے کیوں اس طرح بیوقوف بنا رہی ہو
اگر ہم میں زیورات خریدنے کی سکت نہیں ہے، تو کیا ان کی بھیک مانگا کریں؟" "بس اب خاموش بھی رہئے" رادھارانی نے چلاتے ہوئے کہا۔

"جو شخص اپنی بیوی پر بادہ سے زیادہ سختیاں روا رکھتا ہو وہی سب سے زیادہ ناکارہ انسان ہوا کرتا ہے۔ کیا تمہارا منشا یہہ ہے کہ نئی دلھن کی ایک لونڈی کی طرح گھومتی رہوں؟" جوگیش انتہائی غصہ میں کمرہ سے باہر نکل گیا اور دن بھر واپس نہیں لوٹا شام میں یہہ کہلا بھیجا کہ وہ کسی ضروری کام پر دو تین روز کے لئے شہر سے باہر جا رہا ہے۔ رادھا رانی کا چہرہ غصہ سے لال ہو گیا۔ مگر اس کا اظہار کس پر کیا جاتا۔ چار و ناچار خاموش رہنا پڑا۔ رامندھی نے بھائی کو سمجھانے منانے کی بہت کوشش کی لیکن اس غریب پر کوئی خاص توجہ نہیں کی گئی۔ طویل تہواروں کے ختم ہونے پر سب لوگ تھک گئے تھے اس لئے دس بجنے سے پہلے ہی پورا خاندان گہری نیند میں خراٹے بھر رہا تھا۔ لیکن ان کے لئے آرام کی نیند نہیں تھی۔ رات میں یکایک نسوانی خوفزدہ چیخوں کی مسلسل آوازوں سے پورا محلہ بیدار ہو گیا۔ تھوڑے ہی عرصہ میں رامیندھی کے گھر کے اطراف ایک پریشان ہجوم جمع ہو گیا لیکن چور اس وقت تک اچھی طرح سے لوٹ سمیٹ کر فرار ہو چکے تھے۔ ساری رات غم و غصہ میں کف افسوس ملتے ہوئے بسر ہوئی صبح میں پولیس آگئی اور جوگیش فوراً ان کے پیچھے پیچھے روانہ ہوا۔ جونہی اس کی سوتیلی ماں نے اس کو دیکھا غصہ سے برس پڑی "کہاں جا مرے تھے نابکار کہیں کے؟ کیا تم سے مکان میں بھی نہیں رہا جا سکتا؟ ہم تو بالکل تباہ و برباد ہو گئے۔" جوگیش سراسیمگی کی حالت میں آنکھیں پھاڑ کر دیکھنے لگا "کیا واقعہ ہوا؟" اس نے دریافت کیا۔ اپنی پھوپی کے جواب دینے سے پہلے ہی رامیندھی چلا اٹھا "چور گھس پڑے تھے اور تمہاری بیوی کے تمام زیورات لے کر کافور ہو گئے" جوگیش مردے کی طرح زرد پڑ گیا "وہ کمرہ میں تنہا کیوں پڑی رہی؟" وہ کچھ گنگنایا "وہ ماں جان کے ساتھ کیوں نہیں سوئی؟" "میں نے سوچا کہ اس دورافتادہ کمرہ میں اکیلی پڑے رہنے کے لئے وہ خوف کریں گی" رامیندھی نے کہا "اس لئے آپ کے کمرہ میں سو جانا ہم نے مناسب سمجھا اور بہن صاحبہ ہمارے کمرہ آرام کر رہی تھیں۔" جوگیش صحن میں بیٹھ تو گیا مگر ایک بیہوشی کے عالم میں ڈھیر ہو گیا۔ کمرہ میں سے رادھا رانی کی رنج و غم کی آہیں اس کے دل و دماغ کو چھید رہی تھیں۔

تھوڑی دیر بعد وہ اٹھا اور رامیندھی کو کمرہ سے باہر کھینچ لایا "میری بیوی کے ساتھ اس قدر عنایت سے پیش آنے کے لئے آپ سے کس نے استدعا کی تھی؟" اس نے سختی سے پوچھا "کیا ماں نے؟" رامیندھی ایک بیوقوف کی طرح اس کو تکنا شروع کیا "نہیں' ماں نے نہیں میری بیوی نے کہا تھا کہ مکان کے اپنے گوشہ میں شور و غل مچ رہا ہے اس لئے ایک مرتبہ آپ کے کمرہ میں آرام کرنے کی خواہش ظاہر کی۔ اور اسی نے یہہ رائے بھی دی کہ بہن ہمارے کمرے میں سو جائیں۔"

جوگیش اپنے دل میں قتل و خون کے خیال سے اس بیوقوف کو گھور رہا تھا۔ اس کے بعد وہ خود اپنے ہاتھوں سے اپنے بال نوچنا شروع کیا۔

(سیتا دیوی) مترجمہ ایس۔ بی۔ اننتا

ادارۂ ادبیات اُردو کی مشہور و معروف کتابیں

مرقع سخن
جلد اول
حیدرآباد دکن کے پچیس شعرائے دورِ آصفیہ کا باتصویر تذکرہ پچاس سے زیادہ تصاویر اور چار سو سے زیادہ صفحات۔
مجلد قیمت صمہ

مرقع سخن
جلد دوم
حیدرآباد دکن کے پچاس دیگر شعرائے دورِ آصفیہ کا باتصویر تذکرہ پچاس تصاویر ۴۰۰ صفحات
مجلد قیمت صمہ

سراج سخن
انتخاب کلام شاہ سراج اورنگ آبادی
مرتبہ
پروفیسر عبدالقادر سروری
معہ سوانح شاہ سراج
صـ ۱۵۲ قیمت ۱۲ ار

ایمان سخن
انتخاب کلام شیر محمد خاں ایمان
مرتبہ
مولوی سید محمد صاحب …
معہ سوانح ایمان صـ ۱۲۰
قیمت ۱۲

فیض سخن
انتخاب کلام حافظ میر شمس الدین محمد فیض
مرتبہ
ڈاکٹر سید محی الدین قادری زور
معہ سوانح فیض صـ ۱۴۴ قیمت ۱۲

بادۂ سخن
انتخاب کلام ڈاکٹر احمد حسین مائل
مرتبہ
ڈاکٹر سید محی الدین قادری زور
معہ سوانح و تصویر صـ ۱۳۸ قیمت ۱۲

کیف سخن
انتخاب کلام سید رضی الدین حسن کیفی
مرتبہ
ڈاکٹر سید محی الدین قادری زور
معہ سوانح و تصویر صـ ۱۲۲ قیمت ۱۲

متاع سخن
انتخاب کلام نواب عزیز یار جنگ عزیز
مرتبہ
ڈاکٹر سید محی الدین قادری زور
معہ سوانح و تصویر عزیز صـ ۲۵ قیمت ۱۲

ورڈسورتھ اور اسکی شاعری
مشہور انگریز شاعر کے حالات اور کلام پر تبصرہ
از۔ مولوی میر حسن صاحب ام اے
معہ تصویر شاعر (۱۸۴) صفحات
قیمت صرف ۱عہ

ٹیگور اور اسکی شاعری
ہندوستان کے مشہور شاعر رابندر ناتھ ٹیگور کے حالات اور کلام پر تبصرہ
از۔ مولوی مخدوم محی الدین صاحب ام اے
معہ تصویر شاعر صفحات (۱۲۸)
قیمت ۱عہ

یوسف ہندی قید فرنگ میں
مرزا غالب کی قید فرنگ کے حالات
مرتبہ
مولوی محسن بن شبیر صاحب بی اے۔ ال ال بی۔ صفحات ۸۰
قیمت ۸ر

ہوش کے ناخن (ڈرامہ)
حیدرآباد کی سماجی زندگی …
مصنفہ
مخدوم محی الدین و میر حسن صاحب
صفحات (۹۶)
قیمت

نذر ولی
ولی اورنگ آبادی کی شاعری کے مختلف پہلوؤں پر تفصیلی مضامین کا مجموعہ از
لطیف النساء بیگم بی اے، انجم النساء بیگم بی اے
نعیم النساء بیگم بی اے، جہاں بانو بیگم بی اے
صـ ۲۸۰ قیمت عاں ۸ر

نقد سخن
کلام فانی پر نواب عزیز یار جنگ بہادر عزیز کی تنقیدوں کا مجموعہ
قیمت
عمہ ۸ر

گریہ و تبسم
صاحبزادہ میکش کی نظموں کا مجموعہ
قیمت
عاں

مشاہیر قندھار دکن
دکن کے مشہور مردم خیز …
دلچسپ باتصویر تاریخ
از
اکبر صدیقی بی اے
قیمت عہ

خطبۂ صدارت

[جو اسمٰعیل کالج جوگیشوری بمبئی کے یوم اقبال منعقدہ ۲۸ اگسٹ ۴۸ء میں پڑھا گیا۔]

معزز خواتین و حضرات!

مشرق کے اس شاعر اعظم کے متعلق تمہید و تعارف کے طور پر کچھ عرض کرنے سے قبل ضروری ہے کہ آج کے اس عظیم الشان جلسہ کی صدارت کے لئے آپ حضرات نے جو مجھے منتخب فرمایا ہے اس کا دلی شکریہ ادا کروں۔

اس موقع کے لئے مجھ سے بہتر اصحاب موجود تھے لیکن میں سمجھتا ہوں کہ میرے نام پر جو قرعۂ فال پڑا ہے اس کی وجہ شاید یہ ہو کہ صدیوں سے دکن اور گجرات کے علمی و ادبی تعلقات رہے ہیں۔ یہی دونوں سرزمینیں ابتدا میں اردو زبان و ادب کی گہوارہ تھیں اور ابھی شمالی ہند اور خاص کر دو آبہ گنگ وجمن اُردو و ادب کے فیضان سے محروم تھا کہ گجرات و دکن میں بیسیوں ادیب اور شاعر پیدا ہوئے اور نہ صرف یہی بلکہ ان کے آپس میں اختلاط و ارتباط بھی موجود تھا۔ خاص کر جب اکبر اعظم کے عہد میں احمد آباد کی مظفر شاہی سلطنت کا خاتمہ ہوگیا تو گجرات کے اکثر خدمت گزاران اُردو نے دکن ہی کی سلطنتوں میں پناہ لی۔ اس سے قبل بھی بیجاپور میں گجراتی شعرائے اُردو کا خاص اثر تھا۔ اور وہاں کے مشہور صوفی شاعر شاہ برہان الدین جانم نے تو اپنی زبان کو گجرات ہی کی طرف منسوب کر دیا تھا۔ جانم کے بعد اور کئی دکنی شاعر ایسے ملتے ہیں جن کے کلام میں گجرات کا ذکر موجود ہے اور خود گجراتی شعرائے اُردو نے بھی دکن کا ذکر کیا ہے اور ان دونوں علاقوں کا اردو ادب اس قدر گھل مل گیا ہے کہ آج محققین کے لئے بعض کتابوں اور مصنفوں کے متعلق یہ بتانا مشکل ہے کہ کون گجراتی ہے اور کون دکنی اور سچ تو یہ ہے کہ اس زمانے میں یہ اختلاف حائل ہی نہ تھا طرح طرح کے اختلافات اور قسم قسم کی قیود و بند تو ہماری اس نئی تہذیب و تمدن کا نتیجہ ہیں!

عہد قدیم کے اختلاط اور میل جول کا ایک اہم نمونہ اردو کے قدیم شاعر اعظم ولی کی ذات گرامی ہے جن کو حیدرآباد والے دکنی اورنگ آبادی اور بمبئی والے اور خاص کر میرے دوست مولوی نجیب اشرف صاحب ندوی احمد آبادی کہتے ہیں ہر حال یہ غنیمت ہے کہ ولی کو بمبئی والا نہیں کہا جاتا ورنہ پروفیسر نجیب اشرف صاحب نے تو ان کے متعلق ایسا مواد جمع کر لیا ہے کہ اگر وہ چاہیں تو ولی کو بمبئی والا بھی ثابت کر دکھائیں

معزز خواتین و حضرات!

اس جلسہ کی صدارت قبول کر کے حیدرآباد سے یہاں حاضر ہونے کی اس قدیم تاریخی وجہ کے ساتھ ساتھ ایک جدید وجہ یہ ہے کہ مولانا نجیب اشرف ندوی کے علاوہ اس خوبصورت کالج کے قابل فخر صدر ڈاکٹر عبدالرحمن صاحب سے میرے جو پُر خلوص روابط ہیں ان کا اقتضا ہی یہ تھا کہ وہ مجھے یاد کرتے اور مجھے انکار کرتے نہ بن پڑتی۔ خوش قسمت ہیں وہ طلبہ اور قابل ناز ہے وہ درس گاہ جہاں ایسے صاحب ذوق اساتذہ موجود ہوں

مجھے اپنے اس احساس نا قابلیت کے باوجود اس اہم تقریب کے فریضۂ صدارت کو اس لئے بھی قبول کرنا پڑا کہ یہ جلسہ ہندوستان کے مایۂ ناز شاعر علامہ سر اقبال مرحوم کی یاد منانے کے لئے منعقد کیا جا رہا ہے اور اردو زبان و ادب کے ہر بہی خواہ کا فرض ہے کہ وہ محسنین اُردو کی خدمات کا اعتراف کر کے نہ صرف اپنی سعادت مندی کا اظہار کرے بلکہ اپنے ذوق علم و ادب میں بھی اضافہ کرے۔

اقبال دنیائے مشرق کی اُن عظیم الشان ہستیوں میں سے تھے جن کا نام اور کارنامے رہتی دنیا تک یادگار رہیں گے اور آیندہ نسلوں کو درس حقیقت اور پیام حریت دیتے رہیں گے۔ ان میں حسن اتفاق سے ایسی خصوصیتیں جمع ہوگئی تھیں جو بڑی مشکل سے کسی خوش قسمت کو حاصل ہوسکتی ہیں۔ وہ قدیم تہذیب و شائستگی اور مشرقی علم و فضل کے ساتھ ساتھ نئی روشنی اور مغربی تمدن سے بھی بخوبی واقف تھے اور اپنی ذات میں ان دونوں کا اتنا اچھا امتزاج کیا تھا کہ شاید ہی کسی کو نصیب ہو۔

وہ حقیقت کے سچے ترجمان تھے۔ اور یہہ ظاہر ہے کہ حقیقت بالعموم تلخ ہوتی ہے یہی وجہہ ہے کہ ان کے کلام میں بعض جگہ وہ تلخی پیدا ہوگئی تھی جو پیغمبروں ہی کے رشد و ہدایت میں نظر آتی ہے۔ اس میں تو کوئی شبہہ نہیں کہ قدرت نے ان کو ایک الہامی شاعر پیدا کیا تھا ان کے کلام کو تصنع، تکلف، یا کسی قسم کی بناوٹ سے کوئی تعلق نہ تھا۔ اگر ان کی شاعرانہ زندگی کے ارتقاء پر ایک نظر ڈالی جائے تو معلوم ہوگا کہ شروع سے آخر تک ایک فطرتی تسلسل موجود ہے کہیں کوئی مبالغہ، آورد، یا فطرت سے برگشتگی نظر نہیں آتی۔ شاعر اپنے زمانہ کی پیداوار اور اپنے ماحول کا ترجمان ہوتا ہے اور یہہ مقولہ جتنا اقبال پر صادق آتا ہے شاید ہی کسی اور اُردو شاعر پر آسکے!

اقبال کی اردو شاعری کے آغاز کے وقت اردو ادب میں فطرت پرستی شروع ہوچکی تھی اور یہہ اس تحریک کی خوش قسمتی تھی کہ ابتدا ہی میں اس کو اقبال جیسا بلند ہمت نوجوان شاعر مل گیا۔ کوئی تحریک یا کوئی اصول اُس وقت تک کامیاب نہیں ہوسکتا جب تک اس پر عمل پیرا ہونے والوں میں کامیابی کی صلاحیت نہ ہو۔ اگر کسی اچھی سی اچھی تحریک اور مفید سے مفید اصول کی علمبرداری نااہلوں کے ذریعے ہو تو وہ اصول یا تحریک ایک کھلونا بن کر رہ جائے۔ آزاد اور حالی نے جس قومی اور فطرتی شاعری کا آغاز کیا اس سے اقبال اپنے عنفوان شباب کے زمانے میں متاثر ہوئے اور ان کی قومی شاعری کا آغاز اصل میں اُردو کی قومی شاعری کا ارتقا تھا۔ ان کی سب سے پہلی نظم ایک ایسے رفیع الشان موضوع پر لکھی گئی جس سے زیادہ رفعت اس مادی دنیا کی کسی چیز کو حاصل نہیں ہے اور وہ کیا ہے؟ دیوتاؤں کی جلوہ گاہ کوہستان ہمالیہ لیکن اس موضوع پر لکھتے وقت ہی شاعر کے قلم نے اس حقیقت کی طرف بھی اشارہ کردیا کہ اقبال محض ان مادی موضوعوں پر اکتفا کرنے والے نہیں ہیں۔ وہ ان کو حقیقت کی طرف بڑھنے کا ایک زینہ سمجھتے ہیں اور انھوں نے اس نظم کے پہلے ہی بند میں اس امر کا اظہار بھی کردیا، وہ کہتے ہیں ؎

اے ہمالہ اے فصیل کشور ہندوستاں　　چومتا ہے تیری پیشانی کو جھک کر آسماں
تجھ میں کچھ پیدا نہیں دیرینہ روزی کے نشاں　　تو جواں ہے گردش شام و سحر کے درمیاں
ایک جلوہ تھا کلیم طور سینا کے لئے　　تو تجلی ہے سراپا چشم بینا کے لئے

اس پہلی ہی نظم میں اقبال نے نیچرل یا فطرتی شاعری کا ایک ایسا اچھا نمونہ پیش کردیا کہ جدید اُردو شاعری کی یہہ تحریک کہاں سے کہاں نکل گئی ایسا معلوم ہوتا ہے کہ ایک بچہ اپنے گہوارے سے کود کر یکایک شباب کی سرحد تک پہنچ گیا۔ ہمالیہ پہاڑ کی نیرنگیوں، وہاں کی بے تاب ہواؤں، آوارہ بادلوں، تڑپتی ہوی بجلیوں اور رنگا رنگ بارشوں کے منظر کو کس خوبی سے بیان کرتے ہیں ؎

ابر کے ہاتھوں میں رہوار ہوا کے واسطے　　تازیانہ دے دیا برق سر کہسار نے
اے ہمالہ کوئی بازی گاہ ہے تو بھی جسے　　دست قدرت نے بنایا ہے عناصر کے لئے
ہائے کیا فرط طرب میں جھومتا جاتا ہے ابر　　فیل بے زنجیر کی صورت اڑا جاتا ہے ابر

آتی ہے ندی فراز کوہ سے گاتی ہوئی　　کوثر و تسنیم کی موجوں کو شرماتی ہوئی
آئینہ سا شاہد قدرت کو دکھلاتی ہوئی　　سنگ رہ سے گاہ بچتی گاہ ٹکراتی ہوئی
چھیڑتی جا اس عراق دلنشیں کے ساز کو　　اے مسافر دل سمجھتا ہے تری آواز کو

پھر وہی مجاز سے حقیقت کی طرف اشارہ! شاعر کی روح حقیقت کو بے نقاب کرنے کے لئے شروع ہی سے بے تاب نظر آتی ہے اس طرح کی

مختلف نظمیں اقبال کے ابتدائی دورِ شاعری کی پیداوار ہیں لیکن ایک بڑا شاعر محض کسی علمی وادبی تحریک کی علمبرداری کے لئے وقف نہیں ہو جاتا وہ اپنے گرد وپیش کے حالات وواقعات سے بھی متاثر ہوتا ہے۔ اقبال نے جب آنکھیں کھولیں تو ہندوستان پر ایک مغربی حکومت کے اثرات مسلط ہو چکے تھے اور اہلِ ہند اپنی قدیم مذہبی رواداریوں اور امن واطمینان کی روایتوں سے محروم ہو کر فرقہ وارانہ اختلافات کو کشمکشِ زندگی کا لازمی عنصر بنا چکے تھے۔ اس وقت شاید ہندوستانیوں نے پہلی دفعہ محسوس کیا تھا کہ ان کے آپس میں کتنے زیادہ اختلافات ہیں۔ جتنا یہ احساس شدید ہوتا جاتا سرزمینِ ہند کی نفاق انگیزیاں بڑھتی جاتیں اور جوں جوں اختلاط و قربت کی کوشش کی جاتی اتنا ہی افتراق و اختلافات میں اضافہ ہوتا جاتا۔ اس دردناک منظر سے ہر صاحبِ دل کا متاثر ہونا ضروری ہے اور اقبال پر تو اس کا اتنا اثر ہوا کہ وہ مارے شرم کے آبِ گنگا میں ڈوب جانا چاہتے ہیں۔ وہ کہتے ہیں ؎

وصل کیسا یاں تو اک قربِ فراق آمیز ہے | سرزمیں اپنی قیامت کی نفاق انگیز ہے | ہاں ڈبو دے اے محیطِ آبِ گنگا تو مجھے | مل رہا ہوں کل نہیں پڑتی کسی پہلو مجھے

اس چمن میں کوئی لطفِ نغمہ پیرائی نہیں | جس کے پھولوں میں اخوت کی ہوا آئی نہیں | ایک ہی خرمن کے دانوں میں جدائی ہے غضب | مارے یکرنگی کے یہ ناآشنائی ہے غضب

لذتِ قربِ حقیقی پر مٹا جاتا ہوں میں | اختلاطِ موجہ و ساحل سے گھبراتا ہوں میں

اس کے بعد وہ کہتے ہیں کہ شاعر تو اپنی قوم کا نمائندہ ہوتا ہے لیکن جب قوم ہی نہ ہو تو پھر شاعر کہاں۔ اس لئے وہ حیران ہیں کہ پھر ان کی اس شاعرانہ قوت کا مصرف ہی کیا ہے! وہ افسوس کرتے ہیں کہ ایک ایسے وقت میں پیدا ہوئے جب ان کے چمنستانِ وطن میں گل ولالہ کی جگہ اختلافات اور تفرقے پیدا ہو رہے ہیں۔ ان کے شعر ہیں ؎

شمع کو جلنے سے کیا مطلب جو محفل ہی نہ ہو | حسن ہو کیا خود نما جب کوئی مائل ہی نہ ہو | ہو نہ خرمن ہی تو اس دانہ کی ہستی پھر کہاں | جب نہ خرمن ہو تو کیا شاعرِ معجز بیاں

پھونک ڈالا جب چمن کو آتشِ بیکار نے | کب زباں کھولی ہماری لذتِ گفتار نے | میرے آئینہ سے یہ جوہر نکلتا کیوں نہیں | ذوقِ گویائی خموشی سے بدلتا کیوں نہیں

اس سلسلہ میں اس واقعہ کا اظہار بھی ضروری ہے کہ اقبال نے اپنے ابتدائی کلام ہی میں اپنی اہمیت وحقیقت بھی واضح کر دی ہے۔ وہ جانتے ہیں کہ شاعر کے فرائض کیا ہیں۔ انھوں نے قوم کو جسم اور افراد کو اس کے مختلف اعضا قرار دیتے ہوئے شاعر کو قوم کی آنکھ بتایا جو ہر عضو کے مبتلائے درد ہونے پر روئے بغیر نہیں رہ سکتی۔ وہ کہتے ہیں ؎

شاعرِ رنگیں نوا ہے دیدۂ بینائے قوم | محفلِ نظمِ حکومت چہرۂ زیبائے قوم | منزلِ صنعت کے رہ پیما ہیں دست و پائے قوم | قوم گویا جسم ہے افراد ہیں اعضائے قوم

مبتلائے درد کوئی عضو ہو روتی ہے آنکھ | کس قدر ہمدرد سارے جسم کی ہوتی ہے آنکھ

یہی وجہ ہے کہ اس زمانہ میں وہ اپنی ایک نظم تصویرِ درد میں اپنے پیارے وطن کے حالِ زار پر اس طرح آنسو بہاتے ہیں ؎

چمن میں آہ کیا رہنا جو ہو بے آبرو رہنا | بنائیں کیا سمجھ کر شاخِ گل پر آشیاں اپنا | عبادت چشمِ شاعر کی ہے ہر دم باوضو رہنا | رلاتا ہے ترا نظارہ اے ہندوستاں مجھ کو | کہ عبرت خیز ہے تیرا فسانہ سب فسانوں میں | دیا رونا مجھے ایسا کہ سب کچھ دے دیا گویا | لکھا کلکِ ازل نے مجھ کو تیرے نوحہ خوانوں میں | کیا دیدۂ گریاں وطن کی نوحہ خوانی میں

کیا ہے اپنے بختِ خفتہ کو بیدار قوموں نے | محبت ہی سے پائی ہے شفا بیمار قوموں نے | غلامی ہے اسیرِ امتیازِ ما و تو رہنا | سمجھتے ہو تو آزادی ہے پوشیدہ محبت میں

اسی سلسلہ کی ایک اہم کڑی ان کا ترانۂ ہندی بھی ہے جس کو وہ اس شعر سے شروع کرتے ہیں۔

سارے جہاں سے اچھا ہندوستاں ہمارا | ہم بلبلیں ہیں اس کی یہ گلستاں ہمارا

ترانۂ ہندی کے ساتھ ہی اقبال کے نئے شوالے کا خیال آجاتا ہے جس میں وہ برہمن سے مخاطب ہو کر کہتے ہیں۔

پتھر کی مورتوں میں سمجھا ہے تو خدا ہے | خاکِ وطن کا مجھ کو ہر ذرہ دیوتا ہے

اور پھر محبت و آشتی کا سبق اس طرح پڑھاتے ہیں ؎

آ غیریت کے پردے اک بار پھر اٹھا دیں بچھڑوں کو پھر ملا دیں نقشِ دوئی مٹا دیں سونی پڑی ہوئی ہے مدت سے دل کی بستی آ اک نیا شوالا اس دیس میں بنا دیں
دنیا کے تیرتھوں سے اونچا ہو اپنا تیرتھ دامانِ آسماں سے اس کا کلس ملا دیں ہر صبح اٹھ کے گائیں منتر وہ میٹھے میٹھے سارے پجاریوں کو مے پیت کی پلا دیں
شکتی بھی شانتی بھی بھگتوں کے گیت میں ہو دھرتی کے باسیوں کی مکتی پریت میں ہو

یہ اقبال کی شاعری کا آغاز تھا اور اس سے بہتر آغاز شاید ہی دنیا کے کسی اور شاعر کے کلام کو نصیب ہوا ہو۔ اس کے بعد اقبال تکمیل تعلیم کے لئے یورپ کا سفر کرتے ہیں اور وہاں کا قیام ان کے حالات و خیالات پر بھی اثر انداز ہوتا ہے۔ اب حسن و عشق کی حقیقتوں اور نیرنگیوں سے متعلق نظمیں لکھی جاتی ہیں لیکن اس وقت بھی عقل کے مقابلہ میں دل کو ترجیح دی جاتی ہے اور مادہ پرستی کی فضاؤں میں بھی وہ روحانیت کو نہیں بھولتے۔ اس زمانہ میں انھیں جہاں پین اسلامی تحریک سے سابقہ پڑتا ہے مولانائے روم کے تصوف کا یورپ کے فلسفیوں کے معتقدات سے مقابلہ کرنے کا بھی موقع ملتا ہے جس کا نتیجہ یہ نکلتا ہے کہ وہ فلسفۂ خودی میں ڈوب جاتے ہیں۔

یورپ کے قیام نے اقبال کو مسلمانانِ عالم کی سیاسی کمزوریوں سے آگاہ کر دیا تھا اور چونکہ وہ مسلمان تھے اس لئے بحیثیت شاعر کے ان کا اس صورت حال سے متاثر ہونا بھی ضروری تھا چنانچہ ہندوستان کی طرف واپس ہوتے ہوئے جب ان کا جہاز جزیرہ سسلی کی طرف سے گذرا تو ان کی زبان سے نکلا۔

رولے اب دل کھول کر اے دیدۂ خوں نابہ بار وہ نظر آتا ہے تہذیبِ حجازی کا مزار تھا یہاں ہنگامہ اُن صحرا نشینوں کا کبھی بحر بازی گاہ تھا جن کے سفینوں کا کبھی
زلزلے جن سے شہنشاہوں کے درباروں میں تھے بجلیوں کے آشیانے جن کی تلواروں میں تھے مردہ عالم زندہ جن کی شورشِ قم سے ہوا آدمی آزاد زنجیرِ توہم سے ہوا

پھر لکھتے ہیں کہ جس طرح سعدی نے شیراز کا داغ نے دہلی کا اور ابن بدروں نے غرناطہ کا مرثیہ لکھا تھا شاید قسمت نے مجھے سسلی کا مرثیہ لکھنے کے لئے مقرر کر دیا ہو۔ ہندوستان واپس آنے کے بعد اقبال کو اسرار خودی اور رموز بیخودی کے اظہار کے ساتھ ساتھ اس زمانہ کے سیاسی حالات سے مجبور ہو کر مسلمانوں کی حالت زار پر نوحہ خوانی کرنی پڑتی ہے۔ ترکوں کی لڑائیاں اور دول یورپ کی مشرقی ممالک میں ریشہ دوانیاں انھیں بے حد متاثر کرتی ہیں چنانچہ ان سے اثر پذیر ہو کر انھوں نے کئی پُرجوش نظمیں لکھیں اور یہ نظمیں اردو شاعری کے لئے بالکل انوکھی تھیں۔ شکوہ اور جواب شکوہ بھی اسی عہد کی تخلیق ہیں۔ اگرچہ اقبال کی اس قسم کی شاعری نے اُردو دنیا میں ایک تہلکہ مچا دیا۔ لیکن جہاں عوام ان کے کلام کے گرویدہ بعض مذہبی بزرگوں نے ان کو کافر کہنے میں بھی دریغ نہ کیا۔ اس کے علاوہ ان کی شاعری پر قدیم طرز کے شعرا اور ناقدین فن نے طرح طرح کی تنقیدیں کیں۔ زبان اور محاورہ کی غلطیاں نکالی گئیں اور ہر طرح سے اقبال کے کمال کو گھٹانا چاہا۔

غالباً یہ بھی ایک وجہ تھی اس دس سال کے سکوت کی جو بانگ درا شائع ہونے کے بعد اقبال کی اُردو شاعری پر طاری رہا۔ اس اثنا میں ان کی فارسی نظمیں شائع ہوتی رہیں اور اُردو دنیا نے محسوس کرنا شروع کر دیا کہ یہ شاعر اعظم شاید اس طرح اردو کے اہل زبان نقادوں کو سزا دینا چاہتا ہے۔ واقعہ یہ ہے کہ اُردو اقبال کے فیضان کی منتظر تھی اور بار بار نگاہیں اس ابر کرم کو ترستی تھیں۔ مایوسی اور انتظار کے اس طویل عرصہ میں بانگ درا کی قدر بڑھتی چلی جا رہی تھی اور سچ تو یہ ہے کہ یہی ایک مجموعہ اقبال کو اُردو دنیا میں ہمیشہ کے لئے زندہ رکھنے کے لئے کافی تھا لیکن سوال اقبال کے زندہ رہنے کا نہ تھا۔ وہ تو یوں بھی زندۂ جاوید تھے۔ اصل سوال اردو کی سیرابی کا تھا اور یہ اس کی خوش قسمتی تھی کہ اقبال نے اپنے آخری دو تین سالوں میں بال جبریل اور ضرب کلیم جیسے بیش بہا خزانے اُردو دنیا کے آگے پیش کر دیئے جن سے اہل ہندوستان

سب رہیں
اور خاص کر اہل اردو ہمیشہ مستفید ہوتے رہیں گے۔

اقبال نے اپنی آخر زمانہ کی شاعری میں اجتماعی ترقی کی جگہ انفرادیت اور احساس خودی پر بڑا زور دیا کیونکہ وہ سمجھتے تھے کہ جب تک ہر ایک فرد درست نہ ہوگا قوم کی اجتماعی ترقی ناممکن ہے۔ اس لئے قومی آزادی کو وہ انفرادی آزادی پر منحصر رکھتے ہیں۔ وہ ہر قسم کی قید و بند کے مخالف تھے اور مشرقی قوموں اور خاص کر مسلمانوں میں عہد حاضر میں جو خرابیاں سرایت کر گئی ہیں اس کا ذمہ دار زیادہ تر تہذیب مغرب اور سیاست فرنگ کو سمجھتے تھے۔ اسی لئے فریاد کرتے ہیں۔

فریاد ز افرنگ و دلآویزی افرنگ — فریاد ز شیرینی و پرویزی افرنگ
عالم ہمہ ویرانہ ز چنگیزی افرنگ

اسی طرح اردو میں کہتے ہیں ؎

یورپ میں بہت روشنی علم و ہنر ہے — حق یہ ہے کہ بے چشمۂ حیواں ہے یہ ظلمات
یہ علم یہ حکمت یہ تدبر یہ حکومت — پیتے ہیں لہو دیتے ہیں تعلیم مساوات
بیکاری و عریانی و میخواری و افلاس — کیا کم ہے فرنگی مدنیت کے فتوحات
وہ قوم کہ فیضان سماوی سے ہو محروم — حد اس کے کمالات کی ہے برق و بخارات
ہے دل کے لئے موت مشینوں کی حکومت — احساس مروت کو کچل دیتے ہیں آلات

ان تمام یورپ زدگی، بے راہ روی اور مروت دشمنی کا علاج اقبال نے صرف خودی کے احساس میں ڈھونڈ نکالا۔ وہ کہتے ہیں اگر اہل مشرق میں خودی کا احساس ہو جائے تو وہ ہر حلقہ نگینوں سے آزاد ہو جائیں گے۔ موجودہ تعلیم اور درس گاہوں میں انھیں سب سے بڑا عیب یہی نظر آتا ہے کہ یہاں خودی اور احساس آزادی کو کچل دیا جاتا ہے۔ وہ کہتے ہیں ؎

اقبال یہاں نام نہ لے علم خودی کا — موزوں نہیں مکتب کے لئے ایسے مقالات
بہتر ہے کہ بیچارے ممولوں کی نظر سے — پوشیدہ رہیں باز کے احوال و مقامات
آزاد کی اک آن ہے محکوم کا اک سال — کس درجہ گراں سیر ہیں محکوم کے اوقات
آزاد کا ہر لحظہ پیام ابدیت — محکوم کا ہر لحظہ نئی مرگ مفاجات
آزاد کا اندیشہ حقیقت سے منور — محکوم کا اندیشہ گرفتار خرافات
محکوم کو پیروں کی کرامات کا سودا — ہے بندۂ آزاد خود اک زندہ کرامات

اس خودی کی موت ہی میں اقبال کو تمام دنیا کی خرابیاں نظر آتی ہیں۔ ان کے اردو اور فارسی کلام میں خودی کے متعلق بڑی اچھی اچھی نظمیں موجود ہیں۔ یہ موضوع بجائے خود ایسا ہے کہ اس پر تفصیلی مقالے لکھے جا سکتے ہیں اور خود اقبال نے ایک پوری طویل مثنوی اسرار خودی اسی کی توضیح میں لکھی ہے اور ثابت کیا ہے کہ نظام عالم کے علاوہ سلسلہ حیات کا انحصار بھی خودی ہی پر ہے۔ نہ صرف مشرق بلکہ مغرب میں بھی احساس خودی کی کمی نظر آتی ہے ان کے شعر ہیں۔

…موت سے مغرب کا اندروں بے نور — خودی کی موت سے مشرق ہے مبتلائے جذام
خودی کی موت سے روح عرب ہے بے تب و تاب — بدن عراق و عجم کا ہے بے عروق و نظام
خودی کی موت سے ہندی شکستہ بال پر — قفس ہوا ہے حلال اور آشیانہ حرام

اقبال کی شاعری اسی ذوق آگہی، اسی احساس خودی، اور انہی اسرار کے معلوم کرنے اور کرانے کی سعی پیہم پر مشتمل ہے وہ انسان کو راز دل سمجھتے ہیں اور ان کی خواہش ہے کہ انسان خود اپنی حقیقت سے واقف ہو جائے۔ ہوسناکیوں کو چھوڑ کر اخوت اور محبت سے کام لے۔ شرمندۂ ساحل رہنے کی جگہ ذرا ہمت کرے اور اچھل کر بیکراں ہو جائے۔ اور اس شام و سحر کے حلقے سے نکل کر خودی میں ڈوب لے اور جاودانی منزلت حاصل کرے۔ اور یہ سب باتیں خود انسان کے دل ہی پر منحصر ہیں اور انھوں نے اپنی ہر دور کی شاعری میں دل سے

زیادہ کسی اور پر زور ہی نہیں دیا۔ ان کے آخری زمانہ کے یہ اشعار ان کی خصوصیات شعری کا بہترین نمونہ ہیں۔ وہ کہتے ہیں:

اپنے من میں ڈوب جا پا کر سراغ زندگی　　تو اگر میرا نہیں بنتا نہ بن اپنا تو بن
من کی دنیا من کی دنیا سوز و مستی جذب و شوق　　تن کی دنیا تن کی دنیا سود و سودا مکر و فن
من کی دولت ہاتھ آتی ہے تو پھر جاتی نہیں　　تن کی دولت چھاؤں ہے آتا ہے دھن جاتا ہے دھن
من کی دنیا میں نہ پایا میں نے افرنگی کا راج　　من کی دنیا میں نہ دیکھے میں نے شیخ و برہمن
پانی پانی کر گئی مجھ کو قلندر کی یہ بات　　تو جھکا جب غیر کے آگے نہ من تیرا نہ تن

خواتین و حضرات! یہی وہ قلندرانہ فلسفہ ہے جو اقبال کی حیات اور شاعری ہر دو پر حاوی ہے۔ ان کی زندگی ان کی شاعری کی تفسیر ہے اور ان کی شاعری ان کی زندگی کا آئینہ ہے۔ افسوس ہے کہ یہ شاعر اعظم عین اس وقت ہم سے جدا ہو گیا جب کہ اس کی شاعری ساحری کی حد سے گذر کر پیغمبری کی منزل تک جا پہنچی تھی۔ اور مشرق کی دنیا اس کی پیغمبرانہ تلخ گوئیوں کو برداشت کرنے اور اس کے اصولوں پر عمل پیرا ہونے کے قابل ہوتی جا رہی تھی۔ جس کا ایک ثبوت آج کی یہ محفل بھی ہے جس میں ہم اس شاعر اعظم کی خدمت میں خراج تحسین ادا کرنے جمع ہوئے ہیں اور یقین ہے کہ ملک کے گوشہ گوشہ میں اسی طرح ہمیشہ اقبال کی یاد منائی جاتی رہے گی۔

پجارن

سید محی الدین قادری زور

رنگینیٔ شام درخشاں ہے　　ہر شئے میں جلوۂ درخشاں ہے
پھولوں کا تجمل ہے رقصاں　　الماس و گہر کے ہیں ساماں
سیلابِ شفق ہے نغمۂ رنگ　　تنبیطِ نظر ہیں رباب و چنگ
ہیں کیفِ مجسم نظارے　　حوضوں میں بلوریں فوارے
ہر صنعت فطرت ہے سندر　　مرمر کا نگاریں ہے مندر
طوفانِ طرب کا تلاطم ہے　　جو موج ہے نور تبسم ہے
اک ملکۂ حسن ہے پیش نظر　　چلتا ہوا جادو عیشِ نظر
اس مندر کی وہ پجارن ہے　　ناہید ہے، زہرہ جوبن ہے
گل رنگ، گلابی ساری میں　　اک رقص ہے بادِ بہاری میں
ہر ایک ادا اٹھلائی ہوئی!!　　کرنوں کی طرح لہرائی ہوئی
چہرہ پہ بشاشت کی موجیں　　جیسے ہوں گلابی میں لہریں
آنکھوں میں چھلکتے پیمانے　　رخسار میں غلطاں میخانے
ہونٹوں پہ تبسم کی بجلی!　　ہلکی ہلکی اجلی اجلی
ماتھے پہ دمکتا ہے قشقہ　　زلفوں میں چھلکتا ہے قشقہ
کانوں میں زمرد کے بندے　　ان پھولوں کو کوئی چین دے
احساس سے غافل کھوئی ہوئی　　کچھ جاگی ہوئی کچھ سوئی ہوئی
اک ہاتھ میں پھولوں کی تھالی　　اک ہاتھ میں پھولوں کی ڈالی
پوجا کو یہاں وہ آئی ہے　　گلہائے عقیدت لائی ہے
اب پھول چڑھا کر جائے گی　　اک حشر بپا کر جائے گی!
اے بانکی پجارن! او نکہت!!　　تو عالم قدس کی ہے رنگت
تو حسن کے مندر کی دیوی　　احساس ہے اس کا تجھ کو بھی!
سب آئے ہیں تیرے درشن کو　　تو جانتی ہے کس کے درشن کو؟
اس راز سے مجھ کو واقف کر　　کیا تو بھی درد کی ہے خوگر؟
کیا تو بھی سکوں کی جویا ہے　　مجبور ہے، دل کہیں کھویا ہے؟
میں تجھ کو اے بت رخشندہ!　　کرتا ہوں محبت کا سجدہ
ہو جائے قبول بار گہی!　　تحفہ ہے مرا اک سجدہ ہی

کاوش

فیشن

[پروفیسر سعید الدین صاحب صدر شعبہ نباتیات کے ایک انگریزی مضمون کا ترجمہ ۔]

"فیشن کسی گروہ کے مذاق میں مسلسل تبدیلی کا نام ہے" جس میں کسی افادیت کو دخل ہو تو ہو مگر یہہ اس کی تعریف نہیں ہوی، ممکن ہے کہ اس کے اختیار کرنے والے افراد کو اس سے فائدہ پہنچے لیکن اس سے تو انکار نہیں ہو سکتا کہ وہ ایک اندھی تقلید ہے جس میں یکسانیت اور تبدیلیاں ہوتی رہتی ہیں ۔ یہہ کسی اصول افادیت کے تابع نہیں ہے ۔ لہٰذا اس کو ترقی سے تمیز کرنا چاہئے جس کے معنی افادیت، فوائد اور بہتر توافق ہیں ۔ فیشن کا تعلق نفسیاتی معاشرہ سے اس حد تک ہے کہ قبول عام حاصل کرے ۔ کسی خاص فیشن کا بہت ہی انوکھا ہونا یا عام ہونا کسی وجہہ سے ترک کر دیا جانا کسی نفسیاتی اصول پر مبنی نہیں ہے ۔

نیا فیشن لوگوں کو اپنی ندرت یا شہرت کی وجہہ سے بھا جاتا ہے مگر اس کی زندگی انھیں دو چیزوں کے قائم رہنے تک باقی رہتی ہے اور جوں ہی وہ ختم ہو گئیں یہہ بھی غائب ہو گیا جس کے بعد وہ اوروں کے لئے اپنی جگہ چھوڑ دیتا ہے فیشن کی رفتار میں کبھی یکسانیت نہیں رہتی اور نہ وہ وقت کی میزان پر تلتا ہے ۔ تجربہ ہمیں بتلاتا ہے کہ فیشن ہر وقت بدلتا رہتا ہے ۔ عورتوں کے فیشن مردوں کی بہ نسبت زیادہ متبدل ہوتے ہیں ۔ نئی چیزوں کو پرانی پر ترجیح دینے کا رجحان گو عام ہے لیکن کوئی استدلال نہیں رکھتا ۔

ذاتی حد تک میں اس کے خلاف ہوں ۔ کیوں نہ کسی چیز کی تعریف کی جائے جب کہ وہ قابل تعریف ہے ؟ قطع نظر اس کے کہ وہ پرانی ہے یا نئی ۔ ۱۹۲۹ء میں جب میں (EDINBORGH) میں تھا تو ہم نے گرما کی تعطیلات (PITLOCHARY) (جو اسکاچستان کے شمال میں واقع ہے) گزاری تھیں ۔ اور وہاں پرانے اسکاچ رقص (DANCES.) میں ہم نے اکثر حصہ لیا ہے ۔ مثلاً :—

Eight some reel. The grand old Duke of york 'Lancers' Four-some reel. وغیرہ وغیرہ

کم از کم مجھے تو یہہ رقص مابعد *Waltzes* اور *Foxtrots* کی نسبت زیادہ بہتر معلوم ہوتے تھے ۔ ان میں بہت زیادہ دلچسپیاں ہیں اور لطف یہہ ہے کہ ایک ہی دفعہ میں کئی آدمی حصہ لے سکتے ہیں ۔ لیکن محض انھیں اس لئے پسند نہیں کیا جاتا کہ وہ قدیم ہیں لوگ تو بس جدت کے دل دادہ ہیں خواہ اس میں ان کا فائدہ ہو یا نقصان ۔

اگر فیشن کی علت اصل دریافت کی جائے تو معلوم ہوگا کہ وہ خود نمائی کے جذبہ کو ظاہر کرتا ہے گویا اپنی ذات کو دوسروں سے ممتاز کر لیتا یا دوسروں کی نسبت خود کو مشہور اور جدا کر لیتا ہے ۔ اس قسم کا رجحان ہمیں وحشیوں میں بھی ملتا ہے جن میں زیورات کا بہت شوق اور میلان پایا جاتا تھا ۔ اس اندھی تقلید کے رجحان کے باوجود ایسا معلوم ہوتا ہے کہ ابتدائے زمانے سے اب تک فیشن کی تبدیلیوں میں یقیناً عقل کی کارپردازی کو دخل دیا گیا ہے ۔ وحشیوں کے بھدے اور موٹے زیورات کی نسبت ہم ان سے کہیں زیادہ نازک اور اچھے زیورات دیکھتے ہیں لباس میں بھی موجودہ حالات کے لحاظ سے زیادہ ہم آہنگی دکھائی دیتی ہے عورتیں مردوں کی نسبت فیشن سے زیادہ لگاؤ رکھتے ہیں ۔ وہ ابھی تک بیرے جواہرات پہننے کی عادی ہیں STARR کے الفاظ میں "صحیح تمدن کے حصول میں زیور ہی حائل ہے اور صحیح عمومیت

(Democracy) میں زیوروں کے لئے کوئی جگہ نہیں ہے بلکہ سچ تو یہہ ہے کہ زیور ہی عمومیتی خیالات میں کمی پیدا کرتے ہیں
اس چیز کو انسان کی فطرت میں گہرا دخل ہے کہ وہ اپنے آپ کو دوسروں سے ممتاز بنانے کی کوشش کرتا اور ہمسری
جیسا کہ Brook کہتا ہے "مساوات کے لئے غیر خود غرضانہ اور بہادرانہ کوششوں سے عالمگیر نفرت خود مساوات سے ایک عام نفرت
صحیح فرق بیرونی لباس یا بناؤ سنگار پر مبنی نہیں ہونا چاہئے بلکہ اس کا تعلق عقل، کردار اور ذاتی کسب پر ہے۔ حیرت تو یہہ ہے کہ وہ لوگ بھی
اس کو بخوبی سمجھتے ہیں اندھی تقلید سے باز نہیں آتے۔ یہہ جذبہ ان میں موجود ہے اور اس کا جڑ پیڑ سے نکال دینا محال ہے۔ فیشن دو ہی چیزوں پر
تقلید دوسرا تفریق باہمی۔ ادنی درجہ کے لوگ جس قدر اپنے سے برتر کے لباس کی تقلید کرنے کی کوشش کرتے ہیں اتنا ہی اعلی طبقہ ہر وقت اس بات
رہتا ہے کہ موجودہ روش کو بدل کر اپنے کو ادنی سے ممتاز کرلے۔ یہی وجہہ ہے کہ فیشن اس قدر سرعت سے تبدیل ہوتا رہتا ہے۔ ازمنہ قدیم میں ایسے قواعد
بنائے جاتے تھے جن کی رو سے ایک مخصوص گروہ کے لئے خاص قسم کے لباس پہننے کی اجازت تھی اور تقلید کی ممانعت کی جاتی تھی۔ قدیم جاپان میں
قواعد ملتے ہیں۔ یہاں تک کہ دور وسطی میں یورپ میں ادنی درجے کے لوگوں کی خوراک پر تحدید عائد تھی۔ فی زمانہ چونکہ یہہ سہل ہوتا جارہا ہے کہ ایک طبقہ
اعلے وارفع کی نہایت آسانی سے تقلید کرلے اس لئے فیشن بھی بہت کم قیام پزیر ہوتا جارہا ہے۔ فیشن کے عدم استقلال کی اہم وجوہات
۱۔ کپڑوں کی افراط اور ارزانی۔ اصل سلک کی اچھی خاصی نقل کی گئی ہے۔ اور مصنوعی سلک اس قدر عام ہے کہ بہت ہی ارزاں ہونے کے باوجود
کارآمد ثابت ہوا ہے۔ ۲۔ سماج کی دولت اس قدر کافی ہے کہ وہ فیشن کی فضول خرچیاں نہایت آسانی سے برداشت کرسکتی ہے۔ امیر اپنے کو
ممتاز کرنے میں کوئی خاص دقت محسوس نہیں کرتے اور انھیں جو روپیہ صرف ہوتا ہے اس کی بھی انھیں کچھ پروا نہیں ہے۔ ۳۔ جیسا کے پہلے
طریقۂ تقلید میں بہت ترقی کی گئی ہے اور مصنوعی چیزیں نہایت ہی ارزاں قیمت پر دستیاب ہوسکتی ہیں۔ ۴۔ فیشن پر ایک اچھا خاصا صحافتی
جمع ہونے لگا ہے۔ بڑی بڑی کمپنیوں کے ایجنٹ نئے نئے فیشن پھیلاتے جاتے ہیں۔ اخبارات میں یہہ روزآنہ کا مشاہدہ ہے کہ ایک صفحہ
کے لئے مختص کردیا جاتا ہے۔ البتہ رسالے جو خاص طور پر اس مقصد کے لئے طبع ہوتے ہیں صرف فیشن سے ہی بحث کرتے ہیں اور ہر روز اس کی ترقی
کے لئے کوشاں رہتے ہیں۔ ایجنٹ جن کا کام مختلف آبادیوں میں پھر کر پروپگنڈا کرنا ہے لوگوں کو نئے فیشن کے اختیار کرنے پر ابھارتے
ترغیب دلاتے ہیں۔

مضمون ختم کرتے ہوے چند اختتامی نکات کا بیان کردینا ضروری ہوگا۔ فیشن جہاں تک کہ وہ اصول افادیت اور بہتری کی
تعریف میں آتا ہے یقیناً ترقی پذیر ہے۔ لیکن حالیہ رجحان میں غیر معمولی زیادتی اور انتہا پسندی نظر آتی ہے۔ وہ لوگ جن کا مذاق
آزاد خیال اور صائب الرائے ہیں نیز جو صحت اور آسائش کے خاص طور پر مداح ہیں فیشن کی حالیہ روز افزوں دیوانگی سے بغاوت
ہیں اور شاید یہی ہماری نظروں میں عقل و شعور رکھتے ہیں۔ اگر سماج میں تفریق مدارج اور امتیاز باہمی مقصود ہے تو اس کے لئے دوسرے
احسن طریقے ہیں بجائے اس کے کہ فیشن کے۔

انسان کی بڑائی اور عزت اس کی اندرونی حقیقت پر مبنی ہے نہ کہ بیرونی بناؤ سنگار پر۔

مترجمہ محمد معین الدین

تبصرے

"**کاک ٹیل**"۔ مولوی مرزا عظمت اللہ بیگ صاحب ایک مزاحیہ نگار ادیب اور شاعر کی حیثیت سے ملک کے علمی حلقوں میں اپنی ایک انفرادیت رکھتے ہیں۔ ان کی مزاحیہ نظموں کا مجموعہ "کاک ٹیل" کے نام سے شائع ہوا ہے۔ اس کا مقدمہ مولوی غلام یزدانی صاحب نے لکھا ہے۔ جس میں مرزا صاحب کی نظموں پر تفصیلی روشنی ڈالی گئی ہے۔ اکبر الہ آبادی کی طرح مرزا صاحب بھی "انگریزی الفاظ" استعمال کرتے ہیں۔ ان کی یہ نظمیں بھی ان کے مضامین کی طرح ضرور مقبول ہوں گی۔ اس کا سرورق بھی خود مرزا صاحب کے حسن کارانہ ذوق کا نتیجہ ہے اور خاص طور پر دیدہ زیب ہے۔

"**صور اسرافیل**"۔ لاہور سے پ' احمد صاحب یلدرم اور فیض الحسن صاحب صدیقی کی ادارت میں ایک نیا ماہ نامہ صور اسرافیل کے نام سے جاری ہوا ہے۔ لاہور کی رسائل خیز زمین سے کسی رسالہ کا اجرا کوئی تعجب خیز بات نہیں ہے۔ لیکن "صور اسرافیل" جس نہج کے ساتھ نکلا ہے وہ قابل تعریف ہے۔ اس کے پہلے "جزو" کا پہلا "عدد" ہمارے سامنے ہے۔ لیکن کسی رسالے کے ایک ہی شمارہ کو دیکھ کر اس کے متعلق "اظہار رائے" وقتی تاثر سے زیادہ وقعت نہیں رکھتا اس لئے ہم کچھ عرصہ کے لئے اپنی رائے محفوظ رکھتے ہیں۔ البتہ اتنی بات کہنے میں تامل نہیں ہے کہ پیش نظر شمارہ بہت امید افزا ہے اگر صحت بخش بنیادوں پر کام کیا جائے تو اس کی ترقی میں کسی شبہ کی گنجائش نہیں ہے۔

"**بلاغ**"۔ بلاغ ایک مذہبی ماہ نامہ ہے جو شہباز صاحب کشوری ایم اے اور اصغر صاحب بی اے کی ادارت میں امرتسر سے نکلتا ہے۔ اس کی پندرھویں جلد کا چوتھا نمبر ہمارے دفتر پر تبصرہ کی غرض سے بھیجا گیا ہے۔ یہ شمارہ سلیقہ کے ساتھ مرتب کیا گیا ہے اور اس میں بعض مضامین بہت اچھے ہیں۔ لائق مدیر اس کی ترتیب کے لئے خود محنت کرتے ہیں اس لئے اس کی اچھائی میں کافی اضافہ ہو جاتا ہے۔ "بلاغ" ان تمام کو جو مذہب کا جدید نقطۂ نظر سے مطالعہ کرنا چاہتے ہیں دعوتِ مطالعہ دیتا ہے۔

"**زیب النساء**"۔ (ماہنامہ) سالانہ چندہ تین روپیہ۔ ملنے کا پتہ کنڈی گراں سٹریٹ متصل گرلز اسکول لاہور یا صغرا منزل ہمایوں نگر حیدر آباد دکن

"النساء" "زیب النساء" کے نام سے اپنے دوسرے روپ میں زیر سرپرستی محترمہ بیگم جہاں آرا شاہ نواز صاحبہ زیر ادارت محترمہ صغرا ہمایوں مرزا صاحبہ۔ محترمہ رشیدہ عصمت صاحبہ اور محترمہ شبیر خالدہ صاحبہ لاہور سے شایع ہو رہا ہے۔ اس کی پانچویں جلد کا چوتھا شمارہ ہمارے سامنے ہے۔ اس شمارہ میں عورتوں سے متعلق کارآمد مضامین کے علاوہ بعض ادبی مضامین بھی شامل ہیں۔ عالم بے عمل ایک معاشری ڈرامہ ہے جو برا نہیں۔ "لام کا لچھا" ایک نگاہی مضمون ہے جس کو بلا شبہ تبسم آفرین کہا جاسکتا ہے "عورتوں میں تپ دق اور نرم کھلونوں کی دستکاری" کا مطالعہ عورتوں کی گھریلو زندگی کے لئے بہت مفید ہوگا۔ نظموں میں "مالن" "تاروں کی بستی" "بستی کا آخری سنگار" بہت اچھی نظمیں ہیں۔

بہرحال النساء کی طرح "زیب النساء" بھی طبقۂ نسواں میں سنجیدگی کے ساتھ ایک علمی و عملی فضا پیدا کرنا چاہتا ہے۔ اور بلاشبہ وہ اپنے مقصد میں کامیاب ہو رہا ہے۔ ہم اپنے ملک کی تمام خواتین سے اس کو خریدنے کی سفارش کرتے ہیں۔

"**طلوعِ اسلام**"۔ زیر ادارت حکیم ذکی احمد خاں۔ بدل اشتراک پانچ روپیہ فی پرچہ ۸/

طلوع اسلام حضرت علامہ اقبال رح کی یادگار میں نکلنے لگا ہے۔ اس کی پہلی جلد کا چوتھا شمارہ ہمارے سامنے ہے۔ اس میں کوئی شک نہیں کہ یہ رسالہ سلیقہ سے مرتب کیا گیا ہے۔ نظمیں اور مضامین اچھے ہیں۔ علامہ اقبال کی یادگار قائم کرنے کا یہ علمی و ادبی طریقہ یقیناً قابل مبارکباد ہے۔ ہمیں امید ہے کہ اس رسالے کے ذریعہ اقبال کے زندہ پیغام کو اردو والوں [illegible] صحیح طریقے سے پہچانے کا کام لیا جائے گا۔ اور یہ رسالہ اپنے اندر کلام اقبال کی صحیح روح پیدا کرے گا۔ (م)

بچوں سے باتیں

خدا کا شکر ہے کہ "سب رس" اپنے مقصد میں کامیاب ہوتا جا رہا ہے۔ ملک کے ہونہاروں میں ایک علمی لہر دوڑ گئی ہے جس کا اندازہ "سب رس" کے مضامین، نظموں اور پہیلیوں وغیرہ سے ہو سکتا ہے۔ ہر مہینہ اس قدر مضامین وصول ہوتے ہیں کہ ان کو بلا تاخیر شایع نہیں کیا جا سکتا۔ ہم نے اس بات کا خیال رکھا ہے کہ مضامین سلسلہ بہ سلسلہ شایع ہوتے ہیں۔ بعض مضامین معیار سے گرے ہوئے وصول ہوتے ہیں جن کو شایع نہیں کیا جاتا۔ بعض اصحاب اپنے مضمون کی اشاعت کے متعلق دریافت کرتے ہیں مگر جواب کے لئے ٹکٹ روانہ نہیں کرتے۔ اگر ادارہ ان کا جواب نہ دے تو وہ حق بجانب ہے۔

ہماری یہ کوشش ہے کہ آئندہ سال سے ضمیمہ کو بڑے رسالے سے الگ کر کے صفحات کے اضافے کے ساتھ شایع کیا جائے لیکن یہ کوشش اس وقت تک بارآور نہیں ہو سکتی جب تک "سب رس" معاونین ہماری مدد نہ کریں۔ "ادارہ"

پہیلیوں کے صحیح حل۔ ا۔ اولا۔ (ب) پھل۔ آنکھیں۔ ہاتھ۔ منہ۔

حسب ذیل سب رسی بھائی بہنوں نے صحیح حل بھیجے۔ (۱) حبیب شمس (سٹی کالج) ۲۔ جمیم النسا بیگم (بشیر آباد) (۳) مسیح الدین (بشیر آباد) (۴) محمد عبد الرزاق (مدرسہ فوقانیہ نظام آباد) (۵) محمد علیم الدین جنیدی (مدرسہ مومن پورہ گلبرگہ) (۶) مرزا عبد الرحمن بیگ (سٹی کالج) (۷) محمد عبد الباسط

ایک غلطی والے حل۔ (۱) محمد مصلح الدین خاں برق (۲) محمد احسن الدین (سٹی کالج) (۳) محمد جعفر علی (سٹی کالج) (۴) سید یوسف حسین (سٹی کالج) (۵) محمد فیروز الدین (سٹی کالج) (۶) حبیبہ حبیب الرحمن (۷) سید لایق علی خاں سٹی کالج۔ (۸) سید آصف علی خاں (سٹی کالج) (۹) ستنارائن (سٹی کالج) (۱۰) محمد اشرف علی (کلیج شریعت) (۱۱) سید اعجاز علی (گرامر اسکول)

مشہور شخصوں کے نام (۱) ہٹلر (۲) مسولینی (۳) فرانکو (۴) جناح:۔ حسب ذیل اصحاب نے صحیح نام بتائے۔
(۱) سید احمد (فوقانیہ چالتہ) (۲) محمد اشتیاق رسول صدیقی (سٹی کالج) (۳) محمد یوسف حسین (کلیانی) (۴) سید اعجاز علی (گرامر اسکول) (۵) محمد اشرف علی (کلیج) (۶) سید آصف علی خاں (سٹی کالج) (۷) سید لائق علی خاں (سٹی کالج) (۸) حبیبہ حبیب الرحمن (۹) محمد فیروز الدین صدیقی (سٹی کالج) (۱۰) سید یوسف حسین (سٹی کالج) (۱۱) ... (۱۲) محمد احسن الدین شریف (سٹی کالج) (۱۳) محمد مصلح الدین خاں برق۔ (۱۴) محمد عبد الباسط (سٹی کالج) (۱۵) مسیح الدین خاں متین (بشیر آباد) (۱۶) جمیم النسا بیگم (بشیر آباد)

پہیلیاں حل کیجئے۔

۱۔ کالی ماں کے گورے پوت ۔ ان دونوں کے نئے کرتوت ۔ بھائی کو بھائی سے لاگ ۔ ایک ہے ٹھنڈا دوسرا آگ

۲۔ زمرد کی ڈبیا نیلم کا ڈھکنا ۔ سمجھ بوجھ کے کہنا بیہودہ نہ بکنا ۔ **سید لایق علی خاں** (سٹی کالج)

۳۔ کس کے پھوٹے ایسے بھاگ ۔ پاؤں کنویں میں سر پر آگ۔ (۴) آدھا نام پھول کا آدھا پھل کا کھائے جو کوئی صحیح نام
پھول کو پنکھڑی نہیں، پھل کو نہیں ڈنٹھل، بیچتے بیٹھے موتی حلوائی سیٹھ۔

بشیر النسا بیگم (نسواں فوقانیہ محبلی کمان)

اتاترک مصطفیٰ کمال کا بچپن

ماں کی آرزو "مجھے بچپن کا صرف ایک ہی واقعہ یاد ہے" ترکی کے حکمران مصطفیٰ کمال نے کہا "لیکن وہ میرے دماغ میں اب بھی بہت ہی اچھی طرح محفوظ ہے۔ یہ واقعہ میرے مدرسہ کے داخلہ کے متعلق تھا جس میں میرے والدین بالکل مختلف زاویۂ نظر رکھتے تھے۔"

"میری والدہ صاحبہ پرانے دستور اور رسم و رواج کی پابند تھیں جن میں وہ خود بھی پالی پوسی گئی تھیں۔ ان کی زندگی کا مقصد صرف بے شور اور پرخلوص خدا پرستی تھا۔" دوسری طرف میرے والد ایک آزاد خیال آدمی تھے۔ جو پادریوں کے فرقہ کے مخالف ہونے کے باوجود بھی ان خیالات کے ایک زبردست حامی تھے جو مغرب سے پھیل رہے تھے۔ اسی لیے ان کی خواہش تھی کہ میں ایک ایسے مدرسہ میں داخل کیا جاؤں جہاں قرآن نہیں بلکہ سائنس تعلیم کی بنیاد ہو۔"

"خیالات کے اس اختلاف میں میرے والد نے بالآخر ایک شیریں فریب کی مدد سے جیت لیا۔ ظاہرہ میری والدہ کی خواہشات پر رضامند ہو کر انھوں نے مان لیا۔ کہ دستور کے مطابق رسموں کی ادائی کے بعد مجھے ملاؤں کے مدرسہ 'فاطمہ مولا قادن' میں داخل کر دینا چاہیے۔"

"میرے داخلہ کے دن کی صبح کو میری والدہ صاحبہ نے مجھے سفید پوشاک پہنایا" ایک سنہری پگڑی میرے سر پر باندھی، اور انھوں نے میرے ہاتھ میں ایک چھڑی بھی دی جس پر سونے کا کام کیا ہوا تھا۔ تب میرے استاد صاحب نے اپنے شاگردوں کے ساتھ ہمارے گھر کے ہرے اور سجائے ہوئے دروازہ پر آواز دی۔ جب نماز پڑھا دی گئی تو والدہ، والد اور استاد صاحب کو میں نے اپنی انگلیوں کو سینے اور پیشانی تک لے جا کر بندگی عرض کی۔ پھر میں اپنے نئے ساتھیوں کی تالیوں کی گونج میں ایک برات کے ساتھ شہر کی گلیوں میں گھومتا ہوا مدرسے آیا جو مسجد سے لگا ہوا تھا۔ ہماری آمد پر وہاں بھی ایک نماز با جماعت پڑھی گئی تب میرے استاد نے میرا ہاتھ پکڑ کر ایک گنبد دار خالی کمرہ میں پہنچایا جہاں قرآن کی مقدس دنیا میرے سامنے بے نقاب کی گئی۔

تعلیم میں انقلاب "تقریباً" ۶ مہینے بعد میرے والد بغیر کسی دھوم کے مجھے اس مدرسہ سے نکال کر ایک بوڑھے سے مدرس شمسی آفندی کے ہاں لے گئے جو ایک ابتدائی خانگی مدرسہ کے ڈائرکٹر تھے۔ یہ مدرسہ بالکل مغربی اصولوں پر چلتا تھا۔ میری والدہ کو اس پر کوئی اعتراض نہ تھا کیونکہ اصل طور پر تو انھیں رسوم کی پابندی کا خیال تھا۔ اور اب ان کی آرزوئیں پوری کر دی گئی تھیں۔"

مصطفیٰ کمال کے والدین کا اپنے لڑکے کی پڑھائی پر کشمکش کا قصہ اس زمانہ کی ایک تکلیف دہ تصویر پیش کرتا ہے۔ یہ والدین کا اختلاف، دراصل پرانے اور نئے خیالات کی ایک کشمکش تھی جو ترکی میں سنہ ۱۸۸۰ء میں ہو رہی تھی۔ مصطفیٰ بھی اسی دو دوروں کے درمیانی اور انقلابی زمانے میں پیدا ہوا تھا۔

ماں اور باپ اس کے والد "علی رضا بے" ایک بالکل آزاد خیال آدمی تھے جو (اس زمانے کی) اسلامی ریاست کی کمزوری اور بگاڑ کو اچھی طرح جانتے تھے۔ اور ترکی کی ضعیف حکومت کی اصلاح کے دل سے متمنی تھے۔ مصطفیٰ کی والدہ "زبیدہ خانم" بڑی ہی پکی مذہبی خاتون تھیں جو اپنے آخر دنوں تک بھی اسلام اور زہد و تقویٰ کے سخت پابند رہیں۔ نہ وہ پڑھ سکتی تھیں اور... نہ لکھ سکتی تھیں۔ وہ ایک ترکی گھریلو بیوی کی مانند بالکل بند اور تنہا زندگی گزارتیں، اور سوائے اپنے کنبے اور چند سہیلیوں کے کسی اور سے گفتگو نہ کرتیں اور اپنے گھر ہی

بالکل عیاں تھا کہ وہ عثمانی سلطنت کی بہت بڑی حامی تھیں۔
دوسری طرف مصطفیٰ کے والد تھے، جو اپنی بیوی کے بالکل مخالفت میں ایسے خیالات کے مطیع تھے جو عثمانی سلطنت کا خاتمہ ان دینے والے تھے۔

باپ کی کمائی۔ کمال کے والد علی رضا بے ساحل سالونیکا کے محکمہ محصولات کے ایک عہدہ دار تھے جن کی تنخواہ، جو بہت قلیل تھی، اکثر اوقات مہینوں بعد ملتی تھی اور بعض وقت ملتی ہی نہ تھی۔ اس لیے اس کنبہ کو جو ترکی سالونیکا میں ایک چھوٹے سے لکڑی کے گھر میں رہتا بہت کٹھن دن دیکھنے پڑ رہے تھے۔ اس میں تین بچے تھے۔ دو لڑکے اور ایک لڑکی لیکن مصطفیٰ کا بھائی کمسنی ہی میں مر چکا تھا اس لئے کنبہ کے چار فرد تھے۔ والد، والدہ، مصطفیٰ اور اس کی بہن مقبولہ۔

خوشی کے چند دن۔ علی رضا بے، یہ دیکھ کر کہ اس کی کمائی ہوئی رقم سے اس کے کنبہ کا کھانے کا خرچہ بھی پورا نہیں ہو سکتا، محکمہ محصولات کو چھوڑ دینے کا فیصلہ کیا۔ اس نے لکڑی کی تجارت سے ایک نئی طرز زندگی شروع کی اور جلد ہی اس کی تجارت کامیاب ہو گئی۔ یہ مصطفیٰ کے بچپن کے مسرت انگیز دن تھے۔ لیکن وہ بہت ہی قلیل مدت کے لیے رہے۔

ننھا چرواہا۔ اس کے والد نے جلد ہی انتقال کیا اور ایک بیوی اور دو بچوں کو بغیر کسی سہارے کے چھوڑ دیا۔ اس وقت مصطفیٰ نو سالہ تھا۔ اس کی والدہ نے اپنے بھائی کے ہاں پناہ لی جس کی ایک زمین لازاسان نامی گاؤں میں تھی۔ جو سالونیکا سے دو گھنٹے فاصلہ پر تھا۔ یہاں مصطفیٰ کو کام کرنا پڑا۔ اس کو اصطبل صاف کرنا، جانوروں کو چارہ دینا اور انھیں چرانا پڑتا تھا۔ اب وہ ایک کسان بن گیا۔

ماں کی پریشانی۔ دو سال اسی طرح گذر گئے۔ وہ ایک کمزور اور دبلے بچے سے مضبوط، متفکر اور طاقتور لڑکے میں تبدیل ہو گیا تھا جو ہر وقت خوددار اور خاموش رہتا تھا۔ اس کی والدہ پریشان ہو گئی تھیں۔ وہ اپنے لڑکے کو چرواہا بنانا نہیں چاہتی تھیں۔ بیٹے کے متعلق وہ دوسرے ہی خیالات رکھتی تھیں۔ اس لئے انھوں نے سالونیکا کی ایک بہن کو مصطفیٰ کی تعلیم کے اخراجات برداشت کرنے کے لئے تیار کر لیا۔ اس طرح سے کھیت پر دو سال کی تربیت کے بعد وہ ایک انٹرمیڈیٹ اسکول میں داخل ہو گیا۔ لیکن یہاں وہ اپنے ہم مکتبوں سے لڑ پڑا۔ بدقسمتی سے اس وقت جب کہ لڑائی زوروں پر تھی، عربی کے مدرس کیمک حافظ نے دیکھ لیا اور دوسرے لڑکوں پر عبرت اور اپنا ڈر بٹھانے کے لیے مصطفیٰ کو بہت ہی سخت سزا دی۔

یہ مصطفیٰ کو بہت ناگوار ہوا تھا۔ وہ غضبناک ہو گیا اور تہیہ کر لیا کہ اس مدرسہ کو وہ پھر کبھی نہ جائے گا۔ وہ اپنی والدہ کے ہاں ایک اور بار چلا گیا اور پھر اسے مویشی چرانا اور اصطبل کا کام کرنا پڑا لیکن زیادہ زمانہ تک نہیں۔

فوجی زندگی کا آغاز۔ اس کا دوست احمد جو ایک ہمسایہ میجر قادری بے کا بیٹا تھا فوجی کالج میں زیر تعلیم تھا۔ وہ ایک خوبصورت لباس پہنتا تھا جس کے لیے مصطفیٰ اس سے رشک کرنے لگا تھا۔ اس نے تہیہ کر لیا کہ وہ بھی ایک ایسا ہی سپاہی بنے گا۔ اس کی والدہ نے اس ارادہ کی پرزور مخالفت کی لیکن مصطفیٰ اپنے والد کے ایک دوست کے ہاں گیا اور اس سے امداد کی درخواست کی۔ اس کے والد کے اس دوست نے جو ایک وظیفہ یاب فوجی عہدہ دار تھے، اس لڑکے کے لئے سالونیکا کے فوجی کالج میں امتحان دینے کی اجازت حاصل کر لی۔ مصطفیٰ کامیاب ہو گیا اور داخل بھی کر لیا گیا۔ اس کی والدہ کو بھی اسی قسمت کا سامنا کرنا پڑا۔ اس کا بیٹا جو فوجی

...س کا طالب علم بنا تھا جلد ہی اپنے سارے ہم جماعتوں سے آگے تھا۔

...ال" وہ خصوصاً حساب میں بہت دلچسپی لیتا تھا۔ اس مضمون کے استاد جن کا نام کیپٹن مصطفیٰ تھا۔ اس کے خاص کرم فرما بن گئے۔ اس کے
...رے سال اس مدرس نے مصطفیٰ کے زیر تحت ایک چھوٹی جماعت کر دی اور اپنے نام اور اپنے شاگرد کے نام میں پہچان پیدا کرنے
...لیے اپنے شاگرد کو اس نے "کمال" کا لقب دیا۔ کمال ایک عربی لفظ ہے جس کے معنی فضیلت کے ہیں۔ آتا ترک کا اصل نام کمال
...بلکہ اسے اس کی غیر معمولی قابلیت کی وجہ سے اس کے مدرس کی طرف سے اعزاز کے طور پر دیا گیا تھا۔ اس وقت سے وہ مصطفیٰ کمال
...کے نام سے پہچانا جاتا ہے۔

...ل چلن۔ وہ بہت جلد ہی ابتدائی جماعتوں میں کامیابی حاصل کر کے مناستر کے صدر ٹریننگ اسکول میں مزید فوجی تعلیم کے لئے داخل
...یا۔ وہاں کا ایک لڑکا اپنے سترہ سالہ دوست کے کردار کے متعلق کہتا ہے "مصطفیٰ کمال" ہر وقت خاموش اور اپنے ساتھیوں سے
...دہ رہا کرتا تھا۔ اس نے کبھی کسی سے گہری دوستی قائم نہ کی لیکن وہ کبھی غیر دوستانہ اور سرد مزاج نہ ہوتا تھا۔ وہ زندہ دل اور
...مولی طور پر ہر دل عزیز تھا۔ وہ بہت مطالعہ کرتا تھا لیکن جتنا پڑھتا تھا اس کا سہ گنا وقت اپنی زیر مطالعہ کتاب پر سوچنے اور
...جھنے میں صرف کرتا تھا۔"

آتا ترک مسولینی کے مانند اپنے بچپن میں شریر نہ تھا۔ اس لئے اس کے ساتھیوں کو وہ بہت ہی خود دار اور نامبارک
...ہوتا تھا۔ ایک مرتبہ جب اُس سے پوچھا گیا کہ وہ کیوں ان کے ساتھ (کھیلوں اور شرارتوں میں) شریک نہیں ہوتا تو اس نے
...دیا کہ وہ ان میں دلچسپی نہیں لیتا تھا۔ لڑکوں نے (غصہ میں) پوچھا کہ اس نے اپنے آپ کو کیا سمجھ رکھا ہے اور یہ کہ وہ
...آپ کو کیا بننے والا سمجھ رکھا ہے۔ مصطفیٰ کمال نے لڑکوں پر ایک نظر ڈالی اور متانت اور سنجیدگی سے کہا "کوئی شخص"
...تیلا باپ۔ تعطیلات میں کمال اپنی والدہ کے ہاں گھر گیا جو اس اثنا میں روڈس کے ایک دولت مند شخص سے شادی کر چکی
...وہ اپنی والدہ سے اس شادی کی بنا پر جھگڑ لیا۔ اور اپنے سوتیلے والد سے بات کرنے سے صاف انکار کر دیا۔ اور اس کے بعد
...س کا نام بھی زبان پر نہیں لایا۔

...د۔ جب وہ مناسٹر واپس آگیا تو وہاں اُس نے اتنی محنت سے کام کیا کہ ترقی کے لئے نام زد کر دیا گیا۔ آخر کار جنرل اسٹاف
...عہدہ داروں) کی ٹریننگ کے لئے وہ قسطنطنیہ میں اکاڈمی آف ملٹری آرٹ میں منتقل کر دیا گیا۔ یہ جنرل اسٹاف کالج میں تھا
...مصطفیٰ نے ملک اور وطن کے حالات سے دلچسپی لینی شروع کی۔ بہت جلد ہی وہ کالج کی انقلاب پسند جماعت "وطن" کا ایک
...ا۔ باغیانہ سرگرمیوں کی بنا پر وہ فوراً قید کر دیا گیا۔
...ناگزیر طور پر ہر ایک آمر کی حقیقی سیاسی زندگی کا آغاز قید کی سزا ہی سے ہوتا ہے اسی طرح مسولینی سے ہوا، اسی طرح اسٹالن
...اور اسی طرح آتا ترک سے۔

غلام حقانی انصاری

بُری عادت

اشرف کو بچپن ہی سے چوری کی عادت پڑگئی۔ جب وہ چھوٹا تھا مدرسہ سے لڑکوں کی کتابیں، قلم، اور پنسلیں
گھر میں محفوظ رکھتا۔ اتفاقاً والدین کی نظریں پڑجاتیں تو بہانہ کردیتا کہ یہ چیزیں میرے دوست نے دی ہیں۔ جوان ہوکر
چور بن گیا۔ اس کے دو ساتھی عزیز اور یوسف بری صحبت کی وجہ سے اس کے شریک جرم بن گئے تھے۔

ایک مرتبہ یہ لوگ آدھی رات گئے لوگوں کی نظروں سے بچ کر چوری کی غرض سے کسی بڑے رئیس کے گھر جا گھسے
بہت سارا مال چرا لائے۔ صبح پولیس میں رپورٹ ہوئی کہ چور مال چرا کر چمپت ہوگئے ہیں۔ پولیس نے بہت کچھ تفتیش کی
یہ چیلا، اشرف، عزیز اور یوسف چوری کئے بغیر نہ رہتے، اور جو کچھ بھی مال مسروقہ ہوتا آپس میں بانٹ لیا کرتے، اور شراب
بیٹھ کر شراب نوشی کیا کرتے تھے۔ جب پولیس نے خوب جانچ پڑتال کرلی اور ملزموں کا پتہ نہ چلا تو فیروز نامی جاسوس کو
لگانے پر مقرر کیا گیا۔ فیروز جاسوسی میں کمال رکھتا تھا، اور اس نے پہلے کئی مرتبہ اپنے فن سراغ رسانی کی مدد سے
گرفتار کراکے حکومت سے انعامات بھی حاصل کئے تھے۔

۲

ایک دن جب وہ بازار سے گذر رہا تھا اس نے تین مشتبہ آدمیوں کو اپنے قریب سے گزرتے دیکھا اور ان کے
آخرکار وہ تینوں ایک شراب خانہ میں داخل ہوگئے۔ فیروز بھی چھپتا چھپاتا ان کی خفیہ نقل وحرکت دیکھتا رہا۔
دوسرے سے یوں کہا "کہو یار کہاں کے ارادے ہیں"۔ نواب ناظر حسن کی کوٹھی ـــ کل ـــ ایک بجے رات
اوپر ـــ جلدی ـــ ہاں ہاں ـــ بہت جلد۔

اس کے بعد سب یکے بعد دیگرے شراب خانہ سے غائب ہوگئے۔

۳

دوسرا دن ـــ رات اور تاریک رات ـــ ناظر حسن بستر استراحت پر ـــ ڈاکو اپنی گھات میں ـــ
کمند لگاکر پوری احتیاط کے ساتھ نازل ہوگئے۔ چابیاں تلاش کیں تو بیچارے نواب صاحب کے سرہانے تکیہ کے نیچے پڑی
چابیوں کے ہاتھ لگتے ہی بیگم صاحبہ کے قیمتی زیورات کے بکس، پر دھاوا بول دیا گیا تجوری سے تمام نوٹ اور روپیہ

۴

فیروز اپنے کوٹھے پر سگار جلائے ٹہل رہا تھا۔ پولیس جس کا پہلے سے ہی انتظام کرلیا گیا تھا۔ اشارے کی
دیر نہ گذری کہ دور سے سپاہی نظر آئے فیروز نے ناظر حسن کی کوٹھی کی جانب اشارہ کیا اور خود بھیس بدل کر ان کی
آگے آگے چلنے لگا سپاہیوں نے کوٹھی کو گھیر لیا۔ جب چور اترنے لگے تو اتفاقاً کمند ٹوٹ گئی۔ جس کی آواز سے
آکر جمع ہوگئے۔ ڈاکو بھاگ نہ سکے اور نہایت آسانی کے ساتھ گرفتار کرلئے گئے۔

دوسرے دن مقدمہ مجسٹریٹ کے سامنے پیش ہوا۔ اشرف، یوسف، او عزیز نے اپنے ارتکاب جرم کا اقبال کر لیا۔ مجسٹریٹ نے
...ملزمان اشرف، عزیز اور یوسف کو دو دو سال قید با مشقت کی اور دو دو سو روپیہ جرمانہ ادا نہ کرنے کی صورت
میں چار ماہ اور قید رکھا جائے!

فیروز کی اس سراغ رسانی کے سلسلہ میں گورنمنٹ سے کافی انعام ملا اور نواب صاحب نے بھی الگ خوش کیا۔ چوری کی
عادت کی سزا ایسی ہوتی ہے۔

محمد کمال خاں گمنام (مدرسہ عالیہ)

...نک چوں چوں چوں

ایک چڑیا اور اس کے دو بچے ایک بھاٹ کی کنکی روز چگ جایا کرتے تھے۔ ایک روز بھاٹ تاک میں لگا رہا اور جب چڑیاں آئیں تو
...پکڑ لیا۔ چڑیا تو اس کے پھندے سے نکل گئی لیکن اس کے بچے بھاٹ نے پکڑ لیے۔ چڑیا نے بھاٹ سے بہت منت سماجت کی
...ایک نہ مانی۔ ادھر سے ایک گڈریا اپنی بکریاں لیے جا رہا تھا چڑیا نے اس سے کہا۔

اے میاں بکریوں والے زنگ چوں چوں چوں
دوئی چگلال مرے بھوکوں مریں کچھ دیدو چھڑا کے لو

گڈریے نے بھاٹ سے کہا کہ تو میری سب بکریاں لے لے اور اس کے بچوں کو چھوڑ دے۔ مگر بھاٹ راضی نہ ہوا۔ پھر ایک شخص
...لے کر نکلا چڑیا نے اس کو جا کر اپنا دکھڑا سنایا اور کہا۔

اے میاں گایوں کے چرویے زنگ چوں چوں چوں
دوئی چگلال مرے بھوکوں مریں کچھ دیدو چھڑا کے لو

گائے والے نے بھاٹ کو بہت سمجھایا اور کہا میاں بھاٹ میری سب گائیں تم لے لو اس بیچاری چڑیا کے بچوں کو چھوڑ دو۔
...ماننے والا تھا۔ غریب چڑیا دل مسوس کر رہ گئی۔ اتنے میں ادھر سے اونٹوں والا گزرا چڑیا نے اس سے بھی جا کر کہا کہ۔

او میاں اونٹوں کے چرویے زنگ چوں چوں چوں
دوئی چگلال مرے بھوکوں مریں کچھ دیدو چھڑا کے لو

اونٹوں والے نے بھاٹ سے کہا کہ بھائی مرے سب اونٹ تو لے لے مگر اس غریب چڑیا کے بچے چھوڑ دے مگر بھاٹ نے انکار کیا۔
...ادھر سے ایک بھینسوں والا بہت سی بھینسیں لیے ہوئے آنکلا چڑیا نے اس سے بھی یہی درخواست کی کہ۔

اے میاں بھینسوں کے چرویے زنگ چوں چوں چوں
دوئی چگلال مرے بھوکوں مریں کچھ دیدو چھڑا کے لو

بھینسوں والے نے کہا میاں بھاٹ اس بیچاری کے بچے دے دے۔ کیوں اس کے درپے ہوا ہے۔ میری تمام بھینسیں ہیں

تجھے دیئے دیتا ہوں۔ لیکن بھاٹ کی ایک ہٹ تھی کہ نہیں چھوڑوں گا۔ اتنے میں ایک شخص کسی فوج کے گھوڑے ادھر آنکلا۔ چڑیا کے پھر آس بندھی اس نے کہا۔

اے میاں گھوڑوں کے سردار زنگ چوں چوں
دوی چگلال مرے بھوکوں مریں کچھ دید و چھڑا کے لو

گھوڑوں والے نے کہا۔ بھاٹ تو یہ تمام گھوڑے مجھ سے لے لے اور چڑیا کے بچے چھوڑ دے بھاٹ ابھی گھوڑوں والا کچھ ہی دور گیا ہوگا کہ ایک فیل بان کی ایک ہاتھی ساتھ لئے ہوئے آموجود ہوا چڑیا نے اس

اے میاں ہاتھیوں کے سر و ہنے زنگ چوں چوں چوں
دوی چگلال مرے بھوکوں مریں کچھ دید و چھڑا کے لو

بھاٹ اس پر بھی راضی نہ ہوا۔ اب چڑیا کی بے چینی کی کوئی حد نہ رہی۔ اس شش و پنج میں تھی کہ کیا کرے آخر کار ادھر سے ایک جلاہا آپہنچا اور اس نے اپنے پائی پھیلائے۔ چڑیا غریب کے دم میں دم آیا۔ اس امید و جلاہا فرشتۂ رحمت بن کر پہنچا تھا جلدی سے چڑیا اس کے پاس پہنچی اور نہایت لجاجت سے یوں کہنے لگی۔

اے میاں پائی کے پھیلوایا زنگ چوں چوں چوں
دوی چگلال مرے بھوکوں مریں کچھ دید و چھڑا کے لو

جلاہے نے کہا میاں بھاٹ یہ ماڑی مری تم لے لو اس چڑیا کے بچوں کو چھوڑ دو۔ بھاٹ راضی ہوگیا۔ اور جھٹ اس نے چھوڑ دیا۔ اور ماڑی اٹھا کر چلتا بنا۔ چڑیا اپنے بچوں کو لے کر یہ کہتی ہوئی اڑ گئی۔ ”در موئے بھاٹ

کھیل کی تلوار

یہ چھوٹی سی تلوار دیکھے کوئی
نہ ہوگی کوئی اور اس شان کی

مری نانی اماں مرے واسطے
کھلونوں میں عیدی کے لائیں اسے

یہ موٹر یہ گولہ یہ دو سیٹیاں
یہ انجن نکلتا ہے جس سے دھواں

یہ تلوار اک جگمگاتی ہوئی
اور اک بید کی ننھی منی چھڑی

مجھے اتنے سارے کھلونے ملے
پر ہے سب میں تلوار پیاری مجھے

بڑی تیز تلوار کی دھار ہے
نہیں جاتا خالی کبھی وار ہے

جسے دیکھنا ہو وہ دیکھے ابھی
صفائی ذرا میری تلوار کی

کدو ہو کہ ککڑی۔ پپیتی ہو کہ جام
اسے کاٹ دینے سے ہے سب کا کام

کہو تو جو یہ میز پر آم ہیں
ابھی کاٹ کر ہوں دکھا دیتا ہیں

بڑی اچھی ہیں نانی اماں مری
ہے کیا اچھی عیدی عطا مجھ کو کی

خاموش شہزادی

ایک بادشاہ کے بارہ لڑکے تھے۔ مگر اس کو بیٹی نہ ہونے کا بے حد افسوس تھا۔ ایک دن اس نے دعا مانگی۔ کہ اگر اس کے ہاں لڑکی ہو جائے تو وہ اپنے سب بیٹے اس پر قربان کر دے گا۔ جب ملکہ نے یہ سنا تو اس نے اپنا سر پیٹ لیا۔ مگر اب سوائے افسوس کے کیا کر سکتی تھی۔ شام کو جب سب سے چھوٹا شہزادہ اپنی ماں کے پاس آیا تو اسے افسردہ پا کر سبب دریافت کیا۔ ملکہ نے جواب دیا پیارے بیٹے تمہارے باپ نے ایک لڑکی کے لئے دعا مانگی ہے۔ اور جب وہ لڑکی پیدا ہوگی تو تم سب کو قتل کر دیا جائے گا۔ شہزادے نے یہ سن کر جواب دیا آپ کچھ فکر نہ کریں قبل اس کے کہ وہ لڑکی پیدا ہو ہم سب کسی جگہ جا کر چھپ رہیں گے اور اس طرح ہماری جانیں بچ جائیں گی۔ شہزادوں کے جانے کے کچھ عرصہ بعد ملکہ کے ہاں لڑکی پیدا ہوئی۔ وہ اس قدر خوبصورت تھی کہ جو دیکھتا بے اختیار پیار کرتا تھا۔ جب شہزادی چودہ سال کی ہو گئی تو ایک دن اتفاق سے اس کو ایک کمرے میں ایک پرانے صندوق کے اندر بارہ قمیصیں ملیں۔ وہ ان کو ملکہ کے پاس لے گئی اور پوچھا کہ یہ کس کی ہیں۔ ملکہ نے اس کو اس کے بھائیوں کا پورا واقعہ سنا دیا۔ جب شہزادی نے یہ سنا تو کہا نہایت افسوس کی بات ہے کہ میرے بھائیوں کو میری وجہ سے نکالا گیا اب جب تک میں ان کو ڈھونڈ نہ لوں گی محل میں واپس نہ آؤں گی۔ یہ کہہ کر وہ محل سے نکل کھڑی ہوئی۔ بہت دنوں تک ادھر ادھر بھٹکنے کے بعد اس کو ایک لڑکا ایک جھونپڑی کے پاس بیٹھا دکھائی دیا۔ وہ یہ سوچ کر کہ شاید یہ کچھ میری مدد کر سکے۔ اس کے پاس آئی لڑکے نے اس کو دیکھ کر پوچھا میں تمہاری کیا مدد کر سکتا ہوں۔

شہزادی نے یہ سن کر وہ قمیصیں دکھائیں اور کہا کہ میں اپنے بھائیوں کو ڈھونڈنے نکلی ہوں۔ قمیصوں کو دیکھ کر لڑکا جلدی سے اٹھا اور اپنی بہن کو گلے لگا لیا۔ اتنے میں اس کے اور بھائی بھی آ گئے اور اپنی بہن کو دیکھ کر بہت خوش ہوئے اور شہزادی بھی انھیں کے ساتھ وہیں پر رہنے لگی۔ ایک دن سب بھائی اور بہن اکٹھے بیٹھے ہوئے تھے۔ شہزادی کو تھوڑے فاصلہ پر بارہ خوبصورت پھول دکھائی دئیے۔ وہ دوڑی ہوئی انھیں توڑنے لگی تاکہ انھیں لا کر اپنے بھائیوں کو دے۔ مگر پھول توڑنے کی دیر تھی کہ سب بھائی پرندوں کی شکل میں تبدیل ہو کر اڑ گئے اور شہزادی وہاں اکیلی رہ گئی وہ حیران و پریشان بیٹھی تھی۔ کہ اس نے ایک بوڑھے بزرگ کو سفید کپڑوں میں ادھر آتے دیکھا۔ دیکھتے ہی شہزادی نے سوال کیا۔ کیا آپ مجھے کوئی ایسی ترکیب بتا سکتے ہیں جس سے میرے بھائی مجھ سے مل جائیں۔

بزرگ نے جواب دیا "ہاں! اور وہ یہ ہے کہ تم سات سال تک گونگی بنی رہو۔ کسی سے بات چیت نہ کرو تمہارے بھائی واپس آ جائیں گے"۔ کہہ کر وہ بزرگ غائب ہو گئے۔ شہزادی نے ارادہ کر لیا کہ وہ بھائیوں کے لئے سب کچھ کرے گی۔ اور یہ سوچ کر ایک درخت پر چڑھ گئی۔ اس کو بیٹھے تھوڑی ہی دیر ہوئی تھی۔ کہ ایک نوجوان بادشاہ ادھر سے گذرا اور اسے درخت پر بیٹھے دیکھ اس کے پاس آیا اور اسے نیچے اتارا پھر اپنے محل میں لا کر اس سے شادی کر لی چھ سال ہنسی خوشی گزرے مگر بادشاہ کی ماں شہزادی سے حسد کرتی تھی اور بادشاہ سے جھوٹی شکایتیں کرتی تھی۔ پہلے تو بادشاہ نے کبھی پروا نہ کی۔ مگر جب تھوڑے دنوں بعد بھی شکایتیں

سبدسس

روز بروز بڑھتی گئیں تو اس نے بہت چاہا کہ شہزادی اپنی زبان سے کچھ کہے۔ مگر شہزادی نے تو بولنے کا عہد کر
بادشاہ نے یہ سمجھ کر کہ وہی قصور وار ہے اس کو مار دینے کا ارادہ کیا۔ جب شہزادی کے لئے آگ وغیرہ سب تیار ہو چکا
اس میں ڈالنا چاہا چاروں طرف اندھیرا ہوگیا اور بارہ پرندے نیچے کی طرف آتے دکھائی دیے اور آتے ہی سب
تبدیل ہوگئے یہ اصل میں شہزادی کے بھائی تھے۔ جو اس کو سات سال ختم ہونے کی خوش خبری سنانے آئے تھے اس
اپنی بہن کی جان بچالی۔ جب شہزادی کو لوٹنے کی اجازت مل گئی تو سب مل کر اپنے ماں باپ کے پاس گئے اور تمام باتیں
یہ سن کر بہت خوش ہوا اور سب ہنسی خوشی رہنے لگے۔

امامی سلطان یار جنگ

مچھر نے قلعہ فتح کرادیا

پرینڈہ۔ دکن کا ایک موضع ہے۔ یہاں ایک قلعہ تھا جو نظام شاہی بادشاہوں کے قبضہ میں تھا ابراہیم عادل
نے اس پر قبضہ کر کے اپنے ایک امیر کو قلعہ دار مقرر کیا۔ جب برہان شاہ کو خبر ہوئی تو فوج لے کر قلعہ فتح کرنے کے
روانہ ہوا قلعہ دار کو جب خبر پہونچی تو بہت گھبرایا اور سوچنے لگا کیا تدبیر کرے اس ہی فکر میں آنکھ لگ گئی
کے پاس آکر بھِن بھِن کرنے لگا کم ہمت ڈرپوک نیند میں سمجھا کہ نظام شاہ کی فوج آگئی اور یہ اس کے بگل کی آواز
سمجھ کر نیند سے اٹھا اور بھاگا اور اس کو دیکھ کر قلعہ دار اور اس کے گھر والے بھاگے قلعہ دار اور اس کے گھر والوں کو بھاگتا دیکھ کر فوج
بھاگی۔ قلعہ خالی ہوگیا نظام شاہ نے آکر قبضہ کرلیا۔

مرزا عبدالرحمٰن بیگ

(جماعت ہفتم)

دُوراندیشی

دُوراندیشی ایک اچھی صفت ہے جو لوگ دوراندیش ہوتے ہیں۔ وہ بہت اطمینان سے رہتے ہیں دوراندیشی
میں اچھی ہے۔ مگر گھر کی آمدنی میں تو دوراندیشی کا بہت ہی خیال رکھنا چاہیئے۔ جو لوگ بے سوچے سمجھے
کرتے ہیں وہ بہت تکلیف اٹھاتے ہیں۔ اور دُکھ سُکھ پر انھیں دوسروں کے ہاتھوں کی طرف دیکھنا پڑتا ہے۔
یہ بات یاد رکھنی چاہیئے کہ جوانی کا سرمایہ بڑھاپے میں کام آتا ہے۔ ہمیشہ اس بات کا خیال رہے کہ اس وقت
ہاتھ میں ہے۔ تو دو چار خرچوں کو کم کر کے بھی اسے اُس وقت کے لئے بچا دیں جب کہ آمدنی کی صورت نہ رہے گی۔
کسی کے دن یکساں نہیں رہتے۔ وقت پڑنے پر دوسروں کے دست نگر ہونا بڑی شرمندگی کا باعث ہے۔

محمد اسداللہ خاں

(سٹی کالج)

بچوں سے باتیں (نظم)

جو بات سچی ہو وہ سناؤ ۔ نہ دل میں اندیشہ کوئی لاؤ
نہ کرنا ضد مدرسے سے آکر ۔ خدا نے جو کچھ دیا ہے کھاؤ
نئی جو باتیں ہوں اُن کو سیکھو ۔ جو سیکھ جاؤ تو کر دکھاؤ

ہنر جو تم مدرسہ میں سیکھو ۔ تو دوسروں کو بھی وہ سکھاؤ
جو کھیلو بھائی بہن سے بچو ۔ لڑو نہ جھگڑو نہ کچھ ستاؤ

بڑوں کی طاعت کیا کرو تم ۔ ہوں چھوٹے الفت سے پیش آؤ
ملے جو چھٹی تو کھیلو کودو ۔ وگرنہ مکتب کو آؤ جاؤ

ملے گی دولت کے ساتھ راحت ۔ جو پڑھنے لکھنے میں دل لگاؤ
جو پیش آجائے کوئی مشکل ۔ تو خوف دل میں کبھی نہ لاؤ

ہے تندرستی ہزار نعمت ۔ صحت کو جیسے بنے بچاؤ
زباں کو قابو میں اپنے رکھو ۔ کہیں نہ اس سے زیاں اٹھاؤ

نہ عیب جوئی کرو کسی کی ۔ نہ منہ بناؤ نہ منہ چڑاؤ
جو غمزدوں کی کرو اعانت ۔ کبھی نہ احسان تم جتاؤ

تمہارا طرز عمل ہو بہتر ۔ جو کام اچھے ہوں کرنے جاؤ
نصیحت علم یاد رکھو
کسی کے دل کو نہ تم دکھاؤ

محمد کریم الدین خاں علم

شکسپیر کے جواہر ریزے

(۱) جس شخص کے پاس تمول وسائل اور قناعت نہیں ہے وہ گویا تین عمدہ دوستوں سے محروم ہے۔
(۲) انصاف کرنے میں تحمل سے کام لے کیونکہ ہم سب گنہگار ہیں
(۳) جو میری نقدی چراتا ہے وہ ایک ناکارہ چیز کی چوری کرتا ہے۔ نقدی ہیچ ہے پہلے میری تھی اب اُس کی ہے اور ہزاروں کی ملکیت رہ چکی ہے لیکن جو میری نیک نامی کو چھینتا ہے وہ میری ایک ایسی چیز کو لوٹتا ہے جو اُسے کچھ امیر نہیں بنادیتی اور مجھے درحقیقت غریب کر دیتی ہے۔
(۴) اتنا رونے پر خوش نہیں ہونا جتنا خوشی پر رونا۔
(۵) بلند پہاڑی پر چڑھنے کے لئے پہلے آہستہ چال کی ضرورت ہے۔
(۶) دوست کو دوست کی کمزوریاں برداشت کرنی چاہئیں۔
(۷) ظرافت کی جان اختصار ہے۔
(۸) خدا میری امید ہوگا۔ میرا سہارا۔ میرا رہنما اور میرے قدموں کے لئے چراغ ہدایت۔

منشی محمد عبدالرؤف (کنٹہ روڈ)

کام کی باتیں

(۱) وہ بالکل بے کار آدمی ہے جو دوسروں کی محنت پر زندگی بسر کرتا ہے۔ (سعدی)
(۲) اپنے دماغ کو علم سے محروم نہ کرو اس لئے کہ علم بڑی قدر کرائیگا۔ (فردوسی)
(۳) دوست اور دشمن دونوں پر مہربانی کا اظہار کرو۔ کہ کوئی نامہربان دل مہربانی نہیں کر سکتا۔ (عمر خیام)

سیدہ عظیم النساء بیگم

ہمدرد طالب علم (ڈرامہ) بسلسلۂ گذشتہ

چوتھا منظر

فہیم بازار سے گذر رہا ہے۔ سڑک کے دونوں طرف دکانیں بنی ہوئی ہیں۔

فہیم ایک دکان پر جاکر "صاحب ذرا میں ٹیلیفون پر گفتگو کرسکتا ہوں"

مالک گردن کو جنبش دیتا ہے۔

فہیم آلہ اٹھاتا ہے۔ نمبر ۸۴۴ سے۔

ہو ۔۔۔۔۔۔ ہاں ۔۔۔۔ کہاں سے؟ ۔۔۔ ہاں ۔۔

دیکھو ذرا معین نواب کو بلانا۔

یہاں کا نمبر؟ ۶۵۶۔

فہیم آلہ رکھ دیتا ہے۔ تھوڑی دیر کے انتظار کے بعد گھنٹی بجتی ہے فہیم آلہ اٹھالیتا ہے۔

فہیم ہو ۔۔۔ ہاں ۔۔۔ اچھا معین دیکھو ۔۔۔۔ یہاں پر ایک غریب لاوارث کا انتقال ہوگیا ہے۔ ذرا تم اپنی موٹر لے کر جلدی آؤ ۔۔۔۔ ہاں دیکھو ۔۔۔۔ ذرا آپا سے بھی کہہ دینا۔

ہاں ۔۔۔ ہاں ۔۔۔ دیکھو ذرا جلدی ۔۔۔ تفصیلات یہاں آنے پر معلوم ہوجائیں گے۔ اچھا جلدی کرنا۔ فہیم آلہ رکھ دیتا ہے۔ فہیم مالک کی طرف منہ کر کے ۔۔۔ شکریہ ۔۔۔ فہیم اپنی جیب سے پاکٹ نکال کر دیکھتا ہے۔ صرف سات روپیہ اچھا کپڑا لیتے چلو۔

فہیم چلتا رہتا ہے۔ کسی کے پکارنے کی آواز آتی ہے ۔۔۔ فہیم فہیم۔ فہیم پیچھے پلٹ کر دیکھتا ہے۔ اخو عزیز۔ واہ یار کیا موقع پر پہنچے ہو۔

عزیز۔ بھئی کیا بات ہے۔ تم اتنی جلدی کہاں جارہے ہو۔

فہیم۔ بھئی یہاں کسی غریب لاوارث کا انتقال ہوگیا ہے۔

عزیز! ذرا تم بھی اس میں حصہ لینا۔ کوئی نہیں اس کا ایک دس سال لڑکا ہے۔ جب وہ بیمار تھا تو میں وہاں تھا۔

عزیز۔ اچھا تو جلدی کرو۔

پیچھے سے ایک موٹر تیز آتی ہے۔ اور ان کے پاس ...

فہیم۔ معین تم پہنچ گئے۔ اچھا ہوا۔ والدہ سے بھی کہتے ...

معین۔ ہاں اچھا تو بیٹھ جاؤ۔

سب بیٹھتے ہیں موٹر چلی جاتی ہے۔

پانچواں منظر

فہیم کا گھر۔ پاس باغ بنا ہوا ہے۔ موٹر آکر رکتی ہے۔ للن روتا ہے۔ فہیم للن کو سنبھالے اترتا ہے۔ اس کے بعد معین ... بھی اتر جاتے ہیں۔ اور سب فہیم کے کمرے میں آکر بیٹھتے ہیں للن فرش پر بیٹھنا چاہتا ہے۔ لیکن فہیم اس کو اٹھاکر کرسی پر بٹھا دیتا ہے۔ للن رو رہا ہے۔

فہیم۔ للن تمہارے رونے سے کیا حاصل جو کچھ خدا کو منظور تھا ہوا۔ اب تم اس کو اپنا گھر سمجھو۔ خدا چاہا تو تم کو ہر طرح کا آرام پہنچے گا۔

معین۔ ہاں للن تم اب فہیم کے پاس بہت خوش رہوگے۔ یہ بہت ہی ہمدرد ہیں۔

عزیز۔ للن تم کو کسی قسم کی فکر کرنے کی ضرورت نہیں۔ فہیم ہر طرح تمہیں آرام پہنچائیں گے۔

للن کے معین تولیہ سے آنسو پونچھتا ہے۔

معین۔ بھئی فہیم میرا خیال ہے کہ تم اس کو پڑھاؤ۔ بہت کم عمر ہے۔ ذہین بھی معلوم ہوتا ہے۔

عزیز۔ ہاں بھئی بہت ٹھیک ہے۔ یہ ملک کی ایک زبردست خدمت ہے۔ کہیں گھر کا چھوکرا نہ بنا دینا۔

فہیم۔ جمن! ۔۔۔۔ جمن!

جمن۔ جی سرکار!

فہیم۔ دیکھو جمن! ذرا اس بچے کے ہاتھ پاؤں دھلا دو۔

جمن للن کو لے کر جاتا ہے (باہر آکر)

ہاں ے چھوٹے سرکار بھی کیا دلچسپ آدمی ہیں۔ ہر روز کسی نہ کسی
کر لیتے ہیں۔" اور ان کی خدمت کا بار خود اٹھانے کے
علاوہ ہم پر بھی ڈالے بغیر نہیں رہتے۔

اختر۔۔۔۔! اختر۔۔۔۔!

سرکار۔ بشیر آجاتا ہے۔ اختر کہاں ہے۔

بشیر۔ وہ کہیں کام سے گئے ہیں۔ فہیم اچھا دیکھو۔۔۔۔۔
نا کھاؤ۔

عین۔ اچھا بھئی اب اجازت دیجئے۔

فہیم۔ کیوں کھانا نکالا جا رہا ہے۔

معین۔ معاف کرنا جلدی واپس ہونے کا وعدہ کیا تھا انتظار
ر ہے ہوں گے۔

اختر۔ اچھا بھئی مجھے بھی اجازت دینا۔ معین چھوڑتے چلے جائیں گے۔
نوں کو موٹر کے پاس لاکر فہیم چھوڑتا ہے۔ دونوں بیٹھ جاتے
ں موٹر روانہ ہوجاتی ہے۔ فہیم واپس کمرہ میں آتا ہے۔ جمن
ن کولے کر واپس آتا ہے۔ بشیر آتا ہے۔ سرکار کھانا تیار ہے۔
چلو للن۔ للن ہچکیاں لیتے ہوئے ساتھ جاتا ہے۔

چھٹا منظر

دوسرے روز صبح

کمرہ۔ فہیم میز سے لگی ہوئی کرسی پر بیٹھا ہے۔ للن دوسری بازو
کی کرسی پر بیٹھا ہے۔

فہیم۔ للن اب کپڑا تمھارے لیئے منگوا لیا ہے۔ درزی کو بھی
بلایا ہے۔ کپڑے ایک دو روز میں سل جائیں گے۔ میرا ارادہ
ہے کہ کل سے باضابطہ تم پڑھنا شروع کردو

للن۔ آپ جو بھی بولے (جمن اندر داخل ہوتا ہے)

جمن۔ سرکار درزی آگیا ہے۔ اچھا اس کو اندر آنے دو۔
درزی اندر داخل ہوتا ہے۔ سلام کرتا ہے۔ جمن اس میز پر
سے دھرے ہیں لے آتا۔ جمن کپڑے لے آتا ہے۔ اور سامنے
رکھ دیتا ہے۔ فہیم گٹھڑی کھول دیتا ہے۔ اور علیحدہ علیحدہ کپڑے

نکال کر کہتا ہے۔ یہ پاجامے۔ یہ قمیص اور یہ شیروانیاں
درزی فہیم کی طرف دیکھ کر سر ہلاتا ہے۔ اور للن کا ناپ لینا چاہتا
ہے۔ للن مسکراتے ہوئے کرسی سے اٹھتا ہے۔ اور ناپ دیتا ہے۔
درزی ناپ لے کر لکھ لیتا ہے۔

فہیم۔ کتنے دن میں دوگے؟

درزی۔ چار دن میں۔

فہیم۔ نہیں! جلدی چاہیئے۔

درزی۔ اچھا تین دن میں دوں گا صاب۔

فہیم۔ نہیں دو روز میں دے دو۔

درزی۔ کام بہت ہے۔ آپ کا سوٹ بھی تو کل دینا ہے۔

فہیم۔ اچھا اس کو پھر دے دینا۔ ان کپڑوں کو تو جلدی دیئے۔

درزی کپڑوں کی گٹھڑی باندھتا ہے۔ اور سلام کرکے جاتا ہے۔
اور فہیم اور للن بھی چلے جاتے ہیں۔

ساتواں منظر

(۸ سال کے بعد)

فہیم کا کمرہ۔ اخبار دیکھ رہا ہے۔ کمرہ میں بہت سی تبدیلی ہوگئی
ہے میز کرسی کی جگہ بدل گئی ہے۔ کتابوں کی دو الماریاں دیوار سے
لگی ہیں۔ تصاویر بھی پہلے کی نہیں۔

فہیم۔ جمن! جمن (جمن اندر داخل ہوتا ہے)

فہیم۔ دیکھو للن کو تو بلاؤ۔

جمن۔ جی اچھا۔

بشیر کارڈ لاتا ہے۔ فہیم کارڈ دیکھ کر اہو۔ معین۔ (باہر آکر معین کو
کمرہ میں لے جاتا ہے۔

معین۔ بھئی کیا بتاؤں للن نے کیا تقریر کی۔ ایک دریا تھا جو سکون
و اطمینان کے ساتھ بہہ رہا تھا۔ اتنی شائستہ تقریر تو کسی [illegible]
کی نہیں سنی۔ تم نے تو اس کے ساتھ کافی محنت کی ہے میں تمھاری
اس کامیابی پر مبارک باد دیتا ہوں۔ ہمارے ملک کو تم جیسے ہی
لوگوں کی سخت ضرورت ہے۔

سب ہنس
فہیم ۔ بھئی معین میری کیا حقیقت ہے ۔ من آنم کہ من دانم ۔ خدا کے
فضل سے تم بھی اس معاملہ میں مجھ سے پیچھے نہیں ۔ للن اندر داخل
ہوتا ہے ۔ للن سلام کرتا ہے ۔ معین اور فہیم سلام لیتے ہیں ۔
سب بیٹھ جاتے ہیں ۔
فہیم ۔ تمہاری تقریر کا حال ابھی معین صاحب کی زبانی سنا طبیعت
بہت خوش ہوئی ۔ میاں ملک کی خدمت کے لئے اپنے آپ کو
وقف کردو ۔ شاباش ہے تمہاری ہمت پر ۔ غریبوں اور دردمندوں
کی حمایت تم ہی جیسے نوجوان کرسکتے ہیں ۔

معین ۔ بھئی للن تمہارا زخم کیسا ہے ۔ واہ بھئی واہ
چلتے ہوئے گھر میں جاکر تین معصوم جانیں بچائیں ۔ آفریں
جواں مردی پر ۔
للن ۔ اب زخم سوکھ گیا ہے ۔
معین ۔ اچھا اب چلو ۔ فہیم اور للن کپڑے پہن کر تیار ہو
فہیم ۔ جلسہ کب سے شروع ہوگا ۔
معین ۔ پانچ بجے سے ۔ تینوں باہر جاتے ہیں ۔

شیخ رحیم الدین

ہماری پڑوسن

میں آپ صاحبین سے ایک دلچسپ کردار کا تعارف کراتی ہوں اور وہ ہماری پڑوسن ہیں وہ کہتی تھیں کہ ان کا
آدم علیہ السلام سے ملتا ہے ۔ اور ان کے والد صاحب کے استقبال کے لئے بہت سے امراء جن میں سے مجھے ایک کا نام
افسر جنگ وغیرہ آیا کرتے تھے ۔ میں اس بناوٹی قصہ کو بالکل سچا جانتی تھی ۔ لیکن کچھ عرصہ بعد معلوم ہوا کہ ان کے والد نواب
کے گھوڑے کے نگران کار تھے ۔ باپ ان کا "کرشان" ۔ بھائی مجسم شیطان ۔
پڑوسن کی شکل بیضوی تھی جیسے اصیل مرغی کا لال انڈا ۔ آنکھیں چھوٹی تھیں جس کی وجہ سے وہ عینک لگایا کرتی تھیں
ان کے بہت موٹے ایسا معلوم ہوتا تھا گویا کوئی سیر بھر کے دو پاٹ اوپر تلے رکھے ہوئے ہیں ۔ مجھ سے ان کی ملاقات ایک جلسہ میں ہوئی اور
ہوا کہ وہ پولیس کے انسپکٹر صاحب کی بیوی ہیں ۔ اس ملاقات کے بعد میں ان سے بہت ہی بے تکلف ہوگئی ۔ ایک دفعہ ایسا ہوا کہ
رات میں میں بغیر اطلاع ان کے یہاں گئی ۔ سات بجے کا وقت ہوگا جاکر انہیں سوتا ہوا پائی ۔ وہ عینک لگائے سو رہی تھیں
عینک کو ہاتھ لگایا تو جاگ کر کہنے لگیں خدا کے لئے مت نکالو میں خواب اچھی طرح نہیں دیکھ سکتی ۔ میں نے ہوش میں لاکر پھر دریافت
پھر وہی الفاظ دہرانے لگیں ۔ میں ہنسنے جو لگی تو تاڑ گئیں اور شرمندہ ہوکر مجھے تاکید کی کہ کسی سے نہ کہوں ۔ میں نے جوں توں کرکے
ہنسی کو روک لیا اور گھر واپس آئی ۔ اس واقعہ کے بعد ایک اور واقعہ پیش آیا جس کا لکھنا میں ضروری سمجھتی ہوں ۔ میں نے
مہینہ میں اپنے دوستوں کو رات کے کھانے پر مدعو کیا ۔ پڑوسن کو تو میں نے میرا ہاتھ بٹانے کے لئے صبح سے بلا لیا تھا
کے سالن سے بے حد انس ہے ۔ باورچی کو پکانے کی فرمائش کی ۔ لیکن پڑوسن نے کہا کہ وہ سالن پکانے میں ماہر ہیں اور پکانا چاہتی
میں نے تکلیف کی خاطر انہیں روکا لیکن انہوں نے نہ مانا اور پکانے پر آمادہ ہوگئیں ۔ دوست آنے شروع ہوئے اور
موٹریں ہمارے کمپونڈ میں جمع ہوگئیں اور چھوٹا سا کمپونڈ آوازوں سے گونجنے لگا ۔ پڑوسن انڈوں کو وقت مقررہ تک
نہیں اور وقت رسٹ واچ میں دیکھا کرتی تھیں ۔ اس دن گڑبڑ میں انہوں نے اپنی رسٹ واچ کو گرم پانی میں ڈال

وقت دیکھنا شروع کر دیا۔ یہاں تک کہ روز کے وقت سے زیادہ وقت گزر گیا۔ گڑبڑ میں انھیں انڈے اور رسٹ واچ میں کوئی فرق محسوس نہیں ہوا۔ دسترخوان چنا گیا کھانے کے لئے لوگ اٹھنے لگے لیکن ابھی تک میرے پسندیدہ سالن کا پتہ نہ تھا۔ میں دوڑی دوڑی باورچی خانہ میں گئی تو پڑوسن کی پردہ لڑکی نے ان کے ہاتھ کے انڈے کو تبلا کر تمام ماجرا کہہ تھا کہ میں نے ہنستے ہوئے ایک زور کی چیخ ایسی ماری کہ پڑوسن نے گھبرا کر انڈا نیچے پھینک دیا۔ اور مجھے غصہ سے گھورنے لگیں۔ میں نے سالن مانگا تو بولیں کہ ابھی انڈا نہیں ابلا۔ میں دسترخوان پر گئی تو لوگ میرا انتظار ہی کر رہے تھے۔ تھوڑی دیر بعد پڑوسن بھی آموجود ہوئیں۔ اور بڑی بے تکلفی سے بات چیت کرنے لگیں۔

میرے بعض دوست سیاہ فام تھے۔ اتفاق سے گورے پہلے گاڑیوں میں سوار ہو گئے اور کالے رہ گئے۔ پڑوسن نے جانے یہ شعر کب سے یاد رکھا تھا۔ ایک دم کہہ دیا۔ ؎

گل گئے گلشن گئے الو کے پٹھے رہ گئے
سارے خوبصورت گئے کالے بھنورے رہ گئے

اتنا کہنا تھا کہ سب لوگ ہنس پڑے۔ دوسرے دن تمام دوست بغیر اطلاع پڑوسن کے یہاں آموجود ہوئے اور مجھے بھی بلوا بھیجا۔ میں بھی تماشہ دیکھنے کے قصد سے وہاں پہنچ گئی تو پڑوسن کو کمرہ میں بند پایا اور اندر یہ کہتے ہوئے سنا "جل تو جلال تو آئی بلا کو ٹال تو۔ صاحب کمال تو۔ قدرت جلال تو"۔ بڑی مشکلوں سے انھیں باہر لائی۔ تو مجھ سے پوچھیں بہن آپ کی طبیعت اور مزاج کیسا ہے۔ میں نے پوچھا کہ طبیعت اور مزاج میں کیا باقی ہے۔ تو کہنے لگیں کہ طبیعت مونث اور مزاج مذکر۔ دوستوں نے ان کی ہوشیاری کی داد دی۔ مجھے ابھی تک علم نہ تھا کہ انھوں نے کہاں تک تعلیم پائی تھی۔ اس وقت دریافت کرنے پر انھوں نے اپنے بچپن کے واقعات دہرانا شروع کئے۔ ایک بات وہ ایسی بولیں کہ سب کے پیٹ میں مارے ہنسی کے درد شروع ہو گیا۔ وہ یہ کہ جب وہ سوم یا دوم جماعت میں تھیں تو امتحان کے وقت پرچہ پر انھوں نے ولایتی جوتے اتار کر نیچے یہ لکھ دیا۔

نشانوں کی کنجی ترے ہاتھ ہے
اگر پاس کر دے تو کیا بات ہے

اسی دن انھوں نے ایک اور کمال کیا۔ ان کے بچے تھے بہت شریر۔ وہ ہمیں کھلانے کے لئے کچھ میٹھا پکانا چاہتی تھیں۔ میں نے انھیں روکا لیکن وہ نہ مانیں۔ چولھے کے پاس جا کر تھوڑا سا گڑ شیرہ بنانے کے لئے چولھے پر چڑھا دیا۔ قریب ہی گھی کا بگونہ بھی تھا۔ جب شیرہ نکل گیا تو وہ نیچے رکھ کر اور تھوڑا گڑ چڑھا دیں۔ بچوں نے آ گڑ کا بگونہ لے دور کمرہ میں جا کر کھانے لگے۔ پڑوسن کو اس کی کوئی اطلاع نہ تھی۔ انھوں نے وہ گڑ کا شیرہ بھی اتار کر گھی کو شیرہ سمجھ کر اس میں ڈال دیا۔ اور میٹھا پکا کر ہمارے کھلانے کے لئے لائیں۔ پہلے خود ہی چکھ کر کہنے لگیں کہ "ہائے ہائے یہ کیا ہوا" میں نے پوچھا کیوں خیر تو ہے تو سر پیٹ کر باہر نکل گئیں۔ تو کیا دیکھتی ہیں کہ انھیں کی چھوٹی لڑکی روتے ہوئے آ رہی ہے وجہ پوچھی تو کہنے لگی بڑی آپا کمرہ میں کچھ کھا رہی ہیں جاتے ہی دروازہ بند کر لیا۔ ہم لوگ وہاں پہنچے تو بچوں کو شیرہ پیتے ہوئے پایا۔ ماں انھیں پیٹنے ہم نے انھیں روکا تو جل کر لگیں اول جلول بکنے۔ خیر اسی قصہ میں شام ہو گئی اور ہم سب اپنے اپنے مکان لوٹے۔

...میں دو خاتون دفعہ میں ان کے یہاں اور وہ میرے یہاں آیا جایا کرتی تھیں۔ کیا اعتبار بود و باش کیا بلحاظ خورد و نوش ایک دوسری جیسی بن گئیں۔ اور میری تمام دوستوں سے مل مل کر رہنے لگیں۔ پے در پے ایسے واقعات پیش ... پڑا سفر چھوڑنا پڑا جس کا مجھے بیحد صدمہ ہے۔ اب وہ سال میں ایک دفعہ کہیں کہیں مل ہی جاتی ہیں۔ لیکن دل ...

عظمت افضل خاں

صراحی کی کہانی خود اُس کی زبانی

جنوری کا سرد مہینہ تھا جب کہ میں وجود میں آئی۔ ایک دن مجھ کو ایک بگڑ کمہار سے واسطہ پڑا۔ اس نے مجھ کو زمین سے باہر نکالا۔ اور میرا اسم مبارک چکنی مٹی رکھا۔ پھر خوب سا پانی پلا کر گھنٹوں گھمیاں مالش کی۔ اور اس طرح مجھے ... کر دیا۔ مجھ کو تعجب ہوتا تھا کہ بیچارہ اس کام سے ذرا بھی نہیں تھکتا۔ اور ساتھ ہی سوچتی تھی کہ آخر میرا کیا حشر ہوگا یہ ہوا کہ میں لکڑی کے سانچہ میں ٹھونسی گئی۔ بعد اس کے سورج کی شعاعوں سے میری تواضع کی گئی۔ اس وقت میں ... حالت میں تھی۔ مارے گرمی کے میرا سینہ سوخت ہو رہا تھا۔ میری حالت تباہ ہوئی جاتی تھی۔ آخرش میری گریہ وزاری ... آگیا اور اس دوزخ سے نجات حاصل ہوئی۔ میں نے خیال کیا تھا کہ میری تکلیفوں کا خاتمہ ہوگیا ہے۔ لیکن ابھی قسمت کا لکھا ... تھا۔ ایک نئی آفت مجھ پر ڈھائی گئی۔ یعنی مجھ کو آگ میں جھوکنے کی کارروائی کی گئی۔ اس کارروائی کا دو تین مرتبہ اعادہ کرنے کے ... میرے چہرے پر لال مٹی کا غازہ ملا گیا۔

اب میں بہت مغرور ہوگئی۔ کیونکہ اب میں بہت خوبصورت ہوگئی تھی۔ کمہار نے نہایت ہی احتیاط سے میرے ساتھیوں میں مجھکو بٹھا دیا اور ہم سب کو بازار دکھانے کے لئے گدھے کی شاندار سواری عنایت فرمائی۔ اس سواری سے ... بہت خوش ہوئی اور میں پھولوں نہ سمائی۔ بازار پہونچنے کے بعد ہم کو بیچنے کے لئے ایک قطار میں جما دیا گیا۔ بڑی دیر تک ... بیٹھے رہنے سے میری طبیعت اکتانے لگی۔ کچھ دیر بعد ایک بوڑھیا کمہار سے مخاطب ہوئی پھر ہماری طرف پیش قدمی کی ... بھائیوں کی مزاج پرسی کے بعد مجھ کو ہاتھ میں اٹھا لیا اور چند پیسوں کے دام میں مجھ کو خرید لیا۔ اپنے گھر لا کر غسل دیا اور پانی بھر کر میرا کلیجہ ٹھنڈا کیا۔ اور ایک مقام پر رکھ دیا۔ بر وقت میرا پانی پیا کرتی تھی۔ ایسی حالت میں میں بہت بہت خوش ... صد حیف کے چند ہی روز بعد ایک غضبناک واقع درپیش ہوا۔

ایک روز بوڑھی کے گھر مہمان آئے۔ مہمان کے بچے کو پیاس لگی۔ لہذا بوڑھی نے اس کو مجھے دکھلایا۔ مہمان کے ... جلدی میں مجھ کو اٹھایا اور میں پھسل کر زمین پر آرہی۔ چوٹ کی وجہ میری ہڈی پسلیاں ٹوٹ گئیں۔ ناکارہ ہو جانے کی وجہ سے بوڑھیا نے مجھ کو اٹھا کر گھور پر پھینک دیا۔ اب میں اپنی سابقہ حالت میں پڑی ہوئی ہوں۔ کیا آپ کو میری تباہی پر رحم نہیں آتا!

سید اقبال حسین اقبال

سکندر ہیر آئیل
اپنی نوعیت میں بالکل پہلی ایجاد
مقامات ملنے کے
شاہ عبدالرزاق گلزار حوض
میر حسن عابد روڈ۔ رائل میڈیکل ہال افضل گنج
مہدی اینڈ کو نیاپل۔ شیخ جعفر اینڈ کو روبرو
دواخانہ ڈاکٹر عبدالحسین صاحب قیمت ۸

دماغ کا سچا رہنما
ملک کا پسندیدہ
روغن آملہ
بالوں کا حقیقی محافظ
ساخت
روح تازہ کمپنی چمن گولی گوڑہ حیدرآباد دکن
" " شاخ مچھلی کمان حیدرآباد دکن
حیدرآباد دکن
اگر آپ
فون نمبر (۹۰۹) الکٹرک لانڈری سے ملا کر
بات کرلیں تو آپ کو سلوائی و دہلوائی کے لئے
بہترین خدمات حاصل ہوں گے
کنگ اینڈ کو ٹیلرس عابد روڈ
حیدرآباد دکن
رائل ڈنٹل سرجن ممتحن چشم وعینک ساز)
ماہر انگلش و امریکن دندان سازی
ALL YOUR MECHANICAL WORK IS
SAFE IN OUR HANDS
دندان سازی و علاج پائیوریہ کے لئے ہمارے خدمات
حاصل کیجئے۔ مستورات کے دانت لیڈی ڈاکٹر بناتی ہیں طلبا سے خاص رعایت
پتہ:۔ شاہانہ کارخانہ دندان سازی امریکہ
ڈاکٹر محمد امیر احمد شاہی دندانساز متصل مسجد ٹیپو خاں سالار جنگ بلڈنگ

رجسٹرڈ نمبر (M 3950)

تان ٹپہ آصفیہ د۱۵۳)
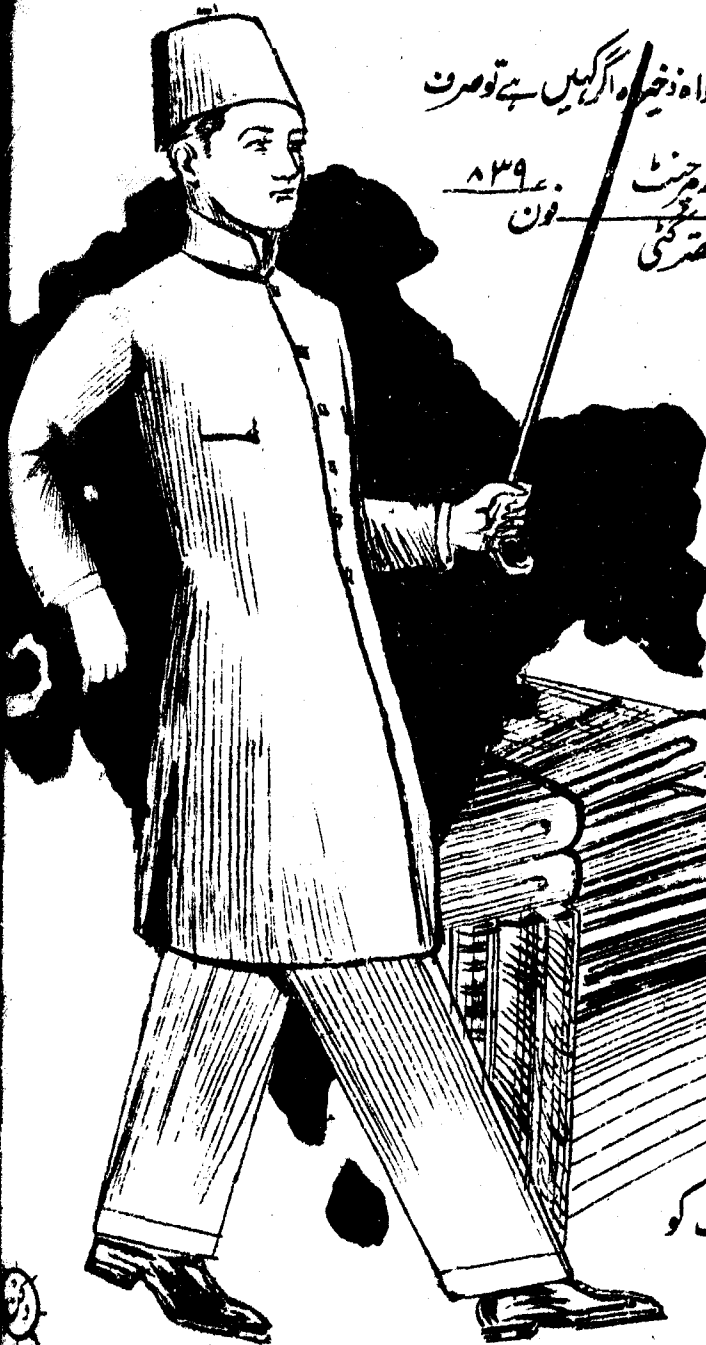
۶ نظمیں
۴ غزلیں
۷ افسانے اور قصے
۱ ڈرامے
۶ عام دلچسپی کے مضمون
۶ علمی اور تاریخی مضمون

"ادارۂ ادبیاتِ اردو" حیدرآباد دکن

کا

ماہ نامہ

سب رس

زیر نگرانی
ڈاکٹر سید محی الدین قادری زورؔ

زیر ادارت
صاحبزادہ میر محمد علی خاں میکشؔ

بہ اہتمام
خواجہ حمید الدین شاہدؔ

مکتبہ ابراہیمیہ مشین پریس میں طبع ہو کر دفتر "ادارہ" رفعت منزل خیریت آباد سے شائع ہوا

سب رس کے مقاصد و قواعد

(۱) یہہ "ادارۂ ادبیات اُردو" کا ماہوار علمی و ادبی رسالہ ہے جس میں اُردو زبان اور ادب کے مختلف اور پہلوؤں پر بحث ہوگی

(۲) مضامین متعلقہ سیاسیات حاضرہ اور مذہبی مباحث کسی صورت میں قابل اشاعت متصور نہ ہوں گے ۔

(۳) اُردو مطبوعات پر بے لاگ تنقید کر کے اردو تصنیف و تالیف کا ذوق صحیح پیدا کرنے کی کوشش کی جائے گی ۔

(۴) غیر زبانوں کے شاہکار مضامین کو اُردو میں منتقل کر کے اُردو کے علمی و ادبی سرمایہ میں اضافہ کیا جائے گا ۔

(۵) یہہ رسالہ کم از کم (۶۴) صفحات اور زیادہ سے زیادہ (۹۶) ... پر ہر ماہ عیسوی کے پہلے ہفتہ میں شائع ہوا کرے گا ۔

(۶) رسالہ نہ پہنچنے کی اطلاع پندرہ تاریخ تک دفتر میں پہنچ جانی چا...

(۷) جواب طلب امور کے لئے جوابی پوسٹ کارڈ یا لفافہ آنا ضروری ...

(۸) خط و کتابت کرتے وقت نمبر خریداری کا حوالہ ضرور دیا جائے ۔

(۹) اشتہارات کی اجرت پیشگی لی جائے گی ۔ وی پی یا دیگر ... ذریعے سے وصولی منظور نہیں کی جائے گی ۔

سب رس کی قیمت

	سالانہ	ششش ماہی	فی پرچہ
بلدہ حیدرآباد کے لئے	چار روپے	دو روپے آٹھ آنے	چھ آنے
شہر میں یا شہر سے باہر بذریعہ ٹپہ	چار روپے بارہ آنے	دو روپے بارہ آنے	سات آنے

محرم نمبر ۱۲ / اقبال نمبر ۱۴ /

بچوں کے سب رس کی قیمت

	سالانہ	ششش ماہی	فی پ...
بلدہ حیدرآباد کے لئے	ایک روپیہ	دس آنے	ڈیڑھ...
شہر میں یا شہر سے باہر بذریعہ ٹپہ	ایک روپیہ آٹھ آنے	بارہ آنے	دو آ...

سب رس کی خریداری اس میں اشتہارات کی طباعت اور ادارہ ادبیات اُردو کی رکنیت یا اس کے مطبوعات کی خریداری کے سلسلے میں جو اصحاب صدر دفتر (رفعت منزل خیریت آباد) سے گفتگو یا مراسلت نہیں کر سکتے وہ حسب ذیل اصحاب سے گفتگو یا مراسلت کر سکتے ہیں

بلدہ (۱) مسٹر یس اے کریم نمائندہ خصوصی چیلہ پورہ قریب مکان حکیم محمود صمدانی مرحوم (۲) مسٹر یس بی اننتا ۔ مکتبہ ابراہیمیہ عابد روڈ (۳) رحمان کاٹیج گھانسی بازار ۔

اضلاع مسٹر محمد فخر الدین ارمان (روضۂ شیخ) گلبرگہ شریف

TURAB.

جلد ۱ سب رس شمارہ ۱۱

نومبر ۱۹۳۸ء

فہرست تصاویر

۱۔ مرقد حضرت میر شمس الدین محمد فیض مقابل صفحہ ۱ ۔ ۲۔ مرقد حضرت میر احمد علی عصر مقابل صفحہ ۸

فہرست مضامین

نمبر	مضمون	مضمون نگار	صفحہ
۱	اداریہ		
۲	ملا جی کا مکتب	میکش	۵
۳	غزل	مرزا عصمت اللہ بیگ	۶
۴	خواب زندگی (افسانہ)	میر سکندر علی وجد (بی، اے۔ ایچ سی ایس)	۸
۵	کیوں لکھیں	عبد القادر سروری (ام، اے۔ ال ال بی)	۹
۶	عمر خیام کے متعلق چند تحقیقات	ڈاکٹر سید محی الدین قادری زور (ام، اے۔ پی۔ ایچ ڈی)	۱۴
		ڈاکٹر قاری سید کلیم اللہ حسینی (ام، اے۔ ال ال بی۔ پی۔ ایچ ڈی)	۱۷
۷	اعتراف شکست (افسانہ)	وصی احمد	۲۲
۸	غزل	عبدالجلیل سائل (بنگلور)	۲۶
۹	نجمہ کے خطوط رضیہ کے نام (افسانہ)	محمد دلاور خاں مہدوی	۲۷
۱۰	غزل	سید وحید اللہ وحید (نلگنڈہ)	۳۰
۱۱	لنگال کی جرائم پیشہ آبادی	موید الدین حس[illegible]	۳۱
۱۲	راز الفت (غزل)	سجاد علی خا[illegible]	
۱۳	غریب کی دنیا (افسانہ)	مو[illegible]	
۱۴	مشرقی بیوی (افسانہ)		
۱۵	درد قوم (نظم)		

نمبر	مضمون	مضمون نگار	صفحہ
۱۶	غائب دماغی (افسانہ)	سید منیر الدین مغربی	۴۰
۱۷	جدید افسانوی ادب کے رجحانات	سید اشفاق حسین ام، اے (ریسرچ اسکالر)	۴۵
۱۸	عذاب (افسانہ)	اکبر صدیقی۔ بی، اے	۴۷
۱۹	ساقی سے (رباعیات)	آغا محشر شیرازی (رکن خصوصی ادارۂ تحریر الاصلاح بمبئی)	۴۸
۲۰	فرزندان دارالعلوم کی علمی خدمات	نصیر الدین ہاشمی (منشی فاضل)	۴۹
۲۱	تلاشِ سکون (نظم)	صمد رضوی ساز (بی، اے۔ ال ال بی)	۵۲
۲۲	بچوں کی تعلیم و تربیت	مرزا سیف علی خاں	۵۳
۲۳	یاد حبیب (نظم)	سلیمان ادیب	۵۵
۲۴	تبصرے	رشید قریشی	۵۷
۲۵	بچوں سے	ادارہ	۵۸
۲۶	پہیلیوں کے صحیح حل	۴ اصحاب	۵۸

نمبر	مضمون	مضمون نگار	صفحہ
۲۷	دریاؤں کے نام بتاؤ	میر محمود علی اکبر مشیر	۵۸
۲۸	لطیفہ	وقار حسن الدین وکیل	۵۸
۲۹	ملک خیالستان کی سیر	معین الدین احمد انصاری	۵۹
۳۰	باغ کی سیر (نظم)	لطیف النساء بیگم بی، اے	۶۱
۳۱	براعظم و بحر اعظم	جی، ایس بھان	۶۲
۳۲	صبح کا وقت (نظم)	میر محمود علی اکبر مشیر	۶۴
۳۳	بٹیا بھاگی جاؤ روٹیاں چپٹی جائیں	سکینہ بیگم (بیگم مشیر)	۶۵
۳۴	برسات اور کسان	محمد مسیح الدین خان متین	[illegible]
۳۵	بارش (نظم)	میر کاظم علی خاں واصل	۶۸
۳۶	ملک خوش حال کی شہزادی (ڈرامہ)	شیخ رحیم الدین ظہیر آبادی	۶۹
۳۷	سستی	سید حسن (دارالعلوم)	۷۱
۳۸	معلومات	محمد فخر الدین ارمان (گلبرگہ شریف)	۷۱
۳۹	بچہ اور پرندہ	اشرف الدین فیضی	۷۲

سب رس کا جنوری ۱۹۳۹ء کا شمارہ چونکہ سالگرہ نمبر ہوگا اس لئے اس کی ابھی سے تیاریاں شروع کردی گئی ہیں۔ اس میں چالیس پچاس تصویریں ہوں گی اور صفحات بھی رسالہ کے عام حجم سے تین گنا زیادہ ہوں گے مضامین نظم و نثر کا خاص انتظام کیا جا رہا ہے اس میں اشتہارات کے لئے صفحات کی تعداد معین کردی گئی ہے۔ مشتہرین قبل از قبل مہتمم سے مراسلت کرلیں۔

شاہد
مہتمم سب رس

اداریہ

آج کل ادارہ سب رس سالگرہ نمبر کی تیاری میں مصروف ہے جو دکن کے متعلق مضامین نظم و نثر کے لئے وقف رہے گا۔ اس میں پچاس سے زیادہ تصاویر اور دو سو سے زیادہ صفحات ہوں گے۔ سب رس کے اس دکن نمبر میں اُن تمام مشاہیر اور زعمائے دکن کی تاریخی تصویریں اور حالات شریک رہیں گے جو اس سرزمین کی علمی، ادبی، تمدنی اور سماجی ترقی کے لئے گذشتہ پانچ سو سال سے اپنی زندگیاں وقف کرتے آئے ہیں اس سالگرہ نمبر کی بیسیوں تصویریں ایسی ہوں گی جو اب تک کہیں شائع نہیں ہوئیں اور جنھیں نہایت ہی قدیم اور مستند تاریخی خزانوں سے حاصل کر کے شائع کیا جارہا ہے تصاویر کی طرح جنوری ۱۹۳۹ء کے سب رس کے مضامین اور نظمیں بھی نہایت معلومات آفریں اور دلچسپ ہوں گی اور ہمیں توقع ہے کہ یہ شمارہ انشاء اللہ ادارۂ ادبیات اردو کے شایان شان شائع ہوگا۔

اس سال حیدرآباد میں انجمن طیلسانین عثمانیہ کی سالانہ کانفرنس ڈاکٹر رضی الدین صدیقی کی صدارت میں منعقد ہوئی اور رائٹ انریبل سر اکبر حیدری نے ایک نہایت پر مغز تقریر کے ساتھ اس کانفرنس کا افتتاح کر کے اس امر کا ثبوت دیا کہ آپ حیدرآباد کی ہمہ جہتی ترقی اور اہل ملک کی ہمت افزائیوں کے لئے ہر وقت تیار رہتے ہیں۔ صدر کانفرنس کا خطبہ بھی خیال آفریں اور برمحل تھا۔ اس کانفرنس کے سلسلے میں انجمن طیلسانین نے جس صنعتی نمائش کا اہتمام کیا وہ بھی توقع سے زیادہ کامیاب رہی۔ ملک کو اب ایسی ہی بارآور اور مستحسن کوششوں کی ضرورت ہے۔

اس بات کا اظہار کرتے ہوئے ہمیں بے حد افسوس ہوتا ہے کہ بعض لوگ دوسروں کے مضامین اور نظموں کو اپنے نام سے بھیج دیتے ہیں۔ چنانچہ سب رس کے گذشتہ شمارہ میں ایک نظم "مزدور" چھپی ہے جو اصل میں مولانا سیماب اکبرآبادی کی ہے ہمیں اندیشہ ہے کہ سب رس میں مضمون یا نظم چھپانے کا اشتیاق بعض معاونین کو غلط راستہ پر نہ ڈال دے اس لئے ضرورت سمجھی گئی کہ انشا پردازی کے متعلق مفید مشورے ہر رسالہ میں شریک کئے جائیں تاکہ نومشق مضمون نگار خود اچھا لکھنا سیکھ جائیں اور بے راہ روی میں مبتلا نہ ہوں

ادارۂ ادبیات اردو کی روز افزوں سرگرمیاں اردو ادب میں ایک بیش قیمت اور قابل لحاظ اضافہ کی ضامن ہیں۔ اس مہینے میں اس کی طرف سے مختصر افسانوں کا ایک دلکش مجموعہ "من کی دنیا" شائع ہو رہا ہے جو سب رس کے ایک مخلص معاون جناب رشید قریشی (عثمانیہ) کی ادبی کوششوں کا نتیجہ ہے۔ قریشی صاحب کے افسانے سب رس کے علاوہ دیگر رسائل میں بھی شائع ہو کر کافی شہرت اور مقبولیت حاصل کر چکے ہیں۔ اور کوئی وجہ نہیں جو ان کی یہ "من کی دنیا" بھی اپنی گوناگوں دلچسپیوں اور رنگینیوں کی وجہ سے مقبول خاص و عام نہ ہونے پائے۔ ہم اس دلچسپ کتاب کی اشاعت پر ادارہ اور رشید قریشی صاحب دونوں کو مبارک باد دیتے ہیں۔ اور متوقع ہیں کہ سب رس کے دیگر معاونین کے رشحات قلم بھی آہستہ آہستہ کتابی صورتوں میں جلوہ گر ہوتے رہیں گے۔ اگر سب رس ہر سال اسی طرح کم از کم ایک نئے انشا پرداز یا شاعر کو اردو دنیا سے روشناس کر سکے تو ادارہ بجا طور پر کہہ سکے گا کہ ع شادم از زندگی خویش کہ کارے کردم۔

میکش

ملّا جی کا مکتب

جب ہم چار برس چار مہینے اور چار دن کے ہوئے اور زوالِ آفتاب کے بعد جب عطارد بُرج میزان میں داخل ہوا تو حسب قاعدہ مروجہ ہماری بسم اللہ کی تقریب عمل میں آئی چونکہ لوگ کثرت سے تھے۔ اول تو عزیز و اقارب نے ہمیں گھیر رکھا تھا دوسرے بہت سے اپنے عمر کے بچے کلیان ہمارے ارد گرد جمع ہو گئے تھے اس لئے ہم پریشان ہو گئے تھے۔ مولوی صاحب نے کئی مرتبہ بسم اللہ پڑھی اور ہم سے بھی کئی مرتبہ گھگیا گھگیا کے اور طرح طرح کے لالچ دے دے کر کہا کہ تم بھی پڑھو؟ مگر ہم مولوی صاحب کے چکمہ میں کہاں آنے والے تھے ہم پر تو دہشت طاری ہو گئی تھی اس لئے بجائے بسم اللہ پڑھنے کے ہم منہ بسور کر رونے لگے۔ بس ہماری آنکھوں کی کیفیت اور ہونٹوں کی جنبش دیکھ کر یاروں نے غل مچا دیا کہ ماشاء اللہ، ماشاء اللہ پڑھ لی بچہ نے بسم اللہ پڑھ لی۔ پھر کیا تھا۔ شیرینی بٹنے لگی، مبارک بادیاں شروع ہو گئیں، ناچ گانے ہونے لگے، لوگ آستینیں چڑھا چڑھا کر دسترخوان پر ڈٹ گئے اور بریانی وغیرہ پر ہاتھ مارنے شروع کر دئے۔ بسم اللہ تو ہو گئی مگر ہم تقریباً سال بھر تک ڈنڈے بجاتے رہے۔ یعنی بحث یہ آپڑی کہ اب ہمیں کس قاعدے کے تحت تعلیم دی جائے چنانچہ ہمارے یورپ پلٹ بھائی نے باقاعدہ ماہرانِ فن سے مشورہ کرنے کے بعد ہمارے لئے ایک ایسا قاعدہ تجویز کیا جو آرٹ پیپر کے سالناموں کا نچوڑ اور مصوّروں کی حسن کاری کا بہترین شاہکار تھا۔ یعنی اس کے ہر حرف کے اوپر ایک تصویر اور ہر لفظ کے نیچے ایک خوشنما منظر تھا۔ جسے دیکھ کر آنکھوں میں طراوٹ اور دل میں ایک جوش پیدا ہو جاتا تھا۔

لوگ کہتے ہیں کہ کسی چیز اور تصویر میں جو تعلق ہے وہی تعلق اس لفظ کو اس تصویر کے ساتھ ہے۔ مگر ہم اس قدر بھولے واقع ہوئے تھے کہ اُن میں خاطر خواہ کوئی نسبت پیدا نہ کر سکے۔ مثلاً الف سے اجمیر شریف، ژ سے ژالہ باری، ض سے ضمانت کے نوٹ، دال سے لنگور کی دُم، ث سے ثور بیل، ذ سے ذیب اور ظ سے ظلم کا کوڑا وغیرہ، اب ہمارے تصور کے زور نے ہمیں معلوم سے نامعلوم اور نامعلوم سے معلوم اشیاء کی طرف گھسیٹنا شروع کر دیا۔ کبھی لنگور کی دُم دیکھ کر ہم دال کہنے لگے اور کبھی بڈھے چہرے دیکھ کر ہم دال پکارنے لگے یہ کیفیت دیکھ کر ہماری اماں جان تو بہت خوش تھیں کہ بچہ خوب ترقی کر رہا ہے، مگر ابا جان تاڑ گئے کہ لڑکا غلط راستہ پر چل رہا ہے اس لئے لنگور کی دُم والا قاعدہ پڑھنا دفعتاً ممنوع قرار دے دیا اور حکم نادری عطا فرمایا کہ بس کل سے ملا جی کے مکتب جاؤ، اور اپنا وہی پرانا بغدادی قاعدہ پڑھو۔ ہم نے بھی سوچا کہ "مے سے غرض نشاط ہے کس روسیاہ کو" یہ نہ سہی وہ سہی۔ گھر میں بیٹھے مکھیاں مارنے سے کیا فائدہ ہے، مکتب میں کم سے کم کھیلنے کا تو موقع ملے گا۔ ابا جان سے تو کہہ دیا بہت اچھا کل سے وہیں جاؤں گا اور اماں جان سے قینچی لے کر قاعدہ کی جملہ تصویروں کو باقاعدہ کاٹ کر اپنے کمرہ کی دیوار پر اچھی طرح سے چپکا دیا۔ ابا جان نے ملا جی سے ہماری تعلیم کے متعلق فوراً تصفیہ بھی کر لیا اور ایک بغدادی قاعدہ لا کر ہمارے حوالے کر دیا۔ دوسرے روز ہم ناشتہ کر بستہ بغل میں دبا سیدھے مکتب کی طرف چل دئے۔ مثل مشہور ہے کہ ملا کی دوڑ مسجد تک، وہ اس دفعہ

ہم پر بھی صادق آئی۔ یعنی جہاں ملاجی کا مکان تھا، وہیں مسجد بھی تھی، وہیں مکتب بھی تھا اور مکتب کے آگے وہیں ایک لمبا چوڑا صحن بھی تھا۔ اس صحن کو آج کل کا پلے گراونڈ سمجھ لینا چاہئے جو ہر مدرسہ کے ساتھ منسلک رہا کرتا ہے۔ یہاں ملاجی نے اپنی رحم دلی اور مہربانی سے مکتب کے کرنوں کے علاوہ سید صاحب کے بوکڑوں اور دھوبی کے گدھوں کو بھی اچھل کود کی اجازت دے دی تھی۔ وہ عموماً بچوں کے ساتھ بے تکلف اس صحن میں گھس آتے تھے اور خلی بالطبع ہو کر چاروں طرف چکر کاٹتے رہتے تھے ہم وہاں پہنچے تو دیکھا کہ بعض لڑکے تو بکروں کے ساتھ بکر کو دمچا رہے ہیں اور بعض گدھوں پر بیٹھے ہوئے گدھے دوڑ یا شرطیں لگا رہے ہیں۔ بعض درخت پر چڑھے جھاڑ بند کھیل رہے ہیں، بعض سرنگ لال گھوڑی، بعض گلی ڈنڈا اور بعض کبڈی کھیلنے میں مصروف ہیں۔ دو چار لونڈے کہیں سے مینڈک پکڑ لائے تھے اور اس سے ہائی جمپ، اور لانگ جمپ کا سبق سیکھ رہے تھے اور بعض مینڈکوں کی ٹانگیں باندھ کر اُن سے اچکنے پھدکنے کا فن حاصل کر رہے تھے۔ یہ سب کے سب ہمیں دیکھ کر ٹھٹکے۔ ہم نے اُسے اپنا خداداد رعب اور ذاتی دبدبہ خیال کیا اور ہم بغیر کسی سے بات چیت کئے لمبے لمبے ڈگ بھرتے ہوئے، سیدھے اس پلے گراونڈ کو طے کرتے ہوئے مکتب کی طرف چلے مگر سید صاحب کے ایک بوکڑ کو شاید ہم پر کچھ شبہ ہوا، وہ نام پوچھنے کے لئے ہماری طرف بڑھا، ہم ذرا تیز ہوئے تو وہ بھی ذرا تیز ہو گیا۔ ہم سمجھ گئے کہ یا تو یہ ہمارے سبد لبستہ کو خمیری روٹی سمجھ رہا ہے، یا ہم نے ایک پیسہ کے بھنے ہوئے چنے جو اس میں رکھ لئے ہیں وہ اُس کی بو پا گیا ہے لہٰذا ایک کہی نہ دو، پورا کا پورا لبستہ اس کے سامنے پھینک دیا۔ بھلا ملاجی نے اس بکرے کو یہ سبق کہاں پڑھایا تھا کہ وہ باقاعدہ اس لبستہ کو کھولتا اور صرف چنے کھا کر بقیہ ہماری چیزیں ہمیں واپس کر دیتا۔ اس نے تو بھوکے بنگالی کی طرح ایک ایسا منہ مارا کہ چنوں کے ساتھ ہمارا لبستہ اور بغدادی قاعدہ بھی ہضم کر گیا۔ ہم نے دل میں کہا کہ چلو جان کا صدقہ مال ہے، اور خیال کیا کہ شاید یہ ان کی سرحد سے گزرنے کا ٹیکس ہے یا کوئی فیس ہے جو ہر لڑکے کو شریک ہونے سے پیشتر ادا کرنی پڑتی ہوگی۔ بہر حال یہ جرمانہ ادا کرنے کے بعد ہم مکتب کے اندر داخل ہوئے تو دیکھا کہ ایک بڑا سا دالان ہے اور زمین پر بورئے کا فرش ہے جو شاید بابا آدم سے بھی پیشتر کا ہوگا۔

چھت سفال پوش تھی اور وہ بالکل قدیم رصدگاہوں کے نمونے پر بنائی گئی تھی یعنی اس میں ہزارہا سوراخ تھے جن کے ذریعے علم مناظر اور فلکیات کی عملی تعلیم، خدا جھوٹ نہ بلائے تو وقت واحد میں دو سو، تین سو طلبہ کو نہایت ہی اچھی طرح سے دی جا سکتی تھی۔ چنانچہ صبح کے وقت نور کی اشاعت، نور کی ترکیب یعنی نور کو چھت کی سوراخوں میں سے گزار کر اور اس کی شعاعوں کو پھاڑ کر مختلف رنگوں میں تقسیم کرنے کے تجربے ہو سکتے تھے اور رات کے وقت نظام شمسی کے سیاروں کی گردشیں منطقۃ البروج، دُم دار تارے اور شہاب ثاقب وغیرہ کا معائنہ نہایت تفصیل کے ساتھ کیا جا سکتا تھا۔ چھت کے علاوہ دیواروں میں عجیب عجیب گل کاریاں اور منبت کاری کے نمونے موجود تھے۔ ان کو بارش کے پانی کے ریلوں نے اس خوبی سے کاٹا تھا کہ کہیں گنگا اور جمنا مع اپنی معاون ندیوں کے صاف بہتی ہوئی دکھائی دیتی تھی کہیں برہم پترا سانپ کی طرح بل کھاتی ہوئی چلی جا رہی تھی اور کہیں پنجاب کی پانچوں ندیاں نہایت آب و تاب کے ساتھ بہتی ہوئی دکھائی دے رہی تھیں لوگوں کو مکتب کے در و دیوار کا یہ نقشہ دیکھنے کے بعد خیال ہوتا تھا کہ ملاجی نے بچوں کو جغرافیہ کی تعلیم دینے کے لئے دیوار پر یہ خاکا کھینچا ہے اور عملی تعلیم دینے کے لئے دیوار پر یہ MAP میپ بنایا ہے۔ ان میں سے بعض دریا تو دیوار کی چوٹی پر سے بہتے ہوئے فرش تک

پہنچ گئے تھے اور بعض محرابوں کی چوٹیوں پر آکر رک گئے تھے ۔ یہہ محرابیں ہمارے قدیم صناعوں اور معماروں نے دیواروں میں سامان [illegible]
رکھنے کے لئے بنا دیں تھیں ۔ ان میں بچوں کی کتابیں مکتب کی جھاڑو ، پانی کے بدلے اور ملاجی کے چند ڈھیلے اور کپڑے رکھے رہتے تھے ہم [illegible]
غلطی سے ایک محراب کا پٹ کھول دیا تو دیکھا کہ ہزاروں مچھر بھنبھنا رہے ہیں ۔ ان میں تقریباً ہر مذہب و ملت ، ہر رنگ اور ہر نمونہ کا مچھر [illegible]
یعنی بار براسٹرس میں سے لے کر انافلیس تک موجود تھا ۔ اس کے علاوہ بڑی خوبی یہہ تھی کہ انڈوں کی حالت سے بڑھاپے کی حالت تک یعنی [illegible]
روپ (LAVVA) سے لے کر ایتم روپ تک (IMAGO) ان کا تفصیلی طور پر معائنہ کیا جا سکتا تھا ہمارے خیال میں ان کی تولید [illegible]
اور پرورش کا جو انتظام اور اہتمام یہاں کیا گیا تھا دنیا کے کسی حصے میں اس کی نظیر ملنا قطعی غیر ممکن تھی ۔ یہہ زبردست انتظام دیکھ کر خیال [illegible]
پیدا ہوتا تھا کہ شاید ملاجی نے اپنے شاگردوں کے لئے اسباق الاشیاء پڑھانے کا خاص طور پر انتظام فرمایا ہے ۔

ہم نے اس زمانے میں دیکھا ہے کہ عام طور سے مدرسوں میں تعلیم شروع ہونے سے پیشتر گھنٹی بجتی ہے ۔ پھر لڑکے ایک جگہ جمع [illegible]
کسی ساز کے نہایت خوش گلوئی کے ساتھ کچھ جملے پڑھتے ہیں پھر اپنے اپنے درجوں میں جا کر دستی مشاغل اور ورزشیات میں مشغول ہو جا[illegible]
مگر ہمیں اچھی طرح سے یاد ہے کہ ہمارے مکتب میں نہ تو کوئی گھڑی تھی نہ گھنٹی اور اگر تھی بھی تو وہ لوکڑ کے گلے میں بندھی ہوئی تھی اسے [illegible]
کوئی واسطہ نہ تھا مگر تعجب یہہ ہے کہ لڑکے صرف سورج کو دیکھ کر ملاجی کی تشریف آوری سے کچھ پہلے مکتب میں آبیٹھے اور بیٹھتے ہی دستی مشا[illegible]
اور ورزشیات میں مصروف ہو گئے یعنے ڈھول دھپا اور ہاتھا پائی شروع کر دی ، پھر ادھر اس کا راؤنڈ ختم ہوا اور ادھر ملاجی اندر [illegible]
ہوتے دکھائی دیتے ، بس لڑکے اس طرح خاموش اور ساکت ہو کر بیٹھ جاتے کہ گویا انھیں سانپ سونگھ گیا ہے ۔

مرزا عصمت اللہ بیگ

(باقی آئندہ)

غزل

یقیں مان ! جادو بیانی نہیں ہے — یہہ بیتا ہے ظالم ، کہانی نہیں ہے
گلوں کی طرح بلبلیں بھی جدا ہیں — کوئی عاشقوں کی نشانی نہیں ہے
قفس ہے یہہ اے زورِ بازو قفس ہے — یہاں رخصتِ پرفشانی نہیں ہے
سراسر خطا تھی نگاہِ تمنا — گنہگار تیری جوانی نہیں ہے
محبت گراں ہے ، مروت گراں ہے — یہاں دوستوں کی گرانی نہیں ہے
دل و جاں نثری طرزِ پرسش کے صدقے — مجھے تجھ سے کچھ بدگمانی نہیں ہے
تصرف ہے سب میری طبعِ رواں کا — بلا کوئی بھی آسمانی نہیں ہے

سناتا ہوں اے **وجد** مجبور ہو کر
مجھے عادتِ "شعر خوانی" نہیں ہے

سکندر علی وجد

مزار حضرت حافظ میر شمس الدین محمد فیض

مزار حضرت میر احمد علی عصر جانشین فیض

ان دونوں شعرائے دکن کے مزاروں پر ادارۂ ادبیات کی طرف سے کتبے لگائے جا رہے ہیں
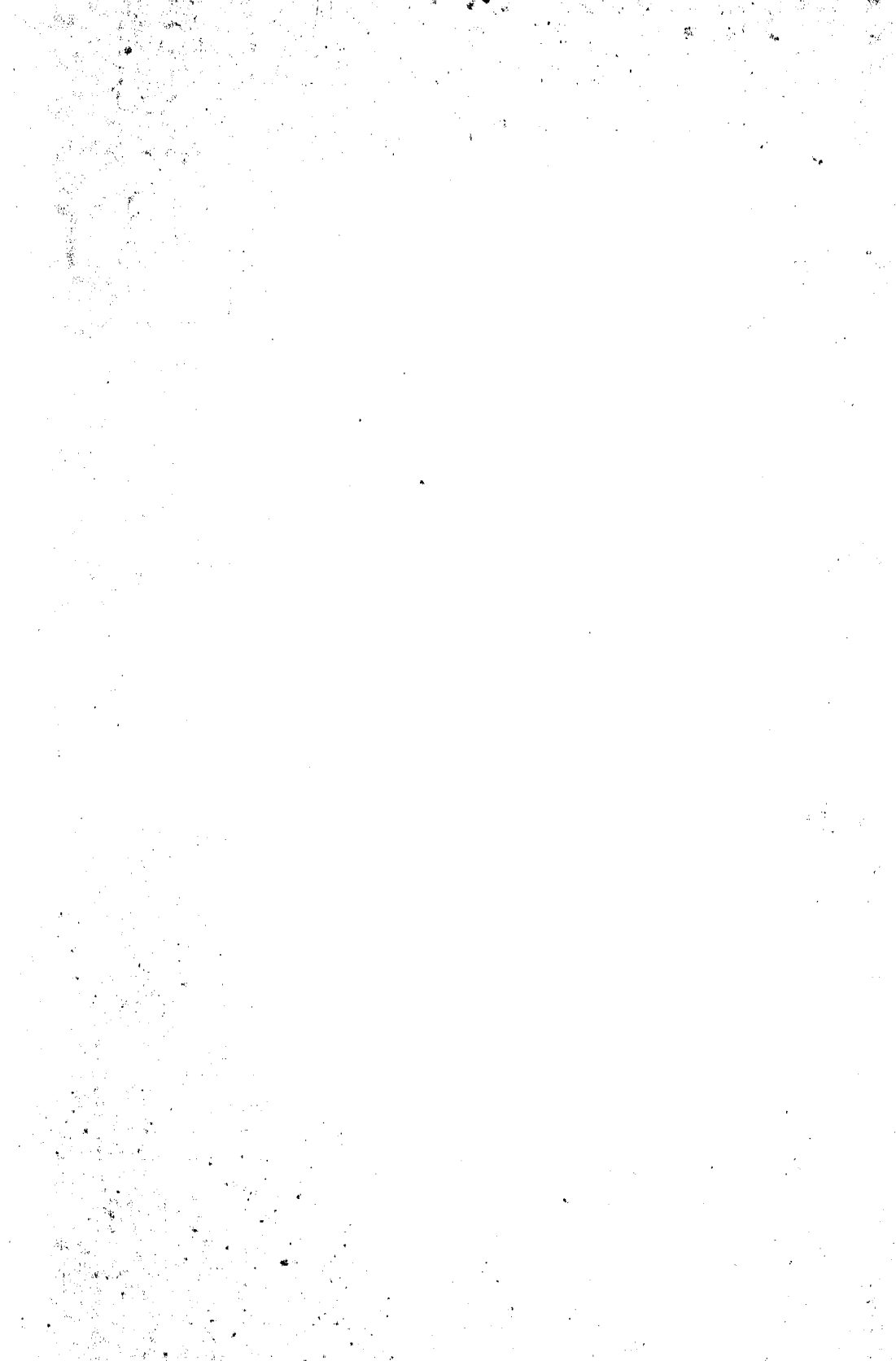
واب زندگی

میرا بیاہ دو دفعہ ہوا۔ پہلی دفعہ میں بہت کم سن تھی۔ بس اتنا یاد ہے کہ گھر میں ایک ہنگامہ سا برپا ہوا۔ اور میں ایک ہنستے بولتے گھر سے پکڑ جکڑ کر قیدی کی طرح ایک قید خانے میں بھیج دی گئی۔ جہاں کی فضا اجنبی تھی، لوگ اجنبی تھے۔ مردوں سے زیادہ عورتیں۔ میری ہر حرکت پر آنکھیں لگی ہوئیں۔ اپنے گھر میں جو باتیں اچھی سمجھی جاتی تھیں انہیں پر یہاں ناک بھوئیں چڑھائے جاتے تھے۔ غرض کچھ موافق ماحول نہیں تھا۔ لیکن لوگ آخر قید خانہ میں بھی بسر کر لیتے ہیں۔ میں بھی رفتہ رفتہ ان چیزوں سے مانوس ہو گئی۔ میرے شوہر بڑے جوشیلے نوجوان تھے۔ ان کی ہر بات میں جوش تھا۔ لیکن وہ پرلے درجے کے الڑھ تھے اور میں بھی انہیں کی طرح الڑھ۔ ہم دونوں نے زندگی کے کھیل کو کچھ نہ کچھ نہ سمجھا۔ بہر حال سال ڈیڑھ سال کا عرصہ گذر ہی گیا۔ اب ہم ایک دوسرے سے مانوس بھی ہونے لگے تھے۔ وہ نوجوانی کی ترنگ میں محبت کا بڑا پرچار کیا کرتے تھے۔ کہتے۔ "دیکھو دنیا میں، محبت کتنی بڑی چیز ہے۔ بغیر اس کے زندگی کا لطف خاک نہیں۔ تم جانتی ہو کہ مجھے تم سے کتنی محبت ہے؟" میں کہتی۔

"ہاں" "کیوں نہیں جبھی تو مجھ سے روز روز جھگڑتے ہو۔" وہ جواب دیتے:۔

"جھگڑا تو لازمہ محبت ہے۔ بغیر اس کے محبت کا لطف نہیں آسکتا۔ اچھا، بتاؤ تم کو مجھ سے کتنی محبت ہے؟" میں جواب دیتی:۔

"بس اتنی ہی جتنی آپ کو ہے" حالانکہ میں جانتی تھی کہ وہ مجھ سے بات بات پر ایسے برافروختہ ہوتے تھے، جیسے کہ ان کا سو دن کا نقصان ہو گیا۔ میرے جواب سے ان کی تشفی نہ ہوتی اور کہتے:۔

"یہ تو کوئی جواب نہ ہوا۔ معین کرو"

میں دونوں ہاتھ اٹھا کر بتاتی۔ "اتنی"۔

وہ کہتے۔ "نہیں یہ بہت تھوڑی ہے۔" میں ہاتھ اور پھیلاتی۔ اس پر بھی وہ کہتے۔ "یہ بھی کم ہے۔" اب میں ہاتھ پورے پھیلا دیتی۔ وہ ہنستے ہوئے میری گود میں آ گرتے۔ میں بھی خوب ہنستی۔

کبھی کبھی وہ یونہی، پوچھ بیٹھتے۔ "اچھا اگر میں مر جاؤں .... تو ......؟" میں جواب دیتی۔ "اچھا اگر میں مر جاؤں۔ تو؟"

"میں تمہارے غم میں دیوانہ ہو جاؤں گا۔ دنیا کو چھوڑ دوں گا .... اور تم کیا کرو گی"

"میں آپ کے غم میں دیوانی ہو جاؤں گی۔ دنیا کو چھوڑ دوں گی۔" میں ہنسنے لگتی۔ وہ خفا ہو کر کہتے۔ "مذاق سوجھا ہے؟" میں سنجیدہ بن کر جواب دیتی:۔

"نہیں۔ خدا نہ کرے آپ کیوں مرنے چلے ......"

"موت زندگی خدا کے ہاتھ ہے" وہ بات کاٹ کر کہتے۔ "کیا معلوم اگر ایسا ہو جائے تو؟"

"پہلے تو ایسا ہونے کیوں چلا۔ اور جو خدا نہ خواستہ ایسا ہو جائے ...... تو میں ...... کیا تبلاؤں؟"

وہ کہتے "دل میں رکھنے کی سند نہیں"۔ صاف صاف کہو۔ ہاں تو کیا کروگی؟ دوسرا عقد کرو......" میں اُن کے منہ پر ہاتھ رکھ دیتی، وہ ہنس کر
ہاتھ نکال دیتے اور کہتے۔

"دوسرا عقد کروگی"۔ مجھے غصہ آتا۔ اور کہتی:۔

"نہ جانے دیجئے۔ یہ مرنے جینے کے پیچھے کیوں پڑ گئے؟ جب کا جب دیکھا جائے گا۔"

"نہیں میں نہیں مانوں گا۔ کہو کیا تم دوسرا عقد کروگی"

"مجھے یہی تو کرنا ہے۔ آپ کو بھی عجب عجب خیال آتے ہیں۔ اب یہ کون جانتا ہے کہ کس کے نصیبے میں کیا بدا ہے۔"

"میں چھوڑوں گا نہیں"۔ وہ ہاتھ پکڑ لیتے "کہو کروگی نا دوسرا عقد؟ .... تم کیوں اپنی زندگی تباہ کرو...... کسی شریف آدمی سے
عقد کرلینا"

"یہ مرد ہی کرتے ہیں۔ میرے لئے تو یہی کافی سے زیادہ ہے"

"باتیں نہ بناؤ۔ میرا جواب دو" میں روتی صورت بناتی اور وہ ہنس کر چپ ہوجاتے۔

لیکن خدا کی مرضی یہی تھی۔ دوسرے سال میں پلیگ پھوٹ پڑا۔ ایک روز وہ دفتر سے گھر آئے تو بخار ساتھ لائے۔ ذرا سی دیر میں ...
ہوگئی۔ رات میں بخار شدت کا رہا۔ دو تین قئیں ہوئیں اور صبح ہوتے ہوتے، ان کا انتقال ہوگیا۔

میں بیوہ ہوکر گھر آئی اور رنڈاپے کے دن کاٹنے لگی۔ ہمارے خاندان میں مذہبیت بہت تھی۔ خود والد سخت مذہبی آدمی تھے۔ اور ان کے
اثر سے گھر کے سب ہی لوگ نماز روزے کے پابند تھے۔ میں بھی نماز، روزے اور تلاوت میں مصروف رہنے لگی۔

لیکن اس حالت کو بھی مشکل سے دو سال گذرے ہوں گے کہ ابا کے ایک بے تکلف دوست نے انہیں میرے عقد ثانی پر مجبور کرنا شروع
کیا۔ ابا جان تھے تو مذہب کے پیرو، لیکن رواج سے ڈرتے تھے۔ کئی روز تک وہ ٹالتے رہے۔ لیکن ان دوست نے پیچھا نہ چھوڑا۔ خدا رسول کا واسطہ
دے دے کر سمجھایا۔ اور اپنے بڑے بیٹے کا نام بھی تجویز کردیا۔ جن کی بیوی تین چار سال پہلے انتقال کرگئی تھیں۔ اور مرتے مرتے دو بچے چھوڑ گئی تھیں۔

ایک روز ابا نے میری رائے بھی پوچھی۔ میں رونے لگی۔ اماں جان نے انہیں سمجھایا:۔

"یہ کام بیٹا بیٹیوں سے پوچھ کر کرنے کے ہوتے ہیں؟ نصیبے کی ماری کیا جواب دے گی؟ ....
اگر لڑکا اچھے عادات و اطوار کا ہے تو کرڈالو۔ یہ رنڈاپا اب سہا نہیں جا سکتا۔ جب سے بیٹی گھر آئی ہے، چھاتی پر پہاڑ سا رکھا ہوا ہے۔"
کہتے کہتے اماں جان پر بھی ایسی رقت طاری ہوئی کہ وہ ڈاڑھیں مار کر رونے لگیں۔ اور ابا جان باہر چلے گئے۔

لیکن چپکے چپکے انہوں نے تیاری کرنی شروع کی۔ میں نے ایک انداز سے اماں جان کے سامنے مخالفت بھی کی۔ لیکن انہوں نے ...
اور ایک روز، خاموشی کے ساتھ، چند دوست احباب کو جمع کرکے اباجان نے میرا عقد ثانی کردیا۔ اب میں پھر بیوی بن کر دوسرے گھر آئی۔

میرے دوسرے شوہر زیادہ عمر رسیدہ نہیں تھے۔ چونتیس پینتیس کا سن ہوگا۔ پڑھے لکھے اور شریف آدمی تھے۔ لیکن ان میں مرحوم کی
تیزی نہیں تھی۔ وہ ہر بات گھنٹوں سوچ سمجھ کر کرتے۔ اتنا کہ میں بیزار ہوجاتی۔ میرا بڑا خیال رکھتے۔ لیکن میری طبیعت ان سے جلد مانوس نہ ہوئی۔
مجھے محسوس ہوا کہ درحقیقت میں اب بیوہ ہوئی ہوں۔ ہر وقت مرحوم کی بچوں کی سی باتیں، الہڑپن، چہل اور اچھل کود یاد آتی رہتی۔ پہلے پہل
ان کا سامنا کرتے مجھے بے حد شرم آتی تھی۔ اور مرحوم کی وہ گفتگو یاد آتی تھی۔ کبھی کبھی تو ایسا دکھائی دیتا کہ وہ کمرے سے نکل کر باہر جا رہے ہیں۔

دوبالا ہوجاتا۔ میں روتی کہ اباجان نے اتنا توقف بھی نہیں کیا کہ میرے دل سے وہ باتیں بھولی جاتیں لیکن شاید یہ میرا خیال تھا۔ وہ باتیں اب اہم اور بامعنی ہوگئی تھیں۔ کسی وقت بھی یاد آتیں۔

ضروریات زندگی اور وقت کی مجبوریوں نے رفتہ رفتہ اس نئے پارٹ سے بھی مجھے مانوس کر دیا۔ اب میں بھی خیال والی ہوگئی تھی۔ وہ اگلا پن اور تیزی مجھ میں نہیں رہی تھی۔ پھر وہ مجھ سے بے حد محبت سے پیش آتے تھے۔ اور ہر وقت میری خوشی ملحوظ رکھتے تھے جانتے اب میری کوئی خوشی نہیں تھی۔ صرف ضروریات تھیں۔ اور ان کی خاطر بھی منظور تھی۔ اس لئے میں چند روز میں۔ نئے حالات سے مانوس ہوگئی اور اس گھر کو اپنا گھر سمجھنے لگی۔

شاید مردوں کو عورت کی زبان سے یہ سننے میں لطف آتا ہے کہ "میں تم سے محبت کرتی ہوں" حالانکہ محبت بہت کم ہوتی ہے۔ اُنس تو سا تھ رہتے۔ رہتے جانور سے بھی ہوجاتا ہے۔ پھر یہ بھی غالباً مردوں کے تعلق خاطری سوال ہے کہ وہ کسی نہ کسی پیرایہ میں یہ جاننا چاہتے ہیں کہ خدانخواستہ وہ مرجائیں تو عورت کیا کرے گی؟ میں سمجھتی ہوں کہ اس کے کسی اور شخص سے وابستہ ہونے کے خیال سے بھی انھیں روحانی تکلیف ہوتی ہے۔ اور سچ پوچھو تو دوسری چیز پہلی کا نتیجہ ہے۔ یہی وہ عورت کے دل کو ٹٹولنا چاہتے ہیں کہ کیا وہ سے اُن سے اتنی محبت ہے کہ خدانخواستہ وہ مرجائیں تو وہ دوسرا عقد نہ کرے گی؟ یہ ایک فطری جذبہ ہے۔ اس پیرایہ میں انسان اپنے کام کی طرح اپنی ذات کے اثر کو دیکھنا چاہتا ہے۔ ٹھیک اسی طرح جس طرح کوئی شخص اپنی پوری شخصیت کو علیحدہ دیکھنے کے لیے شاید بڑے سے بڑا معاوضہ دینے پر بھی تیار ہو جائے۔ اپنی شخصیت کسی شخص کی نظر میں سب سے زیادہ اہمیت رکھتی ہے۔ اور مرد جب عورت سے اس طرح کے سوال کرتے ہیں تو گویا وہ ایک مصور کے مانند اپنے کارنامے کے اثر کو دور سے اور الٹ پلٹ کر دیکھنا چاہتے ہیں۔ یہ اثر ایک نہایت مقدس چیز ہے۔ اکثر لوگ جو اس کو علیحدہ اور مجسم طور پر دیکھ نہیں سکتے، صرف اس کے غلط یا صحیح تصور کے سہارے زندگی گذار دیتے ہیں۔

اگر مرد کو یہ معلوم ہوجائے کہ عورت فی الحقیقت ان کے سوا کسی دوسرے کو نہیں چاہ سکتی تو شاید ان کی زندگی ختم ہوجائے" اور احساس انانیت کی تشفی کے ساتھ وہ مرجائیں۔ لیکن عورت کے یہ کہنے کے باوجود کہ وہ ایسا کرے گی، وہ نہیں مرتے۔ کیونکہ اپنی طرح ان کو اس کے قول کی صداقت کا یقین نہیں آسکتا۔ اور یقین آئے کس طرح۔ یہ بڑی مشکل چیز ہوتی ہے۔

بات طویل ہوگئی۔ کہنا صرف اتنا تھا کہ ایک روز وہ بھی بیٹھے بیٹھے کہنے لگے۔

"تم بڑی حسین ہو صورت سیرت دونوں۔ پہلی بیوی تمھارے پاسنگ میں بھی نہیں آسکتی تھی۔ میں تم کو جان سے زیادہ عزیز رکھتا ہوں" پھر وہ یکایک پوچھنے لگے۔ "تم کو پہلے شوہر سے کتنی محبت تھی؟" میرے ذہن میں ایک اگلی گفتگو تازہ ہوگئی۔ معاً مجھ پر رقت طاری ہوئی۔ لیکن میں نے اپنے آپ کو بہت سنبھالا۔ اور آنسو پی کر رہ گئی۔ کہ کہیں ایسا نہ ہو وہ اس کو اپنا جواب سمجھیں۔ وہ ایسی سپردگی کا مظہر بنے ہوئے تھے کہ چپ رہنا بھی ان کو تکلیف دیتا تھا۔ پھر ان کی شرافت اور محبت نے میرے دل پر بڑا اثر ڈال رکھا تھا۔ میں نے کہا "وہ تو معمولی شکل وصورت کے انسان تھے ......"

"لیکن وہ نوعمر تھے" انھوں نے بات کاٹ کر کہا۔ یہ تفصیلی مقابلہ کا سوال بڑا ٹیڑھا تھا۔ میں نے بات کا رخ پھیرتے ہوئے جواب دیا۔

"جی ہاں! نوعمر تھے، بچہ، بالکل بچہ۔ الھڑ۔ ذرا ذرا سی بات پر سر ہوجاتے تھے" اس سے ان کا ذرا اطمینان ہوا، لیکن جھجکتے جھجکتے، اور پیچ دار راستہ سے حرف مطلب کی طرف آنے لگے۔ "تو تم کو بہت دق کرتے تھے؟"

" بہرحال ہم گذار دیتے تھے ۔ میں برا نہیں مانتی تھی "
" بڑا ظلم کیا کرتے تھے .... تم سے محبت کرنا چاہئے تھا .... میرے لئے تو تمھارے بغیر رہنا مشکل معلوم ہوتا ہے
تم نے کچھ ایسا جادو کر دیا ہے ۔ ہمیشہ کے لئے اپنا کر لیا "
" میں آپ کی ہو گئی .... "
" اچھا سچ سچ بتاؤ ، مجھے کتنا چاہتی ہو ؟ " آخر حرف مطلب آ ہی گیا ۔
" اتنا ہی ، جتنا آپ چاہتے ہیں .... "
" میں تو تم کو دنیا کی ہر چیز سے زیادہ چاہتا ہوں ۔ کیا تم بھی مجھے اتنا ہی چاہتی ہو ؟ "
" جی ہاں کیوں نہیں ۔ دل سے دل کو راہ ہوتی ہے "
" دھوکا نہ دو ، اچھا کہو ، مرحوم سے بھی زیادہ ؟ "
" آپ محسوس نہیں کرتے ؟ اس وقت تو بے خیالی تھی ۔ اور اب تو کچھ یاد بھی نہیں "
" اچھا ، اگر خدا نخواستہ میں مر جاؤں تو کیا کرو گی ...... ؟ "
" آپ کے دشمن مریں ۔ ایسی باتیں زبان سے نہ نکالئے ۔ آپ کے سامنے میں مر جاؤں تو میری مٹی ٹھکانے لگ جائے گی
" تمھاری تو بڑی حیات ہے ۔ اچھا میں دیکھوں تو تمھارا ہاتھ " میرا سیدھا ہاتھ لے کر ، وہ ہتھیلی کی لکیروں کو دیکھنے لگے ۔ تھوڑی دیر کے
سر ہلا کر کہا "
" دیکھا اس حیات کی لکیر کو ، کیسی سیدھی دور تک چلی گئی ہے ۔ بے شک پہلے میں اور پھر تم "
" پہلے میں اور پھر آپ " میں نے جواب دیا ۔
" نہیں یہ تصفیہ شدہ بات ہے ، پہلے میں "
" اچھا تو آپ ہم ساتھ ۔ چلو چھٹی ہوی ۔ کوئی کسی کا غم نہ دیکھے "
" یہ تو پرانے قصوں کی سی بات ہوئی ۔ اور پھر تمھارے مرنے کے خیال ہی سے مجھے تکلیف ہوتی ہے ۔ ایسی حسین چیزیں جتنے زیادہ دن
رہیں ، اچھا ہے "
" سیونہیں رہنے بھی دو ۔ کوئی اور گفتگو نہیں ہے ، جب موت آئے گی مرنا ہی ہوگا ۔ آپ نہ سہی ، میں ہی سہی " اس پر وہ ہنس پڑے
میں بھی ہنسنے لگی ۔ اور بات گئی گذری ہو گئی ۔
لیکن میں تو ٹھہری ازل کی بدنصیب ۔ چند ماہ بعد ۔ یہ نہایت ڈراؤنا خواب بھی سامنے آگیا ۔ انھیں ٹائی فائیڈ ہوا ۔ اور دو وقت
میں رات دن انہیں کی خدمت میں لگی رہتی ۔ رہ رہ کر ، وہ اگلی پچھلی باتیں یاد آتیں ۔ میں نے کئی بار آدھی رات کو ، نمازیں پڑھ پڑھ کر
خدا کی درگاہ میں گڑگڑا کر دعا کی کہ " خداوندا ، اب یہ غم نہ دکھا ۔ نصیب دشمناں ، اگر انہیں کچھ ہونا ہے تو اس سے پہلے مجھے اس دنیا سے
لیکن بدنصیب کی دعا میں اثر کہاں ۔ ان کا بخار طول کھینچتا گیا ۔ کئی ڈاکٹر اور طبیب بدلے گئے ۔ کوئی فائدہ نہ ہوا ۔ آخر دس بارہ روز
نمونیا ہو گیا اور دو تین دن تکلیف اٹھا کر ، ایک روز سہ پہر کے وقت ، وہ میرے دیکھتے ہی دیکھتے اس دنیا سے چل بسے ۔ دنیا میرے لئے اندھیر

میں ٹھہری ہوئی تھی۔ اس صدمہ سے اسی وقت میں غش کر گئی۔ اور بعد میں سخت بیمار پڑی۔ کبھی کبھی مجھے ایسا معلوم ہوا کہ اب کوچ کی تیاری ہے۔ لیکن پھر طبیعت کو سکون ہو جاتا۔ ایک روز، اسی بیماری کی حالت میں، میں نے ایک عجیب غریب خواب دیکھا جس کا اثر میرے دل پر آج تک باقی ہے۔

اماں جان، ابا جان اور ہم سب ریل میں سوار ہو کر کہیں جا رہے ہیں۔ جاتے جاتے ایک مقام پر ریل رکی۔ اور میں اتر پڑی۔ اب ساتھیوں کا کچھ خیال نہ تھا۔ ریل سے اتر کر چلی۔ اور قریب ہی ایک شہر کے دروازے پر پہنچی۔ دربان نے مجھے روکا، اور نامۂ اعمال بتانے کو کہا۔ میں نے ایک کاغذ نکال کر اسے دکھایا۔ کاغذ دیکھتے ہی اس نے اندر جانے کی اجازت دے دی۔ میں خوشی خوشی اندر داخل ہوئی۔ اور بے مقصد کے ادھر ادھر گھومنے لگی۔

اس مقام کی خوبی اور نزہت کا حال، بیان سے باہر ہے۔ ہر طرف سرسبز و شاداب درخت نسیم روح پرور کے جھونکوں سے لہرا رہے تھے۔ کہیں آبشاروں کے گرنے کی آوازیں فردوس گوش کا یقین دلا رہی تھیں۔ ہر طرف نہریں رواں تھیں جن کا پانی گلاب کی طرح معطر اور دودھ کی طرح سفید نظر آتا تھا۔ حقیقت میں یہ جنت تھی۔

ہر طرف، بڑی بڑی آنکھوں والی، نہایت حسین اور طرح دار عورتیں، زرق برق لباس پہنی محوِ خرام دکھائی دیں۔ لیکن وہ ایک دوسرے سے ایسی بے تعلق معلوم ہوتی تھیں، جیسی ہرنوں کی ڈاروں میں ہرنیاں۔ میں بھی وہاں پہنچ گئی، کسی نے مجھے آنکھ اٹھا کر بھی نہیں دیکھا۔ میں اسی طرح پھرتی ہوئی، گویا کسی کی تلاش میں آگے بڑھی۔ دور پر ایک سایہ دار درخت کے نیچے چند نوعمر حسین لڑکے، زریں لباسوں میں سر پر زرنگار ٹوپیاں پہنے زلفیں چھوڑے بیٹھے ہنسی مذاق میں محو تھے۔ ان کے قہقہوں سے ساری فضا گونج رہی تھی۔ میں اور آگے بڑھی۔ میں ٹھیک تو نہ جان سکی لیکن کوئی خیال مجھے کشاں کشاں لئے جا رہا تھا۔ جس قدر میں آگے بڑھتی گئی، اس بے پایاں مقام کی وہی وسعت تھی۔ آخر ایک نہر کے کنارے، سایہ دار درخت کے نیچے میں بیٹھ گئی۔

ابھی پوری طرح دم لینے نہ پائی تھی کہ نہر کے اس پار مجھے ایک جانی پہچانی سی شکل نظر آئی، جو بہشتی حلوں سے مزین تھی۔ جب وہ قریب پہنچی تو میں نے فوراً پہچان لیا کہ یہ میرے پہلے شوہر ہیں۔ وہ اس وقت ہمیشہ سے زیادہ بشاش اور ہر وقت سے زیادہ حسین نظر آ رہے تھے۔ میں نے انھیں پکارنے کی کوشش کی، لیکن آواز حلق سے نہ نکل سکی۔ بے چینی میں ہاتھ پاؤں ہلانے لگی۔ وہ مجھ پر بے توجہی سے نظر ڈالتے ہوئے میری بیتابی کو دیکھے بغیر گذر گئے۔ میں سمجھی کہ وہ میرے دوسرے عقد سے ناراض ہو گئے ہیں۔ اٹھ کر ان کے پیچھے دوڑنا اور قدموں پر سر رکھ کر انہیں منا لینا چاہتی تھی، لیکن پاؤں نے یاری نہیں کی۔ اسی یاس و حرماں کی حالت میں، نہر کے اس رخ پر ایک اور امید کی صورت دکھائی دی۔ یہ میرے دوسرے شوہر تھے۔ یہ بھی اسی طرح کا لباس پہنے ہوئے میرے نزدیک سے اور اس قدر نزدیک سے گذرے کہ ان کی سانس کی گرمی، کو تک میں محسوس کر سکتی تھی۔ لیکن جب انھیں پکڑنے کے لئے میں نے ہاتھ پھیلائے تو وہ دور تھے۔ اور ایک لاابالی نظر مجھ پر ڈالتے ہوئے، درختوں کی آڑ میں چلے گئے۔ پکارنے کی کوشش اب بھی بے سود ثابت ہوئی۔ آخر، حالت کرب میں، اپنی بساط سے زیادہ قوت کے ساتھ میں نے حرکت کرنے اور اٹھنے کی کوشش کی۔ لیکن دھڑام سے زمین پر گر پڑی اور آنکھ کھل گئی۔ کیا دیکھتی ہوں کہ پلنگ سے نیچے گر پڑی ہوں اور آنسوؤں کے دو بڑے قطرے بہہ کر رخسار تک پہنچ گئے ہیں — میں نے دو انمول موتی پا کر کھو دیے۔

عبدالقادر سروری

کیوں لکھیں؟

اکثر لوگوں کو کبھی نہ کبھی ایسی کٹھن گھڑیوں سے سابقہ پڑتا ہے جب کہ انہیں اپنا قلم بےکار اور اپنا دماغ خالی معلوم ہوتا ہے وہ اپنے کاغذ کو سفید اور معرا دیکھ کر بے چین اور فکر مند ہو جاتے ہیں کہ کسی طرح اس پر قلم چلے اور وہ سیاہ ہو جائے یہ واقعے صرف مدرسہ یا کالج ہی کے زمانہ میں نہیں گذرتے کہ کوئی لکھنے پر مجبور ہوا اور اسے کچھ سجھائی نہ دے بلکہ وہاں سے نکلنے بہت بعد دنیا میں لکھنے کی ضرورت پڑتی ہے، بعضوں کو ملازمت یا کاروبار وغیرہ کے سلسلہ میں اپنے حالات وخیالات کا بذریعہ تحریر اظہار کرنا پڑتا ہے، بعض چاہتے ہیں کہ کسی عزیز دوست کو خط لکھیں، اور کسی کی یہ خواہش ہوتی ہے کہ اپنے تجربات دلچسپ معلومات کسی روزنامہ یا رسالہ کے ذریعہ سے عوام تک پہنچائیں مگر جب لکھنے بیٹھتے ہیں تو انہیں محسوس ہوتا ہے کہ ان کا دماغ بالکل معطل ہو گیا ہے۔ وہ حیران رہ جاتے ہیں وہ سوچتے ہیں کہ "آخر ہم نے اتنے امتحان کامیاب کیئے، بڑی بڑی کتابیں پڑھیں اس قدر معلومات کے مالک ہیں، اور ایسے ایسے کام کیئے ہیں، لیکن پھر بھی جب لکھنا چاہتے ہیں تو قلم آگے بڑھتا نظر نہیں آتا اور خاص توجہ، کوشش، اور ارادہ کے دو صفحے بھی نہیں لکھ سکتے۔"

واقعہ یہ ہے کہ ہر لایق آدمی لکھ نہیں سکتا۔ وہی شخص لکھ سکتا ہے جس نے لکھنے کی تربیت حاصل کی ہو، اور جس کو اپنے دماغ سے کام لینے کا طریقہ معلوم ہو۔ مگر بہت کم ہیں وہ خوش قسمت جو اس سے واقف رہتے ہیں یہ طریقہ یا تربیت کسی خاص معجزہ یا وظائف کی پابندی سے حاصل نہیں ہوتی۔ مستقل ارادہ، خاص توجہ اور مسلسل کام کے ذریعہ سے ہر شخص اس پر حاوی ہو سکتا ہے۔ آپ کالج کے طالب علم ہوں، یا کسی دفتر کے اہلکار، یا کوئی کاروباری آدمی، ہر حالت میں اور ہر جگہ ایک مضبوط ارادہ اور مسلسل محنت کے بغیر کامیابی نہیں ہو سکتی۔

ادب یا انشا پردازی محض نظری علم یا سائنس نہیں ہے کہ صرف مطالعہ یا غور و خوض کرنے سے حاصل ہو جائے وہ ایک فن ہے جس کے لئے عمل پیہم اور مسلسل مشق کی ضرورت ہے عام طور پر یہ خیال کیا جاتا ہے کہ مضامین نگاری، یا تصنیف و تالیف یا شاعری مدرسہ کی تعلیم یا بعض مخصوص کتابوں کے مطالعہ سے دسترس حاصل کی جا سکتی ہے۔ لیکن یہ خیال جتنا عام ہے اتنا ہی غلط ان ذریعوں سے ایک شاعر، ایک مصنف، ایک ناول نویس، یا ایک مضمون نگار بن سکنا اسی طرح دشوار ہے جس طرح ان ذریعے سے بڑھائی یا لوہار بن جانا۔

کسی کتب خانہ میں لکڑیوں اور ان کی متفرق قسموں یا اوزار اور ان کے مختلف کام، یا بڑھائی کے فن کے متعلق بہت سی کتابیں اور رسالے مل سکتے ہیں، اگر ہم ان سب کو پڑھ ڈالیں اور ان میں کے ہر اہم اصول یا گر کو ازبر کر لیں کیا ہم اپنے ہاتھ سے ایک اچھی سی میز یا خوشنما کرسی بنا سکیں گے؟

ببرس نومبر ۱۹۳۶ء

ادبی تخلیق یعنے ادبی مضامین لکھنا اور تصنیف و تالیف ایک ایسا ہنر ہے جو صرف مشق ہی سے حاصل کیا جا سکتا ہے۔ اس لئے اگر کوئی شخص اپنی روزمرہ کی زندگی میں کسی نہ کسی غرض سے لکھنے کے لئے مجبور ہو (اور ایسے اشخاص بہت کم ہیں جو مجبور نہ ہوں) تو اس کو چاہیئے کہ اپنے آئے دن کے کام کاج کی سہولت، اپنے مطالب کو خوبی سے ادا کرنے کی قابلیت، اور اس طرح اپنے ہم چشموں میں ممتاز رہنے کی مسرت حاصل کرنے کے لئے لکھنے کی طرف متوجہ ہو۔

بعض حضرات غور و فکر اور علم و فضل میں ایسا تبحر حاصل کر لیتے ہیں، یا ان کے یہاں دنیا اور اس کے کاروبار کی نسبت ایسی بہترین معلومات، تجربے، اور خیالات موجود ہوتے ہیں کہ اگر ان کو بذریعہ تحریر منوار کیا جائے تو نہ صرف دوسرے ان سے مستفید ہوں بلکہ ان کی ذات کو بھی گوناگوں فائدے حاصل ہوں۔ مگر اس قسم کے اکثر لوگ چونکہ لکھنے سے گھبراتے ہیں (کیوں کہ انھوں نے اس کی عادت نہیں کی) اس لئے علم و فضل اور تجربہ و خیالات کے سارے خزانے انہی کے ساتھ دفن ہو جاتے ہیں۔

لکھنا دوسروں کے دماغوں تک اپنا خیال یا پیغام پہنچانے کا بہترین وسیلہ ہے اگر کسی کو اس کا سلیقہ حاصل نہیں ہوا تو اس کا پاکیزہ سے پاکیزہ خیال اور اعلیٰ سے اعلیٰ پیغام بے مصرف رہ جاتا ہے۔ لکھنے کا سلیقہ بعض معمولی سے معمولی قابلیت اور عقل و شعور رکھنے والوں کو بھی قابل ترین علما و فضلا اور اعلیٰ مفکرین کی صف میں لا کھڑا کرتا ہے۔

اگر ادبی اور علمی نقطۂ نظر سے دیکھا جائے تو لکھنے کی مشق کرنا اور اس میں کمال حاصل کرنا ہمارا ایک مقدس فریضہ ہے۔ اردو ادب کا عہد ماضی ہر اہل اردو کو لکھنے کا سبق دیتا ہے۔ اس وقت جب کتابت اور طباعت واشاعت کی کوئی سہولتیں موجود نہ تھیں آج سے تین چار سو سال پیشتر کے اردو مصنفین اور شعرا ایسی ایسی ضخیم اور اعلیٰ درجہ کی کتابیں اپنی یادگار چھوڑ گئے ہیں کہ ان کے مطالعہ سے موجودہ نسلیں درس عبرت حاصل کر سکتی ہیں پھر اس قدیم زمانہ سے لے کر اب تک ہمارے اسلاف برابر تحریری کام کرتے آئے ہیں۔ جس کا نتیجہ یہ ہوا کہ آج اردو زبان ہندستان کی جملہ زبانوں میں اپنے کثیر التعداد بیش بہا اور قدیم ترین ادبی خزانوں کی وجہ سے ممتاز ہے۔ ہندستان کی کسی زبان میں اتنی زیادہ کتابیں اور اتنے قدیم زمانہ سے مسلسل نہیں لکھی گئیں۔

ایسی صورت میں کیا ہمارا فرض نہیں ہے کہ اپنے اسلاف کے اس اہم کام کو جاری رکھیں اور زمانۂ حال کی سہولتوں اور ضرورتوں کے پیش نظر ان کے ادبی کارناموں سے بہتر نہیں تو کم از کم برابر درجہ کی تحریروں ہی سے اپنے ادب میں اضافہ کریں؟ اگر ہم تصنیف و تالیف میں اپنے اسلاف کی سنت دیرینہ کی پابندی، اور اس علمی و ادبی میراث میں اضافہ کی کوشش نہ کریں تو اردو کو ہندستان کی دوسری زبانوں کے مقابلہ میں جو اہمیت حاصل ہے وہ اس عہد کشمکش میں ہرگز برقرار نہ رہ سکے گی۔

اگر ہمارے نوجوان لکھنے کی عادت ڈالیں اور تصنیف و تالیف کا مشغلہ جاری رکھیں تو وہ نہ صرف اپنی زبان کا رتبہ بڑھائیں گے بلکہ اپنے ملک کو دنیا کے ترقی یافتہ ممالک کی صف میں ممتاز کر سکیں گے۔ زبان ملک و قوم کے حالات و خیالات کا آئینہ ہوتی ہے اور اگر اس کا ادبی خزانہ مالا مال ہو اور اس میں اچھے لکھنے والے برابر پیدا ہوتے رہیں تو کوئی وجہ نہیں کہ اس کے باعث ملک و قوم کے وقار میں اضافہ نہ ہو؟

اس قومی اور ملکی نقطۂ نظر کے علاوہ لکھنے میں ذاتی مسرت اور استفادہ کے بھی بہت سے پہلو مضمر ہیں۔ اکثر انسان اپنی روزمرہ کی کاروباری یا دفتری زندگی اور ہر روز کے پامال حالات و واقعات سے گھبرا جاتے ہیں۔ اُن کی خواہش ہوتی ہے کہ اپنے مضمحل قلب و دماغ کو کسی اور کام سے بہلائیں۔ ایسی صورت میں بھی تحریر اور انشاپردازی کا مشغلہ تفریح طبع اور دلچسپی کا باعث ہوا ہے۔ اکثر حضرات وقت گذاری اور خانگی محبوب مشغلے کے طور پر انشاپردازی سے محظوظ ہوتے ہیں۔

انشاپردازی ایک ایسی دلچسپ اور خاموش تفریح یا ایسا بے ضرر محبوب مشغلہ ہے جو دوسری قسم کی اکثر تفریحوں اور دل بہلائیوں کے مقابلہ میں کئی طرح سے قابل ترجیح ہے۔ اس سے کام کرنے والے کے علاوہ دوسروں کو بھی جو روحانی اور جمالیاتی حظ حاصل ہو سکتا ہے بہت کم کسی دوسری تفریح یا دلچسپ مشغلے سے نصیب ہوتا ہے۔ اس کے لئے محظوظ ہونے والے کو کسی طرح کا جسمی، دماغی، یا زَمی بار اٹھانے کی بھی ضرورت نہیں جو دوسری قسم کی اکثر تفریحوں کے لئے لازمی ہے۔ اس کے علاوہ انشاپردازی کے ذریعہ سے اکثر دفعہ عزت، اثر، وقار، علم، فضل اور مال و دولت، غرض وہ تمام ضرورتیں مہیا ہو جاتی ہیں جو دوسری تفریحوں سے شاید ہی حاصل ہو سکیں۔

تفریح طبع کے علاوہ انشاپردازی بطور پیشہ کے بھی اختیار کی جا سکتی ہے۔ آج یورپ اور امریکہ میں متعدد صاحب اقتدار اور سیاسی ہستیاں وہی ہیں جنھوں نے اپنی زندگی انشاپرداز کی حیثیت سے شروع کی تھی۔ انہوں نے صرف اپنے قلم ہی کے ذریعہ سے علمی اور ادبی وقار کے علاوہ سیاسی اقتدار بھی حاصل کر لیا۔ خود ہماری زبان اردو میں بھی بعض اصحاب تصنیف و تالیف اور انشاپردازی کی وجہ سے خوشحال اور آزاد زندگی بسر کر رہے ہیں۔ لیکن یورپ کے مقابلہ میں ہمارے ملک میں ابھی ترقی کا بہت بڑا میدان خالی ہے۔ ہمارے لئے انشاپردازی کے ایسے ایسے خزانے اور ذخیرے محفوظ اور مدفون ہیں جن کو نمودار کرنے اور جن سے مالا مال ہونے کی بہت گنجایش ہے۔ ضرورت ہے کہ ہمارے اکثر نوجوان (خواہ وہ کسی پیشے سے تعلق کیوں نہ رکھتے ہوں) اس طرف متوجہ ہوں، آج ہی سے اپنی فرصت کے اوقات میں لکھنا شروع کر دیں اور رفتہ رفتہ اس کی عادت ڈالیں۔

سید محی الدین قادری زورؔ　　(ماخوذ از فن انشاپردازی)

عمر خیام کے متعلق چند تحقیقات

(یہ مضمون حیدرآباد لاسلکی اسٹیشن سے پڑھا گیا تھا)

دنیا میں کون ایسا فارسی داں انسان ہے جو عمر خیام کے نام سے واقف نہیں۔ فارسی داں کی بھی خصوصیت نہیں بلکہ تقریباً ہر وہ ذی علم جو شعر و سخن سے دلچسپی رکھتا اور خواہ کوئی زبان جانتا ہو ایران کے اس رفیع الشان شاعر کے نام و کلام سے ضرور واقف ہے؛ اس کے کلام سے حظ اٹھانے کے لئے فارسی زبان کا جاننا اس لئے بھی ضروری نہیں کہ آج دنیا کی بڑی بڑی زبانوں مثلاً عربی، انگریزی، فرانسیسی، جرمن روسی اور اطالوی بلکہ چھوٹی زبانوں مثلاً مرہٹی، تلنگی، بنگالی، ہندی اور پنجابی وغیرہ میں رباعیات عمر خیام کے بے شمار ترجمے ہوئے ہیں جن کو پڑھ کر اہل ذوق لطف اندوز ہوتے اور سر آنکھوں پر رکھتے ہیں، امریکنوں اور انگریزوں نے اس شاعر کے کلام کے بیسوں ترجمے کئے اور اس پر مقدمات لکھے ہیں یہاں تک کہ "عمری ادبیات" کے نام سے ایک خاصہ ادب جمع ہو گیا ہے، انھوں نے اسی پر اکتفا نہیں کیا بلکہ قدر دانی و ہر دلعزیزی کا عملی ثبوت اس طرح بھی دیا کہ خیام کے نام سے متعدد کلب قائم کئے جن میں اس شاعر کے قدر دانوں کی ایک کثیر تعداد شریک ہے۔

خیام کو اس قدر شہرت عام و ہر دلعزیزی جو یورپ میں حاصل ہوئی وہ غالباً فارسی زبان کے کسی اور شاعر کو نصیب نہیں ہوئی گو وہ شاعری میں عمر خیام سے بڑھ کر ہی رتبہ رکھتا ہو، حق تو یہ ہے کہ مشرق اور خود سرزمین ایران میں خیام کی اتنی قدر و منزلت و شہرت نہیں ہوئی جو اس کو یورپ و امریکہ میں حاصل ہوئی اور انہیں کے بڑھتے ذوق اور آئے دن کے ترجموں، دیباچوں اور مقدموں نے علم دوست طبقہ میں ایک شوق اور ہیجان پیدا کر دیا اور مشرقی اہل ذوق نے بھی اس طرف زیادہ توجہ کرنی شروع کی۔

رباعی جیسا کہ اس کے نام سے واضح ہے چار مصرعوں کی ہوتی ہے۔ اور اس میں ایک ہی مضمون باندھا جاتا ہے اور آخری مصرعوں کی چستی اور بندش سے زور کلام میں بے انتہا اضافہ ہونا اور لطف سخن کمال کو پہنچ جاتا ہے، گو یہی صنف حضرت ابو سعید ابو الخیر نے اپنے کلام کے لئے اختیار کی لیکن صوفیہ، حکیما اور اخلاقیہ بلند مضامین نے ان کے کلام کو عام معیار فہم سے بالا تر کر دیا اور ایک خاص ذوق رکھنے والا طبقہ ہی ان کے کلام کو سمجھتا اور پسند کرتا ہے لیکن عمر خیام کے کلام میں مئے و معشوق کی چاشنی، مضامین کی سادگی، انداز بیان کی دلکشی، روانی و سلاست کے علاوہ لطف سخن اور زور کلام نے سونے پر سہاگہ کا کام کیا ہے، خیام نے عموماً ایسے سادہ مضامین اخلاقیہ و حکمیہ باندھے ہیں جو انسان کی روزمرہ زندگی، انسانی فطرت و ذوق کو خاص طور پر اپیل کرتے ہیں۔

اہل یورپ اپنے ذوق کی سطحی چیزیں خیام کے کلام میں پا کر اپنے خیالات کا عکس اس کے خیالات کے آئینہ میں دیکھ کر پھڑک اٹھے اور ان کو حرز جاں بنا لیا اور دوسری گہری باتوں کو چھوڑ دیا بلکہ اس کے کلام کا سارا دار و مدار "مئے دو سالہ و معشوق چاردہ سالہ" پر رکھا اور ان کے تخیل نے ایسا خیام بنا دیا جس کو شراب و کباب، بے دینی و الحاد اور دنیائے فانی کی سطحی و عارضی لذات کے سوا کسی اور چیز سے کوئی سروکار نہیں، چنانچہ اس کی زندگی کے اسی رنگ کو اس قدر نمایاں کیا گیا کہ اس کی رباعیات کی تشریحات میں کتابوں اور کیالنڈروں وغیرہ میں مئے و معشوق اس کی زندگی کے جزو لاینفک نظر آتے ہیں۔ اب ہم ایران کے اس عظیم الشان شاعر کی زندگی کے حالات اور اس کا عقیدہ مختصراً پیش کرتے ہیں۔

ابوالفتح عمر بن ابراہیم خیام صوبہ خراسان کے مشہور شہر نیشاپور میں پانچویں صدی ہجری کے وسط میں پیدا ہوا۔ اس کا باپ ابراہیم چونکہ خیمہ دوز تھا اس مناسبت سے اس نے اپنا تخلص خیام رکھا جیسا کہ دیگر ایرانی شعرا کا تخلص پیشے کے لحاظ سے عطار، دباغ وغیرہ رہا ہے۔ خیام نے بچپن میں حضرت امام موفق سے، جو اس زمانہ کے نہایت زبردست عالم و بابرکت بزرگ تھے، تعلیم حاصل کیا۔ حسن و عشق گویا اس کی خمیر میں گوندھے گئے تھے، علم نجوم و حکمت سے اس کو خاص لگاؤ تھا۔ جو بعد میں کمال کو پہنچا۔ ید طولی حاصل ہونے کی وجہ سے اس کو Astronomer Poet کہتے ہیں، ملک شاہ سلجوقی نے جب زیچ کی اصلاح کا کام شروع کرایا تو کمیٹی کے ارکان میں خیام بھی شامل کیا گیا۔

تتمہ صوان الحکمہ میں لکھا ہے کہ ملک شاہ سلجوقی نے خیام کو اپنے ندیم و جلیس کا رتبہ دیا تھا، اور شمس الملوک بخارا میں اس کی نہایت تعظیم و تکریم کرتا اور اس کو تخت پر اپنے بازو بٹھایا کرتا تھا۔ یوں تو عمر خیام کے حالات متاخرین کے اکثر تذکروں میں پائے جاتے ہیں۔ لیکن خیام کے قدیم ترین ترجمہ حال کے متعلق پروفیسر براؤن نے اپنی مشہور کتاب لٹریری ہسٹری آف پرشیا (ج ۲ ص ...) میں لکھا ہے کہ وہ چہار مقالہ میں پایا جاتا ہے اور علامہ مرزا محمد قزوینی نے بھی چہار مقالہ کی تصحیح کے وقت اس بات کو ثابت کیا ہے کہ قدیم ترین ترجمہ حال عمر خیام چہار مقالہ میں ہے (چہار مقالہ مطبوعہ لیدن، مقدمہ ص ۲ و حاشیہ ۲۱۰)۔ میں جب لندن میں تحقیقات علمیہ میں مصروف تھا تو میں نے اثنائے تحقیقات میں چھٹی صدی کے ایک مصنف ابوالحسن علی بن زید البیہقی کی کتاب تتمہ صوان الحکمہ کا پتہ چلایا جو برلن اسٹیٹ لائبریری میں موجود ہے (فہرست مخطوطات عربی نمبر پیٹرمن ۳۰، ...) میں نے پروفیسر سر ڈینیسن راس ڈائرکٹر اسکول آف اورنٹیل اسٹڈیز لندن سے تتمہ کی اہمیت کا ذکر کیا اور اس کو مستعار منگوانے کی خواہش ظاہر کی چنانچہ موصوف نے اسکول کی لائبریری کے توسط سے وہ کتاب اسٹیٹ لائبریری برلن سے منگوائی اور کتاب مستعار بھجوانے پر ڈاکٹر وائیل مہتمم کتاب خانہ کا شکریہ ادا کیا۔ میری استدعا پر تتمہ کا عکس لے کر اسکول کی لائبریری میں محفوظ رکھا گیا ہے۔ تتمہ صوان الحکمہ میں نہ صرف عمر خیام کا اہم ترین تذکرہ ہے بلکہ وہ قدیم ترین بھی ہے کیونکہ تتمہ کا مصنف ابوالحسن بیہقی بچپن میں اپنے والد زید بیہقی کے ساتھ سنہ ۵۰۷ھ میں عمر خیام سے ملنے کے لئے گیا تھا، زید بیہقی عمر خیام کا بڑا دوست تھا، خیام نے ابوالحسن سے حماسہ کے ایک شعر

ولا یرعون اکناف الہوینا ؛ اذا حلوا ولا ارض الہدون

کا مطلب پوچھا تھا اور انواع خطوط قوسیہ بھی دریافت کئے تھے اور ابوالحسن کے فریسانہ جواب سے خوش ہو کر اس کی تعریف کی تھی۔

میں نے جب تتمہ کے سنہ تصنیف کی تلاش و جستجو کی تو داخلی اور خارجی ثبوت سے جو معجم الادبا یاقوت رومی وغیرہ سے حاصل ہوا۔ اس امر کی تحقیق ہوئی کہ ابوالحسن بیہقی نے تتمہ کی تکمیل سنہ ۵۴۹ھ تک کی تھی اس لئے کہ مصنف نے اپنی ایک تالیف مشارب التجارب و غوارب الغرایب میں جو العتبی کی تاریخ یمینی کا ذیل ہے، سنہ مذکور العدد تک اپنی مصنفات و مؤلفات کی فہرست دی تھی جس کو یاقوت نے معجم الادبا (ج ۵، ص ۲۰۹ و ۲۱۰) پر نقل کیا ہے، اس فہرست میں تتمہ صوان الحکمہ بھی شامل ہے لیکن مصنف کی دوسری دو کتابیں لباب الانساب و تاریخ بیہق اس میں شامل نہیں ہیں، لباب الانساب نادر الوجود ہے اور اس کا سنہ تصنیف بھی معلوم نہیں البتہ یاقوت رومی نے معجم الادبا میں لکھا ہے کہ یہ کتاب اس نے سنہ ۶۱۳ھ میں خراسان میں دیکھی تھی۔ تاریخ بیہق اس وقت موجود ہے (ذیل فہرست مخطوطات فارسیہ برٹش میوزیم نمبر اورنٹیل، ۳۵۸۰) اور اس کا سنہ تصنیف

۵۶۲ھ ہے اگر تتمہ صوان الحکمہ ۵۴۹ھ تک مکمل نہ ہوئی ہوتی تو ان کتابوں کی طرح اس کا نام بھی درج فہرست نہ ہوتا، اس سے یہ ثابت ہوتا ہے کہ تتمہ کی تکمیل ۵۴۹ھ تک ہو چکی تھی۔ اس لیئے وہ اس فہرست کتب میں جو اس سنہ تک تکمیل کو پہونچ چکی تھیں درج کی گئی۔

جب تتمہ کا سنہ متحقق ہو چکا تو اب دیکھنا یہ ہے کہ چہار مقالہ کا سنہ تصنیف کیا ہے' آقا میرزا محمد قزوینی نے چہار مقالہ کی تصحیح کے وقت بعد تحقیق یہ لکھا ہے کہ چہار مقالہ مابین ۵۵۲ھ ۵۵۰ھ تصنیف ہوا ہے اس سے ظاہر ہے کہ تتمہ صوان الحکمہ چہار مقالہ پر مقدم ہے اس لیئے عمر خیام کا جو ترجمہ حال تتمہ میں ہے وہ بھی قدیم ترین ہے' اس انکشاف کے بارے میں میں نے آقا قزوینی سے پیرس میں ملاقات کے دوران میں ۱۹۲۹ء میں کہا تھا تو انھوں نے جواب دیا کہ "میں نے جس وقت تحقیق کی تھی مجھے ویسے ہی معلومات حاصل ہوئے تھے اب آپ کو اس کے متعلق جدید مواد دستیاب ہوا ہے"۔

عمر خیام کے سنہ وفات کے متعلق بھی قطعی طور پر اب تک نہ معلوم ہو سکا تھا اگرچہ عموماً ۵۱۷ھ خیال کیا جاتا تھا لیکن ساتھ ہی اس کے غیر تحقیق ہونے کا اظہار بھی کر دیا جاتا تھا' یہ امر مسلمہ ہے کہ خیام ۵۰۸ھ تک زندہ تھا جب کہ ابوالحسن بیہقی نے اس سے ملاقات کی تھی اور نظامی عروضی سمرقندی نے جب اس سے ۵۰۶ھ میں بلخ میں ملاقات کی تو خیام نے اپنی قبر کے متعلق پیشین گوئی کی تھی کہ میری قبر ایسے مقام پر ہو گی جہاں باد شمال پھول برسایا کرے گی"۔ نظامی عروضی جب ۵۳۰ھ میں نیشاپور گیا تو اس وقت خیام کا انتقال ہو چکا تھا جس کو چند سال گزرے تھے اس لیئے شاعر کا اس سنہ سے پہلے فوت ہونا یقینی امر ہے۔ مسٹر ونیکٹ راؤ داتار سابق سب معتمد فینانس کو عمر خیام کے کلام کے ساتھ خاص شغف ہے۔ انھوں نے رباعیات خیام کا ترجمہ مرہٹی زبان میں کیا ہے اور کئی سال سے خیام کے نایاب نسخے' اس کے رسالے اور مواد وغیرہ جمع کیئے ہیں۔ اور زر کثیر صرف کرنے کے علاوہ اپنی عمر عزیز کا ایک حصہ اس کام کے نذر کر دیا (خدائے تعالیٰ ایسے بے تعصب اور علم دوست حضرات میں اضافہ کرے) موصوف نے نہایت محنت و کاوش سے از روئے نجوم خیام کا سنہ وفات اس کے طالع سے نکالا ہے جو ابوالحسن نے تتمہ صوان الحکمہ میں لکھا ہے۔ وھو ھذا طالعہ الجوزاء والشمس وعطارد علی درجۃ الطالع فی ج من الجوزاء وعطارد صمیمی والمشتری من التثلیث ناظر الیھا۔ اس طالع سے سنہ وفات اغلباً ۵۲۶ھ قرار پاتا ہے۔ کچھ عرصہ ہوا مولانا سلیمان ندوی نے ایک مفصل کتاب عمر خیام کے حالات میں "خیام" کے نام سے لکھی ہے جو طبع بھی ہو چکی ہے اس میں سوائے ان مقامات کے جو موصوف کے سماعی یا مبہم لکھے ہوئے ہیں وہاں کچھ سہو واقع ہو گیا ہے ورنہ کتاب اچھی اور بڑی محنت سے لکھی گئی ہے۔ موصوف نے قدیم نسخہ چہار مقالہ سے جس میں اور نسخوں کی بہ نسبت سنہ وفات خیام کے متعلق اختلاف تھا یہ معلوم کیا ہے کہ اس کا سنہ وفات ۵۲۶ھ ہے۔ فی الحال اس کو صحیح ماننے میں ہمیں تامل نہیں ہے تاوقتیکہ مزید تحقیق کے ذریعہ کسی اور سنہ کا پتہ نہ چل جائے۔

خیام کے عقیدہ کے متعلق بعض مشرقی اور اکثر مغربی حضرات کا یہ خیال ہے کہ وہ دہریہ' ملحد و بے دین تھا لیکن اس کی تردید اس کے رسالوں مثلاً رسالۃ فی الوجود' رسالہ فی الکون والتکلیف اور رباعیات و دیگر کتب سے جو اس کے حالات پر مشتمل ہیں ہوتی ہے بلاشبہ اس کا کلام پاک و بے ریا و نمود زندگی' وحدانیت کے راسخ عقیدہ' خدا کے خوف' قیامت کے یقین' سزا و جزا اور ... نفرت سے مملو ہے' اس کے سارے کلام میں ایک خاص اسپرٹ پائی جاتی ہے جو خدا کی طرف اس کی لو اور میلان کو

ظاہر کرتی ہے وہ شوخی وگستاخی سے سب کچھ کہہ جاتا ہے لیکن خدا کی محبت اور خوف وعفو ہمیشہ اس کے دل کی گہرائیوں میں جاگزیں رہتے ہیں۔ اس کے خاتمہ پر کسی کو رشک آئے تو عجب نہیں، خدائے واحد کا خیال آخری وقت میں بھی اس کا ہمدم رہتا ہے صوان الحکمہ میں ابوالحسن بیہقی نے لکھا ہے کہ امام عمر کے داماد محمد بغدادی نے اس سے بیان کیا کہ ایک دفعہ خیام سونے کا خلال کر رہا تھا اور کتاب شفا سامنے تھی۔ الٰہیات پر غور کرنے میں منہمک تھا، جب فصل واحد وکثیر پر پہنچا تو خلال دو ورقوں کے درمیان رکھ دی اور کہا متقی لوگوں کو بلاؤ تاکہ میں وصیت کروں چنانچہ وصیت کرنے کے بعد کھڑے ہو کر نماز عشا ادا کی اور [illegible] پیا، نماز عشا کے بعد سربسجود ہو کر خدا کی بارگاہ میں گڑگڑا کر کہنے لگا۔ اللھم تعلم انی عرفتک علی مبلغ امکانی فاغفرلی فان معرفتی ایاک وسیلتی الیک ومات، اور روح مالک ارواح کے حوالہ کی، ظاہر ہے کہ جس شخص کا اس قدر پختہ عقیدہ کے ساتھ وصال ہو تو اس کے متعلق الحاد و بے دینی کا اتہام کہاں تک صحیح ہو سکتا ہے۔ وہ اپنی آرامگاہ نیساپور میں چین کی نیند سو رہا ہے

ذیل کی رباعیات سے اس پر کافی روشنی پڑتی ہے، کہا جاتا ہے کہ ایک دفعہ خیام مئے خواری میں مصروف تھا اس کی [illegible] کی صراحی اتفاقاً ٹوٹ گئی تو اس نے خداوند تعالیٰ کی شان میں کچھ شوخی وگستاخی دکھائی جس کو ایک رباعی میں ادا کیا ہے

ابریق مئے مرا شکستی ربی — برمن در عیش را ببستی ربی
برخاک بریختی مئے ناب مرا — خاکم بدھن مگر تو مستی ربی

کہتے ہیں کہ اس کے بعد ہی اس کا نصف چہرہ سیاہ ہو گیا، خیام نے اپنی بے ادبی محسوس کی، ساتھ ہی علام الغیوب سے معافی مانگی اور ایک دوسری رباعی کہی۔

ناکردہ گناہ در جہاں کیست بگو — آں کس کہ گنہ نہ کرد چوں زیست بگو
من بد کنم و تو بد مکافات دہی — پس فرق میان من و تو چیست بگو

جو دہریہ ہو اس کو ان باتوں سے کیا سروکار۔

خیام خدا کی ہستی کو پاکر اپنی بے نظیر رباعیات میں اس کو ہر طرح بری العیب وعالم الغیب بتاتا ہے۔

در دیدۂ تنگ مور نور است از تو — در پائے ضعیف پشہ زور است از تو
ذات تو سزا است مر خداوندی را — ہر وصف کہ نا سزا است دور است از تو

کس را پس پردۂ قضا راہ نہ شد — وز سر خدا ہیچ کس آگاہ نہ شد
ہر کس ز سر قیاس چیزے گفتند — معلوم نگشت و قصہ کوتاہ نہ شد

اپنے مالک حقیقی پر یقین رکھنا اس سے دردانگیز مناجاتیں کرتا اور اپنے گناہوں کے بخشوانے کے لئے رسول اللہ صلعم واسطہ دیتا ہے، کیا کوئی دہریہ اور بے دین وملحد اس طرح کر سکتا ہے۔ اس سے تو خدا کی وحدانیت اور رسول خدا کی شفاعت پر پورا عقیدہ واعتماد ظاہر ہوتا ہے۔

بکشائے درے کہ در کشائندہ توئی — بنما رہے کہ راہ نمائندہ توئی

گر من گنہ بر روئے زمیں کرو ستم عفو تو امید ست کہ گیرد دستم
گفتی کہ بروز عجز دستت گیرم عاجز تر ازین مخواہ کہ اکنون ہستم

گر گوہر طاعت نہ سفتم ہرگز ورگرد رہت ز رخ نرفتم ہرگز
نومید نیم ز بارگاہ کرمت دانی کہ یکے را دو نگفتم ہرگز

یک یک ہنرم بین و گناہ دہ دہ بخش ہر جرم کہ رفت حسبۃً للہ بخش
از باد ہوا، آتش کیں را مفروز ما را بدر خاک رسول اللہ بخش

یارب اگر گناہ بے حد کردم بر جان و جوانی و تن خود کردم
چوں بر کرمت وثوق کلی دارم برگشتم و توبہ کردم و بد کردم

با نفس ہمیشہ در نبردم چکنم وز کردۂ خویش تن بدردم چکنم
گیرم کہ ز من درگذرانی بہ کرم زیں شرم کہ دیدی کہ چہ کردم چکنم

آخرت کے عذاب سے خوف دلا کر مخاطب کو شرم دلاتا ہے۔

از آتش آخرت نمی داری باک وز آب ندامت نہ شدی ہرگز پاک
چوں باد اجل چراغ عمرت بکشد ترسم کہ تراز ننگ نپذیرد خاک

خیام کو یقین کامل ہے کہ اس دنیائے فانی سے ایک نئی دنیا میں جانا اور احکم الحاکمین و علام الغیوب کے سامنے اپنے افعال و کردار کی جواب دہی کرنی ہے، کہتا ہے۔

شرمت نامد ازیں تباہی کردن زیں ترک ادامر و نواہی کردن
گیرم کہ سراسر ایں ملک تو شد جز آں کہ رہا کنی چہ خواہی کردن

سر ہمہ دانائے فلک می داند کو مو بہ مو رگ برگ می داند
گیرم کہ بزرق خلق را بفریبی با او چہ کنی کہ یک بہ یک می داند

شان و شوکت ریاکاری ظاہرداری سے نفرت کرتا اور عاقبت کا یقین کامل رکھتا ہے۔

در راہ چناں رو کہ سلامت نہ کنند با خلق چناں زی کہ قیامت نہ کنند
در مسجد اگر روی چناں رو کہ ترا در پیش نہ خوانند و امامت نہ کنند

قاری سید کلیم اللہ حسینی

اسی طرح بے شمار رباعیات سے عمر خیام کا سچا مومن ہونا ثابت ہوتا ہے۔ اور الحاد و بے دینی کی تردید ہوتی ہے۔

اعترافِ شکست (افسانہ)

منورما پیاری۔ تم غالباً خیریت سے پہونچ گئی ہو گی۔ دیکھو میں اپنے کو اپنے وعدہ کی طرح اچھا ثابت کرنے کے لیے
کس قدر جلد خط لکھ رہی ہوں۔

ہاں تو یہ واقعات میرے دل کے وہ راز ہیں کہ میں باوجود تمھارے اصرار و ناراضی کے تمھارے سامنے بیان کرنے کی ہمت
نہ کر سکی۔ لیکن اب اس وقت نہایت آزادی سے لکھوں گی۔ تم کو بھی حیرت ہو گی کہ کُسم جو میرے سامنے شرم و حیا کی پتلی بنی رہتی تھی
اب کس قدر بیباک و بے شرم ہو گئی ہے۔

ہاں تو میرا بچپن گذرا اور وہ زمانہ آیا جسے شاعروں نے نہ معلوم کیا کیا کہا ہے۔ میں اِن لغویات میں نہیں پڑنا چاہتی
بس مختصراً یوں سمجھو کہ میرے دل میں نہ معلوم کیوں یہ خواہش پیدا ہوئی کہ کوئی مجھے ستائے اور ستاتا جائے۔ میری پتلی کلائیاں
اپنے ہاتھوں سے پکڑے میں چھڑانے کی کوشش کروں وہ نہ چھوڑے مجھے اپنی طرف انہیں مضبوط گرفتوں سے کھینچے...
میں کھنچتی جاؤں...... اور بالآخر اُسی کا جسم ہو کر رہ جاؤں۔

میری بہن کملا کے حالات تم نے کچھ نہ کچھ ضرور سنے ہوں گے۔ تمھاری ضد بھی کیسی ضد ہے منورما کہ اس کو پورا کرنے کے لئے
دو رازوں کا انکشاف کرنا پڑ رہا ہے۔

ایک بار میں نے دیکھا کملا بے حد اُداس اور خاموش رہتی ہیں اور اسی اثنا میں کئی بار دیکھا کہ وہ اکثر روتی بھی ہیں۔ وہ مجھے آتا
دیکھ کر اپنے آنسوؤں کو آنچل سے پوچھتے ہوئے مسکرا کر اپنے سربستہ رازہائے دل کو چھپانے کی ناکام کوشش کرتیں۔ میں بھی ادھر ادھر
کی باتیں کر کے ان کا غم غلط کرنے کی کوشش کرتی آخر مجھ سے کب تک دیکھا جاتا منورما میں نے ڈرتے ڈرتے ہمت کر کے ایک دن کملا سے
پوچھ ہی لیا۔

"کملا تم آج کل اتنی اُداس اور خاموش کیوں رہتی ہو؟" "کچھ نہیں کُسم" انھوں نے مسکراتے ہوئے کہا گویا کہ مجھے دھوکا دینا چاہتی
ہیں "گذشتہ چند دنوں سے کچھ حرارت سی رہتی ہے۔ اور جسم بھی اکثر ٹوٹتا ہے غالباً موسم کی تبدیلی اس کا باعث ہے۔"

"نا کملا" میں نے کہا "میں نہ مانوں گی تم لاکھ ہولا کہ باتیں بناؤ مگر رازِ دل بھی کسی کے چھپانے سے کہیں چھپتا ہے!" "پگلی کہیں کی"
کملا نے کہا "بڑی آئی ہے فلسفی بقراط کی بننے۔ جاؤ دور ہو میرا سر نہ کھا" میں بے حد اصرار کرتی رہی مگر انھوں نے ہنسی میں بات کو ٹال دیا
میں بھلا کب ماننے والی تم جانتی ہو جس بات کے پیچھے پڑتی ہوں۔ بس ہاتھ دھو کر پڑتی ہوں اور جب تک مقصد حاصل نہیں ہوتا پیچھا نہیں چھوڑتی

"مجھے ایک بے مروت سے محبت ہے۔" کملا نے مجبور ہو کر ایک دن کہنا شروع کیا۔ میں خط کی طوالت کے خوف سے جملہ حالات نہیں لکھتی
"کُسم نہیں پہلے مجھ سے بے حد محبت تھی ہم دونوں ایک جان دو قالب تھے وہ گھنٹوں اپنی محبت کا اظہار کرتے........ اس قدر زیادہ
کہ بعض اوقات مجھے اُن کی باتیں بناوٹی معلوم ہونے لگتیں اور اس خیال سے میں کانپ جاتی اور اپنے دل کو سمجھاتی کہ نہیں وہ صرف میرے ہیں
اور میں ان کی........ ہم نے کئی راتیں دریا میں کشتی پر چاندنی کی سیر میں گذاریں...... دنیا میں ایک دل رکھنے والی جوان

عورت کی تمام خواہشات کی تکمیل مجھے بدرجۂ اتم حاصل تھی۔ لیکن کسم" وہ کہتے کہتے رک گئیں......... بعد میں انھوں نے اپنا طرز عمل بدل دیا...... وہ تمام باتیں جاتی رہیں۔ مجھ سے ملتے بھی تو فوراً بہانہ کر کے چلے جاتے......... اور آج کل تو بس نہ پوچھو کہیں ہفتوں میں ان کے درشن ہوتے ہیں......" ان کی آواز بھرا گئی...... "میری زندگی تباہ ہوکر رہ گئی ہے۔ میں بڑی گنہ گار ہوں" آنسو ان کی آنکھوں سے بہنے لگے۔

"پریشان نہ ہو کملا" میں نے بہن کو تسلی دیتے ہوئے کہا" میں تمھارے ساتھ خود چلوں گی اور یہ معلوم کرنے کی کوشش کروں گی کہ ان کی ناراضگی کا آخر سبب کیا ہے"۔ وہ خاموشی سے ایک طرف کو چل دیں۔

چند دنوں بعد میں کملا کے ہمراہ ان کے گھر جارہی تھی۔ "کملا وہ کیسے ہیں" میں نے راستہ میں سوال کیا" بے حد حسین، بے حد خوبصورت، حسن مکمل...... مجسم شرم وحیا...... موسم بہار کی تصویر...... دائمی جوانی کا خواب......" وہ آنکھیں آدھی بند کئے مزے لے کر اور نہ معلوم کیا کہتی رہیں...... "تم دیکھو گی تو مر مٹو گی...... میری رقیب ہو جاؤ گی" کملا نے ہنستے ہوئے مذاقاً کہا۔

تھوڑی دیر بعد ہم دونوں اُن کے کمرہ میں بیٹھے تھے۔ وہ آئے میں نے کنکھیوں سے دیکھا۔ کملا کے بیان سے زیادہ پایا...

انھوں نے کملا سے ہاتھ ملایا پھر مجھ سے وہ دیر تک میرا ہاتھ اپنے ہاتھوں میں لئے رہے اور کچھ مضبوطی کے ساتھ......... میں نے چاہا کہ فوراً ہاتھ چھڑا لوں لیکن نہ معلوم کیوں ایسا نہ کر سکی۔ حالانکہ ایسے شخص کو نہ چاہنے کا میں نے عہد مصمم کر لیا تھا۔ میں شرم کے مارے گردن جھکائے تھی۔ "یہ کون ہیں؟" انھوں نے کملا سے پوچھا۔ "میری چھوٹی بہن کسم۔ نئی روشنی کی پیداوار" وہ ہنسے اور مسکرانے لگے۔ میں نے چاہا کہ اُن کی ہنسی کو نہ دیکھوں۔ کیونکہ کملا نے کہا تھا کہ یہی ہنسی سخت سے سخت دل والی لڑکی کا دل اڑانے کے لئے کافی ہے۔ لیکن نہ معلوم کیوں یہ بھی نہ کر سکی۔ انہیں دیکھتی رہی۔ پہلی مرتبہ میرے دل میں خواہش پیدا ہوئی کہ وہ اور ہنسیں اور میں یونہی دیکھتی جاؤں۔ ان کے گھونگروالے بالوں پر نظر پڑی کملا نے انہیں کی متعلق کہا تھا۔ "ہر خم زلف میں اک اک دل ہے" میں نے نظروں کو ہٹانے کی کوشش کی کہ کہیں میرا دل بھی کسی خم میں الجھ نہ جائے اور اس خیال سے ڈر گئی لیکن نہ معلوم کیوں یہ بھی نہ کر سکی۔

ان کی آنکھوں کو دیکھا معاً خیال آیا کہ میں کہیں اِن بیمار آنکھوں کی بیمار نہ ہو جاؤں اور اس خیال سے خوف زدہ ہو کر نظریں پھیر نی چاہیں لیکن افسوس کہ یہ بھی نہ کر سکی۔

"مجھے ضروری کام سے جانا ہے" انھوں نے کہا اور اٹھ گئے "خدا حافظ" انھوں نے کملا سے ہاتھ ملایا اور پھر مجھ سے۔ میں بے ہوش میں آگئی انھوں نے میری طرف دیکھ کر مسکرا دیا میں سن سی ہو کر رہ گئی۔ رات کو میں اپنے بستر پر لیٹی ان کے خیال میں گم تھی آنکھوں میں بھلا نیند کہاں۔ جس شخص کو پہلے میں نفرت کی نگاہ سے دیکھتی تھی اسی کا رنگین تصور میرے دل کے لئے باعث آرام وسکون تھا۔ "بھلا ایسے شخص کو چاہنے سے کیا فائدہ جسے دنیا چاہے اور وہ کسی کو نہ چاہے"۔ میں اپنی کمزوری پر خود کو ملامت کر رہی تھی۔ "محبت کی توہین میں برداشت نہ کر سکوں گی۔ میں اُن سے ملنے کبھی نہ جاؤں گی نہ دیکھوں گی نہ یاد کروں گی"۔ ... میں نے ٹھان لیا۔

ہفتے، مہینے حسب عادت گذرتے گئے اُن کی یاد سے مجھے چھٹکارا نہیں ملا۔ اکثر جب پریشان ہوتی تو ارادہ کرتی کہ اُن کے قدموں پر گر کر جملہ حالات بیان کردوں اور محبت کی بھیک مانگوں لیکن مجھے نہ جانا تھا نہ گئی اگرچہ کملا نے اپنے ہمراہ چلنے کا

سب رس
اکثر شدت سے اصرار کیا تھا۔ عورت جس بات کو ٹھان لیتی ہے وہ کرکے رہتی ہے۔ اور خاص کر اس وقت جب کہ اس کی توہین کی جانے والی ہو۔

کملا کی اُداسی اور خاموشی کی وہی حالت تھی وہ دُبلی اور زرد پڑ گئی تھیں۔ میں بیشتر اس خیال سے لرز جاتی کہ ایک دن مجھ بھی یہی حال ہونے والا ہے۔

ایک دن شام کو ٹہل کر جب میں گھر پہونچی تو معلوم ہوا کملا صبح کی گئی ہوئی اب تک واپس نہیں آئیں۔ میں سمجھ گئی کہ وہ اُسی در پر ہوں گی آج غالباً ان کی کملا پر نظرِ عنایت ہے۔ بس فوراً ہی ایک غیر معمولی جذبہ کے تحت میں ان کے گھر کی طرف ہوگئی۔ کمرہ میں داخل ہوئی۔ میز پر لیمپ روشن تھا اور "وہ" کرسی پر بیٹھے کچھ لکھ رہے تھے۔ کملا وہاں موجود نہ تھیں میں واپس ہوئی مگر انھوں نے دیکھ لیا۔

"آہا آپ ہیں" انھوں نے کہا "آئیے تشریف رکھئے۔ ع" وہ آئیں گھر میں ہمارے خدا کی قدرت ہے"۔ وہ ... میں نے چاہا کہ بھاگ جاؤں اور پھر ایسا کہ مڑ کر بھی نہ دیکھوں لیکن نہ معلوم کیوں ایسا نہ کرسکی اور قریب ہی ایک صوفے پر بیٹھ گئی۔ وہ بھی میرے سامنے کرسی کھینچ کر بیٹھ گئے۔ "میں کملا کو دیکھنے آئی تھی معاف کیجئے گا آپ کو زحمت ہوئی اجازت دیجئے"۔ "آنے کا بہانہ ضرور چاہیئے"۔ انھوں نے ہنستے ہوئے کہا "جب آپ جانا ہی نہیں چاہتیں تو اجازت کیوں!" انھوں نے سچ کہا تھا۔ دونوں طرف خاموشی تھی۔

"آپ مجھ سے ڈرتی ہیں؟" انھوں نے پھر خاموشی کو توڑا۔

"نہیں" میں نے دبی زبان میں کہا۔

"ایک بات کہوں؟"

"بصد شوق!"

"خفا تو نہ ہوں گی؟

"کیوں نہیں؟" وہ خاموش ہوئے۔

"نہیں میں خفا نہ ہوں گی" میں نے ان کی آزردگی کے خیال سے فوراً کہا۔

"محبت" آپ سے محبت ہے" انھوں نے رُکتے رُکتے کہا۔

"بڑی عزت فرمائی آپ نے"

"آپ مذاق کرتی ہیں" انھوں نے کہا اور میرے دونوں ہاتھوں کو اپنے دونوں ہاتھوں میں لے کر بولے۔

"اگر میں آپ کو اپنی طرف کھینچوں تو"۔۔۔۔۔۔۔ میں خاموش تھی۔

انھوں نے مجھے اپنی طرف کھینچنا شروع کیا۔ میں ڈری جھجکی اور شرمائی بھی۔ ساڑی بھی سینہ سے ڈھلک گئی میں نے گھبرا کر اپنے ہاتھوں کو چھڑانے کی کوشش کی لیکن مجھے معلوم نہ تھا کہ وہ ایک مردانہ گرفت تھی۔ وہ کھینچتے گئے میں کھنچتی گئی ڈرتے ڈرتے۔۔۔۔۔۔۔ رکتے رکتے میں نے خود کو ان کی آغوش میں سونپ دیا۔۔۔۔۔۔۔

جھک رہے تھے .... میں مدہوش ...... اُن کی کمر میں ہاتھ ڈالے تھی چاہتی تھی یونہی اُن کی آغوش میں ہمیشہ ہمیشہ کے لئے پڑی رہوں دنیا کی بہترین لذت سے میں لطف اندوز ہو رہی تھی۔ میرے خواب کا راجہ میرے من کا دیوتا مجھے مل چکا تھا۔

منورما۔ یہ میرے گناہ کی سب سے پہلی اور سب سے زیادہ تاریک رات تھی۔

آدھی رات کو جب میں گھر پہونچی ہوں تو دیکھا کملا اپنے کمرہ میں سو رہی ہیں۔ میں بھی دبے پاؤں کمرہ میں پہونچ کر بستر پر پڑ رہی۔

برسات گئی بھی اور آئی بھی میری محبت روز بروز ترقی پر تھی وہ بھی مجھے بے حد چاہتے تھے۔ میں دنیا میں سب سے زیادہ خوش قسمت لڑکی تھی "مجھے آپ کی محبت پر بھروسہ نہیں ہے" میں اکثر اُن سے کہتی "ہاں آپ ہی تو ایک دنیا میں محبت کرنا جانتی ہیں" وہ پیار سے منہ بنا کر کہتے جیسے کہ میری بات ان کو اچھی نہیں لگی۔ میں خود کو اپنے کہے پر لعنت و ملامت کرنے لگتی۔ میں اُن کو ایک سکنڈ کے لئے بھی آزردہ و پریشان نہ دیکھ سکتی تھی۔ کملا کی باتیں مجھے جھوٹ معلوم ہونے لگیں اور سچ پوچھو تو ان باتوں پر میں نے اپنے دماغ کو غور کرنے کا موقعہ ہی نہیں دیا۔ مجھے اُن سے اندھی محبت تھی۔

"مہارانی" انھوں نے ایک دن کہا "کیا ایسا نہیں ہو سکتا کہ ہم تم بھاگ چلیں اور شادی کرلیں۔ مذاہب کے قیود ہمیں بمبئی میں یکجا نہیں کر سکتے۔

"تو پھر آپ اسے چاہتے ہی کیوں ہیں جو آپ کا ہم مذہب نہیں" میں نے ایک غیر متعلق سوال کیا۔ "اسے تم نہیں سمجھ سکتیں مہارانی۔ اسی میں محبت کی عین نزاکت و خوبصورتی پنہاں ہے .... ہاں تو پھر تم کیا کہتی ہو؟" میں نے رضامندی ظاہر کی اس بات کی تو خود عرصہ سے منتظر تھی۔

تیسرے دن آدھی رات کی ٹرین سے ہم کو خفیہ طور پر فرار ہونا تھا۔ رات کو میں اُن کے گھر گئی کہ دیکھوں کیا تیاریاں ہو رہی ہیں۔ گھر پہونچی تو معلوم ہوا وہ گھر پر نہیں ہیں۔ ملازم نے مجھے ایک خط دیا۔ میں نے ڈرتے ڈرتے چاک کیا۔ یہ اُن کا تھا لکھا تھا۔

"میں آج صبح جہاز سے انگلستان جا رہا ہوں گورنمنٹ مجھے تین سال کے لئے ٹرننگ پر بھیج رہی ہے۔ تم مجھے بھول جاؤ۔ اور میرا خیال ترک کردو۔ میں ایسی لڑکی سے ہرگز محبت نہیں کرسکتا اور نہ ایسی لڑکی مجھ پر کوئی حق رکھتی ہے جو اپنے محبوب کی سچی اور جھوٹی محبت میں تمیز نہ کر سکے .... خدا حافظ ہمیشہ کے لئے ...."

پیروں تلے زمین نکل گئی۔ آسمان گھومنے لگا زمین بھی زوروں پر گھوم رہی تھی۔ میں بھی اسی عالم میں گھومتے گھر کی طرف جا رہی تھی .... کمرہ میں بستر پر گر کر میں بے اختیار رونے لگی .... اور نہ معلوم کب تک روتی رہی — کمرہ میں اندھیرا تھا .... چاروں طرف بلا کا سناٹا تھا۔ غضب خدا کا بمبئی جیسا عظیم الشان شہر "ہندوستان کا دل" خاموشی کی بھیانک گہرائیوں میں غرق تھا۔

میرے کمرے میں گھڑی کی ٹک ٹک بھیانک خاموشی میں اضافہ کر رہی تھی۔ عین اسی وقت کوئی رسیلی مگر دردبھری

آواز میں الاپ رہا تھا ۔ " مت کرو کسی کو پیار"
یہ آواز کملا کی تھی جو اُن کے کمرہ سے آرہی تھی ۔ میں زار زار رُو رہی تھی ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ "

وصی اسد

غزل

پڑ گیا رُخ پہ ترے زلفِ گرہ گیر کا عکس
مجھ کو دھندلا نظر آنے لگا تصویر کا عکس

ہو بصیرت تو مصور بھی ہو تصویر کا عکس
لوحِ تقدیر بنے کاتبِ تقدیر کا عکس

گلشنِ دہر میں جلووں نے جو چاہی کثرت
پتے پتے نے دکھایا تری تنویر کا عکس

مہر سے ماہ سے انجم سے ہویدا ہو کر
ہر طرف چرخ پہ پھیلا تری تصویر کا عکس

میں نشیمن میں اگر آہ و فغاں کرتا ہوں
صورتِ برق نظر آتا ہے تاثیر کا عکس

حسنِ یوسف جسے اربابِ جہاں کہتے ہیں
وہ ہے دھندلا سا فقط آپ کی تصویر کا عکس

آسماں پر نظر آیا جو مجھے رنگِ شفق
کھنچ گیا آنکھوں میں خونِ غمِ شبیر کا عکس

پھول گلشن میں بنا دل میں بنا داغِ فراق
رنگ بدلا کیا کیا کیا تری تصویر کا عکس

چرخ پر قوس قزح بن کے جو چھا جاتا ہے
وہ مرے خون کا یا ہے تری شمشیر کا عکس

لے لیا پھول نے کچھ، مہر نے کچھ، ماہ نے کچھ
بٹ گیا ارض و سماں میں تری تصویر کا عکس

ضعف وہ ہے کہ قدم اُٹھ نہیں سکتے سائلؔ
بڑھ کے زنجیر سے بھی مجھ کو ہے زنجیر کا عکس

عبد الجلیل سائلؔ (بنگلوری)

نجمہ کے خطوط رضیہ کے نام

رضیہ بہن۔ محبت نامہ ملا۔ تمھاری شکایت بجا۔ تمھارا گلہ درست ـــ آکر اتنے دن ہوگئے میں نے خط نہیں لکھا۔ نہیں بھول گئی ہوں! کتنی بھولی ہو رضیہ ـــ سنو۔ دنیا میں ایک دو نہیں کئی چیزیں ہیں جن کو مرتے دم تک نہیں بھلایا جاسکتا۔ بھلانے کی کوشش کرنے پر بھی نہیں۔ اور انھیں میں تمھاری بے لوث محبت اور سچی دوستی ہے ـــ رضیہ۔ لڑکپن کا وہ زرین عہد وہ معصوم شرارتیں وہ مسرت آمیز قہقہے وہ مذاق اور دل لگی وہ چہل اور شوخیاں کہیں آسانی سے بھلائی جاسکتی ہیں ـــ شاید تا دم واپسیں انسان کی آنکھوں کے سامنے یہی مناظر چھت پر رقص کرتے رہتے ہیں جن کو وہ اس وقت تک دیکھتی رہتی ہیں جب تک کہ ایک آخری ہچکی ان کو بینائی سے محروم نہیں کردیتی۔ عورتوں کے لئے شوہر کی محبت کے بعد سہیلیوں کی یاد ہی تنہا تسکین کا ذریعہ ہوتی ہے۔ اور نجمہ جیسی دکھیاری کے لیئے گذرے ہوئے ایام کی یاد کے سوا بتاؤ دنیا میں رہا کیا ہے ـــ میں نے تمھیں اب تک خط نہیں لکھا تو اس میں میرا کیا قصور ہے؟ بک جانے کے بعد مجھے اپنے کس فعل پر اختیار رہا ہے۔ نہ میرے دن میرے دن ہیں نہ میری راتیں میری راتیں۔ خود مجھ پر بھی تو میرا اختیار نہیں رہا ہے۔ نئی نئی لونڈی بنی ہوں۔ مہربان ماں باپ نے سونے اور چاندی کے چند ٹکڑوں کی خیرہ کن چمک سے آنکھیں میچ کر پہلے ہی تو مجھے ایک "تجربہ کار" اور "جہاندیدہ" گاہک کے سپرد کرڈالا ہے نا۔ صبح سے شام تک ان کے عزیز و اقارب کی آمد و رفت رہتی ہے۔ وہ خوش ہیں۔ بہت خوش کہ بھیڑیئے نے نہایت خوبصورت ہرن کا شکار کیا ہے۔ وہ آکر شکار کو دیکھتے اور اس کی تعریف کے گیت گانے لگتے ہیں۔

رضیہ۔ اغیار کی کیا شکایت اپنے بھی تو اندھے بن گئے تھے۔ کچھ کہو تو بے شرمی۔ سوسائٹی کی طرف سے لعنت سماج کی طرف سے پھٹکار۔ چپ رہو تو عمر بھر کا روگ۔ دائمی مصیبت۔ جان لیوا غم۔ ہمیشہ کا درد۔ جو کچھ ہونا تھا ہوچکا۔ جب تک سہہ سکوں گی سہوں گی۔ اور اس کے بعد خاموشی سے اپنی زندگی کی بھینٹ خونی سماج کی قربان گاہ پر چڑھا دوں گی۔

بہن۔ پشاور سے طلعت نے خط لکھا ہے۔ اُسے شاید سلطانہ نے خبر دی ہے۔ اس نے گلہ کیا ہے کہ میں نے اسے بلایا نہیں اسے یاد تک نہیں کیا۔ بتاؤ بلاتی تو کس طرح۔ افکار نے میرے دماغ کو معطل کرڈالا تھا۔ رات کی نیند اور دن کا سکون مجھ پر اس دن سے حرام تھا جس دن سے اپنے ہونے والے مالک مجازی کے حالات مجھے معلوم ہوئے تھے۔ کیا اپنی اس بربادی میں ہاتھ بٹانے کے لئے اُسے بلاتی۔ کیا اسے اس لئے بلاتی کہ آ اور اپنی نجمہ کو زندہ در گور ہوتے ہوئے دیکھ آ اور ہمیشہ ہنسنے والی نجمہ کے نہ تھمنے والے آنسوؤں کو دیکھ۔ آ اور اس کی خاک میں ملتی ہوئی آرزوؤں کا تماشا کر۔ آ۔ اور ایک حسرت و یاس کی تصویر دیکھتی جا ـــ لیکن نوری ـــ اس کی شکایت بھی بجا ہے وہ حالات سے کہاں واقف ہے ـــ مبارک باد دی ہے۔ پوچھتی ہے کیسی گذر رہی ہے۔ شکریہ ادا کرتے ہوئے میں نے بھی لکھ دیا ہے کہ اچھی ہوں۔ بہت آرام سے گذر رہی ہے۔ اچھا کیا نا؟ اس کے سوا اور کیا لکھتی۔ اپنی غم کی کہانی کس کس کو سناتی پھروں گی۔ خواہ مخواہ اپنی پریشانیوں کا حال دوسروں کو سنانے سے آخر فائدہ ہی کیا ہے۔ سوائے

اس کہ کہ خوش دلوں پر کچھ دیر رنج و حسرت کی گھٹائیں چھا جائیں۔ اور ان کے لب سے آہ اور آنکھ سے آنسو نکل آئیں ۔۔۔ اور
اس کہانی سے کسی پر کچھ اثر نہ ہوا تو اس کو سنانے سے حاصل ؟ ۔۔۔ ہر ایک کے سامنے دکھڑا رونے سے اپنی اور والدین کی بدنامی
کے سوا کچھ حاصل نہ ہوگا۔ اپنی بدنامی کا مجھے کچھ ڈر نہیں۔ لیکن میں نہیں چاہتی کہ میرے والدین میری وجہ سے بدنام ہوں۔ اپنے آپ کو
ضبط کرنے کی عادی بنا رہی ہوں۔ اپنے غم کو چھپانے کی کوشش کر رہی ہوں۔ جب بہت جی بھر آتا ہے تو تنہائی میں بیٹھ کر تم کو خط لکھتی
ہوں۔ لکھتی جاتی ہوں اور روتی جاتی ہوں۔ خط کے ختم ہونے تک آنسو روک لیتی ہوں کہ جی ہلکا ہو جاتا ہے۔ آنچل سے آنسو صاف کر کے
مسکراتی ہوئی باہر نکل کر گھر کے کاروبار میں لگ جاتی ہوں ۔۔۔ یونہی دن راتوں میں اور راتیں دنوں میں تبدیل ہو رہی ہیں۔

رضیہ بہن ۔۔۔ کس منہ سے تمہارا شکریہ ادا کروں کہ تم میرے خط کا فوراً جواب دے دیتی ہو۔ ان خطوط کی قدر مجھ سے پوچھو۔
ڈاکیہ کی آواز پر کان کھڑے ہو جاتے ہیں۔ نازو کو بھگاتی ہوں۔ وہ خط لیکر آتی ہے ۔۔۔ دل کی دھڑکن تیز ہو جاتی ہے۔ کڑھتی ہوں
وہ خط لاکر مجھے جلدی کیوں دے نہیں دیتی ۔۔۔ لپک کر آدھے راستہ سے لے لیتی ہوں۔ پڑھتی ہوں ختم ہو جاتا ہے تو افسوس کرتی ہوں
پھر سے پڑھتی ہوں۔ فوراً جواب لکھنے بیٹھ جاتی ہوں۔ جواب لکھ چکتی ہوں تو پھر تمہارے خط کا انتظار کرنے لگتی ہوں ۔۔۔ رضیہ
تمہارے خطوط ہی نجمہ کی دلبستگی کا واحد ذریعہ ہیں۔ دیکھنا جواب دینے میں کبھی دیر نہ لگانا۔

میری زندگی اسی قدیم ڈگر پر چلی جا رہی ہے۔ وہی دن ہیں اور وہی راتیں۔ سنتی تھی کہ زمانہ اپنی حالت ہر وقت بدلتا رہتا
لیکن محسوس یہ کر رہی ہوں کہ گویا زمین گردش کرتے کرتے ایک مقام پر ساکت ہو گئی ہے جہاں سے قیامت تک نہیں ہٹنے کی

بہن۔ تم سے یہ کس نے کہہ دیا کہ وہ مجھے نہیں چاہتے۔ مجھ سے محبت نہیں کرتے۔ نہیں رضیہ وہ تو چاہتے ہیں۔ محبت کرتے ہیں
اتنی کہ مجھے ان پر رحم آنے لگتا ہے اور اپنے آپ پر غصہ۔ سوچتی ہوں کہ ۔۔۔ پروردگار ۔۔۔ وہ مجھے کیوں چاہتے ہیں۔ کیوں مجھ سے
محبت کرتے ہیں۔ کیوں نہیں وہ مجھ سے نفرت کرتے۔ دل ملامت کرتا ہے کہ نجمہ ۔۔۔ وہ تو تجھ پر مرتا ہے اور تو اس سے بھاگتی ہے
اس سے نفرت کرتی ہے۔ اسے ٹھکرا دینا چاہتی ہے ۔۔۔ رضیہ ۔۔۔ جسم میرے قبضہ میں تھا۔ اسی کو انھوں نے خریدا بھی تھا۔ وہ
میں نے ان کے حوالہ کر دیا۔ لیکن قلب و دماغ پر تو میرا کوئی قابو نہیں ۔۔۔ میں انھیں ایک مقدس ہستی تصور کرتی ہوں جس کی پرستش
کی جائے اور جس کے ہر حکم پر سر خم کر دیا جائے ۔۔۔ جس کی تعظیم واجب ہے اور جس کی خدمت فرض ۔۔۔ میں ان کا ادب کر سکتی
ہوں۔ احترام کر سکتی ہوں۔ لونڈی کی طرح ان کی خدمت کر سکتی ہوں۔ رات رات بھر ان کے پاؤں سہلاتی بیٹھ سکتی ہوں۔ ان کے
قدموں کے نیچے کی مٹی کو سرمۂ چشم بنا سکتی ہوں ۔۔۔ لیکن آہ۔ جو میں کر سکتی ہوں وہ چاہتے نہیں اور جو وہ چاہتے ہیں اس
کو نہیں سکتی۔

رضیہ بہن۔ آج خوب سوچتی رہی۔ ارادہ کیا کہ دل پر جبر کروں گی وہ تو روتا ہی رہے گا۔ مگر آنکھوں سے مسکراؤں گی
لبوں پر بناوٹی ہی سہی مسکراہٹ پیدا کروں گی۔ خوش بنوں گی۔ خوش خوش ان کا استقبال کروں گی۔ بچپن میں ہمیشہ ہنسنے اور

...الی ہم کے لیے بتاؤ یہ کچھ مشکل تھا؟ لیکن۔ رضیہ ـــ وہ آئے۔ دل دھڑکنے لگا مسکرانے کی کوشش کرتی ہوئی اٹھی۔ مگر ہونٹ لپک کر
...ماغ میں ایک ہیجان سا برپا ہوگیا۔ جی بھر آیا۔ آنکھیں آبدیدہ ہوگئیں۔ ہزار ضبط کے باوجود دو بوند آنسو آخر گال پر ٹپک ہی پڑے۔
...بھرایا۔ آنچل سے آنسو صاف کئے۔ گردن جھکا کر کھڑی ہوگئی وہ قریب آئے۔ کچھ گھبرا سے گئے۔ پوچھا خیر تو ہے ...دی کیوں ہو
...نے ستایا ہے۔ کچھ کہا ہے۔ تکلیف دی ہے ـــ کیسے بیہودہ سوالات ـــ کتنے پست خیالات ـــ گویا عورتیں کسی کے کچھ
...دینے پر رو پڑتی ہیں ـــ رضیہ ـــ یہ مرد نہ عورت کی فطرت کو سمجھے ہیں اور نہ سمجھ سکتے ہیں۔

ایک قصہ سنو۔ ایک مطرب نے رباب خریدا۔ اور اُس کو خوش خوش گھر لے آیا۔ رات کی خاموشیوں میں جب کائنات چاندنی کی
...ں چادر میں لپٹی ہوئی عروسِ نو کی طرح شرمائی اور لجائی جا رہی تھی۔ اس نے رباب اٹھایا۔ اپنی مشاق انگلیوں سے تاروں کو چھیڑا۔ اس
...ہے کہ فضا کو نغموں سے مالا مال کردے ـــ لیکن۔ اس کے جھُرّی دار مفلوج ہاتھ کی سُستی اور لرزتی ہوئی انگلیاں اپنا کام
...نہ دے سکیں۔ تاروں سے آواز نکلی۔ مگر غمگین ـــ کسی دلِ شکستہ کے لب سے نکلی ہوئی آہ کی طرح ـــ دل خراش ـــ کسی
...نصیب کی ہچکیوں کی آواز کی مانند ـــ چاند اس کو گھورنے لگا اور تارے سرگوشیاں کرنے لگے ـــ مرتعش تاروں کی بے ہنگام
...ایں کچھ دیر فضا میں تیرتی رہیں اور آہستہ آہستہ غائب ہوگئیں۔ فضا پر پھر خاموشی کی حکومت طاری ہوگئی۔ بوڑھا مطرب اپنے
...پس آگیا۔ اس نے رباب پر سونے کے بیل بوٹے بنوائے۔ ان کے بیچ میں ہیرے اور زمرد جڑوائے۔ تاروں پر ملمع کرایا۔ اسے دلہن
...طرح سنوارا اور پھر رات کی خاموشی میں رباب لے کر بیٹھ گیا ـــ لیکن اب بھی ساز کے تمام تار گویا ٹوٹے ہوئے تھے۔ وہ نغمہ پیدا نہ ہوسکا
...جسے مطرب کے خیال میں پیدا ہونا چاہیئے تھا ـــ جھنجھلا کر رباب کو اس نے زمین پر ... پٹکا۔ ٹوٹتے ہوئے تاروں کی
...خراش صداؤں سے فضا کانپ اٹھی ـــ وہ دن ہے اور آج کا دن رباب مکان کے ایک گوشہ میں پڑا اپنی قسمت پر آنسو بہا رہا ہے۔

رضیہ۔ موسم کتنا خوش گوار ہے۔ کالے کالے بادل گھر آئے ہیں۔ ٹھنڈی ٹھنڈی ہوائیں مستانہ وار چل رہی ہیں ـــ درخت اپنے
...ین لباس میں ملبوس، والہانہ انداز سے جھوم رہے ہیں ـــ انار کا درخت پھولوں سے لدا ہوا ہے ـــ گلاب کی کلیاں جوشِ مسرت
...سکرا اٹھی ہیں ـــ آم کے جھنڈ میں کویل اپنی کوکو سے موسم بہار کا استقبال کر رہی ہے ـــ بلبل گل کو اپنی داستان سنا رہی ہے ـــ
...ے پھولوں کے گرد منڈلا رہے ہیں ـــ باغ میں جھولے پڑے ہیں ـــ بچے ہی نہیں میری دونوں چھوٹی نندیں بھی پینگوں کے
...اٹھا رہی ہیں ـــ رضیہ ـــ وہ گا رہی ہیں۔ سنتی ہو۔ وہ گا رہی ہیں ـــ ایک جھولا ڈالا ہیں نے امواکی ڈالی پر ـــ یاد ہوگا
...ں بجا کہ ایک دن ہم بھی اسی طرح آم کی شاخوں پر جھولے ڈال کر جھولتے تھے۔ گاتے تھے، چھیڑتے تھے، بناتے تھے، ہنستے تھے، آنکھ مچولی
...تے تھے ـــ اور حسین تتلیوں کی طرح باغ میں رقص کرتے پھرتے تھے ـــ میری آنکھیں دیکھ رہی ہیں۔ وہی مناظر دیکھ رہی ہیں۔
...صاف عکس۔ جیسے سینما کی مشین سے نکلی ہوئی تصویر کا پردۂ سیمیں پر۔
آج بھی وہاں وہی جمگھٹے ہوں گے۔ اسی طرح جھولے پڑے ہوں گے۔ میری بہنیں آج بھی جھولتے جھولتے ابر کی شرارتوں سے بچنے
...کے سایہ دار درختوں کے نیچے بھاگی ہوئی آکر ہانپتی کانپتی مگر مسکراتی ہوئی کھڑی ہوں گی ـــ کاش میں اڑ کر اسی وقت ان میں مل سکوں۔

مجھے بلاتی ہو ـــــ میں آجاؤں ـــــ مل کر بہت دن ہوگئے۔ اپنی نجمہ کو دیکھنا چاہتی ہو۔ دیوانی ہوئی ہو؟ نجمہ کے کہاں اب اُسے کہاں دیکھو گی۔ کہاں پاؤگی۔ ماتم کرو ـــــ سوگ مناؤ اپنی نجمہ کا۔ وہ عرصہ ہوا مرچکی ـــــ نمائش گھر میں تم نے وہ پرندے دیکھے ہوں گے نا۔ جو پرند نہیں پروں کا ڈھانچ ہیں۔ دیکھو تو اصلی پرند۔ گویا اب اڑا ہی چاہتے ہیں۔ اوپر سے نہایت خوبصورت۔ لیکن اندر سوا کچھ نہیں ہوتا۔ وہی حال تمھاری نجمہ کا ہے۔ یہ جو کچھ دیکھتی ہو۔ خول ہے محض خول۔ ایک بے جان مجسمہ ـــــ ہڈیوں کا ایک ڈھانچہ اوپر تو گوشت اور پوست ہے مگر اندر کچھ بھی نہیں جسے تم نجمہ سمجھ رہی ہو وہ نجمہ نہیں نجمہ کی لاش ہے ـــــ وہ تمھارے پاس آئے تو تم اُسے پہچان بھی نہ سکوگی ـــــ تمھاری نجمہ اس کلی کی مانند تھی جو ہوا کے ذرا سے گدگدا دینے پر ہنس پڑتی ہے ـــــ لیکن اب وہ ایک خزاں رسیدہ پتی کی طرح ہوگئی ہے کہ جو ہوا کے ذرا سے چھیڑ دینے پر درخت کی شاخ سے جدا ہو جاتی ہے۔ تمھاری نجمہ اس ساز کی مانند تھی۔ جس کے ہر تار سے مسرت کے نغمے پھوٹ پڑتے تھے۔ لیکن اب تار ٹوٹ چکے ہیں۔ ان میں تم اب نغمہ نہ پاؤگی۔

بہن۔ میرے خطوط تمھاری پریشانی کا باعث ہوتے ہیں۔ اپنی داستان زندگی سنانے کی دھن میں مجھے آج تک اس کا خیال نہ آسکا۔ پڑھتے پڑھتے آنسو بہہ نکلے ؟ رو پڑیں ؟ نہیں بہن آنسو نہ بہاؤ۔ رو نہیں۔ دوسروں کے لئے اپنی دنیا ... کیوں بگاڑتی ہو۔ خوش رہو۔ اچھی رضیہ۔ ہمیشہ مسرور رہنے کی کوشش کرو۔ ہنسو۔ ہنس لو آج جتنا بھی ہنس سکو۔ کل کا دن خدا جانے کیا لائے۔ مسرت وانبساط کی منور شعاعیں یا رنج وآلام کے گھٹاٹوپ بادل۔ رسالوں میں افسانے پڑھتی ہو۔ نجمہ کی زندگی بھی ایک افسانہ ہے۔ ایک لڑکی تھی۔ ہمیشہ ہنسنے اور ہنس ہنس کر ہنسانے والی۔ جب وہ جوان ہوی تو ماں باپ نے اسے ایک غار میں ڈھکیل دیا۔ وہ اب بھی وہیں پڑی ہے۔ لیکن دنیا نہیں جان سکتی کہ کس حال میں ـــــ کتنا مختصر افسانہ رضیہ بس۔ اس سے زیادہ اسے کوئی اہمیت نہ دو۔ بھول جاؤ نجمہ کو۔ نجمہ کی زندگی کو۔ سمجھو کہ رات کو سونے سے قبل تم نے ایک کہانی سنی تھی جس پر ضروری نہیں کہ دن بھر غور کیا جائے۔ یا تم نے ایک قصہ پڑھ لیا تھا جو ضروری نہیں کہ یاد بھی رکھا جائے ـــــ آہ بہن مجھے کتنی شرمندگی ہے۔ میں کتنی خود غرض ہوں۔ کتنی کم ظرف۔ ذرا سی بات چھپا نہ سکی۔ تھوڑا سا غم برداشت نہ کر سکی۔ سنا سنا کر اوروں کو پریشان کرنے کی کوشش کر رہی ہوں نہیں۔ رضیہ اب اپنی کتاب زندگی کے اوراق کو تمھارے سامنے الٹ الٹ کر تم کو پریشان نہ کروں گی۔

نجمہ

غزل

محمد دلاور خاں مہدوی

سوادِ قلب میں مرے وہ شورش فغاں نہیں
بہار ہی بہار ہے خزاں نہیں خزاں نہیں

بلندیوں میں حسن کی میں اڑ رہا ہوں بے جہت
جمال ہی جمال ہے زمین و آسماں نہیں

دماغ میں، خیال میں، نظر میں گل کدے کھلے
نسیم لطف یار کا گذر کہاں کہاں نہیں

نظر تجھے، جگر مجھے جفا تجھے، رضا مجھے
سرورِ عشق کی قسم گراں نہیں گراں نہیں

غزل مری حمید ہے ترانہ بہارِ وصل
غمِ فراق و ہجر کی فضول داستاں نہیں

سید حمید...

لنگال کی جرائم پیشہ آبادی

لنگال جو نو آبادی اقوام جرائم پیشہ ہونے کی وجہ سے مشہور ہے تعلقہ ناگر کرنول ضلع محبوب نگر میں حیدرآباد سے بہ جانب جنوب ۱۰۲ میل پر امرآباد کے مشہور پہاڑ سے کچھ ہٹا ہوا سطح سمندر سے ۲۶۰ ۱ فٹ بلندی پر ایک چھوٹا سا موضع ہے۔

امرآباد کے پہاڑ کی اونچی چوٹی فرح آباد جس کو گرمائی مقام قرار دینے کی تجویز ہے یہاں سے بہ خط مستقیم کوئی ۱۰-۱۲ میل ہے وہاں تک سیدھا راستہ قابل گزر نہیں اس لئے "لکا پلی" اچم پیٹہ' منانور سے ہوتے ہوئے ۴۶ میل کا فاصلہ یہاں جانے کے لئے طے کرنا پڑتا ہے۔ حیدرآباد سے لنگال تک جڑچرلہ' ناگر کرنول اور تلکاپلی پر سے موسم کی سڑک موٹر رانی کے قابل ہے۔ مگر یہ بارش میں قدرے خراب ہے ناگر کرنول کے بعد دو تین نالے بھی بارش میں تکلیف دہ ہیں۔

آبادی لنگال کی رنگ اندازی سلیقہ سے کی گئی ہے سیدھی سیدھی سڑکیں ان پر دو طرفہ درخت' درختوں کے پیچھے مہتمم سٹلمنٹ' ڈاکٹر عہدہ داران جمعیت کوتوالی کے دفاتر اور رہائش کے مکانات' ٹپہ خانہ' مدرسہ' دارالصنائع' بورڈنگ کی عمارات پختہ اور قرینہ سے ہیں ان مکانوں کے پیچھے یا سڑکوں کے کنارے یہاں کے باشندوں کی جھونپڑیاں بھی ہیں مگر کچھ بے ڈھنگی سی۔

لنگال کے مسافر بنگلہ سے بڑا اچھا منظر ہے میں جب یہاں پہونچا بارش کا موسم ہر کا مہینہ تھا۔ تین طرف سبز پوش پہاڑ' وسیع جوار جوار کے کھیت' درختوں کے جھنڈ تھے چوتھی طرف تھوڑے فاصلہ سے لنگال کی آبادی کا ایک حصہ اور حیدرآباد جانے والی سڑک کا دوسرا سرا تھا۔ رہ رہ کے بارش کی ہلکی سی پھوہار بڑی کیف آور تھی خاموش فضا میں کبھی کسی کسان کا نعرۂ مستانہ کسی پرندے کی موسیقی آمیز آواز پولیس کے پریڈ گرونڈ پر بجنے والے بیانڈ کی گونج طبیعت میں سرور پیدا کرتی تھی۔

۱۲ ماہ مہر ۱۳۴۳ ف کو مسٹر بالکرشن مہتمم سٹلمنٹ نے باوجودیکہ وہ کچھ علیل تھے براہ مہربانی مجھے سٹلمنٹ کی سیر کرادی انہی سے یہ معلومات بھی حاصل ہو سکیں کہ اس نو آبادی کو قایم کرنے میں سرکار کے یہ پیش نظر تھا کہ بدنام اقوام جرائم پیشہ اور بار بار کے سزا یافتہ ہوئے یہاں مع اپنے کنبے کے رکھے جائیں تاکہ ان کی نگرانی کے ساتھ ان کو زراعت یا کسب معاش کے کسی اور کام پر بھی لگایا جائے اوران کی اولاد کی اچھی تربیت کی جائے اس مقصد کے حصول کے لئے اطراف کے ۲۲ مربع میل اس سٹلمنٹ میں شامل کر دیے گئے جس میں چار اور گاؤں بسے ہیں لڑکے اور لڑکیوں کے لئے ابتدائی مدارس اور بورڈنگ قایم کرنے کے علاوہ صنعت کی بھی تھوڑی بہت تعلیم کا انتظام کیا گیا ہے۔ اس رقبہ میں جو کچھ زراعت ہوتی ہے وہ اقوام جرائم پیشہ کرتے ہیں لیکن یہ کوئی مدامی پٹہ دار نہیں ہوتے بلکہ سب عارضی کاشت کار ہیں سرکار انہیں تقاوی بھی دیتی ہے۔ لنگال کی ۱۲۰۰ اور دوسرے مواضع کی ۸۰۰ ، اس طرح کل ۲۰۰۰ کی مردم شماری اس سٹلمنٹ کی ہے اس میں باستثنا ان ملازمین کے جو سٹلمنٹ کے کام کے لئے ہیں باقی سارے کے سارے جرائم پیشہ ہیں ان میں جو نیک رویہ نکل آتے ہیں ان کو سررشتہ پولیس میں ملازمت بھی دی جاتی ہے۔ بعد اطمینان چال وچلن یہاں سے جانے کی اجازت بھی مل جاتی ہے۔

مہتمم سٹلمنٹ جو مہتمم کوتوالی ضلع کے درجہ کے عہدہ دار ہیں اس سارے رقبہ کے مہتمم پولیس' افسر جنگلات' ناظم جمعبندی بعض وقت ناظم عدالت بھی ہیں۔ یہی مدرسہ اور دارالاقامہ کے مہتمم بھی ہیں چنانچہ برضرورت آبادکاران جنگل کی قطع وبریداہی کی اجازت سے

ہوتی ہے اس رقبہ کی جمعبندی بھی کرتے اور محاصل مالگزاری مثل عہدہ داران مال انہی کے ذریعہ وصول ہوتا ہے۔
ہمارے معاینہ کے روز تعطیل تھی۔ اس لئے مدرسے بند تھے مردانہ دارالاقامہ کے لڑکے بھی کہتے ہیں کہ کہیں گئے ہوئے تھے۔ مہتمم صاحب نے
بتایا کہ (۹۰) لڑکیاں اور (۱۲۰) لڑکے اس وقت شریک دارالاقامہ ہیں جن کے خورد و نوش لباس اور تعلیم کے سارے مصارف سرکار برداشت
فرماتی ہے۔ مطبخ بھی ہم نے دیکھا مہتمم صاحب نے کھانے کی جو تفصیل کی اس سے معلوم ہوا کہ ان لڑکوں اور لڑکیوں کو ان کی حیثیت سے
بدرجہا بہتر کھانا ملتا ہے۔
لڑکیاں بالغ ہونے تک بورڈنگ میں رہ سکتی ہیں اس کے بعد وہ اپنے گھر بھیج دی جاتی ہیں۔ مہتمم صاحب نے افسوس سے کہا کہ واپس جانے کے
بعد ہی ان کے گھر کے ماحول میں ان کی اخلاقی حالت گرنے لگتی ہے۔ مہتمم صاحب کو اس کا بھی افسوس تھا کہ بورڈنگ اور مدرسے میں لڑکیاں
ٹائی باندھنا اور کلپ لگانا سیکھ جاتی ہیں اور لڑکے تیل ڈالنے اور ٹیڑھی مانگ نکالنے لگتے ہیں۔ اس کا نتیجہ یہ ہے کہ گھر جا کر نہ تو لڑکے زراعت کے
پُر مشقت کام کی طرف مائل رہتے ہیں نہ لڑکیاں گھاس لانے اور کھیت کے دوسرے کام میں دلچسپی لیتی ہیں۔
دارالصنائع میں قالین، شطرنجی، نوار بافی، بانس کی ٹٹی اور بانس کا فرنیچر بنانا سکھایا جاتا ہے۔ ایک بہتر قالین ابھی تیار ہو رہا تھا
کا کام پر تھا اور ہلکی قسم کی نوار بانس کے تپائیاں کرسی کے کپڑے تیار تھے۔ مہتمم صاحب ہی کہتے تھے کہ کام سیکھنے کے بعد یہ لوگ اس سے
فائدہ نہیں اٹھاتے بازار میں صرف بانس کے ٹٹیاں بنا کے بیچتے ہیں یہاں کے ہفتہ وار بازار میں بس اسی کا خوب بیوپار ہے۔ اس بستی
اور اس کے انتظامات دیکھنے کے بعد سرکار کی فیاضی کا ایک اور نقش دل پر کندہ ہو گیا کہ مہربان حکومت رعایا کے ایسے بدراہ طبقہ کی
کے لئے کیسی شفقت سے متوجہ ہے کس فراخ دلی سے روپیہ خرچ کر رہی ہے وہ مفت تعلیم دیتی ہے۔ کھانا کپڑا دیتی ہے۔ تعداد کی
زراعت اور جنگلات کی آمدنی سے دست کش ہے ایک بڑے عملہ کے بھاری مصارف برداشت کر رہی ہے اور یہ سب اس لئے کہ
یہ بدبخت طبقہ سدھر جائے۔ لیکن اس سے جتنا فائدہ ہونا چاہیئے نہ ہوا اس کے وجوہ و اسباب پر کچھ لکھنا اس مضمون کے مقصد سے
باہر ہے۔

مویدالدین حسن

رازِ الفت

اُن کی الفت کا صلہ ہم پا گئے
اب نہ ملنے کے لئے فرما گئے

بڑھی ان کی وہ مایوسی مری
منتیں کیں لاکھ وہ ٹھکرا گئے

کچھ دلِ مضطر نے پایا تھا سکون
پھر تصور میں وہ میرے آ گئے

دل ہی کیا ہوش و خرد عقل و حواس
سب کے سب جاتے رہے وہ کیا گئے

رازِ الفت رازِ دل رازِ وفا
آنکھوں آنکھوں ہی میں وہ سمجھا گئے

وہ نہ چھوڑیں اپنی خو کیا اس کا غم
ہم بھی اپنی ضد پہ زاہد آ گئے

سجاد علی خاں

غریب کی دنیا

حسرت کی دنیا کس قدر تاریک تھی ۔ کتنی سنسان تھی ایک بے آب و گیاہ ریگستان، ایک ہولناک ویرانہ ۔ اس میں جھونکے بھی آئے تباہ کرنے کے لئے، برباد کرنے کے واسطے، ان موجوں کی طرح جو ساکن سمندر کے سینے کو چیر کر اٹھتی ہیں اور جہاز کو تباہ و برباد کر دیتی ہیں اس کا سفینۂ حیات بھی ڈگمگایا، اس کی کشتی بھی گرفتارِ گرداب ہوی ۔ وہ بیگانہ تاثرات سہی، جذبات سے یکسر خالی سہی پھر بھی وہ انسان تھا، چیخ اٹھا، تڑپ گیا ۔

باپ کے مرنے کے بعد، ماں سے چھوٹنے کے بعد وہ بالکل اکیلا رہ گیا تھا ۔ بہت دن ہوئے، بیس سال بلکہ زیادہ، لیکن اسے اچھی طرح یاد ہے تیسرا واقعہ جو اس کے حافظہ سے کبھی خارج نہیں ہو سکتا وہ پیدائشی مکان کا چھوٹنا ہے جس کی وجہ تنگدستی اور عسرت تھی اس گھر سے انس ہو گیا تھا ۔ اس جگہ سے محبت ہو گئی تھی ۔ اس کی جدائی اس کو بے حد شاق گزری، وہ اس کا کرایہ ادا نہ کر سکا اتنی گنجائش ہی نہ تھی ایک اہلکار، معمولی اہلکار وہ روزانہ گھر سے دفتر جاتا اور دفتر سے گھر آتا اور بس ۔ اس کی عمر کے چالیس سال اسی طرح گزر گئے تھے ۔ اس کی زندگی کا نظام العمل ہی ایسا تھا، مشین کی مقررہ گردش کے مشابہ اس کی بینائی میں فرق آ گیا تھا ۔ اس کی انگلیاں شل ہو گئی تھیں کام کی کثرت نے کمزور کر دیا تھا بعض اوقات کام کی یکسانیت اور ہم آہنگی سے تنگ آ کر خدا سے موت کی دعا کرتا تھا ۔

وہ خوبصورت نہیں تھا لیکن بدوضع بھی نہیں تھا ۔ آج تک اس نے کسی کو چاہا نہ کسی نے اس کو ۔ ایسا خیال ہی اس کے دل میں پیدا نہ ہوا، شادی اس نے اس وجہ سے نہیں کی تھی کہ تنخواہ کفالت نہ کرتی تھی ۔ اس نے اپنی ساری زندگی میں کوئی نمایاں کام نہیں کیا ۔ اس کی زندگی کے دن، ہفتے، سال، موسم سب برابر و یکساں تھے ۔ اس کا سویرے اٹھنا، بستر کے شکن صاف کرنا، ناشتہ، دفتر، دوپہر کا کھانا، سات بجے رات کا کھانا اور پھر سو جانا یہہ تھا حسرت کی زندگی کا کبھی نہ بدلنے والا پروگرام ۔

ایک روز حسرت نے آئینہ دیکھا ۔ اس کی مونچھیں سفید ہو گئی تھیں وہ لڑکھڑایا "میرے معبود" اس نے کہا "زندگی کی چالیس منزلیں طے ہوئیں، اب شام ہو رہی ہے لیکن یہہ طویل عرصۂ حیات بے خوابی کے ان مختصر لمحات کی طرح "بے کیف" گزر گیا جو نیند اچٹ جانے پر کروٹیں بدل بدل کر کاٹے جاتے ہیں" آج یہہ پہلا موقع تھا کہ حسرت کو بے کیفی کا احساس ہوا ۔

۲

حسرت اس روز خلاف معمول ایک گھنٹہ قبل دفتر سے نکلا ۔ دور افق میں ڈوبنے والے سورج کی زرد کرنوں سے اس کی آنکھیں چوندھیا گئیں بہار کی خوشگوار شام تھی، فضا میں تنوع تھا، شام کی ایسی کتنی خوشگوار فضائیں تلخ ہو گئیں، شفق کی ایسی کتنی سرخیاں سیاہی میں بدل گئیں لیکن کوئی توجہ نہ کی تھی لیکن آج، خدا جانے یہہ کس انقلاب کا مقدمہ ہے کہ قدرت کے ان نگارشات نے اس کے قلب سوختہ میں ایک انجذابی کیفیت پیدا کر دی تھی اور شاید یہی وجہ تھی کہ وہ بجائے گھر جانے کے ساحل کی طرف چل دیا ۔

آج وہ صبا رفتار موٹر گاڑیوں سے بھی مرعوب نہیں ہوا جن کے خیرہ کر دینے والے رنگ و روغن سے وہ کبھی مانوس نہیں ہوا تھا ۔

جدید تمدن کے پرستار "مرد" اور ان کے "بہترین نصف" جواب تک اس کے لئے سامان دلچسپی نہ رکھتے تھے بلکہ جن کا وجود ہی اس سمجھ سے باہر تھا آج پہلی مرتبہ اس کے لبوں پر ایک خفیف سا تبسم پیدا کرنے میں کامیاب ہو گئے حتیٰ کہ وہ گنگنایا' دبی گانا جو اس کے ... ایک لڑکی گایا کرتی تھی - اس پر ایک سکر کی سی کیفیت طاری تھی - بعض اوقات سواریاں ٹکراتے ٹکراتے گزر جاتی تھیں ہر سواری میں کسی ... افراد ہوتے تھے اور بعض میں صرف "دو رفیقانِ حیات" ان کا ایک تانتا بندھ گیا - اوپر تاروں بھرا آسمان اور نیچے نرم ریت .... وہ چلا ... کچھ لوگ روشنوں کی آڑ میں بیٹھے ہوئے راز کی باتیں کر رہے تھے اور کچھ کھلی ہوا میں گھاس کے فرش پر ایک دوسرے سے لگے بیٹھے ... کہیں دست در بغل چہل قدمی ہو رہی تھی - کسی کے قریب ان کی خوش آئند مسرتیں تیتریوں کی طرح تھرک رہی تھیں -

۳

آخر اس نے اپنے بیٹھنے کے لئے ایک جگہ انتخاب کر لی - اس عالم رنگ و بو میں' اس ہنگامۂ نظر و نگاہ میں' اس سرزمین ... جو سراسر نظم ہی نظم تھی - وہ بیٹھنے کو تو بیٹھ گیا مگر اس کو اپنے وجود سے انفعال ہو رہا تھا - اس نے نظریں پھیریں مگر اس کے حواس ... اس کے قلب کی دنیا میں ایک انقلاب ہو رہا تھا - وہ ایک طرف لطیف قہقہہ کو سن سکتا تھا تو دوسری طرف قہقہہ لگانے والے کے "قلبی ... شعور پر منکشف ہونے لگے تھے -

دفعتاً اس نے اپنے قریب حریر و اطلس کی رگڑ سنی' اس نے محسوس کیا کہ کوئی اس کے قریب بیٹھا ہے -

"ادھر دیکھو! میری طرف" ایک شیریں آواز فضا میں تیرتی ہوئی اس کے کانوں تک پہونچی وہ جھجک گیا "آؤ" فتنۂ قیامت اس کی طرف سمٹنے لگا "میرے قریب آؤ" "آپ کو غالباً دھوکا ہو رہا ہے" حسرت نے سنبھل کر کہا اور جواب کا انتظار کئے بغیر وہاں سے اٹھ گیا - اس کے قدم بھاری ہو گئے تھے وہ بمشکل چل سکتا تھا - یہ لطیف مخاطبت اس کے لئے ایک حادثۂ عظیم تھا - اس سے غریب حسرت کے جذبات کی بنیادیں ہل گئی تھیں - وہ چند قدم چل کر بیٹھ گیا - بدحواس و پریشان -

دوسرے لمحہ میں ایک اور مصرعۂ موزوں' یعنی حسن نسوانی کا نادر نمونہ اس کے سامنے موجود تھا - اس نے اپنی ساری رعنائیوں کے ساری دلفریبیوں کے ساتھ اس کی طرف دیکھا - حسرت کے خرمن ضبط پر ایک بجلی کوند گئی اس کی وحشت اور بڑھ گئی - وہ ان جراحتوں کا عادی نہ تھا - اسے کچھ سوجھائی نہ دیا - وہ نہیں جانتا تھا کہ کیا کرنا چاہئے - اسے تاب مقاومت نہ رہی اور وہاں سے چلدیا -

۴

وہ منظر جو کچھ دیر پہلے اس کے لئے باعث سرخوشی تھا' سرمایۂ انبساط تھا' سکر و سرور پیدا کر رہا تھا - اس تجربہ کو دیکھئے اب اس کے ملال و اندوہ کا سبب بن گیا - آہ! لمحاتِ مسرت بھی کس قدر مختصر ہوتے ہیں - وہ اپنے تنگ و تاریک کمرے کے ایک گوشے میں پڑا آج کے واقعات اور چالیس سالہ تجربات اس کے دماغ میں چکر لگا رہے تھے - "میں نے بڑی غلطی کی" وہ بے حد پریشان تھا "مجھے وہاں نہ جانا چاہئے تھا - میری مالی حالت اس کی متحمل نہیں ہو سکتی - میں ایسا نہیں کر سکتا - مجھے اکیلے رہنا اور اکیلے مرنا ہے "غریب کی دنیا" اس پر رقت طاری ہو رہی تھی "غریب کی دنیا" امیروں کی دنیا سے مختلف ہے شاید غریب اسی لئے پیدا ہوئے ہیں کہ مصائب و آلام کا شکار بنیں

... نامرادی کا لقمہ ہو جائیں غریب کے پیش نظر بھی اپنی زندگی کا ایک لائحہ عمل ہوتا ہے جس کے حصول کی ناکام کاوشوں میں وہ سرگرم رہتا ہے بعض اوقات وہ اپنی کوششوں میں کامیاب بھی نظر آتا ہے۔ اس کے تھکے ہوئے ہاتھ ساحل مراد کو کئی بار چھو جاتے ہیں اور وہ نکلنا ہی چاہتے ہیں کہ امیران کو دھکے دے کر پھر موجوں کے حوالے کر دیتے۔ غریب موسم گرما کی چلچلاتی دھوپ اپنے جسم میں جذب کر لیتا ہے۔ اینٹ پر اینٹ رکھ کر فلک بوس عمارت کھڑا کر دیتا ہے۔ مگر اپنے رہنے کے لئے نہیں اس کے لئے تو وہی پھوس کا جھونپڑا ہے جس میں دسمبر کی سرد راتیں گزارنے کے لئے ... ایک بوسیدہ رضائی کہ جس کے مختلف رنگ کے پیوند شفق کی رنگا رنگی کے اچھے خاصے نقال ہوتے ہیں کچھ نہیں ہوتا۔ امیر کا ایک نرم جملہ غریب کے لئے لطف و مروت کا دفتر بن جاتا ہے۔ غرباء امراء کے دست کرم کے محتاج ہیں اسی لئے امیر غریب کے خون سے ہولی کھیلتا ہے۔ جونک کی طرح چمٹ کر خون چوستا ہے۔ اپنی نفسانیت کی پرورش کے لئے غریب کو آلۂ کار بنا لیتا ہے۔ اس لئے کہ سرمایہ داری انسانی ذہن سے غور و فکر کا مادہ چوس لیتی ہے۔ وہ غیر حساس ہوتا ہے۔ دوسری طرف غربت و عسرت میں خودداری کا پاس باقی نہیں رہتا مفلسوں اور بیکسوں کی داستان پارینہ کا مجھے اس سے زیادہ علم نہیں۔ ان کی کوئی ایسی تاریخ دیکھنے کا مجھے اتفاق نہیں ہوا لیکن جن حوادث سے میری زندگی دوچار ہوئی ہے وہ بجائے خود ایک داستانِ اندوہ ہے۔ ایک فسانۂ خونین ہے۔

یہ دنیا اور اس کے رسم و رواج میرے لئے اب بھی ایک راز ہے لیکن اتنا ضرور سمجھ میں آتا ہے کہ اس کی کوئی کل ضرور بگڑی ہوی ہے کوئی پرزہ ٹوٹا ہوا ہے ورنہ ایسی بے ترتیبی ایسی ناانصافی، اس درجہ بے رحمانہ ضوابط اتنے بڑے نظام کے سراسر منافی ہیں۔ میں نہیں جانتا کہ "خدا" اور "انسان" ان دونوں میں کون اس کا ذمہ دار ہے۔ اگر نظام عالم کا قرار انھیں بے ضابطگیوں سے عبارت ہے، اگر اس کا اصولِ اساسی ایسی ہی ناانصافیوں پر موقوف و منحصر ہے، اگر یہ استبداد و تشدد کرۂ ارض کی بقا و سلامتی کے لئے جائز اور ضروری ہے تو اس نظام کو درہم برہم کر دو اس کرہ کو کسی ایسے سیارہ سے ٹکرا دو جو اس کو پاش پاش کر دے اور اس کے ذرات خلا میں گم ہو جائیں --- مٹ جائیں۔ اگر ایسا نہیں ہے تو اے پروردگار! پھر ایسا کیوں ہے؟"

اس کی آواز بیٹھ گئی تھی وہ رقت سے لرز رہا تھا۔ اس کا حوصلہ کس قدر بلند ہو گیا تھا۔ اس کی نظر کس درجے بسیط ہو چکی تھی عقل و شعور کی ساری راہیں اس پر کھل چکی تھیں۔

— ۵ —

دوسرے روز صبح کو باغ میں ایک انسانی لاش ملی جو ایک درخت سے لٹک رہی تھی اور جس پر عشق پیچاں کی بیل بھی چڑھی ہوی تھی لوگوں نے کہا "حسرت نے خودکشی کر لی ہے"۔ "وہ دیوانہ تھا" "ہمیشہ کا جنونی" اب بھی باغ میں وہی چہل پہل رہتی ہے۔ مگر عشق پیچاں کی بیل کے قریب کوئی نہیں جاتا۔

محمد عبدالستار فاروقی

شدت کی گرمیوں کا زمانہ تھا۔ نہانے اور تیرنے کے خیال سے ہم نے ایک متوسط وسعت کا حوض خانہ باغ میں بنوا لیا
بعد واپسی ہم نے کپڑے اتارے تیرنے کا لباس (SWIMMING COSTUME) پہن لیا اور دھڑام سے حوض میں کود پڑے۔
وقت تھا وحشت افزا لُو چل رہی تھی حوض کا پانی بھی کچھ نیم گرم سا ہو چکا تھا۔ غرض ابھی کچھ ہاتھ پیر مار ہی رہے تھے کہ نورانی کی
سریلی آواز دوپہر کی گرم فضا میں مرتعش نظر آئی۔ غور سے دالان کی طرف جو نظر ڈالی تو ایک طرف ہمارا کھانا نہایت صفائی کے ساتھ چنا ہوا
رکھا تھا اور دوسری طرف نورانی گنگناتی ہوئی نہایت استغراق کے ساتھ مشین پر کچھ سی رہی تھی۔ بظاہر تو معلوم ہوتا تھا کہ اس کو
کی خبر نہیں۔ لیکن خبر کیسے نہیں ہوتی تیرنے کی وجہ سے پانی کے تھپیڑوں کی صدائے بازگشت شاید کمپونڈ کے باہر بھی سنائی دی ہوگی۔ لیکن
نہیں! آج نورانی کو شان استغنا کی نمائش سوجھی تھی۔ وہ سینے میں مصروف تھی اور ہم نہانے میں۔ گرمی کی جھلسا دینے والی شدت
حوض سے باہر نکلنے نہ دیتی تھی۔ کچھ دیر بعد ہم نے جو پانی سے سر اٹھایا تو نورانی بغل میں پاندان دبائے کسی سوچ میں ڈوبی ہوئی حوض کی
چلی آرہی تھی۔ ہم نے عمداً اپنا رخ دوسری طرف پھیر لیا اور خود کو انجان بنا لیا۔ پاندان کے قریب ہی رکھے جانے کی صدا سے ہم نے اندازہ
کہ شاید آج ہمارے فن پیراکی کی خاطر خواہ داد ملنے والی ہے۔

حوض کا چکر لگاتے ہوئے ہم اس کونے کی طرف آئے جہاں ایک سایہ دار درخت کے نیچے حوض کے بالکل قریب ایک ... نورانی
مع اپنے پاندان کے فروکش تھی۔ ہم نے اس کے چہرے کو غور سے دیکھا جہاں اب بھی سوچ بچار کے آثار ہویدا تھے "کس فکر میں
ہم نے اس کی طرف پانی اچھالتے ہوئے کہا۔ "ارے توبہ! ایسا نہ کیجئے" نورانی نے جھک کر آنچل حائل کر کے خود کو پانی سے بچاتے ہوئے
"میں سوچ رہی تھی کہ یہ آپ نے اپنے نہانے کا وقت کیوں تبدیل کر دیا۔ شاید آپ روزانہ چار پانچ بجے نہایا کرتے تھے۔" "ہاں نورانی"
ہم نے کہا "آج گرمی ناقابل برداشت ہے پانی میں اتر پڑنے کے سوا کوئی چارہ نہ تھا" یہ کہتے ہوئے ہم نے اپنے فن کا مظاہرہ
حوض کا چکر لگاتے ہوئے کبھی کبھی نورانی کی طرف پانی اچھال دیتے اور وہ ایک دلفریب مسکراہٹ کے ساتھ آنچل کی آڑ میں خود کو بچا لیتی
"آپ کتنے زمانے سے تیرتے ہیں؟" دفعتاً نورانی نے سروتے سے سپاری کترتے ہوئے پوچھا "سیکھنے میں کیا آپ کو دشواریاں اٹھانی پڑیں"
"دو تین سال قبل سیکھا ہے" ہم نے اس کے بھیگے ہوئے آنچل کو غور سے دیکھتے ہوئے کہا "ہاں ابتدا میں کچھ دشواریاں ضرور
ہوتی ہیں احتیاط کی ضرورت ہے ورنہ نتیجہ ڈوبنے کے سوا اور کیا ہو سکتا ہے۔" "اچھا یہ سنئے!" نورانی نے پانی کی ان ننھی ننھی موجوں
کی طرف دیکھتے ہوئے کہا جو اس کے خوبصورت پاؤں کے قریب حوض کے کنارے پر سر پٹک رہی تھیں۔ "انسان کے سوا اگر کسی ذی
کو پانی میں پھینک دیا جائے تو کیا وہ ڈوب جائے گا؟" "ذی روح سے تیری کیا مراد ہے؟" ہم نے اس کے چہرے کو غور سے دیکھتے ہوئے کہا
نورانی کے چہرے سے ظاہر ہوتا تھا کہ وہ کسی منطق پر آمادہ ہے اس کی پُر از تفکر آنکھیں پتہ دے رہی تھیں کہ وہ کسی خاص

ہمارے ساتھ خیال آرائی کرنا چاہتی ہے۔

"یہی حیوانات، چرند، پرند، بلی، کتا، گھوڑا، مرغ وغیرہ" نورانی نے پان چباتے ہوئے کہا "اگر انھیں پانی میں پھینک دیا جائے تو؟"
"تیر کر باہر نکل آئیں گے" ہم نے کہا "صاف بات ہے" "گویا اس کا مطلب یہہ ہوا" نورانی نے اپنے دماغ پر زور ڈالتے ہوئے کہا "ہر ذی روح سوا انسان کے پانی میں گرنے کے بعد فطرت سے مجبور ہو کر خود بخود تیرنے لگتا ہے اور جان بچا لیتا ہے" "ہاں ہاں!" ہم نے پرزور لہجہ سے کہا "تو پھر یہہ انسان کیوں ڈوب مرتا ہے؟" نورانی نے اپنی نظروں کو ہم پر جماتے ہوئے کہا۔ "اشرف المخلوقات ہونے کی حیثیت سے اور دوسری ذی روح مخلوقات پر فضیلت رکھتے ہوئے انسان کو ہر طرح حق حاصل تھا کہ پانی میں گرتے ہی فطرتاً تیرنے لگے اور جان بچالے۔ سیکھنے سکھانے کی حاجت نہ ہو جس طرح دوسری ذی روح مخلوقات بغیر سیکھنے کے تیرنے لگ جاتی ہیں"۔

نورانی میں فکر و تجسس کا غیر معمولی مادہ تھا۔ ہر معمولی بات میں وہ کوئی نہ کوئی پہلو ایسا تراش لیتی تھی کہ ہمیں ذرا سوچ کر ہی جواب دینا پڑتا تھا۔ ورنہ وہ اپنی تائید میں سیکڑوں موزوں دلائل پیش کیا کرتی تھی۔ اس کی بحث اور استدلال میں خاص رنگ ہوتا تھا۔ اس کا سوال تھا کہ ہر ذی روح خواہ چرند ہو کہ پرند، چھوٹا ہو کہ بڑا پانی میں گرنے کے بعد خود بخود تیرنے لگتا ہے اور جان بچا لیتا ہے لیکن کیوں انسان پانی میں گرتے ہی ڈوب جاتا ہے عمداً اس کے سوال کی پروانہ کرتے ہوئے ہم نے حوض کا چکر لگانا شروع کردیا لیکن نورانی کے قریب پہونچنے تک ہم نے اپنے تخیل اور فہم پر کافی زور ڈال لیا کہ آخر اس انوکھے سوال کا کیا جواب دیا جائے۔

"تجھے سوجھی تو بہت دور کی نورانی!" ہم نے اس کے خیال کی پرواز پر غور کرتے ہوئے کہا "یہہ تو تجھے معلوم ہے کہ محض عقل رکھنے کی وجہ سے انسان کو دوسری ذی روح مخلوقات پر فوقیت حاصل ہے حالانکہ یہہ بھی انہی مخلوقات کی طرح گوشت و خون کا مجموعہ ہے لیکن اس میں کسی شئے کے نفع و نقصان کے سمجھنے کی قابلیت ہے۔ پانی میں گرنے کے بعد ایک جانور یہہ نہیں سمجھ سکتا کہ پانی میں اُسے ڈبو دینے کی خاصیت موجود ہے اس لئے اس کے حواس قائم رہتے ہیں اور وہ تیر کر نکل جاتا ہے لیکن انسان سمجھ جاتا ہے کہ وہ پانی میں گرنے کے بعد زندہ نہیں رہ سکتا اور اسی فہم و ادراک کی وجہ سے اس کے حواس بگڑ جاتے ہیں اور وہ سراسیمہ ہو کر ڈوب جاتا ہے"۔ "واہ کیا خوب!" نورانی نے سائیں سائیں کرنے والی گرم لو کو محسوس کرتے ہوئے کہا "کیا عقل و ادراک سے یہی فائدہ ہے کہ انسان اپنی عزیز جان دے بیٹھے۔ کیوں قدرت نے انسان کی فطرت میں بھی ایسی صلاحیت نہیں رکھی کہ پانی میں گرتے ہی خود بخود فطرتاً بغیر سیکھے سکھلانے کے ہر ذی روح کی طرح تیرتا ہوا باہر نکل آتا اور اس کی جان بچ جاتی۔ پھر کیوں اور دوسری باتوں میں انسان فطرتاً اپنی حفاظت کرتا ہے مثلاً اگر آنکھ میں دفعتاً کسی چیز کے چبھو دینے کی کوشش کی جائے تو انسان خود بخود اپنی آنکھ بند کرلے گا یا تیزی سے اپنا چہرہ ہٹا لے گا کہ آنکھ کا تحفظ ہو جائے اسی طرح اگر انسان کے سر پر زور سے لٹھ مارنے کی کوشش کی جائے تو وہ وار کو فوراً اپنے ہاتھوں پر لے لگا اور سر کو بچائے گا کہ اگر سر پر زد پڑ جائے تو اس کی جان چلی جائے گی۔ ہاتھ پر مار پڑنے سے جان کے چلے جانے کا خطرہ نہیں ہوتا۔ اسی طرح کیوں نہیں انسان کی فطرت میں بھی ایسی صلاحیت، ودیعت کی گئی کہ پانی میں گرتے ہی بغیر کسی خوف اور دہشت کے اور بغیر حواس کو کھوئے ہوئے خود بخود تیرنے لگتا اور اسے جان بچانے کا موقع ملتا۔ ایسی کتنی عزیز جانیں جا چکی ہوں گی اور آئندہ جائیں گی۔ ہاں یہہ اور بات تھی کہ

پانی میں گرتے ہی دو تین غوطوں کے بعد انسان سنبھل جاتا اور تیرنے لگتا یعنے دو تین غوطوں کے بعد فطرتاً اس کے گم گشتہ حواس قائم ہو جاتے
اور پھر وہ تیر کر جان بچانے کے قابل ہو سکتا۔ لیکن ایسا ہی نہیں ہوتا عام طور پر اس کو تیسرے غوطے کے بعد ڈوب کر جان جیسی عزیز شے
سے ہاتھ دھونا پڑتا ہے۔ چیونٹی سے لے کر ہاتھی تک، ہر حیوان کو تیر کر جان بچانے کا حق فطرتاً حاصل ہے لیکن اشرف المخلوقات کو
بغیر تیرنا سیکھے ہوئے پانی میں گرنے کے بعد جان بچانے کا حق نہیں۔ بیسیوں جانیں ڈوب کر تلف ہو جاتی ہیں کیونکہ مرنے والا تیرنا
جانتا نہ تھا"

بیٹھے بٹھائے نورانی نے ایک عجیب بحث چھیڑ دی۔ ایمان کی تو یہہ ہے کہ ہم اپنا تیرنا ویرنا سب بھول گئے اور دماغ پر زور ڈالنے لگے
کہ آخر اس کا کیا جواب دیا جائے۔ واقعی ہر ذی روح پانی میں گرنے کے بعد سراسیمہ تو ہو جاتا ہے لیکن جب تک اس کی طاقت قائم رہتی ہے
سطح آب پر تیرتا ہی رہتا ہے فوراً نہ غوطہ کھانے لگتا ہے اور نہ ڈوب جاتا ہے لیکن انسان بغیر سیکھے ہوئے تیر نہیں سکتا اور فوراً ڈوب کر جان
دے دیتا ہے۔ اسی سوچ میں تیرتے ہوئے حوض کے کنارے ہم نورانی کے بالکل قریب پہونچ گئے۔ "بات یہہ ہے" ہم نے اسے سمجھاتے ہوئے
کہا" اگر یہہ کہا جائے کہ ایک شخص کو تیرنا آتا ہے یا اس نے تیرنا سیکھا ہے تو اس کے معنے یہہ ہوئے کہ اب اس کے دل میں پانی کا یا پانی
میں ڈوب مرنے کا خوف باقی نہیں رہا اور وہ بے کھٹکے ہاتھ پیر مارنے اور تیرنے لگتا ہے۔ لیکن تیرنا سیکھنے سے قبل، اس سے پہلے جیسا کہ
میں نے کہا ہے، انسان چونکہ صاحب عقل ہے احساس واقع ہوا ہے۔ اور اچھے برے کو پہچاننے کی صلاحیت رکھتا ہے اسے معلوم ہے کہ
گہرے پانی میں گرنا موت کا پیام ہے اس لئے ہوش وحواس کھو بیٹھتا ہے اور ڈوب جاتا ہے"

"آپ نے کوئی نیا استدلال نہیں کیا!" نورانی نے ان خشک کھڑکھڑاتے ہوئے پتوں کی طرف دیکھتے ہوئے کہا جو گرم لو کے جھونکوں سے
اس کے اطراف اور حوض میں درختوں کے جھنڈوں سے گر رہے تھے۔ "میں کہتی ہوں کہ پانی میں گرنے کے بعد کیوں انسان کو ہوش وحواس
کھونا چاہئے یا اگر بالفرض ہوش ٹھکانے بھی نہ رہیں تو کم از کم سطح آب پر جب تک اس کی قوت قائم رہے وہ تیرتا رہتا جس طرح دوسری
ذی روح مخلوقات تیرتی رہتی ہیں جس طرح ہوش وحواس کھوئے ہوئے یا نہ کھوئے ہوئے انسان لٹھ کے وار کو خود بخود اپنے ہاتھوں پر
لے لیتا ہے یا اگر اس کو زور سے ڈھکیل دیا جائے تو وہ ہاتھوں کے بل گرنے کی کوشش کرتا ہے اور باوجود سراسیمگی خود بخود اس کے ہاتھ زمین
تک جاتے ہیں کہ کہیں سر کو صدمہ نہ پہونچ جائے۔ یا اگر کہیں خطرہ پاتا ہے تو فطرتاً اس کی معمولی چال تیز رفتاری یا دوڑ سے بدل جاتی ہے
اگرچہ اس کے حواس پران رہتے ہیں۔ بہر حال کسی نہ کسی طرح فطرتاً وہ جان بچانے کی کوشش کرتا اور جان بچا لیتا ہے۔ لیکن کیوں پانی میں
گرنے کے بعد وہ خود بخود ہاتھ پیر نہیں مارتا اور سطح آب پر نہیں تیر سکتا۔ ہاں اس وقت میں انسان کی بے بسی کو مانتی جب دوسری
تمام ذی روح مخلوقات بھی پانی میں گرنے کے بعد انسان کی طرح فطرتاً ڈوب جاتیں اور تیرنے نہ لگتیں حیوان تو اپنی جان بچا لے
اور اشرف المخلوقات باوجود عقل وادراک، احساس اور پہچان کے ہوش حواس کھو دے اور بے بسی کی حالت میں اپنی عزیز جان دے دے
آخر ایسا کیوں؟

نورانی استدلال پر استدلال کر رہی تھی اور جہاں تک ہم سے ممکن تھا ہم نے تشفی بخش جواب دینے کی کوشش کی لیکن واقعتاً اس کے

دلائل کچھ ایسے تھے کہ ہم سوچ میں پڑ گئے۔ اب دن ڈھلنے لگا تھا۔ حوض سے باہر آکر ہم نے تولیے سے اپنا جسم خشک کرتے ہوئے اسے یقین دلایا کہ اس سے متعلق ہم اسے پھر سمجھا دیں گے کیونکہ بھوک شدت سے لگ رہی تھی۔ ہم برآمدہ میں آئے نورانی بھی پاندان بغل میں دبائے اپنی بھولی بھالی صورت پر وہی غور و فکر کے آثار لئے ہوئے ہمارے پیچھے پیچھے برآمدہ میں آئی۔ ہم کھانے میں مصروف ہوگئے اور وہ مشق پر کچھ سینے میں مشغول ہوئی۔

اب ہم پریشان ہیں کہ اس کو کیا سمجھائیں اور کس طرح سمجھائیں۔ اس کو جب سوجھتی ہے نئی سوجھتی ہے۔ انسان کو پانی میں گرتے ہی دوسری ذی روح مخلوقات کی طرح خود بخود فطرتاً بغیر سیکھے ہوئے تیرنے لگ جانا اور بچا لینا چاہئے تھا۔ یہہ تھا نورانی کا نظریہ اور استدلال بھی معقول۔ اب شاید علم نفسیات اور منطق کے گہرے مطالعہ کے بعد ہم نورانی کو تشفی بخش جواب دے سکیں۔

فخر الدین احمد سعید

دردِ قوم

کیا عشق کا ٹھکانا دنیا ہے خود ہی فانی ! | باتیں یہہ سن رہا ہوں میں حسن کی زبانی
بڑھتی ہوئی تمنا اٹھتی ہوئی جوانی | کتنی سرور افزا ہے عشق کی کہانی
کیا پوچھتے ہو مجھ سے بھولی ہوئی کہانی | آنکھیں کھلی تو دیکھا اک خواب تھی جوانی
پیکانِ غم نے دل کا یہہ حال کردیا ہے | آنکھوں سے اشک کیسا ہے خون کی روانی
ہر بات سے ہوں خوش میں ہر حال میں ہوں راضی | ان کی عنایتیں ہیں ان کی ہی مہربانی
صبر و سکون کا میں نے بھی عہد کرلیا ہے | دل کھول کر ستالے اے کاوشِ نہانی
مدت سے ہوں پریشاں برباد ہو رہا ہوں | باقی نہیں ہے مجھ میں احساسِ شادمانی
ہے مد و جزرِ دریا ہے زندگی کا پہلو | ہے عارضی یہہ غم بھی یہہ عیش بھی ہے فانی

تشہیرِ مدعا سے کچھ فائدہ نہ ہوگا
اے قوم دل ہی میں رکھ یہہ رازِ نہانی

قوم جعفری مچھلی شہری (شملہ)

میں بڑا غائب دماغ واقع ہوا ہوں اور جب سے سنا ہے کہ "غائب دماغی" بڑے آدمیوں کی خصوصیت ہے تو لب اوقات عمداً غائب دماغی کا اظہار کرتا ہوں۔ مثلاً اگر کوئی دوست مجھ سے پوچھے کہ کہئے کل آپ بھی سینما تشریف لائے تھے کیسی لیسند آ تو میں سوچ کر ذرا شان سے کہتا ہوں کہ "نہیں تو۔ میں تو کل سینما نہیں گیا تھا"؟ بہر حال کچھ تو تصنع اور کچھ حقیقت نے مجھے سچ مچ غائب دماغ بنا دیا ہے۔

ہماری اس غائب دماغی نے لبا اوقات کچھ ایسے چرکے دئیے ہیں اور ایسی کوفت اور ندامت کا سامنا پڑا کہ اب یاد کر کے روحانی تکلیف ہوتی ہے۔ چونکہ میں جانتا ہوں کہ ایک کی تکلیف اور کوفت اکثر دوسروں کے لئے باعث دلچسپی ہی ہوتی ہے ایک دلچسپ قصہ سناتا ہوں جس سے آپ اندازہ لگا سکتے ہیں میری غائب دماغی نے مجھے کتنا شرمندہ اور پشیمان کیا۔

کالج سے تھک کر واپس ہوا تھا۔ آرام کرسی پر دراز سگریٹ کے لانبے لانبے کش لگاتا ہوا اپنی تھکان کو دور کرنے کی کوشش کر رہا تھا کہ ڈاکیہ نے "خط لے جاؤ" کی صدا لگائی خط وکتابت میرا ایک دلچسپ مشغلہ ہے۔ میں بھی بڑے شوق سے خطوط لکھتا اور دوسروں کے خطوط بھی بڑی دلچسپی سے پڑھتا ہوں چنانچہ ڈاکیہ کی آواز سن کر ایک جوش اور مسرت سے پاس دوڑا خط میرے نام کا تھا۔ بڑے اشتیاق سے میں نے لفافہ چاک کیا۔ خط کو بجنسہٖ ذیل میں نقل کرتا ہوں :-

سلمہ!

تمہارا خط یا افسانۂ محبت وصول ہوا سخت متعجب ہوں کہ لفافہ پر پتہ میرے نام کا اور ملفوف میں خطاب کسی اور سے اور وہ بھی کسی صنفِ نازک سے، سمجھ میں نہیں آیا کہ ماجرا کیا ہے۔ ممکن ہے کہ یا تو لفافے بدل گئے ہیں یا عمداً تم نے مجھے اس دھوکہ میں رکھنے کی کوشش کی ہے کہ اس طرح میں تمہاری طرز نگارش، انشاء پردازی اور افسانہ نگاری سے واقف ہو جاؤں، تو تم نے یہ طریقہ نہایت ہی نامناسب اختیار کیا۔ اپنی معاشقانہ زندگی کے پیرائے میں اپنے بزرگوں کے سامنے (ممکن ہے تم بزرگ نہ سمجھو) اس کا اظہار بے حیائی نہیں تو اور کیا ہے۔ اور اگر سہواً ملفوف بدل گیا ہے تو اس سے تمہارے کیرکٹر، افتادِ طبیعت اور مشاغلِ زندگی پر کافی روشنی پڑ سکتی ہے اور تمہارے ماحول کا آسانی سے اندازہ لگایا جا سکتا ہے۔

برخوردار!

تمہاری عمر کا ہرگز یہ اقتضا نہیں، ابھی تو تم بچے ہو۔ تمہاری عمر ہی کیا ہے اور پھر طالب علم بھی۔ یہ صرف تمہارا برا ماحول ہے جس نے تمھیں غلط راستے پر ڈال دیا۔ ع "کیں رہ کہ تو می روی بہ ترکستان است"

تمہاری زندگی میں اگر ابھی سے رومانیت پیدا ہوجائے تو پھر تمہارا انجام معلوم تمہارا یہہ زمانہ حصول علم کا ہے نہ کہ عشق و عاشقی کا ۔ دنیا کا تجربہ ہے کہ وہ طلباء جو حصول علم کے ساتھ ساتھ محبت کا سبق بھی سیکھ جاتے ہیں کبھی پروان نہیں چڑھتے ۔ وہ ایسے ڈوبتے ہیں کہ پھر کبھی عمر بھر نہیں ابھر سکتے ۔ چڑھا بھوت عشق و جوانی کا سر پہ تو پھر گھاٹ کے آپ ہیں اور نہ گھر کے بس اس کے سوا اور کیا کر سکتا ہوں کہ تمہارے حق میں دعا کروں کہ خدا تمہارے دل و دماغ پر تمہارے جذبات پر اور تمہارے خیالات پر رحم کرے ۔"

خیر اندیش

یہہ خط میرے چچا نے لکھا تھا ۔ خط کیا تھا عنایت نامہ تھا ۔ بار بار پڑھا لیکن کچھ سمجھ میں نہ آیا کہ آخر معاملہ کیا ہے خط دیکھ کر جتنی کوفت تکلیف اور روحانی صدمہ ہوا اس کا اظہار ناممکن ہے ۔ دماغ پر بہت زور ڈالا کہ آخر میرا وہ کونسا خط ہوگا جو غلطی سے چچا صاحب کے پاس پہنچ گیا ۔ اور اس میں ایسی کیا زوردار عاشقی ہوگی جس نے چچا کو اتنا مشتعل کر دیا ۔ بہت سوچا لیکن کچھ یاد نہیں آیا ۔ ہاں اتنا ضرور یاد تھا کہ ان آٹھ روز کے دوران میں نے سعیدہ، رقیہ، زہرہ اور ریحانہ کے نام خطوط لکھے تھے نیز ایک خط چچا صاحب کو بھی لکھا تھا لیکن یہہ کسی طرح یاد نہیں پڑتا تھا کہ چچا صاحب کے خط کے ساتھ میں نے اور کس کو خط لکھا تھا ۔

اس غیر متوقع اور ناگہانی آفت نے مجھے عجیب مصیبت میں مبتلا کر دیا ۔ دل ہی دل میں کوفت اٹھاتا رہا اور اپنے آپ کو ملامت کرتا رہا کہ ایسی بھی "غائب دماغی" کا ہے کی کہ ایک کا خط دوسرے کو بھیج دیا اور پھر وہ بھی ایک صنف نازک کا خط کسی سے نہیں تو چچا کے خط سے ہی بدل جائے ۔ رہ رہ کر چچا صاحب پر بھی غصہ آرہا تھا کہ آخر میں نے ایسا کون جرم کیا تھا جو اتنا سخت اور تکلیف دہ خط لکھا گیا اگر بالفرض و محال میں نے خط میں عشق و عاشقی کا بھی اظہار کیا تھا تو اسے درگذر کر دینا چاہئے تھا ۔ میں نے ایسا کونسا جرم کیا تھا جو اس قدر برگشتہ خاطر ہوگئے ۔ بزرگانہ شان تو اسی میں تھی کہ میرا خط مجھے واپس کر دیتے کہ سہواً تم نے کسی اور کا خط مجھے بھیج دیا ہے ۔ میری عمر، میرے جذبات اور احساسات کا خیال کرنا تھا ۔ جوانی میں عشق و عاشقی پر تو ہر ایک کی طبیعت مائل رہتی ہے ایک تو عمر کا تقاضا دوسرے فیشن ۔

فرماتے ہیں کہ "سخت متعجب ہوں کہ لفافہ پر پتہ تو میرے نام کا اور ملفوف میں خطاب کسی اور سے ۔ اور وہ بھی کسی صنف نازک سے" اس سے مجھے اور بھی پریشانی ہوئی کہ آخر وہ کون صنف نازک ہیں جن کے نام کا خط قبلہ کو پہنچ گیا ؟ میں نے تو چار پانچ صنف نازک کو خط لکھے تھے کم از کم اس صنف نازک کا .... نام بھی لکھ دیتے کہ مجھے ایک اور پریشانی سے نجات ملتی

خط کو میں بار بار مسلسل پڑھے جا رہا تھا ۔ بعض ایسے تیز اور چبھتے ہوئے جملے استعمال ہوئے ہیں جن کو پڑھ کر روحانی کوفت ہو رہی تھی ۔ لکھتے ہیں کہ "ممکن ہے یا تو لفافے بدل گئے ہیں یا عمداً تم نے مجھے اس دھوکہ میں رکھنے کی کوشش کی ہے کہ اس طرح سے میں تمہاری طرز نگارش، انشاء پردازی اور افسانہ نگاری سے واقف ہوجاؤں تو تم نے یہہ طریقہ نہایت ہی نامناسب اختیار کیا" لکھتے ہیں تو کانپ گیا ۔ یہہ بھی خوب رہی ۔ آخر یہہ طریقہ اختیار ہی کس نے کیا تھا جسے آپ نامناسب سمجھ رہے ہیں ۔ ؟ اب رہا انشاء پردازی اور افسانہ نگاری کا سوال حیرت ہے ! چچا صاحب سمجھتے ہیں کہ انشاء پردازی صرف عشق و عاشقی کے اظہار اور

وہ بھی ایک بے قصور لڑکی سے اپنے پرائیوٹ تعلقات کے انکشاف ہی کے ذریعے کی جا سکتی ہے حقیقت میں یہہ طریقہ سراسر نامناسب
لیکن جب میرا منشاء ہرگز ایسا نہیں تھا اور سہواً لفافے بدل گئے تھے تو اب مناسب اور نامناسب کا سوال ہی
یا اللہ میں اس گتھی کو کیسے سلجھاؤں اور کس طرح صاف کروں۔؟ دنیا جانتی ہے کہ شہر کے مشہور اخبارات و رسائل
بہترین افسانے اور شاندار ادبی، تاریخی، سیاسی، معاشی اور معاشرتی مضامین شایع ہوتے رہتے ہیں اور آپ بھی
ان کو ملاحظہ فرماتے ہی ہوں گے۔ میں نہیں سمجھتا کہ میری انشا پردازی کے اظہار میں کوئی ایسی کسر باقی رہ گئی تھی
اظہار خط کے ذریعے سے اور وہ بھی دھوکے سے کئے بغیر چارہ نہ تھا۔ اور پھر میں آپ کو انشا پردازی کا زور دکھلانا بھی
خدانخواستہ مجھے آپ سے انعام و اکرام تو لینا نہیں تھا؟

آگے ایک اور چوٹ کہ "ممکن ہے تم بزرگ نہ سمجھو" ماشاء اللہ آپ کو بزرگ سمجھنے سے کس کو انکار ہے؟
میرے صرف ایک خط سے میرے کیرکٹر، افتادِ طبیعت اور مشاغل زندگی کا بھی اندازہ لگا لیا؟ گویا ہمارے
پر مٹی پڑ گئی۔ حالانکہ میں یونیورسٹی کا ایک بہترین طالب علم سمجھا جاتا ہوں میں نے اپنی تعلیمی زندگی میں ایک سال بھی
ضایع نہیں کیا۔ اور ہر سال امتیازی کامیابی حاصل کرتا رہا۔ پھر میرے علمی و ادبی خدمات کو بھی کم از کم میرا ملک تو
نہیں کر سکتا۔ یہہ کہاں کا انصاف ہے کہ میری ایک معمولی لغزش سے مجھ پر اتنا بڑا اعتاب نازل کیا گیا۔ پھر میرے ماحول پر
بھی حملہ کیا گیا ہے حالانکہ میں نہایت ہی سوشیل اور شریف آدمی ہوں۔ بہتر سے بہتر سوسائٹی میں اٹھتا بیٹھتا ہوں
کافی سے زیادہ ہر دلعزیز بھی ہوں۔ پھر محبت تو ایک فطرتی چیز ہے پھر اسے ماحول سے کیا تعلق یہہ کوئی ضروری نہیں
کہ کوئی شخص عاشقوں میں اٹھتا بیٹھتا ہو تو خود بھی خواہ مخواہ عاشق بن جائے۔؟ اور آگے چلئے۔ کہتے ہیں کہ
تمہاری عمر کا ہرگز یہہ اقتضا نہیں" حالانکہ یہی تو عمر ہوتی ہے عشق و عاشقی کی۔ جوانی اور ہنگاموں سے خالی۔؟
زندگی ہے۔؟ قبلہ چچا صاحب یہہ چاہتے ہوں کہ مجھے اگر عشق کرنا ہی ہو تو بوڑھا ہو کر کروں۔ خوب۔!!! " رومان
ایک فطری چیز ہے میں نہیں سمجھتا کہ " رومانیت " سے انجام برا ہوتا ہے۔ چچا صاحب نے میرے خط سے میری محبت کا
لگایا۔ شاید انھوں نے میری محبت کو مجنوں یا فرہاد کی محبت سمجھ رکھا ہے۔ نہ تو میں جنگلوں میں مارا مارا پھرتا ہوں
کی خاک چھانتا پھرتا ہوں۔ اور نہ لوگ مجھے دیوانہ سمجھتے ہیں۔ میں تو روزانہ یونیورسٹی جاتا ہوں۔ کھاتا ہوں پیتا ہوں
پڑھتا ہوں، لکھتا ہوں غرض ہر وہ کام کرتا ہوں جو کسی عاشق کو نہیں کرنا چاہئے۔ بقول آپ کے اگر ماحول کا اثر بھی
تو میں یہہ دعوے سے کہہ سکتا ہوں کہ کم از کم میرے ماحول میں تو ایسا کوئی عاشق نہیں ہے نیز بیسویں صدی میں رہ کر
کی محبت کو پیش نظر رکھ کر میری محبت کو جانچنا بھی ایک مضحکہ خیز چیز ہے آج کل ایسی محبت کا فیشن نہیں ہے بلکہ ایسی محبت کو تو
بیوقوفی اور نادانی سمجھا جاتا ہے۔ حیرت ہے کہ چچا صاحب نے باوجود تعلیم یافتہ اور روشن خیال ہونے کے آج کل کی محبت کو
سمجھ رکھا ہے۔ حالانکہ محبت تو ایک فائدہ مند اور مفید چیز ہوتی ہے۔ محبت کرنا تو یار لوگوں کا ایک دلچسپ مشغلہ ہے
محبت کا قائل نہیں ہوں " محبت " جیسے پاک لفظ کی یار لوگوں نے جو بری گت بنائی ہے وہ ظاہر ہے وہ لوگ جو اپنے آپ کو مبتلائے عشق

...ب دیں

...ادر کن کے دام محبت میں گرفتار - کوئی ان سے پوچھے کہ وہ کیوں کسی سے محبت کرتے ہیں حقیقت تو یہہ ہے کہ اس پاک لفظ کی آڑ میں وہ اپنی اغراض
و مقاصد کو حاصل کرنے کی گھات لگائے بیٹھے ہیں - آج کل کی ماڈرن محبت کی بنا تو ذاتی اغراض ہی کا باعث ہوتی ہے۔" محبت"
محبت کے لئے نہیں کی جاتی بلکہ نفسانی خواہشات اور شیطانی جذبات کی تکمیل کی خاطر۔ محبت کی ایک اور بھی قسم ہوتی ہے جو رفتہ رفتہ
عام ہوتی جارہی ہے یعنے دولت کی خاطر بھی کسی سے محبت کی جاتی ہے - بہرحال چچا صاحب نے لیلیٰ مجنوں اور شیریں فرہاد کے زمانہ کو پیش نظر رکھ کر
یہہ نتیجہ اخذ کیا ہے کہ محبت تباہ کن ہوتی ہے حالانکہ اس ماڈرن دور میں تو محبت کچھ اور ہی چیز ہوتی ہے - " دنیا کا تجربہ ہے کہ وہ طلباء جو حصول علم
کے ساتھ ساتھ محبت کا سبق بھی سیکھ جاتے ہیں کبھی پروان نہیں چڑھتے اور ایسے ڈوبتے ہیں کہ پھر عمر بھر نہیں ابھرتے" حالانکہ آج کل تو وہ طلباء جو
حصول علم ساتھ محبت کا سبق بھی سیکھ جاتے ہیں خوب پروان چڑھتے اور خوب ابھرتے ہیں اور محبت ہی کے صدقے میں ولایت بھی ہو آتے ہیں کیونکہ
وہ دولتمند لڑکی سے محبت کرتے ہیں سچ تو یہہ ہے کہ محبت کرنا بھی ایک آرٹ ہے جس میں آج کل کے نوجوان کافی مشاق ہیں عشق و جوانی کا جب بھوت
چڑھتا ہے تو گھر کے اور گھاٹ کے نہ سہی ولایت کے اور واپس ہو کر کسی بڑی خدمت کے تو حقدار ہو جاتے ہیں - ؟ آخر میں چچا صاحب نے اس طرح خط
ختم کیا کہ " میں اس کے سوا اور کیا کر سکتا ہوں کہ تمہارے حق میں دعا کروں کہ خدا تمہارے دل و دماغ پر تمہارے جذبات پر اور تمہارے خیالات پر
رحم کرے " واللہ میرے مشفق چچا نے جس خلوص دل سے دعا کی ہے اس سے میں بے حد متاثر ہوا اور فوراً آمین! کہہ اٹھا کہ اگر میرے خیالات بلند
ہوں تو کسی دولتمند (بدصورت ہی سہی) لڑکی سے محبت کروں دل و دماغ سے خود داری کو نکال دوں اور اپنے اعلیٰ جذبات پر قابو پاکر بے غیرت
بن جاؤں اور گھر داماد ی پر رضامند ہو جاؤں تو کم از کم میرا ولایت جانا تو یقین ہے چچا صاحب کو یہہ معلوم کرکے یقیناً مسرت ہوگی میں جن جن لڑکیوں سے
خط وکتابت کرتا ہوں اور محبت اور عشق و عاشقی کا اظہار کرتا ہوں وہ خوبصورت نہ سہی دولتمند ضرور ہیں اتنی روشن خیال اور بھولی بھالی بھی ہیں
کہ میں بآسانی اپنے دام محبت میں انھیں پھانس سکتا ہوں - خدا کرے کہ چچا صاحب قبلہ کی دعا بارگاہ آلہٰی میں قبول ہو جائے کسی بڑے آدمی کا داماد
ہو جانا، ولایت کی ہوا کھانا، اور کسی بڑی خدمت پر متمکن ہو جانا اور اس کساد بازاری کے زمانے میں دلگی ہے - ؟ وہ بھی مجھ جیسے غریب کے لئے - ؟ ان
نعمتوں کے بدلے صرف اتنی تکلیف ہوگی کہ بیگم صاحبہ کی عاجزی و منت و سماجت کرنا پڑے گا - کریں گے آخر اپنی بیوی ہی تو ہے کوئی غیر تھوڑی ہے
اور زیادہ سے زیادہ خسر صاحب کی خدمت میں ہر صبح پانچ سلام بھی کرنا ہوگا - اس میں بے عزتی کی کونسی بات ہے - ؟ خسر کا درجہ باپ کے برابر - بلکہ اپنے خسر کا
درجہ تو باپ سے بھی بڑھ کر ہوتا ہے - انھیں گوناگوں خیالات میں غلطاں و پیچاں تھا کہ گھڑی کے ٹن ٹن نے مجھے چونکا دیا - وقت دیکھتا ہوں تو
... بج رہے ہیں - یا اللہ میں نے کہا اس ظالم خط نے مسلسل تین چار گھنٹے مجھے اس عالم میں مبتلا کر دیا - جب کرسی سے اٹھتا ہوں تو پاؤں میں تو کیا بلکہ
پورے جسم میں چونٹیاں بھر گئی تھیں - طبیعت پر ایک قسم کا بار تھا - سر چکرا رہا تھا جلد غسل کیا اور کپڑے پہن کر باہر نکل گیا یہہ سمجھ کر کہ طبیعت کو کچھ سکون ہو جائے
تو پھر اس گتھی کو سلجھانے کی کوشش کروں گا - اپنے عزیز دوست کے پاس پہنچا - وہاں پہلے ہی سے دو چار خوش باش دوست بیٹھے ہوئے تھے - اپنے آپ کو
بہت بنانے اور زندہ دل ظاہر کرنے کی کوشش بھی کیا لیکن یار لوگوں نے تاڑ ہی لیا کہ آج دال میں کچھ کالا ہے - باربار اصرار سے مجھے اور بھی تکلیف
ہونے لگی یہہ سمجھ کر کہ کم از کم یہی حضرات کچھ طریقہ بتلائیں میں نے خط کا تمام حال بیان کر دیا - یار لوگوں نے خوب خوب مذاق اڑایا اور ہماری خوب گت بنی
وہاں سے نکل کر گھر واپس ہوا مگر طبیعت میں ایک عجیب قسم کا پیدا ہو چکا تھا مختلف کتابیں پڑھنا شروع کیا تب بھی چین نہ آیا سونے کی کوشش
کی مگر نیند کہاں آتی ؟ اپنی ہیبت کذائی کو دیکھ کر خود ہی بھی ہنستا تھا کہ ایک معمولی چیز کو اتنی اہمیت دے کر خواہ مخواہ طبیعت کو کیوں ہلکان کروں

گر اس خط نے میرے جذبات اور احساسات پر کچھ ایسا گہرا اثر کیا کہ بھولائے نہیں بھولتا تھا۔ بار بار یہی سوچتا تھا کہ آخر میں نے کس نام کا خط ...
جاگتے جاگتے صبح کر دی ناشتہ کیا اور کالج چل دیا لیکن بار بار خط کا خیال سوہانِ روح بنا ہوا تھا میرے دو روز جیسی کوفت اور ذہنی کشمکش میں گذرے ...
اس کا اظہار کرنے کے لئے میرے پاس الفاظ نہیں تیسرے روز شام میں چائے پی رہا تھا کہ ملازم نے ایک نہایت ہی حسین رنگین اور خوبصورت لفافہ ...
ریحانہ کی موتیوں کے مانند تحریر دیکھ کر طبیعت کو فرحت ہوگئی میں نے لفافہ فوراً چاک کیا خط کا مضمون یہہ تھا۔

اچھے ــــــ!!!

تین چار روز تک میں اپنے بھائی کے یہاں مہمان تھی۔ واپس ہوئی تو سنگھار میز پر تمہارا خط نظر پڑا لفافے پر تمہاری تحریر دیکھ کر دل میں گدگدیاں
شروع ہوگئیں۔ اور فوراً کمرہ بند کر کے تنہائی میں اطمینان سے خط کھولی۔ تمہاری غائب دماغی اب انتہا کو پہنچ گئی ہے۔ تم نے اپنے چچا کے نام کا
خط میرے لفافہ میں ملفوف کر دیا ہے اور مجھے یقین ہے کہ لفافوں کی اس تبدیلی سے میرے نام کا خط تمہارے چچا کے پاس پہنچ گیا ہوگا خدا معلوم
تم نے اس میں کیا کیا لکھا تھا اگر حسبِ معمول تم نے لکھا تو بڑا غضب ہو جائے گا، تمہارے چچا مجھ سے اچھی طرح واقف ہیں۔ نہ معلوم ان پر
میرے کردار اور اخلاق کا کتنا برا اثر پڑے گا، تمہاری لاپروائی اور غائب دماغی نے بالآخر مجھے بدنام اور رسوا کر کے ہی چھوڑا جب سے خط ...
میری حالت انتہا سے زیادہ پریشان کن ہے۔ خدا کے لئے سچ سچ لکھ دو تم نے اس خط میں کیا کیا لکھا تھا۔؟ میں بہت پریشان اور تشویش ...
ہوں، اور تمہارے جواب کا سختی سے انتظار کر رہی ہوں۔ خدارا جلد از جلد جواب دو تمہارے چچا کا خط واپس کر رہی ہوں کاش وہ بھی میرا خط
واپس کر دیں۔ لیکن اب کیا فائدہ، میں تو تباہ ہوگئی حیا اور عزت کا تو یہہ تقاضا ہے کہ خودکشی ہی کر لوں۔ — تمہاری　　ریحانہ

ریحانہ کا خط پڑھ کر تو ہاتھوں کے طوطے اڑ گئے۔ طبیعت تو میری بھی چاہتی تھی کہ خودکشی کر لوں لیکن کیا کرتا مذہب میں خودکشی بھی تو حرام ہے۔ خواہ مخواہ
ایک شریف بے قصور اور معصوم دوشیزہ کو میری طرف سے اتنی تکلیف ہوئی اور ندامت کا سامنا کرنا پڑا۔ لیکن اب میں کر کیا سکتا تھا۔ بالآخر ایک
تدبیر سمجھ میں آئی میں نے سوچا کہ کم از کم ہماری ریحانہ کو تو اس پریشانی سے نجات دلا دوں، میں جھٹ حسب ذیل خط لکھ دیا۔

میری ریحانہ !

معاف کرنا میری غائب دماغی سے تمہیں روحانی صدمہ پہنچا اور خواہ مخواہ تمہیں پریشان ہونا پڑا۔ خدا کا شکر ہے کہ میں نے اب کی دفعہ معمولی
طور سے تمہیں ایک مختصر اور سادی خط لکھا تھا۔ خط میں کوئی خاص بات نہ تھی سوائے اس کے کہ میں نے اپنے کشمیر کے سفر کے واقعات لکھے تھے
نیز ۵ جولائی کو زہرہ کی انگلستان کو روانگی کی اطلاع دی تھی اور بس۔ تم خدا کے لئے پریشان نہ ہونا، میں قسم کھانے کے لئے تیار ہوں
کہ اس خط میں کوئی ایسی بات نہ تھی جس سے تمہاری عزت اور آبرو پر کسی قسم کے شبہ کی گنجائش ہو۔　　　صرف "تمہارا"

خدا کا شکر ہے کہ تدبیر سمجھ میں آگئی جس سے کم از کم ایک بیچاری کو پریشانی اور کوفت سے نجات ملی۔ لیکن میری پریشانی اور کوفت میں تو اضافہ
ہوگیا۔ بہرحال ہماری غائب دماغی نے ہمیں یہہ ایسا بڑا چرکا دیا کہ اب بھی یاد کرتا ہوں تو تکلیف ہوتی ہے۔ لیکن جب کبھی خط ڈالتا ہوں تو
بیسیوں مرتبہ لفافہ پر کا پتہ اور خط کو غور سے دیکھ لیتا ہوں لیکن ایسا کرنے میں مجھے وہ واقعہ یاد آجاتا ہے تو اور بھی تکلیف ہوتی ہے میری
غائب دماغی نے مجھ سے سب کچھ بھلا دیا لیکن یہہ واقعہ تو اب تک تازہ ہے۔

سید منیر الدین مغربی

جدید افسانوی ادب کے رجحانات

اُردو کے جدید افسانوں کا پہلا رجحان اصلاح معاشرت ہے۔ جس میں نذیر احمد کی کوششیں قابلِ ذکر ہیں۔ اور ان کے یہاں دلی کی مٹتی ہوئی تہذیب کے موقعے بھی نظر آتے ہیں۔ سرشار نے لکھنو کی معاشرت اور تہذیب کے اس دور کو اپنا موضوع بنایا ہے جب کہ وہ زوال کی پستیوں سے گذر رہی تھی۔ ان کا فسانہ آزاد لکھنو کی معاشرت کا سچا مرقع ہے۔ جس میں زبان و بیان کے خوبیوں کے سوا کردار نگاری بھی ہے۔ واقعات اور پلاٹ کے لحاظ سے اس میں کوئی تسلسل نہیں ہے۔ فسانہ آزاد جیسا کہ چکبست مرحوم نے لکھا ہے اخبار میں نامنحصر کے کہنے پر سرشار نے سروانٹس کے ' ڈان کوئک زاٹ ' کی طرز پر لکھا ہے۔ خوجی کا کردار اُردو میں جدید طرز کا مزاحیہ کردار ہے۔ سرشار کا اسلوب شستہ۔ رواں اور بامحاورہ ہے۔ اور اس میں رنگینی اور دلچسپی بھی ہے۔ شرر کی یہاں دو رجحانات پائے جاتے ہیں۔ ایک تو تاریخ اسلام کے مختلف دوروں کو افسانہ میں محفوظ کرنے کی خواہش۔ اور دوسرے ہندو مسلم حالات نے فرقہ پرستی کے جو بیج بو دیئے تھے اور جس کا اظہار بنگال کے مشہور ناول نویس بیگم چند رکے اپنے ناول چنچل کماری میں کیا ہے۔ اس جذبہ کے اثرات بھی شرر کے یہاں موجود ہیں۔ اور اس کا مظہر اُن کا ناول منصور موہنا ہے۔ شرر کے یہاں کردار نگاری بالکل نہیں ہے۔ وہ اپنے ناولوں میں واقعات اور پلاٹ سے دلچسپی پیدا کر دیتے ہیں۔ اُن کے سارے ناولوں کے کردار بالکل ایک سے ہیں۔ شرر کی ناولوں کے اسلوب میں دلکشی نہیں ہے۔ اُن کے اسلوب کی شگفتگی اور روانی ان کے مضامین میں ہے جہاں وہ ایک صاحب طرز اور انشاء پرداز نظر آتے ہیں۔ جیسا کہ رام بابو سکسینہ نے کہا ہے کہ انگریزی طرز پر اُردو نثر لکھنے کا طریقہ سب سے پہلے شرر ہی نے اختیار کیا۔

راشد الخیری۔ سرفراز حسین اور مرزا ہادی رسوا کے یہاں بھی کم و بیش اصلاح معاشرت ہی جذبہ کارفرما ہے۔ اُردو کے رومانی افسانے مغربی ادبیات کے اثر کا نتیجہ ہیں۔ چونکہ یہ دور انگریزی ادب کے رومانی طرز سے متاثر ہے اس لئے اس میں بھی حسن و عشق کے فلسفہ پر زیادہ زور قلم صرف کیا گیا ہے۔ اور ان رومانی افسانوں میں اپنے ماحول کی بہت کم ترجمانی کی گئی ہے۔ اس دور کے لکھنے والوں میں نیاز۔ سجاد حیدر اور سلطان حیدر جوش ہیں۔ ان کا اسلوب عربی اور فارسی کی ترکیبوں سے گراں بار ہے۔ اس پر ابوالکلام آزاد کا اثر ہے۔ نیاز نے گیتانجلی کا ترجمہ کر کے ٹیگور کے اثر کو اُردو افسانوں میں جگہ دی جس کی وجہ سے ادب لطیف کی راہ اردو میں نکل آئی۔ نیاز کے افسانوں میں غیر معمولی شخصیتوں کے کردار پائے جاتے ہیں۔ جو بالکل اجنبی سے معلوم ہوتے ہیں۔ شہاب اور افضال ان کے اپنے تخیلی دنیا کے پیداوار ہیں جنھیں حقیقی زندگی سے کوئی تعلق نہیں۔ سجاد حیدر نے ترکی افسانوں کے ترجمے کئے۔ اس لئے حسن و عشق کے جذبات ان کے یہاں زندگی سے زیادہ قریب ہیں۔

پہلے پہل تو اردو فسانہ نگاری کی لاج پریم چند نے رکھی۔ پریم چند کے دل میں خلوص اور درد تھا۔ انھیں اپنے ملک کی غربت کا احساس تھا۔ اور یہی احساس ان کے سارے افسانوں میں جاری و ساری ہے۔ پریم چند نے مریخ کی سیر کی بجائے

اپنے ملک کے ان تاریک گوشوں کی سیر کی جس جگہ غربت اور افلاس کی ماری آبادی سسکیاں لیتی ہے۔ ملک کے سیاسی حالات سے متاثر ہو کر انھوں نے اپنے ناولوں میں آزادی کے جذبہ کو پرورش دی ہے۔ مگر حصول آزادی کے لئے وہ انقلاب کے قائل نہیں اور وہ یہاں بالکلیہ گاندھی جی کے تحریک عدم تشدد سے متاثر ہیں۔ وہ انقلاب کا دروازہ کھٹکھٹانا نہیں چاہتے بلکہ منزل سے گذرے آزادی حاصل کرنا چاہتے ہیں۔ پریم چند سرمایہ داری کے بھی خلاف ہیں۔ مگر اس کے لئے وہ طبقاتی تصادم کا مطلع صاف کرتے جاتے ہیں۔ ان کے ناولوں کے سب ہی کردار اصلاح پسند ہیں۔ عورتیں بھی مردوں کے ساتھ ساتھ قومی زندگی کی تعمیر میں حصہ لیتی ہیں۔ سبحان سنگھ۔ پریم شنکر اور ونئے کمار کے ساتھ سمن۔ سائتری اور صوفیا بھی اصلاح کے لئے باہر نکل آئی ہیں۔ پریم چند کا فن ایک ناول نگار کی حیثیت سے مکمل نہیں ہے۔ ان کے یہاں کردار کی انفرادیت غائب ہے ہاں جب وہ مجمع میں پہنچتے ہیں تو ان کا قلم اس موقع پر ایک فن کار کا قلم بن جاتا ہے۔ پریم چند کا اصل کمال ان کے مختصر افسانوں میں ہے۔ ان کے افسانے اپنے اسلوب کے لحاظ سے دلکش اور نتیجہ کے لحاظ سے بصیرت افروز ہوتے ہیں۔ اور بعض اوقات ان کا قلم روس کے بہترین افسانہ نویسوں کا قلم بن جاتا ہے۔ اعظم کریوی اور سدرشن نے پریم چند کی تقلید کی ہے۔ مگر وہ صرف تقلید ہی ہے۔ قاضی عبدالغفار کی کتاب "لیلیٰ کے خطوط" ہمارے افسانوی ادب میں اپنے طرز نگارش کی ادا اور دلکشی کی وجہ سے اہمیت رکھتی ہے۔ اور ان کے اسلوب ہی نے اس موضوع کو جس پر پہلے بھی بہت کچھ لکھا جا چکا ہے نیا بنا دیا۔

اس دور میں انگریزی، فرانسیسی اور روسی ادب کے شاہکار افسانوں کو اردو ادب میں منتقل کیا گیا۔ اس خصوص میں جلیل احمد قدوائی، مجنوں گورکھپوری اور امتیاز علی کے نام قابل ذکر ہیں۔

اردو کے مزاح نگاروں میں رشید احمد۔ پطرس اور فرحت اللہ بیگ عام سطح سے ذرا بلند ہیں۔ پطرس اپنے انوکھے واقعات سے مزاح پیدا کرتے ہیں۔ مگر ان واقعات میں وہ اپنے آپ کو بھی شریک کر لیتے ہیں۔ جس سے پڑھنے والے پر ان کی ہر دلعزیزی اور بڑھ جاتی ہے۔ رشید احمد کے یہاں سنجیدہ شخصیتیں بھی ان کے طرز بیان کی وجہہ سے مضحکہ خیز بن جاتی ہیں۔ فرحت اللہ بیگ کا مذاق اپنی قدرت زبان کی وجہہ سے ہے۔ اور وہ اس کے سہارے ایسے واقعات پیدا کرتے جاتے ہیں جو زندگی سے زیادہ قریب ہوتے ہیں اور جن میں نفسیات کی باریکیوں کو بھی نمایاں کیا جاتا ہے۔

ادبیات اردو میں افسانہ نگاروں کا اب ایک ایسا گروہ پیدا ہو رہا ہے جو انقلاب روس سے متاثر اور اشتراکی ادب کا پیرو ہے۔ وہ اپنے اندر سرمایہ داری کے خلاف شدید جذبات نفرت رکھتا ہے۔ اور اسے نظام معاشرت۔ نظام حکومت اور مذہب سے بھی سخت بیر ہے۔ وہ قدیم نظام میں تمدن کی بنیادیں ڈھا دینا چاہتا ہے۔ اور جدید تمدن کی عمارت اشتراکیت کی بنیادوں پر رکھنا چاہتا ہے۔ اس گروہ کا نمائندہ نوجوان ادیب اختر حسین رائے پوری ہے۔ جس نے بنگال کے انقلابی شاعر نذر الاسلام کو اردو میں روشناس کرایا۔ مگر اختر کا آرٹ نامکمل ہے۔ اور اسے ابھی بہت کچھ سیکھنا ہے۔

سید اشفاق حسین

عذاب

جب آدم جنت سے نکالے گئے تو انھوں نے حوا سے کہا تھا کہ یہہ حالت عارضی رہے گی لیکن اس تبدیلی کا اہم مقصد یہہ تھا کہ آدم اور اس کی اولاد اپنی روزی آپ تلاش کرے۔ یہاں سوال یہہ ہوتا ہے کہ کیا یہہ واقعی سزا تھی؟ حالانکہ دنیا کے خطے ایسے بھی ہیں جہاں من و سلویٰ اترتا ہے۔ وہاں کے باشندے ابھی جنگلی حالت میں ہیں۔ کنگسلے اپنی کتاب "آبی بچے" میں ان لوگوں کو بری طرح لتاڑتا ہے جو ایسے مقامات پر جا بسے ہیں جہاں روزی بہ آسانی مل جاسکتی ہے۔ اس کے معنے یہہ ہیں کہ وہ دوبارہ جنت کی طرف دوڑتے ہیں اور پھر ایک بار خوشۂ گندم کا ذائقہ چکھنا چاہتے ہیں۔ کارلائل کہتا ہے کہ وہ شخص خوش نصیب ہے جس کو کوئی کام مل گیا ہو۔ اس سے زیادہ اس کو کوئی نعمت تلاش نہ کرنی چاہئے۔ بہتوں نے ان کی ہمنوائی کی ہے آخری بات جو کہنی ہے یہہ ہے کہ محنت ہمیں غلط کاریوں سے باز رکھتی ہے۔ ڈاکٹر جانسن نے کہا ہے کہ محنت کرنے میں آدمی ایسا ہی ہمہ تن مصروف ہو جاتا ہے جیسے کہ روپیہ جمع کرنے میں۔

بعض عیسائی معترض ہیں کہ حضرت عیسیٰ نے انھیں محنت کے متعلق کہیں تاکید نہیں کی۔ جرمن صوفیوں کا قول ہے کہ اگرچہ حضرت عیسیٰ نے اس بارے میں کچھ نہیں کہا لیکن وہ خود ماہر نجار اور منہمک طالب علم تھے۔ ان کا خیال صحیح ہے لیکن دراصل موجودہ زمانے کے خیال کو انجیل میں ڈھونڈنا آسان بات نہیں۔ مشہور مفکر ہارنیاک نے بالکل صحیح کہا ہے کہ دنیا میں محنت کے متعلق بناوٹی بکواس بہت ہے اس کا تین چوتھائی بلکہ اس سے بھی زیادہ حصہ احمقانہ ہی ہے۔ اور جو شخص واقعی محنت کرتا ہے وہ شاعر کے تخیل کا مستحق ہے جب اس کی شام ہوتی ہے تو اس کا ہر عضو مسرت اور انبساط سے معمور ہو جاتا ہے کیونکہ اس نے کام ختم کر دیا ہے جو لوگ محنت پر وعظ کرتے ہیں وہ خود محنتی نہیں ہوتے۔

تہذیب زمانہ کا یہہ اصول رہا ہے کہ لوگوں نے اس وقت تک کوئی کام نہیں کیا جب تک لوگوں کو رشوت نہیں ملی یا خوفزدہ نہیں ہوئے جذبہ کے تحت کام کرنے والے بہت کم ہوتے ہیں کیونکہ جذبہ یا تو عیش و عشرت کی تکمیل کے لئے ہوتا ہے یا برے آدمی کی طبیعت کے لئے تسکین بخش ہو غلامی کی حالت میں "کام کرو ورنہ پٹو" پر عمل ہوتا تھا اور اب صنعتی دور میں " محنت کرو ورنہ بھوکے مرو" پر پھر بھی یہہ کلیہ فطرت انسانی پر منطبق نہیں ہو سکتا ہر وقت اور ہر جگہ، مرد اور عورت دونوں نے محنت کی ہے لیکن وہ نہ تو کسی خوف کی بنا پر تھی اور نہ کسی مہربانی کی تحصیل کے لئے۔ بلکہ انھوں نے محنت کی صرف اس لئے کہ یا تو وہ محنت سے یا مخلوق سے یا خدا سے محبت کرتے تھے۔ دنیا میں بہتیرے ایسے ہیں جنھوں نے سماج کو اس خرابی سے بچانے میں کوئی کسر نہ اٹھا رکھی جو گھن بن کر سماج کو لگا رہے دیتی ہے جس کے ارکان یا تو دولت کے مارے محنت کرتے ہیں یا نفع العام کی خاطر چند پیسوں میں غیر دلچسپ روایتی خدمتیں بھی ہیں جن کو ترک نہیں کیا جاسکتا۔ جنگ کے زمانے میں سپاہی ہر قسم کی ذمہ داری اپنے سر لینے کے لئے آمادہ ہو جاتا ہے بیس سال پہلے یہہ کہنا بالکل معمولی بات تھی کہ اگر خندق کے شیطانوں اور جنوں کو انسانی شکل میں تبدیل کر دیا جائے تو ہماری زندگی کی مشکلات رفع ہو جائیں گی۔ دنیا میں بعض ایسے پیشے بھی ہیں جن کا معیار پیشہ کی حیثیت سے بہت بڑھا ہوا ہے۔ مدرسین کی آٹھ گھنٹے کی محنت ایام درس میں اور ڈاکٹروں کی وبا کے زمانے میں ان کے لئے تشفی بخش نہیں ہوتی۔ وہ اس سے بھی زیادہ محنت کرتے ہیں لیکن ان کی محنت کے مقابلے میں اس کا معاوضہ کس قدر حقیر ہوتا ہے۔ ہارنیاک وہ دن کے غروب ہونے پر خوشی محسوس کرتے ہیں لیکن ان کی محنت بھی ان کے لئے ایک کھیل ہے، اور یہی چیز ان کے لئے جان نواز ہے ان کو محنت سے باز رکھنے یا

ان سے ناقابل برداشت محنت لینے سے بھی ان کی زندگی دوبھر ہو جائے گی ۔

اس کے علاوہ دنیا کے ہر طبقہ میں ایسے بھی آدمی ہیں جو محنت سے محبت کرتے ہیں انھیں محنت سے اطمینان ہوتا ہے اور راحت ملتی
ایسے ہی انسان دراصل ہماری معاشرہ کی زینت ہیں ۔ ایک اشتراکی اخبار میں لکھا تھا کہ قوم کو ادنیٰ کاموں سے نفرت نہ کرنی چاہئے اور اگر
کبھی موقع پڑجائے تو اس طرح نہ بھاگنا چاہئے جس طرح کہ دباؤں سے بھاگتے ہیں ۔ مدبرین اپنی تقریروں میں اور واعظین اپنے وعظوں میں
محنت کے گیت گاتے ہیں خدا نے انسان کو دماغ اسی لئے عطا کیا ہے کہ وہ اپنی زندگی کو خوشگوار بنائے نہ کہ مزید آلام و مصائب کی
برنارڈ رسل نے کہا ہے کہ انسان محض صلہ پانے کے لئے محنت اٹھاتا ہے اور یہہ تعمیری شہریت کے منافی ہے اس لئے بہتر یہہ ہے کہ سلسلہ
مسدود ہو چار گھنٹہ روزانہ کی محنت تقریباً ہر شخص کے لئے قابل برداشت ہے پہلی چیز یہی ہے کہ کام بجائے خود دلچسپ ہو جب ہم اپنی
اپنے مفوضہ کام کے انجام دینے میں صرف کرتے ہیں تو ہمیں اسی میں دلچسپی پیدا ہو جاتی ہے جب دقتیں حائل ہوتی ہیں تو ان کے حل سے دلچسپی
بڑھتی جاتی ہے لیکن کبھی کبھی اس کے خلاف بھی ہو جاتا ہے کسی چیز کی ایجاد میں جو دلچسپی ہوتی ہے وہ کسی دوسرے کاموں
آخری اور اہم نکتہ محبت ہے گھریلو زندگی میں ایسے پچاسوں کام ہیں جہاں بلا معاوضہ محنت انجام دی جاتی ہے یہہ محض محبت ہے جو کام
لیکن ایسے پیشوں میں جہاں ایمان اور دیانت کا جذبہ کارفرما رہتا ہے ان میں صلہ کی کوئی پرواہ نہیں ہوتی اور جہاں محبت اور وفاداری کا جذبہ
مفقود ہو اور بقول کارلائل کام کرنے والوں کی نظر میں سیم و زر پر ہوں تو سوائے ایک کشمکش کے اور کوئی چیز نظر نہ آئے گی ۔ محنت میں اس
وقت کوئی دلچسپی نہیں رہتی جب کہ کام کرنے والے کو اس کا احساس ہو کہ اس کی محنت بیکار جاری ہے اور اس کا صلہ
مل سکتا ۔ اور جب نوبت یہاں تک پہنچے تو ایک ذہین اور محنتی آدمی حسد اور نفرت کی آگ میں جل جاتا ہے ۔

اگر یہہ بیان صحیح ہو سکے تو پھر معاشرتی مسئلہ سیاسی اور معاشی مسئلہ سے زیادہ نفسیاتی ہو جاتا ہے پھر اس کا کوئی نہ کوئی علاج
ہونا چاہئے خواہ اس میں پیداوار ہی پر اثر کیوں نہ پڑے معاشرے کے تفرقہ پرداز دشمن اس مرض کے لئے مہلک اور
پر وعظ کرنے والے اس کے ممد و معاون ثابت ہوتے ہیں ۔ مذہب سے صنعتی دور کا تعلق بالواسطہ بھی ہے اور اہم بھی ۔ یہہ پیغام کہ
"خدا کی سلطنت میں صرف "کلوا واشربوا" ہی پر عمل نہیں ہوتا بلکہ سچائی، امن و امان اور انبساط روح بھی اس کے ساتھ کارفرما ہیں
ہماری روح کو آلائشوں سے پاک اور زندگی کو مصائب سے آزاد کردے گا ۔

اکبر صدیقی

ساقی سے

سکون قابلِ صد اضطراب ہے ساقی — بتا بتا تو یہہ کیا انقلاب ہے ساقی
جو تشنہ لب ہیں وہ محروم غیر ہیں سیراب — عجب تری نظر انتخاب ہے ساقی

۲

دنیا کی بسی ہوئی ہے بستی مئے سے — ہستی کی قسم ہے میری ہستی مئے سے
حق تو یہی ہے کہ حق سمجھ کر جو پئے — آجاتی ہے اس کو حق پرستی مئے سے

آغا محشر شیرازی (رکن خصوصی ادارہ تحریر الاصلاح بمبئی)

فرزندانِ دارالعلوم کے علمی خدمات پر ایک نظر[1]

آج سے تیس[30] سال پہلے حیدرآباد میں جو کچھ علمی چہل پہل اور تعلیمی فضا تھی وہ سب تقریباً فرزندان دارالعلوم کی وجہ سے تھی، شاعری، نثرنگاری، صحافت سب کا دارو مدار فرزندانِ دارالعلوم سے وابستہ تھا۔ یہہ ناممکن ہے کہ ہم ان کے تمام علمی کاموں اور ادبی کارناموں کی وضاحت کرسکیں۔ کیونکہ یہیں حیدرآباد کی گویا نصف صدی کی علمی تاریخ لکھنی ہوگی جو خالی از دشواری نہیں ہے، ہم مختصر طور پر چند عنوانات کے تحت بعض فرزندانِ دارالعلوم کے علمی خدمات کا ذکر کرتے ہیں۔ تاکہ آئندہ وقت نظر سے کام کرنے والوں کے لئے آسانی ہوسکے اور کچھ مواد یکجا بہم دست ہوجائے

شاعری دارالعلوم کے ہر دور کے طلبہ میں شاعروں کی تعداد کافی نظر آتی ہے جنھوں نے نہ صرف اردو زبان میں شاعری کی ہے بلکہ عربی اور فارسی میں بھی اپنے خیالات کی جولانی دکھائی ہے۔ اور پھر یہہ نہیں کہ ان کی شاعری معمولی یا اوسط درجہ کی قرار پائے بلکہ وہ اچھے سے اچھے شاعر قرار دئے جاسکتے ہیں،

دارالعلوم کے دور اول (۱۲۷۲ء تا ۱۳۰۸ء) کے جن شعرا سے ہم واقف ہیں وہ حسب ذیل ہیں :-

وزیر[1] (نواب آصف یاورالملک) قادر[2] (نواب قادر نواز جنگ) ملا[3] (مولوی عبدالقیوم مرحوم) کوکب[4] (مرزا مہدی خاں) شعلہ[5] (میر کاظم علی) شوق[6] (غلام محمد) ۔ بلیغ[7] (عبدالغفار)[2]

ان تمام شعرا نے اپنے زمانے اور ماحول کے بموجب تصوف و نعت اور عشق و محبت کی قدیم طرز پر شاعری کی ہے، فارسی اور اُردو دونوں زبانوں میں انھوں نے اظہار خیال کیا ہے، بطورِ نمونہ کلام کچھ اشعار پیش کئے جاتے ہیں :-

وزیر

دیکھا ہوں خودی ہی میں خدایا ترا جلوہ ظلمت میں پتہ مجھ کو ملا آبِ بقا کا

وہ دیکھلے جاکر بتِ سفاک کا کوچہ جو عمر میں دیکھا نہ ہو میدان قضا کا

اپنا بنایا دیدۂ دل ہی کو نامہ بر جب سے میان یار پیام وسلام ہے

یہہ خالق کی بنا مخلوق کی وہ کجا کعبہ کجا دیکھو مرا دل[3]

---

[1] دارالعلوم کی تاریخ کی ترتیب ہمارے پیش نظر ہے، اس کے مختلف حصے رسالہ شہاب وغیرہ میں شائع کئے گئے ہیں، یہہ مواد بھی اسی کا ایک باب ہے۔

[2] ان شعرا کے مختصر حالات شہاب میں شائع ہوچکے ہیں [3] تزک محبوبیہ ۔

ملا۔

درحریم وصلِ اُو داماں اگر پیچیدہ ام		دامنِ حشر لبیت پنداری کہ برپیچیدہ ام

از سرِ جاں بگذرم خود را رسانم تا بہ دوست		گر ازیں تدبیر نا ید کار تقدیرست و من

ملا حکایتِ دل و جاں دادنت بباد		ماند بیاد گاریٔ دیرینہ برزمیں

زندۂ جاوید ہے کشتہ تری شمشیر کا		دیکھئے آب بقا کیا موجزن آہن میں ہے

تصویر ہم نے کھینچی ہے اس واسطے تری		عاشق تجھی کو تجھ پہ ستمگر بنائیں گے

نہ سہیں ہم تو بھلا کون سہے ان کا ظلم		ہم وفا کرتے ہیں وہ دادِ جفا دیتے ہیں[1]

شعلہ۔

اے ابرِ کرم گر تو رحمت سے برس جانا		یہہ مشتِ غبار اپنا ہرگز نہ اڑا ہوتا

سنگ دل میرے گل اندام کو کہتے ہیں جو لوگ		ان کے ہو جائیں زبان اور دہن پتھر کے

ہوس میں بوسۂ لب کی اگر مروں گا میں		تو بعد مرگ رہے گا کھلا کفن میں دہن[2]

خوں در دل یاقوت بود از لب لعلش		زانست کہ رنگیں شدہ شیریں سخن ما

بہار آمد بیا ساقی درِ مے خانہ را بکشا		بزن مستانہ ساغرہا و مہر شیشہ ہا بکشا

آں کہ بخشید بتو حسن خود آرائی را		او عطا کرد بمن صبر و شکیبائی را[3]

شوق

ساقی بیار شیشۂ مے مہر بر شکن		صد توبہ در شکست شکستِ خمار ما

اے مہ بانتظارِ شبِ وعدہ تا بہ صبح		وا ماندہ بود دیدۂ اختر شمار ما

گو بعد مرگ وصل میسر شد عاقبت		آمد بکار زندگی مستعار ما

مرض عشق کی شدت ہی سہی		عوض مرگ اذیت ہی سہی

اے فلک غم نہیں کر دے برباد		شوق ناکام کی تربت ہی سہی

کیوں بگڑتے ہو سوال وصل پر		یہہ بھی کیا گالی ہے کیا دشنام ہے

کیا چھپانے سے کہیں چھپتا ہے عشق		شوق تیرا حال طشت از بام ہے[4]

ان نمونوں سے واضح ہوسکتا ہے کہ اس زمانے کے شعرا کے کلام کا کیا انداز تھا۔ اور وہ کس طرح اظہار خیال کرتے تھے، ان کا کیا تھا ان کے تخیل کی پرواز کہاں تک تھی۔ ان کا اسلوب کیسا تھا۔

---

[1] محبوب الزمن [2] تزک محبوبیہ [3] محبوب الزمن [4] تزک محبوبیہ۔

دارالعلوم کا دوسرا دور ۱۳۰۶ھ سے ۱۳۲۴ھ تک قرار پاتا ہے جب کہ اس کا تعلق پنجاب یونیورسٹی سے رہا ہے۔ یہہ زمانہ دارالعلوم کے عروج کا زمانہ ہے۔ اس زمانے میں مادر دارالعلوم کے وہ مایۂ ناز سپوت جلوہ نما ہوے جنھوں نے ملک اور وطن کے بیش بہا خدمت انجام دی ہے اور اپنے کارناموں سے حیات جاوید کا سہرا حاصل کیا ہے۔

ان ہی مایۂ ناز فرزندوں میں ایسے بلند پایہ شاعر اور ادیب بھی ہیں جن کی فصاحت اور بلاغت کا لوہا اہل زبان (فارسی) نے مانا ہے،

مولوی سید جمال الدین نوری مرحوم، مولوی عبدالباری مرحوم۔ مولوی حکیم وحیدالدین عالی وغیرہ وہ بلند پایہ فارسی کے شعرا تھے جن کی شاعری پر فخر کیا جاسکتا ہے، ان اصحاب نے نہ صرف فارسی شاعری میں نام پیدا کیا تھا بلکہ ان کی عربی شاعری بھی قابل تحسین تھی مولوی عبدالقدیر حسرت، مولوی بہاءالدین خاں، مولوی محمّد خاں وغیرہ بھی فارسی کے زبردست شاعر ہیں۔

اس دور کے اُردو گو شعرا کی تعداد بہت زیادہ ہے، ان کے ناموں کی صراحت بھی طوالت کا موجب ہوگی، حضرت کیفی، ذہین مرحوم اور حضرت امجد جیسے بلند پایہ شعرا اسی دور کی یادگار ہیں،

کیفی مرحوم ہمارا حالی تھا۔ ان کی پُر لطف نظمیں جو قومی اسٹیج پر جوش اور ولولہ پیدا کردیتی تھیں وہ بھلایا نہیں جاسکتا قوم کو بیدار کرنے، جگانے ہمت اور جوش دلانے کے لئے کیفی کی نظموں نے بڑا کام کیا ہے، کیفی کی نظموں کے ساتھ ساتھ ان کی روح پرور غزلیں جو تخیل کی بلند پروازی خیالات کی جدت، اسلوب بیان کی خوبی کے لحاظ سے قابل داد ہیں ہماری محفل عیش و نشاط کو گرمانے کے لئے کافی سے زیادہ سامان رکھتی ہیں۔ بہر حال کیفی کی شاعری خواہ وہ قومی اور اخلاقی ہو خواہ عشق و محبت کی غزلیں دونوں واجب التعظیم ہیں اور جب تک زبان اردو زندہ ہے وہ بھی زندہ رہیں گے۔

ذہین مرحوم بھی ہمارا زبردست شاعر تھا۔ ان کی اخلاقی نظمیں خصوصاً بچوں کے لئے جس طرح اخلاقی اور نصیحت کا سبق آموز وافر ذخیرہ فراہم کیا ہے وہ ہماری شاعری کا اہم جز ہے ان کی غزلیں بھی جو تصوف اور اخلاق سے مملو ہیں قابل قدر ہیں شمالی ہند میں جس طرح مولوی محمد اسمٰعیل کی نظمیں بچوں کے متعلق اہمیت رکھتی ہیں اسی طرح ذہین مرحوم کی نظمیں بھی یادگار رہیں گی۔

مولوی محمد حسین آزاد بھی اسی دور کے شاعر ہیں ظرافت آمیز شاعری کے لحاظ سے انھوں نے جو کام کیا ہے وہ درحقیقت قابل تعریف ہے۔ خیالات آزاد حصہ اول و دوم وغیرہ ہمارے ادب کے بیش بہا ذخائر میں شمار کئے جانے کے قابل ہیں۔

حضرت امجد بھی اسی زمانے کے سپوت ہیں امجد کی نظمیں، تضمینیں، غزلیں، رباعیاں جس طرح تصوف، اخلاق اور فلسفہ کی حامل ہوتی ہیں وہ اب اظہر من الشمس ہے۔ آپ کی شاعری کا سکہ دنیائے اُردو پر بیٹھا ہوا ہے۔ آپ کی پرمغز شاعری کے لحاظ سے مولینا سید سلیمان ندوی نے آپ کو "حکیم الشعرا" کے لقب سے موسوم کیا ہے۔

اُردو شاعری میں میر کا کلام اپنے سوز و گداز کی وجہہ سے مقبول ہے۔ خواجہ میر درد تصوف کے لئے مشہور ہیں غالب اور اقبال کا کلام فلسفہ کے باعث عزت کی نگاہ سے دیکھا جاتا ہے، حضرت امجد کے کلام میں یہہ سب کچھ موجود ہے۔

حضرت امجد کی کئی کتابیں شائع ہوچکی ہیں۔

شاعری کے لحاظ سے اس دور کے کئی اور اصحاب بھی قابل ذکر ہیں۔ مثلاً حبیب اللہ وفا، بادشاہ محی الدین مفتون، بدرالدین بسمل، عبدالوہاب عندلیب، سید نوازش علی مست، غیاث الدین (اظہر جنگ) اظہر، وغیرہم

دارالعلوم کا تیسرا دور ۱۳۲۴ھ سے ۱۳۳۷ھ تک قرار پاتا ہے۔ اس دور میں بھی کئی شعرا پیدا ہوئے ہیں مثلاً فرزند علامہ شمسی مرحوم جو عربی میں شعر گوئی کا ملکہ رکھتے تھے، مولوی حسام الدین فاضل مشہور واعظ، عبدالرب کوکب ابذرابن اتابین، ابوالفتح نصر اللہ، ابو نصر فتح اللہ مرحوم فرزندان مولنا احمد مدنی۔

بہرحال شاعری کے لحاظ سے فرزندان دارالعلوم نے جو کچھ کام کیا ہے اس کے لئے ایک خاص مقالہ کی ضرورت ہے۔ اس مضمون میں گنجائش نہیں ہے۔ (باقی)

نصیر الدین ہاشمی

تلاشِ سکوں

مرا سکون یہ دنیائے ہائے ہُو میں نہیں
جہانِ حسن کی امواج رنگ و بُو میں نہیں

نہ جلوۂ سحری میں نہ آفتاب میں ہے
نہ شام میں، نہ شفق میں، نہ ماہتاب میں ہے

نہ سوز و ساز میں نے بربط و رباب میں ہے
جہانِ شعر میں نے کرب و اضطراب میں ہے

نہیں مناظرِ فطرت کی دلنوازی میں
نہیں جہانِ حوادث کی کارسازی میں

ہزار بار لبِ جُو کی سیر کی میں نے
بہارِ سبزۂ و گل میں شراب پی میں نے

طلب کیا کبھی کہسار کی گھٹاؤں سے
کبھی سوال کیا صبح کی ہواؤں سے

عزیز دوست!! خودی میں بھی آکے دیکھ لیا
کبھی تجھے کبھی خود کو بھلا کے دیکھ لیا

چمن چمن میں بہار و خزاں سے پوچھ لیا
کلی کلی سے گل و گلستاں سے پوچھ لیا

زمیں سے مانگ لیا آسماں سے پوچھ لیا
غرض کہ سازؔ نے دونوں جہاں سے پوچھ لیا

مگر سکون اسے کائنات دے نہ سکی!!
تمام شورشِ بزمِ حیات دے نہ سکی!!

مری تلاش پہ اے دوست مسکرائے جا
مرے جنونِ محبت کو آزمائے جا

سمجھ گیا ہو مری جستجو کا حاصل ہے
مری حیات تری آرزو کا حاصل ہے

تری خوشی میں نہاں ہیں مسرتیں میری
سمٹ گئیں تری ہستی میں راحتیں میری

صمد رضوی سازؔ

بچوں کی تعلیم وتربیت (تیسری قسط)

ہر قوم کی ترقی اور نشوونما کا اصلی اور حقیقی سبب اس کے افراد کا دماغی ارتقاء ہے، اسی پر قوم کے عروج اور ترقی کا انحصار ہے
ی قوم میں جوہر قابلیت پیدا کرنے کے لئے ضروری ہے کہ ہر فرد کی خواہ وہ مرد ہو کہ عورت باقاعدہ صحیح اصول پر تعلیم ہو اور اس کے
اق کی صحیح تربیت ہو۔

تعلیم دماغی زندگی کی روح رواں ہے، اس سے دماغ کو غور وخوض کرنے کی عادت اور شوق ہوتی ہے، یہی ایجادات اور اختراعات
بنیاد ہے، اسی سے سوچنے اور سمجھنے کی قابلیت پیدا ہوتی ہے، یہی سرچشمہ ہے ساری کامرانیوں اور مقصد برآریوں کا۔ اگر تعلیم نہ ہو تو
ماغ بھی معطل اور ناکارہ بن جاتا ہے۔ علم انسان کو صحیح معنوں میں "انسان" بناتا ہے اور حسن وقبح کا امتیاز سکھاتا ہے جہالت
اریکی کو دور کرتا ہے، اخلاق وعادات کو سنوارتا ہے، ہماری اخلاقی قوتوں کو ابھارتا ہے اور ہمیں فرض شناس بناتا ہے۔

ایک زمانہ تھا کہ ہم دنیا میں علم، تہذیب اور تمدن کے علم بردار تھے۔ آج ہماری حالت دگرگوں ہے، آج ہم دنیا میں سب سے
دہ پست، سب سے زیادہ کمزور، سب سے زیادہ ذلیل وخوار، سب سے زیادہ بدمعاملہ وناقابل اعتماد اور سب سے زیادہ علم وہنر کے
ج ہیں۔ جو قوم کل ساری دنیا کو درس اصلاح دیتی تھی وہی آج اصلاح طلب ہے۔ یہ صحیح ہے کہ اب ہماری حالت وہ نہیں رہی
ند سال پہلے تھی مگر پھر بھی ہم دوسری اقوام کے مقابلہ میں علمی وعملی میدان میں بہت پیچھے ہیں۔ اس کی وجہ کچھ تو ہماری علم وہنر سے
تنائی اور غفلت ہے اور کچھ ہمارا افلاس ونکبت۔

دنیا میں جن قوموں کی تعمیر یا تخریب ہوتی ہے ان میں ان کی صحیح یا غلط تہذیب کارفرما ہوتی ہے، ہر قوم اپنی تہذیب کے ہاتھوں
تعمیر یا تخریب کا باعث ہوتی ہے اور ہر ملک اپنے تمدن کے بدولت ترقی یا تنزل کا سبب ہوتا ہے، جب کسی قوم کا تمدن اور معاشرت
ی حالت پر قائم نہیں رہتے تو اس قوم کی پستی اور تنزل کے اسباب پیدا ہوتے ہیں۔

دور موسائیت یا عیسائیت کے بہ نسبت اسلام کی تاریخی روایات اپنے اندر زیادہ وزنی نتائج رکھتی ہیں، ان کے عروج وزوال
خارجی اسباب خواہ کچھ ہی کیوں نہ ہوں مگر اس سے انکار نہیں کیا جا سکتا کہ ان کی تخریب کے اصلی اسباب ان کا تمدن اور معاشرت تھے
ب وتمدن صرف قوم ہی کا نہیں بلکہ انسانیت کی عمدہ تکمیل کا جزو اولین ہے، اسی کے ذریعہ سماج کا نظام قائم رہتا ہے اور اسی
جب سوسائٹی کی باقاعدہ تنظیم ہوتی ہے۔ ہم نے جہاں اپنی قدیم روایات کو بھلا دیا وہاں اپنی تہذیب ومعاشرت سے بھی دست بردار
لے اور اپنے تمدن کو بھی خیرباد کہہ دیا۔ یہی اسباب ہیں جو ہماری آئے دن کی تخریب وبربادی کا باعث ہو رہے ہیں۔ آج ہماری
حیثیت ہر پہلو سے گری ہوئی ہے اور ہم چاروں طرف سے ادبار اور فلاکت کی خاردار وادیوں میں گھرے ہوئے ہیں۔ جو قوم اپنے
ل راسخ نہیں ہے اور اپنے ہر کام اور ہر ارادے کو نامکمل وناتمام چھوڑ جاتی ہے یا ابتدائی مراحل طے کئے بغیر منزل مقصود پر پہنچنا چاہتی ہے

وہ کس حد تک اپنے عمل میں کامیاب ہوسکتی ہے اور کس قدر حق رکھتی ہے کہ دنیا کی دوسری زندہ قوموں کے دوش بدوش کھڑی ہو
جس قوم کے کشکول میں دوسروں کی دی ہوئی بھیک ہو، جو غیروں کے ٹکڑے کھانے کی خوگر بن گئی ہو اور جس کو ایا
چسکا پڑ گیا ہو، وہ قوم کہاں تک اپنے قوتِ بازو سے کچھ پیدا کر سکتی ہے! وہ اپنی ساری کوششیں اور قوتیں غیروں کی
صرف کر کے ہاتھ پر ہاتھ رکھے بیٹھی رہتی ہے، جس قوم نے اپنی جیبوں میں ایسے کھوٹے سکے بھر لئے ہیں وہ بازارِ عالم میں
کر سکتی ہے!! ایسی قوم کا مستقبل ظاہر ہے کہ کس قدر شاندار ہوگا!!!

جس کی بہار یہہ ہے پھر اس کی خزاں نہ پوچھ!

کسی قوم کی ترقی اور اصلاح کی بنیاد غلط تقلید اور مہمل نقالی پر نہیں ہے بلکہ صحیح تعلیم اور صحیح عمل پر ہے، ہماری سماج میں
پیدا کرنے کی ضرورت ہے کہ ہر تعلیم صحیح اصول پر ہو اور اچھی نظیر پیش کرے اور ہر دعوی صحیح عمل کے بعد کیا جائے جب تک
انقلاب نہ ہو نہ ہماری آنے والی نسلیں صحیح تعلیم و تربیت پاسکتی ہیں اور نہ ہماری قوم بام ترقی پر پہنچ سکتی ہے۔

بچے قوم کی بنیاد ہیں، اگر بنیاد کی تعمیر مضبوط ہوگئی تو اس پر جو عمارت کھڑی ہوگی وہ نہایت مستحکم اور شاندار ہوگی اور اگر بنیاد
ٹیڑھی ہو تو اس بنیاد پر کھڑی ہونے والی عمارت اور اس کی دیواریں کیوں نہ "تا ثریا" ٹیڑھی جائیں؟ یہی حال ہمارے بچوں کی
تعلیم و تربیت کا ہے غلط اصول پر تعلیم و تربیت پائے ہوئے بچے قوم کی تعمیر کا نہیں "تخریب" کا باعث ہوتے ہیں۔

بچوں کے اخلاق کی تعمیر یا تخریب میں ماں باپ کا بڑا حصہ ہے، انسان میں دو متضاد کیفیتیں پائی جاتی ہیں، ایک طرف تو وہ وال
سے عادات و خصائل، رنگ روغن، صورت شکل اور جسمانی ساخت تک کی میراث لے کر آتا ہے اور دوسری طرف اس کو تعلیم و تربیت
سے عمدہ عادتوں اور اچھی خصلتوں کے اختیار کرنے پر مجبور کیا جاتا ہے، یہہ دونوں باتیں اپنی اپنی جگہ ٹھیک ہیں، جو عادات و خصائل
اپنے والدین سے ورثہ میں لاتا ہے اگر ان کی کامل طور پر تعلیم و تربیت سے اصلاح نہ ہوگی تو ان عادات بد کی شورش تو کچھ ضرور کم ہو جائے
جو اس کی طبیعت میں راسخ ہو چکی ہیں۔

بچوں کے ساتھ برتاؤ کرنے میں والدین سے جو افراط و تفریط سرزد ہوتی ہے وہ بہت کچھ محتاج اصلاح ہے، اولاد کی جسمانی اور
زندگی کی بہتری اور اصلاح کی ذمہ داری زیادہ تر ماں ہوتی ہے جسمانی زندگی سے مراد ہے اولاد کی تندرستی اور توانائی اور "روحانی" سے
اور مذہبی۔ یہہ تب ہی ہوسکتا ہے کہ ماں کو اپنی جسمانی اور روحانی زندگی کے تندرست رکھنے کا خیال ہو، اپنی اور اپنی اولاد کی بھلائی
کے سمجھنے کی اس میں صلاحیت ہو اولاد کا ماں سے جتنا گہرا تعلق ہوتا ہے وہ ظاہر ہے، اس عمیق اختلاط کی وجہہ سے ماں کی خو بو اولاد
اچھی طرح بس جاتی ہے۔ کسی نے بہت سچ کہا ہے کہ بچے کے لئے ماں کی گود اس کا پہلا مکتب ہے اور ماں "معلم اول"۔ بچہ دل و دماغ
لوح سادہ لئے پیدا ہوتا ہے، ماں اس پر نقوش اولین کندہ کرتی ہے۔ یہہ نقوش ممکن ہے کہ تعلیم و تربیت سے کچھ مدھم پڑ جائیں گ
بالکل مٹ نہیں سکتے۔

اولاد کی بہت بڑی ذمہ داری والدین پر یہہ ہے کہ وہ اس کو دین اور دنیا دونوں کے کام کا بنائیں، اگر والدین کو اولاد

اور اپنی ذمہ داریوں کا صحیح احساس ہو تو ان کی نیند حرام ہو جائے مگر ہماری سماج میں اولاد کے حقوق اور والدین کے فرائض کا جو حق
رہا ہے اس کی اگر توضیح و تشریح کی جائے تو ظاہر ہو گا کہ کس حد تک والدین اولاد کو اپنے نمونے دکھاتے ہیں اور اپنی حرکات و سکنات
کی تعلیم دیتے ہیں۔ بیہودہ لاڈ پیار سے، چوچلوں سے، بیجا ناز برداریوں سے ان پر یہہ ثابت کر دیتے ہیں کہ وہ حاکم ہیں اور سب ان کے
ان کی ہر خواہش، خواہ وہ کتنی ہی گراں اور بیجا کیوں نہو، پورا کرنا اپنا فرض سمجھتے ہیں۔ ایسی دیوانی محبت کا لازمی نتیجہ یہہ ہوتا ہے کہ
کی بری عادتیں ہیں سب ہی کا تخم لاڈلی اولاد کی طبیعت میں بویا جاتا اور عمر کے ساتھ ساتھ وہ جڑ پکڑتا، پھوٹتا اور پھولتا پھلتا ہے
لے پالا ڈیپار اور ناز و نعم میں پلنے والے بچے دنیا میں کسی مرض کی دوا نہیں ہوتے۔ بعض والدین بچوں کو ضرورت سے زیادہ اہم بنا دیتے
ان کی ہر ادا اور ہر حرکت پر آمین کہتے ہیں۔ ان کی پرستش کرتے ہیں اور ان کو دنیا کا "آٹھواں عجوبہ" تصور کرتے ہیں۔ ان کی بری
کو یہہ کہہ کر ٹال جاتے اور برداشت کر لیتے ہیں کہ ابھی تو "بچہ" ہے

"آتے آتے آئے گا اُس کو خیال" !

سمجھ آ جائے گی تو خود ہی یہہ بری عادتیں چھوڑ دے گا مگر جب بچہ میں یہہ عادتیں راسخ ہو جاتی ہیں تو پھر ان کا چھوٹنا ایک طرف جہاں
چند عادتیں خراب نہیں وہاں کئی ایک نئی پیدا ہو جاتی ہیں۔

حقیقت یہہ ہے کہ والدین ہی اپنی اولاد کی تخریب کا باعث ہوتے ہیں۔ یا تو وہ خود بری عادات و خصائل کے حامل ہوتے ہیں
کی یہہ عادتیں اولاد میں راسخ ہو جاتی ہیں یا یہہ ہوتا ہے کہ اولاد کتنی ہی بیجا بات کیوں نہ کرے افراط محبت کی وجہہ سے اس کو منع
کرتے بلکہ اپنی ناعاقبت اندیشی سے اس کے ہر فعل پر آمین کہتے ہیں اور اس طرح اولاد کو نکما، خود پسند، ضدی، مسرف اور
آرام کا دلدادہ بنا کر اس کو کسی کام کا نہیں رکھتے۔ نہ دین کا نہ دنیا کا۔ ایسی اولاد کا انجام بہت برا ہوتا ہے، اس کا وجود
تک خاندان ہی نہیں بلکہ ملک و قوم کے لئے باعث ذلت و نکبت ہو کر زمین کی پیٹھ کا بوجھ بن جاتا ہے۔

مرزا سیف علی خاں

حبیب

کالی کالی بدلی چھائی ! — بجلی کوندی برکھا لائی
جانے کس نے روپ دکھایا — آنکھوں میں اک نور سا چھایا
مست ہوا کا جھونکا آیا — باغوں میں غنچوں کو ہنسایا
جنگل میں موروں کو نچایا — جھاڑوں پہ کوئل کو گوایا
خوابیدہ سبزے کو جگایا — منظر بدلا جی گرمایا
ایسے میں وہ یاد جو آئے — بجلی گری اک دل پر ہائے
گلیں ان کی پھر یاد آئیں — نشتر بن کے دل میں سمائیں

دم کے دم میں کایا پلٹی — اف رے دل کی ہو طاجھنی
پھر سے دل میں ہوک اٹھی اک — پھر سے دل کو ٹھیس لگی اک
کاش کہ تم اب آئے ہوتے — سامنے بیٹھے ہنستے ہوتے
ہاں ہاں آؤ جلدی آؤ — دل کو میرے بہلا جاؤ
بیتابی کو کم کر جاؤ — بے چینی کو رم کر جاؤ
چاہت کا پھر راز بتاؤ — مستی کا پھر ساز بجاؤ
پھر وہ پہلا راگ سناؤ — روح کو میری تڑپا جاؤ

سلیمان ادیب

ادارۂ ادبیات اُردو کی مشہور و معروف کتابیں

مرقع سخن
جلد اول
حیدرآباد دکن کے پچیس شعرائے دور
آصفیہ کا باتصویر تذکرہ پچاس سے زیادہ
تصاویر اور چار سو سے زیادہ صفحات
مجلد قیمت صمہ

مرقع سخن
جلد دوم
حیدرآباد دکن کے پچاس دیگر شعرائے
دور آصفیہ کا باتصویر تذکرہ پچاس تصاویر
۴۰۰ صفحات۔
مجلد قیمت صمہ

سراج سخن
انتخاب کلام شاہ سراج اورنگ آبادی
مرتبہ
پروفیسر عبدالقادر سروری
مع سوانح شاہ سراج
صـ ۱۵۲ قیمت ۱۲ر

ایمان سخن
انتخاب کلام شبیر محمد خاں ایمان
مرتبہ
مولوی سید محمد صاحب ام ا
مع سوانح ایمان صفحات
قیمت ۲

فیض سخن
انتخاب کلام حافظ میر شمس الدین محمد فیض
مرتبہ
ڈاکٹر سید محی الدین قادری زور
مع سوانح فیض صـ ۱۴۴ قیمت ۱۲ر

بادۂ سخن
انتخاب کلام ڈاکٹر احمد حسین مائل
مرتبہ
ڈاکٹر سید محی الدین قادری زور
مع سوانح و تصویر صـ ۱۲۸ قیمت ۱۲ر

کیف سخن
انتخاب کلام سید رضی الدین حسن کیفی
مرتبہ
ڈاکٹر سید محی الدین قادری زور
مع سوانح و تصویر صـ ۱۲۲ قیمت ۱۲ر

متاع سخن
انتخاب کلام نواب عزیز یار جنگ
مرتبہ
ڈاکٹر سید محی الدین قادری زور
مع سوانح و تصویر عزیز صـ ۱۲۵
قیمت ۱۲ر

ورڈزورتھ اور اسکی شاعری
مشہور انگریز شاعر کے حالات اور کلام
پر تبصرہ۔ از۔ مولوی میر حسن صاحب
ام اے۔ معہ تصویر شاعر (۱۴۴) صفحات
قیمت صرف عہ ۴ر

ٹیگور اور ان کی شاعری
ہندوستان کے مشہور شاعر رابندرناتھ
ٹیگور کے حالات اور کلام پر تبصرہ۔
از۔ مولوی مخدوم محی الدین صاحب ام اے
مع تصویر شاعر صفحات (۱۴۸)
قیمت عہ ۴ر

یوسف ہندی قید فرنگ میں
مرزا غالب کی قید فرنگ کے حالات
مرتبہ
مولوی محسن بن شبیر صاحب بی اے
ال ال بی۔ صفحات ۸۰
قیمت ۸ر

ہوش کے ناخن (ڈرامہ)
حیدرآباد کی سماجی زندگی کا
مصنفہ
مخدوم محی الدین و میر حسن صاحبان
صفحات ۹۶
قیمت عہ

نذر ولی
ولی اورنگ آبادی کی شاعری کے مختلف
پہلوؤں پر تفصیلی مضامین کا مجموعہ از
لطیف النساء بیگم بی اے۔ نجم النساء بیگم بی اے
نعیم النساء بیگم بی اے۔ جہاں بانو بیگم بی اے
صـ ۲۴۸ قیمت عاں ۸ر

نقد سخن
کلام فانی پر نواب عزیز یار جنگ بہادر
عزیز کی تنقیدوں کا مجموعہ
قیمت عصہ

گریہ و تبسم
صاحبزادہ میکش
کی
نظموں کا مجموعہ
مجلد قیمت
عاں

مشاہیر قندھار دکن
دکن کے مشہور مردم خیز خطہ
دلچسپ باتصویر تاریخ
از
اکبر صدیقی بی۔اے
قیمت عہ

تبصرے

مجلہ نظامیہ مدرسہ نظامیہ حیدرآباد کی ایک قدیم درس گاہ ہے حیدرآباد کے اکثر و بیشتر علما اسی درس گاہ کے ... یافتہ ہیں۔ طلبائے قدیم کی بھی ایک انجمن قائم ہے اور اس کی سرگرمیوں ... ثبوت انجمن کا ماہوار رسالہ "مجلہ نظامیہ" ہے۔ فاضل مدیر کو رسالہ ... ترتیب کا خاص سلیقہ ہے۔ عالمانہ مضامین کے علاوہ رسالہ کی دلچسپی میں ... کے لئے افسانے بھی شائع ہوتے ہیں۔ قلمی معاونین میں طلبائے ... مدرسہ نظامیہ کے علاوہ ہندوستان کے مشہور علما بھی حصہ لیتے ہیں۔ ... یقین ہے کہ انجمن کے زیر سرپرستی یہ رسالہ ترقی کے منازل طے کرے گا۔

رباعیات ... عناصر حکیم محمود خاں صاحب ماہر کی دلکش رباعیوں کا مجموعہ ... رباعی شاعری کی مشکل ترین صنف ہے۔ ہندوستان ... بہت کم شعرا ہیں جو اچھے رباعی گو کہلائے جاتے ہیں۔ ... ماہر کی رباعیوں کے پڑھنے سے ایک سرور کی سی کیفیت طاری ہوتی ہے ... رموز باطنی کو اس خوبی اور سلاست سے پیش کیا ہے کہ ... نکل جاتی ہے۔ یہ پند و نصائح کا گنج بے بہا ہے۔ ... لکھنے کا ایک مقصد کبر و ریا کی دھجیاں اڑانا۔ اور خدائے حقیقی کا ... تلاش کرنا ہے۔ حقایق و معارف کا ایک انمول خزانہ ماہر کی رباعیوں ... ملتا ہے۔

... ظلمت شب میں نور بھرنے والے ‌ ‌ ‌ اے شام بلا کو صبح کرنے والے

... انوار اپنے بھر دے ‌ ‌ ‌ اے چاندنی راتوں میں نکھرنے والے

... اس مجموعہ کے متعلق سچ کہا ہے۔ "یہ کہہ سکتا ہوں کہ میں نے جس رباعی ... والا اسے مطبوع و دل پذیر پایا۔" قیمت عہ (ا۔ق)

ظفر کا سفر حیدرآباد کے ایک نوجوان شاعر جناب زاہد حیدری نے بہادر شاہ ظفر کے قید ہونے پر اپنے دلی تاثرات کو ایک نظم کی ... میں پیش کیا ہے۔ آپ کا کلام ہندوستان کے اکثر جرائد میں طبع ہوتا ... ہے۔ "ظفر کا سفر" آپ کی شاعرانہ صلاحیتوں کا بہترین مظہر ہے۔

ظفر کے قید ہونے کے لمحات اتنے ... انگیز ہیں کہ جب کسی شاعر کے پیش نظر ہوتے ہیں تو اس کا دل تڑپ اٹھتا ہے۔ اس منظر کو اس قدر پر اثر طریقے سے نظم کیا ہے کہ ساری تصویر آنکھوں کے سامنے پھر جاتی ہے۔ لکھائی چھپائی عمدہ اور دیدہ زیب ہے۔ قیمت ۸ ر سب رس کتاب گھر سے مل سکتی ہے۔

جوئبار "ایک نوجوان شاعر کے دل کے تموج، احساسات کی گہرائی، الفاظ کی ہم آہنگی اور موسیقی کے شاعرانہ سنگم کا نام "جوئبار" ہے۔ بھیم سین ظفر ہندوستان کے ان چند نوجوان شاعروں میں سے ہیں جن کی شاعری میں دریا کی سی روانی اور زور رہتا ہے جن کے ہر شعر میں جوانی انگڑائی لیتی رہتی ہے۔

اس مجموعہ میں چند دلکش اور دل پذیر نظموں کے علاوہ غزلیں اور ہندی گیت بھی ہیں۔ غزلوں میں بعض بعض جگہ نظم ہی کا رنگ جھلک جاتا ہے۔ اور کہیں دقیانوسی طرز تغزل آ گیا ہے۔

ظفر کے گیتوں کی خصوصیت حلاوت اور بے ساختگی ہے۔ ذیل کے گیت "سوگ" میں ظفر نے اشعار کے بجائے دل کے ٹکڑے رکھ دئے ہیں۔

کاری بدریا جی تڑپائے
پاپن کویل کوکت جاوے
تم نے آنے کی نہیں ٹھانی
"تمری پریت بڑی نادانی"

کیا جاؤں منتی، تم ہو ایسے
ویسے ناہیں دیکھت جیسے
ہائے مری، کملائی جوانی
"تمری پریت بڑی نادانی"

کتاب اچھی اور واضح۔ مقدمہ جناب ن۔م۔ راشد صاحب ایم اے نے لکھا ہے۔ تعارف احسان دانش صاحب کا ہے۔

صفحات (۹۲) قیمت

ملنے کا پتہ :-

بچوں سے باتیں

یہ سب رس کا گیارھواں شمارہ ہے۔ سال ختم ہونے صرف ایک مہینہ باقی ہے۔ سب رسی بھائیوں اور بہنوں سے توقع ہے کہ [illegible]
سال گذشتہ سب رس کے ساتھ اپنی دلچسپی اور اعانت کا اظہار کیا آئندہ سال بھی اسی طرح ادارہ کا ہاتھ بٹائیں گے۔ سب رس محض علمی و ادبی خدمت
جاری کیا گیا ہے۔ اور اگر اسی طرح آپ کی ہمدردی جاری رہی تو آئندہ سال آپ کا سب رس اور بھی کامیاب ثابت ہوگا۔

اس بات کا اظہار کرتے ہوئے ہمیں بے حد افسوس ہوتا ہے کہ بعض لوگ دوسروں کے مضامین اور نظموں کو اپنے نام سے بھیج دیتے ہیں۔ یہ
ایک اخلاقی کمزوری ہے بلکہ ایک غیر شریفانہ حرکت ہے۔ ایسا کرنے سے بجائے فائدہ کے نقصان ہی پہنچتا ہے۔ اس قسم کے [illegible]
دیکھ کر بے ساختہ زبان سے نکلتا ہے۔ ع

چہ دلاور است دزدے کہ بکف چراغ دارد

ادارہ

پہیلیوں کے صحیح حل (۱) چاند سورج (۲) پستہ (۳) حقہ (۴) گلاب جامن۔ اس مرتبہ صرف سید آصف علی خان
سٹی کالج نے تمام پہیلیاں صحیح حل کیے۔

ایک غلطی والے حل۔ (۱) سید غضنفر علی (سٹی کالج) (۲) صالحہ سید علی جعفری (محبوبیہ گرلز اسکول)

دریاؤں کے نام بتاؤ (۱) بھائی سلیمان جراثیم بہت خطرناک ہوتے ہیں (۲) اچھا دوست کرشن اقبال کون تھا جس کا
تمام ہندوستان ماتم کر رہا ہے (۳) آج بھی ماسٹر صاحب کلاس میں نہیں آئے (۴) میاں حامد [illegible]
ناگپور میں کئی دن رہا ہوں۔

میر محمود علی اکبر [illegible]

لطیفہ

میرے چھوٹے بھائی کے امتحان کا زمانہ تھا ان کی عمر ۸ سال کی ہے۔ امتحان کے دن صبح اٹھے ہاتھ منہ دھویا اور ناشتہ کر کے
مدرسہ گئے ان کے واپس آنے کے بعد میں نے پوچھا کہ امتحان میں تمہارے نمبر زیادہ آئے یا نہیں تو انھوں نے جواب دیا کہ میرے نمبر بہت زیادہ [illegible]
میں نے ان سے دریافت کیا کہ تم کامیاب ہوگئے یا نہیں تو انھوں نے خوش ہو کر ہنستے ہوئے کہا میں کامیاب ہوگیا میں نے ان سے [illegible]
ہونا بہت بری بات ہے۔ اس پر انھوں نے کہا میں فیل ہوگیا۔ توبہ! توبہ!! تم فیل ہوگئے یہ کہہ کر ہم خوب ہنس رہے تھے [illegible]
چہرہ غصہ سے لال ہوگیا۔ آخر میں نے نرم لہجے میں ان سے پوچھا "آخر تم کیا ہوئے" وہ خفا ہو کر بول اٹھے "میں آدھا کامیاب ہوا
آدھا فیل"۔

وقار حسن الدین [illegible]

...ک خیالستان کی سیر

...بھائی جان آج مجھے حسب وعدہ کوئی کہانی قصہ سنائیے کیونکہ
...نے اپنے مدرسہ کا کام جلد ختم کرلیا ہے۔

...کیا سناؤں!! اچھا اگر تم کہو تو اپنا ایک عجیب گردعیپ
...سناتا ہوں۔

...ضرور سنائیے۔

...تو سنو!! "ایک دفعہ میں اور میرا دوست ظفر باغ میں
...رہے تھے اور باتیں کرتے جاتے تھے۔ یکایک ہماری نظر
...ان پر پڑی۔ کیا دیکھتے ہیں کہ دور آسمان پر کوئی چیز اُڑ رہی ہے۔
...جانے دیکھتے رہے۔ چند سکنڈ بعد ایک اڑن کھٹولا ہمارے
...آتا نظر آیا۔ تھوڑی دیر بعد وہ ہم سے قریب ہوگیا اور آخر
...ن پر اترا۔"

...بھائی جان اڑن کھٹولا کیا چیز ہے۔

...اب جس طرح ہوائی جہاز ہے اس طرح قصہ کہانیوں
...اڑن کھٹولا۔ (جس میں بیٹھ کر ہوا میں اڑ سکتے ہیں) ہوتا ہے
...ہوائی جہاز ہی سمجھو۔

...اچھا تو پھر کیا ہوا۔

..." ہاں تو جب وہ زمین پر اترا تو اس میں سے ایک آدمی
...مولی قدوقامت کا اور عجیب و غریب صورت کا نکلا۔ اور ہم کو
...نہ لہجہ میں کہا کہ "اس میں سوار ہو جاؤ" ہم غیر ارادی طور پر
...میں جا بیٹھے اور وہ اڑنے لگا۔ دیکھتے ہی دیکھتے ہم زمین سے
...بلندی پر جا پہونچے میں حیران تھا کہ کہاں جا رہے ہیں۔
...یہ کون شخص ہے جو ہم کو لئے جا رہا ہے۔ اور اس سے
...کی کیا غرض ہے اسی فکر میں تھا کہ مجھے محسوس ہونے لگا
...اتر رہے ہیں کچھ دیر بعد ہم پھر زمین پر تھے سمجھے چلو

خیر گذری تھوڑی سی سیر ہوگئی مگر جونہی ان لوگوں پر نظر پڑی جو
اڑن کھٹولے کو گھیرے کھڑے تھے اور اپنے سردار کی آمد کے منتظر
تھے یعنی وہ شخص جو ہم کو لایا تھا۔ تو ہم بہت پریشان ہوئے۔
ان کے قد تقریباً دس فٹ ہوں گے سرخ چہرے اس پر لمبی ناک
چھوٹی چھوٹی آنکھیں، اونچی پیشانیاں، سرخ کپڑوں میں ملبوس
سیاہ لمبی نوک دار ٹوپیاں پہنے ہوئے تھے۔ مجموعی شکل عجیب
ہیبت ناک تھی۔ وہ اپنی زبان میں سردار سے کچھ باتیں کر رہے تھے
اس کے بعد ہم دونوں کو ساتھ لے کر ایک مکان میں پہنچا گئے یہاں
دوسری منزل پر دو کمرے اور ایک چھوٹا سا جھروکہ کمروں کے سامنے
تھا جہاں سے باہر کی حالت نظر آتی تھی۔ ہمارے کمروں میں ہر ضرورت
کی چیز موجود تھی۔ وقت پر ایک شخص ہمارا کھانا لاکر رکھ جاتا اور کھانے
کے بعد کمرہ صاف کرکے چلا جاتا اور باہر سے قفل لگا جاتا اس کو ہم سے
بات کرنے کا حکم نہ تھا۔ ہم طرح طرح کے سوالات اس سے کرتے
کرتے عاجز آجاتے مگر وہ خاموشی سے اپنا کام ختم کرکے چلا جاتا۔
ان کے سردار سے پھر ملنا نہ ہوا اور اسی کی بے چینی تھی کہ اس سے مل کر
اس قید کا سبب دریافت کرنے کا موقعہ نہ ملا یہاں ہم کو ہر طرح کا
آرام تھا لیکن ہماری آزادی کمروں تک محدود تھی۔ یہی غنیمت ہوا کہ
ہم دو تھے ایک دوسرے سے باتیں کرتے اپنی نوٹ بک پر وہاں کے
لوگوں اور خاص کر ہمارے نئے ملازم کی شکلیں بناتے رہتے تھے۔
اور جھروکے میں بیٹھ کر اطراف کے مناظر سے دل بہلایا کرتے کبھی
خوش ہوتے کبھی اپنی موجودہ حالت پر آنسو بہاتے ابتدا میں جو
خوف ہم کو ہوا تھا اس میں بھی ان کے طرز عمل سے کمی اور کسی قدر
اطمینان ہو گیا تھا کہ ہمارے ساتھ کسی قسم کا ظلم یا زیادتی نہ ہوگی۔
جتنا سوچتے اتنا ہی یہ حل مشکل ہوتا جاتا کہ آخر ہم کو اس طرح سے
لانے اور یہاں رکھنے کی کیا وجہ ہوگی۔ پہلی شب ہماری قریب
قریب بیداری میں گذری کیونکہ ڈر یہی تھا کہ ہم سوتے رہیں اور
یہ آکر ہم کو قتل نہ کردیں۔ جب دو روز جوں توں اچھی یا بری طرح

گذر گئے اور ہماری طبیعت خوف پر غالب آگئی۔ گذشتہ شب بیداری
کی وجہ نیند کا غلبہ ہونے لگا تو دوسری شب ہم دونوں کھانے سے
فارغ ہوتے ہی بے فکری سے سو گئے اور ایسے سوئے کہ صبح جب تک
دھوپ نہ نکلی ہوشیار نہ ہوئے۔ اس قدر آرام کے بعد طبیعت میں چستی
آگئی تھی فوراً اٹھے منھ ہاتھ دھو رہے تھے کہ ہمارا ملازم ناشتہ لے
آیا اپنے کاموں سے جلد فارغ ہوکر ناشتہ کئے ملازم اپنے مقررہ کام
ختم کرکے چلا گیا اور ہم اپنے گھر کی یاد اور والدین اور دوست احباب کے
تذکروں میں وقت گذارنے کے ارادے سے دوسرے کمرے میں جا بیٹھے
کوئی نصف گھنٹہ اس طرح گذرا ہوگا کہ دروازے کے سامنے کچھ لوگوں کے
چلنے کی آواز سنائی دے ابھی ہم ادھر متوجہ ہوئے ہی تھے کہ دروازہ
کھلا اور ان کا سردار جس کے ہم قیدی یا مہمان تھے اور جو ہم کو یہاں
لایا تھا ہمارے سامنے موجود تھا۔ ہم تو اس سے ملنے کی خواہش ہی
رکھتے تھے فوراً کھڑے ہوگئے اور سلام کیا اس نے مسکراہٹ سے سلام کا
جواب دیا اور کہا کہ "بچو! تم حیران ہوں گے کہ میں تم کو کہاں لایا اور
کیوں لایا۔ یہ ملک...... "خیالستان" ہے میں یہاں کا حاکم ہوں۔
اور تم کو چھوڑنے سے پہلے میں ایک تماشا دکھانا چاہتا ہوں تاکہ اس سے
تمھاری اس دو دن کی تکلیف کا معاوضہ ہو جائے۔ آج شام میں تم
اس جھروکے سے دیکھو گے کہ ایک نیک لڑکے کا جلوس گزرے گا۔ اس کے
بعد مقابل کے میدان میں ایک لڑکا لایا جائے گا جو اپنے کئے کی سزا پائے گا۔
جب تم واپس جاؤ تو اوروں کو بتلانا کہ والدین کی نافرمانی، بزرگوں کی
بے ادبی چھوٹوں پر زیادتی جان داروں پر ظلم غریبوں پر سختی۔ جھوٹ۔
مکاری۔ لالچ۔ غصہ۔ جہالت وغیرہ وغیرہ کے کیا نتائج ہیں" یہ کہتے ہوئے
وہ حالتِ غیض و غضب میں کمرے سے باہر چلا گیا اور ہم شام ہونے کا
انتظار کرنے لگے سہ پہر کے بعد ہی سے میں اور ظفر جھروکے میں جا بیٹھے
راستوں پر انتظامات ہو رہے تھے۔ جیسے کسی بادشاہ کی سواری
گذرنے والی ہے۔ سڑکوں پر چھڑکاؤ ہو رہا تھا۔ وہاں کے لوگ جو غالباً
پولیس یا فوجی عہدوں پر ہوں گے وردیاں پہنے زرد صافے باندھے

ہاتھوں میں تلوار لئے انتظامات میں مصروف تھے تھوڑی دیر
دونوں طرف قطاریں استادہ ہوگئیں اور وہی
انسان اس وقت کافی شان دار نظر آرہے تھے
بجا اُدھر سے جلوس آتا دکھائی دیا سامنے مختلف
تھی اس کے بعد ایک لڑکا خوبصورت سے سفید گھوڑے
برق لباس پہنے سر پر ہیرے جواہر کا تاج رکھے آرہا تھا اور
ہمارا معزز میزبان ساتھ تھا۔ کمسن لڑکے حلقہ باندھے درمیان
کو لئے ہاتھوں میں زرد چھوٹی چھوٹی جھنڈیاں لئے
لکھا تھا۔ اطاعت، فرمانبرداری، محبت، ہمدردی
علم، رحم وغیرہ وغیرہ۔ خوش و خرم ہنستے کھیلتے جا رہے تھے۔
دیکھ کر ہم کو اتنی خوشی ہوئی کہ تھوڑی دیر کے لئے ہم بھول گئے
نہیں ہیں اور ایک دوسرے پر اپنی مسرت کا اظہار کرتے گئے
ادھر ہی تھیں جہاں تک ہماری آنکھیں کام دے سکتی تھیں
رہے جونہی یہ سماں نظروں سے غائب ہوا یکایک ہم کو خیال آیا
ایک چیز دیکھنا باقی ہے اس خیال کے آتے ہی سامنے والے میدان
طرف متوجہ ہوگئے، دیکھتے دیکھتے شام ختم ہونے آئی اندھیرا
بیٹھے رہے یکایک ایک شور سا اٹھا دیکھتے کیا ہیں کہ ایک تخت بچھا
جس پر حاکمِ "خیالستان" رونق افروز ہیں لوگوں کے ہجوم سے میدان
بھرا ہوا ہے تخت کے سامنے دو شخص ایک لڑکے کو
چیختا چلاتا اس طرح آتا ہے کہ ہاتھ پیر زنجیروں سے بندھے
اٹھانا مشکل ہے جسم تمام زخموں سے چور ہے ننگے سر ننگے پیر
پہنے کھڑا سردی سے کانپ رہا ہے چونکہ اندھیرا ہوگیا تھا اس
چار چھ لوگ اس کے قریب ہی مشعل لئے ہوئے کھڑے تھے پہلے
بڑی دیر تک اس سے کچھ کہا جس کو ہم سن نہ سکے غالباً اس
اور عادات و اطوار کی تفصیل تھی پھر ان دونوں کو اشارہ کیا
لائے تھے اور پکڑے ہوئے تھے حکم کی دیر تھی کہ دونوں کے ہاتھ

[بستر] جس میں ایک ایک انچ موٹی لوہے کی چھڑیاں تھیں اور اس زور سے اس غریب پر پڑیں کہ وہ بلبلا اٹھا اور اس منظر کو دیکھنے کے بعد کچھ اور دیکھنے کی "تاب" نہ رہی اور منھ سے ایک چیخ نکل ہی گئی اور ساتھ ہی آنکھ کھل گئی۔ میری چیخ سے جتنے لوگ اس جگہ موجود تھے پریشان ہو کر میرے پلنگ کے گرد جمع ہو گئے۔ جب میرے حواس ٹھکانے ہوئے تو سمجھ میں آیا کہ ؎

"خواب تھا جو کچھ کہ دیکھا
جو سنا افسانہ تھا"

حمید۔۔۔۔۔ "بھائی جان! آپ نے کمال ہی کر دیا بچوں کو نصیحت کرنے کا اچھا طریقہ ہاتھ آیا۔"

معین الدین احمد انصاری

باغ کی سیر

ہوا دن گئی رات تاروں بھری
زمانے میں پھیلی ہے اب روشنی

اٹھو بس بہت سو چکے بھائی جاں
سحر کا تو دیکھو سہانا سماں

مرے ساتھ اب باغ چلئے ذرا
سویرے ہی کچھ سیر کا ہے مزا

اہا ہا ذرا دیکھئے تو بہار
ہے کیا ننھی ننھی سی پڑتی پھوار

کھلے خوش نما پھول ہیں جا بجا
ہے خوشبو سے سب باغ مہکا ہوا

یہ بیلے کے پودوں کی دیکھو قطار
ذرا موتیا کی تو دیکھو بہار

ہر اک سو ہیں پودے لدے پھول سے
انھیں دیکھ کر دل نہ کیوں کر کھلے

کہیں آم ہے اور کہیں ہے انار
کسی جا ہے نارنگیوں کی بہار

کہیں پھول ہیں اور کہیں پھل لگے
درخت اور پودے سبھی ہیں لدے

ہزاروں ہیں قدرت کے جلوے بہم
خدا کا کریں شکر پھر کیوں نہ ہم

لطیف النساء بیگم

براعظم و بحراعظم

تم کو معلوم ہے کہ دنیا میں خشکی اور تری کے دو حصے ہیں۔ خشکی کا حصہ کل زمین کا ایک چوتھائی ہے اور تری کا تین چوتھائی۔
ظاہر ہے کہ خشکی کا حصہ تری کے مقابلے میں بہت چھوٹا ہے۔ خشکی کے بہت بڑے حصے کو براعظم کہتے ہیں۔ اس کے لفظی
بر یعنی خشکی اور اعظم یعنی بڑا۔ دنیا میں چھ براعظم ہیں جن کے نام یہ ہیں۔

براعظم ایشیا۔ یہ دنیا کا سب سے بڑا براعظم ہے۔ اس براعظم کو دوسرے براعظموں پر کئی طریقے سے بڑائی حاصل ہے۔ دنیا کا سب سے
بلند پہاڑ ہمالیہ یہیں ہے۔ سطح مرتفع پامیر جو "دنیا کی چھت" کہلاتا ہے اسی براعظم میں ہے۔ اس کے شمالی حصے میں بہت سردی پڑتی ہے
اس لئے وہ ہمیشہ برف سے ڈھکا رہتا ہے۔ اور جنوبی حصے میں بہت گرمی ہوتی ہے۔ اس لئے اس میں ایک بڑا ریگستان ہے۔ اس کے
شمال میں ایک حصہ ایسا ہے جہاں چھ مہینے دن اور چھ مہینے رات رہتی ہے۔ یہی وہ براعظم ہے جس کی گود میں دنیا کے بڑے بڑے
اور دھرم پیدا ہوئے۔ یہیں ہندوؤں کے اوتار اور مسلمانوں اور عیسائیوں کے پیغمبروں نے جنم لیا۔ جب دنیا کے دوسرے براعظموں
میں وحشی قومیں بستی تھیں اس وقت یہ براعظم تہذیب سے مالامال تھا۔ یہیں سے دنیا میں تہذیب پھیلی۔ اسی براعظم کے جنوب میں
ہمارا پیارا ملک ہندوستان ہے۔ جس کے جنوب یا دکھن میں ہماری شان دار ریاست حیدرآباد ہے۔ اس لئے یہ ہمارا اپنا براعظم ہے۔

شمالی اور جنوبی امریکہ۔ سب سے پہلے امریگو ویسپوچی نے یورپ کے مغرب میں ایک بڑا براعظم معلوم کیا تو وہ براعظم اسی شخص کے نام پر
امریکہ کہلانے لگا۔ اس وقت سے یہاں اسپین والوں کی حکومت قائم ہوئی۔ لیکن ۱۲ اکتوبر ۱۴۹۲ء میں کرسٹوفر کولمبس نے اس براعظم سے
ملا ہوا شمال میں ایک اور براعظم معلوم کیا تو اس کا نام بھی امریکہ پڑ گیا۔ چونکہ یہ براعظم شمال میں تھا۔ اس لئے شمالی امریکہ اور جو جنوب
میں تھا وہ جنوبی امریکہ کہلانے لگا۔ جب یورپ والوں کو پہلی دفعہ ان براعظموں کی کیفیت معلوم ہوئی تو وہ ان کو نئی دنیا کہنے لگے۔
آج تک ان کو نئی دنیا بھی کہتے ہیں۔

چوتھا براعظم آفریقہ ہے۔ یہ براعظم ہمارے ملک یعنی ہندوستان سے قریب قریب سات گنا بڑا ہے۔ یہی دنیا کا سب سے گرم
براعظم ہے۔ یہاں کے رہنے والے بونے کہلاتے ہیں۔ ان کا قد چھوٹا، رنگ کالا اور بال گھنگروالے ہوتے ہیں۔ اس براعظم کے
بیچوں بیچ بہت گھنے جنگل ہیں۔ سورج کی روشنی ان درختوں کے پتوں میں سے ہو کر زمین تک نہیں پہنچ سکتی۔ یہی وہ براعظم ہے جہاں
بن مانس یعنی جنگل کے انسان پائے جاتے ہیں۔ یہی خونخوار شیر اور خطرناک سانپوں کا گھر ہے۔

اس براعظم کو تو آج کل یورپ والوں نے آپس میں بانٹ لیا ہے اور اس پر حکومت کرتے ہیں۔ اس میں صرف حبش کی ایک دیسی خود مختار
ریاست رہ گئی تھی جس کو حال ہی میں اٹلی والوں نے فتح کرلیا۔ ملک اٹلی براعظم یورپ کے جنوب یا دکھن میں ہے۔ اب افریقہ میں کوئی
آزاد دیسی ریاست نہیں ہے۔

پانچواں براعظم یورپ ہے۔ یہ براعظم ایشیا کے براعظم سے ملا ہوا ہے۔ اسی لئے ان دونوں کو یوریشیا بھی کہتے ہیں۔ یہاں کے
رہنے والوں نے تھوڑے ہی عرصے میں بہت ترقی کی ہے۔ اسی میں انگلستان، جرمنی، اٹلی اور روس جیسے طاقتور ملک ہیں

بب گیس — نومبر ۱۹۳۷ء

یورپ والوں کی حکومت دنیا کے بہت بڑے حصے پر ہے۔ یہاں کے رہنے والے جتنے بہادر ہیں اتنے ہی قابل بھی ہیں۔ ان میں حب الوطنی کوٹ کوٹ کر بھری ہے۔ اپنے ملک کی آن کے مقابلے میں سارے دنیا کی دولت کو ہیچ سمجھتے ہیں۔ ان کی قابلیت کا اندازہ اس سے ہو سکتا ہے کہ ہوائی جہاز، ریڈیو، ٹیلیفون وغیرہ انھیں کی نکالی ہوئی ہیں۔ جس طرح دنیا کو سنوارنے کی چیزیں یہیں سے ایجاد ہوئیں اسی طرح اس کو برباد کرنے کی اشیا بھی یہیں بنائے گئے۔ ان میں سے ذکر کے قابل بب، گیس، بڑی بڑی توپیں، تارپیڈو وغیرہ ہیں۔

چھٹا اور سب سے چھوٹا براعظم آسٹریلیا ہے۔ یہ براعظم دوسرے براعظموں سے بہت دور ایشیا کے جنوب مشرق میں ہے۔ سب سے پہلے یورپ کے ایک ملک ہالینڈ کے چند سیاحوں نے اس براعظم کو دریافت کیا۔ وہ لوگ جو دور دراز کا سفر کرتے ہیں سیاح کہلاتے ہیں۔ تھامس کک سب سے پہلا سیاح ہے جس نے آسٹریلیا پر انگریزوں کا جھنڈا لہرایا۔ انگریز اپنے جھنڈے کو یونین جیک کہتے ہیں۔ اس طرح انگریزوں نے آسٹریلیا کو اپنا کر لیا۔

پہلے پہل اتنے دور دراز کے فاصلے پر کوئی بسنے کو تیار نہیں تھے۔ تو حکومت نے مجبور ہو کر اس کو بسانے کے لیے سب سے پہلے قیدیوں کو بھیجا۔ ان کی حفاظت اور ملک کی نگرانی کے لئے کچھ فوج اور کچھ پولیس مقرر کی۔ بعض لوگوں نے جو اپنے وطن میں اپنا پیٹ تک نہیں پال سکتے تھے۔ یہاں آکر دوکانیں لگالیں۔ بہرحال یہاں زیادہ تر قیدی ہی بسنے تھے۔ لیکن ایک دن بعض لوگوں کو ایک ندی کے کنارے سونا نظر آیا۔ اب کیا تھا ہر ایک آدمی سونا بٹورنے کے لئے وہیں آن پہنچا۔ نہ اب پولیس والوں کو قیدیوں کی نگرانی کا خیال رہا اور نہ قیدیوں کو پولیس کا خوف۔ دوکان دار اپنی دوکانوں چھوڑ سونا بٹورنے لگے۔ آگے چل کر یہ لوگ بہت مال دار ہو گئے۔ اب یہ لوگ نہ پولیس والے رہے اور نہ قیدی بلکہ ان کا شمار ملک کے رئیسوں میں ہونے لگا۔ جب اس کی خبر ولایت پہنچی تو لاکھوں آدمی امیر بننے کے لالچ میں یہاں آئے اور بس گئے۔ اس طرح یہ براعظم آباد ہوا۔ جن مقامات کی آب و ہوا اچھی ہے وہاں یہ لوگ آباد ہو گئے اور اصلی لوگوں کو اس طرف بھگا دیا جہاں کی آب و ہوا صحت کے لئے نہایت خراب ہے۔ اسی لئے تو ان کی آبادی بہت کم ہو رہی ہے۔ اور اب تو گھٹ گھٹا کر ساٹھ ہزار رہ گئی ہے۔ آج کل سارے براعظم پر انگریزوں کا راج ہے۔

بحر اعظم۔ جس طرح خشکی کے بڑے حصے ہیں اسی طرح تری کے بھی بڑے حصے ہیں۔ تری کے بڑے حصوں کو بحر کہتے ہیں۔ کل بحر پانچ ہیں۔

بحرالکاہل سب سے بڑا بحر ہے۔ اس کا رقبہ تمام براعظموں کے رقبے سے بھی زیادہ ہے۔ اگر تمام براعظموں کو ایک جگہ کیا جائے تو بحرالکاہل ان سب سے بڑا ہے۔ اگر دنیا کا سب سے بلند پہاڑ ہمالیہ براعظم ایشیا میں ہے تو سب سے زیادہ گہرائی بحرالکاہل میں ہے۔ ایک جگہ تو اس کی گہرائی چھ میل تک پہنچ گئی ہے۔ یہ بحر براعظم ایشیا، آسٹریلیا اور شمالی اور جنوبی امریکہ کے درمیان ہے۔ دوسرا بڑا بحر بحراوقیانوس ہے۔ اس کے مشرق میں یورپ و آفریقہ کے براعظم اور مغرب میں شمالی اور جنوبی امریکہ کے براعظم ہیں۔ سب سے زیادہ جہاز بحراوقیانوس میں چلتے ہیں۔ اتنے جہاز کسی اور بحر میں نہیں چلتے۔ اس میں بعض جگہ اتنی مچھلیاں پکڑی جاتی ہیں کہ اس سے لاکھوں آدمیوں کا پیٹ پلتا ہے۔ ان مچھلیوں کو ڈبوں میں بند کر کے دور دراز ملکوں کو بھیجتے ہیں۔

بحر ہند۔ یہ ہمارا اپنا بحر ہے۔ یہ بحر ہمارے ملک ہندوستان کے جنوب میں ہے۔ اسی لئے اس کو بحر ہند کہتے ہیں۔ ہر سال اس بحر سے ہوائیں اٹھ کر ہندوستان کی طرف آتی ہیں جن سے خوب بارش ہوتی ہے۔ یہ ہوائیں چونکہ خاص موسم میں آتی ہیں اس لئے موسمی ہوائیں کہلاتی ہیں۔ انھیں کی وجہ سے ہندوستان نہایت زرخیز ہو گیا ہے۔

بحر منجمد شمالی تمام خشکی کے علاقوں کے شمال میں ہے۔ یہاں سردی بہت ہوتی ہے۔ اسی لئے یہ قریب قریب سال بھر یعنی اس کا پانی سردی سے جم جاتا ہے۔ اور جب گرمی میں کچھ برف پگلتی ہے تو برف کے بڑے بڑے تودے پانی کے ساتھ بہتے بعض دفعہ پانی کے اوپر نظر آتے ہیں اور بعض دفعہ پانی میں نیچے رہتے ہیں اور نظر نہیں آتے۔ یہ بڑے خطرناک ہوتے ہیں ایک بڑا جہاز ایسے ہی برف کے ایک بڑے تودے سے ٹکرا گیا اور ٹوٹ کر ڈوب گیا۔ اس میں جو مسافر تھے وہ بھی ڈوب گئے۔
بحر منجمد جنوبی۔ یہ بحر قطب جنوبی کے اطراف پھیلا ہوا ہے۔ بحر منجمد شمالی کے مانند یہاں بھی سردی زیادہ ہوتی ہے۔ اس لئے اس کا پانی بھی جم جاتا ہے۔

جی ایس جہاں

صبح کا وقت

سورج نکلا گیا اندھیرا — باقی نہیں اب کوئی تارا
دہقاں اپنے ہل کو سنبھالا — بیلوں کو کچھ گھاس بھی ڈالا
بیلوں کو اور ہل کو لے کر — سیدھا اپنے کھیت کو جا کر
جوتے گا وہ کھیت کو اپنے — بوئے گا کچھ کھیت میں اپنے
باغ میں ہر سو بلبل چہکے — بلبل چہکے پھول بھی مہکے
کیسا اچھا وقت سہانا — بول رہی ہے باغ میں مینا
اٹھو شمیم اب تم بھی اٹھو — اٹھ کر اپنے منہ کو دھو لو
ہم بھی چلو اب باغ کو جائیں — باغ سے خوش خوش گھر کو آئیں
پھر گھر آ کر کھانا کھائیں — کھانا کھا کر پڑھنے جائیں
پڑھ کر خوش خوش گھر کو آئیں — نیا سبق ابا کو سنائیں

ابا بھی خوش ہو کے کہیں گے
بچے ہیں یہ کیسے اچھے

میر محمود علی اکبر مشیہ

"بیٹا بھاگی جاؤ روئیاں چھپی جائیں"

ایک لداف تھا روئی دھنک کر اپنی بسر اوقات کرتا۔ جب وہ روئی دھنکنے بیٹھتا تھا تو ایک چھوٹی سی چھپا نکل کر آتی اور ادھر ادھر پھدکتی پھرتی یہ اس سے کہا کرتا "بیٹا بھاگی جاؤ روئیاں چھپی جائیں"۔

اس ملک کا شہزادہ روز اس طرف سے گذرتا تھا اور روز یہ صدا سنا کرتا ایک دن اس کے دل میں خیال ہوا کہ لداف کی لڑکی کتنی حسین اور نازک اندام نہ ہوگی کہ جس کے روئی کا روئگٹا چبھتا ہے اگر اس حسن و نزاکت کی مجسمہ سے رشتہ ہو جائے تو زہے قسمت طالع۔ اسی دھن میں اس نے تمام شام بسر کی اور سیر و تفریح سے جب گھر واپس لوٹا تو اٹوائی کھٹوائی لے کر پڑ گیا۔ بادشاہ نے ہرچند پوچھا کہ "بیٹا کیا بات ہے؟ کیوں سست ہو؟ یہ کیا حالت بنا رکھی ہے" لیکن وہاں ایک چپ تھی اور ہزار چپ۔ بادشاہ نے سمجھایا بتاؤ کیا واقعہ ہے کسی نے اگر آنکھ دکھائی ہو تو اس کی آنکھ نکلوا ڈالوں کسی نے انگلی اٹھائی ہو تو اس کی انگلی کٹوا دوں"۔

جب بادشاہ نے بہت اصرار کیا تو شہزادے نے کہا کہ "باواجان میری شادی لداف کی بیٹی سے کرنے کا وعدہ کیجئے تو میں اٹھوں گا بھی اور کھانا بھی کھاؤں گا ورنہ مجھے یونہیں رہنے دیجئے۔

بادشاہ نے کہا بیٹا یہ کتنی بڑی بات ہے لداف غریب تمہارے گھر کا غلام تمہارے در کا بھکاری اس کو کچھ روپئے پیسے دیدوں گا اور اس کی لڑکی سے تمہارا بیاہ کر دوں گا۔ شہزادہ فوراً اٹھ بیٹھا اور کھا پی کر پھر اپنے کام کاج میں بدستور مشغول ہو گیا۔

ادھر بادشاہ نے لداف کے گھر پیام بھیجا لداف نے کہا "خداوند عالم جان بخشئے تو کچھ عرض کروں" بادشاہ نے کہا "بول کیا کہنا ہے" لداف نے عرض کی کہ "جہاں پناہ میرے نہ آل ہے نہ اولاد اور جب اولاد ہی نہیں تو شہزادہ کو لڑکی کہاں سے لاکر دوں گا۔ اس خواہش کو پورا کرنا میرے امکان میں نہیں" بادشاہ نے نہ مانا اور کہا کہ ضرور تیرے بیٹی ہے لیکن تو چھپاتا ہے تجھے شہزادے کو اپنی لڑکی کسی صورت بیاہنی ہوگا"۔

لداف مجبور ہو گیا اور چار و ناچار اس حکم کی تعمیل کے لئے راضی ہونا پڑا۔ کچھ دیر سوچ کر اس نے کہا "بارگاہ جہاں پناہی میں ایک عرض گذارش ہے۔ سرکار کا حکم یہی ہے تو میں بسر و چشم قبول کرنے آمادہ ہوں۔ لیکن میری ایک شرط ہے اس کو شرف منظوری عطا ہو" بادشاہ نے کہا "بتا کیا شرط ہے" لداف بولا "حضور کوئی رسم میں نہیں کروں گا۔ نہ مانجھ ہو نہ ساچق نہ مہندی نہ جلوہ دولہا آئے اور دلہن کو نکاح پڑھوا کر میانے میں سوار کروا کے لے جائے۔

بادشاہ نے لداف کے تمام شرائط قبول کر لئے اور دن تاریخ مقرر کر کے بڑے تزک و احتشام سے بیاہنے چلے۔ لداف نے چھپا پکڑ رکھی تھی بعد نکاح کے اس کو میانہ کے اندر چھوڑ دیا۔ جب بادشاہ کے محل سرا میں برات پہنچی اور میانہ دروازہ پر لگایا گیا تو چوہیا میانے کے دروازہ کی دڑاڑ سے نکل کر بھاگ گئی۔ قریب میں ایک گھاس کی گری تھی جس میں جا کر چھپ رہی۔ شہزادے نے جب دلہن کے اتارنے کو میانے کا دروازہ ہٹایا تو اس کو خالی پایا۔

محل میں ایک کھلبلی مچ گئی فوراً لداف کے گھر آدمی گئے اور اس کو پکڑ لائے۔ دھوکا دینے کے جرم پر سولی کا حکم ہوا
"خداوند عالم آپ کے عدل اور انصاف کا زمانے میں شہرہ ہے۔ میری بھی کچھ سن لیجیے۔ میں نے پہلے ہی عرض کیا تھا کہ میرے
اولاد نہیں آپ اس بارے میں خود دریافت کروا سکتے ہیں۔ البتہ مرے گھر ایک چوہیا آیا کرتی تھی اور جب میں
وہ ادھر ادھر دوڑی پھرتی ہیں اس سے کہا کرتا بٹیا بھاگ جاؤ روٹیاں چھپی جائیں" میں نے ہر چند آپ سے کہا کہ میرے
آپ نے نہ مانا اور آپ کے اصرار پر میں نے مجبور ہو کر یہ شرائط پیش کیے اور نکاح کے بعد اس چوہیا کو جو میری منہ بولی بیٹی تھی
اب وہ کہیں بھاگ گئی ہوگی۔

شہزادے نے کہا یہ سچ کہتا ہے اس کا کوئی قصور نہیں میری قسمت کے لکھے کو وہ کیا کرے اس کو چھوڑوا دیا جائے۔ چنانچہ
چھوڑ دیا گیا۔

اب شہزادہ بیچارہ سست و غمگین رہنے لگا۔ اس کا دل کسی چیز میں نہ لگتا تھا دن رات اپنی خیالی محبوبہ کے تصور میں
کھانا، پینا، نیند، چین سب اس کے لئے حرام ہو گئے۔ باپ کے خیال سے کہ اپنی حالت دیکھ کر انہیں رنج و صدمہ ہوگا رات
نہ کھاتا بلکہ اپنے کمرہ میں منگوا لیا کرتا۔ لیکن یہاں کھایا کس سے جاتا تھا!

ادھر چوہیا کا حال سنئے۔ یہ تھی اصل میں پری زاد۔ اس کو ایک جادوگرنی نے چوہیا بنا رکھا تھا۔ جب شہزادہ
سو جاتا تو وہ اسی اصلی حالت میں آتی کھاپی کر صبح ہوتے ہوتے چلی جاتی۔ شہزادہ جب صبح اٹھتا تو دیکھتا تھا کہ خاصہ جو رات
اس کے لئے لاکر رکھا جاتا ہے سب غائب ہو جایا کرتا ہے۔ کسی سے پوچھ بھی نہ سکتا تھا کیونکہ پوچھنے میں خود اپنے نہ کھانے کا
اسی سوچ بچار میں کچھ دن گذر گئے۔ آخر شہزادے نے دل میں ٹھانی کہ اس چور کو پکڑیں جو روز اس دیدہ دلیری سے
کمرہ میں آکر کھانا کھا جایا کرتا ہے۔

یہ سوچ کر اس نے ایک رات بستر پر پڑے پڑے اس چور کا انتظار کیا۔ لیکن گیارہ بجے کا عمل ہوگا کہ اس کو نیند سی محسوس ہوئی
وہ سو رہا۔ دوسرے دن اس نے مصمم ارادہ کیا کہ آج تو ہرگز نہ سوؤں گا لیکن پھر اس پر نیند غالب آگئی۔ تیسرے دن اس نے انگلی
کاٹ کر اس میں مرچ بھر دی اور بچھونے پر لیٹ رہا۔ تکلیف کے مارے اسے نیند نہ آئی بارہ بجے رات کو کیا دیکھتا ہے کہ ایک پری
چندے آفتاب چندے ماہتاب آہستہ سے کمرہ میں داخل ہوئی یہ اس کے حسن و جمال پر سو جان سے فدا ہو گیا لیکن خاموش
پڑا اس کو ٹکٹکی باندھے دیکھتا رہا۔

جب یہ کھانا کھاپی کر فارغ ہو گئی اور پان کا بیڑا اٹھانے کے لئے ہاتھ بڑھایا تو شہزادہ جھٹ سے اٹھ بیٹھا اور دوڑ کر اس کا ہاتھ
پکڑ لیا کہ بتا تو کون ہے؟ کیوں آتی ہے؟ اور میرا کھانا کیوں کھا جایا کرتی ہے۔" اس نے جواب دیا کہ "میں وہی چوہیا ہوں تمہاری
دن بھر گھاس کی گری میں چھپی رہتی ہوں رات میں بھیس بدل کر آتی ہوں۔ یہاں عمدہ عمدہ کھانے چنے ہوتے ہیں۔ دن بھر کی بھوکی
ہوں خوب پیٹ بھر کے کھا جاتی ہوں۔"

شہزادہ اس کے پاؤں پر گر پڑا اور منت سماجت کی کہ اب مجھے چھوڑ کر نہ جانا۔ اول تو تمہارا نادیدہ عاشق تھا لیکن اب تم پر
جان نثار کرتا ہوں۔ تمہارے بغیر میں زندہ نہیں رہ سکتا۔ اپنے رحم و کرم سے مجھے محروم نہ کرو" اس نے کہا کہ "تم اطمینان رکھو

اریں جا ابھی جا ہوں تو نہیں جا سکتی۔ تم نے جس گھڑی مجھے دیکھ لیا میرا جادو ٹوٹ گیا" شہزادہ باغ باغ ہو گیا اس کا
غم اب انتہائی خوشی سے مبدل ہو گیا۔ صبح بادشاہ کو خبر ہوئی تو وہ بھی نہایت خوش ہوا تمام شہر میں خوشیاں منائی گئیں۔
ن کو زر و جواہر سے مالا مال کیا گیا۔ اس کے لئے بادشاہ نے ایک عمدہ مکان بنوا دیا جس میں وہ اپنی بقیہ عمر راحت و آرام سے
رنے لگا۔ منہ بولی بٹیا اس کو بیٹیوں سے بڑھ کر چاہنے لگی اور یہ بھی اسے بہت پیار کرتا۔

ادھر شہزادہ اور چوہیا کی جو اب ایک نہایت خوبصورت لڑکی تھی بڑی دھوم دھام سے از سر نو شادی رچائی گئی۔ خوب ناچ
ہوا۔ دعوتیں منائی گئیں اور تمام ملک میں خیر خیرات تقسیم ہوئی بادشاہ نے بیٹے کو تخت و تاج دے دیا اور خود اس سے
ت بردار ہو گئے اور بیٹے بہو کے ساتھ ہنسی خوشی سے رہنے لگے۔

سکینہ بیگم

رسات اور کسان

وہ زمانہ ختم ہو جاتا ہے جب کہ گرمی سے انسان، حیوان اور نباتات پریشان اور افسردہ تھے اور تمام جنگل چٹیل، درخت بے رونق
کھیت ویران پڑے ہوئے تھے۔ چرند، پرند، درند غرض تمام جاندار گرمی سے بے تاب ہو کر تڑپتے تھے اور موسم باراں کے سختی سے
منتظر تھے۔

دیکھئے اپنی مخلوق کو جاں بہ لب دیکھ کر رحمت باری جوش میں آئی آسمان پر کالے کالے بادل منڈلانے لگے۔ آفتاب جہاں تاب نے
سارے عالم پر اپنی طاقت اور حرارت کا سکہ جمائے ہوئے تھا شکست مان لی اور شرمندگی سے اپنے چہرہ کو ابر کے پردوں میں چھپا لیا بجلیاں
آفتاب کی شکست فاش اور غرور کا سر نیچا ہوتے دیکھ کر مسکرانے لگیں۔ بادل بھی گرجنے لگے۔ اور زور و شور سے بارش کی آمد کا
آغاز ہوتا ہے۔ پیاسی زمین سیراب ہوتی ہے۔ مرغابیاں خوشی خوشی تالابوں پر جمع ہوتی ہیں۔ ندی نالے زوروں پر بہنے لگتے ہیں۔
بجلی کی چمک بادلوں کی گرج اور کالے کالے ابر کے ٹکڑوں کا منڈلانا کیا بھلا معلوم ہوتا ہے۔ جب بجلی چمکتی ہے تو کم سن بچے اپنے والدین کی
گود میں پناہ لیتے ہیں۔ کالی کالی راتوں میں جگنوؤں کا تاروں کی طرح چمکتے اور اڑتے پھرنا بہت ہی بھلا معلوم ہوتا ہے۔ مینڈک وہ
شور برپا کرتے ہیں کہ کان پڑی آواز سنائی نہیں دیتی۔

لیکن ان سب سے زیادہ حسین منظر کسانوں کا ہوتا ہے غریب بیچارے سب سے زیادہ بارش کے منتظر تھے اور بارش کے لئے
دعائیں مانگتے تھے اب وہ اپنی دعا کو بارگاہ ایزدی میں مقبول دیکھ کر خوشی سے پھولے نہیں سماتے ہیں اور رحمت باری تعالیٰ کے شکور
یہ بارش ان کے حق میں مال و دولت کی بارش امیدوں اور ارمانوں کی بارش ہے۔ یہی بارش ان کے مغموم اور بیکس دلوں کو
خوشی اور شادمانی بخشتی ہے اور یہی بارش ان کے مایوس اور افسردہ چہروں پر خوشی اور مسرت کی لہریں دوڑاتی ہے۔

یا خدا وہ کتنے خوش ہوتے ہیں تیری بارش کے ہر ایک قطرے سے ـــــ میں نے دیکھا اور خوب دیکھا ہے جب کہ پھوار
پڑ رہی تھی ـــ وہ خوشی سے دیوانے تھے اور ایسی ایسی حرکتیں کرتے تھے جیسے کوئی شخص اپنی حیثیت سے زیادہ مال و دولت
کرتا ہے۔

سچ ہے وہ قابل رحم ہیں۔ وہ محنت کرکے روزی کماتے ہیں۔ سال بھر پسینہ بہانے کے بعد بھی ان کو پیٹ بھر کپڑا میسر نہیں ہوتا۔ لیکن وہ محنت و مشقت کرکے اور اپنا خون پسینہ ایک کرکے دوسروں کے لئے عیش و آرام کے سامان ... آہ! وہ کس مشقت سے دن بھر ہل چلاتے ہیں ـــ پیٹ میں غذا ہے نہ تن پر کپڑا مگر اسی میں مست ہیں اور ... وہ اپنے کھیت کی مٹی کے ڈھیلوں کو اپنے لئے لعل و زر سمجھتے ہیں ؎

کیوں نہ اپنے کھیت کی مٹی کو سمجھیں لعل و زر
زندگانی جب کہ سب کی ہو اسی پر منحصر
متین

بڑے بڑے محلوں میں بیٹھ کر اور رات دن عیش و عشرت میں زندگی گذار دینے والوں کو کیا معلوم کہ ان پر کیا گذرتی ہو... دھوپ ہے۔ پانی ہے۔ سردی ہے۔ سب قسم کی تکلیفیں سہتا ہے اور خدا کی مرضی پر خوش ہے ـــ کمبل اوڑھے ہوئے ... سخت سردیوں کا مقابلہ کرتا ہے اور اپنے کھیتوں کی رکھوالی کرتا ہے ـــ غور کرو اور خوب غور کرو وہ وقت جب کہ ہر انسان ... اپنے اپنے بستروں پر مزے کی نیند سوتا رہتا ہے اور صرف انسان ہی نہیں بلکہ ہر ایک حیوان بھی آرام لیتا ہے لیکن کیا ... غریب ہی ان حیوانوں سے بدتر ہیں ؟

ہائے ہم کتنے ظالم ہوتے جارہے ہیں ہمیں ان کی اس حالت پر کبھی رحم نہیں آتا۔ بجائے ان پر رحم کرنے کے سختیاں کرتے ہیں ... ذرا چلو ایک دن ہم بھی کسانوں کی طرح محنت کرکے دیکھیں اس کے بعد ہمیں بخوبی معلوم ہو سکتا ہے کہ غریب کس طرح ... بسر کرتے ہیں ـــ آؤ آج ہم سب مل کر آپس میں اتفاق کریں کہ غریبوں کی مدد کریں گے اور ان کے لئے دعا کریں گے کہ ... ان کو ان کی ضرورت کے موافق بارش دے۔

محمد مسیح الدین خاں متین

بارش

"ننھا"

دیکھو ابا! پانی آیا	بھیگ رہا ہے میرا گھوڑا
اور یہ کھلونے میرے سارے	ہاتھی موٹر گیند اور بلا
کھیل میں تھا مصروف جو میں بھی	بھیگے کپڑے اور یہ جوتا

ابا کہتے کیوں نہیں اس سے
میرے گھر میں یہ نہ برسے

"ابا"

ننھے میرے پیارے بچے	سنو جو کہتا ہوں میں تم سے
یہ نہ آتا ہے نہ جاتا	میرے حکم سے اور نہ تمہارے
ہے جو سب کا قادر مطلق	اسی کے ہیں یہ سارے دھندے
اس کو اس کی رحمت جانو	ایسا تم نہ کہنا پیارے

بگڑا اسے کچھ! اس سے بولو
وہی بگاڑے وہی سدھارے

میر کاظم علی داخل

ملکِ خوش حال کی شہزادی

(ڈرامہ)

پہلا منظر ۔ ایک کمرہ جس میں میز رکھی ہے۔ میز پر کتابیں وغیرہ ہیں اور اس کے شمال کی جانب ایک کھڑکی کھلی ہے۔ اسٹیج پر مدھم روشنی ہے۔

ماں داخل ہوتی ہے۔ چاروں طرف دیکھنے کے بعد کھڑکی کے پاس کھڑی ہو کر

ماں۔ حامد! حامد! دیکھو اندھیرا ہو رہا ہے۔ گھر میں آجاؤ۔

حامد۔ اماں مجھے کھیل پورا کر لینے دو۔

ماں۔ نہیں حامد۔ اتنی رات گئے کھیل مناسب نہیں۔ جلدی آجاؤ

حامد کوٹ ٹوپی اور ایک گولہ لئے ہوئے داخل ہوتا ہے۔

حامد۔ اماں آپ نے میری دلچسپی کا ناس کر دیا۔ یہ میری باری تھی۔

ماں۔ حامد! میں تم سے بارہا کہہ چکی ہوں کہ زیادہ رات گئے باہر رہنا ٹھیک نہیں تم خود اچھے بچے ہو۔ ضدی نہ بنو۔ میں تمہارے لئے ابھی کہانیوں کی کتابیں لا دیتی ہوں (ماں جاتی ہے)

حامد۔ کچھ دیر تو کرسی پر بیٹھتا ہے اور اس کے بعد پلنگ پر لیٹ جاتا ہے۔ اس کے کچھ دیر بعد دو آدمی لمبے جبّے پہنے داخل ہوتے ہیں۔

پہلا آدمی۔ یہ وہی لڑکا ہے (حامد کی طرف بتاتے ہوئے)

دوسرا آدمی۔ کیا یہ یہی ہے؟ پھر تو جلدی کرو۔

پہلا آدمی۔ آہستہ سے حامد کا شانہ پکڑ کر ہلاتا ہے۔

اٹھو حامد! اٹھو حامد! اٹھو!

حامد آنکھیں ملتے ہوا اٹھ جاتا ہے۔ پریشانی سے دریافت کرتا ہے۔

حامد۔ تم کون ہو۔ تمہیں میرا نام کیونکر معلوم ہو گیا۔

دوسرا آدمی۔ ہم ملکِ خوش حال کی شہزادی کے قاصد ہیں۔ شہزادی تمہاری مدد کی خواہاں ہے۔

حامد۔ کیا؟ ملکِ خوش حال کی شہزادی!

پہلا۔ ہاں ملکِ خوش حال کی شہزادی۔ وہ تم جیسے نیک لڑکوں ہی سے مدد چاہتی ہے۔ حامد پلنگ سے کود پڑتا ہے۔

حامد۔ میں ہر شخص کی مدد کے لئے ہر آن تیار رہوں خواہ مجھے خود اس شخص کے متعلق کچھ معلومات ہی کیوں نہ ہوں۔

دوسرا آدمی۔ ہمارے ساتھ چلو راستے میں سب حالات سے آگاہ کر دیں گے۔ سب جاتے ہیں۔

دوسرا منظر۔ ملکِ خوش حال کی شہزادی کا دربار۔ شہزادی بیچ میں تخت پر بیٹھی ہوئی ہے۔ چاروں طرف درباری صف بستہ ہاتھوں میں برچھے اور ڈھال لئے کھڑے ہیں۔

ہر ایک کی ڈھال پر مختلف نشان بنے ہوئے ہیں۔

(مناسب ہے کہ کردار کے لحاظ سے ان پر نشان لگائے جائیں۔)

حامد اور وہ دو آدمی داخل ہوتے ہیں۔

پہلا آدمی۔ شہزادی کے آگے جھک کر سلام کرتا ہے۔ اور پھر یوں مخاطب کرتا ہے۔

شہزادی سلامت خدا تا ابد سلامت رکھے اور اقبال میں دن دونی رات چوگنی ترقی دے۔

حسب ارشاد حامد حاضر ہے۔

شہزادی (حامد کی طرف دیکھتے ہوئے) حامد! میں تمہاری آمد پر مبارک باد دیتی ہوں۔

یہ میرے درباری ہیں (سب کی طرف بتاتے ہوئے) میں ان کا تم سے تعارف کراتی ہوں۔

حامد۔ (پہلے شخص کا تتبع کرتے ہوئے خود بھی شہزادی کے سامنے خم ہوتا ہے۔ اور کہتا ہے۔)

شہزادی سلامت۔ اس عزت افزائی کا شکریہ قبول ہو۔

وہ شخص جس کی ڈھال پر خطرہ کا نشان لگا ہے۔ آگے بڑھتا ہے

(یہ نشان سڑکوں پر خطرہ کے لئے لگایا جاتا ہے)

احتیاط خاں۔ آپ مجھے اچھی طرح جانتے ہیں۔ میرا نام احتیاط خاں ہے

جب کبھی تم سیکل پر سوار ہوکر راستے سے گزرتے ہو تو میں آگے کے
خطرہ سے تم کو آگاہ کر دیتا ہوں۔
جس کی ڈھال پر (بائیں جانب چلئے) کا نشان لگا ہوا ہے۔
آگے بڑھتا ہے (نوٹ:۔ یہ نشان بھی سڑکوں پر لگایا جاتا ہے)
تاکید بیگم۔ میرا نام تاکید بیگم ہے۔ جب کبھی تم اپنی سمت کو
چھوڑ کر سڑک کے بیچ میں آجاتے ہیں تو میں تم کو بچاتی ہوں۔
باوجود اس کے کہ میرا تعلق صنف نازک سے ہے۔
لیکن ملک و قوم کی خدمت کرنا اپنا فریضہ سمجھتی ہوں۔
حامد۔ میں تم ہر دو کی خدمات سے واقف ہوں۔
جس کی ڈھال پر آنکھ کا نشان ہوتا ہے۔ آگے بڑھتا ہے۔
حامد۔ میں تمھارے عزیز دوستوں میں سے ہوں۔
میری وجہ سے تم ساری دنیا کو دیکھتے اور ہر اچھی بری چیز میں
تمیز کرتے ہو۔ میرا نام ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔
حامد۔ میں تم کو ان دونوں سے بھی زیادہ جانتا ہوں۔
نام بتانے کی ضرورت نہیں۔
جس کی ڈھال پر روشنی کا نشان بنا ہوتا ہے آگے
بڑھتا ہے۔ مجھے بھی آپ جانتے ہیں۔ میرے بغیر آپ سفر
نہیں کرتے۔ لیکن بدقسمتی کہئے کہ آج کل ہماری سلطنت میں
اکثر لوگوں کو مجھ سے نفرت ہوگئی ہے۔
حامد۔ یہ ان کی کج فہمی کا نتیجہ ہے۔ تمھاری خدمت کا نہ صرف میں
بلکہ تمام دنیا اعتراف کرتی ہے۔
ایک شخص جس کی ڈھال پر عجیب و غریب نشان بنے ہوئے ہیں کہ جسکے دیکھنے سے ہنسی آجائے۔
آگے بڑھتا ہے (اس کا لباس لال ہو تو مناسب)
خوش طبعی۔ حامد تم ہر وقت میرے جویا رہتے ہو۔ ہر شخص
میری جستجو میں سرگرداں ہے۔ جس کسی کے پاس ہوتی ہوں۔
گویا دنیا کی دولت اسے مل جاتی ہے۔ جب تمھارے سر پر
غم و اندوہ کے بادل چھا جاتے ہیں۔ میں ہی تم کو ان سے

نجات دلاتی ہوں۔
شہزادی۔ حامد کی طرف دیکھتے ہوئے۔ یہ ہما...
وہ عہدہ دار ہے جن کے ذمے کوئی نہ کوئی محکمہ ہے۔ یہ ...
یہ ہمارے فوج کے افسر اعلیٰ ہیں۔ ایک پولیس کانسٹبل ...
پہنے ہوتا ہے آگے بڑھتا ہے۔
کانسٹبل۔ آہو حامد! میں تم کو یہاں دیکھ کر بہت خوش ...
کانسٹبل۔ شہزادی سے۔ شہزادی صاحبہ ان سے بہت ...
یارانہ ہے (حامد کی طرف بتاتے ہوئے۔)
حامد کی طرف دیکھتے ہوئے۔ تم یہاں جس مقصد کے لئے ...
ہو شاید تم اس سے ناواقف ہوگے۔
ہماری قلمرو میں ایک باغی۔ لاپرواخاں بدنظمی پھیلا...
کر رہا ہے۔ اور چند نوجوانوں کو ابھار رکھا ہے۔ اس کا ...
ضروری ہے۔
حامد۔ بہادر جنرل میں تمھارے روز کے کارناموں سے بخوبی واقف...
بھلا کون ہے جو تمھارے مقابل میں اڑ سکے۔ پولیس کانسٹبل
شکریہ حامد! اب ہم کو تمھاری مدد کی سخت ضرورت ہے ...
یہاں تک تکلیف بھی دی گئی ہے۔
حامد۔ اس کو میں اپنا اولین فریضہ تصور کرتا ہوں۔
شہزادی۔ بہادر جنرل اب تیاری شروع کر دو۔ پولیس کانسٹبل ...
پولیس کانسٹبل خوش طبعی سے۔ حامد کے لئے ہتیار مہیا کر دو۔ خوش طبعی
بہت خوب۔ جاتی ہے اور پھر ایک ٹارچ نیزہ اور ڈھال لا دیتی ہے
حامد۔ یہ چیزیں لیتے ہوئے۔ بندوق اور تلوار کہاں اس کو کیا کام
خوش طبعی۔ اس سے دشمنوں کی آنکھیں خیرہ کر دی جائیں گی۔
پولیس کانسٹبل۔ دیکھو جب میں پہلی سیٹی بجاؤں تو تم سب تیار ہو جانا
اور دوسری پر فوری حملہ کرنا۔ لیکن تنظیم کے ساتھ۔ سب ایک صف میں
ہوتے ہیں۔ سب سے آگے شہزادی ہے اس کے بعد حامد اور جنرل
(پولیس کانسٹبل) روانہ ہو جاتے ہیں۔ شیخ رحیم الدین ...

ایک غفلت شعار اپنے بستر پر پڑا کروٹیں بدل رہا ہے، آنکھیں بند ہیں۔ اور یہ الفاظ اس کے لبوں سے نکلتے سنائی دے رہے ہیں۔ "کیوں تم نے مجھ کو اس قدر جلد جگادیا۔ تم مجھے نیند جیسی نعمت سے محروم کرنا چاہتے ہو۔ ہٹو ہٹو۔ میرے پاس سے ہٹ جاؤ میں ابھی اور سوؤں گا ذرا سی دیر اور آرام کروں گا ذرا سی دیر اور سوؤں گا۔"

اس آرام طلبی کے خیال نے اس کی زندگی کو برباد کردیا۔ پس آرام قدرت نے اس سے چھین لیا۔ مستعدی جیسی دولت سے وہ محروم کردیا گیا۔

تندرستی بالکل مٹ چکی ہے۔ وہ کاہلی اور سستی میں اپنی کارآمد زندگی کو تباہ کررہا ہے، جب وہ اٹھتا ہے تو انگڑائیاں لیتا ہوا جب وہ چلتا ہے تو جھومتا ہوا۔

اس کی ظاہری حالت بہت زیادہ قابل افسوس ہے، ایک ٹوٹی چارپائی اور ایک میلا بستر اس کی جاگیر ہے، بدن کے کپڑوں کے چیتھڑے ہورہے ہیں۔ اور دور سے بو آرہی ہے۔ اس کاہلی پر وہ اپنے باپ دادا کی تمام جائداد برباد کرچکا۔ وہ زمانہ بھی بہت قریب ہے جب اس کے پاس ایک پیسہ نہ رہے گا۔ اور معدے کے پے در پے تقاضے اسے ہلنے چلنے کے لئے مجبور کریں گے۔ اس وقت اس کو معلوم ہوگا کہ خواب غفلت کیا ہے اور سستی کس بلا کا نام ہے۔

اس کی خستہ حالی دیکھ کر درسِ عبرت حاصل کرنا چاہئیے۔ ہمیشہ اپنے دل کو چستی اور مستعدی کی تعلیم دو۔ اس لئے کہ مستعدی اور خوش نصیبی ایک ہی چیز ہے۔

سید حسن (دارالعلوم)

معلومات

۱۔ سب سے پہلی انگریزی ڈکشنری سرموئیل جانسن نے لکھی۔
۲۔ سب سے پہلا گاؤں قابیل کے ایک بیٹے نے بسایا۔
۳۔ سب سے پہلی کشتی حضرت نوح نے ایجاد کی۔
۴۔ سب سے پہلے بارود اہل عرب نے سنہ ۶۰۹ء میں تیار کی
۵۔ سب سے پہلے صابن جناب سلیمان نے بنایا۔
۶۔ سب سے پہلی توپ سنہ ۱۳۳۰ء میں جان اروِن نے بنائی۔
۷۔ سب سے پہلے آلاتِ جراحی ابوالقاسم جراح نے ایجاد کئے۔
۸۔ سب سے پہلی دوربین ابوالحسن نے بنائی۔
۹۔ سب سے پہلے علمِ منطق ارسطو نے ایجاد کیا۔
۱۰۔ سب سے پہلے گراموفون سنہ ۱۸۵۷ء میں اڈیسن نے بنایا۔
۱۱۔ سب سے پہلے محکمہ پولیس زیاد بن امیہ نے قائم کیا۔
۱۲۔ سب سے پہلے فنِ موسیقی فیثاغورث نے ایجاد کیا۔

محمد فخر الدین امان

بچہ اور پرندہ

دانہ چگتا تھا جو پرندا
بچہ اُس کو دیکھ کے بولا
دانہ چگنے، مارا مارا
جنگل جنگل کیوں ہے پھرتا
تجھ کو اچھا سا گھر دوں گا
اُس میں دانہ بھی ڈالوں گا
بیٹھ کے کھا تو جیسے راجا
آکر میرے پاس تو رہ جا

بولا پرندہ چوں چوں کر کے
سُن لے پیارے ننھے مُنّے
مجھ کو نہیں منظور ہے تیرا
ایک سنہری گھر اچھا سا
گھاس کا ہے جو میرا یہ گھر
تیرے گھر سے ہے یہ بہتر
مجھ کو تیرے ان کھانوں سے
بہتر اور اچھے ہیں وہ دانے
میں پھرتا ہوں جنگل، جنگل
جنگل میں ہے مجھ کو منگل

محنت سے کچھ بھی نہ کمائیں
اور نکھٹو بیٹھ کے کھائیں
یہ ہے طریقہ انسانوں کا
ہے اپنا کچھ اور طریقہ
اپنی روزی آپ کمانا
جگ میں آزادی ہے پانا
اپنی اپنی ہے اک فطرت
تجھ کو مبارک تیری عزت
بچے کو یہ گیت سنایا!
اور اُڑا آزاد پرندا

فیضی دنیا کو یہ سناؤ
اپنی روزی آپ کماؤ

سب رس سب کی نظر میں

خدا کے فضل و کرم سے سب رس کا پہلا سال قریب الختم ہے گذشتہ دس مہینوں میں سب رس کے قدر دانوں نے طرح طرح سے اس کی ہمت افزائی کی، وقتاً فوقتاً دفتر میں ایسے خطوط اور رائیں بھی وصول ہوتی گئیں جن کے چھاپنے کے لئے ہمیں ہر ماہ سب رس کے چند صفحے وقف کر دینے پڑتے اس لئے ہم نے اب تک گریز کیا۔ اب چونکہ سال ختم ہو رہا ہے اس لئے مناسب سمجھا گیا کہ معاصر رسالوں اور اخباروں کی رایوں اور دوسرے ہمدردوں کی نظموں کا اس موقع پر انتخاب شائع کر دیا جائے، اسی لئے یہاں دس رائیں اور بارہ ۱۲ نظمیں شائع کی جا رہی ہیں۔ سب رس کی تعریف میں بہت سی نظمیں وصول ہوئیں جن میں سے اکثر ہمارے کمسن قدر دانوں کا نتیجۂ فکر ہیں، ان میں جو شائع ہونے کے قابل نظر آئیں وہ اس وقت چھاپ دی جا رہی ہیں بقیہ نہیں چھپینگی اور آئندہ کے بارے میں بھی اس امر کا اعلان کر دینا ضروری ہے کہ سب رس کے قدردان بچے اور بچیاں سب رس کی تعریف میں نظمیں اور رباعیاں لکھنے کی جگہ دلچسپ قصے، کہانیاں یا علمی و ادبی مضامین اور نظمیں لکھ کر روانہ کریں تو بہتر ہے (سب رس)

یہہ تحفہ ہے لاجواب از بس لے لو　　　مرغوب دل ہر کس و ناکس لے لو۔

سب کا لینا تو امر ناممکن ہے　　　سب میں بہتر یہہ ہی کہ "سب رس" لے لو

امجد

اُردو ۔ سہ ماہی اورنگ آباد ۔ معتمد انجمن ترقی اُردو ۔ حیدرآباد میں اُردو کی ترقی اور علم و ادب کی فراوانی کے باوجود اپنے رسائل کا ایک بڑی حد تک فقدان نظر آتا ہے ۔ اس کمی کو پورا کرنے کے لئے "سب رس" نکالا گیا ہے ۔ یہہ ایک ادبی رسالہ ہے جس کا مقصد یہہ ہے کہ ایسے دلچسپ اور عام فہم مضامین شائع کئے جائیں کہ جنھیں عام و خاص سب پڑھ سکیں ....

سب رس کی ایک اور خصوصیت یہہ بھی ہے کہ اس کا ایک حصہ بچوں کے لئے وقف ہے جس میں ان کی دلچسپی کے مضامین، طرح طرح کی معلومات، نظمیں، کہانیاں، پہیلیاں، لطیفے اور چٹکلے ہوتے ہیں ۔ کاغذ لکھائی چھپائی بہت اچھی ہے ۔ تصاویر بھی شائع کی جاتی ہیں

(اردو اپریل ۱۹۳۸ء)

ادبِ لطیف ۔ ماہنامہ لاہور ۔ اڈیٹر صاحب نے مضامین کی ترتیب میں حسن ذوق کا ثبوت دیا ہے ۔ تقریباً تمام مضامین نظم و نثر خوب ہیں .... رسالہ کے آخر میں بچوں اور طلبہ کے لئے بھی مضامین درج ہیں ۔ یہہ تنوع رسالہ کی افادی حیثیت پر خاص اثر ڈالتا ہے ۔ رسالہ میں تصاویر بھی ہیں ۔

(ادب لطیف فروری ۱۹۳۸ء)

سب رس سب رس سب رس سب رس سب رس

سب رس ہیں کوئی ایسا ہے میٹھا کب رس
خود نسخہ کے نام سے چکاں ہے جب رس
سب کا سب رس ہی رس ہے سب رس ہیں رحیم
سب خلق ہے تر زباں کہ "سب رس سب رس"

رحیم (منشی فاضل)

المعلّم - ماہنامہ حیدرآباد - ہمارے ملک کے نوجوان۔ اہل قلم نہایت تیزی کے ساتھ اپنے قدم میدانِ صحافت میں آگے بڑھاتے چلے جا رہے ہیں اور دامے، درمے، قدمے، سخنے، ہر طرح اُردو زبان کی خدمت کرنے میں ہمہ تن مصروف نظر آتے ہیں ...... سب رس کے ادارے نے [illegible] جوان اور بچوں کو الفاظ کے ذریعے اظہارِ خیال کا موقع دیا ہے۔ عوام کے لئے یہہ مضامین لکھے گئے ہیں، ان کے اچھے ہونے سے انکار نہیں کیا جا سکتا۔ بہر حال بحیثیت مجموعی یہہ رسالہ بہت امید افزا ہے یقین ہے کہ ہماری ریاست پر ایسا چھائے گا کہ بیرونی ملک کے عامیانہ مذاق کے رسالوں کے لئے دروازہ بند ہو جائے گا۔

المعلم (اسفندار [illegible])

کیسا اچھا نام ہے تیرا — نام کے جیسا کام ہے تیرا
تیرے قصے تیرے مضموں — کیسے اچھے کیسے موزوں
سچی سچی نظمیں تیری — اچھی اچھی غزلیں تیری
پڑھتا ہے تجھ کو بچہ بوڑھا — تو ہے سب کے دل کا اجالا
جب تو آجاتا ہے گھر پر — خوشی کی موجیں دل کے اندر
پابندی سے آتا ہے تو! — سب کے دل کو بھاتا ہے تو
چندہ کم مضمون زیادہ — شوق سے پڑھنے سب آمادہ
تو ہے خوب موثر پرچہ — ہر گھر میں ہے تیرا چرچہ

سدا یوں ہی تو آتے رہنا
گیت ہمارے گاتے رہنا

سید اسد علی شرف
(مدرسہ عالیہ)

شاہ کار - ماہنامہ لاہور - "سب رس" ہر لحاظ سے کامیاب پرچہ ہے اور اس کے مضامین کا تنوع قابلِ داد ہے۔ ہر شخص کے مذاق کی کوئی نہ کوئی چیز مہیا کر دی گئی ہے۔ امید ہے کہ یہہ رسالہ خوب ترقی کرے گا اور پبلک اس کی سرپرستی میں کوئی دقیقہ فروگذاشت نہ کرے گی۔

(شاہ کار - سنہ ۱۹۳۹ء)

ساقی۔ ماہ نامہ دہلی "سب رس" عروسِ جمیل و لباسِ حریر کی تفیرین کر جلوہ گر ہوا ہے۔ مضامین میں ہر عمر اور ہر مذاق کے لوگوں کا لحاظ رکھا گیا ہے۔ زبان بھی جہاں تک ہو سکا آسان رکھی گئی ہے۔ تحقیقی اور تنقیدی مضامین جمع کئے گئے ہیں حصہ نظم بھی نثر کے مقابلہ میں بے جوڑ نہیں ہے۔ یہہ غنیمت ہے کہ سیاسی اور مذہبی مضامین "سب رس" کی پالسی سے خارج ہیں۔

ساقی مارچ ۱۹۳۸ء

مریضِ جہل کے حق میں یہہ داروئے شفا ہوگا
جنھیں ہے علم کا ذوق ان کے حق میں رہنما ہوگا
بجیں گے رات دن ڈنکے جہاں میں اس کی عظمت کے
متین اپنا یہہ سب رس آگے چل کر جانے کیا ہوگا

محمد مسیح الدین خاں اقبال متین

پیام۔ روزنامہ حیدرآباد "سب رس" ادارۂ ادبیات کی کوششوں کا ایک ثمر نورس ہے اور ہم کو اتنی بات کے کہنے میں کوئی تامل نہیں ہے کہ یہہ ماہ نامہ اپنی خصوصیات کے اعتبار سے حیدرآباد کی موجودہ ادبی فضا میں ایک ممتاز جگہ حاصل کرنے والا معلوم ہوتا ہے۔ مضامین کا معیار بلاشبہ بلند ہے۔ حیدرآباد کے مشاہیر اہلِ قلم کے مضامین ماہ نامہ کے صفحات پر اہلِ ذوق کو دعوت فکر و نظر دے رہے ہیں۔ تاریخی، علمی اور خالص ادبی مضامین کے بعض دلچسپ نمونے ان صفحات پر نظر آتے ہیں۔ ماہ نامہ کی ایک خصوصیت یہہ بھی ہے کہ اس میں چند صفحات بچوں کے لئے مخصوص کئے گئے ہیں۔ ہم تہہ دل سے اس نئے معاصر کا خیر مقدم کرتے ہیں اور امید کرتے ہیں کہ ملک کی ادبی صحبتوں میں اس کو بہت جلد ایک معیاری حیثیت حاصل ہو جائے گی

پیام۔ مورخہ ۲۵ر فروری ۱۹۳۸ء

سب رس (ادارۂ ادبیات اُردو کا ماہ نامہ۔ شمارہ اگست ۱۹۳۶ء) ہم کو یہہ دیکھ کر خوشی ہوتی ہے کہ ملک کا یہہ نیا ماہ نامہ روز بروز ترقی کر رہا ہے اور اس کی اشاعتوں کے دیکھنے سے معلوم ہوتا ہے کہ اس کے معیار کو بلند کرنے کی کوشش کامیابی کے ساتھ کی جا رہی ہیں۔ پیش نظر شمارہ کے مضامین کی نوعیت پر ان مستحسن کوششوں کا اچھا اثر پڑا ہے۔ چند چھوٹے چھوٹے ظریفانہ مضامین نے بھی ان صفحات کی دلچسپی میں اضافہ کیا ہے۔ ہم اس ماہ نامہ کی ترقی کے متمنی ہیں اور یہہ امید رکھتے ہیں کہ اگر اس کی ترقی کی موجودہ رفتار قائم رہی تو وہ ایک دن حیدرآباد کا بہترین ادبی رسالہ بن سکتا ہے۔ اس کے علم دوست سرپرست ڈاکٹر زور اور اس کے قابل مدیر جناب میکش کے مذاق سلیم کو اس امر کی ضمانت ہونا چاہئے۔

روزنامہ پیام۔ بابتہ ۱۶ر مہر ۱۳۴۷ف

شان ہند ہفتہ وار بمبئی ۔ رسالہ سب رس ہمارے سامنے اپنا اقبال نمبر لے کر حاضر ہے ۔ برعنۃ المطلا
کے طور پر چغتائی آرٹ کی رنگین تصویر متعلقہ رباعی علامہ مرحوم پیش کی گئی ہے جو نہ صرف نظر فریب بلکہ
دیدہ زیب بھی ہے طباعت اور کتابت پر خاص توجہ دی گئی ہے مضامین کا معیار بہت بلند ہے شاعر مشرق
کی حیات کے مختلف پہلوؤں پر جی کھول کر بحث کی گئی ہے ۔ سرورق رنگدار آرٹ پیپر پر ہے جو ترجمان حقیقت کی
کی درویشانہ تصویر سے مزین ہے ۔ ان تمام خوبیوں کے باوصف سب رس اقبال نمبر کی قیمت ۱۲ ہے ۔

"شان ہند" ۱۰ر جولائی ۱۹۳۸ء

ہے زور کی کوشش کا نتیجہ سب رس
ہر علم معارف میں ہے یکتا سب رس
میکش سا مدیر جب ملا ہے اس کو
کیونکر نہ ہو پھر بلند و بالا سب رس

میر حسن علی خاں یمین

مشیر دکن ۔ روزنامہ حیدرآباد ۔ اس نمبر میں نظم و نثر مضامین کے ۳۴ عنوانات ہیں جو سب کے سب دلچسپ اور قابل مطالعہ ہیں مضمون نگاروں میں سب کے سب اچھے اہل قلم ہیں ۔ مشہور مضمون نگار خواتین کے مضامین کا بھی ایک حصہ شامل ہے ۔ مضامین کے انتخاب میں بڑی وسعت نظر سے کام لیا گیا ہے اور ہر ذوق کے مضامین خاص ترتیب کے ساتھ جمع کئے گئے ہیں جس سے پرچہ میں تنوع اور رنگارنگی پیدا ہو گئی ہے اور پرچہ ہر طبقہ کے مطالعہ کے قابل بن گیا ہے ۔

ملک کے بچوں کے مفاد کو بھی نظر انداز نہیں کیا گیا ہے ۔ ان کے لئے بھی آخر میں ۱۶ صفحوں کا ایک ضمیمہ شامل ہے جو علحدہ بھی شائع ہوتا رہے گا ۔ کارکنان ادارہ کی یہہ کوشش بے حد پسندیدہ ہے کیونکہ یہی بچے ہیں جو آئندہ چل کر ملک و قوم کے رہنما بنیں گے ۔ ہماری رائے میں اس ضمیمہ کی ہر بچے والے گھر میں ضرور رسائی ہونی چاہئے اس پرچے میں ہمیں ایک نہایت قابل ذکر اور لائق تعریف بات یہہ نظر آئی کہ ملک کی تعلیم یافتہ خواتین کو بھی اس پرچے کے ذریعے اپنے خیالات کی اشاعت کا موقع دیا گیا ہے اور بہت سے صفحات ان کے لئے وقف کئے گئے ہیں ۔

پرچے کی لکھائی چھپائی کاغذ سب عمدہ ہیں ۔

مشیر دکن مورخہ ۲۲ جنوری ۱۹۳۸ء

سب رس ہمارے سب رس اے سب سے اچھے سب رس
تو راہبر ہمارا ممنون ہم ہیں تیرے

ہوٹل میں ذکر تیرا دفتر میں تیرے چرچے
یعنی ہر ایک کا تو سب پر کرم ہیں تیرے

ملکِ دکن میں تو ہو! شہرت نہ ہو تو کیونکر؟
صدہا ادیب و شاعر خادم بہم ہیں تیرے

باغ ادب میں تیرے ہر دم بہار ہی ہو!
ان کی دعا یہی ہے جو دم بہ دم ہیں تیرے

منیر سلطانہ بہآر (فوقانیہ پھلی کمان)

شاعر۔ ماہ نامہ آگرہ۔

ادارہ ادبیات اُردو حیدرآباد کی طرف سے حال ہی میں ایک بہترین ماہ نامہ شائع ہونا شروع ہوا ہے یہہ اس کا تیرا نمبر ہے جسے محرم نمبر کے نام سے شائع کیا گیا ہے اکثر اخبارات کے محرم نمبر شائع ہوتے رہتے ہیں۔ ہمارے خیال میں رسالوں میں یہہ پہلا "محرم نمبر" ہے جسے اس قدر مکمل اور احسن طریقہ پر شائع کیا گیا ہے کہ بے ساختہ داد دینے کو جی چاہتا ہے۔

شاعر آگرہ اپریل ۱۹۳۸ء

ہاں باغِ ادب کا یہہ ثمر ہے نورس
جو رکھتے ہیں ذوق ان کو ہی مرغوب از بس

ہیں اور بھی دنیا میں رسیلے میوے
سب کے رس اس میں ہیں یہہ ہے سب رس

محمود عبدالماجد ماجد (طالب علم مدرسہ فوقانیہ محبوب نگر)

پھل ایک کرو فرض تم ایسا بُچّو ۔۔۔ جس میں کہ الگ الگ مزے کا رس ہو

بس ویسے ہی مضمون ہیں اس میں موجود ۔۔۔ سب رس نہ کہو اس کو تو پھر کیا ہے کہو

ما حیا

ہندستانی. تماہی الہ آباد۔

سب رس کے ذریعے ایسا ادب پیش کرنا، جس سے انسانوں کو پہچاننے اور سماج کی نبض پر ہاتھ رکھنے کا دل
پیدا ہو بلا شبہ ایسا بلند مطمحِ نظر ہے، جس سے امید ہے کہ ایک طرف سماج کی ترقی میں مدد ملے گی اور دوسری
طرف انسانیت کے ہمدم اور غمگسار ادیب پیدا ہوں گے۔ رسالہ اپنے قابل مدیر کی نگرانی میں اس مقصد میں خاص کامیاب ہے

ہندستانی۔ اپریل ۱۹۳۸ء

کس قدر خوب ہے دلکش ہے دل آرا سب رس ۔۔۔ روح پرور ہے عجب تیرا نظارا سب رس

چشم بد دور ترقی پہ ترقی ہو تجھے ۔۔۔ اور چمکے تری قسمت کا ستارا سب رس

تجھ کو ہم وطنوں کے خدمات کا حاصل ہے شرف ۔۔۔ ان کی تحریروں کا ہی تجھ میں نظارا سب رس

تجھ میں سامان ہر اک طبع کی تفریح کے ہیں ۔۔۔ تو بڑوں کو ہے پسند بچوں کو پیارا سب رس

ترے اوراق میں پوشیدہ ہے علمی دنیا ۔۔۔ دولت علم کا مخزن ہے ہمارا سب رس

نظم رنگین جو ہے، نثر بصیرت افروز ۔۔۔ اور معمے بھی ہے بھجواتا ہمارا سب رس

اک رسالہ کے لئے چاہئے جتنے جوہر ۔۔۔ پیش کرتا ہے وہ سب تیرا شمارا سب رس

آرزو ہے یہہ دعا ہے، یہہ تمنا اپنی ! ۔۔۔ نجم گھر گھر نظر آئے یہہ ہمارا سب رس

احمد الدین نجم حیدرآبادی (سہ ماہیہ)

ہمت نہیں ہاری ہے حاصل ہو زمانہ کا پچھوڑ
ہم جانتے بیٹھے ہیں کہ ہو وہی سب رس سے
کیوں ڈھونڈتے ہو بادۂ نایاب عالم سارے
تم ہی ہو ادب کا بیاں سب رس سے

جنت حیدرآبادی

اردو کو سدا ہند میں سب رس ہی بنا دوں   تحدید زباں کی ہے جو بنیاد ہلا دوں

عالم میں جو خاموشی ہے اک دھوم مچا دوں

سب رس کی تمنا ہے یہ سب رس کی تمنا

پھر ہند میں پیغام سخن سب کو سنا دوں   پھر علم کے دریا بھی دکن ہی سے بہا دوں

اک شور سے سوئی ہوئی دنیا کو جگا دوں

سب رس کی تمنا ہے یہ سب رس کی تمنا

سید مرتضیٰ مجتہدی (نظام آباد)

ہے زورِ سبؔ رس کا احسان دکن والوں پر　　مشہور یہی ہر کس و ناکس میں ہے

میکش کی رگوں میں تھی جو بجلی رقصاں　　وہ بن کے شراب علم "سب رس" میں ہے

گل ہائے مضامین و خیالات کا رس　　شاہد ہے مری آنکھ کہ "سب رس" میں ہے

ہر سانس مری لے کے نکلتی ہے شمیمؔ　　اب سارا گلستاں مرے بس میں ہے

شمیمؔ

سب رس نے اپنے پہلے سال میں تین خاص نمبر شایع کئے محرم نمبر۔ اقبال نمبر۔ اور حیدرآباد ایجوکیشنل کانفرنس نمبر۔ یہہ تینوں خاص طور پر کامیاب ثابت ہوے۔ اگرچہ یہہ خریداروں کو مفت دیے گئے لیکن جو سالانہ خریدار نہیں ہیں ان کو ۱۲ ار ۔ عسم ۱۴ر۔ اور ۸ر میں دئے گئے۔ اسی طرح سنہ ۱۹۳۹ء میں بھی سب رس کے کئی خاص نمبر شایع ہوں گے جن میں سے پہلا سالگرہ نمبر دو سو سے زیادہ صفحات اور پچاس سے زیادہ نایاب تاریخی تصاویر پر مشتمل ہوگا سالانہ خریداروں کو مفت ملے گا اور جو خریدار نہ ہوں ان کو عال روپے میں دیا جائے گا۔ کیونکہ اس کی لاگت پر ہزاروں روپے صرف کئے جارہے ہیں۔

سب رس کا سالانہ چندہ للعہ روپے ہے

خواجہ حمید الدین شاہد

اخراجات ڈپہ ذمۂ خریدار

دفتر ادارۂ ادبیات اردو رفعت منزل۔ خیریت آباد حیدرآباد دکن

خاص رعایت
رمضان شریف کیلئے
قیمت اصلی
قیمت رعایتی
بگ بن لوڈ الارم
آنندا الارم
ٹام ٹام الارم
سکیوریٹا الارم
راسلے الارم
بے بی ماتھے الارم
جلال اینڈ سنس
ہول سیل اینڈ ریٹیل ڈیلر
ٹاور کلاک اسپیشلسٹ
ماہران گھڑی سازی قدیم تجربہ کار
عابد روڈ۔ روبرے ویکاجی ہوٹل
حیدرآباد دکن
لوڈ الارم
BIG BEN

نفس زماں ہے تو کیا ڈر ہے
حق نگہبان ہے تو کیا ڈر ہے
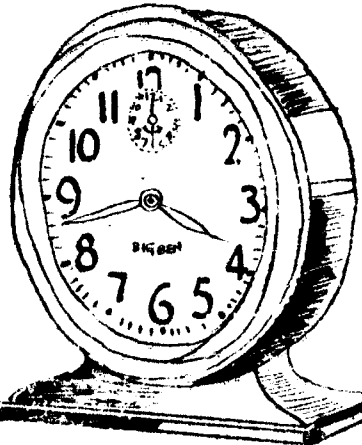
زندہ طلسمات

جس کی کشتی کا ناخدا ہے خدا
لاکھ طوفان ہے تو کیا ڈر ہے

ناظرین! یہہ وہ مشہور دوا ہے جس نے حیدرآباد سے لے کر یورپ تک اپنی صداقت کا ڈنکا بجا دیا۔ مشہور ڈاکٹروں و حکما نے آزمایش کر کے سیکڑوں سرٹیفکیٹ عطا فرمائے اور یہہ لکھ دیا کہ **زندہ طلسمات** کا ہر گھر میں رہنا نہایت ضروری ہے کیونکہ **زندہ طلسمات** کھانسی، بخار، پیچش، متلی، ہیضہ، طاعون، نزلہ زکام، بواسیر، خارش، سانپ، بچھو کے زہر وغیرہ قسم کے درد پر ایک ڈاکٹر کا کام دیتی ہے زہر دور ہونے کے علاوہ اس کا کمپیل امتحان بھی ہو چکا ہے۔ آپ کے شہر میں ہر ایک دوکان پر ملیگی جو صاحب اس دوا کو غیر مفید ثابت کر دیں انکو دس [illegible] دیا جائیگا۔ ایک بار ضرور آزمایش کیجئے۔ قیمت بالکل قلیل رکھی گئی ہے قیمت شیشی نمبر ۱ (عہ) نمبر ۲ (۸ر) نمبر ۳ (۴ر) بوقت خریدی شیشی کے پاکٹ پر رجسٹرڈ نمبر [illegible] اور ٹریڈ مارک نظام گورنمنٹ کا تاج دیکھ لیجئے تاکہ دھوکا نہ ہو کیونکہ بہت سے حضرات نے اس کی نقل کی ہے۔ زندہ طلسمات جس مقام پر نہ ملے تو

کارخانہ زندہ طلسمات حیدرآباد دکن سے طلب کیجئے

منجن فاروقی

بڑے بڑے امراء و روسا، ولایتی اور قیمتی منجنوں کا استعمال ترک کر کے اس کا استعمال شروع کر دئے ہیں کیونکہ یہ دانتوں کی جملہ بیماریوں کو دور کرتا ہے منہ سے بدبو آنا مسوڑوں کا پھولنا دانتوں سے خون کا نکلنا درد کرنا کیڑے کو مارتا ہے۔ آپ بھی روزآنہ صبح منجن فاروقی سے دانت صاف کیا کرو دانتوں کو مضبوط اور پائدار بناتا ہے یہ خاص ملکی جڑی بوٹیوں سے تیار کیا جاتا ہے اور ہر دوکان پر ملتا ہے۔ اس منجن کے مقبولیت کا یہ عالم ہے کہ روزآنہ جس قدر تیار ہوتا ہے۔ خرچ ہو جاتا ہے۔ جو آرڈر آج وصول ہوتے ہیں اس کی تعمیل دوسرے روز ہوتی ہے۔ قیمت بڑی شیشی ۵ر اور چھوٹی شیشی ۳ر تیار کردہ کارخانہ زندہ طلسمات حیدرآباد دکن

AIRMAIL
ایرمیل
R 101
SHOE

R. MENTOJI
Cloth Merchant
PATHER GATTI HYDERABAD DN.
PHONE
No. 839
۸۳۹
فون
آر - مینٹوجی
عیدالفط
کیلئے
ٹوئیڈ - سلک - شرٹنگ کا بے نظیر شاندار بالکل نیا اسٹاک
(جو)
یورپ - جرمن - اٹلی - جاپان - روسی کارخانوں سے ہر مذاق کا اتنا لاجواب ذخیرہ فراہم
کہ آپ دیکھکر خود فرمائینگے - کہ ہم نے آجتک اتنا خوبصورت خوشرنگ خوشوضع کا پارچہ کہیں بھی
خواتین کیلئے اپٹوڈیٹ فیشن کے مطابق رنگ برنگ بالکل نیو ڈزائن کی ساڑیاں بھی قابل تعریف
مال و دام میں ہر طرح کا اطمینان
دکن

زبان ٹپہ صفحیہ ۱۵۲
رجسٹر نمبر (M3950)

ادارۂ ادبیات اردو حیدرآباد دکن

کا

ماہنامہ

زیر نگرانی

ڈاکٹر سید محی الدین قادری زور

زیر ادارت

صاحبزادہ میر محمد علی خان میکش

بہ اہتمام

خواجہ حمید الدین شاہد

مکتبۂ ابراہیمیہ مشین پریس میں طبع ہو کر دفتر ادارہ رفعت منزل حیدرآباد سے شائع ہوا

سب رس کے مقاصد و قواعد

(۱) یہ ادارۂ ادبیات اردو کا ماہوار علمی و ادبی رسالہ ہے۔ جس میں اردو زبان اور ادب کے مختلف پہلوؤں پر بحث ہوگی۔

(۲) مضامین متعلقہ سیاسیات حاضرہ اور مذہبی مباحث کسی صورت میں قابل اشاعت متصور نہ ہوں گے۔

(۳) اردو مطبوعات پر بے لاگ تنقید کر کے اردو تصنیف و تالیف کا ذوق صحیح پیدا کرنے کی کوشش کی جائے گی۔

(۴) غیر زبانوں کے شاہکار مضامین کو اردو میں منتقل کر کے اردو کے علمی و ادبی سرمایہ میں اضافہ کیا جائے گا۔

(۵) یہ رسالہ کم از کم (۶۴) صفحات اور زیادہ سے زیادہ [illegible] صفحہ پر ہر ماہ عیسوی کے پہلے ہفتہ میں شایع ہوا کرے گا۔

(۶) رسالہ نہ پہنچنے کی اطلاع پندرہ تاریخ تک دفتر [illegible]

(۷) جواب طلب امور کے لئے جوابی پوسٹ کارڈ یا لفافہ [illegible]

(۸) خط و کتابت کرتے وقت نمبر خریداری کا حوالہ [illegible] دیا جائے۔

(۹) اشتہارات کی اجرت پیشگی لی جائے گی۔ [illegible] ذریعے سے وصولی منظور نہیں کی جائے گی۔

سب رس کی قیمت

	سالانہ	ششماہی	فی پرچہ
بلدہ حیدرآباد کے لئے	چار روپے	دو روپے آٹھ آنے	چھ آنے
شہر میں اور شہر سے باہر بذریعہ ڈاک	چار روپے آٹھ آنے	دو روپے بارہ آنے	سات آنے

بچوں کے سب رس کی قیمت

	سالانہ	ششماہی	فی پرچہ
بلدہ حیدرآباد کے لئے	ایک روپیہ	دس آنے	[illegible]
شہر میں اور شہر سے باہر بذریعہ ڈاک	ایک روپیہ آٹھ آنے	بارہ آنے	[illegible] آنے

محرم نمبر ۱۲ر اقبال نمبر عہ ۱۴ر

سب رس کی خریداری اس میں اشتہارات کی طباعت اور ادارۂ ادبیات اردو کی رکنیت یا اس کے مطبوعات کی خریداری کے سلسلے میں جو اصحاب صدر دفتر (رفعت منزل خیریت آباد) سے گفتگو یا مراسلت نہیں کر سکتے وہ حسب ذیل اصحاب سے گفتگو یا مراسلت کر سکتے ہیں

بلدہ (۱) مسٹر یس اے کریم نمائندہ خصوصی چیلہ پورہ قریب مکان حکیم محمود صمدانی مرحوم (۲) مسٹر یس بی انمتا۔ مکتبہ ابراہیمیہ عابد روڈ (۳) رحمان کاٹیج گھانسی بازار

اضلاع مسٹر محمد فخرالدین ارماں (روضۂ شیخ) گلبرگہ شریف

سب رس میں جنوری ۱۹۳۹ء کا مرقع دکن نمبر

سب رس اپنا نیا سال ایک ایسی عظیم الشان کوشش سے شروع کر رہا ہے جو دکن کی تاریخ کو نہایت ہی صحیح نقطہ نظر سے
سب سے پہلی دفعہ علمی دنیا میں روشناس کرے گی۔ اس میں جو مضامین نظم و نثر درج ہیں وہ تحقیق و تنقید اور ادب عالیہ کے
معیار کے لحاظ سے بھی نہایت گراں مایہ ہیں۔ ان کی فہرست کے لئے کئی صفحات درکار ہوں گے۔ یہاں صرف خاص خاص مشاہیر کے نام
لکھدئیے جاتے ہیں جن کی نادر تصویریں اس مرقع میں درج ہیں۔ ان اصحاب کے علاوہ دکن کی جملہ سلطنتوں کی [illegible]
بہت سے ایسے مشاہیر دکن کے حالات اور کارناموں کے تذکرے بھی شامل ہیں۔ جن کی تصویریں نہیں دی جاسکیں۔

سلطنت بہمنیہ کے مشاہیر کی تصاویر اب تک کسی کو نہیں ملی تھیں۔ لیکن اس مرقع میں دو نادر تصویریں شامل ہیں۔

سلطنت احمد نگر کے مشاہیر میں صرف چاند سلطانہ کی تصویر چھپی ہے۔ لیکن دکن نمبر میں اس ہیروئین کی ایک عجیب و [illegible]
تصویر کے علاوہ اور دو مشاہیر کی تصویریں ہیں۔

سلطنت بیجاپور کے مشاہیر کی بارہ نہایت اعلیٰ تصاویر ہیں جن میں اکثر پہلی دفعہ چھپ رہی ہیں۔

سلطنت گولکنڈہ کے مشاہیر کی تصویریں خاص اہتمام سے مہیا کرکے ان کے بلاک بنائے گئے ہیں۔ کیونکہ حیدرآباد کی [illegible]
کوئی تاریخ اس دور کی سرگذشت کو واضح کئے بغیر مکمل نہیں ہو سکتی۔ اس دور کے بائیس ۲۲ مشاہیر کی تصویریں اس مرقع میں شامل [illegible]

سلطنت آصفیہ کے اکثر مشاہیر کی تصویریں اس سے پہلے بھی چھپی ہیں۔ لیکن اس مرقع میں تصویروں کے انتخاب [illegible]
خاص معیار ملحوظ رکھا گیا ہے اور اچھی تصویریں پیش کرنے کے علاوہ انہی پچیس ۲۵ مشاہیر کی تصویریں منتخب کی گئی ہیں جنھوں نے
اس ملک کی گذشتہ دو سو سال کی تاریخ میں بڑا حصہ لیا ہے۔

بہرحال صحیح معنوں میں یہ ایک مستند تاریخی مرقع ہے۔ اور توقع ہے کہ اس کی اشاعت کے بعد دکن کی صحیح تاریخ پیش نظر ہوجائے گی
اور آئندہ کے لئے غلط فہمیوں کا ازالہ ہوجائے گا۔

ان مشاہیر کی تصویروں کے سوا قدیم تاریخی گروپ اور دکن کے ہر دور کی تمدنی یادگاروں، قلعوں، مسجدوں، مندروں
مقبروں، مشہور عمارتوں اور تالابوں کی بھی تصویریں اس مرقع میں شریک رہیں گی۔

اعلیٰ حضرت سلطان العلوم کے دور حکومت کی ہمہ جہتی ترقیوں کے متعلق مستند مضامین کے علاوہ دکن کے مختلف مقامات اور
واقعات پر دلچسپ مضامین اور افسانے اور نظمیں بھی شریک ہیں۔

یہ مرقع **ایک محدود تعداد** میں چھاپا جا رہا ہے اور سب رس کے صرف سالانہ خریداروں کو مفت دیا جائے گا۔ ششماہی
خریداروں یا دوسرے اصحاب کو دو روپے میں ملے گا۔ سب رس کے **سالانہ خریدار** بھی صرف **فروری ۱۹۳۹ء** تک
اس کو حاصل کرسکیں گے جو اصحاب فروری کے بعد خریدار ہوں گے ان کو شاید یہ نہ مل سکے گا۔

مہتمم سب رس

ادارہ

یہ سب رس کے پہلے سال کا آخری شمارہ ہے۔ سب رس کے قدر دانوں نے محسوس کیا ہوگا کہ اس کا ہر پرچہ وقت پر شایع کرنے کے علاوہ صحیح معنوں میں سب
رس میں ہر ایک کی دلچسپی کے کچھ نہ کچھ سامان پیدا کئے گئے اور ہر ماہ طرح طرح کے... مختلف میلانات اور مختلف ذوق کے اصحاب بھی
اس کو اپنا ہی سمجھتے رہے۔

ملک کے ہر نقطۂ خیال کے اہل قلم اصحاب و خواتین کے علاوہ ہندوستان کے دور دراز مقامات کے بلند پایہ ادیبوں اور شاعروں کے مضامین اور نظمیں سب رس
کی اشاعت کے لئے کثرت سے وصول ہوئیں اور برابر چھپتی رہیں۔ اور اس طرح یہ امر بھی قابل ذکر ہے کہ سب رس کی رسائی دور دور تک ہوگئی اور اس کے خریداروں
اور قدر دانوں میں بعض ایسے بھی ہیں جو ہندوستان کے باہر رہتے ہیں۔

اس رسالہ کے ساتھ ہم سال بھر کے مضامین نظم و نثر اور تصویروں کی فہرست علیحدہ شایع کر رہے ہیں تاکہ جو اصحاب پورے سال کے پرچوں کی جلد
بنانا چاہیں وہ اس مکمل فہرست کو ابتدا میں لگالیں۔ لیکن جلد بناتے وقت سب رس کے سرورق علیحدہ نہ کئے جائیں تو مناسب ہے۔ عام طور پر رسالوں کی
جلد بندی کے وقت ایسا کیا جاتا ہے۔ ہر نمبر کی طرح سب رس کے سرورق بھی ایک انفرادی حیثیت رکھتے ہیں۔ اور خاص اہتمام اور بڑے صرفہ سے تیار کرائے
جاتے ہیں۔

سب رس خان بہادر عبدالرحمٰن چغتائی، مسٹر خلیل، اور مسٹر تراب کا شکر ادا کرتا ہے کہ انھوں نے بڑے پایہ کے سب رس کے لئے
خوبصورت دیدہ زیب سرورق تیار کئے اور کر رہے ہیں۔ اسی طرح محبوب شریف صاحب ... کی تعریف بھی ضروری ہے کہ
انھوں نے ادارہ کی فرمائش پر سب رس کے لئے نئی نئی وضع کے مضبوط اور خوشنما کرم پوش تیار کئے جن میں پورے سال کے بارہ رسالے محفوظ کئے
جا سکتے ہیں۔

طلبہ اور بچوں کے حصہ میں ہم نے اعلان کیا تھا کہ سال بھر میں جن کے چھ مضمون شایع ہوں گے ان کو سب رس کی طرف سے انعام دیا جائے گا۔
حسن اتفاق کی بات ہے کہ چھ مضمون کسی کے بھی نہیں چھپے۔ اس لئے جن جن کے پانچ مضمون چھپے انہی میں یہ انعام تقسیم کر دئے جاتے ہیں۔ اس طرح
... رحیم الدین ظہیر آبادی، معین الدین احمد انصاری، محمود علی، اور مسیح الدین خاں مستحق انعامات کے مستحق ہیں اور دفتر سے اپنے انعام حاصل کریں۔

ہم نے گذشتہ پرچہ کے اداریہ میں لکھا تھا کہ مولانا سیماب کی نظم مرزا ... کے نام سے بھیج دی گئی تھی۔ لیکن اب اس بارے میں عزیز فاطمہ صاحبہ
کی معذرت وصول ہوئی ہے کہ وہ اس نظم کو بھیجتے وقت اپنے نام کے آگے مرسلہ لکھنا بھول گئی تھیں۔ چونکہ سب رس میں پہلے بھی اس طرح بعض منقولہ
نظمیں چھپ چکی تھیں اس لئے ان کو بھی اپنی پسند کی نظم نقل کر کے بھیجنے کا خیال پیدا ہوتا تھا۔ اگرچہ انھوں نے اپنے معذرت نامہ کے شایع کرنے پر اصرار
کیا ہے لیکن اس کا تذکرہ ہی کافی ہے۔

اس شمارہ میں پروفیسر ہارون خاں صاحب شیروانی کی تصویر شایع کی جا رہی ہے۔ جنھوں نے گذشتہ چھ ماہ یورپ کی سیر و سیاحت میں
گزارے جہاں وہ "علوم تاریخ کی پنج سالہ بین الاقوامی آٹھویں کانگریس" میں جامعہ عثمانیہ کی نمائندگی کے لئے تشریف لے گئے تھے۔
ہندوستان سے اس تقریب میں صرف دو ہی نمایندے شریک تھے۔ مشہور مورخ فادر ہراس اور پروفیسر ہارون خاں صاحب شیروانی۔

اس کانگریس نے مشرق بعیدہ کے امور کے لیے بیس مشہور و معروف اصحاب کی جو مجلس منتخب کی ہے اس کا پروفیسر شیروانی کو [illegible]
بنایا ہے۔ انھوں نے کانگریس میں جو مقالہ پڑھا وہ اس عنوان پر تھا "اسلامی سیاسی تحقیق اور اس کا درجہ علوم سیاسی میں"

یہ پرچہ اپنی اہمیت کی وجہ سے کانگریس کے اکیڈیمک سیشن کے پہلے ہی دن رکھا گیا تھا۔ اور اس کے سنانے کے لیے [illegible]
بحث و مباحثہ کے لیے بیس منٹ دے گئے۔ پروفیسر شیروانی کو کانگریس نے اس کمیٹی کا صدر منتخب کیا جو تاریخ ہند و مختلف [illegible]
تقسیم کرنے کے لیے مقرر کی گئی تھی۔ اس اعزاز کے علاوہ پروفیسر صاحب علوم تاریخی کی اس بین الاقوامی مجلس عاملہ کے بھی [illegible]
جو آئندہ پنج سالہ کانگریس تک کام کرتی رہے گی۔ ان اعزازات پر ادارہ پروفیسر شیروانی صاحب اور جامعہ عثمانیہ کو مبارک باد دیتا ہے [illegible]
شکریہ ادا کرتا ہے کہ انھوں نے اپنے تاثرات سفر یورپ سب رس میں چھپنے کے لیے روانہ فرمائیے۔

اس مہینہ میں ادارہ ایک اور نئی کتاب "مدراس میں اردو" شایع کر رہا ہے۔ اس کے مصنف مولوی نصیر الدین صاحب ہاشمی [illegible]
"دکن میں اردو" ایک کتاب آفریں کتاب ثابت ہوئی کیونکہ اس کے بعد ہی ہندستان کے مختلف صوبوں کے اصحاب کو اپنے [illegible]
خدمات پر نظر ڈالنے کا خیال پیدا ہوا۔ چنانچہ دو کتابیں یعنی حافظ محمود خاں شیروانی کی "پنجاب میں اردو" اور نواب نصیر حسین خاں خیال
"مغل اور اردو" شایع ہو چکی ہیں۔

ہاشمی صاحب نے مدراس میں اردو لکھ کر ایک کمی کو پورا کر دیا ہے۔ صوبہ مدراس میں اردو صدیوں سے مروج ہے [illegible]
بڑے شاعر اور انشا پرداز پیدا ہو چکے ہیں۔ اس کتاب میں ان سب کے متعلق بہت مستند معلومات پیش کی گئی ہیں۔ جو اصحاب [illegible]
کی ترقی سے دلچسپی رکھتے ہیں وہ اس کے مطالعہ سے ضرور مستفید ہوں گے۔

اس سال یعنی ۱۹۳۸ء میں ادارہ نے چار کتابیں شایع کیں۔ نذر ولی۔ گریہ و تبسم۔ من کی دنیا۔ مدراس میں اردو۔ [illegible]
موضوع بالکل مختلف ہیں لیکن ہر کتاب مفید اور دلچسپ ہے اور اردو زبان اور ادب میں اضافہ کا باعث ہے۔ توقع ہے کہ آئندہ سال [illegible]
زیادہ کتابیں شایع کر سکے گا۔

سب رس کا جنوری نمبر مملکت دکن کے ماضی، حال اور مستقبل کے متعلق مفید، دلچسپ اور مستند معلومات کے لیے وقف کر دیا گیا ہے [illegible]
دور عثمانی میں اور زیادہ تر جشن سیمین عثمانی کے سلسلہ میں کئی کتابیں اور رسالے ایسے شایع ہوئے ہیں جن میں ان موضوعوں پر بہت کچھ لکھا [illegible]
لیکن سب رس کے دکن نمبر کو ملک اور ادارۂ ادبیات اردو کے شایاں اعلیٰ معیار پر مرتب کیا جا رہا ہے۔ یہ نمبر دکن کے سیاسی [illegible]
تمدنی حالات کی ایک مستند اور شگفتہ تاریخ ہونے کے علاوہ مستقبل کے لیے ایک ایسا رہبر ثابت ہوگا جس کی رہنمائی میں عہد حاضر کی بعض [illegible]
سکتی ہیں۔ اس میں تاریخ دکن کے جملہ پہلوؤں پر ذمہ دار اور موزوں و مستند اصحاب سے مضامین اور مقالے تیار کر کے شایع کیے جا [illegible]
اور ان کے علاوہ زمانہ قدیم سے آج تک کے سلاطین و امرائے دکن کی ایسی نادر پختیہ تصویریں بھی شایع کی جا رہی ہیں جن میں سے [illegible]
قریب تو بالکل پہلی دفعہ شایع ہو رہی ہیں۔ اور ایسے مشاہیر کی ہیں جنھوں نے اپنی زندگی میں اس سر زمین کی سیاسی اور [illegible]
بڑا حصہ لیا تھا۔ ان تصاویر کے لیے ادارہ نواب سالار جنگ بہادر کا ممنون منت ہے۔ کیونکہ یہ سب نواب صاحب معظم ہی کے گراں بہا [illegible]
لطیفہ کی بیش قیمت قدیم قلمی تصویروں سے حاصل ہوئی ہیں۔ اگر نواب سالار جنگ بہادر کی ذاتی توجہ اور خاص دلچسپی شامل نہ ہوتی تو [illegible]
آب و تاب کے ساتھ سب رس دکن نمبر نکالنے کی جرأت ہی نہ ہوتی۔

بہ مرقع دکن سالانہ خریداروں کو تو مفت دیا جائیگا لیکن صرف ایک پرچہ علیحدہ خریدا جائے تو دو روپیے سے کم قیمت میں نہ ملے گا۔ اور واقعہ یہ ہے کہ اس نمبر کی محض تصویروں کی لاگت اس قیمت سے زیادہ ہے۔

سب رس اپنے قدر دانوں سے متوقع ہے کہ وہ آئندہ سال بھی اپنی خریداری جاری رکھیں گے اور اپنے اعزہ و احباب کو بھی اس کا خریدار بنائیں گے کیونکہ جتنے زیادہ خریدار ہوں گے اتنا ہی سب رس کی زیب و زینت میں اضافہ ہوگا۔ اس امر کے اظہار کی تو شاید ضرورت نہیں کہ یہ رسالہ جو اردو داں اصحاب میں علم و ادب کے ذوق کو عام کرنے کی خاطر نکالا جا رہا ہے۔ اس سے ادارہ یا اس کے کارکن کوئی ذاتی منفعت نہیں حاصل کرنا چاہتے۔ اس نے ایک سال ہی میں حیدرآباد میں کافی علمی و ادبی چہل پہل پیدا کر دی ہے اور یقین ہے کہ آئندہ سال اس کی دلچسپیاں اور دائرہ اثر اور بھی وسیع ہو جائے گا۔

اس مہینہ حیدرآباد میں سید ہمایوں مرزا صاحب بیرسٹر کا ایک طویل علالت کے بعد انتقال ہوا۔ مرحوم سب رس کی معاون اور اردو کی مشہور انشا پرداز خاتون محترمہ صغرا بیگم صاحبہ کے شوہر اور خود بھی ایک اچھے مصنف اور شاعر تھے۔ چنانچہ ان کی ایک رباعی اس شمارہ میں شایع کی جا رہی ہے۔ اس جانگداز غم و الم میں ادارہ محترمہ موصوفہ کے ساتھ اظہار ہمدردی کرتا ہے۔

ادارہ

مشرق کے قائد اعظم غازی مصطفیٰ کمال اتاترک مرحوم کی وفات حسرت آیات تمام مشرق کے لئے باعث رنج و الم ہے۔ افسوس ہے کہ یہ شمارہ تیار ہو چکا تھا ورنہ سب رس میں بھی اتاترک مرحوم کے متعلق بعض مضامین اور نظمیں ضرور شریک کی جاتیں۔ فی الحال جناب ماہر القادری صاحب کی ایک نظم درج ہے جو اس نمایندہ جلسہ میں سنائی گئی تھی جو باشندگان حیدرآباد کی جانب سے ۱۸ نومبر کو پیالس ٹاکیز میں منعقد ہوا۔

صدقے تری جرارت کے سمجھایا زمانہ کو — تلوار کے سایہ میں رازِ مے و پیمانہ

جس مے کی حلاوت نے ترکی کو کیا زندہ — اس مے کا ادھر بھی دے ساقی کوئی پیمانہ

سطوت کا تری نغمہ توپوں کے دہانوں پر — آزادی کا دل ہے شائد ترا افسانہ

تو مرد مجاہد ہے، تو غازی ملت ہے — بھاری ہے زمانہ پر ایک عشوۂ ترکانہ

سناتی ہیں صلیبوں کی زبانیں — تری وحدت پرستی کا فسانہ

تعالیٰ اللہ! تری شانِ جلالت — لرزتا ہے شکوہ کافرانہ

ترا ہر کارنامہ غیر فانی — بدل دی تو نے تاریخ زمانہ

غلاموں کی نمازوں سے مقدس — ترا سجدہ بہ طرز غازیانہ

تو نے بتایا سارے جہاں کو — اک مرد غازی دنیا پہ بھاری

طاقت کے آگے جھکتی ہے سطوت — بیکار ہیں سب فریاد و زاری

مردان کاہل، یاران سادہ — کرتے ہیں شب کو اختر شماری

غازی کی راتیں مقتل کی صبحیں — ہر سانس گویا اک سعی جاری

رباعیات

جب غم سے دل و دماغ پھٹ جاتے ہیں
احباب بھی منہ پھیر کے ہٹ جاتے ہیں
دل کو کیا کیا سکون دل ملتا ہے
جب سارے تعلقات کٹ جاتے ہیں

۲

جب سانس [illegible] سوز جگر جاتا ہے
فولاد سا سخت دل بھی مڑ جاتا ہے
جب [illegible] گرائے غم کی بجلی
سرمایۂ ہوش بھک سے اڑ جاتا ہے

امجد

غزلیات

نالہ مرا چمن میں ستم ڈھا کے رہ گیا
جو گل کھلا وہ آہ سے مرجھا کے رہ گیا

اتنا تو میکشوں کی دعا نے کیا اثر
میخانے پر اک ابر سیہ چھا کے رہ گیا

لایا گل [illegible] جھونکا نسیم کا
دامن میں ہر بہار میں پھیلا کے رہ گیا

سیلاب اشک سے مجھے تسکین تو کیا ہوئی
کچھ اور آگ سینے میں بھڑکا کے رہ گیا

صورت جو محتسب کی نظر آ گئی مجھے
پینا کیا شراب کا غم کھا کے رہ گیا

چلتے ہوئے چمن سے وہ باد صبا کے ساتھ
میں ساتھ ان کے نقش کف پا کے رہ گیا

اے چرخ کتنے خاک سے پیدا ہوئے حسین
تو ایک آفتاب کو چمکا کے رہ گیا

رندوں نے پی شراب تو جام و سبو کی طرح
مستی میں ایک ایک سے ٹکرا کے رہ گیا

تعریف حشر اس نے جو پوچھی تو میں جلیل
قصہ شب فراق کا دہرا کے رہ گیا

فصاحت جنگ جلیل

۲

اضطراب اہل دل جیسے کہ نامعلوم ہے
ان کا طرز بے نیازی کس قدر معصوم ہے

لذت ذوق وفا سے نظر تا محروم ہے
حسن کہتے ہیں جسے ظالم نہیں مظلوم ہے

کاش! پروانوں کی جرأت رنگ محفل دیکھتی
بزم میں اک ابتری ہے شمع بھی مغموم ہے

مسکراہٹ ان کی دلکش ہو مگر کیا کیجیے
ان کی پیشانی پہ ان کا حال دل مرقوم ہے

آپ سن بھی لیں تو فرصت غور کرنے کی کہاں
عشق کا افسانہ تو مفہوم در مفہوم ہے

کیا اسی کا نام ہے ماہر محبت کا مآل
میں ہوں اب اور سوگواری دل مرحوم ہے

ماہر القادری

عمارتوں کے عجیب و غریب نام - ۱۵ - رسم و رواج - ۱۶ - قدیم روایتیں - ۱۷ - عید اور تہوار وغیرہ

اگر آپ حسن اتفاق سے کسی قدیم شہر کے باشندے ہوں تو آپ کو ہر دورانے میں سبزہ کے ساتھ ساتھ [illegible] خاکے بھی اگتے ہوئے نظر آئیں گے۔ قدیم آبادیاں فسانوں کے خاکوں سے بھری پڑی ہیں خصوصاً دہلی، لکھنؤ، حیدرآباد [illegible] اور دو نو ابطن اصلی سے صدیوں ہم آغوش رہ چکے ہوں قصوں کے سرچشمے ہیں۔ اگر آپ کا محلہ یا اس کا [illegible] [illegible] کسی موضوع یا افسانوی [illegible] آپ کی ضیافت [illegible] آئیں تو آپ ٹہلتے ٹہلتے یا کاڑی میں [illegible] [illegible] دقت نظر اور قوت کوشش سے کام لیجئے آپ [illegible] ملیں۔ فسانوں کے نہیں تو کم از کم مضامین کے [illegible] دستیاب ہو جائیں گے۔

اگر آپ کو اپنے شہر کی کسی چیز کی نسبت کچھ لکھنے کا شوق نہیں ہے تو موضوع حاصل کرنے کا ایک اور طریقہ یہ ہے کہ کوئی [illegible] اور دیکھئے سیکڑوں عنوان آپ کے سامنے کھیلتے نظر آئیں گے۔ مثال کے طور پر صرف ایک لفظ "عورت" کو لیجئے اور دیکھئے [illegible] عنوان آپ کے ذہن میں آ گئے۔ مثلاً

ا ۱ - عورت پردہ میں - ۲ - بے پردہ عورتیں - ۳ - صحیح اسلامی پردہ - ۴ - ہندوستان اور پردہ - ۵ - پردہ کی ضرورت [illegible] ۷ - بے پردہ یورپ - ۸ - اگر آج پردہ اٹھ جائے۔

ب ۱ - صحیح بیوی - ۲ - بیوی جو مرد کو مرد بناتی ہے - ۳ - بیویاں کیا جانتی ہیں - ۴ - انتظام خانہ داری - ۵ - ہوشیار بیوی [illegible] بے وقوف مرد - ۶ - ہوشیار مرد اور بے وقوف بیویاں - ۷ - مشہور بیویاں - ۸ - مشہور آدمیوں کی بیویاں - ۹ - بیوی کی ضرورت [illegible] مصنوعی بیویاں - ۱۱ - چار بیویاں -

ج ۱ - صحیح ماں - ۲ - مشہور مائیں - ۳ - مشہور آدمیوں کی مائیں - ۴ - ماں کی مامتا - ۵ - بچوں کی پرورش

د ۱ - کام کی عورتیں - ۲ - رقاص عورتیں - ۳ - مشہور طوائف - ۴ - بھولارن - ۵ - پنواڑن - ۶ - مامائیں - ۷ - مالنیں - ۸ [illegible] ۹ - کل کی لڑکیاں - ۱۰ - قدیم وضع کی عورتیں - ۱۱ - حسین عورتیں - ۱۲ - راز دار عورت - ۱۳ - عملی عورتیں - ۱۴ - کھلاڑی لڑکیاں - ۱۵ [illegible] عورتیں - ۱۶ - مردانہ عورتیں۔

یہ مکمل فہرست نہیں ہے اور نہ کوئی ایک شخص اس کی تکمیل کر سکتا ہے۔ اور اس کے پیش کرنے کا مقصد یہ نہیں ہے کہ آپ بسم اللہ کہہ کر ان تمام عنوانوں پر مضمون نگاری کا قصد شروع کر دیں۔ یہ اور اس قسم کے کئی عنوانوں میں سے اپنے لئے انتخاب کر [illegible] مضمون نگار بہت سوں کو رد کر دیتا ہے کیونکہ عین ممکن ہے کہ ان کی نسبت اس کی معلومات کم ہوں۔

ان میں سے بعض عنوانات پر لکھنے کے لئے ذاتی تجربہ کی ضرورت ہے، اور بعضوں کی نسبت دوستوں یا اہل پیشہ اور [illegible] گفتگو کے دوران میں بہت سے نکتے حل ہو سکتے ہیں۔ ان زندہ ذریعوں کے علاوہ فنی کتابوں، انسائیکلوپیڈیا اور اس قسم کی دوسری معلوماتی تحریروں سے بھی مدد مل سکتی ہے۔

اس کتاب کے آخر میں بھی اسی فصل کے سلسلے میں ایک ضمیمہ کے طور پر ایسے سیکڑوں عنوان پیش کئے گئے ہیں جو دلچسپ اور کامیاب مضمونوں افسانوں بلکہ کتابوں کے موضوع بن سکتے ہیں۔

لکھنے کے لئے موضوع حاصل کرنے کا ایک اور مفید طریقہ یہ ہے کہ ہمیشہ ایک نوٹ بک ساتھ رکھی جائے اور اس میں قصوں یا مضمونوں کے متعلق جو بھی خیال آپ کے ذہن میں آئے اس کو فوراً قلمبند کر لیجئے تاکہ کسی وقت اس سے کام لے سکیں۔

اگر نوٹ بک ساتھ نہ ہو تو کسی کاغذ کے ٹکڑے پر ایک آدھ لفظ لکھ رکھنا بھی نہایت سود مند ثابت ہوگا۔ اپنے حافظہ پر بھی بھروسہ نہ کیجئے۔ یہ بہت ممکن ہے کہ کوئی خیال اس وقت تو آپ کے ذہن میں موجود بلکہ واضح ہو لیکن آدھ گھنٹہ کے بعد بالکل غائب ہو جائے ذہنی نقوش سے زیادہ تحریری نقوش پر اعتماد رکھئے۔ موقع اور وقت پر صرف ایک لفظ یا اشارہ قلمبند کر لینا کافی ہے اور پھر جب آپ کو فرصت ملے پورے خیال کو لکھ ڈالئے۔ لیکن اس دفعہ بھی ذہن پر ضرورت سے زیادہ زور نہ ڈالئے۔ ورنہ کام میں ایک طرح کی مصنوعیت پیدا ہو جائے گی۔

بعض دفعہ رات میں جب نیند اچاٹ ہو جاتی ہے اور انسان بستر پر کروٹیں بدلتا رہتا ہے اس کا دماغ غیر ارادی طور پر قسم قسم کے مضمونوں اور قصوں کے خاکے پیش کرتا جاتا ہے۔ اس وقت اگر دلچسپ خیال مل جائے تو اس کو جانے نہ دیجئے اس کے ساتھ کھیلنے کی کوشش کیجئے کہ آپ کا تخیل اس پر روشنی ڈالتا رہے۔ اور اگر اس طریقہ کار سے کوئی کام کے مکالمے ترکیبیں یا جملے پیدا ہوتے جائیں تو ان کو فوراً لکھ ڈالئے۔ ہوشیار انشاپرداز بستر کے قریب ہمیشہ کاغذ اور پنسل رکھا کرتے ہیں بعض اصحاب کے ذہن میں صبح نیند سے بیدار ہونے کے بعد ناولوں، نظموں اور مضمونوں کے متعلق خیالات پیدا ہوتے ہیں ان میں بہت کم ایسے ہوتے ہیں جو ان کی نسبت اسی وقت ایک آدھ لفظ لکھ لیتے ہوں۔

غرض اگر آپ سلیقہ اور اصول کے ساتھ خیالات کو قلمبند کر کے جمع کرتے جائیں تو چند مہینوں میں ایک نہایت اچھے ذخیرہ کے شاد کام مالک ہو جائیں گے اور کبھی خاکوں اور موضوعوں سے محروم نہ رہ سکیں گے۔

ان موضوعوں سے متعلق جن سے آپ کو دلچسپی ہو انگریزی اور اردو اخباروں کے تراشوں (کٹنگز) یا ایسی عبارتوں کو جو افسانوں یا مضمونوں کے امکانات پیش کرتی ہوں جمع کرتے رہئے۔ پھر ان تمام کو سادہ کاغذ پر چپکا کر محفوظ کر لیجئے اور فرصت کے اوقات میں ان کو مضمون وار ترتیب دیتے رہئے اگر ہو سکے تو "نیوز پیپر کٹنگ البم" خرید لائیے اور ان تراشوں کو اس میں محفوظ کر لیجئے۔

(ماخوذ از فن انشاپردازی)

سید محی الدین قادری زور

رباعی

اے گل یہ بتا تجھ میں بو کس کی ہے
باغوں میں [illegible] ہے
دل لینا لپٹ لپٹ کے خو کس کی ہے
اب تک نہ کھلا کہ جستجو کس کی ہے

سید ہمایوں مرزا

فرزندانِ دارالعلوم کی علمی خدمات پر ایک نظر

نثر نگاران

نثر نگاران دارالعلوم کی تعداد شاعروں سے زیادہ ہے، فرزندانِ دارالعلوم کے تصنیفات کا پتہ چلانا [illegible] البتہ مختصر طور پر ان کا تذکرہ کیا جاتا ہے۔

دورِ اول کے نثر نگاروں میں ملا عبدالقیوم مرحوم، مرزا مہدی خاں کوکب اور نواب قادر نواز جنگ کے نام پیش [illegible] کا نام حیدرآباد کے علمی اور قومی اسٹیج سے کبھی مٹ نہیں سکتا۔ انھوں نے "استدعائے تعلیم جبری" کے نام سے ایک رسالہ [illegible] کی تھی جو نہ صرف معلومات کا ایک کافی ذخیرہ رکھتی ہے اور اپنے زمانے کی قابلِ قدر کتاب ہے، ملا صاحب نے اس وقت جبری [illegible] کی تھی جب کہ ہندوستان کے [illegible] مصلح قوم کے لئے کی آواز بھی ہنوز بلند نہیں ہوئی تھی۔ ملا صاحب کے دیگر تصانیف [illegible] اور اخلاقی مضامین بھی خاص اہمیت رکھتے ہیں۔

مرزا مہدی خاں کوکب [illegible] میں جو دارالعلوم کی تعلیم کے بعد یورپ تشریف لے گئے اور وہاں سے علم [illegible] ڈگری حاصل کی۔ آپ کی کتاب "[illegible] سرکارِ عالی" قابلِ قدر معلومات کا گنجینہ ہے۔ اس کے علاوہ آپ کے [illegible] تراجم بھی اردو زبان میں بیش بہا اضافہ کا موجب ہیں۔

قادر نواز جنگ [illegible] شاعری کے ساتھ نثر نگاری کا بھی شوق تھا چنانچہ "شیراز کی مہربانو" اور "دشمنِ جاں" [illegible] آپ [illegible] میں شراب کی مذمت اور اس کے برے نتائج کی تفصیل کی گئی ہے۔

اس دور کے کئی اور بھی نثر نگار ہیں مگر ہم ان کے کارناموں سے بخوبی واقف نہیں ہیں اس لئے تفصیل کا موقع نہیں۔

دوسرے دور کے نثر نگاروں کی صرف فہرست بھی خاصی طویل ہو سکتی ہے۔ یہاں مختصر صراحت کی جاتی ہے اس دور کے [illegible] مختلف علوم و فنون میں اپنی قوتِ فکر اور زورِ قلم کا اظہار کیا ہے۔ ادب، اخلاق، تاریخ، فلسفہ، منطق، حدیث، فقہ، ریاضی [illegible] مختلف فنون میں ان کے تصانیف ہیں اور عزت کی نگاہ سے دیکھے جاسکتے ہیں۔

مولوی جمال الدین نوری مرحوم۔ مولوی غلام مصطفےٰ ذہین مرحوم۔ شاعری کے ساتھ نثر نگاری میں بھی کافی مہارت رکھتے تھے [illegible] کی کتاب شرح دیوانِ غالب ایک قابلِ قدر ضخیم کتاب ہے افسوس کہ اب تک زیورِ طبع سے آراستہ نہیں ہو سکی۔ ذہین مرحوم کے اخلاقی [illegible] اور کتابیں لائقِ ستائش ہیں۔

مولانا عبدالقدیر صدیقی کی کئی کتابیں شائع ہو چکی ہیں جن سے آپ کی نثر کا پوری طرح اندازہ کیا جاسکتا ہے،

[illegible] نثر کے میدان میں بھی جولانی دکھائی ہے آپ کی کتابیں جمالِ امجد، حجِ امجد، حکایاتِ امجد، [illegible] [illegible] رکھتی ہیں۔

جمالِ امجد آپ کی خود نوشتہ سوانح زندگی ہے مگر یہ ایسی سوانح ہے جس میں تصوف اور حقائق کا خزانہ جمع کر دیا [illegible]

معرفت اور حقیقت کا دریا بہا دیا ہے، فلسفہ اور حکمت کا مخزن بنا دیا ہے، اسی طرح گلستان اقبال جو سعدی کی گلستاں کا ترجمہ ہے مگر اس کی حالت ترجمہ کی نہیں بلکہ تصنیف کی ہوگئی ہے، جس میں سعدی کی نظم و نثر کا نثر میں ترجمہ کیا ہے اور موقع بموقع اپنی رباعیات و قطعات وغیرہ درج کئے ہیں جس کے باعث ترجمہ کی شان باقی نہیں رہی ہے۔

اس دور کے نثر نگاروں میں مولوی مرتضی مرحوم کا نام بھی درخشاں نظر آتا ہے۔ آپ کے تاریخی اور تنقیدی مضامین اپنی آپ نظیر ہیں۔ تاریخی مقالات جو جدید اصول کے لحاظ سے تنقیدی پہلو پر لکھے گئے ہوں ان کے دکن میں آپ ہی موجد ہیں، آپ کی کتاب اردو ئے دکن جو سلطنت آصفیہ کی تاریخ ہے مرحوم کی زندگی میں شائع نہ ہوسکی اور اب اس کا ایک حصہ عہد سلطنت کے نام سے شائع ہوا ہے جس سے معلوم ہوسکتا ہے آپ کی تاریخی معلومات کا کیا درجہ ہے۔ روح ترقی، تاریخ التواریخ، میلاد خاتم النبی، سوانح بافرخندہ وغیرہ آپ کی کتابیں شائع ہوچکی ہیں ان کے علاوہ معارف علی گڈھ اور صحیفہ حیدرآباد دکن وغیرہ میں آپ کے بیسیوں مقالے شائع ہوکر مقبولیت حاصل کرچکے ہیں۔

اس دور کے نثر نگاروں میں مولوی عبدالباسط اور مولوی اکبر علی بھی خاص حیثیت رکھتے ہیں۔ مولوی عبدالباسط مولانا عبدالقیوم مرحوم کے تیسرے فرزند ہیں اپنے والد بزرگوار کی طرح دارالعلوم سے استفادہ کیا اور اپنے عمدہ ادبی اور تاریخی مضامین کے لحاظ سے ممتاز حیثیت حاصل کرلی۔ رسالہ صحیفہ میں آپ کے قابل قدر مضامین عام طور سے دلچسپی سے دیکھے جاتے تھے۔ مولوی محمد اکبر علی مہتمم اخبار صحیفہ بھی اپنی ادبی قابلیت سے مشہور ہیں رسالہ صحیفہ اور پھر اخبار صحیفہ کے اڈیٹر کی حیثیت سے جو نام آوری آپ نے حاصل کی وہ محتاج بیان نہیں ہے ایک عربی ناول کا ترجمہ بھی آپ نے معجز محبت کے نام سے شائع فرمایا ہے۔

مولوی شمس الدین صدیقی صاحب اور مولوی عبدالوہاب صاحب عندلیب بھی اسی دور کے نثر نگار ہیں صدیقی صاحب کے چھوٹے چھوٹے اخلاقی اور اصلاحی رسالے اور عندلیب صاحب کی کئی ایک مذہبی کتابیں نثر اردو میں قابل قدر اضافے ہیں۔

اس دور کے ایک مشہور مضمون نگار مولوی محمد مظہر[*] ہیں آپ کی تصنیف "قلمرو آصفی کی دولت" سلطنت آصفی کی دولت و ثروت، صنعت و حرفت کی معلومات کا گنجینہ ہے، یہ کتاب حضرت غفراں مکاں میر محبوب علی خاں آصف جاہ سادس کی پچاس سالہ جوبلی کی نمائش میں پیش ہوئی تھی اور آپ کو اس پر انعام ملا تھا۔ مظہر صاحب کی دوسری کتابیں بھی ہیں مثلاً اخلاق رسالت پناہی وغیرہ اس کے علاوہ آپ کے کثیر مضامین رسالہ اور اخبار صحیفہ میں شائع ہوئے ہیں، حیدرآباد کی سیاسی، تعلیمی، علمی، صنعتی وغیرہ معلومات پر جس قدر آپ کو عبور حاصل ہے وہ بہت کم اصحاب کو ہوگا۔

اس دور کے ایک نثر نگار عبدالرزاق بسمل ہیں، ان کی کتابیں تذکرہ جمیل، اور صنف نازک مقبولیت حاصل کرچکی ہیں ان کا اشہاب کئی سال سے ملک کی خدمت گزاری میں مصروف ہے۔

اس دور کے اور بھی کئی نثر نگار ہیں مثلاً مولوی اکرام علی صاحب، مولوی محمد نصیر الدین صاحب، مولوی قادر مرتضی حسین صاحب وغیرہم

---

[*] مولوی حافظ محمد مظہر صاحب، مولوی مرتضی مرحوم سابق سکریٹری ایجوکیشنل کانفرنس کے بھائی ہیں، اور اب کانفرنس کے سکریٹری آپ ہی ہیں۔

ثوالت کے خوف سے سب کی صراحت نظر انداز کی جاتی ہے۔

دار العلوم کے تیسرے دور کے بھی کئی ایک نثر نگار میدان عمل میں گام زن ہیں، مثلاً مولوی حسام الدین صاحب، مولوی عبدالرب صاحب کوکب اڈیٹر رسالہ اتالیق، مولوی عبدالغفار صاحب، مولوی عبدالسلام مرحوم وغیرہ،
مولوی حسام الدین صاحب اپنے وعظ کے باعث کافی شہرت رکھتے ہیں، مولوی عبدالرب نے بزم انجم کے نام سے علم ہیئت پر قابل قدر رسالہ شایع کیا ہے اور اپنے رسالہ اتالیق کے ذریعہ ملک کی خدمت کر رہے ہیں۔ مولوی عبدالغفار صاحب کی ... اور اصلاحی شائع ہوئی ہیں۔ مرحوم عبدالسلام کی کئی تصانیف ہیں اس کے علاوہ ان کے بیسیوں مضامین ملک کے ... میں شائع ہو کر مقبولیت حاصل کر چکے ہیں۔ مرحوم کی بے وقت جوان موت ایک افسوس ناک واقعہ ہے، ملک کی اردو ... امیدیں مرحوم سے وابستہ تھیں۔

راقم الحروف کو بھی دار العلوم کے تیسرے دور سے ہی تعلق ہے، میری مطبوعہ کتابوں کی تفصیل حسب ذیل ہے

(۱) دکن میں اُردو (اس کے اب تک تین اڈیشن شائع ہوئے ہیں، تیسرا اڈیشن بالکل جدید تالیف کی حیثیت رکھتا ہے) (۲) (شافعی فقہ) (۳) رہبر سفر یورپ (۴) یورپ میں دکھنی مخطوطات (۵) حضرت امجد کی شاعری (۶) مکتوبات امجد (۷) عہد عثمانی (۸) ذکر نبی (۹) خیابان نسوان (۱۰) دفتر دیوانی کے اُردو مخطوطات کی فہرست (۱۱) سلاطین دکن کی ... ان کے علاوہ چند اور کتابیں عنقریب شائع ہونے والی ہیں مثلاً (۱) مقالات ہاشمی حصہ اول و دوم (۲) مدراس ... (۳) صغرا بیگم کے موسومہ خطوط وغیرہ۔

دار العلوم کے چوتھے دور کے طلبہ کو چونکہ جامعۂ عثمانیہ سے تعلق ہے اس لئے ان کے کارناموں کی صراحت ہمارے موضوع ...

صحافت اخباروں اور رسالوں کی اڈیٹری بھی ایک بہت بڑی علمی خدمت ہے لہٰذا اس کی صراحت بھی اس موقع پر ضروری ہے۔ فرزندان دار العلوم نے اس حیثیت سے بھی نمایاں خدمات انجام دیئے ہیں، جو اصحاب اس زمرہ میں شامل ہوتے ہیں وہ حسب ذیل ہیں:

(۱) مولوی سید رضی الدین حسن کیفی مرحوم نے رسالہ صحیفہ جاری کیا تھا "انجمن معارف" کی زیر نگرانی یہ رسالہ شائع ...
(۲) مولوی محمد اکبر علی صاحب۔ انجمن معارف کے شکست ہونے کے بعد مولوی اکبر علی صاحب اس رسالے کے اڈیٹر بنے کئی سال تک شائع ہوتا رہا۔ اس میں عموماً اہل دکن اور خصوصاً فرزندان دار العلوم کے علمی، اخلاقی، تاریخی، فلسفی، ادبی وغیرہ مضامین شائع ... یہ رسالہ اپنے بیش بہا مضامین کے لحاظ سے تمام ہندوستان میں خاص وقعت رکھتا تھا۔ اس کے دلچسپ اور پُر از معلومات ... اور خاص میں مقبولیت رکھتے تھے۔

چند سال کے بعد رسالہ نے روزانہ اخبار کی صورت حاصل کی جنگ ٹرکی اور بلقان کے زمانے میں اس اخبار نے بڑی ... حاصل کرلی۔ اس زمانے میں سوائے منشیر دکن اور صحیفہ کے کوئی دوسرا روزانہ اخبار نہیں تھا۔ اخبار صحیفہ نے ملک کی جو خدمت کی ہے ہر آئینہ لایق ستائش ہے۔

(۳) مولوی عبدالباسط صاحب فرزند ملا عبدالقیوم مرحوم نے "معارف" کے نام سے ایک روزانہ اخبار شائع فرمایا تھا جو کچھ عرصہ کے بعد بند ہوگیا۔ (۴) مولوی عبدالوہاب صاحب عندلیب ایک پندرہ روزہ اخبار "واعظ" کے نام سے شائع کرتے ہیں، یہ اخبار پہلے ماہوار رسالہ کی صورت میں شائع ہوا کرتا تھا، اس کے بعد یہہ پندرہ روزہ اخبار کی صورت میں منتقل ہوا، اس میں مذہبی مضامین شائع ہوا کرتے ہیں، عموماً اہل اسلام خصوصاً دیہات کے مسلمانوں کی اصلاح اس رسالہ کا نصب العین ہے اور اپنے مقصد میں کامیابی کی پوری کوشش کرتا ہے۔ (۵) مولوی عبدالرب کوکب ایک ماہوار رسالہ بچوں کے لئے "اتالیق" کے نام سے شائع کرتے تھے، سرکار عالی کی جانب سے مدارس میں تقسیم ہوتا تھا۔ (۶) مدرسہ دارالعلوم سے ایک رسالہ مولوی عبدالواسع مرحوم سابق پرنسپل عثمانیہ کالج کی اڈیٹری اور راقم کے اہتمام سے شائع ہوا ہے، اس رسالہ کا نام "ثمرۃ الادب" تھا کیونکہ دارالعلوم کالج کی یونین انجمن ثمرۃ الادب کی جانب سے یہہ شائع ہوتا تھا۔ بعض طلبہ اور پروفیسران دارالعلوم کے مضامین اس میں شائع ہوئے ہیں، ایک سال کے بعد یہہ رسالہ بند ہوگیا۔ ۔۔۔ اسمعیل صاحب کئی سال سے رسالہ شہاب شائع کررہے ہیں جو اپنی پابندی وقت کے لحاظ سے خاص طور پر قابل ذکر ہے، اردو زبان کی خدمت گزاری اور "بلدیہ" کی خدمت اس کا نصب العین ہے۔

ہر حال فرزندان دارالعلوم نے صحافت کے میدان میں پوری جولانی دکھائی ہے اور ان کو اس میں کامیابی بھی ہوئی ہے۔

علمی انجمنیں منتخرجین دارالعلوم نے علمی انجمنوں کے ذریعے بھی ملک کی کافی خدمت انجام دی ہے، اس کی پوری تفصیل ہمارے اس مختصر مضمون میں دشوار ہے، البتہ بطرز نوٹ کچھ صراحت کردی جاتی ہے:۔

ملا عبدالقیوم مرحوم نے نواب عماد الملک مرحوم کے ساتھ شریک ہوکر "دائرۃ المعارف" کی بنیاد ڈالی اور اپنے ذاتی صرفوں سے اس کی ابتداء فرمائی، اس ادارہ کا مقصد یہہ تھا کہ نایاب عربی کتابوں کو صحت کے ساتھ شائع کیا جائے۔

اس ادارہ نے جو ترقی حاصل کی ہے اس کو اہل ملک نے بچشم خود چند ماہ پہلے دیکھ لیا ہے جب کہ سالانہ جلسہ منعقد ہوا تھا۔ ادارہ کہ صرف ذاتی صرفہ سے قائم ہوا تھا وہ اب سرکار عالی کی توجہ سے پانچ لاکھ کے مستقل سرمایہ سے کام کررہا ہے، اور اب تک ۔۔۔ کتابیں جن کی تقریباً دوسو جلدیں ہوتی ہیں شائع ہوچکی ہیں، نہ صرف ہندوستان بلکہ بلاد اسلامیہ اور یورپ میں بھی اس ادارہ کو کافی شہرت ہے۔

انجمن معارف، ملا صاحب مرحوم کی سرپرستی میں دارالعلوم کے چند نوجوانوں نے ایک علمی انجمن بنام "انجمن معارف" قائم کی تھی ۔۔۔ میں علمی لکچر ہوتے تھے اور ایک علمی رسالہ صحیفہ شائع ہوتا تھا۔

دارالعلوم ہی کے فرزند نے حیدرآباد ایجوکیشنل کانفرنس قائم کی تھی، جب تک مولوی مرتضی مرحوم زندہ رہے کانفرنس کو ترقی دینے میں مصروف رہے ان کے بعد کانفرنس پر مردنی چھاگئی تھی مگر اب پھر دارالعلوم ہی کے فرزندوں محمد مظہر، مرزا محمد بیگ صاحب، حبیب الرحمن خاں صاحب کی کوشش سے دوبارہ بیدار ہوکر کام کررہی ہے، چنانچہ گزشتہ مہر میں اس کے اجلاس ہوچکے ہیں۔

حیدرآباد ایجوکیشنل کانفرنس نے اپنے مقصد میں کہاں تک کامیابی حاصل کی اور ملک میں علمی بیداری پیدا کرنے اور جامعہ عثمانیہ کے

قیام میں جو کچھ جد و جہد اس نے کی ہے اس کی تفصیل کا یہہ موقع نہیں ہے

فرزندان دارالعلوم نے "انجمن طلبہ قدیم دارالعلوم" بھی قائم کی تھی نادار طلبہ کو وظائف دینا' متخرجان دارالعلوم کی تعلیم دلانا اور عموماً تعلیمی اور خصوصاً دارالعلوم کے تعلیمی امور کی جانب سرکار کو متوجہ کرنا اس انجمن کا مقصد عظیم تھا

... علی مرحوم کی زندگی تک یہہ انجمن بھی اپنے مقاصد میں پوری طرح سرگرم رہی اس کے سالانہ اجلاس منعقد ... ساٹھ سالہ جوبلی کا علمی جلسہ حیدرآباد کے علمی جلسوں میں ہمیشہ یادگار رہے گا جو اپنی شان شوکت اور نوعیت کے ...

مرحوم عبدالسلام نے انجمن اساتذہ کلیہ کی بنیاد قائم کی تھی جس نے اب کانفرنس اساتذہ کی صورت حاصل ... ایک کامیاب تعلیمی کانفرنس خیال کی جاتی ہے۔

عبدالسلام مرحوم نے اور بھی کئی علمی' اخلاقی اور مذہبی انجمنیں قائم کی تھیں اور اپنی زندگی تک وہ ملک کی خدمت میں مصروف و منہمک رہے۔ مرحوم کا نام ہی "انجمن گر" رکھ دیا گیا تھا۔

انجمن ثمرۃ الادب بھی دارالعلوم ہی کے طلبہ کی انجمن تھی ملک کی علمی بیداری میں اس انجمن کا بڑا حصہ ہے ... طبی جلسوں کی بنیاد اسی انجمن کے ذریعے قائم ہوئی تھی۔

اس طرح فرزندان دارالعلوم کے علمی خدمات کثیر ہیں' جن کی تفصیل اور صراحت دشوار ہے' ڈاکٹر سید محی الدین ... اپنی تالیف "عہد عثمانی میں اُردو کی ترقی" میں فرزندان دارالعلوم کے علمی خدمات کا ذکر بھی جا بجا کیا ہے اور ان کے ... کے معترف اور مداح ہیں۔

یہہ ہے فرزندان دارالعلوم کے علمی خدمات کی مختصر روداد جو حیدرآباد کی علمی تاریخ میں ہمیشہ یادگار رہے گی۔

نعیم الدین ہاشمی

غزل

آنسو نہ کبھی بہائیں گے ہم
کیا دل کی لگی بجھائیں گے ہم

گھبرا کے کہیں بھی جائیں گے ہم
پھر تیرے ہی در پہ آئیں گے ہم

دیوانہ بنا دیا ہے تم نے!
دنیا کو بہت ہنسائیں گے ہم

جب اپنی شکست مان لیں گے
اس دن سے نظر نہ آئیں گے ہم

گر دید ہے وجہہ بے قراری
نظریں ہی نہیں اٹھائیں گے ہم

جب آئے گی یاد جھیڑ ان کی
روتے میں بھی مسکرائیں گے ہم

تم لاکھ دکھاؤ بے نیازی
طالب ہیں ضرور آئیں گے ہم

محمد طالب حسینی

تعلیمی سفر یورپ

(ڈائری کے دو ورق)

روز یکشنبہ ۱۳ جون ۱۹۳۷ء آج کل یہاں اُجالا بہت جلد ہو جاتا ہے اور سویرے ہی آنکھ کھل جاتی ہے۔ بار بار گھڑی دیکھتی رہتی ہوں کہ آخر کیا وقت ہو گیا ہوگا۔ آج ہم اس وقت تک کہیں باہر نہیں گئے۔ چونکہ دوپہر کے کھانے کے بعد ہم بہت دور جائیں گے مسز وتانے نے آرام کے لئے وقت دیا ہے۔ علاوہ اس کے آج اتوار کا دن بھی ہے اور تمام بڑی بڑی دکانیں اور ادارات بند رہتے ہیں۔ غرض کہ ہماری قیام گاہ پر ایک جلسہ منعقد ہوا اور ہم کو فرانس کے سیاسی حالات سنائے گئے۔ فاضل مقرر نے آغاز تقریر ہی میں فرمایا۔ یورپ ایسا کوربخت ملک ہے کہ اس میں اتحاد عنقا ہو رہا ہے۔ مختلف زبانیں بولی جاتی ہیں ساتھ ہی ہر ملک کی تہذیب بھی جداگانہ ہے۔ آزادی اور اقتدار کی زد میں صدیوں سے کشمکش چلی آ رہی ہے اور ہنوز سکون نصیب نہیں ہوا۔ بعض اوقات یہی ہیجان یہاں انقلاب کی صورت میں نمودار ہوتا رہا۔

سنہ ۱۷۸۹ء کے انقلاب عظیم نے فرانس کی کایا پلٹ دی اور اس کے لیے انتہا تا اثرات میں سے زیادہ اہمیت ان اقتصادی، اخلاقی و دماغی ترقیوں اور آزادی کو دی جاتی ہے جس نے قوم کے رگ و ریشہ میں ایسا تموج برقی پیدا کر دیا اور انھوں نے یہ جان لیا کہ زندگی کا دوسرا نام آزادی ہے اور مساوات و اخوت و حریت کے بلند نعروں سے تمام ملک کو جگا دیا۔ فرانس کی آبادی پچاس فی صدی شہری اور پچاس فی صدی مزارعین پر مشتمل ہے۔ غلہ کی کاشت بس اس قدر ہوتی ہے کہ تمام ملک کے لئے کافی ہو جائے۔ فرانس بیرون ملک کی درآمد کا محتاج نہیں۔ برعکس اس کے اگر انگلستان سے ممالک خارجہ و نوآبادیات قطع تعلق کر لیں اور اناج کی درآمد روک دی جائے تو اہل ملک کو فاقہ کشی کی نوبت آ جائے۔ فرانس کے باشندوں کے دل فرقہ وارانہ تعصب سے صاف ہوتے ہیں جس کا بیّن ثبوت اس امر سے ہوتا ہے کہ ممالک خارجہ سے لوگ آتے ہیں اور فرانس میں سکونت پذیر ہو جاتے ہیں اور ملک کا تمدن اختیار کر لیتے ہیں۔ اس کی وجہ یہ بھی ہو سکتی ہے کہ اہل فرانس صرف صلح پسند ہی نہیں بلکہ دخل در معقولات سے حتی الامکان کنارہ کش رہتے ہیں اور اپنی آزادی میں وہ خودغرض نہیں ہیں بلکہ اوروں کو بھی آزاد دیکھنا چاہتے ہیں۔ حقوقِ انسانی کی حفاظت ان کا فرضِ اولین ہے۔ فرانس میں بہت سی سیاسی جماعتیں موجود ہیں۔ اشتراکی جماعت زیادہ طاقتور نہیں اور عورتوں کو اب تک حق رائے دہندگی نہیں دیا گیا۔ اس کا سبب یہ ہے کہ خود انھوں نے کبھی مطالبہ ہی نہیں کیا وہ گھریلو کاموں سے زیادہ اُنس و دلچسپی رکھتی ہیں اور شوہروں سے موافقت کا یہ حال کہ باہم شیر و شکر رہتی ہیں اور یونہی تمام حقوق حاصل ہو جاتے ہیں ان کو کسی قسم کی شکایت کا موقع نہیں رہتا۔ اختتام تقریر پر مباحثہ کے لئے وقفہ دیا گیا اور آخر میں مسز وتانے نے مقرر کا شکریہ ادا کیا۔

دوپہر کے کھانے کے بعد ہم سب ملکر شاہی محل دیکھنے گئے جس کی تعمیر لوئی چہار دہم کے عہد میں ہوئی تھی۔ رہنما نے بتلایا کہ جب بادشاہ شکار کھیلنے نکلتا تو اکثر وہیں جا کر ٹھیرتا تھا۔ اس شکارگاہ میں بتدریج کمرے بنتے گئے اور قلیل عرصہ میں ایک رفیع الشان محل کھڑا ہو گیا فی الحقیقت بادشاہ کے رہائش کے کمرے، دربار کا ہال، کھانے کے اور استراحت کے کمرے بہت نفیس ہیں

کپڑے بدلنے کا بہت بڑا کمرہ ہے۔ کہا جاتا ہے کہ جلیل القدر ڈیوک علی الصباح بادشاہ کو کپڑے پہنانے حاضر ہوتے تھے۔ ہر ایک کے ہاتھ میں ...
... پر رہتا تھا اور سب اس کی رونق افروزی کے منتظر رہتے تھے۔ بادشاہ کو لباس پہنانے کا اعزاز نہایت اہم سمجھا جاتا تھا۔ ایسے افراد منتخب ہوتے ...
... سے بے تکلفی ہوتی تھی اور ذیشان بھی ہوتے تھے۔ لوئی کی والدہ اور بیوی کے کمرے اپنی پاکیزگی اور نفاست میں بے مثل ہیں۔

قصر شاہی کی دیواریں تمام گلکاری اور تصاویر سے مزین کی گئی ہیں۔ لیکن ہر جگہ بادشاہ کی تصویر زیادہ نمایاں معلوم ہو رہی ہے ...
ٹوپی میں سفید پروں کا طرہ لگا ہوا ہے۔ بادشاہ کی والدہ کے کمروں میں لوئی کے لڑکپن کی تصویریں ہیں۔ کہا جاتا ہے کہ ملکہ نہایت ...
خاتون تھی اور اس نے اپنے فرزند ارجمند کی تربیت دینے میں کوئی دقیقہ فروگذاشت نہ کیا تھا لیکن لوئی کے کردار کی ایک کمزوری کو ...
کرسکی۔ اس میں اور اس کی بیوی میں اتفاق پیدا کرنے کی کوئی تدبیر اس کو سجھائی نہ دی۔ ان دونوں میں ان بن رہتی تھی کیونکہ لوئی ...
لڑکیوں کا شیدا تھا۔ ملکہ ناراض اداس اور چڑچڑی رہا کرتی تھی اور تنہائی پسند ہوگئی تھی۔ ان لڑکیوں کی رہائش کے لیے متعدد
چھوٹے چھوٹے کمرے بنوائے گئے تھے۔ یہاں کا باغ بہت پرانا ہے۔ فلک بوس درختوں کے سایہ میں نشستیں بنی ہیں اور کرسیاں ...
رہتی ہیں۔ لوگ آکر بیٹھتے ہیں اور سبزہ زار دلکشائے رنگین کے تختوں اور فواروں کے فرحت بخش مناظر سے لطف اندوز ہوتے ہیں۔

۱۸ جون دوشنبہ۔ ناشتہ کے بعد ہم سب بازاروں کی سیر کو روانہ ہوئے۔ اس قدر بڑی بڑی دکانیں ہوتی ہیں کہ اگر
انسان پہلی دفعہ تنہا جائے تو مشکل سے باہر نکل سکے۔ ہزارہا چیزیں قرینے سے رکھی ہوتی ہیں اور ہر ایک پر قیمت کی چٹھی لگی ہوتی ...
ہندوستان کے بعض شہروں میں بھی اچھی دکانیں ہیں لیکن اتنے بڑے پیمانہ پر نہیں۔ ہم سب نے کچھ نہ کچھ خریدا۔ ہمارے
پنجابی رفیقوں نے بہت سی ایسی چیزوں پر زر کثیر صرف کیا جو اکثر غیر ضروری تھیں۔

مسٹر ڈنانے موٹریں تیار رکھی تھیں دوپہر کے کھانے کے بعد ہم سب ایک نہایت دلآویز مقام کی جانب روانہ ہوئے۔ ...
چند میل کے فاصلہ پر ایک نیا قایم شدہ مدرسہ ہے۔

آج کے نظام العمل میں اس اسکول کے معاینہ کو خاص جگہ دی گئی تھی۔ اتفاق سے ہمارا گزر خوشنما چمن اور گلزاروں پر
ہوا جس طرف نظر اٹھاتے گلاب ہی گلاب دکھلائی دیتے نہایت خوش رنگ اور ترو تازہ۔ درخت اور بیلیں پھولوں سے لدی
ہوئی تھیں۔ سرخ سفید پیازی و زرد گلاب کے گچھے اپنی رعنائیوں اور حسن آرائیوں سے دلکش نظارہ پیش کرکے تماشائیوں کو ...
بنا رہے تھے۔ اس معصوم نشاط زندگی سے محظوظ ہونے والوں کا جی چاہتا تھا کہ اس فردوس مثال گلستان میں اتر پڑیں اور ان
گلوں کو دیر تک گھورتے رہیں تاکہ ان کا نقشہ نظروں میں جم جائے اور تا دیر باقی رہے۔ اتنے میں ہمارے ساتھیوں کے ایک گروہ نے
یک بیک گانا شروع کردیا "جیون کا سکھ آج پربھو جیون کا سکھ آج" یہ غزل ختم ہونے بھی نہ پائی تھی کہ بمبئی والے رفیقوں نے تان اڑائی

If there is any trouble let us S.M.I.L.E.

مناظر قدرت کے عبور سے ادھر آنکھوں کو فرحت حاصل ہو رہی تھی۔ ادھر سامعہ نوازی سے دل میں سرور غرض کہ فضا عجیب
پرکیف نطافت سے مملو ہو رہی تھی۔ دو گھنٹے کا سفر ایک آن میں گذر گیا اور ہماری بس مدرسہ کی پھاٹک پر جا کھڑی ہوئی۔ مدرسہ کی
عمارت بلندی پر ہے اور بجائے سیڑھیوں کے ڈھلوان سڑکیں بنائی گئی ہیں۔ باقی آئندہ

مسز صوفی

میری سوچ

کبھی میں بھی جواں تھا سوچتا ہوں ۔۔۔ رگوں میں خوں رواں تھا سوچتا ہوں
خدا جانے کہاں بجلی گری تھی ۔۔۔ کہاں پر آشیاں تھا سوچتا ہوں
کبھی اے دوست کاشانہ بھی میرا ۔۔۔ چمن زار جناں تھا سوچتا ہوں
کوئی لمحہ بھی اپنی زندگی کا ۔۔۔ حیات جاوداں تھا سوچتا ہوں
حقیقت میں کبھی پہلو میں دل تھا ۔۔۔ کہ اک وہم و گماں تھا سوچتا ہوں
وہ الطاف کریمانہ تھے ان کے ۔۔۔ کہ میرا امتحاں تھا سوچتا ہوں
میں رویا تھا۔ مگر دامن مرا کیوں! ۔۔۔ مکمل گلستاں تھا سوچتا ہوں
فلک پر تھا دماغ اور سر زمیں پر ۔۔۔ میں سجدہ میں کہاں تھا سوچتا ہوں
مرا دردِ محبت بھی کسی دم ۔۔۔ مرا آرام جاں تھا سوچتا ہوں
یہی اب سوچ باقی رہ گئی ہے ۔۔۔ کہاں پر ہوں کہاں تھا سوچتا ہوں

شور عابدی
(گلبرگہ)

ملّا جی کا مکتب

بسلسلۂ گزشتہ

ہاں! یہ بات کہنا بھول گیا کہ ملا جی کو دیکھتے ہی سب نے مل کر السلام علیکم کا ایک نعرہ فرد مارا اور انھوں نے اس کا جواب اس طرح کھینچ تان کر دیا کہ گویا کوئی بدو نخلستان میں کھڑا ہوا اونٹوں کے بچوں کو پانی پلا رہا ہے۔

ملّا جی کا کسیرد کی طرح چھلا ہوا سر، غلافی آنکھیں، آنکھوں میں دنبالہ دار سرمہ، لمبی داڑھی کچھ سرخ، کچھ سپید اور کچھ کالی خاصی توس قزح کا نمونہ بنی ہوئی تھی۔ ملّا جی نے ہمیں دیکھتے ہی پہچان لیا، پہلے تو مسکرائے پھر فرمایا کہ بیٹا، شیرینی نہیں لائے؟ ہم نے کہا کہ جی نہیں! اماں جان نے کہا ہے کہ کل لے جانا۔ ملّا جی نے کہا کہ اچھا بیٹا! پھر کل ہی پڑھائی بھی شروع کر دینا، آج ایک طرف بیٹھ کر یہاں کی پڑھائی کا طریقہ دیکھ لو۔ اندھا کیا چاہے دو آنکھیں ہم نے کہا کہ مناسب ہے۔ اور کھسک کر ایک طرف بیٹھ گئے۔

اس کے بعد ملا جی نے اٹھ کر ایک محراب کا پٹ کھولا اور کچھ عملی تعلیم دینے کا سامان نکالا۔ اس میں ایک تو چوب دستیوں کا سیٹ تھا جو پانچ یا چھ چھوٹی چھوٹی لکڑیوں پر مشتمل تھا اور ایک تسموں کا سیٹ تھا، جو سب چھوٹے بڑے ملا کر تعداد میں تقریباً چھ یا سات تھے۔ ان میں ایک تسمہ تقریباً دو فٹ کا تھا، دوسرا تین فٹ کا، چوتھا چار فٹ کا ہو گیا تھا۔ دوسری

سب بس

ایک اور چھوٹی سی شئے تھی جو ڈفلی یا دف کے قبیل سے تھی، پھر دو رسیاں، کچھ سنگ ریزے اور اسی طرح کی [illegible] چیزیں تھیں جن کو ملاجی نے اپنے سامنے اس طرح چُن دیا تھا، جس طرح مداری تماشا کرنے سے پیشتر تمام سامان [illegible] آگے جمالیا کرتا ہے۔

ملاجی کے بعض اشیا پر خیال ہوتا تھا کہ وہ شاید فیروبل کے تحائف ہیں بعض پر گمان ہوتا تھا کہ وہ ڈاکٹر منٹسوری نے [illegible] ہیں جو حواس کی تربیت کے لئے ملاجی نے جمع کر لئے ہیں اور بقیہ یعنی ڈف، کنکر، رسی اور تسموں وغیرہ پر شبہ ہوتا تھا کہ وہ شاید [illegible] کئے ہوئے آلات ہیں جو بچوں کی ذہنی پیمائش کرنے کے لئے فراہم کئے گئے ہیں۔ مگر واقعہ یہ ہے کہ وہ سامان نہ تو محصلات کی ناپ تول [illegible] تھا اور نہ ذہنی پیمائش کے لئے تھا بلکہ وہ تمام آلات جسمانی اصلاح کرنے کے لئے تھے یعنی اگر کوئی لڑکا نزدیک ہے اور زیادہ [illegible] اس کے لئے چھوٹی چوب دستی استعمال کی جاتی تھی۔ ذرا کمزور ہے تو تسمہ سے مرمت کی جاتی تھی، ذرا دور ہے تو بڑی چوب دستی یا بڑا تسمہ [illegible] اگر بھاگ رہا ہے تو سب سے آخری نمبر کی بڑی چوب دستی یا بڑا تسمہ استعمال کیا جاتا تھا اور جب وہ مکتب سے نکل کر صحن تک [illegible] بجا دیا جاتا تھا، تاکہ وہ الارم سگنل کا کام دے اور تمام مکتب کے لڑکے بہ یک وقت اٹھ کر اس کے پیچھے دوڑیں اور ڈنڈا ڈولی [illegible] میں ادھر اٹھا لائیں۔ پھر تو جسمانی حواس ناپنے کے دوسرے آلات استعمال کئے جاتے تھے، یعنی زنجیر اور لکڑی کا کندا، زنجیر کا [illegible] کندا کاندھے پر [illegible] دیا جاتا تھا اور وہ حضرت دو چار گھنٹے تک گدھے کی طرح لدے ہوئے سیدھے کھڑے رہتے تھے۔ کبھی دیوار سے پیٹھ [illegible] دے کر ذرا جھکا کر کھڑا کر دیا جاتا تھا اور وہ کرسی بنے ہوئے دو ایک گھنٹے تک اسی طرح کھڑے رہتے تھے، کبھی دونوں ہاتھوں کی ہتھیلیوں [illegible] کے پاؤں کے نیچے دبا کر پٹی پر کسی مسنڈے کو بٹھا دیا جاتا تھا، کبھی ہاتھوں کو پاؤں میں سے نکال کر دونوں کان پکڑوائے جاتے [illegible] لیول قائم رکھنے کے لئے ان کی پیٹھ پر پانی سے بھرا ہوا بدھنا یا ایک تختی رکھ دی جاتی تھی۔ اس طرح وہ حضرت گھنٹے دو گھنٹے تک [illegible] کھڑے رہتے تھے اور کبھی رسی سے دونوں ہاتھ باندھ کر اُن کو ٹانڈ پر اس طرح کھینچ دیا جاتا تھا کہ نہ تو ان کے پاؤں زمین پر [illegible] ٹکے رہتے تھے۔ نہ ادھر رہتے تھے۔ غرض یہ کہ ایسے بہت سے طلسم اور چٹکلے موجود تھے جن سے لڑکوں کی کھال نرم کر دی جاتی تھی [illegible] راستہ چلنے والوں کو جنتر میں کھینچ کر تکلے کی طرح سیدھا کر دیا جاتا تھا۔ بظاہر ملاجی نہایت بردبار، سلیم الطبع اور رحم دل [illegible] اس لئے، ہم نے دیکھا کہ تعلیمی آلات جمانے کے دوران میں ہمارے ملاجی کے لڑکے گھر میں سے نکل کر مکتب میں نازل ہو گئے۔ یہ [illegible] تعداد میں شاید بارہ تھے جو چار نفر فی استانی ماں کے حساب سے اس دنیا میں تشریف لائے تھے۔ وہ ملاجی پر گدھ کی طرح گرے۔ کسی نے ان کی مونچھوں کے بالوں کا جائزہ لے لیا، کسی نے ڈاڑھی کو مٹھیوں میں بھر بھر کر ناپنا شروع کر دیا، کوئی پیٹھ پر جونک کی طرح [illegible] کسی نے ان کی کھوپڑی کا رقبہ نکالنا شروع کر دیا، کوئی پیٹ سے بندر کی طرح لپٹ گیا اور کوئی اُن کی گود میں قلا بازیاں کھانے [illegible] ملاجی کی یہ محبت اپنی اس لمیٹڈ کمپنی اینڈ سنس تک ہی محدود تھی مگر جو بچے کرڑ پہنے آتے تھے ان کے متعلق بجز چند موقعوں کے ملاجی [illegible] اصول پر عمل کرتے تھے کہ "جور استاد بہ زمہر پدر" وہ چند موقعے عید بقرعید، محرم اور شب برات کے تھے کہ ملاجی لڑکوں سے میٹھی میٹھی [illegible] کیا کرتے تھے۔ کسی سے کہتے تھے کہ دیکھو بیٹا! ہم نے مفلس، نادار، یتیموں اور بیواؤں کے لئے بیت المال کھولا ہے۔ بکرا ذبح ہوتے [illegible] خود لاکر یہاں پہنچا دینا۔ کسی سے کہتے تھے کہ بیٹا! ذرا حلوا زیادہ لانا، ہمارے گھر میں رات کو مُردے کثرت سے آئیں گے، غرض یہ کہ [illegible] مختلف موسموں پر مختلف موسمی فرمائشیں اور میٹھی میٹھی باتیں کرتے اور جہاں شب برات وغیرہ ختم ہوئی اور ملاجی ترش رو اور [illegible]

ہو جاتے تھے۔ ہاں تو ملا جی نے وہ تمام جسم کے رقبہ ناپنے کے آلات سامنے چن دیئے اور اپنا ذرا حلق صاف کر کے بلند آواز میں بسم اللہ پڑھی پھر کیا تھا مکتب کے لونڈوں نے گلے پھاڑ پھاڑ کر بے تحاشا چلانا شروع کر دیا۔ ہم نے دیکھا کہ ایک لڑکا بغدادی قاعدہ لیئے ہوئے سامنے آیا۔ قاعدہ تو چھوٹا سا تھا، مگر واقعہ یہ ہے کہ اسے پڑھاتے وقت چھٹی کا دودھ یاد آجاتا ہے۔ اس قاعدہ کے مصنف نے اس میں دنیا بھر کے طریقے بھر دیے ہیں، یعنی طریق الصوت بھی ہے، طریق ہجی بھی ہے، طریقہ راست بھی ہے، طریقہ بالواسطہ بھی ہے، طریقہ مثلثانی بھی ہے، وہ طریقہ تراکزی بھی ہے، صرف شرط یہ ہے کہ پڑھانے والا استاد اور تجربہ کار ہو تو یقین کامل ہے کہ بچہ ایک مہینہ اندر اندر ہی معلم الملکوت کے بھی کان کترنے لگتا ہے۔

ہم نے دیکھا کہ اس میں کل لے دے کے ۲۸ حروف اور شاید دس بارہ تختیاں ہیں مگر ان کا تلفظ کرتے وقت کبھی تو ملا جی کا سینہ پھول کر تقا کبوتر کی طرح دوہرا ہو جاتا تھا، کبھی جوش میں آکر وہ اپنا پورا زمین پر ٹیک دیتے تھے، کبھی آنکھیں بیر بہوٹی کی طرح سرخ ہو جاتی تھیں، کبھی گلے کی رگیں پھول کر الگ حرکت کرتی ہوئی معلوم ہوتی تھیں اور کبھی وہ ناک ہی ناک میں غن غنا کر حرف اس طرح ادا کرتے تھے کہ گویا کوئی استاد ستار کے تار پردے پر کھینچ کر مینڈ کاری کر رہا ہے۔ کبھی کہتے تھے کہ دیکھو یہ حروف صفیرہ ہیں چڑیا کی طرح آواز نکالو، کبھی کہتے تھے کہ یہ حروف حلقی ہیں، حلق سے ادا کرو، مگر لڑکوں کی سمجھ میں خاک بھی نہ آتا تھا۔ وہ لڑکے صرف "دیکھو بوبو" کیا اصول پر ان کا منہ تکتے تھے اور اسی طرح منہ بنا بنا کر ان کا منہ چڑاتے رہتے تھے۔ اس پر ہمارے ملا جی کبھی ڈانٹ ڈپٹ کرتے کبھی چوب دستی چلاتے اور کبھی تسمہ کو استعمال فرماتے رہتے تھے۔ ملا جی کے نعروں اور بچوں کی آوازوں سے ہمارے کانوں کے پردے پھٹ گئے۔ تسموں اور چوب دستی کی چیرہ دستیوں سے جی دہلنے لگا اور ہم پریشان تھے کہ کب چھٹی ملے اور کب ہم اپنے گھر چل دیں مگر ملا جی ہم سے بھی زیادہ کائیاں تھے، وہ آج کل کے جدید استادوں کی طرح نہ تھے کہ لڑکے درجہ میں بیٹھے ہوئے دوسرے کاموں میں مشغول رہیں اور ماسٹر صاحب کو خبر تک نہ ہو۔ ہمارے ملا جی کی توجہ لفظوں کے مخرج کی طرف بھی رہتی تھی، تلفظ کرتے وقت آنکھیں بند بھی رہتی تھیں مگر نظریں کویوں کے سوراخوں میں سے نکل کر دنبالہ دار سرمہ کے خطوط سے گذرتی ہوئی بچوں کے دلوں کا بھید لیتی رہتی تھیں۔ نتیجہ یہ ہوتا تھا کہ زبان چلنے سے اول ہاتھ اور ہاتھ چلنے سے پیشتر انیس نمبر کا تسمہ یا نمچی چلنا شروع کر دیتی تھی، جس نمبر کا لڑکا جس سزا کا مستحق ہے۔

خدا خدا کر کے ظہر کا وقت آیا اور ملا جی نے نماز شروع کر دی۔ ہم بھی برتول رہے تھے اور بڑی دیر سے منہ میں گھنگنیاں بھرے ہوئے بیٹھے تھے۔ موقع پایا تو ذرا اٹھ کر ایک لڑکے سے اس ڈف کی حقیقت پوچھنے لگے۔ ہم نے دیکھا کہ ملا جی رکوع میں گئے اور دونوں ٹانگوں کے بیچ میں سے سر نکال کر ہم کو باتوں میں مصروف دیکھا تو وہیں سے للکار کر فرمایا کہ "او نئے لونڈے میں نے تجھ کو دیکھ لیا ہے۔ نماز سے فراغت کر لوں تو دیکھ پھر تیری کیسی گت بناتا ہوں" یہ سن کر ہمارے ہاتھ پاؤں سن ہو گئے، ذرا سنبھلے تو سارے چھ فٹ والے تسمہ، ڈف، ڈنگا ڈولی اور اس زنجیر والے لکڑی کے کندے کا خیال آیا تو بس ہاتھوں کے طوطے اڑ گئے، زمین پاؤں کے نیچے سے نکل گئی، پھر وہاں سے جو چمپت ہوئے تو سیدھے گھر میں آکر دم لیا۔ اماں جان سے چمٹ کر پھوٹ پھوٹ کر رونے لگے اور توبہ کی کہ آئندہ سے پھر کبھی مکتب نہ جائیں گے یا تو کسی مدرسے میں شریک ہو جائیں گے یا وہی لنگور کی دم والا قاعدہ پڑھتے رہیں گے۔

مرزا عصمت اللہ بیگ

خودکشی

"سنئے خاں صاحب آپ تھرڈ کلاس کے مسافر ہیں۔ آپ کو جگہ دینی ہوگی۔ یہ کوئی بات ہے کہ آپ تو آرام سے سوتے رہیں اور ہمیں بیٹھنے کے لئے جگہ تک نہ ملے۔" شراب میں مست نووارد نے درشت لہجہ میں کہا۔ "کیا معنی" خاں صاحب نے اپنے سر کو اٹھاتے ہوئے کہا۔

"معنی یہی کہ تھرڈ کلاس کے مسافروں کو جب کہ مسافروں کی کثرت ہو سونے کا حق حاصل نہیں۔ اگر آپ کو آرام ہی کرنا ہو تو سکنڈ کلاس کا ٹکٹ لیجئے۔" "واللہ کیا بات کہی ہے تم نے بھی۔ شاید تھرڈ کلاس کے مسافر انسان نہیں —— ارے بھائی حیوان بھی آرام کرتے ہیں ہم تو خیر انسان ہیں۔ خاں صاحب نے کچھ مسکراتے ہوئے کہا۔ "لیکن یہ ریلوے قانون ہے آپ اس کی خلاف ورزی نہیں کر سکتے۔" "ہشت۔ قانون؟ اس کی پابندی کرنے والے الو اور تم بھی الو —— جاؤ ہم نہیں اٹھتا۔" خان صاحب نے تیور بدلا کر کہا۔ "خاں صاحب زبان سنبھالئے آپ نے الو کیا سمجھ کر کہہ دیا۔" نووارد کا چہرہ غصہ سے سرخ ہوگیا تھا۔ "سمجھنا کیا الو ہی تو رات کو نہیں سوتے تمھاری طرح جاگتے رہتے ہیں۔" میں شروع سے ان کی گفتگو سن رہا تھا۔ صرف اس خیال سے کہ کہیں یہ گفتگو ہاتھا پائی کی صورت نہ اختیار کر لے نووارد کو اپنے قریب بمشکل جگہ دی اور اس طرح سے ہم دونوں الو بیٹھے رہے اور خاں صاحب انسان بنے خراٹوں کی تانیں اڑا رہے تھے۔ نووارد نشہ میں چور تھا اور اس کا لباس اس بات کو واضح کر رہا تھا۔ وہ ایک غریب آدمی ہے۔ قد تقریباً پانچ فٹ لانبا چھریرا بدن گندمی رنگ خشخشی ڈاڑھی بڑی بڑی سرخ آنکھیں جن سے غم کے آثار ظاہر ہو رہے تھے۔ دسمبر کا مہینہ تھا۔ سردی حد سے زیادہ فیاضی سے کام لے رہی تھی۔ باوجود یکہ تمام کھڑکیاں بند تھیں۔ لیکن جسم سن ہوگیا تھا۔ ریل کے مسافر مختلف طریقوں سے اپنے آپ کو گرم رکھنے کی کوشش کر رہے تھے۔

نووارد ایک معمولی قسم کے کمبل میں جو اس سخت سردی کے [illegible] بید کی طرح کانپ رہا تھا۔ یہ میں نہیں جانتا کہ اس شخص [illegible] کیوں ہمدردی ہوگئی تھی۔ "لیجئے اسے اوڑھ لیجئے [illegible]" میں نے اپنی رضائی دیتے ہوئے کہا۔ نووارد میری طرف غور [illegible] لگا۔ شاید وہ میرے چہرے کو معمہ سمجھ کر اس کے حل کرنے میں [illegible] تھا۔ کانپتے ہوئے ہونٹوں سے اس نے شکریہ ادا کیا [illegible] میں خود کو اچھی طرح لپیٹ لیا۔ "آپ کہاں تشریف [illegible]" کچھ دیر بعد نووارد نے سوال کیا۔ "میں حیدرآباد جا [illegible]" "میں —— میں بھی آپ کا حیدرآباد تک ساتھ دوں گا" [illegible] —— سگریٹ پیجئے۔" میں نے اپنے سگریٹ کیس کو آگے [illegible] "معاف کرنا مجھے اس کی عادت نہیں۔" شرابی نے اپنے [illegible] شراب کا شیشہ نکالتے ہوئے کہا۔ ڈبہ کے اور دوسرے مسافر [illegible] نظروں سے اس کو گھورنے لگے۔ نووارد نے شراب کے چند گھونٹ [illegible] پی کر شیشے کو جیب میں رکھتے ہوئے کہا۔ "آپ کو زیادہ پریشان [illegible] ضرورت نہیں۔ میں سگریٹ کا عادی اس لئے نہیں ہوں کہ [illegible] اتنے زیادہ فائدہ مند ثابت نہیں ہوتے جتنی کہ یہ تلخ شراب۔"

موجودہ حالت میں میں نے بھی بہتر سمجھا کہ اس شرابی کے منہ نہ لگوں [illegible] سب مسافر اس کے ساتھ ساتھ مجھے بھی تیز نظروں سے دیکھ [illegible] اس لئے میں نے خاموشی اختیار کر لی۔ لیکن تھوڑی دیر بعد ہی شرابی [illegible] آہستگی سے مجھے مخاطب کیا۔ "میرے مہربان معاف کرنا ممکن ہے [illegible] غلط فہمی ہو رہی ہو لیکن کیا آپ میرا ایک شبہ دور کر سکتے ہیں؟" [illegible] نے ہر لفظ پر ٹھہرتے ہوئے کہا۔ "فرمائیے میں اپنی انتہائی کوشش [illegible] شبہ کو دور کرنے کے لئے صرف کروں گا۔" "اس سے پہلے کہ [illegible] کوئی اور سوال کروں میں آپ سے یہ دریافت کرنا چاہتا [illegible] کیا آپ مجھے جانتے ہیں؟" ایسا شخص جس کو قطعی میں نے اب تک نہ [illegible] دیکھا وہ اپنے آپ کو میرا آشنا سا بتانے کی کوشش کر رہا ہے میرے [illegible] یہ بے تکا جملہ سخت متحیر کن تھا۔ "معاف کرنا میں نے آج سے پہلے [illegible]

آپ کو . کہاں تک نہیں اس کے بعد جاننے اور نہ جاننے کا سوال ہی بے معنی ہے" میں نے سنجیدہ ہو کر کہا " مجھے اس کی امید تھی اور ان ایسے شخص کو آپ واقعی نہیں پہچان سکے جس کو آپ نے بہت کم دیکھا ہے۔ خیر ـــــ میرا خیال ہے آپ سلیم کو تو اتنا جلد نہیں بھول سکتے ۔" "سلیم ـــــ ان سے تو میں اچھی طرح واقف ہوں۔ اگرچہ ان سے میں بہت کم ملا ہوں اور ـــــ اخاہ ـــ میرے دوست اس سوال کا کیا مطلب تھا. کیا اس کے معنی یہ تو نہیں کہ آپ ہی وہ سلیم ہیں جن کی شناخت میں بہت آسانی سے کر سکتا ہوں ـــ فرمائیے دوست آپ اپنے خیالات کو بہت ہی محدود الفاظ میں ظاہر کر رہے ہیں میرے لئے ان کا سمجھنا قدرے دشوار ہے بہتر تو یہ ہے کہ آپ صاف صاف اپنے مطلب کو واضح کریں" میں نے سگریٹ سلگاتے ہوئے کہا۔" زمانہ ہر چیز میں انقلاب پیدا کر دیتا ہے۔ ممکن ہے کہ خرابی صحت کی وجہ سے مجھ میں بہت ساری تبدیلیاں ہو گئی ہوں لیکن میں ہوں وہی سلیم جس کو آپ اچھی طرح جانتے ہیں" میں نے بغور اس کے چہرے کا مطالعہ کیا میری پریشانی کی کوئی انتہا نہ تھی جب میرے دماغ نے بھولی ہوئی صورت کو پہچان لیا۔ میرے جسم میں ایک کپکپی سی پیدا ہو گئی میں نے بدحواسی میں اس سے سوال کیا۔" تعجب ۔ مجھے تو یہ خبر ملی تھی کہ آپ مر چکے ہیں۔" "ممکن ہے آپ نے ایسا سنا ہو لیکن میں اسی آرزو میں اب تک جی رہا ہوں شکر ہے کہ آپ نے مجھے پہچان لیا ـــ مسٹر رحیم آپ کو شناخت کرنے میں مجھے بھی بہت دقت ہوئی لیکن اتنی نہیں جتنی کہ آپ کو ہوئی ۔" "لیکن یہ تو فرمائیے کہ آپ غائب کہاں ہو گئے تھے ۔ یہ دو سال کا طویل عرصہ آپ نے کس طرح اور کہاں گذارا ۔ میں نے آپ کی تلاش میں کتنی کوشش صرف کی لیکن رائیگاں گئی ۔" اس کے چہرے پر ایک خاص قسم کی افسردگی دوڑ گئی ۔" "میں بہت جلد آپ کو ان باتوں سے باخبر کر دوں گا لیکن یہ تو فرمائیے ۔ کیا آپ کی اہلیہ "ثریا" بھی آپ کی ہم سفر ہیں" اس نے کچھ جھجکتے ہوئے کہا۔ اس سوال سے ایکدم میری حالت دگرگوں ہو گئی اور میری آواز پست ۔" "آپ کا اس سوال سے ـــ" "بالکل ٹھیک"۔ اس نے قطع کلام کرتے ہوئے کہا۔" میں شرابی ہوں لیکن ایک شریف انسان، اور پھر ثریا ـــ آپ تو جانتے ہی ہیں ـــ بس صرف ایک مرتبہ ان سے ملنا چاہتا ہوں اگر آپ کو ناگوار خاطر نہ گزرے" میں نے اپنی پریشانی کو چھپانے کی کوشش کرتے ہوئے کہا" ان سے آپ ملاقات کرنا چاہتے ہیں! آخر کس لئے ؟" میرے اس سوال کا جواب اس کے بڑے بڑے آنسو تھے۔ اس نے ایک مایوسی سانس کھینچی اور آہستہ سے کہا۔" دوست میں اب کچھ اپنی زندگی سے مایوس ہو گیا ہوں مجھے یقین نہیں کہ زندگی اب آئندہ میرا ساتھ دے گی۔ اسی لئے میں چاہتا ہوں کہ ایک مرتبہ ثریا کا دیدار نصیب ہو جائے اور ـــ ہاں یہ میری زندگی کے چند اہم ترین دنوں کا روزنامچہ ہے جس کو میری آرزو ہے کہ ثریا کے حوالہ کر دوں۔" سلیم نے اپنی جیب سے ایک کاپی نکالتے ہوئے کہا۔" مسٹر رحیم صرف چند منٹ میں میری یہ آخری تمنائیں پوری ہو جائیں گی۔ میں صرف اسی ارادہ سے حیدرآباد آ رہا تھا اس کا مجھے علم نہیں تھا کہ آپ بھی" میں نے قطع کلام کرتے ہوئے کہا ـــ" اچھا یہ دیکھئے ۔ کیا آپ مجھے اپنا روزنامچہ دیکھنے کا موقع دے سکتے ہیں؟" "کیوں نہیں اس میں کچھ ایسی بات نہیں جو آپ کو ثریا سے بدگمان ہونے کا موقع دے ـــ وہ تو دیوی ہے ـــ لیجئے" سلیم نے روزنامچہ کے چند خاص اوراق کی نشاندہی کرتے ہوئے کہا۔" انھیں پڑھ لیجئے یہ میرے روزنامچہ کا نچوڑ ہے ـــ لیکن سنئے مجھے ایک دفعہ ثریا سے ضرور ملا دیجئے ۔ یہ میری آپ سے التجا ہے" سلیم نے یہ کہتے ہوئے شراب کی بوتل منہ سے لگا لی میری نظریں بے تابی سے روزنامچہ کی تحریر پر دوڑ رہی تھیں ۔

سب رس

"کشمیر کی ایک شام"

موسم بہار کے شگفتہ پھولوں جیسی نازک اور خوبصورت،
نسیم صبح کی چھیڑ چھاڑ سے جھوم جھوم کر چٹکنے والی کلی کی طرح
چلبلی اور شوخ، کویل کی کوک کی طرح بولنے والی حسین ثریا آج
اپنے سڈول اور بلوریں جسم کو سیاہ بالوں کے فرکوٹ میں لپیٹے
ہوئے کتنی بھلی دکھائی دیتی تھی ـــــ اس کا گلاب کی پتی جیسا
شگفتہ اور نازک چہرہ سیاہ فرکوٹ اور سیاہ گیسوؤں کے درمیان
ایسا معلوم ہوتا تھا جیسے سیاہ بادلوں میں سے جھانکنے والا
بدر کامل ـــــ کاش اس وقت وہاں کوئی مصور موجود ہوتا
ـــــ اس کی نظر میں ایک ایسی تصویر کے لیے سامان مہیا کر دیتی
جو اس کی زندگی کی شاہکار تصویر ہوتی ـــــ لیکن وہاں تو
صرف میں موجود تھا ـــــ وہ مصور جو اپنے دل کے مندر میں
تصور کے آب و گل سے محبت کے ایک دیوتا کا مجسمہ تیار کر سکتا ہے
لیکن لوگ اُسے مصور نہیں سمجھ سکتے ـــــ دیوتا کے درشن
اور اس کی پوجا کرنے کا صرف اس کے موجد اور اس کے پجاری ہی کو
حق ہے اور دوسرے اُس کو دیکھنے کے لئے نظر پیدا کر سکتے ہیں
اور نہ پوجنے کے لیے دل ـــــ صرف ایک پجاری کا ایک دیوتا
نہ کبھی ٹوٹنے والا اور نہ کبھی مسمار ہونے والا ـــــ لیکن ہاں
میں بھول گیا ـــــ مندر کی موجودگی پر ہی دیوتا کے وجود کا
انحصار ہے۔ ثریا کا تو میں پجاری ہوں اور وہ دیوی ـــــ
اس خیال کے ظاہر کرنے میں مجھے خوف کیوں ہو جب کہ یہ میرا
ذاتی اور معقول خیال ہے اور جو صرف میرے روزنامچہ میں درج
کیا جا رہا ہے۔

ہاں اگر ایسا ہوتا کہ کسی مشہور رسالہ میں میرا روزنامچہ
شائع ہوتا تو ممکن ہے دنیا والے مجھے دیوانہ یا مجنون اور
مولوی کافر یا ملحد کہہ دیتے ـــــ لیکن مجھے ان روکھے
پھیکے مولویوں اور واعظوں سے تو سخت نفرت ہے ـــــ

یہ کیا جانیں کہ عبادت کا مفہوم کیا ہے۔ مجھے ان سے تعلق [illegible]
نہیں ـــــ کیونکہ آج ثریا نے بھی اپنے گانے میں [illegible]
اس خیال کی تائید کی ہے پھر میں کیوں نہ [illegible]
تری یاد میری عبادت ہے" ـــــ ندی کے بیچ ـــــ [illegible]
چمکدار روشنی میں ہچکولے لینے والی کشتی پر ـــــ [illegible]
اور دیوتا ـــــ کنارے سے بہت دور جہاں صرف [illegible]
موجوں سے پیدا ہونے والا نقرئی دبیلا شور ـــــ [illegible]
ملنے پر غصہ میں چیختے ہوئے سمندر پر منڈلانے [illegible]
مسلسل شور ـــــ اس کے ساتھ میری پیاری ثریا [illegible]
عربی گیت ـــــ اُس کی بلوریں گردن کی [illegible]
ہیں۔ جب وہ تان کھینچتی تھی ـــــ اس کی محبت [illegible]
بھری ہوئی آواز نیلگوں سمندر اور برف پوش پہاڑ [illegible]
ہوا میں ارتعاش پیدا کر رہی تھی ـــــ میں اس [illegible]
گیت کو نہیں بھول سکتا ـــــ کتنے پیارے اشعار تھے ـــــ
" اے میری محبوبہ ـــــ تیری یاد میری عبادت ہے [illegible]
مغرب کو ـــــ سمندر کے کنارے ـــــ جب کہ [illegible]
انسان تفریح میں مشغول ہوتے ہیں ـــــ اس وقت [illegible]
سورج دن بھر کے سفر سے تھک کر زرد اور ماند پڑ جاتا ہے
ـــــ ہاں ـــــ بالکل اُسی وقت ـــــ لوگ مجھے گھورتے ہوئے
گذر جاتے ہیں ـــــ میری نظریں مسلسل ایک ہی طرف [illegible]
رہتی ہیں ـــــ اور میں فکر محو طرز بت بنا ہوا رہتا ہوں
ـــــ ایسا کیوں ہوتا ہے؟ ـــــ اس لئے کہ "اے میری
محبوبہ ـــــ تیری یاد میری عبادت ہے" (باقی آئندہ)

خلیل اللہ

غریب الوطنی

دشمن کو نہ ہو رنج غریب الوطنی کا
چوبوں کو ہنر یاد ہے ناوک فگنی کا
فرحت کے عوض ہوتا ہے دل خون چمن میں

لہراتا ہے ہر رہ پہ علم راہ زنی کا
کلیوں میں بھی انداز ہے برچھے کی انی کا
غنچوں کی مہک آگ لگاتی ہے بدن میں

برسات میں جب جھوم کے آتی ہیں گھٹائیں
کہتی ہیں چلو عیش کے دریا میں نہائیں
دل خرمنِ باطل کو جلانے نہیں دیتا

میخانے لٹاتی ہوئی پھرتی ہیں ہوائیں
غم کو خس و خاشاک کے مانند بہائیں
شعلہ ہے مگر آگ لگانے نہیں دیتا

قاتل ہیں مسافر کے لئے چاندنی راتیں
ہر گام پہ یاد آتی ہیں احباب کی باتیں
رخ زرد ہی رہتا ہے سدا شمس و قمر کا

بے نور نظر آتی ہیں تاروں کی براتیں
کھاتی ہے خرد، دل سے ہر اک چال پہ ماتیں
بھاتا نہیں انداز کوئی شام و سحر کا

تنہائی تو معراجِ مصائب ہے سفر میں
ہر سانس پہ شعلے سے بھڑک اٹھتے ہیں سر میں
دم بھر کے لیے یاس سے گردن نہیں جھکتی

ہوک اٹھتی ہے دل میں تو کبھی درد جگر میں
اک آن بہلتا نہیں جی آٹھ پہر میں
سونے میں بھی اشکوں کی روانی نہیں رکتی

گل ہی نہیں، یاد آتا ہے ہر خار وطن کا
مہتاب کی ضو رنگ دکھاتی ہے کفن کا
منظر کبھی پردیس کا بھاتا نہیں کوئی

آنکھوں میں کھٹکتا ہے ہر اک پھول چمن کا
جھولے پہ تو ہوتا ہے گماں، دار و رسن کا
جز یادِ وطن دل کو بھاتا نہیں کوئی

دو دن میں بدل جاتی ہے پیری میں جوانی
رہتی نہیں دوروں پہ طبیعت کی روانی
دل محفلِ عشرت سے تعلق نہیں رکھتا

آتی بھی نہیں یاد محبت کی کہانی
ہوتی ہے قتیلِ غمِ دل سحر بیانی
ہوں شمس و قمر ساتھ مگر جی نہیں لگتا

خوش بخت ہیں، ناواقفِ آفاتِ زمانہ
ہے وردِ زباں حسن و محبت کا ترانہ

دل جن کے نہیں ناوکِ دوری کا نشانہ
آنکھوں سے چھلکتی ہے مئے عیش شبانہ

جوبن گل و ریحاں کا نکھرتا ہے چمن میں
فردوس میں رہتے ہیں، جو رہتے ہیں وطن میں

سکندر علی وجد

ایک ضعیفہ کی تمنّا

آؤ بیٹا! اِدھر آؤ — دیکھو ہم ماں بیٹی تمہارا کتنی دیر سے انتظار کر رہے ہیں، صبح سے ہم سراپا نگاہ بن
راہ دیکھ رہے ہیں، اب تم آ گئے بیٹا! جانواز مہر نو ہم میں جان آ گئی — آج تمہاری سکینہ نے کہا کہ تم جنگ
مانو، یہ سنتا ہی تھا کہ سوکھے دھانوں میں پانی پڑ گیا، میرا نصیبا جاگ اٹھا، میری برسوں کی آرزو کہ میرے کوئی بیٹا
ہوگئی، مجھے خدا نے یہ دن دکھلایا۔

— ہاں تو کہو، افسرِ جنگ نے تمہارا انتخاب کر لیا؟ ڈاکٹر نے تمہاری تصدیق کر دی؟ — تم نیچی نگاہیں کئے
کیوں قدم بڑھا رہے ہو بیٹا!؟ — میں جانتی ہوں، ہم بیکسوں کا خیال تمھیں ستا رہا ہے، دل بھاری نہ کرو
بیٹے میرے لال!؛ ہمارے ارمان، ہماری آرزوئیں قوم کی آزادی کے ساتھ ساتھ ہیں — ان ڈبڈبائی آنکھوں کو دیکھ کر
ہمارے دل بھر آئے ہیں — نہیں، بیٹا! یہ خوشی کے آنسو ہیں، آج ہم بے حد خوش ہیں — ہماری خوشی کی انتہا نہیں ہے
بہنوں نے مادرِ وطن کی آغوش میں ایسے تحفے پیش کئے ہیں جو ثریا کی طرح باہم متصل ہوں گے، جن کا نور بوڑھوں کا عصا
نگہبان — جن کی روشنی بھٹکے ہوئے مسافروں کے لئے مشعلِ راہ کا کام دے گی، تو کمزوروں اور مفلسوں کے دامنوں کو
موتیوں سے بھر دے گی، وہ شجاعت اور امتیاز کے میدان میں حق و صداقت انسانیت اور ملنساری کے لئے اپنے خون کا آخری قطرہ
تک بہا دیں گے۔

اِدھر آؤ بیٹا! بہادروں کی طرح، سینہ تانے میرے قریب آؤ، اور کہو کہ تمہارا انتخاب ہوگیا، اور پھر میں تمھیں اپنے
سینے سے لگاؤں اور اپنے بزرگوں کی روحوں کو پکاروں کہ وہ آئیں، اور تمھیں اپنی آغوش میں بھینچ بھینچ کر اپنے
قوت تمہارے شانوں میں بھر دیں، اور تم — ہاں تم ایک بہادر سپاہی کے جواں مرد بیٹے، کل سورماؤں کی صف میں
آواز سے اپنے قلب کی آواز ہم آہنگ کئے آگے آگے چلے جا رہے ہوگے، شہیدانِ وطن کی روحیں آگے بڑھ بڑھ کر تمہارے قدم
لیں گی — اور ہم بیکس ماں، بیٹی کی آتمائیں تم پر نچھاور ہوتی رہیں گی۔

— تم جب میدانِ جنگ سے فتح و کامرانی کا سہرا پہنے لوٹو گے تو تمہارے استقبال کو قوم کی لڑکیاں اپنے اپنے تحفے
لئے آگے بڑھیں گی، اور تمہاری مردانگی و شجاعت کے راگ گاتی تمہاری مدح و ثنا کرتی تمھیں گھر لائیں گی — اور تمہاری
تمہارے قدموں میں وہ انمول تحفہ پیش کرے گی، جو، تمہارے، اور صرف تمہارے لئے ہی مخصوص ہوگا —

— ہاں، تم جا سکتے ہو، ہم دونوں تمھیں الوداع کہنے کے لئے دل و جان سے راضی ہیں، ہمارے دل پکار پکار کر
تم جاؤ اور آئندہ نسلوں کے لئے آزادی کا باب کھول دو۔

— مجھے یقین ہے کہ تم ظالم و غاصب حریفوں کے چھکے چھڑا دو گے — تم یہ ثابت کر کے دکھا دو گے کہ حق و صداقت اسے
کہتے ہیں۔ تمہاری رگوں میں بہادر شہیدوں کا خون دوڑ رہا ہے، تم اُن کی شجاعت کا نمونہ ہو — تم کیا نہیں کر سکتے!!

...تم میں ہی نسرزندوں کے ہاتھوں قوم کی کامیابی ہے ــــ اُس کا وقار تمھارے ہی دم سے ہے ــــ تمھارے ہی ہاتھوں قوم کا پرچم
...ن کے سینے پر لہرا سکتا ہے ــــ!!

اکبر سُہیل

نظر آیا

وحشت میں عجب رنگِ بیاباں نظر آیا
ہر خار ہم آغوشِ گریباں نظر آیا

ظاہر نظر آیا کبھی پنہاں نظر آیا
ہر رنگ سے تو جلوۂ جاناں نظر آیا

اس شان سے وہ جلوہ بداماں نظر آیا
جس نے اُسے دیکھا وہی حیراں نظر آیا

ہم مر بھی چکے، ختم ہوا قصۂ ہستی
اب کیا ہے اگر کوئی پشیماں نظر آیا

وہ آئے عیادت کو تو چمکی مری قسمت
روشن سر بالیں مہِ تاباں نظر آیا

پھر برہمئی دوست کے آثار ہیں پیدا
الجھا ہوا پھر تارِ رگِ جاں نظر آیا

عشرت میں بھی انجام کی تلخی رہی شامل
ہر حال میں انسان پریشاں نظر آیا

اللہ رے نیرنگیِ رفتارِ زمانہ
خنداں جسے سمجھا وہی گریاں نظر آیا

کل ان کی معیت میں عجب شانِ چمن تھی
ہر پھول کا انداز غزل خواں نظر آیا

آباد کرو میکدۂ ہستی و مستی
پھر روح کی خلوت میں وہ مہماں نظر آیا

دیکھا کچھ اس انداز سے اس شوخ نظر نے
ہر ذرۂ عالم مجھے رقصاں نظر آیا

منظرؔ کہ ترے لطف پہ تھی زندگی اس کی
ہر حال میں شرمندۂ احساں نظر آیا

منظر صدیقی اکبرآبادی

مجھے خبر بھی نہ تھی نجمہ کہ وقت کا ایک لمحہ میری زندگی میں یوں انقلاب پیدا کر دے گا۔ اُف مجھے یاد ہے۔ اچھی طرح یاد ہے وہ
ایک لمحہ جس میں ایک دوست سے گفتگو کرتے کرتے تم سے ملنے کے سامان مہیا ہو گئے۔ اتفاقاً محض اتفاقاً ہماری ملاقات ہوگئی۔ اور
کہ ہم روز ملنے لگے۔ یاد ہے نجمہ میں کس پابندی سے تمہارے ہاں آتا تھا۔ ملازم رخصت لیتا ہے۔ طالب علم چھٹیاں مناتا ہے۔ لیکن میں نے
تمہارے ہاں آنے میں تامل نہیں کیا۔ ہاں ہاں۔ مجھے اعتراف ہے کہ میرا مقصد محض تم سے ملنا اور گفتگو کرنا ہوتا تھا۔ میرے
وابستہ تھے۔ لیکن کیا تم مانو گی کہ اُس دن بھی جس دن میرے پاس تمہارے ہاں نہ آنے کی کافی وجہ موجود ہوتی تھی مجھے نہ معلوم
تمہارے ہاں آئے بغیر چین نہ پڑتا تھا۔ سردی کی ٹھٹھرا دینے والی سردیوں میں ہواؤں کے تھپیڑے کھاتا ہوا گرما کی جھلسا دینے والی
میں گرم لوؤں کا مقابلہ کرتا ہوا۔ برسات میں بجلی کی دل دہلا دینے والی گرج اور آنکھوں کو خیرہ کر دینے والی چمک کا سامنا کرتا ہوا
ابر میں تمہارے پاس آکر ہی دم لیتا تھا۔ اور جب مجھے معلوم ہوتا کہ تم میرا انتظار کر رہی تھیں تو شاید تم نہ سمجھ سکو کہ میں کس آسانی سے
اپنے مصائب کو فراموش کر دیا کرتا تھا۔

نجمہ ہم اسی طرح ملتے رہے۔ بے روک ٹوک۔ بہت عرصہ تک۔ یا صرف چند دن۔ مجھے ٹھیک یاد نہیں۔ میں نے گننے کی کوشش ہی نہیں کی۔
تم جانتی ہو انسان کی فطرت کو۔ وہ سمجھتا ہے کہ دنیا ایک ہی حالت پر قائم رہے گی۔ جانتا ہے۔ دیکھتا ہے کہ ہر روز بلکہ ہر لحظہ دنیا بدل رہی ہے
مگر پھر بھی وہ اپنے آپ کو دھوکا دیتا ہے۔ اپنے آپ کو غلط فہمی میں مبتلا رکھنا چاہتا ہے۔ اور اگر کوئی اسے سمجھانے کی کوشش بھی کرے تو
وہ کانوں میں انگلیاں دے لیتا ہے۔ یہی میں نے بھی کیا۔ مجھے خیال بھی نہ تھا کہ تم اور میں ایک دن الگ الگ ہو جائیں گے۔ آخر نجمہ وہ
منحوس گھڑی آئی میں غصہ میں بھرا ہوا تمہارے گھر سے نکل گیا۔ میرا خون جوش کھا رہا تھا۔ گو بظاہر میں خاموش تھا۔ یقیناً نجمہ تم مزاج
ملتی تھیں۔ ایک ہمدرد اور خلیق کی طرح۔ لیکن اُف۔ وہ الفاظ میرے لئے ناقابل برداشت تھے۔ میں اپنی بے عزتی کو گوارا نہ کر سکتا تھا۔
تم کو یاد ہیں نجمہ وہ الفاظ؟ جن کو سن کر تم بھی چونک سی پڑتی تھیں۔ اور باری باری سے مجھے اور ان کو دیکھنے لگی تھیں۔ جن الفاظ کو سن کر
میں خاموشی کے ساتھ اٹھ کر وہاں سے نکل گیا تھا۔ اس ارادہ کے ساتھ کہ گو اس وقت تم سمجھ نہ سکی ہوں گی اور نہ اس کی متوقع ہوں گی کہ
پھر کبھی یہاں قدم نہ رکھوں گا۔

میں نے اسے بہت سہل جانا تھا۔ نجمہ جب تک تم سے مل سکتا تھا۔ میں اس سے قطعی لاعلم رہا کہ تم سے ملنا میرے ضروریات زندگی
میں ہوا پانی اور غذا کی طرح شامل ہو گیا ہے۔ جس طرح دولتمند انسان بھوک کی تکلیف کا تصور بھی ذہن میں نہیں لا سکتا جس طرح
چشمہ کے کنارے بسنے والا پیاس کو ایک معمولی خواہش تصور کرنے لگتا ہے۔ بالکل اسی طرح میں نے اس وقت تم سے جدائی کے بار کو محسوس کیا
آہ وہ الفاظ کہاں سے لاؤں جو دل کی اس وقت کی حالت کو بیان کر سکیں جس وقت مجھے یہ خیال آتا ہے کہ بغیر تم سے کہے ہوئے بغیر
تمہیں بتائے ہوئے کہ اب تم سے ہمیشہ کے لئے رخصت ہو رہا ہوں' میں چلا آیا۔ نجمہ مجھے بالکل معلوم نہ تھا کہ زندگی میرے لئے سوہان روح
بن جائے گی۔ میں نہیں جانتا تھا کہ اس کی یاد، جس سے میں سمجھتا تھا کہ مجھے کوئی قلبی تعلق نہیں ہے۔ مجھے راتوں کو چین سے نہ سونے دے گی۔

مجھے خبر نہ تھی کہ تمہارا خیال جس کو تمہارا وجود سامنے آکر دبا دیا کرتا تھا تم سے دور ہوتے ہی میری زندگی پر چھا جائے گا۔ سینہ میں آگ کی دبی ہوئی چنگاری تیز ہو رہی ہے۔ شعلے بھڑک رہے ہیں۔ میں جانتا ہوں کہ یہ میرے دل و دماغ کو پھونک ڈالیں گے۔ میرے ذہن عقل و ہوش کو جلا کر خاک کر ڈالیں گے۔ نہیں میری زندگی ہی بھسم ہو جائے گی۔

نجمہ تم متمول خاندان کی چشم و چراغ ہو۔ دولت تمہارے قدموں میں کھیل رہی ہے۔ سیکڑوں ایسے سامان تمہارے ارد گرد ہیں جو میرے خیال کو اگر وہ تمہارے دل کے کسی گوشہ میں موجود ہے بہت جلد نکال باہر کر دیں گے۔ میں جانتا ہوں تم جلد اور بہت جلد مجھے بھول جاؤ گی۔ شاید اب تک بھول بھی چکی ہو۔ ہاں بہتر بھی یہی ہے کہ ہم ایک دوسرے کو بھول جائیں۔ کیونکہ ہم دور ہو گئے ہیں ایک ہی جگہ رہ کر بھی بہت دور ہو چکے ہیں۔ اتنی دور کہ شاید اب اس دنیا میں ہم پھر کبھی ایک دوسرے سے نہ مل سکیں گے۔

محمد دلاور خاں مہدوی

وطن کے نام

نہ ملالِ جور و ستم تجھے، نہ خیالِ لطف و کرم تجھے
کیا کس کے فسونِ ستم گری نے اسیرِ ناز و نعم تجھے

تری بے خودی میں اثر نہیں، تجھے خودگری کی نظر نہیں
نہ قبولِ ذوقِ طرب تجھے، نہ عزیز لذتِ غم تجھے

ترے حوصلوں کا اثر ہے یہ، تری ہمتوں کا ثمر ہے یہ
کیا غیر کے خنجرِ ناز نے جو شکارِ جور و ستم تجھے

گل و غنچۂ طرفِ چمن، تری بے حسی پہ ہیں خندہ زن
نہ گمانِ راحتِ دل ترا، نہ یقینِ رنج و الم تجھے

ترا شعلۂ جاں ہی بجھا ہوا، ترا سوز و اثر ہی مٹا ہوا
نہ مجالِ شکوۂ آرزو، نہ فغانِ شوق کا دم تجھے

کبھی سوچتا بھی ہے اے وطن کہ یہ شوقِ راحتِ انجمن
لئے جا رہی ہے کہاں کہاں یہ فضائے رحم و کرم تجھے

ترے رنگِ نمود پہ غور کر، تری شانِ وجود پہ غور کر
کہ ملا ہے خونِ دل و جگر سے یہ بادۂ جامِ جم تجھے

یہ صلہ ہے رحمتِ عشق کا، یہ نگہ ہے چشمِ خلوص کی
نظر آ رہی ہے ملی ہوئی جو رہِ خدا و صنم تجھے

تو صداقتوں پہ نگاہ رکھ، تو صداقتوں ہی سے راہ رکھ
یہ وفائے اپنی بنائیں گی کبھی رشکِ باغِ ارم تجھے

تو انہیں کی منزلِ شوق بن، تو انہیں کا رہبرِ ذوق بن
جو ملیں گے رہروِ زندہ دل، شب و روز تیز قدم تجھے

باقی

ظفر الدولہ

(ایک تاریخی قصہ)

غدر سے پہلے جب ہندوستان میں مردی و مردانگی کا زور و شور تھا، ہندوستانیوں کے دل و دماغ غلامانہ ذہنیت کے ...
تھے، ریاست حیدرآباد کے ایک ضلع اندور (موجودہ نظام آباد) کے کسی قصبے میں ایک شریف سپاہی رہتا تھا۔ سرباز خاں اس کا نام تھا
آدمی تھا نوجوان اور جواں مرد۔ سپہ گری اس کو آباو اجداد سے حصے میں ملی تھی، طبیعت بھی نیزے کی طرح راستی اور زبان ...
تیزی موجود تھی۔ آسمان کی سختیاں خاموشی کے ساتھ سہہ جاتا لیکن زبان کی سختی اس سے برداشت نہ کی جاتی۔ جہاں کہیں ملازم ہوا ...
ان بن ہو گئی۔ وہ اس کی نازک مزاجی سے ناخوش، یہ ان کی نازک دماغی کا شاکی۔ چار دن جم کر کسی سرکار میں نوکری کر سکتے، ملازمت
چھوڑ چھاڑ کر گھر میں آ بیٹھتا۔ آذوقہ ختم ہونے لگتا تو مجبوراً پھر تلاشِ معاش میں نکلتا۔

ایک مرتبہ یوں ہی خاں صاحب نوکری چھوڑ چھاڑ گھر کی چار دیواری میں محصور تھے کہ تنہائی سے جی گھبرانے لگا، استلاج کے علاج ...
کسی نباضِ دہر نے "بیاہ" کا نسخہ تجویز کیا۔ خاں صاحب نے فوراً شادی کر لی۔ چندے آرام سے گذری، بالآخر تنگی محسوس ہونے لگی

یہ وہ زمانہ تھا کہ ظفر الدولہ حضور نظام کی طرف سے نرمل کے قلعہ دار تھے۔ قلعہ میں معقول انتظام تھا، رعایا خوش حال تھی
فوج میں چنے ہوئے کار آزمودہ جرار سپاہیوں کے قدر داں مشہور تھے۔ تنگی میں بسر ہونے لگی تو بی بی نے سرباز خاں سے کہا "بے کار بیٹھے ...
ہنر یہ ہے کہ کسی اچھی سرکار میں نوکری کر لیجئے۔" جواب دیا "نوکری کسی سرکار کی ہو، اچھی نہیں ہوتی۔" کہنے کو تو یہ کہہ دیا لیکن ضرورت ...
تقاضا اور بی بی کے بار بار سمجھانے سے خاں صاحب ایک روز سویرے ہی ناشتہ کر ہتھیار باندھ "نرمل" کی طرف چل کھڑے ہوئے
آدمی تھے وجیہہ قد آور اور مضبوط، قلعے پر پہنچے تو سنتری نے حالات دریافت کر کے فوراً قلعے میں داخل ہونے کی اجازت دے دی
پوچھتے پوچھتے سردار فوج کے ڈیرے پر پہنچے۔ انھوں نے دفتر میں چہرہ لکھوانے کو کہا۔ یہاں میر منشی نے ضروری اندراجات لینے کے ...
منشی صاحب کے پاس بھیج دیا۔ انھوں نے نام پوچھا، خاں صاحب نے بتلا دیا۔ پوچھا "کیا آپ کی شادی ہو چکی ہے" کہا ...
منشی نے کہا "پھر تو بتلایئے آپ کی بی بی کا کیا نام ہے؟" بس یہ پوچھنا ہی تھا کہ خاں صاحب غصے سے لال ہو گئے۔ داڑھی کے بال ...
سپاہیوں کی طرح اپنی اپنی جگہ اٹینشن ہو گئے۔ ہاتھ تلوار کے قبضے پر جا پڑا۔ منشی جی گھبرا گئے عاجزی سے کہنے لگے "صاحب! ...
ظفر الدولہ کا یہی حکم ہے۔ آپ کو اگر نوکری منظور ہو تو سوال کا جواب دیجئے ورنہ آپ مختار ہیں اور ہم مجبور۔"

خاں صاحب نے جونہی کہ نواب صاحب کا "یہی حکم ہے" تو بگڑ کر کہنے لگے "بی بی کا نام تو یاد نہیں سالے کا نام لکھ لو" منشی نے ...
ہمیں اس کی ضرورت نہیں۔ انھوں نے تلوار نیام سے کھینچ لی اور کڑک کر کہا "ہمیں تمہاری ضرورتوں کی کچھ پرواہ نہیں سوال کیا ہے
جواب بھی سن لو اور تمہارے نواب کو سنا دو، انکار کر گئے تو یاد رکھو تن پر سر نہ ہوگا۔" خاں صاحب کو شمشیر بکف اور خشمگیں پا کر منشی صاحب
ہوش اڑ گئے ڈرتے ڈرتے قلم اٹھایا اور کہا "فرمایئے جناب آپ کے سالے کا اسم مبارک؟" سپاہی نے فاتحانہ انداز میں آواز پر زور دیتے
ہوئے کہا "ظفر الدولہ" نام سن کر منشی جی کے اوسان ہی تو خطا ہو گئے قلم ہاتھ سے گر پڑا، آنکھیں پھٹی کی پھٹی اور منہ کھلے کا کھلا رہ گیا
خاں صاحب نے ڈانٹ جو بتائی تو وہ گدی چھوڑ کے بھاگے خاں صاحب بھی تیغ بکف ان کے تعاقب میں چلے۔ دونوں کو اس حالت میں دیکھ کر

سپاہیوں نے گھیر لیا۔ شور و غل سن کر ظفر الدولہ خود ہی محل سے نکل آئے۔ منشی نے ہاتھ جوڑ کر ڈرتے ڈرتے حالات گوش گذار کئے۔ اور خاں صاحب غصے میں بھرے سپاہیانہ انداز میں بے خوف ڈٹے کھڑے رہے۔

ظفر الدولہ نے انھیں سر سے پاؤں تک جرأت آزما نگاہوں سے دیکھا۔ سپاہی جب بالکل ہی متاثر نہ ہوا تو مسکراتے ہوئے مخاطب ہوئے اور کہا "بھائی صاحب خوب آئے میں تو آپ کا منتظر ہی تھا۔ کہئے آپ کو تنخواہ کیا ملے ؟" خاں صاحب نے تن کر جواب دیا "تنخواہ وتنخواہ تو تم اپنے ہی پاس رکھو، ہم سالے کی نوکری نہیں کرتے۔" یہ کہا اور بے رخی سے پیٹ کر جانے لگے سپاہیوں نے چاہا کہ بڑھ کر روک لیں مگر ظفر الدولہ نے اشارے سے سب کو منع کیا۔ سپاہی ان کی نظروں میں سما گیا تھا انھوں نے اپنے ایک جاسوس کو حکم دیا کہ اس کے حالات اور قیام گاہ کا پتہ لگا کر اطلاع دے۔

ظفر الدولہ ادھر محل میں داخل ہوئے۔ خاں صاحب ادھر جھلائے ہوئے اپنے گھر پہنچے غصے میں تو تھے ہی بی بی پر برس پڑے۔ عورت تھی مزاج داں سمجھی کہ کہیں سے الجھ کر آئے ہیں۔ پہلے تو نرم باتوں سے انھیں ٹھنڈا کیا جب ذرا راہ پر آئے تو دسترخوان بچھا کھانا کھلایا، پینے کو حقہ بھر کے دیا اور پاؤں دبانے کے بہانے پاس جا بیٹھی۔ چاہتی تھی کہ واقعات دریافت کرے مگر ابھی کچھ پوچھنے بھی نہ پائی تھی کہ دروازے پر کھٹکا ہوا۔ خاں صاحب نے بلند آواز سے پوچھا "کون"؟ جواب ملا "ظفر الدولہ" پوچھا "کیا کام ہے؟" کہا "اپنی بہن سے ملنا چاہتا ہوں" خاں صاحب نے بی بی سے کہا "اٹھ دروازہ کھول دے۔ تیرا بھائی تجھ سے ملنے آیا ہے"۔

ظفر الدولہ اندر داخل ہوئے۔ منہ بولی بہن کو سلام کیا، بہنوئی صاحب کو دیکھا کہ چارپائی پر دراز دیوار کی طرف منہ کئے حقہ پی رہے ہیں۔ ان سے تو نہ بولے بہن سے کہا "تعجب ہے اس قدر قریب رہ کر بھی تم نے ہمیں اپنے حالات سے مطلع نہیں کیا اور تکلیف اٹھاتی رہیں۔ خیر! لو آج سے سو روپیہ تمھارا درماہہ مقرر ہوا ہے۔ یہ رقم برابر ماہ بماہ تم کو پہنچتی رہے گی۔ اپنی حالت درست کرو اور بھائی صاحب کے لئے آرام کے سامان مہیا کرو۔" روپیوں کی تھیلی چٹائی پر رکھ "خدا حافظ" کہہ کر ظفر الدولہ رخصت ہوئے۔

بی بی نے تھیلی اٹھا شوہر کے سامنے رکھی۔ انھوں نے اٹھا صحن میں پھینک دی اور کہا "مجھے اس سے کیا سروکار تیرے بھائی نے دی ہے تو ہی اسے سنبھال"۔

بی بی نے روپے قبضے میں کئے اور گھر کی حالت درست کرنے میں آہستہ آہستہ خرچ کرنے لگی۔ دو چار مہینے میں گھر کی یہ صورت بنی کہ گھوڑا، پالکی، نوکر، چاکر اندر باہر نظر آنے لگے۔ عزت سے بسر ہونے لگی۔ چند سال اسی طرح گزرے اس عرصے میں دو لڑکے بھی اللہ نے دئے۔ تنخواہ بغیر مانگے ظفر الدولہ خود وقت پر پہنچا جاتے تھے۔ جو کچھ کہنا ہوتا بہن سے کہتے بہنوئی سے کچھ نہ بولتے۔

یہ حال دیکھ کر حاسدوں اور بے کاروں نے "چہ می گوئیاں" شروع کیں ظفر الدولہ پر غائبانہ پھبتیاں اڑائی جانے لگیں "مفت کے بہنوئی کی خوب مدارات ہو رہی ہے۔ یہی حال رہا تو بہنوئیوں کی کمی نہیں رہے گی" یہ خبریں ظفر الدولہ کے کانوں تک بھی پہنچتیں۔ مگر وہ زمانے کا سرد و گرم چکھے ہوئے تھے سنی ان سنی کر دیتے اور اپنے عمل میں فرق نہ آنے دیتے۔

اتفاق سے کسی راجہ نے ریاست سے بغاوت کی اور خراج موقوف کر دیا ظفر الدولہ کے نام سرکار نظام کا فرمان پہنچا کہ راجہ پر چڑھائی کر کے خراج وصول کر لائیں۔ تعمیلاً ظفر الدولہ فوج لے کر روانہ ہوئے مگر خاں صاحب کو اطلاع نہ دی۔ اب تو لوگوں کو

[illegible] ذمبر [illegible]

[illegible] ملنے کا ابھی موقع ملا۔ ہر طرف ذکر اذکار ہونے لگے کہ نواب صاحب! بہنوئی تو خوب ملے، بغیر نوکری کے تنخواہ کھا [illegible] لڑائی [illegible] بھی ان سے کام نہیں لیا جاتا۔ شاید بہن کے رنڈاپے کا اندیشہ ہے۔" ظفر الدولہ ان باتوں کی پروا [illegible] کہتے تو یہ [illegible] میں نے اس کے سمجھنے میں غلطی نہیں کی ہے۔"

ادھر [illegible] ظفر الدولہ بہن سے ملنے نہ گئے اور آدمی کے ذریعے تنخواہ گھر پہنچی تو سرباز خاں نے بی بی سے [illegible] پوچھا [illegible] اب کے تمہارے بھائی نہیں آئے۔" اس نے کہا "خدا انہیں خیر خوبی سے واپس لائے وہ تو راجہ ستاب کے مقابل [illegible] [illegible] سنا تھا کہ خاں صاحب اٹھ کھڑے ہوئے کہا اب ہم پر چین اور آرام حرام ہے۔" فوراً سلاح جنگ پہنی گھوڑا [illegible] بی بی نے پوچھا "کیا قصد ہے؟" جواب دیا "بس اب حقِ نمک ادا کرنے کا وقت آگیا۔ تمہارے بھائی کے احسانات سے سبکدوش ہونا ہے۔ ہم نواب پلٹ کر آنے کے نہیں، تم ان بچوں سے ذرا خبردار رہنا۔ لو خدا حافظ۔" یہ کہا اور جلدی سے رخصت ہو کر [illegible] کھڑے ہوئے۔

ظفر الدولہ ادھر راجہ ستاب کے مقابل فوج ڈالے پڑے تھے۔ رسل و رسائل کے ذریعے معاملات کو [illegible] ہو رہی تھیں لیکن بے سود، راجہ لے لڑے خراج دینے پر تیار نہ تھا، مجبوراً جنگ کی ٹھہری۔ آغاز جنگ سے پہلے ظفر الدولہ کی فوج [illegible] ایک سوار سر سے پاؤں تک لوہے میں غرق نکلا، راجہ کی فوج کے مقابل پہنچ کر اس نے باگ کھینچی اور کڑک کر آواز دی [illegible] ظفر الدولہ کے مقابلے کی تاب نہیں لا سکتے اس کی فوج کا ایک ایک سپاہی تمہاری تمام فوج پر بھاری ہے۔ بہتری اسی میں ہے [illegible] کرو ورنہ یاد رکھو پچھتاؤ گے۔" راجہ کی فوج میں سے ایک زبردست جوان بے جین ہو کر نکلا اور سخت جواب دیا۔ سپاہی بھلا [illegible] اور گھوڑے کو ڈپٹ کر اس زور سے نیزہ مارا کہ زرہ کو توڑ کر سینے کے پار ہوگیا۔ بات کی بات میں مخالف کو مار کر جیدار سپاہی [illegible] تنہا راجہ کی پوری فوج پر جا پڑا اور دم کے دم سیکڑوں انسانوں کو گاجر مولی کی طرح کاٹ ڈالا۔ نبرد آزمائی میں اس کو [illegible] کمال تھا کہ جس طرف حملہ کرتا صفوں کی صفیں صاف ہو جاتیں۔ ہر حملے میں راجہ سے قریب ہوتا جاتا تھا گویا اس نے پہلے ہی سے [illegible] تاک رکھا تھا۔ اب راجہ اور سپاہی میں صرف ایک صف حائل تھی۔ سپاہی نے جان توڑ حملہ کیا اور صف کو چیر کر گھوڑے کو ہاتھی پر جا ڈالا۔ جاندار گھوڑے نے مالک کے اشارے پر سیدھا ہو کر دونوں اگلے پاؤں ہاتھی کے پیٹ پر جما دیئے۔ سپاہی نے [illegible] کھڑے ہو کر نیزے کا بھرپور ہاتھ۔ راجہ پر چھوڑا، راجہ صاحب جھک نہ جاتے تو فیصلہ ہی تھا۔ نیزہ گردن کے عقبی حصے کو چھیلتا ہوا نکل گیا۔ دوسرا وار کرنے سے پہلے ہاتھی نے گھوڑے کو سونڈ میں پکڑ کر کھینچ لیا اور سوار سمیت پاؤں تلے روند ڈالا۔

جان تو بچ گئی مگر راجہ کے حواس برجا نہ تھے۔ خیال کیا کہ ایسے ایسے "سر پھرے" دو ایک ہی جوان ظفر الدولہ کی فوج [illegible] اور نکلے تو جان کی خیر نہیں۔ فوراً سفید جھنڈی دکھائی گئی یہ صلح کی علامت تھی قاصد دوڑے شرائط صلح طے ہونے لگے۔ خراج اور فوج کشی کے اخراجات کے علاوہ جرمانے میں رقم خطیر ظفر الدولہ کے ہاتھ لگی۔ شرائط صلح کے طے ہوتے ہی ظفر الدولہ نے دریافت کیا کہ آخر وہ کون بہادر تھا جس نے آن کی آن میں جنگ کا نقشہ بدل ڈالا۔" نعش منگوائی گئی۔ ڈھاٹا کھولا تو سرباز خاں کی صورت نظر پڑی لوگوں کو تعجب تھا ظفر الدولہ جوشِ محبت و ولے سے بے چین ہو گئے۔ میت کے سر و پیشانی پر بوسے دینے لگے۔ روتے جاتے تھے اور کہتے جاتے تھے ظفر الدولہ سپاہی کاہے کو ہوتا اگر تیرے پہچاننے میں اس سے غلطی ہوتی۔"

میر محمد نقی رضوی

سائنس

لفظ سائنس لاطینی لفظ سائنشیہ (scientia) سے مشتق ہے جس کے معنی "علم" کے ہیں اور سائنشیہ کا ماخذ "سائیو" (scio) ہے جس کے معنی "جاننا" ہے سائنس ہر قسم کے علوم پر حاوی ہے۔ جو مشاہدہ اور تجربہ سے حاصل ہوتا ہے۔ فی زمانہ اس کے مفہوم نے ایک خوفناک وسعت اختیار کرلی ہے۔ اسکولوں اور کالجوں میں اس کے معانی طبعیات کیمیا وغیرہ دو چار علوم تک محدود ہیں۔ لیکن عالموں اور محققوں اور فلسفیوں کے نزدیک سائنس زمین و آسمان کے باقاعدہ اور یقینی حالات پر حاوی ہے جن کو انسان نے اپنی تحقیق اور تجسس سے معلوم کئے ہیں اور یہاں تک اسے وسعت دی ہے کہ اپنے جسم اور دل اپنی عقل اپنے گرد اپنی طرز معاشرت اور اپنے جملہ تعلقات کو اسی کے تابع کر دیا ہے۔ سائنس تبحر علم ہے۔ جس کے کنارے اور عمق کی حد نہیں ہے۔ ساکنین خلا اجرام فلکی اراکین نظام شمسی ستارے چاند وغیرہ سب ہستیاں اس کے اندر مقید ہوگئی ہیں۔

ہربرٹ اسپنسر کا قول

سائنس کیا ہے۔ سائنس علم عامہ کے ارتقائے اعلیٰ کا نام ہے اگر اس سے انحراف کیا جائے تو اس کے ساتھ ہر قسم کے علم سے انکار کرنا لازم آتا ہے۔ علوم روزانہ زندگی کے تجربوں سے پیدا ہوتے ہیں۔ اور جیسے وہ نامعلوم طور پر بڑھتے ہیں اسی طرح وہ زیادہ دور افتادہ اور پیچیدہ تجربوں پر حاوی ہوجاتے ہیں۔ ... کوئی خط کھینچ کر یہ کہنا محال ہے کہ سائنس یہاں سے شروع ہوتا ہے۔

جب ہم مظاہر و موجودات کی اندرونی ترتیب و باقاعدگی کے علم معینہ کو سائنس کے نام سے پکارتے ہیں تو یہ لازم آتا ہے کہ قاعدہ کے انکشاف سے اس فاسد خیال کو صدمہ پہنچے جو عدم ترتیب کی باعث عوام کے دلوں میں سنی سنائی باتوں سے قائم ہوجاتا ہے۔ جب تجربہ سے یہ ظاہر ہوجاتا ہے کہ فلاں اسباب سے فلاں نتائج پیدا ہوجاتے ہیں تو دل سے ان اشخاص کے توسط کا وہم دور ہوجاتا ہے جو ان کے بانی تصور کئے جاتے ہیں۔

سائنس وہ علم ہے جو قاعدہ اور قانون کے تابع ہے جس کے جملہ شعبے اور مطالب معقول ضوابط کے مطیع رہتے ہیں۔ اس میں عامیانہ علم میں یعنی ایک معمولی آدمی اور ایک محقق عالم کے علم یعنی معلومات میں اتنا فرق ہے کہ اول الذکر کے خیالات اور معلومات پھوہڑ عورت کے گھر کے مانند ہیں جو ہر قسم کے قرینہ اور سلیقہ سے بیگانہ ہے برعکس اس کے موخر الذکر کا علم جنرل مرچنٹ کی دوکان کی طرح ہے جہاں ہر ایک شئے قرینہ کے ساتھ دھری رہتی ہے جب گاہک آتا ہے تو حسب خواہش اپنی ضرورت کی چیز لیجاتا ہے۔ ہم روزمرہ زندگی میں ہر قسم کے واقعات اور حالات سے دوچار ہوتے ہیں اہل نظر اور صاحب فکر انہیں غور سے دیکھتا اور بھالتا ہے۔ ہزاروں واقعات کو دیر تک مشاہدہ کرکے استخراج نتائج کرتا ہے اور ان سے مستفید ہوتا ہے یہ علم اور یہ نتائج اس کے ذہن میں مستقل صورت ممکنہ اختیار کر لیتے ہیں اور علم کی حیثیت قبول کر لیتے ہیں۔ یہ سائنس ہے۔

۲۔ ہکسلے

پروفیسر ہنری ٹامس ہکسلے ایک نہایت مشہور جید عالم تھے جن کی مساعی سے ڈارون کے مسائل اور خیالات کو انگلستان میں اس قدر شہرت اور ہر دلعزیزی حاصل ہوئی تھی۔ وہ کہتے ہیں "میری رائے میں سائنس صرف

تربیت یافتہ اور منضبط عقل کا نام ہے تربیت یافتہ اور معمولی عقل میں وہی فرق ہے جو ایک قواعد داں و آزمودہ کار سپاہی [illegible]
بگڑے ہوئے ہجوم میں ہوتا ہے ان دونوں کے طریق عمل میں بھی وہی اختلاف ہے جو ایک مہذب شمشیر زن اور وحشی کی جنگ [illegible]
ہوتا ہے۔

۴۔ ڈیوک آف ارگایل

جارج ڈگلس ڈیوک آف ارگایل ایک نہایت مشہور عالم تھے آپ فرماتے ہیں [illegible]
زاید اشیاء کا ایک دوسرے سے کیا تعلق ہے اور یہ کہ ہماری قوتوں سے [illegible]
ہے۔ یہ سائنس یا علم ہے۔ یعنی موجودات کے باہمی تعلقات اور نیز ان کے اور ہمارے درمیانی تعلقات کا نام سائنس ہے [illegible]
[illegible] اشیاء کے چند باہمی تعلقات اور نیز ان کے نظام عالم کے علاقہ تک محدود ہے۔ مشابہت میں اختلاف اور اختلاف [illegible]
مشابہت معلوم کرنا جائے خود ایک قسم کا ادراک اور موجودات کے حقیقی تعلقات کا علم ہے اور یہ عقلی عمل سائنس سے متعلق ہے

ایک اور عالم کہتا ہے "سائنس موجودات کی ابتدا اور ہستی کے نظریہ کا نام ہے۔ مشہور عالم جارج لوئیس کہتا ہے [illegible]
وسیلہ سے جو مختلف کلیات حاصل کئے جاتے ہیں انھیں کسی ضابطہ یا نظام کے تابع کرنا سائنس ہے۔ مظاہرہ کے قاعدہ [illegible]
قانون کی صورت دینا سائنس کا کام ہے اس کے وسیلہ سے معمولی علم اور واقعات ایک علم کی صورت اختیار کرتے ہیں [illegible]
قانون کی توجیہہ بھی اسی کے ذریعہ سے ہوتی ہے۔ کیونکہ وہ انہیں تقاضہ اور تسلسل کے قواعد کے تابع کرتا ہے [illegible]
عام تصورات کی جماعت بندی کرتا ہے۔ الغرض سائنس علم اور معلومات بہم پہونچاتا ہے سائنس ہم کو یہ سکھاتا ہے کہ [illegible]
تصادم سے کس طرح محفوظ رہ سکتے ہیں اور دوسری طرف ہم ان سے مدد لیکر کس طرح مستفید ہو سکتے ہیں۔ چنانچہ قواعد قدرت [illegible]
علم اور ان کے قاعدوں سے واقفیت پیدا کرکے انسان نے ان سے حسب منشا کام لینا شروع کردیا ہے۔ برقی اور مقناطیسی [illegible]
کیسے حیرت انگیز کام ہو رہے ہیں۔ پانی انسان کی مصروفیتوں کے کتنے شعبوں پر حاوی ہے یہ سب سائنس کے [illegible]
سائنس نظام عالم کے متعلق تصورات اور خیالات بہم پہونچاتا ہے۔ موجودات کے تمام تغیرات اور تبدیلات اس کے [illegible]
فرمان رہتے ہیں۔ اس کی مملکت صرف عالم مرئی تک ہے اس کے آگے رہنا امکان سے باہر ہے۔

پروفیسر ہکسلے ایک اور جگہ سائنس کی تشریح یوں کرتے ہیں۔ سائنس قوانین قدرت کے اس علم کا نام ہے جو [illegible]
تجربہ اور استدلال (استقرائی و استخراجی و تمثیلی) سے حاصل کیا جاتا ہے۔ ایسی واضح جامع اور عام فہم تشریح [illegible]
دشوار ہے، وہی عالم پھر آگے چل کر کہتا ہے کہ ہر قسم کے صحیح اور واضح علم کا نام سائنس ہے یعنی علم چاہے کسی قسم کا ہو اگر اس کے اصول
اور ضوابط نہایت معقولیت سے قائم کئے گئے ہوں تو وہ سائنس کی ذیل میں شمار ہو سکتا ہے۔

ڈاکٹر الگزنڈر بل نے سائنس کی یوں تشریح کی ہے سائنس اس علم کا نام ہے جو ضابطہ کے تابع ہو اور نظام میں
مقید ہو علم کیا ہے۔ علم اس صورت متمکنہ کا نام ہے جو ہم اشیاء اور موجودات کی بابت قایم کرتے اس میں ایک طرف تو عالم
اور دوسری طرف معلوم (جانی ہوئی شئے) ہوتا ہے ان دونوں کے درمیان جو تعلق پایا جاتا ہے وہ علم ہے ایک سادہ لوح
آدمی سورج کی نسبت یہ خیال رکھتا ہے کہ ایک بڑا گولہ ہے جو صبح کو مشرق سے نکلتا ہے اسے روشنی اور گرمی پہونچاتا ہے
اور شام کو مغرب میں پہاڑوں ٹیلوں یا درختوں کے جھنڈ کے پیچھے چھپ جاتا ہے مگر صاحب فکر اور مشتاق علم اسے دیکھ کر

سوالات پوچھتا ہے سورج کیا ہے اس سے روشنی اور حرارت کس طرح پیدا ہوتی ہے کیا یہ بذات خود کرہ نار و نور ہے۔ یہ کس چیز سے بنا ہے وغیرہ پھر وہ ان سوالات کا جواب باصواب بہم پہونچانے کی کوشش کرتا ہے واس کے دیکھنے میں آتی ہے گروہ ایک قاعدہ اور کسی معیار کو مدنظر رکھتا ہے جس سے اپنے قیاس کی صحت اور عدم صحت کا اندازہ کرتا ہے اس طریقہ سے جو علم وہ آفتاب کی نسبت حاصل کرتا ہے وہ باقاعدہ یعنی معقول علم ہوگا۔ کیونکہ اس کے حصول میں اس نے مقررہ قاعدہ سے کام لیا ہے اور اس قسم کے علم کو سائنس کے نام سے پکارا جاتا ہے۔

سائنس کا کیا مقصد ہے

سائنس کے مفہوم و معانی پر بحث کرنے کے بعد اب اس کے مقصد اولی کی طرف رجوع ہونا مناسب ہے۔ ارسطاطالیس کہتا ہے (سائنس) تجربات کی وسیع تعداد سے شروع ہوتا ہے۔ سائنس کا اصلی مقصد یہ ہے کہ عالم کا (جس کا ادراک عقل انسانی کے لئے ممکن ہے) واضح اور معقول حال بیان کرے۔

پروفیسر ٹامسن اپنی کتاب میں کسی دوسری جگہ لکھتے ہیں۔ سائنس کا مقصد تجربہ کے غیر شخصی واقعات کو قابل تصدیق الفاظ میں حتی الوسع نہایت عام فہم پیرایہ اور حتی الامکان نہایت مکمل و مفصل طریقہ اور وضاحت سے بیان کرنا ہے۔ یہ عقلی ترکیب اور دنیا کا عملی نمونہ خیال ہے یہ عالم کے حالات کو اسی ڈھنگ سے بیان کرتا ہے کہ تجربہ سے ان کی تائید ہو سکتی ہے۔ سائنس عالم کے قابل فہم حقایق سے بحث کرتا ہے روحانی اور طبعی ہر دو علموں سے اس کا واسطہ ہے یعنی انسان اور کائنات دونوں کے حالات سائنس تلاش کرنے میں مصروف رہتا ہے۔ الغرض کوئی ایسی شئے اس کے حلقہ دست سے بعید نہیں رہ سکتی جو اس کے طریقہ تحقیق کی زد میں آ سکتی ہے۔

سائنس کا نفس مضمون وہ حقایق و واقعات ہیں، جو تجربہ میں آتے ہیں اور جن کی تصدیق و تائید ہو سکتی ہے۔

(۱) سب سے پہلے اصل واقعات اور فرضی حالات میں خوب ہوشیاری سے امتیاز کرنا لازم آتا ہے اس کے بعد سائنس کا طریقہ عمل ممکن ہوتا ہے۔

(۲) سائنس اصلی واقعات سے سروکار رکھتا ہے اس سے یہ مراد ہے کہ واقعات جو ہیں کائنات کے اندر اپنی طبعی صورت میں نظر آتے ہیں۔

(۳) سائنس نے اپنے واسطے یہ قاعدہ مقرر کر لیا ہے کہ وہ صرف ایسے واقعات سے سروکار رکھتا ہے جن کی تشریح و تائید ممکن ہے جن امور کو بخوبی بیان نہ کیا جا سکے یا جن کی اصلیت کی تصدیق نہ ہو سکے۔ سائنس انہیں نظر انداز کرتا ہے مثلاً تجربوں سے صرف ایک ہی شخص دوچار ہوا ہے دوسرے لوگ ان کی ماہیت اور اصلیت سے بالکل بیگانہ ہیں جیسے مظاہر روحانی ارواح کو دیکھنا یا اُن سے گفتگو کرنا زندہ اشخاص کو خاص موقعوں پر اپنے مکان سے بہت دور رکھنا وغیرہ یا کسی سیاح کا یہ بیان کرنا کہ اس نے آسٹریلیا کے وسطی جنگلوں میں ایک گوری پست قد وحشی قوم کو دیکھا ہے۔ سائنس اسے تسلیم نہیں کرے گا۔ جب تک اس کی تصدیق دیگر معتبر وسایل سے نہ ہو سکے۔

سائینس کا کام موجودات کے اسباب معلوم کرنا بھی ہے سلسلہ اسباب و نتائج علت و تعلل کی ماہیت کا کھوج مبداء عام اور نیز یہ کہ موجودات عالم اور مختلف النوع کا ایک ہی آغاز ہے یا ایک سے زیادہ ان سب معاملات پر بحث کرنا بھی سائینس کا کام ہے۔ الغرض سائینس کا مقصد کائنات اور مافیہا کا علم حاصل کرنا ہے۔ قدرت کے اندر ہزار ہا قسم کی اشیاء میں ان کے تعلق باہمی اور وہ قوانین جن سے جملہ تعلقات اور تغیرات عمل میں آتے ہیں نیز مختلف ہستیوں کی اصلیت معلوم کرنا بھی اس کا کام ہے۔ الغرض بے جان اشیاء اور معدنیات نباتات حیوانات اور نوع انسان سب کے سب سائینس کی مملکت کے باشندے ہیں۔

"سائینس کے طریقے"

سائینس کا طریقہ تحقیق یعنی کسی ہستی کے صحیح اور واضح علم حاصل کرنے کا ڈھنگ نیا نہیں ہے بلکہ وہی ہے جو صدیوں سے یہاں رائج چلا آتا ہے ارسطاطالیس کے زمانہ میں تین طرح سے استدلال کر کے استخراج نتائج کیا جاتا تھا یعنی کسی امر کی سچائی یا کذب دریافت کرنے کے حسب ذیل ڈھنگ مروج تھے۔

(۱) خاص امر سے خاص امر کی طرف استدلال کر کے خاص نتیجہ اخذ کرنا جیسے استدلال تمثیلی یعنی (Analogical Reasoning) کہتے ہیں۔

(۲) خصوصیات سے کلیات کی طرف دلیل کرنا اسے دلیل استخراجی (Deductive Reasoning) کے نام سے پکارا جاتا ہے ان کی مثالیں دینا ضروری ہے۔ بعض فلکی عالم کہتے ہیں کہ مریخ آباد ہے وہاں جا کر کسی نے نہیں دیکھا ہے کہ تمثیلی کی بنا پر اس بات کو تسلیم کر لیا جاتا ہے۔ آبادی کے واسطے جن شرائط اور حالات کا ہونا اس زمین پر لازم ہے وہ مریخ میں بھی پائے جاتے ہیں سب چھوٹی لڑکیاں گڑیوں کی بیحد شایق ہوتی ہیں یہ قاعدہ کلیہ ہزار پانچ سو لڑکیوں کی کیفیت اور شوق کو مشاہدہ کرنے کے بعد قایم کیا گیا ہے اور یہ استدلال استقرائی کا نتیجہ ہے۔ چونکہ سب چھوٹی لڑکیاں گڑیا کی شایق ہوتی ہیں اس لئے پاربتی بھی جو ایک چھوٹی لڑکی ہے گڑیا کی شایق ہو گئی یہ نتیجہ استدلال استخراجی سے اخذ ہوا ہے۔

تحقیقات کے طریقہ استخرا کا بانی "بیکن" تھا اس نے پہلے اس امر پر زور دیا تھا کہ قدرت کے خاص حالات کو مشاہدہ کرنے کے بعد قاعدہ کلیہ یا اصول قایم ہونا چاہیے زمانہ حال کے سائینس داں اسی اصول کے پابند ہیں۔ "نیوٹن" نے اسی قاعدہ پر عمل پیرا ہو کر کشش کا قانون معلوم کیا تھا اور قرار دیا تھا کہ یہ عالمگیر ہے اور جملہ اجسام ایک دوسرے کی کشش قبول کرتے ہیں۔ "ڈارون" نے اسی کو مدنظر رکھ کر قاعدہ انتخاب طبعی (Natural selection) جہد البقاء (Struggle for Existence) بقائے بہترین (Survival of the fittest) وغیرہ قوانین دریافت کئے تھے استقراری قوت (Persistence of force) قوائے توانائی (Conservation of Energy) بقا، حرکت اور عدم فنائے مادہ کے مسایل بھی اسی طریقہ تحقیق سے وضع ہوئے تھے استدلال استخراجی کے وسیلہ سے ارباب سائینس ماضی اور مستقبل کے واقعات پر عبور حاصل کرتے ہیں فلکیات کے محققوں میں وہ کچھ مدت بعد دریافت ہوا تھا اسی طرح اگر کسی دمدار ستارے کو تین مرتبہ مشاہدہ کیا جائے تو بعد ازاں استخراج سے کام لے کر اس کے نمودار ہونے کی پیشگوئی ہو سکتی ہے۔ مگر استخراج سے مغالطہ کا بھی امکان ہے مثلاً ارسطاطالیس نے جو قدیم زمانہ کا سب سے بڑا فلاسفر اور محقق تھا ایک مرتبہ اس طرح

دسمبر ۱۹۳۰ء

[استد]لال کرکے فقط نتیجہ نکالا تھا ستارے قدیم ہیں ان کی حرکت بھی قدیم ہونا چاہیے اور حرکت استمراری گول ہونا چاہیئے۔ اس میں سے [ظ]اہر ہے کہ ستارے زمین کے گرد حلقوں میں گھومتے ہیں۔

یہاں سائنس کے جملہ طریقوں پر بحث کرنے کی گنجائش نہیں ہے جیسے ریاضی طریقہ استدلال (Mathematical) [استقرا]ئی (Emperical) طریقہ ہیں جن کا [توضیحی] (Explanatory) اور تحقیقی (Verificatory) تمثیلی [طر]یقہ ہیں جن کا [تفص]یلات سے ذکر کیا گیا ہے مگر دو باتوں کو کبھی نہیں بھولنا چاہیئے۔ ایک تو یہ کہ بعض وقت اہم نتیجہ آپ سے آپ ذہن کے اندر موجود ہوتا [ہے] اور آدمی کو استدلال یا تحقیق کرنے کی ضرورت نہیں ہوتی دوسرے یہ کہ مثلاً استقرار اور استخراج ایک دوسرے سے نہایت پیچیدہ طور پر [وا]بستہ ہیں جب آدمی مشاہدہ کرکے واقعات جمع کرتا ہے اور ان سے کوئی خاص نتیجہ نکالنا چاہتا ہے تو ان دونوں طریقوں سے کام لیا جاتا ہے عقل کبھی آگے جاتی [ہے] اور کبھی پیچھے لوٹتی ہے۔ سائنس کے انکشافات بڑے بڑے اہل دماغ اور غیر معمولی ذہین آدمیوں کی فوری سوچ سے عمل میں آئے ہیں [ز]یادہ تر نظر غائر اور شوق کے سہارے یہ بڑا بار لگا ہے۔ چیزوں کو خوب ہوشیاری سے دیکھنے کا شوق اور نئی نئی باتیں معلوم کرنے کی [تم]نا سائنس کی دریافتوں کے لئے لازم ہے۔ اس کے بغیر کوئی مسئلہ حل نہیں ہو سکتا اگر کسی مسئلہ کو سائنسی طریقہ سے حل کرنا چاہو تو [سب] سے پہلے اس کے متعلق معلومات و واقعات بہم پہنچاؤ یعنی بڑی احتیاط درستی، بے تعصبی اور قابلیت کے ساتھ مشاہدہ کرو اور اس میں [خورد]بین فوٹو گرافی وغیرہ آلات سے بھی مدد لی جا سکتی ہے۔ دوسروں کی باتوں کو من وعن باور مت کرو اشیاء کا عرض و طول عمق و [ار]تفاع بھی بڑی صحت کے ساتھ ناپنا ضروری ہے الغرض اپنے تجربہ اور مشاہدہ میں چھوٹی سی چھوٹی بات کو بھی نظر انداز مت کرو [جب] معلومات بہم پہنچ جائیں تو پھر ان کی تقسیم و ترتیب لگاؤ یعنی یہ دیکھو کہ ان میں کتنا اختلاف اور کتنی مطابقت پائی جاتی ہے ایک [طرح کی] باتوں کو الگ کرو یعنی درمیانی تعلقات معلوم کرنے کی کوشش کرو اور یہ کام بھی بڑی ہوشیاری اور خوبی سے کرنا چاہیے ورنہ [غل]طی کا اندیشہ ہے جہاں ضرورت ہے۔ تشکیک بیانی سے کام لینا چاہیئے بعض وقت محقق کے دل میں از خود ایک خیال پیدا ہوتا ہے۔ [نظ]ریہ قایم کرکے اس کے متعلق ثبوت بہم پہنچانے کی کوشش کرتا ہے اس لئے تجربہ سے کام لیتا ہے۔ مثلاً برقی صدمہ کا پودوں پر کیا اثر [ہوتا] ہے آلہ کی مدد سے برق پیدا کرکے پودوں پر ڈالو اور اس کا اثر مشاہدہ کرکے رائے قایم کرو نظریہ یا خیال کو جب چاہو قائم کرو [مگر] اس کی صحت و تائید واقعات سے ہونی چاہیئے۔ جب یہ ہو جائے تو پھر اس نظریہ کو اصول یا قاعدہ کی صورت میں نہایت عام فہم مگر [صحیح] طریقہ سے بیان کیا جاتا ہے یعنی نئے حقائق کو کسی پرانے قاعدے کے تابع کر دیا جاتا ہے اور وہ سائنس کے قاعدوں میں شمار [ہوتے] ہیں، سائنسی طریقہ تحقیق و استدلال کے لئے ضروری ہے کہ مشاہدہ سے کام لیا جائے مشاہدہ غور اور احتیاط سے ہونا چاہیئے۔ [تجربہ] بھی لابدی ہے۔ بہت سے مختلف واقعات کو یکجا جمع کرکے انھیں تقسیم کرو اور پھر ان سے نتائج اخذ کرو جب اس کی تصدیق [وتو]ثیق ہو جائے تو پھر اسے ضابطہ یا قاعدہ یا اصول کی صورت دو سائنس میں یہ بھی ضروری ہے کہ انسان بچے کی طرح سچے دل سے [سب] کا متلاشی رہے اور واقعات و معلومات کی بنا پر نتیجہ نکالنے اور تب اپنی رائے قایم کرے تعصب اور طرفداری کو ذرا [دخل نہ د]ے صرف راستی اور حق کو ملحوظ خاطر رکھے۔

سید بشیر الدین نظامی

کتبۂ مزارِ سلطان ٹیپو شہیدؒ (والئ میسور)

تری فرمانروائی کا ہے چرچا بادشاہوں میں
ترے طرزِ جہانبانی کا شہرہ کج کلاہوں میں

بہادر کانپتے ہیں نام سن کر رزم میں تیرا
جگر اس کا ہے جس نے تجھ کو دیکھا رزمگاہوں میں

مثال ایسی کہاں ڈھونڈیں نظیر ایسی کہاں پائیں
جو صوفی صوفیوں میں بادشاہ ہو بادشاہوں میں

بتائیں کیا، وہ کیا تھا تیرا عہدِ معدلت گستر
اگر نوشیرواں ہوتا تو ہوتا دادخواہوں میں

حمایت نے تری ان کو کیا بے خوف خطرے سے
جنھیں دیکھا تھا لٹتے دن دہاڑے شاہراہوں میں

ترا ذہن رسا تھا قوتِ ایجاد کا مالک
قوانینِ کہن جچتے نہ تھے تیری نگاہوں میں

شکوہِ قیصر، و شانِ فریدوں، شوکتِ دارا
ترا پرچم، ترے ماہی مراتب، تیرا نقارا

سریر آرائے نعمت اوج بخشِ تاجِ سلطانی
پناہِ بے پناہاں چترِ رحمت ظلِ سبحانی

معینِ امتِ مرحوم شانِ ملتِ بیضا،
فروغِ دینِ مصطفوی، ضیائے شمعِ ایمانی

تری ہیبت سے اکثر رخ بدلتا تھا ہواؤں کا
تری دہشت سے اٹھتی تھی نہ دریاؤں میں طغیانی

گذاری عمر اپنی تو نے بے دینوں کے نرغے میں
تجھے جمعیتِ خاطر رہی اکثر پریشانی

تجھے اغیار نے اپنے جگر کی پھانس ہی سمجھا
مگر افسوس اپنوں نے نہ تیری قدر پہچانی

بہے گی اک نہ اک دن بہہ کر ترے سیلابِ سطوت میں
خس و خاشاک بن کر اہلِ یورپ کی ستم رانی

ابھی باقی ہے اس کی گونج جو کہتا تھا تو اکثر
صد و سی سال سے گیدڑ کے اک دن شیر کا بہتر

مبارک ہو ترے نقشِ قدم کو کہکشاں ہونا
زمیں پر خطۂ میسور رشکِ آسماں ہونا

مبارک[1] اے زبانِ حضرتِ ٹیپو مبارک ہو
تجھے قانونِ قدرت کا حقیقی ترجماں ہونا

نسیمِ حضرتِ والا کا ادنیٰ فیض ہے یہ بھی
خزاں دیدہ چمن وقفِ بہارِ جاوداں ہونا

ترا مہرِ کرم تھا علم و فن پر یوں ضیا افگن
کہ ہر ذرے کو آیا بدرِ بن کر ضو فشاں ہونا

"کرشنا راج" ساگر کیوں نہ اب ممنون ہو تیرا
سکھایا تو نے اعرج کو رواں ہونا دواں ہونا

اسی سے خطۂ میسور کی ہے گلشن آرائی
تھا ہر ہر خار کی قسمت میں اک اک گلستاں ہونا

---

[1] میسور کا کرشنا راج ساگر بند بالکل سلطان ٹیپو کی بنائی ہوئی اسکیم کے مطابق تیار کیا گیا ہے۔ ایک کتبہ دست یاب ہوا جس پر سلطان کا وہ فرمان کندہ ہے جس میں کاشتکاروں کے حقوق کی حفاظت پر ایک دستور العمل مرتب کیا گیا تھا۔ آج اس کتبہ کو بند کے ایک نمایاں حصے پر نصب کیا گیا ہے۔

دکن میں "سوتھہ کاویری"[1] اک عالم جس کو کہتا ہے
وہ فیضِ جاریہ لگ کر ترے قدموں سے بہتا ہے

غلامی جن کی فطرت میں تھی وہ آزاد کیا ہوتے — ہیں ساری عمر بیٹھے اپنی تقدیر کو روتے
ہوا تھا پارہ پارہ جن کے ہاتھوں دامنِ غیرت — وہ پیشانی سے ہیں داغِ ندامت آج سب دھوتے
سکوں حاصل ہوا دم بھر نہ گردش میں غلامی کی — جو دکھ دیتے ہیں اپنوں کو وہ سکھ کی نیند کیا سوتے
اگر احساس ہوتا اپنی آبائی غلامی کا — نہ یوں غیروں سے مل کر وہ متاعِ حریت کھوتے
قریں تر ہو چکی تھی منزلِ مقصود آزادی — ترے دشمن نہ تیری راہ میں کانٹے اگر بوتے
بھلا کیا خاک ہوتی آبیاریِ نخلِ ملت کی — ہوئے سب بند جب سرچشمۂ امید کے سوتے

لبوں پر دم ہے اب تک دم تری غیرت کا بھرتے ہیں
ندامت رنگ لائی ہے نہ جیتے ہیں نہ مرتے ہیں

اگر دنیا نہ پاری تیری سطوت کا وجود اب تک — مثال بو نہ رہتا اپنا رنگ بست و بود اب تک
ذرا کروٹ تو لے جاگ اٹھے قسمت نوعِ انساں کی — ترے آرام سے ہے ہند پر طاری جمود اب تک
ستم گاری میں چرخِ کینہ پرور کی نہ فرق آیا — دکھاتا ہے زمانے بھر کو یہ چشمِ کبود اب تک
رواداری کی پھونکی روح تو نے جسمِ عالم میں — ترا دم بھرتے ہیں کیا مسلماں کیا ہنود اب تک
وہ گہوارہ امانت جس میں پلتی تھی خدائی کی — وہ گودی کھیلتی ہے جس میں فطرت کی نمود اب تک
وہ رقبہ درحقیقت تھا جو منزل گاہِ آزادی — وہ نقشہ حریت کے جس میں شامل ہیں حدود اب تک

غلام آباد ہیں اب اس میں غداروں کی بستی ہے
ستم گاروں کی مکاروں کی عیاروں کی بستی ہے

احمد عبد القیوم (عاذ)

غزل

ابو المنیر مشتاق قریشی
(بنگلوری)

جستجوئے نارتھی یا نورِ یزداں کی تلاش — پُر صداقت تھی مگر موسیٰ عمراں کی تلاش
محشرستانِ نوا میں ہے ترنم کی ہوس — گلشنِ اندوہ میں گلہائے خنداں کی تلاش
چارہ گر بے سود ہیں تیری یہ ساری کاوشیں — درد پر مرتا ہوں میں اور تجھ کو درماں کی تلاش
بزمِ امکاں میں جو ہے مستور تیرے دل میں ہے — خلوتِ دل ہی میں کر حسنِ نمایاں کی تلاش

رازِ فطرت ذرّے ذرّے سے ہے عالم آشکار
پھر دلِ عارف کو ہے کس رازِ پنہاں کی تلاش

---

[1] دریائے سوتھہ کاویری سلطان ٹیپو شہیدؒ کے مزار کے پائین ہو کر بہتا ہے۔

گنگا کا ایک نظارہ

سرِشام کا دھندلکا شب کی تاریکیوں کے ہجوم میں غائب ہو رہا تھا۔ مقدس بنارس کے مناور اندھیرے میں چھپ۔۔۔
۔۔۔ لہر پھیلنے لگی تھی اور ظلمت و تاریکی کا سمندر ٹھاٹھیں مار رہا تھا۔

تاریکیوں اور ظلمت کے اسی سمے میں ایک ہندو دوشیزہ اپنے دل میں پریم اور محبت کے جذبات کی ایک کشتی۔۔۔
ساحل پر آئی ۔۔۔ اس نے کنول کے ایک پتے پر شمع جلا کے سطح آب پر تیرنے کے لئے چھوڑ دی ۔۔۔ اُس مست شباب نازنین کی
کٹاروں کی تھکی ہوئی آنکھوں میں نیند انڈیل رہا تھا ۔۔۔ اس کا خیال اس کے پردیس گئے ہوئے ساجن کی یاد میں محو تھا۔۔۔
ساجن بہت دور ۔۔۔ پردیس گیا ہوا تھا ۔۔۔ اب تک واپس نہیں آیا تھا ۔۔۔ یہ بہتی ہوئی شمع اب اس کی زندگی۔۔۔

شمع بہی جا رہی تھی ۔۔۔ نازنین اس بھیانک اندھیرے میں شمع کو دیکھ رہی تھی ۔۔۔ شمع کی لَو ہوا۔۔۔
دلیرانہ لڑ رہی تھی ۔۔۔ ہوا کے پیہم حملے اور کمزور ہوتی ہوئی شمع نے اس حسینہ کے قلب و جگر میں گریہ و اضطراب کا ایک۔۔۔
۔۔۔ رنج و الم کے جذبات سے وہ سوگوار ہوئی جا رہی تھی۔ اس کی زندگی کی ساری متاع فنا کی گود میں دکھائی دے۔۔۔
فوراً ہی ہوا کے تیز و تند جھونکے نے شمع کو ہمیشہ کے لئے بجھا دیا۔ بڑا ہی قاتل نظارہ تھا ۔۔۔ ایک بُرا شگون اس کے۔۔۔
دائمی جدائی کا یقین دلا رہا تھا ۔۔۔ وہ اپنی پھوٹی قسمت پر اپنے محبوب کی یاد میں آنسو بہا رہی تھی ۔۔۔
اس کے رنج و غم میں گنگا کی پرشور موجیں ساحل سے ٹکرا ٹکرا کر گریہ و الم کا طوفان برپا کر رہی تھیں ۔۔۔ اس شور۔۔۔
بادلوں کے پیچھے جا چھپے تھے ۔۔۔ اور شورِ قیامت برپا تھا۔

(ماخوذ از رہبر دکن)

غزل

محبوب حسن جگر

زلف بدوش اور بھی آ رنگ سرور کی قسم
تجھ کو فروغ رنگ و بو اپنے غرور کی قسم

منزلِ یاد دوست میں ضبط کا ماجرا نہ پوچھ
درد بھی تھک کے رہ گیا قلب سرور کی قسم

عشق کی شان دیکھ لی حسن کی آن دیکھ لی
لطف حیات پالیا تیرے حضور کی قسم

ایسی بھی ایک ساعت حسن تمام آئی تھی
میں بھی تمام حسن تھا شعلۂ طور کی قسم

اے بت حسن آفریں! محو نمازِ عشق ہوں
صرف نیاز ہے جبیں تیرے ظہور کی قسم

کاوشِ بے نشاط کے ذوق کا حال کچھ نہ پوچھ
آج وہ مست مست ہے چشم سرور کی قسم

دنیا میں ہر شخص کو کسی نہ کسی شے کی ضرورت سے زیادہ طلب ہوتی ہے اور جب یہ طلب اپنی حد سے آگے نکل جائے تو ذہنی بچہ گویا ہوا مالنا آتا ہے۔ یعنی طلب کو "مینیا" کہا جائے تو حرج نہ ہوگا۔ ایک کا مطمح نظر صرف سیم و زر ہے۔ دوسرا حسن کا دیوانہ ہے۔ یعنی سارے سیم وزر کو حسن پر قربان کرنے تلا ہے۔ تیسرا کتابوں کا عاشق ہے۔ اس کے نزدیک دولت ڈھلتی ہوئی چھاؤں اور حسن سفلی دھوکا ہے۔ چوتھا شاعر ہے۔ تمام عمر حسن کی قصیدہ گوئی کرتا ہے اور فلک کو گالیاں دیتا رہتا ہے۔ لیکن اگر حسن و عشق کسی کوچے میں تنہا بھٹکتے ہوئے مل جائیں تو ان دونوں کو اپنے دیوان پر سے وار دے۔ کوئی صرف شہرت کا بھوکا ہے۔ کبھی بلدیہ کی رکنیت کے لئے نام پیش کرکے آخر وقت دوسرے کے حق میں دست بردار ہو جاتا ہے کہ کم از کم اخبارات میں یہ خبر کئی دن تک شائع ہوتی رہے کہ فلاں صاحب نے اپنا نام واپس لے لیا۔ بعض معرکتہ الآرا سیاسی مسائل پر رائے زنی کرنا پیدائشی حق سمجھتا ہے اگر شہرت کسی مسئلہ کی مخالفت کے ذریعے سے ملتی ہو تو پھر ملک میں اس مسئلہ کے سب سے زبردست حریف آپ ہی ہیں۔ بہرحال ان کے علاوہ ایک شخص ایسا ہے جس کا دل دوستوں کے لئے وقف ہے۔ وہ بغیر دوستوں کے جی نہیں سکتا۔ رات تنہا بسر کرتا ہے تنہائی بھی خواب کی حد تک۔ ورنہ وہ دوستوں سے نہیں چھوٹ سکتا اور نہ دوست اس سے چھوٹ سکتے ہیں ہر وقت آپ ملاحظہ فرمائیں گے کہ اس کے ملاقات کے کمرہ میں کوئی نہ کوئی بزرگوار دھرے ہوئے ہیں۔ اگر تصدیق کرنی ہو تو کبھی غریب خانہ پر تشریف لائیے۔

جناب والا دوست! تو دوست کا آپ پاس کیا مفہوم ہے؟ کیا دو تین مرتبہ سلام علیکم کا جس شخص نے گردن لٹکا کر جواب دیا ہو، وہ دوست ہے؟ یا چلتی ہوئی ریل میں ایک دوسرے سے آپ کہاں جا رہے ہیں؟ اور پھر جواب میں یہ کہ آپ کہاں جا رہے ہیں؟ پوچھنے کے بعد دوستی ہو جاتی ہے؟ یا راستہ چلتے ہوئے اپنا "دوست" سمجھ کر کسی اجنبی کی پیٹھ پر دستِ محبت دراز کرتے ہوئے کہ "ٹھیرو بھائی بشیر کہاں جا رہے ہو" اور پھر فوراً ہی "معاف فرمائیے غلط فہمی ہو گئی" کہنے کے بعد کیا دوستی کا عہد و پیماں ہو جاتا ہے؟ یا اندھیری رات میں بائیسکل کا لیمپ جلانے کے لئے کسی راہ چلتے بھلے مانس کو روک کر کہیں کہ ذرا دیا سلائی (بقول ایک صاحب کے "کاڑی") کی ڈبیہ تو دیجئے کیا اس احسان کے معاوضہ میں آپ دوستی کو ڈبیہ میں بند کرکے واپس کریں گے۔ یا پھر امتحان گاہ میں ریاضی کا پرچہ حل کرتے ہوئے آپ کے سامنے بیٹھنے والا اپنی کاپی اس طرح رکھے کہ آپ کو جواب علانیہ نظر آ رہا ہو تو کیا یہ محسن بھی دوست بن سکتا ہے؟

ممکن ہے ان میں سے کوئی ایک آپ کی دوستی کے معیار پر پورا اتر سکے۔ لیکن معاف فرمائیے میں اس قسم کی دوستی سے بچتا ہوں میں نہایت اطمینان سے بلکہ فخریہ طور پر کہہ سکتا ہوں کہ میرا معیارِ انتخاب بہت بلند ہے۔ ہر وہ شخص جو مجھ سے ملتا ہے۔ مجھے اپنا دوست سمجھ سکتا ہے۔ لیکن اسے اس اصرار کا کوئی حق حاصل نہیں کہ میں بھی اسے اپنا دوست سمجھوں۔ وہ معیار کیا ہے؟ تو یہ

میری زندگی کا راز ہے اور ظاہر ہے کہ راز عام طور پر نہیں بتائے جاتے اور پھر یہ بھی ہے کہ بعض باتوں کے دہرانے سے ان کا ... ہو جاتی ہے۔ بہ حال میری دوستی کا معیار انتخاب کی جس بلندی پر ہے وہاں تک سطحی نظر نہیں پہونچ سکتی۔ اور یہی وجہ ہے ... ہزار ہا طلباء میں سالہا سال رہنے کا اتفاق ہوا وہاں صرف تین، چار دوست پیدا کر سکا

یا بش بخیر! علی گڈھ کی زندہ سرزمین میں میں نے پانچ سال گذارے۔ لیکن اس مدت میں صرف تین دوست مجھے ... وجیہہ، ذکا، اقبال ہم تینوں میں کتنا گہرا ربط تھا! یوں سمجھ لیجئے کہ یا تو یہ تین ہستیاں میری ذات میں مدغم ہو گئی تھیں یا میں ... جذب ہو گیا تھا۔ اٹھنا بیٹھنا، پڑھنا، لکھنا، چلنا، پھرنا سب ایک ساتھ عرصے تک ملے رہے لیکن کیا مجال کہ کسی روز کسی ... شکن تک پڑی ہو۔ وجہہ یہ کہ ایک دوسرے کی طبیعت سے واقف، ہر ایک خوش مذاق موقع و محل شناس، علمی ... اور پھر بحث و مباحثہ کا خوگر! جب چار خوش مذاق یکجا ہوں اور سلسلۂ سخن ٹوٹنے نہ پائے تو بتائیے کتنا لطف آتا ہے۔ کم سن شخص شاید دوستی کو دلچسپ بنا نہیں سکتا۔

چھٹیوں کی راتیں ہیں اور چاند کی روپہلی روشنی میں مارلیسن کورٹ کے احاطے میں چارپائیاں بچھی ہوی ہیں۔ ایک ... کی باہم نوازی پر ایک خوش گلو کا غالب پر سر دھنناکہ

رہیئے اب ایسی جگہ چل کر جہاں کوئی نہ ہو   ہم نوا کوئی نہ ہو اور ہم زباں کوئی نہ ہو

بس سمجھئے کہ ہر شخص وارفتہ ہو کر جھوم رہا ہے اور درو دیوار زبردستی جھوم رہے ہیں۔ بہر کیف ایک کیف اور بے خودی کا عالم طاری ہے ... یہ تان ختم ہوئی اور ہم نے اطراف نظر ڈالی تو دیکھا کہ سب لحافیں تان کر سو رہے ہیں۔ احمد نے مجھ سے صیغۂ راز میں کہا "اس ... حرکت کی کیا سزا ہو سکتی ہے۔ ہم بیوقوف تو نہیں کہ اتنی رات گئے یوں ہی جاگتے رہے اور یہ سب چین سے خراٹے ... کہا" تو پھر کارروائی شروع کرنی چاہئے" کارروائی یہ تھی کہ ڈائننگ ہال سے پندرہ، بیس صراحیاں لائی گئیں اور پھر ... لئے ان میں سرخ رنگ گھولا گیا اور تھوڑی دیر بعد تڑاخ پڑاخ اور غافلوں کی چیخ و پکار سے مارلیسن کورٹ کی ساکت فضا گویا ... کی چہل پہل اور دوڑ دھوپ میں تبدیل ہو گئی۔ ہر شخص اپنی چارپائی پر مرغ آبی بنا ہوا تھا .... زندہ دلی بھی دوستی کا جزو ...

چار دوست اطمینان سے بیٹھے ہوے ہیں۔ بات یہاں تک پہونچی کہ ہندوستان میں سیاسی انقلاب سے پہلے معاشی انقلاب کی ضرورت ہے۔ بس سمجھ لیجئے کہ سب محمد علی جناح اور جواہر لال نہرو ہیں۔ چاروں میں سے ہر ایک معقولیت کے ساتھ دلائل پیش کر رہا ہے اور دوسرے پر غلبہ پانے کے لئے خوب زور زور سے چیخ کر اپنی بات منوا رہا ہے۔ ایک ۱۸۵۷ء کی تاریخ سے بحث کر رہا ہے۔ دوسرا ... عہد سے لے کر آج تک کے معاشی تغیرات بتلا رہا ہے۔ احمد نے تو ایک مرتبہ محمد تغلق کے عہد سے ہندوستانی سیاسیات کے نقشے ... سمجھانے کی کوشش کی تھی۔ بحث زوروں پر ہے یہاں تک کہ ایک اجنبی شخص یقین کر لے کہ یہ لوگ سول نافرمانی کے سلسلے میں نظر بند کئے جا چکے ہیں۔ بہر حال بحث اپنی منزلیں تیزی سے ختم کرتی ہوی اس نقطہ پر پہونچی کہ انسان بے لوث محبت کر سکتا ہے یا ...

۱۔ علی گڈھ کا ایک بورڈنگ جس کے کمرہ نمبر ۵ میں میں رہتا تھا۔

شخص محبت کی تعریف اور اس کے اقسام بتا رہا ہے لیکن کوئی وثوق سے نہیں کہہ سکتا کہ معاشیات اور سیاسیات کے جھگڑے نکل کر محبت کے دروازہ میں کب داخل ہوئے۔

دوست وہ ہے جو دوست کی غلطی کو اپنی غلطی سمجھے اور یہی بات ہم چاروں میں تھی۔ دہلی سے علی گڈھ واپس ہو رہے ہیں۔ رات کے گیارہ بجے دہلی پلیٹ فارم نمبر ۴ سے گاڑی چھوٹتی ہے۔ ابھی خرید و فروخت میں ہی تھے کہ چاندنی چوک کے گھنٹہ گھر نے پونے گیارہ بجائے، اب پندرہ منٹ میں اسٹیشن پہونچنا ہے۔ اتفاق سے کوئی تانگہ بھی نہیں ملا۔ میں نے کہا وقت نہ ورنہ کھلی سڑک پر ڈبل مارچ جائیے سب نے اتفاق کیا۔ اور ہانپتے ہوئے اسٹیشن پہونچے۔ وہاں کی گھڑیاں گیارہ بجا رہی تھی۔ ریلوے پل کو عبور کرکے پلیٹ فارم کے دونوں جانب گاڑیاں کھڑی ہیں اور دونوں کے انجن سیٹی دے رہے ہیں۔ میں نے احمد سے کہا "آگے بڑھ کر دریافت کرلو۔ کونسی گاڑی علی گڈھ جا رہی ہے پلیٹ فارم کے اس طرف کی یا اس طرف کی" میں صبح ہی معلوم کرچکا ہوں۔ احمد نے یقین آمیز لہجہ میں بائیں طرف ہاتھ بتاتے ہوئے کہا علی گڈھ کی گاڑی اس طرف کی ہے۔ ہم احمد کے ساتھ ساتھ انٹر کلاس کی طرف لپکے۔ سو اتفاق ڈبہ خالی تھا۔ اندر داخل ہوے اور برتھ پر دراز ہوگئے۔ دہلی سے علی گڈھ ستر میل کا فاصلہ ہے اور راستہ میں صرف دو جگہ گاڑی ٹھہرتی ہے۔ یعنی غازی آباد اور خورجہ پر۔ تیسرا اسٹیشن علی گڈھ ہے اور یہہ سفر کوئی ڈھائی گھنٹوں میں طے ہوتا ہے۔ بہرحال گاڑی روانہ ہوی اور کوئی گھنٹہ بھر بعد ہی اقبال نے اطمینان کا سانس لیتے ہوئے کہا "شکر ہے غازی آباد آگیا۔ وحید نے کہا "ایک بڑا گندم خورجہ بھی تو ہے" میں نے بھی اتفاق کیا۔ خیر گاڑی چلی اور کچھ دیر بعد رکی۔ احمد نے کہا "تو میاں علی گڈھ کی ہوا آنے لگی۔ یہہ تمام گفتگو برتھ پر بیٹھے بیٹھے ہو رہی تھی کسی نے جھانک کر تک نہ دیکھا کہ غازی آباد کی کیا کیفیت ہے اور خواجہ کا کیا عالم ہے۔ ایک گھنٹہ کی شیطانی چال کے بعد گاڑی رکی اور ہم برتھ سے کود کر دروازہ کی طرف پہونچے۔ مگر عجیب منظر نظر آیا۔ یا للعجب! نہ وہ علی گڈھ کا اونچا پلیٹ فارم ہے اور نہ وہ ماحول۔ ہم حیرت سے ایک دوسرے کا منہ تکنے لگے۔ لیکن فوراً ہی بات سمجھ میں آگئی یعنی ہم دہلی سے ڈیرہ ڈون جانے والی گاڑی میں بیٹھ گئے تھے۔ خیر یہہ پریشانی ختم بھی نہ ہوی تھی کہ تھوڑے سے فاصلہ پر جناب ٹکٹ انسپکٹر صاحب استقبال کو آتے ہوئے نظر آئے انسپکٹر کو آتا دیکھ کر ہم نے ڈیرہ ڈون کے فوجی کالج پر بحث شروع کردی۔ انسپکٹر پاس کھڑا ہو ا ٹکٹ مانگنے لگا۔ احمد نے وحید کو مخاطب کرتے ہوے کہا پینتیس کروڑ کی آبادی میں ایک فوجی کالج اور وہ بھی ڈیرہ ڈون میں کافی نہیں ہوسکتا۔ آخر کیوں نہ ہر شہر میں ایک ایک فوجی کالج قائم کیا جائے؟ ٹھیک ہے مجھے بھی اس رائے سے اتفاق ہے۔ آخر کیوں نہ ہر شہر میں ایک ایک فوجی کالج قائم کردیا جائے۔ اقبال نے انسپکٹر کا ہاتھ پکڑ کر اس سے سوال کرتے ہوے کہا۔ انسپکٹر ہاتھ چھڑا کر ٹکٹ مانگنے والا ہی تھا کہ میں نے اپنا ہاتھ اس کے منہ کے قریب پہونچا کر اس کو مزید سوال و جواب سے روکتے ہوے وحید سے کہا "ہر مقام کی آب و ہوا مختلف ہوتی ہے فوجیوں کے لئے بالخصوص کھلا اور سرد مقام چاہئے تاکہ ان سے خوب کس کر محنت کی جاسکے جس طرح اس اسٹیشن کی ناموافق آب و ہوا میں ہم بے چینی محسوس کر رہے ہیں۔ کیا کبھی علی گڈھ کے اسٹیشن پر بھی اس طرح بے چین ہوے تھے ...... ؟ اچھا تو آپ سب علی گڈھ کے ہیں؟ ٹکٹ انسپکٹر گویا دشمنی کی نظر سے دیکھتے ہوے کہا۔ فوراً ٹکٹ بتائیے۔" بات یہہ ہے ماسٹر" احمد نے انسپکٹر کے کندھے پر ہاتھ رکھتے ہوے کہا۔ "آج ایک لطیفہ یہہ ہوا کہ

دہلی پلیٹ فارم نمبر ۴ پر دو گاڑیاں کھڑی تھیں۔ علی گڈھ پہونچانے والی گاڑی کی بجائے عجلت سے ہم اس گاڑی میں ... آپ کے مہمان رہیں، دیکھئے خدا کی کیا مصلحت ہے انسپکٹر دعوت کا رقعہ مانگنے والا ہی تھا کہ وحید نے کہا "ایسا تو ہوتا ہے ... آپ سے غلطی ہوجاتی ہے اور کبھی ہم سے۔ اس دنیا میں کوئی کام خدا کے کاموں سے اس قدر ملتا جلتا نہیں ہے جس قدر یہ کہ ... کی غلطیوں کو معاف کردیں۔ مگر..... آپ پہلے ٹکٹ بتائیے...... یہہ اسٹیشن ہے اور سرکاری معاملہ ہے اقبال نے ... ہوئے کہا "ہم اس لئے عرض کررہے ہیں کہ یہہ دنیا ہے اور دنیا میں یہہ ایک اسٹیشن ہے۔ ورنہ معلوم ہے قیامت کے دن آپ ... کہاں ہونگے۔ اور ہم کہاں ہوں گے۔ اس روز نہ آپ ہم سے ٹکٹ مانگ سکیں گے اور نہ ہم آپ کو بتا سکیں گے۔

"اچھا یہہ تو بتایئے" میں نے دوستانہ لہجہ میں انسپکٹر سے کہا" یہاں سے واپسی کی گاڑی کب ملے گی ؟" ... اور مسکراہٹ کے ساتھ ارشاد ہوا۔ خوب دل لگی رہی۔ اچھا آپ لوگ بیٹھ تو جائیے۔ انسپکٹر نے ایک بڑی بنچ منگائی اور ہم ... دوران گفتگو میں معلوم ہوا کہ دو بجے گاڑی آئے گی۔ اس میں بیٹھ کر ہم ہاپڑ (یہہ وہی ہاپڑ ہے جس کے بڑے بڑے ... پڑے گا۔ وہاں صبح گیارہ بجے گاڑی ملے گی۔ اس میں چل کر ہم دو بجے غازی آباد پہونچیں گے۔ ہاپڑ والی گاڑی آگئی ہم ... اسٹیشن ماسٹر کو خدا حافظ کہتے ہوئے روانہ ہوئے اور پروگرام کے مطابق دوسرے دن ۵ بجے علی گڈھ پہونچے۔ سفر بے حد ... بالخصوص اس وقت جب کہ ہم ہاپڑ کے اسٹیشن پر مولوی عبدالحق صاحب کی اُردو کی زبردست خدمات کا ذکر کرتے ہوئے ... صعوبتوں کو بالکل بھول چکے تھے اور یہہ محسوس کررہے تھے کہ ہاپڑ میں اردو کانفرنس منعقد ہورہی ہے اور ہم اس میں شرکت ... سے آئے ہوئے ہیں۔ سفر دلچسپ کیوں نہ رہتا ؟ ہر شخص غلطی کا شکار تھا ...... دوست کی غلطی کو اپنی غلطی سمجھنا غالباً دوستی کا ...

غزل

محمد منیر الدین

عقاب مہر کی پروازِ بے باکانہ جاری ہے
منازل کی بلندی اور پستی اعتباری ہے

سمندر ہے کرشمہ اتصالِ فکرِ پیہم کا
قرار و صبر میں مضمر گہر کی آب داری ہے

نہ بخشی قوتِ پیوستگی آتش کو قدرت نے
کہ شورِ برتری شعلہ کی ہر اک رگ میں ساری ہے

ادائے فرض میں آتش بجاں ذرات کے دل ...
اسی توفیق سے عالم کو حاصل استواری ہے

عمل اور فکر کی وحدت سے ہے پیوستگی حاصل
دگرنہ زندگی کو زندگی کہنا بھی خواری ہے

نظر کی لغزشوں کو حائلِ راہِ خرد مت کر
وہ خوشِ زندگی ہے یہہ عنانِ شہ سواری ہے

ہیں پابندِ فریبِ آگہی ہم آہ خوش خوش ہیں
مسافر کو دگرنہ فرصتِ اختر شماری ہے ؟

مس میمونہ بیگم آہ

ط مولوی عبدالحق صاحب سکریٹری انجمن ترقی اُردو کا وطن۔

دنیا میں ہزاروں ہستیاں "مسرتِ حقیقی" کی تلاش و جستجو میں مجروح ہو چکی ہیں جس طرح پھول کے حاصل کرنے میں نوکِ خار سے دوچار ہونا لازمی ہے اسی طرح مسرت تک پہونچنے کے لئے ان چار مہیب عناصر کو مغلوب کرنا پڑتا ہے جو مسرت کو گھیرے ہوئے ہیں یعنی "ہوس و محبت" "امید و بیم" یہی عناصر ہیں جن سے دل کا خمیر بنایا گیا ہے۔ جو دل کی کائنات پر باالترتیب اپنے پورے اثرات ڈالنے کی کوشش کرتے ہیں۔

"ہوس" اپنے آئینۂ فریب کی شعاعیں دل پر ڈالتی ہے ان بظاہر روشن مگر دشمنِ نور شعاعوں کی ساحرانہ قوتوں کا مظاہرہ اس طرح ہوتا ہے کہ "روحِ مسرت" بے حس اور منجمد ہو جاتی ہے خوف ہوتا ہے کہ یہہ بے حسی اور انجماد اس کی فنا کا باعث نہ ہو جائے اسی وقت "بیم" کی ہوشکن شعاعیں ہوس کے لئے وہ کام کرتی ہیں جو رات کی تاریک و خوفناک فضا کے ساتھ طلوع ہوتے ہوئے سورج کی روشنی "روحِ مسرت" مانگتی ہے مگر "ہوس و بیم" کی زنجیروں میں جکڑی ہوی "دل" وہ خوفناک دشمنوں کے نرغے میں پھنسا ہوا دل طائر مجبور مگر انسان کے سینہ کی کمزور یں اس طائر کی وحشتوں کا مقابلہ کرنے کے لئے کافی نہیں۔

کسی کی ہمت افزا نظروں نے انسان کو تسکین دی ان کشاکشوں کی قوتوں کا مقابلہ کرنے کے قابل بنا دیا۔ وحشی دل کو رام کیا۔ اب دل سینے کے اندر بے چین نہ تھا محبت کی گہرائیوں میں امید موہوم کے چند شرارے ترقی کرکے تیقن کی شعاعیں بن چکی تھیں۔ رات کی تاریک فضا مشرق سے نکلتے ہوئے خطوطِ مطلا سے فنا ہوتی ہے۔ "بیم و ہوس" فنا ہو گئے تیقن کی شعاعوں ہیں۔ آہ کمزور دل مجبور دل۔ ایک زمانے کی کشاکش کے بعد اس ایقان کی روشنی میں مضبوط اور مختار دل بن گیا۔

انسان کے دل کے ساتھ یہہ چاروں عناصر وجود میں آئے کمزور عقل کا کمزور دل مسرت کے بہلانے سے بہل گیا اور یہہ سمجھ بیٹھا کہ ہوس و بیم فنا ہو گئے اور ہمیشہ کے لئے۔ افسوس وہ یہہ بھول گیا کہ ان چیزوں کا تعلق اس کے خمیر سے ہے جس طرح موسم سرما میں پرندوں کی نوش الحان آواز نہیں سنائی دیتی مگر یہہ چیز پرندوں کے عدم پر دلیل نہیں ہو سکتی۔ یہہ کہہ سکتے ہیں "ہوس و بیم" کے اثرات فنا ہو گئے۔ "ہوس و محبت" "امید و بیم" دل کے ساتھ ہیں اور ہمیشہ رہیں گے۔

(ماخوذ از انگریزی)

احمد علی اکبر راز قاسمی

آپ دنیا کے جھگڑوں سے تنگ آ گئے ہوں گے۔ تن کی دنیا اگر تھوڑی دیر کے لئے چھوڑنا چاہتے ہوں تو "من کی دنیا" میں داخل ہو جائیے۔ "من کی دنیا" جناب رشید قزلباشی کے افسانوں کا مجموعہ ہے جس کو "ادارۂ ادبیات اُردو" کی طرف سے اسی ماہ خاص اہتمام سے شائع کیا گیا ہے۔ علامہ اقبال مرحوم نے بالکل سچ کہا ہے کہ ع تن کی دنیا سود و سودا مکر و فن۔ قیمت مجلد (عہ)

بہارِ خراماں

میری زندگی کا سب سے زیادہ قیمتی لمحہ وہ تھا جب کہ میں نے تمہیں دیکھا۔ تم ہاں تم ایک "بہارِ خراماں" باغ میں … ٹہل رہی تھیں۔ مسحور کن فضا کی رنگینیوں میں تم گویا گم ہو کر رہ گئی تھیں۔ تمہیں کیا خبر تھی کہ کوئی تمہیں دیکھ رہا ہے۔ تم ایک … پھول چن رہے تھے۔ اور جب تم گلاب توڑنے لگیں تو ایک کانٹا تمہاری پھول سی انگلی میں چبھ گیا تمہاری زبان سے بے اختیا… کی آواز نکلی تم نے جلدی سے ہاتھ کھینچ لیا اور سارے پھول پھینک دئیے۔ ہاں! اور تم دونوں ہاتھ سرہانے رکھ کر … پر لیٹ گئیں اور کچھ گنگنانے لگیں ....!

کوئل برابر والے درخت پر سے کوکو کی صدا بلند کر رہی تھی تھوڑی دیر تک تم نے اس کا نغمہ سنا لیکن پھر خدا جانے … میں کیا خیال آیا تم نے ایک پتھر کھینچ مارا اور کوئل اڑ گئی ....!

حوض پر تم نے تھوڑی دیر خاموش اور ساکت پانی میں اپنے جمال کی تصویر دیکھی لیکن نہ جانے کیوں تم نے اس ساکت … اور فاتحانہ انداز میں ہنستی ہوئی حوض کی سیڑھیاں اتر کر سبزے پر بے تحاشہ بھاگنے لگیں ......

تمہاری ہر ادا میرے لئے تیر تھی۔ تمہاری ہر حرکت پر میں تڑپ اٹھتا تھا۔ تتلی کو پکڑنے میں جب تم ناکام رہیں تو تم نے اپنے … کا ننھا پیر جھٹکنے تمہارا انداز اور بھولا پن دیکھ کر دل چاہتا تھا کہ دوڑ کر تم سے لپٹ جاؤں لیکن میں دل پر جبر کئے دور ہی سے کھڑا … حسنِ دلفریب کا نظارا کرتا رہا۔

ہوا کی معمولی سی تیزی پر تم اتنی پریشان ہو گئیں کہ دو منٹ بھی تم نے وہاں ٹھہرنا مناسب نہ سمجھا اور سیڑھیاں … مکان میں داخل ہو گئیں اور جاتے جاتے میرا سرمایۂ حیات ساتھ لیتی گئیں۔ میں حیران اور مبہوت بنا بالکل بے حس و حرکت … خدا جانے کتنی دیر تک ـ !! لیکن بادِ تند کے ایک جھونکے نے مجھے اپنی بے خبری سے چونکا دیا۔ ہاں۔ بادِ تند کے جھونکے نے جو تمہارے … ہوئے پھول اڑائے لئے جا رہا تھا۔ میں بے اختیار دوڑا پھول جمع کئے اور ان کا ایک ہار بنایا اور آخر میں ایک بہت بڑا سرخ گلاب توڑا اور اس میں ایک کانٹا چبھو دیا گویا یہ تمہارے تیرِ نظر اور میرے خون شدہ دل کی تصویر تھی۔ میں نے اس گلاب کو ہار … مقام پر کہ جب تم ہار پہنو تو یہ تصویر تمہارے سامنے رہے، لگا دیا اور اس مقام پر رکھ دیا جہاں تم پہلے ٹہل بیٹھی تھیں اور … سے ہٹ گیا اور تمہارے انتظار میں اپنے مقام پر کھڑا ہو گیا

تم تھوڑی دیر بعد آئیں تم نے حیرت سے ہار کو دیکھا، اٹھایا جب تمہاری نظر اس گلاب پر پڑی تو تم نے حیرت سے چا… دیکھا، اور پھر پھول پر نظر ڈالی کانٹا کھینچ پھینک دیا، ایک قہقہہ لگایا اور پھر تم نے وہ ہار گلے میں ڈال لیا۔

"عشق کی کامیابی اس سے بڑھ کر اور کیا ہو سکتی ہے کہ اس کا ہدیہ بارگاہِ حسن میں قبول کر لیا جائے۔"

عباس عابدی

ہاسٹل

بخاری "معصوموں کی بستی" میں دوبارہ داخل ہوا جہاں ایک نئی قسم کی فضا نظر آرہی تھی بعض نونہالوں کے متعلق اسے
معلوم ہوا کہ وہ "فارغ التحصیل" ہو چکے ہیں اور اب اپنی زندگی کے باقی ماندہ دن گذارنے کے لئے تلاش روزگار کی فکر میں ہیں
بعض لڑکے ماں باپ کی آنکھوں سے دور محض حصول علم کے شوق میں یہاں آئے ہوئے تھے۔ اور ایک نئی دنیا میں زندگی گذارتے
ہوئے کچھ عجیب طرح کی بے چینی محسوس کر رہے تھے۔ لیکن یہہ لڑکے تھوڑی سی مدت کے بعد اس ماحول میں ایک نیا لطف پائیں گے
بخاری نے ایک لڑکے کو دیکھا جو بالکل نئے آئے ہوئے تھے۔ کسی قیدی ہرن کی طرح ماحول کو پریشان نظروں سے
دیکھتے ہوئے قیامت خیز اداؤں سے وہ بے خبری میں ایک عالم کو گرویدہ کر رہے تھے۔ چال ڈھال، بات چیت ہر چیز سے بے نیازی
ظاہر ہو رہی تھی۔ ایک دن نہ معلوم وہ کس خیال میں اخبار بینی کرنے لگے۔ خدا کا شکر ہے ان کے مطالعہ میں کوئی خلل انداز نہیں ہوا۔
بخاری نے انھیں سلام کیا۔ آنکھوں کے اشارے سے انھوں نے سلام کا جواب دیا اور کچھ پریشان سے ہو گئے۔ بخاری نے ان کو
چائے نوشی کے لئے مدعو کیا۔ ڈرتے ڈرتے انھوں نے کہا "میں نہیں آتا" آپ جائیے نا" اسی لہجہ میں بخاری نے عرض کیا "چائے
پیتے ہیں نا بے کا تکلف ہے بھلا، چلئے نا" "جی میں نہیں آتا۔ آپ جائیے نا" بخاری نے ان کی دل شکنی کے خیال سے مزید اصرار
مناسب نہ سمجھا لیکن اس انکار پر اسے بے حد تعجب ہوا کہ "اس قدر شرمانے والے عملی زندگی میں کس طرح کامیاب ہو سکیں گے"!
بخاری نے اچھے شاعر کی نسبت دریافت کیا کہ وہ کہاں غائب ہو گئے ہیں؟ بخاری کو یہہ سن کر بے حد افسوس ہوا کہ اس کا
"اچھا شاعر" امتحان میں ناکام ہونے کی وجہہ سے دوبارہ اس فردوسی بستی میں داخل نہ ہو سکا۔ بخاری نے امتحانی طریقہ پر
نیاس آرائی کی کہ "قابلیت کے اصلی جوہر دو تین گھنٹوں کے لکھے ہوئے چند کاغذوں میں کسی طرح ظاہر نہیں ہو سکتے۔ یہہ ہو سکتا ہے کہ
ایک اوسط قابلیت کا لڑکا نصاب کی کتابوں اور پروفیسروں کی لکھائی ہوئی یادداشتوں کی مدد سے امتحانی سوالات بہت اچھے
طریقہ سے حل کر دے۔ لیکن اس طرح اس کی بناوٹی قابلیت کا بھانڈا نہیں پھوٹ سکتا۔ وہ ایک پڑھائی ہوئی چیز کو گراما فون کے ریکارڈ
کی مانند محض دوہرا دیتا ہے"!

اچھا شاعر، اصغر "ایک غلط لیکن ضروری اصول" کی بنا پر بے کیف زندگی گذارنے پر مجبور تھا۔ "معصوموں کی بستی" سے
قطع تعلق اس کے لئے سائبیریا کو جلا وطن ہونے کے برابر تھا "معصوموں کی بستی" اس کے بغیر ویران نظر آتی تھی۔
بخاری نے ایک نئے لڑکے، لطیف سے ملاقات کی۔ یہہ اصغر کے سب سے زیادہ گہرے دوست تھے۔ ان کی دوستی نے اصغر
کو ساری دنیا سے بے نیاز کر دیا تھا۔ امتحان کی ناکامی کے باعث اصغر اب اپنے اکیلے دوست سے بھی جدا ہونے کے لئے مجبور تھا۔
گھر کی چار دیواری کے اندر اصغر کی زندگی اس شعر کی تفسیر تھی۔

گذاری ہیں خوشی کی چند گھڑیاں — انھیں کی یاد میری زندگی ہے

ایک مرتبہ سرِ شام اپنے چند ملاقاتیوں کے ہمراہ "معصوموں کی بستی" کا نیا رنگ ڈھنگ دیکھنے چلے آئے۔ ... ملنے جلنے میں اصغر کو اتنی فرصت نہ ملی کہ وہ لطیف سے اطمینان کے ساتھ مل سکتے۔ گھر واپس ہوتے ہوئے انھوں نے ... کہنا چاہا۔ اصغر کا یہہ بیگانہ پن لطیف کے لئے بے حد تکلیف دہ تھا۔ اصغر اس کا سب کچھ تھا۔ اصغر کے بغیر اسے کسی چیز ... محبت کی ... وہ کسی صورت گوارا نہ کر سکا۔ اس نے غم و غصہ سے مخبوط الحواس ہو کر اصغر کو گالیاں دی۔ ... اصغر نے صفائی کی کوشش کی عدیم الفرصت ہونے کا عذر پیش کیا لیکن لطیف نے اس کی کسی بات کا خیال ... ان کو قصداً ذلیل کرنے کی کوشش کی۔

ہم چشموں میں اس طرح ذلیل ہونے کے بعد اصغر بادلِ ناخواستہ اپنے گھر واپس ہوا پجاری نے اصغر کو ... آنکھوں سے آنسوؤں کا سیلاب بہہ رہا تھا۔

اصغر کے جانے کے بعد لطیف نے محسوس کیا کہ اس نے ناحق اپنے معصوم دوست کو بری طرح تکلیف پہنچائی ... تکلیف اور ذہنی اذیت کے زیرِ اثر مسلسل دو گھنٹے تک نہ تھمنے والے آنسو بہائے۔ وہ حقیقی معنوں میں شرمندہ تھے۔ دوسرے ... نے دیکھا اصغر اور لطیف کی آپس میں صفائی ہو گئی ہے۔ دونوں کے دلوں میں رات کی ناچاقی کا کوئی اثر باقی نہ تھا۔ ... لڑکے معنی خیز مسکراہٹ کے ساتھ ان دونوں کو دیکھ رہے تھے گویا اتنی شدید لڑائی کے بعد ان کو ایک دوسرے سے ... نہ ملنا چاہئے تھا۔ پجاری کا خیال ان لڑکوں سے مختلف تھا۔ اسے دو روٹھے ہوئے دلوں کو ملتے دیکھ کر حقیقی مسرت حاصل ہو ... پجاری نے دیکھا اس کے "مقدس دیوتا" اِس ملاپ پر مسکرا رہے ہیں۔ دیوتا کی جنت کی خوبصورت پریاں اُن پر پھول برسا ... گویا وہ اس قدر جمیل غصہ اور اس کے بعد اتنے دلچسپ ملاپ سے بے حد متاثر ہیں۔

پجاری نے "معصوموں کی بستی" میں رہتے ہوئے یہاں کے نونہالوں کے عادات و خصائل کا بالغور مشاہدہ کیا ... ابتدائی تین مہینوں تک یہہ لڑکے نصاب کی کتابوں کی طرف کم متوجہ ہوتے۔ ان کا زیادہ وقت کھیل کود اور گپ شپ میں ... سے دو ماہ پیشتر یہہ لڑکے کتابوں کے ڈھیر میں گم ہو جاتے۔ انتہائی انہماک کا یہہ زمانہ بھی بے حد دلچسپ ہوتا۔ آپس میں گپ ... کی بجائے یہہ لڑکے مختلف علمی مباحث پر گفتگو کرتے۔ ہر لڑکا اپنی معلومات سے دوسرے کو مرعوب کرنے کی کوشش کرتا۔

امتحان کو صرف پندرہ دن باقی تھے۔ رات کے سات بجتے ہی سے تمام لڑکے پڑھنے میں مشغول ہو گئے۔ پجاری بھی ... میں بیٹھا "اختر کی ڈائری"[1] کی ورق گردانی کر رہا تھا۔ گیارہ بجنے کے بعد اسے ایسا معلوم ہوا کہ کوئی شخص ستار بجا ... آواز میں گاتے ہوئے موسیقی کا ساحرانہ اثر دیکھنا چاہتا ہے۔ پجاری کی طرح تمام لڑکے بھی اِس دلچسپ خلل اندازی سے متاثر ... نہ رہ سکے۔ کتابوں سے دلچسپی قائم رکھنے کی کوشش میں ناکام ہو کر وہ کمروں سے باہر نکل آئے۔ پجاری نے دیکھا ایک لڑکا ناچنے کے ...

---

[1] مسٹر اشفاق حسین ایم اے (عثمانیہ) کا ادبی شہ کار۔ جو مجلہ عثمانیہ کی کسی اشاعت میں چھپ چکا ہے۔

انگلیوں سے ستار کی آواز پیدا کر رہا ہے۔ وہ گا رہا تھا:-

جاؤ بہت باتیں نہ بناؤ جاؤ تمھیں پہچان گئی ہاں ہاں! جاؤ تمھیں پہچان گئی

ان مختصر سے لفظوں میں اس لڑکے نے کتنی موسیقی اور لطافت پیدا کر دی تھی۔ بہت سے لڑکے اس کے ساتھ گانے میں شریک ہو گئے۔ باقی افراد اپنی وجدانی کیفیت مختلف طریقوں سے ظاہر کرنے لگے۔ ایسا معلوم ہو رہا تھا "موسیقی کا دیوتا" گا رہا ہے اور دنیا اس کے نغمہ میں کھوئی ہوئی ہے۔ سارا ماحول شعریت میں ڈوب گیا تھا۔ لہلہاتے ہوئے سبزہ زاروں میں سفید چاندنی کا فرش ان کو باہر نکلنے کی دعوت دے رہا تھا۔ گاتے، بجاتے، جھومتے اور رقص کرتے سب کے سب "موسیقی کے دیوتا" کے ساتھ باہر نکل آئے پجاری بھی ان دلچسپیوں میں شریک ہو گیا۔ دنیا میں اتنی پر لطف رات کبھی اس نے بسر نہ کی تھی۔ "موسیقی کے دیوتا" کی خدمت میں پجاری نے عقیدت کے انمول پھول پیش کئے اور کہا "تم جیسا شوخ طبع اور رنگین مزاج لڑکا اپنی ذات سے ایک انجمن ہے جہاں بیٹھ جاؤ گے محفل کو رنگین بنا دو گے"۔

بارش کا موسم کتنا خوش گوار ہوتا ہے۔ سرد ہوائیں ہلکی ہلکی پھوار کس قدر فرحت بخش ہوتی ہے۔ اس کا اندازہ فطرت کے پرستار ہی کر سکتے ہیں۔ لیکن شہر میں رہنے والے بے وقت کی بارش سے اکثر شاکی نظر آتے ہیں۔ موسلا دھار پانی، راستوں کا کیچڑ ان کے کاروبار میں مخل انداز ہوتا ہے۔ اس لئے وہ بارش سے خوش نہیں ہوتے لیکن "معصوموں کی بستی" کے نونہال اس پریشان کن موسم میں بھی اپنے لئے خاصی دلچسپی پیدا کر لیتے ہیں۔

موسلا دھار بارش کے وقت کمروں میں گرم گرم چاء تیار رہتی ہے چاء نہ پینے والے بھی اس "آب حیات" سے لطف اندوز ہونے لگتے ہیں۔ چاء اڑانے اور کچھ دیر آپس میں گپ شپ کرنے کے بعد ان کو پانی سے کھیلنے کی سوجھتی ہے۔ اس کھیل کی ابتدا اس طور پر ہوتی کہ ایک لڑکا اپنے کسی دوست کو کیچڑ اور پانی میں زبردستی نہلا دیتا۔ وہ دوست اپنے ساتھی کے غسل صحت کی تجویز کرتے۔ یہ عمل اس تیزی سے جاری رہتا کہ اس دن "معصوموں کی بستی" کے تمام افراد بند دیواروں کی بجائے کھلے میدان میں کپڑوں سمیت نہا لیتے۔ وہ بزرگ کسی قدر متین بن کر کمرہ میں روپوش ہو جانا چاہتے تو پھر ان کی خیر نہیں ہوتی۔ لڑکے ان کا کمرہ بند رہنے کی رکاوٹ کبھی خاطر میں نہیں لاتے۔ کھڑکی، روشن دان ہر طرف سے ان کے کمرے میں کیچڑ اور پانی کی موسلا دھار بارش ہونے لگتی۔ پجاری نے دیکھا ایک صاحب جو کہنہ ہوتے ہوئے اپنے آپ کو بہت کچھ سمجھتے تھے، کمرے میں قلعہ بند ہو گئے۔ ان کو سمجھایا گیا کہ وہ ہتیار ڈال دیں۔ لیکن انھوں نے ایک نہ مانی۔ حسب معمول بہت تیزی سے کیچڑ اور پانی کی ان کے قلعہ پر گولہ باری ہونے لگی۔ تنگ آ کر انھوں نے کمرے کا پھاٹک کھول دیا اپنے مضبوط ہاتھوں سے مچھر دان باندھنے کا ڈنڈا دو چار بار ہوا میں اس طرح گھمایا گویا وہ مقابلہ پر آمادہ ہیں۔ لڑکے ان کو کیا مانتے ان کا ڈنڈا تو ایک طرف رہا۔ ڈنڈے کی زد سے باہر رہ کر لڑکوں نے جوان کو سنگ بار کرنا شروع کیا تو بے چارے ڈنڈا چھوڑ کر انکھوں کی حفاظت کرنے لگے۔ ڈنڈا چھن جانے سے وہ بے بس ہو گئے۔ اس کے بعد لڑکوں نے ان کے ساتھ جو روا دارانہ سلوک کیا۔ اس کا

بخوبی اندازہ قائم کیا جاسکتا ہے بچپن کی شرارتوں پر سنجیدگی، متانت اور بزرگانہ تقدس کا پردہ ڈھانکنے والا
یہی طریق عمل اختیار کیا جاتا۔

پجاری نے چند ایسے لڑکوں کو بھی دیکھا جو اس ہنگامے میں حصہ لیتے ہوئے شرماتے تھے۔ لیکن وہ بھی اچھوتے
چھوڑے گئے۔ اتنی رعایت البتہ ان کے ساتھ کی گئی کہ کیچڑ ملائے بغیر صرف پانی سے ان کو نہلایا گیا۔ لیکن یہ
ان افراد کے لئے بہت زیادہ تھا۔ پانی میں بھیگنے کے بعد کپڑے ان کے جسم سے پیوست ہو گئے تھے اور وہ اپنی
کو ہ طور کا ایک نیا منظر پیش کرتے ہوئے پریشان تھے۔ اس پریشانی میں کتنی شعریت تھی اسے پجاری کے علاوہ بہت سی
نے بھی یقینی طور پر محسوس کیا ہو گا۔

امتحان ختم ہو جانے کے بعد تمام لڑکے چھٹیوں میں اپنے اپنے گھروں کو روانہ ہو جاتے ہیں سوسائٹی
دنیا کی یہ تین سب سے بڑی نعمتیں ان کو اپنی فردوسی بستی کے اندر میسر رہتی ہیں۔ یہاں سے جدائی کا خیال ان
تکلیف دہ ہوتا ہے لیکن وہ اپنے دل کو اس طرح سمجھا لیتے ہیں کہ یہ مفارقت عارضی ہے تھوڑے ہی دنوں میں
واپس آجائیں گے۔

پجاری نے "موسیقی کے دیوتا" کو دیکھا جس کا "معصوموں کی بستی" میں قیام کا زمانہ ختم ہو چکا تھا
مجبور تھا کہ ہمیشہ کے لئے اس جنت ارضی کو خیرباد کہہ دے۔ آٹھ سال اس نے یہاں گذارے تھے حسرت اور شادمانی
کتنی جلدی ختم ہو گئے۔ اب اس کی زندگی مسلسل کاوشوں اور تلاش روزگار کی تھکا دینی والی جدوجہد میں
اس ہونہار سپوت کو کبھی کسی نے رنجیدہ نہ دیکھا تبسم اس کے ہونٹوں پر ہمیشہ کھیلتا رہا۔ ایسا معلوم ہوتا تھا
پاس مسرت اور قہقہوں کا ایک بیش بہا خزانہ موجود ہے جسے وہ مستقبل سے لاپروا ہو کر دوستوں کے ساتھ
لٹا ہوا ہے۔ اب وہ کتنا مغموم تھا۔ پجاری نے کہنے کو اسے تسلی تو دی لیکن اس کی جدائی پر وہ آنسو بہائے بغیر نہ رہ سکا۔

پجاری نے اس عرصہ میں کئی مقامات دیکھ ڈالے تھے لیکن "معصوموں کی بستی" سے پجاری کو اتنی دلبستگی ہو گئی تھی
تقریباً یہاں کا ہو کر رہ گیا تھا۔ معصوم لڑکوں کے ساتھ زندگی گذارتے ہوئے وہ اپنے دیوتا اور وطن سے بے خبر تھا۔ پجاری نے
میں اب تک کسی کو مصیبت زدہ یا پریشان حال نہیں دیکھا تھا۔ ایک دن دوپہر کے وقت جب تمام لڑکے کھانے سے فارغ
کمروں کو واپس ہو رہے تھے۔ پجاری نے دیکھا طعام خانے سے باہر دسترخوان صاف کئے جا رہے ہیں اور دسترخوان کی چند
ہڈیوں اور جلی ہوئی روٹی کے چند ٹکڑوں پر قبضہ پانے کے لئے آس پاس کے کتے جھپٹنے لگے۔ ان بے زبان جانوروں کے ساتھ
کے چند بچے بھی دوڑے دوڑے چلے آئے۔ دھوپ کی تمازت نے ان کے سارے جسم کو کوئلہ کی طرح سیاہ کر دیا۔ پیٹ بھر کھانا

ں کے چہرہ پر انتہائی مایوسی ٹپک رہی تھی ۔ پجاری کو وہ صرف ہڈیوں کے ڈھانچے نظر آئے جن پر گویا کھال چڑھا دی گئی ۔ دسترخوان
ے الوان نعمت حاصل کرنے کے لئے ان معصوم بچوں کی کتوں سے لڑائی ہونے لگی ۔ کتوں پر فتح یاب ہونے کے بعد مال غنیمت میں چند
ہونے والے ہاتھ آئے ۔ ان کو پا کر یہہ لڑکے کتنے خوش تھے ۔ کتنا دردناک نظارہ اور انسانیت کی کتنی اہانت ۔ توہین پجاری کے آنسو
کل آئے ۔ اس نے آخر اپنے دل کو اس طرح تسلی دی فطرت کے اٹل قوانین کے سامنے انسان کا کچھ بس نہیں چل سکتا ۔ ان بچوں کے
ریعے قدرت ' دنیا والوں کو قناعت اور شکر گذاری کا درس دینا چاہتی ہے "

پجاری نے کئی سال ان معصوم لڑکوں کے ساتھ گذارے ۔ اب اس کے مقدس دیوتا نے اسے واپس بلایا تھا " معصوموں کی
بستی سے روانہ ہوتے وقت وہ کتنا ملول نظر آرہا تھا ۔ جاتے ہوے اس نے تمام لڑکوں کو دعا دی اور کہا " میں یہاں سے چلا تو جارہا
ہوں لیکن مجھے " ع جنت میں بھی یاد آئیں گے یہہ چند مہینے ۔

پجاری

تم کو معلوم نہیں ؟

رات کو چرخ پہ دیکھا ہے ستاروں کا سماں ؟
ان میں دیکھی ہے تڑپ ؟
یہہ مرے قلب کی دھڑکن ہے ۔ مرا سوز نہاں
ان کی دنیا میں چھپا !
تم کو معلوم نہیں !

تم نے دیکھی ہے کبھی ساغر رنگیں میں شراب ؟
اس میں دیکھی ہے جھلک ؟
یا گلستاں میں کبھی دیکھا ہے رنگین گلاب ؟
خون ہے دل کا مرے !
تم کو معلوم نہیں !

مضطرب موجوں کا دریا میں وہ پرجوش خرام
تم نے دیکھا ہے کبھی ؟
لب ساحل ہے ہر اک موج کا وہ رقص دوام
مرے جذبات ہیں وہ !
تم کو معلوم نہیں !

تم نے دیکھا ہے ہواؤں کا کبھی رقص و سرود ؟
ان کی آواز سنی ؟
میرے جذبات سے معمور ہے بس ان کا وجود
ان کا ہنگامہ تمام !
تم کو معلوم نہیں !

دیکھتے ہو کبھی آئینے میں آنکھوں کا خمار ؟
ایک پوشیدہ سرور ؟
ان میں مضمر ہے مری بس مری الفت کی بہار
میری الفت کا ظہور !
تم کو معلوم نہیں !

سعادت علی

تاثرات سفر یورپ بمبئی سے بندر سعید تک

حکومت آصفیہ ولی نعمت اعلیٰ حضرت سلطان العلوم خلد اللہ ملکہ و سلطنتہ کی مہربانی سے مجھے ٹھیک چوبیس سال بعد یورپ [illegible]
موقع ملا۔ سیکڑوں ہندوستانی یورپ کو جاتے ہیں۔ بعض طالب علمانہ حیثیت سے، بعض تفریح طبع کے واسطے، اور [illegible]
افزوں ہے۔ اسی لئے یہ سفر اس قدر عام ہو گیا ہے کہ اب اس کے حالات لکھنے کی طرف بہت کم توجہ کی جاتی ہے۔ [illegible]
صرف چار ماہ باہر رہا لیکن اس دوران میں بعض ایسے گوناگون مشاہدے ہوئے کہ انھیں مختصراً بیان کر دینا ممکن ہے [illegible]
باعث دلچسپی ہو۔ جہاز کے سفر کے حالات سے اکثر لوگ واقف ہوں گے لیکن تقریباً نصف صدی میں اس سفر میں جو [illegible]
بدیہی تھا کہ اس کا تھوڑا بہت ذکر مناسب ہے۔

ہمارا جہاز اطالوی لائن کا کونتے بیانکا مانو "امیر سپید دست" نامی تھا اور تقریباً ۱۸ ہزار ٹن وزنی تھا۔ چوبیس سال پہلے یورپ اور
ہندوستان کے درمیان آنے جانے والا جہاز اس وزن کا تو کیا اس سے آدھے وزن کا بھی نہیں ہوتا تھا۔ جہاز کیا تھا کسی محل یا [illegible]
ہوٹل کے مانند تھا اور نیچے سے اوپر تک سات منزلیں تھیں۔ اطالوی جہازوں کا کھانا انگریزی جہازوں سے بہت بہتر ہوتا ہے [illegible]
رات کے کھانے میں کم از کم ۲۰، ۲۵ مختلف قسم کی اشیاء ہوتی تھیں، اور بعض مرتبہ یہ طے کرنا مشکل ہوتا تھا کہ کونسی چیز لی جائے [illegible]
چھوڑی جائے۔ حقیقت یہ ہے کہ جب تک جہاز میں رہے "مرزا سرگزشت" بہت ہی یاد آئے۔ جہاز میں سوار ہونے سے پہلے [illegible]
"معائنہ" ہوتا ہے۔ مجھے یاد ہے کہ صبح کو جاتے وقت اس معائنے میں کیا کیا دقتیں اور پریشانیاں اٹھانی پڑی تھیں [illegible]
معائنہ سے چھٹکارا ہوا تھا تو کامران میں معائنے اور قرنطینے کی صعوبتیں اٹھانی پڑی تھیں، اور کہاں اس "معائنے" میں [illegible]
ایک منٹ لگا ہو گا کہ جہاز پر سوار ہونے کی اجازت مل گئی۔ جہاز میں بیٹھتے ہی انسان گویا اپنے آپ کو یورپ میں محسوس کرنے لگتا ہے
یوروپی تمدن میں جو بھی اچھی یا بری باتیں ہیں وہ سب سامنے آجاتی ہیں۔ جہاز کے لنگر اٹھاتے ہی جو فرق مجھے جنگ سے پہلے اور [illegible]
کے تمدن میں نظر آیا وہ مسافروں کی عریانی تھی۔ جہاز میں اوپر والے عرشے پر جو تماشا گاہ تھی، ہر وقت اس کے چاروں طرف عورتوں،
مردوں، بچوں، بچیوں کا جمگھٹ رہتا تھا، اور بہت سی عورتیں محض ایک چولی اور جانگیا پہنے، پیٹ اور پیٹھ کھلی ہوئی [illegible]
بیٹھی، کچھ بچھا کر تختہ پر لیٹی، مرد ننگ دھڑنگ محض ایک تنگ جانگیا پہنے چہل کرتے نظر آتے تھے۔ اس "دوجزی" اور "یک جزی" [illegible]
اور عریانی میں محض درجہ کا فرق تھا۔ حقیقت یہ ہے کہ یوروپی تمدن کی حیرت انگیز دورخی ان کی روزآنہ زندگی سے ظاہر ہوتی ہے۔ [illegible]
عیش و عشرت کو انھوں نے روزمرہ کا گویا معمول بنا لیا ہے، دوسری طرف مرد عورت اور بچہ ہر طرح کی مشکلات برداشت کرنے کا
عادی بن رہا ہے تاکہ ملک پر وقت پڑے، یا خود اپنی عزت اور ناموس کا سوال پیدا ہو تو سب آرام و آسائش، عیش و عشرت کو بھول
جائے اور واقعاً تن، من، دھن اپنی ذات کے یا ملت کے ناموس کے لئے قربان کر دے۔

جہاز کے ان انتظامات میں جو حکمیاتی اکتشافات کی بدولت ہوتے ہیں، روزآنہ اخبار کا اجرا بھی ہے۔ لاسلکی کے ذریعے
تقریباً ہر وقت خبریں آتی رہتی تھیں، جنھیں باضابطہ اخبار کی شکل میں طبع کر کے چار بجے تقسیم کر دیا جاتا تھا۔ اور ایسا انتظام تھا کہ

پروفسر ہارون خان صاحب شروانی
صدر شعبہ تاریخ جامعہ عثمانیہ

دنیا میں جو واقعات کسی روز پیش آتے ہیں، اسی روز اخبار میں چھپ جاتے اور مسافروں کو معلوم ہو جاتا کہ دنیا میں آج کیا کیا ہو رہا ہے۔ یہ جہاز کے اخبار کا حال ہے۔ ہمارے ملک ہندوستان کے کتنے مستقل اخبارات ہیں جن میں دنیا کے واقعات ہر روز چھپتے ہوں جہاز کے مختلف حصوں میں بھونپو ("آلۂ مکبر الصوت") لگا ہوا ہے جس میں اٹلی کی نشر گاہوں کے نشریات براہ راست آتے رہتے ہیں۔

۵ جون کو شام کے چار بجے سب سے اوپر کے عرشے پر بینڈ بجا اور اطالوی جھنڈے کو سلامی دی گئی۔ دریافت پر معلوم ہوا کہ ۱۸۴۸ء میں کارلو البرتو شاہ سارڈانیہ نے جو دستور اپنی رعایا کو دیا تھا۔ اس کی سالگرہ ہے۔ یہ سلطنت سارڈانیہ بڑھتے بڑھتے ۱۸۶۱ء میں ملوکیت اطالیہ بن گئی اور سروانی دستور مسولینی کے برسر اقتدار ہونے تک جوں کا توں ہی رہا۔ لیکن فاشی جماعت برسر اقتدار ہونے کے بعد دستور کی صورت ایسی مسخ ہو گئی ہے کہ گویا ۱۸۴۸ء کی دستاویز کا پتہ نشان بھی نہیں رہا۔ تاہم ہر سال جون کے پہلے ہفتے کو تمام اٹلی میں خوشیاں منائی جاتیں اور جھنڈے کو سلامی دی جاتی ہے، اور ہمارے جہاز میں بھی اسی سنت پر عمل ہوا۔

۶ جون کو عرب کی پہاڑیاں نظر آنی شروع ہو گئیں اور ۱۱ بجے کے قریب جہاز عدن پر ہو کر گزرا۔ جہاز عدن پر رکا نہیں بلکہ اس انگریزی مقبوضے سے کتراتا ہوا نکل گیا۔ عدن سے دو گھنٹے کے بعد یمن کی پہاڑیاں نظر آنی شروع ہو گئیں جن پر اس وقت اٹلی کا دانت ہے۔ خدا کی قدرت ہے کہ یہ عرب، جہاں کے باشندوں نے سیکڑوں، ہزاروں میل جا کر اپنی نوآبادیاں اور مقبوضات قائم کئے، اب ایسا بے دست و پا ہو گیا ہے کہ جیسے نعوذ باللہ کسی مردہ جانور کا بے جان لاشہ پڑا ہو اور چاروں طرف سے اس کا گوشت کھانے کے لئے گدھ اور چیلیں ٹوٹ پڑی ہوں۔ ہم ہندوستانی وقت بے وقت ابن سعود اور دنیا بھر کے مسلمان فرمانرواؤں کو برا بھلا کہتے ہیں لیکن یہ نہیں سوچتے کہ ان کو کن کن بھیڑیوں سے واسطہ پڑتا ہے اور کس کس طرح وہ دھمکیوں، تدبیروں، خوشامدوں، لڑائیوں اور سب سے زیادہ خدا کی مہربانیوں سے اپنے ملکوں کی کہیں پوری، کہیں ادھوری آزادی محفوظ رکھنے میں کامیاب ہوتے ہیں!

باب المندب کو عبور کر کے شام کے وقت جہاز عصاب کے بندرگاہ پر ٹھیرا۔ عصاب اطالوی اریتریا کا بندرگاہ ہے اور یہاں سے حبشہ کے مستقر، سابق شہنشاہ حبشہ کے پایہ تخت ادیس ابابا کو براہ راست سڑک جاتی ہے۔ ہمارا جہاز اس لئے رکا تھا کہ اطالوی گورنر جنرل حبشہ، ڈیوک آوستا، جو شاہ اٹلی کے چچا زاد بھائی ہیں۔ ہمارے جہاز پر سوار ہو جائیں۔

۷ جون کو جہاز مصوع پہونچا جو اطالوی اریتریا کا مستقر ہے اور یہی وہ جگہ ہے جہاں جنگ حبشہ کے دوران میں حبشیوں کا خون چوسنے کے لئے اطالوی سامان جنگ، طیارے اور موٹریں جمع ہوئی تھیں۔ جہاز پر سے تو ہم میں سے کسی کو نہیں اترنے دیا گیا، لیکن عرشے ہی پر سے ایک دل فگار نظارہ سامنے آیا، وہ یہ کہ تقریباً سوا سو صومالی مسلمان تالیاں بجاتے، ناچتے، غل مچاتے جہاز کے سامنے آئے اور اس طرح ڈیوک آوستا کو گویا سواگت کیا۔ اس غول کا سالار ایک اطالوی تھا۔ اور یہ بچارے صومالی اس کے اشارے پر سرکس کے جانوروں کی طرح ناچ رہے تھے۔ (انا للہ وانا الیہ راجعون۔ صاف ظاہر ہوتا تھا کہ یہ سب جوش بالکل مصنوعی ہے اور یہ بچارے غریب صومالی اپنے پیٹ سے مجبور ہو کر سلامی دے رہے ہیں اور اپنا تماشا دکھا کر

سب بس
علم آویزاں تھا۔ یہاں سے جہاز کے سب اطالوی ایک دوسرے کو بلکہ ہمیں بھی ایک خاص انداز سے ہاتھ آگے کو اونچا کر کے فسطائی طرز سے سلام کرنے لگے۔

دوسرے دن صبح ہی سے خشکی جہاز کے دونوں طرف نظر آنا شروع ہو گئی۔ ایک طرف ساحل عرب (ایشیا) اور دوسری جانب ساحل مصر (افریقہ) اور ساڑھے پانچ بجے ہم سوئیس پہونچ گئے۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ یہ شہر رات کے وقت ایک نور کے ہار کے مانند معلوم ہوتا ہے جس میں بجلی کے سیکڑوں ننھے ننھے ہیروں کے مانند جگمگا رہے ہوں۔ سبز ہلال تین تارے والے مصری علم لہراتی ہوئی کشتیاں جن میں سے کسی پر (POLICE) اور کسی پر (DOCTOR) لکھا تھا جہاز کے قریب آئیں اور معائنہ کر کے چلی گئیں۔ مصری اشیاء بیچنے والے بادبانی کشتیوں میں بیٹھ کر اپنی چیزیں بیچنے کے لئے آئے۔ ہمارا جہاز بہت اونچا اور بڑا تھا، اور پر تک اشیاء کا پہونچنا محال تھا، اس لئے یہ ترکیب نکالی گئی کہ ایک لمبی رسی لے کر اس کا ایک کنارہ اوپر پھینک دیا، دوسرے کنارے میں لوکری باندھی اور اس کے ذریعے سے اشیاء اوپر اور دام نیچے آنے جانے لگے۔ شام کو سات بجے شام جہاز نہر سوئیس میں داخل ہوا جو دنیا کی عظیم ترین شاہراہوں میں شمار کی جاتی ہے۔ جگہ جگہ گودیاں بنی ہوئی ہیں کہ دوسرا جہاز آئے تو ایک گودی میں چلا جائے۔ مصری طرف کنارے کنارے ریل جاتی ہے۔ القنطرہ پر (جس کے معنی ہیں پل) ایک پل ہے اور یہاں سے ریل فلسطین، استنبول اور یورپ جاتی ہے۔ یہ پل جہازوں کے لئے اٹھا دیا جاتا ہے۔

بندر سعید ایک نہایت خوش منظر اور پر فضا شہر ہے۔ اس کا سنگ بنیاد مؤسس نہر سوئیس یعنی فرڈیننڈ ڈی لیسپس کے ہاتھوں سنہ ۱۸۵۶ء میں رکھا گیا تھا اور اب اس کی آبادی ڈیڑھ لاکھ سے زیادہ ہے۔ شہر بہت ہی پردیسی ہے اور دنیا کا کوئی ملک مشکل سے ایسا ہوگا جس کے باشندے اس میں نظر نہ آتے ہوں، چنانچہ ہمارے ہندو بھائیوں کی بھی دو تین دوکانیں ہیں، جنھیں خود یہاں کے باشندے "کفار" کہتے ہیں۔ جہاز والوں نے مسافروں کو پورٹ سعید کی سیر کرانے کا بھی انتظام کیا تھا۔ یعنی ہر پندرہ منٹ پر ایک دخانی کشتی مسافروں کو لے کر کنارے جاتی اور اسی عرصے میں واپس آتی تھی۔ پورٹ سعید کے لوگ عام طور پر بڑے چالاک اور فطرتی اور دھوکہ باز ہوتے ہیں۔ اصل میں یہاں کی آبادی میں اصل مصری بہت کم ہے۔ بلکہ یونانیوں، اطالویوں وغیرہ نے یہاں کی زندگی کو گندا کر رکھا ہے۔ چیزیں بیچنے والے ایک ایک کی چار چار اور ایک ایک میں دیتے ہیں اور یہ کیفیت اچھی بڑی دوکانوں میں بھی ہے۔ چنانچہ خریدار نہایت آسانی سے لٹ سکتا ہے۔ چمڑے پر نہایت خوبصورت کام ہوتا ہے اور چرمی اشیاء حیرت انگیز طور پر کم قیمت میں مل جاتی ہیں۔ جہاز نے نصف شب کے شام کے پورٹ سعید اور مشرق کو خیرباد کہا اور بحیرۂ روم میں داخل ہو گیا۔

دوسرے دن یعنی ۱۱ جون کو شام کے وقت جزیرۂ کریٹ نظر آنے لگا۔ جس پر ۱۸۹۷ء تک ترکوں کا قبضہ تھا۔ دراصل اس سنہ میں ترکوں نے یونانیوں کو ہر جگہ جنگ میں نیچا دکھایا لیکن یہ جزیرہ دول یورپ نے جبراً ترکوں سے چھین لیا اور کچھ عرصے کے بعد اس پر کلیتہً یونان کا قبضہ ہو گیا۔ (باقی آئندہ)

ہارون خاں شیروانی

یونان کے سب سے زبردست فلسفی سقراط کا نام آج صرف دو وجوہ سے زندہ ہے ایک اس کے محاسن اخلاق کی وجہ سے اور دوسرے اس کی سحر بیانی سے جس کی بدولت اس نے اپنے زمانے کے مدبرین و مفکرین کو موہ لیا تھا، برخلاف اس کے مصلح اعظم افلاطون کا نام صرف اس کی تصانیف کی وجہ سے باقی ہے اور انہیں تصانیف کی وجہ سے اس کے استاد سقراط کو حیاتِ جاوید نصیب ہوئی لیکن جہاں افلاطون نے اپنی تحریرات میں سقراط کی عظیم تر شخصیت کے بے نقاب کرنے میں کوئی دقیقہ اٹھا نہ رکھا۔ وہیں اس نے خود اپنی ہستی کو بہت پس پشت ڈال دیا ہے۔

افلاطون کی زندگی

افلاطون ایک نہایت امیر گھرانے کا لڑکا تھا اس کا تعلق ماں اور باپ دونوں کی جانب سے "تو دروس" سے جا ملتا تھا یہی وجہ تھی کہ جہاں اور امیروں اور اعلیٰ خاندانوں کے لڑکے سقراط کے پاس فلسفہ کی تعلیم حاصل کرنے اور اپنی علمی استعداد کو بڑھانے آتے تھے وہیں افلاطون بھی جا پہنچا لیکن اس کا مقصد اوروں سے بالکل جداگانہ تھا۔ وہ سقراط کے علمی مباحث کو نہایت غور سے سنتا رہتا تھا اس کو سقراط سے ایک روحانی لگاؤ تھا اور وہ اپنے استاد کا بے حد شیدا تھا۔

سقراط کی موت نے اس کی زندگی میں ایک انقلاب برپا کر دیا اس وقت اس کی عمر ۲۵ اور ۳۰ سال کے درمیان تھی۔ قیاس یہ کہتا ہے کہ سقراط کی موت کے المناک سانحہ کے بعد ہی افلاطون نے ایتھنز کو خیرباد کہا۔ اپنی زندگی کے اس نے جو اصول بنائے تھے ان میں یک لخت تبدیلی ہو گئی حتیٰ کہ اس نے اپنے نام و نمود کو خیرباد کہا۔

ابتداءً اسے اپنی امارت اور جاہ و ثروت کا احساس تھا لیکن اپنے عزیز استاد کی موت نے اس کے دل میں ایک نئی خلش کو ابھارا اور اسے یہ دھن لگ گئی کہ کسی نہ کسی طرح ان علمی مباحث کے مختلف پہلوؤں کو ضبط تحریر میں لائے جن کو سقراط نے دنیا کے آگے تخیلی صورت میں پیش کیا تھا۔ اپنی پیش نظر چیز کو اس نے باقاعدہ رسائل کی صورت میں تصنیف نہیں کیا بلکہ اسے علماء کے مکالموں کی شکل میں پیش کیا ہے جن کا ایک طویل سلسلہ ہے۔

مکالمے سقراط اور اسی عہد کی مشہور شخصیتوں کے درمیان ہوتے ہیں۔ ان مکالموں میں متعدد مشاہیر کے نام ہمیں نظر آتے ہیں جو افلاطون کے زمانے میں ایتھنز میں موجود تھے۔ ان میں افلاطون نے خود اپنے نام کو صرف تین مرتبہ ظاہر کیا ہے اور وہ بھی اشارۃً و کنایۃً

ان مباحث میں سب سے زیادہ مشہور بحث "جمہوریت" کی ہے جس میں افلاطون کے دو بھائی گلاکن اور اڈیمانٹس سب سے زیادہ حصہ لیتے ہیں۔ اس کے مکالموں میں سب سے زیادہ اہمیت بھی اسی مکالمے کو حاصل ہے۔

افلاطون کے مکالموں کا مطالعہ کرنا گویا فلسفہ اور ادب کا درس حاصل کرنا ہے کیونکہ یہ مکالمے مفکرانہ و مدبرانہ دلائل سے بھرے پڑے ہیں اور لحاظ زبان یونانی ادب میں یہ چوٹی کے مخطوطات میں شمار ہوتے ہیں۔ ظاہر ہے کہ ترجمہ میں زبان کی بہت سی خوبیاں

زائل ہوجاتی ہیں باوجود اس کے شیلے کے ترجمے "جشن" اور جووبٹ کے ترجمے "جمہوریت" میں بے شمار ادبی خوبیاں پائی جاتی ہیں۔ غائر مطالعہ کرنے والوں کے لئے ان مکالموں سے صرف ایک منتخب مکالمہ افلاطون کی دماغی قابلیت اور ادبی مہارت کے ظاہر کرنے کو کافی ہے اس کے علاوہ اس کے نقطۂ نگاہ سے سقراط کی عظیم ترین شخصیت کا انکشاف ہوتا ہے۔

مکالمے مکالموں کی کل تعداد پینتیس [۳۵] ہے جن سے چوبیس [۲۴] کے متعلق علماء کی متفقہ رائے ہے کہ ان کو افلاطون ہی نے لکھا ہے باقی کے متعلق بھی یہی خیال ہے کہ ان کا مصنف افلاطون ہے لیکن بعض نقاد اس سے اختلاف کرتے ہیں۔ ان کے موضوع مختلف النوع ہیں۔ سب سے آسان مکالمہ "معذرت" ہے موجودہ حالت میں یہ مکالمہ نہیں کہلایا جاسکتا بلکہ سقراط کی ان تقریروں کا مجموعہ ہے جو اس نے ایتھنز کے ججوں کے سامنے کی تھیں۔

"کریٹو" "گارجیاس" اور "جمہوریت" کی ابتدائی چار جلدوں کا شمار اس کی آسان تحریرات میں ہوسکتا ہے۔ ... کا مطالعہ کرنا آسان کام نہیں اس کے بعض مخطوطات مثلاً "پرمینائڈس" "صوفی" "سیاس" "فائیلبس" اور "جمہوریت" کے کچھ حصص کے مطالعہ کے لئے خاص دلچسپی اعلیٰ مذاق اور بے حد توجہ کی ضرورت ہے۔ اس میں شک نہیں کہ اس کے وہ مکالمے جن میں ادبیت اور ٹھوس علمیت کی طرف کم توجہ کی گئی ہے افلاطون کے مطالعہ کے مبتدیوں کے لئے مفید ہیں اور کسی قدر دلچسپ بھی ہیں۔ بعض مواقع پر افلاطون جیسا عظیم شخص بھی اپنے جزیرے اٹلانٹس کی محبت کے اظہار میں ان قدیم اور ناقابل یقین عقائد کے ... باز نہیں رہتا جن سے یونان کا سارا مایۂ ناز ادب بھرا پڑا ہے۔

سید ابوالفضل العباس

شاعر کی کائنات

میں بحرِ شاعری کی منتہی گہرائیوں میں تھا	تخیل کا ٹھکانا عرش کی بالائیوں میں تھا
مجسم شاعری تھا میں فنا فی الشاعری ہوکر	کمائی تھی حیاتِ نو، حیاتِ ادبیں کھو کر
میں کامل تھا، نہ تھی اب مجھ میں باقی کوئی معذوری	مری تخلیق کی، نام خدا، غایت ہوی پوری
کسی دن بارگہ میں اس نے مجھ کو یاد فرمایا	سرِ تسلیم خم میرا بصد عجز و نیاز آیا!
دفاتر شاعری کے پیش کر کے عرض کی میں نے	الٰہی کردیا تکمیل فرضِ منصبی میں نے
خدائے کن فکاں ہر شعر پر کہتا گیا "ہوجا"	ہوی پھر کائناتِ شاعری اک آن میں پیدا

جو جیتی جاگتی ہیں پردۂ قدرت پہ تصویریں
ہیں میرے خوابہائے شاعری کی نیک تعبیریں

دامودر بنت ذکی
(کوہیر)

دنیا میں بے روزگاری کی وبا سُرعت سے پھیلی جا رہی ہے۔ بے روزگاروں میں اَن پڑھوں سے زیادہ تعلیم یافتہ پائے جاتے ہیں۔ حکومتیں مختلف تدبیریں سوچ رہی ہیں کہ خطرہ سے دوچار ہونے سے پہلے خطرہ کا ازالہ ہو جائے۔ یوں تو تمام ممالک میں بے روزگاری کے اسباب یکساں ہیں لیکن ہمارے ملک ہندوستان کو ایک امتیاز حاصل ہے۔ یہاں گھٹیا اور بڑھیا پیشوں کی تفریق نے ایسا سر اٹھایا کہ پڑھا لکھا فرقہ مفلوج ہو کر رہ گیا۔ بیکار دماغ شیطان کی جولانگاہ ہے۔ بغیر محنت روپیہ کمانے کی نت نئی چالیں سوچتا رہتا ہے [illegible] ہے۔ لیکن بدترین اس وقت ہو جاتی جب انسان اپنی خودداری اور شخصیت کھو کر سب کا محتاج بن جائے۔ اس لئے ضرورت ہے [illegible] اٹھے اور معاشرہ کی سب سے بڑی برائی کو نیکی سے بدل دے۔

۲

دیکھنے والی آنکھوں کو محنت کی بلندیاں دکھانے کی ضرورت نہیں۔ البتہ آنکھ والے اندھوں پر محنت کی عظمت جتانا ضروری ہے۔ اُن کو بتانا ہے کہ کس طرح محنت نے ایک عالم منتشر کو عالم منظم اور لاکھوں مربع میل میں پھیلی ہوئی دنیا کو سکیڑ کر ایک بستی بنا دیا۔ یہی نہیں بلکہ محنت اسرار سربستہ کھول کھول کر قدرت کو مسخر کرتی جا رہی ہے۔ اگر محنت کا وسیع مفہوم بھی نہ لیا جائے تو اُس کی قوتِ اعجاز میں فرق نہیں آتا۔ وہ ایک قانونِ حیات ہے جو افراد اور قوموں کو ترقی کی راہ پر لگاتار رہتا ہے۔ وہ زندگی کی روح ہے جس کے بغیر نہ تو جسم کی نشو و نما ہو سکتی ہے اور نہ دماغ اپنے جوہر اُگل سکتا ہے۔

۳

ذاتی محنت کی حدود میں قدم رکھنے کے بعد جی نہیں چاہتا کہ نکموں اور اپاہجوں کو کسی اور جنت کی دعوت دی جائے۔ اپنی محنت سے کمائی ہوئی دولت، ترکہ میں ملی ہوئی یا بخشی ہوئی دولت سے زیادہ دیرپا اور مسرت بخش ہوتی ہے۔ اپنے ہی ہاتھوں سے لگائے ہوئے درختوں کے پھل بازار سے خریدے ہوئے یا تحفتہً ملے ہوئے پھلوں سے زیادہ شیریں ہوتے ہیں۔ وہ امید کے رس سے خوش رنگ اور بوئے وفا سے دلفریب بن جاتے ہیں۔ محنت، امیر و غریب سب کو کرنی چاہئے۔ دولت مندوں کو بھی اپنے عیش کے معاوضہ میں سماج کی فلاح کے لئے کچھ نہ کچھ کرنا ہی پڑتا ہے۔ محبتِ انسانی کا پہلا اصول یہی ہے کہ بھوکوں کو کھانا، ننگوں کو کپڑا اور دکھیوں کو سکھ چین دیا جائے۔

۴

انسان کی سب سے بڑی احتیاج روٹی ہے۔ وہ اپنا پیٹ سب سے پہلے بھرنا چاہتا ہے۔ یہ خود غرضی سب میں کم و بیش پائی جاتی ہے۔ زمین سے بھی چشمہ اُبل کر پہلے اپنی سطح سیراب کرتا ہے پھر اُن گڈھوں کو پانی دیتا ہے جہاں چوپائے آکر پیاس بجھاتے ہیں۔ دنیا کے پہلے دن سے لے کر آج تک روٹی کا سوال موت و زندگی کا سوال بنا رہا۔ کیا اس کشمکش سے نجات پانا ممکن ہے؟ ہاں ممکن ہے۔ بشرطیکہ ذی ثروت انسان اپنے سوائے دوسروں کو بھی ذی روح مخلوق سمجھیں اور اپنی بے اندازہ دولت کو زمین کے پیٹ سے نکال کر بیکاروں کا پیٹ بھرنے کی فکر کریں۔ ہم یہ نہیں کہتے کہ وہ خیرات کریں۔ خیرات ایک غیر دلچسپ فعل ہے۔ ایک سے دو اور دو سے چار بنانے کا مشغلہ بہت دلچسپ ہے۔

اور یہ شعلہ نیکی بن جائے گا اگر بچے کام کے آدمی بن جائیں اور اُن کے لئے روزی کی راہیں کھل جائیں۔

۵

روٹی کی محنت تفریق اور نفرت کو مٹا دیتی ہے۔ یہ نوعِ انسان کے بکھرے ٹکڑوں کو ایک دوسرے سے جوڑ کر انہیں قدرتی زندگی
ہمیں یقین ہے کہ جب لوگ اپنی روٹی آپ کمانے لگ جائیں گے مفلسی کی ذلت بھی مٹتی جائے گی۔ دغا بازی اور بدمعاشی کا کہیں نام و نشان
اور معاش کی خاطر عزت و آبرو بیچنے کی حاجت نہ ہوگی۔ جو لوگ محنت سے روٹی کمانا نہیں چاہتے وہ اپنا بوجھ دوسروں پر ڈالتے ہیں یا مرنے والے
جائی کے ترکہ پر نظر لگائے رہتے ہیں۔ جہاں یہ سہارے نہ ہوں وہاں لطیفۂ غیبی کا انتظار رہتا ہے اور اس سے بھی مایوسی ہو تو گردشِ ایام اور
شکوہ شروع ہو جاتا ہے۔ ایسے ناسمجھوں کو کون سمجھائے کہ سکندر بختی اَن تھک محنت کا دوسرا نام ہے۔ کارنیگی اور فورڈ ایک دن میں خدا داد
اُن کی ساری عمر کام کرتے گذری اور کبھی اُن کو ادنیٰ محنت سے عار نہ ہوا۔ ادنیٰ اور اعلیٰ محنت میں صرف افادہ کی کمی بیشی کا فرق ہے۔ کڑی دھوپ
میں سڑک پر پتھر توڑنے والے مزدور اور پارلیمنٹ میں سر جوڑ کر معاملاتِ ملکی پر غور کرنے والے وزیر کے کام کی قدر و منزلت یکساں ہے
ملک کی ترقی کی عمارت میں اینٹ پر اینٹ رکھ رہے ہیں۔

۶

سچی بھوک کبھی پاپ کا رستہ نہیں دکھاتی۔ وہ انسان کو حقایق سے دوچار کر کے باعزت زندگی بسر کرنا سکھاتی ہے۔ وہ تہ
نہیں بنتی۔ اُس کی فطرت میں حرکت پذیری ہے اور حرکت ہی میں اسے مزا آتا ہے۔

جو انسان مصائب سے منہ موڑ کر تنہائی میں پناہ لیتے ہیں وہ اپنے عذاب میں کچھ اضافہ ہی کر لیتے ہیں۔ بیکاری اور تنہائی سے
دنیا میں کوئی مشقت اور مصیبت نہیں۔ کاہل ہمیشہ کسی نہ کسی حیلے کام ٹالتے رہتے ہیں۔ ان کی زندگی کا اصول یہ ہے کہ "ماضی نے دھوکا
حال پریشان کرتا ہے مستقبل ڈراتا ہے۔"

۷

فضول کام کو اہم سمجھ کر انجام دینا بیہودگی ہے۔ چیخ پکار اور نمایش میں قوت صرف کرنا لاحاصل ہے۔ کام خاموشی کے ساتھ کیا جائے
اور حقیقی خاموشی اپنے آپ کو اس کام میں کھو دینے سے پیدا ہوگی۔

زندگی کی دوڑ شروع ہو چکی۔ تم ابھی جوتے ہی کے بند کس رہے ہو۔

دوڑو اور اُڑتے ہوئے لمحوں کو پکڑ کر اُن کی ساری دولت نچوڑ لو!

محمد امیر
(اورنگ آبادی)

بچیوں کی تعلیم و تربیت

بچوں کی تعلیم کے سلسلہ میں لڑکیوں کی تعلیم و تربیت کے متعلق بھی کچھ عرض کرنے کی ضرورت ہے۔ ہماری موجودہ زندگی میں یہ مسئلہ نہایت اہم اور کوئی غور و فکر کا محتاج ہے، لڑکیوں کی با اصول تعلیم اور صحیح تربیت بہ نسبت لڑکوں کی تعلیم و تربیت کے زیادہ اہم اور ضروری ہے، ہماری وہ لڑکیاں جو مستقبل قریب میں "بیوی" اور "ماں" بننے والی ہیں اگر زیورِ علم سے آراستہ اور صحیح تربیت یافتہ نہ ہوں تو اُن میں اپنے ماحول کی ضروریات کو سمجھنے کی قابلیت و صلاحیت نہ ہوگی اور نہ وہ اپنی اولاد کی صحیح اصول پر پرورش و تربیت کر سکیں گی۔ یہ سوال لڑکیوں کی تعلیم کا نہیں، بیویوں اور ماؤں کی تعلیم و تربیت کا ہے۔

ہماری آنے والی نسلوں کی نشو و نما کا دار و مدار اور ان کے ارتقا کا راز صحیح اور با اصول تعلیمِ نسواں میں مضمر ہے، لڑکیوں کی تعلیم و تربیت کچھ اس طرح ہونی چاہیئے کہ وہ عہدِ ماضی کی خواتین کی روحانی صفات اور دورِ حاضر کے قابلِ تقلید خیالات کے اتصال کی ایک زندہ مثال بنیں، ان میں مشرقی شرم و حیا، ایثار و وفا، وطن پرستی، اطاعت، محنت، ہمدردی اور خود داری کے اعلیٰ جذبات ہوں، ہماری لڑکیوں کو قدیم حسن و خوبی کا خزانہ اور جدید تعلیم و تہذیب کے بہترین جوہروں کا آئینہ ہونا چاہیئے۔

لڑکیوں کی تعلیم لڑکوں کے مقابلہ میں بہت پیچھے ہے، ہمارے ملک کی لاکھوں لڑکیوں میں سے صرف پچاس ہزار لڑکیاں اس وقت نسوانی درسگاہوں میں تعلیم پا رہی ہیں، ان میں سے معدودے چند ایسی خوش قسمت لڑکیاں ہوں گی جن کی اخلاقی تربیت بھی صحیح اصول پر ہو رہی ہو، جب تک ہر لڑکی صحیح تعلیم و تربیت یافتہ نہ ہو، ہماری قوم کا مستقبل اسی طرح تاریک رہے گا۔ اور ہمارے نوجوانوں کو بیاہ کے وقت بیویوں کے انتخاب میں اُن ہی دشواریوں سے سابقہ پڑتا رہے گا جو اب تک پیش آتی رہی ہیں۔ انہیں عموماً برائے نام پڑھی لکھی، اچھائی اور برائی کی تمیز سے بیگانہ، آغوشِ جہالت میں پروان چڑھی ہوئی، مغرب کی اندھی تقلید کے بھنور میں چکر کھاتی ہوئی لڑکیوں میں سے اپنی شریکِ حیات کا انتخاب کرنا ہوگا، ظاہر ہے کہ اس قسم کی لڑکی جب رفیقِ زندگی بنے گی تو وہ اپنے شوہر کے جذبات اور احساسات کا کس حد تک احترام کرے گی اس کی زندگی کی الجھنوں کو کہاں تک سلجھائے گی۔ اور اس کی آمد و خرچ کے توازن کو کس درجہ تک گرنے نہ دے گی، ایسی علم و عمل سے بے بہرہ ماؤں کی گود میں ہمارے بچے تنک مزاج، خود پسند، نافرمان، عیش پرست، نکمے اور مسرف ہو کر ہماری قوم کی پستی اور نکبت کا باعث ہوتے رہیں گے۔

ذی فہم والدین اپنی اولاد کو دنیاداری اور معیشت کے اصول سمجھانے کی امکانی کوشش کرتے ہیں، مگر شاید ہی کوئی باپ ایسا ہوگا جس نے اپنے "لختِ جگر" کو اپنی بیوی کے ساتھ خلوص و محبت سے پیش آنے اور اس کی جائز خواہشات کو بحدِ امکان پورا کرنے کی تعلیم دی ہو! کتنی مائیں ایسی ہوں گی جو اپنی "لاڈلی" لڑکیوں کی نسبت یہ کہہ سکتی ہیں کہ انھوں نے ان کو اپنے شوہروں سے محبت کرنے، ان کے جذبات و احساسات کا احترام کرنے اور اُن کی خدمت، اطاعت، و فرماں برداری کو اپنا نصب العین بنانے کا عملی سبق پڑھایا ہے!! لڑکوں اور لڑکیوں کو ایسی اہم اور ضروری تربیت سے بیگانہ رکھنے کا نتیجہ یہ ہے کہ میاں بیوی میں آئے دن اَن بن رہتی ہے اور بات بات پر جھڑپ ہو جاتی ہے۔ شکر رنجیاں اور خانہ جنگیاں ہونے لگتی ہیں اور یہ ناا تفاقیاں بڑھتے بڑھتے ایک دن خلع اور طلاق کی بلا کھینچ لاتی ہیں۔

موجودہ نظامِ تعلیم میں لڑکوں اور لڑکیوں کے نصابِ تعلیم کو کچھ ایسا خلط ملط کر دیا گیا ہے کہ اس قسم کی تعلیم سے لڑکیوں کو [illegible]
فائدہ نہیں ہو سکتا۔ تعلیمِ نسواں کی درس گاہوں کے قیام سے پہلے ان کے مخصوص نصاب کی ترتیب و تکمیل بہت ضروری تھی [illegible]
عمارت قائم ہونے والی تھی اس کا مضبوط اور مستحکم ہونا ازبس لازم تھا مگر اس مرحلہ کے طے کرنے سے پہلے عمارت کی تعمیر آغاز کر دی [illegible]
اور لڑکیوں کی تعلیم کا تقریباً ایک ہی نصاب قرار پایا، لڑکیوں کے لیے ان کی مخصوص ضرورتوں اور فرائض کے مدِنظر ایک علیحدہ نصاب [illegible]
[illegible] موجودہ نصاب پر جو تعلیم دی جا رہی ہے۔ وہ نہ تو ہماری لڑکیوں کی ضروریات کو پورا کر سکتی ہے اور نہ ہمارے حالات اور معاشی [illegible]
[illegible] کہ وہ اس قدر گراں بھی ہے کہ ملک کا غریب طبقہ اپنی لڑکیوں کو اس سے مستفیض نہیں کر سکتا اب [illegible]
[illegible] تعلیم و حامیانِ تعلیمِ نسواں نہایت پسندیدہ اور موزوں اسلوب پر تعلیمِ نسواں کا جدید نصاب تیار کریں۔

جس قوم سے اس کی قومیت اور تمدن نکل گیا ہو اور اس کی خصوصیات نابود ہو گئی ہوں وہ گویا دنیا سے مٹ گئی، [illegible]
[illegible] ہے۔ ہر قوم اپنی [illegible] کی وجہ سے اقوامِ عالم سے اپنا فرق منواتی ہے، یہ خصوصیت ایسی ہے جس کو ہمیشہ قائم رکھنے کی کوشش [illegible]
چاہیے، موجودہ نصاب پر غور کرنے سے معلوم ہوگا کہ کس حد تک ہماری قومی روایات اور خصوصیات کو نصاب میں جگہ دی گئی ہے [illegible]
تواریخ کو کہاں تک طاقِ نسیاں پر رکھ دیا گیا ہے، اپنی تواریخ اور روایات سے فائدہ اٹھانے کے عوض غیروں کی تواریخ اور روایات سے فائدہ
اٹھانے کی کوشش کی جا رہی ہے، اپنے مشاہیر اور اسلاف کے تذکروں سے نصاب کو بڑی حد تک محروم کر دیا گیا ہے مگر دوسری اقوام کے مشاہیر
[illegible] تذکروں سے ہماری درسی کتابیں بھری پڑی ہیں، ضروری اجزائے تعلیم کو ترک کر کے بہت سی ایسی غیر ضروری باتیں نصاب میں شامل کر
دی گئی ہیں جن سے بجز اس کے کہ لڑکیوں کے نازک اور کمزور دماغوں پر خواہ مخواہ بار پڑے اور کوئی فائدہ کی امید نظر نہیں آتی۔

عام طور پر لڑکیوں کی تعلیم و تربیت کا مفہوم صرف ان کو کتابیں پڑھانا ہے، لڑکوں کی طرح ان کو بھی ریاضی اور جبر و مقابلہ کے ادق سوالات
[illegible] کی عجیب و غریب ٹیڑھی ترچھی شکلیں سکھا کر اور تاریخ و جغرافیہ رٹا کر ان کی صحت و تندرستی کو غارت کیا جاتا ہے، اس کے عوض اگر
[illegible] انگریزی اور مادری زبان میں لکھنے پڑھنے کی کافی مشق کے ساتھ امورِ خانہ داری، گھریلو حساب، حفظانِ صحت، مبادیاتِ مذہب [illegible]
[illegible] بچوں کی پرورش اور تربیت کے طریقے، ابتدائی سائنس، ملکی تاریخ و جغرافیہ اور سوزن کاری کی تعلیم دی جائے
ایک لڑکی اچھی بیوی اور ماں بن کر ملک اور قوم کی بہت کچھ خدمت کر سکتی ہے۔ اور اپنی گود میں پلنے والی نسلوں کو بامِ ترقی پر پہنچا سکتی ہے۔

لڑکوں کی طرح اسکول اور کالجوں میں تعلیم پا کر وہ اپنے مخصوص امتحانات میں تو کامیاب ہو جاتی ہیں مگر اپنے فرائض کو بھولنے کے
ساتھ ساتھ وہ ایک حد تک اپنی "نسائیت" بھی کھو بیٹھتی ہیں، ابھی وہ ابتدائی تعلیم کے مدارج بھی طے کرنے نہیں پاتیں کہ ان کو آزادی حاصل کرنے کا
خیال گدگدانے لگتا ہے یہ نتیجہ تعلیم کا نہیں بلکہ ناقص تربیت اور اس ماحول کا ہے جس میں وہ تعلیم پانے بھیجی جاتی ہیں، عام طور پر اسکول اور [illegible]
[illegible] ایسے افراد سے سابقہ پڑتا ہے جو مغرب کی اندھی تقلید کی وجہ اپنی نام نہاد آزادی کی اشاعت کرتی ہیں،
[illegible] کے متعلق اپنی ساری ذمہ داریوں سے بے نیاز ہو جاتے ہیں، نہ وہ ان کی اخلاقی تربیت [illegible]
[illegible] نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ جب وہ اسکول یا کالج کی تعلیم ختم کر چکتی ہیں تو ان کے دلوں میں نہ والدین کی
[illegible] باقی رہتی ہے نہ مذہب کی عظمت، اپنی لیاقت اور قابلیت کے گھمنڈ میں وہ والدین کو عقل و سمجھ سے بے بہرہ سمجھ کر [illegible]
[illegible] کرنے لگتی ہیں اور ان کو کٹ پتلیوں کی طرح نچاتی ہیں، یہ بیچارے اس وقت " سعدی از دستِ خویشتن فریاد" کی

صدا بلند کرتے ہیں اور "ٹنک ٹنک دیدم دم نہ کشیدم" بنے بیٹھے رہتے ہیں، ہندوستان کے اسکول اور کالج زیادہ تر اس قسم کی "تعلیم یافتہ" لڑکیاں پیدا کر رہے ہیں۔

لڑکیوں کی تعلیم کا مقصد صرف "ملازمت" نہ ہونا چاہئے، یہ واقعہ ہے کہ جدید تعلیم کا مقصد یہی قرار دیا گیا ہے مگر اس مقصد میں ہمیں کس حد تک کامیابی ہو رہی ہے وہ ظاہر ہے! ہزاروں تعلیم یافتہ نوجوان تلاش ملازمت میں در در کی ٹھوکریں کھاتے ہوئے گداگر بن کر حیران و سرگرداں پھر رہے ہیں ان کی قیمت آئے دن گرتی ہی جا رہی ہے، اس تلخ تجربے کے بعد ہمیں چاہئے کہ لڑکیوں کی تعلیم کے معاملہ میں عاقبت اندیشی سے کام لیں، لڑکوں کی طرح ان کی زندگی کو بھی ناخوش گوار بنا کر ان کی سنجیدگی و تندرستی، اطمینان قلب اور گھر کی پرسکون زندگی کو برباد نہ کریں۔

تعلیم کا مقصد صرف "تعلیم" سمجھا جاتا ہے "تعلیم" و "تدریس" میں نمایاں فرق ہے، ہمارے مدارس میں جو کچھ پڑھایا جاتا ہے۔ وہ "تدریس" ہے اس کو تعلیم نہیں کہہ سکتے! اچھے اخلاق اور عمدہ کردار کتابوں سے نہیں، صحیح جذبات اور بلند احساسات سے حاصل ہوتے ہیں، اس لئے نہایت ضروری ہے کہ ابتدائی تعلیم میں اخلاقی تربیت بھی شامل ہو، جس طرح ابتدائی تعلیم سنگ بنیاد ہے اعلیٰ تعلیم کا، اسی طرح بچپن کی اخلاقی تربیت سیرت سازی اور اچھے خصائل کی بنیاد ہے، بہترین کردار کی تعمیر اسی عمر میں ہوتی ہے۔

ہماری قوم کی تباہی اور ادبار کے اسباب صرف جہالت اور تعلیم کی کمی نہیں ہے، اس میں ہمارے اخلاقی افلاس کو بھی بڑا دخل ہے۔ جو ہمارے مالی افلاس سے بہت زیادہ خطرناک اور عبرت ناک ہے اور اپنے اندر ہمارے لئے اقسام کی تباہ کاریاں رکھتا ہے، یہ واقعہ ہے کہ جب ہم اس افلاس میں مبتلا ہوئے دنیا کی نظروں میں ذلیل و خوار ہو کر تباہ و برباد ہو گئے، نہ دین کے رہے نہ دنیا کے!

نہ خدا ہی ملا نہ وصال صنم نہ ادھر کے رہے نہ ادھر کے رہے!!

ہمارا فرض اولین یہ ہونا چاہئے کہ ابتدائی تعلیم کے ساتھ ہی ہم اپنے بچوں میں عمدہ خصائل اور اچھی عادتیں پیدا کرنے کی کوشش کریں، مذہب کی عظمت اور قوم کی خدمت کا ان میں احساس پیدا کریں، وطن پرستی اور ایثار کے جذبات کو ان کے اندر بیدار کریں، جن قوموں نے ترقی کی ہے اور دنیا میں عروج حاصل کیا ہے، انھوں نے بچوں کی تعلیم و تربیت کا یہی اصول قرار دیا ہے، وہ اپنے بچوں کو ابتدا ہی سے ایسی تعلیم و تربیت دیتی ہیں کہ وہ زندگی کی کشمکش میں ثابت قدم رہ کر اپنے ملک اور قوم کی اس طرح خدمت کرتے ہیں کہ "زندۂ جاوید" ہو جاتے ہیں اور ہمیشہ کے لئے اپنے زرین کارنامے صفحۂ تاریخ پر چھوڑ جاتے ہیں، ان ہی کے لئے یہ دعویٰ کرنا جائز ہے کہ

"ثبت است بر جریدۂ عالم دوام ما!"

مرزا سیف علی خاں

سالانہ خریداران سب رس سے

جن اصحاب کا چندہ دسمبر ۱۹۳۸ء میں ختم ہوتا ہے۔ وہ براہ کرم دفتر کو مطلع فرما دیں کہ جنوری ۱۹۳۹ء کا پرچہ (جون نمبر) ایک سال کے لئے وی پی کر دیا جائے یا چندہ بذریعہ منی آرڈر ارسال کیا جائے گا۔ اگر کوئی صاحب ۱۹۳۹ء کے لئے پرچہ جاری رکھنا نہ چاہتے ہوں تو وہ دفتر کو مطلع کر دیں تاکہ پرچہ وی پی نہ کیا جائے۔ اگر ۴ جنوری ۱۹۳۹ء تک کوئی اطلاع وصول نہ ہوگی تو یہ تصور کر لیا جائے گا کہ پرچہ کو جاری رکھنا منظور ہے۔ اور جنوری ۱۹۳۹ء کا پرچہ وی پی کے ذریعہ بھیجا جائے گا۔

مہتمم

صنفیت کی ابتداء

اس امر کے خیال کے لئے کافی وجوہات ہیں کہ صنفیت کی ابتداء اجاتی تولید سے ہوئی ہے۔ مثلاً (Synchytrium endobioticum) ایک طفیلی پودا ہے جو گوبھی کے پودے پر اپنی زندگی بسر کرتا ہے۔ سادہ حالتوں میں (S. endobioticum) کے ایک صنفی عضویہ کو جب غذا وغیرہ کافی میسر آتی رہتی ہے تو وہ اس طرح اجاتی تولید کرتا ہے کہ ... کرکے دو دختر خلیوں میں تبدیل ہو جاتا۔ اور پھر یہ تقسیم عرصہ دراز تک جاری رہتی ہے۔ اس طرح عضویوں کی تعداد میں ... لیکن اس عضویے کی سوانح میں ایک دلچسپ دور اس وقت آتا ہے جب گوبھی کا پودا بیماری کی کثرت کی وجہ سے سوکھنے ... ایسی صورت میں پودے میں ترشئی مادّوں کی افراط اور غذائی مادّوں کی کمی (S. endobioticum) ... میسر کرنے میں دشواریاں پیدا کرتی ہے۔ ان حالات میں خلیے اجاتی تقسیم جاری نہیں رکھ سکتے۔ بلکہ ایک خاص منظر کو پیش کرتے ہیں یعنی ... خلیے جو مزید تقسیم کے قابل نہیں آپس میں جوڑے جوڑے سے ملنے لگتے ہیں۔ اُن کے لاپ سے تخرایہ اور مرکزے متحد ہو جاتے ہیں ... جسم حاصل ہوتا ہے جو جگتہ ہے۔ یہ جگتہ کم وبیش نفتہ رہ کر پھر موسم بہار میں اپجتا اور نیا عضویہ پیدا کرتا ہے جو پھر تقسیم سے افزائش ...

اسی طرح (Copromonas) میں بھی جو ایک اکیلوی عضویہ ہے۔ افزائش تعداد اجاتی تولید کے ذریعہ ... ہے لیکن جب کبھی واسطے (Medium) میں کوئی معدنی نمک ملا دیا جائے یا ایسی ہی تبدیلی کی جائے یا غذائی ... یا عضویے مسلسل تقسیموں سے کمزور ہو جائیں تو یہ ہوتا ہے کہ دو خلیے ایک دوسرے کے قریب آجاتے ہیں۔ اُن کے ... (Cilia) جو عضویوں کے اعضائے حرکت ہیں اندر کھینچ لئے جاتے اُن کی درمیانی دیوار جذب ہو جاتی اور اُن کے تخزمائی مادّے ... مل جاتے ہیں اور جگتہ حاصل ہوتا ہے اس جگتے کی مزید تقسیم سے جو خلیے حاصل ہوتے ہیں وہ آیا پھر آزاد (Copromonas) کی زندگی بسر کرتے ہیں اور اجاتی تولید کے ذریعہ

افزائش نسل کرتے ہیں یا پھر دو دو لاپ کر سکتے ہیں۔ چنانچہ ان لاپ کرنے والے عضویوں کو ہم زواجے (Gametes) اور اس عمل کو جاتی یا صنفی تولید کہہ سکتے ہیں۔ ٹھیک یہی کیفیت نباتات میں جن سے (Chlamydomonas) کی ہے معمولی حالتوں میں اگر غذا کافی میسر آئے تو پودا عرصہ لامتناہی کے لئے اجاتی تقسیم کرتا رہتا ہے اور اس طرح اپنے خلوی ... تقسیم سے نئے عضویے بناتا رہتا ہے لیکن اگر اس عضویے کو اس نمکین محلول سے نکال کر جس میں اس کی کاشت کی گئی تھی معمولی سادہ ... میں منتقل کیا جائے تو پھر عضویے سے جو دختر خلیے نمودار ہوتے ہیں وہ اس قابل نہیں ہوتے کہ ذاتی طور پر زندگی گذار سکیں ... چھوٹی جسامت کے بھی ہوتے ہیں۔ اس طرح تولیدی اور معمولی خلیوں میں پہلی بار تمیز نظر آتی ہے۔ اس لئے دو دو مل کر ... لاپ (Copulation) کرتے اور اس صنفی عمل سے جگتہ پیدا کرتے ہیں جو بڑھ کر پھر نئے عضویے بنا سکتا ہے ...

لہذا ان مثالوں سے ہم حسب ذیل نتائج حاصل کر سکتے ہیں۔

ڈسمبر ۱۹۳۰ء

سادہ یکخلوی عضویوں میں جاتی تولید یا صنفی تولید معمولی سوانح زندگی کی ایک مستثنیٰ شکل کی صورت میں نمودار ہوتی ہے۔ خاص حالات کے تحت اس کا مظاہرہ ہوتا ہے۔

عضویہ ← زواج → جگتہ
زواج
اجاتی تولید
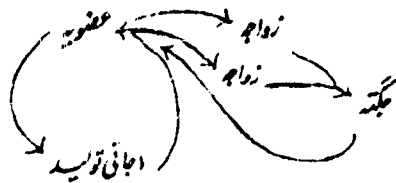
اس ضمن میں یہ خیال صحیح نہیں کہ صنفیت اور تولید میں لازم و ملزوم کا تعلق ہے بعض وقت صنفیت کی موجودگی میں تولید کا مفہوم باقی نہیں رہتا یعنی بجائے افزائش تعداد کے افراد کی تعداد میں کمی ہونے لگتی ہے۔

لہذا ابتدائی ماہرین کا یہ خیال کہ صنفیت کی ابتداء افزائش نسل کے لئے ہوئی ہے صحیح نہیں معلوم ہوتا۔

مثلاً الجی کا ایک رکن (Cylindrocystis) میں عموماً افزائش نسل اجاتی تولید کے ذریعہ وقوع میں آتی ہے۔ لیکن جب کبھی اس عضویے میں صنف کا عمل ہوتا ہے تو دو عضویے آپس میں ملاپ کرتے ہیں جگتہ پیدا کرتے ہیں۔ اور یہ جگتہ کم و بیش ایک عرصہ تک ستاتی حالت گزارنے کے بعد نمو پاکر (Cylindrocystis) کا ایک نیا رکن بناتا ہے اس مثال سے ظاہر واضح ہے کہ یہاں دو عضویوں کے ملاپ سے صرف ایک عضویہ حاصل ہوا۔ چہ جائیکہ تولید سے مراد افزائش نسل ہونا چاہئے تھا اور یہاں تولید نہ ہوئی جہاں کمی واقع ہو مزید یہ کہ جس عرصہ میں جگتہ ستاتی حالت گذارتا رہتا ہے یہ دو عضویے تقسیموں کے ذریعہ عضویوں کی کئی نسلیں پیدا کر چکے ہوتے۔

ظاہر ہے کہ ان عضویوں کی سوانح میں صنفیت کا ظہور موزوں حالات کے تحت ضروری نہیں کیونکہ افزائش نسل بغیر صنف کے عرصہ دراز تک ہو سکتی ہے بلکہ معمولی سادہ زندگی میں غیر معمولی ماحول کے تحت مثلاً تخفف غذائیت یا کاشت کی نلیوں کو سیاہ کاغذ وغیرہ سے ڈھانکنے پر صنفیت کے مظاہر کو پیدا کیا جا سکتا ہے۔ بنا بریں ہم یہ کہہ سکتے ہیں کہ جاتی تولید یا صنفی تولید سادہ حالتوں میں پودے کی سوانح حیات کے لئے ضروری نہیں۔

کچھ عرصہ قبل صنفیت کی تفہیم کے لئے نظریۂ تشبیب (Theory of Rejuvenescence) پیش کیا جاتا تھا اس نظریہ کے حاملوں کا یہ خیال تھا کہ ایک عرصہ تک نباتی یا اجاتی تولید کرنے کے بعد مسلسل تقسیموں کی وجہ سے عضویہ اس قابل نہیں رہتا کہ تقسیم کر سکے وہ کمزور ہو جاتا ہے۔ اور اس کے مرکزے ملاپ کر کے ایک ایسا عضویہ پیدا کرتے ہیں جو اس مرکزی ملاپ کی بدولت نمو کی نئی قوتیں لے کر آتا ہے۔

چنانچہ اس صورت میں کسی عضویے کی نسلی تاریخ میں یہ ضروری ہے کہ وہ کبھی نہ کبھی جاتی تولید ضرور کرے۔ مگر حقیقت میں تو مذکورہ بالا نظریہ واقعات کی کسوٹی پر پورا نہیں اترتا مثلاً (Chlamydomonas) پر تجربے کرتے ہوئے بعض محققین نے یہ کیا کہ حتی الامکان عضویوں کو صنفی تولید سے باز رکھا۔ وہ اس طرح کہ اجاتی تقسیم کے بعد فوراً ہی دختر عضویوں کیا تو علحدہ کر دیا گیا یا ان کے واسطوں میں ایسی کیمیائی تبدیلیاں کی گئیں کہ جاتی یا صنفی تولید ممکن ہی نہ ہو سکے چنانچہ اس صورت میں دیکھا گیا کہ عضویے پانچ چھ سال تک مسلسل بغیر کسی جاتی تولید کے اسی قوت اور عزیمت کے ساتھ زندہ رہے اور ان سے ہزارہا نسلیں حاصل

بچوں سے

یہ سب رس کے پہلے سال کا آخری شمارہ ہے۔ جنوری سے نیا سال شروع ہوتا ہے سب رس [illegible] ماں بچوں اور [illegible] توقع رکھتا ہے کہ وہ آئندہ سال بھی اپنی خریداری جاری رکھیں گے۔ اور اپنے عزیزوں اور دوستوں کو بھی اس کا خریدار بنائیں۔ کیونکہ [illegible] نیا خریدار ہوں گے۔ اتنا ہی بچوں کے سب رس کی زیب و زینت میں اضافہ ہوگا اور تصویریں بھی چھپ سکیں گی۔

ہم نے اعلان کیا تھا کہ سال بھر میں جن کے چھ مضمون شائع ہوں گے ان کو سب رس کی طرف سے انعام دیا جائے گا۔ لیکن اتفاق کی [illegible] کسی کے بھی نہیں چھپے۔ اس لیے جن جن کے پانچ مضمون چھپے انہی میں یہ انعام تقسیم کر دیے جاتے ہیں۔ اس طرح شیخ رحیم الدین ظہیرآبادی [illegible] محمود علی اور مسیح الدین خاں تین انعامات کے مستحق ہیں اور دفتر سے اپنے انعام حاصل کریں۔

حسبِ ذیل اصحاب نے دریاؤں کے نام بوجھے۔

"دریاؤں کے نام: ۔ مانجرا ۔ کرشنا ۔ بھیما ۔ پورنا۔"

۱۔ سید لایق علی خان (سٹی کالج)، ۲۔ رحیم النساء بیگم (بشیرآباد)، ۳۔ سید قاضی الدین (سٹی کالج)، ۴۔ مرزا مسیح الدین بیگ (سٹی کالج)، ۵۔ مس [illegible] ۶۔ سید محمود علی (سٹی کالج)، ۷۔ بدر النساء بیگم (مغل پورہ)، ۸۔ سید غضنفر علی (سٹی کالج)، ۹۔ حبیب شمس (سٹی کالج)، ۱۰۔ [illegible] (سٹی کالج)، ۱۱۔ سید اعجاز علی (گرامر اسکول)۔

"ادارہ"

(انعامی معمہ)

۱	۲	۳	۴	۵	۶	۷	۸	۹	۱۰	۱۱
۱	ر									
۲ ج										
۳ س		ر	س							
۴ ر		ف	ر							
۵	و		م		س					
۶	و	ل	ی	ن	ب	ص				
۷ ر	ن	ر	ط	و	ل	ی	ہ			
۸ م			ف		ک		ر			
۹	ر	ت		س	ا		ر	ن	ہ	
۱۰ س	ل	ط	ر	ن	ر	ل	ہ	ل	و	م

اس معمہ کے حل وہی حضرات روانہ کریں جو اس رسالہ کے خریدار ہیں۔ صحیح حل پر ایک کتاب انعام دی جائے گی۔

انعام کا تصفیہ ادارہ کے تفویض ہے۔

آڑے اشارے

۱۔ سمندر سے ـــــ نکالے جاتے ہیں۔

۲۔ موسم باراں میں ہر ـــــ سرسبز ہوتا ہے۔

۳۔ حیدرآباد کا مشہور رسالہ ـــــ بچوں کی خدمت کرتا ہے۔

۴۔ جو حاکم اپنے ـــــ دلی محبت نہیں رکھتا وہ اپنی رعیت سے سچی محبت نہیں کر سکتا۔

۵۔ امریکہ کا پتہ لگانے والا پہلا شخص ـــــ گذرا ہے۔

۶۔ بیجاپور کی ایک عمارت جس کا نام ـــــ ہے ساری دنیا میں مشہور ہے۔

۷۔ ایشیائے کوچک کا دوسرا نام ـــــ ہے۔

۸۔ ان دنوں ـــــ کی وفات پر ماتم کیا جا رہا ہے۔

۹۔ احمدنگر کی مشہور شہزادی ـــــ تھی جس کی بہادری تاریخ میں اپنی نظیر آپ ہیں۔

۱۰۔ موجودہ فرمانروائے دکن کا خطاب ـــــ ہے۔

غلام مجتبیٰ قمر

ملک خوش حال کی شہزادی
(بسلسلۂ گذشتہ)

تیسرا منظر

لڑکے اِدھر سے اُدھر جا رہے ہیں۔ آمد و رفت میں بدنظمی ہے سائیکلیں بغیر قندیل کے ہیں بہت شور ہے۔ پہلی سڑک کی آواز آتی ہے۔ لاپرواخاں جوان کے درمیان ہے۔

اب ہم ان کو ثابت کر دکھائیں گے کہ ہماری موجودگی میں ان کا ہر قاعدہ اور قانون بیکار ہے۔

پہلا لڑکا۔ میں جدھر چاہوں جاؤں گا سمت کی قید میرے لئے نہیں۔

دوسرا لڑکا۔ میں گولہ گلیوں میں ضرور کھیلوں گا۔ کیونکہ ان کے قواعد میں اس کے خلاف حکم ہے۔

تیسرا لڑکا۔ جس کی سیکل ہے۔ میں قندیل ہرگز نہیں لگاؤں گا۔ بڑی سی بڑی قوت بھی اس پر مجبور نہیں کر سکتی۔

لاپرواخاں۔ بہادرو۔ آفریں ہے تمھاری بہادری پر ہم کو آج دنیا کی کوئی قوت بھی زیر نہیں کر سکتی۔ اب تم تیار ہو جاؤ اور حملہ اول دو۔ سیٹی بجاتا ہے۔ اور سامنے سے دوسری سیٹی ہوتے ہی دوسری جماعت اسٹیج پر آتی ہے۔ جوں ہی کہ یہ بےترتیبی سے حملہ کرتے ہیں۔ وہ اطراف سے گھیر لیتے ہیں اور نارجم کی روشنی سے ان کی آنکھیں چندھیا جاتی ہیں۔ برچھے لگا دیئے جاتے ہیں۔

پولیس کانسٹبل۔ اب تم ہل نہیں سکتے۔ بتاؤ اب ہماری اطاعت منظور ہے۔

لاپرواخاں۔ جی ہاں حضور۔

سب۔ سرکار ہم کو جانے دیجئے۔

ملکہ بیگم۔ اب تم میرے حکم کی بجا آوری کیا کرو گے۔

سب۔ دل و جان سے۔ (آنکھ اور کان) کیا تم سب کو میری اطاعت منظور ہے۔ سب۔ بسروچشم۔

روشنی۔ کیا تم اب بھی بغیر میرے سیکل چلاؤ گے۔

سب۔ ہرگز نہیں۔

سب شہزادی سے۔ شہزادی سلامت اب ہم قاعدہ کی پابندی کا فرض سمجھیں گے۔ اور آئندہ سے کبھی بھی ایسی غلطی نہ ہوگی۔

شہزادی۔ یاد رکھو اگر آئندہ ہو تو تم کو اس کا خمیازہ بھگتنا ہوگا۔

لاپرواخاں۔ میں آپ کو اطمینان دلاتا ہوں کہ کبھی ایسی شکایت کا موقع نہ دے گا۔

شہزادی۔ اچھا ان کو چھوڑ دو۔

شہزادی۔ بہادر سپاہیو میں تمھاری اس کامیابی پر مبارک باد دیتی ہوں۔ اس بارے میں بہادر جنرل اور میاں حامد خاص شکریہ کے مستحق ہیں۔

میرا فریضہ ہے کہ حامد کے احسان کا کچھ نہ کچھ بدلا دوں۔ اس لئے یہ مناسب ہے کہ حامد اپنے ساتھ خوش ملبی کو لے جائیں۔ تاکہ کبھی کوئی مصیبت کا منحوس چہرہ نہ دیکھے۔

سب۔ شہزادی سلامت زندہ باد۔

حامد زندہ باد۔

جنرل زندہ باد۔

پردہ

شیخ رحیم الدین (ظہیرآبادی)

خریدارانِ سب رس سے

جن اصحاب کے پرچوں پر سُرخ نشان ہے اُن کا چندہ ختم ہو چکا ہے۔

براہ کرم دوسرے سال کا چندہ بذریعہ منی آرڈر روانہ فرمائیں یا وی پی کرنے کے لیے دفتر کو مطلع کریں۔

مہتمم

ایک پرلطف واقعہ

کچھ دن پہلے ہم لوگ سیر کو گئے تھے۔ وہاں ایک اور بیگم تشریف لائیں۔ پہلے میں نے ان کو کبھی نہ دیکھا تھا۔ بیگم صاحبہ نے مجھ سے سوال کیا کہ بی بی آپ ضرور اسکول جاتی ہوں گی؟ میں نے کہا ہاں جاتی ہوں۔ پھر دریافت کیا "کون سے اسکول کو؟" میں نے اسکول کا نام بتلایا۔ انھوں نے فوراً کہا "اوہو اس سے تو میں خوب واقف ہوں۔ اسکول کی جتنی انگریز استادنیاں ہیں ان سب کے نام گنوائے۔ بلکہ ان کے صفات بھی بیان کئے۔ دیکھنے سے لایق معلوم ہوتی تھیں۔

اب تک تو میں صرف جواب دے رہی تھی اب میں نے کہا "کیا آپ ہمارے اسکول ہی کی پڑھی ہوئی ہیں؟" کہنے لگیں "نہیں میں ابھی یونیورسٹی سے ہوں" اس کے بعد اپنے مختلف قصے سنانے شروع کئے۔ جن میں قابل ذکر پردہ کے متعلق تھا۔ ان کی عمر پینتیس چالیس کے لگ بھگ ہوگی۔ دیکھنے میں لڑکی معلوم ہوئی تھیں۔ گورا رنگ دبلی پتلی لانبا یا قد بہت لانبا نہیں! انتہائی فیشن ایبل۔ آپ کھلی موٹر میں تشریف لائی تھیں۔ اور فرماتی تھیں آپ کے شوہر پردہ کے بہت پابند ہیں۔ میرے ہمراہ امی بھی تھیں۔ امی نے ان کے شوہر کا نام دریافت کیا تو شرمانے لگیں۔ امی کو بڑی ہنسی آئی کہ کھلی موٹر میں آئی ہیں لیکن صاحب کا نام بتلاتے ہوئے شرماتی ہیں۔ بعد کو میں نے خود ان کا نام دریافت کیا۔ تو وہ اپنا نام بھی بتلاتے ہوئے ہچکچانے لگیں۔ اس کے بعد انھوں نے میرا نام پوچھا۔ والد کا نام دریافت کیا عہدہ دریافت کیا سکونت دریافت کی میں نے پورا پتہ بتلا دیا۔

اب میرے کپڑوں کی تعریف شروع ہوئی۔ میرے جسم پر کسی قسم کا زیور تو تھا نہیں۔ صرف ایک انگوٹھی تھی جس کو میں بہت عزیز رکھتی تھی۔ اس پر میرے نام کا سرحرف (ع) بہت پاکیزہ بنا ہوا تھا۔ بیگم نے اس کو بہت ہی تعریفی نظروں سے دیکھا اور میری انگلی سے نکال کر خود اپنی انگلی میں پہن لیا۔ کہنے لگیں "میری تمھاری انگلی برابر ہے" تھوڑی دیر پہنے رہیں۔ پھر نکال کر میری طرف بڑھاتے ہوئے کہنے لگیں "اگر یہ سونے کی نہ ہوتی تو میں بطور نشانی تم سے ضرور لے لیتی" اس وقت انگوٹھی میری انگلی میں پہنچ چکی تھی۔ میں نے ہنستے ہوئے کہا "کونسی بڑی چیز ہے لیجئے اپنے پاس رہنے دیجئے" ابھی میرا آخری فقرہ ختم بھی نہ ہونے پایا تھا کہ انھوں نے ہاتھ بڑھا کر میری انگلی سے خود ہی اتار لیا۔ اور میں منہ دیکھتی رہ گئی۔ نہ معلوم میرا یہ فعل درست تھا یا نہیں۔ میں نے تفریحاً کہہ دیا تھا۔ میرا خیال تھا کہ اگر میں ایسا کہدوں تو کیا برائی ہے۔ کیونکہ وہ اس کے جواب میں کہیں گی "نہیں بی بی میں نے تم سے یوں ہی مذاق میں کہا تھا" الٹا وہ اپنی انگلی میں پہن وہاں سے چمپت ہوگئیں۔ اگرچہ وہ کچھ زیادہ قیمتی نہ تھی۔ لیکن بیگم صاحبہ کی یہ حرکت تمام عمر یاد رہے گی۔ گھر آنے کے بعد میں کچھ چپ سی تھی۔ مجھے اپنی انگوٹھی کے جانے کا افسوس نہ تھا بلکہ ہنسی آرہی تھی۔ اب خیال آیا کہ اسی لئے وہ اپنا نام بتلانا نہیں چاہتی تھیں۔ کاش میں ان کے نام سے واقف ہوجاتی۔ اب میرے اکثر دوست مجھے کہتے ہیں کہ تمھاری انگوٹھی کیا ہوئی۔ مجبوراً مجھے یہ قصہ دہرانا پڑتا ہے۔

بھائیوں اور بہنوں نے مجھے تنگ کر دیا۔ میں نے کہا "براکیا ہے آپ لوگوں کو ہنسنے کا موقع تو مل گیا......" آیندہ مجھے خیال رہے گا۔ چھوٹی سی چیز بس نصیحت ہوگئی۔ اور معلوم ہوگیا کہ دنیا میں ایسے لوگ بھی آباد ہیں۔ ان کی نشانی یہ ہے کہ وہ اپنا نام و پتہ نہیں بتلاتے۔

عزیز النساء ضیاء الدین

مصیبت میں صبر

مصیبت میں رنج کرنا عبودیت کی شان کے خلاف ہے۔ رنج و مصیبت کو کوئی ٹال نہیں سکتا۔ اور نہ کوئی ہلکا کرسکتا ہے۔ بلکہ الٹا مصیبت کو بڑھاتا ہے۔ اس لئے ہر ایک کو چاہئے کہ جتنی بھی تکلیف ہو اس میں صبر کرے۔ بعض خدا کے بندے ایسے ہیں کہ ذرا سی تکلیف کو برداشت نہیں کرسکتے۔ اور پریشان ہوجاتے ہیں اور موت کی دعائیں کرتے ہیں خدا کی شان میں گستاخی کرتے ہیں۔ بعض تو خودکشی بھی کرلیتے ہیں۔ بعض بندے ایسے بھی ہیں جو مصیبت میں ہر وقت صبر سے کام لیتے ہیں۔ ان پر کتنی سخت سے سخت مصیبت نازل ہو خاموشی سے برداشت کرلیتے ہیں۔

پہلے زمانہ میں ہمارے پیارے رسول صلعم کو مخالفین بہت ہی اذیتیں دیتے تھے۔ راستہ میں کانٹے بچھادیتے تھے۔ جس سے آنحضرت صلعم کے پائے مبارک زخمی ہوجاتے تھے۔ پھر بھی خدا کے پیارے رسول زبان سے اُف نہ کرتے اور بارگاہ ایزدی میں ان کو نیک توفیق عطا ہونے کے لئے دعا فرماتے تھے۔ مصیبت خدائے تعالیٰ ہی کی طرف سے نازل ہوتی ہے۔ اور وہی اس کو رفع کرتا ہے۔

مصیبت سے جو بڑا فائدہ انسان کو پہنچتا ہے وہ یہ ہے کہ مصیبت دل میں عجز و انکسار کی صفت پیدا کرتی اور خدا کو یاد دلاتی ہے۔ مصیبت کے وقت انسان خدا کی طرف متوجہ ہوتا ہے۔

مس بی فخرالدین

کلی کی فریاد

آہ ظالم! میری محدود زندگی کی اس قدر جلد شام نہ کر! ابھی میری زندگی کی یہ پہلی صبح ہے جس صبح کو میری آرزوں اور میری زندگی کی ابتدا کا یہ پہلا ورق ہے۔ میں ابھی ابھی اس انجان دیس میں آئی ہوں۔ مجھے کیا خبر کہ یہاں کیسے کیسے مزے ہیں ـــ رہنے دے ـــ! مجھے ابھی رہنے دے!!! ظالم! کیا تیرے ہاتھ میری تباہی و بربادی کے لئے بنائے گئے ہیں؟ کیا قسمت نے مجھے اس لئے یہاں چھوڑا ہے کہ تیرے ظالم ہاتھ آن کی آن میں مجھے فنا کردیں! نہیں نہیں ایسا نہیں ہو سکتا ـــ! قدرت کبھی ظالم نہیں ہوتی ـــ قدرت نے تجھے کبھی اتنی طاقت نہیں دی کہ کسی کمزور چیز پر اپنا ہاتھ صاف کرنے! ظالم تیری یہ بھول ہے کہ تجھ میں بھی کچھ قدرت و طاقت ہے ـــ اس فضول خیال کو چھوڑ دے۔ اس جھوٹے غرور کو دور کر جو تجھے بہت جلد فنا کردے گا۔

دیکھ تیرے ظالم ہاتھ لمحہ بہ لمحہ میری طرف بڑھ رہے ہیں۔ روک جلد روک!! کہیں ایسا نہ ہو کہ تیری غفلت میری

زندگی کا خاتمہ کر دے۔

کلی کی فریاد ظالم انسان کے نزدیک کچھ حقیقت نہ رکھتی تھی۔ اس نے فوراً توڑ لیا — بس — آہ! کلی کی محدود زندگی کی شام ہو گئی۔

محمود علی

یورپ کے مشہور حکماء

بچو!! آج میں تم سے ایسے واقعات کا اظہار کرنا چاہتی ہوں جس کو پڑھ کر اگر تم چاہو تو ہمت اور استقلال پیدا کر سکتے ہو اور ایسے کارنامے نمایاں کر سکتے ہو جن کا اب میں ذکر کروں گی۔ پڑھو غور سے پڑھو اور ان انمول ہستیوں کے زریں کارناموں کا مطالعہ کر کے خود بھی اس قابل بننے کی کوشش کرو جنھوں نے صرف ہماری اور تمھاری خاطر اپنے کو برباد کر دیا یہاں تک کہ ساری عمر اسی میں صرف کر دی۔

حکیم بقراط

حضرت موسیٰ علیہ السلام کے بعد سب سے فاضل طبیب اگر کوئی مانا جاتا تھا تو وہ بقراط تھا۔ یہ ایک یونانی شخص تھا۔ جو ایشائے کوچک میں جزیرہ کوس میں حضرت مسیح سے تقریباً ۴۶۰ برس پیشتر پیدا ہوا۔ بقراط کے پہلے جتنے بھی طبیب گذرے وہ بالکل یہ نہ جانتے تھے کہ انسان کا دل حرکت کیسے کرتا ہے اور یہ پھیپھڑوں کا فعل کیا ہے لیکن بقراط نے سخت محنت سے تجربہ و مشاہدے کے بعد ایک نئے نظام طب کی بنیاد قائم کی اور یہ بھی معلوم کر لیا کہ امراض کی حقیقت معلوم کرنے کے لئے بیمار کے سینے پر کان رکھ کر آوازیں سننی چاہئیں ان آوازوں کے متعلق اس نے بعض قواعد بھی بنائے لیکن اصول کا پورا پورا اندازہ برٹنی کے ایک نامی گرامی ڈاکٹر لائنک نے "ستھوسکوپ" کو ایجاد کر کے ظاہر کیا جس کا آج کل ہر ڈاکٹر مرہون منت ہے۔

جان ہنٹر

یہ ایک نہایت ہی مشہور شخص تھا جس کے شاگردوں میں ایک ایڈورڈ جینر بہت ہی قابل نکلا جس نے چیچک کے ٹیکے کی ایجاد کر کے شہرت لازوال حاصل کی وہ ۱۷۴۹ء میں انگلستان میں پیدا ہوا اور ہنٹر سے تعلیم حاصل کر کے اپنے وطن میں مقیم رہا اور چیچک کے ٹیکے کے لئے غور کرتا رہا یہاں تک کہ اس نے پوری کامیابی حاصل کر لی۔ اس عظیم الشان ایجاد کی بنا پر جینر نے بہت ہی عزت پائی اور انگلستان کی پارلیمنٹ نے اسے تقریباً ساڑھے چار لاکھ روپیہ انعام دیا۔

گاٹ فریڈ ولیم لائب نیٹز

یہ ایک بہت بڑا فلسفی تھا ماہ جولائی ۱۶۴۶ء میں لائپزگ کے مقام پر پیدا ہوا۔ یہ ہمیشہ ان مضامین کا مطالعہ کرتا جو عام طالب علموں کے نزدیک خشک اور بے مزہ ہوتے ہیں۔ ۱۶۵۲ء میں اس کے باپ کا انتقال ہو گیا۔ اس کی ماں نے اجازت دے دی کہ خاندان کے کتب خانے میں جتنی چاہے کتابیں پڑھ لے جس کا نتیجہ یہ ہوا کہ جب وہ پندرہ برس کی عمر میں پہنچا تو یونیورسٹی میں داخل ہو گیا۔ کیمسٹری فلسفہ قانون سیاسیات دینیات میں کافی تعلیم حاصل کی اور بہت جلد جرمنی کے بڑے بڑے آدمیوں سے شناسائی پیدا کر لی۔ اسی زمانے میں فرانس کا بادشاہ لوئی چہاردہم

جرمن پہ یا مصر میں حملہ کرنے کی تجویزیں سوچ رہا تھا۔ لیکن لائب نیٹز نے ایک کتاب لکھی جس میں فرانس کو یہ مشورہ دیا کہ مصر پر حملہ کیجئے اس میں شک نہیں کہ اس پہ ترک اور مصری بہت ناراض ہوئے لیکن جرمنی کے سر سے بلا ٹل گئی کیونکہ فرانس کا بادشاہ مصر کی فتح کے خواب دیکھنے لگا اور جرمنی پر حملہ کرنے سے باز رہا۔

ہمبولٹ

یہ علم حیوانات کا بہت بڑا ماہر گذرا ہے۔ اس کی خواہش تھی کہ آج کل کی زندگی کے رازوں کو بے نقاب کر دے۔ جن دنوں یہ فریبرگ کی یونیورسٹی میں تعلیم پا رہا تھا اسے جارج فارسٹر کی شناسائی حاصل ہوئی جو کپتان کک کے ساتھ بڑے بڑے لمبے بحری سفر طے کر کے واپس ہوا تھا جب ہمبولٹ نے اس کے سفر کے حالات سنے تو سیر و سفر کا بے پناہ شوق پیدا ہوا۔ لیکن اس کو ۳۰ برس کی عمر تک سفر کا موقع نہ ملا کیونکہ اس زمانہ میں فرانسیسی لڑائیاں خوب زوروں پر تھیں ۱۷۹۸ء میں نپولین نے اس تجویز پر عمل کرنا چاہا جو لائب نیٹز نے لوئی چہار دہم کو سمجھائی تھی یعنی مصر پر حملہ کرنے کا فیصلہ ہمبولٹ اس کے ساتھ جانے کو تیار تھا لیکن عین روانگی کے وقت معلوم ہوا کہ جہاز میں اس کے لئے جگہ نہیں رہی ہے۔ آخر کار اسے ہسپانیہ کے جہاز پر سفر کرنا پڑا ہمبولٹ نے جنوبی امریکہ پہنچ کر وینیزویلا، کولمبیا، اکویڈر، وغیرہ میں خوب سیاحت کی پانچ سال تک رہ کر وہاں کے حالات معلوم کرتا رہا اور عجیب و غریب پرندوں اور جانوروں کے حالات معلوم کئے جنوبی امریکہ کے دریا میں برقی مچھلی کا حال بھی جس کے جسم کو ہاتھ لگانے سے بجلی کا سا جھٹکا لگتا ہے اسی نے معلوم کیا۔ جن سے یورپ والے اب تک بے خبر تھے۔ ہمبولٹ نے اورنی نوکو، ایمزن اور ان کے معاون دریاؤں میں بھی بہت کچھ سفر کیا اور اسی سفر میں اس کے دائیں بازو میں ایک قسم کا زہر سرایت کر گیا جس سے اس کا بازو عمر بھر کے لئے بیکار ہو گیا جب یورپ واپس آیا تو بہت سی عجائبات کا ذخیرہ ساتھ لایا۔ اس کی زندگی کے آخری ۳۰ سال برلن میں گذرے جہاں اس نے ۱۸۵۹ء میں انتقال کیا۔ اسے پیرس سے محبت تھی اور کبھی کبھی چپ چاپ وہاں چلا جاتا تاکہ سکون اور خاموشی کے ساتھ کام کر سکے۔ اس کا ایک بڈھا نوکر سوئزرلینڈ کا رہنے والا تھا۔

کہا جاتا ہے کہ یہ بہت ہی سیدھا سادہ اور پکا وفادار تھا۔ عمر بھر وہ کبھی جھوٹ نہیں بولا جب لوگوں کو یہ معلوم ہو جاتا کہ ہمبولٹ پیرس میں ہے تو ملاقات کی غرض سے اس کے مکان پر آتے لیکن بڈھا نوکر ان سے اس طرح صاف کہہ دیتا "ہاں پروفیسر ہمبولٹ اندر ہیں لیکن انھوں نے مجھے یہی کہنے کا حکم دے رکھا ہے کہ وہ اندر نہیں ہیں"۔

تم نے سنا ہوگا اور بضرور سنا ہوگا فلموں میں اکثر ایسے جملے استعمال کئے جاتے ہیں جو صرف مذاق پر مبنی ہوتے ہیں۔ لیکن ہمبولٹ کا بڈھا نوکر حقیقت میں سچ بولنے کا عادی تھا۔ اس طرح کہہ دیا کرتا۔

باغ میں صبح کا وقت

نیر سلطانہ

شانِ خدا کو آکر دیکھو — باغ گھڑی دم جا کر دیکھو
خوش ہے کتنا باغ کا مالی — دیکھ کے گلشن کی ہریالی
گل سے بلبل بول رہی ہے — رازِ دلی سب کھول رہی ہے
چڑیاں چوں چوں بول رہی ہیں — گویا موتی رول رہی ہیں

محمد عین الدین جنیدی
متعلم ...

خرگوش کا ایک ہونٹ کیوں کٹا ہوا ہوتا ہے

کیا تمہیں معلوم ہے کہ خرگوش کا ہونٹ کٹا ہوا کیوں ہوتا ہے۔ جاپانی بچوں کا یہ خیال ہے:۔

جاپان سے کچھ دور پر ایک جزیرے میں کئی سو سال پہلے ایک خرگوش رہا کرتا تھا۔ یہ خرگوش روز اس جزیرے پر پھرا کرتا۔ یہاں تک کہ وہ اس جزیرہ کے چپے چپے سے واقف ہوگیا۔ اس کو اس بات کی بے حد خواہش تھی کہ وہ کسی طرح سمندر کے پار پہنچ جائے اور شہر جاپان کو بھی دیکھ لے۔ مگر وہ غریب تیرنا نہ جانتا تھا۔ اس سے کوئی تدبیر بن نہ پڑی۔ آخر تنگ آکر سارے جزیرے گھومنا شروع کیا کہ شاید کوئی جہاز یا کشتی دکھائی دے۔ تھوڑے دن تک وہ یونہی پھرتا رہا لیکن کوئی جہاز اسے نظر نہ آیا۔ ایک دن بجائے جہاز کے اسے ایک مگرمچھ کا سر پانی کے اوپر دکھائی دیا۔ مگرمچھ کو دیکھتے ہی اسے ایک ترکیب سوجھی۔ اسے [illegible] اگر مگرمچھ سے اس پار لے جانے کو کہے تو ممکن ہے کہ وہ اسے ہڑپ کر جائے۔ اس لئے اس نے نہایت حکمت عملی سے کام لیا۔ کہا

"جناب مگرمچھ صاحب کیا آپ یہ بتا سکتے ہیں کہ اس سمندر میں کتنے مگرمچھ ہیں؟"

مگرمچھ۔ "نہیں"

خرگوش۔ "میں نے یہ سنا ہے کہ اس جزیرے میں جو خرگوش ہیں ان کی تعداد اس سمندر کے مگرمچھوں کی تعداد سے زیادہ ہے"

مگرمچھ۔ "ہرگز نہیں۔ میں اس پر تم سے شرط بد سکتا ہوں۔ مگرمچھوں کی تعداد زیادہ ہے۔"

خرگوش۔ "اور میں بھی شرط بد سکتا ہوں کہ خرگوشوں کی تعداد زیادہ ہے۔ خیر اگر ایسا ہی ہے تو جاؤ جتنے مگرمچھ ہیں انھیں بلا لاؤ اور قطار بناؤ۔ میں ہر ایک کی پیٹھ پر سے چلوں گا اور گنتا جاؤں گا کہ کتنے مگرمچھ ہیں۔ مگرمچھ فوراً خرگوش کی باتوں میں آگیا۔ جا کر جتنے مگرمچھ تھے سب کو بلا لایا۔ خرگوش یہ دیکھ کر اتنا خوش ہوا کہ خوشی کے مارے اچھلنے لگا۔ تھوڑی دیر بعد اس نے مگرمچھوں سے کہا

"اچھا اب تم لوگ ایک قطار باندھو تاکہ میں تمھیں گن سکوں۔" مگرمچھوں نے حکم کی تعمیل کی اور ان کی قطار اس جزیرے برابر جاپان کے ساحل تک پہنچ گئی۔

اب خرگوش ایک کی پیٹھ پر سے دوسرے کی پیٹھ پر اچکتا ہوا ساحل پر پہنچ گیا۔ یہاں آکر پلٹا اور مگرمچھوں سے کہنے لگا

"اے مہربان مگرمچھو یہ تم نے بڑی عنایت کی کہ میرے لئے آسانی سے ایک پل بنا دیا اور میں چاہتا بھی یہی تھا۔"

اس کے بعد وہ اتنا ہنسا اتنا ہنسا کہ اس کا اوپر کا ہونٹ پھٹ گیا اور یہی وجہ ہے کہ آج تک اس کی اولاد کا ایک ہونٹ کٹا ہوا ہوتا ہے۔

ش
(سٹی کالج)

بعض بچوں کو شکایت ہے کہ ان کے مضمون نہیں چھپتے۔ ہم ان کو یقین دلاتے ہیں کہ اچھے مضمون باری باری سے ضرور چھپتے ہیں۔ ان کا نمبر بھی آئیگا۔ وہ اچھے مضمون بھیجتے رہیں۔

سریا

پچھلے پہر کا وقت تھا۔ اور صبح کاذب کے آثار شفق پر نمایاں ہو رہے تھے کہ میں اپنے بستر سے جاگ اٹھا۔ میرے کانوں میں ایک سریلی آواز آرہی تھی جس کے اثر سے میں بالکل بے قابو ہوگیا۔ ہر چند اٹھنے کی کوشش کی لیکن جو محویت اس سریلے نغمہ نے طاری کر دی تھی۔ اس نے کبھی اجازت نہ دی کہ میں اس کے لطف سے محروم رہوں۔ بہت دیر تک میں اپنے بستر پر سکتے کے عالم میں پڑا رہا۔ اور ایسا محسوس کر رہا تھا کہ میرے جسم میں روح نہیں ہے۔ وہ بالکل ساکت ہے۔ صرف دل کی دھڑکن کی آواز آرہی تھی۔ رفتہ رفتہ یہ سریلی آواز دور ہوتی گئی یہاں تک کہ وہ یک بیک خاموش ہوگئی۔ جیسے ہی وہ خاموش ہوئی میں اپنے بستر سے اٹھا۔ اور باہر نکل کر دیکھا۔ تو ایک فقیر ہاتھ میں بانسری لئے ہوئے کچھ فاصلے پر نظر آیا۔ میں دوڑ کر اس کے قریب گیا اور اس سے التجا کی کہ وہ ایک بار وہی نغمہ الاپے لیکن اس نے مجھے کوئی جواب نہ دیا۔ بلکہ میری صورت دیکھتا رہا۔ میں نے مکرر درخواست کی۔ لیکن پھر بھی کوئی جواب نہ ملا۔ وہ برابر مجھے ٹکٹکی باندھے دیکھتا رہا۔

میں نے جو غور سے دیکھا تو وہ رو رہا تھا۔ نہ معلوم کیوں۔ میں اس کو اپنے گھر لایا۔ اس وقت کچھ کچھ صبح ہوگئی تھی۔ پرندانِ خوش الحان صناعِ ازل کی تعریف کے راگ الاپ رہے تھے۔ کوئل کی کوک پپیہے کی پیہو پیہو اور فاختہ کی ہو حق سے بادہ نوشانِ معرفت مست و بیخود ہو رہے تھے۔ چمن میں ایک بنچ پڑی ہوئی تھی۔ میں وہیں اس فقیر کو ہمراہ لئے بیٹھ گیا۔ کچھ دیر وہ خاموش رہا اور مجھے بھی اس کو چھیڑنے کی جرأت نہیں ہوئی۔ ایسا معلوم ہو رہا تھا کہ وہ کوئی سخت ترین رنج و غم محسوس کر رہا ہے۔ میں اس حالت سے متاثر ہوئے بغیر نہ رہ سکا اس نے ایک بار گی اپنے سر کو جنبش دی اور میری طرف دیکھ کر مسکرا دیا۔ میں اس کی اس حرکت کو سمجھنے سے قاصر تھا۔ میں حیرت و استعجاب کے عالم میں اس کی صورت دیکھتا رہا۔ اس نے پھر اپنا سر نیچا کر لیا اور اپنی نظریں زمین میں گاڑ دیں۔ درختوں پر ہر قسم کے پرندے نغمہ زن تھے۔ بلبل ہزار داستان اپنی نوا سنجی سے کائنات کے ذرے ذرے کو مست و بے خود بنا رہی تھی۔ لیکن اس نے کسی طرف توجہ نہیں کی۔ اور خاموش بیٹھا رہا۔ میں نے ڈرتے ڈرتے اس مہرِ خاموشی کو یہ کہتے ہوئے توڑا۔

"شاہ صاحب کیا آپ بانسری بجائیے گا؟"

وہ چونک کر میری طرف دیکھنے لگا۔ اور پھر اپنی بانسری کی طرف میں نے پھر بانسری بجانے کی درخواست کی اس بار بانسری ہاتھ میں لے کر

" پپیہا کا ہے مچاوت شور "

گانا شروع کیا۔ کائنات کا ہر ذرہ عالم محویت میں اس حرمان نصیب کی خوش الحان آواز سن رہا تھا۔ درختوں پر پرندے خاموش بیٹھے تھے۔ نسیم سحر کے جھونکے کبھی کبھی درختوں سے گستاخی کر جاتے تھے۔ میں بیخودی کے عالم میں بیٹھا۔ شاہ صاحب کی راگنی سے لطف اندوز ہو رہا تھا جب خورشید عالمتاب کے آتشیں رخسار سے نقاب الٹنے کا وقت قریب آیا تو اس نے بانسری بجانی بند کر دی ۔۔۔ لیکن میں نے اس کا راستہ روکا۔ اس نے ایک بار گی غم آگین لہجے میں کہا "دوست مجھے جانے دو" اس کی آنکھوں ۔۔۔ رہے تھے۔

"آپ کیوں رو رہے ہیں" میں نے پوچھا۔

"کچھ نہیں" اس نے جواب دیا۔

"نہیں کچھ تو کہئے۔ کیا آپ کو یہاں آنا گوارا نہیں تھا؟"

"نہیں دوست" (اس نے کہا) اور پھر خاموش ہوگیا۔

میں نے بہت اصرار کیا اور پوچھا کہ آپ کیوں غمگین ہیں۔

"کلیجہ تھام لوگے جب سنوگے   نہ سنو اے خدا شیون کسی کا"

پھر اس نے سلسلۂ کلام جاری رکھتے ہوئے کہا "دوست ہمارے غم کی داستان سن کر آپ کیا کریں گے۔ یہ بہت دردناک ہے۔ آپ اس کو رہنے دیجیئے۔ اس سے آپ کو کوئی فائدہ نہ ہوگا۔

وہ یہ کہہ رہا تھا اور اس کی آنکھوں سے برابر آنسو جاری تھے وہ کوئی ایسا زیادہ معمر نہ تھا۔ بلکہ ابھی جوان تھا۔ اس کی عمر تقریباً تیس پینتیس کی ہوگی۔ اس کی گفتگو سن کر میں بھی پسیج گیا۔ میں نے مکرر بصد اصرار سے پوچھا کہ شاہ صاحب آپ نے کس لئے ایسا حال بنا رکھا ہے۔ اس کی کیا وجہ ہے۔ کچھ تو آگاہ فرمایئے۔ اس نے آنسو اپنے دامن سے پونچھتے ہوئے کہا "میں بھی کسی زمانہ میں متمول تھا میرے والد شہر کے نامور لوگوں میں سے تھے۔ لیکن آپ یہ خیال نہ کیجئے کہ میں اپنی بدچلنی کی وجہ سے اس حال کو پہنچا ہوں؛ اس نے ذرا سا دم لیا اور پھر کہنا شروع کیا۔

"مجھ سے ایک بھول ہوگئی۔ غلطی ہوئی جس کی سزا مجھے اس طرح دربدر کی ٹھوکریں کھاتے پھرنا ملی ہے۔ دوست یہ دنیا فانی ہے سراب ہے، حباب ہے، اس دنیا میں انسان سکھی نہیں رہ سکتا یہ دنیا جس کو ہم دنیا سمجھے ہوئے ہیں۔ دنیا نہیں ہے بلکہ مصائب و تکالیف کی آماج گاہ ہے۔ یہ ایک بحر زخار ہے جس میں ہمیشہ تموجی کیفیت رہتی ہے۔ اس سے پار اترنا ہر انسان کا کام نہیں۔ ہر مشکل کو آسان اور کڑی کو سہل سمجھ کر برداشت کئے جانا صرف مستقل مزاجوں کا کام ہے۔ اس نے ایک ٹھنڈی سانس بھری اور پھر کہنا شروع کیا۔ "دوست! مجھے ایک لڑکی سے محبت ہوگئی تھی۔ ہاں محبت! صرف محبت ہی نہیں۔ پاک محبت!! ہم آپس میں ایک جان دو قالب تھے۔ دوست! اگر مجھے یہ معلوم ہوتا کہ میرے والد کا تمول میری محبت میں حائل ہوکر میری محبوبہ سے مجھے دور کر دے گا۔ تو میں کسی غریب کے گھر جنم لیتا۔ یا میں ایسی غلطی کرنے سے باز رہتا۔ لیکن دوست! محبت اندھی ہوتی ہے۔ میں یہ معلوم نہیں کر سکا۔ کہ مجھے اس لڑکی سے کیوں اتنی محبت ہوگئی۔ جس وقت ہماری جان پہچان ہوئی اس وقت ہم بہت چھوٹے تھے۔ ہم آپس میں ہمیشہ مل جل کر کھیلا کودا کرتے تھے۔

بچپن ہی سے کیوپڈ کا ایک چھوٹا سا پیکان ہمارے دل میں پیوست تھا۔ رفتہ رفتہ ہماری عمر کے ساتھ ساتھ ہماری محبت میں استواری پیدا ہوتی گئی۔ یہاں تک کہ ہم اس محبت کی مضبوط زنجیروں سے جکڑ دیے گئے جس سے مرتے دم تک چھٹکارا نظر نہیں آتا۔ شاید مرنے کے بعد آرام ہو۔"

وہ برابر رو رہا تھا۔ اس پر رقت طاری تھی۔ اس نے پہلے یہ شعر پڑھا اور پھر سلسلۂ کلام جاری کیا۔

اب تو گھبرا کے یہ کہتے ہیں کہ مر جائیں گے   مر کے بھی چین نہ پایا تو کدھر جائیں گے

ہمارے ... یا ... کہ میں ... کر دوں میں شادی کروں لیکن وہ میرے راز ہائے سربستہ سے بالکل واقف تھے۔ ادھر میں اپنی زندگی کو خوشگوار خوابوں سے سنوار رہا تھا۔ اور اُدھر وہ میرے حسرتوں پر پانی پھیرنا اور جگر کا خون کرنا چاہتے تھے۔ ایک دن اس کے متعلق مجھ سے تذکرہ آیا۔ میں نے شادی سے انکار کر دیا۔ اس پر سب کے سب خاموش ہو رہا۔ ایک مرتبہ میں نے والدہ کو تنہا پاکر اپنا ارادہ ظاہر کیا کہ میں حمیدہ سے شادی کرنا چاہتا ہوں میری والدہ اچھی طرح جانتی تھیں لیکن وہ یہ کہہ کر خاموش ہوگئیں کہ یہ بالکل نامناسب ہے اور ہم کبھی ایسا ہونے نہ دیں گے۔ وہ ایک غریب ... کی لڑکی ہے اور تمھارے والد شہر کے عزت داروں میں ہیں وہ کبھی اس رشتے کو گوارا نہیں کریں گے۔ ... سن کر کہا کہ یہ تو میری زندگی کا سوال ہے اس میں والد صاحب کو کوئی دخل نہیں۔ لیکن اس پر بھی نفی میں جواب پاکر میں خاموش ہو رہا۔ پھر ایک بار اس نے آنسو پونچھا اور کہنا شروع کیا۔ دوست! یہ خبر رفتہ رفتہ حمیدہ تک پہنچ گئی ایک دن وہ ... کر کہنے لگی۔ راشد میں تم سے ایک بات کہوں گی۔ بشرطیکہ تم یہ وعدہ کرو کہ اس پر ثابت قدم رہو گے۔ میں نے اس کو ... دلایا۔ وہ کہنے لگی۔ راشد میں نے معلوم کیا ہے کہ تمھارے والد ہمارے ہونے والے رشتہ کے خلاف ہیں اور آج کل ... کچھ سختیاں ہو رہی ہیں۔ دیکھو راشد۔ میں تم کو خوشی سے اجازت دیتی ہوں کہ تم اپنی شادی اپنے والدین کے حسب منشا ... تم اپنی زندگی کو تلخ نہ بناؤ۔ میرا خیال ترک کر دو اگر تم نے ایسا نہیں کیا تو پچھتانا ہوگا" اس کے ہچکی بندھ گئی تھی وہ ... دیر کے لئے خاموش ہو رہی میں نے پانی کا گلاس دیتے ہوئے کہا" تھوڑا پانی پی لیجئے گا" اس نے پانی پی کر پھر شروع کیا۔

" میں نے اس کو اس بات کا یقین دلایا کہ تم مطمئن رہو میں اپنی زندگی کبھی تلخ نہیں بناؤں گا۔ لیکن دوست! افسوس کہ ... نے اس کا مفہوم بالکل برعکس سمجھا۔ تھوڑے دنوں بعد مجھے ایک خط ملا۔ جو حمیدہ کا لکھا ہوا تھا۔

راشد!— خوب کی سیر پھرے پھول چنے شاد رہو باغباں جاتے ہیں گلشن ترا آباد رہے

" مجھے اس بات کا افسوس ہے کہ میں تم سے نہیں مل سکی۔ اور نہ آئندہ تم سے ملنے کی کوئی توقع ہے کیونکہ میں اس دنیا کو ... رہی ہوں۔ اور میں اس دنیا کے سفر کے لئے کمر باندھ رہی ہوں جہاں سے کوئی لوٹ کر نہیں آ سکتا۔ راشد اگر مجھ سے تم کو کوئی ... ہو تو معاف کرو" تمھاری حمیدہ

دوست! یہ خط پڑھ کر میرے پیروں تلے سے زمین نکل گئی۔ مجھے دنیا اندھیری نظر آنے لگی۔ میرے عقل و ہوش گم ہوگئے۔ ... نہ دیتا تھا کہ میں کیا کروں۔ میری آئندہ دنیا کا صرف ایک چراغ تھا جو سحر ہونے سے پہلے گل ہوگیا۔ میری خوشی کی دنیا ... بدل گئی۔ وہ دل جس میں کسی کا تصور رہا کرتا تھا اب ماتم کدہ بن گیا ہے۔ اس میں ناسور پڑھ گئے ہیں"

میں نے قطع کلام کرتے ہوئے پوچھا" پھر وہ کہاں چلی گئی"

کہاں چلی گئی دوست!" اس نے جواب دیتے ہوئے کہا" وہ اس دنیا سے گذر گئی۔ اس نے خودکشی کر لی اور مجھے اس دنیا میں ... کا شکار بنا گئی"

اس ... اپنے گھر کو پھر یاد کیا۔ اور اپنے مکان اور ملک کو ایک حسرت بھری نظر سے دیکھ کر چل کھڑا ہوا۔

جس کو آج سات سال کا عرصہ ہوتا ہے دوست!! یہ کہتے ہوئے اس پر غشی طاری ہو گئی ... بچھاتے ہوئے اسی ... دیا جس پر ہم بیٹھے ہوئے تھے۔ کچھ عرصے بعد اس کو ہوش آیا۔ تو میں نے یہ التجا کی کہ آج ... بہت مجبور کرنے پر ... رضامند ہوا۔

ہم دونوں دن بھر ساتھ رہے میں نے ممکنہ کوشش کی کہ وہ اپنے اس در بدر پھرنے کے ارادے سے باز رہے لیکن ...

داغ مرحوم :- جو رہِ عشق میں قدم رکھے، وہ نشیب و فراز کیا جانے

ہم دونوں شام کے کھانے کے بعد ایک دوسرے کو شب بخیر کہہ کر رخصت ہوئے۔ میں نے باہر والے ... میں اس کے لیے شب بسر کرنے کا انتظام کر دیا تھا۔ صبح ہوتے ہی میں جب شاہ صاحب سے ملنے کے لئے گیا تو حجرہ سنسان ... ہوا تھا۔ شاہ صاحب چلے گئے تھے۔ بستر کے قریب جب گیا تو مجھے شاہ صاحب کا ایک خط ملا جس میں لکھا تھا۔

میرے مشفق دوست۔

آپ کی مہمان نوازی کا شکریہ۔

مجھے مجبوراً آپ سے بغیر ملے کے رخصت ہونا پڑا ہے۔ اس وجہ سے کہ مجھے خوف ہے کہ آپ کہیں مجھے آج بھی نہ روک ... دوست آپ نے بہت کوشش کی کہ میں اپنے اس آوارہ گردی کے خیال سے باز رہوں لیکن دوست۔ جس کی دنیا ... ہو ... حسرت و ارمان پیوند خاک ہو گئی ہوں۔ جو دنیا میں کوئی سہارا نہیں رکھتا ہو جس کی خوشی کی دنیا غم سے بدل گئی ہو اس کا ... ہی زندگی بسر کرنا چاہیے۔

میں امید کرتا ہوں کہ آپ مجھے معاف فرمائیں گے۔

خیراندیش

راشد

میر ظہور اللہ ...
... عالیہ ...

طالب علم کے اخلاق

علم سے انسان کی اصلاح ہوتی ہے۔ علم کے حاصل کرنے کے بعد آدمی اچھے اخلاق سیکھتا ہے اور شائستہ بن جاتا ہے ... متانت، سنجیدگی، راست بازی، خاکساری، شیریں کلامی، جیسی بہترین اور نیک خصلتیں علم کی بدولت حاصل ہوتی ہیں۔ ... طالب علم کا دائرۂ اخلاق بہت وسیع ہے۔ معلم کا ادب و احترام کرنا طالب علم کا اخلاقی فریضہ ہے۔ اور انسانیت کا بھی ... حکما نے کہا ہے کہ "استاد روحانی باپ ہے جو اپنے علم سے طالب علموں کی تربیت کرتا ہے۔ اس لیے طالب علم کا فرض ... وہ اپنے حقیقی باپ کی طرح روحانی باپ یعنی استاد کی عزت و حرمت کرے"۔

استاد کی خدمت اور اطاعت کے بغیر طالب علم استاد کی علمی معلومات سے مستفید نہیں ہو سکتا۔ سچائی طالب علم کے لئے ایک ... صفت ہے جو تمام برائیوں سے بچاتی ہے۔ طالب علم کی اچھی عادتوں میں سے ایک عادت صفائی بھی ہے۔ اس کے علاوہ طالب ... اپنی کتابوں کو حسن سلیقہ سے صاف پاک رکھتا ہے اور اصول حفظانِ صحت کے ذریعہ تندرستی کو برقرار رکھتا ہے۔

... ہیں
... اخلاق طالب علم کے رگ و ریشہ میں داخل ہوجاتے ہیں اور وہ با اخلاق فرد بشر کہلانے کا مستحق
سمجھا جاتا ہے ... طالب علم بتدریج منازل ترقی کو طے کرتا ہوا زینۂ عروج پر پہنچ جاتا ہے

غلام مجتبیٰ قمر (بیدر)

شیر اور چوہا

کسی جنگل میں شیر سوتا تھا
ایک چوہا اُدھر کو آ نکلا

شیر پر کودنے لگا چوہا
فتنہ جو سو رہا تھا جاگ اُٹھا

شیر کہنے لگا پکڑ کے اُسے
مار ڈالوں گا دیکھ اب میں تجھے

یوں لگا کہنے شیر سے چوہا
بخش دیجے مجھے شہ والا

آج اگر بخش دو۔ کبھی نہ کبھی
کام آؤں گا آپ کے میں بھی

شیر چوہے پہ خوب خوب ہنسا
اور چوہے کو اُس نے چھوڑ دیا

کہتے ہیں ایک دن شکاری نے
شیر کو پھانسا دام میں اپنے

شیر گھبرا کے گڑگڑانے لگا
سر پہ سارا جہاں اُٹھانے لگا

جب کہ چوہے نے اُس کا شور سنا
بل سے اپنی وہ جھٹ نکل آیا

شیر کو دام میں جو یوں دیکھا
جلدی جلدی اُسے کترنے لگا

جال کو آن میں کتر پھینکا
اپنے محسن کو بس چھڑا ہی لیا

شکر یہ شیر جب بجا لایا
سن کے چوہے نے پھر یہ اُس سے کہا

اے شہنشاہ یہ خیال نہ کر
کہ نہیں سر بلند دست نگر

آپ ہم ہیں یہاں سبھی محتاج
آپ کل کام آئے اور میں آج

اس جہاں میں نہیں خدا کے سوا
کام جس کو نہ ہو کسی سے پڑا

دل لگی کی نہیں کہانی یہ
بلکہ عبرت کی ہے نشانی یہ

سید شاہ یعقوب حسین قادری

کسان

صبح کاذب ہے۔ آنے والے دن کا پیام ہے۔ بادِ صبا اپنی ٹھنڈی موجوں سے کھیتوں کو لہلہاتی ہے۔ شبنم اپنا موتیوں کی مالا سبزہ زاروں کے گلے میں پہنا رہی ہے۔ گلزاروں میں نسیم صبح کلیوں کو پیامِ زندگی دے رہی ہے۔ کلیوں کی آنکھیں کھلیں اور مسکراتے ہوئے چہروں سے باغ کا حسن دوبالا ہوگیا۔ پرندے سبزہ زاروں اور گلزاروں میں پیامِ زندگی کا نغمہ الاپ رہے ہیں۔ کسان اپنی نئی زندگی اور نئے دن کی تمنائیں لئے ہل کاندھے پر رکھے بیلوں کو ہانکتے ہوئے کھیت کی طرف چلا۔ مشرق کی جانب آسمان پر افق کی شعاعوں میں شباب کی رنگینیاں حسن کی فتنہ پردازیاں کسان کے خلاف سازشیں کر رہی ہیں کہ اس بھولے بھالے کو کس طرح دامِ محبت میں پھانس لیا جائے مگر وہ ان تمام چیزوں سے بے خبر اپنے کھیت پر پہونچ ہی گیا۔ اور خدا کا نام لے کر کام شروع کردیا۔ وہ اپنی محنت و مشقت کا واحد سرمایہ "اناج" خوشی خوشی خاک میں بکھیرتا ہے اور باران رحمت کی طرف نظر لگائے رہتا ہے۔ آسمان پر گھنگھور گھٹائیں چھا جاتی ہیں تو اس کی عید ہوتی ہے خوشی و مسرت کا دروازہ کھلتا ہے۔ اس کی خود اعتمادی کا حال یہ کہ اس کو اپنی قسمت اور خدا کی رحمت پر کامل یقین ہے اور اس کو اس کا یقین کامل ہے کہ وہ اپنی محنت کے پھل سے فیض یاب نہیں ہو سکتا۔ مگر خوش ہے کہ دنیا اور اس کی آنے والی نسلیں فیض پاتی ہیں۔ یوں ہی دنیا چل رہی ہے۔ اور قانون ہے کہ ایک محنت کرے اور دوسرا پھل پائے۔

محمد عبدالحکیم قریشی

احسان فراموشی

(ترجمہ)

اے موسم سرما کی تند ہوا تو چل اور نہ تھم۔ تو اس قدر تکلیف دہ نہیں ہے جیسی کہ انسان کی احسان فراموشی۔ تیرے دانت اس قدر تیز نہیں کیونکہ تو دکھائی نہیں دیتی۔ اگرچہ تیری تکلیف کا اثر ہم ضرور محسوس کرتے ہیں مگر یہ اثر دل سے بہت جلد غائب ہو جاتا ہے لیکن انسان کی احسان فراموشی کا زخم ہمیشہ دل میں رہتا ہے اور تکلیف دیتا ہے۔

دنیا کی دوستی صرف ظاہری ہے اور یہاں کے خود غرض دوستوں سے محبت کرنا حماقت ہے۔ پس آؤ خوشیاں منائیں اور گائیں ــــ یہ زندگی سب سے بہتر ہے۔

اے سخت اور نامہربان آسمان تو سرد ہوتا چلا جا مگر تو تکلیف دہ نہیں ہے۔

اے سرد ہوا تو اگرچہ ہم کو سردی میں منجمد کر دیتی ہے مگر تیرا یہ طیش اس قدر زہریلا نہیں ہے جتنا کہ ایک دوست کا احسان فراموش کر دینا۔

دنیا کی دوستی صرف ظاہری ہے اور یہاں کے خود غرض دوستوں سے محبت کرنا حماقت ہے۔ پس آؤ خوشیاں منائیں اور گائیں ــــ یہ زندگی سب سے بہتر ہے۔ (شکسپیر)

سردار النساء بیگم صدیقی

دوستوں کی دلچسپ گفتگو

حامد:۔ کہئے مزاج تو اچھے ہیں۔ آج کل کیسے گذرتی ہے۔

محمود:۔ خدا کا شکر ہے خاصی گزر رہی ہے۔

حامد:۔ خیر یہ تو اچھی بات ہے۔

محمود:۔ نہیں جی اچھی کہاں ؟ میرے والد کا انتقال ہوگیا۔

حامد:۔ افسوس یہ تو برا ہوا۔

محمود:۔ نہیں کچھ زیادہ برا تو نہیں ہوا۔ کیونکہ ترکہ میں انھوں نے میرے لئے بہت سی جائداد چھوڑی ہے۔

حامد:۔ یہ تو اچھا ہوا۔

محمود:۔ نہیں کچھ بہت اچھا بھی نہیں ہوا۔ کیونکہ جتنے مویشی والد صاحب نے چھوڑے تھے سب مر گئے۔

حامد:۔ بہت برا ہوا۔

محمود:۔ نہیں کچھ برا تو نہیں ہوا۔ کیونکہ میں نے ان مویشیوں کا بیمہ کرا رکھا تھا۔

حامد:۔ خیر یہ تو بہت اچھا ہوا۔

محمود:۔ نہیں کچھ اچھا نہیں ہوا۔ کیونکہ بیمہ کمپنی کی عمارت میں آگ لگ گئی اور ڈائرکٹر اس میں جل کر مر گیا۔

حامد:۔ اوہو یہ تو بہت برا ہوا۔

محمود:۔ نہیں کچھ برا نہیں ہوا کیونکہ میں نے ڈائرکٹر کی بیوی سے شادی کر لی۔

حامد:۔ خیر یہ تو اچھا ہوا۔

محمود:۔ کیا خاک اچھا ہوا۔ یہ عورت بڑی بد زبان اور سخت مزاج نکلی۔

حامد:۔ افسوس یہ تو برا ہوا۔

محمود:۔ نہیں جی ایسا کچھ زیادہ برا نہیں ہوا۔ کیونکہ اس کے پاس کافی دولت تھی۔

حامد:۔ خیر یہ تو بہت اچھا ہوا۔

محمود:۔ نہیں کچھ بھی اچھا نہیں ہوا۔ کیونکہ اس نے ایک دن غصہ میں گھر کو آگ لگا دی۔

حامد:۔ افسوس یہ تو بہت ہی بہت برا ہوا۔

محمود:۔ سب برا ہوا لیکن یہی تو اچھا ہوا کہ وہ کم بخت عورت بھی اسی میں جل مری اور اب اس کی ساری دولت میرے قبضہ میں ہے۔ اور اب میں عیش کرتا اور مزے اڑاتا ہوں۔

سرور ظفر

کام کی باتیں

جو شخص مجھے کسی بڑے کام سے ڈراتا ہے وہ اس شخص کے مانند ہے جو مجھے کسی امر کا مژدہ سناتا ہے۔ (حضرت علیؓ)

دنیا میں بہت بڑی مصیبتیں ہیں لیکن سب سے بڑی مصیبت تو ملی بے حرمتی ہے۔ (امرسن)

زبانی دعویٰ کرنا سہل ہے۔ مگر کام کر کے دکھا دینا ہی آدمی کی قابلیت کی آزمائش ہے۔ (رامائن)

سیدہ عظیم النساء بیگم

پرستان

خدا مجھ کو دیدے جو پر چھوٹے چھوٹے
چلا جاؤں بس میں پرستان اڑکے

وہاں جاکے پریوں کے بچوں سے کھیلوں
پرستان کی ساری چیزوں کو دیکھوں

کنارے پہ نہروں کے کھیلوں کبھی میں
تو سبزے پہ جنگل کے لوٹوں کبھی میں

مزے سے پھروں کھاتا باغوں کے میوے
اور اڑتا پھروں تتلیوں کے میں پیچھے

کبھی ساتھ پریوں کے بچوں کے ناچوں
کبھی بیٹھ کر ناچ پریوں کا دیکھوں

ابھی جو میں امرود کے پیڑ پر تھا
ابھی اڑ کے بیری کی شاخوں پہ پہونچا

جو دم میں پہاڑوں کی چوٹی پہ پہنچوں
تو اک آن کی آن میں نیچے اتروں

کبھی آسماں کی پھروں سیر کرتا
کبھی چاند تاروں کا دیکھوں تماشا

جو آئے مجھے یاد امی کی اپنی
پرستاں سے لوں راہ پھر اپنے گھر کی

میں گھر رات کے وقت چپکے سے آؤں
اسی نیم کے پیڑ پر بیٹھ جاؤں

لئے گود میں ننھی بی بی کو امّی
مری یاد میں ہوں گی چپ چاپ بیٹھی

جو پوچھے گی ننھی کہ بھیا کہاں ہے
کہیں گی کہ آنکھوں سے میری نہاں ہے

نہ جانے مرا لال کس جا گیا ہے
وہ کیوں اپنی امّی سے اتنا خفا ہے

تو بس پیڑ سے اتروں میں چپکے چپکے
گلے سے لپٹ جاؤں امّی کے جا کے

کہوں بخش دیجے قصور اب ہمارا
تو امّی یہ حاضر ہے بچہ تمہارا

لطیف النساء بیگم

سب رس ۱۹۳۸ء کی تصویروں اور مضامین کی فہرست

جنوری

- سر شیخ محمد اقبال — مقابل صفحہ ۸
- [ملک ا]لشعراء سید احمد حسین امجد — " ۱۲
- [علا]مہ سید وحید الدین سلیم — " ۵۰
- ... ابتدائی (سہ رنگی) — " ۷۲

فبروری

- [مولو]ی عبدالحق بی اے ڈی لٹ — مقابل صفحہ ۶
- ... محمود علی صفی اورنگ آبادی — " ۳۲
- ... حسن علی آزاد — " ۳۲

مارچ

- [حید]رآباد کی ایک قدیم مجلس — مقابل صفحہ ۴
- [سل]طان محمد قلی قطب شاہ — " ۲۶
- [میر ب]بر علی انیس — " ۲۶
- [س]لطان عبداللہ قطب شاہ — " ۶۰
- [مل]ک الشعراء ملا غواصی — " ۶۰
- [مر]زا غلام سجاد شہیر — " ۹۰
- [مر]زا علی جعفر جعفر — " ۹۰
- ... جنگ سرفراز — " ۹۲
- [س]ید محمد مہدی خاں مہدی — " ۹۲

اپریل

- [ڈ]اکٹر رابندر ناتھ ٹیگور — مقابل صفحہ ۶
- [مو]لوی آفتاب علی صاحب قہر — " ۴۸
- [مو]لوی محمد حسین صاحب آزاد — " ۴۸

مئی

- [ڈ]اکٹر رضی الدین صدیقی — مقابل صفحہ ۳
- ... میر حلیہ — " ۲۸
- [ن]یک نام خاں — " ۲۸

جون

- ... رنگ کی تصویر — از خاں بہادر عبدالرحمٰن چغتائی۔ مقابل صفحہ ۲
- ... صبح (نظم اقبال) — تصویر از فضل حسین جیبی " ۵۲

- ۲۵ علامہ اقبال کی دو نادر تصویریں — مقابل صفحہ ۶۸
- ۲۶ ہندوستاں ہمارا — تصویر از فضل حسین جعفی " ۱۱۲
- ۲۷ گروپ تصاویر سر اقبال / سر راس مسعود وغیرہ — " ۱۴۴

جولائی

- ۲۸ ایک اہم تاریخی گروپ — مقابل صفحہ ۴

اگست

- ۲۹ چاند سلطانہ — سرورق
- ۳۰ نواب سالار جنگ بہادر — مقابل صفحہ ۵
- ۳۱ گروپ سر اکبر حیدری و مسز سروجنی نائیڈو وغیرہ — " ۴۱
- ۳۲ محمد مرتضیٰ مرحوم — " ۴۹
- ۳۳ محمد عبدالرحمٰن خاں — " ۷۳
- ۳۴ سید رضی الدین حسن کیفی — " ۸۱

ستمبر

- ۳۵ رائٹ آنریبل ڈاکٹر سر اکبر حیدری / حیدر نواز جنگ بہادر — سرورق کے بعد
- ۳۶ گروپ جلسہ سالانہ ادارۂ ادبیات اردو — مقابل صفحہ ۴
- ۳۷ نواب مہدی یار جنگ بہادر — " ۷

اکتوبر

- ۳۸ مولوی عزیز مرزا مرحوم — مقابل صفحہ ۶
- ۳۹ آبشار جبر چپہ — " ۲۴

نومبر

- ۴۰ مرقد حضرت میر شمس الدین فیض — " ۸
- ۴۱ مرقد حضرت میر احمد علی عصر — " ۸

دسمبر

- ۴۲ پروفیسر ہارون خاں شروانی — مقابل صفحہ

افسانے قصے اور کہانیاں

۱۔ اندلس کی شہزادی ... رحمن۔ جنوری ۳۳
۲۔ ایک پیسہ رشید قریشی // ۴۹
۳۔ پشیمانی نیوراتی دیوی اہلیہ پریم چند // ۶۱ مترجمہ غلام رسول
۴۔ بی مینڈکی کی کہانی لطیف النساء بیگم جنوری ۴۷
۵۔ لال بھبکا س // ۸۷
۶۔ فطرت خان بہادر عبدالرحمن چغتائی فروری ۴
۷۔ میں اور وہ رشید قریشی // ۲۲
۸۔ حسن و دل عبدالحق // ۴۶
۹۔ کھویا ہوا گھر ر // ۵۹
۱۰۔ گاڑی بان دلاور خاں نہدوی // ۷۷
۱۱۔ سحرزدہ اکبرالدین صدیقی // ۸۱
۱۲۔ سنگم کی دیوی جلال الدین اشک مارچ ۱۰۲
۱۳۔ بیچارہ ننھی مسافر مترجمہ محمود نعیمی // ۱۰۵
۱۴۔ شام غربت کی ایک جھلک جہاں بانو بیگم ۱۱۳
۱۵۔ میرا خواب طیبہ افضل محمد خاں مارچ ۱۳۳
۱۶۔ بدلہ رشید قریشی // ۱۳۴
۱۷۔ تصویر کی قیمت صابر کوسگوی اپریل ۲۰
۱۸۔ امتحان از منشی پریم چند // ۲۵ مترجمہ گوچرن داس سکینہ
۱۹۔ جوہر کی عقلمندی ابوالحسن اپریل ۵۵
۲۰۔ سانپ اور بندر سید ابوالقاسم رضوی // ۵۸
۲۱۔ ایک آنہ بابو راجہ // ۶۳
۲۲۔ الٹا پیچ اکبر صدیقی مئی ۱۵
۲۳۔ بیوہ رشید قریشی // ۲۲
۲۴۔ دیوتا پجاری // ۲۶
۲۵۔ عید تو یہ ہے معتصمہ جمیل الرحمن // ۳۳
۲۶۔ جادو کا محل اشرف ہادی علی // ۶۲
۲۷۔ ایک سمجھ دار لڑکا ابوالعباس متقی // ۶۸
۲۸۔ احسان فراموشی کیقباد سہراب جی // ۶۳
۲۹۔ بچپن کی ایک خطرناک تفریح رضیہ زین العابدین // ۶۵
۳۰۔ قسمت بدر شکیب جولائی ۱۵
۳۱۔ بے کار سدرشن۔ مترجمہ غلام رسول جولائی ۳۳
۳۲۔ چڑیا کی کہانی سکینہ بیگم جولائی ۵۲
۳۳۔ شیخ چلی وحید الدین // ۵۴
۳۴۔ محبت میں فتح و شکست۔ مترجمہ لیس بی اعتنا۔ اگست ۱۲
۳۵۔ ہم سفر رشید قریشی // ۱۳
۳۶۔ میرا ایک دوست محمد دلاور خاں نہدوی // ۳۱
۳۷۔ کسان اکبر صدیقی // ۳۳
۳۸۔ لطیفہ مرزا محمد ارشد مختار بیگ دہلوی // ۹۵
۳۹۔ نانی اور ان کی شہ پر نواسی ارجمند ریحانہ (دہلی) // ۹۶
۴۰۔ طلسمی قالین مرزا مظفر الدین احمد ثاقب // ۹۸
۴۱۔ مردانے موتی جانی سکینہ بیگم // ۱۰۰
۴۲۔ آدم کی اولاد مخدوم محی الدین ستمبر ۴۱
۴۳۔ دولت کا نشہ معتصمہ جمیل الرحمن // ۵۴
۴۴۔ شادی مرزا ظفر الحسن // ۵۹
۴۵۔ الکن بند عن رشید قریشی // ۶۳
۴۶۔ ہماری انگریزی کی معلمہ عائشہ صغریٰ // ۶۷
۴۷۔ ایماندار لڑکا گوچرن داس سکینہ // ۶۹
۴۸۔ بڑے بول کا نتیجہ نادر ناصر نواز الدولہ // ۷۹
۴۹۔ بھوتوں کی مسجد اکبر صدیقی اکتوبر ۵۲
۵۰۔ بیوقوف سیتا دیوی مترجمہ لیس بی اعتنا اکتوبر ۵۸
۵۱۔ خاموش شہزادی امامی سلطان بارجنگ // ۸۱
۵۲۔ مچھر نے قلعہ فتح کرایا مرزا عبدالرحمن بیگ // ۸۲
۵۳۔ ہماری پڑوسن عظمت افضل خاں // ۸۶
۵۴۔ صراحی کی کہانی (خود اس کی زبانی) سید اقبال حسین اقبال // ۸۸
۵۵۔ رنگ چوں چوں چوں سکینہ بیگم // ۷۹
۵۶۔ خواب زندگی عبدالقادر سروری نومبر ۹
۵۷۔ اعتراف شکست وصی احمد // ۲۲
۵۸۔ نجمہ کے خطوط رضیہ کے نام محمد دلاور خاں نہدوی // ۲۷
۵۹۔ غریب کی دنیا عبدالستار فاروقی گلبرگہ // ۳۴
۶۰۔ مشرقی بیوی فخر الدین احمد سعید // ۳۶
۶۱۔ غائب دماغی سید منیر الدین ...
۶۲۔ عذاب اکبر صدیقی
۶۳۔ ملک خیالستان کا سیر معین الدین ...
۶۴۔ بڑھیا کی جادو (روٹیاں چھپی جائیں) سکینہ بیگم
۶۵۔ خودکشی خلیل اللہ
۶۶۔ ایک ضعیفہ کی تمنا اکبر سہیل
۶۷۔ ظفر الدولہ محمد امین رضوی
۶۸۔ دوستی کا راز محمد منیر الدین
۶۹۔ سادھو موہن لال ...
۷۰۔ ایک پر لطف واقعہ عزیز فاطمہ ...

ڈرامے

۷۱۔ مدرسہ کا وقت انور جہاں قریشی
۷۲۔ انتقام قاضی عبدالغفار ...
۷۳۔ بدگمان بیگم محمد کمال خاں
۷۴۔ موت محمد یحییٰ صدیقی ستمبر ۳۳
۷۵۔ ہمدرد طالب علم شیخ رحیم الدین
۷۶۔ ملک خوش حال کی شہزادی شیخ رحیم الدین ظہیرآبادی

مزاحیہ مضامین

۷۷۔ شادی عبدالقادر سروری
۷۸۔ جھٹکا عبدالقادر سروری
۷۹۔ بندر بھبکی مرزا عصمت اللہ بیگ
۸۰۔ یار باش مرزا فرحت اللہ بیگ
۸۱۔ ہنسی اور ظرافت مرزا عصمت اللہ بیگ
۸۲۔ ظریف اور ظرافت ام اسلم اگست
۸۳۔ تیسرا درجہ عبدالقادر سروری
۸۴۔ پرچے ظہیر الدین احمد ستمبر
۸۵۔ جھنگ والا رشید قریشی اکتوبر
۸۶۔ جوگی فال کا ہیر مرزا عصمت اللہ بیگ //
۸۷۔ فیشن سعید الدین، مترجمہ معین الدین
۸۸۔ حاجی کا مکتب عصمت اللہ نومبر ۶

۲۴۳ شیطان کی آنت پر ایک نظر — بنت شمس العلماء شاطر — لطیف النساء — اگست ۲۹
۲۴۵ کاش میں ایسا نہ کرتا — محمد کمال خاں — 〃 ۹۱
۲۴۶ نظام ساگر کی سیر — مظفر سلطانہ — 〃 ۹۳
۲۴۷ مدرسہ کا پہلا دن — سید سعید — 〃 ۱۰۲
۲۴۸ خیا بینی — محمد عبدالمنعم صدیقی — 〃 ۱۰۳
۲۴۹ ماں باپ کی اطاعت — محمد عبدالمنعم صدیقی — ستمبر ۷۳
۲۵۰ ہر چیز کے خرچ کرنے یا استعمال کرنے کا صحیح طریقہ — محمود علی — 〃 ۷۴
۲۵۱ برسات — معین الدین احمد انصاری — ستمبر ۷۵
۲۵۲ ایلورا — حبیب احمد فاروقی — اکتوبر ۱۳
۲۵۳ تنہائی — احمد علی اکبر راز قاسمی — 〃 ۵۶
۲۵۴ اتاترک مصطفےٰ کمال کا بچپن — غلام حقانی انصاری — 〃 ۷۵
۲۵۵ بری عادت — کمال خاں — 〃 ۷۸
۲۵۶ بنگال کی جرائم پیشہ آبادی — موید الدین حسن — نومبر ۳۱
۲۵۷ دریاؤں کے نام بتاؤ — میر محمود علی اکبر مشیر — 〃 ۵۸
۲۵۸ سستی — سید حسن (دار العلوم بلدہ) — 〃 ۷۱
۲۵۹ معلومات — محمد فخر الدین ارمان انگلبرگہ — 〃 ۷۱
۲۶۰ سائنس — سید بشیر الدین
۲۶۱ گنگا کا ایک نظارہ — محبوب حسن جگر — دسمبر ۴۰
۲۶۲ روٹی کی محنت — محمد امیر — 〃 ۵۷
۲۶ محنت میں صبر — مس ۔ بی ۔ فخر الدین — 〃 ۶۹
۲۶ یورپ کے مشہور حکما — منیر سلطانہ — 〃 ۷۱
۲۶ مزیا — میر ظہور اللہ خاں — 〃 ۷۲
۲۶ طالب علم کے اخلاق — غلام مجتبیٰ قمر — 〃 ۷۶
۲۶ کسان — محمد عبدالحکیم قریشی — 〃 ۷۸
۲۶ دوستوں کی دلچسپ گفتگو — سرور ظفر — 〃 ۷۹

نظمیں

۲۶ آزاد وطن کے باشندے — نوشابہ خاتون — فروری ۸۰
۲۶ فلسفۂ شہادت — احمد حسین امجد — مارچ ۲
۲۶ نفس — صدق جائسی — 〃 ۹
۲۶ دام زندگی — خواجہ حمید الدین شاہد — 〃 ۱۰۱
۲۶ سوئی کے متوالے — سری من ناراین اگروال — 〃 ۱۰۷

۲۶۴ کشمکش — میکش — مارچ ۱۰۹
۲۶۵ ایک دوست کے نام — سکندر علی وجد — 〃 ۱۱۵
۲۶۶ بچی کا پیار اکھلونا — لطیف النساء بیگم
۲۶۷ بچی کی لوری — عبدالسلام ذکی — مارچ ۱۲۲
۲۶۸ پیارے وطن کی اچھے ہو — میر سکندر علی وجد — اپریل ۔
۲۶۹ میر الجیل — سید عزیز حسن شو عابدی — 〃 ۲۴
۲۸۰ درس صداقت — میکش — 〃 ۲۷
۲۸۱ تبسم — میر حادث علی — 〃 ۲۸
۲۸۲ نوائے گل فروش — کبیر خاں کاوش — 〃 ۳۸
۲۸۳ شکست خوردہ سپاہی کے نام — عرش تیموری — 〃 ۴۵
۲۸۴ شریک زندگی — خواجہ فاروق علیخاں علی — 〃 ۴۸
۲۸۵ خاک پاک — سید احمد حسین امجد — 〃 ۴۹
۲۸۶ سینما — سید ابو القاسم سرور — 〃 ۵۷
۲۸۷ بلند ارادہ — میر کاظم علی واصل — 〃 ۵۹
۲۸۸ اچھا بچہ — لطیف النساء بیگم — 〃 ۶۱
۲۸۹ کسان — میکش — مئی ۴
۲۹۰ جنگ — مخدوم محی الدین — 〃 ۲۵
۲۹۱ مغنیہ سے — النسب کلبیانوی — 〃 ۲۷
۲۹۲ اندھیری رات — باقی — 〃 ۴۸
۲۹۳ اورنگ آباد — وجد — 〃 ۵۷
۲۹۴ چھٹی کا دن — لطیف النساء بیگم — 〃 ۶۱
۲۹۵ بچوں کی مٹھائی — سرور — 〃 ۷۰
۲۹۶ عید میلاد النبی — سلطان قلی قطب شاہ — 〃 ۷۴
۲۹۷ سبزۂ بیگانہ — عبداللہ عمادی — جنوری ۸
۲۹۸ غم اور ہم — امجد — 〃 ۱۲
۲۹۹ تو (رباعی) — امجد — 〃 ۱۲
۳۰۰ جادۂ یقین — اختر — 〃 ۱۶
۳۰۱ عبدالرزاق لاری — وجد — 〃 ۲۱
۳۰۲ مناجات — محمد قلی قطب شاہ — 〃 ۲۵
۳۰۳ ختم ماہ صیام — محمد قلی قطب شاہ — 〃 ۲۵
۳۰۴ راز زندگی — نوشابہ خاتون — 〃 ۲۶
۳۰۵ آ گئے ۔ بندے، — منصلی شرن گپت — 〃 ۲۱
۳۰۶ ٹوٹ گئے ہوئے تارے — مخدوم محی الدین — 〃 ۳۲
۳۰۷ حکایت باغ میں — عزیز — 〃 ۳۷

۳۰۸ سکون و سکوت — زیبا — جنوری ۴۳
۳۰۹ سال نو — میکش — 〃 ۴۸
۳۱۰ عقل و دل — ہاشم — 〃 ۵۴
۳۱۱ تبسم (رباعی) — راز — 〃 ۵۷
۳۱۲ شاعر کی آرزو — کاوش — 〃 ۶۰
۳۱۳ موسم سرما اور غریب — وفا — 〃 ۶۹
۳۱۴ اٹھو خدا کے واسطے — شہریار — 〃 ۷۰
۳۱۵ ماں کی گود — لطیف النساء بیگم — 〃 ۷۳
۳۱۶ اجل کا فرشتہ — سید سعادت علی — 〃 ۷۶
۳۱۷ دو پنی کا پھول — منشی دھرو دیانکار — 〃 ۸۰
۳۱۸ مقبرہ رابعہ دورانی — باقی — فروری ۱۳
۳۱۹ دو رنگی — اشفاق — 〃 ۲۱
۳۲۰ نامۂ شوق — صدق جائسی — 〃 ۲۵
۳۲۱ بیوی کی یادیں — نگین — 〃 ۳۱
۳۲۲ شاعر کی تمنا — میر عباس علی خاں — 〃 ۳۸
۳۲۳ نیا جل اور شام — سید محمد لبرد خاقانی — 〃 ۳۶
۳۲۴ چار خیار سے استفسار — وجد — ۴۴
۳۲۵ شتاج کے پھولوں میں ۔ پنڈت دہنشی دھرو دیانکار — فروری ۵۳
۳۲۶ دل کی آواز — عباس حسین نقوی — فروری ۴۵
۳۲۷ تارون کا نسیم کر (مصور) — لطیف النساء بیگم — 〃 ۵۵
۳۲۸ تھوڑا تھوڑا بہت — آزاد
۳۲۹ گئے کی سزا — لطیف النساء بیگم — فروری ۶۸
۳۳۰ ساون — باہر — 〃 ۷۸
۳۳۱ وطن کے نام — باقی — دسمبر ۲۹
۳۳۲ نظم — سعادت علی
۳۳۳ شاعر کی کائنات — دامودر پنت ذکی — 〃 ۵۲
۳۳۴ شیر ادھ چوہا — سید شاہ یعقوب حسین قادری — 〃 ۷۷
۳۳۵ پرستان — لطیف النساء بیگم — 〃 ۸۰
۳۳۶ نقشہ مزار سلطان ٹیپو بنگلور — ابو النیر مشتاق قریشی — 〃 ۳۸
۳۳۷ باغ میں صبح کا وقت — محمد معین الدین جنیدی — دسمبر ۷۱
۳۳۸ اقبال اور حیدرآباد — اقبال — جون ۸

نمبر و عنوان	مصنف	ماہ	صفحہ
۳۳۹ موت و زندگی	اقبال	جون	۸
۳۴۰ اقبال کا آخری کلام	"	"	۱۳
۳۴۱ وداع اقبال	اختر	"	۱۶
۳۴۲ حضرت اقبال	وجد	"	۱۷
۳۴۳ امت کا شب چراغ	مخدوم محی الدین	"	۳۵
۳۴۴ اقبال	ماہر القادری	"	۳۶
۳۴۵ اقبال سے	بشیر النساء بیگم بشیر	"	۴۰
۳۴۶ اقبال	شور عابدی	"	۴۸
۳۴۷ اقبال	میکش	"	۵۷
۳۴۸ اقبال	مخدوم محی الدین	"	۵۹
۳۴۹ اقبال	وجد	"	۶۱
۳۵۰ مطرب آتش نفس	جعفر	"	۸۰
۳۵۱ یاد اقبال	شاہد صدیقی	"	۸۷
۳۵۲ اقبال	کاوش	"	۹۲
۳۵۳ آہ اقبال	باقی	"	۹۸
۳۵۴ آہ اقبال	علی احمد	"	۱۰۹
۳۵۵ اشک خونیں	نوشابہ خاتون	"	۱۳۷
۳۵۶ کاشف راز حقیقت	منصور	"	۱۴۱
۳۵۷ شعرا کا نذرانۂ تحسین (انتخاب)		جون	۱۴۲ تا ۱۴۴
۳۵۸ بچے کی دعا	اقبال	جون	۱۵۱
۳۵۹ محسن قوم اقبال	لطیف النساء بیگم	"	۱۵۲
۳۶۰ پرندے کی فریاد	اقبال	"	۱۶۵
۳۶۱ اقبال کے چند منظوم مکالمے اور کہانیاں	محمد معین الدین	"	۱۶۶
۳۶۲ ماں کا خواب	اقبال	جون	۱۶۸
۳۶۳ راز	ساز	جولائی	۸
۳۶۴ ترانۂ بہار	شہید	"	۲۹
۳۶۵ پرواز تخیل	جمیلہ خاتون کلکتہ	"	۳۳
۳۶۶ برہم راگ	تقی عابدی	"	۳۵
۳۶۷ من موہن	محمد اکرام الحق صدیقی	"	۳۷
۳۶۸ اردو	جذبہ (عالم پور)	"	۳۸
۳۶۹ ریل	شبنم	"	۵۴
۳۷۰ سادگی	محمود عبد الماجد	"	۵۸

نمبر و عنوان	مصنف	ماہ	صفحہ
۳۷۱ چڑیا کی کہانی	سید موسیٰ کلیم الٰہی	جولائی	۶۳
۳۷۲ واردات	صمد ساز رضوی	اگست	۸
۳۷۳ تجدید شوق	نظر (حیدرآبادی)	"	۳۸
۳۷۴ ہیبت سلطانی	ابوالخیر مشتاق قریشی	"	۱۱
۳۷۵ اندھا	میکش	"	۱۵
۳۷۶ چاند سلطانہ	وجد	"	۱۷
۳۷۷ عثمانیہ یونیورسٹی	سید آصف الدین احمد	"	۲۶
۳۷۸ نظم	رافت	"	۴۶
۳۷۹ نظم	رسا	"	۴۸
۳۸۰ تارا	لطیف النساء بیگم	"	۹۱
۳۸۱ بالا حصار	لطیف النساء بیگم	"	۹۵
۳۸۲ کالج کی علحدگی	منیر فاطمہ	اگست	۱۰۴
۳۸۳ دیہات کی رانی	انسب کلیانوی	ستمبر	۱۹
۳۸۴ تمہاری یاد	سید سعادت علی	"	۲۲
۳۸۵ کیا کبھی ایسا بھی ہوگا	ساز	"	۳۰
۳۸۶ شباب و خواب کی دنیا	وجد	"	۳۱
۳۸۷ تجدید شباب	رشید احمد	"	۳۲
۳۸۸ غلام کی زندگی	الطاف مشہدی	"	۵۳
۳۸۹ صبح	پرویز	"	۵۶
۳۹۰ نمائندہ سلطان خاور	علی منظور	"	۵۸
۳۹۱ علم کی طاقت	محمد محی الدین جنیدی	"	۶۸
۳۹۲ ننھے سپاہی کی ننھی تلوار	متین	"	۷۰
۳۹۳ آم	مرسلہ مسز احمد	"	۸۰
۳۹۴ عروس نو کی جدائی پر	علی احمد	اکتوبر	۱۲
۳۹۵ چاند	محمد نعیم الدین صدیقی	"	۱۵
۳۹۶ کمال سلطانی	ابوالخیر مشتاق قریشی	"	۳۰
۳۹۷ شام و سحر	سید مجتبیٰ حسین نقوی	"	۴۸
۳۹۸ مزدور	مرسلہ عزیزی فاطمہ ضیاء الدین	"	۵۱
۳۹۹ بنجارن	کاوش	"	۷۰
۴۰۰ کھیل کی تلوار	لطیف النساء بیگم	"	۸۰
۴۰۱ بچوں سے باتیں	علم	"	۸۳
۴۰۲ درد قوم	قوم جعفری مچھلی شہری	نومبر	۳۹
۴۰۳ تلاش سکون	ساز	"	۵۲
۴۰۴ یاد حبیب	سلیمان ادیب	"	۵۵
۴۰۵ باغ کی سیر	لطیف النساء بیگم	"	۶۱

نمبر و عنوان	مصنف
۴۰۶ صبح کا وقت	[illegible]
۴۰۷ بہار شش	[illegible]
۴۰۸ بچہ اور پرندہ	[illegible]

سلام اور مرثیے

نمبر و عنوان	مصنف
۴۰۹ سلام	عباس [illegible]
۴۱۰ "	سید مجتبیٰ حسین نقوی
۴۱۱ "	حبیب حسین [illegible]
۴۱۲ نوحۂ مسلسل	اختر [illegible]
۴۱۳ سلام	[illegible]
۴۱۴ "	[illegible]
۴۱۵ "	کاظم
۴۱۶ مرثیہ	سلطان محمد قلی قطب شاہ
۴۱۷ "	ملا وجہی
۴۱۸ "	ملا غواصی
۴۱۹ "	غلام علی خاں لطیف [illegible]
۴۲۰ "	سلطان عبداللہ قطب شاہ
۴۲۱ "	مرزا بیجاپوری
۴۲۲ "	سید میراں ہاشمی بیجاپوری
۴۲۳ "	شاہ قلی خاں شاہی حیدرآبادی
۴۲۴ "	افضل
۴۲۵ "	مرزا حیدرآبادی
۴۲۶ "	اشرف
۴۲۷ "	قادر دکنی
۴۲۸ "	ہاشم علی گجراتی
۴۲۹ "	کاظم (انتخابات)
۴۳۰ "	ذوقی (انتخابات)
۴۳۱ "	رضی (")
۴۳۲ "	ندیم (")
۴۳۳ "	سیدن
۴۳۴ "	قائم (انتخابات)
۴۳۵ "	امامی
۴۳۶ "	منظر
۴۳۷ "	شرف
۴۳۸ "	نواب درگا قلی خاں درگاہ

مرثیہ محمد عظیم عظیم مارچ ۷۴
″ مسکین ″ ۷۵
″ ہاشم ″ ۷۶
″ محب ″ ۷۷
″ حسینی شاہجہاں آبادی ″ ۷۸
″ ندرت ″ ۷۹
میر تقی میر ″ ۸۰
سودا ″ ۸۱
مجذوب ″ ۸۲
میر مستحسن خلیق (انتخاب) ″ ۸۲
میر ضمیر ″ ۸۳
دبیر ″ ۸۴
انیس ″ ۸۵
انفیس ″ ۸۶
سلام رشید ″ ۸۷
وحید ″ ۸۸
سلام و نوحہ ناجی ″ ۸۹
…ین بر سلام انیس اشہر ″ ۹۰
…کی لڑائی کا نقشہ اشہر ″ ۹۰
مہدی ″ ۹۱
مائل ″ ۹۲
سلام و مرثیہ سرفراز ″ ۹۳
جعفر ″ ۹۴
سلام و مرثیہ مسرور ″ ۹۵
واثق ″ ۹۶

غزلیں

…ل ماہر القادری
…ات امجد امجد فروری ۶
…نے دے عزیز ″ ۶
…نیاز معین ″ ۸
…روزگار صفی (اورنگ آبادی) ″ ۳۲
…ہار مینار کی ایک غزل محمد قلی قطب شاہ ″ ۴۵
…ل قدر مارچ ۴۸
…تمنا النسب کلیانوی ″ ۱۰۴
…شق وحید ″

۴۷۳ شکریہ تقی عابدی مارچ ۱۱۲
۴۷۴ رباعیات شہید ″ ۱۲۱
۴۷۵ ذوق نظر معین اپریل ۱۹
۴۷۶ چھوڑ دے عزیز ″ ۳۱
۴۷۷ آرزوئے زلیت نجم افندی ″ ۳۱
۴۷۸ غزل بطرز فارسی صدق جائسی ″ ۱۹
۴۷۹ پوچھ لے محبت ″ ۴۱
۴۸۰ غزل صفی (اورنگ آبادی) ″ ۴۹
۴۸۱ رباعیات نوشابہ خاتون ″ ۶۰
۴۸۲ محبت سید شاہ بلیغ الدین جمیل ″ ۶۳
۴۸۳ ریختی سلطان محمد قلی قطب شاہ ″ ۴۲
۴۸۴ غزل صفی (اورنگ آبادی) مئی ۷
۴۸۵ نظر بلند عزیز ″ ۷
۴۸۶ چل دئے تقی عابدی ″ ۱۴
۴۸۷ طرز یگانہ مرزا یگانہ چنگیزی ″ ۲۱
۴۸۸ میرے لئے مرزا فرحت اللہ بیگ ″ ۲۱
۴۸۹ دیکھنے والے صدق جائسی ″ ۷۳
۴۹۰ دیکھ لینے دے مہر ″ ۷۳
۴۹۱ غزل جلیل جولائی ۷
۴۹۲ رباعی امجد ″ ۸
۴۹۳ غزل محبوب ″ ۱۴
۴۹۴ رباعیات ماہر اکبرآبادی ″ ۲۱
۴۹۵ غزل راز قاسمی ″ ۲۴
۴۹۶ ″ ابوالاثر حفیظ جالندھری ″ ۲۵
۴۹۷ ترجمہ رباعیات (عمر خیام) جہاں بانو بیگم ″ ۲۵
۴۹۸ غزل معین ″ ۲۸
۴۹۹ ″ بدر النساء بیگم ″ ۲۸
۵۰۰ مرکز خیال (ابیات) سکینہ بیگم اگست ۱۱
۵۰۱ غزل تابش دہلوی اگست ۱۶
۵۰۲ ″ نقی ″ ۱۶
۵۰۳ مشکل صمیم ″ ۲۰
۵۰۴ غزل نجم افندی ″ ۲۱
۵۰۵ رباعیات مرزا یگانہ چنگیزی ″ ۲۱
۵۰۶ غزل منصور ″ ۲۴

۵۰۷ غزل جلیل ستمبر ۶
۵۰۸ ″ ماہر القادری ″ ۶
۵۰۹ ″ ″ اکتوبر ۶
۵۱۰ ″ ہاشم ″ ۳۸
۵۱۱ ″ وحید نومبر ۸
۵۱۲ ″ عبدالجلیل ساحل نگلوری ″ ۲۶
۵۱۳ ″ وحید (نلگنڈہ) ″ ۳۰
۵۱۴ از ابعت زاہد ″ ۳۲
۵۱۵ ساقی سے (رباعیات) آغا حشر شیرازی ″ ۴۸
۵۱۶ رباعی ہمایوں مرزا دسمبر ۱۱
۵۱۷ غزل محمد طالب حسینی ″ ۱۶
۵۱۸ میری سوچ شور عابدی (کلکتہ) ″ ۱۹
۵۱۹ نظر آیا منظر صدیقی اکبرآبادی ″ ۲۷
۵۲۰ غزل عارف ″ ۳۹
۵۲۱ ″ کاوش ″ ۴۰
۵۲۲ ″ آہ ″ ۴۴
۵۲۳ دو غزلیں قیصری ″ ۶۴

تنقیدیں

۵۲۴ ضمیر سروری جنوری
۵۲۵ نظم اقبال میکش ″
۵۲۶ پریم سوگ ″ ″
۵۲۷ گولکنڈے کے ہیرے ″ ″
۵۲۸ اورنگ آباد ″
۵۲۹ تبسم پارے ″ فروری
۵۳۰ الموسیٰ ″
۵۳۱ تمدن ہند میں (دکن کا حصہ) ″ ″
۵۳۲ حیدرآباد (انجینئرنگ گزٹ) میکش ″
۵۳۳ آخری رسول ″ ″
۵۳۴ اولیائے دکن (اور قرآن) اکبر صدیقی ″

نمبر و عنوان	مصنف	ماہ	صفحہ	نمبر و عنوان	مصنف	
۵۳۵ ایشیا بابتہ اکتوبر، نومبر، ڈسمبر	پ - چ	فبروری		۵۶۰ مسلمان اور تجارت	میکش	
۵۳۶ شمس معنوی	اکبر صدیقی	مارچ	۱۳۶	۵۶۱ انکشاف	〃	
۵۳۷ المعلم حج نمبر	〃	〃	۱۳۷	۵۶۲ روزنامہ مشیر ہند	〃	
۵۳۸ فن انشا پردازی	رشید قریشی	〃	۱۳۸	۵۶۳ اردو ہفتہ وار بمبئی	〃	
۵۳۹ سخنوران بلند فکر	نصیر الدین ہاشمی	〃	۱۳۹	۵۶۴ تاریخ عدالت آصفی	اکبر صدیقی	
۵۴۰ حسن کے دونوں رخ	میکش	〃	۱۴۲	۵۶۵ مقالہ	شاہد	
۵۴۱ مجلہ طیلسانین عثمانیہ				۵۶۶ کلام نسوان	〃	جولائی
۵۴۲ ہمایوں کا مشاعرہ نمبر	میکش	اپریل	۶۶	۵۶۷ اسلامی طب	میکش	
۵۴۳ شاعر	〃	〃	۶۶	۵۶۸ طب قدیم اور طب جدید	〃	
۵۴۴ ماہنامہ شہاب	〃		۶۶	۵۶۹ علامہ اقبال	〃	ستمبر
۵۴۵ طوفان	〃	〃	۶۶	۵۷۰ نارجیلستان	〃	
۵۴۶ اسلام اور حسن خلق	شیخ چاند مرحوم	〃	۶۷	۵۷۱ عارف	〃	
۵۴۷ حکیم دکن	میکش	〃	۶۷	۵۷۲ زیب النساء	〃	
۵۴۸ ختم نبوت اور قادیانیت	〃	〃	۶۸	۵۷۳ کاک ٹیل	〃	اکتوبر
۵۴۹ تین افسانے	〃	〃	۶۸	۵۷۴ صور اسرافیل	〃	〃
۵۵۰ پرانی اور نئی تعلیم	قادری	〃	۶۸	۵۷۵ بلاغ	〃	
۵۵۱ کلام ایاز	〃	〃	۶۹	۵۷۶ زیب النساء	〃	
۵۵۲ فہرس	〃	〃	۶۹	۵۷۷ طلوع اسلام	〃	
۵۵۳ دی حیدرآباد ڈومینینس	اکبر صدیقی	مئی	۷۷	۵۷۸ مجلہ نظامیہ	اکبر صدیقی	نومبر
۵۵۴ آصفی کہانیاں	〃	〃	۷۷	۵۷۹ اربعہ عناصر	رشید قریشی	
۵۵۵ المنظور کربلا نمبر	〃	〃	۷۷	۵۸۰ ظفر کا سفر	〃	
۵۵۶ مرقع اصلاح حال	〃	〃	۷۸	۵۸۱ جوئبار	〃	
۵۵۷ پہلا شراب کار	〃	〃	۷۸	۵۸۲ باغی	قادری	ڈسمبر
۵۵۸ خیابانِ نسواں	〃	〃	۷۸	۵۸۳ نثر پاہٹ اور دو ڈرامے	〃	〃
۵۵۹ انتظام کتب خانہ	〃	〃	۷۸	۵۸۴ عدل جہانگیری	〃	

رشید قریشی

سب رس شعرا کی نظر میں

خدا کے فضل و کرم سے سب رس کا پہلا سال تقریباً ختم ہے گذشتہ دس مہینوں میں سب رس کے قدر دانوں نے طرح طرح سے اس کی ہمت افزائی کی، وقتاً فوقتاً دفتر میں ایسے خطوط اور رائیں بھی وصول ہوتی گئیں جن کے چھاپنے کے لئے ہمیں ہر ماہ سب رس کے چند صفحے وقف کر دینے پڑتے اس لئے ہم نے اب تک گریز کیا۔ اب چونکہ سال ختم ہو رہا ہے اس لئے مناسب سمجھا گیا کہ معاصر رسالوں اور اخباروں کی رایوں اور دوسرے ہمدردوں کی نظموں کا اس موقع پر انتخاب شائع کر دیا جائے، اسی لئے یہاں دس رائیں اور بارہ نظمیں شائع کی جارہی ہیں۔ سب رس کی تعریف میں بہت سی نظمیں وصول ہوئیں جن میں سے اکثر ہمارے کمسن قدر دانوں کا نتیجۂ فکر ہیں، ان میں جو شائع ہونے کے قابل نظر آئیں وہ اس وقت چھاپ دی جارہی ہیں بقیہ نہیں چھپینگی اور آئندہ کے بارے میں بھی اس امر کا اعلان کر دینا ضروری ہے کہ سب رس کے قدر دان بچے اور بچیاں سب رس کی تعریف میں نظمیں اور رباعیاں لکھنے کی جگہ دلچسپ قصے، کہانیاں یا علمی و ادبی مضامین اور نظمیں لکھ کر روانہ کریں تو بہتر ہے (سب رس)

یہہ تحفہ ہے لاجواب از بس لے لو — مرغوب دل ہر کس و ناکس لے لو

سب کا لینا تو امر ناممکن ہے — سب میں بہتر یہہ ہی کہ "سب رس" لے لو

امجد

اُردو ـ سہ ماہی اورنگ آباد ـ معتمد انجمن ترقی اُردو ـ حیدرآباد میں اُردو کی ترقی اور علم و ادب کی فراوانی کے باوجود اپنے رسائل کا ایک بڑی حد تک فقدان نظر آتا ہے۔ اس کمی کو پورا کرنے کے لئے "سب رس" نکالا گیا ہے۔ یہہ ایک ادبی رسالہ ہے جس کا مقصد یہہ ہے کہ ایسے دلچسپ اور عام فہم مضامین شائع کئے جائیں کہ جنھیں عام و خاص سب پڑھ سکیں..........

سب رس کی ایک اور خصوصیت یہہ بھی ہے کہ اس کا ایک حصہ بچوں کے لئے وقف ہے جس میں ان کی دلچسپی کے مضامین، طرح طرح کی معلومات، نظمیں، کہانیاں، پہیلیاں، لطیفے اور چٹکلے ہوتے ہیں۔ کاغذ لکھائی چھپائی بہت اچھی ہے۔ تصاویر بھی شائع کی جاتی ہیں

(اُردو اپریل ۱۹۳۸ء)

ادبِ لطیف ـ ماہنامہ لاہور۔ اڈیٹر صاحب نے مضامین کی ترتیب میں حسن ذوق کا ثبوت دیا ہے۔ تقریباً تمام مضامین نظر فریب ہیں......... رسالہ کے آخر میں بچوں اور طلبہ کے لئے بھی مضامین درج ہیں۔ یہہ تنوع رسالہ کی افادی حیثیت کو نمایاں طور پر بڑھاتا ہے۔ رسالہ میں تصاویر بھی ہیں۔

(ادبِ لطیف فروری ۱۹۳۷ء)

سب رس سب رس سب رس سب رس سب رس

سب رس ہیں کوئی ایسا ہے میٹھا کب رس
خود نسخہ کے نام سے چکاں ہے جب رس
سب کا سب رس ہی رس ہے سب رس ہیں رحیم
سب خلق ہے تر زباں کہ "سب رس سب رس"

رحیم (منشی فاضل)

المعلم - ماہنامہ حیدرآباد - ہمارے ملک کے نوجوان، اہل قلم نہایت تیزی کے ساتھ اپنے قدم میدانِ صحافت میں آگے بڑھاتے چلے جا رہے ہیں اور دامے، درمے، قدمے، سخنے، ہر طرح اردو زبان کی خدمت کرنے میں ہمہ تن مصروف نظر آتے ہیں .... سب رس کے ادارے نے بوڑھے، جوان اور بچوں کو الفاظ کے ذریعے اظہارِ خیال کا موقع دیا ہے۔ عوام کے لئے یہہ مضامین لکھے گئے ہیں، ان کے اچھے ہونے سے انکار نہیں کیا جا سکتا بہرحال بحیثیت مجموعی یہہ رسالہ بہت امید افزا ہے۔ یقین ہے کہ ہماری ریاست پر ایسا چھائے گا کہ بیرونی ملک کے عامیانہ مذاق کے رسالوں کے لئے دروازہ بند ہو جائے گا۔

المعلم (اسفندار ۱۳۴۶ف)

کیسا اچھا نام ہے تیرا	نام کے جیسا کام ہے تیرا
تیرے قصے تیرے مضموں	کیسے اچھے کیسے موزوں
سچی سچی نظمیں تیری	اچھی اچھی غزلیں تیری
پڑھتا ہے تجھ کو بچہ بوڑھا	تو ہے سب کے دل کا اجالا
جب تو آ جاتا ہے گھر پر	خوشی کی موجیں دل کے اندر
پابندی سے آتا ہے تو !	سب کے دل کو بھاتا ہے تو
چندہ کم مضمون زیادہ	شوق سے پڑھنے پہ آمادہ
تو ہے خوب موثر پرچہ	ہر گھر میں ہے تیرا چرچہ

سدا یوں ہی تو آتے رہنا
گیت ہمارے گاتے رہنا

سید اسد علی شرف
(مدرسہ عالیہ)

شاہ کار - ماہنامہ لاہور - "سب رس" ہر لحاظ سے کامیاب پرچہ ہے اور اس کے مضامین کا تنوع قابلِ داد ہے۔ ہر شخص کے مذاق کی کوئی نہ کوئی چیز مہیا کر دی گئی ہے۔ امید ہے کہ یہہ رسالہ خوب ترقی کرے گا اور پبلک اس کی سرپرستی میں کوئی دقیقہ فروگذاشت نہ کرے گی۔

(شاہ کار - سنہ ۱۹۳۸ء)

ساقی۔ ماہ نامہ دہلی "سب رس" عروسِ جمیل، لباسِ حریری کی تفیریں کر جلوہ گر ہوا ہے۔ مضامین میں ہر عمر اور ہر ذاق کے لوگوں کا لحاظ رکھا گیا ہے۔ زبان بھی جہاں تک ہوسکا آسان رکھی گئی ہے تحقیقی اور تنقیدی مضامین جمع کئے گئے ہیں حصہ نظم بھی نثر کے مقابلہ میں بے جوڑ نہیں ہے۔ یہہ غنیمت ہے کہ سیاسی اور مذہبی مضامین "سب رس" کی پالسی سے خارج ہیں۔

ساقی مارچ ۱۹۳۸ء

مریضِ جہل کے حق میں یہہ داروئے شفا ہوگا
جنھیں ہے علم کا ذوق ان کے حق میں رہنما ہوگا
بجھیں گے رات دن دیکھے جہاں میں اس کی عظمت کے
متین اپنا یہہ سب رس آگے چل کر جانے کیا ہوگا

محمد مسیح الدین خان اقبال متین

پیام۔ روزنامہ حیدرآباد۔ "سب رس" ادارۂ ادبیات کی کوششوں کا ایک ثمر نورس ہے اور ہم کو اتنی بات کے کہنے میں کوئی تامل نہیں ہے کہ یہہ ماہ نامہ اپنی خصوصیات کے اعتبار سے حیدرآباد کی موجودہ ادبی فضا میں ایک ممتاز جگہ حاصل کرنے والا معلوم ہوتا ہے۔ مضامین کا معیار بلاشبہ بلند ہے۔ حیدرآباد کے مشاہیر اہل قلم کے مضامین ماہ نامہ کے صفحات پر اہل ذوق کو دعوت فکر و نظر دے رہے ہیں۔ تاریخی، علمی اور خالص ادبی مضامین کے بعض دلچسپ نمونے ان صفحات پر نظر آتے ہیں۔ ماہنامہ کی ایک خصوصیت یہہ بھی ہے کہ اس میں چند صفحات بچوں کے لئے مخصوص کئے گئے ہیں۔ ہم تہہ دل سے اس نئے معاصر کا خیر مقدم کرتے ہیں اور امید کرتے ہیں کہ ملک کی ادبی صحبتوں میں اس کو بہت جلد ایک معیاری حیثیت حاصل ہو جائے گی

پیام۔ مورخہ ۲۵ر فبروری ۱۹۳۸ء

سب رس (ادارۂ ادبیات اُردو کا ماہ نامہ۔ شمارہ اگست ۱۹۳۸ء) ہم کو یہہ دیکھ کر خوشی ہوتی ہے کہ ملک کا یہہ نیا ماہنامہ روز بروز ترقی کر رہا ہے اور اس کی اشاعتوں کے دیکھنے سے معلوم ہوتا ہے کہ اس کے معیار کو بلند کرنے کی کوشش کامیابی کے ساتھ کی جارہی ہیں۔ پیش نظر شمارہ کے مضامین کی نوعیت پر ان مستحسن کوششوں کا اچھا اثر پڑا ہے۔ چند چھوٹے چھوٹے ظریفانہ مضامین نے بھی ان صفحات کی دلچسپی میں اضافہ کیا ہے۔ ہم اس ماہ نامہ کی ترقی کے متمنی ہیں اور یہہ امید رکھتے ہیں کہ اگر اس کی ترقی کی موجودہ رفتار قائم رہی تو وہ ایک دن حیدرآباد کا بہترین ادبی رسالہ بن سکتا ہے۔ اس کے علم دوست سرپرست ڈاکٹر زور اور اس کے قابل مدیر جناب میکش کے مذاق سلیم کو اس امر کی ضمانت ہونا چاہئے۔

روزنامہ پیام۔ بابتہ ۱۶ر مہر ۱۳۴۷ ف

شانِ ہند ۔ ہفتہ وار بمبئی ۔ رسالہ سب رس ہمارے سامنے اپنا اقبال نمبر لے کر حاضر ہے۔ باقی قبال کے طور پر چغتائی آرٹ کی رنگین تصویر متعلقہ رباعی علامہ مرحوم پیش کی گئی ہے جو نہ صرف نظر فریب بلکہ دیدہ زیب بھی ہے طباعت اور کتابت پر خاص توجہ دی گئی ہے مضامین کا معیار بہت بلند ہے۔ شاعرِ مشرق کی حیات کے مختلف پہلوؤں پر جی کھول کر بحث کی گئی ہے ۔ سرورق رنگ دار آرٹ پیپر پر ہے جو ترجمانِ حقیقت کی درویشانہ تصویر سے مزین ہے ۔ ان تمام خوبیوں کے باوصف سب رس اقبال نمبر کی قیمت ۸ھ ہے ۔

"شانِ ہند" ۱۰ر جولائی ۱۹۳۸ء

ہے زور کی کوشش کا نتیجہ سب رس
ہر علم معارف میں ہے یکتا سب رس
میکش سا مدیر جب ملا ہے اس کو
کیونکر نہ ہو پھر بلند و بالا سب رس

میر حسن علی خاں یمین

مشیر دکن ۔ روزنامہ حیدرآباد ۔ اس نمبر میں نظم و نثر مضامین کے ۴۳ عنوانات ہیں جو سب کے سب دلچسپ اور قابل مطالعہ ہیں مضمون نگاروں میں سب کے سب اچھے اہل قلم ہیں ۔ مشہور مضمون نگار خواتین کے مضامین کا بھی ایک حصہ شامل ہے ۔ مضامین کے انتخاب میں بڑی وسعت نظر سے کام لیا گیا ہے اور ہر ذوق کے مضامین خاص ترتیب کے ساتھ جمع کئے گئے ہیں جس سے پرچہ میں تنوع اور رنگارنگی پیدا ہوگئی ہے اور پرچہ ہر طبقہ کے مطالعہ کے قابل بن گیا ہے ۔

ملک کے بچوں کے مفاد کو بھی نظر انداز نہیں کیا گیا ہے ۔ ان کے لئے بھی آخر میں ۱۶ صفحوں کا ایک ضمیمہ شامل ہے جو علحدہ بھی شائع ہوتا رہے گا ۔ کارکنان ادارہ کی یہہ کوشش بے حد پسندیدہ ہے کیونکہ یہی بچے ہیں جو آئندہ چل کر ملک و قوم کے رہنما بنیں گے ۔ ہماری رائے میں اس ضمیمہ کی ہر بچے والے گھر میں ضرور رسائی ہونی چاہئے اس پرچے میں ہمیں ایک دوسری قابل ذکر اور لائق تعریف بات یہہ نظر آئی کہ ملک کی تعلیم یافتہ خواتین کو بھی اس پرچے کے ذریعے اپنے خیالات کی اشاعت کا موقع دیا گیا ہے اور بہت سے صفحات ان کے لئے وقف کئے گئے ہیں ۔

پرچے کی لکھائی چھپائی کاغذ سب عمدہ ہیں ۔

مشیر دکن مورخہ ۲۲ جنوری ۱۹۳۹ء

سب [illegible] سب [illegible] اے سب سے اچھے سب رس

تو راہبر ہمارا ممنون ہم ہیں تیرے

ہوں ہیں ذکر تیرا دفتر ہیں تیرے چرچے

یعنی ہر ایک کا تو سب پر کرم ہیں تیرے

ملکِ دکن میں تو ہو! شہرت نہ ہو تو کیونکر؟

صدہا ادیب و شاعر خادم بھی ہیں تیرے

باغ ادب میں تیرے ہر دم بہار ہی ہو!

ان کی دعا یہی ہے جو دم بہ دم ہیں تیرے

منیر سلطانہ بہآر (فوقانیہ پھلی کمان)

شاعر۔ ماہ نامہ آگرہ۔

ادارۂ ادبیات اردو حیدرآباد کی طرف سے حال ہی میں ایک بہترین ماہ نامہ شائع ہونا شروع ہوا ہے یہ اس کا [illegible]را نمبر ہے جسے محرم نمبر کے نام سے شائع کیا گیا ہے اکثر اخبارات کے محرم نمبر شائع ہوتے رہتے ہیں۔ ہمارے [illegible]ل میں رسالوں میں یہ پہلا " محرم نمبر" ہے جسے اس قدر مکمل اور احسن طریقہ پر شائع کیا گیا ہے کہ بے ساختہ [illegible] دینے کو جی چاہتا ہے۔

شاعر آگرہ اپریل ۱۹۳۸ء

ہاں باغِ ادب کا یہ ثمر ہے نورس

جو رکھتے ہیں ذوق ان کو ہی مرغوب از بس

ہیں اور بھی دنیا میں رسیلے میوے

سب کے رس اس میں ہیں یہ ہے سب رس

محمود عبدالماجد ماجد (طالب علم مدرسہ فوقانیہ محبوب گنج)

پھل ایک کرو فرض تم ایسا کہ جو ۔۔۔ جس میں کہ الگ الگ مزے کا رس ہو

بس ویسے ہی مضمون ہیں اس میں موجود ۔۔۔ سب رس نہ کہو اس کو تو پھر کیا ہے کہو

ماجد

ہندستانی. تماہی الہ آباد۔

سب رس کے ذریعے ایسا ادب پیش کرنا، جس سے انسانوں کو پہچاننے اور سماج کی نبض پر ہاتھ رکھنے کا ولولہ پیدا ہو بلاشبہ ایسا بلند مطمحِ نظر ہے، جس سے امید ہے کہ ایک طرف سماج کی ترقی میں مدد ملے گی اور دوسری طرف انسانیت کے ہمدم اور غمگسار ادیب پیدا ہوں گے۔ رسالہ اپنے قابل مدیر کی نگرانی میں اس مقصد میں خاص کامیاب ہے۔

ہندستانی۔ اپریل ۱۹۳۸ء

کس قدر خوب ہے دلکش ہے دل آرا سب رس ۔۔۔ روح پرور ہے عجب تیرا نظارا سب رس

چشم بد دور ترقی پہ ترقی ہو تجھے ۔۔۔ اور چمکے تری قسمت کا ستارا سب رس

تجھ کو ہم وطنوں کے خدمات کا حاصل ہے شرف ۔۔۔ ان کی تحریروں کا ہے تجھ میں نظارا سب رس

تجھ میں سامان ہر اک طبع کی تفریح کے ہیں ۔۔۔ تو بڑوں کو ہے پسند بچوں کو پیارا سب رس

ترے اوراق میں پوشیدہ ہے علمی دنیا ۔۔۔ دولت علم کا مخزن ہے ہمارا سب رس

نظم رنگین جو ہے، نثر بصیرت افروز ۔۔۔ اور معمے بھی ہے بجھواتا ہمارا سب رس

اک رسالہ کے لئے چاہئے جتنے جوہر ۔۔۔ پیش کرتا ہے وہ سب تیرا شمارا سب رس

آرزو ہے یہہ دعا ہے، یہہ تمنا اپنی! ۔۔۔ نجم گھر گھر نظر آئے یہہ ہمارا سب رس

احمدالدین نجم حیدرآبادی (مرہٹیہ)

تمنا ہے کہ اردو کا بیاں سب رس سے ہو

اردو کو سدا ہند میں سب رس میں بنا دوں　　تحدید زباں کی ہے جو بنیاد ہلا دوں

عالم میں جو خاموشی ہے اک دھوم مچادوں

سب رس کی تمنا ہے یہ سب رس کی تمنا

پھر ہند میں پیغام سخن سب کو سنا دوں　　پھر علم کے دریا بھی دکن ہی سے بہا دوں

اک شور سے سوئی ہوئی دنیا کو جگا دوں

سب رس کی تمنا ہے یہ سب رس کی تمنا

سید مرتضیٰ مجتہدی (نظام آباد)

ہے زور کا احسان دکن والوں پر — مشہور یہی ہر کس و ناکس میں ہے

میکش کی رگوں میں تھی جو بجلی رقصاں — وہ بن کے شراب علم "سب رس" میں ہے

گل ہائے مضامین و خیالات کا رس — شاہد ہو مری آنکھ کہ "سب رس" میں ہے

ہر سانس مری لے کے نکلتی ہے شمیم — اب سارا گلستاں مرے بس میں ہے

شمیم

نشان ٹپہ آصفیہ ۱۵۲
نشان ٹپہ برطانیہ (M 3950)

اِدارۂ ادبیاتِ اُردو حیدرآباد دکن

کا

ماہ نامہ

سب رس

بابت مئی ۱۹۳۹ء یعنے جلد (۲) شمارہ (۵)

زیر نگرانی

ڈاکٹر سیّد محی الدّین قادری زورؔ

مجلسِ ادارت

صاحبزادہ میر محمد علی خان میکشؔ
سکینہ بیگم
خواجہ حمید الدین شاہدؔ
معین الدّین احمد انصاری

مکتبہ ابراہیمیہ پریس میں طبع ہوکر دفتر ادارہ "رفعت منزل خیریت آباد" سے شایع ہوا
سالانہ چندہ (للعہ) علاوہ محصول ڈاک فی پرچہ چھ آنے

جلد (۲) شمارہ (۵) | سب رس | مئی ۱۹۳۹ء

فہرست مضامین

نمبر	مضمون	مصنف	صفحہ
۱	اداریہ	ادارہ	۵
۲	مسافر (نظم)	مسعود الحسن تابش	۷
۳	مغربی خواتین	انیسہ ہارون بیگم شیروانیہ	۹
۴	پیرس (تعلیمی سفر یورپ)	مسز صوفی ایم [illegible] اے	۱۲
۵	معاشرت میں سادگی	مرزا سیف علیخاں	۴
۶	غزل	صفی اورنگ آبادی	۱۶
۷	شاعر کا گناہ (افسانہ)	صابر کوسگوی	۱۷
۸	مرکز خیال	سکینہ بیگم	۲۲
۹	گزرے ہوئے لمحات	عبد الحمید (علی گڑھ)	۲۳
۱۰	آرزو والے ناکام (غزل)	اعجاز صدیقی مدیر "شاعر" (آگرہ)	۲۴
۱۱	مطالعۂ قدرت کی اہمیت کے متعلق جدید علماء کے خیالات	پروفیسر محمد سعید الدین	۲۵
۱۲	بہن کی یاد (نظم)	انسب کلیانوی	۲۶
۱۳	دیس سیوا	سید خلیل اللہ حسینی	۲۷
۱۴	رنگ زمانہ (غزل)	عزیز اللہ عزیز (بنگلور)	۲۹
۱۵	جواب تنقید	علی منظور	۳۰
۱۶	مسولینی کی صحت	ہمایوں بخت	۳۶
۱۷	دل کی دنیا (غزل)	بشیر النساء بیگم بشیر	۳۷
۱۸	تیج پیدا کرنا	ڈاکٹر سید محی الدین قادری زور	۳۸
۱۹	نیری (نظم)	سلیمان ادیب	۴۰
۲۰	دولت کی تقسیم	پروفیسر ضیاء الدین انصاری	۴۱
۲۱	غزل	شاد عارفی (رام پور)	۴۴
۲۲	تنقید و تبصرہ	عبد القادر سروری، بدر شکیب، مرزا سیف علیخاں	۴۵
۲۳	اردو کی جدید مطبوعات	مرزا سیف علی خاں	۴۶
۲۴	فریب	احمد علی اکبر راز آبادی	۴۷
۲۵	غزل	مسیح الحسن آقا نقوی بخاری	۴۸
۲۶	نذر اقبال	محمد امیر امیری، اے بی ٹی اورنگ آبادی	۴۹
۲۷	اقبال اور فلسفہ	ابو الفتح نصر اللہ برقی	۵۰
۲۸	نوحۂ غم	محمد مظہر الدین صدیقی	۵۲
۲۹	اقبال (نظم)	پروانہ بریلوی	۵۵
۳۰	بچوں سے	معین الدین احمد انصاری	۵۵
۳۱	پہیلیوں کے حل	خشاین اصحاب	۵۸
۳۲	معمۂ اقبال	معین الدین احمد انصاری	۵۸
۳۳	موسم گرما	محمد فخر الدین ارمان (گلبرگوی)	۵۸
۳۴	ہندوستاں ہمارا (نظم)	مسز برکت [illegible]	۵۹
۳۵	ستا کھانا	(ماخوذ از رسالہ "ہل")	۶۰
۳۶	کون ہیں!	" " "	۶۰
۳۷	بر ہٹلر	سید عابد حسین	۶۱
۳۸	تربیت طفلی کے نقائص	ممتاز ابیت الرحیم	۶۱
۳۹	اتفاق	سید حسین	۶۳
۴۰	پروردہ لڑکیاں	سلطانہ صبیحہ مؤید الدین حسن	۶۴
۴۱	اقبال کے کلام میں بچوں کا حصہ	مسز ہاشمی	۶۵
۴۲	سر محمد اقبال	سید صفدر حسن نجف	۶۶
۴۳	اقبال بچوں کے لئے	یادو راج	۶۷
۴۴	سر محمد اقبال	سید ریاض الحسن	۶۹
۴۵	اقبال بحیثیت معلم اخلاق	محبوب خاں یوسف زی	۷۰

ضروری اطلاعیں

(۱) **سب رس کے گذشتہ سال کے پرچے** ہمیں نومبر اور ڈسمبر ۱۹۳۸ء کے مزید چند پرچوں کی ضرورت ہے جو صاحب علمی
براہ کرم دفتر کو مطلع فرمائیں۔ اصل قیمت پر پرچے خرید ے جائیں گے۔
سب رس کا گزشتہ سال کا فائل مکمل نہیں ہے اور وہ اس کو مکمل کرنا چاہتے ہیں تو دفتر سے مراسلت کریں۔ اگر ممکن ہو تو
کرکے ان کے فائل کی تکمیل میں مدد دے گا۔

(۲) **کتاب گھر** ادارۂ سب رس کی خواہش ہے کہ علم و ادب کا ذوق رکھنے والوں کے لئے ہر طرح کی علمی و ادبی سہولت
سب رس کتاب گھر میں جو کتابیں موجود نہیں رہتیں ان کو بھی کسی نہ کسی طرح سے فراہم کرنے کی کوشش کی جاتی ہے
اصحاب اپنی ضرورت کی کتابیں بے تکلف سب رس کتاب گھر کے توسط سے حاصل کر سکتے ہیں۔

(۳) **رقمی دادو ستد** ادارے کے بڑھتے ہوئے کاروبار کی وجہ سے مختلف اصحاب اس کے کاموں میں ہاتھ بٹا رہے ہیں اور سب رس کا چندہ اور ادارۂ ادبیات
کی کتابوں وغیرہ کی قیمت بھی وصول کر رہے ہیں۔ اس سلسلہ میں علم دوست اصحاب کو مشورہ دیا جاتا ہے کہ وہ ادارہ سے
ادا کرتے وقت ادارہ کی مطبوعہ نمبری رسید ضرور حاصل کریں تاکہ ادارہ کے حسابات میں دقتیں نہ پیدا ہوں۔ دفتر سے اسی رقم کی ذمہ داری
مطبوعہ رسید جاری کی گئی ہے۔

(۴) **ایجنٹوں کی ضرورت** سب رس اور بچوں کے سب رس اور ادارۂ ادبیات اردو کی کتابوں کے لئے مختلف شہروں اور تعلقوں
ضرورت ہے جن کو کافی کمیشن دیا جائے گا اور ہر قسم کی سہولتیں فراہم کی جائیں گی۔ ایجنسی کے تفصیلی شرائط

(۵) ادارۂ ادبیات اردو کی نئی کتابیں **عاصمہ** ایک دلچسپ اور مفید معاشرتی ناول جس میں ڈیوڑھی کی اک کنیز کے واقعات زندگی
ترقی پسند نظریوں کے مطابق قلمبند کئے گئے ہیں۔ مصنفہ مولوی ابوالظفر موید الدین حسن صاحب

(۶) **من کی بپتا** صنف نازک کی ضرورتوں اور زندگی کی تلخیوں کے متعلق معرکتہ آلارا مشورے از لطیف النسا بیگم صاحبہ

(۷) **نذر دکن**۔ دکن کے متعلق خواتین دکن کے شگفتہ ادبی اور تاریخی مضامین اور نظمیں مجلد باتصویر بڑی سائز صفحات (۱۱۲) قیمت عہ

(۸) **محرم نامہ**۔ سانحہ کربلا کے متعلق مضمونوں، مرثیوں، سلاموں، نوحوں اور تصویروں کا عظیم الشان مجموعہ بڑی سائز صفحات (۱۰۴) قیمت عہ

(۹) **نظام الملک آصف جاہ اول** اس مختصر کتاب میں نظام الملک آصف جاہ اول کے مجمل حالات مستند واقعات زندگی نہایت سلیس
شگفتہ زبان میں تحریر کئے گئے ہیں۔ ادارہ دوسرے سلاطین آصفی کے سوانح حیات بھی تیار کر رہا ہے۔
اس کتاب کو اس سلسلے کی پہلی کڑی سمجھنا چاہئے۔ مصنفہ مولوی شیخ چاند مرحوم ام۔ اے۔ قیمت صرف ۴ر

(۱۰) **روح غالب** غالب کی حیات اور کارناموں کی ایک مجمل سرگزشت اور ان کے اردو خطوط کے دلچسپ ادبی حصوں کا انتخاب۔
کتاب کا پیش لفظ نواب مہدی یار جنگ بہادر ام۔ اے (کیمبرج) صدر المہام تعلیمات و معین المہام
فرمایا ہے۔ مرتبہ ڈاکٹر سید محی الدین صاحب قادری زور ام۔ اے، پی۔ ایچ۔ ڈی (لندن) پروفیسر ادبیات اردو جامعہ عثمانیہ صفحات
معہ تصاویر قیمت (عہ)

اداریہ

اس مہینے اردو دنیا نے شاعرِ مشرق علامہ اقبال مرحوم کی برسی ہر جگہ خاص اہتمام سے منائی۔ اپنے محسنوں کی یاد تازہ رکھنا اور ان کی حیات اور کارناموں سے بصیرت حاصل کرنا ہر زندہ قوم کا اولین فریضہ ہے۔ سب رس نے گزشتہ سال نہایت قلیل عرصہ میں اس شاعرِ مشرق کے شایانِ شان اقبال نمبر شایع کرنے کی سعادت حاصل کی تھی جو توقع سے زیادہ مقبول ہوا اور اب تک اس کی مانگ جاری ہے۔ اگرچہ اب اس کے بہت کم نسخے باقی رہ گئے ہیں۔ اس غیر معمولی قدردانی کے پیشِ نظر ادارۂ سب رس اقبال مرحوم سے متعلق عنقریب ہی ایک مستقل کتاب "نذرِ اقبال" شایع کرنے والا ہے جس میں اقبال نمبر کے اکثر بہترین مضمونوں اور نظموں کے علاوہ متعدد نئے مضمون، تصویریں اور نظمیں جو خاص اہتمام سے تیار کرائی گئی ہیں شامل رہیں گی۔ ان کے علاوہ اب تک اردو رسائل وغیرہ میں حضرت اقبال پر جو بہترین ادب شایع ہوا ہے ان کے منتخبات بھی اس "نذر" میں شریک رہیں گے۔ توقع ہے کہ یہ کتاب خاص آب و تاب کے ساتھ شایع ہو سکے گی۔ زیرِ نظر شمارہ کا ایک حصہ بھی حضرت اقبال کے متعلق چند مضامین کے لئے وقف کر دیا گیا ہے۔

ناظرین سب رس کے اضافۂ معلومات کے لئے "دولت کی تقسیم" (جو اس شمارہ میں پیشِ نظر ہے) جیسے مضمونوں کی خاص طور پر ضرورت ہے۔ ادارہ مولوی ضیاء الدین صاحب انصاری کا شکریہ ادا کرتا ہے کہ انھوں نے ہر شمارہ کے لئے اس قسم کی معلومات بھیجنے کا وعدہ کیا ہے۔ سب رس میں معلوماتِ جدیدہ اور زمانہ کی رفتار سے متعلق دلچسپ اور مفید مضامین شکریہ کے ساتھ شایع ہوتے رہیں گے۔ کیونکہ ادب اور زندگی کی جدائی قوم کو ذہنی زوال کی طرف مائل کر دیتی ہے۔ بڑے شاعر اور باکمال ادیب وہی ہوتے ہیں جو زمانہ کے رجحانات اور ماحول کے حالات سے متاثر ہو کر اپنے رشحاتِ قلم میں بروقت تبدیلی کرتے رہتے ہیں۔ جو لوگ قدیم ڈگر سے ہٹنا نہیں چاہتے اور ترقی پسند نظریوں اور اصولوں سے ناواقف رہتے ہیں ان کی تحریر بے اثر ہوتی ہے۔ ان کی ساری شاعری اور انشا پردازی لکیر کی فقیری سے زیادہ اہمیت نہیں رکھتی۔ جو لوگ اب تک اردو زبان اور ادب کو میر و سودا، ناسخ و آتش، یا امیر و داغ کے زمانہ کے معیار سے جانچنا چاہتے ہیں وہ اردو کو ترقی کی بجائے تنزل کی طرف لے جانا چاہتے ہیں۔ وہ دریا کی روانی کو روک کر پانی کو گدلا رکھنا پسند کرتے ہیں۔ وہ فطرت کے خلاف عمل کرنا چاہتے ہیں۔ زبان اور ادب بے جان پہاڑ نہیں ہیں جو زمانہ کی گردشوں اور موسموں کی نرمیوں یا سختیوں کو ایک ہی طرح کھڑے جھیلتے رہیں۔ یہ انسانوں کے حالات و خیالات کے ساتھ خود بھی بدلتے رہتے ہیں۔ اور اپنی موجوں کی طغیانیوں کے مقابلہ میں کسی کی پروا نہیں کرتے۔

زیرِ نظر شمارہ میں حضرت علی منظور کا ایک مضمون "جوابِ تنقید" کے عنوان سے شایع ہو رہا ہے۔ یہ عرصہ تک شایع نہ ہو سکا کیونکہ سب رس سوال و جواب اور بحث و مباحثہ کے ذریعہ ہنگامہ آرائی نہیں کرنا چاہتا حالانکہ وہ جانتا ہے کہ بقول غالب ؎ ایک ہنگامہ پہ موقوف ہے گھر کی رونق۔ رونق اور سستی مقبولیت حاصل کرنے کے لئے خواہ مخواہ جھگڑے پیدا کرنا سب رس کے مسلک کے خلاف ہے۔ لیکن حضرت منظور کے تلامذہ کے بار بار اصرار کرنے اور یقین دلانے پر کہ یہ مضمون جو شہاب کی کسی تنقید کے جواب میں لکھا گیا پہلے شہاب ہی میں اشاعت کے لئے روانہ کیا گیا تھا اور ایک عرصہ کے بعد واپس ہوا ہے اب سب رس میں شایع کیا جا رہا ہے۔ بہتر تو یہ تھا کہ یہ اسی پرچہ میں چھپتا جس میں تنقید شایع ہوئی تھی۔

ادارۂ ادبیات اردو اس امر کی خاص طور پر کوشش کر رہا ہے کہ علوم وفنون کو عام کیا جائے اور بڑے بڑے موضوعوں پر
چھوٹی چھوٹی کتابیں شایع کی جائیں جن میں طلبہ اور کم علم اصحاب کے لئے مجمل اور ضروری معلومات صاف اور سادہ زبان میں [illegible]
پیش کی گئی ہوں۔ وہی ادب زیادہ مفید ہے اور وہی ادیب اور شاعر قابل مبارک باد ہیں جو اپنی قوم کے زیادہ سے زیادہ [illegible]
پہنچا سکتے ہیں۔ اب وہ زمانہ نہیں رہا کہ زبان یا ادب کو کسی خاص طبقہ یا حلقہ تک ہی محدود رکھا جائے اور اس سے [illegible]
والے چند نفوس خاص اہل ذوق یا کسی مخصوص شہر یا حصۂ ملک کے رہنے والے ہی ہوں۔ اب ہر قسم کی بندشیں [illegible]
ہیں اور اکثر کاموں کا عوام کے فائدے اور سب کی دلچسپی کے لئے ہونا ضروری ہے۔ حضرت نظام الملک آصفجاہ اول پر [illegible]
بہت کچھ لکھا جا چکا ہے لیکن کوئی ایسی کوشش اب تک منظر عام پر نہ آسکی جو طلبہ اور عوام کی ضرورت کو پیش نظر رکھ کر [illegible]
شیخ چاند مرحوم نے شاید اسی غرض سے اس کام کا آغاز کیا تھا۔

ان کی کتاب نظام الملک آصفجاہ اس مہینے ادارہ کی طرف سے شایع کر دی گئی ہے اور دوسرے سلاطین آصفیہ کے [illegible]
بھی علیحدہ علیحدہ کتابی صورت میں شایع کئے جا رہے ہیں۔

حضرت نظام الملک آصفجاہ اول پر یہ چھوٹی سی کتاب نہ صرف اس لئے اہم ہے کہ اس میں سلطنت آصفیہ کے قابل احترام [illegible]
درج ہیں بلکہ اس لئے بھی کہ یہ مرحوم شیخ چاند ایم۔ اے۔ ال ال بی ریسرچ اسکالر کی آخری تحریروں میں سے ہے اور پہلی دفعہ شایع ہو [illegible]
توقع ہے کہ مدرسوں کے طلبہ اور تاریخ سے عام دلچسپی رکھنے والوں کے لئے یہ کتاب مفید ثابت ہوگی۔

شعبہ زبان کی خواہش پر دکن کی کہاوتوں اور محاوروں وغیرہ کو جمع کرنے کا کام شروع ہو چکا ہے اور بعض اصحاب نے [illegible]
جمع کر کے بھی روانہ فرمائی ہیں جن میں مولوی محمد جمال الدین حیدر صاحب کی فہرست نہایت مفصل اور باضابطہ حروف تہجی کے لحاظ سے مرتب
کی ہوئی ہے۔ ہم صاحب موصوف کی اس علمی دلچسپی اور نفیس ذوق کی داد دئے بغیر نہیں رہ سکتے۔ دکنی محاوروں اور کہاوتوں وغیرہ کے
علاوہ دکنی گیتوں اور قصوں اور کہانیوں کو بھی جمع کرنے کی ضرورت ہے۔ جو اصحاب اس کام میں ادارہ کا ہاتھ بٹا سکتے ہیں وہ [illegible]
نہ فرمائیں۔ شکریہ کے ساتھ ان کا مرسلہ مواد سب رس میں شایع کیا جائے گا۔ یہ کام کسی ایک شخص کے کرنے کا نہیں ہے اور [illegible]
ملک کے ہر حصے میں ایسے صاحبان ذوق موجود ہیں جن کی علمی وادبی وملکی دلچسپی سے توقع ہے کہ بڑے بوڑھے لوگوں اور [illegible]
خاتونوں سے فرمایش کر کے گیتوں اور کہانیوں وغیرہ کو قلمبند کرالیں گے یا ان سے پوچھ کر اور سن کر خود ہی قلمبند کر کے روانہ فرمائیں گے۔

اس ماہ نواب عزیز یار جنگ بہادر کی صدارت میں شعراء و مصنفین دکن کے شعبے کا جلسہ ہوا جس میں [illegible] تجاویز
منظور ہوئیں۔ جن میں سے حسب ذیل سب رس کے ناظرین کی معلومات کے لئے درج ہیں۔

(۱) مولوی میر سعادت علی صاحب رضوی نے دایرۂ میر مومن صاحبؒ میں مدفون شعراء میں سے (۱۱) کی قبروں کا پتہ

شیخ چاند مرحوم ایم - اے، ال ال - بی (عثمانیہ)

جاکر ان کی فہرست پیش کی جس کے متعلق یہ طے ہوا کہ منجانب ادارہ سررشتہ امورِ مذہبی کو توجہ دلائی جائے کہ ان کے ورثا وغیرہ کے ذریعہ ان شعرا کی قبروں پر ان کے نام سنہ ولادت و سنہ وفات کے کتبے لگائے جائیں۔

(۲) حضرت شاہ سراج اورنگ آبادی کے مزار پر منجانب ادارہ کتبہ لگایا جائے۔

(۳) گنبد حضرت شاہ راجو قتال اور قبرستان قطبی گوڑہ میں جو شعرا و مصنفین مدفون ہیں ان کا پتہ چلایا جائے۔ مولوی سروری صاحب نے اول الذکر اور مولوی میر سعادت علی صاحب نے آخر الذکر کام اپنے ذمہ لیا۔

(۴) جلال الدین صاحب توفیق اور حفیظ الدین صاحب پاس کی قبروں کا بھی پتہ چلایا جائے اور ان کے ورثا کو کتبے لگانے کے لئے توجہ دلائی جائے۔

(۵) مرقع سخن کی تیسری جلد کے لئے مولوی میر سعادت علی صاحب نے تقریباً ایک سو شعرا کی فہرست مرتب کر کے پیش کی اس کے متعلق قرار پایا کہ اس فہرست کو سب رس میں چھاپ کر پبلک سے درخواست کی جائے کہ اگر ان شعرا کے حالات و ان کا کلام کسی کے پاس ہو تو ادارے کو اس سے مطلع کر کے شکریے کا موقع دیں۔

(۶) داعی شعبہ مولوی سید محمد صاحب نے اب تک جن مشاہیر شعرا کی قبروں پر ادارہ کی طرف سے کتبے لگائے گئے ہیں ان کی تفصیل پیش کی اور شعبہ نے اس کام کے سلسلہ میں ان کا شکریہ ادا کیا۔ (دوسرے شعبوں کی روداد آئندہ مہینے شائع ہوں گی)

"ادارہ"

مُسافر

آخرِ شب تھا طلوعِ صبح کے آثار تھے　　تیرگی کے بھیس میں انوار ہی انوار تھے

ہر ستارہ پر گماں ہوتا چراغِ طور کا　　آسماں پر موجزن تھا ایک دریا نور کا

نور و ظلمت سے زمین و عرش کے پست و بلند　　بڑھ کے بام ہر نظر پر ڈال دیتے تھے کمند

شیشۂ احساس کر دیتا تھا اکثر پاش پاش　　قلبِ گیتی کے دھڑکنے سے فضا کا ارتعاش

شرحِ ہستی کے لئے ذروں نے کھولی تھی زباں　　دن کے ہنگاموں کی تھی شب کی خموشی داستاں

زندگانی کے لئے تھے عشرت و غم کی اساس　　تنگ گلیوں کی اداسی شاہراہوں کا ہراس

اضطراب و کرب سے کروٹ بدلتے بار بار　　مفلسوں کی بے زری سرمایہ داروں کا وقار

اہلِ مطلب جا چکے تھے کارواں در کارواں　　شاہدِ ذوقِ طلب تھے جن کے قدموں کے نشاں

کر چکے تھے اہلِ دنیا کے گناہوں کا شمار　　تیرگیٔ شب کے پردہ میں خطوطِ رہ گذار

نشر کرتی تھی سکوتِ شب میں ہر جانب فضا　　دن کی پامالی سے ذروں کے سسکنے کی صدا

اک مسافر یک بیک آیا نظر جاتا ہوا
اپنے قدموں سے سکوتِ شب کو ٹھکراتا ہوا

تمکنت سے گامزن تھا اک رہِ خاموش پر | جرأتِ منزل قدم میں، بارِ ہستی دوش پر
ہر خطِ ابروئے عروسِ شب کی زلفِ مشکبار | حسنِ سلمائے سحر لوحِ جبیں سے آشکار
شکل و صورت دیکھنے سے خضر کا ہوتا گماں | انقلاباتِ جہاں نے رخ پہ چھوڑے تھے نشاں
سہہ چکا تھا خوب رنجِ راہِ عمرِ بے ثبات | ہر نفس تھا رہ گزارِ چشمۂ آبِ حیات
منکشف ہوتی تھی ہر قدسی کی تحریرِ جبیں | غیب کے در باز کرتی تھی نگاہِ دوربیں
بارہا حل کر چکا تھا عقدۂ ذات و صفات | گوشِ جاں سے سن چکا تھا جنبشِ نبضِ حیات
نقشِ پا میں جذب تھے پست و بلند افلاک کے | گرمیٔ رفتار سے تھے ہر ذرے خاک کے
راستہ دشوار تر تھا پھر بھی فرشِ راہ تھا | اضطرابِ شوقِ پیہم ہی شگوں آگاہ تھا
رہنمائی کر رہے تھے آرزوؤں کے چراغ | رہگذر کے پیچ و خم تھے قربِ منزل کا سراغ

فرطِ امید و رجا سے اشک جاری ہو گئے
پاس منزل کے پہنچ کر پاؤں بھاری ہو گئے

بزمِ ہستی سے چلا تھا، بزمِ ہستی چھوڑ کر | یک بہ یک دیکھا نگاہِ یاس سے منہ موڑ کر
بزمِ ہستی میں نظر آئے بصد جوش و خروش | جنتِ ہستی مناظر اور جلوے خلدِ ہوش
پھر نظر آنے لگے الفت کے رنگا رنگ خواب | پھر تصور سے اتاری ایک تصویرِ شباب
پھر حصولِ ہوش کی تھیں مستیوں میں کوششیں | پھر خرد نے کسب کر لی تھیں جنوں کی شورشیں
پھر نیازِ عشق کو شوقِ جبیں سائی ہوا | پھر حدیثِ حسن کا عنوان رسوائی ہوا
پھر محبت، دشمنی تھی انجمن در انجمن | پھر فریبِ دوستی دیتے تھے احبابِ کہن
پھر بعنوانِ عنایات و کرم آزار تھے | پھر عزیز و اقربا الفت کے دعویدار تھے
پھر غم و عشرت سے لذت گیر تھے کام و زباں | پھر احاطہ نفس کا کرتے تھے انعامِ جہاں
پھر حیاتِ مادی سے بڑھ چلا تھا ارتباط | پھر ہوس نے ڈال دی تھی طرحِ ایوانِ نشاط

ہو چکی تھی صبح لیکن رہگذر بے نور تھی
پھر جو دیکھا جانبِ منزل تو منزل دور تھی

مسعود الحسن تابش

یورپین خواتین اور ان کی تہذیب و معاشرت کی بابت بہت سی باتیں ہم عمر بھر سنتے رہے۔ اور آئے دن اخبارات میں
مضامین اور تنقیدیں ان کی بابت پڑھتے رہتے ہیں۔ اس لیے مغرب میں جا کر بعض یورپین ممالک دیکھنے کے بعد جو ذاتی
ات اس بارے میں پیدا ہوئے ان کا لکھنا غالباً دلچسپی سے خالی نہ ہوگا۔

یورپین خواتین میں بہت سی صفات و عادات مشترک پائے جاتے ہیں جو تمام یورپ میں یکساں موجود ہیں۔ لیکن بعض مخصوص
ریں ہیں جو مختلف ممالک میں مقامی حالات سے تعلق رکھتی ہیں۔ اس وقت زیادہ تر یہاں ان کی مشترک خصوصیات کا ذکر کیا جائے گا
قریباً تمام خطۂ یورپ کی بیبیوں میں پائی جاتی ہیں۔

مغربی خواتین کا ایک نمایاں امتیاز یہ ہے کہ ہر جگہ ہر بات میں یہ مردوں پر فوقیت لے جانا چاہتی ہیں۔ اور کشمکش حیات میں
ہ مردوں سے آگے نظر آتی ہیں۔ سیر و تفریح میں کاروبار میں تعلیم و تنظیم میں مردوں سے سبقت لے جانے کے لئے ہر وقت
شاں رہتی ہیں۔ یہاں کا مقتضائے تہذیب یہی ہے کہ مرد عورت سے رفتار میں دو قدم پیچھے رہے۔ اگلی سیٹ یہاں ہمیشہ عورت کے لئے
لی یعنی صدر مقام پر عورت بیٹھے گی۔ اور پچھلی مرد کے لئے۔ مرد اس سے پیچھے رہے گا۔ مرد کا ایک فرض یہ بھی ہے کہ عورت جس وقت
ٹ پہنے تو وہ اس کی مدد کرے۔ یعنی اس کو کوٹ پہنائے۔ بال روم میں اگر کسی لڑکی سے کوئی مرد آکر رقص کی درخواست نہ کرے تو
کی توہین ہو جائے گی۔ غالباً اسی لئے یہاں عورتوں میں احساس برتری پیدا ہو گیا ہے۔ اور وہ ہر لحظہ مردوں سے بازی لے جانے کی کوشش
مصروف رہتی ہیں۔

اوسط اور ادنیٰ طبقہ کی مستورات کبھی مردوں کی محتاج رہنا پسند نہیں کرتیں بلکہ ہمیشہ اپنے لئے خود روزی پیدا کرتی ہیں۔
کارخانوں میں دوکانوں میں ہوٹلوں میں ڈاک خانوں میں اسٹیشنوں میں غرض ہر جگہ مردوں سے زیادہ تعداد میں عورتوں کو برسرکار
پایا جائے گا۔ یورپین ممالک کے کاروبار میں عورتوں کی اتنی اہمیت دیکھ کر ہم ہندوستانیوں کو ایک اچنبا سا ہو جاتا ہے۔ مگر امر واقعہ
ہے۔ ایک مرتبہ میں نے سوئیزرلینڈ کے ایک گاؤں میں رہنے والی خاتون سے دریافت کیا کہ آپ لوگوں نے اپنے مردوں کے لئے بھی کوئی
چھوڑا ہے یا نہیں؟ انھوں نے جواب دیا کہ ہاں۔ دفتری کام ہمارے یہاں صرف مرد ہی کرتے ہیں۔ میں نے حیرت سے کہا کہ آپ کے
دوں کے تو دفتروں اور کارخانوں میں بھی عورتوں ہی کی ریل پیل نظر آتی ہے۔ شاید گاؤں میں اس قسم کا تقسیم کار ہوتا ہوگا۔ بچے یہاں
خاندان میں زیادہ نہیں پائے جاتے۔ اکثر ایک دو یا زیادہ سے زیادہ چار ہوتے ہیں۔ شاذ و نادر اس سے زیادہ۔ یہ بحیثیت بیوی کے اپنے
ہر سے جب تک رضامند رہے اس پر جان و دل سے فریفتہ ہوتی ہے۔ اور چونکہ غیر معمولی شکی مزاج رکھتی ہے۔ اس لئے سائے کی طرح
سے ایک منٹ جدائی پسند نہیں کرتی۔ نہ خود اپنی طرف سے اظہار محبت و لگاوٹ میں کمی کرتی ہے۔ ہم نے بعض ایسے بوڑھے جوڑوں کو
دیکھا جو باہم بے حد اخلاص و محبت رکھتے تھے۔ اور بیویاں خاوندوں پر غیر معمولی مہربان تھیں۔ لیکن اگر ذرا بھی مرد کا رخ بدلا دیکھے تو پھر

اسے ہر طرح سیدھا بنانے اور عقل درست کرنے کے لئے بھی پوری طور پر تیار نظر آئے گی اور یہ ناممکن ہے کہ وہ مرد کی طرف سے بے انتفاقی یا بدسلوکی کو ذرا بھی روا رکھے۔

یہاں کی بیبیاں خانہ داری اور کھانے پکانے کے بکھیڑوں سے جہاں تک ممکن ہو بالکل آزاد رہنا چاہتی ہیں اور بازاروں کے ساتھ ہوٹلوں میں پکا پکایا ہوا کھانا کھانا اور چائے وغیرہ اڑانا زیادہ پسند کرتی ہیں۔ لیکن ساتھ ہی اپنے گھر کی صفائی اور زینت کی بدرجۂ اتم دلدادہ ہوتی ہیں اور اپنی ہنرمندی جدت پسندی اور نفاست سے گھر کے گوشہ گوشہ کو آراستہ کرتی ہیں۔ پینٹنگ، نٹنگ کارپٹ کروشیا وغیرہ ہر قسم کی دست کاری کے اعلیٰ سے اعلیٰ نمونے یہ ہمیشہ اپنے گھر کے لئے خود اپنے لئے تیار کرتی رہتی ہیں۔ چونکہ تفریح کی طرح کام کی بھی دھن ہوتی ہیں۔ اس لئے کبھی بیکار رہنا پسند نہیں کرتیں۔ پھٹے کپڑوں کو بھی رفو کی بھرمار کرکے ان کو درست کرلیتی ہیں۔ زیادہ تر اپنے ہی ہاتھ کے بنائے ہوئے سوئٹر جرسیاں گرم پاجامے اور دستانے استعمال کرتی رہتی ہیں۔ اور اپنے بچوں کے لئے بھی قسم قسم کی اونی چیزیں ہمیشہ تیار کرتی رہتی ہیں۔

ان کے مکانوں کی کھڑکیوں میں روزانہ صبح کو دھلے ہوئے کپڑوں کی ایک بڑی تعداد رسیوں کے ذریعہ سے لٹکی ہوئی نظر آتی ہے۔ جس سے ان کی صفائی لباس کا اندازہ ہوسکتا ہے۔

یورپ میں اعلیٰ طبقہ کی خواتین بھی جو رات دن اعلیٰ سے اعلیٰ فیشن ایبل اور قیمتی لباس دوکانوں سے خریدتی رہتی ہیں۔ وہ بھی اپنے گھر میں ایک منٹ کے لئے خالی ہاتھ نہیں بیٹھتیں۔ اور علاوہ لکھنے پڑھنے کے مشاغل کے ہر وقت کسی نہ کسی دست کاری میں مصروف رہتی ہیں۔ ریل کے سفر میں ایک بار دیکھا گیا کہ ایک خاتون کو اپنے دستانہ میں ذرا سا شگاف نظر آیا تو فوراً ہینڈ بیگ میں سے ہم رنگ تاگا اور سوئی نکال کر اس کی مرمت کر ڈالی۔

یہ ہنرمندی رفتہ رفتہ ان کی ایسی طبیعت ثانیہ بن جاتی ہے کہ بڑھاپے میں بھی عورتوں کو عینک لگائے ہوئے نٹنگ گلکاریوں اور نٹنگ وغیرہ میں مصروف دیکھا جاتا ہے۔ کیونکہ یہ لوگ بڑھاپے میں بھی اپنی اولاد کا منہ دیکھا ہونا پسند نہیں کرتے جہاں تک ممکن ہو ہر طرح اپنے ہاتھ پاؤں مارتے رہتے ہیں ضعیف عورتیں چست لباس پہنے ہوئے لاٹھی ٹیکتی ہوئی خود بازار سے سودا لاتی ہوئی بارہا نظر آتی ہیں۔ غرض کاہلی سے زیادہ کوئی عیب ان لوگوں میں بدتر نہیں سمجھا جاتا۔ اور یہ طبقہ کی لڑکیاں شادی سے پہلے ہی نوجوانی کی عمر میں اپنے اپنے کام سے بے فکری کے ساتھ لگی رہتی ہیں۔ نہایت تندرست خوش و خرم ہیں تفریح کی ذہنی ہنرمندی کی شایق۔ دفتروں میں اہل معاملہ ان کی چتون ہی دیکھتے رہتے ہیں اور وہ وقار کے ساتھ اپنی خدمات انجام دیتی ہوئی نظر آتی ہیں۔ ہوٹلوں وغیرہ خانگی ملازمتوں میں ان کے ساتھ نہایت مہربانی کا برتاؤ کیا جاتا ہے۔ جو خاتون سفید کپڑے پہنے صاف اور خوشنما ایپرن لگائے ہوئے ہم کو تمیز کے ساتھ کھانا کھلا رہی ہے۔ تھوڑی دیر بعد کھانے کے ختم ہوتے ہی اپنے حساب کی کاپی اور آویزاں پنسل نکال کر ہمارا حساب کھڑے کھڑے تیار کرکے بل ہمارے حوالہ کردے گی۔ اور دوسرے وقت کے وقت میں اس کو کوئی اخبار پڑھتے یا دست کاری کا عمدہ نمونہ تیار کرتے دیکھا جائے گا۔ چونکہ تعلیم جبری ہے۔ اس لئے ان دونوں

تعلیم یافتہ ہیں۔ کوئی شخص اَن پڑھ یورپ میں پایا ہی نہیں جاتا۔ اسکولوں میں علاوہ لکھنے پڑھنے کے ان کو قسم قسم کے ہنر بھی سکھائے جاتے ہیں۔ جن سے یہ موقعہ بہ موقعہ عمر بھر کام لیتی رہتی ہیں۔

جب ان کے کام کا وقت ختم ہو جاتا ہے تو کاروباری لباس اتار کر فیشن ایبل کپڑے پہن لیتی ہیں۔ اور بیگ ہاتھ میں لے کر کسی کے ساتھ تفریح کے لیے روانہ ہو جاتی ہیں۔ اس وقت شاید ان کو بھول کر بھی یہ خیال نہیں آتا کہ وہ دن بھر کسی کی ملازمت اور خدمت گزاری میں لگی رہی ہیں۔

کام کاج کے علاوہ تفریحی مقامات میں بھی یہ ہمیشہ مردوں سے چار قدم آگے ہی نظر آئیں گی۔ شہ سواری تیراکی کشتی رانی بیڈمنٹن وغیرہ مختلف کھیلوں میں ہمیشہ مردوں کا سخت مقابلہ کر کے ان کو ہرانے کی کوشش کرنا گویا ان کا خاص نصب العین ہوتا ہے۔ بناؤ سنگار اور ... نئے فیشن ایبل لباسوں کا شوق یورپ میں خبط کی حد تک پہنچا ہوا نظر آتا ہے۔ عورتوں کا رات دن آئینہ پاؤڈر اور لپ اسٹک وغیرہ میں مصروف و منہمک رہنا ایک مشہور صفت ہے اور آزادی کے شوق کی انتہا یہ ہے کہ لباس سے بھی چھٹکارا حاصل کرنا چاہتی ہیں۔ اسی کی وجہ سے عریانی یہاں روز بروز زیادہ بڑھتی جاتی ہے۔ جو خاتون جس قدر زیادہ اپ ٹوڈیٹ ہوگی اسی قدر وہ کم سے کم لباس پسند کرے گی۔ تیراکی کے مقامات میں آزادانہ مردوں کے ساتھ برائے نام لباس میں تیرتی ہیں۔ کیونکہ یہ ان کا نہایت محبوب مشغلہ ہے ان کو دیکھ کر اس وقت بے ساختہ خیال آتا ہے کہ لفظ " شرم " کا کوئی مفہوم اب یورپ میں باقی نہیں رہا۔ اور جس طرح نپولین اعظم فرانسیسی ڈکشنری سے لفظ " ناممکن " کو خارج کر دینا چاہتا تھا۔ اسی طرح یورپ کی ڈکشنری سے شرم کا لفظ خود بخود نکل گیا۔ اور شاید کوئی شخص جان ہی نہیں سکتا کہ اس لفظ کے بھی کوئی معنی ہوتے ہیں۔

ہماری ملکی خواتین کو بھی لازم ہے کہ مغربی بیبیوں کے اعلیٰ صفات و مشاغل سے سبق حاصل کریں ان کی اچھی باتوں پر غور کر کے اپنے یہاں ان کو رواج دینے کی کوشش کریں۔

اور جو عیوب و نقائص ان کی معاشرت میں پائے جاتے ہیں۔ ان سے احتراز کریں۔ کیونکہ بہ تقاضائے بشریت کوئی ملک و قوم اس سے خالی نہیں ہو سکتی

انیسہ ہارون بیگم شیروانیہ

...ن کی بتیا

ایک دلچسپ ادبی کتاب جس کو محترمہ لطیف النساء بیگم صاحبہ نے بچیوں کی بہترین تربیت کے لئے لکھا ہے۔ اس میں حسب ذیل عنوانوں پر نہایت مفید اور کارآمد باتیں لکھی ہیں۔ گھر، سواری، ہمارے نوکر، خورد و نوش، لباس، بچوں کی تعلیم اور ان کی ضرورتیں، اخبار، کتابیں اور رسالے، نذر و نیاز، چندے، مختلف رسومات، علاج معالجہ، متعلقین اور لواحقین، سیر و تفریح، سینما، فیشن۔ ہر تعلیم یافتہ گھر میں اس کتاب کا ہونا ضروری ہے۔ کتاب بہت خوبصورت اور مجلد ہے۔ ۱۰۰ صفحات

قیمت صرف (۸/)

پیرس

تعلیمی سفر یورپ

(ڈائری

۱۵ر جون ۱۹۳۷ء۔ آج صبح شہرۂ آفاق بین الاقوامی نمائش دیکھنے کے ارادہ سے روانہ ہوئے۔
نہایت اشتیاق کے ساتھ انتظار کر رہے تھے۔ نمائش گاہ پر پہونچنے کے بعد اس کی اہمیت و عظمت کا اندازہ ہوتا
پہلے تو مقام ہی کچھ ایسا پُر فضا و فرحت بخش تھا کہ جس کے نظارہ سے طبیعت سیر نہیں ہوتی تھی۔ وسط پیرس
دونوں جانب تقریباً ڈیڑھ سو ایکڑ رقبہ پر نمائش کا احاطہ پھیلا ہوا ہے۔ دنیا کے عام متمدن ممالک کو اس میں
گئی تھی اور انھوں نے بھی اس میں پوری سرگرمی کے ساتھ حصہ لیا اور اسے کامیاب بنانے کے لئے کوئی
کیا۔ ہر ایک ملک کے لئے جداگانہ عمارت بنائی گئی ہے۔ کہا جاتا ہے کہ حکومت فرانس نے صرف دیواریں کھڑی کر دیں
نے یہ بھی تصفیہ کر دیا کہ ممالک خارجہ کے ہر بڑے شہر کے لئے ایک ہزار مربع گز رقبہ مختص رہے۔ لیکن وہ خود اپنے
کریں اور انہیں کا اہتمام بھی رہے۔ فلک بوس عمارتوں اور دیو تمثیل ستونوں کے دیکھنے سے ولولۂ حیات کا
عہدِ حاضرہ کے تمام فنونِ لطیفہ، آلاتِ حرب، صنعت و حرفت، سائنس دانوں کی جدت پسند طبائع کے گوناگوں
آرام و آسایش، عیش و عشرت، فنا و ہلاکت کے اشیا، غرض کہ کوئی علم کوئی کاریگری ایسی نہیں تھی جس کے حیرت انگیز
گئے ہوں۔ تہذیب و تمدن کا زندہ مرقع تھا۔ عجائبات کا بصیرت افروز مجموعہ تھا۔ دورِ جدید کی کاروباری دنیا نے اپنے
جمیلہ سے جو ثمرات حاصل کئے تھے اُن سب کو اہلِ نظر کے سامنے لاکر دھر دیا تھا تاکہ ان کو پرکھا جائے اور داد دی جائے۔
کی شان و شوکت و تجلیات کی جلوہ گاہ کو دیکھ کر سیاحوں پر محویت طاری ہو رہی تھی۔ اس نمائش کا سرِ نہانی و اصلی مقصد بین الاقوامی
آشتی و آزادانہ تبادلۂ خیالات و رائے پر مبنی تھا۔ تمدنی اور معاشرتی زندگی کی ترقیات کا وسیع مرقع کھینچنا
تھی کہ تجارت کو فروغ دیا جائے۔ ہزاروں کی تعداد میں تماشائیوں کا ہجوم تھا اور قابلِ دید نمونوں کو دیکھ
اور اس نظریہ کا ثبوت ان کو حاصل ہو رہا تھا کہ وہی قومیں جو اپنی قوتوں کو عملی کاروبار میں صرف کرتی ہیں۔ موجودہ
ہیں اور سطحِ اعلیٰ تک ان کی رسائی ہو سکتی ہے اور ترقیوں کے میدان میں مقابلہ کر سکتی ہیں۔

سب سے پہلے ہم نے جرمن نمائش گاہ میں قدم رکھا۔ اس رفیع الشان عمارت کے دروازہ پر عقاب ہی
دیکھو تو یوں معلوم ہوتا ہے کہ چیل پروں کو تول رہی ہے اور جھپٹا مارا ہی چاہتی ہے۔ تصاویر، مجسمے، آلات
اور بیسیوں چیزیں رکھی دیکھیں۔ اس کے بعد ہم نے بلجیم، روس و انگلستان وغیرہ کی عمارتوں کی سیر کی۔
لیس، گھڑیاں، زیورات اور جوتے بتلائے تھے۔ بلجیم نے قابلِ دید جواہرات، تصاویر و مجسمے رکھے ہیں ان سب کے وسط
بادشاہ کا مجسمہ ہے۔ روس نے اپنے عالی شان دروازے پر ایک مرد اور ایک عورت کا مجسمہ نصب کیا ہے گویا کاروبار
دونوں مساوی حیثیت رکھتے ہیں۔ عمارتوں کی کئی کئی منزلیں ہیں۔ اور بلند و کشادہ سیڑھیاں۔ اطراف میں

ہوٹلوں کا انتظام ہے۔ تمام اہلکار قومی وردیوں میں ملبوس نظر آتے ہیں۔ نمایش کے ایک مقام سے دوسرے مقام تک نقل و حرکت کے لئے ریلیں اور موٹریں چل رہی ہیں۔ پھر بھی یہ نقص پایا جاتا ہے کہ اس نمایش کی تمام چیزوں کو کوئی شخص دیکھ نہیں سکتا تھا وہ نہایت وسیع و عظیم الشان ہے۔ ہر وقت اچھا خاصہ میلا لگا رہتا ہے۔ شایقین علم اہل نظر اور مشاہدہ کرنے والوں کے لئے زرین موقع ہے۔ اس نمایش کو منعقد کرکے فرانس نے غیر فانی شہرت حاصل کرلی۔ کامل ۵ گھنٹے چلنے کے بعد ہم نے چمن میں نشستیں قرار لیا اور ستانے بھی نہ پائے تھے کہ مسز دتا نے واپسی کا اشارہ کردیا۔

آج شام ہم ایک پر تکلف عصرانہ میں مدعو کئے گئے۔ ہمارے میزبان نے اپنے خوش منظر اور شاندار مکان کے صحن میں ہمارا خیر مقدم کیا۔ بنگلہ کی آرایش نہایت خوش اسلوبی سے کی گئی تھی۔ تمام کمروں میں سرخ مخملی قالین کا فرش تھا۔ سرخ ریشم کے پردے دروازوں پر آویزاں تھے اور دیواریں بڑی بڑی طلائی تصاویر سے مزین تھیں۔ کمرے کے ایک جانب میز پر نہایت قدیم اشیا اور سوزن کاری کے نمونے نہایت سلیقہ سے رکھے گئے تھے۔ چا کے بعد خاتون محترمہ نے ایستادہ ہوکر اپنی تقریر دل پذیر اور شگفتہ بیانی سے حاضرین کو محظوظ کیا۔ دوران تقریر میں فرمایا تیس سال کا ذکر ہے کہ ہمارے ہاں کی لڑکیوں کو تنہا کہیں جانے کی اجازت نہیں تھی۔ حتیٰ کہ مدرسہ کو بھی ہم بغیر محافظ کے نہیں جاتے تھے۔ میرے ساتھ ایک معمر خاتون سایہ کی طرح رہتی تھیں جو ایک طرف کو بیٹھی ہوئی کتاب کا مطالعہ کیا کرتیں یا بننے اور سینے میں مصروف رہتیں۔ ہم نے اپنے والدین کے خلاف صدائے احتجاج بلند کی خوب لڑائیاں ہوئیں تب کہیں جاکر اب ہمارے ساتھ اتنی رعایت کی جاتی ہے کہ ہم تنہا مدرسوں کو جاتے ہیں اور دعوتوں میں شریک ہوتے ہیں لیکن ہم کو اب تک حق رائے دہی حاصل نہیں ہوا۔ اس لحاظ سے تو آپ خواتین ہند ہماری پیشرو ہیں مجھ کو یقین واثق ہے کہ جتنی جدوجہد یورپی صنف نازک کو تحصیل حقوق میں کرنی ہوتی ہے اس کی عشر عشیر زحمت و کاوش آپ کے درپیش نہیں ہوتی۔ آپ کو نہایت آسانی سے اپنے حقوق مل جاتے ہیں۔ لیکن یاد رکھئے کہ حقوق کا حاصل کرنا اس قدر مشکل نہیں ہے جتنا کہ فرایض کی ذمہ داری کا مسئلہ اور ان کی انجام دہی میں جو دشواریاں لاحق ہوتی ہیں ان سے دوچار ہونا۔ ختم تقریر پر ہمارے ساتھیوں میں سے ایک نے شکریہ ادا کرتے ہوئے کہا کہ ہم نے فرانس کو جس قدر کہ اس کی تعریف سنی تھی، اس سے کہیں زیادہ پایا۔ آپ کے حسن اخلاق کے ہم مداح ہیں۔ آپ کی مہمان نوازیوں اور آپ کے شہر کی دلچسپیوں کے تاثرات ہندوستان کی واپسی کے بعد بھی ہمارے دلوں میں تازہ رہیں گے۔

قیام گاہ پر پہونچ کر ہم نے اپنا سامان باندھا اور دوسرے روز برسلز (بلجیم) جانے کے لئے تیار ہوگئے۔

مسز صوفی

معاشرت میں سادگی

(پہلی قسط)

زندگی کی مسرتیں حقیقت میں اُسی کو حاصل ہیں جس نے طرزِ معاشرت میں اعتدال قائم رکھا اور سادگی کو اپنا [illegible]
ہو ضروریات اور لوازمات زندگی میں ہمیشہ سادگی کو پیش نظر رکھنا چاہیے، یہ ایسی خصوصیت ہے کہ اس سے [illegible]
[illegible] خود بخود پاکیزہ ہونے لگتے ہیں۔ زیب وزینت، آرائش و زیبائش اور تہذیب جدید کے نئے نئے طریقوں میں جو وقت [illegible]
ہوتا ہے، معاشرت میں سادگی اختیار کرنے والے انسان اوقات کو دوسرے مفید اور ضروری کاموں میں صرف کر سکتے [illegible]
کی زندگی کا ایک ایک لمحہ کس قدر قیمتی ہوتا ہے، بشرطیکہ ہم اُس کی قدر و قیمت کرنا سیکھیں اور اس کی اہمیت کو محسوس کریں۔

ہم کو فطرتاً سادہ معاشرت کا پابند ہونا چاہیے، مگر ہم پر تقلید کا مادہ اس قدر غالب ہے کہ بھول کر بھی ہم اس مسلک [illegible]
کرنا نہیں چاہتے۔ جس سے زندگی کی حقیقی مسرتیں حاصل ہوتی ہیں۔ جب تک ہم اپنی معاشرت میں سادگی نہ پیدا کریں، روپیہ [illegible]
کرنے والے زیب و زینت کے طریقوں اور نت نئے فیشنوں سے احتراز نہ کریں، ہمیں حقیقی مسرت کبھی حاصل نہیں ہو سکے گی۔

زمانہ کی رفتار اور حالات سے بے خبر ہم اندھوں کی طرح خوفناک غاروں اور خطرناک خندقوں کی طرف بڑھے چلے جا رہے ہیں [illegible]
یہ علم رکھنے کے باوجود کہ اب تک سیکڑوں انسان فضول رسم و رواج اور گراں قیمت معاشرت کی قربان گاہ پر بھینٹ ہو چکے ہیں [illegible]
نہیں ہوتی اور نہ ہماری جھوٹی وضعداری [illegible] فرق آتا ہے۔ گراں معاشرت اور رسم و رواج کی ان تباہ کاریوں کو دیکھتے ہوئے بھی [illegible]
ہماری نت نئی خواہشوں میں فرق نہ آئے، اگر ہمارے قیمتی لباس میں تغیر نہ ہو۔ اگر ہمارے شادی بیاہ نے سادگی اختیار نہیں کی۔ اگر ہمارے
آمد و خرچ کے توازن کو ہم نے برقرار نہیں رکھا اور اگر نے کچھ پس انداز نہیں کیا تو ہماری سمجھ پر جتنا بھی ماتم کیا جائے کم ہوگا۔ ہمیشہ ہم دوسروں کے
دست نگر ہی رہیں گے۔ اور افلاس و ادبار کے بادل ہمارے سروں پر اسی طرح چھائے رہیں گے جیسے کہ اب چھائے ہوئے ہیں۔

دنیا میں جتنے بھی کاروبار ہیں ان کے نتائج کے لیے ہمیں کچھ دن توقف کرنا ہوگا، مگر سادہ معاشرت اور کفایت شعاری کا [illegible]
ایسا ہے کہ فوراً نتیجہ نکل آتا ہے، ادھر ہم نے زندگی کے طرز کو بدلا سادگی اختیار کی، کفایت شعاری کو اپنا شعار بنایا اور اُدھر ہم میں سے [illegible]
سرمایہ جمع ہونے لگا، غیروں کے آگے ہاتھ پھیلانے کی ضرورت باقی نہ رہی ہماری عزت و وقعت میں اضافہ ہوا۔ ساکھ قائم ہو گئی [illegible]
کی فکروں سے نجات حاصل ہوئی۔ غرض کہ ہماری دنیا ہی بدل گئی۔

رشوت، سود، بے ایمانی کی آمدنی، دھوکہ دغا کی کمائی اور ایسے ہی برے آمدنی کے ذرائع اختیار کرنے میں ہم پس و پیش نہیں
کرتے اور نہ ہمیں شرم آتی ہے مگر سادہ معاشرت اختیار کرنا اور کفایت شعاری پر عمل کرنا عار اور شرم کا باعث! حالانکہ یہ چیز رشوت [illegible]
اور دوسری ناجائز آمدنیوں سے کہیں زیادہ فائدہ بخش ہے۔ نہ ایمان بگڑتا، نہ ضمیر کی لعنت ملامت سننی پڑتی ہے۔ باوجود
یقین رکھنے کے کہ بے ایمانی کرنے سے کبھی کوئی دنیا میں پھولتا پھلتا ہے اور نہ آخرت میں سرخ روئی کی امید ہے اور اگر دنیا میں بے
ایمانی اور دغا بازی کا پاپ ہمارے آگے نہ آئے تو ہماری اولاد کے آگے ضرور آئے گا ہماری آنکھوں پر کچھ ایسے غفلت کے پردے

پڑے ہوئے ہیں کہ ہمیں گناہ و ثواب میں کوئی امتیاز ہی نہیں ہوتا۔

جب یہ ایک طے شدہ امر ہے کہ معاشرت میں سادگی اختیار کرنا اور کفایت شعاری سیکھنا دین و دنیا میں کامیابی کا باعث ہو سکتا ہے تو پھر اس نیک کام میں توقف کرنا اور فضولیات و خرافات کو ترک نہ کرنا یا ترک کرنے میں عجلت نہ کرنا سراسر خلاف مصلحت ہے۔ ع در کار خیر حاجت ہیچ استخارہ نیست! ہم کبھی اپنے کسی مقصد میں بھی کامیاب نہیں ہو سکتے جب تک کہ جس کام کو ہم برا سمجھتے ہیں ترک نہ کریں اور جس بات کو اچھا سمجھتے ہیں اختیار نہ کریں۔

سب سے پہلے ہم کو اپنی آمد و خرچ پر غور کرنا چاہیئے۔ اور دیکھنا چاہیئے کہ کون سے مصارف ایسے ہیں جنھیں ہم اپنی عزت اور صحت کو نقصان پہنچائے بغیر کم کر سکتے ہیں، ایسے اخراجات کو کم کرنے سے یقیناً کچھ روپیہ پس انداز ہو گا۔ مگر ہمیں ایسی کوئی حماقت نہ کرنی چاہیئے کہ اس "پس انداز" کے لئے دوسرا کوئی مصرف تلاش کریں، اس قسم کی کفایت شعاری سے کوئی فائدہ نہیں ہو سکتا کہ ہم اپنے کسی فضول خرچ کو گھٹا کر کوئی دوسرا خرچ کا مد بڑھا دیں۔ کفایت شعاری سے جو روپیہ پس انداز ہو اس کو محفوظ میں چاہئے آنے والے اخراجات کے لئے اٹھا رکھنا چاہیئے، اخراجات کے کم کرنے میں اپنے متعلقین سے ضرور مشورہ کرنا چاہیئے تاکہ کسی قسم کی بے لطفی نہ ہو۔ سادہ معاشرت اور کفایت شعاری کے بے حد و شمار فوائد انہیں اچھی طرح سمجھا کر یہ بات ان کے ذہن نشین کرنی چاہیئے کہ جو آدمی روپیہ پس انداز نہیں کرتا اور آنے والے "کل" کی فکر نہیں کرتا وہ ہمیشہ گھاٹے میں رہتا ہے اور اپنے ہم چشموں میں ہمیشہ ذلیل و خوار ہوتا ہے۔

اگر ہم تھوڑا غور کریں تو یہ ضرور محسوس کریں گے کہ ہمارے اخراجات کے بہت سے مد بالکل فضول اور غیر ضروری ہیں، ان کے بغیر بھی ہم بغیر کسی تکلیف کے زندگی بسر کر سکتے ہیں۔ مثلاً ہم اپنی سیر و تفریح پر بیدریغ روپیہ صرف کر دیتے ہیں، مہینہ میں دس بیس دفعہ سینما دیکھتے ہیں صبح سے شام تک تیس چالیس سگریٹ پھونک دیتے ہیں، چا خانوں اور ہوٹلوں میں جا کر دس پندرہ چاء کی پیالیاں اور پانچ دس آئسکریم کے پلیٹ معہ لوازمہ اڑا دیتے ہیں، بغیر کسی مقصد کے موٹر میں میلوں بھٹکتے پھرتے ہیں بلا ضرورت دوکانوں پر جا کر ضرورت پیدا کرتے ہیں اور فضول سامان ادھار خرید لاتے ہیں، کافی لباس موجود ہوتے ہوئے بھی نئی وضع کے کپڑوں کی خاطر لباس بناتے ہیں اچھی خاصی موٹر رکھتے ہوئے "نئے ماڈل" کی خوشی میں نئی کار خرید لیتے ہیں، غرض کہ ایسی سیکڑوں حماقتیں ہیں جو ہم روزانہ اپنی زندگی میں کر کے اپنے ہاتھوں اپنے پیروں پر کلہاڑی چلاتے ہیں اور پھر آمدنی کی کمی کا رونا روتے رہتے ہیں۔

یہ اچھی طرح یاد رکھنا چاہیئے کہ اگر ہمیں کسی حادثہ یا اچانک آنے والے کسی خرچ کے لئے روپیہ کی ضرورت ہوگی تو ہمارے کسی عزیز یا دوست سے روپیہ ملنے کی بہت کم توقع ہو سکتی ہے، اگر کسی نے ہماری کچھ امداد بھی کی تو ہمیشہ کے لئے اس کا شرمندہ اور زیر بار احسان رہنا ہوگا۔ ایسے موقعوں پر پس انداز کیا ہوا روپیہ ہی ہم کو کسی کا شرمندۂ منت کئے بغیر ہمارے کام آ سکتا ہے اور ہمیں اقسام کی آفتوں سے نجات دلا سکتا ہے۔

وہ دولت مند اور متمول حضرات جن کو دنیا کی ساری نعمتیں، عیش و عشرت، زیب و زینت اور آرائش و زیبائش کے

اسباب حاصل ہیں کیا وہ واقعی ایسے قانع اور خوش و خرم ہیں جیسا کہ انھیں ہونا چاہیئے ؟ غور کرنے سے نہیں تو خود ان [illegible]
دریافت کرکے ہم معلوم کر سکتے ہیں کہ وہ حقیقت میں ایسے نہیں ہیں! آخر اس کے کیا اسباب ہیں! اس کی وجہ یہ ہے [illegible]
نعمتیں ان کو زیادہ میسر آتی جائیں گی اسی قدر ان کے تکلفات بڑھتے جائیں گے، جتنی ان کی خواہشیں پوری ہوتی جائیں [illegible]
دوگنی پیدا ہوتی رہیں گی، حقیقت میں زندگی کا لطف اسی کو حاصل ہے جو معاشرت میں سادہ ہے، اس قدر سادگی کی بھی [illegible]
مقدور ہو پھٹے کپڑے پہنے، حیثیت ہو اچھا کھانا نہ کھائے اور فراغت ہو مگر تکلیف اٹھائے۔

اگر ہم تھوڑی دیر کے لیئے ارتقائے انسانیت کی تاریخ پر نظر ڈالیں تو واضح ہوگا کہ کس طرح زمانہ کی ترقی کے ساتھ ساتھ [illegible]
سے نظر پوشی کی گئی۔ ایک زمانہ تھا کہ حضرت انسان غاروں اور درختوں کے سایہ میں رہا کرتے تھے، ہر طرف "نیچر" کی حکومت [illegible]
یہ آزاد و میدانی زندگی صحت بخش، طاقتور اور بے لوث ہونے کے علاوہ اس میں فکر، رنج، تکلیف اور خجالت کا کہیں نام و نشان [illegible]
اس کثرت سے بیماریاں آتی تھیں نہ قحط پڑتے تھے، نہ بغاوتیں ہوتی تھیں نہ آزادی کے لئے کوششیں، صرف آزادی اور سادگی کی [illegible]
حکومت تھی، خیالات سادہ تھے مگر وسیع اور متفق، نہ وہ ہزاروں جانب منقسم تھے اور نہ فضولیات میں الجھے ہوئے۔ اس کے بعد [illegible]
وجود میں آئی جس نے ہمارے تعلقات کو نیچر سے کامل طور پر جدا کر دیا، اس آگ کے معلوم ہونے کے دن سے تہذیب و تمدن کی [illegible]
ہوتی ہے کیونکہ اس وقت سے انسان کی ضرورتوں کا دائرہ وسیع ہوتا چلا گیا، نتیجہ یہ ہوا کہ ضرورتیں بے حد بڑھ گئیں اور ساری [illegible]
غائب ہوگئیں۔

مرزا سیف علی خاں

غزل

مصیبت، رنج، غم، صدمہ، ہر اک منظور ہوتا ہے
محبت ایسی شئے ہے آدمی مجبور ہوتا ہے

کہیں جاتے ہیں تو اس کی گلی سے ہو کے جاتے ہیں
اگرچہ راستہ اُس راستے سے دُور ہوتا ہے

کوئی مجنوں کی عزت عشق کی سرکار میں دیکھے
بڑی خدمت پہ ایسا آدمی مامور ہوتا ہے

حسینوں کا تنزل بھی نہیں ہے شان سے خالی
بڑھاپے میں بھی ان لوگوں کے منہ پہ نور ہوتا ہے

تری فرقت میں کچھ تو ہو نہیں سکتا غریبوں سے
تڑپ لیتے ہیں ان کا جس قدر مقدور ہوتا ہے

تجھے مشہور ہونا ہے تو جی بھر کے ستا مجھ کو
برائی سے بہت جلد آدمی مشہور ہوتا ہے

صفیؔ ہر دم تڑپنے کی بھلا طاقت کہاں مجھ میں
ذرا ان کو ستانا بھی کبھی منظور ہوتا ہے

صفی اورنگ آبادی

شاعر کا گناہ

(افسانہ)

ناصر شاعر تھا اور راحت کے ادبی نام سے اتنا مشہور کہ ناظرین کی مشتاق نگاہیں ہر رسالہ کے صفحات پر اس کی نظم یا مضمون پاکر مطمئن ہوتیں، درد و اثر، سوز و گداز، حسن و شباب یہ چیزیں اس کی فطرت میں کوٹ کوٹ کر بھر دی گئی تھیں، اس کا مطالعہ گہرا، معلومات وسیع، خیالات بلند اور پاکیزہ تھے، شاعرانہ عظمت کے نقطۂ نظر دیگر ادبی اصناف میں ممتاز صف میں نظر آتا، ملک کے اکثر رسائل اس کے دلاویز مضامین اور کیف آگیں نظموں سے معمور نظر آتے۔ رسالہ "فردوس" کے سالنامہ میں اس کا بلند پایہ مقالہ "عورت اور محبت" کے عنوان سے شایع ہو کر خراجِ تحسین حاصل کر چکا تھا اس کی تعریف میں ناصر کو مدیر رسالہ کے توسط سے کئی خطوط وصول ہوئے جنھیں فرصت کے لمحات میں دیکھنے کے خیال سے اس نے میز کے دراز میں رکھ دیا، رات کا کھانا کھا کر وہ ان سب کو لے بیٹھا، وہ ان تعریفی خطوط پڑھتے پڑھتے تھک گیا، اس قدر مبالغہ آمیز تعریف اسے پسند نہ تھی، آخری خط جو اس نے پڑھا —— شاید دلچسپ ہو۔ جو نسوانی تحریر لیے ہوئے تھا، گہری نظر سے ناصر نے اس کا مطالعہ کیا۔ لکھا تھا۔

"یوں تو سارے مضامین آپ کے خاص اثر اور دلچسپ موضوع لیے ہوئے ہوتے ہیں، میں انھیں وقعت کی نگاہ سے دیکھتی ہوں، اور کافی وقت ان کے مطالعہ میں صرف کرتی ہوں آپ جیسی درد مند ہستیاں ملک اور قوم کے لئے قابلِ فخر ہیں، میں آپ کے رومانوی سچے جذبات کی قدر کروں گی، صنفِ نازک کے متعلق آپ کے خیالات کتنے بلند اور پاکیزہ ہیں آپ کا وہ جملہ "عورت قدرت کا لاجواب عطیہ ہے، جو مرد کی مسرت کو دوبالا اور غم کو بھلا دینے کے لئے عطا کیا گیا ہے، اس کی تزئین و حفاظت مرد کا اولین فریضہ ہے۔" قابلِ تحسین ہے جو مکروہ خیالات مردوں کے دلوں میں صنفِ نازک کے متعلق جاگزیں ہیں انھیں اپنے پاکیزہ جذبات سے دور کرنے کی آپ نے پوری کوشش کی ہے۔ شکریہ! راقمہ ——

میں نہیں جانتا، ناصر نے دبے ہوئے لہجہ میں کہا یہ کون ہے؟ میری تعریف میں پُر زور شکریہ کے الفاظ اس کی چنداں ضرورت نہ تھی مجھے اس کا راز معلوم کرنا چاہیئے —— لیکن کیسے؟ —— فرصت کے پہلے لمحے میں ناصر نے جواب لکھا، اور ایڈیٹر کی معرفت روانہ کیا:-

"آپ کی مبالغہ آمیز تعریف نے میرے قصرِ خیال کو متزلزل کر دیا، لیکن یقین مانئے! میں ان افراد میں نہیں جن پر تعریف کا نشہ چڑھ جاتا ہے۔ قدر افزائی کا شکریہ! رہا اب صنفِ نازک کے متعلق میرے خیالات، اس کا اظہار اور اندازہ میرے پچھلے مضامین اور نظموں کے مطالعہ سے ہو سکتا ہے، میں اس حسین ہستی کو قدر کی نگاہوں سے دیکھتا ہوں، میں نے اس کا کافی مطالعہ کیا ہے۔"

محترمہ! مجھے آپ کا نام اور سکونت پوچھنے کی اجازت دیجئے، "راحت"

خط کو لکھے ہوئے ایک ہفتہ گذرا۔ ناصر بے چینی کے ساتھ جواب کا منتظر تھا —— اس عرصہ میں کئی مرتبہ اُس نے ڈاکیہ سے استفسار کیا۔ اس دوران میں اس کی دلچسپ نظم "کیف نغمہ" کے عنوان سے شایع ہو کر ملک میں بہت جلد مقبول ہو چکی، یہ نظم ناصر کے بہترین خیالات کا مجموعہ تھی، رومانوی جذبات کا رنگین مرقع —— اس نظم کے ذریعہ اُس نے جمالیات کا ایک باب کھول کر دنیا کے سامنے پیش کیا تھا۔

شام کی تفریح کے بعد ناصر گھر لوٹا۔ ملازم نے ایک سرخ لفافہ اس کے آگے پیش کیا، دھڑکتے ہوئے دل سے ناصر نے لفافہ کو [illegible] اس کی مشتاق نگاہوں نے ذیل کی تحریر پڑھی۔

"محترم راحت! میں اپنے خط کے جواب کو پاکر کتنی خوش ہوئی یہ ظاہر کرنے سے قاصر ہوں، شکریہ آپ نے جواب دے کر میری تشفی فرمائی۔ میرے پیش نظر اس وقت آپ کی دلکش نظم "گیت نغمہ" ہے، میں نے اسے بار بار پڑھا، نہ معلوم اور کتنی مرتبہ پڑھوں گی۔

آپ میرا نام اور مقام دریافت کرتے ہیں، فی الحال اس کی ضرورت نہیں، ہمیں اتنی جلد ایک دوسرے سے متعارف نہ ہونا چاہیئے، اگر یہی ضد ہے آپ کی تو ــــ ناز کے ادبی نام سے یاد کیجئے،　　ناز۔ کلکتہ

ناز! ایک ہلکی سی چیخ کمرے میں گونج اٹھی، کلکتہ کی مشہور ادیبہ، جس کے مضامین، جس کی نظمیں صحافتی دنیا میں خراج تحسین حاصل کرتی ہیں، آج میری تعریف میں اس کا قلم زور و شور سے جنبش کر رہا ہے، یقیناً میں خوش نصیب ہوں۔

جواب لکھنے کے لئے وہ میز پر آبیٹھا۔

"ناز! کیا واقعی تم ناز ہو، معاف کرنا میں "تم" کے بے تکلفانہ لفظ سے خطاب کر رہا ہوں، میں مجبور ہوں، شاعر اپنے جذبات سے مجبور ہوتا ہے، بعض وقت اس کو دنیائے عمل سے ہٹ کر گزرنا پڑتا ہے، یہ کتنی ناانصافی ہے جو اسے دنیاوی کشمکش میں مبتلا کیا گیا، کیوں نہ اسے شبستان کی رنگین وادی میں بھٹکا گیا، اسے تخیلات کی دنیا میں رومانی زندگی بسر کرنے سے کیوں روکا جاتا ہے۔ وہ چاہتا ہے تخیلات کی رنگین فضاء میں ہمیشہ پرواز کرتے رہے اور کچھ نہیں ناز! یہ پوچھنے کی اجازت دو ــــ تم ابھی شادی کی سنہری زنجیروں میں جکڑ دی گئی ہو، یا دوشیزگی کی حسین آغوش میں پل رہی ہو، یہ جاننے کے لئے میں کتنا متمنی ہوں۔"　　جواب کا منتظر۔ راحت حیدرآبادی

خط چلا گیا، ناصر کے جذبات میں اب ہل چل سی پیدا ہونے لگی ــــ دل تلاش سکون نہیں بلکہ ہجر و مفارقت کے صدمات سہنے کے لئے لگا ــــ طویل راتوں کا اکثر حصہ کسی نامعلوم خیالی پیکر کے رنگین تصورات میں بسر ہوتا۔

ایک مہینے سے زیادہ دن گذرے لیکن ناصر کو اس عرصہ میں ناز کا کوئی خط وصول نہ ہوا اس کی آنکھیں راستہ تکتے تکتے تھک گئیں اور دل آپ ہی آپ مایوسیوں کی گہرائیوں میں ڈوبا جانے لگا۔ ڈاکخانہ کو ملازم بھیج کر دریافت کیا، ایڈیٹر سے استفسار کیا، کسی نے بھی اسے تشفی بخش جواب نہ دیا۔ وہ حیران تھا، یہ طویل خاموشی کیا راز لیے ہوئے ہے، گرمی کی چھٹیاں ختم ہونے پر دفتر کھل چکے تھے، کام کی زیادتی و دیگر مصروفیتوں نے ناصر کو اس لطیف خیال سے قدرے بھلا دیا ــــ ایک شام ــــ بارش کی حسین خوش گوار شام وہ مختلف خیالوں میں الجھا ہوا دفتر سے گھر پہونچا۔ بھولا ہوا خیال دل میں چٹکیاں لینے لگا، رنگین تصورات سے اس کا دماغ منور تھا ــــ کوئی خط نہیں ــــ اس نے کہنا شروع کیا ــــ آہ کیا اب بھی یہ ایک دوسرے کے درمیان خوش گوار سلسلہ پیدا کر سکتے ہیں، نہیں ــــ اب کبھی نہیں، محض خیال ہے ــــ ناصر اس دن بہت تھکا ہوا تھا، مختلف خیالات نے اسے پریشان کر رکھا تھا ــــ

رات کی تفریح کے لئے وہ کوئی موزوں ذریعہ تلاش کرنے لگا ــــ ملازم سے اس نے شام کی ڈاک پیش کرنے کو کہا [illegible]

نے مختلف خطوط کے ساتھ ایک دعوتی رقعہ ملا۔ ناصر اس شادی کے رقعہ کو اپنی تفریح کا بہترین آلہ قرار دے کر مطمئن ہوگیا۔

آدھ گھنٹہ کی مصروفیت کے بعد وہ گھر سے روانہ ہوا، دعوت کے جلسے میں پہونچ کر اسے اپنے دوست کے توسط سے کئی حضرات و خواتین سے متعارف ہونا پڑا ــــ اس کا حلقۂ احباب بہت وسیع تھا، وہ دیر تک محفلِ رقص و سرود سے محظوظ ہوتا رہا۔ اس کی نگاہیں محفل کے ہر فرد پر اٹھ اٹھ کر پڑ رہی تھیں، اور بالآخر ایک حسین مجسمۂ ملائک فریب پیکر اس کی نگاہوں کا مرکز بنا رہا ــــ حسن و شباب کا نمونہ نگاہوں کے سامنے رقص کر رہا تھا۔ ع

شفق میں ڈوبے ہوئے نور میں نہائے ہوئے

رخصت کے وقت ناصر اپنے دوست کے توسط سے حسین خاتون سے مس زلیخا کے نام سے متعارف ہوا۔ اور ناصر زبیری کے نام سے رنگین فضاؤں کا سہارا لیے وہ گھر پہونچا ــــ مستقبل کی رنگینیاں اسے تھپک تھپک کر سلانا چاہتی تھیں۔ وہ بہت جلد مسہری پر لیٹ کر نیند کے خراٹے لینے لگا۔

صبح ناصر بیدار ہوا ــــ اس کے چہرے سے مسرت و شادمانی کے آثار ہویدا تھے ــــ اس نے دلکش پیرایہ میں رات کا رنگین افسانہ، نظم کے ذریعہ قلمبند کیا۔

۳

جنوری کے ابتدائی دنوں میں حیدرآباد کی نمائش کا افتتاح ہوا، باغ کا وسیع احاطہ کئی ایک خوبیوں کے ساتھ کثیر تعداد میں تماشا بینوں کو لیے ہوئے تھا، ناصر کو بھی اپنے ایک مخلص دوست کے اصرار پر ان دلچسپ نادر چیزوں میں حصہ لینا پڑا، دونوں دوست بڑی دیر تک باغ کے وسیع احاطہ میں گھومتے رہے، قدیر کو ناصر کے اصرار پر کسی پرسکون گوشہ میں چل کر بیٹھنے پر آمادہ ہونا پڑا، ہجوم کو چیرتے پھاڑتے وہ مشکل سے راستہ طے کر رہے تھے، دشوار گزار راستہ طے کرکے انھوں نے اطمینان کی سانس لی ــــ سین جھیل کے پاس والے گروہ نے ان کے حواس منتشر کردیے قدیر نے اپنا رجحان اس جانب مبذول کیا ــــ اور ناصر کو اس کے قریب لے گیا۔

ناصر نے دیکھا گروہ کے ہر فرد کی نگاہ پانی کی سطح پر لگی ہوی ہے وہ یہ معلوم کرکے ابھی ابھی ایک لڑکی پانی میں گر پڑی، فوراً کودا، پانی کی سطح ہنوز متحرک تھی، چند سکنڈ کے بعد وہ ابھرا، ایک بے بس چیز ناصر کے کندھوں پر تھی، وہ کنارے پر آ لگا، اس کی سانس پھول رہی تھی، اعضاء کمزور ڈھلکے ہوئے تھے مدد کے لیے اس نے لوگوں کو چلانا شروع کیا، اس عرصہ میں لڑکی کا باپ بھی آ پہونچا۔

لڑکی کا باپ جنون کی حالت میں ناصر کے پیروں پر گرا۔ لیکن اس کے دل نے کبھی یہ فعل گوارا نہیں کیا۔ وہ اپنے اس عمل کو فرض کی ادائی سمجھا ہوا تھا، لڑکی کے والد ناصر کو اپنے ساتھ گھر لیجانا چاہتے تھے، لیکن اس نے اپنی تھکن کا عذر پیش کرکے معافی چاہی

مجمع کا ہر فرد ناصر کی کامیابی پر شاباش کہہ رہا تھا، اور ناصر خود بھی اپنے خیال کے مطابق بیحد خوش تھا اس نے نامعلوم حسینہ کی جان بچالی۔

شام کیفیت افزا لمحات میں ناصر لڑکی کے والد کے دیے ہوئے پتہ پر گھر پہونچا، پر فضا پہاڑی پر بنا ہوا جرمن وضع کا عالیشان بنگلہ ناصر کے دل میں قابل قدر وقعت پیدا کر رہا تھا، ملازم کے ذریعہ اس نے اپنا ملاقاتی کارڈ پیش کیا ــــ ملازم اسے ایک باغیچہ سے گذار کر

اندر ہال کے بڑے کمرے میں پہونچا آیا' لڑکی مسہری پر دراز تھی' ڈاکٹر اور اُس کا باپ اس کے قریب کھڑے تھے' آپ آگے بڑھ کر باپ نے مصافحہ کے لیے ہاتھ آگے بڑھائے۔

اب طبیعت کیسی ہے؟ ناصر نے مصافحہ کے بعد کہا'

خدا کا فضل شامل حال رہا۔ ڈاکٹر کہنے لگا' شکر ہے پانی کے زیادہ حملے نہیں ہوئے۔ لڑکی آنکھ بند کئے ہوئے تھی' اس دامن کو لینے والا کافر حسن ناصر کی سیماب نواز آنکھوں کے لئے سامان تفریح تھا' چند سکنڈ تک اسے تکتا رہا۔ اور نہ جانے کب تک ——

یقین جانئے ڈاکٹر صاحب! لڑکی کے والد نے مخاطب کیا' اگر یہ اس وقت نہ ہوتے کبھی کا میرا چراغ گل ہوگیا ہوتا'

قسمت کی پھیر دیکھئے' پھر انھوں نے اپنا سلسلۂ کلام جاری رکھتے ہوئے کہا' میں وہاں ایک صاحب سے باتیں کرتے ہوئے لڑکی کا خیال نہ گفتگو میں اتنا منہمک رہا کہ لڑکی کے پانی میں گرنے تک کا مجھے مطلق علم نہیں۔ لڑکی میرے یہاں سے نکل کر جھیل کے پاس آچکی تھی' اور وہاں کھڑی کر پانی کا نظارہ کرنے لگی۔ اس اثناء میں آدمیوں کی ایک ایسی ریل آئی جس سے یہ گھبرا کر پرے سرک گئی' وہ پل کی منڈیر تک پہونچی گھبراہٹ میں وہ اپنا توازن بھی قایم نہ رکھ سکی' لڑکھڑاتی ہوئی پانی میں آگری' خدا کا شکر ہے کہ اس نیکی کے فرشتہ نے بچالیا'

ناصر ان جملوں سے محجوب ہو رہا تھا'

بیٹا' —— زلیخا آنکھیں کھولو' طبیعت کیسی ہے اب'

زلیخا کے لفظ میں نہ جانے کونسی ایسی تاثیر پنہاں تھی' جو ناصر کے بدن کے ہر حصہ میں بجلی کی طرح سرایت کرگئی' یہ نام اُس نے کہیں سنا تھا شاید شادی کی محفل میں ——

فرط مسرت میں ایک ہلکی سی چیخ اس کی زبان سے نکلی —— اسے لڑکی کے باپ اور ڈاکٹر کی موجودگی کا مطلق خیال نہ رہا زلیخا نے نرگسی آنکھیں کھولیں' اس کی بیمار نیم وا آنکھیں اب ناصر کی نگاہوں کو دعوت نظارہ دے رہی تھیں'

بیٹا۔ یہ تمھارے محسن ہیں' باپ نے تعارفی لہجہ میں کہا' انھوں نے تمھیں ڈوبنے سے بچایا —— لڑکی نے ناصر کو دیکھا —— اس کے لب ہل رہے تھے' شاید شکریہ کے لیے —— احترام کی خاطر وہ اٹھنا چاہتی تھی' لیکن باپ نے اسے سہارا دے کر لیٹا دیا ——

نہیں' نہیں' آپ لیٹے رہیے' نہ معلوم ناصر نے یہ جملہ کس حالت میں ادا کیا' الفاظ اس کے حلق میں پھندا بنا رہے تھے۔

ڈاکٹر اپنے پیشہ کی مصروفیت کی وجہ رخصت ہونے لگا' لڑکی کا باپ اسے وداع کرنے موڑ تک گیا' آہ —— آپ میرے قریب آئے' لڑکی نے ناصر سے کانپتی ہوئی آواز میں کہا'

ناصر جھکا' اس ہوش ربا منظر کی وہ تاب نہ لاسکا' وہ آہستہ سے پلنگ کی پٹی پر بیٹھ گیا' اس کے کانپتے ہوئے ہاتھ ایک ملائم ہاتھ کی مضبوط گرفت میں تھے' ایک میٹھی سی لہر آب حیات سے زیادہ لطیف' اس کے بدن میں دوڑی' محبت کا ہلکا سا خمار اس کی آنکھوں پر چھایا ہوا تھا —— اس عرصہ میں لڑکی کا باپ آچکا تھا' ناصر پہلی مرتبہ اپنی حرکت قابل گرفت سمجھا —— وہ اٹھا اور وہ باہم ملنے کا وعدہ کرکے گھر روانہ ہوا' دوسرے دن اس نے لڑکی اور باپ کے متعلق کافی معلومات حاصل کئے' وہ یہ معلوم کرکے کہ باپ بیٹی کسی عزیز کی شادی کے

سلسلہ میں کلکتہ سے حیدرآباد آئے ہوئے ہیں مطمئن ہو گیا ــــــ

ناصر ہر روز زلیخا کی مزاج پرسی کے لئے جاتا، گھنٹوں اُس کی پرلطف صحبت میں گزار کر چلے آتا، محبت کا اثر قدرے ایک دوسرے کے دلوں پر منقش ہونے لگا.

باپ اپنی بیٹی کی سلامتی، اور ناصر جیسی محسن ہستی کا تعارف اپنے معزز احباب میں کرانے کے لیے ایک شاندار ڈنر ترتیب دیا ــــــ لڑکی کے والد پروفیسر لطیف ایک آزاد منش بلند خیال ولایت کے تعلیم یافتہ ہونے کے علاوہ اعلیٰ خاندانی فرد تھے، لڑکی پروفیسر موصوف کی جائداد کی واحد مالک تھی، پروفیسر دورانِ دعوت میں بہت محظوظ تھے، ان کی زبان سے ناصر کے شکریہ کے لیے اچھے اچھے منتخب جملے ادا ہو رہے تھے، مہمان ایک ایک کر کے وداع ہونے لگے ــــــ

رات اپنی تاریک آغوش میں کئی گنہ لیے ہوئے نمودار ہوئی، محبت کا پرستار جوڑا باغ کے محفوظ حصہ میں بیٹھا ہوا پریمی راگ الاپ رہا تھا ــــــ

زلیخا حسین مجسمۂ اخلاق زلیخا، اپنے محسن، عاشق ناصر کی آغوش میں مچل رہی تھی ــــــ محبت کی کھیتی بوسوں کی بارش سے سرسبز کی جاتی ہے۔ دونوں شرابِ عشق سے مخمور تھے، عشق کا پرندہ جب سر پر منڈلانے لگتا ہے تو انسان اپنے ہوش حواس کھو بیٹھتا ہے۔ عیوب پردہ پوش ہو جاتے ہیں، ناصر کے جذبات دل کے ساگر میں بڑے زور و شور کے ساتھ لہریں لے رہے تھے، مردانہ قوتیں لطیف جذبات پر قابو پانے کی بڑی جد و جہد کر رہی تھیں، اس نے اپنی فوری پیدا ہونے والی خواہش کا اظہار کر ڈالا ــــــ

عورت با غریب مستقبل سے ناآشنا، انجام سے ناواقف، مرد آسانی کے ساتھ اسے اپنے فریبی جال میں لا سکتا ہے ــــــ اور لا کر رہا۔ آہ کتنا لطیف خوش گوار حملہ، چال اور مکر سے پُر ڈاکہ ــــــ حسن کے رنگین شگوفوں پر ہلکی ارغوانی شراب کے نشہ میں ــــــ اُف خدا! ناصر نے ایک پھول کو چھوا ــــــ اور مسل بھی دیا ــــــ

چاند رموزِ محبت کا واقف کار چاند نکلا ــــــ ناصر کی حرکات پر خندہ زن ہونے کے لئے۔ ہوس کا بندہ، رات کی تاریکیوں میں چھپے چھپے اپنی ہوس کاریوں کی تکمیل میں مصروف رہا، اس طرح دنوں ــــــ اور ہفتوں تک، لیکن ناصر کا فریب گنہ کی کالی گھڑی میں زیادہ دیر تک نہ چھپ سکا۔

اس دوران میں وہ مختلف جگہ، مختلف خیالات میں تبدیل ہوتے رہے، ہوس پرست زیادہ دن تک مسرت کی خوش گوار فضا میں اطمینان کا سانس نہیں لے سکتے، ناصر محبت کی ناجائز شراب کا خمار اپنے اندر زیادہ دیر تک نہ رکھ سکا، وہ ضرورت سے زیادہ چالاک ہو گیا تھا ــــــ اس کے جذبات میں مردنی سی چھا گئی تھی۔

آہ ــــــ پروفیسر، کیا معلوم؟ اس کی نورِ نظر کو اس طرح بے نور بنانے کی کوشش کی جا رہی ہے، کیا خبر؟ کیسے حالات رونما ہوں گے، وہ ان دونوں کے ملاپ کو ایک اچھے جائز نتیجہ پر لانے کے کوشاں تھے، ان کا خیال تھا، وطن پہونچ کر دونوں کو شادی کے خوش گوار سلسلہ میں منسلک کر دوں، ابتدا ــــــ اور اس کے انجام سے وہ بالکل ناواقف تھے۔

پروفیسر کو بلدہ آئے ہوئے ایک ماہ سے زیادہ عرصہ گزرا، کاروبار کے تحت وہ اپنے وطن جانا چاہتے تھے..... مگر
وہ زلیخا کی مرضی کے خلاف کچھ نہ کر سکے،
جدائی کی گھڑیاں بھی کتنی روح فرسا ہوتی ہیں۔ اشکوں کا سیلاب بہہ بہہ کر ایک طوفان مچا رہا تھا، گنہ کی
تاریک اسٹیج پر، دو تنوں نے مل کر ادا کیا تھا، اس کا انجام فلک کے برباد ہاتھوں چھوڑ دیا گیا۔
ناصر، جذبات کا مغلوب ہوس پرست ناصر نے جھوٹے اور یقین نہ آنے والے وعدے اور طویل قسمیں کھائیں۔

صابر کا سلوک

مرکزِ خیال

۱
سواد دیدہ حل کردم فرستم نامہ سوئے تو
کہ در ہنگام خواندن چشم من انند بروئے تو
آنکھ کی تصویر سرنامہ پہ کھینچی ہے کہ تا
تجھ پہ کھل جائے کہ اس کو حسرت دیدار ہے — غالب

۲
گفتہ بودم غم دل باتو بگویم چو بیائی
چہ بگویم کہ غم از دل برود چوں تو بیائی — سعدی
میرے دل میں تھا کہ کہوں گا میں جو یہ دل پہ ہے ملال
وہ جب آگیا مرے سامنے تو نہ رنج تھا نہ ملال تھا — ظفر

۳
دشمنان طعنہ زنندم کہ چرا دل بتو دادم
باید اول ز تو پرسید چنیں خوب چرائی — سعدی
پیار کرنے کا جو خوباں ہم پہ رکھتے تھے گناہ
ان سے بھی تو پوچھتے "تم اتنے کیوں پیارے ہوئے" — میر

۴
از دماغ من برشتہ منخیال رخ دوست
بجفائے فلک و غصہ دوران نہ رود
آنچہ از بار غمت در دل مسکین من است
برود دل ز من و از دل من آن نہ رود — حافظ
سر جاتا ہے سر سے ترا سودا نہیں جاتا
دل جاتا ہے دل سے تری الفت نہیں جاتی — داغ

۵
در فراق تو چہا اے بت محبوب کنم
صبر ایوب کنم گریہ یعقوب کنم — مخلص
ہم نے کیا کیا نہ ترے ہجر میں محبوب کیا
صبر ایوب کیا گریہ یعقوب کیا — مومن

سکینہ بیگم

گزرے ہوئے لمحات

گذری ہوئی گھڑیاں۔

بھولی ہوئی باتیں ....

رہ رہ کے یاد آتی ہیں۔

گائے ہوئے گانے اور بچھڑے ہوئے دوست.....

کیوں ہمیں آستاتے ہیں ؟

کبھی درد۔ کبھی تبسم....... ساتھ لاتے ہیں کبھی مجسمہ عیش..

کبھی تصویر غم ہمیں بناتے ہیں۔

آہ!

گذرے ہوئے دن کیوں یاد آتے ہیں ؟

دسمبر کی اک صبح۔ ہوا کے سرد جھونکوں نے مجھے بیدار کیا۔

ٹھنڈک معمول سے زیادہ تھی۔

اور ہوا کے جھونکوں کے ساتھ۔

درخت کی سنسناہٹ میں ....

ایک دھیمی سی دلکش آواز داخل ہو رہی تھی میں

کھڑکی کے سامنے گیا۔

اور باہر کے دلفزا مناظر کو غور سے دیکھنے میں محو

ہو گیا۔

ابر چھایا ہوا تھا بھوار کے چھوٹے چھوٹے قطرے

درختوں کی ڈالیوں میں ....

آپس میں گنگنا رہے تھے۔

یک بیک خیالات میں جنبش ہوئی۔

....

ایک بھولا ہوا سماں آنکھوں کے سامنے آگیا....

میں نے کیا محسوس کیا ؟

بچپن کا زمانہ ہے !

حیدرآباد کی سرزمین !!

اسکول سے آتے ہوئے بارش آگئی۔ سڑک کے کنارے

پیپل کے درخت کی آڑ میں کھڑا ہوں۔

کیسا دلکش نظارہ ہے۔

پودوں کی ہری بھری وردیاں چمک رہی ہیں۔ ان کی نازک

ڈالیوں سے موتی لٹک رہے ہیں۔

سامنے گرجا گھر کی چوٹی بادلوں سے

کھیل رہی ہے۔

بہتا ہوا پانی اک سریلی آواز پیدا کر رہا ہے۔ بھینی

بھینی خوشبو سے ہوا معطر ہو گئی ہے۔

میرا دل اچھل رہا! ....

کیوں ؟

ان پُرکیف اور روح فرسا مناظر سے ؟

نہیں !

ہرگز نہیں !!

بلکہ اپنے بھولی کرامت کی موجودگی سے !!!

بارش سے بچنے کی خاطر وہ مرے ساتھ لپٹا ہوا کھڑا ہے۔ اس کی

میٹھی آواز میرے کان میں آرہی ہے۔ ”بھائی جان! ہماری محبت

غیر فانی ہے۔ زندگی کی طوفان خیز موجیں ہمیں علٰحدہ نہیں کر سکتیں“

یک لخت فلک پہ بجلی چمکی جس نے مجھے چونکا دیا خود کو اپنے کمرے میں

اکیلا کھڑا پایا۔

مسکراہٹ جاتی رہی۔ اک خفیف سا درد پیدا ہوا۔

”آہ کاش کرامت ساتھ ہو“

عبدالحمید (علی گڑھ)

آرزوئے ناکام

تسلیم کہ ہم دید کا ارماں نہ کریں گے
کس طرح یقیں ہو کہ وہ حیراں نہ کریں گے

وحشت سہی، تو ہین بہاراں نہ کریں گے
جو کچھ بھی ہو، دامن کو گریباں نہ کریں گے

بیدار نظر روح میں ہیجاں نہ کریں گے
آنکھوں کو خراب چمنستاں نہ کریں گے

ہم ترک محبت کسی عنواں نہ کریں گے
یہ کام فرشتے کریں انساں نہ کریں گے

اچھا گلۂ کاہش پنہاں نہ کریں گے
مرنے کے سوا اب کوئی ارماں نہ کریں گے

تجھ کو کبھی محسوس رگ جاں نہ کریں گے
جب تک غم کونین کا عرفاں نہ کریں گے

دانستہ تڑپ جانے کا ساماں نہ کریں گے
نظروں کو تری جذب رگ جاں نہ کریں گے

سجدے تری راہوں میں پریشاں نہ کریں گے
کافر تری تقلید مسلماں نہ کریں گے

غارتگر تسکیں بھی ہیں وہ، دشمن جاں بھی
سوچا ہے کہ دل میں انہیں مہماں نہ کریں گے

قطعہ

کیا آج یونہی چاندنی مغرور رہے گی
کیا آج وہ پھر چاند کو حیراں نہ کریں گے؟

کیا آج رہیں گی یونہی خاموش فضائیں
کیا آج وہ کلیوں کو غزلخواں نہ کریں گے؟

کیا حسرت نظارہ رہے گی یونہی ناکام
کیا جلوۂ پنہاں کو وہ عریاں نہ کریں گے؟

کیا "تاج" کا ماحول رہے گا یونہی تاریک
کیا آج وہ پھولوں میں چراغاں نہ کریں گے؟

کیا آج لٹیں گے نہ مسرت کے خزانے
کیا آج بہاروں کو وہ خنداں نہ کریں گے؟

کب تک یونہی خاموش بہے جائے گی جمنا
کیا اس کو وہ نظروں سے خراماں نہ کریں گے؟

کیا آج بپا ہوگا نہ اک محشر رنگیں
کیا آج وہ ذروں کو پرافشاں نہ کریں گے؟

کیا تکملۂ وحشت دل آج نہ ہوگا
کیا آج وہ ترتیب گریباں نہ کریں گے؟

کیا عشق کی فطرت یونہی مغموم رہے گی
کیا درد محبت کا وہ درماں نہ کریں گے؟

میں اپنے خیالات میں گم تھا کہ یکایک
پہلو سے وہ بول اٹھے کہ ہاں ہاں نہ کریں گے؟

وہ یونہی کہے جائیں گے دل خون نہیں ہے
اندازۂ نوک سر مژگاں نہ کریں گے

آسودہ و ہموار گلستاں کی فضا ہے
ایسے میں وہ کیا عزم گلستاں نہ کریں گے

اک دن انھیں آنا ہی پڑے گا پئے درماں
کب تک وہ علاج غم پنہاں نہ کریں گے

کھل جائے گا اس وقت بھرم ان کے کرم کا
جب ہم گلۂ تنگیٔ داماں نہ کریں گے

اعجاز نہ آئے گی کبھی وجد میں دنیا
ہم بربط دل کو جو غزلخواں نہ کریں گے

اعجاز صدیقی اکبرآبادی
مدیر "شاعر"

مطالعہ قدرت کی اہمیت کے متعلق چند علماء کے خیالات

کوئی شے کیسی ہی حقیر ہو، ایسا جانور بھی ایسا نہیں ہے جو سمجھدار انسان کو حیرت زدہ نہ کر دے۔ (جان لاک)

جس وقت میں چھوٹی چھوٹی حقیر بوٹیوں کو دیکھتا ہوں جو زمین سے اگتی ہیں اور ہوا دنی ترین نباتات ہیں اور جب میں زندگی کی اس خفیہ چنگاری پر غور و خوض کرتا ہوں جو کہ ان میں موجود ہے جو جاذبیت رکھتی، بڑھتی، نمو پاتی اور خودکی اور اپنی نوع کی پرورش کرتی ہے، ہر جو خوبیاں ان بوٹیوں میں بلحاظ غذا اور ادویہ زیادہ کل مخلوق کی خوشنودی کے لیے موجود ہیں تو میرا خیال اس خدا کی حمد و ثنا کی طرف کھنچ جاتا ہے جس کی دانائی، قوت اثر اور حکمرانی اس کی اچھائی کی ان چھوٹی چھوٹی پودوں میں دکھلائی دیتی ہیں جن کے زیر سایہ بننے والے دانا سے دانا قابل سے قابل طاقتور سے طاقتور اور عالم سے عالم انسان ہیں ان سب کو بے لیے تو بھی وہ خدا کی اس دانائی کے برابر نہیں ہو سکتے جو گھاس کی ایک پتی میں ظہور پذیر ہے۔ (سر ایم ہسل)

ایسی کوئی جستجو کی قدر و قیمت نہ تھی جو انسانوں کو ان کے خالق کی کارگزاریوں پر سوچ بچار کرنے کی طرف مائل کرتی۔ یہ جب آپ Linnean Society کے جرنل کے صفحات پر نظر ڈالیں تو آپ کو اس کا مسادہ محض ایک ماہر نباتات معلوم ہوگا مگر اس کا حقیقت مقصد رکھتی ہے جس میں وہ وقت گزارتا ہے اور جو اس کے دماغ میں سمایا ہوا رہتا ہے اور اس کے جذبات کو تسکین پہنچتا ہے۔ ورنہ وہ مسرت جو اس کو کسی پودے کی ساخت کی تحقیق میں محسوس ہوتی ہے اس سے کم پاکیزہ ہے۔ جو انسانی ذہانت کی اعلیٰ ترین پیداوار کے مطالعہ سے حاصل ہوتی ہے۔ (ساؤتھے)

اگر ہم اپنی آنکھ کھولیں اور اس کا بندھن نکال پھینکیں تو ہم سب کو موسیٰ علیہ السلام کی طرح ایک جھاڑی میں بھی نور قدرت دیکھنا چاہیے وغیرہ۔ (کاؤلی)

ایک انسان کے لیے جو پریشان ہو اور متعدد خیالات میں گم ہو گیا ہو، قدرت سے نزدیک تر تماس میں آنا اور اس کے طریقوں اور اس کی اسپرٹ کو سمجھنا اچھا ہوتا ہے۔ یہ یقین کرنا محض خیال نہیں ہے کہ موجودہ نسل کے بچوں کو بہ نسبت سابق کے قدرت اور قدرت میں خدا تعالیٰ کے طریقوں کے متعلق زیادہ معلومات حاصل کرائی جائیں تو ان کے پاس زیادہ تندرست اور زیادہ خوش حال اور کم پریشان کن اور کم فکر مند زندگی بسر کرنے کے لیے مواد مہیا ہوگا بہ نسبت ان زندگیوں کے جو ہم میں سے بیشتر بسر کرتے ہیں۔ (بشپ تلبس بروکس)

قدرت کی محبت ایک بڑا عطیہ ہے اور اگر اس کو منجمد کر دیا جائے یا دبوچ دیا جائے تو یہ کہ اس نقصان کے اثر سے شاید ہی بچ سکتا ہے۔ میں درحقیقت یہ نہیں کہوں گا کہ ایک شخص جس کو قدرت سے محبت نہ ہو لازمی طور پر خراب ہے یا جو محبت کرتا ہے لازماً اچھا ہے بلکہ اکثر و بیشتر دماغوں کے لیے اس سے بڑی مدد ملتی ہے۔ بہت سارے جیسے کہ کتاب کہتی ہیں مندر میں اس دروازے سے داخل ہوتے ہیں جس کو خوبصورت کہتے ہیں۔ (سر جان لبک)

یہ بہت زیادہ وسیع طور پر معلوم نہیں ہو سکتا کہ قدرت وسیع ہے اور علم محدود، نیز یہ کہ کسی فرد کو بھی خواہ وہ اپنے درجہ کے یا کتاب کے لحاظ سے کتنا ہی حقیر کیوں نہ ہو عام خزانہ (معلومات) میں اضافہ کرنے کے متعلق نا امید ہونے کی ضرورت نہیں۔ (ہیوج ملر)

اس بات پر تعجب نہ کرو کہ شاعر پھولوں کے متعلق اتنا زیادہ کیوں کہتے ہیں۔ کیا آپ نے کسی شاعر کے متعلق یہ [illegible] اس نے پھولوں کے متعلق کچھ نہ کہا ہو۔ وہ ہمیشہ ہمیشہ دنیا کے قائم رہنے تک اشعار میں کھلیں گے۔ جیسے کہ بن [illegible] ہیں ہمیشہ پرانے اور ہمیشہ نئے (ا۔ ڈبلو۔ ہوسس)

محمد سعید الدین

دلہن کی یاد میں

آہ کہ تم تھے مری دنیائے طرب کی رونق
تم سے رنگین تھی دنیائے محبت کی شفق
یا کوئی فلسفۂ حسن کا مضمونِ ادق
یا کتابِ شررِ حسن کا زرّین ورق
کس قدر نازشِ ارمانِ جوانی تم تھے — مجھے معلوم نہ تھا عشرتِ فانی تم تھے

تم تو رخصت ہوئے مجھ کو غمِ دنیا دے کر
پھول سے دل پہ مرے داغِ تمنا دے کر
نگہِ شوق کو پیغامِ تماشا دے کر
مری امید کو الفت کا سہارا دے کر
نامکمل ہے محبت کا فسانہ افسوس — میری ہستی کو کچل دے گا زمانہ افسوس

غیرتِ رنگِ شفق میری رنگیلی دلہن
عظمتِ درسِ حیا میری ہٹیلی دلہن
پیکرِ ناز و ادا بانکی سجیلی دلہن
عشرتِ صبحِ جوانی کی سہیلی دلہن
دل پہ جو نقشِ محبت ہے مٹاؤں کیونکر — کچھ سمجھ میں نہیں آتا تجھے پاؤں کیونکر

زندگی تھی تری وابستۂ یک شامِ نشاط
اس لئے لرزہ بہ اندام تھا پیغامِ نشاط
ہاتھ جو چھوٹ گیا، ٹوٹ گیا جامِ نشاط
آہ یہ دردِ الم ناکیِ انجامِ نشاط
عشرت آباد میں دنیا کو بھلا بیٹھے ہیں — ہم تری یاد میں دنیا کو بھلا بیٹھے ہیں

انیسہ کلیانوی

دیس کا میوا

میں کشن کو ڈھونڈتا ہوا گاؤں کی چھوٹی سی ندی کی طرف گیا۔ میں نے دیکھا کہ کشن اکیلا بیٹھا ہوا دور افق پر کسی چیز کو ٹکٹکی باندھے دیکھ رہا ہے، اس کی پلکوں پر اس وقت آنسوؤں کے دو بڑے بڑے قطرے موتی کی طرح چمک رہے تھے۔ میں کچھ دیر کے لئے حیران سا ہو گیا۔ کشن میرا بچپن کا گہرا دوست تھا۔ کالج میں بھی میں نے اس کے ساتھ چار برس گزارے تھے۔ اس کے پاس دولت نہیں تھی میری طرح وہ فکر روزگار سے بے نیاز بھی نہیں تھا، لیکن کبھی اس نے اپنی غربت اور تنگدستی کی شکایت نہیں کی وہ اپنی حالت پر مطمئن تھا۔ اسے وہ سکون قلب حاصل تھا جو بہت کم لوگوں کو میسر آتا ہے، حرص اور زیادہ دولت کی خواہش اسے چھو کر بھی نہیں گئی تھی۔ ملول اور مغموم آدمیوں کو وہ سوسائٹی کا مجرم سمجھتا تھا۔ میں اس قلب ماہیت پر حیران ہو گیا ——— کیا یہ وہی کشن ہے!

اس نے مجھے دیکھ کر آنسوؤں کو پی لینے کی کوشش کی "کب آئے بابو تم، مزاج تو اچھی ہے" ہونٹوں پر مصنوعی مسکراہٹ کے آثار پیدا کرتے ہوئے وہ مجھ سے مخاطب ہوا۔

میں نے جواب دیا ——— "میں ابھی شام کی گاڑی سے آرہا ہوں، کشن! کیا بات ہے۔ ابھی تمہاری آنکھوں میں آنسو کیوں چھلک رہے تھے"۔ "کوئی خاص بات نہیں ہے" اس نے میری بات کو کاٹتے ہوئے کہا ——— "اچھا یہ بتاؤ اب یونیورسٹی کے کیا حالات ہیں، ڈاکٹر صاحب تو اچھے ہیں"

"سب اچھے ہیں"۔ میں نے طنزاً کہا۔ "معاف کیجئے مجھے معلوم نہ تھا کہ آپ اپنے حالات میں اس قدر رازداری برتتے ہیں۔ اور کسی پرخلوص سوال کا جواب یوں ٹال مٹول سے دیا کرتے ہیں"۔

کشن میرے اس طنز کی تاب نہ لا سکا اور کہنے لگا "بھائی معاف کرو میں تم سے کچھ نہیں چھپاؤں گا" "تم رادھا کو جانتے ہو ——— ٹھاکر صاحب کی لڑکی رادھا" میرا دل دھڑکنے لگا، میں نے کہا "ہاں کیوں نہیں، اچھی طرح جانتا ہوں"۔ ——— کشن نے کہا "کوئی دو مہینے کی بات ہے، میں اسی مقام پر بیٹھا ہوا پڑھتا بیٹھا تھا، میں پڑھ رہا تھا ——— جب تو مجھے نغمہ سرائی کا حکم دیتا ہے تو میں محسوس کرتا ہوں کہ میرا دل غرور سے پھٹ جائے گا۔ میں اس گیت پر ابھی سر دھن رہا تھا کہ مجھے اچانک کسی کے گانے کی آواز آئی ——— "بالم آئے بسو مورے من میں" رادھا اپنے آپ میں مگن گاتی ہوئی چلی آرہی تھی، مجھے بیٹھا ہوا دیکھ کر وہ خاموش ہو گئی اور مندر کی طرف چلی گئی، میں نے کتاب ہاتھ سے رکھ دی اور غیر اختیاری طور پر بہت لے سری اور بھونڈی آواز میں لہک لہک کر "بالم آئے بسو مورے من میں" گانا شروع کیا۔ میں کوئی آدھے گھنٹے تک اسی طرح گا رہا، رادھا اب مندر سے لوٹ رہی تھی، مجھے اس بے ہنگامی سے گاتا ہوا دیکھ کر اس کے ہونٹوں پر ایک خفیف سی مسکراہٹ نمودار ہوئی، میں جھینپ کر خاموش ہو گیا اور وہ میرے سامنے سے نظریں نیچی کئے ہوئے گزر گئی" ——— کشن کے اس بیان کو سن کر مجھے کسی قدر ہنسی آئی، میں بہت دلچسپی سے سن رہا تھا ——— کشن نے قصہ جاری رکھتے ہوئے کہا "اس کے بعد سے میں ہر روز یہاں آکر بیٹھا کرتا ہوں رادھا روزانہ اسی طرح مندر کو جایا کرتی ہے، میں ہمیشہ ہی چاہتا ہوں کہ میں اس سے بات کروں لیکن اس کے وقار اور متانت کو دیکھ کر میری ہمت نہیں پڑتی۔ اگرچہ میں نے اب تک اس سے گفتگو نہیں کی لیکن مجھے محسوس ہوتا ہے کہ میری روح اس سے

برسوں سے واقف ہے' تم جانتے ہو بابو" ——— کشن نے ٹھنڈی سانس لی اور زمین کی طرف دیکھتے ہوئے کہا

"میں ایک غریب اور مفلوک الحال خاندان سے تعلق رکھتا ہوں' یہ احساس میرے دل میں پہلی مرتبہ پیدا ہوا ... زندگی میں پہلی مرتبہ امیروں کی زندگی کو رشک کی نظروں سے دیکھا ہے ——— اور وہ بھی اس لیے کہ راد ... خاندان ... کی ... ہے' اور میرا اس کا کوئی جوڑ نہیں ہو سکتا"

کشن کی باتیں سن کر مجھ پر سکتے کا سا عالم طاری ہو گیا' مجھے بھی راد ... سے محبت تھی' اور میں نے ... رکھتا تھا' میں نے اپنے گھر میں تحریک کی تھی اور یہ اطلاع ملنے پر کہ ٹھاکر صاحب میرے رشتے کے لئے تیار ہیں کچھ دنوں کے ... اب کشن کو یہ خوشخبری سنانے کے لیے میں یہاں آیا تھا کیونکہ میری کوئی مسرت کشن کے بغیر مکمل نہیں ہو سکتی تھی' لیکن یہ مسرت ... ——— اس میں بھلا اس بیچارے کا کیا قصور تھا' مجھے اس کی باتیں یاد آنے لگیں ———

"اچھا ہوا بابو تم آ گئے' یہ بھید تو کچھ تمہارے کھوجے ہی کھل سکے گا' دو تین مہینے سے نہ جانے کیا ہو گیا ہے' ... اداس رہتا ہے' کوئی دکھ ہے بڑا بھاری جو اس کے جی کو کھا رہا ہے' میں پوچھتی ہوں تو کچھ بتاتا ہی نہیں ——— ...

"ماتا جی ——— آپ فکر نہ کیجئے' میں سب کچھ معلوم کروں گا" بیچاری بوڑھی عورت کے دل کو میرے الفاظ سے کچھ ڈھارس ... بھری آواز میں اس نے مجھے دعائیں دیں اور کہا ——— "بیٹا اس اجڑے سنسار میں مری دھن دولت سب کچھ کشن ہے' وہ ... سکھی رہے تو میرے یہ جیون جنت سے بھی بڑھ کر ہے"۔

ہم دونوں خاموش گھر کی طرف جا رہے تھے' میں نے کہا "کشن مایوس ہونے کی کیا ضرورت ہے' تم آج بھی سرکاری ملازمت ... کرنی چاہو تو پھر تمہارے رشتے کے لئے کوئی مشکل باقی نہیں رہے گی ———"

کشن نے کہا ——— "بھائی میرے لئے یہی کافی ہے کہ ایشور نے میرے دل میں محبت کا پاک جذبہ پیدا کیا ہے' میں اس جذبے ... کروں گا اور اپنی زندگی گزار دوں گا" ———

میں نے کہا "بھائی تم اپنے اس فلسفۂ محبت کو اپنے پاس ہی رکھو' اگر ملازمت سے طبعی نفرت ہے تو بھی گاؤں ... اثر ڈال سکتی ہے" ———

میں گھر چلا آیا ——— رات بھر مجھے ایک خلش اور بے چینی سی رہی' کشن کے فلسفۂ محبت نے مری آنکھیں کھول دی تھیں' میں نے ... دل میں یہ فیصلہ کیا کہ کشن کی دوستی پر اپنی محبت کو قربان کر دوں گا۔

دوسرے روز میں نے اپنے والد سے باتیں چھیڑیں اور کہا ——— "بابو جی آپ ٹھاکر صاحب والوں سے کہہ دیں کہ شادی ... نہیں ہو سکتی' وہ اگر ٹھیرنا چاہیں تو چار چھ برس تک اور ٹھیریں" بابو جی نے حیرت سے کہا "تو کیا اتنے دنوں تک وہ اپنی لڑکی کو ... بٹھا رکھیں گے' اور میں کہتا ہوں کہ ٹھیرنے کی ضرورت ہی کیا ہے"

میں نے کہا "بابو جی میں ابھی اپنی تعلیم جاری رکھنا چاہتا ہوں' اور تعلیم کے ختم ہونے کے بعد شادی کا خیال ہے" بابو جی نے کہا ———

اگر یہ بات تھی تو پھر مجھے اس قدر اصرار سے لکھنے کی کیا ضرورت تھی اور کل تک تو تم راضی تھے اور بہت خوش تھے آج یکایک یہ تبدیلی ہو کیا گئی ہے" بابو جی اس وقت برہم ہو رہے تھے —— میں نے سامنے سے ٹل جانے کی کوشش کی لیکن کشن آتا ہوا دکھائی دیا —— پتا کس سے لینے گئے —— "اچھا ہوا کشن تم وقت پر آ گئے تمھارے دوست کو یہ کیا ہو گیا ہے"

کشن نے کہا —— "مجھے معلوم نہیں —— کیوں خیریت ہے" اس نے میری طرف دیکھ کر کہا۔ پتا جی برہمی سے کہنے لگے —— "اس نے مجھے خط لکھا تھا کہ ٹھاکر صاحب کی لڑکی سے بیاہ کی بات چیت کروں۔ کل تک بھی یہ اس پر راضی تھا لیکن آج کہتا ہے کہ دو چار ہی برس ٹھیریں ورنہ کہیں اور بات پکی کر لیں ——"

یہ سن کر کشن نے میری طرف دیکھا مجھ میں اس سے آنکھیں چار کرنے کی ہمت نہ تھی۔ میں اس کے عزم اور ارادے سے واقف تھا۔ میں خاموش سامنے کسی بے جان چیز کو تکنے لگا۔ کشن نے کہا —— "اچھا تو یہ بات ہے۔ بابو جی آپ مطمئن رہیے میں انہیں راضی کر لوں گا"

اس واقعے کو ایک برس گزر چکا ہے۔ میں اپنی سرکاری ملازمت کے سلسلے میں شہر میں رہتا ہوں۔ رادھا میری شریکِ زندگی ہے۔ مجھے اپنے گھر میں وہ سب کچھ میسر ہے جس کی کسی کو آرزو ہو سکتی ہے۔ ڈرائنگ روم میں بیچوں بیچ کشن کی تصویر لگی ہوئی ہے جو ہر وقت اس کے جذبۂ ایثار کی یاد تازہ کرتی رہتی ہے۔

کشن آج کل "دیس سیوک منڈل" کا سکریٹری ہے۔ اخباروں میں اس کے کارناموں کی بڑی دھوم ہے۔ پہلی بار اس کا خط آیا تھا اس میں اس نے لکھا ہے کہ

"میری زندگی بہت چین اور شانتی سے گزر رہی ہے ملک کے فاقہ کش غریب اور بے زبان کسانوں کی سیوا میں میری آتما کو بڑا سکھ ملتا ہے۔ یہی میری زندگی کا مقصد ہے میں اسی میں خوش ہوں۔ رادھا کو دعا سلام۔"

رادھا سیوا منڈل کے لئے خاص اپنے ہاتھ سے بنائے ہوئے تحفے بھیجتی رہتی ہے۔

سید خلیل اللہ حسینی

رنگِ زمانہ

باغِ عالم کی ہوا کا رنگ ہی کچھ اور ہے
آج بلبل کی نوا کا رنگ ہی کچھ اور ہے

کس طرح منزل کو پہنچیں رہروانِ راہِ عشق
وائے قسمت رہنما کا رنگ ہی کچھ اور ہے

سن کے بھی ہوتا نہیں ہے جادہ پیما قافلہ
کیا کہیں بانگِ درا کا رنگ ہی کچھ اور ہے

گوشۂ عزلت ہے بہتر محفلِ ہستی میں آج
آشنا نا آشنا کا رنگ ہی کچھ اور ہے

کس ادا سے ان کے رخ پر بال ہیں بکھرے ہوئے
آج اس کالی گھٹا کا رنگ ہی کچھ اور ہے

اب نہ وہ لطفِ محبت ہے نہ وہ شانِ ستم
اب وفا کا اور جفا کا رنگ ہی کچھ اور ہے

گل کھلائے ہیں زمینِ شعر میں کیا کیا عزیز
اب تری طبعِ رسا کا رنگ ہی کچھ اور ہے

عزیز اللہ عزیز (بنگلوری)

جوابِ تنقید

حیدرآباد کے مشہور شاعر حضرت علی منظر کی نظمیں ہندستان کے مقتدر رسائل میں شائع ہوتی اور نہایت شوق سے پڑھی جاتی ہیں۔ ان کا کلام عہد حاضر کے لئے ایک اجتہادی حیثیت کا مالک ہے۔ انھوں نے اپنے کلام پر تنقید کا جواب رسالہ شہاب میں اشاعت کے لئے روانہ کیا تھا۔ لیکن کئی ماہ کے بعد واپس ہوگیا اب ان کے معتقدین کے اصرار پر سب رس میں شائع کیا جاتا ہے

تعلقہ بھنا آباد سے پرسوں ایک "محبت نامہ" میرے نام آیا جس کا خلاصہ میں یہاں بطور تمہید پیش کرتا ہوں۔

منظور بھائی! ...... تمہاری نظم "جاسوس دوست" مجھے بہت پسند آئی تھی اتنا یہ ہے کہ اس نظم پر جب تک میں نے اپنی رائے کا اظہار نہیں کر دیا دوسرا کوئی کام نہیں کیا۔ اب بھی اس نظم کے تصور کے ساتھ ایک ملت کش ضمیر فروش دوست کی تصویر سامنے آجاتی ہے اور اس گھومنے والے "تجسس" "ابن آدم" کی سخن آرائی کس کس کی "نظر بندی" اور "زبان بندی" کی علت غائی ہے۔ کل کی بات ہے کہ یہ ظالم بالکل پراگندہ مارا مارا پھرتا تھا آج ہوائی جہاز میں بیٹھ کر پرکا کوا بنا اور اڑا رہا ہے۔ اپنی ترقی کے لئے یہ اپنوں کو ذلیل کرتا ہے نہ یہ وطن پرست نہ قوم پرست نہ زر پرست ہے، گرگٹ کی طرح رنگ بدلتا ہے۔ کچھ سوچتے سوچتے ... بیساختہ ہنس دیتا ہے کہ کسی کو بناوٹ کا گمان تک نہ ہو ---- پریشان نہ ہو کر پریشان نظر آتا ہے۔ ایسا پریشان کہ ناواقف انسان بھی اس کی ہمدردی پر تل جائے" اس نظم میں تم نے کردار نگاری کا کمال دکھایا ہے ...... مگر افسوس ہے کہ اس کے دو ایک اشعار پر بادی النظر میں (جناب عطارد کو) کچھ شبہ سا ہو رہا ہے[1]

یہ پورا جملہ عطارد صاحب ہی کا ہے ---- خالص شبہ نہیں بلکہ کچھ شبہ سا ہو رہا ہے کیا خوب!!

خیر تم خود قلم اٹھاؤ یا مجھے اجازت دو۔

میں جانتا ہوں کہ شہاب کے تم نہ قلمی معاون ہو نہ "رقمی موید" (خریدار) اس لئے رسالہ مذکور اس خط کے ساتھ بھیج رہا ہوں فقط

اپنے صدیق عزیز مولوی سید کریم الدین صاحب اکرم کا شکریہ ادا کر کے میں نے "نقد و نظر" کا مطالعہ کیا۔ موزونہ بالا نظم کا پہلا شعر ہے ؎

الاماں یہ تیری آشفتہ نگاہی الاماں ‏ ‏ عمرو عیار کی بھی ہیچ ہیں چالاکیاں

" آشفتہ نگاہی مصنف کے عندیہ میں شاید جدید لفظ ہے اسی لئے اس کو واوین میں لکھا گیا ہے۔ آشفتہ یا آشفتہ حالی پریشانی یا شوریدگی کو کہتے ہیں[2] اس لئے آشفتہ نگاہی کے معنی ہوئے پریشان نگاہی یعنی پریشانی اور گھبراہٹ سے ادھر ادھر دیکھنا۔ عیار یا جاسوس کے واسطے "آشفتہ نگاہی" تو کچھ ٹھیک نہیں معلوم ہوتی اس آشفتہ نگاہی سے تو عیاری کا بھانڈا پھوٹ جائے گا اور جاسوس دوست دھر لئے جائیں گے"

جناب عطارد! آشفتہ نگاہی نہ میرے عندیہ میں جدید لفظ ہے نہ آپ کے خیال میں لیکن میں نے اس کے ہم وزن لفظ دیدہ نگاہی

---

[1] رسالہ شہاب حیدرآباد دکن جلد (۶) نمبر (۱۱) آبان ۱۳۴۷ ف

[2] آشفتہ یا آشفتہ حالی پریشانی یا شوریدگی کو نہیں کہتے بلکہ پریشانی یا شوریدگی کے حال کو کہتے ہیں۔ اگر آپ آشفتہ حال پریشانی کو کہتے ہیں تو ... صاحب ... حاجت کہنا روا ہے؟ ۱۲

موقع کے لحاظ سے اس کو ترجیح دی ہے اس لئے وہ واوین کی خصوصیت سے ممتاز نظر آ رہا ہے۔ اس شعر کا اور اس سے پہلا شعر نہیں نہ سہی
صرف ایک شعر تو پڑھ لیجئے ؎

تیری آنکھوں سے عیاں اب تک وہ برقی لہر ہے   تیری نگاہ تیز پاس ہاں لہر ہے

مولوی صاحب! نظم کو غزل کی طرح نہ جانچئے۔ موخر الذکر صنف کا ہر شعر ایک نئے مضمون کا حامل ہوتا ہے برخلاف اس کے نظم کے تمام
شعر مربوط ہوتے ہیں مثلاً شاعر مشرق کا یہ شعر پڑھئے۔

دیا اہلِ حرم کو رقص کا فرمان ستمگر نے   یہ انداز ستم کچھ کم نہ تھا آثار محشر سے

سننے والے کہیں گے کہ اہل حرم کو بت کے آگے سجدہ کرنے کا حکم دیا تو ستمگری کا ایک کمال سمجھا جاتا۔ یہ راجہ اندر بھی عجیب بزرگ ہیں کہ
اہل حرم کو رقص کرنے کا حکم دے رہے ہیں لیکن ماقبل و مابعد کے بھی گوش گزار کر دیجئے ؎

بھلا کس قدر ظالم جفا جو کینہ پرور تھا   نکالیں شاہ تیموری کی آنکھیں نوکِ خنجر سے
بھلا تعمیل اس فرمانِ غیرت کش کی ممکن تھی   شہنشاہی حرم کی نازنینان سمن بر سے

اب خود سامعین کا ذہن غلام قادر روہیلہ کی طرف منتقل ہو جائے گا اور دیر و حرم کی مناسبتیں جو پہلے ذہن میں آگئی تھیں پس پشت
ڈال دی جائیں گی ——— اسی طرح میری نظم کا یہ شعر تنہا پیش کیا جائے تو "آشفتہ نگاہی" لوگوں کی نگاہوں میں ضرور کھٹکے گی مگر پہلے
والے شعر کے ساتھ پڑھا جائے تو یہی آشفتہ نگاہی بہت زیادہ موزوں معلوم ہوگی۔ آپ کا یہ فرمانا کہ :-

عیار یا جاسوس کے واسطے آشفتہ نگاہی تو کچھ ٹھیک نہیں معلوم ہوتی۔

غور و فکر کا طالب ہے۔ مولوی صاحب! ایک اچھے جاسوس کی آشفتہ نگاہی پر بڑے بڑے لوگوں کی سمجھ کی نظر حیران ہو جاتی
ہے۔ یہ ظالم ایک منٹ میں پوری محفل کا جائزہ لے لیتا ہے۔ اس کا گھبرا گھبرا کر ادھر ادھر دیکھنا بھی مصلحت سے خالی نہیں۔ غرض یہاں
کم نگاہی، کج نگاہی، خوش نگاہی، بد نگاہی کوئی چیز نظر انداز کرنے کے قابل نہیں۔ بلاغت نظر سے کام لیجئے تو معلوم ہو جائے گا کہ
بالکل آشفتہ نگاہی سے عیاری کا بھانڈا نہیں پھوٹتا۔ بلکہ یہ عیاری کا بھرم رکھ لیتی ہے۔ کچے جاسوس دھر لئے جاتے ہیں میرا
دوست تو پکا جاسوس ہے ——— کیوں ہنسی آگئی!!

"عمرو اس شعر میں ابرو کے وزن پر لکھا گیا ہے حالانکہ بفتح اول و سکون ثانی نام ہے ایک عیار کا جس میں"
"واؤ غیر ملفوظ اور زاید ہے یہ رسم الخط محض حضرت عمر رضی اللہ عنہ کے اور اس نام کے فرق و امتیاز کے لئے"
"اختیار کیا گیا ہے ..... اس نام میں واؤ زاید ہے جو پڑھا نہیں جاتا ..... بفرض غلط عمرو میں واؤ کو جز"
"نام قرار دیا جائے تو فارسی کے عام قاعدے کے لحاظ سے جس کلمہ کے آخر واؤ ہو اضافت کی حالت میں وہاں"
"ایک (ی) زیادہ کی جاتی ہے۔ جیسے رُو سے روئے زیبا ..... مگر اس شعر میں عمرو عیار ہی لکھا گیا ہے"
"یہ بھی صحیح نہیں بہر حال اس تصریح کے لحاظ سے بغیر واؤ کو پڑھے مصرع کا وزن متاثر ہو رہا ہے۔"

جناب عطارد! یہ واؤ میرے شعر میں بھی غیر ملفوظ اور زائد ہی ہے۔ میں نے بھی یہ رسم الخط محض حضرت عمر رضی اللہ عنہ سے [illegible] کے فرق و امتیاز کے لئے اختیار کیا ہے۔ میرا یہ بیان دیکھ کر آپ حیران ہو جائیں گے کہ ایسی صورت میں کیا وزن شعر [illegible] ہوگا!

جناب من! ہرگز نہ ہوگا ؏ سکھایا ہے بڑے استاد نے مجھ کو پھری گد کا ——— پڑھئے عمرو کے میم کو مشدد [illegible]
مولانا روم ؒ کا شعر نظیر آ سے

دیدہ را بر جستنِ عمر گماشت ———— رخت را و اسپ را ضایع گزاشت

چونکہ عمر و عیار کے واؤ کو میں اپنے شعر میں بھی غیر ملفوظ اور زائد ثابت[2] کر چکا ہوں اس لئے فارسی کے اس قاعدہ [illegible] کرنے کی ضرورت نہیں رہی کہ

جس کلمہ کے آخر واؤ ہو اضافت کی حالت میں وہاں ایک (ی) زیادہ کی جاتی ہے ۔ ے

کیوں میں حیران ہوں جو ہر سو آج تیری دھوم ہے ———— تیری فطرت ابتدا ہی سے مجھے معلوم ہے

" ہوں اور ہووں میں ہوئے ہو وے میں کیا کوئی فرق نہیں ہے ؟ "
آپ کا یہ سوال میری سمجھ میں اچھی طرح سے نہیں آیا، اگر آپ یہاں حال و مضارع کا امتیاز پیدا کرنا چاہتے [illegible]
بمعنی حال کی نظیر سنئے ے

نالہ سینے سے کرے عزم سفر آخر شب ———— راہرو چلنے پہ باندھے ہے کمر آخر شب

---

[1] عطارد میاں! یہ نام تو ہے ایک مگر پڑھا جاتا ہے تین طرح سے مثلاً :-
۱۔ من بہ تو مشغول و تو با عمرو و زید ——— بہ فتح اول و سکون ثانی۔
۲۔ عمر پنجہ بر پیچ دیو مرید ——— بہ ضم اول و فتح ثانی۔
۳۔ تیسری صورت جو اوپر پیش کی گئی۔ یعنی بہ تشدید میم۔
پہلی نظیر گلستاں میں دوسری بوستاں میں تیسری مثنوی مولوی معنوی دفتر اول میں دیکھی جا سکتی ہے۔

[2] جب مشق سخن کی ابتدا تھی اور میں نے منشی فاضل کا امتحان بھی پاس نہیں کیا تھا وحید العصر علامہ اقبال کے مندرجہ ذیل قطعہ [illegible]

برخیز کہ آدم را ہنگام ظہور آمد ———— ایں مشت غبارے را انجم بہ سجود آمد
آں راز کہ پوشیدہ در سینۂ ہستی بود ———— از شوخی آب و گل در گفت و شنود آمد

دوسرے شعر کا ترجمہ ملاحظہ ہو ے

پنہاں تھا جو راز کبھی موجود محض کے سینہ میں، شوخی آب و گل کی بدولت کہنے سننے میں آیا۔
زیر خط لفظ کی تحقیق نہ تھی کہ بہ سکون ثانی ہے یا بہ فتح ثانی، میرے محتاط ذوق نے اس لفظ کو ایسی جگہ کھپایا کہ دونوں حالتوں میں اس پر اعتراض نہیں کیا جا سکتا یعنی یہ مخفف ہے تو دال نقل بے اشباع اور مخفف ہے تو با اشباع۔ تقطیع کر کے دیکھ لیجئے، ابتدائی دور میں یہ حال تھا تو احتیاط کا اب کیا عالم ہوگا!

"ہر استاد کے عوض ہر کسی استاد سے قطع نظر" "زبان کا ورد ہونا" بھی نیا لفظ ہے جو ترجمہ ہے۔ وردِ زبان کا
"غلط ہے فصحا کی یہ زبان نہیں ہے اردو میں بھی وردِ زبان ہونا یا خالی ورد ہونا ہی کہتے ہیں"

کونسی شب کو مرا وردِ چہل کاف نہیں "آتش مرحوم"

بھائی صاحب! میرا مصرع جو شخص بھی پڑھے گا میرا مطلب سمجھ جائے گا، صاف صاف صحیح ہے۔

نام تیرا واقعی سب کی زبان کا ورد تھا

لیکن اس کے لفظوں کو توڑ مروڑ کر اس طرح پیش کیا گیا ہے کہ سطحی نظریں فوراً پریشان ہو جائیں گی ــــ
ہونا" بھی نیا لفظ ہے۔ مولوی صاحب! آپ نے وادین میں جو فقرہ لکھا ہے اس سے یہ معلوم ہوتا ہے کہ
بننے کی صلاحیت ہے" زبان کا ورد ہونا بے شک نیا لفظ ہے مگر اس مصرع سے یہ بات ظاہر نہیں ہوتی
وادین میں لکھا ہے" اپنا مصرع مکرر لکھتا ہوں۔

نام تیرا واقعی سب کی زبان کا ورد تھا

سب کی زبان کا وظیفہ یعنی سب کا وظیفہ تھا اس میں شک نہیں کہ یہ وردِ زبان کا ترجمہ ہے۔ سنئے
زبان کے محاورہ کو دوسری زبان میں ترجمہ کرنا اگرچہ جائز نہیں مگر ہمارے پیشروؤں نے یہ فرق بھی اٹھا دیا

بھائی کونسی وہ چیز بتوں کی ہم کو — نہ کمر رکھتے ہیں ظالم نہ دہن رکھتے ہیں

یہ حقیقت میں لفظی ترجمہ فارسی محاورہ کا ہے کہ نہ کمر دارند نہ دہن دارند۔[۵] فرمایئے حضرت! وردِ زبان کا ترجمہ
کیا نئی بات ہوئی" ورد ہونا غلط ہے" ہوگا۔ ورد نہیں تو آپ کی پیش کردہ نظیر کی رو سے صحیح ہے؟

کونسی رات مرا وردِ چہل کاف نہیں "آتش مرحوم"

جب ورد نہیں صحیح ہے تو ورد ہے بھی صحیح ہوگا" میر خلیق فرماتے ہیں۔

دس میں کہوں سو میں کہوں یہ ورد ہے میرا

ورد ہے صحیح ثابت ہو گیا تو ورد تھا کیونکر غلط ہوگا!؟ مولانا! کڑی سے کڑی ملایئے اور فرمایئے کہ فصحا کی یہی زبان ہے۔
"واقعی کا لفظ حشو ہے وزن شعر کے سوا واقعی اور غیر واقعی کی یہاں کوئی ضرورت نہ تھی"
بھائی صاحب! جس بات میں شک و شبہ نہیں ہوتا وہ اسی طرح کہی جاتی ہے" استاد ذوق فرماتے ہیں ؎

سن کے مجنوں نے مرے شورِ جنوں کو یہ کہا — واقعی مجھ سے بھی یہ شوریدہ سر اچھا

اب میں اپنا شعر لکھتا ہوں ؎

ہر کسی استاد کا تو منہ چڑھا شاگرد تھا — نام تیرا واقعی سب کی زبان کا ورد تھا

بالغ نظر اصحاب انصاف کریں گے کہ واقعی کا لفظ حشو ہے یا اس سے قوت ایقان بڑھ رہی ہے۔

ہیں سیاہ اخبار سارے تیرے نام اور کام سے — شاید اب تو آ رہا ہے خاص ملک شام سے

"کیا ملک شام کے باشندے جاسوس ہوا کرتے ہیں؟ یا ملک شام کی آب و ہوا میں کچھ ایسی تاثیر ہے؟ شامی پیر کے

---

[۵] آب حیات میں اس قسم کی بیسیوں نظیریں ملیں گی۔

پیش گوئی نہ تھی؟ یہ نظم جنوری میں لکھی گئی یا شایع ہوئی شامی پیر کا ظہور چھ مہینے کے بعد ماہ جون میں ہوا الیکس شامی پیر جاسوس نہیں سمجھا گیا۔ وہ تخت و تاج افغانستان کا مالک بننا چاہتا تھا اس جاسوس دوست کو با ایں ہمہ صفات خاص ملک شام سے کیا تعلق تھا۔ نہیں یہ سب قیاس آرائیاں غلط۔ بات صرف یہ ہے کہ شاعر نے ضلع اور جگت کی طرف رجعت کی ہے محض اخبار کی سیاہی کی مناسبت "شام" کا نہ ظرلانا پڑا ملک شام کے ساتھ لفظ خاص کا الحاق بھی معنی خیز نہیں ہے غلط یا صحیح زبان و بیان کے متعلق بہیرے شبہات ہیں"

"علم و فن کے اعتبار سے جانچنا صاحب فن شاعر کا کام ہے"

جناب عطار روا! علی منظور حیدرآبادی کے ایک قدیم ترین دوست زمانۂ طفلی کے رفیق اور ہم مکتب کے تذکرہ پر اس قسم کے سوالات کہ کیا ملک شام کے باشندے جاسوس ہوا کرتے ہیں؟ یا ملک شام کی آب و ہوا میں کچھ ایسی تاثیر ہے؟ ۔۔۔۔ بیجا ہیں یا بجا ہیں ۔ میں بھی اسی قسم کے اور کچھ سوال کروں؟ نہیں، طول نگاری سے کیا حاصل، دقیقہ سنج حضرات خود سمجھ گئے ہوں گے ۔۔۔۔ بہتر اور اس کے اگلے پچھلے صرف دو شعر یہاں پیش کر دیتا ہوں ؎

تیری فطری فطانت تیرے کام آ ہی گئی	غیر ملکی حاکموں تک تجھ کو پہنچا ہی گئی
بڑھا ہے سیاہ اخبار سارے تیرے نام اور کام سے	شاید اب تو آ رہا ہے خاص ملک شام سے
کر رہا ہے سیر دنیا جن کے اب جاسوس تو	آہ! اپنا ہے وطن سے خاک ہو مانوس تو

کیا اب بھی شامی پیر شام کی آب و ہوا کی تاثیر اور دوسرے سوالات اپنی اپنی جگہ قائم رہ سکتے ہیں؟

رہی ضلع جگت سے میں اسی قدر نامانوس جس قدر مارواڑی گوشت سے۔ از خود کوئی شخص گستاخانہ لطافت ضلع جگت کے پردہ سے بھلیاں دکھا رہی ہے تو یہ اور بات ہے۔ شام اور فلسطین میں آج قیامت صغریٰ بپا ہے باوجود اس کے آپ پوچھتے ہیں کہ

اس جاسوس دوست کو با ایں ہمہ صفات خاص ملک شام سے کیا تعلق تھا؟

جناب عطار روا! شام اور فلسطین میں جو ربط ہے اہل نظر سے پوشیدہ نہیں آل عثمان کے دور شہنشاہی ہی میں شام و فلسطین ایک ہی گورنر کے زیر حکومت تھے۔ خیر، حالات حاضرہ کے مدنظر خاص کا لفظ کتنا معنی خیز ہے اور "انتدابی نتیجہ" کے نقطہ دل کی کس حد تک رہنمائی کر رہا ہے اس کے اظہار کی یہاں ضرورت محسوس نہیں ہوتی۔

مولانا! تلاش کیجیے آپ کے احباب میں بھی دو چار "جاسوس" ایسے نکل ہی آئیں گے جو اپنے ذاتی مادی فائدہ کے لئے قوم و وطن کا ہر طرح "نقصان کئے جا رہے ہیں" جناب عطار روا میں اسی قسم کے افراد سے قوم کو کبھی کبھی متعارف کرا دیتا ہوں ۔۔۔۔ رہے استعارہ اور کنایہ کے زیر و بم؟ تو ان کے بغیر نہ میرا کام چل سکتا ہے نہ آپ کا نہ کسی اور مفکر کا فقط

علی منظور

مسولینی کی صحت

اس وقت تقریباً ساٹھ برس کی عمر میں بینیٹو مسولینی دنیا کے ایک اہم ترین اور نہایت خطرناک عہدے پر ہوتے ہوئے [illegible]
اس کی جسمانی مشین سو فی صدی خوبی کے ساتھ کام کرتی ہے۔ اس کی صحت و تندرستی پر رشک آتا ہے۔ اس کی پھرتی [illegible]
گھنٹے تک روزانہ کام کرنا اس کے لئے معمولی بات ہے۔ ظاہر ہے کہ قومی اور بین الاقوامی معاملات کا اس پر بے [illegible]
بے تعداد اہم اور پیچیدہ مسائل اس کے سر پر فکر کا ایک پہاڑ جمع کر دیتے ہوں گے۔ ایک مسئلہ کا حل بمشکل ختم ہوتا ہے [illegible]
کہیں اہم اس کی جگہ آموجود ہوتا ہے۔ اور پھر سیکڑوں کے راستہ کا وہ کانٹا ہے۔ سیکڑوں اس کے دشمن ہیں۔ سیکڑوں [illegible]
ہے۔ سیکڑوں اس کے خون کے پیاسے ہیں۔ لیکن اس کو کبھی درد سر تک نہیں ہوتا۔ اس کی جسمانی صحت کا اندازہ [illegible]
کوئی بارہ سال سے اب تک ایک دن بھی وہ اپنے دفتر سے بیماری کے بہانے غیر حاضر نہیں رہا۔ اس عمر میں اس کی [illegible]
کی ذمہ دار آخر کونسی چیزیں ہیں؟ ایک مشہور اخبار کا نمائندہ جس نے حال ہی میں مسولینی سے ملاقات کی تھی بیان کرتا ہے کہ [illegible]
صحت کے ذمہ دار اس کے اصولِ زندگی ہیں۔ جب مسولینی سے یہ سوال کیا گیا کہ کیا آپ کی غذا معین ہے اور [illegible]
نے جواب دیا کہ میری غذا ان معنوں میں مقرر ہے کہ میں اپنی خوراک میں ترکاریوں کی مقدار زیادہ سے زیادہ رکھتا ہوں [illegible]
استعمال حتی الوسع کم کرتا ہوں۔ اس سوال کے جواب میں کہ کیا آپ شراب یا تمباکو کا استعمال کرتے ہیں۔ اس نے جواب دیا [illegible]
عام صحت کے لئے خطرناک سمجھتا ہوں۔ میں شراب صرف سرکاری ضیافتوں میں کبھی کبھی پیتا ہوں۔ لیکن جنگ عظیم [illegible]
کبھی تمباکو کا استعمال نہیں کیا۔ جب چائے اور کافی کے متعلق سوال کیا گیا تو اس نے کہا میں کافی اور چائے کو انسانی [illegible]
غیر ضروری بلکہ ایک حد تک مضر سمجھتا ہوں اور ان چیزوں کا قطعی استعمال نہیں کرتا۔ مسولینی نے اس نمائندے سے یہ بھی کہا کہ [illegible]
کم از کم آدھ گھنٹے سے پون گھنٹے تک ورزش کرتا ہے جس میں گھوڑے کی سواری اور تیرنا شامل ہے۔ مسولینی ہر قسم کے کھیل [illegible]
اچھا کھلاڑی ہے۔ باوجودیکہ تمام دنیا کی آنکھیں اس پر ہیں۔ اس کے ہر لفظ اور ہر حرکت پر گرفت کی جاتی ہے اور دنیا میں شور مچتا ہے [illegible]
کی فاشستی حکومت کے دوران میں شروع سے آخر تک بڑے بڑے بین الاقوامی مسئلوں نے اس کے دماغ کو بے انتہا پریشان کیا لیکن [illegible]
برابر خلل نہیں آیا۔ گفتگو کا سلسلہ جاری رکھتے ہوئے مسولینی نے اس نمائندے سے کہا۔ میں راتوں کو برابر سات یا آٹھ گھنٹے سوتا ہوں میرے خواب [illegible]
گیارہ اور سات بجے کے درمیان ہے۔ مجھے لیٹتے ہی فوراً نیند آجاتی ہے خواہ دن بھر میں نے کچھ ہی کیا ہو اور مجھ پر کچھ بھی گزرا ہو [illegible]
نیند کی دعوت دینے کے لئے کبھی کسی دوا یا اور کوئی شئے کے استعمال کی ضرورت نہیں ہوئی۔

تمام چھوٹے موٹے عارضات کا علاج مسولینی کے پاس فاقہ کرنا یا روزہ رکھنا ہے۔ مسولینی روزے کو نہ صرف صحت کے [illegible]
نہایت ضروری خیال کرتا ہے بلکہ ہر قسم کی چھوٹی چھوٹی بیماریوں کا بہترین علاج سمجھتا ہے۔ جب کبھی وہ اپنی تندرستی [illegible]
کمی محسوس کرتا ہے وہ فوراً روزہ رکھنا شروع کر دیتا اور کم از کم دو روز تک مسلسل کھانا نہیں کھاتا۔ اس میں کوئی شک نہیں کہ [illegible]
بہت ساری بیماریاں محض ہمارے خوراک کی بے توجہی سے پیدا ہوتی ہیں۔ وقتاً فوقتاً روزہ رکھنے یا دو ایک روز صرف [illegible]
استعمال کرنے سے بہت ساری بیماریاں ابتدا ہی میں بہ آسانی دبا دی جا سکتی ہیں۔

جب مسولینی سے یہ سوال کیا گیا کہ وہ اس قدر زیادہ کام روزانہ کس طرح انجام دیتا ہے تو اس نے جواب دیا۔ میں نے اپنے عمل کو تقسیم کار کے اصول پر ترتیب دے رکھا ہے وقت ضائع کرنے اور بیکار کاموں میں مشغول ہونے سے بچنے کی دائمی جدوجہد کرتا رہتا ہوں۔ اس سے میرے کام کی مقدار اور مجھ میں تکان کی عدم موجودگی کا تخمینہ ہو سکے گا۔ میں نے اپنی ہستی کو ایک مشین بنا رکھا ہے جو نہایت استقلال و باقاعدگی کے ساتھ کام کرتی ہے جس کی متواتر نگرانی کی جاتی ہے اور پورے قابو میں رکھا جاتا ہے۔ یہی آخر جملہ اور ساتھ ہی ساتھ اس کے پرہیزگاری اصول مسولینی کی صحت و بہتری کے ذمہ دار نظر آتے ہیں۔ انہی اصولوں پر کاربند ہو کر ہم بھی یقیناً مسولینی کے مانند جسمانی صحت و تندرستی کو بدرجہ کمال حاصل کر سکتے ہیں۔

ہمایوں بخت

دل کی دنیا

کیا غم کی حقیقت ہے! کیا کیا ہے مرے دل میں — آتش ہے مرے دل میں دریا ہے مرے دل میں

برباد تمنا کیا آباد نہیں ہوتے؟ — ہر لحظہ غم تازہ پیدا ہے مرے دل میں

کیا جانے تو اے زاہد! کیا دل کی حقیقت ہے — ہر روز نیا عالم برپا ہے مرے دل میں

وسعت کو نہ پوچھ! اس کی، عالم نہیں یہ اک ہے — سرمستی عرفاں کی دنیا ہے مرے دل میں

جو اٹھ نہ سکا ہرگز ارباب ملائک سے — وہ بار گراں دیکھو رکھا ہے مرے دل میں

امروز جو حاصل ہے فردا کی ضرورت کیا — ہنگامۂ محشر اک برپا ہے مرے دل میں

جو طور کا حاصل تھا، جو ضرب سے بالا تھا — معبود کلیم اللہ رہتا ہے مرے دل میں

رخ ہوتے ہیں پھولوں کے جس درد سے پژمردہ — وہ درد مگر پہلے اٹھتا ہے مرے دل میں

دریاؤں کی طغیانی، حیراں نظر آتی ہے — جب بجلی پہ ہر طوفاں اٹھتا ہے مرے دل میں

اک نغمۂ لاہوتی، سکھلاتا ہے مدہوشی — جب عالم بالا سے آتا ہے مرے دل میں

جس شعلہ نوائی سے دل ہوتے ہیں سیمابی — وہ نالۂ غم اول آتا ہے مرے دل میں

اک پردۂ غفلت سے روپوش ہوں میں ورنہ — ہر ذرہ دو عالم بستا ہے مرے دل میں

جرأت ہے بھلا کس کی، ہو تردید کرے میری!
اللہ کی قدرت کا جلوہ ہے مرے دل میں

بشیر النساء بیگم بشیر

اُپج پیدا کرنا

جب آپ لکھنے کے لئے تیار ہوتے ہیں تو آپ کے قلم سے سب سے پہلے ہی عام لفظ اور جملے نکلنے لگتے [illegible]
روزمرہ کی زندگی میں بار بار سنتے یا پڑھتے ہیں۔ لیکن ان کے استعمال میں احتیاط کی ضرورت ہے۔ اس [illegible]
کہ اپنے خیالات کو خاص اپنی ہی زبان میں ادا کیا جاسکے۔ پامال اور عام ترکیبوں کا استعمال آپ کی تحریر میں [illegible]
نہیں کرسکتا۔

جہاں آپ نے مضمون یا افسانہ لکھ لیا اُس پر نظر ثانی کیجئے اور دیکھئے کہ اس قسم کی کوئی پامال [illegible]
ترکیبیں باقی تو نہیں رہ گئیں۔ ساتھ ہی ہر لفظ کو جانچئے معلوم کیجئے کہ اس میں کہاں تک مناسبت، تازگی اور [illegible]

اثنائے تحریر اور پھر نظر ثانی میں زحمتیں اٹھانا کامیاب انشاپردازی کا ایک بڑا راز ہے۔ اس میں کوئی [illegible]
بعض دفعہ زیادہ کاٹ چھانٹ اور بار بار کی نظر ثانی تحریر کی جدت اور دلکشی میں جان باقی نہیں رکھتی لیکن [illegible]
محنت اور خاص زحمت کے وہ انشا پرداز جن کی کامیابیاں دنیا میں روز روشن بن چکی ہیں، اپنی زندگیوں کو [illegible]
ہی کی حیثیت میں ختم کردیتے۔ اُپج حاصل کرنے کے لیے زحمتیں اٹھانا لازمی ہے بغیر کاٹ چھانٹ، اصلاح [illegible]
کے ایک فطری اور ذاتی اسلوب نہیں بن سکتا اور بغیر ایک فطری اور ذاتی اسلوب کے آپ کی تحریر میں انفرادیت نہیں [illegible]
ہوسکتی۔ نیز یہ امر ہمیشہ ملحوظ خاطر رہنا چاہیے کہ انفرادیت فن لطیف کے ہر شعبہ اور ہر پہلو میں نئی روح [illegible]
اہلِ ذوق اسی کو اچھی چیز سمجھنے لگتے ہیں۔

نومشق انشاپردازوں کو چاہیے کہ ہمیشہ اس حقیقت حال کو پیش نظر رکھیں کہ ہر زبان کے ادبی شہ کار [illegible]
ہیں جن کے لئے ان کے مصنفوں نے خاصہ وقت صرف کیا ہے اور جو کافی محنت اور توجہ کے ساتھ لکھے گئے ہیں۔ [illegible]
نظر رکھنے والے اس واقعہ کو نہیں بھول سکتے کہ محمد حسین آزاد مرحوم جن کی کتابیں آج اردو کے لئے مایۂ ناز ہیں [illegible]
اسلوب کے باعث ادبیاتِ عالیہ مانی جاتی ہیں اپنی تحریریں متعدد بار کاٹ چھانٹ کیا کرتے تھے۔ چنانچہ ان [illegible]
کے جو مسودے اس وقت موجود ہیں ان سے ظاہر ہوتا ہے کہ انہیں ایک ایک لفظ کے لئے کتنی محنت اور تلاش [illegible]
سے کام لینا پڑتا تھا۔ ایک جملہ لکھنے کے بعد جب اسے دو دو تین تین دفعہ کاٹنے کی ضرورت پڑتی اور اس جملہ کے [illegible]
خالی جگہ ان کے مرمہ جملوں سے بھر جاتی تو وہ مجبور ہو کر اس جملہ پر کاغذ کی ایک چیپی لگا دیتے۔ اکثر دفعہ تو ایسا بھی ہوا ہے [illegible]
جملہ کے لئے ایک کے بعد ایک کاغذ کی کئی چیپیاں لگائی گئی ہیں۔

یہی غیر معمولی محنت اور توجہ تھی جس کی بنا پر آج آزاد کا اسلوب بے نظیر سمجھا جاتا ہے اور دوسرے انشاپردازوں
کے لئے ناقابل تقلید ہے۔

یہی حال اردو کے ایک دوسرے بڑے ادیب علامہ شبلی نعمانی کی تحریروں کا ہے۔ ان کے متعلق بھی مشہور ہے کہ وہ
پنے ذاتی مسودوں کی طباعت کے لئے کتابت ہوجانے کے بعد بھی کاپیوں اور پروفوں کو نہایت احتیاط اور توجہ سے دیکھتے تھے
ر ایک ایک لفظ میں ترمیم کرتے تھے۔

یہ تو ہماری زبان اردو کا ذکر تھا۔ دنیا کی دوسری زبانوں میں اگر اس قسم کے واقعات کی تلاش کی جائے تو سیکڑوں
الیں دستیاب ہوسکیں گی اور ان کے نقل کرنے کے لئے ایک علیحدہ کتاب کی ضرورت ہوگی۔ تاہم ان حضرات کی خاطر جو ہر خیال کا
وت انگریزی زبان کے کسی مصنف یا کتاب سے حاصل کرنا چاہتے ہیں دو چار مثالیں یہاں درج کی جاتی ہے۔

سب سے واضح مثال گذشتہ صدی کے سب سے بڑے انگریز شاعر لارڈ ٹنی سن کے کلام کی ہے۔ وہ اپنی نظموں میں اس قدر
میم کیا کرتا تھا کہ جب کبھی اس کے کلیات کی نئی طبع یا ایڈیشن شایع ہوتی تو اس کی اکثر نظمیں بہت کچھ تبدیل شدہ شکل میں پائی جاتیں

دوسری مثال انگریزی کے ایک بہت بڑے نثر نویس کارلائل کی تحریروں کی ہے۔ وہ ان میں آخر دم تک اتنی تبدیلیاں
یا کرتا تھا کہ آخر کار خود اہل مطبع اس کی کتابوں کے شایع کرنے سے احتراز کرنے لگے تھے۔

لندن کے مشہور آفاق برٹش میوزیم میں کئی مصنفوں کے ہاتھ کے لکھے ہوئے متعدد مسودے موجود ہیں جن پر نظر ڈالنے سے معلوم
تا ہے کہ بڑے بڑے اور مشاق انشاپردازوں نے بھی ایک ایک سطر میں کئی کئی بار ترمیمیں کی ہیں۔

یسید الدین سلیم فرمایا کرتے تھے کہ انھوں نے اپنے اخبار کے لئے کوئی مضمون ایسا نہیں تیار کیا جس پر تین تین چار چار دفعہ
ہیں نظر ثانی نہ کرنی پڑی ہو۔ کمزور ترکیبوں کے دور کرنے جملوں میں جان ڈالنے بھونڈی صفتوں کو ہٹاکر برمحل اور واضح صفتیں
تعمال کرنے بھدے فعلوں کو بدلنے اور ہر جملہ کی موسیقیت کے خوشگوار بنانے کی مشق اور مسلسل مشق سے ان کے اسلوب میں انتہا کی سادگی
ں اور موسیقیت پیدا ہوگئی تھی۔ وہ اپنے شاگردوں کے مضمونوں میں بھی انہی خصوصیات کے لحاظ سے کاٹ چھانٹ کیا کرتے تھے اور اس
ا اس قدر شدت پسند تھے کہ بعض دفعہ طالب علم ان کے یہاں سے اپنے کام کی نسبت نہایت مایوس کن احساسات کے ساتھ واپس
تے تھے۔ جب میں اپنی تصنیف "روح تنقید" کے حصے سنانے کے لئے کالج کے وقت کے بعد ان کے یہاں جایا کرتا تو ان کے ہر پارے اور
ں نو ہر جملے کے دہرا دہرا کر سننے اور ترکیبوں کی تبدیلی سے اس قدر اکتا جاتا تھا کہ مکان جاتے وقت تمام راستہ اسی کشمکش میں گذر
ا کہ کل مولوی صاحب کے یہاں کتاب سنانے جاؤں بھی یا نہیں۔

اسی سلسلہ میں نئے انشاپردازوں کی تسلی کے لئے اس حقیقت کا اظہار بھی ضروری ہے کہ یہ محنت اور کاٹ چھانٹ ایک عرصہ
بعد غیر ضروری ہوجاتی ہے مسلسل مشق کی وجہ سے اکثر کہنہ مشق انشاپرداز اس قابل ہوجاتے ہیں کہ بغیر جھجک اور روک ٹوک کے
ے بہتر عبارتوں کی تخلیق کرسکیں۔ اور گو اس وقت اعلےٰ نتیجے صرف چند ہی گھنٹوں میں نمودار ہوسکیں گے لیکن یہ نہیں بھولنا
ئے کہ اچھا لکھنے کی یہ قوت کتنے برسوں کی پیہم محنت کا نتیجہ ہے۔

آپ کے خیالات جس طرح کے ہوتے ہیں آپ کا قلم انہیں اسی طرح کی زبان میں قلمبند کرتا ہے۔ اگر آپ کا دماغ ... خیالات سے معمور ہوا اور پرانی لکیروں کا فقیر بنا رہے اور پھر آپ کو اپنی تحریر میں تازگی یا جدت کے آثار نظر آئیں تو سمجھ لیجئے کہ یا تو آپ ... ہو گئے ہیں یا آپ کی تحریر ایک معجزہ ہے۔

اگر آپ کا ذہن تھکا ہوا یا سست ہو گیا ہو تو آپ کی تحریر میں شگفتگی ہرگز نہیں پیدا ہو سکتی۔ اپنے خیالات کو ... غیر معمولی راستوں سے باہر لے آئیے اور اپنے ذہنی پیکروں کو ہر وقت نت نئے لباس میں ملبوس کیا کیجئے۔

پیش پا افتادہ ترکیبیں اور قدیم روایتی جملے عام طور پر آدھے خیالات کے حامل ہوتے ہیں۔ ہوشیار انشا پرداز ان ... سے واقف ہو جاتا ہے لیکن انہیں اپنی تحریر میں گھسنے نہیں دیتا اور ان کی جگہ چند ایسی نئی نئی اور تازہ ترکیبوں کو روشناس کرتا ہے ... کے کلام میں انفرادیت اور قوت پیدا کر دیتی ہیں۔

فرانس کا ایک مشہور فن کار فلابیرٹ وہاں کے ایک بہترین فسانہ نگار گی دے موپاساں کو مشورہ دیتا ہے کہ

"ہر اس بات پر جس کو کوئی شخص ظاہر کرنا چاہتا ہے کافی توجہ کے ساتھ نظر ڈال لینی چاہئے اور کافی عرصہ تک تاکہ یہ ظاہر ہو سکے کہ اس ... کوئی ایسا پہلو ہے جس کو اب تک کسی نے نہ تو نہیں دیکھا۔ یا ظاہر نہیں کیا۔ سب سے چھوٹی شے میں بھی کوئی نہ کوئی چیز ایسی موجود ہے جو نامعلوم ہے۔ اس کو دریافت کرو۔ تم جو کچھ کہنا چاہتے ہو اس کے ظاہر کرنے کے لئے ایک ہی اسم ہوگا اس میں روح پھونکنے کے لئے ایک ہی فعل ہوگا اور اس کو واضح کرنے کے لئے صرف ایک ہی صفت ہوگی بس ڈھونڈو جب تک کہ وہی اسم وہی فعل اور وہی صفت دستیاب ہو جائے کبھی "تقریباً" پر قانع نہ رہو کبھی لفظی چال نہ چلو خواہ وہ کتنی ہی اچھی کیوں نہ ہو اور مشکل دور کرنے کے لئے زبان کی بے ہودگیوں سے فائدہ نہ اٹھاؤ یہ ہے طریقہ اپنے حاصل کرنے کا۔"

ماخوذ از فن انشا پردازی — سید محی الدین قادری زور

تیتری

حسن رسیدہ موج ہوا میں — رنگ پریدہ اوج فضا میں — سیم بروں کو دیکھ کے ٹھٹکی — پاس گئی کچھ پوچھ ...
طرفہ نظارہ کوہ و دمن میں — رقص شرارہ کہئے چمن میں — دیکھے نرگس آنکھ دکھا دی — پھول ہنسے تو شان ...
کہئے بسنت کی رانی آئی — حور و پری یا تتلی آئی — کلیوں کا منہ چوم اڑی اب — لوٹے ان کی جھوم ...
بھری آنکھیں موٹی موٹی — پلکیں نشتر لمبی لمبی — کام ہے اس کا صبح و مسا کا — کیاری کیاری پھولنا ...
افشاں پروں پر گنگا جمنی — نازک جنبش کلک ازل کی — خود تو ہے محبوب سبھی کی — پر ہے پھرتی مست ...
اللہ اللہ کیا جوبن ہے — سج دھج کتنا من موہن ہے — دیتی ہے وہ درس محبت — جان ذرا سی ...
تخت ہوا سے اتری پہنچے — دیکھنے والا دیکھ کے تڑپے — بھول نہ جانا پیاری پیری — ابدی فطرت ...
بادِ سبک سے فتنے اٹھاتی — پیت کا سویا جادو جگاتی — جیون نیا کھیتی رہنا — پیت سندیسہ دیتی ...
پھرتی ہے اٹھکیلیاں کرتی — رقصاں خنداں شوخیاں کرتی — حسن ازل پہ مرتی رہنا — جان نچھاور کرتی ...

دولت کی تقسیم

"Intelligent

(ذیل کی چند سطریں برنارڈ شا کی شہرۂ آفاق کتاب "Woman's guide to socialism etc." کی ایک فصل کا آزاد ترجمہ ہیں۔ عجب نہیں جو اس کتاب کا اردو میں ترجمہ ہو چکا ہو لیکن راقم کو کسی ترجمہ کا علم نہیں اس لئے اس خیال سے یہ جرأت کی جا رہی ہے کہ ناظرین "سب رس" میں سے اکثر اس سے مستفید نہ ہوئے ہوں گے۔

اگرچہ عبارت کو مانوس بنانے کے لئے ترجمہ میں کسی قدر آزادی برتی گئی ہے لیکن راقم کی حیثیت مترجم سے بڑھ کر نہیں۔ وہ ہمارے نوجوان مضمون نگاروں کی طرح یہ لکھنا پسند نہیں کرتا کہ "میں اس مضمون کے لئے برنارڈ شا کا ممنون ہوں" اس لئے کہ اس ممنونیت کے معنی یہ بھی ہو سکتے ہیں کہ میں نے یہ مضمون تمام و کمال برنارڈ شا سے لکھایا ہے یعنی لفظ بہ لفظ اردو زبان میں اور معنی بھی ہو سکتے ہیں کہ برنارڈ شا میرا دوست یا شاگرد ہے جس نے میرے لئے انسائیکلوپیڈیا سے یا دوسری کتابوں سے مواد فراہم کر دیا۔)

یوں تو ہر ایک کو معلوم ہے کہ "اجتماعیت" کا کیا مقصد ہے۔ اجتماعیت ملک کی آمدنی کو تقسیم کرنے کا ایک نیا طریقہ ہے۔ لیکن ایک بات ہے جو ہر ایک کو نہیں معلوم اور وہ یہ ہے کہ ملک کی آمدنی اب بھی ہر روز بلکہ ہر منٹ تقسیم ہو رہی ہے اور جب کہ روئے زمین پر انسان کی باقی رہتی تاکہ تقسیم ممکن ہو یہ تقسیم ہوتی رہے گی۔ اس لئے اگر رائے میں اختلاف ہو سکتا ہے تو اس بارے میں نہیں کہ تقسیم کی جائے یا نہ بلکہ اس بارے میں کہ کس کو کتنا اور کس شرط کے ساتھ۔ سینٹ پال نے تجویز کی تھی کہ "جو کام نہ کرے اس کو کھانے کو بھی نہ دیا جائے"۔ لیکن چونکہ سینٹ پال عورتوں کے متعلق پست رائے رکھتے تھے اس لئے بچوں کو بھول ہی گئے۔ چھوٹے بچے کام نہیں کر سکتے اور ان کو بھوک بہت لگتی ہے۔ لیکن اگر ان کو کھانے کو نہ دیا جائے تو دنیا بہت جلد انسانوں سے خالی ہو جائے گی۔ اس لئے معلوم ہوا کہ اس پر عمل نہیں کیا جا سکتا۔

بعض لوگ یہ سمجھتے ہیں کہ چونکہ ہم روپیہ جمع کر سکتے ہیں اس لئے دنیا کی دولت جمع کی جا سکتی ہے۔ یہ خیال بالکل غلط ہے۔ دولت دراصل ان اشیا کا نام ہے جو انسان کی ضروریات کو پورا کریں، اور اس طرح جو دولت ہم کو زندہ رکھتی ہے اس میں سے بہت سی ایسی ہے جو ایک ہفتہ سے زیادہ نہیں رکھی جا سکتی۔ میز اور کرسی ایک عمر تک کام دے سکتے ہیں۔ لیکن ہم میز اور کرسی کھا کر نہیں جی سکتے۔ کھانے کی چیزوں کو بھی محفوظ رکھنے کی کوشش کی جاتی ہے مثلاً مچھلی کو ٹین کے ڈبوں میں بند کیا جاتا ہے۔ گوشت کو برف میں رکھا جاتا ہے اور دودھ کا سفوف بنایا جاتا ہے۔ لیکن پھر بھی یہ واقعہ ہے کہ کھانے پینے کی اکثر چیزیں اگر تیار ہو کر چند روز کے عرصہ میں کھا پی نہ لی جائیں تو گل سڑ جائیں اور زہر بن جائیں۔ کپڑے بھی بہت دن نہیں چل سکتے اگر ان کو پہن کر کام کیا جائے اور دھلواتے رہیں۔

یہ واقعہ ہے کہ ہر سال کھیتی کر کے غلہ اگانا اور مویشی کی نسلیں حاصل کرنا ضروری ہے۔ گزشتہ سال کی فصل ہمارے کام نہیں آ سکتی اور آئندہ سال کی فصل کا ابھی وجود نہیں اس لئے اسی سال بونا اور کاٹنا اور پیسنا اور پکانا ضروری ہے۔ جس کو ہم "بچانا" کہتے ہیں وہ دراصل آئندہ کے لئے ایک سمجھوتہ کرنا ہے۔ مثلاً اگر میں ایک سو ایک روٹیاں پکاتا ہوں تو کھا تو صرف ایک سکتا ہوں (اس روٹی سے مراد ڈبل روٹی ہے) اور باقی کو بچا نہیں سکتا کیونکہ ایک ہفتہ کے اندر وہ کھانے کے قابل نہیں رہیں گی۔ اب میں صرف یہ کر سکتا ہوں کہ ایک ایسے شخص کو فراہم کروں جس کو اسی وقت

کھانے کے لئے اپنے خاندان اور نوکروں کے لئے سو روٹیوں کی ضرورت ہے اور اس سے یہ سمجھوتہ کروں کہ اگر میں اس کو [illegible]
دوں تو وہ مجھے ہر ہفتہ سات روٹیاں دیا کرے گا۔ لیکن یہ روٹیوں کو "بچانا" نہ ہوا۔ یہ دو فریقوں کے درمیان صرف ایک
فریق آئندہ کا انتظام چاہتا ہے اور دوسرا اس وقت ایک بڑی مقدار خرچ کرنا چاہتا ہے۔ اس کے معنی یہ ہوتے کہ میں [illegible]
جب تک کہ مجھے کوئی خرچ کرنے والا نہ ملے۔ یہ خیال کہ ایک ملک کے سب باشندے مل کر کچھ بچا سکتے ہیں بالکل غلط ہے۔ حقیقت [illegible]
لوگ جن کے پاس ضرورت سے زیادہ مال دولت ہو بچا سکتے ہیں اور وہ بھی اسی صورت میں کہ ملک میں ایسے لوگ بھی ہوں جن کے پاس [illegible]
کم مال ہے۔ زید کی بچت کو ایک خرچ کرنے والا بکر ملنا چاہیئے ورنہ زید کی بچت ضائع ہو جائے گی۔ اور زید اور بکر کو ملا کر دیکھا جائے تو دونوں [illegible]
کچھ بھی بچت نہیں ہوتی۔ بحیثیت مجموعی ہر ملک کے باشندوں کو روز کا روز پکانا اور روز کا روز کھانا ضروری ہے۔ اگر کوئی ملک کا [illegible]
ایک دو ہفتہ کے اندر اس کے سب باشندے ہلاک ہو جائیں گے اگرچہ کہ ان میں سے ہر مرد اور عورت اور بچے کے پاس کئی [illegible]
اور بنک میں لاکھوں روپیہ ہو۔ کفایت شعار امیروں کا دستور ہے کہ غریبوں کو حقارت سے دیکھ کر کہتے ہیں کہ اگر یہ لوگ بھی [illegible]
میں سے کچھ پس انداز کرتے رہتے تو ان حالتوں کو نہ پہونچتے۔ ان کی اس سمجھ پر میں دل میں ہنستا ہوں۔ کیونکہ واقعہ ہے کہ اگر غریب لوگ اس [illegible]
عمل کرنے لگیں اور روپیہ پس انداز کر کے اس کے بھروسہ پر کام چھوڑ دیں تو یہ ساری دنیا کے لئے ہلاکت کا پیغام ہے۔ امیروں کی [illegible]
غریب لوگوں کو ایسی کفایت شعاری کا سبق دینا [illegible]

ہر ایک کو کتنا

اب تم سمجھ گئے ہوں گے کہ ہر روز کام کرنا ضروری ہے۔ ہر روز روٹیاں پکانا اور جب وہ پک جائیں تو ان کو فوراً تقسیم کرنا ضروری ہے۔
اس تقسیم میں ہر شخص کو وہی حصہ ملے گا جو قانون نے قرار دیا ہے۔ یہ حصہ کتنا ہونا چاہیئے یعنی ہم میں سے ہر ایک کو کتنا ہے۔ [illegible]
یا زیادہ نہ ملے؟ اگر ایک بیوہ کو جس کے چھ بچے ہیں ہفتہ میں صرف دو روٹیاں ملتی ہیں اور ایک کاہل اور آوارہ کنوارے نوجوان کو [illegible]
خاندانوں کو کافی ہوں تو کیا یہ ایک معقول تقسیم ہوئی۔ کیا یہ بہتر نہ ہو گا کہ اس بیوہ کو زیادہ دی جائیں اور اس نوجوان کو کم [illegible]
حل خود بخود نہیں پیدا ہوتا بلکہ ان کو قانون کے ذریعہ فیصل کیا جاتا ہے۔ اگر وہ بیوہ اپنے بچوں کے واسطے اس کنوارے نوجوان کی [illegible]
لے لے تو اس کو پولیس پکڑ لے گی اور جیل بھیج دے گی۔ اور یہ اس لئے کہ قانون کی رو سے اس کا حصہ صرف دو روٹیاں ہیں۔ اکثر لوگوں [illegible]
جب یہ معلوم ہوتا ہے تو کہتے ہیں کہ قانون کو بدل دینا چاہیئے۔
لیکن کسی چیز کو بدلنے سے پہلے یہ معلوم رہنا چاہیئے کہ اس کو بدل کر کیا بنانا چاہیئے۔ یہ کہنا کافی نہیں کہ موجودہ تقسیم سراسر ظلم ہے۔

دولت صرف محنت کی بدولت

محنت کے بغیر دولت وجود میں نہیں آسکتی۔ کسان اور نانبائی کے بغیر روٹی وجود میں نہیں آسکتی مسلسل روزانہ محنت کے بغیر ہم [illegible]
ہو کے مر جائیں۔ اگر ایک شخص کاہل ہے تو یقیناً کوئی دوسرا شخص دو کی محنت کر رہا ہے۔ اسی وجہ سے سینٹ پال نے کہا کہ "جو کام نہ کرے
اس کو کھانے کو بھی نہ دیا جائے"۔ کام کا فرض ہم پر فطرت نے عائد کیا ہے اور دولت کی تقسیم کی طرح محنت اور کام کی تقسیم بھی ضروری ہے۔

لیکن تقسیم کے ہوتے ہوئے پیداوار کے ساتھ متناسب ہونا ضروری نہیں۔ ایک شخص ایک شخص کی خوراک سے بہت زیادہ پیدا کر سکتا ہے۔ یہ ہو تو چھوٹے بچوں کو غذا کہاں سے ملے گی۔ اور جو لوگ بہت بوڑھے ہو کر ناکارہ ہو گئے ہیں ان کو کھانے کو نہ ملے گا۔ پہلے کے زمانے میں ایک شخص صرف اپنے دو ہاتھوں سے اتنا کما سکتا تھا کہ اپنے بچوں اور بوڑھے ماں باپ کو پال سکے اور اس کے علاوہ مکان کا کرایہ اور کھیت کا محاصل بھی ادا کر سکے جس کے معنی یہ ہوئے کہ وہ مکان کے مالک اور زمیندار کی بھی پرورش کرتا تھا۔ اور اب تو پانی بھاپ اور بجلی کی طاقت سے اور کلوں کے ذریعے ایک آدمی اتنا کام کر سکتا ہے جتنا پہلے ایک ہزار آدمی نہیں کر سکتے تھے۔

قدرتی طاقتوں اور مشینوں کے استعمال سے محنت کی ضرورت کم ہو گئی ہے یعنی فرصت پیدا ہو گئی ہے اور دولت اور محنت کے ساتھ فرصت کی تقسیم بھی ضروری ہے۔ اگر ایک شخص کی روزآنہ دس گھنٹے کی محنت دس آدمیوں کو پال سکتی ہے تو یہ دس آدمی کئی طرح سے اس کو تقسیم کر سکتے ہیں۔ یہ بھی ہو سکتا ہے کہ ایک شخص دس گھنٹے محنت کرے اور باقی نو پوری فرصت حاصل کریں اور ان کو غذا بھی ملے۔ یہ بھی ہو سکتا ہے کہ ہر شخص ایک گھنٹہ کام کرے اور نو گھنٹہ کی فرصت پائے۔ اور یہ بھی ہو سکتا ہے کہ تین آدمی سارا دن کام کریں جس سے بیس آدمی کی خوراک فراہم ہو اور باقی سات آدمی بیکار رہیں اور چودہ آدمیوں کا کھانا کھائیں اور اپنے لئے تیرہ نوکر رکھیں۔ یعنی تین کام کرنے والے آدمی سات کاہل اور پرخور نوابوں اور ان کے تیرہ ملازموں کے لئے خوراک فراہم کریں۔ غرض کہ اس طرح کے بیسیوں تقسیمیں ممکن ہیں۔ غلامی، سرمایہ داری، اشتمالیت وغیرہ سب دراصل محنت، فرصت، اور دولت کی مختلف تقسیموں کے نام ہیں۔ اور نوع انسان کی تاریخ میں ہر انقلاب کی علت یہی رہی ہے کہ ایک جماعت کسی موجودہ تقسیم سے غیر مطمئن ہو کر محنت کی کمی اور فرصت اور دولت کی زیادتی کی طالب ہوتی۔

لیکن ہم فی الحال صرف دولت کی تقسیم سے بحث کریں گے۔ کیونکہ محنت اور فرصت کی تقسیم میں زیادہ سے زیادہ جو تفاوت برتا جا سکتا ہے وہ اس تفاوت کے مقابلے میں کچھ بھی نہیں جو دولت کی تقسیم میں برت سکتے ہیں۔ کسی غلام سے ایک دن میں ۲۴ گھنٹے سے زیادہ محنت نہیں لے سکتے اور کسی امیر آدمی کو دن میں ۲۴ گھنٹے سے زیادہ کی فرصت نہیں دے سکتے لیکن امیر آدمی کو ہاتھ ہلانے کی زحمت دئے بغیر ۲۴ ہزار روپیہ اس کی جیب میں ڈالا جا سکتا ہے۔

اشتراکیت

اگر یہ بات آپ پر واضح ہو گئی ہے تو اب بتائیے کہ ملک کی آمدنی کو آپ کس طرح تقسیم کریں گے۔ یوں تصور کیجئے کہ آپ ملک کی پوری آمدنی کے مختار ہیں اور اس کو اس طرح تقسیم کرنا ہے کہ ملک کے ہر باشندے کو زیادہ سے زیادہ خوش حالی نصیب ہو۔ اس سوال کو حل کرنے کی جتنی کوششیں کی گئی ہیں اور جو حل آزمائے یا تجویز کئے گئے ہیں ان کا ذکر کر دینا نامناسب نہ ہو گا۔

سب میں آسان حل یہ ہے کہ ہر شخص اپنی آمدنی ایک مشترک فنڈ ... میں داخل کرے اور پھر اپنی ضرورت کے موافق اس میں سے لے لے۔ اس کا نام اشتراکیت ہے۔ چھوٹی مذہبی جماعتوں میں جن کے سب افراد ایک دوسرے کو جانتے پہچانتے ہوں اس پر آج بھی عمل ہوتا ہے۔ لیکن بڑی آبادیوں کے لئے یہ اتنا آسان نہیں۔ یہاں تک کہ ایک گھر اور ایک خاندان کے اندر بھی اس پر پورا پورا عمل نہیں ہوتا۔ کیونکہ اگرچہ کہ باپ اپنی آمدنی کا ایک حصہ اور بچے اگر کماتے ہوں تو وہ بھی اپنی آمدنی کا ایک حصہ ماں کو دیتے ہیں جو سب کے لئے خوراک مہیا کرتی ہے لیکن خاندان کا ہر فرد

اپنے استعمال کے لئے کچھ نہ کچھ کمائی اپنے پاس رکھ لیتا ہے۔ اس طرح ایک خاندان کا انتظام بالکلیہ اشتراکیت پر مبنی نہیں ہوتا۔ اور ... کے درمیان تو کوئی چیز مشترک نہیں ہوتی۔ البتہ اس زمانے کے شہروں کے بلدی انتظام بیشتر اسی اصول پر مبنی ہیں۔ مثلاً ... روشنی کچرے کی اٹھوائی وغیرہ۔ کوئی ٹیکس دینے والا یہ نہیں کہتا کہ "میں رات کو کبھی باہر نہیں جاتا۔ میں کچرا گھر ہی ... ڈالنے کے کام میں لے آتا ہوں۔ اس لئے میں کیوں سڑک پر روشنی لگانے میں اور صفائی کا عملہ قایم رکھنے میں چندہ دوں" ... ہے کہ سڑکوں اور روشنی اور صفائی کے بغیر شہری زندگی وجود میں نہیں آسکتی۔ اگر کوئی شخص فریش ہے اور گھر سے باہر نہیں نکلتا ... اندھا ہے اور سڑک کی بجلی کی روشنی اس کے کسی کام کی نہیں تو یہ شخص بھی اپنی دوا اور غذا کی فراہمی کے لئے شہر کی بلدیہ کے انتظام ... ویسے ہی محتاج ہیں جیسے دوسرے تندرست لوگ۔ اس طرح بلدیہ اشتراکیت کی ایک مثال ہے۔

اس اشتراکیت میں ہم جو چندہ دیتے ہیں وہ اپنی اپنی جائداد اور آمدنی کے لحاظ سے دیتے ہیں لیکن فائدہ ... مسافر جوان اور بوڑھے نیک اور بد گورے اور کالے سب یکساں اٹھاتے ہیں۔ اور یہ انتظام بہت اچھی طرح چلتا ہے۔ ... نہیں ہوتا کہ سڑک پر چلنے کے لئے ٹکٹ لگانا چاہیے اور جو آدمی غریب ہو کر ٹکٹ نہ خرید سکے۔ اس کو سڑک پر چلنے نہ دیا جائے حالانکہ ... ٹکٹ خرید کر جانا ہوتا ہے۔ مثلاً ناٹک سینما وغیرہ ان کے اتنا خرچ نہیں ہوتا جتنا سڑک بنانے میں خرچ ہوتا ہے۔ (باقی دارد)

غزل

ضیاء الدین ...

پھر وہ بت یاد آیا آج — دل کی دنیا ہے تاراج
اس کو خط لکھتا ہوں آج — داتا ہی رکھے گا ... لاج
آنکھ نہ ہو تو جلوے کیا — ہر جلوہ میرا محتاج
اس کا کوچہ ہے اور ہم — یوں بھی ہوتی ہے معراج
لاکھوں فتوے ہیں اور شیخ — خالی بندہ۔ کام نہ کاج
دل مل جانا کفر نہیں — ہٹ دھرمی کا نام سماج
دیکھ وفاداری کا پھل — اس کے دل پر میرا راج
میں کیا۔ میری ہستی کیا — پوچھ رہے ہیں آپ مزاج
ساقی کو توبہ سے ضد — "یا وہاب یا وہاج"
جو کچھ مانگے اس سے مانگ — کل عالم جس کا محتاج
برتے جا خودداری شاد — پاؤں برہنہ۔ سر پر تاج

شاد

تنقید و تبصرہ

سریلی بانسری :- چھوٹی کراؤن تقطیع، ۲۰۰ صفحات مجلد، مطبوعہ انڈین بک ڈپو لکھنؤ۔ قیمت عالی۔

یہ جناب سید انور حسین آرزو لکھنوی کے کلام کا مجموعہ ہے۔ جناب آرزو اردو دنیا میں شاعر اور ادیب کی حیثیت سے کافی شہرت رکھتے ہیں، یہ مجموعہ گویا خود جناب مصنف کی زبان میں "خالص اردو" میں لکھا گیا ہے۔ اور بجائے کسی شخص کے نام معنون ہونے کے "بھارت ماتا کی بھینٹ" چڑھا گیا ہے۔ اس میں کوئی سوا سو غزلیں، چند قطعوں، رباعیوں اور دو تین نظموں کے علاوہ ایک مضمون بھی شامل ہے۔ غزلیں، نہایت صاف سلیس اور عام فہم زبان میں ہیں۔ اس میں شک نہیں کہ جناب آرزو کو اس میں تھوڑی بہت محنت اٹھانی پڑی ہوگی، لیکن اس میں انھیں جو کامیابی حاصل ہوئی ہے، اس کا پتہ اس سے چلتا ہے کہ کوشش کا اثر کہیں ظاہر نہیں ہوتا حقیقت میں یہ ایک نمونہ ہے سلیس زبان کا اور پھر اس کا غزل میں کامیابی کے ساتھ استعمال ہونا، شاعر کے نادر کلام ہونے کا ثبوت ہے۔ غزلیں اول سے آخر تک پر لطف اور پڑھنے کے قابل ہیں۔ رباعیوں میں غالباً یہ رنگ چمک نہ سکا اس لئے ان کی تعداد دو سے زیادہ نہ بڑھ سکی۔

مجموعے کی ابتدا میں جناب سید علی عباس حسین کا ایک تعارف بھی ہے، جس میں جناب آرزو کے مختصر سے حالات اور کلام پر روشنی ڈالی گئی ہے۔ خود مصنف کا ایک مقدمہ ہے جو انھیں کے الفاظ میں "ایک علمی اور تحقیقی بحث کا نچوڑ ہے"۔ اس میں مصنف نے ایک دلچسپ بحث "اردو" اور "خالص اردو" کی چھیڑی ہے۔ مصنف نے لکھا ہے "خالص اردو" وہ ہے جس سے عربی اور فارسی کے الفاظ خارج کر دئے جائیں، اس بحث کی ضرورت ظاہر ہے کہ موجودہ فرقہ پرستی کی شدید رو سے تعلق رکھتی ہے، جو نئے نئے روپ میں ظاہر ہوتی جا رہی ہے۔ اور جس کے جواز کے فتوے تراشنے میں آج ہندوستان کے بعض بہترین دماغ لگے ہوئے ہیں۔

سروری

حیدرآباد میں فرقہ واری مسئلہ
The Communal Problem in Hyderabad

مصنفہ میر زاہد علی صاحب کامل بی اے ال ال بی (عثمانیہ) وکیل ہائیکورٹ چھوٹی سائز ۶۸ صفحات قیمت بھی درج نہیں ہے۔

یہ کتابچہ مصنف نے بزبان انگریزی ہندوستان پریس نیو دہلی کی ایک رپورٹ کے جواب میں تحریر کیا ہے جو آل انڈیا ہندو مہا سبھا کی جانب سے ممالک محروسہ میں ہندوؤں کی عام حالت سے متعلق کچھ عرصہ قبل شایع کی گئی تھی۔ اور جس میں حیدرآباد کے ہندوؤں کی حالت کو انتہائی ناگفتہ بہ بتلا کر پورے ہندو جاتی کی ہمدردی حاصل کرنے کی کوشش کی گئی ہے۔

مصنف نے بہت ہی مدلل طریقہ سے ان سوالات کا جو ترک وطن، تعلیم، شہری و مذہبی آزادی اور معاشی حالات سے متعلق ہیں اعداد و شمار کی روشنی میں جواب دیا ہے جس کے پڑھنے کے بعد معلوم ہوتا ہے کہ حیدرآباد میں ہندوؤں کی صحیح حالت کیا ہے اور ان کے ساتھ حکومت کتنی رعایتیں کرتی ہے جو کسی ہندو ریاست میں بھی ہندوؤں کو نصیب نہیں۔

کامل صاحب نے انتہائی کاوش و جانفشانی سے اس کتابچہ کو مرتب کیا ہے۔ ساتھ ہی اس میں مسلم زاویہ نظر کو بھی پیش کیا گیا ہے جس سے مسائل کے سمجھنے میں بڑی سہولت ہو گئی ہے۔ اس کتاب کا مطالعہ ان لوگوں کے لئے بے حد ضروری ہے جو ملک کے صحیح حالات سے واقف ہونا چاہتے ہیں۔

توبۃ النصوح (جدید ایڈیشن) از مولانا نذیر احمد صاحب مرحوم ۲۷۸ صفحات قیمت ۸ر

ریڈیو ڈرامے (آٹھ ڈراموں کا مجموعہ) از فضل حق صاحب قریشی ۱۹۲ صفحات قیمت عہ۴ر

انوکھی دنیا (افسانوں کا مجموعہ) از اختر انصاری صاحب دہلوی ۱۸۵ صفحات قیمت عہ ۱ر

بڑابس (مزاحیہ افسانہ) از شوکت تھانوی قیمت عہ۴ر

اشکوں کا شہر (افسانے) از محترمہ بیگم صاحبہ عبد القادر۔ قیمت عہ۱۴ر

شمع راہ (خطبات) از پروفیسر محمد سجاد مرزا بیگ صاحب ۱۵۵ صفحات قیمت ۱ر

خواب فراموش (انگریزی ناول کا ترجمہ) ۲۵۰ صفحات قیمت عہ۔ ہندوستانی لٹریچر کمپنی ۴۲ میلن روڈ۔ لاہور

سالنامہ حقیقت اسلام بابت ۱۹۳۶ء ۴۴ صفحات قیمت ۸ر۔ سپکر لمیٹڈ۔ بیرون موچی دروازہ۔ لاہور

رہنمائے تعلیم (اتیپ دق نمبر) مرتبہ سردار صاحب۔ ماسٹر جگت سنگھ ۲۶۰ صفحات قیمت عا۔ دفتر رسالہ رہنمائے تعلیم لاہور

لندن کی ایک رات (افسانہ) از سید سجاد ظہیر صاحب ۱۵۰ صفحات قیمت عہ۔ دبیر منزل۔ لکھنؤ

نوجوان اور مظلوم (اصلاحی مضمون) از سید صابر حسین صاحب قیمت ۱۰ر حلقۂ ادب۔ لکھنؤ

قرآن شریف کا تلنگی ترجمہ از چلکوری نارائن راؤ صاحب۔ ایم اے پی ایچ ڈی معلم السنہ مشرقی۔ چار روپیہ۔ از اننت پور۔

شہید بچارن (تاریخی افسانہ) از عبد الستار صاحب قمر قیمت ۲ر سیٹھ آدم جی عبد اللہ اینڈ کمپنی۔ نولکھا۔ لاہور

ماہری۔ از خلیل احمد صاحب بی اے ۲۰۰ صفحات قیمت عہ۔ اردو لٹریچر سوسائٹی ۹۶ شمل روڈ۔ لاہور

بچوں کی بیماریاں۔ از ڈاکٹر سید ممتاز حسین صاحب ۲۰۰ صفحات قیمت عہ۔ دفتر رسالہ زیب النساء۔ لاہور

سازہستی (ناول) از مخزون صاحب قیمت عہ۴ر دار الادب پنجاب۔ لاہور

انسداد گداگری۔ از سلطان احمد صاحب قیمت عہ۔ منیجر صاحب کتب خانہ شمسیہ مدراس۔ امرتسر

بیاض قدسیہ (نوحوں کا مجموعہ) از محترمہ سیدہ قدسیہ خاتون صاحبہ قدسیہ قیمت ۸ر قصر الادب دفتر شاعر آگرہ۔

تاریخ الہ آباد۔ مولفہ مولوی سید مقبول احمد صاحب قیمت للعہ۔ کتابستان۔ الہ آباد۔

بادۂ فطرت (نظموں اور غزلوں کا مجموعہ) از میر زیدی صاحب ۲۸۸ صفحات قیمت ۱۲ر اشرف بک ڈپو۔ نولکھا۔ لاہور

اسلامی سپہگری (فن حرب کے متعلق) از عبد الکریم صاحب قیمت عہ۔ نومسلم تبلیغی جماعت۔ نائی منڈی۔ آگرہ۔

حدیث حسن (نظموں کا مجموعہ) از شمیم احمد صاحب فطرت قیمت عہ۔

اردو مضمون نویسی از پروفیسر نانک پرشاد صاحب بی اے قیمت ۸ر زمانہ بک ایجنسی۔ کانپور۔

رازونیاز (ادبی مضامین) از سلطان احمد صاحب وجودی قیمت عہ۔ دفتر رسالہ عصمت۔ کوچہ چیلان۔ دہلی

ماں کا بیٹا (اصلاحی و معاشرتی مضامین) از محترمہ لطیف النساء بیگم صاحبہ بی اے قیمت ۸ر دفتر سب رس۔ خیریت آباد

مسلمان عورت کے حقوق (حقوق نسواں کے متعلق) از حضرت علامہ راشد الخیری مرحوم قیمت ۱۲ر

ساحر من موہنی (تسخیر شوہر کے طریقے) از علامہ مرحوم قیمت ۴ر باقی آئندہ

مرزا سیف علی خاں

فریب

جب چراغ ٹوٹ جاتا ہے تو اس کی روشنی ختم ہو جاتی ہے۔ جب بادل منتشر ہو جاتے ہیں قوس قزح کی [illegible] ہے۔ جب ساز ٹوٹ جاتا ہے اس کے نغمے خاموش ہو جاتے ہیں۔ جب زبان اظہار مدعا کر دیتی ہے تو محبت کا بڑھتا ہوا [illegible] ٹھنڈا ہو کر رہ جاتا ہے۔ ساز شکستہ سے نکلے ہوئے نغمے مسرور نہیں کر سکتے۔ روح کے شکستہ ساز سے نرالے [illegible] آہیں نکلتی ہیں۔ وہ نغمے نہیں ہوتے۔ کسی عالی شان عیش محل کے کھنڈرات سے گزرتی ہوئی ہوا کی سائیں سائیں [illegible]

جو دل کبھی کاشانۂ محبت تھا جس کا ہر گوشہ مسرور نغموں سے گونجتا تھا۔ آج برباد ہے۔ اس کے [illegible] اس کے مکین کی یادگار تک باقی نہیں۔

"محبت"! تو دنیا کی کمزوری کو دور کرتی ہے۔

"تو" کمزور ترین شئے یعنی "دل" میں پیدا ہوتی ہے۔ پھولتی پھلتی ہے اور فنا ہوتی ہے۔ یہ کیوں؟ تو نہیں جانتی [illegible] خواہشات تیری شان و شوکت کو برباد کر دیں گی۔ جس طرح سے عالی شان سے عالی شان محل پڑے [illegible] سامنے سرنگوں ہو جاتے ہیں۔ تیری دلچسپ فضا میں افسوس ناک تغیر پیدا ہو جائے گا۔ جس طرح برسات کی گھنگھ[illegible] اور ننھی ننھی پھوار کی کیفیات کو چمکتے ہوئے سورج کی ایک شعاع برباد کر دیتی ہے۔

تو اس خانہ بدوش پرند کی مانند ہو جائے گی جو شاداب درختوں میں گھونسلا بناتا ہے مگر یہ نہیں جانتا [illegible] موسم اس درخت کے خوشنما لباس کو پرزے پرزے کر کے اتارنے کے درپے ہے۔

تو اس درخت کے مثل ہو جائے گی جو بہار کی رنگینیوں کو دیکھ کر ہمیشہ سرسبز رہنے کے خواب دیکھتا ہے [illegible] اس کو عریاں کر کے دنیا کی نظروں میں "بربادی کی یادگار" بنا دیتی ہے۔

احمد علی اکبر [illegible]

(ماخوذ از انگریزی)

غزل

گھرا ہے ابر اور موسم جواں ہے — کہاں ہے مطرب رنگیں کہاں ہے

ہوائیں کیف میں ڈوبی ہوئی ہیں — جوانی از زمیں تا آسماں ہے

زہے موسم کہ محفل جھوم رہی ہے — خوشا قسمت وہ مجھ پر مہرباں ہے

ہے رقصیدہ نظر میں بزم دنیا — نشے میں مجلس پیر مغاں ہے

حساب دوستاں میں جانتا ہوں — مرے دل میں حساب دوستاں ہے

مری کیا ہمسری کوئی کرے گا — مرا سکہ دو عالم میں رواں ہے

ہر اک مصرعہ ہے اک تفصیل عشرت
بقاؔ کیا خوب انداز بیاں ہے

مسیح الحسن بقا نقوی

...ذرِ اقبال

۱۔ جگدیش چندر بوس کی جدائی کے بعد اقبال کی مفارقت ایک دوسرا سانحہ ہے اور عظیم تر

۲۔ حقیقت میں ایک بڑے انسان کی زندگی ساری قوم کی زندگی اور اس کی موت ساری قوم کی موت ہوتی ہے۔

۳۔ حسنِ نامعلوم ہمیشہ معلوم صورتوں میں پوشیدہ رہا۔ وہ کہیں کلی ہے کہیں کہیں ابر، کہیں پھول، کہیں بلبل اور کہیں شاعر کی زبان۔

اقبال کے سینہ میں بھی زبان ہے جو کچھ بول رہی ہے اور کچھ سنا رہی ہے — ایسا بول جو سب سے بالا اور ایسا نغمہ جو روح القدس کے شہپروں میں ہیں!

دنیا کی تصویریں نسل و وطن بدترین خدوخال ہیں۔ انسان چاہے تو انھیں مٹا کر ایک عظیم الشان برادری کی بنیاد رکھ سکتا ہے۔ انسانیت کا نصب کتنا ہی اہم سہی لیکن اہم ترین وہ کوشش ہے جو اس کی طلب میں صرف ہو۔

۴۔ آہ مرگئی وہ آواز جو مژدۂ آزادی، نویدِ امن اور جہانِ نو کی بشارت بن کر دور و نزدیک سنائی دیتی تھی ————

اب اس کی ایک گونج ہوگی جو مستقبل کی وادیوں میں رہ جائے گی

ڈوب گیا وہ دن جو آلِ آدم کی تاریخ میں نہایت روشن اور شاندار تھا ————

اب اس کی

ایک جھلک ہوگی جو آنے والی تاریکیوں میں رہنمائی کرے گی۔

۵۔ قدرت نے اقبال کو ہم سے چھین کر اپنی کمی پوری کرلی ————
اور ہم نے اقبال کو دے کر اپنا سب کچھ کھو دیا

۶۔ آج ہمارے دل افسردہ ہیں اور ہماری آنکھیں آنسوؤں سے تر ہیں
کاش یہ آنسو نذرِ شاعر ہوکر
لاقیمت بن جائیں!

امیر (اورنگ آبادی)

اقبال اور فلسفہ

فلسفۂ دنیا کے متعلق مختلف مدارسِ خیال ہیں لیکن سب کے سب انسان کو ترکِ عمل اور خواب کی تعلیم دیتے ہیں اس کے برعکس اقبال کا پیغامِ عمل انسان کو نیند سے بیدار کرنے والا ہے۔ اس خیال کو اس نظم میں ادا کیا گیا ہے دنیز اقبال کے فلسفہ سے دوسرے تمام مدارسِ خیال کے جواب دیے گئے ہیں۔

ابراہیم ادہم کی تلقین

اے زمزمہ سنجانِ طرب میری سنو کچھ — اے نوحہ سرایانِ الم مجھ سے کہو کچھ
ہاں میری نصیحت سے خبر ہو کہ نہ ہو کچھ — ہاں میری تسلی کا اثر لو کہ نہ لو کچھ
دنیا کو سرا اک اتر پڑنے کی جانو
اک بات ہے حق کی اسے مانو کہ نہ مانو

کس بات پہ پھولا ہوا اس باغ میں تو ہے — ہستی نہیں تیری گلِ خوش رنگ کی بو ہے
اک قطرۂ شبنم ہے جو خورشید پہ رو ہے — یا ٹوٹنے والا تو حبابِ لب جو ہے
دو دن کی بہاروں سے نہ دل اپنا لگا تو
صدمہ سے خزاں کے نہ پھر اس دل کو دکھا تو

اس ہستیٔ فانی کی بہاروں پہ نہ جانا — اس گلشنِ خوش رنگ کے دعووں میں نہ آنا
دو روز کی دنیا کا یہ رنگیں ہے فسانا — گو عیش کی ہستی ہے نہ کچھ غم کا ٹھکانا
ہر رنگ کو گردش ہے طرب ہے کہ الم ہے
پایندہ بس اک دورِ تغیر کا علم ہے

اس دار کے دیوار و سقف گنبد و در چھوڑ — اس باغ کے گل چھوڑ شجر چھوڑ ثمر چھوڑ
یہ سیم دغل چھوڑ زر و لعل و گہر چھوڑ — یہ فتنۂ و شر چھوڑ زن و دختر و پسر چھوڑ
تنہائی میں کر بیٹھ کے حل راز یہاں کا
شاید کھلے جنگل میں طلسمات جہاں کا

پیام خیام

ہیں راز بڑے دہرِ پُر افسوں کے پرانے — حل کر نہ سکے جن کو حکیم اور سیانے
کچھ ساقی و مطرب کے سنا یار فسانے — کم وقت ہے دو چار تو خم دیدے لنڈھانے

اس ذکر کے سننے کی نہیں ہے مجھے فرصت
جو وقت میسر ہے غنیمت ہے غنیمت

آئینہ صفت زنگ سے تیور پہ نہ بل آئے / دل صورتِ گل خار کی کاوش ہی سے کھل جائے
مانا کہ یہ دنیا ہے مصائب کی فقط جائے / رکھو عیش پہ دل ڈھونڈتے ہیں غم نہ جسے پائے

وہ صورتِ مینا نہ تو مخمورِ مسرت
اور عیش کی دے داد جو گردش میں ہے قسمت

خدام ہیں تیرے زِ سما تا بہ سمک دیکھ / ہر گوشہ میں افسرِ شاہی کی جھلک دیکھ
ہے خاک نشیں تو مگر انوارِ فلک دیکھ / تاریکیٔ شب میں مہ و انجم کی چمک دیکھ

اس عقلِ الم کوش کو ساغر میں ڈبو دے
سب کلفتِ دیرینہ لبِ اک جرعہ میں دھو دے

انتی کا فلسفہ

کچھ پوچھ نہ اے دوست کہ کیا راز ہے عالم / اک خوابِ مسلسل ہے نظر آئے جو مبہم
تصویرِ خیالی ہے جو کچھ دیکھتے ہیں ہم / یا عکسِ تصور کہ جو ہو درہم و برہم

ہم دیکھتے ہیں اپنے تصور کے اثر کو
یہ اصل حقیقت ہے کہ دھوکہ ہے نظر کو

اس مزرعِ بے بود میں بویا بھی تو پھر کیا / اس بازیٔ بے سود میں کھویا بھی تو پھر کیا
اس نمکدۂ وہم میں رویا بھی تو پھر کیا / اس عالمِ تصویر میں سویا بھی تو پھر کیا

حاصل ہی جو ہے خرمنِ بے اصل کا معلوم
پھر رنج و تعب کا بھی رہا اب کوئی مفہوم

بال کا پیامِ عمل

انسان جو اس بزم کا اک رکنِ رکیں ہے / جو اشرفِ مخلوق سماوات و زمیں ہے
مسجودِ ملک کنگرۂ عرش بریں ہے / کیا اپنے فریضہ سے وہ آگاہ نہیں ہے
معیارِ شرف گنجِ قناعت نہیں اس کا / مقصود اتم رنج و مسرت نہیں اس کا
بلبل کے لئے ہے کہ کرے نغمہ شعاری / ہے شمع کو زیبا جو کرے گریہ و زاری
تو گوشۂ عزلت میں کرے عمر گذاری / جو کام کہ کرنا ہے تجھے کام ہے بھاری

مقصود تری زیست کا ہے ارفع و اعلیٰ — جو تیرا فریضہ ہے وہ ان سب سے ہے بالا
یہہ عمر جو ہر لحظۂ و ہر دم گزراں ہے — لاریب کہ قبضہ میں ترے نقد رواں ہے
اک آگ تری ہستیٔ فانی میں تپاں ہے — اک برق ترے قلب میں ہنگامہ کناں ہے

للکار ہے جس کی کہ بڑھے جاؤ جہاں میں
ہے جذبِ قیامت کا اس آواز نہاں میں

اے نیند کے ماتے تو ذرا اٹھ کے سنبھل دیکھ — ہے تاک میں ہر ایک پا پیچ کی اجل دیکھ
اس ذہن کے زنداں سے نکل اور تو عمل دیکھ — گر خواب تری زیست ہے تو خوابِ عمل دیکھ

سب خوابوں سے دلکش ہے بہت خوابِ ترقی
تو کھولتا جا خواب میں ابوابِ ترقی

ہر شکل ہے کھولے ہوئے آغوشِ ترقی — ہر سینہ میں ہے موج زناں جوشِ ترقی
صوفی ہے بڑا سب سے قدح نوشِ ترقی — ہشیاروں سے ہشیار ہے مدہوشِ ترقی
ہے صاف عیاں حاجتِ اظہار نہیں ہے — قدرت کا عطیہ ہے یہہ بیکار نہیں ہے
محکوم بنا بھاپ کو اور برقِ تپاں کو — محسوس بنا مثل مکاں بُعدِ زماں کو
جا ڈھونڈنے مریخ میں اسرارِ جہاں کو — لا توڑ کے افلاک کے انوارِ رواں کو

ہے فیض یہہ نفسِ تفتیش آمادہ کا تیرے
تسکیں کے لئے جان ہی خود اپنی نہ کھو دے

جذبہ جو یہہ بخشا ہے عنایت ہے خدا کی — ہاں اپنی کرو قدر کہ نعمت ہے خدا کی
سینوں میں تمہارے یہہ ودیعت ہے خدا کی — ہرگز نہ تلف ہو کہ امانت ہے خدا کی

میدانِ ترقی میں قدم اپنے بڑھاؤ
اس نعمتِ عظمیٰ کو چلو کام میں لاؤ

ابوالفتح نصر اللہ برقی

فیض سخن (ادارۂ ادبیات اردو کی ایک اہم کتاب)

میر شمس الدین محمد فیض اردو شاعری کے مسلم الثبوت استاد تھے۔ صاحب دل بزرگ مانے جاتے تھے اور عاشقانہ شاعری میں تصوف کی رنگ آمیزی کرتے تھے۔ ڈاکٹر سید محی الدین صاحب قادری زور نے حضرت فیض کے کلام کا انتخاب شائع کیا ہے اور اس کے ساتھ ان کا مقدمہ بھی ہے جس میں فیض کی حیات اور شاعری پر بحث کی گئی ہے۔ قیمت ۱۲ر تعداد صفحات ۱۴۴ مع تصویر مقبرۂ حضرت فیض۔ سب رس کتاب گھر سے طلب کیجئے۔

نوحۂ غم

ہزاروں سال نرگس اپنی بے نوری پہ روتی ہے بڑی مشکل سے ہوتا ہے چمن میں دیدہ ور پیدا

دنیا میں زندگی اور موت کا سلسلہ کبھی ختم ہونے والا نہیں ہے۔ تعمیر و تخریب فطرت کا ایک ابدی تماشا ہے جو ازل سے اس وقت تک جاری ہے اور ہمیشہ رہے گا جس طرح دنیا میں ہر لمحہ اور ہر گھڑی زندگی نئی نئی شکلوں میں ظہور پذیر ہوتی ہے اور نئے نئے قالب اختیار کرتی ہے اسی طرح فطرت پرانی شکلوں کو مٹاتی ہے اور پرانی عمارتوں کو ڈھاتی ہے تاکہ تجدید حیات کے لئے راہ نکالے۔

موت تجدید مذاق زندگی کا نام ہے

سبھی جانتے ہیں کہ موت ایک یقینی اور ناگزیر شئے ہے جس سے بچنا محال ہے۔

اَیْنَمَا تَکُوْنُوْا یُدْرِککُّمُ الْمَوْتُ وَلَوْ کُنْتُمْ فِیْ بُرُوْجٍ مُّشَیَّدَۃٍ (قرآن)

تم کہیں بھی ہو موت تمھیں پالے گی خواہ تم مستحکم برجوں میں کیوں نہ بند ہو۔

لیکن اس علم کے باوجود شاید ہی کوئی شخص ہو جو موت کے منظر سے متاثر نہ ہوتا ہو۔ موت کسی کی بھی ہو اور کسی حالت میں کیوں نہ واقع ہو اپنے اندر صدہا سامان رنج والم رکھتی ہے کون ہے جو دوستوں اور عزیزوں کی موت پر آنسو نہیں بہاتا ہے اور عنان ضبط اپنے ہاتھوں سے کھو نہیں دیتا ہے۔ عقل کی راہبری ایسے وقت کام نہیں دیتی ہے اور استدلال کے پائے چوبیں لڑکھڑانے لگتے ہیں۔ خاندان کا جب کوئی بڑا بزرگ اٹھ جاتا ہے تو ہر فرد بے چین نظر آتا ہے۔ ہر سینہ فگار اور ہر آنکھ اشکبار ہوتی ہے اور ایسا معلوم ہوتا ہے کہ خاندان کی عظمت و رفعت بھی مرنے والے کے ساتھ پیوند خاک ہو جائے گی۔ یہی حال قوموں کا ہے۔ دنیا میں بہت کم لوگ پیدا ہوتے ہیں جو حقیقی عظمت کے مالک ہوں جنھوں نے اپنے خون جگر سے قومی زندگی کی آبیاری کی ہو جن کی ذات ملک و قوم کے لئے نازش و افتخار کا باعث ہو مگر جب کسی ایسے شخص کی موت واقع ہوتی ہے تو قومی زندگی میں ایک خلا پیدا ہو جاتا ہے جس کو پُر کرنا مشکل ہوتا ہے۔ ایسے افراد کی موت ایک قومی نقصان ہے جس کی تلافی صدیوں تک نہیں ہو سکتی ہے۔ پھر قوم ان کو کیوں نہ روئے اور ان کے ماتم میں سیہ پوشی کیوں نہ اختیار کرے۔

اقبال کی موت ہمارے لئے ایک مصیبت عظمیٰ سے کم نہیں ہے۔ صدیوں کے بعد ایک ہستی پیدا ہوئی تھی جس کو پنجۂ موت نے ہم سے چھین لیا اور ہمارے دلوں کو فگار اور سینوں کو داغدار کر دیا۔ آہ وہ الفاظ کہاں سے آئیں جن سے ہم اپنے جذبات غم کا اظہار کر سکیں۔ شدت الم سے آنسوؤں کا دریا خشک ہے اور ماتم و فغاں کی زبان بند ہے۔ کیونکہ چمنستان ادب کا سب سے زیادہ خوبصورت پھول مرجھا گیا، شاعری کے باغ سے شادابی رخصت ہو گئی۔ عروس سخن سوگوار ہے کہ اس کا سہاگ لٹ گیا اور اس کی

زینت و آرائش کا سامان اس سے چھن گیا۔ شعر و سخن کی محفل سونی ہے کہ اس کا طائر خوش نوا ہمیشہ کے لئے خاموش ہو گیا۔ اب کون ہے جس کی زمزمہ سنجی سے دردمند قلوب اپنے زخموں کے لئے تازگی اور اپنی روح کے لئے سوز و گداز حاصل کریں گے۔ کس کی آنکھیں زوال ملت پر خوننابہ فشانی کریں گی کس کا قلب مسلمانوں کے مصائب پر رنج و الم سے [illegible] ہوگا کس کی زبان یاس و نا امیدی کی فضائے تاریک میں امید کا پیغام سنائے گی اور دلوں کو درد ملت سے [illegible] آہ موت نے ہمارے سرمایۂ ملی کا راس المال ہم سے لے لیا اور ہمارے متاع ذہنی کا سب سے زیادہ خوش آب موتی ہم سے چھین لیا

ہوتے جو کئی دیدۂ خونابہ فشاں اور
ہے خونِ جگر جوش میں دل کھول کے روتا

اقبال کا پیغام ۔ اقبال کی قدر و عزت ہمارے دلوں میں صرف اسی لئے نہیں ہے کہ اس نے ہماری زبان و ادب کے سرمایہ میں بیش بہا اضافہ کیا اور ہماری شاعری کے لئے جس کے خیالات و افکار کا دائرہ اب تک محدود تھا ایک نئی شاہراہ کھول دی۔ اقبال کا مایۂ ناز کارنامہ تو وہ پیغام زندگی ہے جس کے لئے عالم اسلام ایک مدت سے گوش بر آواز تھا۔ جس نے مسلمانوں کو غفلت کی نیند سے چونکایا اور انھیں اخوت اسلامی کا درس دیا۔ اس میں کوئی شک نہیں ہے کہ حضرت جمال الدین افغانی کے بعد عالمگیر اسلامی اخوت کا اگر کوئی علم بردار تھا تو وہ اقبال ہی تھا۔ اقبال کی شاعری میں جو چیز بمنزلہ روح کے ہے وہ یہی پیغام اخوت اور درس اتحاد ہے۔ وطنیت اور قومیت کے جدید تخیل کے خلاف اقبال نے جس بے باکی سے اپنی صدائے احتجاج بلند کی ہے وہ اس کی اخلاقی جرأت کا ثبوت اور اس پر شاہد عادل ہے۔ اقبال نے محسوس کیا کہ وہ وطنیت اور قومیت موجودہ دنیا جس کی اس قدر دلدادہ ہے اور جو تہذیب جدید کی اساس و بنیاد ہے ان اوہام باطلہ میں سے ہے جنھوں نے وحدت انسانی کو پارہ پارہ کر دیا ہے۔ اس کی نگاہوں نے اس راز کو پا لیا کہ قومیت کا یہی محدود تصور امن عالم کا غارت گر اور اخوت انسانی کے لئے سم قاتل ہے۔ اس کی بجائے اس نے اسلام کا وہ تصور حیات پیش کیا جو قوموں اور جماعتوں کو شیرازۂ اخوت میں جکڑ دیتا ہے اور انسانی قلوب میں محبت کی تخم ریزی کرتا ہے اور بغض و عداوت کے جذبات کو مٹاتا ہے۔ یہ تھا اقبال کا پیغام جس کو لے کر وہ دنیا میں آیا تھا، جس کے لئے اس نے اپنی عمر عزیز صرف کی اور جس کی آرزو وہ اپنے پیچھے چھوڑ گیا۔

اقبال کی شاعری کی ایک خصوصیت جو اس کا وصف امتیازی ہے اور جس کا فقدان ہماری شاعری کا ایک [illegible] اس کی رجائیت ہے جو ہماری کشت امید کو سرسبز اور آرزو کی شاخ کو تر و تازہ رکھتی ہے، جس کے اثر سے دل حزن و ملال کی گرد سے پاک و صاف ہو جاتے ہیں۔ اردو شاعری پر اب تک یاس و حسرت اور رنج و الم کے جذبات کا غلبہ رہا ہے جس کی وجہ سے وہ قومی زندگی کے ضعف اور حیات اجتماعی کے اضمحلال کا سبب بنی رہی خواہ وہ اپنے رنگ میں کیسی ہی کامیاب کیوں نہ ہو۔ ہمارے شعرا کا بیشتر حصہ زندگی کے بجائے موت شادمانی کے بجائے افسردگی اور نشاط و مسرت کی جگہ حزن و یاس کا پیغامبر ہے۔ ہماری شاعری نغمۂ شادی نہیں بلکہ نوحۂ غم ہے جس سے درد و الم کی صدائیں بلند ہوتی ہیں اور جس دل تک پہونچتی ہیں اسے خوشی و مسرت امید و وسوسہ خواہش حیات اور جوش عمل سے خالی کر دیتی ہیں۔ اس کے برعکس اقبال کی شاعری بحیثیت مجموعی انسانی زندگی کا رخ روشن پیش کرتی ہے دلوں کو گرماتی ہے امید کو تازہ کرتی ہے اور [illegible]

مژدہ مسرت اور نوید کامرانی سناتی ہے۔ یہ وہ چشمۂ رواں ہے جس کا پانی انسان کو زندگی بخشتا ہے اس کی روح کو بالیدہ اور اس کی ہمت کو بلند کرتا ہے۔ یہی ہے جس سے قومی زندگی کی جڑیں مضبوط ہوتی ہیں اور اس کا درخت برگ و بار لاتا ہے۔

پھر اب کون ہے جو اس سوکھی ہوئی کھیتی کو پانی دے گا اور اس میں عمل پیہم اور یقین محکم کے وہ بیج بوئے گا جن سے تو میں پھلتی اور ترقی کرتی ہیں۔

محمد مظہر الدین صدیقی

اقبال

(یوم اقبال بریلی کالج کی ایک کامیاب نظم)

مشعلِ راہِ ہدایت ہستیٔ اقبال تھی ۔۔۔ اس کی نکتہ رس نظر آئینہ دارِ حال تھی
ہر زمینِ شعر اس کی آسمانِ اجلال تھی ۔۔۔ اس کے دم سے شاعری زندہ تھی مالامال تھی
نیرِ شعر و ادب اس نے درخشاں کر دیا
سنگ کو ہم پلۂ لعلِ بدخشاں کر دیا

شاعری نازاں ہے اس کی جدتِ گفتار پر ۔۔۔ ایشیا کو ناز ہے اقبال کے کردار پر
فخر کرتا ہے زمانہ شاعرِ خوددار پر ۔۔۔ رشک کرتا ہے ادب اس کے نئے افکار پر
شاعری اقبال کی "شمعِ جہاں افروز ہے"
"توسنِ ادراکِ انساں کو خرام آموز ہے"

اس نے چھیڑا زخمۂ احساس سے سازِ خودی ۔۔۔ نعرۂ تکبیر سے توڑا طلسمِ بے حسی
از سرِ نو قوم کو اس نے عطا کی زندگی ۔۔۔ اس کی تعلیمِ عمل نے ختم کر دی بیہشی
حال و مستقبل کی اس کی شاعری آئینہ ہے
نردبانِ بامِ رفعت علم کا گنجینہ ہے

ملتِ بیضا کو پھر اس نے نمایاں کر دیا ۔۔۔ ملتِ اسلام کو گوہر بداماں کر دیا
مردِ مسلم کو نئے سر سے مسلماں کر دیا ۔۔۔ اور غلامِ ہند کو بیرونِ زنداں کر دیا
کون اس کا ہند میں شرمندۂ احساں نہیں
کون سیرابِ زلالِ چشمۂ حیواں نہیں

بادۂ منصور سے لبریز اس کا جام تھا — راہ پر لانا مسلمانوں کو اس کا کام تھا
خیر خواہِ ملک تھا اور خادمِ اسلام تھا — بت شکن تھا تابعِ لا تعبدالاصنام تھا
جس قدر ممکن تھی خدمت اس نے کی اسلام کی
لاج رکھ لی بانیٔ دینِ خدا کے نام کی

دوڑتا تھا اس کی رگ رگ میں اخوت کا لہو — تا دمِ آخر رہا "سرگرم ذوقِ جستجو"
قوم کی اصلاح تھی اس کی حقیقی آرزو — اس کا فرمانِ عمل تھا "لا تذر لا تقنطو"

سرفروشی کا سبق اس نے مسلماں کو دیا
کر گیا زندہ وہ تعلیم علی موسیٰ رضا

اس کو رفتارِ زمانہ کا صحیح اندازہ تھا — اس کا ہر اک شعر دنیا کو پیام تازہ تھا
شرق سے تا غرب اس خوددار کا آوازہ تھا — اس کے ہاتھوں مجتمع اسلام کا شیرازہ تھا
رومی و تبریز کے اطوار سے آگاہ تھا
جاں نثارِ مصطفےٰ تھا بندۂ اللہ تھا

رحلتِ اقبال سے ہندوستاں ماتم میں ہے — صرف ہندوستاں نہیں سارا جہاں ماتم میں ہے
اٹھ گیا مرغِ سحر اب گلستاں ماتم میں ہے — ایک عالم از زمیں تا آسماں ماتم میں ہے
اس کے اٹھنے سے زمانے پر اندھیرا ہو گیا
گلشنِ اردو ادب ہم رنگ صحرا ہو گیا

"آرزو کو خون رلواتی ہے بیدادِ اجل — مارتا ہے تیر تاریکی میں صیادِ اجل"
رہروِ ملکِ عدم کو چاہیئے زادِ اجل — ہے ہر اک انسان پر لطفِ خداداد اجل
"موت ہر شاہ و گدا کے خواب کی تعبیر ہے"
"اس ستمگر کا ستم انصاف کی تصویر ہے"

پروانہ بریلوی

بچوں سے

عزیز سب رسی بھائیو اور بہنو!!

یہ تو آپ کو معلوم ہی ہوگا کہ اس ماہ سر محمد اقبال کی برسی ہر جگہ منائی جا رہی ہے (یوں تو گذشتہ سال جون [illegible] میں اقبال نمبر نکل ہی چکا تھا جس کی ابھی تک مانگ ہے) اسی لئے ہم نے اس دفعہ بھی نصف پرچہ اقبال ہی سے متعلق وقف کر دیا ہے نیچے ایک معمہ بھی اقبال ہی سے متعلق دیا گیا ہے اسے ضرور حل کر کے ۱۵ مئی تک ہمارے پاس بھیج دو۔

اپریل کے پرچہ میں مس اقبال باسط علی خاں کے جو پہیلیاں شایع ہوئی تھیں ان کو حسب ذیل اصحاب نے حل کر کے روانہ کیا ہے (۱) مسیح الدین خاں متین (۲) سید نور القمر الدین (۳) محمد ظہیر احمد (۴) محمد عبد العزیز۔ پہلے کے تین اصحاب نے ایک غلطی کی ہے اور آخر صاحب نے تین غلطیاں کی ہیں۔ صحیح حل یہ ہیں (۱) چاند (۲) سال، ماہ، دن (۳) آم (۴) بجلی۔ چونکہ بعض حل ۱۵ تاریخ کے بعد وصول ہوئے اس لئے شریک نہیں ہوسکے۔

بچوں کے سب رس کے علاوہ ادارہ چاہتا ہے کہ ہمارے بھائیوں اور بہنوں کی معلومات بڑھانے کے لئے چھوٹی چھوٹی اور دلچسپ سستی کتابیں بھی چھپتی رہیں تاکہ فرصت کی گھڑیوں میں ہم سب ان کو پڑھیں اور فائدہ حاصل کریں۔ گذشتہ مہینہ میں "من کی بتیا" کتاب چھپی تھی اور اس مہینہ میں ایک دوسری کتاب "نظام الملک آصفجاہ" چھپی ہے۔ اس میں سلطنت حیدرآباد کے محترم بانی حضرت آصف جاہ اول کے مستند حالاتِ زندگی سادہ اور سلیس زبان میں لکھے گئے ہیں ان کے پڑھنے سے معلوم ہوگا کہ ہمارے پہلے بادشاہ کے اخلاق و عادات اور ہمت اور بہادری کیسی تھی۔ یہ کتاب بچوں ہی کے لئے نہیں بلکہ ان بڑے لوگوں کے لئے بھی مفید ہے جو بڑی بڑی تاریخی کتابیں نہیں پڑھنا چاہتے۔ اسی طرح ہمارے دوسرے بادشاہوں کے حالات بھی الگ الگ چھوٹی چھوٹی کتابوں میں چھاپے جائیں گے۔ یہ کتاب صرف چار آنہ کے ٹکٹ بھیجنے پر روانہ کی جائے گی اس میں حضرت آصفجاہ اول کی رنگین تصویر بھی ہے۔

"معمہ اقبال"

ہر لفظ کے سرحرف کو جوڑنے سے ایک نام نکلتا ہے۔ بتاؤ وہ کیا ہے؟ یہ سب الفاظ بہ ترتیب لکھے ہیں مثلاً باسط، قادر، احمد، لیاقت، اکبر، کمال۔ اقبال

۱۔ بمبئی۔ ناگپور۔ احمد آباد۔ گوالیار۔ رائچور۔ دولت آباد۔ احمد نگر (۲) سمرقند۔ اعظم گڑھ۔ بادگیر۔ لاہور۔ ورنگل۔ کشمیر۔ ٹراونکور (۳) آگرہ نظام آباد۔ راولپنڈی۔ ڈیچپلی۔ لکھنؤ۔

معین الدین احمد انصاری

موسم گرما

موسم گرما ہے یا ہے نارِ نمرود اے خدا
روح جسموں سے تڑپ کر ہوتی جاتی ہے جدا

واہ رے ہمت تری انساں بڑا جرار ہے
تیرے استقلال نے [illegible] گلزار ہے

اپنے استقلال کا تو نے ثمر پایا ہے آم
[illegible] جام

[illegible] ارماں

ہندوستاں ہمارا

شہری ہیں ہم وطن ہے ہندوستاں ہمارا
ہے یہ زمیں ہماری یہ آسماں ہمارا

ریاست بھی ہمارا قرآن بھی ہمارا
اللہ بھی ہمارا بھگوان بھی ہمارا

گنگا و رود جمنا اور آب چاہ زمزم
سیراب کر رہے ہیں دونوں جہاں ہمارا

دیوالی اور دسہرا عید تعزیے محرم
ڈنڈی کی یہ سواری اور یہ نشاں ہمارا

پوجا پاٹھ اپنا روزہ نماز اپنی
اظہار عقیدت کا ہے یہ نشاں ہمارا

اوتار اور پیمبر ہیں پاسباں ہمارے
سجدے میں سرنگوں ہے ہندوستاں ہمارا

۲

پہلے تو دیش بھارت امن واماں کا گھر تھا
رہتے تھے سب اکٹھے کوئی نہ خوف ڈر تھا

کیا ہو گیا ہے اب یہ جھگڑے کی ہے کمائی
کچھ بھول ہو گئی ہے سدھ اپنی ہے گنوائی

اپنے ہی بھائیوں پر آفت جو ڈھا رہے ہیں
آپس میں پھوٹ کر کے عزت گنوا رہے ہیں

امن واماں کی دنیا برباد کر رہے ہیں
ناحق و ناروا ہی فریاد کر رہے ہیں

۳

سنتا ہے کون اپنی ہم کس کو یہ سنائیں
یہ بھول ہے سراسر کس طرح یہ بتائیں

وحدت کے فلسفہ کو ہم نے مٹا دیا ہے
دنیا ہے چند روزہ یہ بھی بھلا دیا ہے

کچھ یاد بھی ہیں تم کو ایکو برہمہ کے معنی
ہے لاشریک واحد پروردگار یعنی

سارے جہاں میں ہستی اس کی ظہور اس کا
آنکھوں میں نور اس کا دل میں سرور اس کا

ہر ذرہ سے عیاں ہے الفت کا یہ نمونہ
باز آئیں جھوٹی ضد سے بس مدعا یہی ہے
جھگڑے فساد جھوٹے ہیں ان کو جھوٹ جانو
منوائیں کچھ وہ اپنی کچھ دوسروں کی مانیں
جب نام آئے ان کا سب مل کے سر جھکائیں
بھٹکے ہوئے جہاں کے باہم گلے ملیں گے
ہندوستانی ہم کو جب ہر کوئی کہے گا

اس تھوڑی سی مدت میں ہٹلر نے جرمنی کو پھر وہ نمونہ
...ب وجلال کا سکہ تمام اقوام پر ڈالا ہے۔ غالباً یہ
...نکہ عوام میں نہیں پھرتا بلکہ اس کی بیباکانہ چال

گولکنڈے کے افسانے

گولکنڈہ کی کوئی سیر و تفریح ان کتابوں کے بغیر نہیں ہو سکتی...
...نہیں دیکھا اور جنہوں نے کبھی گولکنڈہ کی سیر نہیں...
...باتصویر ہیں۔ سیر گولکنڈہ صفحات ۳۱ تصاویر...

تفریق کوئی ہم میں باقی نہیں رہے گی
اُس ایک ذات ہی سے تفریق بھی رہے گی
کثرت میں وحدت کا جلوہ دکھائی دے گا
پھر تو ہر ایک شے میں اللہ دکھائی دے گا
مذہب پریم کا ہے دنیا پریم کی ہے
جیون کو کھینے والی نیا پریم کی ہے
رہبر اصول قدرت الفت کا راز ہے یہ
چشمہ یگانگت کا وحدت کا راز ہے یہ

مسز برکت رائے

سستا کھانا

دیہاتیوں اور دوسرے غریبوں کو تھوڑے داموں میں ٹھیک اور پورا کھانا کیسے مل سکتا ہے؟ یہ ایسا سوال ہے جس کا حل کرنا ذرا ٹیڑھی کھیر ہے۔ پھر بھی ہم اس جگہ اس کے تھوڑے سے طریقے بتاتے ہیں۔ ان پر غور کر کے عمل کرنے سے گھروں کی حالت بہت کچھ اچھی ہو سکتی ہے۔

۱۔ گیہوں کی جگہ مکا، باجرہ یا بجھڑ وغیرہ استعمال کیجیے۔ اٹلی کے لوگوں کا کھانا صرف مکا، تیل اور ترکاری ہے انھیں نہ دودھ ملتا ہے اور نہ وہ گوشت انڈا وغیرہ کچھ کھاتے ہیں، پھر بھی تندرست رہتے ہیں۔

۲۔ شکر کی جگہ گڑ استعمال کرنا چاہیے گڑ میں وٹامن 'اے' ہوتا ہے۔ جو شکر میں نہیں ہوتا۔ گڑ سستا ہوتا ہے اور اور پاخانہ بھی صاف لاتا ہے۔

۳۔ ہر موسم کا کھانا انھیں چیزوں کا ہونا چاہیے جو اس موسم میں ہوتی ہوں۔ جب جس چیز کی فصل ہوتی ہے اس وقت وہ چیز بہت سستی ملتی ہے۔

۴۔ سستے پھل اور ترکاریاں خوب کھانے چاہئیں۔ یہ خیال کہ انگور، سیب وغیرہ میں زیادہ طاقت ہوتی ہے، بالکل غلط ہے ان میں وٹامن بھی زیادہ نہیں ہوتا۔ جام امرود اور جامن وغیرہ سستے پھل مہنگے پھلوں سے زیادہ اچھے ہوتے ہیں۔ کھانے کی چیزوں کو صرف اسی لئے برا نہیں سمجھنا چاہیے کہ وہ سستی ہیں۔ "گراں بہ حکمت" اور "ارزاں بہ علت" والی مثل کھانے کی چیزوں کے لئے صحیح نہیں۔

ماخوذ

(از ہل)

معین الدین احمد انصاری

روح جسموں سے تڑپ کر ہوتی جاتی ہے جدا
میرے استقلال نے [illegible] ہے
[illegible] جام

اگر

ہٹلر

ہٹلر جنگ عظیم میں جرمن فوج کا کپتان تھا۔ ۱۹۲۰ء تک کسی نے اس کا نام بھی نہیں سنا تھا۔ اس نے اپنی پیرو ایک جماعت بنائی۔ یہ لوگ نازی کہلانے لگے۔ آہستہ آہستہ یہ جماعت بڑھتی گئی اور باوجودیکہ ہنڈن برگ (جنگ عظیم کا مشہور جرمن جنرل) جرمن ریپبلک کا پریسیڈنٹ تھا۔ نازیوں نے رفتہ رفتہ ملک کی تمام طاقت اپنے زیر کرلی۔ انھوں نے حکومت کی باگیں اپنے اختیار میں کرلیں۔ اس وقت سے ہٹلر جرمنی کا آہنی شخص کہلایا جاتا ہے۔ اور اس کی پوری کوشش یہی ہے کہ یہ جرمنی کو دوسری قوموں کے دباؤ سے محفوظ رکھے۔ یاد ہوگا کہ جنگ عظیم کے بعد جو صلح نامہ کے شرائط تھے ان کی رو سے اہل جرمنی کے اوپر بہت سی قیدیں لگائی گئی تھیں۔ اور انھیں اس وقت بہت نیچا دیکھنا پڑا تھا۔ ہر ہٹلر نے کچھ ہی عرصے میں صلح نامہ کے شرائط کو نظرانداز کر کے اپنی قوم کو پھر ایک طاقتور قوم بنالیا۔ چانسلر کی حیثیت سے بھی اس کی قدر ہنڈن برگ اعظم سے کم نہ تھی۔ ہنڈن برگ کی وفات پر ۱۹۳۴ء میں اہل جرمنی نے متفق الرائے ہوکر ہٹلر کو اپنا پریسیڈنٹ منتخب کیا۔ جون ۱۹۳۴ء میں ہٹلر نے ان تمام اشخاص کو جنھیں وہ اپنے سے باغی تصور کرتا تھا مروا دیا۔ اس کی موجودہ پالیسی ہے کہ اپنے ملک والوں کو متحد اور ایک مضبوط قوم بنا دے۔

اب ہٹلر کی بدولت جرمنی ایک آزاد قوم اور طاقتور ملک ہوگیا ہے۔ ہٹلر نے ملکی ترقی کے لئے نہایت مفید اسکیمیں بنائی ہیں۔ ملک کی ایک کثیر تعداد کو فوج میں بھرتی کیا۔ عمدہ آلوں سے زراعت کو ترقی دی۔ یہودیوں کو نکال دیا۔ صنعت و حرفت سے تجارت کو فروغ دیا۔ اس طرح اپنے ملک کو دوسرے ملکوں کے ہم پلہ کردیا۔ قومی انقلاب کا اگر پورا پورا ہٹلر کے سر سہرا نہیں تو کم سے کم اسی کی کوششوں کا نتیجہ ہے۔

ملک جرمنی پر جو بیجا خراج عاید کئے گئے تھے اس کی ادائی سے ہٹلر نے انکار کردیا۔ رائینلینڈ (Rhineland) پر قابض ہوگیا۔ اب وہ اسپین کی خانہ جنگی میں جنرل فرانکو کی مدد کر رہا ہے۔ دوسری طرف وہ اپنی نوآبادیوں کو طلب کر رہا ہے جو سارے یورپ کو خطرہ میں ڈال رہی ہیں۔

اس تھوڑی سی مدت میں ہٹلر نے جرمنی کو پھر وہی قوت دی جس کا کسی نے خواب بھی نہ دیکھا تھا اور اس نے اپنے رعب و جلال کا سکہ تمام اقوام پر ڈالا ہے۔ غالباً یہ سن کر تعجب ہوگا کہ ہٹلر، مسولینی اور اسٹالن کی طرح قدم پھونک پھونک کر عوام میں نہیں پھرتا بلکہ اس کی بیباکانہ چال پر ہر طرف سے نعرے بلند ہوتے ہیں ——

گولکنڈے کے افسانے

سید عابد حسین

گولکنڈہ کی کوئی سیر و تفریح ان کتابوں کے بغیر نہیں ہوسکتی۔ جو گولکنڈہ دیکھ چکے ہیں وہ جب یہ افسانے پڑھتے ہیں تو محسوس کرنے لگتے ہیں کہ گویا کچھ نہیں دیکھا۔ اور جنھوں نے کبھی گولکنڈہ کی سیر نہیں کی ان کے دل میں ان کو پڑھنے کے بعد گولکنڈہ کی سیر کی امنگیں موجزن ہوجاتی ہیں۔ ان کتابوں میں با تصویر ہیں۔ سیر گولکنڈہ صفحات ۰۴۱ تصاویر ۱۲ اور قیمت صرف ۱۵ / گولکنڈے کے ہیرے صفحات ۱۲۶ تصاویر ۱۲ قیمت ۱۲ /

تربیتِ طفلی کے تقاضے

اکثر لوگوں کو خیال ہوتا ہے کہ لایق والدین بچوں کی تربیت اچھی طرح سے کر سکتے ہیں۔ میری رائے میں یہی ایک
ہوئی مصروفیتوں اور دلچسپیوں کی وجہ سے اس سے بالکل بے پرواہ سے رہتے ہیں اور پھر لیاقت کے ساتھ یہ ضروری نہیں
تربیت کا مادّہ بھی ہو۔ مجھے خود اکثر ایسے والدین کو دیکھنے کا اتفاق ہوا جو باوجود تعلیم یافتہ ہونے کے بچوں کی
ایسی کرتے ہیں کہ شاید جاہل بھی اسے پسند نہ کریں۔ وہ والدین جو ہر طریقے سے لایق کہے جا سکتے ہیں بچوں کو ایسی
فضول باتیں سکھاتے ہیں جو کہ خود بچوں کے لئے زہر ہلاہل سے کم نہیں ہوتیں اور جب وہ بڑھ کر بھی وہی باتیں کرتے ہیں
وقت انھیں بُرا معلوم ہوتا ہے اور عام طور پر ایک وجہ یہ بھی ہوتی ہے کہ خصوصاً مسلمان بچوں کے اخلاق بُرے ہو
ہیں۔ والدین تو اپنے وقت مقررہ پر تفریح کے لئے چلے جاتے ہیں اور بچوں کو نوکروں کے سپرد کر کے گھر پر چھوڑ دیا جاتا
اب نوکریں بچوں کو خواہ اچھی باتیں سکھلائیں یا بری۔ صرف یہی نہیں بلکہ نوکروں کو بچوں پر پورا پورا اختیار دیا جاتا ہے
اب ظاہر ہے بچوں کے اخلاق کیسے ہوں گے۔ بچوں کو شاید یہ سمجھ کر ہمراہ نہ لے جاتے ہوں کہ اور لوگ انھیں فیشن سے د
اور بوڑھا خیال کریں گے۔

میں نہیں کہتی کہ والدین تفریح نہ کریں بلکہ بچوں کو بھی اپنے ہمراہ یا نوکروں ہی کے ساتھ کسی ایسی جگہ بھیجا
ان کی بھی خاطر خواہ تفریح ہو سکے۔ کیونکہ ان ہی نونہالاں سے قوم کی آئندہ امیدیں وابستہ ہیں۔ کسی نے کیا سچ کہا
"ماں کی گود بچے کی پہلی درس گاہ ہے"۔ اسی لئے ایسی تربیت ہونی چاہیے کہ مسلمان بھی غیر قوموں سے آگے نکل
بہت سی باتوں میں یورپ کی اندھا دھند تقلید تو ہوتی چلی جاتی ہے لیکن اس نظریہ پر غور نہیں کیا جاتا کہ یورپ میں
تربیت کس خوبی سے کی جاتی ہے۔ اور وہاں کی معاشرت ان کی تربیت سے کس قدر موافق ہے۔ مختصر یہ کہ بچوں
تربیت بہت عمدگی سے ہونی چاہیے کیونکہ یہ قوم کی امیدیں ہیں اور صرف انہیں پر قوم کی آئندہ امیدوں کا انحصا

ممتاز زینت الرح

اتفاق

اگر غور کیا جائے تو یہ دنیا اتفاق ہی کا جلوہ معلوم ہوتی ہے۔ کیا معنی؟ زمین پر کوہ اور صحرا، سمندر اور دریا، نباتات
جمادات غرض کل کائنات جمع ہو رہے ہیں اور انہی کا نام دنیا ہے۔ اگر کوئی ایسی صورت ممکن ہو کہ ان میں اتفاق
نہ رہے اور یہ خاک و باد آب و آتش وغیرہ کے عنصر جو اہل کیمیا نے دریافت کئے ہیں، سب تتر بتر ہو جائیں ایک دوسرے
سے اتفاق کی شکل یہ ہے جس کو اہل علم کشش ثقل کے نام سے پکارتے ہیں باقی نہ رہے تو اس دنیا و مافیہا کا خاتمہ ہو جائے۔
اس کارخانے میں جدھر نظر ڈالتے ہیں اور جس طرف آنکھ اٹھا کر دیکھتے ہیں ویرانہ بازار ہو یا گلزار اتفاق کا جلوہ نظر آتا ہے۔
چند پودوں کو جمع کیا جاتا ہے اور اس کو سجایا جاتا ہے تو وہ گلزار بن جاتا ہے۔

خود حضرت انسان کا وجود ہی اتفاق کی بدولت ہے اگر اتفاقاً انسان کے اعضا باہم متفق نہ رہیں تو زندہ رہنا مشکل
...کی قدرتی سامان ہم کو بتا رہے ہیں کہ اتفاق بڑی شئے ہے اور چاہیے کہ ہم انسانوں میں بھی اتفاق قائم رہے جن
لوگوں نے دنیا میں باہم اتفاق کیا ہے بڑے بڑے فائدے اٹھائے ہیں اتفاق کرنے سے مشکل سے مشکل کام آسان
ہو جاتے ہیں سمندر جو ایسا بڑا ہیبت ناک اور بے حد و حساب قوت کا مالک ہے آخر کیا ہے قطروں کا مجموعہ کیا قطرہ
اور کیا اس کی حیثیت لیکن اکٹھا ہونے کی یہ کرامت ہے کہ بحر بن گیا۔ اتفاق ایک ایسی چیز ہے کہ جس سے ہم بہت کچھ
کر سکتے ہیں تاریخ اس بات کی گواہ ہے کہ جس میں اتفاق رہا وہ ہمیشہ غالب رہے۔ اور جن لوگوں میں نااتفاقی ہے وہ
ہمیشہ ذلیل رہے۔

جے چند اور پرتھی راج کے نفاق نے سلطان شہاب الدین غوری کو ملک دلوایا۔ محمد تغلق اور اس کے امرا کی
آپس کی جھگڑے دیکھ کر امیر تیمور ہند پر چڑھ آیا۔ ابراہیم لودھی اور اس کے امیروں کی نااتفاقی نے بابر کو باہر سے بلوایا۔
...شاہی دربار کے اراکین کی ناچاقی نے نادر شاہ کے ہاتھ سے دلی جیسے شہر میں قتل عام کرایا۔ انگریزوں کو یہ عروج
...کر حاصل ہوا صرف باہمی اتفاق سے غرض اتفاق بڑی بیش بہا دولت ہے جہاں تک ہو سکے حاصل کرنا چاہیے۔
نفاق بہت بری چیز ہے اس سے بچنا چاہیے۔

سید حسین

...ن کی کتاب

ایک عجیب و اعلیٰ کتاب جس کو محترمہ لطیف النساء بیگم صاحبہ نے بچوں کی بہترین تربیت کے لئے لکھا ہے۔ اس میں حسب ذیل عنوانوں کے
...مفید اور کار آمد باتیں لکھی ہیں۔ گھر، سواری، ہمارے نوکر، خورد و نوش، لباس، بچوں کی تعلیم اور ان کی ضرورتیں، اخبار، کتابیں اور
...لئے ... مختلف رسومات، علاج معالجہ، متعلقین اور لواحقین، سیر و تفریح، سینما، فیشن، ہر تعلیم یافتہ گھر میں اس کتاب کا
ہونا ضروری ہے۔ بہت خوبصورت اور مجلد ہے۔ (۸۰ صفحات) قیمت صرف ۸ر بچوں کے لئے رعایتی قیمت ... اشاعت۔

پروردہ لڑکیاں

غریب لوگ مفلسی سے تنگ آکر اپنی جان سے زیادہ عزیز بچوں کو کچھ پیسوں کے عوض بڑے گھروں میں دے دیتے ہیں اور سمجھتے ہیں
ان کے لخت جگر یہاں خوش وخرم زندگی گزاریں گے لیکن ان کو کیا خبر کہ وہ لوگ جو ان سے ان کے بچے بھلائی کے بڑے بڑے وعدے کر کے
لیتے ہیں اس کو بھلا کر تکلیفیں دینے لگیں گے۔

اکثر گھروں میں پالک لڑکیاں دکھائی دیتی ہیں جو گو کام کاج بڑے سلیقے سے کرتی ہیں لیکن ان کے کام لینے والے ایسی
گالیوں اور سخت الفاظ سے ان کو مخاطب کرتے ہیں کہ سن کے دل دہل جاتا ہے۔ ان کے آرام کی کسی کو بھی کچھ فکر نہیں۔ سردی میں
اکڑ جائیں تو بلا سے دھوپوں میں گرمی سے بھسم ہو جائیں تو کچھ حرج نہیں برسات میں بھیگ جائیں تو کچھ مضائقہ نہیں غرض کبھی
وہ بیمار ہو جائیں تو اس کی بھی کچھ پرواہ نہیں۔ رات میں سب کے سو جانے کے بعد سونا اور صبح سب کے پہلے اٹھنا گویا ان کا فرض ہے
اگر ایسا نہیں ہوا تو بس اللہ ہی خبر کرے۔ میں اپنا ایک چشم دید واقعہ سناتی ہوں۔

میں ایک عزیز کی شادی میں گئی تھی وہاں بہت سے بڑے گھروں کی بیویاں جمع تھیں ان میں سے ایک کے ہمراہ ایک کمسن
سات آٹھ برس کی لڑکی تھی جو اپنی بیگم صاحبہ کا پاندان جس کا وزن چار پانچ سیر ہوگا اٹھائے ہوئے بیگم کے ساتھ پھر رہی تھی کہ جب رات
زیادہ ہو گئی تو لڑکی سو گئی اور اسے اس پاندان کا کچھ خیال نہ رہا بیگم نے دیکھا کہ لڑکی پاندان سے بے خبر ہو کر سو گئی ہے تو پاندان
چپکے سے اٹھا لیا اور پھر اس لڑکی کو جگا کر پوچھا کہ وہ پاندان کہاں ہے لڑکی گھبرائی اور چو طرف ڈھونڈنے اور رونے لگی بیگم
کے غصے اور سزا کے ڈر سے اس کے حواس گم تھے۔ جب وہ میرے نزدیک کھڑے ہوئے پھوٹ پھوٹ کر رونے لگی تو مجھے بہت برا
معلوم ہوا۔ بیگم صاحبہ نے پاندان جہاں چھپایا تھا وہ جگہ مجھے معلوم تھی۔ میں چپکے سے وہ جگہ بتا دی اور اس نے پاندان کا
پا لیا۔ جب اس کی پریشانی دور ہوئی تو میں نے آہستہ سے اسے بلایا اور پوچھا کہ اس کے ساتھ بیگم کا کیا سلوک ہے تو وہ
بے اختیار رونے لگی جس کا مجھ پر بڑا اثر ہوا کیونکہ معلوم ہوتا تھا کہ یہ ننھی سی جان بڑی دکھی ہے نہ معلوم ایسی اور کتنی جانیں
کمبخت سخت دل عاقبت سے غافل انسانوں کے ہاتھ سے سختی اور مصیبت جھیل رہی ہوں گی

بہنو۔ یہ ہمارا فرض ہے کہ جن کو اپنی پناہ میں لیں ان سے انسانیت کا برتاؤ کریں انسان تو انسان جانوروں سے بھی برا
برتاؤ خدا اور رسول کو پسند نہیں۔

سلطانہ صفیہ موئد الدین حسن

اقبال نمبر

حضرت علامہ اقبال مرحوم سے متعلق مستند اور دلچسپ مضمونوں اور نظموں اور تصویروں کا یادگار مرقع۔ اگر آپ کو اپنے شاعر اعظم
کے متعلق کچھ پڑھنے اور اس سے واقف ہونے کا شوق ہے تو یہ مرقع ضرور منگا لیجئے۔ کئی تصویریں ہیں۔ جن میں ایک ہفت رنگی تصویر
بھی ہے۔ قیمت صرف ۱۲؍ ۔ بچوں کے لئے رعایتی قیمت صرف (عہ) بذریعہ منی آرڈر

اقبال کے کلام میں بچوں کا حصّہ

مشرق کا ایک عظیم ترین شاعر جس کو دنیا اقبال کے نام سے یاد کرتی ہے. آج ہم سے جدا ہو چکا اور موت نے اس کو ہم سے چھین لیا. مگر اس کا کلام زندۂ جاوید ہے. مدتوں لوگ اس کو پڑھیں گے اور مرنے والے کا نام یاد رکھیں گے.

اقبال کے اردو کلام کے تین مجموعے شائع ہوئے ہیں جو بانگ درا، بال جبرئیل اور ضرب کلیم کے نام سے موسوم ہیں. بانگ درا سب سے زیادہ ضخیم کتاب ہے. اس میں ان کی بیسیوں نظمیں وغیرہ شامل ہیں. بانگ درا میں ان کا ابتدائی کلام بھی شامل ہے اس کتاب کی ایک خصوصیت یہ بھی ہے کہ اس میں "بچوں" کے متعلق بھی کئی نظمیں ہیں. ان کی یہاں تفصیل کی جاتی ہے.

(۱) پہلی نظم کا عنوان" ایک مکڑا اور مکھی" ہے یہ نظم غالبًا کسی انگریزی نظم سے ماخوذ ہے. اس نظم میں بتایا گیا ہے کہ دنیا میں خوشامد سے کیا کیا ہوتا ہے اور خوشامد کرنے سے ایک عقلمند بھی فریب میں آ سکتا ہے.

(۲) دوسری نظم کا عنوان" ایک پہاڑ اور گلہری" ہے یہ بھی انگریزی نظم سے ماخوذ کی گئی ہے. پہاڑ گلہری سے کہتا ہے تو تو ذراسی ہے اس پر اتنا غرور کیوں ہے. گلہری اس کا جواب دیتی ہے اگرچہ تو بڑا ہے. مگر تجھ میں کوئی ہنر نہیں ہے تجھ میں قدم اٹھانے کی طاقت نہیں ہے اور میں درخت پر چڑھ سکتی ہوں خدا نے ہر ایک چیز اپنی حکمت سے بنائی ہے. دنیا میں کوئی چیز نکمی نہیں ہے.

(۳) تیسری نظم کا عنوان" ایک گائے اور بکری ہے یہ نظم بھی ماخوذ ہے. گائے آدمیوں کا گلہ شکوہ کرتی ہے. اور بکری ان کا لطف و احسان گناتی ہے.

(۴) چوتھی نظم "بچے کی دعا" کے عنوان سے ہے. یہ نظم بھی دوسری زبان سے ماخوذ ہے.

(۵) پانچویں کا عنوان ہمدردی ہے" جو ویم کوپر سے ماخوذ ہے.

(۶) چھٹی نظم" ماں کا خواب" ہے یہ بھی ماخوذ ہے. (۷) ساتویں نظم کا عنوان "پرندے کی فریاد" ہے.

یہ تمام نظمیں نصیحت آموز اور سلیس ہیں جن کو بچے اچھی طرح سمجھ سکتے ہیں. ان نظموں میں سب سے چھوٹی نظم "بچے کی دعا" ہے جو بچوں کو زبانی یاد کرنی چاہیئے. اس لئے اس کو یہاں درج کرنا مناسب معلوم ہوتا ہے.

لب پہ آتی ہے دعا بن کے تمنا میری ــ زندگی شمع کی صورت ہو خدایا میری

دور دنیا کا مرے دم سے اندھیرا ہو جائے ــ ہر جگہ میرے چمکنے سے اجالا ہو جائے

ہو مرے دم سے یونہی میرے وطن کی زینت ــ جس طرح پھول سے ہوتی ہے چمن کی زینت

زندگی ہو مری پروانہ کی صورت یا رب ــ علم کی شمع سے ہو مجھ کو محبت یا رب

ہو مرا کام غریبوں کی حمایت کرنا ــ دردمندوں سے ضعیفوں سے محبت کرنا

میرے اللہ برائی سے بچانا مجھ کو ــ نیک جو راہ ہو اس رہ پہ چلانا مجھ کو

سر محمد اقبال

غالب کی موت کے بعد مولانا حالی اور ان کے زمانے کے دوسرے شاعروں کا یہ خیال تھا کہ اب غالب جیسا شاعر پیدا نہ ہوگا۔ کسے خبر تھی کہ سیالکوٹ کے ایک نومسلم کشمیری خاندان میں ایک ایسا شخص پیدا ہوگا جو اردو شاعری کے قلب میں نئی روح پھونک دے گا جس کی بدولت غالب کا بے نظیر تخیل اور نرالا انداز بیان ایک بار پھر شاعری کو نصیب ہوگا۔ زبان اردو کی خوش اقبالی کہئے کہ جب شمع اردو دہلی اور لکھنؤ میں گل ہو رہی تھی۔ اس دور میں پنجاب نے اقبال سا شاعر پیدا کیا جس کے کلام کا سکہ نہ صرف ہندوستان میں بلکہ تمام دنیا میں بیٹھ گیا۔ اقبال نے ملک کو بیدار کرنے، قومی احساس پیدا کرنے اور مسلمانوں کے دور گزشتہ کی یاد تازہ کرنے میں نمایاں حصہ لیا۔ شکوہ اور جواب شکوہ کے ذریعے سے بندے کو خدا سے ہم کلام کرا دیا۔ غالب اور اقبال میں بعض لوگوں کو اس قدر مشابہت معلوم ہوتی ہے کہ مسئلہ تناسخ کے تحت یہ یقین کرنا چاہتے ہیں کہ غالب کی روح نے اقبال کے جسم میں جنم لیا اور انگریزی تعلیم اور نئے فلسفہ پر قادر ہو کر نقش اولین سے بہت کچھ بہتر نقوش دنیا کے سامنے پیش کئے۔

کہتے ہیں کہ شاعر پابندیوں کی تاب نہیں لاسکتا۔ چنانچہ اقبال نہ پروفیسری کی کرسی پر عرصہ تک بیٹھ سکے نہ زیادہ دن عدالت میں مقدمات کی پیروی کے لئے کھڑے رہ سکے۔ جس قدر ان کی شاعری ترقی کرتی گئی دنیا کے دوسرے افکار سے وہ آزاد ہوتے گئے۔ ملک اور ملت کی خدمت بھی انھوں نے شاعری کے ذریعہ ہی سے کی۔ ان کی "کوہ ہمالیہ" والی نظم نے دلوں میں ہیجان پیدا کر دیا۔ نالۂ یتیم نے ہستوں کو رلا دیا۔ فریاد امت نے سوتوں کو جگا دیا اور شکوے نے تو خدا اور بندہ کو ملا دیا۔ وہ صرف ظاہری شاعر نہ تھے۔ ان کو دنیا کی تاریخ پر عبور تھا۔ قوموں کے بڑھنے اور گھٹنے کے افسانے ان کے کانوں میں گونج رہے تھے۔ ترقی اور تنزل کے اسباب سے وہ واقف تھے۔ انھوں نے مغرب کے فلسفے سے مشرق کے فلسفہ کا مقابلہ کیا۔ وہ ایک درد مند دل لے کر پیدا ہوئے تھے۔ دل کے جذبات کے اظہار پر وہ قادر تھے۔ وطن پرستی ان کا شیوہ تھا اور ان خیالات کے اظہار کا موقع ان کو ایسے وقت نصیب ہوا جب ہندوستان کے بسنے والے اس کو سننے کے لئے بیتاب تھے۔ ان کا کلام پست دلوں کی ہمت بڑھاتا تھا۔ ان کا فلسفۂ خودی غلامی کی زنجیریں کاٹ رہا ہی تھا کہ ان کی زندگی ختم ہو گئی۔ ان کے کلام میں انگریزی خیالات، فارسی بندشیں اور وطن پرستی کی چاشنی تھی۔

اسرار خودی والی مثنوی نے پروفیسر نکلسن کو بے خود کر دیا اور اس کا انگریزی ترجمہ کر کے پروفیسر موصوف نے ان کا تعارف یورپ و امریکہ سے کرایا۔ اب ان کی شاعری اور فلسفے کے اس قدر چرچے ہوئے کہ سرکار انگریزی نے انھیں "سر" کا خطاب دیا۔

آج وہ دنیا میں نہیں ہیں ان کا ماتم کیا جا رہا ہے۔ اور کہا جا رہا ہے کہ اب اقبال کا بدل ممکن نہیں۔ لیکن ہم بھی مسئلۂ تناسخ ماننے والوں سے آگے بڑھ کر خود اقبال کے ان اشعار پر بھروسہ کیوں نہ کریں۔

مرنے والے مرتے ہیں لیکن فنا ہوتے نہیں — یہ حقیقت میں کبھی ہم سے جدا ہوتے نہیں

بستیٔ عالم میں ملنے کو جدا ہوتے ہیں ہم — عارضی فرقت کو دائم جان کر روتے ہیں ہم

سید صفدر حسن "نجد"

اقبال بچوں کے لئے

یوں تو دنیا میں بہت بڑے بڑے شاعر گذرے اور اپنی بلند پروازی اور نازک خیالی کی بدولت ممتاز ہوئے ان کی شہرت عالمگیر ہوئی۔ لیکن بہت کم ایسے شعرا گذرے جنھوں نے بچوں کے لئے نایاب کارنامے چھوڑ گئے۔ اگر ہم سنوری دنیا کے بھی بڑے بڑے شعرا کو دیکھیں تو ہمیں معلوم ہوگا کہ ایسا شاعر ان میں بھی نہیں پیدا ہوا جس کو بچوں سے اُنس و محبت ہو۔ مگر ہم خوش نصیب ہیں کہ ہمیں ایسا شاعر دستیاب ہوا جس کو ہم سے اُنس اور محبت ہے۔

اقبال نے ابتدا ہی سے بچوں کے لئے نظمیں لکھنی شروع کیں۔ انھوں نے سمجھ لیا تھا کہ کسی قوم یا کسی وطن کے آئندہ پھولنے پھلنے والے پودوں کے دل و دماغ کو تعلیم سے آراستہ کرنا چاہیئے۔ اسی لئے انھوں نے اپنا فرض سمجھا کہ بچوں کو اچھی تعلیم دی جائے۔ اخلاق ایک ایسی زبردست چیز ہے جو بہادر سے بہادر سپہ سالار کو بھی زیر کر دکھاتی ہے۔ اسی وجہ سے اقبال نے لڑکوں کے لئے چھوٹے چھوٹے سبق آموز قصے لکھے۔

یہ عام بات ہے کہ قصوں اور افسانوں سے بچوں کا دل بہل جاتا ہے۔ اور جو چیز ہنسی مذاق میں بولی جاتی ہے وہ ان کے دل پر زیادہ دن تک نقش رہتی ہے۔ یہ فطرت کا تقاضا ہے کہ نظم بہ نسبت نثر کے زیادہ دل آویز اور دلکش ہوتی ہے اس لئے جو چیز سلیس نظم میں سمجھائی جائے اسے لڑکے بہت جلد سمجھ جاتے ہیں۔ اقبال نے بھی اس خیال کے مدنظر کئی نصیحت آمیز نظمیں لکھیں جس سے چھوٹے لڑکوں کے عادات و اطوار درست ہو سکیں۔

مثال کے طور پر چند نصیحت آمیز نظمیں درج کی جاتی ہیں جس میں شاعر کے تخیل اور نازک خیالی کی جھلک نظر آتی ہے مثلاً اقبال کی ایک نظم بعنوان "ہمدردی" جو بچوں کے لئے لکھی گئی ہے۔ نہایت تعجب خیز ہے۔ انھوں نے بیان کیا ہے کہ ہمدردی دنیا کو کس قدر فائدہ پہنچاتی ہے ؎

ہیں لوگ وہی جہاں میں اچھے ۔۔۔ آتے ہیں جو کام دوسروں کے

اس کے علاوہ اقبال نے ایک اور نظم میں پہاڑ اور گلہری کے درمیان مکالمہ سے ثابت کر دکھایا ہے کہ دنیا کی کوئی چیز بیکار اور بری نہیں ؎

نہیں ہے چیز نکمی کوئی زمانے میں ۔۔۔ کوئی برا نہیں قدرت کے کارخانے میں

ایک اور نظم ایک مکڑا اور مکھی میں مکڑی کی مکاری اور مکھی کا دام فریب میں آنا جس خوش اسلوبی کے ساتھ بیان کیا ہے اس سے بچوں کا دل باغ باغ ہو جاتا ہے "ایک گائے اور بکری" کی نظم میں انھوں نے بکری کی زبانی گائے کو یہ ثابت کر دکھایا ہے کہ انسان کس قدر رحم دل ہے اور جانوروں کے لئے کس قدر آسائش مہیا کرتا ہے۔ آخر مجبور ہو کر گائے کو کہنا پڑتا ہے کہ ؎

یوں تو چھوٹی ہے ذات بکری کی ۔۔۔ دل کو لگتی ہے بات بکری کی

اس کے علاوہ انھوں نے اپنی نظموں میں "عہد طفلی" کے زمانے کو نہایت خوش اسلوبی کے ساتھ بیان کیا ہے۔ یہ وہ زمانہ ہے

جب کہ بچے کو ماں کی گود سب سے زیادہ عزیز ہوتی ہے۔

پرندے کی فریاد میں اقبال اس بدنصیب طائر کی داستان اس کے زبانی بیان کرتے ہیں جو قفس کی سلاخوں سے اکتا گیا ہے۔ اقبال نے ایک پرندہ اور جگنو کا قصہ اس عمدگی سے بیان کیا ہے کہ واقعی ہمارا دل دوستی اور سچائی کی طرف مائل ہوتا ہے۔ ان کا مقصد اس سے یہ ہے کہ آپس میں ہمدردی، خلوص اور محبت بڑھے۔ اسی خیال کے مد نظر انھوں نے کہا ہے

ہم آہنگی سے ہے محفل جہاں کی
اسی سے ہے بہار اس بوستاں کی

ان کے نزدیک بچہ سراپا نور ہے جو کہ اس محفل میں عریاں نہیں بلکہ مستور ہے۔ آپ اس بچہ کو جو شمع کے حسن کو دیکھ کر محو ہو جاتا ہے یہ فلسفہ سمجھاتے ہیں کہ ساری دنیا، ساری چیزیں، ساری فطرتی اشیا جس کو خداوند تعالیٰ نے بنایا ہے وہ سب حسن سے معمور ہیں۔ پہاڑ، دریا، کوہ، چاند، سورج اور ستارے ان تمام میں حسن کا جلوہ نظر آتا ہے۔ ایک نظم میں چیونٹی اور عقاب کے متعلق فرماتے ہیں۔

چیونٹی۔ میں پائمال و خوار و پریشان و دردمند
تیرا مقام کیوں ہے ستاروں سے بھی بلند

عقاب جواب دیتا ہے۔

تو رزق اپنا ڈھونڈتی ہے خاک راہ میں
میں نہ سپہر کو نہیں لاتا نگاہ میں

اسی طرح شیر اور خچر کے درمیان یوں مکالمہ کرواتے ہیں۔

شیر۔ ساکنان دشت و صحرا میں ہے تو سب سے الگ
کون ہیں تیرے اب و جد؟ کس قبیلہ سے ہے تو

خچر۔ میرے ماموں کو نہیں پہچانتے شاید حضور
وہ صبا رفتار! شاہی اصطبل کی آبرو

سینما کے متعلق ان کا خیال ہے کہ ع یہ تہذیب حاضر کی سوداگری ہے۔

پرواز کی نظم میں درخت و صحرا کے درمیان جو مکالمہ بیان کیا ہے۔ وہ دلچسپی سے خالی نہیں اس لئے یہ نظم یہاں پیش کی جاتی ہے ؎

جہاں میں لذت پرواز حق نہیں اس کا
وجود جس کا نہیں جذب خاک سے آزاد

دیا جواب اسے خوب مرغ صحرا نے
غضب ہے داد کو سمجھا ہوا ہی تو بیداد

طالب علم کے متعلق لکھتے ہیں ؎

خدا تجھے کسی طوفاں سے آشنا کر دے
کہ تیرے بحر کی موجوں میں اضطراب نہیں

تجھے کتاب سے ممکن نہیں فراغ کہ تو
کتاب خواں ہے مگر صاحب کتاب نہیں

غرض اسی طرح اقبال نے کئی جگہ بچوں کو مخاطب کیا، ان سے کلام کیا، ان کو نصیحت کی اور ان کو سچائی کے راستہ پر لانے کی کوشش کی۔ ان کو اخلاق کا سبق سکھایا۔ ان کو اپنی حقیقت سے آشنا کیا اور علم و ادب کا ذوق دلایا۔

الحاصل جس طرح حضرت اقبال ایک بڑے فلسفی اور ایک بڑے شاعر ہیں۔ اسی طرح انھوں نے اپنا فرض سمجھا کہ اپنے ملک کے چھوٹے پودوں کو بھی سرسبز و شاداب کیا جائے۔

یاد دوراج
(دورجہ ہفتم ...)

ر محمد اقبال

دنیا میں آئے دن طرح طرح کے جاں کاہ واقعات اور حادثات پیش آتے ہیں۔ احباب اور عزیزوں کی موت سے بھی متعلقین کو
...رِ عظیم پہنچتا ہے لیکن سر محمد اقبال کی ناگہانی اور بے وقت موت نے نہ صرف ہندوستان بلکہ تمام اسلامی دنیا میں تلاطم برپا کر دیا۔
...و ناز م اردو کے لئے ایک ناقابل تلافی نقصان ہے۔

اقبال سنہ ۱۸۷۶ء میں شہر سیالکوٹ میں پیدا ہوئے۔ یہ ایک ہندو کشمیری قبیلے سے ہیں جو بعد کو مسلمان ہو گیا۔ اقبال بچپن سے
...ین تھے۔ چنانچہ اسکول اور اس کے بعد کالج میں ہمیشہ ایک ممتاز طالب علم رہے۔ اور اردو، فارسی، عربی میں کافی مہارت حاصل کی۔
...۱۹ء میں وہ انگلستان گئے اور تین سال کی مسلسل محنت سے اپنی دماغی قابلیت کو اور زیادہ آب و تاب کے ساتھ چمکانے لگے۔
...سی زمانے میں انھوں نے فارسی فلسفہ پر تنقید کی۔ اپنے دین کی چھان بین کی اور اسلام پر تقریریں کیں اور نظمیں لکھیں۔
...طرح اپنی نظم و نثر کی بدولت تقریباً سارے ہندوستان اور اسلامی سلطنتوں میں ہر دلعزیز ہو گئے۔

یورپ کا سفر اقبال کی روحانی نشو و نما کا نہایت نازک وقت تھا۔ ایک بار یہاں تک نوبت پہونچی کہ وہ اپنی "روحِ شاعر"
...برباد کر رہے تھے۔ لیکن خوبیٔ قسمت انھوں نے وہ ارادہ ترک کیا اور مصمم ارادہ کیا کہ اب شاعری تا دمِ مرگ نہ چھوڑوں گا۔
...ں ہی سے ایک نیا دور شروع ہوا اور اقبال ایک شہرۂ آفاق شاعر اور روشن خیال حکیم بن گئے۔

حقیقتاً اقبال ایک قومی شاعر تھے۔ وہ جو کچھ علمیت پیدا کرتے تھے وہ اپنی قوم تک پہنچا دیتے تھے۔
...راسی لئے ان شاعری زندگی کے فلسفہ اور دنیوی معلومات کا مجموعہ ہے۔ یہی ان کے نزدیک اسلام کی تفسیر تھی۔
شاعر کی حیثیت سے اقبال ان شاعروں میں ہیں جنھوں نے بگڑے ہوئے ملکوں کو بنایا اور پژمردہ اقوام کو خوابِ غفلت
...سے جگایا مسلمانوں کے لئے جو انھوں نے خدمت کی وہ نہ صرف ہم بلکہ آئندہ آنے والی نسلیں ہرگز ہرگز فراموش نہیں کر سکیں
...یہی وجہ ہے کہ اقبال کے انتقال پر چھوٹا بڑا، امیر غریب سبھوں نے ماتم کیا۔

غالباً سب سے زیادہ بچے ان کو کبھی نہیں بھول سکتے۔ انھوں نے سادہ اور بے لوث نظموں سے نئی روح پھونکی اور ہماری
...ی کے ساتھ ساتھ وہ جوش و ولولہ پیدا کیا جس کا اثر اس نئی پود کی بیداری ہے۔ ان کی بے لوث خدمت کا ہر بچہ تہہ دل سے
...گذار ہے۔ اور ان کی موت کا اتنا ہی صدمہ پہنچا جو ایک عزیز بھائی کی جدائی سے ممکن تھا۔

اقبال مر گئے، لیکن ان کا کلام زندہ ہے اور وہی ہماری ترقی کے لئے شمع ہدایت بنے گا۔ گو اس وقت ہم کو ایسی نایاب
...ہستی کی سخت ضرورت تھی۔ لیکن پھر بھی ان کا کلام انکی یاد تازہ کرے گا۔ اور ہر مسلمان کو اس کی مصیبت کے وقت یہ اشعار
...قوت دیں گے ؎

تو نہ مٹ جائے گا ایران کے مٹ جانے سے ۔۔۔ نشہ سے کوئی تعلق نہیں پیمانے سے
...عیاں یورشِ تاتار کے افسانے سے ۔۔۔ پاسباں مل گئے کعبے کو صنم خانے سے
کشتیٔ حق کا زمانے میں سہارا تو ہے ۔۔۔ عصرِ نو رات ہے دھندلا سا ستارا تو ہے

سید ریاض الحسن

اقبال بہ حیثیتِ معلّمِ اخلاق

خوں بہالے اپنی بدبختی پہ اے ہندوستاں
تیری قسمت میں بھلا اب ایسے شاعر پھر کہاں؟

غالبؔ کے بعد مدتوں سے رُوحِ شاعری خوابیدہ تھی اور ادب کی محفلیں سونی پڑی ہوئی تھیں کہ سرزمینِ
پنجاب سے آفتابِ شاعری طلوع ہوا جس کی نورانی شعاعوں نے مشرق اور مغرب کو یکساں منور کیا لیکن ۶۰ سال
کے بعد ۲۱ اپریل ۱۹۳۸ء کی منحوس صبح کو آفتابِ شاعری ہمیشہ کے لئے غروب ہوگیا۔ صبح کا وقت اور غروبِ آفتاب
اور جائے غروب! کیا یہ قیامت کی سچی نشانیاں نہیں ہیں؟ شاید یہی وجہ ہے کہ نہ صرف ہندوستان میں بلکہ مشرق اور
ایک محشر بپا ہے۔

آہ! وہ صاحب اقبال فلسفی شاعر جس نے اقبال نام پایا اب ہم میں کہاں؟ وہ اسم بامسمّیٰ تھا۔ جب تک زندہ
قدم چومے اور جب مرا تو سارے عالم نے کلیجے تھام لئے۔ اُف! اپنے اشعار کے اعجاز سے سوتوں کو جگا دینے والا
خرمنِ باطل کو جلانے والا چل بسا۔ فلسفہ کو جس پر ناز تھا تدبر کو جس پر فخر تھا ہمیشہ کے لئے وہ ہم سے جدا ہو گیا۔ وہ
کمال کو کوئی کہاں تک گنا سکتا ہے؟ اگر وہ شریعت سے بھی واقف تھا تو رندی سے بھی آگاہ تھا اگر تصوف میں
شعر و سخن میں ہم پلۂ خیام و خاقانی تھا لیکن افسوس صد افسوس کہ قمریٔ شمشادِ معانی، رشکِ کلیم ہمدانی، مشرق کا شاعر
و حالیؔ کا جانشین آج ہم سے بچھڑ گیا۔ ایسے زمانے میں جب کہ "گیسوئے اردو ابھی منت پذیرِ شانہ" تھی۔ ایسے دور میں جب
زبانِ اردو کی موت و حیات کا مسئلہ درپیش تھا اردو کے اس سرپرستِ اعلیٰ کی موت دنیائے ادب پر ایک ناقابلِ
ضرب ہے۔ ایسے وقت میں جب کہ مسلمانوں کے دن پھر رہے تھے اور اقبال ان کی یاوری کر رہا تھا ان کا اقبال
کھو دینا بدنصیبی نہیں تو اور کیا ہے؟ خود ہندوستان میں آج کل سیاسی اصلاحات کا دور دورہ ہے ایسے نازک دور میں
جیسا ہونہار سپوت جو امن کا علمبردار اور اتحاد کا حقیقی بانی تھا مادرِ ہند کی گود سے چھین لیا گیا۔ لیکن بقول مرحوم کے

مرنے والے مرتے ہیں لیکن فنا ہوتے نہیں
یہ حقیقت میں کبھی ہم سے جدا ہوتے نہیں

اس لئے ہم ہندوستانیوں کا یہ فریضہ ہے کہ مغفور کے پیام کو جو اُن کی لازوال تصانیف کے ذریعہ ہم تک پہنچا ہے حرزِ جاں
ورنہ اندیشہ ہے کہ خدانخواستہ ہمارا وہی حشر نہ ہو جس کے متعلق وطن پرست شاعر نے کئی سال پہلے ہمیں آگاہ کر دیا ہے

نہ سمجھو گے تو مٹ جاؤ گے اے ہندوستاں والو
تمہاری داستاں تک بھی نہ ہوگی داستانوں میں

حیف صد حیف کہ درماندہ قوم اور ہمارے کم نصیب ملک کے امراض کا علاج کرنے والا مسیحا ہمیشہ کے لئے ہم سے رخصت ہو گیا
ذیل میں ہم صرف انہی منتخب اشعار پر طائرانہ نظر ڈالیں گے جن میں مشرق کے شاعرِ اعظم نے مغرب کے بڑھتے ہوئے سیلاب
اور آزادی کے خطرے سے ملک و قوم کو متنبہ کیا ہے۔ سچ پوچھئے تو اکبرؔ کے بعد اقبال ہی ایک ایسا شاعر تھا جس نے یورپ کی

[مغر]بی تمدن کو اصلی رنگ روپ میں پیش کیا ہے۔ دورِ حاضر کے متعدد معاشرتی مسائل پر اچھوتے انداز میں ناصحانہ تنقید کی [چ]ونکہ اقبال کی حیات کا تذکرہ یا اس نغمہ طراز کی شاعری پر تبصرہ ہمارا مقصد نہیں ہے۔ لہٰذا ہم صرف چند نمونے پیش کریں گے [تاکہ ناظ]رین کو بخوبی اندازہ ہو سکے کہ دیگر کمالات کے قطع نظر اقبال کا درجہ بہ حیثیت ایک مسلّم اخلاق کے کس قدر بلند تھا۔

[نئی] تہذیب | نئی تہذیب کی حقیقی تصویر ترجمانِ حقیقت اقبال نے جس خوبی کے ساتھ کھینچی ہے ناظرین خود اندازہ فرمالیں ؎

اٹھا کر پھینک دو باہر گلی میں — نئی تہذیب کے انڈے ہیں گندے
الکشن، ممبری، کونسل، صدارت — بنائے خوب آزادی نے پھندے

میاں نجار بھی چھیلے گئے ساتھ
نہایت تیز ہیں یورپ کے رندے

[۱] نظر کو خیرہ کرتی ہے چمک تہذیبِ حاضر کی — یہ صنّاعی مگر جھوٹے نگوں کی ریزہ کاری ہے
[۲] دیارِ مغرب کے رہنے والو! خدا کی بستی دکاں نہیں ہے — کھرا جسے تم سمجھ رہے ہو وہ اب زرِ کم عیار ہوگا
تمہاری تہذیب اپنے خنجر سے آپ ہی خودکشی کرے گی — جو شاخِ نازک پہ آشیانہ بنے گا ناپائیدار ہوگا

[م]وجودہ تعلیم اور اس کے نتائج | سارا ہندوستان موجودہ تعلیم اور اس کے نتائج سے غیر مطمئن ہے سپرو کی رپورٹ، میکنزی [رپورٹ] اور واردھا کی تجاویز میں ایک چیز مشترک ہے یعنی سب اس مسئلہ پر متفق ہیں کہ موجودہ طریقۂ تعلیم ناقص اور قابلِ اصلاح ہے اور [نتیجہ] یہی ہے کہ ایک طرف تو بے کاری بڑھتی جا رہی ہے اور دوسری طرف مذہب و اخلاق سے بیزاری عام ہوتی جا رہی ہے۔
[لیکن] اقبال کی دور رس نگاہوں نے اس خطرے کو پہلے ہی محسوس کر لیا تھا۔ فرماتے ہیں ؎

[۱] خوش تو ہیں ہم بھی جوانوں کی ترقی سے مگر — لبِ خنداں سے نکل جاتی ہے فریاد بھی ساتھ
ہم سمجھتے تھے کہ لائے گی فراغت تعلیم — کیا خبر تھی کہ چلا آئے گا الحاد بھی ساتھ
گھر میں پرویز کے شیریں تو ہوئی جلوہ نما — لے کے آئی ہے مگر تیشۂ فرہاد بھی ساتھ
[۲] آیا ہے مگر اس سے عقیدوں میں تزلزل — دنیا تو ملی طائرِ دیں کر گیا پرواز
[۳] تعلیمِ مغربی ہے بہت جرأت آفریں — پہلا سبق ہے بیٹھ کے کالج میں مار ڈینگ
[۴] تہذیب کے مریض کو گولی سے فائدہ — دفعِ مرض کے واسطے پِل پیش کیجئے
تھے وہ بھی دن کہ خدمتِ استاد کے عوض — دل چاہتا تھا ہدیۂ دل پیش کیجئے

بدلا زمانہ ایسا کہ لڑکا پس از سبق
کہتا ہے ماسٹر سے کہ بِل پیش کیجئے

موجودہ تعلیمِ نسواں | موجودہ تعلیمِ نسواں کو جس خوبی سے بے نقاب کیا ہے ملاحظہ ہو ؎

لڑکیاں پڑھ رہی ہیں انگریزی — قوم نے ڈھونڈھ لی فلاح کی راہ
روشِ مغربی ہے مدِ نظر — وضعِ مشرق کو جانتے ہیں گناہ
[یہ ڈر]اما دکھائے گا کیا سین؟ — پردہ اٹھنے کی منتظر ہے نگاہ

د۔ پردہ | چراغ خانہ کو شمع محفل بنانے کی کوشش ہر طرف جاری ہے اگرچہ مغرب نے بہت دیر میں ... یہ معلوم کرلیا ہے کہ عورت کی کونسل سے زیادہ جنت ارضی میں ضرورت ہے۔ پھر بھی حیرت ہے کہ پرستاران ... اور جرمنی کے رد عمل کو نظر انداز کرکے خود بھی اسی غلطی کے مرتکب ہونا چاہتے ہیں حالانکہ ایک مشہور مقولہ ہے ... جہل است“ ؎

۱ یہ کوئی دن کی بات ہے اے مرد ہوش مند — غیرت نہ تجھ میں ہوگی نہ زن اوٹ چاہے گی
آتا ہے اب وہ دور کہ اولاد کے عوض — کونسل کی ممبری کے لئے ووٹ چاہے گی

۲ شیخ صاحب بھی تو پردے کے کوئی حامی نہیں — مفت میں کالج کے لڑکے ان سے بدظن ہو گئے
وعظ میں فرما دیا کل آپ نے یہ صاف صاف — پردہ آخر کس سے ہو جب مرد ہی زن ہو گئے

ھ۔ ابن الوقتی | اسلام دین فطرت ہے۔ اس کے اصول ہر زمانے اور ہر ملک کے لئے یکساں کارآمد ہیں اس کے باوجود بعض مذہبی پیشواؤں کا ”چلو تم ادھر کو ہوا ہو جدھر کی“ پر عمل پیرا ہونا بہت معیوب ہے۔ اسی کی طرف اشارہ کرتے ہوئے ...

کچھ غم نہیں جو حضرت واعظ ہیں تنگ دست — تہذیب نو کے سامنے سر اپنا خم کریں
رد جہاد میں تو بہت کچھ لکھا گیا — تردید حج میں کوئی رسالہ رقم کریں

تمدن حاضرہ | مجلس اقوام کی بے بسی، دول عالم کی نام نہاد امن کو قائم رکھنے کے لئے اسلحہ بندی اور سرمایہ داروں اور مزدوروں کی کشمکش کیا یہ سب اس حقیقت کی بین دلیلیں نہیں ہیں کہ ہمارے تمدن کی مثال اس قصر کی سی ہے جس کی بنیادیں ریت پر کھڑی کی گئی ہوں اور کیا اس سے کوئی انکار کرنے کی جرأت کرسکتا ہے کہ اس کی تعمیر میں بنیادی اینٹ سے لے کر بلند ترین کنگرہ کے آخری کلس تک انسانی خون جھلکتا نظر آتا ہے ؎

ابھی تک آدمی صید زبون شہریاری ہے — قیامت ہے کہ انساں نوع انساں کا شکاری ہے
وہ حکمت ناز تھا جس پر خردمندان مغرب کو — ہوس کے پنجۂ خونیں میں تیغ کارزاری ہے
تدبر کی فسوں کاری سے محکم ہو نہیں سکتا — جہاں میں جس تمدن کی بنا سرمایہ داری ہے

المختصر سطور بالا میں مشرق کے شاعر اعظم کے کلام بلاغت نظام کی صرف ایک خصوصیت پر روشنی ڈالنے کی ادنیٰ کوشش کی گئی ہے ورنہ اقبال کی فلسفیانہ شاعری پر تو مندرجہ ذیل شعر حرف بحرف صادق آتا ہے ؎

داماں نگہ تنگ و گل حسن تو بسیار
گل چین بہار تو ز داماں گلہ دارد

محبوب خاں یوسف زئی
گلبرگوی مددگار سررشتہ فوقانیہ عسکریہ ...

نشان ٹپہ آصفیہ (۱۵۳) نشان ٹپہ برطانیہ (M3950)

ادارہ ادبیات اردو حیدرآباد دکن کا ماہ نامہ

سب رس

زیر نگرانی

ڈاکٹر سید محی الدین قادری زور

جلد (۲) شمارہ (۷)	سب رس	جولائی ۱۹۳۹ء

فہرست مضامین

نمبر	مضمون	مضمون نگار	صفحہ	نمبر	مضمون	مضمون نگار	صفحہ
۱	اداریہ	ادارہ	۳	۸	حسیات (غزل)	بنی الحسن شمیم بی اے	۲۰
۲	علامہ سر ڈینی سن راس	ڈاکٹر سید محی الدین قادری زور	۵	۹	معلمہ (افسانہ)	مترجمہ یس بی انعنا	۲۱
۳	غزل	نواب فصاحت جنگ بہادر جلیل	۸	۱۰	بیوہ (نظم)	زاہد حیدری	۲۸
۴	محسوسات (نظم)	صمد رضوی ساز	۹	۱۱	شاد عظیم آبادی کا ایک خط	(سید ہمایوں مرزا مرحوم کے نام)	۲۹
۵	دیوتاؤں کا فیصلہ	ایم اے شاکر	۱۰	۱۲	بارگاہ مصطفوی میں (نظم)	بشیر النساء بیگم بشیر	۳۰
۶	حسن آوارہ (نظم)	عزیز احمد	۱۳	۱۳	مختصر افسانہ	دلاور خاں مہدوی	۳۱
۷	تاثرات سفر یورپ	پروفیسر ہارون خاں شروانی	۱۴	۱۴	جنگل میں ایک صبح (نظم)	کاوش	۳۲

۱۵ غزل — محبوب حسین جگر — ۳۲
۱۶ ویرانہ — ایم اسلم (لاہور) — ۳۳
۱۷ سوز و ساز (غزلیں) — علی منظور — ۳۴
۱۸ قسمت کا فیصلہ (افسانہ) — خلیل اللہ — ۳۵
۱۹ افغانی نوجوان (نظم) — ماہر القادری — ۳۷
۲۰ یہی میری زندگی کا سہارا ہے — صفیہ صدیق فریدہ — ۳۸
۲۱ دو شعر — سکندر علی وجد بی اے ایچ سی ایس — ۴۱
۲۲ غزلیں — مرزا جالب چغتائی مراد آبادی ۔ شاد عارفی — ۴۲
۲۳ محمد قلی قطب شاہ کی بارہ پیاریاں — ڈاکٹر سید محی الدین قادری زور — ۴۳
۲۴ تنقید و تبصرہ — ش ۔ س ۔ ن — ۵۱
۲۵ بچوں سے — معین الدین احمد انصاری — ۵۸
۲۶ دلچسپ معلومات — سمیع الدین خاں شفیق — ۵۸
۲۷ نارسس — محی الدین شررہ (متعلم) — ۵۹
۲۸ صنعت و تجارت — محمد عبد القادر فاروقی
۲۹ اکبر بادشاہ کی کہانی — منیر احمد
۳۰ ایک بڑھیا کے آخری چند لمحات — اقبال النساء
۳۱ ایک شیخی خورہ اور چربی کا ٹکڑا — مرزا عصمت اللہ بیگ
۳۲ انمول موتی — سید خواجہ معین الدین
۳۳ ہماری معاشرت — عزیز فاطمہ صابر الدین
۳۴ درسِ علم (نظم) — احمد معین الدین فہیم صدیقی
۳۵ میرا محبوب مشغلہ — عارف انصاری
۳۶ کسان اور اس کی لڑکی — سید خیرات حسین رضوی
۳۷ ایک کوشش — شیخ رحیم الدین (ظہیر آبادی)
۳۸ کلیم کی زندگی کا ایک ورق — اقبال فاطمہ
۳۹ اردو رسالے اور جریدے — (ادارہ کی میز سے)
۴۰ من کی جیتا سب کی نظر میں
۴۱ ایک بچی کی خواہش (نظم) — احمد النساء بیگم ادیب فاضل ،،

ادارہ کا رسالہ سب رس کم از کم ۶۴ صفحات اور زیادہ سے زیادہ ۹۶ صفحات پر ہر ماہ عیسوی کے پہلے ہفتہ میں شایع ہوا کرے گا۔

رسالہ پہنچنے کی اطلاع پندرہ تاریخ تک دفتر میں پہنچ جانی چاہئے۔ جواب طلب امور کے لئے جوابی پوسٹ کارڈ یا لفافہ آنا ضروری ہے۔

خط و کتابت کرتے وقت نمبر خریداری کا حوالہ ضرور دیا جائے۔ اشتہارات کی اجرت پیشگی لی جائے گی۔ وی پی یا وی پی کے ذریعہ سے وصولی منظور نہیں کی جائے گی۔

سب رس کی قیمت حیدرآباد کے لئے چار روپے سالانہ۔ دو روپے آٹھ آنے شش ماہی۔ چھ آنے فی پرچہ

،، ،، ،، حیدرآباد سے باہر چار روپے آٹھ آنے سالانہ۔ تین روپے شش ماہی۔ سات آنے فی پرچہ

اداریہ

ادارہ ادبیات اردو کے شعبے برابر سرگرم عمل ہیں۔ لیکن گزشتہ رسالہ کے اداریہ میں جگہ کی قلت کی وجہ سے ان کی روئدادوں کے اہم اقتباسات درج نہیں کئے جاسکے۔ اس سلسلہ میں سب سے پہلے شعبۂ نسواں کے دو اجلاسوں کا تذکرہ ضروری ہے جن میں معتمد شعبہ محترمہ سکینہ بیگم صاحبہ کے علاوہ محترمہ رابعہ بیگم صاحبہ، محترمہ سارہ بیگم صاحبہ، محترمہ جہاں بانو بیگم صاحبہ ایم اے اور محترمہ لطیف النساء بیگم صاحبہ ایم اے نے شرکت کی۔ (موخر الذکر دوسرے اجلاس میں شریک نہ تھیں) اس شعبہ نے ضرورت محسوس کی کہ چند اور خواتین کو مجلس انتظامی میں شریک کیا جائے۔ چنانچہ حسب ذیل کے نام تجویز پائے اور ان کو دعوت نامے روانہ کر دیئے گئے ہیں۔ محترمہ بشیر النساء بیگم صاحبہ بشیر (۲) محترمہ تہذیب النساء بیگم صاحبہ (بنت کرنل علی رضا صاحب) (۳) محترمہ عظمت النساء بیگم صاحبہ (۴) محترمہ غوث بیگم صاحبہ (محل انصاری صاحب) (۵) محترمہ امیر بیگم صاحبہ (محل محمد محسن صاحب مرحوم) اور (۶) محترمہ بتول بیگم صاحبہ (محل حبیب حسن صاحب) جو خواتین علمی و ادبی دلچسپی رکھتی ہیں اور شعبۂ نسواں کا ہاتھ بٹانا چاہتی ہیں وہ معتمد شعبہ محترمہ سکینہ بیگم صاحبہ کریم آباد جوبلی ہلز بلدہ کے پتہ پر مراسلت فرمائیں

ان اجلاسوں میں سب سے اہم مسئلہ نوکری پیشہ غریب اور نادار عورتوں کو پڑھنا لکھنا سکھانے سے متعلق زیر بحث آیا اور جملہ اراکین نے وعدہ کیا کہ اپنے اپنے محلوں میں اس کام کے انجام دینے میں سعی کریں گی۔ اس بارے میں خود غیر تعلیم یافتہ عورتوں اور ان کے مردوں کے خیالات دریافت کرنے اور ان سے تبادلۂ خیالات کی ضرورت محسوس کی گئی۔ خوشی کی بات ہے کہ اراکین شعبہ نے دوسرے اجلاس تک اس مسئلہ کے بعض مرحلے طے کر لیے اور فیصلہ کیا کہ ہر محلہ میں علحدہ علحدہ مرکز قایم ہوں جن میں تعلیم کا صحیح انتظام ہوگا۔ سردست اڈیکمیٹ میں محترمہ سارہ بیگم صاحبہ اور محترمہ رابعہ بیگم صاحبہ کی نگرانی میں ایک مدرسۂ شبینہ کے قیام کی تجویز عمل میں آئی۔ محترمہ جہاں بانو بیگم صاحبہ بھی اس کے نشو و نما میں حصہ لیں گی۔

ایک اور اہم تجویز یہ بھی منظور ہوئی کہ بیگم صاحبہ نواب غوث یار جنگ بہادر نے گلبرگہ میں جو تربیت گاہ قائم کی ہے۔ اس کا اراکین شعبہ معائنہ کریں اور ایسی تربیت گاہوں یا مدارس کے قیام میں اس کے طریقۂ کار سے مدد مل سکتی ہو تو اس سے استفادہ کریں۔

شعبۂ **زبان** کا جلسہ بھی قابل ذکر ہے جس میں ڈاکٹر رضی الدین صدیقی، ڈاکٹر سید محی الدین قادری زور، ڈاکٹر یوسف حسین خاں، قاضی عبدالغفار صاحب مدیر پیام اور عبدالقادر صاحب سروری نے شرکت کی۔ حسب ذیل امور جو پیش اور طے ہوئے قابل ذکر ہیں۔

۱۔ شعبہ کے اعلان کے سلسلہ میں مولوی جمال الدین حیدر صاحب کے یہاں سے دکنی الفاظ اور محاوروں کی جو فہرست وصول ہوئی ہے اس کے متعلق صاحب موصوف کا شکریہ ادا کیا جائے اور اس کو اشاعت سے قبل مولوی سروری صاحب اور قاضی عبدالغفار صاحب کے سپرد کیا جائے تاکہ ایک نظر ڈال لیں۔

۲۔ مولوی ضیاء الدین صاحب انصاری (داعی شعبہ) کے ضلع پر تبادلہ کی وجہ سے ان کا کام عارضی طور پر پروفیسر عبدالقادر صاحب سروری کے سپرد کیا جائے۔ (جو صاحب شعبۂ زبان کے متعلق مراسلت کرنا چاہیں تا اطلاع ثانی موخر الذکر سے مراسلت کریں)۔

۳۔ دفتری زبان کی موٹی موٹی یا غلط اصطلاحات کے جمع کرنے کا کام جو ڈاکٹر جعفر حسن صاحب اور ڈاکٹر رضی الدین صاحب کے ذمہ تھا ابھی تکمیل طلب ہے۔ جس کو تکمیل کے بعد آئندہ جلسہ تک پیش کیا جا سکے گا۔

۴۔ اردو زبان کی ترقی و اصلاح سے متعلق عام بحثیں ہوئیں۔ عربی اور فارسی کے بعض ایسے الفاظ کی جمع کی صورتیں
زبان سے نامانوس تھیں۔ ان کے بارے میں یہ طے پایا کہ اس عام قاعدے کی ہر جگہ پابندی ہونی چاہیے کہ جمع ہمیشہ اردو کے اصول کے
مطابق بنائی جائے۔

مصنفین اردو ۔ مالی پبلشنگ ہاؤس کتاب گھر دہلی نے ایک تفصیلی فہرست شائع کی ہے جس میں اردو مصنفین و مؤلفین
مترجمین کے حالات اور کتابوں کی تفصیلی فہرست کے ساتھ ایک سو سے زیادہ مشاہیر اردو کی تصویریں بھی شامل ہیں۔ جن میں
قابل دید ہیں۔ خاصکر قدیم شعرا مثلاً میر، درد، سودا، مصحفی، انشا، آتش، اور ذوق وغیرہ کی تصویریں۔

یہ فہرست جو ۲۳۲ صفحات پر مشتمل ہے ایک مختصر سی تاریخ ادب اردو کا کام بھی دے سکتی ہے۔ حیدرآباد کے شعرا و مصنفین
اگرچہ اعلیٰ حضرت آصفجاہ سابع، مہاراجہ یمین السلطنۃ شاد، نواب فصاحت جنگ جلیل، نواب حیدر یار جنگ نظم طباطبائی،
سید محی الدین قادری زور، پروفیسر عبدالقادر سروری وغیرہ کے حالات اور تصویریں شائع کی گئی ہیں۔ لیکن تعجب ہے کہ
صفی، امجد، سید محمد اور نصیر الدین ہاشمی کی تصویریں وغیرہ شریک نہیں ہیں۔ حالانکہ یہ حیدرآباد کے وہ اصحاب ہیں جن کی
کی شہرت تمام ہندستان میں پہنچ چکی ہے اور جن کی تصویریں بھی شائع ہوکر منظر عام پر آچکی ہیں۔ توقع ہے کہ دوسرے ایڈیشن میں
کی تلافی ہو جائے گی۔

اردو ادب کے قدردان اس فہرست کے مطالعہ سے خوش ہوں گے۔ بلاتصویر فہرست صرف ایک کارڈ لکھ کر مفت طلب کرسکتے ہیں
اور باتصویر کے لئے ۲ کے اسٹامپس روانہ کرنے پڑتے ہیں۔

دی نیو ایرا چند ماہ سے ایک ہفتہ وار انگریزی جریدہ ”دی نیو ایرا“ حیدرآباد سے شائع ہو رہا ہے۔ اس کے مدیر مولوی سید
...اے ہیں جنھوں نے پہلے بھی صحافتی دنیا میں کامیابی حاصل کی ہے۔ توقع ہے کہ یہ نیا ہفتہ وار بھی کامیاب رہے گا۔ اور
...دیر کی خنتیں ٹھکانے لگیں گی۔ یہ جریدہ اگرچہ زیادہ تر سیاسی امور اور حالات حاضرہ کے مسائل پر نظر رکھتا ہے لیکن ضرورت ہے کہ مہینے
...اس کا ایک شمارہ علمی و ادبی مسائل کے لئے بھی وقف کر دیا جائے۔ یا ہر شمارہ کا ایک آدھ صفحہ اردو زبان و ادب کے مسائل پر مشتمل رہے۔
...اردو زبان کے متعلق دوسری زبانوں اور خاصکر انگریزی میں عام معلومات کی اشاعت نہایت ضروری ہے۔ اگر مولوی سید
...توجہ کریں تو انھیں اردو سے متعلق حیدرآباد ہی میں ایسا کافی مواد مل سکتا ہے کہ وہ ہر شمارہ کا ایک صفحہ یا مہینہ کا ایک شمارہ اس کے لئے
...کرسکتے ہیں۔ کم از کم حیدرآباد کی اردو خدمات کے متعلق تو اس میں ضرور معلومات شریک رہنی چاہئیں۔ یہ پرچہ سرعت سے ترقی کر رہا ہے۔
...اور اپنے اداریوں کے پختہ اور سنجیدہ نقطۂ نظر کی وجہ سے مقبول ہو رہا ہے اس لئے توقع ہے کہ اہل ذوق اس کی قدر کریں گے

”ادارہ“

ادارہ کی مطبوعات اور سب رس کتاب گھر کی فہرست جملہ علم دوست اصحاب کی خدمت میں
مفت روانہ کی گئی ہے۔ کسی صاحب کو نہ پہنچی ہو تو اطلاع دینے پر روانہ کر دی جائے گی۔

مہتمم
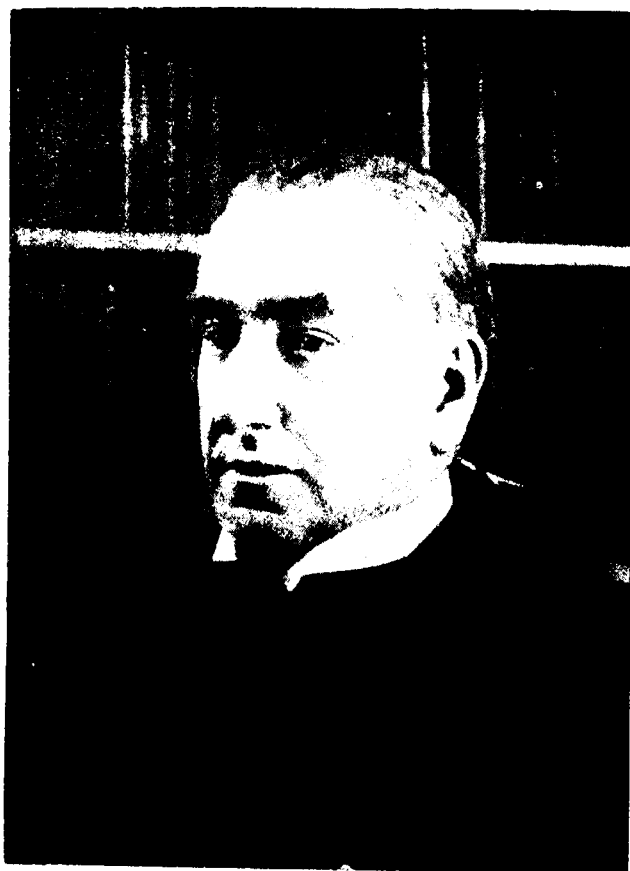
سر ڈ۔ نی سن راس

علامہ سر ڈینی سن راس

مشہور انگریز مستشرق ڈینی سن راس کی شخصیت محتاج تعارف نہیں ہے۔ وہ سالہا سال سے لندن یونیورسٹی کی مشہور درسگاہ
معارف مشرقیہ" (اسکول آف اورینٹل اسٹڈیز) کے ڈائرکٹر یا ناظم رہے ہیں اور ابھی ابھی اپنے عہدہ سے وظیفہ حسن خدمت پر
سبکدوش ہوئے ہیں۔ وہ ۶ جون ۱۸۷۱ء کو پیدا ہوئے چنانچہ اس مہینے میں ان کی عمر پورے اڑسٹھ سال کی ہوئی ہے۔ ان کی زندگی کے
حالات اور کارناموں کی تفصیل نہایت شاندار ہے۔ ان کی عظیم الشان شخصیت اور غیر معمولی مقبولیت کا اندازہ اس واقعہ سے ہو سکے گا
کہ گذشتہ سال ان کی وظیفہ پر علیحدگی کی تقریب میں ہندستان کے سربرآوردہ مستشرقین اور خصوصاً جامعہ لندن کی درسگاہ معارف مشرقیہ
کے فارغ التحصیل کو خیال ہوا کہ سر ڈینی سن راس کی طویل ہندستانی و اسلامی خدمات کے اعتراف میں ایک مجموعہ معارف ہندستانی و ایرانی
(والیوم آف انڈین اینڈ ایرانین اسٹڈیز) مرتب کرکے ان کی خدمت میں پیش کیا جائے۔ چنانچہ اس کام کے لئے ایک کمیٹی ترتیب دی
گئی جس کے اراکین حسب ذیل مقرر ہوئے۔

ڈاکٹر ہدایت حسین — ڈاکٹر سنیتی کمار چٹرجی — ڈاکٹر سدھیشور ورما — ڈاکٹر سوشیل کمار ڈے
ڈاکٹر سید محی الدین قادری زور — ڈاکٹر ایم آئی بورہ — مسٹر سید احسن نیر — ڈاکٹر بھاسکر آنند سالیتور
ڈاکٹر ایس ایم کترے — مسٹر پی کے گوڈے

اس کمیٹی نے ۱۹۳۸ء میں تمام علما و قدر دانانِ علوم مشرقیہ کی خدمت میں اپنے دستخطوں کے ساتھ دعوت نامے روانہ کئے تاکہ اس
مقالات مجموعہ کی تیاری و ترتیب میں مدد دیں۔ ڈاکٹر ایس ایم کترے اور مسٹر پی کے گوڈے نے اس کی ترتیب کا کام شروع
کیا اور کرناٹک پبلشنگ ہوز بمبئی نے اس کی اشاعت کا ذمہ لیا۔ چنانچہ تقریباً ایک سال کے اہتمام کے بعد یہ قابل قدر مجموعہ مکمل ہو چکا
ہے اور اسی مہینے سر ڈینی سن کی اڑسٹھویں سالگرہ کے موقعہ پر یعنی ۶ جون ۱۹۳۹ء کو اس کا پیش نامہ شائع کر دیا گیا ہے۔ اس میں
مجموعہ کے مرتبین نے اپنے پیش لفظ میں مذکورہ بالا ارکان مجلس انتظامی اور ناشر کا شکریہ ادا کیا ہے جن کے تعاون سے اس قدر مفید
اور نفیس و عالیشان مجموعہ تیار ہو سکا۔

اس پیش لفظ کے بعد سر ڈینی سن راس کے نام وہ انتسابی مکتوب شائع کیا گیا ہے جو ارکانِ مجلس کی طرف سے ان کی خدمت
میں علما کا بیش بہا مجموعہ کو پیش کرتا ہے۔ اس خط کے مطالعہ سے سر ڈینی سن راس کی عظمت واضح ہو جاتی ہے اس لئے اس کا ترجمہ یہاں
درج کیا جاتا ہے۔

سر ڈینی سن

ہمیں اس امر پر فخر و امتیاز ہے کہ علوم مشرقیہ اور خاصکر تاریخ . . . کے موضوعوں پر آپ کی گہری معلومات اور ٹھوس خدمات کے
اعتراف میں معارف ہندستانی و ایرانی پر ایک جلد بطور تحفہ پیش کرنے کی اجازت حاصل کریں۔ کلکتہ مدرسہ کے محبوب
پرنسپل کی حیثیت سے آپ کے قابل ذکر قیام ہندستان نے آپ کے شاگرد، کار اور طلبہ کے دلوں میں ناقابل فراموش نقش مرتسم

کر دیے ہیں۔ دل و دماغ کی ان خوبیوں نے جو ہندستانی علما کے ساتھ آپ کے ابتدائی تعلق کی خاص خصوصیت تھی آپ کی ہندستانی و ایرانی دلچسپیوں کے غیر منقطع سلسلہ کو مضبوط کر دیا جس کی وجہ سے علوم مشرقیہ مالا مال ہو گئے اور آپ کے پیدا کیے ہوئے میدانوں کی طرف نئے نئے محققین کی توجہ منعطف ہو گئی۔

جامعہ لندن کے اسکول آف اورنیٹل اسٹڈیز کے پہلے اور مقبول ناظم کی حیثیت سے آپ نے اپنی اس خوش طبعی، پرخلوص ہمدردیوں کے ذریعہ سے جو علوم مشرقیہ کی تاریخ میں بے نظیر رہیں گی، ہندستانی طلبہ کو گرانبار منت کر دیا ہے۔ علوم مشرقیہ کے متعلق آپ کے چالیس سال سے زیادہ کے غیر معمولی کارناموں کے ایک حقیر خراج تحسین کے طور پر اس مجموعۂ معارف کو پیش کرتے وقت ہم آپ کے لیے درازیٔ عمر اور خوشحالی کی دعا کرتے ہیں تاکہ آپ تاریخی تحقیقات کے اس مقدس کام کی اور زیادہ خدمت کر سکیں۔ اس کام کو آپ نے اپنے لیے مخصوص کر لیا ہے اور یہ آپ کی عرصہ کی فیض رسانی کی وجہ سے ظاہر کرتا ہے کہ آئندہ اور بھی بار آور ہوگا۔

ام ہدایت حسین	اس ام کترے	سوشل کمار ڈے
سنیتی کمار چٹرجی	پی کے گوڈے	سید احسن شبر
سید محی الدین قادری زور	سد ھیشور ورما	ام آئی بورہ

۲ر جون ۱۹۳۹ء — امران کلکرنی — بھاسکر انند سالیٹور

اس عالی شان مجموعۂ معارف مشرقیہ میں تمام دنیا کے مشہور و معروف مستشرقین کے تقریباً پچاس بلند پایہ مقالے شامل ہیں۔ ان میں سے حسب ذیل ہمارے لیے خاص دلچسپی کا باعث ہیں:۔

۱۔ عہد حکومت علی عادل شاہ بیجاپور از کے کے باسو

۲۔ قدیم ہند کے وزراء از بی بھٹاچاریا

۳۔ امیر حسن دہلوی کی ایک غیر مطبوعہ رومانوی مثنوی از ام آئی بورہ

۴۔ ٹامل کے چند صوتیاتی رجحانات از اے سی چیٹر

۵۔ بنگالہ کے پالہ سلاطین کے زمانہ میں سنسکرت ادب از اس کے ڈے

۶۔ سلاطین میسور اور شرنگری مٹ از وی آر رامچندر ڈکشتر

۷۔ ۱۴۰۰ء سے ہندستان میں توپوں اور بارود کا استعمال از پی کے گوڈ

۸۔ موہنجو ڈارو رسم الخط کے ہندسے از اچ ہراس

۹۔ شاہ طاہر دکنی از محمد ہدایت حسین

۱۰۔ بیجاپور کی عادل شاہی حکومت کے تعلقات پرتگالیوں کے ساتھ از پی ام جوشی

۱۱۔ پراکرت زبانوں کے نام از اس ام کترے

۱۲۔ قدیم پشتو قلمی کتابیں از جی مارگن سٹرن

۱۳۔ جنوبی ہند کے مذہبی فرقے (عربی جغرافیہ دانوں کے بیان کے مطابق۔ از محمد حسین نینر۔

۱۴۔ ایک غیر معروف پراکرت محاورہ از وی پسانی۔

۱۵۔ ہتھرو پرانوں کا زمانہ اور اہمیت از پنڈت بشیشوز ناتھ ریو۔

۱۶۔ جلال الدین فیروز خلجی کی زندگی از این بی رائے۔

۱۷۔ حیدر علی اور ٹیپو سلطان کی سوانح عمریوں پر ایک نوٹ از کے این وی شاستری۔

۱۸۔ پٹنہ میوزیم کے چند پہلو از سید احسن شیر۔

۱۹۔ بنگال اور راجپوت۔ از منہ متوسط میں انوخیس چندر سرکار۔

۲۰۔ ہنچورا ور مدہ۔ اکی حکومتوں میں اسلامی ہماں از سی آر سرنیواس چاری۔

مرڈینی سن راس نے علوم مشرقیہ کی جو خدمت کی ہے اس کا ایک اندازہ ان کے کارناموں کی حسب ذیل فہرست سے ہو سکے گا۔ اس فہرست میں ان متعدد مقدموں کا ذکر نہیں ہے جو انھوں نے مختلف کتابوں اور علماء کے سوانح حیات پر لکھے تھے اور نہ وہ مضامین اور مقالے شامل ہیں جو انھوں نے مختلف رسائل میں شایع کیے۔

۱۔ شاہ اسمٰعیل (بانی خاندان صفویہ) کے ابتدائی ایام (مطبوعہ ۱۸۹۶ء)

۲۔ ترجمہ و ترتیب تاریخ رشیدی مرزا محمد حیدر دغلات (مغول وسط ایشیا کی تاریخ) ۱۸۹۵ء۔

۳۔ قلب ایشیا (دی ہارٹ اف ایشیا) ۱۸۹۹ء

۴۔ مقدمہ تاریخ خلیفہ واثق (از ولیم بک فورڈ) ۱۹۰۰ء

۵۔ سوانح و مقدمہ رباعیات عمر خیام ۱۹۰۰ء

۶۔ کتب خانۂ انڈیا آفس کے عربی و فارسی مخطوطات کی تفصیلی فہرست۔ ۱۹۰۲ء

۷۔ ترتیب عربی تاریخ گجرات مولفہ عبداللہ محمد بن عمر علی الملکی الغ خانی ۳ جلدیں ۱۹۱۰ء، ۱۹۲۱ء، ۱۹۲۸ء۔

۸۔ ترتیب تاریخ گجرات مولفہ میر ابو طالب ولی ۱۹۰۹ء

۹۔ ترتیب فہرست طیور (ترکی، پنجوا ور چینی) ۱۹۰۹ء

۱۰۔ ترتیب سنسکرت تبتی انگریزی ڈکشنری ۱۹۱۰ء

۱۱۔ چینی بدھی تری پٹاکا کے کارناموں کے عنوانات کی ابجدی فہرست ۱۹۱۰ء۔

۱۲۔ ترتیب دیوان بابر بادشاہ ۱۹۱۰ء

۱۳۔ ترتیب دیوان فارسی و ترکی بیرم خاں خانخاناں ۱۹۱۰ء

۱۴۔ ترتیب مبانی اللغت (ترکی قواعد از مرزا مہدی خاں) ۱۹۱۰ء

۱۵۔ ترتیب و ترجمہ قصہ تمدکن ون (تبتی) ۱۹۱۲ء

۱۶۔ رودکی اور نام نہاد رودکی ۱۹۲۴ء۔

۱۷۔ قصیدہ رودکی ۱۹۲۵ء۔

۱۸۔ شمالی ایران کی تین اسلامی سلطنتیں دسویں اور گیارہویں صدی میں ۱۹۲۵ء

۱۹۔ تنبیح منتر کی پانچویں جلد کا پیش لفظ ۱۹۲۶ء۔

۲۰۔ پیرسٹر جان اور سلطنت حبشہ ۱۹۲۶ء

۲۱۔ ترتیب تاریخ فخرالدین مبارک شاہ ۱۹۲۷ء

۲۲۔ اسلام ۱۹۲۷ء

۲۳۔ مشرقی آرٹ اور ادب ۱۹۲۸ء

۲۴۔ گجرات اور خاندیش ۱۹۲۸ء

۲۵۔ بابر ۱۹۲۷ء

۲۶۔ ہندستان اور اہل پرتگال (۱۴۹۸ تا ۱۵۹۸) ۱۹۲۹ء

۲۷۔ ترجمہ اسلام اس کے عقائد اور ادارے (مولفہ ایچ لیمنس)

۲۸۔ ترجمہ ہندستان اور ذات پات (مولفہ ایمل سینارٹ)

۲۹۔ ایرانی لوگ ۱۹۳۱ء

۳۰۔ ترتیب و شرح سیاحت مارکوپولو

۳۱۔ ترتیب سرا عظمی شرلے اور اس کا ہم ایران ۱۹۳۳ء
۳۲۔ فارسی نثر۔ فارسی نظم ۱۹۳۳ء
۳۳۔ مارکو پولو اور اس کی کتاب ۱۹۳۴ء
۳۴۔ مشرقی ترکی زبان کے مکالمے (سیاحوں کی ...
۳۵۔ ترتیب و اشاعت جرید ... رابرٹ ...
۳۶۔ ترتیب ترکوں کے مباحث ...

سر ڈینی سن راس نے جامعہ اسٹراس بورگ سے پی ایچ ڈی کی ڈگری حاصل کی۔ جامعہ لندن و جامعہ کلکتہ کے ... رائل ایشیاٹک سوسائٹی بنگال کے اعزازی رفیق منتخب ہوئے۔ ۱۹۱۲ء میں سی آئی ای کا خطاب ملا۔ اس کے بعد ... برٹش اکاڈمی، رائل بٹاوین سوسائٹی اور پراگ یونیورسٹی کے کرسپانڈنگ رکن بنائے گئے۔

۱۹۱۸ء میں سر کا خطاب حاصل کیا۔ آرڈر آف دی نائل سکنڈ کلاس ملا۔ اس کے بعد جامعہ لندن نے ڈی لٹ کی ڈگری ... اور ۱۹۳۵ء رائل ایشیاٹک سوسائٹی کا طلائی تمغہ حاصل کیا۔ عہد حاضر کے کسی مستشرق کو سر ڈینی سن راس جیسی عظمت ... نہیں ہے۔

غزل

سید محی الدین ...

جن کے جلوے یہ ہر طور نظر آتے ہیں
دل کے پردے میں وہ مستور نظر آتے ہیں

نہ اشارہ نہ کنایہ نہ تبسم نہ کلام
پاس بیٹھے ہیں مگر دور نظر آتے ہیں

بنتے ساغر ہیں چمن میں گل تر کے ساقی
بادہ حسن سے معمور نظر آتے ہیں

کس کا میں دیکھنے والا ہوں یہ پوچھو یہ کلیم
اک نظر میں مجھے سو طور نظر آتے ہیں

میکدہ ہے کوئی یا جلوہ گہہ جاناں ہے
بے پیے سیکڑوں مخمور نظر آتے ہیں

تھک گیا قافلۂ زیست بھی چلتے چلتے
ابھی منزل کے نشاں دور نظر آتے ہیں

ہر نظر اس کی چھلکتا ہوا ساغر ہے جلیل
آج ہم پینے پہ مجبور نظر آتے ہیں

فصاحت جنگ جلیل

…ومات

مرے حبیب!! تو شرمندۂ وفا کیوں ہے   کسی غریب کی ہستی سے کھیلتا کیوں ہے
یہ کیوں کہوں کہ تری چاہ نے تباہ کیا   میں جانتا ہوں مرے دل نے جو گناہ کیا

ہے اپنے جرمِ محبت کا اعتراف مجھے!!
جنوں نواز!! نہ کرنا کبھی معاف مجھے!!

وہ دل جسے ترے لطف و کرم نے لوٹ لیا   وہ سازؔ جس کو تری چشم نم نے لوٹ لیا
نیازِ عشق کو ناز و ادا میں جذب کیا   نظامِ ہستیِ دل کو وفا میں جذب کیا

اور اُس پہ تو ہی پشیماں ہے کیا قیامت ہے!
وفا یہ کیسی ہے، کیسا یہ جوشِ الفت ہے!

ہر ایک سانس اگر اشک بن کے بہہ جائے   مرے لبوں پہ ہنسی آہ بن کے رہ جائے

تو جب بھی حقِ محبت ادا نہیں ہو گا
تری وفاؤں کا ہمدم صلہ نہیں ہو گا

غلط غلط، کہ نہیں مجھ پہ اعتبار تجھے   بجا بجا، کہ کہا میں نے سوگوار تجھے
قبول کر کے مرے ہدیۂ محبت کو   بلند کر دیا میری نظر میں فطرت کو
اور اب یہ وہم نہ یاد آئے گی وفا تیری   مجھے یقیں کہ وہی وجہ زندگی میری!

جو اب بھی تجھ کو مرے دل سے بدگمانی ہے
یہ اعتمادِ محبت کی اک نشانی ہے!!

نہ ڈھونڈھ چاروں طرف اے نگاہِ یار مجھے   کہیں نہ پائے گی یہ چشم اشکبار مجھے
خود اپنے قلب کی گہرائی میں پکار مجھے   وہیں ملوں گا ملا ہے وہی دیار مجھے

زمانہ اس کو نہ سمجھے گا۔ تجھ سے کہتا ہوں!!
میں تیرے پاس۔ ترے ساتھ دل میں رہتا ہوں!!

وفورِ غم سے جگر پاش پاش ہونے دے   خدا کے واسطے جی بھر کے آج رونے دے
تڑپ رہا ہوں ایک گھڑی کو ملے قرار مجھے   نہیں ہے اتنا بھی اب دل پہ اختیار مجھے

وہ دن قریب ہیں خود کو بھی جب بھلا دوں گا!!
تعینات کی سنگیں حدیں مٹا دوں گا!!

صمد رضوی سازؔ

دیوتاؤں کا فیصلہ

اگلے زمانہ میں لوگ انسان کو انصاف کرنے سے معذور سمجھ کر وقتاً فوقتاً طرح طرح کے دوسرے طریقے
یہ ممکن ہے کہ آپ ان کے انصاف کو مشتبہ نظروں سے دیکھیں اور رخنوں سے بھرا ہوا خیال کریں۔ لیکن
ان سے بری ہیں؟ اور اس زمانہ کا انصاف تو مفت ہوتا تھا مفت۔ لاکھوں کروڑوں روپے انصاف
نام کرنے کے لئے رعایا سے نہیں لوٹے جاتے تھے۔ اور یہ بھی ماننا پڑتا ہے کہ پچھلے دنوں جرائم آج کل
کم تھے اور کیا اچھے انصاف کی سچی جانچ جرائم کی کمی نہیں ہے؟

خیر یہ باتیں تو ایک طرف۔ اب ہم آپ کو پچھلے زمانے کی ایک عجیب و غریب عدالت میں دائر کیا ہوا ایک
حال سناتے ہیں۔

دوسری صدی عیسوی میں وسط ایشیا کے ایک بادشاہ نے دنیوی عدالتوں اور قوانین کو کھوکھلا پا کر
ڈھنگ ایجاد کیا تھا۔ یہ عدالت انسانی اثرات سے بالکل بری تھی یعنی یہاں انصاف دیوتاؤں کا ہوتا تھا۔

شہر کے ایک وسیع میدان میں یہ دیوتا اپنا فیصلہ سنایا کرتے تھے۔ اس عدالت کے وسط میں ایک
سے گھرا ہوا تھا۔ اس حصے کے ایک طرف دو تہہ خانے تھے۔ جہاں آمد و رفت بھی پوشیدہ سرنگوں کے ذریعے
تہہ خانوں کا ایک ایک دروازہ سطح زمین پر سلاخوں سے گھرے ہوئے حصے میں کھلتا تھا۔ ان دروازوں کے
عدالت کے دوسرے کنارے سلاخوں سے باہر دو طلائی تخت تھے جس پر شاہ اور اس کی بیٹی جلوہ افروز ہوتے تھے۔

یہ تو ہوا عدالت کا نقشہ۔ اب اس میں انصاف کس طرح ہوتا تھا؟ جب کوئی شخص کسی جرم کے الزام میں گرفتار
آتا تھا تو تمام شہر میں اعلان کر دیا جاتا تھا کہ فلاں دن دیوتاؤں کی عدالت میں اس شخص کا انصاف ہوگا
سب لوگ عدالت میں جمع ہو جاتے تھے۔ شاہ اور شہزادی اپنے تخت پر رونق افروز ہونے کے بعد ملزم کو عدالت
پیش کیا جاتا تھا۔ ملزم پہلے شاہی تخت کے سامنے جاکر شاہی آداب بجا لاتا اور پھر واپس ہو جاتا اور سلاخوں کے اندر
تہہ خانوں کے ان دو دروازوں میں سے کسی ایک کو اپنے ہی ہاتھوں کھول دیتا۔ اب ان دو تہہ خانوں میں کیا رہتا تھا؟

ایک میں تو ملک الموت یعنی ایک خونخوار شیر ہوتا تھا جو خاص طور سے اس انصاف کے لئے کئی روز سے بھوکا
اگر ملزم اس دروازے کو کھولتا تو شیر فوراً اس کا خاتمہ کر دیتا تھا۔ دیکھنے والے رنج و غم کرتے تھے۔ سوگ کی گھنٹیاں بجائی
تھیں اور سینکڑوں غلام جو سوگ کے لئے خاص طور سے مہیا کئے جاتے تھے، زور زور سے رونا پلانا شروع کر دیتے
لوگوں کو یقین ہو جاتا تھا کہ ملزم نے یقیناً جرم کیا تھا۔

اگر ملزم دوسرا دروازہ کھولتا تو اس میں سے ایک حور وش پری جمال نازنین برآمد ہوتی تھی جو اس شخص کے
آکر اپنے گلے کا ہار اس کو پہنا دیتی تھی۔ فوراً مذہبی گرو طلب کئے جاتے تھے جو وہیں پر تیار رہتے تھے۔ اور اسی وقت
اس حسینہ کی اس شخص کے ساتھ شادی ہو جاتی تھی۔ سب لوگ خوشیاں مناتے تھے اور دولہا دلہن کی خو

لئے دیوتاؤں سے دعائیں مانگتے تھے۔ اور ان پر پھولوں کی بارش کرتے تھے۔

اب اگر اس شخص کو لوگوں نے اپنی ہی آنکھوں سے جرم کرتے دیکھا ہو تو کیا تھا۔ مانا کہ اس نے واقعی جرم کیا تھا لیکن دیوتا اس سے راضی ہیں اور جب دیوتاؤں کو اس کا جرم پسند ہے تو ظاہر ہے کہ اس کی یہ مانا حرکت انسانیت کے لئے ...ت اور بھلائی کا باعث تھی۔ اس نے خود ہی اپنے ہاتھوں سے دروازہ کھولا تھا۔ دیوتاؤں نے اس کے دل میں وہی ...وازہ کھولنے کا اشارہ کیا تھا۔ اور دیوتاؤں کے انصاف پر بھلا کون سر ہلا سکتا تھا۔

ہماری نظروں میں یہ انصاف سچا ہوتا تھا یا جھوٹا لیکن یہ ماننا پڑتا ہے کہ اس انصاف کا اثر قوم کے ضمیر پر تو خوب پڑتا ...سب لوگ سمجھتے تھے کہ انصاف دیوتا کرتے ہیں اور دیوتا تو دل کا سب حال جانتے ہیں ان کے لئے ظاہر و پوشیدہ ...ب برابر ہے۔ گناہ کریں گے تو ضرور سزا پائیں گے اور سزا بھی کیسی۔ موت!!! بھیا! اس سے تو دور ہی اچھے۔

خیر انصاف تو پکا ہوتا تھا۔ اس کے خلاف کسی کو احتجاج کرنے کی گنجائش ہی نہ تھی لیکن ....

ایک نوجوان فوجی عہدہ دار نے جرم کیا۔ نت نیا۔ بالکل نرالا۔ جس کی نظیر عدالت کی زندگی میں ایک نہ تھی.....
...اس نے پریم کیا...... شہزادی سے!!! اور پریم کے لئے تو کوئی بندھن نہیں ہے۔ شہزادی بھی اس نوجوان سپاہی ...محبت کرتی تھی....... کیا پریم کرنا پاپ تھا؟ نہ ہو۔ لیکن ایک اجنبی عورت سے بار بار ملنا... راتوں کو... تنہا..... اور پھر ...وں سرگوشیاں کرنا یہ ضرور پاپ تھا۔ اور یہ باتیں کیا کہیں چھپا کرتی ہیں۔ شاہ کو معلوم ہو گیا۔ اور شاہ بھی بیچارہ ...معاملات میں جکڑا ہوا تھا۔ مجبور تھا۔ وہ کر ہی کیا سکتا تھا بجز اس کے کہ اس جرم کا فیصلہ عدالت کے سپرد کر دے۔ اس نے ...ہی کیا۔ اس نوجوان سپاہی کو عدالت میں حاضر ہو کر دیوتاؤں کا فیصلہ حاصل کرنے کی اطلاع دی گئی۔

چونکہ یہ جرم ایک خاص جرم تھا اور اس میں شہزادی اور شاہ کو خاص دلچسپی تھی اس لئے اس مقدمے کے لئے خاص ...ں اور بڑی بڑی تیاریاں کی گئیں۔ شاہی پنجروں کا سب سے زیادہ خونخوار شیر اور ملک کی سب سے زیادہ حسین لڑکی ...ن نوجوان پریمی کے لئے منتخب کئے گئے۔ اور ملک کے کونے کونے میں اعلان کر دیا گیا کہ فلاں دن اس فوجی نوجوان ...جرم کے الزام میں عدالت سے فیصلہ حاصل کیا جائے گا۔

آخر وہ دن بھی آ گیا۔ سب لوگ عدالت کے میدان کے گرداگرد جمع ہو گئے۔ کچھ دیر بعد نقارے پر چوب پڑی ...ہی شاہ اور شہزادی اپنے اپنے تخت پر رونق افروز ہوئے اور نوجوان ملزم کو حاضر عدالت کیا گیا۔

لوگوں کی تعداد ہمیشہ سے بہت زیادہ تھی اور ان سب کا دل ملزم کے لئے ہمدردی سے لبریز تھا۔ یہ بانکا سپاہی ...خوش اخلاق اور ہر دل عزیز تھا۔ عدالت میں اس کو جاں بہ لب دیکھ کر لوگوں نے آہیں بھرنی شروع کیں اور صدق دل ...دعاؤں کے لئے ہاتھ اٹھا دیئے۔ ہر شخص ہمدردانہ جذبات سے بے قابو ہو رہا تھا۔ سب کے دل دھڑک رہے تھے ...بے چینی کی ایک آگ لگی ہوئی تھی۔ لیکن نوجوان سپاہی اطمینان و سکون کا مجسمہ بنا ہوا فیصلے کا انتظار کر رہا تھا۔

شہزادی نے بھی اپنے حصے کا پورا کام کیا تھا۔ ظاہر ہے کہ اس مقدمے میں اس کو بے انتہا دلچسپی تھی۔ اپنی جان خطرہ میں ...ڈال کر اس نے تمام کٹھن منزلیں طے کر لیں اور وہ وہ باتیں معلوم کر لیں جو دیوتاؤں کے قانون کے مطابق خود شاہ کو بھی

سب رس
معلوم نہ ہو سکتی تھیں۔ اور کیوں نہیں؟ ایک شہزادی، نوجوان، حسین، کیا کچھ نہ کر سکتی تھی۔ ان دیویوں کے بڑے بڑے بھی کئی مرتبہ چکر کھا چکے ہیں۔ غرض وہ یہ معلوم کرنے میں کامیاب ہو گئی کہ کونسی لڑکی نوجوان کے لئے منتخب کی گئی اور کس نہہ خانے میں اس کو رکھا گیا تھا۔

نقارے پر دوبارہ چوب پڑی اور مقدمے کی کارروائی شروع ہو گئی۔ نوجوان آگے بڑھا ... جھک کر آداب بجالایا۔ اور سر اٹھاتے اٹھاتے آنکھوں ہی آنکھوں میں اس نے شہزادی سے دریافت کیا ... کہ لا جائے۔ نوجوان سمجھ چکا تھا کہ شہزادی نے سب کچھ معلوم کر لیا ہوگا۔ اور شہزادی یہ خوب جانتی تھی کہ ... ضرور دریافت کرے گا۔ اور اس نے یہ بھی فیصلہ کر لیا تھا کہ وہ کیا جواب دے گی۔

جب نوجوان نے استفساریہ نگاہیں شہزادی کی طرف اٹھائیں تو شہزادی نے نہایت ہی اطمینان کے ساتھ ... ہاتھ کا اشارہ کیا۔ نوجوان نے بھی اطمینان کے ساتھ لوٹ کر قدم بڑھایا اور سلاخوں کے اندر داخل ہو کر سیدھا ...

کیا اس دروازے میں سے لڑکی نکلی؟ ہم کو یہاں پر ایک لمحہ غور کرنا چاہیئے۔ یہ یاد رکھنا ضروری ہے ... قوم کی شہزادی تھی جن میں حسد کا مادہ بدرجۂ اتم موجود تھا۔ شہزادی اس منتخب شدہ حسینہ سے واقف ... بھی نہیں بلکہ اس کے لاجواب حسن کے سبب اس سے کچھ جلتی بھی تھی۔ اپنے فرشتے کی گود میں اپنی جگہ اس حسینہ کو ... مارے ڈالتا تھا۔ نوجوان میرا ہے صرف میرا۔ اگر دیوتا اس کو میرا نہیں ہونے دیتے تو پھر وہ کسی اور کا بھی نہیں ہو سکتا ... وحشیانہ جوش کے ساتھ یہ خیال اس کے دماغ میں سمائے ہوئے تھا۔ نوجوان کی اس حسینہ کے ساتھ ... بدلے مرجانا زیادہ پسند کرتی تھی۔

تو کیا اس دروازے میں سے شیر نکلا؟ کیا شہزادی نے اپنے پریمی کو شیر کے حوالے کر دیا ...... ہو پھر بھی وہ نوجوان سے بیحد پریم کرتی تھی اس پر دل وجان سے فدا تھی۔ کیا یہ کسی طرح بھی ممکن تھا کہ وہ اپنی آنکھوں ... اور اپنے ہی اشارے سے اپنے عاشق صادق کو، اپنے دل وجگر کو شیر کے خونی پنجوں کے حوالے کر دیتی، اس کو ہمیشہ ... اپنے سے جدا کر دیتی، بالکل ہی کھو دیتی، فرقت میں اپنی ساری عمر برباد کرتی اور اس کی یاد میں مر مر کے زندہ رہتی؟

آخر شہزادی نے کیا تصفیہ کیا؟ اپنے دلبر کو موت کے نوالے یا دوسرے کے حوالے کیونکہ اس کے سوا ... اس سوال کا جواب میں اس داستان کے پڑھنے والے دوستوں سے چاہوں گا کہ ہر پہلو پر مکمل غور کرنے کے بعد اس کا فیصلہ کریں کہ دروازے میں سے کیا نکلا۔

ملک الموت یا پیام مسرت

ایم۔ اے۔ ...

حسنِ آوارہ

حریمِ ناز کے پردے اٹھا رہا ہے کوئی — سرور و کیف کی دنیا بسا رہا ہے کوئی
نگاہِ شوق کو رنگیں بنا رہا ہے کوئی — گذشتہ دورِ نفس کو بلا رہا ہے کوئی

بہارِ کیف کے جھونکے چمن میں آنے لگے
گلوں کو جوشِ مسرت سے گدگدانے لگے

قرار اب نہیں صبر و قرار جاتے ہیں — حواس ہوش بھی بے اختیار جاتے ہیں
مری نگاہ سے لیل و نہار جاتے ہیں — نیاز مندِ غمِ روزگار جاتے ہیں

ستارے ڈوب رہے ہیں سحر کی آمد ہے
پُرآب چشم ہیں وقتِ سفر کی آمد ہے

درِ حبیب پہ فرقِ نیاز سجدے میں — قبول ہو گئی دل کی نیاز سجدے میں
تمام ہو گئی میری نماز سجدے میں — رہا نہ رازِ محبت کا راز سجدے میں

مری نگاہ میں کون و مکاں کے جلوے ہیں
کفِ نیاز میں عرشِ بریں کے پردے ہیں

ہجومِ شوق میں کھو دوں نہ ان نظاروں کو — اتار لایا ہوں میں آسماں سے تاروں کو
چھپا لوں گوشۂ خاطر میں لالہ زاروں کو — کہاں میں ڈھونڈنے جاؤں گا ان بہاروں کو

گلوں سے رات کو شبنم نے آشنائی کی
سحر ہوئی تو ستمگر نے بے وفائی کی

کسی کا حسنِ جہاں سوز جلوہ ریز ہے آج — نظر کی منزلِ اول سرور خیز ہے آج
نفس کی آمد و شد اور بھی تیز ہے آج — گلابِ دامنِ صحرا کا عطر بیز ہے آج

گلے لگا کے صبا سے نسیم کہتی ہے
کلی کلی چمنِ حسن کی مہکتی ہے

عزیز احمد

تاثراتِ سفرِ یورپ

بسلسلۂ گذشتہ

یوگوسلافیہ ۹ تا ۱۱ جولائی۔ ہم صبح چھ بجے یوگوسلافیہ کے مشہور و معروف پائے تخت بلغراد پہونچے اور اسٹیشن کے سامنے ہی گرانڈ ہوٹل میں قیام کیا۔ تہذیب کے اعتبار سے بلغراد بجائے یورپ کے ایشیا کا ٹکڑا معلوم ہوتا ہے۔ لوگ اول تو کوٹ پہنتے ہی نہیں، اور جو مغربی فیشن کے دلدادہ ہیں وہ کوٹ ساتھ لے لیتے ہیں لیکن بجائے پہننے کے بے تکلف کندھوں پر ڈالے پھرتے ہیں۔ یہاں کی زندگی میں بہت کچھ مشرقیت نظر آتی ہے اور سڑکوں پر بے جھجک کی سیاہ ٹوپی، کرتا، پاجامہ، تقریباً ویسا ہی جیسا ہمارے یہاں پہنا جاتا ہے۔ اور کرتے پر صدری، یہ سب لباس نظر آتے ہیں۔ عورتیں بجائے کسی قسم کی ٹوپی پہننے کے سر پر رومال باندھتی ہیں جس سے بال ڈھک جاتے ہیں، اور بدن پر رنگ برنگ کی مشرقی طرز کی صدریاں پہنی ہیں۔

یوگوسلافیہ کی آبادی میں پندرہ بیس لاکھ مسلمان ہیں اور حکومتی کابینہ میں دو مسلمان وزرا یعنی جعفر یودوپچ اور محمد سپاہو شامل ہیں۔ یہاں کے اکثر مسلمان دو صوبوں یعنی بوسنیہ اور ہرزی گووینہ میں آباد ہیں اور ... مسلمانوں کے جو ترکی النسل ہیں، سب خالص یوروپی اور اسلافی نسل کے ہیں اور ان کی مادری زبان ... ہے ... تو نہیں جا سکا لیکن تصاویر دیکھنے سے یہ حصہ بالکل ایشیائی معلوم ہوتا ہے جس میں مسجدیں، مقبرے، خانقاہیں سب ہی نظر آتی ہیں۔ بہرحال جہاں تک بلغراد کا تعلق ہے۔ اب صرف ایک ہی مسجد باقی رہ گئی ہے۔ میں نے شہر کی رہنمائی کے لئے جو کتاب خریدی اس کا ایک فقرہ نقل کرنے کے قابل ہے۔ اس کا مصنف کرنیاتسکی کہتا ہے کہ "سلطان سلیمان اعظم کے آثار ... ہوئی مسمار ہو گئے۔ مسلمانوں کے قبرستان جو شہر کے وسطی حصے میں نظر آتے تھے، ان کا وجود باقی نہیں رہا۔ ان کی قبروں میں سے صرف ایک قبر باقی ہے وہ ایک مسلمان ولی شیخ مصطفےٰ کی ہے۔ بلغراد مساجد سے بھرا ہوا تھا۔ لیکن اب شہر میں صرف ایک مسجد ہے جس کی تعمیر سولھویں صدی میں ہوئی تھی اور یہ بھی زمانۂ حال تک گرجا کا کام دیتی تھی۔ ملان شاہ ... (۱۸۶۸ء تا ۱۸۸۹ء) نے اسے از سرِ نو مسلمانوں کے سپرد کر دیا۔ اس کے علاوہ کوئی مسجد بلغراد میں باقی نہیں ہے" انا للہ وانا الیہ...

یوگوسلافیہ کا سکہ دینار کہلاتا ہے۔ عجیب بات ہے کہ قدیم روما اور خلافت اسلامیہ کے زمانے میں درہم اور دینار ساتھ ساتھ چلتے تھے لیکن یورپ میں جہاں دینار ہے وہاں درہم نہیں اور جہاں درہم کا چلن ہے وہاں دینار نہیں۔ جنگ سے پہلے ایک انگریزی اشرفی کے پچیس دینار آتے تھے، اب دو سو پینتیس آتے ہیں۔ بلغاری اور یوگوسلافی زبانیں تقریباً ایک ہی سی ہیں اور مجھ سے لوگوں نے بیان کیا کہ ایک ملک کا باشندہ دوسرے ملک کی بولی بہ آسانی سمجھ سکتا ہے، لیکن طرزِ تحریر میں فرق ہے۔ بلغاریہ میں روس کی طرح سریلی Cyrillic حروف رائج ہیں۔

یوگوسلافیہ میں لاطینی اور سریلی دونوں حروف کا رواج ہے۔ قدیم سربیہ میں جس کا مستقر بلغراد ہے، سوائے سریلی کے کوئی لاطینی حرف کا نام یا اعلان دیکھنے میں بھی نہیں آیا۔ اور کرواتیہ میں (جس کا اصلی نام "خروات" ہے) کہیں

سربی حرف دیکھنے میں نہیں آتا بلکہ رسم الخط لاطینی (انگریزی) ہے بلغراد کی آبادی جنگ سے پہلے صرف اسی ہزار تھی لیکن جنگ کے بعد جب ملک میں نئے علاقوں مثلاً سلوفینیہ، کروآتیہ، جبل اسود وغیرہ شامل ہو گئے تو پایۂ تخت کی آبادی یکایک بڑھ گئی اور اب اس میں کم و بیش چار لاکھ نفوس آباد ہیں۔ یہاں کے تمام سرکاری ایوانات، مثلاً وزارتیں، محلات اور دوسرے سرکاری دفاتر بالکل جدید ہیں اور نئی یوگوسلافیہ جیسی وسیع سلطنت کے شایانِ شان ہیں۔

ہوٹل میں تھوڑی دیر آرام لینے کے بعد اسی عظیم الشان قلعہ کی زیارت کو گیا جو مسجد کے بعد بلغراد میں ترکوں کی واحد یادگار ہے اور جس کے نام "قلعہ میدان" کو بگاڑ کر اب Kalemagdan کہتے ہیں۔ قلعہ میدان دریائے ڈینیوب اور دریائے ساوے کے سنگم پر ایک بڑی پہاڑی پر واقع ہے اور اس کے در و دیوار اپنی زبانِ حال سے ترکی حکومت کے لئے جس کا یہ سیکڑوں برس تک ناقابلِ تسخیر مورچہ رہا آٹھ آٹھ آنسو بہاتا ہے۔ اس کی بیشتر خندقوں کو پاٹ کر ایک بہت بڑا پارک بنا دیا گیا ہے لیکن ایسے حصے بھی ہیں جہاں فوج رہتی ہے اور یہاں کوئی باہر والا نہیں جا سکتا۔ اس بند حصے میں کئی عمارتیں ایسی نظر آئیں جو پہلے مسجدیں ہوں گی لیکن اب گرجا ہیں، اور میری رہنما کتاب میں چند ایسی قبروں کا پتہ دیا تھا جہاں تک کسی کی پہونچ ممکن نہیں۔ پارک کے ہر کونے پر کسی نہ کسی ممتاز سربی کا مجسمہ ہے اور وسط میں ایک جغرافی نوادرخانہ ہے۔ لیکن سب سے عجیب منظر وہ ہے جو دریائے ساوے کے سامنے قلعہ میدان کا حصہ ہے۔ ترک جب اس حصہ کے مالک تھے تو انھوں نے اس کا نام "فکر بایر" یا "قلعۂ فکر" رکھا تھا اور واقعہ یہ ہے کہ یہاں جو بنچیں پڑی تھیں وہاں سے کچھ ایسا لطیف منظر ہے کہ ان پر بیٹھ کر انسان سب کچھ بھول جاتا ہے اور عالمِ فکر میں غرق ہو جاتا ہے۔ اس کے قریب میں فوجی نوادرخانہ ہے جو دراصل ترک کے والی کا محل تھا اور اس وقت بھی اس کی کچھ ایسی مشرقی کیفیت ہے کہ معلوم ہوتا ہے کہ بس ابھی اس میں سے کوئی ترک نکل رہا ہوگا۔ قریب ہی ترکی فاتحِ یونان داماد علی پاشا کی تربت ہے۔ آپ کسی زمانے میں سربیہ کے والی تھے اور انھوں نے اس خطۂ یورپ میں اسلامی عدل و انصاف کا کچھ ایسا ڈنکا بجایا کہ آج بھی یوگوسلافی لوگ انھیں اپنا "ماں باپ" کہہ کر یاد کرتے ہیں۔ مقبرے کے دروازے پر ترکی اور سربی زبان میں مناسب کتبہ ہے اور قبر پر سبز چادر پڑی رہتی ہے۔

قلعہ میدان سے نصف میل کے قریب بلغراد کی واحد مسجد ہے۔ یہاں پہونچ کر عجیب لطیفہ ہوا۔ بلقانی مساجد میں (شاید ان مظالم کے سبب سے جو عیسائیوں نے مسلمانوں پر ڈھائے ہیں) غالباً غیر مسلموں کو داخل نہیں ہونے دیا جاتا۔ چونکہ میری ٹوپی یوروپی تھی اس لئے مجھے روکا گیا (شاید امتحاناً) مجھ سے مغرب کی اذان کہلوائی گئی۔ اور مجھے نماز کے لئے اقامت بھی کہنی پڑی۔ جو لوگ نماز میں شامل تھے وہ سب کے سب یوروپی تھے۔ امام صاحب کا وطن مقدونیہ تھا اور نام رفعت شاکر ہازار یووچ تھا۔ بہرحال ان کے ساتھ ایک گھنٹہ نہایت پر لطف صحبت رہی بلکہ انھوں ہی نے داماد علی پاشا کے مقبرے کی نشان دہی کی۔

اگلے دن صبح کے وقت نوادرخانہ شاہزادہ پال دیکھنے گیا۔ یہ نوادرخانہ شاہزادہ پال کے وقف کئے ہوئے محل میں واقع ہے۔ پال کے نام سے بہت لوگ واقف ہوں گے اس لئے کہ یہ ڈچز آف کینٹ کے (جو شاہ جارج ششم کی سب سے چھوٹی بھاوج ہیں) چچا اور پیٹر دوم شاہ یوگوسلافیہ کی نابالغی کے زمانے میں متولیٔ سلطنت ہیں۔ اس نوادرخانے میں علاوہ یونانی، رومن اور اسلامی اشیاء کے (جو سلطنت یوگوسلافیہ میں ملی ہیں) سربیہ کی ابتدائی تاریخ کے بعض نہایت

دلچسپ آثار بھی ہیں، مثلاً سربیہ کے پہلے عیسائی حکمران میلوش کا لباس، قراجارج کے (جو پہلے شاہ سربیہ پیٹر اول کا باپ اور موجودہ حکمران کا پردادا تھا) کپڑے اور پیٹر اول کا لباس تاج پوشی، یہ سب چیزیں بہت دلچسپ ہیں۔ جو چیز خاص طور قابل لحاظ ہے وہ یہ ہے کہ باوجودیکہ میلوش اور قراجارج ترکوں کے جانی دشمن تھے تاہم ان کے لباس ایشیائی [illegible] عربی وضع کے ہیں چنانچہ میلوش کا عمامہ اور قراجارج کا جبہ خاص طور پر قابل دید ہیں۔ حالانکہ میلوش وہ شخص ہے جس [illegible] ترکوں کے خلاف علم بغاوت بلند کیا۔ ترکی بلغراد اور اس کی مساجد و مقابر کو مسمار کرنا شروع کیا تھا۔ ان [illegible] پتہ چلتا ہے کہ ترکوں نے دنیا کے اس حصے پر کس قدر اثر قائم کر لیا تھا اور موجودہ بلقانی ریاستیں اس اثر کو کس حد تک [illegible] کرنے میں کامیاب ہوئی ہیں۔

بلغراد سے چلنے سے پہلے پھر ایک مرتبہ قلہ میدان کے ترکی آثار دیکھنے گیا اور داماد علی پاشا کی تربت پر آخری [illegible] پڑھی۔ کھانا کھانے کے بعد، جو زیادہ تر ترکی تھا، ۲-۲۵ کی گاڑی سے بلغراد سے روانہ ہو گیا اور چند ہی منٹ میں [illegible] ساوے عبور کر لیا جو صدیوں تک ترکوں اور آسٹریا ہنگری کی سرحد بنا ہوا تھا۔ ارادہ براہ راست آگے جانے کا تھا لیکن راستہ میں میری اہلیہ کا مزاج خراب ہو گیا۔ اور چونکہ وینس تک رات بھر کا سفر تھا اس لئے مجبوراً زاگریب میں (جس کا نام جنگ سے پہلے اگرام تھا اور جو کرواتیہ کا مستقر ہے) قیام کرنا پڑا۔ ریل یہاں ½۹ بجے پہونچی اور ہم یہاں کے [illegible] ہوٹل میں ٹھہر گئے۔

یہ اچھا ہوا کہ زاگریب میں ایک روز رہنا پڑا اس لئے کہ یہاں آئے کے بغیر اس عجیب ملک یوگوسلافیہ کی زندگی [illegible] ایک رخ پر نظر ڈالنا مشکل ہوتا۔ یوگوسلافیہ منجملہ ان ممالک کے ہے جس میں ہماری اردو ہندی کی طرح تقریباً ایک ہی زبان کے دو [illegible] رسم الخط ہیں جو ایک دوسرے سے بالکل جدا ہیں۔ سربیہ خاص میں یہ زبان cyrillic حروف میں لکھی جاتی [illegible] روسی زبان کے لئے حروف ہیں۔ اور کرواتیہ میں کلیتاً لاطینی حروف رائج ہیں۔ تحقیقات سے معلوم ہوا کہ سربیہ [illegible] کے الفاظ کے درمیان نہایت ہی کم فرق ہے اور جو ہے وہ محض جزوی مثلاً دودھ کو سربی میں mleko اور کرواتی میں mlijeko کہتے ہیں۔ لیکن سربی اپنی زبان لاطینی حروف میں اور کرواتی اپنی زبان سربی حروف میں لکھنا گوارہ نہیں کرتے۔ اس کے باوجود دونوں خطے کے رہنے والے ایک دوسرے کے ساتھ غایت امن و امان سے زندگی بسر کرتے ہیں۔ یوگوسلافیہ کے سرکاری کاغذات دونوں حروف ہی میں طبع ہوتے ہیں۔ بعض سکوں پر ایک قسم کے حروف ہیں بعض پر دوسری قسم کے حروف میں کتبہ ہوتا ہے۔ مثلاً ۱، ۲، اور پچاس دینار کے سکوں پر سربی میں اور ۱۰ اور ۲۰ دینار کے سکوں [illegible] لاطینی میں اور نوٹوں پر ایک طرف لاطینی میں نہ جانے ہمارے ہندوستان میں اردو ہندی والوں کے درمیان [illegible] اسی انداز کی مفاہمت کیوں ممکن نہیں۔ مذہبی اعتبار سے بھی یوگوسلافیہ میں تنوع ہے۔ یعنی کرواتی رومن کیتھولک [illegible] اور بوسنیہ والے سب کے سب مسلمان اور باقی ماندہ ملک والے ارتھوڈکس ہیں۔

زاگریب خود ایک نہایت خوبصورت شہر ہے۔ آبادی ۲ لاکھ ہے لیکن ہمارے بڑے بڑے شہروں میں بھی اس قدر خوبصورتی

...وفائی نہیں جتنی اس شہر میں ہے۔ سات یا آٹھ مختلف قسم کے نوادر خانے ہیں جن میں زیادہ کروآتیہ کی طرز معاشرت، یہاں کے ...میں ملبوسات (جن میں ترکی اور اسلامی اثر صاف نمایاں ہے) یہاں کی [illegible] اور پیکر تراشی کی نمائش ...یونیورسٹی جس میں کروآتی زبان میں تمام تعلیم دی جاتی ہے بند تھی لیکن کتب خانہ کھلا ہوا تھا۔ یونیورسٹی نسبتاً جدید ہے ... Dr Strossmayer نے ۱۸۶۱ء میں قائم کیا تھا۔ [illegible] کے نام پر ایک بڑا [illegible] اور ایک سڑک کے نام رکھے ...ہیں۔ دوسری بلقانی اور یوروپی جامعات کی طرح یہاں کی جامعہ میں بھی یہاں کے [illegible] مذہبی تعلیم کا شعبہ نہایت اہم ہے ...دریافت سے معلوم ہوا کہ بہت سے طلبا اس مضمون کو اختیار کرتے ہیں۔ [illegible] کتب خانہ [illegible] ہی نفیس عمارت میں ہے اور ...میں چار لاکھ کتابیں ہیں۔ لیکن جن مددگار خاتون نے کتب خانہ کی سیر کرائی [illegible] کہہ رہی تھی کہ افسوس ہے کہ ...رے یہاں بہت کم کتابیں ہیں۔ جامعہ میں ساڑھے چار ہزار طلبہ تعلیم پاتے ہیں۔ علاوہ [illegible] کتب خانہ کے ہر شعبہ کا ایک ایک ...گانہ کتب خانہ بھی ہے جو کلیتہ اس شعبہ کے پروفیسر سے متعلق ہے اور ہر شعبہ وار کتب خانہ میں اوسطاً دو ہزار کتابیں ہیں۔ ...نے مطالعہ خانے بھی دیکھے۔ ہر شخص کے لئے دو میٹر جگہ، ایک بجلی کی خوبصورت لیمپ [illegible] وار کرسی ہے۔ خواہ کمرہ ...کے لئے مخصوص ہو یا اساتذہ کے لئے۔ طلبہ کے کمرہ میں ۲۴۰ طلبہ کی نشستیں ہیں [illegible] پروفیسروں کے مطالعہ خانے میں ۲۴ ...نشستوں اور دوسرے برآوردہ اشخاص کے مطالعہ خانہ میں [illegible] نشستوں کا انتظام کیا گیا ہے۔ ناظم کتب خانہ کا درجہ پروفیسر کا ...ہے۔ فہرست کے لئے جداگانہ کمرہ ہے اور یہ بالکل کارڈ سسٹم پر ہے۔ [illegible] (۲۰۰۰۰۰ ہوگا) ایک طرف مضمون ...وار فہرست ہے اور دوسری طرف جداگانہ مصنف وار [illegible] سب کا اندازہ ہوا۔

شام کے وقت یہاں کا اسقفی گرجا دیکھنے گیا جس [illegible] ہوئے ہیں۔ راستہ میں ...نے دیکھا کہ سڑک کے دونوں طرف انسانوں کے ٹھٹھ کے ٹھٹھ [illegible] بوڑھے، جوان، عورتیں، مرد، سب ...کے منتظر ہیں۔ آخر سات بجے ایک عظیم الشان جلوس نکلا [illegible] پادری صاحبان حضرت ...عیسیٰ کی تصویریں لئے ہوئے تھے۔ بوائے اسکاؤٹ اور وردی پوش سپاہی [illegible] کا جھنڈا لئے ہوئے تھے۔ جلوس ...لوں کے پشتوں پر کھانے پینے اوڑھنے بچھونے کی اشیاء بندھی تھیں۔ جلوس میں [illegible] چار پانچ ہزار آدمی تو ضرور ...ہوں گے۔ معلوم ہوا کہ ہر سال یہ جلوس ۹ جولائی کو زاگریب سے چلتا ہے۔ یہاں سے ۱۵ کلومیٹر کے فاصلے پر ایک گرجا ...ہے St. Maria Bistrica P. Maria Bari[illegible] [illegible] ۱۰ جولائی کو رہتے ہیں اور ...کو واپس زاگریب جاتے ہیں۔ عورتیں، مرد، بوڑھے، بچے سب پیدل ہوتے ہیں [illegible] مذہبی اور قومی گیت گاتے جاتے ہیں ...اور گیت گاتے ہوئے واپس آتے ہیں۔ سب کے سب زیارت کے [illegible] بوڑھوں کے لنگڑے لولے بھی تھے ...ہمارے ہندوستان میں مذہب کے نام سے اب مذاق اڑایا جانے لگا ہے۔ یہاں مذہب کا مظاہرہ جامعہ اور سڑک ...دونوں پر ہے۔ زاگریب میں انگریزی کوئی نہیں جانتا تھا۔ فرانسیسی کم بولتے ہیں [illegible] واحد غیر ملکی زبان جس کا رواج ہے ...جرمن ہے۔

...سرحد پر ۱۲ جولائی کو صبح ۶-۵۰ پر زاگریب سے روانہ ہوئے۔ شہر سے نکلتے ہی نہایت نفیس پہاڑی مناظر شروع

ہوجاتے ہیں اور کئی گھنٹے تک ریل دریائے ساوے کے کنارے کنارے چل کر Alpe ...
کو عبور کرتی ہے۔ راستہ میں کئی صاف شفاف شہر اور گاؤں نظر آئے جو بیس سال پہلے آسٹریا کی ملکیت ...
اور جو اب یوگوسلاویہ میں Rakek یوگوسلاویہ کا آخری شہر ہے۔ یہاں پاسپورٹ دیکھے گئے ...
ریل اطالوی سرحد کو عبور کرتی ہے اور دو میل پر اطالوی شہر پوسٹومیا واقع ہے۔ روس کے مشہور زار ...
لکھا ہے کہ ماسکو سے پیرس جاؤ تو مختلف ممالک میں سے ہو کر گذرنا پڑتا ہے جن میں سے کسی ملک پر ...
بغیر ریل بدلے ہوئے یورپ کے ایک سرے سے دوسرے سرے تک پہونچ سکتے ہو۔ اس کو وہ زار کی اصولی ...
طور پر پیش کرتا ہے۔ اس دلیل میں حقیقت کا پہلو ہو یا نہ ہو یہ ضروری ہے کہ ایک ملک سے دوسرے ملک ...
گاڑیوں میں بیٹھ کر جا رہے ہیں اور معلوم ہوتا ہے اس کے سرحد پر عملہ بدل جاتا ہے گاڑیاں وہی ...
چوڑائی ایک ہی ہے اور شکل سے معلوم ہوتا ہے کہ ملک، زبان، قوانین، رسم و رواج اور مذہب سب ...
دیکھا کہ ایک ہی گاڑی استنبول سے چلتی ہے اور سیدھی پیرس اور کیلے جاتی ہے اور راستہ میں پہلے ترکی پھر یونان ...
پھر بلغاری پھر یوگوسلاوی پھر اطالوی پھر سوئیستانی پھر فرانسیسی سرحد عبور کرتی ہے۔ اور باوجودیکہ کوئی مشترک انتظام ...
معاملگی کے سبب سے کسی قسم کی دقت پیش نہیں آتی۔ ہماری ریل Trieste کے اسٹیشن پر تین گھنٹے ٹھیری ...
قلعہ نظر آیا جو نہایت درجہ نفیس خلیج پر واقع ہے۔ ٹریسٹ جنگ سے پہلے آسٹریا کی سب سے بڑی بندرگاہ تھی۔ ...
میں شہنشاہ آسٹریا کا بھائی میکسی میلین اپنے اچھے وقتوں میں رہا کرتا تھا اور یہیں سے وہ میکسیکو کا شہنشاہ بن ...
مارے جانے کے لئے چلا تھا۔

چونکہ ریل بہت بھری تھی اس لئے رات کے لئے پلنگ کمرے کا انتظام کرلیا تھا جو وینس میں ہمیں مل گیا ...
بیس روپے رات تمام کے دینے پڑے۔ چونکہ رات ہی میں سوئیستانی سرحد عبور کی جاتی ہے اس لئے اپنے پاسپورٹ
پلنگ گاڑی کے کنڈکٹر کو دے دیے اس کے بعد ہم سوگئے۔

۱۳ر جولائی کو ہماری ریل مشہور آفاق سیمپلون ٹنل Simplon Tunnel میں ہو کر گذری اس ...
طرف اٹلی اور دوسری جانب سوئیستان ہے، چنانچہ ریل داخل ہوئی تو اٹلی کا ملک تھا اور نکلی تو ہم سوئیستان میں تھے۔ ...
طویل ہے اور کوہ Monte Leone کی تہہ میں کھودا گیا ہے۔ ریل پوری رفتار سے چلی اور ٹھیک پندرہ منٹ ...
نکلی۔ اس وقت سے لے کر لوزان تک (جہاں وہ صلح نامہ ہوا تھا جس کی رو سے موجودہ صدر جمہوریہ ترکی عصمت ...
کوششوں سے ترکی اغیار کے خوفناک پنجوں سے نکلا تھا) مناظر نہایت ہی دلفریب تھے۔ صرف دو ڈھائی گھنٹہ اس ...
ریل والورب کے مقام پر فرانس میں داخل ہوئی اور پھر پاسپورٹ دکھانے کی ضرورت پیش آئی لیکن برخلاف ان ممالک ...
اس سے پیشتر عبور کی گئی تھیں، سوئیستان اور فرانس میں صرف رسمی طور پر پاسپورٹ پر مہر لگائی گئی، وہ روپیہ کا استثنا ...
Visa کے جھگڑے جو بلقانی ریاستوں اور اٹلی میں تھے یہاں نام کو بھی نہ تھے۔
شہر دیژون سے پہلے ہی روپیہ تبدیل کرنے کے لئے ایک شخص ریل میں آیا اور اس نے یوگوسلافی دینار ...

...کے فرانسیسی فرانک دے دیے۔ جنگ عظیم سے پہلے جب میں آخری مرتبہ فرانس آیا ہوں تو ایک انگریزی اشرفی کے
...پچیس نقرئی فرانک آتے تھے اور بیس فرانک کا سکہ طلائی "لوئی" تھا۔ اب کاغذی پونڈ کے ۱۷۶ فرانک آتے ہیں اور بجائے
...کے اب فرانک صرف ۱؍۴ کا رہ گیا ہے۔ صبح ۹ بجے کے قریب ہم پیرس کے "لیون" نامی اسٹیشن پہنچے، وہاں سے ٹیکسی لے کر
شمالی اسٹیشن جہاں سے لندن جانا ہے آئے۔ دوسرے روز یعنی ۱۴ جولائی کو فرانس کی قومی عید تھی، چونکہ اس عید کی ایک
...بڑی اہمیت ہے اور میں کبھی اس سالگرہ پر فرانس نہیں آیا تھا، اس لیے اس موقع کو غنیمت جانا اور بجائے فوراً لندن جا
جانے کے پیرس میں ٹھیر گیا۔

جیسا اوپر بیان کیا جا چکا ہے، فرانس کے سکے کی قیمت نہایت گری ہوئی ہے جس کی وجہ سے اشیا نسبتاً ارزاں ہیں۔
...لوگ کہتے ہیں کہ اب تو قیمتیں پہلے سے بڑھ گئی ہیں۔ جب دو تین مہینے پہلے فرانک کی قیمت ایک ساتھ گری تھی یا تجارت کو
فروغ دینے کے لیے گرائی گئی تھی تو اشیا اب سے بہت زیادہ سستی تھیں۔ رات کے وقت صبح کے جشن کی تیاریاں تھیں، شہر میں بجلی
کی روشنی تھی اور شہر گویا ایک بقعۂ نور بن رہا تھا۔ سڑکیں عورتوں، مردوں، فرانسیسیوں، اجنبیوں سے ایسی بھری ہوئی تھیں کہ کھوے سے کھوا
چھلتا تھا۔ ایک اور چیز جو غایت درجہ دلچسپ تھی وہ انگریزی یونین جیک کی افراط تھی۔ کوئی گھر، کوئی دکان، کوئی اسٹیشن، کوئی دکان
ایسی نہ تھی جہاں انگریزی جھنڈا فرانسیسی جھنڈے کے پہلو بہ پہلو نظر نہ آتا ہو اور بعض مرکزی مقامات مثلاً وہ سڑکیں جو [illegible] اور
...کے چاروں طرف ہیں، ان دونوں جھنڈوں اور الوان روشنی کے پھندوں کی وجہ سے [illegible] بہار دکھا رہی تھیں۔ اصل یہ ہے
چند روز بعد شاہ جارج ششم اور ملکہ الیزبتھ پیرس آنے والے تھے اور پیرس والوں نے ۱۴ جولائی کی عید کو گویا ان کے استقبال [illegible]
...سواگت کا گویا ایک ریہرسل بنا دیا تھا۔ فرانس چاروں طرف دیکھ رہا تھا [illegible] جرمنی کی طاقت [illegible]
...چوگنی بڑھ رہی ہے اور فرانس کی نگاہیں کسی نہ کسی ملک کو اپنا ساتھی بنانے کی [illegible] خوف تھا کہ کہیں وہ یورپ میں
...تنہا رہ جائے۔ بہرحال میں نے پیرس میں [illegible] اتنی بڑی تعداد میں یونین جیک نہیں دیکھے۔
فرانسیسی اخبارات میں دیکھا کہ صدر جمہوریہ فرانس نے پیرس کی جامعہ سوربون [illegible] طلبہ کو انعامات تقسیم کیے
...کیفیت مغربی ممالک کی ہے۔ ہمارے ہندوستان کے بعض لوگ کہتے ہیں کہ انعامات صرف ابتدائی مدارس میں [illegible]
...اس لیے کہ انگلستان میں جامعی امتحانات کے سلسلے میں انعامات عام طور پر نہیں دیے جاتے، ان کا تعلق ابتدائی مدارس سے
ہونا چاہیے!

۱۴ جولائی کو صدر جمہوریہ فرانس موسیو لبرون نے بری، بحری اور ہوائی فوجوں کا ریویو کیا اور رات کو شہر کو شاندار
...روشنی ہوئی جو رات کی روشنی سے بھی بڑھی چڑھی ہوئی تھی۔ یہ تاریخ سقوط باستیل کی تاریخ ہے جب ۱۴۹ برس پہلے
...انقلابی فرانسیسیوں نے مطلق العنان اور جابر حکومت کے قلعہ باستیل پر چڑھائی کی اور اسے فتح کر کے اس کے
اندر جو سیاسی قیدی تھے سب کو رہا کر دیا۔ سنہ ۱۷۹۰ء میں یہ قلعہ مسمار کر دیا گیا اور سنہ ۱۸۴۰ء میں اس کی جگہ ایک اونچا منارہ
...اس پر "آزادی" کا ایک مجسمہ نصب کر دیا گیا جو آج تک موجود ہے۔ اسی [illegible] کی سالگرہ پر فرانس کی سب سے بڑی
...عید منائی جاتی ہے اور تمام ملک خوشی سے پھولا نہیں سماتا۔ ہم نے دیکھا کہ [illegible] سڑکوں [illegible] راتوں میں

متعلق غور کر رہی تھی، ایک ہمسایہ ہناؤ نامی زمیندار چار گھوڑے والی گاڑی میں سوار اس کی گاڑی کے ساتھ ہو لیا۔ یہ وہی شخص ہے جو گذشتہ سال اس کے مدرسے میں ممتحن مقرر کیا گیا تھا۔ جب وہ اس کے قریب پہونچا تو پہچان کر اپنا سر جھکایا۔

"آداب عرض ہے" اس نے کہا "شاید آپ گھر تشریف لے جا رہی ہیں"

ہناؤ جس کی عمر چالیس سال معلوم ہوتی ہے جس کی شکل صورت میں کوئی خاص بات نہیں، چہرہ پر ماندگی کے آثار اور کچھ عمر رسیدہ نظر آ رہا ہے، لیکن اب بھی وہ خوشرو ہے اور عورتیں اس سے دلچسپی لیتی اور اکثر تعریفیں کرتی رہتی ہیں۔

وہ اپنے وسیع مکان میں تنہا رہتا اور اس نے کہیں ملازمت اختیار نہیں کی۔ اس کے متعلق لوگ کہا کرتے کہ وہ مکان میں سیٹی بجاتے ہوئے ادھر ادھر ٹہلتے رہنے یا اپنے قدیم ملازم کے ساتھ شطرنج کھیلنے کے سوا اور کچھ کام کاج نہیں کرتا۔ اور یہ بھی کہتے کہ وہ خوب پیتا ہے۔ اور یہ واقعہ ہے کہ گذشتہ امتحان کے موقع پر اس نے جو کاغذات لائے تھے ان میں وائن (ع ۱۸۶۳) اور عطر کی خوشبو مہک رہی تھی۔ اس موقع پر وہ بالکل نیا لباس پہنے ہوئے تھا، اور ماریا وسیلیونا اس کو نہایت پرکشش سمجھ رہی تھی، اور جس وقت تک وہ اس کے قریب بیٹھی رہی۔ بے چینی سی محسوس کرتی رہی۔ اس کو ہمیشہ نازک مزاج اور صاحب سمجھ ممتحنوں سے اسکول میں سابقہ پڑتا رہا۔ لیکن حضرت کی یہ حالت کہ ایک دعا بھی یاد نہیں، اور نہ یہ جانتے کہ کیا سوالات کرنے چاہئیں، ہاں انتہائی خلیق اور حلیم تھا، اور زیادہ سے زیادہ نمبر دیا کرتا تھا۔

"میں بکوسٹ سے ملنے جا رہا ہوں" ماریا سے مخاطب ہو کر اس نے کہا "لیکن مجھ کو اطلاع ملی کہ وہ مکان میں موجود نہیں ہیں"

وہ شاہراہ سے مڑ کر ایک چھوٹے راستے [illegible] روانہ ہوئے، ہناؤ رہنمائی کر رہا تھا اور [illegible] ہانک رہا تھا۔ چاروں گھوڑے وزنی گاڑی کو [illegible] بدقت کھینچ رہے تھے۔ سیمون ناہموار زمین [illegible] ڈھلے ہوئے دلدل وغیرہ سے بچا بچا کر راستے کے [illegible] ہانکتا چلا جا رہا تھا، اکثر اس کو گاڑی سے اتر اتر کر [illegible] مدد کرنی پڑتی۔ ماریا وسیلیونا اپنے مدرسے کے متعلق [illegible] میں محو تھی، مثلاً وہ حیران تھی کہ آیا امتحان میں [illegible] سوالات مشکل آئیں گے یا آسان۔ مجلس تعلیمی [illegible] خدشہ لگا ہوا تھا، کیونکہ کل تو وہاں ایک بھی [illegible] یہ کس قدر غیر اصولی باتیں ہیں! یہاں وہ دو سال [illegible] استدعا کرتی چلی آ رہی ہے کہ چوکیدار کو علحدہ کر دیا جائے [illegible] نہایت نکما اور اس کے ساتھ درشتی سے پیش آتا اور [illegible] بچوں کو زد و کوب کرتا، لیکن اس پر اب تک کسی نے بھی توجہ نہیں کی۔ دفتر میں پریسیڈنٹ صاحب سے ملاقات [illegible] دشوار امر تھا۔ اور خوش قسمتی سے کبھی کو ان سے [illegible] ہو جائے تو وہ پر اشک آنکھوں سے فرمایا کرتے کہ مجھے [illegible] لمحہ کی بھی فرصت نہیں ہے۔ مہتمم صاحب [illegible] ایک مرتبہ معائنہ کے لئے مدرسہ تشریف لایا کرتے [illegible] وہ پہلے سررشتہ آبکاری میں کارگذار تھے [illegible] کے تحت تعلیمات میں ان کو مہتمی کی جائداد مل گئی [illegible] نتیجہ یہ کہ اپنے فرائض سے بالکل لاعلم ہیں اسکول کونسل کے اجلاس شاذ و نادر منعقد ہوا کرتے لیکن [illegible] اس کا پتہ بھی نہیں چلتا۔ مدرسے کا سرپرست ایک جاہل [illegible] ہے، یہ نرا احمق، تندمزاج، کسی چمڑے کے کارخانہ کا [illegible] اور خیر سے چوکیدار کے ساتھ اس کا گہرا یارانہ ہی [illegible]

نہیں معلوم ہوتا ہے کہ یہ اپنے شکوے شکایات آخر کس کے سامنے پیش کرے۔

ہناؤ پر ایک اچٹتی ہوئی نظر ڈالتے ہوئے اس نے دل میں سوچا "واقعی یہ مقبول صورت آدمی ہے"

جوں جوں یہ جنگل میں بڑھتے گئے، راستہ کی حالت بدسے بدتر ہوتی چلی گئی۔ مڑنے کے لئے ذرا سی جگہ بھی نہیں تھی۔ پہیے گہرے دھنستے چلے گئے، پانی اور کیچڑ میں شدید طور پر ان کے چہروں پر سخت چھینٹے اڑ رہے تھے۔

"کیا واہیات راستہ ہے"؟ ہناؤ نے ہنستے ہوئے کہا۔

معلم نے اس کی طرف کچھ غور سے دیکھا اور یہ سمجھنے سے قاصر رہی کہ یہ عجیب آدمی اس نواح میں کیوں رہتا ہے۔ باوجود دانشمند، خوش اخلاق، خوش رو، شریف ہونے کے ایسے گئے گذرے دور افتادہ اور کیچڑ زدہ مقام میں پڑا ہوا ہے جس میں کوئی منظر نظر نہیں آتا۔ وہ اپنی زندگی سے کوئی خاص لطف بھی نہیں اٹھاتا۔ اور یہاں دیکھو سیمون کی طرح، آفت و مصیبت اٹھاتا، دھکے اور جھٹکے کھاتا، ایک تکلیف دہ راستہ سے بے اطمینانی کے ساتھ گاڑی میں چلا جا رہا ہے۔ جب کہ یہ پیٹرزبرگ یا اور بہترین شہروں میں رہ سکتا ہے۔ تو یہاں پڑے رہنے کے لئے کیا شامت آئی ہے؟ اگر کوئی یہ خیال کرے کہ اس جیسے امیر آدمی کے لئے یہ بالکل آسان تھا کہ یہاں ایک عمدہ سڑک بنوا دے، تاکہ آئے دن کی مصیبتوں سے نجات ملتی، اور اس کوچوان اور سیمون کو بھی سہولت اور آرام میسر ہوتا۔ لیکن وہ اس قسم کی باتوں پر قہقہہ لگاتا، اور یہی ظاہر کرتا کہ اس کو عیش و آرام کی زندگی کی خواہش نہیں ہے۔ وہ اس قدر رحم دل، لطیف مزاج اور سادگی پسند شخص تھا کہ اس قسم کی کشمکش کی زندگی اس پر بار خاطر نہیں گذرتی۔ وہ مدرسوں میں صرف گلوبس (Globes) تقسیم کیا کرتا، اور اپنے کو تعلیم کی نشر و اشاعت کے سلسلہ میں ایک مفید اور امتیازی رفاہ کار تصور کرتا۔ لیکن ایسے مقامات میں اس کے گلوبس سے کیا فائدہ پہونچتا ہے؟

"سنبھل میں ہوں وسیلیونا!" سیمون نے خوفزدہ آواز میں کہا۔ گاڑی کو اتنا زور سے جھٹکا ہوا کہ الٹتے الٹتے رہ گئی۔ اور کوئی چیز لڑھکتی ہوئی ماریا کے پیروں پاس آگئی ——— یہ اپنی خریدی ہوئی چیزوں کا پارسل تھا۔ راستہ اونچائی سے آثار کی طرف تھا، پانی نے زمین کاٹ کاٹ کر جگہ جگہ رخنے ڈال دئے، اور بیچ راستے ایک چھوٹا سا نالہ قل قل کرتا بہہ رہا تھا۔ اب یہاں سے آگے بڑھتے ہی جیسے گھوڑوں کی تو سانس پھولی ہوئی تھی۔ ہناؤ لمبا اور کوٹ پہنے اپنی گاڑی سے اتر پڑا، راستے کے کنارے سے چلنے لگا۔ وہ مضطرب تھا۔

"تو یہ کیا راستہ ہے!" یہ کہہ کر وہ پھر ہنسنے لگا۔ "اس سے تو کسی کی گاڑی بالکل جلد غارت ہو جائے گی"

"جناب عالی! ایسے موسم میں باہر سواری کرنے کے لئے آپ کو مجبور کون کرتا ہے" سیمون نے ترش روئی سے کہا "جناب کو تو اس وقت دولت خانہ میں رہنا چاہئے تھا"

"گھر میں دل نہیں لگتا ہے بابا۔ مجھ کو تو گھر میں وحشت معلوم ہوتی ہے"

سیمون کے بازو کھڑے ہوئے وہ مضبوط اور شکیل نظر آتا ہے۔ لیکن اس کی چال ڈھال سے کچھ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ اس کی زندگی میں کسی چیز کی کمی ضرور ہے جس کی وجہ سے وہ آزردہ خاطر اور ضعیف نظر آتا ہے، اور بربادی کی راہ پر چلا جا رہا ہے۔ یکایک اس میں اندرونی کشمکش شروع ہو گئی۔ ماریا وسیلیونا کا دل اس شخص کے لئے دہشت اور خوف سے بھر گیا۔ جو خواہ مخواہ بلا وجہ تباہی کے منجدھار میں بہا چلا جا رہا ہے، اور اس کے دماغ میں یہ خیال آیا کہ اگر وہ اس کی

بیوی یا بہن ہوتی تو اس کو تباہی و بربادی سے بچانے کی خاطر اپنی پوری زندگی وقف کر دیتی۔ اس کی بیوی! ان کی زندگی اس نہج پر چل رہی تھی کہ وہ باوجود اپنے وسیع مکان کے تنہا بود و باش کرتا ہے اور بیوی ایک خوش گاؤں میں اکیلی پڑی رہتی ہے۔ اس پر بھی محض اس قسم کا تصور کہ کبھی وہ اور یہ مساوی حیثیت سے ایک دوسرے کے قریب رہیں گے ناممکن اور بعید از قیاس معلوم ہوتا۔ حقیقت میں زندگی کے روابط و ضوابط، انسانی تعلقات ایسے پیچیدہ اور ناقابل فہم اصول قائم کئے گئے ہیں کہ جب کبھی کوئی ان پر سنجیدگی سے غور کرتا ہے تو نہ صرف یہ سب غیر معقول ہوتے ہیں بلکہ ان کے اثرات سے اس کا دل بیٹھا جاتا ہے۔

"یہ چیز سمجھ سے بالکل باہر ہے" ماریا نے سوچا "اللہ تعالیٰ کمزور، بدقسمت اور ناکارہ لوگوں کو حسن، خوبی، نمکین خوشنما آنکھیں کس لئے عطا کرتا ہے —— اور وہ لوگ اس قدر دلکش کیوں ہوتے ہیں۔"

"یہاں ہمیں دائیں جانب مڑنا چاہئیے" یہ کہتے ہوئے ہنا وہ اپنی گاڑی میں سوار ہو گیا۔

"خدا حافظ! میری یہ عین آرزو ہے کہ تمہیں ہر طرح کی خوشی نصیب ہو"

اس کے بعد پھر وہ اپنے مدرسے اور شاگردوں کے معاملات میں غرق ہو گئی۔

اس کی بیوی! صبح میں کڑاکے کی سردی رہتی، کوئی چولہا جلانے والا موجود نہیں، چوکیدار بھی غائب، بچے علی الصبح کیچڑ اور برف سے لدے چلے آتے اور شور پکار سے مدرسہ سر پر اٹھا لیتے۔ یہ سب کس قدر مصیبت اور تکلیف دہ ہے۔ اس کے رہنے کے لئے ایک کمرہ اور ساتھ ہی باورچی خانہ لگا ہوا تھا۔ کام کرنے کے بعد روزانہ اس کے سر میں درد شروع ہو جاتا، اور کھانے کے بعد اس کے دل میں سوزش رہتی۔ اس کو لکڑیوں، چوکیدار اور

سرپرست کے لئے مدرسے کے بچوں سے پیسے
اس پر بھی اس تند مزاج اور بیٹ بھرے دماغ
پڑتی —— کہ برائے خدا لکڑیاں
کسانوں، برف باری، اور راستی اتنی
اس قسم کی زندگی اس کو قبل از وقت ضعیف
لے جا رہی تھی اور ساتھ ہی روز بروز
گوشہ نشین بنتی جا رہی تھی۔ یہ ہمیشہ
مجلس کا کوئی رکن یا مدرسے کا سرپرست
نشست پر بیٹھے رہنے کی ذرا جرأت نہ
کھڑی ہوتی۔ اور جب ان میں سے کسی سے بات چیت
اتفاق ہوتا تو رسمی آداب و احترام کے
کرتی۔ اس کی زندگی بے کیف تھی، کرنی چاہیے
یا غمگسار نصیب نہیں، اور کوئی اس کی طرف توجہ
ان حالات میں اگر آپ کسی کی محبت میں گرفتار
انجام کس قدر بھیانک ہوتا!

"سنبھل بیٹھو وسیلیو نا!"

دوبارہ پہاڑی پر ایک خوفناک مقام سے
اس کا معلمہ بن جانا کسی کی خواہش
خود اپنی احتیاج و ضرورت کا منت کش تھا۔ یہ خیال
کبھی نہیں گذرا کہ ملازمت کے لیئے خاص طور
بلائے گا، نہ اس کے پیش نظر کبھی یہ مسئلہ رہا کہ تہذیب
کی خدمات انجام دی جائیں۔ اپنے فرائض کی انجام
اس کے پاس ترویج شائستگی اور بچوں کی اتنی
نہ تھی جتنی کہ امتحانات کی فکر۔ شائستگی کی خدمت
کی نظر میں اپنی قدر و منزلت کے متعلق سوچ بچار کرنے کے
اس کے ہاں وقت ہی کیا بچتا تھا۔ مدرسین، معلمات
اور ان کے مددگار، جن کی تنخواہیں ان کی حوائج اور

...قابل کم ملتی ہوں، جن کو اپنے فرائض میں سخت محنت و مشقت
...رنی پڑتی ہو، انہیں یہ سوچنے کا بھی موقع نہیں ملتا کہ وہ ایک
...لی شعبۂ زندگی میں مصروف ہیں، یا کہ لوگوں کی اعلیٰ ترین خدمت
...ن کا شریف مشغلہ ہے، چونکہ رات دن، اپنے زور کی
...دلی آگ کے لئے لکڑیاں، ناہموار و ناقابل گذر راستے
...ور امراض جیسے امور کے غور و فکر میں ان لوگوں کے دل و دماغ
...گے رہتے ہیں۔ اس طرح کی زندگی ایک آفت اور کشمکش کی زندگی
...ہوتی ہے، جس میں کوئی دلچسپی و وابستگی کا نام و نشان بھی نہیں
...ہوتا۔ ایسے حالات میں، خاموش، صابر، لدو جانور ہی زندگی
...بسر کر سکتے ہیں، جیسے کہ ماریا وسیلیونا کی زندگی گزر رہی
...تھی۔ ورنہ خوش مزاج، شوقین اور نازک مزاج والے
...جو تہذیب اور خدمت کے متعلق عموماً بڑی بڑی ہانکتے ہیں
...یہاں تو ایک دن بھی نہیں ٹک سکتے اور ملازمت کو بالائے طاق
...رکھ الٹے پیر چمپت ہو جاتے ہیں۔
سیمون راستہ کاٹ کاٹ کر منزل مقصود کی دوری میں
...کمی کرتا چلا جا رہا تھا۔ کبھی میدانوں میں سے کبھی گاؤں کی
...جھونپڑیوں کے عقب سے، کہیں کسان اس کو منع کرتے،
...کہیں پادری صاحب کا کھیت آجانے کی وجہ سے دوسرا
...رخ اختیار کرنا پڑتا اور کہیں تو عین راستے میں کسی نے
...زمین خرید لی اور حفاظت کے لئے اطراف سے کھائی کھود رکھی۔
...غرض اسی طرح مڑتے ہٹتے بڑھتے چلے جا رہے تھے۔
یہ لوگ تیز نے گور ووتش (ایک مقام) پہونچ گئے۔
...سرائے کے قریب اطراف و اکناف میں زمین گوبر اور برف
...سے لت پت ہے، یہاں بڑی بڑی گاڑیاں کھڑی ہیں،
...ان میں متعفن گندک کے تیزاب کی بڑی بڑی بوتلیں لائی
...گئیں۔ سرائے میں بہت سارے لوگ جمع ہیں۔ تقریباً سب
...مزدور ہیں۔ اندر ووڈکا (ایک معمولی شراب)، تمباکو اور

اور بھیڑوں کے چمڑوں کی بو پھیلی ہوئی ہے۔ آپس کی گفتگو اور
جھولتے ہوئے دروازوں کی وجہ سے وہ شور غل مچا ہے کہ
کان پڑی آواز سنائی نہیں دیتی۔ کان کے اندر کانسرٹینا
(ایک قسم کا باجا) کی آواز بغیر ایک لمحہ رکے، دیواروں کے
باہر سنائی دے رہی ہے۔ ماریا وسیلیونا نے اپنی نشست
سنبھالی اور تھوڑی سی چائے پی، بازو کی میز پر کسان
ووڈکا اور بیئر کے دور چلا رہے تھے، چائے کی گرمی
اور سرائے کے دھوئیں کی وجہ سے یہ سب پسینے میں نہا
رہے تھے۔

"کرتا میں جو کہہ رہا ہوں پہلے سنو!" مختلف آوازوں
کی چیخ پکار سے گڑ بڑ مچی ہوئی تھی۔ "وہاں کیا ہو رہا ہے!"
"ہم پر خدا کا فضل ہو جائے!" "یون ڈینچ میں تمہیں وہ
سب بتا سکتا ہوں!" "ارے میاں تلاش کرو!"
ایک شخص نے جس کے چہرہ پر پھنسیوں کے نشانات،
جس کی داڑھی بالکل سیاہ، اور نشہ میں مست، یکایک کسی
چیز سے برافروختہ ہو کر فحش بکنا شروع کر دیا۔
"کیا بیہودہ باتیں کر رہے ہو، اور کس کی قسم کھا رہے
ہو؟" سیمون جو کچھ دور بیٹھا ہوا تھا، گرجتے ہوئے کہا۔ "کیا
تمہیں نوجوان خاتون نظر نہیں آ رہی ہیں؟"
"نوجوان خاتون!" کسی نے ایک گوشہ میں ہنسی اڑائی۔
"اڑائی ہوئی بلبل ہے!"
"ہمارا کوئی منشا نہیں تھا۔۔۔۔" مخمور آدمی نے حواس
باختہ حالت میں کہا۔ "معاف کیجئے یہاں ہم اپنا روپیہ خرچ
کرتے ہیں، اور نوجوان خاتون بھی اپنے پیسے خرچ کرتی
ہیں۔ آداب عرض ہے!"
"آداب!" معلمہ نے جواب دیا۔
"ہم تہہ دل سے شکریہ ادا کرتے ہیں!"

ماریا وسیلیونا نے اطمینان سے چائے پی، اور پھر بھی
کسانوں کی آمد سرخ ہونے لگی، پھر جلانے کی لکڑی اور چوکیدار
کے متعلق سوچ میں پڑ گئی۔
"ٹھیر جاؤ بڑے میاں" اس کے بازو کی میز سے یہ آواز
سنائی دی۔ یہ دیازو (مقام) کی معلمہ ہے...... ہم اس کو
بخوبی جانتے ہیں، یہ ایک نہایت شریف نوجوان خاتون ہے"
"تب تو ٹھیک ہے!"
جھولتے دروازہ مسلسل آواز آرہی ہے، کوئی آرہے
ہیں۔ کوئی جارہے ہیں۔ کنسٹنٹینا بھی چلا جا رہا ہے۔ اب دوپہر
کا وقت آگیا۔ کسانوں نے جو دوسری میز پر بیٹھے تھے کوچ کی تیاری
شروع کردی مخمور آدمی جو کچھ بے قابو تھا، ماریا کے قریب پہونچا اور
اپنا ہاتھ بڑھا دیا، اس کی تقلید کرتے ہوئے اور لوگ بھی اس
سے مصافحہ کرکے رخصت ہوئے۔
"سیلیونا، تیار ہو جاؤ" سیمیوں نے اس سے
خطاب کیا
وہ یہاں سے روانہ ہو گئے۔ رفتار بہت دھیمی تھی۔
"کچھ عرصہ پیشتر ہٹر نے گوروڈش کے باشندے ایک مدرسہ
تعمیر کر رہے تھے" سیمیوں نے پلٹ کر کہا۔ لیکن جو کچھ ہوا،
وہ بہت برا ہوا!"
"کیوں کیوں کیا بات ہے؟"
"لوگ کہتے ہیں صدر صاحب نے ایک ہزار، اور
مدرسہ کے نگراں کار صاحب نے ایک ہزار اور خیر سے مدرس صاحب
نے پانسو اپنی اپنی جیبوں میں خاموشی سے اتار لئے۔"
مدرسہ کی پوری لاگت زیادہ سے زیادہ صرف ایک ہزار
ہوگی۔ لوگوں پر تہمت لگانا، گناہ ہے، نانا۔ یہ سب فضول
باتیں ہیں۔"

"تو بھائی میں کیا جانوں...... میں نے جو کچھ
لیکن یہ تو ظاہر ہے کہ معلمہ کی باتوں پر
نہیں کیا۔ کسان بھی اس پر اعتماد نہیں کرتے تھے
خیال تھا کہ اس کو معقول تنخواہ ملتی ہے،
(ایک سکہ)، گویا پانچ کافی ہیں نیز مدرسہ کے
اور نگہبان کے لئے جو پیسے جمع کرتی ہے اس کا ایک
خود دبا دیتی ہے۔ سرپرست کا بھی کچھ ایسا ہی
خود سرپرست حکام کی لاعلمی سے ناجائز فائدہ اٹھا کر
کو لکڑیاں بیچتا اور خوب کماتا تھا۔
شکر ہے کہ اب یہ لوگ گھنے جنگل سے نکل کر
آگئے یہاں سے ویازو تک بالکل کھلا میدان ہے زیادہ
بھی جانا نہیں ہے۔ اب انھیں ندی اور ریلوے لائن
باقی ہے اس کے بعد تو بس یازو نظروں کے سامنے
"کس طرف ہانک رہے ہو؟" ماریا نے سیمیوں
دریافت کیا۔ وہ دائیں طرف سے پل کی جانب
"کیا ہوا" اس راہ سے بھی ہم چل سکتے ہیں
نہیں ہے کہ کچھ اندیشہ ہو۔"
"دیکھو کہیں گھوڑا ڈوب نہ جائے۔"
"کیا؟"
"دیکھو دیکھو ہنا، گاڑی میں بیٹھے ہوئے پل پر
رہے ہیں" سیدھے طرف دو چار گھوڑوں کو دیکھ کر ماریا نے
"میرے خیال میں یہ وہی ہیں"
"ہاں وہی تو ہے۔ معلوم ہوتا ہے کہ کوسرے سے مکان
پر ملاقات نہیں ہوئی۔ یہ کیسا خر دماغ آدمی ہے۔ اللہ ہم
فضل نازل کرے! آخر وہ اس طرف سے جا کیوں رہا ہے
اس راہ سے تو پورے دو میل کی قربت ہو جاتی ہے۔"

یہ دریا لینگ پہونچ گئے جو گرما میں چھوٹا سا نالا بن جاتا ہے
کو آسانی سے پار کیا جاسکتا ہے یہ ماہ اگسٹ میں عموماً خشک
جاتا ہے لیکن اس وقت بہار کی کچھ طغیانیوں کی وجہ چالیس
چوڑائی سے بہہ رہا ہے۔ پانی کی دھار تیز، سرد اور کیچڑ آلود ہے
کناروں پر پہیوں کے تازہ نشانات نظر آرہے ہیں۔
سے پتہ چلتا ہے کہ ابھی ابھی گاڑیاں یہاں سے پار ہوی ہیں
چلو آگے بڑھو! سیمون لگام کو زور سے کھینچے، اور
ٹہنیوں کو ہلاتے ہوئے جس طرح کہ پرندے اڑتے وقت
بازو تولتے ہیں، کچھ تیزی دہراسانی سے چلانے لگا۔ "چلو بڑھو
بڑھنے لگا کا پانی اس کے پیٹ تک پہونچ گیا، یہاں
آرام لیا اس کے بعد بڑی جد و جہد سے آگے چلنے لگا
اپنے پیروں سے چبھتی ہوئی سردی محسوس ہو رہی تھی
"چلو بڑھو!" وہ بھی اُٹھ کر چلائی، "بڑھو چلو!" آخرکار وہ
سے پر جا پہونچے۔
کیا عمدہ پنگھٹ ہے، اللہ رحم و کرم کرے!" گھوڑے
ساز و سامان درست کرتے ہوئے سیمون نے کہا۔۔۔۔
اس مقام میں یہی ایک مصیبت ہے۔۔۔۔"
ماریا کے جوتے، پائتابے پانی سے بالکل بھیگ گئے
کے لباس کا نچلا حصہ اور کوٹ اور آستین اس قدر تر
ان میں سے پانی ٹپک رہا تھا۔ لیکن ان سب سے
تکلیف دہ واقعہ یہ ہوا کہ شکر اور آٹا بھی پانی پانی ہوگیا
مایوسی کی حالت میں اپنے ہاتھ ملتے ہوئے ماریا صرف
کہہ سکی:
"او سیمون تم کس قدر نقصان رساں ہو، ہاں
۔۔۔۔"
سڑک سے ریل کی پٹری گذرتی ہے، اسٹیشن سے

گاڑی رہی تھی اسی لیئے دروازے بند کر دیئے گئے۔
ماریا دسیلیونا تو سردی کے مارے کانپ رہی تھی، گیٹ
کے قریب کھڑی ہوگئی تاکہ ریل چلی جائے تو آگے بڑھے۔ دیا رو
اب تو نظروں کے سامنے ہے مدرسہ اور اس کی سبز چھت،
گرجا جس کی صلیبیں سہر کی دھوپ سے چمک رہی ہیں، اسٹیشن کے
دریچے بھی چمک رہے ہیں: انجن سے سیاہ دھواں نکل رہا ہے۔
اس کو ایسا محسوس ہوا کہ سب چیزیں سردی سے تھر
تھرا رہی ہیں
ٹرین آگئی، اس کی کھڑکیاں ایسی چمک رہی ہیں جیسی
کہ گرجا کی صلیبیں ان کی طرف دیکھنے سے اس کی آنکھوں
میں تکلیف ہوئی۔ درجہ اول کے دو ڈبوں کے درمیان
چھوٹے سے پلاٹ فارم پر ایک خاتون کھڑی ہوئی تھی۔
جب وہ سامنے سے گزری تو ماریا نے اس کو دیکھ لیا۔ اس
کی ماں! کیا غضب کی مشابہت ہے! اس کی ماں کے بھی
اسی طرح گھنے بال خمدار ابرو اور خوبصورت گردن تھی۔ ان
تیرہ سالوں میں آج پہلی مرتبہ، اس کی ماں، باپ بھائی
اسکو کی وسیع عمارت اور حوض کی چھوٹی مچھلیاں، یہاں
تک کہ ہر چھوٹی سی چھوٹی چیز جیتی جاگتی چلتی پھرتی آنکھوں
میں نظر آئی، پیانو کی صدا اور اپنے باپ کی آواز نہایت
صاف طور سے سنائی دی اور اس وقت اس کو کچھ ایسا
معلوم ہوا کہ وہ پہلے کی طرح نوجوان اور حسین ہے، اور
ایک آراستہ، گرم کمرہ میں اپنے چہیتے عزیزوں کے ساتھ
موجود ہے خوشی و مسرت کا ایک لطیف احساس اس کے
دل و دماغ اور جسم پر چھا گیا، ایک مدہوشی کے عالم میں اس
نے اپنے ہاتھ سے کنپٹیوں کو خوب دبایا
اور نہایت درد بھرے ۔۔۔۔۔۔۔۔۔

جگر خراش، رقت انگیز لہجہ میں اس نے آواز دی،

"ماں!"

اور رونا شروع کر دیا، جس کی وجہ سے وہ خود لاعلم تھی۔

عین اسی لمحہ، ہناؤ اپنے چار گھوڑوں کی گاڑی میں یہاں آ پہونچا۔ اس کو دیکھتے ہی مارینا نے اپنے میں کچھ ایسی خوشی و خرمی محسوس کی کہ اس قسم کا تصور اس کو پہلے کبھی نہیں ہوا۔ اس نے اپنے ہم مرتبہ اور ایک دوست کی حیثیت سے سر تسلیم خم کیا، اور وہ پھول کی طرح مسکرا دی، اور اس کو ایسا معلوم ہوا کہ حقیقی خوشی اور سچی کامیابی چاروں طرف آسمان پر دریچوں پر بلکہ ہر درخت کی پتی پر خنداں اور شادماں نظر آ رہی ہے۔ گویا اس کے والدین کا انتقال ہی نہیں ہوا، وہ کبھی مغلمہ نہیں رہی، اور ان واقعات کی حیثیت ایک طویل دردانگیز اور عجیب و غریب خواب کی سی ہے۔ لیکن اب ... خواب پریشاں سے بیدار ہو چکی ہے

"وسیلیونا سوار ہو جاؤ!"

پلک جھپکتے ہی ساری چیزیں غائب ... آہستہ سے کھل گیا۔ مارینا وسیلیونا سر ... کانپتی ہوئی گاڑی میں سوار ہو گئی۔ چار گھوڑوں ... گاڑی نے ریل کی پٹری کو پار کیا، سیمون پیچھے ... رہا تھا۔ سگنل والے نے اپنی ٹوپی اتار دی۔

"دیا زو آ گیا۔ اب ہم یہاں پہونچ گئے ..."

(انطون چیخوف)

(ترجمہ) ایس. بی. ...

بیوہ

ہے خموشی فضا پہ چھائی ہوئی
چاند کو بھی ہے نیند آئی ہوئی

چل رہی ہے بہت ہی سرد ہوا
جسم کو کاٹتا ہے ہر جھونکا

ہے ہر اک گھر کا بند دروازہ
نہیں باہر نکلنے کا یارا؟

گرم ملبوس ہر بدن پر ہے
گرم اور نرم سب کا بستر ہے

گرم سب نے لحاف اوڑھا ہے
سب نے سردی سے منہ کو موڑا ہے

اک مکاں ہے بہت شکستہ حال
زندگی جس میں ہو بشر کی محال

ٹوٹی پھوٹی ہے چار دیواری
جس کے کاندھوں پہ چھت بھی ہو بھاری

ایک ٹوٹا لگا ہے دروازہ
جس کا اک پٹ ہے بند اک ہے کھلا

اس قدر ہے مکاں میں ویرانی
گم جہاں ہوں حواس انسانی

شمع اک اس میں ٹمٹماتی ہے
شاید اس کو بھی نیند آتی ہے

شمع کو آگے رکھ کے اک دکھیا
نہیں احساس جس کو سردی کا

سر کو اپنے جھکائے بیٹھی ہے
نو کسی سے لگائے بیٹھی ہے

آنکھ میں ڈبڈبائے ہیں آنسو
روتی ہے شمع بے کسی پہ لہو

دوش پر بال سب پریشاں ہیں
جو کہ خود اک دلیل ہجراں ہیں

تن پہ ساڑی ہے اک غبار آلود
ہے ساری عدم کے ...

اس قدر اس میں ہیں لگے پیوند
اب رفو کی نہیں ہے ...

میلا میلا ہے جسم کا کرتا
اور وہ بھی جگہ جگہ سے ...

آستیں پرزے اور گریباں چاک
ہے سراپا شبیہ ...

ہے شبیہ علم نشست اس کی
اک چٹائی بچھی ہوئی ...

ایک کمبل ہے جو بہت ہی خراب
جس پہ ہیں وہ یتیم ...

شکل دونوں کی پیاری پیاری ہے
جن پہ چھوٹ و ہراس طار...

لے کے معصوم ہاتھ بھائی کا
سینے پر رکھ کے سو...

ماں اڑھائی ہے ایک چھوٹی ردا
جس میں سوراخ ہیں ...

ننھے چہروں پہ چھائی ہے زردی
ہائے کتنی شدید ...

ہائے تقدیر کے یہ مارے ہیں
جیسے بدلی میں چاند ...

شمع اس غم کا دیکھ کر منظر
نہ رہا ضبط بجھ گئی آ...

ساری مخلوق ہے کہ سوتی ہے
ایک بیوہ ہے جو کہ روتی ہے

زاہد ...

شاد عظیم آبادی کا ایک خط

(سید ہمایوں مرزا مرحوم کے نام)

جناب اخی محترم روحی فداکم! تسلیم و دعائے ترقی عمر و اقبال

نامۂ گرامی سرمۂ چشم منتظر ہوا شکریہ قبول فرمائیے۔ بھائی اب ضعف پیری طویل طویل تحریروں کی اجازت نہیں دیتی۔ ہوں ہوں۔ میں ہی ہوں جس نے بیک وقت مختلف اوزان کی غزلوں پر دس منٹ میں پندرہ پندرہ غزلوں پر اصلاحیں دیں اور اب یہ حالت ہے کہ لکھنؤ ...دیہ دہلی وغیرہ وغیرہ کے احباب کی سیکڑوں غزلیں دھری سڑتی ہیں تقاضے سن رہا ہوں اور اصلاح کی ہمت و طاقت نہیں ہے۔ اللہ تعالیٰ خوب آگاہ ہے کہ اس عمر میں اب مجھ کو کسی بات کا نہ شوق ہے نہ ولولہ بقول اپنے ؎ خوش تھے افلاس میں بھی ہائے جوانی مرحوم اس بڑھاپے میں خزانے بھی اگر پائے تو کیا البتہ یہ تمنا ضرور ہے کہ سید صاحب سلمہٗ کی اولاد کے لئے اگر کچھ ہو جائے تو بڑی بات ہے۔ عزیز گرامی قدر فخر قوم و ملت سید علی امام صاحب کو اگر موقع ملے گا تو شاید وہ کوئی صورت کریں گے ورنہ بچوں کی تقدیر۔ جب ساری عمر میری گزر چکی اور کچھ نہ ہوا تو اب جب کہ گنتی کے دن زندگی کے رہ گئے ہیں کیا امید ہو سکتی ہے۔ میں نے گذشتہ نیاز نامے میں فقط اس امر کی استدعا کی تھی کہ مولی الیہم کی خدمت میں دو برس ہوئے جو مثنوی حاضر کی ہے اس کا بجنسہ مسودہ جاتا رہا اس کے علاوہ جا بجا اس کے مضامین کی اصلاح مدنظر ہے تین مہینے ہوئے کہ بار بار یاد دہی کی پھر دو عریضے اخوی وکیل حضرت مولائی نواب اثر مدظلہٗ کی جناب میں بھیجے مگر کسی کا جواب نہ ملا گھبرا کر آپ کو زحمت دی ممکن ہے کہ کشاکش علالت و سفر کے سبب سے اس کا پتہ نہ ہو اگر یہ بھی معلوم ہو جائے تو اطمینان سے اسی مسودہ نامرتب کو مرتب کر دوں تاکہ کتاب ادھوری نہ رہے آپ نے اس کا جواب کچھ نہ دیا۔ ایسا سنا ہے کہ حیدرآباد میں خطوط کھول کر پڑھ لئے جاتے ہیں اس لئے میں یکسر اپنے ہر دل عزیز گرامی قدر سلمہٗ کو کچھ لکھ بھی نہیں سکتا۔

میرے پیارے بھائی اب مجھ کو ہر طرح سے مایوسی ہے اور کوئی چیز چھپے یا نہ چھپے مگر اپنی سوانح عمری جو خود اپنے قلم سے لکھی ہے اور جس کے چھاپ دینے کو وصیت کر دی ہے انشاء اللہ میرے چہلم کے اندر چھپنا شروع ہوگی اس کو پڑھ کر آپ بہت روئیں گے۔

کل باہمہ ضعف و اختلاج قلب ڈاکٹر مشتاق علی صاحب کے سخت اصرار اور سخت تر کوشش کے سبب سے غالباً ایک برس بعد مجلس میلاد جناب امیرؑ میں ایک مسدس پڑھنا پڑا تین سو بند کا مسدس ہے۔ خدا جانے کیونکر دو گھنٹے تک پڑھا ڈیڑھ ہزار آدمیوں سے کم نہ تھے۔ شاید ہی کوئی ایسا ہو جو شریک نہ ہو ورنہ جتنے اعیان قدیم و جدید ہیں سب تھے آپ شریک ہوتے تو دیکھ کر خوش ہوتے۔ جن جن لفظوں میں میری تعریفوں کا شور تھا یہ وہی عظیم آباد ہے جو آج میرے قدم قدم پر نثار ہو رہا ہے ابھی تو خیر جب مر جاؤں گا تب دیکھئے گا کہ یہی پٹنہ انشاء اللہ میری قبر کو پوجے گا۔ اگر ایسا نہ ہوا تو آپ مجھ کو ناقص سمجھئے گا میری فخر خواتین بھاوج کو میری دعائیں کہہ دیجئے۔ موقع ہو تو اس مثنوی کے بارے میں میرے غمخوار فخر روزگار عزیز سے یوں فرمائیے گا کہ ایک مثنوی جو آپ کے ملاحظہ کے لئے حاضر کی تھی اگر جلد بھیج دی جائے تو صاف کروا کر اپنے تصانیف میں داخل کر دوں سید سلمہٗ اور ان کے بچے قدم بوسی بجا لاتے ہیں۔

تمہارا جان نثار دعاگو

سید علی محمد شاد

۴ شعبان سنہ ۱۳۳۰ھ

پٹنہ سٹی

عطیۂ صغریٰ بیگم ہمایوں مرزا مرحوم

بارگاہِ مصطفوی میں

اے بانیٔ اسلام! دلِ قبلہ نما دے — ان لوٹے ہوئے نالوں کو پھر آہِ رسا دے
جو خوگرِ لا ہیں انھیں الّا کا پتا دے — بھولے ہوئے اسباقِ کہن یاد دلا دے
پھر مصطفویؐ شان زمانے کو دکھا دے

کیا دیکھ رہا ہے ابھی؟ اسلام کے والی! — دنیا ترے پیغام سے ہونے کو ہے خالی
میخانہ لٹا، رہ گیا اک جامِ سفالی — ڈھائی ہوئی تعمیر نئے سر سے بنا دے
پھر مصطفویؐ شان زمانے کو دکھا دے

تاویل کے پھندوں میں ہے جکڑا ہوا قرآں — تہذیب کے اُلجھاؤ ہیں، اُلجھائے [illegible]
سینوں سے لرزتا ہوا، رخصت ہوا، ایماں — اے ہادیٔ برحق! ہمیں پھر اپنا بنا دے
پھر مصطفویؐ شان زمانے کو دکھا دے

تنو بر گئی قوم کے اربابِ نظر سے — مرعوب ہوئے جاتے ہیں اعدا کے اثر سے
خیرات بھی پانے لگے اشرار کے در سے — دے ہوش انھیں، یا ابدی نیند سلا دے
پھر مصطفویؐ شان زمانے کو دکھا دے

کٹھ پتلی بنے دین و مذاہب کے پجاری — آوارہ و سرگرداں ہے اب قوم بچاری
اُمت پہ تری حالتِ سکرات ہے طاری — جی اُٹھے یہ، ایسی کوئی اکسیر پلا دے
پھر مصطفویؐ شان زمانے کو دکھا دے

پیدا ہو یہاں پھر کوئی فاروقؓ کہ حیدرؓ — یا بھیج دے، پھر خالدؓ و ٹیپو کو مکرر
طارق کا جگر، جرأتِ ایوبی عطا کر — جاں بازیٔ شبیرؓ تن آساں کو سکھا دے
پھر مصطفویؐ شان زمانے کو دکھا دے

پھر جذبۂ ایمان پرستی کو جگا دے — پھر نعرۂ تکبیر کی تفسیر سنا دے
پھر قلبِ غنی، ماحصلِ بیم و رجا دے — پھر اپنے مسلماں کو مسلماں بنا دے
پھر مصطفویؐ شان زمانے کو دکھا دے

بشیر النسا بیگم بشیر

مختصر افسانہ

میں بھی وہاں سیر کو جاتا تھا۔ اور لوگ بھی آتے تھے اور وہ دونوں بھی آیا کرتے تھے۔ جوڑا ۔۔۔ وہ دونوں بانہوں میں بانہیں
لے آہستہ آہستہ ٹہلتے ہوئے آتے تھے ۔۔۔ مسرت ان کے چہروں پر رقص کرتی تھی۔ بات بات پہ مسکراتے۔ ہری ہری گھاس پہ بیٹھ
تے۔ گھومتے پھرتے۔ سر ٹکنے والی موجوں کا نظارہ کرتے۔ پھولوں سے لدی اور وجد کرتی ہوئی ڈالیوں سے کھیلتے۔ پھر ایک ایک
ول توڑ کر سونگھتے ہوئے آہستہ آہستہ واپس چلے جاتے۔

وہ بڑے نیک تھے ۔۔۔ ان کے آتے ہی فقیر صدا لگاتا "خدا تمہاری جوڑی کو سلامت رکھے بابا ۔۔۔ دیتے جانا مائی باپ کچھ۔"
بھی کبھی وہ مسکرا کر ایک دوسرے کو دیکھتے اور پھر نظریں نیچی کر لیتے ۔۔۔ ایک چمکدار سکہ فقیر کے ہاتھ میں گر پڑتا

یونہی بہت دن گذر گئے ۔۔۔ لیکن ایک دن وہ نہیں آئے ۔۔۔ دوسرے دن بھی نہیں ۔۔۔ کئی دن تک نہیں ...
گذر گئے ۔۔۔ ایک مہینے ۔۔۔ وہ نہیں آئے۔

"سائیں جی! اب وہ نہیں آتے" میں نے فقیر سے کہا۔

"ہاں بابا!" فقیر نے کہا "بڑے نیک تھے وہ ۔۔۔ مجھے روز کچھ نہ کچھ دے جاتا ۔۔۔ بہت دنوں سے انھوں نے آنا چھوڑ دیا ہے
نے کیا بات ہے ۔۔۔ یا کہیں جاتے ہوں گے ۔۔۔ یہی ایک تفریح گاہ تو نہیں ہے ایک ہی جگہ سے اکتا گئے ہوں گے ۔۔۔"

ہم انھیں تقریباً بھول چکے تھے ۔۔۔ میں بھی اور فقیر بھی ۔۔۔ کہ ایک دن وہ آیا ۔۔۔ اکیلا آہستہ آہستہ قدم اٹھاتا ہوا ۔۔۔
نے نہ پانی کی سر ٹکرانے والی موجوں کی طرف پلٹ کر دیکھا نہ رنگ برنگ کے پھولوں سے لدی ہوئی ڈالیوں کی طرف ۔۔۔
کی نظریں جھکی ہوئی تھیں اور اس کے چہرہ پر افسردگی تھی ۔۔۔ انتہائی افسردگی ۔۔۔ وہ کسی خیال میں منہمک تھا اور
چل رہا تھا جیسے کسی نامعلوم منزل کی طرف جا رہا ہو جہاں پہنچنے کی نہ اسے خواہش ہے نہ جلدی ۔۔۔ فقیر اسے دیکھ کر چونک پڑا ۔۔۔
اس نے وہی آواز لگائی "خدا تمہاری جوڑی کو سلامت رکھے بابا ۔۔۔ دیتے جانا غریب کو بھی کچھ"
وہ ایک دم چونک سا پڑا ۔۔۔ ایک چمکدار سکہ فقیر کے ہاتھ پر گرا ۔۔۔ اس کے ساتھ ساتھ ایک گرم قطرہ بھی ۔۔۔ فقیر نے
ا کر دیکھا تو اس کی آنکھیں آبدیدہ ہو چلی تھیں۔

محمد دلاور خاں مہدوی

جنگل میں ایک صبح

جنگل میں حسنِ فطرت جادو جگا رہا ہے — خورشیدِ عالم آرا موتی لٹا رہا ہے

آہستہ رو ہوائیں نغمے مچل رہے ہیں! — خوابیدہ تھے جو چشمے تھم تھم کے چل رہے ہیں

سبزہ لہک رہا ہے غنچے چٹک رہے ہیں! — اک موجِ سرخوشی میں پودے لچک رہے ہیں

اک نور کا سا عالم کھیتوں پہ چھا رہا ہے! — میں اُن کو دیکھتا ہوں اور وجد آ رہا ہے!

گرمِ عمل ہے ان میں اب بھی غریب دہقاں — ہے جس کے بازوؤں میں ہستی کا راز پنہاں

پھولوں میں اک تبسم ذروں پہ اک تجلی — بیدار ہو رہا ہے سویا ہوا تخیل!!!

موتی ڈھلک رہے ہیں پتوں پہ جھاڑیوں کے — آنکھوں میں کھپ رہے ہیں منظر پہاڑیوں کے

خارِ غمِ زمانہ دل سے نکل رہا ہے!! — طوفانِ شعر و نغمہ پیہم ابل رہا ہے

خونِ بہار رقصاں ہے نبضِ خار و خس میں — مرغِ اسیر گویا آزاد ہے قفس میں

ہر سانس میں کچھ ایسا محسوس ہو رہا ہے — سینے میں حسنِ پنہاں نشتر چبھو رہا ہے

چونکے ہوئے ہیں دل میں احساس کے ترانے — آنکھوں پہ کھل رہے ہیں عرفان کے خزانے

اللہ! یہ مناظر یہ حسنِ شادمانی
باور ہوا مجھے بھی اک شے ہے زندگانی

کاوشؔ

غزل

مجھے وہ دیکھتے ہی مسکرائے — مری قسمت کہاں سے کوئی لائے

فلک سے پھر کہو بجلی گرائے — بڑی مدت ہوئی نظریں ملائے

زمیں تو کیا فلک بھی گونج جائے — اگر وہ ہولے ہولے گنگنائے

اسے کہتے ہیں تاثیرِ محبت — لبوں پر نام آیا تھا کہ آئے

گئی گذری ہوئی باتیں نہ چھیڑو — کہاں تک کوئی دل اپنا دکھائے

جگرؔ ان کی نظر ہے مرنا جینا — بڑی مشکل سے دونوں ہاتھ آئے

محبوب جی[illegible]

ویرانہ

ویرانہ؟

جو دل آرزوؤں اور تمناؤں سے نا آشنا ہو اس کا نام ویرانہ ہے۔

لیکن ع

تم کہو تو اس کو پھر آباد کر لیتا ہوں!

اور وہ بھی شاید اس لیے کہ ع

دلِ دوستاں سلامت کہ تو خنجر آزمائی!

میرے دوست!

جب زندگی خود ایک ویرانہ ہو تو پھر آبادیوں کی جستجو سے حاصل؟
ملمع کاری کب تک فریب نظر ہو گی جھوٹے نگینوں کی آبداری پر کوئی کب تک بھولے حقیقت تو آشکار ہو کر رہے گی۔
حرص وہوس، لالچ اور فریب کاری یہی تو بستیوں کا میوہ ہے۔

دوست!

اُٹھ! ہم کسی ویرانے کو چل کر آباد کریں۔ جو عورت کی فسوں سازیوں اور عشوہ طرازیوں سے پاک ہو۔
عورت! کتنا پیارا نام ہے لیکن اگر کوئی اسے حلقۂ زنجیر کہدے تو پھر دنیا اور عورت! دنیا کا تمر عورت اور عورت کی محبت سے زندگی کامران۔ لیکن ایک بے ثبات دوسری سیماب صفت۔

ہمنشیں!

چل کوئی ویرانہ تلاش کریں جس کی مشاطگی قدرت کرتی ہو۔ وہ جگہ جو اصل فطرت کے مطابق ہو جس کے من کی دنیا آباد وہ شاد کام! جس کے من کی دنیا ویران وہ نامراد۔ اگر تو رمزِ خودی سے واقف ہے تو پھر سنگِ راہ سے پریشانی کیسی؟ ؎

ہزار چشمہ ترے سنگِ راہ سے پھوٹے
خودی میں ڈوب کے ضربِ کلیم پیدا کر

ایم اسلم

سوز و ساز

نئی نئی حسرتوں کے غنچے بنا رہا ہوں مٹا رہا ہوں
میں جب سے دنیائے عشق میں ہوں مزا آ...

سکونِ درماندگی نے بخشی مرے دلِ مضطرب کو راحت
نہ اب میں فریاد کر رہا ہوں نہ اب میں آنسو بہا...

نمودِ بے اختیار پر خود خجل مری بیکسی ہے لیکن
کسی کو افسردہ دل بتانے میں درد دل کہ...

خبر نہیں کون جا رہا ہے نہ جانے یہ کون آ رہا ہے
نثار ہے جس پہ جان اسی سے میں نزع میں...

نہیں ملی "جلوہ گاہ" اب تک اگر کسی وقت مل بھی جائے
بر آئے گی کیا مری توقع میں جس پہ توقع...

یہ بیم و امید کا دوراہہ مرے لئے ہے مقامِ حیرت
یہاں نہیں یہ خبر بھی مجھ کو میں رہ رہا ہوں...

معاملہ کی یہی ہے صورت نہیں ہے منظور آزمائش
نہ مجھ کو وہ آزما رہے ہیں نہ ان کو میں آزما رہا ہوں

وہ میٹھے باتیں بنا رہے ہیں تو ہاں میں ہاں میں ملا رہا ہوں
تصوراتِ جمیل کو یوں جمیل تر خود بنا...

اسی حیاتِ فنا اثر میں بقا کے آثار پا رہا ہوں
خود ان کے رشتہ میں مٹ رہا ہوں کہ...

وہ ناز سے مجھ کو دیکھتے ہیں میں پیار سے ان کو دیکھتا ہوں
وہ اپنا جادو جگا رہے ہیں میں اپنا جادو جگا...

کمال کیا ضبطِ نفس کا ہے جمالِ پردہ نشیں ہے سمجھا
میں ان کی خاطر سے اپنے دل میں حسین...

روابطِ حسن و عشق اب تک سمجھ سے باہر ہیں گرچہ مبہم
وہ مجھ کو سمجھائے جا رہے ہیں میں ان کو سمجھا...

نہ چھپ سکے گا وہ دلنشیں اب کھلیں گے رازِ نہفتنی اب
نگہ کی قوت سے کام لے کر حجابِ دل کا ہٹا...

مجھے یہ منظور خاک سمجھے قیاس آرا ہیں اس کے سجدے
بتانِ مہوش کو میں تو دل میں حقیقتہً پوجتا رہا ہوں

مت کا فیصلہ

سلیمہ۔ حامد کے بارے میں تمہارے یہ گندے خیالات درحقیقت میرے لئے بے حد تکلیف دہ ثابت ہو رہے ہیں اس
مت کی میرے دل میں کتنی وقعت ہے تم سمجھنے سے قاصر ہو" "خیر آپ تو سمجھ سکتے ہیں نا۔ بس چھٹی ہوئی جب آپ کے
عزیز ترین دوست آپ کے ساتھ رہیں گے تو پھر وہاں میرا ہونا تو کوئی ضروری نہیں ہے"

بات معمولی تھی سلیمہ اور ظہیر بطور تفریح بمبئی جانا چاہتے تھے۔ ظہیر چاہتا تھا کہ بجائے ہوٹل کے حامد کے ہاں
قیام ہو۔ لیکن سلیمہ اس بات کی مخالفت کر رہی تھی۔ اس کا کہنا یہ تھا کہ آج کل کے نوجوان اعتبار کے قابل نہیں ہوتے
پھر بھی مجھے اعتبار نہیں۔ یوں وہ آپ کے کتنے ہی اچھے دوست کیوں نہ ہوں۔ ظہیر بھلا اپنے دوست کی توہین کو کیونکر
برداشت کر سکتا تھا، برہم ہو گیا۔ اس نے کھلے الفاظ میں سلیمہ سے کہہ دیا کہ "ظہیر کی محبت میرے دل میں تم سے کہیں زیادہ ہے،
میری رفیقۂ حیات ہو، لیکن میری مسرتوں اور خواہشوں کے مقابلہ میں تم نے ہمیشہ اپنے ذوق، سینما، فیشن، اور تنہا
تفریح کو ترجیح دی۔ کیا یہی ایک مشرقی عورت کا فریضہ ہے؟" بات اور زیادہ بڑھ جاتی اگر سلیمہ موقع کی نزاکت کا خیال
کرتی۔ سلیمہ ایک امیر گھرانے کی لڑکی تھی۔ ماں باپ کی چہیتی اور لاڈلی۔ فیشن پرستی کی عادت شادی ہونے کے بعد بھی
چھوٹ سکی۔ تعلیم یافتہ تھی۔ لیکن ازدواجی تعلقات کیا ہونے چاہئیں یہیں جانتی تھی۔ اس نے جب یہ دیکھا کہ ظہیر اس کی
اس مغربی آزادی سے خوش نہیں ہے تو پریشان ہو گئی۔ وہ نہیں جانتی تھی کہ ظہیر کو اس کے بارے میں بہت ساری
غلط فہمیاں ہو گئی ہیں۔ سلیمہ یقیناً اب تک خوشی کے دن بسر کر رہی تھی لیکن اس وقت وہ اپنی مسرتوں میں ایک
کمی کی محسوس کر رہی تھی اس نے کہا۔ "ظہیر تم کتنے شکی اور کتنے زود رنج ہو۔ اگر تمہیں میرا اس طرح بے باکی سے
بمبئی کے لئے جانا پسند نہ تھا تو تم نے پہلے ہی کیوں نہ بتا دیا۔ میں تمہاری مرضی پر چلتی۔ خیر اب میں تم سے معافی چاہتی ہوں۔
میں تمہارے ساتھ چلوں گی اور تمہارے دوست حامد کے یہاں ہی ٹھہرا کروں گی۔"

بمبئی کے پندرہ روزہ قیام میں سلیمہ کو حامد کے بارے میں صحیح رائے قائم کرنے کا بہت اچھا موقع ملا اس نے حامد کو
ظہیر کی تعریف کا پورا مستحق پایا۔ اس کے اخلاق اور سنجیدہ مذاق نے سلیمہ کو بہت گرویدہ بنا لیا تھا۔ ہنسی خوشی خوشنما شہر میں یہ
دونوں انتہائی عیش و مسرت کے دن بسر کر رہے ہیں۔ ماہم کا وہ حصہ جو زیادہ آباد نہیں ہے دیار۔ حامد کا خوبصورت گر مختصر
مکان ہے ذرا آگے دریا کا کنارہ' ایک سنسان مقام جہاں نہ تفریح کے لئے چمن ہے اور نہ بیٹھنے کے لئے کوئی بینچ، چمکتے ہوئے
ریت کے ذرے' نیلگوں آسمان' ہچکولے لیتا ہوا سمندر' تنہائی' بے شمار موجوں کا کنارے سے ٹکرا کر واپس ہو جانا' لہروں کا
ان ساری رنگینیوں کو سمیٹا ہوا یہ دلفریب مقام سلیمہ جیسی مناظر پرست لڑکی کے لئے ارضی جنت سے کم نہ تھا۔

سورج ایک شکست خوردہ سپاہی کی طرح اپنا چہرہ سیاہ بادلوں میں لپیٹے ہوئے مغرب کی طرف کوچ کر رہا تھا۔ رات ایک
فوج کی طرح بڑھ رہی تھی۔ سورج کی آخری کرن بھی غائب ہو گئی۔ اور سلیمہ کے لئے صرف موجوں کی آواز اور پرندوں
کی پکار باقی رہ گئی۔ اس خاموش فضاء میں سلیمہ کے پیچھے سے کوئی اس کی طرف بڑھتا ہوا معلوم ہوا۔ سلیمہ پلٹ کر

دیکھنا ہی چاہتی تھی کہ ایک زبردست ہاتھ سلیمہ کے چہرہ پر تھا — ایک صنف نازک — اور اس کی نا
کوششیں بیکار ثابت ہوئیں۔ سلیمہ کے اعضا نے جواب دے دیا۔ اس کا سر چکرا گیا۔ اور اس کی آنکھوں کے
اندھیرا چھا گیا — سلیمہ کو جب ہوش آیا تو اس نے خود کو حامد کی آغوش میں پایا — اس کے منہ سے
نکلی اور ایک جھٹکے کے ساتھ وہ حامد کے ساتھ علٰحدہ ہو گئی — پریشانی — شرم — ندامت —
تعجب اور بے بسی — وہ صبر نہ کر سکی — اور اس کی آنکھوں سے آنسوؤں کا سیلاب بہہ نکلا —
غبار کم نہ ہوا — اس کی حقارت آمیز نظریں حامد پر گڑی ہوئی تھیں — حامد — افسوس اس کے متعلق
قائم کرنے میں اس نے جلد بازی سے کام لیا۔

غم اور غصہ کے اٹھتے ہوئے طوفان کو سلیمہ دبا نہ سکی — اس سے صبر نہ ہو سکا — حقارت آمیز
اس نے کہنا شروع کیا — "حامد تم تو مجھے بہن کہہ کر پکارتے تھے اور ظہیر کے جان نثار دوست بھی تھے
ہو — بے شرم — بیہودہ انسان — خود غرض کتے — پارسائی کا ڈھونگ تو خوب چاہتے
کہ زیادہ دن نباہ نہ سکا — لیکن" اس نے کڑک کر کہا، اس کا جسم غصے سے تھر تھر کانپ رہا تھا — میں تم
انتقام لوں گی — یہ نہ سمجھنا کہ میں ایک کمزور عورت ہوں — تم میری زبان نہیں بند کر سکتے — ذلیل
— سلیمہ اسی حالت میں بیہوش ہو کر گر پڑی۔

حامد اس وقت تو وہاں سے نکل گیا — لیکن وہ کسی گہری سوچ میں تھا وہ یہ نہیں چاہتا تھا کہ اس دوستی
طلسم کسی طرح ٹوٹے — اور سچ پوچھو تو اس کے لئے ظہیر سے کشیدگی کا خیال بھی تکلیف دہ تھا کیونکہ
بچپن کا دوست تھا اور وہ اس کو کسی قیمت پر اپنے سے علٰحدہ کرنا نہیں چاہتا تھا۔ اسی سوچ بچار میں کئی گھنٹے گزر
آخر اس نے اپنے ڈرائیور معین کو آواز دی۔ "معین دیکھو سلیمہ اس کمرہ میں بے ہوش ہیں ان کو ہوش میں لانے کی
کرو — یہ دس کا نوٹ تمہارے کارنامے کے سلسلہ میں اور ایک دس روپیہ اور آئندہ اس کام کے
میں تمہارے سپرد کروں گا ٹھیک نصف گھنٹہ کے بعد — اس سامنے والے نیم کے درخت کے پیچھے میں آؤں
میرے ساتھ ایک اور شخص ہوگا۔ جب ہم اپنے آپ کو اس درخت کی آڑ میں چھپا لیں اس وقت سلیمہ کو یہ کہہ کر
گھر پہنچا دوں سامنے سے گذرنا اور کسی طرف چلے جانا — نصف گھنٹہ بعد میرے مکان پر آ جانا — واپس لا کر چھوڑ د
— اور وہاں تمہاری کار کا نمبر —" "جی ہاں حضور میں سب کچھ سمجھ گیا —" "شاباش"

"دیکھو یہ وہی شخص ہے جس کا میں ابھی تمہارے سامنے تذکرہ کر چکا ہوں" حامد نے ظہیر کو اس موٹر کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا جس
معین اور سلیمہ بیٹھے ہوئے تھے۔ "میرے دوست میں تمہارا کس طرح شکریہ ادا کروں تم نے آج مجھے ایک عورت کے فریب سے ہمیشہ کے لئے
اس کا اس طرح ہمیشہ غائب رہنا۔ تفریح — میٹنگ — او مکار عورت تو میرے دل کے شبہات کو کس خوبی سے مٹا دیا کرتی تھی" — اس
ہونٹ چباتے ہوئے کہا — "لیکن حامد میرا فیصلہ تم جانتے ہو کیا ہوگا"
حامد نے پریشان صورت بنا کر اس کی بات کاٹتے ہوئے کہنے لگا۔ "لیکن ظہیر تم وعدہ کر چکے ہو کہ اس راز کو پوشیدہ رکھو گے" — اور
میں قسم کھاتا ہوں کہ اس واقعہ کا علم ہمارے خدا کے سوا اور کسی کو نہ ہوگا
"اور ہاں ظہیر — جب تم کو سب کچھ معلوم ہی ہو گیا ہے تو بہتر ہے کہ تم اس سے قطع تعلق ہی کر لو" ظہیر خاموش رہا — مکان آ چکا

رات کے دو بج چکے تھے۔ ہر طرف سنسان سناٹا تھا۔ سلیمہ کا کمرہ اس کی بربادی پر ماتم کر رہا تھا۔ روشندان سے جو چاندنی چھن چھن کر آرہی تھی سلیمہ کے پلنگ پر پڑ رہی تھی ـــ سلیمہ حسرت و یاس کی مورت بنی ہوئی کمرہ میں داخل ہوئی ـــ اس وقت وہ درد کی سراپا تصویر معلوم ہو رہی تھی ـــ اترا ہوا مغموم چہرہ ـــ آنسوؤں سے تر گال ـــ پریشان بال ـــ ڈگمگاتی ہوئی چال ـــ اندر کو دھنسی ہوئی بے نور آنکھیں ـــ وہ مسہری کے پاس ساکت کھڑی ہو گئی ـــ وہ کسی گہری سوچ میں کھوئی ہوئی تھی ـــ اس سے آخر کھڑا نہ رہا گیا ـــ اور مسہری پر دھڑام سے گر پڑی ـــ اور دل کا غبار آنکھوں کے راستے بہہ نکلا ـــ

دروازہ آہستہ آہستہ کھلا ـــ ایک آنکھوں کو خیرہ کر دینے والی چمک کے ساتھ ایک خنجر سلیمہ کے پیوست ہو گیا۔

سلیمہ جیسے بیدار ہوئی ـــ "کون ـــ ؟ ظہیر؟" اس نے شکستہ آواز میں کہا ـــ "خیر تم نے اچھا کیا ـــ آخر تم سے ایک نہ ایک کل صبح کو چھٹنا ہی ـــ قسمت کا یہ فیصلہ تھا کہ میں تم سے جدا ہوئی" ـــ سلیمہ کی خون آلود لاش کے قریب کھڑا ہوا حیرت زدہ ظہیر ـــ قسمت کے فیصلہ پہ سر دھن رہا تھا۔

خلیل اللہ

افغانی نوجوان!

آ رہا ہے وہ فرازِ کوہ سے گاتا ہوا
آتشیں نغموں سے دل کی آگ بھڑکاتا ہوا

کر رہا ہے "رائفل" سے عہد و پیمانِ ستیز
اپنی آبائی شجاعت کی قسم کھاتا ہوا

دل قوی، چہرے پہ شادابی، نگاہیں مطمئن
جا رہا ہے حُریت کا نور برساتا ہوا

چل رہا ہے پتھروں کے راستہ پر تیز تیز
ہر نفس پر ایک تازہ زندگی پاتا ہوا

گا رہا ہے کس مزے کے ساتھ آزادی کے گیت
گرد افشاں کاکلوں کے پیچ سلجھاتا ہوا

ڈالتا ہے برگ و گُل پر کس قیامت کی نگاہ
زندگی کی اک نئی تفسیر فرماتا ہوا

میلی ٹوپی، پھٹے جوتے، گریباں تار تار
چل رہا ہے پھر بھی اک دُنیا کو ٹھکراتا ہوا

قبلہ رو ہو کر کھڑا وہ ہو گیا بہرِ نماز
عظمتِ اسلام کی تاریخ دُہراتا ہوا

ماہر القادری

"آپ ہی میری زندگی کا سہارا ہے"

رضیہ کی شادی ہوئے چار سال ہو چکے تھے مگر اس عرصہ میں اس کی میری کبھی ملاقات نہ ہوئی تھی۔
میں اور وہ ایک ساتھ میٹرک تک تعلیم پائے تھے۔ امتحان دینے سے پہلے اس کی شادی ہو گئی اور میری تعلیم کا سلسلہ
سعیدہ ایک حسین سی لڑکی ہمارے ہاں اکثر آتی تھی اسی کی زبانی معلوم ہوا تھا کہ اس کو ایک استانی
ایک روز کا ذکر ہے کہ ہم سب گنڈی پیٹ تفریح کے لئے گئے ہوئے تھے۔ اتفاق سے اسی دن ہمارے
ایک حسین کا بھی زنانہ آیا ہوا تھا۔ سعیدہ مجھے دیکھ کر دوڑتی ہوئی آئی اور آکر میرا ہاتھ پکڑ لی اور کہا کہ آپا! ہماری استانی
نہ ہوگی" میں نے کہا سعیدہ ضرور ملوں گی۔ تمہاری استانی جی ہے کہاں؟ دیکھو! آپا وہ خود آپ سے ملنے چلی آ رہی ہیں
استانی صاحبہ کے نزدیک آتے ہی میری زبان سے بے ساختہ نکل گیا۔ رضیہ تم یہاں کہاں؟ تم
ہو گئی ہو۔ میں نے سنا ہے کہ تمہاری شادی ہو گئی ہے۔ کیا یہ سچ ہے۔ غرض بیسیوں سوالات تھے جو
جن میں سے ایک سوال کا بھی جواب نہ دیا گیا۔ میں اس کے چہرہ کو بغور دیکھ رہی تھی۔ اس کا رنگ متغیر ہو رہا تھا۔
میں نے موضوعِ سخن بدل ڈالا۔

اس واقعہ کے تیسرے دن بعد ہمارے ہاں دعوت تھی۔ امی نے میری کامیابی کی مسرت میں میرے دوستوں
چائے پر مدعو کیا تھا۔ رضیہ کو بھی دعوت دی گئی۔ رضیہ ہر تیسرے چوتھے روز میرے پاس آ جایا کرتی تھی۔ اب اس کی
میں پہلے کی سی شگفتگی اور لبوں پر مسکراہٹ نہ تھی۔ میں نے بشرے سے جان لیا کہ ضرور کچھ نہ کچھ راز ہے۔ میں نے
مرتبہ پوچھنا چاہا کہ اس نے اپنی حالت ایسی کیوں بنا رکھی ہے۔ مگر یہ جملہ میری زبان پر آ کر رک گیا۔ آخر ایک دن
میری زبان سے نکل ہی گیا رضیہ! تمہارے میاں کیسے ہیں کچھ ہمیں بھی تو سناؤ۔

میاں کا لفظ سنتے ہی اس کی آنکھوں میں آنسو بھر آئے۔ شاید میں یہ قصہ کسی کے سامنے دہرانا نہیں چاہ
میرا قصہ سن کر سوائے رنج کے اور کچھ نہ حاصل ہوگا آخر میرے اصرار پر اس نے کہنا شروع کیا۔

ایک حد تک میرا قصہ تمہارے لئے درسِ عبرت ہے۔ اس کو سننے کے بعد تم مردوں پر کبھی بھروسہ نہ کرو
افسانوں میں نیرنگیٔ قسمت کی عجیب و غریب داستانیں پڑھی ہیں۔ اس میں شاہ کو گدا اور گدا کو شاہ بنتے دیکھا
آہ! تقدیر ایک سربستہ راز ہے۔ گلیوں میں پھرنے والی بھکارنیں تختِ زریں پر متمکن ہو گئیں اور وہ نشہ ثروت
متوالے جن کے ایک اشارے پر تقدیر بھی سر جھکاتی تھی آنِ واحد میں فقیروں سے بھی بدتر ہو گئے۔
اس کی نظیر کہیں نہیں ملتی۔ اُن واقعات کو یاد کرتی ہوں تو حیرت ہوتی ہے کہ میں اب تک کیسے زندہ
بھی مسرتوں اور امیدوں کا گہوارہ تھا مگر آہ! اس بے داد کے ہاتھوں مر مٹیں۔ میں کیا جانتی تھی کہ وہی شخص جو
ایک ایک ادا پر جان دیتا تھا مجھے اس طرح ذلیل و خوار کرے گا۔

میری شادی ہوئے چار سال ہوتے ہیں۔ جب میں اس گھر کی ملکہ بنائی گئی تھی تو وہ میرے لئے ایک شگفتہ و شاداب چمن تھا۔ میں اس چمن کی بلبل تھی۔ سارا چمن میرا تھا جہاں چاہتی اور جس ڈال پر چاہتی چہکتی اور جس پھول کو چاہتی سونگھتی اور جس شاخ میں چاہتی اپنا آشیانہ بناتی صیاد بھی میرا ہم راز و ہمساز تھا وہ اپنی بلبل کی دلجوئی میں ہر وقت مشغول رہا کرتا تھا۔ باغ میں حوضِ بلوریں کے کنارے ہم محبت میں سرشار گھنٹوں راز و نیاز کی باتیں کیا کرتے۔ باغ کی روشوں میں ایک دوسرے کے ہاتھ میں ہاتھ ڈالے ٹہلا کرتے۔ وہ آہستہ سے میرے کان میں کہتے "تم میری جان ہو" میں اس کا جواب زیر لب دیتی تم میرے دلدار ہو"

ہماری جائداد وسیع تھی۔ ہمیں زمانے کی کوئی فکر نہ زندگی کا کوئی غم تھا ہمارے لئے زندگی ایک طلسم بہار تھی جس میں مرادیں لپلپتیں اور خوشیاں ہنستی ہوئی ہم سے ہم آغوش ہوتی تھیں۔ زمانہ ہمارا ہوا خواہ آسمان ہمارا دمساز و بخت ہمارا مساعد تھا ایک دن وہ گھر میں ہنستے ہوئے داخل ہوئے اور کہا کہ "میں تم سے ایک التجا کرنے آیا ہوں دیکھنا ان مسکراتے ہوئے لبوں پر حرف انکار نہ آئے۔ میں اپنی تمام جائداد تمہارے نام منتقل کرا دینا چاہتا ہوں۔ میرے لئے تمہاری محبت ہی کافی ہے میں چاہتا ہوں کہ تمہارے دروازے کا فقیر بن کر رہوں۔ تم میری نورجہاں بن جاؤ میں تمہارا سلیم بن جاؤں گا۔ میری آنکھیں ڈبڈبا گئیں مسرتیں اپنے انتہائی عروج پر پہونچ کر قطرہ اشک بن گئیں۔

دو سال بھی ہم کو اس پریم نگری میں قیام کرتے نہ گزرے تھے کہ زمانہ نے پلٹا کھایا۔ حامد کے مزاج میں تغیر پیدا ہو گیا اب اس کا دل میرے لئے دیوانہ تھا نہ اس کی اشتیاقانہ نظریں مجھ پر بار بار پڑتی تھیں۔ اب وہ رات رات بھر غائب رہا کرتا۔ اب وہ مجنوں کی طرح میرا مشتاق نہ تھا۔ میری جدائی اس کے لئے شاق نہ تھی۔ کچھ دنوں تک تو میں اس کی حالت کا بغور مطالعہ کرتی رہی روز بروز اس کی بے التفاتی ترقی کرتی گئی۔ مجھے اس کی محبت آمیز باتیں یاد آتیں میں گھنٹوں بلکہ پہروں اس کے لئے روتی صحت خراب ہو رہی تھی مگر اس کو مطلق فکر نہ تھی میں دن دن بھر اسی خیال میں غرق رہتی کہ کیا محبت اس قدر جلد فنا ہو سکتی ہے۔ نہیں ہرگز نہیں۔ محبت کا چشمہ لازوال ہے محبت کا لازوال چشمہ اب بھی اس میں موجزن تھا مگر اس کا بہاؤ کسی اور طرف تھا۔ اب وہ کسی دوسرے چمن کی شادابی میں منہمک تھا۔ میں بھی اس کی سرد مہری کا جواب خاموشی سے دینے لگی۔ میں نے کئی بار ارادہ کیا کہ اس سے اس بے مہری کا سبب دریافت کروں مگر خودداری کا بھلا ہو اس نے کبھی اجازت نہ دی۔

رفتہ رفتہ میری محبت نفرت سے بدل گئی۔ حامد میرے لئے محبت کی گزشتہ بہار کا ایک بھولا ہوا نغمہ تھا سوزِ دل سرد ہو گیا اور شمعِ محبت بجھ گئی تھی۔ اس کی عزت میرے دل سے رخصت ہوگئی۔ جو شخص محبت کے پاک مندر میں کدورت کو داخل کرتا ہے وہ ہرگز پرستش کے لائق نہیں

اب میں اپنا زیادہ وقت کتب بینی میں صرف کیا کرتی تھی ایک روز صبح جب کہ میں چمن میں مالی کو کچھ درختوں کے لگانے کی فرمائش کر رہی تھی، ایک حسین عورت ایک مرد کے ساتھ باغ کی پھاٹک پر نظر آئی۔ اس کے بعد میں بغیر کچھ سوچے ورانڈے میں چلی آئی۔ میرے آنے کے آدھ گھنٹہ بعد وہی عورت اندر آئی .... میں

ایک اجنبی عورت کو آتا ہوا دیکھ کر اٹھی اور چاہتی تھی کہ اس سے اچانک آنے کا سبب دریافت کروں مجھے سیڑھیوں ... کی آواز آئی دیکھتی کیا ہوں کہ حامد غیر معمولی طور پر مسکراتا ہوا آرہا ہے۔ حامد اور اس عورت کو ایک ساتھ دیکھتے ہی ... سناٹا چھا گیا۔ فوراً میری سمجھ میں آگیا کہ یہ عورت حامد کی محبوبہ ہے۔ دراصل واقعہ بھی یہی تھا۔ حامد خوش خوش اس کو اپنے ساتھ ... سے بارہ دری کی طرف چلا گیا۔ یہ دیکھتے ہی میری آنکھوں میں اندھیرا چھا گیا۔ انتقام کی آگ بھڑک اٹھی مگر لیا کرتی خاموش ... برسات کا موسم تھا۔ رات اندھیری تھی۔ ہر طرف سناٹا چھایا ہوا تھا۔ اور بارش کی ہلکی ہلکی پھوار پڑ رہی تھی۔ اس وقت مجھے حامد کی یاد رہ رہ کر ستا رہی تھی میں نے دل بہلانے کی خاطر کچھ اشعار گنگنانا شروع کیا غمزدہ دلوں کی تسکین کا سامان اس کے سوا ... کیا ہے

گیارہ بجے کے قریب اس عورت کو ساتھ لیتے ہوئے حامد آموجود ہوا دونوں بالاخانہ پر چلے گئے محفل رقص ... ہوئی اور شراب کے دور چل رہے تھے میں کواڑ کی دراڑوں میں سے یہ سب تماشا دیکھ رہی تھی اس کی محبوبہ نے کہا تمہاری بیگم کا دل یہ سب دیکھ کر کباب ہو رہا ہوگا۔ وہ ضرور یہاں پر چھپی تماشا دیکھ رہی ہوگی"۔ حامد۔ "نہیں وہ تو اب کسی کمرے میں سو رہی ہوگی" محبوبہ نے تیوری پر بل ڈال کر کہا۔ اگر میں اس کو اسی بالاخانہ پر ڈھونڈ نکالوں تو تم مجھے کیا دوگے۔" "جو تم مانگو گے" حامد مسکراتے ہوئے کہہ رہا تھا۔ دیکھو اپنی زبان کو نہ پلٹو گے۔ "نہیں، بے شک جو تم مانگو دوں گا۔ اور تم جو کہوگی مجھے بسر و چشم منظور ہوگا۔ ان باتوں کو جانے دو مجھے ایک اور جام لبریز تمہارے ہاتھ سے پینے دو۔

یہ سنتے ہی وہ دروازہ کھول باہر نکل آئی۔ میں بھاگتی ہوئی سیڑھیوں پر سے اترنا ہی چاہتی تھی کہ اس نے مجھے پکڑ لیا میں نے اس کی گرفت سے بچنے کی حتی الامکان کوشش کی مگر نہ بچ سکی۔ وہ بدطینت مجھے کھینچتی ہوئی حامد کے سامنے لے گئی ایک طرف گانا ہو رہا تھا دوسری طرف شراب کے دور چل رہے تھے۔ حامد بت بنا بیٹھا تھا۔ اس نے حامد سے مڑ کر کہا کہ اب میں اسے مارنا چاہتی ہوں۔ یہ کہہ کر اس نے اپنی ملازمہ کے ہاتھ میرے ہاتھ پیر بندھوائے اور مجھے مارنا شروع کیا میں چیخ رہی تھی حامد ساکت و صامت یہ تماشا دیکھ رہا تھا میں زار و قطار رو رہی تھی وہ کہتی جاتی تھی کہ محفل عیش میں مداخلت کرنے کی یہی سزا ہے اور مارتی جاتی تھی حامد مجھے ایک بازاری عورت کے ہاتھ پٹوا رہا تھا۔ اس کی عزت و حرمت خاک میں مل گئی تھی۔ اس نے ایک یا دو دفعہ اپنی محبوبہ سے کہا کہ مارنا بس کردو مگر ایک نہ سنی جب وہ مار مار کر تھک گئی تو مجھے اس طرح بندھا ہوا چھوڑ آپ حامد کا ہاتھ پکڑ نیچے اتر گئی اس کے ساتھ سب اہل محفل بھی نیچے چلے گئے۔ میں درد و کرب میں ساری رات تڑپتی رہی اپنی ذلت اور حامد کی بے وفائی پر آٹھ آٹھ آنسو روتی رہی۔ جب صبح ہوئی تو میں نے بڑی کوشش سے خود کو آزاد کیا۔ اور بلا کسی عزم و ارادہ کے سڑک کی طرف چل پڑی۔ راستے میں میری ملاقات ایک طوائف سے ہوگئی میں نے اس کے سامنے اپنا تمام احوال دہرایا۔ اس کو رحم آیا وہ مجھے اپنے ساتھ اپنے بالاخانہ پر لے گئی۔

مجھے گھر سے غائب ہوئے ایک ماہ کا عرصہ ہو چکا تھا مجھے اس طوائف کے ذریعہ حامد کی خبریں ملا کرتی تھیں مجھے یہ بھی معلوم ہوا کہ وہ عورت بلا شرکت غیرے مکان پر اپنا قبضہ جمائے ہوئے ہے اور حامد اس کے سامنے ایک غلام کی حیثیت سے کھڑا رہتا ہے۔

...ب اس میں ایک روز بالاخانہ پر بیٹھی ہوئی تھی کہ حامد کی موٹر نظر پڑی۔ میں نے اپنے سر کو دریچہ کے باہر ڈال موٹر کو بغور ...یکھنا شروع کیا۔ میں موٹر کو دیکھ رہی تھی حامد مجھے دیکھ رہا تھا۔ میری اس کی آنکھیں چار ہوئیں۔ میں نے نگاہیں پھیر لیں ...ا مقصد تو اس کو میری طرح آتشِ حسد سے جلانا تھا وہ پورا ہو چکا۔ مجھے دوسرے دن اطلاع ملی کہ حامد نے خودکشی ...رلی ہے اور اس عورت کو بھی کسی نے قتل کر ڈالا ہے۔ لیکن جب میں مکان پہونچی تو ملازموں کی زبانی معلوم ہوا ...ہ حامد پہلے اس عورت کو گولی کا نشانہ بنا کر بعد خود موت کے گھاٹ اترا۔

میرے زخم مندمل ہو جائیں گے۔ وہ ذلت جو میں نے اس کے جلانے کی خاطر گوارا کی بھلادی جائے گی مگر وہ ...بت کی ساعتیں جو اس کے ساتھ گزری تھیں تادم زیست یاد آئیں گی بس یہی یاد میری زندگی کا سہارا ہے۔

صفیہ صدیق فریدہ

دو شعر

روتے روتے آنکھ میں آنسو کی بوند	گوہرِ نایاب بن کر رہ گئی
اس نظر سے تم نے کیوں دیکھا مجھے	ہر تمنا خواب بن کر رہ گئی!

سکندر علی وجد

اعلان

اردو اکادمی جامعہ ملیہ اسلامیہ دہلی نے ذیل کے ہر مضمون پر مبلغ دو سو روپے انعام دینا تجویز کیا ہے۔ جن ...احب کا مقالہ سب سے بہتر ہوگا انھیں مذکورہ بالا انعام دیا جائے گا۔ اکادمی کا فیصلہ ناطق ہوگا۔ اس کے علاوہ ...اکادمی منتخب مقالہ جات کے حقوق اشاعت اپنے ذمہ رکھے گی۔ مقالہ میں تقریباً پچاس ہزار الفاظ ہونے چاہئیں ...ور تمام مقالے سکریٹری اردو اکادمی کے پاس ۱۵ ستمبر تک پہونچ جانا چاہئیں۔ جو صاحب اس مقالہ نویسی میں شرکت ...پسند کریں وہ پہلے اپنے مضمون کے انتخاب سے سکریٹری کو مطلع کر دیں۔

فہرست مضامین

اشتراکیت۔ نازی ازم۔ سامراج وطنیت سرمایہ داری۔ بحیرہ روم کی سیاست۔ ...بحرالکاہل کی سیاست۔ امریکہ اور سیاست عالم۔ نوآبادیوں کی تقسیم۔ ممالک اسلامی کی سیاست۔ فاسزم

سکریٹری اردو اکادمی
(جامعہ ملیہ اسلامیہ دہلی)

غزلیں

روح کے راز کو سمجھ جسم کی زندگی نہ دیکھ / آئینہ کی تلاش کر سدِ سکندری نہ دیکھ
نفس سے اپنے جنگ رکھ نفس کی برہمی نہ دیکھ / ترکِ تعلقات کر دہر کی آذری نہ دیکھ
رحم و کرم پہ رکھ نظر طاعت و بندگی نہ دیکھ / اس کی طرف نگاہ کر اپنی طرف کبھی نہ دیکھ
چہرۂ یار پر نہ جا اس کی شگفتگی نہ دیکھ / اس کے بھی دل میں درد ہے لب پہ جو ہنسی نہ دیکھ
آتا ہے سامنے سے وہ خاک بسر ادھر کوئی / ہائے نگاہِ شوق سے اس کی شکستگی نہ دیکھ
خود ہی تمام جلوہ بن خود ہی بہارِ جلوہ بن / خود ہی ہر ایک شے پہ چھا اس کی طرف کبھی نہ دیکھ
غنچۂ ناشگفتہ کے رازِ نہفتہ کو سمجھ! / درد بھری صدا نہ سن حالتِ دل ابھی نہ دیکھ
دستِ طلب بڑھائے جا پردۂ رخ اٹھائے جا / کام سے اپنے کام رکھ یار کی برہمی نہ دیکھ
تجھ کو خدا کا واسطہ حسن کہیں تڑپ نہ جائے / اشک بھری نگاہ سے عشق ادھر کبھی نہ دیکھ
جالبِ خستہ بزم میں داد نہ دے اگر کوئی / کام سے اپنے کام رکھ غیر کی ابھی نہ دیکھ

محمد عادل مرزا جالب چغتائی (مراد آباد)

۲

دل پر کچھ الزام نہیں ہے / قسمت میں آرام نہیں ہے
دل کی حالت عام نہیں ہے / اچھا ہوں، آرام نہیں ہے
جس کا مطلب عام نہیں ہے / شعر تو ہے الہام نہیں ہے
سجدہ اور بے مطلب سجدہ / قاصد ہے پیغام نہیں ہے
خالی ہاتھ لگا ہے منہ سے / ہائے تصوّر جام نہیں ہے
اپنی حد کے اندر رہ کر / کوئی طلب ناکام نہیں ہے
اب تک وہ پھرتے ہیں نظر میں / عشق خیالِ خام نہیں ہے
اس سے کام پڑا ہے مجھ کو / جس کو مجھ سے کام نہیں ہے
مجھ کو بے کس کہنے والو! / کیا یہ "اس کا" کام نہیں ہے
دل ہے نامانوسِ محبت / جام ہے کیفِ جام نہیں ہے
چھوٹ رہا ہے اس کا دامن / اور مئے گلفام نہیں ہے
یارب اس کے صدقے مجھ کو / رونا اس کا کام نہیں ہے
نشاد کبھی ہنسنا بھی ہوگا / رونا ہی انجام نہیں ہے

نشاد عار

محمد قلی قطب شاہ کی بارہ۱۲ پیاریاں

سلاطین قطب شاہیہ میں محمد قلی قطب شاہ ہی ایک ایسا بادشاہ ہے جس کا زمانہ زیادہ سے زیادہ امن و امان اور راحت و آرام سے گذرا۔ اور جس نے اپنی تمام زندگی عیش و عشرت اور بہجت و کامرانی میں گذاردی مغل مورخوں نے قطب شاہوں کے آخری یادگار ابوالحسن تانا شاہ کو بدنام کرنے اور شہنشاہ اورنگ زیب عالمگیر کی فتوحات کو حق بجانب ثابت کرنے کے لیئے تانا شاہ کو بڑا عیاش اور رند بدمست مشہور کر رکھا ہے۔ لیکن حقیقت یہہ ہے کہ سلطان محمد قلی کو عیاشی کے جو موقعے حاصل ہوئے تانا شاہ کو ان کا عشر عشیر بھی نصیب نہ ہوسکتا تھا۔

محمد قلی نے بچپن سے محل کے ناز و نعم میں پرورش پائی اور اگر وہ بھاگ متی والا قصہ صحیح ہے (جس کی رو سے بھاگ متی کی خاطر اس نے زبردست طغیانی کے باوجود رود موسیٰ میں اپنا گھوڑا ڈال دیا اور بعد کو اس جرأت کی پاداش میں محل سرا میں نظربند کردیا گیا اور وہاں ملک ملک کی حسین دوشیزاؤں کو اس کے ساتھ چھوڑ دیا گیا تاکہ اس کا دل بہلائیں اور بھاگ متی کا خیال اس کے دل سے دور کردیں) تو ظاہر ہے کہ عنفوان شباب کے ساتھ ہی وہ مہہ جبینوں کے ماحول میں رہنے لگا جن میں سے ہر ایک اس پر جان و دل فدا کرنے تیار تھی۔

اس حسین و رنگین ماحول کے ثبوت خود محمد قلی کے کلام سے بھی دستیاب ہوتے ہیں۔ ہر تقریب میں اس کے اطراف خوبرویوں کا جمگھٹا رہتا اور رمضان اور محرم کے مہینوں کے سوا اس کی زندگی کے بہت کم لمحے ایسے ہوں گے جب شاہد و شراب و نغمہ اس سے دور رہتے ہوں۔ اتنا ضرور ہے کہ رمضان اور محرم میں وہ شراب قطعاً ترک کردیتا تھا اور عیش و عشرت چھوڑ کر ایسا زاہد مرتاض اور متقی و پرہیزگار بن جاتا تھا کہ اس کے رند شاہد باز ہونے پر شاید شبہہ ہونے لگتا یہہ اس کی طبیعت کا استقلال اور تربیت کی خوبی تھی۔

بھاگ متی کے متعلق تفصیل سے آئندہ لکھا جائے گا لیکن اس کے علاوہ سلطان محمد قلی کی بیبیوں اور معشوقائیں تھیں ان میں سے حسب ذیل کے نام یا عرف اس کی کلیات میں بار بار دستیاب ہوتے ہیں :۔

۱۔ ننھی ۲۔ سانولی ۳۔ کونلی ۔ ۴۔ پیاری ۵۔ گوری ۶۔ چھبیلی ۷۔ لالا ۸۔ لالن ۹۔ موہن ۱۰۔ محبوب ۱۱۔ بلقیس زمانی ۱۲۔ ...تم ۱۳۔ ہندی چھوری ۱۴۔ پدمنی ۱۵۔ سندر ۱۶۔ سجن ۱۷۔ رنگیلی ۱۸۔ مشتری ۱۹۔ حیدر محل۔

ان ہیں۳ مہہ جبینوں میں بارہ ایسی ہیں جو خاص طور پر اس کی منظور نظر تھیں۔ کیونکہ محمد قلی بارہ اماموں کی رعایت سے ہر چیز میں بارہ کے عدد کا لحاظ رکھتا تھا چنانچہ جب اس نے حیدرآباد کے بابِ جنوب کی خوش منظر پہاڑی پر (جہاں اب قصر فلک نما واقع ہے) ایک عالی شان قصر "محل کوہ طور" کی تعمیر کی تو اس میں انہی دوازدہ ائمہ معصومین کی رعایت سے بارہ برج بنائے تھے چنانچہ اسی محل سے متعلق اس نے ایک نظم بھی لکھی ہے جس میں ان برجوں کا ذکر اس طرح کرتا ہے "چونکہ ان بارہ برجوں پہ بارہ اماموں کی نظرِ عنایت ہے اسی لئے ان پر ایمان کی تجلی جھلکتی رہتی ہے"

اس کا شعر ہے ؎

باره بروج پر ہے باره امام دشتی — تو اس اُپر جھلکتا ایمان کا اجالا

باره پیاریوں کی تخصیص کے متعلق بھی اس کے کلام سے مستند شہادت ملتی ہے۔
شہر حیدر آباد کی تعمیر کے وقت محمد قلی نے کئی عالی شان قصر تعمیر کئے تھے۔ اور خاص کر اپنے لئے ایک رفیع الشان محل بنوایا تھا جس کا نام خداداد محل رکھا تھا۔ اس محل کی آرائش و زیبائش کے متعلق اس کی ایک نظم اس کے کلیات میں موجود ہے (دیکھو صفحہ ۲۱) اس نظم سے معلوم ہوتا ہے کہ جب وہ اس محل میں آکر رہا تو اپنے ساتھ صرف ان بارہ پیاریوں کو لے آیا تھا جو اس وقت اس کی منظور نظر تھیں۔ اس نظم کا ایک شعر ہے ؎

نبیؐ صدقے بارا اماماں کرم تھے — کرو عیش جم باره پیاریوں سو پیا، ے

اسی طرح عید میلاد النبی کی ایک نظم (دیکھو صفحہ ۳۹) میں بھی اس نے ان بارہ مہ جبینوں کا بھی بارہ اماموں کے ساتھ ذکر کیا ہے۔ وہ کہتا ہے ؎

مبارک منج اچھو یو عید ہو ر مولود پیغمبر — ملے ہیں قطب سوں باره اماماں ہور نگاراں خوشی

ان بارہ پیاروں میں سے چند کی خصوصیتیں ذیل میں درج کی جاتی ہے۔ سب سے پہلے ننھی قابل ذکر ہے۔
اس کی تعریف میں محمد قلی نے کئی نظمیں لکھی ہیں اور اکثر نظموں اور غزلوں میں اس کا ذکر بھی کیا ہے۔ وہ کہتا ہے کہ ننھی کی جیسی حسین تو آسمانوں میں بھی نہیں۔ سرو اس کے قد کے مقابل کبھی نہیں آسکتا۔ اس نے مدن پھول کے رنگ کی ساڑی باندھی ہے جس کے کنارے عجیب و غریب موتی ٹنکے ہوئے ہیں۔ اس کی یاد کی مئی قطب شہ کو چڑھی ہوی ہے اور وہ اس کو ریجھانے کی خاطر دوتارے پر عجیب تان بجاتا ہے۔

ایک دوسری نظم میں کہتا ہے :—
اے سکھیو! میں ننھی کے پریم میں موتی بکھیر رہا ہوں، تم سمیٹ کر ان کو خوشی سے گوندھو۔ ننھی بہرے سا عشق کا داؤ کھیلتی ہے اور اپنے چاند سے چہرے پر نئی بہار دکھاتی ہے۔ اے ننھی میں تیرے جسم کی خوشبو کا ذکر کروں یا تیرے راز کی کہانی بیان کروں۔ کیونکہ تیری خوشبو کی مہکاٹ عاشق کی روح کو مہکا دیتی ہے۔ خوشبو تیرے جسم سے اسی طرح مہکتی ہے جیسے سانت کی بارش سے مہکتی ہو، تیری آنکھوں کی چمک میں کاجل بہت سہانا نظر آتا ہے اور یہ تو اس لئے لگاتی ہے کہ رقیبوں کے منتر تجھ پر کام نہ کریں۔
ایک نظم میں ننھی کے ہنسنے کھیلتے اور ڈلتے ہوئے پیالہ پلانے کا ذکر کیا ہے۔ معلوم ہوتا ہے کہ وہ بڑی ہنس مکھ اور حاضر جواب تھی۔ وہ شراب کی صراحی ہاتھ میں لیئے یا قطب شہ کو پیالہ بھر بھر کر دینے کو پسند نہیں کرتی تھی اور چاہتی تھی قطب شاہ زیادہ شراب نہ پیئے اس لئے طرح طرح سے ٹالتی رہتی تھی۔ اس کا ذکر سالگرہ کی ایک نظم میں بھی کیا ہے (دیکھو صفحہ
یہ تو بعد کے اوصاف تھے۔ ابتدا میں ننھی کی کیا حالت تھی اور بادشاہ نے اس کو ننھی کا لقب کیوں دیا تھا۔ اس کا علم ان نظموں سے ہوتا ہے جو صفحات ۲۲۸ تا ۲۳۱ میں درج ہیں جس میں وہ کہتا ہے کہ :—

اے نازک ننھی تو ابھی محبت سے ناواقف ہے۔ تیری آنکھیں کاجل کی وجہ سے چمکتی ہیں لیکن تو نہیں جانتی
کہ یہ کیا جادو جگا رہی ہیں۔ تیرا دل عشق و عاشقی کی طرف بھی مائل نہیں نہ تو شیشہ و پیالہ میں شراب بھرتی ہے
اور نہ میری عرض مانتی ہے۔ لیکن مجھے تجھ سے آس ہے۔ اگرچہ تو دل لگانے کے طریقوں سے ناواقف ہے
لیکن میرا معشوق تو ہے۔ تجھے اپنے بچپن کے کھیلوں کا مول نہیں معلوم نہ یہ جانتی ہے کہ تیرے ہونٹوں میں
آب حیات ہے۔ اس لئے تو منہ سے صاف صاف بات نہیں کرتی۔ سچ تو یہ ہے کہ تجھے ابھی اپنی قیمت
معلوم نہیں۔ تجھے چاہیئے کہ قطب زماں کو جانے، محبت کی باتوں کو پہچانے اور عشق کی سیوا کرے تو کب تک
اسی طرح اپنے کو کھینچتی رہے گی۔

ک اور نظم میں محمد قلی نے ننھی کے متعلق لکھا ہے کہ:—

جب چمن میں ننھی محو خرام ہوتی ہے تو شرم کے مارے آنچل ڈال لیتی ہے۔ معلوم نہیں کہ اس ننھی ڈالی پر
ابھی سے شباب کے پھل کیوں لگ گئے۔ جب وہ غصہ یا ناز سے خط سرمہ کے اشارہ سے بات کرتی ہے
اور اس کے ہونٹ عرق آلود ہو جاتے ہیں تو دل چاہتا ہے کہ اس کو مگن دیکھوں۔ میری محبت کے نونہالوں
میں سے ایک کو اچھے پھل رتن لگے ہیں۔ اے خدا وہ میرے باغ کا ایک سرو ہے اس کی حفاظت کر۔
اس کی بہشتی خوشبو سے جگ کے تمام پھول کھلتے ہیں۔ اس کی خوشبو، خطا اور ختن بھی نہیں پا سکتے
اے ننھی تیرے چہرے سے سب خوبرویوں کو روشنی ملی۔ تیرے چہرے کو زیور و جواہر کی کیا ضرورت!
جب تو چاندنی میں نکلتی ہے تو چاند چھپ جاتا ہے اور تارے آسمان پر سے تجھ پر نثار ہونے کے لئے
آتے ہیں۔ میں نہیں جانتا کہ تو کیسے نور سے پیدا ہوئی ہے۔ سب پرند تیری چکاچوند روشنی کے لئے
اپنا اپنا وطن چھوڑ آئے ہیں۔ تو غصہ سے کیوں میری طرف بھوؤں کی کمان چڑھا کر دیکھتی ہے۔ تجھے تو
چاہیئے کہ ناز و غمزے کے ساتھ مجھے اپنے ہونٹوں کا بوسہ دے۔"

۲

کلیات میں ننھی کے بعد سانولی کا ذکر زیادہ ملتا ہے۔ اس کے متعلق محمد قلی نے لکھا ہے کہ میری سانولی من کی
یاری نظر آتی ہے کیونکہ وہ رنگ روپ میں بالکل کونلی عورت ہے۔ سب سہیلیوں میں اس کا قد الیا بالا ہے کہ معلوم
تا ہے سرو کو اس پر سے نثار کر دیا گیا ہے۔ جب وہ سکھیوں کے ساتھ عشق کا کھیل کھیلتی ہے تو اس کے چہرہ کی
شنی میں چاند ذلیل و خوار نظر آتا ہے۔ کوئل اس کے بولوں کے مقابلے میں ہاری ہوئی نظر آتی ہے۔ اس کی اچھی
ال سب کے دل کو بھاتی ہے اور وہ اپنے ساتھیوں میں ایک نادر پھول نظر آتی ہے۔ اگرچہ سکھیوں نے اپنے چہرہ کو
ر طرح سے غازہ لگایا اور اپنے جسم کو رنگین بنایا لیکن اس کے قدرتی رنگ کی بات کسی عورت میں نہیں آتی۔
وسری نظم میں لکھا ہے:—

سانولی پیاری نے اپنے سبز رنگ میں نزاکت دکھا کر ہمارے دل کو موہ لیا۔ اس کے ہونٹوں پر

پان کی رنگیلی دھڑی ایسی سہانی معلوم ہوتی ہے کہ دنیا کی تمام رنگینیاں اس پر ریجھ جاتی ہیں۔ جب
وہ ہنستی ہے تو اس کے کنول جیسے منہ سے موتی جھڑتے ہیں اور ان موتیوں سے عالم جگمگانے لگتا ہے۔
تیسری نظم میں لکھتا ہے کہ :۔

جب سے اے سانولی تجھ پر نظر ہے ہوش وحواس گم ہیں اور بے خبر ہو گیا ہوں۔ جب تو اپنی سمو
آنکھوں سے ناز وغمزہ کرتی ہے تو میرا رواں رواں اس سے متاثر ہو جاتا ہے۔ جب تو ناز سے ہنستی ہے
تو تیرے دانتوں کی چمک چاند کی طرح جھلکتی ہے۔ تیرا سرو جیسا قد جب محو خرام ہوتا ہے تو تیرے
بالوں کا لمبا جوڑا چنور کا کام کرنے لگتا ہے۔ جب تو لباس پہن کر صحن میں نکل آتی ہے تو تیرے
چمکدار کپڑوں سے آسمان روشن ہو جاتا ہے۔ جب تو موتی کے رنگ کی نیم تنی پہنتی ہے تو تجھے
ایک بہشتی حور نظر آتی ہے قطب شہ تیری نزاکت سے ناواقف نہیں۔

۳

سانولی کے بعد محمد قلی کونلی کی تعریف میں رطب اللساں ہے۔ وہ لکھتا ہے کونلی اپنے ہاتھ میں پیالہ لئے
اور اتنی دبلی پتلی ہے کہ ہوا سے ہل رہی ہے۔ وہ بالوں میں پھول جماتی ہے اور چوٹی میں دونا دو بالا باندھتی ہے
کونلائے ہوئے چہرہ پر وہ اپنی بھووں کو اس طرح چڑھاتی ہے کہ نورانی معلوم ہونے لگتی ہے۔ اگرچہ نظر
کھنچی کھنچائی کھڑی ہے لیکن آنچل کے اندر سے اپنی آنکھوں کی چنچل پتلیوں کو نچا رہی ہے۔ اس کے جسم
نورتن کو روشنی ملی ہے۔ اور اس کے گلے میں چاند سورج کے حمائل بنا کر ڈالے گئے ہیں۔
دوسری نظم میں لکھتا ہے کہ :۔

اے کونلی تیرا قد دیکھ کر چمن کے سرو اشارے کرنے لگتے ہیں۔ تیرا قد باغ فردوس کے لئے بھی باعث
زینت ہے۔ میں نے اپنی پلکوں کو تکیے بنا کر رکھا ہے تاکہ اے مہندی پتلی تو میری آنکھ میں آکر آرام کرے
تیرے دونوں ہونٹ ایسے رنگیلے ہیں کہ یاقوت نے ان سے رنگ مانگا اور عقیقوں نے یمن میں ان سے
بھیک لی۔ تیری باریک کمر کے عشق میں میں بال کی طرح باریک ہو گیا ہوں۔ یہ اتنی باریک ہے کہ چین
کا کوئی تار اتنا باریک نہ ہوگا۔ دکھن کی اس کونلی سکی کو دیکھ کر میری جتنی کالی اور گوری سہیلیاں تھیں
میں ان سب کو بھول گیا۔
تیسری نظم میں لکھتا ہے کہ :۔

اے اچھی پیاری جب تو نظر بازی کرنے کے لئے آنکھ سے آنکھ ملا کر کھڑی ہوتی ہے تو میرے لئے نظر لگانا
دشوار ہو جاتا ہے۔ تو کندنی رنگ کی ایک پتلی ہے۔ جس کا روپ کونلا ہے۔ تیری گلابی آنکھوں میں سمندر
موجیں مارتا رہتا ہے۔ اور تیرے سورج سے گالوں میں دانت نورتن کی طرح جڑے ہوئے ہیں۔ تو بالے
رنگا رنگ اور چنچل ہے۔ خوبرویوں پر راج کرنا تجھے سجتا ہے اے گلابی آنکھ والی سہیلی تو میرے دل کی پیاری ہے

ب رس
... اور نظم میں لکھتا ہے کہ :-

یہہ شگفتہ چنچل پھر میرے یہاں سبز آنچل اوڑھے اور پھولوں کی کلغی لگائی ہوئی آئی - اس کی الھڑ چال سے شراب کا خمار اور آنکھوں میں رنگ کے ڈورے نظر آ رہے ہیں - اس حسین کی محبت اور اس کے پاؤں کی جھنکار دل کے لئے امید، تن کے لئے عیش اور کان کے لئے ذوق کا باعث ہے - وہ گالی دیتی ہے اور دکھ سے کاری ہو کر گھات کرتی اور لاکھ خوشامد اور نوچ سے دروازے میں سیرے آڑے آتی ہے - یہہ سب میں ہوشیار عورت ہے کیوں کہ بھید کو جانتی عشق کو پہچانتی اور اپنے گھر میں تخت پر بیٹھتی ہے -

۴

پیاری بھی محمد قلی کی نہایت چہیتی تھی - لیکن وہ اپنے حسن و نزاکت پر اتنی مغرور تھی کہ ہمیشہ محمد قلی کو ترساتی اور ستاتی رہتی تھی وہ ہمیشہ اس کو منانے کی فکر میں رہتا چنانچہ کہتا ہے کہ :-

اے سکیو تم آج جا کر پیاری کو سمجھا منا کر لے آؤ کیونکہ تمام عشوہ طرازوں کا تاج اسی کے سر سجتا ہے - اس سے کہو کہ قطب شہ نے اپنے مکان کو بہت ہی زیبائش و آرائش سے سنوارا ہے لیکن تیرے بغیر گذارنا مشکل ہے اگر تجھے عشق ستاتا ہے تو آ اور دیوانہ بنالے کیونکہ یہاں تیرا ہی راج ہے - تیرا لباس حسن ایسا عجیب ہے کہ اس کے ساتھ یہہ عشوے تجھے زیب دیتے ہیں - تو اپنے روپ کی وجہہ سے شاہِ خوباں ہے اس لئے سب تجھے خراجِ عشق ادا کرتے ہیں جس وقت میں تیرے چہرہ کا نور دیکھتا ہوں تو وہ ایک لمحہ مرے لئے سو برس کی عشرت کے برابر ہے -

... نظم میں کہتا ہے :-

اے پیاری تو مجھ سے غرور نہ کر جب یہہ جوانی چلی جائے گی تو خمیدہ ہو جائے گی - یقین جان کہ یہہ بات دنیا میں مشہور ہے کہ ٹوٹے ہوئے موتی کا مول کم ہو جاتا ہے - جوانی اور جوبن اسی لئے ہے کہ اپنے سائیں کے لئے باعث عیش ہو - تو اپنے دل میں سائیں کی محبت قائم رکھ کیونکہ تیری ہی وجہہ سے اس کا عیش ہے جب تو عشوہ و ناز کے ساتھ سنگھار کر کے آتی ہے تو تیرے چہرے پر پسینہ کی بوندیں اسی طرح بھلی معلوم ہوتی ہیں جس طرح پھول پر شبنم - تو اپنی شراب حسن سے سکیوں کو فیضیاب کرتی ہے اور تمام خوبرویوں میں اپنا علم سرفرازی بلند رکھتی ہے -

... نظم میں یوں لکھا ہے :-

اے پیاری تیرے بچھڑنے کی وجہہ سے مجھے راتوں کو نیند نہیں آتی - مجھے قدرت نے ایسا اچھا گھڑا ہے کہ تیرے بغیر مجھے ایک گھڑی بھی محبت نہیں بھاتی - جو دل سے تیرا عاشق ہے اس کو رات اور دن کچھ بھی سجھائی نہیں دیتا تیری یاد کچھ اس طرح لگی ہوئی ہے کہ پھر کچھ بھی یاد نہیں آتا - تیرے بیمار محبت کا علاج لقمان بھی نہیں کر سکتا - جب تک تو اپنے ہونٹوں کا شربت نہ چکائے گی تیرے عاشق کو کیونکر صحت ہو گی؟

یہہ سچ ہے کہ تیرے ساتھ ایک رات رہنا میرے لئے سو راتوں کے برابر ہے۔ تو ہی کہہ کہ جب تو مجھے اپنے سیج پر نہ بلائے تو میں پھر کس کے سیج پر رہوں۔ تیری اس فرقت کی آگ میں میرا دل موم کی طرح پگھل رہا ہے۔ لیکن تو مصری کی طرح سخت اور گھٹ ہے اور خود کو ذرا بھی نہیں پگھلاتی۔

تیری گفتار، تیری رفتار، تیرے تیور، طرح طرح کے ہیں۔ تو جو کچھ برا بھلا کہنا چاہتی ہے کہہ لے لیکن مجھے ناامید نہ کر۔ تجھ کو خدا نے اتنی قدرت دی ہے کہ تو قطب شاہ کو سمجھا سکتی ہے۔

ایک اور نظم میں لکھتا ہے :—

اے پیاری تیرا بول مجھے مارے ڈالتا ہے۔ تیری ہر بات مجھے کٹاری نظر آتی ہے۔ تیری چوٹی ناگ کی طرح ہے جس کا زہر کڑوا ہوتا ہے۔ تو کھیلتے وقت اپنی اس ناگ جیسی چوٹی کی وجہہ سے سچ مچ ناگن معلوم ہوتی ہے۔ میں بھنورے کی طرح تیرے اطراف پھر پھر کر تیری خوشبو لیتا ہوں کیونکہ اس خوشبو میں نرگس کی طرح خمار نہیں ہے۔ تیرے جسم سے صندل اور مشک کی خوشبو نکلتی رہتی ہے۔ تو کانچ کی چوڑیاں پہنتی ہے اور ہاتھ میں اچھی باندھی ہے ٹھیکری اور کانچ میں وہ ہندی گنوار کیا فرق کر سکتی ہے۔ بھو بگاڑ کر کہتا ہے تیرے بول میں نمک نہیں اور تیرے ہونٹوں میں رس نہیں ہے۔ تیری چولی کسی ہوئی نہیں ہے اور تیری چوٹی اندھیرا ہے۔

۵

محمد قلی کی بارہ پیاریوں میں ایک گوری بھی ہے۔ اس کی نسبت ایک نظم میں لکھتا ہے :—

گوری کا چہرہ حسن کی وجہہ سے اس قدر سہانا معلوم ہوتا ہے کہ اس چاند سے چہرہ سے شرما کر خود چاند غائب ہو جاتا ہے۔ وہ سرو جیسا قد نہیں بلکہ ایک کندنی درخت ہے جس سے سورج جیسی روشنی نکلتی ہے۔ اے گوری تو رنگ کے باغ کی کلی ہے اس لئے تیرے چہرہ سے زندگانی کا پانی ٹپکتا ہے۔ تیرے رسیلے ہونٹوں میں شراب بھری ہے جو عاشقوں کے دل کو جلا کر کباب بنا دیتے ہیں۔

ان کو میں زلفیں کہوں یا تازہ سنبل جو تیرے پھول جیسے چہرہ پر اس طرح بکھرتی ہیں جیسے چاند برابر۔ تیری مستانہ چال سے ہاتھی شرماتے ہیں کیونکہ ان میں یہہ ناز اور شوخی نہیں۔ اے قطب نبی کے صدقے گوری ملی ہے تو اس کے گلے میں باہیں ڈال اور اس کے ساتھ شراب پی۔

دوسری نظم میں کہتا ہے :—

گوری عشق کی ایک رنگیلی پتلی ہے جو تمام خوبرویوں میں چھبیلی نظر آتی ہے۔ تجھے پدمنیوں کے چہروں کی بزم آرائی زیب دیتی ہیں۔ کیونکہ تو چاند جیسی صورت رکھنے والیوں میں سب سے زیادہ رسیلی ہے سولہ سنگار صرف تیرے جسم کی سج دھج کو دیکھ کر بنائے گئے ہیں کیونکہ تمام مہ جبینوں میں تو ہی سب سے زیادہ حسین ہے۔ تیرے سر پر نور کا جلوہ برستا ہے۔ تیری جیسی سندر سہیلی اور کوئی نظر نہیں آتی ہے۔

نبی کے صدقے میں قطب شاہ سے ایسی پیاری حسن کا پرانا پہن کر آملی۔

تیری نظم میں کہتا ہے:---

اے عشق کی پتلی تو میرے دل میں کھڑی ہوئی ہے۔ اور عشق کی وجہ سے تجھے تو پر لگ گئے ہیں۔ اس پتلی کو عشق و محبت پر ناز کرنا زیب دیتا ہے۔ وہ عشق بازی کے لئے کمر باندھ کر تیار اور جوبن کے پیالے اپنے ہاتھ میں لے کر کھڑی ہوئی ہے۔ اے پریم کی سہیلیو بتاؤ کہ پریم کے باغ میں یہ پیاری سجتی ہے کہ نہیں اے گوری تیرے جسم پر سرتا قدم پھول ہی پھول ہیں۔ تو اپنی پرستش کرانے کے لئے کھڑی ہے۔ تو مجھے عشق کی صحبتوں میں پیالہ پلا۔ مجھ پر تیرے عشق کی بھٹی کی مستی چڑھی ہوئی ہے۔ نبی کے صدقے میں مجھے ایسی گوری ملی ہے کہ سورج اور مشتری جس کے عکس ہیں۔

اسی طرح بارہ پیاریوں میں سے ہر ایک پر کئی کئی نظمیں لکھی ہیں جو کلیات کے صفحات ۲۲۴ تا ۲۶۴ پر درج ہیں اور ان خاص پیاریوں کے علاوہ اور دوسری پیاریوں پر بھی اس کی نظمیں موجود ہیں جو کلیات کے صفحات ۲۶۵ تا ۲۸۱ پر شائع ہوئی ہیں۔

ان سب پیاریوں کی نظموں کے خاکے یا خلاصے پیش کرنا موجب طوالت ہے اس لئے ہم یہاں اس کی صرف خاص خاص پیاریوں کے سراپا اسی کی نظموں سے اخذ کر کے نہایت مجمل الفاظ میں پیش کر دیتے ہیں۔

۱۔ **ننھی** بالا قد۔ چاند سا روشن چہرا۔ چمکدار آنکھیں۔ جسم میں ایک خاص خوشبو۔ ابتدا میں نہایت شرمیلی اور سیدھا سادھی لڑکی تھی جو بہت جلد عنفوان شباب کو پہنچ گئی۔ ملنے اور بات کرنے سے جھجکتی تھی۔ شراب سے نفرت کرتی تھی اور شراب کی صراحی اور پیالہ ہاتھ میں لینے اور پینے پلانے سے ہمیشہ بچتی تھی۔ آنکھوں میں کاجل لگاتی اور خط سرمہ کھینچتی تھی۔ بدن پھول کے رنگ کی ساری باندھتی جس کے کنارے عجیب و غریب موتی ٹنکے ہوتے۔ وہ بعد کو بڑی ہنس مکھ، ظریف، اور حاضر جواب ہو گئی تھی۔

۲۔ **سانولی** بلند و بالا قد۔ دلفریب سانولا سلونا رنگ جس کی وجہ سے وہ بہت نازک اور کونلی معلوم ہوتی تھی۔ خوش آواز خوش خرام۔ موتی کی طرح دانت۔ شوخ آنکھیں۔ زرق برق لباس پہننے والی۔ موتی کے رنگ کی نیم تنی زیب کرتی

۳۔ **کونلی** ایسی دبلی پتلی کہ ہوا سے ہلنے والی۔ جسم کو شرم و ناز سے اتنا چرا کر رکھتی کہ کمر کے ہونے نہ ہونے کا شبہ ہوتا۔ دمکتی مہ جبین۔ کندنی رنگ۔ گلابی آنکھیں جو نگین ڈوروں کی وجہ سے ہمیشہ خماری نظر آتیں۔ چڑھی ہوئی بھویں یاقوت اور عقیق یمن کو شرمانے والے ہونٹ۔ چمکدار رخسار۔ نورتن جیسے دانت۔ سرتاپا زنگار رنگ اور چنچل۔ سبز آنچل اوڑھتی۔ بالوں کو پھولوں سے سجاتی۔ بہت ہی ہوشیار۔

۴۔ **پیاری** ہمیشہ روٹھنے اور بگڑنے والی۔ بہت ہی خوبصورت اور اپنے حسن پر مغرور۔ روشن چہرہ۔ جب بن سنور کر نکلتی تو چہرہ پر پسینہ کی بوندیں ایسی بھلی لگتیں جیسے پھول پر شبنم۔ تند مزاج اور تلخ گفتگو کرنے والی تھی ناگ کی طرح سیاہ بل کھائی ہوئی لانبی چوٹی۔ خوشبودار جسم۔ کانچ کی چوڑیاں پہنتی اور ہاتھ میں چھری باند

بے حد عشوہ طراز۔

۵۔ **گوری** چاند سا چمکتا چہرہ۔ روشن پیشانی۔ پراگندہ زلفیں۔ رسیلے ہونٹ۔ مستانہ چال۔ ابھرا ہوا سینہ۔ پتلی بدن خوبصورت اور پھولوں کی طرح نرم و نازک اور شگفتہ جسم۔

۶۔ **چھبیلی** رخسار پر تل۔ ژولیدہ زلفیں۔ شکاری آنکھیں خط سرمہ کھنچا ہوا۔

۷۔ **لالا** ہونٹوں میں آب حیات۔ گلابی پھولوں کی طرح دانت۔ سرپستاں سے جوانی ٹپکتی ہوئی۔ مست کرنے والی پیاری ہنسی سے رات کو دن بنانے والی۔ عشق و محبت کی پیاسی۔ غمزدۂ فراق۔

۸۔ **لالن** منقل جیسے ہونٹ۔ ہنس جیسی چال۔ پھول کی کلی سے نازک کم عمر اور نادان۔

۹۔ **موہن** جادو سے بھری ہوئی آنکھیں۔ عشوہ طراز اور گن والی چہرہ پر عیش وصال کی کیفیت نمایاں۔ آنکھیں پیار کی خماری سے متوالی۔ سہانی سبز ساری جس پر شفق رنگ کی کناری لگی ہوئی۔ محبت میں دیوانی۔

۱۰۔ **محبوب** گلاب کے پھول ایسے گال۔ باریک کمر۔ زرین پٹکہ کسی ہوئی۔ یوسف سے زیادہ حسین۔

بارہ پیاریوں میں سے اور دو پیاریوں مشتری اور حیدر محل کا ذکر آئندہ تفصیل سے آئے گا۔

ان پیاریوں کے علاوہ محمد قلی نے متعدد نظمیں ایسی بھی لکھی ہیں جو اُس کی عیش و عشرت کی ترجمان ہیں اور عشق و عاشقی کی زندگی کی دلچسپ داستانوں کا کام دیتی ہیں۔ ان نظموں میں بعض بہت عریاں ہیں جن میں اس نے وصال کے پُرکیف مرقعے پیش کئے ہیں۔ اور بعض نظمیں اس کی جوانی کی راتوں اور مرادوں کے دنوں کے تفصیلی اور دلچسپ نظام العمل ہیں حسن و عشق کے راز و نیاز کا شاید ہی کوئی موضوع ہو جو چھوٹ گیا ہو۔ شباب کی رنگا رنگیوں اور جذبات کی بوالہوں کے اظہار میں اس کا قلم غیر معمولی قدرت رکھتا تھا۔ اور یہ قدرت تخیلی یا فرضی عشق عاشقی سے نہیں پیدا ہو سکتی۔ محمد قلی صحیح معنوں میں اس میدان کا مرد تھا۔ اس کے رفیع الشان محل نہ تھے بلکہ اصل میں بین قومی حسن و نغمہ کی وسیع اور آراستہ و پیراستہ نمائش گاہیں تھیں۔ ان میں کئی ملکوں کئی مذہبوں اور ہر وضع و قطع کی نازنینیں آزادی اور بے تکلفی کے ساتھ اپنے حسن و جمال کی آرائش و زیبائش میں مصروف و منہمک اور عشق و مستی کی عجیب غریب کیفیتوں اور جوانی و رعنائی کے بے پناہ جذبات کے مظاہرے کرتی رہتی تھیں۔

سید محی الدین قادری زور

تنقید و تبصرہ

ظہورِ قدسی

تقطیع پاکٹ سائز۔ صفحات ۴۰ مطبوعہ فیروز پرنٹنگ ورکس لاہور۔ قیمت ۸ر

جناب ماہر القادری صاحب نے **آنحضرت** صلی اللہ علیہ وسلم کی ولادت مبارک اور زندگی کے واقعات کو نہایت خوبی کے ساتھ نظم کیا ہے۔ من گھڑت اور افسانوی روایتوں کو بالکل نظر انداز کر کے صحیح روایات اور سیرت کی مستند کتابوں سے واقعات چن کر ان کو نظم کا جامہ پہنایا ہے اور بارگاہِ رسالت میں بطور سلام کے نذر پیش کی ہے یہ سلام بالکل ہی قسم کا ہے میلاد کے کئی جلسوں میں انھوں نے اس سلام کو سنایا تھا جو بہت مقبول ہوا اور اب کتابی صورت میں شائع ہو گیا ہے اس سلام کے چند شعر یہ ہیں :۔

سحر کا وقت ہے معصوم کلیاں مسکراتی ہیں — ہوائیں خیر مقدم کے ترانے گنگناتی ہیں
پسینہ شادمانی سے ہے پھولوں کی جبینوں پر — بطوں کا دیدنی ہے رقص تالابوں کے سینوں پر
ابھی جبریل اترے بھی نہ تھے کعبہ کے منبر سے — کہ اتنے میں صدا آئی یہ عبداللہ کے گھر سے
مبارک ہو نبی آخری تشریف لے آئے — مبارک ہو جہاں کی روشنی تشریف لے آئے
سلام اس پر کہ جس کے گھر میں چاندی تھی نہ سونا تھا — سلام اس پر کہ ٹوٹا بوریا جس کا بچھونا تھا
درود اس پر تبسم جس کا گل کے مسکرانے میں — درود اس پر کہ جس کا فیض ہے سارے زمانے میں

اس مبارک کتاب کا تعارف مولانا مناظر احسن صاحب گیلانی صدر شعبۂ دینیات جامعہ عثمانیہ نے تحریر فرمایا ہے جو نہایت ہی بصیرت افروز ہے "ع ش"

عربی قواعد

مصنفہ حکیم ہبۃ اللہ صاحب۔ طباعت نہایت نفیس، قیمت ۲ر

یہ کتاب بظاہر نئے اصول پر لکھی گئی ہے اور اس میں قواعد کو ریڈر بنانے کی سعی بلیغ کی گئی ہے لیکن ریڈر کی سی دلچسپی کم پیدا ہو سکی ہے اور کتاب چند ضروری الفاظ کا مختصر سا مجموعہ بن کر رہ گئی جس کے پڑھنے سے طالب علم کو "گرامر" کا فائدہ مشکل ہی سے حاصل ہو سکے گا۔

تعلیم کسی زبان کی ہو اگر نفسیاتی اصول و ضوابط پر دی جائے تو پڑھنے والوں کے لئے بہت آسان اور زود ہضم ہو جاتی ہے۔ مگر اس کے سہل بنانے ہی میں ساری حکمت ہے۔ اس قسم کی تعلیم میں وہ تمام اہم مطالب جنھیں متعلم کے ذہن میں بٹھانا منظور ہوتا ہے سادہ ترین شکلوں میں اس کی نظر کے سامنے اس طرح لائے جاتے ہیں کہ ذہن کسی پیچیدگی سے دوچار ہونے نہیں پاتا یا بالفاظ دیگر ذہن کو ایک خاص نقطہ پر مرتکز کر کے اور دوسری سمتوں میں بھٹکنے سے روک دیا جاتا ہے مثلاً اسم کی بحث میں اسماء کی شکلیں ایک خاص ضابطہ کے تحت اس طرح پیش کی جاتی ہیں کہ ان سے ایک بڑا مقصد حاصل ہوتا ہے۔

اَلبَیتُ اَلنَّہرُ اَلقَلَمُ اَلطَّاوِلَۃُ
اَلکِتَابُ اَلبَلَدُ اَلخَاتَمُ اَلسَّاعَۃُ

اس یکسانیت اور لفظ کے اول و آخر میں بعض حروف و حرکات کے التزام سے پڑھنے والے کی سمجھ میں خود بخود یہ بات آتی ہے کہ عربی میں اسم کے اول "ال" اور حرف آخر پر ضمہ ضرور ہوتا ہے۔ مگر اس مقصد کے حصول میں ایک احتیاط یہ ملحوظ رکھنی پڑتی ہے کہ اس فہرست میں کوئی اسم ایسا نہ آنے پائے جو "ال" کو قبول نہیں کرتا اور یہ کوئی مشکل کام نہیں جب یہ چیز پوری طرح ذہن نشین ہو جائے تو دوسری مشق تنوین کی دینی چاہئے۔ یہ دوسرا طریقہ اسم کے لکھنے کا ہوگا

اگر اس مرتبہ وہی اسماء جن پر مشق اول میں "ال" داخل کیا گیا تھا تنوین کے ساتھ لکھے جائیں مثلاً:-

بَیتٌ مشہرٌ قلمٌ طاوِلۃٌ

کِتَابٌ بَلَدٌ خَاتَمٌ سَاعۃٌ

تو یہ بات آسانی سے متعلم کی سمجھ میں آجائے گی کہ "ال" کے دور کرنے کے بعد اسم کے حرف آخر پر دو پیش ...
اگر اس التزام کے ساتھ ایک قاعدہ کو دوسرے قاعدہ سے علیحدہ رکھ کر غلط ملط کئے بغیر روزانہ مشق ...
پڑھایا جائے تو پڑھنے والے میں جودت، ذوق، حوصلہ و استعداد کا پیدا ہونا لازم ہے۔

حکیم صاحب نے قواعد کے مشکلات کو دور کرنے کا آسان طریقہ یہ اختیار کیا کہ کسی مشکل کو چھیڑا ہی نہیں لیکن
معلوم ہے کہ ذکر نہ کرنے سے مشکل دور نہیں ہو سکتی۔ صحیح طریقہ تو یہ تھا کہ مشکل کو کھول کھول کر اتنا سادہ بنا دیا جاتا کہ
مشکل ہی نہ رہتی۔ بہرحال حکیم صاحب نے کتاب کی نظم و ترتیب سے طالب علم کے ذہن کو کسی قاعدہ کی طرف منتقل کرنے
کی کوشش ہی نہیں کی۔ اسم کی بحث میں اسم منون، اسم معرف باللام، اسم غیر منصرف اور حرف میں غلط ...
بچوں کا تو کیا ذکر قواعد عربی سے نابلد بڑے لوگ بھی اسے سمجھ نہیں سکتے تثنیہ کی بحث میں حالت رفعی، نصبی و جری تعریفات
جو تشریح نوٹ کے ذریعے کی ہے وہ ناواقف کے لئے پھر بھی "چیستاں" ہی رہی پھلا پیش کی حالت، زبر کی حالت، زیر
حالت مبتدی کیا جانے۔ مجہول کی تعریف مجہول سے کرنے کی بجائے، وضاحت درکار تھی

"ن"

رسالہ اُردو کا "اقبال نمبر"

حجم ۴۱۲ صفحات۔ قیمت درج نہیں۔ پتہ انجمن ترقی اردو (ہند) نئی دہلی

انجمن ترقی اُردو کے مشہور سہ ماہی رسالہ "اُردو" نے علامہ اقبال کی یادگار میں
بڑی خوش اسلوبی کے ساتھ یہ نمبر شایع کیا۔ اس میں اقبال کی شاعری، شخصیت، پیغام، تصور خودی، آرٹ، ذہنی ...
تصور زمان، تنوع افکار، تصور حیات، فلسفہ خودی، فلسفہ تمدن، تخیل، تصوف، نصب العین۔ ان سب پر بلند پایہ ...
میں تبصرہ کیا گیا ہے۔ اس نمبر کا ہر مقالہ اس قابل ہے کہ ایک سے زیادہ مرتبہ غور کے ساتھ پڑھا جائے۔

ڈاکٹر سید عابد حسین نے "اقبال کا تصور خودی" میں شاعری پر شرح و بسط کے ساتھ روشنی ڈالی ہے۔ اقبال کی
شاعری کو فلسفیانہ شاعری کہنے کے یہ معنی نہیں ہیں کہ وہ حکمت کے نظریات کی طرح سوز و درد، زندگی اور حرکت سے خالی ...
اقبال کی شاعری تو آبِ حیات کا خزانہ ہے جس سے زندگی اور زندہ دلی کے چشمے ابلتے ہیں جن سے سیراب ہو کر ...
دلوں کی خشک اور بنجر زمین میں جان پڑ جاتی ہے اور امید کی کھیتی لہلہانے لگتی ہے۔ اقبال کے کلام کا موضوع
فرد اور ملت کی زندگی کا ایک جامع نصب العین ہے جسے ہم فلسفۂ تمدن کہہ سکتے ہیں۔

خلیفہ عبدالحکیم صاحب نے اپنے پُرمغز مقالہ "رومی، نطشے اور اقبال" میں وضاحت کے ساتھ یہ بتایا ہے کہ
تنوع افکار اور ثروت تصورات، فلسفہ جدید اور فلسفہ قدیم، تصوف اسلامی اور غیر اسلامی کے تمام انواع، مذاہب
عالم کے گوناگوں تصورات معاشرتی، سیاسی اور اخلاقی مسائل، فکر اور عمل کی تمام قدیم اور جدید تحریکات کو اقبال نے
کس طرح اپنی شاعری میں پیش کیا ہے اور رومی نطشے کے فلسفہ خودی اور تصور انسان کی کس حد تک اپنی شاعری میں ترجمانی کی ہے

ڈاکٹر یوسف حسین خاں صاحب نے "اقبال اور آرٹ" میں تبصرہ کیا ہے کہ کس طرح اقبال نے اپنی شاعری کا موضوع
ی ان اہم بالشان حقایق کو قرار دیا جو قوموں اور جماعتوں کی سیرت کی تشکیل میں ممد و معاون ہوتے ہیں۔ اس نے
ی کو مقصود بالذات کبھی نہیں سمجھا بلکہ اس کے ذریعے سے اشاروں اشاروں میں حیات انسانی فطرت اور تقدیر
اسرار و رموز ہمارے لئے بے نقاب کر دئیے۔ وہ آرٹ کو زندگی کا خادم خیال کرتا ہے۔ اس کے نزدیک حقیقی شاعر وہ ہے جو اپنی
یت کی قوت اور جوش عشق کی بدولت اپنے دل و دماغ پر ایسی کیفیت طاری کرے جس کے اظہار پر وہ مجبور ہو جائے یہی کیفیت آرٹ
ن ہے۔ یہہ واقعہ ہے کہ اقبال کا آرٹ تنقید و تعریف کی حدوں سے بالکل بے نیاز ہے۔

ڈاکٹر قاضی عبد الحمید صاحب نے "اقبال کی شخصیت اور اس کے پیغام" پر جو مقالہ سپرد قلم کیا ہے، اس میں انھوں نے
کی سادہ معاشرت، پسندیدہ اخلاق، خاکساری، صاف گوئی، جذبۂ قومیت، وطن پرستی، قومی شاعری، فطری شاعر، عصری
ی شاعری، اصولِ ارتقاء، نظریۂ علم، تصور عشق، تصور خودی، روحانی اشتراکیت۔ غرض یہہ کہ اس کی بہت ساری معانی
ن نظریے اور تصورات پر کافی روشنی ڈالی ہے۔

ابو ظفر عبد الواحد صاحب نے اپنے مقالہ "اقبال کا ذہنی ارتقاء" میں اقبال کی بڑائی، علمیت، جامعیت، شاعری کا
د اور واعظانہ روپ، مذہبی رنگ، معتقدات اور رجحانات، پیام عمل، فلسفۂ حیات، روحانیت، تفکر، ذہانت، ہمہ دانی
ی اور اس کی شاعری کے غیر فرقہ پرستانہ پہلو کو اچھی طرح اجاگر کیا ہے۔

سید بشیر الدین صاحب نے "اقبال کے تصور زماں" پر ایک تحقیقی و تنقیدی مقالہ تحریر کیا ہے۔ اقبال کے پیام کی کامیابی
بڑی حد تک زمان کے اس تصور میں مضمر معلوم ہوتا ہے کہ زمان ایک حقیقت ہے اور زندگی نام ہے زمان میں ایک مسلسل
کا زمان کا یہہ تصور اس کے ادب میں جاری و ساری ہے اور اس کے پائدار اور لازوال ہونے کا بڑی حد تک ضامن ہے۔

سید نذیر نیازی صاحب نے علامہ اقبال کی آخری علالت کا حال بڑے پُر درد پیرایہ میں نہایت تفصیل کے ساتھ بیان کیا ہے
مون اقبال کی سوانح حیات کا ایک مستقل جزو ہے۔

سید آل احمد سرور صاحب لکچرار مسلم یونیورسٹی نے "اقبال اور اس کے نکتہ چیں" کے عنوان سے جو مضمون لکھا ہے اس میں بتایا ہے
ال نے بہت سی خوبصورت ترکیبیں وضع کی تھیں، بہت سے نئے استعارے اور تشبیہات پیش کئے تھے وہ کانوں کو اجنبی معلوم ہوئے
اس لئے بعض نگاہوں میں نہ جچا۔ سورج نکلنے والا ہوتا ہے تو بعض ستارے کچھ دیر تک آنے والی روشنی کا مقابلہ کرتے ہیں مگر کب تک،
دیر کے بعد وہ رخصت ہو جاتے ہیں اور سارا عالم مطلع انوار ہو جاتا ہے۔ بہت دن تک اقبال پر جو اعتراضات کئے گئے تھے وہ زبان سے
ے۔ وقت گذرتا گیا شاعر کا کلام مقبول ہوا اس کی شاعری کا سونا زندگی کی بھٹی میں تیار ہوا تھا۔ اس لئے اس میں صداقت
اور حسن بھی۔ اب وہ وقت آیا کہ اقبال اپنے دور پر اثر انداز ہوئے۔ ان کا رنگ بھی مقبول ہوا اور دوسرے شعرا غیر شعوری
ں کا اتباع کرنے لگے۔ اسی مضمون میں علامہ اقبال کے بعض معترضین کے اعتراضات بھی لکھے گئے ہیں اور انکی تردید بھی کی گئی ہے

غرض یہہ کہ اس اقبال نمبر کے جملہ مضامین نہایت قابلیت اور تحقیق و تنقید کے ساتھ لکھے گئے ہیں۔ ہر مضمون اس قابل ہے کہ
پڑھا اور سمجھا جائے بعض جملے اور عبارتیں ایسی خوبصورت اور حسین لکھی گئی ہیں کہ بے ساختہ دل سے واہ نکلتی ہے۔ "س"

بچوں سے

سب رسی بھائیو اور بہنو!!

گرمی کی چھٹیاں ختم ہو چکیں مدرسے کھل گئے ہیں۔ اکثر مدرسوں
پہلا مہینہ ہے۔ ہم ان سب سب رسی بھائیوں اور بہنوں کو مبارک باد دیتے ہیں جنھوں نے اس سال ترقی پائی او
توہی امید رکھتے ہیں کہ وہ ہمارا ہاتھ بٹائیں گے۔ اور اتفاق سے جو اس سال ناکامیاب ہیں ان سے بھی ہمارا
ہے کہ وہ ناامید نہ ہوں بلکہ اس سال دل لگا کر پڑھیں اور اچھے نمبروں سے کامیاب ہوں۔

گزشتہ مہینے ایک تحریک کی گئی تھی جس کی طرف بہت کم بھائیوں اور بہنوں نے توجہ کی خصوصاً بھائیوں
شکایت ہے کہ وہ ان معاملات میں لڑکیوں سے بہت پیچھے ہیں۔ ہمیں اب تک جو کوپن وصول ہوئے وہ یہ ہیں
(۱) مس بی فخرالدین (۲) سید نورالقمرالدین (۳) مس شوکت باسط علی خاں (۴) حبیب شمس (۵) تہذیب فاطمہ۔ آپ
دیکھیں گے کہ بھائیوں کی تعداد زیادہ رہتی ہے یا بہنوں کی۔ اکثر بچے الگ کاغذ پر کوپن بھیجتے ہیں۔ جن کے پاس
کوپن چھپا ہے اسے چاک کر کے بھیجیں۔ کوپن جلد از جلد روانہ کیجئے۔ بالفعل دو نام دیے جاتے ہیں۔ یہ ایک دوسرے
خط وکتابت کریں اور کچھ دریافت کرنا چاہیں تو دفتر کو خط لکھیں۔ براہ کرم ان ہی سے خط وکتابت کریں جن کے پتے
سے دیے جائیں۔ خطوط کی ایک نقل ہمارے ہاں بھی روانہ کریں اگر وہ قابل اشاعت ہوں تو شایع کر دیے جا
دوسرے بھی اسی طرح لکھنا سیکھیں۔ اس تحریک سے ہمارا مقصد ایک دوسرے میں محبت و اتفاق پیدا کرنا اور ا
خیالات سے آگاہ کرنا ہے اس سے یہ فائدہ ہوگا کہ خط لکھنا آجائے گا۔ خط لکھنا بھی ایک ہنر ہے ایک دوسرے کو
خاص مشق ہو جائے گی اور خط لکھنے کا صحیح طریقہ آجائے گا۔ اچھا تو اس ماہ ان دونوں بہنوں کے پتے دیے جاتے
ایک دوسرے سے خط وکتابت کریں۔ دونوں کا محبوب مشغلہ ٹکٹ جمع کرنا ہے۔

(۱) مس بی فخرالدین باغ ظفر جنگ سیف آباد حیدرآباد دکن (۲) مس شوکت باسط علی خاں ناظم خفیفہ خیریت آ

دیکھیں اس ماہ کتنے اور کس کے کوپن آتے ہیں۔

اس مہینے میں ہم نے اور آٹھ صفحے زیادہ کر دیے ہیں۔ تاکہ ہمارے بھائیوں اور بہنوں کو پڑھنے کے لئے ز
کوشش کریں کہ اکثر رسالے بجائے ۱۶ کے ۲۴ صفحوں ہی کے تیار ہوں۔ اور ان آٹھ صفحات کی زیادتی کی وجہ
کی سالانہ قیمت میں کوئی اضافہ نہ ہوگا۔ اس کے بدلے میں توقع ہے کہ سب رسی بچے اور بچیاں خریداروں کی
اضافہ کرنے کی کوشش کریں گے۔

معین الدین احم

دلچسپ معلومات

(۱) دنیا میں سب سے بڑا سینما ہال نیویارک امریکہ میں ہے۔ جس کا نام روکسی ہے
میں (۶۵۰۰) اشخاص آسانی سے بیک وقت بیٹھ سکتے ہیں۔ (۲) دنیا میں سب سے بڑا جہاز کوین میری ہے جس کی لمبا
اور چوڑائی (۱۱۸) فیٹ ہے اور اس میں ۸۰ ہزار ۳۰۰ ٹن بوجھ لادا جا سکتا ہے۔

مسیح الدین

س

یران کے جنوب و مغربی جانب ایک خلیج واقع ہے جس کو خلیج فارس کہتے ہیں۔ اس کے کنارے ایک قطعہ زمین
ہی سرسبز و شاداب ہے اور جس کی آب و ہوا نہایت ہی خوشگوار ہے۔ جسے پارس کہتے تھے۔ جس کو اہل عرب
س کے نام سے پکارنے لگے۔ کہتے ہیں کہ اس شہر کا نام ہوشنگ کے بیٹے پارس کے نام سے موسوم کیا گیا تھا۔ اسی
نام قطعہ ایران کو پارس کہتے تھے۔ یہی وجہ ہے کہ اہل یورپ اب بھی سارے علاقۂ ایران کو پرشیا کہتے ہیں۔
ے کہ اس کے ٹکڑے ٹکڑے ہو گئے اور ہر ایک علاقہ کا علیحدہ علیحدہ نام رکھا گیا اس خاص علاقہ کو پارس یا فارس

درتی طور سے یہ علاقہ دو حصوں میں منقسم ہے۔ ایک پہاڑی اور دوسرا میدانی۔ اس کے جنوبی سرے پر سمند
یعنی خلیج فارس۔ اس قطعہ کی آب و ہوا کہیں نہایت گرم ہے تو کہیں نہایت سرد۔ اکثر صحرا سرسبز و شاداب ہیں۔
اور ندیاں جاری ہیں۔ یہاں ہمہ اقسام کے میوے کے درخت اگائے جاتے ہیں۔ یہاں کا گلاب بھی مشہور ہے جس کا

جاتا ہے۔
اس کے علاوہ یہ قطعہ ایک زمانہ میں اپنی شان و شوکت میں یکتا تھا۔ یہاں کی کانیں اور گرم پانی کے چشمے بہت
ہیں۔ ایک زمانہ میں یہاں کے آثار قدیمہ کے متعلق لوگوں کا یہ خیال تھا کہ یہ جن و پری کے کام ہیں۔ مثلاً۔ خانۂ زردشت
و پور۔ تختِ جمشید اور دخمۂ فریدوں۔
یہاں کی آب و ہوا جیسا کہ اوپر بیان کیا گیا ہے۔ خوش گوار اور صحت افزا ہے۔ قویٰ میں شگفتگی و بالیدگی پیدا کرتی ہے
ہمیشہ تومند اور چست و چالاک رہتا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ فارس کے اکثر شہر مثلاً یزد۔ فیروز آباد۔ بیضا۔ شیراز
وغیرہ مردم خیز سمجھے گئے ہیں۔ ان شہروں میں کثرت سے شاعر۔ ادیب۔ علماء۔ فضلاء پیدا ہوئے خصوصاً
یا۔
علاوہ کہ صدہا سال تک ایران کا دارالسلطنت بنا رہا اور جس کو دار العلم بھی کہا کرتے تھے۔ زبردست فصیح و بلیغ
پیدا ہوئے ہیں۔ مثلاً سعدی شیرازی۔ حافظ شیرازی اور عُرفی شیرازی وغیرہ۔ زمانے کے تغیرات سے اس علاقہ کی
حالت ابتر ہے۔ لیکن یہاں کے موجودہ باشندوں کے حالات سے معلوم ہوتا ہے کہ قدیم برتری و بزرگی اب بھی

موجود ہے۔
شیراز کے گرد و نواح میں ایک صحرا ہے جس کو صحرائے شاہ پور کہتے ہیں۔ اس میں ایک عالی شان اور پُر رونق
جس کو شِعب بوان کہتے ہیں۔ اس کا شمار دنیا کے ان تفرج گاہوں میں ہوتا تھا جو عربوں کے نزدیک لاثانی تھے۔
غوطۂ دمشق۔ نہر اُبلہ۔ صغدِ سمرقند۔ اور شِعب بوان۔ آتابک ابوبکر سعد زنگی یہاں کا ایک مشہور بادشاہ گزرا ہے۔
کہ اسی کے زمانہ میں شیخ سعدیؒ نے گلستاں لکھی ہے۔ اس کا خیال تھا کہ میری سلطنت میں صرف دو چیزیں ایسی
[illegible] کی حالت میں بادشاہوں کے لئے ناگزیر ہیں۔ خوف کی حالت میں قلعہ سفید اور اطمینان کی حالت میں

سب رس

شعب بوآن۔ اس قطعہ کی تعریف میں اکثر شعرائے عرب نے قصیدے لکھے ہیں۔ ایک مشہور شاعر کہتا ہے کہ اگر ... کی حالت میں قلعہ پر سے شعب بوآن کی فضا کو دیکھتا ہے تو اس کی ساری تکلیفیں یک لخت معدوم ہو جاتی ہیں۔

محی الدین

صنعت و تجارت

اگر ہم دنیا کی کامیاب اور متمدن اقوام کی تاریخ پر نظر ڈالیں تو تجارت اور صنعت و حرفت کے پراسرار الفاظ ... سے لکھے ہوئے نظر آئیں گے۔ اور واقعہ یہ ہے کہ متمدن اقوام عالم کے جادۂ ترقی میں یہی دو چیزیں پہلے بھی جلوہ افروز ... اور اب بھی موجود ہیں۔ صنعت و حرفت ہی کی بدولت دنیا کے چار طرف عظیم الشان شہر پھیلے ہوئے ہیں۔ اگر دنیا میں ... وجود ہوتا تو آج بڑے بڑے اور مہیب سمندروں کے سینۂ پرخطر پر تیرنے والے عظیم الشان جہاز فضائے آسمانی ... ہوائی جہاز، ویران اور سنسان جنگلوں میں پھرنے والی ریل۔ آن کی آن میں خبر رسانی کرنے والا تار برقی اور ریڈیو ... دولت کے محافظ چھاپے کی ایجاد اور بنی نوع انسان کو لباس پہنانے والے کپڑے کے زبردست کارخانے ہرگز ہرگز ... اسی طرح اگر تجارت دنیا میں نہ ہوتی تو یہ تمام مفید ایجادات و اختراعات جو حضرت انسان کی آسائش اور ... باعث ہیں فضول متصور ہوتیں۔ فی الحقیقت تجارت ہی وہ چیز ہے جس کی بدولت دنیا کی مصنوعات و دیگر اشیا ہم تک ... ہیں۔ اگر آج ہم صنعت و حرفت سے ناواقف ہوتے تو انجینیری کے تعجب خیز مناظر اور سائنس کے محیر کن کرشمے جو انسانی ... ثبوت ہیں ناپید ہوتے اور دنیا ان کے بغیر بالکل بے لطف و بے کیف ہو جاتی۔ سچ تو یہ ہے کہ انسان کو بام عروج ... اور ترقی کی منازل طے کرانے والی یہی دو چیزیں صنعت و حرفت اور تجارت ہیں۔

زمانۂ گذشتہ میں وہ کونسی چیز تھی جس نے عربوں کے بحری بیڑے کی عظمت کی دھاک اہل یورپ کے دل پر ... تھی، کولمبس کو کس چیز نے نئی دنیا کا پتہ دیا، فرانسیسی، پرتگیز اور انگریز کیوں سمندر پار پہنچے اور وہ کیا چیز تھی جس ... انگریز ہندوستان پر قابض ہو گئے۔ آج ایشیا، یورپ کا دست نگر ہے اور یورپ ہی کے ہاتھ ایشیا کی زیست ... ہے حالانکہ مشرق اپنی روحانی عظمت اور بزرگی میں مغرب پر ہزار درجہ تفوق رکھتا ہے لیکن پھر بھی مغرب کی ... طوق اس کی گردن میں ہے۔ اس کی وجہ صرف یہی ہے کہ مشرق نے صنعت و حرفت اور تجارت کو حرف غلط سمجھ ... اور مغرب نے اس کو ترقی کا راز سمجھ کر مضبوط پکڑ لیا۔

اگر ہم اپنے ملک اور قوم کا نام دنیا کی کامیاب اقوام اور متمدن ممالک کی فہرست میں لکھانا چاہیں اور معاشی غلامی ... سے آزاد ہو کر مغربی اقوام کی طرح سطح زمین پر آزادی سے سانس لینا چاہیں تو ہمارے لئے یہ ضروری ہے کہ ہم اپنی ... صنعت و حرفت اور تجارت کی طرف پھیر دیں۔ تجارت اور صنعت و حرفت تہذیب و تمدن کی علامت ہے اور تجارت ... خدا بھی محبوب رکھتا ہے چنانچہ ہم دیکھتے ہیں کہ جو قومیں تجارت اور صنعت و حرفت میں کامل دست گاہ رکھتی ہیں وہ ... ترقی کے منازل طے کر رہی ہیں اور غلامی کی زنجیروں کو توڑ کر آزادی کا دم بھرنے لگی ہیں

محمد عبد القادر فا...
(حمایت نگر)

اکبر بادشاہ کی کہانی

آؤ ہم تمہیں ایک بڑے اچھے بادشاہ کا حال سنائیں۔ جس سے تمام ہندوستانی بڑی محبت کرتے ہیں۔ بابر بادشاہ کا حال ہم پھر تمہیں سنائیں گے۔ اکبر اس کے بیٹے کا بیٹا یعنی پوتا تھا۔ اکبر اپنے دادا سے بہت زیادہ مشہور ہے اور دنیا کے بڑے بادشاہوں میں گنا جاتا ہے۔ ایسے بادشاہ کی تو بڑی مزیدار کہانی ہوگی؟ ہاں۔ سنو۔ ابتدا خود کتنی دلچسپ ہے۔ اکبر کے باپ ہمایوں نے شیر شاہ سے شکست کھائی اور شمال مغرب کی طرف مدد کی تلاش میں نکل گیا۔ یہ واقعہ تقریباً چار سو سال پیشتر کا ہے۔ شیر شاہ بہار کے ایک چھوٹے سے علاقہ کا حاکم تھا۔ بہار بنگال کے اوپر شمال میں واقع ہے۔ ہمایوں سلطنت کھو کر جنگلوں میں آوارہ و پریشان بھٹکتا پھر رہا تھا کہ اکبر اعظم پیدا ہوا

قاعدہ کے مطابق ہمایوں نے مشک جو بچ رہی تھی اپنے وفادار ساتھیوں میں بطور تحفہ تقسیم کر دی کیونکہ مال دنیا سے کوئی اور چیز باقی نہ تھی۔ اور ہمایوں کی زبان سے بے ساختہ یہ الفاظ نکلے کہ "جس طرح مشک کی بو نے سارا جنگل معطر کر دیا اسی طرح اس لڑکے کی حکومت سارے ہندوستان پر پھیل جائے اور اس نے جس طرح تمہارے دل و دماغ کو فرحت بخشی اسی طرح اس کی حکومت تمہیں آسودہ حالی اور چین بخشے"۔ کچھ عرصہ بعد ہوا بھی ایسا ہی جس کا حال تم پڑھو گے۔ دیکھا تم نے کہ کس طرح ٹوٹے ہوئے دلوں کی آواز اگر فوراً نہیں تو ایک نہ ایک دن ضرور اپنا اثر دکھلاتی ہے۔ ہمایوں نے اس بچہ کو اپنے ایک تجربہ کار ساتھی کے حوالے کر دیا۔ اس کے ساتھی کا نام بیرم خاں تھا۔ تمہیں حیرت ہوگی کہ جو لڑکا ان عجیب حالات میں پیدا ہو وہ اتنا بڑا کیسے بن گیا۔

ہمایوں نے بڑی بہادری دکھلائی اور سلطنت پھر سے حاصل کر لی۔ ہمایوں کے انتقال پر اس کا بیٹا اکبر بادشاہ ہوا۔ اس وقت اکبر کی عمر (۱۳) سال کی تھی۔ بیرم خاں اس کمسن بادشاہ کا اتالیق تھا۔ یہ نہایت سمجھدار اور تجربہ کار تھا۔ اس نے ملک میں اچھے اچھے انتظامات کئے۔ جس سے ملک میں امن قایم ہو گیا۔ جتنی بغاوتیں ہوئیں ان سب کو بیرم خاں نے سختی سے فرو کر دیا۔ سب سے پہلی اہم بغاوت ہیمو نے کی۔ ہیمو اس خاندان کا ملازم تھا جس نے اکبر کے باپ کے زمانہ میں سلطنت کھو دی تھی۔ ہیمو نے دلی کے اطراف کے علاقوں پر قبضہ کر لیا۔ اس فتح سے مغرور ہو کر خود بادشاہ بن بیٹھا۔ بیرم خاں نے اس کو پانی پت کے میدان پر قتل کر کے بغاوت کا خاتمہ کر دیا۔ یہ وہی میدان ہے جہاں اس کے دادا بابر نے ابراہیم لودھی کو نیچا دکھا کر ہندوستان میں پہلی دفعہ قدم رکھا تھا۔ کچھ دنوں بعد جب اکبر بڑا ہو گیا اس نے سلطنت کی باگ اپنے ہاتھ میں لے لی۔ دلی کے اطراف کے علاقے بالکل آزاد تھے۔ اکبر پر لازمی تھا کہ انہیں مطیع کرے ورنہ ڈر تھا کہ کہیں وہ یکجا رہ کر اکبر سے سلطنت نہ چھین لیں۔ اس طرح کے علاقے اکبر نے رفتہ رفتہ فتح کر لئے۔ یہ علاقے راجپوتانہ، گجرات، بنگال، کابل اور دکن تھے۔ یوں تو اس کی سلطنت سارے ہندوستان پر پھیل گئی۔

ادھر سے فارغ ہو کر وہ ملک کی بہتری کی طرف پلٹا۔ اور بڑی اچھی اچھی اصلاحیں کیں۔ ساری سلطنت کو ۱۵ صوبوں میں تقسیم کر دیا۔ ان پر صوبیدار مقرر کئے۔ جو سارے صوبہ پر حکومت کرتے تھے۔ صوبوں کو پھر ضلعوں میں تقسیم کیا اور ان پر جو عہدہ دار رکھے وہ فوجدار کہلاتے تھے۔ اکبر کا وزیر راجہ ٹوڈرمل تھا۔ اس نے کسانوں سے محصول وصول کرنے کا ایسا اچھا

انتظام کیا کہ رعایا بہت خوشحال ہوگئی۔ اور سرکاری آمدنی بھی بہت بڑھ گئی۔

ملکی انتظام کے علاوہ اکبر نے کئی بری رسمیں بھی موقوف کردیں۔ ہندوستان کی رسم کے مطابق شوہر مرجانے پر اس کی بیوی جل مرتی تھی۔ چھوٹے چھوٹے بچوں کی شادی کردی جاتی تھی۔ کئی علاقوں کو فتح کرنے کے بعد وہاں کے لوگوں کو غلام بنایا جاتا تھا۔ شوہر کے مرجانے پر عورت دوبارہ شادی نہیں کرسکتی تھی۔ اکبر بادشاہ نے یہ تمام خراب رسمیں فوراً موقوف کردیں۔ یہ تو سب کچھ ملک کے لئے کیا اب ذرا علم کی خدمت کا حال سنو۔ اس کے دربار میں اس زمانہ کے تمام قابل لوگ جمع تھے۔ تم اب ان کے نام پوچھو گے۔ اچھا وہ بھی سن لو۔ دو بھائی ابوالفضل اور فیضی اکبر کے بڑے دوست تھے۔ ابوالفضل بڑا لایق تھا اس نے اکبرنامہ لکھا نام ہی خود بتلاتا ہے کہ اس میں کس کے حالات ہیں۔ فیضی فارسی زبان کا بڑا شاعر تھا۔ ان کے علاوہ ٹوڈرمل، ان سنگھ، بیربل اور تان سین اکبر کے خاص مصاحب تھے۔

مان سنگھ فوج کا بڑا عہدہ دار تھا۔ ٹوڈرمل اپنے مالی انتظامات کی وجہ سے مشہور ہے۔ بیربل کے مزیدار چٹکلے تو تم یقیناً سن چکے ہوں گے۔ یہ اکبر کو جو بس پھر ہنساتا تھا۔ گانے سے اگر تم سب کو نہیں تو بعض کو ضرور دلچسپی ہوگی جس کا گانا بہترین معلوم ہو بس اس کو تان سین کا شاگرد سمجھو۔ ان میں ہر ایک اپنے فن کا استاد اور اپنے علم کا زبردست جاننے والا تھا۔ اکبر کے دربار میں یہ لوگ آسمان پر ستاروں کی طرح چمکتے تھے اور یہی دربار اکبری کے نورتن یعنی نو ہیرے کہلاتے ہیں۔

اکبر بادشاہ کا آخری زمانہ بڑی پریشانیوں میں گذرا۔ اس کے بیٹوں نے بغاوتیں کیں اور سارا بنا بنایا کھیل بگاڑ ڈالا انچاس برس کے سن میں اکبر نے انتقال کیا۔ اور اس کا بیٹا جہانگیر بادشاہ ہوا۔

مسز احمد

ایک بڑھیا کے آخری چند لمحات

ایک بڑھیا بستر مرگ پر اپنے آخری لمحات گزار رہی تھی۔ اس کی ایک بیٹی سوہنی تھی۔ بڑھیا کے سوہنی سے پیشتر کئی بچے گزر چکے تھے اس لئے بڑھیا نے سوہنی کو بڑے لاڈ پیار سے پالا تھا۔ گو اس بڑھیا نے غربت و نکبت میں عمر بسر کی تھی۔ لیکن جب تک اس کے ہاتھ پیر چلتے تھے کبھی سوہنی کی کسی فرمائش کو رد نہ کیا۔ رد کرنا تو کجا صرف سوہنی کا میٹھے آواز میں اتنا کہنا ہی اس کے لئے کافی تھا۔" اماں "فلاں چیز (اچھی لگتی ہے) بھلی معلوم ہوتی ہے۔ بڑھیا فوراً اس کی تکمیل کردیتی تھی

ہر وقت بڑھیا اسی خیالات میں منہمک رہتی تھی کہ" میرا کیا ہے آج گھر میں کل گور میں۔ میرے دم میں دم ہے تب تک میں سوہنی کی خواہشات و فرمائشات پوری کروں گی کیونکہ میرے سوا اس کی خواہش پورا کرنے والا کون ہے"۔ دم آخر۔ بڑھیا نے ایک آہ بھر کر کہا" آہ میری سوہنی تنہا رہے گی اور وہ میری یاد میں روتی رہے گی۔ لیکن اس کا کوئی پرسان حال نہ ہوگا" کیونکہ سوہنی کے باپ بھائی سب گزر چکے تھے۔ اب کوئی دور دراز کے رشتے دار باقی تھے بھی تو بھلا غربت میں کون کسی کا ساتھی ہوتا ہے۔ حالانکہ سوہنی کا بہت بڑا قبیلہ تھا۔

لیکن [illegible] بہت بری بلا ہے جس کی وجہ اپنے بھی پرائے ہو جاتے ہیں۔ بیچاری سوہنی اور بڑھیا کو کوئی کبھی کبھار پلٹ کر بھی نہ دیکھتا کہ ان کا کیا حشر ہو رہا ہے۔ وہ اپنی ہوگی میں بھی رشتے داروں کے گھر جا کر حقیر و ذلیل ہونا نہ چاہتی تھی۔ وہ کئی دفعہ بیمار ہوئی لیکن اس دفعہ اس کے بچنے کی کوئی امید نہ تھی۔ بڑھیا اس خیال سے سہمی ہوئی تھی۔ کیونکہ سوہنی بمشکل بارہ سال کی تھی۔ اگر وہ یہ سن پائے گی کہ اس کی ماں کا بھی سایہ اس کے سر سے اٹھنے والا ہے تو اس کا ننھا کلیجہ دہل جائے گا اور وہ ممکن ہے پریشان ہو کر پاگل ہو جائے۔ بڑھیا انہی خیالات میں غرق تھی کہ آنے والی مصیبت سے سوہنی کو آگاہ کردوں یا نہیں۔ وہ سوہنی کو کچھ آخری مرتبہ نصیحت کرنا چاہتی تھی۔ لیکن اس کو غش پہ غش آتا تھا اور وہ بے ہوش ہو جاتی تھی۔

سوہنی ماں کے کبھی سرہانے پر ہی بیٹھی ہوئی تھی اور زار و قطار رو رہی تھی۔ سوہنی نے کسی کو مرتے ہوئے نہ دیکھا تھا۔ لیکن مرنے کا نام کئی دفعہ سن چکی تھی اور کئی جنازے سڑک سے گزرتے ہوئے دیکھے تھے۔ اس لئے ہیبت زدہ ضرور تھی کہ اب اس کی ماں کا نہ معلوم کیا حشر ہونے والا ہے۔

جب بڑھیا بے ہوش ہو جاتی تو سوہنی گھبرا کر فوراً ہلاتی اور کہتی "اماں ایسا کیوں کر رہی ہو آنکھیں کھولو کچھ تو کہو کہ تم پر کیا عالم ہے کیا مجھے تنہا چھوڑ جاتی ہو ایسا ہرگز نہ کرو کئی دفعہ سنا ہے کہ لوگ مر جاتے ہیں اور تم ہی خود کہتی تھیں کہ میرے باپ بھائی سب مر گئے۔ کیا تم بھی مر رہی ہو۔ للہ صحیح کہدو۔ سوہنی ایک سرد آہ کھینچتی اور آسماں کی طرف دیکھنے لگتی گویا وہ کسی سے فریاد کر رہی ہے اور چاروں طرف آنکھیں پھاڑ پھاڑ کر دیکھنے لگتی کیونکہ اس کی آنکھوں میں تاریکی چھا رہی تھی اور دنیا اس کو تاریک نظر آ رہی تھی۔ وہ ایک بار بلکہ آخری مرتبہ ماں کے سینہ پر گری اور چلانے لگی "دنیا کتنی بری جگہ ہے خدایا۔ یا یوں کہوں کہ غریبی بہت بری بلا ہے۔ جس کی وجہ آج کوئی میرا ساتھی نہیں۔ ہائے میری دکھیا ماں جس نے مجھے اب تک پالا پوسا تھا وہ بھی مجھے آج تنہا چھوڑ کر سدھار رہی ہے۔" یہ سوہنی کے درد بھرے الفاظ بڑھیا کے کان میں پڑے اور وہ ہوش میں آئی اور کانپتے ہوئے ہاتھوں سے آخری مرتبہ سوہنی کے آنسو خشک کئے اور کہنے لگی۔ "بیٹیا موت انسانوں کو ہی آتی ہے یہ لازمی چیز ہے۔ کتنے ہی دن دنیا میں رہیں آخر ایک دن جانا ہے۔ گھبراؤ نہیں اب میرا بھی سفر ہے۔ تمھارا خدا رزاق ہے اسی کی ذات پر بھروسہ رکھو (وہی سب کو روزی دیتا ہے) (اور وہی پالتا ہے) اسی نے پیدا کیا ہے) اب میں تم کو کچھ بطور نصیحت کے کہنا چاہتی ہوں کیونکہ اب میں چند لمحات کی مہمان ہوں۔ اس کو ہمیشہ ہمیشہ کے لئے یاد رکھو۔ اب تم سیانی ہوتی جا رہی ہو۔ کسی نیک اور شریف لڑکے سے بیاہ کرلو اور عاجزی انکساری کو ہمیشہ دوست بنائے رکھو۔ غریبوں اور مصیبت زدوں کی ہر وقت مدد کرنے کے لئے تیار رہو کبھی کسی حاجت مند کی مدد کرنے سے پہلو تہی نہ کرو۔"

بڑھیا اور کچھ کہنا ہی چاہتی تھی اس کی روح پرواز ہو گئی اور سوہنی نے دھاڑیں مار مار کر رونا شروع کیا آج اس مرتبہ سوہنی کی ماں بے ہوش نہ ہوئی تھی۔ جو سوہنی کو ذرا ایک بار سمجھاتی اور گلے لگاتی۔

اتنے میں اس بوڑھیا کا ہمدرد ہمسایہ جو صبح سے اپنے کام پر گیا ہوا تھا آیا، سوہنی کی چیخ پکار سن کر جھونپڑا

داخل ہوا۔ بڑھیا کا یہ حال دیکھ کر پریشان ہوا اور سوہنی کو زمین سے اٹھا کر گلے لگا لیا۔ اور دلاسا دے کر کہا "بیٹی رو نہیں میرا گھر نہیں تیرا ہی گھر ہے اور آج سے میں تیرا باپ ہوں میرے جیتے جی تجھے ہرگز تکلیف نہ ہونے دوں گا" یہی ایک ہمسایہ تھا جو بڑھیا کے ساتھ ہمیشہ ہمدردی سے پیش آتا تھا اور اس کی ہر طرح مدد کرتا۔ یہی وجہ تھی کہ سوہنی کو اس پر بھروسہ تھا۔ اس نیک بخت ہمسایہ کے ایک لڑکا تھا جو بڑھیا کی زندگی میں ہی سوہنی کو جھونپڑی سے باہر آتا جاتا دیکھ کر خوش ہوتا تھا۔

چونکہ سوہنی کوئی بدشکل لڑکی نہ تھی بلکہ اس کے چہرے پر ملاحت تھی اور سوہنی کی ہر ایک ادا میں نزاکت تھی اس لئے وہ اس کو دل سے پسند کرتا تھا۔ بڑھیا بھی کئی دفعہ اس لڑکے کی نسبت ذکر کیا کرتی تھی اس لئے سوہنی بھی اس لڑکے سے نفرت نہ کرتی تھی۔ جب سے ایک گھر میں دونوں رہنے لگے۔ میل ملاپ بڑھتا گیا۔ اور وہ دونوں ایک دوسرے سے زیادہ محبت کرنے لگے۔

ہمسایہ گو کوئی غریب نہ تھا اور طرفہ یہ کہ اکلوتا اس کا لڑکا تھا۔ بڑی آرزوؤں سے بڑے گھر کی لڑکی بیاہ لانے کی دل میں ٹھان رکھی تھی۔ لیکن اب اس نے سوہنی سے ہی بیاہ کرنے کا ارادہ کیا۔ کیونکہ وہ سوہنی کے خاندانی حالات سے بخوبی واقف تھا۔ اس میں شک نہیں سوہنی غریب ضرور تھی اور لین دین کچھ نہ تھا۔ ہمسایہ اکثر کہتا رہتا کہ "غریبی کوئی عیب نہیں ہاں جو لالچی ہوتے ہیں غریبوں سے نفرت کرتے ہیں لیکن مجھے نفرت نہیں کرنا چاہیئے۔ بلکہ سوہنی سے بڑھ کر اور کم سخن فرمانبردار سلیقہ مند لڑکی نہیں ملے گی۔"

اس خیال کے آتے ہی اس نے بیاہ کی تیاری کی کیونکہ لڑکے کی مرضی بھی اسی میں تھی۔ جوں ہی سوہنی کا بیاہ ہوا اس گھر میں دولت کی دن دونی رات چوگنی ترقی ہونے لگی۔

بہو سے ساس سسر سب ہی خوش تھے۔ یہ سوہنی کے ہی اخلاق تھے جو سب کو اس طرح فریفتہ کئے ہوئے تھے۔ یا بڑھیا کے آخری الفاظ تھے جو سوہنی کے دل پر گہرا اثر کئے ہوئے تھے۔ جس کی وجہ وہ ہر ایک سے محبت ملاپ عاجزی انکساری سے پیش آتی تھی۔ حالانکہ وہ اب بہت دولت مند ہو چکی تھی اور گھر کی اکلوتی بہو تھی لیکن غریبوں اور محتاجوں کی مدد کرنے سے کبھی انکار نہ کرتی تھی بلکہ وہ ایسوں کی مدد کرنا زیادہ ضروری سمجھتی تھی۔

سوہنی کے نام کا ڈنکا گھر گھر بجنے لگا تھا۔ بلکہ دور دور تک اس کی سخاوت اور ہمدردی کی شہرت ہو چکی تھی۔ سوہنی اب دو تین بچوں کی ماں بن چکی تھی۔ لیکن کبھی کبھی بڑھیا ماں کی یاد میں آنسو بہایا کرتی۔

اقبال النساء

ت شیخی خورا ور چربی کا ٹکڑا

ایک شخص پر لے درجے کا جھوٹا اور شیخی خورہ تھا۔ دیکھنے میں تو وہ چکنا چپڑا نظر آتا تھا مگر اس کا پیٹ ڈھول
رح خالی تھا اور اس میں ہر وقت چوہے قلابازیاں کھاتے رہتے تھے۔ اتفاقاً ذبیحے کی چربی کا ایک
ڑا کہیں سے اس کے ہتھے چڑھ گیا تھا۔ وہ روزآنہ علی الصباح اس سے اپنے ہونٹ اور مونچھیں چکنی
کے شہر کے خوش حال لوگوں میں بیٹھا گپیں مارتا رہتا تھا۔ بات بات پر کہتا کہ آج تو ہم نے بڑے تر نوالے
ائے ہیں اور بار بار اپنی چکنی مونچھوں کو تاؤ دے دے کر بتاتا رہتا تاکہ وہ اس کی باتوں کو سچ سمجھیں۔

ایک روز کسی محفل میں بیٹھا ہوا اسی طرح بے پر کی اڑا رہا تھا۔ اتفاقاً اس کے گھر میں بلی آئی اور چربی کا
ڑا لے کر چل دی۔ بچہ اس کے پیچھے لپکا مگر وہ چھلانگ مار کر کہیں سے کہیں جا پہنچی۔ اس وقت وہ شیخی خورہ باہر
ٹھا ہوا یار دوستوں میں شیخیاں بگھار رہا تھا کہ آج ہم نے یہ کھایا اور آج ہم نے وہ کھایا اور یہ دیکھو کہ
اروں کی مونچھیں اب تک چکنی ہیں ...... اتنے میں وہ بچہ دوڑتا ہوا باہر آیا اور کہنے لگا کہ اباجان جس
چربی سے آپ روزانہ اپنی مونچھیں اور ہونٹ چکنے کرتے رہتے تھے، ابھی ایک بلی آئی اور اسے منہ میں دبا کر
لے بھاگی۔ بچے کے منہ سے یہ بات نکلتے ہی اس کا چہرہ فق ہوگیا اور لوگوں نے یہ واقعہ سن کر ایک فرمائشی قہقہہ مارا
اس کے بعد جب لوگوں کو اس کی مفلسی اور ناداری کا حال معلوم ہوا تو انھیں بہت رحم آیا اور اس کی امداد کرنے لگے۔ اس
ی خورہ نے جب سچ بولنے کا یہ نتیجہ دیکھا تو شیخی اور تکبر سے توبہ کی اور راستی کو اپنا شعار بنالیا۔

او چو ذوقِ راستی دید از کرام — بے تکبر راستی را شد غلام

(اس نے جب سچ بولنے پر لوگوں کی یہ مہربانی دیکھی — تو تکبر سے توبہ کی اور راستی کا غلام بن گیا)

نتیجہ:۔ شیخی اور تکبر کا سر نیچا اور سچائی کا بول بالا رہتا ہے۔

مرزا عصمت اللہ بیگ

انمول موتی

(۱) مارنا چاہتا ہے تو نفسِ امارہ کو مار (۲) فتح کرنا چاہتا ہے تو حواسِ خمسہ کو فتح کر۔
(۳) کھانا چاہتا ہے تو طیش و غضب کھا (۴) پینا چاہتا ہے تو شربتِ وحدانیت پی۔
(۵) پہننا چاہتا ہے تو نیکی کا لباس پہن۔ (۶) دینا چاہتا ہے تو نیچی نگاہ کرکے دے اور بھول جا۔
(۷) جانا چاہتا ہے تو متبرک مقامات پر جا (۸) آنا چاہتا ہے تو غریبوں کی مدد کو آ۔

(ماخوذ) **سید خواجہ معین الدین**

میرا محبوب مشغلہ

مطالعہ ایک شریفانہ ہی نہیں بلکہ حکیمانہ فعل ہے۔ پڑھنے کی عادت بہت اچھی ہے۔ ہم کو چاہیئے کہ جس چیز کا بھی
مطالعہ کریں اس کو کسی مقصد کے تحت پڑھیں۔ ایک مصنف لکھتا ہے کہ بغیر کسی مقصد کے پڑھنا فضول ہی نہیں بلکہ مضر ہے
مقصد کے بغیر پڑھنے سے کوئی فائدہ نہیں ہوتا۔ مطالعہ معمولی کتابوں کا نہیں کرنا چاہیئے کیونکہ ہم کو اس سے زیادہ اچھی معلومات
حاصل نہیں ہوتیں بعض لوگ فضول اور ادنیٰ درجے کی کتابیں پڑھتے ہیں۔ جس سے ان کا خیال ہے کہ معلومات میں اضافہ
ہوتا ہے۔ لیکن وہ یہ نہیں سمجھتے کہ معمولی اور ادنیٰ معلومات دماغ میں بھرے جا رہے ہیں۔ جس سے اعلیٰ معلومات کی گنجائش
نہیں رہتی۔ اس سے معلوم ہوا کہ مطالعہ تو ضرور کرنا چاہیئے لیکن اس کے ساتھ ہی ساتھ جس کتاب کا مطالعہ کیا جائے وہ مفید
ہو اور اس سے ہم کو اعلیٰ معلومات اور فوائد حاصل ہوں عمدہ کتابوں کے مطالعہ نے انسان کے اخلاق اور عادات پر
اثر ڈالا۔ خیالات میں بہت بڑا تغیر پیدا کیا قوموں میں ہلچل اور انقلابات بپا کئے۔ ممالک کی کایا پلٹ میں حیرت انگیز مدد دی
ہے۔ بعض کتابیں اب بھی دنیا میں موجود ہیں جن کے پڑھنے سے مردہ دل انسان بھی زندہ دل ہوگئے۔ بہت سے
ہوئے ہشیار ہوگئے۔ بہت سی قوموں میں قومیت اور انسانیت کی روح زندہ ہوگئی۔ مطالعہ کے ذریعہ اخلاق کی تعلیم
دے سکتے ہیں۔ اعلیٰ اخلاق کی تعلیم یوں دی جائے کہ نوجوانوں کے دلوں میں اعلیٰ اور پاکیزہ خیالات اس طرح متمکن
ہوجائیں کہ دنیوی لالچ خودغرضانہ خواہشات دوستی اور مروت انھیں ڈانواں ڈول نہ کرسکے اس کے لئے ان کو ایسی
کتاب مطالعہ کے لئے دی جائے جو موثر بھی ہو دلکش بھی اور طبیعتوں میں ولولہ اور جوش بھی پیدا کرے۔ یعنی ان لوگوں کے
حالات مطالعہ کے لئے دیئے جائیں جنھوں نے دنیا میں بڑے بڑے کام کئے ہیں۔ ان کتابوں کے مطالعہ سے انسان کے
دل میں ولولہ اور جوش پیدا ہوتا ہے۔ مطالعہ میں انسان اتنا مشغول ہوتا ہے کہ وسے آس پاس کی خبر نہیں ہوتی
یہ تمام کرشمے مطالعہ سے ہی ظہور میں آتے ہیں۔

عارف انصاری

کسان اور اس کی لڑکی

ایک کسان چوری کرتے وقت چاروں طرف دیکھا کرتا تھا۔ لیکن ایک طرف نہیں دیکھتا تھا۔ ایک دن وہ اپنی لڑکی کو لے کر
چوری کرنے گیا۔ اس نے چاروں طرف دیکھا۔ لڑکی نے کہا اباتم چاروں طرف کیوں دیکھ رہے ہو اس نے کہا کہ دیکھتا ہوں
کوئی آتا تو نہیں ہے لڑکی نے کہا اباتم چاروں طرف تو دیکھتے ہو مگر اوپر کی طرف نہیں دیکھتے۔ وہ دیکھو اوپر خدا دیکھ رہا ہے
یہ سن کر کسان نے اس روز سے چوری کرنا چھوڑ دیا۔

سید خیرات حسین

...یک کوشش

امتحان! امتحان!! خدا کی پناہ امتحان!!!

...ان کا روح فرسا سماں دیکھ کر رونگٹے کھڑے ہو جاتے ہیں۔
...اس امر کی کوشش کرتا ہوں کہ ایسا خیال کبھی پیدا ہونے ہی نہ پائے۔ چونکہ یہ میرے لئے ناقابل برداشت ہے۔
...صاحب تھوڑے وقفہ سے اسی موضوع پر پُر زور تقریر کرتے ہیں۔
...میری یہ حالت کہ جوں ہی کتاب چھوی۔ آنکھوں کے سامنے امتحان گاہ کا منظر کھنچ گیا۔
...ل میں قدم رکھے صرف پانچ ہی سال ہوئے ہیں۔ ناکام ضرور ہوا ہوں۔ لیکن اوروں کی طرح مایوس نہیں۔ میرا عقیدہ
...کہ (مرد باید کہ ہراساں نہ شود) اس کے علاوہ والد صاحب نے بھی تو ہمت افزائی کا بیڑا اٹھایا ہے۔ یہ ایک عام قاعدہ
...کہ جو کوئی فیل ہو وہ سب کی نظر میں برا ٹھہرتا ہے۔ لیکن میرا معاملہ ہی کچھ اور ہے۔

پہلے سال جو فیل ہوا تو والد صاحب نے ایک لفظ تک اس ناکامی پر زبان سے نہ نکالا۔ اول اول تو میں سمجھ گیا تھا کہ
...خاموشی کچھ نہ کچھ رنگ لا کر رہے گی۔ لیکن میرا یہ خیال غلط نکلا۔ والدہ کی حالت سے تو وہی لوگ خوب واقف ہیں جنہیں
...ری طرح تجربہ ہوا ہو۔

پہلی مرتبہ ناکام رہے تو۔ خاموشی اختیار کی۔ دوسری مرتبہ تو میری مدارات میں اور اضافہ ہوا۔ میں ایسا
...نکرا بنا کہ کبھی کتاب چھونے کا نام نہ لیتا تھا۔ بھلا کیونکر چھوتا۔ جب کتاب ہاتھ میں آئی۔ دل و دماغ تفکرات کی آماج گاہ
...ن جاتے ہیں۔

کہتے ہیں پڑھنا دو طرح سے آتا ہے۔ ایک ڈر سے دوسرے شوق سے۔ شوق۔ ارے! ان کتابوں میں رکھا
...ہے۔ ہاں کچھ نئی کتابیں ہوں تو دیکھ لو کہ ختم کئے تک دم نہ لوں گا۔

اب رہا ڈر۔ ڈر کس کا۔ والد تو اس معاملہ میں بڑے ہی رحمدل ہیں۔ کبھی کوئی لفظ زبان سے نہ نکالا۔
...ہیں والدہ۔ ممتحن صاحب ہی ان کے مخاطب تھے۔ مجھے کبھی یہ شرف حاصل نہ ہوا۔
...صلواتیں سنائیں کہ میں ممتحن ہوتا تو کبھی کے توبہ کر لیتا۔ والدہ اور بہنوں کی نقل کرنا ناممکن ہے۔ ان کا منہ بھرے کا نہیں بلکہ
...لدو ہے کی کوئی کل ہوتا ہو گا کہ گھنٹوں بغیر رُکے چلے چلتا ہے۔ ساتھی کالج کی خوشگوار زندگی ختم کر کے عملی زندگی میں قدم
...رکھ چکے تھے مجھے بھی ان کا دیکھا دیکھی شوق ملازمت چرایا۔

ملازمت کے لئے بھی تو میٹرک کی قید ہے۔ اور اس پر طرفہ یہ کہ جج کے بیٹے اور تھرڈ گریڈ کی ملازمت کریں بغرض
...لازمت کرنا چاہو تو بھی میٹرک ہوں۔ اور آگے بڑھو تو بھی اس کی کامیابی لازمی ہے۔

ایک روز کھانے پر والد صاحب نے کہا بیٹا! اب امتحان کے دن قریب آ رہے ہیں۔ محنت کرو اور صبح
...لد جانا۔ تم بہت دیر سے اٹھتے ہو۔ طالب علم اتنی دیر سے نہیں اٹھا کرتے۔

پہلی مرتبہ والد نے یہ الفاظ منہ سے نکالے تھے۔ مجھے بھی ان کا کہنا شاق نہ گزرا۔ اس لئے کہ ملازمت کا شوق تھا
پڑھنے کو جی للچاتا تھا غرض کہ میٹرک پاس کرنا چاہتا تھا۔ اور پھر والد کی جادو بیانی نے بھی متاثر کیا۔

ا۔ میں نے صبح اٹھنے کا پکا ارادہ کر لیا۔ اسی خیال میں سیدھے نانی اماں کے ہاں پہنچا۔ اس وقت نانی اماں
کچھ کھا رہی تھیں۔ دیکھتے ہی چیخ اٹھیں۔ وہ دیکھو مردود آیا۔ معلوم نہیں اب کیا مصیبت ڈھاتا ہے۔

میں نے کہا نانی اماں! آپ بھی عجیب ہو۔ میں تو ایک بات کہنے آپ کے ہاں آیا ہوں۔ بھلا وہ کب ماننے
آسامی تھیں۔ کہنے لگیں۔ بس بیٹے رہنے دو اپنی بات.........

میں نے بات کاٹ کر جواب دیا۔ نانی اماں بات یہ ہے کہ میرا امتحان قریب آ رہا ہے۔ آپ روز صبح
نماز کو اٹھتی ہیں مجھے بھی اٹھا لیا کرنا۔

نانی اماں نے طنز سے کہا۔ اوہو بیٹا صبح اٹھو گے!

اچھا میں تم کو ضرور اٹھا دوں گی۔

اب میں صبح اٹھنے کی وہ وہ تیاریاں کرنے لگا گویا کہ کوئی زبردست مہم سر کرنی تھی۔ کیوں نہیں۔ صبح خیزی سے
زیادہ میرے لئے اور کیا مہم ہو سکتی ہے۔

رات کا کھانا کھا نانی اماں سے کہا کہ ٹھیک پانچ بجے اٹھا دیں۔ احتیاطاً الارم بھی رکھ دیا۔ اپنے پڑھنے کے
کمرے میں آیا۔ کتاب اٹھائی دو تین صفحے پڑھے۔ خیال ہوا کہ صبح جلدی اٹھنا ہے۔ اس لئے سیدھے بستر پر دراز ہو گیا
دماغ میں ادھر ادھر کے خیالات آنے شروع ہوئے۔ حتیٰ کہ امتحان کا ساں جو کچھ دیر پہلے پریشان کن تھا خوش کن
بن گیا۔ امید نظر آنے لگی کہ اس سال تو ضرور کامیاب ہو جاؤں گا۔ آنکھ جھپک گئی۔

۲۔ کواڑوں پر زور زور سے کھٹکے پڑنے لگے۔ جاگ گیا۔ آنکھیں کھولیں۔ چاروں طرف دیکھا تاریکی چھائی ہوئی
تھی۔ کواڑوں کے روزن سے روشنی آ رہی تھی۔ اور کچھ نظر نہ آتا تھا۔ کچھ دیر تک خاموشی چھائی رہی مجھے یقین ہو گیا
بھوت ہے۔ چادر اوڑھ لی۔ پھر کھٹکے پڑنے شروع ہوئے۔ لیکن اب کی مرتبہ تھرتھراتی ہوئی آواز بھی آئی
اٹھو کتنی دیر سے جگا رہی ہوں۔ جاگنے کا نام نہیں لیتے۔ اب سمجھ گیا کہ بھوت نہیں بلکہ نانی اماں ہیں۔ بھلا اس میں
میرا کیا قصور تھا۔ نانی اماں ہی کا طفیل ہے کہ میں بھی بھوت پر یقین رکھتا ہوں۔

میں نے چادر منہ سے ہٹائی اور دیکھا تو وہی اندھیرا تھا۔ میں نے کہا بڑی بی کو یہ کیا سوجھی کہ صبح چار بجے ہی
آن کھڑی ہوگئیں۔

پانچ بجے کہا تھا۔ ابھی اتنا اندھیرا ہے۔ اب کھٹکے اور تیز ہوئے تو کہا ہاں نانی اماں میں جاگ گیا ہوں۔ نانی
یہ کہتی چلی گئیں کہ پانچ بج کر دیر ہوئی جلدی اٹھ جاؤ۔

بھلا ان کو وقت دیکھنا کس نے سکھایا۔ یونہی اندازہ سے کہہ دیتی ہیں۔ پھر اس پر فخر یہ کہ ان کا اندازہ
گھڑیوں سے بھی زیادہ صحیح ہے۔ پھر سوچا کہ جلدی ہی کیا ہے تھوڑی دیر بعد ہی اٹھیں گے۔

اب دل و دماغ میں امتحان اور کامیابی کے خیالات آنے شروع ہوئے۔ واقعی صبح خیزی بھی کیا نعمت ہے۔ آنکھیں ...نہیں۔

دیکھوں ممتحن صاحب کیونکر فیل کرتے ہیں۔ پانچ سے ساڑھے سات بجے ڈھائی گھنٹے ہو! اور پھر رات میں آٹھ بجے ...یارہ بلکہ اگر پہلی مرتبہ گیارہ بجے تک نہ جاگا تو کیا مضایقہ ہے۔

اتنے گھنٹے پڑھوں اور کامیاب نہ ہوں۔ دیکھوں کونسی قوت مجھے ناکام کرتی ہے۔ ممتحن صاحب کو بھی میری ...ت کا لوہا ماننا ہی پڑیگا اردو کا امتحان۔ یہ تو گھر کی کھیتی ہے۔ مادری زبان ہے۔ اس میں تو زیادہ محنت ...ضرورت نہیں۔ ساٹھ فی صدی سے کیا کم ہیں گے۔ اچھا دیکھا جائے گا۔

سائنس ضرور دیکھنا اس کو رٹنا تو مجھ سے نہیں ہوتا۔ لیکن کیا کروں مجبور ہوں۔ اس کے بعد کیا ہوا اس کی ...بالکل خبر نہیں۔ البتہ جب اٹھا تو ٹھیک آٹھ بجے تھے۔

شیخ رحیم الدین
(ظہیر آبادی)

...م کی زندگی کا ایک ورق

کلیم میاں نصوح کے فرزند اکبر تھے۔ نصوح دہلی کے شہرۂ آفاق اور ممتاز گھرانوں میں سے تھے۔ خدا تعالے ان کو دو...
...اولاد بھی دی تھی۔ ایک دفعہ کا ذکر ہے کہ دہلی میں ہیضہ پھوٹ پڑا اور اتفاق سے میاں نصوح بھی اس کا شکار ہوئے ...جان کے لالے پڑ گئے۔ موت کا منظر ہمیشہ میاں نصوح کے پیش نظر رہتا تھا۔ ڈاکٹر نے خواب آور ہی کی دوا دی اور ...ملے چند گھنٹوں تک آرام کیا۔ وہی تصور اس کو خواب پریشاں بن کر نظر آیا۔ جونہی وہ چونک پڑا اس کے چہرے سے ...ت اور خوف کے آثار نمایاں تھے۔ روز بروز صحت کی طرف میلان بڑھتا گیا اور وہ جب کامل صحت پا چکا تو تہیہ کر لیا کہ ...باتوں۔ پنج وقتہ نماز اور تلاوت قرآن سے فراموش نہ ہوگا۔ اب اس نے اپنے تمام خاندان کو راہ راست پر ...کا مصمم ارادہ کر لیا تھا۔ اس سے قبل اس کے گھر میں دینی باتوں کا چرچا نہ تھا اس لئے اس کی اولاد بے بہرہ ہو چکی تھی اور ...دینی باتوں سے کچھ ایسی نفرت ہو گئی تھی کہ وہ ہرگز راہ راست پر آنا گوارا نہ کرتے تھے۔ خاندان تو کیا بیٹا بیٹی بھی ...ان کے سخت مخالف ہو گئے۔ لیکن جو چھوٹے تھے وہ تو والدین کا کہا ماننے لگے۔ بس اسی طرح کلیم نے والدین کا کہا ...اس کے بدنفس نے اس کو گھر سے چل کھڑے ہونے پر مجبور کر دیا لیکن اس نے بچپن سے اس قدر ناز و نعمت میں ...پائی تھی جو امیر زادوں کو بھی میسر نہیں آتی۔

میاں نصوح کی کوٹھی میں سب سے الگ تھلگ کلیم نے دو کمرے اپنے لئے علٰحدہ لے رکھے تھے۔ ایک کا نام عشرت منزل ...میں تمام دن اور پہروں رات گئے دوست آشناؤں کا مجمع رہتا تھا اور مختلف قسم کے کھیل ہوتے مثلاً گنجفہ ...تاش وغیرہ۔

کلیم دوستوں کی ہر قسم کی ضروریات کو پورا کرنا مثلاً کھانا، چائے، پان، سگریٹ وغیرہ خدمت گار رلا یوں وہ ان کے
حکم کو بجالاتے کیونکہ وہ گھر کا بڑا بیٹا تھا۔

دوسرا کمرہ جس کو وہ خلوت خانہ کہا کرتا تھا بدراہوں کو گمراہ کرنے کے لیے وہ کافی وسعت رکھتا تھا اور
خیالات میں محو کرنے کے لیے اس میں بہت گنجایش تھی۔

کلیم شاعری سے بھی دلچسپی رکھتا تھا بلکہ وہ کافی شہرت حاصل کر چکا تھا۔ اس لیے اس پر شاعری کی
کیونکہ شاعر اکثر خود پسند اور داد و تحسین کے امیدوار رہتے ہیں۔ وہ اپنے کو ایسا بڑا شاعر سمجھا ہوا تھا کہ جہاں
یہ چل کھڑا ہوگا وہاں کا والیٔ ملک اس کی تشریف آوری کا متمنی اور منتظر ہوگا۔

گھر سے نکلا تو تہی دست لیکن اس خیال خام میں مستغرق کہ کوئی آن میں وہ دنیا کے خزانوں کا مالک بن جائے گا
کلیم کو اپنے دوست احباب پر اعتماد تھا لیکن وہ دوراندیش اور سمجھ دار نہ تھا جو آنے والی باتوں پر غور کرتا۔ مصیبت آتی
ہے تو ایک طرف سے نہیں بلکہ چوطرف سے۔ بُرے وقت دوست بھی مدد دینے سے پہلو تہی کرتے ہیں۔

بہر حال اس نے گھر کو خیرباد کہہ کر صرف والدین کی ہی نافرمانی نہیں کی بلکہ طرح طرح کی آفتیں، مصیبتیں اور
جھیلیں۔ آخر کار دو مرتبہ سپاہیوں کے پنجے سے اور جیل خانے سے اس مشفق باپ ہی کی وجہ رہائی پائی۔ تب بھی راہ
نہ آیا۔ تیسری دفعہ فوج میں کپتان ہو کر لڑائی میں بری طرح زخمی ہوا اور زندگی کی کوئی امید باقی نہ تھی آخر کار دل
گیا اور ماں باپ کے سایۂ عاطفت میں پناہ گزیں ہوا۔

نصوح نے علاج میں کوئی دقیقہ باقی نہ رکھا ایک چھوڑ دو دو ڈاکٹر بیٹھے رہے لیکن موت کا کوئی علاج نہیں
اور مشیت ایزدی میں کسی کا دخل نہیں۔ کلیم بھی جان چکا تھا کہ وہ اس مرض سے جان بر ہونے والا نہیں۔ وہ موت
زیادہ ترجیح دیتا تھا اس نالائق زندگی پر جو اس نے رسوائی ذلت اور والدین کی ناراضمندی اور حق کی نافرمانی
میں بسر کی تھی۔ لیکن اب وہ بستر مرگ پر ہونے کی وجہ سے راہ راست پر آ چکا تھا۔ اس کو تسلی اور تشفی تھی تو اتنی کہ
وقت ایسے لوگوں میں ہے جو اس کے شفیق اور ہمدرد تھے۔

اس نے یہ کہا کہ وہ اپنی زندگی سے خود مستفید نہیں ہوا لیکن اس کی زندگی دوسروں کے لئے نمونہ عبرت
اور ایسی زندگی کو وہ رائگاں اور عبث نہیں کہہ سکتا۔ ع من نہ کردم شما حذر بکنید۔

اب کلیم کی دلی حسرت تھی تو یہ تھی کہ باپ سے معافی مانگ لوں لیکن موت نے اتنی بھی مہلت نہ دی وہ بے ہوش ہو گیا
ساتھ ہی ہچکیاں شروع ہو گئیں۔ نصوح تلاوتِ یٰسین میں مصروف ہو گیا۔ کلیم نے آخری مرتبہ آنکھیں کھولیں اور با
نگاہِ حسرت سے دیکھ کر ہاتھ جوڑے وہ کچھ کہنا چاہتا تھا لیکن زبان بے قابو ہو چکی تھی۔ اس لیے اس نے آنکھ کے
اشارے سے معافی چاہی اور جان بحق ہوا۔

اقبال فا

رسالے اور جریدے

ادارہ ادبیات اُردو کے کتب خانہ میں اُردو کی جو کتابیں آتی رہتی ہیں ان میں سے کسی نہ کسی پر سب رس کے ہر شمارہ میں تبصرہ یا تنقید شایع ہوتی رہتی ہے۔ اب تصفیہ کیا گیا ہے کہ ادارہ کے دارالمطالعہ کی میز پر جو ماہوار یا سہ ماہی رسالے اور پندرہ روزہ یا ہفتہ وار جریدے موجود رہتے ہیں ان کی فہرستیں ہر سہ ماہی کو شایع ہوا کریں اس لئے اس وقت جو رسائل و جرائد موجود ہیں ان کی فہرست درج ذیل ہے۔ بہت کم کتب خانے ایسے ہوں گے جہاں دنیا تو اُردو رسائل و جرائد مطالعہ کے لئے موجود رہتے ہوں۔ "ادارہ"

لاہور جون صلاح الدین احمد

" " چودھری برکت علی

امرت سر مئی محمد حسین

لاہور جون ایم فتح اللہ

دہلی جون ایس۔ ایم۔ نور الٰہی دہلوی

" اپریل رازق الخیری

امرتسر " علیم الدین (ڈاکٹر)

دہلی فبروری۔ سعید احمد اکبر آبادی

کلکتہ مئی ڈاکٹر حکیم محمد علی قریشی

جالندھر شہر۔ جون۔ ڈاکٹر علی شبیر گوہیر

دہلی " پروفیسر محمد عاقل

کلکتہ " پرویز شاہدی

دہلی " سید عاشق علی بجنوری

جالندھر اپریل سرور

حیدرآباد جنوری حکیم محمد ظفر الدین ناصر

" ربیع الثانی۔ مرزا امام بیگ رونق قادری

دیوبند جمادی الثانی۔ مولوی سید احمد فاضل دیوبند

لاہور مئی و جون حکیم محمد یوسف حسن

... زندگی گوجرانوالہ پنجاب جون، حکیم نیاز احمد صدیقی

رسالہ ترک مسکرات حیدرآباد جولائی۔ صدر انجمن ترک مسکرات

THE READER'S DIGEST نیویارک مئی

زمانہ کانپور نومبر دیا نارائن نگم

زیب النساء حیدرآباد مارچ صغرا ہمایون مرزا۔

ساقی دہلی اپریل شاہد احمد دہلوی

سلطان المشائخ لاہور ڈسمبر سید عبداللطیف شاہ لطیف نگاری

شمس المشائخ۔ امرتسر مارچ مقبول انور دادودی

شاعر آگرہ جون اعجاز صدیقی اکبرآبادی

شاہکار گورکھپور یوپی۔ نومبر۔ حکیم عارف بلگرامی

شہاب حیدرآباد فبروری محمد عبدالرزاق بسمل

شاہ کار لاہور جون محمود جاوید

شان اسلام بمبئی مارچ صاحبزادہ عبدالقیوم قریشی سرحدی

صبح امید " جنوری محمد سعید جیتیکر

صوفی اعظم حیدرآباد ربیع الاول و ربیع الثانی مفتی السید شاہ احمد علی الصوفی

صور اسرافیل لاہور اکتوبر۔ ب۔ احمد الملقب بیلدرم

طلوع اسلام دہلی اپریل محمد ظہیر الدین صدیقی

عارف لاہور جون محمد عبدالرحمٰن شوق

سب رس

عالمگیر لاہور جون حافظ محمد عالم

عصمت دہلی " رازق الخیری

قلم حیدرآباد " سعداللہ قادری

قائد مراد آباد ربیع الاول۔ سید محی الدین اختر اسلام

کہکشان دہلی اپریل سید کاظم دہلوی (ادیب عالم)

کامیاب " اگست قسیم فدائی

کتاب نما " " مکتبہ جامعہ ملیہ اسلامیہ

کتابی دنیا " عالی پبلشنگ ہوز

مست قلندر لاہور جون ڈاکٹر برتمی سنگھ

مولوی دہلی " عبدالحمید خاں

منزل " " سید محمود مورخ و صاحبزادہ عالمگیر شیدا

موج بہار لاہور جنوری رام ناتھ کپور

مجلہ نظامیہ حیدرآباد جون ابوالخیر کنج نشین فاضل

معارف اعظم گڑھ مئی و جون۔ سید سلیمان ندوی

مشعل پشاور جون مفتی عزیز الرحمن

مووی لینڈ سکندرآباد۔ جون محمد حسام الدین خاں غوری

نیرنگ خیال لاہور مئی حکیم محمد یوسف حسن

نقیب حیدرآباد مارچ پروفیسر کرشن چندر راکسکینہ

نغمہ فیض آباد نومبر سلام مچھلی شہری

نور جالندھر فروری اسداللہ خاں

ہمایوں لاہور مئی بشیر احمد

ہل الہ آباد " شری ناتھ سنگھ

رسالے (سہ ماہی)

اردو نئی دہلی۔ اپریل ڈاکٹر عبدالحق

الموسیٰ حیدرآباد اسفندار۔ سید عباس و محمد مصطفی [illegible]

تلمیذ حیدرآباد [illegible] عبدالعزیز [illegible]

علی گڑھ میگزین علی گڑھ [illegible] آفتاب احمد صدیقی

مجلہ ملیسانین حیدرآباد [illegible] سید محمد

ہندوستانی الہ آباد اپریل مولانا عبدال[illegible]

مجلہ عثمانیہ حیدرآباد۔ جلد ۱۲ عبدالعلی خاں

رسالے شش ماہی

THE PALMS جوگیشوری مارچ (M.A) PANDIT

رسالے پندرہ روزہ

صدق لکھنؤ یکم جون [illegible] عبدالماجد

ماہ نیم ماہ دہلی جون حامد شاہجہان پوری

ہماری زبان نئی دہلی یکم اپریل انجمن ترقی اردو

اخبار۔ ہفتہ وار

الیشیا آگرہ [illegible] منظر صدیقی اکبر[illegible]

انصاف بمبئی [illegible] اکتوبر ایس۔ کوی راج

البرق سری نگر ۱۰ مارچ۔ ایم اے صابر۔ ایم نصیر[illegible]

اخبار تعلیم لاہور ۱۳ مارچ۔ منشی طالب علی پابند[illegible]

جدوجہد ناگپور ۲۲ جنوری۔ سید قاسم علی رائپوری

رہنما مراد آباد [illegible] جون۔ ایم اے اشفاق حسین[illegible]

خان ہند بمبئی [illegible] جون [illegible] صاحبزادہ عبدالقیوم[illegible]

کانگریس مراد آباد [illegible] جون۔ [illegible] فقار فریدی

نیر اعظم " [illegible] مالک دختر ایس [illegible]

نئی دنیا بمبئی [illegible]

اسلام آگرہ جون [illegible] اسحاق [illegible]

وغیرہ

...کی ... پر سب کی نظر

...ف ۔ ۱۰ ربیع الاول ۱۳۵۸ھ

...ہاری معاشرتی خرابیوں میں عورتوں اور مردوں کے بے جا اسراف، لغو رسم و رواج بے جا نمود و نمایش، ظاہری شان و
...تن آسانی اور جدید نسل کی غلط نقالی نے متوسط الحال سفید پوش گھرانوں کے امن و سکون کا خاتمہ کردیا ہے۔ اس کی
...کا دار و مدار بڑی حد تک ہماری خواتین کے سدھار، ان کی صحیح و صالح تربیت، پاکیزہ خیالی اور ان کی سادگی و جفاکشی پر ہے
...یف النساء بیگم صاحبہ جدید تعلیم کے باوجود ان اوصاف سے آراستہ اور صحیح نسوانی تعلیم کا اچھا نمونہ ہیں۔ انھوں نے
...الا کتاب میں ان تمام معاشرتی خرابیوں اور اس کے اسباب کو دکھا کر ان کی اصلاح کے طریقے بتائے ہیں اگر ہماری
...ں میں اعلیٰ تعلیم کے ساتھ ایسی صحیح روشنی اور پاکیزہ خیالات پیدا ہو جائیں تو ہماری زندگی سنور جائے یہ کتاب اس
...ہے کہ اسے لڑکیوں کے نصاب میں داخل کیا جائے۔

...ق ۱۵ ر جون ۱۹۳۹ء

"حریت نسوان" اور "تجدد" کے دور میں اہم ضرورت اس کی ہے کہ خود طبقہ خواتین کی صاحب فہم ہستیاں اپنے
...اصلاح کے لئے قلم ہاتھ میں لیں اور معاشرت و معیشت کی گوناگوں منزلوں میں راہ ہدایت دکھائیں اور بڑی
...ی بات ہے کہ یہ چھوٹی سی کتاب اس معیار پر پوری اترتی ہے مصنفہ دکن کی اعلیٰ تعلیم یافتہ خواتین کی صف اول
...ں اور تربیت و تعلیم کا بھی تجربہ رکھتی ہیں۔ کتاب ۱۶ چھوٹے چھوٹے عنوانات میں تقسیم ہے۔ گھر، سواری، خورد و نوش
...، چندے، علاج، معالجہ، سیر و تفریح، فیشن وغیرہ اور ان کے اندر باتوں باتوں میں وہ سب کچھ سنا دیا گیا جس کی
...ت موجودہ مسلم عورت کو ہے۔

کتاب اصلاحی نقطۂ نظر سے اس قابل ہے کہ اسے ہر شریف گھرانے میں پہونچنا چاہیئے۔ محترم مصنفہ نے اگر خدانخواستہ
...لم کو آگے نہ پھیلایا اور اپنی کوششوں کو اس مختصر رسالہ پر ختم کردیا تو وہ اپنے اور اپنی قوم دونوں کے حق میں انصاف
...ں ظلم سے کام لیں گی۔

...لت (دہلی) ۱۰ مئی ۱۹۳۹ء

یہ لطیف النساء بیگم صاحبہ بی اے کے چند معاشرتی و اصلاحی مضامین کا مجموعہ ہے جسے "ادارہ ادبیات اُردو"
...آباد حیدرآباد دکن، نے مجلد شایع کیا ہے۔ مضامین کا موضوع اصلاح نسوان اور مقصود اپنی معاشرت کے
...العیب کو سدھارنا ہے۔ یہ دیکھ کر ہمیں بڑی خوشی ہوئی ہے کہ ہماری تعلیم یافتہ خواتین بھی اب مشرقی اوصاف کی
...نے لگی ہیں اور وہ طبقہ نسوان کی بہبودی اس میں تصور کرتی ہیں کہ عورتیں مغرب زدگی کی بجائے اپنے آپ کو مشرقی
...ے پر ڈھالیں۔ موصوفہ حیات انسانی پر تنقیدی نظر رکھتی ہیں اور انھوں نے ان مضامین میں اپنی رائے کا

اظہار آزادی سے کیا ہے چند اچھے مضامین کے عنوانات یہہ ہیں۔ گھر، ہمارے نوکر، بچوں کی تعلیم اور ان کی ...
اخبار، کتابیں اور رسالے، سینما اور فیشن۔ خواتین کو یہہ کتاب ضرور پڑھنی چاہئے۔ کتابت، طباعت، کاغذ ...

شاعر (آگرہ) ماہ مئی ۱۹۳۹ء

یہہ کتاب "ادارۂ ادبیات اُردو" کا تئیسواں (۲۳) شمارہ ہے۔ اِدارۂ ادبیات اُردو جہاں مردوں کے خیالات
سے ملک کو بہرہ مند کر رہا ہے وہاں یہہ چیز باعث مسرت ہے کہ وہ طبقۂ نسواں کے رجحانات سے بھی ہمیں آگاہ کر...
بہت کم ایسے اِدارے ہیں جو اس قسم کے مطبوعات شایع کرتے ہیں۔ ضرورت ہے کہ جو عورتیں تصنیف و تالیف کا کام
احسن انجام دے سکتی ہیں۔ ان کو ملک کے سامنے پیش کیا جائے تاکہ ہندوستان کسی دوسرے ملک سے پیچھے نہ ر...
"من کی جیتا" میں مختلف موضوعات پر معاشرتی مضامین ہیں۔ تمام موضوعات میں اصلاحی پہلو نمایاں ر...
یہہ کتاب خواتین کے لئے بے حد مفید ہے۔ ناظرین "شاعر" خانگی زندگی کو خوشگوار بنانے کے لئے اپنی خواتین کو "من...
کی ایک جلد ضرور منگا دیں۔

نیرنگ خیال ماہ اپریل ۱۹۳۹ء

محترمہ لطیف النساء بیگم صاحبہ بی اے نے خانگی زندگی کو خوشگوار بنانے کے لئے یہہ مفید کتاب لکھی ہے۔
گھر، سواری، نوکر، خورد و نوش، لباس، بچوں کی تعلیم، نذر و نیاز، چندے، رسومات، سیر و تفریح اور فیشن ...
پر مختصر مگر سلیس عبارت میں مفید باتیں لکھی ہیں جو لڑکیوں اور عورتوں کو ضرور مطالعہ کرنی چاہئیں۔

ماہ نیم ماہ یکم و ۱۶ مئی ۱۹۳۹ء

"من کی جیتا" میں محترمہ لطیف النساء بیگم صاحبہ بی اے نے تدبیر منزل کے متعلق مستورات کو نہایت اہم اور مفید ...
دیئے ہیں۔ اور عہد حاضرہ کی مستورات میں مغربی اثر کے ماتحت جو ظاہرداریاں رونما ہو رہی ہیں انھیں دلکش اور مو...
بیان میں واضح کیا ہے۔ مصنفہ محترمہ بیان فرماتی ہیں کہ "عورت کا یا ہر گھر کی بی بی کا پہلا فرض یہہ ہے کہ وہ اپنی ...
کا ایک صحیح نصب العین بنائے جس میں بیجا ظاہرداریوں کو دخل نہ ہو" عام طور پر ایک متوسط گھر کے خرچ کے مدات ...
گھر، سواری، خورد و نوش، نوکر چاکر، کپڑا لتا، بچوں کی ضروریات، تعلیم، اخبار رسالے، عید، تہوار، نذر و نیاز، مختلف
مختلف رسومات، علاج معالجہ، متعلقین و لواحقین، انعام و اکرام، سیر و تفریح، سینما، فیشن، چنانچہ موضوعات ...
سیر حاصل بحث کی ہے۔

اُردو ادبیات میں اس قسم کا لٹریچر بہت کم ہے اور جو ہے مثلاً مرات العروس وغیرہ اس کے مفید ہونے سے انکار ...
آج سے ساٹھ ستر برس پہلے کی لڑکیوں اور مستورات کے لئے عدم سے وجود میں آیا تھا اب حالات بدل گئے ہیں ضرورت ...
عہد حاضرہ کی مستورات کو انھیں کی صنف نازک میں سے کوئی من کی جیتا سنائے اور انھیں راہ راست دکھائے۔ ...
محترمہ لطیف النساء بیگم صاحبہ نے اس کمی کو ایک حد تک پورا کر دیا ہے۔ ہمیں یقین ہے کہ "من کی جیتا" کا مطالعہ ان مستو...
کے لئے جن پر خانہ داری کی ذمہ داریاں عاید ہیں اور ان لڑکیوں کے لئے جو مستقبل قریب و بعید میں ان ذمہ داریوں ...
ہونے والی ہیں۔ نہایت مفید ثابت ہوگا۔

ایک بچّی کی خواہش

میں تاریک گھر کا اُجالا بنوں گی
جہاں جاؤں گی میں اُجالا کروں گی

میں ہر روز اعلیٰ سے اعلیٰ بنوں گی
جو آنکھوں سے دیکھوں گی سچ سچ کہوں گی

کسی کو میں دکھ دینے والی نہ ہوں گی
مشقت کروں گی مصیبت سہوں گی

میں ہر حال میں شکر کا دم بھروں گی
میں ہر روز اعلیٰ سے اعلیٰ بنوں گی

جہاں جاؤں گی میں اجالا کروں گی
صداقت کا میں بول بالا کروں گی

شکایت کروں گی نہ شکوہ کروں گی
مصیبت غریبوں کی ٹالا کروں گی

پلیڈر بنوں گی تو سچی پلیڈر
جو منصف بنوں گی تو بس عدل گستر

کروں گی غریبوں کی امداد اکثر
میں ہر روز اعلیٰ سے اعلیٰ بنوں گی

رکھوں گی یتیموں کے میں ہاتھ سر پر
میں ہر روز اعلیٰ سے اعلیٰ بنوں گی

سیّدہ احمد النساء بیگم

ادارۂ ادبیات اُردو کی مشہور و معروف کتابیں

مرقع سخن (جلد اول) حیدرآباد
کے پچیس شعرائے دور آصفیہ کا باتصویر تذکرہ پچاس سے زیادہ تصاویر اور چار سو سے زیادہ صفحات مجلد قیمت
صمہ

مرقع سخن (جلد دوم) حیدرآباد
کے پچاس دیگر شعرائے دور آصفیہ کا باتصویر تذکرہ پچاس تصاویر ...۴ صفحات مجلد قیمت
صمہ

سراج سخن
انتخاب کلام شاہ سراج اورنگ آبادی مرتبہ پروفیسر عبدالقادر سروری ایم اے معہ سوانح شاہ سراج صفحات ...
قیمت ۱۲ ار

ایمان سخن
انتخاب کلام شیخ محمد خان ایمان مولانا سید محمد صاحب ایم اے معہ سوانح ایمان صفحات ۱۲۰
قیمت ۱۲ ار

فیض سخن
انتخاب کلام حافظ میر شمس الدین محمد فیض۔ مرتبہ ڈاکٹر سید محی الدین قادری زور معہ سوانح فیض صفحات ۱۴۴
قیمت ۱۲ ار

بادۂ سخن
انتخاب کلام ڈاکٹر احمد حسین مائل مرتبہ ڈاکٹر سید محی الدین قادری زور معہ سوانح و تصویر صفحات ۱۲۸
قیمت ۱۲ ار

کیف سخن
انتخاب کلام سید رضی الدین حسن کیفی مرتبہ ڈاکٹر سید محی الدین قادری زور معہ سوانح و تصویر صفحات ۱۳۲
قیمت ۱۲ ار

متاع سخن
انتخاب کلام نواب عزیز یار جنگ بہادر عزیز مرتبہ ڈاکٹر سید محی الدین قادری زور معہ سوانح و تصویر صفحات ۱۲۵
قیمت ۱۲ ار

ورڈزورتھ اور اسکی شاعری
مشہور انگریز شاعر کے حالات اور کلام پر تبصرہ۔ از مولوی میر حسن صاحب ایم اے معہ تصویر شاعر صفحات ۱۸۴ -
قیمت صرف عہ ۴ر

ٹیگور اور انکی شاعری
ہندوستان کے مشہور شاعر رابندر ناتھ ٹیگور کے حالات اور کلام پر تبصرہ از مولوی مخدوم محی الدین صاحب ایم اے معہ تصویر شاعر صفحات ۱۲۸ قیمت ۴ر

یوسف ہندی قید فرنگ میں
مرزا غالب کی قید فرنگ کے حالات۔ مرتبہ مولوی محسن بن شبیر صاحب بی اے ال ال بی۔ صفحات (۸۰)
قیمت ۸ر

ہوش کے ناخن (ڈرامہ)
حیدرآباد کی سماجی زندگی کا خاکہ۔ مصنفہ مخدوم محی الدین و ... صفحات (۹۶) قیمت عہ

نذر ولی
ولی اورنگ آبادی کی شاعری کے مختلف پہلوؤں پر تفصیلی مضامین کا مجموعہ از لطیف النساء بیگم بی اے نجم النساء بیگم بی اے نعیم النساء بیگم بی اے جہاں بانو بیگم بی اے صفحات ۲۴۵ قیمت عہ ۸ر

نقد سخن
کلام فانی پر نواب عزیز یار جنگ بہادر عزیز کی تنقیدوں کا مجموعہ
قیمت
عہ

گریہ و تبسم
صاحبزادہ میکش کی دلکش نظموں کا مجموعہ
قیمت مجلد دو روپے

مشاہیر قندھار دکن
دکن کے مشہور مردم خیز خطہ کی دلچسپ باتصویر تاریخ از محمد اکبر صدیقی بی اے
قیمت عہ

من کی دنیا
نوجوان انشاپرداز رشید قریشی کے ولولہ انگیز افسانے مجلد قیمت عہ

مدراس میں اُردو
مولوی نصیر الدین صاحب ہاشمی کی محققانہ تالیف صفحات ۲۰۰ مجلد قیمت عہ

نذر دکن (باتصویر)
دکن کے متعلق خواتین دکن کے رشحات قلم معہ عکس تحریر و تصاویر صفحات ۱۱۴ مجلد قیمت ...

محرم نامہ
شہادت کربلا کے متعلق دلچسپ معلومات۔ باتصویر مجموعہ صفحات ۱۱۲ مجلد قیمت عہ

کٹر سید محی الدین صاحب قادری زور پروفیسر ادبیات اردو جامعہ عثمانیہ کی معرکۃ الآرا کتابیں

اردو کے اسالیب بیان
نثر نگاری کی تاریخ انشا پرداز
کے اسلوب بیان کی خصوصیات
جدید دور نثر کے رجحانات اور
مستقبل کے متعلق مشورے طبع دوم
صفحات قیمت ۱۲ھ

اردو شہ پارے
آغاز اردو سے دلی اور نگ آبادی
تک کے اردو ادب (نظم و نثر) کا
محققانہ تذکرہ مع نمونہ کلام قدیم
شعرا اور قدردانان اردو کی نایاب
تصاویر۔ بڑی تقطیع صفحہ
مجلد قیمت ۱۴ھ

روح تنقید
فن تنقید پر اردو ادب کی واحد
مستند کتاب جو مختلف جامعات کے
نصاب تعلیمی میں شامل ہے طبع
سوم۔ صفحات ۲۴۰ قیمت
۱۲ھ

تنقیدی مقالات
روح تنقید کا دوسرا حصہ اردو کے
بہترین ادبی کارناموں پر بلند
پایہ تنقیدیں۔ طبع دوم
۲۹۶ صفحات مجلد قیمت
۱۴ھ

دکن میں اردو کی ترقی
ربع صدی میں اردو ادب
جو ترقیاں ہوئی ہیں ان کا
اور مکمل تذکرہ مع مصنفین کی
تصانیف آپ تک مع فہرست
اردو کی تصانیف پر تبصرہ
۲۸۲ صفحات مجلد قیمت ۱۸ھ

محمود غزنوی کی بزم ادب
غزنین کی فارسی شاعری اور
وہاں کی ادبی و علمی چہل پہل کا
مبسوط واحد تذکرہ صفحات
(۱۱۷) قیمت
(۸ھ)

ہندستانی لسانیات
اردو زبان کا لسانی تجزیہ و
تشریح اپنے فن میں اردو کی
پہلی کتاب اردو ہندی جھگڑے
کی تاریخ قیمت عہ

ہندستانی صوتیات
(بزبان انگریزی)
اردو زبان کا صوتی تجزیہ دنشریح
جدید ترین عملی صوتیاتی آلوں اور
گردونوں کے نتائج سے
پچھتر فوٹو قیمت عالہ ۱۴ھ

فن انشا پردازی
انشا نگاری اور انشا پردازی کے
فن تحریریں کامیابی کے
لیے انشا پردازی میں
کامیابی حاصل کرنے کے وسائل
صفحات ۱۱۶ قیمت عہ ۱۲ھ

طلسم تقدیر
زوال گولکنڈہ کے وقت کا
نیم تاریخی افسانہ
طبع سوم صفحات ۶۶
قیمت
۸ھ

سیر گولکنڈہ
۱۶ افسانے۔ ۱۲ تصاویر۔ گولکنڈہ
کی زندگی کے مختلف پہلو افسانوں
کی شکل میں قطب شاہوں کی
مختصر تاریخ۔ صفحات ۱۶۰
قیمت ۱۵ھ

گولکنڈے کے ہیرے
۱۶ افسانے ۸ تصاویر
سیر گولکنڈہ کا دوسرا حصہ
گولکنڈہ کے آخری دور کے
متعلق نیم تاریخی افسانے
صفحات ۱۳۶ قیمت مجلد ۱۲ھ

دفتر سب رس۔ رفعت منزل خیرت آباد حیدرآباد دکن یا ہر کتب فروش سے مل سکتی ہیں

پروفیسر عبدالقادر صاحب سروری کی مشہور و معروف کتابیں

دنیائے افسانہ
افسانہ نگاری کے اصول
اور مبادی پر سیر حاصل بحثیں
اُردو افسانہ نگاری کی تاریخ پر
مستند تصنیف طبع دوم قیمت عہ

کردار اور افسانہ
افسانوں میں کردار پیدا کرنے کے
اصول، ان کی اہمیت، نوعیت
وغیرہ پر اُردو کی واحد کتاب
قیمت صرف
عہ

جدید اُردو شاعری
حالی سے لے کر موجودہ عہد تک
اُردو شاعری کے مختلف دبستانوں
کی تاریخ، شعراء کے حالات اور
تصاویر۔ قیمت عال

حیدرآباد کی تعلیمی ترقی
گزشتہ ربع صدی میں،
اس موضوع پر پہلی کتاب
قیمت صرف
عہ

قدیم افسانے
زیر نگرانی سروری صاحب
مرتبہ۔ محمد محی الدین صاحب۔ قیمت
عہ

چینی اور جاپانی افسانے
قیمت
عہ

انگریزی افسانے
قیمت
عہ

فرانسیسی افسانے
زیر نگرانی سروری صاحب۔ مرتبہ
عزیز احمد صاحب بی اے۔ قیمت ۱۲ار

مولوی سیّد محمد صاحب ایم اے کی مشہور و معروف کتابیں

ارباب نثر اردو
فورٹ ولیم کالج کے
نثر نویسوں کا محققانہ
تذکرہ۔ قیمت
عہ

گلشن گفتار
شعرائے اردو کا
قدیم ترین تذکرہ
قیمت ۱۲ار

مثنویات میر
میر تقی میر کی تمام
مثنویاں ترتیب تصحیح
کے ساتھ قیمت عہ

ابتدائی فارسی
براہ راست طریقۂ تعلیم
کے متعلق فارسی کی
صرف و نحو قیمت ۱۲ار

یادگار ولی
اردو شاعری کے
ابوالاباولی اورنگ آبادی
کے جشن دوصد سالہ کے
مقالات مع انتخاب کلام ولی
قیمت عہ

حکیم الشعراء حضرت امجد کی تصنیفات

دفتر سب رس رفعت منزل خیریت آباد حیدرآباد یا ہر کتب فروش سے مل سکتی ہیں

(مطبوعہ عہد آفریں برقی پریس)

نشان ٹپہ آصفیہ (۱۵۳) نشان ٹپہ برطانیہ (M3950)

ادارہ ادبیات اردو حیدرآباد دکن کا ماہنامہ

سب رس

زیر نگرانی

ڈاکٹر سید محی الدین قادری زور

مجلس ادارت

صاحبزادہ میر محمد علی خان میکش — سکینہ بیگم
خواجہ حمید الدین شاہد — معین الدین احمد انصاری

جلد (۲) شمارہ (۹) — ستمبر ۱۹۳۹ء

فہرست تصاویر

گولکنڈہ کے نئے قلعہ کے مناظر

۱۔ ہتیان کا درخت (دو رخ اور پیڑ کی سطح) ۲۔ نئے قلعہ میں سے قلعہ گولکنڈہ کا منظر ۳۔ ملا خیالی کی مسجد ۴۔ ملا خیالی کی مسجد کا پچھلا حصہ۔
۵۔ نئے قلعہ کے حوض اور جزیرہ ۶۔ نئے قلعہ سے قطب شاہی گنبدوں کا منظر ۷۔ نئے قلعہ میں شہنشاہ اورنگ زیب اور عبداللہ قطب شاہ کے برج

فہرست مضامین

۱	اداریہ	ادارہ	۳	۵	خلجی ان (قصہ)	حادی نقوی، حسین آباد لاہور	۱۲
۲	تلقین وفا (نظم)	علی منظور	۶	۶	قیدی جن (قصہ)	حفیظ جیلانی ایم اے	۱۷
۳	نئے قلعہ کا معاینہ	عبدالمجید صدیقی ایم اے ال ال بی	۷	۷	روحی (قصہ)	دلاور خاں مہدی	۲۶
۴	شاہ سراج اور شاہ چراغ (اورنگ آبادی)	عبدالقادر سروری ایم اے ال ال بی	۹	۸	ایک اخلاقی غزل	ابنہ خاتون [illegible] بیگم [illegible]	

نمبر	مضمون	مصنف	صفحہ	نمبر	مضمون	مصنف
۹	شاعر	نیکشن	۲۹	۲۷	بچپن کا خواب (قصہ)	محمد عبدالمنعم صدیقی
۱۰	بارش سے پہلے (نظم)	شاد عارفی (رامپور)	۳۳	۲۸	ہماری ناؤ	اشرف الدین فیضی
۱۱	قدم قلم رقم سخن کا شکریہ	صغریٰ بیگم ہمایوں مرزا	۳۴	۲۹	جھوٹ کا انجام (قصہ)	باقر علی زاہد
۱۲	رباعیات	باقی ام اے ریسرچ اسکالر	۳۶	۳۰	علم (نظم)	رضیہ بیگم
۱۳	بیربل اور اس کے تاریخی واقعات	قاضی سراج الدین محمد نیر (کیمبلپور)	۳۷	۳۱	عفو سے دشمن کو فتح کرنا	کاشی ناتھ (دوامرگدہ)
۱۴	چرواہی (نظم)	الطاف مشہدی پنجاب	۴۲	۳۲	کبابی پنڈے (نظم)	"مولوی شکم پُر"
۱۵	میری خط	ابوظفر موید الدین حسن (تعلقدار)	۴۴	۳۳	نورجہاں کی آخری آرام گاہ	سید اشرف حسین عابد
۱۶	غزل	کاوش	۴۵	۳۴	اندھوں کی تعلیم	محمد غوث محی الدین (گلبرگہ)
۱۷	شبلی کی زندگی کے چند دلچسپ پہلو	میر عزیز الحق بی اے	۴۶	۳۵	جھوٹا خواب (ڈرامہ)	اس ام عباس
۱۸	مدرسہ تعلیم بالغان کے افتتاح پر (نظم)	بشیر النساء بیگم بشیر	۴۸	۳۶	سفید جھوٹ (قصہ)	محمد کمال خاں گمنام (مدرسہ عالیہ)
۱۹	ترک مسکرات	خورشید بیگم	۴۹	۳۷	جہالت (اقوال)	عالیہ سلطانہ
۲۰	ہندوستان کا رسم الخط	منشی برکت رائے	۵۰	۳۸	جدید مطبوعات	مرزا سیف علی خاں
۲۱	بازاری دوا فروش یا سفری حکیم	مرزا عصمت اللہ بیگ	۵۷	۳۹	تنقید و تبصرہ	س۔ ش۔ ق
۲۲	سوتیلی ماں	رابعہ بیگم انوار اللہ	۶۱	۴۰	ادارہ کی کتاب من کی دنیا پر رائیں	نگار، معارف، جامعہ، ادب لطیف ماہ نیم ماہ، شاعر، نیرنگ خیال
۲۳	بچوں سے	معین الدین احمد انصاری	۶۶			
۲۴	حضرت	شاہ زمانی بیگم	۶۷	۴۱	ادبی اعلانات	صادق النجری۔ اردو اکیڈیمی۔ ادارہ
۲۵	برباد کسی شخص کی محنت نہیں جاتی	جنید ریر شاد جوہر	۶۸	۴۲	ادارہ کی مشہور و معروف کتابیں	مہتمم ادارہ
۲۶	جواہر مالا (مرہٹی اور گجراتی سے)	محمد حسین (اماندیٹر)	۶۹			

سب رس اور بچوں کا سب رس دونوں رسالے ہر عیسوی مہینے کی پہلی کو شایع ہوکر ایک ہفتہ کے اندر اندر ہر جگہ پہنچ جاتے ہیں۔ رسالہ نہ پہنچنے کی اطلاع پندرہ تاریخ تک دفتر میں پہنچ جانی چاہیے۔ ورنہ دفتر پر ذمہ داری نہ رہے گی۔ جواب طلب امور کے لئے جوابی کارڈ یا ٹکٹ آنا ضروری ہے۔

سب رس کی قیمت چار روپے سالانہ علاوہ محصول ڈاک۔

بچوں کے سب رس کی قیمت ایک روپیہ سالانہ علاوہ محصول ڈاک۔

خواجہ حمید الدین شاہد کے اہتمام سے عہد آفرین پریس میں چھپ کر دفتر ادارہ نعمت منزل خیریت آباد حیدرآباد دکن سے شائع ہوا۔

ہتیان کا درخت (دو رخ اور پیٹھ کی سطح)

قلعہ گولکنڈہ کا منظر (نئے قلعہ میں سے)

ملا خیالی کی مسجد
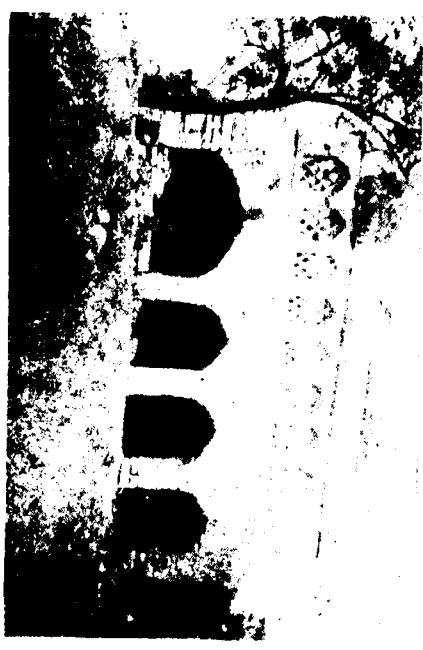
اداریہ

اس مہینے ادارۂ ادبیات اردو بے حد مصروف رہا۔ اس کے مختلف شعبوں کے سات اجلاس ہوئے، ایک دلچسپ مشاعرہ ہوا، اُردو کے مشہور ادیب سر شیخ عبدالقادر ادارہ میں تشریف لائے، درس گاہ تعلیم بالغات کا افتتاح کیا گیا، اور دو دفعہ ادبی و تاریخی مقامات کے معائنے کئے گئے۔

سر شیخ عبدالقادر

شیخ صاحب اُردو کے مستند و مشہور ادیبوں اور خاص صاحبانِ ذوق میں سے ہیں اُردو کا پہلا جدید طرز کا رسالہ **مخزن** ان ہی نے نکالا تھا اور علامہ سر محمد اقبال جیسے جوہرِ قابل کو اُردو سے روشناس کرنے کا سہرا بھی ان ہی کے سر ہے۔ آپ انگلستان سے واپس ہوتے ہوئے سالگرہ ہمایونی کی تقریب میں حیدرآباد تشریف لائے تھے اور یہاں کے چار روزہ قیام میں سرکاری اور قومی تقریبوں میں اگرچہ بے حد مصروف رہے لیکن ادارۂ ادبیات اُردو کے معاینہ اور اربابِ ادارہ سے ملنے اور تبادلۂ خیالات کرنے کا بھی وقت نکال لیا چنانچہ ۱۴ر اگست کو صبح ساڑھے نو بجے ادارہ میں تشریف لائے اور ڈیڑھ دو گھنٹے تک ٹھہر کر ادارہ کے کاموں کا تفصیلی معاینہ کیا اور کہا کہ "اگر میں یہاں نہ آتا تو مجھے بڑا افسوس ہوتا"۔ ادارہ کی تصنیفات، طریقۂ کار، اور کتب خانہ وغیرہ دیکھ کر بہت خوش ہوئے اور فرمایا کہ "کام کرنے کے ایسے ہی طریقے سب کو یورپ سے سیکھنے چاہئیں"۔ جب آپ کو ادارہ کے کتب خانہ کی عمارت کا نقشہ دکھایا گیا تو نواب احسن یار جنگ بہادر اور مولوی سید عارف الدین صاحب سے اس بارے میں تبادلۂ خیال کیا۔ اور ناظم اعزازی نواب مرزا سیف علی خاں صاحب کو اُردو کے رسائل کے فائل کی تکمیل کے لئے نہایت مفید مشورے دیئے۔ لفظ اُردو اور ہندوستانی کے رواج کے بارے میں ڈاکٹر زور معتمد ادارہ اور نواب بہادر یار جنگ بہادر کے ساتھ تقریباً آدھ گھنٹہ تک گفتگو کی۔ سر عبدالقادر کے ساتھ شیخ محمد اکرام صاحب بیرسٹر مدیر انیس نسواں دہلی بھی تشریف لائے تھے۔ اس یادگار ادبی صحبت کا ایک گروپ فوٹو بھی لیا گیا جو آئندہ سب رس میں شائع کیا جائے گا۔

مشاعرہ

ادارہ کی طرف سے شعرائے عثمانیہ کا جو دلچسپ انتخاب کلام شائع ہو رہا ہے اس کے سلسلہ میں ۲ رجب ۱۳۵۶ھ کو ایک خاص مشاعرہ ترتیب دیا گیا تھا جس میں شعرائے عثمانیہ کے علاوہ دیگر شاعر بھی مدعو تھے۔ کئی شعراء اور اہلِ ذوق اضلاع سے بھی تشریف لائے تھے جن میں جذب، جوہر، وجد، رشدی، اشک اور معین الدین قریشی صاحبان اور مقامی شاعروں میں علی منظور، صفی اورنگ آبادی، خنجر، ڈاکٹر رگھونندن راج، باقی، خدوم، میکش، شکیب، مہندر راج سکسینہ راز اور ذکی وغیرہ قابلِ ذکر ہیں۔ نہایت دلچسپ اور یادگار صحبت رہی۔ ادارہ کے اکثر معاونین و رفقاء اور متعدد اہلِ ذوق اصحاب نے شرکت کی۔ تقریباً تین گھنٹے یہ ادبی ضیافت جاری رہی اور دو گروپ فوٹو بھی لئے گئے۔ اکثر حاضرین نے اس امر پر زور دیا کہ ادارہ کی طرف سے اسی طرح خاص مشاعرے منعقد ہوتے رہیں۔

درس گاہ تعلیم بالغات

ادارہ کا شعبۂ نسواں ان پڑھ عورتوں کی تعلیم و تدریس کے بارے میں خاص دلچسپی لے رہا ہے اور اس کی خواہش ہے کہ اس طرح سے اپنے طبقہ کی خاطر خواہ خدمت کی جائے۔ اس سلسلہ میں

یہ امر موجب مسرت ہے کہ شعبہ نے اس قسم کی پہلی درس گاہ کا افتتاح سالگرہ ہمایونی کے یوم سعید یکم رجب ۱۳۵۸ھ کو کیا
یہ مدرسہ صدر شعبہ محترمہ رابعہ بیگم صاحبہ کی نگرانی میں ان ہی کے مکان پر قائم ہوا ہے اور اس میں فی الحال ہفتہ میں ...
تعلیم کا انتظام کیا گیا ہے۔ شعبہ نے غیر مستطیع عورتوں کو لانے لے جانے کے لئے اپنی طرف سے ایک گاڑی کی فراہمی کا بھی انتظام
کیا ہے۔ اس مدرسے کی افتتاحی تقریب ہمیشہ یادگار رہے گی۔ شعبۂ نسوان کی اراکین نے مل کر فاتحہ خوانی اور تقسیم شیرینی کے
ساتھ اس کے کام کا آغاز کیا اور اس موقع پر محترمہ زینت النساء بیگم صاحبہ تنبیر نے ایک برجستہ نظم سنائی جو اس رسالے کے
صفحہ ۴۸ پر درج ہے۔

تاریخی آثار

شعبۂ تاریخ دکن کی طرف سے اس ماہ تاریخی مقامات کے معائنوں کا دو بار انتظام کیا گیا تھا۔ پہلی بار
گولکنڈے کے نئے قلعے اور دوسری دفعہ منصور آباد کی سیاحت کی گئی۔ پہلے معائنہ کی رپورٹ اور تصاویر
وغیرہ اس ماہ شایع کئے جا رہے ہیں۔ توقع ہے کہ اسی طرح کی تاریخی سیاحتیں اور معائنے جاری رہیں گے اور اس طرح
ملک کے بعض اہم تاریخی مقامات کے متعلق سب رس کے ذریعہ سے دلچسپ اور مفید معلومات شایع ہوتی رہیں گی

گنبد حضرت شاہ سراج

ادارہ کی طرف سے جہاں بہت سے قدیم اُردو شاعروں اور ادیبوں کی تصنیفات و تالیفات کی حفاظت
و اشاعت کا کام ہو رہا ہے ان کے دیگر آثار کی حفاظت کی طرف بھی توجہ کی جا رہی ہے چنانچہ
متعدد شاعروں کی قبروں پر سنگ مرمر کے کتبے لگائے جانے کا تذکرہ پہلے کیا جا چکا ہے۔ اسی سلسلے میں حضرت شاہ سراج کے گنبد
کی حفاظت و درستی اور کتبہ وغیرہ کے متعلق مولوی غلام احمد خاں صاحب صوبہ دار اورنگ آباد کو توجہ دلائی گئی تھی جنھوں نے نہایت
دلچسپی لے کر اس کام کی تکمیل کے اسباب پیدا کر دیئے ہیں۔ توقع ہے کہ بہت جلد یہ تاریخی گنبد محفوظ ہو جائے گا۔ صوبہ دار صاحب
نے موجودہ حالت کا ایک فوٹو بھی روانہ کیا ہے جس کے لئے ادارہ ان کا شکر گذار ہے۔

شاہ سراج کا گنبد جس مقام پر واقع ہے وہ بعد کو ان کے خلیفہ شاہ چراغ کے تکیہ کے نام سے مشہور ہو گیا۔ اور اسی لئے
اورنگ آباد میں بعض لوگ شاہ سراج اور شاہ چراغ کو ایک ہی شخص سمجھتے ہیں۔ اس غلط فہمی کو دور کرنے کے لئے اس رسالہ میں
مولوی عبدالقادر صاحب سروری کا ایک مضمون صفحہ ۹ پر شایع کیا جا رہا ہے۔ پروفیسر سروری نے شاہ سراج پر جو بلند پایہ تحقیقی کام
کیا ہے وہ عنقریب ایک مبسوط کتاب کی صورت میں شایع ہو جائے گا۔

درگاہ حضرت فیض

استاذ الکل حضرت میر شمس الدین محمد فیض کی درگاہ حیدرآباد کے لال دروازہ کے باہر ہے جہاں حضرت
کی خانقاہ وغیرہ کے کھنڈر بھی موجود ہیں۔ اور حضرت کے معتقدوں اور شاگردوں کی
قبریں بھی اسی احاطہ میں موجود ہیں جس کے اطراف چار دیواری نہیں ہے۔ اس کے لئے ادارہ کی طرف سے کئی ماہ سے محکمہ
امور مذہبی کو توجہ دلائی جا رہی ہے۔ اور اس کے مراسلوں سے معلوم ہوتا ہے کہ اس بارے میں کارروائی جاری ہے۔ امید
ہے کہ یہ محکمہ اس کام کو بھی شایانِ شان اہمیت دے گا۔

سوتیلی ماں

اس عنوان سے اس ماہ سب رس میں محترمہ رابعہ بیگم صاحبہ کا ایک مضمون شایع ہو رہا ہے یہ اصل میں اس
دلچسپ اور مفید کتاب کا ایک ٹکڑا ہے جو اسی نام سے ادارہ کی طرف سے زیر طبع ہے۔ یہ کتاب اس قدر دلچسپ

پیرائے میں لکھی گئی ہے اور ایسے مفید اور کارآمد مشوروں سے مالامال ہے کہ اس کا مطالعہ ہر ایک کے لئے دلچسپی اور فائدہ کا باعث ہوگا

ادارہ کا کتب خانہ

ادارہ کا کتب خانہ رفتہ رفتہ بہت ترقی کرتا جا رہا ہے اور اس کے ناظم اعزازی نواب مرزا اسیف علی خاں صاحب جاگیردار کی دلچسپیاں اس کو مستقبل قریب میں اردو کا ایک اعلیٰ منظم اور باضابطہ کتب خانہ بنادیں گی جو اس زبان اور مملکت حیدرآباد کے شایان شان ہوگا اور جس سے تشنگان علم و تحقیق فائدہ اٹھا سکیں گے۔ اس کتب خانہ کی امداد کے لئے صاحبان ذوق کو خاص طور پر دعوت دی جارہی ہے۔ یقین ہے کہ اس مفید کام میں ادارہ کا ہاتھ بٹایا جائے گا۔

شعبۂ نسواں

۳ اگست ۳۹ء کو شعبۂ نسواں کا ساتواں اجلاس منعقد ہوا جس میں رابعہ بیگم صاحبہ، سارہ بیگم صاحبہ لطیف النساء بیگم صاحبہ ام اے، جیلانی بیگم صاحبہ، بشیر النساء بیگم صاحبہ بشیر اور سکینہ بیگم صاحبہ (معتمد) نے شرکت کی۔ رسمی امور کے تصفیوں کے بعد شعبہ کے اراکین میں اضافہ کرنے کی طرف توجہ مبذول کی گئی۔ مدرسہ تعلیم بالغات کے بارے میں بقیہ انتظامات کی تفصیل طے پائی چنانچہ اس کے مطابق ۱۰ اگست کو جملہ اراکین مجلس انتظامی نے ... کراس درس گاہ کا آغاز بھی کردیا۔ شعبہ نے اپنا اجلاس عام ۲۲ شعبان مطابق ۲ اکتوبر کو مقرر کیا ہے جس میں ادبی، اصلاحی، سماجی و معاشرتی مضامین پڑھوائے جائیں گے اور لطیف النساء بیگم صاحبہ ایک اصلاحی نسوانی ڈرامہ بھی اس موقعہ پر ترتیب دیں گی۔ جو خواتین اجلاس سے دلچسپی رکھتی ہیں معتمد اعزازی کوہ نور، کریم آباد، چنچل گوڑہ سے مراسلت فرمائیں۔

شعبۂ تالیف و ترجمہ

اس ماہ شعبۂ تالیف و ترجمہ کے دو اجلاس ہوئے۔ پہلے میں ۹ اگست کو پروفیسر فضل حق صاحب، عبد القادر صاحب سروری، فیض محمد صاحب، ڈاکٹر سید محی الدین صاحب قادری زورؔ اور ظہیر الدین احمد صاحب (ادا می شعبہ) نے شرکت کی اور طے پایا کہ شعبہ کا نام شعبۂ تالیف و ترجمہ قرار دیا جائے۔ ۲۔ بچوں کے لئے عام فہم انگریزی کتابیں اردو میں منتقل کی جائیں جن کے انتخاب کا کام فیض محمد صاحب اور پروفیسر سروری کے سپرد کیا گیا۔ ۳۔ ڈاکٹر رضی الدین صدیقی سے درخواست کی جائے کہ وہ شعبہ کے لئے ایک مختصر کتاب "مسلمان ریاضی داں" کے عنوان پر لکھ دیں۔ دوسرے جلسوں اور شعبوں کی روداد یں آئندہ ماہ درج کی جائیں گی۔

بزم ادب عثمان آباد

عثمان آباد میں ۲ مہر ۱۳۴۸ف کو بزم ادب عثمانیہ کا دوسرا سالانہ جلسہ بصدارت مولوی سید محمد قاسم صاحب رضوی منعقد کیا گیا تھا اسکی تفصیلی روداد وصول ہوئی ہے جس سے واضح ہے کہ علم دوست اصحاب اضلاع میں بھی علمی و ادبی چہل پہل پیدا کرنے کی کوشش کر رہے ہیں۔ یہ بزم ادب قابل ستائش ہے کہ اس نے لوگوں کو ایسے کام کی طرف راغب کرانے میں ایک حد تک کامیابی حاصل کی۔ مختلف انعامی مقابلے مثلاً اردو نویسی، قرأت، خوشنویسی، مضمون نگاری، لطیفہ گوئی اور تقریر رکھے گئے اور ان میں اول و دوم آنے والوں کو انعامات دئے۔ جو مشاہیر اردو کے ناموں سے منسوب تھے۔ مثلاً سرشار پرائز، سرسید پرائز، حالی پرائز، امجد پرائز، زور پرائز، اقبال پرائز، حکمت پرائز وغیرہ۔ یہ طریقہ صرف قابل ستائش بلکہ قابل تقلید بھی ہے۔

جلسہ میں مولوی عبدالحق، ڈاکٹر زورؔ، ڈاکٹر رضی الدین، مولوی ابوالحسن سید علی صاحب وغیرہم کے پیامات سنائے گئے۔ اس قسم کی علمی و ادبی انجمنیں زندگی کی نشانی ہے۔ توقع ہے کہ بزم ادب عثمانیہ دوسرے اضلاع کے لئے ایک اچھی مثال ثابت ہوگی۔ ادارۂ ادبیات اردو ایسی انجمنوں کو مدد دینا اور سہولتیں بہم پہنچانے میں حتی الامکان کوشش کرے گا۔ کیونکہ اس کا اہم مقصد یہی ہے کہ ملک کے گوشہ گوشہ میں علمی و ادبی ذوق عام ہوجائے۔

تلقین وفا

(سالگرہ ہمایونی ۱۳۵۸ھ)

نظر آئی سب کے دل میں مجھے جائے شاہِ عثماں
یہ نثارِ شاہِ عثماں وہ فدائے شاہِ عثماں

علما کا پاس ان کو، علما قریب ان سے   شعرا کی قدر ان کو، شعرا اثنا گران کے
میں ہر ایک سمت سنتا ہوں ثنائے شاہِ عثماں

وہ ہیں خیرہ بیگانہ دل خلق ان پہ مائل
مقر ان کا ہے زمانہ نہیں کون ان کا قائل

سخن ان کا جاذبِ دل کہ وہ جدت آفریں ہیں   ہیں مدبر ان کے قائل کہ وہ صاحب یقیں ہیں
نہیں مضطرب کسی جا کبھی رائے شاہِ عثماں

وہ ہنروروں کا ملجا ہنر ان کے آشکارا
وہ سخنوروں کا ماویٰ سخن ان کا محفل آرا

نظر ان کی ہر کسی پر وہ نہیں کسی سے غافل   انہیں علم ہے کہ دنیا میں ہے کون کون قابل
جسے مستحق ہی پائے وہ عطائے شاہِ عثماں

وہ مفید سب کے حق میں یہ ترا وطن ہی کیا ہے
یہ ترا وطن ہی کیا ہے کرم ان کا جابجا ہے

بہ عطا وجود اکنوں بنہ بود کسے مثیل اش   کہ برائے تشنہ کاماں شدہ وقف سلسبیل اش
مجھے مل رہے ہیں ہر سو عرفائے شاہِ عثماں

نہیں یاد دوسروں کو یہ طریق حکمرانی
تجھے خسرو دکن کا نہ ملے گا کوئی ثانی

انہیں دھیان ہندوؤں کا ہیں مطیع ان کے ہندو   وہ نشاطِ روح مسلم دل مسلم اور وہ خوشخو
طربِ دل رعایا ہر ادائے شاہِ عثماں

علی منظور

ملا خیالی کی مسجد کا پچھلا رخ

اورنگ زیب اور عبد اللہ قطب شاہ کے برج
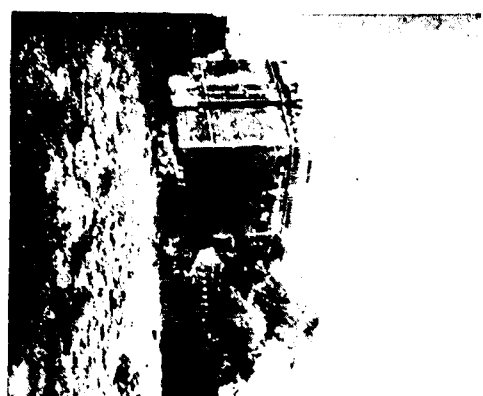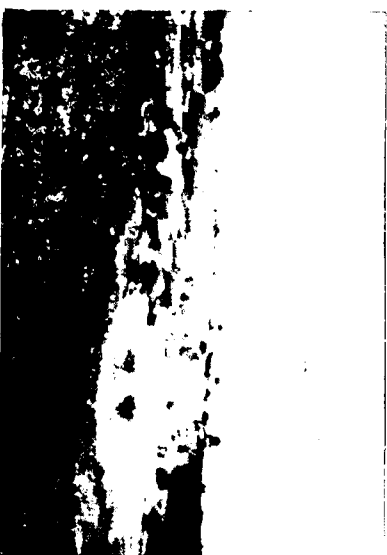
نئے قلعہ سے گنبدوں کا منظر

نئے قلعے کے حوض اور جزیرہ

نئے قلعہ کا معاینہ

۲۸ر شہریور ۱۳۴۲ف مطابق ۴ر اگست جمعہ کے دن شعبۂ تاریخ دکن کی طرف سے نئے قلعے کے معاینہ کا انتظام کیا گیا۔
اس میں ڈاکٹر سید محی الدین صاحب قادری زورؔ، عبدالقادر صاحب سروری، سید محمد صاحب، عبدالحفیظ صدیقی صاحب
اور عبدالمجید صدیقی شریک تھے۔ اس نئے قلعے کے احاطے میں جو پرانے قلعہ گولکنڈہ کے شمالی مشرقی جانب اور اسی سے
متصل ایک بلند اور مستحکم فصیل سے محصور ہے قابل دید آثار پائے جاتے ہیں بعض آثار تو اس قلعے کی تعمیر سے پہلے کے ہیں
اس قلعے کی تعمیر سنہ ۱۰۶۶ھ ۱۶۵۶ء کی یادگار ہے جب کہ شاہزادہ اورنگ زیب نے فاتح دکن کی حیثیت میں قلعہ گولکنڈہ پر حملہ کیا تھا۔
اس کا باعث دوسری الجھنوں کے ساتھ محمد سعید میر جملہ کی غداری تھی۔ مغل حملہ آوروں کو قلعے سے باہر اس کے مشرقی
سمت ایک قدرتی پہاڑی مل گئی جس پر انھوں نے ایک بلند پختہ مورچہ باندھ کر قلعے پر زد کی جس کی وجہ سے حکمران وقت
عبداللہ قطب شاہ کو ہتھیار ڈالنے پڑے اور کمزور شرائط پر صلح کرنی پڑی تھی۔ یہ پختہ مورچہ اب تک موجود ہے۔ جب
حملہ آور فوج واپس ہو گئی تو عبداللہ قطب شاہ نے اس پہاڑی کو جس پر اورنگ زیب نے اپنا مورچہ باندھا تھا باہر چھوڑنا
مناسب نہیں سمجھا کیونکہ مدافعی نقطۂ نظر سے یہ قلعے کی آئندہ بقا کے لئے بہت خطرناک تھا۔ اس لئے کہ جو حملہ آور
آتے ان کو قلعے پر حملہ کرنے کے لئے اچھے موقعے مل جاتے۔ چنانچہ اس پہاڑی کے اطراف کہ یہ فصیل کے اندر آجائے
اور دشمن کو قابو پانے کا موقع نہ ملے ایک بڑا احاطہ محصور کر لیا گیا اس کو نیا قلعہ کہتے ہیں حسب موقع فصیل پر مستحکم برج
بنائے گئے تاکہ حملہ آوروں کی خاطر خواہ مدافعت ہو سکے۔ چنانچہ اورنگ زیب کے مورچے کے قریب ایک بہت بڑا قطب
شاہی برج ہے جو اپنے موقع اور استحکام کے لحاظ کرتے قابل دید ہے۔ وہاں سے بہت دور تک توپوں کی زد ہوتی ہے
اس کی تعمیر غالباً دھرماچار میستری کے ہاتھوں سے ہوئی تھی جس نے اسی جنگ کے بعد موسی برج بھی بنایا تھا۔

اس احاطے میں سب سے پرانی چیز ملا خیالی کی مسجد ہے جو ابراہیم قطب شاہ کے عہد کا مشہور دکھنی شاعر تھا
اس کی تاریخ سے معلوم ہوتا ہے کہ اس کا وجود قلعے کی تعمیر سے پہلے تھا۔ اگرچہ یہ ایک چھوٹی مسجد ہے لیکن بلند کرسی پر
تعمیر ہوئی ہے اس کے کمان اور محراب تعمیر کاری کے اچھے نمونے ہیں۔ درمیان محراب میں خط ثلث میں قرآن شریف
کی آیتیں لکھی ہوئی ہیں جو بہت خوش نما اور نمایاں ہیں۔ محراب کے اوپر اور دونوں جانب کمانوں پر بھی خاص رنگ سے
بہت سی آیتیں لکھی گئی تھیں جو اب مٹ گئی ہیں۔ دروازے پر قرآنی آیات کے بعد حسب ذیل قطعہ کندہ ہے جس پر
سنہ تعمیر، بانی مسجد اور شاہِ وقت کے نام پائے جاتے ہیں جو ادبی اور تاریخی دونوں حیثیتوں سے معنی خیز ہیں۔

(قطعہ)

منت یزدان کہ در دوران شاہ دیں پناہ — قطب عالم شاہ ابراہیم آں نیکو سرشت
کردہ ایں مسجد بنا ملا خیالی کز شرف — می سزد کارند حوران بہشتی سنگ و خشت
رکنے از جنت برائے پیش آمد باخدا — از برائے آں بود تاریخ او رکن بہشت ۱۰۲۷

اس کے علاوہ ایک اور خوش نما مسجد جو خاص اہتمام سے بنائی گئی تھی نرالی یادگار ہے اس کے کتبے سے معلوم ہوتا ہے کہ

ے

سب رس

وہ محمد قلی قطب شاہ کے عہد میں تیار ہوئی تھی لیکن یہ بتانا مشکل ہے کہ اس کے بانی کون تھے۔ اس احاطے کی دوسری [illegible]
چیز دو وسیع اور طویل حوض ہیں جو مسلسل بنائے گئے تھے۔ چونکہ یہ ایک وسیع احاطہ تھا اس لئے قطب شاہوں کے پاکیزہ
ذوق نے اس کو بنجر حالت میں چھوڑنا مناسب نہیں سمجھا۔ اس میں تفریح کے سامان جمع کئے گئے۔ جیسا کہ اس کے [illegible]
سمت یکے بعد دیگرے [illegible] حوض بنائے گئے جن کو حوض در حوض کہنا چاہئے۔ ان کی سطح ایک دوسرے سے مختلف
[illegible] سب سے پہلے حوض کی سطح جس میں تالاب سے پانی آتا تھا بہت بلند ہے اور دوسرے حوض علی الترتیب اس سے
نیچے ہیں تاکہ ایک حوض کا پانی دوسرے حوض میں اس طرح آئے کہ اس کے بہاؤ سے ایک کیف آور منظر پیدا ہو۔
علاوہ آبشار پیدا کرنے کا انتظام بھی کیا گیا ہے۔ یعنے دو حوضوں کے درمیان جہاں پانی بلندی سے نیچے گرتا ہے ایسے
ڈھلوان بنائے گئے ہیں جن کا رخ نیچے کی طرف ہے اور ان ڈھلوانوں میں ایک ہی پیمانے کی گہرائیاں اور ابھار
تاکہ ان پر پانی اچھل کر ایک دلکش منظر پیدا کرے۔ نیز ان حوضوں کے دونوں طرف دو نہریں بھی دوڑتی تھیں اور
درختوں کی قطاروں کے ساتھ جو ان کے برابر نصب کئے گئے تھے دلفریب منظر پیدا کرتی تھیں۔ سب سے آخری حوض
اس قدر وسیع ہے کہ ایک بڑا تالاب معلوم ہوتا ہے۔ اور اس کے بیچ میں ایک سڈول چبوترہ بنایا گیا ہے جہاں غالباً
تفریح کے لئے ٹہلتے تھے لیکن چبوترے پر جانے کے لئے کوئی راستہ نہیں ہے۔ غالباً اس کے لئے کشتی استعمال کی جاتی
ہوگی۔ تفریح کا یہ انتظام ہندوستان کے اور آثار قدیمہ میں نہیں پایا جاتا۔ ان حوضوں کے شمال میں ایک تالاب
جس کے ذریعے ان میں پانی آتا تھا اور زائد پانی فصیل کے باہر خارج کردیا جاتا تھا۔

احاطے کے مشرقی جانب بارہ دری کی طرح ایک اور عمارت ہے جو اپنی تعمیری طرز میں آصفجاہی معلوم ہوتی ہے
غالباً یہ حضرت غفراں مآب نواب نظام علی خاں کی بنائی ہوئی ہے اور تفریح کے لئے استعمال کی جاتی ہوگی۔ یہ عمارت
بہت بڑی نہیں ہے لیکن اس کے مشرقی سمت آبشار کا بڑا دلچسپ انتظام ہے۔ یعنے ایک بلند ٹیلے سے منصوبہ
کھڑی کرکے پانی نیچے گرانے کا انتظام کیا گیا تاکہ ایک آبشار کی شکل پیدا ہو۔ کچھ فاصلے سے نالیوں کے ذریعے
لایا جاتا تھا غالباً یہ پانی ایک خزانۂ آب سے آتا تھا جس کی عمارت قریب میں پائی جاتی ہے اور یہ پانی بہتے ہوئے
سطح سے نیچے گرتا تھا اور جہاں پانی گرتا تھا وہاں حوض نما تین دیواریں بنائی گئی ہیں جن پر منقش طاقچے ہیں۔ [illegible]
ہوتا ہے کہ ان طاقچوں میں شب کو ماہی پیہوں کی روشنی کی جاتی تھی تاکہ یہ روشنی اپنے گوناگوں نمونے کے ساتھ
آبشار میں منعکس ہو اور دلفریب منظر پیدا کرے۔

عبدالمجید صدیقی

تاریخ گولکنڈہ

حیدرآباد کے مشہور مورخ اور جامعۂ عثمانیہ کے استاذ تاریخ پروفیسر عبدالمجید صاحب صدیقی ام اے ال ال بی نے اس کتاب میں
قطب شاہیہ کی نہایت مستند اور مبسوط تاریخ قلمبند کردی ہے۔ دکن کا تمدنی ارتقاء بادشاہوں اور امیروں کے صلات، مختلف
علم و فضل کی سرپرستی غرض ہر پہلو پر قدیم، نادر اور قلمی تاریخوں کی مدد سے روشنی ڈالی گئی ہے۔ اس کتاب کی تصویریں بھی
کی طرح قدیم تاریخی ماخذوں سے حاصل کی گئی ہیں۔ صفحات (۲۵۰) مجلد قیمت ۸ر

شاہ سراج اور شاہ چراغ

اورنگ آبادی

حضرت سید شاہ سراج الدین، سراج اورنگ آبادی کے یوں تو کئی شاگرد، معتقد اور مرید تھے، لیکن ان میں
ن سے انہیں خاص ربط تھا وہ شاہ عبد الرسول چشتی، شاہ ضیاالدین پروانہ، شاہ تاج الدین اور شاہ چراغ
شاہ عبد الرسول اور شاہ ضیاء الدین کے متعلق تو پتہ چل سکتا ہے کہ ان سے شاہ سراج کی دوستی، عنفوان شباب
ی اور آخر عمر تک قایم رہی۔ لیکن شاہ تاج الدین اور شاہ چراغ کی شناسائی کس زمانے میں ہوئی، اس کا پتہ
ہوا ہے۔ قیاس یہ ہے کہ، یہ لوگ، شاہ سراج کی طرف اس وقت رجوع ہوئے تھے، جب انھوں نے دنیا کو
رکے فقیری اختیار کر لی تھی۔ انھوں نے اپنے پیر کی ایسی خدمت کی کہ بہت جلد منظورِ نظر ہو گئے۔

عجیب اتفاق ہے کہ آخری زمانے میں، جب شاہ سراج ہر وقت علیل رہا کرتے تھے۔ ان معتقدین میں سے
ان کے پاس نہ تھا۔ شاہ ضیاء الدین پروانہ، ملازمت کے سلسلہ میں، بیجاپور چلے گئے تھے، شاہ تاج الدین بھی
آباد میں نہیں تھے اور شاہ چراغ، احمد نگر میں مقیم تھے۔

حسنِ اتفاق سے یہ تمام تفصیلات، شاہ سراج کے فارسی خطوط کے ذریعے ہماری دسترس میں آگئی ہیں۔
ءالدین پروانہ کو جو خطوط، سراج نے اس زمانے میں تحریر کئے ہیں، ان میں اکثر اپنی علالت کا حال لکھا ہے۔
ہاں تنہا رہا کرتے تھے، اور دو خدمت گار، گھر کے کام کاج کے لیئے رکھ لئے گئے تھے۔ ایک خط میں وہ
لکھتے ہیں۔

"از ہفدہ ماہ، بواسیر بادی و ضعف قوائے رئیسہ خصوصاً ضعف معدہ غالب است
اگرچہ مطابق فعل الحکیم لایخلو عن الحکمۃ، خود را بمصلحت حکیم حقیقی حوالہ کردہ شدہ،
لاکن بحکم داد مراتب و ادائے شان عبدیت، بطبیبان شہر رجوع آوردہ موافق مزاج
اینہا، بدوا و غذا پرداختہ می آید دو روز اگر قدرے آثار شفا مرتب می شود، باز
بحکم مصلحت حقیقی ہماں دوا بمضرت می پردازد۔ بہرحال ہر دو صورت خالی از حلاوت خاص
نیست دریں ولا باز از یک ہفتہ آثار شفا است آیندہ باید دید کہ رضا در چہ کار، د
مار ادراں چہ بار۔ ضعف بدن بمرتبہ ایست کہ ابسیر حوک ہم معذور است"

اسی تکلیف و تنہائی کی وجہ سے اس زمانے میں وہ شاہ چراغ کو اورنگ آباد آنے کے لئے لکھتے ہیں
چنانچہ ایک خط میں لکھتے ہیں۔

"فقیر تا حال در ہمان بیماری از مدت یک و نیم سال گرفتار است و ہر روز دوائے
حکیمان بعمل می آید۔ یکے بیماری دوم تنہائی و کسے دلسوز در خدمت نیست"

ایک اور خط میں انہیں کو لکھتے ہیں۔

"دریں ولا بسبب بیماری تا یک ہفتہ زندگانی بالکل نبود۔ بلکہ مرزا سنجر بیگ دراں وقت
حاضر بودند آنچہ لازمہ دوستی بود بجا آوردند"

لیکن ایسا معلوم ہوتا ہے کہ شاہ چراغ ذرا لا ابالی طبیعت کے انسان تھے۔ اور وقت سے پہلے میدان
میں نکل آنا چاہتے تھے۔ چنانچہ سراج ہی کے ایک خط سے یہ معلوم ہوتا ہے کہ انھوں نے احمد نگر میں اپنے آپ
رونق شاہ مشہور کر رکھا تھا۔ اور اپنا رنگ جما رہے تھے۔ خود مرشد نے انھیں شاہ چراغ کا لقب عطا کیا تھا۔ اس
چھوڑ کر وہ ایک اور لقب اختیار کرنا چاہتے تھے۔ شاہ سراج انہیں بار بار منع کرتے تھے کہ فقیری کے یہ معنی
نہیں کہ جہاں جائیں ایک نئے نام سے اپنے آپ کو مشہور کریں۔ اس پر بھی وہ اپنی ہٹ پر قائم تھے۔ مرشد کی
خدمت میں حاضر ہونا تو درکنار خط بھی لکھنے میں انہیں تامل ہوتا تھا۔ اس لئے شاہ صاحب کبھی کبھی ان سے خفا
ہو جاتے تھے اس کا سبب یہ تھا کہ شاہ صاحب کو شاہ چراغ سے بڑا انس تھا بار بار بلانے کے بعد بھی جب وہ
ہیں حاضر نہیں ہوتے تو ایک دفعہ طنزیہ انداز میں تحریر فرماتے ہیں۔

"بتوجہ شما بار حق تعالیٰ فضل کرد بیماری تخفیف یافت والحال احتیاج آمد شما نیست
اگر قصد سیر شہر باشد مبارک است"

ایک اور خط میں شاہ صاحب نے ان سے باز پرس کی تھی کہ میرے بار بار بلانے پر بھی تم حاضر خدمت نہیں
اور وہاں ایک ایسے نام سے جو مرشد نے تمھیں نہیں دیا اپنے آپ کو مشہور کر کے اپنا رنگ جمانا چاہتے ہو یہ فقیری
کے شیوے نہیں فقیری کرنا ہو تو یہاں آؤ میں تم کو بتاتا ہوں کہ فقیری کیا چیز ہے۔ لیکن جب اس کا بھی کچھ اثر
نہ ہوا تو ایک دفعہ رنجیدہ ہو کر لکھ دیا کہ بیماری سے میرا برا حال ہے اگر میں مرجاؤں تو اچھا ہے کہ میری لاش پر
تمھارا سایہ نہ پڑے۔ شاہ چراغ کی بیوی للن جی یا لالن جیو کو بھی شاہ صاحب نے اسی مضمون کے خط لکھے
اور اگر شاہ چراغ نہ آنا چاہیں تو خود انہیں آنے کی ہدایت کی ہے۔

غالباً مرض کی تکلیف جب بہت بڑھ گئی اور بیکسی کا وہی حال رہا تو انھوں نے اپنے عزیز دوست
شاہ عبدالرسول چشتی کے پاس لشکر میں جا کر رہ جانے کا تصفیہ کر لیا۔ جانے سے پہلے ایک خط میں انھیں

ں کی اطلاع اس طرح دیتے ہیں ۔

"فقیر لاعلاج عزم جزم دارد کہ پیش رسول خاں صاحب بروم .... اگر آمدن
نمی شود جواب صاف بنویسند کہ انتظار آمدن یا جواب شما است ۔ فقیر پا در رکاب
است "

یہ خط بھی پہلے تمام خطوں کی طرح بے اثر رہا تو جاتے ہوئے ایک خط لکھا کہ میں شکر جا ۔ بارون تکیہ
اد ہے گا تم چاہو تو آکر اس میں مقیم ہو سکتے ہو ۔

ایسا معلوم ہوتا ہے کہ سراج کے انتقال کے بعد شاہ چراغ تکیہ میں آکر فروکش ہو گئے تھے چنانچہ
اب نظام علیخاں کے عہد میں یہ اسی تکیہ میں رہا کرتے تھے شاہ تجلی علی نے جو دربار کے مشہور مورخ ہیں اپنی تاریخ
زک آصفیہ میں ایک واقعہ لکھا ہے جس سے پتہ چلتا ہے کہ وہ اس زمانے میں اورنگ آباد کے خرقہ پوشوں میں
بہت شہرت رکھتے تھے اور شاہ سراج کے مرید خلیفہ اور جانشین کی حیثیت سے مشہور تھے نواب نظام علیخاں کے
دربار کے ایک امیر راز دار الدولہ بہادر جن کو مدت سے خرقہ پوشی کی آرزو تھی شاہ چراغ کے مرید ہو نے
ور ترک دنیا کر کے فقیری اختیار کر لی ۔ شاہ چراغ نے انھیں سراج ثانی کا لقب عطا کیا تھا اور یہ اسی نام سے
مشہور تھے (تزک آصفیہ صفحہ ۴۹۱)

چونکہ شاہ چراغ کا زمانہ بعد کا ہے اس لیے وہ تکیہ جہاں حضرت شاہ سراج رہا کرتے تھے شاہ چراغ کے
نام سے موسوم ہو گیا اور اب عام طور پر اورنگ آباد میں یہ شاہ چراغ کا تکیہ ہی کہلاتا ہے ۔ اسی تعلق کی وجہ سے
الاً شاہ سراج کا مزار بھی شاہ چراغ کے نام سے موسوم ہو گیا ہے ۔ حالانکہ یہ گنبد شاہ چراغ کی زندگی ہی میں
ان کے برادر طریقتی شاہ ضیاء الدین پروانہ نے اپنے مرشد کی یادگار باقی رکھنے کے لیے تعمیر کرادی تھی ۔
شاہ پروانہ بہت متمول آدمی نہیں تھے اس لئے گنبد زیادہ پائیدار نہ بنا سکے بلکہ یہ اینٹ اور چونے سے تعمیر
کرایا گیا اسی لئے مرور زمانہ سے اب اس کی حالت نہایت خستہ ہو گئی ہے ۔

محمد عبد القادر سروری

اطلاع

براہ کرم کوئی صاحب رسالہ کا چندہ یا ادارہ کی کتابوں کی قیمت مطبوعہ رسید نمبری
حاصل کئے بغیر نہ دیں ۔ ورنہ دفتر اس کا ذمہ دار نہ ہوگا ۔ مہتمم

خلجان

"نت نئے جھگڑوں اور روز کی دھینگا مشتی سے تو ماٹ کا جل بھی سوکھ جاتا ہے میں تو پھر آدمی ہوں
بھوربھاگی کے لئے تو کیوں دکھتے ہیں۔ پتاجی کی آنکھ بند ہوتے ہی میں سمجھ گیا تھا کہ اس سنسار میں میرا سہارا
دیپ بند ہو گیا تھا کہ ماں۔ میری ماں سب کچھ ہے میری ڈھارس میرا آسرا موجود ہے لیکن ماں جس دن سے تو نے
چوڑیاں پہنی ہیں میرے جیون کا سوگ شروع ہو گیا ہے چاچا جی کی باتوں میں آ کر تو بھی میرے کرے دھرے پر پانی
میں سب سہہ سکتا ہوں مگر اپنے پتا پر یہ دوش دیا جانا نہیں سن سکتا کہ اس نے مجھ ایسے پاپی کو سنسار میں لا کر
کمایا ہے۔ میرا یہ پتا پاپ ہے نا۔ ماں کی سنوں چپ رہوں چاچا دکھی سکھی نہ۔ مجھے جھوٹی تنگی لگے سب
اگر میں ردی کیا ہوں رسالن، مانگ لوں تو کٹھو اگر کچھ نہ کہوں اور رو دوں تو ...... گھنگ نے بیچ جاتے ہیں۔
اشیرباد (دعا) دے کہ میں جاؤں اور جیون کی زندگی میں کچھ کروں اور چاچا جی کو دکھا دوں کہ میری
میرے پتا نے جن کیا تھا پاپ نہیں۔" شام کی پلکوں پر آنسو تھے اور اس کے بار یک ستو لائے ہوئے ہونٹ
پتی کی طرح کانپ رہے تھے۔ اس نے اپنی الجھی پگڑی کو سر پر لپیٹا گندی چادر کندھے پر ڈالی لاٹھی جو اس نے
میں کھرپے سے زمین کھودنا کرنے کی مزدوری نا پر خرید کی تھی سنبھالی اور ماں کے قدموں پر جھک گیا" ماں اشیرباد
ایشور کی کرپا سے میں پردیس میں دیس سے زیادہ سکھی رہوں گا" ماں کی آنکھوں سے آنسو ٹپک ٹپک کر جھکے ہوئے
شام کی میلی پگڑی کی سلوٹوں میں جذب ہو رہے تھے چوڑیاں پہننے کے بعد وہ خود کو سہاگن سمجھنے لگی تھی لیکن
اسے پھر احساس ہوا کہ یہ سہاگ جھوٹا سہاگ ہے بیوگی کی زردی اس کے چہرے پر لرز رہی تھی شام جھکا ہوا
تھا کہ ماں اسے اجازت دے۔ ماتا جی یہ سیس چرنوں سے نہیں اٹھے گا اجازت دو سورج ڈوب رہا ہے سانجھ ہو
وزیرآباد نکل جاؤں گا۔ "کہاں جائے گا اس کی ماں نے پوچھا"

"جہاں ایشور لے جائے گا ماں"

"میں بھی تیرے ساتھ چلوں گی"

"چاچا جی کا گھر سونا ہو جائے گا"

"تو نہ جا میں مر جاؤں گی"

"ماں کسی کے جانے سے کوئی نہیں مرتا۔ لے اب اشیرباد دے نہیں تو تیرے سنہرے آنسو مجھے پردیس میں
دکھی کریں گے۔ مجھے کوئی نہیں روک سکتا ہنس کر میں بھی ہنستا ہوا جاؤں۔ ماں پتا کی عزت میرا دھرم ہے جا

مجھے کسی جوگ کا نہیں رکھا چھوٹے چھوٹے بالک بھی شام پر بولی ٹھٹھولی مارتے ہیں۔ "ماں رام رام" اور شام اس عجلت سے گھر سے نکلا کہ اس کی ماں کے لفظ کپکپاتے ہی ہونٹوں میں رہ گئے وہ دیر تک دروازے پر آئی مگر شام کھیتوں کی بلند ہریالی میں ڈوب چکا تھا سورج پر شام کی سرخ بدلیاں آگئی تھیں اور سیاہی بستی کا رخ کیے تیزی سے چلی آرہی تھی۔ شام قدم اٹھائے وزیر آباد کی پگڈنڈی پر بڑھا چلا جارہا تھا کسان دوکرلیوں (بیٹھک) کے باہر بیٹھے حقہ پی رہے تھے کہ شام وزیر آباد کی حدود پار کر گیا افق سے چاند نے سر اٹھایا تھا کہ شام جمنا کے دوسرے کنارے پر اپنا لنگر سکھا کر جگت پور کے جنگل میں ایک پرانے برگد کے درخت کے نیچے بیٹھا اپنے مستقبل کے متعلق سوچ رہا تھا کدھر جائے اور کدھر نہ جائے آس پاس کے تمام دیہات اس کے واقف ہیں اگر کسی نے دیکھ لیا تو کیا کہے گا اس نے جیب میں سے بیڑی نکالی اور ایک راہگیر کی چلم سے سلگا کر پھر درخت کے سائے میں بیٹھ گیا۔ "زمانہ بھرم (بھروسہ اور نیکی) کا نہیں" اس نے اپنے دل سے کہا اور لاٹھی کاندھے پر رکھتا ہوا لاچی پور کی چوپال کی طرف چل دیا کنھیا بچپن کا ساتھی مل گیا۔

"شام"

"کنھیا"

"کیسے آیا۔ ماں راضی ہے"

"سب چوکھے ہیں ذرا سسرال جارہا ہوں" شام جھوٹ بولا لیکن اس کی معصوم روح کو جھٹکا سا محسوس ہوا "کہا کنھیا سے بھی ملتا چلوں۔ سنا چھورے گنڈاسے[1] کا کیا حال ہے"

"چوکھا (خوب) ہے تو بہوڑیا کب لائے گا" کنھیا نے پوچھا اور دونوں ہنس دیئے۔ بچپن والے جب بھی کہیں مل جاتے ہیں تو حشر بیدار کر دیتے ہیں گاؤں کے چھ سات ہم عمر لڑکے پاؤنے "(مہمان) کے پاس آبیٹھے اور ہنسی مذاق شروع ہوگیا شام نے حتی المقدور دل کے درد کو چھپانا چاہا لیکن آنکھوں میں ٹھہری ہوئی افسردگی کنھیا کی دوست آشنا نگاہیں نظر انداز نہ کرسکیں۔

"شام آؤ ذرا کھیتوں پر چکر لگائیں آج کل مرگ (ہرن) بہت نسکان (نقصان) کرتے ہیں"

"ہم بھی چلیں گے" دو لڑکوں نے کہا"

"نہیں کنھیا نے انھیں جھڑکا اور شام کے بازو پکڑ کر لے گیا راستے میں ہزاروں ہی قسمیں دے ڈالیں واسطے دیئے مگر شام کے دل کی نہ جان سکا۔

صبح ہوتے ہی شام نے جانے کی جلدی مچادی کنھیا کی بہو نے ساتھ کے لئے بھی روٹی باندھ دی شام انکار کرتا رہا مگر دونوں میاں بیوی کے اصرار کے سامنے سر جھکانا ہی پڑا۔ تمام دن شام چلتا رہا۔ خان پور، بدرپور، میرپور

---

[1] گنڈاسہ خاص دیہاتی بندش ہے جس کے معنی ہیں کہ سناؤ معشوق (محبوب بیوی) کا کیا حال ہے۔ حادی

سب کو چھوڑتے ہوئے اور واقف کاروں سے نظر بچاتے ہوئے شام . شام کے قریب آبادیوں سے بہت دور نکل چکا تھا
آج چاند گھنٹہ ٹیک کر نکلا . تاریکیوں میں چلتے چلتے شام اصل راستہ چھوڑ کر جنگل کے وسط میں جا پہنچا پتوں سے چھنتی ہوئی چاندنی کی
روشنی اب زمین کے سینے کو داغ رہی تھی دور جھاڑیوں میں سے سسکیوں کی آواز نے شام کو اپنی طرف "کھینچ" لیا۔ یہ بے خوف و خطر
اپنے دامن کو دشتی خار دار جھاڑیوں سے بچاتا وہاں پہنچا کوئی عورت گھٹنوں میں سر دیئے رو رہی تھی سامنے ایک پلی سی گٹھڑی
پوٹلیا بندھی ہوئی رکھی تھی شام کھڑا ہو گیا . رونے والی کی سسکیاں ہچکیوں میں تبدیل ہوئیں اور ان کی رفتار سے یہ ظاہر
ہو رہا تھا کہ عورت اب بیہوش ہوئی فضا سے ہچکیوں میں جو "جھٹکے" پیدا ہو رہے تھے انہوں نے شام کے نرم دل کو اور بھی
نرما دیا اسکی اپنی موجودہ بے بسی پر آنکھوں میں آنسو بھر آئے مگر اس نے ان نادان رازداروں کو وہیں روک لیا اور آپ آگے بڑھا

"کیوں رو رہی ہے"

رونے والی نے سر اٹھایا ابر کا کانپتا ہوا ٹکڑا چاند پر آ گیا اور شام اس کی شکل اچھی طرح نہ دیکھ سکا وہ نزدیک ہو بیٹھا
اور چاند نکلنے کے انتظار میں بیڑی سلگائی . دیا سلائی کی روشنی میں اُسے ایسا معلوم ہوا کہ ایک بجلی سی اس کی نگاہوں میں کوند گئی
ابر چاند پر سے ہٹ چکا تھا لڑکی اپنے آنسو پونچھ لینے کے بعد خاموش بیٹھی تھی ۔

"تو کیوں رو رہی تھی" شام نے اس کے چہرے پر نگاہ ڈالتے ہوئے پوچھا"

"قسمت رلا رہی تھی"

"تو کہاں رہتی ہے"

"کہیں بھی نہیں"

"گام (گاؤں) کونسا ہے"

"ایشور جہاں بسا دے" شام جھنجھلا گیا "تو گھر سے بھاگ آئی ہے کہاں جائے گی ساتھی کہاں ہے" اس نے
مشکوک لہجے میں پوچھا۔

"میرا کوئی بھی نہیں ساتھی ہوتا تو روتی ہی کیوں"

"تیرا نام کیا ہے"

"تو کیا کرے گا"

"جو تو کرنا چاہتی ہے" اور شام کے ذہن میں ایک پرشباب ماحول رقص کرنے لگا۔ اس کی تمام تھکن دور ہوتی

"میں مرنا چاہتی ہوں"

"اور میں بھی"

"کیوں" لڑکی نے چونک کر پوچھا۔

"میرا بھی اس دنیا میں کوئی نہیں" شام کو حلق میں دکھ محسوس ہونے لگا الفاظ گلے میں اڑ گئے"

"ماں بھی" لڑکی نے پوچھا اور اس کی آنکھوں میں آنسو آ گئے۔

"ماں ہے پر میری نہیں"

"میری ماں نہیں میرا باپ دوسری کا ہے" اور وہ رونے لگی شام نے اسے تسلی دی۔ ان چند اکھڑی اکھڑی ہوئی باتوں نے ہی دونوں کو مانوس سا کر دیا شام نے کہا اب تو نام بتا دے میرا تیرا ایک ہی ٹھور ٹھکانہ معلوم ہوتا ہے"

"سونا" لڑکی نے جواب دیا۔

"میرا نام شام ہے سونا تو کہاں جا رہی تھی اب کہاں جائے گی"

"شام۔ ایشور جانے" سونا نے شام کے چہرے پر نگاہیں ڈالتے ہوئے کہا "میری ماں مر گئی باپ نے دوسری شادی کر لی اور اس نے میری کاٹ کرنی شروع کی عیب لگائے۔ پرسوں شام پنچایت میں میرے باپ کا حقہ پانی بند ہونے لگا تھا کہ اگر وہ مجھ جیسی "چھوری (لڑکی) کو گھر میں رکھے گا تو..... ماسی نے (سوتیلی ماں نے) باپ کو ایسی پٹی پڑھائی کہ مجھ سے چھوڑ غصے کی باتیں کرنے لگا میں بھیگی رات اٹھی اور نکل آئی شام اب میں سوچ رہی تھی کہاں جاؤں کہ تو نے مجھے رونے بھی نہ دیا"

"سونا رونے سے کچھ نہیں ہوتا۔ کام کرنے سے ہوتا ہے بیٹھے سے نہیں ہوتا اٹھ چلیں" "کہاں"

"جہاں دھرتی (زمین) ختم ہو جائے آکاش گود میں لے لے"

(۲)

جلھولی کے نمبردار نے رحم کھا کر شام کو اپنے ہاں رکھ لیا۔ سونا گھر کا کام کاج کرتی اور شام کھیتوں پر جاتا، رہٹ چلاتا، رکھوال کرتا۔ دو سال اسی کش مکش میں گزر گئے شام گاؤں سے مانوس ہو چکا تھا اور گاؤں والے اس کی خوش مزاجی کے مداح۔ نمبردار کے ہاں کی لڑکی بالیاں سونا کو بھابی پکارتیں انہیں امتیاز آقا و بندہ تھا ہی نہیں شام کو وہ بھائی کہتی تھیں لیکن شاما شام کا نام ہی لے کر پکارتی تھی رادھا اس کی ہم عمر تھی دونوں اکثر شام کے تذکرے ہی میں اپنی فرصت کے اوقات کاٹتی تھیں۔ سونا کو اتنی فرصت ہی نہ تھی کہ وہ ان میں بیٹھتی گھر کے کام کاج سے ہی اسے فرصت نہ تھی۔ صبح تاروں کی چھاؤں میں ڈھوروں (مویشیوں) کی سانی کرتی دونوں وقت کا اناج پیستی اور جب مویشی جنگل چلے جاتے گوبر سمیٹتی اور پتھواروں میں چلی جاتی، اپلے تھاپتی، تھوڑے بناتی اور دوپہر کو ہالیوں (کسانوں) کی روٹی لے کر کھیتوں پر پہنچتی۔ لیکن اس دو سال کے عرصے میں ایک بار بھی ایسا موقع نہ آیا کہ وہ اور شام اپنی موجودہ زندگی پر تبصرہ کر سکے ہوں۔ ایک مشین چلا دی گئی تھی جس کے کل پرزے اپنے مقررہ کام انجام دے رہے تھے۔

کھرسا (موسم گرما) کی کڑکتی دھوپوں میں دیہات میں مردنی سی چھا جاتی ہے وہ رونق وہ کیف جو دیہاتی زندگی کا جزو خیال کیا جاتا ہے ایک اجنبی کی نظروں میں قریب قریب بالکل مفقود ہو جاتا ہے۔ ہالی بھی ٹھنڈے ٹھنڈے ہل چلا لیتے ہیں اور پھر دوپہر یا تو کسی درخت کے سائے میں اور یا اگر کھیت بستی کے نزدیک ہوئے تو دو باریوں (بیٹھک) میں گزار دیتے ہیں۔ لوؤں کے تپتے ہوئے تھپیڑے اور گرم طمانچے یہ سخت جان دہقان بھی ناقابل برداشت سمجھتے ہیں۔

جیٹھ کی دوپہریں تو وہاں میں نظریں برداشت ہی نہیں کر سکتیں وہ سکوتِ تو یں بیابان و بستی پر کارفرما ہوتا ہے کہ الاماں۔ ایسی ہی ایک دوپہر تھی تھکی ہاری سونا منہ لپیٹے سونے کی ناکام کوششیں کر رہی تھی کہ شاما کے منہ سے شام کا نام سن کر اس کے کان کھڑے ہوئے اس نے اپنی خفیف سی حرکت پر بھی قابو پانے کی کوشش کی اور سانس بھی رُک رُک کر لینے لگی۔

"ایسا کٹھور سنگدل مرد بھی ہم نے نہیں دیکھا" رادھا نے شاما سے کہا "سونا بھی عجب ہے کبھی کوئی خیال ہی نہیں۔ جیسے غیر ہوں۔ اور شاما تو بھی پگلی ہوئی ہے پالا ہونے والا ہے اور تو پرانی رزائی بھاڑ جھاڑ ہونے کو پکارتی ہے کیسے مانوں رادھے جیسے آنکھ بھر کے بھی نہ دیکھا ہے تو یہی دھاوند دھار ہوں اور جس کی پوجا کرے اسے..... کچھ بھی نہ سمجھوں رادھے تو کیا کرتی"

"کچھ بھی نا سمجھنے کہنا یا انھا ٹوٹ گیا۔ کھو گیا"

"تو کیوں نہ کہتی میری طرح تو بھی چار بچوں کے باپ سے بیاہی جاتی تو پوچھتی کہ اب ناج کیا بھاڑ سے سیکھی؟"

"ابھی تو تو کہہ رہی تھی کہ آنکھ بھر کے بھی نہ دیکھا ہی بدھا بنا رہی کیا جیجا بوڑھا ہے۔" اور رادھے مسکرا دی ایک مگن تبسم اس کے چہرے پر رقصاں تھا

"مجھے کیا بیرا (علم)"

"پھر کیسے جانا"

"سنا ہی ہے رادھا" شاما نے ہلکی سی آہ کھینچتے ہوئے کہا۔ شام۔ رادھا۔ شام شام ہی ہے۔ چندری ملتی ہے۔ وہ اکیلا ہے دو۔ منکور ہے وہ سب شام ہی شام پکارتی ہیں"

"اور رادھا"

"وہ تو شام کی ہے" دونوں ہنس دیں۔

"چل ری اپنی بلا دوسرے کے سر منڈھتی ہے۔ میں تو اسے بھائی سمجھتی ہوں" سونا نے جس کے دل کی دھڑکنیں بہت تیز ہو چکی تھیں اطمینان کا سانس لیا اور کروٹ بدلی شاما چونک اٹھی۔

"چپ" اس نے رادھا سے کہا "سونا جاگ رہی ہو"

"سونا" رادھا نے آواز دی "سونا" شاما نے پکارا مگر سونا مزید سننے کے لیے خاموش پڑی رہی "بیچاری بہت تھکی ہے" رادھا نے کہا تم بہنوں نے جب سے یہ آئی ہے کام ہی کرنا چھوڑ دیا۔ چاچا جی نے اسے نوکر تو نہیں رکھا شام کو بیٹا بنایا ہے" آج کو منوہر ہوتا

کل انھوں نے باپو سے کہا تو وہ بھی شام کو بھائی کہہ کر بھی نہ سماتا سچ تو یہ ہے ایشور نے عمر دھونے کو شام مجھے دے دیا ہے سونا اس کی بہوٹر یا دیوی اپنے تو گھر کو سونا ہی بنا دیا سونا نے دل ہی میں نمبردار کو دیوتا کہا اور کان شاما کی آواز پر لگا دیئے۔

"رادھا آج میں شام کو کہہ ہی دوں گی"۔

"کیا"

"یہی کہ شام اگر یونہی ستانا ہے تو مار ڈالو کہ میری گتی ہو جا۔

"اور تجھے لاج نہ آئیگی" رادھا نے شاما سے پوچھا۔

"دیوتاؤں سے دان مانگنے میں لاج نہیں آتی" رادھا سونا کو کھری چارپائی کا ایک ایک بان سلگتے ہوئے انگاروں کی طرح محسوس ہونے لگا اس نے پھر کروٹ بدلی "سونا" رادھا نے پکارا جو دیر سے سونا کی مرتعش انگلیوں کو دیکھ رہی تھی سونا خاموش رہی "تو جگا دیگی" شاما نے جھنجھلا کر کہا "میری باتیں بری لگتی ہیں تو کہہ دے اپنی ویر دیار۔ دفعہ کسی کو نہ جگانے دیا"

"میں نے کونسی ایسی باتیں کی ہیں" رادھا نے سر کی ہوئی چندریا سنبھالتے ہوئے کہا۔ "او ہوری بھولی۔ شنکر کو بھول گئی"

"شاما سب ہی بھول کرتے ہیں جوانی میں بھول ہو ہی جاتی ہے"

"تو مجھے کیوں روکتی ہے۔ رادھا میں بھی جوان ہوں"

"ہاں ہے تو ہی مگر پاگل" شاما کچھ کہنا ہی چاہتی تھی کہ اس کی چھوٹی بہن روتی ہوئی آئی اور شاما کے دل کی دل ہی میں رہ گئی۔

تقاپا دوپہر سونا نے آگ پر گزاری۔ ابھی سائے ڈھلے ہی تھے کہ وہ گھڑے اٹھا پنگھٹ کو چل دی۔ شام ہل پر جا رہا تھا اس نے آواز دی۔ شام کو دیکھتے ہی سونا رونے لگی بیچارا گھبرا گیا۔

"کیا ہوا سونا"

"شام....." اور وہ کچھ کھوسی گئی "تم ہمارا دے کر چھوڑ دو گے"

"کس نے کہا" اور وہ کوئیں کی منڈیر پر بیٹھ گیا سونا اب بھی رو رہی تھی "کھویا ہوا تھا۔ اور پڑی ہوئی مایا۔ لے کر میں کہیں نہیں جاؤں گا یہاں چاچا جی نکما نہیں کہتے"۔ رادھا اور شاما بھی پانی لینے آئیں۔ سونا اور شام کو باتیں کرتا دیکھ کر شاما کے چہرے پر زردیاں کھنڈ گئیں اور مٹکا ہاتھ سے چھوٹ کر پاش پاش ہو گیا۔

"کیا ہوا بہن!" اور شام ہل ہانکتا ہوا چلا گیا۔

حاوی نقوی

(لاہور)

قیدی جن

(انقلابِ فرانس کا ایک واقعہ)

کاونٹ دی ترومان، فرانس کے زمینداروں میں ایک نہایت ممتاز خاندان کا نوجوان رئیس تھا، نپولین سے پہلے جب فرانس میں ملوکیت کے خلاف ہنگامے اور فسادات برپا ہوئے، امن و امان کا نام و نشان بھی نہ رہا، تو فرانس کے بہت سے شرفا ہجرت کرکے انگلستان آگئے، کاونٹ بھی بعض تارکینِ وطن کے ساتھ انگلستان پہونچا،

کاونٹ دی تروملان کا تعلق فرانس کی اس پارٹی سے تھا جو جمہوریت پسندوں کو شکست دے کر تختِ فرانس پر باربون کے خاندان میں سے کسی کو بٹھانا چاہتی تھی، معرکہ کیبرون میں جب بادشاہ پسندوں کو جمہوریت پسندوں کے ہاتھوں شکست فاش اٹھانی پڑی تو شکست خوردہ اسیروں میں کاونٹ دی تروملان بھی تھا، لیکن کسی طرح ان کے پنجوں سے نکل کر انگلستان کو فرار ہو گیا۔ اس طرح کاونٹ کو اپنا وطن ہی چھوڑنے پر مجبور نہ ہونا پڑا بلکہ اپنی حسین اور نوجوان بیوی سے بھی جدا ہونا پڑا جس سے شادی ہوکر ابھی بہت تھوڑے ہی دن گزرے تھے۔

کاونٹ لندن آگیا، اور لندن میں اس کے لئے حکومتِ انگلستان کی طرف سے تھوڑا سا وظیفہ بھی مقرر ہو گیا، اس زمانہ میں انگلستان اور فرانس کے درمیان ناچاقی تھی، اس لئے جو لوگ جمہوریت پسندوں سے چھوٹ کر انگلستان آجاتے تھے حکومتِ انگلستان ان کی تھوڑی بہت مدد کیا کرتی تھی،

فرانس کے ہنگامہ پروروں کی عدالت میں ہجرت "خیانتِ وطن" کا جرم تھا، جس کی سزا موت کے سوا کچھ نہ تھی، اس لئے کاونٹ کو معلوم تھا کہ اگر کسی طرح اس نے فرانس کی زمین پر قدم رکھا تو موت سے چھٹکارا ممکن نہیں، اسے ایسی حالت میں جمہوریت پسندوں سے نجات کی کوئی دور کی امید بھی نہیں ہوسکتی تھی، لیکن جلاوطنی اور بے کاری کی زندگی دنیا کے اولوالعزم انسانوں کے لئے ہمیشہ سوہانِ روح ہوتی ہے۔ اس لئے کیسے ممکن تھا کہ کاونٹ دی تروملان صبر و شکر کے ساتھ انگلستان میں زندگی بسر کرتا، کچھ ہی دنوں میں وہ انگلستان کی زندگی سے اکتا گیا، اور اس فکر میں رہنے لگا کہ کسی نہ کسی طرح فرانس چلا جائے یا کم از کم ایسی کوئی صورت نکل آئے کہ وہ فرانس کے سواحل کو ہی دیکھ سکے، اسی فکر میں تھا کہ اس کی ملاقات کپتان سر سڈنی اسمتھ سے ہو گئی اور آہستہ آہستہ دوستانہ تعلقات قائم ہو گئے۔

سر سڈنی اسمتھ امیر البحر نلسن کے بعد برطانوی بیڑے کا سب سے زیادہ مشہور کپتان تھا، فرانس کے جمہوریت پسند اس شخص کو دنیا میں اپنی تحریک کا سب سے بڑا دشمن، اور اپنے لئے سب سے زیادہ خطرناک آدمی سمجھتے تھے، اور واقعہ بھی یہی تھا کہ کپتان شمالی فرانس میں شاہ پسندوں کی سلاح ورسد سے ہمیشہ مدد کیا کرتا تھا، اور جب کبھی موقع مل جاتا، وہ اپنی کشتیوں کے ذریعہ وہاں سے مہاجرین کو ہالینڈ، بلجیم، اور انگلستان بھی پہونچا دیا کرتا تھا۔

شمالی فرانس میں شاہ پسندوں اور جمہوریت پسندوں کے مابین معرکہ قتال و حرب جاری تھا، سر سڈنی دور افتادہ شاہ پسندوں کے نامہ و پیام شاہ پسند قبائل کو پہنچانے کے علاوہ ان کی سامانِ جنگ سے مدد کرتا تھا، اور بارہا تو یہ ہوا کہ ان کو جنگ کے لئے آمادہ بھی اسی شخص نے کیا۔

سر سڈنی اپنے کام میں اس قدر ہوشیار تھا، اور اتنی جلد سمندر میں ایک جگہ سے دوسری جگہ منتقل ہو جاتا تھا کہ فرانسیسی بحریوں نے اس کا ان محیر العقول حرکتوں کی وجہ سے "عفریت البحر"

نام رکھ دیا تھا، جب کبھی فرانسیسی بیڑے سے اس کا مقابلہ ہوا، فرانسیسیوں کو ہمیشہ سخت نقصانات اٹھانے پڑے۔ اس لئے کچھ جاہل بحری سپاہی دل سے یقین کرنے لگے تھے کہ یہ انسانی شکل میں کوئی عفریت ہے۔

کاونٹ دی تروملان سے اس کی دوستی کو کچھ ہی دن ہوئے تھے کہ اس نے کاونٹ کو اپنے ساتھ جہاز میں رہنے کی دعوت دی، یہ واقعہ ۱۷۹۶ء کا ہے۔ اس وقت سر سڈنی ایک جہاز "ڈائمنڈ" کا افسر تھا، یہ جہاز برطانوی دوسرے بیڑوں کے ساتھ فرانس کے سواحل کے محاصرہ میں شریک تھا۔

کاونٹ دی تروملان نے لندن کی پر سکون زندگی پر، اس ہنگامہ پرور حیات کو ہزار درجہ ترجیح دی، اور سر سڈنی کے ساتھ "ڈائمنڈ" میں رہنے لگا، چھوٹی چھوٹی بحری جنگوں، ہنگاموں، اور آب و خون کی دلچسپیوں میں اس کا جی اچھی طرح لگتا تھا، ساحل دیپ سے لے کر آخری نارمن حصہ تک اس جہاز کی دوڑ ایسی چیز تھی جس میں کاونٹ کے دل بہلانے کا کافی سامان تھا۔ اسی لئے کاونٹ دل سے چاہتا تھا کہ یہ صورتِ حال طویل تر ہو جائے، لیکن دنیا میں کبھی ایسا ہوتا نہیں ہے، کسی حالت کو قرار نہیں، ایک دن چاندنی رات میں ایسا واقعہ پیش آیا کہ جس کا ابتدائی حصہ بہت ہی خوش آئند تھا، مگر آخری، بڑا ہی ہولناک اور خوفناک ثابت ہوا۔

سڈنی نے سوچا کہ آج کی رات اپنے دوست کو شاندار بہادری کا جدید کارنامہ دکھائے، اور اپنے جہاز ڈائمنڈ کو لے کر سواحل "ہافر" کی طرف چل دیا۔ اس ساحل پر فرانس کی پانچ چھوٹی چھوٹی کشتیاں حفاظت کے لئے لنگر انداز تھیں، راستہ میں اس کو ایک فرانسیسی جنگی کشتی ملی کیپٹن نے اس کشتی کا راستہ روک کر اپنے آدمیوں کو حکم دیا کہ کشتی کو لوٹ لیں ... ہو چکی اور سڈنی اپنے جہاز کو ساحل سے دور لے جانے کی کوشش کر رہا تھا، زور کی آندھی چلی اور ... "ڈائمنڈ" جنوب کی طرف کھنچ کر ... جا پڑا، فرانسیسی کشتیوں نے جہاز کو چاروں طرف سے ... اور آن کی آن میں "ڈائمنڈ" اور اس کا عفریت ... فرانس کا قیدی ہو گیا۔

سڈنی پر اس ناشدنی واقعہ کا جو بھی اثر پڑا ہو ... لیکن بہادرانہ طریقہ پر اس نے صورتِ حال پر ... غور کیا، اتفاقات کو برا کہنے اور دنیا کو گالیاں دینے ... اولوالعزم اشخاص وقت ضائع نہیں کیا کرتے ... بار بار سوچا مگر خلاصی کا کوئی راستہ نظر نہیں آیا ... معلوم تھا کہ اس کا اور اس کے ساتھیوں کا جو بھی حال ... ہو، بہرحال انجام ان کے لئے برا نہیں ہو سکتا، زیادہ ... زیادہ یہی ہو سکتا ہے کہ قید میں رہنا پڑے گا، اور ... جب جنگ ختم ہو جائے گی، جنگ کے خاتمہ ... اس کی رہائی یقینی ہے، ہاں اس کے دوست کاونٹ دی تروملان کا پوزیشن بڑا نازک ہے ... شاہ پسند، جنگجو، فراری اور گرفتار ہونا ہے ... جہاز پر اس کے لئے چوبیس گھنٹے کے اندر اندر ... سوا اور سزا بھی کیا ہو سکتی ہے، یہ تمام نقشہ کپتان کے ... تھا، اس نے اپنے کو چھوڑ کاونٹ کی رہائی پر غور کرنا شروع کیا، اور جب تک فرانسیسی جہاز کا جائزہ لے رہے تھے اس نے نہایت تیزی کے ساتھ اپنے ساتھیوں ... کیا اور جنگی انداز میں حکم دیا۔

" اس گھڑی سے کاونٹ دی تروملان میرا ...

اس ہے اور اس کا نام "جان بروملی" ہوگا"

ایک افسر نے کہا وہ تو ایک لفظ انگریزی کا نہیں جانتا۔
نے جواب دیا۔ ہاں وہ کینیڈا کا رہنے والا ہے، اور وہیں سے
میرے ساتھ ہوگیا ہے۔ مجھے بہت عزیز ہے اور میرا خاص
ملازم ہے"

اس اثنا میں فرانسیسی جہاز پر پوری طرح قبضہ حاصل
کر چکے، کپتان سرسڈنی نے اپنی تلوار فرانسیسی کپتان کے حوالہ کی،
اور اپنے بحری سرداروں کو نام بنام ایک ایک کرکے اس کے
سامنے پیش کرتا رہا، فرانسیسی افسر نے حکم دیا کہ جہاز "مال غنیمت"
اور قیدی جنگ کے قیدی قرار دئے جاتے ہیں۔ فوراً انگریزی
جھنڈا جہاز سے اتار دیا گیا اور جمہوریت فرانس کا علم لہرانے لگا۔

کاونٹ دی ترو ملان یعنی کپتان کا ملازم خاص جان بروملی
جسے ہم آئندہ جان بروملی کے نام سے یاد کریں گے، ان تماشوں
میں شریک نہ تھا، بلکہ اس نے نہایت تیزی کے ساتھ اپنے
نفیس کپڑے اتار کر خادموں کا لباس پہن لیا اور بحری افسروں
کے پیچھے نوکروں میں آکر کھڑا ہوگیا، اس نے دیکھا کہ فرانسیسیوں
نے خادموں سے کچھ دریافت نہیں کیا، یہ وہاں سے کپتان کے
کمرے میں آگیا اور کپتان کے کپڑے وغیرہ درست کرکے صندوق
میں رکھنے لگا اس کے سکون و اطمینان سے ایسا معلوم ہوتا
تھا کہ جیسے کچھ ہوا ہی نہیں، یا اگر کوئی واقعہ ہوا ہے تو اس سے
اس کو کوئی فائدہ یا نقصان پہونچنے کی امید نہیں ہوسکتی،

۱۹ اپریل ۱۷۹۶ء کی صبح بھی عجیب صبح تھی، جہاز کے
پکڑے جانے کی خبر راتوں رات پھیل گئی، بہت سویرے
شہر کے ساحلی حصہ کے چھجے، سڑکیں اور کھڑکیاں سب اس گرفتار
بھوت کو دیکھنے والوں سے بھری پڑی تھیں، لوگوں نے دیکھا کہ
جسے وہ بھوت سمجھے ہوئے تھے، وہ ایک انسان، بلکہ اس وقت
وہ بہت ہی بے دست و پا انسان تھا، لوگ مذاق اور طعن دونوں
ہی طرح کے بولے کس رہے تھے، گر سڈنی نہایت کشادہ پیشانی
کے ساتھ ہاتھ میں ہیٹ لئے، مسکراتا اور سلام کرتا ہوا گذر
رہا تھا، جب سڈنی ہوٹل میں پہونچا، جہاں اسے احکام کے
ورود تک قید رکھنا قرار پایا تھا تو اس نے نگہبانوں سے
ہنس کر کہا۔

اچھا ہوا اس طرح مجھے فرانس کو قریب سے دیکھنے کا موقع
مل گیا، تمنا کسی طرح پوری ہوئی، لیکن بہرحال پوری ہوئی۔
چار دن کے بعد حکام اعلیٰ کی طرف سے حکم نامہ آیا، کہ کپتان سرسڈنی
اور اس کے سکریٹری مسٹر رائٹ کو پیرس بھیج دیا جائے، اور
بقیہ قیدیوں کو تاحکم ثانی وہیں رکھا جائے، حکم کی تعمیل میں سرسڈنی
اور رائٹ کو ایک ڈاک گاڑی میں سوار کرادیا گیا، جان بروملی
بغیر کچھ کہے سنے کوچبان کے بازو میں جا بیٹھا، گویا آقا کے ساتھ نوکر
کا چلا جانا ایک طے شدہ امر ہے، افسروں میں سے بعض نے اسے
خلاف ورزی بھی، لیکن آخر میں یہ طے پایا کہ وفادار خادم کو آقا
کے ساتھ ہی رہنے دیا جائے، پیرس میں اس کے متعلق فیصلہ
ہوجائے گا۔

پہلی مئی کو یہ لوگ پیرس پہونچے اور "التامپل" کے قیدخانہ میں
داخل کردئے گئے۔

"التامپل" بڑے بڑے سیاسی قیدیوں کا زنداں ہونے کی وجہ
سے سارے یورپ میں مشہور تھا، ابھی کچھ ہی سال پہلے اس بد
نصیب بادشاہ لوئی شانزدہم اور اس کے خاندان قید رہ چکے
تھے، یہ قیدخانہ ایک بہت ہی مضبوط قلعہ تھا، جس کی آسمان سے
باتیں کرنے والی دیواریں، مضبوط و مستحکم برج، اور پہرہ داروں
کی کثیر جمعیت جو وہاں متعین تھی ظاہراً قیدیوں کا بہترین انتظام
معلوم ہوتی تھی، لیکن واقعہ یہ تھا کہ جمہوری انقلابات کے بعد جو

"مجلس ڈائرکٹرس" ملک پر حکومت کرنے کے لئے قایم کی گئی تھی
وہ دیانت دارانہ تھی، رشوتوں، سفارشوں اور شخصی مفاد کے لئے
خطرناک جرائم خود اعلیٰ عہدہ داروں میں اس قدر بے تکلفی
کے ساتھ موجود تھے کہ ملک کے تمام چھوٹے بڑے ادارے اس
مرض میں مبتلا ہو گئے، قید خانہ بھی اس سے مامون نہ تھا جتنی
زیادہ جمعیت حفاظت کے لئے متعین کی جاتی تھی، اتنے ہی زیادہ
مواقع قیدیوں کی فراری کے ہو جاتے تھے، کوئی نہ کوئی رشوت
لالچ میں مبتلا ہو کر قیدیوں کے لئے آلہ کار بن جاتا تھا، اس میں
کوئی شک نہیں کہ قلعہ "انامبل" کے آس پاس کی سڑکیں،
فوجوں، سپاہیوں، جاسوسوں اور خفیہ نویسوں سے بھری
رہتی تھیں، لیکن اس میں کوئی شبہ نہیں کہ گرد و نواح
کے اکثر مکانات شاہ پسندوں کے قبضہ میں تھے جو بھیس بدل کر
وہاں رہتے، اور طرح طرح کی سازشیں کرتے تھے، اکثر وہ
نہایت صفائی کے ساتھ قیدی کو نکال لے جاتے اور کسی کو
کانوں کان خبر بھی نہ ہوتی۔

سرسڈنی کو "انامبل" کے متعلق بہت کچھ سنی
سنائی باتیں معلوم تھیں، اس کو وہ بعض قصے بھی معلوم تھے
جو یہاں سے قیدیوں کی فراری کے متعلق دور دور ملکوں تک
پہونچ چکے تھے، اس لئے اسے کچھ زیادہ تعجب نہ ہوا جب کہ
اس نے پہلی ہی شب کو ایک تماشا دیکھا۔

جس برج میں یہ قید تھا اسی کے سامنے ایک عالی شان
مکان واقع تھا، اس مکان کی ایک کھڑکی میں سفید کپڑا لگا
ہوا تھا، اس کپڑے پر لیمپ کے ذریعہ رات کو روشن حروف
بنائے جاتے تھے، جس سے پوری عبارت بنتی تھی، نیچے کے
پہرہ دار اس کے سوا کچھ نہ دیکھ سکتے تھے کہ دریچہ سے روشنی
آرہی ہے، اور یہ کوئی شبہ کی بات نہ تھی، مگر برج کے اوپر
رہنے والے قیدی جو اس دریچہ کے اندر دیکھ سکتے تھے پور
عبارت پڑھ سکتے تھے۔

سرسڈنی کو معلوم ہوا کہ یہ طریقہ قیدیوں کو مخاطب کر
ہے۔ یہ مکان ایک عورت "دی لونواہ" نامی کا تھا، اور
طریقہ بھی اسی کی ایجاد تھا، یہ عورت شاہ پسندوں سے تعلق
تھی، اور اس مکان میں غالباً اسی غرض سے رہتی تھی کہ
مدد کر سکے۔

کپتان کو مذکورہ بالا طریقہ خطاب سے معلوم ہوا کہ "کاؤنٹ
دی تروطان" کو جب لندن سے اطلاع ملی کہ جہاز
گرفتار ہو گیا اور اس کا شوہر بھی قیدیوں میں شامل ہے
کاؤنٹس نے پیرس آکر اسی مکان کے قریب ایک مکان
رہنا شروع کیا، اور اسی فکر میں رہتی کہ کسی طرح اپنے شوہر
رہا کرائے۔

یہ ایک طبعی بات تھی کہ کاؤنٹ کی رہائی کے متعلق کاؤنٹس
اور "دی لونواہ" دونوں کو غیر معمولی فکر تھی، کیونکہ انھیں
تھا کہ اگر کاؤنٹ پہچان لیا گیا، تو اس کے لئے موت کے سوا کوئی
دوسری شکل نہیں ہو سکتی، اور اس کا ہر وقت خطرہ تھا کہ اس کو
کوئی شخص پہچان لے یا اسے دیکھ کر کوئی دوست اصلی نام سے
پکارے، یہاں کاؤنٹ کا یہ حال تھا کہ ایک ادنیٰ ملازم کی حیثیت
سے کپتان کے ساتھ رہتا تھا۔ اس پر کوئی پابندی نہ تھی۔

قید خانے کے افسروں کو اس پر بڑا رحم آتا تھا کہ اس نے
اپنے آقا کی وفاداری میں اپنے کو پھنسا رکھا ہے۔ انھیں یقین
تھا کہ یہ ایک احمق خدمت گار کو انگلستان اور فرانس کی جنگ
سے کوئی دور کا واسطہ بھی نہیں ہو سکتا، اس کی نہ تو پیرس
میں کسی سے جان پہچان ہے اور نہ اس کے پاس اتنا روپیہ
ہے کہ کوئی اہم کام انجام دے سکے، اس لئے اسے اجازت

بھی قلعہ میں جہاں چاہے آئے جائے، تھوڑے دنوں تک دیکھتے رہنے کے بعد جب انھیں معلوم ہو گیا، کہ یہ شخص صاف دل گرانی ہے تو انھوں نے اپنے فرائض اور قانون کے خلاف بھی رعایتیں شروع کیں، حتیٰ کہ اس کو پیسے دے کر بازار سے چیزیں منگوایا کرتے تھے، کاؤنٹ بھی خدمتگاری میں اس قدر چست بے عذر و وفاداری میں سچا اور باقاعدہ ثابت ہوا کہ کسی کو شبہ کی گنجائش نہ مل سکی، وہ شراب لاتا، نگہبانوں کو پلاتا اور میٹھا میٹھا بے وقوفوں کی طرح باتیں بناتا۔

خفیہ کے افراد نے ملازم کو جب باہر آتے جاتے دیکھا تو ابتداءً انھیں شبہ ضرور ہوا اور انھوں نے اس کا پیچھا بھی کیا، مگر جلد ہی انھیں معلوم ہو گیا، کہ راستہ میں کسی سے ملنا، باتیں کرنا یا کوئی ایسی حرکت کرنا جس سے شبہ پیدا ہو سکے اس ملازم کی عادت سے بعید ہے، اور تو اور انھوں نے بارہا دیکھا کہ ایک اجنبی عورت کے پاس وہ جیل خانے کے قریب ہی والے مکان میں جایا کرتا ہے، مگر وہاں سے نکلتے وقت جب کبھی اس کے چہرہ کا مقابلہ کیا تو ان کا یقین بڑھتا گیا، کہ یہ صرف دو گھڑی کو جیل کی کلفت مٹانے چلا جاتا ہے، کیونکہ اس کے بشرہ سے کوئی علامت بد ظاہر نہ ہوتی تھی، حالانکہ یہ عورت کاؤنٹس کے سوا کوئی دوسری نہ تھی جو اپنے شوہر اور کپتان کی رہائی کے لئے تدابیر سوچا کرتی تھی۔

خفیہ والوں نے اسے بارہا روکنا چاہا مگر یہ سوچ کر چپ ہو رہے کہ جب یہ خود جانا نہیں چاہتا اور کوئی برا ارادہ نہیں رکھتا تو سختی کا برتاؤ کر کے جیل کے محافظین سے کیوں بگاڑ لیں۔

ادھر کاؤنٹس بڑے بڑے نامی شاہ پسندوں کی مدد سے جن کے سروں کے لئے حکومت نے گراں بہا انعامات مقرر کر رکھے تھے، اس کی رہائی کے لئے تدابیر اختیار کرتی رہی۔

یہ بات اب کوئی راز نہ تھی کہ ناپل کے اردگرد جو مکانات ہیں وہ شاہ پسندوں کے مسکن اور ان کی ریشہ دوانیوں کے مرکز ہیں، اور ایک مدت سے ان لوگوں نے چونکہ ان مکانات کو اپنا مرکز بنا رکھا تھا اس لئے اس زمین میں چھوٹی چھوٹی سرنگیں بھی پائی جاتی تھیں، تروملان کے بعض دوستوں نے کاؤنٹس کو ایک مکان کا پتہ بتایا، کاؤنٹس نے اسے فوراً کرایہ پر لے لیا، بڑی محنت سے اس نے سرنگ کے چند دہانے کا پتہ چلا لیا، اب کام صرف اس قدر باقی رہ گیا تھا کہ ان میں سے مٹی نکال کر اسے صاف اور وسیع کر لیا جائے، اور تقریباً [illegible] مزید کھود کر جیل خانے کے اس کمرہ تک پہنچ دیا جائے جہاں کپتان اور کاؤنٹ کو باہر [illegible] شاہ پسندوں کی مدد سے [illegible] باقی رہ گئی [illegible] بعد [illegible] تروملان اس راستہ سے مکان تک [illegible] وہاں سے چھپ کر کسی ساحل پر جا پہنچے، اس کے بعد [illegible] کو روانگی کوئی بڑی بات نہ تھی۔

طے پایا تھا کہ رات کی تاریکیوں میں یہ آخری کام انجام پائے چنانچہ ٹھیک وقت پر کاؤنٹس کے معاونین آ پہنچے۔ اور کام شروع ہوا، لیکن نادانوں نے نقب کے آخری سرے کی توسیع کے لئے بے ضرورت اور احمقانہ سعی کی، جس کا نتیجہ یہ ہوا کہ ایک زور کا دھماکہ ہوا اور فرش جیل خانہ سے اینٹیں اور چونے کی بڑی مقدار گر پڑی، اس دھماکہ کو دوسرے قیدیوں اور محافظین دونوں نے سنا۔

شاذ و نادر سپاہیوں کی ایک بڑی جماعت وہاں آ گئی [illegible] لیکن

کسی کی سمجھ میں یہ نہ آسکا کہ ساری جدوجہد اتنے قیدیوں
میں کس قیدی کی رہائی کے لئے کی گئی تھی، کیونکہ خوش قسمتی
سے اس جگہ کوئی قیدی موجود نہ تھا، ادھر کاؤنٹس نے
جو ناکامی دیکھی اپنی اور اپنے مددگاروں کی جان بچاکر
نکل گئی، سپاہیوں کو اس سرنگ کا دوسرا سرا معلوم
کرنے میں کچھ وقت صرف ہوا، اور جب تک اس گھر تک
سپاہی پہونچیں، وہاں کوئی نشان ان کا باقی نہ تھا۔

اس واقعہ کی خبر ارباب اقتدار کو پہونچائی گئی۔
تحقیقات کا کوئی دقیقہ اٹھا نہ رکھا گیا، مگر یہ راز نہ کھل
سکا کہ معاملہ کیا تھا، اور کس قیدی کو رہا کرنے کے لئے یہ تدبیر
اختیار کی گئی تھی، لیکن کپتان اور اس کے خادم کی طرف اب
ذرا شبہ کی نظر سے دیکھا جانے لگا، اور جیل کے مہتمم کو احکام
دئے گئے کہ انگریزی قیدی کی نگرانی شدت سے کی جائے۔
نیز یہ کہ اس کے نوکر کو الگ کرکے انگلستان بھیج دیا جائے،
کیونکہ کپتان کے پاس اس کے رکھنے میں کوئی فائدہ نہیں۔

تامبل کے رہنے والوں میں شاید ہی کوئی ہو جس کو
اس حکم سے تکلیف نہ ہوئی ہو بلکہ خود نگرانوں کو بھی افسوس
تھا کہ ایک اچھا دوست ہاتھ سے جاتا رہے گا مگر کیا کیا جا سکتا
تھا احکام کی تعمیل ہوئی، اور ایک چھوٹی سی سرکاری گاڑی
چند سپاہیوں کی حراست میں خادم کو لینے آگئی، کاؤنٹ
ایک ایک سے بڑے حزن و ملال کے ساتھ رخصت ہوا۔
خاص کر وہ منظر بڑا ہی دردناک تھا، جب کہ وفادار خادم
جان بروملی اپنے آقا کپتان سڈنی سے رخصت ہو رہا تھا
غریب خادم کی آنکھوں سے آنسوؤں کے دریا ابلے آتے
تھے، اور وہ آقا کے ہاتھوں کو بوسہ دے رہا تھا، آنکھیں
کہہ رہی تھیں کہ میں آپ کی رہائی کے لئے جان تک کی بازی
لگا دینے سے دریغ نہ کروں گا، یہاں تک کہ اس نے سار
مجمع کے سامنے ہی کہہ دیا کہ میں آپ کے لئے انگلستان
کچھ کروں گا، سپاہی اس منظر سے بہت متاثر ہو
آنسو پونچھنے اور دلاسا دینے لگے، خود کپتان بھی بے حد
ہوا اور اپنی تھیلی میں سے وہ ساری رقم جو بچ رہی تھی
حوالہ کردی، ایک صداقت نامہ حسن خدمت کا لکھ کر اس
حوالہ کیا، چلتے وقت تک کپتان اس سے اپنے گھر وا
سلام و پیام پہونچانے کے لئے کہتا رہا، اور یہ بھی کہا کہ میں
تمہاری سفارش کرکے کسی اچھے انگریزی گھرانے میں نوکری دلا
جان بروملی کا پیرس سے ساحل "ونگرک" تک سفر بھی اپنی نوعیت کا
سفر تھا، فرانس میں بدامنی شروع ہونے کے بعد پہلا اتفاق تھا کہ
دی تروملان، جمہوریت پسندوں کا سب سے بڑا دشمن
مشہور سازشی شاہ پسند جس کے سر کے لئے حکومت کی جانب
گرانقدر انعامات کا بار بار اعلان کیا جا رہا تھا، سرکاری گا
میں سوار، پولیس کی جمعیت کے ساتھ کھلے خزانے دن کے
اپنی جان کی طرف سے مامون اور مطمئن سفر کر رہا تھا، یہ وہی
جلا وطن تھا، جو فرانس میں داخل نہیں ہو سکتا تھا، یہ وہی دشمن
حکومت تھا جو راتوں کو اور جنگلوں میں چل چل کر فرانس سے
اپنی جان سلامت لے جا سکتا تھا، آج سرکاری سپاہی اس کی
جان کی حفاظت اور راحت کا سامان کر رہے ہیں، تاکہ بخیر و
خوبی اسے انگلستان پہونچا دیا جائے تقدیر کی ستم ظریفیاں بھی
عجیب ہوتی ہیں۔

جان بروملی نے اپنے محافظین کو شکریہ کے ساتھ گودی پر رخصت
کیا، اور جہاز پر چڑھ گیا، جہاز انگلستان کے لئے لنگر اٹھا دیا،
اور جان بروملی عرشہ جہاز سے محافظین کو رومال کے اشارے
کر رہا تھا، اور ہنس رہا تھا، وہ ہنسی جس کا سبب

کوئی دوسرا نہیں جانتا تھا، لیجیئے جہاز وہ نکل گیا، اور جان بردلی اپنے کمرہ میں آکر بیٹھا، اب اسے بڑے زور کی ہنسی آئی اور خوب قہقہہ مار کر ہنسا، اب جمہوریت فرانس اس کا کچھ نہیں بگاڑ سکتی تھی، وہ فرانس میں رہا اور جمہوریت پسندوں کی آنکھوں میں خاک جھونک کر صاف نکل آیا، لیکن کاونٹ دی تروملان کیا بہادر اپنی جان بچ جانے کو غنیمت جان کر چپ بیٹھ سکتا تھا؟ کیا اس کی غیرت یہ گوارا کرسکتی تھی، کہ اس کا رفیق کپتان "تاہیل" میں قیدی کی حیثیت سے دن گزارے اور وہ انگلستان میں رنگ رلیاں اڑاتا رہے؟ وہ ابھی موت کے منہ سے نکلا تھا، لیکن اس نے دل سے عہد کرلیا تھا، کہ وہ کپتان کو ضرور رہا کرے گا، وہ انگلستان سے پھر فرانس چلا آیا، اور نئے نام سے اپنی بیوی کے ساتھ رہنے لگا۔

اسی سلسلہ میں سب سے دلچسپ بات یہ تھی، کہ فرانس خانہ کایان میں کاونٹ دی تروملان فرضی نام کے ساتھ زندگی بسر کر رہا ہے، ادہر حکومت پیرس کے پاس انگلستان سے جان بردلی کپتان سڈنی کے ملازم کے متعلق اطلاعات پہونچ رہی ہیں، فرانس کی باخبر حکومت ملازم کو روانہ کرنے کے بعد بے خبر نہیں ہے، وہ ہمیشہ جان بردلی کے متعلق اطلاعات حاصل کر رہی ہے، اور جب اسے معلوم ہوجاتا ہے کہ جان بردلی نے ایک انگریز خاندان میں ملازمت کرلی ہے اور لندن میں خانہ زندگی بسر کر رہا ہے تو اسے اس ملازم کی طرف سے بالکل اطمینان ہوجاتا ہے۔

کپتان سڈنی کو معلوم تھا کہ اس کے نام آنے والے تمام خطوط کھول کر دیکھ لئے جاتے ہیں اس لئے وہ احباب واعزہ کو جان بردلی کے ساتھ اچھے برتاؤ اور کسی دوسری جگہ سفارش کے لئے لکھا کرتا تھا، ادہر اس کے احباب واعزہ جان بردلی کی خیریت اور احوال لکھا کرتے تھے ایک مرتبہ اس کے بھائی نے لکھا کہ جان بردلی کنیڈا (یعنی اپنے گھر) گیا ہے۔ حکومت فرانس ان اطلاعات سے مطمئن تھی کہ مسکین ملازم جان بردلی کسی شک وشبہ کی نظر سے دیکھے جانے کے قابل نہیں اور واقعہ یہ تھا کہ کاونٹ اپنی چہیتی بیوی کے ساتھ فرانس میں بیٹھا کپتان کی رہائی کے لئے تدابیر سوچ رہا تھا۔

کایان میں کاونٹ کی اقامت کو ابھی تھوڑے ہی دن ہوئے تھے کہ ہیڈ دی نوفیل، فلیبو، اور بوجیرار کے جیسے خطرناک سازشی اور انتہا پسند شاہ پرستوں کی جماعت اس کے گرد اکٹھا ہوگئی، اور یہ تدبیر سوچی جانے لگی کہ کپتان سر سڈنی کو قید خانے سے کیسے رہا کیا جائے، طرح طرح کی تجاویز پر غور کیا گیا، یہاں تک کہ ایک ایسی تجویز پر اتفاق ہوا، جو بلا کی چابکدستی اور عظیم الشان جرأت چاہتی تھی، اس تدبیر میں ضرورت تھی کہ وزیر پولیس کے دفتر سے "اشد ضروری" کا چھپا ہوا فارم اڑایا جائے، اور اس پر وزیر کی خصوصی مہر بھی لگائی جائے، پھر کپتان کو دوسرے قید خانے میں منتقل کرنے کا فوری حکم لکھ کر وزیر کی جعلی دستخط کردی جائے، اب رہا سرکاری گاڑی کا مسئلہ جو قیدی کو منتقل کرنے میں کام آتی ہے، جب یہ سب کچھ ہوجائے گا تو وہ کچھ زیادہ مشکل نہیں۔

اتفاق سے اس تدبیر کی دقتوں پر قابو پانے کی جد وجہد میں ان کو ایک غیر ملکی جاسوس سے ملاقات کا موقع مل گیا، جو حکومت کی طرف سے یہاں متعین تھا، اس عیار کا نام ونیسکو فنٹس تھا، یہ شخص ادارۂ امن عامہ میں ملازم تھا، اور ایک دوسری حکومت سے جاسوسی کے لئے تنخواہ پاتا تھا، ایک گراں بہا رقم کے بعد وہ اس پر راضی ہوا کہ وہ "اشد ضروری" والا کاغذ جسے پولیس کی اصطلاح میں

"مہر بر سفید" کہتے ہیں۔ وزیر اس پر مہر کر کے اپنے انتہائی اہم ضروری احکام جاری کرتا ہے، کسی نہ کسی طرح بچہ اکبر ان کو لادے گا۔

۱۳ اپریل ۱۷۹۶ء کی شام کے وقت ایک شاندار گاڑی "ٹامپل" کے دروازے پر رکی، کوچبان کے بازو میں اونچی ٹوپی پہنے ہوئے پولیس کی وردی میں ایک شخص بیٹھا تھا، اس نے ٹوپی اور رومال سے اپنا چہرہ ایسا نیم پوشیدہ کر رکھا ہے کہ پہچانا نہیں جاتا، گاڑی سے دو امین پولیس اترے اور بہت شان سے ٹامپل کے دروازہ میں داخل ہوئے، ایک زریں لباس افسر گاڑی کے پاس کھڑا ہے، یہ شخص کوئی ذمہ دار افسر معلوم ہوتا ہے، لیکن یہ کاؤنٹ ڈی تروملان کے علاوہ اور کون ہو سکتا ہے۔

دونوں امین جیل کے مہتمم کے پاس گئے اور اسے حکم نامہ حوالے کیا، اس حکم نامے میں مرقوم تھا کہ حامل حکم نامہ کی نگرانی میں آج راتوں رات سرسڈنی اسمتھ انگریزی کپتان کو ٹمپلو کے جیل خانے میں منتقل کر دیا جائے۔ داروغہ جیل نے حکم نامہ کو غور سے دیکھا، مہر و دستخط پر نگاہ کی، اس کے بعد دونوں امینوں کے چہرے کو غور سے دیکھا، جب یقین ہو گیا تو اس نے روزنامچہ جیل نکالا، اس حکم کا اندراج کیا، اور قیدی کی سپردگی کے احکام جاری کر دئے۔

کپتان لایا گیا، اس نے اپنے اسباب کے متعلق کچھ ہدایات دیں، اور چلنے کو تیار ہو گیا، دونوں امینوں میں سے ایک نے داروغہ جیل سے درخواست کی کہ کچھ تھوڑے سپاہی گاڑی کے ساتھ حفاظت کے لئے روانہ کئے جائیں، افسر نے اکراہ سے انتظامات کرتے ہوئے کہا کہ ہمیں خفیہ طور پر قیدی کو وہاں پہونچانے کا حکم ہے، سپاہی ساتھ چلنے ہوں گے تو ساری دنیا اسی کو غور سے دیکھے گی، اس کے بعد امین نے کپتان کو گھور کر دیکھا، اور بولا،

تم فوجی ہو؟

کپتان، بلاشبہ،

امین، دیکھو فوجیوں میں عزت کی قسم سب سے بڑی قسم ہے، جو توڑی نہیں جا سکتی،

کپتان، ہاں اس میں کیا شک ہے؟

امین، کیا تم اپنی عزت کی قسم کھا سکتے ہو، ہمیں دھوکا دے کر نہیں بھاگو گے، تاکہ ہم پہرہ داروں سے بے نیاز ہو جائیں۔

کپتان، دونوں ہاتھ اٹھا کر میں اپنی عزت کی قسم کھا کر کہتا ہوں کہ تم جہاں لے جاؤ گے میں بے چون و چرا چلا جاؤں گا اور تمھارے احکام کی پابندی کروں گا۔

امین، بس کافی ہے،

جیل کا دروازہ کھلا، اور کپتان دونوں امینوں کی حفاظت میں گاڑی میں جا بیٹھا، گاڑی چلی اور اس زور سے چلی، کہ جیسے زمین کی طنابیں کھنچ گئی ہوں۔ کچھ دور نکلے تھے کہ ایک ایسا واقعہ پیش آیا، جو کسی کے وہم و گمان میں بھی نہ تھا، گھوڑا یکلخت بھاگتا ہوا ایک میوہ فروش کی دوکان سے ٹکرا گیا، دوکاندار چیخنے اور چلانے لگا، ایک ہنگامہ ہو گیا اور بہت سے لوگ اکٹھا ہو گئے۔

اس ہنگامہ میں لوگوں نے دیکھا کہ کوچبان کے پاس جو شخص بیٹھا تھا، اس نے اتر کر اندر کے لوگوں سے کچھ کہا، تینوں اشخاص سرکاری وردی میں اترے اور جلد ہی

گلیوں میں ہو لئے، رات کا زمانہ تھا جدھر جس کا منہ اٹھ گیا چھپتا چھپاتا نکل گیا، ایک شاہ پسند کے گھر میں کاونٹ دی تروملان اور کپتان نے پناہ لی، اور صبح علی الصباح کسانوں کے لباس میں غیر معروف راستہ سے شہر والوں کی راہ لی، اور وہاں سے نیپہ کی معیت میں جو دوسرے راستہ سے وہاں پہونچ گیا تھا، انگلستان کو روانہ ہو گیا، کاونٹ دی تروملان کا بان میں اپنے گھر واپس آ گیا، جہاں اس کی بیوی شدید بے چینی سے اس کا انتظار کر رہی تھی، بقیہ دو شریک کار بورگ اور بوزجیرار دوسری سازشوں کے لئے پیرس ہی میں رہ گئے، یہ دونوں روزانہ اخباروں میں سرسڈنی کی فراری، یا گرفتاری کی خبر تلاش کرتے رہے، تین چار روز تک جب اس قسم کی کوئی خبر شایع نہ ہوئی، تو انھیں بڑی حیرت ہوئی، اور مامن سے نکل کر کچھ پتہ چلانے لگے، انھوں نے تامبل کے پاس جا کر دیکھا وہاں کوئی نئی بات معلوم نہ ہوئی تھی، روزانہ کی سی معمولی صورت حال تھی، اس کے بعد انھوں نے اس گاڑی کی خبر لگائی تو معلوم ہوا کہ لوگوں نے کوچبان کو پولیس میں پہونچا دیا تھا، مگر پولیس نے یہ عذر قبول کر لیا، کہ گھوڑے اس کے قابو سے باہر ہو گئے تھے، دکان دار کو کچھ تاوان دے دلا کر معاملہ ختم کر دیا۔

گاڑی والے سے جب سواریوں کے متعلق دریافت کیا گیا تو معلوم ہوا راستہ سے کرایہ کیا تھا، ان کے متعلق گاڑی والا کچھ نہیں جانتا، باعزت لوگ تھے، پولیس کے جھمیلوں سے بچنے کے لئے اتر کر اپنے گھر چلے گئے، پولیس کی سمجھ میں یہ بات آ گئی اور گاڑی کا معاملہ رفت و گذشت کر دیا گیا۔

سب سے عجیب بات تو یہ تھی کہ حکام بالا کو بھی عشرہ تک کپتان سرسڈنی اسمتھ کی فراری کے متعلق کوئی اطلاع نہ ملی، اور ملتی بھی تو کیسے جیل خانہ سے قیدی تو قانونی احکام کے تحت باہر ہوا، مہتمم کو اس کی رپورٹ دینے کی کوئی وجہ نہ تھی، اور نہ حکام بالا، یا کوتوالی کو کسی اور ذریعہ سے اطلاع ملی، جو تلاش یا تحقیق شروع ہوتی، معاملہ یہ معاملہ کب تک چھپا رہتا، لیکن وزیر پولیس نے ڈاکٹر انچارج تامبل کو کھانے پر بلایا، اور باتوں باتوں میں اس سے کپتان سڈنی کا حال پوچھنے لگا، ڈاکٹر نے جواب میں کہا جب سے کپتان کو ٹمپلو میں منتقل کر دیا گیا ہے اسے کچھ نہیں معلوم، اب وزیر کے کان کھڑے ہوئے اور ساحلوں پر ہر جگہ تلاش شروع ہوئی لیکن اب کیا ہو سکتا تھا جب کہ قیدی کئی دن پہلے انگلستان پہونچ چکا تھا۔

کاونٹ دی تروملان نو سال تک فرضی نام سے گمنامی کی زندگی بسر کرتا رہا، جب جنرل بونا پارٹ نے امپرر نپولین کے نام سے اپنی شہنشاہیت کا اعلان کیا اور تمام پچھلے شاہ پسندوں کی معافی کا حکم جاری ہوا تو کاونٹ دی تروملان بھی پیرس میں آ کر رہنے لگا، ایک دن پولیس نے اس کو کسی شعبہ میں پھانس کر کوتوال کے پاس پیش کیا، وہاں کاونٹ نے بلا تکلف اپنی شخصیت واضح کر دی، وزیر پولیس نے طلب کیا، اور یہ قصہ نپولین تک جا پہونچا۔ نپولین نے بلا کر اس سے پوری داستان سنی۔ اور اپنے یہاں فوج میں جگہ دیدی۔

واٹرلو کے تاریخی میدان میں جو آخری شخص دشمنوں کے مقابلہ میں سینہ سپر تھا وہ کاونٹ دی تروملان تھا، وہ پکا شاہ پسند، اور غیر مل سازشی۔ (ترجمہ)

حفیظ جیلانی ام اے ال

روحی

"تو بہ تمہیں کیسے یقین دلاؤں" وہ کہنے لگتا "میں نے نہ تو میری ایک لڑکی سے ملاقات ہے۔ لیکن اس کا مطلب [illegible]
بریا اس سے محبت کرنے لگا ہوں۔ اور جو کچھ لکھتا ہوں وہ اپنی ہی داستان ہوتی ہے۔"

وہ افسانہ نویس تھا۔ اس کے افسانے کافی مقبولیت حاصل کرتے جا رہے تھے۔ اس کی خانگی زندگی بڑی [illegible]
[illegible] خاندان کا فرد، تعلیم حاصل کرنے کا شوق، اعلیٰ تعلیم کے اخراجات نے اسے مقروض بنا دیا تھا۔ حصول معاش [illegible]
[illegible] اٹھانی پڑتی تھیں۔ لیکن اس کے باوجود وہ ایک خوش اخلاق اور ہنس مکھ نوجوان تھا۔ مطالعہ کا [illegible]
[illegible] مطابق وہ فطرتاً افسانہ نویس پیدا ہوا تھا اور اس کے اس ذوق پر کوئی چیز اثر انداز نہ ہو سکی۔

اس کے پڑوس کے خالی مکان میں ایک خاندان فروکش ہوا۔ متمول لوگ تھے۔ مگر ایسے نہیں کہ غریبوں سے نفرت [illegible]
[illegible] بحیثیت افسانہ نویس تعارف ہوا۔ آمد و رفت کا سلسلہ شروع ہوا اور چند دنوں میں خاصی بے تکلفی پیدا ہو گئی
یوں روحی سے اس کی ملاقات ہوئی۔ روحی کوئی بارہ تیرہ سال کی ہوگی۔ طبیعت میں الھڑپن، گفتگو میں معصومیت، بھولی
بھالی سی۔

اب اس کے افسانوں کا ایک نیا باب کھل گیا۔ کبھی سلمہ سے خطاب شائع ہو رہا ہے تو کبھی دوست کے روپ میں
حالات سنائے جا رہے ہیں۔

"سلمہ جب ساری دنیا سوتی ہوتی ہے۔ فضا پر چاند حکومت کرتا ہے۔ زمین اور آسمان، درخت اور پہاڑ، جنگل اور [illegible]
جھونپڑے درِ محلِ نور کے دریا میں غوطہ زن ہوتے ہیں۔ ندی اور آبشار پگھلی ہوئی چاندی کے معلوم ہوتے ہیں۔ جب درخت ان
مناظر کا لطف اٹھاتے اور وجد کرنے لگتے ہیں۔ اس وقت میں تمہاری یاد میں آنسو بہایا کرتا ہوں۔
لیکن سلمہ —— تمہارے دل کی دھڑکنوں میں بھی میرے لئے کوئی جگہ ہے؟ ——"
ہر دیکھنے والا جو حالات سے واقف ہو آسانی سے اندازہ لگا سکتا تھا کہ حضرت کی اپنی ہی سرگذشت ہے مگر اس خدا کے
بندے نے ہمیشہ انکار ہی کیا۔

"لیکن تمہارا نیا افسانہ میں نے دیکھا۔ حالات میں اتنی مطابقت۔ چھپائے سے باتیں چھپ نہیں سکتیں۔ تم چاہے اقرار
کرو یا انکار تمہیں روحی سے محبت ضرور ہو گئی ہے ——" میں اس سے بحث کرتا۔
وہ جواب دیتا "مد بھئی افسانے کے لئے پلاٹ چاہیئے۔ کہیں سے کوئی کام کی بات ہاتھ لگی اور ہم نے اس پر ایک افسانہ
لکھ ڈالا۔ اب اگر آپ ہر افسانہ کو لکھنے والے کی آپ بیتی اور شعر کو شاعر کے حقیقی واقعات کی تصویر سمجھنے لگیں تو سخت مصیبت
آن پڑے گی۔"
لیکن مجھے اس سے کبھی تشفی نہ ہو سکی۔ چہرہ کی پژمردگی، طبیعت کی افسردگی، ہر وقت کا غور و فکر، آخر یہ سب کیا تھی

رکھتے تھے۔ صبح صبح اس کی آنکھوں کا سرخ رہنا آخر کس چیز کو ظاہر کرتا تھا۔ کیا سے روحی سے واقعی محبت نہیں ہو گئی تھی؟ کیا وہ مادی قہقہوں کے پردے میں اپنے جذبات کو چھپانے کی کوشش میں کئی بار ناکام نہ ہو چکا تھا؟ کیا اس کی سرخ آنکھیں نہیں بتاتی تھیں کہ اس نے رات تارے گن گن کر گذاری ہے؟

افسانے پر افسانے شایع ہو رہے تھے۔ بار بار وہ سلمہ سے خطاب کیے جا رہا تھا۔ میں یہ سمجھتا تھا کہ یہ تمام اس کے وہ جذبات ہیں جنھیں وہ افسانوں اور خطاب کی شکل میں روحی تک پہنچا دینا چاہتا تھا۔

مگر اس کا انکار برابر جاری تھا۔ اور میں جانتا ہوں کہ کبھی روحی کے سامنے معصومانہ مذاق اور سادی سیدھی باتوں کے سوا اس نے اپنے جذبات کو ذرا بھی ظاہر نہ ہونے دیا۔

روحی جوان ہو گئی اور اس کی نظروں سے پوشیدہ۔ اب وہ پردہ کرنے لگی تھی۔ پھر سلمہ سے ایک خطاب شایع ہوا۔ "آہ سلمہ دنیا مجھے تم سے جدا کرنے پر تلی ہوئی ہے۔ تم میری نظروں سے دور کر دی گئیں لیکن میرے دل سے تمھیں کوئی دور نہ کر سکے گا"

روحی کی شادی مقرر ہو گئی۔ ایک نہایت معزز اور دولت مند خاندان میں وہ بیاہی جا رہی تھی۔ اور ادھر اس کی حالت ابتر ہو گئی۔ پھر سلمہ سے اس نے اقرار کیا کہ "سلمہ شمع کی طرح گھلتا ہی رہوں گا اور اپنی زبان کو خاموش بھی رکھوں گا۔ اس موتی کی طرح جو صدف کے سینے میں بند رہ کر سمندر کی تاریک گہرائیوں میں دنیا کی نظروں سے پوشیدہ رہتا ہے میری محبت بھی میرے دل میں پوشیدہ رہے گی۔ اور دنیا کبھی اس کا حال نہ جان سکے گی۔"

اس کے چہرہ کی پژمردگی میں اضافہ ہو گیا۔ اس کی خاموشی ہمیشہ سے زیادہ ہو گئی۔ صبح ایسے معلوم ہوتا تھا کہ جیسے رات اس نے صرف تارے گن گن کر بلکہ رو رو کر گذاری ہے۔ آنکھیں سوجھنے لگی تھیں۔ روز بروز اس کی حالت بگڑتی جا رہی تھی مجھ سے رہا نہ گیا۔

"آخر تمھیں یہ ہو کیا گیا ہے۔ میں جانتا ہوں تمھیں روحی سے محبت ہے" میں نے اس سے کہا "لیکن تم اسے چھپا رہے ہو۔ محبت کرنا جرم نہیں، گناہ نہیں، انسان ہو، انسان ہی محبت کرتے ہیں۔ مگر تم اسے چھپانا کیوں چاہتے ہو۔ کہو تو میں تمھاری ان سے کوشش کرتا ہوں۔ یہ ناممکن نہیں ہے کہ روحی تم سے بیاہ دی جائے۔ اب بھی وقت نہیں گیا ہے"

"دیوانے ہوئے ہو" وہ مسکرانے کی کوشش کرتے ہوئے کہنے لگا "کیسی محبت، کہاں کا عشق، آخر تم کو یہ کیا خبط ہو گیا ہے۔ تمھیں یہ یقین کیسے ہو گیا ہے کہ میں روحی پر عاشق ہو چکا ہوں۔ میں غریب بھلا اس کے قابل کہاں؟"

میں حیران کہ اللہ معمہ کیا ہے۔ مجھے یقین کہ یہ شخص روحی کو چاہتا ہے اور اسے اس سے انکار۔

دن گذرتے گئے۔ روحی کی شادی کی تاریخ مقرر ہو گئی۔ اور ادھر اس کی افسردگی میں اور اضافہ ہوتا گیا۔ آخر شادی کی تاریخ آ گئی۔ وہ بھی انتظامات میں مصروف رہا۔ بارات دلہن کو لے کر واپس ہو گئی۔ اس کے بعد دو دن تک کسی نے اس کو دیکھا۔ تیسرے دن جب میں اس کے مکان پر ملا ہوں تو میری آنکھیں پھٹی کی پھٹی رہ گئیں۔ اس کی صورت پر دس برس بیت گئی۔ چہرہ ستا ہوا۔ آنکھیں اندر دھنسی ہوئیں۔ پلکیں اب تک آنسوؤں سے بھیگی ہوئی تھیں۔ حالت یہ کہ جیسے ایک مردہ کو

[illegible] سامنے کھڑا کر دیا گیا ہو۔

[illegible] بھی وہ افسانے لکھتا ہے۔ درد و غم میں ڈوبے ہوئے۔ ہجر و فراق کی [illegible] بیان کرتا ہے۔ سلمیٰ سے چھوٹے جانے پر [illegible] ہے۔ درد انگیز الفاظ میں اپنی الم ناک زندگی کا نقشہ کھینچتا ہے "سلمیٰ ہم ایک دوسرے سے جدا کر دئے گئے۔ اب ہم دور ہو چکے ہیں اتنی دور کہ شاید اب قیامت تک ایک دوسرے سے نہ مل سکیں۔ تم شاید مجھے بھول جاؤ لیکن میں تمھیں [illegible] نہ بھول سکوں گا۔ ایک آگ ہے کہ رہ رہ کر سینے میں تیز ہو رہی ہے۔ شعلے بھڑک رہے ہیں۔ یہ میرے دل و دماغ کو پھونک ڈالیں [illegible] عقل و ہوش کو جلا کر خاک کر ڈالیں گے۔ بلکہ شاید میری زندگی ہی بھسم ہو جائے گی۔"

[illegible] میں وہ اگلی مسکراہٹ ہے نہ ظرافت۔ نہ دوستوں سے ملتا ہے نہ باہر نکلتا۔ اب وہ ہے اور انتہائی فکرمند [illegible] بیٹھے بیٹھے سوچ میں پڑ جاتا ہے۔ سوچتے سوچتے آنکھیں غمگین ہو جاتی ہیں۔ وہ سر تا پا درد و الم بن کر رہ گیا [illegible] اس کی زندگی پر غم کی گھٹا چھائی ہوئی ہے۔ لیکن اب بھی جب کبھی میں اس سے کہتا ہوں کہ تمھیں روحی سے محبت ہے تو وہ [illegible] کی ناکام کوشش کرتے ہوئے کہہ اٹھتا ہے "نہیں۔ تم غلطی پر ہو۔"

محمد دلاور خاں عابد

ایک اخلاقی غزل

علامہ اقبال ۔ تجھے کیا فکر ہے اے گل دلِ صد چاکِ بلبل کی
تو اپنے پیرہن کے چاک کو پہلے رفو کر لے

مقید شوق مے کو کیوں یہ اندازِ سبو کر لے
کسی ترکیب سے ساقی کو ہی اپنا نہ تو کر لے؟

یہ دنیا کیا ہے؟ اک مجموعۂ تلخی و ناکامی
یہ بہتر ہے کہ تو صبر و رضا کی اپنی خو کر لے

اگر دنیا میں تجھ کو ایک کا ہو کر ہی رہنا ہو
تو پھر قطع خیالِ ارتباطِ ما و تو کر لے

مزا آئے اگر دامن جھٹک کر گردِ کثرت سے
دلِ آزاد کو پابندِ ذاتِ وحدہٗ کر لے

مؤخر خدمتِ ملکی و قومی ہے مگر اپنا
مقدم چاکِ دامانِ مسلمانی رفو کر لے

سندِ تقلیدِ اہلِ غرب کب ہے آدمیت کی
نہ یہ زیبا ہے سب کچھ جو کہ وہ کرتے ہیں تو کر لے

کرم ہے یقیناً جو کہ عند اللہ اتقیٰ ہے
اگر چاہے تو پیدا تو بھی ایسی آبرو کر لے

[illegible] کو چھوڑ [illegible] آخر تجھے اک روز جانا ہے
ابھی اچھی طرح سے خاک بیزی کو بہ کو کر لے

کلیم اللہ پہونچے طور تک شوقِ تکلم میں
وہ دل میں جلوہ فرما ہے جو چاہے گفتگو کر لے

انیسہ خاتون ہارون بیگم

[illegible] اِنَّ اَکرَمَکُم عِندَ اللّٰہِ اَتقٰکُم (قرآن کریم) یعنی تم میں سے زیادہ قابل عزت وہ ہے جو زیادہ متقی ہے ۱۲

شاعر

شاعروں کے متعلق کچھ کہنا بڑے دل گردے کا کام ہے۔ تعریف کی تو خیر "قصیدوں" کا ایک پلندا ہماری میز پر جمع ہوجائے گا اور ہم ان کو پڑھیں گے یا نہیں پڑھیں گے، یہ ہماری مرضی پر موقوف ہے۔ "تشبیب اور گریز" کی یہ دنیا ہمارا دماغ خراب کرنے کے لئے کافی ہوگی اور اگر مذمت کی تو ہماری جانب ہجو کے اتنے تیر پھینکے جائیں گے کہ ہمارا سینہ چھلنی ہوجائے گا اور انجام کار شاعروں کی شان میں ہمیں ایک فی البدیہہ قصیدہ سنانا ہوگا۔ کسی کی برائی کو ظاہر کرنا ہماری فطرت کے خلاف ہے اس لئے صرف اچھائی سے فائدہ اٹھا کر ہم شاعروں کے متعلق کچھ کہیں گے۔ اب شاعروں کا کام ہے کہ وہ اسے سنیں یا نہ سنیں۔ ہمیں معلوم ہے کہ اس وقت کئی شاعر "فکر سخن" میں اپنی پیشانیوں سے پسینہ پونچھ رہے ہوں گے تاکہ مشاعرہ میں ان میں سے ہر ایک کی غزل، دوسرے کی غزل سے بازی لے جائے۔ کئی ایسے جو دوسروں کے اصرار سے پہلے ہی اپنی عنایت سے جھوم جھوم کر اپنا کلام سنا رہے ہوں گے۔ کئی ایسے جو مشاعرہ جانے کی تیاری میں ریہرسل کر رہے ہوں گے۔ کئی ایسے جو اپنی تازہ غزل کے لئے قافیے جمع کر رہے ہوں گے اور کئی ایسے جو کسی چائے خانے میں چائے کی پیالی منہ سے لگائے ہوئے پان کی طرف للچائی نظروں سے دیکھ رہے ہوں گے۔ تو غرض یہ ہے کہ شاعروں کی اس مصروف زندگی میں مخل ہونا بالکل ایسا ہی ہے جیسے شاعر اپنی بیاض ہاتھ میں لئے دوسروں کی مصروف زندگیوں میں مخل ہوتا ہے۔

سب سے پہلے ہمیں یہ سوچنا چاہئے کہ اس تنگنائے دنیا میں شاعروں کی آبادی کا کیا تناسب ہے؟ افسوس ہے کہ مردم شماری کی کسی رپورٹ میں اس قسم کے اعداد و شمار نہ مل سکے۔ آئندہ سے مردم شماری کے تختہ میں ایک خانہ اس قوم کے لئے بھی ہونا چاہئے۔ یہ پوچھنے کی ضرورت نہیں کہ کون شاعر ہے؛ صرف یہ دریافت کرنا ہے کہ کون شاعر نہیں ہے۔ بہرحال باضابطہ تحقیق کی عدم موجودگی میں صحیح اندازہ یہ ہے کہ دنیا کے بہت کم بدنصیب انسان ایسے ہوں گے جو شاعر نہیں ہیں۔ جدائی کی راتوں میں آسمان پر بکھرے ہوئے تاروں کو گننے والے ان تاروں سے کسی طرح کم نہیں ہوسکتے۔

جب شاعروں کی آبادی اتنی کثیر ہے تو ہونا یہ چاہئے کہ ہر شاعر پر ٹکس لگایا جائے تاکہ "اشاعت شاعری" کا مالی کام نکل سکے۔ مگر ہمیں اندیشہ ہے کہ متواتر ہجو یہ نظمیں سن کر یہ تحریک واپس لینی ہوگی اور ایک ایسا فنڈ قائم کرنا ہوگا جس کے ذریعے سے شاعروں کی امداد ہوسکے۔ یوں تو شاعر سمرقند و بخارا بھی بخش دیتا ہے لیکن اکثر "وہ سخن دریں است" کہہ کر خاموش ہوجاتا ہے۔ اس لئے ٹکس لگانے کے بارے میں ہم اپنے الفاظ واپس لیتے ہیں۔ البتہ امدادی فنڈ کے متعلق ہمیں کئی کروڑ شاعروں کی نمائندگی کا فخر حاصل ہے۔

لیکن یہاں ہماری توجہ صرف ان شاعروں کی طرف ہے جن کا معشوق خدا جانے کیا حلیہ رکھتا ہے۔ لیکن ان کے شعروں سے تو بڑا کریہہ اور ہیبت ناک معلوم ہوتا ہے۔ فرض کیجئے ایک آدمی ہے جس کے بال سنبل کی طرح، پیشانی چوڑی، ابرو خنجروں کی مانند، پلکوں کی جگہ تیروں کا پرا، آنکھیں غزالیں، دہانہ تنگ، اس کے نیچے چاہِ زنخداں۔ کمر پتلی اور بعض نسبت بالکل نہیں تو آپ ہی فرمائیے کہ اس کا تصور کیا اس قابل ہے کہ ہم اس میں کھو جائیں۔ یہی تصوری تجسمہ ۱۲ . ۲ ، خواب پریشان

بن جاتی ہے جس کے خوف سے ہمارے شاعر راتوں کو جاگ جاگ کر اختر شماری کرتے ہیں۔ بہرحال عشق کا بھوت معشوق کو انسانی تصور سے بلند کر دیتا ہے اور اس طرح وہ اس دنیا کا باشندہ نہیں رہتا۔ شاید معشوق کے نزدیک بھی عاشق کا یہی تصور ہوتا ہو چنانچہ کسی شاعر نے کہا ہے کہ

باہم شب وصال غلط فہمیاں ہوئیں
مجھ کو پری کا دھوکا ہوا ان کو بھوت کا

شاعر اس تصوری معشوق کے عشق میں کبھی صحرا کے بگولوں سے اٹکھیلیاں کرتا ہے۔ کبھی کپڑے پھاڑ کر دیوانہ ہو جاتا ہے اور کبھی زخموں کے لئے نمک دان خریدتا پھرتا ہے۔ بس یوں سمجھئے کہ وہ قیس عامری ہے۔ جو اکثر انا لیلیٰ کے نعرے لگاتا ہے، اکثر فرہاد جانباز کی طرح جوئے شیر کی جستجو میں کوہ کنی کرتا ہے اور کبھی کبھی طور کی سیر بھی کر لیتا ہے۔

اس کی دنیا ہمیشہ نالہ و فریاد کے شراروں میں جلتی رہتی ہے جس پر آہوں کا دھواں منڈلاتا پھرتا ہے۔ وہ کبھی بلبل بنتا ہے اور پنجرے میں قید ہو جاتا ہے یا اپنے آشیانہ کے لئے ایسے تنکے چنتا ہے جن پر کسی نہ کسی طرح بجلیاں گریں اور کبھی پروانہ بنتا ہے اور شمع کے گرد گھوم گھوم کر جل جاتا ہے۔ اس کے باغ میں ہمیشہ خزاں رہتی ہے اور کبھی نصیب دشمناں بہار آتی ہے تو وہ گریباں چاک کر کے صحرا کی طرف نکل جاتا ہے۔

گھٹائیں چھاتی ہیں تو شراب نہیں ملتی اور چشم ساقی یاد کر کے بے پئے سرشار رہتا ہے۔ اکثر اتنی پی جاتا ہے کہ پینے سے غرض نشاط نہیں رہتی۔ شراب پینے کے کئی طریقے ہیں بعض وقت خم کے خم لنڈھا جاتا رہتا ہے۔ بعض وقت چلو میں تلچھٹ ہی کو غنیمت سمجھتا ہے۔ ہمیشہ شراب کی بھٹی یا میخانے کی دہلیز پر بستر لگا رکھتا ہے۔ نہ کام نہ کاج۔ توبہ کرتا ہے لیکن بادل کا رنگ دیکھ کر طبیعت بدل جاتی ہے اور رحمت کو باتوں میں بہلا کر پھر پی جاتا ہے۔ اس کی توبہ جام شکن رہتی اور جام توبہ شکن اس طرح اس کے سامنے ٹوٹے ہوئے پیالوں کا ڈھیر لگا رہتا۔

اس کا معشوق کیا ہے؟ اس کے لئے طبیعت پر زور ڈالنا پڑے گا اور طبیعت پر زور ڈالنے کے ہم قائل نہیں۔ آمد اور آورد میں بڑا فرق پڑ جاتا ہے۔ آمد تو وہی کہ بس بولتے چلے جاؤ۔ اس لئے ہم اپنی "آمد" کو طبیعت پر زور ڈال کر برباد نہیں کریں گے البتہ صرف اتنا کہنا کافی ہے کہ اس کے کپڑے زنانی ہوتے ہیں لیکن وہ ایک چلتا پھرتا فتنہ ہوتا ہے۔ آتا ہے، جاتا ہے، ستاتا ہے، اس کے پازیب کی جھنکار، اس کے بندوں کی چمک، اس کے ڈوپٹہ کا رنگ بہرحال کسی نے دیکھ کر کہہ دیا کہ

آسماں رنگ بدلتا نظر آتا ہے مجھے

یہی نہیں بلکہ یہ معشوق جو ڈوپٹہ پہن کر کبک دری کی طرح مشق خرام کرتا ہے۔ جس کی کلائی پھول اچھالنے سے درد دینے لگتی ہے، جس کے تلوؤں میں گلاب کی پتی سے خراش ہونے لگتی ہے۔ جس کے بدن پر نسیم سحری کا ہلکا جھونکا بھی بوجھ معلوم ہوتا ہے۔ ہمیشہ تلوار اور خنجر لئے ہوئے اپنے عاشق کو قتل کرنے کے لئے تیار رہتا ہے۔ اور جب قتل کرتا ہے تو نعش گھر کے سامنے لٹکاتا ہے۔ اکثر وہ کند چھری سے بھی ذبح کرتا ہے اور مقتول کو مقتل میں تڑپتا ہوا چھوڑ کر چلا جاتا ہے۔ خدانخواستہ کبھی وہ بے ارادہ نہیں ...

۵۰۔ (ن) اِنَّ اَکْرَمَکُمْ عِنْدَ اللّٰہِ اَتْقٰکُمْ (قرآن کریم) یعنی تم میں سے ر...

شاعر پہلے تو اس کے سامنے خنجر رکھ دیتا ہے۔ پھر کلیجہ پھر دل اور پھر سر۔ اس کے بعد کہتا ہے کہ

تو مشق ناز کر خونِ دو عالم میری گردن پر

یہ تو اپنے دوست سے شاعر کے تعلق کا حال ہے،

اب اس کے دشمنوں کی کیفیت سنئے۔ دنیا کا ذرہ ذرہ اس کا دشمن ہے، لیکن پانچ دشمن بہت اہم ہیں۔ آسمان، تقدیر، ناصح، زاہد اور رقیب۔ آسمان اور تقدیر تو خیر پیدایشی دشمن ہیں۔ لیکن محبت کی ابتدا کے ساتھ ہی رقیب ایک طرف سے ستاتا ہے اور ناصح دوسری طرف سے۔ رقیب معشوق سے مل جاتا ہے اور معشوق بھی رقیب کے ساتھ ہو جاتا ہے۔ ناصح عشق ہی کی ممانعت کرتا ہے۔ لیکن شاعر ان دونوں سے نہیں ڈرتا۔ وہ رقیب کو خوب گالیاں دیتا ہے اور ناصح سے کہتا ہے "میاں جاؤ تم بھی کسی کو دل دو تمہیں کیا معلوم کہ محبت میں کس قدر لذت ہے"۔ مے نوشی کے وقت زاہد اس کی راہ میں حائل ہوتا ہے اور شاعر "ارے کم بخت تو نے پی ہی نہیں" کہتے ہوئے اس کے سر پر ایک تڑاق سی لگاتا ہے اور پھر ہاتھ ملتا ہے کہ اچھی پڑی نہیں۔

شاعر کا جس طرح گھر نہیں ہوتا اور وہ خانماں برباد صحرا نوردی کرتے پھرتا ہے اسی طرح اس کا کوئی مذہب نہیں ہوتا۔ وہ "کفر و ایمان" سے آزاد ہوتا ہے۔ دل کو کعبہ سمجھتا ہے۔ کوچۂ یار میں سجدے کرتا ہے۔ ابروئے یار کو طاقِ حرم سے تشبیہ دیتا ہے۔

غرض اس کی ساری زندگی یوں ہی گذرتی ہے زیادہ تر ہجر و فراق میں۔ کبھی کبھی نظارہ دوست ہو جاتا ہے تو آنکھیں چوندھیا جاتی ہیں اور اس کا دوست ایک طرف شرماتا ہے۔ جبین پر شکن اور ابرو میں بل ڈال کر منہ پھیر لیتا ہے اور نظر نہیں ملاتا۔ اور دوسری طرف شاعر خود اتنا تڑپتا ہے کہ کوچۂ یار کی زمین بھی ہموار ہو جاتی ہے۔ وہ پریشانی خاطر کا مواد اپنے ذہن میں لاتا ہے لیکن کچھ بھی نہیں کہہ سکتا۔ اکثر عمر بھر وصال نہیں ہوتا۔ اور وہ یوں ہی آلام و مصائب جھیلتا ہوا، آنسوؤں کی ندیاں بہاتا ہوا، تصور کو اپنا چارہ ساز بنا کر نزع کی حالت تک پہنچ جاتا ہے۔ اکثر نزع کے وقت اس کا معشوق آتا ہے۔ بس معشوق کی آمد کے ساتھ ہی یا تو پھر سانس کا دور چلنے لگتا ہے یا وہ ہمیشہ کے لئے ختم ہو جاتا ہے اور اکثر وہ جب مر چکا ہوتا ہے تو اس کا معشوق آ کے سرِ بالیں کہتا ہے کہ

مر گیا، اچھا ہوا، بد بخت تھا، دیوانہ تھا

آپ نے اکثر شاعروں کو مشاعرہ میں زندہ بیٹھے ہوئے یہ کہتے سنا ہوگا کہ وہ مر چکے ہیں۔ ان کی لحد کو ان کا معشوق کل ہی ٹھکرا تا گیا۔ ان کے مزار پر کی شمع بجھا دی گئی۔ قبر میں بھی ان کے شانے ہلائے جاتے ہیں۔ غالباً یہ شاعر، شاعر نہیں ہوتے بلکہ شاعروں کے جنازے ہوتے ہیں جو مشاعرہ کی خبر سن کر قبروں سے نکل آتے ہیں۔ جنت اور دوزخ کے سارے چشم دید حالات سنا دیتے ہیں۔ حوروں سے ان کی ملاقات ہوتی ہے۔ کوثر و تسنیم سے اپنی پیاس بجھاتے ہیں اور فرشتوں کو ایسے دنداں شکن جواب دیتے ہیں کہ بے چارے سٹ پٹا کر رہ جاتے ہیں۔

بہرحال، شاعر جب مر جاتا ہے تو اس کی وصیت رہتی ہے کہ "عاشق کا جنازہ ہے بڑی دھوم سے نکلے" ایسے موقع پر کبھی کبھی اتفاقاً معشوق جنازے کو کاندھا دینے آ جاتا ہے۔

اگر رسوائی کے ڈر سے نہیں آتا تو راتوں کو اپنے عاشق کی قبر پر
جاکر ماتم کرتا ہے اور اس کی یاد میں بال بکھرا کر غم کی صورت
تو ضرور بنا لیتا ہے۔

شاعر کی زندگی بھی کتنی شاعرانہ ہے اور موت بھی
کتنی شعر پرور۔ اب اس کو یہیں چھوڑیے اور اس کے
تخلص پر غور کیجئے۔ تخلص کا انتخاب شعروں کے انتخاب سے
زیادہ اہم ہے۔ اچھے شاعر کے لیے اچھا تخلص چاہیئے۔ مثلاً
مجبوب، بہتر شاعر کے لئے تخلص کے بعد بھی کچھ ہونا چاہیئے۔
جیسے مجبوب عقبائی اور بہترین شاعر کے لئے نام کے پہلے بھی
کچھ ہونا چاہیئے اور بعد میں بھی جیسے ابو الانفعال عقبائی اب کہیں
الحمدللہ والمنہ کہ دریں ایام نرجام ایک دیوان الموسوم بہ "گلزار مجبوبی" مرتب
ہوسکتا ہے اور اس کے بعد ہر ردیف کی سنگلاخ زمین پر دو
غزلے، سہ غزلے سنائے جا سکتے ہیں۔ اگر دیوان اور کلام کی
ضرورت نہیں تو صرف تخلص ہی شہرت کے لئے کافی ہے۔

جب تخلص کی مشکل حل ہوگئی اور کوئی مشکل اور
طویل تخلص مل گیا تو سوچنا چاہیئے کہ کس طرح شاعری کی جاتی
ہے۔ گنجینۂ قوافی اور آئینِ شاعری کی دو تین کتابیں
جو بادامی رنگ کے کھردرے کاغذ پر چھپی ہوئی مل جائیں گی
خرید لینا چاہیئے اور ان کے بھروسہ پر کچھ دنوں کے بعد
بہ بانگ دہل کہہ دینا چاہیئے کہ

شاعری کھیل نہیں ہے جو کہ بچہ کھیلے
ہم نے پینسٹھ برس اس فن میں ہیں پاپڑ بیلے

لیکن یہ شاعری تو کتابی ہوئی۔ اکتسابی شاعر کا
مقابلہ کیا کر سکے گی۔ اس کے لئے کسی استاد کے دروازے کو
کھٹکھٹانے کی ضرورت ہے۔ استاد کے پاس جانے سے
پہلے چند باتیں ضرور سیکھ لینا چاہیئے۔ پاؤں دبانا، حقہ بھرنا
دو زانو ہوکر ادب سے بیٹھنا، بٹوے میں پان کھانا اور
اپنی غزل استاد کے گھر میں پھینک کر استاد کی دی ہوئی
غزل کو مشاعرے میں اپنے نام سے پڑھنا۔ یہ آگیا تو
نام کے آگے اور ایک سند کا اضافہ ہوجاتا ہے۔ اب پورا
تخلص سنئے اور سمجھنے کی کوشش کیجئے۔ ابو الانفعال
مجبوب عقبائی تلمیذ ملک الشعراء، پہلوان کلام زبدۃ ال
ابو الادب و الشاعری حضرت عاشق ہمدانی۔

دیکھا آپ نے شاعر بننا کتنا مشکل کام ہے۔ جب
سے واقف ہوگئے۔ بے کاری بھی ہے اور استاد بھی
گیا تو مشاعرہ میں دوسروں کے ہر شعر پر واہ واہ
اے سبحان اللہ، کیا برابر کا مصرع ہے، زبان پائی
ہے اور اس قسم کی چند باتیں ضرور کہنی چاہئیں تا کہ
جب اپنی باری آئے تو اس کے صلہ میں دوسرے
بھی اسی قسم کی باتیں اپنے لئے کریں اور جب مشاعرہ
سے اٹھیں تو راستہ بھر مشاعرہ میں شریک ہونے
تمام شاعروں پر اعتراضات کرتے ہوئے گھر پہنچ جانا
چاہیئے۔ اور چائے کی وجہ سے نیند نہ آئے تو بس معشوق
یاد کرکے تارے گننا چاہیئے یا فکر سخن کرنی چاہیئے تا
صبح ہوجائے اور لوگوں کو اپنا کلام سنا کر داد حاصل کر
موقع ملے۔

بارش سے پہلے

سمندر پر ہوائیں رقص میں ہیں — ہمالہ پر گھٹائیں رقص میں ہیں
زبانوں پر دعائیں رقص میں ہیں — حسینوں پر ادائیں رقص میں ہیں

شباب انگیز جھونکے آ رہے ہیں
شراب آمیز جھونکے آ رہے ہیں

کوئی مہندی لگانے پر تُلی ہے — کوئی چُنری سُکھانے پر تُلی ہے
کوئی جھولا جھلانے پر تُلی ہے — کوئی ہنسنے ہنسانے پر تُلی ہے

سروں پر ابر چھاتا جا رہا ہے
مگر نزدیک آتا جا رہا ہے

ترنم گنگ میں ڈوبا ہوا ہے — رباب و چنگ میں ڈوبا ہوا ہے
تبسم رنگ میں ڈوبا ہوا ہے — دہانِ تنگ میں ڈوبا ہوا ہے

"رخِ گلگوں پہ گیسو کی سیاہی"
شفق کی بادلوں میں بے پناہی

صراحی ساقیٔ منظر لئے ہے — "شراب" انگور کی دختر لئے ہے
شبابِ میکدہ ساغر لئے ہے — سکوں بخشِ دلِ مضطر لئے ہے

جو خستہ شیوۂ ساقی نہیں ہے
صراحی میں "مئے باقی" نہیں ہے

جگر کی ٹیس دونی ہو رہی ہے — محبت میں ترقی ہو رہی ہے
ترقی سے تسلی ہو رہی ہے — نثارِ شاد بجلی ہو رہی ہے

وہ "بجلی" کون۔ پھولوں کی جوانی
"بھری برسات" جس کی مہربانی

شاد عارفی

(رام پور)

قدم، قلم، سخن، رقم کا شکریہ

فریدہ ۔ مری پیاری بچی میں تمھاری شکر گذار ہوں تم نے مری بڑی خدمت کی ۔

فوزیہ ۔ کس لئے شکریہ کس بات پر شکریہ میں نے کیا خدمت کی جو آپ شکریہ ادا کر رہی ہیں ۔ آپ بزرگ ہیں اماں جان آپ کی خدمت کرنی مری عزت ہے ۔ شکریہ ادا کر کے مجھے شرمندہ نہ کیجیے ۔

فریدہ ۔ مری بچی تم نے مری بیماری میں مری بہت خدمت کی میں تمھاری وجہ سے زندہ ہوں ۔
بچی شکر ہے خدا کا کہ اس نے ایسی پیاری لایق بہو مجھے دی ۔ لڑکی سے زیادہ تم نے میری خدمت کی ۔ کیا کسی لڑکی نے ایسی دن رات خدمت کی ہوگی ؟

فوزیہ ۔ اماں جان مجھے شرمندہ نہ کیجئے ۔ میرا فرض تھا میں نے ادا کیا دراصل آپ کا شکریہ مجھے ادا کرنا چاہیئے کہ آپ نے اپنے لڑکے کو ایسی اچھی تعلیم و تربیت دی کہ ان کی صحبت میں مرے خیالات درست ہوئے ورنہ میرا خیال پہلے یہ تھا کہ ساس نند بہت برے ہوتے ہیں ان کے نام سے مجھے نفرت تھی ۔ چونکہ مرے شوہر خود آپ کی خدمت کرتے ہیں آپ کی عزت کرتے ہیں آپ کے حکم کی تعمیل کرتے ہیں ۔ مجھے ہمیشہ یہ کہا کرتے ہیں مری اماں کو اگر تم نے خوش رکھا تو گویا مجھے خوش کیا ۔ مری اماں کی اگر تم نے خدمت کی تو گویا مری خدمت کی بعض وقت آپ کے لڑکے نے مجھے یہ بھی کہا کہ تم مری خدمت نہ کرو بلکہ مری اماں کی خدمت کرو ان کو اس کا خیال نہ آنے دو کہ وہ بیوہ ہیں ان کا دل اس وقت ٹوٹا ہوا ہے ان کو خوش کرنا گویا خدا کو خوش کرنا ہے ۔ اماں جان لڑکا اگر اچھا رہا تو بہو بھی خود بخود اچھی ہو جاتی ہے لڑکا جب ہی اچھا ہو سکتا ہے اس کو تعلیم کے ساتھ ساتھ تربیت بھی دی جائے ۔ تو آپ کی شکر گذار ہوں کہ آپ نے میرے شوہر کو تعلیم کے ساتھ تربیت بھی اچھی دی ان کے اخلاق بہت اچھے ہیں جس کے سبب سے میں بھی اچھی ہو گئی یہ سب ان کی صحبت کا سبب ہے ورنہ میں کچھ بھی نہیں ہوں ۔

شاہ پور (باہر سے کمرے کے اندر آکر) اماں جان اب مزاج کیسا ہے دوا آپ نے پی یا نہیں ؟

فریدہ ۔ شکر ہے خیریت سے ہوں دوا ابھی تمھاری دلہن نے پلائی تمھاری دلہن کو دعائیں دے رہی تھی شکریہ ادا کر رہی تھی ۔ انھوں نے بہت محبت سے مری تیمار داری کی ان کی خدمت اور نرسنگ کی وجہ سے میں زندہ رہی ورنہ خدا جانے میرا کیا حشر ہوتا ۔ تمھارے باپ کا غم تم نے تمھاری بی بی نے بھلا دیا ۔ خدا تم لوگوں کو خوش رکھے ۔ بیٹے کہاں تھے جواب آئے ہو ۔ دفتر سے بہت دیر کر کے آئے چائے پی یا نہیں ۔

شاہ پور ۔ جی ہاں آج دیر ہو گئی چند کام ایسے لگ گئے تھے کہ دیر سے آنا ہوا ۔ اماں جان آپ بار بار شکریہ ادا کرتی ہیں میں آپ کا خادم ہوں مری بی بی آپ کی خادمہ ہے ۔ ہم دونوں آپ کی خدمت کو ہر وقت تیار ہیں

دعا کے ہم محتاج ہیں آپ کی دعا ہماری آئندہ زندگی کو کامیاب بنانے گی شکریہ کا لفظ نہ فرمایا کیجئے۔

فوزیہ۔ آج دیر کیوں ہوئی چند کام کرتے زیادہ ہوئے کیا چائے منگاؤں؟

شاہ پور۔ چائے میں نے پی لی ہے چند نیک کام میں نے آج کئے ہیں اپنے قلم، قدم، سخن، رقم کا شکریہ ادا کرتا ہوں۔ انہی کی وجہ سے میں نے نیک کام کئے۔

فوزیہ۔ (ہنس کر) کیا آج شکریہ ادا کیا جائے گا۔ اس وقت سے اماں جان صاحبہ میرا شکریہ ادا کر رہی تھیں اب آپ قدم، قلم، سخن، رقم کا شکریہ ادا کر رہے ہیں۔ یہ کیوں ادا ہو رہا ہے کچھ کہو بھی۔

شاہ پور۔ آج صبح کو دو غریب یتیم لڑکے میرے ہاں آئے ان کو میں نے اپنے ہمراہ یتیم خانے میں لے جا کر شریک کروا دیا ان کی مدد کو کوئی نہ تھا ایک غریب ضعیف لڑکوں کا دادا ہے جس کو کھانے کو کچھ نہیں ہے۔ میرے ہمراہ لڑکے جانے سے یتیم خانے کے مہتمم نے شریک کر لیا ورنہ یہ خیال کیا جاتا ہے کہ ماں باپ والے لڑکوں کو دھوکا دے کر یتیم خانے میں شریک کر رہے ہیں۔ جب میں یتیم خانے سے واپس آیا تو میرے دل نے میرے قدم کا شکریہ ادا کیا اس کے تھوڑی دیر بعد ایک غریب آیا کہ اس کی بی بی مر گئی ہے روپے نہیں ہیں میں نے سیکل پر آدمی اس کے گھر بھیج کر دریافت کیا تو معلوم ہوا کہ در اصل جنازہ پڑا ہوا ہے دفن کفن کو کچھ نہیں ہے میں نے روپئے بھجوا دئے جب دفن کر کے میرے آدمی واپس آئے ان لوگوں نے کہا کہ آپ کو اس غریب نے بہت دعائیں دیں یہ سن کر میرے دل نے اپنی رقم کا شکریہ ادا کیا کہ رقم کی وجہ سے میں ایک نیک کام کر سکا جس کے سبب سے مجھے خوشی حاصل ہوئی اگر میرے ہاں رقم نہ ہوتی تو میں یہ حقیقی خوشی حاصل نہ کر سکتا۔

فوزیہ۔ آپ نے اپنی رقم اللہ میاں کی بنک میں جمع کر دی اس کا منافع خوشی ہمیشہ ملتا رہے گا۔ بڑا اچھا کام کیا نیکی کرنے کا موقع ملنا بھی خدا کے ہاتھ ہے اور دو کام بتاؤ کیا کئے۔

شاہ پور۔ آج ایک شخص دفتر میں آیا کہا ناظم صاحب سے سفارش کر کے نوکری دلوا دیجئے۔ میں بہت غریب ہوں بچے والا ہوں۔ میں نے سفارش کر دی ناظم صاحب نے وعدہ کیا ہے غریب بہت خوش خوش اپنے گھر چلا گیا۔ میں نے میرے دل نے اپنے سخن کا شکریہ ادا کیا۔

فوزیہ۔ قلم کا شکریہ تو بہت کچھ ہے میرا شکریہ ادا کرتے ہو یا قلم کا میں بھی تو شکریہ کی مستحق ہوں۔

شاہ پور۔ ہنس کر۔ تمہارے قدم کا شکریہ ادا کرتا ہوں کہ تمہارے قدم سے میری ترقی ہوئی۔

فوزیہ۔ یہ قافیہ تو خوب نکالا۔ قدم، قلم، سخن، رقم۔ شاید ہی کسی نے ان چاروں کا شکریہ ادا کیا ہوگا۔ ہمیشہ اور اکثر لوگ خوشی میں یا غم میں خدا کا شکریہ ادا کرتے ہیں تم نے تو نئی ترکیب شکریہ کی نکالی ہے۔ قدم، قلم، سخن، رقم کو چاہا چار اقلیم قائم کر دیجئے یا چار یار اپنے لئے بنا لئے۔ قلم کا کیا شکریہ ادا کیا بتاؤ اس کو محروم نہ رکھنا مری باتوں میں کہیں

سب ہیں
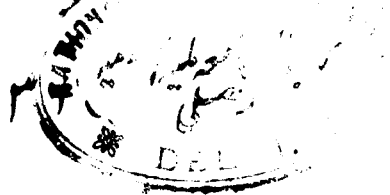
قلم کو بھول نہ جانا۔

شاہ پور۔ قلم کا شکریہ تو ادا ہو ہی نہیں سکتا۔ اس نے مجھے کامیاب بنایا اسی کی بدولت آج ہزار روپئے ماہوار مل رہی ہے۔ اسی کی وجہ آرام سے زندگی گذر رہی ہے اسی کی بدولت تم مجھے ملیں۔ گزشتہ شب کو میں پریشان تھا مرے قلم نے مجھے ایک ایسا اچھا مضمون لکھوایا جس کی وجہ سے میرا دل شاد ہوا مرے قلم نے مجھے حقیقی خوشی دی اس لئے میرے دل نے قلم کا شکریہ ادا کیا۔

فریدہ۔ بٹیا تم نے قلم، رقم سخن، قدم کا شکریہ ادا کیا میں ہزاروں دعاؤں کے ساتھ تمھارا تمھاری دلہن کا شکریہ ادا کرتی ہوں تم نے میری بیماری میں خدمت کی۔

شاہ پور۔ آپ شکریہ کا لفظ نہ کہیے بلکہ دعا دیجیے۔ ہمارا فرض تھا ہم نے ادا کیا آپ نے کتنی خدمت کی ہوگی جو آج میں اتنا بڑا ہوا تعلیم حاصل کی یہ سب آپ کی وجہ سے ہے آپ کے قدم کے نیچے جنت ہے۔

فریدہ۔ یہ سچ ہے لیکن اس کا خیال کون کرتا ہے یہ کہا جاتا ہے ماں باپ کا فرض تھا ادا کیا۔ یہ تمھاری اور تمھاری دلہن کی سعادت مندی ہے خدا تم لوگوں کو خوش اور بامراد کرے۔

صغرا ہمایوں مرزا

رباعیات

(حسن مخمور)

پھر جھوم کے ساغر کو اٹھاتا ہے کوئی
مدہوش کو پھر ہوش میں لاتا ہے کوئی
اے بادہ نیوش اٹھ کہ میخانے میں
بے پردہ ترے سامنے آتا ہے کوئی

(جنونِ شوق)

آوارۂ وحشتِ شوق رہنے دے مجھے
تکلیفِ تلاشِ حسن سہنے دے مجھے
اے عرش نشیں سنبھل سنبھل کر تجھ سے
جو بات زباں پہ آئے کہنے دے مجھے

عبد القیوم باقی

بیڑ اور اس کے تاریخی واقعات

ریاست حیدرآباد میں یہی ایک ایسا ضلع ہے جہاں آمد و رفت کے ذرائع کافی طور پر مہیا نہیں ہیں جس کی وجہ سے یہاں کی تجارت دوسرے اور اضلاع سے گری ہوئی ہے۔ یہ شہر قدرتی طور پر دو حصوں پر منقسم ہے۔ اس شہر کے بیچوں بیچ ایک ندی "بند سورا" گذرتی ہے۔ ندی کے جانب مغرب جو آبادی ہے اس کو "قصبہ" کہتے ہیں۔ یہاں ہر گھر میں ایک ایک کنواں تو ضرور ہے اور اس طرف کے لوگوں کو پانی کا انتہا درجہ کا آرام ہے۔ ندی کے جانب مشرق جو آبادی ہے جس کو "پیٹھ" کہتے ہیں، وہاں پانی کی سخت تکلیف ہے اور باشندے عموماً ندی کا پانی پیتے ہیں۔ موسم گرما میں پانی خراب ہو جانے کی وجہ سے آب و ہوا ذرا خراب ہو جاتی ہے۔

یہ شہر بہت پرانا اور تاریخی ہے۔ یہاں ہندو مسلم آثار قدیمہ بکثرت پائے جاتے ہیں جو حسب ذیل ہیں۔

(۱) کوتوالی دروازہ کے نام سے ایک کمان مشہور ہے جو ندی کے جانب مغرب کنارہ ہی پر واقع ہے یہاں حسب ذیل کتبہ لکھا ہوا ہے۔

"بسم اللہ الرحمن الرحیم"۔۔۔ سلطان ابوالمظفر محی الدین محمد اورنگ زیب بادشاہ غازی ۔۔۔۔ فرمودہ ملک بیجاپور وآدونی و نرنالہ وجنجین وغیرہ مفتوح ساختہ و سنہ چہل و ہفت کہ پس از فتح قلعہ کہلنا ۔۔۔۔۔ بہ وادی بیجاپور نا خجستہ بنیاد بتمام نامی نواب فلک جناب عمدۃ الملک غازی الدین خاں بہادر فیروز جنگ تعلق داشت باہتمام احقر العباد حاجی سعد ارشاہ کہ بہ نیابت عمدۃ الملک بہ بند و بست ۔۔۔۔ رمضان سنہ مذکور از جلوس میمنت مانوس مطابق یک ہزار و یک صد و ۔۔۔۔۔

(۲) تقریباً سو سال ہو چکے ہیں کہ اس شہر میں زبردست طغیانی آئی تھی۔ طغیانی کو ظاہر کرنے کے لئے اور حصار بندی کے راز کو آشکار کرنے کے لئے اسی دروازہ پر ایک کتبہ لکھا ہوا ہے۔

الواحد۔ بتاریخ دوازدہم جمادی الاول ۱۲۳۱ھ رود بار قصبہ بیڑ طغیانی نمودہ ہمہ حصار از پائے برد ہمدرین سنہ مذکور نواب فلک جناب امیر نواز جنگ بہادر خلف الصدق دولہ خاں مرحوم دام اقبالہ از سر نو سد حصار مرتب فرمودند مادہ تاریخش اینست۔

" سدی شدہ چوں سد سکندر انیست "

(۳) کوتوالی دروازہ کے جانب مشرق ایک خانقاہ ہے۔ اس کی بناوٹ سے معلوم ہوتا ہے کہ یہ عمارت غارہائے ایلورا کی طرح بنی ہوئی ہے۔ کیونکہ اس کی بناوٹ غارہائے مذکور کے مشابہ ہے۔

(۴) اسی دروازے کے جانب شمال و مشرق دو میل کے فاصلہ پر "کنکالی" کے نام سے ایک مندر مشہور ہے جہاں ایک مینار بھی ہے جو چونے اور مٹی سے مل کر بنا ہے۔ لیکن آنا بکہنہ کہ اگر کوئی گرانا چاہے تو ناممکن ہے۔ اس مینار کی

بلندی ۶۰ یا ۷۰ فٹ کے قریب ہوگی اور یہ ہندوؤں کے عہد قدیم کی یاد تازہ کرتا ہے۔
(۵) کوتوالی دروازے کے جانب مغرب دو فرلانگ کے فاصلہ پر ایک کمان ہے جس کو "جونا بازار" کی کمان کہتے ہیں اس کا کتبہ درج ذیل ہے۔

" بانی دین رواتی پسرخ نبیاں صف شکن خاں مرید شاہ جہاں"

(۶) جونا بازار کی کمان کے جانب مغرب ایک دروازہ ہے جس کو احمد نگر کا دروازہ کہتے ہیں اور بعضے راجوری دروازہ بھی اس لئے کہ راجورہ او احمد نگر اس طرف واقع ہیں۔ اس دروازے پر دو کتبے لکھے ہیں ایک مرہٹی میں ہے اور دوسرا فارسی میں یہ کتبہ محمد شاہ کے عہد کا ہے جو حسب ذیل ہے۔

" درعہد خلافت خاقان خواقین زمین و زماں محمد شاہ بادشاہ غازی خلد اللہ ملکہ وسلطانہ شہامت و حوالی مرتبت راؤ سلطان جی بنالکر"

جاگیردار پرگنہ بیر تعمیر ایں احمد نگر دروازہ فرمود سنہ ۱۲ سنہ مطابق سنہ ۱۱۴۳ھ۔
(۷) قصبہ کے جانب شمال ایک دروازہ "مالی دروازہ" کے نام سے موسوم ہے اس پر ایک کتبہ لکھا ہوا ہے جس سے پتہ چلتا ہے کہ یہ شاہ عالم کے عہد کا ہے۔

" درعہد شاہ عالم بادشاہ غازی در زماں صوبہ داری نظام الدولہ میر نظام علی خاں بہادر مطابق حکم عمدہ امرائے نواب شرف الدولہ بہادر باہتمام خان ذیشان علی محمد خاں تعمیر ایں دروازہ در سنہ ۱۱۸۱ھ باتمام رسید"

(۸) ڈھونڈھاجی ولیپانڈیہ کے نام کا دروازہ ساحل "بندسورا" کے جانب مغرب واقع ہے۔ جس کو آج کل "ڈھونڈہ پور کا دروازہ" کہتے ہیں اس پر تین کتبے ہیں۔ دو بزبان فارسی اور ایک مرہٹی میں۔

بسم اللہ الرحمن الرحیم

(الف)

" درزماں بادشاہ جہاں ماحی نقش دیوئی تیں سنن مصطفوی ابوالمظفر محی الدین محمد اورنگ زیب عالمگیر کہ خدمت صوبہ داری ملک دکن بہ معز الملک غازی الدین خاں بہادر فیروز جنگ و نیابت سرکار بیڑ بہ حاجی الحرمین الشریفین حاجی صدر شاہ بیگ بودہ بمعرفت ڈھونڈھاجی ولیپانڈیہ"

عمارت برج "ڈھونڈاپورہ" سنہ ۱۱۱۶ھ مطابق سنہ ۔۔ جلوس والا ظہور یافت۔
(ب) کمترین بندہ ڈھونڈھاجی بشن دلیپانڈیہ پرگنہ بیڑ سنہ ۱۱۰۲ھ۔
(۹) گنج دروازے پر جو کتبہ ہے وہ اشعار ہیں ہے۔

در زمان شہنشہ عادل کہ بود در زمانہ بے ہمتا	خان دوران شجاع..... معدن جود و کان حلم و سخا
شاہ اورنگ زیب عالمگیر صیت عدلش گرفتہ ارض و سما	زبدۂ خانان خاندان معنوی کہ ازو یافت چشم دہر ضیا

کرد ور بیر .... که از آں کوتہ است دست قضا　　سال تاریخ ایں بنا جستم　　بتفرع ز خالق یکتا
گشت ساعی ایں بنا ظاہر　　ز آنکہ او ہست خود ز اہل وفا　　...... کہ از غیب　　از سر لطف ہاتفی ز سما
شد بہ معمور بعدہ آں مشہور　　......... باد بقا　　سر پے بگیرد ...... بگو　　باشد ایں پورہ جنت دنیا

(۱۰) پورہ نامی ایک مقام ہے جہاں حسب ذیل کتبہ لکھا ہوا ہے۔

"یا فتاح در عہد خلافت بادشاہ دیں پناہ ابو المظفر محی الدین محمد اورنگ زیب عالمگیر غازی و صوبہ داری و فوجداری نواب عالی جناب عمدۃ الملک غازی الدین خاں بہادر فیروز جنگ از دار الظفر بیجاپور تا خجستہ بنیاد باہتمام حاجی الحرمین الشریفین حاجی صدر شاہ بیگ نائب فوجداری و اتفاق سدھوجی دیسکھ و ڈھونڈھاجی دیشپانڈیہ شنبھو شہید ایں بال شہید ایں پورہ مبارک غازی الدین نگر در قصبہ بیڑ بنا نمودہ صورت اتمام داد" سنہ ۴۰

(۱۱) شہر کے بیچ میں جامع مسجد بنی ہوئی ہے جس کا کتبہ یہ ہے۔

"در زمان خلافت حضرت عالمگیر شاہ غازی رفعت و عوالی دست گاہ سردار خاں فوجدار جرائن دکن ..... فرش سنگین و پیتر پختہ تعمیر ساخت واقعہ غرہ شوال سنہ ۱۱۰۱ھ مطابق سنہ ۱ جلوس والا"
"داروغہ عمارت بندہ درگاہ اختیار خاں ...... ساکن بہار نپور"

(۱۲) راجوری دروازے کے قریب ایک مسجد ہے جس میں پانچ کمان ہیں اس کا کتبہ درج ہے۔

"ھو الاول والآخر وھو معکم این ما کنتم افضل الذکر لا الہ الا اللہ واکمل انکلہ محمد رسول اللہ انما یعمر مساجد اللہ من آمن باللہ والیوم الآخر اولئک ان یکونو من المھتدین ہ در عہد خلافت بادشاہ محمد شاہ غازی خلد اللہ عمرہ بتائید الٰہی بانی ایں مسجد خادم الشرع متین قاضی محمد رکن الدین۔ متوطن قصبہ چھلبی بجلہ بھار باہتمام محمد تاج الدین برادر سنہ ۱۱۳۵ھ باتمام رسید"

۲

یہاں بہت سے اولیاء کرام آرام فرما ہیں بلکہ میں یہ کہتا ہوں کہ دکن میں بزرگان دین کی زیادہ تعداد اورنگ آباد، قندھار شریف، گلبرگہ شریف، بیجاپور اور بیڑ ہی میں آئی ہے۔

(۱) حضرت شاہ کوچک رح المعروف شہنشاہ ولی رح کوتوالی دروازے کے جانب مشرق ایک میل کے فاصلہ پر استراحت فرما ہیں آپ پدر حضرت خواجہ قاضی الاولیاء قاضی مہذب الدین رح قبلہ قدس سرہ العزیز جن کی زیارت گاہ مرجع خاص و عام قصبہ کیج شریف تعلقہ مومن آباد میں ہے۔ محمد تغلق کے زمانہ میں جو چودہ سو ولیوں کی پالکی دکن میں آئی تھی ان ہی ولیوں کے آپ قاضی الاولیا تھے۔ آپ نبیرہ حضرت شیخ فرید گنج شکر رح کے ہیں اور خرقہ خلافت آپ نے حضرت خواجہ نظام الدین اولیا محبوب الٰہی دہلوی کے

حاصل فرمایا تھا) نے قاضی الاولیاؒ سے خرقۂ خلافت حاصل فرمایا۔ حضرت قاضی الاولیاؒ کے واقعات انشاءاللہ تعالیٰ آئندہ صحبت میں کیمبج کے واقعات کے تحت زیب تحریر کئے جائیں گے۔ حضرت شاہ کوچکؒ نے جس وقت خرقۂ خلافت حاصل فرمایا۔ اور آپ کو دربار قاضی الاولیا سے حکم ہوا کہ بیٹر جاؤ تو آپ نے اپنے مرشد کے حکم کی تعمیل کی۔ آپ نے بیٹر جانے تک کیمبج کی جانب پشت نہیں کی بلکہ آپ ۳۶ میل تک پیچھے چلتے رہے حضرت شہنشاہ کی درگاہ کے متعلق حسب ذیل کتبات ہیں یا یہ کتبہ درگاہ کے قریب ہے۔

(الف)

بسم اللہ الرحمن الرحیم

اَفضلُ الذِکرُ لا اِلٰہَ اِلّا اللہ		وَاَکملُ الفکرِ مُحمدٌ رسولُ اللہ		بہر مسجد گشت حاجی صدر شاہ		نائب و ملتمس در بارگاہ

حمد بے حد صلوٰۃ مفتخر		مر خدا را و علی خیر البشر		حکم صادر شکر کہ مسجد را بساز		تا بجمعیت ادا کردہ نماز

باد بر آل و صحابش صد سلام		نیز زین احقر بعتبہ السلام		شکر اللہ یافت تعمیر انصرام		ہم چنیں یا بد مراوش انتظام

بعد گویم گنج بخش بیدرنگ		عمدۃ الصمد او ہم فیروز جنگ		کار غازی بود و ہم غازی نمود		آمدہ تاریخ ہم غازی نمود

رکن بیت دین و دنیا و نظام		غازی الدین خاں نہایت نیکنام		از محمد شاہ نظم ایں بارگاہ		باد در دوراں الٰہی یوم القرار

گر کسے پرسد کہ ناظم کیست آں

گو غلام درگہہ حاجیست آں

(ب) مزار مبارک کے قریب ہی مسجد ہے جس کا کتبہ یہ ہے۔

لَا اِلٰہَ اِلّا اللہُ مُحمدٌ رسولُ اللہ

مَن بَنیٰ مسجداً لِلہ کانَ صَغیراً اَو کَبیراً بَنیٰ اللہُ بیتاً فی الجنۃ

کرد مسجد بنا امیر نواز		جنگ دولہ کہ دولتش دامت		اجرایں ریز بر مزار شریف		شاہ کوچک بفضل کرامت

پس بگفتا کہ اے خدائے کریم		ایں بنا گشت شکر انعامت		شمس برج ولایت خاصہ		قطب در کرامت عامت

کار نیکاں تو نکو سازد		اہتمامی امر الہامت		قدس اللہ سرہ العالی		آسماں و زمین مادامت

بہر تاریخ تیز شد ایما

گو نبار الصلوٰۃ قد قامت

۱۲۵۵ھ

(ج) درگاہ کے قریب ہی ایک حجرہ ہے جس کا کتبہ یہ ہے۔

" ز صفاں۔ مجاور مرتب شدہ در ۱۱۹۵ھ ہجری "

(د) مزار مبارک کے ۶۰ فٹ کے قریب ایک چھوٹا سا حجرہ ہے جہاں آپ معروف عبادت رہتے تھے۔ یہی وہ کمرہ ہے جس میں حضرت خواجہ گیسو دراز کو جوتے چھوڑ کر اندر تشریف لے جانا پڑا۔ اور اسی کمرہ سے آپ کو " بندہ نواز " کا خطاب بھی (جو بے بدل ہے) ملا۔ اور آپ کے ساتھ جو اولیا کرام آئے تھے (کیونکہ ان بزرگان دین کی ولایت آپ بزور قوت سلب

فرما چکے تھے) اسی کمرہ سے ان تمام اولیاء کرام کو اُن کی خدمت کی ہوئی نعمت انھیں دیدی گئی۔ اور اسی کمرہ سے حضرت خواجہ صاحب استفادہ حاصل فرما کر بطرف گلبرگہ راہی ہوئے۔ اسی دروازہ پر یہ کتبہ لکھا ہوا پایا گیا۔

ببیں حجرہ شاہ کوچک ولی بناکرد اتہل زصدق دلی چو تاریخ او جستم از عقل خویش نموداز گل گلشن نادِ علی ۱۱۳۶ھ

(ہ) درگاہ شریف کے باہر ایک باؤلی ہے جس پر جتبل کے ورق پر یہ کتبہ لکھا ہوا ہے۔

شاہ کوچک دام ......

شاہ عالم بہادر بادشاہ غازی در عہد خلافت بادشاہ زمین وزماں .... والدہ ایزانے ین روپ چند قوم کتھری عرف بانقہ متوطن خوشاب محلہ پنجاب بحسب قسمت در قصبہ بیڑ قیام گرفتہ بروضۂ منورہ حضرت دہن چاہ آب دسبیل بنا نمودہ سنہ جلوس والا مطابق ۱۱۳۲ھ

(و) آپ کی درگاہ کے قریب کم سے کم دو فرلانگ کے فاصلہ پر حضرت گوشہ نشین آرام فرما ہیں آپ ہی وہ بزرگ ہیں جو پہلے بیڑ تشریف لے آئے۔

(ز) کوتوالی دروازے کے شمال و مشرق کی جانب حضرت منصور شاہؒ کی زیارت گاہ مقبول عام ہے۔ آپ کی مزار مبارک اور گنبد و فرش تمام سنگ مرمر سے بنے ہوئے ہیں۔ مہاراجہ گوالیار حضرت قبلہ سے عقیدت رکھتے ہیں اور گوالیار ہی سے اس درگاہ کی تعمیر و ترمیم کے لئے سنگ مرمر آیا ہے۔ آپ کی اولاد گوالیار ہی میں فروکش ہے۔ جس کی وہاں مہاراجہ گوالیار بہت تعظیم و تکریم کرتے ہیں۔ ہماری مملکت میں اس درگاہ کے لئے جاگیر بھی ہے۔

(ح) احمد نگر کے دروازہ کی طرف تقریباً دو میل کے فاصلہ پر حضرت پیر بالے شاہؒ کی درگاہ نہایت ہی پُر فضا مقام پر واقع ہے۔ باشندگان بیڑ ہمیشہ اسی طرف تفریح کے لئے آتے ہیں اور کیوں نہ ہو کہ ایسی جائے تفریح کسی اور جگہ نظر نہیں آتی۔ درگاہ کے قریب مسجد ہے۔ مسجد کا کتبہ حسب ذیل ہے۔

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

اِنَّ المساجد للہ فلا تدعوا مع اللہ احدا

شرف الدولہ والی ایں ملک هست از فضل حق سراپا جود بخشی او علی محمد خاں چوں بنا کرد ایں مکاں بسجود سال تاریخ کرد رقم صفی خانۂ طاعت الہ ودود

"باہتمام محمد لشکری ملازم سرکار تیار ساختہ و آراستہ کرده دادن"

(ط) درگاہ حضرت پیر بالے شاہ اور احمد نگر دروازے کے مابین دو پتھر کے ستون جن پر مرہٹی ست کچھ لکھا ہوا ہے لیکن زمانہ کے انقلاب کی وجہ سے حرف مٹ چکے ہیں۔ کہا جاتا ہے کہ یہ پتھر "رن کھم" کے نام سے موسوم ہے اور یہ پتھر زمانۂ راجہ اشوک کو یاد دلاتا ہے۔

(ی) کوتوالی دروازے سے جانب جنوب ۳ میل کے فاصلہ پر ایک باؤلی "خزانہ باغ کی باؤلی" کے نام سے موسوم ہے۔

اس باؤلی میں تین نالیاں بنی ہوئی ہیں جس میں دو طرف سے پانی آتا ہے اور ایک طرف سے پانی شہر میں جاتا ہے۔ خوبی تو یہ ہے کہ باؤلی میں پانی کمر سے کم ہی ہوتا ہے۔ چاہے موسم سرما ہو یا موسم گرما۔ اس باؤلی میں پانی کہاں سے آتا ہے ابھی تک کسی کو اس کا علم نہیں ہوا صرف پہاڑ تک (جو تین میل ہے) اس کا پتہ ملا ہے۔ اس کے آگے نہیں لیکن سنا جاتا ہے کہ یہ نالی احمد نگر کے قلعہ کی ہاتھی باؤلی سے لائی گئی ہے واللہ اعلم بالصواب۔

ایک طرف کی نالی (جو پانی آبادی کی طرف لاتی ہے) اتنی اونچی ہے کہ ایک آدمی کھڑا رہ کر نالی میں سے گذ سکتا ہے۔ نالی زمین کے اندر سے نکالی گئی ہے اور "بند سورا" ندی کی تہہ سے لائی گئی ہے اور اس نالی پر جا بجا دو دو فرلانگ کے فاصلہ پر (شاید پانی لینے کے لئے) راستے بھی بنائے گئے ہیں۔ اس نالی سے یہاں کے زمینیں سیراب ہوتی ہیں۔ اس نالی سے پانی شہر کے بیچ میں ایک حوض میں جس کا نام "کارنجہ" ہے آتا تھا۔ لیکن اب حوادث زمانہ کی وجہ سے پانی کا آنا بند ہے۔ اب اس جگہ گھڑیال گھر بنوایا گیا ہے۔ اگر حوض کو درست کر کے اور نالی سے مٹی وغیرہ نکال کر صاف کیا جاتا اور پانی کو یہاں لایا جاتا تو اور ہی کچھ لطف ہوتا۔

ابوالفیض قاضی سراج الدین احمد نیر

چرواہی

اے جوانی کے حسیں خوابوں کی متوالی بہار
چھوڑ دے بھیڑیں مرے کھیتوں میں اور گیسو سنو

آہ کانٹے چبھ رہے ہیں تیرے نازک پاؤں میں
بیٹھ جا کچھ دیر اس شیشم کی ٹھنڈی چھاؤں میں

جم رہی ہیں پپڑیاں ہونٹوں پہ تیرے پیاس سے
وہ اٹھا لا چھاچھ کا برتن لپک کر گھاس سے

کھینچ کر آنچل ذرا سینے کو اپنے ڈھانپ لے
راز تیری نوجوانی کا نہ کوئی بھانپ لے

کوئی بانکا نوجواں کر دے نہ تجھ کو بے قرار
زندگی تیری نہ ہو جائے الم سے ہم کنا

تیری آنکھوں میں نہ آنسو مسکرانا سیکھ جائیں
دلنشیں ہونٹوں پہ آہیں گنگنانا سیکھ جائیں

دل کی خواہش ہے کہ کھیتوں پر تری شاہی رہے
جب تلک زندہ ہے تو اک مست چرواہی رہے

الطاف مشہ
(پنجاب)

میری خطا

۱

دفتری مصروفیت، دورہ گھر کے کام، دعوتوں میں پھرنے، دوستوں سے ملنے، گپ شپ مارنے، سونے اور کھانے کے بعد جمائیوں اور انگڑائیوں نے وزٹنگ کارڈ نہ بھیجا تو کبھی کچھ پڑھتا اور لکھتا ہوں۔ مگر اس میں بھی خلل پڑتا ہے جب بیگم کمرۂ مطالعہ میں داخل ہو کر نرم آواز سے پوچھتی ہیں "کیا کر رہے ہیں آپ" انھیں واپسی پر آمادہ کرنے اگر کہا جائے کہ دیکھو مہمان آجائے گا تو وہ لوٹ جانے کے عوض ڈرائنگ روم کے جانب کا دروازہ جلدی سے بند کرکے بولٹ لگا دیتی ہیں اور ہماری کرسی پر ایک ہاتھ ٹیک کر یا بازو والی کرسی پر بیٹھ کر "سنئے تو" کے زیرِ عنوان کوئی مشورہ طلب مسئلہ چھیڑ دیتی ہیں غرض ان سارے جھمیلوں کے بعد بھی گر پڑ کر کچھ لکھ لیتا ہوں۔

۲

ایک قابل ادیب، یورپ کے تعلیم یافتہ، ایم، اے پی، ایچ، ڈی کا مکتوب گرامی صادر ہوا کہ "آپ کی عبارتوں میں خدا اور مذہبی ذکر زیادہ رہتا ہے اور یہی وہ چیز ہے جس کو آج کل کے نوجوان پسند نہیں کرتے اور لکھنے والے کو دقیانوسی سمجھتے ہیں۔"

فاضل دوست بہت سنجیدہ ہیں کہ اتنا ہی لکھا ورنہ جرم کی سنگینی تو ایسی تھی کہ ملّا، قل اعوذی، مذہبی مجنون وغیرہ وغیرہ سب ہی کا لکھا جانا بجا ہوتا۔

جب میرا یہ گناہ مجھے بتایا گیا تو الہ آباد کے ایک خطا کار شاعر کا یہ شعر مجھے بے ساختہ یاد آگیا۔

رقیبوں نے رپٹ لکھوائی ہے جا جا کے تھانے میں
کہ اکبر نام لیتا ہے خدا کا اس زمانے میں

۳

جانتا ہوں کہ "آج کل کے نوجوان" تو یہ پسند کرتے ہیں کہ الفاظ عریاں ہوں مضامین عریاں ہوں، تصاویر عریاں ہوں، لباس بھی نیم عریاں ہو۔ اسی کو شبابیات کا نام دیا گیا ہے، حیاسوز سفلی جذبات کو، رومانیت کہا جاتا ہے اور اسی "پسند" کو بے پناہ مقبولیت حاصل ہوتی جاتی ہے تا عشق بازی سے بیشتر آنکھوں کے گناہ، ذہنی تعیش اور دماغی معصیت کی لذت اٹھائیں اس کا جو ساتھ نہ دے وہ اولڈ ٹائپ یا دقیانوسی ہے۔ یہ جاننے کے باوجود کیا کروں کہ دماغ کو گرد و پیش کی وسعت کافی نہیں وہ بلند پروازی کرتا ہے نظر پھیلتی ہے اور دیکھتا ہوں کہ صدہا سال پہلے قوی الجثۃ طویل القامت ایسی قومیں گزری ہیں، جنھوں نے مخلوق کو معبود سمجھا بندے کو رب جانا پہاڑوں پر عظیم الشان قصر بنائے۔ عیش و عشرت کی نئی نئی راہیں نکالیں حتیٰ کہ عورتوں کے کام لڑکوں سے لینے لگے شبابیات کا اس زمانے میں بھی رنگ تھا۔ اللہ کے نیک بندوں نے انھیں سمجھایا تو قوم نے انھیں مفتری، بے وقوف، ساحر اور جادوگروں کا استاد کہا اپنی بستی سے نکال دینے سنگسار کرنے کی دھمکی دی۔

زمانہ آگے بڑھتا ہے ایک قوم پر اللہ کے ظاہری اور باطنی احسان ہوتے ہیں۔ غلامی کی زندگی سے نجات دی جاتی ہے۔ ہر مشکل میں اعانت ہوتی ہے۔ ترنجبین اور بٹیر بھیجے جاتے ہیں مگر ان پیاپے نعمتوں پر شکر کے عوض کفر کیا جاتا ہے۔ گردن جھکانے کے عوض سرتابی ہوتی ہے اور نصیحت کرنے والوں کی محنت رائگاں جاتی ہے۔ اس کو بھی کئی سال گزر گئے عرب میں وہ زمانہ آیا جس کو ایام جاہلیت کہا جاتا ہے اس عہد میں شراب خواری تمغۂ شرافت سمجھی جاتی ہے۔ جس قدر زر اس پر صرف کیا جاتا ہے کرم میں شمار ہوتا ہے۔

قمار بازی کو مکارم اخلاق کی فہرست میں ممتاز جگہ ملتی ہے
جوا بازی سے جو رقم جیتتے ہیں وہ فقرا اور مساکین میں تقسیم کی
جاتی ہے۔ قوم کی بہو بیٹیوں کے حسن کے چرچے علی الاعلان
ہوتے ہیں امرء القیس جو مشہور شاعر اور شہزادہ تھا اپنی
چچیری زاد بہن کے ساتھ اپنی بدکاری کا قصہ مزہ لے لے کر
بیان کرتا ہے اور یہ قصیدہ کعبہ پر آویزاں کیا جاتا ہے۔
لڑکیاں زندہ دفن کی جاتی ہیں باپ کی منکوحہ سعادت مند
پسر کو وراثت میں ملتی ہے۔ بیٹی سے شادی ہوتی ہے ایسے
وقت اس ذات قدسی کا ظہور ہوتا ہے جو بعد از خدا بزرگ
ہے یہ ان بدراہوں کو صراط المستقیم پر لاتی ہے۔

ان امم سابقہ پر جنھوں نے نصیحت نہ مانی خیرخواہوں
کی قدر نہ کی کبھی طوفان آیا کبھی زلزلہ اور کڑک۔ کہیں پتھر
برسے طبقۂ زمین اوندھا کر دیا گیا اور کسی کو مسخ کر دیا۔
مگر جنھوں نے بات سنی سر اطاعت خم کیا انھیں دولت
وحشمت ملی، سلطنت وحکومت ملی، عزوجاہ ملا اور اخروی اجر
جو کچھ ہے اس کا حساب اللہ ہی جانے۔

۴

اب آج کل کے زمانے کو دیکھیے جو کلی اور بھاپ کا
ہے، ریل اور جہاز کا ہے، تار اور ریڈیو کا ہے، طیارہ
اور کلوں کا ہے، تہذیب وتمدن کا ہے، ترقی اور تجدد
کا ہے اور سمجھ یا غلط عقل و دانش کا ہے اس زمانہ میں
شراب کا استعمال کہاں نہیں کس تہذیب جدید کے شیدائی
کے مرۂ طعام، کس فیشن ایبل محفل، کس ڈنر، کس اٹ ہوم،
کس ہوٹل اور کس شائستہ کلب میں وہ موجود نہیں
امریکہ میں چند دن کی بندش کے بعد یہ امتناع اٹھا دیا جاتا
ہے تو ہر شراب کی دکان پر رندوں کا ایسا اجتماع ہوتا ہے
جیسے چوٹے پر مکھیاں (اس زمانے کے مصور اخبار ذرا
دیکھ لیجئے) بمبئی میں امتناع شراب کے خلاف احتجاج کرنے
بڑے بڑے دولت مند شرفا سراو ناٹ جمع ہوتے ہیں۔
جوا پرانا نام قابل نفرت ہے مگر پریل، برج، لاٹری کے
نئے نام سے کہاں یہ مہذب شغل جاری نہیں، برج ٹورنامنٹ
میں شرکت اور اس میں جیت روشن خیالی اور زندہ دلی
کی عین علامت ہے جو روپیہ اس سے جیتا جائے اس کو
بعض اصحاب کرم چیریٹی فنڈ میں داخل کر دیتے ہیں۔

عورت جسے عزو شرف کا نام لیکر آزاد وبے پردہ
کیا جا رہا ہے درحقیقت اس کے حسن کی نمائش اس کے
سینے، بازو اور پنڈلی کی نمائش ہیں بڑی بڑی محفلیں منعقد
اور مشہور زمانہ اخبارات کے صفحے کے صفحے تصویروں اور
مضامین سے پر کرکے رسوا کیا جا رہا ہے۔ اس کی خلوت کی
تصویریں اس کے جسم کا تار تار اڑا (؟) اس کے نازک اعضا کا
پیچ وخم ابھارا اور تیلی لکیریں فنون لطیفہ کے بہانے سے
نمایاں کرکے اس کے شرم وحیا کا جنازہ نکالا جا رہا ہے
کبھی لڑکی زندہ دفن کی جاتی تھی بنی اسرائیل کے لڑکے
مارے جاتے تھے تو آج برتھ کنٹرول کے نام سے لڑکے
اور لڑکیوں دونوں کا قتل عام ہو رہا ہے۔
مضمون طول ہو رہا ہے اس لئے قلم روکتا ہوں ورنہ
ایسی بیسیوں باتیں اور بتاؤں۔

۵

عہد حاضر جس کو تمدن اور ترقی کا زمانہ اور نئی روشنی
سمجھتے ہیں جاہلیت اور ایام ضلالت کا ہم رنگ ہے اگر
نبی آتے تھے قانون الٰہی لاتے تھے مگر اب تو یہ سلسلہ بند
ہوگیا۔ البتہ اسی قانون کا ایک دفعہ ہے کہ تم میں ایسے

لوگ ہوں جو نیکی کی طرف بلائیں اچھے کاموں کا حکم دیں اور برائی سے منع کریں پس فرمائیے ہیں "آج کل کے نوجوان" کی پسند کو ملحوظ رکھ کر انہیں سوز و مستی جذب و شوق کے دریائے بے پایاں میں ڈوبنے چھوڑ دوں یا اس دفعہ کے تحت انہیں طوفانِ موج افزا سے کھینچ کر باہر نکالوں۔

عنفوانِ شباب کی رعنائیوں میں بھٹکنے والے "آج کل کے نوجوان" کی واہ واہ بہ آسانی حاصل کی جاسکتی ہے مگر اس کے لئے قوم کے اخلاق پر تیشہ لگانا پڑے گا اور میں اس سے لرزہ براندام ہوں اسی لئے انجام غفلت، دھن کا پکا، قتالہ، بے مثل محبت وغیرہ مختصر افسانے لکھا یا ہمایوں اور زبیدہ، عاصمہ، جیسے طویل ناول میں تو اس کا لحاظ رکھا کہ نہ تو وہ پند نامہ ہو کر نوجوان کے لئے اس کا پڑھنا اجیرن ہو جائے اور نہ شبابیات کا گندہ لٹریچر کہ نونہالانِ قوم کے اخلاق کو تباہ کر دے۔ اس لئے "حسن و شباب" "شاہد و مے" "کشمکش و فراق، محبت و وصال" کی داستان سناتا تو ہوں مگر صرف اس لئے کہ "در حدیث دیگراں" "نوجوانان" کو بھلے اور برے کی تمیز کرا دوں۔ تاکہ معلوم ہو جائے کہ یہ بہترین کردار ہے اور یہ قابل نفرت۔ میں "نوجوان" کو بتانا چاہتا ہوں کہ اس رنگین دنیا اس خوشنما چمن سے فائدہ اٹھانے کے طور طریق کس حکمت کے ساتھ منضبط کر دئے گئے ہیں ذرا اس کا مطالعہ کرو۔ پھول چنو مگر خار سے دامن بچاؤ ..... اور یہی میری خطا ہے

ابوظفر موئدالدین حسن

غزل

دل سے خیالِ یار بھلایا نہ جائے گا — ایسا یہ نقش ہے کہ مٹایا نہ جائے گا

ہم سے غمِ حیات اٹھایا نہ جائے گا — یہ سلسلہ اب اور بڑھایا نہ جائے گا

اے عشق! چھیڑ چھیڑ کے گستاخیاں نہ کر — وہ روٹھ جائیں گے تو منایا نہ جائے گا

افسانۂ جنوں ہے کچھ اس درجہ خوں چکاں — سننا بھی چاہیں وہ تو سنایا نہ جائے گا

رنگِ بہار دید کے قابل سہی، مگر، — آنچل تمھارے رخ سے ہٹایا نہ جائے گا

میں وارداتِ عشق مگر تم سے کیا کہوں — تم سے حسیں کو مجھ سے رلایا نہ جائے گا

افشائے رازِ عشق میں رسوائیاں سہی — ہم سے تو دل کا حال چھپایا نہ جائے گا

وہ مسکرا کے دیکھ رہے ہیں مری طرف — بجلی سے آشیانہ بچایا نہ جائے گا

کاوش! میں ان کی یاد میں مٹ جاؤں گا مگر
اُن کا خیال، دل سے مٹایا نہ جائے گا

کاوش

شیلی کی زندگی کے چند دلچسپ پہلو

شیلی انگلستان کا مشہور شاعر بنی نوع انسان سے
بے انتہا محبت رکھتا تھا اس کا حساس دل مظلوموں اور
کمزوروں کے دکھ اور درد سے بے حد متاثر ہوتا تمام جذباتی
انسانوں کی طرح اس کی خواہش ہوتی کہ دنیا کا نظام
آن واحد میں بدل جائے وہ چاہتا تھا کہ تیزی کے ساتھ
حالات میں تبدیلی واقع ہو انسان جس عذاب کی زندگی
میں مبتلا ہے اس سے جلد چھٹکارا پا جائے۔

شیلی کی انسانیت سے محبت کرنے والی فطرت کو
جس قدر سراہا جائے کم ہے لیکن اس کو کیا کیا جا سکتا ہے کہ
دنیا کے حالات اتنی تیزی سے نہیں بدلتے یہی سبب ہے کہ
انگلستان کے اس نظریہ پرست شاعر کی زندگی ناکامیوں
کی ایک المناک داستان ہے۔

شیلی کتابوں میں جو اصول اور نظریے پڑھتا علمی
دقتوں کا لحاظ کئے بغیر ان پر عمل کرنے کی کوشش کرتا اور
دوسروں سے بھی اس بات کی توقع رکھتا کہ وہ ان نظریوں
اس کی طرح عمل پیرا ہوں گے۔ لیکن جب اس کی یہ توقعات
پوری نہ ہوتیں تو اسے دنیا اور دنیا والوں سے بڑی
مایوسی ہوتی۔

شیلی کے خیالات پر گاڈون کی کتاب (Poli-
tical Justice "سیاسی عدل") کا بڑا اثر
رہا اس کتاب میں مصنف نے نکاح کو مذموم قرار دیا ہے
خود شیلی کا خیال تھا کہ مرد اور عورت کی باہمی محبت،
ان کے باہم مل کر زندگی گذارنے کے لئے، کافی ہے
سیاسی عدل کے مصنف کی طرح وہ بھی نکاح کو غیر ضروری
تصور کرتا لیکن جب گاڈون کی لڑکی نے اپنے باپ کے
اس نظریہ پر عمل کیا اور شیلی کے ساتھ بغیر نکاح کئے زندگی
گذارنی شروع کی تو اس کو اپنی لڑکی کی اس حرکت سے
روحانی اذیت پہونچی شیلی نے جب اس کو نکاح کے بارے میں
اس کا اپنا نظریہ یاد دلایا تو وہ اور بھی چراغ پا ہوا اس
زمانہ میں اس نے جو خطوط شیلی کو لکھے ان کے پڑھنے سے
اس عمیق رنج و غم کا اندازہ ہوتا ہے جو اس کی روح
پر مستولی تھا۔

گاڈون نے ایک اور ستم ظریفی یہ کی تھی کہ نکاح کے
بارے میں اپنے نظریہ کے خلاف دو مرتبہ نکاح کیا اس کی
پہلی بیوی کے انتقال کے بعد اس نے ایک بیوہ عورت سے
دوبارہ شادی رچائی۔

شیلی طالب علمی کے زمانہ میں بھی اور لڑکوں سے
بہت مختلف تھا اس کے ساتھی جب کرکٹ کھیلتے یا کوئی
اور کھیل میں مشغول ہوتے تو وہ کتابیں بغل میں دبائے
کسی کنج کی تلاش میں نکل جاتا وہاں جاکر وہ یا تو مطالعہ
میں مصروف ہو جاتا یا پھر نظمیں کہتا اس کے ساتھی اسے
"پاگل شیلی" کے نام سے پکارتے اور طرح طرح سے
دق کرتے لیکن ساتھیوں کی اس ایذا رسانی سے اس کی
عادتوں میں کوئی تبدیلی نہ ہوتی۔

شیلی اپنے انوکھے خیالات کی وجہ سے اپنے والد کی
بارگاہ میں ہمیشہ معتوب رہا اس کو وہاں سے بہت کم
مالی امداد ملتی۔ مال و متاع اور عیش عشرت کو اس نے
اپنے معتقدات پر سے قربان کر دیا تھا وہ اگرچہ کہ ایک
امیر گھرانے سے تعلق رکھتا تھا لیکن اس نے نہایت سا

زندگی گزارنے کی خو ڈال لی تھی۔
شیلی پریشان حالی کے زمانہ میں بھی محتاجوں کی امداد سے کبھی دریغ نہ کرتا اس کی زندگی کے اوراق پر جگہ جگہ ایثار اور قربانی کی عدیم المثال نظیریں ملیں گی۔

کالج کے زمانہ میں شیلی نے "دہریت کی ضرورت" کے عنوان پر ایک مقالہ لکھا ارباب جامعہ نے اسے اس بناء پر کالج سے نکال دیا۔
اس کے والد بھی اس سے بہت برافروختہ اور انتہائی ناراض ہوئے اور مرتے دم تک ناراض رہے۔
سب سے بڑھ کر یہ کہ شیلی کی خالہ زاد بہن ہیریٹ نے جس سے شیلی کو بہت محبت تھی صاف کہہ دیا کہ وہ اس سے شادی کرنا نہیں چاہتی یہ سانحہ شیلی کے لئے بہت الم انگیز تھا۔

بدل گئیں وہ نگاہیں یہ سانحہ تھا اخیر
پھر اس کے بعد کوئی انقلاب ہو نہ سکا

لیکن یہ سب کچھ اس نے انتہائی صبر و تحمل سے برداشت کر لیا آلام و مصائب کا اس غیر معمولی انسان نے آخر دم تک مردانہ وار مقابلہ کیا۔
شیلی نے کئی دفعہ اس امر کا اعتراف کیا کہ وہ خدا کا قایل ہے دہریت کی ضرورت کے موضوع پر اس نے جو مقالہ لکھا اس کے متعلق اس نے بیان کیا کہ وہ مذہبی دیوانوں کی انتہائی پسندی کا جواب ہے۔ شیلی نے اپنے عادتی جوش میں اس امر کا احساس نہیں کیا کہ وہ جس انتہاپسندی اور دیوانگی کا الزام دوسروں پر عاید کر رہا ہے۔ ٹھیک اسی جرم کا وہ خود بھی مرتکب ہو رہا ہے۔ شیلی کا جہاد دراصل رائج الوقت نام نہاد مذہب کے خلاف تھا۔ لیکن اس نے اپنے فطری جوش میں خدا ہی کے وجود سے انکار کر دیا...... حالانکہ وہ خدا کے وجود کا دل سے معترف تھا۔
شیلی کے دوست ٹری لانی نے ایک دفعہ بیان کیا کہ "شیلی کا حیات بعد الموت پر اعتقاد ہے جن لوگوں نے اسے دہریہ سمجھ رکھا ہے وہ دراصل اس سے واقف نہیں ہیں اس نے خود مجھ سے بیان کیا کہ وہ اٹھارویں صدی کے فرانسیسی فلسفہ کو غلط اور مضر سمجھتا ہے۔"
دی رات کے فلسفہ کا اس پر زیادہ عرصہ تک اثر نہیں رہا۔ آخر میں وہ افلاطون اور ڈانٹے کے فلسفہ سے متاثر تھا۔
کہا جاتا ہے کہ بعض لوگ آزاد طبع پیدا ہوتے ہیں سوسائٹی کے قوانین ان کی فطری آزادی کے راستے میں ایک مستقل رکاوٹ ہیں اس لئے وہ ان قوانین کے خلاف بغاوت کرنا اپنا فرض سمجھتے ہیں شیلی نے ایک دفعہ کہا تھا "اس بات کا جھوٹا ادعا کیا جاتا ہے کہ انسان کے بنائے ہوئے قوانین ہماری فطری خواہشوں کو منضبط کرتے ہیں۔ یہ خیال کتنا مہمل ہے"۔ شیلی کی رائے میں یہ خیال کتنا ہی مہمل کیوں نہ ہو لیکن ہے صداقت سے لبریز (LEWIS) نے ایک جگہ لکھا ہے کہ "قانون کی وجہ سے افراد کے اقوال اور افعال پر قابو حاصل ہوا اور انسانوں میں باہمی اعتماد اور بھروسہ پیدا ہوا قانون امن و امان کی ضمانت ہے اس کی بدولت افراد میں بے یقینی، شک اور خوف کا ازالہ ہو گیا" اس میں شک نہیں کہ دنیا میں بہت سے ایسے قوانین بھی نافذ ہیں جو غیر ضروری اور بحیثیت مجموعی انسانیت کے لئے ضرر رساں ہیں لیکن بہت سے قوانین ایسے بھی

ہیں جو ہماری حیات اجتماعی کے لئے ضروری ہیں اگر یہ قوانین نہ ہوں تو انسانوں کا مل جل کر رہنا ناممکن ہو جائے۔

شیلی کی موت خلیج اسپزیا میں کشتی کے الٹ جانے سے واقع ہوئی اس کے ساتھیوں میں سے کوئی بھی زندہ نہ بچا۔ جب کئی دن کے بعد ان کی نعشیں ساحل سمندر پر ملیں تو شیلی کی نعش کو شناخت کرنا دشوار ہو گیا جامہ تلاشی پر کیٹس Keats کی نظموں کا مجموعہ جس نعش کے ہاں سے ملا اس کے متعلق یقین ہو گیا وہ شیلی کی نعش ہے۔

مذہب سے متعلق شیلی کے جو خیالات تھے ان کے مدنظر اسے قبرستان میں جگہ نہ مل سکی اس لئے ساحل سمندر پر بائرن ٹری لانی اور لے ہنٹ کے روبرو اس کی نعش کو نذر آتش راکھ کو سمندر میں بہا دیا گیا۔

اس کے سوانح نگار آندرے موروا نے لکھا ہے۔
"شیلی کو زندگی نے جو سبق دیا وہ یہ تھا کہ کمال اس دنیا میں حاصل نہیں ہو سکتا اس سے کم درجہ کی کسی چیز کو قبول کر لینا چاہیئے۔"

میر عزیز الحق

مدرسہ تعلیم بالغات کے افتتاح پر

نظر آتی ہیں تاثیریں نصیبِ زور آور کی — کہ جاری چشمۂ شیریں ہوئے دشت و بیاباں میں
خبر آئی کہ اب سرسبز ہوں گے پھر نئے سر سے — وہ اشجارِ خزاں دیدہ جو ہیں گلزارِ نسواں میں
بڑی مصروف ہے آرائش و تنظیم میں دنیا — سفیدی ہو رہی ہے اب پرانے کاخ و ایواں میں
کسے معلوم تھا، سوئی ہوئی تقدیر جاگے گی — خبر کیا تھی کہ آئے گی بہار اجڑے گلستاں میں
یہی سرگرمیاں ہوتیں اگر اس کے زمانے میں — نوا سنگ درنہ یوں پھرتا تلاشِ آبِ حیواں میں
شعاعِ مہر سے اب مندمل خود زخم ہوتے ہیں — "پھرا کرتے نہیں مجروحِ الفت فکرِ درماں میں"
مقدر میں سعادت ہو تو یوں اسباب بنتے ہیں — اسیروں کو نہ رہنا چاہیئے مایوس زنداں میں
خدا رکھے، وہ اب کچھ زندگی کا لطف پائیں گے — کٹی ہے جن کی ساری عمر ماحولِ پریشاں میں
اڑیں گے اب فضاؤں میں طیورِ پرشکستہ بھی — کہاں تاثیر تھی اتنی بھلا تختِ سلیماں میں
یہ اقدامِ عمل اے بانیٔ شعبہ مبارک ہو! — خدا جوشِ عمل دے، شعبۂ نسواں کے ارکاں میں

"یہی آئینِ قدرت ہے، یہی اسلوبِ فطرت ہے
جو ہے راہِ عمل میں گام زن، محبوبِ فطرت ہے"

بشیر النساء بیگم بشیر

ترکِ مسکرات

اک ہوک سی دل میں اٹھتی ہے
اک درد جگر میں ہوتا ہے
ہم چھپکے چھپکے روتے ہیں
جب سارا عالم سوتا ہے

مسلم امر ہے کہ رات کے وقت ہر درد احساس زیادہ ہوتا ہے۔ خواہ امراض جسمانی ہوں یا آلام روحانی۔

رات کا وقت ہے آسمان پر کالی گھٹا چھائی ہوئی ہے۔ رامپور کے گلی کوچوں پر سناٹے کا عالم ہے۔ سڑک کے دو رویہ چراغ اپنی نیم باز متانہ آنکھوں سے ٹمٹما رہے ہیں۔ ادھر دیکھو وہ کیا ہے؟ کوئی چڑیل یا بھوت تو نہیں؟ آہا! یہ تو ایک عورت ہے۔ جلد جلد قدم اٹھائے چلی جا رہی ہے۔ گود میں ایک نوعمر بچہ ہے۔ نیند کا ماتا، ماں کے سینے پر سر رکھے خوابِ نوشین کے مزے لے رہا ہے۔ رات کے سناٹے میں ایک عورت کا اس طرح جانا کیا معنی؟ دیکھو وہ پیچھے مڑ مڑ کر دیکھتی بھی جاتی ہے ایسا معلوم ہوتا ہے کہ کسی کے تعاقب سے بچنا چاہتی ہے۔

"ذرا نزدیک ہو جائیں" کچھ آپ ہی آپ کہہ رہی ہے۔ صبر کی انتہا ہو گئی۔ بھائی بھائی کر کے کمبخت کی نذر سب کچھ کر چکی۔ اس کے ظلم و تعدی کو برداشت کیا لیکن منہ سے اُف نہ کی۔ اب اس کی سفاکی دیکھی نہیں جاتی۔ میرا جتنا جمع جتھا تھا سب اس کی مے نوشی میں صرف ہوا۔ قرض سر سے اونچا ہوا۔ ادائی کی ہمت نہ رہی۔ ساہوکار ڈگری لے آیا۔ عدالت میں نالش کر دی۔ اب رہی سہی آبرو بھی جا رہی ہے۔ خاندان کا نام ڈوب رہا ہے۔ میں تو اس پر بھروسہ کئے ہوئے تھی۔ سچ ہے روپے پیسے کے آگے ایمان خیرباد کہہ جاتا ہے۔ شرم و حیا کا پردہ چاک ہو جاتا ہے۔ روپیہ حاصل کرنا اس کا نصب العین ہے۔ خواہ کسی ذریعے ہی سے کیوں نہ ہو۔ آج میری امیدوں کا خاتمہ ہو گیا۔ اب وہ میرے معصوم کو اس کے آبائی ورثہ سے محروم کرنا چاہتا ہے۔

سچ ہے۔ میں اس کی بہن ہوں۔ میرا فرض ہے کہ میں اس کی مدد کروں۔ اڑے وقت پر کام آؤں۔ میں نے اپنا حق بے دریغ ادا کیا۔ جس دن سے بیوہ ہو کر اس کے گھر آئی اس دن سے اس کی معاشرتی زندگی سنبھالنے میں کوئی دقیقہ اٹھا نہ رکھا۔ اس کی آوارہ زندگی کو دیکھ کر کلیجے پر برچھیاں چلتی تھیں۔ سمجھی کہ بہن ہوں۔ میرا تو گھر اجڑ چکا۔ ارمانوں کا خاتمہ ہو گیا۔ ماں باپ کوئی سر پر تو رہے کہ میرے بھائی مومن کا گھر بسائے۔ خیر میں ہی کیوں نہ اس کا گھر بساؤں۔ شاید بیوی کے آنے سے اس کی آوارہ زندگی میں انقلاب ہو۔

نتیجہ الٹا ظہور پذیر ہوا۔ بیاہ کے بعد چند دن تک تو خوب رنگ رلیاں منائی گئیں۔ عیش و عشرت کے مزے لوٹے۔ روپیہ پانی کی طرح صرف ہونے لگا۔ جی کھول کر ارمان نکالے۔ جب فضول خرچی کا چسکا لگا پھر سونے پر سہاگا ہوا۔ جائیداد کی آمدنی کافی نہ ہوئی۔ قرضہ لیا جانے لگا۔ دوستوں کی صحبت میں شراب نوشی سیکھی۔ اب نہ بیوی کا خیال رہا۔ نہ بہن کا۔ بیاہ کے بعد چھ ماہ بھی نہ ہوئے تھے کہ جائیداد نیلام پر چڑھی۔ گاؤں میں بدنام ہوئے۔ خاندان کے نام کو کلنک کا ٹیکا لگایا۔ گھر میں فاقے ہونے لگے بیوی کو میکے روانہ کیا۔ جوئے میں شرط ہار دی۔ گھر میں جو کچھ اسباب تھا سب کا سب

قرض خواہوں نے اٹھا لے گیا۔ اب کچھ نہ رہا تو اس معصوم کی جائیداد پر خیانت کی نظر ڈال رہا ہے۔ اب پنڈت گرو انند کے ہاں جاؤں گی۔ اور ان سے اس معاملہ میں انصاف چاہوں گی۔"

باب دوم

لو۔ صاحب یہ تو پنڈت گرو انند کے مکان کی سیڑھیاں چڑھ گئی۔ پیچھے ہو لو۔ سنیں تو وہ کیا کہتے ہیں۔

پدمنی ۔۔ پنڈت جی نمسکار عرض ہے۔ غریب کی بے وقت آمد سے پریشان نہ ہو جیئے۔ میں آپ کے در پر غرض لے کر آئی ہوں نا امید نہ کیجئے۔

گرو انند ۔۔ کہو بیٹا تمہارا اس وقت کیسے آنا ہوا؟ ہائیں! گوپی کو بھی لے آئی ہو۔ کہو کیا بات ہے؟ اس طرح ہانپ کیوں رہی ہو۔ کیا پیدل آئی ہو؟ بیٹھو تو۔ میں تمہاری مدد کے لئے ہر وقت تیار ہوں۔ کہو کیا ہے؟ خاموش کیوں ہو؟ یہ آنسو کیسے؟ کیا موہن سے لڑائی ہو گئی۔

پدمنی ۔ پنڈت جی بات صرف اتنی ہے کہ موہن آج کل شراب کے نشے میں بدمست ہو رہا ہے۔ میری اور موہن کی جائیداد نیلام چڑھی۔ قرض خواہ گھر میں جو کچھ تھا سب لے گئے۔ اور موہن ایک دن خلاف قانون جوا کھیلتے ہوئے پکڑے گئے۔ یہ خبر سن کر میں نے سر پیٹ لیا۔ میرا زیور فروخت کر کے جرمانہ ادا کیا۔ اور موہن کو حراست سے رہائی ہوئی۔ لیکن اب مجھ سے یہ نہ ہوگا کہ گوپی کے نام کی جائیداد بھی موہن کے ہاتھوں پامال ہوتے دیکھوں۔ جب میں نے اس سے گوپی کی جائیداد کے دستاویز کا مطالبہ کیا تو کہتا ہے کس کی جائیداد؟ کہاں کی جائیداد؟ پنڈت جی میں تو لٹ گئی۔ لیکن مجھ سے یہ نہ ہوگا کہ جیتے جی اس معصوم کو بھی لٹتے دیکھوں۔ اب میرا اس کے ساتھ اس گھر میں نباہ نہ ہوگا۔

گرو انند ۔ آخر تمہارا کیا مطلب ہے میں نہیں سمجھا [illegible]
موہن نے تمہیں دغا دی اور اب گوپی کی حق تلفی پر تلا ہوا ہے [illegible]

پدمنی ۔ میں صرف یہ چاہتی ہوں کہ پنچایت میری [illegible]
کرے۔

گرو انند ۔ تو بیٹا کیا تم یہ گوارا کرو گی کہ تمہارے معاملا[ت]
پنچایت میں طے پائیں۔ اور ناموس خاندان تمہارے ہاتھو[ں]
برباد ہو؟

پدمنی ۔ پنڈت جی گستاخی معاف۔ ناموس خاند[ان]
کو تو موہن نے برباد کر دیا۔ کیا آپ سمجھتے ہیں کہ باپ دادا کی [illegible]
میں فرق نہیں آیا؟ عزت و ناموری اسی وقت [illegible]
جب جاگیر نیلام پر چڑھی۔ اور عدالت سے قرقی آئی۔

گرو انند ۔ بیٹی! تو مجھ سے وہ چیز مانگتی [illegible]
کیا کہوں ....

پدمنی ۔ میں جانتی ہوں کہ آپ موہن کو پنچایت [illegible]
نفرین و ملامت سے بچانا چاہتے ہیں۔ لیکن میرے [illegible]
انتہا ہو گئی۔ اب میرا ارادہ مصمم ہے۔ اگر آپ میری امد[اد نہ]
کریں گے تو مجھے گاؤں کے پٹواری سے بالمشافہ بات کرنی [illegible]

گرو انند ۔ اگر تمہارا عزم مصمم ہے تو مجھے [illegible]
معلوم ہوتا ہے کہ ہم آپس میں ہی فیصلہ کر لیں۔ میں نہیں [illegible]
موہن کی رہی سہی عزت اور خاندان کی لاج پنچایت [illegible]
برباد ہو۔ اچھا تو تم بے فکری سے سو رہو۔ رات بہت [illegible]
ہے۔ معاملہ کل سلجھ جائیگا۔

پدمنی ۔۔ پنڈت جی آپ کا بے ح[د شکریہ]
خدا حافظ۔

باب سوم

کل جگ نہیں کرجگ ہے یہ یہاں دن کو دے اور رات لے
کیا خوب سودا نقد ہے اس ہاتھ دے اس ہاتھ لے

صبح کا سہانا وقت ہے پرندے یادِ الٰہی میں مصروف ہیں۔ مہرِ عالمتاب نے اپنا سر مشرق سے نکالا ہی تھا کہ مؤذن نے اذان دی۔ کلیسا والے نے گھنٹہ بجایا۔ مندر میں برہمن نے صدائے ناقوس بلند کی۔ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ دنیا کی کل جو رات کو چند گھنٹوں کے لئے ٹھہر گئی تھی پھر چلنی شروع ہو گئی۔ لوگ ادھر ادھر تیز تیز قدم اٹھائے اپنے اپنے کام پر جا رہے ہیں۔ پنڈت گرو انند تو ابھی تک مندر میں سرگرم عبادت ہیں۔ اے لو۔ پوجا پاٹ سے فارغ ہو کر چل کھڑے ہوئے ہیں۔ ہم بھی ساتھ ہو لیں تو معلوم ہو کہ معاملہ کیسے طے پاتا ہے۔ اے ہے! یہ کون ہے جو پنڈت جی سے سرگرم کلام ہے۔

گرو انند۔ بیٹا موہن کہاں جا رہے ہو؟

موہن راؤ۔ نمسکار عرض ہے پنڈت جی۔ میں آپ ہی سے ملنے کے لئے گھر سے نکلا تھا۔ یہ میری عین خوش نصیبی ہے کہ آپ راستے ہی میں مل گئے۔ اگر غریب خانہ پر تشریف لے آئیں تو بہت مہربانی ہوگی۔

گرو انند۔ آخر ایسی کونسی ضرورت ہے جو تمھیں میرے گھر تک آنے کا خیال ہوا۔ ورنہ مہینے گزر جاتے لیکن کبھی غریب بوڑھے پنڈت کی یاد تمھیں نہ ستاتی۔

موہن۔ یہ آپ کیا فرماتے ہیں؟ میں اور آپ کو بھول جاؤں! یہ ناممکن بات ہے۔ یہ گوشت پوست میرا نہیں۔ آپ کا پروان چڑھایا ہوا ہے۔ آپ ہی کے سایۂ عاطفت میں میں اس رتبہ پر پہنچا۔ ورنہ بن باپ کا یہ بچہ دنیا کے تھپیڑوں میں کیسے اکیلا پرورش پاتا؟ اگر میں تمام عمر آپ کے قدموں پر سر جھکائے رہوں تو بھی یہ احسان ادا نہ ہو سکے گا۔ لیجئے۔ گھر آ گیا۔ آئیے۔ اندر تشریف لائیے۔ آپ کے پاؤں سے میرا جھونپڑا پوتر ہو جائے گا۔

دو آدمی گھر بیٹھے ہمارے خدا کی قدرت ہے کبھی ہم ان کو کبھی اپنے گھر کو دیکھتے ہیں

پنڈت جی بیٹھے ہوئے کہتے ہیں اچھا تو بتاؤ کہ تمھاری صورت پر ہوائیاں کیوں اڑ رہی ہیں۔ کیوں کیا پرملا کے دشمنوں کا مزاج خراب ہے؟ خیر تو ہے؟

موہن۔ آپ سے کیا چھپاؤں۔ رات سے پدمنی غائب ہے۔ ننھے گوپی کو بھی ساتھ لے گئی ہے۔ کہاں گئی کچھ پتہ نہیں۔ رات کو کھانا کھاتے وقت باتوں ہی باتوں میں جاگیر کے متعلق تکرار ہو گئی۔ بھگوان جانتا ہے کہ وہ کہاں گئی ہے۔

گرو انند۔ وہ رات کو میرے پاس آئی تھی۔ بہت پریشان تھی اور پنچایت میں ترکہ کے متعلق فیصلہ کروانا چاہتی تھی۔ میں نے بہت کچھ روکا لیکن وہ ایک نہ مانی۔ ناچار ہو کر میں نے اس معاملہ کو ست نراین اور رتن ناتھ کے آگے رکھ دینے کا فیصلہ کیا ہے۔

موہن۔ بھائی بہن کی نااتفاقی میں غیروں کی مداخلت کی کیا ضرورت تھی۔ اگر آپ ہی فیصلہ کر دیتے تو کافی تھا۔ اے لو وہ آ گئے۔

ست نراین اور رتن ناتھ۔ نمسکار عرض ہے۔

گرو انند۔ جیتے رہو بچو۔ آؤ یہاں بیٹھ جاؤ۔ دیکھو میں نے تمھیں ایک اہم معاملہ میں رائے دینے اور گواہ رہنے کے لئے بلوایا ہے۔ سوچ سمجھ کر کام لینا۔

یہ بھائی بہن میں کچھ ناچاقی ہوگئی ہے ۔ پدمنی ۔ ابھی اب آجائگی تو
دونوں کا بیان سن کر اپنی رائے دینا ۔ پھر میں اپنا فیصلہ سناؤں گا ۔
اور تم اس کے شاہد رہنا ۔ اے لو پدمنی بھی آن پہنچی ۔ کہو
موہن کیا بات ہے ۔

موہن ۔ پنڈت جی ۔ واقعہ یہ ہے کہ میرے مرنے
میں پدمنی کی جائیداد آگئی ہے ۔ لیکن میں نے اڑے وقت پر مدد
نہ کی ۔ اور پناہ نہ دی ۔ اور اب اگر اپنی مصیبت کے وقت اس
کی جائداد سے فائدہ اٹھاؤں ۔ تو کیا گنہگار ٹھہروں ؟ آپ ہی
انصاف کیجئے ۔ میں نے گوپی کا کچھ نہیں بگاڑا ۔ اس کا کچھ
روپیہ پیسہ نہ تھا ۔ اب پھر یہ الٹی زبردستی کیسی ؟ پدمنی ۔
گوپی کی جاگیر کے دستاویز مانگتی ہے ۔ جب جائداد ہی نہیں
تو دستاویز کہاں سے آئے ؟ یہ میری سمجھ میں نہیں آتا ۔

گروانند ۔ پدمنی کیا بھائی کا بیان سچ ہے ؟

پدمنی ۔ پنڈت جی یہ انصاف کا آسن ہے ۔
پہلے آپ بیٹھ جائیے اور پھر میرا بیان سنئے ۔ میں آج
بہن بن کر نہیں بلکہ مظلوم بنکر فریاد کرنے آئی ہوں آسن پر
بیٹھئے اور فریادرسی کیجئے ۔ موہن ! اگر تیری رگوں میں چھتری
خون ہے تو سچ کہہ کیا گوپی کا کچھ ترکہ نہ تھا ؟ کیا تجھے شرم نہیں
آتی کہ ایک بیوہ بہن کے ترکے کو پامال کرنے کے بعد ایک یتیم
بچے کی حق تلفی کرنا چاہتا ہے ؟ سر جھکائے زمین پر کیا دیکھ
رہا ہے ؟ اگر تجھ میں باپ دادا کی ذرا بھی حمیت باقی ہے
تو سر اٹھا کر چھتریانہ غرور کے ساتھ اپنی زبردستی کا اقبال کر
سچ کہہ ۔ کیا تیرا ارادہ امانت میں خیانت کرنے کا نہ تھا ؟ چھتری
بچے جوانمرد ہوتے ہیں ۔ خدا نے تجھے قوت و صحت عطا کی ہے
کہ تو اپنی عمر کمزور اور بے بس لوگوں کی خدمت میں صرف کرے ۔
نہ یہ کہ لاوارث اور بیکس مسکینوں کے مال پر ناجائز نظر رکھے ۔
تیری عقل پر بے ایمانی کا پردہ پڑا ہے ۔ تیرا ایمان متزلزل
ہو چکا ہے ۔ تیری آنکھیں جذبات حیوانی کے نشے میں مخمور ہیں ۔

"شہد میں جیسے مگس ہم حرص میں پابند ہیں ۔
آہ افسوس اس سیاہ زندان میں یوں حسرت زدہ

تیری حالت زار مجھے خون کے آنسو رلاتی ہے ۔ ابھی وقت
باقی ہے ۔
اپنے خواب غفلت سے بیدار ہو اور آنکھیں کھول کر دیکھ کہ دنیا
میں کیا ہو گیا اور کیا ہوا جاتا ہے ۔ تو کہاں سے کہاں
پہنچ گیا ہے ۔

اٹھو ورنہ حشر نہیں ہوگا پھر کبھی ۔ دیکھو زمانہ چال قیامت کی چل گیا

میرا ضمیر مجھے ملامت کر رہا ہے ۔
میں نے تیرے ساتھ جو کچھ کیا اس کا خدا شاہد ہے ۔ دیکھ
کفران نعمت انسان کی کمینہ خصلتوں میں سے ہے ۔
ایسی خو نہ اختیار کر کہ چھتری قوم کو بٹہ لگے ۔ اب سب کے آگے
خدا کو شاہد کر کے کہتی ہوں کہ موہن گوپی کو اپنے آبائی ترکہ سے
محروم رکھنا چاہتا ہے ۔ اس نے مجھے گوپی کے نام کے کاغذات
دینے سے انکار کیا ہے ۔ لیکن پھر بھی مجھے امید ہے کہ اگر
وہ اپنا معاملہ بنظر غور سے کرے تو معلوم ہو کہ اس کی اس
تنگ نظری کی زبان نے کس طرح اس کے دھرم ، ایمان ، اور
عزت کو برباد کیا ہے ۔ یہی ایک گوشت کا پارہ کذب و
افترا کا آلہ ہے ۔ فحش بکنے کا وسیلہ ۔ اور عناد و فساد کی
بنیاد ہی ہے ۔ اگر اس کو اپنی زبان پر قابو ہوتا اور اپنے
ضمیر کی ملامت آمیز آواز کو سنتا اور ماننے سے پرہیز کرتا
تو آج یہ دن دیکھنا نصیب نہ ہوتا اس مٹے نے اس کے

اخلاق کو بگاڑا۔ اس کی صحت کے درپئے ہوئی۔ اس کے دل سے خدا کا خوف اور دنیا کا لحاظ مٹ گیا۔ باقی اس کا خدا اور شراب خانہ اس کا مندر رہا۔ نہ بیوی کی فکر ہے نہ دھرم کی لاج دو دو دن گذر جاتے۔ گھر میں آگ نہ جلتی۔ اور آپ ہیں کہ گھر آنے کا نام نہیں لیتے۔ بیوی مرجائے۔ جائیداد نیلام پر چڑھے۔ یا ناموس خاندان برباد ہو۔ انہیں کسی کی پروا نہیں۔ پنڈت جی جو کچھ کہنا تھا کہہ چکی۔ اب انصاف آپ کے ہاتھ ہے۔ آپ اس پر بیٹھے ہو۔ اس کے مقدس نام کی لاج رکھئیے اور انصاف کیجئے۔

گرداند۔ ست نرائن۔ رتن ناتھ۔ تم نے تو دونوں کا بیان سنا ہے۔ کہو تمھاری کیا رائے ہے۔ اے بیٹا ذرا دیکھو تو دروازے پر کوئی کنڈی کھٹکھٹا رہا ہے۔

رتن ناتھ اٹھ کر جاتے ہیں۔ اور تھوڑی دیر میں ایک شخص کو ساتھ لئے واپس آتے ہیں۔ اجنبی جو لباس و وضع سے کوئی خانگی ملازم معلوم ہوتا ہے۔ سب کو جھک کر نمسکار کرتا ہے۔ اور پھر موہن کو مخاطب کر کے کہتا ہے:-

ملازم۔ بابو جی میں سہارنپور سے آیا ہوں۔ اگر آپ کی اجازت ہو تو پیام سناؤں۔

موہن۔ ہاں کہو۔ کیا ہے؟ سب خیریت سے ہیں نا؟

ملازم۔ سب خیریت سے تو ہیں لیکن..........

موہن۔ تمھارا پس و پیش کرنا مجھے اور تکلیف دیتا ہے۔ کہو کیا ماجرا ہے؟۔

ملازم۔ کاش! میں پیدا ہی نہ ہوتا۔ جو آج اس صدمہ کا سامنا ہوتا۔ (گرداند۔ ارے تو کہے گا بھی کہ نہیں؟)

ملازم۔ کیا کہوں سرکار۔ پرملا دیوی نے جس وقت قرقی اور نیلام کی خبر سنی۔ تو اسی شب کو سنکھیا کھا کر دنیائے فانی کو خیرباد کہا۔

موہن۔ کیا؟ پرملا؟!

ملازم۔ ہاں۔ اور جس وقت لاش سپرد آگ کی گئی۔ اس وقت بھگوان جیسے کہ بسنت بابو کہاں سے دوڑتے ہوئے آئے۔ اور اپنی ننھی سی جان آغوش مادری کی جستجو میں قربان کردی۔

موہن یہ خبر سنکر زار و قطار رونے لگتا ہے۔ سب کے سب اس کیفیت سے متاثر ہو کر آبدیدہ ہو جاتے ہیں۔

"اب تو گھبرا کے یہ کہتے ہیں کہ مرجائینگے پر مر کے بھی چین نہ پایا تو کدھر جائینگے"

چند لمحوں تک سب پر سکوت طاری رہتا ہے۔ پھر پنڈت جی موہن سے یوں مخاطب ہوتے ہیں:-

گرداند۔ موہن بیٹا۔ بے شک تمھاری حالت بہت قابل رحم ہے۔ لیکن حکام ایزدی کے آگے انسان کی کیا مجال ہے کہ خلاف ورزی کچھ کر سکے۔ یہ صدمہ جانکاہ ہے۔ لیکن پھر بھی مجھے امید ہے کہ یہ صدمہ جانکاہ تمھاری گذشتہ زندگی میں ایک نیا ورق الٹے گا۔ اور تم اپنی آوارہ گردی اور مے نوشی سے باز آؤ گے۔ دیکھو خدا کے قہر سے بچو۔ اس کی خلاف مرضی تم نے یہ سب کچھ کیا۔ اور نتیجہ بھی دیکھ لیا۔ مے پرستی میں ایسے ہوئے کہ معبود حقیقی کی یاد دل سے محو ہو گئی اور تم بے باکانہ قعر ذلت و معصیت کی طرف بڑھتے چلے گئے۔ اب پرمیشور نے تمھاری آنکھیں کھول دی ہیں۔ تم دونوں کے بیان سے تو کچھ نتیجہ ہی نہیں نکلتا۔ ایک دوسرے کی بات کو رد کرتے ہو۔ سچ کیا ہے خدا ہی جانتا ہے۔ اگر حقیقتاً تم گذشتہ کی غلطی پر نادم ہو تو باز آؤ۔ مے نوشی تمہارے حق میں

سود مند نہ ہوئی۔ اب اس کی خاطر ایک معصوم بچے کے پال
پر نظر خیانت نہ ڈالو۔ پرمیلا۔ اور بسنت کی موت سے عبرت
حاصل کرو۔ غور کرو کہ یہ دو کس کے ظلم کے کشتہ ہیں۔ تمھاری
سنگدلی اور بے اتفاقی نے دو کا خون کیا۔ اب یوں ہی
اس یتیم بھانجے کی آہوں کا نشانہ نہ بنو۔ انسان خطا کا پتلا ہے
غلطی ہر انسان سے ہوا کرتی ہے لیکن خدا نے تمھیں عقل سلیم
عطا کی ہے۔ اس سے کام لو۔ اور اس کے آگے سر جھکا کر
عفو کے خواستگار ہو۔ وہی سب کا پتا و ماتا ہے۔ اسی کے
کرپا پر دنیا چلتی ہے۔

باب چہارم

ایشور تو ہے دیالو پتا دکھ دور کر ہمارا
تیری شرن میں آیا تو پربھو دیجئے سہارا

موہن اٹھ کر کمرے میں جاتے ہیں۔ اور تھوڑی دیر
کے بعد ایک پوٹلی اور چند کاغذات لا کر پدمنی کے آگے
رکھ دیتے ہیں۔ اور کہتے ہیں۔

"پدمنی خدارا مجھے معاف کرو۔ میں نے تمھارے
ساتھ بہت ظلم کیا۔ اور یہ تمھارے دستاویز اور زیور۔ بھگوان
کو گواہ رکھ کے ان سب کے آگے کہو کہ تم نے مجھے معاف کیا۔
ورنہ ابھی جان دے دوں گا۔ دنیا میں میرا اب کوئی نہیں رہا
تو پھر اس ہستی کا نابود ہو جانا ہی بہتر ہے۔ دیکھو میری حالت
زار پر رحم کرو۔ اور مجھے معاف کر دو۔ تاکہ میری روح کو
آنند ہو۔"

پدمنی آگے بڑھتی ہے۔ اور دونوں بھائی بہن لپٹ کر
بہت دیر تک روتے ہیں۔ سب پر ایک سکوت چھا جاتا ہے۔
اور پھر پدمنی آنچل سے آنسو پونچھ کر کہتی ہے:۔

پدمنی۔ میں آج اپنے آپ کو دنیا کی سب سے خوش قسمت
ہستی سمجھتی ہوں۔

کیوں؟ اس لئے کہ آج میرے بھائی کی نئی زندگی کا پہلا
دن شروع ہوتا ہے۔ وہ آج دنیا کی نظر میں ایک مفلس قلاش
تصور کیا جاتا ہے۔ نہ اس کے پاس دولت ہے۔ نہ عزت۔
نہ رفیق زندگی ہے نہ راحت جان فرزند۔ لیکن پھر بھی میں اسے
سب سے زیادہ خوش نصیب سمجھتی ہوں۔ اس لیے کہ اس
نے سب کچھ کھو کر ایمان کو حاصل کیا۔ اگر اس کا ایمان پکا رہا تو
اسے دنیا میں کسی کا ڈر نہیں۔ یہ فانی چیزیں اسے پھر مل سکتی
ہیں۔ موہن۔ اب اس ایمان کو جان شیریں سے عزیز سمجھو۔
اور راہ راست پر قدم جمائے رکھو۔ خدا جو کچھ دیتا ہے اس
پر قناعت کرو اور سجدۂ شکر بجا لاؤ۔ ہاں۔ یہ زیور میرا نہیں
پرمیلا کا ہے۔ کیا تمہارا ارادہ یہ ہے کہ میں زیور کو پہن کر جیتے جی
دوزخ کی آگ میں جلوں؟ مجھ سے یہ نہ ہوگا۔ لے یہ رکھ۔ جب
کوئی نئی بہن تیری آئے گی تو پہنے گی۔ لیکن کیا بات ہے کہ میرا دل اس
کی گواہی نہیں دیتا کہ پرمیلا کی خبر سچ ہے۔ اگر خدا کی مرضی ہے
تو یہ خبر ضرور جھوٹ ہوگی۔ کسے معلوم تیرے ہزار دشمن ہیں۔
شاید انہیں کی لگائی ہوئی یہ آگ ہو۔ کچھ بھی ہو جب تک کوئی
خط ہمارے پاس نہ آئے میں کبھی اس خبر کو سچ نہ مانوں گی۔

ملازم۔ سرکار۔ مجھے خدارا معاف کیجئے میں نے یہ
جو کچھ خبر سنائی ہے غلط ہے۔

گرداننند۔ غلط! اس سے تمھارا مدعا کیا ہے؟

ملازم۔ پنڈت جی واقعہ یہ ہے کہ میں اور میرا ساتھی
جگت سنگھ اس موضع کو (نرک مسکرات) کی کوشش پر آئے ہوئے ہیں
زمانہ دراز سے یہاں ہمارا یہی مدعا رہا ہے کہ ہم کسی نہ کسی طرح یہاں

کے حالات سے بخوبی واقف ہوں۔ اور لوگوں کو مئے سے
پرہیز کرنے کی ہدایت کریں۔ ہمارے آنے کے بعد ہی بہت سے
مئے خانے قہوہ خانوں سے مبدل ہو گئے ہیں۔ پرسوں
رات کو ہم دونوں یونہی ٹہل رہے تھے کہ بھیس میں رات کی
تاریکی میں تو مئے نہ فروخت ہوتی ہو۔ کیا دیکھتے ہیں کہ ایک
عورت گود میں ایک نو عمر بچہ کو لیئے جلد جلد قدم اٹھائے جا رہی
ہے۔ ہم بھی پیچھے ہو لئے۔ اور شروع سے اب تک تمام
واقعات کو دیکھتے آئے۔ جس وقت آپ لوگوں میں
باتیں ہو رہی تھیں اس وقت میرے ساتھی بابو جگت سنگھ محلہ والوں
سے بابو موہن راؤ کے خانگی حالات دریافت کر آئے۔ اور
صلاح دی کہ میں اندر پہنچ کر یہ ہنگامہ ختم کر ڈالوں۔ اور آپ
کے اثر کو دیکھوں۔ غرض میں نے کنڈی کھٹکائی۔ اور اس
کے بعد جو کچھ ہوا وہ آپ کو معلوم ہے۔ بمصداق۔

دروغ مصلحت آمیز بہ از راستی فتنہ انگیز

ہمارا منشا یہ تھا کہ کسی طرح اندر تک پہنچیں اور ایک
معصوم ہستی کو قعر ذلت و معصیت میں گرنے سے بچائیں۔

اب آپ لوگوں پر ظاہر ہے کہ مئے کا اثر انسان کے
تمام قوا پر ہوتا ہے۔ صحت مضمحل ہو جاتی ہے۔ بری صحبتوں
سے سابقہ پڑتا ہے۔ مہذب مذاق فحش گوئی اور کمینہ خصلتی سے
بدل جاتا ہے۔ فضول خرچی اور آوارگی طبیعت میں پیدا
ہو جاتی ہے۔ انسان سے اصلی شرم و حیا رخصت ہو جاتی
ہے۔ نہ اس کو دنیا کی پروا اور نہ دین کا لحاظ رہتا ہے
اس کے لئے کیفیت جام ایک نئی دنیا پیدا کر دیتی ہے۔
اسی شراب نوشی کے باعث ہزاروں خاندان تباہ اور لاکھوں
گھر اجڑ گئے۔

بابو صاحب تمہیں اب شکریہ الہی ادا کرنا چاہیئے کہ تمہاری
زندگی کی کشتی تباہ کن طوفان سے بچائی گئی ہے۔ آپ کی جانثار
بیوی اور نو عمر لسنت حیرت سے ہیں۔ انہیں یہاں کی کچھ خبر نہیں۔
اب ہم آپ سے اس بات کی التجا کرتے ہیں کہ آپ ہماری کمیٹی
کی کامیابی کا بیڑا اٹھائیں۔ اور جس طرح آپ کی زندگی میں
ایک خوش آئند انقلاب پیدا ہوا ہے۔ اسی طرح اپنے ہم
وطنوں کی زندگی میں انقلاب پیدا کریں۔ کتنی ہستیاں ہماری
غفلت کے باعث بحر معصیت میں غرقاب ہوئی جاتی ہیں۔

"سرخرو ہوتا ہے انساں ٹھوکریں کھانے کے بعد"

القصہ بابو موہن راؤ نے بہت ہی کم عرصہ میں اپنی محنت کی
کمائی سے اپنی معاشرتی حالت کو سنبھال کر۔ بیوی اور بچہ کو میکے سے
لے آئے۔ اور اب خانگی زندگی کی نعمتوں سے لطف اٹھا رہے
ہیں۔

راہ میں جاؤ تو ہر ایک بچے کی زبان پر بابو موہن راؤ کا
نام ہوگا۔ وہی ہیں جو اس نئی پود میں ایک تازہ روح
پھونک رہے ہیں۔ ان کی زندگی ایک خوش آیند نمونہ
ثابت ہوئی ہے۔

اب اسی گھر میں جہاں خانہ جنگی، بے ایمانی،
اور نکبت و افلاس برستا تھا، وہاں۔ اتحاد، محبت،
صداقت، حق شناسی اور حق گوئی کی سچی تصویر
نظر آتی ہے۔

خورشید بیگم

ہندوستان کا رسم الخط

مجھے اکثر مدارس دیکھنے کا اتفاق ہوتا ہے ان مختلف زبانوں کی تعلیم کو جاری رکھنے کے لئے جو انتظامات اور اہتمام کئے جاتے ہیں میں آتا ہے وہ دیکھ کر مجھے بڑا افسوس ہوتا ہے۔ کیونکہ اس طریقہ سے مدارس کے اخراجات بھی زیادہ ہوتے ہیں۔ اور معلموں اور بچوں کے اوقات بھی ضائع ہوتے ہیں مختلف قسم کے رسم الخط کو سیکھنے میں جو محنت بچوں کو اٹھانی پڑتی ہے اس کا اثر آئندہ طلباء کی اس دماغی نشو ونما اور عملی قابلیت پر پڑتا ہے۔ جو کہ فراغت تعلیم کے بعد ان کو حاصل ہونی چاہئے تھی۔ اور جو اخراجات کسی مدرسہ میں مختلف زبانوں کی تعلیم پر صرف کئے جاتے ہیں۔ اگر ہمہ تعلیم ایک رسم الخط میں رکھی جانے تو اتنے ہی اخراجات سے موجودہ تعداد سے چوگنا زیادہ طلباء کو تعلیم دی جا سکتی ہے۔

میں نے دیکھا ہے کہ مختلف زبان اور رسم الخط کو سیکھنے کے لئے مختلف فرقے اپنی اپنی کلاس میں حاضری دیتے ہیں۔ لیکن انگلش کی کلاسوں میں سب ہی بچے شرکت کرتے ہیں۔ لہٰذا انگلش میں ان کا تعلیمی نصاب رکھ کر دیگر مقامی زبانوں کے لئے رومن رسم الخط رکھا جائے اور رومن رسم الخط ہی میں ہندوستانی زبان کی تعلیم دی جائے تو ہماری مشکلات رفع ہو سکتی ہیں۔ ابتدائی جماعتوں میں انگلش نصابی تعلیم کے ساتھ ساتھ رومن رسم الخط میں فرقہ واری یا مقامی زبان کی بھی حسب ضرورت تعلیم دی جا سکتی ہے۔ اس کا نتیجہ یہ ہوگا کہ بچے بہت قلیل مدت میں اپنا کورس (نصاب) ختم کر سکیں گے اور علم سے بہرہ ور ہو کر ان کو اپنی قابلیت حاصل کرنے نیز خوض کرکے اپنی دماغی قابلیتوں کو بڑھانے کا موقع ملے گا۔ بجائے اس کے کہ مختلف زبانوں کے حروف تہجی اور ان کے ہجے وغیرہ کو رٹنے میں اپنی طاقتیں خرچ کریں۔ ملک کا جو روپیہ انگلش سے بڑی بڑی کتابوں کے دوسری زبانوں میں ترجمہ کرنے میں صرف ہوتا ہے وہی روپیہ تعلیم کے ملک میں پھیلانے میں لگایا جا سکتا ہے۔

اب رہی عوام الناس کی رائے کہ ہماری زبان کو کیسے چھوڑیں یہ محض ایک ہٹ ہے۔ جب ایک فرقہ اپنی مادری زبان کو نہیں چھوڑنا چاہتا۔ تو دوسرا فرقہ بھی اس کے مقابل میں مادری زبان کے لئے اڑ جاتا ہے۔ بدنصیبی سے جب کہ مادر وطن کی ایک زبان ایک رسم الخط ہی نہیں ہے تو پھر میرے خیال میں مادری زبان کا دعوٰے ہی بے بنیاد ہے۔ ہم کو تو وقت اور اس کی ضرورت کو دیکھنا چاہئے۔ جو طریقہ ہماری زندگی کی ضرورت کو پورا کرنے میں مدد دیتا ہے اور سہولت پیدا کرتا ہے۔ اس کو اختیار کرنے میں کبھی بھول یا دیر نہ کرنی چاہئے۔ آپ یاد کیجئے کہ ابتدائے آفرینش سے اب تک خدا جانے ہم نے کتنی زبانیں بدل دی ہیں اور حقیقت میں ایک انسان کی قدرتی زبان کیا ہو سکتی ہے یہ نہیں معلوم فرض کیجئے کہ ایک بچہ کو جنگل میں چھوڑ دیا جائے تو وہ کونسی زبان بولے گا۔ اور ہم لوگ ضرورت اور مصلحت کے لحاظ سے اپنا لباس تبدیل کر دیتے ہیں۔ خوراک بدل دیتے ہیں۔ مکان کا نقشہ بدل دیتے ہیں مقام سکونت بدل دیتے ہیں تو رسم الخط کیا ہے اس کو بدلنا کیا مشکل ہے جس کے بدلنے سے ہماری بڑی بڑی مشکلیں آسان ہو جاتی ہیں ہندوستان میں اتحاد ہو جاتا ہے رومن رسم الخط میں اگر اردو ہندی ایک ہو جاتی ہے مختلف فرقے اور صوبہ جات اس کو بغیر استاد کی مدد کے پڑھ سکتے ہیں اور ایک دوسرے کی زبان سمجھنے کے قابل بن سکتے ہیں۔ علاوہ ازیں رومن رسم الخط آج ساری دنیا کا رسم الخط ہے البتہ خاص طور پر اس کا (عالم) بننے والوں کے لئے یونیورسٹیوں میں مختلف زبانوں کے رسم الخط کو جاری رکھا جا سکتا ہے لیکن عام طور پر تعلیم پانے والے بچوں کے لئے تو سہولت پیدا کرنا چاہئے آخر میں میری یہ استدعا ہے کہ کم از کم ایک اسکول میں طریقہ کا تجربہ قائم کر کے اور دیکھیں کہ اس کا نتیجہ کیا مفید ثابت ہوتا ہے

مسٹر ڈی برکت رام

بازاری دوافروش یا سفری حکیم

اگر آپ بازاری دوافروشوں یا سفری حکیموں کی زیارت کرنی چاہتے ہیں تو شام کے وقت آفتاب غروب ہونے سے ذرا پیشتر کسی بڑے شہر کے گنجان حصے، وسیع میدان یا کسی مشہور بازار میں چلے جائیے تو آپ کو کئی بزرگ ہاتھوں میں شیشیاں دبائے کڑاکی کڑاک آواز لگاتے ہوئے لہک لہک کر اشعار پڑھتے ہوئے دکھائی دیں گے۔ بس یہی بازاری دوافروش یا سفری حکیم ہیں۔

ان میں ہر ایک شخص اپنے زمانہ کا بقراط اور جالینوس ہونے کا دعوی کرتا ہے۔ ان کی چرب زبانی اور جادو بیانی دیکھنے کے قابل ہے۔ زبان قینچی کی طرح چلتی ہے آنکھیں الگ مٹکتی ہیں اور ہاتھ پاؤں الگ ناچتے ہیں۔ کوئی صاحب موٹر پر کھڑے تقریر فرماتے ہیں کوئی تانگے پر بیٹھے شیخیاں بگھارتے ہیں اور کوئی صاحب صندوق پر کھڑے ہو کر اپنی قابلیت کا مظاہرہ کرتے رہتے ہیں۔

اب ہم آپ کو ایک بازاری دوافروش کی تصویر کھینچ کر بتاتے ہیں جس سے آپ کو ان کی لفاظی، عام معلومات اور طرز تقریر کا بہت کچھ اندازہ ہو جائے گا اور پتہ چلے گا کہ وہ کس طرح پبلک کو اپنے گرد جمع کر لیتے ہیں اور کس طرح بھولے بھالے لوگوں کو الو بنا کر اپنا الو سیدھا کرتے رہتے ہیں

کلکتہ میں ایک کھلا ہوا مقام ہے جس کو چورنگی کہتے ہیں۔ شام کو یہاں خاص طور پر ہر قسم کے لوگ جمع ہوتے ہیں۔ ایک روز کا ذکر ہے کہ وہاں ہم نے ایک حکیم نما بزرگ کو مونڈھے پر بیٹھے ہوئے دیکھا۔ ان کے داہنی جانب ایک چھوٹی سی تپائی تھی جس پر ایک ہینڈ بیگ اور چند شیشیاں رکھی تھیں۔ اور سامنے ایک جنگلی نیم برہنہ اور نہایت کریہہ منظر شخص کھڑا تھا۔ معلوم ہوتا تھا کہ یہ شخص اول بندر یا چمپانزی تھا مگر ہمارے حکیم صاحب اپنی ایجاد کردہ دوا کے ذریعے اسے انسان بنانے کی کوشش میں مصروف ہیں۔ اس جنگلی کے گلے میں ایک بڑا سا تختہ لٹکا ہوا تھا جس پر بندر اور انسان کی تصویریں تھیں۔ اس کی پیٹھ مونڈھا اور پیشانی پر حکیم صاحب نے اپنا نام اور اپنی دوا کا نام سفیدے سے لکھ د تھا۔ اس کے داہنے ہاتھ میں ایک ڈگڈگی تھی، بائیں ہاتھ میں دوا کی شیشیاں تھیں اور وہ ڈگڈگی بجا بجا کر ناچتا تھا اور عجیب و غریب حرکتیں کر ر

ہمارے حکیم صاحب نے جب دیکھا کہ کافی لوگ جمع ہو گئے ہیں تو اس جنگلی کو اشارے سے روکا۔ خود مونڈھے پر کھڑے ہو گئے اور کڑک کر یوں بیان کیا:

نالۂ بلبل شیدا تو سنا ہنس ہنس کر ﴿ اب جگر تھام کے بیٹھو مری باری آئی

دوستو! مجھے اس حالت میں دیکھ کر آپ لوگ کوئی معمولی آدمی نہ سمجھ لینا۔ میں خدا کے فضل سے ایک لکھ پتی کا لڑکا ہوں مگر پبلک کی سیوا کرنے کا شوق اور سیاحت کا ذوق ہے اس لئے میں نے اپنی یہ حالت بنا رکھی ہے۔ شاعر کہتا ہے کہ

ہوتے سیرت سے ہیں مردان، علاوہ تم سازینہ ﴿ ورنہ صورت میں تو تشہبار سے کچھ کم نہیں جہل

اور کہتا ہے کہ

شوق ہر رنگ رقیب سروساماں نکلا ﴿ قیس تصویر کے پردے میں بھی عریاں نکلا

اور کہتا ہے کہ

دولت سے ہے پیشۂ آبا سپہ گری ﴿ کچھ شاعری ذریعۂ عزت نہیں مجھے

اس مختصر تمہید کے بعد میں آپ کی خدمت میں وہ بے مثل دوا پیش کر رہا ہوں جس کو دیکھ کر چین، ہمالیہ، جرمنی، ارمنی، جاپان، ترکستان اور امریکہ اور ہندوستان، غرض سب کے سب انگشت بدنداں ہیں۔ اس دوا کا ادنی کرشمہ یہ ہے کہ اگر مردے کے حلق میں ڈال دی جائے تو پہلی خوراک میں اس کے تمام شریر میں بجلی دوڑ جائے گی۔ دوسری خوراک میں ہاتھ پاؤں میں حرکت پیدا ہو جائے گی، اور تیسری خوراک میں تو یقین جانئے کہ وہ کفن پھاڑ کر بھاگنا شروع کر دے گا۔ شاعر کہتا ہے کہ

اللہ رے ذوق دشت نوردی کہ بعد مرگ ﴿ ہلتے ہیں خود بخود مرے اندر کفن کے پاؤں

پر تو شرط اتنی ہے کہ مردے کا شریر ٹھنڈا نہ ہونے پائے اور دم نکلنے

کہ ایک گھنٹہ اندر باہر یہی خوراک حلق میں ڈال دی جائے۔ شاعر کہتا ہے کہ

ناوک نے تیرے صید نہ چھوڑا زمانہ میں
تڑپے ہے مرغ قبلہ نما آشیانہ میں

اس شعر کے پڑھنے کے بعد حکیم صاحب نے مجمع پر نظر ڈالی تو دیکھا کہ ہر شخص متوجہ تھا اور وہ دوا خریدنے کے لئے بے قرار تھا۔ اس نے تین چار شیشیاں ہاتھ میں لے کر سب کو دکھائیں اور پھر اس طرح تقریر شروع کی کہ

حضرات! اس دوا کے کھانے ہی جوع البقر ہو جاتا ہے یعنی بھوک اس قدر بڑھ جاتی ہے کہ انسان کنکر پتھر چبانے شروع کر دیتا ہے اور معدے میں ایسی شکتی پیدا ہو جاتی ہے کہ وہ لوہے اور پتھر کے ٹکڑوں کو بھی ہضم کر جاتا ہے۔ یہ دوا دیابطس، کھانسی، نزلہ، زکام، درد سر، درد دل، درد جگر، امراض چشم، امراض کبد، پلیگ، ہیضہ، کالا بخار، لال بخار، گورن تو بخار، غرض یہ جملہ امراض انسانی او حیوانی، جسمانی اور روحانی کے لئے نہایت مجرب المجرب اور سریع التاثیر ہے۔

دوستو! اشتہار بازوں کی زہریلی اور خطرناک دواؤں سے بچو۔ ڈاکٹر اور حکیموں کو فیس دے دے کر اپنا روپیہ برباد نہ کرو۔ اگر تمہارے ہر دوں میں دم اور گردوں میں ایکس ہیں تو اس دوا کو فوراً سے ورتو جس کو میرے گرو جی نے ہمالیہ پربت کی سب سے بلند چوٹی پر بیٹھ کر جس دم کا عمل سادھ کر تین سو سال ریاضت کرنے کے بعد خالص دیسی بوٹیوں سے تیار کیا ہے۔ مسلمان بھائیوں کو ایمان کی قسم اور ہندو بھائیوں کو دھرم کی سوگندھ دے کر کہتا ہوں کہ یہ دوا سرشٹی یا نرنک ویشٹی ہے جس کی تصدیق بڑے بڑے لیڈر کرتے چلے آرہے ہیں۔ اس میں ہزاروں دیسی بوٹیوں کے علاوہ دو سیر سنکھیا، بارہ تولہ سم الفار، دس تولہ رس کپور، آٹھ تولہ کچلہ، دس تولہ بش عقرب اور پندرہ تولہ خالص دیسی زہروں کی روح ہے، جس کو سانپ کے منہ میں منتر کر کے ناگ پنچمی کے روز نینی تال جنتر کیا گیا ہے۔

اگر کسی کے معدے میں گیس اور دماغ میں بھس بھر گیا ہو، یا خدانخواستہ دل کی جگہ جگر اور جگر کی جگہ مثانہ منتقل ہو گیا ہو تو چلو آگے بڑھو اور نین بند کر کے اس دوا کو نوش جان کر جاؤ۔

شاعر کہتا ہے کہ

وقت پر قطرہ بہت ہے ابر خوش انجام کا
جل گئی کھیتی اگر برسا تو پھر کس کام کا

دوستو۔ اس دوا کی دوسری تاثیر یہ ہے کہ اس کی ایک خوراک پتھر کو پانی اور پانی کو خون بنا دیتی ہے۔ یہ دیکھئے آپ کے سامنے اس گلاس میں جل ڈالتا ہوں، ذرا نین جما کر دیکھئے اور بتائیے کہ اس کا رنگ کیسا ہے؟

تمام لوگوں نے پانی کو غور سے دیکھ کر کہا کہ جناب اس کا رنگ سپید ہے۔ اس کے بعد خدا معلوم اس نے کوئی سپید رنگ کی دوا ڈال دی جس سے پانی بالکل لال ہو گیا۔ اور کہا بھلا بتاؤ کہ اب اس کا رنگ کیسا ہو گیا لوگوں نے بغور دیکھا اور کہا کہ اب اس کا رنگ لال ہو گیا۔ حکیم صاحب یہ سن کر اکڑ گئے پھر مونچھوں پر تاؤ دے کر نہایت فخریہ لہجہ میں فرمایا کہ

ہاں! لال ہو گیا یعنی پانی مثل گلال ہو گیا۔ یہ دیکھو جادوگر کا کمال ڈالے سپید نکلے لال۔

دوستو جس طرح دوا کے ایک قطرہ نے پانی کو خون بنا کر رکھ دیا۔ اسی طرح وہ روگی ضعف نے جس کا خون نچوڑ کر زرد پتی کی طرح زعفرانی کر دیا ہے ایک خوراک میں اس کے جسم میں شراب ارغوانی کی طرح سرخ خون دوڑنے لگے گا، جسم کندن کی طرح چمکنے لگے گا اور چہرہ چقندر کی طرح لال ہو جائے گا۔

دوستو! میرا دعویٰ ہے کہ سو برس کا بڈھا کم نسٹ ایک خوراک میں بیس برس کا نوجوان گبرو بن جائے گا۔ یہ دوا ہندو ہو یا مسلمان عیسائی ہو یا پارسی، کو آپریٹر ہو یا نان کو آپریٹر۔ روگی ہو یا نروگی، بیمار ہو یا تندرست، مردہ ہو یا زندہ سب کے لئے یکساں مفید ہے

تندرست آدمی کے لیے ایک شیشی مرتے دم تک کافی ہے۔ بیمار کے لیے نصف شیشی یعنی چالیس روز تک کام دیتی ہے اور جو شخص بستر مرگ پر پڑا ہوا دم توڑ رہا ہو اس کے لیے صرف پاؤ شیشی درکار ہے دو چار قطرے حلق میں ڈال دیے جائیں اور دو لفن چھڑک دی جائیں پھر قدرت کا تماشا دیکھیے۔ شاعر کہتا ہے کہ

اک خون چکاں کفن میں کروڑوں بناؤ ہیں ۔ پڑتی ہے آنکھ تیرے شہیدوں پہ حور کی

بیرونی کمزوریوں کے لیے ضماد کیا جائے، اندرونی بیماریوں کے لیے جوشاندے کی طرح استعمال کیا جائے، حلق میں درد ہو تو غرغرہ کیا جائے دانتوں میں درد ہو، دانت ہلتے ہوں، مسوڑے پھول گئے ہوں، حلق میں سوزش ہو تو تھوڑی سی دوا انگلی پر ڈال کر منجن کی طرح رگڑیے انشاء اللہ ایک رگڑے میں ہلتے ہوئے دانت آئس کریم کی طرح جم جائیں گے۔

حکیم صاحب نے ابھی یہ جملہ پوری طرح ختم بھی نہیں کیا تھا کہ ایک عمر رسیدہ شخص آگے بڑھا اور پوچھا کہ حکیم صاحب اگر دانت ٹوٹ گیا ہو تو کیا کیا جائے؟ سفری حکیم نے فوراً ہنس کر کہا کہ میرے میاں! وہ کوئی بات نہیں ہے اس گرے ہوئے دانت کو ذرا تر کر کے پھر وہیں چپکا دو اور قدرت کا تماشا دیکھو بھگوان کی کرپا سے وہ اس طرح بیٹھ جائے گا جیسے انگوٹھی میں نگینہ۔ دوسرے صاحب نے بڑھ کر کہا کہ حکیم صاحب میرا سانس بہت جلد جلد چلتا ہے۔ حکیم صاحب نے جواب دیا کہ گھبراؤ اللہ شافی ہے۔ بسم اللہ کر کے یہ دوا پیو انشاء اللہ ایک خوراک میں سانس چلنا بالکل بند ہو جائے گا۔ پھر تو مجمع میں ایک حرکت پیدا ہوئی اور ہر شخص نے بڑھ کر کہا کہ حکیم صاحب ایک شیشی ہم کو بھی دیدو۔ سفری حکیم نے بڑھتے ہوئے مجمع کو ہاتھ کے اشارے سے روکا اور ڈپٹ کر کہا کہ ابھی ٹھہرو پہلے میں اپنے بیان کو ختم کر لوں پھر دوا تقسیم کروں گا۔ لوگ بدستور اپنی اپنی جگہ پر کھڑے ہو گئے اور انھوں نے پھر اسی طرح اپنی تقریر شروع کی:-

اچھا دوستو! یہ دیسی اور پردیسی ادویات کا سرتاج شہرۂ آفاق ہے۔ اس کا رجسٹرڈ نمبر چھتیس ارب بارہ کروڑ دو سو بارہ ہے۔ دوسری پہچان یہ ہے کہ اس پر پرشش مارکہ بنا ہوا ہے اور اس دوا کا نام دافع الارواح قاطع الامراض ہے۔

آپ نے اس کے گن سن لیے، نام سن لیا اب دام بھی سن لیجیے۔ دوستو! میرے گرو جی کا حکم ہے کہ دوا مفت تقسیم کر دی جائے دام ہرگز نہ لیے جائیں جس کو واقعی ضرورت ہو وہ آگے بڑھ کر ہاتھ اٹھائے اور جس کو ضرورت نہیں وہ مہربانی کر کے دو دو قدم پیچھے ہٹ جائے۔

سفری حکیم کے منہ سے یہ بات سن کر مجمع میں بھی ایک حرکت پیدا ہوئی اور بجائے پیچھے ہٹنے کے سب لوگ ہاتھ اٹھا کر سامنے بڑھ آئے۔ سفری حکیم نے دیکھا کہ لنگنگہ کا جادو کارگر ہوا اور ہر شخص جال میں پھنسا ہوا نظر آ رہا ہے تو پھر ایک آواز لگائی اور کہا کہ

دوستو! اس وقت سب کے سب حاجتمند نظر آ رہے ہیں۔ گر میں سب کو کسوٹی پر کس کر دیکھوں گا۔ اور یہ دوا صرف ان لوگوں کو ہی دوں گا جن کو واقعی سخت ضرورت ہے۔ شاعر کہتا ہے۔

بک جاتے ہیں ہم آپ متاع سخن کے ساتھ ۔ لیکن عیار طبع خریدار دیکھ کر

اے میرے دوستو! میرے گرو جی کے حکم کے مطابق مجھے اس دوا کی ایک کوڑی بھی لینا حرام ہے مگر شیشی کی قیمت لیبل کے دام اور میرے حقیقی اخراجات سب ملا کر چار آنے کچھ پائی ہوتے ہیں۔ وہ کچھ پائی تو میں معاف کرتا ہوں، اب جو صاحب چار آنے دیں گے صرف ان کو ہی یہ دوا مفت تقسیم کر دی جائے گی جس کو لینا ہو پانچ منٹ کے اندر اندر حاصل کر لے ورنہ پانچ منٹ گزر جانے کے بعد اگر افلاطون خان بھی آسمان سے اتر آئیں گے تو ان کو بھی صاف جواب دیا جائے گا۔

بازاری دوا فروش کا الٹی میٹم سن کر ہر شخص نے فوراً چار چار آنے اپنی جیب سے نکالے۔ سفری حکیم ایک ہاتھ سے چار آنے لیتا تھا اور دوسرے ہاتھ سے دوا کی شیشی دے کر یہ شعر پڑھتا تھا۔

کلجگ نہیں کرجگ ہے یہ ۔ یاں دن کو دے اور رات لے
کیا خوب سودا نقد ہے ۔ اس ہاتھ دے اس ہاتھ لے

تھوڑی دیر کے بعد وہ بھیڑ چھٹ گئی۔ ہر شخص خوشی خوشی دوا کی شیشی لے کر اپنے گھر کی طرف چل دیا مگر سفری حکیم صاحب مع اپنے چپراسی کے وہیں بیٹھے ہوئے

خوردہ گنتے رہے خدا معلوم ان بے چارے خریداروں پر کیا گزری مگر ہمارے حکیم جی کے پو بارے ہو گئے اور خوردہ گننے کے بعد پتہ چلا کہ کچھ اوپر نیس کا جڑا اور خوردہ ہنڈ بیگ میں جھنک رہا تھا۔ یہ ہے ہمارے حکیم کی سرگزشت اور اسی کو چلتی ہوئی حکمت کہتے ہیں۔

مرزا عصمت اللہ بیگ

(یہ مضمون حیدرآباد ریڈیو اسٹیشن سے نشر کیا گیا تھا)

سوتیلی ماں

(ادارہ کی ایک دلچسپ زیر طبع کتاب کا ٹکڑا)

بڑے بوڑھے کہا کرتے ہیں کہ "ماں" کہنے میں
دونوں ہونٹ مل جاتے ہیں جو دلیل ہے اس بات
کی کہ یہ رشتہ تمام تعلقات سے قریب تر و شیریں
تر ہے کوئی شک نہیں کہ اس رشتہ کی شیرینی
جیسی لب بند کرنے والی، اس کی قربت جیسی روح
کو بالیدہ بنانے والی ہے کوئی تعلق کوئی رشتہ اس کا
مقابلہ نہیں کرسکتا اس نعمت عظمیٰ کی قدر تو انہیں کو
ہو سکتی ہے جو اس کو کھو چکے ہوں۔ ماں کا وجود
سراپا رحمت اور اس کی محبت کا خوش اثر و نیک انجام
ہونا یقینی ہے برخلاف اس کے سوتیلی ماں کا رشتہ
رشتوں میں بعد و تلخی کے اعتبار سے زبان زد
و عام ہے اس کا تلخ تعلق محبت سے ملوا اس کی
محبت کاہش جان اس کی ہستی ہمہ تن زحمت اس کے
عمل کے تاثرات کا بدنتیجہ ہونا امر حقیقی خیال کیا
ہے۔ سوتیلی ماں وہ پرہول از تعاش انگیز موقع
جس سے روح دہل اٹھے وہ حسیات سے عاری سنگین
ہے جس کو لطیف سے لطیف جذبہ بھی متاثر نہ کرسکے
ایسی مشین ہے جو اپنے ہی کل پرزوں کو پارہ پارہ
رکھ دیتی ہو۔ ایک ایسا شکنجہ ہے جو قریب ہونے
والے کو پیس ڈالے۔ طوفان خیز باراں اور
سوز بجلی۔ غرض سوتیلی ماں کو جو بھی کہئے عام
کا اس پر صاد ہے سوتیلی ماؤں کی حیثیات
انہ ہیں۔ مگر اس وقت میری مراد ایسی سوتیلی ماں
ہے جو بچوں کی ماں کے فوت ہونے پر لائی گئی ہو۔
اس حقیقت سے کون انکار کرسکتا ہے کہ
سوتیلی ماں اور بچوں کے تعلقات کے ناگفتہ بہ نتائج ظاہر ہوتے
رہے اور ہو رہے ہیں۔ اگرچہ موجودہ تعلیم سے آراستہ
اور مہذب دور میں بے شبہ اس کیفیت نے بھی ایک
اصلاحی جامہ زیب تن کر لیا ہے۔ مگر "خاموش ہیں
گوشۂ دل چھپ ہوئے ہیں" یہ ایک کھلی ہوئی حقیقت
ہے کہ اکثر و بیشتر گھروں میں اس تعلق کے ناخوشگوار
اثرات ہر متعلقہ ہستی کے لئے عذاب جان اب بھی
بنے ہوئے ہیں۔

اگرچہ متعدد اصحاب موضوع بالا پر طبع آزمائیاں
کرچکے ہیں۔ مضامین لکھے گئے افسانے تحریر ہوئے
ناولوں پر خامہ فرسائیاں کی گئیں۔ مگر اتنا کہنے پر میں
مجبور ہوں کہ سب بس ایک لکیر کو پیٹتے رہے ہیں کہ
سوتیلی ماں آئی باپ اس کے ہاتھ میں کٹھ پتلی بن گیا۔
اس نے بچوں کے ساتھ ظالمانہ بہیمانہ سلوک شروع
کردیا۔ کوئی بچہ راہی عالم بقا ہوا۔ کوئی دائم المریض بن کر
عمر بھر کے لئے بیکار ہوگیا۔ کسی کو ایسی سسرال اور شوہر
کے حوالے کردیا گیا جو اس کے لئے دوسرا جہنم ثابت ہوا
کسی کو محروم الارث کرکے حیران و سرگرداں سر بصحرا
چھوڑ دیا گیا۔ بہرحال وہ ستم کارانہ درندگیاں کہ
الامان الحفیظ!

یہ باتیں خالی از صداقت اور مبالغہ بے بنیاد ہرگز
نہیں۔ بلاشک سیکڑوں معصوم ہستیاں سوتیلی ماؤں کے
دستِ ستم کی بھینٹ چڑھ گئی ہیں مگر سوال یہ ہے کہ اس کی
ذمہ دار کیا صرف ایک ہی ہستی ہے۔ اگر اسی کو تسلیم کرلیا جائے تو
اس کے انسداد کی صرف یہی ایک صورت ہے کہ اس نسخہ کو
خار راہ بننے ہی نہ دیا جائے۔ صاحب اولاد اشخاص بچوں کی

ماں کے انتقال کے بعد اپنی زندگی بچوں کے لئے وقف کردیں
مگر ایسا نہیں ہوا۔ نہیں ہوتا اور فطرتاً نہیں ہوسکتا۔
جب یہ رشتہ ناگزیر ہے تو پھر یہ امر غور طلب ہے کہ
وہ کونسے اسباب اور وہ کون کون ذمہ دار ہستیاں ہیں
جو اصل الاصول اور جن کے کندھوں پر اس رشتہ کے
شیریں و خوش گوار یا تلخ و ناگوار بنانے کا بوجھ ہے سب سے
پہلی چیز ہے۔

(۱) ارث و ماحول۔ جس گھر میں انسان پیدا
ہوتا جس فضا میں پلتا بڑھتا ہے اس کے اثرات نہایت
استحکام و پختگی کے ساتھ اس کے دل و دماغ میں جاگزیں
ہوتے چلے جاتے ہیں اور ان کے تواتر و مداومت سے
فطرت انسانی طبیعت کا پیکر اختیار کرلیتی ہے۔ مثل مشہور
ہے کہ عادت طبیعت ثانی کا حکم رکھتی ہے۔ علم و جہل، ظلم و رحم
دانش و ناقہمی، حق شناسی و ہٹ دھرمی، حق طلبی و
حق رسانی، ایثار و خود غرضی، حسد و فراخ دلی، نفسانیت
و نفس کشی، حرص و قناعت، وسیع الخیالی و تنگ نظری۔
ربوبیت و خود پروری، نیکی و حسن سلوک، ضبط و غصہ
نرم کلامی و تیز زبانی، تحمل و شعلہ خوئی، مذہبیت و الحاد
خوف خدا و ناخدا ترسی، شرم رسول و محاسبۂ نفس،
فکر عاقبت و پاس دنیا یہ سب باتیں انسان اپنے ارث
و ماحول سے اخذ کرتا ہے۔ اگرچہ اس کے متعلق ایک
کلیہ نہیں قائم کیا جاسکتا۔ کیونکہ کبھی ولی کے پیٹ میں
شیطان اور شیطان کے پیٹ میں ولی جنم لیتے ہیں
نااہلوں کی اولاد اہل اور صالحوں کی اولاد طالح
نکلی ہے۔ برے ماحول اور بدطینتوں کی صحبت میں رہ کر
بھی اکثر افراد مابہ الامتیاز کردار کے حامل ہوئے ہیں
مگر الشاذ کالمعدوم۔
قوت اکثریت کو حاصل ہے اور اکثریت کل
رکھتی ہے۔ ادبی مذاق رکھنے والے خاندان
کی پیداوار عینی مشاہدہ ہے۔ شریف النفس
سیرت اسلاف کے اخلاف بھی اکثر نہیں کے
ثابت ہوئے ہیں۔ نیک طینتی وراثتاً پشت ب
عجیب عجیب مظاہرے دکھاتی رہی ہے۔ خصیلے
مستقید بیت عادات بد اخلاق والدین کی ا
انہیں کے نقش قدم پر گام زن ہونا امر بدیہی
بیٹا سپاہی اور چور کا پوت بالعموم چور ہی نکلت
انسان جو کچھ اپنے ارث و ماحول سے حاصل کر
اس پر ارادتاً ہی نہیں بلکہ بلا ارادہ عامل
مجبور رہتا ہے۔ پس نہایت ضروری ہے کہ یہ ر
کرنے سے پیشتر فریقین اس امر کا بخوبی اطمینا
جس خاندان میں وہ عمر بھر کے لئے سلسلۂ قر
رہے ہیں وہ کس سیرت و کردار کے افراد
معاشر اور کن صحبتوں کے خوگر ہیں۔ لڑکی و
ناقابل معافی غلطی ہے کہ شرافت ذاتی اور
اکتسابی سے اغماض کر کے ہوس زر طلب
جلب منفعت کی خاطر کئی زندگیوں کو بے چین
بنانے کا سبب بنیں۔ اس طرح فریق مقابل ک
حسن و جوانی، مال و متاع، جائداد املاک من
سونے موتی گھوڑے جوڑے کے لالچ میں و
وخیالی آسائش کے تحت چند معصوم جانور
ناکردہ گناہ ہستی کو قعر جہنم میں ڈھکیل
نفس پرستی غایت درجہ تنگ دلی اور خارج

ینی ہے۔ ہر دو فریق کا فریضہ ہے کہ رشتہ بہ توازن
حسن قائم کرنے کی بہ حد ممکنہ بہ غور و تدبر کوشش کریں
یونکہ مکارم اوصاف دنیائے معاشرت میں بجائے خود
ک زبردست ادیب اور کامیاب مصلح ظاہر ہوئے
یں اس صورت خاص میں بھی فریقین کا شرف نفس
ور علو کردار گھر کی دنیا کی کایا پلٹ دے سکتے ہیں۔

فطرت ـــ فطرتاً اس تعلق میں بعد و بیگانگت
وجود ہوتی ہے۔ قرابت اور ان کی قربت کی جدا جدا
یثیات ہیں جنھیں فطری طور پر خوش گوار و شیریں مستحکم
پر از محبت بنانے والا خون کا جوش ہے جیسے اولاد
ں باپ بھائی بہن، نانا، نانی، دادا، دادی ماموں
چا پھوپی اور پھر خالہ ماموں پھوپی چچا زاد وغیرہ۔
ں جوں خون کا قرب کم ہوتا جاتا ہے تعلق خاطر بھی کم
تا ہے ظاہر ہے جن دو ہستیوں میں کوئی رشتہ ہی
ہو ان میں قلبی لگاؤ کیونکر پیدا ہو سکتا۔ مثلاً دو بیگانہ
یا دو بیگانہ عورتیں۔ ایک اجنبی عورت یا ایک اجنبی مرد
نا آشنا ہستی یا کوئی نا آشنا ہستیاں۔ ان میں تعلق
ہوتا ہے معاملے یا کسی اور خارجی سبب سے جیسے
ں بیوی سوتیلی ماں اور بچے، دوست احباب ہمسائے
ملک، اخوان ملت اس قسم کے تعلق کو خوش گوار
نے والی چیز باہمی حسن سلوک اور رواداری ہے
جو اسی وقت ظہور میں آسکتا ہے۔ جب کہ جانبین
شناس و حق گذار ہوں۔ سوتیلی ماں اور بچوں کی
ی تعلقات کی ایک بڑی وجہ ہم دگر فقدان
شناسی اور عدم حق گذاری ہے۔

(۳) بچوں اور ماں کے عزیز و اقربا، دوست
احباب، قدیم ملازم آیا، انّا درمیانی نوکر چاکر آنے
جانے والے وغیرہ۔ ازاں جملہ یہ بالکل حقیقت ہے کہ
ناخوش گواریوں کی تخلیق و پرورش میں بچوں کے عزیزوں کا
بہت زیادہ دخل ہوتا ہے یہ وہ نکتہ ہے جس پر آج تک
کسی کی امعانی نظر نہیں پڑی ہے۔ جس قدر یہ امر سرسری
سمجھا گیا محض جذبات محبت پر محمول کیا گیا ہے اسی قدر
اہم اور رسمی اثرات سے بھرا ہوا ہے۔ کہا جاتا ہے۔
"محبت اندھی ہوتی ہے"۔ محبت کا اندھاپن جس قدر
اس موقع پر خطرناک اور بدانجام ظاہر ہوتا ہے شاید ہی
کسی اور موقع پر ہو۔ نادان دوست دشمن برابر۔
جانبین یعنی سوتیلی ماں اور بچوں کی آنکھوں پر خیر خواہی
اور جوش محبت کے نقش و نگار کا پردہ ڈالا جاتا ہے مگر
درحقیقت وہ کھلی ہوئی دشمنی اور زہریلے سانپ بچھوؤں
سے پٹا ہوا جنگل ثابت ہوتا ہے۔ ماں کے آنے سے پیشتر
ہی غم و الم ماتم و واویلا برپا ہو جاتے ہیں۔ بچوں کو
کلیجے سے چمٹا چمٹا کر آنسو بہائے جاتے ہیں۔ ٹھنڈے
ٹھنڈے سانس بھرے جاتے ہیں۔ بدقسمت و بدنصیب
بچوں کے نام سے ان کو خطاب کیا جاتا ہے۔ ان آوازوں
سے ان کے کان بھرے جاتے ہیں کہ ہائے ان کی ماں
جیتی ہوتی تو سوتیلی اماں کے ہاتھ میں جلنے بھننے کو کیوں
پھنستے چار دن میں باپ کی نظر پھیر دی گئی۔ اب گھر اس کا
زر اس کا خزانہ کا سانپ بن کے وہ بیٹھے گی ان کا حق
پوچھنے والا کون ہے۔ باپ کا دوسری شادی کرنے کا
خیال ہی پہلی سسرال میں ایسا زبردست گناہ تصور
کیا جاتا ہے جو معاف کرنے کے قابل نہ ہو۔ نہ صرف
ملنے بلکہ وہ صورت دیکھنے کے بھی لائق نہیں سمجھا جاتا۔

سوتیلی ماں کا نام تحقیر انگیز اور اس کا ذکر تنفر خیز ہوتا ہے
بچے سمجھنے لگتے ہیں کہ سوتیلی ماں کوئی آفتِ آسمانی اور
بلائے ناگہانی ہوتی ہے۔ ان احمقانہ ہمدردیوں کا یہ
نتیجہ ہوتا ہے کہ بچوں کے دل میں دہشت، نفرت، شبہ
عدم اعتماد سرکشی اور نہ صرف بیگانگت بلکہ عداوت کے
احساسات جاگیر ہوتے ہیں جن کا رشتے کے ساتھ ہی
عملی صورت میں اظہار شروع ہوجاتا ہے۔

آنے والی ماں کے دل و دماغ بھی انہیں خیالات
اسی قسم کی آوازوں سے بھرے ہوتے ہیں کہ باپ سوت
ہوسوت کے پوت نہ ہوں۔ سوتیلے بچے سانپ کے سنپولے
کبھی پنپنے نہیں دیتے۔ سوتیلے بچوں پر دینے سے تو
کنویں میں ڈھکیل دینا ہزار درجہ بہتر ہے کہ ایک ہی
دفعہ مرجائے گی۔ یہ ہر آن کے ملک الموت اور رات
دن کی جانکنی میں تو نہیں پھنسے گی۔ ماں بھی بچوں کو
لائق تنفر ناقابل بھروسہ آفتِ جان اور سدِ راہِ مقاصد
خیال کرنے لگتی ہے۔ جب بلا سابقہ دونوں طرف سے
دل باہم مشتبہ و متنفر ہوجائیں تو پھر خوش دلی و رواداری
کے ساتھ نباہ کی گنجائش ہی کہاں باقی رہی! معاملے سے
پہلے ہی نفرت اپنا عمل شروع کردیتی ہے اور شبہ اتنی
بھی فرصت نہیں دیتا کہ ایک دوسرے کو ٹھنڈے دل سے
حقیقی طور پر آزما ہی لیں۔ نہ صرف رشتہ کرنے سے
پہلے ہی اس قسم کی باتیں ہوتی ہیں بلکہ بچوں کے اعزا
بعد میں تو اور شدت کے ساتھ اس کو تلخ سے تلخ تر بنانے
میں حصہ لیتے ہیں یا تو ملتے ہی نہیں یا سلسلہ آمد و رفت
رہے تو آنے والی کو کھانے پیتے پہنتے اوڑھتے خوش و خرم
دیکھ کر قسم قسم کے آوازے کستے ہیں اشارات کنایات

الفاظ میں ناگواریوں کا اظہار ہوتا ہے حسرت و حر[...]
رشک و حسد سوز و جلن کی نگاہوں سے اسے برا[...]
ہے ایسے طعن طنز کئے جاتے ہیں کہ گویا مرنے وا[...]
ان کے محروم ہونے کا اصل سبب وہی ہے۔ بچوں[...]
ماں کی رفتار گفتار کردار برتاؤ کے متعلق عجیب نا[...]
طریقے سے سوالات کئے جاتے ہیں۔ پند و نصائح کے [...]
اس کے لئے کھول دئے جاتے ہیں کہ ہائے بے ماں[...]
بچے ہیں ان کا دل نہیں دکھانا چاہیے خدا ناخوش [...]
ہے عرش کا کنگرہ ہل جاتا ہے "ساس مت کر برائی[...]
آگے بھی ہے جائی" غرض سوتیلی ماں سے تو بہ شدت [...]
کی جاتی ہے کہ وہ بچوں کے لئے فرشتے سے بھی با[...]
مگر کبھی بھولے سے بھی بچوں کو توجہ نہیں دلائی جا[...]
انھیں ماں سے کس طرح پیش آنا چاہیے۔

کس قدر غیر منصفانہ خیال اور نا روا عمل [...]
بچوں کی ماں تو ہر عیش عشرت آرام آسایش زی[...]
زیبایش۔ اقتدار اختیار کی بے تکلف ملتحق جیسا [...]
جس کے ساتھ وہ کرے برسرِ حق مگر اس کی [...]
ان کے نقطۂ نظر سے ہر چیز کی نہ صرف غیر مستحق ب[...]
اپنے تمام حقوق سے محروم ہوجانا چاہیے۔

علاوہ ازیں نانی دادی خالہ پھوپی وغیرہ [...]
حامی بن جاتی ہیں۔ اور بات بات میں پشتی [...]
خلاف انھیں سرکشی پر کھڑا کردیتی ہیں یا ماں [...]
الگ کرلیتی ہیں۔ مگر چونکہ اس عارضی علٰحدگی [...]
منقطع نہیں ہوسکتا ماں سے نہیں تو باپ سے [...]
گوارا یا ناگوار قائم رہتے ہی ہیں۔

رابعہ [...]

سب رس

بچوں کے لئے

ضمیمہ

زیر نگرانی

ڈاکٹر سید محی الدین قادری زور

مجلس ادارت

صاحبزادہ محمد علی خان میکش — سکینہ بیگم

خواجہ حمید الدین شاہد — معین الدین احمد انصاری

جلد ۲ — ستمبر ۱۹۳۹ء — شمارہ ۹

فہرست مضامین

نمبر	مضمون	مصنف	صفحہ
۱	بچوں سے	معین الدین احمد انصاری	۲
۲	حسرت	شاہ زمانی بیگم	۳
۳	بیاد کسی شخص کی محنت نہیں جاتی	جتیندر پرشاد جوہر	۴
۴	جواہر مالا	محمد حسین (نانڈیڑ)	۵
۵	بچپن کا خواب	محمد معید المنعم صدیقی	۶
۶	ہماری ناؤ (نظم)	اشرف الدین فیضی (پرلی)	۶
۷	جھوٹ کا انجام	باقر علی زاہد	۷
۸	علم (نظم)	رضیہ بیگم	۸
۹	عفو سے دشمن کو فتح کرنا	کاشی ناتھ (وامرگدہ)	۹
۱۰	کتابی پسندے (نظم)	مولوی شکم پرّ	۱۰
۱۱	نورجہاں کی آخری آرام گاہ	سید اشرف حسین عابدی	۱۲
۱۲	اندھوں کی تعلیم	محمد نوشہ محی الدین (گلبرگہ)	۱۱
۱۳	جھوٹا خواب (ڈرامہ)	ایس ایم عباس	۱۳
۱۴	سفید جھوٹ	محمد کمال خان گمنام (دوتعلیا)	۱۵
۱۵	جہالت	عالیہ سلطانہ	۱۶
۱۷	جدید مطبوعات		
۱۸	تنقید و تبصرہ	من (؟) دنیا پیرائیر	

عہد آفرین برقی پریس میں طبع ہو کر دفتر ادارہ "رفعت منزل خیرت آباد" سے شائع ہوا۔

قیمت فی پرچہ ۱ر ۶م

بچوں سے

سب رس کے سال بھر میں کئی خاص نمبر نکلتے ہیں۔ اس سال کا جنوری کا پرچہ دکن نمبر تھا جو اتنا مقبول ہوا کہ ہر ایک [illegible]
سے دیکھتا ہے اور ابھی تک اس کی مانگ جاری ہے۔ اسی طرح آئندہ جنوری میں ایک اور خاص نمبر "اردو نمبر" کے نام سے نکلنے والا ہے
امید ہے کہ یہ نمبر دوسرے خاص نمبروں کی طرح کامیاب ثابت ہوگا۔ اس میں اچھے اچھے مضامین رہیں گے اور اس کے ساتھ ساتھ
کئی اچھی نایاب تصویروں کا دلچسپ مرقع رہے گا۔ اس پرچے کے لئے ابھی سے مضامین لکھ کر بھیج دیجئے تاکہ آپ کے مضمون کے لئے
بھی اس خاص نمبر میں جگہ نکل جائے۔

چند ماہ پہلے دو بہنوں کے پتے دیئے گئے تھے وہ برابر ایک دوسرے سے خط وکتابت کر رہی ہیں ایک بہن کا خط شایع
کیا جاتا ہے جنھوں نے پہلی دفعہ ایک دوسری بہن کو خط لکھا تھا اس خط کا جواب آئندہ پرچے میں شایع کیا جائے گا۔ یہ خط اس لئے
شایع کر رہے ہیں کہ آپ بھی پہلی مرتبہ کچھ اسی طرح لکھیں اور اس کی نقل ہمارے پاس بھیج دیں۔ وہ بھی شایع ہو جائے گا
اس ماہ ان دو بھائیوں کے پتے دیئے جاتے ہیں یہ ایک دوسرے سے خط وکتابت کریں اور پہلے خط کی نقل ہمارے پاس بھیجیں

۱۔ محمد عارف علی انصاری مکان نمبر ۱۱۲۴ محلہ اردو شریف بلدہ (۲) سید نور القمر الدین بمکان سید نور العلی صاحب منصف جگاؤں ضلع نلگنڈہ
عارف علی انصاری کا مشغلہ مطالعہ ہے اور سید نور القمر الدین کا فوٹوگرافی یہ پتے اس لئے دیئے جا رہے ہیں کہ مطالعہ سے ہر ایک کو
دلچسپی ہوتی ہے اور ہونی چاہیئے۔ یہ ایک دوسرے سے ضرور خط وکتابت کریں اور جب کوئی نیا بھائی شریک ہو جس کا
مشغلہ وہی ہو جو ان کا ہے اس صورت میں ہم ان دونوں کو پھر دوسرے پتے دیں گے۔

خط

بہن شوکت! میں پہلے اپنا تعارف کرانا چاہتی ہوں اگر میں پہلے تعارف نہ کراؤں تو یقیناً آپ پریشان ہو جائیں گی اور
ضرور اپنے دل میں کہیں گی یا اللہ یہ کون لڑکی ہے۔ ہاں تو میں آپ کی سب رسی بہن ہوں۔ بہن یہ تو ہمارے سب رس کے
بزرگوں کی نوازش ہے کہ آپ کو میری اور مجھ ناچیز کو آپ کی دوست اور بہن بنایا۔ میرا پورا نام حسن بانو فخر الدین ہے میرا اور آپ کا
مشغلہ ایک ہی ہے آپ کے پاس کونسے ممالک کے ٹکٹ ہیں اور آپ کن سے تبادلہ کرنا چاہتی ہیں مطلع کیجیے۔ میں ٹکٹ ہی نہیں بلکہ فلم سٹاروں
کی تصویریں اور مونوگرام بھی جمع کرتی ہوں آپ کا ٹکٹ کے علاوہ اور بھی کوئی مشغلہ ہو تو معلوم کرائیے۔ شاید میں کچھ مدد دے
سکوں۔ میرے اور بہت سے دوست ہیں جن کے پتے ایک برادری کی طرف سے دیئے گئے ہیں (جس کی میں ممبر ہوں) وہ
سب کی سب بہت اچھی ہیں۔ امید کہ آپ بھی اچھی ثابت ہوں گی جواب جلد دیجئے۔ فقط آپ کی سب رسی بہن

حسن بانو فخر الدین

اگر آپ لوگوں کی خط وکتابت کامیاب طریقے پر ہوتی رہے تو ہم ممالک غیر کے پتے بھی دیں گے۔

معین الدین احمد انصاری

حضرت

ایک ضلع کے مدرسے میں جو لڑکیوں کی تعلیم کے لئے تھا طالبانہ بندی میں بیٹھ کر مدرسہ پہنچتی تھیں۔ تعلیم کا انتظام تو یاد نہیں کہ کیسا تھا۔ البتہ یہ یاد ہے کہ وہاں کی استانی کا نام تعظیماً حضرت بیگم رکھا گیا تھا۔ جس طرح لوگ آپا بیگم، خالہ بیگم، اماں بیگم پکارا کرتے ہیں۔ یہ ذکر کوئی دس پندرہ برس پہلے کا ہے۔

یہ ایک مسلمہ بات ہے کہ دنیا کی ہر چیز میں تغیر ہوتا ہے اور یہ تغیر کبھی ترقی کی طرف مائل ہوتا ہے یا کبھی تنزل کی طرف۔ اس اٹل اصول کے مطابق حضرت بیگم کا لقب بھی ترقی کرتے کرتے حیدرآباد پہنچا اور مسافت طے کراتے کرتے اس کا آخری لفظ "بیگم" گھس کر اڑ گیا۔

اب یہاں ایک تعلیمی ادارہ ہے۔ جس میں کئی "حضرت" ہیں...... حضرت کے معنی ہیں۔ نزدیکی، حضور، درگاہ، حاضر ہونا۔ نہ اس میں خالص مونث ہونے کا مفہوم نکلتا ہے نہ مذکر ہونے کا۔ لیکن اس کے باوجود غالباً صنفِ لطیف کی تخصیص کے لئے "حضرتہ" کی عجیب و غریب اصطلاح کا رواج پڑ گیا ہے۔ جس کی کرختگی کو اصحابِ ذوق بھی محسوس کرتے ہیں۔ اس میں شاید صنفِ نسوانیت کے متعلق تعین پیدا کرنے کی کوشش کی گئی ہے۔ ورنہ جب زنگی کا نام کافور رکھا جا سکتا ہے، تو اس "تنگ نظری" کے کیا معنی ہوتے ہیں۔ کم از کم میرا تصور "حضرت" کے متعلق یہ ہے کہ اس مقدس لقب کے حامل وہی لوگ ہوا کرتے ہیں جن کے سر پر عمامہ بمقدارِ علم و عمر رسا ہو، [illegible] شیشے کے نہیں تو کم از کم باریک شیشے [illegible] چڑھی ہو جس [illegible] کا [illegible] کہیں کہیں سے سیاہی مائل ہو۔ کرتا ململ کا گلے پر چپا بنی ہوئی اور کاندھے پر کاج جس میں کپڑے کی گنڈیاں لگی ہوئی ہوں۔ پورے آدھے تھان کا پائجامہ۔ ہاتھ میں جریب ہو اور پاؤں میں بادشاہی جوتا۔ یہ ان بزرگوں کا خاکہ ہے جن کو صدیوں سے ہر عمر کی لڑکیاں اور لڑکے "حضرت" کے رعب آور لقب سے پکارتے آئے ہیں۔ ظاہر ہے کہ یہ صاحب الکرامات شخصیت اس معصوم ہستی سے کس قدر تضاد رکھتی ہے۔ جن کو لڑکیوں نے آج کل زبردستی "حضرت" بنا لیا ہے۔ سب سے بین فرق یہ ہے کہ موخر الذکر کلاہ کے مستقل مظہر ہیں اور تقدس کے "سائن بورڈ" کے بجائے سر پر ایک لہرائی ہوئی "زلف" رکھتی ہیں۔

اس کے علاوہ حضرت کسی قدر وسیع المعنی لفظ ہے۔ فرض کیجئے کہ کوئی آپ کو یوں مخاطب کرے کہ "آپ تو بڑے حضرت ہیں" فرمائیے اس جملہ کا آپ پر کس قدر خوش گوار ردِ عمل ہوگا........

میں ان خواتین کی وسعت نظری کی قائل ہوں جو اس بلیغ لقب کو بجا تمکنت کے ساتھ برداشت کرتی ہیں۔ میں تو ایک معقول استانی کو "حضرت" پکارنا اخلاقی جرم سمجھتی ہوں۔ اس سے تو بہتر یہ ہے "آنوں جی" پکارا جائے۔ جس سے کم از کم ان کی صحیح صنف تو ظاہر ہوتی ہے۔ مگر حضرت تو متضاد تصورات کا معجون مرکب ہے۔ جس کی جنس لطیف شکل سے متحمل ہو سکتی ہے۔ گر نا یہ یہ [illegible] کوئی نیا فیشن ہے۔ اردو زبان میں کم از کم لسانی حد تک تذکیر و تانیث کے فرق کو مٹا کر مساوات جنسی حاصل کرنے کی

کوئی "جدید تحریک" ہے۔ چنانچہ حیدرآباد کی ایک ممتاز درسگاہِ اناث میں اکثر لڑکیاں .... میں آتا ہوں۔ میرا آیا تھا۔ میں بولتا ہوں۔ میں سنتا ہوں۔ بولنے پر مفتخر معلوم ہوتی ہیں۔ پہلے ہی سے اس درسگاہ میں اردو زبان سے کونسی محبت برتی جاتی ہے۔ یہاں تو انگریزی، انگریزیت، انگریزیت ہی طرۂ امتیاز ہے۔ پھر جب کہ موجودہ اردو ہی کے لالے پڑے ہوں تو اس بے چاری زبان پر یہ نیا ظلم کس لئے توڑا جا رہا ہے؟ اس کا سبب میں نہیں بتا سکتی۔ اس کا جواب آپ کو اس درسگاہ کی زنانہ لباس پہننے والی گرمردانہ بولی بولنے والی لڑکیوں سے مل سکے گا یا ان کے والدین سے جن کے اندر میں اس عجیب طرزِ عمل کے خلاف بہت کم ردِ عمل دیکھتی ہوں۔ بلکہ میرا خیال ہے کہ یہ بزرگ اپنی لڑکیوں کی "ایسی بولی" پر علانیہ نہیں تو اندرونی طور پر ضرور کچھ فخر کرتے ہیں۔ کہ ہماری اولاد کی یہ بولی ایک خاص مدرسے کی تعلیم کا "ٹریڈ مارک" ہے۔ کاش ان اردو زبان کے محسنوں سے کوئی پوچھے کہ یہ زنانہ لباس پہننے والی لڑکیاں جو مردانہ بولی بولتی ہیں ان کو تم نے کیا نام رکھا ہے۔

شاہ زمانی بیگم

بربادکسی شخص کی محنت نہیں جاتی

ابھی آفتاب طلوع نہیں ہوا تھا۔ فلک پر کچھ سرخی نمودار ہو رہی تھی۔ بہت سے بندگانِ خدا بیدار ہو کر عبادت میں مشغول ہو گئے۔ چڑیاں اپنے آشیانہ میں بیٹھی چیں چیں کر رہی تھیں۔ پپیہا پیو پیو کے نعرے سے جنگل کو سر پر اٹھا رہا تھا۔ کسان اپنے بیلوں کو لئے کھیت کا رخ کر رہے تھے۔ بچے منہ ہاتھ دھو کر شانہ کر کے مکتب جانے کی تیاریوں میں مشغول تھے جھاڑ پہاڑ غرض قدرت کی ہر ایک کائنات نئے رنگ اور روپ میں دکھائی دے رہی تھی۔

۲۔ بالو اپنے جھونپڑے سے آنکھیں ملتا ہوا اپنا سیاہ کمبل لیتا ہوا باہر نکلا۔ اور قدرتی مناظرے سے لطف اندوز ہونے کی خاطر ایک بیڑی سلگائی۔ اور اپنا سیاہ کمبل کاندھے پر ڈال کر ایک ٹیلے پر جا بیٹھا۔

ایک آدھ گھنٹہ گذارنے کے بعد اپنا سفید گرمیلا اور تھوڑی جگہ سے ٹوٹا ہوا جال لے کر ندی جانے کی تیاری کر رہا تھا۔ اس کا کام ہر روز مچھلیاں پکڑنا اور اس کو بازار میں بیچ کر اپنا پیٹ بھرنے کا تھا۔

۳۔ ندی کا فاصلہ کچھ زیادہ نہ تھا۔ مشکل سے دو میل ہو گا۔ راستہ میں ایک گھنا جنگل بھی تھا۔ جو دن کو بھی اماوس کی رات بنا دیتا تھا۔ بالو اپنا آدھے ہر جال لئے ہوئے چلا۔ اور ندی پر پہنچا۔ ندی کا پانی بالکل خاموش تھا۔ اور کوئی ایک چھوٹا کنکر اس میں ڈ کبھی حلقے بناتا ہوا تہ تک چلا جاتا تھا۔ بالو کے پہنچنے سے پہلے ہی بہت سے مچھیرے اپنا جال پانی میں ڈالے بیٹھے تھے۔ بالو نے جال ڈالا اور بیٹھ گیا۔ کئی گھنٹے گذر گئے شام ہونے لگی آفتاب غروب ہو رہا تھا۔ بالو اپنا جال پانی سے باہر نکالا اور دیکھتے ہی اس کا رنگ پیلا پڑ گیا۔ جیسے کئی دن کا بیمار ہے۔ چونکہ مچھلیاں

اس کی زندگی کا سہارا تھیں اب یہ خیال کرنے لگا آج میں میری بیوی بچے کیا کھائیں گے۔

۴۔ اسی سوچ بچار میں وہ اپنے گھر پہنچا۔ اور بیوی سے کہا آج مجھے ایک بھی مچھلی نہیں ملی۔ ساری محنت بیکار گئی۔ اب ہمیں بھوکے پیٹ ہی سونا ہوگا۔ بیوی نے جب میاں کو نا امید ہوتے دیکھا تو تسلی دینے کی خاطر کہنے لگی آج نہیں تو کل سہی۔ ایسے بھی دن برداشت کرنے کی عادت ہونی چاہیئے۔ کسی کو ہر وقت اچھے دن تھوڑے ہی نصیب ہوتے ہیں۔ کیا ہم کو کبھی مچھلیاں نہیں ملیں گی۔

۵۔ بالو کئی دن تک مچھلیاں پکڑنے جاتا رہا۔ جب وہ ایک شام مایوسی میں ڈوبا ناامید جھونپڑے کی طرف آرہا تھا۔ اس کو ایک آواز سنائی دی اگر بالو اس سے کوئی بھی نتیجہ نہیں نکال سکا۔ اس کی پریشانی میں اور بھی اضافہ ہونے لگا۔ آواز قریب آئی تو اس نے ایک فقیر کو پایا جو یہ گا رہا تھا۔

"برباد کسی شخص کی محنت نہیں جاتی"

بالو نے اس کو کان بھر کے سنا اور کہنے لگا کہ مجھ کو ہمت نہ ہارنا چاہیئے کیونکہ صبر کا پھل کبھی نہ کبھی ضرور ملتا ہے ہمت نہ ہارنا چاہیئے۔ رات کو وہ بھوکا پیٹ ہی سو گیا۔

۶۔ دوسرے روز وہ پھر اپنا جال لیے ہوئے ندی پر پہنچا۔ جال ڈالا اور حسب معمول شام کو نکالا۔ کچھ وزنی پایا۔ اور جب پانی سے باہر نکالا تو اس کی خوشی کی انتہا نہ رہی مچھلیاں تعداد میں زیادہ تھیں۔ اس کو بازار میں لیجا کر بیچا۔ اور سامان لا کر اپنے بھوکے پیٹ کو بھرا۔ اس کے بعد اپنی بیوی سے کہنے لگا۔ اب ہمارے دن پھر گئے۔ بھاگ جاگ اٹھے۔ مجھے مرتے دم تک ایک فقیر کی نصیحت یاد رہے گی۔ بیوی نے پوچھا "وہ کیا" کہنے لگا۔

"برباد کسی شخص کی محنت نہیں جاتی"

جتیندر پرشاد جوہر

جواہر مالا

۱۔ جرأت و طاقت خوش زندگی کے لوازم ہیں۔

۲۔ بہادری، ضبط و صداقت کے بغیر آزادی و خودداری حاصل نہیں ہو سکتی۔

۳۔ تمام انسانی قرابتوں کی اصل — شادی — میاں بیوی کا محبت اور سلوک سے زندگی بسر کرنا ہے۔

۴۔ حسن معاشرت کیا ہے؟ اپنی راحت کی تلاش اور حقوق کی حفاظت کرتے وقت دوسروں کے حقوق اور راحت کا خیال!

۵۔ اگر تم اپنا اعتبار قائم کرنا چاہتے ہو تو دوسروں پر اعتبار کرو۔

۶۔ حسن اخلاق اور آداب مجلس کی اعتدال کے ساتھ پابندی کا نام تہذیب ہے۔

۷۔ ناخلف ہیں وہ لوگ جو بزرگوں کی شائستگی اور زندہ دلی میں اضافہ نہیں کرتے۔

۸۔ غرور و خود ستائی کا نتیجہ عزت نہیں نفرت ہے۔

محمد حسین (ناندیڑ)

بچپن کا خواب

میری عمر کوئی پانچ سال کی تھی جب کہ میں اپنی چھوٹی بہن سلیمہ کے ساتھ کھیلا کرتا تھا۔ ہم دونوں بہن بھائی ایک ہی جا
کھاتے۔ ایک ہی جگہ بیٹھتے اور ایک ہی جگہ سویا کرتے تھے وہ کبھی گڑیوں کا بکس لاتی اور میرے ساتھ کھیلا کرتی
چھوٹی ہارمونیم پر ہاتھ صاف ہوتا اور کبھی موٹر اور ریل کی ٹکر ہمارے بچپن کے کھیل تھے۔ اس طرح ہم مخت
کھلونوں سے اپنا وقت کاٹتے اور دل بہلایا کرتے تھے۔ ایک لکڑی کا گھوڑا تھا جس پر میں بیٹھا کرتا تھا۔

ایک روز اتفاقاً میں کھیلتے کھیلتے سو گیا۔ اس وقت میں اگرچہ کہ مزے کی نیند سو رہا تھا لیکن مے
بہن سرہانے بیٹھی ہوئی تھی۔ اس کے ایک ہاتھ میں گڑیوں کا بکس تھا اور دوسرا ہاتھ میرے سر پر تھا۔ دیگر کھ
اطراف پھیلے ہوئے تھے۔

میں خواب دیکھ رہا تھا کہ اپنے لکڑی کے گھوڑے کو سرپٹ دوڑا رہا ہوں گھوڑا تیزی سے دوڑا جا
وہ اچانک رک گیا۔ اور میں گرتے گرتے بچ گیا۔ گھوڑا اپنی شرارت پر تلا ہوا مجھے پٹک دینا چاہتا تھا۔ اس
سلیمہ رو رہی تھی اور میں دیکھ رہا تھا کہ اس کے ہاتھ دست بدعا ہیں۔ آنکھ کھلی تو گھوڑے کو قریب پا
بہن کو سر پر ہاتھ رکھے ہوئے دیکھا۔

محمد عبد المنعم صدی
دسویں کلاس

ہماری ناؤ

آنگن میں پانی آیا ہے
کیا اچھا تالاب بنا ہے

کاغذ ہم اچھے لائیں
پھاڑ کے ان کو ناؤ بنائیں
کھیلیں کودیں دل بہلائیں
کیا اچھا تالاب بنا ہے

ناؤ تمھاری ٹوٹی اختر
ڈوب رہی ہے چکر کھ
دوڑ و اکبر اس کو بچائیں
کیا اچھا تالاب بنا ہے

پانی میں سب مل کر جائیں
اپنی اپنی ناؤ بہائیں
بیڑا سب کا پار لگائیں
کیا اچھا تالاب بنا ہے

کھیل میں رونا دھونا کیا
یہ نہیں اچھی دوسر
سب سے آگے اس کو بڑھائیں
کیا اچھا تالاب بنا ہے

دیکھو یہ کیا تیز چلی ہے
سب سے آگے جا پہنچی ہے
آؤ اس کو ناچ نچائیں
کیا اچھا تالاب بنا ہے

دیکھو دیکھو پھنس گئی وہ
دیکھو کیسی ال سے چلی
جانے دو جس سمت بھی جائیں
کیا اچھا تالاب بنا ہے

تیر رہی ہے یوں پانی پر
پھول کھلے ہیں جوں پانی پر
آؤ ذرا امی کو دکھائیں
کیا اچھا تالاب بنا ہے

اشرف الدین

جھوٹ کا انجام

عزیز بچو! آج ہم تمہیں ایک بڑا ہی دلچسپ اور
نصیحت آمیز قصہ سناتے ہیں۔ تمہیں معلوم ہوگا کہ اکثر
انسانوں میں بہت ساری بری عادتیں ہوا کرتی ہیں۔
بری عادتیں یا بری خصلت خواہ کسی قسم کی کیوں نہ ہو
وہ بری ہی ہوا کرتی ہے۔ برے آدمیوں کی صحبت
سے انسان بری عادتیں سیکھتا ہے ہم کو چاہئے کہ کبھی
بھول کر بھی برے آدمیوں کی صحبت اختیار نہ کریں
یہی وہ بدترین چیز ہے جو انسان کو دوسروں کی نظروں
میں ذلیل کرتی ہے انسان اوروں کی نگاہوں سے
گر جاتا ہے۔ لوگ بری عادت رکھنے اور بری صحبت
میں اٹھنے بیٹھنے والوں سے ملنا پسند نہیں کرتے ہمیشہ
ایسے لوگوں سے کنارہ کشی کرتے ہیں۔

بری عادتوں کی وجہ سے آدمی بدنام اور
دوسروں کی نظروں میں ذلیل و خوار ہوجاتا ہے۔ ہم
تمہیں جھوٹ کا ایک بڑا مزےدار اور سبق آموز قصہ
سناتے ہیں۔

سنو! یہ ایک قدیم زمانے کا واقعہ ہے کہ کسی
گاؤں میں ایک چرواہے کا لڑکا رہا کرتا تھا۔ وہ ہر روز
جنگل میں بکریاں چراتا تھا۔ اس کے پاس بہت ساری
بکریاں تھیں وہ ان بکریوں کے منڈے کو لے کر صبح
سویرے جنگل چلا جاتا۔ اور تمام دن اس کام میں مشغول
رہتا اس کو اپنا پیٹ بھرنے کے لئے بکریوں کا بہت سا
دودھ مل جاتا جس کو پی کر وہ خوب موٹا تازہ ہوگیا تھا۔
جنگل کی تازہ اور خوشگوار ہوا بھی اس کی صحت اور
تندرستی کے لئے اس کو میسر تھی۔ ان تمام چیزوں کی
وجہ سے وہ ہمیشہ تندرست اور خوش رہا کرتا تھا اس کی
زندگی ایک خوش حال دیہاتی کی طرح بسر ہو رہی تھی۔

بچو غالباً تمہیں معلوم ہوگا کہ جب انسان خوش حالی
اور اطمینان کے ساتھ زندگی بسر کرتا ہے تو اس کو طرح
طرح کی باتیں سوجھتی ہیں وہ اپنی اچھی خاصی خوش حال
زندگی میں اپنے ہاتھوں آپ روڑے اٹکانا شروع کر دیتا
ہے جب انسان اس طرف ایک قدم اٹھاتا ہے تو شیطان
اس کو اور چار قدم آگے بڑھاتا اور بڑھاتے بڑھاتے
ایک نہ ایک دن تباہی کے خوفناک اور بھیانک غار میں
جھونک دیتا ہے۔ جب چرواہے کی شامت آئی تو اس نے
بھی اسی طرح کیا۔ دیکھو وہ اپنے ہاتھوں آپ کس طرح
تباہ ہوا اور اپنی ساری کائنات کھو بیٹھا جھوٹ نے
اس کو کس قدر نقصان پہنچایا اور ذلیل کیا۔

یوں تو وہ ہر روز ہمیشہ کی طرح بکریاں چرایا کرتا تھا
لیکن ایک دن اس کو شرارت سوجھی اور وہ ایک بڑے
ٹیلے پر جا کر چیخ چیخ کر پکارنے لگا "شیر آیا شیر آیا دوڑو"
یہ سنتے ہی گاؤں میں تمام آس پاس کے رہنے والے
لاٹھیاں اور ڈنڈے لے کر اس کے پاس پہنچ گئے
اور جب سب لوگوں نے وہاں آکر دیکھا تو شیر کا کہیں
پتہ نہ تھا۔ جب چرواہے سے دریافت کیا تو اس نے
کہا "شیر وبر" آیا نہیں میں تو صرف مذاق کر رہا تھا
تمام گاؤں والے یہ سن کر اس پر برہم ہوئے اور غصے
سے اپنے اپنے گھروں کو واپس چلے گئے۔

اس واقعہ کو گذر کر کچھ روز ہوئے تھے کہ چرواہے

پھر وہی حرکت کی۔ ٹیلے پر جاکر پھر "شیر آیا شیر آیا دوڑنا" چلانے لگا اس مرتبہ بھی تھوڑے بہت گاؤں والے اس کی مدد کو بھاگ کر آئے لیکن ان کو اس دفعہ بھی پہلے کی طرح واپس ہونا پڑا۔ تمام گاؤں والوں نے چرواہے کو خوب لعنت ملامت کی اور برا بھلا کہا اس نے ان کو دو مرتبہ دھوکا دیا۔

اس کے بعد کئی روز گذر گئے۔ ایک دن جب وہ سب معمول جنگل میں بکریاں چرا رہا تھا سچ مچ شیر آگیا۔ اس وقت وہ پہلے سے بہت زیادہ چیخ پکار کرنے لگا خوب چلایا اور غل مچایا کہ "شیر آیا شیر آیا دوڑنا" لیکن چونکہ وہ اس سے پہلے دو مرتبہ گاؤں والوں کو جھوٹ کہہ کر دھوکا دے چکا تھا اس لئے تمام گاؤں والوں نے یہ خیال کیا کہ اس مرتبہ بھی چرواہا جھوٹ کہہ کر دھوکا دینا چاہتا ہے جس کی وجہ سے کوئی اس کی مدد کو نہ آیا اور شیر اس کی تمام بکریاں چیر پھاڑ کر کھا گیا۔

بچو دیکھا تم نے چرواہے کو جھوٹ کہنے اور دھوکا دینے کی وجہ سے کس قدر نقصان پہنچا۔ برائی کتنی بری چیز ہے ایک تو اس کا نقصان ہوا دوسرے لوگوں کی نگاہوں میں اس کی کوئی وقعت نہ رہی۔

باقر علی زا...

علم

علم وہ جوہر لطافت ہے
عرشِ اعظم پہ جس کی شہرت ہے

گوشِ دل سے سنو مری بہنو
میں جو کہتی ہوں وہ حقیقت ہے

آؤ بہنو عمل کے میداں میں
آج اس کی بڑی ضرورت ہے

ہے تڑپ علم کی مرے دل میں
میری آواز میں صداقت ہے

علم سے قوم کو کرو بیدار
میری بہنو جو تم میں ہمت ہے

وقت نازک ہے اب اٹھو بہنو
ہم پہ واجب دکن کی خدمت ہے

علم کی روشنی کو پھیلاؤ
شمع بن کر جو ذوقِ فطرت ہے

یا الٰہی سدا رہے قائم
عہدِ عثماں بھی ایک نعمت ہے

سچ تو یہ ہے کہ اے مری بہنو
قوم ان کی رہینِ منت ہے

میرے نزدیک وہ فرشتہ ہے
علم کی جس کے دل میں عظمت ہے

مانو "ب، م" کا کہا بہنو
علم ہی سے ہماری عزت ہے

رضیہ بیگ...

عفو سے دشمن کو فتح کرنا

قدیم زمانے میں بنارس میں برہم نامی راجا کی حکومت تھی۔ برہم کی وسیع سلطنت میں دولت اور فوجی قوت کی کمی نہ تھی۔ دشمنوں کا خوف نہ تھا۔ اسی عہد میں ملک کوسل کا راجا وجے تھا جس کی سلطنت بہ نسبت برہم کی سلطنت کے چھوٹی اور فوج کم تھی۔ دونوں میں جنگ چھڑی۔ برہم کو فتح نصیب ہونے سے راجا وجے نے اپنے ملک کو خیرباد کہہ کر جنگل کا رخ کیا۔ اور بندھیاچل کے غاروں میں بے سروسامان زندگی بسر ہونے لگی۔

بھگوان کی کرپا سے غاروں میں ایک لڑکا تولد ہوا جس کا نام دنیا بھوشن رکھا گیا۔ جیسے جیسے بھوشن کی عمر بڑھتی گئی اس کو یہ احساس ہوتا گیا کہ میرے باپ کی موجودہ مصیبت کا تنہا ذمہ دار والی بنارس ہے

قانونِ قدرت کے مطابق وجے عمر طبعی کو پہونچا۔ ایک دن بہ حالتِ نزع اپنے لختِ جگر کو یہ نصیحت کی کہ "میرے پیارے! اب میرا وقت قریب ہے۔ جیسا کہ پکا ہوا پتا درخت سے جھڑتا ہے اسی طرح مجھے بھی اب سنسار کے درخت سے جھڑنا ہے۔ اس وقت تمھیں دینے کے لئے نہ سلطنت ہے اور نہ دولت البتہ مجھ سے عفو حاصل کرکے دشمنوں کو زیر کر سکتے ہو"۔ یہ کہتے ہوئے راجا ہمیشہ کے لئے میٹھی نیند سوگیا۔

اب بے یار و مددگار دنیا بھوشن نے بنارس کے راجا کے پاس ملازمت اختیار کی اور رفتہ رفتہ اپنی قابلیت سے ترقی کی۔ ایک دن دنیا بھوشن اپنے روزمرہ فرائض سے فارغ ہوکر الگ الاپتا ہوا دراز تھا۔ اس کی سریلی آواز نے راجا برہم کو اپنی طرف کھینچ لیا۔ اس درد بھری اور رسیلی آواز سے دنیا بھوشن راجا کو خوش کرکے رتھ بان بنا۔

اس طرح کچھ عرصہ گذرنے کے بعد برہم اور دنیا بھوشن شکار کی خاطر جنگل گئے۔ اثنائے راہ میں شکار کی دھن میں راستہ بھول گئے۔ اتفاق سے رتھ میں دونوں ہی تھے۔ سفر کی تکان سے ادھر راجا سوتا پڑا اور ادھر اپنے باپ کے انتقام کی فکر میں دنیا بھوشن نے میان سے تلوار نکالی۔ لیکن عین اس وقت جب کہ راجا جہنم رسید ہونے کو تھا دنیا بھوشن اپنے باپ کی نصیحت یاد آئی کہ "عفو سے دشمن کو فتح کرنا"۔ افسوس کے ساتھ اس نے اپنی تلوار میان کے اندر رکھ لی۔ راجا یہ سب حرکات خواب کی شکل میں دیکھ رہا تھا۔ نیند سے ہوشیار ہوکر دریافت کیا اور عفو کی قوت سے نادم ہوکر کوسل کی سلطنت دنیا بھوشن کو دے دی۔

کاشی ناتھ (دامرگدہ)

تاریخ گولکنڈہ حیدرآباد کے مشہور مورخ اور جامعہ عثمانیہ کے معلم تاریخ پروفیسر عبدالمجید صاحب صدیقی ام اے ال ال بی نے سلاطینِ قطب شاہیہ کی نہایت مستند اور مبسوط تاریخ قلمبند کی ہے۔ جس میں گولکنڈہ اور اس کے آس پاس کی سلطنتوں کے تعلقات، دکن کا تمدنی ارتقاء، بادشاہوں اور امیروں کے حالات، لڑائیاں، علم و فضل کی سرپرستی غرض ہر پہلو پر قدیم نادر قلمی تاریخوں کی مدد سے روشنی ڈالی ہے۔ اپنے موضوع پر پہلی کتاب ہے جو اس اہتمام اور محنت سے لکھی گئی ہو۔ تاریخ گولکنڈہ باتصویر ہے اور اس کی تصویریں بھی اس کے مواد کی طرح قدیم تاریخی ماخذوں سے حاصل کی گئی ہیں۔ بڑی سائز ڈھائی سو سے زیادہ صفحات قیمت ے مہ

کبابی پسندے

(۱)

پڑوسن نے لکھا زلیخا بوا کو　　غدا شام کو میرے گھر تک تو آؤ
پکائے ہیں میں نے کبابی پسندے　　نہیں ہوتے گو مجھ سے اب تو یہ دھندے
مگر جی میں آیا کہ تم کو بلاؤں　　کبابی پسندے تمھیں بھی کھلاؤں
تمھیں ہیں پسند یہ پسندے ہمارے

(۲)

زلیخا بوا نے لکھا یہ جواباً　　سدا خوش رہو تم ہماری پڑوسن
مرے گھر میں ہیں آج مہمان آئے　　اور آئے بھی ہیں آج یہ بن بلائے
میں خوش ہوں کہ یہ آج کھائیں گے کھانا　　کہاں پھر یہ اور ہے کہاں میرا دانا
پسند تو ہیں مجھ کو پسندے تمھارے

(۳)

پڑوسن نے لکھا زلیخا بوا کو　　نہیں شام کو تو ذرا شب میں آؤ
تمھیں میزبانی مبارک مبارک　　تمھیں ہے خوشی کچھ نہیں اس میں اب شک
ہمیں بھی کرو خوش تو ہے مہربانی　　محبت کی ہوتی یہی ہے نشانی
نہیں میرے ہیں یہ پسندے تمھارے

(۴)

زلیخا بوا نے لکھا بی پڑوسن!　　تمھاری نذر ہو ہمارا یہ تن من
مگر میں ہوں مجبور آنے سے اب تو　　میری اچھی بہنا مجھے معاف کر دو
مگر کل صبح کو تم آجاؤ بہنا!　　نئی ماما کا امتحاں بھی ہی ہونا
رہیں اور کسی دن پسندے تمھارے

(۵)

پڑوسن نے لکھا زلیخا بوا کو　　نہیں کچھ حرج آج تم گر نہ آؤ
صبح کو ہے آنا یہ مشکل ہمارا　　برامت منانا اسے تم خدارا
سینما ہے جانا ہمیں بس ضروری　　بہت ہو خوشی تم بھی ہو میری ساتھی
گئے بھاڑ میں یہ پسندے ہمارے!

(۶)

زلیخا بوا نے جواباً یہ لکھا　　اتارا بہن تم نے تو خوب بدلا
نئے دوست تم کو مبارک مبارک　　ہیں ہم تو پرانے نہیں اس میں کچھ شک
نئے دوستوں کو کرو اب تو خوش تم　　پڑا اس نے دو ہم کو بس اب ہیں ہم
کہاں ہم کہاں وہ پسندے تمھارے؟!

(۷)

یہ سوچیں پڑوسن کہ کل ہی صبح کو　　منائیں گے چل کر زلیخا بوا کو
چنانچہ یہ نکلیں صبح ہی سویرے　　سویرے بھی اتنا کہ تھا منہ اندھیرے
زلیخا بوا کو جگا کر بٹھایا　　اور اک پان ان کو لگا کر کھلایا
کہا! کھاؤ گی تم پسندے ہمارے!

(۸)

زلیخا بوا تھیں مگر منہ پھلائے　　کہ گویا کبھی گلگلے تھے پکائے
نہ وہ منہ سے بولیں وہ سر ہی کھجلیں　　جو بولیں تو ایسا کہ بس سر ہی ہو
سمجھ میں نہ آیا یہ قصہ ہمارے　　جو ہونے لگا واں ہمارے تمھارے
گئے بھاڑ میں یوں پسندے ہمارے

(۹)

ادھر بی پڑوسن کا غصہ غضب تھا　　زباں کو قرار ان کی بس اب نہ
چلی ایسی گویا کہ وہ تھی کترنی　　رکے اب تو کیسے شروع ہو جو جا
رکی یوں کہ تھیں وہ اک دم تھکے سے　　کہیں اک دو باتیں نکلتے
کہا ہم نئے ہیں! وہ پسندے ہمارے؟!

(۱۰)

غرض اس طرح ٹوٹا یک دم وہ رشتہ　　برس پندرہ میں جو محکم ہوا
مگر یہ لڑائی نہ تھی دشمنی کی　　کہ تھی یہ نشانی محبت دلی
لہذا لڑائی نہ تم اس کو سمجھو　　اسی سے محبت کی ہستی کو پ
ختم یوں ہوئے وہ پسندے ہمارے
مو

نورجہاں کی آخری آرامگاہ

(یہ مضمون حیدرآباد ریڈیو اسٹیشن سے نشر کیا گیا)

لاہور میں دریائے راوی کے کنارے ایک مزار واقع ہے چاندنی رات تھی۔ ہم کشتی میں سوار ہو کر چاندنی کا لطف اٹھا رہے تھے۔

باتوں باتوں میں ملاح سے پوچھا یہ مقبرہ کس کا ہے۔

ملاح۔ جناب یہ نورجہاں کا مزار ہے۔

ساتھ ہی دل میں خیال آیا یہ وہی نورجہاں ہے جو جہانگیر کے دل پر حکومت کرتی تھی۔ جس کے کپڑوں میں الماس، زمرد، لعل ٹکے رہتے تھے۔ جو پھولوں کی سیج پر سویا کرتی مگر آج بستر خاک پر پڑی ہے۔ یہ دریا وہی دریا ہے جس پر اکثر جہانگیر چاندنی کا لطف اٹھانے کے لئے آیا کرتے۔ جہانگیر اور بیگم اسی دریا میں کشتیوں میں بیٹھ کر گشت لگاتے۔ آتش بازیاں چھوٹتیں، ساغر کے دور چلتے۔ یہاں تک کہ چڑیاں بولنے لگتیں اور سویرا ہو جاتا آج نہ وہ ہیں نہ ان کا زمانہ مقام وہی ہے لیکن وہ خاک میں مل گئے۔

ہم دریا کو عبور کر کے قریب پہونچے سامنے ایک ٹوٹی پھوٹی عمارت ہے جس پر اکثر جگہ گھاس پات اُگی ہوئی ہے۔ جس سے اس بات کا پتہ چلتا ہے کہ یہ زمانۂ قدیم کی یادگار ہے۔

ہم اندر داخل ہوئے۔ کتبہ پر یہ شعر کندہ ہے۔

برمزار ما غریباں نے چراغے نے گلے
نے پر پروانہ سوزد نے صدائے بلبلے

اور واقعی یہاں نہ شمع ہے نہ پروانہ نہ پھول ہے نہ بلبل ایک سناٹا سا چھایا ہوا ہے۔ وہ نورجہاں جو ہندستان کی ملکہ تھی آج بے مونس وغمخوار اکیلی سو رہی ہے۔

مقبرہ میں چند کبوتروں کے گھونسلے ہیں جو اپنی غٹرغوں سے نورجہاں کا دل بہلا رہے ہیں اور لوری دے دے کر سلا رہے ہیں۔ اور وہ ان کی لوری سے ایسی بے ہوش ہو گئی ہے کہ ہوش میں آنے کا نام تک نہیں لیتی۔

نورجہاں خوبصورتی اور حسن تدبیر میں بے مثل تھی بادشاہ اس سے ہر بات میں مشورہ کرتا تھا۔ مردانہ کھیلوں سے نورجہاں کو بہت دلچسپی تھی چنانچہ اس کو شیر کے شکار کا بہت شوق تھا۔ شعر و ادب کا بھی ذوق تھا۔ جہانگیر نے عید کا چاند دیکھنے کے بعد کہا۔

ہلال عید کہ بر اوج فلک ہویدا شد
(عید کا چاند جو کہ آسمان پر دکھائی دے رہا ہے)

اور ثانی مصرعہ کی فکر تھی۔ اسی اثنا میں نورجہاں کو خبر ملی کہ بادشاہ سلامت کچھ پریشان سے ہیں۔ وہ آئی پریشانی کا سبب دریافت کیا۔ مسکرائی اور کہنے لگی ذرا سے مصرعہ کے لئے اتنی فکر۔

کلید میکدہ گم گشتہ بود پیدا شد
(میخانے کی کنجی جو کھو گئی تھی پھر مل گئی)

ایک دفعہ نورجہاں نے موتیوں کی لڑیاں اپنی مانگ میں آویزاں کیں۔ جہانگیر نے اس کو دیکھ کر یہ مصرعہ کہا۔

سلک مروارید برفرق سرت دانی کہ چیست
(تم جانتے ہو کہ موتیوں کی لڑی جو تمھارے سر پر ہے کیا چیز ہے)

نورجہاں نے فی البدیہہ دوسرا مصرعہ اس طرح کہا۔

تشنگان شوق را جوئیست از آب حیات
(شوق کے پیاسوں کے لئے یہ آب حیات کی ایک نہر جاری ہے)

جہانگیر کی طبیعت ناساز تھی۔ نورجہاں نے جرأت کر کے پوچھا

جہانگیر کے آنسو نکل آئے اور اس نے یہ مصرعہ کہا۔

نمی آید بغیر از گریہ دیگر کار از چشم
(میری آنکھوں کو رونے کے سوا اور کوئی کام نہیں آتا)

نورجہاں نے فی البدیہہ کہا۔

بلے از مردم بے دست و پا دیگر چہ می آید
(بیشک بے ہاتھ پاؤں کے آدمیوں سے اور کیا ہو سکتا ہے)

اس مصرعہ میں لطف یہ ہے کہ مردم کا لفظ دو معنوں میں آیا ہے۔ آدمی اور آنکھ کی تپلی۔ یہ اشعار نورجہاں کی قابلیت پر کافی روشنی ڈالتے ہیں۔

سید اشرف حسین عابدی

اندھوں کی تعلیم

تقریب دو صدی سے متمدن ممالک میں اندھوں کی تعلیم کا طریقہ رائج ہے متمدن ممالک میں ماہران خصوصی کے زیر اہتمام اندھوں کے لئے اسکول قائم ہیں۔ جہاں وہ لکھنے پڑھنے کا کام اور علوم و فنون سیکھتے ہیں ـــــ اس طرح ان کے لئے خاص خاص مدارس اور ادارے قائم ہیں اسی طرح ان کے لئے خاص خاص مطبع ہیں۔ جہاں انہیں کے لئے کتابیں چھپتی اور شایع ہوتی ہیں ـــــ ان کے لئے اخبارات بھی نکالے جاتے ہیں جس کے اڈیٹر اندھے نامہ نگار اندھے اور خریدار سب اندھے ہوتے ہیں ـــــ اندھوں کے لئے خاص خاص کتب خانے قائم ہیں جہاں ان کے لئے کتابیں فراہم کی جاتی ہیں

اندھوں کی تعلیم کا سب سے پہلے باقاعدہ انتظام فرانس میں جاری کیا گیا ـــــ "والنٹین ہوے" نے [illegible] میں اندھوں کی تعلیم کے لئے سب سے پہلا مدرسہ پیرس میں قائم کیا۔

فرانسیسیوں کے سات سال بعد انگریزوں نے پہلی مرتبہ "لیورپول" میں ایک مدرسہ اندھوں کی تعلیم کا جاری کیا اس کے بعد ۱۷۹۹ء میں خاص لندن میں اس قسم کا سب سے پہلا مدرسہ قائم کیا گیا۔ اس کے بعد اندھوں کی تعلیم کے لئے مدارس قائم ہوتے رہے، اور تھوڑے ہی دنوں میں اس قسم کے مدارس کا عام رواج ہو گیا اور اب یورپ کے ہر حصہ میں ان کی تعلیم کا انتظام ہے۔

اب حیدرآباد میں بھی ان کی تعلیم کے لئے ایک خاص مدرسہ قائم کیا گیا ہے۔ ان کی تعلیم کا مروجہ عام طریقہ یہ ہے کاغذ پر ابھرے ابھرے حروف بنائے جاتے ہیں جن کو چھو چھو کر طلبا پڑھتے ہیں۔ گو ابتداءً دشواری ہوتی ہے لیکن نابینا طلبا اسی طریقہ سے تھوڑی مشق اور عادت کے بعد اس قدر تیزی و روانی سے چھو چھو کر پڑھتے ہیں جیسے ہم اپنی کتاب دیکھ کر پڑھتے ہیں۔

یورپ میں یہ طریقہ اب بہت اہمیت حاصل کر چکا ہے، اور روز بروز اس طریقہ میں جدید اصلاحوں کی کوشش کی جا رہی ہے، بعض کتابیں اور مختلف مضامین بھی اب تک اس موضوع پر طبع ہو گئے ہیں، سب سے بڑی بات یہ ہے کہ نابیناؤں میں بہت سے باکمال پیدا ہو گئے ہیں جو اس طریقۂ تعلیم کی کامیابی کا کھلا ثبوت ہے۔

محمد غوث محی الدین [illegible]

جھوٹا خواب

(ڈرامہ)

ڈرامہ کے افراد

۱۔ سوہن لال .... ایک ساہوکار
۲۔ لڈن .... سوہن لال کا بچہ
۲۔ لتا .... سوہن لال کی بیوی
۴۔ محمد علی .... سوہن لال کا دوست
۵۔ رتن .... ڈاکٹر

(سوہن لال احمد آباد کے ایک گاؤں میں رہتا تھا۔ وہ اس گاؤں کا ساہوکار تھا اور سب گاؤں والے اس سے بخوبی واقف تھے کیونکہ وہ ہر ایک کو قرض دیا کرتا تھا۔ محمد علی سوہن لال کا بہت دوست تھا اور اس سے قرض لیا کرتا تھا۔ پیر کے روز سوہن لال کو گھر آنے میں ذرا دیر ہو گئی۔)

لتا۔ کیوں جی آج تمہیں اتنی دیر کیوں ہوئی۔

سوہن لال۔ (جواب دئے بغیر) کھانا جلدی دو۔ نیند آرہی ہے۔ (لتا ایک تھالے میں کھانا لے کر آئی۔ جب کھانا ختم ہوا تو سوہن لال شب بخیر کہہ کر اپنے پلنگ پر جا لیٹا۔ تھوڑی دیر وہ سو گیا اور خوب فراٹے لینے لگا۔ ہر طرف اندھیرا چھایا ہوا ہے۔ اور ہو کا عالم ہے۔ سوہن لال سوتے سوتے ایک ڈراؤنا خواب دیکھا گھبرا کر اٹھ بیٹھا اور چلانے لگا) "میں لٹ گیا۔ میرا گھر برباد ہو گیا"۔ (اتنے میں اس کی نظر گھڑیال پر پڑی۔ اس وقت ٹھیک دو بجے کا عمل تھا وہ زور زور سے چلانے لگا۔ اس کے شور و غل سے اس کی بیوی "لتا" دوڑتی ہوئی آئی)

لتا۔ ہائے میں کیا کروں۔ آدھی رات کو تمہیں کیا ہو گیا۔

سوہن لال۔ "لڈن کی ماں، لڈن کی ماں" کیا کہوں۔ میرے مرنے کا وقت قریب آگیا دیکھو دیکھو دو بج گئے۔ اب صرف میں ایک گھنٹے کا مہمان ہوں۔ ذرا میرے لڈن کو جلدی لاؤ تاکہ اسے آخری مرتبہ پیار کر لوں۔

لتا۔ (اور بھی پریشان ہو کر رونے لگتی ہے اور کہتی ہے) میں لٹ گئی، میں لٹ گئی۔ مجھے اکیلا چھوڑ کر آپ نہیں جا سکتے۔ ہائے میرا لڈن کس کو پتاجی کہہ کر پکارے گا۔ (ان لوگوں کے شور و غل سے پڑوسی سب جاگ اٹھے اور سب کے سب جمع ہو گئے)

سوہن لال۔ ادھر آ، لڈن کی ماں! میں تم سے کچھ کہنا چاہتا ہوں۔ دیکھ گھبراؤ نہیں اب میں تھوڑی دیر کے بعد مر جاؤں گا۔ مجھے معلوم ہو چکا ہے۔ اچھا دیکھو محمد علی اور دو تین اشخاص کے ہاں میرے روپے ہیں ان سب سے وصول کر لینا اور یہ کنجیاں لو اور دیکھو یہ راز کسی کو نہ کہنا۔ جاؤ اور میری الماری کھولو۔ بیچ کے خانے میں کپڑے ہیں ان کپڑوں کو اٹھاؤ۔ ایک کنجی ملے گی اس کنجی کو لے کر میری تجوری کھولو ایک پوٹلی میں اشرفیاں ہیں اور دوسری میں روپے۔ ان کو حفاظت سے رکھنا اور کسی کو نہ بتانا۔

لتا۔ (خوب زور زور سے رو کر کہتی ہے) ہائے میں یہ سب لے کر کیا کروں۔ جب آپ ہی نہیں تو یہ دولت میرے کس کام کی۔ ہائے خدا تو ان کے خواب کو جھوٹا کر دے، تو جو چاہے کر سکتا ہے۔ یہ کہہ کر وہ اور دھاڑیں مارنے لگی۔

محمد علی۔ (لتا کے قریب جاتا ہے اور پوچھتا ہے)
کیا ہوا (پھر سوہن لال کے قریب جاتا ہے۔) تم ہی بتاؤ
آخر بات کیا ہے؟

سوہن لال۔ دوست تم آگئے (یہ کہہ ہی رہا تھا کہ
گھڑیال نے ڈھائی بجائے۔ گھڑیال کی آواز سن کر چلا
اٹھتا ہے) اب صرف آدھ گھنٹہ ہے۔ اس کے بعد
مر جاؤں گا۔ ہاں محمد علی تم جو میرا روپیہ دینا باقی ہو وہ
لڈن کی ماں (یعنی لتا) کو دینا۔

لتا۔ (رو کر کہتی ہے) دیکھو بھائی (یعنی محمد علی)
ذرا جاکر ڈاکٹر صاحب کو بلا لاؤ۔ ذرا جلدی کرو (محمد علی
ڈاکٹر کو بلانے چلا گیا)

سوہن لال ہائے ڈاکٹر کو کیوں بلایا؟ یہاں پیسے
کس کے پاس ہیں جو ڈاکٹر کو دئے جائیں۔ خیر اگر محمد علی
نے ڈاکٹر رتن کو بلایا تو اچھا ہے کیونکہ وہ ہمارا پکا دوست
ہے (اتنے میں محمد علی رتن کو ساتھ لے کر آتا ہے اور
سوہن لال کے کمرے میں لے جاتا ہے۔)

رتن۔ ہلو (Hello) سوہن لال۔ کہو کیا ہوا۔

سوہن لال۔ ارے بھئی کیا کہوں میں نے رات کو
تقریباً ایک بجے خواب دیکھا کہ میں تین بجے تک مر جاؤں گا
(گھڑی دیکھتا ہے) اور کہتا ہے کہ ہائے اب صرف
پندرہ منٹ ہی رہ گئے ہیں۔ "لڈن کی ماں" (پکارتا ہے
جب وہ آئی تو کہتا ہے) جاؤ ایک سفید چادر لے آؤ اب
وقت بہت قریب آگیا ہے۔ جاؤ جلدی جاؤ۔

لتا۔ (دوڑتی ہوئی آتی ہے اور چادر دے کر
روتی ہوئی کہتی ہے) ہائے میں برباد ہوگئی۔ اب میں کیا
کروں پھر خدا سے دعا مانگتی ہے کہ بھگوان تو چاہے کر سکتا ہے
مگر ان کے خواب کو جھوٹا کر دے۔

سوہن لال (گھڑی دیکھ کر سب کو خدا حافظ کہتا ہے
اور لتا کو بلا کر کہتا ہے) سب سے پیسے وصول کر لینا
(یہ کہہ کر چادر اوڑھ لیتا ہے)۔

لتا۔ خوب روتی ہے اتنے میں تین بجتے ہیں۔ لتا
آہ سرد بھرتی ہے اور پھر گر جاتی ہے

رتن۔ (تھوڑی دیر تک بیٹھتا ہے اور ۳ ½ کے بعد
سوہن لال کی نبض دیکھتا ہے اور خوشی سے کہتا
ہے۔ یہ زندہ ہے مرا نہیں (یہ آواز سن کر لتا آ...

لتا۔ (خوشی سے چلا اٹھتی ہے) ان کا خواب
جھوٹا تھا۔

سوہن لال۔ (رتن سے کہتا ہے) گھڑی تیز ہو گئی
مجھے تین بجے مرنا ہی ہے

(رتن بیٹھا انتظار کرتا ہے۔ یہاں تک کہ چار بج
جاتے ہیں)۔

رتن۔ سوہن لال اب ہماری فیس کہاں ہے

سوہن لال۔ محمد علی سے ایک روپیہ لے لو۔ یہ تمہاری
فیس ہے (رتن اور محمد علی چلے جاتے ہیں)

لتا۔ (خوش ہو جاتی ہے اور پھر چلا کر بولتی ہے
ان کا خواب جھوٹا تھا۔ دونوں خوشی سے اچھل پڑتے ہیں
اور آپس میں گلے ملتے ہیں۔

ایس ایم عباس

سفید جھوٹ

احمد اور محمود کی عمروں میں صرف دو تین سال کا فرق تھا۔ دونوں ایک ہی جماعت میں پڑھتے تھے احمد ہمیشہ جماعت میں اول یا دوم رہتا تھا اور محمود گیارہویں یا بارہویں درجہ میں رہتا تھا۔ دونوں میں بے حد دوستی تھی۔ دونوں اول جماعت سے شریک سبق تھے۔ احمد اور محمود کی طبیعت میں ایک زبردست فرق تھا۔ احمد سنجیدہ اور جفاکش، محمود شوخ اور کاہل۔ مدرسہ میں وقفہ ملتا تو احمد کھانا کھاتے ہی مطالعہ کے کمرہ میں جاکر رسالے اور میگزین وغیرہ پڑھتا مگر محمود جلد کھانا کھاکر دوسرے لڑکوں کے ساتھ گپ شپ مارا کرتا تھا۔

۲

احمد اور محمود ہشتم تک برابر کامیاب ہوتے رہے۔ اب محمود کی طبیعت پہلی سی نہ تھی۔ اس کی طبیعت میں ایک زبردست انقلاب ظہور پذیر ہو چکا تھا۔ اس کو احمد سے کچھ نفرت سی ہوگئی تھی وہ اس کے پاس بیٹھنا بھی نہ چاہتا تھا۔ احمد کی حالت محمود کی طبیعت کے بالکل برعکس تھی۔ اس کو محمود سے کچھ محبت سی پیدا ہوگئی تھی۔ اس کو محمود کی سختی اور برے برتاؤ سے قلق ہوتا تھا پھر بھی وہ محمود کا خیر خواہ تھا۔ اس نے اس سے علحدگی کا سبب پوچھا، بہت منت سماجت کی لیکن محمود کا دل نہ پسیجا۔ اس نے ترش روئی سے احمد کو روکھا سا جواب دیا۔ اس جواب سے احمد کے ٹوٹے ہوئے دل پر اور بھی ایک چوٹ لگی اس دن وہ گھر جاکر بہت رویا اور مدرسہ کا کام تک بھی نہیں کیا اور اسی پریشانی کے عالم میں سوگیا۔ دوسرے دن مدرسہ گیا جماعت میں کتابیں رکھ کر باہر آرہا تھا کہ محمود سے مڈبھیڑ ہوئی۔ محمود نے اس کی طرف سے منہ پھیر لیا سلام کا جواب بھی نہ دیا اور چلتا بنا۔ احمد جماعت میں بالکل گم سم رہا اور کسی سے بات تک نہ کی۔

۳

تعطیل تھی محمود گھر میں بہت خوش تھا۔ مگر احمد اپنے گھر میں بہت سنجیدہ، بستر پر بیٹھ کر محمود کو اس طرح خط لکھنے لگا۔

پیارے دوست محمود!

تسلیم۔ میں نے آخر ایسا کونسا گناہ کیا ہے جس کا خمیازہ بھگت رہا ہوں۔ آپ کو مجھ سے نفرت کیوں ہے۔ کیا میں نے کوئی کام آپ کی مرضی کے خلاف کیا؟ نہیں ہرگز نہیں کیا پھر مجھ سے دور دور کیوں رہتے ہو۔ کیا یاد نہیں کہ ہم کتنے دوست تھے؟ ہر وقت ہم پیالہ وہم نوالہ اور ایک جان دو قالب رہتے تھے۔ ہر وقت کا ایک ساتھ پڑھنا ایک ساتھ کھیلنا اور ایک ساتھ لکھنا آپ میرے دل کی گہرائیوں میں ہیں اور مجھے ہمیشہ وفا شعار اور اپنا خیر خواہ پائیں گے مہربانی فرماکر اس خط کا جواب دیجئے۔ فقط آپ کا مخلص دوست

"احمد"

احمد نے خط کو لفافہ میں بند کرکے محمود کے ہاں بھیج دیا۔ محمود پورا خط بھی نہ پڑھا تھا کہ اسے غصہ سے بخار چڑھ آیا اور اس نے خط چاک کر ڈالا اور نوکر سے

کہلا بھیجا کہ پھر کبھی وہ کچھ لکھنے کی جرأت نہ کرے۔ احمد جو جواب کے لئے منتظر کھڑا تھا یہ روکھا سا جواب سن کر دل ہی دل میں کڑھتا رہا۔

۴

احمد کئی مرتبہ محمود کے گھر گیا مگر محمود نے احمد کو کہلا بھیجا کہ اسے فرصت نہیں ہے یا وہ اس سے ملنا نہیں چاہتا۔ ان ہی دنوں محمود کے گھر ٹیلیفون آیا۔ جوں ہی احمد کو معلوم ہوا کہ محمود کے گھر ٹیلیفون ہے تو اس نے کئی دفعہ محمود سے بات کرنے کی کوشش کی مگر بے سود جب احمد نے پوچھا کہ محمود گھر میں ہے تو محمود ہی نے ٹیلیفون پر کہا کہ وہ گھر میں نہیں ہیں۔ ایسے واقعات آئے دن ہوتے تھے۔ ایک دن محمود نے چاہا کہ احمد کو جھوٹ بول کر پریشان کرے۔ اس لئے جب احمد نے اس کے پاس ٹیلیفون کیا تو محمود نے کہا کہ جب وہ بازار سے گذر رہا تھا تو موٹر سے ٹکرا گیا اور اس کی ایک ٹانگ ٹوٹ گئی ہے اور وہ ہسپتال میں ہے احمد نے جب یہ بات سنی تو اس نے سچ سمجھا اور ہسپتال میں محمود کو دیکھنے کے لئے وہاں پہنچا۔ اسے محمود تو کجا محمود کے فرشتے بھی نہ ملے۔

اس دن محمود بہت خوش تھا کیونکہ اس نے احمد کو بے وقوف بنانے میں کامیابی حاصل کرلی تھی۔

۵

محمود سائیکل پر بازار سے کتاب لانے کے لئے گھر سے نکلا۔ بازار میں آدمیوں کا انبوہ تھا موٹریں بہت گذر رہی تھیں محمود بجائے سائیکل سے اترنے کے اسی پر بیٹھا رہا یہاں تک کہ ایک موٹر سے واقعی ٹکر ہوگئی اور اس کا پاؤں ضائع ہوگیا۔ بڑی مشکل سے لوگوں نے گھر پہنچا دیا۔ بہت دن تک محمود کا علاج ہوتا رہا آخرکار وہ چلنے کے قابل ہوگیا مگر اس کا پیر ٹھیک طریقہ سے درست نہ ہوا کبھی اس کے پیر میں درد محسوس ہوتا ہے تو یہ سمجھتا ہے کہ یہ سب احمد کی بددعا کا اثر ہے مگر وہ کبھی یہ خیال نہیں کرتا کہ کسی کو ٹیلیفون پر جھوٹ کہہ کر بے وقوف بنانے کا نتیجہ ایسا ہی ہوتا ہے۔

محمد کمال خاں گمنام

(مدرسہ عالیہ)

جہالت

۱۔ وہ جہالت جو علم کے پردہ میں پوشیدہ ہو زیادہ خطرناک ہے۔

۲۔ جاہل کی زندگی ہمیشہ بدمزگی سے بسر ہوتی ہے۔

۳۔ جاہل میں دوراندیشی تو درکنار حالات حاضرہ کے سمجھنے کی اہلیت بھی نہیں ہوتی۔

۴۔ جاہل آدمی کی مثال اس کھوٹے سکّے کی سی ہے جو کبھی کام نہیں آتا۔

۵۔ میرے نزدیک جہالت اور انسانیت ایک سطر میں لکھے نہیں جا سکتے۔ کیونکہ وہ ہمیشہ ایک دوسرے کے مخالف ہیں۔

عالیہ سلطانہ

جدید مطبوعات

شیطان کا انتقام۔ (عہدِ حاضر کے اخلاقی اور سیاسی رجحانات) از محمد جلال الدین صاحب اشک حجم ۹۰ صفحات قیمت عہ مطبوعہ انتظامی پریس حیدرآباد۔

سلطان ہند کی سیاست وطنی۔ (سیاسی حالات) مرتبہ محمد امین صاحب زبیری حجم ۱۱۹ صفحات قیمت ۱ر مطبوعہ عزیزی پریس آگرہ۔

اقبال اور اس کا پیغام۔ (اقبال کا فلسفۂ حیات) از ڈاکٹر تصدق حسین صاحب خالد حجم ۶۴ صفحات قیمت ۴ر مطبوعہ جامعہ ملیہ دہلی۔

انقلاب میں کسانوں کا ہاتھ۔ (کسانوں کی تنظیم) از منظر رضوی حجم ۱۱۵ صفحات قیمت عہ مطبع آزاد پریس میرٹھ۔

حرف و حکایت (نظموں کا مجموعہ) از جوش ملیح آبادی حجم ۲۴۸ صفحات قیمت عار کتب خانہ رشیدیہ دہلی۔

شجرۂ آصفیہ (تاریخ خاندانِ آصفیہ) از حکیم سید شمس اللہ صاحب قادری حجم ۹۵ صفحات مع متعدد شجرے قیمت ۵ر مطبوعہ عہد آفریں برقی پریس حیدرآباد

مشاہیر ہند (چند مشاہیر کے حالات) از سید بادشاہ حسین صاحب حجم ۱۳۱ صفحات قیمت عہ مطبوعہ اعظم اسٹیم پریس حیدرآباد۔

بنیادی قومی تعلیم کا نصاب از ذاکر حسین صاحب حجم ۲۴۰ صفحات قیمت عہ مطبوعہ جامعہ ملیہ دہلی۔

محمد علی جناح (سوانح حیات) از احسان اللہ صاحب ربانی حجم ۱۲۸ صفحات قیمت ۸ر مطبوعہ سلطانیہ برقی پریس لکھنو۔

حاجی لق لق کے افسانے از حاجی لق لق صاحب حجم ۱۶۰ صفحات قیمت ۱۲

پھول والوں کی سیر (بہادر شاہ کے زمانے کے حالات) از فرحت اللہ بیگ صاحب حجم ۴۵ صفحات قیمت ۲ر کتب خانہ علم و ادب، دہلی

انقلابی شرارے (اقوال کا مجموعہ) از لالہ چھبیل داس صاحب حجم ۲۴۸ صفحات قیمت ۱ر ایچ رائے اینڈ سنز۔ لاہور۔

سالنامہ عالمگیر لاہور بابتہ جون ۱۹۳۹ء۔ مرتبہ حافظ محمد عالم صاحب حجم ۲۱۶ صفحات قیمت عہ

راز و نیاز (غزلوں کا مجموعہ) از حبیب اشعر صاحب دہلوی حجم ۸۴ صفحات۔ منزل بک ڈپو۔ بلی ماراں۔ دہلی۔

ڈرامہ نمبر ادب لطیف لاہور، مرتبہ چودہری برکت علی صاحب حجم ۲۲۰ صفحات قیمت ۱۲ر

سکھی کسان (کسانوں کی بہبودی کے متعلق) از عبد الحمید صاحب تحصیلدار آرمور نظام آباد حجم ۱۹۲ صفحات قیمت عار۔

رپورٹ کمیٹی اصلاحات مع ضمیمہ نمبر ۱ و اعلان مقامی حکومت مرتبہ سید یوسف علی صاحب ایچ سی ایس حجم ۱۶۴ صفحات قیمت عہ

ماہ عرب (تاریخی ناول) از جرجی زیدان مترجمہ عظمت علی صاحب حسرت لکھنوی قیمت عہ۔

مختار دلہن (اصلاحی افسانے) از محمد مرزا خاں صاحب حجم ۱۰۰ صفحات قیمت ۹ر

انقلاب روس (تاریخ) حجم ۲۰۰ صفحات قیمت عہ

مکمل باورچی خانہ (پکوان کے طریقے) از فہمیدہ خاتون صاحبہ فرحت حجم ۲۰۰ صفحات قیمت ۱۲

آصفی کہانیاں با تصویر از محمد عبد السلام ذکی حجم ۱۰۰ صفحات قیمت ۸ر مطبوعہ اعظم اسٹیم پریس۔ حیدرآباد۔

وحدت ملت از محمد بخش صاحب مسلم حجم ۴۶ صفحات قیمت ۵ر مطبوعہ چشتی پریس بمبئی۔

مدح صحابہ اور تبرا (اقتباسات اخبار مدینہ بجنور) حجم ۹۶ صفحات قیمت ۴ر مطبوعہ مدینہ پریس بجنور۔

مرزا سیف علی خاں

تنقید و تبصرہ

روحِ حیات از جناب اختر قریشی صاحب حجم ۸۰ صفحات قیمت ۱۲ مطبوعہ عہد آفریں برقی پریس حیدرآباد

جناب اختر قریشی کے مکتوبات کے اس مجموعہ میں کوئی ڈھائی درجن دلچسپ مکتوب ہیں، جن میں عورت کے حقوق، نظریۂ محبت، بچوں کی تعلیم و تربیت، مغرب پرستی، ازدواجی زندگی، توہم پرستی، عورت کی فطرت، تمدن و معاشرت اور موجودہ سماجی خرابیوں کی نسبت جناب اختر نے اپنے تاثرات مختصر پیرایہ میں بیان کئے ہیں اور بعض مکتوب میں مزاحیہ انداز میں بڑی پتہ کی باتیں لکھی ہیں، بہ حیثیت مجموعی کتاب دلچسپ اور سبق آموز ہے

وصلی کی دستکاری مولفہ سید رضا احمد صاحب جعفری حجم ۵۶ صفحات قیمت ۸ مطبوعہ محبوب المطابع دہلی عصمت بک ڈپو دہلی سے مل سکتی ہے زیر نظر کتاب چار باب پر مشتمل ہے پہلے باب میں وصلی یا کارڈ بورڈ کی قسمیں بتائی گئی ہیں اور کارڈ بورڈ کے نمونے زاول بنانے کے لئے جن چیزوں کی ضرورت پڑتی ہے ان کی تفصیل دی گئی ہے دوسرے باب میں وصلی کی دستکاری کے اصول اور عام ہدایتیں درج ہیں تیسرے باب میں ابتدائی یا بنیادی شکلیں وضاحت کے ساتھ نقشوں کے ذریعہ سمجھائی گئی ہیں اور چوتھا باب چند آسان نمونوں پر مشتمل ہے۔ وصلی یا کارڈ بورڈ کی دستکاری بقول مولف بچوں کے لئے بدرجہ اتم مفید اور ساتھ ہی آسان اور ارزاں ہے اس کی کاٹ چھانٹ چھوٹے سے چھوٹے بچے کے لئے بھی ممکن اور سہل ہے اگر اس صنعت کو جرمنی اور جاپان اسکولوں کی طرح ہندوستانی مدرسوں میں بھی بطور "مینوئل ٹریننگ" داخل کردیا جائے تو بلاشبہ مفید نتائج مرتب ہوں گے۔

ترکِ شراب، اسلام اور گداگری از جناب عبد المجید خان صا[حب] حجم ۲۴ صفحات قیمت ۲ ر

مطبوعہ تاج محل فائن آرٹ لیتھو ورکس بمبئی۔ اس مختصر مفید رسا[لہ] میں شراب کی برائیاں اور نقصانات اور صحت و نسل انسانی پر اس کے مضر اثرات نہایت موثر پیرایہ میں بیان کئے گئے ہیں۔ کتاب کا کچھ کم آدھا حصہ "بنت عنب" کی تباہ کاریوں سے مملو ہے باقی اوراق انسداد گداگری کے لئے وقف کئے گئے ہیں "دکن میں گداگری" کے عنوان سے جناب مولف نے لکھا ہے کہ یہ چھوٹی سی کتاب انسداد گداگری کے لئے بہت مفید ثابت ہوگی

لکڑی کا باریک کام

مرتبہ مولوی سید رضا احمد صاحب جعفری ہیں ادارۂ عصمت بک ڈپو [illegible] شائع کیا ہے جہاں سے عورتوں کے لئے اکثر ایسی ہی مفید اور کارآ[مد] کتابیں شائع ہوتی رہتی ہیں۔

اگرچہ یہ پرانا مقولہ صحیح ہے کہ تجربہ ہی سب کچھ سکھاتا ہے [illegible] ہر علم و فن میں محنت و مشقت کے بغیر کامیابی نہیں ہوسکتی تاہم اس قسم [کی] کتابوں سے یہ فائدہ ہوتا ہے کہ ان دقتوں اور پریشانیوں سے د[و چار] ہوئے بغیر جو ہر نئے کام میں لازمی ہیں، مبتدی جلد ترقی حاصل کر [سکتا ہے] یہ کتاب فریٹ ورک کے متعلق لکھی گئی ہے۔ لکڑی کا نفیس کام [illegible] کے کام سے بے شمار وضع اور قطع کی زیبائشی اور کارآمد اشیا بنائی ج[اسکتی] ہیں تصویروں اور آئینوں کے فریم، گلدان، قلمدان، الما[ریاں] اسٹیشنری کیس، گڑیوں کے مکان اور دوسرے کھلونے وغ[یرہ] بڑے خوبصورت بن سکتے ہیں۔ اور اس فن میں یہ خوبی ہے کہ اس [سے] مرد اور عورت اور بچہ اور بوڑھا ہر ایک فائدہ یا لطف اٹھا سکتا ہے [illegible] پردہ نشین عورتوں اور لڑکیوں کے لئے یہ نہ صرف ایک دلچسپ مشغ[لہ] اور ورزشی ہنر ہے بلکہ ایک مفید کام اور آمدنی کا ذریعہ بھی ہے [illegible] سید رضا احمد صاحب نے اس کتاب کو چند بابوں [illegible]

نشان ٹپہ آصفیہ (۱۵۳)

نشان ٹپہ برطانیہ (M 385)

ادارۂ ادبیات اردو حیدرآباد دکن کا ماہنامہ

سب رس

زیر نگرانی

ڈاکٹر سید محی الدین قادری زور

مجلس ادارت

صاحبزادہ میر محمد علی خان میکش — سکینہ بیگم

خواجہ حمید الدین شاہد — معین الدین احمد انصاری

جلد (۲) شمارہ (۱۱)

نومبر ۱۹۳۹ء

فہرست مضامین

	مضمون	مصنف	صفحہ
	اداریہ	ادارہ	۳
	شہریار صحرا	نواب اعانت جنگ معین الدولہ بہادر معین	۹
	ادارۂ ادبیات کی ایک جدید اور مفید تجویز	قاضی عبدالغفار مدیر پیام	۱۲
	اردو امتحانات	سید احمد محی الدین مدیر رہبر دکن	۱۳
	ایک مستحسن اقدام	احمد عارف مدیر صبح دکن	۱۴
	ایک دلہن کو ڈولی میں سوار ہوتے دیکھ کر	ایم ایم اسلم (لاہور)	۱۵
۷	غزلیات	[illegible] (کانپور)	۱۶
۸	معاہدۂ معاشری	[illegible] الدین ایم اے	۱۷
۹	تاثرات سفر یورپ	پروفیسر ہارون خاں شیروانی	۲۰
۱۰	غزل	سکندر علی وجد ایم اے سی ایس	۲۵
۱۱	معاشرت میں سادگی	نواب مرزا سیف علیخاں	۲۷
۱۲	سکون و اضطراب (غزلیں)	سید علی منظور	۲۹
۱۳	لمبا رستے	حفیظہ جمال (ناندیڑ)	۳۰
۱۴	الن (نظم)	انسب کلیانوی (گرگنٹہ)	۳۲

نمبر	عنوان	مصنف	صفحہ
۱۵	موت سے (نظم)	مرتضیٰ مجتہدی	۴۲
۱۶	جیسم پتری	مرزا عصمت اللہ بیگ	۴۳
۱۷	صنفِ قصیدہ پر ایک نظر	سید ممتاز علی وارثی بی اے	۴۴
۱۸	محبوب سے خطاب (نظم)	مسز ڈی برکت رائے	۴۳
۱۹	اشتراکیت کی حدیں	ضیاء الدین انصاری ایم اے بی اس سی آنرز	۴۴
۲۰	کچھ گولکنڈے کے نئے قلعہ سے متعلق	سید رحمت علی شاہ قادری	۴۹
۲۱	بھکاری کا خونیں انتقام	خلیل اللہ	۵۲
۲۲	جدید مطبوعات	مرزا سیف علی خاں	۵۶
۲۳	تنقید و تبصرہ	شعبۂ تنقید ادارہ	۵۷
۲۴	بچوں سے	معین الدین احمد انصاری	۶۶
۲۵	معمہ	سید خواجہ معین الدین متعلم فوقانیہ گلبرگہ	۶۶
۲۶	میں جگنوں سو گیا	سکینہ بیگم	۶۷
۲۷	پتنگ (نظم)	لطیف النساء بیگم ام اے	۷۰
۲۸	تقریر	سید احمد حسین (انٹرمیڈیٹ کالج)	۷۰
۲۹	مدرس سے خطاب (نظم)	مرزا سرفراز علی (بی اے بی ٹی اسپ اڈیڈ ڈبلن)	۷۲
۳۰	اچھی صورت	سرور فاطمہ عصمت	۷۳
۳۱	نصیحت (نظم)	نظر	۷۴
۳۱	روپہی کی بلی	راجہ جیتندر پرشاد جوہر	۷۵
۳۲	عورت کی پہلی آزادی	اکرام النساء بیگم (نامپلی ہائی اسکول)	۸۰

---

(۱) اردو تصنیف و تالیف اور انشا پردازی کا ذوق رکھنے والے اصحاب ادارہ سے مشورہ کر سکتے ہیں ادارہ کے مختلف شعبوں میں ہر موضوع اور ہر فن کے ماہرین موجود ہیں جو خوشی سے مدد دیتے ہیں۔

(۲) اردو زبان سے متعلق جو بھی کام ہو اس کے بارے میں "ادارہ ادبیات اردو" کی خدمات ہر وقت حاضر ہیں۔

(۳) اردو کی ترقی و اشاعت کے لئے اردو کے بہی خواہ جو بھی مفید تجویزیں اور مشورے ادارہ میں روانہ کرتے ہیں ان پر سنجیدگی سے غور کیا جاتا ہے اور اُن کے روبہ عمل لانے کی کوشش کی جاتی ہے۔

(۴) اردو مطالعہ کا ذوق ہو تو ادارہ کے سب رس کتاب گھر کی فہرست منگوا لیجئے۔

(۵) اگر اردو کتابیں خریدنی ہوں تو پہلے سب رس کتاب گھر سے مشورہ کیجئے۔

(۶) مراسلت کرنے والے اصحاب اس امر کا ضرور خیال رکھیں کہ اگر ادارہ سے جواب حاصل کرنا ہو تو جوابی کارڈ یا ایک آنے کے اسٹامپ لازماً روانہ کریں۔ ورنہ ادارہ پر جواب کی ذمہ داری نہیں رہتی۔

خواجہ حمید الدین شاہد کے اہتمام سے عہد آفرین پریس میں چھپ کر دفتر ادارہ رفعت منزل خیریت آباد حیدرآباد دکن سے شائع ہوا

اِداریہ

اردو نمبر

سب رس کا تیسرا سال جنوری ۱۹۳۹ء سے شروع ہوتا ہے۔ اس مہینہ کا شمارہ اردو نمبر ہوگا۔ جس طرح سے سب رس کا دوسرا سال ایک عالی شان دکن نمبر سے شروع کیا گیا تھا جس میں دو سو صفحات اور تقریباً سو تصویریں تھیں اُسی طرح کوشش کی جا رہی ہے کہ تیسرے سال کا آغاز بھی سب رس کے شایان شان ہو۔ اردو نمبر کی تیاری کئی ماہ سے جاری تھی۔ اس کے لئے اب تک بیسیوں تصویروں کے بلاک بن چکے ہیں اور ابھی بن رہے ہیں۔ مضامین بڑے بڑے اہتمام سے لکھوائے گئے ہیں۔ معاصرین کے علاوہ بڑے بڑے شاعروں اور انشا پردازوں کی نگارشات قلم کے علاوہ اردو کے گزرے ہوئے مشہور و معروف بزرگوں کے اہم غیر مطبوعہ خطوط بھی اشاعت کے لئے فراہم کئے گئے ہیں۔ اس اردو نمبر میں اردو زبان اور ادب کے اکثر پہلوؤں کے متعلق ایسی مفید اور ضروری معلومات شائع کی جائیں گی جو بڑی بڑی کتابوں کے پڑھنے کے بعد بھی آسانی سے معلوم نہیں ہو سکتیں۔ اس کے مضامین نظم و نثر کی طرح اس کی تصویریں بھی نادر اور بڑی قیمتی ہیں۔ جن اصحاب نے سب رس کے اقبال نمبر، محرم نمبر اور دکن نمبر دیکھے ہیں، وہ خود اندازہ کر سکتے ہیں کہ اردو نمبر کس پایہ کا ہو سکتا ہے۔ یہ نمبر اگرچہ سب رس کے سالانہ خریداروں کو مفت دیا جائے گا لیکن علیحدہ خریدنے والوں کے لئے اس کی قیمت دو روپے ہوگی۔ اگرچہ جنگ کی وجہ سے ہر شئے میں گرانی محسوس کی جا رہی ہے۔ لیکن سب رس انشاء اللہ اپنی آب و تاب کو باقی رکھے گا اور اس کی قیمت میں بھی کوئی اضافہ نہیں کیا جائے گا۔ توقع ہے کہ سب رس کے قدردان ہمارے اس ایثار سے متاثر ہوں گے اور اس کی توسیع اشاعت میں ہمارا ہاتھ بٹائیں گے۔

اردو امتحانات

اس ماہ ادارۂ ادبیات اردو نے ایک اور شعبہ یعنی شعبۂ امتحانات کے کام کا آغاز کیا۔ اس شعبہ کا پہلا اجلاس مولوی سید علی اکبر صاحب ایم اے کنٹب ناظم تعلیمات ممالک محروسہ کی صدارت میں یکم اکتوبر کو عثمانیہ ٹریننگ کالج میں منعقد ہوا جس کے پرنسپل مولوی سجاد مرزا صاحب ایم اے کنٹب نائب صدر شعبہ ہیں۔ اس جلسہ میں ایک پرتکلف عصرانہ کا بھی انتظام کیا تھا۔ اس شعبہ کے معتمد پروفیسر عبد القادر صاحب سروری ایم اے ال ال بی ہیں۔ اراکین حسب ذیل اصحاب ہیں۔

(۱) ڈاکٹر سید محی الدین صاحب قادری زور ایم اے پی ایچ ڈی (لندن) پروفیسر اردو جامعہ عثمانیہ معتمد اعزازی "ادارۂ ادبیات اردو"

(۲) مولوی غلام ربانی صاحب بی اے بی ٹی پرنسپل گورنمنٹ چادرگھاٹ ہائی اسکول حیدرآباد دکن۔

(۳) مولوی ظہیر الدین احمد صاحب ایم اے ایچ سی ایس معتمد محکمہ ریلوے حیدرآباد دکن۔

(۴) مولوی عبد المجید صاحب صدیقی ایم اے ال ال بی لکچرار تاریخ جامعہ عثمانیہ حیدرآباد دکن۔

(۵) مولوی سید محمد صاحب ایم اے اردو لکچرار [illegible]

(۶) مس [illegible] بی اے آنرز (لندن) [illegible]

(۷) مولوی میر اکبر علی خاں صاحب بی اے ال ال بی (آنرز) بیرسٹر ایٹ لا۔

(۸) مولوی طاہر الحسن صاحب بی اے بی ٹی اردو لکچرار کلیۂ تعلیم المعلمین حیدرآباد دکن۔

(۹) پنڈت نرسنگ راؤ صاحب ایڈیٹر رعیت حیدرآباد۔

اس شعبے کے تفصیلی اغراض و مقاصد اور قواعد و ضوابط اور امتحانات کے پرچے نصاب کی کتابیں اور دیگر امور ایک علیحدہ کتابچہ معلومات میں شایع کئے گئے ہیں جو فی الحال مفت تقسیم کیا جا رہا ہے بشرطیکہ ادارہ کے دفتر سے دست بدست حاصل کیا جائے۔ بذریعہ ڈاک منگانے والوں سے ایک آنہ کے ٹکٹ طلب کئے جاتے ہیں۔ اس کام کو اتنا پسند کیا گیا ہے کہ اب تک سیکڑوں صاحب یہ کتابچہ معلومات حاصل کر چکے ہیں۔ اور اس کے متعلق اخباروں نے بھی بہت اچھی رائیں لکھی ہیں۔ چنانچہ آئندہ صفحوں میں بعض موقر جرائد کے ادارئیے درج کئے جا رہے ہیں۔ جن کے مطالعہ سے یہاں اس تحریک کے متعلق رائے عامہ کا علم ہو سکتا ہے۔ ان امتحانات کی اہمیت اور ضرورت بھی محسوس ہو گی۔

ادارہ نے شرکتِ امتحانات کی فیس بھی بہت قلیل رکھی ہے۔ یعنی اردو دانی ایک روپیہ۔ اردو عالم پانچ روپیے۔ اردو فاضل سات روپیے۔ خوش نویسی دو روپیے۔ خطاطی و کتابت (یعنی کاپی نویسی) سات روپیے۔ ان سب امتحانوں میں ہر شخص بلا امتیاز مذہب و ملت و جنس شریک ہو سکتا ہے جس کے لئے مقررہ نصاب کتب کی تکمیل کافی ہو گی۔ خواتین کے لئے امتحان گاہ میں پردہ کا انتظام کیا جائے گا۔ پہلے امتحانات جون ۱۹۴۰ء یعنی امرداد ۱۳۴۹ف میں لئے جائیں گے۔ چونکہ ادارہ کی جگہ محدود ہے اس لئے افسوس ہے کہ اس سے زیادہ معلومات نہیں دی جا سکتیں۔ مزید علم کے لئے کتابچۂ معلومات دیکھ لیا جائے۔

افتتاحِ تعلیم

ان امتحانات کی تیاری اور امتحان میں بیٹھنے والوں کی سہولت کے لئے ادارہ ہر ممکنہ کوشش کرنا چاہتا ہے۔ ملک کی تمام انجمنوں سے اشتراکِ عمل کی توقع کی جا رہی ہے۔ اور بعض نے تو خود ہی ہاتھ بٹانے کے لئے آمادگی ظاہر کی۔ چنانچہ درسگاہ علوم شرقیہ کی خواہش پر جناب ڈاکٹر زور صاحب معتمد اعزازی ادارہ نے ۱۸ اکتوبر ۱۹۳۹ء کو شام کے پانچ بجے اس درسگاہ میں اردو عالم اور اردو فاضل کے امتحانات کی تعلیم کا افتتاح کیا۔ انھوں نے اپنی افتتاحی تقریر میں اردو زبان کی اہمیت اردو مطالعہ کی ضرورت اور اردو امتحانات کے اغراض و مقاصد پر نہایت شرح و بسط کے ساتھ روشنی ڈالی۔ حاضرین کی کثیر تعداد سے ظاہر ہوتا تھا کہ اردو زبان سے دلچسپی رکھنے والوں میں زندگی کے آثار پیدا ہوتے جا رہے ہیں۔ اس تقریب میں ادارہ ادبیاتِ اردو کی طرف سے معتمد امتحانات پروفیسر سروری صاحب کے علاوہ پروفیسر مجید صدیقی صاحب پروفیسر سید محمد صاحب ایم اے اور مولوی فیض محمد صاحب بی اے ٹوپ ایڈ نے بھی شرکت کی۔

نئی کتابیں

اس مہینے ادارہ نے بچوں اور بچیوں اور عوام کی معلومات کے لئے تین مفید کتابیں سرسید احمد خاں۔ سالار جنگ اعظم اور سوتیلی ماں شایع کیں۔ پہلی دو کتابیں ادارہ کے شعبہ تالیف و ترجمہ کی طرف سے شایع ہوئی ہیں۔ کتاب سرسید احمد خاں میں شعبہ کے معتمد مولوی ظہیر الدین احمد صاحب ایم اے۔ اج سی یس نے مسلمانوں کے محسن اعظم

سرسید احمد خاں کے مختصر حالات زندگی نہایت سادہ اور سلیس پیرایہ میں قلمبند کیے ہیں۔ کتاب کے سرورق پر سرسید کا نہایت پاکیزہ فوٹو بھی ہے قیمت صرف ۲ ر رکھی گئی ہے تاکہ زیادہ سے زیادہ لوگ اس کو خرید کر پڑھ سکیں۔

شعبۂ تالیف و ترجمہ کی دوسری کتاب سالار جنگ اعظم کے مولف مولوی فیض محمد صاحب بی اے۔ ڈبے۔ ٹی ہیں جن کو سوانح نگاری کا بڑا ملکہ حاصل ہے۔ چنانچہ مشہور مصلحان تعلیم کی سوانح عمریوں کے علاوہ ان کی کتاب ابن سعود کئی سال قبل شایع ہو چکی ہے۔ سالار جنگ اعظم کے متعلق انھوں نے جملہ ضروری اور مفید معلومات کو بڑے دلچسپ اور سادہ پیرایے میں قلمبند کر دیا ہے۔ یہ کتاب بھی باتصویر ہے اور مدرسوں کے طلبا اور عوام کے مطالعہ کی خاطر اس کی قیمت بھی بہت کم یعنی صرف ۶ ر رکھی گئی ہے۔

شعبۂ تالیف و ترجمہ کی طرف سے اور ایک کتاب مغربی تصانیف کے اردو تراجم زیر طبع ہے۔ یہ ان تمام اجتماعی اور انفرادی کوششوں کا مستند تذکرہ ہے جو صدیوں سے اردو زبان کو مالا مال کرنے کے لئے دوسری زبانوں کی کتابوں کو منتقل کرنے کے سلسلہ میں کی جاتی رہی ہیں۔ اس کے مصنف مولوی میر حسن صاحب ام اے مصنف "ورڈز ورتھ اور اس کی شاعری"، "ہوش کے ناخن" وغیرہ ہیں۔

اس ماہ کی تیسری مطبوعہ کتاب شعبۂ نسواں کے سلسلۂ مطبوعات کی چوتھی کڑی ہے۔ اس سے پہلے "بندولی نذر دکن" اور "من کی بتیا" اس شعبہ کی طرف سے شایع ہو کر مقبولیت حاصل کر چکی ہیں۔ یہ کتاب اگرچہ نفسیاتی اور اخلاقی موضوع پر لکھی گئی ہے لیکن طرز ادا ایسی دلچسپ ہے کہ بار بار پڑھنے کو جی چاہے گا۔ اس کی مصنفہ محترمہ رابعہ بیگم صاحبہ (مسز انوار اللہ صاحب) صدر شعبۂ نسواں ہیں جو اردو کی اچھی ادیب اور شاعرہ ہیں۔ اس کتاب کی طباعت و کتابت ایسی نفیس ہے اور اس کا سرورق اور جلد ایسی خوش نما ہے کہ اس کے مقابلہ میں اس کی قیمت محض ۱۲ ر ہیچ معلوم ہوتی ہے۔ ادارہ نے محض مطالعہ کا ذوق عام کرنے کے لئے ایسی کم قیمتیں مقرر کی ہیں۔

شعبۂ نسواں کی طرف سے مرحومہ طیبہ بیگم بلگرامی کے جو رسائل عرصے سے خاص اہتمام سے زیر طبع تھے ان کا کام اب مکمل ہو چکا ہے اور انشاء اللہ اس رسالہ کی اشاعت کے ساتھ ساتھ وہ بھی منظر عام پر آسکیں گے۔

اس ماہ شعبۂ نسوان کی طرف سے ایک اور اہم کتاب سوانح آزاد کی طباعت کا کام شروع ہو چکا ہے۔ شمس العلما مولوی محمد حسین آزاد کے مکمل حالات زندگی اب تک شایع نہیں ہوئے تھے محترمہ ہمایوں بانو بیگم صاحبہ ام اے نے بڑی خوش سلیقگی کے ساتھ ان کو مرتب کر لیا ہے۔ اور انشاء اللہ یہ کتاب نومبر کے ختم تک شایع ہو جائے گی۔

امداد کتب خانہ

ناظم صاحب اعزازی کتب خانۂ ادارہ اطلاع دیتے ہیں کہ حسب ذیل اصحاب نے اس ماہ ادارہ کو کتابیں اور رسائل عنایت کئے ہیں۔

محترمہ صغریٰ ہمایوں مرزا صاحبہ۔ النساء ۱۷۔ اسوفی ۱۲ ظل السلطان ۸۔ مسلم ۸۔ شباب اردو ۷۔ تہذیب نسواں ۲۔ نبات ۶۔ خادمہ ۵۔ اشاعت اسلام ۵۔ متفرق ۱۱۴۔ انگریزی رسالے ۲۶۔ آصف اللغات ۸ جلدیں۔ انوار اللغۃ ۲ جلدیں۔

گلشن ترنم۔ خیابات فطرت۔ حالات ابن رشد۔ خیابان فطرت
کرشمۂ تقدیر۔ مکاتیب۔ سرگذشت اجرہ۔ مخزن معرفت۔
منبر نسوان۔ شاہراہ نجات ایک ایک جلد۔ متفرق کتب ۶۹ جلد
ان کے علاوہ حضرت شاد عظیم آبادی کے قلم سے لکھے ہوئے
رسالے جن کی فہرست مرتب کی جارہی ہے۔

محترمہ فخر الحاجیہ بیگم امیر حسن صاحب۔ رباعیات
شاد اور عیسائی آشرم۔ پروفیسر سید محمد صاحب ایم اے۔
رسالۂ الہادی کے تین مکمل فائل اور دیوان انشاء کا قلمی نسخہ۔
مولوی نصیر الدین ہاشمی صاحب۔ شہاب ۱۸۔ عصمت ۱۹۔
مست قلندر ۵۔ زیب النساء ۱۴۔ حیا ۶۔ اور ۷ متفرق
رسالے۔ رسالۂ کرۂ ارض شمس الامراء۔ دکن میں اردو۔
مقالات ہاشمی۔ خواتین عہد عثمانی۔ مکتوبات امجد۔ یورپ میں
دکنی مخطوطات۔ رسالہ سراج الحیات قلمی۔ قصۂ ہندی قلمی۔
ہشت بہشت قلمی۔

مولوی موید الدین حسن صاحب دوم تعلقدار ۴ چار
متفرق رسائل اور سالنامے۔

مولوی حمید اللہ حسینی صاحب (عثمانیہ) ایک ضخیم اور قدیم
قلمی بیاض جس میں حسب ذیل اردو مثنویاں، غزلیں
اور مرثیے شامل ہیں۔ قصۂ ہرنی۔ ترکیب بند غفار۔ کشف المعراج
غزلیات شغلی۔ غزلیات سلطان۔ مکالمۂ عشق و عقل۔
مرثیہ شغلی۔ رسالۂ وجودیہ۔ رسالۂ وصل نامہ۔ محی الدین
نامۂ افضل۔ مراثی مرزا۔ مرثیہ نعیم احمد۔ مرثیہ شفیع مراثی قادر
مرثیہ علی عادل شاہ۔ مراثی اشرف۔ قلندر۔ حیرت وغیرہ
کلام معجز۔ غزل عبداللہ قطب شاہ۔ درالاسرار۔ قصۂ
حکمت سلیمان۔ مرآۃ المصلی۔ منظومات شیخ اسمٰعیل۔
مثنوی علی وغیرہ

بچوں کا سب رس

سب رس کے ناظرین اس امر سے واقف ہیں کہ ہر مہینے سب رس کے علاوہ اس کا ضمیمہ بچوں کا سب رس علیحدہ بھی شائع ہوتا ہے۔ یہ بچوں کا ماہنامہ اضلاع اور بیرون ریاست کے بچوں میں بہت مقبول ہو چکا ہے۔ اس کی بڑی خصوصیت یہ ہے کہ اس کے ہر پرچے کے مضمون نگار تک اکثر بچے اور بچیاں ہیں۔ ان کے علاوہ اس میں بڑوں کے جو مضمون، کہانیاں اور نظمیں درج کی جاتی ہیں وہ خاص طور پر بچوں کی ضرورتوں اور خصوصیتوں کا لحاظ رکھ کر لکھوائی جاتی ہیں۔ اس پرچے میں ۱۶ سے ۲۴ صفحوں تک کے مضامین اور نظمیں درج رہتی ہیں اور کبھی کبھی تصویریں بھی چھاپی جاتی ہیں۔ اس کی قیمت صرف عہ معہ محصول ڈاک ہے جو کوئی زیادہ نہیں بلکہ اس کے رنگا رنگ سرورق اور عمدہ کاغذ کے اخراجات ہی پر صرف ہو جاتی ہے۔ لیکن خریداروں کی کثرت کی وجہ سے یہ بچوں کا پرچہ بھی اپنے اخراجات آپ پیدا کر لیتا ہے۔ اس لئے کوشش کی جارہی ہے کہ نئے سال سے اس میں بھی بہت سی خوبیوں کا اضافہ کیا جائے۔ جو والدین اور سرپرست اپنے بچوں کو پڑھنے لکھنے کی طرف راغب کرنا چاہتے ہیں اور ان کی عام معلومات میں اضافہ کے خواہشمند ہیں وہ سب رس کے اس ضمیمہ کو ضرور پسند کریں گے۔ اس میں بچوں کو مطالعہ اور لکھنے کا شوق دلانے کے لئے انعامی معمے اور مقابلے بھی شامل رہتے ہیں۔ چنانچہ سال میں کئی دفعہ متعدد بچے انعام میں کتابیں وغیرہ حاصل کرتے ہیں۔

اراکین اعزازی

اس ماہ ادارہ کی مجلس عاملہ نے طے کیا کہ مولانا سید سلیمان ندوی اور سر شیخ عبدالقادر کو ان کی اعلیٰ علمی و ادبی خدمات اور

ان علمی دلچسپیوں کی وجہ سے جو وہ ادارہ کے معاملات میں لیتے رہتے ہیں، ادارۂ ادبیات اردو کا رکن اعزازی یعنی رفیق منتخب کیا جائے۔

معاونین وارکین

معتمد صاحب ادارہ نے ملک کے اکثر علم دوست اصحاب کے یہاں ادارہ کی رکنیت یا معاونت قبول کرنے کے لئے دعوت نامے روانہ کئے ہیں جن کو اکثر اصحاب نے قبول کر لیا ہے۔ اس وقت تک حسب ذیل خواتین اور اصحاب کی طرف سے رقمیں وصول ہو چکی ہیں۔

معاونت۔ مولوی حبیب الرحمن صاحب بی اس سی آنرز

رکنیت دوامی۔ نواب بہادر یار جنگ بہادر۔ محترمہ صغریٰ بیگم ہمایوں مرزا مرحوم۔

رکنیت الف۔ مولوی میر اکبر علی خاں صاحب بیرسٹر۔ مولوی سید یوسف علی صاحب ایچ سی اس۔ مولوی محمد حسین خان صاحب مولوی محمد شجاع الدین خاں صاحب۔

رکنیت ب۔ مولوی سید سلطان احمد صاحب۔ مولوی سید امیر اللہ حسینی صاحب۔

معتمد صاحبہ شعبۂ نسوان نے اطلاع دی ہے کہ حسب ذیل خواتین سے رکنیت کے چندے وصول ہو چکے ہیں۔ قمر النساء بیگم صاحبہ۔ انور جہاں قریشی صاحبہ۔ بشیر النساء بیگم صاحبہ بشیر۔ تصدق فاطمہ بیگم صاحبہ۔ ہارون بیگم صاحبہ شروانیہ۔

توقع ہے کہ اور خواتین اور اصحاب بھی ادارہ کی معاونت یا رکنیت قبول کر کے اردو سے ہمدردی کا ثبوت دیں گے۔

شعبۂ نسوان

حیدرآباد کی علمی و ادبی ذوق رکھنے والی خواتین میں اس شعبہ سے دلچسپی بڑھتی جا رہی ہے۔ اور واقعہ یہ ہے کہ اس شعبہ کی مجلس عاملہ ایسی خواتین پر مشتمل ہے جو اپنے جذبۂ عمل کی وجہ سے ممتاز ہیں اور یقین ہے کہ ان کا خلوص اور سرگرمی کامیاب ہو گی۔

اس مہینہ بھی اس کا ایک جلسہ ہوا۔ اس کا قائم کیا ہوا مدرسۂ بالغات محترمہ رابعہ بیگم صاحبہ کی نگرانی میں کامیابی کے ساتھ ترقی کر رہا ہے۔ دوسرے محلوں یا اضلاع کی رہنے والی خواتین کو بھی اسی طرح ان پڑھ عورتوں کو پڑھانے کا انتظام کر کے خلق اللہ کی خدمت اور اردو کو تقویت دینے کی سعادت حاصل کرنی چاہیئے۔ جو خواتین مدارس بالغات قائم کرنا یا ان میں کام کرنا چاہتی ہیں وہ شعبۂ نسوان کی معتمد محترمہ سکینہ بیگم صاحبہ کوہ نور کریم آباد جوبلی ہلز حیدرآباد سے مراسلت یا گفتگو کریں۔ وہ ہر ایسے کام میں مدد اور مشورہ دینے یا دوسروں کی تجویزوں یا مشوروں پر ہمدردی کے ساتھ غور و خوض کرنے کے لئے ہمہ وقت تیار ہیں۔

اس شعبہ کی طرف سے وقتاً فوقتاً خواتین کے علمی و ادبی اجتماع کی بھی کوشش کی جا رہی ہے تاکہ باہمی میل جول سے علمی ذوق میں ترقی ہو اور ایک دوسرے کے کام اور خیالات سے واقفیت پیدا ہوتی جائے۔ اس طرح سے توقع ہے کہ ادارہ کا یہ شعبہ رفتہ رفتہ حیدرآباد کی جملہ تعلیم یافتہ اور روشن خیال خواتین کی ذہنی کاوشوں کا مرکز بن جائے گا۔

شعبۂ تالیف و ترجمہ

اس ماہ کے اجلاس میں سید فضل حق صاحب ام اے پروفیسر نظام کالج پروفیسر عبدالقادر صاحب سرمدی، مولوی فیض محمد صاحب بی اے ڈپ ایڈ، ڈاکٹر سید محی الدین صاحب قادری زور اور مولوی ظہیر الدین احمد صاحب ام اے ایچ سی یس۔

معتمد شعبہ نے شرکت کی۔ طے پایا کہ شعبہ کی طرف سے زیر طبع کتاب مغربی تصانیف کے اردو تراجم کے علاوہ حسب ذیل تین کتابیں بھی اشاعت کے لئے دیدی جائیں۔ (۱) سر سید احمد خاں مرتبہ ظہیر الدین احمد صاحب (۲) سرسالار جنگ اعظم مرتبہ مولوی فیض محمد صاحب (۳) بچوں کی کہانیاں مرتبہ مولوی میر حسن صاحب ام اے۔

شعبۂ امتحانات کی ضرورت کے پیش نظر حسب ذیل تین کتابوں کے ترجمے یا ترتیب کا کام بعجلت ممکنہ عمل میں آئے (۱) ترجمہ تاریخ ادب اردو از ڈاکٹر بیلی (مولوی سید محمد صاحب ام اے) (۲) عام دفتری معلومات از مولوی ظہیر الدین احمد صاحب ام اے ایچ سی اس (۳) سائنس کے کرشمے مرتبہ مولوی میر حسن صاحب ام اے۔

شعبۂ زبان

اس ماہ مولوی قاضی عبد الغفار صاحب اڈیٹر پیام، ڈاکٹر رضی الدین صاحب صدیقی، ڈاکٹر جعفر حسن صاحب، ڈاکٹر راحت اللہ خاں صاحب، ڈاکٹر سید محی الدین قادری صاحب زور اور پروفیسر عبد القادر صاحب سروری نگران کار معتمد شعبہ نے شرکت کی۔ چونکہ مولوی ضیاء الدین صاحب انصاری کے بیرون شہر تبادلہ ہونے کی وجہ سے پروفیسر سروری صاحب نے عارضی طور پر یہ کام اپنے ذمہ لیا تھا اس لئے ڈاکٹر راحت اللہ خاں صاحب ام اے پی ایچ ڈی مہتمم کتب خانہ آصفیہ کو اس شعبہ کا معتمد منتخب کیا گیا۔ ڈاکٹر صاحب علوم شرقیہ کے فارغ التحصیل اور کتب خانوں کے کام کے بہت بڑے ماہر ہونے کے علاوہ جامعہ عثمانیہ کے ان اعلیٰ تعلیم یافتہ اصحاب میں سے ہیں جنھیں اردو کی خدمت کا شوق ہے اور جو اپنی زبان اور ادب کا درد رکھتے ہیں۔

اس جلسے میں جمال الدین حیدر صاحب رینج افسر جنگلات کے مرتب کردہ دکنی محاورے اور ضرب الامثال وغیرہ کے مسودے پر غور و خوض کیا گیا۔ اور یہ مسودہ مولوی قاضی عبد الغفار صاحب کو نظر ثانی کے لئے دیا گیا۔ مولوی ضیاء الدین صاحب انصاری نے بھی ایسے محاورے وغیرہ روانہ کئے تھے نیز انھوں نے ایسے چند الفاظ کی فہرست بھی بھیجی تھی جن کی تذکیر و تانیث حیدرآباد کی زبان میں معین نہیں ہے۔ ان پر مجلس نے دیر تک بحث و مباحثہ کیا اور طے پایا کہ ادارہ کی طرف سے حسب ذیل الفاظ کے بارے میں قطعی طور پر ایک ہی جنس استعمال کرنے کی سفارش کی جائے۔

طلاق۔ دق۔ مار (بمعنی چوٹ)۔ آواز۔ بندگاہ۔ جنگ ۔ مونث

گلاس۔ ہوٹل۔ گنبد۔ مزار۔ پھاٹک۔ ملاپ۔ چکر۔ مذکر

ڈاکٹر جعفر حسن صاحب نے حیدرآباد کی دفتری اردو کے نمونے اور ان پر ایک اصلاحی نوٹ لکھ دینے کا وعدہ کیا۔ یہ شعبہ اردو کے متعلق ہر قسم کی مفید تجویزیں اور ضروری مشورے قبول کرنے اور ان کے متعلق غور و خوض کرنے کے لئے تیار رہتا ہے۔ اور توقع ہے کہ جن اصحاب کو اپنی زبان کے لغوی اور لسانی پہلوؤں کے متعلق دلچسپی ہے وہ ضرور اس کے ساتھ تعاون عمل کریں گے۔

ادارہ

اطلاع

رسالہ نہ پہنچنے کی اطلاع ۱۵ تاریخ کے اندر دیدیجئے۔ دیر سے اطلاع آنے پر یا تو پرچے ختم ہوجاتے ہیں یا گزشتہ مہینے کے پرچوں پر زیادہ محصول ڈاک ادا کرنا پڑتا ہے۔ اس لئے تاریخ مقررہ کے بعد اطلاع آنے تو پرچہ روانہ کرنے میں تامل ہوگا۔

مہتمم مدیر

شہریارِ صحرا

نواب معین الدولہ بہادر معین حیدرآباد کے اس عظیم الشان خاندان کے فرد فرید ہیں جن کا نام علم دوستی و تصنیف وتالیف کے لحاظ سے اردو وادب کی تاریخ میں زندہ جاوید رہے گا۔ کون ہے جو نواب صاحب مرحوم امیر کبیر شمس الامراء کی ستۂ شمسیہ اور دوسری کتابوں کی اہمیت سے واقف نہیں۔ نواب معین الدولہ بہادر کے اعلیٰ ذوقِ سخن کا ایک ادنیٰ نمونہ ذیل کی نظم ہے جو انھوں نے اپنے خاص موضوع یعنی شیر پر لکھی ہے۔ نواب صاحب کو شیر کے شکار سے بے حد دلچسپی ہے اور ہندوستان ہی کیا دنیا میں چند ہی لوگ ایسے ہوں گے جو اس فن میں ان کی ہمسری کر سکیں۔
اس نظم کے ساتھ جو تصویر شایع کی جا رہی ہے اس سے معلوم ہو جائے گا کہ انھوں نے کیسے کیسے شیروں کے شکار کئے ہیں۔ (سب رس)

آ! اے مرے شہریارِ صحرا — اے صاحبِ اقتدارِ صحرا
ہیں تیری خصوصیات مشہور — اے شیر تری ہر آن بانور
ہیں یوں تو ہزاروں جانور اور — ہے بات ہی تیری کچھ مگر اور
مشہورِ جہاں تری دلیری — کیا بات ہے واہ شیر تیری
ہمت میں نظیر آپ اپنی — غیرت میں نظیر آپ اپنی
اُف ری شانِ جلال تیری — ملتی ہی نہیں مثال تیری
ہر جانِ حزیں ہو کیوں نہ خائف — ساری دنیا ہے تجھ سے واقف
گزرے جو تیری رہ گزر سے — چاں د شوار تیرے ڈر سے
کیا تجھ سے کوئی نظر ملائے — تجھ سے سب کو خدا بچائے
آساں کب تیرا سامنا ہے — آفت کا بلا کا سامنا ہے
تیرے پنجے سے کون چھوٹا — کس کس کا نہ تارِ عمر ٹوٹا
ہے موت کا وار وار تیرا — دیکھے کوئی شکار تیرا
جو تیری ادا ہے وہ ہے پیاری — تو ایک ہزار پر ہے بھاری
کیا کیا ہو صفت بیان تیری — ہے سب سے انوکھی شان تیری
سانبر چیتل کے دعوے باطل — سب ہیچ ہیں یہ ترے مقابل
سب سے نازک مزاج تیرا — سارے جنگل میں راج تیرا
تیرے آگے ہر ایک مغلوب — بچہ بچہ ہے تجھ سے مرغوب
زاغ و کرگس و سگ و ثعالب — کھا کر پلتے ہیں تیرے واصب

ہے چشم غضب تری بلا کی
جس کو دیکھو وہ اس کا شاکی

غصہ تیرا غضب قیامت
چالیں تیری عجب قیامت

غصے میں کبھی صدا جو نکلی
گویا بجلی فلک پہ کڑکی

رفتار تری صبا کی رفتار
بلکہ پیک قضا کی رفتار

کیا لکھے کوئی ترا سراپا
صد رشک شباب ہے بڑھاپا

دست قدرت نے کیا بنائی
گردن تیری تری کلائی

بو بھی تری مست آنکھ بھی مست
ہے ایک تجھے بلند اور پست

پنجہ شاخ نہال آفت
ناخن شکل ہلال آفت

ہے رنگ ہر ایک سے نرالا
بیلا کہہ سکتے ہیں نہ کالا

دلچسپ ہے تیری زندگانی
حیرت انگیز سخت جانی

آتا ہے تری پکار میں لطف
ملتا ہے ترے شکار میں لطف

دل سے ہے **معین** ترا فدائی
جنگل جنگل تری دُہائی

ادارۂ ادبیاتِ اردو کی ایک جدید اور مفید تجویز

یوں تو حیدرآباد میں ادبی انجمنوں اور اداروں کی کچھ کمی نہیں ہے بلکہ سچ تو یہ ہے کہ ضرورت سے بہت زیادہ ہیں لیکن عملی اور تعمیری کام کرنے والے ایسے ادارے جن کے اراکین ادبی صحبتوں کی رنگینیوں سے گزر کر بھی کوئی نتیجہ خیز کام کرتے ہیں دو چار سے زیادہ نہیں ہیں۔ ان میں سے ایک "ادارہ ادبیات اردو" ہے جو بلحاظ اپنی کم عمری کے زیادہ مشہور نہ ہو لیکن بلحاظ اپنے کام کے ایک بہترین ادارہ ہے جو اس ملک میں اردو زبان کی زیادہ سے زیادہ خدمت کر رہا ہے۔ اور اس خدمت کی بڑی خوبی یہ ہے کہ وہ خاموش خدمت ہے — پروپگنڈے کے نقارے اس کے ساتھ ساتھ نہیں ہیں۔ اور اس کے متعلق مقامی خبر رساں ایجنسیاں کے ذریعے سے نہ تو ہر روز کوئی بیان شایع ہوتا ہے اور نہ وقتاً فوقتاً کوئی بلند آہنگ شاندار مظاہرہ ہوتا ہے جو اس کو شہرت کی سند عطا کرتا رہے!

ادارۂ ادبیات خاموش کام کرنے والوں کی ایک جماعت ہے جس نے اردو زبان و ادب کی ترقی و تعمیر میں جو کچھ محنت کی ہے اس محنت کے نتائج ہماری نظر کے سامنے ہیں۔ اس ادارے کی مخلصانہ جد و جہد سے اردو زبان کے جدید لٹریچر کا ایک بہت اچھا ذخیرہ جمع ہوتا جاتا ہے اور اس کے ذریعے سے چند نئے اہل قلم میدان میں آگئے ہیں۔

ہم نے بارہا اپنا یہ خیال ظاہر کیا ہے کہ جہاں تک اردو زبان کی اشاعت اور ترقی کا تعلق ہے بہت سی چھوٹی چھوٹی انجمنوں کو کسی ایک مرکز پر متحد ہو کر کام کرنا چاہیے۔ اس لئے کہ مقامی اہل قلم کی کوششوں کا موجودہ انتشار اس تحریک کی اجتماعی قوت کو کم کرتا ہے۔ اس وقت ہم اس بحث کو طول دینا نہیں چاہتے بلکہ اہل ملک کو "ادارۂ ادبیات اردو" کی ایک جدید تحریک پر توجہ دلانا چاہتے ہیں۔ جو "اردو امتحانات" کے نام سے شروع کی گئی ہے۔ اس تحریک کے مقاصد کو حسب ذیل الفاظ میں واضح کیا گیا ہے۔

"اردو زبان اور ادب کی حفاظت، بقا اور ترقی کے سلسلہ میں ضروری ہے کہ اردو [illegible] کام کیا جائے۔ ان [illegible] لوگوں یا نوجوانوں کے لئے جو کسی جامعہ یا سرکاری ادارہ کی زبان اردو کی تعلیم سے بہرہ مند نہیں ہو سکتے یا ایسے اصحاب کے لئے جو دوسرے مضامین کے تعلیم یافتہ یا سند یافتہ تو ہوتے ہیں لیکن اردو ادب سے دلچسپی رکھتے ہیں اردو زبان اور ادب کے ایسے نصاب اور امتحانات مقرر کئے جائیں جن کی پابندی اور شرکت سے وہ اپنی اردو قابلیت اور ادبی ذوق کی تکمیل ایک باضابطہ معیار کے مطابق کر سکیں۔ اس اہم مقصد کے پیش نظر ادارۂ ادبیات اردو نے اپنے دوسرے شعبوں کے ساتھ ایک شعبۂ اردو امتحانات بھی قائم کیا ہے جو مقررہ قواعد

وضوابط کے ماتحت امتحانات لے گا اور کامیاب
طلبۂ امیدواروں کو ادارہ کی طرف سے صداقت
نامے اور سندیں اور شوق دلانے کے لئے امتیاز
کے ساتھ کامیاب ہونے والوں کو انعامات عطا
کرے گا۔ ان امتحانات میں ہر فرد بلا امتیاز
مذہب وملت وجنس شریک ہو سکے گا۔ ادارہ
کوشش کر رہا ہے کہ اپنے مقررہ نصاب کی تعلیم
کے لئے مختلف مقامات پر مدرسہ بالغان بھی
قائم کرے چنانچہ ایک مدرسہ بالغات اڈکمیٹ
میں قائم ہو چکا ہے ہفتہ وار عام تقریروں کا
بھی انتظام کیا جا رہا ہے جو ادارے کے مقررہ
نصاب کے مطابق کی جائیں گی۔"

مجلس امتحانات جو قائم کی گئی ہے اس میں ملک کے
بہترین ماہرین فن تعلیم کو شریک کیا گیا ہے۔ مجلس کے صدر
مولوی سید علی اکبر صاحب نائب ناظم تعلیمات ہیں اور نائب صدر
مولوی سجاد مرزا صاحب پرنسپل ٹریننگ کالج ہیں اس
مجلس کے معتمد مولوی عبدالقادر صاحب سروری اردو
لکچرار جامعہ عثمانیہ ہیں۔ امتحانات کے قواعد وضوابط کو
ہم عنقریب اپنی کسی اشاعت میں شائع کریں گے لیکن
اس قدر بتا دینا ضروری ہے کہ مجوزہ نصاب کی تکمیل کے
تین درجے رکھے گئے ہیں (۱) سند اردو دانی (۲) اردو
پروفیشینسی یعنی اردو عالم (۳) اعلیٰ پروفیشینسی یعنی
اردو فاضل۔ نصاب جو تجویز کیا گیا ہے اس کے لئے
بہترین قدیم وجدید تصانیف منتخب کی گئی ہیں اور ادبیات
وعلوم کے ہر پہلو کا لحاظ رکھا گیا ہے۔

درحقیقت یہ تحریک تعلیم بالغان کا ایک اہم جزو
ہے اور جیسا کہ بتایا گیا ہے ادارہ کا خود بھی یہ ارادہ ہے کہ وہ
مختلف مرکزوں پر مدارس بالغان قائم کرے۔ مقصود یہ کہ
اردو زبان کے ذریعہ سے عام تعلیم کا دائرہ وسیع ہو اور مدرسوں
اور مکتبوں کی پابندی کئے بغیر بھی عوام کے اندر تعلیم کے
رجحانات پیدا کئے جائیں۔ درحقیقت ادارہ کے اس مقصد
سے دو مقصد حاصل ہوتے ہیں ایک طرف تعلیم بالغان کی
تحریک قوت حاصل کرتی ہے اور دوسری طرف زبان
اردو کے منظم اشاعت کا ایک نتیجہ خیز نقشہ مرتب ہو جاتا
ہے۔ جو لوگ اپنے فرصت کے اوقات میں اپنے علمی ذوق کی ترقی
چاہتے ہوں اس کے لئے "ادارۂ ادبیات اردو" نے ایک ایسی
تنظیم پیدا کر دی ہے جس کے ماتحت وہ بہترین ماہرین علوم کے
مشورے سے فائدہ اٹھا سکتے ہیں اور اردو زبان میں ادبیات و
علوم کے ایک وسیع میدان کو طے کر سکتے ہیں۔

ہم "ادارۂ ادبیات" کی اس کوشش کا خیر مقدم کرتے ہیں
اور یہ امید رکھتے ہیں کہ اہل ملک کی تائید اور دلچسپی ادارہ کی
کوششوں کو سرسبز اور کامیاب بنائے گی اور کچھ زمانہ گزرنے
کے بعد یہ ادارہ تعلیم عامہ کی غیر سرکاری کوششوں کا ایک ایسا
مرکز بن جائے گا جس کے کارناموں کو اہل ملک فخر کے
ساتھ بیان کر سکیں گے۔

تعمیری کام کی یہ اسکیم اپنے اندر وزن رکھتی ہے اور
ہماری تمنا ہے کہ اس کے نتائج توقعات سے بھی زیادہ مفید
پیدا ہوں اور ملک میں اس کی تحریکات کو موثر مرکزیت حاصل ہو۔
انجمنیں اور ادارے قائم کر لینا تو بہت آسان کام ہے خصوصاً
حیدرآباد میں ـــ لیکن صبر اور استقلال کے ساتھ تعمیری اور
اصلاحی کام کرنا آسان نہیں۔ اس مشکل کام کو آسان وہی لوگ
بنا سکتے ہیں جو اپنے مقاصد پر اعتماد رکھتے ہوں اور اپنی قوت عمل کو
پھول جھڑیاں چھوڑنے میں ضائع نہ کریں۔ ادارۂ ادبیات اردو نے اپنے لئے
جو پروگرام مرتب کیا ہے وہ ماہرین فن کے وسیع تجربہ پر منحصر ہے اور ایسے ہی
منحصر ہے جن کے جذبۂ عمل پر بھروسہ کیا جا سکتا ہے۔ (پیام مورخہ ۱۱ اکتوبر ۱۹۳۹ء) قاضی عبد

اردو امتحانات

"ادارۂ ادبیات اردو" نے "اردو امتحانات" کے نام سے ایک ذیلی ادارہ قایم کیا ہے جس کے قواعد و ضوابط اس وقت ہمارے آگے ہیں اس نے ایک "مجلس امتحانات" بنادی ہے جس کے صدر، نائب صدر اور معتمد علی الترتیب مولوی علی اکبر صاحب نائب ناظم تعلیمات۔ مولوی سجاد مرزا صاحب پرنسپل ٹرینگ کالج اور مولوی عبدالقادر صاحب سروری اردو لکچرار جامعہ عثمانیہ اور نو اور قابل اشخاص اراکین ہیں۔

علے هذا کفی الحال اس ادارہ کا یہ شعبۂ امتحانات اردو ہر سال پانچ امتحانات لیا کرے گا۔ جن میں ہر وہ شخص شریک ہو سکے گا جس نے مقررہ نصابوں کی تکمیل کی ہو۔ اس کے امتحانات (۱) اردو دانی (۲) اردو ابتدائی یعنی اردو عالم (۳) اعلیٰ ابتدائی یعنی اردو فاضل (۴) خوش نویسی (۵) خطاطی و کتابت یعنی کاپی نویسی پر مشتمل ہیں۔ اردو عالم کے نصاب میں (۱) نثر و قواعد (۲) نظم و عروض (۳) تاریخ ادب و مضمون نگاری اور (۴) عام معلومات کے علاوہ ایک اور مضمون اختیاری ہی ان مضامین میں سے بھی لینا ضروری ہوگا "خوش نویسی خطاطی و کتابت۔ ٹائپ مختصر نویسی۔ عام دفتری معلومات" اور نصاب "اردو فاضل" میں بھی اردو زبان کی آگاہی کو بلند رکھنے کے ساتھ ساتھ اونچے درجہ کی "عام معلومات" پیدا کرنے کی کوشش بھی کی گئی ہے۔ قواعد و ضوابط میں تمام نصابی کتابوں کی تفصیل وید ی گئی ہے۔ ان امتحانوں کے اغراض و مقاصد حسب ذیل بیان کئے گئے ہیں۔

"اردو زبان اور ادب کی حفاظت۔ بقاء ترقی کے سلسلہ میں ضروری ہے کہ اردو مطالعہ کا ذوق عام کیا جائے اور ان سن لوگوں یا نوجوانوں کے لئے جو کسی جامعہ یا سرکاری ادارہ کی زبان اردو کی تعلیم سے بہرہ مند نہیں ہو سکتے یا ایسے اصحاب کے لئے جو دوسرے مضامین کی تعلیم یافتہ تو ہوتے ہیں لیکن اردو ادب سے دلچسپی رکھتے ہیں اردو زبان اور اردو ادب کے ایسے نصاب اور امتحانات مقرر کئے جائیں جن کی پابندی اور شرکت سے وہ اپنی اردو قابلیت اور ادبی ذوق کی تکمیل ایک باضابطہ معیار کے مطابق کر سکیں"

لیکن ان امتحانوں کے نصابی مضامین پر نظر ڈالنے سے یہ واضح ہو رہا ہے کہ ان کے ذریعہ نہ صرف اردو کی قابلیت اور ادبی ذوق ہی پیدا کرنا منظور ہے بلکہ ان امتحانوں سے فراغت حاصل کرنے والوں کو روزگار کے قابل بنانا بھی۔

ٹائپ۔ مختصر نویسی اور عام دفتری معلومات تو ہر کہیں ملازمتیں کامیابوں کے لئے آسان کر سکتے ہیں اور خطاطی و خوش نویسی کے امتحان سرکاری ملازمت کے دائرہ کے اندر اور باہر دونوں جگہ فراہمی کا ذریعہ بن سکتے ہیں۔ ادارۂ ادبیات اردو اپنی اس تازہ سعی کے لئے قابل مبارکباد ہے اور ہماری آرزو ہے کہ اس کی یہ سعی مشکور ہو۔

رہبر مورخہ ۱۱/ اکتوبر ۳۹ء — سید احمد محی الدین ایڈیٹر رہبر

ادارۂ ادبیات اردو کا ایک مستحسن اقدام

"ادارۂ ادبیات اردو" کا شمار حیدرآباد کے ان چند اداروں میں ہے جو اپنا پروپگنڈہ کم کرتے ہیں اور کام زیادہ۔ گزشتہ چند سال سے یہ ادارہ اردو ادب کی خاموش خدمت کر رہا ہے۔ اس ادارہ کا اردو ادب کی خدمت کے سلسلہ میں تازہ ترین اقدام ایک شعبۂ امتحاناتِ اردو کا قیام ہے۔ اس شعبہ کے اغراض و مقاصد دیکھنے سے پتہ چلتا ہے کہ اس ادارہ کا بڑا مقصد تعلیم بالغان بھی ہے۔

"ان سن لوگوں یا نوجوانوں کے لئے جو کسی جامعہ یا سرکاری ادارہ کی زبان اردو کی تعلیم سے بہرہ مند نہیں ہو سکتے یا ایسے اصحاب کے لئے جو دوسرے مضامین کے تعلیم یافتہ یا سند یافتہ تو ہوتے ہیں لیکن اردو ادب سے دلچسپی رکھتے ہیں اردو زبان اور ادب کے ایسے نصاب اور امتحانات مقرر کئے جائیں جن کی پابندی اور شرکت سے وہ اپنی اردو قابلیت اور ذوق کی تکمیل ایک باضابطہ معیار کے مطابق کر سکیں"۔

اس مقصد کے تحت اس ادارہ نے شعبۂ امتحانات قائم کیا ہے جو مقررہ قواعد و ضوابط کے تحت امتحانات لے گا اور کامیاب امید واروں کو صداقت نامے اسناد اور انعامات عطا کیا کرے گا۔ گویا اس اقدام سے ادارہ ایک طرف تو "اردو" کی اشاعت کر رہا ہے دوسری طرف معیاری امتحانات کے ذریعے ملک کی ایک بڑی ضرورت کو بھی پورا کر رہا ہے۔ اس ادارہ کے امتحانات میں ہر شخص بلا اختلاف مذہب و ملت شریک ہو سکتا ہے۔ بہت سے اشخاص ایسے ہیں جنھیں اردو زبان کا ذوق و شوق ہے لیکن کوئی ایسا ادارہ نہ تھا ان کے اس بڑھتے ہوئے ذوق کو پورا کرتا۔ اس ادارہ کا قیام اس سلسلہ میں ایک فال نیک ہے اس کے ساتھ ہی ساتھ ادارہ کوشش کر رہا ہے کہ اپنے مقررہ نصاب تعلیم کے لئے مختلف مقامات پر مدرسہ بالغان بھی قایم کرے چنانچہ ایک مدرسہ بالغات اوکیٹ میں قائم ہو چکا ہے۔ نیز متعدد تقریروں کا بھی انتظام کیا جا رہا ہے جو ادارہ کے مقررہ نصاب کے مطابق کی جائیں گی۔"

ہمیں امید ہے کہ عوام اس ادارہ کی قدر کریں گے اور جہاں تک ہو سکے غیر تعلیم یافتہ اشخاص کو اس ادارہ کے ذریعہ تعلیم حاصل کرنے کی طرف متوجہ کروائیں گے۔ قواعد و ضوابط امتحانات سے ظاہر ہوتا ہے کہ فی الحال یہ شعبہ ہر سال پانچ امتحانات لیا کرے گا یعنی (۱) سند اردو دانی (۲) اردو عالم (۳) اردو فاضل (۴) خوش نویسی (۵) خطاطی و کتابت۔ امتحانات کے لحاظ سے نصاب بھی اس کے مطابق تیار کیا گیا ہے۔ مجلس امتحانات میں ملک کے بہترین انشا پردازوں اور اعلیٰ دماغ ہستیوں کو شامل کیا گیا ہے۔ اس کے صدر مولوی سید علی اکبر صاحب ناظم تعلیمات۔ نائب صدر مولوی مسیح و مرزا صاحب اور معتمد مولوی عبد القادر صاحب سروری ہیں۔ ادارہ ہذا کی مذکورہ بالا ساعی قابلِ قدر اور قابلِ مبارک باد ہیں۔ امید ہے کہ یہ ادارہ بہت جلد عوام میں مقبول ہو جائے گا اور اس کی اسناد بھی معیاری تصور کی جائیں گی۔ دفاتر میں آج کل زبان دانی خصوصیت کے ساتھ اردو دانی کی جو شرائط رکھی گئی ہیں اگر وہ اس ادارہ کے معیار کو تسلیم کریں اور اس امتحانات سے فارغ شدہ اصحاب کو ترجیح دیں تو کوئی وجہ نہیں کہ یہ ادارہ بہت جلد ترقی نہ کرے۔ ہم اس ادارہ کی کامیابی کے دلی متمنی ہیں اور اس کی سرخروئی کے خواہشمند۔ امید ہے کہ ملک کے اور دیگر ادارے بھی اس قسم کے مفید نصب العین کو اختیار کر کے حقیقی معنوں میں قومی خدمات ...

۱۹ اکتوبر ۱۹۳۹ء — **احمد عارف** ایڈیٹر صبح دکن

ایک دلہن کو ڈولی میں سوار ہوتے دیکھ کر

اے صدق وصفا کی دیوی!

اگر تیرے شبستانِ دل میں یہ آرزوئے لطیف شرارِ شوق بن کر چھلک رہی ہے کہ ہم آبادہستی کی سنگلاخ منازل اور دشوار گزار مراحل میں ہمیشہ شادکام رہے تو اپنے پیمانۂ حیات کو اس طرح نور کے سانچے میں ڈھال کہ تیرا رفیقِ حیات خود بخود تیرا دامن پکڑ لے اور تیرے [illegible] بھکار ہے۔

تیرا دل ایک پھول کی مانند ہے شگفتہ بھی اور نازک بھی۔ ذرا سی ٹھیس لگے تو چٹکنا چور۔ خوشی اور مسرت میں بحرِ بے پایاں۔ درد سے آشنا۔ پاکیزگی اور ہمدردی کے نیرنگِ صدق وصفا آئینہ!!

لاوارث اور بیکس جو کبھی تجھ ایسی ہی کسی عورت کی آنکھوں کا تارا اور کلیجے کا سرور تھے اب تیری آغوشِ محبت میں پناہ لیں۔

اے نوجوان حسینہ!

تیرا شباب قدرت کا ایک نفیس اور پاک عطیہ ہے۔ اس میں ہزاروں برکتیں مستور ہیں ہوشیار باش! زندگی کی آخری منازل میں یہ تیرے لئے چراغ راہ کا کام دے گا اور تیرے نام کو درخشاں اور تاباں رکھے گا۔

اے سرچشمۂ وفا!

دیکھ قدرت نے تجھے رفیق حیات کیا اچھا عطا کیا ہے۔ لیکن اسے بگاڑنا یا سنوار کر رکھنا اب تیرا کام ہے۔ کہیں ایسا نہ ہو کہ تیری بے معنی سرد مہری، بے اعتنائی اور خودسری اس کے شیشۂ دل کو چکنا چور کر دے۔ تو وہ عمل اختیار کر کہ تو اس کی ہم نوا ہو اور وہ تیرا ہم نوا۔

اے مہربان!

اگر افکارِ زمانہ نے تجھے پریشاں کر رکھا ہو تو ہراساں نہ ہو۔ اگر مال و زر کا مینہ برستا ہے تو غرور نہ کر۔ بزمِ گیتی میں تیرا جو قدم بھی اٹھے۔ وہ دوسرے کے لئے برکت ہو۔ صبر اور شکر تیرا شیوہ ہو۔

تو جویائے علم ہو اور پاکیزہ خیالات تیرا زیور ہوں۔ کسی کے عیوب کو عریاں کرنے میں جلدی نہ کر۔ شاید کہیں تیرے دامن پر بھی کوئی دھبہ نہ ہو۔ غمازی سے پرہیز کر۔ اور خاموشی اور متانت سے دلوں کو تسخیر کر۔ اگر تیرے لب کبھی اظہارِ حقیقت کے لئے وا ہوں تو ان سے وہ گوہر برسا کہ کوئی نامراد نہ رہے۔

اے روحِ پاک!

ایامِ زندگی کو گناہ کی آلودگیوں سے پاک رکھنے کے لئے اگر سینے کا خون بھی تجھے بھینٹ چڑھانا پڑے تو یہ کوئی بڑی قربانی نہیں۔ تو جب چاہے نیک بن سکتی ہے اور نیکی کا راستہ دوسروں کو دکھا سکتی ہے۔ زندگی حوادثِ زمانہ سے اگر تلخ ہے تو کچھ پرواہ نہیں۔ تو عورت ہے اور عورت کا کام ضبط اور تحمل! تیری فریاد طائرانِ سدرہ کو بھی بے قرار کر دیتی ہے۔ آسمان کی راہیں تیری فریاد کے لئے ہر وقت کھلی ہیں۔

خدا تجھے نیکیوں کی توفیق دے!!

ایم اسلم

غزل

چارہ گر کو نظر نہیں آتا　　داغ دل کیوں ابھر نہیں آتا

جو نظر آتا ہوں نہیں ہوں میں　　اور جو کچھ ہوں نظر نہیں آتا

اُس کی آنکھوں میں کچھ جگہ پاؤں　　مجھے ایسا ہنر نہیں آتا

میرے ہم رہ ہے راہبر میرا　　پھر بھی میں راہ پر نہیں آتا

نہ کرو کوئی آرزو امجد
اس شجر میں ثمر نہیں آتا

امجد

کیفِ جاوید

تخئیل کی نوازش وہ روبرو نہ آئیں　　جلووں کو لوٹ لیں گی یہ بوالہوس نگاہیں

اب صبح ہو رہی ہے وہ آئیں یا نہ آئیں　　آ پیکرِ تصور لے لوں تری بلائیں

پیغامِ صد محبت مدہوش سی ادائیں　　مخمور تر جوانی شرمیلی سی نگاہیں

اللہ خیر کرنا دردِ حسین تر کی　　وہ آ رہی ہیں جیسی تسکیں فروش ہوائیں

ٹوٹے ہوئے ستارے گیتی پہ مسکرائے　　جلووں نے تیرے بڑھ کر لے لیں ہیں بلائیں

تفسیرِ صد محبت انعامِ نوجوانی　　ہاں ہاں وہی وہی تو شرمیلی سی نگاہیں

کہنا تو تھا بہت کچھ افسوس دل کے ہاتھوں
ہم کہہ سکے نہ کچھ بھی پوچھا تو کیں نگاہیں

نواب زادہ جاوید
(کانپوری)

معاہدۂ معاشری

مشہور فلسفی ہیگل کا خیال ہے کہ مملکت بجائے خود ایک مقصد ہے۔ یہ وہ نصب العین ہے جس کے تمام افراد پابند ہیں ان کا سب سے بڑا فریضہ یہ ہے کہ وہ مملکت کے رکن بنے رہیں۔ تنہا ایک ہیگل ہی کیا، کئی ایک مفکروں نے انسانی معاشرہ کی عظمت کو جتایا ہے۔ اسی معاشرہ کو سیاسیات کی زبان میں مملکت کہا جاتا ہے۔ یہ ایک ایسی بڑی انجمن ہے جس کا ہر شخص رکن ہے۔ نہ تو کوئی اس کے رکن ہونے سے انکار کر سکتا ہے اور نہ اس سے چھٹکارا حاصل کر سکتا ہے۔ مختصر یہ کہ ہم مملکت کے جزو ہیں اور مملکت ہمارا جزو ہے۔ لیکن یہ بات کیا ہے کہ اس ادارہ کو اس قدر اہمیت حاصل ہوگئی؟ غالباً اس کا اصلی سبب اس کی منظم کیفیت ہے یہ کیفیت اس قدر نمایاں ہے کہ اگر اس کو مملکت کی روح کہا جائے تو بے جا نہ ہوگا۔ آپ دنیا کے کسی حصہ میں چلے جائیے آپ کو ایسے ہی انسانوں سے سابقہ پڑے گا جو چند اصول اور قاعدوں کے تحت زندگی گزار رہے ہیں۔ یہ اور بات ہے کہ آپ اس دعوے کی تصدیق فرمانے کی غرض سے کسی ایسے جزیرے میں پہنچ جائیں جہاں دوسرا کوئی نہ ہو۔ وہاں اگر آپ تنہا بیٹھ کر روبن سن کروسو کی طرح یہ خیال فرمانے لگیں کہ میں انسان کے بنائے ہوئے کسی قاعدہ کا پابند نہیں ہوں تو آپ کا ایسا سمجھنا درست تو ہوگا لیکن آپ کو وہاں اپنی فطرت سے بڑی جنگ کرنی پڑے گی جس کا تقاضا یہ ہے کہ انسان ایک دوسرے سے مل جل کر زندگی بسر کرے۔ وہاں آپ تنہائی سے اکتا کر ایسے مقام کی آرزو کرنے پر مجبور ہوں گے جہاں انسان بستے ہوں۔ اسی لئے تو کہا گیا ہے کہ انسان ایک سماجی جانور ہے جو مل جل کر رہنے پر مجبور ہے۔

جب انسانوں کا مل جل کر رہنا طے ہے تو زندگی کا چند اصول و قواعد یعنی نظم کے تابع ہونا بھی ضروری ہے۔ نظم کے ساتھ ہی اس کا بھی تصور کیا جا سکتا ہے کہ کوئی اصول اور قوانین بنانے والا بھی ہو اور دوسرے ان کی پابندی کرنے والے۔ جہاں اس قسم کے تعلقات ہوں تو سمجھیے کہ وہی سیاسی معاشرہ یعنی مملکت ہے۔ لیکن سیاسیات جیسے اہم علم کا وجود نہ ہوتا اگر اس سیاسی معاشرہ کو جوں کا توں چھوڑ دیا جاتا۔ انسانی فطرت ہمیشہ جستجو اور کھوج میں لگی رہتی ہے۔ کیا تھا؟ اور کیا ہوگا؟ یہ ایسے سوالات ہیں جن پر خیال آرائی سے انسان کبھی نہیں تھکتا۔ اس لئے وہ دریافت کرنے لگا کہ مملکت کی ابتدا کیسے ہوئی اور کیوں ہوئی؟ مملکت سے پہلے انسان کس طرح زندگی گزارتا تھا؟ اور اب ایسا کیوں ہے کہ وہ جہاں کہیں بھی ہے ایک نہ ایک طرح کے حاکمانہ اقتدار کے تحت ہے؟ قیام مملکت سے پہلے اور بعد کی حالت پر غور کرنا محض ایک دل خوش کن تخیلی کوشش ہی نہیں ہے بلکہ اس کا گہرا تعلق تاریخ کے علاوہ اس اہم اخلاقی سوال سے بھی ہے کہ مملکت کا قیام ہی فی نفسہ کیوں درست سمجھا جائے؟ مملکت بجائے خود ایک مقصد کیوں ہے اور کیوں افراد پر یہ پابندی ہے کہ وہ اس کے رکن بنے رہیں؟

ان کے جوابات دینے کی مشرق اور مغرب دونوں نے کوشش کی۔ کسی نے کہا کہ انسان کی حالت ابتدا میں بالکل مکمل تھی لیکن رفتہ رفتہ اس میں انتشار پیدا ہو گیا اور قوم چار درجوں میں منقسم ہو گئی۔ ایک اور صاحب نے بتلایا کہ مملکت سے پہلے بالکل نراج ہی نراج تھا۔ انسانوں کی وہی حالت تھی جو سمندر میں مچھلیوں کی ہوتی ہے۔ یہ حالت اس قدر ناقابل برداشت ہوگئی کہ آخر لوگوں نے

چین کی خاطر ایک حکمران کی ماتحتی قبول کرلی اور اس طرح سیاسی معاشرہ قائم ہوگیا۔ غور کرنے والے برابر سقراط کے زمانہ سے اس پر غور کرتے رہے ہیں کہ آخر یہ راز ہے کیا۔ یہاں تک کہ سترہویں اور اٹھارویں صدی میں، بعض لوگوں نے باقاعدہ طور پر وہ مشہور نظریہ پیش کیا جس کو ”معاہدہ معاشری“ کے نام سے یاد کیا جاتا ہے۔

اس نظریہ کا پرچار کرنے والے ہوبز، لاک اور روسو تھے۔ لیکن اس کو یاد رکھنا چاہیے کہ ان تینوں مفکروں کے نظریوں نے جداجدا راہیں اختیار کرلیں۔ انگلستان کے فلسفی ٹامس ہوبز نے، جو چارلس دوم کا اتالیق بھی رہ چکا تھا، اپنی کتاب لیویاتھن میں اس نظریہ کو نہایت تفصیل سے بیان کیا ہے۔ اس نے اپنے نظریہ کی بنیاد انسانی فطرت پر رکھی ہے۔ انسانی فطرت کے متعلق اس کا خیال کہاں تک درست ہے، اس کا فیصلہ آپ خود فرمالیں۔ بہرحال اس کا کہنا ہے کہ انسان بالکل ہی خود غرض، خود بیں اور مطلب پرست حیوان ہے۔ اس کے افعال اور حرکات یہی بتلاتے ہیں کہ وہ محض اپنی نفسانی خواہشوں کا بندہ ہے۔ حالت فطری میں یعنی مملکت کے قیام سے پہلے جبکہ انسان کسی قاعدے قانون کا پابند نہ تھا، تو ہر روز جنگ وجدال کا بازار گرم رہا کرتا تھا اس جھگڑے سے تنگ آکر جس میں ”ہر وقت کا خوف اور اچانک موت کا ڈر لگا رہتا ہے“ لوگوں نے آپس میں ایک معاہدہ کرلیا۔ اور یہی معاہدہ ”معاہدہ معاشری“ کہلایا ہوبز کے خیال کے مطابق لوگوں نے یہ طے کرلیا کہ اگر جان ومال کی سلامتی منظور ہے، تو ضرورت ہے کہ ہر شخص اپنی آزادی سے دست بردار ہوجائے اور یہ آزادی ایک شخصیت کے حوالہ کردی جائے، جو ملک میں امن وامان قائم رکھنے کی ذمہ داری لے۔ غرض اس طرح تمام لوگوں نے مل کر حکومت کرنے کے اختیار کو ایک شخص کے حوالے کردیا۔ اسی کو مقتدر اعلیٰ یا بادشاہ قرار دیتا ہے۔ وہ کہتا ہے کہ اس معاہدے کے بعد لوگوں پر ہمیشہ کے لئے یہ پابندی عائد ہوگئی کہ وہ بادشاہ کے احکام کو مانتے رہیں، خواہ وہ احکام ان کے نزدیک غلط ہی کیوں نہ ہوں۔ اس طرح ہوبز نے اس نظریہ سے مطلق العنان بادشاہی کی حمایت کا کام لیا ہے۔

ہوبز کے بعد جس شخص نے اس مسئلہ پر روشنی ڈالی وہ اسی کا ہمعصر اور ہم قوم، جان لاک ہے، لیکن لاک نے جس طرح اس نظریہ کو پیش کیا ہے اس کی صورت مختلف ہے۔ وہ حالت فطری کو محض جنگ کی حالت نہیں سمجھتا تھا بلکہ اس کے خیال میں اس وقت بھی انسان عقل وشعور سے بے بہرہ نہ تھا اور وہ حق اور ناحق میں تمیز کرنے کی صلاحیت رکھتا تھا۔ اس وقت انسان جن قاعدوں کا پابند تھا وہ فطرت کے قاعدے تھے۔ ان ہی قاعدوں کو ”قانون فطرت“ کا لقب دیا گیا ہے۔ ہوبز کے نزدیک تمام دقت اس وجہ سے تھی کہ حالت فطری میں کوئی قانون نہ تھا لیکن لاک کے نزدیک اس قانون کے ہوتے ہوئے بھی مشکل حل نہیں ہوتی۔ بات یہ تھی کہ ہر شخص کو قانون کی تاویل کرنے کا اختیار تھا یعنی وہی ملزم بھی تھا اور جج بھی۔ بھلا غور کیجیے کہ جہاں یہ متضاد خصوصیتیں ایک ہی جگہ جمع ہوجائیں وہاں اگر ملزم کے خلاف جج کوئی فیصلہ ہی نہ کرسکے تو کیا تعجب ہے۔ لاک کہتا ہے کہ اس کے باوجود کام خیر وخوبی سے چل جاتا اگر بعض لالچی اور خود غرض لوگ، دوسروں کی چیزوں پر قبضہ کرنے کی کوشش نہ کرتے غرض اس کے بعد پھر وہی معاہدہ کی نوبت آئی اور لوگوں نے اپنی جان ومال، عزت وآبرو اور آزادی کی حفاظت کی خاطر یہ طے کرلیا کہ قانون فطرت کی تاویل اور نفاذ کے حق کو ہر شخص سے چھین کر پوری قوم کے حوالہ کردیا جائے اور اس کے بعد یہ اختیارات ایک شخص کو

کو دے دیئے جائیں۔ ہوبز کے نزدیک تو بادشاہ، نہ معاہدہ کا فریق تھا اور نہ اس کا پابند۔ لیکن لاک کی رائے میں بادشاہ بھی معاہدہ کا ایک فریق ہے اور وہ اپنے منصب پر اسی وقت تک قائم رہ سکتا ہے جب تک وہ معاہدے کے مقصد کو پورا کرتا رہے۔ دوسرے لفظوں میں اگر بادشاہ معاہدہ کی خلاف ورزی کرے تو قوم کو انقلاب کا حق حاصل ہو جاتا ہے۔ لاک کے خیالات دراصل اس کشمکش کو ظاہر کرتے ہیں جو اس وقت شاہ انگلستان اور رعایائے انگلستان میں جاری تھی۔ لاک نے معاہدہ کی ابتدا کے متعلق ایک دلچسپ استدلال پیش کیا ہے۔ وہ کہتا ہے کہ گو منطقی دلیل سے ممکن ہے کہ اس کا ثبوت نہ دیا جا سکے لیکن اس کا امکان ہے کہ اس کی بنیاد تاریخی واقعات پر ہو، اور محض اس لئے کہ ہمارے پاس اس کا ثبوت کم ہے، یہ نہیں کہا جا سکتا کہ یہ واقعہ پیش ہی نہ آیا ہوگا

یہ عجیب بات ہے کہ ایک ہی نظریہ، جس کو ہوبز نے شخصی بادشاہی کی حمایت کا آلہ بنایا تھا اور لاک نے محدود شاہی اور جمہوریت کے لئے پیش کیا تھا، وہ فرانس کے مشہور مفکر روسو کے ہاتھ میں آکر عوام الناس کے اقتدار کا ہتھیار بن گیا۔ انقلاب فرانس کا یہ "روحانی باپ" ان لوگوں میں سے تھا جو حال کی نسبت ماضی کو زیادہ سراہتے ہیں۔ فرانس کے انقلابیوں کے نزدیک اس کی مشہور کتاب "معاہدۂ معاشری" کی وہی حیثیت تھی جو اشتراکیوں کے پاس کیپٹل [illegible] یا نازی جرمنی میں ہر ہٹلر کی خود نوشتہ سوانح عمری کو حاصل ہے۔ اس کی رائے میں حالت فطری کا زمانہ انسان کا زرین دور تھا۔ اس عہد میں انسان نہایت ہی آرام اور چین کی زندگی بسر کرتا تھا۔ اس وقت، کوئی چیز کسی کی نہ تھی۔ گو انصاف اور اخلاق کا تخیل نہ تھا مگر چونکہ "فطری آزادی" ہر شخص کو نصیب تھی اس لئے وہ دوسروں کے جذبات اور احساسات کا پاس کرتا تھا لیکن جائداد کے رواج اور طاقتور انسانوں کی حرص نے اس دور کا خاتمہ کر دیا اور "انسان جو فطرتاً آزاد پیدا ہوا ہے، ہر جگہ پابہ زنجیر نظر آنے لگا"۔ جب ظالموں کے ظلم بڑھنے لگے تو امن کی ایک ہی ترکیب نظر آئی، وہ یہ کہ تمام افراد مل کر ظالموں کا مقابلہ کریں۔ اس مقصد کے لئے تمام لوگوں نے ایک رائے ہو کر اپنے جملہ اختیارات قوم کے حوالہ کر دئے اور اپنے آپ کو قوم کی مرضی کا تابع بنا دیا۔ اس مرضی کو وہ "مشیت عامہ" سے موسوم کرتا ہے۔ یہاں مشیت عامہ اور مشیت عوام کے فرق کو ذہن نشین کر لینا چاہئے جس کو خود روسو نے محسوس کیا تھا۔ ہر شخص کی دو حیثیتیں ہوتی ہیں ایک انفرادی، دوسری اجتماعی۔ انفرادی حیثیتوں کا مجموعہ کسی طرح اجتماعی حیثیتوں کا مجموعہ نہیں کہلایا جا سکتا اسی لئے روسو نے اجتماعی ارادوں کو مشیت عامہ اور انفرادی ارادوں کے مجموعہ کو مشیت عوام کا لقب دیا ہے۔ اس موقع پر روسو نے بڑی عجیب منطق پیش کی ہے۔ وہ کہتا ہے کہ اختیارات کے اس طرح دے دینے سے کسی شخص کی بھی آزادی میں کمی نہیں ہوئی کیونکہ ہر شخص اس معاہدہ میں شریک تھا جس کے ذریعہ قوم کو اختیارات دئے گئے تھے اور چونکہ ہر شخص اس میں شریک تھا اس لئے اس کی کھوئی ہوئی آزادی دوبارہ واپس مل گئی۔

شہاب الدین

تاثراتِ سفرِ یورپ

بسلسلۂ گذشتہ

۲۱ جولائی کو جمعہ کا دن تھا۔ انڈیا ہاؤس گیا اور نسیم حسین صاحب سکریٹری ہائی کمشنر صاحب سے دریافت کیا تو معلوم ہوا کہ لندن میں نمازِ جمعہ Eccleston square میں ہوتی ہے جو وکٹوریا اسٹیشن کے قریب ہے۔ افسوس ہے کہ تگ و دو کے باوجود مجھے پہنچنے میں ذرا دیر ہو گئی اور نماز نہ مل سکی۔

شام کے وقت حسبِ معمول نوادر خانہ برطانیہ گیا اور مطالعہ کیا۔ انڈیا ہاؤس میں ایک اشتہار کے ذریعے سے معلوم ہوا کہ (Imperial Institute) میں ہر روز کئی کئی مرتبہ سیاسی اور تعلیمی فلم دکھائے جاتے ہیں جن میں برطانوی سلطنت کے مناظر، پرندے درخت چوپائے وغیرہ کی چلتی بولتی تصویریں ہوتی ہیں۔ ہمارے ملک میں سینماؤں میں جو فلمیں دکھائی جاتی ہیں وہ اکثر ایسی ہوتی ہیں کہ ان سے اخلاق پراگندہ ہی نہیں بلکہ خراب ہو جاتے ہیں۔

یہاں یورپ میں ایک تو ایسے سینما ہیں جہاں ذرا چٹپٹی فلمیں ہوتی ہیں دوسری وہ جن میں محض خبریں ہوتی ہیں اور تیسرے وہ تعلیمی اور سیاحتی فلمیں دکھاتے ہیں۔ اول الذکر سینماؤں میں بھی بعض فلمیں جنھیں (A Film) کہتے ہیں وہ ہوتی ہیں جن میں بچے نہیں جا سکتے، (B) وہ فلمیں جن میں بچے محض اپنے والدین یا کارجین [?] کے ساتھ جا سکتے ہیں اور (C) وہ فلمیں ہیں جن میں بچے آزادی کے ساتھ جا سکتے ہیں۔ اس کے علاوہ بعض وسیع اداروں مثلاً Imperial Institute ہر روز [?] اور دوسری انجمنوں میں خاص طور کی جغرافی اور سیاحتی فلمیں دکھائی جاتی ہیں۔ لندن میں ایسے بھی سینما ہیں جن میں تمام دنیا کی کل [?] دنیا کی خبریں دکھائی جاتی ہیں۔ یہ "شو" ڈیڑھ گھنٹے رہتا ہے اور اس میں یہ پابندی کی جاتی ہے کہ کوئی تصویر یا خبر حتی الامکان ہفتہ بھر یا زیادہ سے زیادہ دس روز سے زیادہ پرانی نہ ہو۔ خاص بات یہ ہے کہ سیاحتی اور اخباری فلموں کی نمایشوں کو دیکھنے کے لئے بھی لوگ اسی طرح جوق جوق آتے ہیں جیسے معمولی سینماؤں میں۔ "مغربی بداخلاق" یورپ میں تو یہ موشگافیاں اور یہ شوق اور ہمارے "خوش اخلاق" ہندوستان میں رطب و یابس کی یہ عام آزادی!!

۲۳ جولائی کو اتوار کی وجہ سے برطانوی نوادر خانے کا مطالعہ خانہ بند تھا اس لئے اس موقع کو غنیمت جان کر میں نے نوادر خانے کی بعض نایاب اشیاء کا معائنہ کیا۔ نوادر خانہ اسم بامسمیٰ ہے اور جس شعبہ میں جاؤ نوادر خانے بھرے پاؤ گے۔ میں صرف سرسری طور پر چند کمرے ہی دیکھ سکا۔ جو اشیاء میں نے دیکھیں ان میں زیادہ دلچسپ اور اہم حسبِ ذیل تھیں۔ (ایشیائی کمرہ) محمد شاہ رنگیلے کا پیش قبض، موصل کے نفیس اشیا (ہندوستانی کمرہ) ٹیپو سلطان شہید کا عطردان اسی کے تخت کا ایک ٹکڑا گندھارا (قندھار) کے مجسمات (رومن برطانوی کمرہ) رومن عہد کا زیور، مٹی شیشے اور دھات کے برتن مجسمے خاص کر ہادریانوس (ہیڈرین) کا خود دار سر والا مجسمہ رومن سپاہیوں کے اسناد وغیرہ۔ زینے کے دونوں طرف اور سامنے کا حصہ امراوتی کی نادر ترین مورتیوں

اور سنگ تراشی کے نمونوں سے بھرا پڑا ہے معلوم ہوتا ہے کہ بدھ مت کی آثار سب کے سب یہاں لے آئے گئے ہیں اور اصل موقع کو بالکل عریاں چھوڑ دیا گیا ہے۔

یکم اگست کو نوادر خانے میں محمود گاواں کے متعلق جستجو کی۔ ڈاکٹر عبداللہ چغتائی نے (جو مشہور نقاش عبدالرحمن چغتائی کے بھائی ہیں) مجھے ایک مخطوطے کا پتہ دیا تھا جس میں محمد ثانی فاتح قسطنطنیہ اور محمود گاواں کے خطوط کی نقلیں ہیں۔ اس مخطوط کو برآمد کیا۔ اس میں دراصل محمد فاتح کے وہ خطوط ہیں جو اس نے فتح کے بعد دنیائے اسلام کے بادشاہ وزیروں عالموں اور دوسرے مشہور لوگوں کو لکھے تھے۔ اس مجموعے میں وہ خط بھی ہے جو سلطان نے محمود گاواں کو لکھا اور وہ بھی جو خواجہ نے اس کے جواب میں تحریر کیا۔ مطالعہ خانہ پانچ بجے بند ہوا تو میں نے اس کمرے کی بعض نایاب تبادیکھیں جو قدیمی خطوط کے لئے وقف ہے۔ جو خطوط وغیرہ میں نے دیکھے ان میں سے حسب ذیل بھی تھے۔ وکٹر ہیوگو مٹن (وہ وثیقہ جس کے ذریعے سے ملٹن نے اپنی تصنیف Paradise Lost کی فروخت پر اسے پانچ پونڈ ملیں گے) سر اسحاق نیوٹن، بیکن، لاک، ڈکنز، ڈرائیڈن، ڈیفو، جنگ طرف الغرب (۱۸۰۵ء) کا روزنامچہ فریڈرک اعظم، نپولین، بولین، ہنری ہشتم، ہنری چہارم شاہ فرانس، چارلس اول، جیمز اول، الیزبتھ، میری، فلپ دوم شہنشاہ چارلس پنجم، ولیم چہارم، وکٹوریا، گلیڈسٹن، ایبراہام لنکن وغیرہ کے خطوط ان کے علاوہ انجیل کا قدیم ترین نسخہ Codex Siniaticus جو حال میں طور سینا کے راہبوں سے خریدا گیا ہے اور جو چوتھی صدی عیسوی کا لکھا ہوا ہے۔

اگلے دن ۲ اگست کو میرے قدیم استاد اور زمانۂ حال کے ایک بڑے مورخ (R. B. Mowat) نے جو برسٹل یونیورسٹی کے میر شعبہ فنون ہیں مجھے برسٹل بلایا تھا۔ مووٹ صاحب بے شمار کتابوں کے مصنف ہیں اور گو ۲۰ سال سے ان سے ملاقات نہیں ہوئی لیکن اس دوران میں انھوں نے از راہ عنایت مجھ سے خط و کتابت برابر جاری رکھی۔ انگلستان میں قاعدہ ہے کہ بعض ریلیں ایسی ہیں کہ منزل مقصود سے پہلے کسی اسٹیشن پر نہیں کھڑی ہوتیں چنانچہ میں جس ریل میں برسٹل گیا اس نے ۱۲۰ میل کا فاصلہ بغیر کسی جگہ قیام کئے ہوئے دو گھنٹے میں طے کر دیا۔ برسٹل کے اسٹیشن پر اترتے ہوئے سب سے پہلے میں اکبر شاہ ثانی شہنشاہ ہند کے مشہور سفیر ہندو مسلمانوں کے اتحاد کے حامی اور زمانۂ حال میں ہندو مذہب میں نعرہ توحید بلند کرنے والے برہمو سماج کے مؤسس راجہ رام موہن رائے کی سمادھ پر گیا جو (Aornos cemetry) میں واقع ہے اور ہندوستانی طرز پر بنائی گئی ہے۔ معلوم ہوا کہ ہر سال جاترا ہوتی ہے اور بہت سے برہمو آکر گویا تبرکھ کرتے ہیں۔ تعجب ہے کہ جو کتاب "رہنمائے برسٹل" میں نے خریدی اس میں اس سمادھ کا کہیں ذکر نہ تھا۔ قبرستان تمام یوروپی قبرستانوں کی طرح پھولوں سے آراستہ گویا پارک بنا ہوا تھا اور اس میں یہ سمادھ بہت بھلی

معلوم ہوتی تھی۔ اس کے بعد میں برسٹل کا اسقفی گرجا دیکھنے گیا جس کے بعض حصے اینگلوسیکسن زمانے کے ہیں۔ یہاں سے موورٹ صاحب کے یہاں گیا۔ وہ اور ان کی اہلیہ صاحبہ نہایت ہی مہربانی سے پیش آئے۔ باوجودیکہ بیسوں کتابوں کے مولف ہیں اور ہر وقت بس لکھتے ہی رہتے ہیں لیکن ذرا بھی تکبر یا نخوت نہیں پائی جاتی۔ ۸۶ برس کی ماں ہیں اور یہ یورپ کی آب و ہوا کی برکت ہے کہ ٹہلنے جاتی ہیں' خط لکھ لیتی ہیں' اخبار پڑھتی ہیں اور کھانے پر خوب باتیں کرتی ہیں۔ کھانے کے بعد بھی خوب روشنی تھی۔ چنانچہ موورٹ صاحب اور مسز موورٹ مجھے لیکر یہاں کے مشہور Clifton Downs لے گئے۔ اس کے نیچے دریائے اے وَن کا نظارہ اور مشہور کلفٹن پل قابل دید ہیں۔ رات کو انہیں کے مکان میں سویا۔

اگلے دن صبح ساڑھے نو بجے برسٹل سے چلا اور ٹھیک بارہ بجے اکسفورڈ پہنچا جہاں میرے پرانے استاد A.E.W. Hazel صاحب نے جو اب میرے کالج یعنی جیسز کالج کے پرنسپل ہیں' مجھے چائے پر بلایا تھا۔ بارہ بجے سے چار بجے تک اپنی پرانی جامعہ سے ملاقات کا احیاء کیا۔ آکسفورڈ اس ۲۵ برس میں بہت بدل گیا ہے۔ شاید لارڈ نفیلڈ کے موریس موٹر کے کارخانے کی وجہ سے شہریت میں بہت اضافہ ہوگیا ہے۔ مشہور Cornmarket کی سڑک کلیتہً ربڑ کی ہوگئی ہے اور اس میں بڑی بڑی دوکانیں بن گئی ہیں۔ چائے پر جانے سے پہلے میں نے چند کالج دیکھے۔ سب سے پہلے کرائسٹ چرچ گیا جس کا نفیس طعام خانہ کارڈنل وولزی نے ۱۵۲۹ء میں بنوایا تھا اور جس کی چیپل آکسفورڈ کا اسقفی گرجا ہے۔ اس گرجا کے بعض حصے ۱۱۰۰ء کے بنے ہوئے ہیں۔ یہاں سے آکسفورڈ یونین ہوتا ہوا گرجا St. Michael گیا جس کے بعض حصے ۱۰۲۶ء کے ہیں اور جس کے نیچے وہ قید خانہ تھا جس میں اپنی پھانسی سے پہلے کریمر' رڈلے اور لاٹیمر جو انگلستان کے تین پروٹسٹنٹ شہدا تھے' قید رہے۔ اس کے بعد سینٹ ماڈلین گرجا دیکھا جس کے کچھ حصے بارہویں صدی کے ہیں۔ نیز مرٹن کالج جسے کیمبرج کا سب سے قدیم کالج سمجھا جاتا ہے' سینٹ جان کالج جس کا باغیچہ نہایت نفیس ہے' بیلیل کالج جس کی ابتدا تیرہویں صدی میں پڑی اور جو ویکلف' لارڈ کرزن' لارڈ گرے' ایسکوئتھ اور ریڈنگ' کا کالج تھا۔ اور ماڈلین کالج ہوتا ہوا جیسز کالج آیا جہاں پرنسپل اور ان کی بیوی نے مجھے خوش آمدید کہا۔ جیسز کالج اس لئے ممتاز ہے کہ "اصلاح" کے بعد یہ پہلا کالج تھا جس کی آکسفورڈ میں تاسیس کی گئی۔ ہیزل صاحب نے اپنے ساتھ مجھے کالج کا ہال چیپل اور پرانی چیزیں دکھائیں اور پرانی باتیں کیا کئے۔ میں ان کے ساتھ دو گھنٹے رہا۔ اس کے بعد آکسفورڈ کے عربی کے معلم پروفیسر گب سے ملنے گیا جن کے لئے لندن اسکول آف اورنٹیل اسٹڈیز کے معتمد روز میٹی صاحب نے مجھے خط دیا تھا۔ گب صاحب کو تاریخ فلسفہ سیاست پر جو میں نے کام کیا ہے وہ دکھایا اور ان سے مختلف تاریخی امور کے متعلق تبادلۂ خیالات کیا۔ پروفیسر صاحب نہایت

افسوس ظاہر کرتے تھے کہ ہندوستان سے جو طلبا آتے ہیں وہ عربی نہیں جانتے ورنہ عربی زبان میں تاریخ ہند پر عظیم الشان مواد ہے جس کا کسی نے تجربہ نہیں کیا۔ مثلاً تاریخ تمدن ہند اور صوفیائے کرام کی تحریروں سے ابھی تک کافی استفادہ حاصل نہیں کیا گیا۔ محمود گاواں کے متعلق انھوں نے مشورہ دیا کہ کیمبرج کے عربی کے استاد پروفیسر (C. E. Story) سے (جو کسی زمانے میں علیگڈھ میں عربی کے پروفیسر تھے) مشورہ کروں۔ کاش کہ میں آکسفورڈ زیادہ ٹھیر سکتا لیکن مجھے لندن پہونچنا ضروری تھا اس لئے دنیچے کی گاڑی سے لندن گیا۔

اس کے دوسرے دن برطانوی نوادر خانے میں محمود گاواں اور سلطان محمد فاتح کے خطوط کی نقل جاری رکھی۔ شام کو پروفیسر اسٹوری (کیمبرج) کو خط لکھا کہ محمود گاواں کے متعلق کوئی خطوط وغیرہ کی براہ کرم نشان دہی کریں۔ بیزر فیع حیدری صاحب اور بیگم رفیع حیدری نے اپنے مسکن Palace Chambers میں چائے پر بلایا تھا وہاں گیا۔ اگلے دن ۵ راگست کو بھی محمود گاواں والے خطوط کی نقل جاری رکھی۔

۶ اگست کو صبح کے وقت ڈاکٹر میک لاخلن صاحب سے ملا جو بین الاقوامی تاریخی کانگریس کی فارسٹرن کمیشن کی معتمد ہیں۔ جب میں نے مس میک لاخلن کو کہا تھا تو انھوں نے خود میرے پاس آنے کے لئے کہا تھا لیکن اسی دوران میں برسٹل آکسفورڈ وغیرہ جانا ہو گیا۔ مس صاحبہ کیمبرج کے گرٹن کالج میں تاریخ کی لکچرار ہیں اور نہایت قابل بی بی ہیں۔ نہ صرف ایم اے پی ایچ ڈی ہیں بلکہ انھیں کیمبرج کے چوٹی کے تمغے (یعنی پرنس کانسرٹ تمغہ اور سیلی تمغہ) ملے ہیں جو کیمبرج کے طلبہ اور طالبات کے لئے اول درجے کا اعزاز ہے۔ میں نے مس صاحبہ سے کہا کہ جس کی ضرورت ہے اور جسے کانگریس میں بہت کم اہمیت دی گئی ہے وہ تاریخ ہند اور تاریخ اسلام ہیں۔ اسلامی انقلاب ایک عالمگیر انقلاب تھا اور ضرورت اس کی ہے کہ جس طرح مختلف ممالک کی ایک (Bibliography) ترتیب دی جارہی ہے اسی طرح اسلامی اثرات پر کتابیں لکھی ہوں ان کی فہرست ترتیب دی جائے اور اس میں جو کتابیں ولندستان جرمنی وغیرہ میں طبع ہوئی ہوں ان کا ذکر ہو۔ انھوں نے اپنی کمیشن کے ایجنڈے میں یہ مسئلے داخل کر لئے۔ میں نے اپنی جامعہ کے جدید تخیل تاریخ ہند اور اس کی جدید تقسیم کا بھی ذکر کیا جس کی رو سے اب بجائے "ہندو، مسلم، برطانوی" ادوار کے اسے قدیم تا ۶۰۰ء وسطی ۱۲۰۶ء تا ۱۷۶۵ء ہمالیہ از ۱۷۶۵ء میں تقسیم کیا جاتا ہے۔ یہ دلچسپ صحبت ڈیڑھ گھنٹے تک رہی۔

شام کے وقت میں پارلیمنٹ کے ایوانوں کو دیکھنے کے لئے گیا۔ اور منجملہ دوسری چیزوں کے بادشاہ کے کپڑے بدلنے کا کمرہ، ایوان امرا، ایوان عام شاہی تخت کی کرسی اور بہت سی دلچسپ اشیا دیکھیں۔ یہاں سے واپس آکر برطانوی نوادر خانے میں قدیم یوروپی (زمانہ قبل تاریخ) اور مصری گیلری دیکھی جن میں سب سے دلچسپ

اور اہم سب ذیل اشیا تھیں۔

قدیم شاہان مصر کے مجسمے از ۲۰۰۰ ق م ' روزیٹا کا پتھر جس کے ذریعے سے قدیم مصری تحریر پڑھی جا سکی ممیاں اور مُردوں کی کتاب " یورپ کے پتھریلے زمانہ کی اشیاء اور اینگلو اسکیس اور شمالی زمانے کی برطانوی اشیاء وغیرہ۔

اگلے دن اتوار کی وجہ سے کتب خانہ بند تھا اس لئے زیادہ تر میں ہوٹل ہی میں مقیم رہا۔ شام کے وقت حیدرآباد کے صدیقی صاحب نے جو سٹی کالج حیدرآباد دکن میں مددگار ہیں اور جو تعلیم کا ڈپلوما لینے کے لئے آئے ہوئے ہیں مجھے International club for students دیکھنے بلایا تھا جو رسل اسکوائر میں واقع ہے۔ یہ کلب لندن یونیورسٹی اور عیسائی مشن سے متعلق ہے لیکن ہر مذہب والوں کے لئے کھلا ہوا ہے۔ بڑے بڑے کمرے مطالعہ خانے مباحثہ خانے رہنے کے کمرے غرض اوسط طریقے پر ہر طرح آرام ہے۔ بہت سے ہندوستانی رکن بھی ہیں اور اکثر اعزازی طور پر مختلف ملک کے طلبہ کرتے ہیں۔ کلب پر عیسویت غالب معلوم ہوتی ہے۔

[illegible] صرف دو تین دن باقی رہ گئے تھے اس لئے کوشش ہے کہ اس قلیل عرصے میں [illegible] نوادر ممکن ہو اسے جمع کر دوں۔ پروفیسر اسٹوری کا خط آیا جس میں انھوں نے میرے استفسار پر از راہ مہربانی کچھ حوالے دئے تھے۔ ان کتابوں کو برطانوی نوادر خانے میں دیکھا۔ رفیع حیدری صاحب بیگم رفیع حیدری صاحبہ اور ان کے بچوں کو چائے پر بلایا تھا وہ سب آئے۔

۹ اگست کو برطانوی نوادر خانہ جا کر کتاب "ظفر الدولہ" میں محمود گاواں کے متعلق جو اندراجات ہیں ان کا مطالعہ کیا اس میں ایک حوالہ کتاب ضوؤ اللامع لاہل قرن التاسع کا تھا۔ یہ کتاب نوادر خانے میں تلاش کی اس کے بعد انڈیا آفس کے کتب خانے میں دیکھی لیکن کہیں پتہ نہیں چلا۔ اس پر پروفیسر اسٹوری کو خط لکھا کہ مہربانی کر کے مطلع کریں کہ یہ کتاب کہاں ملے گی۔ انڈیا آفس کے کتب خانے میں بہت سی ایسی نایاب چیزیں یا ذخیرہ ہے جو تاریخ ہند کے لئے بہت کارآمد ہو سکتی ہیں۔ اتنا وقت تو نہ تھا کہ جو نوادر یہاں تھے وہ سب دیکھتا لیکن چند اشیاء دیکھنے کا موقع مل ہی گیا۔ اصل عہد نامہ ۱۷۶۵ء (یعنی صلح نامہ الہ آباد) جس کے بموجب بنگالہ بہار اوڑیسہ اور کرناٹک کے دیوانی اختیارات لارڈ کلائیو کے ذریعے سے انگریزوں کو ملے تھے۔ ٹیپو سلطان شہید کی بعض اشیاء مثلاً ان کے پڑھنے کا قرآن مجید اور ان کے خوابوں کی کتاب۔ شاہ عالم کے ہاتھ کا لکھا ہوا قرآن مجید۔ بعض انگریزوں کی مہریں جن پر شہنشاہ دہلی کی طرف سے جو خطابات " ملک " اور " جنگ " کے ملے تھے وہ اور " فدوی " بادشاہ وغیرہ فارسی میں کندہ ہے۔ یہ سب چیزیں دیکھیں۔ افسوس یہ سب اشیاء بے ترتیب حالت میں رکھی ہیں۔ یہ تو ایسے نوادر ہیں کہ ان کے لئے ایک کمرہ بطور خاص علیحدہ کیا جا سکتا ہے۔

دوسرا دن اسباب کے جائزے میں صرف ہوا۔ ۱۱ اگست کو چلنے کا دن تھا اور میں مایوس ہو چلا تھا کہ اسٹوری صاحب کا جواب اب کیا آئے گا لیکن صبح کی ڈاک سے کیا دیکھتا ہوں کہ میرے استفسار کے جواب میں ان کا خط آ رہا ہے جس میں انھوں نے الضوء اللامع کا پورا پتہ مع صفحے اور جلد کے دیا ہے اور لکھا ہے کہ کتاب ۱۳۵۵ھ میں طبع ہوئی۔ اور غالباً اس وقت تک برطانوی نوادرخانے کے کارڈ انڈکس پر نہ آئی ہوگی اس لئے مشرقی مطالعہ خانے جا کر فلاں شخص سے دریافت کیا جائے۔ مجھے اس کتاب کی بڑی ٹوہ تھی۔ اس لئے کہ شائد یہ واحد معصر کتاب ہے جس میں محمود گاواں کے حالات درج ہیں۔ باوجودیکہ انگلستان کو خیرباد کہنا تھا لیکن سب کام چھوڑ کر نوادرخانہ گیا اور مشرقی مطالعہ خانے والوں کو اسٹوری صاحب کا خط دکھایا۔ آخر کار کتاب مل گئی۔ میں نے اس کے وہ نسخے جو محمود گاواں کے متعلق تھے نقل کئے۔ انگریز علما جنھیں ہمارے یہاں کے عالم ہیچ سمجھتے ہیں حقیقت میں بڑے معتبر ہوتے ہیں کہاں محمود گاواں کا ایک عربی کتاب میں ذکر کہاں کیمبرج کے ایک پروفیسر کی اس قدر باخبری حقیقت میں یہی لوگ دنیا کی بادشاہت کے مستحق ہیں!

دو بجے کی گاڑی سے وکٹوریا اسٹیشن سے روانہ ہوا۔ بھاری اسباب راست پیرس کو رجسٹری کرانا پڑا۔ ۴½ بجے ڈوور بغیر راستے میں کسی جگہ رکے ہوئے پہنچے۔ پانچ سے ۶½ بجے تک دوبارا انگلستان کو عبور کیا۔ ۹½ بجے پیرس۔ جہاز نہایت تیز تھا اور ہوا تند۔ چونکہ پیرس میں بارش ہو رہی تھی اس لیے اسٹیشن کے قریب ہی ایک ہوٹل میں قیام کیا تاکہ دوسرے دن قومی کتب خانہ تلاش کر کے اسی کے قریب کسی ہوٹل میں منتقل ہو جاؤں۔

ہارون خاں شیروانی

غزل

جب کبھی کاری لگی ضربِ جنوں — عقل کے ماتھے سے پھوٹی جوئے خوں
تیشۂ فرہاد کی جھنکار سن — موم ہے ہمت کے آگے بے ستوں
خواب ہیں اہلِ نظر کے سامنے — جلوہ ہائے دولتِ دنیائے دوں
قوتِ تدبیر بھی کچھ کم نہیں — بے عمل تقدیر کو روتا ہے کیوں

مہربانی تھی نگاہِ حسن کی
دل کی بربادی کا قصہ کیا کہوں

سکندر علی وجد

معاشرت میں سادگی

چوتھی قسط

ہماری موجودہ معاشی و اقتصادی پستی کے مدنظر اس وقت ہمیں اپنی معاشرت کی اصلاح اور فضول رسم و رواج و توہمات کے انسداد کی شدید ضرورت ہے۔

دوسروں کی نقل اور فریب طرز زندگی اور اس کی دلچسپیوں میں ہم کچھ ایسے کھو گئے ہیں کہ کبھی بھول کر بھی ہم کو اپنی اصلاح کی طرف توجہ نہیں ہوتی۔

یہ ایک مسلمہ امر ہے کہ جو قوم مفلس ہوتی ہے اس میں اظہار قابلیت کی صلاحیت عموماً معدوم ہو جاتی ہے اور جس قوم میں کوئی صلاحیت نہ ہو وہ دوسری اقوام کے ساتھ شاہراہ ترقی پر کس طرح گامزن ہو سکتی ہے؟ ہماری قوم کا افلاس حد سے سوا ہو گیا ہے اور ہم پر ادبار و نکبت کی گھٹائیں چھائی ہوئی ہیں، مگر ہماری آنکھوں پر غفلت کے پردے پڑے ہوئے ہیں اور ہم کچھ ایسے خواب میں ہیں کہ مشکل سے جاگنا نصیب ہے!

دنیا میں شاید ہی کوئی قوم اس قدر مفلس ہونے کے باوجود اتنی مسرف ہوگی! افلاس اچھی طرح ہم پر مسلط ہو چکا ہے مگر ہم اپنے فضول رسم و رواج میں پیسہ پانی کی طرح روپیہ کا خون کرنا عین وضع داری خیال کرتے ہیں! ہم آج تک صنعت و حرفت کے کسی پیشے کو اختیار کرنا عار اور اپنی شان کے خلاف سمجھتے ہیں مگر بیہودہ رسوم و رواج کی خاطر قرض خواہوں کی دام و ڈگریوں میں اپنے آباؤ اجداد کی جائیدادیں نیلام چڑھوانا شان وضع داری ہے۔

ہم اپنی معاشرت کو اپنے ہاتھوں دن بدن گراں بنا رہے ہیں اور اپنے معیار زندگی کو دوسری متمول اقوام کی اندھی تقلید میں بے تحاشا اونچا کر رہے ہیں جس کے نتیجے میں ہماری معاشی اور اقتصادی حالت روز بروز بدتر ہوتی جا رہی ہے، ہمارا خرچ ہماری آمدنی سے سوا ہو گیا ہے اور ہم قرض کے شکنجوں یا ساہوکاروں کے پنجوں میں بری طرح پھنستے جا رہے ہیں۔ مغربی قوموں کی تقلید کے عوض اگر ہم اپنی ہمسایہ قوموں کی ایک حد تک تقلید کریں اور باوجود مال و دولت کی فراوانی کے ان کی سادہ زندگی سے سبق حاصل کریں تو بیجا نہ ہوگا۔

جن مغربی قوموں کی اندھی تقلید میں ہم اپنی معاشرت کو گراں اور اپنے معیار زندگی کو بلند کر رہے ہیں وہ قومیں اپنے معیار زندگی کو اس لئے اونچا کر رہی ہیں کہ جس رفتار سے ان کی زندگی کی ضرورتوں میں اضافہ ہوتا جائے گا اسی رفتار سے ان میں کسب معاش کا خیال خود بخود ترقی کرتا جائے گا اور اس سلسلے میں وہ اپنے بنی نوع کی امداد و اعانت کرنے کے قابل ہو سکیں گی اور بے روزگاری بتدریج قلع قمع ہوتا جائے گا۔ مغربی اقوام کا یہ اصول نہایت قابل ستائش ہے کیونکہ وہ اپنے اس خیال کو بحسن و خوبی عمل میں لا رہی ہیں مگر باوجود ان کی ان تھک کوششوں کے اب تک بے روزگاری کا انسداد نہ ہو سکا۔

ہم مشرقی جو مغرب کی اندھی تقلید کرنا اپنا دین و ایمان سمجھتے ہیں آئے دن زندگی کے معیار کو تو بڑھاتے جاتے ہیں مگر مغربی قوموں کی طرح کسب معاش اور صنعت و حرفت کی طرف بالکل متوجہ نہیں جس کی وجہ ہمارے افلاس میں روز افزوں اضافہ ہو رہا ہے، آمدنی کی کمی اور خرچ کی زیادتی ہماری آمد و خرچ کے توازن کو بری طرح گرا رہی ہے، اس توازن کو برقرار رکھنے کی ایک ہی تدبیر ہو سکتی ہے کہ ہم اپنے ضروری مدات خرچ کا تعین

کریں اور اس امر کا لحاظ رکھیں کہ آمدنی کا کتنا فیصد کس
مد پر صرف کیا جانا چاہیئے اور کتنا غیر مرئی آنے والی ضرورتوں
کے لیئے مدِ محفوظ میں رہنا چاہیئے' اس طرح اگر ہم
اپنا بجٹ بنالیں اور اپنی زندگی کے معیار کو اپنی آمدنی
کے لحاظ سے گھٹادیں تو ہمارا افلاس بڑی حد تک دور
ہو سکتا ہے اور زندگی کی حقیقی مسرتیں ہمیں حاصل ہوتی

ہمارا کوئی گھر ایسا نہیں جہاں سال میں دو چار
بلکہ دس پانچ فضول تقریبیں نہ ہوتی ہوں اور قرض
کے روپے سے پر تکلف دعوتیں اور رقص و سرود کی
رنگین محفلیں برپا نہ کی جاتی ہوں' ہماری قوم کا مسلک
یہ ہے کہ انسان صرف کھانے اور اڑانے کے لئے پیدا کیا
گیا ہے' یا لباسِ فاخرہ پہن کر اپنی جھوٹی شان و شوکت کا
مظاہرہ کرنے کے لئے عالم وجود میں آیا ہے' خواہ اس
نمائش میں جگ ہنسائی کی نوبت ہی کیوں نہ آئے
اور ذلت و خواری کی حد و انتہا ہی کیوں نہ ہو جائے!

بچے کی تاریخِ پیدائش سے لے کر عمرِ طبعی کو پہونچ کر
دوسری دنیا میں سدھارنے تک بلکہ اس کے بعد بھی کوئی
نہ کوئی تقریب ایسی ہوتی رہے جس کی وجہ سے گھر میں
خاصی چہل پہل ہوا اور صاحبِ خانہ کی میزبانی' دریادلی
اور خوش سلیقگی کے خوب چرچے ہوا کریں' چاہے اس
میزبانی میں میزبان صاحب کی عزت و آبرو پر ایک دن
پانی ہی کیوں نہ پھر جائے اور گھر کا اچھی طرح صفایا ہی
کیوں نہ ہو جائے!

بچہ پیدا ہوتے ہی فضول اور غیر اسلامی رسموں کا
طوفان برپا ہو جاتا ہے' چھٹی' چلہ' بوٹ چٹائی' ناک چھدائی
وغیرہ وغیرہ ان فضول رسموں کا کرنا واجب اور قرض لے کر
پر تکلف دعوتیں کرنا لازم ہو جاتا ہے۔ ایسے موقعوں پر
بچے کے [illegible] ہوتا ہے بچے کے ساتھ
اس کے [illegible] والدین بھی "مرغ زریں" بن جاتے ہیں۔
اور اعلیٰ پیمانہ پر دعوتیں کی جاتی ہیں' بعض گھروں میں
بچے کی [illegible] تقریبیں کچھ اس طرح منائی جاتی ہیں کہ گویا
بچے کی پیدائش کوئی عجیب و غریب بات ہے یا بچہ دنیا کا
آٹھواں عجوبہ ہے۔ گھر کی [illegible] ننھے بچے کو بسم اللہ کے گنبد میں
بٹھا دیتی ہے اور کچھ ایسے ناز و نعم اور بیجا لاڈ پیار میں
اس کی پرورش ہوتی ہے اور اس کی ذہنیت پروان چڑھتی
ہے کہ وہ بڑا ہو کر اپنے عاقبت نااندیش والدین کے نقشِ قدم
پر چلتا ہے اور آگے چل کر اسی قسم کی لغویات اور خرافات کا
عادی ہو جاتا ہے۔

چھٹی چلہ وغیرہ وغیرہ کا بوجھ ابھی ہلکا نہیں ہونے
پاتا کہ دوسرا سالگرہ کی تقریب قریب آتی ہے سالگرہ
بھی کیسی؟ پہلی سالگرہ!!! اس میں تو خوب جی کھول کر
روپیہ خرچ کرنا چاہئے' برس کا یہ ایک دن بھلا بار بار
کہاں آتا ہے! نوبت نقارے کے ذریعہ ڈنکے کی چوٹ
سالگرہ کا اعلان ہوتا ہے۔ اور ایک شاندار دعوت کے
کسی [illegible] کرایا جاتا ہے' غرض کہ

ایک ہنگامہ پہ موقوف ہے گھر کی رونق!!

مگر اس رونق کے سلسلے میں ایک دن وہ بھی آتا ہے
نوبت نقارے کے عوض نیلامی [illegible] کا "نوحۂ غم" سننا پڑتا
ہے کیونکہ ہماری اکثر بیشتر تقریبیں کسی نہ کسی ساہوکار کی
شرمندۂ منت ہوا کرتی ہیں' جھوٹی شان و شوکت کے مظاہرے

ہماری قوم کی حالت بد سے بدتر کر دی ہے مگر ہم کو اپنی تقریبوں کی خوش سلیقگی اور تکلف پر بڑا فخر و ناز ہوتا ہے کہ ایسے پیمانے پر ہماری تقریبیں ہوا کرتی ہیں کہ ہر مہمان ہمارے سلیقے اور فراخ دلی کی جی کھول کر داد دیتا ہے اور ہر جگہ ہماری خوب واہ واہ ہوتی ہے اگرچہ کسی دن اس "واہ واہ" کے سلسلے میں قرض کی ڈگریاں "ہائے وائے" بھی کر دیتی ہیں۔

پہلی سالگرہ کے قرض سے نجات بھی نہیں ملی تھی یہ لڑکے کی ختنہ یا لڑکی کی ناک اور کان چھدائی کی تقریب آ پہونچی ہے یہ تقریب بھی اسی روایتی آن بان سے منائی جاتی ہے ورنہ والدین کے ساتھ سارے خاندان کی ناک کٹ جانے کا خطرہ لگا رہتا ہے۔ یہ سب خرافات اور لغویات واجبات سے سمجھے جاتے ہیں، خواہ ان "واجبات" کی سربراہی اور انجام دہی میں ایک دن سارا اثاث البیت ہی کیوں نہ نیلام کرانا پڑے! ان تقاریب کے ساتھ ساتھ ہر سال دھوم دھام سے سالگرہ کرنا فرض ہو جاتا ہے، اگر یہ رسم کسی سال ناغہ ہو جائے تو بڑی بدشگونی سمجھی جاتی ہے۔ اور بچے کی جان اقسام کے نام نہاد خطروں میں گھر جاتی ہے۔

چوتھا سال شروع ہوتے ہی والدین کو تسمیہ خوانی یا "بسم اللہ" کی فکر لگ جاتی ہے، اس رسم کو بڑی اہمیت دی جاتی ہے۔ اور اب تک جتنی تقریبیں ہوئی تھیں ان سب سے اعلیٰ پیمانہ پر یہ تقریب سعید منائی جاتی ہے۔ بیش قیمت زرین لباس، دہی کھانے کھلانے کی پر تکلف دعوتیں، رقص و سرود کی رنگین محفلیں، شاندار آتش بازی کا دھواں دھار مظاہرہ، ان سب پر مستزاد یہ کہ "بسم اللہ" کے نوشہ کی برات گھوڑے یا موٹر پر چکا چوند کرنے والی روشنی، فضا کو گندہ کرنے والی آتش بازی اور کان پھاڑ باجوں کے ساتھ عزیز و اقارب اور دوست احباب کی پلٹن کی ہمراہی میں دو چار گھنٹوں کی گشت کے بعد بخیر و خوبی گھر لوٹتی ہے۔

چھٹی، چلہ، عقیقہ، ختنہ، ناک چھدائی، کان چھدائی، سالگرہ، بسم اللہ وغیرہ میں روپے کا جو دریا بہایا گیا تھا اس کا اثر والدین کی اقتصادی حالت کو برسوں سنبھلنے نہیں دیتا قرض کی رقم تو رہی ایک طرف اس کا سود تک ادا کرنا دشوار ہو جاتا ہے۔ والدین اپنے اس چشم و چراغ کی مسرت انگیز روشنی میں کچھ ایسے کھو جاتے ہیں کہ ان کو اپنے برے بھلے کی کوئی سدھ نہیں رہتی، اپنی ناسمجھی اور مشیت ایزدی کی وجہ کسی دن یہ "گھر کا چراغ" سارے گھر کو پھونک دیتا ہے اور ایک دن وہ بھی آتا ہے کہ

"اس گھر کو آگ لگ گئی گھر کے چراغ سے"

کہنا پڑتا ہے، بعض حضرات تو قرض کے شعلوں میں بالکل ہی بھسم ہو جاتے ہیں اور بعض جو نیم سوختہ ہوتے ہیں انھیں چند سال کے بعد اپنے اس آتش افروز چراغ کی کتخدائی کی فکر دامن گیر ہوتی ہے۔ اس تقریب کو بھی قرض سے ہٹ کر لغویات کا مظہر بنا دیا جاتا ہے، اس میں بھی وہی جھوٹی شان و شوکت کا مظاہرہ اور اسراف کی نمائش کی جاتی ہے۔ نام و نمود کا شوق ہماری طبیعتوں میں کچھ ایسا راسخ ہو گیا ہے کہ جب تک ہر تقریب میں جی بھر کر فضول خرچی نہ کریں چین ہی نہیں پڑتا۔ (باقی)

مرزا سیف علی خاں

سکون و اضطراب

کس کی آرزو میں ہوں؟ آہ کیسی بدنامی!
کس کی جستجو میں ہوں؟ واہ کیسی ناکامی!

جس پہ جان دینے کی ہے مری وفا حامی
مجھ سے ہے خجل اس کے التفات کی خامی

حسن، دلربا کیوں ہے؟ حسن آفریں جانے
میں تڑپ گیا سن کر یہ جواب الزامی

مانتا ہوں کیفیت در بیاں نمی گنجد
جانتا ہوں میں ہی کچھ لطفِ حرفِ بدنامی

نامراد میں ہی تھا بامراد میں ہی ہوں
لطف کامیابی ہے راز رنج ناکامی

بے سبب دل آزاری ہے جب اتنی جاں پرور
کتنی جاں فزا ہوگی اے حسین دل آرامی

بند ہو گئیں منظور آج بے قرار آنکھیں
دور ہو گئی شاید تھی جو عشق میں خامی

مست کیا کرے مجھ کو بادۂ خُمِ جامی
منحرف ان سے تھا ان کا حال مے آشامی

اپنے عہد کا ساقی ہر نقیب دوراں ہے
کیف بخش میخواراں اب نہیں ہے "خیامی"

کام آ گئی غیروں کے جن کی بیخودی کل تک
لے رہا ہوں میں ان سے آج درس خود کامی

لاج اس تلون کی میری عقل رکھ لے گی
عامیوں میں ہوں عارف عارفوں میں ہوں عامی

فرقِ ظاہر و باطن کیا مجھے بنا دے گا
احتساب کا دشمن انقلاب کا حامی

ہے بشارتِ ذہنی انقلاب آئندہ
جلد مٹنے والا ہے فرق حامی و سامی

عام ہو گی ہمدردی اور دینِ فطرت کی
غیر مسلموں میں بھی ہو گی شان اسلامی

رنگ تھا ہی منظور ارتقا پسندوں کا
بیسویں صدی کی ہے یہ غزل بھی انعامی

علی منظور

لمباڑے

لمباڑے یا بنجارے دکن کے قدیمی باشندے ہیں، جنگلوں میں، کھلی فضا میں اپنی چھوٹی چھوٹی جھونپڑیاں بنا کر رہ پڑتے ہیں۔ خانہ بدوشی ان کی عادت ہے۔

یہ لوگ اہلِ ہنود سے ہیں، جہالت و توہمات نے جوان کا وتیرہ ہے، انھیں بہت پست درجہ کا بنا رکھا ہے۔ یہ لوگ ممالکِ محروسہ سرکارِ عالی کے ہر حصے میں پائے جاتے ہیں جنگلی جانور اور درندے جو بھی ان کا شکار ہوں، یہ اسے چٹ کر جاتے ہیں۔ ان کی بولی خاص ہوتی ہے، مگر مقامی زبان بھی بول لیتے ہیں۔

صدی پون صدی پہلے جب کہ ریلوے اور موٹر حمل و نقل کے ذرائع نہ تھے، یہ قوم کافی مالدار ہوا کرتی تھی۔ ان کے مویشی، گائے بیل ان کی ملکیت ہوا کرتے۔ جو لمباڑوں کے "نانڈے" کے نام سے مشہور تھے ان پر وہ نمک وغیرہ دور دور سے لا کر بیچتے تھے اور جب کبھی موقع ملتا جنگلوں میں مسافروں کو لوٹ بھی لیا کرتے

ان کی وحشیانہ حرکتوں، ان کے جرائم، ان کی جرأت سے لوگ خائف رہتے تھے، خاص کر ان کی ہیئت کدائی بھی مرعوب کرتی۔

لیکن اس روشن زمانے میں جب کہ لوٹ مار کے موقعے باقی نہیں رہے اور نہ ان کی تجارت! اس لئے یہ لوگ مفلس ہو کر رہ گئے ہیں۔ اور ان کے وہ نانڈے شاذ ہی کسی کے پاس ہوا کرتے ہیں۔ اب بسر اوقات کے لئے کچھ لوگ زراعت بھی کرنے لگے ہیں۔ ملازمت اور مزدوری بھی کرتے ہیں۔ ان کی عورتوں نے شہروں میں اپنا ناچ دکھا کر بھیک مانگنا بھی شروع کر دیا ہے۔

لمباڑنوں کا لباس خصوصیت سے قابلِ ذکر ہے۔ ایک لباس ڈیڑھ دو سال ان کے استعمال میں رہتا ہے۔ ایک دفعہ نیا پہننے کے بعد وہ پھٹ کر ہی اترتا ہے۔ یہ بڑے اور خوب گھیر دار لہنگے پہنتی ہیں جو پنڈلیوں تک آتے ہیں۔ اس پر وہ اپنے ہاتھ سے کام نکالا کرتی ہیں چھوٹے چھوٹے گول آئینہ اور ابرک کے ٹکڑے کمر کے حصے میں کئی کئی قطاروں میں ٹانکا کرتی ہیں، جو مثل بلٹ کے نظر آتا ہے۔ ان کے اطراف مثل ہوا کے سیا کرتی ہیں۔ ایک طرح کی چولی یا انگیا پہنتی ہیں جس سے سامنے کا تمام حصہ لہنگے تک پوشیدہ رہتا ہے۔ اس میں بڑی بڑی جیبیں اور گلا کھلا ہوتا ہے۔ اس کی گوٹ بطور پیپنگ کے لگایا کرتی ہیں۔ پیچھے پیٹھ کا تمام حصہ کھلا ہوتا ہے۔ اس پر ایک اوڑھنی جو پیچھے پیٹھ پر لے کر اوڑھ لیا کرتی ہیں۔ ان کا یہ لباس رنگین اور چھاپے کی کھادی کا ہوتا ہے ان کے زیورات بھی عجیب ہوتے ہیں۔ خوب چوڑی ہڈیوں کی چوڑیاں کہنیوں تک پہنتی ہیں۔ اس کے آگے چاندی کی پٹیاں بھی ڈال لیتی ہیں۔ ہر ایک لمباڑن خاص قسم کے چاندی کے کرن پھول جو بڑے بڑے ہوتے ہیں پہنتی ہیں۔ یہ کان کے نزدیک بالوں کی لٹ میں باندھ لئے جاتے ہیں۔ بالوں کا سنگار اس طرح ہوتا ہے۔ بالوں کی پٹیاں بھوؤں تک لائی جاتی ہیں اور سامنے سے پتلی چوٹی "مہریاں" کانوں تک گوندکر چوٹی ڈال لیا کرتی ہیں۔ گلے میں گلوبند وغیرہ کے

مالن

چاند اور تارے رہ گئے تکتے
ننھے شرارے رہ گئے تکتے
پھول بچارے رہ گئے تکتے
مالن کتنی البیلی ہے

کوئل گاتی رہ گئی ظالم
شور مچاتی رہ گئی ظالم
راگ سناتی رہ گئی ظالم
مالن کتنی البیلی ہے

کلی کلی کا دم گھٹتا ہے
قافلہ عشرت کا لٹتا ہے
دل میں ظالم درد اٹھتا ہے
مالن کتنی البیلی ہے

پھولوں کی معصوم جوانی
تاروں کی ہے پریم کہانی
اللہ! اللہ! یہ سب فانی
مالن کتنی البیلی ہے

باغ کا مالی فریادی ہے
ڈالی ڈالی فریادی ہے
بھولا مالی فریادی ہے
مالن کتنی البیلی ہے

کون ہے اس کی پریت کا مارا
صبح طرب کا روشن تارا
اتنا مد صورت اتنا پیار[ا]
مالن کتنی البیلی ہے

انسب کلیانو[ی]

(گرگنش)

موت سے!

نہ چھیڑ "موت" ذرا مجھ کو اور جینے دے!

ابھی تو "مہر درخشاں" سے نور مانگا ہے
ابھی تو "برق تپاں" سے ملی ہے مجھ کو تڑپ
ابھی تو گردشِ لیل و نہار دیکھی ہے
ابھی تو "ربط ہستی" کے تار چھیڑے ہیں
ابھی تو "حسن ازل" کا ہوا ہوں مدح سرا
ابھی تو "جذبۂ رومان نواز" کے صدقے
ابھی تو "شاہدِ رعنا" کی عشوہ ریزی سے
ابھی تو "حسنِ گریزاں" کے چند جلووں میں
ابھی تو "چشم غزالیں" کے اک اشارے پر
ابھی تو "محفلِ رنداں" میں روح پھونکی ہے
ابھی تو "دردِ وطن" سے ہوا ہے دل معمور
نہ چھیڑ "موت" ذرا مجھ کو اور جینے دے

ابھی تو "مسند انجم" بچھائی ہے میں نے
ابھی تو "موجِ جوانی" اڑائی ہے میں نے
ابھی تو "کشتیٔ ارماں" سجائی ہے میں نے
ابھی تو "دولتِ احساس" پائی ہے میں نے
ابھی تو "شعر کی محفل" جمائی ہے میں نے
نقابِ "چہرۂ رنگیں" اٹھائی ہے میں نے
"حریم شوق" پہ بجلی گرائی ہے میں نے
شباب و کیف کی بستی بسائی ہے میں نے
سکون و چین کی دنیا لٹائی ہے میں نے
ابھی تو شعر سے مستی لٹائی ہے میں نے
ابھی تو جبر کی بنیاد ڈھائی ہے میں نے
شباب و کیف کے رنگین جام پینے دے

مرتضیٰ

جنم پتری

ہم آپ کو اُن لوگوں کے کیرکٹر اور واقعات سناتے ہیں جو ۲۳ جولائی سے لے کر ۲۱ اگست تک پیدا ہوئے ہیں مگر یہ خیال رہے کہ یہ حالات بالکل عام ہوں گے۔ اگر اس سے زیادہ حالات اور خاص خاص باتیں معلوم کرنی ہیں تو مہینے کے علاوہ پیدائش کا روز، صحیح وقت اور سنہ کی ضرورت ہوتی ہے پھر حساب کرنے کے بعد اس شخص کی تفصیلی کیفیت اور اہم خصوصیات بتائے جاتے ہیں۔

۲۲ جولائی سے ۲۱ اگست تک آفتاب برج اسد میں رہتا ہے۔ اسد کا تعلق دل سے ہے جس سے دلیری اور ہمت پیدا ہوتی ہے۔ اس لئے جو لوگ اس زمانہ میں پیدا ہوتے ہیں یہ صفتیں ان میں خاص طور پر پائی جاتی ہیں جوانی میں نڈر، جو شیلے، شیر دل اور سمجھدار ہوتے ہیں مگر بچپن میں ان لوگوں کی یہ کیفیت ہوتی ہے کہ ہمیشہ کسی نہ کسی خیال میں ڈوبے رہتے ہیں اور گھنٹوں اکیلے بیٹھے ہوئے خیالی پلاؤ پکاتے رہتے ہیں۔ اگر ابتدا سے انھیں کسی رستے پر لگا دیا جائے تو اس خیالی فضا سے نکل کر عملی میدان میں دوڑ دھوپ شروع کر دیتے ہیں ورنہ اپنے ساتھیوں اور قریب ترین لوگوں کے عادات و اطوار اختیار کر لیتے ہیں۔

جو لوگ اس زمانہ میں پیدا ہوتے ہیں وہ کسی چیز کو تفصیل سے نہیں دیکھتے بلکہ اس کو بحیثیت مجموعی دیکھنا پسند کرتے ہیں۔ یہ لوگ بلند خیال، عالی حوصلہ اور دلیر ہوتے ہیں۔ ادنیٰ درجے کا مذاق اور معمولی کاروبار سے انھیں نفرت ہوتی ہے۔ ان کے بڑے بڑے خیالات ہوتے ہیں اور ہر کام کو وسیع پیمانہ پر انجام دینے کی فکر میں لگے رہتے ہیں۔ یہ لوگ فیاض، راست باز، کشادہ دل، بے باک، صاحب عزت اور صاف گو ہوتے ہیں اور ان میں انتظامی قابلیت بھی بہت اچھی ہوتی ہے۔ یہ لوگ خاص خاص [illegible] کے پابند [illegible] ہیں اور [illegible] راستہ کا انتخاب کر لیتے ہیں۔

یہ لوگ اپنے ماتحتوں اور نوکروں کے مقابلے میں نہایت لاپروائی برتتے ہیں۔ انھیں اپنی طاقت اور [illegible] ہمیشہ [illegible] طرح جھپٹتے ہیں اور شیر کی طرح پل پڑتے ہیں۔ ان کی طبیعتیں عام طور پر رحم اور بخشش کی طرف مائل ہوتی ہیں۔ یہ ہمدرد، رحم دل اور نہایت شریف ہوتے ہیں۔

ان لوگوں کا ایک عدد ہے۔ اور یہ ایک عدد آفتاب کی علامت ہے۔ یہی وجہ ہے کہ یہ لوگ روشن دماغ، غیر معمولی طور پر ذہین اور [illegible] ہوتے ہیں۔ ان میں [illegible] باتوں کی چھان بین، علم کی تلاش اور ایجاد کا مادہ ہوتا ہے۔ یہ اپنے ارادوں کے پکے اور دھن کے پورے ہوتے ہیں۔ طبیعت میں ضد اور ہٹ ہوتی ہے اور مزاج میں تیزی اور عجلت پسندی پائی جاتی ہے۔

عام طور پر یہ ایک عدد ان لوگوں کا ہے جو کسی مہینے کی پہلی اور ۱۰، ۱۹ یا ۲۸ تاریخوں میں پیدا ہوں لیکن اس کے اثرات اور خصوصیت سے پائے جاتے ہیں جو ۲۲ جولائی سے ۲۱ اگست تک پیدا ہوئے ہوں۔ یہ لوگ جوشیلے اور بلند خیال ہوتے ہیں۔ انھیں فضول خوشامد، کسی کی زبردستی کی تعریف اور [illegible] یاری داری سے سخت نفرت ہوتی ہے

کمزوریاں

ان میں ایک بڑی کمزوری یہ ہوتی ہے کہ یہ اپنی موت اور کارگذاریوں پر مغرور ہوجاتے ہیں اور اکثر خود ستائی پر اُترآتے ہیں بعض بڑے تندمزاج او رمغلوب الغضب ہوتے ہیں۔ خود کو دلیر اور جواں مرد ثابت کرنے کے لئے دوسرے کی جان لینا ایک کھیل سمجھتے ہیں۔ ان میں سے بعض کے خیالات اِس قدر اونچے ہوتے ہیں کہ معمولی سے معمولی کاروبار کی تکمیل میں ہزاروں دشواریاں پیدا ہوجاتی ہیں۔

دوست احباب

اِن کے دوست احباب کا حلقہ بہت وسیع ہوتا ہے مگر اصلی معنوں میں جو دوست ہیں وہ دو چار ہی ہوتے ہیں۔ خصوصاً اُن لوگوں سے تو بہت گاڑھی چھنتی ہے جو خود اُن کے زمانے میں پیدا ہوئے ہوں یا جن کی پیدائش جنوری، نومبر یا دسمبر کے مہینے میں عمل میں آئی ہو۔

پیشہ یا کاروبار

یہ لوگ ترقی کرکے بڑے بڑے عہدوں پر پہنچ جاتے ہیں۔ سرکاری ملازمت ہو یا غیرسرکاری یہ اپنے فرائض بڑی محنت، دیانت داری اور بڑی خوش اسلوبی سے انجام دیتے ہیں چھوٹے سے چھوٹے اور بڑے سے بڑے کام کو نہایت صلاحیت اور قابلیت سے کرتے ہیں۔ عورتیں بہترین شاعر، ادیب مضمون نگار، اور موسیقی کے فن میں ماہر ہوتی ہیں۔ ان کا رجحان بچوں کی تعلیم وتربیت کنڈرگارٹن، مانٹسوری اور اسی قسم کے فنون پر زیاد[ه] ہوتا ہے۔ انھیں اپنی ذمہ داریوں کا احساس کام [کا] شوق اور اپنے فرائض کی انجام دہی کا ذوق ہوتا ہے مگر عیب یہ ہے کہ کسی کی ماتحتی کرنا انھیں مطلق گوا[را] نہیں۔

صحت اور بیماریاں

ان کی جسمانی قوتیں بہت اچھی ہوتی ہیں۔ اگر احتیاط برتیں تو صحت اور تندرستی کے ساتھ بڑی عمر تک پہنچ جاتے ہیں۔ اِن لوگوں کو عام طور پر دل جگر گلے اور سینے کی بیماریاں کثرت سے ہوتی ہیں۔ بڑھاپے میں خون کے دباؤ، اختلاج، گٹھیا اور آنکھوں کے مرض میں بھی اکثر مبتلا ہوجاتے ہیں۔

۱۹ اور ۵۵ سال کی عمر میں ان کی صحت میں [اہم] تبدیلیاں واقع ہوتی ہیں۔ ساتویں سال سے ۱۴ سال کی عمر تک حلق کی بیماریوں کا اندیشہ ہے۔ ۲۰ سے ۲۵ سال [تک] دل اور جگر کی بیماریوں کا خوف ہے۔ انھیں ۴۹ سے لے کر [...] تک اپنی صحت کا خاص طور پر خیال رکھنا چاہیے۔ اس کے علاوہ اسد کے برج کو آگ سے بہت لگاؤ ہے۔ اس [لئے] انھیں آگ سے ہمیشہ بچنا چاہیے۔ اکتوبر، دسمبر اور جنو[ری] میں انھیں زیادہ کام کرنا نہیں چاہیے اور آنکھوں کا خاص طو[ر پر خیال] رکھنا چاہیے۔ روزانہ تھوڑا بہت آرام اور مقام کی تبدیلی ان کے [لئے] ہزار دوا کی ایک دوا ہے۔

مرزا عصمت اللہ بیگ

صنفِ قصیدہ پر ایک ناقدانہ نظر

قصیدہ اصناف سخن میں بہت اہمیت رکھتا ہے کیونکہ اردو شاعری میں قصیدہ گوئی کا آغاز قدما کے نہایت ابتدائی دور میں ہوتا ہے اور نہ صرف اردو میں بلکہ فارسی شاعری میں بھی ایران نے سب سے پہلے قصیدہ گوئی کی ابتدا کی۔ قصیدہ کی غیر معمولی شہرت و ہردلعزیزی کے دو وجوہ ہیں۔ اولاً یہ کہ ہر ذی حیات خواہ وہ بنی نوع انسان ہو یا بہایم تعریف و تحسین کو پسند کرتا ہے اور انسان بدرجہ اولیٰ کیونکہ وہ ذی حیات ہونے کے علاوہ ذی شعور ذی فہم اشرف المخلوقات اور خلیفۃ اللہ فی الارض تسلیم کیا گیا ہے۔ خدائے ایزد بارک تعالیٰ ستایش و تعریف، تشکر و امتنان سے خوش ہوتا ہے ہماری ریاضت، عبادت کی تاسیس اسی حمد و ثنا پر ہوئی روزہ، نماز، حج یہ سب اس خالق کون و مکاں کے شکر و تعریف کے مختلف طریقے ہیں۔ ہمارے لئے اس سے افضل و اعلیٰ اور کیا مثال ہو سکتی ہے کہ کلام مجید کی ابتدا "بسم اللہ الرحمٰن الرحیم اور الحمد للہ رب العالمین" سے ہوتی ہے۔

ثانیاً یہ کہ انعام، صلہ، بخشش کی توقع صرف قصیدہ سے ہو سکتی ہے قصیدہ لکھنے کے صلے میں شاعروں کے منہ موتیوں سے بھرے گئے، سونا، چاندی بیش بہا جواہرات انعام دئے گئے۔ جاگیر، منصب، خلعت حکمران وقت کی طرف سے عطا کئے گئے اس طرح شعرا کی قدر، منزلت عزت حریم میں چار چاند لگ گئے انوری جو فارسی قصائد کا پیغمبر مانا جاتا ہے، ظہیر فاریابی جو استاد قصیدہ تسلیم کیا جاتا ہے ان کے علاوہ دیگر شعرا نے بھی اسی صنف کی وجہ سے خوش حال زندگی بسر کی۔ اردو میں مصحفی، سودا، ملک الشعرا خاقانی ہند ذوق، غالب کی زندگی آشفتہ حالی، پریشانی، تنگدستی اور بے روزگاری میں گزری اور جو کچھ مالی امداد حاصل ہوئی وہ قصیدہ کی بدولت اگر یہ کہا جائے تو بے جا نہ ہوگا کہ غالب ان ہمارے بڑے بڑے شعرائے نازک خیال کا طرۂ امتیاز رہا ہے اور اسی تنگدستی نے ان کو مجبور کیا کہ وہ شاعری کے کسی ایسے میدان میں گامزن ہوں جس سے ان کو مالی منفعت اور امداد حاصل ہو اور اقتصادی پستی دور ہو چنانچہ قصیدے نے ان کی مفلسی کو ایک حد تک تمول میں تبدیل کر دیا۔

سودا نے مستقل طور پر قصیدہ گوئی کی ابتدا اردو شاعری میں کی اور عرفی، انوری، خاقانی کے مماثل قصائد اردو میں لکھنے شروع کئے۔ سودا کا زمانۂ شاعری سنہ ۱۷۴۳ء سے ۱۷۸۱ء تک ہے۔ اس سے قبل دکنی زمانہ میں بھی قصائد لکھے گئے۔ قصیدہ کی تمہید میں عشقیہ اشعار ہوتے ہیں جن کو تشبیب کہتے ہیں۔ پہلے شاعر اپنے ممدوح کو حسن و عشق محبت اور لطافت کے دل خوش کن نغمے سناتا ہے اور ابتدائی اشعار میں اس کے سامنے حسن کی سحر کاریاں، عشق کی دلفریبیاں معشوق کے عشوہ و ناز دلفریب خاکے کھینچتا ہے، شراب ساقی، جام و مل، گل و بلبل کا ذکر کرتا ہے۔ یہاں مثال کے طور پر چند شعرا کی تشبیب ملاحظہ ہو۔

سلمان:
عذار و خط و رخسار و لب و دار و گفتار و شرع
بہار و سبزہ و بیج، شراب و شاہد و ساقی

سر زلف و رخ خوب و خط سبز و لب لعلش
چمن ساے و ہوا ساے و گل آراے و گہر زا

قاآنی سے — شمع روشن ہمہ نور است ہمانا خرد است
چین زلفش ہمہ مشک است ہمانا ختن است

تا نگرو دہی آن آتش رخسارہ خموشش
زلفش آں آتش افروختہ را باد زدن است

ظہیر فاریابی سے — دل مرا کہ فراموش کرد عہد وصال
نسیم باد صبا بوئے زلف یار دہد

سپیدہ دم چو صبا مژدہ بہار دہد
دم ہوا ادرنا فہ تنتار دہد

ذوق سے — سحر جو گھر میں بشکل آئینہ تھا میں بیٹھا نظارہ حیراں
تو اک پری چہرہ جو طلعت بشکل بلقیس ماہ کنعاں
پری کی صورت چمن کی رنگت گر اس کا شیوہ تو اس کا جلوہ
زباں شہر ہیں بیاں نمکیں کلام خنداں خرام مستاں
انیس خلوت جلیس جلوت حریف عشرت ظریف صحبت
بہ بزم یاراں بدل بہاراں با اہل عزلت گلے بداماں

ذوق (در مدح ابوظفر بہادر شاہ)
کرتا ہے ہلال ابروئے ہر خم سے اشارہ
ساقی کو کہ بھر بادہ سے کشتی طلائی
ہے عکس فگن جام بلوریں سے مئے سرخ
کس رنگ سے ہول ہاتھ مہ میکش کے خیالی

اے سرو چمن بر گل اندام — از عارض تو خجل مہ شام
باز آئی کہ ہجر جانگداز ت — بر واز دل من قرار آرام
از دانہ خال و دام زلفت — مرغ دل من فتادہ در دام

تشبیب کے بعد مدح شروع ہوتی ہے جس کو
"گریز" کہتے ہیں جس میں شعرا ممدوح کی تعریف و تحسین
کرتے ہیں اس کے اوصاف حسنہ بیان کرتے ہیں اور
اکثر تعریف میں ایسے محیر العقول پل باندھتے ہیں کہ
اس کو کہیں بشریت سے تعلق نہیں ہوتا ان اوصاف
سے کوئی متنفس موصوف نہیں ہو سکتا۔

مثلاً ظہیر فاریابی نے ایک قصیدہ مظفر الدین
قزل ارسلان کی مدح میں لکھا ہے اس میں ممدوح
کی تعریف میں جو مبالغہ اور ناممکن الوجوہ اشیاء
کا ذکر کیا گیا ہے ملاحظہ ہو ۔

نہ کرسئ فلک نہد اندیشہ زیر پائے
تا بوسہ بر رکاب قزل ارسلاں دہد

یعنی میرے ممدوح کا رتبہ اس قدر بلند و اعلیٰ ہے کہ
نو آسمان جیسی بلند کرسیاں اگر پیر کے نیچے رکھی
جائیں تو اس وقت شاید کوئی اس کے رکاب کو بوسہ
دے سکے۔

بیروں ز کائنات پر و صد ہزار سال
سیمرغ وہم تا ز جنابش نشان دہد

انوری نے ایک قصیدہ سلطان سلجوق کی مدح میں
لکھا ہے وہ اپنے ممدوح کو لاثانی تصور کرتا ہے۔
کائنات کی کوئی چیز اس کا مقابلہ نہیں کر سکتی۔ فرماتے ہیں

آسمانی نے کہ ثابت پائے نبود آسماں
آفتابی نے کہ زاید نور نبود آفتاب
سیر امرت چوں مسیر اختراں بے ارتداد
دور عزمت چوں قضائے آسماں بے انقلاب
پائے حلم تو ندارد خاک ہنگام درنگ
دست حکم تو ندارد باد ہنگام شتاب

ممدوح کے قہر و عتاب لطف و کرم کو بیان فرماتے ہیں۔

قہرت اندر جام زہرہ زہر گرد اند عقار
(۱) لطف اندر کام افعی نوش گرد اند لعاب

گر نشیند بائے باست در بنائے تبت
(۲) خوں شود در نافہ آہو بار دیگر مشک ناب

(۱) انوری اپنے ممدوح کے غیظ و غضب کو بیان کرتا ہے اور کہتا ہے کہ جب بادشاہ کا قہر و غضب ہوتا ہے تو اس وقت بہتر سے بہتر چیز بری ہو جاتی ہے یہاں تک کہ شراب باوجود خوبصورت پیالے میں ہونے کے زہر مہلک بن جاتی ہے اور جب اس کی طبیعت لطف و کرم عنایت و مراحم خسروانہ کی طرف راغب ہوتی ہے تو اس وقت برائی اچھائی میں مبدل ہو جاتی ہے۔ رطب یابس کا امتیاز باقی نہیں رہتا۔ سانپ کے منہ کا زہر بھی نوش دارو بن جاتا ہے۔

(۲) اگر میرے ممدوح کے باس (غصہ) کی ب تبت کی ب سے بدل جائے یعنی اگر تبت میں ممدوح کا غصہ پہونچے تو وہاں کے لوگوں کے علاوہ وحشت و گری سے ہرن کا نافہ دوبارہ خون ہو جائے۔ (تبت میں ہرن بکثرت ہوتے ہیں اور ان کے نافوں میں مشک بھرا رہتا ہے)

ذوق کے ایک قصیدہ کا گریز ملاحظہ ہو جس میں مبالغہ کی انتہا ہو گئی۔ ایسی چیزیں بیان کی گئی ہیں جو انسانی طاقت سے بالکل بعید تر ہیں صرف شاعرانہ تخیل کی داد دی جا سکتی ہے۔

تہنیت خواں ہے تو آج اُس شہ دریا دل کا
جس کے نزدیک ہے اک قطرہ سے کم قلزم و نیل

وہ نو چشمہ زدن میں یہ کامل ہو جائے
نظر مہر میں ہے اس کے وہ نور تکمیل

بالکس نقش پلٹ سے تیرے جو نگری ہو
جا کر فلک پہ اس کو تاروں سے زری ہو } درمدح اکبر شاہ ثانی

گریز و مدح کے بعد شاعر ممدوح کی دعا پر قصیدہ ختم کرتا ہے۔

قاآنی نے ایک قصیدہ حسین خان صاحب اختیار کی مدح میں لکھا ہے جس کے دعائیہ اشعار یہ ہیں۔

الا تا نسبت صد را اگر با چار صد سنجی
چناں چوں نسبت ده با چہل یک با چہار آید

حساب دولت افزوں از آں کز اندر حساب افتد
شمار مدت بیروں از آں کز در شمار آید

ذوق

ہو سیہ بخت تیری گر از رخ میمنت پر
زنار بخت اعدا سر رجع ہنقری ہے

جو ہوویں اس کے ہوا خواہ وہ رہیں سرسبز
ہوں اس کے دشمن بد کیش حا ئلاً نی النار

عام طور پر ہمارے شعراء نے یہ طریقہ اختیار کیا ہے کہ اختتام کے لئے کوئی سبیل تلاش کرتے ہیں مثلاً۔

سودا اب خموش کہ جائے ادب ہے یہ
اس نظم کو تو کر بدعائیہ اختتام } سودا

ختم کرتا ہوں اب دعا پہ کلام
شاعری سے مجھے نہیں سروکار } غالب

بعض شعراء دعائیہ اشعار کے ساتھ اپنے اغراض ذاتی بھی شامل کر دیتے ہیں اور چاہتے ہیں کہ دعا کے ساتھ ان کا کام بھی نکل جائے مثلاً امیر احمد صاحب فرماتے ہیں۔

نفس چند جو باقی ہوں مرے زلیت کے بھی
انھی قدموں کے تلے جائیں بڑے لطف سے کٹ

قصیدہ کی ابتدا اور انتہا یعنی تشبیب اور دعا، یہ دو چیزیں قصیدہ کی جان ہیں اور بڑی حد تک انھی دو کی اچھائی پر قصیدہ کی کامیابی اور فصاحت بنی ہے۔ ابتدا بہت اچھی ہونی چاہیئے۔ انگریزی میں ایک مقولہ ہے "well begun half done"

قصیدہ کی دعا یعنی آخری اشعار خاص طور پر عمدہ اور دلکش ہونے چاہئیں۔ کیونکہ وہی اشعار کانوں میں دیر تک گونجتے رہتے ہیں اگر قصیدہ کا خاتمہ اچھا ہوا تو قصیدہ اچھا ہے ورنہ بُرا۔ اعمال کا دارومدار جیسا کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا "اس کے خاتمہ ہی پر ہے" انگریزی میں مقولہ ہے۔

"all's well that ends well"

قصیدہ گوئی کو ہم تین دور میں منقسم کر سکتے ہیں۔

(۱) قدما، (۲) متوسطین (۳) متاخرین

قدما، کے دور کے حسب ذیل خصوصیات ہیں۔

(۱) تکلف، مبالغہ، اور آورد نہ تھی سادہ اور صاف خیالات کو معمولی الفاظ میں ادا کرتے تھے۔

آدم الشعرا استاد رودکی کے یہ اشعار ملاحظہ ہوں

بوئے جوئے مولیاں آید ہمی — یاد یار مہرباں آید ہمی
ریگ آموے و درشتیہائے او — پائے مارا پرنیاں آید ہمی
اے بخارا شاد باش و شاد زی — شاہ نزدت شادماں آید ہمی
شاہ ماہ است و بخارا آسماں — ماہ سوئے آسماں آید ہمی
شاہ سرو است و بخارا بوستاں — سرو سوئے بوستاں آید ہمی

بوئے جوئے مولیاں کس قدر سادہ الفاظ ہیں۔ شاعر نکہت، شمیم اور دیگر خوشبوؤں کا استعمال نہیں کرتا گل و گلزار سبزہ زار کا اعادہ نہیں کرتا بلکہ ریگ آموے سے تمام مطالب ادا کر دیتا ہے یعنی دریا اور اس کی ریت (آموے دریائے جیحون کا نام ہے)

دریائے جیحون کا ذکر کس قدر سادگی سے کیا گیا ہے جو بات واقعی تھی بیان کر دی گئی اس وقت اگر کوئی ہمارا شاعر ہوتا تو دریا اور اس کی موجوں اور سبزہ زار کی تعریف میں آسمان و زمین کے قلابے ملا دیتا۔ معلوم نہیں کیسی کیسی مفرد مرکب تشبیہیں اور حسن تعلیل، استعارہ استعمال ہوتے۔

(۲) قدما، کے کلام میں مترادف الفاظ اور انواع و اقسام کی لفظی صنعت گریاں بھی کثرت سے پائی جاتی ہیں۔ انوری نے اس طرز کو تبدیل کیا۔ ظہیر فاریابی نے مضمون آفرینی کا آغاز کیا۔ متوسطین اور متاخرین ان کے مقلد ہیں۔

تشبیب کے لئے یہ ضروری ہے کہ اس کے اشعار مدحیہ اشعار سے زیادہ نہ ہوں۔ چنانچہ ابن رشیق کا مقولہ ہے۔

"ومن عیوب ہذا الباب ان یکون النسیب کثیرا والمدح قلیلا"

(عمدہ جلد اول صفحہ ۱۵۵)

بعض شعرا طویل عاشقانہ اور رندانہ تشبیب لکھتے ہیں جو پسندیدہ نظروں سے نہیں دیکھی جاتی متاخرین میں حکیم جلال لکھنوی نے ایک قصیدہ کی تشبیب بہت طویل لکھی ہے مثال کے طور پر چند اشعار یہاں درج کئے جاتے ہیں

میں شب کو بند کیے دیدۂ تماشا بیں
بغور دیکھتا تھا سیر آسمان و زمیں
جہان کے تھے نشیب و فراز پیش نگاہ
فلک نشیں تھا کبھی اور گاہ خاک نشیں
کبھی تھا پیر مغان میکشوں کے جلسوں میں
کبھی تھا زاہدوں کی انجمن میں قبلۂ دیں
کبھی تھا ساقیٔ محفل کبھی تھا ساغر کش
کبھی سرور سے مملو کبھی خمار آگیں
کہیں ترنم عنبا گران گل رخسار
کہیں چمائی مہوش کا بادہ رنگیں
یکایک آگئی نیند اور بن کے پھرنے لگی
مری نگاہوں میں اک نازنین بانکیں
وہ نازنین کہ شرم و حجاب پر جس کے
ہزار دل سے فدا شاہدانِ پردہ نشیں

(۱) عربی اور فارسی کے مقابلہ میں اردو میں بہت کم قصائد لکھے گئے۔ عربی سے قصیدہ گوئی فارسی میں آئی اور فارسی سے اردو نے حاصل کیا۔ عربی قصیدہ گوئی کی مابہ الامتیاز خصوصیت یہ ہے کہ اس میں مبالغہ، تصنع، لفاظی قطعاً نہیں ہوتی ایک قصیدہ کا شعر ملاحظہ ہو۔

وَنُکرِمُ جَارَنَا مَادَامَ فِینَا
وَنُتبِعُہُ الکَرَامَۃَ حَیثُ کَانَا

"یعنی ہم اپنے پڑوسی کی جب تک وہ ہم میں رہتا ہے عزت و تکریم کرتے ہیں اور اس کے بعد بھی جہاں رہے اس کا احترام کرتے رہتے ہیں"۔ اس شعر میں کوئی غیر معمولی بات نہیں اور نہ کوئی مبالغہ ہے بلکہ ایک صحیح واقعہ کا اظہار ہے۔ برخلاف اس کے سودا ایک قصیدہ میں شاہی گھوڑے کی تعریف میں فرماتے ہیں ؎

روبرو سے اگر آئینہ کے اس گلگوں کو
پھینک دے چڑھ کے جو شوق سے نے غربیلک
اتنے عرصہ میں پھرا دے کہ اسے باور کر
عکس بھی آئینہ سے ہونے نہ پاوے منفک

مبالغہ اگر ایک حد تک کیا جائے تو درست ہے لیکن اس کے یہ معنی نہیں کہ ایک وصف کو بالکل ناممکن بنا دیا جائے۔

(۲) متاخرین شعرائے ایران نے قصیدہ کو ایک میدان تخیل تصور کر لیا تھا اور اس میں اپنی جولانیٔ طبع کا مظاہرہ کیا کرتے تھے۔ ہمارے شعراء نے بھی وہی روش اختیار کی اور اپنے سمند خیال کو بے لگام چھوڑ دیا۔ یہاں تک کہ وہ منزل تخیل کو طے کر کے تصورات و مفروضات کے بحر ناپیدا کنار کو بھی عبور کر گیا۔ یہاں ایک جائز و معقول سوال یہ پیدا ہو سکتا ہے کہ جب بحر ناپیدا کنار ہے تو وہ عبور کیونکر کیا گیا؟ اس کا جواب یہ ہے کہ شاعری میں اور خصوصاً قصائد میں ایسے ناممکن الوجود واقعات اکثر آیا کرتے ہیں اور اس کے لئے یہ کوئی نئی چیز نہیں ہے۔

حقیقتاً ممدوح کی مدح اس اسلوب سے ہونی چاہئے کہ اس کی ذات ان تمام خصوصیات کا مجسمہ بن کر ناظرین یا سامعین کے سامنے آجائے۔

(۳) مدح کے بعد ایک یا دو شعر دعائیہ ہونے چاہئیں اور اس میں کسی قسم کی خود غرضی کا لگاؤ نہیں ہونا چاہئے۔ اور نہ دعا میں غیر مربوط الفاظ ہی کی جائیں۔

(۴) ممدوح کی انہی اوصاف پر روشنی ڈالنی چاہئے جس کا کہ وہ واقعی حامل ہو اور وہ اوصاف اس سے مناسبت رکھتے ہوں۔ جیسے قاضی یا جج کے لیے بہترین مناسب الفاظ یہ ہو سکتے ہیں، عدل گستر ہے غریب اور امیر میں انصاف کے معاملہ میں کوئی امتیاز نہیں کرتا۔ حق دار کو اس کا حق دلواتا ہے۔ احکام تعزیری کے نفاذ میں کسی قسم کا پس و پیش نہیں کرتا وغیرہ۔

بادشاہ یا وزیر کے لئے یہ الفاظ مستعمل ہو سکتے ہیں۔

دانشمند، مدبر، سیاست داں، عالم و فاضل، روشن دماغ، رعایا پرور، عادل، رحم و کرم سے کام لیتا ہے، فیاض ہے۔

سپہ سالار یا کسی فوجی افسر کے لئے۔

شجاعت، ایثار، وفاداری، استقلال، صبر و تحمل جفاکش، محنتی۔ اگر کوئی شاعر اس فرق مراتب کا لحاظ نہیں رکھتا ہے تو اس کا قصیدہ مقبول و کامیاب نہیں ہو سکتا اور اس کی مدح بلاغت کے اصول سے غیر مستحسن و مسترد متصور کی جائے گی۔ مثلاً اگر شاعر کسی ادیب عالم کی مدح میں یہ لکھے کہ وہ بڑا شجیع یا ہمت بہادر ہے اور قاضی کی مدح حمیت اور تدبر، سپہ سالار کی مدح علمی قابلیت اور انشا پردازی سے کرے تو صحیح نہیں۔

اسی طرح مثنوی یا غزل اور صحیح جذبات و واقعات کا اظہار شاعر کرتا ہے۔ لیکن قصیدہ میں چونکہ آورد ہوتی ہے اس لئے شاعر کو الفاظ، واقعات محاورات، تلمیحات خود پیدا کرنے پڑتے ہیں جس کے لیے قادر الکلامی کی ضرورت ہے۔ ہر شاعر قصیدہ گو نہیں ہو سکتا اور اگر ہوتا بھی ہے تو اس کے کلام میں بہت سے متبذلات متروکات خامیاں پائے جاتے ہیں۔

قصائد کے معائب

(۱) سب سے پہلا نقص یہ ہے کہ قصائد بہت طویل ہوتے ہیں اور وہ طوالت بھی بالکل غیر ضروری ہوتی ہے خصوصاً بادشاہوں، امیروں کے دربار میں طویل قصائد بہت نامقبول ثابت ہوتے ہیں۔ کیونکہ نازک مزاج لوگ طوالت کو پسند نہیں کرتے۔ طویل قصیدہ سے بہت جلد گھبرا جاتے ہیں۔ جریر نے اپنے پوتے عمارہ کو نصیحت کی تھی۔

"فرزندمن! جب مدح کرو تو طول بیانی سے کام نہ لو کیونکہ اس طریقہ سے اشعار بھلا دیئے جاتے ہیں۔ اور ہجو کہو تو اس کے مخالف روش اختیار کرو"

(۲) قصائد میں پرخلوص جذبات کا اظہار نہیں ہوتا بلکہ اپنے ممدوح کو کسی نہ کسی طرح خوش کرنا ہوتا ہے۔ میں اس کو تسلیم کرتا ہوں کہ مذہب شاعری نے جھوٹ مبالغہ، بغض بے جا بہتان کو بالکلیہ جائز قرار دے رکھا ہے اور یہ شاعری کا جزلاینفک سمجھ لیا گیا ہے۔ اور جس میں یہ جواہر پارے نہ ہوں وہ شاعری کہلائے جانے کی مستحق نہیں ہوتی اور قصیدہ میں از بس ضروری سمجھی جاتی ہے چنانچہ خلفائے عباسیہ کے عہد سے آج تک یہ چیز برابر چلی آرہی ہے لیکن یہی ایک ایسا کیڑا ہے جو

اندر ہی اندر جسم شاعری کو زوال پذیر کر رہا ہے اور
اس میں گھن لگتا چلا جا رہا ہے۔ عرب شعراء تعلی، مبالغہ
جھوٹ سے بے حد احتراز کرتے تھے۔ زہیر بن ابی سلمیٰ
جو قادر الکلام شاعر گزرا ہے اس کا قول ہے کہ
"احسن القول ما صدقہ الفعل" یعنی سب سے
بہتر کلام وہ ہے جو صداقتِ افعال پر مبنی ہو۔ حضرت
عمر فاروقؓ زہیر کے متعلق فرماتے ہیں "انہ اشعر
الشعراء لا یمدح الا مستحقاً" یعنی وہ افضل ترین شعراء
میں سے ہے کیونکہ وہ اسی کی مدح کرتا ہے جو مستحق مدح ہو۔
(۲) ایسے اوصاف بیان کیے جاتے ہیں جن کا
اطلاق صرف ممدوح ہی پر نہیں بلکہ ان کے خاندان کے
کسی فرد پر نہیں ہوتا۔
(۴) کسی وصف کی تعریف اس قدر کی جاتی ہے کہ
اس وصف کو بالکل ناممکن بنا دیا جاتا ہے۔
(۵) تشبیب میں خود ممدوح کو معشوق بنا دیا جاتا
ہے جیسے سید انشاء فرماتے ہیں ؎

حاضر ہوا ہوں یوسفِ کنعاں کے سامنے
یا آگیا ہوں میں مہِ تاباں کے سامنے
یاد آوے تیری چشم کی شوخی تو پھر وہیں
ساقی کرے مراقبہ زنجاں کے سامنے
قمری کی طرح طوقِ غلامی پہن ہی لے
گو آوے تجھ سے سرو خراماں کے سامنے

(۶) قصائد میں مغلق اور ثقیل سے ثقیل الفاظ
استعمال کیے جاتے ہیں۔ جس کی وجہ سے قصیدہ مشکل اور
ادق الفاظ و اصطلاحات کا مجموعہ بن جاتا ہے۔
مثال کے طور پر صرف ایک شعر لکھا جاتا ہے
زیادہ لکھنا طوالت کا باعث ہوگا۔

دوش گردوں پہ ہو نہ فرغل سنجاب غمام
سبزہ تا خاک پہ ہو پیرہن استبراق

(۷) قصیدہ میں دعائیہ اشعار سے پہلے شاعر
لکھتا ہے کہ اب میں دعا دیتا ہوں حالانکہ دعائیہ شعر
خود صاف معلوم ہوتا ہے۔ حضرت سید طباطبائی اس طریقہ
کو پسند نہیں کرتے چنانچہ مولانا طباطبائی مرحوم نے غالب
کے اس شعر پر اعتراض کیا ہے ؎

ختم کرتا ہوں اب دعا پہ کلام
شاعری سے مجھے نہیں سروکار

ایک عمدہ فصیح و بلیغ قصیدہ کا معیار کیا ہونا چاہیے؟

(۱) قصیدے کے الفاظ متین، سنجیدہ، پُرمعنی، موزوں
جزیل اور شاندار ہونے چاہئیں۔ الفاظ میں کسی قسم کا
تصنع، غلو، مبالغہ نہیں ہونا چاہیے۔
غالب کا ایک قصیدہ ان تمام خصوصیات کا
حامل ہے۔ چند اشعار مثال کے طور پر درج ذیل ہیں:

قبلۂ چشم و دل بہادر شاہ — مظہر ذو الجلال والاکرام
شہسوار طریقۂ انصاف — نوبہار حدیقۂ اسلام
جس کا ہر فعل صورت اعجاز — جس کا ہر قول معنی الہام
بزم میں میزبان قیصر و جم — رزم میں اوستاد رستم و سام
اے ترا لطف زندگی افزا — اے ترا عہد فرخی فرجام

قصیدہ گوئی بہ نسبت دیگر اصناف سخن بہت مشکل
چیز ہے۔ کیونکہ اس کا تعلق آورد سے ہے اور دوسری
شاعری مثلاً مثنوی، غزل، مرثیہ، ہجو وغیرہ آمد سے ہوتی
ہے۔ اگر شاعر کسی غم کے منظر سے متاثر ہو [illegible]

طبیعت میں جذباتِ رنج والم برانگیختہ ہوئے اُس وقت
اس آمد کو اس نے قلمبند کر دیا انہی کو اب ہم مراثی کے
نام سے یاد کرتے ہیں۔ شاعر جس قدر کسی واقعۂ سانحہ
سے زیادہ متاثر و مغموم ہوگا اسی قدر عمدہ مرثیہ
لکھ سکے گا۔ اس کا بیّن ثبوت اس واقعہ سے ملتا ہے کہ
حضرت عمر فاروقؓ کے زمانے میں متمم بن نویرة بہت زبردست
مرثیہ گو شاعر تھا۔ اس کو اپنے بھائی سے بہت زیادہ
محبت تھی۔ اتفاق سے وہ ایک لڑائی میں خالد بن ولید
کے ہاتھوں مارا گیا۔ متمم بن نویرہ پر کوہ رنج والم ٹوٹ
پڑا اس سانحۂ عظیم سے بہت زیادہ متاثر ہوا اور اس نے
ایک مرثیہ اپنے مرحوم بھائی پر لکھا۔ حضرت عمرؓ نے بھی
اس مرثیہ کو مسموع فرمایا اور آپ بھی اس کے جاں گداز
اشعار سے بہت متاثر ہوئے اور اس کے بعد آپ نے
اس سے فرمایا کہ "میرے بھائی زید کا مرثیہ لکھو"
اس نے حسب الحکم مرثیہ لکھا لیکن وہ اس قدر
پُر اثر اور دردناک نہیں تھا۔ حضرت نے فرمایا "کہ اس میں
وہ سوز و گداز وہ الم و یاس نہیں ہے" اس نے یہ عرض
کیا "امیر المومنین، زید آپ کے بھائی تھے میرے بھائی
نہ تھے" (از موازنہ انیس و دبیر)

فخریہ:

فخریہ نوعیت کے لحاظ سے قصیدہ کا مترادف
ہے صرف ان دونوں میں قابلِ امتیاز چیز یہ ہے کہ قصیدے
میں شاعر کا ممدوح کوئی دوسرا شخص ہوتا ہے۔
اور فخریہ میں وہ خود اپنی تعریف کرتا ہے اپنے محاسن
اور اپنے آباؤ اجداد کے اوصاف کا اعادہ کرتا ہے۔
اپنی قوم کی ستائش کرتا ہے۔

فخریہ اردو فارسی شاعری میں بہت کم ہیں البتہ
عربی شاعری میں زیادہ پائے جاتے ہیں اس کی
وجہ یہ ہے کہ فخریہ شاعری کی ابتدا مقابلہ کی شکل
سے ہوئی۔ جہاں دوسرے قبائل یا دشمنوں سے
مقابلہ ہوتا ہے وہاں اس صنعتِ شاعری کی ضرورت
ہوتی ہے تاکہ غنیم کے سامنے اپنی اور اپنے خاندان
اپنی قوم کی تعریف کر کے اس پر رعب قائم کیا جائے
اور خود میں شجاعت، بہادری پیدا کی جائے مثلاً
عربی کا شاعر متنبّی کہتا ہے ؎

إنا وإن أحسابنا كرمت   لسنا على الأحساب نتكل
نبني كما كانت أوائلنا   تبني ونفعل مثل ما فعلوا

یعنی اگرچہ ہمارا نسب نہایت معزز ہے لیکن ہم
صرف بزرگوں کی شرافت پر قانع نہیں بلکہ ہم خود بھی
وہی کام انجام دیتے ہیں جو ہمارے آباؤ اجداد انجام دیا
کرتے تھے۔

غالب کا یہ شعر فخریہ ہے ؎

یا رب زمانہ مجھ کو مٹاتا ہے کس لیے
لوحِ جہاں پہ حرفِ مکرر نہیں ہوں میں

عربی شاعر بشار کا یہ شعر افتخار کا بہترین نمونہ ہے۔ ؎

إذا ما غضبنا غضبة مضرية
هتكنا حجاب الشمس أو أمطرت دما

یعنی جب ہم کو مضری غصہ آتا ہے تو سورج کا پردہ
چاک کر دیتے ہیں۔ یہاں تک کہ وہ خون برسانے لگتا ہے۔
اردو میں میر انیس کا یہ شعر جواب ہو سکتا ہے۔

طاقت اگر دکھاؤں رسالت مآب کی
رکھ دوں زمیں پہ چیر کے ڈھال آفتاب کی

سیّد انشاء فرماتے ہیں ؎

کیا چیز دیو مرد سخنداں کے سامنے
پر جلتے ہیں فرشتوں کے انساں کے سامنے

صدمہ ہی پہونچے رعد کی گردن پہ ایک بار
آوے کبھی جو نعرۂ مرداں کے سامنے

کیا چیز بھلا قصر فریدوں مرے آگے
کانپے ہے پڑا گنبد گردوں مرے آگے

میر انیس اپنی شاعری پر فخر کرتے ہیں ؎

جب تک یہ چمک مہر کی پرتو سے نہ جائے
اقلیم سخن میرے قلمرو سے نہ جائے

تعریف یہ چشمہ کو سمندر سے ملا دوں
قطرہ کو جو دوں آب تو گوہر سے ملا دوں

ریختہ رتبے کو پہونچایا ہوا اس کا ہے
معتقد کون نہیں میر کی استادی کا

داغ ؎ نہیں کھیل اے داغ یاروں سے کہہ دو
کہ آتی ہے اردو زباں آتے آتے

میر ؎ سارے عالم پر ہوں میں چھایا ہوا
مستند ہے میرا فرمایا ہوا

[illegible] شوق سخن کا مرے ہرگز
تا حشر جہاں میں مرا دیوان رہے گا

[illegible] آنکھیں
تب کوئی ہم سا [illegible]

سید [illegible]

محبوں سے خطاب

(یہ نظم اورنگ آباد کے ایک وداعی جلسہ میں سنائی گئی تھی)

محبوں کا وہ فیض صحبت کہاں ہے
وہ بے غرض و بے لوث [illegible] کہاں ہے

مرے بھائی بہنوں کے جیسے مربی
مرے دوستوں کی محبت کہاں ہے

کہاں ہے وہ خدمات قوم و وطن کی
وہ جوش [illegible] کہاں ہے

مری دستگیری مری رہنمائی
مرا ساتھ دیتی وہ طاقت کہاں ہے

دیں انجام خدمات کس کے بھروسے
بتا مجھ کو اب میری ہمت کہاں ہے

الٰہی یہ نقشے کو بدلا ہے جس نے
اسے سوچنے کی یہ فرصت کہاں ہے

مرا دل ہے یا ہے وہ تصویر خانہ
محبوں کی معکوس صورت جہاں ہے

رہیں شاد آباد احباب میرے
خدا [illegible] عالم کی برکت جہاں ہے

مسز ڈی برکت [illegible]

اشتراکیت کی حدیں

(برنارڈ شا سے آزاد ترجمہ)

کیا آپ کو کبھی خیال بھی آیا تھا کہ اشتراکیت جس کو اخبار والے اس کے خونخوار انقلابیوں کی ایجاد کہتے ہیں وہ در اصل باہمی امداد کے ایک شائستہ طریقہ کا نام ہے۔ اشتراکیت جتنی زیادہ ہوگی اتنا ہی تہذیب و تمدن میں ترقی ہوگی۔ اشتراکیت نہ ہو تو اپنی سڑک آپ بناؤ، رات کو قندیل ہاتھ میں لے کر نکلو۔ گھر کا کچرا اٹھا کر بستی کے باہر جاکر خود پھینک کر آؤ۔ ندیوں پر پل بناؤ۔ لوگ بلدیہ کا ٹکس دینے کو جز بز ہوتے ہیں وہ یہ نہیں سمجھتے کہ اس حقیر رقم سے وہ جتنا فائدہ اٹھاتے ہیں اتنا اپنی پوری آمدنی سے نہیں اٹھاتے۔ اگر وہ غور کرتے تو اس کی تمنا کرتے کہ کاش ان کی پوری آمدنی ان سے لے لی جائے اور ہر چیز اسی طرح اشتراکیت کے اصول پر مفت ملے۔

لیکن یہ قابلِ عمل نہیں کہ ضرورت کی ہر چیز اشتراکیت کے اصول کے تحت تقسیم کی جائے۔ سڑک اشتراکیت سے اس لئے بنائی جاتی ہے کہ ہر شخص اس سے فائدہ اٹھاتا ہے۔ اس طرح یہ ایک قاعدہ کلیہ سمجھ لو کہ جو چیز ہر شخص کے کام میں آئے وہ مشترک بنائی جا سکتی ہے۔ مثلاً کیوں نہ روٹی اور دودھ مشترک کر دیا جائے۔ کیا اچھا ہو کہ دنیا میں کوئی بھوکا نہ رہے۔ ریل کو مشترک کر دیا جا سکتا ہے۔ اسی طرح بہت سی چیزیں ہیں۔ لیکن ان چیزوں پر آکر رک جانا پڑتا ہے جو سب کے فائدے کی ہیں۔ دودھ کو مشترک بناؤ لیکن شراب کے متعلق کیا ہو۔ شراب کو مشترک بنانے کے معنی یہ ہوں گے کہ ٹکس اس سے بھی وصول کیا جائے جو شراب نہیں پیتا اور شرابی کو جی بھر کر پینے دیا جائے۔ جو شراب نہیں پیتا اس کو دہرا اعتراض ہوگا ایک یہ کہ اس سے ایسی چیز کے واسطے چندہ لیا جا رہا ہے جو اس کے استعمال میں نہیں آئے گی دوسرے یہ کہ شراب اس کی رائے میں بدمستی، بیماری، اور جرائم پیدا کرے گی اس لئے اگر اس کے لئے چندہ دینے کا قانون بن بھی جائے تو وہ اس کی خلاف ورزی کر کے جیل جانا پسند کرے گا۔ غرض کہ جہاں تک خیالات اور ضروریات کا اتحاد وہاں تک اشتراکیت۔ جہاں اختلاف ہو وہاں اشتراکیت ممکن نہیں۔ اگر ہر چیز کے لئے اشتراکیت ممکن ہوتی تو دنیا میں روپیہ کا وجود غیر ضروری ہوتا لیکن چونکہ ایسا نہیں اس لئے کم از کم غیر مشترک ضروریات کے لئے ہر شخص کو روپے کی ضرورت ہے۔ اس لئے پھر وہی سوال پیدا ہوتا ہے کہ ہر شخص کو کتنا دیا جائے۔ اشتراکیت اس کو صرف ایک حد تک حل کرتی ہے۔ پورے طور پر حل کرنے کے لئے کوئی اور تدبیر سوچنا ضروری ہے۔

سات حل جو تجویز کئے جاتے ہیں

ایک حل یہ پیش کیا جاتا ہے کہ ہر شخص کو ملک کی دولت میں سے اتنا حصہ دیا جائے جتنا وہ پیدا کرتا ہے۔ بعض لوگ یہ کہتے ہیں کہ ہر شخص کو اتنا دو جتنے کا وہ مستحق ہو۔ بعض اس کی تائید میں ہیں کہ "جس کی لاٹھی اس کی بھینس" جس میں جتنی طاقت ہو اتنی دولت اس کو مل جائے۔ بعض کہتے ہیں کہ عوام یعنی غریب غربا کو اتنا مل جانا چاہیے جس سے وہ زندہ رہ سکیں اور باقی خواص یعنی امرا کا حصہ ہے۔ بعض کہتے ہیں کہ آبادی کو چند طبقوں میں تقسیم کرنا چاہیے

اور ہر طبقے کے اندر دولت کی تقسیم مساوی ہو البتہ مختلف
طبقوں کا حصہ مساوی نہ ہو بعض یہ کہتے ہیں کہ جس طرح
چل رہا ہے اسی طرح چلنے دو۔ اور سوشلسٹ یہ کہتے ہیں کہ
ہر شخص کو مساوی حصہ دیا جائے خواہ وہ کسی پیشہ کا ہو۔
اگر ان میں سے کوئی طریقہ یا سب طریقے تم کو ناپسند
ہوں اور ناگوار گزریں تو مصنف کا کوئی قصور نہیں وہ تو
صرف یہ بتا رہا ہے کہ کتنے مختلف طریقے تجویز کئے گئے ہیں
اگر تم ان کے علاوہ کوئی طریقہ تجویز کرتے ہو تو تم کو اختیار
ہے لیکن اس مسئلے سے یہ کہہ کر انجان نہ ہو جاؤ کہ "اونھ ہم کو
کیا پڑی ہے۔ شہر کے اندیشے سے ہم کیوں دبلے ہوں" یہ سوال
خود تمھاری غذا، تمھارے رہنے سہنے اور تمھاری زندگی
کا ہے۔ اگر تم اپنی کوئی رائے نہ رکھو گے تو دوسرے لوگ
اس سوال کو طے کریں گے اور یاد رکھو کہ وہ اپنے حصے کا
خوب تحفظ کریں گے اور ممکن ہے کہ تمھارا حصہ سرے سے
غائب ہی کر دیں۔ اگر تم یہ سمجھتے ہو کہ تم کو اس وقت جو
حصہ مل رہا ہے وہ پہاڑ کی طرح اٹل ہے تو یہ تمھاری
غلطی ہے۔ دنیا بہت تیزی سے بدل رہی ہے۔

ہر ایک کو اس کا پیدا کیا ہوا

دیکھنے میں یہ بہت منصفانہ طریقہ ہے کہ ہر ایک کو
اتنی دولت دی جائے جتنی وہ اپنی محنت سے پیدا کرے لیکن
جب اس پر عمل کرنے بیٹھیں تو معلوم ہوگا کہ یہ ناممکن ہے۔
کیونکہ اشیا کے پیدا کرنے میں بہت سے لوگوں کا ہاتھ رہتا ہے
اور یہ قرار دینا ناممکن ہے کہ کس شخص نے کتنا پیدا کیا ہے۔
اور اکثر لوگوں سے تو کچھ پیدا کرنے کا کام لیا ہی نہیں جاتا بلکہ
وہ کسی قسم کا انتظامی کام کرتے ہیں
جب ایک کسان اور اس کے مزدور مل کر ایک کھیت بوتے
اور کاٹتے ہیں تو یہ کہنا مشکل ہے کہ ہر ایک نے کتنا غلہ پیدا کیا
ہے۔ ایک کارخانہ لاکھوں سوئیاں بناتا ہے۔ یہ کہنا مشکل ہے کہ
مشین کے موجد نے کتنی سوئیاں بنائیں، فورمین نے کتنی،
مزدوروں نے کتنی اور دوسرے عملے نے کتنی۔ اگر ایک شخص
ایک غیر آباد جزیرہ میں اکیلا جاکر آباد ہو جائے تو بے شک وہ
کسی چیز کو بنا کر خالص اپنی پیداوار کہہ سکتا ہے بشرطیکہ وہ
اپنے ساتھ کسی قسم کے اوزار نہ لے گیا ہو۔ مگر موجودہ متمدن
دنیا میں تو کوئی شخص ایک چھوٹی سے چھوٹی چیز پر ہاتھ رکھ کر
یہ نہیں کہہ سکتا کہ یہ خالص میری پیداوار ہے۔ مثلاً ایک کرسی
کہ اس کے بنانے میں لکڑہاروں کا ہاتھ ہے جنھوں نے
جنگل سے لکڑی کاٹی ان مزدوروں کا ہاتھ ہے جنھوں نے
اس کو بستی تک پہونچایا۔ آرہ کشوں کا ہاتھ ہے۔ بڑھائی کا
ہاتھ ہے۔

غرض کہ ہر شخص کو اس کی پیداوار تقسیم کرنا عملاً ناممکن
ہے۔ یہ البتہ کیا جا سکتا ہے کہ ہر شخص کو اس لحاظ سے دولت
تقسیم کی جائے کہ اس نے کام میں کتنا وقت صرف کیا ہے لیکن
یہ بھی اتنا آسان نہیں جتنا نظر آتا ہے۔ بعض کاموں کے لئے
تعلیم، ٹریننگ اور تجربہ کی ضرورت ہوتی ہے۔ مثلاً ڈاکٹری کا
فن ہے کہ چونکہ اس کی تحصیل میں ایک طویل زمانہ بغیر اجرت
کے بلکہ اپنی گرہ سے خرچ کر کے گزرتا ہے اس لئے ڈاکٹر یہ
مطالبہ کر سکتے ہیں کہ ان کا وقت زیادہ قیمتی ہے۔ یہ مطالبہ
واجبی ہے لیکن اس کی قیمت ٹھیک ٹھیک کیا ہو اس کا مقرر
کرنا مشکل ہے۔

اسی طرح ہوشیار کاریگر کی مزدوری معمولی کاریگروں سے زیادہ ہونی چاہیے۔ لیکن کس قدر زیادہ اس کا یقین مشکل ہے۔

بہت سے پیشہ ور ایسے ہیں جو بظاہر کچھ پیدا نہیں کرتے مثلاً علماء، سرکاری ملازم، ڈاکٹر، خانگی ملازم، ایکٹر، بادشاہ، اور ملکہ غرض کہ ہر ایک کا، اس کی پیدا کی ہوئی دولت دینے کی تدبیر پر عمل ممکن نہیں۔

ہر ایک کو اتنا جس کا وہ مستحق ہے

دوسری تدبیر یہ ہے کہ ہر ایک کو اتنا دیا جائے جتنے کا وہ مستحق ہے۔ بہت سے لوگ خصوصاً جو خوش حال ہیں سمجھتے ہیں کہ دنیا میں ایسا ہی ہوتا ہے۔ ان کی دلیل یہ ہے کہ محنتی اور معتدل عادتوں کے اور کفایت شعار لوگ بہت کم مالی مشکلات میں مبتلا ہوتے ہیں اور افلاس زیادہ کاہلی، نشہ بازی، جوئے بازی اور فضول خرچی کی وجہ سے آتا ہے۔ لیکن غور کر کے دیکھو تو اس سے صرف یہ ثابت ہوتا ہے کہ تم اپنی "روٹی کھاؤ بھی اور بچاؤ بھی" یہ نہیں ہو سکتا۔ یہ ثابت نہیں ہوتا کہ تم کو روٹی کا جو حصہ ملا تھا وہ صحیح تھا۔ اس سے صرف یہ ثابت ہوتا ہے کہ بعض بری عادتوں کی وجہ سے انسان مفلس ہو جاتا ہے۔ لیکن لوگ یہ بھول جاتے ہیں کہ بعض بری عادتوں کی وجہ سے انسان مالدار بھی ہو جاتا ہے۔ بلکہ واقعہ تو یہ ہے کہ انسان کی عادتیں بننے سے بہت پہلے اس پر مفلسی یا دولتمندی مسلط ہو جاتی ہے اور یہ اس کے ماں باپ کی وجہ سے ہوتی ہے۔

اس کے جواب میں کوئی یہ کہہ سکتا ہے کہ اگر دولت اچھے اوصاف کے لحاظ سے تقسیم نہیں ہوتی تو اس کو ہونا چاہیے اور ہم کو اپنا قانون ایسا بنانا چاہیے کہ اچھے آدمیوں کو زیادہ دولت ملے اور بروں کو کم۔ اس میں کئی مشکلیں ہیں اور پہلی ہی مشکل ایسی ہے کہ اس کو ناممکن بنا دیتی ہے۔ وہ یہ کہ اچھے اوصاف کو کس طرح ناپا اور تولا جائے۔ مثلاً گاؤں کے پیش امام اور لوہار کو لو اور بتاؤ کہ ان کو کتنا کتنا ملنا چاہیے۔ پیش امام کو لوہار کے برابر یا اس سے دگنا یا آدھا یا کتنا۔ پیش امام عربی پڑھ سکتا ہے اور لوہار عربی نہیں پڑھ سکتا۔ لیکن لوہار نعل بنا سکتا ہے پیش امام نعل نہیں بنا سکتا۔ اب تصفیہ کرو کہ کتنی عربی ایک نعل کے برابر ہے۔ غرض کہ یہ مضحکہ خیز ہے۔

جتنا جس کے ہاتھ لگ جائے

تیسری تدبیر یہ ہے کہ جتنا جس کے ہاتھ لگ جائے

اگر اس پر عمل ہو تو دنیا سے امن اور اطمینان رخصت ہو جائے گا۔ اگر ہر شخص مساوی جسمانی طاقت رکھتا تو مضائقہ نہ تھا لیکن دنیا میں بچے بوڑھے عورتیں بیمار اور کمزور موجود ہیں۔ اور تندرست جوان مرد بھی طاقت میں برابر نہیں ہوتے تو اس سے دنیا بہت جلد عاجز آ جائے گی۔ چور اور لٹیرے اور ڈاکو بھی اپنی چوری اور لوٹ کی کمائی کو صلح اور صفائی سے تقسیم کرنا پسند کرتے ہیں نہ یہ کہ چوری اور لوٹ کے بعد پھر آپس میں بھی لوٹ مار ہوتی ہے۔ سو ہم لوگوں میں اگرچہ کہ چوری اور لوٹ منع ہیں لیکن تجارت کو ہم بڑی حد تک اسی اصول پر چلا رہے ہیں کہ ہر شخص صرف اپنا فائدہ دیکھے اور دوسروں کا خیال کئے بغیر جتنا پیسہ گھسیٹ سکتا ہے گھسیٹے۔ اس کے نتائج اتنے برے ہوتے ہیں کہ اس کی روک تھام کے لئے

سلسل قوانین بننے لگے ہیں۔

خوش باش طبقہ

چوتھی صورت یہ ہے کہ دس یا سو میں سے ایک کو بغیر کام کیے مال دار بنا دیا جائے اور باقی نو یا ننانوے دن بھر کام کریں اور خود صرف اتنا لیں کہ زندہ رہ سکیں اور بچے پیدا کر سکیں تاکہ ان کے بعد ان کی نسل کے ذریعے یہ غلامی کا سلسلہ جاری رہے۔ اس زمانہ میں کم و بیش یہی ہوتا ہے۔ کل آبادی کا دس فیصدی وہ آدمی ہیں جو نوے فیصدی جائداد پر قابض ہیں۔ اور باقی نوے فیصدی گویا بغیر کسی جائداد کے ہیں اور صرف اپنی روزانہ مزدوری پر بہ مشکل جیتے ہیں۔ اس صورت کے فائدے یہ بتائے جاتے ہیں کہ اس طرح ہم کو امرا و شرفا کا ایک طبقہ ہاتھ آتا ہے یعنی ایسا طبقہ جو اعلیٰ اور گراں تعلیم حاصل کر سکے۔ ملک پر حکومت کرنے کے قابل ہو۔ علمی علوم یعنی سائنس، فنون لطیفہ، علم ادب، فلسفہ، دینیات کو زندہ رکھ سکے۔ غرض کہ اس تمدن کو قائم رکھے جو شہروں کو دیہات سے ممتاز کرتا ہے۔ اس سے زیادہ زور اس بات پر دیا جاتا ہے کہ ان کو ضرورت سے زیادہ پیسہ دینے سے وہ اس قابل ہوتے ہیں کہ سرمایہ جمع کریں اور بڑی بڑی صنعتوں کو رواج دیں۔

یہ "چند امیر اور بہت سے غریب" ایک پرانا نظام ہے اور اب تک رائج ہے اور یہ ظاہر ہے کہ اگر امیروں کی دولت چھین کر سب غریبوں پر تقسیم کی جائے تو ان کا افلاس کچھ بہت کم نہیں ہوگا۔ اور تمدن کی جتنی باتیں ہیں فنا ہو جائیں گی۔ یہی وجہ ہے کہ بہت لوگ غریب ہو کر بھی دانستہ یا نادانستہ طور پر اس نظام کو قائم رکھے ہوئے ہیں۔

یہ تو اس نظام کے فائدے ہوئے۔ لیکن اس کے نقصانات اتنے ہیں کہ اب دنیا اس سے بیزار ہو رہی ہے۔ اگر اس کو جاری رکھنے کا تصفیہ ہو تو پہلا سوال یہ ہے کہ وہ دس میں ایک کون سا خوش نصیب منتخب ہو جو دوسروں کی محنت سے مال دار ہو کر صرف حکومت کرے۔ یہ ہو سکتا ہے کہ قرعہ اندازی کی جائے اور ہر دس میں سے ایک ایسا شخص انتخاب کیا جائے اور یہ منتخب طبقہ آپس میں شادی بیاہ کر کے اپنے طبقہ کو قائم رکھے۔ لیکن اس کی کیا ضمانت ہے کہ یہ لوگ اپنے وہ فرائض انجام دیں گے جس کے لیے ان کو مال دار بنایا جا رہا ہے۔ یہ امرا کا طبقہ اگر نیک نیت ہو تو بھی عام لوگوں سے دور دور رہنے کی وجہ سے ان کی ضروریات کو سمجھنے سے قاصر رہے۔ یہ لوگ اپنے اقتدار کے ذریعے غریبوں کو اور غریب بناتے ہیں۔ علوم اور فنون پر کم روپیہ صرف کرتے ہیں اور کھیل تماشوں اور کھانے پینے میں زیادہ۔ یہ غریب لوگوں کو بجائے پیدائش دولت کے کاموں میں لگانے کے ان کو اپنی ٹہل سیوا میں لگاتے ہیں جس سے دولت کی پیدائش گھٹتی ہے اور غریبی اور بڑھتی ہے۔ نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ اقتدار امرا کے طبقہ سے چھین کر سول سروس، مجالس مقننہ، مجالس بلدیہ وغیرہ کو دے دیا جاتا ہے۔ اور جب یہ صورت ہے تو پھر امرا کے طبقہ کی ضرورت کیا رہی۔ اب وہ نرے مفت خورے ہو گئے۔ یہی وجہ ہے کہ عام لوگ اور حکومت دونوں اس طبقے کے خلاف ہیں۔ اور نسلاً بعد نسل ان کا اقتدار اور تمول توڑا جا رہا ہے۔

اور چند دنوں میں یہ بالکل آثار قدیمہ ہی رہ جائیں گے تاہم اپنی جاگیروں میں تو خیر ان کا اقتدار باقی ہے لیکن شہروں میں ان کو کوئی پوچھتا تک نہیں ۔ اس لئے موجودہ تمدن میں جو ریلوں، موٹروں، تار، ٹیلیفون، ریڈیو کا تمدن ہے ان لوگوں کی کوئی جگہ باقی نہیں رہی۔

البتہ ابھی ایک دلیل پر غور کرنا باقی ہے جس کو معاشی طبقہ سب میں بڑی دلیل سمجھتا ہے جو یہ ہے کہ اس طبقہ کی فاضل دولت کی وجہ سے سرمایہ فراہم ہوتا ہے جس کی وجہ بڑی بڑی صنعتیں فروغ پاتی ہیں ۔ اگر دولت سب پر تقسیم کر دی جائے تو ہر ایک کے پاس اس کی ضرورت کو کافی ہو کر اتنا تھوڑا بچے گا کہ وہ بھی خرچ ہو جائے گا اور ریلوں مشینوں اور کارخانوں کے قیام کی کوئی صورت نہ ہو گی۔

اس میں شک نہیں کہ تمدن کی بقا کے لئے پس انداز روپیہ کی ضرورت ہے لیکن اس طریقے سے زیادہ بے کفایت طریقہ شاید ہی ہو سکتا ہے ۔ کسی قوم کو یہ لازم نہیں کہ کافی خرچ کرنے سے پہلے پس انداز کرے۔ خرچ کرنا مقدم ہے ۔ جو قوم اپنے بچوں کو دودھ سے محروم کر کے ریل تیار کرتی ہے وہ بے وقوف ہے ۔ اور پھر اس کی بھی کیا ضمانت ہے کہ یہ مال دار طبقہ اپنی پس انداز کو صنعتوں کی ترقی میں صرف کرے گا ۔ ان کا تو یہ حال ہے کہ وہ جب تک خرچ کرتے کرتے تھک نہ جائیں اس وقت تک کچھ نہیں بچاتے ۔ اور اگر بچائیں اور صنعتوں میں روپیہ لگائیں تو کیا ضروری ہے کہ ملک کے اندر ہی لگائیں ۔ انگلستان کا سرمایہ جنوبی امریکہ، افریقہ اور چین میں لگ رہا ہے اور انگلستان میں آنا سرمایہ نہیں کہ آبادی کے غلیظ محلے از سر نو تعمیر کئے جائیں ۔ انگلستان کے سرمایہ دار کہتے ہیں کہ باہر سرمایہ لگانے سے زیادہ منافع ملتا ہے اور اس منافع کو ملک میں خرچ کرنے سے زیادہ لوگوں کے لئے روزگار فراہم ہوتا ہے ۔ لیکن یہ منافع سارا کا سارا انگلستان میں صرف ہوتا ہے ۔ زیادہ تر اس کا رو اور مصر وغیرہ کی نذر ہوتا ہے ۔ اور انگلستان میں صرف ہوتا بھی ہے کن کاموں میں اور کیا روزگار فراہم کرتا ہے ۔ ہمارے ہاں بہترین مزرعے ہیں ۔ بہترین گالف کے میدان ہیں ۔ بہترین کرنیاں ہیں ۔ بہترین ہوٹل ہیں ۔ ان میں کام کرنے والے ویسے ہی نکمے یعنی پیدائش دولت کے ناقابل ہوتے ہیں جیسے ان کے آقا ۔ اب فرض کر کہ باہر کے کسی ملک میں جس میں ہمارا روپیہ پھنسا ہوا ہے سیاسی انقلاب واقع ہوا اور وہ ہمارے سرمایہ کو تسلیم کرنے سے انکار کر دے یا ہمارے منافع پر بھاری ٹکس قایم کر دے تو ہمارا کیا حشر ہو گا ۔ انگریز نوکر جوتے کو بہترین پالش کرنا جانتا ہو لیکن جب لکھپتی کا دیوالہ نکل جائے اور اس کے پاس پالش کرانے کو جوتا نہ ہو تو یہ نوکر کس مصرف کا ۔ غرض کہ یہ صورت بھی بے کار ہے ۔

ضیاءالدین انصاری

نذرِ دکن (باتصویر)

دکن کے متعلق خواتین دکن کے رشحاتِ قلم کو محترمہ سکینہ بیگم صاحبہ نے خاص ذوق اور سلیقہ سے مرتب کیا ہے۔

یہ مجموعہ ایک ایسا بیش بہا تحفہ ہے جس کے مطالعہ سے عورتیں اور مرد دونوں مستفید ہو سکتے اور سرزمین دکن کے متعلق ضروری معلومات حاصل کر سکتے ہیں ۔ اس میں صنف نازک کے مذاق کی نفیس تصویریں بھی ہیں صفحات (۱۴۴) قیمت مجلد ۱۲

کچھ گولکنڈے کے نئے قلعہ سے متعلق

(یہ مضمون ایک ایسے بزرگ کا لکھا ہوا ہے جو گولکنڈہ ہی میں پیدا ہوئے وہیں رہتے ہیں اور وہاں کے چپے چپے سے واقف ہیں۔ قلعہ اور شہر حیدرآباد کے اکثر احباب اور خاص کر بھوت پلیت عملیات اور تعویذوں پر اعتقاد رکھنے والی عورتوں میں "قلعہ کے مرشد" کے لقب سے مشہور ہیں۔ (سب رس)

جہاں گولکنڈے کے دیگر قابلِ ذکر مقامات ہیں۔ وہاں اس حصہ کو بھی اہمیت حاصل ہے جو "نیا قلعہ" کے نام سے مشہور ہے۔ یہ مقام گولکنڈے کے مشرقی اور شمالی رخ پر واقع ہے یہ جگہ ایک فصیل سے محصور ہے جو قلعہ قدیم کے ایک (شمالی) دروازے سے شروع ہوکر دوسرے (شرقی رخ کے) دروازے کے گوشے میں ختم ہوتی ہے اس فصیل کی لمبائی تقریباً ایک میل ہوگی۔ نئے قلعے کی تعمیر کی وجہ[1] یہاں کے عوام یوں بیان کرتے ہیں کہ سلطان تانا شاہ کے زمانے میں ایک معمار اپنے فن میں یکتا تھا اس نے یہ محسوس کیا کہ قلعہ قدیم کی شرقی و شمالی فصیل کا کچھ حصہ منجملہ تمام فصیل کے نشیبی ہے اگرچہ کہ اس طرف سے دشمن کے حملہ کا بہت کم امکان ہے پھر بھی اس کمی کو پورا کیا جائے اس نے اپنی رائے دربارِ سلطان میں پیش کی سلطان نے اس کی دور اندیشی کی بہت قدر کی اور معاونی فصیل کی تعمیر کا حکم صادر فرمایا۔ جب سے اس حصہ کا نام نیا قلعہ مشہور ہو گیا۔

قلعہ کی قدیم فصیل اور اس معاونی فصیل کے درمیانی حصے میں ایک چھوٹا سا تالاب متعدد حوض اور کئی باؤلیاں ہیں جو پانی کی بیرونی آمد سے ہمیشہ معمور رہتی ہیں افراطِ آب کی وجہ سے یہاں چاول کی دو فصلیں کاشت ہوتی ہیں اور دیگر ثمر دار و غیر ثمری درخت کافی تعداد میں پائے جاتے ہیں۔ وافی کاشت کی وجہ سے یہ مقام شادابی میں اپنی آپ نظیر ہے۔

اس محصورہ مختصرہ میں دو مسجدیں بھی بنی ہوئی ہیں جن میں ایک مسجد تو ملا خیالی کی ہے اور دوسری فنِ تعمیر کی وجہ سے قابلِ ذکر ہے یہ مسجد نئے قلعے کے شرقی جانب نہایت ہی خوبصورت و سنگ بستہ ہے اور دیکھنے سے تعلق رکھتی ہے مجھے جہاں تک خیال ہے ممالک محروسہ سرکار عالی میں اس ساخت کی مسجد میری نظر سے نہیں گزری۔ اس مسجد کے راست و چپ دو کمرے عجیب ترکیب سے بنے ہوئے ہیں یعنی باہر سے دیکھا جائے تو یہ کمرے مسجد ہی معلوم ہوتے ہیں اور اندر جاکر دیکھیں تو ان کمروں کا مسجد سے کوئی تعلق نہیں معلوم ہوتا۔ طرفہ یہ کہ صدہا سال ہوئے کسی نے بھی ان کمروں کی تحقیق نہیں کی تھی تقریباً تیس سال پہلے جب کہ میں کم سن تھا مجھے خوب یاد ہے کہ ایک شب نئے قلعے کی جانب سے ایک مہیب دھماکے کی آواز سنائی دی۔ دوسرے روز معلوم ہوا کہ اس سنگ بستہ مسجد میں دو کمرے تھے جس میں قطب شاہی زمانے کی بارود محفوظ تھی۔ چوروں کو کسی طرح اس کا پتہ لگ گیا تھا۔ اور ہر روز

---

[1] اس قلعہ کی اصل وجہ تعمیر "سب رس" بابت ستمبر ۳۹ء میں شایع ہو چکی ہے (مدیر)

وہ بارود چرانے جایا کرتے تھے۔ جس روشنی کی مدد سے وہ چوری کرتے تھے غلطی سے بارود میں لگ گئی پھر کیا تھا تمام کمرے کی بارود بیک وقت جل اٹھی اور لوگوں نے دیکھا کہ بانشس مثل کوئلے کے سیاہ جلی ہوئی پڑی تھیں۔

اس وقت جانب راست کا کمرہ محفوظ تھا جو بعد کو کھولا گیا وہ بھی بارود سے معمور تھا پھر وہاں سے بارود اٹھوا کر سرکاری توپ خانے میں داخل کر دی گئی [illegible]

مسجد کی حالت بہت ناگفتہ بہ ہو رہی ہے چھت اور دیواروں [illegible] غیری پودے خوب نشو و نما پا رہے ہیں۔ ان کی جڑیں بیل خوب صورت پتھروں کو اپنی نشستوں اور جڑوں سے جدا کر رہے ہیں اب یہ لاثانی عمارت محکمہ آثار قدیمہ کی توجہات کی امیدوار ہے۔

اسی قلعے میں شمالی رخ کی طرف معاونی فصیل سے متصل ایک درخت عجائب روزگار سے اس وقت تک موجود ہے۔ اس درخت کو عام لوگ ہتھیان کا درخت کہتے ہیں اس کی وجہ کچھ معلوم نہیں ہوئی کہ ہتھیان سے کیا مراد ہے غالباً یہی وجہ ہوگی کہ اس درخت کا پوست ہاتھی کی جلد کے مشابہ ہے اس درخت کے تنے کا دور نوے فٹ اندازہ کیا گیا ہے زمین سے دس فٹ بلندی کے بعد اس درخت کے تنے کا بالائی حصہ قدرتی گنبد نما بنا ہوا ہے اور کچھ نیچے کی جانب ایک دریچہ قدرتی واقع ہوا ہے جب اس دریچہ سے اندر کی طرف جائیں تو معلوم ہوتا ہے کہ درخت کی پیڑ کا اندرونی حصہ تمام تر کھوکھلا سا بنا ہوا زمین تک گیا ہے۔ اور اندرونی زمین کا حصہ نہایت صاف و مسطح ہے اور روشنی اور ہوا آنے کا بہترین ذریعہ یہی قدرتی دریچہ ہے جس کا ذکر کیا گیا۔ کیا تعجب ہے کہ کسی زمانے میں چوروں نے اس درخت سے فائدہ اٹھایا ہو۔

ایک دفعہ میرے ایک مخلص نے ہراج میں سے قلعہ کا چونہ خرید اتھا۔ کنڈوائی کے اختتام پر اتفاق سے میرا گزر اس طرف ہوا دیکھتا ہوں کہ آٹھ دس تیر انداز بیٹھے اپنی کلہاڑیاں تیز کر رہے ہیں اور میرے مخلص بھی تشریف فرما ہیں۔ میں نے کہا۔ بھائی کہو کیا ہو رہا ہے اب تو کنڈوائی کبھی ختم ہو چکی ہے۔ میرے مخلص نے اس گرہ پیکر سے درخت کی طرف اشارہ کرتے ہوئے فرمایا کہ "اب اس کی باری ہے۔ یہ سن کر میری حیرت کی انتہا نہ رہی میں نے کہا۔ "بھائی یہ وہ شئے ہے جس کے دیدار کے تمنائی ابھی ہزاروں نہیں بلکہ لاکھوں موجود ہیں اور رہیں گے۔ افسوس کہ اس کی یہاں یہ قدر ہو رہی ہے!۔

پھر میں نے کہا "اگر تم قبول کرو تو میرا مشورہ یہ ہے کہ ایک درخواست سرکار عالی میں گزرانی جائے۔ ممکن ہے کہ اس نمائشی درخت کے عوض چند درخت تم کو مل جائیں جس کی وجہ سے تمہارا نقصان بھی نہ ہوگا اور یہ دکن کی عجیب قطب شاہی یادگار تلف ہونے سے بچ جائے گی" یہ سن کر میرے مخلص نے کہا "واللہ کیا بات کہی میرے بھی دل میں ایک دھڑکن سی تھی کہ سالہا سال کا درخت ہے نہیں معلوم اس پر کتنے بھوتوں اور جنوں کا تسلط ہوگا۔ خدا جانے اس کے کاٹنے سے کیا آفت برپا ہو۔ بھائی آپ نے اس وقت تدبیر بتلا کر بڑا احسان کیا جس کے بار سے گردن دبی جاتی ہے" میں نے کہا انسان خود اپنی بداعمالیوں کی وجہ سے خبیث کہلانے کا

بھکاری کا خونین انتقام

"سرکار میں بھوکا ہوں۔ کچھ پیسے دلوا دیئے۔" ایک بھکاری نے اپنا ہاتھ پھیلاتے ہوئے کہا۔ بنسی لال نے پائپ سلگاتے ہوئے جواب دیا۔" بھوکا ہے محنت مزدوری کیوں نہیں کرتا۔ جوان ہے، ہٹا کٹا ہے، تجھ کو دینا تو الٹا پاپ ہے" بھکاری ۲۰ یا ۲۲ سال کا خوب صورت جوان لیکن غربت نے سونے پر پارہ کا کام کیا تھا۔ ایک معمولی دھوتی اور ایک بوسیدہ کمبل جس میں رنگ برنگ کے پیوند لگے ہوئے تھے، یہی اس کی پوشاک تھی ہوٹل میں ہم لوگ ایسی جگہ بیٹھے ہوئے تھے، جہاں سے سڑک کا منظر بخوبی دکھائی دیتا تھا۔ میں اس بھکاری کو ہوٹل میں بیٹھے ہوئے دیکھ رہا تھا۔ لیکن وہ اس وقت کسی سے بھیک نہیں مانگ رہا تھا۔ حالانکہ متعدد لوگ ہوٹل میں داخل ہوئے اور باہر گئے۔ مگر ہم کو ہوٹل سے نکلتے ہوئے دیکھ کر وہ ہمارے سامنے ہاتھ پھیلانے کے لئے آگے بڑھا۔ جیسے وہ صرف ہمارا ہی منتظر تھا۔ ہوٹل سے نکلنے کے بعد سے موٹر میں سوار ہونے تک اس کی خوفناک عمیق نظریں بنسی لال کے چہرے پر گڑی ہوئی تھیں۔ بنسی لال کے روکھے جواب سے اس کے چہرے پر سرخی دوڑ گئی اور اس کے تیور عتاب آمیز ہو گئے۔ اس نے اپنے ہونٹوں کو سکیڑتے ہوئے اپنی نظروں کو میری طرف پھیر دیا۔ وہ ایک معمولی بھکاری کی حیثیت رکھتا تھا لیکن اس کی نظروں میں افلاس و فقر کی سطوت کچھ اس طرح نمایاں تھی کہ میں اس کی طرف دیکھنے کی ہمت نہ کر سکا۔

"یقیناً بھیک مانگنا بالکل معیوب بات ہے" میں نے چند پیسے بھکاری کے ہاتھ پر رکھتے ہوئے کہا۔

"سچ کہتے ہیں آپ —— بھگوان آپ پہ دیا کرے" بھکاری نے اپنی پُر رعب آنکھوں کو بنسی لال کے چہرے پر جما کر کہا۔ چند منٹ بعد ہماری موٹر بھکاری کو اسی طرح چھوڑ کر ہوٹل سے بہت دور ہو گئی۔ میں نے موٹر سے اپنا سر نکال کر دیکھا۔ بھکاری چھوٹے سے کاغذ پر کچھ لکھ رہا تھا۔

دوسرے روز شام میں تقریباً ۸ بجے میں بنسی لال کے مکان سے نکل رہا تھا سڑک کی دوسری طرف وہی بھکاری اپنی خونخوار نظروں سے مجھ کو گھور رہا تھا میرے دل میں ایک نامعلوم خوف کی لہر دوڑ گئی۔ قدم بھاری ہو گئے۔ سمجھ میں نہیں آتا تھا کہ یہ پُراسرار ہستی آخر ہے کون؟۔ میں آہستہ آہستہ ترچھی نگاہوں سے اس کی طرف دیکھتا ہوا قدم بڑھاتا چلا جا رہا تھا۔ اور وہ —— ہاں وہ بھی میرے پیچھے چل رہا تھا۔ لیکن اس کے قدم تیز تھے۔ خود بخود میرے قدم تیز ہو گئے۔ میں نے پیچھے پلٹ کر دیکھا وہ بھاگتا ہوا میری طرف آ رہا تھا۔ اس نے چیخ کر کہا۔ "ٹھہریئے —— مجھے آپ سے کچھ کام ہے" ایک فوجی کے لئے اس کے کمانڈر کا حکم جتنا اثر رکھتا ہے۔ اس سے کہیں زیادہ اس بھکاری کے تحکمانہ لہجے نے مجھ پر اثر کیا۔ اور میں اسی جگہ جم کر رہ گیا۔

"یہ آپ کا مکان ہے سرکار" اس نے دھیمی آواز میں کہا۔ "نہیں تو —— میرا مکان یہ نہیں ہے"

——— کیوں۔ اس سوال سے تمہارا مطلب ؟" میں نے اپنے خوف کو چھپانے کے لئے سگریٹ سلگاتے ہوئے لاپروائی سے کہا۔ "یہ مکان آپ کا نہیں ——— تو پھر جنسی لال کا ہے۔ کیوں ؟ ——— بھکاری نے کہا ——— " ہاں ——— لیکن کیا تم انھیں جانتے ہو ؟"

" ہاں جانتا ہوں ——— اور آپ سے زیادہ بہتر طریقہ پر ——— اچھا آپ کو میں نے زحمت دی معاف کیجئے گا۔" اتنا کہہ کر بھکاری تیزی سے آگے بڑھ گیا۔ اس وقت میری حیرت کی کوئی انتہا نہ تھی چند منٹ تک تو میں گزرے ہوئے واقعہ پر غور کرتا ہوا میں کھڑا رہا ——— اس کے بعد لوٹ کر جنسی لال کے مکان پر پہنچا۔

" جنسی لال ——— کل شام میں جب کہ ہم لوگ "گرانڈ ہوٹل" سے نکل رہے تھے تو ایک بھکاری نے ہم سے بھیک مانگی تھی ——— تمہیں یاد ہے"۔

" بھکاری ہاں اچھی طرح یاد ہے ——— وہی نا جس کو تم نے پیسے دیکر نصیحت بھی کی تھی"۔ "ہاں ——— جنسی لال ——— وہ تو مجھے کوئی خطرناک انسان معلوم ہوتا ہے۔ ابھی ابھی تمہارے پاس سے واپس جاتے کے بعد قریب ہی وہ مجھ سے ملا تھا ——— وہ تم سے بخوبی واقف ہے"۔

" ہوگا آخر ہم کوئی معمولی آدمی تھوڑی ہیں ——— ہم اُسے بھیک تو نہیں دیں گے ——— نوکری چاہتا ہو تو نوکر رکھ لیں گے"۔ " لیکن وہ بھکاری بھی تو نہیں ہے۔

——— جنسی لال وہ تو ——— کیا تم نے کبھی اسے دیکھا تھا "۔ میں نے پریشان ہوتے ہوئے دریافت کیا۔" وہ بھکاری نہیں ——— تو پھر ——— آخر تم اتنے پریشان کیوں ہو "۔" میں نے اسے کبھی نہیں دیکھا ——— لیکن جگدیش"۔ جنسی لال کچھ پریشان ہوتے ہوئے چلایا۔ " وہ کہاں سے آیا ہے ! ——— کیا نام ہے ؟۔ اس نے کچھ کہا ؟ " " اس نے یہ کچھ نہیں بتلایا مگر اس کی باتیں صاف ظاہر کر رہی تھیں کہ وہ بھکاری نہیں بلکہ ——— جنسی لال نے قطع کلام کرتے ہوئے کہا۔ " جگدیش کیا تم نے کچھ غور کیا ——— مجھے تو شبہ ہے ——— کہ وہ میری جان کا دشمن ہے " " تمہاری جان کا دشمن ——— یہ کیوں ——— اس میں تو غور کرنے کی گنجائش بھی نہیں " میں نے حیرت کے ساتھ جواب دیا۔

" خیر تم نہیں جانتے ——— تم نہیں سمجھ سکتے لیکن مجھے یاد ہے ——— اچھی طرح یاد ہے۔ زمانۂ ماضی کے واقعات میں کبھی نہیں بھول سکتا " جنسی لال پر گھبراہٹ اور اُداسی چھائی ہوئی تھی۔ ان واقعات کو پیش آئے ہوئے تقریباً ایک ہفتہ گزر چکا تھا۔ جنسی لال روز بروز پریشان دکھائی دے رہا تھا۔ اور اس کی صحت نمایاں طور پر بد سے بدتر ہوتی جا رہی تھی۔ متعدد بار میری متجسس فطرت نے اس بھکاری کے متعلق سوالات کرنے پر مجھے مجبور کیا لیکن وہ ہمیشہ یہ کہہ کر ٹالتا رہا۔ " جگدیش اس ذکر کو چھیڑ کر میری پریشانیوں میں اضافہ نہ کرو۔ کسی اور موضوع پر گفتگو کرو۔ اس کے جاننے کی تمہیں کوئی شدید ضرورت تو نہیں ہے"۔ آج وہ مدے

زیادہ پریشان تھا۔ چہرہ پر مردنی چھائی ہوئی تھی۔ اس نے
مجھے خاص طور پر اپنے یہاں بلایا۔ شام میں بارش نے
خوب فیاضی دکھائی۔ موسم کافی سرد ہو گیا تھا۔ ہوا میں
خنکی پیدا ہو گئی تھی۔ بنسی لال نے موٹر لانے کے لئے
حکم دیا اور ہم دونوں تفریح کے لئے حسین ساگر کے
چھوٹے سے خوبصورت چمن کو چلے گئے ــــ بنسی لال
نکھٹو تھا اس کی عمر تقریباً چالیس کے لگ بھگ تھی
اس کی عیاشی اور شراب نوشی کے چرچے ہر جگہ ہو رہے
تھے۔ بنسی لال کے قماش کے لوگ عموماً ایسے ہی لوگوں
سے زیادہ خوش رہتے ہیں جو ان کی خواہش کے
مطابق ہر اس کام میں شریک ہوں جو وہ کرتے ہیں۔
لیکن حیرت کی بات یہ تھی کہ باوجود میرے ان تمام
لغویات سے نفرت کرنے کے وہ مجھ سے محبت کرتا
تھا اور ہمیشہ مجھ کو ساتھ رکھتا تھا۔ جب کبھی میں
سنجیدگی سے ان بری عادتوں کو چھوڑنے کے لئے
رائے دیتا تو وہ ہنس کر خاموش ہو جاتا تھا۔

چنانچہ اس وقت بھی اس کے ساتھ شراب
کے شیشے موجود تھے۔ میری بار بار کی ہدایتوں کے
باوجود وہ اس وقت تک دو شیشے خالی کر چکا تھا۔
رات کے گیارہ بج چکے تھے۔ ابر اب بھی چھایا ہوا تھا۔
بعض وقت اکا دکا تارے بھی دکھائی دیتے تھے۔
اور پھر گھٹاؤں کی چادر میں چھپ جاتے تھے۔ نالا کا
پانی کشتے سے ٹکراتا اور ہلکے سے خوفناک شور سے سکوت
کو توڑتا ہوا واپس ہو جاتا تھا۔ سڑک کی بجلی اپنی روشنی
سے مفلس کے چراغ کی طرح اس چمن کو بھی فیضیاب کر رہی
تھی۔ اس مدھم روشنی میں میں نے دیکھا کہ کوئی شخص
چمن کی کیاریوں کو آہستگی سے طے کرتا ہوا ہماری طرف
چلا آ رہا تھا۔ مجھے زیادہ غور کرنے کی ضرورت نہ رہی
میں نے فوراً پہچان لیا کہ آنے والا شخص کون ہے۔ میرے
جسم میں ایک کپکپی سی پیدا ہوئی۔ سانس رکنے لگی۔ میں نے
بنسی لال کے بازو کو زور سے دباتے ہوئے آہستہ سے
کہا: بنسی لال ــــ بھکاری ــــ ادھر آ رہا ہے۔

بنسی لال کی حالت نشہ سے تباہ ہو چکی تھی۔ اور وہ
مطلق ہوش نہ تھا۔ اس نے بڑبڑاتے ہوئے جواب
دیا "آنے دو ــــ میں اسے پہچان گیا ــــ
وہی ہوگا ــــ میں نے اسی زمانے میں کسی سے
سنا بھی تھا۔ لیکن جگدیش ــــ اوہ ــــ (بنسی لال
نے کچھ دیر کے بعد کہا) مگر تمہیں اس کے جاننے کی ضرورت
نہیں کہ وہ کون ہے ــــ اور اس کا مجھ سے کیا
تعلق ہے"

بھکاری سامنے کھڑا ہوا تھا۔ اس نے ایک لمبی
سانس کھینچی اور اس کا جیب میں چھپا ہوا ہاتھ اپنے
ساتھ چھوٹا سا چمکدار خنجر لئے ہوئے باہر نکلا قبل اس کے
کہ میں کچھ اپنے آپ کو سنبھال سکوں، وہ عقاب کی طرح
بنسی لال پر جھپٹا اور چشم زدن میں اس کے سینے کے پار
ہو گیا۔ ذرا سی دیر میں بنسی لال کا سرخ خون سبزہ
پر بہنے لگا۔ میری حالت اس وقت مردے کی سی ہو گئی
تھی۔ اپنی جگہ بت بنا ہوا کھڑا تھا۔ موت کے بھیانک تصور
سے آنکھیں بند ہو گئی تھیں۔ سر چکرا رہا تھا۔ مجھے صرف
اتنا خیال ہے کہ بھکاری نے اپنے خون میں لتھڑے

ہوئے ہاتھوں کو بنسی لال کی قمیص سے صاف کیا اور مطمئن چال سے واپس چلا گیا۔

میرے قدم بھاری ہو چکے تھے۔ تعاقب کا خیال ہی میرے لئے موت سے بھیانک ثابت ہو رہا تھا جب وہ میری نظروں سے اوجھل ہو گیا تو میری حالت میں کچھ تغیر پیدا ہوا۔ بے شمار خیالات نے متحدہ طور پر میرے دماغ پر یورش کی اور میں دیوانہ وار "خون ـــــ پولیس" چلاتا ہوا دوڑا اور چمن کے بازو والے ناکے میں داخل ہوا۔ وہاں پہونچتے ہی مجھ پر بیہوشی سی طاری ہونے لگی۔ بھکاری وہاں موجود تھا۔ اس نے کانسٹبل کو مخاطب کر کے میری طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا "آپ گواہ ہیں اس بات کے کہ میں نے بنسی لال کو قتل کیا"۔ اس کے بعد مجھ کو خبر نہیں کہ کیا ہوا۔ البتہ جب مجھے ہوش آیا تو میں نے اپنے آپ کو ہاسپٹال میں پایا۔ قریب میں چند دوست احباب اور ڈاکٹر کھڑے ہوئے تھے۔ دو موٹی اور کالی نرسیں میرا سر سہلا رہی تھیں۔

۲۲ جون کا دن مشہور وکلا اور شوقین حضرات کے علاوہ میرے لئے خاص اہمیت رکھتا تھا۔ کیونکہ یہی وہ میری زندگی کا قابلِ یادگار دن تھا جس میں بنسی لال کے حیرت انگیز قتل کے مقدمہ کی پہلی پیشی مقرر تھی ساری رات عجیب کرب و اضطراب میں گزری۔ صرف اس خیال ہی سے کہ مجھے اس خوفناک بھکاری کے روبرو جو اب قاتل کی حیثیت رکھتا ہے اسی کے خلاف کہنا ہے جسم سرد ہو رہا تھا۔

اگر مجھے اس مقدمے سے بذاتِ خود کوئی تعلق نہ ہوتا اور مجھے بحیثیت گواہ عدالت طلب نہ کرتی تو میں بالیقین کہہ سکتا ہوں کہ قتل کی واردات پیش آنے کے بعد ہی میں کسی دوسرے ملک کو چلا جاتا۔ لیکن میں مجبور ہو گیا تھا۔ پولیس کے لئے صرف میری واحد شخصیت ہی ان کے مقدمہ کو کامیاب بنانے اور ان کی ملازمت میں ترقی کے مواقع پیدا کرنے کے زرین خواب پیش کر رہی تھی۔

صبح ناشتہ سے فارغ ہو کر میں اپنے دوست سندر لال کے ساتھ عدالت پہنچا۔ کمرۂ عدالت مشہور بیرسٹروں اور عوام سے کھچا کھچ بھرا ہوا تھا۔ ٹھیک دس بجے مقدمہ کی کارروائی شروع ہوئی مقدمہ کی سماعت ہو رہی تھی لیکن ملزم ان تمام باتوں سے بالکل لاپرواہ دکھائی دیتا تھا۔ اس کی آنکھیں تقریباً بند تھیں اور وہ کٹھیڑے پر اپنے ہاتھ کے سہارے اپنی ٹھوڑی ٹیک کر کسی گہری سوچ میں غرق تھا۔

جج نے ملزم کو مخاطب کرتے ہوئے بیان دینے کے لئے حکم دیا۔ ملزم نے ایک گہری سانس لیتے ہوئے اپنی آنکھیں کھول دیں۔ اس نے جج کو نرم لہجے میں مخاطب کیا۔

"مقتول کو میں اچھی طرح جانتا ہوں۔ وہ میرا باپ تھا۔ اس کو قتل کرنے کی وجہ صرف یہی ہے کہ مجھے دنیا میں زندہ رہنے کا حق حاصل نہیں ہے تو پھر میرے وجود کا باقی دنیا میں کیسے رہ سکتا ہے ـــــ

(باقی آئندہ)

خلیل اللہ

جدید مطبوعات

۱۔ عرفان نانک (سکھوں کی دعا کا اردو ترجمہ) از برج بلب سنگھ صاحب بیدی حجم ۲۲۲ صفحات۔ مرکنٹائیل پریس لاہور۔

۲۔ ید بیضا (اسلام اور مسلم سوسائٹی پر مضامین کا مجموعہ) از ڈاکٹر سید نجم الدین احمد صاحب جعفری حجم ۱۴۰ صفحات۔ آرمی پریس شملہ

۳۔ مظاہر ذہنیات (نفسیات کے متعلق) از ڈاکٹر فضل الرحمٰن صاحب حجم ۱۴۰ صفحات قیمت عا۔ کوثر چاند پوری بھوپال۔

۴۔ مشیر الصحت عرف دیہاتی چٹکلہ (چند مجرب نسخے) مولفہ میر مصطفےٰ علی صاحب دوم تعلقدار نلگنڈہ۔ قیمت عہ

۵۔ دیوانِ ثاقب از مرزا ذاکر حسین صاحب ثاقب لکھنوی حجم ۵۰ صفحات۔ قیمت عا۔

۶۔ انیس الاخلاق (انیس کی رباعیوں کا مجموعہ) مرتبہ سید محمد عباس صاحب۔ قیمت ۵ر

۷۔ تصویرِ احساس (مجموعہ کلام) از الطاف صاحب مشہدی قیمت مجلد عاں

۸۔ شبِ غم (ناول) از میاں ایم اسلم صاحب قیمت مجلد عہ ہر

۹۔ خواب کی دنیا (خواب کی ماہیت اور اس کا فلسفہ) مترجمہ عبد المالک صاحب قیمت عہ ہر

۱۰۔ دیہاتی گیت (گیتوں کا مجموعہ) از ڈاکٹر اعظم صاحب کریوی قیمت ۸ر عصمت بک ڈپو۔ دہلی

۱۱۔ زندگی کے کھیل (افسانے) از لطیف الدین احمد صاحب۔ اکبر آبادی حجم ۱۶۰ صفحات قیمت عہ۔ آرمی پریس شملہ۔

۱۲۔ ضبطِ تولید و اصلاحِ نسل (رسالہ ہمدرد صحت دہلی کا خاص نمبر) مرتبہ حکیم عبد الحمید صاحب حجم ۲۰۰ صفحات قیمت ۱۲

۱۳۔ حیات و کلیات اسمٰعیل با تصویر (سوانح حیات و مجموعہ کلام) دوسرا ایڈیشن مرتبہ محمد اسلم صاحب سیفی حجم ۶۰۰ صفحات قیمت للعہ مکتبہ جامعہ دہلی

۱۴۔ سر سید (سوانح حیات) مرتبہ انصار الحق صاحب۔ حجم ۶۴ صفحات قیمت ۵ر حالی پبلشنگ ہوس۔ دہلی۔

۱۵۔ عہد حاضر کے بڑے لوگ با تصویر حصہ اول و دوم (چند سیاسی رہنماؤں کی سوانح حیات) حجم ۲۵۶ صفحات قیمت عہ۔ دائرۂ ادبیہ۔ دہلی

۱۶۔ جوئبار (نظموں اور غزلوں کا مجموعہ) از بسیم حسین صاحب ظفر حجم ۹۶ صفحات قیمت عہ۔ ادارۂ تصنیف و تالیف۔ عزیز گنج۔ دہلی

۱۷۔ سیرت سید احمد شہیدؒ (مجاہد اسلام حضرت سید احمد صاحب بریلوی کی سوانح حیات) از سید ابو الحسن علی صاحب حجم ۴۶۴ صفحات قیمت عاں نامی پریس لکھنو

۱۸۔ آبِ حیات کے لطیفے (آزاد مرحوم کی سوانح حیات مع لطیفے) از آغا محمد اشرف صاحب حجم ۱۴۴ صفحات قیمت عہ ہر عالمگیر پریس۔ لاہور

۱۹۔ رسولِ پاک از عبد الواحد صاحب سندھی حجم ۱۶۵ صفحات قیمت ۸ر مکتبہ جامعہ دہلی

۲۰۔ کلیات بحری مرتبہ ڈاکٹر محمد حفیظ سید صاحب حجم ۲۱۲ صفحات قیمت (ے) نول کشور پریس۔ لکھنو

۲۱۔ رحمۃ اللعٰلمین صلعم (جلد اول) از قاضی محمد سلیمان صاحب حجم ۴۶۴ صفحات قیمت عاں۔ مکتبہ جامعۂ دہلی

۲۲۔ دہلی کی دستکاری از سید رضا احمد صاحب جعفری حجم ۵۶ صفحات قیمت ۸ر عصمت بک ڈپو۔ دہلی

۲۳۔ لکڑی کا باریک کام از سید رضا احمد صاحب جعفری حجم ۵۰ صفحات قیمت ۸ر عصمت بک ڈپو۔ دہلی

۲۴۔ تاریخ بچکنڈہ (تاریخ دکن کا ایک ورق) از سید مراد علی صاحب طالع حجم ۳۰ صفحات قیمت ۵ر

۲۵۔ روحِ حیات (مکتوبات کا مجموعہ) از اختر صاحب قریشی حجم ۸۰ صفحات قیمت ۴ر عہد آفریں برقی پریس۔ حیدر آباد

۲۶۔ سوتیلی ماں۔ از محترمہ صالحہ بیگم صاحبہ (ما شاءاللہ) حجم ۵۰ صفحات قیمت ۴ر ادارہ ادبیات اردو۔

مرزا سیف علیخان

اس کے آغاز میں صرف خاص مبارک کے صحرا کی جوانگی کی مختصر تاریخ لکھی گئی ہے اس کے بعد فارسٹ پالیسی، بندوبست صحرا، پیدائش صحرا اور مالیاتی نتائج وغیرہ پر بڑی قابلیت اور وضاحت کے ساتھ روشنی ڈالی گئی ہے۔ سنین ماضیہ کی آمدنی کا اوسط بہت کم تھا، حال ناظم صاحب جنگلات کے زمانے میں آمدنی بہت بڑھ گئی اور مصارف کم ہو گئے۔ ناظم صاحب حال کے حسن انتظام اور قابلیت کا اس سے بہتر ثبوت نہیں مل سکتا کہ آمدنی میں چند سے زیادہ اضافہ ہوا اور اخراجات بہت گھٹ گئے۔ گزشتہ پچیس سال میں صرف خاص مبارک کے جنگلات کی نہ کوئی رپورٹ مرتب ہوئی اور نہ شایع کی گئی۔ اس رپورٹ کو صرف خاص مبارک کے جنگلات کے نظم و نسق کی پہلی رپورٹ ہونے کا فخر حاصل ہے۔

نیرنگِ خیال (حرب و ضرب نمبر) مرتبہ حکیم محمد یوسف حسن صاحب حجم ۲۰۸ صفحات قیمت ۸ [illegible] لاہور کے قدیم اور مشہور رسالہ نیرنگ خیال کا یہ خاص نمبر بابتہ جولائی ۳۹ء کوئی چالیس جنگی مضامین پر مشتمل ہے، جن میں سے چند کے عنوان ہیں۔ جوان ترک، جرمنی کی موجودہ جنگی قوت، کیا امریکہ جنگ سے علیحدہ رہ سکتا ہے؟ برطانیہ کی حکمت عملی کیا ہونی چاہیئے؟ کیا رومانیہ دوسرا اسپین بنے گا؟ سیاسیات عالم اور عرب، فرانس کی ماژینولائین، چین اور جاپان کی جنگ، برطانیہ کی جنگی طاقت، دنیا کی سات بڑی طاقتوں کی جنگی قوت وغیرہ وغیرہ۔ تقریباً جملہ مضامین دلچسپ ہیں اور ان میں سے اکثر بڑی تحقیق اور جستجو کے بعد لکھے گئے ہیں۔ موجودہ جنگ کے زمانے میں ان مضامین کے پڑھنے سے انسان کی جنگی معلومات اور مختلف حکومتوں کی بری، بحری اور فضائی قوتوں کی تفصیل معلوم ہو سکتی ہے۔

مکمل شرح انتخاب اردو۔ از حکیم ابوالافتخار صاحب فخر و ابوالمحاسن متین صاحب حیدرآبادی حجم ۲۳۶ صفحات قیمت عہ

مولوی سید محمد صاحب ام اے پروفیسر سٹی کالج کی مرتبہ "انتخاب اردو" کی یہ مکمل شرح ہے، اصل کتاب انٹرمیڈیٹ فائنل کے نصاب میں شریک ہے، اس میں مشہور انشاپردازوں اور شاعروں کے منتخب مضامین، نظمیں اور غزلیں ہیں۔ اس کتاب کی زیر نظر شرح میں ہر مضمون کے ادق الفاظ کے معنی لکھے گئے ہیں اور خاص خاص محاورات و اصطلاحات کی توضیح اور تاریخی و جغرافی ناموں کی تشریح کی گئی ہے اور ہر مضمون کا خلاصہ مشکل لفظوں کے معنوں کے آخر میں سلیس زبان میں لکھا گیا ہے، کتاب کے آخر میں تیس مشہور نثر نگاروں اور شاعروں کے مختصر حالات بھی درج ہیں، غرضکہ یہ شرح محنت سے مرتب کی گئی ہے۔ چھٹی فارم کے طلبہ کو اس شرح کے ساتھ "انتخاب اردو" پڑھنے میں کافی مدد ملے گی، خصوصاً وہ طلبہ جو اردو ادب کے مضمون میں کمزور ہوں اس شرح سے ضرور استفادہ کریں۔ "[illegible]"

زیب النساء (افسانہ و دستکاری نمبر) بابتہ ستمبر و اکتوبر ۳۹ء مرتبہ محترمہ صغرا ہمایوں مرزا صاحب چیف ایڈیٹر حجم ۱۲۸ صفحات قیمت ۸

محترمہ صغرا ہمایوں مرزا صاحبہ کا نام ادبی دنیا میں محتاج تعارف نہیں ہے۔ آپ کی ادارت میں ایک عرصہ تک "النساء" نکلتا رہا اور اب اس کے دوسرے روپ میں "زیب النساء" شایع ہو رہا ہے۔ ان ہر دو رسائل کی ظاہری اور باطنی خوبیاں موصوفہ کی علم دوستی اور حسن قابلیت کی آئینہ دار ہیں۔ زیر نظر خاص نمبر کے افسانوں میں "عورت کا انتقام"، "معصوم محبت"، "مایوس تمنا"، "شادی کیسے ہو؟"، "کمخواب کا جوڑا" نہایت پاکیزہ اصلاحی، اخلاقی اور سماجی افسانے ہیں، چند عمدہ نظمیں بھی اس نمبر میں شامل ہیں۔

دستکاری نمبر کو محترمہ سنجیدہ اشرف صاحبہ نے مرتب

کیا ہے۔ اس میں مغربی زردوزی صنعتوں اور دست کاریوں
کے نمونے مشرقی مذاق کے مطابق متعدد نقشوں کے ذریعہ آسان
طریقوں سے پیش کئے گئے ہیں۔ غرضکہ یہ خاص نمبر عمدہ افسانوں
بلند پایہ نظموں اور کارآمد دست کاریوں سے مملو ہے اور
اس کے جملہ مضامین قابل انشا پرداز خواتین کے رشحات قلم
کے منت کش ہیں۔ م۔ س

محکومیتِ نسواں ۔ مترجمہ معین الدین صاحب انصاری
کراؤن سائز تقطیع قیمت عہ ۔ یہ جان اسٹوارٹ مل کی
"سبجکشن آف ویمن" کا ترجمہ ہے اور صاف ستھری زبان
میں کیا گیا ہے۔ مولوی معین الدین صاحب انصاری بیرسٹر نے
اس سے پہلے بھی بعض کتابوں کے ترجمے کئے اور بہت اچھے کئے
ہیں۔ اس ترجمے میں بھی انھوں نے ایسا طرز تحریر اختیار کیا ہے
جو کم استطاعت لوگوں کی سمجھ میں آجائے۔ اصل کتاب جو چار
ابواب پر مشتمل ہے، مل کے ان مفکرانہ خیالات کو پیش کرتی ہے
جو وہ عورتوں کی محکومیت کی حالت اور ان کی آزادی کی حمایت
میں رکھتا تھا۔ یہ ان کتابوں میں سے ہے جن کے مطالعہ سے انگلستان
کے باشندوں میں سماجی بیداری پیدا ہوئی اور قدیم رسم و رواج
کے بندھن توڑنے اور سماجی ترقیوں کی شاہراہ کھولنے کی
عام تحریک پیدا ہوئی اور اس میں کوئی شبہ نہیں کہ مل کی
محکومیت نسواں کو عورتوں کی آزادی کا صحیفہ سمجھنا چاہیے۔

تاریخ بچکنڈہ ۔ از سید مراد علی صاحب طالع مدرس کراؤن
تقطیع ۴۰ صفحات قیمت ۵ر ۔ ضلع ناندیڑ تعلقہ دیگلور کے تحت
ایک قصبہ بچکنڈہ کے نام سے مشہور ہے۔ یہ مختصر رسالہ
اسی قصبے کی تاریخ ہے۔ اس قصبے کی اہمیت یہ ہے کہ
کسی زمانے میں ایک مشہور مقام تھا۔ یہاں کا تالاب اور مندر
دونوں تاریخی حیثیت رکھتے ہیں۔ جب یہ مقام بہمنی سلطنت
کے ختم ہو جانے کے بعد قطب شاہیوں کے قبضے میں آیا تو
یہاں پارس پتھر برآمد ہونے کا ایک عجیب و غریب واقعہ
پیش آیا۔ یہاں قطب شاہی عہد کی ایک خوبصورت مسجد بھی ہے
جو عنبری مسجد کے نام سے مشہور ہے۔ مندر پورے کا پورا
سنگ سیاہ کا اور بہت ہی قدیم ہے۔ یہاں ایک بڑے بزرگ
حضرت خواجہ سید احمد کبیر روشن ضمیر کا مزار بھی ہے اور
سالانہ آپ کا عرس بہت اہتمام سے ہوتا ہے۔ قدرتی مناظر
کے لحاظ سے بھی یہ مقام قابل دید ہے۔ قابل مولف نے
بہت سلیقے سے اس مقام کے متعلق تمام ضروری باتیں
تاریخی اور عصری ایک رسالے کی صورت میں پیش کر کے شائع
کی ہیں۔

شاہ نعمت اللہ ولی ۔ از محمد عبدالحفیظ صاحب، چھوٹی تقطیع
قیمت ۳ار ۔ حضرت شاہ نعمت اللہ صاحب رح مشہور عالم بزرگ
گزرے ہیں۔ قیامت کے بارے میں آپ سے پیشین گوئی
منسوب ہے اس کی وجہ سے ہر شخص آپ کے نام نامی
سے واقف ہے۔ مولوی عبدالحفیظ صاحب نے آپ کے
حالات زندگی نہایت تلاش اور کوشش سے فراہم کر کے
یہ سوانح عمری مرتب کی ہے۔ اس میں آپ کا کلام بھی مختلف
تذکروں اور ماخذوں سے لے کر شائع کیا ہے۔ کتاب بہت
تحقیق اور سلیقے سے مرتب کی گئی ہے۔

مجلہ عثمانیہ جلد ۱۲ ع ۱ و ۲ ۔ یہ مجلے کی بارہویں جلد کا پہلا
مشترک نمبر ہے جو عبدالعلی خاں صاحب بی اے اور عابد علی
خاں صاحب متعلم بی اے کی ادارت میں شائع ہوا ہے۔ مضامین
مختلف عنوانات معاشیات، سیاسیات، فلسفہ، ادبیات

سائنس، سوانح عمری، ڈرامے اور سفرنامے کے تحت دیئے گئے ہیں اور اکثر و بیشتر مضامین کافی محنت اور توجہ سے لکھے گئے ہیں۔ نظم کا حصہ بھی دلچسپ ہے۔ رسالہ مجموعی طور پر بہت سلیقے اور خوبی سے ترتیب دیا گیا ہے۔ "س۔ م"

روحِ رواں کراؤن سائز ۱۲۴ صفحات مجلد مطبوعہ نامی پریس قیمت اور ملنے کا پتہ درج نہیں ہے۔

یہ اردو کے مشہور شاعر جگت موہن لال رواں کی نظموں، غزلوں اور رباعیوں کا مجموعہ ہے۔ رواں اپنی شاعری کی بدولت ادبی حلقوں میں کافی قدر و منزلت کی نگاہ سے دیکھے جاتے ہیں۔

ان کی شاعری کے پس منظر میں ایک طرف فارسی شعر و سخن کا ذوق اور قدیم اساتذہ اردو کے کلام کے [illegible] نقوش نمایاں ہیں اور دوسری طرف جدید علوم و خیالات کے [illegible] لیکن یہ رواں کی وضعداری ہے کہ وہ موجودہ [illegible] کاریوں کے درمیان رہ کر بھی قدیم اساتذہ کے نقش قدم سے تجاوز نہیں کرنا چاہتے۔ اس کے باوجود ان کی شاعری میں جو جدید اثرات شامل ہو گئے ہیں زمانے کا اقتضا ہے۔

رواں نہایت خوش فکر اور کہنہ مشق شاعر ہیں۔ ان کی شاعری کا مقصد معین ہوتا ہے۔ اور وہ لفظی صناعیوں پر زیادہ وقت صرف کرنا نہیں چاہتے جیسا کہ ایک شعر میں فرمایا ہے۔

مرے جذبات کی ندرت ہے غالب حسن لفظی پر
نہیں ہے اس لئے کچھ فکر انداز بیاں مجھ کو

ان کا انداز بیان صاف ستھرا اور خیالات کے اظہار کا طریقہ راست اور ایچ پیچ سے خالی ہوتا ہے۔ جیسا کہ توقع ہو سکتی ہے ہندو مذہب کی روایات اور تاریخ کے متعلق بعض بہترین نظمیں رواں کی فکر کا نتیجہ ہیں۔ سرور، چکبست وغیرہ کی اس طرح کی نظموں کو شامل کر کے یہ اردو شاعری کا ایک ضروری اور اہم سرمایہ ہیں۔ مذکورۂ بالا نظموں کے علاوہ شعر و سخن پر جو نظم انھوں نے "شاعری" کے عنوان سے لکھی ہے وہ اور "دیوانے" خاص چیز ہیں۔

رواں کی غزلیں بھی کافی تعداد میں موجود ہیں۔ ان غزل کے تمام لوازم کو مدنظر رکھتے ہوئے بھی ان کے انداز بیان میں موجودہ زمانے کی بہت سی ندرتیں داخل ہو گئی ہیں۔ بعض ایسے مضامین کو بھی جو عام غزل گو شعراء کے دائرے سے خارج تھے انھوں نے غزل میں داخل کر کے اس میں تھوڑی سی وسعت پیدا کر لی ہے۔ اس میدان میں ان کی پختہ مشقی ان کو اساتذہ کے رتبہ تک پہنچا دیتی ہے۔

رواں کی رباعیاں جو غزلوں سے تعداد میں کم ہیں [illegible] خاص شہرت رکھتی ہیں۔ یہاں بھی ان کی عام شاعری کی خصوصیت سادہ بیانی اور سلاست موجود ہے۔ ان رباعیوں کے موضوع حضرت امجد کی رباعیوں کی طرح اخلاقی اور حکیمانہ ہیں۔

رواں کی شاعری کی شہرت کے مدنظر ان کے کلام کی اشاعت ایک ضرورت تھی، جو "روحِ رواں" سے پوری ہو رہی ہے۔ "ع۔ بس"

نغمہ والہام کراؤن سائز ۱۴۴ صفحے قیمت ۱۲؍ ملنے کا پتہ سب رس کتاب گھر۔

یہ مسٹر سجاد علی خاں ناہد حیدری کی نظموں کا مختصر مجموعہ ہے۔ جو کم و بیش چار سال کی کاوشوں کا نتیجہ ہے۔ ابتدا میں جناب ضامن کنتوری کا ایک خط تعارف کے طور پر شامل ہے۔

زاہد حیدری باوجود نوعمری کے اچھا اور دلچسپ کلام سرانجام کرنے لگے ہیں۔ عمر اور کلام کا مقابلہ کیجیے تو مجموعے کا عنوان غلط نہیں معلوم ہوتا۔ تعارفی خط میں جناب ضامن نے ان نظموں کی تعریف ان الفاظ میں کی ہے "جس قدر کلام اس مجموعے میں شامل ہے، وہ یک لخت جذبات سے معمور ہے"۔ نظموں کے موضوع، کچھ شاعرانہ اور جذباتی ہیں اور کچھ مذہبی اور گروہ بندی کے مسائل لکھنے کا انداز سادہ سیدھا اور دلچسپ ہے۔ توقع ہے کہ زاہد صاحب کی مشق اسی طرح جاری رہی تو وہ جلد اچھے شاعروں کی صف میں جگہ حاصل کرلیں گے۔ بعض غلطیاں بھی کہیں کہیں نظر سے گزریں مثلاً پہلی ہی نظم کے تیسرے شعر میں "منصور" کو "مقصور" لکھ دیا گیا ہے۔ صفحہ ۴۱ پر آخری شعر "خوشا یہ دشت وحشت" "خوشا اے دشت وحشت" اسی شعر میں "رکھلی" کا املا "رکھ دی" ہونا چاہیے۔

رازونیاز۔ کراؤن سائز ۸۰ صفحے چھپائی اچھی مطبعہ دلی پرنٹنگ ورکس دہلی۔ قیمت درج نہیں ہے۔

یہ حبیب اشعر دہلوی کے کلام کا مجموعہ ہے۔ ابتدا میں مصنف کا دیباچہ ہے، جس میں نظموں کی طباعت پر "مسرت" اور "کوتاہ نظر طبایع کے ایرادات و اعتراضات" سے خائف نہ ہونے کا اعلان کیا گیا ہے اور اپنے "کمال فن" کو "کسی شباب سے بھرپور ہستی کی "چشم سحرکار" کی "افسوں طرازی" کا نتیجہ" بتلایا گیا ہے۔ غزلوں کی زبان صاف اور سلیس اور خیالات پاکیزہ ہیں اور امید ہے کہ دلچسپی سے پڑھی جائیں گی۔

نادر خطوط غالب۔ کراؤن سائز ۶۲ صفحے۔ طباعت معمولی مطبوعہ دی ٹائمز پریس لکھنؤ قیمت مر۔ یہ غالب کے ۲۱ خطوط کا مجموعہ ہے۔ جس کو جناب سید محمد اسمٰعیل صاحب رسا ہمدانی گیاوی نے مرتب فرمایا ہے۔ ابتدا میں غالب کی تصویر اور مرتب کا ۱۵ صفحوں کا مقدمہ ہے۔ جس میں غالب کے حالات فن پر بحث کی ہے اور غالب کی نثر نگاری کے سلسلے میں "یادگار غالب" کا اقتباس خطوط کے طرز تحریر سے متعلق پیش کیا ہے۔ اس کے علاوہ اس میں غالب کے تین بہاری تلامذہ (۱) موفق میتری بہاری (۲) منیر بلگرامی (۳) کرامت ہمدانی بہاری کے مختصر حالات بھی درج ہیں۔ جن کے نام کے خطوط اس مجموعے میں شامل ہیں۔ پچھلے چند مہینوں میں غالب کے حالات، شاعری، خطوط سے متعلق کئی اہم اور قابل ذکر تصنیفات اور تالیفات شایع ہوچکی ہیں۔ ان میں ایک اضافہ ہے، جس سے آئندہ زمانے میں غالب کے حالات اور کمالات کا وسیع تر اور زیادہ صحت بخش نقطہ نظر سے مطالعہ ہوسکے گا۔ مرتب کے دادا سید شاہ علی حسین ہمدانی عالی نے وہ خطوط جو اپنے والد سید شاہ کرامت حسین ہمدانی بہاری کے نام حضرت غالب نے بھیجے تھے۔ "نادر خطوط غالب" کے نام سے ایک جا کرکے شایع کرنا چاہا تھا۔ لیکن چند مجبوریوں نے کسی زمانے سے انہیں محروم رکھا لیکن "اگر پدر نتواند پسر تمام کند" ستائیس سال کے بعد لائق پوتے کو دادا کی یہ خواہش پوری کرنے کا موقع ملا۔ اس سے غالب کے حالات کے ایک رخ پر صحیح زاویہ سے روشنی پڑسکتی ہے۔ مقدمہ میں مرتب نے کرامت ہمدانی کا دیوان غالب کی اصلاحوں کے ساتھ شایع کرنے کا وعدہ فرمایا ہے۔ امید ہے کہ یہ قیمتی مرقع بھی جلد شایع ہوجائے گا۔ "ع۔ س"

اجتماعی زندگی کی ابتدا۔ از محمد عاقل صاحب ایم اے استاد عمرانیات جامعہ ملیہ۔ چھوٹی سائز حجم (۱۱۲) صفحے قیمت مر
اس کتاب میں حضرت انسان کے بن مانس سے ترقی کرکے آدمی

بن جانے کے حالات جمع کیے گئے ہیں اور قیاسی امور کو اس طرح لکھا گیا ہے کہ وہ گویا واقعی امور ہیں، اشرف المخلوقات کا بن مانس سے ترقی کر کے انسان بن جانا ڈارون کا نظریہ ہے لیکن کم از کم اسلامی نقطۂ نظر سے اس کی کوئی وقعت نہیں ہو سکتی۔ جامعہ ملیہ کے پروفیسروں کا اس نظریہ پر عمل تعجب سے خالی نہیں ہے۔

ہندوستان کا دیہی قرضہ۔ از محمد عاقل صاحب ایم اے

چھوٹی سائز حجم ۵۶ صفحات قیمت ۴؎۔ معاشی اور معاشرتی مسئلہ کی تحقیقات دو طرح سے جا سکتی ہیں۔ ایک تو تحقیقات کو وسیع رقبہ پر پھیلا کر سرسری جائزہ لیا جائے اور دوسری صورت یہ ایک مختصر محدود رقبہ کو متعین کر کے جزئی اور تفصیلی امور کی صراحت کی جائے۔

اس مختصر رسالہ میں اولاً قرض خواہوں کی قسمیں، قرضے کے اسباب، سود کی شرح، تقاوی کے نرخ وغیرہ امور پر روشنی ڈالی گئی ہے۔

دوسرے حصے میں تفصیل سے بتایا گیا ہے کہ ہندوستان کا دیہی قرض کس قدر ہے اور اس پر کتنا سود حاصل ہوتا ہے۔ کتاب نہایت محنت سے لکھی گئی ہے، اور ہر اس شخص کے لئے اس کا مطالعہ ضروری ہے جو معاشی امور سے دلچسپی رکھتا ہے۔

سیاسیات کی پہلی کتاب۔ از محمد عاقل صاحب ایم اے

حجم ۶۰ صفحے قیمت ۸؎۔ اس کتاب میں سیاسیات کے مبادیات کو اختصار کے ساتھ دلچسپ پیرایہ میں بیان کیا گیا ہے۔

پہلا باب ریاست کی تعریف کے عنوان پر ہے جس میں ریاست کے لازمی عناصر، آبادی، علاقہ، حکومت، اقتدار اعلیٰ وغیرہ سے بحث کی گئی ہے۔ دوسرے باب میں ریاست کی ابتدا کے بارے میں "نظریے" کا بیان ہوا ہے۔ تیسرا باب ریاست کا اقتدار اعلیٰ اور افراد کی آزادی کے عنوان پر ہے۔

تاریخ ہندوستان کی تمہید۔ از پروفیسر محمد مجیب صاحب بی اے (آکسن)

حجم ۲۴۴ صفحے قیمت ۵؎ یہ کتاب جیسا کہ اس کے نام سے ظاہر ہے پروفیسر صاحب کی زیر تصنیف تاریخ ہندوستان کی تمہید ہے۔ یہ حقیقت اب عالم آشکار ہو چکی ہے کہ ہمارے مدرسوں میں جو تاریخ ہند کا درس ہوتا رہا ہے وہ حقیقت سے دور اور قصداً ہندوستانی ذہن کو مسخ کرنے کے لئے ہوتا ہے۔

خوشی کی بات ہے کہ اب اس نقصان کی تلافی کی طرف لوگ متوجہ ہو چکے ہیں، چنانچہ زیر نظر کتاب اس کی تمہید ہے۔ اس میں بتایا گیا ہے۔ ہندوستان خصوصاً جنوبی ہند (دکن) اس وقت بھی مہذب اور متمدن تھا جب کہ یونان اور مصر بھی تہذیب کے علم بردار نہیں بنے تھے۔ "ن۔ م"

سوتیلی ماں۔ از محترمہ رابعہ بیگم صاحبہ چھوٹی تقطیع کے ۷۶ صفحات عمدہ طباعت قیمت ۴؎ سب رس کتاب گھر رفعت منزل خیریت آباد۔

اس مختصر مفید کتاب میں فاضل مصنفہ نے اصلاح معاشرہ کے بعض اہم پہلوؤں پر بڑی قابلیت سے روشنی ڈالی ہے، مختلف عنوان مثلاً ماں اور سوتیلی ماں، ارث و ماحول، فطرت، بچوں اور ماں کے اعزہ و اقربا، سوتیلی ماں، باپ، دوسری بیوی لانے سے قبل سوتیلے بچے وغیرہ کے تحت نہایت وضاحت سے سوتیلی ماں اور سوتیلے بچوں کے تعلقات خوش گوار بنانے کے مفید طریقے بیان کئے ہیں اور اس سلسلے میں باپ، سوتیلی ماں اور بچوں کے فرائض اور حقوق پر سبق آموز پیرایے میں اپنے اعلیٰ تاثرات قلمبند کئے ہیں، یہ کتاب اس قابل ہے کہ ہر وہ مرد جو اپنے بچوں کے لئے سوتیلی ماں لانے پر مجبور ہوا ہو اور ہر وہ خاتون جو سوتیلی ماں بن چکی ہو یا بننے والی ہو اور وہ ذی شعور بچے جو سوتیلی ماں کے

زیر سایہ آ چکے ہوں خصوصیت کے ساتھ اس کو غور سے پڑھیں۔
اور سمجھیں اور لائق مصنف کی قیمتی نصیحتوں پر عمل کر کے اپنی
زندگیوں اور گھر کی فضا کو خوش گوار بنائیں۔ ہر مرد اور ہر
عورت کو بھی اس کتاب کے پڑھنے کی اس لئے ضرورت ہے کہ
نہ معلوم کب کس مرد کو اپنے بچوں کے لئے سوتیلی ماں لانے کی
ضرورت ہو اور اسی طرح کسی خاتون کو بھی کبھی سوتیلی ماں
بننا پڑے۔ "س"

نوائے کارگر
آتش خاموش
چراغاں

احسان ایک غریب مزدور شاعر ہے جس کا
کلام زندگی کی تلخیوں کو بے نقاب کرنے
میں بڑی حد تک کامیاب سمجھا جا سکتا ہے۔
وہ ان بد مست اور نقال شاعروں میں سے نہیں ہے۔
جو خود تو اچھا کھاتے، اچھا پہنتے اور موج کرتے رہتے ہیں۔
لیکن اندھی تقلید یا فیشن کی خاطر غریبوں کی زندگی سے متعلق
نظمیں لکھتے ہیں۔ یہ لوگ پرانے قصیدہ گو شاعروں کی طرح
فرضی اور فرمائشی شاعری کرتے ہیں۔ فرق صرف اتنا ہے کہ
بے چارے قصیدہ گو روپے پیسے کے لالچ میں لکھا کرتے
تھے اور یہ شاعر نام و نمود اور جدت پسندی کی ہوس میں
لکھا کرتے ہیں۔

" احسان کا پہلا مجموعہ نوائے کارگر ہے جو ۲۶۰ صفحات
پر مشتمل ہے۔ ابتدا ایک دیباچہ یا تعارف سے ہوتی ہے جو اشارات
کے عنوان سے لکھا گیا ہے اس کو شاعر کے ایک دوست
محمد توقیر صاحب طاہر گنگوہی نے لکھا ہے۔ وہ لکھتے ہیں۔

احسان میرا عزیز دوست ہے اور قریب ترین
اعزا سے مجھے عزیز تر۔ لیکن بد قسمتی سے زندگی کے تلخ تجربات
نے اسے اعزا سے خائف اور احباب سے مایوس کر دیا ہے۔"
شاعر کے حالات کے سلسلے میں لکھا ہے۔

" لاہور میں احسان نے مزدوری بھی کی اور معماری بھی۔
پہرہ داری بھی کی اور باغبانی بھی۔ لیکن اسے کبھی رات کو
بارہ بجے سے پہلے اور صبح کو چار بجے کے بعد مصروف خواب
نہیں دیکھا اور آج تک اس کا یہی پروگرام ہے۔"
اس کتاب میں شاعر کی ایک اچھی تصویر بھی ہے جس کو
دیکھ کر اس مزدور شاعر کا وہ قول یاد آ جاتا ہے جو اس کے
دوست نے اپنے اشارات میں نقل کیا ہے کہ
" یاد رکھو میری بوریے پہ آنکھیں کھلی ہیں اور قالین پر دم نکلے گا"
نوائے کارگر میں سو سے زیادہ نظمیں اور تقریباً بیس
غزلیں ہیں۔ نظموں کو مختلف عنوانوں مثلاً حسن خیال،
ساغر، قلب و نظر، زبور محبت، ہجوم خیال اور لہریں وغیرہ
کے تحت تقسیم کیا گیا ہے۔ پہلے عنوان میں حمد و نعت ہے۔
نعت میں ایک بڑی پاکیزہ نظم ہے جس کے چند آخری شعر یہ ہیں۔

غلاموں کو دیا اس شان سے پیغام آزادی
کہ گردش میں ہے تیرہ سو برس سے جام آزادی
کتاب اس پر وہ اتری ہے جسے قرآن کہتے ہیں
تمدن کی تدبر کی وفا کی جان کہتے ہیں
وہ قرآں جس کی ضو سے بزم باطن میں اجالا ہے
وفا میں سربلندی ہے حریت کا بول بالا ہے
جہاں جب تک جہاں میں عظمت قرآں باقی ہے
مکمل یادگار سید ذی شان باقی ہے
جو ہے قرآں کا منکر اس کا ایماں ہو نہیں سکتا
غلامی کا جو حامی ہے مسلماں ہو نہیں سکتا

" احسان کی نظموں کا دوسرا مجموعہ چراغاں ۳۰۰ صفحات
میں چھپا ہے۔ اس میں تقریباً "پون سو" نظمیں اور بیس سے زیادہ
غزلیں ہیں۔ ان نظموں میں بھی حقیقت کی تلخیوں کو اس خاص رنگ میں

بے نقاب کیا گیا ہے۔ نمونہ کے طور پر ایک ایسی نظم کے چند شعر پیش ہیں جو ہم میں سے شاید اکثروں کے حالات زندگی پر منطبق ہوتی ہو گی۔

اک دن کہ دوپہر کی جوانی تھی کامیاب
آتش فشانیوں میں تھا مصروف آفتاب

تھی بام و در پہ روح جہنم فسانہ خواں
جھنجھلائی سی زمین بھڑکتا سا آسماں

طیارہ دھوپ میں جو اٹھے گل کے گر پڑے
طائر اڑے ہوا میں تو پر جل کے گر پڑے

ایسے میں اک مریض ادب خستہ و زبوں
لے کر عقیدتوں کا ابھارا ہوا جنوں

ہر سانس میں خلوص کی خوشبو لیے ہوئے
دل میں خیال خدمت اردو لیے ہوئے

سودا رسوخ کا نہ جنون مصاحبت
سرسام منتوں کا نہ خبط ملازمت

خواہش نہ ترمیم کی نہ سفارش کی آرزو
شہرت کی اور نہ داد نگارش کی آرزو

ملنے کو اک محافظ اردو کے گھر گیا
رد کا ہزار ذوق خودی نے مگر گیا

نکلی کا جس کی سارے زمانے میں شور ہے
اس میں بھی زور اس کے قلم میں بھی زور ہے

ہے جس کے ننگ رخ کا زر و سیم پر مدار
قرنوں سے کامگار ہے پشتوں سے مال دار

لیکن بغیر پوچھے کہ آنے کا کیا سبب
اس دھوپ میں عذاب اٹھانے کا کیا سبب

باصد غرور جاہ و باندازِ پیچ و تاب
دولت کی بے خودی نے یہ بڑھ کر دیا جواب

آرام کا یہ وقت ہے اس وقت جائیے
گر ہو سکے تو شام کو تشریف لائیے

ارماں بھری نگاہ کو چکر سا آ گیا
دنیائے آرزو میں اندھیرا سا چھا گیا

رنگیں بیانیوں کے قدم رک کے رہ گئے
خودداریوں کے سبز علم جھک کے رہ گئے

ثابت ہوا کہ فطرت زر میں غرور ہے
شہرت کا طمطراق حقیقت سے دور ہے

احسان بن دانش کی نظموں کا تیسرا مجموعہ آتش خاموش ہے۔ اس میں ڈیڑھ سو صفحات کی نظمیں اور پچاس صفحات کی غزلیں ہیں۔ ان تین مجموعوں کے علاوہ اور دو مجموعے نفیر فطرت، جادۂ نو، کی اشاعت کا بھی اعلان کیا گیا ہے۔ یہ سب کتابیں اردو شاعری میں ایک صحت مند اور مفید اضافہ ثابت ہوں گی۔ اور ان نوجوانوں کے لیے خضر منزل کا کام دیں گی جو شاعرانہ ترنگوں، شبابیاتی کیفیتوں اور آزادی و رعنائی خیال کے لیے ضروری سمجھتے ہیں کہ مذہب شائستگی اور تہذیب کو گالیاں دیے بغیر گزر نہیں۔ احسان کے کلام میں حریت و آزادی اور خلوص و صداقت اور پاکیزہ جذبۂ عمل نے جس خوبی سے امتزاج پایا ہے اس کی نظیر جدید اردو شاعری میں مشکل سے ملے گی۔ اور یہ تمام خوبیاں نتیجہ ہیں علم و کمال اور محنت و عمل کے دوش بدوش چلنے کا۔ جہاں ان میں سے ایک نے دوسرے کا دامن چھوڑا اور وہ بے ڈھنگا پن اور بے راہروی پیدا ہو گئی جو عہد حاضر کے بعض برخود غلط نوجوان شاعروں اور ادیبوں کا طرۂ کمال ہے۔

زور

بچوں سے

...ں ایک ماہ کے عرصے میں کیا کیا ہوا۔ حیدرآباد نے جشن سال نو منایا۔ کیونکہ حیدرآباد
کے سب سرکاری کاموں کا تعلق فصلی مہینوں اور سال سے ہوتا ہے۔ سال نو نہ صرف حیدرآباد بلکہ بعض اضلاع
نامگر، نظام آباد وغیرہ میں بھی بڑی کامیابی کے ساتھ منایا گیا اس موقع پر میلا اور دوسرے دلچسپ مشاغل بھی ہوتے ہیں ...
بھی ترتیب دیا جاتا ہے۔ آپ نے بھی کسی جلسے میں ضرور شرکت کی ہوگی۔

ہاں ایک بات آپ سے یہ کہنی ہے۔ بعض بچوں نے ہمارے پاس لکھ بھیجا اور بعضوں نے گفتگو کی۔ ...
...س کی ایک ایسی مجلس قائم کرنا چاہتے ہیں جس میں بچے ہی تقریر کریں گے۔ بچے ہی نقلیں پڑھیں گے اور
اس طرح کے دوسرے مفید مشغلے رہیں گے۔ ہمارا بھی کئی دن سے یہی خیال تھا اس طرح آپ تحریر کے ساتھ ساتھ
تقریر میں بھی مہارت پیدا کرنے کی کوشش کر سکتے ہیں۔ آپ کا کیا خیال ہے؟ جلد سے رائے لکھ بھیجئے۔
دیکھیں اس طرف پہلے حیدرآبادی بچے توجہ کرتے ہیں یا باہر کے۔ اگر یہ تحریک کامیاب رہی تو اس سے متعلق
مزید باتیں بتائیں گے۔

صفحہ ۵ پر جو اعلان کیا گیا ہے اسے ضرور پڑھیں۔ ہمارے بھائیوں اور بہنوں کی خط وکتابت کا
طریقہ پر عمل رہی ہے۔ نور نصر الدین بنگلور کو توجہ دلائی جاتی ہے کہ وہ عارف علی انصاری سے خط وکتابت کر...

گزشتہ پرچے میں ایک معمہ دیا گیا تھا اس کا صحیح حل یہ ہے۔ (۱) سانپ (۲) بندر (۳) ریچھ (۴) ہر...
(۸) شیر (۹) چیتا۔ بہت بچوں نے اس میں حصہ لیا جن اصحاب کے بالکل صحیح حل وصول ہوئے ان کے نام
نیچے لکھے جاتے ہیں۔

(۱) عارف علی انصاری (۲) وہاب شطاری (۳) فیروز الدین صدیقی (۴) سید محمود علی (۵) سید یوسف علی
(۶) احمد علیم الدین (۷) حبیب شمس (۸) عطیہ سلطانہ۔

اس ماہ میں ایک اور معمہ دیا جاتا ہے۔ یہ بھی بڑا ہی دلچسپ ہے اس کو حل کر کے ۱۵ نومبر تک بھیج سکتے ہیں۔

معین الدین احمد انصاری

انعامی معمہ

سوال:۔ آٹھ خط مستقیم ایسے کھینچے جائیں جس میں کا ہر خط آٹھ زاویے بناتا ہو۔

نوٹ:۔ صحیح حل والے صاحب کو ایک جلد "نظام الملک آصفجاہ اول" مصنفہ شیخ چاند صاحب با تصویر دی جائے گی
اگر زیادہ صحیح حل وصول ہوں تو قرعہ اندازی سے انعام نکالا جائے گا۔ تمام حل ۱۵ نومبر تک دفتر میں آجانا چاہیے

سید خواجہ معین الدین (متعلم ہشتم الف فوقانیہ...)

"میں چگوں سو کیا؟"

ایک تھی چڑیا۔ وہ نکلی کہیں چگنے۔ دور سے
اس کو ایک چنے کا دانہ نظر آیا۔ یہ بھوکی تو تھی ہی
فوراً اتر پڑی اور جھٹ سے دانہ اٹھا چلی وہاں سے
اڑتی ہوئی کہ کہیں چین سے بیٹھ کر اسے کھائے۔

اڑتے اڑتے وہ ایک مکان کی چھت پر
پہنچی۔ وہاں پڑا تھا ایک کاٹھ کا ٹکڑا۔ یہ چونچ
میں چنے کا دانہ لئے ہوئے اس پر جا بیٹھی اور دانہ
کاٹھ پر رکھ کر ستانے لگی۔

کاٹھ میں ایک سوراخ تھا۔ چنے کا دانہ اس میں
گر پڑا۔ جب چڑیا دم لے چکی تو اس نے چاہا کہ چنے کا دانہ
کھائے لیکن دانہ سوراخ میں پھنسا ہوا تھا۔ اس نے
بہت کوشش کی کہ چونچ سے اس کو نکال لے لیکن
سوراخ تھا چھوٹا سا اس میں سے دانہ نہ نکل سکا۔

چڑیا نے جب دیکھا کہ دانہ نکلتا نہیں ہے تو
بڑی عاجزی سے کاٹھ سے کہنے لگی۔

کاٹھ کاٹھ چنا دے، کاٹھ کاٹھ چنا دے

"میں چگوں سو کیا"

کاٹھ نے چنا دینے سے انکار کر دیا۔ یہ وہاں
سے گئی بڑھائی کے پاس اور بڑھائی سے کہا۔

"بڑھائی بڑھائی کاٹھ چیر
کاٹھ چنا دیتا نہیں
میں چگوں سو کیا؟"

بڑھائی نے کہا "ایک چنے کے دانے کے لئے
میں کاٹھ کہاں چیرتا پھروں۔ دور ہو یہاں سے [illegible]
چڑیا گئی راجہ کے پاس فریاد کر کے کہا۔

"راجہ راجہ بڑھائی ڈانٹ
بڑھائی کاٹھ چیرتا نہیں
کاٹھ چنا دیتا نہیں
میں چگوں سو کیا؟"

راجہ نے ہنس کر کہا "خوب! اتنی سی بات کے لئے
میں بڑھائی کو ڈانٹوں۔ نکل یہاں سے [illegible]
چڑیا گئی رانی کے پاس اور رانی سے کہنے لگی۔

"رانی رانی راجہ سے روٹھ
راجہ بڑھائی ڈانٹتا نہیں
بڑھائی کاٹھ چیرتا نہیں
کاٹھ چنا دیتا نہیں
میں چگوں سو کیا؟"

رانی نے کہا "دیوانی ہوئی ہے۔ ذرا سے چنے کے
دانے کے لئے میں اپنے راجہ سے روٹھوں؟ یہ تو مجھ
سے نہیں ہو سکتا۔" چڑیا گئی چوہے کے پاس اور چوہے
سے التجا کرنے لگی کہ

"چوہے چوہے رانی کا کھٹولا کاٹ
رانی راجہ روٹھتی نہیں
راجہ بڑھائی ڈانٹتا نہیں
بڑھائی کاٹھ چیرتا نہیں
کاٹھ چنا دیتا نہیں
میں چگوں سو کیا؟"

چوہے نے کہا "بی چڑیا، میں کھٹولا کاٹوں [illegible]

تمھارا چگنے کا دانہ ملے گا۔ تم کہیں اور جاؤ۔" چڑیا گئی
بلی کے پاس اور دل میں یہ سوچنے لگی کہ "ٹھیرو میاں
چوہے کو مزا چکھا دوں گی۔" بلی سے کہنے لگی۔

"بلی بلی چوہے کو کھا
چوہا رانی کھٹولا کاٹتا نہیں
رانی راجہ روٹھتی نہیں
راجہ بڑھائی ڈانٹتا نہیں
بڑھائی کاٹھ چیرتا نہیں
کاٹھ چنا دیتا نہیں
میں چگوں سو کیا؟"

بلی نے کہا "میری بلا سے میں کیا کروں؟
میں تو چوہے کو کھانے سے رہی!" چڑیا اپنا سا منہ
لے لکڑی کے پاس پہنچی کہ بی بلی کو کچھ سزا دلوائے۔
لکڑی سے کہنے لگی۔

"لکڑی لکڑی بلی مار
بلی چوہا کھاتی نہیں
چوہا رانی کھٹولا کاٹتا نہیں
رانی راجہ روٹھتی نہیں
راجہ بڑھائی ڈانٹتا نہیں
بڑھائی کاٹھ چیرتا نہیں
کاٹھ چنا دیتا نہیں
میں چگوں سو کیا؟"

لکڑی نے کہا "چل چل میں ان باتوں میں
نہیں پڑتی۔" چڑیا چلی آگ کے پاس اور آگ سے
یوں بولی۔

"آگ آگ لکڑی جلا
لکڑی بلی مارتی نہیں
بلی چوہا کھاتی نہیں
چوہا کھٹولا کاٹتا نہیں
رانی راجہ روٹھتی نہیں
راجہ بڑھائی ڈانٹتا نہیں
بڑھائی کاٹھ چیرتا نہیں
کاٹھ چنا دیتا نہیں
میں چگوں سو کیا؟"

آگ نے کہا "جانے میری بلا سے! میں کیا جانوں
کہ تم کیا چگو!" چڑیا پھر چلی سمندر کے پاس اور سمندر سے کہا

"سمندر، سمندر آگ بجھا
آگ لکڑی جلاتی نہیں
لکڑی بلی مارتی نہیں
بلی چوہا کھاتی نہیں
چوہا رانی کھٹولا کاٹتا نہیں
رانی راجہ روٹھتی نہیں
راجہ بڑھائی ڈانٹتا نہیں
بڑھائی کاٹھ چیرتا نہیں
کاٹھ چنا دیتا نہیں
میں چگوں سو کیا؟"

سمندر نے کہا "مجھ سے تو یہ نہیں ہو سکے گا۔" چڑیا چلی
ہاتھی پاس اور ہاتھی سے کہا کہ۔

"ہاتھی ہاتھی سمندر سوکھ (پی جا)
سمندر آگ بجھاتا نہیں

آگ لکڑی جلاتی نہیں
لکڑی بلی مارتی نہیں
بلی چوہا کھاتی نہیں
چوہا رانی کھٹولا کاٹتا نہیں
رانی راجہ روٹھتی نہیں
راجہ بڑھائی ڈانٹتا نہیں
بڑھائی کاٹھ چیرتا نہیں
کاٹھ چنا دیتا نہیں
میں چگوں کیا کھاؤں؟"

ہاتھی نے یہ سب سن کر اپنی گردن ہلائی اور کہا " اونھ ہو کچھ میں تو اس معاملہ میں دخل نہ دوں گا۔ زبردستی سمندر کا پانی کیوں سوکھوں؟"

اب چڑیا لگی سوچنے کہ کیا کروں جھٹ اس کو خیال آیا کہ چلو چیونٹی پاس چلیں اس کام میں تو وہی مدد کر سکے گی۔ فوراً چیونٹی پاس پہنچی اور اس سے کہا کہ

" چیونٹی چیونٹی ہاتھی کی سونڈ میں گھس
ہاتھی سمندر سوکھتا نہیں
سمندر آگ بجھاتا نہیں
آگ لکڑی جلاتی نہیں
لکڑی بلی مارتی نہیں
بلی چوہا کھاتی نہیں
چوہا رانی کھٹولا کاٹتا نہیں
رانی راجہ روٹھتی نہیں
راجہ بڑھائی ڈانٹتا نہیں
بڑھائی کاٹھ چیرتا نہیں
کاٹھ چنا دیتا نہیں
میں چگوں کیا کھاؤں؟"

چیونٹی نے کہا "بہن یہ کتنی بڑی بات ہے چلو میں ابھی چلتی ہوں" یہ کہہ کر چیونٹی جونہی لگی ہاتھی کی سونڈ میں گھسنے۔
ہاتھی نے کہا "میری سونڈ میں نہ کوئی گھسیو میں سمندر سوکھتا ہوں"
سمندر نے کہا "مجھے کوئی نہ سوکھیو میں آگ بجھاتا ہوں"
آگ نے کہا "مجھے کوئی نہ بجھائیو میں لکڑی جلاتی ہوں"
لکڑی نے کہا "مجھے کوئی نہ جلائیو میں بلی مارتی ہوں"
بلی نے کہا "مجھے کوئی نہ مارے میں چوہا کھاتی ہوں"
چوہے نے کہا "مجھے کوئی نہ کھائیو میں رانی کھٹولا کاٹتا ہوں"
رانی نے کہا "میرا کھٹولا نہ کوئی کاٹیو میں راجہ روٹھتی ہوں"
راجہ نے کہا "مجھے نہ کوئی روٹھے میں بڑھائی ڈانٹتا ہوں"
بڑھائی نے کہا "مجھے کوئی نہ ڈانٹے میں کاٹھ چیرتا ہوں"
کاٹھ نے کہا "مجھے کوئی نہ چیرے میں چنا دیئے دیتا ہوں"

"سب رس" کے ناظرین اسی طرح کی دلچسپ کہانیاں بڑی بوڑھیوں سے سن کر لکھیں اور سب رس کے لئے روانہ کریں تو سال بھر کی بہترین کہانی پر سب رس کی طرف سے انعام دیا جائے گا۔

یہ کہہ کر کاٹھ نے چنا دیدیا۔ چڑیا جھٹ سے اپنا چنا اٹھا یہ جل وہ جل چلتی بنی۔ چلو ہو گئی کہانی اور اب کہانی پر پتھر اور ہمارا کہا رہے ہر اللہ میاں کا چھتر۔
سکینہ بیگم

پتنگ

نہایت ہے پیارا مجھے یہ پتنگ ۔ نہ کھاتا ہے کتنا نہ کھاتا ہے لنگ
بڑے اچھے ہیں اس کے ٹھڈی کماں ۔ ذرا دیکھئے آپ بھی بابا جاں
بہت مجھ کو بھاتا ہے یہ روپ رنگ ۔ یہ پھندنا گلابی یہ دھانی پتنگ
ابھرتا ہوا اور لچکتا ہوا ۔ یہ اڑتا ہے کیسا اکڑتا ہوا
وہ پھر تیر سا نیچے آکر اٹھا ۔ یہ بجلی سا پھر غوطہ کھا کر اٹھا
یہ اُڑنے میں کیا تیز ہے واہ واہ ۔ ذرا ڈھیل دی بس ہوا ہو گیا
کبوتر سا پر پھڑپھڑاتا ہوا ۔ ہوا پر چلا سرسراتا ہوا
اڑانا تو ہے آگیا مجھ کو ہاں ۔ لڑانا سکھا دو ذرا بھائی جاں
تو پھر دیکھنا اتنے کاٹوں پتنگ ۔ کہ ہو جائیں بس دیکھ کر آپ دنگ

تقریر

لطیف النساء بیگم

میرے خیال میں ملک و قوم کی خدمت کرنے کے لئے تقریر کے سوا کوئی دوسرا بہترین ذریعہ نہیں ہم تقریر کے ذریعہ قوم کی اصلاح کر سکتے ہیں اور ملک کو شاہراہ ترقی پر لا سکتے ہیں۔ عموماً ہر طالب علم کی یہی خواہش ہوتی ہے اور خصوصاً ہماری یہی دلی خواہش رہی کہ کسی نہ کسی طرح سے ملک و قوم کی خدمت کریں۔ لیکن سوال یہ تھا کہ ہم کو ایسا کونسا طریقہ کار اختیار کرنا چاہیئے جو ہم کو بڑے ہو کر ملک و قوم کی خدمت کرنے میں ممد و معاون ثابت ہو سکے۔ چنانچہ ہم نے یہ رائے قائم کی کہ ہم کو ابھی سے تقریر کرنے کی مشق کرنی چاہیئے اور مضمون نویسی میں مہارت پیدا کرنی چاہیئے جو کہ آیندہ چل کر ہمیں ملک و قوم کی خدمت کرنے میں بے حد مدد دے گی۔ اس قیاس آرائی کے بعد سے ہی ہم نے مختلف رسائل خصوصاً "سب رس" کا خاص دلچسپی سے مطالعہ شروع کیا تا کہ ہم کو مضمون لکھنے کے طریقے معلوم ہو جائیں اور کالج میں جتنی بھی تقاریر ہوتیں انہیں بغور سنتے اور مقرر کو رشک بھری نگاہوں سے دیکھتے۔ مثل مشہور ہے۔

"برباد کسی شخص کی محنت نہیں جاتی"

الغرض اتنی محنت و جانفشانی کے بعد ہم میں تقریر کرنے اور مضمون لکھنے کا کسی قدر ملکہ پیدا ہو چکا تھا۔

خدا کے فضل و کرم سے ہم نے ششم کے امتحان سے فارغ ہونے کے بعد تعلیم کی ساتویں منزل میں قدم رکھا۔ گویا ہمارے سوتے ہوئے نصیب جاگے۔

خدا خدا کر کے وہ دن بھی آن پہونچا جب کہ ہماری دلی مراد جو رہ رہ کر ستاتی تھی بر آئی۔ چنانچہ ہماری مادر کلیہ کے ایک پرانے اور تجربہ کار استاد محترم جناب مولوی فیض الحسن صاحب نے ہماری دلی آرزو پوری کرنے کا بیڑا اٹھایا یعنی ایک انجمن قائم کی اور مڈل کی جماعتوں (الف، ب، ج، د) سے اراکین و عہدہ دار منتخب کئے گئے۔ اس کے بعد سے ہمارا عملی پروگرام شروع ہوا۔ ہر جماعت میں ہر پنجشنبہ کو تقریری مقابلہ منعقد کیا جانے لگا۔ اور ہر ماہ کرسٹ ہال میں مڈل کی جماعتوں کا تقریری مقابلہ ہونے لگا۔ کرسٹ ہال کے سب سے پہلے مقابلہ کا عنوان سینما بینی کے فوائد یا سینما بینی کے نقصانات تھا۔ جس میں ہفتم الف نے شایان شان کامیابی حاصل کی اور صف اول میں جگہ پانے کی مستحق قرار پائی۔ یہ بعض طلبائے ہفتم الف کی کوشش اور محترم جناب فیض الحسن صاحب کی حسن توجہ کا نتیجہ ہے۔ اسی سلسلہ میں طلباء ہفتم الف نے اپنے محترم استاد و صدر انجمن کے اعزاز میں ایک ٹی پارٹی ترتیب دی تھی جس میں مختلف طلباء الف نے موصوف کے اوصاف پر روشنی ڈالی ان تقاریر کے بعد موصوف کو پھول پہنائے گئے اس کے بعد تصویر کشی ہوئی اور جلسہ برخاست ہوا اسی موقع پر دھیراج کمار متعلم ہفتم الف نے ایک دلکش نظم سنائی جس کو حاضرین نے بے حد پسند کیا اس نظم کے چند اشعار درج کئے جاتے ہیں۔

اے قلم حاجت ہے مجھ کو اب تری امداد کی
آج لکھنی ہے ثنا مجھ کو مرے استاد کی
ہاں رواں ہو جا خدارا اے مری طبع رواں
ہو عیاں ہر شعر سے خوبی مبارک باد کی
شفقتیں ان کی بیاں ہوں مجھ سے میری کیا مجال
تربیت تعلیم میں کیا کیا، سکوں استاد کی
علم کی دولت سے مالا مال کرتے ہیں ہمیں
جس کے آگے ہیچ ہیں سب نعمتیں اجداد کی
ان کے احساں سے بری ہوں حشر تک ممکن نہیں
حیثیت ماں باپ سے بھی بڑھ کے ہے استاد کی

پیدہ: احمد حسین انیٹر (ہفتم الف سکول)

مدرس سے خطاب

جو خلق میں افضل ہے لقب جس کا ہے انساں
خالق نے بنایا ہے تجھے اس کا نگہباں

کہتے ہیں یہ سب تجھ سے اجالا ہے جہاں میں
مشہور ہے تو شعلہ نفس کون و مکاں میں

اک تیرے اشارے سے ہو دنیا تہہ و بالا
ہو جائے جہالت کا وہیں دیس نکالا

رفتار سے گفتار سے کردار سے اپنے
بھٹکے ہوئے انسانوں کو تو راہ بتا دے

تو خلق سراپا ہے تو ایثار مجسم
رکھتا ہے تری لاج بہت خالق عالم

فاقوں میں بھی دینا ہے تجھے درس تحمل
ہستی تری مٹ جائے پہ دہلے نہ ترا دل

جوں شمع تپش سے ہے تری بزم چراغاں
رہنا ہے تجھے سوز دروں ہی پہ نازاں

تو کارگہِ دہر میں عرفاں کی ہے تفسیر
واقف ہے کم و بیش سے اے صاحب تدبیر

غفلت سے تری دم میں اجڑ جائے گی دنیا
توکل سے جو بیٹھے تو بگڑ جائے گی دنیا

آرام کی خواہش کو میں بے جا نہیں کہتا
راحت کی طلب سے تجھے باز آ نہیں کہتا

میں یہ نہیں کہتا کہ تو انسان نہیں ہے
جذبات میں تیرے کوئی ہیجان نہیں ہے

معبود نے تجھ کو بھی دیئے ہیں زن و فرزند
فطرت ہی کہتی ہے رکھے تو انھیں خورسند

لیکن ہوس زر ترا مقصود نہیں ہے
اے نائب حق یہ ترا معبود نہیں ہے

چوکھٹ پہ کسی کی نہ جبیں تیری ہو نیچی
اجرت تری جز تحفۂ دل ہو نہیں سکتی

کوتاہ نظر صاحب زر کے ہیں پرستار
کتوں سے بھی بدتر ہیں خراب ان کے ہیں اطوار

ٹکڑا انھیں دولت کے دھنی ڈال بھی دیں گے
آوارہ یہ سگ ہیں انھیں یوں ٹال بھی دیں گے

پیسہ تو طوائف بھی کما لیتی ہے لیکن
عزت جو گئی اس کا مداوا نہیں ممکن

جو آن پہ مرتے ہیں وہ ایسا نہیں کرتے
خوددار کبھی ذات سے بے جا نہیں کرتے

پھیلے کے نہ خوشامد ترے نزدیک خدارا
تو جھیل لے سختی پہ اسے کر نہ گوارا

جگ میں جسے کردار کی تعمیر ہے کرنا
بھاتا نہیں ہر خورد و کلاں سے اسے ڈرنا

ہاں خوف کے عنصر کو تو دنیا سے مٹا دے
بنیاد کو نخوت کی محبت سے تو ڈھا دے

ماں باپ سے بڑھ کر ہے معلم ترا رتبہ
بدبخت ہیں وہ تجھ سے جو کرتے ہیں محابا

دنیا ترے انصاف سے ہو جائے مسخر
دے درس عمل نیند کے ماتوں کو جگا کر

ہندو ہی سمجھنا نہ مسلمان سمجھنا
سب بھائی ہیں تیرے انھیں انسان سمجھنا

تو درس صداقت سے انھیں رام کرے گا
ٹوٹے ہوئے دل جوڑ کے تو نام کرے گا

اٹھ دیس کو گرداب فنا سے تو بچا لے
جھوٹے ہیں یہ لیڈر انھیں میداں سے ہٹا دے

مرزا سرفراز علی (ہیڈ ماسٹر ہائی اسکول ...)

اچھی صورت

قمر جہاں کو خدا نے ایک معزز اور دولت مند خاندان کی آغوش عطا فرمائی تھی۔ لیکن افسوس حسن کے خزانے سے یہ کچھ اس طرح محروم کر دی گئی تھی کہ سیاہ فام تو تھی ہی اس پر چیچک کے چونڈے پھلے اور گہرے اُبل اور سامنے کے دو زرد اُبل دانتوں نے اور بھی غضب کر دیا تھا۔ ان سب باتوں پر طرہ یہ کہ جاہل اور بے ہنر بھی تھی۔ ماں کے لاڈ پیار نے اور بھی تباہ کر دیا تھا۔ قمر کا باپ بے چارہ نہایت ہی شریف آدمی تھا۔ اس کے ماں باپ کی دلی خواہش تھی کہ قمر کسی اچھے شخص سے بیاہی جائے۔ بات چیت چھڑتے پر ان کو کچھ عزیزوں اور دوستوں نے مشورہ دیا کہ لڑکی کی شادی کسی خاندانی گر غریب شخص سے کر دو جو تمہارے گھر میں تمہارے ہی ٹکڑوں پر پڑا رہے۔ لیکن معلوم نہیں کہ قمر کے والد رضا احمد نے کیوں اس مشورے کو نہ سنا اور انھوں نے مشہور کر دیا کہ اپنی جائداد میں سے دو گاؤں (جو تقریباً دو لاکھ کی مالیت کے تھے) اپنی لڑکی قمر کے جہیز میں دوں گا۔ اس بیاہ سے پہلے ہی لڑکے والوں میں سے کسی نے لڑکی کو دیکھ لیا اور یہ سب بنا بنایا کھیل بگڑ گیا۔ قمر کی عمر اب بیس سال کی ہو چکی تھی اگر دوراندیشی سے کام لیتے تو علم و ہنر کے زیور سے آراستہ کر کے کسی غریب کے حوالے کر دیتے جو دولت کے دباؤ میں ہمیشہ ہمیشہ کے لئے اس کا غلام بن کر رہتا۔ لیکن حقیقت تو یہ ہے کہ اولاد خواہ وہ کتنی ہی بدصورت اور بدسیرت کیوں نہ ہو ماں باپ کی نظروں میں اچھی ہی معلوم ہوتی ہے۔ ہر وقت انکی خواہش ہوتی ہے کہ جو بھی ہو اولاد خوش و خرم شاد و آباد رہے۔ یہی وجہ تھی کہ قمر کے والدین اس کی شادی کے لیے سخت متفکر تھے۔ اور ساتھ ہی ساتھ یہ بھی چاہتے تھے کہ جس تدبیر سے بھی ہو یہ کسی اچھے اور بڑے گھر میں چلی جائے۔ اسی اثناء میں ایک اجنبی نوجوان کا تبادلہ جس کا نام اختر تھا اور جو فوج میں کسی اچھے عہدے پر تھا اتفاقاً اس مقام پر ہوا جہاں قمر کے ماں باپ رہتے تھے اور کسی پیغام رساں کے ذریعہ سے اس کا پیغام قمر کے لئے آیا۔ دریافت کرنے پر معلوم ہوا لڑکا نہ صرف خاندانی بلکہ نیک اور خوش مزاج بھی ہے۔ بس پھر کیا تھا دو چار دن میں نسبت ٹھیر گئی۔ قمر کے والد رضا احمد نے بات کی بات میں تیاریاں کر کرا کے شادی کی تاریخ بھی مقرر کر دی اور قمر کو مانجھے بھی بٹھلا دیا گیا۔ یہاں جہیز بننے لگے لیکن اسی سلسلے میں کسی دشمن نے جا کر اختر سے کہہ دیا کہ بھائی کہاں کی شادی کرنے بیٹھے ہو ذرا تو تحقیق کی ہوتی لڑکی ایسی بدصورت ہے کہ اگر تم اندھیرے میں دیکھو تو چیخ مار سر پر پاؤں رکھ کر بھاگ کھڑے ہو گے۔ کہاں کی آفت میں پڑ رہے ہو۔ زندگی وبال ہو جائے گی۔ خود تو ماشاءاللہ ایسے حسین ہو اور دلہن ایسی کہ بس بالکل چڑیل کی خالہ معلوم ہوتی ہے یہ سن کر اختر کے پاؤں تلے زمین نکل گئی۔ گھبرا گیا اور فوراً قمر کے گھر یہ پیغام بھیجا کہ میں نے ایسی خبریں سنی ہیں۔ اگر یہ صحیح ہے تو مجھے معاف فرمائیے۔ یہ خبر قمر کے ماں باپ پر کڑکتی ہوئی بجلی کی طرح گری اور وہ بے چین و مضطرب ہو گئے لیکن بجز

ہوش وحواس کو بجا رکھنے کی کوشش کرتے ہوئے عزیزوں کو
جمع کرکے کہا چونکہ شادی کا سامان ہو چکا اور تاریخ مقرر ہو چکی
اور مہمان بھی آگئے ہیں اس لئے اب جس طرح بھی اس
بدنامی سے جان بچ سکتی ہو بچائی جائے۔ چنانچہ سوچ
سانچ کر اختر کو یہ جواب بھجوا دیا گیا کہ یہ خبر جو تم نے سنی ہے
سراسر غلط ہے اپنی کسی ہمدرد سی عورت کو بھیج کر دلہن کو
دکھالو علاوہ اس کے تم کو آرسی مصحف کے وقت بھی
معلوم ہو جائے گا کہ یہ بات جھوٹ ہے یا سچ۔ اس سے
چھٹی پاکر اب اس مسئلہ پر غور کیا گیا کہ آخر اس بے
سروپا جھوٹ کو نباہا کس طرح جائے۔ مشورہ دینے
والوں نے کہا یہ کتنی بڑی بات ہے کسی خوبصورت
لڑکی کو دکھلا دیا جائے گا اب رہا آرسی مصحف اس وقت
اللہ مالک ہے۔ شادی کے بعد پھر کوئی کر ہی کیا سکتا
ہے۔ مجبوراً راضی ہو کر نباہنا ہی پڑے گا۔ قمر کی ایک
سہیلی سلطانہ جو انتہائی خوبصورت اور قمر کی ہم سن
تھی اس کی شادی ہوئے تقریباً چار سال کا عرصہ
ہوا تھا چنانچہ اس کی ایک لڑکی بھی تھی۔ تمام پہلوؤں
پر اچھی طرح غور کرکے اس کو اس کام کے لئے منتخب
کیا گیا اور طے پایا کہ اس کو دلہن بنا کر بٹھایا جائے یہ
تجویز یقیناً کامیاب ثابت ہوتی اگر اختر اس راز سے
واقف نہ ہو جاتا لیکن وہاں تو کوئی بھیدی ہاتھ دھو کر
پیچھے پڑا تھا۔ اس نے سارا راز اختر سے فاش کردیا۔
اختر یہ تمام باتیں سن کر آگ بگولا ہوگیا۔ چاہتا تھا کہ فوراً
اس طلسمات سے اپنی جان چھڑائے کہ پھر اس کو کچھ خیال
آیا اور اس نے تمام باتوں پر غور کرکے اپنی جگہ پر ایک
رائے قائم کرلی اور بالکل خاموش ہو رہا۔

۲

برات کا جلوس بڑی دھوم دھام سے خراماں
خراماں آرہا ہے۔ دولہا بڑا خوش ہے لیکن دلہن
کے قریبی رشتہ دار نہایت مضطرب و پریشان ہیں۔
ان کے چہروں پر ایک خاص قسم کی اداسی چھائی ہوئی ہے
نکاح ہو چکا اب وقت آیا کہ رسومات کی تکمیل کے لئے
دولہے کو اندر بلایا جائے اور آرسی مصحف کی رسم ادا
کی جائے۔ سلطانہ کا شوہر کسی ضروری کام پر دو چار روز
سے غائب تھا اس وقت تک جو بھی تدبیریں کی گئی تھیں
اور سلطانہ سے اس سلسلے میں کام لیا جانے والا تھا ان کا
ذکر بھی سلطانہ سے نہیں کیا گیا۔ اس لئے جب سلطانہ کے
سامنے یہ تمام باتیں لائی گئیں وہ سخت پریشان ہوگئی
اور سوچنے لگی کہ اس کو کیا کرنا چاہیئے۔ بالآخر جب سب نے
کہا کہ کوئی ڈر کی بات نہیں تمہارے شوہر کو یہ راز معلوم
نہ ہو سکے گا تم مطمئن رہو۔ اس کے علاوہ قمر نے بھی اپنی
عزیز سہیلی کو بلا کر کہا کہ دیکھو سلطانہ تم اس معاملہ میں
پس و پیش نہ کرو میرے خاندان کی عزت کا سوال
ہے تم میری غمگسار سہیلی ہو میری مدد کرو۔ غرض سلطانہ
ہر طرف سے یہ باتیں سنتے سنتے تھک گئی تھی اور
اس کے دماغ میں اتنی گنجائش باقی نہیں تھی کہ وہ کچھ بھی
اس مسئلہ پر غور کرسکے۔ وقت کی تنگی نے اور بھی مجبور کر
رکھا تھا چنانچہ اس نے مرتے جیتے قبول ہی کر لیا اپنی
چھ ماہ کی بچی طیبہ کو دودھ پلا کر دوسروں کے حوالے
کرکے خود نہا دھو دلہنوں کا جوڑا پہن تیار ہوگئی۔

اختر کو یہ تمام خبریں تفصیل کے ساتھ پہونچ رہی تھیں، چنانچہ
جب دولھے کو اندر بلایا گیا اور آرسی مصحف کے لئے
دلہن کے نزدیک بٹھلایا گیا تو وہ چاند سا مکھڑا دیکھ کر انتہائی
خوش ہوگیا۔ رسومات کی تکمیل ہو جانے پر باہر سے پیغام
آیا کہ دولھے کو باہر بھیجدو اس کے دوست احباب بلا
رہے ہیں اور دو چار مرتبے اس پر اصرار بھی ہوا لیکن
دولھے میاں ہیں کہ دلہن کے پاس سے اٹھنے کا نام
ہی نہیں لیتے، دلہن والوں نے یہ صورت حال دیکھ کر
یہ کوشش شروع کردی کہ کسی طرح بھی دولھا باہر چلا جائے
لیکن ان کی ایک نہ چلی۔ یہاں تک کہ روانگی کا وقت
جس کا دھڑکا لگا ہوا تھا بلائے ناگہانی کی طرح سر پر
آ پہنچا ادھر اختر لیجرٹ کی اینٹ ہوکر رہ گیا تھا کہ کھسکنے کا
نام ہی نہیں لیتا تھا۔ دلہن کے عزیزوں نے مل کر جلد
بلد ایک کمیٹی کی اور یہ طے کردیا کہ فی الحال سلطانہ ہی کو دولھے
کے ساتھ بھیج دیا جائے اور ساتھ دو سمجھ دار عورتیں روانہ
کی جائیں جو سلطانہ کی ضروری حفاظت کریں اور وقتاً
فوقتاً تسلی اور دلاسا بھی دیتی رہیں تاکہ حمید یعنی سلطانہ
کے شوہر پر یہ راز نہ کھل سکے صبح سویرے یا تو دلہن
کو پہنچا کر سلطانہ کو واپس لایا جائے یا سلطانہ کو گھر بلا کر
اصل دلہن کو بھیج دیا جائے۔ افسوس اس بات کا ہے
کہ ان کمبختوں کو یہ معلوم ہی نہ تھا کہ خود ان میں سے
کوئی ہر بات کی رپورٹ اختر کو دے رہا ہے۔ چنانچہ
یہ تمام واقعات بھی اسی وقت ایک نامعلوم طریقہ پر اختر
تک پہنچا دئے گئے۔ سلطانہ کو روانگی کے لئے آمادہ
کرنا سہل نہ تھا لیکن پھر بھی یہ سمجھاتے ہوئے کہ یہ وقت

انتہائی نازک ہے خاندان بھر کی ناک کٹ جائے گی برائے
خدا عزت و آبرو برقرار رکھنے کے لئے چلی جاؤ صبح
تک تم کو کسی طریقہ سے واپس بلا لیا جائے گا تم ماشاء اللہ
سمجھ دار ہو۔ علاوہ اس کے تمھارے ہمراہ دو عورتیں
بھی کی جارہی ہیں جو تمھاری ہر وقت دیکھ بھال کرتی
رہیں گی۔ بہرحال کسی قسم کا خیال نہ کرو تمھاری ہر بات کا
ہم لوگوں کو خیال ہے۔ یہ تمام باتیں سمجھا بجھا کر آخر رضا مند
کرہی لیا۔ دولھے نے دلہن کو اپنے ہاتھوں سے گود میں
لے کر سوار کیا اور خود بھی بیٹھ گیا سلطانہ تو رخصت ہوگئی
لیکن آہ [illegible] رخصت [illegible]
اس پر طرہ یہ کہ [illegible] کی معصوم [illegible]
بلک رہی تھی۔ جب سلطانہ [illegible] ہوشیار
[illegible]
[illegible] جا رہا تھا۔
بار بار سوچ رہی تھی [illegible] کی معصوم
صورت اور حمید کی غضب آلود نگاہوں کا تصور قلب کو
اور بھی بے چین کئے دیتا تھا۔ اختر نے گھر پہونچتے ہی سب سے
پہلا کام یہ کیا کہ نوکروں کو [illegible] ان عورتوں کی خاطر
مدارات کی جائے اور [illegible] کریں فوراً مہیا
کی جائیں کسی قسم کی تکلیف نہ ہونے پائے۔ علاوہ اس کے
جہاں تک ہو سکے ہوشیاری سے رہنا [illegible] دروازہ
کسی حالت میں بھی بغیر بلا اجازت نہ کھولا جائے۔ اگر
کسی نے اس کے خلاف کیا تو جان ہی لے لوں گا اور
خود برآمدے میں پلنگ بچھا کر سو رہا۔ یہ سب پیش بندیاں
اس نے اس لئے کی تھیں کہ اس کا خیال تھا کہ آج رات

دلہن کو تبدیل کرنے کے لئے ضرور لوگ آئیں گے دلہن
یعنی سلطانہ کو دالان میں روتے روتے صبح ہوگئی۔
منہ اندھیرے نماز سے قبل دلہن کی طرف کے آدمی
اختر کے یہاں [illegible] گئے۔ پہلے تو یہاں اختر کے
آدمیوں نے دروازہ کھولنے سے انکار کردیا لیکن
جب [illegible] اصرار کرنے دروازہ کھلا اور میاں اختر آنکھیں
لال پیلی کئے ہوئے باہر برآمد ہوئے تو ان لوگوں نے
کہا کہ ہم لوگوں کی رسومات کے مطابق دلہن کو اس وقت
میکے جانا چاہیئے۔ آپ بھی ایک گھنٹے کے لئے تشریف
لا سکتے ہیں۔ دلہن شام تک رسومات کی تکمیل کے بعد
واپس بھیج دی جائے گی۔ اختر نے کہا اب میں ہرگز
ہرگز دلہن کو واپس نہ لے جانے دوں گا۔ مجھے یہ فضول
رسومات منظور نہیں اور نہ میں گھڑی گھڑی آنا جانا
پسند کرتا ہوں۔ پہلے تو دلہن والوں نے کہا کہ یہ
ایک قسم کی بدشگونی ہے۔ اگر اس رسم کی تکمیل نہ ہوگی
تو دولہا اور دلہن دونوں کے لئے خرابی ہے لیکن
جب ہزارہا تدبیروں کے بعد بھی نتیجہ صفر ہی رہا تو
مجبور ہو کر اصل واقعہ کا اظہار کرتے ہوئے منت
سماجت پر اتر آئے اور کہنے لگے کہ اب تک جو ہونا
تھا ہو چکا تم خوشی خوشی سلطانہ کو رخصت کرتے ہوئے
ہم کو بلوا لو۔ کل بھری مجلس میں بدنامی کے خیال سے
ہم لوگوں نے سلطانہ کو جو ایک شخص کی ہو چکی تھی برائے نام
تمہارے ساتھ کر دیا تھا۔ اب ہماری عزت و آبرو
تمہارے ہاتھ ہے۔ لیکن اختر نے ایک نہ سنی آخر میں
یہ کہتے ہوئے کہ میری دلہن میرے گھر میں موجود ہے۔
برائے مہربانی آپ لوگ تشریف لے جائیے دروازہ بند
کرلیا۔ دلہن کے رشتہ دار مایوس ہو کر چلے گئے۔ یہاں
حمید یعنی سلطانہ کا شوہر واپس آ ہی چکا تھا اب تک
تو وہ یہی سمجھ رہا تھا کہ سلطانہ اپنی سہیلی قمر کی شادی
میں شرکت کی غرض سے گئی ہے۔ وہ شادی کے گھر آیا
تو بجائے سلطانہ کے اپنی بچی طلیعہ کو بلکتے اور بلبلاتے
ہوئے دیکھا۔ دریافت کرنے پر انہی رہبر صاحب
نے جو اندارسے اختر کی رہبری فرما رہے تھے سارا
حال تفصیل سے کہہ سنایا جس کو سن کر حمید نے سر پیٹ لیا
اور بے عزتی کے ناقابل برداشت صدمے سے دیوانہ
سا ہو گیا۔ بے چارے رضا احمد حمید کو صورت
نہیں دکھا سکتے تھے گو ان کی نیت سلطانہ کے ساتھ
بدی کرنا تھی لیکن تقدیر کے سامنے تدبیر کی ایک نہ چل
سکی۔ وہ ہارے اور بہت بری طرح ہارے۔ اب
دنیا ان کی نظروں میں ہیچ معلوم ہو رہی تھی اور آسمان
و زمین گھومتے ہوئے دکھائی دے رہے تھے۔ بدنامی
رسوائی اور جگ ہنسائی کا خوف تھا ہی حمید کی صورت
دیکھ کر ان پر گھڑوں پانی پڑ گیا۔ رضا احمد افیون کھا کر
ہمیشہ ہمیشہ کے لئے سو رہے اور ساری مصیبتوں سے
نجات حاصل کرلی۔ حمید نے اپنی حسین بیوی کو حاصل
کرنے کے لئے قانون سے مدد چاہی۔ لیکن یہ عجیب محبت
کا مقدمہ تھا۔ اختر بھی خوب مقدمہ لڑا اس نے عدالت
کے روبرو واقعات کا صاف صاف اظہار کر دیا اور
کہا سیکڑوں بلکہ ہزاروں آدمیوں کے روبرو اس دلہن کو
میرے ساتھ بٹھایا گیا اور پھر میرے ساتھ روانہ بھی کر دیا گیا۔ میں اسے
کیسے چھوڑ سکتا ہوں یہ میری بیوی ہے۔

سرور فاطمہ عصمت

نصیحت

سدا رات کو چاند سے لڑنے والو
سناتا ہوں آؤ تمہیں اک کہانی

بہت دور تاروں کی دنیا سے آگے
کسی شاہ کی تھی وہاں راج دھانی

وہ ملکِ حسیں جو تھا حوروں کا مسکن
جہاں کی ہر اک چیز تھی غیر فانی

جہاں راج تھا بادشاہوں کے شہ کا
جہاں مسکراتی تھی پریوں کی نانی

وہاں ایک دن اک غریب اور بوڑھا
نگاہوں میں جس کی نہاں ناتوانی

چلا آیا دربار میں جانے کیسے
جسے دیکھ کر ڈر گئی راج رانی

یوں کرنے لگا عرض شاہِ فلک سے
مبارک ہو تجھ کو تری حکمرانی

مگر اے سدا مال و زر دینے والے
یہ کیوں چھین لی تو نے میری جوانی؟

کہا شاہ نے اس سے بے چین ہو کر
سنی ہم نے دلچسپ تیری کہانی

مگر اے شکایت پہ خوش ہونے والے
خبر بھی ہے تجھ کو، تری نوجوانی؟

ستاتی تھی کتنے غریبوں کو ناداں
مٹاتی تھی کتنے گھروں کی نشانی

جوانی نہیں اس لئے دی گئی تھی
کہ لے اس سے تو کارِ ریشہ دوانی

جوانوں سے کہہ اپنی دنیا میں جا کر
رہے پاک کلبوں سے ان کی جوانی

وہ یوں پھر سے جینے کے گر سیکھ جائیں
اڑا کر فلک سے ستاروں کو لائیں!!

نظر

روہنی کی بلّی

روہنی نے جب اپنا ہوش سنبھالا اور کچھ باتیں سمجھنے کے قابل ہوئی تو اس کے ماں باپ نے اسے مدرسے میں داخل کیا۔ اور یہ مدرسہ جانے لگی۔ روہنی کی سالگرہ آئی۔ اس کی پھوپی نے کہا روہنی تمہیں میں اس مرتبہ تمہاری سالگرہ پر کیا تحفہ دوں۔ روہنی کی زبان سے بلی نکلا۔ اور بولی دیکھو پھوپی۔ مجھے سفید اور خوبصورت بلی چاہیئے۔ پھوپی نے جب دیکھا کہ روہنی کو بلّی پسند ہے تو انھوں نے ایک چھوٹی خوبصورت بلّی روہنی کی سالگرہ پر اس کر دی۔ اور کہا لو روہنی یہ تمہاری سالگرہ کا تحفہ ہے۔ روہنی بلی کو لے کر بہت خوش ہوئی۔ دن رات روہنی بلی کے ساتھ کھیلتی اس کا اور اپنا جی بہلاتی۔ ایک روز روہنی نے خیال کیا کہ چلو اس بلی کا نام رکھیں۔ اور اپنے ہم جماعت لڑکیوں کو بھی دعوت پر بلائیں۔ آخر کار اتوار کا دن مقرر کیا گیا پھر روہنی اس روز کی تیاریوں میں مشغول ہوگئی۔ اس دن کے لئے بہت ہی بے قرار اور بے چین رہتی تھی۔ غرض بڑی دھوم دھام سے اس بلی کا نام رکھا گیا۔

روہنی اپنے بچپن کا زیادہ حصہ اس بلی ہی کے ساتھ کھیل کود میں گذارتی۔ یہ جہاں جاتی بلی کو اپنے ساتھ لے جاتی۔ .... بلی کو بھی روہنی سے کافی محبت ہوچکی تھی۔ روہنی نے اپنی عمر کے پندرہویں سال میں قدم رکھا۔ تو اس کے ماں باپ نے اس کی شادی کرنے کی جی میں ٹھانی۔ خدا کے فضل سے روہنی کے لئے بر ڈھونڈنے میں کوئی بھی مشکل پیش نہ آئی ایک مہینے کے اندر روہنی کی شادی ہوگئی۔ اس پر بھی روہنی نے اپنی بلی کو نہیں چھوڑا۔ اپنا سسرال میں اپنے ساتھ لے گئی۔ اس کے ساتھ ویسے ہی برتاؤ اور محبت سے پیش آتی تھی۔ بلی بھی جب کبھی باہر جاتی اور چوہے کا شکار کر کے میاؤں میاؤں کرتی ہوئی روہنی کے کمرے میں داخل ہوتی تو روہنی سمجھ جاتی کہ بلی مجھے بھی اس کے کھانے میں شریک ہونے کے لئے بلا رہی ہے۔ اور اگر روہنی اس وقت لاپروائی سے اس کے ساتھ پیش آئے تو وہ مرے ہوئے چوہے کو وہاں پر ہی چھوڑ کر کئی گھنٹے بھوکی بیٹھی رہتی۔ ......

اگر روہنی اس کے ساتھ محبت سے پیش آتی۔ کچھ بھی باتیں کرتی تو بلی بھی خوشی کے ساتھ چوہے کو چٹ کر جاتی۔ جب کبھی روہنی باغ میں جاتی تو بلی بھی وہاں موجود رہتی اور اس کے ساتھ ادھر ادھر پھرتی۔ اور جب روہنی تھک کر کسی جگہ بیٹھ جاتی تو وہ بھی جلد آ کر اس کے پہلو کی طالب رہتی اور میاؤں میاؤں کر کے روہنی کا دل بہلاتی۔ اور خوش کرنے کی کوشش کرتی۔ غرض انہی باتوں سے روہنی کے دن بغیر بیزاری کی تکلیف اور رنج کے گذر جاتے تھے۔ اگر بلی نہ ہوتی تو روہنی کے لئے مشکلات کا سامنا کرنا پڑتا۔ روہنی کی بلی اس کی نظروں میں اس کی سہیلیوں سے بہت زیادہ عزیز تھی۔

چند دنوں کے بعد روہنی نے دیکھا کہ اس بلی کو بچے ہونے والے ہیں اور جب وقت آیا تو اسے چار چھوٹے چھوٹے سفید بچے ہوئے۔ روہنی بچوں کے

بینے کی بے حد کوشش کرتی مگر بلی کامیاب ہونے نہ دیتی
بے چاری بلی دن میں کئی مرتبہ باہر جاتی اور اپنے بچوں
کے لئے کھانے کے واسطے کچھ نہ کچھ کہیں نہ کہیں سے
ڈھونڈ ہی لاتی۔ اور ان کا پیٹ بھرتی۔ جب بچے
آنکھیں کھولتے تو ان کو اپنے ساتھ لے جایا کرتی۔
اور ان کو شکار میں ماہر بناتی۔

جب بچے چھ مہینے کے ہوئے تو بلی نے ان کو
اپنے سے دور کر دیا اور بولی کہ جاؤ تم اپنا پیٹ آپ پالو۔
بچارے بچے ہر چند کوشش کرتے کہ وہ اپنی ماں کے
پاس جائیں۔ مگر پنجوں کے مار کھانے کے ڈر سے
کبھی کامیاب نہیں ہوتے۔ روہنی نے ان سب باتوں کو
سمجھا کیونکہ وہ سمجھ دار تھی۔ اس نے اپنے دل میں خیال
کیا کہ بلی واقعی ہم کو ایک ایسا سبق سکھاتی ہے جس کا
ہم لاپروائی کی وجہ سے ذرا بھی غور نہیں
کرتے۔

جب روہنی کے ہاں خدا نے ایک نہایت ہی
خوبصورت بیٹا دیا تو روہنی کی خوشی میں اضافہ ہوا۔
اور بہت سی خوشیاں منائی گئیں۔ مگر ان باتوں کے
ہونے پر بھی روہنی کے دل میں بلی کی وہ بات پتھر کی
لکیر کے مانند بیٹھ گئی۔

جب روہنی کے راج کمار کی پانچویں
سالگرہ ماں کے گھر میں منائی گئی تو ماں نے
دو تین روز بعد اس کو ایک اچھے بورڈنگ میں
داخل کر دیا۔ اگرچہ راج کمار اس کا ایک ہی بچہ
تھا مگر روہنی نے ماں کی ممتا پر ایسی ٹھوکر ماری کہ
جو سنتا تعجب کرتا۔

روہنی کی ایک سہیلی لیلا بمبئی سے ملنے کے لئے
آئی روہنی کو تو پایا۔ مگر راج کمار نظر نہیں آیا۔ جب
اس سے رہا نہ گیا تو بولی بہن لڑکا کہاں ہے۔ روہنی
کھلکھلا کر ہنس پڑی۔ اور کہنے لگی۔ واہ بہن راج کمار
کی یاد بہت جلدی آئی میں نے تو اسے بورڈنگ میں
شریک کر دیا ہے۔ بچوں سے زیادہ لاڈ پیار کرنے سے
بچوں پر برا اثر ہوتا ہے۔ اور ہم اپنی محبت کے
فرض کو ایک حد تک نہیں پہچان سکتے۔ اور یہی ہماری
محبت آگے چل کر آرام دہ نہیں رہتی۔ بلکہ ہمیشہ ہم کو
دکھ پریشانی اور مصیبت میں پھانستی ہے۔ یہ باتیں
سن کر لیلا بولی واقعی تم نے مجھے اس بات سے
آگاہ کیا جس کی میں ممنون ہوں اور وعدہ کرتی
ہوں کہ میں بھی اپنے بچوں سے کبھی بھی زیادہ
پریم اور محبت نہ کروں گی۔

روہنی خدا تمہیں کامیاب اور بامراد کرے
یہ میری دعا ہے۔

راجہ جتیندر پرشاد جوہر

عورت کی پہلی آزادی

حضرت موسیٰ کے قوانین کی رو سے عورت کی حیثیت منقولہ جائداد سے زیادہ نہ تھی وہ گویا مرد کے عیش اور اس کی خدمت گزاری کے لئے بنائی گئی تھی اور درجہ میں غلام اور نوکر کے برابر تھی ان قوانین میں کوئی چیز ایسی نہ تھی جو عورت کے مرتبہ کو بڑھانے کی طرف مائل ہو۔

ہندوستان میں "منو" کے قوانین یہ تبلاتے ہیں کہ مرد عورتوں کا مالک اور محافظ ہے اس کو چاہئے کہ وہ انھیں دن رات تابعداری کی حالت میں رکھے۔ گویا ہندو دھرم کے قوانین نے عورت کو مرد کے رحم و کرم پر چھوڑ دیا ہے۔ بدھ مت نے بھی عورت کی کوئی قدر نہ کی مہاتما بدھ کے چیلے آنند نے ان سے پوچھا کہ "اے مہاتما عورتوں کے ساتھ ہمارا برتاؤ کیسا ہونا چاہئے"؟ جواب ملا "ان پر نظر نہ ڈالو"۔

حضرت عیسیٰ نے عورتوں کے بارے میں حضرت موسیٰ کے قوانین کی پیروی کی۔ آپ نے نہ شادی کی اور نہ عورت کے ساتھ سلوک کے بارے میں کوئی ایسی نصیحت چھوڑی جس پر عمل کیا جائے۔ اگر ہم لیوک (Luke) کی بات کا یقین کریں تو حضرت عیسیٰ نے تو اپنی ماں کی قدر اور عزت بھی نہیں کی۔ سینٹ برنارڈ (St. Bernard) نے عورت کے متعلق کہا تھا کہ "اس کا چہرہ جھلسا دینے والی ہوا کے جیسا ہوتا ہے اور اس کی آواز سانپ کی پھنکار کے جیسی ہوتی ہے"۔

سینٹ [illegible] سینٹ جیروم، سینٹ گریگری، سینٹ کیپرین اور سینٹ بوناونچر سب نے عورت کی لعنت ملامت کی۔ انھوں نے اس کی نسبت یہ جملے اور الفاظ استعمال کئے ہیں: "بچھو جو ہمیشہ ڈنک مارنے کو تیار ہو" "شیطان کا آلہ" "شیطان" "بدی کا راستہ" "ڈکوری کا زہر" "اژدہے کا کینہ" وغیرہ۔ کیا یہ ان بہنوں کے لئے لکھ رہی ہوں جو عیسائی مذہب کے پھیلانے والوں کی جھوٹی کہانیوں سے متاثر ہو جاتی ہیں۔

عورتوں کا محافظ

جب عورتیں اس طرح کی باتیں برداشت کر رہی تھیں اس وقت سب پیغمبروں سے افضل حضرت محمد مصطفےٰ صلی اللہ علیہ وسلم دنیا میں آئے۔ انھوں نے عورت اور مرد کے درجے کو برابر کر دیا اور عورت کے درجے کو اتنا بلند کیا کہ اس سے پہلے اس کو نصیب نہ ہوا تھا۔ عورتوں کے بارے میں حضرت عیسیٰ اور ان کے خاص پیروؤں کے خیالات کے مقابلہ میں دیکھئے کہ پیغمبر اسلام کے ارشادات کیا ہیں! (۱) "مسلمانوں کو اپنی بیوی سے نفرت نہ کرنی چاہئے۔ اگر اس کی کوئی بات بھلی نہ لگتی ہو تو اس کی کسی دوسری اچھی صفت سے خوش ہونا چاہئے" (۲) "عورت گھر کی رانی ہے" (۳) "جنت ماں کے قدموں میں ہے"۔ (۴) "دنیا اور اس کی سب چیزیں قیمتی ہیں لیکن شریف بیوی کی قیمت ان سب سے سوا ہے"۔ میں اس کے ثبوت میں پچاسوں حوالے دے سکتی ہوں کہ پیغمبر اسلام نے عورت کے درجے کو اونچا کیا ہے اور اس کو مرد کے برابر حقوق دیئے ہیں۔ حضرت محمدؐ عورتوں کے سب سے بڑے نجات دلانے والے ہیں۔ عورتوں پر آپؐ کا ہمیشہ احسان رہے گا۔ (ترجمہ) اکرام النساء (زمانہ)

نشان ٹپہ آصفیہ (۱۵۳)

نشان ٹپہ برطانیہ (M 3950)

ادارہ ادبیات اردو حیدرآباد دکن کا ماہنامہ

سب رس

زیر نگرانی

ڈاکٹر سید محی الدین قادری زور

مجلس ادارت

صاحبزادہ میر محمد علی خان میکش — سکینہ بیگم

خواجہ حمید الدین شاہد — معین الدین احمد انصاری

فہرست مضامین

جلد (۲) شمارہ (۱۲)

ڈسمبر ۱۹۳۹ء

۱	اداریہ	ادارہ	۳
۲	شعرائے عثمانیہ	سید احمد عارف (ایڈیٹر صبح دکن)	۶
۳	عقیدت کے پھول	عزیز احمد فراہی منشی کامل (الہ آباد)	۷
۴	منصور آباد اور حیات آباد (تاریخی تنقیح)	پروفیسر عبد المجید صدیقی (ام اے ال ال بی)	۹
۵	احساس زندگانی (نظم)	رشید احمد عثمانیہ	۱۲
۶	معاشرت میں سادگی (آخری قسط)	نواب مرزا سیف علیخاں	۱۳
۷	دل (نظم)	کاوش	۱۶
۸	گل بوٹے	"باغبان"	۱۷
۹	دنیائے خواب (نظم)	نعیم الدین صدیقی	۲۰
۱۰	ہاتھ اور لکیریں	شجاع احمد قائد	۲۱
۱۱	بادۂ شباب (غزل)	نظر	۲۵
۱۲	دعوت	معصومہ الرحمن	۲۶

نمبر	عنوان	مصنف	صفحہ	نمبر	عنوان	مصنف	صفحہ
۱۳	جنگ (نظم)	سلیمان اریب	۳۲	۲۶	جدید مطبوعات	نواب مرزا سیف علی خاں جاگیردار	۶۴
۱۴	آج کا بچہ	صاحبزادہ میر نجابت علی خاں بی اے	۳۳	۲۷	بچوں سے	معین الدین احمد انصاری	۶۶
۱۵	سجدہ (نظم)	مہدی علیخاں (میر احسان لاہور)	۳۷	۲۸	جواہر پارے	سید خواجہ معین الدین (گلبرگہ)	۶۶
۱۶	نفسیات اور ادب	ششنکر موہن لال بی اے	۳۸	۲۹	ایک مسافر اور ریچھ	مرزا عصمت اللہ بیگ	۶۷
۱۷	نوائے ساز دل (غزل)	حبیب حسن	۴۰	۳۰	مٹھو (نظم)	لطیف النساء بیگم ام اے	۶۸
۱۸	بھکاری کا خونیں انتقام	خلیل اللہ	۴۱	۳۱	شوق مطالعہ	عبدالقادر فاروقی	۶۹
۱۹	موسیقی انطاع عالم میں	عبدالستار فاروقی	۴۳	۳۲	نصیحت کا اثر	عبدالمجید خاں یوسف زئی	۷۱
۲۰	شرارت (نظم)	شور عابدی (گلبرگہ)	۴۵	۳۳	بھو کا مرغا (نظم)	سید عظمت اللہ حسینی	۷۲
۲۱	آج کل کی لڑکیاں	مسز صوفی ام اے	۴۶	۳۴	بہادر لڑکا	عظیم قادری صدق	۷۳
۲۲	عید ہو گئی (غزل)	انیسہ ہارون بیگم شروانیہ	۴۸	۳۵	سالگرہ کا تحفہ	مرزا محمد انور	۷۴
۲۳	پیرس	ہارون خاں شروانی ام اے (اکسن) بیرسٹر ایٹ لا	۴۹	۳۶	جاپانی طلبا	رحیم الدین ظہیر آبادی	۷۵
۲۴	رباعیات	باقی ام اے	۵۷	۳۷	ہمارے مولوی صاحب	اسد احمد زبیری	۷۷
۲۵	تنقید و تبصرہ	شعبہ تنقید ادارہ	۵۸	۳۸	کابلی والا	مس زیبا حمید	۷۹

---

(۱) اردو تصنیف و تالیف اور انشا پردازی کا ذوق رکھنے والے اصحاب ادارہ سے مشورہ کر سکتے ہیں۔ ادارہ کے مختلف شعبوں میں ہر موضوع اور ہر فن کے ماہرین موجود ہیں جو خوشی سے مدد دیتے ہیں۔

(۲) اردو زبان سے متعلق جو بھی کام ہو اس کے بارے میں "ادارۂ ادبیات اردو" کی خدمات ہر وقت حاضر ہیں۔

(۳) اردو کی ترقی و اشاعت کے لئے اردو کے بہی خواہ جو بھی مفید تجویزیں اور مشورے ادارہ میں روانہ کرتے ہیں ان پر سنجیدگی سے غور کیا جاتا ہے اور ان کے روبہ عمل لانے کی کوشش کی جاتی ہے۔

(۴) اردو مطالعہ کا ذوق ہو تو ادارہ کے سب رس کتاب گھر کی فہرست منگوائیے۔

(۵) اگر اردو کتابیں خریدنی ہوں تو پہلے سب رس کتاب گھر سے مشورہ کیجئے۔

(۶) مراسلت کرنے والے اصحاب اس امر کا ضرور خیال رکھیں کہ اگر ادارہ سے جواب حاصل کرنا ہو تو جوابی کارڈ یا ایک آنے کے اسٹامپ لازماً روانہ کریں۔ ورنہ ادارہ پر جواب کی ذمہ داری نہیں رہتی۔

(۷) رسالہ نہ پہنچنے کی اطلاع ۱۵ تاریخ کے اندر دیدیجئے۔ دیر سے اطلاع آنے پر یا تو پرچے ختم ہو جاتے ہیں یا گزشتہ پرچوں پر زیادہ محصول ڈاک ادا کرنا پڑتا ہے۔ اس لئے تاریخ مقررہ کے بعد اطلاع آئے تو پرچہ روانہ کرنے میں تامل ہوگا۔

خواجہ حمید الدین شاہد کے اہتمام سے عہد آفرین مشن پریس میں چھپکر دفتر ادارہ نعمت منزل خیریت آباد حیدرآباد سے شائع ہوا

اداریہ

یہ سب رس کے دوسرے سال کا آخری شمارہ ہے۔ خدا کا شکر ہے کہ یہ رسالہ ہر سال ترقی کرتا جا رہا ہے اور اس کے قدردانوں میں برابر اضافہ ہو رہا ہے۔ اس کے ہر شمارہ میں مختلف ذوق کے مضامین نظم و نثر پیش ہوتے رہے اور اس طرح اردو زبان کی طرف زیادہ سے زیادہ اصحاب کو متوجہ کرنے کا موقع ملا۔

اردو نمبر کی بعض خصوصیتیں سب رس کے تیسرے سال کا پہلا شمارہ یا سالگرہ نمبر اردو زبان اور ادب کی ضروری معلومات کے لیے وقف کر دیا گیا ہے۔ یہ جنوری سنہ ۱۹۴۰ء کے پہلے ہفتہ میں شائع ہوگا اور سب رس کے گذشتہ سالگرہ نمبر یعنی دکن نمبر سے زیادہ شاندار اور کامیاب ثابت ہوگا۔ اس میں اردو کے بہترین شعرا مثلاً جوش، امجد، فانی، جگر، سیماب، علی اختر، علی منظور، عزیز، صفی، معین، احسان، دانش، ساغر، ماہر، بہزاد، محروم، وجد، شاد عارفی، روش اور مخدوم وغیرہ کے تازہ ترین کلام کے علاوہ اردو کے نامور ہوں مثلاً مصحفی، حالی، گرامی، داغ، شاد عظیم آبادی، اقبال اور تسلیم کے غیر مطبوعہ خطوط بھی پہلی دفعہ اردو دنیا کے سامنے پیش کئے جا رہے ہیں۔

اس وقت ہندستان کی مختلف جامعات میں جو اصحاب اردو کے پروفیسر ہیں ان کے حالات زندگی اور تصویریں بھی شریک رہیں گی۔ اس سال یعنی سنہ ۱۹۳۹ء کی بہترین اردو کتابوں کا ایک تذکرہ بھی درج رہے گا۔ اس شمارہ کے جملہ مضمون اردو ادب کے ایسے اچھوتے پہلوؤں پر لکھوائے گئے ہیں کہ ان کا مطالعہ دلچسپی اور افادہ سے خالی نہ ہوگا۔ اور اس ایک شمارہ میں اردو سے متعلق جتنی مستند اور شائستہ معلومات حاصل ہو سکیں گی اردو کی کسی بڑی سے بڑی تاریخ سے نہیں ہو سکتیں۔ مضامین اور معلومات کے علاوہ اردو نمبر اپنی بیش بہا تصویروں کی وجہ سے بھی بڑی اہمیت رکھتا ہے۔ مشاہیر اردو کی نادر اور پاکیزہ تصویروں کے ساتھ ساتھ ایسے یورپین شعرا و مصنفین کی دلچسپ تصویریں بھی اس میں شامل ہیں جن کی تحریروں کا اردو ادب پر خاص اثر پڑا ہے۔ جو اصحاب دکن نمبر کی تصویریں دیکھ چکے ہیں وہ خود اندازہ کر سکیں گے کہ اردو نمبر کی تصویریں کس شان کی ہو سکتی ہیں۔

نمائش مطبوعات اس ماہ طیلسانین عثمانیہ کی ساتویں سالانہ کانفرنس کی وجہ سے اورنگ آباد علمی و ادبی اور سماجی سرگرمیوں کا مرکز بن گیا تھا۔ اس کانفرنس کی خواہش پر طیلسانین کی تصنیفات و تالیفات کی ایک نمائش منعقد کرنے کا کام ادارہ ادبیات اردو کی طرف سے انجام دیا گیا۔ مولوی معز الدین صاحب اور مولوی عبد العلی صاحب نے اورنگ آباد میں ادارہ کے مہتمم اور کارکنوں کی بڑی مدد کی۔ طیلسانین کی یہ کانفرنس کئی خصوصیتوں کے لحاظ سے بے حد کامیاب رہی۔ یوں تو اورنگ آباد جیسے تاریخی ماحول میں اس کا انعقاد ہی اس کی کامیابی کا ضامن تھا لیکن شہزادہ نواب سالار جاہ بہادر کی دلچسپی بھی اس کی بڑی ممد و معاون ثابت ہوئی۔ اس کانفرنس کی صدارت پروفیسر عبد المجید صاحب صدیقی نے انجام دی جو ادارہ ادبیات اردو کے مؤسسین میں سے ہیں۔ اور جن کی محققانہ کتاب تاریخ گولکنڈہ حال ہی میں ادارہ سے شائع ہوئی ہے۔ موصوف کا خطبہ صدارت علمی اور سنجیدہ حلقوں میں بڑی قدر کی نگاہوں سے دیکھا جا رہا ہے۔ اس میں نہایت بالغ نظری اور سنجیدگی کے ساتھ ایسے مسائل پر روشنی ڈالی گئی ہے جو آج کل ملک میں زیر بحث ہیں۔ اور جن کو سلجھانا نہایت ضروری ہے۔

ادارہ کے معتمد اعزازی ڈاکٹر زور نے بھی اس کانفرنس کے دوسرے اجلاس میں قطب شاہی عہدوں پر ایک دلچسپ تقریر کی۔ پروفیسر سروری صاحب نے بھی شاہ سراج اورنگ آبادی پر ایک مفید مقالہ تیار کیا تھا جو اگرچہ وقت کی قلت کی وجہ سے پڑھا نہ جا سکا لیکن کانفرنس کی روداد کے ساتھ مجلہ طیلسانین میں شائع ہو رہا ہے۔

شاہ سراج کا گنبد اورنگ آباد اور اس کے اطراف و اکناف کی سرزمین بڑے بڑے مشاہیر ہند کی آخری آرام گاہ ہے۔ انہی میں ایک اردو کے مشہور شاعر شاہ سراج اورنگ آبادی بھی ہیں۔ جن کا گنبد نہایت خستہ حالت میں پڑا ہوا تھا۔ ادارہ کی طرف سے اس کی تعمیر و مرمت

کے لئے مولوی غلام احمد خاں صاحب سابق صوبہ دار اورنگ آباد کو توجہ دلائی گئی تھی۔ اور ایک سال سے اس بارے میں مراسلت جاری تھی جس کا تذکرہ اس سے قبل کئی بار سب رس کے اداریوں میں گزر چکا ہے۔ خوشی کی بات ہے کہ غلام احمد خاں صاحب کی توجہ سے اس کی مرمت کے لئے محکمۂ امور مذہبی کی طرف سے احکام جاری ہو گئے۔ اس سفر کے موقع پر ڈاکٹر زور اور پروفیسر سروری اور پروفیسر عبدالمجید صاحب صدیقی نے اس گنبد کا معاینہ کیا اور اوّل الذکر نے مولوی عبدالباسط خاں صاحب صوبہ دار کو اس کی مرمت کی طرف توجہ دلائی۔ صاحب موصوف نے آغاز عمل کے لئے فوراً احکامات جاری کر دیے۔ چنانچہ ان اصحاب کی روانگی سے قبل کام شروع ہو چکا تھا توقع ہے کہ یہ گنبد جلد درست ہو جائے گا آیندہ نمبر میں انشاء اللہ مرمت سے قبل اور بعد کی تصویریں شایع کی جائیں گی۔

آثار قدیمہ | اس ماہ پروفیسر عبدالمجید صاحب صدیقی کا وہ مضمون اور تصویریں شایع کی جا رہی ہیں جو حیات آباد کے تاریخی معابد کی یادگار ہیں ہم محکمۂ آثار قدیمہ حیدرآباد کو اس قدیم تاریخی مسجد کی طرف متوجہ کرنا چاہتے ہیں جو قطب شاہوں کی ایک عظیم الشان یادگار ہے اور جو قریب میں منہدم ہو جائے گا اگر یہ محکمہ اس کی طرف توجہ نہ کرے۔ کیونکہ اس پر جگہ جگہ پیپل کے درخت اگ آئے ہیں۔

اسی طرح ادارہ کے چند ارکان نے اس ماہ قلعہ کویل کنڈہ کا بھی معاینہ کیا ہے۔ یہ بھی نہایت اہم تاریخی مقام ہے کیونکہ سلطان ابراہیم قطب شاہ نے قلعہ گولکنڈہ کو فتح کرنے کی مہم کا آغاز یہیں سے شروع کیا تھا۔ چنانچہ یہاں تلنگی میں ایک اہم کتبہ بھی موجود ہے۔ لیکن افسوس ہے کہ محکمۂ آثار قدیمہ نے اس قلعہ کی طرف بھی اب تک کوئی توجہ نہیں کی۔ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ اس محکمہ کی توجہ زیادہ تر اجنتاہ ایلورا اور بیدر کے شامل حال ہے۔ اور وہاں کے کاموں سے اس کو ایک گونہ عشق سا ہو گیا ہے۔ جب ہی تو ممالک محروسہ کے دوسرے اہم تاریخی مقامات اور خاص کر دار السلطنت سے قریب ہی کے آثار محروم نظر ہیں۔ قلعہ گولکنڈہ، قلعہ سلطان نگر اور حیات آباد تو شہر حیدرآباد سے صرف پانچ میل ہی کی مسافت پر واقع ہیں لیکن ان کی طرف سے غفلت شاید "چراغ تلے اندھیرے" والی مثل کو ثابت کرنے کے لئے برتی جا رہی ہے۔

چند نادر مضمون | اس ماہ کے مضمونوں میں اور دو کا تذکرہ ضروری ہے۔ دعوت ایک قصہ ہے محترمہ معتصمۃ الرحمٰن کا۔ جو اپنی تیمہ نگاری اور انشا پردازی کی وجہ سے اردو دنیا میں کافی تعارف حاصل کر چکی ہیں۔ چونکہ یہ قصہ محترمہ نے اپنی شادی خانہ آبادی سے چند ہی روز قبل ہمارے یہاں روانہ کیا ہے اس لئے ہم اس کو ان کی زندگی کا ایک تاریخی قصہ سمجھتے ہیں کیونکہ کدخدائی کے بعد ان کی انشا پردازی کا بھی متاثر ہونا ضروری ہے۔ اس مضمون کی اشاعت کے ساتھ ساتھ ہم محترمہ کو دلی مبارکباد پیش کرتے ہیں۔

دوسرا مضمون پیرس ہے جو ہمارے دیرینہ کرم فرما پروفیسر شروانی صاحب کے سلسلۂ تاثرات سفر یورپ کی ایک دلچسپ کڑی ہے۔ یہ سلسلہ گذشتہ سال ماہ ڈسمبر سے شروع ہوا تھا اور محترم موصوف کی تصویر بھی شایع کی گئی تھی۔ مسرت کی بات ہے کہ یہ پابندی کے ساتھ جاری رہا اور اب قریب الختم ہے۔ لیکن ہمیں یقین ہے کہ شروانی صاحب اس کو آیندہ ایک کتابی صورت میں بھی شایع فرمائیں گے کیونکہ ان کے مضمون ندرت معلومات کے علاوہ اس لئے بھی اہمیت رکھتے ہیں کہ ان میں جنگ سے عین قبل کے یورپ کے متعلق مفید اور اہم معلومات قلمبند ہو گئی ہیں۔

نئی کتابیں اس ماہ ادارہ نے اور تین نئی کتابیں شائع کیں۔ جن میں پہلی مغربی تصانیف کے اردو تراجم ہے۔ یہ ان تمام اجتماعی اور انفرادی کوششوں کا محققانہ تذکرہ ہے جو اردو کو جدید ترین علوم و فنون سے مالامال کرنے کے لئے گزشتہ سوا سو سال سے کی جا رہی ہیں۔ اس کا ذکر گزشتہ مہینہ کے اداریے میں کیا جا چکا ہے۔ دوسری کتاب محبت کی چھاؤں ہے جس کے مصنف مولوی مرزا ظفر الحسن صاحب بی اے عثمانیہ ہیں یہ کسی دلنواز کے نام معنون کی گئی ہے اور اس کے جوانسانے عشق و محبت کی ولولہ انگیزیوں اور حسن و شباب کی رعنائیوں سے معمور ہیں اس کا حسین و جمیل سرورق دیکھتے ہی اس کتاب کے بےباک اسلوب اور اس کے افسانوں کی بے پناہ شوخی کا اندازہ ہو جاتا ہے۔

تیسری کتاب شعرائے عثمانیہ ہے جو ادارہ کے سلسلہ مرقع سخن کی چوتھی جلد ہے۔ اس میں چھبیس [26] شعراء کے کلام کا انتخاب درج ہے۔ اس کی خصوصیات اخبار صبح دکن حیدرآباد مورخہ ۲۲ نومبر کی تنقید کے اس اقتباس سے معلوم ہو سکتی ہیں جو اس اداریہ کے آخر میں درج ہے۔

ادارہ کی شاخیں ادارۂ ادبیات اردو اپنے مقاصد کے تحت مختلف مقامات میں اپنی شاخیں قائم کر رہا ہے چنانچہ اس وقت تک اورنگ آباد اور محبوب نگر میں اس کا آغاز کر دیا گیا ہے دوسرے مقامات کے علم دوست اصحاب سے بھی توقع ہے کہ وہ اپنے یہاں اس کام کا آغاز کریں گے اور اس بارے میں معتمد صاحب اعزازی سے مراسلت فرمائیں گے۔

محبوب نگر میں ۲۴ نومبر کو مولوی سید تقی صاحب بلگرامی بی اے بیرسٹر ناظم ضلع کی صدارت میں ایک جلسہ عام منعقد ہوا جس میں مولوی احمد عبداللہ صاحب مسدوسی بی اے ال ال بی وکیل نے ڈاکٹر زور صاحب معتمد اعزازی کو ادارہ کے متعلق تقریر کرنے کی فرمائش کی نتیجہ کے طور پر وہاں علم دوست اصحاب کی ایک مجلس منتخب کی گئی اس شاخ کے متعلق بھی مزید تفصیل آیندہ شمارہ میں درج رہے گی۔

شعبۂ تنقید گزشتہ ماہ اس شعبہ کی روئداد اداریہ میں جگہ نہ پا سکی تھی اس شعبہ کا ایک جلسہ ۲۹ ستمبر کو منعقد ہوا تھا جس میں پروفیسر سروری داعی شعبہ کے علاوہ ڈاکٹر زور، پروفیسر فضل حق، مولوی نصیر الدین ہاشمی، نواب سیف علی خاں صاحب جاگیردار نے شرکت کی۔

(۱) میتھو ارنلڈ کے ترجمہ کے متعلق مترجمین نے ترجمہ کی دقتوں کے مدنظر نومبر میں پہلی قسط دینے کا وعدہ کیا۔

(۲) سولہ [16] کتابیں اور سات رسائل وغیرہ تنقید کے لئے وصول ہوئے تھے تقسیم کر دئے گئے۔

(۳) تنقید کی کتابیں جو گزشتہ جلسہ میں اراکین کو تنقید کے لئے دی گئی تھیں وہ سب سوائے بدر شکیب صاحب کے پاس کی کتابوں کے وصول ہو گئیں۔

(۴) باتفاق آرا طے پایا کہ حسب ذیل حضرات شعبہ کے رکن بنائے جائیں۔

۱۔ مولوی عبدالمجید صدیقی صاحب ۲۔ ڈاکٹر عبدالمعید خاں صاحب ام اے پی ایچ ڈی

۳۔ ڈاکٹر راحت اللہ خاں صاحب ام اے پی ایچ ڈی ۴۔ مولوی فیض محمد صاحب صدیقی بی اے ڈپ ایڈ

۵۔ مولوی غلام دستگیر صاحب رشید ام اے ۶۔ ابوظفر عبدالواحد صاحب ام اے لکچرار سٹی کالج۔

۷۔ محترمہ جہاں بانو بیگم صاحبہ ام اے۔ ۸۔ محترمہ محمدی بیگم صاحبہ بی اے ۹۔ مولوی صابر علی صاحب ہاشمی

۱۰۔ محترمہ زہرہ بیگم صاحبہ سعید بی اے۔ ۱۱۔ محترمہ صغرا ہمایوں مرزا صاحبہ۔ ۱۲۔ ڈاکٹر جعفر حسن صاحب پی ایچ ڈی

(دوسرے شعبوں کی روئدادیں آئندہ شمارہ میں شایع کی جائیں گی)

"ادارہ"

شعرائے عثمانیہ | رائل سائز صفحات ۲۳۱ قیمت عالہ۔ ملنے کا پتہ دفتر ادارۂ ادبیات اردو، رفعت منزل خیریت آباد دکن۔

جامعہ عثمانیہ کے ہونہار شاعروں کا کلام متفرق رسالوں اور جرائد میں شایع ہو رہا تھا اور نوجوانوں کے دل و دماغ کو متاثر بھی کر رہا تھا۔ کم و بیش دس سال سے یہ جواہر پارے بکھرے ہوئے پڑے تھے بڑی خوشی کی بات ہے کہ جامعہ کے دو مشہور اور صاحب ذوق فرزندوں سید معین الدین صاحب قریشی اور محمد عبدالقیوم صاحب باقی نے ان کو جمع کر دیا ہے جس سلیقے سے یہ ضروری کام ان دو حضرات کے ذمہ دار ہاتھوں سے انجام پایا وہ اپنی نظیر آپ ہے۔

اس مجموعہ کی متعدد خصوصیات قابل ذکر ہیں۔ ایک تو یہ کہ اردو زبان میں آج تک کوئی مجموعہ ایسا مرتب نہیں ہوا جو جدید شاعری کے رجحانات کو اتنی خوبی اور تنوع کے ساتھ ظاہر کرتا ہو۔ نظم نگاری دور جدید کی پیداوار ہے۔ اس مجموعے سے یہ ثابت ہوتا ہے کہ جامعہ نے شاعروں کو ریزہ خیالی کے علاوہ ٹھوس اور مربوط خیالات کے اظہار پر بھی قادر کر دیا اور ان میں بلند ذوق پیدا کر دیا ہے۔ دوسرے اس میں ہر قسم کے حسن و کمال کی نظمیں ملتی ہیں جو مختلف اور پاکیزہ عنوانات پر لکھی گئی ہیں۔ اس کی وجہ سے اہل علم کے ایک کثیر طبقے کو اس میں دلچسپی کے سامان مل سکتے ہیں نظمیں نہایت ذوق انگیز اور دلفریب ہیں۔ ان کی گوناگونی اور ان کے مضامین کی کثرت کے باوجود جیسا کہ اس مجموعے کی فاضلانہ تقریب میں لکھا گیا ہے شعرائے عثمانیہ کے کلام میں ایک قسم کی ہم آہنگی بھی پائی جاتی ہے۔ اس میں ۱۵۳ نظمیں اور کم و بیش ایک سو غزلیں منتخب ملیں گی جن میں کہیں خیالات کا لطف ہے تو کہیں زبان کا کہیں جذبات کی تازگی اور بلندی ہے تو کہیں اسلوب بیان کی جدت۔

ہمیں یہ دیکھ کر حیرت ہوئی کہ غزل کے آزمودہ اور دیرینہ میدان میں بھی ان باہمت شاعروں نے اپنا خاص کمال دکھایا ہے۔ ہر شاعر پر جو جامع و مانع اشارات لکھے گئے ہیں وہ جناب باقی صاحب کی وسعت ذوق و نظر اور حسن اظہار کا ثبوت ہیں۔ ایسا معلوم ہوتا ہے دریا کو کوزے میں بند کیا گیا ہے۔ کلام کا انتخاب اس خوبی سے کیا گیا ہے کہ ہر شاعر کی عظمت اور اس کا معیار پورے طور پر سامنے آتا ہے۔ بظاہر یہ کہنا دشوار معلوم ہوتا ہے کہ کونسا شاعر زیادہ اچھا ہے اور کون کم۔ کیونکہ یہاں "ہر گلے را رنگ و بوئے دیگر است" کا معاملہ ہے۔ یہ بھی لائق مرتبین کے انتخاب کا کمال ہے۔ اس میں بطور خاص ہم "فاوسٹ" جیسے شاہکار کے اردو ترجمے کے اقتباس اور "عمر خیام" کے آپرا کو شریک کرنے کی داد دیں گے کیونکہ یہ دونوں چیزیں اردو شاعری کے لئے بالکل نئی ہیں اور ان سے مجموعے کا ادبی معیار خاصہ بلند ہو گیا ہے۔

آخر میں ہم ادارۂ ادبیات اردو کے فاضل ناظم ڈاکٹر سید محی الدین صاحب قادری زور کو جو خود بھی شاعر ہیں ولی مبارکباد دیتے ہیں کہ انھوں نے اعلیٰ اور نفیس طباعت اور بلند خیالی کے ساتھ اس بے نظیر مجموعے کی اشاعت فرمائی۔ ہم پر زور خواہش کرتے ہیں کہ جامعہ عثمانیہ کے تمام طلبہ اور مدارس کے نوخیز شاعر اسے خرید کر اس سے لطف اندوز اور مستفید ہوں۔ ڈاکٹر صاحب موصوف نے یہ بھی طے فرمایا ہے کہ مجموعے کا ایک ایک نسخہ ان شاعروں کی خدمت میں تحفتہً پیش کیا جائے گا جن کا کلام اس میں شامل ہے یہ امر بھی ان کی وسیع علمی ہمدردی کو ظاہر کرتا ہے۔　　　(روزنامہ صبح دکن مورخہ ۲۳ نومبر ۱۹۳۹ء)

"عقیدت کے پھول"

دن کے کھیل کود اور سیر و تفریح کے بعد رضیہ اور اس کی سہیلیاں گھر جانے کیلئے تیار ہیں۔ ان لوگوں کے ساتھ رضیہ کا بھائی شمیم بھی ہے دن کا تھکا ماندہ آفتاب بھی آہ بھر کے ہوئے مغرب کی پہاڑیوں میں روپوش ہونے کو ہے رضیہ، سلطانہ، شہناز موٹر میں بیٹھ گئیں شمیم نے موٹر کا ٹاپ کھول دیا اور خود بیٹھ کر چلانے لگا شمیم کی بائیں طرف شیاما بیٹھی تھی۔

یہ لوگ پورب کی سمت روانہ ہوئے۔ یہ منظر نہایت دلفریب تھا۔ ڈوبتے سورج کی کرنوں سے سامنے کے تمام وادی و کہسار سنہرے ہوگئے ہیں۔

موٹر اپنی پوری رفتار سے جا رہی تھی ہوا کے گستاخ جھونکے بار بار سب کے آنچلوں کو چھیڑتے اور چمپئی رخساروں پر گستاخانہ تھپیڑ مارتے۔ آنچل بار بار سر سے اڑ جاتے اور سر کے بال بے ترتیبی سے بکھر جاتے سب کی سب آنچل سنبھالنے اور بکھرے ہوئے بالوں کو سنوارنے میں مصروف اور شمیم اسٹیرنگ کی مدد سے موٹر کا رخ پھیرنے میں مشغول تھا دل کی کشتی بحرِ محبت میں ہچکولے کھا رہی تھی ادھر شیاما کی ریشمی ساڑی کا سرمئی آنچل دامنِ خیال کو چھیڑتا اور ہوا کی سرد لہریں اس کے سینہ میں گدگدیاں پیدا کرتیں شیاما کی اک ذرا سی مسکراہٹ اس کے دل کی کلیاں کھلا دیتی۔

"یہ لوگ جنگل و بیابان وادی و کہسار سے ہو کر گزر رہے تھے طائرانِ خوش الحان نغمہ سرائیاں کر رہے تھے درختوں پر پرندے چہچہا رہے تھے اور وفورِ شوق میں خوشی کے گیت گا رہے تھے آہوانِ صحرا وحشت زدہ اِدھر اُدھر بھاگ رہے تھے کوئل کی کوک اور پپیہا کی پیہو سے عجیب پرکیف سماں تھا۔

جا بجا قدرتی چشمے جاری تھے باد صبا رقص کرتی ہوئی ناچتی اور سطح آب سے اٹکھیلیاں کرتی گزر جاتی۔ جذبۂ شوق میں آب حباب بن کر اٹھتا پھر ان موجوں کو بھوٹ بھوٹ روتا جو ساحل تک نہ پہنچ سکتیں۔ دن بھر کے چھڑے چرند پرند اپنے اپنے مقام پر واپس جا رہے تھے ادھر اُدھر کے بھولے بھٹکے اکے دکے مسافر بھی اپنی منزل مقصود تک جلد پہنچنے کے لئے قدم بڑھائے چلے جا رہے تھے اب کچھ اندھیرا ہو چلا تھا کالے کالے بادل منڈلانے لگے۔ دھیرے دھیرے سیاہی بڑھتی گئی اور تاریکی ساری فضا میں پھیلتی گئی۔ گویا رات نے اپنا ماتمی لباس پہن لیا ہر طرف گھنگھور گھٹا چھائی ہوئی تھی۔

کبھی کبھی بجلی کالے بادلوں سے کوندتی زمین پر آتی اور پھر بل کھا کر نکل جاتی۔ بیم و رجا میں سب کے دل دھڑک رہے تھے۔ ہر ایک پر سکوت طاری تھا۔ یکایک زور کی آواز ہوئی ایک دھچکا لگا موٹر رک گئی لوگ سہم گئے نیچے اتر کر دیکھا تو پہیا ہوا سے خالی ہو گیا تھا۔ وہاں سے کچھ دور روشنی معلوم ہوئی جہاں سے گانے کی آواز آرہی تھی شہناز کہنے لگی اپنے بنگلوں میں چین کی بانسری بجانے والوں اور راگ الاپنے والوں کو ہمارے اس حال کی کیا خبر۔

رضیہ نے کہا ہاں یہ ٹھیک ہے لیکن ہم بھی تو کبھی آرام چین سے اپنے شاندار بنگلوں میں عیش و عشرت اور رنگ رلیاں منایا کرتے ہیں۔ مینھ کی جھڑی اور اس کی پیہم آوازیں جو فضا میں ایک موسیقیت پیدا کرتی ہے

لطف اندوز ہوتے ہیں دریچوں پر کھڑے ہو کر اس کا جائزہ
لیتے ہیں اور لطف اندوز ہوتے ہیں۔ لمحہ کے لئے بھی ان
غریب انسانوں کا خیال دل میں نہیں آتا جو اپنے جھونپڑوں
میں غمگین اور افسردہ خاطر رہتے ہیں آنے والے کل کی
فکر معاش ان کو ستاتی رہتی ہے۔ ان بیواؤں کے حال زار
سے بالکل بے خبر رہتے ہیں جو بارش کے ساتھ ساتھ اپنی چشم
دریا بار سے اشک بہاتی رہتی ہیں اور اگر بادل ایک گھنٹہ
برستا ہے۔ تو ان کی ٹوٹی ہوئی جھونپڑیاں دو دو گھنٹے رستی
رہتی ہیں۔

شمیم کا خیال ہوا کہ آبادی اب قریب ہے ہم لوگوں
کو یہاں سے پیدل چلنا چاہئے۔ بالآخر روشنی کی جانب روانہ
ہوئے راستہ ایک باغ سے ہو کر گیا تھا۔ باغ کی چار دیواری
منہدم ہو چکی تھی صرف نشانات باقی تھے جس کے اندر اونچے
اونچے خاموش درخت کھڑے اپنی قدامت کا ثبوت دے
رہے تھے اندر داخل ہونے پر معلوم ہوا کہ یہ عدم کی نیند سونے
والوں کا سنسان محلہ ہے۔

صف در صف کچی قبروں کے بوسیدہ نشانات تھے
بے کسی ان پر رو رہی تھی چاروں طرف وہی سنسان بستی وہی
ہو کا عالم اور حسرت برس رہی تھی۔

شہناز ایک جگہ جھک کر ٹارچ کی روشنی میں کچھ پڑھنے لگی
سب اس کی طرف بڑھیں اور ہر ایک کی متجسس نگاہیں اس کتبہ
پر پڑیں جس کو شہناز پڑھ رہی تھی پتھر پہ کندہ تھا۔

"جاکے جب تازہ مزاروں پہ چراغاں کرنا
ایک ٹوٹی ہوئی تربت پہ بھی احسان کرنا"

"متوفی فیروز شاہ اصفہانی" سن کا پتہ نہ چل سکا
شہناز کے دل میں فیروز کی یاد تازہ ہو گئی۔ گزرا ہوا بچپن کا
زمانہ یاد آگیا اور وہ سماں نظروں میں پھر گیا جو کبھی ہرسنگار کے
درخت کے نیچے کسی مزار کے قریب اپنے بھولے پن اور معصومانہ انداز
میں کہا تھا کہ فیروز! اگر اس مزار کے مجاور تم ہوتے تو میں عقیدت
کے ان بکھرے ہوئے چند پھولوں کو چن لیتی اور ان کو سلک
محبت میں پرو کر گلے میں ڈال لیتی۔ شہناز [illegible] وہ خیالات کی دنیا میں
گم تھی مگر افتاد راز اور سہیلیوں کے تاڑنے کے خوف سے وہاں
کھڑی ہوگئی اور ٹھنڈی سانس کے ساتھ کہنے لگی۔ اس شعر میں کیسی
التجا و آرزو ہے۔ نہ جانے کون اصفہانی جوان اس خاموش بستی میں
گہری نیند سو رہا ہے۔

صورت حال سے تو ہر ایک متاثر تھی ہی مگر شہناز کے دل پر ایسی
سخت ٹھیس لگی کہ اس کا شیشۂ دل چور تھا اب وہ عدم آباد بستی سے
باہر نکل چکے تھے۔ ہوا تھم چکی تھی بادل غائب ہو گئے تھے سماں کھل گیا تھا
ستارے نمودار ہو چکے تھے چشمہ مہتاب سے نور کی ندیاں
رواں تھیں سبزہ زاروں اور کھیتوں کو پار کرتے سرسبز شاداب فصلوں
سے گزرتے ہوئے ایک چوراستے پر پہنچے جہاں ثریا کا بنگلہ قریب تھا شمیم و ثریا نے
آنکھوں ہی آنکھوں میں خدا حافظ کہا اور اپنی سہیلیوں سے رخصت ہو کر اپنے
بنگلے کے صدر پھاٹک میں داخل ہو گئیں۔

تھوڑی دیر بعد رضیہ وغیرہ بھی اپنے بنگلہ پر پہنچ گئیں۔
اس کے بعد سے شہناز روزانہ شام کو گورغریباں کی سیر کو
جاتی اور اپنے اصفہانی جوان کی قبر پر جھاڑو دیتی اور ایک
چراغ جلا دیتی۔ قبر کے سرہانے ہرسنگار کا ایک درخت بھی
لگا دیا تھا۔ مدت کے بعد جب آپس کی سہیلیاں اپنی اپنی شادیوں
کے بعد ایک دوسرے سے جدا ہو کر، دلی اور لکھنؤ کے شہروں میں رہنے لگیں
سلطانہ اب بڑی ہو چکی جو اس وقت اپنی سہیلیوں میں سب سے کمسن تھی
ایک شام اسی قبرستان سے گزری جس میں فیروز کی قبر تھی اس کے پہلو میں اب ایک اور
قبر تھی دونوں پر ہرسنگار کے مرجھائے ہوئے پھول بکھرے تھے اور ایک بجھی ہوئی شمع تھی۔

عزیز احمد فراہی

حیات آباد (حیات نگر) کی مشہور مسجد کے مینار اور اگلا اور پچھلا رخ

منصور آباد اور حیات آباد

(ادارہ کی ایک تاریخی تفریح)

۱۰ اکتوبر مطابق ۶ آذر ۱۳۴۹ ف کو منگل کے دن
شعبۂ تاریخ دکن کا تاریخی دورہ ہوا۔ اس میں ڈاکٹر رشید
محی الدین صاحب قادری زور، عبدالقادر صاحب سروری
عبدالحفیظ صاحب صدیقی بی اس سی اور عبدالمجید صدیقی
شریک تھے۔ اس شعبہ کے ایک اجلاس میں
یہ طے ہوا تھا کہ حیدرآباد کے مشرق میں جو تاریخی آثار پائے
جاتے ہیں ان کا تحقیقی معائنہ ہونا چاہیے کیونکہ مشرقی
جانب اس شاہراہ کے اردگرد جو مسولی پٹم کو جاتی
ہے قطب شاہوں کے زمانے کے بہت سے تاریخی آثار
موجود ہیں۔ خود شاہراہ بھی جو مسولی پٹم کی شاہراہ کہلاتی
ہے تاریخی ہے اور یہ اب بھی بجواڑے پر سے گذرتی
ہوئی مسولی پٹم پہنچتی ہے۔ قطب شاہی دور میں اس شاہراہ
سے تاجروں اور سیاحوں کی بہت آمد و رفت ہوتی
تھی۔ مغربی تاجر اور سیاح اسی کے ذریعے مسولی پٹم
سے حیدرآباد آتے تھے اور قطب شاہی تاجر حیدرآباد
سے جایا کرتے تھے۔ چنانچہ ان راہروؤں کی سہولت
کے لیئے قطب شاہی حکومت کی جانب سے اس راستے پر
کئی سرائیں بنائی گئیں اور کنوے کھدوائے گئے جو اب تک
موجود ہیں اور مسولی پٹم تک برابر پائے جاتے ہیں۔
اور کچھ انہیں ضرورتوں کو پورا کرنے کے لیئے گولکنڈے کے
سلاطین اور امرا اور خواتین نے اس شاہراہ پر
کئی قصبے بھی آباد کیئے اور ان میں عالی شان عمارتیں بنائیں۔

پہلے ہم نے منصور آباد کا معاینہ کیا جو موجودہ سرورنگر
سے دو ڈھائی میل کے فاصلے پر واقع ہے۔ اس کے قریب
سڑک کی دوسری جانب حال میں سرکاری نشرگاہ تعمیر ہوئی
ہے۔ منصور آباد سڑک کے شمالی جانب ایک میل کے فاصلے پر
واقع ہے۔ قریب جانے تک باہر سے اس قصبے کے کوئی
آثار نظر نہیں آتے۔ یہ اس وقت ایک چھوٹا سا قصبہ ہے
جس میں پرانے اور نئے مکانات پائے جاتے ہیں لیکن
بعض کھنڈروں سے معلوم ہوتا ہے کہ گیارہویں صدی
ہجری کے وسط میں جب کہ اس کی بنیاد پڑی تھی یہ قصبہ
زیادہ آباد ہوگا اور یہاں مسافر ٹھیرتے ہوں گے۔ چنانچہ
فرانسیسی سیاح ٹیورنیر نے اپنے سفرنامے میں اس قصبے کا
ذکر کیا ہے۔ ممکن ہے کہ وہ اپنے سفر میں یہاں دو ایک روز
ٹھیرا ہو۔ اور حیدرآباد سے جو شاہی جلوس حیات آباد
یا اس کے آگے جاتے تھے وہ منصور آباد پر سے گزرتے
تھے۔ اس وقت اس قصبے کی تاریخی یادگار صرف ایک مسجد
ہے جو اس زمانے کی رہنمائی کرتی ہے یہ قطب شاہی طرز
کی ایک پرانی مسجد ہے جو بلند کرسی پر تعمیر ہوئی ہے اس کی
عمارت اور مینار چونے اور پتھر سے بنائے گئے ہیں اور
کافی بلند ہیں۔ اس کے درمیان میں ایک حوض ہے۔ غالباً
اس میں پانی پہنچانے کا بھی انتظام تھا۔ مسجد کے قریب ایک
باغ بھی ہے جو اسی زمانے کا ہے اور اچھی حالت میں ہے
قرائن یہ ہیں کہ یہ قصبہ منصور خاں حبشی کا آباد کیا ہوا ہے
اور اسی کے نام سے موسوم ہے۔ منصور خاں سلطان محمد قطب شاہ
اور عبداللہ قطب شاہ کے اوائل عہد میں سلطنت کی بڑی
خدمتوں پر فائز تھا۔ لشکر رکاب خانے کی حوالداری سے
ترقی کر کے سلطان محمد کے عہد میں عین الملک کی خدمت پر
فائز ہوا جو فوج کی وزارت تھی چنانچہ عبداللہ قطب شاہ
کی تخت نشینی کے وقت اسی نے گولکنڈے اور حیدرآباد

میں امن قایم رکھنے کی کوشش کی اور کمسن بادشاہ کی تخت نشینی کا انتظام کیا اور عبداللہ قطب شاہ کے اوائل عہد میں خانم آغا کی سفارش سے جو بادشاہ کی دادی تھی میر جملہ کی خدمت پر فائز ہو گیا۔ چونکہ یہ دکنی فریق کا طرفدار تھا اس لیے اس کی موجودگی میں باہر والوں کو ملک میں ترقی کرنے کا موقع نہیں ملا۔ اور اس کے اثر سے ملا محمد تقی جیسے لایق لوگ نچلی خدمتوں پر فائز ہوئے۔ جب اس کا ۱۰۳۸ھ میں انتقال ہوا تو شیخ محمد ابن خاتون اور دوسرے نودار دبر سر حکومت ہو گئے۔

منصور آباد کے بعد حیات آباد کا معائنہ ہوا۔ جس کو آج کل بالعموم حیات نگر کہتے ہیں۔ یہ منصور آباد سے دو میل اور شہر حیدر آباد سے ۸ میل کے فاصلے پر واقع ہے۔ یہ مشہور قصبہ جو ایک زمانے میں ایک شہر تھا قطب شاہی خاندان کی مشہور خاتون حیات بخشی بیگم کا بنایا ہوا ہے جو "حیات ماں صاحب" کے ہر دلعزیز لقب سے مشہور تھی اس کی تعمیر غالباً ۱۰۳۵ھ میں شروع ہوئی تھی جب سلطان محمد قطب شاہ کا انتقال ہوا اور اس کا کمسن بیٹا عبداللہ قطب شاہ تخت نشین کیا گیا۔ شہر سے قریب اور مسولی پٹم کی شاہراہ پر ہونے کی وجہ سے اس کا موقع محل بہت اچھا تھا۔ اور ایسا معلوم ہوتا ہے کہ حیات ماں نے اس کو ایک بڑے شہر کی صورت میں آباد کیا تھا یعنی اس میں عالی شان عمارتیں اور باغ بنائے گئے اور کثرت سے تاجر صناع اور اہل علم جمع کئے گئے۔ کیونکہ اس زمانے کا مورخ نظام الدین کہتا ہے کہ "از وفور اہل صنعت و جمعیت اصناف و طبقات انام و کثرت ابنیہ و عمارات رفیعہ بسیارے باغات و بساتین مشابہ شہرے شدہ"۔ دو تین سال میں یہاں اس قدر چہل پہل ہو گئی تھی کہ لوگ بے ساختہ داد دیتے تھے۔

جب ۱۰۴۱ھ میں حیات ماں نے یہاں اپنے بیٹے عبداللہ قطب شاہ کی رسم موتراشی انجام دی تو اس قصبے کی رونق اس کے بلند محلات اور باغات کے ساتھ بہت بڑھ گئی۔ اسی وجہ سے نظام الدین اس کے متعلق کہتا ہے کہ "حیات آباد قطعہ ایست از بہشت بریں و بقعہ ایست بہشت آئین" ان الفاظ سے اس قصبے کی عظمت کا صحیح اندازہ ہو سکتا ہے۔ ۱۰۴۱ھ میں عبداللہ کی رسم موتراشی کے موقع پر شاہی جلوس موضع سعید آباد اور منصور آباد میں ٹھیرتا ہوا حیات آباد پہنچا تھا۔ اس جلوس میں حکومت کے تمام اعضائے سیاسی کے علاوہ ایران اور مغل سلطنت کے سفیر بھی تھے اور ان کی بہت مہمان نوازی ہوئی اور تقریباً ایک مہینے تک یہاں رقص و سرود کی محفلیں گرم رہیں۔

لیکن افسوس یہ ہے کہ اس وقت اس کی وہ آبادی ہے نہ اس کی عمارتیں باقی ہیں۔ اب اس کی پرانی یادگار ایک عالی شان مسجد ہے جو اپنی وسعت اور بلندی کے اعتبار سے قطب شاہی حسن کاری کا بہترین نمونہ ہے اور وسعت و بلندی کے اعتبار سے مکہ مسجد کے بعد اسی مسجد کا درجہ ہے۔ یہ ایک وسیع اور بلند عمارت ہے جو ایک بلند کرسی پر تعمیر ہوئی ہے۔ مسجد اور اس کے میناروں کا نظارہ دیکھنے والوں کو متاثر کئے بغیر نہیں رہتا۔ اگرچہ تمام تعمیر قطب شاہی طرز کی ہے لیکن اس کی ساخت میں جگہ جگہ لطیف اختراعیں بھی پائی جاتی ہیں جن کی وجہ سے یہ مسجد دوسری تمام قطب شاہی عمارتوں میں ممتاز ہو جاتی ہے۔ ان اختراعوں

معلوم ہوتا ہے کہ اس آخری دور میں جب کہ اس سلطنت کا زوال شروع ہوگیا تھا قطب شاہی تعمیر کاری بہت ترقی کرگئی تھی۔ مرکزی دالان اور اس کے آس پاس کی کمانوں کو بڑے سلیقے سے سجایا گیا ہے اور ہر کمان نئے طریقے سے تعمیر ہوئی ہے۔ ہر سقف پر بہت نئے نقش و نگار ہیں چنانچہ ہر سقف جو چار ستونوں کے درمیان ہے نئے نقش سے آراستہ ہے۔ اس کے میناروں کی ساخت بھی دوسری قطب شاہی مسجدوں سے مختلف ہے۔ ان میں بڑی جدت ہے۔ ان کا نچلا حصہ عجیب طرح سے بنایا گیا ہے یعنی اس کے چاروں طرف کتابی نما کئی کمانیں اس طرح بنائی گئی ہیں کہ عمارت سے علیحدہ معلوم ہوتی ہیں گویا وہ بالکل معلق ہیں۔ اس کے بعد میناروں کا درمیانی حصہ جو ان کمانوں کے اوپر سے ایک سڈول صراحی یا مرتبان کی شکل میں ڈھالا گیا ہے اور بہت خوشنما معلوم ہوتا ہے اور بالائی حصہ جس پر کلس نصب ہے اننناس کی طرح دکھائی دیتا ہے۔ اور جہاں سے مینار شروع ہوتا ہے مینار کے چاروں طرف گچ سے ایسا لطیف نقش بنایا گیا ہے کہ گویا مینار کو جواہر کا ہار پہنایا گیا ہے۔ اس کے علاوہ مسجد کی تمام چھت اور اس کے تمام کنگروں میں بے حد حسن کاری کی گئی ہے اور چاروں طرف خوش نما جالیاں کھڑی کی گئی ہیں۔ قبلہ کی طرف جو چھوٹے مینار ہیں وہ بھی بہت خوش نما معلوم ہوتے ہیں۔ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ جالیوں اور میناروں میں اندلس کی تعمیر کاری کی نقل کی گئی ہے۔

مسجد کے اردگرد ایک بہت بڑا صحن ہے جو دوسری قطب شاہی مسجدوں کو نصیب نہیں۔ چاروں طرف چار بڑے بڑے صدر دروازے ہیں لیکن سب سے زیادہ دلچسپ چیز یہ ہے کہ چاروں طرف طلبہ اور مسافروں کے ٹھیرنے کے لئے متعدد کمرے بنائے گئے ہیں جن کی تعداد تقریباً ۲۰۰ ہے اگرچہ کمرے چھوٹے ہیں اور ان کی مختصر وسعت سے معلوم ہوتا ہے کہ وہ ایک شخص کی سکونت کے لئے تھے لیکن ان کے باہر کشادہ برآمدے ہیں جو دھوپ اور پانی سے حفاظت کرتے ہیں اور مشہور یہ ہے کہ یہ تمام کمرے تعلیمی اغراض کے لئے تعمیر ہوئے تھے اور ان میں طالب علم ٹھیرتے تھے۔ اور یہاں ان کی تعلیم کا خاطر خواہ انتظام تھا۔ صحن کے درمیان ایک بڑا حوض ہے جس میں باہر سے پانی کا انتظام تھا اور غالباً اس حوض میں باؤلی سے پانی آتا تھا جو مسجد کے شمالی جانب موجود ہے۔ بہت بڑی سنگ بستہ باؤلی ہے اور مشہور یہ ہے کہ اس باؤلی سے ہاتھی کے ذریعے پانی کھینچا جاتا تھا۔

اگرچہ تاریخ سے معلوم ہوتا ہے کہ یہاں کئی باغ اور عمارتیں تعمیر ہوئی ہیں لیکن اب صرف ایک باغ رہ گیا ہے جو "خاص باغ" کے نام سے موسوم ہے۔ باغ کی پختہ روشوں سے جو گچ سے بنی ہوئی ہیں معلوم ہوتا ہے کہ یہ قطب شاہی زمانے کا باغ ہے۔ اس کا نام بھی پرانا ہے۔ بلند عمارات اور محلات میں سے جن کا ذکر تاریخ میں ہے سوائے ایک چبوترے کے جس کو ایک عمارت کی کرسی کہنا چاہیئے کوئی جز باقی نہیں ہے یہ چبوترہ یا کرسی مسجد کے سامنے ہے اس کی ساخت اور اس کے خوش نما پہلوؤں سے معلوم ہوتا ہے کہ اس پر ایک اچھا محل بنایا گیا تھا لیکن زمانے کے دستبرد سے تباہ ہوگیا اور اب اس محل کا صحیح اندازہ لگانا بہت مشکل ہے ممکن ہے کہ

آئندہ مسجد کا بھی یہی حال ہو کیونکہ اس کی پشت پر کئی جگہ پیپل کے درخت اُگ آئے ہیں اور عجب نہیں کہ درختوں کی جڑوں سے جو پتھروں میں بُری طرح نفوذ کر جاتی ہیں مسجد کی پشت شق ہو جائے۔

عبدالمجید صدیقی

احساسِ زندگانی

وہ ڈرا ہوا جبیں پر اک رنگِ شادمانی
عارض کی سرخیوں میں رقصاں نئی جوانی
وہ جسمِ مرمریں وہ ملبوسِ زعفرانی
تم بن کے آ گئے تھے اک حورِ آسمانی
اس وقت ہاں ہوا تھا احساسِ زندگانی

بے کیف زندگی سے گھبرا کے آ گئے تھے
تم اپنی بندشوں کو ٹھکرا کے آ گئے تھے
بے مہر بوں پہ اپنی پچھتا کے آ گئے تھے
روئے حسیں پہ زلفیں بکھرا کے آ گئے تھے
اس وقت ہاں ہوا تھا احساسِ زندگانی

میں گنگنا رہا تھا تم مسکرا رہے تھے
بجلی گرا رہے تھے جادو جگا رہے تھے
میں پاس آ رہا تھا تم دور جا رہے تھے
شوخی سے تمکنت کی عظمت بڑھا رہے تھے
اس وقت ہاں ہوا تھا احساسِ زندگانی

آنکھوں میں اک چمک تھی رُخ تمتما رہا تھا
اک رنگ آ رہا تھا اک رنگ جا رہا تھا
سر سے ڈھلک کے آنچل شانوں تک آ رہا تھا
تارا کہیں جبیں پر اک جھلملا رہا تھا
اس وقت ہاں ہوا تھا احساسِ زندگانی

عشرت کے زمزموں سے معمور تھیں فضائیں
بے خود بنا رہی تھیں گانی ہوئی ادائیں
اٹھتی تھیں مستیوں میں ڈوبی ہوئی نگاہیں
تم مسکرا رہے تھے ڈالے گلے میں باہیں
اس وقت ہاں ہوا تھا احساسِ زندگانی

سینے سے نقشِ وہمِ باطل مٹا گئے تم
صدقے میں اس کرم کے جینا سکھا گئے تم
کافر ادائیوں سے بندہ بنا گئے تم
دل میں سما گئے تم ہستی پہ چھا گئے تم
اس وقت ہاں ہوا تھا احساسِ زندگانی

رشید احمد رشید

معاشرت میں سادگی (آخری قسط)

جس گھر میں بچے کی پیدائش کے ساتھ اس قسم کی تقریبوں کا سلسلہ شروع ہو جاتا ہے اور اس کی عمر کے ساتھ اس سلسلہ کی درازی بھی بڑھتی جاتی ہے' ایسے گھر کے بچے کی ذہنیت اور خیالات کیا ہو سکتے ہیں؟ قیمتی سے قیمتی لباس کی اس کو ضرورت ہوگی، تمام فضول خرچیاں اس کی فطرت میں داخل ہو جائیں گی خود پسندی اور انانیت کے زہریلے جراثیم اس کے دماغ میں گھر کر لیں گے' کاہلی اور عیش پرستی اس کی طبیعت ثانیہ بن جائے گی' غرض کہ ایسے ناز و نعم کے گہوارے میں جو بچے پرورش پاتے ہیں وہ دنیا میں کسی مرض کی دوا نہیں ہوتے' نہ ان کے عاقبت نااندیش والدین ہی کو اندھی محبت کی وجہ ان کی تعلیم و تربیت کا خیال ہوتا ہے اور نہ ایسے بچوں میں پڑھنے لکھنے یا کوئی ہنر سیکھنے کا شوق ہوتا ہے، اس قسم کی فضا میں پرورش پانے ہوئے بچے اگر کچھ پڑھ لکھ بھی لیں تو اپنی بری عادتوں کی وجہ اپنے بزرگوں کے نیک ناموں کو بدنام کرنے والے بن کر زمین کی پیٹھ کا بوجھ بن جاتے ہیں اور اپنے وجود سے دوسرے انسانوں کے نقصان پہنچاتے ہیں۔

اس موقع پر اسی قسم کے بگڑے ہوئے ایک صاحب کے فرزند ارجمند کا ذکر کرنا بے جا نہ ہوگا۔ تعلیم کی غرض سے ایک صاحب نے اپنے صاحبزادے کو کلکتہ بھیجا' برخوردار کے ساتھ ایک اتالیق بھی بھیجے گئے' دو سو روپے کرایہ کا مکان لیا گیا اور صاحبزادہ صاحب انٹرنس میں شریک کرا دئے گئے۔ لڑکے کے ساتھ پدرِ بزرگوار بھی محض اس کی دلجوئی کے لئے مہینہ ڈیڑھ مہینہ کلکتہ میں رہے۔ صاحبزادہ کے لئے عمدہ فرنیچر خریدا گیا اور مکان کو خاطر خواہ سجا دیا گیا۔ اسکول جانے کے لئے ایک چھوٹی سی کار بھی خریدی گئی شوفر رکھا گیا۔ باورچی بھی حیدرآبادی اس لئے پسند کیا گیا کہ صاحبزادہ کی مرضی سے واقف تھا۔ یہ سارے انتظامات کر کے جب پدرِ بزرگوار لوٹنے لگے تو باپ بیٹے کی خوب دھائیں دھاڑیں ... اسٹیشن پر بھی ان دونوں کی جدائی کا عجیب منظر تھا۔ قصہ مختصر یہ کہ سیکڑوں ہزاروں روپے صرف ہونے کے بعد برخوردار بی اے پاس ہو گئے۔ جب بی اے کی کامیابی کا تار آیا تو گھر میں اعلیٰ پیمانے پر جشن منایا گیا۔ کئی روز تک دعوتیں ہوتی رہیں۔ صاحبزادہ کی جس دن گلپوشی ہوئی کسی طوائف کے مجرے کے ساتھ ایک شاندار ڈنر دیا گیا اور برخوردار کو پھول پہنا کر سب سے ملایا گیا اس تقریب میں بی اے کے نوشہ میاں کے زرین لباس پر دو ڈھائی سو روپے بھینٹ چڑھ گئے۔ چند روز کے بعد صاحبزادے کی صفتیں کھلنے لگیں۔ بے چارے شریف گھرانے والے ماں باپ کو جب یہ معلوم ہوا کہ صاحبزادے پکے جواری شرابی بن کر کلکتہ سے تشریف لائے ہیں تو اب ان کی آنکھیں کھلیں۔ اپنے آپ پر لعنت ملامت کرنے لگے کہ تعلیم کے زمانے میں نہ اس قدر روپے کی ریل پیل کرتے نہ یہ نوبت آتی مگر اب کیا ہو سکتا ہے جب چڑیاں چگ گئیں کھیت۔

جو لوگ فضول رسم و رواج کے پابند ہیں اور ہر رسم کو اپنے مذہب یا معاشرت کا جزو سمجھتے ہیں وہ کبھی سکھ چین سے زندگی نہیں بسر کر سکتے۔ مسلسل تقریبوں کی وجہ قرض کی پریشانیوں میں وہ کچھ ایسے مبتلا ہو جاتے ہیں کہ اپنی

اولاد کی تعلیم و تربیت کی طرف کچھ توجہ نہیں کر سکتے بچوں کی پرورش اور صحیح تعلیم و تربیت سمجھدار والدین کی کوششوں سے ہوتی ہے، اگر باپ فضول رسم و رواج اور اپنی حیثیت سے زیادہ گھر کے مصارف کی وجہ سے قرض کے ناقابل برداشت بار سے بوجھل ہو کر اپنے قرض خواہوں کو سمجھانے، منانے اور اپنی عزت و آبرو بچانے کی فکر میں لگ جائے تو ظاہر ہے کہ اکیلی ماں کیا کر سکتی ہے! ہماری وہی لڑکیاں قوم کی مائیں بنتی ہیں جنھیں برائے نام صرف تعلیم دی جاتی ہے، تربیت کی تو قطعاً ضرورت نہیں سمجھی جاتی، حالانکہ تربیت تعلیم سے زیادہ ضروری ہے اور یہی وہ چیز ہے جو ایک حیوان کو بھی انسان بنا دیتی ہے! لڑکیوں کو اسکول بھیج کر ہم سمجھتے ہیں کہ ایک دن وہ صحیح معنوں میں "عورت" بن کر نکلے گی۔ مگر جب وہ تھوڑی بہت تعلیم پا کر اسکول سے نکلتی ہیں اور اپنے والدین کو جاہل یا پاگل سمجھتی ہیں تو تب کہیں ان کی آنکھوں پر سے غفلت کے پردے اٹھتے ہیں اور تربیت نہ کرنے پر انھیں کفِ افسوس ملنا پڑتا ہے۔

اکثر ایسی نظیریں بھی موجود ہیں کہ لڑکا اُنیس بیس سال کا بھی نہیں ہونے پاتا کہ ماں باپ کو اپنے لختِ جگر کے بیاہ کا خیال ستانے لگتا ہے، اگر بیاہ ممکن نہ ہو تو کم از کم منگنی کی رسم تو کرنا واجب ہو جاتا ہے، یہ رسم ہوتے ہی نورِ چشم کے سسرال سے سمدھیانے کا رشتہ قائم ہو جاتا ہے اور دونوں طرف سے عید بقرعید کے موقعوں پر حصے بخرے آنے جانے شروع ہو جاتے ہیں۔ کہنے کو تو یہ عید کے حصے ہوتے ہیں مگر ان کی تیاری میں کافی فضول خرچی کی جاتی ہے اور موازنہ میں جو پہلے ہی سے غیر متوازن تھا ایک مستقل مدِ خرچ کا اضافہ ہو جاتا ہے، اس طرح چند سال بھی گزرنے نہیں پاتے کہ والدین کو فکر ہوتی ہے کہ اگر بیاہ جلد نہ کیا جائے تو کہیں برخوردار "آوارہ" نہ ہو جائیں اور کہیں بازاری جنس سے چپکے سے سودا نہ کریں۔

ہمارے گھروں میں شادی بیاہ کے موقعوں پر جو فضول خرچی کی جاتی ہے اور بیہودہ رسوم میں جو اسراف ہوتا ہے، اس کا صرف تصور ہی ایک سمجھ دار انسان کے لئے کافی خوفناک اور شرمناک ہے، اپنی حیثیت سے بڑھ کر اپنی شخصیت کو ظاہر کرنے کی خواہش ایک ایسا مرض ہے جس میں تقریباً ہر شخص مبتلا نظر آتا ہے، تقاریب کے موقعوں پر تو اس مرض میں کافی شدت ہو جاتی ہے، عروس کے والدین خواہ صاحبِ ثروت ہوں یا نہ ہوں مگر ان پر واجب ہے کہ اپنے برخوردار داماد کے بیش قیمت لباس اور سواری یا "گھوڑے جوڑے" کے لئے ایک کثیر رقم کسی صورت سے فراہم کریں۔ اس کے علاوہ دلہن کے لئے قیمتی زرین لباس کے پچاس ساٹھ جوڑے، مرصع زیور کا سراپا، نئی وضع کا عمدہ فرنیچر، نئے ماڈل کی شان دار موٹر کار غرض کہ اقسام کی سیکڑوں چیزیں جہیز میں دیں اور نکاح کے دن ایک ایسی پرتکلف دعوت کریں کہ جس میں دولھا میاں کے سارے عزیز و احباب ان کے ہمسائے، دور دور کے رشتہ دار، اگر کہیں ملازم ہیں تو دفتر کا پورا عملہ اور عہدہ داران متعلقہ و غیر متعلقہ سب کے سب بغیر کسی شکایت کے اقسام کے مزیدار کھانے نوشِ جان کریں اور ناچ گانے کی محفل کا لطف اٹھاتے

گپیں اڑاتے، تاش کھیلتے شام تک رونق افروز رہیں تاکہ
اس تقریب میں ایک "عصرانہ" بھی ہوجائے۔ اسی قسم
کی شادیاں اکثر خانہ بربادی کا باعث ہوا کرتی ہیں، اسی لئے
ہمارے ایک محترم دوست جنھیں خدا رکھے آدھی درجن
لڑکیاں ہی لڑکیاں ہیں ہمیشہ کہا کرتے ہیں

"بیٹی کیا آتی ہے اک گھر میں بلا آتی ہے"!

شادی بیاہ اور دوسری تقریبوں کے علاوہ محرم،
شب برات، اور عیدین کے موقعوں پر بھی ہم اپنی فضول خرچی
کا اپنی حیثیت سے بڑھ کر خوب مظاہرہ کرتے ہیں، جہاں کہیں
کوئی عید آئی دو چار ہفتے پہلے ہی سے دکانوں پر میلا لگ
جاتا ہے، اعلیٰ سے لے کر ادنیٰ تک اپنے اور اپنے اہل و عیال
کے لئے سر سے پیر تک نیا لباس بنواتا اور نیا سامان خریدتا
ہے، یہاں تک کہ محرم کے متبرک دنوں میں بھی شہیدان کربلا
کی یاد کو تازہ کرنے کے عوض نئے نئے لباس بنائے جاتے
ہیں اور شب برات کے مقدس گھنٹوں میں عبادت کو بالائے
طاق رکھ کر آتشبازی سے جی بہلایا جاتا ہے اور بڑی
بیدردی سے روپے کی ہولی جلائی جاتی ہے۔

ہماری فضول خرچیوں اور رسم و رواج کی تباہ کاریوں
کی کوئی حد و انتہا نہیں ہے، مرنے کے بعد بھی یہ سلسلہ جاری
رہتا ہے، زیارت، دسواں، بیسواں، چہلم، سہ ماہی، چھ ماہی
نوماہی، برسی وغیرہ کے ناموں سے جو تقریبیں کی جاتی
ہیں ان میں بھی جی کھول کر روپیہ صرف کیا جاتا ہے،
اور نہایت پرتکلف اقسام کے کھانوں سے مہمانوں کو
شاد کام کیا جاتا ہے، بعض لوگوں کا تو یہ عقیدہ ہے کہ
چہلم میں کم از کم چالیس قسم کے کھانے ہونے چاہئیں ورنہ
مرحوم یا مرحومہ کی روح کی بھوک پیاس تشنہ رہ جاتی
ہے اور اپنے پسماندوں کو پریشان کرتی، سرگرداں رہتی
ہے۔ چنانچہ حال ہی میں ہمیں اپنے ایک دوست کی بیوی
کے چہلم میں شریک ہونے کی سعادت حاصل ہوئی دسترخوان پر بلا مبالغہ
ہم نے چالیس قسم کے کھانے دیکھے۔ وفادار شوہر نے اپنی چہیتی بیوی کے
چہلم میں شریک ہونے والوں کی خاطر خواہ تواضع کی بڑی سیر چشمی سے
آپ نے کھانے کھلوائے تھے جب دوست احباب اور عزیز و اقارب
رخصت ہونے لگے تو آپ نے سب کا شکریہ ادا کیا اور کھانوں کی
نسبت پوچھا کہ "کسی کو ناپسند تو نہیں ہوئے؟ مزے میں کیسے
تھے؟ میٹھے کیسے پکے تھے"؟ غرض کہ پکوان کے متعلق آپ نے
اقسام کے سوال کر ڈالے!! گویا کہ یہ تقریب آپ نے محض اپنا
سلیقہ، اپنی لطافت اور اپنے کھانے کا مذاق دکھانے کے لئے کی تھی!!!

خوشی کی تقریبوں کی طرح زیارت، دسواں،
چہلم وغیرہ کو بھی تقریب کا رنگ دیا جاتا ہے، فرق صرف
اتنا ہوتا ہے کہ ان تقریبوں میں "ارباب نشاط" کو مدعو نہیں
کیا جاتا مگر بعض گھروں میں "قوالی" ہوا کرتی ہے، دوست احباب
عزیز و اقارب، شناسائی، پڑوسی، حوالی موالی سب کے
سب جمع ہوتے ہیں، کھاتے پیتے ہیں اور ہنس بول کر غم
غلط کرتے ہیں بقول اکبر الہ آبادی کے

بتائیں ہم تمھیں مرنے کے بعد کیا ہوگا
پلاؤ کھائیں گے احباب فاتحہ ہوگا

فاتحہ اور نیاز بری چیزیں نہیں ہیں بشرطیکہ ان کو
صحیح معنوں میں انجام دیا جائے، محتاج، یتیم اور مستحقین
کے عوض ایسے لوگ مدعو کئے جاتے ہیں جن کی شرکت قطعاً
باعث ثواب نہیں ہو سکتی! اس طرح ایصال ثواب کا
مقصد ہی فوت ہوجاتا ہے اور فاتحہ "تقریب" بن
جاتی ہے!!

سخت ضرورت ہے کہ اپنی معاشرتی خرابیوں، رسم و رواج کی تباہ کاریوں اور فضول خرچیوں کی طرف ہم اپنی پہلی فرصت میں توجہ کریں کہ ہماری خوشی اور غمی کی یہ تقریبیں اپنے اندر کس حد تک تخریب کے سامان رکھتی ہیں اور کہاں تک ہمارے افلاس اور نکبت کا ذریعہ بنی ہوئی ہیں، ہماری آنکھوں پر غفلت کے پردے پڑے ہوئے ہیں اور ہم فیشن پرستی، مغرب کی اندھی تقلید، رسم و رواج اور توہمات کی بھول بھلیوں میں کچھ ایسے پھنسے ہوئے ہیں کہ ہمیں کچھ سوجھتا ہی نہیں! خدا ہمیں سمجھ دے کہ ہم فضول رسم و رواج کی پابندی اور مغرب کی اندھی تقلید کرنا چھوڑیں جس کی وجہ آئے دن ہماری دولت دوسری اقوام کی جیبوں میں چلی جا رہی ہے اور ہم افلاس اور بربادی کے سمندر میں غوطے کھا رہے ہیں، خدا وہ دن لائے کہ ہم برائی اور بھلائی میں امتیاز کرنا سیکھیں، کفایت شعاری کو اپنا شعار بنائیں اور اپنی آمد خرچ کے توازن کو برقرار رکھنے کی ہمیشہ کوشش کریں اپنی جھوٹی شان و شوکت کی نمائش کے عوض ہم میں وہی سادگی، راست بازی، عزت نفس اور صداقت شعاری کے جذبات پیدا ہوں جو ہمارے اسلاف میں تھے جن کی بدولت انھوں نے ساری دنیا کو اپنا گرویدہ بنا لیا تھا اور اپنا امتیاز دوسری اقوام سے منوا کر چھوڑا تھا

مرزا سیف علیخاں

دل

بادۂ عشق سے لبریز ہے پیمانۂ دل
بے خودی ہے صلۂ لغزشِ مستانۂ دل

ہم فردوس ہے اور زاہد بیگانۂ دل
ورنہ کچھ راز نہیں خاکِ صنم خانۂ دل

حسنِ بیدار ہے آرائشِ کاشانۂ دل
کس تکلف سے سجایا ہے پری خانۂ دل

تیز ہے عشق کی مئے وہ ہیں برافگندہ نقاب
ڈر رہا ہوں کہ چھلک جائے نہ پیمانۂ دل

نغمۂ سازِ محبت کوئی سنتا ہی نہیں
آج تک منتظرِ گوش ہے افسانۂ دل

محوِ نظارہ ہے وہ شمعِ شبستانِ جمال
کس قدر شوخ ہے بے تابیٔ پروانۂ دل

داغِ پنہاں نے عجب پھول کھلائے کاوش
غیرتِ گلشنِ فردوس ہے ویرانۂ دل

کاوش

گل بوٹے

ہمیں ایک عمدہ قالین کی ضرورت تھی، ملکی مصنوعات کی دکان سے ہم نے اسکی تلاش شروع کی۔ ساری دکان چھان ماری مگر ہمارے کمرے کے ناپ کا قالین ملنا تھا نہ ملا! یہاں سے ہم چلے دوسری دکان کی تلاش میں!! ایک صاحب نے پتہ دیا کہ قدیم کتب خانہ کی عمارت میں جیل کی مصنوعات کی ایک دکان ہے وہاں اگر قالین نہ ملے تو عمدہ نقشی دری تو ضرور مل جائیگی جب ہم مرحوم کتب خانے کے احاطہ میں داخل ہوئے تو یہ محسوس ہوا کہ اس کے پچھلے جنم میں جہاں کتابوں کے پشتارے لگے رہتے تھے اب وہاں انجمنوں کے "انبار" پڑے ہوئے ہیں!

انجمنوں کی اس پرسکون اور دلکش دنیا میں ایک طرف برآمدہ میں ایک مرد معقول لنگی شیروانی پہنے اور آرا ٹیڑھا شملہ پہنے ریل کے انجن کی طرح دھواں چھوڑتے نیم دراز بیٹھے ہوئے تھے، ہم نے ان سے پوچھا

"جیل کے سامان کی دکان کہاں ہے"؟

جواب ملا "وہ معلوم نہیں یہ ترک مستورات کا دفتر ہے"

ہمیں بڑا تعجب ہوا کہ یہ نیا دفتر کب سے قائم ہوا؟ اور آخر اس میں کام کیا ہوتا ہے!! جستجو کے شوق نے ہمیں اندر جانے پر مجبور کیا، یہاں "صیغہ دار" قسم کے ایک صاحب رونق افروز تھے، ہم نے ان سے دریافت کیا تو معلوم ہوا کہ یہ ہر قسم کی نشہ بازی کو ترک کرانے کا دفتر ہے"!!!

جب ہم نے اپنے پہلے اور دوسرے دونوں ملاقاتیوں کے جوابات پر غور کیا تو اس نتیجہ پر پہنچے کہ یہ دفتر "ترک مستورات" کا اس لئے کہلاتا ہوگا کہ "عورت" بھی ایک قسم کا نشہ ہے! اور یہ "وہ نشہ نہیں جسے ترشی اتار دے"!!

کسی زمانے میں بعض ولایتی گنڈیوں پر "دخت رز" کی بوتل کے ساتھ ایک ناچنے والی "دخت حوا" کی تصویر بھی ہوتی تھی اور اس کے نیچے "بربادی کا راستہ" لکھا ہوتا تھا، گویا "بنت عنب" اور "بنت حوا" دونوں ہم اثر ٹھیرے! مگر اب سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ اس دفتر کو پہلے کس نشہ کے ترک کرنے کی کوشش کرنی چاہیے!! یا ان لوگوں کو جو اس دوسری قسم کے نشے میں چور رہ کر اپنی دین و دنیا خراب کر رہے ہیں یک گونہ بیخودی ہی میں مبتلا رکھنا چاہیے!!! اس مسئلہ کو "ترک مستورات" کا دفتر ہی بہتر سلجھا سکتا ہے!

دل ہی دل میں اس مسئلہ پر غور کرتے ہم چلے جیل کی دکان کی تلاش میں! اسی "دنیائے انجمن" کے ایک گوشے میں سرِ راہ یہ دکان برآمد ہوئی اور بڑی مشکل سے "فٹ پاتھ" کے برآمدے سے نیچے اتر کر ہم اس دکان میں نازل ہوئے!! دیکھتے کیا ہیں کہ ملکی مصنوعات کو بڑے جیل خانون سے نکال کر ایک "کال کوٹھڑی" میں بند کر دیا گیا ہے! جہیں چلنا پھرنا تو کجا سانس تک لینا بھی دشوار ہے!!

اور جب ہمیں بے ساختہ ایک دوسری ریاست کی مصنوعات کا "شوروم" یاد آیا تو بلا مبالغہ سینے میں دم رکنے لگا!!

جیل کی مصنوعات کی اس دکان میں ہم نے کچھ کرسی چیزیں بھی دیکھیں جنہیں بعض "خوش عاملہ" لوگوں نے کچھ بیانہ دیکر اپنے لئے محفوظ کرا لیا ہے! مگر اب نہ آتے ہیں نہ باقی روپے دے کر انہیں لیجاتے ہیں ورنہ کبھی اپنے نوکر کو بھیج کر ان کو معاف کراتے ہیں!!

یہاں بھی ہمیں اپنے کمرے کے ناپ کا نہ قالین ملا نہ دری! اگر وہ بارہ اس "کال کوٹھڑی" میں جانے کی ہمیں سعادت حاصل

ہوتی تو اس کی سچ و جج پر شاید کچھ اور بھی عرض کرتے، اسی خیال سے حال ہی میں ہم نے اس دکان میں دوبارہ جانا چاہا تو دروازے پر کسی انجمن کا نام نظر آیا! بھلا انجمنوں کی اس "محفل" میں بیچارے غریب قیدیوں کی دستکاریاں کیا بہار دکھاتیں!!!

ایک خاتون جو "خوردن برائے زیستن و ذکر کردن" کا حقیقی معنوں میں پابند ہیں، کم از کم غذا کے استعمال کا ریکارڈ قائم کرنے کی کوشش کر رہی ہیں، موصوفہ کے اس مختصر مفید کھانے پینے کی تفصیل ذیل میں درج کی جاتی ہے۔

صبح (ناشتہ) آدھا بسکٹ، آدھی پیالی چاء
دوپہر (لنچ) چانول دو تولہ، دال چھ ماشہ
سہ پہر سنگترے کی ایک پھانک اور آدھی پیالی چاء
شام (ڈنر) اسپریگس ۲ تولہ، قورمہ ۶ ماشہ

کیسی ہی شدت کی گرمی کیوں نہ ہو مقررہ مقدار سے پانی کا زیادہ پینے کی آپ نے قسم کھائی ہے اور اپنی "پیاس" پر بڑی خوبی سے آپ نے کافی قابو رکھا ہے چنانچہ دن اور رات کے چوبیس گھنٹوں میں صرف چار اونس پانی استعمال کرتی ہیں، وہ اس طرح کہ ناشتہ اور دوپہر کے کھانے کے درمیان ایک اونس، دوپہر کے کھانے اور سہ پہر کی چاء کے درمیان ایک اونس، سہ پہر کے اور شام کے کھانے کے درمیان ایک اونس سوتے وقت ٹھیک آدھی رات کو ایک اونس۔

غذا کی اس قلت نے، اگرچہ کہ موصوفہ کو کھنو کی گڑیا بنا دیا ہے مگر روحانی قوت میں آئے دن اضافہ ہو رہا ہے اور بینائی اس قدر صاف اور تیز ہوگئی ہے کہ دن میں تارے نظر آ رہے ہیں۔ اگر کسی کو ہمارے بیان کی صداقت میں شبہ ہو تو موصوفہ کے اس پروگرام پر عمل کر کے دیکھ لے کہ کس طرح وہی "آدمی" جس کے متعلق حضرت غالب فرماتے ہیں۔

"آدمی کو بھی میسر نہیں انساں ہونا!"

کتنی سرعت کے ساتھ "انسان" بن جاتا ہے اور "خوردن برائے زیستن و ذکر کردن" کا حقیقی مفہوم سمجھنے لگتا ہے۔

ایک دن صبح سویرے یہ منحوس خبر ملی کہ ہمارے ایک دوست نے اس سنسار سے اچانک رحلت فرمائی، ہمیں اس "مرگ ناگہانی" پر کچھ تعجب نہیں ہوا اس وجہ سے کہ آجکل پچاس فیصدی روحیں مسٹر عزرائیل اسی طرح اڑا لیجاتے ہیں اور رنجیدہ بیچارے "دل" پر رہتا ہے۔ کہ اس نے بغیر کسی نوٹس کے "حرکت ہڑتال" کر دی۔

کوئی دس بجے ہونگے کہ ہم مرحوم کے مکان پر پہنچے گھر خاصہ ماتم کدہ تھا عورتوں کے بین جگر کے ٹکڑے کر رہے تھے، بچوں کی شور و شین سے کلیجہ پانی پانی ہو رہا تھا مرحوم کے عزیز اور دوست جمع ہو رہے تھے کہ آپ کو "منزل" تک پہنچا دیں۔

کچھ دیر بعد سب کے سب اس کمرے میں داخل ہوئے جہاں مرحوم ایک سفید شال کے نیچے قیامت کی نیند سو رہے تھے، جگہ جگہ اگربتیاں جل رہی تھیں، عود اور اگر کی خوشبو سے کمرہ طبلۂ عطار ہو رہا تھا اور آپ کے سرہانے دو حافظ جی تلاوت کر رہے تھے، کچھ عجب عبرت خیز منظر تھا، جو انسان چند گھنٹے پہلے بھلا چنگا، چلتا پھرتا تھا کسے خبر تھی کہ اس طرح رخصت ہو جائیگا مرحوم کی خوبیوں کو یاد کر کے ہم سب نے آٹھ آٹھ آنسو بہائے

اور مرحوم کو کروٹ کروٹ جنت نصیب ہونے کی دعائے خیر کی، مرحوم کے بھائی سے معلوم ہوا کہ آپکی چھوٹی بہن کو جب آپ کی وفاتِ حسرت آیات کی خبر ملی تو اس قدر صدمہ ہوا کہ اس نے کھڑے سے خود کو گرا دیا اور غش آ گئی اور ابھی گھنٹوں سے بے ہوش ہے، آپ کی بھانجیوں نے اپنے سروں کو دیوار سے اس بری طرح ٹکرایا کہ لہولہان ہوئیں، ہم نے حتی الامکان حقِ تعزیت ادا کیا اور مرحوم کے عزیزوں کو ضبط و صبر کی تلقین کی۔

جب مرحوم کے چھوٹے بھائی نے باچشمِ گریاں شال ہٹا کر ہم سب کو مرحوم کا "دیدار" کرایا تو ہم سب نے مرحوم کی "جوانا مرگی" پر اظہارِ افسوس کیا، مرحوم کی بے وقت موت اور آپ کے ننھے معصوم بچوں کے مستقبل پر ہم ابھی غور کر رہے تھے کہ ہمیں مرحوم کے جسم میں کچھ حرکت معلوم ہوئی اور ہماری حیرت و پریشانی کی کوئی حد نہ تھی جب ہم نے دیکھا کہ "مرحوم" کلمہ پڑھتے اٹھ بیٹھے، "مرحوم" کا زندہ ہونا ہی تھا کہ ایک بھگدڑ پڑ گئی، بچے چیخیں مارتے بھاگ نکلے، دونوں حافظ جی ایک کونے میں جھپک گئے اور بغیر آواز کے "لاحول" اور "برب الناس" پڑھنے لگے، دو چار جھوٹ جو "ترسیدم پائے رفتن بہ بست" کے چکر میں تھے وہ زبانِ حال سے کہہ رہے تھے۔

این کہ می بینم بہ بیداریست یا رب یا بخواب"

"مرحوم" کے بھائی ایک طرف کھڑے مسکرا رہے تھے اور "مرحوم" کے چہرے پر بھی ہنسی کی ایک ہلکی سی لہر رقص کر رہی تھی، ہم نے ڈرتے ڈرتے آپکی اس "ڈرامائی" موت کے متعلق جو استفسار کیا تو معلوم ہوا کہ "کواکوہی" کے "ملاپ" کا نظارہ اس ساری "ستم ظریفی" کا باعث ہوا، سب کو اسکی جھینپ رہی کہ کواکوتی کے کارن انہیں "الو" بننا پڑا، ہمیں یہ فکر ہوئی کہ ان بندوں کی "شرارت" کے واقعات میں اگر کچھ تھوڑا سا اضافہ ہو جائے تو کوئی تعجب نہیں جو "موت ستی" میں شرکت کی رسم ہی سماج سے اٹھ جائے۔ جو کچھ بھی ہو ہمیں یہ سن کر مسرت ہوئی کہ "مرحوم" کی والدہ معظمہ بے حد خوش ہیں کہ اب آئندہ "سوا سو برس" تک "مرحوم" سے مسٹر عزرائیل ملاقات کی جرأت نہیں فرما سکتے، بڑی بی صاحبہ کو اسکی بھی خوشی ہے کہ مرحوم نے بڑی "سعادت مندی" سے اس معاملہ میں ان کے احکام کی لفظ بہ لفظ تعمیل فرمائی، سچ ہے !

"این سعادت بزور بازو نیست" !!

ایک بزرگوار نے فتح میدان کے چوراہے کے "بجلی محل" کی دیوار پر جلی حروف میں لکھا دیکھا

"برقی قوت زیادہ استعمال کیجئے"

اسی رات سے آپ نے اپنے مکان میں رات کے تمام چراغ روشن رکھنا شروع کر دئے! بیگم نے چیخ پکار کی تو فرمایا

"بیوقوفی کی باتیں مت کرو! کبھی ایسے ویسے سے نہیں سنا ہے !! سرکاری محکمہ کے "بجلی محل" پر موٹے موٹے حرفوں میں لکھا ہوا ہے "برقی قوت زیادہ استعمال کرو" سرکاری محکمہ جھوٹ کیسے لکھ سکتا ہے" !!!

غرض کہ پورا مہینہ آپ کے دولت خانہ میں ساری رات "چراغاں" ہوتا رہا، بیگم کی نیند حرام ہو گئی مگر آپ نے کسی کی نہیں سنی، برقی قوت زیادہ استعمال کرنے کے خاطر زیادہ قوت کے گولے لگائے گئے، اللہ اللہ کرکے مہینہ ختم ہوا، ہمیشہ پندرہ بیس روپے کا بل آیا کرتا تھا اس دفعہ پورے ڈیڑھ سو روپے کا بل آیا، بیگم نے سر پیٹ لیا، اتنے میں آپ

تشریف لائے، بیگم نے خوب صلواتیں سنائیں، آپ نے بل دیکھا اور لگے بغلیں بجانے! فرمایا
"دیکھا تم نے! اس مہینہ میں کتنا ڈسکونٹ ملا ہے"
چونکہ بل کی رقم زیادہ تھی اس لئے ڈسکونٹ کی مقدار بھی زیادہ ہوگئی تھی اور آپ کی نظر ہمیشہ ڈسکونٹ پر رہا کرتی تھی۔ بل ہاتھ میں لےکر تھوڑی دیر آپ نے ادھر اُدھر چہل قدمی کی پھر بیگم کے بازو بیٹھ کر مسکراتے ہوئے بڑی متانت سے فرمایا "برقی قوت زیادہ استعمال کرنے میں فائدہ ہی فائدہ ہے" کہیں "بجلی محل" والے بھی جھوٹ بولتے ہیں۔"

باغبان

دنیائے خواب

جہاں دریا کی موجیں نور کے آنسو بہاتی ہیں
جہاں سورج کی کرنیں وادیوں میں منہ چھپاتی ہیں
جہاں چشموں پہ جل پریاں صفِ ماتم بچھاتی ہیں
وہ اس خاموش آبادی میں میٹھی نیند سوتی ہے

اسے بھاتی نہ تھی دنیا کی یہ ہنگامہ آرائی
رہا کرتی تھی اس کو جستجوئے کنجِ تنہائی
جدا بزمِ جہاں سے ہو کے وہ سوئے وطن آئی
وہ اس خاموش آبادی میں میٹھی نیند سوتی ہے

نہ دیکھے گی وہ اب کہسار کی رنگیں بہاروں کو
سنہرے لالہ زاروں کو، چمکتے آبشاروں کو
شفق کی سرخیوں کو صبح کے عکسِ ستاروں کو
وہ اس خاموش آبادی میں میٹھی نیند سوتی ہے

ابد کی نیند سے اس کو جگا سکتا نہیں کوئی
حجابِ ظلمتِ شب کو اٹھا سکتا نہیں کوئی
سکوتِ موت پر آنسو بہا سکتا نہیں کوئی
وہ اس خاموش آبادی میں میٹھی نیند سوتی ہے

نعیم الدین صدیقی

(ماخوذ از روزیٹی)

ہاتھ اور لکیریں

دنیا علوم کا خزانہ ہے، مٹی کے ادنیٰ اور ناچیز ذرے، درختوں کی چھوٹی چھوٹی اور معمولی پتیاں علوم کے بڑے بڑے دفتر اپنی آغوشوں میں لئے ہوئے ہیں، ضرورت صرف دیکھنے اور سمجھنے والے کی ہے؛ سائنس کی ترقیاں آج دنیا جانتی ہے کہ اس کی سر توڑ کوششیں کیسے کیسے غضب ڈھا رہی ہیں اس کی ایجادات اور انکشافات کو سن سن کر دنیا عش عش کر رہی ہے لیکن اگر ایک طرف اس مختصر سی دنیا کی عظیم ترین وسعتوں کو رکھ دیا جائے اور دوسری طرف سائنس کی ایجادوں کو تو سوا اس کے اور کچھ بھی نہ معلوم ہوگا کہ سائنس ایک ایسا بچہ ہے جو ابھی گھٹنیوں بھی چلنے پر اچھی طرح قادر نہیں ہو سکا ہے۔

نہ معلوم کتنے صاحب عقل و سمجھ اس دنیا کی آغوش میں ایسے ہیں جو یہ سمجھ رہے ہیں کہ انسانی عقل دنیا کے بسیط اور نہ مٹنے والے علوم پر بہت جلد حاوی ہو جائیگی اور نہ معلوم کتنے ان خیالات کو صرف ایک رنگین اور دل خوش کن خواب سے تعبیر کر رہے ہیں بہر حال یہ تو دنیا ہے جس کی سمجھ میں جو آتا ہے بک دیتا ہے؛ سننے والوں کی بھی اللہ کے فضل و کرم سے کمی نہیں ہے۔ چنانچہ آج کی صحبت میں میں بھی کچھ تھوڑا بہت بک دینا چاہتا ہوں، اور قبل اس کے کہ میں اپنی بک بک شروع کروں سمع خراشی کی معافی مانگ لیتا ہوں۔

انسانی جسم کے کسی حصے یا کسی جزو کو بیکار نہ سمجھنا چاہئے انسان کے ہاتھ پیر، سر، سینہ، بال ناخن چہرے کے خط و خال پیشانی کی شکنیں، ہاتھ کی لکیریں، چال ڈھال، تحریر تقریر بیان تک کردار و گفتار انسان کے کیرکٹر اور حالات کا آئینہ دار ہے۔ ان سب چیزوں کی محض ظاہری شکل صورت کو پیش نظر رکھتے ہوئے ان کو معمولی کام کاج کا آلہ سمجھنا میرے خیال میں قدرت کے ایک بہت بڑے نظام کی حقیقت کا لاپروائی سے فراموش کر دینا ہے

انسانی جسم کی ہر چیز میں نہ معلوم کتنی دنیائیں پوشیدہ ہیں، وقت کا لحاظ کرتے ان سب کا ذکر مشکل ہے اس لئے مختصر طور پر ہاتھ اور اس کی لکیروں سے متعلق کچھ عرض کر دینا مناسب سمجھتا ہوں۔

ہاتھ کی لکیروں وغیرہ کو دیکھ کر جس علم کی رہبری سے انسان کے ماضی اور مستقبل کے متعلق کچھ کہا سنا جاتا ہے اس کو انگریزی میں پامسٹری عربی میں فراست الید اور ہندی میں سمدرک کہتے ہیں بعض بعض باتوں کی نسبت آپس میں اختلافات ہیں چنانچہ لکیروں کا حال یہ ہے کہ ایک ہی لکیر کو کوئی کسی بات سے متعلق کہتا ہے اور کوئی کسی سے لیکن اس کا مطلب نہیں ہے کہ یہ علم کوئی حقیقت نہیں رکھتا اس میں سے سب کچھ ڈھونڈنے والوں نے جیسا اور جتنا ڈھونڈھا اتنا اور ویسا پایا مختصر یہ ہے کہ مارکوٹ کر اس کو دو حصوں میں تقسیم کر دیا گیا ایک تو وہ حصہ ہے جسکا تعلق ہاتھ کی بناوٹ ہتھیلی کی ساخت انگلیوں کی کیفیت، پوروں اور ناخنوں کی وضع قطع سے ہے اور دوسرا وہ حصہ ہے جس میں ہاتھ کی لکیروں اور اس کے نشانات سے بحث کی جاتی ہے اس علم کے پرانے اور قدیم جاننے والوں نے ہاتھ کی ساخت کے لحاظ سے اس کو سات قسموں پر منقسم کیا ہے اور آج بھی بعض ماہرین اتنی ہی قسمیں بتلاتے ہیں ممکن ہے کہ اس کا تعین سبع سیارہ کے لحاظ سے کیا گیا ہو۔ لیکن حقیقت کا جہاں تک تعلق ہے اس کی صرف تین ہی قسمیں ہیں اور بقیہ دوسری صورتیں کوئی مستقل حیثیت نہیں رکھتیں بلکہ انہی تین کی آپس کی آمیزش اور اختلاط کے نمونے ہیں۔ چنانچہ ایک تو چوکور ہاتھ ہوتا ہے دوسرا چپٹا تیسرا گاؤدم۔

چوکور ہاتھ کا حکم اس ہاتھ پر لگایا جاسکے گا جس کی ہتھیلی

چوکور ہونے کے ساتھ ساتھ انگلیاں بھی چوکور ہوں، انگلیوں کے چوکور ہونے کا مطلب یہ ہے کہ وہ پتلی اور گول نہ ہوں بلکہ گوشت سے بھری ہوئی ہوں اور ان کو ظاہر بظاہر دیکھ کر یہ سمجھا جاسکے کہ یہ چوکور ہیں، چوکور ہاتھ والا عمل کے لئے بے چین رہتا ہے، زندگی کا مطالعہ مادی اسباب اور عملی نقطۂ نظر سے کرنے کے علاوہ عاقبت اندیشی سے کام لیتا ہے اس کے خیالات میں ایک خاص قسم کی ترتیب اور تنظیم ہوتی ہے محبت کی جانب بہت کم مائل ہوتا ہے لیکن اگر کسی سے محبت ہو جاتی ہے تو پھر مرتے دم تک نباہنے کی کوشش کرتا ہے ان سب باتوں کے علاوہ کاروبار میں قابل اعتماد بھی ہوتا ہے لیکن جہاں اتنی اچھائیاں ہیں وہاں کچھ برائیاں بھی ہیں، اختراع و ایجاد کا مادہ نہیں ہوتا لکیر کا فقیر بنا رہتا ہے اور گہرائی میں جانے سے بھاگتے ہیں جو ظاہر بظاہر جو چیز جیسی بھی علم میں آجاتی ہے اس کو ویسا ہی سمجھ لیتا ہے۔

پھیلا ہاتھ اس کو کہہ سکیں گے جس کی ہتھیلی اور انگلیوں کے سرے سمار کی کنّی کی طرح پھیلے اور پسیلے ہوئے ہوں اس قسم کا ہاتھ مضبوط اور اس کا انگوٹھا بڑا ہوتا ہے ایسے ہاتھ والے میں اعتماد نفس، قوت ارادی کی مضبوطی، خیالات کی آزادی، اختراع و ایجاد کی صلاحیت، پیش بینی کی قوت، سفر و سیاحت کرنے کا شوق، مشنری کے کاموں میں دلچسپی، اور انتقام کی امنگ ہوتی ہے لیکن ایسے ہاتھ والا ہمدردی کے موقعوں پر اکثر پیچھے ہٹ جاتا ہے چونکہ ایسے لوگوں کو آرٹ یا فنون لطیفہ سے دلچسپی نہیں ہوتی اس لئے کسی چیز کی ظاہری جسامت اور ضخامت ان کے دل و دماغ پر زیادہ اثر انداز ہوتی ہے حسن کا احساس کمزور ہونے کی وجہ سے خوبصورتی کو بھی زیادہ اہمیت نہیں دیتے، مذہبی معاملات میں کچھ غیر متعصب ہوتے ہیں اور صرف انہی باتوں کا یقین کرلیتے ہیں جو ان کی عقل میں کسی طریقے سے آجایا کرتی ہیں۔

گاؤدم ہاتھ والا صنعت اور فن کی جانب زیادہ مائل رہتا ہے ایسے ہاتھ کی ہتھیلی انگلیوں کی جڑ کی جانب نسبتاً کم چوڑی ہوتی ہے اور ہتھیلی تقریباً ایک تہائی حصہ اوپر کی جانب دبیز ہوتی ہے اس کی کلائی کی طرف ہتھیلی کا حصہ تدریجاً پتلا ہونا ضروری ہے ناخنوں کی طرف ہاتھ کا حصہ بالکل گاؤدم سا معلوم ہوگا اور سارا ہاتھ اگر انگلیوں کو ملا کر دیکھا جائے تو انگشتانے کی طرح دکھائی دے گا جس کو درزی بیچ کی انگلی میں پہن کر سیتے پروتے ہیں، ایسے ہاتھ والا جذبات کا فرماں بردار ہوتا ہے اور قوت عقل و تمیز کے سرہانے کو ہاتھ لگانا قریب قریب امانت میں خیانت کردینے کے برابر سمجھتا ہے اس کا قلب کسی چیز یا بات کے اثر کو بہت جلد قبول کرلیتا ہے اس کی محبت اور دوستی بودی اور نفسی ہوتی ہے لیکن جب وہ کسی سے محبت کرتا ہے تو اندھا بن کر پرستش کرنے لگتا ہے اس کا مزاج گھڑی میں تولہ اور گھڑی میں ماشہ ہوتا ہے ابھی ابھی مسرتوں سے کھیل رہا تھا دیکھتے دیکھتے غم و الم کا مجسمہ بن گیا بغیر کسی خاص وجہ کے کسی چیز سے محبت اور کسی سے نفرت کرنا تو سمجھو کہ اس کی خاص خصوصیت ہے لیکن اس کے ساتھ ہی ساتھ خطا پوشی اور عطا و بخشش کے موقعوں پر کبھی پیچھے نہیں ہٹتا، اس کا غصہ کرنا بھی کا ابال سمجھو طبیعت میں جوش اور حقیقی باتوں کے مقابلہ میں خیالی امور پر توجہ اس کا طرۂ امتیاز ہوتا ہے اگر ایسے ہاتھ والے کا انگوٹھا سخت ہوا تو انہی خصوصیات میں قوت ارادی کا اضافہ ہونا ضروری ہے صنعتوں سے کھیلنا اسکا خاص شغل ہوگا، پبلک کا کام کرنے والے لوگوں میں ایسے ہاتھ والے اپنی ذہانت کی نسبت جوش سے زیادہ کامیاب ہوجاتے ہیں

مخلوط یا گڈ مڈ یا ایسا ہاتھ کہا جا سکے گا جس میں گذشتہ تین قسموں کی حالتیں ملی جلی پائی جائیں اس کی خصوصیات بھی اسی ہاتھ کی جیسی ہوں گی جس کی خصوصیات اس میں زیادہ پائی جاتی ہوں مثلاً اگر کسی چوکور ہتھیلی والے ہاتھ کی انگلیاں ملی جلی یا مخلوط ہوں تو ایسا شخص خیالی دنیا کا بادشاہ ہوگا لیکن ساتھ ساتھ اس کا ہر خیال عملی سانچے میں ڈھلنا ضروری ہے کیونکہ ایسے ہاتھ کا مالک کسی ماحول کے مطابق اپنے کو بنا لینے میں تقریباً کامل ہوتا ہے۔ چپٹے ہاتھ کی مخلوط انگلیاں بھی انہی خصوصیات کو ظاہر کرینگی لیکن ایسے شخص میں سیاحت زیادہ ہوگی نئے نئے مناظر کا دلدادہ اور ایجادات کا شائق ہوگا لیکن افسوس ہے کہ غیر مستقل مزاجی کی وجہ سے ناکام رہیگا۔

مخروطی یا کاودم ہتھیلی میں اگر ملی جلی انگلیاں ہوں تو یہ سمجھنا چاہئے کہ ایسے شخص کے خیالات و حرکات آرٹ سے زیادہ متاثر ہیں۔ گرہ دار ہاتھ سے مراد وہ ہاتھ ہو سکتا ہے جس کی انگلیوں کے جوڑ زیادہ واضح اور نمایاں ہوں اور جوڑ گرھوں جیسے دکھائی دیں۔ ایسے ہاتھ کو فلسفیانہ ہاتھ کہا جا سکیگا۔

اس علم میں انگوٹھے کی بڑی اہمیت ہے۔ دوسری انگلیوں کی طرح انگوٹھے کے بھی تین حصے یا پوریں ہوتی ہیں پہلی پور تو وہ ہے جس میں ناخن شامل ہے دوسری پور درمیانی اور تیسری پور اس کو کہا جائیگا جس میں ہتھیلی کا ایک حصہ شامل ہے۔ پہلی پور ارادے کی قوتوں کو ظاہر کرتی ہے، دوسری عقل اور تدبر کو اگر یہ دونوں پوریں برابر کی ہوں تو سمجھنا چاہئے کہ یہ دونوں قوتیں برابر کی ہیں اور ایسا انسان معاملات پر ٹھنڈے دل سے غور کرنے کے علاوہ عمل بھی کرتا ہے لیکن اگر پہلی پور نوکیلی ہوگی تو ایسے آدمی پر ماحول کا اس طرح اثر پڑے گا جیسے مقناطیس کا فولاد پر۔ اگر پہلی پور دوسری پور سے چھوٹی اور چوڑی ہوگی تو خود رائی کا مادہ زیادہ پایا جائے گا۔ اگر پہلی پور کا زیادہ بھرا ہوا حصہ جوڑ کے قریب ہو یہاں تک کہ دوسری پور تک چلا گیا ہو تو ایسا شخص اپنی ہٹ کا پکا ہوگا اس کو جب تک پوری پوری طور پر کسی بات کا یقین نہ ہو اپنے خیال سے باز آنے کا نام نہ لے گا اگر پہلی پور بہت چھوٹی ہوگی تو قوتِ ارادہ نام کو بھی نہ ہوگی، ایسا شخص بس خیالی دنیا میں موجیں مارا کریگا یہی وجہ ہے کہ عورتوں کے انگوٹھوں کی پہلی پور بہت چھوٹی ہوتی ہے

ابھی ابھی عرض کیا گیا ہے کہ دوسری پور قوتِ فہم و فیصلہ کو ظاہر کرتی ہے اگر دوسری پور لمبی اور پہلی پور کے برابر ہوگی تو معلوم ہوگا کہ ایسے شخص کی قوتِ استدلال و فیصلہ اعلیٰ ہے لیکن اگر اسی کے ہاتھ کی پہلی پور چھوٹی ہوگی تو اس کی قوت عمل کمزور ہوگی اور ایسا شخص اپنے خیالات و تجاویز کو مشکل سے ہی صورت میں تبدیل کرنے پر قادر ہو سکیگا۔ دوسری پور اگر چھوٹی ہوگی تو قوتِ استدلال نہ ہونے کے علاوہ اس سے دوستی اور وفاداری کی امید کرنا کاغذی پھول سے خوشبو کے متمنی ہونے کے برابر ہے۔ اگر دوسری پور پہلی کے برابر موٹی ہوگی تو اس پور کی خصوصیات بہت زیادہ واضح اور نمایاں ہوں گی۔ تیسری پور ہتھیلی میں شامل ہے اور اس کا تعلق محبت وغیرہ سے ہے۔ انگوٹھا دو قسم کا ہوتا ہے، نرم اور سخت۔ نرم انگوٹھا پھیلاتے وقت پیچھے کی طرف جھکا رہتا ہے اور سخت ہمیشہ سیدھا کیونکہ اس کا جوڑ مضبوط ہوتا ہے۔ نازک جوڑ کے انگوٹھے والا ضدی نہیں ہوتا معقول بات سن لیتا ہے ہنستے کھیلتے زندگی گذارتا مروت، اخلاق اور فیاضی سے کام لینا اس کا خاص جوہر ہوتا ہے ہاتھ کی انگلیاں پھیلانے میں انگوٹھا انگلیوں سے جتنا زیادہ دور رہیگا اتنا ہی ایک انسان دریا دل اور فضول خرچ ہوگا اور جتنا انگلیوں کی طرف کھنچا رہیگا اتنا ہی کنجوس ہوگا اور قدم قدم پر احتیاط سے کام لیگا سخت جوڑ کے

انگوٹھے والا تندخو ہوتا ہے پہلے تو وہ کسی بات کو تسلیم ہی نہیں کرتا جب تک اس کو پورا ثبوت نہ مل جائے لیکن اگر وہ کسی بات کو دل میں ٹھان لیتا ہے تو پھر اس کو کئے بغیر چین نہیں لیتا تنہائی پسندی، غرور، ضد اس کی خاص صفات ہیں بعض انگوٹھوں کا سرا نہایت ہی بھدا اور موٹا ہوتا ہے انگوٹھے کی یہ قسم اچھی نہیں ہوتی کیونکہ ایسے انگوٹھے والے جاہل، وحشی اور ظالم ہوتے ہیں یہاں تک کہ سنگین سے سنگین جرائم بھی کرتے ہوئے نہیں ڈرتے۔

اس وقت تک جو کچھ بھی عرض کیا گیا ہے اس میں ہاتھوں کی بناوٹ اور انگوٹھے کی ساخت پر مختصر الفاظ میں روشنی ڈالی گئی ہے یہ نہیں ظاہر کیا گیا کہ اگر ایسے ہاتھوں کے ساتھ دوسری انگلیوں کی پوریں ایسی ہوں یا ناخن ایسے ہوں تو اس صورت میں طبیعت کا رخ اور فطرت کا رجحان کدھر ہوگا، ہاتھوں کے ساتھ ساتھ ناخنوں اور پوروں کی کیفیت اور خاص طور پر لکیروں کے اتار چڑھاؤ کے اثرات کا بھی دخل ہے اس لئے تاوقتیکہ کسی ہاتھ کی تمام چیزیں سامنے نہ ہوں لب کشائی ذرا مشکل ہی ہے۔

گو یہ علم اپنی جگہ بڑی اہمیت رکھتا ہے لیکن اس میں ایک خامی ایسی ہے جسکی تلافی ذرا مشکل ہی معلوم ہوتی ہے یعنی ہاتھ کی لکیریں گھٹنے بڑھنے کی وجہ سے قطعیت کے ساتھ کوئی حکم نہیں لگایا جاسکتا لیکن باوجود اس قابل لحاظ کمزوری کے لوگوں نے اس کے پیچھے اپنی زندگیاں تباہ کردیں اور گھر بار تج دیا۔ ہندوستان میں عام طور پر اس علم سے دلچسپی پائی جاتی ہے، کہ ذرا دیہات میں چلے جائیے بہت سے پنڈت اس خبط میں گرفتار دکھائی دیں گے، قصبوں کے جوتشی بھی کچھ کم نہیں ہیں، شہروں کے تعلیم یافتہ حضرات بھی اسکی چاشنی کے مزے لے رہے ہیں بہرحال اس کا چرچا ہر طرف ہے میرے ذاتی مشاہدات ہیں کہ وہ لوگ جو اس فن اور اس فن کے جاننے والوں کو ذلت اور بے اعتباری کی نظروں سے دیکھتے ہیں کسی نہ کسی وقت اپنا ہاتھ ان میں سے کسی ایک کے سامنے پھیلا ہی دیتے ہیں خواہ وہ مذاق اور تفریح کی خاطر ہی کیوں نہ ہو۔

دنیا کے ایسے علوم جن کا تعلق پیشین گوئی وغیرہ سے ہو زیادہ تر مذہبی خیال والوں پر قائم ہیں اس لئے ایسا شخص جو مادہ کو ہی کائنات کا خالق سمجھتا ہو اور جسکی نظروں میں حشر و نشر کی کوئی حقیقت اور اہمیت نہ ہو اور جسکی عقلی رسائیاں یہاں تک پہنچ کر جواب دینے لگتی ہوں کہ انسان صرف چند کیمیائی اجزا کی آمیزش کا نام ہے اور اس کا فنا ہو جانا محض انہی اجزا کا بکھراؤ ہی ہو سکتا ہے ظاہر ہے کہ اس کی نظروں میں ایسے علوم کی مہملات سے زیادہ وقعت نہیں ہو سکتی کیونکہ اگر ایسے لوگ ادھر ایک قدم بھی بڑھائیں تو سمجھو کہ آفت ہی آجائے اس لئے کہ اس کو ماننے کے بعد ایک ناقابل فہم برتر و بالا قوت کا ماننا ان پر واجب ہو جائے اور پھر ان کی تمام فیشن ایبل آزادیاں خاک میں مل کر رہ جائیں لیکن یہ قدرت کا کھیل سمجھو یا فطرت کا کرشمہ کہ ان کی زندگی میں بھی ایسے موقع ہوتے ہیں یا آجایا کرتے ہیں کہ ان کو ایسی چیزوں کے سامنے مجبوراً جھک جانا پڑتا ہے۔ گو ابھی یہ بات مشکل سے سمجھ میں نہیں آتی کہ انسان کے ہاتھ پیر، آنکھ ناک، سر سینہ، گردن، ناخن پوروں اور بالوں کی وضع قطع یا ان کی نرمی سختی بھی ایسی چیزیں ہو سکتی ہیں جن کا انسانی زندگی سے تعلق ہو سکتا ہے لیکن بایں ہمہ اس کے علم قیافہ اور سمدرک دنیا میں موجود ہے اور اچھی اہمیت کے ساتھ پھل پھول رہا ہے۔ ہندو بھائیوں کے ہاں تو

سدرک اور زائچے وغیرہ کی تقریباً پچانوے فیصد اہمیت ہے اور وہ اٹھتے بیٹھتے سوتے جاگتے اس کی اہمیتوں کو پیش نظر رکھتے ہیں، ادھر بچہ پیدا ہوا کہ زائچہ تیار، جس میں وقت گھڑی ساعت، دن تاریخ سب ہی کچھ موجود۔ زائچہ بیکار چیز نہیں ہے اس سے ستارے وغیرہ بھی دیکھے جاسکتے ہیں علاوہ اس کے دوسرے علوم کے سلسلہ میں بھی کام آتا ہے ان سب کے قطع نظر اس بات کا علم ہو جانا کیا کم ہے کہ خاندان میں کہاں تک کتنی عمر رہی اور اس کے بعد اس میں کتنی کمی و زیادتی ہوگئی میں پہلے عرض کر چکا ہوں کہ علم سدرک اور قیافہ کے کے علاوہ اور بہت سے علوم ایسے ہیں جن کی مدد سے فطرت انسانی کا اندازہ کیا جاسکتا ہے لیکن خدا بھلا کرے ہماری کم علمی کا جو ہمارے سامنے ہر وقت بیٹھی رہتی ہے جس کی وجہ سے نہ تو ہم آگے بڑھ سکتے ہیں اور نہ یہ دیکھ سکتے ہیں کہ اس کا نتیجہ کیا۔

ایک زمانہ تھا کہ اسی سدرک کو ترقی دینے کی سیکڑوں کوشش کی گئیں اور بعض اہم کتابیں بھی لکھی گئیں لیکن بعض وجوہ کے تحت خاطر خواہ کامیابی نہ ہو سکی یہاں تک کہ دنیا اس کی طرف سے قریب قریب بالکل بے خبر ہوگئی لیکن زمانے کی رفتار نے دنیا کو پھر گردش دی اور اس علم کے دن پھرے، چنانچہ آج یورپ اور مخصوص طور پر فرانسیسی زبان کے دامن تو تقریباً اس علم سے مالا مال ہیں۔ یہ خیال میرے لئے سخت تکلیف دہ ثابت ہوتا ہے جب میں محسوس کرتا ہوں کہ اردو اس علم سے تہی آغوش ہے وہ حضرات جو اردو داں ہونے کے علاوہ دوسری زبانوں سے بھی واقف ہیں اس جانب توجہ فرمائیں۔

شجاع احمد قائد

(یہ مضمون حیدرآباد ریڈیو اسٹیشن سے نشر کیا گیا تھا)

بادۂ شباب

قصۂ غم جب انہیں رو کر سنا دیتا ہوں میں
اپنے قدموں میں دو عالم کو جھکا دیتا ہوں میں

جب نیاز و ناز کے پردے اٹھا دیتا ہوں میں
دہر کی تاریکیوں کو جگمگا دیتا ہوں میں

جب وفورِ شوق میں خود کو بھلا دیتا ہوں میں
رفعت و پستی کو اک مرکز پہ لا دیتا ہوں میں

وہ سراپا حسن و ناز اور میں مجسم درد و غم
پھر بھی اس کو دل کا آئینہ دکھا دیتا ہوں میں

تیرے صدقے ایسے ہی لطف و کرم کی یاد میں
ہر قدم پر اک نئی دنیا بسا دیتا ہوں میں

اس بلندی سے جہاں وہ خود نہ اب تک آسکا
کیا خبر ہے کس لئے اس کو صدا دیتا ہوں میں

ہائے وہ معصوم آنکھیں جن میں شائد میں بھی تھا
کس قدر بدبخت ہوں ان کو بھلا دیتا ہوں میں

اس تمنا میں کہ شائد تم نہ مجھ کو پا سکو
اپنی قیمت اپنی نظروں سے گرا دیتا ہوں میں

جذب ہو جاتی ہے دل کی دھڑکنوں میں زندگی
اپنی محرومی پہ جب اس کو رلا دیتا ہوں میں

میری مے خواری نہ پوچھو اب تو ساقی کو **نظر**
مست ہو کر مستیوں کے گر سکھا دیتا ہوں میں

چھیڑتا ہوں جب رباب دل کے تاروں کو **نظر**
محفلوں میں ایک محشر سی مچا دیتا ہوں میں

نظر

دعوت

روز کی طرح آج پھر صبح ہوئی۔ مگر اب تک سورج نہیں نکلا تھا کالے بادلوں سے آسمان ڈھکا ہوا تھا۔ آنکھیں کھولنے سے پہلے ہی شکیلہ نے محسوس کیا تھا کہ آج کا دن بے رونق ہوگا مگر وہ ہمت کرکے اٹھی اسی لئے کہ صبح سویرے اٹھنا روز کا معمول تھا اور اس لئے بھی اٹھی کہ وہ یہ معلوم کرنے کے لئے بے چین تھی کہ کل شاکر کے انٹرویو کا کیا حشر ہوا۔ رات جب وہ آیا تو شکیلہ سو رہی تھی۔ شکیلہ نے اٹھتے ہوئے آہستہ سے شاکر کو پکارا۔ مگر وہ غافل سو رہا تھا۔ اس کے چہرے سے خوشی یا غم کے آثار ظاہر نہیں تھے۔ ہاں ایک قسم کا اطمینان ضرور ظاہر ہوتا تھا۔ وہ اس کے چہرے سے کل کے انٹرویو کی کامیابی یا ناکامی معلوم کرنا چاہتی تھی۔ مگر بے سود شاکر کو دیکھنے سے یہ معلوم ہوتا تھا کہ اس کی عمر چالیس سے کچھ زیادہ ہے اور ذرا بھاری بدن کا آدمی ہے۔ جب تک وہ اٹھ کر بولنا نہیں شروع کرے گا وہ کچھ بھی معلوم نہ کر سکے گی۔ جب وہ رات کو دیر میں گھر آتا تو کبھی شکیلہ کو نہ جگاتا تھا شکیلہ نے بھی اس وقت اس کی نیند خراب کرنی گوارا نہیں کی اور آہستہ کمرے کے باہر چلی گئی۔

غسل خانے کی صاف ستھری چیزوں اور صابن کی ہلکی ہلکی خوش بو میں وہ موسم کی خرابی کو بھول گئی۔ بارہ سال کی شادی شدہ زندگی میں اسے بہت سے تجربے ہوئے۔ کتنے ہی غم اور خوشیاں دیکھنے میں آئیں۔ دنیا کی بہت سی چیزیں بدل گئیں۔ مگر یہ گھر جیسا تھا ویسا ہی رہا۔ اس لئے شکیلہ کو اپنے گھر سے بہت محبت تھی۔

اب وہ باورچی خانے میں گئی، ہر ایک چیز صفائی سے اپنی جگہ پر رکھی تھی۔ چھوٹا سا نعمت خانہ اور دوسرا باورچی خانے کا سامان آج سے گیارہ سال پہلے حسین بی کو نوکر رکھنے سے کچھ دن قبل خریدا تھا بالکل اسی طرح اپنی جگہ پر رکھا تھا۔ اس خیال کے آتے ہی اسے اپنی وفادار نوکرانی یاد آگئی۔ ناشتہ بناتے پکاتے وہ سوچنے لگی، کہ اگر نوکر ہمارے زیادہ عرصے تک رہیں تو ہم کس طرح ان کے دکھ درد کے ساتھی بن جاتے ہیں۔

حسین بی کے جانے سے شکیلہ کو اتنا ہی رنج ہوا تھا جتنا اس کے مرنے سے ہوتا۔ وہ دونوں خوب روئی تھیں "بیگم صاحب جب تک سرکار کو نوکری نہیں ملتی بغیر تنخواہ کے کام کروں گی۔"

لیکن شکیلہ نے کہا "بیوقوفوں جیسی باتیں مت کرو تم محنتی ہو تمہیں ابھی سے اچھی نوکری مل سکتی ہے۔ جب وہ نوکر ہو جائیں گے میں تم کو پھر بلاؤں گی۔ فی الحال بوڑھا قاسم کافی ہے"

حسین بی کو نوکری مل گئی پہلے سے اچھی۔ اسی دوران میں کہ شکیلہ یہ سب باتیں سوچ رہی تھی شاکر کے غسل خانے میں جانے کی آواز آئی "یہ آبادی میں رہنے کی خرابی ہے۔ موٹروں اور گاڑیوں کی گھڑگھڑاہٹ اور گلی کے بچوں کی چیخ پکار سے انسان آرام سے نہیں سو سکتا۔ شکیلہ نے جلدی جلدی ناشتے کی سب چیزیں رکابیوں میں نکالنی شروع کیں "کچھ بھی ہو میں یہ نہ معلوم ہونے دوں گی کہ مجھے کچھ فکر ہے" قبل اس کے کہ وہ سب چیزیں ٹھیک کرلے شاکر باورچی خانے کے دروازے میں کھڑا تھا۔

"اوہو آپ آگئے لیجئے ناشتہ بھی تیار" شکیلہ نے مسکراتے ہوئے کہا۔

"ہاں صاحب بھوک تو بہت لگ رہی ہے" شاکر نے سر کھجاتے ہوئے کہا اور وہیں چوکی پر بیٹھ گیا "ہاں تو بڈھے منصف صاحب بھی وہاں تھے۔ ان کو ایک مددگار کی ضرورت ہے

وہ اپنا جیسا ہی آدمی چاہتے ہیں۔

"اپنا جیسا آدمی چاہتے ! ہیں اس کا کیا مطلب ہے؟
وہ خود کیسے ہیں"؟

"کیا بتاؤں کیسے ہیں دقیانوسی بڈھے آدمی ہیں"
شاکر تھوڑی دیر کے لئے کچھ سوچ میں پڑ گیا۔ "سمجھتے ہیں
ان سے اچھا افسر دنیا میں پیدا ہی نہیں ہو سکتا۔ اور ان کا
خیال ہے کہ کاروبار میں انسانیت سے کام لینا چاہئے"۔

"مگر جب آپ نے کہا کہ مجھے نوکری کی ضرورت ہے
تو انھوں نے کیا کہا۔ میں جب سے یہ معلوم کرنا چاہ رہی ہوں"
شکیلہ کے اس سوال سے شاکر کو بڑی الجھن ہوئی

"یا اللہ" تم نے آخر مجھے سمجھ کیا رکھا ہے میں ان سے نوکری
کے لئے کس طرح پوچھ بیٹھتا؟ اگر ان کو سرسری طور پر بھی یہ
معلوم ہو جاتا کہ میں نوکری کے لئے آیا ہوں، تو شاید وہ مجھ سے
بات بھی نہ کرتے۔ یہ کام تو سلیقے سے کئے جاتے ہیں۔
شوکت اور حامد نے ان سے میرا ذکر کیا تھا"۔

"آپ کا کیا ذکر کیا تھا"؟

"یہی کہ میں دفتر میں نوکر تھا۔ وہاں تخفیف کی وجہ سے
میں الگ کر دیا گیا ہوں۔ اور یہ کہ میں بہت محنتی اور قابل ہوں"

"تو پھر آپ سے منصف صاحب نے کیا کہا"؟

"یہی کہ مجھ سے مل کر بہت خوشی ہوئی۔ ہمارے
ہاں آنے کی خواہش ظاہر کی اور کہا کہ میرے ساتھ کسی دن
کھانا کھائیں گے"

"ہمارے یہاں کھانا کھائیں گے"؟
"ہاں وہ شکیلہ کو سمجھانے لگا انھیں گھر کے پکے ہوئے
کھانے بہت پسند ہیں۔ تین سال ہوئے کہ ان کی بیوی
مر گئی ہیں۔ جب سے اچھا کھانا انھیں میسر نہیں آیا۔ میں نے

ان سے کہا ہے کہ آج شام کا کھانا ہمارے ساتھ کھائیں"

"آپ نے ان سے یہ بھی پوچھا کہ نہیں کہ ......"
آخر شاکر کے صبر کا پیالہ لبریز ہو گیا۔ "ایک تو نوکری
تلاش کرتے کرتے میرا ناک میں دم آگیا ہے اور دکھاؤ
تو تم سوال کر کر کے جان کھا جاتی ہو۔ منصف صاحب سے تو
مجھے کچھ اطمینان نہیں ہوا۔ آج دو تین جگہ اور جانا ہے بھاگتے
بھاگتے میرا برا حال ہے اور تم سے ایک آدمی کی دعوت
کا سامان بھی نہیں ہو سکتا۔ اب یہ بھی میں ہی بتاؤں کہ تم کیا
کیا پکاؤ۔ آخر تم کو خدا نے دماغ کس واسطے دیا ہے"؟

جھگڑا بڑھنے کے خیال سے وہ ہنس دی۔ "اچھا جانے
دیجئے۔ خیر کچھ بھی پکا لیں گے۔"

"نہیں زیادہ تکلیف کرنے کی ضرورت نہیں۔ ہم جو
ہر روز کھاتے ہیں وہ کافی ہے۔ دسترخوان پر صرف ایک
مرکابی زیادہ رکھ دینا اور بس۔

گھبرائیے نہیں آج کل ہی میں نوکری مل جائے گی"

"کیا سچ مچ آج کل ہی میں مل جائے گی" وہ سوچنے
لگی۔ سوائے مایوسی کے کچھ دکھائی نہیں دیتا۔ شاکر کی عمر
چالیس سے اوپر ہو چکی ہے۔ اس عمر میں نوکری ملنی بہت
مشکل ہوتی ہے۔ کہیں ایسا نہ ہو کہ شاکر کو نوکری نہ ملے۔ اور
ہمیں اپنا مکان بیچ دینا پڑے۔ وہ محسوس کرتی تھی کہ سال
بھر سے روپے کی قلت نے ان کو کتنا ستا رکھا ہے شادی
کے بعد آج پہلی دفعہ اسے یہ سوچ کر خوشی ہوئی کہ ان کے
کوئی بچہ نہیں ہے۔

وہ سب باتیں سوچتے سوچتے ایک دم چونک پڑی
وہ کتنی ہی پست ہمت کیوں نہ ہو، اس پر کتنی ہی مصیبتیں کیوں
نہ پڑیں مگر اسے گھر کا کام کرنا تو ضروری ہے۔ اور آج تو

شاکر نے منصف صاحب کی دعوت بھی کر دی ہے۔ ایک ایسے آدمی کی دعوت جس کو ان سے بالکل ہمدردی نہیں، جس سے دوستی کی توقع نہیں۔ غربت کے زمانے میں ایسے آدمی کی دعوت کرنا بہت ہمت کا کام ہے "بڈھے تو ہیں کیا خبر پرہیزی کھانا کھاتے ہوں" اس کو آج ایک ایسے آدمی کے لئے کھانا پکانا تھا، جس کے سہارے شاکر کو نوکری ملنے کی ہلکی سی امید تھی اور دیوان خانہ بھی صاف کرنا تھا۔ اتنا سارا کام اور وہ اکیلی کرنے والی۔

شکیلہ نے قاسم کو آواز دی اور اسے دعوت کا سامان بتانے لگی: "اچھا سیر بھر گوشت لے آؤ"

"سیر بھر گوشت بیگم صاحب!!"

"ہاں" شکیلہ کا منہ ندامت سے سرخ ہو گیا شاکر کی نوکری چھوٹنے کے بعد اس نے پہلی مرتبہ سیر بھر گوشت لانے کو کہا تھا۔ مگر اس کے باوجود وہ قصائی کی قرضدار تھی

"بیگم صاحب آج کیا پکائیں گے"

"گوشت بھونا جائے گا اور بہت سی چیزیں پکانی ہیں۔ آج دعوت ہے"

"بھنا ہوا گوشت بیگم صاحب مجھ کو بھی بہت پسند ہے۔ مگر جب سے دانت ٹوٹے ہیں کھانا چھوڑ دیا۔"

"شائد منصف صاحب کے بھی دانت ٹوٹے ہوئے ہوں۔ وہ کہہ رہے تھے کہ بڈھے آدمی ہیں"۔ شکیلہ نے سوچا "اچھا گوشت مت لاؤ" پھر سوچ میں پڑ گئی۔ "ان سے کیوں نہیں پوچھ لیا کہ منصف صاحب کے دانت ٹوٹے ہوئے تو نہیں ہیں"۔ جیسے شاکر اسے بتا دیتا تھا اسے تو پہلے ہی غصہ آرہا تھا۔ "معمولی فیرنی پلاؤ اور آلو کا قورما بس ٹھیک ہے جب وہ معمولی گھر کی پکی ہوئی چیزیں چاہتے ہیں تو مجھے کیا مصیبت پڑی ہے کہ پر تکلف کھانے پکاؤں" اس نے قاسم کو سودا بتایا اور وہ چلا گیا۔

قاسم کے جانے کے بعد وہ باورچی خانے جانے والی ہی تھی کہ ایک لڑکے نے خط لا کر دیا۔ یہ بجلی کے کارخانے کا خط تھا۔ اور اطلاع تھی کہ "دو مہینے سے آپ نے بجلی کا بل ادا نہیں کیا۔ اگر آج شام تک آپ نے دس روپئے نہیں بھیجے تو کارخانے والے تار کاٹ دیں گے میں اس لئے یاد دلاتا ہوں کہ شائد آپ بھول گئے ہوں"

"اچھا آج بھیج دیا جائے گا" شکیلہ نے لکھ دیا وہ دونوں بجلی کے بل کو تو بالکل بھول گئے تھے آج بھی اگر بے وقت اطلاع نہ مل جاتی تو منصف صاحب کی دعوت اندھیرے میں ہوتی مگر یہ دس روپئے آئیں گے کہاں سے شکیلہ کے پاس تو صرف چھ روپئے تھے اب چار روپئے کی کمی کس طرح پوری ہو۔ اس نے گھر کے سارے ڈبے دیکھ ڈالے شاکر کی تمام پرانی شروانیوں کی جیبیں دیکھ ڈالیں مگر سوائے آٹھ آنے کے کچھ نہیں ملا۔ اس کو یہ بھی احساس تھا کہ وقت گزر رہا ہے اور اس نے دعوت کا کچھ سامان نہیں کیا آخر وہ ڈھونڈتے ڈھونڈتے تھک گئی۔ مایوسی سے اس کی آنکھوں میں آنسو بھر آئے۔ اگر گھر میں سے روپیے نہ نکلے تو وہ کیا کرے گی کس سے مانگے گی۔ اور پھر رات کی دعوت کا کیا ہوگا۔ شکیلہ اور شاکر تو موم بتی ہی جلا کر گزار سکتے ہیں، مگر منصف صاحب کو کیا کریں گے۔

آخر مایوس ہو کر اس نے شاکر کے ایک پرانے گرم کوٹ کی جیب میں ہاتھ ڈالا تو پانچ روپیے کا نوٹ نکلا وہ بچوں کی طرح زمین پر بیٹھ کر ہنسنے لگی پانچ کا نوٹ اس میں کب رکھا گیا تھا اچھا ہوا پہلے نہیں ملا۔ ورنہ آج

کیا بنتا" قاسم کو روپیے دے کر چلتا کیا۔ یہ سب مرحلے
طے کرنے تک بارہ بج گئے" اب شام تک منصف صاحب
کی دعوت کی تیاری کرنی ہے۔ جب شکیلہ نے دیوان خانے
میں جا کے دیکھا کہ کتنی صفائی کی ضرورت ہے تو کیا دیکھتی
دروازوں اور کھڑکیوں کے پردے بہت میلے ہیں اور
دیواروں پر جالے بھی لگے ہوئے ہیں پردے دھونے
تو آسان تھے مگر ان کی استری بہت محنت کا کام تھا۔ جب
استری کر رہی تھی تو ایک انگلو انڈین لڑکی کتابیں بیچنے آئی
اور لگی بیٹھ کر کتابوں کی تعریف کرنے شکیلہ نے دیکھا کہ اس کی
بکواس ختم ہی نہیں ہوتی تو کہنے لگی" تم میرے پاس کیا
کتابیں بیچنے آئی ہو میں خود لکھ سکتی ہوں"۔ وہ لڑکی اس کا
منہ تکنے لگی۔ شکیلہ کو شرارت سوجھی" تم کیا سوچ رہی ہو۔
تمہاری کتابوں سے اچھی کتابیں میں گھنٹہ بھر میں لکھ سکتی ہوں"
وہ شکیلہ کے بے وقت کے مذاق سے ایسی گھبرائی کہ کتابیں اٹھا
چپ چاپ چلی گئی۔ شائد یہ سمجھی کہ اس عورت کا دماغ خراب ہے
فیرنی پکاتے پکاتے اسے خیال آیا کہ اگر ایس کریم
بنائی جائے تو کیسا رہے۔ آج کل رات کی دعوتیں میں لوگ
ایس کریم ضرور دیتے ہیں دودھ تو بچا ہوا ہے مگر کیوڑا تو
جتنا منگایا تھا سب فیرنی میں ڈال دیا۔ شاید پہلے کا بچا ہوا
کہیں پڑا ہوا ہو۔ وہ نعمت خانے میں ڈھونڈنے لگی۔
" تین بج گئے ہیں میں نے اب تک کھانے کا سامان بھی
پورا نہیں کیا۔" منصف صاحب تم کو خدا سمجھے تمہیں کبھی اس
بات کا احساس نہیں ہوگا کہ تمہاری دعوت کے لئے مجھے
کتنی تکلیفیں اٹھانی پڑیں" شکیلہ اچک کر اوپر کے تختے پر دیکھنے
لگی دوسرے تختے سے اتنی زور کی چوٹ لگی کہ دماغ بھنّا گیا
مگر اتنا فائدہ ضرور ہوا کہ گلاب مل گیا۔" خیر یہی سہی۔ اگر یہ نہ

ملتا تو منصف صاحب آج شام کو آپ ایس کریم سے محروم
رہتے۔ اب آپ کو کچھ نہیں ملے گا آپ کا کیا ہے جو ملتا جائیگا
آپ کھاتے جائیں گے کام کرتے کرتے میری جان نکل جائیگی"
اب صرف روٹی پکانی اور ایس کریم بنانی باقی تھی
شکیلہ منہ دھونے حمام میں گئی۔ کھڑکی میں سے جو جھانکا تو
کیا دیکھتی ہے حسین صاحب کی بیگم صاحبہ کا تانگا چلا آرہا ہے
" ان کو انجمن کے لئے چندے کی ضرورت ہوگی" شکیلہ کا
خیال ٹھیک نکلا۔ انھوں نے آتے ساتھ وہی قصہ نکالا۔
مگر وہ حسین بی کے متعلق بھی کچھ پوچھنے آئیں تھیں" آپ نے
پرانی ماما کو کیوں نکال دیا"
شکیلہ بیٹھی سوچ رہی تھی کہ اس بکواس میں بیکار وقت
ضائع ہو رہا ہے۔ ان کے اس سوال سے شکیلہ کی آنکھوں
میں حسین بی کی سال بھر پہلے کی صورت پھر گئی۔ اور اس کا
گڑگڑا کر صرف کھانے کپڑے پر پڑے رہنے کی التجا کرنا یاد
آگیا۔ پھر اسے خیال آیا کہ ابھی بہت سوں کو شاکر کی نوکری
چھٹنے کا حال معلوم نہیں۔
" میں نے اسے کسی قصور پر نہیں نکالا۔ وہ کام بہت اچھا
کرتی تھی اور میں اسے زیادہ تنخواہ نہیں دے سکتی۔ کسی
بڑے گھر میں نوکری کرے گی تو دگنی تنخواہ دینگے"
" اچھا تو بڑے گھر کی تلاش میں اس نے پرانی نوکری
چھوڑ دی"
" ہاں...... ہاں کچھ ایسا ہی ہوا......
" یہ نوکر بھی بڑی بے وفا قوم ہے۔ ... اب بچے کا
کیا ہوگا۔ اتنا نازک معاملہ ہے"
" اس کے بچے کو کیا ہو گیا؟ جب وہ میرے پاس تھی
تو بچہ بالکل تندرست تھا۔

"اس کی نوکری چھوٹ گئی اور وہ بچہ بیمار ہے کل میرے پاس مدد کے لئے آئی تھی"۔

"میاں بچہ بڑا ہی ہوگئی ہوگی ورنہ ہرگز آپ سے مدد نہ مانگتی"۔ شکیلہ نے افسوس کی صورت بنا کر کہا۔

"بہر حال مجھے یہ معلوم تھا کہ دو برسوں سے آپ کے پاس نوکر تھی۔ اس لئے میں نے پوچھا کہ آپ کے ہاں سے کیوں نکل گئی۔ تو ذرا سوچ کر کہنے لگی "وہ بیگم صاحبہ تو بہت اچھی تھیں مگر میرا دل آرام کرنے کو چاہتا تھا" ذرا سوچئے تو سہی اپنی تندرست مضبوط عورت کو آرام کی ضرورت پڑ گئی"

"اس کی وفاداری کا خیال آکر شکیلہ کی آنکھوں میں آنسو بھر آئے وہ جان دے دے گی مگر گھر کا راز کسی کو نہ بتائے گی"۔

"میری سفارش پر صادق صاحب کی بیگم صاحبہ نے اسے نوکر رکھ لیا تھا۔ آج صبح کو ان کے پاس سے آدمی آیا کہ وہ نہیں آئی اور بچے کی بیماری کا بہانہ کرتی ہے۔ اگر بچہ سچ مچ بیمار ہے تو ہم مدد کرنے تو تیار ہیں مگر مجھے تو ایسا معلوم ہوتا ہے کہ محض بہانے ہیں کیونکہ آج ان کے پاس دعوت ہے۔ کام سے گھبرا کر بھاگ گئی"۔

حسین صاحب کی بیگم نے نوکروں کی بیوفائی کے لمبے چوڑے قصے سنانے شروع کئے۔ ان کی سستی اور کاہلی کے دفتر کھول دئے سامنے لگی ہوئی گھڑی میں ایک ایک منٹ کر کے آدھ گھنٹے سے زیادہ گزر چکا تھا

"میں خود اس کے پاس جا کر دیکھوں گی کہ اس کے بچے کو کیا ہو گیا ہے۔ ان کو تو مر بھی جائے تو کچھ نہ بتائے۔ اگر بیچارا بچہ سچ مچ بیمار ہے تو مجھے ضرور کچھ کرنا چاہئے"۔

ساڑھے پانچ کے قریب حسین صاحب کی بیگم صاحبہ گئیں صورت سے ایسا معلوم ہوتا تھا کہ کچھ خفا ہیں خفا ہونے کی بات بھی تھی۔ شکیلہ نے نہ ان سے چائے پینے کے لئے کہا نہ ان کو پان ہی دیا اس کے برعکس یہ بھی کہہ دیا کہ شاکر نے آج اپنے ایک دوست کی دعوت کی ہے۔ وہ اشارہ پاتے ہی چل دیں

شاکر نے شکیلہ کو یہ نہ بتایا کہ منصف صاحب کب آئیں گے۔ نہ اپنی واپسی کا وقت بتایا۔ اور حسین بی بی مدد کے لئے اس کے پاس کیوں نہ آئی، اس کا جواب دینا آسان تھا۔ وہ شکیلہ کی مصیبتوں میں اضافہ نہیں کرنا چاہتی تھی۔ اس کا بچہ مر بھی جاتا تو وہ اس سے مدد نہ مانگتی یہ ہے شان وفاداری کی جو کوئی نہ معلوم کر سکا۔ شکیلہ نے آخر سوچا کہ وہ اس کے بچے کو ڈاکٹر کے پاس لے جائیگی اور حسین بی کو یہاں [illegible] بنانے اور روٹی پکانے کو بھیج دے گی۔ جانے سے پہلے اس نے جو کچھ پکایا تھا اچھی طرح دیکھ لیا اور قاسم سے تانگا منگا کر حسین بی کے گھر چلی۔ راستے کی ٹھنڈی ہوا سے اس کے سر کا درد ٹھیک ہوگیا۔ "مجھے ہر وقت اس کا افسوس [illegible] کہ بنک میں صرف دو سو روپے رہ گئے ہیں اگر ان کو جلدی نوکری نہ ملی تو کیا کریں گے لیکن خدا نہ خواستہ اگر ہمارے ان [illegible] ایک بیمار بچہ ہوتا اور گھر میں ایک کوڑی نہ ہوتی تو کیا کرتے" "گھوڑے کو دوڑاؤ مجھے جلدی پہنچنا ہے"۔ خدا خدا کر کے شکیلہ حسین بی کے چھوٹے سے گھر پہنچ گئی جہاں وہ ایک اور کرائے دار کے ساتھ رہا کرتی تھی۔ صحن میں کرائے دار کے بچوں نے ایک اودھم مچا رکھا تھا۔ وہ ان سے بچتی بچاتی چلی جا رہی تھی کہ راستے میں یانا ڈاکٹر ملا شکیلہ کو دیکھ کر ٹھیر گیا۔ "ابھی میں آپ کی ماما کے بچے کو دیکھ کر آ رہا ہوں [illegible] اس کی حالت بہت نازک ہے۔ نمونیہ کا اثر ہے میں ان [illegible]

کہہ رہا ہوں کہ اتنے چھوٹے بند مقام میں بچے کا رہنا بہت
مضر ہے۔ ہسپتال لے چل مگر مانتی نہیں اب آپ ہی سمجھائیے
آپ کا کہنا ضرور ملے گی۔ وہ ڈاکٹر سے پوچھا پھر اکر معین بی
کی طرف چلی۔

وہ پہلے رو رہی ہوگی مگر اب خاموش بیٹھی سوچ رہی
تھی۔ "ڈاکٹر صاحب کہتے ہیں اسے ہسپتال لے جاؤ میرے
پاس تو ٹانگے کا کرایہ بھی نہیں ہے میں اسے کیسے لے جاؤں
اور ہسپتال والے اسے لیں گے بھی کہ نہیں

"ضرور لینگے۔ آخر کیوں نہیں لیں گے"؟

"کیا معلوم بیگم صاحب ان لوگوں نے بھی حسین صاحب
کی بیگم صاحب کی طرح سوال پوچھ کر نکال دیا تو کیا کروں گی"

سامنے کسی دوکان کی گھڑی نے چھ کے گھنٹے بجائے
شکیلہ سوچنے لگی "ابھی ایس کریم بنانی اور روٹی پکانی باقی ہے
وہ اب تک گھر پہنچے ہیں یا نہیں۔ اگر منصف صاحب ان سے
پہلے آگئے تو کیا ہوگا گھر تو بند پڑا ہے بڈھا قاسم کیا کرے گا
کنجیاں تو میرے پاس ہیں اس بچے کی حالت نازک ہے اور ادھر
منصف صاحب کی دعوت بہت اہم چیز ہے شاید ہماری قسمت
آج ہی پلٹا کھائے اور میں یہاں بیکار کھڑی ہوں" سنو حسین بی
آج رات ان کے ایک بہت عزیز دوست کی دعوت ہے
اور کھانا ابھی آدھا تیار ہے۔ تم جاکر اس کو پورا کرو اور میں
بچے کو ہسپتال لے جاؤں گی۔ تم مجھ پر تو اعتبار کرتی ہو یہ لو
کنجیاں اور چل دو۔

جب شکیلہ گھر پہنچی ہے تو سات بج چکے تھے۔......
وہ باورچی خانے میں پہنچی تو ہر ایک چیز بالکل تیار تھی اور حسین بی
دسترخوان بچھا رہی تھی۔ شکیلہ نے پورا قصہ اسے سنا دیا۔ "تمہارا بچہ
بالکل آرام سے ہے" ڈاکٹر کہتا ہے کہ کچھ خطرے کی بات نہیں
انشاء اللہ جلدی ہی اچھا ہو جائے گا۔ اس کمرے کی نرس بھی
بہت اچھی ہے اب کچھ گھبرانے کی ضرورت نہیں"

وہ ابھی یہ باتیں کر کے اپنے کمرے کی طرف جا رہی تھی
کہ شاکر اسے راستے میں ملا "آخر تم کہاں غائب ہوگئی تھیں"
شاکر نے غصے سے پوچھا "میں جب گھر آیا ہوں تو کیا دیکھتا ہوں
کہ معین بی ہمارے اور اپنے خاندان کے سب قصے منصف صاحب
کو سنا رہی ہے اتنی تمیز دار نوکرانی اور ایسی بیہودگی کرے کانوں
سے سنتا تو یقین نہ آتا۔

ہاں مجھے یاد ہے کہ میں نے کہا تھا کہ آپ کے بہت
عزیز دوست آ رہے ہیں۔ اس لئے اس نے کہانی شروع
کر دی کہ وہ سب باتوں سے واقف ہی ہوں گے۔ اگر باتیں
نہ کرتی تو روتی رہتی۔ آپ کو کیا معلوم اس نے کتنی مصیبتیں
اٹھائی ہیں۔

"اس پاگل پن سے تو یہی بہتر تھا کہ وہ بیٹھ کر روتی
.... "خیر اب فکر کی کوئی بات نہیں۔ منصف صاحب نے
حامد سے کہہ دیا ہے کہ انہوں نے ایک آدمی کا انتخاب کر لیا ہے"
شکیلہ مایوسی سے ہونٹ چبانے لگی۔ اس نے آہستہ سے
دیوان خانے کا پردہ اٹھا کر دیکھا منصف صاحب نہ بڈھے
تھے نہ دقیانوسی ہی معلوم ہوتے تھے ان کے دانت بھی
پورے تھے۔

"آج مجھے آپ کے گھر آکر بہت خوشی ہوئی" وہ
شاکر سے کہہ رہے تھے۔

"ہاں کیوں خوشی نہ ہوگی منصف صاحب بیٹھے بٹھائے
مفت میں اتنے اچھے کھانے کھانے کو مل گئے آپ کو
کیا خبر مجھے آپ کی اس دعوت کی وجہ سے کتنی مصیبتیں اٹھانی
پڑیں" شکیلہ نے سوچا "اور ہمیں آٹھ دن کا خرچ ایک دن

کر دینا پڑا۔"

ہاں تو میں ابھی آپ سے کہہ رہا تھا کہ میں نے ایک مددگار چن لیا ہے۔ ایک ایسا آدمی جس نے عمر بھر دفتر کے کام میں غلطی نہ کی ہو۔" منصف صاحب نے کہا۔

شکیلہ کا دماغ چکرا گیا۔ اس کا پیارا اگرچہ چند روز میں دشمن خواہوں کی نذر ہو جائے گا۔ منصف صاحب کی آنکھوں سے ایک قسم کا تمسخر ٹپک رہا تھا۔ حسین بی دیوان خانے کے ایک کونے میں اس بات کے انتظار میں کھڑی تھی کہ وہ لوگ باتیں ختم کریں تو کہے کہ خاصہ تیار ہے۔

" ہاں تو میں نے یہ فیصلہ کر لیا ہے کہ شاکر صاحب اچھا مددگار مجھے کہیں نہیں مل سکتا۔"

" حسین بی تم نے اچھا کیا کہ سب کچھ منصف صاحب کو سنا دیا۔" شکیلہ نے سوچا۔ اس کو صبح سے پہلی مرتبہ تھکان محسوس ہوئی۔ " سرکار خاصہ تیار ہے" حسین بی نے کہا۔ اس کی آنکھیں خوشی سے چمک رہی تھیں۔

معتصمۃ الرحمن

جنگ

"جنگ" ہاں مانتا ہوں ایک تبہ کاری ہے
بلکہ یہ کہیے کہ "دانستہ سیہ کاری ہے
ہے سکوں کو ہدفِ ناوکِ طوفاں کرنا
ملک گیری کے لئے جانوں کو قرباں کرنا

سچ ہے تخریب کا آپ اپنی ہے ساماں کرنا
دوسرے لفظوں میں شیطاں کو ہے شاداں کرنا

اپنے بچوں کو بنانا ہے یتیم و بے یار
اپنے ماں باپ کو کرنا ہے غمِ نو کا شکار
اپنی بیوی کو رنڈاپے کا ہے تحفہ دینا
اپنے محبوب کو ہے سوگ کا ہدیہ دینا!
ملک الموت سے کہنا ہے خود، آؤ آؤ
ساتھ دوزخ کے فرشتوں کو بھی لاؤ لاؤ

اس طرح دہر کی بنیاد ہلا دینا ہے
اس کو اک جرعۂ تلخاب پلا دینا ہے

ہے مگر کوئی جو یہ بات سمجھا دے مجھ کو
یعنی ازراہِ کرم اتنا بتا دے مجھ کو
کیا یہی دین ہے مذہب یہی تہذیب یہی
آدمیت یہی ہمدردی کو تادیب یہی؟
عدل و انصاف یہی الفت و اشفاق یہی
زور یاں یہی قوتِ اخلاق یہی؟!
تو بہت خوب ہے جنگ ہوتی رہے ہوتی رہے
ہم یہ دنیا یونہی تنگ ہوتی رہے ہوتی رہے

آئے وہ روز کہ دنیا کا بھلا ہو جائے!
آئے وہ روز کہ دنیا ہی فنا ہو جائے۔

سلیمان اریب

آج کا بچہ

آج کے بچے کی واقعی اہمیت کا اندازہ کرنے کے لئے ہم کو کل کے بچے کے متعلق تاریخی واقعات کی چھان بین کرنی ہوگی۔ قدیم ترین زمانے میں جب کہ انسان وحشیانہ زندگی بسر کرتے تھے، اولاد کی پرورش وہاں بھی تھی لیکن جوں جوں زمانہ گزرتا گیا انسانی زندگی کے طریقوں میں بھی تبدیلیاں ہوتی گئیں۔ انفرادی زندگی اجتماعی زندگی سے بدل گئی۔ معاشرتی قوانین بنے۔ سیاسی اور معاشی نظام قائم ہوئے اور مذہب نے اپنا اقتدار قائم کیا۔ اس طرح انسان نے تہذیب و تمدن کی منزلیں طے کیں۔

یہ تو صاف ظاہر ہے کہ ہر ملک کی تہذیب دوسرے ملکوں سے مختلف ہے اسی مناسبت سے ہر ملک میں معاشرتی قوانین بھی مختلف ہیں۔ اب ہم مختصر طور پر مختلف ممالک کے معاشرتی قوانین سیاسی قوانین اور مذہبی قوانین میں معصوم بچوں کا درجہ معلوم کریں گے۔ تاریخ شاہد ہے کہ کسی عالمگیر مذہب نے بچے کو ادنیٰ یا حقیر نہیں جانا بلکہ اس کو ہمیشہ بالغوں سے برتر ہی سمجھا۔ حضرت عیسیٰ چھوٹے بچوں کو بہت عزیز رکھتے تھے اور لوگوں کو اس بات کا یقین دلاتے تھے کہ انسانی نسل کی ترقی اور رہبری کا انحصار ان ہی ہونہار بچوں کی صحیح تربیت پر ہے۔

پیغمبر اسلام نے تو متعدد مرتبہ صحابۂ کرام کو اس بات کی عملی تعلیم دی کہ ان کو اپنے بچوں کے ساتھ کس قسم کا سلوک کرنا چاہیے۔ آنحضرتؐ اپنی لڑکی اور نواسوں کو اس قدر عزیز رکھتے تھے کہ ان کی دل جوئی کے لئے ہر قسم کی زحمت گوارہ کرنے کو ہمیشہ تیار رہتے تھے۔ یہاں تک کہ مذہبی تقاریر و وعظ وغیرہ کے وقت اگر آپ کے نواسے آجاتے تو آپ ان کو اٹھا لیتے اور بوسہ دیتے۔

ہندوستان کی بزرگ ترین ہستی گوتم بدھ کی تعلیمات میں سب سے زیادہ اہمیت اس پر دی گئی ہے کہ جانداروں کے ساتھ شریفانہ برتاؤ کیا جائے۔ اس سے ظاہر ہے کہ گوتم بدھ کا سلوک بچوں کے ساتھ کیسا ہوگا۔ ایسے جانداروں کے ساتھ جن سے نقصان پہنچنے کا ہمیشہ اندیشہ رہتا تھا جب نرمی کے سلوک کی تلقین کی گئی تو بھلا بچوں کے ساتھ جو مجسم نیکی ہوتے ہیں کیا سلوک تجویز کیا ہوگا۔

ان پاک اور محبت بھرے خیالات کے برخلاف جو بچوں کے متعلق ان پیغمبروں نے ظاہر کئے ہیں ان ممالک میں جہاں کسی بھی دین نے اپنی نورانی شعاعوں سے باشندوں کے دلوں کو روشن نہیں کیا یا پھر جہاں کے لوگوں نے ان بزرگ ہستیوں کی ہدایت پر عمل نہ کیا بدترین رسم و رواج اور توہمات نے جنم لیا اور خود غرض افراد اور انسان دشمنوں نے بچوں کی قربانی شروع کر دی۔

چنانچہ شام کے قدیم تمدن میں دیوتاؤں کی خوشنودی کے لئے بچوں کی قربانی کی جاتی تھی جس کا سلسلہ تقریباً حضرت موسیٰ کے زمانے تک قائم رہا۔

ہندوستان بھی اس قسم کے مکروہ توہمات سے خالی نہ تھا یہاں بھی کسی بڑی عمارت کی تعمیر اور گھنٹوں اور جرس کی ساخت کے وقت معصوم ہونہاروں کی بھینٹ چڑھائی جاتی تھی۔ اور خاص خاص امراض میں بچوں کے خون میں نہانا طغیانی اور قحط کے زمانے میں ان کو دیوتاؤں کے نام پر قربان کرنا جنگ کے شروع اور بادشاہوں کی تخت نشینی کے وقت ان کی قربانی کرنی ضروری تھی غرض جہاں تک بچے کا تعلق مذہب سے ہے کسی بھی مذہب نے اس کو

برا نہیں سمجھا۔ لیکن بعض قوموں نے بدترین رسوم و رواج کو جاری کیا جن کی وجہ سے تمدنِ انسانی کی تاریخ کا دامن ہمیشہ داغ دار رہے گا۔

یہ تو بچہ اور مذہب کا تعلق تھا اب ہم سیاسیات اور بچے کے تعلق کا جائزہ لیں گے۔ سیاسیات نے کہیں کھلم کھلا اور کہیں پوشیدہ طور سے بچوں پر بڑے بڑے ظلم ڈھائے ہیں۔ نمرود نے حضرت ابراہیم کی پیدائش کی خبر سن کر اپنی حکومت کے زور سے تمام نوزائیدہ بچوں کو قتل کروا دیا تاکہ حضرت ابراہیم بھی قتل ہو جائیں اسی طرح فرعون نے بھی حضرت موسیٰ کی ولادت سے خوف کھا کر بچوں کا قتل عام کر دیا تھا۔ اس کے علاوہ بعض ممالک میں ایسے قوانین جاری تھے جن کی رو سے والدین کو اپنی اولاد پر پورا اختیار حاصل تھا کہ اگر وہ چاہیں تو ان کو قتل بھی کر سکیں۔ مثلاً چین میں والدین کو اپنی اولاد کے قتل کا قانونی حق حاصل تھا۔ جاپان میں والدین کے جرموں کی پاداش میں بچوں کو سزائیں دی جاتی تھیں۔ قدیم زمانے میں معاشی مشکلات کی وجہ سے بھی ایسے رسم و رواج وجود میں آئے جن کی وجہ سے بچوں کا قتل جائز قرار دیا گیا۔

ٹونگنی کے باشندوں کو بچوں سے بڑی نفرت تھی ان کو عذابِ جان تصور کر کے تولد کے بعد ہی قتل کر دیتے تھے آسٹریلیا کے قبائل میں بھی یہ رسم عام تھی۔ عرب میں لڑکیوں کا قتل بھی ان ہی معاشی مشکلات کا نتیجہ تھا۔

یہ تھی مختصر سی حالت معصوم بچوں کی عہدِ قدیم میں۔ بیچ کے زمانے میں جہاں قوموں نے انسانی زندگی کے ہر شعبے میں ترقی کی وہاں بچوں کے ساتھ برتاؤ میں بھی تبدیلیاں ہوئیں۔ لیکن پھر بھی ان کے ساتھ وہ سلوک نہیں کیا جاتا تھا جس کے وہ مستحق تھے۔ قتل و قربانی کی ظالمانہ رسوم کی جگہ غلامی کا شرمناک طریقہ رواج پایا۔ اور جب اس کے تباہ کن نتائج ناقابلِ برداشت ہو گزرے تو متمدن ممالک میں اس طریقہ کا خاتمہ ہو گیا۔ گو بعض ممالک میں غلامی کا رواج ابھی تک پوشیدہ اور نیم وحشی طور پر جاری ہے۔

موجودہ زمانے میں بچے کو جو اہمیت حاصل ہو گئی ہے اس کا تعلق بہت بڑی حد تک تعلیم کی اشاعت سے ہے یہ بالکل درست ہے کہ تعلیم کی ابتداء تو اسی وقت سے ہوئی جب سے نسلِ انسانی کی ابتداء ہوئی۔ لیکن تعلیم کی ذمہ داری فطرت پر تھی جس کے قوانین اٹل تھے۔ مثلاً فطرت یہ بتلاتی ہے کہ اگر آگ میں ہاتھ ڈالنے سے وہ جھلس جاتا ہے۔ اگر اس کے خلاف کیا تو اس کی ذمہ داری کرنے والے پر ہوگی۔ لیکن زمانے کی ترقی کے ساتھ ساتھ تعلیم کا فرض صرف فطرت کے ہاتھوں باقی نہیں رہا۔ بلکہ اس کام کو خود انسانوں نے اپنے ہاتھوں میں لے لیا۔

ایک زمانے تک یہ تعلیم تو نہایت سادہ تھی۔ لیکن بعد میں اس میں تبدیلیاں ہوتی گئیں۔ نشاۃ ثانیہ کے قبل تک جس قسم کی تعلیم دی جاتی تھی اس کا تعلق روزمرہ کی زندگی سے بہت کم تھا۔ یہ محض قدما کے کلام کو زبانی یاد کرنا۔ مذہبی اور سماجی رسومات کے ذریعہ ان کے کارنامے دہرانا۔ دیوتاؤں کی پوجا۔ سورماؤں اور بہادروں کی قصیدہ خوانی پر مشتمل تھی۔ طریقۂ تعلیم جماعتی تھا جس کی ذمہ داری مذہبی لوگوں کے سر تھی یہاں بھی بچوں پر ایسے مظالم ڈھائے جاتے تھے کہ سننے سے تکلیف ہوتی ہے۔ استاد رحم دلی اور ہمدردی جانتے ہی نہ تھے۔ بید کا استعمال عام تھا۔ کوڑوں اور ڈنڈوں سے سزا دی جاتی تھی۔ اس کے علاوہ انھا بیٹھی کروانا اور

مرغا مرغی بنانا، کان کی لوی میں کنکر رکھ کر دبانا، ناک گھسوانا
اور قسم کے متعدد طریقے سزاؤں کے جاری تھے۔ مختصر یہ کہ
پیچ کے زمانے میں جہاں تعلیم کو تمام ترقیوں کا ذریعہ خیال
کیا جاتا تھا، بچوں کی تعلیم میں جس پر نسلوں کی ترقی کا انحصار ہے
بچوں کی فطرت ان کے میلانات اور رجحانات کو بالکل نظرانداز
کیا جاتا تھا نہ صرف یہ بلکہ ان کے ساتھ رحم دلی اور ہمدردی
کا سلوک بھی روا نہ رکھا جاتا تھا۔

سترھویں صدی سے جو تعلیمی انقلاب کی ابتدا ہوئی
اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ ماہران تعلیم نے نہ صرف مواد تعلیم پر ترمیم
کی بلکہ طریقہ تعلیم بھی بدلنے کی کوشش اور افلاطون کے اس
خیال پر ٹھنڈے دل سے غور کرنا شروع کیا کہ فرد یا حکومت
اس وقت تک باقاعدہ اور عمدہ طریقے سے کسی لڑکے کو تعلیم
نہیں دے سکتی جب تک کہ تعلیم کے آغاز سے پہلے ہی وہ
طالب علم کے متعلق جانچ نہ کرلے کہ وہ اس کا اہل ہی ہے یعنی
ماہران تعلیم نے مطالعۂ اطفال پر زور دیا۔

مطالعۂ اطفال کی تحریک کا نتیجہ یہ ہوا کہ مختلف ممالک
میں متعدد انجمنیں مختلف ناموں سے قائم ہوئیں جن کا مقصد
یہ تھا کہ بچے کی تعلیم و تربیت میں جو جو آسانیاں ہوسکتی تھیں
فراہم کی جائیں۔

اسی سلسلے میں بہی خواہان قوم نے ایسی انجمنوں کے
قیام پر زور دیا جو بچوں میں گداگری اور دوسری خلاف اخلاق
عادتوں کا انسداد کرسکیں مطالعۂ اطفال کی تحریک سے پہلے
یہ خیال عام تھا کہ ڈاکو کی اولاد ڈاکو ہوتی ہے۔ لیکن تحقیقات
سے پتہ چلا کہ بچہ پر ارثی اثرات کے علاوہ ماحول کا بھی گہرا اثر
پڑتا ہے۔ اس لئے بچوں کے لئے خوش گوار ماحول کا پیدا کرنا
ناگزیر سمجھا گیا۔ اور چونکہ یہ کام بغیر حکومت کی مدد کے پورا نہیں
ہوسکتا تھا، عوام نے حکومت کو مجبور کیا کہ وہ بچوں کی نگرانی
کا کام اپنے ذمہ لے لے۔

سنہ ۱۸۹۶ء سے بچوں کی نگرانی کے قوانین کا سلسلہ
شروع ہوا اور سنہ ۱۹۰۸ء کے قانونِ اطفال کی رو سے
والدین پر بھی چند پابندیاں عائد کی گئیں۔ مثلاً والدین کا یہ فرض
قرار پایا کہ سولہ سال سے کم عمر لڑکوں کے لباس، خوراک اور
تعلیم کا معقول انتظام کریں۔ ان کو خراب عادات میں پڑنے
نہ دیں ان پر کسی قسم کا ظلم نہ کیا جائے۔

قانون کی خلاف ورزی کی صورت میں ان کو عدالت
میں پیش کیا جاتا ہے اور عوام کو اس بات کی اجازت دی
گئی ہے کہ اگر وہ کسی وقت بھی کسی لڑکے کو بچوں کے قانون
کے خلاف پائیں تو اس کو
عدالت اطفال میں چالان کریں۔

آج کل ایسے قوانین کا نفاذ بڑی تعداد میں ہو رہا ہے
جو ہر طرح بچوں کی حفاظت اور بھلائی پر نظر رکھتے ہیں۔ بہبودی
اطفال، تحفظ شیر خوارگی وغیرہ کی بہترین انجمنیں حکومت اور عوام
کی توجہ سے قائم ہوگئیں اور ہر متمدن ملک میں ایسی بیسیوں
بلکہ سیکڑوں انجمنیں موجود ہیں۔ جو بچے کی تعلیم و تربیت کا کام
بڑی ذمہ داری سے انجام دیتی ہیں۔

بیسویں صدی کے شروع میں مغربی ممالک میں
جبری تعلیم شروع ہوگئی لیکن جو لڑکے ابتدائی تعلیمی عمر سے
کم ہوتے تھے ان کی تعلیم کا انتظام کرنا تعلیمی نظام کی
کامیابی اور بچوں کی تربیت کے لئے ضروری تھا۔ اس لئے
بالک سیوا اور ششو گھر کی تحریکیں عام ہوتی گئیں۔ ان اداروں
میں کم سن بچوں کو رکھ کر ان کے نفسی اعمال کا مطالعہ کیا
جاتا اور خراب میلانات کی روک تھام کی جاکر ان کی جگہ

اچھے میلانات پیدا کئے جاتے ہیں۔ ایسے بچوں کے لئے جو نہایت چالاک ہوتے تھے لیکن مفلسی کی وجہ سے اپنی ذہانت بُرے کاموں میں صرف کرتے اور قبل از وقت بدترین بیماریوں میں مبتلا ہو کر موت کا شکار ہوتے تھے بالک سیوا ادارے قائم ہوئے جہاں ہر قسم کی سہولت پہنچائی جاتی ہے اور ذہین بچوں کو بجائے ڈاکو راہزن وغیرہ بننے کے محب وطن اور ذمہ دار شہری بننے کی تربیت دی جاتی ہے

بالک سیوا کے علاوہ اور ایک ادارہ جو چھوٹے بچوں کی تعلیم و تربیت میں بہت کامیاب ثابت ہو رہا ہے ششو گھر ہے۔

ششو گھر کے بچے تربیت یافتہ معلمات کی نگرانی میں رہتے ہیں جو ان کی سیرت و کردار کا مشاہدہ کرتی ہیں اور بچوں کی فطرت کی مناسبت سے ان کی جسمانی، جذباتی اور ذہنی ترقی کو موقع دیتی ہیں۔ یہاں لکھائی پڑھائی اور حساب نہیں سکھایا جاتا۔ بلکہ بچہ اگر خاص رغبت ظاہر کرے تو اس کا انتظام کیا جاتا ہے

ششو گھر کی تنظیم میں جو چیز سب سے زیادہ اہم ہے وہ بچوں کی صحت کی نگرانی ہے۔ بچوں کا طبی معائنہ پابندی کے ساتھ ہوتا ہے۔ اور اگر کسی بچے میں کوئی نقص ہو تو بڑی احتیاط کے ساتھ اس کو دور کیا جاتا ہے۔ بچوں کی تدریجی ترقی کا باقاعدہ حساب رکھا جاتا ہے اور والدین کو طبی معائنوں سے مطلع کیا جاتا ہے۔

ششو گھر میں بچوں کی غذا پر بھی بہت زیادہ توجہ کی جاتی ہے اور صحت بخش غذا مثلاً میوہ، ترکاری دودھ مکھن کا استعمال کثرت سے کیا جاتا ہے۔ اور جو بچے کمزور ہوتے ہیں ان کو مچھلی کا تیل بھی دیا جاتا ہے

جب بچے بالک گھر سیوا ششو گھر وغیرہ سے بالک گھر جاتے ہیں تو یہاں بھی ان کی پوری نگہداشت ہوتی ہے اور ہر بچے کو آزادی کے ساتھ پھلنے پھولنے اور تعلیم حاصل کرنے کا موقع دیا جاتا ہے۔

موجودہ زمانے میں بچے کی اہمیت کا اندازہ اس سے ہو سکتا ہے کہ بچہ ہر قوم کا بہترین سرمایہ سمجھا جاتا ہے۔ ہر وہ قوم جو متمدن اور مہذب کہلاتی ہے بچے کی حفاظت اور تعلیم و تربیت اپنا سب سے بڑا فرض خیال کرتی ہے یورپ اور امریکہ میں تو بچوں کی نگہداشت کا اتنا خیال ہے کہ ان کی بہبودی کے ذرائع فراہم کرنے میں بڑے جوش کے ساتھ مسابقت جاری ہے بچوں کی پرورش اور تعلیم و تربیت پر کثیر رقمیں صرف کی جاتی ہیں ان کی حفاظت اور بہتری کے لئے نئے نئے قوانین نافذ کئے جاتے ہیں جن ممالک میں بچوں کی اہمیت کا انکشاف نہیں ہوا وہاں یہ بات ضرور تعجب کی نگاہ سے دیکھی جاتی ہو گی کہ چھوٹے بچوں پر اس قدر کیوں توجہ کی جاتی ہے اور کیوں قوم کا کثیر روپیہ ان پر صرف کیا جاتا ہے لیکن جو قومیں دنیا میں ترقی کرنا چاہتی ہیں، وہ خوب جانتی ہیں کہ قوم کی ترقی اور بچوں کی تعلیم و تربیت میں چولی دامن کا ساتھ ہے

آج کا بچہ ہی تو ہو گا جو کل بالغ شہری کی حیثیت سے قوم کی ہر تحریک میں جوش اور ولولے کے ساتھ حصہ لے گا۔ اسی لئے کہا جاتا ہے کہ جس قدر بچوں کے دماغ روشن قوی اور تندرست ہوں گے اسی قدر قومی دولت اور ثروت میں اضافہ ہو گا

آج کے بچے کی نگہداشت تعلیم و تربیت ملی ترقی کے لئے لازمی سمجھی گئی ہے اور متمدن ممالک نے یہ اہم کام اپنے ذمہ لے لیا ہے۔ حکومتوں کی سرپرستی اور امداد کے

علاوہ خود عوام میں بچے کی اہمیت کا اس قدر احساس پیدا ہوگیا ہے کہ سیکڑوں بلکہ ہزاروں ادارے خانگی طور پر چلائے جاتے ہیں جہاں ضروری پیش بندیاں ان کی پیدائش سے پہلے ہی سے کی جاتی ہیں۔ ہونے والی ماؤں کے ساتھ طرح طرح کی رعایتیں برتی جاتی ہیں ان کو مفید مشورے دیئے جاتے ہیں۔ طبی معائنے مفت ہوتے ہیں۔ مالی امداد دی جاتی ہے اور سیر و تفریح کا انتظام کیا جاتا ہے۔

غرض آج کل بچے کو ساری دنیا میں بڑی اہمیت حاصل ہوگئی ہے

(یہ مضمون حیدرآباد لاسلکی نشرگاہ سے نشر کیا گیا تھا)

میر نجابت علی خاں

سجدہ

آہ نکہت کیوں جگاتی ہے مجھے بہرِ نماز
آہ نکہت کیوں بلاتی ہے مجھے بہرِ نماز
مجھ سے کیوں کہتی ہے اب اٹھو سحر ہونے کو ہے
چہرۂ خورشید منظورِ نظر ہونے کو ہے
کروٹیں لیتی ہے خوشبو پھول کی آغوش میں
نیند سے بے ہوش کلیاں آ رہی ہیں ہوش میں
دھو رہی ہے صبح اپنے منہ کو آبِ نور سے
اٹھ کے دیکھو وہ جبیں ہے آسماں کی نور سے
کر رہی ہے رقص گلشن میں خوشی سے ڈالیاں
دے رہی ہیں داد انھیں پتے بجا کر تالیاں
بارگاہِ ایزدی میں اٹھ کے سر اپنا جھکاؤ
بھول جاؤ ہاں خیالِ ماسوا کو بھول جاؤ"

آشنائے حاصلِ ذوقِ عبادت میں بھی ہوں
ان اسیرِ لذتِ شوقِ عبادت میں بھی ہوں
لیکن اپنے سر کو جب سجدے میں نیوڑھاتا ہوں میں
سامنے صورت تمہاری جلوہ گر پاتا ہوں میں
اس جہاں میں جلوہ فرما ہو تمہیں تم ہر جگہ
ہر گھڑی ہر آن ہر ساعت ہے میرے روبرو
خالقِ مطلق کے آگے سر جھکاؤں کس طرح
تم کو اپنے دل کے مندر سے ہٹاؤں کس طرح
خوف ہے مجھ کو کہ حاصل بندگی کا کھو نہ جائے
میں اسے سجدہ کروں سجدہ تمہیں کو ہو نہ جائے

مہدی علیخاں
(مدیر روزنامہ سیاست لاہور)

نفسیات اور ادب

ادب کا موجودہ دور نفسیات کا دور کہا جا سکتا ہے ادب اب محض تفنن کی چیز نہیں تفنن کے سوا اس کا کچھ اور بھی مقصد ہے وہ اب محض ہجر و وصال کے راگ نہیں الاپتا۔ اب وہ حیات کے مسائل پر غور کرتا ہے ان کا محاکمہ کرتا ہے اور ان کو حل کرتا ہے۔

اخلاقیات اور ادبیات کی منزل مقصود ایک ہے صرف ان کے طرزِ خطاب میں اختلاف ہے اخلاقیات بھی حقائق و معارف سے بحث کرتے ہیں اور ادبیات بھی اخلاقیات کا ذریعۂ استدلال ہے وہ براہین و دلائل سے عقل و ذہن کو متاثر کرنے کی کوشش کرتا ہے ادب نے اپنے لئے کیفیات اور جذبات کا دائرہ چُن لیا ہے اور انہیں حقائق کو جذبات کے ذریعہ ہمارے دل تک پہونچاتا ہے اس کا کام جذبات صالح کو بیدار کر کے سعی و عمل کی تحریک کرنا ہے۔

ادب کی بہت سی تعریفیں کی گئی ہیں لیکن میرے خیال میں اس کی بہترین تعریف تنقیدِ حیات ہے ہم جس رومانیت کے دور سے گزر رہے ہیں اسے حیات سے کوئی بحث نہ تھی ہمارے ادبا تخیلات کی ایک دنیا بنا کر اس میں من مانے طلسم باندھا کرتے تھے شعرا پر تو انفرادیت کا رنگ غالب تھا اور اب بھی ہے۔ افسانے منظوم یا منثور بہ استثنائے چند زندگی سے بے علاقہ ہوتے تھے اس وقت کا ذوقِ سخن اسی سے محظوظ ہوتا تھا اور آج بھی اس کے پرستاروں کی کمی نہیں ہے مگر اب ہم حیات کے دائرے سے ایک انچ بھی باہر نہیں جا سکتے یہ خیال بہت صحیح ہے کہ ادب اپنے زمانے کا آئینہ ہے اس کا منشا یہ بھی ہے کہ جو خیالات اور کیفیات اور تاثرات دلوں میں پیدا ہوتے ہیں اور ادب ان کی ترجمانی کرتا ہے اس کسوٹی پر آپ اس دور کے شاعر اور ادیب کو جانچئے تو آپ دیکھیں گے کہ ان کی دنیا کتنی محدود تھی اور زندگی کے حالات سے وہ کتنے بے اثر تھے جب ادب پر دنیا کی بے ثباتی کا رنگ غالب ہوا اور اس کا ایک ایک لفظ معاشقے میں ڈوبا ہوا ہو تو کوئی تعجب نہیں کہ قوم جمود اور انحطاط کا شکار ہو چکی تھی اس میں سعی اور اجتہاد کی قوت فنا ہو چکی تھی اس نے جذباتِ عالیہ کی طرف سے آنکھیں بند کر لی تھیں مشاہدے کی قوت زائل ہو چکی تھی مگر اب حالات بڑی سرعت سے تبدیل ہوتے جا رہے ہیں آج کا ادب حالات کے گرد و پیش سے بے خبر نہیں رہ سکتا۔ آج اگر وہ معاشرتی اور مذہبی مسائل سے بے حس ہے تو اس پر ادب کا اطلاق نہیں ہو سکتا۔

زمانہ قدیم میں مذہب کے ہاتھ میں سوسائٹی کی لگام تھی۔ انسان کی روحانی اور اخلاقی تہذیب مذہب کے احکام پر مبنی تھی اب ادبیات نے یہ خدمت اپنے ذمے لے لی ہے مذہب تحریص سے کام لیتا تھا عذاب و ثواب اس کے آلۂ کار تھے ادب ذوقِ حسن کو اپنا آلۂ کار بناتا ہے ایسا کوئی انسان نہیں جس میں حسن کا احساس نہ ہو ادب اسی ذوقِ حسن کو پیدا کرنے کی کوشش کرتا ہے۔ ادیب یا شاعر میں فطرت کے مشاہدے ازلی ذکاوتِ احساس کے باعث جذبۂ حسن کی اتنی شدت ہو جاتی ہے کہ جو کچھ غیر مستحسن ہے اسے وہ برداشت نہیں کر سکتا اس پر وہ بیان اور جذبات کی ساری

قوت سے وار کرتا ہے یوں کہیے کہ وہ انسانیت کے علویت کے شرف کا علمبردار ہے جو پامال ہیں مظلوم ہیں مجروح ہیں۔ وہ فرد ہوں یا جماعت ان کی حمایت ......
اور وکالت ان کا فرض ہے اس کی عدالت سوسائٹی ہے اسی عدالت کے روبرو وہ اپنا استغاثہ پیش کرتا ہے اور عدالت کے احساس حق و انصاف اور جذبۂ حسن کی تالیف کرکے اپنی سعی کو ناکام سمجھتا ہے مگر عام وکلا کی طرح سے وہ اپنے موکل کی طرف سے جا و بیجا دعوی نہیں پیش کرتا۔ مبالغہ نہیں کرتا۔ اختراع سے کام نہیں لیتا۔ وہ جانتا ہے کہ ان ترکیبوں سے وہ سوسائٹی کی عدالت کو متاثر نہیں کر سکتا اس عدالت کی تالیف جب ہی ممکن ہے جب ہم حقیقت سے ذرا بھی منحرف نہ ہوں ورنہ عدالت ہم سے بدظن ہو جائے گی اور ہماری گزارش پر اعتنا نہ کرے گی اور عدالت کے سامنے اپنے آپ موکل کے ظاہر سے جتنی ہی بحث کرتے ہیں اتنی ہی یا اس سے زیادہ اس کے باطن کے مشاہدے سے آپ اس کے ظاہر کی تشریح کر سکتے ہیں مگر اس کے باطن کی تشریح کے لئے ہمارے پاس نفسیات کے سوا اور کوئی ذریعہ نہیں۔ انسانی ذہن کی خصوصیات کے باوجود بیشتر حالات میں ہمارے جذبات عام ہوتے ہیں فرق صرف اثر کے مدارج کا ہوتا ہے بعض طبائع میں وہ اثر اتنا شدید ہوتا ہے کہ عمل کی صورت میں ظاہر ہو جاتا ہے اکثر طبائع میں وہ جمود یا غیر شعوری حالت میں پڑا ہوتا ہے۔ ادب ان اثرات کو غیر شعوری اثرات سے شعوری حالت میں لانے کی کوشش کرتا ہے مگر اس حقیقت کو وہ کبھی نظر انداز نہیں کرتا کہ انسان میں جو ذوق جمال ہے وہی اس کا

مرکز خطاب ہے پند و نصیحت کا دروازہ اس کے لئے بند ہے ہاں طنز اور استہزا اور تضحیک میں بھی جذبۂ حسن کو جگانے کی طاقت ہے اور ادبا حسب ضرورت اس کا استعمال کرتے ہیں اس قید کے ساتھ کہ حسن مذاق کا دامن ملوث نہ ہونے پائے۔ ابتذال ادب کے دائرے سے خارج ہے ان سے حسن کی بجائے نفرت کے جذبات کی تحریک ہوتی ہے۔

تہذیب نفس ہمیشہ ادب کا مقصد اولی رہا ہے اور ہمیشہ رہے گا یہ دعوی کہ ادب کسی خاص مقصد کا تابع نہیں وہ تو محض لطف کی چیز ہے سطحی ہے ادب اور کسی تحریک کا تابع ہو یا نہ ہو جمالیات کا تابع ضرور ہے اور جمالیات کی تہہ میں بھی تہذیب نفس کا جذبہ کارفرما ہے۔ ہم آہنگی جمالیات کی روح ہے اور ہم آہنگی تبھی پیدا ہوتی ہے جب ہم مادیت کی جانب سے روحانیت کی جانب مائل ہوتے ہیں ادب اسی روحانی ہم آہنگی کی تیز ہیں نوائی ہے اور ہم آہنگی نام ہے خلوص کا، ایثار کا، حمیت کا، محبت کا۔ جہاں یہ جذبات ہیں وہیں اتحاد ہے استحکام ہے اور زندگی ہے، جہاں ان جذبات کا فقدان ہے وہیں افتراق ہے، نفرت ہے، خود پروری ہے، حسد ہے اور موت ہے۔ جمالیات ہمارے معنوی احساسات کو مستحکم کرتے ہیں ہم میں وہ ہم آہنگی پیدا کرتے ہیں جس سے ہم میں اور فطرت میں اتحاد اور مساعدت پیدا ہوتی ہے۔

اس اعتبار سے ادب اور جمالیات کے مقاصد میں بڑی حد تک یکسانیت ہے ہمارا جذبۂ حسن اسی حالت میں متاثر ہو سکتا ہے یا دوسرے لفظوں میں ہمیں

ادب سے اُسی حالت میں لطف و سرور حاصل ہو سکتا ہے جب وہ فطرت سے ہم آہنگ ہوں۔ بسا اوقات غیبت اور بدگوئی سے بھی ہمیں حظ حاصل ہوتا ہے نفس پروری بھی اکثر ہمارے حظ کا باعث ہوتی ہے تاریخ میں ایسے دور بھی گزرے ہیں جب انسان کو درندوں کے قتل ہوتے ہوئے دیکھ کر لطف آتا تھا۔ اور اس قرنے کے آدمیوں کی آج بھی کمی نہیں ہے لیکن اسے ہم لطف یا سرور نہیں کہہ سکتے اس کا ...... نام جنون یا نشہ ہے لطف و سرور وہ احساس ہے جس سے سکون ہو۔ جس سے ہماری روح میں شگفتگی اور تازگی پیدا ہو۔ جو ادب ہم میں جمود پیدا کرے اس کو ہم سفلی کہہ سکتے ہیں علوی ادب وہی ہے جو ہم میں عقل صالح ضبط اور قوت حیات کی تحریک کرے اور ادب میں یہ صلاحیت اسی وقت آئے گی جب اس کا منبع ہماری معاشرت اور اس سے متعلق مسائل ہوں۔ نئے ادب کا مفہوم ہی یہی ہے اس میں زندگی کے مسایل سے بحث ہو زندگی کی تنقید ہو یہی حیاتی مشاہدے اور تاثرات ادیب کے جذبات کے محرک ہوتے ہیں جن پر اس کی تخلیق کی بنیاد کھڑی رہتی ہے اور زندگی کا صحیح مرقع کھینچنے کے لئے ہمیں قدم قدم پر نفسیات کے علم کی ضرورت ہوتی ہے جب ہم یہاں وہبی اکتسابی علم نفسیات نہیں ہے یہ غیر ممکن ہے کہ ہم اپنی قوت فکر کو بہنے سے روک سکیں۔ مشاہدہ تخلیق کے ظاہری اسباب پیدا کر دیتا ہے لیکن اسے واقعیت کا رنگ دینے کے لئے ہمیں اس کے محرکات کے اندر جانا پڑتا ہے اور ادیب میں یہ قوت جتنی تیز ہوتی ہے اتنی ہی اس کی تخلیق میں حرکت حرارت اور حیات پیدا ہوتی ہے۔

شنکر موہن لال

نوائے سازِ دل

کون میرے دل میں بیٹھا چھیڑتا ہے سازِ دل
طور کی بجلی جو ہنس کر پوچھتی ہے رازِ دل

بعدِ مردن اب ہوئے ہیں وہ مرے پرسانِ حال
کیا مبارک موت ہے تیرے لئے اے رازِ دل

دل کو دل سے راہ ہوتی ہے مثل مشہور ہے
لاکھ پردوں میں نہاں ہو پاس ہے ہمرازِ دل

تیغِ ابرو کے اشاروں سے وہ سو ٹکڑے کریں
ہے شہیدِ ناز ہونا باعثِ صد نازِ دل

آنکھ میں مقتول کی تصویرِ قاتل بھی رہے
تیرِ مژگاں کا نشانہ ہو یہ ہے پروانۂ دل

گو بظاہر ہے فقط اک ؟ بے بال و پر
کل فضائے شش جہت ہی وسعتِ پروازِ دل

اک جھلک ہٹ کر دکھا اے پردۂ حسنِ مجاز
دیکھ پھر انجامِ جوشِ طاقتِ پروازِ دل

محرمِ غم ہائے پنہاں شمعِ بزمِ حسن و عشق
تارِ اشکِ فرقتِ جاناں ہی سوز و سازِ دل

اُکھڑی سانسوں کے اشاروں سے بتاتا ہے حبیب
میری رگ رگ سے قریں تر ہے مرادِ سازِ دل

سید حبیب حسن

بھکاری کا خونین انتقام

(بسلسلہ گزشتہ)

سرکار ــــ میں اپنے وجود کے بارے میں چند باتیں ضروری کہنا چاہتا ہوں ــــ اپنی صفائی یا اپنی جان بخشی کے لئے نہیں بلکہ میرا مقصد دنیا والوں کے سامنے بعض معمولی واقعات کی اہمیت کو واضح کرنا ہے تمام واقعات سے ہٹتے ہوئے دوسرے واقعات میں بغیر کسی کی اجازت کے بیان کرنا نہیں چاہتا۔" جج نے ملزم کو اجازت دی کہ وہ بلا کم و کاست اپنے واقعات بیان کرے ملزم نے دوبارہ ایک سرد آہ بھری اس نے رکتے رکتے کہنا شروع کیا۔

"سرکار ــــ میں ایک غریب انسان ہوں۔ محنت مزدوری میرا پیشہ ہے میں نہیں جانتا کہ میں کہاں پیدا ہوا اور کس حالت میں۔ لیکن یہ میں بخوبی جانتا ہوں کہ میں نے ایک چھوٹے سے گاؤں میں ہوش سنبھالا۔ مجھ سے محبت کرنے والی، میرے ہر دکھ کو اپنا دکھ سمجھنے والی صرف میری ایک ماں تھی۔ (اس موقع پر ملزم کی آنکھ سے آنسو بہنے لگے۔) وہ مجھ سے بے انتہا محبت کرتی تھی۔ وہ مجھے ہمیشہ خوش دیکھنے کے لئے سخت سے سخت کام کرتی اور اپنی کمائی سے میرے کھلونے اور دوسری چیزیں مہیا کرتی تھی لیکن ــــ آہ وہ ہمیشہ رنجیدہ رہتی تھی ــــ اس کی بڑی بڑی آنکھیں ہمیشہ حسرت و یاس کے دریا میں غوطہ زن ــــ اگر وہ زندہ تھی تو صرف مجھے دیکھ کر ــــ جب مجھ میں عقل و تمیز پیدا ہوئی اور میں محلے کے لڑکوں میں اٹھ بیٹھ کر دنیا سے واقف ہوا تو مجھے اس بات کی تشویش ہونے لگی کہ دنیا میں میرا باپ کون ہے۔

تقریباً ہر روز اور ہر وقت میں اپنی ماں سے لڑتا تھا کہ وہ مجھے میرے باپ کا نام اور پتہ بتا دے۔ لیکن وہ اس بات کا جواب دینے سے ہمیشہ گریز کرتی رہی یہاں تک کہ میں بالغ ہو گیا۔ اور وہ منحوس وقت بھی آ گیا جب کہ میری ماں جو میری امیدوں کا سہارا تھی مجھ کو چھوڑ کر ہمیشہ ہمیشہ کے لئے رخصت ہونے لگی ــــ اس نے مرتے وقت مجھے اپنے سینے سے چمٹا لیا اس کا گرم جسم ــــ اور اس کی بے ترتیب سانسیں ــــ اس کی ڈبڈبائی ہوئی بے تاب آنکھیں ــــ اس کے دھڑکتے ہوئے دل کی بلند آواز کے ساتھ میرے کانوں نے سنا کہ میری ماں ایک غریب گھرانے کی لڑکی تھی ــــ معصوم ــــ بھولی بھالی ــــ بنسی لال کے مکان میں ملازمہ کی حیثیت رکھتی تھی۔ خوبصورت تھی ــــ جوان تھی ــــ غریب تھی ــــ بنسی لال نے ان باتوں سے فائدہ اٹھایا مستقبل کی زندگی کے وہ دلخوش خواب پیش کئے جو سراسر فریب اور مکاری پر مبنی تھے۔ اپنے شیطانی جذبات اور نفسانی خواہشات کو دولت کی لالچ ــــ اور جھوٹے وعدوں کی آڑ میں پورا کیا طاقت والے انسان نے کمزور عورت کی زندگی تباہ کی اس کے ساتھ ناجائز طور پر ایک طویل مدت تک عیش کرتا رہا۔ اور اپنی شادی کی مسرتوں میں خود کو گم کر کے اس غریب کو ٹھوکریں مار کر گھر سے نکال دیا تاکہ اس کی شرافت پر دھبہ آنے کے مواقع نہ پیدا ہو جائیں اور اس کی ہونے والی شادی ملتوی نہ ہو جائے۔ دنیا کی نظروں سے بچتے ہوئے بیکس و ناچار عورت نے اپنی زندگی کا بقایا حصہ گاؤں میں گزارنا شروع کی۔

اس کے چند دن بعد میں پیدا ہوا ـــ ملزم نے اپنے سینے کو ابھارتے ہوئے بہ آوازِ بلند کہنا شروع کیا "سرکار ـــ میری ماں کی مقدس روح نے اس سے پہلے کہ وہ قفسِ عنصری کو خیرباد کہے مجھے میرے دیرینہ سوالات کا جواب دیا اس نے بتایا کہ میرا باپ کون ہے ـــ کیا ہے ـــ اور کہاں رہتا ہے ـــ اس نے رو رو کر مجھ سے کہا کہ میں نے تم کو بچپے سے جوان صرف اس لئے کیا اور بجائے تمھارا گلا گھونٹنے کے کھلا پلا کر اس لئے پرورش کیا کہ تم وہ کام کرو جس کو میں کمزور عورت ہونے کی وجہ سے نہ کر سکی ـــ یعنی اپنے باپ ـــ ظالم باپ سے انتقام لو۔"

"مجھے جب اپنی حقیقت معلوم ہوئی کہ میں کون ہوں اور جب میری ماں کی مصیبتوں کا حال میں نے سنا تو مجھے از خود اس درندہ خصلت انسان سے نفرت پیدا ہونے لگی، جو میری ماں کی برباد شدہ زندگی کا باعث تھا اور جس نے مجھ جیسے قابلِ نفرت انسان کو پیدا کرنے میں حصہ لیا تھا۔ اس کے ناقابلِ معافی گناہوں اور شیطانی خصلتوں کا میں نچوڑ ہوں جس کو دنیا میں جینے کے قابل نہیں سمجھا جاتا ـــ جس کو آپ کی عدالت کا بنایا ہوا قانون اور آپ کا سماج ٹھکراتا ہے ـــ لیکن اس پر غور نہیں کیا جاتا کہ مجھ جیسے حرامی اور ناپاک افراد کا دنیا میں اضافہ کرنے والا ـــ معصوم لڑکیوں کو اپنی شہوت پرستی کا شکار بنانے والا انسان نما شیطان کس سزا کا مستحق ہے اور اُسے دنیا میں زندہ رہ کر لطفِ زندگانی حاصل کرنے کا کہاں تک حق حاصل ہے ـــ سرکار ـــ میں نے اپنے باپ کو وہ سزا دی ہے جس کا وہ مستحق تھا۔ آپ کی عدالت کا قانون مجھے مجرم اور خونین مجرم سمجھتا ہے لیکن میرے ضمیر کا فتویٰ یہ ہے کہ میں نے جو کچھ کیا ٹھیک کیا۔"

جج کو پہلی مرتبہ بھکاری کو یہ ہدایت کرنے کی ضرورت پیش آئی کہ وہ ایسے جملے نہیں کہہ سکتا جس سے عدالت کی توہین ہوتی ہو ـــ ملزم نے اپنے جوش کو دباتے ہوئے کہا "میں آگے کچھ نہیں کہنا چاہتا سوائے اس کے کہ مجھے اس بات کا اقرار ہے کہ میں نے جنسی لال یعنی اپنے باپ کو قتل کیا۔ اور عمداً۔"

چونکہ عدالت کا وقت ہو چکا تھا اس لئے اجلاس برخاست کر دیا گیا۔

تقریباً ایک مہینہ تک عدالتی مرحلے طے ہوتے رہے۔ یہاں تک کہ وہ دن بھی آ گیا جس دن اس مقدمہ کا فیصلہ سنایا جانے والا تھا۔ اس دوران میں میرے دل میں بھکاری کی طرف سے بجائے دہشت کے ہمدردی پیدا ہو چلی تھی۔

جج کے کمرے میں داخل ہوتے ہی ملزم کو حاضر کیا گیا۔ جج نے آہستگی سے فیصلہ پڑھ کر سنا دیا۔ حاضرین کی خوف زدہ ہلکی چیخوں سے عدالت کا کمرہ تھوڑی دیر کے لئے گونج اٹھا۔ ملزم کے چہرے پر مسرت کی لہر دوڑ گئی۔ اس نے کہا۔

"میں مطمئن ضمیر اور مسرور دل کے ساتھ اس حکم کا خیر مقدم کرتا ہوں"

لوگ ہمدردی اور حیرت کے ساتھ اس کے چہرے کو دیکھنے لگے۔

خلیل اللہ

موسیقی اقطاعِ عالم میں

اگر ہم ان تمام آلات کو ایک جگہ رکھیں جن کے حضرتِ انسان نے آواز پیدا کی ہے تو وہ ایک عجیب و غریب مجموعہ ہوگا۔ ایک طرف افریقہ کے قدیم لکڑی و مٹی کے ڈھول ہوں گے تو دوسری طرف اسی کی ترقی یافتہ شکل دورِ جدید کا طبلہ ہوگا۔ جہاں ایک عجیب بے ڈھنگا سا تاروں والا باجا (جو کھوکھلی چیز مثل کدو وغیرہ سے تیار کیا جاتا ہے) پڑا ہوگا۔ وہیں پر ایک خوش اسلوب بربط و قرونِ وسطیٰ کی سات تاروالی سارنگی یا موجودہ تہذیب کا مشہور باجا وائلن دھرا ہوگا۔ نرسلوں سینگوں اور ہاتھی دانت کے غلیظ و بدوضع قرنے و شہنائیاں اور خوشنما وضع ارگن مذاقِ قدیم و جدید کا نمونہ پیش کر رہے ہوں گے۔

ان تمام قسم کے قدیم و جدید باجوں کو تین گروہ میں تقسیم کیا جا سکتا ہے۔ پہلے ضربی یعنی وہ باجے جو مار یا چوٹ پر آواز دیں مثلاً نقارہ ڈھول طبلہ وغیرہ دوسرے تاری یعنی وہ باجے جو تاروں سے بنائے گئے ہوں مثلاً سارنگی وائلن، ستار وغیرہ تیسرے ہوائی یعنی وہ باجے جو ہوا کی مدد سے آواز دیں مثلاً ہارمونیم وغیرہ۔ انسان نے ابتدائے آفرینش سے آج تک آواز پیدا کرنے کے مختلف طریقے ایجاد کئے ہیں مگر ہر طریقہ ان تینوں گروہوں میں سے ایک نہ ایک میں ضرور شامل ہے۔

زمانۂ قدیم کے باشندوں نے اپنی ذاتی آواز کے علاوہ کسی دوسرے طریقے سے اپنی خواہش و جذبات کے اظہار کی کوشش کی۔ اسی خواہش و شوق کے تکملہ کے سلسلے میں یہ لوگ آلاتِ موسیقی کی طرف مائل ہوئے۔ ابتدائی آلات جن کے بنانے میں وہ کامیاب ہوئے ایسے باجے تھے جو کسی دوسری چیز سے پیٹنے کے بعد آواز دیتے تھے تاہم اس نے اس خصوص میں جلد ترقی کی۔ انھوں نے ایک کھوکھلی چیز پر کسی جانور کا چمڑا منڈلیا تو ایک ڈھول کی شکل ترتیب پاگئی یا اس نے ایک تیز اور صاف آواز نکالنے کے لئے نرسلیں استعمال کیں جو چند روز کے بعد قرنے در شہنائی کی شکل میں ترقی کر گئیں۔ جب قدیم انسان نے دیکھا کہ ایک کھوکھلی چیز میں چھوٹی چھوٹی کونیاں سی ڈال کر ہلائی جائیں تو ایک جھنجھنے کی سی آواز پیدا ہوتی ہے تو اس طرح سے اس نے ایک تیسرا آلۂ صوت تیار کرلیا۔ آج تک بھی دنیا کے بعض حصوں میں ایسے لوگ موجود ہیں جو ڈھول قرنے اور جھنجھنے کو خاص آلاتِ موسیقی کا درجہ دیتے ہیں۔ قدیم ورا بتدائی آواز پیدا کرنے کے طریقے اور دورِ جدید کی ترقی یافتہ موسیقی میں صدیوں کا زمانہ حائل ہے تاہم اگر ہم کسی قدیم بجانے والے کو بغور دیکھیں تو اس کے سر اور دیگر اعضا کے حرکات و سکنات سے پتہ چلتا ہے کہ تال کا قائم رکھنا اس کے لئے ضروری چیز ہے جنوبی امریکہ کا سرخ ہندی اپنے ٹم ٹم (ایک قسم کا ڈھول) میں یا آفریقہ کا حبشی اپنے ڈھول میں نغمہ اور راگ سے زیادہ تال کا خیال رکھتا ہے اس سے صاف ظاہر ہے کہ زمانۂ قدیم کی جاہل اقوام کے دماغوں میں نغمہ، راگ اور الاپ سے زیادہ تال کی اہمیت بسی ہوئی تھی۔ آفریقہ کے حبشیوں کے نزدیک ڈھول بجانا ایک خاص فن ہے جس میں وہ کامل مہارت رکھتے ہیں۔ چنانچہ انہی ڈھولوں کی آواز سے وہ میلوں تک پیغام رسانی کرتے ہیں۔

حبشیوں کے گانے اور بجانے کا اصول ہم آہنگی ہے۔

جو ہر سننے والے کے لئے ایک بیزار کن امر ہے۔ اگرچہ کہ
جب وہ مذہبی جوش میں بجاتے ہیں تو ایک غمگین اور
موثر نغمہ پیدا کر دیتے ہیں جس کو وہ "مقدس ترانے"
کے نام سے یاد کرتے ہیں۔ وسط آفریقہ کے اکثر قبائل
موسیقی میں کامل دست رس رکھتے ہیں اور کسی قبیلہ
کا ایک فرد جو گانا بجانا اور ناچنا جانتا ہے، کسی علاقہ
میں جاتا ہے تو اس کا پرجوش خیر مقدم کیا جاتا ہے
مگر ان کا طریقۂ استقبال سخت بے رحمی سے تعلق رکھتا ہے
جیسا کہ ایک سیاح کا بیان ہے کہ جب کبھی ایسا شخص دوسرے
قبیلہ میں جاتا ہے تو اس قبیلہ کا سردار اس کی آنکھیں
نکلوا دیتا ہے تا کہ ایسی خوبیوں والا انسان ادھر ادھر
مارا مارا نہ پھر سکے۔

اگر حبشیوں کے گانوں اور موسیقی کی شہرت ان کی
تال سے ہے تو مشرق راگ اور سرگم کا دلدادہ ہے۔
حتیٰ کہ تقاریر میں بھی اس کی جھلک نظر آتی ہے۔ کیونکہ
مشرقی ممالک میں ایک ہی لفظ آواز کے نشیب و فراز
یا لب و لہجہ کے لحاظ سے مختلف معنی [illegible]
میں علم موسیقی کو نشو و نما پانے کے [illegible]
ہوئے کیونکہ یہاں ہر چیز گورنمنٹ کے ہاتھ میں ہونے
کی وجہ سے رفتار ترقی بہت سست ہے۔ حالانکہ جاپان
میں نغمہ، راگ اور الاپ کو پسندیدہ نظروں سے دیکھا
جاتا ہے یہی وجہ ہے کہ یہاں کی موسیقی جلد ترقی پا رہی ہے

ہر مشرقی قوم اپنے ہاں ایک خاص آلۂ موسیقی
روایتاً رکھتی ہے۔ اہل چین "دی کنگ" نامی آلۂ موسیقی
کو بہت عزیز رکھتے ہیں جو ایک قسم کا سلاخ دار باجا ہوتا
ہے جس میں سولہ پتھر دو قطار میں بندھے ہوتے ہیں۔
جن کو ایک لکڑی کی موگری سے بجایا جاتا ہے۔
اہل برما ایک خاص قسم کے ڈھول کے شیدائی ہیں۔
جس میں اکیس (۲۱) مختلف سائز کے چھوٹے بڑے ڈھول
ایک نصف دائرے کی شکل میں جڑے ہوتے ہیں اور
بجانے والا نصف دائرے کے بیچ میں کھڑا یا بیٹھا
رہتا ہے۔ جاپانی بانس کی نلیوں والے باجے کو پسند
کرتے ہیں جس کو وہ "اینک لانگ" کہتے ہیں۔ ہندوستانی
موسیقی دیگر ممالک سے بہت آگے ہے "بین" ہندوستان کا
ایک ایسا باجا ہے جو ہندوستانی موسیقی کی ساری
خصوصیات کا حامل ہے۔

شمالی امریکہ میں ہر ابتدائی قسم کے ڈھول،
سیٹیاں، جھنجھنے اور بانسریاں استعمال ہوتی ہیں۔ یہاں
موسیقی کو بہت پسند کیا جاتا ہے۔ وسطی اور جنوبی امریکہ
کے اکثر قبائل علم موسیقی کے بہت عاشق ہیں جو مختلف
قسم کے تار والے آلات استعمال کرتے ہیں جو کھوکھلی چیزوں
از قسم کدو وغیرہ پر محویت انگیز آواز پیدا کرتے ہیں۔
قدیم مصری تین ہزار قبل مسیح میں فن موسیقی کو اوج کمال
پر پہنچا چکے تھے وہ تار والے آلات استعمال کرتے تھے
مثلاً چنگ، بربط اور ستار کی قسم کا ایک مثلث نما باجا
وغیرہ اس کے بعد سے فن موسیقی کو انحطاط شروع ہوا۔
یہودیوں نے موسیقی مصریوں سے حاصل کی۔ یونانیوں
نے موسیقی کو اصولی اور فنی حیثیت سے ترقی دی اور
یہی پہلی قوم تھی جس نے علم موسیقی پر قلم اٹھایا۔ موسیقی
ان کی رہین منت ہے۔ اس قوم نے موسیقی پر مفید
مواد فراہم کیا۔ آرفیوس اور اس کے بربط کی سحر انگیزیاں
آج تک زبان زدِ خاص و عام ہیں کہ جب وہ بجاتا تھا تو

ساکن پہاڑ بہتے دریا اور خاموش درخت اس کے کمال کی داد میں سر دھنتے تھے۔ عرب اس خصوص میں بڑے حساس واقع ہوئے تھے وہ بجائے تال اور آواز کے نغمہ اور راگ کے جویا تھے بانسری، بربط، چنگ اور دف ان کے ہر دلعزیز آلاتِ موسیقی ہیں۔ زمانہ تاریک میں جب یورپ جاہلانہ دور سے گزر رہا تھا ان کے گرجاؤں نے علم موسیقی کو زندہ رکھا اور وہ قومی ناچ گانے جو آج تک موجود ہیں انہیں گرجاؤں کے ممنون ہیں ان گرجاؤں کے علاوہ اس زمانہ میں گانے اور بجانے والے ادھر ادھر پھرا کرتے تھے مثلاً جنوبی یورپ کے غزل گو شعراء اور شمالی رزمیہ شعراء اور جرمنی کے مغنی شعراء اور برطانیہ کے گویئے اور بہروپئے وغیرہ۔ آلات موسیقی کی جدید ساخت بالخصوص پیانو کے ذریعہ علم موسیقی کو پوری ترقی حاصل ہوئی ہے اس سے دنیا کے ہر گوشے میں چھوٹا بڑا واقف ہے

محمد عبدالستار فاروقی
(گلبرگہ)

شرارت

کوئی شرارت پھر کر جاؤ
اٹھو اٹھ کر سامنے آؤ

سامنے آؤ، نظریں ملاؤ
مجھ سی اپنی شکل بناؤ
کوئی شرارت پھر کر جاؤ

ساون آیا، بھادوں آئی
الفت عالم پر مستی چھائی

تم بھی اٹھو لے کر انگڑائی
دونوں عالم پر چھا جاؤ
کوئی شرارت پھر کر جاؤ

اک پل آنا، اک پل جانا
خوب آتا ہے تم کو ستانا

سن کر میرا سارا فسانا
میرا فسانہ مجھ کو سناؤ
کوئی شرارت پھر کر جاؤ

چاند آیا ہے، تم بھی آؤ
اپنا روپ انوپ دکھاؤ

بدلی چھائی، تم بھی چھاؤ
بالوں کو چہرہ پر لاؤ
کوئی شرارت پھر کر جاؤ

مجھ سے پردہ پوشی کیسی؟
دوست مرے خاموشی کیسی؟

ہوش میں ہوں بے ہوشی کیسی؟
سامنے آکر ہوش اڑاؤ
کوئی شرارت پھر کر جاؤ

شور تمہاری پیت نرالی
بات نرالی، جیت نرالی

خوب لکھی یہ گیت نرالی
اور کوئی طوفان اٹھاؤ
کوئی شرارت پھر کر جاؤ

شور عابدی
(گلبرگہ)

آج کل کی لڑکیاں

اس سے قبل کہ آج کل کی لڑکیوں سے میں آپ کا تعارف کراؤں آپ ہی کے رنگین تصورات آپ کے سامنے ایک پیکر لاکر کھڑا کر دیں گے جس کا خاکہ الفاظ کے ذریعہ اتارنا ٹیڑھا سوال معلوم ہوتا ہے۔ جدید لباس میں ملبوس بال کٹے ہوئے شانے لٹکے چہرہ پر سرخ و سفید غازہ ملا ہوا ابروؤں کی جگہ خالی لیکن ان سے دو انگشت اوپر ہٹ کر باریک سلائی سے بنائی ہوئی کمان دار بھویں ناخن اور ہونٹوں پر سرخ رنگ چڑھا ہو غرض کہ یہ معلوم ہوگا کہ فطرتی صورت پر کوئی مصنوعی نیم مانوس چہرہ لگا دیا گیا ہے۔ یہ آج کل کی لڑکیوں کی خیالی تصویر آپ کے ذہن میں ہوئی۔ لیکن کیا آج سے دس سال قبل ان پر یہ نظریں اٹھائی نہیں جاتی تھیں اور ان کی تو ہین نہیں کی جاتی تھی اور ان پر حصہ نہیں لیتی تھیں۔ بیس سال بلکہ سو سال پہلے جس طرح لڑکیوں پر نقرے کسے جاتے تھے اسی طرح آج کل کی لڑکیوں کے خلاف بھی مخالفت کی آواز بلند کی جاتی ہے۔ کسی عہد میں اصل مرض کی تشخیص نہ کی گئی اور نہ اب بھی کسی کے بس کی بات ہے۔

ایک ایسے زمانہ سے جس کا تعین آسان نہیں ان حرماں نصیبوں کی امنگوں، خوشیوں اور احساسات کو کچل دیا گیا اور فطرتی طور پر پھلنے پھولنے اور نشو نما پانے نہ دیا گیا اور پھر یہ بڑی بڑی امیدیں رکھی گئیں کہ وہ ایک ذمہ دار ہستی بن کر رہیں۔ حالانکہ ان کے نوکی نظر و ان کی نظر تنگ، ان کے خیالات پست، ان کی ذہنیت ادنیٰ ہوتی چلی گئی وہ ایک علٰحدہ دنیا میں رہنے لگیں۔ مرد کی شریکِ حیات نہیں بلکہ ایک زبردست ہستی بن کر غلامی کی زنجیروں میں جکڑی رہیں۔ اس کے رحم و کرم کے لئے منہ تکتی رہیں حالت یہ ہوئی کہ صنفِ مقابل سے وہ ہراساں رہنے لگیں۔ اس کے سائے سے خوف زدہ بھٹکے ہوئے ہرن کی گت بن گئی اس لحاظ سے ہماری آبادی کا نصف حصہ نکما بنا رہا۔ اور اس رسم و رواج نے لڑکیوں کو بے کار کر دیا اور زمانہ کی عادت کے مطابق اس کا ردِ عمل لازمی ہوگیا۔ اب جو ذرا آزادی دی جا رہی ہے۔ اپنے گھر کی چار دیواری سے باہر آ رہی ہیں تو ان کو اس چار دیواری سے کوئی انس یا لگاؤ باقی نہیں رہا مغرب کی اندھی ریس کے کنویں میں گری جا رہی ہیں۔ گویا کہ وہ فضولیات میں الجھ رہی ہیں۔ مغربی تہذیب کے بُرے طریقے اختیار کئے جا رہے ہیں۔ زیب و زینت بناؤ سنگھار اور نئی تہذیب کے نئے طریقوں میں وقت برباد کیا جاتا ہے فیشن کی دوڑ میں یورپ سے بھی آگے بڑھنے کی دھن ہے۔ بہت سی باریکیاں اور نزاکتیں اس فیشن میں پیدا کی جاتی ہیں۔ جس پر ان کی دولت اور وقت کا بہت سا قیمتی حصہ صرف ہو رہا ہے۔ اور صحت پر بھی برا اثر پڑ رہا ہے۔ یہ خصوصیت اس وقت زیادہ واضح ہوتی ہے جب کہ کوئی تقریب منائی جاتی ہے یا شادی بیاہ کے موقعوں پر جہیز تیار کیا جاتا ہے اور کمرے سجائے جاتے ہیں تو سیکڑوں نئے ڈھب تراشے جاتے ہیں۔ اور اس کا خاص خیال رہتا ہے کہ تمام چیزیں موزوں ہوں ایک دوسرے سے "میچ" کریں ورنہ بھدی اور بے رونق کہلائی جانے کا خوف

سوہانِ روح بنا رہتا ہے۔ آج کل کی لڑکیوں کے
مذاق کی وجہ سے کہئے یا ان کے تخیلات کے اثر سے
کہئے ایسے مضحکہ آمیز واقعات پیش آئے ہیں جو سلامت روی
سے کوسوں دور ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ ضرورتوں کا دائرہ
وسیع ہوتا چلا جا رہا ہے۔ خیالات ہزاروں جانب
بٹے جا رہے ہیں۔ آج کل کی لڑکیاں چاہتی ہیں کہ
شوہر ان کے مرید بنے رہیں اور ان کے گاڑھے پسینے
کی کمائی کی گویا صرف وہی حق دار ہیں اور اس کو خرافات
اور فضولیات پر خرچ کر دینا چاہتی ہیں۔ وہ اقتصادی اور
معاشرتی اصولوں سے محض نا آشنا ہوتی ہیں۔ حالانکہ
اس دور میں نسوانیت کا احترام اور وقار بڑھ رہا
ہے۔ تعلیم یافتہ اور متمدن شوہر اپنی رفیقۂ حیات کو زندگی
کی تمام مسرتوں میں شریک رکھنے کے لئے آمادہ نظر
آتے ہیں۔ لیکن آزادی خیالات کے زہریلے اثر سے
میاں بیوی میں باہمی خلوص و محبت کا سدا بہار چشمہ
رات دن کے اختلافات سے گدلا ہو جاتا ہے اور
مردوں کو یہ یقین ہو جاتا ہے کہ حسنِ سیرت اور شرافتِ
ذاتی اس نئی روشنی میں کھوئی جا رہی ہے بہتر ہوتا کہ
پھر وہی قدیم روایتی اصول قائم ہو جاتے کیونکہ
جدید تغیرات اور اصلاحات پریشانی کا سبب بنتے
نظر آ رہے ہیں اور خیال پیدا ہو رہا ہے کہ ان کے
حقیقی جوہر ضایع ہو رہے ہیں۔ وہ اپنی امتیازی
خصوصیتوں اور فطری خوبیوں سے کوسوں دور
ہوتی جا رہی ہیں اور اندیشہ ہوتا ہے کہ نسوانیت برقرار
نہیں رہے گی۔

اے گل از بستانِ آمارستہ ‌‌ داغش از دامانِ ملت شستہ

ایسی حالت میں آج کل کی لڑکیوں سے یہ کس طرح
امید ہو سکتی ہے کہ وہ اچھی مائیں اور اچھی بیویاں بنیں
گی جن کا معیارِ زندگی موجودہ نام نہاد تہذیب کے
مطابق ہو اور وہ اس کی دلدادہ ہوں، ہر وقت اپنے
بناؤ سنگھار اور جدید لباس میں ملبوس رہنا باعث
عزت تصور کرتی ہوں اور بیجا اسرافات کے باعث
والدین اور شوہروں پر بار گراں معلوم ہوتی ہوں۔
اور پھر یہ فکر بھی پیدا ہوتی ہے کہ ان کی گود میں پلنے والی اولاد
کی سیرت کس طرح بنے گی کیا وہ اپنی اولاد کی اچھی
اعلیٰ تربیت دے سکیں گی کہ وہ صحیح معنوں میں زندہ دل
کہلا سکے۔ درحقیقت آج کل کی لڑکیاں تعلیم پا کر یہ سمجھنے
لگی ہیں کہ انھوں نے ہر قسم کی آزادی حاصل کر لی اور
اپنے مذہبی طریقوں اور احکام کو بالائے طاق رکھ کر
قدیم روایتوں کا مذاق اڑانے کو اپنا شیوہ بنا لیتی ہیں
[illegible] کہ ان تمام [illegible]
کرنے والی خرابیوں پر ایک گونہ سکون چھایا ہوا ہے۔ نئی
تحریکیں پیدا ہو رہی ہیں۔ تعلیم نسواں کا چرچا بڑھ رہا ہے۔
اور آج کل کی لڑکیوں کی ایک جماعت ایسی بھی ہے
جو معاشرت میں سادگی اختیار کرتی ہیں۔ اور وہ اپنا
جائز حصہ اور اپنے فطری حقوق اور جگہ حاصل کرنے کے
لئے کامیابی کے ساتھ آگے قدم بڑھا رہی ہیں۔ زندگی کے
بعض شعبوں میں ترقی کر رہی ہیں۔ ڈاکٹر، وکیل، بیرسٹر
مجسٹریٹ، اسکولوں کی استانیاں اور پروفیسر بن رہی
ہیں۔ انجمنوں اور کانفرنسوں میں کام کر کے یہ ثبوت
دے رہی ہیں کہ اجتماعی زندگی میں حقیقی طاقت کا ذریعہ
عورت ہی ہے۔ [illegible] کا انحصار ہماری نوجوان لڑکیوں کی

بیداری پر موقوف ہے۔ وہ پہلے کی لڑکیوں کی طرح سست نہیں ان کی جمودی حالت میں ہیجان پیدا ہو گیا ہے۔ وہ ہم عصر اقوام کے ساتھ ساتھ قدم اٹھانا چاہتی ہیں۔

ترقی کے میدان میں وہ کسی سے پیچھے رہنا پسند نہیں کرتیں۔ ہندوستانی کالجوں اور اسکولوں کی تعلیم ان کے لئے کافی نہیں وہ یورپ جاکر اعلیٰ تعلیم پاتی ہیں تاکہ اپنے پیروں پر کھڑے ہونے کے لائق بن سکتی ہیں۔ اور بوقت ضرورت اپنی تعلیم سے فائدہ اٹھاسکتی ہیں بہرحال ان کے لئے ترقی کے راستے خود بخود کھل رہے ہیں۔ لیکن گذشتہ زمانہ میں جو مذہبی اور اخلاقی تعلیم کا خاص خیال رکھا جاتا تھا، وہ اب بالکل بھلادیا جارہا ہے۔ شریفوں کے گھرانوں میں خاص توجہ لڑکیوں کے اخلاق اور عادتوں کے درست کرنے پر کی جاتی تھی ان کو نیک نفس اور پاکباز بنایا جاتا تھا۔ مذہب کے احکام کی پابندی لازمی کردی جاتی تھی۔ لیکن اب اس کا چرچا رہا نہیں اس سے تو ظاہر ہوا کہ ہماری تربیت ہی میں نقائص پیدا ہوگئے ہیں۔ ان تمام کمزوریوں کو ہماری نوجوان بہنیں اور لڑکیاں کامیابی کے ساتھ دور کرسکتی ہیں۔ وہ دماغی توازن تیز نظری اور دانشمندی کے مضبوط ہاتھوں سے کام لیں اور ان موقعوں سے پورا پورا فائدہ حاصل کریں ان کو اس وقت صرف ایسے چند رہنماؤں کی ضرورت ہے، جو خلوص اور صدق دلی سے ان کی رہبری کرکے خود نمونہ اور مثال بن جائیں تاکہ ان کی بھولی بھالی روشن سیرت پر سے بدنما داغ مٹادئے جائیں جو خوش قسمتی سے ابھی طبیعت ثانیہ بنے نہیں ہیں۔

مسز صوفی

عید ہو گئی

(رمضان حیدرآباد ریڈیو اسٹیشن سے نشر کیا گیا)

پیغام نشاط و عیش کی تمہید ہو گئی
[illegible] روزہ دار تھے بہر رضائے رب
انسان تھا پاس دار امانت قدیم سے
کہتے ہیں جو کہ "مائل پستی و ضعف ہے"
آمادہ بہر خدمت ملت ہیں جو نفوس
مانگی دعا جو واسطۂ مائین سے

دو دید سے تیری اے مہ نو! عید ہو گئی
الفت کی خوشی کی غیب سے تائید ہو گئی
عہد وفا کی خوب یہ تجدید ہو گئی
"دین بلند" ان کی بھی تردید ہو گئی
ان کی مثال زندۂ جاوید ہو گئی
صد شکر مغفرت کی کچھ امید ہو گئی

روٹھا ہوا ہے آج ہمارا عزیز دوست
من جائے وہ تو پھر بخدا، عید ہو گئی

انیسہ ہارون بیگم شروانیہ

پیرس

(تاثرات سفر یورپ از ۱۹ اگست تا ۳۰ اگست)

چونکہ ہم پیرس رات کے وقت پہنچے تھے اس لئے
بالفعل اسٹیشن کے قریب ہی ایک ہوٹل میں قیام کر لیا تھا۔
لیکن یہ ہوٹل "قومی کتب خانے" BIBLIOTHEQUE NATIONALE
سے کئی میل کے فاصلے پر تھا اور اس خیال سے کہ اس میں مستقل
قیام کیا تو آنے جانے میں بہت وقت ضائع ہوگا، دوسرے
روز میں نے کتب خانے کے قریب ہی ایک ہوٹل تلاش کر لیا
اور اس میں منتقل ہو گیا۔ قومی کتب خانہ ایک عالی شان تاریخی
عمارت میں ہے اور جو رتبہ انگلستان میں برطانوی نوادر خانے
کے کتب خانے کو حاصل ہے وہی فرانس میں اس کتب خانے کو
ہے۔ جس عمارت میں کتب خانہ ہے اس کی ابتدا لوئی ۱۴
شاہ فرانس کے مشہور وزیر مازارین نے سترھویں صدی کے
شروع میں ڈالی تھی اور اس عمارت کے ایک دوسرے
حصے میں فرانس کا ایک دوسرا وزیر کولبرٹ رہا کرتا تھا۔
مطالعہ خانے میں کام کے لئے ایک اجازے کی ضرورت پڑتی ہے
جس کے لئے غیر فرانسیسیوں کو اپنے سفارت خانوں سے
ایک تعارف نامہ پیش کرنا پڑتا ہے، لیکن اگر کوئی شخص صرف
سات روز (علاوہ ان تعطیلات کے جو درمیان میں آجائیں)
مطالعہ کرنا چاہے تو بغیر تعارف نامے کے صرف دو فرانک
ادا کرنے پر اجازہ مل جاتا ہے۔ شکر ہے کہ مجھے مطبوعات کا
مطالعہ کرنا اور محمود گاواں کے لئے الضوء اللامع کو اپنے
لندن کے قیام کے آخری دن دیکھ چکا تھا ورنہ بڑی دقت پڑتی
اس لئے کہ ہر سال ۱۴ اگست سے یکم ستمبر تک مطبوعات کا
شعبہ تنقیح وغیرہ کے اغراض سے بند رہتا ہے اگر مخطوطات
کی بھی یہی کیفیت ہوتی تو میرا پیرس آنا ہی بیکار رہ جاتا لیکن
مخطوطات کا شعبہ اگست میں بند نہیں ہوتا بلکہ اس کی تنقیح
صیغہ مطبوعات کھلنے کے بعد کی جاتی ہے۔

قومی کتب خانے کے قریب ہی وہ مشہور ایوان ہے
جسے "ایوان شاہی" (Palais Royale) کہتے ہیں
اور جس میں آج کل فرانس کی عدالت عالیہ (Conseil de état)
(مجلس مملکت) واقع ہے جو مختلف عدالتی اختیار سماعت کے
تنازع کے موقع پر آخری تصفیہ کرتی ہے۔ یہ "ایوان شاہی"
۱۷۸۹ء کے انقلاب فرانس میں بہت مشہور ہو گیا اس لئے کہ
یہی وہ مقام ہے جہاں کے باغیچے میں (جو اس وقت تک موجود ہے)
مشہور انقلابی خطاب ڈے مولین (Desmoulin)
نے فرانسیسیوں کے سامنے نعرہ بلند کیا تھا کہ اب ظلم و ستم کی
انتہا ہو گئی اور وقت آگیا ہے کہ ظالموں کے پنجے سے نکلنے
کے لئے ایک خلاف ہتھیار اٹھاؤ۔ ڈے مولین کا مجسمہ جس میں
وہ انبوہ کو مخاطب کر رہا ہے، باغیچے کے ایک ہال جسے میں
نصب ہے اس "ایوان شاہی" کو لوئی ۱۳ کے وزیر کارڈنل
ریشیلیو نے ۱۶۲۹ء میں تعمیر کرانا شروع کیا تھا اور اسی میں ۱۶۴۲ء
میں اس کا انتقال ہوا۔ انقلاب فرانس سے ذرا پہلے ڈیوک
آرلینز نے، جسے فلپ "مساوات پسند" کہتے ہیں اسے چاروں
طرف سے دوکانات اور قہوہ خانوں سے گھیر لیا اور گھیر کے
ایک کونے میں انجمن اقوام کی شاخ "بین الاقوامی ادارہ برائے
ارتباط ذہنی" International Institute
INTELLECTUAL CO-OPERATION کا مرکز ہے۔

اگلے دن صبح کے وقت میں نے ناس ٹک کے یہاں سے
ڈاک لی۔ لفافوں میں سے ایک قومی کتب خانے کے ناظم کے
نام ایک تعارف نامہ تھا جو میری طلبی پر انڈیا ہاؤس کے نیسٹر
Knaster صاحب نے بھیجا تھا۔ لیکن مجھے

اس کی ضرورت پیش نہ آئی اس لئے کہ میرا ارادہ سات آٹھ
روز سے زیادہ پیرس میں رہنے کا نہ تھا اور اس مدت کے
لئے بغیر تعارف نامے ہی کا اجازہ مل جاتا ہے۔ شعبہ مطبوعات
دو ایک ہی دن میں بند ہونے والا تھا اس لئے میں نے
اس مہلت کو غنیمت جان کر اس پر ایک نظر ڈالی مطالعہ نما
مطبوعات میں ایک کتبے سے معلوم ہوا کہ یہ کتب خانہ سب سے
پہلے عوام الناس کے لئے سنہ ۱۶۹۲ء میں کھولا گیا تھا۔ اس
میں شبہ نہیں کہ یہ مطالعہ خانہ اس قدر عالی شان نہیں جتنا برطانوی
نوادرخانہ کا مطالعہ خانہ ہے، لیکن یہاں ایک ایک چیز سے
تاریخی اہمیت ظاہر ہوتی ہے جو لندن والے ذخیرے میں
اتنی نمایاں نہیں۔ دونوں میں یہ بھی فرق ہے کہ لندن میں تو
مشرقی اور مغربی کتابوں کے مطالعہ کے لئے جدا جدا کمرے ہیں،
لیکن پیرس میں کتابوں کی جو تقسیم کی گئی ہے وہ مشرقی اور مغربی
کتابوں میں نہیں ہے بلکہ یہاں مطبوعات اور مخطوطات میں
کتابیں منقسم ہیں۔ مخطوطات کا مطالعہ خانہ بالکل جداگانہ بلکہ
محاذ ہی کی ایک بالکل علیحدہ عمارت میں ہے۔ میں نے آخر الذکر
میں چند گھنٹے کام کیا اور کتاب مین الابرار کا مطالعہ کیا۔ یہ
روز پونے پانچ بجے بند ہو جاتا ہے۔ میری خوش نصیبی سے
کتب خانے ہی میں اس زمانے میں ایرانیات کی نمائش
ہو رہی تھی، اور جب دریافت کرنے پر معلوم ہوا کہ یہ ۶ بجے
تک کھلی رہتی ہے تو میں مطالعہ خانے سے نکل کر نمائش دیکھنے
چلا گیا۔ اس نمائش میں نہایت بیش بہا فارسی مخطوطات قدیم
تصاویر قدیم ایرانی چینی کے برتن قبل اسلام اور اسلامی سکول
کا نہایت نایاب ذخیرہ، شیشہ آلات اور ایسی جو بھی اشیا
جمع کی گئی تھیں۔ سوا گھنٹے میں سرسری طور پر حسب ذیل قابل لحاظ
اشیا نظر آئیں۔ کلیلہ و دمنا کی تصاویر جو سنہ ۱۲۲۲ء اور ۱۲۳۰ء کے

درمیان بنائی گئی تھیں، مقامات حریری کی تصاویر جو ان تصاویر
کی ہمعصر تھیں، نویں صدی عیسوی کا لکھا ہوا باتصویر یونانی
زبان میں خواص الادویہ کا نسخہ جس پر ہسپانوی عرب علماء
طب رحمہم اللہ علیہم اجمعین نے مختلف پودوں کے نام عربی
زبان میں لکھ دئے ہیں، شاہنامہ باتصویر مخطوطہ سنہ ۱۴۳۰ء
وغیرہ جو سکے نظر آئے اس میں سب سے اہم حسب ذیل ہیں
پہلا عربی درہم جسے خلیفہ عبدالملک بن مروان نے مسکوک کیا
خلیفہ ہارون الرشید کا دینار، غزنوی، تیموری اور صفوی،
سلجوقی سکے وغیرہ۔ اشیاء کے اعتبار سے تو یہ محض ایرانیات
کی نمائش تھی لیکن ظاہر ہے کہ ایرانیات کی نمائش میں
اسلامیات کا عنصر غالب تھا۔

شام کے وقت میں اور میری اہلیہ پیرس کے ہندوستانی
ریستوان (Restauant Nedou) کھانا کھانے
گئے جو آپرا کے قریب واقع ہے۔ یہاں محض اتفاقاً
عبداللطیف خاں صاحب جج ناگپور اور ان کی بیگم صاحبہ
سے، جو نواب محمد یار جنگ بہادر (حیدرآباد) کی دختر ہیں
ملاقات ہوئی۔ میری اہلیہ بیگم عبداللطیف خانصاحب سے پہلے
سے واقف تھیں اس لئے یہ صحبت بہت پرلطف رہی۔ بیگم صاحبہ
گلے کے کسی آپریشن کے لئے یورپ آئی تھیں اور یہ آپریشن وئنا
میں ہوا۔ کہتی تھیں کہ محض انجکشن کے ذریعہ سے جراحی عمل
کی جگہ بالکل سن کر دی گئی تھی اور باوجودیکہ عمل برابر چالیس منٹ
ہوتا رہا لیکن انھیں مطلق تکلیف محسوس نہیں ہوئی۔ جس ہوٹل
میں ہم گئے تھے وہاں نہایت ناقص قسم کا کھانا ملا۔

۱۴/اگست کو صبح کے وقت دوبارہ ایرانیات
کی نمائش دیکھنے گیا اس لئے کہ کل طبیعت سیر نہیں ہوئی
اور حسب ذیل مزید قابل لحاظ اشیاء دیکھیں۔ کیخسرو دوم کا

تصویر کا درہم جو جنگ فارسیہ کے سال (۶۴۲ء) میں
مشکوک ہوا تھا۔ بہت سے دوسرے درہم جو عربوں کے
بنائے ہوئے تھے اور جن پر یزدجرد ثانی آخری ساسانی
شہنشاہ ایران کی تصویر تھی ایک سکہ جن پر پہلوی زبان میں
مسلمان گورنر کا نام تھا قدیم ایرانی شہنشاہوں مثلاً اردشیر،
شاپور، بہرام وغیرہ کے سکے، نگوں اور کانچ پر منبت کاری
میں شبیہیں جن میں سے بعض نہایت ہی قدیم یعنی زمانہ
قبل اسلام کے کپڑوں کے نمونے، وغیرہ وغیرہ حقیقت
یہ ہے کہ اس نمائش میں جو اشیاء مختلف نوادر خانوں
اور خانگی مجموعوں سے لے کر جمع کی گئی ہیں لاتعداد تو نہیں
لیکن ندرت میں ایک سے بڑھ کر ایک ہے۔

اسی روز شام کے وقت یعنی مخطوطی مطالعہ خانے
کے بند ہونے کے بعد میں پیرس کی مشہور مسجد گیا جو جنگ عظیم
کے بعد فرانس اور فرانسیسی سلطنت کے ان حصوں کے چندوں
سے بنائی گئی ہے جہاں مسلمانوں کی آبادی ہے مسجد دراصل
پیرس کے "ادارۂ اسلامی" (INSTITUT MUSSULMANE) کا ایک حصہ ہے مسجد نہایت حسین ہے۔
صدر دروازہ نہایت اعلےٰ درجہ کا ہے۔ اور طرح طرح کی
ہندسی اشکال سے معمور ہے مسجد کے صحن میں ایک کے
چاروں طرف اسلامی کتب خانہ خطاب گاہ وغیرہ ہیں
اور دوسرا حصہ خاص مسجد جس کے مخصوص صحن میں کچھ کچھ الحمرا
غرناطہ کی جھلک نظر آتی ہے۔ اس کا اندرونی حصہ نہایت ہی
مزین ہے۔ منبر جس میں سیپ کی پچی کاری ہے، سلطان
مراقش کا عطیہ ہے صدر دروازے کے محاذ میں (اکثر عربی
اور مغربی مساجد کی طرح) صرف ایک منارہ ہے جو مسجد سلطان حسن
قاہرہ کے نمونے پر بنایا گیا ہے معلوم ہوا کہ پنج وقتہ اذان
منار پر کھڑے ہو کر نہیں دی جاتی بلکہ مسجد کے اندرونی حصے
میں ہی دی جاتی ہے اور منار پر صرف عیدین کی اذان ہوتی ہے
امام صاحب سے، جو خود مراقشی ہیں معلوم ہوا کہ جس زمین
پر ادارۂ اسلامی کی تعمیر ہوئی ہے وہ حکومت فرانس نے
دی۔ شمالی افریقہ کے مسلمانوں نے تقریباً دو ارب فرانک
(تقریباً ۱۲ کروڑ روپیہ) چندہ کر کے اس کی تعمیر کی۔ مسجد کے پشت
پر قہوہ خانے (جن میں عربی موسیقی بھی ہوتی ہے) طعام خانے
عربی کھانے مہیا ہوتے ہیں حمام اور شمالی افریقہ کی بنی ہوئی
اشیاء کی دوکان واقع ہیں۔ یہ سب چیزیں قابل دید ہیں
مسجد میں مغرب کی نماز باجماعت پڑھی اور اس کے طعام خانے
میں مراقشی کھانے کا لطف اٹھایا۔

۱۵؍ اگست کو (عید انتقال العذرا)
(FESTIVAL OF THE ASSUMPTION)
کی وجہ سے تمام فرانس میں تعطیل تھی۔ رومن کیتھولک لوگوں
کا عقیدہ ہے کہ ۱۵؍ اگست کو حضرت عیسیٰ آسمان سے
اترے اور فرشتوں کی مدد سے حضرت مریمؑ کی نعش کو اٹھا کر
آسمان پر لے گئے، چنانچہ اس دن کی برسی کے طور پر ۱۵؍ اگست
کو رومن کیتھولک لوگوں کا بڑا بھاری تہوار ہوتا اور فرانس
میں تمام کتب خانے، مدارس، سرکاری دفاتر وغیرہ بند
ہوتے ہیں۔ چنانچہ مخطوطاتی مطالعہ خانہ بھی بند تھا صبح
کے وقت ہوٹل ہی میں رہا شام کو ایک نہایت دلچسپ
جگہ یعنی پیرس کے قریب ترین جو میدان جنگ ہے اسے
دیکھنے گیا۔ چونکہ پیرس میں صرف چند روز ہی قیام کا
ارادہ تھا۔ اور "وقت تنگ است و کار ما بسیار" کے
مصداق ایک ایک لمحہ قیمتی تھا اس لئے میں نے قریب ترین
میدان جنگ دیکھا ورنہ جی تو یہ چاہتا تھا کہ فلانڈرز کے میدان

دیکھ آؤں ۔ پیرس سے مختلف میدان ہائے جنگ کو نہایت
آرام دہ (Pullman motors) جاتی ہیں
جن میں ۳۰، ۳۰، ۳۵، ۲۵، ۱۱ اشخاص کے لئے جگہ ہوتی ہے
اور ہر مسافر کو نہایت عمدہ مخملی گدے اور نشست، سردی
کے بچاؤ کے لئے کمبل اور ہر طرح کے آرام کا انتظام
ہوتا ہے ۔ چونکہ قریب ترین میدان وہ ہے جہاں جنگ عظیم
کے آخر میں امریکی لڑے تھے اس لئے سوائے میرے
اور دو ایک اور اصحاب کے باقی سب کے سب مسافر
امریکی ہی تھے ۔ ہم شام کے دو بجے چلے اور آٹھ بجے واپس
آگئے ۔ پیرس سے صرف انیسویں میل پر وہ مقام ہے جو جرمن
اقدام کی آخری منزل ہے ۔ یہاں شہر کے مشہور محافظ سپاہ
گالی ایی کا مجسمہ ہے جو اس پہاڑی کی طرف اشارہ کرتا ہوا
نظر آتا ہے جہاں تک جرمن پہنچ گئے تھے ۔ جرمن ابتدائے
جنگ ہی میں یہاں تک آگئے تھے ۔ تقریباً تمام فوج مختلف
محاذوں پر بھیجی جا چکی تھی ۔ اور قریب تھا کہ ایک ہی ہلے میں
پیرس کی شہر پناہ تک جرمن پہنچ جائیں ۔ گالی ایی نے تو
سب سے پہلے تو پیرس کی بارہ سو ٹیکسی موٹروں پر قبضہ
لیا اور ان میں جتنے بھی سپاہی پیرس میں تھے ان سب کو بھر کر
جرمنوں کے خلاف بھیجدیا ۔ جرمن سپہ سالار فون کلک
VON KLUCK کو کیا معلوم تھا کہ پیرس بالکل خالی ہے
ورنہ اطمینان سے پیرس اور اس فوج کے بیچ میں آجاتا
اور پیرس پر قبضہ کر لیتا ۔ بہرحال دونوں میں مڈبھیڑ ہوئی
اور جرمنوں کو پیچھے ہٹنا پڑا ۔ یہ پہلی زک تھی جو جرمنوں کو
فرانس میں ملی ۔ ہمارا راستہ برابر مارکول کی سڑک پر ہو کر تھا
جس کے دونوں طرف نفیس سرو قد درخت لگے ہوئے تھے
راستے میں وہ مکان دیکھا جسے مشہور جنگ دریائے مارن کے
زمانے میں مارشل ژوفر (Joffre) نے اپنا مستقر بنایا تھا
ہمارے راستے میں مایول (Mayeul) اور ایورنے
(Jverney) پڑے یہاں جنگ مارن سے پہلے
جرمن فوجیں پندرہ روز تک رہی تھیں ۔ کہیں کہیں چند ڈیب
پتھر نظر آئے جو بوربون خاندان شاہی کے زمانے میں
میلوں کا کام دیتے تھے اور جن پر ان کا سوسن کا نشان
بنا ہوا تھا ۔ مو (Meaux) ایک تاریخی
شہر ہے ۔ اس کی تیرھویں صدی کی گرجا اور شہر کی فصیل جو
جون آف آرک کے زمانہ کی بنی ہوئی ہے اس وقت تک
موجود ہیں ۔ کہتے ہیں جب جرمن اس قصبے کے قریب آئے تو
شہر فوجوں سے خالی تھا ۔ جنرل گالی ایی نے حکم دیا کہ سب
لوگ روشنیاں گل کردیں اور اپنے آپ کو اپنے گھروں میں
بند کریں اور ایسے خاموش ہو جائیں کہ یہ بھی معلوم نہ ہو کہ
قصبے میں کوئی ہے بھی یا نہیں ۔ جرمنوں نے آکر یہ فضا دیکھی
کہ سڑکوں پر عورتوں مردوں بچوں کا پتہ نشان ہی نہیں اور
خیال کیا کہ ہو نہ ہو فرانسیسیوں نے ہمارے لئے کوئی پھندا
تیار کیا ہے ورنہ حقیقت یہ تھی کہ پھندا یہی تھا کہ کوئی
پھندا نہ تھا ۔ الغرض بغیر شہر پر فوجی قبضہ کئے ہوئے شہر چھوڑ کر
دوسری طرف چل دیئے !

اس قصبے سے باہر نکلتے پر ایک ایسی سڑک
ملتی ہے کہ اس پر جو دو رویہ درخت ہیں وہ اوپر جا کر ایک دوسرے
سے مل گئے ہیں اور ایک طرح کی قدرتی چھت کا کام دیتے ہیں
اس کے بعد مشہور آفاق دریائے مارن (Marne)
اور شہر ترلپورٹ (Trilport) آتا ہے یہاں
مارن پر دو پل ہیں ایک ریل کے لئے اور ایک گاڑی
وغیرہ کے واسطے ۔ جب سنہ ۱۹۱۴ء میں انگریزوں اور فرانسیسیوں

کی پسپائی ہوئی تو انگریزوں نے دونوں پلوں کا ایک ایک در باروت سے اڑا دیا چنانچہ صاف ظاہر ہوتا ہے کہ پلوں کا کونسا حصہ جدید ہے اور کونسا قدیم۔ اس کے بعد شہر (La Ferté) ہو کر گزرے جس کے قریب ہی ایک چھوٹی سی پہاڑی پر وہ عمارت ہے جو جنگ عظیم میں امریکی شفاخانے کا کام دیتی تھی یہاں سے ہم بیلو جنگل (BELLEAU WOOD) پہنچے جہاں جرمنوں اور امریکیوں کے درمیان ایک مہینے مسلسل دست بدست لڑائی ہوتی رہی تھی اور اس کی ایک ایک انچ زمین سنگینوں اور تلواروں کی مدد سے امریکیوں نے جرمنوں سے فتح کی تھی۔ ہم تقریباً ایک گھنٹہ پھرتے رہے آج کوئی اسے دیکھے تو یہ اندازہ مشکل سے ہوتا ہے کہ بیس بائیس سال سے پہلے یہاں کی زمین میں کیسا کیسا قتل و غارت ہوا ہوگا اور بنی نوع انسان نے ایک دوسرے کو کیسی کیسی بہیمیت سے ذبح نہ کیا ہوگا۔ اب بھی اس جنگل میں جرمن توپیں ٹوٹی پڑی ہیں۔ اور ذرا غور سے دیکھنے اور زمین کھکھوڑنے پر چلے اور بے چلے کارتوس، خودوں کے ٹکڑے اور ایسی چیزیں پڑی ملتی ہیں۔ درخت تقریباً سب کے سب تازہ لگے ہوئے ہیں اس لئے کہ پورا جنگل گولہ باری کی وجہ سے تہس نہس ہو گیا تھا۔ بعض خندقوں میں چھت سی پڑی ہوئی ہے یہ وہ خندقیں ہیں جن میں کسی نہ کسی طرح کا دفتری کاروبار کیا جاتا ہوگا۔ غرض عجیب و غریب عبرت کا مقام ہے۔ ایک چھوٹا سا نوادر خانہ بھی ہے جو یہاں کی باقیات سے بھرا ہوا ہے یہ دیکھ کر افسوس ہوا کہ اس میں جو اشیا رکھی ہیں ان کی صفائی کا انتظام نہیں اور میں نے دیکھا کہ خود دار بندوقوں، تلواروں، توپوں، طیاروں کے ٹکڑوں سب ہی پر گرد جمی ہوئی تھی۔

بیلو جنگل سے چل کر مشہور پہاڑی "۲۰۴" ہوتے ہوئے امریکی فوجی قبرستان پہنچے جہاں دو ہزار سے زیادہ امریکی مقتول دفن ہیں۔ یہ قبرستان خود ممالک متحدہ امریکہ کے قبضے اور انتظام میں ہے اور اس چھوٹے سے خوبصورت گرجا پر جو اس کے سرے پر واقع ہے دھاری چاندوں (Stars & Stripes) کا بانوا اڑتا ہوا دور نظر آتا ہے یہاں کی ہر چیز صاف ستھری اور سلیقے کی نظر آئی اور ہر چیز میں تنظیم اور ضبط کا اثر پایا گیا۔ ہمارے ساتھ ایک بیچاری بوڑھی خاتون تھیں جنہیں اپنے بیٹے کی قبر کا پتہ لگانا تھا! وہ اترتے ہی قبرستان کے دفتر میں گئیں جہاں پورے قبرستان کا نقشہ اور مدفونوں کی ہجائی فہرست موجود تھی شاید دو منٹ بھی نہ لگے ہوں گے کہ انہیں قبر کا پتہ لگ گیا۔ یہاں عیسائی اور یہودی مدفونوں کی قبریں جدا جدا ہونے کی ہیں یعنی عیسائی قبروں پر ایک صلیب اور یہودی قبروں پر ایک تارہ بنا ہے اور ہر صلیب یا تارے پر قبر والے کا نام جس ریاست سے آیا تھا۔ اس کا نام، پلٹن وغیرہ سب کندہ ہیں۔ قبریں ایسے عظیم الشان باغیچے میں ہیں جہاں کی خوبصورتی اور نفاست کی وجہ سے چلنے کو جی نہیں چاہتا گو فضا میں حسرت اور عبرت بھری ہوئی ہے۔ قبرستان سے چل کر ہم شہر شاتو تئے ری (Chateau Thierry) کی طرف گئے جہاں امریکیوں نے فرانس کے ساتھ باہم دوستی اور اتحاد کی ایک عظیم الشان یادگار بنائی ہے۔ اس یادگار سے شاتو تئے ری کا مشہور میدان جنگ بالکل نقشے کی طرح پھیلا ہوا نظر آتا ہے اور وہ قلعہ بھی دکھائی دیتا ہے جس کے نام پر شہر کا نام پڑا اور جس میں جانی ہوئی لڑائی

(Charles martel) نے اپنے آقا ستے ری (Thierry) کو قید کیا تھا۔ یہ وہی چارلس مارٹل ہے جس نے پیرس سے ۲۲ میل جنوب کی طرف ۷۳۲ء میں پہلی مرتبہ اس میدان میں جسے عرب "بلاط الشہداء" کہتے ہیں، مسلمانوں کے امنڈتے ہوئے بادل کو روکا تھا۔

ہمارے قافلے میں ایک معمر امریکی تھا جو دوران سفر میں اتفاقاً میرے پاس بیٹھا تھا۔ اس سے بہت باتیں ہوئیں اور میں نے حیدرآباد کی اہمیت اور اس کی گوناگوں ترقیوں کا ذکر کیا جس کا اس پر بہت اثر ہوا۔ مگر سب سے زیادہ جس چیز سے اسے دلچسپی تھی وہ ہندوستانی سیاسیات کا مسئلہ تھا۔ جب میں حیدرآباد کی باتیں ختم کرچکا تو وہ بولا کہ یہ تو سب کچھ ہے، یہ تو بتاؤ کہ گاندھی جی کیا کر رہے ہیں اور ذات پات توڑنے کے مقابلے میں کیا کیا ہو رہا ہے۔

عجیب بات ہے کہ یورپ (اور غالباً امریکہ) میں ہندوستان کے معنے گاندھی جی کے اور گاندھی جی کے معنے ہندوستان کے ہیں۔ ان صاحبوں کو یہ بات مشکل سے سمجھ میں آتی ہے کہ گاندھی جی کے ادارہ کے علاوہ کوئی دوسرا ہندوستان بھی ہے!!

۱۶ اگست کے دن کا زیادہ تر وقت کتب خانے میں صرف ہوا۔ آج سے سیغہ مطبوعات بند ہے اور صرف مخطوطات کا حصہ کھلا ہے جس میں ہر وقت ساٹھ ستر مرد عورت انتہائی انہماک سے مصروف مطالعہ رہتے ہیں۔ یہ ہمارے ہندوستانی اساتذہ اور طلبہ دونوں کے لئے ایک سبق ہے کہ جامعہ اور مدارس میں تعطیلات میں کتب خانے کا ایک بڑا حصہ بند ہے اور یہ حقیقی طالب علم پیرس کے خدا جانے کس کس گوشے سے آکر علم کی تلاش میں مصروف کار ہیں، کوئی عربی کتاب پڑھ رہا ہے کوئی پرانے قوطی (GOTHIC) نوشتہ پر دیدہ ریزی کر رہا ہے، کوئی پرانے مصری نوشتہ کے مطالعہ میں مصروف ہے کوئی کسی نپولیونی فرمان سے نتائج اخذ کر رہا ہے، اور باوجود ایک ہی کمرے میں اتنے آدمیوں کے بیٹھے رہنے کے کیا مجال جو ذرا سی آواز ہو، اتنی خاموشی ہے کہ سوئی گرے تو اس کی آواز آجائے۔

شام کے وقت تو ئی لیری کے باغیچہ میں گیا جس کے ایک طرف لوور کا عظیم الشان نوادر خانہ ہے جو شاہی زمانے میں پیرس کا شاہی محل تھا۔ تو ئی لیری باغیچہ سے زیادہ خوشکل سے کوئی دوسرا باغیچہ ہوگا۔ ہر طرف یک رنگ پھولوں کے بڑے بڑے جھنڈ، جگہ جگہ مجسمے، تالاب، قہوہ خانے، نفیس ترین روشیں، کھیلتے ہوئے بچے، کرسیوں ہر عمر کے فرانسیسی اور فرانسیس، غرض عجیب و غریب دلفریب جگہ ہے۔ اس کے آگے وہ چوک ہے جسے اب "اتحاد چوک" (PLACE DE LA CONCORDE) کہتے ہیں اور جسے انقلاب فرانس کے زمانے میں "انقلاب چوک" (PLACE DE LA REVOLUTION) کہتے تھے اور یہی مقام ہے جس کے وسط میں گلوٹین لگی تھی اور سیکڑوں مرد عورتوں کے سر کاٹ کر موت کے گھاٹ اتارے جاتے تھے اس کے آگے "باغ بہشت" CHAMPS ELYSEE ہے جو تقریباً دو میل سڑک کے دو رویہ "محراب فتح" (ARC DE TRIOMPHE) تک چلا گیا ہے۔ یہ "محراب فتح" نپولین کی فتوحات کی یادگار ہے اور یہی وہ مقام ہے جس کے نیچے "فرانس کے نامعلوم سپاہی" کی قبر ہے۔

دوسرے روز دونوں وقت کتب خانے میں
کام کیا اور علامہ طرطوشی کی کتاب سراج الملوک کا مطالعہ
کرتا رہا۔ کتب خانہ بند ہونے کے بعد گرجا NOTRE DAME DES VICTOIRES
دیکھا جو شاہ لوئی ۱۴ نے ۱۶۲۹ء میں اپنی ایک فتح کی یادگار
میں بنایا تھا۔ مثل اکثر دوسرے رومن کیتھولک گرجاؤں
کے اس کے اندرونی حصہ میں بیحد تاریکی ہے۔ یہاں تک کہ
جو کتبے ہیں وہ بھی بغیر روشنی کے پڑھنے میں نہیں آتے۔
اس کے بعد ہم ایفل ٹاور دیکھنے گئے جو دنیا کی بلند ترین
عمارتوں میں سے ہے۔ ایفل ٹاور کی تعمیر ۱۸۸۷ء میں
شروع ہوئی اور افتتاح ۱۸۸۹ء میں ہوا۔ اس پر جو لوہا لگا ہے
اس کا وزن ایک لاکھ پچھتر ہزار من ہے اور اس میں بارہ ہزار
گرڈر ۲۵ لاکھ ریویٹ کے ذریعہ سے جوڑے گئے ہیں۔
اس کی چار منزلیں ہیں۔ پہلی منزل ۵۷ میٹر پر، دوسری ۱۱۵
میٹر پر، تیسری ۲۷۴ میٹر پر اور چوتھی پورے ۳۰۰ میٹر پر۔
پہلی منزلوں تک لفٹ جاتا ہے اور چوتھی منزل پر دنیا میں
سب سے اونچا لاسلکی کا اسٹیشن ہے۔ اسی میدان میں ۱۹۳۷ء
میں بین الاقوامی نمائش ہوئی تھی، جنھوں نے یہ نمائش دیکھی
ان کا تو کیا کہنا ہے، صرف اس کی تصویریں ہی دیکھنے سے
گویا بھوک بھاگتی تھی۔ یہ تمام ایوان توڑے جارہے تھے
اور اب اکثروں کی جگہ سوائے بانس کی کھپچیوں اور پلاسٹر
کے تودوں کے کچھ باقی نہیں رہا۔ دنیوی زینت اور خوبروی
کو جاتے ہوئے کتنی دیر لگتی ہے!

۱۸ اگسٹ کو دونوں وقت کتب خانہ میں علامہ
اسروی کی کتاب عقد الفرید کا مطالعہ کیا۔ کتب خانہ بند ہونے کے
بعد نپولین اعظم کے مقبرے کی زیارت کے لئے گیا۔ نپولین کا
مقبرہ دنیا کی ان عمارتوں میں سے ہے جہاں جاکر انسان کی
طبیعت پر خاص اثر شروع ہوتا ہے۔ جس قبے کے نیچے
شہنشاہ کا تابوت ہے اس کی تعمیر ۱۷۰۶ء میں یعنی لوئی ۱۴
کے زمانے میں ختم ہوچکی تھی اور کہتے ہیں کہ یہ قبہ جو دراصل
اس کے محاذ کے گرجا کا ایک حصہ تھا، فرانسیسی نشأۃ جدیدہ
کا ایک شاہکار ہے۔ لیکن حقیقت میں اسے وہ اہمیت
جو اس وقت اسے ہے اس وقت تک حاصل نہیں ہوئی
جب تک کہ ڈھائی سو برس بعد یعنی ۱۸۴۰ء میں نپولین کی
ہڈیاں سینٹ ہیلینا سے لاکر یہاں دفن نہ کردی گئیں۔ نپولین
کا انتقال تو ۱۸۲۱ء میں ہوا اور اس کے بعد اس کی لاش کو
جزیرہ سینٹ ہیلینا سے جہاں وہ انگریزوں کی قید میں مرا
تھا، پیرس میں لاکر از سر نو دفن کیا گیا، یا یوں کہئے کہ جہاں سے
وہاں رکھ دیا گیا، اس لئے کہ اس کی لاش زمین میں دفن نہیں
بلکہ زمین سے تقریباً دو گز اونچے چبوترے پر ایک تابوت
میں رکھی ہے۔ ۱۸۴۰ء میں فرانس کا بادشاہ لوئی فلیپ تھا
جسے یورپی میدان میں ہر جگہ شکست پر شکست ہو رہی تھی۔ وہ
جانتا تھا کہ فرانسیسیوں کو نپولین کا نام کس درجہ عزیز ہے اور
محض قوم کو خوش کرنے کے لئے اس نے شہنشاہ کا جنازہ بڑے
تزک و احتشام سے پیرس منگوایا اور حکم دیا کہ سین کلو
(ST CLOUD) سے پیرس تک اسے سولہ گھوڑوں والی
گاڑی میں لایا جائے۔ خود بادشاہ بھی تقریباً ایک میل تک
گاڑی کے ساتھ ساتھ چلا۔ کہتے ہیں کہ فی نفسہ اس بات
سے متاثر ہوکر جو ناکام لوئی فلیپ اور کامیاب نپولین کے
درمیان نمایاں تھا، لوگوں میں اس درجہ جوش پیدا ہوا کہ
چند ہی مہینے بعد انھوں نے بالآخر لوئی فلیپ کو تخت چھوڑنے
پر مجبور کیا اور اس کے صرف چار ہی سال بعد نپولین اعظم کا
بھتیجا نپولین سوم کے خطاب سے فرانس کے تخت پر بیٹھ گیا۔

جس کی وجہ سے نپولین کے مرقد سے دل پر ایک خاص اثر ہوتا ہے وہ یہ ہے کہ اول تو وہ دفن نہیں بلکہ سرخ چمکدار پتھر کے ایک خوشنما تابوت میں ہے' اور برخلاف قبر کی کیفیت کے آپ عین وہ جگہ دیکھ سکتے ہیں جہاں گویا نپولین کی لاش ہوگی۔ پھر گرجا میں جاتے ہی ایک سناٹا سا ہوتا ہے' کوئی شخص آواز سے بات نہیں کرتا' ایک کنواں سا ہے اس کے نیچے ایک خوبصورت مدور دالان ہے اور دالان کے ہر فیلپائے پر نپولین کی بڑی بڑی فتوحات کے مثالی مجسمے ہیں جو ٹکٹکی لگائے ہوئے شہنشاہ کے تابوت کو دیکھ رہے ہیں۔ اس برآمدے میں جانے کے لئے چند سیڑھیاں اترنی پڑتی ہیں اور تقریباً۔ امرداخلہ دینا پڑتا ہے دروازے کی چوکھٹ پر وہ وصیت کندہ ہے جو شہنشاہ نے اپنے مرنے پر کی تھی، وہ یہ ہے:۔

"میری خواہش ہے کہ میری خاک دریائے سین کے کنارے دفن ہو تاکہ میرا تعلق ابدالآباد تک اس پیاری فرانسیسی قوم سے قائم رہے جو مجھے جان سے زیادہ عزیز ہے"

شہنشاہ کے گنبد ہی کے نیچے اس کے بھائیوں جوزف شاہ اسپین اور ژیردم شاہ وسیٹ فالیہ کی قبریں ہیں اور ایک کونے میں پچھلی جنگ عظیم کا فرانسیسی سپہ سالار مارشل فوش مدفون ہے۔

اسی روز بین الاقوامی تاریخی کانگریس کے مشرقی ماموریہ (EASTERN COMMISSION) کی معتمد مس میک لاکلن کا خط آیا کہ میری تحریک پر ماموریہ کے پیش نامے میں تاریخ ہند اور تاریخ اسلام کے مسئلہ کو خاص طور پر رکھا گیا ہے۔ فالحمد للہ۔

دوسرے روز عقد الفرید کا مطالعہ ختم کیا۔ دوپہر کو جمعہ کی نماز مسجد میں پڑھی۔ کم و بیش دو سو مسلمان شریک تھے جن میں زیادہ تر تعداد الجزائر تونس اور مراکو والوں کی تھی۔ خطبہ کلیتہً عربی میں تھا۔ اکثر لوگوں نے کوش آثار کرمراکشی بیجے پہن لئے تھے جن میں پیچھے کی طرف سرخ ٹکنے کے لئے ایک ٹوپی سی جڑی ہوتی ہے۔ خاص بات یہ ہے کہ نماز کے بعد ایک کونے میں "ذکر" ہوا اور لا الہ الا اللہ کا شور مچ گیا۔ میں نے واپسی میں عربی دوکان سے چند اشیاء خریدیں اور عربی قہوہ خانے میں بیٹھ کر عربی قہوہ پیا۔

یہاں سے سیدھا (INVALIDES) کے فوجی نوادر خانے گیا جس میں تاریخ فرانس کے نہایت دلچسپ اور اہم فوجی آثار محفوظ ہیں۔ اس کے تفصیل سے دیکھنے کے لئے کئی روز درکار ہوں گے۔ میرے پاس وقت کم تھا اس لئے صرف چند ہی اشیاء دیکھ سکا جن میں اہم حسب ذیل ہیں۔

فرانسس اول' لوئی ۱۴ اور دوسرے شاہان فرانس کے زرہ بکتر اور خود' نپولین اعظم کے کپڑے' جنگ عظیم کے آثار جن سے کئی کمرے بھرے ہوئے ہیں' انقلاب فرانس کے علم' جنگ آزادی امریکہ کی یادگاریں' ان ۱۲۰۰ ٹیکسیوں میں سے ایک جن میں جنرل گالی اینی پیرس کی محافظ فوج کو جرمنوں کے خلاف لے گیا تھا' یہ چیزیں دیکھنے میں آئیں۔ جس عمارت میں یہ نوادر خانہ ہے اس کی تعمیر لوئی ۱۴ (۱۶۴۳ء تا ۱۷۱۵ء) کے عہد میں ہوئی تھی اور اس میں جملہ ۳۶ ہزار اشیاء اور ۲۳ ہزار اشیاء کی تصاویر اور نقول ہیں۔

دوسرا دن یعنی ۲۰ اگست ہمارے پیرس کے قیام کا آخری دن تھا۔ صبح کے وقت کتب خانے میں امام ابن تیمیہ کی کتاب السیاستہ الشرعیہ کے ایک جزو کا مطالعہ کیا۔

یہ نسخہ ساتویں صدی ہی کا لکھا ہوا ہے۔ شام کے وقت مجھے اور میری اہلیہ کو عبداللطیف خاں صاحب جج ناگپور اور ان کی بیگم نے اپنے ہوٹل واقع (Rue de Moscow) میں چائے پر مدعو کیا تھا۔ اسی ہوٹل میں ایک جنوبی ہندی عیسائی جن کا نام (Ross) تھا مقیم تھے ان سے عبداللطیف خاں صاحب نے ملاقات کرائی۔ یہ غالباً پرانی اشیاء کا بیوپار کرتے ہیں اور اپنی مملوکہ اکثر اشیاء انہوں نے دکھائیں۔ قرآن مجید دکھایا اور بیان کیا کہ ہندوستان کے شمال مغربی سرحد کی ایک مہم میں یہ کسی انگریز سپاہی کو زمین پر پڑا ملا تھا اور راس صاحب نے اسے ان سے ۱۲ سو روپیہ میں خریدا۔ بظاہر یہ پانچویں یا چھٹی صدی عیسوی کا لکھا ہوا معلوم ہوتا حالانکہ وہ روس والے اسے رسول اکرم صلعم کا ہم عصر بتاتے جو یقیناً بالکل غلط ہے

اس کے علاوہ ان کے پاس رامائن اور مہابھارت کے پرانے نسخے اور ایک قیمتی نوشتہ بھی تھا۔ یہ تمام اشیاء اتنی نایاب ہرگز نہیں جتنی راس صاحب بتاتے تھے۔ عبداللطیف خاں صاحب مجھ سے کہتے تھے کہ خدا جانے آپ نے کیا افسوں پھونکا ہے کہ آپ کو یہ چیزیں دکھا دیں ورنہ ہم نے کئی دفعہ یہ دکھانے کے لئے کہا لیکن یہ ہمیشہ ٹال مٹول ہی کرتے رہے!

رات کے ساڑھے دس بجے کی گاڑی سے ہم نے پیرس کو خیرباد کہا اور سوئٹستان روانہ ہو گئے۔ ریل نہایت تیز رو تھی اور رات بھر میں مشکل سے چار پانچ اسٹیشنوں پر رکی۔ صبح پونے چھ بجے سرحدی اسٹیشن والوربے آیا جہاں ہمارے پاسپورٹ وغیرہ دیکھے گئے اور ہم سوئٹستان میں داخل ہو گئے۔

ہارون خاں شروانی

رُباعیات

آشفتہ نگاہ

آشفتہ نگاہ سیر فرما تو سہی
معشوقِ نظر کے ناز دکھلا تو سہی
پامالِ خرام ہیں نظارے کتنے
دو چار مہ و مہر کو ٹھکرا تو سہی!

نازک کلائی

چھلکاتے ہوئے شراب ساغر آئی
محصور بہ گرداب جواہر آئی
اک ریشمی سیلاب کے منجدھاروں سے
نازک سی کلائی دیکھ باہر آئی

زندگی کی آواز

ہر پھول میں سوز ہر کلی میں اک ساز
گلزارِ سماعت ہے بہت نغمہ نواز
جو سنتے ہی رہتی ہیں نہ سننے کی صدا
پوچھے کوئی ان سے زندگی کی آواز باقی

تنقید و تبصرہ

تنقیحات: ابوالاعلیٰ مودودی۔ دفتر رسالہ "ترجمان القرآن" ملتان روڈ لاہور۔ قیمت ۱۲ صفحات ۲۴۰ غیر مجلد

مودودی صاحب نے اپنی زندگی تبلیغ اسلام کے لئے وقف کر دی ہے۔ سات سال سے ایک رسالہ "ترجمان القرآن" شایع کر رہے ہیں جو مذہبی رسالوں میں بہت اچھا تصور کیا جاتا ہے۔ اسی رسالے میں انھوں نے "اسلام اور مغربی تہذیب کے تصادم اور اس سے پیدا شدہ مسائل پر مختصر تبصرے کئے تھے۔" اب ان کو کتابی شکل میں شایع کیا گیا ہے اور یہ کتاب سلسلہ مطبوعات ادارۂ دارالاسلام کی چوتھی اشاعت ہے۔ پنجاب کی اکثر اردو کتابوں کی طرح اس کتاب کی کتابت اور طباعت اچھی ہے۔ کاغذ بھی اچھا ہے صفحوں کی تعداد ۲۴۰ ہے باریک خط میں لکھی ہوئی تقریباً ڈھائی سو صفحوں کی کتاب کی قیمت صرف ۱۲ر بہت کم ہے۔

اس کتاب میں کل ۱۵ مضمون ہیں جن کے موضوع "نظام تعلیم کا بنیادی نقص" "تعلیمی پالیسی" "ایمان اور اطاعت" "لارڈ لوتھن کا خطبہ" وغیرہ ہیں۔ کئی مضمون ایسے ہیں جن کے عنوانوں میں پورے مضمون کی جھلک موجود ہے اور صرف عنوانوں کو پڑھنے سے معلوم ہو جاسکتا ہے کہ آئندہ کیا آنے والا ہے۔ مثلاً ایک عنوان ہے "عقلیت کا فریب" ہم اندازہ کر سکتے ہیں کہ اس مضمون میں فلسفۂ عقلیت پر کیا کیا عنایتیں ہوئی ہوں گی "مغربی تہذیب کی خودکشی" اور "دورِ جدید کی بیمار قومیں" دوسرے مضمونوں کے عنوان ہیں۔ ان ہی سے لکھنے والے کے قلبی تاثرات کا اندازہ لگایا جاسکتا ہے۔ یہ عنوان ہی ایک طرح کے فیصلے ہیں اور ان کے بعد تحقیق اور تبصرے کی گنجائش ہی کم ہو جاتی ہے۔

مغربیت کی مخالفت کرنا کوئی عیب نہیں مگر مغربی زندگی کی مخالفت میں خود مشرق زدہ ہو جانا بھی تو مناسب نہیں

ح ۔ ج

قتیل اور غالب: مصنفہ سید اسد علی انوری فرید آبادی۔ کراؤن سائز ۱۲۰ صفحے لکھائی چھپائی متوسط مطبوعہ مکتبہ جامعہ قیمت درج نہیں ہے۔ مکتبہ جامعہ دہلی سے مل سکتی ہے۔

یہ رسالہ مرزا غالب اور قتیل کے معرکے کی تفصیلات پر مشتمل ہے اور نہایت عمدگی سے لکھا گیا ہے۔ مرزا غالب کی زندگی کے ایک آدھ واقعہ کی طرح یہ ہنگامہ بھی ایک ناخوش گوار واقعہ ہے۔ اس کا سبب کچھ تو غالب کے مخالفین کا جوش و خروش اور کچھ غالب کی نازک مزاجی تھی۔ جس چیز پر غالب کو سب سے زیادہ ناز تھا ان کی فارسی دانی ہے اس کی نفسیاتی بنیاد یہ بھی تھی کہ وہ دہلی کے ذوق کے مقابلے میں کسی دوسرے مقام کے صاحبان علم کو خاطر میں نہ لاتے تھے۔ کلکتہ میں جب ان کے کلام پر قتیل کا نام لے کر حملے کئے گئے تو وہ بے حد جز بز ہوئے اور ایک پورا ہنگامہ کھڑا ہو گیا۔ یہ تمام واقعات رسالے میں نہایت تفصیل کے ساتھ بیان کئے گئے ہیں۔ غالب کی زندگی اور ان کے کلام پر پچھلے دنوں میں جو مختلف کتابیں شایع ہوئی ہیں ان میں یہ ایک اچھا اضافہ ہے۔ آئندہ عظیم تر اور مکمل تر غالب کے لئے یہ اچھا مسالہ ثابت ہوگا۔

نیا ادب: مرتبہ سبط حسن، علی سردار جعفری، اسرار الحق مجاز۔ سائز درمیانی حجم ۴۰ صفحات قیمت [illegible]

یہ مجموعہ انجمن ترقی پسند مصنفین کے سلسلے کی پہلی اشاعت ہے۔ ترقی پسند مصنفین کی تحریک ملک میں مقبولیت حاصل کرتی جا رہی ہے۔ اس انجمن کی شاخیں شمالی ہند کے اکثر شہروں میں قائم ہو چکی ہیں۔ یہ تحریک وقت کا اقتضا ہے۔ جیسے جیسے زمانہ ترقی کرتا جا رہا ہے علوم و فنون میں بھی نئے نئے خیالات اور رجحانات کا

اضافہ ہو رہا ہے۔ ادب اور شاعری میں تو اس کا اثر سب سے زیادہ نمایاں ہے کیونکہ یہی وہ اصناف ہیں جو کسی قوم اور ملک کے احساسات اور جذبات کے آئینہ دار ہوتے ہیں۔ ملک میں بیسیوں ادیب اور شاعر ایسے پیدا ہو گئے ہیں جو ترقی پسند خیالات کے حامی ہیں جو زمانہ کے سیلاب کے ساتھ بہے جا رہے ہیں اور جو اپنے گرد و پیش کے حالات میں انقلاب کو رونما ہوتا دیکھنا چاہتے ہیں تاکہ زندگی کے فرسودہ اصول، توہمات اور قدیم روایات جن سے جسد قومی کو گھن لگ گیا ہے نابود ہو جائیں اور دنیا میں صلح و آشتی محبت اور امن کا دور دورہ ہو۔ یہ بڑی خوش آئند تحریک ہے۔ جامعہ عثمانیہ کی تاسیس نے حیدرآبادی نوجوانوں کے دماغوں میں کچھ ایسے ہی ذہنی انقلاب کے بیج بیس سال قبل بوئے تھے۔ اور آج اس کے نونہال علم و ادب کے میدان میں بہت آگے نکل گئے ہیں۔ ممکن ہے ترقی پسند انجمن کے قیام کے لئے دکن کی سرزمین کسی خاص وجہ سے راس نہ آئی ہو۔ لیکن اس کے یہ معنی نہیں کہ یہاں کے نوجوان ترقی پسندی میں ہندوستان کے کسی صوبہ سے پیچھے ہیں۔

"نیا ادب" کا یہ دلکش مجموعہ تین عنوانات پر مشتمل ہے۔ تنقید، شاعری اور افسانے۔ مضامین کا انتخاب بہترین ہے۔ ملک کے اچھے لکھنے والے نوجوان ادیب اور شاعر اس میں شریک ہیں۔ اس قسم کے مجموعوں کی ملک کو ضرورت ہے تاکہ اس تحریک کے اثر و نفوذ سے اہل ملک واقف ہوتے رہیں۔

"ر ش"

ساز ہستی مصنفہ عبدالاحد مخزون چلکوی۔ جیبی تقطیع حجم ۱۹۰ صفحات قیمت درج نہیں ہے۔ پتہ دارالادب پنجاب لاہور۔ یہ کتاب صوبہ بہار کے ایک نوجوان مصنف کی پہلی تصنیف ہے جس پر حکومت بہار نے ساڑھے تین سو روپیہ انعام بھی دیا ہے۔ مصنف پاؤں سے معذور ہیں۔ انھوں نے کہیں باقاعدہ تعلیم بھی حاصل نہیں کی بلکہ ان کے قول کے مطابق اردو کی دوسری کے بعد کسی استاد کے سامنے زانوئے ادب بھی طے نہیں کیا۔ محض اپنی کوششوں اور محنت سے حصول علم کی طرف متوجہ ہوئے اور ادب کا اچھا ذوق پیدا کیا۔ اس لحاظ سے ان کی یہ کوشش قابل تعریف ہے۔

زیر نظر کتاب میں مصنف نے ناول کے پیرایہ میں اپنے احوال کے تجربات کو قلمبند کیا ہے۔ یہ کتاب نہ پوری آپ بیتی ہے اور نہ ناول۔ اس میں جہاں عشق و محبت کے قصے ہیں۔ وہاں سیاسیات حاضرہ پر تبصرہ بھی ہے۔ ریل کے ایک درجہ سوم کے سفر، مسافرین کی تکالیف اور کارکنان ریلوے کی زیادتیوں کو ۵۰ صفحات میں بیان کیا گیا ہے۔ قصہ میں کوئی خاص جاذبیت نہیں ہے۔ بعض جگہ غیر مانوس الفاظ کے استعمال سے عبارت میں بے ربطی پیدا ہو گئی ہے۔ مثلاً قوت تفہیم، ساگرِ دل متہوج ہوا، قیل، یا استکراہ، تشائد خیالات، کشاکشات، ملوث، تہم نا تکمیلی احتیاج ... وغیرہ۔

تاہم چونکہ یہ مصنف کی پہلی کوشش ہے اور اس وقت لکھی گئی جب کہ ان کی عمر اٹھارہ انیس سال کی تھی قابل قدر ہے۔ جو ان کی آئندہ کوششوں کو کامیاب بنانے میں دلیل راہ ثابت ہو گی۔

"ر ش"

مجلہ طیلسانین ابتدا ہی سے مجلہ نے اپنے بلند پایہ مضامین اور مقالوں کی وجہ سے ملک میں کافی اہمیت حاصل کر لی تھی لیکن مالی دقتوں کی وجہ سے یہ اپنے معیار کو برقرار نہ رکھ سکا۔ شکر کا مقام ہے کہ جدید انتظام کے تحت

اس مجلّہ کی نہ صرف مالی حالت سنبھل گئی ہے بلکہ یہ اب پھر طیلسانین عثمانیہ کے علمی وقار کے شایان شان طریقہ پر شایع ہونے لگا ہے۔ اس شمارہ کے جملہ مضامین پر از معلومات اور دلچسپ ہیں۔

" ش "

متاع اقبال۔ یہ کتاب چھوٹی نصابی کتابوں کی تقطیع کے ٹھیک سو صفحات پر چھپی ہے۔ اس کے مرتب مولوی ابوظفر عبد الواحد صاحب ایم اے لکچرار سٹی کالج ہیں۔ اقبال کے متعلق گذشتہ چند برسوں میں کئی کتابیں اور مجموعے شایع ہو چکے ہیں۔ اور ان کے انتقال کے بعد سے تو یہ موضوع اہل اردو کے لئے خاص دلچسپی کا باعث بن گیا ہے۔ اکثر اردو رسالوں نے اقبال کی یاد میں اپنے مخصوص نمبر شایع کئے۔ اور شاعروں اور ادیبوں کے علاوہ سائنس اور دوسرے علوم سے دلچسپی رکھنے والے اصحاب نے بھی اقبال کے کلام کا مطالعہ شروع کیا اور اس کی خوبیوں کے اعتراف میں طویل مقالے تحریر کئے۔

"متاع اقبال" میں تین اہم عنوانوں پر اظہار خیال کیا گیا ہے۔ پہلے عنوان کے تحت اقبال کی شاعری کے پس منظر پر روشنی ڈالی ہے۔ اور ہندستان کی تاریخ اور تمدنی حالات کا سرسری خاکہ کھینچ کر ہر زمانہ کے اردو ادب کے متعلق نہایت مختصر الفاظ میں رائے ظاہر کی ہے اور اقبال کی شاعری کے آغاز کے وقت ہندستان کا جو رنگ تھا اس کی طرف اشارہ کیا ہے۔

دوسرا عنوان "اقبال کا ذہنی ارتقا" ہے۔ اسی عنوان کے تحت مصنف نے زیادہ لکھا ہے۔ خاص کر غالب اور اقبال کا موازنہ شرح و بسط سے کیا ہے۔ اور پھر اقبال کی نظموں کے مجموعوں پر تاریخی ترتیب کے ساتھ روشنی ڈالی ہے۔

تیسرا اور آخری عنوان اقبال کا شاعرانہ فلسفہ ہے جس میں اصل موضوع سے زیادہ مصنف نے اقبال کے متعلق اپنے نتائج فکر کو پیش کیا ہے۔ یہ اصل میں ابتدائی صفحات میں جو کچھ لکھا گیا اس کا نچوڑ یا نتیجہ ہے۔

اس کتاب میں اگرچہ بعض جگہ غیر مانوس الفاظ اور ترکیبیں بھی نظر سے گزرتی ہیں لیکن بحیثیت مجموعی یہ ایک کامیاب کوشش ہے اور اقبال سے متعلق تحریروں میں ایک چھوٹا سا اضافہ۔

" ق "

کلیات بحری:۔ آج کل اردو زبان میں نئی کتابوں کے ساتھ ساتھ پرانی کتابیں بھی شایع ہو رہی ہیں اور یہ بات عجیب معلوم ہوگی لیکن واقعہ ہے کہ پرانی کتابوں کو صحت کے ساتھ چھاپنا نئی کتابوں کے چھاپنے سے زیادہ مشکل ہے۔ کیونکہ پرانی کتابوں کی زبان بھی پرانی ہوتی ہے اور ان کی کتابت و طباعت کے وقت کاتب اور مطبع کے لوگ پرانے لفظوں کو غلط سمجھ کر ان کی جگہ نئے لفظ رکھ دیتے ہیں اور اس طرح کتابوں کے مسخ ہو جانے کا اندیشہ ہمیشہ لگا رہتا ہے۔

ترقی یافتہ زبانوں میں بہت کم ایسی ہوں گی جن کی قدیم کتابیں ابھی تک چھپ کر منظر عام پر نہ آ چکی ہوں۔ اردو کو اسی لئے پوری طرح ایک ترقی یافتہ زبان نہیں کہا جاتا کہ اس میں ابھی بہت سے کام باقی ہیں۔ جن میں سے ایک یہ بھی ہے۔ کیونکہ اس کے بعض بڑے بڑے شاعروں اور ادیبوں کے کارنامے ابھی مخطوطوں ہی کی شکل میں ہیں۔ جب تک ہر دور اور ہر مقام کی جملہ اہم اردو کتابیں شایع نہ ہو جائیں گی اس وقت تک اردو ادب کی ایک مکمل تاریخ مرتب نہیں ہو سکتی۔ اور اسی وجہ سے کوئی مکمل تاریخ اب تک لکھی بھی نہیں گئی

قاضی محمود بحری اردو کے ایک بہت بڑے شاعر اور صوفی ہیں ان کی ایک کتاب من لگن بہت عرصہ پہلے چھپ چکی ہے اور اب ان کا کلیات بڑی تقطیع کے تین سو سے زیادہ صفحات پر نولکشور پریس لکھنؤ سے شایع ہوا ہے۔ اس کلیات کو ڈاکٹر محمد حفیظ سید ایم اے پی ایچ ڈی لٹ ریڈر الہ آباد یونیورسٹی نے ایک مفید مقدمہ اور تشریح کے ساتھ شایع کیا ہے۔

مقدمہ میں پانچ باب ہیں۔ جن میں بحری کے عہد کی تاریخ، ان کے ہمعصر شعرا، سوانح حیات، تصانیف اور کلام بحری کی لسانی خصوصیت پر اچھی بحث کی ہے۔ بحری بیجاپور اور گولکنڈہ کے آخری بڑے شاعروں میں سے ہیں۔ انھوں نے ان سلطنتوں کے زوال کے بعد بھی عرصہ تک اردو شعر و شاعری کی شمع کو روشن رکھا۔ ان کی زبان ولی اورنگ آبادی کی طرح ایک درمیانی دور کی زبان سمجھی جا سکتی ہے نہ قدیم شعرا مثلاً وجہی، غواصی و نصرتی کی طرح ہندی آمیز ہے اور نہ دور متوسط کے شعرا آبرو و ناجی اور حاتم و مظہر کی طرح فارسی آمیز۔ کلیات بحری کے مطالعہ سے تصوف و عرفان کی چاشنی بھی پیدا ہو سکتی ہے کیونکہ بحری خود ایک بہت بڑے صوفی اور اہل اللہ تھے۔ ڈاکٹر سید کی یہ کوشش قابل قدر ہے اور یقین ہے کلیات ولی کی طرح کلیات بحری کو بھی اہل ذوق نعمت غیر مترقبہ سمجھیں گے۔

ر ۔ ق

ہلال و صلیب:- یہ اردو اکیڈیمی لاہور کی طرف سے شایع کی گئی ہے۔ اور اس کے مصنف اردو کے مشہور افسانہ نگار ایم اسلم ہیں۔

کتاب چھوٹی کراؤن سائز کے ۸۴ صفحات پر مشتمل ہے اور اس میں سلطان صلاح الدین ایوبی کے مبسوط سوانح حیات درج ہیں۔ کتاب کے آغاز میں مشہور شاعر ابو الاثر حفیظ جالندھری کی ایک نظم بھی دیباچہ کے طور پر شامل کی گئی ہے۔

نظم اور کتاب دونوں ہیرو پرستی کے جذبات سے مملو ہیں۔ خاص کر حیات صلاح الدین کے لکھنے میں ایم اسلم صاحب نے اپنے دلچسپ اسلوب بیان کا پورا زور صرف کیا ہے۔ اور یہ بڑی خوشی کی بات ہے کہ وہ فرضی واقعات نگاری کی جگہ اب تاریخی میدان میں اتر آئے ہیں۔ یہ کتاب تاریخ اور افسانہ دونوں کا لطف دیتی ہے اور یقین ہے کہ مقبولیت کی نگاہوں سے دیکھی جائے گی۔

ر ۔ ق

گیس کا دفاع:- یہ چھوٹی سی مفید کتاب راجہ صاحب محمود آباد کے قایم کیے ہوئے سلسلۂ مطبوعات کی ایک کڑی ہے۔ اور بڑے ضروری اور اہم موضوع پر لکھائی گئی ہے۔ اس کے مصنف سید ہادی حسین صاحب رضوی بی کام ہیں۔ انھوں نے گیس کی مختصر تاریخ گیس کی قسموں اور ان سے حفاظت کے طریقوں پر تفصیل سے روشنی ڈالی ہے۔ عہد حاضر میں خاص کر آج کل ایسی کتابوں کی بے حد ضرورت ہے اور توقع ہے کہ ہر اردو داں اس کتاب کا مطالعہ کر کے اپنی معلومات میں اضافہ کرے گا۔ اور وقت پر اپنی حفاظت کر سکے گا۔

ر ۔ ق

عصمت کی کہانی اور وداع راشد:- دو چھوٹی چھوٹی کتابیں ہیں جو سلسلۂ مطبوعات عصمت ۱۵۱ ویں اور ۱۵۵ ویں کڑی ہیں۔ مولانا راشد الخیری نے مطبوعات کا ایک ایسا اچھا سلسلہ قایم کیا ہے کہ اس کی وجہ سے اردو کے نسوانی لٹریچر میں بڑی وسعت پیدا ہو گئی ہے۔

یہ دونوں کتابیں راشد الخیری مرحوم ہی کی خدمات سے متعلق لکھی گئی ہیں۔ اور ان کے مصنف مرحوم کے فرزند رازق الخیری ہیں۔ ان کو پڑھنے سے معلوم ہوتا ہے کہ راشد الخیری نے اردو ادب پر

کتنا احسان کیا ہے اور اپنی قوم کے طبقۂ نسواں کی کیسی پُرخلوص خدمات انجام دی ہیں۔

"ق"

کیلے کا چھلکا اور دوسرے مضامین

از سند باد جہازی — ۱۷۶ صفحات

قیمت عہ ناشر اردو اکیڈمی پنجاب لوہاری دروازہ۔ لاہور۔

یہ کتاب اٹھارہ مزاحیہ افسانوں اور مضامین پر مشتمل ہے۔ اس میں زیادہ تر انگریزی زبان کے افسانوں کے محض ترجمے شامل ہیں لیکن بعض افسانوں کا ترجمہ اس خوبی سے کیا گیا ہے کہ "ترجمہ" نہیں معلوم ہوتا بالکل اپنا لیا گیا ہے۔ تمام مضامین اور افسانوں میں علم و ادب کی جھلک کے ساتھ ساتھ طنز و مزاح کے پہلو بھی روشن ہیں۔ جناب سند باد جہازی مشہور مزاح نگار ہیں۔ آپ کے مضامین اور افسانوں میں صرف ہنسنے ہنسانے کی باتیں ہی نہیں ہوتی ہیں بلکہ ہر مضمون میں اصلاح اور سماج سدھار کی کوششیں بھی لطیف پیرایہ میں کی جاتی ہیں۔ زیر نظر مجموعہ بھی ان ہی خوبیوں کا حامل ہے۔

"ں"

پطرس کے مضامین (تیسرا ایڈیشن)

از احمد شاہ صاحب بخاری — ۱۷۶ صفحات

قیمت عہ ناشر حالی پبلشنگ ہاؤس دہلی۔ پطرس کے مضامین کی مقبولیت کا اس سے بہتر ثبوت کیا ہو سکتا ہے کہ [illegible] قلیل مدت میں یہ مجموعۂ مضامین تیسری دفعہ شائع ہو [illegible] مجموعہ میں گیارہ مضامین ہیں پہلے [illegible] آخری مضمون "لاہور کا جغرافیہ" [illegible] جناب بخاری [illegible] کہنہ مشق مزاح نگار ہیں۔ آپ [illegible] کچھ جاتے ہیں۔ آپ کا طرز نگارش [illegible] ہوتا ہے۔ آپ کے مضامین میں شگفتگی، چلبلا پن، زندہ دلی، شوخی، روانی، نازک خیالی سب ہی کچھ موجود ہے اور انداز بیان اس قدر دلچسپ اور دلکش ہوتا ہے کہ کوئی مضمون شروع کرنے کے بعد ختم کئے بغیر چین نہیں پڑتا۔

"س"

ایک کہانی

چھ ادیبوں کی زبانی — ۱۰۴ صفحات قیمت ۶/

لکھنؤ ریڈیو اسٹیشن والوں نے چھ مشہور افسانہ نگاروں سے یہ کہانی لکھوائی ہے اس کی پہلی قسط جناب نیاز کے رشحات قلم کی منت کش ہے۔ نیاز کہانی کے ہیرو مرزا سعید کو ان کی بچپن کی منکوحہ ریحانہ کے کمرہ میں چھوڑ کر رخصت ہو جاتے ہیں۔ سید علی عباس سعید کی حماقتوں کو جن کا آغاز نیاز نے کیا تھا مضحکہ خیز بنا دیتے ہیں اور احمق سعید کو ریحانہ کے گھر سے نکلوا دیتے ہیں۔ ل۔ احمد سعید کو [illegible] کے [illegible] سے ریحانہ کے التفات حاصل کرنے کی سعی لاحاصل میں سرگرداں رکھتے ہیں۔ جناب یلدرم ریحانہ کی تسخیر کے عوض سعید پر اپنی سیفی چلا کر اپنی وضع قطع بدلنے پر مجبور کر دیتے ہیں۔ ریحانہ کی ذہنی الجھن کو امتیاز علی تاج نے سلجھا کر چھوڑا اور ریحانہ کی سہیلی سلمیٰ کے بھائی محمود کو ریحانہ کا منظور نظر بنا دیا۔ یلدرم کی اسی سیفی کو تاج کے زمانے میں سعید پر یہ اثر ہوا کہ وہ کباڑی کی دکان پر جا کر اپنے لئے مرحوم گورا سپاہیوں کا لباس خریدتے ہیں اور [illegible] بن کر ریحانہ کے گھر تشریف لے جاتے ہیں۔ خان بہادر [illegible] سعید کو اس حالت گداگری میں چار آنے والے [illegible] لگا دیتے ہیں۔ [illegible] اپنی سہیلی سلمیٰ کے ساتھ سینما دیکھنے [illegible] جب ریحانہ سلمیٰ سے کہتی ہے کیا [illegible] زندگی اس جوان کے ساتھ گزارنی ہوگی؟ سلمیٰ کے والد [illegible] لیتے ہیں اور ریحانہ کو طلاق دلا کر چھوڑتے ہیں۔ ریحانہ محمود کی ہو جاتی ہے اور سعید عمل تسخیر میں مشغول بنے رہتے ہیں۔

ہر افسانہ نگار نے اپنے زورِ قلم سے اس کہانی کو دلچسپ مزاحیہ اور نتیجہ خیز بنانے کی خاطر خواہ کوشش کی ہے ... علم و ادب دہلی نے بڑے اہتمام ... ۔

نہر اطلقہ از جناب ناظر کاکوری چھوٹی تقطیع۔ ... صفحات قیمت درج نہیں۔ ناشر انوار بک ڈپو لکھنو

یہ چھوٹی سی کتاب مجموعہ ہے ایک بیکس خاتون کی کتابِ داستانِ حیات کے اوراقِ پریشاں کا۔ اس خاتون کے دل و دماغ پر عالمِ خواب کے کچھ ایسے تاثرات مرتسم ہو گئے تھے کہ جن کی وجہ سے اس کی زندگی ناخوشگوار بن گئی تھی۔ اور اس کا مستقبل تاریک ہو گیا تھا۔ انہی خیالات کے تحت اس نے اپنی ایک سہیلی کو کئی خط لکھے تھے۔ ان خطوں کے مجموعہ کا نام "نہر اطلقہ" اس لئے قرار پایا کہ اس خاتون کو خواب میں نہر و ملقہ نے تقدر ایک عجیب منظر کا چہرہ نظر آیا کرتا تھا۔ ان خطوں میں بقول جناب ناظر کے "صرف الفاظ ہی کی جادوگری نہیں ہے بلکہ اس ساغر میں تلخ شراب بھی کہیں کہیں چھلکتی نظر آئے گی"۔ اس تلخ شراب کے ایک دو گھونٹ ملاحظہ ہوں۔

"افسوس یہ ہے کہ ہمارے سماج کی حالت اس قدر گندی اور گھنونی ہو گئی ہے کہ اس میں عورت کا وجود ہی خطرناک ہو گیا ہے لڑکی کا پیدا ہونا منحوس سمجھا جاتا ہے اور جہیز، قرار داد اور سلامی کی رسموں نے تو غریب لڑکیوں کو سسرال کی شکل دیکھنے سے محروم کر دیا ہے۔"

ان خطوں میں جو "بیراہ سماج کی آبادی" کے نام معنون کئے گئے ہیں، دلچسپی اور دلکشی کے ساتھ ساتھ معاشرتی اور سماجی اصلاحات کے کافی سبق ہیں، ذہنی اور سماجی جکڑ بندیوں سے رہائی، آزادی کے طریقے قابلِ عمل اور گمراہ سماج کی رہبری کی یہ ... قابل ... ادہیں۔

سہ ہر دی سیلوفر از ... جہاں صاحبہ رعنا ۱۴۰ صفحات قیمت ۸ ... ناشر عصمت بکڈپو دہلی

زیر تبصرہ کتاب گیارہ چھوٹی چھوٹی دلچسپ سبق آموز اور نصیحت خیز کہانیاں بچوں اور بچیوں کے لئے لکھی گئی ہیں۔ ان کہانیوں کی زبان نہایت سلیس اور آسان ہے۔ یہ کہانیاں اس قابل ہیں کہ چھوٹے بچوں اور بچیوں کو پڑھائی جائیں۔ بعض کہانیوں میں تصویریں بھی دی گئی ہیں۔ "س"

شیطان کا انتقام یہ ایک دلچسپ و جدید کتاب ہے جس کو جامعہ عثمانیہ کے ایک فارغ التحصیل مولوی سید جلال الدین صاحب اشک بی اے ال ال بی نے بڑی خوبی سے تصنیف کیا ہے۔ اس میں بقول مصنف دورِ حاضرہ کے علمی اخلاقی اور سیاسی رجحانات پر ایک تیز اور تند اور تلخ تبصرہ کیا گیا ہے۔ لیکن سچ تو یہ ہے کہ عہدِ حاضرہ کے حالات اس سے زیادہ تیز و تند اور تلخ تر تبصرے کے مقتضی ہیں۔

یہ کتاب جیسا کہ مصنف نے خود ان لفظوں میں لکھا ہے "ایک مسرت سے محروم دل کی آہ سرد اور ولولہ و تڑپ ہے۔" یہ سچ ہے کہ ایک محروم مسرت انسان اگر اس دنیا پر نظر ڈالے تو اسے یہ تمام کائنات واقعی شیطان کے انتقام کی کارگاہ نظر آئے گی۔ اس کے مطالعہ سے وہ لوگ ضرور متاثر ہوں گے جن کی زندگیاں اسی انتقام کی شکل میں ظہور پذیر ہوئی ہیں بشرطیکہ شیطان ان کو اس کے مطالعہ کا موقع دے جس کی بظاہر امید نہیں ہے اس لئے یہ کتاب اگر محروم مسرت دلوں ہی کو اطمینان و مسرت کی طرف راغب کر دے تو مصنف کی بڑی کامیابی ہو گی۔ ... اسی کامیابی کی خاطر یہ لکھی بھی گئی ہے۔ "ق"

جدید مطبوعات

۱۔ سیرت اقبال (سوانح) از محمد طاہر فاروقی ۲۹۴ صفحات قیمت سے۔

۲۔ کمال اتاترک (محمد توفیق کی ترکی تصنیف کا ترجمہ) ۲۸۸ صفحات قیمت عار۔

۳۔ شہید مسولینی (ائرش محب وطن کی سوانح عمری) ۱۲۲ صفحات آزاد پریس پٹنہ

۴۔ پریت افسانے حصہ دوم (مختصر افسانے) از گربخش سنگھ ۲۵۰ صفحات۔

۵۔ ہاشمی و دو شمشیرہ حصہ اول دوم (عہد عباسی کا تاریخی ناول) از محمد صادق حسین ۴۸۰ صفحات۔

۶۔ مرقع ملتان (تاریخ) از سید محمد اولاد علی گیلانی ۴۱۶ صفحات۔

۷۔ مقالات شبلی جلد ششم (مولانا شبلی نعمانی کے مذہبی ادبی سیاسی اور تاریخی مضامین کا مجموعہ) ۲۰۴ صفحات

۸۔ ریاض حیدر (مرثیوں کا مجموعہ) از حیدر عباس رضوی ۲۰۰ صفحات

۹۔ نغمۂ نکہت مجموعۂ کلام از نانک چند نانک لکھنوی ۸۰ صفحات۔

۱۰۔ فہم انسانی (فلسفۂ ہیوم کی کتاب کا مجموعہ) ۱۹۴ صفحات قیمت عہ۔

۱۱۔ مقالات ہاشمی (ادبی و تنقیدی مضامین) از نصیر الدین ہاشمی ۴۱۲ صفحات عار

۱۲۔ ہندوستان کی صنعت و تجارت از منت اللہ ۲۱۲ صفحات۔

۱۳۔ نقوش سلیمانی (مضامین و تقاریر کا مجموعہ) از مولانا سید سلیمان صاحب ندوی ۴۹۶ صفحات عار

۱۴۔ فرحت دل (منتخب اشعار) از نواب بہادر سید عبداللہ خاں ۱۷۲ صفحات قیمت عہ

۱۵۔ معارف جمیل (مجموعۂ کلام) از حکیم آزاد انصاری ۲۵۶ صفحات قیمت عہ

۱۶۔ چوپال (دیہاتی افسانے) از احمد ندیم قاسمی ۲۰۴ صفحات قیمت عہ

۱۷۔ افسانہ نگاری از اعتشام الدین ایم اے ۱۵۰ صفحات قیمت عہ۔

۱۸۔ گل نغمہ (نظموں کا مجموعہ) از ڈاکٹر عظیم الدین احمد اعظم غیر مجلد قیمت عار۔

۱۹۔ کیلے کا چھلکا اور دیگر مضامین (مزاحیہ افسانے و مضامین) از چراغ حسن حسرت ۱۷۶ قیمت عہ

۲۰۔ ہلال و صلیب (سلطان صلاح الدین کی سوانح عمری) از ایم اسلم ۱۵۰ صفحات قیمت عار

۲۱۔ انمول کہانیاں (انقلابی افسانے) از جناب شوکت عثمانی ۱۳۱ صفحات قیمت ۱۲

۲۲۔ عصمت کی کہانی (رسالہ عصمت دہلی کی سوانح عمری) از رازق الخیری ۹۰ صفحات قیمت ۸

۲۳۔ وداع راشد الخیری (راشد کا آخری باب) از رازق الخیری ۸۰ صفحات قیمت ۸

۲۴۔ جدید جغرافیہ پنجاب (پنجاب کی سیاست پر مزاحیہ تبصرہ) از چراغ حسن حسرت قیمت عہ

۲۵۔ شہزادی نیلوفر (مختصر کہانیاں) از محترمہ سرو جہاں رعنا بی اے ۱۲۰ صفحات قیمت ۸

۲۶۔ تنقیحات (اسلام اور مغربی تہذیب کے تصادم پر تبصرہ) از سید ابو الاعلیٰ مودودی ۲۸۴ قیمت ۱۲

۲۷۔ پیام روح با تصویر (مجموعۂ کلام) از حامد اللہ افسر قیمت سے۔

۲۸۔ جذبات بسمل با تصویر (مجموعۂ کلام) از سکھ دیو پرشاد بسمل قیمت عہ ۸

۲۹۔ ابو الحسن (ٹالسٹائے کے ڈرامے کا ترجمہ) از جناب مجنون گورکھپوری قیمت

۳۰۔ گلبدن بیگم (شہزادی گلبدن کی سوانح عمری) از سید ابن حسن شارق ۱۰۰ صفحات

۳۱۔ محاورات اردو از حافظ عبد الکریم صاحب مون ۲۴۴ صفحات قیمت ۸

۳۲۔ اسلام میں غلامی کی حقیقت از سعید احمد ۱۹۲ صفحات قیمت عار

۳۳۔ اقبال اور اس کا پیغام (اقبال کی شاعری پر تبصرہ) از ڈاکٹر تصدق حسین قیمت

۳۴۔ صنعت و حرفت کے قیمتی راز از مہاشے ندجی قیمت عہ ۸

۳۵۔ نغمۂ فطرت (مجموعۂ کلام) از احسان دانش قیمت عہ۔

۳۶۔ تاریخ ائمہ (انبیاء کرام و ائمہ طاہرین کے حالات) از سید علی حیدر ۴۰۵ صفحات

۳۷۔ معاشدار (عطیۂ معاش کی وضاحت) از کاشی ناتھ راؤ وکیل قیمت عہ۔

۳۸۔ متاع حق (اسلامی سیاست) از سید امیر احمد ۱۵۸ صفحات قیمت ۸

۳۹۔ خوراک صحت (مہاتما گاندھی جی کے تجربات) ۱۷۶ صفحات قیمت ۱۲

۴۰۔ سفرنامہ حکیم ناصر خسرو از رحمت اللہ کرمانی ۱۵۰ صفحات۔

۴۱۔ فن تفسیر از مرزا عزیز فیضانی ۲۰۰ صفحات۔

۴۲۔ گرہست جیون (مہاتما گاندھی جی کے تجربات) ۱۵۰ صفحات قیمت ۱۲

۴۳۔ جوہر تخلیق (شاہنامہ کی جنگ کا موس کا منظوم ترجمہ) از سید محمد علی حشم ۹۰ قیمت

۴۴۔ تمثیلی مشاعرہ از پنڈت کیفی ۱۰۰ صفحات قیمت عہ۔

۴۵۔ برہمچریہ (مہاتما گاندھی جی کے تجربات) ۹۶ صفحات قیمت ۹

۴۶۔ کرشنا سیکنیکل گائیڈ از پنڈت کشن چند ۳۲۰ صفحات۔

۴۷۔ مخزن اخلاق (پانچواں ایڈیشن) از رحمت اللہ سبحانی ۴۸۸ صفحات۔

۴۸۔ انقلاب حبش (حبش پر اطالیہ کے مظالم) از محمد اشرف خاں عطا قیمت ۸

۴۹۔ جادۂ نو (قطعات) از احسان دانش قیمت ۸

۵۰۔ بے انصافی کا انصاف (ڈراما) از پنڈت دیودت شرما ۲۱۰ صفحات قیمت عہ

۵۱۔ سر سید احمد خاں مرتبہ ظہیر الدین احمد ایم اے پی ایچ ڈی ۱۶۰ صفحات قیمت

۵۲۔ سر سالار جنگ اعظم مرتبہ فیض محمد بی اے ڈپ ایڈ ۸۰ صفحات قیمت ۶

مرزا سیف علیخاں

بچوں سے

نہایت خوشی کی بات ہے کہ گزشتہ پرچہ میں جو تحریک کی گئی تھی وہ کامیاب ثابت ہوئی۔ بہت سے بچے اور بچیوں نے اس کی تائید میں نہ صرف حیدرآباد سے بلکہ باہر سے بھی خطوط بھیجے ہیں۔ ہم سب سے پہلے اپنے ننھے منے بھائیوں اور بہنوں کو مبارکباد دیتے ہیں کہ اب ان میں ایک بیداری پھیل چکی ہے اور قوی امید ہے کہ وہ آگے چل کر ملک کے لیے قابل فخر ثابت ہوں گے۔

پہلے ہم کو ایک جلسہ کرنا ہوگا جس میں نہ صرف خریدارِ کلیہ دوست بلکہ سب طالب علم جو میٹرک تک کی جماعتوں میں تعلیم پاتے ہوں بلا تفریق مذہب وملت اس جلسہ میں شریک ہو سکیں گے۔ اس جلسہ میں سب کی متفقہ رائے سے ضروری امور کا تصفیہ کریں گے۔ بعض جو بہت ہی چھوٹے ہیں سب سے پہلے وہ جلسہ میں شریک ہونے سے گھبرا رہے ہیں۔ گھبرانے کی کوئی بات نہیں ان کی ایک اور چھوٹی سی انجمن قائم ہو جائے گی جس میں پرائمری تک کے جماعتوں کے بچے شریک رہیں گے مگر اس کا تعلق اسی ایک انجمن سے رہے گا۔ یہ انجمن دراصل ادارۂ ادبیات اردو کا شعبۂ طلبہ ہے مگر اس کے لئے ایک موزوں نام اسی جلسہ میں تجویز کریں گے۔ بچے اس کے لئے اچھے اچھے نام سوچیں اور جلسہ میں پیش کریں۔ چونکہ خیریت آباد (دفتر ادارہ) دُور ہے اور سب کو آنے میں تکلیف ہوگی جس کا ہم کو خود احساس ہے اور جس کا مناسب انتظام ہم کر چکے ہیں صرف پہلا جلسہ دفتر سب رس میں کریں گے اس کے بعد کہیں وسط شہر میں ہمارے جلسے ہوں گے جہاں ہر ایک بہ آسانی آسکے گا۔ جس کا تصفیہ جلسہ میں ہوگا۔ اس انجمن کے قیام کا سب سے بڑا مقصد سب رس میں تحریری دلچسپی کے ساتھ ساتھ تقریر میں بھی مہارت پیدا کرنا ہے۔ آپ اس جلسے میں ضرور آئیں اور کوشش کریں کہ زیادہ سے زیادہ آپ کے دوست احباب اس میں شریک ہوں خواہ وہ سب رس کے خریدار ہوں یا نہ ہوں مگر یہ ضروری ہے کہ وہ میٹرک تک کی جماعتوں میں تعلیم پاتے ہوں۔ ہندو ہوں یا مسلمان یا کسی اور مذہب سے تعلق رکھتے ہوں وہ سب اس انجمن میں شریک ہو سکتے ہیں مگر اپنے والدین سے یا سرپرست سے ضرور اجازت لے آئیے انھیں اطمینان دلا کر آئیے کہ ہم ایک نیک کام میں حصہ لینے جا رہے ہیں بہتر تو یہی ہے کہ ہم نے جو کچھ لکھا ہے تم انھیں بتا دیں وہ ضرور اجازت دے دیں گے۔ توقع ہے کہ آپ معہ اپنے دوست احباب کے بتاریخ ۲۲ دسمبر ۱۹۳۹ء مطابق ۱۰ ذی القعدہ ۱۳۵۸ھ بروز جمعہ بوقت ۵ بجے شام دفتر ادارۂ ادبیات اردو، رفعت منزل خیریت آباد ضرور آئیں گے۔ خیریت آباد میں آنے کے بعد کسی سے بھی دریافت کر لیجئے کہ دفتر سب رس یا رفعت منزل کہاں ہے کوئی بھی بتا دے گا۔ اسی طرح حیدرآباد کے باہر اور اضلاع میں انجمن کی شاخیں قائم ہو سکتی ہیں۔ لڑکیوں کے لیے بھی اسی طرح کی انجمن بن سکتی ہے۔ جو اس میں دلچسپی لینا چاہتی ہوں وہ ہم سے مراسلت کریں۔

مس بی فخر الدین نے ہمارے پاس لکھ بھیجا ہے کہ ان کی طرف سے آپ سب کو دیوالی اور عید مبارک چھاپ دیں ہم بھی آپ سب کی طرف سے انھیں عید مبارک لکھتے ہیں۔ گزشتہ پرچہ میں جو انعامی معمہ دیا گیا تھا اس کی تاریخ بڑھائے دیتے ہیں کیونکہ اکثر حل غلط آئے ہیں۔ ۲۰ دسمبر تک بھیج دیں۔ جلسہ کی تاریخ بھولنا نہیں۔ اچھا خدا حافظ

معین الدین احمد انصاری

جواہر پارے

(۱) لینا چاہتا ہے تو دعائیں لے (۲) تو یہ کرنا چاہتا ہے تو گناہ اور ظلم سے توبہ کر (۳) دیکھنا چاہتا ہے تو حق اور ناحق کے فرق کو دیکھ (۴) سننا چاہتا ہے تو خدا کی تعریف اور مظلوم کی پکار کو سن (۵) رونا چاہتا ہے تو اپنے اعمال پر رو۔ (۶) ہنسنا چاہتا ہے تو اپنی قسمت پر ہنس۔

(ماخوذ) **سید خواجہ معین الدین** (گلبرگہ شریف)

ایک مسافر اور ریچھ

دیکھیے میاں! ایک دفعہ کا ذکر ہے کہ ایک مسافر کسی گھنے جنگل میں سے چلا جا رہا تھا۔ چلتے چلتے کیا دیکھتا ہے کہ ایک ریچھ اور ایک اژدہا دونوں گتھے ہوئے ہیں۔ ریچھ تڑپ رہا ہے اور اژدہا اسے مضبوط پکڑے ہوئے نگلنے کی کوشش کر رہا ہے۔ مسافر نے یہ حال دیکھا تو ریچھ پر ترس آ گیا فوراً درخت کا ایک موٹا سا ٹہنا کاٹا اور اژدہے کے پاس جا کر کھڑا ہو گیا۔ جوں ہی اس نے منہ پھاڑا اور اس نے اژدہے کے منہ میں وہ ٹہنا اڑا دیا۔ جس سے اس کا منہ کھلا کا کھلا رہ گیا اور ریچھ فوراً نکل بھاگا۔

ریچھ اژدہے کے منہ سے نکل کر مسافر کی طرف بڑھا اور اس کے قدموں پر گر کر لوٹنے لگا۔ تھوڑی دیر کے بعد مسافر چلا تو وہ بھی دم ہلا کر اس کے ساتھ ہو لیا۔ چلتے چلتے دونوں ایک کنوئیں کے پاس پہنچے۔ مسافر ذرا تھکا ہوا تھا، ٹھنڈی چھاؤں دیکھ کر ایک درخت کے نیچے لیٹ گیا اور ریچھ اس کے سرہانے بیٹھ گیا۔

اتنے میں ایک شخص ادھر سے گزرا۔ اس نے یہ تماشا دیکھا تو وہیں کھڑا ہو گیا۔ جگا کر پوچھا کہ حضرت! یہ کیا ماجرا ہے اور یہ ریچھ سائے کی طرح تمہارے پیچھے کیوں پڑا ہے۔

مسافر نے اژدہے اور ریچھ کا قصہ بیان کیا اور پھر اپنی کارگزاری ظاہر کی۔ اس نے یہ رام کہانی سن کر کہا کہ خیر تم نے یہ تو ثواب کا کام کیا جو ریچھ کو اس موذی کے پنجے سے چھڑا دیا مگر پھر اس کالی بلا کو اپنے ساتھ کیوں رکھ چھوڑا ہے۔ میاں! یہ تو بڑا بے وقوف جانور ہے۔ تم اس پر کبھی بھروسہ نہ کرنا ورنہ یہ اپنے ساتھ تم کو بھی لے ڈوبے گا۔

مسافر نے کہا کہ جا بابا جا! اور اپنا کام کر۔ میں کوئی ننھا بچہ تو ہوں نہیں جو تو مجھے نصیحت کر رہا ہے۔ بھلا سوچنے کی بات ہے کہ یہ بے چارہ مجھے کیا نقصان پہنچا سکتا ہے۔

جب اس نے دیکھا کہ مسافر کے کان پر جوں تک نہیں رینگتی تو اس کا ہاتھ پکڑ کر اپنی طرف کھینچا اور کہا کہ میں سچ کہتا ہوں کہ دیکھو اس نادان کی صحبت نہ اختیار کرو ورنہ پچھتاؤ گے اور کسی نہ کسی دن مصیبت میں گرفتار ہو جاؤ گے۔

مگر مسافر کے سر پر تو شامت سوار تھی وہ بھلا کہاں ماننے والا تھا، فوراً ہاتھ جھٹک کر چھڑا لیا اور کہا کہ بابا! میں نے اپنے بال تو دھوپ میں سفید کئے نہیں۔ مجھے اپنی برائی بھلائی اچھی طرح معلوم ہے۔ براہ کرم اب آپ تشریف لے جائیے اور خدا کے واسطے میرا پیچھا چھوڑیے۔

آخر کار اس شخص نے دیکھا کہ یہ کسی طرح بھی راستے پر نہیں آتا تو مجبور ہو کر کہا کہ اچھا! تم میری بات نہیں سنتے تو نہ سنو، اب تم جانو اور تمہارا کام۔ میں تو یہاں سے یہ چلا۔ کہیں ایسا نہ ہو کہ گیہوں کے ساتھ گھن بھی پس جائے۔ یہ کہہ کر وہ اٹھا اور اسے برا بھلا کہتا ہوا چل دیا۔ اس کے جانے کے بعد وہ مسافر پھر اسی طرح درخت کے نیچے ٹانگیں پھیلا کر لیٹ گیا اور تھوڑی دیر کے بعد اسے نیند آ گئی۔ ادھر ریچھ اس کے سرہانے کھڑا مکھیاں اڑانے لگا۔

اب اتفاق دیکھیے کہ ایک مکھی بار بار اڑ کر مسافر کی ناک پر آ بیٹھتی۔ ریچھ اُسے بار بار اڑاتا' وہ اڑتی اور پھر وہیں بیٹھ جاتی۔ مکھی کی یہ ڈھٹائی دیکھ کر ریچھ بہت جھنجھلایا' سوچا کہ یہ میرے مالک کو بہت ستا رہی ہے اس کو ضرور سزا دینا چاہیے۔ بس فوراً دوڑ کر ایک بھاری پتھر اٹھا لایا اور دل میں ٹھان لی کہ اگر اب کے مکھی آکر بیٹھے گی تو بس اس کا کچومر ہی نکال دوں گا۔

تھوڑی دیر میں بھن بھن کرکے وہ مکھی پھر ناک کی پھننگ پر آ بیٹھی۔ ریچھ تو پتھر تانے ہی کھڑا تھا' بس آنکھیں بند کرکے وہ پتھر ناک پر دے مارا۔ مکھی تو اڑ گئی مگر اس غریب کا سر چکنا چور ہوگیا اور بھیجا پاش پاش ہوکر بہہ گیا۔

کر نہ بے عقلوں کی صحبت اختیار
کر نہ ان کی دوستی پر اعتبار
کر بھروسہ کچھ نہ ان کی بات پر
وہ تو بالکل جانور ہیں جانور
بات یہ کہتے ہیں ہم ایمان کی
دوستی اچھی نہیں نادان کی

مرزا عصمت اللہ بیگ

مٹھو

امی نے ہے مٹھو پالا
کیا اچھا بھولا بھالا
آؤ بھیا دیکھو آکر
آپا روٹی ڈالو آکر
آؤ اس کی صورت دیکھو
دل یہ چاہے گود میں لے لو
پیارا چہرہ بانکی گردن
آنکھ رسیلی تیکھی چتون
مَیں حال ہے دیکھو کیا متوالی
چونچ پہ ہر دم پان کی لالی
سر سے لے کر دُم تک پورا
سبز پروں کا پہنے جوڑا
لال گلے میں کنٹھی ڈالے
بیٹھا ہے کیا چونچ نکالے

لطیف النساء بیگم

شوقِ مطالعہ

امریکہ کا مرحوم صدر جمہوریہ لنکن ایک نہایت ہی غریب خاندان کا چشم و چراغ تھا۔ اس کو لڑکپن میں مطالعہ کا بہت شوق تھا مگر غربت و تنگدستی اس بات کی اجازت نہیں دیتی تھی کہ وہ اپنی علمی تشنگی کو بجھانے کے لئے ذاتی صرفہ سے کتابیں خرید کر پڑھے اور اس زمانے میں نہ تو اخبارات و رسائل کی افراط تھی نہ ہی ایسے دارالمطالعے تھے کہ جن سے عوام مستفید ہو سکیں۔ اس کے اپنے مکان میں چند پرانی کتابیں تھیں جن کو وہ اکثر و بیشتر پڑھتا تھا۔ ان مخصوص کتابوں کے کثرتِ مطالعہ کے سبب وہ ان کا حافظ ہو گیا تھا۔

اسی زمانے میں اس کو پتہ چلا کہ کرافرڈ نامی ایک شخص اس کے پڑوس کے گاؤں میں مقیم ہے۔ اور اس کے پاس "مشاہیر واشنگٹن" نامی کتاب ہے۔ لنکن کو یہ معلوم ہوتے ہی وہ پیدل ہی کرافرڈ کے گاؤں کو جو اس کے گاؤں سے دس میل دور تھا چلا گیا۔ کرافرڈ کے پاس پہنچ کر لنکن نے نہایت اشتیاق سے سوال کیا "کیا آپ مجھ کو اپنی کتاب "مشاہیر واشنگٹن" مطالعہ کے لئے مستعار دے سکتے ہیں؟" کرافرڈ نے لنکن کے لب و لہجہ اور حرکات و سکنات سے اس کے علمی ذوق کا پتہ چلا لیا اور جب اس کو اطمینان ہو گیا کہ واقعی لنکن اپنی علمی تشنگی کو بجھانا چاہتا ہے تو کرافرڈ نے کتاب دے کر کہا "دیکھو یہ کتاب بہت قیمتی ہے کہیں ایسا نہ ہو کہ تم بد احتیاطی سے اس کو خراب کر دو" لنکن نے جواب دیا "نہیں! ہرگز نہیں! یہ جوں کی توں آپ کو واپس کر دی جائے گی"

کتاب لے کر لنکن نہایت فاتحانہ انداز سے اپنے گاؤں کی طرف لوٹا مگر چونکہ اس کا شوقِ مطالعہ حد درجہ بڑھ گیا تھا اس لئے اس سے صبر نہ ہو سکا کہ وہ گھر جا کر اطمینان سے مطالعہ کرے۔ چنانچہ وہ راستے ہی میں چلتے چلتے مطالعہ کرتا رہا۔ یہاں تک کہ لنکن اپنے گاؤں پہنچنے سے قبل ہی سورج غروب ہو گیا تھا۔ لنکن نے جب دیکھا کہ تاریکی بڑھ رہی ہے تو کتاب بند کر کے دوڑتا ہوا اپنے گھر آیا اور نہایت اشتیاق سے چراغ کی روشنی میں "مشاہیر واشنگٹن" کے مطالعہ میں غرق ہو گیا حتیٰ کہ اس پر نیند کا غلبہ ہوا اور وہ کتاب کو تپائی پر رکھ کر سو گیا۔ رات جب کہ لنکن میٹھی نیند سو رہا تھا، ہوا و غبار بارش ہوئی اور لنکن کے گھر میں پانی اتر آیا کیونکہ لنکن کا گھر کوئی محل نہ تھا بلکہ ایک غریب کی جھونپڑی تھی۔

جب لنکن بیدار ہوا تو اس کو کتاب کا خیال آیا اور وہ گھبرا کر اٹھا کہ آیا کتاب خراب تو نہیں ہو گئی۔ اس نے ذرا کتاب کو دیکھا تو کتاب بھیگ کر بہت خراب ہو گئی تھی۔ اس کے اوراق ایک دوسرے سے چپک گئے تھے۔ اور جلد تو بالکل گل گئی تھی۔ کتاب کی یہ بری حالت دیکھ کر لنکن کا دل دھک سا ہو گیا کیونکہ اس نے کرافرڈ سے کتاب کے جوں کی توں واپس کرنے کا وعدہ کیا تھا کتاب کی یہ بری حالت دیکھ کر اس کی نیند کافور ہو گئی اور اس نے فوراً کتاب کو آگ سے سینکنا شروع کیا اور اس کے درست کرنے کے لئے اپنی ساری کوششیں صرف کر دیں مگر افسوس کہ کتاب اپنی اصلی حالت پر نہ آ سکی بلکہ آگ پر سینکنے کی وجہ اس کے اوراق میں

سختی پیدا ہو گئی تھی۔

لنکن کو کتاب کے خراب ہو جانے کا بے حد رنج تھا اور ساتھ ہی ساتھ اپنے جھٹلائے جانے کا بھی از حد ملال تھا۔ مگر پھر بھی اس نے ہمت و جرأت سے کام لیا اور دوسرے دن کتاب لے کر کرافرڈ کے پاس پہنچا اور کتاب واپس کر دی۔ کرافرڈ نے اپنی کتاب کو خستہ حالت میں دیکھ کر درشت لہجہ میں پوچھا "تم نے تو کتاب کی حالت بدل ڈالی! کیا تم نے اپنے الفاظ کی یہی قدر کی؟" یہ سن کر لنکن مارے شرم کے پانی پانی ہو گیا اور نہایت سنجیدگی سے جواب دیا "مجھے اس کا اعتراف ہے کہ میں آپ کی کتاب کو جوں کی توں واپس نہ کر سکا لیکن میں بالکل بے قصور ہوں کیونکہ یہ اس اچانک بارش کا سبب ہے کہ آپ کی کتاب محفوظ نہ رہ سکی۔ میں اس کا معاوضہ ادا کرنے کے لئے ہمہ تن تیار ہوں لیکن معاوضے کے لئے میرے پاس ایک پیسہ بھی نہیں ہے بلکہ میں صرف اپنی خدمات پیش کر سکتا ہوں۔ آپ مجھ سے جو چاہیں خدمت لے سکتے ہیں۔"

کرافرڈ اس کی گفتگو سن کر مبہوت ہو گیا اور خیال کیا کہ واقعی لڑکا بالکل بے قصور ہے۔ مگر پھر یکایک اس کے دل میں لنکن کی آزمائش کا خیال پیدا ہوا کہ آیا وہ اپنے اس قول پر اس کا معاوضہ ادا کرنے کے لئے تیار ہے پورا اترتا ہے یا نہیں۔ اس نے لنکن سے کہا "تم کو اس کتاب کا معاوضہ ادا کرنے کے لئے تین دن تک میرے پاس کام کرنا ہوگا" لنکن نے مسکراتے ہوئے اثبات میں جواب دیا اور مسلسل تین دن تک لنکن کو جو کام بھی دیا گیا نہایت مستعدی سے پورا کیا۔ تین دن کے بعد جب لنکن نے اس سے گھر جانے کی اجازت طلب کی تو اس وقت کرافرڈ لنکن کی خودداری استقلال اور عزم راسخ کا گرویدہ ہو گیا اور نہایت مشفقانہ لہجہ میں یہ کہتے ہوئے کتاب اس کے حوالے کی "لنکن بے شک میری کتاب بہت قیمتی ہے مگر تمہارا معاوضہ بھی کتاب کی قیمت سے ہزار گنا زیادہ ہے۔ اس لئے میں تمہیں یہ کتاب انعام دیتا ہوں" کتاب کے اس طرح مل جانے سے لنکن کو انتہائی مسرت ہوئی وہ عالم کیف میں ڈوبا ہوا گھر لوٹا۔ اب لنکن کا معمول تھا کہ اکثر و بیشتر اسی کتاب "مشاہیر واشنگٹن" کا مطالعہ کرتا اور اس کے مطالعہ میں اس کو بے حد سرور حاصل ہوتا تھا کیونکہ اس کتاب کو اس نے ایک گراں معاوضے پر حاصل کیا تھا۔

جب تک لنکن امریکہ کا صدر جمہوریہ رہا ہمیشہ اپنی تقریروں میں یہ ضرور کہا کرتا تھا کہ اس کا یہ اعزاز محض "مشاہیر واشنگٹن" کے مطالعہ کی بدولت ہے۔

محمد عبد القادر فاروقی
(حمایت نگر)

نصیحت کا اثر

موہن کا باپ ایک معمولی خدمت پر کسی دوسرے
شہر میں ملازم تھا جس کی تنخواہ بیس روپے تھی موہن
اس وقت ساتویں جماعت میں پڑھ رہا تھا۔ موہن روزانہ
حسب معمول صبح سویرے اٹھ کر شہر سے باہر جاتا اور
لکڑیاں توڑ کر سورج نکلنے سے پہلے گھر لوٹ آتا تھا۔
جب یہ ساتویں جماعت سے آٹھویں جماعت میں داخل
ہوا تو بہت سے نئے لڑکے اس کے دوست ہو گئے۔
ان نئے ساتھیوں میں اکثر مالداروں کے لڑکے تھے۔
موہن ان سے صرف اسکول میں ملا کرتا تھا لیکن ان کے
گھر کبھی جانے کا اسے اتفاق نہ ہوا تھا۔ اور اس نے
خود اپنے کو پابند بنا لیا تھا کہ وہ ان کے گھر ملنے نہ جائے گا
کیونکہ وہ جانتا تھا کہ اگر وہ ان لڑکوں سے ملنے جائے گا تو
وہ بھی اس کے گھر ضرور آئیں گے۔ لیکن جس گھر میں یہ
رہا کرتا تھا وہاں نہ تو دیوان خانہ تھا اور نہ بیٹھنے کے لیے
فرش۔ اس لیے وہ ان لڑکوں سے ملتے ہوئے گھبراتا
تھا۔ لیکن جب دوستی زیادہ بڑھ گئی تو ادھر گھر کے کاروبار
میں خلل آنے لگا۔

ایک روز موہن رات میں ۱۰ بجے گھر لوٹا۔ ماں نے
دیر سے آنے کا سبب دریافت کیا تو وہ کہنے لگا وہ
ایک دوست کے ساتھ کھیلنے کلب پر گیا تھا اور جب وہاں
سے ۹ بجے گھر آ رہا تھا اس کے دوست نے گھر چلنے پر
مجبور کیا اور وہیں اسے ۱۰ بج گئے۔ ماں نے اسے
گھر کے کاروبار کی جانب توجہ دلاتے ہوئے کہا کہ تین روز سے
وہ لکڑیاں لانے نہیں گیا ہے اور لکڑیاں اب بالکل
ختم ہو چکی ہیں اگر تو کل لکڑیاں نہ لائے گا تو کل کھانے کا
بھی خدا حافظ ہے۔ موہن چونکہ قصوروار تھا اس لیے
خاموش ہو رہا۔ تھوڑی دیر بعد پھر اس نے اپنی ماں سے
اس دوست کا ذکر شروع کر دیا اور کہنے لگا اس کے
دوست کے مکان میں ایک اچھا صاف ستھرا کمرہ ہے
جہاں بجلی کی روشنی ہے فرش نہایت ہی صاف ستھرا
تھا میز کرسیاں صوفے وغیرہ نہایت آراستہ و پیراستہ
سلیقہ سے اپنی اپنی جگہ رکھے ہوئے تھے۔ اس کے
بعد اس نے ماں سے کہا کہ وہ بھی ایک کمرہ اس طرح ہی
رکھے ماں نے جواب دیا کہ بیٹا یہ تمام باتیں امیروں
کی ہیں ہم غریب یہ تمام چیزیں کہاں سے لائیں گے۔
تمہارے والد کو دیکھو کہ وہ اپنے کھانے کے لیے
صرف آٹھ روپے رکھ لیتے ہیں اور تمہارے لیے
بارہ روپے بھیج دیتے ہیں اس میں ہی ہماری زندگی
بسر ہونا مشکل ہے تو یہ ٹھاٹ باٹ اور شان وشوکت
کہاں سے کریں۔ موہن خاموش تھا اس کی ماں
کی نصیحت کا اس پر اثر ہو چکا تھا وہ اٹھا اور بستر پر
دراز ہو گیا۔ صبح سویرے اٹھا۔ اور ایک رسی
لے کر جنگل کی راہ لی۔ لکڑیاں توڑ لایا اور اب روزانہ
پھر وہی معمول جو پہلے تھا اس کی پابندی کرنے لگا۔

موہن نے اب جماعت نہم میں قدم رکھا تھا اور
ایک سال بعد وہ جماعت دہم میں تھا۔ اس نے لگاتار
محنت کی اور گھر کے بھی کاروبار انجام دیتا رہا۔ لیکن اس کو
ان دوستوں کی شان وشوکت اور جاہ وحشم کا کبھی خیال

نہ گندا۔ چنانچہ دہم کی کامیابی کے بعد اس نے اسکول کو خیرباد کہہ دیا اور ملازمت کے لئے اس نے درخواست دی اور ایک سو پچاس روپے کا ملازم بھی ہوگیا۔ اب اس نے ماں سے آکر پوچھا کہ اب کیوں ہم ایک اچھا گھر نہ لیں اور وہی چیزیں جو دوست کے گھر میں تھیں اپنے پاس نہ رکھیں ماں نے اسے اجازت دے دی اور اب وہ ایک عمدہ مکان میں تھا۔

موہن کو جب کبھی رات میں نیند نہ آتی تو وہ اس وقت اپنی ماں کی نصیحتوں کو یاد کرتا تھا اور سوچتا تھا کہ محض ان نصیحتوں کے سبب آج اس کی زندگی کامیاب ہے ورنہ اس کی زندگی تاریک ہو جاتی۔

عبدالمجید خان یوسف زئی

بھوکا مرغا

ایک مرغا بھوک سے بیتاب تھا　　جستجو میں چند دانوں کی چلا
دیکھا اک انبار کوڑے کا لگا　　خوب سا اس کو کریدا جا بجا
دیر تک کی جستجو تو ناگہاں　　بیش قیمت اک ملا موتی وہاں
دیکھ کر موتی کو رنجیدہ ہوا　　ہو کے غمگیں دل سے یہ کہنے لگا
کوئی دولت مند اسے پاتا اگر　　اس کا دل خوش ہوتا موتی دیکھ کر
قدر اس کی کرتا کوئی جوہری　　شاہ پاتا تو اسے ہوتی خوشی
یہ نہ بخشے گا خوشی دل کو مرے　　اب نہ جاں بر ہوں گا ہرگز بھوک سے
جستجو میری ہوئی سب رائگاں　　آہ اک دانہ کہاں موتی کہاں
کام یہ دانے کا کر سکتا نہیں　　آہ موتی پیٹ بھر سکتا نہیں

حاصل

یہ نصیحت یاد رکھ المختصر　　دہر میں بے فائدہ زینت نہ کر
قیمتی دانہ ہے موتی سے کہیں　　بے غذا کے زندگی ممکن نہیں
عظمت ایسی فکر صبح و شام کر　　جس سے بھوکے سیر ہوں وہ کام کر

سید عظمت اللہ حسینی
(متعلم دہم مدرسہ چنچل گوڑہ)

بہادر لڑکا

لڑکا جہاز کے جلتے ہوئے تختے پر کھڑا تھا جب سب اپنی اپنی جانیں بچا کر بھاگ گئے تھے۔ لیکن وہ ہمت کر کے کھڑا تھا۔ شعلوں کی روشنی میں سپاہیوں کی لاشیں لڑکے کے اطراف پڑی ہوئی نظر آ رہی تھیں وہ اب بھی بشاش و خوبصورت دکھائی دے رہا تھا۔ جیسا کہ وہ جہاز پر حکومت کرنے کے لئے پیدا ہوا گو وہ ایک چھوٹا لڑکا تھا مگر بہت بہادر تھا۔ شعلے بلند ہونے لگے۔ وہ اپنے باپ کی اجازت کے بغیر نہیں جا سکتا تھا۔ باپ زندگی کی آخری سانس لے چکا تھا۔ اس کی آواز سنائی نہیں دے رہی تھی۔ اس نے زور سے پکارا "آبا! بولو! بولو! کیا میرا فرض ابھی پورا نہیں ہوا" اس کو معلوم نہیں تھا کہ اس کا باپ بے خبر پڑا ہوا ہے۔ "آبا! بولو" اس نے پھر چلایا "کیا میں یہاں سے ہٹ سکتا ہوں؟" مگر اس کو جواب میں بندوقوں کی آوازیں سنائی دیں۔ شعلے اور بلند ہونے لگے۔ اس کو اپنے بالوں اور پیشانی پر گرمی محسوس ہونے لگی۔ اب بھی وہ اس خطرناک جگہ بہادرانہ انداز میں کھڑا تھا۔ اس نے پھر ایک دفعہ چلایا "میرے آبا! کیا مجھے یہاں ٹھہرنا ہوگا؟" آگ جہاز کے ہر حصے تک پہنچ گئی تھی۔ جہاز کا جھنڈا جل رہا تھا اور اس کے شعلے ہوا کے دباؤ سے فضا میں لہریں مار رہے تھے ایسا معلوم ہوتا تھا کہ ایک سنہری جھنڈا لڑکے کے اوپر فضا میں لہرا رہا ہے۔ آگ بارود کے گودام کے قریب پہنچ گئی تھی۔ ایک دھماکہ ہوا۔ آہ! لڑکا وہ کہاں تھا۔

یہ تھا ایک بہادر فرانسیسی لڑکے کی موت کا منظر جس کو انگریزی زبان کی مشہور شاعرہ ہیمن نے اپنی نظم "کاسابیانکا"[1] میں پیش کیا ہے۔ سب رسی بھائیو واقعہ یہ ہے کہ ایک بحری جنگ میں ایک فرانسیسی جہاز کے کپتان نے اپنے لڑکے کاسابیانکا کو جو اس کے ساتھ تھا ایک محفوظ جگہ بٹھا کر یہ ہدایت کی کہ وہ وہاں پر بیٹھے رہے اور وہاں سے اٹھنے کی جرأت نہ کرے جب تک کہ اس کو وہاں پر سے ہٹنے کا حکم نہ دیا جائے۔ دشمنوں نے آتش باری کی جس کی وجہ سے جہاز کو آگ لگ گئی اس سلسلے میں کاسابیانکا کا باپ کپتان بھی مر گیا۔ لڑکے نے جب جہاز کو آگ لگتے دیکھا تو اپنے باپ سے وہاں سے ہٹنے کی اجازت مانگی۔ باپ تو مر چکا تھا مگر کاسابیانکا کو یہ معلوم نہ تھا کہ اس کا باپ مر چکا ہے وہ سمجھ رہا تھا کہ باپ وہیں کہیں موجود ہوگا۔ چنانچہ اس نے کئی بار اپنے باپ سے وہاں پر سے ہٹنے کی اجازت مانگی مگر اس کو کوئی جواب نہ ملا۔ اگر وہ چاہتا تو بھاگ کر اپنی جان بچا سکتا لیکن اس کو اپنے باپ کی ہدایت یاد تھی اس لئے اس نے بغیر باپ کی اجازت کے اپنی جان بچا کر بھاگنے سے موت کو ترجیح دی۔ یہ ایک چھوٹا سا سچا واقعہ ہے جس میں یہ بتایا گیا ہے کہ اپنے فرائض ادا کرنے میں پیچھے نہ ہٹنا چاہیئے گو اس میں ہماری جان تک کیوں نہ چلی جائے۔

سب رسی بھائیو اور بہنو! تم بھی اس بہادر لڑکے کاسابیانکا کی طرح اپنے فرائض ادا کرنے میں کبھی دریغ نہ کرنا اس لڑکے کو مرے ہوئے بہت عرصہ ہوا۔

[1] لڑکے کا نام

گر دنیا اب تک اس کو یاد کر رہی ہے اور تاریخ میں اس کی اس قربانی کو سنہری الفاظ میں لکھا جا رہا ہے۔ دنیا اب تک اس کی لافانی قربانی سے سبق حاصل کر رہی ہے۔ کاسابیانکا مرا نہیں۔ کون کہتا ہے کہ وہ مرگیا؟ وہ زندہ ہے۔ دیکھو! وہ پکار پکار کر کہہ رہا ہے" دنیا والو! میری اس زبردست قربانی کو شمع ہدایت بناؤ اور اپنے فرائض کو انجام دینے میں کبھی پیچھے نہ ہٹو گو اس میں تمہاری جان تک کیوں نہ چلی جائے۔ دنیا میں ترقی پانا اور سرخرو رہنا چاہتے ہو تو اپنے فرائض کو استقلال کے ساتھ انجام دو۔ اگر تم یہ چاہتے ہو کہ دنیا تمہیں تمہارے بعد بھی اچھے نام سے یاد کرے اور تمہیں زندہ تصور کرلے تو یاد رکھو اپنے فرائض کی تکمیل میں کبھی غفلت نہ کرنا آج کے کام کو کل پر نہ چھوڑنا ہی تمہاری ترقی کا راز ہے اور اسی میں ہی ترقی کا بھید مضمر ہے۔"

عظیم قادری صدف

سالگرہ کا تحفہ

کل سلمیٰ کی سالگرہ ہونے والی تھی۔ وہ سالگرہ کا خیال لئے ہوئے سوگئی۔ اس نے دیکھا کہ اس کی ماں اس کو عمدہ عمدہ کپڑے پہنا رہی ہے۔ وہ خوش ہو رہی تھی کہ اتنے میں اسے آسمان پر کوئی چیز اڑتی ہوئی نظر آئی۔ چونکہ اس کو پریوں کی کہانیوں سے بہت دلچسپی تھی اور ان کے دیکھنے کی بہت مشتاق تھی اس پری کو دیکھ کر سہم گئی پری نے کہا پیاری سلمیٰ میں تم کو کچھ ضرر نہ پہونچاؤں گی ہماری ملکہ تم کو بلا رہی ہیں۔ چلو پرستان کی سیر کرائیں اس نے پوچھا کہ آپ کے علاوہ وہاں اور بھی پریاں ہوں گی؟ پری نے مسکرایا سلمیٰ پرستان چلنے کی خوشی میں اپنی ماں سے اجازت لینا بھول گئی۔ اور پری کے ساتھ روانہ ہوگئی۔ وہ اڑتی ہوئی جا رہی تھی یکایک وہ ایک نئی دنیا میں پہونچ کر رک گئی۔ اس نے دیکھا کہ وہاں کی زمین مثل چاندی کے چمک رہی ہے باغوں میں طرح طرح کے پھول لگے ہیں ہر طرف سونے چاندی کے مکانات کی قطاریں ہیں سونا چاندی مٹی کی طرح زمین پر پڑی ہے۔ سلمیٰ ان چیزوں کو دیکھ کر کہہ رہی تھی کہ کاش ہمارے ملک میں بھی اس قسم کی چیزیں ہوتیں۔ پری اس کو لئے ہوئے آگے بڑھی، کئی مکانات پر سے گزر کر پری ایک مکان پر آکر رک گئی سلمیٰ نے دیکھا تو اس میں بیش قیمت جواہرات لگے تھے۔ سارا مکان سونے چاندی سے بنا ہوا تھا پری نے کہا کہ یہ ملکہ کا محل ہے۔ ملکہ کے طلب کرنے پر دونوں اس کے کمرے میں پہونچ گئے۔ ملکہ اٹھ کر سلمیٰ کے پاس آئی اور کاندھے پر ہاتھ رکھ کر کہا کہ سلمیٰ مجھے اس کی اطلاع ہے کہ تم نے اپنی ماں سے کہا تھا اماں ایک دن پریوں سے ملنے چلو۔ میں نے خیال کیا کہ تم کو سالگرہ کے موقع پر بلا کر کچھ تحفے دوں یہ لو دو پر ہیں ان کو لگا کر ہر وقت تم پرستان آسکتی ہو اور یہ ایک طلسمی آئینہ ہے اس کو تم جب سورج کو دکھاؤ گی اس وقت ایک پری آئے گی جو تم کو پرستان کا راستہ بتائے گی۔ سلمیٰ نے ملکہ سے پوچھا کہ کیا

پرستان کی سیر کے لیئے روز آسکتی ہے ملکہ نے اس کو جواب دیا کہ وہ روز آسکتی ہے۔ اتنے میں اس نے دیکھا کہ اس کی ماں اس کو جگا رہی ہے اور کہہ رہی ہے کہ بیٹی اٹھو آج تمھاری سالگرہ ہے تم کب تک سوتی رہوگی سلمیٰ کی آنکھ کھل گئی اب اس کی سمجھ میں آیا کہ وہ خواب دیکھ رہی تھی۔

مرزا محمد انور

جاپانی طلبا

(یہ مضمون انگریزی کتاب "جاپان" سے ماخوذ ہے)

پیارے سب رسی بھائی اور بہنو! تم نے جاپان کا نام تو ضرور سنا ہوگا۔ یوں تو اس ملک کی بہت ساری چیزیں بیان کرنے کے قابل ہیں لیکن آج ہم تمھیں جاپانی طالب علموں کا کچھ حال سناتے ہیں۔ جس طرح کسی ملک کی ترقی میں نوجوانوں کو بہت دخل ہوتا ہے۔ اسی طرح جاپان کی ترقی میں وہاں کے طلبا کا بہت بڑا ہاتھ ہے۔

جاپانی طلبا کو تمھاری طرح تحتانی جماعتیں ختم کرنے کے بعد وسطانی درجے میں قدم رکھنا پڑتا ہے۔ لیکن انھیں تمھاری نسبت زیادہ مدت گزارنی پڑتی ہے۔ اگر تمھیں صرف چار سال کے بعد طبقۂ وسطانیہ میں شرکت کی اجازت مل جاتی ہے تو جاپانی طلبا کو چھ سال تک تعلیم حاصل کرنی پڑتی ہے۔

وسطانی تعلیم کے بعد طلبہ کی ایک بڑی تعداد صنعتی مدارس میں شریک ہو جاتی ہے۔ تم نے اپنے بزرگوں کو یہ کہتے سنا ہوگا کہ جاپان ایک صنعتی ملک ہے۔ اور خود تم بھی اپنی ضرورت کی بہت سی چیزیں جاپان کی بنی ہوئی خریدتے ہو۔ جدھر دیکھو جاپانی مال کی مانگ ہے۔ یہ سب کچھ ان محنتی طلبہ کی کوششوں کا نتیجہ ہے۔

بعض طلبا ایسے بھی ہوتے ہیں جو کہ فوقانی جماعتوں میں شریک ہو کر آئندہ تعلیم جاری رکھتے ہیں اور چھ سات سال کے بعد انھیں دستار فضیلت مل جاتی ہے۔

بھائی اور بہنو! تم نے دیکھا جاپانی طلبا کی مدت تعلیم بہت طویل ہے۔ لیکن طلبا بہت ہی سرگرمی سے محنت کرتے ہیں۔ اور نہایت ہنسی خوشی سے زندگی گزارتے ہیں۔ ان کی ایک اور خوبی یہ ہے کہ ہماری طرح یہ تعلیم پانے کے بعد ملک و قوم کے لئے وبال نہیں بن جاتے بلکہ اپنی روزی آپ کما سکتے ہیں۔

جاپان کے مدرسوں کا آغاز انگریزی مہینے اپریل سے ہوتا ہے۔ یہ دن بہار کے ہوتے ہیں۔ پُرلطف موسم میں سکورا کے پھولوں کا منظر قابل دید ہوتا ہے سکورا جاپانیوں کا بہت ہی عزیز پھول ہے۔ جس طرح ہم گلاب کے پھول پر جان دیتے ہیں سکورا بھی جاپانیوں کا بہت ہی چہیتا پھول ہے۔ کوئی گھر ایسا نہیں ہوتا جہاں سکورا کے پودے نہ لگے ہوں، کیا غریب اور کیا امیر سب ہی چمن بندی سے دلی لگاؤ رکھتے ہیں۔ ان کے چمن

کی نوعیت بالکل مختلف ہوتی ہے۔ طلبہ اپنا فالتو وقت ایسے کاموں میں ہی صرف کرتے ہیں۔ بالکل تمھاری طرح ان کا بھی پہلی میقات کے ختم پر سہ ماہی امتحان ہوتا ہے۔ یہ زمانہ بارش کا ہوتا ہے۔ سب پڑھنے میں مصروف دکھائی دیتے ہیں۔

سب رسی بھائیو! تم یہ تو جانتے ہی ہو کہ گرما کی ہم کو بھی چھٹیاں ملتی ہیں۔ لیکن نہ تو ہمارے ہاں کوئی نظام نامہ ہی ہوتا ہے۔ اور نہ جاپانیوں کا سا اہتمام بس جدھر بن پڑے چل کھڑے ہوئے۔ اور کسی نہ کسی طرح چھٹیاں گزار دیتے ہیں اور کتنے ہم میں سے گھر گھسنے ایسے ہیں جو کہیں جانا تو کجا شہر ہی کی بہت ساری تاریخی یادگاروں سے ناواقف ہیں۔

گرما میں طلبا پہاڑیوں پر چڑھتے ہیں۔ اور بعض ٹولیاں پیدل سفر بھی کرتی ہیں یہ ان کا بہت ہی دلچسپ مشغلہ ہے۔ جاپانی طلبہ سفر کے حالات قلمبند کرتے ہیں اور لوٹنے پر اپنے دوست احباب کو ان سے مستفید ہونے کا موقع دیتے ہیں بلکہ کئی کئی دن تک ایسی تقاریر کا سلسلہ بھی جاری رہتا ہے۔ جس میں طلبہ اپنے سفر کے حالات اپنے دوستوں کو سناتے ہیں۔ یہی چیزیں ہیں جن کے باعث جاپانیوں نے اتنی ترقی کی ہے۔

جاپانی طلبا کی اکثر جماعتیں ایسی بھی ہوتی ہیں جو ساحلی علاقوں کی سیر و تفریح کے لئے چھٹیوں کو وقف کر دیتی ہیں۔ اور قدرتی مناظر کا لطف اٹھاتی ہیں۔ پیراکی ان کا محبوب ترین مشغلہ ہے۔ لڑکے اور لڑکیاں دوش بدوش کشتی چلانے اور پیراکی میں حصہ لیتی ہیں۔

غالباً تم بھی اچھی طرح واقف ہو کہ بعض طلبہ کے والدین بہت غریب ہوتے ہیں اور ان طلبہ کو اپنی کفالت آپ کرنی پڑتی ہے۔ ایسے طلبہ ان چھٹیوں میں اپنے والدین کا بھی ہاتھ بٹاتے ہیں۔ ایسے طلبہ کی جاپان میں بہت بڑی تعداد ہے۔ آفریں ہے ان کی قومی خودداری کہ طرح طرح کی تکلیفیں اٹھانے کے باوجود کسی کے آگے دستِ سوال نہیں پھیلاتے۔

جاپانی طلبہ کے اکتسابِ علمی کا یہ عالم ہے کہ وہ گرمیوں کی چھٹیوں میں غیر ملکوں کی زبانوں اور نئے نئے علوم و فنون کے حاصل کرنے میں سخت محنت کرتے ہیں۔ تم نے دیکھا جاپانی طلبہ کی چھٹیاں کتنی دلچسپ ہوتی ہیں!

تم کہیں یہ نہ سمجھ لینا کہ یہ تو ان ملکوں کی بات ہے۔ جو ہم سے ترقی میں بہت آگے ہیں۔ ہندوستان بھلا ان کی برابری کیا کرے۔ نہیں! ان سے زیادہ ترقی کے تمھیں مواقع حاصل ہیں۔ اگر چاہو تو وہ سب کچھ کر سکتے ہو جو ناممکن ہے۔

اچھا تو اب ذرا مدرسے کھلنے کے بعد کا حال سنو۔ ستمبر کے مہینے میں پھر مدرسے کھل جاتے ہیں۔ طلبا ایک دوسرے سے اپنی اپنی گرمی کی مصروفیتوں کے قصے سناتے دکھائی دیتے ہیں۔ اچھی اچھی تقریریں سننے میں آتی ہیں۔ تقریر کا جاپان میں خاصہ اہتمام کیا جاتا ہے۔ خود طلبہ بھی تقریر کرتے اور دوسرے بزرگوں کی تقریریں سنتے ہیں۔

تم نے سنا ہوگا کہ اکثر ملکوں میں فوجی تعلیم بھی دی جاتی ہے۔ جاپان بھی ان ہی ملکوں میں سے ہے

جاپانی طلبہ ایک ایک ہفتہ کے لئے سپاہی بن جاتے ہیں اور وہ شہروں کو چھوڑ کر چھاؤنیوں میں چلے جاتے ہیں۔ اور بہت ہی محنت اور جانفشانی سے فوجی قواعد سیکھتے ہیں۔ فوجی تعلیم میں یوں تو بہت سے فوائد ہیں جن میں دو بہت ہی اہم ہیں ایک تو اس سے ملک کی خاص حفاظت ہوتی ہے اور دوسرے خود ان کی اپنی جسمانی صحت اچھی رہتی ہے۔

ہر ملک و قوم نے ایک دن قومی عید کے لئے مقرر کیا ہے۔ جس طرح ہم پہلی آذر کو اپنے ہاں قومی عید مناتے ہیں، جاپانیوں کے ہاں بھی عید نوروز سرما کے دنوں میں منائی جاتی ہے۔ شہر ہو کہ گاؤں ہر جگہ چہل پہل نظر آتی ہے۔ اور دوست احباب ایک دوسرے کو مبارکباد کے کارڈ اور تحفے تحائف دیتے ہیں۔ اس عید نوروز میں بلا لحاظ مذہب و ملت سب ہی شریک ہوتے ہیں۔ تحفے بھیجنے میں ایک لحاظ ضرور کیا جاتا ہے۔ یعنی جو چیز بطور تحفہ بھیجی جاتی ہے یا تو وہ ان کی اپنی بنائی ہوئی ہوتی ہے ورنہ ملکی ضرور ہوگی۔

دیکھا ترقی کس طرح کی جاتی ہے اسی مستقل مزاجی نے انسان کو پستی سے نکال کر بلندی پر پہنچا دیا۔ جاپان جس کی کہ آج ہم اس قدر تعریف کر رہے ہیں کچھ دن پہلے ایک معمولی جزیرہ تھا۔ اگر تم بھی چاہتے ہو کہ ترقی یافتہ اقوام کی صف میں اپنے لئے جگہ بناؤ تو اپنے حوصلوں کو بلند کرو اور کوشش کئے جاؤ۔ دنیا میں کام کا ہی بول بالا ہے۔ وہی کچھ پاتا ہے جو کچھ کرنا چاہتا ہے۔

شیخ رحیم الدین (ظہیرآبادی)

ہمارے مولوی صاحب

جب کبھی ہم لوگ آپس میں گفتگو کرتے کرتے تعلیم او استاد کے متعلق اظہار خیال کرتے ہیں تو یقین جانئے کہ ہمارے جسم میں ایک برقی لہر سی دوڑ جاتی ہے، اور وہ تمام مناظر آنکھوں کے سامنے پھرنا شروع ہو جاتے ہیں جب کہ ہم لوگ گھر پر تعلیم پاتے تھے۔ ابا جان نے ہماری تعلیم کے لئے ایک "استاد" کو مقرر کیا تھا۔ استاد کیا تھے سچ مانئے جلاد تھے جلاد — ہم لوگوں کی روح ان سے کانپ جاتی تھی — ہر روز دعا مانگتے تھے کہ خدا اس استاد سے نجات دلائے —

استاد صاحب روزانہ ایک موٹی بید کے ساتھ تشریف لاتے تھے ان کا رعب ہی کیا کم تھا پھر "بید" کی ہمراہی ان کو آتے دیکھ کر ہم لوگوں کے ہوش و حواس کا جنازہ نکل جاتا تھا۔ ذرا سی آواز ہوئی اور ایک طمانچہ پڑھتے پڑھتے ذرا رکے اور طمانچہ سی پڑی، ذرا غلطی ہوئی اور ایک زبردست کان گوشمی —

بہرحال استاد صاحب کی موجودگی میں ہم پر جو گذرتی تھی وہ ہم جانتے ہیں اور ہمارا دل —

ایک روز کا ذکر ہے کہ ہمارے بڑے بھائی نے "ہوم ورک" نہیں کیا اور جب حضرت کے آنے کی اطلاع ملی تو سب میں پہلے پیش قدمی کر کے بڑے دور دور سے ہی سلام میں پیش بندی کرتے ہوئے کہے "آداب ہڈٹ" (آداب حضرت) "آداب" مولوی صاحب نے رکھیرپن سے جواب دیا — "ہڈٹ آٹھ ہم ال ڈبلا کا ہوم وٹ نہیں ٹلے" (حضرت آج ہم الجبرا کا ہوم ورک نہیں کرسے) —

"کیوں نہیں کیا" مولوی صاحب نے سخت لہجہ میں کہا "ٹاپی ٹھوڈیٔ ہڈٹ" (کاپی کھو گئی حضرت) "جھوٹ، بالکل جھوٹ، کاپی خود چھپا دیا اور جھوٹ کہہ رہا ہے" ذرا نزدیک تو آ" ۔ حضرت نے کہا ۔ قسمت کے مارے بڑے بھائی آگے بڑے تو اس استاد نے اس بے رحمی سے ان کا کان مروڑا کہ بے چارے "ل ڈیا ہڈٹ (مرگیا حضرت) کہتے ہوئے تڑپنے لگے ۔

چھوٹے بھائی جان جو ذرا دلیر تھے، سبق میں رکنے لگے کیونکہ انھوں نے سبق برابر یاد نہ کیا تھا، اس کی سزا میں مولوی صاحب نے ان کی دونوں انگلیوں کے درمیان قلم رکھ کر اس زور سے دبایا کہ "اماں ڈان بٹاؤ ۔ اماں ڈان بٹاؤ" (اماں جان بچاؤ) کہتے ہوئے ناچنے لگے ۔

بڑی آپا ہماری پٹی ضرور تھیں مگر ہم سے کم ۔ ہم لوگوں کے دل میں مولوی صاحب کا رعب اور خوف اتنا بیٹھ گیا تھا کہ نیند سے چونک چونک کر اٹھتے تھے ۔ ایک مرتبہ بڑی آپا دوپہر میں سو گئی تھیں کہ اتنے میں "مولوی صاحب" تشریف لائے ۔ چھوکری نے جگایا، بے چاری نیند میں سے چونک کر اٹھیں اور حواس باختہ ہو کر ہیبت میں بجائے کتابوں کے "بیگ" کے سرہانے کا تکیہ لیے ہوئے سیدھے جلدی جلدی مولوی صاحب کے پاس گئیں، بندگی کر کے بیٹھ گئیں اور تکیہ کو میز پر رکھ دیا۔ "یہ کیا ہے" مولوی صاحب نے بری صورت بناتے ہوئے کہا "جی کتابوں کا "بیگ" ہے مولوی صاحب" بڑی آپا نے کہا "بیگ ہے، دیکھو، آنکھیں کھول کر دیکھو" ۔ بڑی آپا نے اب جو دیکھا تو روح فنا ہو گئی کیونکہ کتابوں کے بیگ کی بجائے بڑی آپا نے "تکیہ" اٹھا لایا تھا ۔ "قصور ہو گیا حضرت معاف کر دیجیے" اتنا کہنے پر بھی نہ مولوی صاحب کو رحم آیا اور غصہ اترا، انھوں نے اسی تکیہ سے بڑی آپا کے سر پر ضربیں چار رسید کیے ۔ آپا بلبلا رہی تھیں ۔

اب میری کہانی بھی سن لیجیے ۔ میں فطرتی طور سے کم گو واقع ہوئی ہوں ۔ چونکہ میں ان سب سے چھوٹی ہوں اس لئے مولوی صاحب کو خاص طور پر ہدایت کی گئی تھی کہ وہ مجھ پر سختی نہ کریں ۔ مولوی صاحب کے سامنے میں منہ سے ایک حرف تک نہیں نکالتی تھی، جو کچھ وہ کہتے ہیں سن لیتی ہوں، لیکن کبھی منہ سے ایک لفظ نہ دہرائی، مولوی صاحب نے مجھے کئی مرتبہ کہا کہ اگر میں صرف ایک لفظ کہوں تو وہ مجھ کو اس دن کی پڑھائی معاف کر کے چھٹی دے دیں گے، وہ لاکھ لالچ دیتے لیکن میں بالکل خاموش رہتی ۔ ۔ بعض اوقات تنگ آ کر وہ مجھ کو کان گوشی دیتے، لیکن میں صبر کرتی اور پھر خاموش رہتی ۔ اس طرح کئی دن گزر گئے ۔ ایک روز انھوں نے مجھ سے کہا کہ اگر میں اب نہ بولوں تو میرا منہ جلا دیا جائے گا ۔ لیکن میں پھر بھی خاموش تھی ۔ مولوی صاحب نے اندر سے آگ کی ایک ڈلی منگوائی اور اس کو پھونکنا شروع کیا اور جب وہ بالکل سرخ ہو گئی تو میرے منہ کے قریب لے آئے، اب تو میرے اوسان جاتے رہے، لاکھ ضبط کی لیکن میرے سے بے اختیار نکلا "اللہ مر گئی" اتنا کہا اور کرسی چھوڑ کر اندر ایسا بھاگی کہ پھر مولوی صاحب نے لاکھ کوشش کی لیکن باہر نہ آئی ۔

والد مجھے بے حد چاہتے تھے، میں نے مولوی صاحب کی شکایت کی، میرے ساتھ بڑے بھائی جان اور بڑی آپا نے بھی ہمنوائی کی، تو وہ بے حد متاثر ہوئے اور مولوی صاحب کو ہمیشہ کے لئے رخصت کر دیا گیا ۔ جس دن مولوی صاحب کو علٰحدہ کر دیا گیا اس دن بڑی اطمینان کی نیند آئی ہے ۔ اتنی مدت گزر گئی ہو خدا بخشے مولوی صاحب کا انتقال ہوئے چار سال ہو چکے ہیں لیکن جب کبھی ان کا خیال آتا ہے تو کلیجہ کانپ جاتا ہے ...

کابلی والا

میری پانچ سالہ منی بغیر بک بک کئے خاموش نہیں رہتی
میری تو یہ حالت ہے کہ اگر کبھی خلافِ معمول اس کو خاموش
دیکھتا ہوں تو دل میں ہلکا سا اضطراب پیدا ہو جاتا ہے۔
یہی وجہ ہے کہ ایسے وقت میں خود چھیڑ چھیڑ کر سوالات کیا
کرتا ہوں۔

ایک دن صبح کو میں حسبِ معمول ناول کے لکھنے میں
نہایت سرگرمی کے ساتھ مستغرق تھا۔ یکایک اس نے بلند آواز
کے ساتھ میوہ فروش کو آواز دی۔ اس سے مجھے بڑی تکلیف
محسوس ہوئی اور میرا دماغ اور خیالات منتشر ہو گئے۔ میں نے
دریچہ سے دیکھا رحمٰن نامی کابل کا رہنے والا میوہ فروش
گزر رہا تھا۔ جوں ہی وہ اندر داخل ہوا منی اسے دیکھ کر
پریشان و سراسیمہ اندر چلی گئی اور اپنی ماں کے آنچل میں
پناہ گزیں ہوئی۔ مجھے چند قسم کے میوے خریدے۔ خیر ان
نہ پڑا۔ اس نے مجھ سے پوچھا "آپ کی لڑکی کہاں ہے؟
کیا وہ مجھے دیکھ کر گھبرا گئیں؟" یہ سن کر میں بحرِ تفکر میں ڈوب
گیا۔ جس طرح جھرنوں سے پانی ابلا کرتا ہے اس طرح
میرے دل میں خیالات پیدا ہونے لگے کہ کہیں اس کے
دل پر ہمیشہ کے لئے کابل والے کا رعب نہ چھا جائے۔ میں
نے منی کو جبراً اندر سے اپنے ساتھ لے آیا۔

وہ گھبرا گئی، ڈرتی ہوئی میری کرسی کے قریب کھڑی رہی
اس نے استعجاب کی نگاہوں سے رحمٰن اور اس کے تھیلے کی
طرف نظر دوڑائی۔ میں نے نہایت حزم و احتیاط سے رحمٰن کے
چہرے پر پیدا ہونے والے تاثرات کا مطالعہ کیا۔ رحمٰن نے
مزید اخروٹ اور بادام اس کے سامنے پیش کئے۔ لیکن
منی نے اس کا ہدیہ قبول نہ کیا۔ میرے قریب تر آگئی — یہ تھی
ان دونوں کی پہلی ملاقات۔

۲

کچھ دنوں بعد منی اس سے ایسی مانوس ہو گئی گویا برسوں
کی جان پہچان تھی۔ ان دونوں کا آپس میں مذاق ہوا کرتا
تھا اور دونوں ہشاش بشاش رہتے تھے۔ معلوم یہ ہوتا
تھا کہ دونوں باہم ایک دوسرے کی صحبت سے نہایت خوش تھے۔
اسی طرح سے دن گزرتے گئے — ان کی روزافزوں
محبت کو دیکھ کر میرے دل میں پریم کی لہریں اٹھنے لگیں۔

ایک دن صبح کو میں نے دریچہ سے دیکھا کہ رحمٰن
پولیس کے سپاہیوں سے گھرا ہوا ہے اور اس کے ساتھ ہتکڑیوں
سے جکڑے ہوئے ہیں۔ استفسار کرنے پر معلوم ہوا کہ اس نے
کسی کو ضرب شدید پہنچایا۔ منی نے حسبِ معمول دلفریب
تبسم کے ساتھ اسے دیکھا۔ اس واقعہ کے بعد ان دونوں
کی ملاقات قطعی طور پر بند ہو جاتی ہے کیونکہ اس کو آٹھ سال
کی قید بامشقت کی سزا دی گئی۔ طویل مدت کی وجہ سے
میرے ذہن سے رحمٰن کا خیال قطعی طور پر نکل گیا اور منی نے
بھی اسے بالکل فراموش کر دیا۔ اس طرح آٹھ سال گزر گئے۔

۳

منی کا سن تیرہ کا ہو چکا تھا، اس کے بیاہ کا دن تھا۔ صبح
ہی سے بانڈ باجا ساتھ نوازی کر رہا تھا۔ میں ضروری انتظامات
میں مشغول تھا۔ یکایک رحمٰن میرے کمرے میں داخل ہوا
اور مجھے مؤدبانہ سلام کیا۔ اس کی مجموعی ہیئت کو دیکھ کر
میں پہچان نہ سکا۔ اس نے کچھ تبسم کیا اور میں نے اسے
غور کرنے کے بعد پہچان لیا۔ خواب کی طرح ایک دھندلی سی
گزشتہ واقعات کی یاد کے سوا نے اب میرے پاس کچھ
نہ تھا۔ میں نے پوچھا "تم یہاں کب آئے؟" اس نے جواباً
"مجھے کل شام کو قید خانہ سے نجات ملی اور اب یہاں آیا ہوں۔"

اس جملے نے میرے دل پر نشتر کا کام کیا۔ ایسے خوشی کے موقع پر ایک ایسے شخص کا آنا کہ جو قید سے نکلا ہو اچھا گمان اور نیک فال نہ تھا۔ میں نے اس سے کہا "آج میری لڑکی کی شادی رچی ہے تم کسی اور وقت آؤ" آنسو کے چند قطرے دل کی گہرائیوں سے اٹھ کر اس کی آنکھوں میں جمع ہو گئے۔ اس نے ٹھنڈی سانس بھر کر پوچھا "کیا آپ اپنی لڑکی کو ایک منٹ کے لیے بھی یہاں نہیں بھیج سکتے؟" شاید رحمٰن یہ سمجھ رہا تھا کہ منی وہی پہلی سی ہو گی۔ میں نے اسے صاف کہہ دیا "منی کسی طرح سے بھی یہاں نہیں آ سکتی"۔ رحمٰن مایوس ہو گیا۔ اس کی آنکھیں پر آب ہو گئیں اور اسی سے چہرہ اترنے لگا۔ اس نے عاجزانہ میری طرف نظر دوڑائی اور خدا حافظ کہتا ہوا کبیدہ خاطر ہو کر میرے کمرے سے نکل گیا۔ میرا دل بھر آیا۔ پھر وہ دوبارہ واپس آیا۔ مجھے کاغذ کا ایک پوڑا تھماتے ہوئے کہا "میں نے یہ چیزیں منی کے لیے لائی ہیں۔ آپ کی لڑکی کی ہم عمر میری بھی ایک لڑکی ہے جو اپنی ماں کے پاس میرے وطن میں ہے۔ جب کبھی مجھے اپنی لڑکی کی یاد بے چین کرتی تھی میں یہاں آجایا کرتا تھا" یہ کہتے ہوئے اس نے ایک لمبی سانس لی۔ میرا ضمیر مجھے ملامت کرنے لگا کہ . . . .

ایسی بے مروتی برتنا کس قدر معیوب ہے۔ میں فوراً منی کو اپنے ساتھ لے آیا۔ عورتیں منع کرتی رہیں لیکن میں نے ایک نہ سنی۔ منی عروسانہ لباس پہنی ہوئی تھی۔ جوانی خوب نکھری تھی۔ اس کے چہرے پر شرم سے پسینہ آگیا۔ شرما کر نیچے نظر کر کے کھڑی رہی۔ رحمٰن کسی حواس باختہ کی طرح گم سم ہو کر منی کی طرف دیکھنے لگا۔ تھوڑے تامل کے بعد مسکرا کر پوچھا "کیا تم اپنے سسرال کے یہاں جا رہی ہو؟

معاً میرے دل و دماغ گران دونوں کی محبت اور ملا[قات] کے گزشتہ واقعات نے پراگندہ کر دیا۔ وہ کئی آر[زوئیں] اور خیالات کو اپنے دل میں یہاں بنا رہا تھا۔ کبھی [یہ] خیال کرتا کہ میری لڑکی بھی شاید اس عمر کو پہنچ چکی [ہو] کبھی یہ خیال اس کو پریشان کر رہا تھا کہ معلوم نہیں ا[س] طویل عرصہ میں اس پر کیا گزری ہو گی؟

شادیانے بجنے لگے، دعوتی آنے لگے، ہر شخص شاداں و فرحاں نظر آ رہا تھا۔ لیکن رنجور اور سوختہ جا[ں] رحمٰن ایک جگہ بیٹھا ہوا اپنے وطن کا تصور کر رہا تھا۔ م[یرا] دل بے تاب ہو گیا۔ میرے دل میں اس کی طرف سے ہمدردی پیدا ہوئی۔ میں نے اسے دس روپیہ کے تین نوٹ دیتے ہوئے کہا "رحمٰن تم اپنے وطن جاؤ اور اپنی لڑکی سے ملو۔ تمہارا اپنی لڑکی سے ملنا میری منی کے لیے نیک گمان اور اچھا شگون ہو گا"۔ خوشی کا ایک لطیف جذبہ مجھ پر طاری ہوا۔ میں نے راحت کا تسکین بخش اثر اپنے [دل] میں محسوس کیا۔ ایسے وقت میں ہر چیز روحانی کیف اور سرور سے لبریز نظر آ رہی تھی۔ اس وقت کی خوشی اور مسرت کا حال کوئی میرے دل سے پوچھے کہ بانسوں اچھل [رہا تھا]

(ٹیگور)

[مترجمہ] ...ل زیبا حمید